وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

اور ہم نے آپ کی طرف قرآن کریم اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وضاحت سے بتائیں کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے

تفسیر الخازن

کبیرہ

جلد اوّل

الفاتحة ۰ البقرة ۰ آلِ عمران

مفسّر

علامہ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم صوفی بغدادی

المعروف بالخازن، متوفی ۷۴۱ھ

مترجم ومحشی

مولانا حافظ محمد اسماعیل حسین قادری نورانی

فاضل دار العلوم نعیمیہ، نائب مفتی جامعہ انوار القرآن گلشن اقبال کراچی

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفسیر الخازن (جلد اوّل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

''فرید بک سٹال'' اربابِ علم اور اہلِ ذوق کے درمیان نشر و اشاعت کا ایک معروف اور معتمد ادارہ ہے۔ یہ ادارہ درحقیقت میرے والد محترم سید اعجاز احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا لگایا ہوا خوشنما پودا ہے' جو اب الحمد للہ اُن کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجہ میں ثمر بار درخت بن چکا ہے۔ میدانِ تصنیف میں اہلِ سنت کی عملی ترقی کا ایک بہت بڑا حصہ بحمدہٖ تعالیٰ ''فرید بک سٹال'' کے ساتھ وابستہ ہے۔ علماء اہل سنت اور قارئین کے علمی اور مطالعاتی تعاون سے اس ادارہ نے چند سالوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اور امید ہے کہ عروج و ترقی کا یہ سفر جاری رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز

جناب علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اپنے تلامذہ میں سے ایک نوجوان تلمیذ رشید (مولانا محمد اسماعیل حسین نورانی) کا مجھ سے تعارف کروایا۔ مولانا اسماعیل اللہ عزوجل کے فضل و کرم سے ایک اہلِ قلم' اہلِ زبان' صاحبِ ذوق اور خدمتِ دین سے شغف رکھنے والے نوجوان ہیں۔ اکابر اساتذہ کی توجہ اور عنایت نے کم عمری ہی میں بہت عزت سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ ''حقائق شرح صحیح مسلم ودقائق تبیان القرآن'' کی شکل میں ہم قارئین کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے آغاز میں ہم نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ہم ایک معروف تفسیر ''تفسیر الخازن'' کے ترجمہ تحقیق کا کام بھی مولانا اسماعیل صاحب نورانی سے کروا رہے ہیں۔ اور وہ کام اس انداز کا ہے کہ اس میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تفسیر میں مذکور احادیث کی تشریح اور تخریج ہوگی اور علامہ خازن علیہ الرحمہ چونکہ شافعی المذہب ہیں' اس لیے جہاں وہ فقہاء احناف کے دلائل کا رد کریں گے' وہاں مولانا اسماعیل صاحب دلائل کی روشنی میں فقہ حنفی کی حقانیت کو اُجاگر کریں گے۔ سو الحمد للہ اس کی پہلی جلد جو کہ الفاتحہ' البقرہ اور آل عمران پر مشتمل ہے' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اور بقیہ جلدیں بھی وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہیں گی۔ ہم نے تفسیر الخازن کی طباعت کو حسین سے حسین تر بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور بہت محنت سے کام لیا ہے۔ قارئین کی آنکھیں انشاء اللہ خیرہ ہوں گی اور قلبی طمانیت کا احساس ہوگا۔

ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنے محبوب مکرم ﷺ کے طفیل مفسر قرآن حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہٗ کا سایہ اہل سنت پر دراز فرمائے اور اُن کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے۔ انہوں نے مولانا محمد اسماعیل نورانی کی شکل میں ہمیں جو تحفہ دیا ہے' اُس پر اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ مولانا اسماعیل صاحب کو اللہ تعالیٰ ظاہری باطنی صحت و عافیت اور استقامت کے ساتھ ہمیشہ دینِ متین کی خدمت میں رکھے اور نظرِ بد سے محفوظ فرمائے۔ علماء اہلِ سنت کے تحریری کارناموں کو منظر عام پر لانے میں ہماری جو کاوشیں اور محنتیں ہیں' اُن کو اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے۔ ہمارے ادارہ کو اور اہل سنت کے جملہ اداروں کو اللہ تعالیٰ دائمی ترقی عطا فرمائے۔ حاسدین کے حسد اور شریروں کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

سید محسن اعجاز

تفسیر خازن کے ترجمہ اور اس کے مترجم کا تعارف

(تحریر: علامہ غلام رسول سعیدی)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علٰی رسولہ الکریم

علامہ مفتی حافظ محمد اسماعیل نورانی (زید علمہٗ وسعدہٗ) کم سن عالم دین ہیں' کم عمری میں دینی علوم سے فراغت حاصل کی اور بہت مہارت پیدا کی' اللہ تعالیٰ نے انہیں وافر ذہانت اور قوی حافظہ عطا فرمایا ہے اور انتہائی دقت نظر گہرائی اور گیرائی عطا فرمائی ہے' مطالعہ کا بے حد شوق ہے اور زیادہ سے زیادہ حصولِ علم کی ان تھک لگن ہے' اس کم عمری میں انہوں نے دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ گریجویشن بھی کرلیا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں سید محسن اعجاز زید حبہٗ نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ میں تفسیر خازن کا ترجمہ کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ مارکیٹ میں بہت سے تراجم دستیاب ہیں' آپ کے کرائے ہوئے ترجمہ میں کوئی انفرادیت ہونی چاہیے' صرف خالی ترجمے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا' تفسیر خازن کا ایسا ترجمہ ہونا چاہیے' جس میں ان احادیث کی مکمل تخریج اور تحقیق ہو جن کو علامہ خازن نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے' چونکہ علامہ خازن شافعی المذہب ہیں اس لیے وہ فقہ شافعی کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات' احادیث اور آثارِ صحابہ وارد کرتے ہیں اور فقہ حنفی کا رَد کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ترجمہ کے حاشیہ میں علامہ خازن کے پیش کردہ دلائل کا بھرپور جواب دیا جائے اور فقہ حنفی کے ثبوت میں اسی طرح قرآن مجید کی آیات' احادیث اور آثارِ صحابہ سے دلائل پیش کیے جائیں تاکہ عام قارئین مذہب حنفی کے بارے میں شکوک اور شبہات کا شکار نہ ہوں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ جن احادیث کے معنیٰ پر کوئی اشکال ہوتا ہو' حاشیے میں اس کا بھی ازالہ کردیا جائے' تب یہ تفسیر خازن کا ایسا ترجمہ ہوگا جو نہ صرف منفرد ہوگا بلکہ قارئین کے لیے معلومات افزاء ہوگا۔ نیز اس ترجمہ کی زبان نہایت آسان' سادہ اور سہل ہونی چاہیے اور اس میں دقیق' مشکل اور ثقیل الفاظ سے مکمل احتراز اور اجتناب کیا جائے۔ تب ہی یہ تفسیر عوام وخواص کے ہر طبقے میں مرغوب اور مقبول ہوگی۔ سید محسن صاحب نے مجھ سے کہا کہ ایسا ترجمہ تو کوئی ماہر' پختہ اور تجربہ کار عالمِ دین ہی کرسکتا ہے۔ آپ کی نظر میں ایسا متبحر عالمِ دین کون ہے؟ میں نے کہا: اس سال ہماری دورۂ حدیث کی کلاس سے مولانا محمد اسماعیل نورانی فارغ ہورہے ہیں اور وہ بلاشبہ اس کام کو باحسنِ وجوہ کرسکتے ہیں' محسن صاحب نے مجھ سے کہا: آپ اتنے اہم اور عظیم کام کو ایک نوخیز اور نوجوان طالب علم سے کرانے کا سوچ رہے ہیں میں نے کہا: آپ اس نوجوان کی علمی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں جب آپ اس کے کام کو دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا۔

میں نے مزید کہا: میں عرصہ سینتیس (۳۷) سال سے حدیث شریف پڑھا رہا ہوں' میں نے اب تک ایسا عبقری اور غیر معمولی ذہین طالب علم نہیں دیکھا' میں نے بتایا کہ مولانا اسماعیل نورانی نے تنظیم المدارس اہل سنت کے عالمیہ کے امتحان کے لیے ایک مقالہ لکھا ہے' جس میں شرح صحیح مسلم کا دیگر کتب احادیث کی شروح سے تقابل کیا ہے' میں یہ مقالہ آپ کو بھجواؤں گا' پھر آپ میری تجویز پر غور کیجئے گا۔ سید محسن صاحب اس مقالے کے پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے نہ صرف مولانا

اسماعیل نورانی سے تفسیر خازن کا کام کرانے کا پروگرام بنالیا' بلکہ اس مقالہ کو بھی طبع کردیا۔
چنانچہ یہ مقالہ اب چھپ کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے' اس کا عنوان ہے: ''حقائق شرح صحیح مسلم و دقائق تبیان القرآن''۔
اب میں ان سطورِ ذیل میں مختصر طور پر علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی کے حالات ذکر کر رہا ہوں۔
علامہ اسماعیل نورانی کے والد گرامی کا نام محمد حسین ہے' مولانا اسماعیل نورانی کی ولادت ۱۹۸۳ء میں ہوئی اور ۱۹۹۲ء میں انہوں نے مدرسۃ المدینہ گودھرا کراچی سے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی اب تک ماشاء اللہ سات بار تراویح میں قرآن مجید سنا چکے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں درسِ نظامی پڑھنے کی ابتداء انوار القرآن' گلشن اقبال' کراچی سے کی۔ ان کے حامی' مربی اور بانی استاذِ گرامی حضرت استاذ العلماء الحاج المفتی محمد حسن حقانی مدظلہٗ العالی ہیں' ان کے علاوہ دیگر اساتذہ میں حضرت مولانا غلام جیلانی' مولانا محمد رضوان نقشبندی اور مولانا اسحٰق قادری کے نام نمایاں ہیں' ۲۰۰۱ء میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے دار العلوم نعیمیہ کراچی میں داخلہ لیا۔
حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن دامت برکاتہم العالیہ سے صحیح مسلم پڑھی' مولانا عبد الحیٔ افغانی سے سنن نسائی پڑھی اور راقم الحروف سے صحیح بخاری پڑھی اور راقم کی نگرانی میں ہی تنظیم المدارس اہل سنت کے عالمیہ کے امتحان کے لیے مقالہ تحریر کیا اور ۲۰۰۲ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور مشاہیر علماءِ کرام کے ہاتھوں دستار بندی کا شرف حاصل کیا۔ جن علماء نے ان کی دستار بندی کی' اِن میں نمایاں اسماء حضرت قائد اہل سنت علامہ الشاہ احمد نورانی صدیقی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت علامہ مفتی محمد حسن حقانی مدظلہٗ' حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن مدظلہٗ' حضرت مولانا الیاس رضوی مدظلہٗ' حضرت علامہ غلام جیلانی مدظلہٗ' علامہ محمد رضوان مدظلہٗ اور راقم الحروف ہیں۔
مفتی محمد اسماعیل نورانی عربی اور اردو میں یکساں طور پر فی البدیہہ تقریر بھی کرتے ہیں اور انشاء پرداز بھی ہیں' ان کا رسم الخط بھی تحریر کی طرح بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے مختلف موضوعات پر مضامین سپردِ قلم کرتے رہے ہیں' ان رسائل و جرائد میں سے نمایاں نام ''نور الحبیب'' ''النعیم'' اور ''فیضانِ کرم'' ہیں۔
تفسیر خازن کے ترجمہ' تخریج' تحقیق اور تشریح کے کام کی ابتداء اسی نہج پر ہو چکی ہے' جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس ترجمہ کی پہلی جلد قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کو پڑھ کر قارئین کرام یہ اندازہ کریں گے کہ میں نے اس ترجمہ کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے' اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے' بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس ترجمہ کی کوئی خوبی اب تک میرے نوکِ قلم پر نہ آئی ہو۔
عام طور پر ثقہ علماء علمی کارناموں میں تو بہت آگے ہوتے ہیں' لیکن عمل کے میدان میں ان کا اپنے علم کے تقاضوں کے مطابق کوئی خاص کردار نہیں ہوتا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ! مفتی محمد اسماعیل نہایت باعمل عالمِ دین ہیں' پابند صوم و صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ متبعِ سنت ہیں' شہر کی تقریبات میں ان کے دل پذیر خطابات ہوتے رہتے ہیں اور وہ بہت مقبول اور مرغوب مقرر ہیں۔ مسجد الماس عزیز آباد میں تقریباً تین سال سے جمعہ پڑھا رہے ہیں اور وہاں کے عوام و خواص ان کے بہت دلدادہ ہیں اور بہت محبت کرتے ہیں۔
افتاء کے شعبے میں بھی ان کو بہت مہارت ہے اور عرصہ چار سال سے علامہ مفتی محمد حسن حقانی مدظلہٗ کی نگرانی میں فتوے لکھ رہے ہیں ان کے فتاویٰ کا مجموعہ بھی ساتھ ساتھ مرتب ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ جلد یا بدیر وہ بھی زیب اشاعت ہوگا۔ مفتی محمد

اسماعیل نورانی اپنے اساتذہ کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان سے دعائیں لیتے ہیں۔ ہر منگل کو راقم الحروف سے ملاقات کے لیے آتے ہیں بہت زیرک اور ذہین ہیں' نکتہ شناس ہیں اور عربی کی دقیق عبارات کو بہت جلد سمجھ لیتے ہیں۔

اس ماہ ۲۵ ربیع الاوّل ۱۴۲۶ھ کو مفتی محمد اسماعیل نورانی عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے حرمین طیبین روانہ ہو رہے ہیں اور وہاں حرم کعبہ اور حرم رسول کے جوار میں تفسیر خازن کے ترجمہ کی دوسری جلد کے تبرکاً چند صفحات لکھنے کا عزم رکھتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کی اس جلد میں حرمین شریفین کی برکتیں انڈیل دے اور جس طرح انہیں عمرہ کی سعادت عطا فرمائی ہے' حج مبرور کی سعادت سے بھی مشرف فرمائے' (آمین)۔

میں ان کے لیے ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے علم وعمل میں اور زورِ قلم میں مزید نکھار اور رعنائیاں عطا فرمائے اور ان کو ہمیشہ خوش وخرم اور شاداب رکھے ان کی زندگی میں ہمیشہ بہار سایہ افگن رہے اور کبھی خزاں نہ آنے پائے۔ دنیا اور آخرت کی ہر مشکل اور پریشانی سے ان کو محفوظ و مامون رکھے۔ مہلک اور موذی بیماریوں سے کبھی ان کا واسطہ نہ پڑے اور اللہ تعالیٰ مجھے اور ان کو زیادہ سے زیادہ دین کی خدمات کرنے' اسلام پر جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت عطا فرمائے' مرنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور مرنے کے بعد آپ کی شفاعت نصیب فرمائے۔ (آمین)

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ
۲۹ اپریل' ۲۰۰۵ء/ ۱۸ ربیع الاوّل ۱۴۲۶ھ

تقریظ جلیل

استاذ العلماء حضرت علامہ مفتی محمد حسن حقانی اشرفی
(پرنسپل جامعہ انوار القرآن، گلشن اقبال، کراچی)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

اما بعد

فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم

بسم الله الرحمن الرحیم

زیرِ نظر کتاب ''تفسیر الخازن'' (عربی) کا اردو ترجمہ اور اس پر تحقیق ہے، جو کہ برادرِ عزیز مولانا محمد اسماعیل قادری نورانی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب مفسرِ قرآن حضرت علامہ مولانا شیخ الحدیث غلام رسول سعیدی صاحب کے شاگردِ رشید ہیں اور قائدِ ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا ہیں۔ اور جامعہ انوار القرآن (گلشنِ اقبال، کراچی) میں منصب تدریس و افتاء پر فائز ہیں۔

''گدڑی میں لعل'' بطور محاورہ بہت سنا ہے، لیکن مولانا اسماعیل نورانی پر یہ محاورہ پوری آب و تاب کے ساتھ حقیقت بن کر میرے اور ہر ایک کے سامنے آیا ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب صرف گدڑی کے لعل نہیں بلکہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ گودھرا کے لعل بھی ہیں۔ تفسیر الخازن پر ان کی کاوش کئی اعتبارات سے قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔ مثلاً: (الف) مولانا نے بہت عرق ریزی کے ساتھ ''قرآنی آیات کا ترجمہ'' زینتِ قرطاس کیا ہے۔ جس میں کنز الایمان (از امام اہلِ سنت)، البیان (از غزالیٔ زماں)، جمال القرآن (از پیر محمد کرم شاہ الازہری)، ترجمہ قرآن (از محدث اعظم کچھوچھوی)، تبیان القرآن (از مفسرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی) کی خوشبو شامل کر کے قارئین کو گویا ترجمہ کا ایک مہکتا مہکتا گلدستہ پیش کیا ہے۔ (ب) صاحبِ تفسیر علامہ خازن رحمہ اللہ تعالیٰ کی عربی عبارت کو اردو کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے کہ اردو کے مروّجہ محاورات اور سلاست کا بھرپور لحاظ کیا ہے۔ کہ جو بھی صاحبِ ذوق اس تالیف کا مطالعہ کرے گا وہ قلبی و ذہنی نشاط اور علمی و فکری حلاوت و طراوت پائے بغیر نہ رہ سکے گا۔ (ج) علامہ خازن کی وارد کردہ احادیث مبارکہ کا ترجمہ بھی دورِ حاضر کی بامحاورہ زبان میں کیا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ان احادیث کے مآخذ و حوالہ جات کی مکمل نشاندہی بھی کی ہے۔ (د) حاشیہ میں بہت ہی محنت اور ذمہ داری کے ساتھ فقہ حنفی کی تائید و تقویت میں دلائل و براہین کا ذخیرہ پیش کیا ہے۔

مولانا اسماعیل صاحب کی تالیف کی یہ تمام خصوصیات کو دیکھا جائے تو اپنی اپنی جگہ خود مستقل ایک کارنامہ ہیں۔ لیکن جس خصوصیت نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا ہے وہ مولانا کی حاشیہ آرائی کا اندازِ بیان ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ کیونکہ جب مؤلف پر اور مؤلف کے سراپا پر ایک نظر پڑتی ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، فہم مفلوج ہو جاتی ہے اور روح فرطِ خوشی سے جھوم اٹھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسماعیل نورانی کو قدرت نے اس کام کے لیے چن لیا ہے۔ ورنہ جوانی کی عمر میں اپنے آپ اس قدر جبر اور پابندی کہ دن اور رات تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ پھر ساتھ میں جمعہ کی امامت و خطابت' ہفتہ میں دو دن کا درس' ہر منگل کو استاذِ محترم (علامہ غلام رسول سعیدی) کی بارگاہ میں حاضری' ادارہ میں طلباء کی اصلاح و تربیت' شہر میں وقتاً فوقتاً محافل میں تقاریر' یہ سب کا سب محض فضلِ الٰہی ہے۔ قدرت نے انہیں بہت کشادہ مواقع عطا کیے ہیں اور بہت سازگار ماحول فراہم کیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے گھر والے انہیں گھر کی ہر ذمہ داری اور خدمت سے آزاد کر کے دین کی خدمت کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ جس بستی کے یہ رہنے والے ہیں وہاں غیر مہذب لوگوں کی کمی نہیں' ایسے ویران ماحول سے نکال کر اللہ تعالیٰ نے انہیں جامعہ انوار القرآن' دار العلوم نعیمیہ اور مرشد گرامی (قائد اہل سنت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے روحانی فیوض و برکات سے جس طرح معمور اور روشن فرمایا ہے وہ ان کے لیے انشاء اللہ ثم انشاء اللہ دنیا و آخرت دونوں میں سعادت اور ترقی کا ضامن ہوگا۔

مولانا پر قدرت بھی بہت مہربان ہے اور سیّد المرسلین ﷺ کی بھی خصوصی شفقت و عنایت ہے۔ جس کی ایک جھلک "تفسیر خازن" پر مولانا کا یہ علمی و تحقیقی کام ہے۔ اور شیخ سعدی کی زبان میں "ایں سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کا کھلم کھلا مظہر ہے۔

برادرِ عزیز مولانا اسماعیل نورانی بحمدہٖ تعالیٰ اس وقت تدریس و تصنیف اور تحقیق کے میدان میں مسلسل ترقی پذیر ہیں اور انشاء اللہ العزیز اپنے عہد کے جلال الدین سیوطی اور عہد حاضر کے مفتی احمد یار خان نعیمی کی طرح مولانا بھی کثیر التصانیف ہوں گے۔ کہ ابھی تو علم و فن کے میدان میں قدم رکھا ہے اور "تفسیر خازن" پر تحقیقی شاہکار پیش کرنے کی سعادت پا رہے ہیں۔ امید ہے مولانا اسماعیل نورانی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد جب اٹل قانون کے مطابق اس جہانِ فانی سے رخصت ہوں گے تو نسل در نسل یاد رہیں گے' تصنیفات و تالیفات کی شکل میں ان کی یادگاریں نہ صرف ان کی یاد دلاتی رہیں گی بلکہ انشاء اللہ ان کے لیے صدقہ جاریہ بنیں گی۔

مولانا اسماعیل صاحب نے بہت بلند پایہ اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ جن میں ایک طرف مفسّرِ قرآن حضرت علامہ غلام رسول سعیدی صاحب کا نام نامی ہے تو دوسری طرف حضرت مولانا غلام جیلانی اشرفی' مولانا محمد رضوان احمد نقشبندی' مولانا محمد اسحاق قادری رضوی جیسے جلیل القدر اساتذہ کے اسماءِ گرامی بھی سرفہرست ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ جناب نے احقر محمد حسن حقانی سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ تاہم میں بہت حقیر' پر تقصیر نکما اور گمنام سا آدمی ہوں۔ جو کچھ بھی میں ان کی تالیف سے متاثر ہوا ہوں وہ مجھے میری اوقات بتاتا رہے گا۔ لیکن بایں ہمہ دل میں ان سے یا کسی سے حسد نہیں کہ شاگرد اگر استاذ سے کسی جہت سے آگے بڑھ جائے تو استاذ خوش ہوتا ہے۔ مرید اگر مرشد سے یا بیٹا باپ سے آگے نکل جائے تو مرشد اور والد کو خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح مجھے ہی نہیں' مولانا اسماعیل کے تمام ہی مربیّوں کو مسرت ہوگی کہ ان کا پروردہ کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے! (اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچا کر اپنی خصوصی حفظ و امان میں رکھے۔)

بارگاہِ الٰہی میں میری دعا اور استغاثہ ہے کہ وہ رحمۃ للعالمین' شفیع المذنبین ﷺ اور سیّدی سرکارِ بغداد' محبوب سبحانی غوثِ صمدانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی بغدادی حسنی حسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طفیل مولانا اسماعیل نورانی کو ہر جسمانی و روحانی آفت و بلا اور تبختر و تکبّر سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ ہم سب کو ایمان پر استقامت اور ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

احقر محمد حسن حقانی اشرفی

۱۰ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

تقریظ

مفتی منیب الرحمٰن

(صدر تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان، چیئرمین مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پاکستان، مہتمم دار العلوم نعیمیہ، کراچی)

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله وحده ازلی ابدی لا اول له ولا اخر له صمدی سرمدی لاضد ولا ندله والصلوٰة والسلام علی من لانبی بعده سیدنا ومولینا محمد النبی الامی وعلی کل من صحبه و تبعه باحسان بعده

مولانا حافظ محمد اسماعیل نورانی زاده اللہ بسطة فی العلم والجسم وحفظه الله تعالیٰ ایک سلیم الفطرت نوجوان اور انتہائی فاضل عالم ہیں، دین اور علمِ دین سے محبت ان کی رگ و پے میں رچی بسی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ قوتِ حافظہ، بے مثال ذہانت، فکرِ رسا، اصابتِ رائے، استحضارِ علم، مجتہدانہ بصیرت اور تخلیقی ذہن سے نوازا ہے۔ بایں ہمہ عجب، کبر وریا، تعلّی اور تفاخر ایسی صفاتِ ذمیمہ سے اللہ جل شانہ کی شانِ کریمی نے انہیں محفوظ رکھا ہے، وہ انتہائی خلیق اور متواضع طبیعت کے مالک ہیں، حلیم الطبع اور مؤدب ومتأدب ہیں، ابلاغِ دین کے تینوں شعبوں یعنی تدریس، تحریر اور تقریر میں اللہ تعالیٰ نے ان پر فیضانِ وافر فرمایا ہے، بہت کم سعید و سعد شخصیات کو اس طرح مجمع الکمالات بننا نصیب ہوتا ہے، ان کی تحریر میں بلا کی ادبیت، بلاغت، سلاست اور اثر آفرینی ہے، بلاشبہہ استاذ العلماء علامہ محمد حسن حقانی مدظلہم کے سر اس جوہرِ علمی کی تلاش، تراش اور تشکیل کا سہرا جاتا ہے، لیکن اس کی تکمیل، تحسین اور تزیین کا اعزاز علامہ غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کو حاصل ہے، علامہ حقانی صاحب نے انہیں بحرِ علم میں تیراکی کا فن سکھایا تھا، علامہ سعیدی نے بحرِ علوم میں غواصی و دُور شناسی کا نہ صرف انہیں ملکہ عطا کیا بلکہ سراسر اپنا اور علم کا گرویدہ بنالیا، علوم دینیہ کے بحرِ ناپیدا کنار کی وسعتوں اور مقامِ ابلاغ کی رفعتوں سے آشنا کیا۔ میری مخلصانہ دعا ہے اللہ جل شانہ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل انہیں فریبِ نفس، اغواءِ شیطان، زلّتِ فکر، علمِ غیر نافع، نگاہِ حاسدین، شماتتِ اعداء، تنگیٔ ظرف، شہرت عاجلانہ اور سیاحتِ اقلیمِ علوم میں فطرتِ نظر قانع کے فتنوں سے محفوظ رکھے، ان کے علمی، عملی اور فکری ارتقاء کا سفر جاری وساری رہے، مجھے امید ہے مراتبِ عالیہ ان کے منتظر رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

حضرت علامہ مفتی محمد اسماعیل نورانی زید مجدہم وبارک اللہ فی علمہم وفقاہتہم وثقاہتہم وعمرہم نے ''شہادۃ العالیہ فی العلوم العربیہ والاسلامیہ'' کے امتحان کے موقع پر ''حقائق شرح صحیح مسلم ودقائقِ تبیان القرآن'' کے عنوان سے ایک وقیع علمی مقالہ تحریر فرمایا تھا، اس موقع پر میں نے سطور بالا حضرت قبلہ مفتی صاحب کے لیے تحریر فرمائی تھیں۔ اس وقت حضرت صاحب اپنی تعلیم کی تکمیل فرما رہے تھے اور ابھی تحقیق وافتاء، تصنیف وتالیف، تدریس وخطابت الغرض علمی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق ان کی اعلیٰ علمی واخلاقی شخصیت کی تصویر کشی کی تھی۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ مجھے اس پر خلق اور خالق کے حضور شرمسار نہیں ہونا پڑا، ان کے بارے میں جیسا گمان کیا تھا، اس سے انہیں ہر لحاظ سے بہتر پایا۔ اب ایک بہترین مدرس، فقیہ، مفتی، خطیب اور مصنف ومؤلف ومترجم کے طور پر ان کا مقام مسلّم ہے، ماشاء اللہ وہ ایک بلند پایہ مفتی ہیں، ان کی نگاہ عمیق اور مطالعہ بڑا

وسیع ہے، تحقیق وتدقیق ان کے مزاج میں رچی بسی ہے ان کے بعض فتاویٰ علمی شاہکار ہیں، عین عالمِ شباب میں ان کے سارے لمحات بحرِ علم کی غواصی میں گزرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ یہ نوجوان قرونِ وسطیٰ کا ایک فرد ہے، اپنے عہد کی ساری رنگینیاں ورعنائیاں اپنی تمام تر فریب و جاذبیت کے باوجود انہیں اپنی طرف مائل نہیں کرسکیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی نظریاتی، عقلی، فکری اور اخلاقی آلودگیوں سے ہمیشہ انہیں محفوظ رکھے، ان کی شخصیت ایسی ہی مصفّٰی، مزکّٰی، مجلّٰی اور مثالی رہے، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد انہیں اہلِ علم، اربابِ فکر ونظر اور اہلِ دین کا مرجع بنائے گا۔

حضرت مفتی صاحب علامہ علاء الدین ابوالحسن بن علی الخازن نور اللہ مرقدھم کی معرکۃ الآراء تفسیر ''لباب التاویل فی معانی التنزیل'' کا ترجمہ فرما رہے ہیں اور پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سلیس اور بامحاورہ ہے، اس میں ادبیت بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اصلی متن عربی کی مکمل رعایت بھی ہے، ان دونوں محاسن کا کسی ترجمے میں اس انداز سے جمع ہوجانا کہ متن کی بھی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہو اور قاری کو محسوس ہو کہ وہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ اصل کتاب پڑھ رہا ہے، بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے علامہ خازن کی روح کو بھی تسکین پہنچائی ہے کہ تفسیر میں درج جملہ احادیث کی تخریج بھی کردی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ترقیم (Numbering) بھی فرمادی ہے، یہ وہ کام ہے جو آج تک نہیں ہوا تھا۔ اُمید ہے اس خدمت جلیلہ کے صلے میں ان پر علامہ خازن قدس سرھم العزیز کا روحانی فیض وتوجہات وتصرفات ہمیشہ مرکوز رہیں گی۔ چونکہ علامہ خازن قدس سرھم العزیز شافعی المسلک ہیں، اس لیے فطری طور پر انہوں نے متعلقہ مقامات پر اپنے مسلک کو ترجیح دی ہے، محترم مفتی محمد اسماعیل نورانی صاحب نے ان مواقع پر مسلکِ احناف کو حاشیے کے تشریحی نوٹ میں دلائل سے مبرہن کردیا ہے، اس لیے حنفی المسلک قاری اس کا مطالعہ کرتے وقت کسی تشکیک یا تردد میں مبتلا نہیں ہوگا، بلکہ ان شاء اللہ العزیز اس کا مسلکی تصلب اور راسخ ہوگا۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ جلّ شانہٗ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل مفتی صاحب کی اس علمی کاوش کو اپنی بارگاہ میں مقبول وماجور فرمائے، اسے قبولِ دوام اور شہرتِ عام نصیب فرمائے، اس کی افادیت اور فیض رسانی کو اپنی برکات سے مالا مال فرمائے، حضرت مفتی محمد اسماعیل نورانی صاحب کے علم اور عمر میں برکات نصیب فرمائے۔

دعا گو ودعا جو: بندۂ عاجز
منیب الرحمٰن
۲۳ مارچ ۲۰۰۶ء

مقدمہ (از مترجم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمO

نحمدہ ونصلّی ونسلّم علی رسولہ الکریمO

اللہ تعالیٰ کا بے پناہ فضل و کرم کہ اُس نے مجھ ناکارہ کو اپنے پاک کلام کی عربی تفسیر ''لباب التاویل فی معانی التنزیل'' کا اُردو ترجمہ کرنے کا جذبہ اور توفیق و سعادت عطا فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کی نظرِ عنایت کہ اس ترجمہ میں مجھے بہت آسانیاں اور قلبی راحت و سکون نصیب ہوا اور اس کی برکت سے قرآن و سنّت کے ساتھ تعلق قائم ہوا۔

اختلافِ مذاہب سے قطع نظر ہمارے جُملہ اسلاف کرام اور بزرگانِ دین نے دینِ متین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے بے پناہ جدّ و جہد کی ہے اور انتہائی مشکلات کے باوجود فریضۂ تبلیغ کو پوری ذمّہ داری سے نبھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بحمدہٖ تعالیٰ دین متین اپنی تمام جزئیات کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلافِ امت کی خدمات اور کارہائے نمایاں دین کے تمام شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن جس طرح دین کے تمام شعبوں کا مرکز و محور اور بُنیاد قرآن و سنّت ہے' اسی طرح بزرگانِ دین کی جُملہ خدمات کا حاصل اور مقصود بھی قرآن و سنّت ہی کی تفہیم اور اس کی تبلیغ ہے۔ چنانچہ بعض ائمہ نے براہِ راست قرآن و سنّت پر کام کیا ہے اور بعض نے بالواسطہ قرآن و سنّت کی تفہیم و تبلیغ میں کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلافِ امت کی خدمات اور مآثر علمیّہ جو ہمارے لیے مآخذ و مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں وہ سب کے سب عربی اور فارسی زبان میں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن سے حقیقی طور پر فائدہ صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو عربی یا فارسی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں اور جو عربی یا فارسی سے واقف نہیں ہیں وہ کماحقّہٗ فیض حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مدارس عربیّہ کے طلباء بھی اسلاف کی کتابوں میں آنے والی بعض طویل ترین ابحاث کو اس لیے ترک کر دیتے ہیں کہ وہ عربی یا فارسی میں ہونے کی وجہ سے دشوار معلوم ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب (تفسیر خازن) بھی قرآن کریم کی ایک عربی تفسیر ہے۔ لیکن دیگر عربی تفاسیر کی طرح اس سے استفادہ بھی صرف ''ضرورت'' اور ''حوالہ'' تک محدود ہو چکا ہے۔ حالانکہ دیگر کئی تفاسیر کے مقابلہ میں یہ تفسیر مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ نفس قرآن کریم کی تفہیم اور حل کے لیے بہترین ممدّ و معاون ہے اور مختصر الفاظ و عبارات میں بیش بہا اور قیمتی معلومات کا ایک عظیم خزینہ ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن کریم کی اس آسان اور معلوماتی تفسیر کا اردو ترجمہ کر کے اس کے فیضان کو عام کیا جائے' تاکہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے متعلّق ضروری معلومات کے حصول کا شوق رکھنے والوں کی قلبی تسکین ہو چنانچہ میرے استاذ محترم مفسّر قرآن حضرت شیخ الحدیث علاّمہ غلام رسول سعیدی (مدّ اللہ ظلّہٗ العالی) نے مجھے اس کا اردو ترجمہ (مع تخریج احادیث و مختصر حواشی) کرنے کا حکم فرمایا اور اپنی سرپرستی اور نگرانی میں اس کام کو کروانے کا ذمہ لیا۔ میں اپنی ناکارگی کے باعث اس عظیم کام کو انجام دینے کا قطعاً اہل نہیں تھا۔ تاہم استاذ صاحب کی پیہم شفقت و محبت اور بھرپور تعاون نے میری ہمت افزائی کی اور فضل الٰہی سے پہلی جلد (از ابتداء تا آل عمران مع حاشیہ) پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ میرے لیے باعث فخر ہے کہ استاذ صاحب نے باقاعدہ سبق کی طرح مجھے اس تفسیر کے خطبہ کا کچھ حصہ مع ترجمہ پڑھایا اور میرے لیے

بہت دُعا فرمائی۔ استاذ صاحب تفسیر قرآن کی انتہائی اہم مصروفیت کے باوجود میرے ترجمہ اور حواشی کو متعدد مقامات سے بہ نظر غائر ملاحظہ فرماتے رہے ہیں اور ضروری مقامات پر اصلاح بھی فرمائی ہے۔ استاذ صاحب کا وجود بلاشبہ جمیع اہلسنّت کے لیے مایۂ افتخار اور عظمت و رفعت کا نشان ہے۔ آپ متعدد عوارض اور تکالیف کے باوجود بہت تیزی سے تبیان القرآن کو تصنیف فرمارہے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی اور تکمیلِ تفسیر کی سعادت عطا فرمائے اور دین متین کی مزید خدمات کے لیے آپ کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔)

میں یہاں اپنے مرشد گرامی حضرت قائد اہل سنّت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی قادری (علیہ الرحمۃ والرضوان) اور استاذ محترم استاذ العلماء علامہ محمد حسن حقانی اشرفی دام ظلّہٗ کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے آخر تک مجھے اپنی دُعا اور فیضان سے نوازا۔ کئی مرتبہ آپ نے مجھ سے زیر نظر ترجمہ کے حال احوال دریافت کیے۔ ایک موقع پر حضرت مرشد گرامی نے مجھ سے تفسیر خازن کی خصوصیات اور اس کے ترجمہ کی ضرورت پر مختصر گفتگو فرمائی اور استاذ العلماء علّامہ محمد حسن حقانی (مدّ ظلّہ العالی) کے کہنے پر ترجمہ کو بعض مقامات سے ملاحظہ فرمایا اور بہت دُعائیں دیں۔ گو کہ اب آپ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن انشاء اللہ العزیز آپ کی روحانی سرپرستی اور فیضان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے گا۔ (اللہ عزوجل آپ کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے۔) اور استاذ محترم علامہ سعیدی و علامہ حقانی صاحب کا سایۂ عاطفت دراز فرمائے۔

مقدمہ کی اس ابتدائی اور ضروری گفتگو میں تفسیر و تاویل، تفسیر کی اقسام، علامہ خازن علیہ الرحمۃ کے حالات، تفسیر خازن کی خصوصیات اور زیرنظر ترجمہ کے متعلق کچھ باتیں تحریر کرنے سے قبل یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تفسیر خازن کے ترجمہ و تخریج اور حواشی کے اس کام کو منظر عام پر لانے کی ذمہ داری سید محسن اعجاز صاحب (فرید بک سٹال، لاہور) نے لی ہے۔ سیّد محسن صاحب علّامہ سعیدی صاحب کے واسطہ سے مجھ سے بھی بہت محبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت محنت اور محبت سے میری مختصر سی تالیف ''حقائق شرح صحیح مسلم و دقائق تبیان القرآن'' کو دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیا اور اب الحمد للہ! تفسیر خازن کے ترجمہ کی طباعت میں کوشاں ہیں۔ اُن کی بہت خواہش تھی کہ تفسیر خازن کے ترجمہ کا کام میں انجام دوں، اس میں مذکور احادیث کی تخریج اور ضروری مقامات پر مختصر تشریح بھی کروں اور علامہ خازن چونکہ شافعی ہیں اس لیے حاشیہ میں اُن کے دلائل کے جوابات اور فقہ حنفی پر اعتراضات کے جوابات بھی لکھوں۔ یہ کام میرے لیے بہت عظیم اور مشکل تھا اور وہم و گمان سے بھی بالاتر تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت مدد فرمائی اور علّامہ سعیدی صاحب کی سرپرستی میں سیّد محسن صاحب کی خواہش کے مطابق میں نے کام کا آغاز کیا۔ بحمدہٖ تعالیٰ پہلی جلد قارئین کے ہاتھوں میں ہے اور دوسری جلد پر کام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل ترجمہ و تخریج اور حواشی کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ (آمین)

اب ذیل میں تفسیر و تاویل کا تعارف، تفسیر کی اقسام، علامہ خازن علیہ الرحمۃ کے حالات، تفسیر خازن کی خصوصیات اور ترجمہ کے متعلق ضروری باتیں پیش کی جارہی ہیں:

تفسیر و تاویل کا تعارف

تفسیر و تاویل کا مفہوم کیا ہے اور ان میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے بھی اپنے مقدمہ میں اس پر کلام فرمایا ہے۔ اس کو وہاں مع حاشیہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں پر اختصار کے ساتھ تفسیر و تاویل کا لغوی معنیٰ اور ان کی جامع تعریف ذکر کر رہے ہیں۔

''تفسیر'' فسر سے باب تفعیل ہے۔ بمعنیٰ کشف و بیان (یعنی کھولنا اور ظاہر کرنا) اصطلاحی اعتبار سے یہ وہ علم ہے جس میں

الفاظ قرآن کے نطق کی کیفیت (یعنی علم قرأت) ان کے مدلولات (یعنی الفاظ کے معانی) ان کے مفرد و مرکب ہونے کے احکام (علم صرف ونحو وغیرہ) حالت ترکیب میں الفاظ کے معانی (کہیں حقیقی کہیں مجازی) اور اُن الفاظ کے تتمات (یعنی ناسخ و منسوخ اور واقعۂ نزول وغیرہ) سے بحث کی جاتی ہے۔ (البحر المحیط از علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ الاتقان از امام سیوطی متوفی ۹۱۱ھ)

میر سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

تفسیر کالغوی معنیٰ کھولنا اور ظاہر کرنا ہے۔ اصطلاح شرع میں "واضح لفظوں کے ساتھ آیت کا معنیٰ اور اس کا پس منظر بیان کرنا" تفسیر کہلاتا ہے۔ (التعریفات)

"تاویل" اَول سے باب تفعیل ہے۔ بمعنیٰ رُجوع کرنا لوٹنا۔ اصطلاحِ شرع میں "ایک لفظ کو اُس کے ظاہری معنیٰ سے ہٹا کر ایک ایسے معنیٰ پر محمول کرنا جس کا وہ احتمال رکھتا ہو اور وہ احتمال کتاب و سنّت کے موافق ہو" تاویل کہلاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد: یخرج الحیّ من المیّت. (وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے) اگر اس میں انڈے سے پرندے کو نکالنا مراد ہو تو یہ تفسیر ہے اور اگر کافر سے مؤمن کو پیدا کرنا یا جاہل سے عالم کو پیدا کرنا مراد ہو تو یہ تاویل ہے۔ (التعریفات تبیان القرآن ج ا ص ۱۲۳)

تفسیر اور تاویل میں کئی وجوہ سے فرق کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تفسیر کا تعلّق قرآن کریم کے الفاظ اور اُس کے مفردات سے ہے۔ جبکہ تاویل کا تعلّق اُن الفاظ کے معانی اور جملوں سے ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ تفسیر میں اس بات کا قطعی بیان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ سے یہ معنیٰ مراد لیا ہے۔ جبکہ تاویل میں بغیر قطعیت کے کسی ایک معنیٰ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ تفسیر کا تعلّق روایت سے ہے اور تاویل کا تعلّق درایت سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس لفظ کا ایک معنیٰ ہو اس کو بیان کرنا تفسیر ہے اور جس لفظ کے کئی معانی ہوں تو دلیل سے کسی ایک معنیٰ کو بیان کرنا تاویل ہے۔

(مزید تحقیق کے لیے الاتقان فی علوم القرآن اور تبیان القرآن ملاحظہ کیجئے)

علم تفسیر کا موضوع قرآن کریم کی آیات ہیں اس حیثیت سے کہ اس علم میں اُن آیات کے معانی سمجھے جاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس علم کا موضوع قرآن مجید ہے۔ اس علم کی غرض اور مقصود یہ ہے کہ کلامِ الٰہی کے معانی کو مکمل طور پر سمجھا جائے۔ اور غایت یہ ہے کہ دُنیا و آخرت میں خوش بختی اور کامیابی حاصل ہو۔ (مقدمہ تفسیر مظہری)

تفسیر کی اقسام

اللہ تعالیٰ نے چونکہ سب اہل علم کو علمی، فکری اور طبعی اعتبار سے یکساں نہیں رکھا ہے اس لیے سب کی تحریر اور اندازِ فکر بھی یکساں نہیں ہے۔ کسی کی طبیعت احادیث و آثار کی طرف مائل ہے تو کسی کی طبیعت میں لغت اور ادبیّت کا غلبہ ہے۔ کوئی فقہی احکام کی تحقیق میں زیادہ شغف رکھتا ہے تو کسی کو معقولات (منطق و فلسفہ) سے قلبی لگاؤ ہے اور یہی مزاج و رجحان طبع اُس کی تحریر میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے ہم قرآن کریم کی تفاسیر کو چند اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) التفسیر بالمأثور: یعنی ایسی تفسیر جس میں زیادہ تر احادیث اور اقوال صحابہ پر اعتماد کیا گیا ہو۔ جیسے تفسیر امام عبدالرزاق بن ہمام (متوفی ۲۱۱ھ)، تفسیر عبد بن حُمید (متوفی ۲۴۹ھ)، تفسیر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تفسیر امام ابی بکر بن المنذر (متوفی ۳۱۸ھ)، تفسیر امام ابی محمد بن ابی حاتم (متوفی ۳۲۷ھ)، تفسیر امام ابی بکر احمد بن موسیٰ بن مردویہ (متوفی ۴۱۰ھ)، تفسیر امام عبدالرحمٰن ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ)، تفسیر حافظ اسماعیل ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ)، تفسیر درّ منثور از حافظ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)۔

(۲) التفسیر باللغة: یعنی ایسی تفسیر جس میں زیادہ تر لغت و ادب اور صرفی ونحوی ابحاث کو بیان کیا گیا ہو۔ جیسے علامہ حسین

بن محمد راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) کی المفردات' علامہ نظام الدین نیشا پوری (متوفی ۷۲۸ھ) کی تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان' علامہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی تفسیر کشاف اور امام ابوالحیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) کی تفسیر البحر المحیط۔

(۳) **التفسیر بالمعقولات** : یعنی ایسی تفسیر جس میں منطق وفلسفہ اور عقلی باتوں کا غلبہ ہو۔ جیسے امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر مفاتیح الغیب (المعروف بتفسیر کبیر)۔

(۴) **التفسیر بالفقہیات** :یعنی ایسی تفسیر جس میں فقہی احکام کو زیادہ بیان کیا گیا ہو۔ جیسے امام عماد الدین کیاہرّاسی (متوفی ۵۰۴ھ) کی تفسیر' امام ابوبکر ابن العربی مالکی (متوفی ۵۴۳ھ) کی تفسیر' امام ابوبکر جصّاص حنفی (متوفی ۳۷۰ھ) کی تفسیر احکام القرآن اور علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی (متوفی ۶۷۱ھ) کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن۔

(۵) **التفسیر بالماثور والقصص** :یعنی ایسی تفسیر جس میں احادیثِ نبویّہ اور اقوالِ صحابہ وتابعین بھی کثرت سے ہوں اور گذشتہ امتوں کے واقعات بھی تفصیل سے ہوں۔ (عام ازیں کہ وہ واقعات غلط ہوں یا صحیح۔) جیسے امام احمد بن محمد ثعلبی (متوفی ۴۲۷ھ) کی تفسیر الکشف والبیان' امام ثعلبی کے شاگرد امام علی بن احمد الواحدی کی تفسیر البسیط' امام حسین بن مسعود بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تفسیر معالم التنزیل اور علامہ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم خازن بغدادی (متوفی ۷۴۱ھ) کی تفسیر ''لباب التاویل فی معانی التنزیل'' (یعنی تفسیر خازن)۔

تفسیر کی اقسام کی مزید تفصیل وتحقیق کے لیے تفسیر بغوی کا مقدمۃ المحقق (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)' تفسیر قرطبی (مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت) کا مقدمۃ المحقق اور تبیان القرآن' ج ۱ (ص ۱۲۹) ملاحظہ فرمائیے۔

علّامہ خازن (علیہ الرحمۃ) کے حالات

علامہ خازن کا مکمل نام علاؤ الدین ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم خازن ہے۔ نسبت آپ کی صُوفی اور بغدادی ہے۔ آپ کو خازن کے نام سے شہرت اس لیے ملی کہ دمشق کی ایک خانقاہ کی لائبریری کے انچارج تھے۔ عربی میں خازن الکتب لائبریرین کو کہتے ہیں۔

آپ ۶۷۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ بغداد ہی میں ابن الدوالیبی کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔ پھر دمشق میں آ کر قاسم بن مظفر اور وزیرہ بنت عمر سے استفادہ کیا۔ تعلیم وتعلّم سے بہت زیادہ شغف اور دلچسپی رکھتے تھے۔ تاریخ نگار بیان کرتے ہیں کہ آپ ایک بلند پایہ عالم اور بہت بڑے مصنّف تھے۔ آپ نے اپنی بعض تصانیف خود اپنے شاگردوں کو پڑھائیں۔ مختلف علوم وفنون میں آپ نے کئی تصانیف یادگار چھوڑیں معروف تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) **لباب التاویل فی معانی التنزیل** (یعنی تفسیر خازن)

(۲) مذہب شافعی کی کتاب عمدۃ الاحکام کی شرح

(۳) **مقبول المنقول** : یہ دس ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں علامہ خازن نے مسند احمد' مسند شافعی' صحاح ستّہ' مؤطا امام مالک اور سُنن دار قطنی کو یکجا کر دیا ہے اور ابواب کے تحت مرتب کیا ہے۔

(۴) **سیرت النبی** (ﷺ): یہ بھی ایک مبسوط اور ضخیم کتاب ہے۔

علامہ خازن علیہ الرحمۃ کا شمار اہل تصوّف میں ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ کی نسبت صُوفی ہے۔ آپ خوش مزاج اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے ۷۴۱ھ بعُمر ۶۳ سال میں بمقام حَلَب میں وصال فرمایا۔ تفسیر خازن جو دار الکتب العلمیہ'

بیروت سے طبع ہوئی ہے اس پر علامہ کا سالِ وصال ۷۲۵ھ لکھا ہوا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ مستند کتب تاریخ میں آپ کا سال وصال ۷۴۱ھ ہے۔ صاحب کشف الظنون کی تصریح کے مطابق ۷۲۵ھ علامہ خازن کے تفسیر سے فراغت کا سال ہے اور وصال ۷۴۱ھ میں ہے۔ (علامہ خازن کے حالات کے لیے دیکھئے: الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ ج۳ ص۹۷' رقم الحدیث:۲۲۱' مطبوعہ دائرۃ المعارف' حیدر آباد دکن ۱۳۵۰ھ (از حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ)' کشف الظنون ج۲ ص۱۵۴۰' مطبوعہ تہران ۱۳۷۸ھ (از حاجی خلیفہ)' ہدیۃ العارفین و آثار المصنفین ج۱ ص۷۱۸' مطبوعہ تہران ۱۳۷۸ھ (از اسماعیل پاشا البغدادی)' طبقات المفسرین ص۲۶۷' مطبوعہ مدینہ منورہ ۱۴۱۷ھ (از احمد بن محمد من علماء القرن الحادی عشر)' تاریخ تفسیر و مفسرین' ص۲۷۵' مطبوعہ فیصل آباد (از غلام احمد حریری))

تفسیر خازن کا مقام

تفسیر خازن کا اصل نام 'لباب التاویل فی معانی التنزیل'' ہے۔ (یعنی قرآن مجید کے معانی کی جو تفاسیر بیان کی گئی ہیں اُن کا لبِّ لباب اور خلاصہ) نام سے ظاہر ہے کہ یہ تفسیر' قرآنی آیات کی مختلف تفاسیر کی جامع اور اُن کا خلاصہ ہے۔ بعض مؤرخین نے اس تفسیر کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ حالانکہ فی الواقع یہ تفسیر بہت مُفید اور فہم قرآن کا بہترین ذریعہ ہے۔ بُنیادی طور پر اس تفسیر کے مشمولات امام بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل' امام ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۱ھ) کی جامع البیان اور امام فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر کبیر سے مأخوذ ہیں۔ اور ان تینوں تفاسیر کو اہل علم کے درمیان مرتبۂ قبول اور مقام استناد و اعتماد حاصل ہے۔ لہٰذا تفسیر خازن جو اِن تینوں تفاسیر کا بہترین مجموعہ ہے وہ بھی یقیناً معتمد اور مستند شمار ہوگی۔ علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے تفسیر کے مقدمہ میں خود فرمایا ہے کہ ''اس تفسیر میں میرا ذاتی کوئی عمل دخل نہیں ہے' یہ صرف اخذ و انتخاب پر مشتمل ہے''۔ بعض اصحابِ تاریخ نے اس تفسیر کو جو زیادہ اہم نہیں گردانا ہے اُس کی وجہ وہ واقعات اور اسرائیلی روایات ہیں جو علامہ خازن نے تفسیر بغوی' تفسیر ثعلبی اور بعض دیگر کتبِ روایات سے اپنی تفسیر میں نقل کر دی ہیں اور ماسوا چند مقامات کے اُن واقعات پر کوئی بحث و تمحیص اور جرح بھی نہیں کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ پوری تفسیر کے مقابلہ میں واقعات اور اسرائیلیات کا حصہ قلیل ہے اور کثیر حصہ احادیثِ رسول ﷺ' اقوالِ صحابہ و تابعین' استنباط مسائل' مفاہیم آیات' معانیٔ الفاظ' مذاہب ائمہ اور مُفید سوالات و جوابات اور دیگر خصوصیات پر مشتمل ہے' جس کی بنیاد وہی مستند تفاسیر ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ دوسرا یہ کہ بعض علماء کا کسی تفسیر یا کتاب کو غیر مستند قرار دینا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ کتاب واقعۃً غیر مستند اور غیر اہم ہو۔ اعتراض کرنے کو تو تفسیر کبیر پر بھی اعتراض کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ حاجی خلیفہ کی صراحت کے مطابق بعض علماء نے یہاں تک کہا کہ ''فیہ کل شیء الا التفسیر''۔ (تفسیر کبیر میں سب کچھ ہے' تفسیر نہیں ہے۔) (کشف الظنون ج۱ ص۲۳۰) لیکن ظاہر ہے کہ جنہوں نے تفسیر کبیر کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کے مقام و مرتبہ سے خوب واقف ہیں۔ دورِ حاضر کی تفاسیر میں میرے استاذ محترم علامہ غلام رسول سعیدی مدّ ظلّہٗ کی تفسیر (تبیان القرآن) انتہائی جامع اور مدلّل تفسیر ہے' لیکن تنقید و تشنیع سے وہ بھی محفوظ نہیں رہی۔ یہی حال راقم کے نزدیک تفسیر خازن کا بھی ہے کہ اس کو اگرچہ مؤرخین نے زیادہ اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے اور دل کی بات یہ ہے کہ راقم نے ترجمہ کر کے اس تفسیر کی لذت محسوس کر لی ہے اور (غالب طور پر) اس کے مشمولات کو بہت ہی عمدہ اور قوی پایا ہے۔ قارئین بھی اس کا مطالعہ کریں اور جو عربی زبان سے واقف ہیں وہ اصل کتاب سے بھی استفادہ کریں (البتہ جہاں علامہ خازن مذہب شافعی کی قوت ثابت کریں اور احناف پر اعتراضات کریں وہاں زیرِ نظر ترجمہ اور حواشی کو ملاحظہ کر لیا جائے)۔

راقم نے ترجمہ کے دوران تفسیر خازن کو جن خصوصیات اور قابلِ ذکر باتوں پر مشتمل پایا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) ابتداء میں اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ کئی تفاسیر کے مقابلہ میں یہ تفسیر مختصر ہونے کے ساتھ نفس قرآن کریم کی تفہیم اور حل کے لیے بہترین مُمِدّ ومعاون ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس تفسیر کی عبارت مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت آسان ہے۔ علامہ خازن نے بنیادی طور پر اس تفسیر میں افادیت کو پیش نظر رکھا ہے اور حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ عبارت زیادہ طویل اور گنجلک نہ ہو۔ حتیٰ کہ انہوں نے احادیث کی سند کو صرف اس لیے ذکر نہیں کیا کہ عام قارئین کے لیے علی العموم اُس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ اپنے جذبۂ افادیت کے پیش نظر سند کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اکثر مقامات پر احادیث میں آنے والے مشکل الفاظ اور دیگر متعلقہ امور کی تشریح کر دی ہے۔ مقدمہ میں آپ اصحاب تصنیف کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''جو شخص بھی کسی فن میں کوئی کتاب تالیف کرے اُسے چاہیے کہ اُس کی کتاب میں پانچ باتیں ضرور ہوں: (۱) گنجلک اور پیچیدہ باتوں کو کھول کر علیحدہ بیان کیا جائے (۲) بکھری ہوئی باتوں کو یکجا کر دیا جائے (۳) مشکل مقامات کی تشریح کی جائے (۴) اوّل تا آخر حسنِ ترتیب کو قائم رکھا جائے (۵) غیر ضروری باتوں اور کسی بات کو بلاوجہ لمبا چوڑا کرنے سے اجتناب کیا جائے''۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ میری اس کتاب میں آپ کو یہ تمام خصوصیات ملیں گی۔

(۲) اس تفسیر میں احادیث نبویہ کا بہت عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ کئی مقامات پر باقاعدہ فصل قائم کر کے کثیر تعداد میں احادیثِ مبارکہ ذکر کی گئی ہیں۔ مثلاً البقرہ:۱۵۷ کی تفسیر کے بعد علاّمہ نے مصائب پر صبر کرنے والوں کی فضیلت میں وارد ہونے والی احادیث کو فصل کے تحت یکجا کیا ہے۔ اسی طرح البقرہ:۱۸۵ کی تفسیر میں ماہِ رمضان اور اس کے روزوں کے فضائل اور البقرہ:۱۸۶ کی تفسیر میں دُعا کے آداب وفضائل میں وارد ہونے والی احادیث کو بھی فصل کے تحت ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی مقامات پر آپ نے فصل قائم کی ہے۔ اس پر مزید خوبی یہ کہ علامہ خازن نے جہاں بھی کوئی حدیث باقاعدہ ذکر کی ہے وہاں اس کا حوالہ (یعنی کتاب کا نام) ذکر کر دیا ہے اور حدیث شریف میں آنے والے مشکل الفاظ کے معانی اور فوائد بھی کئی مقامات پر ذکر فرمائے ہیں۔

(۳) علامہ خازن نے آیات کی تفسیر میں صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال بھی کثرت سے ذکر کیے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض مقامات پر غیر مناسب یا غیر صحیح قول پر تنبیہ یا تردید بھی کی ہے۔ مثلاً آل عمران:۳۹ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحیٰی علیہ السلام کے لیے ایک صفت حصور ذکر فرمائی ہے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حصور اُس شخص کو کہتے ہیں جو مجامعت سے عاجز ہونے کی وجہ سے عورتوں سے کنارہ کش ہو۔ علامہ خازن نے تمام اقوال ذکر کر کے اِس قول کا رد کیا ہے اور اس کو منصب نبوت کے خلاف قرار دیا ہے۔ (تفصیل کے لیے متعلقہ آیت ملاحظہ فرمائیے) علاوہ ازیں متعدد اقوال ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر علامہ خازن نے امام ابن جریر طبری یا امام رازی کے حوالہ سے تصحیح اور ترجیح کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ یعنی مختلف اقوال میں جو قول صحیح یا اصح یا راجح ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً آل عمران:۱۲۴ کی تفسیر میں پہلے یہ اختلاف ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ غزوۂ بدر میں پورا ہوا یا غزوۂ اُحد میں اور اس اختلاف کے دلائل بھی بیان کیے' پھر آخر میں امام طبری کے حوالہ سے ''اولی الاقوال بالصواب'' کہہ کر اس بات کو ترجیح دی کہ مذکورہ وعدہ غزوۂ بدر میں پورا ہوا۔ (تفصیل کے لیے متعلقہ آیت ملاحظہ فرمائیے۔)

(۴) اس تفسیر میں احکام ومسائل کی آیات کے تحت شرعی مسائل پر ابحاث بھی موجود ہیں' اس سلسلہ میں علامہ خازن نے عموماً

تفسیر کبیر (امام فخر الدین رازی) کا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک عنوان کے تحت مسئلہ کی مختلف جزئیات کو ترتیب وار علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے اور کئی مقامات پر ائمہ اربعہ کے مذاہب بھی بیان کیے ہیں۔ خصوصاً امام شافعی اور امام اعظم ابوحنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے اختلاف پر دلائل بھی ذکر کیے ہیں اور چونکہ خود شافعی ہیں اس لیے امام شافعی کے مذہب کی تقویت' احناف کے دلائل کی تردید اور احناف پر اعتراضات میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی مختلف آیات کے تحت اس کی متعدد مثالیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

(۵) علامہ خازن نے اس تفسیر میں متعدد مقامات پر آیات کی تفسیر کے ضمن میں مفید سوالات واشکالات قائم کر کے اُن کے جوابات بھی ذکر کیے ہیں اور ہمارے اندازے کے مطابق اس میں بھی علامہ خازن نے تفسیر کبیر کو پیش نظر رکھا ہے۔ کیونکہ جو اعتراضات واشکالات اور اُن کے جوابات وتوجیہات علامہ خازن نے ذکر کیے ہیں وہ علی العموم تفسیر کبیر میں شرح و بسط کے ساتھ موجود ہیں۔ لہٰذا جو حضرات امام فخر الدین رازی کی تحقیقات سے استفادہ نہیں کر پاتے یا نہیں کر سکتے اُن کے لیے تفسیر خازن کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ تفسیر خازن میں اعتراضات و جوابات اور اشکالات وتوجیہات کے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے:

(۱) اس اعتراض کا جواب کہ فرشتے تو معصوم ہیں' پھر انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ بنائے جانے پر اعتراض کیوں کیا؟ (البقرہ:۳۰)

(۲) اس اشکال کا جواب کہ جب اہل مکہ پہلے کفر کر چکے تھے تو پھر اس آیت میں یہودیوں کو پہلے کفر کرنے والے کیسے فرمایا گیا؟ (البقرہ:۴۱)

(۳) انبیاء کرام کے قتل کو ناحق کیوں فرمایا گیا' جبکہ اُن کا قتل یقیناً ناحق ہے؟ (البقرہ:۶۱)

(۴) مقتول کو گائے کا ٹکڑا مارنے کا حکم کیوں دیا گیا اور بنی اسرائیل کو گائے کے علاوہ کوئی اور جانور ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا؟ (البقرہ:۷۳)

(۵) حضرت ابراہیم واسماعیل (علیہما السلام) نے صرف اپنی اولاد کے لیے دُعا کی' باقی کے لیے نہیں کی؟ (البقرہ:۱۲۸)

(۶) دلکش چیزوں میں سب سے پہلے عورتوں کا ذکر کرنے اور اولاد میں صرف بیٹوں کا ذکر کرنے کی وجہ؟ (آل عمران:۱۴)

(۷) اس سوال کا جواب کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کی بشارت پر حیرت کا اظہار کیوں کیا؟ (آل عمران:۴۰)

(۸) صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا کلمہ کیوں قرار دیا گیا جبکہ ساری مخلوق کلمہ کُن ہی کے واسطہ سے وجود میں آئی ہے؟ (آل عمران:۴۵)

(۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی مثل قرار دینے پر اشکال کا جواب۔ (آل عمران:۵۹)

(۶) قرآن کریم کی جن آیات میں سیرت نبویّہ کے واقعات کا ذکر آیا ہے اُن کی تفسیر میں علامہ خازن نے علی العموم پورا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے اور صحیح احادیث کے ذریعہ اُس واقعہ کی تائید بھی پیش کی ہے' مثلاً البقرہ:۲۰۷ کی تفسیر میں حضرت خُبیب انصاری اور حضرت زید بن دثنہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کی شہادت کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آل عمران:۱۰۳ کی تفسیر میں بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ کا پورا واقعہ بیان کیا ہے۔ آل عمران:۱۲۱ تا ۱۲۸ اور ۱۴۰ تا ۱۵۵ کے ضمن میں غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کی بہت ساری تفصیلات اور اُن کے متعلق متعدد احادیث مبارکہ ذکر کی ہیں۔ علاوہ ازیں آل عمران:۱۶۹ کی تفسیر میں بیر معونہ کا واقعہ صحیحین کی حدیث کی تائید کے ساتھ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ آگے بعض آیات کے

تحت غزوۂ بدر صغریٰ اور کعب بن اشرف یہودی کے قتل کا واقعہ بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

سیرت و مغازی کے ان واقعات کے ساتھ ساتھ علاّمہ خازن نے کئی مقامات پر گذشتہ انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اُن کی امتوں کے واقعات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان واقعات و روایات کو اصطلاح میں ''اسرائیلیات'' کہا جاتا ہے۔ یہ واقعات حق ہیں یا باطل؟ اس کی تفصیل کے لیے اوّلاً جاننا چاہیے کہ اسرائیلیات کی تین اقسام ہیں:

(۱) بعض اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کا صحیح ہونا معتمد اور مستند دلائل سے ثابت ہے۔

(۲) بعض وہ ہیں جو شریعتِ مطہرہ کے صراحۃً معارض اور خلاف ہیں۔

(۳) اور بعض وہ ہیں جن کا حق اور باطل ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔

قسم اوّل کی روایات شرعاً صحیح ہیں' قسم دوم کی روایات باطل ہیں اور قسم سوم کی روایات مسکوت عنہا ہیں۔ یعنی ہم نہ اُن کی تصدیق کرتے ہیں نہ اُن کا رد کرتے ہیں۔ اس قسم سے تعلق رکھنے والے واقعات کو بیان کرنا گو کہ جائز ہے لیکن اُن میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ اُن کا بیان قطعاً بے فائدہ ہے۔ علاّمہ خازن نے سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران کی تفسیر میں مجموعی طور پر ۲۰ سے زائد اسرائیلی واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جن میں ایک کے ماسوا تمام واقعات کا تعلق اسرائیلیات کی تیسری قسم سے ہے۔ یعنی اُن کا نہ کسی شرعی دلیل سے ثبوت ہے نہ وہ کسی دلیلِ شرعی کا مُعارض ہیں۔ اس لیے ہم پر نہ اُن کی تردید لازمی ہے نہ تصدیق۔ البتہ ایک واقعہ ایسا ہے جس کا تعلق اسرائیلیات کی دوسری قسم ہے۔ یعنی اُس کا مضمون شریعتِ مطہرہ کے قطعاً مُعارض اور مخالف ہے' جس کی وجہ سے وہ سخت قابل تردید ہے (اس کی تفصیل البقرہ:۱۰۲ کے تحت ''ہاروت اور ماروت کے زمین پر بھیجے جانے کا واقعہ'' کے عنوان سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔) حیرت ہے کہ اس واقعہ کو امام بغوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور اس کی کوئی تردید نہیں کی۔ جبکہ علامہ خازن علیہ الرحمہ نے پورے واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں بھرپور طریقہ سے اس کا رد کیا ہے۔

اسرائیلی روایات پر مذکورہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تفسیر خازن میں اسرائیلی روایات ضرور ہیں' لیکن عموماً اُن روایات کا تعلق اسرائیلیات کی تیسری قسم سے ہے۔ یعنی ہم اُن کی تصدیق اور تردید دونوں سے عاجز ہیں۔ لہٰذا مطلقاً اسرائیلی روایات کی بناء پر تفسیر خازن کو غیر مستند قرار دینا درست نہیں ہے۔ اس باب میں زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ اسرائیلیات کی قسم ثالث کے واقعات کو بیان کرنا گو کہ جائز ہے لیکن علامہ خازن اگر ان واقعات کو قطعاً بیان ہی نہ کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

تفسیر خازن کی خصوصیات کے عنوان سے اب تک چھ خصوصیات بالتفصیل ذکر کی جاچکی ہیں۔ جن سے تفسیر خازن کا مقام بہت حد تک واضح ہوجاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی خصوصیات تفسیر خازن کا حصہ ہیں۔ مثلاً آیاتِ مبارکہ کے واقعۂ نزول اور اس سلسلہ میں مختلف روایات کو کہیں تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مختلف مقامات پر موقع کی مناسبت سے فِرَقِ باطلہ (معتزلہ اور قدریہ وغیرہ) کا رد کیا گیا ہے۔ آیات میں آنے والے مشکل الفاظ پر متعدد جگہ لُغت اور اعراب کے حوالہ سے بحث کی گئی ہے۔ کئی مقامات پر لفظ کے کسی معنی کی تائید میں عربی اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ الغرض تفسیر خازن مختصر اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جامع اور بھرپور تفسیر ہے۔

زیرِ نظر ترجمہ کے متعلق چند باتیں

کسی کتاب کا ''محض ترجمہ'' ہمارے گمان کے مطابق اُس وقت تک زیادہ فائدہ مند نہیں ہوتا جب تک کہ اُس میں قارئین کی سہولت کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ قارئین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کتاب کی زبان آسان اور عام فہم ہو' قابل اعتراض یا قابل

اشکال مقام کی پیچیدگی دُور ہو، گفتگو بالترتیب اور عنوانات کے تحت ہو۔ (وغیرہ وغیرہ۔) بحمدہٖ تعالیٰ زیرِنظر ترجمہ میں بھرپور کوشش کے مطابق قارئین کی سہولت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً اس میں ترجمہ کی زبان کو حتی الامکان آسان اور عام فہم رکھا گیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت عربی زبان کے اسلوب کی بجائے اُردو زبان کے اسلوب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ترجمہ کے دوران اس بات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ عربی عبارت کا اختصار یا پیچیدگی اُردو میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس کے لیے متعدد مقامات پر بریکٹ (قوسین) ڈال کر مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعض مقامات پر پیچیدہ عبارت کا مفہومی انداز میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ میں قارئین کی سہولت کے لیے تفصیلی عنوانات قائم کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ فہرست کے ذریعہ اصل موضوع پر پہنچنے میں بھی آسانی ہو اور عنوانات کی مدد سے مفسّر علیہ الرحمۃ کی گفتگو کی ترتیب بھی پیشِ نظر رہے۔ علاّمہ خازن نے اس تفسیر میں کثرت سے احادیث نبویّہ ذکر کی ہیں۔ ترجمہ میں اُن احادیث کی ترقیم (نمبرنگ) اور مفصل تخریج کی گئی ہے۔ تخریج کے سلسلہ میں بیروت کی مطبوعہ کتب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور جلد صفحہ کی بجائے رقم الحدیث بیان کیا گیا ہے۔ ماسوا اُن کتابوں کے جن کا رقم الحدیث بیان کرنا مُفید نہیں ہے۔ مثلاً مسند احمد اور سنن بیہقی وغیرہ۔ تخریج احادیث کے لیے زیادہ تر تفسیر بغوی (مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۰ھ)، تفسیر قرطبی (مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت، ۱۴۲۰ھ)، مشکوٰۃ مخرّجہ (مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ)، موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف (مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی (مطبوعہ دارالدعوۃ، استنبول، ۱۹۸۸ء) اور بیروت وغیرہ کی دیگر مطبوعہ مخرّجہ کتب سے مدد لی گئی ہے۔

شروع میں جیسا کہ بیان کیا گیا کہ علامہ خازن علیہ الرحمۃ شافعی المذہب ہیں اور وہ احکام و مسائل کی آیات کی تحت مذاہب ائمہ کے بیان میں عموماً احناف و شوافع کا مذہب مع دلائل بیان کرتے ہیں۔ پھر احناف کے دلائل کا رد کرتے ہیں اور مذہب شافعی کی قوت ثابت کرتے ہیں زیرِنظر ترجمہ میں اس کے لیے مختصر حواشی (وضاحتی نوٹس) کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی متعلقہ مقام پر حاشیہ میں علامہ خازن کے استدلال اور تردید احناف کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اگر کہیں علامہ خازن نے شوافع کے دلائل پر اکتفاء کیا ہے اور احناف کا مذہب بلا دلیل بیان کیا ہے وہاں حاشیہ میں مختصراً احناف کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ کہیں علامہ خازن سے احناف کا مذہب بیان کرنے میں تسامح ہوا ہے وہاں حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر ہدایہ، بدائع الصنائع، تفسیر مظہری، تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ علاّمہ خازن نے آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر میں کثرت سے جو احادیث نبویہ ذکر کی ہیں اُن کی بھی حاشیہ میں ضروری مقامات پر مختصر وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر عمدۃ القاری، مرقات المفاتیح، مراۃ المناجیح اور شرح صحیح مسلم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے متن قرآنی کے ترجمہ میں بھی حتی الوسع آسانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ، حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہٗ، غزالیٔ زماں علامہ کاظمی قدس سرہٗ اور استاذِ محترم علاّمہ غلام رسول سعیدی صاحب (دام ظلّہٗ) کے تراجم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

تفسیر خازن کے ترجمہ کے متعلّق یہ چند ضروری اُمور تھے جو ہم نے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔ اس میں جو کچھ حُسن اور خوبی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور رسول اللہ ﷺ کی نظرِ عنایت کا نتیجہ ہے اور جو بھی خامی خرابی ہے وہ میری بے مائیگی، نااہلی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ وہ فقیر کی اس مختصر سی کاوش کو اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ اس کو میرے لیے کفارۂ سیئات بنائے اور میرے اساتذہ، جملہ مشائخ، والدین، احباب اور اعزّاء کے لیے صدقہ جاریہ

بنائے۔ خصوصاً علاّمہ خازن علیہ الرحمہ اور دیگر جمیع مفسّرین ومحدثین اہل حق کے فیوض کو ہماری جانب متوجہ فرمائے اور ہم سب کو ایمان پر خاتمہ بالخیر عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

محمد اسماعیل قادری نورانی غفرلہٗ

۱۲ شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ / ۲۵ نومبر ۲۰۰۴ء

✡✡✡✡✡

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمدهٗ و نصلّی علی رسوله الكريم

خطبۃ الکتاب

تمام[۱] تعریفیں اُس معبودِ برحق کے لیے جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا' پھر ان کے لیے ایک مناسب اندازہ مقرر فرمایا اور انسان کی شکل کو بہت ہی حسین اور خوب صورت بنایا' اُسے عقل کی نعمت سے نوازا اور اُسے سُننے والا دیکھنے والا بنایا اور اُسے اپنے سببِ معرفت یعنی علم سے مشرف فرمایا' اُس کے دل کو خوب روشن فرمایا اور اُسے اپنی معرفت کی راہ دکھائی۔ اللہ عزوجل کا یہ کس قدر عظیم احسان اور فضل ہے۔ اُس نے انسان کو قوت گویائی عطا فرمائی' جس کے ذریعہ اُس نے اپنے رب کی تعریف اور توحید و تکبیر بیان کر کے اس کا شکر ادا کیا' اُس نے سیدنا محمد ﷺ کو تمام مخلوق کی طرف ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا' اُن پر نہایت عظیم روشن کتاب کو نازل فرمایا' جس میں اس نے حکمت' احکام اور ترغیب و ترہیب (ثواب و عذاب) کی باتیں بیان فرمائیں' اس کے حفظ کرنے والوں کو اس کی تلاوت اور تجوید عطا فرمائی اور اپنے بندوں کو اس کتاب کے علوم کی فہم اور بصیرت عطا فرمائی اور لوگوں سے جہالت و حیرت کو دور کرنے کے لیے اس میں مختلف مثالیں بیان فرمائیں اور اس کو واضح دلیل اور صحیح و سالم اور روشن بنایا اور اس کتاب کو بے پناہ فضیلت عطا فرمائی' اس طور پر کہ اس کو سینوں میں محفوظ فرما دیا' زبانوں پر اس کی تلاوت کو جاری کیا اور اس کو کتابی شکل عطا فرما دی' یہ کتاب اس راستہ کی ہدایت دیتی ہے جو سب سے زیادہ سیدھا اور مستحکم ہے اور جو ایمان والے نیک کام کرتے ہیں ان کو بشارت دیتی ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور اللہ عزوجل نے اس کی مثل ایک سورت بھی لانے سے ہر بلیغ اور زبان آور شخص کو حسرت زدہ اور عاجز بنا دیا اور خود ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل: ۸۸)

(اے محبوب!) آپ کہیے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

میں (علی بن محمد البغدادی) اللہ عزوجل کے مسلسل انعامات پر اس کی بہت حمد کرتا ہوں' اپنے معاملات کو اس کے سپرد کرنے کے بعد اور اس کی ذات سے پناہ طلب کرتے ہوئے اس پر بھروسا کرتا ہوں اور یہ بات کہ "اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے" اس پر میں ایسی گواہی دیتا ہوں جس سے میرے دل کو اطمینان اور نور حاصل ہو اور میں اس

---

[۱] دیگر مفسرین و مصنفین کی طرح صاحب کتاب' علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی تفسیر کا آغاز اللہ عزوجل کے نام اور اس کی حمد سے کیا ہے۔ یہ درحقیقت خود قرآن کریم کی اتباع ہے' کیونکہ اس کا آغاز بھی حمد الٰہی سے ہے' اور پھر یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی اتباع ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر کتاب کے آغاز کا ذریعہ ہے۔ (کنز العمال: ۲۴۹۰) دوسری حدیث شریف میں ہے کہ ہر وہ عظمت والا کام جس کا آغاز بسم اللہ سے نہ کیا جائے وہ ادھورا رہتا ہے۔ (جمع الجوامع: ۱۵۷۶۱' کنز العمال: ۲۴۹۱) حمد کے متعلق آپ کا ارشاد یہ ہے کہ "ہر وہ کلام جس کا آغاز اللہ کی حمد (تعریف) سے نہ کیا جائے وہ انتہائی نامکمل رہتا ہے"۔ (سنن ابوداؤد: ۴۸۴۰' سنن ابن ماجہ: ۱۸۹۴' سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۰۹)

بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد ﷺ اللہ عزوجل کے خاص بندے اور ایسے عظیم رسول ہیں جن کو اس نے اپنے فضل سے عزت و وقار' شان و شوکت اور جاہ وجلال عطا فرمایا۔ (اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کی آل و اصحاب پر رحمت و سلامتی نازل فرمائے جیسا کہ اُن سے ناپاکی کو دور رکھ کے اُنہیں خوب پاکیزہ فرمایا۔)

حمد وصلوٰۃ کے بعد جاننا چاہیے کہ:

اللہ عزوجل نے اپنے رسول سیدنا محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا' تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کر دے' انہیں تمام جہانوں کے لیے رحمت' مؤمنین کو ثواب کی بشارت دینے والا اور مخالفین کو عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا' انہیں پر نبوت کی عظیم عمارت کو مکمل فرمایا اور انہیں کے ذریعہ دفترِ رسالت پر مہر لگائی اور انہیں سے اخلاق کی اقدار کو مکمل فرمایا' سارے عالم میں ان کی عظمت کا چرچا کیا اور ان پر ایسی کتابِ نور نازل فرمائی جس کے ذریعہ انہوں نے ہمیں گمراہی سے بچایا اور جہالت کی تاریکیوں سے نجات دی' اس کتاب کی پیروی کرنے والوں کو اُنہوں نے عظیم کامیابی کا مژدہ سنایا اور جان بوجھ کر اس سے منہ پھیرنے والوں کو خسارہ اور ہلاکت کی وعید سنائی' اللہ عزوجل نے جب یہ چیلنج فرمایا کہ لوگ اس کتاب کی مثل ایک سورت ہی بنا کر لے آئیں تو ساری مخلوق اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئی' پھر کتاب کے اس قدر مُعجز ہونے کے باوجود پروردگارِ عالم نے اپنے مؤمن بندوں پر اس کی تلاوت کو اور زبانوں پر اس کی قرأت کو آسان[۲] بنا دیا' اس میں امر و نہی اور ثواب و عذاب کو بیان فرمایا' آخرت کی یاد دلانے کے لیے نصیحتیں' غور وفکر کرنے کے لیے مثالیں' عبرت حاصل کرنے کے لیے گذشتہ امتوں کی خبریں اور تفکر کے لیے اپنی توحید کی مختلف نشانیاں' اس کتاب میں بیان فرمائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سے اس کتاب کی' ایسی قرأت نہیں چاہتا جس میں تیزی اور کلمات کی درست ادائیگی تو ہو' لیکن اس کتاب کی حدود کی پابندی اور اس کے ارشادات پر عمل نہ ہو' نہ ہی وہ ایسی تلاوت چاہتا ہے جس میں آیات کے معانی و مفاہیم میں غور وفکر نہ ہو اور نہ ہی اس کتاب کا ایسا پڑھنا' اُسے پسند ہے جس میں اس کے حقائق کو جاننا اور اس کی باریکیوں کو سمجھنا نہ پایا جائے[۳] اور یہ تمام چیزیں اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں جبکہ اس کتاب کی تفسیر' اس کے احکام' حلال وحرام کی معرفت' آیات کے واقعۂ نزول اور اس کی اقسام کو جانا جائے اور اس کتاب کی ناسخ و منسوخ اور خاص و عام آیات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ کیونکہ یہی "علم تفسیر[۴]" تمام علوم کی مضبوط ترین بنیاد ہے' اس کی

---

۲ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا کہ "ہم نے قرآن کو یاد کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی (اس کو) یاد کرنے والا؟" (القمر: ۱۷) امام سیوطی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ قرآن مجید کو لوگوں کی زبان پر آسان نہ فرماتا تو مخلوق میں سے کوئی شخص بھی کلام الٰہی کو اپنی زبان سے ادا نہ کر سکتا"۔ (درمنثور ج ۷ ص ۵۹۶)

۳ قرأت وہی مطلوب ہے جس میں الفاظ کی درستگی کے ساتھ ساتھ ان کے معانی میں غور وفکر بھی پایا جائے۔ قرآن حکیم کے نزول کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس میں غور وفکر کر کے اس سے نصیحت حاصل کی جائے۔ ارشادِ باری ہے: یہ برکت والی کتاب ہے اس کو ہم نے آپ کی طرف اُتارا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور وفکر کریں اور عقل والے اس کی نصیحت کو قبول کریں۔ (ص: ۲۹)

۴ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام علوم میں سب سے زیادہ شرف' علم تفسیر کو حاصل ہے۔ علامہ خازن نے اس علم کی عظمت اور اس کے مقام و مرتبہ کو جن الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

فانہ ارسخ العلوم اصلا واسبغھا فرعا وفصلا واکرمھا نتاجا وانورھا سراجا فلا شرف الا وھو السبیل الیہ ولا خیر الا وھو الدال علیہ.

علم تفسیر تمام علوم کی مضبوط ترین بنیاد ہے' اس کی شاخیں انتہائی کامل ہیں' اس کے نتائج بہت اعلیٰ اور اس کی روشنی بہت زیادہ ہے۔ ہر فضیلت کا راستہ اور ہر بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا یہی علم ہے۔

شاخیں انتہائی کامل ہیں' اس کے نتائج بہت اعلیٰ اور اس کی روشنی بہت زیادہ ہے۔ کوئی فضیلت اور کوئی بھلائی ایسی نہیں ہے جس کی طرف یہ علم' رہنمائی نہ کرتا ہو۔ (ہر شرف اور ہر خیر کا سرچشمہ یہی علم ہے۔) اور اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے نوازے ہوئے کئی حق گو علماء کو اتنی قوت اور طاقت عطا فرمائی کہ انہوں نے تفسیر سے تعلق رکھنے والے تمام علوم پر کتابیں تصنیف فرمائیں اور اس کے تمام متفرق فنون کو یکجا کیا اور ہر ایک نے اپنے علم اور فہم و فراست کے مطابق اس کاوش کو سرانجام دیا اور اس کام میں انہوں نے اپنے بعد آنے والے لوگوں کا لحاظ فرمایا اور گزرے ہوئے علماء کی پیروی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان تمام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)

تفسیر خازن کا بنیادی ماخذ اور طرزِ تفسیر

علم تفسیر میں شیخ جلیل' ذی علم و فضل' امام کامل' محی سنّت' پیشوائے امّت' امام الائمہ' مفتی کل' حامی سنت و مددگارِ دین ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[٥] کی کتاب ''معالم التنزیل'' ایک جلیل القدر' بلند پایہ' عظیم الشان اور ضیاء بار تصنیف ہے اور کئی عظیم خصوصیات کی حامل ہے۔ مثلاً:

(١) اس میں تفسیر سے متعلق صحیح روایات کو جمع کیا گیا ہے۔

(٢) یہ تفسیر' روایات میں شکوک و شبہات اور تحریف و تبدیل سے پاک ہے۔

(٣) اس کے مندرجات احادیثِ مبارکہ سے آراستہ ہیں۔

(٤) مختلف آیات کے تحت شرعی احکام کا بیان اس تفسیر کی زینت ہے۔

(٥) عجیب و غریب قصے اور گذشتہ اُمتوں سے متعلق مختلف روایات بھی اس میں درج ہیں۔

(٦) تفسیر میں کئی مقامات پر انتہائی خوب صورت پیرایہ میں اشارات و کنایات کی زبان استعمال کی گئی ہے اور بالعموم بہت ہی واضح عبارت کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

(٧) مجموعی طور پر اس پوری تفسیر میں عبارت کا حسن و جمال اور فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت مصنّف علاّم کو رحمتیں اور اجرِ عظیم عطا فرمائے اور جنت الفردوس کو ان کا مسکن اور جائے قرار بنائے۔ (آمین)

معالم التنزیل کی مذکورہ خصوصیات کی بنیاد پر میں نے چاہا کہ اس تفسیر میں مفاہیم و مطالب کے جو روشن فوائد اور یکتا و بے مثال موتی اور الفاظ و معانی کے جو گلدستے اور جواہر' ورق در ورق بکھرے ہوئے ہیں' ان میں سے کچھ' میں بھی چُن کر اپنی کتاب (تفسیر خازن) میں اس طرح سجادوں کہ:

٥ امام بغوی علیہ الرحمۃ اہل علم و فضل کے درمیان ایک مستند اور معروف مصنف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ٤٣٣ ہجری میں بغشور (ہرات اور مرو کے درمیان ایک قصبہ) میں پیدا ہوئے' اس نسبت سے آپ کو بغوی کہا جاتا ہے۔ (یہ نسبت خلاف قیاس ہے۔) امام بغوی کو مؤرخین اور مفسرین علماء نے اپنی کتب میں بہت ہی اعلیٰ القاب سے یاد کیا ہے۔ حوالہ کے لیے علامہ سبکی کی طبقات الشافعیہ' امام ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ' امام سیوطی کی طبقات المفسرین' علامہ ابن کثیر کی البدایہ والنھایہ اور ابن خلکان کی وفیات الاعیان کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ خود علامہ خازن نے اپنے خطبہ میں امام بغوی کو جن الفاظ سے یاد کیا ہے وہ ان کے مقام و مرتبہ کو بہت اجاگر کرتے ہیں۔ علامہ بغوی ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ کی کئی تصنیفات اور تالیفات ہیں۔ مثلاً تفسیر بغوی المعروف بمعالم التنزیل' مصابیح السنہ' شرح السنہ وغیرہ۔ راجح قول کے مطابق آپ کا سن وصال ٥١٦ھ ہے' اور آپ خراسان کے شہر طالقان میں مدفون ہیں۔

(۱) اختصار بھی برقرار رہے۔
(۲) تفسیر و تاویل کی روح بھی اس میں موجود ہو۔
(۳) بغوی سے جو کچھ میں اخذ کروں' میری کتاب اس کی تلخیص ہو۔
(۴) اس کے نکات اور اصول' میری کتاب کے لیے بنیاد ہوں۔

یہاں یہ واضح رہے کہ میری تفسیر میں کئی اہم باتیں ایسی بھی ہیں جن کو میں نے اُن کتابوں سے اخذ کیا ہے جو تفسیر سے متعلق دیگر علوم پر لکھی گئی ہیں' میں نے ان کی مفید اور بے مثال عبارات کا خلاصہ کر کے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

بہر حال اس تفسیر میں میرا ذاتی کوئی دخل نہیں ہے۔ میں نے صرف اور صرف اخذ اور انتخاب کیا ہے۔ البتہ بات کو بے جا لمبا چوڑا کرنے سے اجتناب کیا ہے' حتیٰ کہ احادیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے اصل مقصود' بہت جلد حاصل ہوتا ہے اور چونکہ قرآنِ حکیم کی واضح تفسیر' سنّت رسول ﷺ سے معلوم ہوتی ہے اور پھر دونوں کے مجموعہ پر شرعی احکام کا دارومدار ہے' اس لیے میں نے آیات کی تفسیر یا کسی حکم کی تشریح کرتے ہوئے مختلف احادیث مبارکہ کو ذکر کیا ہے اور اس میں طریقہ یہ رکھا ہے کہ حدیث کے ساتھ ہی اس کے مخرج کی وضاحت کر دی ہے' یعنی یہ حدیث کون سی کتاب میں موجود ہے اور کس امام نے اس کو روایت کیا۔ نیز طلبہ کی آسانی کے لیے' میں نے امام کا پورا نام ذکر کرنے کی بجائے' علامۃً ایک[۱] ایسا حرف شروع میں ذکر کر دیا ہے جس سے نام معلوم ہو جائے۔ چنانچہ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی الجامع الصحیح سے جو روایات میں نے ذکر کی ہیں' ان کے لیے حرف ''خ'' کو علامت بنایا ہے اور امام ابو الحسین مسلم بن حجاج نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ کی صحیح مسلم سے جو روایات میں نے ذکر کی ہیں' ان کے لیے حرف ''م'' کو علامت بنایا ہے اور وہ روایات جن کو دونوں ائمہ نے روایت کیا ہے ان کے لیے حرف ''ق'' کو میں نے علامت بنایا ہے اور جو روایات میں نے سنن ابوداؤد' سنن ترمذی اور سنن نسائی سے ذکر کی ہیں' ان کے آغاز میں علامت کی بجائے پورا نام لکھ دیا ہے' مثلاً اخرجهٗ ابو داؤد یا اخرجهٗ النسائی۔ اور وہ روایات جو مجھے مذکورہ کتابوں میں نہیں ملیں اور امام بغوی رحمۃ اللہ نے تنہا اپنی سند کے ساتھ' اُنہیں اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے' ان کو بیان کرتے وقت میں نے وضاحت کر دی ہے کہ: روی البغوی بسندہ. یعنی امام بغوی نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور جن روایات کو امام بغوی نے امام ثعلبی متوفی ۴۲۷ھ کی سند سے روایت کیا ہے' ان کو بیان کرتے وقت میں نے لکھ دیا ہے: روی البغوی باسناد الثعلبی. یعنی امام بغوی نے اس حدیث کو امام ثعلبی کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور وہ روایات جو بغوی میں زائد ہیں اور متغیر الفاظ کے ساتھ مروی ہیں ان کو ذکر کرتے ہوئے میں نے امام بغوی پر اعتماد کیا ہے اور حدیث کی دیگر معتبر کتب مثلاً امام حمیدی کی الجمع بین الصحیحین اور امام ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ کی جامع الاصول فی احادیث الرسول ﷺ اور ان جیسی دیگر کتابوں سے' میں نے جو احادیث ذکر کی ہیں' ان کی تصحیح میں بھی' میں نے جدوجہد اور کوشش کی ہے اور احادیث کی سند کو جو میں نے حذف کیا ہے' اس کے بدلے میں نے شرح غریب الحدیث کا اضافہ کیا ہے' یعنی سند کی کمی کو پورا کرنے کے لیے حدیث میں آنے والے مشکل الفاظ اور دیگر متعلقہ امور کی میں نے تشریح کر دی ہے' تاکہ اس کتاب میں احادیث سے بھرپور

---

[۱] اصل کتاب تفسیر خازن میں تو اسی طرح ہے' البتہ یہاں ترجمہ میں راقم نے علامتی حرف کو لکھنے کے بجائے تمام احادیث کی ترقیم (نمبرنگ) کر دی ہے' اور ہر حدیث کے اختتام پر اس کے مکمل حوالہ جات تحریر کر دیئے ہیں۔ تاکہ قارئین کو حدیث کا پورا حوالہ معلوم ہو جائے اور نمبرنگ سے یہ معلوم ہو جائے کہ علامہ خازن نے کس سورت یا کس پارے میں کتنی احادیث اور پوری تفسیر میں کتنی احادیث ذکر کی ہیں۔

فائدہ حاصل ہو اور طلبہ کو سہولت ہو جائے۔

بہرصورت اس کتاب میں، جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے میں نے انتہائی اختصار اور حسنِ ترتیب کو قائم رکھا ہے اور ساتھ ہی' اس بات کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ قارئین کے لیے یہ تفسیر بہت ہی آسان اور قابلِ فہم ہو۔ اب آخر میں اربابِ تالیف اور اصحاب تصنیف کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں:

مؤلفین و مصنّفین کو ایک نصیحت

ہر وہ شخص جو کسی بھی فن میں' کوئی کتاب تالیف کرے اُسے چاہیے کہ اس کی کتاب پانچ خصوصیات کی حامل ہو:

(۱) **استنباط شیئ کان معضلا**: گنجلک اور پیچیدہ باتوں کو کھول کر علیحدہ بیان کرنا۔

(۲) **جمعه ان کان متفرقا**: جو باتیں بکھری ہوئی ہوں' اُنہیں یکجا کرنا تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۳) **شرحه ان کان غامضا**: پیچیدہ اور مشکل مقامات کی وضاحت کرنا۔

(۴) **حسن نظم و تألیف**: کتاب میں اوّل تا آخر ترتیب کے حسن کو برقرار رکھنا۔

(۵) **اسقاط حشو و تطویل**: غیر ضروری باتوں سے اور بات کو بلاوجہ لمبا چوڑا کرنے سے کنارہ کشی کرنا۔

مجھے اُمید ہے کہ میری اس کتاب میں آپ کو یہ تمام خصوصیات ملیں گی اور میں اس کتاب کا نام ''**لباب التأویل فی معانی التنزیل**[ے]'' رکھتا ہوں اور اللہ عزوجل کی بارگاہ میں سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے' کیونکہ میں اپنے مطلوب کو آسان سے آسان تر بنا کر پیش کرنے کے لیے اُسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ وہ اس تفسیر کو خالص اپنی پاک ذات کے لیے بنا دے اور اس کو اپنی بارگاہ میں' میری جانب سے قبول فرمائے' بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے' اس کی ذات میرے لیے کافی ہے اور وہ کیا ہی خوب کارساز ہے' اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اُسی کی طرف میں ہر معاملہ میں رجوع کرتا ہوں۔

خطبہ و دعا کے بعد اور تفسیر شروع کرنے سے پہلے' تین فصلوں پر مشتمل ایک مقدمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں' تاکہ قرآن حکیم اور اس کی تفسیر سے متعلق ابتدائی امور ذہن نشین ہو جائیں۔

پہلی فصل: قرآن حکیم کا مقام اور اس کی تلاوت و تعلیم کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث میں قرآن حکیم کا مقام اور اس کو پڑھنے پڑھانے کی بہت فضیلت ارشاد فرمائی ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی چند احادیث کچھ تشریح کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

قرآن کریم کے مقام اور عظمت سے متعلق چند احادیث

(۱) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دینے کے لیے مکہ اور مدینہ کے درمیان اس تالاب پر کھڑے ہوئے جس کو خُم کہتے ہیں' آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا: اے لوگو! سنو میں ایک بشر ہوں' عنقریب میرے رب کا پیغام لانے والا (فرشتہ اجل) میرے پاس آئے گا اور میں اس کو لبیک کہوں گا۔ میں تم میں دو ثقیل[۸] (عظیم) چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں' ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے' اللہ کی

ے یعنی قرآن مجید کے معانی کی جو تفسیریں بیان کی گئی ہیں ان کا لب لباب اور خلاصہ۔

۸ کتاب اللہ اور اہل بیت کے ''ثقیل'' ہونے کی علماء نے دو توجیہات کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ثقیل سے مراد یہ ہے کہ کتاب اللہ اور اہل بیت کے نقش قدم پر چلنا ایک مشکل اور دشوار امر ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور اہل بیت کی عظمت بہت زیادہ ہے۔ (شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۲۷۹' النہایہ ج ۱ ص ۲۱۱)

کتاب پر عمل کرو اور اس کو مضبوطی سے تھام لو' پھر آپ نے کتاب اللہ پر ہمیں اُبھارا اور اس کی ترغیب دی' پھر فرمایا: اور (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کو یاد دلاتا ہوں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کو یاد دلاتا ہوں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کو یاد دلاتا ہوں[9]۔

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: اللہ کی کتاب جس میں ہدایت اور نور ہے' جس نے اس کتاب کو تھام لیا اور اس کو دلیل بنایا وہ ہدایت پر ہوگا اور جو اس کو چھوڑ دے گا وہ گمراہ ہوگا۔ (صحیح مسلم: ۶۱۰۸۔ ۶۱۱۰' السنن الکبریٰ للنسائی ج۵ ص۵۱)

(۲) ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اللہ عزوجل کی کتاب' وہ اس کی رسّی[10] ہے جو اس کی اتباع کرے گا وہ ہدایت پر رہے گا اور جو اس کو ترک کر دے گا' وہ گمراہی پر ہوگا۔ (صحیح مسلم: ۲۴۰۸)

(۳) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں تمہارے درمیان (دو چیزیں) چھوڑ کر جا رہا ہوں' جب تک تم اُنہیں تھامے رہو گے میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ ان میں سے ایک' دوسری سے بہت عظیم ہے۔ اللہ کی کتاب' آسمان سے زمین کی طرف لٹکی ہوئی ایک رسّی ہے' اور (دوسری چیز) میری اولاد یعنی اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اس وقت تک جدا نہیں ہوں گی جب تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر نہیں آ جائیں گی[11]' لہٰذا تم غور کر لو کہ

---

۹ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا کہ "میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کو یاد دلاتا ہوں"۔ یعنی میرے اہل بیت کے معاملہ میں تم اپنے اندر اللہ کا خوف پیدا کرو' انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچانے سے بچو اور ان کا بھرپور ادب اور احترام کرو۔ علامہ ابو العباس قرطبی اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی اس وصیت اور عظیم تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی آل اور آپ کے اہل بیت کا احترام' ان کی فرمانبرداری' ان کی عزت اور ان سے محبت رکھنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح وہ فرض کام ضروری ہیں جن کی تاکید آئی ہے اور ان کو کسی عذر کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ (المفہم ج۶ ص۳۰۴)

۱۰ اس حدیث میں کتاب اللہ کو حبل اللہ فرمایا۔ "حبل" کے عربی میں کئی معانی ہیں' مثلاً عہد' امان' رسّی' نور ممتد (یعنی پھیلی ہوئی روشنی) "کتاب اللہ حبل اللہ ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ عزوجل اور اس کے بندوں کے درمیان ایک عہد ہے' عذاب سے امان دینے والی اور آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی ایک روشنی ہے۔ حبل اللہ سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب' اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی رحمت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ (شرح مسلم للنووی ج۲ ص۲۸۰' النہایہ ج۱ ص۳۲۰)

علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ نے کتاب اللہ کو "حبل" فرمانے کی بہت عمدہ توجیہ کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حبل (یعنی رسّی) اوپر چڑھنے کا بھی ذریعہ ہے اور نیچے آنے کا بھی ذریعہ ہے' اسی طرح قرآن حکیم سے بھی کئی لوگ ترقی پاتے ہیں اور کئی لوگ تنزلی۔ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ "اللہ (مختلف مثالیں بیان فرما کر) بہت سوں کو گمراہی میں مبتلا فرماتا ہے اور بہت سوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے"۔ (البقرہ: ۲۶) اور حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "قرآن یا تو تمہارے حق میں دلیل ہے یا تمہارے خلاف"۔ (صحیح مسلم: ۲۲۳' مرقات ج۱۰ ص۵۱۸)

۱۱ اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے اپنی زندگی میں کتاب اللہ اور میرے اہل بیت کو تھامے رکھا اور ان سے محبت کی وہ کل بروز محشر اس طرح نوازا جائے گا کہ یہ دونوں چیزیں اس کے ساتھ رہیں گی' بلکہ حوض کوثر پر آ کر اللہ کے رسول ﷺ سے اس کو بدلہ دلوائیں گی۔ شارح مشکوٰۃ علامہ شرف الدین طیبی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جس نے نبی ﷺ کی اس وصیت پر عمل کیا اور دونوں چیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کر کے شکرانِ نعمت کیا تو یہ دونوں چیزیں قیامت میں ہر جگہ اس کے ساتھ رہیں گی' یہاں تک کہ یہ دونوں چیزیں حوض کوثر پر آ کر نبی علیہ السلام کے سامنے اس شخص کے عمل کی تعریف کریں گی۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ اس شخص کو خود بدلہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ کامل ترین جزاء عطا فرمائے گا اور جس شخص نے نبی اکرم ﷺ کی اس وصیت کو ضائع کر دیا اور نعمت کی ناشکری کی تو اس کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ (شرح الطیبی ج۱۱ ص۲۹۹)

میرے بعد تم ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔

(سنن الترمذی: ۳۷۸۸؛ مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۶؛ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۵۰۵؛ سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۱۴۸)

(٤) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: سنو! بے شک تمہارے نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعہ بعض لوگوں کو عزت عطا فرماتا ہے اور بعض لوگوں کو رُسوا فرما دیتا ہے۔

(صحیح مسلم: ۸۱۷؛ سنن ابن ماجہ: ۲۱۸؛ مسند احمد ج ۱ ص ۲۵؛ سنن الدارمی: ۳۳۶۵؛ ج ۲ ص ۵۳۶؛ صحیح ابن حبان: ۷۷۲)

(٥) حضرت حارث اعور رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ (ایک مرتبہ) میرا مسجد میں گزر ہوا تو لوگوں کو باتوں میں[12] مشغول پایا' میں سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور ان سے عرض کیا: امیر المؤمنین! کیا آپ نہیں دیکھتے کہ لوگ باتوں میں مشغول ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا واقعی لوگ مشغول ہیں؟ میں نے کہا: ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: سنو! بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: آگاہ ہو جاؤ! بے شک عنقریب فتنے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! ان سے بچنے کا راستہ کیا ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا: ان سے بچنے کا راستہ اللہ کی کتاب ہے' جس میں تمہارے اگلوں اور تمہارے پچھلوں کے متعلق خبریں ہیں' تمہارے جھگڑوں میں یہ کتاب ثالث ہے' اس کی باتیں فیصلہ کن ہیں' مذاق نہیں ہیں۔ جو ظالم متکبر اس کتاب کو چھوڑے گا' اللہ عزوجل اُسے ہلاک فرما دے گا اور جو شخص اس کے علاوہ کسی اور چیز میں ہدایت کو تلاش کرے گا' اللہ تعالیٰ اُسے گمراہی میں ڈال دے گا' یہی کتاب اللہ کی مضبوط رسّی ہے' یہی سراپا حکمت ذکر ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے خواہشات میں بہکاؤ اور بولنے میں شبہات پیدا نہیں ہوتے۔ (اس کی شان یہ ہے کہ) اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوں گے' بار بار تلاوت کے باوجود یہ پرانی نہیں ہوگی (ہمیشہ تر و تازہ رہے گی) اور اس کے عجائب و غرائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ یہی وہ کتاب ہے کہ جب جنات نے اس کو سنا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ: ''بے شک ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف ہدایت دیتا ہے''۔ جو شخص اس کتاب کی بنیاد پر گفتگو کرے گا' اس کی تصدیق کی جائے گی اور جو اس پر عمل کرے گا' اس کو اجر و ثواب دیا جائے گا' جو اس کے ذریعہ فیصلہ کرے گا' وہ (حقیقتاً) انصاف کرے گا اور جو لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے گا' اُسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی جائے گی۔ حضرت علی نے فرمایا: اے اعور! ان باتوں کو اچھی طرح نوٹ کر لو۔

(سنن الترمذی: ۲۹۰۶؛ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۸۲؛ مسند احمد ج ۱ ص ۹۱؛ سنن دارمی: ۳۳۳۱۔ ج ۲ ص ۵۲۶؛ مسند ابو یعلیٰ: ۳۶۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب[13] قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی سند مجہول ہے اور حدیث کے راوی حارث اعور

---

[12] اس سے یا تو دنیاوی باتیں مراد ہیں' یا پھر یہ مراد ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ احادیث میں اس قدر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں کہ انہوں نے قرآن کی طرف توجہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حارث اعور اس بات کو لے کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اس لیے گئے کہ دورِ خلافت آپ کا چل رہا تھا' یا اس وجہ سے کہ آپ کو معاملات سلجھانے میں زیادہ کمال حاصل تھا' کیونکہ آپ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں''۔

(المستدرک ج ۳ ص ۱۲۶؛ کنز العمال: ۳۲۹۷۸؛ مرقات ج ۴ ص ۲۴۸)

[13] حدیث غریب کی تعریف سے قبل یہ جاننا چاہیے کہ حدیث غریب' حدیث صحیح کی ایک قسم ہے۔ علماء محدثین نے حدیث صحیح کی چار اقسام بیان فرمائی ہیں: غریب' عزیز' مشہور اور متواتر۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ ان اقسام کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''حدیث صحیح کو روایت کرنے والا اگر ایک شخص ہو تو وہ حدیث غریب ہے اور اگر روایت کرنے والے دو افراد ہوں تو وہ حدیث عزیز ہے اور اگر روایت کرنے والے دو سے زائد ہوں تو وہ حدیث مشہور ہے (اس کو مستفیض بھی کہتے ہیں) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے بارے میں ماہرین رجال کو کلام ہے۔[۱۴]

حدیث مذکور: (۵) کے چند کلمات کی تشریح

"هو الفصل": قرآن حکیم "فصل" ہے۔ یعنی حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب ہے۔

"ليس بالهزل": یہ کتاب "هزل" یعنی مذاق نہیں ہے' بلکہ اوّل تا آخر حقائق پر مشتمل کتاب ہے۔

"الجبار": یہ آدمی کی صفت ہے۔ اس کا معنیٰ ہے: مسلّط ہونے والا' تکبر کرنے والا' لوگوں میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا۔

"قصمه الله": اس کا معنیٰ ہے: اهلكه الله۔ یعنی اللہ عزوجل نے اسے ہلاک فرمادیا۔

"حبل الله المتين": قرآن کریم اللہ عزوجل کی مضبوط رسّی ہے۔ "حبل" کے کئی معانی ہیں:

(۱) "العهد": وعدہ (۲) "الأمان": حفاظت' پناہ۔ اب معنیٰ یہ ہوا کہ جب انسان' قرآن حکیم کو تھام لیتا ہے تو اللہ رب العزت اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔

"الذكر الحكيم": قرآن مجید ذکر حکیم ہے۔ "ذکر" سے یہاں مراد ہے: قابل تکریم' قابل عزت واحترام۔ اور "حکیم" سے مراد ہے: محکم اور مضبوط' جس میں کوئی اختلاف اور اضطراب نہ ہو۔

"الصراط المستقيم": قرآن کریم "صراط مستقیم" ہے۔ یعنی واضح اور سیدھا راستہ ہے۔

"لا تزيغ به الاهواء": اس کا معنیٰ ہے: "لا يميل عن الحق". یعنی اس کتاب کی برکت سے دل میں کوئی بہکاؤ اور گمراہی پیدا نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم کی تلاوت اور دوسروں کو اس کی تعلیم دینے کی فضیلت پر چند احادیث

(٦) حضرت سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اور اگر حدیث صحیح کے راوی اتنے زیادہ ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو تو وہ حدیث متواتر ہے"۔ (مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح)

زیر بحث حدیث کو امام ترمذی نے جو غریب قرار دیا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی حمزہ الزیات ہیں' جنہوں نے ابو المختار الطائی سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ان سے روایت کرنے میں حمزہ الزیات منفرد (تنہا) ہیں' اس لیے یہ حدیث غریب ہے لیکن یہ امام ترمذی کی اپنی تحقیق ہے۔ اس کے برعکس حافظ ابن کثیر کی تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے' اس میں محمد بن اسحٰق نے محمد بن کعب القرظی سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (دیکھئے مسند احمد ج۱ص۹۱) لہٰذا یہ حدیث غریب نہیں ہے۔ (فضائل القرآن مع تفسیر ابن کثیر ج۷ص۴۳۳)

[۱۴] علماء رجال کے نزدیک حارث اعور کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہے۔ یحییٰ بن معین کے نزدیک یہ ضعیف راوی ہے' ابوزرعہ کے نزدیک ان کی روایت نا قابل استدلال ہے' ابوحاتم کا بھی یہی قول ہے۔ جبکہ علی بن المدینی اور ابوبکر بن ابی خیثمہ کے نزدیک حارث اعور کذاب ہے۔ (تہذیب الکمال ج۴ص۴۲) حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ بہرحال حارث اعور کی حدیث میں ضعف ہوتا ہے۔ (تقریب التہذیب ج۱ص۱۷۵) علامہ علی قاری حنفی فرماتے ہیں کہ ماہرین رجال کی تصریحات کے مطابق گو کہ حارث اعور کی زیر بحث حدیث سنداً ضعیف ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' خصوصاً اس صورت میں جبکہ یہ فضائل سے تعلق رکھتی ہے اور اصول ہے کہ ضعیف حدیث' فضائل میں بالاتفاق قابل عمل ہوتی ہے۔ (مرقات ج۴ص۶۵۲)

جس کے سینے میں قرآن کریم کا کچھ حصہ نہ ہو وہ شخص ویران گھر کی مانند ہے۔

(سنن الترمذی:۲۹۱۳ مسند احمد ج۱ص۲۲۳ مستدرک ج۱ص۵۵۴ سنن دارمی:۳۳۰۶۔ج۲ص۵۲۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کے بعد فرمایا:''هذا حديث حسن صحيح'' (یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔)

(۷) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جو خود قرآن کریم سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ (صحیح بخاری:۵۰۲۷ سنن الترمذی:۲۹۰۷ سنن ابوداؤد:۱۴۵۲ سنن ابن ماجہ:۲۱۲ صحیح ابن حبان:۱۱۸ مسند احمد ج۱ ص۵۷ سنن دارمی:۳۳۳۷ بیروت ج۲ص۵۲۸)

(۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کریم میں مہارت حاصل کرنے والا (جنت میں) ایسے فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو لکھنے والے باعزت اور نیک ہیں اور جو شخص قرآن کریم پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے اور پڑھتے ہوئے دشواری ہوتی ہے اس کے لیے ڈبل اجر ہے۔ (صحیح بخاری:۴۹۳۷ صحیح مسلم:۷۹۸ سنن الترمذی: ۲۹۰۴ سنن ابوداؤد:۱۴۵۴ سنن ابن ماجہ:۳۷۷۹ مسند احمد ج۶ص۹۴ سنن دارمی:۳۳۶۸۔ج۲ص۵۳۷)

حدیث: (۸) کے چند کلمات کی تشریح

''الماهر بالقرآن'': ماہر بالقرآن سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن حکیم پر مہارت رکھتا ہو اس کا مکمل حافظ ہو اور بہترین تلاوت کرتا ہو۔

''السّفرة'': یہ ''سَافِرٌ'' کی جمع ہے اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس پیغام لے کر آتے ہیں انہیں ''سفرة'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ عزوجل کا پیغام لے کر انبیاء علیہم السلام کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ''سفرة'' سے مراد وہ فرشتے ہیں جو لکھنے والے ہوتے ہیں۔

''البررة'': یہ فرشتوں کی صفت ہے۔ یعنی انہیں اللہ عزوجل جس چیز کا حکم فرماتا ہے وہ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تو ''ماہر بالقرآن'' ایسے نیک فرشتوں کے ساتھ ہوگا یعنی اس بندے کے لیے جنت میں کچھ درجات ہوں گے جن میں وہ فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔

''يتتعتع'': اس کا معنیٰ ہے: صحیح یاد نہ ہونے کی وجہ سے اٹک اٹک کے تلاوت کرنا۔

''له أجران'': جو شخص قرآن کریم اٹک اٹک کے پڑھتا ہے اور اسے دشواری ہوتی ہے اس کے لیے دو اجر ہیں یعنی ایک اجر تو اس بات پر کہ اس نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور دوسرا اجر اس بات پر کہ اس نے مشقت اور تکلیف کو برداشت کیا۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ اس کو ماہر بالقرآن سے زیادہ اجر ملے گا۔ ''بل الماهر افضل منه و اكثر اجرا'' ماہر شخص بہرحال افضل ہے اور زیادہ اجر کا مستحق ہے۔

(۹) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مؤمن قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج (پھل) کی طرح ہے جس کی خوشبو پسندیدہ اور ذائقہ خوشگوار ہے اور جو مؤمن قرآن مجید نہیں پڑھتا وہ کھجور کی طرح ہے جس میں خوشبو تو نہیں لیکن ذائقہ میٹھا ہے اور فاسق و فاجر جو قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال اس پودے کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی ہے لیکن ذائقہ کوئی نہیں اور جو فاسق و فاجر قرآن کریم کو نہیں پڑھتا اس پودے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے اور اس میں خوشبو بھی نہیں ہوتی۔

(صحیح بخاری:۵۰۲۰ صحیح مسلم:۷۹۷ سنن الترمذی:۲۸۶۵ سنن ابوداؤد:۴۸۳۰ سنن نسائی:۵۰۵۳ سنن ابن ماجہ:۲۱۴ صحیح ابن حبان:

۵۰۷۷ مسند احمد ج ۴ ص ۴۰۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۵۲۹، سنن دارمی: ۳۳۶۳۔ ج ا ص ۵۳۵)

اس حدیث سے درج ذیل دو اہم باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) قرآن کریم کو حفظ کرنے والے بڑی فضیلت کے مستحق ہیں۔

(۲) سامع پر اپنے کسی مقصد کو واضح کرنے کے لیے مختلف مثالیں بیان کرنا مستحب اور پسندیدہ عمل ہے۔

(۱۰) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا دس گنا اجر ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ ''الم'' ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف[۱۵] ہے۔

(سنن الترمذی: ۲۹۱۰، الترغیب والترہیب: ۲۰۹۷، سنن دارمی موقوفاً: ۳۳۰۸۔ ج ۲ ص ۵۲۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب قرار دیا ہے۔

اس حدیث کو بعض نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور بعض نے موقوفاً[۱۶]۔

(۱۱) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! وہ کون سا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الحال المرتحل[۱۷]''۔ اس شخص نے پوچھا: ''الحال المرتحل'' کیا ہوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے مراد وہ شخص ہے جو اوّل تا آخر قرآن کریم کو پڑھتا ہے جب بھی وہ (اختتام پر) رکتا ہے تو دوبارہ چل پڑتا ہے۔

(سنن الترمذی: ۲۹۴۸، المعجم الکبیر: ۱۲۷۸۳، سنن دارمی: ۳۴۷۶۔ ج ۲ ص ۵۶۰)

(۱۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: تو قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجوں میں) چڑھتا جا اور جس طرح دنیا میں تو ٹھہر ٹھہر کر قرآن

---

۱۵ اور جس نے یہ تین حروف ادا کیے وہ ۳۰ نیکیوں کا مستحق ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر دس نیکیوں کے برابر اجر عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام کی آیت: ۱۶۰ میں ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص ایک نیکی لے کر حاضر ہوگا اس کے لیے دس کے برابر اجر ہوگا''۔

۱۶ یعنی بعض نے اس کو نبی اکرم ﷺ تک اسناد کیا ہے اور یوں کہا ہے کہ ''قال رسول اللہ ﷺ'' (اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا)'' اور بعض نے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ جیسے امام دارمی نے اس حدیث کو حضرت ابن مسعود تک موقوف کیا ہے۔

۱۷ ''الحال المرتحل'' میں الحال باب ضرب (حلّ بالمکان) سے ہے جس کا معنیٰ ہے: کسی جگہ اترنا اور المرتحل باب افتعال سے ہے جس کا معنیٰ ہے: منتقل ہونا، کوچ کرنا۔ علامہ ابن اثیر جزری اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن حکیم کی تلاوت کرے اور جب اختتام کو پہنچے تو پھر اس کا آغاز کر دے۔ ایسے شخص کو مسافر سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وہ کسی جگہ اترتا ہے تو پھر روانہ ہوتا ہے اسی طرح مکہ کے قرأ جب قرآن کریم کے اختتام پر پہنچتے تو ساتھ ہی سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقر کی پانچ ابتدائی آیتیں پڑھ لیتے پھر قرآن کریم ختم کرتے۔ ایسے شخص کو ''الحال المرتحل'' کہا جاتا ہے۔ یعنی جو قرآن کریم ختم کرے اور پھر اس کا آغاز کر دے۔

(النہایہ ج ا ص ۴۱۴)

کریم پڑھتا تھا' اسی طرح یہاں بھی پڑھ' جہاں تو آخری آیت پڑھے گا' اللہ عزوجل کے نزدیک (جنت میں) وہی[۱۸] تیرا مقام ہو گا۔ (سنن الترمذی: ۲۹۱۴' سنن ابوداؤد: ۱۴۶۴' سنن کبریٰ للنسائی ج ۵ ص ۲۲' مسند احمد ج ۲ ص ۱۹۲' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۹۸' صحیح ابن حبان: ۷۶۶' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۵۳)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

(۱۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن قرآن کریم آئے گا اور کہے گا: اے میرے رب! اس کو مزین اور آراستہ کر دے تو (قرآن پڑھنے والے کو) عزت کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا: اے میرے رب! اس کو اور مزین کر دے' تو اُسے عزت والا لباس پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا: اے میرے رب! اس سے راضی ہو جا! تو اللہ عزوجل اس سے راضی ہو جائے گا' پھر اس شخص سے کہا جائے گا: تو قرآن پڑھتا جا اور (جنت کے درجوں میں) چڑھتا جا اور ہر آیت کے بدلہ میں اس کو ایک نیکی دی جائے گی۔

(سنن الترمذی: ۲۹۱۵' المستدرک ج ۱ ص ۵۵۲' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۹۸' مسند احمد ج ۲ ص ۴۷۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

(۱٤) حضرت سہل بن معاذ جہنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآن کریم کو پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا' اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے زیادہ ہوگی' جبکہ سورج تمہارے دنیاوی مکان میں موجود ہو تو تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا گمان ہے جو اس کتاب پر عمل کرنے والا ہو[۱۹]۔ (اس کی روشنی کس قدر ہوگی!) (سنن ابوداؤد: ۱۴۵۳' مسند احمد ج ۳ ص ۴۴۰' المستدرک ج ۱ ص ۵۶۷)

(۱۵) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے قرآن مجید پڑھا اور اس کو حفظ کیا' اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا' اللہ عزوجل اس کی برکت سے اُسے جنت

---

۱۸ اس حدیث کی علماء نے دو توجیہات کی ہیں۔ ایک توجیہ یہ ہے کہ جنت کے درجات کی تعداد قرآنی آیات کی تعداد کے مطابق ہے۔ جو شخص وہاں پورے قرآن کی تلاوت کرے گا وہ جنت کے درجات میں سب سے آخری درجہ پر فائز ہوگا اور جو شخص کچھ حصہ تلاوت کرے گا وہ اس کے مطابق درجہ پائے گا اور رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشادِ پاک کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ قرآن حکیم کی آیات چھ ہزار سے زائد ہیں اور ہر آیت کے بدلہ میں ایک درجہ ہے اور جنت کے ہر دو درجات کے درمیان زمین و آسمان کے برابر فاصلہ ہے۔ (جمع الجوامع: ۱۲۰۴۱' کنز العمال: ۲۴۲۵) لہٰذا علماء کی پہلی توجیہ کے مطابق زیر بحث حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنی تلاوت کے مطابق جنت کے درجات کو پائے گا' جتنا وہاں قرآن پڑھے گا اتنا بلندی پر فائز ہوگا۔ دوسری توجیہ اس حدیث کی یہ ہے کہ اس میں دائمی ترقی مراد ہے۔ یعنی جب آدمی وہاں ایک مرتبہ قرآن کریم کا ختم کرے گا تو دوبارہ پڑھنے کی خواہش ہوگی' اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا' جس کے نتیجہ میں وہ بہت زیادہ بلندی پائے گا۔

۱۹ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ اس شخص کا مقام بیان فرما رہے ہیں جو قرآن حکیم کو پڑھتا ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے کہ قیامت کے دن اس کے والدین کو اتنا چمکدار تاج پہنایا جائے گا کہ اس کی روشنی سورج کی روشنی سے زیادہ ہوئی جبکہ سورج ہمارے گھر میں موجود ہو۔ یعنی بالفرض سورج اگر کسی کے گھر میں موجود ہو تو وہ گھر جس قدر روشن ہوگا اس سے کہیں زیادہ روشن تاج اس شخص کے والدین کو پہنایا جائے گا جو قرآن حکیم کو پڑھ کر اس پر عمل کرنے والا ہو۔

میں داخل فرمائے گا[20] اور اس کو اس کے گھر کے دس افراد کی شفاعت کرنے والا بنائے گا جن میں سے ہر ایک کے لیے جہنم کی آگ واجب ہو چکی ہوگی[21]۔ (سنن الترمذی: ۲۹۰۵' سنن ابن ماجہ: ۲۱۶' المعجم الاوسط: ۵۱۲۶' کامل ابن عدی ج ۲ ص ۷۸۸)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو "غریب" قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی سند صحت سے خالی ہے۔

(۱۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی کام پر اس قدر اجر عطا نہیں فرماتا جتنا نبی کی خوش الحانی اور بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے پر اجر عطا فرماتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۵۰۲۴' صحیح مسلم: ۷۹۲' سنن ابوداؤد: ۱۴۷۳' سنن نسائی: ۱۰۱۹' مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۰' صحیح ابن حبان: ۷۵۱' سنن دارمی: ۳۴۹۰۔ ج ۲ ص ۵۶۳)

حدیث مذکور: (۱۶) کی مختصر لغوی تشریح

حدیث مذکور میں "اذن" کا لفظ آیا ہے' اس کا لغوی معنیٰ ہے: "استمع" (غور سے سُننا) ' اور ایک معنیٰ ہے: "اصغاء" (کان دھرنا' کان لگانا' سننے کے لیے مائل ہونا)۔ یہ معانی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہ ہونے کے سبب اُس کے لیے محال ہیں' اس لیے ہم "اذن" کے لفظ کو ان معانی پر محمول نہیں کریں گے' بلکہ یہی کہیں گے کہ اس لفظ کو کنایۃً استعمال کیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم پڑھنے والے کو اپنا قرب عطا فرماتا ہے اور اس پر اسے بہت عظیم اجر عطا فرماتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کا سننا ہمیشہ سے یکساں ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اس لیے حدیث مذکور میں تاویل کرنا ضروری ہے[22]۔

ایک لفظ حدیث مذکور میں آیا ہے: "یتغنی بالقرآن" اس کا معنیٰ ہے: خوش الحانی اور خوب صورت آواز کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کرنا۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب پڑھتے ہوئے آواز پرسوز اور باریک ہو۔ ایک دوسرے قول کے مطابق "یتغنی بالقرآن" کا معنیٰ ہے: قرآن کے ذریعہ لوگوں سے بے نیاز ہو جانا۔ اس کی بہ نسبت پہلا معنیٰ مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ سیاق حدیث (حدیث کا اگلا لفظ) "یجھر بہ" سے پہلے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔

(۱۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآن مجید کو

---

[20] اس حدیث شریف میں ایک جملہ ہے: "من قرء القرآن فاستظھرہ". (جس نے قرآن کریم کو پڑھا اور اس کو حفظ کیا۔) استظہار کے مختلف معانی ہیں۔ مثلاً: کسی چیز کو حفظ کرنا' خوب اچھی طرح یاد کرنا اور احتیاط کرنا۔ حدیث کے اس جملہ میں تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں' لہٰذا اس میں بیان کردہ فضیلت ہر اس شخص کے لیے ہے جو قرآن کریم کو حفظ کرے' اس کو خوب اچھی طرح یاد کرے اور اس کے آداب کا مکمل لحاظ کرے۔ اس آخری معنی کی وضاحت حدیث شریف کے اگلے جملہ سے ہو رہی ہے جس میں فرمایا کہ قرآن کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانے۔

[21] حدیث شریف کے اس جملہ سے معلوم ہوا کہ شفاعت جس طرح بلندیٔ درجات کے لیے ہوتی ہے' اسی طرح عذاب سے نکلوانے کے لیے بھی ہوتی ہے۔ علامہ طیبی نے لکھا ہے کہ یہاں سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو یہ سمجھتے ہیں کہ شفاعت صرف بلندیٔ درجات کے لیے ہوتی ہے۔ (شرح الطیبی ج ۴ ص ۲۵۱)

[22] یعنی حدیث میں "اذن" کا لفظ آیا ہے اور اذن کا معنیٰ ہے: غور سے سننا۔ اور یہ معنی اللہ عزوجل کی شان کے لائق نہیں ہے' کیونکہ غور سے سننے کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کی قرأت کے علاوہ دیگر چیزوں کو اللہ تعالیٰ غور سے نہیں سنتا' اور اس مفہوم کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے سننے میں تغیر اور تبدیلی آتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اذن سے مراد یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام پر اتنا اجر عطا نہیں فرماتا جتنا نبی کی خوش الحانی اور بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے پر عطا فرماتا ہے۔ اذن کا یہ معنیٰ یا تو کنایۃً ہے (جیسا کہ علامہ خازن نے فرمایا ہے) یا پھر توسعاً ہے جیسا کہ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے۔

اچھی آواز کے ساتھ نہیں پڑھا وہ ہماری سنت[۲۳] پر نہیں ہے۔

(صحیح بخاری: ۷۵۲۷ سنن ابوداؤد: ۱۴۶۹ سنن ابن ماجہ: ۱۳۳۷ صحیح ابن حبان: ۱۲۰ المستدرک ج ۱ص ۵۶۹)

دوسری فصل: دو شخصوں کے متعلق وعید کا بیان

(۱) جو شخص قرآنی آیات میں علم کے بغیر اپنی رائے سے گفتگو کرے۔

(۲) جس شخص کو قرآن کی نعمت عطا کی گئی اُس نے اسے بھلا دیا اور اس کی حفاظت نہ کی۔

احادیثِ مبارکہ میں مذکورہ دونوں عنوانات کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے وعیدیں بیان فرمائی ہیں ذیل میں ہم بالترتیب پہلے عنوان پر پھر دوسرے عنوان پر چند احادیث تشریح کے ساتھ پیش کر رہے ہیں:

قرآنی آیات میں بغیر علم کے اپنی رائے سے گفتگو کرنے پر وعید

(۱۸) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔

(سنن الترمذی: ۲۹۵۰ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ص ۶۲۳ مسند احمد ج ۱ص ۲۳۳ مسند ابویعلیٰ ۲۳۳۸)

(۱۹) ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔

(سنن الترمذی: ۲۹۵۱ سنن کبریٰ نسائی ج ۵ص ۳۱)

☆ امام ترمذی نے مذکورہ دونوں روایات کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ''فلیتبوأ'' فرمایا گیا اس کا معنیٰ ہے:

فلیتخذ له مباءة ای منزلا من النار. اُسے اپنے ٹھکانا اور منزل دوزخ میں بنا لینی چاہیے۔

(جو قرآن میں اپنی رائے سے کلام کرے۔)

(۲۰) حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ عزوجل کی کتاب میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اور وہ درست ہو تب بھی اس نے غلطی کی۔

(سنن الترمذی: ۲۹۵۲ سنن ابوداؤد: ۳۶۵۲ السنن الکبریٰ للنسائی ج ۵ص ۳۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

☆ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم کی درج ذیل آیت کا معنیٰ پوچھا گیا:

وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ (العبس: ۳۱) (ہم نے زمین کو چیر کر اُس میں تمہارے لیے) میوے اور گھاس (کو اُگایا)O

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (انتہائی معذرت کرتے ہوئے) فرمایا: اگر میں بغیر علم کے اللہ کے کلام میں کوئی کلام

۲۳ اس حدیث شریف میں فرمایا کہ لیس منا من لم یتغن بالقرآن. شارحین نے اس پر بحث کی ہے ''لیس منا'' سے کیا مراد ہے؟ علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ ہماری ہدایت اور رہنمائی کو قبول کرنے والا نہیں ہے اور ہمارے اخلاق کو اپنانے والا نہیں ہے۔ (مزید فرماتے ہیں کہ) جن علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ ''وہ ہمارے دین اسلام پر نہیں ہے'' وہ درست نہیں ہے۔

(شرح سنن ابوداؤد ج ۵ص ۳۸۵ عمدۃ القاری ج ۲۵ص ۲۷۳)

کروں تو پھر کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے اپنے اوپر رکھے گی؟

(جامع البیان للطبری ج۱ص۵۵' شعب الایمان للبیہقی ج۲ص۴۲۴)

اپنی رائے سے تفسیر کرنے کی جائز اور ناجائز صورتیں اور جواز وعدم جواز کا محمل[۲۴]

علماء فرماتے ہیں کہ قرآنی آیات میں اپنی رائے سے گفتگو کرنے کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس اور اپنی خواہشات کے مطابق آیات کا معنیٰ بیان کرتا ہے' ان کی تفسیر کرتا ہے اور اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ اس آیت کا یہ معنیٰ نہیں ہے' پھر بھی (اپنی رائے سے) وہ معنیٰ بیان کرنا۔ جیسے وہ لوگ جو اپنی بدعت (ایجاد کردہ بات) کو درست ثابت کرنے کے لیے قرآن حکیم کی بعض آیات سے استدلال کرتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا یہ معنیٰ نہیں ہے لیکن چونکہ انہیں اپنے مدّ مقابل پر بحث کو اس طرح خلط ملط کرنا ہوتا ہے کہ جس سے ان کی دلیل اپنی بدعت پر مضبوط ہو جائے' اس لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ جیسے باطنیہ (ایک شیعہ فرقہ)' خارجی اور دیگر بدعتی لوگ' عوام کو دھوکا دینے کے لیے یہ طریقہ اپناتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسا کرے' مثلاً کسی آیت کے ممکنہ کئی معانی ہوں' لیکن وہ ایسا معنیٰ بیان کرے جو ممکنہ معانی کے علاوہ ہو' ان کا غیر ہو۔

تفسیر بالرائے کی یہ دونوں صورتیں قابل مذمت ہیں اور اس وعید میں داخل ہیں کہ ''جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے''۔

ہاں اگر تفسیر بالرائے کی بجائے کوئی شخص قرآنی آیات میں تاویل کرتا ہے یعنی اپنے استنباط و اجتہاد سے آیت کا کوئی ایسا معنیٰ مراد لے جو اُس آیت کے مناسب ہو' اپنے اندر آیت کے ماقبل اور مابعد کا احتمال رکھنے والا ہو اور قرآن وسنت کے موافق ہو تو یہ صورت علماء کے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی قرآن حکیم کی تفسیر کیا کرتے تھے اور تفسیر میں

[۲۴] تفسیر بالرائے یعنی اپنی رائے سے تفسیر کرنے کے مسئلہ میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک یہ ممنوع ہے۔ ان کی دلیل وہ احادیث ہیں جو علامہ خازن نے ۱۸' ۱۹ اور ۲۰ نمبر کے تحت ذکر کی ہیں۔ اس کے برعکس اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ جو شخص علوم تفسیر سے واقف ہو وہ اپنے اجتہاد و استنباط سے کسی آیت کا ایسا معنیٰ بیان کرے جو قرآن وسنت اور اجماع مسلمین سے متصادم نہ ہو تو وہ جائز ہے اور جن احادیث میں تفسیر بالرائے سے ممانعت آئی ہے وہ اس صورت میں ہے جب کوئی شخص اپنی خواہش نفس کے مطابق آیت کا معنیٰ اور تفسیر بیان کرے۔ علامہ قرطبی مالکی نے ممانعت والی احادیث کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ پہلا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ممانعت اس صورت میں ہے کہ جب آدمی قرآن کریم کی ایسی تفسیر کرے جس میں اس کی طبعی اور نفسانی خواہش کا دخل ہو یا آیت کا معنیٰ نہ جاننے کے سبب تفسیر بالرائے کرے یا یہ معلوم تو ہو کہ آیت کی جو تفسیر میں بیان کر رہا ہوں وہ اس کی تفسیر نہیں ہے لیکن اپنے حریف پر بات کو خلط ملط کرنے اور اپنے غلط نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے رائے سے کام لے یا کوئی مقرر اور خطیب قسم کا آدمی اپنے نکتہ کو ثابت کرنے کے لیے اور سامعین کو خوش کرنے کے لیے کسی آیت کی اپنی رائے سے تفسیر کرے۔ یہ تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ دوسرا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اپنی رائے سے تفسیر کرنا اس وقت منع ہے جب کوئی شخص قرآن حکیم کی باریکیوں میں غور کیے بغیر محض ظاہر الفاظ کو دیکھ کر اور اپنی تھوڑی بہت عربی دانی کا سہارا لے کر آیات کی تفسیر شروع کر دے۔ ان صورتوں کے علاوہ دیگر صورتوں میں تفسیر بالرائے جائز ہے۔ (تفسیر القرطبی ج۱ مقدمۃ المفسّر)

مختلف معانی کی بنیاد پر آپس میں اختلاف کیا کرتے تھے۔ کیونکہ (ظاہر ہے کہ) جو کچھ وہ تفسیر کیا کرتے تھے وہ سب انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے نہیں سنی ہوتی تھی' لیکن پھر بھی وہ اپنی فہم اور سمجھ کے مطابق قرآن کریم کے معانی بیان کیا کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا فرمائی:

اللھم فقھه فی الدین وعلمه التاویل. اے اللہ! تو ان کو دین کا فقیہ بنا اور ان کو قرآن کے معانی ومطالب بیان کرنے کی بھرپور صلاحیت عطا فرمادے۔ (مسند احمد ج ۱ص ۲۶۶' صحیح ابن حبان: ۷۰۵۵)

یہی وجہ ہے کہ اُن سے جو کچھ منقول اور مروی ہے وہ زیادہ تر قرآن کی تفسیر سے متعلق ہے۔

قرآن کریم کو بھلا دینے اور اس کی حفاظت نہ کرنے پر وعید

(۲۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کریم کو یاد رکھو۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے قرآن مجید رسیاں توڑنے والے اونٹ سے زیادہ جلدی سینے سے نکل جاتا ہے[۲۵]۔ (صحیح بخاری: ۵۰۳۲' صحیح مسلم: ۷۹۱)

(۲۲) حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حافظ قرآن کی مثال اس اونٹ کے مالک کی طرح ہے جس کا ایک پیر بندھا ہوا ہو' اگر اس کے مالک نے اس کا خیال رکھا تو وہ رکا رہے گا اور اگر اسے کھلا چھوڑ دیا تو وہ چلا جائے گا۔ (صحیح بخاری: ۵۰۳۱' صحیح مسلم: ۷۸۹)

اس حدیث شریف میں فرمایا: ''الابل المعقلة'' اس کا معنیٰ ہے: رسّی سے بندھا ہوا اونٹ۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو حافظ قرآن کے لیے بہ طور مثال بیان فرمایا ہے اور اس بات کی ترغیب فرمائی ہے کہ بار بار اس کی تلاوت اور دور کر کے اس کی حفاظت کی جائے تاکہ یہ حافظہ سے نہ نکلے۔

(۲۳) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہت[۲۶]

---

۲۵ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں علامہ ابن بطال کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حدیث قرآن مجید کی دو آیات کے موافق ہے۔ ایک آیت سورۃ المزمل کی ہے جس میں قرآن مجید کو ''ثقیل'' (یعنی بھاری) قرار دیا گیا اور ایک آیت سورۃ القمر کی ہے جس میں قرآن مجید کو آسان قرار دیا گیا۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم ایک مشکل اور بھاری کتاب ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید آسان ہے۔ ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس نے قرآن حکیم کو خوب یاد کیا اور اس کی بھرپور حفاظت کی اس کے لیے آسان ہے اور جس نے اس کو یاد نہ کیا اور اس کی دیکھ بھال نہیں کی اس کے لیے مشکل ہے۔ (فتح الباری ج ۱۰ص ۱۰۰' شرح البخاری لابن بطال ج ۱۰ص ۲۶۸)

۲۶ اس حدیث میں اس بات سے منع کیا جارہا ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس طرح کہنا مکروہ تنزیہی ہے' البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مجھے فلاں آیت بھلادی گئی۔ پہلے جملہ میں چونکہ آدمی کی اپنی سستی اور غفلت کا اظہار ہے اس لیے وہ مکروہ ہے اور دوسرے میں فعل کی نسبت فاعل حقیقی (اللہ عزوجل) کی طرف ہے اس لیے وہ جائز ہے' کیونکہ حقیقۃً ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور ہر چیز کو موجود کرنے والا اللہ رب العالمین ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ آدمی کا یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ مجھے فلاں آیت بھلادی گئی۔ کیونکہ اس میں آدمی کا اپنی بندگی اور عاجزی کا اقرار ہے اور اس اعتراف کا اظہار ہے کہ ساری قدرت اور طاقت اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن حدیث شریف میں ''نُسِّیَ'' فرما کر بھولنے کی نسبت اپنی طرف کرنے کی مذمت نہیں فرمائی جارہی بلکہ درحقیقت آدمی کی غفلت اور لاپرواہی کی مذمت فرمائی جارہی ہے کہ اس نے قرآن کریم کو صحیح طور پر یاد کیوں نہیں کیا کہ بھولنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ (فتح الباری ج ۱۰ص ۹۹)

بُری بات ہے کہ کوئی شخص یوں کہے میں فلاں فلاں آیت بھول گیا' بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اُسے بھلا دیا گیا۔ قرآن کو صحیح طرح سے یاد رکھو کیونکہ یہ بندھے ہوئے جانور سے زیادہ جلدی لوگوں کے سینوں سے نکل جاتا ہے۔
(صحیح بخاری: ۵۰۳۲' صحیح مسلم: ۷۹۰)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ:

لا یقل احدکم نسیت آیة کذا و کذا بل هو نسی. (صحیح مسلم بحوالۂ سابق)	تم میں سے کوئی شخص یوں نہ کہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اُسے بھلا دیا گیا۔

حدیث مذکور: (۲۳) کے چند کلمات کی تشریح

''بئسما لاحدهم'': یعنی جو شخص قرآن کریم کو حفظ کرے اور پھر اپنی حد درجہ غفلت سے اس کو بھلا بیٹھے اس کی حالت بہت ہی بُری ہے۔

''لا یقل احدکم نسیت اية کذا و کذا'': یعنی کسی آیت کے بھول جانے پر بھولنے کی نسبت اپنی طرف کرنا مکروہ ہے' کیونکہ تمام اشیاء کو مقدر فرمانے والا اللہ رب العٰلمین ہے' لہٰذا اسی نے نسیان طاری فرمایا۔ ایک قول یہ ہے کہ ''نسیان'' کا معنیٰ ہے: ''الترک'' (چھوڑنا)۔ یعنی کوئی شخص یوں کہے کہ ''میں نے قرآن کو چھوڑ دیا'' یا ''اس کو چھوڑنے کا ارادہ کیا ہے'' یہ مکروہ ہے۔

''بل هو نسی'': اس کا اعراب اس طرح ہے: ''نُسِّيَ''. اور معنیٰ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص یوں نہ کہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اس کے کسی گناہ اور کوتاہی کے سبب یا قرآن کی صحیح حفاظت نہ کرنے کے سبب' سزا کے طور پر اُسے آیت بھلا دی گئی۔

''اشد تفصّیا'': یعنی (صحیح حفاظت نہ کرنے کے سبب) قرآن کریم بہت جلد لوگوں کے سینوں سے نکل جاتا ہے۔ یہی معنیٰ حدیث نمبر ۲۱ میں آنے والے اس جملہ کا ہے: ''لهو اشد تفلتا من الابل فی عقلها'' یعنی قرآن مجید رسیاں توڑنے والے اونٹ سے زیادہ جلدی سینے سے نکل جاتا ہے۔

''عقال'' اس رسّی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کو باندھا جاتا ہے۔

(۲۴) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر وہ شخص جو قرآن پڑھ کر اُسے بھلا دے وہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم پر کوڑھ کی بیماری ہوگی[۲۷]۔
(سنن ابوداؤد: ۱۴۷۴)

اس حدیث میں اجذم کا لفظ آیا ہے اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد ''مقطوع الید'' ہے یعنی قرآن کو بھلا دینے والا قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہاتھ کٹے ہوئے ہوں گے۔

---

[۲۷] اس حدیث میں جس شخص کے متعلق وعید بیان فرمائی جارہی ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن حکیم کو حفظ کر کے بھلا دے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن کریم کو پڑھے اور پڑھ کر اس کے حلال وحرام سے واقف ہو اور پھر اس پر عمل نہ کرے تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم پر کوڑھ ہوگا۔

(۲) اس سے مراد "مقطوع الحجة" ہے یعنی وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔
(۳) اس سے مراد جذامی ہے یعنی وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم پر کوڑھ ہوگا۔
(۲۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ پر[۲۸] میری امت کے اجر پیش کیے گئے یہاں تک کہ اس تنکے کا اجر بھی جس کو آدمی مسجد سے صاف کرتا ہے اور مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کیے گئے تو میں نے ان میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کوئی آدمی قرآن کی کسی سورت یا آیت کو حفظ کرے اور پھر اسے بھلا دے[۲۹]۔ (جامع الترمذی: ۲۹۱۶' سنن ابوداؤد: ۴۶۱' مسند ابو یعلی: ۴۲۶۵)
☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔
(۲۶) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے اس خوف سے کہ کہیں وہ دشمن کے ہاتھ لگ جائے (اور وہ اس کی بے حرمتی کریں)۔
(صحیح بخاری: ۲۹۹۰' صحیح مسلم: ۱۸۶۹' سنن ابوداؤد: ۲۶۱۰' سنن ابن ماجہ: ۲۸۷۹)
اس حدیث میں قرآن سے پورا مجموعہ مراد ہے۔ یعنی اُس کو کافروں کے علاقوں میں لے جانا جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث مذکور میں[۳۰] ممانعت آ گئی۔ ہاں اگر کافروں کو کوئی خط لکھا جائے اور اس میں قرآن کی آیت آ جائے تو اس میں حرج نہیں ہے۔

[۲۸] امت کے اعمال نبی اکرم ﷺ پر کب پیش کیے گئے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ شب معراج میں پیش کیے گئے اور دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی حیات پاک کے آخری ایام میں پیش کیے گئے۔ رہا یہ کہ اعمال پیش کیے جانے سے کیا مراد ہے؟ سو اس کے متعلق علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو امت کے تمام اجر و ثواب کا علم حاصل ہے۔ (پھر فرماتے ہیں کہ) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اجر کا پیش کیا جانا حقیقۃً ہو۔ یعنی خوب صورت شکل میں اجر و ثواب اور بدصورت شکل میں امت کے گناہ پیش کیے گئے ہوں۔ جیسے قیامت کے دن خوب صورت اور بدصورت شکل میں لوگوں کے (اچھے اور بُرے) اعمال تولے جائیں گے۔
(شرح سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۶۹)
علامہ عینی کی اس عبارت میں اہل سنت کے اس عقیدہ پر دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے امت کے تمام اجر و ثواب اور گناہوں کے متعلق علم عطا فرما دیا ہے۔

[۲۹] واضح رہے کہ بھولنے پر اگرچہ شرعاً گرفت نہیں ہے لیکن اس حدیث میں بھولنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر قرآن کریم کو چھوڑے رکھے حتیٰ کہ اس کو بھلا بیٹھے تو یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ (مرقات ج ۲ ص ۴۲۳)

[۳۰] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اب بھی یہ ممانعت برقرار ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ممانعت کا حکم ایک خاص علّت اور سبب کی وجہ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ دشمنوں کی زمین میں قرآن مجید کو لے جانے سے خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی بے حرمتی اور توہین کریں گے۔ لیکن اب معاملہ یہ ہے کہ دنیا کے کونے کونے میں قرآن مجید کے نسخے پہنچ چکے ہیں اور کفار و مشرکین علی العموم قرآن مجید کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ اِلّا یہ کہ کبھی کسی جگہ سے خبر آتی ہے کہ وہاں پر دشمنوں نے یا کسی انتہاء پسند تنظیم نے قرآن مجید جلا دیئے اور ان کی بے حرمتی کی۔ سو جہاں اس طرح کی صورت ہو یعنی وہاں قرآن مجید ساتھ لے جانے کی صورت میں بے حرمتی کا بہت زیادہ خطرہ ہو اور بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث شریف کے مطابق ایسی جگہ قرآن مجید لے جانا ممنوع ہوگا' ورنہ نہیں۔ شارحین نے اس حدیث کی شرح میں یہی تصریح فرمائی ہے کہ ممانعت کا حکم ایک خاص علّت کے ساتھ مقید ہے' جہاں وہ علّت اور وجہ پائی جائے گی وہاں ممانعت ہوگی اور جہاں نہیں پائی جائے گی وہاں ممانعت بھی نہیں ہوگی۔ (دیکھئے: شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۱۳۲' عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۱۶۹)

کیونکہ خود نبی اکرم ﷺ نے ہرقل (شاہِ روم) کو جو مکتوب تحریر فرمایا اُس میں یہ آیت لکھی:

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ. (اے محبوب) آپ کہیے! اے اہل کتاب! تم اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان (مشترک) ہے۔ (آل عمران:۶۴)

(۲۷) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (کسی دن) وہ ایک قاری کے پاس سے گزرے جو قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا' تلاوت کے بعد اس نے لوگوں سے (نذرانہ) مانگا تو حضرت عمران بن حصین نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے تو اسے چاہیے کہ وہ اس تلاوت کا بدلہ اللہ[۳۱] سے مانگے کیونکہ عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جو قرآن کریم پڑھیں گے اور لوگوں سے اس کا معاوضہ طلب کیا کریں گے۔ (سنن الترمذی: ۲۹۱۷' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۸۰' معجم کبیر ج ۱۸' رقم الحدیث: ۳۷۰' مسند احمد ج ۴ ص ۴۳۶)

(۲۸) حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جس نے اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال جانا[۳۲]۔ (سنن الترمذی: ۲۹۱۸' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۵۳۷)

☆ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

(۲۹) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بلند آواز سے قرآن پڑھنے والا اس شخص کی طرح ہے جو کھلم کھلا صدقہ دے اور آہستہ آواز سے قرآن پڑھنے والا اس شخص کی طرح ہے جو چھپا کر صدقہ دے[۳۳]۔ (سنن الترمذی: ۲۹۱۹' سنن ابوداؤد: ۱۳۳۳' سنن نسائی: ۱۶۶۲)

---

[۳۱] اس حدیث کے شارحین نے مختلف معانی بیان فرمائے ہیں۔ ایک معنیٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کر کے آدمی لوگوں سے سوال کرنے کی بجائے اللہ عزوجل سے سوال کرے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ تلاوت کے دوران رحمت کی آیت پر اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرے اور عذاب کی آیت پر اس سے پناہ طلب کرے۔

اس حدیث کا جو آخری جملہ ہے کہ "عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جو قرآن کریم پڑھیں گے اور لوگوں سے اس کے ذریعہ سوال کیا کریں گے" اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھ کر لوگوں سے بھیک مانگا کریں گے اور قرآن کو مانگنے کا ذریعہ بنائیں گے۔ یہاں واضح رہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ بھیک مانگنا اور قرآن کریم پر اجرت لینا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اجرت لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے زیادہ حق دار اللہ کی کتاب ہے"۔ (صحیح بخاری: ۵۷۳۷) قرآن کریم پر اجرت کے جواز کی تحقیق اور تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۱۰۳۵ تا ۱۰۶۹۔

[۳۲] یوں تو شرعاً جو جو چیزیں حرام ہیں ان سب کو حرام جاننا ضروری ہے' لیکن یہاں قرآن کریم کا مقام و مرتبہ ظاہر کرنے کے لیے خاص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کا ذکر فرمایا کہ جس نے ان کو حلال جانا یا حلال سمجھ کر انہیں انجام دیا وہ قرآن پر ایمان لانے والا نہیں ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں علماء نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے کسی حرام کام کو حلال قرار دیا یا جان بوجھ کر اسے حلال سمجھا وہ کافر ہے۔ (دیکھئے مرقات ج ۴ ص ۷۰۳)

[۳۳] یعنی دونوں طرح قرآن کریم کی تلاوت جائز ہے' خواہ بلند آواز سے کی جائے یا آہستہ آواز سے۔ جیسے صدقہ چھپا کر دینا بھی جائز ہے اور کھلم کھلا دینا بھی جائز ہے۔ لیکن جس طرح بعض صدقات کو چھپا کر دینا افضل اور زیادہ بہتر ہے اس طرح آہستہ آہستہ سے تلاوت کرنا زیادہ بہتر ہے۔ علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ جس طرح ظاہر کر کے صدقہ دینے والا بعض اوقات ریاکاری اور دکھلاوے کا شکار ہو جاتا ہے' اسی طرح بلند آواز سے تلاوت کرنے والا بھی ریاکاری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدقہ میں بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

☆ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تیسری فصل: جمع قرآن، ترتیب نزول اور قرآن مجید کے سات حروف پر نازل ہونے کا بیان

ذیل میں بالترتیب مذکورہ تینوں عنوانات کی تفصیل، صحیح احادیث کی روشنی میں پیش کی جاتی ہے:

قرآن حکیم کس طرح جمع کیا گیا؟

(۳۰) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ یمامہ کے دوران، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلوایا، اس وقت ان کے پاس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ میرے پاس حضرت عمر آئے اور کہا کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ اگر یونہی مختلف جنگوں میں حفاظِ قرآن شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن مجید چلا جائے گا اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم دیں، میں نے حضرت عمر سے کہا کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں، جس کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟ تو حضرت عمر نے کہا کہ خدا کی قسم! اس میں خیر ہے، پھر حضرت عمر مسلسل مجھ سے یہ کہتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے عمر فاروق کا شرح صدر فرمایا ہے اس کے لیے میرا دل بھی مطمئن فرما دیا ہے اور میری رائے حضرت عمر کی رائے کے موافق ہو گئی ہے۔ حضرت زید کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے (مجھ سے) کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک عقل مند اور نوجوان شخص ہو اور ہم کو تمہارے متعلق کسی قسم کی کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ ﷺ کے لیے وحی لکھتے تھے، لہٰذا تم قرآن مجید کو تلاش کر کے جمع کرو۔ حضرت زید کہتے ہیں: خدا کی قسم! اگر یہ لوگ مجھ سے یہ کہتے کہ پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دو تو یہ میرے لیے اتنا دشوار نہ ہوتا جتنا قرآن مجید کو جمع کرنے کے حکم پر عمل کرنا میرے لیے دشوار تھا، میں نے کہا: آپ لوگ وہ کام کیوں کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟ تو حضرت ابوبکر نے کہا: خدا کی قسم! اس میں خیر ہے۔ پھر حضرت ابوبکر مجھ سے مسلسل اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے حضرت ابوبکر و عمر کا شرح صدر فرمایا تھا اس کے لیے میرا سینہ بھی کھول دیا اور اس معاملہ میں میری رائے بھی ان کی رائے کے موافق ہو گئی[۳۴] پس میں نے قرآن کریم کو تلاش کرنا شروع کیا، میں نے پتوں سے صاف کی ہوئی کھجور کی شاخوں، پتھروں اور مسلمانوں کے سینوں سے قرآن مجید کو جمع کیا حتیٰ کہ سورۂ توبہ کی آخری آیت: "**لقد جاء کم رسول من انفسکم**" الخ مجھے حضرت خزیمہ[۳۵] یا ابوخزیمہ کے پاس ملی، تو میں نے اسے اس کی سورت میں ملا دیا۔ پھر صحیفوں میں جمع شدہ یہ قرآن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، حتیٰ کہ وہ اس دنیا سے پردہ فرما گئے، پھر وہ حضرت عمر کے پاس رہا، حتیٰ کہ آپ بھی وصال فرما گئے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) پوشیدگی افضل ہے اور تلاوت میں بھی پوشیدگی (یعنی آہستہ آواز سے پڑھنا) افضل ہے۔ پھر جس طرح چھپا کر صدقہ دینے والا ریاکاری سے بہت دور اور خلوص سے بہت قریب ہوتا ہے اسی طرح آہستہ آواز سے تلاوت کرنے والا بھی دکھلاوے سے بچا رہتا ہے اور اس کے دل میں خلوص پیدا ہوتا ہے۔ (شرح سنن ابوداؤد ج ۵ ص ۲۴۸)

۳۴ حضرات شیخین (ابوبکر و عمر) اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اس گفتگو سے بنیادی طور پر دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اتباع نبی میں بہت ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ انہوں نے ایک کام کے اچھا ہونے کے باوجود اس کو کرنے میں صرف اس وجہ سے تامل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے انجام نہیں دیا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو اچھا کام رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ اقدس میں نہ ہوا ہو، اس کو اگر بعد میں کسی ضرورت اور فائدہ کے پیش نظر ایجاد کیا جائے تو یہ شرعاً جائز اور قابلِ تحسین ہے اور اسی کو بدعتِ حسنہ کہا جاتا ہے۔

۳۵ اس کی تشریح آگے آ رہی ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ آیت حضرت خزیمہ کے پاس سے ملی یا حضرت ابوخزیمہ کے پاس سے ملی؟

آپ کے بعد وہ قرآن آپ کی صاحبزادی حضرت ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔

(صحیح بخاری: ۴۹۸۷، سنن الترمذی: ۳۱۰۳، مسند احمد ج ۱ ص ۱۰، صحیح ابن حبان: ۴۵۰۶، سنن کبریٰ للنسائی ج ۵ ص ۷)

بعض راویوں نے کہا ہے کہ حدیث مذکور میں "اللخاف" کا معنیٰ ہے: "الخزف" یعنی ٹھیکری، پتھر۔

(۳۱) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن الیمان جب اہل شام اور اہل عراق کی معیت میں آرمینیا اور آذربائجان کی فتوحات حاصل کر رہے تھے تو امیر المؤمنین حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ انہیں شامیوں[۳۶] اور عراقیوں کے قرأت میں اختلاف نے تڑپا دیا تھا' چنانچہ حضرت حذیفہ نے حضرت عثمان کی خدمت میں عرض کیا: اے امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف کی شکار ہو آپ اس امت کی چارہ سازی فرمائیے۔ پس حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے پاس پیغام بھیجا کہ قرآن کریم کا جو اصل نسخہ آپ کے پاس محفوظ ہے وہ ہمیں عنایت فرمائیے' ہم اسے نقل کر کے واپس بھجوا دیں گے' حضرت حفصہ نے وہ نسخہ حضرت عثمان کے پاس بھیج دیا' انہوں نے حضرت زید بن ثابت' حضرت عبد اللہ بن زبیر' حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا تو ان حضرات نے اس کو مختلف مصاحف میں منتقل کیا۔ حضرت عثمان نے آخر الذکر تینوں قریشی حضرات سے فرمایا کہ جب تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان کسی لفظ میں اختلاف واقع ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھنا' کیونکہ قرآن مجید کا نزول ان کی زبان میں ہوا ہے' چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ اس کو مختلف مصاحف میں منتقل کر چکے تو حضرت عثمان نے اصلی نسخہ حضرت حفصہ کو واپس کر دیا' پھر نقل شدہ نسخوں سے ایک ایک نسخہ ہر علاقے میں بھیج دیا گیا اور امیر المؤمنین نے حکم فرمایا کہ ہمارے بھیجے ہوئے مصحف کے خلاف جس کے پاس بھی کوئی قرآن حکیم ہو وہ اسے جلا دے۔[۳۷]

(صحیح بخاری: ۴۹۸۷، سنن الترمذی: ۳۱۰۴)

(۳۲) ابن شہاب نے فرمایا کہ مجھے خارجہ بن زید نے بتایا کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے (مجھ سے یہ واقعہ) بیان کیا کہ قرآن کریم جمع کرتے وقت مجھے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی' حالانکہ وہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان

---

۳۶ اہل شام اور اہل عراق کے درمیان اختلافات ہونے لگے کہ آیا یہ لفظ قرآن کریم کا ہے یا نہیں؟ اہل شام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت سے قرآن پڑھتے تھے اور اہل عراق حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت سے قرآن پڑھتے تھے اور اس بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر بھی کرنے لگے تھے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہو کر امت کی چارہ سازی کی درخواست کی۔

۳۷ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے جمع کردہ نسخوں کے علاوہ دیگر نسخوں کو جلانے کا حکم کیوں دیا؟ اس بارے میں بعض علماء کا قول یہ ہے کہ حضرت عثمان نے صرف ان آیات کو جلانے کا حکم فرمایا تھا جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی یا آیات کے ساتھ جو تفسیر کی باتیں لکھی ہوئی تھیں انہیں جلانے کا حکم فرمایا تھا۔ ایک احتمال یہ ہے کہ جو قرأتیں شاذ تھیں انہیں جلانے کا حکم فرمایا تھا۔ قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمہ کی تحقیق یہ ہے کہ جن آیات کو جلایا گیا تھا انہیں حضرت عثمان غنی نے پہلے پانی سے دھلوا دیا تھا۔

تنبیہ: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فعل سے کوئی شخص یہ استدلال نہ کرے کہ قرآن کے مجید کے اوراق کو (بوسیدہ ہونے کی صورت میں) معاذ اللہ جلانا جائز ہے فقہاء کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ قرآن مجید کے اوراق اگر بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں جلانے کی بجائے یا تو کسی پاک صاف کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے' یا پانی کے ذریعہ ان کی سیاہی کو صاف کر دیا جائے یا کسی محفوظ اور پاکیزہ جگہ پر رکھ دیا جائے۔ (فتاویٰ عالم گیری ج ۵ ص ۳۲۳' ردالمحتار ج ۹ ص ۵۱۸' طبع جدید)

مبارک سے سنی تھی۔ جب ہم نے اسے تلاش کیا تو حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی' وہ آیت یہ تھی: ''مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ''۔ (الاحزاب: ۲۳) پس ہم نے جمع کردہ نسخہ کے اندر اس کی سورت میں اسے لکھ دیا۔

(صحیح بخاری: ۴۹۸۸' سنن الترمذی: ۳۱۰۴' مصنف عبد الرزاق: ۱۵۵۶۸' مسند احمد ج ۵ ص ۱۸۸' معجم کبیر: ۳۷۱۲)

نوٹ: ابوالیمان کی روایت میں خزیمہ بن ثابت کے نام کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے:

الذی جعل رسول الله ﷺ شهادته شهادة رجلين. (صحیح بخاری: ۲۸۰۷) وہ صحابی جن کی گواہی کو اللہ کے رسول ﷺ نے دو آدمیوں کے برابر قرار دیا۔

(۳۳) ابن شہاب زہری نے فرمایا کہ اس دن کاتبین کے درمیان لفظ تابوت اور تابوہ میں اختلاف ہو گیا۔ قریشی کاتبین نے کہا کہ یہ لفظ تابوت ہے اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ یہ لفظ ''تابوہ'' ہے۔ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں لے جایا گیا تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ اس کو تابوت لکھو' کیونکہ قرآن لغت قریش کے مطابق نازل ہوا ہے۔ (سنن الترمذی: ۳۱۰۴)

مذکورہ احادیث میں آنے والے مشکل الفاظ اور دیگر متعلقہ امور کی تشریح

(ا) حدیث: ۳۰ میں فرمایا گیا:

قال بعث الى ابوبكر لمقتل اهل اليمامة. حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جنگ یمامہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلوایا۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اہل یمامہ کے قتل کے وقت مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلوایا' یعنی وہ جنگ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یمامہ کے مقام پر لڑی گئی اور یہ معرکہ مرتدین کے خلاف پیش آیا' اس میں بہت سے حفاظ اور قراء شہید ہو گئے۔

یمامہ' ملک یمن کا ایک شہر ہے' جو کہ طائف سے دو دن اور مکہ سے چار دن کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس میں کئی قبیلے آباد تھے اور یہ شہر نجد کے خطہ میں آتا ہے۔

(۲) ''استحر القتل'': اس کا معنیٰ ہے: کثرت سے قتل ہونا۔ عربی میں ناپسندیدہ چیز کو ''حر'' (گرمی) کی طرف اور اچھی چیز کو ''برد'' (ٹھنڈک) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

(۳) ''شرح الصدر'': اس کا معنیٰ ہے: دل کا کشادہ ہونا اور اس کا خیر کو قبول کرنا۔

(۴) ''فتتبعت القرآن اجمعهٗ من العسف والرقاع واللخاف'': (حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:) پس میں نے قرآن مجید کو تلاش کرنا شروع کیا' میں نے اُسے کھجور کی شاخوں' کاغذ کے ٹکڑوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے جمع کیا۔

اس جملہ میں ''رقاع'' ''رقعة'' کی جمع ہے اور اس کا معنیٰ ہے: وہ چیز جس میں کچھ لکھا جائے۔

''عُسُبٌ'' ''عسیب'' کی جمع ہے اور اس کا معنیٰ ہے: کھجور کے درخت کی شاخیں۔

''لِخاف'' ''لَخْفَةٌ'' کی جمع ہے اور اس کا معنیٰ ہے: ''حجارة بيض رقاق'' (سفید باریک پتھر)۔

(۵) ''یغازی اهل الشام'': اس کا معنیٰ ہے: ''یغازی مع اهل الشام'' یعنی حضرت حذیفہ بن الیمان اہل شام کی معیت میں آرمینیا اور آذربائجان کی فتح کے لیے جہاد کر رہے تھے۔

اِرمینیہ کا نام ارمین بن کنطی بن لومن بن یافث بن نوح علیہ السلام کی وجہ سے رکھا گیا ہے' کیونکہ وہی سب سے پہلے اس

شہر میں آئے تھے اس لیے ان کے نام پر اس شہر کا نام ارمینیہ رکھا گیا۔

اَذْربیجان کے مختلف اعراب ہیں اور ابن جنی نے کہا ہے کہ اس لفظ میں غیر منصرف ہونے کے پانچ اسباب موجود ہیں:

(۱) علمیّت (۲) تانیث (۳) عجمہ (۴) ترکیب (۵) الف ونون زائدتان

آذربائیجان ممالک عجم میں ایک جگہ ہے جو کہ کئی شہروں پر مشتمل ہے۔

(۶) ''حتی وجدت اخر سورة التوبة مع خزيمة او مع ابی خزيمة الانصاری '': (حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:) یہاں تک کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت خزیمہ یا ابوخزیمہ انصاری سے پائیں۔ حضرت زید بن ثابت ہی کے حوالہ سے حدیث نمبر ۳۲ میں گزرا کہ قرآن کریم جمع کرتے وقت مجھے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی حالانکہ وہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سنی تھی جب ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے ملی وہ آیت یہ تھی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا۔ (الاحزاب: ۲۳)

یہاں یہ بات جان لیجئے کہ پہلی حدیث میں سورۂ توبہ کی آخری آیات کا تذکرہ ہے اور دوسری حدیث میں سورۃ الاحزاب کی آیت کا تذکرہ ہے۔ (بہ ظاہر یہ تعارض ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے) کیونکہ دو الگ الگ واقعات[۳۸] ہیں۔

---

۳۸ یہاں علامہ خازن علیہ الرحمۃ ایک اعتراض اور اس کے جواب کی وضاحت فرما رہے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ حدیث نمبر ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کے وقت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورۂ توبہ کی آخری دو آیات حضرت خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس سے ملی تھیں جبکہ حدیث نمبر ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورۃ الاحزاب کی آیت: ۲۳ حضرت خزیمہ بن ثابت سے ملی تھی۔ ان دونوں واقعات میں تعارض اور ٹکراؤ ہے پہلے میں سورۂ توبہ کی آخری آیات کے ملنے کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں سورۃ الاحزاب کی آیت: ۲۳ کے ملنے کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح پہلے واقعہ میں روایت مضطرب ہے کہ سورۂ توبہ کی آیات حضرت خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس سے ملیں۔ جبکہ دوسری روایت کے الفاظ واضح ہیں کہ سورۃ الاحزاب کی آیت حضرت خزیمہ بن ثابت کے پاس سے ملی۔

علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ دونوں واقعات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ پہلا واقعہ جس میں سورۂ توبہ کی آخری آیات کا تذکرہ ہے اس کا تعلق حضرت ابوخزیمہ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے جو کہ غزوۂ بدر اور بعد کے دیگر غزوات میں شریک ہوئے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں وصال فرمایا۔ جبکہ دوسرا واقعہ جس میں سورۃ الاحزاب کی آیت ملنے کا تذکرہ ہے اس کا تعلق حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے جن کی گواہی کو نبی اکرم ﷺ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا اور انہوں نے بھی غزوۂ بدر اور بعد کے دیگر غزوات میں شرکت کی لیکن یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی معیت میں جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

جب میں علامہ خازن علیہ الرحمۃ کے اس جواب کی اصل عبارت کا ترجمہ کر رہا تھا تو اس دوران مجھے یہ تردد ہوا کہ مشہور تو یہی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورۂ توبہ کی آخری آیات ''حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' سے ملی تھیں لیکن علامہ خازن کی اس تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت زید کو ابوخزیمہ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملی تھیں۔ میں نے یہ تردد اور اشکال اپنے استاذ اجل مفسر قرآن علامہ غلام رسول صاحب سعیدی مدظلہ کے سامنے پیش کیا تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پہلی حدیث میں جس صحابی کا ذکر آیا ہے وہ ابوخزیمہ بن اوس بن زید بن اصرم بن ثعلبہ بن عمر بن مالک بن نجار انصاری رضی اللہ عنہ ہے' انہوں نے غزوۂ بدر اور بعد کے دیگر غزوات میں شرکت کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کا وصال ہوا۔ انہی کے پاس سے سورۂ توبہ کی آخری آیات ملیں۔ جیسا کہ امام ابن عبدالبر نے ذکر کیا ہے۔

(الاستیعاب ج۴ص۶۰۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) انہوں نے سورۃ الاحزاب کی آیت: ۲۳ کی تفسیر میں اس کا مفصل اور مدلل جواب تحریر فرمایا۔ میں نے اس جواب کو چونکہ بہت شافی و کافی اور وافی پایا اس لیے اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں:
حقیقت امر یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات کے متعلق امام بخاری کی روایات مضطرب ہیں اور جمع قرآن کے اس واقعہ کو انہوں نے متعدد مقامات پر روایت کیا ہے۔ کتاب التفسیر کی روایت میں حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات مجھے خزیمہ انصاری کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ پھر اس روایت کے آخر میں امام بخاری لکھتے ہیں کہ ابوثابت نے ابراہیم سے روایت کیا کہ یہ دو آیتیں خزیمہ کے پاس سے ملیں یا ابوخزیمہ کے پاس سے ملیں۔ (صحیح بخاری: ۴۶۷۹)
پھر یہی واقعہ امام بخاری کتاب الاحکام میں روایت کرتے ہیں' اس میں حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ مجھے سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس سے ملیں۔ (صحیح بخاری: ۷۱۹۱) اس کے بعد امام بخاری یہی واقعہ کتاب التوحید میں روایت کرتے ہیں' اس میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات مجھے حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس سے ملیں۔ (صحیح بخاری: ۷۴۲۵)
ان تمام روایات میں واقعہ ایک ہی ہے' لیکن کسی میں صرف حضرت خزیمہ کا ذکر ہے' کسی میں صرف ابوخزیمہ کا ذکر ہے اور کسی میں حرفِ شک کے ساتھ دونوں کا ذکر ہے۔ اب اس میں ایک فرد کے تعین اور تحقق کے لیے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا ضابطہ کیا تھا؟ سو ضابطہ یہ مقرر کیا گیا تھا کہ جس آیت کے متعلق کم از کم دو صحابی یہ گواہی دیں گے کہ اس آیت کو نبی اکرم ﷺ نے لکھوایا تھا اس کو مصحف میں درج کیا جائے گا۔ سورۃ الاحزاب کی آیت: ۲۳ کے بارے میں صرف حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی تھی۔ اور یہ بات بہ ظاہر مذکورہ ضابطہ کے خلاف تھی' اس کے باوجود اس آیت کو قرآن کریم میں صرف اس لیے درج کیا گیا کہ حضرت خزیمہ کی گواہی کو نبی اکرم ﷺ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا۔ اب اگر سورۂ توبہ کی آیات کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ صرف حضرت ابوخزیمہ کی گواہی سے مصحف میں درج کی گئیں (جیسا کہ علامہ خازن نے علامہ ابن عبد البر کے حوالہ سے لکھا ہے) تو یہ تو خود صحابہ کے اپنے ہی ضابطہ کے خلاف ہے' کیونکہ حضرت ابوخزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار نہیں دیا گیا' لہٰذا صرف ان کی گواہی سے سورۂ توبہ کی آیات مصحف میں کیونکر درج کی جا سکتی ہے؟ اس لیے ہم سورۂ توبہ کی آیات کے متعلق امام بخاری کی ان ہی روایات کو ترجیح دیں گے جن میں حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ہے کیونکہ وہی ایک ایسے صحابی ہیں جو تنہا ہونے کے باوجود صحابہ کرام کے مقررہ ضابطہ پر پورے اترتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ علامہ بدرالدین عینی اور علامہ ابن حجر عسقلانی (علیہما الرحمۃ) نے ابوخزیمہ بن اوس والی روایات کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ ابوخزیمہ والی روایات زیادہ صحیح ہیں اور ماسبق میں جو اعتراض ذکر کیا گیا کہ "ابوخزیمہ والی روایات کو ترجیح دینے کی صورت میں صحابہ کرام کے مقررہ ضابطہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہے" اس کا جواب علامہ ابن حجر عسقلانی نے تخمینہ کے انداز میں یہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے جب حضرت زید بن ثابت نے سورۂ توبہ کی آخری آیات کو حضرت ابوخزیمہ کے پاس (لکھا ہوا) پا لیا ہو تو باقی صحابہ کرام کو بھی یاد آ گیا ہو (کہ یہ آیت لکھوائی گئی تھی) جس طرح حضرت زید کو یاد آ گیا تھا۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۱۸) علامہ ابن حجر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور دوسری حدیث میں جس صحابی کا ذکر آیا ہے' وہ ابوعمارہ خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ بن ثعلبہ بن ساعدہ الخطمی الاوسی الانصاری ہیں'جو''ذو الشھادتین'' سے مشہور تھے'انہوں نے غزوۂ بدر اور بعد کے دیگر غزوات میں شرکت کی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی معیت میں جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

(۷) ''فـفـقـدت اية مـن سـورة الاحـزاب..... الی قوله.....فوجدناها مع خزيمة'':(حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:) قرآن کریم جمع کرتے وقت مجھے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی' حالانکہ وہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سنی تھی' جب ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے ملی۔

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآن حکیم کے مختلف نسخوں کا' اس نسخہ سے موازنہ کررہے تھے جو اصلی تھا اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپ کے سامنے لکھا گیا تھا تو حضرت زید نے سورۃ الاحزاب کی آیت:۲۳ کو صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پایا۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن حکیم ایک آدمی کے قول سے ثابت ہوا ہے' کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سورۃ الاحزاب کی آیت:۲۳ کو خود رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا اور آپ ﷺ ہی کے بتانے اور سکھانے سے حضرت زید نے آیت مذکورہ کا سورۃ الاحزاب میں مقام اور اس کی جگہ معلوم کی تھی۔جیسا کہ حدیث نمبر ۳۲ میں خود حضرت زید نے وضاحت فرمائی کہ:

قد كنت اسمع رسول الله ﷺ يقرء بها. حالانکہ (سورۃ الاحزاب کی) وہ آیت میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو تلاوت فرماتے ہوئے سنی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عسقلانی علیہ الرحمۃ کے اس اندازے اور گمان کے برخلاف صحیح بخاری کی مضطرب روایات میں صرف یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات حضرت ابوخزیمہ کے پاس سے ملیں اور اس پر بھی یہ اشکال قائم رہے گا کہ صرف ایک صحابی کی گواہی سے سورۂ توبہ کی آیات کو مصحف میں کیسے درج کرلیا گیا' جب کہ معیار دو گواہوں کا تھا؟ اور اس معیار سے صرف نظر کرکے دیکھا جائے' پھر بھی جب صحیح بخاری میں سورۂ توبہ کی آیات کے متعلق دو روایتیں ہیں' ایک حضرت ابوخزیمہ بن اوس کے بارے میں جن کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار نہیں دیا گیا اور دوسری حضرت خزیمہ بن ثابت کے بارے میں جن کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا گیا ہے تو ترجیح اسی روایت کو ہونی چاہیے جس میں حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ ہے۔

ایسا اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ سورۂ توبہ کی آیات کے متعلق خزیمہ اور ابوخزیمہ کی ترجیح میں صرف امام بخاری کو تردد اور شک ہے جبکہ دیگر محدثین (رحمہم اللہ) کو اس میں کوئی تردد نہیں ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات کو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی سے مصحف میں درج کی گیا ہے۔حوالہ کے لیے دیکھئے:سنن ترمذی:۳۱۰۳' صحیح ابن حبان:۴۵۰۷-۴۵۰۶' مسند ابویعلیٰ:۶۴-اسی طرح مفسرین میں سے علامہ قرطبی مالکی نے صرف حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا ہے۔دیکھئے:تفسیر قرطبی ج۸ص۲۱۹ اور حافظ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے امام محمد بن سعد' امام احمد' امام بخاری' امام ترمذی' امام نسائی' امام ابن جریر' امام ابن ابی داؤد' امام ابن حبان' امام ابن المنذر' امام طبرانی اور امام بیہقی کے حوالوں سے صرف حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا ہے۔دیکھئے:الدر المنثور ج۴ص۲۹۹

حاصل کلام یہ کہ جمع قرآن کے وقت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ کی آخری دو آیات بھی حضرت خزیمہ بن ثابت سے ملیں' اور سورۃ الاحزاب کی آیت:۲۳ بھی حضرت خزیمہ بن ثابت سے ملی' کیونکہ انہی کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا۔

رہا یہ کہ جب حضرت زید نے نبی اکرم ﷺ سے اُس آیت کو سنا تھا تو پھر اسے کئی صحابہ نے تلاش کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتیاط کی بنیاد پر تھا نہ یہ بات کہ وہ اب اس آیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ قرآن عظیم حضرت زید بن ثابت اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی درج ذیل حدیث سے ثابت ہے:

(۳٤) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانۂ اقدس میں چار آدمیوں نے قرآن کو جمع کیا اور وہ سب کے سب انصاری تھے۔ (۱) حضرت اُبی بن کعب (۲) حضرت معاذ بن جبل (۳) حضرت ابوزید (۴) حضرت زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم)۔ (حضرت قتادہ کہتے ہیں:) میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ابوزید سے کون مراد ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ میرے ایک چچا ہیں۔ (صحیح بخاری: ۳۸۱۰' صحیح مسلم: ۲۴۶۵' سنن الترمذی: ۳۷۹۴)

☆ حضرت ابوزید کا نام سعد بن عبید ہے (رضی اللہ عنہ)۔

اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث ملاحظہ ہو:

(۳۵) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چار بندوں سے قرآن کو حاصل کرو (۱) عبد اللہ بن مسعود (۲) ابی بن کعب (۳) معاذ بن جبل (۴) سالم یعنی ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام۔

(سنن الترمذی: ۳۸۱۰' اس حدیث کو باختلاف الفاظ امام بخاری اور امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ صحیح بخاری: ۳۷۵۸۔ ۳۸۰۸' صحیح مسلم: ۲۴۶۴)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

مذکورہ دو احادیث کے علاوہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث: ۳۰ بھی گزر چکی' جس میں یہ تھا کہ ''یمامہ کی جنگ میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے''۔ ان تمام احادیث سے ثابت ہوا کہ جس ترتیب کے ساتھ آج ہمارے سامنے قرآن موجود ہے' اُسی ترتیب اور تالیف کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے عہد اقدس میں بھی موجود تھا' فرق یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں قرآن کو ایک مصحف میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض آیات منسوخ کر دی جاتی تھیں اور بعض کی تلاوت اٹھائی جاتی تھی' جیسا کہ بعض احکام بھی قرآن حکیم کے منسوخ کر دیئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے زمانۂ نبوی میں قرآن کو ایک مصحف میں جمع نہیں کیا گیا۔ (اگر بالفرض اس وقت جمع کر دیا جاتا) اور پھر کچھ آیات کی تلاوت منسوخ کر دی جاتی تو اس سے آپس میں اختلاف پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ دینی معاملات میں شبہات پیدا ہو جاتے۔ اس لیے جب تک آیات کے منسوخ ہونے کا زمانہ جاری تھا اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے قلوب کے ذریعہ اپنی کتاب کی حفاظت فرمائی اور پھر (جب خلافتِ راشدہ کا دور آیا تو) اللہ تعالیٰ نے حضرات خلفاءِ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک مصحف میں قرآن کریم جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور صحیح دلیل سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے قرآن کریم کو بغیر کسی کمی بیشی کے بالکل ویسا ہی جمع کیا جیسا اللہ عزوجل نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا تھا اور جس چیز نے اُنہیں جمعِ قرآن کا حوصلہ دیا' وہ حدیث: ۳۰ میں بیان ہونے والی وضاحت کے مطابق یہ تھی کہ قرآن حکیم متفرق تھا' کچھ حصہ اس کا کھجور کی شاخوں اور سفید پتھر کے ٹکڑوں پر لکھا ہوا تھا اور کچھ حصہ اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اس وجہ سے صحابہ کرام کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ کھجور کی شاخیں اور پتھر کے ٹکڑے ضائع ہو گئے اور قرآن کریم کو سینوں میں محفوظ کرنے والے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو ہماری یہ کتاب ہم سے ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں فریاد کی کہ اس کتاب کو (ایک مصحف میں) جمع کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی رائے کو ملحوظ رکھتے

ہوئے قرآن حکیم کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم جاری فرمایا اور اس میں سب کے سب متفق تھے۔ حکم ملنے کے بعد صحابہ کرام نے قرآن کریم کو ویسا ہی لکھنا شروع کیا جیسا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا' نہ تو انہوں نے کوئی آیت یا لفظ آگے پیچھے کیا نہ کوئی ایسی ترتیب وضع کی جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہی نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ پر جو کچھ قرآن نازل ہوتا' آپ اپنے اصحاب کو اس کی تلقین اور تعلیم فرما دیتے اور یہ تعلیم اسی ترتیب کے مطابق تھی جس ترتیب پر آج ہمارے سامنے قرآن موجود ہے اور اس ترتیب کے مطابق تعلیم حضرت جبریل علیہ السلام کے بتانے سے ہوتی تھی۔ یعنی وہ جب بھی کوئی آیت لے کر آتے تو ساتھ یہ بتا دیتے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے بعد فلاں سورت میں لکھا جائے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ صحابۂ کرام کی تمام تر کوشش کا محور' قرآن کریم کو یکجا کرنا تھا' نہ یہ کہ اس کی آیات اور سورتوں کو ترتیب دینا۔ کیونکہ قرآن حکیم' جس ترتیب کے ساتھ آج ہمارے سامنے موجود ہے' بعینہٖ اُسی طرح لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر سال رمضان کے مہینہ میں جبریل امین کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے اور جس سال آپ کا وصال اطہر ہوا اس میں آپ نے دو مرتبہ دور فرمایا۔ (یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن حکیم کی ترتیب پہلے ہی ہو چکی تھی) حدیث ملاحظہ ہو:

(۳٦) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل امین' نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے اور جس سال آپ (ﷺ) کا وصال اقدس ہوا' اس سال جبریل نے آپ کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔

(صحیح بخاری: ۴۹۹۸' صحیح مسلم: ۲۴۵۰' سنن ابن ماجہ: ۱٦۲۱)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جبریل امین کے ساتھ قرآن حکیم کا جو آخری دور فرمایا اس میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور اسی آخری دور میں جن آیات کو منسوخ ہونا تھا وہ منسوخ ہو گئیں اور جن آیات کو باقی رہنا تھا وہ باقی رہ گئیں۔ (شرح السنہ ج۴ ص۵۲۵) اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کتابتِ قرآن کا اہم کام حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے انجام دلوایا اور ان پر اس کی ذمہ داری عائد فرمائی۔ کیونکہ جس سال نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال اطہر ہوا' اس سال حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ نبی ﷺ کو قرآن سنایا۔

اس لیے کہنا پڑے گا کہ امت مسلمہ کے پاس قرآن حکیم جو باقی ہے وہ اسی جمع کرنے کا نتیجہ ہے اور یہ جمعِ قرآن' اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت بھی ہے اور اپنے اُس وعدہ کا اثبات ہے جو اس نے اپنی اس کتاب کی حفاظت کے لیے فرمایا تھا کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ بے شک ہم نے ہی (یہ) قرآن نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ○ (الحجر: ۹)

قرآن حکیم کی ترتیب نزول

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورا قرآن کریم رمضان المبارک کی شب قدر میں' لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر ایک ہی مرتبہ میں نازل فرمایا' پھر جبریل امین کے ذریعہ نبی ﷺ پر آپ کی مدتِ رسالت (۲۳ سال) تک حسبِ ضرورت و واقعات اور حسبِ منشاء نازل فرماتا رہا۔ لیکن جس ترتیب سے قرآن کریم نازل کیا گیا تھا (یعنی حسبِ ضرورت اور حسبِ واقعات) وہ ترتیب علیحدہ تھی اور جس ترتیب سے ہم تلاوت کرتے ہیں اور جو ہمارے پاس کتابی شکل میں موجود ہے' وہ ترتیب اور ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جس ترتیب کے ساتھ قرآن کریم نازل ہوا وہ درج ذیل ہے:

مکی[۳۹] سورتوں کے نزول کی ترتیب

(۱) سورۃ العلق	(۲) سورۃ نون والقلم	(۳) سورۃ المزمل	(۴) سورۃ المدثر
(۵) سورۃ تبت یدا	(۶) سورۃ التکویر	(۷) سورۃ الاعلیٰ	(۸) سورۃ واللیل
(۹) سورۃ والفجر	(۱۰) سورۃ والضحیٰ	(۱۱) سورۃ الانشراح	(۱۲) سورۃ العصر
(۱۳) سورۃ العادیات	(۱۴) سورۃ الکوثر	(۱۵) سورۃ التکاثر	(۱۶) سورۃ الماعون
(۱۷) سورۃ الکافرون	(۱۸) سورۃ الفیل	(۱۹) سورۃ الاخلاص	(۲۰) سورۃ النجم
(۲۱) سورۃ عبس	(۲۲) سورۃ القدر	(۲۳) سورۃ البروج	(۲۴) سورۃ التین
(۲۵) سورۃ قریش	(۲۶) سورۃ القارعۃ	(۲۷) سورۃ القیامۃ	(۲۸) سورۃ الھمزۃ
(۲۹) سورۃ المرسلات	(۳۰) سورۃ ق	(۳۱) سورۃ البلد	(۳۲) سورۃ الطارق
(۳۳) سورۃ القمر	(۳۴) سورۃ صٓ	(۳۵) سورۃ الاعراف	(۳۶) سورۃ الجن
(۳۷) سورۃ یسٓ	(۳۸) سورۃ الفرقان	(۳۹) سورۃ فاطر	(۴۰) سورۃ مریم
(۴۱) سورۃ طٰہٰ	(۴۲) سورۃ الواقعۃ	(۴۳) سورۃ الشعراء	(۴۴) سورۃ النمل
(۴۵) سورۃ القصص	(۴۶) سورۃ بنی اسرائیل	(۴۷) سورۃ یونس	(۴۸) سورۃ ھود
(۴۹) سورۃ یوسف	(۵۰) سورۃ الحجر	(۵۱) سورۃ الانعام	(۵۲) سورۃ الصآفات
(۵۳) سورۃ لقمان	(۵۴) سورۃ سبا	(۵۵) سورۃ الزمر	(۵۶) سورۃ المؤمن
(۵۷) سورۃ السجدۃ	(۵۸) سورۃ الشوریٰ	(۵۹) سورۃ الزخرف	(۶۰) سورۃ الدخان
(۶۱) سورۃ الجاثیہ	(۶۲) سورۃ الاحقاف	(۶۳) سورۃ الذاریات	(۶۴) سورۃ الغاشیۃ
(۶۵) سورۃ الکہف	(۶۶) سورۃ النحل	(۶۷) سورۃ نوح	(۶۸) سورۃ ابراہیم
(۶۹) سورۃ الانبیاء	(۷۰) سورۃ المؤمنون	(۷۱) سورۃ حم السجدۃ	(۷۲) سورۃ الطور
(۷۳) سورۃ الملک	(۷۴) سورۃ الحاقۃ	(۷۵) سورۃ المعارج	(۷۶) سورۃ النبا
(۷۷) سورۃ النازعات	(۷۸) سورۃ الانفطار	(۷۹) سورۃ الانشقاق	(۸۰) سورۃ الروم

(۸۱) العنکبوت

اس بارے میں اختلاف ہے کہ مکی سورتوں میں نزول کے اعتبار سے آخری سورت کون سی ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''العنکبوت'' آخری ہے۔ حضرت ضحاک اور عطاء کے نزدیک ''المؤمنون'' آخری ہے اور حضرت

---

۳۹ مکی اور مدنی سورتوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء مفسرین کے تین قول ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ جو آیت یا سورت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی وہ مکی ہے اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی وہ مدنی ہے (خواہ کسی بھی مقام پر نازل ہوئی ہو)۔ اس قول کے مطابق سفر ہجرت کے دوران نازل ہونے والی آیات مکی کہلائیں گی۔ مکی اور مدنی کی تعریف میں یہ قول زیادہ مشہور ہے۔ (۲) جو آیت یا سورت مکہ میں نازل ہوئی' خواہ ہجرت کے بعد' وہ مکی ہے اور جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی وہ مدنی ہے اس قول کے مطابق دورانِ سفر نازل ہونے والی آیات نہ مکی ہیں نہ مدنی۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ جس آیت یا سورت میں اہل مکہ سے خطاب ہو وہ مکی ہے اور جس میں اہل مدینہ سے خطاب ہو وہ مدنی ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۹)

مجاہد کے نزدیک "سورۃ المطفّفین" آخری ہے۔

یہ کل ۸۳ سُورتیں بنتی ہیں، جو کہ ثقہ راویوں کی روایات سے ثابت ہیں[۴۰]۔ اب مدنی سورتوں کی تفصیل اور ان کی ترتیب ملاحظہ ہو:

مدنی سورتوں کے نزول کی ترتیب

(۱) سورۃ البقرہ	(۲) سورۃ الانفال	(۳) سورۃ آل عمران	(۴) سورۃ الاحزاب
(۵) سورۃ الممتحنہ	(۶) سورۃ النساء	(۷) سورۃ الزلزال	(۸) سورۃ الحدید
(۹) سورۃ محمد (ﷺ)	(۱۰) سورۃ الرعد	(۱۱) سورۃ الرحمٰن	(۱۲) سورۃ الدھر
(۱۳) سورۃ الطلاق	(۱۴) سورۃ البیّنہ	(۱۵) سورۃ الحشر	(۱۶) سورۃ الفلق[۴۱]
(۱۷) سورۃ الناس	(۱۸) سورۃ النصر	(۱۹) سورۃ النور	(۲۰) سورۃ الحج
(۲۱) سورۃ المنافقون	(۲۲) سورۃ المجادلۃ	(۲۳) سورۃ الحجرات	(۲۴) سورۃ التحریم
(۲۵) سورۃ الصّف	(۲۶) سورۃ الجمعۃ	(۲۷) سورۃ التغابن	(۲۸) سورۃ الفتح
	(۲۹) سورۃ التوبۃ	(۳۰) سورۃ المائدہ	

بعض علماء سورۃ المائدہ کو سورۃ التوبہ سے پہلے رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ مدنی سورتوں کے نزول کی ترتیب ہے۔ البتہ سورۃ الشوریٰ کے نزول میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مکہ میں نازل ہوئی اور بعض کے نزدیک مدینہ میں نازل ہوئی۔ علماء کے اختلاف کی تفصیل ہم انشاء اللہ ان کے مقامات پر بیان کریں گے۔

قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے کا بیان اور اس کے متعلق علماء امت کے اقوال کی تفصیل

(۳۷) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ جب میں نے ان کی تلاوت کو غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ وہ تو اس سورت کو کچھ زیادہ حروف کے ساتھ پڑھ رہے ہیں جو کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے، قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی ان سے اُلجھ پڑتا لیکن میں نے ان کے سلام پھیرنے تک صبر کیا، جب وہ فارغ ہو گئے تو میں نے اپنی چادر ان کے گلے میں ڈال کر ان سے پوچھا: تمہیں کس نے یہ سورت پڑھائی جو میں نے تم سے سنی؟ تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سورت رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے تو میں نے کہا: تم غلط کہتے ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ سورت اور طریقہ سے پڑھائی ہے۔ یہ کہہ کر میں انہیں کھینچتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گیا اور میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے سورۃ الفرقان مجھے پڑھائی ہے، میں نے انہیں اس سے مختلف طریقہ پر پڑھتے ہوئے سنا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم انہیں چھوڑ دو اور اے ہشام! تم پڑھو۔ تو انہوں نے ویسے ہی سنائی جیسے

---

[۴۰] سورتوں کی نزولی ترتیب میں علماء کا اختلاف ہے۔ علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے مکی سورتوں کی جو تعداد بتائی ہے وہ ۸۳ ہے اور جو نام بیان کیے ہیں وہ (سورۃ المطففین سمیت) کل ۸۲ ہیں۔ شاید آپ مزید ایک سورت ذکر کرنا بھول گئے اور وہ سورت، سورۃ الشمس ہے۔ جیسا کہ الاتقان میں ہے۔

[۴۱] بعض علماء کے نزدیک یہ دونوں سورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) مکی ہیں، لیکن مختار یہی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الاخلاص بھی بعض کے نزدیک مکی اور بعض کے نزدیک مدنی ہے۔ علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے اس کو مکی سورتوں میں شمار کیا ہے، جبکہ امام سیوطی علیہ الرحمۃ نے اس کے مدنی ہونے کو ترجیح دی ہے۔

میں نے ان سے سنی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! تم پڑھو تو میں نے اس طرح پڑھ کر سنائی جیسے مجھے رسول اللہ ﷺ نے سکھائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ بے شک یہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے' پس ان میں سے جو طریقہ آسان ہو اسی طریقہ سے پڑھا کرو۔

(صحیح بخاری:۴۹۹۲' صحیح مسلم:۸۱۸' سنن الترمذی:۲۹۴۳' سنن ابوداؤد:۱۴۷۵' سنن نسائی:۹۳۷)

حدیث مذکور: (۳۷) کی تشریح

حدیث مذکور میں حضرت عمر نے فرمایا: ''فکدت اساورہ فی الصلوۃ'' اس کا معنیٰ ہے:

او اثبہ و اقاتلہ وھو فی الصلوۃ. قریب تھا کہ میں ان پر ٹوٹ پڑتا اور ان سے لڑتا' جبکہ وہ نماز میں تھے۔

اور ''تو بّصں[۴۲]'' کا معنیٰ ہے: ''التثبت'' (ٹھہرنا' کسی کام کو کرنے سے رک جانا)۔

پھر فرمایا: ''فلبّبتہ بردائہ'' یعنی میں نے اپنی چادر کو ان کی گردن میں ڈالا اور انہیں کھینچا۔ یہ ''لَبَّۃ'' سے مأخوذ ہے (اور ''لبۃ'' کا معنیٰ ہے: سینے کا بالائی حصہ جہاں ہار پہنے جاتے ہیں)۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں قرآن کریم کو اہمیت دینے' اس کا دفاع کرنے اور اس کے لفظوں کی نگہبانی کا جذبہ کس قدر بلند تھا کہ جن الفاظ کے ساتھ انہوں نے نبی علیہ السلام سے قرآن کو سنا' ہمیشہ ان الفاظ کے پابند رہے اور کسی مقام پر عربی زبان کی گنجائش کو استعمال نہیں کیا۔

رہا یہ کہ نبی ﷺ نے حدیث مذکور میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ ہشام کو چھوڑ دو تو یہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کے نزدیک ان کے گلے میں حضرت عمر کے چادر ڈال کے کھینچنے کا سبب اور اس کی وجہ ثابت نہیں تھی' دوسرا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ہشام بن حکیم کی طرف یہ نسبت کر دی کہ وہ قرأت میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہیں' حالانکہ نبی اکرم ﷺ کے نزدیک ہشام کی قرأت بھی درست تھی اور آپ ﷺ قرأت کے ایسے طریقوں کو جانتے تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں جانتے تھے (اس لیے فرمایا کہ تم ہشام کو چھوڑ دو)۔ تیسرا یہ کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی چادر ہشام کے گلے میں ہی رہتی اور پھر وہ قرأت کرتے تو وہ حضورِ قلب کے ساتھ اور اچھی طرح سے تلاوت نہ کر پاتے جیسا کہ ایک آزاد شخص تلاوت کرتا ہے۔

حدیث مذکور میں فرمایا:

ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ أحرف فاقرء وا ما تیسر منہ. بے شک یہ قرآن سات قرأتوں پر نازل کیا گیا ہے' تو اس قرآن سے جو آسان لگے اُسے پڑھو۔

علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کو سات حروف (قرأتوں) پر اس لیے نازل کیا گیا تا کہ لوگوں کے لیے تخفیف اور آسانی ہو۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سات حروف[۴۳] سے کیا مراد ہے؟

---

[۴۲] علامہ خازن نے حدیث مذکور:۳۷ میں تصبرت کو تربصت لکھا ہے اور اسی کے مطابق شرح کرتے ہوئے التثبت کہہ کر اس کا معنیٰ بیان کیا ہے۔ اگرچہ تصبرت اور تربصت میں معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے' تاہم جن کتب کے حوالہ سے علامہ نے حدیث مذکور کو ذکر فرمایا ہے' ان میں تصبرت یا اس کے ہم معنیٰ (امھلت وغیرہ) کے الفاظ ہیں۔

[۴۳] یہاں واضح رہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو مصاحف تیار کروائے تھے وہ رسم الخط کے اعتبار سے اس طرز پر لکھے گئے تھے کہ ان میں ساتوں قرأتوں کی گنجائش موجود تھی۔ یعنی ان میں نہ نقطے لگائے گئے تھے نہ زبر' زیر' پیش وغیرہ لگائے گئے تھے۔ تا کہ قرأت کے ساتوں طریقوں سے قرآن کریم کو پڑھا جاسکے۔ (الاتقان ج ۱ ص ۴۹' مرقات ج ۴ ص ۷۴۳)

(۱) بعض علماء کا موَقف یہ ہے کہ ''سات قرأت'' فرما کر یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں تمہارے لیے گنجائش اور سہولت ہے۔اس سے یہ بتانا مقصد نہیں ہے کہ صرف سات ہی قرأتوں پر قرآن نازل ہوا ہے۔

(۲) اکثر علماء فرماتے ہیں کہ سات قرأت کہہ کر حصر ہی کا قصد کیا گیا ہے'یعنی یہ قرآن صرف سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے۔

(۳) بعض علماء کے نزدیک ''سبعة احرف'' سے مراد قرآن حکیم کے سات (معروف) مضامین ہیں:

(۱) وعدوعید (۲) محکم (۳) متشابہ (۴) حلال (۵) حرام (۶) قصص وامثال (۷) امر ونہی۔بعض کے نزدیک سات کا حصر اس میں ہے کہ تلاوت کا طریقہ اور قرآنی کلمات کی ادائیگی سات طرح سے ہے:

(۱) ادغام (۲) اظہار (۳) تفخیم (۴) ترقیق (۵) مد (۶) قصر (۷) امالہ۔

چونکہ اہل عرب' آپس میں مختلف لغات رکھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر آسانی فرمائی اور قرآن کو سات قرأتوں پر نازل فرمایا' تاکہ ہر شخص اپنی لغت کے موافق اور اپنی زبان کی سہولت کے مطابق قرآن کریم کو پڑھ سکے۔

(۴) حضرت ابوعبیدہ کا قول یہ ہے کہ سات حروف سے' اہل عرب کے تمیم ومعد کی سات لغتیں مراد ہیں اور یہ تمام لغاتِ عرب میں سب سے فصیح اور بلند ترین ہیں۔

(۵) ایک قول یہ ہے کہ سات حروف سے قریش'ہوازن'ھذیل اور اہل یمن کی لغت مراد ہے۔

(۶) ایک قول یہ ہے کہ ساتوں قرأتیں' تنہا قبیلۂ مُضر کی ہیں۔

رہا یہ کہ یہ سات قرأتیں قرآن مجید میں متفرق مقامات اور کلمات میں ہیں یا کسی ایک کلمہ میں' اس بارے میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ قرأتیں کسی ایک کلمہ میں جمع نہیں ہیں بلکہ متفرق کلمات میں ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم کے بعض کلمات ایسے ہیں جن میں ساتوں قرأتیں جمع ہیں۔مثلاً:

وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ . (المائدہ:۶۰) (بُرے وہ لوگ ہیں) جنہوں نے شیطان کی عبادت کی۔

يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ . (یوسف:۱۲) وہ پھل کھائے اور کھیلے۔

بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا . (سبا:۱۹) ہماری منازلِ سفر میں دوری پیدا کر دے۔

بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ . (الاعراف:۱۶۵) بہت بُرے عذاب میں۔

قرآن کریم کے سات قرأتوں پر نازل ہونے کے معنیٰ میں صحیح قول

''سبعة احرف'' سے ایک قول کے مطابق سات قرأتیں مراد ہیں۔یہی قول صحیح ہے اور حدیث مذکور: ۳۷ کے موافق ہے۔کیونکہ یہ ساتوں قرأتیں نبی اکرم ﷺ سے حاصل ہوئیں اور آپ ﷺ ہی سے سن کر صحابہ کرام نے ان کو محفوظ کیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت نے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخوں میں ان کو ثابت رکھا اور ان قرأتوں کے صحیح ہونے کی دوسروں کو خبر دی اور جو قرأتیں تواتر سے ثابت نہیں تھیں ان کو ان سات قرأتوں سے خارج کیا۔

''سبعة احرف'' سے جو سات قرأتیں مراد لی گئی ہیں ان میں آپس میں کبھی معنوی فرق ہوتا ہے اور کبھی لفظی فرق ہوتا ہے' لیکن یہ قرأتیں آپس میں ایک دوسرے کی متضاد نہیں ہیں۔پس جنہوں نے ''سبعة احرف'' سے قرآن کریم کے مضامین (وعدوعید اور حلال وحرام وغیرہ) مراد لیے ان کا قول قطعاً صحیح نہیں ہے۔کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے (حدیث مذکور میں) اشارۃً بتا دیا ہے کہ سات قرأت میں سے کسی بھی قرأت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنا اور ایک قرأت کی جگہ دوسری قرأت کو اختیار کرنا

جائز ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہو چکا ہے کہ جن آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مثالیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے کسی آیت کو احکام کی آیت سے بدلنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح جنہوں نے یہ کہا کہ ''سبعة احرف'' کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآنی آیات کے آخری حصوں کو سات طریقوں سے پڑھنا جائز ہے' مثلاً ''غفور رحیم'' کی جگہ ''سمیع علیم'' پڑھنا' سوان کا قول بھی فاسد اور غلط ہے۔ کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ جس نظم اور ترتیب کے ساتھ قرآن نازل ہوا ہے اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم (اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے۔)[۴۴]

(۳۸) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جبریل امین نے ایک طریقہ پر قرآن پڑھایا تو میں ان سے زیادہ کا مطالبہ کرتا رہا' یہاں تک کہ سات طریقوں تک پہنچ گئے۔
(صحیح بخاری: ۴۹۹۱' صحیح مسلم: ۸۱۹)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ میں جبریل امین سے بار بار مطالبہ کرتا رہا کہ وہ اللہ عزوجل سے قرأت کے مزید طریقے طلب کریں' تاکہ امت کے لیے گنجائش اور آسانی ہو جائے تو جبریل امین اپنے رب عزوجل سے مطالبہ کرتے رہے اور اللہ عزوجل مختلف قرأتیں بیان فرماتا رہا' تاآنکہ سات قرأتیں ہو گئیں۔

(۳۹) حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا' ایک شخص آ کر نماز پڑھنے لگا اور نماز میں قرآن مجید کی ایسی قرأت کی جو میرے لیے غیر مانوس تھی' پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے کسی اور طریقہ سے قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ جب ہم لوگ نماز سے فارغ ہو گئے تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا: اس شخص نے اس طرح قرآن مجید کو پڑھا جو میرے لیے غیر مانوس تھا اور دوسرا شخص آیا تو اس نے ایک اور طریقہ سے قرأت کی۔ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو پڑھنے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے پڑھ کر سنایا تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو صحیح قرار دیا جس سے میرے دل میں (آپ ﷺ کی) ایسی تکذیب پیدا ہوئی جو اس سے پہلے نہ کبھی زمانۂ اسلام میں پیدا ہوئی تھی نہ کبھی زمانۂ جاہلیت میں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے میرے اس حال کو دیکھا تو میرے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف الٰہی کی مجھ پر ایسی کیفیت پیدا ہو گئی گویا میں اللہ عزوجل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے اُبی! پہلے مجھے یہ حکم دیا گیا تھا کہ میں قرآن مجید ایک حرف (لغت) پر پڑھوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ میری امت پر آسانی فرما' پھر مجھے دو طریقوں سے پڑھنے کا حکم دیا گیا تو میں نے دوبارہ عرض کیا کہ میری امت پر آسانی فرما۔ پھر مجھے تیسری بار سات طریقوں سے پڑھنے کا حکم ہوا اور فرمایا کہ تم نے جتنی بار امت پر آسانی کی دعا کی ہے اتنی بار کے عوض تم ہم سے ایک دعا مانگ لو تو میں نے عرض کیا: اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما اور تیسری بار کی دعا میں نے اس دن کے لیے محفوظ کر لی جس دن ساری مخلوق حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی میری طرف متوجہ ہوں گے۔ (صحیح مسلم: ۸۲۰)

---

[۴۴] یہاں علامہ خازن ان لوگوں کا رد فرما رہے ہیں جنہوں نے ''سات حروف'' سے آیات کے آخری حصے مراد لیے ہیں اور حدیث کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآنی آیات کے آخری حصوں کو سات طریقوں سے پڑھنا جائز ہے۔ مثلاً غفور رحیم کی جگہ سمیع علیم پڑھنا۔ علامہ خازن فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ جس نظم اور ترتیب کے ساتھ قرآن کریم نازل ہوا ہے اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے۔ علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ یہ بات کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر مثلاً سمیع علیم کی جگہ علیم حکیم یا اور اس جیسے دیگر الفاظ پڑھے۔ ہاں اگر بغیر ارادہ کے دوسرے الفاظ ادا ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بغیر ارادہ کے نماز میں ایسا ہو جائے تو نماز بھی فاسد نہیں ہو گی۔ (شرح سنن ابو داؤد ج ۵ ص ۳۹۳)

حدیث مذکور (۳۹) کی تشریح

حدیث مذکور میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''فسقط فی نفسی التکذیب ما لم یقع فی الاسلام ولا اذ کنت فی الجاهلية''۔

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ شیطان نے میرے دل میں نبوت کو جھٹلانے کا ایسا وسوسہ ڈالا جو زمانۂ جاہلیت میں ہونے والی تکذیب سے زیادہ سخت تھا' کیونکہ زمانۂ جاہلیت کی تکذیب بہرحال غفلت اور شک کی بنیاد پر تھی اور اس تکذیب میں شیطان نے یقین پیدا کر دیا تھا۔

اس حدیث کا معنیٰ بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ پر حیرت اور تعجب کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ شیطان نے ان کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جھٹلانے کا خیال ڈال دیا۔ حالانکہ ان کا کوئی ارادہ یا عقیدہ ایسا نہیں تھا اور یہ طے ہے کہ اس قسم کے خیالات پر شرعاً گرفت نہیں ہے[۴۵] جو ذہن میں آتے جاتے رہتے ہوں۔ پھر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ضرب في صدري ففضت عرقا''۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب دیکھا کہ اُبی بن کعب پر ایک بُرا خیال غالب آ رہا ہے تو آپ ﷺ نے ان کے دل کو اسلام پر ثابت اور قائم رکھنے کے لیے ان کے سینہ پر اپنا ہاتھ مارا۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ۳ ص ۱۹۴)

پھر اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کأنما انظر الی اللہ تعالی فرقا'' (مجھ پر خوفِ الٰہی کی ایسی کیفیت طاری ہو گئی گویا میں اللہ عزوجل کو دیکھ رہا ہوں)۔

''فَــرَق'' کا معنیٰ ہے: خوف وخشیت۔ اور پورے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت اُبی بن کعب کے سینہ پر جب ہاتھ مارا تو ان پر ان کے خوف و ہیبت اور اس کی عظمت وجلال کا ایسا تصور چھا گیا کہ ان سے وہ تکذیب کا خیال بالکل دور ہو گیا[۴۶]۔

پھر حدیث مذکور میں نبی اکرم ﷺ اللہ عزوجل کا کلام بیان فرماتے ہیں کہ:

جب میں نے دوبارہ عرض کیا کہ میری امت پر آسانی فرما تو مجھے تیسری مرتبہ میں سات طریقوں سے قرآن پڑھنے کا حکم ہوا اور ساتھ یہ بھی فرمایا گیا: ''فلک بکل ردة رددتکها مسألة تسألنيها'' (تم نے جتنی بار امت پر آسانی کی دعا کی ہے اتنی بار کے عوض تم ہم سے کوئی دعا مانگ لو۔)

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دعا جو آپ اِس وقت مانگیں وہ قطعی طور پر قبول ہو گی۔ جبکہ باقی دعاؤں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی قبولیت قطعی نہیں ہے[۴۷] ہاں امید اور توقع ہے کہ وہ بھی قبول کی جائیں گی۔ واللہ اعلم

[۴۵] مثلاً کسی شخص کے دل میں کفری بات کا خیال آتا ہے لیکن زبان سے ادا کرنے کو وہ بُرا جانتا ہے تو یہ کفر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کے سینے میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے جب تک آدمی اُس پر عمل نہ کرے یا زبان سے ادا نہ کرے۔ (صحیح بخاری: ۲۵۲۸' صحیح مسلم: ۱۲۷)

لہٰذا دل میں آنے والی کفریہ بات کو جب تک زبان سے ادا نہ کیا جائے اس پر گرفت نہیں ہے' بلکہ اس کی ادائیگی کو بُرا جاننا خالص ایمان کی علامت ہے۔ (دیکھئے خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۸۴' شرح الفقہ الاکبر ص ۱۶۵' بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۲۱)

[۴۶] اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل نے نبی اکرم ﷺ کو تصرف اور اختیارات عطا فرمائے ہیں۔ چنانچہ اپنے خداداد علم کی بنیاد پر آپ ﷺ نے یہ جان لیا کہ ابی بن کعب پر تکذیب کا وسوسہ غالب آ رہا ہے' پھر اپنے تصرّف اور قوت کو یوں ظاہر فرمایا کہ جیسے ہی آپ نے ابی بن کعب کے سینہ پر ہاتھ مارا تو ان پر اللہ عزوجل کی عظمت وجلال کا ایسا تصور چھا گیا کہ ان سے تکذیب کا وسوسہ قطعاً دور ہو گیا۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۹۶)

[۴۷] یہی بات حدیث مذکور کی شرح میں علامہ نووی نے بھی تحریر فرمائی ہے۔ (دیکھئے: صحیح مسلم مع شرح النووی ج ۱ ص ۲۷۳) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴۰) امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک قرآن کریم سات قرأتوں پر نازل کیا گیا ہے' ان میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر ایک کے لیے حد مطلع ہے۔ (تفسیر بغوی (المسمی بمعالم التنزیل) فی آخر المقدمہ ج ۱ص ۶۹' شرح السنہ للبغوی ج ۱ص ۲۶۳' جامع البیان للطبری ج ۱ص ۲۵' المعجم الکبیر: ۱۰۱۰۷' الجامع الصغیر للسیوطی: ۲۷۲۷' صحیح ابن حبان ج ۱ص ۲۷۶' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۵)

حدیث مذکور: (۴۰) کی تشریح

اس حدیث کی مختلف تشریحات کی گئیں ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ''ظھـــر'' سے مراد قرآن کریم کے الفاظ ہیں اور ''بــطـن'' سے ان الفاظ کے معنی اور تاویل مراد ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ہمیں گذشتہ قوموں کے متعلق بتایا گیا کہ انہوں نے نافرمانی کی تو ان پر عذاب نازل کیا گیا۔ اس طرح کی آیات کا ''ظھـر'' یہ ہے کہ ان میں ہمیں ایک خبر دی جارہی ہے اور ان کا ''بـطـن'' یہ ہے کہ ان واقعات میں ہمارے لیے نصیحت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''ظھر'' سے مراد قرآن حکیم کو زبان سے تلاوت کرنا ہے جیسا کہ وہ نازل ہوا اور ''بطن'' سے مراد دل ودماغ کے ذریعہ اس میں غور وفکر کرنا اور اُسے سمجھنا ہے۔ پس قرآن کریم کی تلاوت زبان سے حاصل ہوتی ہے' مثلاً کسی کو قرآن کی تعلیم دی جائے اُسے پڑھنے کی تلقین کی جائے اور قرآن میں غور وفکر اور اس کی سمجھ' اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی کی نیت سچی اور صاف ہو' دل میں قرآن کی عزت اور احترام ہو' عمل میں اخلاص ہو اور پاکیزہ اور حلال رزق کھاتا ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اسی طرح جس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر نبی کے لیے ایک مقبول دعا ہے'' اس کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ دعا ہے جو قطعاً مقبول ہوگی اور باقی دعاؤں کی قبولیت قطعی نہیں ہے' بلکہ امید اور توقع ہے کہ وہ بھی قبول کی جائیں گی۔ (فتح الباری ج ۱۲ص ۴۷' ۴۳' عمدۃ القاری ج ۲۲ص ۴۳۰)

دلائل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعض دعائیں لازماً مقبول ہوں گی اور دیگر دعاؤں کے متعلق چونکہ کوئی دلیل قطعی نہیں ہے اس لیے ان پر قطعی مقبول ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم انبیاء کرام خصوصاً سید الانبیاء رحمۃ للعالمین ﷺ سے ہماری جو عقیدت اور وابستگی ہے اور جمیع انبیاء کرام خصوصاً نبی اکرم ﷺ کی بارگاہِ الٰہی میں جو محبوبیت ہے اس کی بنیاد پر ہم یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ عزوجل اپنے نبی کی کسی دعا اور تمنا کو ٹالتا نہیں ہے۔ الّا یہ کہ جب اس کی حکمت ان کی کسی دعا کو قبول کرنے کی مقتضی نہ ہو تو وہ انہیں اس دعا اور سوال ہی سے منع فرما دیتا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے کسی موقع پر طویل نماز ادا فرمائی اور اس میں یہ تین دعائیں مانگیں کہ اللہ میری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ فرمائے' میری امت کو غرق کرکے ہلاک نہ فرمائے اور میری امت آپس میں جنگ وجدال اور لڑائی نہ کرے۔ (آپ ﷺ فرماتے ہیں:) ان میں سے دو چیزیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرما دیں اور ایک سے مجھے روک دیا۔ (صحیح مسلم: ۲۸۹۰' مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۲)

علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ کسی نبی کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ان کی بعض دعائیں مقبول نہیں ہوتیں' بلکہ ان کی شان کے مطابق یوں کہنا چاہیے کہ انبیاء کی بعض دعائیں فی الفور قبول ہو جاتی ہیں اور بعض کو کسی خاص وقت تک مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۲۲ص ۴۳۰)

اسی طرح ایک معروف حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے ہر محبوب بندہ کے متعلق فرماتا ہے کہ ''اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور بہ ضرور اسے عطا کروں گا''۔ (صحیح بخاری: ۶۵۰۲) جب ایک محبوب ومقرب بندہ کا یہ مقام ہے تو حضرات انبیاء کرام خصوصاً سید المحبوبین ﷺ کا مقام یقیناً اس سے بہت زیادہ بلند ہوگا۔ اس لیے ہم یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ عزوجل اپنے نبی کی کسی دعا اور تمنا کو ٹالتا نہیں ہے۔ ہاں بعض حکمتوں کے پیش نظر انہیں سوال سے منع فرما دیتا ہے یا قبولیت کو کسی خاص وقت تک مؤخر فرما دیتا ہے۔

حدیث مذکور کا آخری حصہ ہے:

ولکل حد مطلع. اور ہر ایک کے لیے مطلع ہونے کی حد ہے۔

اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ آیات کے ظاہر اور باطن میں سے ہر ایک کا الگ مقام ہے جس پر پہنچ کر آدمی (اس مقام کے مطابق) آیات کے ظاہر اور باطن کو پہچان لیتا ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ مذکورہ جملہ میں "**مطلع**" سے مراد فہم اور سمجھ ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں غور وفکر کرنے والے شخص پر آیات کی تاویل اور معانی کا وہ دروازہ کھول دیتا ہے جو کسی اور پر نہیں کھولتا۔ (اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:)

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ○ (یوسف:۷۶) اور ہر (متناہی) علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

واللہ اعلم

فصل: تفسیر اور تاویل کے معنیٰ اور دونوں میں فرق کا بیان

تفسیر لغت[۴۸] میں فسر سے مشتق ہے اور فسر کا معنیٰ ہے: ڈھکی ہوئی چیز کو کھولنا۔ اور تفسیر کا معنیٰ ہے: الفاظ کے معقول معانی بیان کرنا۔ لہٰذا ہر وہ بات جس سے کسی چیز کی معرفت اور اس کے معنیٰ کی پہچان حاصل ہو وہ تفسیر ہے۔ بعض اوقات ان باتوں کو بھی تفسیر کہہ دیا جاتا ہے جو مفرد اور مشکل الفاظ کے ساتھ مخصوص ہیں (یعنی مفرد اور مشکل الفاظ کی وضاحت کو بھی تفسیر کہا جاتا ہے)۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ تفسیر "**تفسرة**" سے مشتق ہے اور "**تفسرہ**" اس قارورہ (شیشی) کو کہتے ہیں جس میں ڈاکٹر (مریض کی کوئی چیز لے کر) اُسے دیکھتا ہے اور اس کے ذریعہ بیماری کا سبب دریافت کرتا ہے اسی طرح مفسّر بھی (جب کسی آیت پر قلم اٹھاتا ہے تو) اس کا معنیٰ اس کی حقیقت اور واقعۂ نزول بالکل کھول کر رکھ دیتا ہے۔

تأویل "اَوْل" سے مشتق ہے۔ جس کا معنیٰ ہے: "**الرجوع الی الاصل**" اصل چیز کی طرف لوٹنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: "**أولته فآل**" (میں نے اُسے پھیرا تو وہ پھر گیا۔) اسی طرح اول کا معنیٰ ہے: "**رد الشیئ الی الغایة**" (کسی چیز کو اس کے مقصد کی طرف پھیرنا) یعنی اس کے اصل مقصد کو واضح کرنا۔ اب تاویل کا معنیٰ یہ ہوا:

بیان المعانی والوجوه المستنبطة الموافقة للفظ الآیة. وہ معانی ومفاہیم جو قرآنی آیات سے اخذ کیے جائیں اور وہ آیت کے الفاظ کے موافق ہوں ان کو کھول کر بیان کرنا۔

تفسیر اور تاویل میں فرق یہ ہے کہ تفسیر کی بنیاد نقلِ مسموع (قرآن وسنّت) ہے اور تاویل کی بنیاد آدمی کی اپنی فہم ہے جب کہ وہ صحیح ہو۔ واللہ اعلم

---

۴۸ علامہ خازن نے علم تفسیر کا لغوی معنیٰ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ علم تفسیر کی اصطلاحی تعریف مستند کتب کی روشنی میں یہ ہے کہ "یہ وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے نطق کی کیفیت (یعنی علم قرأت) ان کے مدلولات (یعنی الفاظ کے معانی) ان کے مفرد اور مرکب ہونے کے احکام (علم صرف ونحو وغیرہ) حالت ترکیب میں الفاظ کے معانی (کہیں حقیقی کہیں مجازی) اور ان الفاظ کے تتمات (یعنی ناسخ ومنسوخ اور شانِ نزول وغیرہ) سے بحث کی جاتی ہے"۔

علم تفسیر کی یہ تعریف علامہ ابو الحیان اندلسی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر میں بیان کی ہے اور امام سیوطی نے الاتقان میں اس تعریف کو تشریح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ترجمہ اسی تشریح کے مطابق کیا گیا ہے۔

(دیکھیے: البحر المحیط ج۱ص۲۶ الاتقان ج۲ص۱۷۴ تبیان القرآن ج۱ص۱۲۳)

استعاذہ کی تحقیق

استعاذہ کے لیے اکثر علماء نے ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' کے الفاظ کو ترجیح دی ہے کیونکہ[۴۹] اس میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی موافقت ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ (النحل:۹۸) تو (اے رسول مکرم!) جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں ○

اعوذ باللہ کے مفردات کے معانی

''اعوذ عاذ یعوذ'' سے مشتق ہے اور ''اعوذ باللہ'' کا معنیٰ ہے:

التجئی الیه و امتنع به مما اخشاه. میں اُن چیزوں سے اللہ کی پناہ اور اس کی حفاظت میں آتا ہوں جن کا مجھے ڈر اور خطرہ ہے۔

''شیطان'' کا مشتق منہ ''شطن'' ہے بمعنیٰ دور ہونا۔ یعنی شیطان وہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گیا۔ بعض کے نزدیک یہ ''شاط یشیط'' سے مشتق ہے بمعنیٰ جلنا اور ہلاک ہونا۔

جن و انس میں سے جو بھی (اپنے رب کی) حدود سے آگے بڑھ جائے اور اس کے سامنے اکڑ جائے اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ جنات میں جو شیطان ہوتے ہیں انہیں چونکہ آگ کی قوت سے پیدا کیا جاتا ہے اس لیے ان کے اندر غصہ کا پاور بہت زیادہ ہوتا ہے۔

''الرجیم'' فعیل کے وزن پر اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے بمعنیٰ (لوگوں کے دلوں میں) وسوسہ اور شر ڈالنے والا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ اسم مفعول کے معنیٰ میں ہے اور اس صورت میں (علی اختلاف الاقوال) اس کے درج ذیل معانی ہیں:

(۱) مرجوم بالشهب عند استراق السمع. جب وہ چوری چھپے (فرشتوں کی باتیں) سننے جاتا ہے تو اس پر انگارے برسائے جاتے ہیں۔

(۲) مرجوم بالعذاب. عذاب میں پھینکا ہوا۔

(۳) مطرود عن الرحمة وعن الخیرات وعن منازل الملأ الاعلی. اللہ عزوجل کی رحمت سے دور ہر قسم کی خیر سے محروم اور عالم بالا کے فرشتوں کے مراتب سے نیچے گرایا ہوا۔

اعوذ باللہ سے متعلق چند فقہی مسائل

ذیل میں اعوذ باللہ سے متعلق چند فقہی مسائل اور ان میں ائمہ کے درمیان اختلاف کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم

جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ[۵۰] نماز میں ''اعوذ باللہ'' پڑھنا سنت ہے یعنی اگر کسی نے اس کو نہ پڑھا تو اس کی

---

۴۹ حضرت سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب تعوذ پڑھتے تو یہ الفاظ کہتے: اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. (میں شیطان مردود کے وسوسوں سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔) (الدر المنثور ج ۵ ص ۱۴۵) اس لیے علماء کی اکثریت نے تعوذ کے لیے انہی الفاظ کو ترجیح دی ہے۔

۵۰ فقہائے احناف اور فقہائے حنابلہ نے لکھا ہے کہ نماز میں قرأت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے۔ (دیکھئے: درمختار مع ردالمحتار ج ۲ ص ۱۵۲، المغنی ج ۱ ص ۲۸۳) امام مالک کے نزدیک فرض نمازوں میں اعوذ باللہ نہیں ہے البتہ قیام رمضان (تراویح) میں قرأت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھی جائے گی۔ (دیکھئے: المدوّنہ ج ۱ ص ۶۴) جبکہ امام شافعی نماز میں اعوذ باللہ کو مستحب قرار دیتے ہیں جیسا کہ امام نووی نے روضۃ الطالبین (ج ۱ ص ۳۴۶) میں لکھا ہے۔

نماز باطل نہیں ہوگی' خواہ اس نے قصداً چھوڑا ہو یا بھول کر۔ ہاں نماز سے باہر جب کوئی تلاوتِ قرآن کرے تو مستحب ہے کہ ''اعوذ باللہ'' پڑھ لے۔

عطاء تابعی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کو دونوں صورتوں میں واجب قرار دیتے تھے' خواہ آدمی نماز میں قرأت کر رہا ہو یا نماز سے باہر۔

اور امام ابن سیرین کا قول یہ ہے کہ آدمی عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی ''اعوذ باللہ'' پڑھ لے گا تو اس سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔

ان دونوں ائمہ کی وجوب پر دلیل' اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ (النحل:۹۸) تو تم شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔

اس آیت میں ''فاستعذ'' امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مواظبت اور پابندی کے ساتھ ''اعوذ باللہ'' کو پڑھا ہے لہٰذا اس کا پڑھنا واجب ہوا۔

جمہور علماء (اس بات پر کہ نماز میں ''اعوذ باللہ'' پڑھنا واجب نہیں ہے) دلیل یہ دیتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جب ایک اعرابی کو نماز کا طریقہ سکھایا[۵۱] تو اس میں کہیں بھی ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کی تعلیم نہیں فرمائی (اور ایسا بھی نہیں کہ بعد میں آپ ﷺ نے وضاحت فرما دی ہو) کیونکہ وضاحت کو اس کے وقت سے مؤخر کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فاستعذ'' تو اس کا معنیٰ جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ ''جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو ''اعوذ باللہ'' پڑھ لیا کرو'' جیسے فرمایا: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا . (المائدہ:۶) یعنی جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور ٹخنوں سمیت اپنے پاؤں دھو لو۔

اور یہ دلیل کہ نبی اکرم ﷺ نے مواظبت اور پابندی کے ساتھ نماز میں اعوذ باللہ کو پڑھا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز میں بہت سارے ایسے کام پابندی کے ساتھ ادا فرمائے ہیں جو واجب نہیں ہیں۔ مثلاً تکبیراتِ انتقال اور رکوع سجود کی تسبیحات۔ تو جس طرح ان پر حضور کے پابندی فرمانے کے باوجود یہ واجب نہیں ہیں' سنّت ہیں' سو اسی طرح اعوذ باللہ پڑھنا بھی نماز میں سنّت ہے[۵۲]۔

''اعوذ باللہ'' کو قرأت سے پہلے پڑھا جائے یا قرأت کے بعد؟

جمہور علماء کے نزدیک قرأت سے پہلے ''اعوذ باللہ'' پڑھنی چاہیے' خواہ قرأت نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔ امام نخعی کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ قرأت کے بعد ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کا قول کرتے تھے اور یہی امام داؤد کا مسلک ہے اور ابن

۵۱ اس حدیث کے حوالہ کے لیے دیکھئے: صحیح بخاری: ۷۵۷' صحیح مسلم: ۳۹۷' سنن ابوداؤد: ۸۵۶' سنن ترمذی: ۳۰۳' سنن نسائی: ۸۸۳' سنن ابن ماجہ: ۱۰۶۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۸۰۴ ص ۷۶۔

۵۲ واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کا کسی بھی عمل کو دوام اور ہمیشگی کے ساتھ کرنا اس وقت وجوب کی دلیل بنتا ہے جب آپ نے اس کے ترک کرنے والے پر انکار بھی فرمایا ہو۔ محض دوام کے ساتھ آپ کا کسی کام کو کرنا وجوب کی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا اعوذ باللہ پڑھنا مداومت کے باوجود سنت ہے۔

(دیکھئے: فتح القدیر ج ۲ ص ۳۹۴' البحر الرائق ج ۲ ص ۲۹۹' ردالمحتار ج ۱ ص ۱۹۸' تبیان القرآن ج ۳ ص ۴۴)

سیرین کی دو روایتوں میں سے ایک روایت یہی ہے۔

جمہور علماء کی اپنے موقف پر دلیل درج ذیل دو حدیثیں ہیں:

(٤١) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے پھر یہ پڑھتے: "سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولا الہ غیرک"۔ پھر "اللہ اکبر کبیرا" کہتے پھر پڑھتے: "اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من ھمزہ ونفخہ ونفثہ" (میں سمیع و علیم معبود کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود کے وساوس اس کے تکبر اور اس کے جادو سے)۔

(سنن الترمذی: ۲۴۲' سنن ابوداؤد: ۷۷۵' سنن ابن ماجہ: ۸۰۴' سنن نسائی: ۸۹۸' مسند احمد ج ۳ ص ۵۰' دارمی: ۱۲۳۹' ج ۱ ص ۳۱۰)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس باب میں مشہور ترین ہے' اس کے بعض راویوں پر جرح کی گئی ہے اور امام احمد نے کہا کہ اس حدیث کی سند صحیح نہیں ہے۔

(٤٢) حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک نماز پڑھتے ہوئے دیکھا (راوی حدیث) عمرو کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی نماز تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ "اللہ اکبر کبیرا" کہا اور تین مرتبہ "الحمد للہ کثیرا" اور "سبحان اللہ بکرۃ واصیلا" پڑھا (اور پھر کہا:) "اعوذ باللہ من الشیطن من نفخہ ونفثہ وھمزہ" (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان کے وساوس' اس کے تکبر اور اس کے جادو سے)۔ راوی نے کہا کہ "نفخ" سے مراد تکبر' "نفث" سے مراد اشعار اور "ھمز" سے مراد جنون ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۷۶۴' سنن ابن ماجہ: ۸۰۷)

☆ "موتہ" سے مراد جنون ہے' کیونکہ جو شخص پاگل ہوتا ہے اس کی عقل مر جاتی ہے اور "ھمز" سے مراد وہ خیال ہے جو شیطان نماز کے دوران دل میں ڈالتا ہے اور "نفخ" سے مراد وہ شکوک و شبہات ہیں جو وہ نماز میں اس لیے ڈالتا ہے تا کہ آدمی اپنی نماز توڑ دے۔

مسئلہ زیر بحث میں جنہوں نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ "اعوذ باللہ" قرأت کے بعد پڑھنی چاہیے' انہوں نے فرمانِ باری تعالیٰ: "فاذا قرءت القرآن فاستعذ باللہ" کے ظاہر سے استدلال کیا ہے۔ جمہور کی طرف سے اس کا جواب وہی ہے جو گذر چکا۔

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرض نماز میں "اعوذ باللہ" نہیں پڑھی جائے گی اور تراویح میں قرأت کے بعد پڑھی جائے گی۔

(امام مالک کے جواب میں) ہمارے دلائل وہی ہیں جو گذر چکے[۵۳]۔

استعاذہ کے لیے کون سے الفاظ پڑھے جائیں؟

استعاذہ کے لیے امام شافعی نے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" کے الفاظ کو ترجیح دی ہے اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے موافق ہیں:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ (النحل: ۹۸) تو تم شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔

نیز یہ الفاظ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث: ۴۲ کے بھی مطابق ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا موقف یہ ہے کہ استعاذہ کے لیے "اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم" کے الفاظ

---

۵۳ علامہ کا اشارہ ان دو احادیث کی طرف ہے جو ۴۱ اور ۴۲ نمبر کے تحت ترمذی اور ابوداؤد کے حوالہ سے وہ ذکر فرما چکے ہیں۔

زیادہ بہتر ہیں۔ کیونکہ اس طرح آیتِ مذکورہ (النحل:۹۸) اور درج ذیل آیت' دونوں پر عمل ہو جائے گا۔ ارشاد فرمایا:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ○ تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو بے شک وہی سننے والا خوب جاننے والا ہے○ (حٰمٓ السجدۃ:۳۶)

نیز یہ الفاظ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث:۴۱ کے موافق ہیں۔

امام ثوری اور اوزاعی کا موقف یہ ہے کہ استعاذہ کے لیے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ان اللہ ھو السمیع العلیم" کے الفاظ زیادہ بہتر ہیں۔

بہرصورت (کوئی بھی الفاظ پڑھے جائیں) استعاذہ آدمی کے دل کو ہر اس چیز سے پاک اور صاف کر دیتا ہے جو آدمی کے دل کو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے۔

"اعوذباللّٰہ" پڑھنے کے لطائف

جب بندہ یہ الفاظ کہتا ہے:

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. میں شیطان مردود (کے وسوسوں) سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

(۱) تو وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ میں بالکل عاجز' ناتواں اور کمزور ہوں۔

(۲) اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قادر مطلق اور بے نیاز ذات ہے۔ وہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کو دور کرے۔

(۳) ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ شیطان میرا کھلا دشمن ہے۔

اس لیے استعاذہ میں (درحقیقت) اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ہے جو کہ شیطان مردود کے وسوسوں کو دور کرنے پر قادر ہے اور بندے سے شیطانی وساوس کو دور کرنا' اللہ کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے۔)

سُورۃ الفاتحہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جونہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے O نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے O روزِ جزاء کا مالک ہے O ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں O ہمیں سیدھے راستہ پر چلا O (یعنی) ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' نہ کہ ان کا راستہ جن پر (تیرا) غضب ہوا اور نہ ہی گمراہوں کا O

مختصر تعارف

اس سورت میں بالاتفاق سات آیات ہیں اور ستائیس کلمات ہیں اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔ البتہ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی یا مدینہ میں؟ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا ہے۔ حضرت مجاہد کے نزدیک اس کا نزول مدینہ میں ہوا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ سورت دو مرتبہ نازل ہوئی' ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں اور ایسا اس لیے ہوا تا کہ لوگوں کو اس سورت کے مقام و مرتبہ اور اس کی فضیلت سے آگاہ کر دیا جائے۔

سورۂ فاتحہ کے دیگر نام

اس سورت کے کئی نام ہیں اور یہ بھی اس کی فضیلت کی ایک وجہ ہے کیونکہ کسی چیز کے ناموں کا زیادہ ہونا اس چیز کے مقام اور فضیلت پر دلیل ہوتا ہے۔

اس کا پہلا نام ''فاتحۃ الکتاب'' ہے۔ کیونکہ اسی سے قرآن کریم کا آغاز ہوا' مصاحف کی کتابت اور نماز کا آغاز بھی اسی سورت سے کیا جاتا ہے۔

دوسرا نام اس سورت کا ''الحمد'' ہے۔ کیونکہ اس سورت کا آغاز الحمد للہ سے ہے۔ تیسرا نام اس سورت کا ''امّ القرآن'' ہے۔ کیونکہ ''ام'' کا معنیٰ ہے اصل' اور یہ سورت بھی قرآن کی اصل ہے اس لیے اس کو ''امّ القرآن'' کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ سورت بعد میں آنے والی دیگر سورتوں کی امام اور ان سے آگے ہے اس لیے اس کو ''امّ القرآن'' کہا جاتا ہے۔

چوتھا نام اس سورت کا ''السبع المثانی'' ہے۔ (کیونکہ ''سبع'' کا معنیٰ ہے سات اور اس سورت میں سات آیتیں ہیں) اور مثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر نماز میں اس کو دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے اور ہر رکعت میں اس کی قرأت کی جاتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو امت محمدیہ کے لیے مستثنیٰ فرما لیا ہے اور کسی امت پر اس کو نازل نہیں فرمایا

اس لیے اس کو مثانی کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سورت کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے اس لیے اس کو مثانی کہا جاتا ہے۔

پانچواں نام اس سورت کا ''الـوافیه'' ہے۔ کیونکہ ''وافیه'' کا معنیٰ ہے مکمل اور پوری۔ چونکہ اس سورت کو نماز میں آدھا آدھا کر کے نہیں پڑھا جاتا اور باقی سورتوں کو تقسیم کر کے پڑھا جاتا ہے اس لیے اس کو الوافیه کہتے ہیں۔

چھٹا نام اس سورت کا ''الـکـافیـه'' ہے۔ کیونکہ نماز میں اس سورت کو دوسری سورتوں کے بدلہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس کے بدلہ کسی سورت کو نہیں پڑھا جا سکتا اس لیے اس کو ''الکافیه'' کہا جاتا ہے[۵۴]۔

سورۂ فاتحہ کے فضائل

(۴۳) حضرت ابوسعید بن معلّٰی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز ادا کر رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا' میں نے جواب نہیں دیا۔ پھر (میں نماز سے فارغ ہونے کے بعد) حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) ارشاد نہیں فرمایا کہ تم اللہ اور اس کے رسول کے بلانے پر فوراً حاضر ہو جاؤ جب وہ تمہیں بلائیں[۵۵]۔ (الانفال:۲۴) پھر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میں تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے تمہیں ضرور بہ ضرور ایک ایسی سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ عظمت والی ہے۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور جب باہر نکلنے کا ارادہ فرمایا تو میں نے عرض کیا: آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں تمہیں ضرور ایک ایسی سورت سکھاؤں گا جو

---

۵۴ علامہ خازن نے سورۂ فاتحہ کے چھ نام گنائے ہیں' ان میں سے ایک کے ماسوا ہر نام کے متعلق احادیث موجود ہیں جن کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے:

(۱) فاتحۃ الکتاب: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز میں فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) نہ پڑھی اس کی نماز (کامل) نہیں ہے۔ (سنن ترمذی:۲۴۷) (۲) الحمد (۳) امّ القرآن (۴) السبع المثانی: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ امّ القرآن ہے' ام الکتاب ہے اور سبع مثانی ہے۔ (سنن دارمی:۳۳۷۴) ایک حدیث میں فرمایا: جس شخص نے (نماز میں) امّ القرآن نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہیں۔ (صحیح مسلم:۳۹۴) ایک اور حدیث میں فرمایا: الحمد للہ رب العالمین (یعنی سورۂ فاتحہ) یہ سبع مثانی ہے۔ (صحیح بخاری:۴۴۷۴) سورۂ فاتحہ کا نام ''السبع المثانی'' خود قرآن حکیم کی سورت الحجر:۸۷ میں موجود ہے۔ (۵) الوافیہ: امام رازی اور علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا نام ''الوافیہ'' حضرت سفیان بن عیینہ نے لکھا ہے۔ (۶) الکافیہ: اگرچہ صراحت کے ساتھ اس نام کے متعلق حدیث شریف مجھے نہیں ملی' لیکن ''الکافیہ'' کا جو مفہوم علامہ خازن اور دیگر مفسرین نے بیان فرمایا ہے وہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔ الکافیہ کا مفہوم (وجہ تسمیہ) یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک ایسی سورت ہے جس کو نماز میں دوسری سورتوں کے بدلہ میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس کے بدلہ میں کسی دوسری سورت کو نہیں پڑھا جا سکتا۔ یہ مفہوم حدیث شریف سے ثابت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: امّ القرآن (سورۂ فاتحہ) دوسری سورتوں کا بدل ہے اور دوسری کوئی سورت اس کا عوض نہیں ہے۔ (المستدرک ج ۱ص ۲۳۸' کنز العمال:۲۵۰۷) سورۂ فاتحہ کے دیگر ناموں کی تفصیل اور ان کے دلائل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ۱ص ۱۳۷

۵۵ رسول اللہ ﷺ کے اس جواب سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص حالت نماز میں ہو اور اس کو نبی اکرم ﷺ بلائیں تو اسے فوراً حاضر ہونا واجب ہے کہ نماز درحقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا نام ہے۔ علامہ علی قاری حنفی امام طیبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ (حالت نماز میں) رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہنا اور آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونا نماز کو باطل نہیں کرتا۔ جیسا کہ نماز میں ''السلام علیک ایها النبی'' کہہ کر نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرنا نماز کو باطل نہیں کرتا۔

(مرقات ج ۴ص ۶۲۴)

قرآن میں سب سے زیادہ عظمت والی ہے تو آپ نے پڑھا:[٥٦] ''الحمد لله رب العالمین'' (اور فرمایا:) یہ سبع مثانی ہیں (یعنی سات آیتیں ہیں جو دہرائی جاتی ہیں) اور یہی قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے۔

(صحیح بخاری: ۴۴۷۴، صحیح ابن حبان ج ۳ ص ۵۶، مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۴، سنن دارمی: ۳۳۷۱۔ ج ۲ ص ۵۳۸)

☆ مؤطا امام مالک اور سنن ترمذی میں یہی روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ہے یعنی ان کو نبی اکرم ﷺ نے آواز دی اور وہ نماز ادا کر رہے تھے اور اس روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا: تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے تمہیں ایک ایسی سورت معلوم ہو جائے گی جس کی مثل تورات، انجیل اور خود قرآن میں نہیں ہے۔ سنن ترمذی میں یوں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابی بن کعب سے فرمایا:

کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی سورت سکھاؤں جس کی مثل تورات، انجیل، زبور اور خود قرآن میں نہیں ہے۔

(مؤطا امام مالک ج ۱ ص ۹۴، سنن الترمذی: ۲۸۷۵، مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۷، شرح السنۃ: ۱۱۸۴۔ ج ۴ ص ۴۴۴)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

(٤٤) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل نے تورات اور انجیل میں سے کسی میں بھی ''ام القرآن'' (سورۂ فاتحہ) کی مثل نازل نہیں[٥٧] فرمائی اور یہ سات آیتیں ہیں جو دہرائی جاتی ہیں اور یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم کردی گئی ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ (مجھ سے) سوال کرے۔

(سنن ترمذی: ۳۱۲۵، سنن نسائی: ۹۱۳)

(٤٥) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''الحمد لله رب العالمین'' قرآن اور کتاب کی ''اُم'' (یعنی اصل[٥٨]) ہے اور یہ سات آیتیں ہیں جو دہرائی جاتی ہیں۔

(سنن ابوداؤد: ۱۴۵۷، سنن ترمذی: ۳۱۲۴، سنن دارمی: ۳۳۷۴۔ ج ۲ ص ۵۳۹، مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۸)

---

٥٦ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوسعید سے پہلے وعدہ فرمایا کہ میں تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے تمہیں ضرور ایک ایسی سورت سکھاؤں گا جو قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ عظمت والی ہے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ چاہتے تو اسی وقت انہیں وہ سورت سکھا دیتے۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ فرمایا تب بھی از خود آپ نے توجہ نہیں فرمائی بلکہ حضرت ابوسعید کے عرض کرنے پر آپ نے وہ سورت ارشاد فرمائی، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ حضرت ابوسعید کا ذہن مکمل طور پر اس سورت کی طرف متوجہ ہو جائے، اور ان کی طبیعت میں رغبت اور ذوق وشوق مزید بڑھ جائے۔ تاکہ جب انہیں اس سورت کی تعلیم دی جائے تو ان کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے۔

(مرقات ج ۴ ص ۶۲۴ بتوضیح)

٥٧ اس حدیث سے ان علماء کی تائید ہوتی ہے جنہوں نے السبع المثانی کی تشریح یہ کی ہے کہ سورۂ فاتحہ امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا تحیۃ) کی خصوصیت ہے۔

٥٨ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کو پورے قرآن کی اصل اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس سورت کی تمام آیتیں مُحکم ہیں، یعنی ان میں کسی قسم کے نسخ اور تبدیل کا احتمال نہیں ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ''۔ (آل عمران: ۷) یعنی قرآن کی کچھ آیتیں محکم ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ قرأت میں دیگر سورتوں کی امام ہے اور سب سے پہلے پڑھی جاتی ہے اس لیے اس کو پورے قرآن کی امّ اور اصل قرار دیا گیا۔ (شرح سنن ابوداؤد ج ۵ ص ۳۷۱)

(٤٦) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن جبرائیل علیہ السلام نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بیٹھے ہوئے تھے' اچانک رسول اللہ ﷺ نے ایک آواز سنی۔ نبی ﷺ نے سراُوپر اٹھایا۔ حضرت جبریل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جس کو صرف آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے اس کو کبھی نہیں کھولا گیا۔ پھر اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا تو جبریل نے کہا: یہ آج سے پہلے زمین کی طرف کبھی نازل نہیں ہوا۔ اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: آپ کو ان دو[٥٩] نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کا آخری حصہ۔ آپ ان میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے آپ کو اس کے مطابق دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم: ٨٠٦' سنن نسائی: ٩١٢' مستدرک ج١ص ٥٥٨' الترغیب والترہیب: ٢١٥٣۔ ج٢ص ٣٤٣)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''نقیض'' اس کا معنیٰ ہے: آواز' جو دروازہ کھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(٤٧) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ایسی نماز پڑھی جس میں اس نے سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھا تو اس کی نماز ناقص ہے' ناقص ہے' ناقص ہے اور نامکمل ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا: اے ابو ہریرہ! میں بسا اوقات امام کے پیچھے ہوتا ہوں (تو میں کیا کروں؟) تو حضرت ابو ہریرہ نے میرا بازو دباتے ہوئے مجھے کہا کہ اے فارسی! تم اس کے معانی میں غور وفکر کیا کرو۔ کیونکہ بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: میرے اور میرے بندہ کے درمیان سورۂ فاتحہ کو تقسیم کر دیا گیا ہے تو اس کا آدھا حصہ میرے لیے اور آدھا حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اس کو ملے گا۔ جب بندہ کہتا ہے: ''الحمد للہ رب العالمین'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی۔ پھر جب وہ ''الرحمن الرحیم'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مالک یوم الدین'' تو اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعظیم کی اور کبھی فرماتا ہے: میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے حوالہ کر دیا۔ پھر جب بندہ کہتا ہے: ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اسے ملے گا۔ پھر جب کہتا ہے: ''اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' تو اللہ عزوجل فرماتا ہے یہ میرے بندہ کے لیے ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اس کو ملے گا۔

(صحیح مسلم: ٣٩٥' سنن ترمذی: ٢٩٥٣' سنن ابوداؤد: ٨٢١' سنن ابن ماجہ: ٨٣٨۔ ٣٧٨٤' صحیح ابن حبان: ١٧٧٦۔ ج٣ص ٥٤' مسند احمد ج٢ص ٢٤١)

حدیث مذکور: (٤٧) کی مختصر تشریح

حدیث مذکور میں مختلف الفاظ اور جملے آئے ہیں جن کی کچھ تشریح اور وضاحت پیش خدمت ہے:

''خداج'': اس کا معنیٰ ہے ناقص اور نامکمل۔

''غمز ذراعی'': حضرت ابو ہریرہ نے اپنے ہاتھ سے میرے بازو کو دبایا۔

''قسمت الصلاۃ'': ''صلاۃ'' سے یہاں (سورۂ فاتحہ کی قرأت مراد ہے' کیونکہ آگے ''صلاۃ'' کی قرأت ہی سے تفسیر کی گئی ہے اور اس لیے بھی کہ قرأت نماز کا ایک رکن اور جزء ہے۔ سو یہاں کل بول کو جزء مراد لیا گیا ہے)۔

٥٩ علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کو اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کو جو نور فرمایا گیا اس سے ان کی عظمت اور ثواب عظیم کی طرف اشارہ ہے' یا اس لیے نور فرمایا گیا کہ یہ آیات اپنے پڑھنے والے کے لیے پل صراط پر روشنی کا باعث ہوں گی' یا جس طرح نور رہنمائی کرتا ہے اسی طرح یہ آیات بھی راہِ حق کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں۔ (مرقات ج٤ص ٦٣٤)

''نصفین'': میرے اور میرے بندے کے درمیان سورۂ فاتحہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہاں تقسیم سے مراد یہ نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ کے الفاظ خالق اور مخلوق کے درمیان منقسم ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اس سورت کا معنیٰ اور مضمون منقسم ہیں۔ کیونکہ معنوی اعتبار سے اس سورت کا نصف حصہ ثناء پر مشتمل ہے اور دوسرا نصف حصہ دعا پر مشتمل ہے۔ ''الحمد'' سے لے کر ''ایاک نعبد'' تک اللہ عزوجل کی ثناء اور تعریف ہے اور ''ایاک نستعین'' کا تعلق دعا سے ہے۔ اس لیے حدیث مذکور میں ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' کے متعلق اللہ عزوجل نے فرمایا کہ ''یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اسے ملے گا''۔

''حمدنی عبدی و مجدنی'': حمد اور مجد سے مراد تعریف اور ثناء ہے۔ کیونکہ حمد کا معنیٰ ہے: اچھے کاموں پر کسی کی تعریف کرنا اور تمجید کا معنیٰ ہے: صفات جلال کی تعریف کرنا۔ ایک قول یہ ہے کہ تحمید اور تمجید دونوں کا معنیٰ تعظیم کرنا ہے۔

''قال مرة فوض الی عبدی'': جب بندہ کہتا ہے: ''مالک یوم الدین'' تو اللہ عزوجل کبھی اس کے جواب میں یہ بھی فرماتا ہے کہ میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے حوالہ کر دیا۔ اللہ عزوجل کے اس جواب کی ''مالک یوم الدین'' کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا معاملہ کسی کے سپرد کر دیتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے تو کہا جاتا ہے: ''فلان فوض امره الی فلان'' فلاں شخص نے اپنا معاملہ فلاں کے سپرد کر دیا۔

☆ حدیث مذکور میں اس بات پر دلیل ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کو پڑھنا واجب ہے[۶۰] اور یہ بھی ثابت ہوا کہ سورۂ فاتحہ قرأت کا معیّن رکن[۶۱] ہے۔ امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ آگے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے بعد ان شاء اللہ یہ مسئلہ (وضاحت کے ساتھ) بیان ہوگا۔ واللہ اعلم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے

۶۰ احناف کا بھی یہی مؤقف ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے یعنی اس کی ساتوں آیتیں پڑھنا واجب ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: (سورۂ فاتحہ کی) ہر آیت مستقل واجب ہے۔ ان میں ایک آیت بلکہ ایک لفظ کا ترک بھی ترک واجب ہے۔ (بہار شریعت ج ۳ ص ۴۱) لہٰذا اگر کسی نے فرض نماز کی پہلی دو رکعتوں میں اور وتر، سنت اور نوافل کی کسی بھی رکعت میں سورۂ فاتحہ چھوڑ دی یا اس کی کوئی آیت یا کوئی لفظ چھوڑ دیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

۶۱ یہ امام شافعی کا مؤقف ہے اور ان کے نزدیک اس کے معیّن رکن ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوگی۔ احناف کے نزدیک سورۂ فاتحہ نماز کا معیّن رکن نہیں ہے بلکہ کوئی بھی سورت نماز کا معیّن رکن نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں اللہ عزوجل نے مطلقاً ارشاد فرمایا: ''فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ''۔ (المزمل: ۲۰) قرآن سے جو تمہیں آسان ہو پڑھ لیا کرو۔
اللہ عزوجل کے اس صریح فرمان کی وجہ سے احناف نے کسی بھی سورت کو قرأت کا معیّن رکن قرار نہیں دیا، بایں معنیٰ کہ اس کے بغیر نماز ہی نہ ہو۔ ہاں سورۂ فاتحہ کو اور اس کے ساتھ کم از کم تین چھوٹی آیات یا ان تین کے برابر ایک بڑی آیت کو واجب قرار دیا ہے کہ اگر ان میں کچھ کمی کی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

بسم اللہ کی باء کے مسائل

بسم اللہ میں باء حرف جار (زیر دینے والا حرف) ہے۔ جیسے اور حروف جارہ (من اور عن وغیرہ) اپنے بعد آنے والے اسم کو زیر دیتے ہیں اسی طرح یہ بھی اپنے مابعد کو زیر دیتا ہے۔

بسم اللہ کی باء کا متعلق مضمر (پوشیدہ) ہے۔ جیسا کہ کلام ہی سے معلوم ہو رہا ہے اور اصل عبارت یوں ہے: ''ابداء بسم اللہ'' (اللہ کے نام سے میں آغاز کرتا ہوں) یا ''بسم اللہ ابدء أو اقرء'' (اللہ کے نام سے میں آغاز کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں)۔

صرف بسم اللہ کی باء کو لمبا کر کے لکھا جاتا ہے اور تخفیفاً اس کے الف کو گرا دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ الف کو گرا کر اس کا طول باء کو دے دیا گیا تا کہ معلوم ہو کہ یہاں سے الف کو گرایا گیا ہے۔ جہاں تک ''فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ'' میں ''باسم'' کے ساتھ الف لکھنے کا تعلق ہے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ بسم اللہ کے مقابلہ میں اس آیت کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ (فلا حاجة الی التخفیف)

بسم اللہ کی باء کو لمبا کر کے لکھنے کی بعض علماء نے وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ چونکہ بسم اللہ کے ذریعہ قرآن کریم کا آغاز کیا جاتا ہے اس لیے باء کو لمبا کر کے لکھنا چاہیے تا کہ قرآن کا آغاز ایک معظم حرف کے ساتھ ہو اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ باء ظاہری اعتبار سے جھکا ہوا حرف ہے' سو جب اس کو اللہ عزوجل کے نام مبارک سے ملایا جائے گا تو یہ بلند ہوگا' اس لیے اسے لمبا کر کے لکھنا چاہیے۔

ایک قول یہ ہے کہ حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ اپنے کاتبین سے فرمایا کرتے تھے:

طولوا الباء من بسم الله واظهروا السين و دوروا الميم تعظيما لكتاب الله عزوجل.

بسم اللہ کی باء کو لمبا کر کے لکھا کرو' سین کے دندانے ظاہر کرو اور میم کو اچھی طرح گول بنایا کرو کہ اس میں اللہ عزوجل کی کتاب کی تعظیم ہے۔

اسم اپنے مسمّٰی کا عین ہوتا ہے یا غیر؟

کسی بھی شی کے اسم اور نام سے متعلق علماء کے دو گروہ ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک اسم اور مسمّٰی (یعنی نام اور ذات) میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اسم اپنے مسمّٰی کا عین ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ٪اسْمُهٗ يَحْيٰى. (مریم: ۷)

بے شک ہم تمہیں ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں' جن کا نام یحییٰ ہے۔

اس آیت میں فرمایا کہ جس لڑکے کی ہم خوشخبری دے رہے ہیں اس کا نام یحییٰ ہے۔ پھر اسی سورت کی آیت: ۱۲ میں حضرت یحییٰ کو ان کے نام سے پکارا: ''یا یحیی'' (اے یحییٰ!)۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ (الاعلیٰ: ۱)

پاکی بیان کیجئے اپنے رب کے نام کی جو سب سے بلند ہے ○

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِى الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○ (الرحمٰن: ۷۸)

بڑی برکت والا نام ہے آپ کے رب کا جو نہایت عظمت اور بزرگی والا ہے ○

ان آیات سے ثابت ہوا کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں متحد اور ایک ہیں۔

علماء کا یہ قول مضبوط نہیں ہے۔ صحیح اور مختار قول وہ ہے جو دیگر علماء کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم اپنے مسمّٰی کا بھی غیر ہوتا ہے اور فعلِ تسمیہ یعنی نام رکھنے کا بھی غیر ہوتا ہے اور کسی بھی چیز کا اسم (نام) وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس چیز کی پہچان حاصل ہو۔ اب ہم اسم اور مسمّٰی کے غیر ہونے پر دلائل اور قولِ اوّل پر دیئے گئے دلائل کے جوابات ذکر کر رہے ہیں:

اسم اور مسمّٰی کے ایک دوسرے کے غیر ہونے پر پہلی دلیل یہ ہے کہ اسم مختلف آوازوں اور چند ایسے حروف سے مل کر بنتا ہے جو اس اسم کے مصداق اور مسمّٰی کی ذات پر دلالت کرتے ہیں۔ اسم کی اس حقیقت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسم اپنے مسمّٰی کا غیر ہوتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض اوقات ذات ایک ہوتی ہے اور نام اس کے زیادہ ہوتے ہیں۔ جیسے خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى . (الاعراف:۱۸۰) اور سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چیزیں کئی ہوتی ہیں لیکن ان کا نام ایک ہی ہوتا ہے جیسے اسمائے مشترکہ۔ سو کبھی ذات کا ایک ہونا اور اس کے ناموں کا زیادہ ہونا یا کئی اشیاء کا ایک نام ہونا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسم اپنے مسمّٰی کا غیر ہوتا ہے۔

تیسری دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

فَادْعُوْهُ بِهَا . (الاعراف:۱۸۰) تو تم ان (ہی) ناموں سے اُسے پکارو۔

اس آیت میں اس بات کا حکم فرمایا جارہا ہے کہ اللہ عزوجل کو اس کے ناموں کے ذریعہ پکارا جائے یعنی پکارنے کا ذریعہ اس کے مختلف نام ہیں اور جس کو پکارا جارہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یقیناً جس کو پکارا جائے اور جس کے ذریعہ پکارا جائے یہ دونوں چیزیں آپس میں ایک دوسرے کی غیر ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اسم اپنے مسمّٰی کا غیر ہوتا ہے۔

رہے وہ دلائل جو قولِ اوّل (اسم اور مسمّٰی کے عین ہونے) پر دیئے گئے ہیں ان کے جوابات درج ذیل ہیں:

پہلی دلیل (انا نبشرک بغلام اسمه یحیی) کا جواب یہ ہے کہ اس میں اسم سے ایک مکمل ذات مراد ہے جس کو (فوراً ہی) یحییٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نفسِ اسم مراد نہیں ہے۔

دوسری دلیل (سبح اسم ربک اور تبارک اسم ربک) کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اسم کو ربّ کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اب اگر اسم اپنے مسمّٰی کا عین ہو تو ایک ہی شیئ کی اپنے آپ کی طرف اضافت لازم آئے گی جو کہ محال اور ناممکن ہے۔

اس دلیل کا بعض علماء نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ ان آیات میں اللہ عزوجل کے نام کی پاکی بیان کرنے کا حکم اور نام کے مبارک ہونے کا بیان اس لیے فرمایا گیا ہے (تاکہ معلوم ہو کہ) جس طرح اللہ عزوجل کی ذات کو عیوب سے پاکیزہ جاننا ضروری ہے اسی طرح اس کے ناموں کو بھی پاکیزہ جاننا ضروری ہے۔

☆ ہم نے اس بحث کے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ اسم فعل تسمیہ یعنی نام رکھنے کا بھی غیر ہوتا ہے' اس سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پہچان کے لیے خاص لفظ معین کرنا ''تسمیہ'' کہلاتا ہے اور جو لفظ معین کیا جائے اس کو اسم کہتے ہیں۔ اس سے بھی بالکل واضح ہو گیا کہ اسم اپنے مسمّٰی کا غیر ہوتا ہے۔

لفظ اسم کے اشتقاق میں علماءِ بصرہ وکوفہ کا اختلاف

بصری علماء کے نزدیک اسم "سمو" (بمعنیٰ بلندی) سے مشتق ہے۔ لہٰذا کسی بھی چیز کا نام اسے کہا جائے گا جو اس چیز کو بلند اور ظاہر کردے اور خود وہ اسم اس چیز پر بلند ہو۔ یہاں تک کہ اس کے معنیٰ پر بلند ہو اور اس چیز کے لیے علَم اور نشانی بن جائے۔

کوفی علماء کے نزدیک اسم "سمة" (بمعنیٰ علامت) سے مشتق ہے۔ گویا اسم اپنے مسمّٰی کی علامت اور پہچان ہوتا ہے۔

بصری علماء دلیل یہ دیتے ہیں اگر اسم "سمة" سے مشتق ہوتا (جیسا کہ کوفیوں نے سمجھا ہے) تو اسم کی تصغیر وسیم اور جمع اَوسام آتی۔ حالانکہ یہ بات سب مانتے ہیں کہ لفظ اسم کی تصغیر "سُمَیٌّ" آتی ہیں اور جمع "اسماء" اور "أَسام" آتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اسم 'سمو سے مشتق ہے۔

لفظ اللہ اسم جلالت کی لفظی اور معنوی تحقیق

لفظ "اللہ" اللہ عزوجل کا ذاتی نام ہے اور صرف اُسی کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ نہ یہ لفظ کسی سے بنا ہے نہ ہی کوئی اور اس میں شریک ہے (اس کا مصداق صرف اور صرف اللہ عزوجل کی ذات ہے۔) یہی قول صحیح اور مختار ہے اور اس پر دلیل خود اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ۝ (مریم:۶۵) کیا تم اس کے نام کا کوئی دوسرا جانتے ہو ۝

یعنی اس کے سوا کسی کا نام "اللہ" نہیں ہے۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ لفظ "الاهة" (باب فتح) سے بنا ہے یعنی عبادت کرنا' جیسے کہتے ہیں: "عبد یعبد عبادةً"۔

اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۔ (الاعراف:۱۲۷)

(فرعون کی قوم کے سرداروں نے فرعون سے کہا:) کیا تو موسیٰ اور ان کے لوگوں کو چھوڑ دے گا کہ وہ زمین میں فساد کرتے پھریں اور موسیٰ تجھے اور تیری عبادت کو چھوڑے رہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ لفظ "اللہ" ولــه سے بنا ہے' جس کا معنیٰ ہے: فریاد کرنا۔ چونکہ مخلوق بھی اپنی حاجتوں میں اس سے فریاد کرتی ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے اور کسی شاعر کا اسی معنیٰ میں ایک شعر ہے:

ولهـت اليـكـم فـى بـلايـا تنوبنـى فـالـفـيتـكـم فيهـا كـرائـم محـتـد

"میں نے اپنے آپ پر آنے والی مسلسل تکالیف میں آپ سے فریاد کی۔ تو میں نے آپ کو تکالیف دور کرنے میں بہت ہی عالی نسب پایا"۔

ایک قول یہ ہے کہ اسم جلالت "الـه" سے بنا ہے۔ جس کا معنیٰ ہے: کسی سے راحت اور سکون حاصل کرنا۔ چونکہ مخلوق بھی اللہ عزوجل کی پناہ میں سکون اور اس کے ذکر سے چین حاصل کرتی ہے اس لیے اسے "اللہ" کہا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ لفظ اللہ کی اصل "ولاہ" ہے۔ واؤ کو الف سے تبدیل کردیا گیا اور "ولاہ وَلَــهٌ" سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے: فریاد کرنا اور پناہ لینا۔ چونکہ ساری مخلوق اسی کی طرف پناہ لیتی ہے۔

اسی معنیٰ کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اللہ عزوجل ہر چیز کا محبوب ہے کیونکہ ہر چیز اس کی ذات پر دلیل ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ہر چیز اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کررہی ہے۔ (بنی اسرائیل:۴۴)

لفظ اللہ اسم جلالت کی حیرت انگیز خصوصیت

اس لفظ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کسی بھی حرف کو کم کیا جائے' اس کی معنویت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہر صورت میں یہ اللہ عزوجل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ شروع سے اگر الف کو حذف کیا جائے تو باقی بچتا ہے ''لـلّٰه'' جس کا معنیٰ ہے: ''اللہ کے لیے''۔ اور اگر الف کی بجائے لام کو حذف کیا جائے تو باقی بچتا ہے ''الـہ'' جس کا معنیٰ ہے: ''عبادت کا مستحق''۔ اور اگر الف اور لام دونوں کو حذف کر دیا جائے تو باقی بچے گا ''لـــہ'' یعنی اُسی کے لیے۔ اور اگر الف اور دونوں لام حذف کر دیئے جائیں تو باقی بچے گا ''ھو'' جس کا معنیٰ ہے وہ۔ (''ھو'' میں واؤ ضمہ کے بدلہ میں ہے۔)

بعض علماء کا قول ہے کہ اسم جلالت ''اللہ'' ہی اسم اعظم[۶۲] ہے۔ کیونکہ یہ لفظ اس کی ذات پر دلیل ہے۔ جبکہ باقی نام اس کی مختلف صفات پر دلالت کرتے ہیں۔

لفظ رحمٰن اور رحیم کی تحقیق

رحمٰن کا معنیٰ ہے: نہایت رحم فرمانے والا اور رحیم کا معنیٰ ہے: بہت مہربان۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

ھما اسمان رقیقان احدھما ارق من الاخر. یہ دونوں نام اپنے اندر نرمی کا معنیٰ رکھتے ہیں لیکن ان میں سے ایک' دوسرے سے زیادہ نرمی کا مفہوم رکھتا ہے۔

---

۶۲ اسم اعظم سے مراد اللہ عزوجل کا وہ نام ہے جو اس کے تمام ناموں کا جامع ہو۔ (التعریفات للجرجانی' ص۲۲) اس بارے میں اختلاف ہے کہ اللہ عزوجل کے ننانوے ناموں میں وہ کون سا نام ہے جو تمام ناموں کا جامع (یعنی اسم اعظم) ہے؟ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں بہت تحقیق کے ساتھ ۱۴ اقوال ذکر کیے ہیں' جن میں اللہ عزوجل کے مختلف ناموں کو اسم اعظم قرار دیا گیا ہے۔ بعض نے لفظ ''ھو'' کو' بعض نے اسم جلالت ''اللہ'' کو' بعض نے ''اللہ الرحمن الرحیم'' کو' بعض نے ''الحی القیوم'' کو اور بعض نے دیگر اسماء کو اسم اعظم قرار دیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری ج۱۲ ص۵۲۶' مطبوعہ بیروت' ج۱۱ ص۲۲۴' مطبوعہ لاہور' تبیان القرآن ج۴ ص۴۲۹' شرح صحیح مسلم ج۷ ص۴۵۳)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی علیہ الرحمۃ نے امام غزالی کی کتاب ''المقصد الاسنٰی'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے ناموں میں اسم جلالت ''اللہ'' اسم اعظم ہے۔ کیونکہ یہ نام ایسا ہے جو اللہ عزوجل کی تمام صفات کا جامع ہے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے قطعاً استعمال نہیں کیا جاتا۔ (روح المعانی ج۹ ص۲۷۸' بیروت) امام رازی کا بھی یہی مختار ہے۔ (تفسیر کبیر ج۱ ص۱۱۱' مطبوعہ پشاور)

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اسم اعظم کا قائل نہیں ہے۔ اس طبقہ میں امام ابوجعفر طبری' امام ابوالحسن اشعری' ابو حاتم' قاضی ابوبکر باقلانی وغیرہم اکابر علماء شامل ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض ناموں کو بعض پر فضیلت دینا جائز نہیں ہے اس کے تمام ہی نام عظمت والے ہیں۔ امام جعفر صادق اور جنید وغیرہما نے کہا ہے کہ بندہ اپنے رب کے جس نام میں ڈوب کر دعا کرے وہی نام ''اسم اعظم'' ہے۔ (فتح الباری ج۱۲ ص۵۲۶)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ہر نام اسم اعظم ہے اور تمام ناموں میں سب سے بڑھ کر اسم ذات ''اللہ'' ہے' اس کا ورد اور اس کا تصور ہر قسم کی ترقی کا ذریعہ ہے' بزرگانِ دین نے اسی کے ذریعہ سے سب کچھ پایا ہے۔ اس کے ذکر وفکر سے کسی منزل میں جدا نہ ہوئے۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ جو کام کریں اس کے اوّل میں بسم اللہ پڑھیں کہ اس نام کی برکت ہمیشہ شامل حال رہے اور جو کچھ اسم اعظم کے فضائل ہیں سب اس میں موجود ہیں۔ کہنے کا طریقہ اور کہنے والے کی خصوصیت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ (فتاویٰ امجدیہ' ج۴ ص۳۶۵)

اس کے علاوہ علماء کے مختلف اقوال درج ذیل ہیں:

بعض علماء کے نزدیک رحمٰن اور رحیم دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے یعنی رحمت والا۔ جیسے ندمان اور ندیم بمعنیٰ ساتھی۔ اور ایک معنیٰ ہونے کے باوجود بسم اللہ میں دونوں کو اس لیے لایا گیا تاکہ تاکید پیدا ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ اللہ عزوجل کی طرف مائل ہونے والوں کے دلوں میں مزید محبت اور شوق پیدا ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ رحمٰن عام ہے اور رحیم خاص ہے۔ رحمٰن کا معنیٰ ہے: دنیا میں عطا فرمانے والا' اور یہ کافر اور مؤمن دونوں کو شامل ہے۔ کیونکہ وہ دنیا میں مؤمن کو بھی نوازتا ہے اور کافر کو بھی۔ جبکہ رحیم کا معنیٰ ہے: بہت بخشنے والا۔ اور یہ آخرت میں مؤمنین کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ کافروں کی بخشش نہیں ہوگی۔ اس لیے رحمٰن کا تعلّق دنیا سے اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے اور اسی لیے کہا جاتا ہے: دنیا میں رحمٰن (یعنی مؤمن وغیر مؤمن سب کو عطا فرمانے والا) اور آخرت میں رحیم (یعنی صرف مؤمنین کی بخشش فرمانے والا)۔

رحمت' رحمٰن اور رحیم کا مفہوم

رحمت کا معنیٰ ہے: بھلائی کا ارادہ کرنا اور بھلائی والوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے پیش آنا۔ بعض علماء نے رحمت کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ جو شخص سزا کا مستحق ہو اس کو سزا نہ دینا اور جو شخص کسی انعام و اکرام کا اہل نہ ہو اس کے ساتھ بھلائی کرنا' یہ رحمت ہے۔ پہلی صورت میں رحمت' اللہ عزوجل کی ذاتی صفت اور دوسری صورت میں فعلی صفت ہوگی۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل' رحمٰن یوں ہے کہ وہ مصیبتیں دور کرتا ہے اور رحیم یوں ہے کہ وہ گناہوں کی بخشش کرتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ رحمٰن اس طرح ہے کہ وہ مکمل طور پر راستہ کی وضاحت کرتا ہے اور رحیم اس طرح ہے کہ وہ (اس راہ پر چلنے میں غلطیوں سے) بچاتا ہے اور خیر پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

بسم اللہ کا حکم

بسم اللہ کے حکم میں دو اہم مسئلے بیان کیے جائیں گے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟ اور دوسرا مسئلہ یہ کہ نماز میں بسم اللہ جہراً (بلند آواز سے) پڑھی جائے یا سرًا (آہستہ)؟ دونوں مسئلوں کی تفصیل بالترتیب درج ذیل ہیں:

بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا اور (ماسوا سورۂ توبہ کے) دیگر سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟

بسم اللہ کے سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کے جزء ہونے میں علماء کے اختلاف ہے۔ امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی (مستقل) ایک آیت ہے اور ہر سورت کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی ہوتی ہے وہ بھی اُس سورت کی ایک آیت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت ابوہریرہ' حضرت سعید بن جبیر' حضرت عطاء' حضرت عبداللہ بن مبارک' امام احمد بن حنبل (ایک روایت کے مطابق) اور امام اسحٰق کا یہی مذہب ہے۔ امام بیہقی نے یہی قول حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم' حضرت ابن شہاب زہری' حضرت سفیان ثوری اور محمد بن کعب کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ (سنن کبریٰ ج۲ ص۴۵۔۵۰' شعب الایمان ج۲ ص۴۴۰)

اس کے برعکس امام اوزاعی' امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے اور (ابوداؤد کے اضافہ کے مطابق) دیگر سورتوں کی بھی آیت نہیں ہے' صرف سورۂ نمل کی آیت:۳۰ کا ایک جزء ہے اور سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی جاتی ہے وہ اس لیے لکھی جاتی ہے تاکہ ایک سورت دوسری سورت سے جدا ہو جائے اور (سورت کے آغاز

میں) بسم اللہ سے تبرک بھی حاصل ہو جائے۔ امام مالک علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ فرض نماز کے آغاز میں بسم اللہ نہیں پڑھی جائے گی اور امام شافعی جہاں بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا لازمی جزء قرار دیتے ہیں وہاں ان کا بھی ایک قول یہ ہے کہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی ہوتی ہے وہ ان سورتوں کا جزء نہیں ہے۔

جن علماء نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کی آیت قرار نہیں دیا' اُن کے دلائل

پہلی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ مشہور حدیث ہے جو کہ بخاری' مسلم دونوں میں موجود[٦٣] ہے۔ دوسری دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ درج ذیل حدیث ہے:

(٤٨) رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز تکبیر سے اور قرأت کا آغاز ''الحمد لله رب العالمين'' سے فرماتے تھے۔

(صحیح مسلم: ٤٩٨' سنن ابوداؤد: ٧٨٣' سنن ابن ماجہ: ٨١٢' مسند احمد ج ٦ ص ٣١' صحیح ابن حبان: ١٧٦٨' سنن دارمی: ١٢٣٦۔ ج ١ ص ٣٠٨)

علاوہ ازیں بسم اللہ کے سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کی آیت نہ ہونے پر ان علماء نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ پہلی وحی جو سیدنا جبریل امین نبی اکرم ﷺ کے پاس لے کر آئے اس کا آغاز یہ تھا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ (العلق: ١) (اے محبوب!) پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیاO

اس میں بسم اللہ کا ذکر نہیں ہے۔ (اگر بسم اللہ بھی اس سورت کا جزء اور آیت ہوتی تو اس کو یہاں ذکر کیا جاتا) لہٰذا یہ اس بات دلیل ہے کہ بسم اللہ سورت کا جزء نہیں ہے۔

علماء مذکورین نے اپنے موقف پر یہ دلیل بھی دی ہے کہ قرآن کے الفاظ تواتر اور نبی کریم ﷺ سے سن کر ہی ثابت ہوتے ہیں اور (یہ دلیل بھی دی ہے کہ) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کئی سورتوں پر اجماع اور اتفاق تھا (کہ بسم اللہ کے بغیر ان کی آیتیں ایک مخصوص تعداد میں ہیں' مثلاً) سورۃ الملک میں تیس آیتیں ہیں' سورۃ الکوثر میں تین آیتیں ہیں اور سورۃ الاخلاص میں چار آیتیں ہیں۔ اگر بسم اللہ سورۃ الاخلاص کا جزء ہوتی تو پھر اس کی کل پانچ آیتیں ہوتیں۔ (لیکن ایسا نہیں ہے' لہٰذا اس بات کی دلیل ہے کہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی ہوتی ہے وہ اُن سورتوں کا جزء نہیں ہے۔)

---

٦٣ اس سے علامہ خازن علیہ الرحمۃ کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی نماز کا آغاز الحمد لله رب العالمين سے کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ٧٤٣)

صحیح مسلم کی روایت اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی اور ان میں سے کسی کو میں نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی' یہ سب الحمد لله رب العالمين سے (قرأت کا) آغاز کیا کرتے تھے اور بسم اللہ کو نہ تو قرأت کے شروع میں ذکر کرتے تھے نہ قرأت کے آخر میں۔ (صحیح مسلم: ٣٩٩)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ نہ تو سورۂ فاتحہ کا جزء ہے نہ کسی اور سورت کا جزء ہے۔ اگر یہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہوتی تو رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنی قرأت کے آغاز میں اس کو بھی بلند آواز سے پڑھتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا' سو معلوم ہوا کہ بسم اللہ نہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے نہ کسی سورت کا اور یہی امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے۔

جن علماء نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کی آیت قرار دیا ہے' اُن کے دلائل

جن علماء کے نزدیک بسم اللہ' سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کی ایک آیت ہے ان کے احادیث سے دلائل درج ذیل[۶۴] ہیں:

(۴۹) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں بسم اللہ پڑھی اور اُسے ایک آیت شمار کیا[۶۵]۔

(شعب الایمان للبیہقی: ۲۳۱۸۔ ج ۲ ص ۴۳۵' المستدرک ج ۱ ص ۲۳۲)

(۵۰) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ عزوجل کے اس فرمان کا معنیٰ پوچھا گیا کہ ''بے شک ہم نے آپ کو دہرائی جانے والی سات آیتیں عطا فرمائیں'' آپ نے فرمایا: اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ کسی نے کہا کہ ساتویں آیت کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ ''بسم الله الرحمن الرحيم''[۶۶] ہے۔

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۵' جامع البیان لابن جریر: ۱۶۱۲۱' المستدرک ج ۱ ص ۵۵۱' الدر المنثور ج ۵ ص ۸۴' شرح السنہ للبغوی ج ۳ ص ۵۰)

---

۶۴ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کی ہر سورت کا جزء ہے ان کے مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے علامہ خازن نے چھ احادیث' پانچ آثارِ صحابہ اور دو عقلی دلائل ذکر کیے ہیں۔ ذیل کے حواشی میں بالترتیب ہم ان دلائل کے جوابات ذکر کریں گے۔ واضح رہے کہ علامہ خازن مسلکاً شافعی ہیں اور ان کا بھی یہی مؤقف ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کی ہر سورت کا جزء ہے۔

۶۵ علامہ بدرالدین عینی حنفی علیہ الرحمۃ اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس روایت کا مدار عمر بن ہارون بلخی پر ہے اور یہ مجروح راوی ہے' اس کے بارے میں کئی ائمہ نے کلام کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں اس سے کوئی حدیث روایت نہیں کرتا ہوں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ یہ بہت جھوٹا راوی ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ یہ متروک الحدیث ہے (یعنی اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی گئی ہے)۔ امام ابن جوزی' یحییٰ بن معین کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ یہ بہت ہی جھوٹا اور خبیث راوی ہے اس کی روایت کردہ حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۳۹۹)

علامہ عینی کے اس جواب سے معلوم ہوا کہ شوافع اور دیگر کا بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء ثابت کرنے کے لیے حضرت امّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس روایت کا مدار ایک ایسے راوی پر ہے جس کے بارے میں علماءِ رجال کو بہت کلام ہے اور اس پر سخت جرح کی گئی ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس روایت کا ایک اور جواب علامہ شہاب الدین خفاجی اور علامہ سید محمود آلوسی بغدادی نے دیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت ام سلمہ کی اس روایت کو ابن ملیکہ نے روایت کیا ہے اور حال یہ ہے کہ ابن ملیکہ کا سماع حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ثابت نہیں ہے' بلکہ مستزاد یہ ہے کہ ابن ملیکہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث ایسی روایت کی ہے جو زیر بحث حدیث کے مخالف ہے۔ لہٰذا حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زیر بحث روایت قابل استدلال نہیں ہے۔

(حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ج ۱ ص ۴۹' روح المعانی ج ۱ ص ۵۸)

۶۶ اس روایت کے علامہ عینی نے دو جواب دیئے ہیں' ایک جواب یہ دیا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالعزیز بن جریج ہے' اس کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ اس کی روایت کردہ حدیث کی متابعت نہیں کی جاتی۔ یعنی یہ راوی اپنے شیخ سے روایت میں متفرد ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت سے کھڑے ہوتے تو قرأت کا آغاز الحمد لله رب العالمين سے فرماتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم اور امام طحاوی نے روایت کیا ہے۔

(صحیح مسلم: ۵۹۹) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۵۱) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سورتوں کے درمیان فصل کو اس وقت جانا جب (ہر سورت کے لیے) بسم اللہ نازل ہوئی۔[۶۷] (سنن ابوداؤد: ۷۸۸، شعب الایمان ج ۲ ص ۴۳۸، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۳۱، مجمع الزوائد: ۱۰۸۰۶۔ ج ۷ ص ۱۸، کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۳ ص ۴۰)

☆ امام حاکم نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔

(۵۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم "الحمد لله رب العالمين" پڑھو تو "بسم الله" پڑھ لیا کرو۔ بے شک سورۂ فاتحہ قرآن اور کتاب کی اصل ہے اور وہ ایسی سات آیتیں ہیں جو دہرائی جاتی ہیں۔ اور "بسم الله الرحمن الرحيم" ان میں سے ایک آیت ہے۔[۶۸]

(سنن دارقطنی: ۱۱۷۷۔ ج ۱ ص ۳۱۰، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۵، جمع الجوامع للسیوطی: ۱۶۷۱، کنز العمال: ۱۹۶۶۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یہ حدیث صریح دلیل ہے اس بات پر کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔ اگر یہ اس کی آیت ہوتی تو نبی اکرم ﷺ دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ ضرور اس کو پڑھتے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۴۰۰)

تیسرا جواب حضرت ابن عباس کی اس روایت کا یہ ہے کہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ بسم اللہ کو (نماز میں) بلند آواز سے پڑھنا کیسا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تو دیہاتیوں کا طریقہ ہے۔ (شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۵۰)

امام طحاوی اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت کے خلاف ہے جس میں انہوں نے بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت قرار دیا ہے۔ (حوالہ سابق)

اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دو متعارض قول مروی ہیں اور جب ان کے اقوال آپس میں متعارض ہیں تو ان کے اس قول سے استدلال کرنا کیونکر درست ہوگا جو رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل سے معارض ہے؟ رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کرام کا عمل یہ تھا کہ قرأت کا آغاز "الحمد لله رب العالمين" سے کیا کرتے تھے اور بسم اللہ کو نہ تو قرأت کے شروع میں پڑھتے تھے نہ قرأت کے آخر میں (یعنی بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے)۔ ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ: ۶۳۔

۶۷ اس حدیث کو بسم اللہ کے جزء ہونے پر دلیل بنانا باعثِ حیرت ہے! یہ حدیث تو احناف کی مؤید ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو سورتوں کے درمیان فصل اور فرق کرنے کے لیے اتارا گیا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ ان سورتوں کا جزء ہے؟

احکام القرآن میں امام ابوبکر جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ نے اس حدیث سے احناف کے اسی مؤقف پر استدلال کیا ہے کہ بسم اللہ کو سورتوں کے درمیان فصل کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۴)

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی متوفی ۱۲۲۵ھ نے بھی اس حدیث سے احناف کے اسی مؤقف پر استدلال کیا ہے کہ بسم اللہ کو سورتوں کے درمیان فصل کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ (التفسیر المظہری ج ۱ ص ۳)

۶۸ اس حدیث میں ایک راوی نوح بن ابی بلال ہے۔ انہوں نے یہ حدیث حضرت سعید مقبری کے واسطے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے اور حضرت ابو ہریرہ نے نبی اکرم ﷺ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے امام ابوبکر جصاص حنفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میری کسی دن نوح بن ابی بلال سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے یہی حدیث سعید مقبری کے واسطے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کی اور اس کو مرفوع نہیں کیا (یعنی حدیث مذکور کو رسول اللہ ﷺ تک نہیں پہنچایا) اور جب کسی حدیث کی سند اور اس کو مرفوع کرنے میں اس طرح کا اختلاف ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۵۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ (سورۂ فاتحہ) اس طرح پڑھا کرتے تھے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم. الحمد للہ رب العالمین. الرحمن الرحیم"۔ اس طرح آخر تک۔ یعنی ہر ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھتے تھے اور اعرابی اعتبار سے ایک ایک آیت شمار کرتے تھے اور بسم اللہ کو ایک (مستقل) آیت شمار کرتے تھے اور "انعمت علیہم" پر آیت نہیں کرتے تھے۔ یعنی اسے علیحدہ آیت شمار نہیں کرتے[۶۹] تھے۔

(۵۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرماتے تھے کہ اچانک آپ کو اونگھ آ گئی پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ کس وجہ سے مسکرا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم. إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝[۷۰]"

(صحیح مسلم: ۴۰۰، سنن ابوداؤد: ۷۸۴، سنن نسائی: ۹۰۳، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۷۰۲، ج ۶ ص ۵۲۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) وہ حدیث اصلاً مضبوط نہیں ہے اور جب وہ مضبوط نہیں ہو گی تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو گا کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے۔

پھر زیر بحث حدیث میں یہ بھی ممکن ہے کہ آخری جملہ (بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہو کیونکہ بعض اوقات راوی اپنے قول اور حدیث میں فرق کے بغیر اپنا کلام حدیث میں شامل کر دیتا ہے اور احادیث میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ پس جس حدیث کی یہ کیفیت ہو اس میں چونکہ احتمال ہوتا ہے اس لیے اس کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز زیر بحث حدیث میں یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آخری جملہ اس اعتبار سے کہہ دیا ہو کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے جہراً بسم اللہ سُنی ہو اور اس کو سورۂ فاتحہ کا حصہ سمجھا ہو۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے جہراً بسم اللہ پڑھنے کی حدیث روایت کی ہے۔

(بر سبیل تسلیم) اگر یہ حدیث سند کے اضطراب اور مرفوع ہونے کے اختلاف سے خالی ہو اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول ہونے کا احتمال بھی ختم ہو جائے پھر بھی ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء قرار دیں کیونکہ (بطور آیت کے) اس کو ثابت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پوری امت سے یہ منقول ہو۔ (اور اس کے بارے میں ایسا نہیں ہے کہ ساری امت نے اس کو سورۂ فاتحہ کی آیت قرار دیا ہو۔) (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۱)

۶۹۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ہے جس کے بارے میں علامہ عینی کے حوالہ سے ہم حاشیہ نمبر ۶۵ میں علماءِ رجال کی آراء ذکر کر چکے ہیں۔ سو یہ حدیث بھی مدعا کے اثبات میں مفید نہیں ہے۔ نیز اسی راوی (عمر بن ہارون بلخی) کی وجہ سے اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ جیسا کہ سنن دار قطنی کے مخرّج الشیخ مجدی حسن نے زیر بحث حدیث کے تحت لکھا ہے۔

(دیکھئے: سنن دار قطنی ج ۱ ص ۳۰۶)

۷۰۔ صحیح مسلم کی شرح میں امام شرف الدین نووی شافعی نے بھی اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی ہوتی ہے وہ قرآن کریم کا حصہ ہے۔ (شرح مسلم، ج ۱ ص ۱۷۲، مطبوعہ کراچی)

استاذِ محترم مفسر قرآن حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہٗ تبیان القرآن میں اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے سورۂ کوثر سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو تبرکاً پڑھا ہے سورۂ کوثر کی آیت ہونے کے لحاظ سے نہیں پڑھا کیونکہ اگر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہر سورت کی ابتداء میں اس کا جز ہوتی تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن کریم کا اور (سورۃ التوبہ کے ماسوا) دیگر تمام سورتوں کا جزء ہے' اس پر ہمارے اصحاب (شوافع) کی جو سب سے بہترین دلیل ہے وہ یہ ہے کہ مصحف میں قرآن کریم کو جمع کرتے وقت صحابہ کرام نے بسم اللہ کو بھی (سورۃ التوبہ کے ماسوا) ہر سورت کے آغاز میں درج کیا۔ پھر کیسے کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام نے ایک سو تیرہ آیتیں وہ درج کر دیں جو قرآن کریم کا حصہ نہیں تھیں[۱] ۔ حالانکہ صحیح روایات سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت شمار کرتے تھے[۲] ۔ اور امام شافعی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) آپ پر سب سے پہلے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نازل ہوتی' حالانکہ صحیح بخاری اور دیگر کتب صحاح میں یہ تصریح ہے کہ آپ پر سب سے پہلے ''اقراء باسم ربک الذی خلق'' نازل ہوئی ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ پر سب سے پہلے یہی آیت نازل ہوئی ہے۔ (تبیان القرآن ج ا ص ۱۵۸)

عمدۃ القاری میں علامہ عینی نے اس جواب کو ایک اور مثال سے واضح کیا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ لکھی ہوتی ہے وہ ان سورتوں کا جز نہیں ہے' اس پر دلیل وہ حدیث بھی ہے جس کو اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم کی ایک سورت ایسی ہے جو آدمی کی شفاعت کرے گی' یہاں تک کہ اس آدمی کو بخش دیا جائے گا وہ ''تبارک الذی بیدہ الملک'' سورت ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۸۹۱' سنن ابوداؤد: ۱۴۰۰' سنن نسائی: ۷۱۰' سنن ابن ماجہ: ۳۷۸۶' مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۹' مستدرک ج ۲ ص ۴۹۷)

اگر بسم اللہ ہر سورت کا جز ہوتی تو نبی اکرم ﷺ اس حدیث میں بیان کردہ سورت کا آغاز بسم اللہ سے فرماتے' لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا لہٰذا معلوم ہوا کہ سورتوں کے آغاز میں لکھی جانے والی بسم اللہ ان سورتوں کا جز نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۴۰۷)

[۱] اس دلیل کے چند جوابات ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل اس پر تو حجت ہو سکتی ہے جو سرے سے اس بات کا منکر ہو کہ بسم اللہ قرآن کریم کا جز ہے' لیکن اس پر حجت نہیں ہو سکتی جو بسم اللہ کو قرآن کریم کی آیت مانتا ہے۔ احناف کثرہم اللہ کا مؤقف یہ ہے کہ بسم اللہ پورے قرآن کی ایک آیت ہے' اس کو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورت کے آغاز میں صحابہ کرام نے بسم اللہ کو برقرار رکھا' اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ بسم اللہ ان سورتوں کا جزء ہو۔ صحابہ کرام نے بسم اللہ کو اس لیے برقرار رکھا کہ وہ سورتوں کے درمیان فصل کے لیے نازل ہوئی تھی' نہ یہ بات کہ وہ اُن سورتوں کا جز ہے۔ فصل کے لیے نازل ہونے پر دلیل وہ حدیث ہے جس کو علامہ خازن ابوداؤد کے حوالہ سے ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حدیث نمبر ۱۵ اور احناف بھی یہی کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو سورتوں کے درمیان فصل اور فرق کرنے کے لیے اتارا گیا ہے۔ لہٰذا احناف پر اس بات کو حجت بنانا درست نہیں ہے کہ صحابہ کرام نے سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کو برقرار رکھا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ایک طرف صحابہ کرام کا عمل یہ تھا کہ انہوں نے بسم اللہ کو سورتوں کے آغاز میں برقرار رکھا' دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نماز میں معمول یہ تھا کہ بسم اللہ کو بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے اور اپنی قرأت کا آغاز ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' سے کیا کرتے تھے' نیز کئی مقامات پر نبی اکرم ﷺ نے مختلف سورتوں کا تذکرہ فرمایا اور ان کے آغاز میں بسم اللہ نہیں پڑھی۔ علاوہ ازیں پہلی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں تھا بلکہ ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ'' سے تھا اور اسی کو بالاتفاق پہلی آیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ صحابہ کرام کا سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کو برقرار رکھنا فصل کے لیے تھا اور حقیقتاً یہ ان سورتوں کا جز نہیں ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کرام اس کو نماز میں بلند آواز سے پڑھتے اور پہلی وحی کا آغاز بھی بسم اللہ سے ہوتا اور بسم اللہ ہی کو پہلی آیت قرار دیا جاتا۔

[۲] ان روایات کا جواب ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حاشیہ ۶۶' ۶۷

رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد والی سورت کے لیے بسم اللہ کو ترک نہیں فرماتے تھے[۳]۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مصحف میں صرف وہی لکھا جائے گا جو پڑھا جاتا ہے[۴]۔ امام شافعی کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی بسم اللہ کو ترک نہیں کرتے تھے اور آپ فرماتے تھے کہ شیطان نے قرآن والوں سے قرآن کی ایک بہترین آیت (بسم الله الرحمن الرحيم) کو چھین[۵] لیا۔

(شعب الایمان ج ۲ ص ۴۳۸' سنن کبریٰ ج ۲ ص ۵۰)

(۵۵) حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم ﷺ قرأت کس طرح فرماتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ قرأت میں الفاظ کو کھینچتے تھے۔ پھر حضرت انس نے ''بسم اللہ'' پڑھ کر بتائی اور اس میں انہوں نے ''بسم الله ' الرحمن ''اور''الرحيم '' کو کھینچا[۶]۔ (صحیح بخاری: ۵۰۴۶' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۶)

۳ے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بسم اللہ کو سورت کا جز سمجھتے تھے یا جز سمجھ کر اس کو پڑھا کرتے تھے بلکہ اس روایت کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اس بات کے قائل تھے کہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ موجود ہے وہ سورتوں کے درمیان فصل اور فرق کرنے کے لیے ہے' نہ یہ کہ وہ اُن سورتوں کا جز ہے اور یہی احناف کا مذہب ہے۔

۴ے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا یا قرآن مجید کی دیگر سورتوں کا جزء ہے' کیونکہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مطلقاً فرمایا کہ ''مصحف میں صرف وہی لکھا جائے گا جو پڑھا جاتا ہے'' اور یہ اس بات کے خلاف نہیں ہے کہ سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کو فصل کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ کیونکہ (فصل کے لیے نازل ہونے کے باوجود) آغازِ سورت کی بسم اللہ پڑھی جاتی ہے' یعنی تلاوت کرنے والے اسے پڑھتے ہیں اور جب اسے پڑھا جاتا ہے تو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق اسے قرآن کریم میں لکھا بھی جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول اس بات کو تو ثابت کرتا ہے کہ سورتوں کے آغاز میں لکھی جانے والی بسم اللہ کو چونکہ پڑھا جاتا ہے اس لیے اُسے قرآن کریم میں لکھا جاتا ہے' لیکن اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ اس بسم اللہ کو فصل کے لیے نازل کیا گیا ہو نہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ان سورتوں کا جز ہے۔

۵ے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا یا قرآن کریم کی دیگر سورتوں کا جزء ہے۔ البتہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جیسا کہ ان کے الفاظ (قرآن کی ایک بہترین آیت) سے واضح ہے اور یہی احناف کثرہم اللہ کا مذہب ہے۔

۶ے اس حدیث سے بھی ثابت نہیں ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ یا قرآن کریم کی کسی اور سورت کا جز ہے۔ کیونکہ اس میں نبی اکرم ﷺ کی قرأت کا طریقہ بیان کیا جا رہا ہے' نہ یہ بات کہ آپ ﷺ بسم اللہ کو فلاں سورت کے ساتھ بہ طور جزء پڑھتے تھے۔ پھر اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مطلقاً پوچھا گیا کہ ''نبی اکرم ﷺ قرأت کس طرح فرماتے تھے؟'' چونکہ سائل نے کسی خاص آیت اور سورت کے حوالہ سے نہیں پوچھا تھا اس لیے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہ طور مثال پڑھ کر بتا دیا کہ نبی اکرم ﷺ قرأت کس طرح فرماتے تھے۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ یا قرآن کریم کی کسی اور سورت کا جزء ہے' انتہائی تعجب خیز ہے۔ پھر مستزاد یہ کہ اس حدیث میں نماز کا بھی تذکرہ نہیں ہے' جس کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کیا جا سکے نبی اکرم ﷺ کا اس انداز سے بسم اللہ پڑھنا' سورۂ فاتحہ اور دیگر سورتوں کے ساتھ تھا یا نہیں تھا؟ اور یہ جہراً تھا یا سرًّا تھا؟ جب اس حدیث میں اس طرح کی کسی بات پر کوئی دلالت نہیں ہے تو اس سے یہ ثابت کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ بسم اللہ قرآن کریم کی کسی سورت کا جزء ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان تمام صحیح اور واضح دلائل سے ثابت ہو گیا کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ اور دیگر تمام سورتوں کا جزء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام نے مصاحف میں بسم اللہ کو متفقہ طور پر برقرار رکھا' حالانکہ ان کا مطلوب تو یہ تھا کہ قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کر کے اُسے ہر اس چیز سے پاک کر دیا جائے جو قرآن کریم سے متعلق نہیں ہے[۷] اور پھر وہ تو اس خوف کے ساتھ قرآن کریم کو جمع کرتے تھے کہ (خدانخواستہ) کہیں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مصحف میں (سورۂ فاتحہ کے اختتام پر) آمین کا لفظ بھی درج نہیں کیا حالانکہ یہ ثابت تھا کہ نبی اکرم ﷺ سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر سورتوں کے آغاز میں لکھی ہوئی بسم اللہ قرآن کریم کا جزء نہ ہوتی تو صحابۂ کرام اس کو جمع قرآن کے وقت مصحف میں درج نہ کرتے اور اس کا حکم بھی آمین کی طرح[۸] ہوتا!

نماز میں بسم اللہ کو جہراً (بلند آواز سے) پڑھا جائے یا سرًّا (آہستہ)؟

جیسا کہ دلائل سے واضح ہو چکا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا اور (ماسوا سورۂ توبہ کے) دیگر تمام سورتوں کا جزء ہے' لہٰذا اس کو نماز میں جہراً (بلند آواز سے) یا سرّاً (آہستہ) پڑھنے کا وہی حکم ہوگا جو سورۂ فاتحہ کا ہے۔ یعنی جن نمازوں میں سورۂ فاتحہ کو جہراً پڑھا جاتا ہے وہاں بسم اللہ کو بھی جہراً پڑھا جائے گا اور جن نمازوں میں سورۂ فاتحہ کو سراً پڑھا جاتا ہے ان میں بسم اللہ کو بھی سراً پڑھا جائے گا[۹]۔ صحابہ میں سے جنہوں نے بسم اللہ کو جہراً پڑھنے کا قول کیا ہے ان میں حضرت ابوہریرہ' حضرت عبد اللہ بن عباس' حضرت ابن عمر اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور تابعین اور تبع تابعین میں سے جنہوں نے بسم اللہ کو جہراً پڑھنے کا قول کیا ہے ان میں سعید بن جبیر' ابو قلابہ' ابن شہاب زہری' عکرمہ' عطاء' طاؤس' مجاہد' علی بن الحسین' سالم بن عبد اللہ' محمد بن کعب القرظی' ابن سیرین' ابن المنکدر' حضرت ابن عمر کے آزاد کردہ غلام نافع' زید بن اسلم' مکحول' عمر بن عبد العزیز' عمرو بن دینار اور مسلم بن خالد شامل ہیں۔ یہی امام شافعی کا مذہب ہے اور امام مالک کے شاگرد ابن وہب کا بھی ایک قول کے مطابق یہی موقف ہے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی قرأت کا جو طریقہ بیان کیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے آغاز میں بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسم اللہ کا تذکرہ بہ طور مثال کیا ہے' لہٰذا بسم اللہ متعین نہیں ہوگی اور جن بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نماز میں بسم اللہ پڑھا کرتے' ان کا یہ استدلال محل نظر ہے۔ (فتح الباری' بتغیر ما ج۹ ص۱۱۲)

۷ے اس دلیل کا جواب ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حاشیہ نمبر ۱۷

۸ے علامہ خازن کا یہ معارضہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ سورتوں کے آغاز میں جو بسم اللہ نازل کی گئی ہے وہ سورتوں کے درمیان فصل کے لیے نازل کی گئی ہے اس لیے بالاتفاق اسے قرآن کریم میں درج کیا گیا ہے۔ جب کہ ''آمین'' کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ''آمین'' کے بارے میں پوری امت کا اتفاق ہے کہ یہ قرآن کریم کا حصہ نہیں ہے' حتیٰ کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ قرآن کریم کا حصہ ہے' وہ دین سے خارج ہو جائے گا۔ کما قال العلامة العینی رحمهٗ الله. (عمدۃ القاری ج۴ ص۴۹۷)

چونکہ آمین قرآن کریم کا حصہ نہیں ہے اس لیے اسے قرآن مجید میں درج نہیں کیا گیا اور بسم اللہ چونکہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کا نزول سورتوں کے درمیان فصل کے لئے ہوا ہے اس لیے اس کو قرآن مجید میں درج کیا گیا ہے۔

۹ے یہ امام شافعی کا مذہب ہے' جیسا کہ عنقریب علامہ خازن علیہ الرحمۃ واضح کریں گے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ ہر نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مبارک اور ابوثور سے بھی یہی قول منقول ہے۔

دوسری طرف جو صحابہ کرام اس بات کے قائل تھے کہ بسم اللہ کو سراً پڑھا جائے گا ان میں حضرات خلفاء راشدین' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عمار بن یاسر' حضرت عبداللہ بن مغفل اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور تابعین و تبع تابعین میں سے جنہوں نے بسم اللہ کو سراً پڑھنے کا قول کیا ہے ان میں حسن بصری' شعبی' ابراہیم نخعی' قتادہ' اعمش اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ امام مالک' امام ابوحنیفہ' امام احمد اور دیگر ائمہ کا یہی مؤقف ہے۔

جن علماء نے نماز میں بسم اللہ کو جہراً پڑھنے کا قول کیا ہے ان کے دلائل[80]

پہلی دلیل درج ذیل حدیث ہے جس کو حضرت ابوہریرہ' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت انس' حضرت علی بن ابی طالب' حضرت سمرہ بن جندب اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے:

(۵٦) رسول اللہ ﷺ بسم اللہ کو جہراً (بلند آواز سے) پڑھا کرتے تھے[81]

(سنن دارقطنی ج۱ص ۳۰۷' المستدرک ج۱ص ۲۳۳' کنز العمال ج۸ص ۱۱٦)

(یہ حدیث اس بارے میں صریح اور واضح ہے کہ بسم اللہ کو جہراً پڑھا جائے گا) جبکہ سراً بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی صریح حدیث مروی نہیں ہے' ماسوا دو[82] روایتوں کے جو پیش کی جاتی ہیں' ان میں سے بھی ایک ضعیف ہے

---

۸۰ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں بسم اللہ کو زور سے پڑھا جائے گا (مثلاً امام شافعی وغیرہ) ان کے مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے علامہ خازن نے سات احادیث ذکر کی ہیں اور ساتھ ہی احناف کے دلائل کا رد کیا ہے۔ ذیل کے حواشی میں ہم علامہ خازن کے دلائل کے جوابات اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب پر دلائل ذکر کریں گے۔

۸۱ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغنانی رحمۃ اللہ نے اس حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جو جہراً (زور سے) بسم اللہ پڑھتے تھے وہ صحابہ کو تعلیم دینے کی غرض سے تھا' کیونکہ ایک دوسری حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز میں) بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتے تھے۔ (اب ان دونوں روایتوں میں جو ٹکراؤ ہے اس کو دُور کرنے کی صورت یہ ہے کہ جس میں بسم اللہ کو زور سے پڑھنے کا اثبات ہے اس کو تعلیم پر محمول کیا جائے اور جس میں زور سے پڑھنے کی نفی ہے اس کو عام معمول پر محمول کیا جائے۔) (ہدایہ اولین ص ۱۰۲' مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ' لاہور)

۸۲ یہ احناف کا رد ہے اور اس سے اشارہ علامہ خازن کا درج ذیل دو روایتوں کی طرف ہے:

(۱) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی نماز کا آغاز "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۷۴۳)

مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے اس طرح ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی اور ان میں سے کسی کو میں نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

(صحیح مسلم: ۳۹۹)

(۲) حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے کا بیان ہے کہ میرے والد نے مجھے نماز میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھتے ہوئے سن لیا' انہوں نے مجھ سے کہا: اے میرے بیٹے! یہ بدعت ہے' تم بدعت سے بچو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو بھی اپنے والد سے زیادہ بغض رکھنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے' میں نے ان میں سے کسی کو بھی نماز میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دوسری حدیث جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح بخاری میں موجود ہے وہ معلّل ہے اور قابل استدلال نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ لہٰذا تم نماز میں بسم اللہ نہ پڑھا کرو جب تم نماز شروع کرو تو کہو: "الحمد للہ رب العالمین"۔ (سنن الترمذی: ۲۴۴، سنن نسائی: ۹۰۴، سنن ابن ماجہ: ۸۱۵)

ان دونوں روایتوں سے احناف کا مؤقف ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھنا چاہیے۔ علامہ خازن نے احناف کا رد کرنے کے لیے ان دونوں روایتوں پر جو تبصرہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت ضعیف ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت معلّل اور نا قابل استدلال ہے۔

(معلّل سے مراد وہ حدیث جس کی اسناد میں کچھ ایسی پوشیدہ اور دقیق علتیں ہوں جو اس کی صحت میں خلل انداز ہوں اور ان علتوں کی کسی شخص کو اس وقت تک پہچان نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے علم حدیث میں دسترس اور قوی ملکہ حاصل نہ ہو۔)

علامہ خازن نے حضرت عبداللہ بن مغفل والی روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے بارے میں محدثین کی آراء مختلف ہیں۔ چنانچہ امام ترمذی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث حسن ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے اکثر کا یہی عمل رہا ہے (یعنی وہ بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے) ان صحابہ میں حضرات خلفاء راشدین اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ اور ان کے بعد کے تابعین شامل ہیں"۔

امام ترمذی کے اس تبصرے سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت حَسن ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اکثریت بشمول خلفاءِ راشدین اسی بات کی قائل تھی کہ نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھنا چاہیے۔ (واضح رہے کہ امام ترمذی اور علامہ خازن دونوں مسلکاً شافعی ہیں۔)

پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے سے مروی زیر بحث روایت سنن ترمذی وغیرہ میں قیس بن عبایہ کے حوالہ سے ہے۔ جبکہ یہی حدیث علامہ عینی کی تحقیق کے مطابق مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مغفل کے بیٹے سے ابونعامہ کے حوالہ سے ہے اور طبرانی میں مزید دو راوی عبداللہ بن بریدہ اور ابوسفیان طریف بن شہاب کے حوالہ سے ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے سے ان تین راویوں نے بھی زیر بحث حدیث کو روایت کیا ہے تو اب اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا اور حدیث جب حَسن ہو تو وہ یقیناً قابل استدلال ہوتی ہے خصوصاً اس وقت جب اسے کئی شواہد اور کثیر متابعات سے تائید حاصل ہو۔ (البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۲ ص ۲۳۰)

اب رہا علامہ خازن کا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر تبصرہ کہ وہ معلّل اور نا قابل استدلال ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو امام ترمذی نے "حسن صحیح" قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ صحابہ کرام، تابعین اور ان کے بعد والوں کا اسی پر عمل تھا کہ وہ قرأت کا آغاز "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے کرتے تھے (یعنی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے)۔

دوسرا جواب عمدۃ القاری کے حوالہ سے یہ ہے کہ اس حدیث کو بالاتفاق امام بخاری و امام مسلم اور دیگر کئی ائمہ نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کے ثبوت میں جتنی روایات مروی ہیں ان میں سے ایک روایت کو بھی امام بخاری اور امام مسلم نے قبول نہیں کیا اور اسے اپنی کتاب میں روایت نہیں کیا۔ ہاں ان کے معیار پر اگر کوئی روایت اس بحث میں پوری اتری تو وہ صرف یہی روایت ہے جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ جو لوگ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت کو ضعیف اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو معلّل اور نا قابل استدلال قرار دیتے ہیں یہ اُن لوگوں کی بصیرت کی کمی اور جوشِ تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسری دلیل (بسم اللہ کے جہر پر) درج ذیل حدیث ہے:

(۵۷) حضرت نعیم المجمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہوں نے شروع میں بسم اللہ پڑھی پھر سورۂ فاتحہ پڑھی۔ جب ''ولا الضالین'' پر پہنچے تو انہوں نے اور لوگوں نے ''آمین'' کہا۔ اور وہ جب سجدہ میں جاتے تو ''اللہ اکبر'' کہتے اور جب دو رکعتوں کے بعد اٹھے تو ''اللہ اکبر'' کہا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تم میں سب سے زیادہ میری نماز رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق[۸۳] ہے۔ (سنن نسائی: ۹۰۴ سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ص ۴۶ سنن دارقطنی ج ۱ص ۳۰۴ المستدرک ج ۱ص ۲۳۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یہ لوگ جو اتنی بڑی بات کرتے ہیں وہ بتائیں کہ ان کے پاس بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کے حوالہ سے کون سی صحیح حدیث موجود ہے؟ بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کے حوالہ سے جتنی احادیث مروی ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ ان میں سے اکثر کو امام حاکم اور امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ امام حاکم کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ کس طرح تساہل کرتے ہیں اور ضعیف احادیث بلکہ موضوع احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں اور امام دارقطنی کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دارقطنی کو غریب، شاذ اور معلّل احادیث سے بھرا ہوا ہے۔ کتنی احادیث دارقطنی میں ایسی ہیں جو حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملتیں اور ان احادیث کے راویوں میں ایسے جھوٹے، کمزور اور مجہول راوی ہوتے ہیں جن کا تاریخ اور جرح وتعدیل کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً عمرو بن شمر، جابر بن جعفی، حصین بن مخارق وغیرہم۔ پھر دیکھئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حنفی مذہب سے کس قدر تعصب رکھتے ہیں، اس کے باوجود وہ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے حوالہ سے ایک حدیث نہ لا سکے۔ انہوں نے بڑا زور لگایا کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے حوالہ سے ایک صحیح حدیث مل جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور اس بحث میں انہیں اپنے معیار کی صرف ایک حدیث ملی جو کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

(عمدۃ القاری بتغییر وتوضیح، ج ۴ص ۴۰۴ تا ۴۰۶)

۸۳ اس حدیث سے علامہ خازن کا استدلال اس طور پر ہے کہ اس میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسم اللہ پڑھی، پھر سورۂ فاتحہ پڑھی اور دیگر ارکان ادا کیے پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو اللہ عزوجل کی قسم کھا کر لوگوں سے کہا کہ تم میں سب سے زیادہ میری نماز رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق ہے۔ گویا اس آخری جملہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتادیا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اپنی نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ بات درست ہے کہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق تھی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی بسم اللہ پڑھی اور رسول اللہ ﷺ بھی سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے، لیکن اس میں یہ کہاں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی اور جب اس کی کوئی وضاحت اور تذکرہ نہیں ہے تو پھر اس سے یہ استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی اور رسول اللہ ﷺ بھی بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے؟

امام ابوبکر جصاص حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسم اللہ پڑھی، یہ نہیں ہے کہ انہوں نے بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی اور یہ ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسم اللہ پڑھی ہو اور آہستہ پڑھی ہو اور راوی نے یا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بتانے سے جانا ہو یا پھر قریب ہونے کی وجہ سے خود سن لیا ہو۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ظہر اور عصر میں قرأت فرمایا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں آیت سنائی دیتی تھی۔ پھر خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت کے لیے کھڑے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

☆ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں کہا کہ نبی اکرم ﷺ کا (نماز میں) جہراً (بلند آواز سے) بسم اللہ پڑھنا صحت کے ساتھ ثابت ہے۔[۸۴]

(۵۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب امامت فرماتے اور قرأت کرتے تو سورۂ فاتحہ کا آغاز بسم اللہ سے[۸۵] فرماتے۔ (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۳۰۵ ' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۷)

☆ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ (مضبوط) ہیں۔

(۵۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ جہراً (بلند آواز سے) بسم اللہ پڑھتے[۸۶] تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہوتے تو '' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ '' سے اس کا آغاز فرمایا کرتے تھے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی نماز میں اس کو بلند آواز سے نہیں پڑھا۔ کیونکہ جو بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں سمجھتا ہے وہ اس کو زور سے نہیں پڑھتا ہے۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۶)

۸۴ صحیح ابن خزیمہ میں یہ بات مجھے نہیں ملی۔ اس کے برعکس امام ابن خزیمہ نے یہ ضرور لکھا ہے کہ نماز میں خواہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی جائے یا آہستہ' اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۵۱)

تاہم اگر رسول اللہ ﷺ کا نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنا ثابت ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ وہ صحابہ کو تعلیم دینے کی غرض سے تھا اور عام معمول آپ کا وہی تھا جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی اور ان میں سے کسی کو میں نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ (صحیح مسلم: ۳۹۹)

۸۵ علامہ ابن الترکمانی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابو اویس ہے۔ اس کو امام احمد بن حنبل' ابن المدینی اور یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے اور یحییٰ بن معین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ثقہ راوی نہیں ہے' حدیث کا سرقہ کرتا ہے۔
(السنن الکبریٰ مع تحقیق و تخریج ج ۲ ص ۶۸)

علامہ بدر الدین عینی نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ متفرد روایت ہے' اس کا کوئی شاہد اور متابع نہیں ہے پھر یہ کہ اس کے راوی (ابو اویس) کو امام احمد' یحییٰ بن معین اور ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۳۹۸)

۸۶ علامہ عینی اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ نہ تو واضح ہے نہ صحیح ہے۔ واضح تو یوں نہیں ہے کہ اس میں نماز کا تذکرہ نہیں ہے' بلکہ مطلقاً ہے کہ رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھتے تھے اور صحیح یوں نہیں ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن عمرو بن حسان ہے' یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ امام فن علامہ علی بن مدینی اور ابو حاتم نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے' یہ جھوٹ بولتا تھا۔ (لہٰذا اس روایت سے استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے؟) (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۴۰۰)

دوسرا جواب اس روایت کا یہ ہے کہ اگر یہ واضح اور صحیح بھی ہو تو یہ سنن دارقطنی اور مستدرک وغیرہ کی حدیث ہے' یہ اس حدیث کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے جس کو امام بخاری' امام مسلم' امام ترمذی' امام ابوداؤد' امام ابن ماجہ' امام ابن خزیمہ وغیرہم نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی قرأت کا آغاز '' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ '' سے کیا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۷۴۳ ' صحیح مسلم: ۳۹۹ ' سنن ابوداؤد: ۷۸۲ ' سنن نسائی: ۹۰۶ ' سنن ترمذی: ۲۴۶ ' سنن ابن ماجہ: ۸۱۳ ' صحیح ابن خزیمہ: ۴۹۷ ' مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۴۱۰)

تیسرا جواب جو علامہ ابن ہمام نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنا صحابہ کو تعلیم دینے کی غرض سے تھا اور معمول آپ کا وہی تھا جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ ' حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی اور ان میں سے کسی کو میں نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۲۹۲)

(سنن دارقطنی ج ۱ص ۳۰۳' المستدرک ج ۱ص ۲۰۸' مجمع الزوائد: ۲۶۳۳ ـ ج ۲ص ۲۸۱' معجم کبیر: ۱۱۴۴۲' کنز العمال ج ۸ص ۱۱۹)

☆ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث پر کسی قسم کی کوئی جرح نہیں ہے۔ امام حاکم (صاحب مستدرک) نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس میں کوئی علّت (سببِ طعن) نہیں ہے۔

(٦٠) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نماز میں قرأت کا آغاز بسم اللہ سے فرمایا کرتے تھے[۸۷]۔ (سنن الترمذی: ۲۴۵' سنن دارقطنی ج ۱ص ۳۰۳' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲ص ۴۷)

☆ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے' اس کی سند میں کوئی جرح نہیں ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی سند مضبوط نہیں ہے۔

شیخ ابوشامہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح بخاری کی روایت کے برابر نہیں ہے' لیکن جب اس حدیث کو مذکورہ احادیث کے ساتھ ملا دیں گے تو یہ صحیح بخاری کی روایت سے بھی اونچی ہو جائے گی۔

(٦١) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ کو جہراً پڑھا کرتے تھے[۸۸]۔ (سنن دارقطنی ج ۱ص ۳۰۷)

☆ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

---

۸۷ محدثین کے نزدیک یہ روایت اُس پایہ کی نہیں ہے کہ اس سے استدلال کیا جا سکے۔ امام ترمذی کے نزدیک اس کی سند مضبوط نہیں ہے اور امام ابوداؤد نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ نیز اس روایت کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن حماد ہے جس نے ابوخالد سے اس حدیث کو روایت کیا ہے' امام بزار فرماتے ہیں کہ اسماعیل بن حماد حدیث میں قوی نہیں ہے۔ امام عقیل نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے لیکن اسماعیل بن حماد کی وجہ سے اس کو معلول قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسماعیل بن حماد کی حدیث غیر محفوظ ہے اور ابوخالد کا پتا نہیں کہ کون ہے؟ (عمدۃ القاری ج ۴ص ۴۰۱)

دوسرا جواب اس حدیث کا یہ ہے کہ اگر یہ سنداً صحیح بھی ہو تو اس میں صرف یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ قرأت کا آغاز بسم اللہ سے فرمایا کرتے تھے۔ یہ صراحت اور وضاحت نہیں ہے کہ آپ ﷺ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھتے تھے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ حدیث سنداً بھی صحیح ہو اور یہ بھی مان لیا جائے کہ آپ ﷺ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھتے تھے تو ہم کہیں گے کہ یہ آپ ﷺ کا معمول نہیں تھا بلکہ صحابہ کو تعلیم دینے کی غرض سے تھا۔

۸۸ اس حدیث کا ایک جواب جو علامہ عینی نے ابن الھادی کے حوالہ سے دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت میں ''لا'' ساقط ہو گیا ہے یعنی اصل روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ص ۴۰۱)

دوسرا جواب اس حدیث کا یہ ہے کہ یہ سنن دارقطنی کی روایت ہے اور اس کے برخلاف حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی روایت ہم بارہا ذکر کر چکے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی قرأت کا آغاز ''الحمد للہ رب العالمین'' سے کیا کرتے تھے۔ یہ حدیث تمام کتب صحاح میں موجود ہے تو یقیناً جس حدیث کو امام بخاری و امام مسلم اور دیگر جلیل القدر محدثین نے قبول کیا ہو اس کو سنن دارقطنی کی روایت پر ترجیح اور فوقیت حاصل ہو گی۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ امام دارقطنی کو یہ اعتراف ہے کہ نماز میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے ثبوت میں کوئی صحیح حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ نے ابن تیمیہ کے حوالہ سے لکھا ہے اور خود امام دارقطنی کے حوالہ سے ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تو کسی مالکی نے قسم دے کر ان سے پوچھا کہ آپ اس بارے میں مجھے کوئی صحیح حدیث بتائیں تو امام دارقطنی نے کہا کہ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے۔ (فتح القدیر ج ۱ص ۲۹۱)

اس واقعہ کو علامہ بدرالدین عینی نے بھی ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے: البنایہ ج ۲ص ۲۳۲ ـ ۲۳۳)

(٦٢) محمد بن ابی سری عسقلانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے معتمر بن سلیمان کے پیچھے نہ جانے کتنی بار فجر اور مغرب کی نماز پڑھی اور (ہر بار) وہ سورۂ فاتحہ سے پہلے اور بعد جہراً ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھا کرتے تھے اور میں نے معتمر سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں حضرت اُبی کی اقتداء میں مسلسل نماز ادا کرتا رہا ہوں' حضرت اُبی نے کہا کہ میں حضرت انس بن مالک کی اقتداء میں مسلسل نماز ادا کرتا رہا ہوں اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں مسلسل نماز ادا کرتا رہا ہوں[۸۹]۔ (سنن دار قطنی ج ۱ص ۳۰۷' المستدرک ج ۱ص ۲۳۳' نصب الرایہ ج ۱ص ۳۰۲)

☆ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ (مضبوط) ہیں اور امام حاکم نے فرمایا ہے کہ اوّل تا آخر اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جانبین سے اس بحث میں اور بھی احادیث' دلائل' اعتراضات اور ان کے جوابات موجود ہیں جن کو یہاں ذکر کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لیے ہم اسی قدر بحث پر اکتفا کرتے ہیں اور ہر کام کی توفیق اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے O

اس آیت میں ''الحمد للہ'' کا جملہ لفظوں میں تو خبر ہے لیکن معنیٰ کے اعتبار سے امر ہے یعنی بہ ظاہر تو اس بات کی خبر دی جارہی ہے کہ تمام تعریفات کی مستحق اللہ عزوجل کی ذات ہے لیکن حقیقۃً یہ حکم دیا جارہا ہے کہ تم ''الحمد للہ'' کہو۔ اور اس میں مخلوق کو یہ بھی سکھا دیا گیا کہ اللہ عزوجل کی تعریف کس انداز سے بیان کرنی چاہیے۔ (اس آیت میں حمد کا لفظ ہے جس کا معنیٰ تعریف ہے' اس مناسبت سے یہاں حمد' مدح اور شکر کے معانی اور ان کے درمیان باہمی نسبت کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:)

حمد' مدح اور شکر کے معانی اور ان کے درمیان باہمی نسبت کی وضاحت

حمد اور مدح دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ان دونوں میں فرق موجود ہے اور وہ دو طرح سے ہے:

۸۹ اس حدیث سے علامہ خازن کا استدلال اس طور پر ہے کہ معتمر بن سلیمان اپنی نمازوں میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ میں حضرت اُبی کی اقتداء میں نمازیں پڑھتا رہا ہوں' اسی طرح حضرت اُبی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حوالہ دیتے تھے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کا حوالہ دیتے تھے۔ یعنی حضرت اُبی بھی نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے' حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی عمل تھا۔

اس حدیث کا جواب علامہ عینی نے یہ دیا ہے کہ امام ابن خزیمہ اور امام طبرانی نے معتمر بن سلیمان ہی سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آہستہ پڑھا کرتے تھے۔ (اور یہ ایک ہی شخص (معتمر بن سلیمان) سے دو متضاد روایات ہیں۔) (عمدۃ القاری ج ۴ص ۴۰۱)

یعنی جب ایک ہی شخص ''معتمر بن سلیمان'' سے دو متضاد احادیث مروی ہیں تو ان کی اس حدیث سے استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل سے معارض ہے؟

دوسرا جواب اس حدیث کا وہی ہے جو گذشتہ حاشیہ میں ہم دوسرے جواب کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں۔

(۱) کسی مدح کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی احسان کے نتیجہ میں ہو۔ بعض اوقات احسان سے پہلے بھی مدح کی جاتی ہے اور بعض اوقات احسان کے بعد۔ جبکہ حمد اسی صورت میں کی جاتی ہے جب احسان پایا جائے۔

(۲) بعض علماء نے فرق یہ بیان کیا ہے کہ مدح بعض اوقات ممنوع ہو جاتی ہے[۹۰]۔ جبکہ حمد کبھی ممنوع نہیں ہوتی (بلکہ اس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔)

حمد اور شکر (کے درمیان معنوی تقابل) کی وضاحت یہ ہے کہ کسی نعمت پر شکر ادا کرنے کو بھی حمد کہا جاتا ہے اور کسی کے اچھے کاموں پر اس کی تعریف کرنے کو بھی حمد کہا جاتا ہے۔ مثلاً: ''حمدت الرجل علی علمه و کرمه'' (میں نے آدمی کے علم اور اس کی سخاوت پر اس کی حمد (تعریف) کی)۔

جبکہ شکر کا لفظ اسی وقت بولا جاتا ہے جب کوئی نعمت حاصل ہو۔ لہٰذا کسی کے علم کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں (ہاں اگر اس کی طرف سے کوئی نعمت حاصل ہو تو شکر کا لفظ استعمال کیا جائے گا)۔

اس ساری تقریر سے واضح ہو گیا کہ (چونکہ حمد کا لفظ نعمت اور غیر نعمت دونوں پر بولا جاتا ہے اور شکر کا لفظ صرف نعمت حاصل ہونے کی صورت میں بولا جاتا ہے اس لیے) حمد شکر سے زیادہ عام ہے یعنی ہر حامد تو شاکر ہے لیکن ہر شاکر حامد نہیں ہے۔

حمد اور شکر میں ایک فرق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حمد زبان سے کی جاتی ہے جبکہ شکر اپنے کسی فعل کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ اور (یہ بھی واضح ہے کہ) حمد 'مذمت کی ضد ہے اور ''الحمد لله'' کے ''لِلّٰه'' میں جو لام ہے وہ برائے استحقاق ہے۔ یعنی تمام تعریفوں کا مستحق اللہ رب العالمین ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ''الدار لزید'' (گھر کا مستحق زید ہے' اسی طرح یہاں فرمایا گیا کہ تمام تعریفوں کا مستحق اللہ رب العالمین ہے۔) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل ہی سارق مخلوق پر علی الاطلاق احسان اور فضل فرمانے والا ہے۔

رب کا معنیٰ اور مفہوم اور مخلوق کے لیے لفظ رب استعمال کرنے کا حکم

رب کا معنیٰ ہے ''مالک''۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''ربّ الدار'' (گھر کا مالک) اور ''ربّ الشیئ'' (کسی چیز کا مالک)۔ اور رب کا لفظ تربیت اور اصلاح کرنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''رب فلان الضیعة'' یعنی فلاں شخص نے اپنی زمین کی اصلاح کی۔ اس معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کو رب کہا جاتا ہے یعنی وہ تمام جہانوں کی تربیت اور اصلاح فرمانے والا ہے۔ (لیکن واضح رہے کہ) مخلوق میں سے کسی کے لیے ''الرب'' کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا' ہاں کسی چیز کے ساتھ نسبت دے کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ''رب الشیئ'' (فلاں چیز کا مالک)۔

---

۹۰ مثلاً کسی کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ وہ تعریف سن کر اکڑ جائے گا اور تکبر میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے منہ پر اس کی مدح (تعریف) کرنا منع ہے۔ اسی طرح کسی کی بے جا تعریف یا حد سے زیادہ تعریف یا دنیاوی مفادات کے لیے تعریف کرنا' یہ سب صورتیں ممنوع ہیں۔ (شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۴۱۴' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۹۵۰)

انہی صورتوں کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم بہت زیادہ تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں مٹی ڈال دو (یعنی جس جھوٹے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ تعریف کر رہے ہیں اس کو پورا نہ کرو)۔ (صحیح مسلم: ۳۰۰۲)

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپس میں ایک دوسرے کی (بے جا اور حد سے زیادہ) تعریف کرنے سے بچو' کیونکہ (یہ تعریف نہیں ہے بلکہ) ذبح کرنا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۳۷۴۳)

عالمین کا معنیٰ

''عَالَمین''، ''عَالَم'' کی جمع ہے اور اس کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا[۹۱] اللہ عزوجل کے سوا ہر موجود چیز کو عالَم کہا جاتا ہے' یوں ساری مخلوق عالَم میں داخل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عالَمین سے جنات اور انسان مراد ہیں' کیونکہ یہی دو مخلوق اللہ عزوجل کے احکامات کی مخاطب ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ ملائکہ' جنات اور انسانوں میں جو علم والے ہیں' انہیں عالَم کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے لیے عالَم کا لفظ نہیں بولا جاتا کیونکہ ان میں عقل نہیں ہوتی۔

عالَم کی تعداد میں مختلف اقوال

کُل عالَم کتنے ہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے ایک ہزار عالَم ہیں جن میں سے چھ سو عالَم سمندر میں اور چار سو خشکی میں ہیں۔ بعض کے نزدیک کل عالَم اسّی ہزار ہیں جن میں سے چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کُل عالَم اٹھارہ ہزار ہیں جن میں دُنیا بھی ایک (مستقل) عالَم ہے۔

لفظ عالَم کا مشتق منہ اور وجہ تسمیہ

لفظ عالَم ''علم'' سے بنا ہے اور بعض کے نزدیک یہ ''علامة'' سے بنا ہے (بمعنیٰ نشانی) اور عالَم کو عالَم اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر دلیل ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

(اللہ عزوجل) نہایت رحم فرمانے والا' بہت مہربان ہے O

''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' کا معنیٰ ومفہوم اور ان میں فرق

رحمٰن کا معنیٰ ہے: ایسی نعمتیں دینے والا جو اس کے بندوں میں سے کوئی دوسرا نہ دے سکے اور رحیم کا معنیٰ ہے: ایسی نعمتیں دینے والا جو اس کے بندے بھی دے سکتے ہوں اس (فرق) کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو رحمٰن نہیں کہا جا سکتا جبکہ رحیم کہا جا سکتا ہے۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مسیلمہ کذاب (جس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا) اس کو لوگ یمامہ کا رحمٰن کہتے تھے اور خود انہی کے شاعر نے اپنے ایک شعر میں اُسے رحمٰن کہا کہ:

وانت غيث الورى لازلت رحمانا. تم ہی ساری مخلوق کے لیے بارش ہو (اور اللہ کرے کہ) تم ہم پر رحمٰن (بہت مہربان) رہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ چونکہ اپنے کفر میں بہت آگے نکل چکے تھے اور مسیلمہ کی خوب بڑھا چڑھا کر تعریفیں کیا کرتے تھے اس لیے انہوں نے اسے رحمٰن بھی کہہ دیا۔ لہٰذا یہ لائقِ التفات اور قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

---

[۹۱] جیسے عربی میں لفظ ''قوم'' کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا' کیونکہ یہ معنوی اعتبار سے جمع ہے۔ اسی طرح ''عالَم'' بھی معنوی اعتبار سے جمع ہے اور اس کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا۔

اس اعتراض کا جواب کہ جب بسم اللہ میں الرحمن اور الرحیم آ چکا تو پھر سورۂ فاتحہ میں اس کو دوبارہ کیوں لایا گیا؟

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ''بسم اللہ'' میں جب ''الرحمن الرحیم'' آ چکا تو پھر سورۂ فاتحہ میں اس کو دوبارہ لانے کی کیا ضرورت تھی اور اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں دوبارہ ''الرحمن'' اور ''الرحیم'' کو اس لیے لایا گیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ (اللہ تعالیٰ کی صفات میں) بندوں کی طرف صفتِ رحمت زیادہ متوجہ ہے اور ہم اس کی رحمت کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔ سو رحمٰن اور رحیم کو دوبارہ ذکر کر کے اللہ عزوجل نے اس بات سے ہمیں آگاہ فرما دیا کہ میری رحمت بھی بہت زیادہ ہے اور میں اپنی مخلوق پر (بہت ہی) مہربان ہوں[۹۲]۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس دِن کا مالک ہے جس دن (لوگوں کو ان کے اعمال کا) بدلہ دیا جائے گا O

مالک اور ''مَلِک'' کا معنیٰ اور ان میں فرق

مالک وہ ہوتا ہے جو (اپنے ماتحت لوگوں پر) امر اور نہی کے ساتھ تصرف کرے۔ یعنی اُنہیں کسی کام کے کرنے کا حکم دے اور کسی کام سے روک دے۔ بعض علماء کے نزدیک مالک وہ ہے جو چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت رکھتا ہو یعنی غیر موجود کو وجود میں لا سکتا ہو اور یہ قدرت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ (لہٰذا مالک بھی وہی ہے۔) ایک قول یہ ہے کہ ''مَلِک'' کے مقابلہ میں مالک کا لفظ زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ ہم کسی کو مختلف چیزوں کا مالک تو کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف چیزوں کا ''مَلِک'' (بادشاہ) نہیں کہہ سکتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی کو ''مَلِک'' (بادشاہ) اسی وقت کہا جاتا ہے جب اسے ملکیت حاصل ہو۔ جبکہ مالک کا لفظ اتنا وسیع ہے کہ اگر (فی الوقت) کوئی چیز ملکیت میں نہ ہو تب بھی اس کو مالک کہہ دیا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مَلِک'' کا لفظ زیادہ اولیٰ ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی ''مَلِک'' (بادشاہ) ہوتا ہے وہ مالک ضرور ہوتا ہے لیکن ہر وہ شخص جو کسی چیز کا مالک ہو وہ ضروری نہیں ہے کہ ''مَلِک'' (بادشاہ) بھی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مَلِک اور مالک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ جیسے ''فَارِهٌ'' اور ''فَرِهٌ'' ایک[۹۳] ہی ہیں۔

''یوم الدین'' کا معنیٰ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''مالک یوم الدین'' کا معنیٰ ہے: حساب والے دن فیصلہ فرمانے والا''۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''یوم الدین'' میں دین کا معنیٰ ہے: جزاء اور بدلہ۔ اور یہ لفظ خیر اور شر کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ''کما تدین تدان'' (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے)۔

بعض علماء کے نزدیک ''یوم الدین'' کا معنیٰ ہے: ایسا دن جس میں صرف دین ہی فائدہ دے گا۔ بعض کے نزدیک دین

---

۹۲ یہ اعتراض اور جواب مذہب شافعی کے مطابق ہے۔ کیونکہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بسم اللہ شریف سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ لہٰذا اُن کو یہ اشکال ہوگا کہ سورۂ فاتحہ میں الرحمن اور الرحیم دو مرتبہ کیوں لایا گیا؟ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بسم اللہ چونکہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں ہے اس لیے ان کے نزدیک یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ سورۂ فاتحہ میں الرحمن اور الرحیم کی تکرار کیوں کی گئی؟

۹۳ یہ باب سمع سے ہے اس کا معنیٰ ہے: خوش ہونے والا اکڑنے والا۔

کا معنیٰ ہے: غالب آنا۔ جیسے کہتے ہیں: ''دنته فدان'' (میں نے اس پر غلبہ پالیا تو وہ ذلیل ہو گیا)۔

اس اشکال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ تو تمام دنوں کا مالک ہے' پھر اُس نے قیامت کے دن کی تخصیص کیوں فرمائی؟

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ تو تمام دنوں کا مالک ہے اور ہر روز اسی کی ملکیت ہے پھر اس نے یہاں خاص قیامت کے دن کا کیوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُس کا مالک ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن چونکہ کسی کی ملکیت اور بادشاہت باقی نہیں رہے گی' صرف اور صرف اللہ عزوجل کی بادشاہت اور اسی کا حکم ہوگا اس لیے یہاں خاص قیامت کے دن کا ذکر فرمایا اور اس کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ . (الفرقان:۲۶)　　اُس دن سچی بادشاہت صرف رحمٰن کی ہوگی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ (المؤمن:۱۶)　　آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ صرف اللہ کی جو ایک ہے سب پر غالب ہے ○

(ان آیات سے معلوم ہوا کہ حقیقی اور سچی بادشاہت صرف اور صرف اللہ عزوجل کی ہے) اور اس دنیا میں ہم مختلف لوگوں کو بادشاہ کہتے ہیں اس سے حقیقی بادشاہت مراد نہیں ہوتی بلکہ انہیں مجازاً بادشاہ کہا جاتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ○

اس آیت میں خبر کی بجائے خطاب کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ابتداء سے لے کر ''مالک یوم الدین'' تک ثناء اور تعریف پر مشتمل ہے اور تعریف اسی وقت زیادہ بہتر ہوتی ہے جب اس کو عدم موجودگی میں (مخاطب کیے بغیر) کیا جائے۔ پھر ''ایاک نعبد'' سے دعا کا آغاز ہوتا ہے اور دعا میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ جس سے مانگا جا رہا ہے اس کو مخاطب کیا جائے اس لیے ''ایاک نعبد'' سے خطاب کا انداز اختیار کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایک لفظ پوشیدہ ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے: ''قولوا ایاک نعبد'' (تم کہو ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں)۔

اور ''ایاک نعبد'' کا معنیٰ اور مفہوم یہ ہے کہ ہم عبادت کے لیے تیری ہی ذات کو خاص کرتے ہیں' تجھے ایک جانتے ہیں اور عاجزی کے ساتھ تیری اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔

عبادت اور بندگی کا مفہوم

عبادت کا معنیٰ ہے: اپنے آپ کو انتہائی عاجزی کے ساتھ جھکا دینا اور مکمل طور پر پست کر دینا۔ بندہ کو عبد اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے مولیٰ کے آگے بچھا ہوا ہوتا ہے اور اسی کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کی تعظیم کی خاطر جس فعل کے ذریعہ فرض کو ادا کیا جائے وہ عبادت ہے۔ لہٰذا جب کوئی بندہ ''ایاک نعبد'' کہتا ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ میں تیری ذات کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتا۔

عبادت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے لیے مکمل طور پر جھک جائے اور اس کی بھرپور تعظیم کرے۔ کیونکہ وہی (وحدہٗ

لاشریک سب سے) عظیم ہے اور عبادت کا مستحق ہے اور عبادت صرف اسی جھکنے کو کہتے ہیں جو اللہ عزوجل کی خاطر ہو' کیونکہ اسی نے اپنے بندوں پر سب سے بڑی نعمت فرمائی ہے یعنی انہیں عدم سے وجود بخشا اور پھر اپنے دین کی راہ دکھائی۔ لہٰذا بندہ کو چاہیے کہ اپنے رب جل جلالہٗ کے آگے جھک جائے اور اس کی بارگاہ میں پستی اختیار کرے۔

اس آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا: ''وایاک نستعین'' (اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں[۹۴])۔

یعنی ہم عبادت کے معاملہ میں اور اپنے تمام معاملات میں تیری ہی ذات سے مدد کے طلب گار ہیں۔

عبادت کو پہلے اور استعانت کو بعد میں ذکر کرنے کی وجوہات

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کسی کام پر جو مدد طلب کی جاتی ہے وہ کام شروع کرنے سے پہلے ہوتی ہے جب کہ یہاں اس آیت میں عبادت کا تذکرہ پہلے ہے اور مدد طلب کرنے کا ذکر بعد میں ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں عبادت کو پہلے اور استعانت کو بعد میں ذکر کرنے کی علماء نے چند وجوہات ذکر کی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مذکورہ اعتراض اس شخص پر وارد ہوسکتا ہے جو اس بات کا قائل ہو کہ استطاعت قبلِ فعل ہوتی ہے۔ ہم تو بحمد اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ کسی بھی کام کی توفیق اور استطاعت کام کے ساتھ ہی[۹۵] ہوتی ہے۔ لہٰذا اس آیت میں عبادت کو پہلے اور استعانت کو بعد میں ذکر کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۹۴ یعنی حقیقی مدد تجھ ہی سے طلب کرتے ہیں۔ یہاں واضح رہے کہ مدد دو طرح کی ہوتی ہے۔ حقیقی اور غیر حقیقی۔ لوگوں سے مختلف معاملات میں جو مدد لی جاتی ہے مثلاً مریض کا ڈاکٹر سے علاج معالجہ یا غریب آدمی کا مالدار آدمی سے قرض کا حصول یا ڈوبنے والے کا تیرنے والے سے سہارا طلب کرنا یہ تمام غیر حقیقی مدد کی مثالیں ہیں' لیکن ان سب میں درحقیقت اللہ ہی کی مدد شامل حال اور کارفرما ہوتی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کو علاج معالجہ کی' مالدار کو قرض دینے کی اور تیراک کو بچانے کی قدرت اور طاقت اللہ ہی نے عطا فرمائی ہے اور اسی کی عطا کردہ قوت اور قدرت سے یہ لوگ بلکہ تمام لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے لوگ ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں تو پھر اس زندگی میں لوگوں سے مدد اور تعاون طلب کرنا ہی ناجائز ہو جائے گا' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ ہی کی مدد پہ بھروسا کوتے ہوئے اور اُسی کے فضل و کرم کو حاصل کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ اور اللہ عزوجل کے دیگر نیک بندوں سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اس میں بھی حقیقتاً اللہ ہی کی مدد شامل ہوتی ہے' کیونکہ یہ تمام بارگاہیں اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ اس لیے ''ایاک نستعین'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہم حقیقی مدد صرف تجھ سے طلب کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس آیت کو بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی سے کسی صورت میں مدد مانگنا جائز نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بے بنیاد اور دلائل کے خلاف ہے۔ شیخ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ''ایاک نستعین'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

(حاشیۃ القرآن' زیر بحث آیت)

۹۵ یعنی اہل سنت کا مؤقف یہ ہے کہ جس قدرت سے فعل واقع ہوتا ہے اس قدرت کو اللہ تعالیٰ اس فعل کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔ جبکہ معتزلہ کا مؤقف یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کسی فعل کی قدرت پیدا کرتا ہے اور پھر بندہ اس قدرت سے اس فعل کو واقع کرتا ہے۔ اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ طاقت ایک عرض ہے۔ اگر وہ فعل سے پہلے حاصل ہو تو کہا جائے گا کہ ''طاقت باقی ہے''۔ اور بقاء بھی ایک عرض ہے۔ سو اس صورت میں قیام العرض بالعرض (عرض کا عرض کے ساتھ قائم ہونا) لازم آئے گا جو کہ ناممکن ہے۔ اس لیے قدرت اور طاقت کا فعل سے پہلے ہونا ناممکن ہے اور جب ہمارے نزدیک قدرت و طاقت کا فعل سے پہلے ہونا ناممکن ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) مدد طلب کرنا بھی عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ تو گویا ''ایاک نعبد'' فرما کر پہلے عبادت کا خلاصہ بیان کیا گیا پھر ''ایاک نستعین'' سے عبادت کی تفصیل بیان فرمائی۔

(۳) ''ایاک نعبد'' کہہ کر جب بندہ نے عبادت کا آغاز کر دیا تو اب ''ایاک نستعین'' کہہ کر اللہ عزوجل سے اس کی تکمیل پر مدد طلب کر رہا ہے۔ یعنی (اے مولیٰ تعالیٰ! میں نے عبادت کا آغاز کر دیا ہے) اب مجھے اس کے مکمل کرنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

(۴) بندہ جب ''ایاک نعبد'' کہتا ہے تو اس کے اندر فخر پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ عبادت ایک بڑا رتبہ ہے تو اس سے خود پسندی آ جاتی ہے اس لیے فوراً ہی کہلوایا گیا: ''ایاک نستعین'' (ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) تاکہ جو عُجب اور فخر پیدا ہو سکتا تھا وہ دور ہو جائے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

ہمیں سیدھے راستہ پر چلا ۝

ہدایت کی دعا کرنے کا معنیٰ

اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی فرما اور بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: ہمیں سیدھے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔ جیسے کسی کھڑے ہوئے شخص سے ہم کہتے ہیں کہ ''قم حتی اعود الیک'' تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے کہ میرے واپس آنے تک تم کھڑے رہو۔

اہل ایمان پہلے ہی ہدایت پر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ دعا کرنا کہ ''ہمیں سیدھے راستہ پر چلا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں سیدھے راستہ پر قائم اور دائم رکھ۔ اور (یہ معنیٰ بھی کر سکتے ہیں کہ) سیدھے راستہ کی طرف ہماری ہدایت میں اضافہ فرما۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور اس کی ہدایتیں لامتناہی اور لامحدود ہیں (اس لیے ہم اس سے ہدایت میں اضافہ کا سوال کرتے ہیں) اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

صراطِ مستقیم سے کیا مراد ہے؟

صراط کا معنیٰ ہے: راستہ۔ شاعر جریر کا ایک شعر اسی معنیٰ میں ہے:

امیر المؤمنین علی صراط	امیر المؤمنین اس وقت بھی سیدھے راستہ پر
اذا اعوج الموارد مستقیم	ہوتا ہے جب راستے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے دین اسلام مراد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تو زیر بحث آیت میں عبادت اور استعانت کے تقدم و تاخر میں بھی کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ استطاعت ہمارے نزدیک فعل کے ساتھ ہوتی ہے۔ البتہ معتزلہ کو یہ اشکال ہوگا کہ عبادت کو استعانت پر مقدم کیوں کیا گیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک استطاعت قبلِ فعل ہوتی ہے۔

قرآن مراد ہے اور یہ مرفوع روایت[۹۶] سے ثابت ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ صراطِ مستقیم سے سنت اور جماعت مراد ہے۔ اور بعض نے آیت مذکورہ کا معنیٰ کیا ہے: ہمیں مستقیمین جنت کے راستہ پر چلا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ

راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا

''الذین انعمت علیھم'' سے کون لوگ مراد ہیں؟

یہ ''الصراط المستقیم'' سے بدل ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ جن پر تو نے ہدایت اور توفیق کا انعام اور احسان فرمایا ان کے راستہ پر چلا۔

جن پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور توفیق کا انعام فرمایا وہ انبیاء اور مؤمنین ہیں۔ جن کا ذکر اللہ عزوجل نے اس آیت میں فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ (النساء:۶۹)

(جو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریں) وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، ان سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی امت کے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے تورات اور انجیل میں کسی قسم کی تحریف اور تبدیلی نہیں کی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ان سے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ اور آپ کے اہل بیت مراد ہیں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ

نہ کہ ان کا راستہ جن پر (تیرا) غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا O

غضب اور ضلال کا معنیٰ

یعنی جن پر تو نے غضب فرمایا اور جو لوگ ہدایت سے ہٹ گئے، ہمیں ان کے راستہ پر نہ چلا۔

غضب کا اصل معنیٰ ہے: انتقام کے ارادہ کے وقت دل کے خون کا جوش مارنا۔ اسی معنیٰ میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

(۶۳) غضب سے بچو۔ کیونکہ یہ ایک چنگاری ہے جو ابن آدم کے دل میں جلتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ (غضب کے وقت) آدمی کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں[۹۷]۔

---

۹۶ اس سے علامہ خازن کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جو مقدمہ میں قرآن کریم کے مقام و مرتبہ کے بیان میں خود ذکر کر چکے ہیں۔ اُس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ یہی (قرآن) صراطِ مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۹۰۶، مسند احمد ج ۱ ص ۹۱، سنن دارمی: ۳۳۳۱)

۹۷ علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ غصہ سے بچنے کا معنیٰ یہ ہے کہ ان چیزوں سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(سنن الترمذی: ۲۱۹۱ ' مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۵۳۷۵ ' شرح السنہ ج ۱۴ ص ۲۴۱)

اللہ تعالیٰ کے لیے جب غضب کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کا معنیٰ صرف ''انتقام لینا'' ہوتا ہے۔ یعنی وہ انتقام جو اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں سے لے گا۔ لیکن مسلمانوں میں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ غضب نہیں فرماتا۔ غضب صرف اور صرف کافروں کے لیے ہے۔

ضلال کا اصل معنیٰ ہے: غائب ہونا اور ہلاک ہونا۔ جب پانی دودھ میں غائب ہو جائے اور اچھی طرح مل جائے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''ضل الماء فی اللبن'' (پانی دودھ میں مل گیا)۔

''المغضوب علیھم'' اور ''الضالین'' سے کون لوگ مراد ہیں؟

ارشاد فرمایا: ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' یعنی ہمیں نہ تو ان کے راستہ پر چلا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان کے راستہ پر جو گمراہ ہو گئے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جن پر غضب نازل ہوا ان سے مراد یہودی ہیں اور جو گمراہی کا شکار ہوئے ان سے مراد نصاریٰ ہیں۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٤) بے شک یہودیوں پر غضب نازل کیا گیا اور نصرانی گمراہ[98] ہیں۔

(سنن الترمذی: ۲۹۵۳ ' مسند احمد ج ۴ ص ۳۷۹ ' صحیح ابن حبان: ۷۲۰۶۔ ج ۱۲ ص ۱۸۴ ' المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۹۹)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بچو جو غصہ کا باعث بنتی ہیں۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ غصہ سے اللہ عزوجل کی پناہ طلب کیا کرو اور غصہ کے چنگاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ نفس کے چولہے میں پوشیدہ طور پر آگ کی چنگاری کی شکل میں فطرتی اور طبعی گرمی ہوتی ہے اور آخر میں جو فرمایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ (غصہ کے وقت) آدمی کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور اس کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح یہ کیفیت اس شخص پر طاری ہوتی ہے جو بخار زدہ ہو اسی طرح اُس پر بھی ہوتی ہے جو اندر سے گرم ہو۔ کیونکہ کسی بھی چیز کا ظاہر اس کے باطن کی علامت ہوتا ہے اور ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

(مرقات ج ۸ ص ۸۷۷)

98 اس حدیث سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غضب صرف یہودیوں پر نازل ہوا ہے نصاریٰ پر نہیں ہوا اور گمراہی میں صرف نصاریٰ پڑے ہوئے ہیں' یہودی گمراہ نہیں ہیں۔ حالانکہ یہود و نصاریٰ دونوں پر غضب بھی نازل ہوا ہے اور دونوں گمراہ بھی ہیں۔ سو اس حدیث میں غضب کو یہودیوں کے ساتھ اور گمراہی کو نصاریٰ کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے جرائم بہ نسبت نصاریٰ کے زیادہ خطرناک اور موجب عذاب ہیں۔ مثلاً یہودیوں کے یہ قول اللہ عزوجل محتاج ہے۔ (سورۂ آل عمران: ۱۸۱) ان کے یہ قول اللہ عزوجل کا ہاتھ بندھا ہوا ہے یعنی وہ بخیل ہے۔ (المائدہ: ۶۴) نیز یہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے قاتل ہیں (البقرہ: ۶۱)' مسلمانوں سے سب سے زیادہ دشمنی انہی لوگوں کو ہے۔ (المائدہ: ۸۲) اور یہی لوگ اپنی زبانیں موڑ کر اللہ کے حبیب ﷺ کو معاذ اللہ ''بیوقوف'' کہا کرتے تھے۔ (النساء: ۴۶) اس کے برعکس نصاریٰ کا جرم شنیع یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے نبی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی محبت میں گمراہ ہوئے اور ان کو خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ (التوبہ: ۳۰) اور تثلیث کے قائل ہوئے۔ (النساء: ۱۷۱) یعنی تین معبود مانے' اللہ عزوجل' عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام۔ (المائدہ: ۱۱۶) اس لیے بالتخصیص نصاریٰ کو گمراہ اور یہودیوں کو 'مغضوب علیھم'' قرار دیا گیا۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۱۳۰ ' تبیان القرآن ج ۱ ص ۲۲۶)

غضب کے مستحق یہودی ہیں اور نصرانی گمراہ ہیں اس پر یہ دلیل بھی ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر غضب کا فیصلہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا:

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ ۔ (المائدہ:۶۰) (بُرے وہ لوگ ہیں) جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور ان پر غضب فرمایا۔

اور نصرانیوں کے لیے گمراہی کا فیصلہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ ۔ (المائدہ:۷۷) اس قوم کی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ ہو چکی ہے۔

"غیر المغضوب علیھم" اور "ولا الضالین" کا ایک معنیٰ بعض نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ "غیر المغضوب علیھم بالبدعة ولا الضالین عن السنة" یعنی ہمیں نہ تو ان کے راستہ پر چلا جو بدعت کی وجہ سے (تیرے) غضب کے مستحق ہوئے اور نہ ان کے راستہ پر چلا جو راہِ سنّت سے ہٹ گئے۔

سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہنے کا حکم اور اس کی فضیلت

قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ جب وہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر فارغ ہو تو آخر میں کچھ وقفہ سے آمین کہے۔

آمین کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ الف کے مد کے ساتھ بھی اور بغیر مد کے بھی (جیسے "اَمِیـــن")۔ الف کے مد کے ساتھ استعمال پر شاعر کا یہ شعر دلیل ہے:

یــا رب لا تسـلبنـــی حبهــا ابـدا	اے میرے رب مجھ سے کبھی اس کی محبت ختم نہ کر
ویـــرحـــم الـلـــه عبـدا قـــال آمیـنـا	اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحمت کرے جو آمین کہے

بغیر مد کے استعمال پر شاعر کا یہ شعر دلیل ہے:

تبــاعــد مـنـــی فـطـحـل اذ سـألتـه	مجھ سے فطحل دور ہو گیا جب میں نے اُس سے سوال کیا
امیـن فـــزاد الـلــــه مــا بیـنـنـا بـعـدا	ایسا ہی ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان دوری کو اور زیادہ کرے

لفظ آمین کیا ہے اور اس کا معنیٰ کیا ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے: "اللهم اسمع واستجب" (اے اللہ! میری دعا کو سن لے اور اس کو قبول فرما)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنیٰ بتایا ہے: "کذالک یکون" (ایسا ہی ہو)۔ بعض علماء کا مؤقف یہ ہے کہ "آمین" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بعض کے نزدیک یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ایک مُہر ہے جو اس نے اپنے بندوں پر لگائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ ان کے گناہوں کو دور کرے۔

آمین کہنے کی فضیلت میں یہ حدیث ہے:

(۶۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو گئی اس کے پچھلے گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔ ابن شہاب زہری نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ آمین کہتے تھے۔ (صحیح بخاری:۷۸۰، صحیح مسلم:۴۱۰، سنن الترمذی:۲۵۰، سنن ابوداؤد:۹۳۶، سنن نسائی:۹۲۷، سنن ابن ماجہ:۸۵۲)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ:

(٦٦) جب امام "غیر المغضوب علیهم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو۔ کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے پچھلے گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔ (صحیح بخاری: ۷۸۲٬ سنن ابوداؤد: ۹۳۵٬ سنن نسائی: ۹۲۶)

آمین کی فضیلت میں ذکر کردہ احادیث کی مختصر تشریح

حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا: جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے فرشتوں کے ساتھ آمین کہا یا ان کی طرح خشوع وخضوع اور اخلاص کے ساتھ آمین کہا تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ حدیث کا پہلا معنیٰ (جس نے فرشتوں کے ساتھ آمین کہا) یہ زیادہ صحیح ہے۔ (علماء احناف کے نزدیک موافقت سے مراد یہ ہے کہ نماز میں اس طرح آمین کہی جائے کہ آواز بلند نہ ہو۔ اس مسئلہ کی تحقیق اور تفصیلی دلائل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ا ص ۲۳۰۔۲۲۹) رہا یہ کہ فرشتوں سے کون سے فرشتے مراد ہیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہر انسان پر مقرر ہیں اور بعض نے کہا کہ اس سے دوسرے فرشتے مراد ہیں۔ حدیث مذکور میں فرمایا کہ اس شخص کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اس سے مراد گناہِ صغیرہ ہیں نہ کہ کبیرہ۔ اور ابن شہاب زہری نے جو یہ کہا کہ نبی اکرم ﷺ آمین کہا کرتے تھے اس سے آپ ﷺ کے آمین کہنے کا طریقہ بتانا مقصود ہے۔

نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم

نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام مالک٬ امام شافعی٬ امام احمد اور جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور یہ کہ سورۂ فاتحہ نماز کا ایک معیّن رکن ہے٬ کوئی دوسری سورت اس کی جگہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ ان تمام علماء کی دلیل درج ذیل احادیث ہیں:

(٦٧) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے[99]۔ (صحیح بخاری: ۷۵۶٬ صحیح مسلم: ۳۹۴٬ سنن الترمذی: ۲۴۷٬ سنن ابوداؤد: ۸۲۲٬ سنن نسائی: ۹۱۰٬ سنن ابن ماجہ: ۸۳۷)

دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو ۴۷ نمبر کے تحت گزر چکی۔ اس میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے ایسی نماز پڑھی جس میں اس نے سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھا تو اس کی نماز ناقص ہے٬ ناقص ہے٬ ناقص ہے اور نامکمل ہے۔

(اس حدیث کے مکمل حوالہ جات حدیث نمبر ۴۷ کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

سورۂ فاتحہ کے متعلق دوسرا موقف امام ابوحنیفہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ (شرعاً نماز کا) معیّن رکن نہیں ہے۔ بلکہ نمازی پر قرآن کریم کی کوئی بھی ایک لمبی آیت یا تین چھوٹی آیتوں کا پڑھنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کے دلائل درج ذیل ہیں: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ (المزمل: ۲۰) تو قرآن سے جو تمہیں آسان ہو پڑھ لیا کرو۔

---

[99] علماء احناف کے نزدیک اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہیں ہے۔ یعنی اگر آخر میں سجدۂ سہو کرلیا تو نماز ہو جائے گی اور اگر سجدۂ سہو نہ کیا تو نماز کو لوٹانا واجب ہوگا۔ دیگر ائمہ کے نزدیک اگر کسی نے سورۂ فاتحہ کو چھوڑ دیا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی۔ ہمارے اور ان ائمہ کے موقف میں وجہ فرق یہ ہے کہ ہمارے نزدیک نماز میں قرآن کریم کا کوئی حصہ (خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو یا اور کوئی سورت ہو) بطور فرض کے قرأت کے لیے معیّن نہیں ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہ ہو۔ جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ نماز کا ایک مخصوص اور معیّن رکن ہے۔ یعنی ایسا لازمی حصہ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔

دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں اعرابی کا واقعہ مذکور ہے کہ اس نے صحیح طریقہ پر نماز نہ پڑھی (تو نبی اکرم ﷺ نے اس کو نماز کا طریقہ بتایا اور) اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

(۶۸) جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو۔ پھر جو تمہیں قرآن کریم سے آسان معلوم ہو اس کی تلاوت کرو۔

(صحیح بخاری: ۷۵۷، صحیح مسلم: ۳۹۷، سنن ترمذی: ۳۰۳، سنن ابوداؤد: ۸۵۶، سنن نسائی: ۸۸۳، سنن ابن ماجہ: ۱۰۶۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۸۰۴)

جمہور علماء کے اپنے مؤقف پر دلائل وہ احادیث ہیں جو گزر چکیں۔ یہاں اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جمہور علماء نے اپنے مؤقف پر جو حدیث: (۶۷) پیش کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہیں ہے؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ حدیث کا یہ معنیٰ ظاہر الفاظ کے خلاف[۱۰۰] ہے۔ (ظاہر الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ہی نہ ہوگی۔) اور اس معنیٰ کی تائید میں ایک اور حدیث دلیل کے طور پر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۶۹) وہ نماز کافی نہیں ہوتی جس میں آدمی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے[۱۰۱]۔ (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۳۱۹)

۱۰۰؎ ہمارے نزدیک حدیث کا یہ معنیٰ قرآن کریم اور کئی احادیث مبارکہ کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم کی جو آیت علامہ خازن نے ذکر کی کہ ''قرآن سے جو تمہیں آسان ہو پڑھ لیا کرو'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ مخصوص اور معیّن نہیں ہے۔ اب اگر حدیث: ۶۷ کی بنیاد پر سورۂ فاتحہ کو نماز کا معیّن رکن قرار دیا جائے تو یہ آیت مذکورہ کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ آیت مذکورہ اپنے مفہوم میں مطلق ہے اور قرآن کے مطلق کو خبر واحد سے مقید کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو مقید کرنے سے قرآن کریم پر زیادتی لازم آئے گی جو کہ جائز نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ حدیث: ۶۷ کا جو معنیٰ احناف بیان کرتے ہیں کہ ''جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہیں ہے'' یہ خود علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیث کے مطابق ہے جو انہوں نے حدیث: ۶۷ کے متصلاً بعد ذکر کی ہے کہ جس شخص نے ایسی نماز پڑھی جس میں اس نے سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھا تو اس کی نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے اور نامکمل ہے۔ اس حدیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے صراحت فرمادی کہ جس نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز کامل نہیں ہے۔ سو حدیث: ۶۷ کا جو معنیٰ احناف بیان کرتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بھی مطابق ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ احادیث آپس میں متعارض ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

۱۰۱؎ اس حدیث سے علامہ خازن اس بات کی تائید پیش کر رہے ہیں کہ حدیث ۶۷ کا احناف نے جو معنیٰ کیا ہے وہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ واضح طور پر فرما رہے ہیں کہ وہ نماز کافی نہیں ہوتی جس میں آدمی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر ہم اس حدیث کی وجہ سے سورۂ فاتحہ کو نماز کا معیّن رکن قرار دے دیں تو اس سے قرآن کریم کی مذکورہ آیت پر زیادتی لازم آئے گی کہ ''قرآن سے جو تمہیں آسان ہو پڑھ لیا کرو'' اور ہمارے نزدیک قرآن پر زیادتی سے کہیں زیادہ آسان یہ ہے کہ ہم اس حدیث میں تاویل کر لیں اور وہ تاویل یہ ہے کہ اس حدیث سے سورۂ فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے نہ کی اس کی فرضیت۔ لہٰذا اگر کسی سے سورۂ فاتحہ رہ گئی اور آخر میں اس نے سجدۂ سہو کر لیا تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اگر سجدۂ سہو نہ کیا تو اس نماز کو لوٹانا واجب ہوگا۔

دوسرا جواب اس حدیث کا یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس میں یہ نہیں فرمایا کہ ''وہ نماز ہوتی ہی نہیں ہے جس میں آدمی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے'' بلکہ فرمایا: وہ نماز کافی نہیں ہوتی ہے اور کفایت کی نفی سے اصل شئی کی نفی لازم نہیں آتی۔ جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کھانا میرے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاتا کہ جو کچھ اس شخص کے سامنے ہے وہ کھانا ہی نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کھانا اس شخص کے لیے نامکمل اور ناکافی ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں جو فرمایا کہ ''وہ نماز جس میں آدمی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے وہ کافی نہیں ہوتی ہے'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نماز اس شخص کے لیے نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ایسی نماز پڑھی جس میں اس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے اور نامکمل ہے۔

تیسرا جواب زیر بحث حدیث کا یہ ہے کہ بالفرض اس سے اگر سورۂ فاتحہ کا رُکن معیّن ہونا ثابت بھی ہو تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

☆ امام دار قطنی نے کہا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ:

(۷۰) رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں (لوگوں میں) یہ اعلان کر دوں کہ سورۂ فاتحہ اور اُس پر کچھ مزید تلاوت کیے بغیر نماز نہیں ہوتی[۱۰۲]۔ (سنن ابوداؤد: ۸۲۰)

اعرابی والی حدیث (جو امام ابوحنیفہ نے اپنے مؤقف پر پیش کی ہے) اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمانا کہ ''جو تمہیں قرآن کریم سے آسان معلوم ہو اس کی تلاوت کرو'' اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہی ہے کیونکہ وہ آسان ہے یا اس سے سورۂ فاتحہ پر مزید تلاوت کرنا مراد ہے یا یہ حکم اس کے لیے ہو جو سورۂ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو[۱۰۳]۔ واللہ اعلم

❁❁❁❁❁

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یہ سنن دار قطنی کی روایت ہے اور وہ حدیث جو ابھی مذکور ہوئی جس میں نبی اکرم ﷺ نے بغیر سورۂ فاتحہ والی نماز کو تین مرتبہ ''ناقص'' اور آخر میں ''ناکمل'' قرار دیا وہ صحیح مسلم' سنن ترمذی' سنن ابوداؤد' سنن ابن ماجہ' صحیح ابن حبان اور دیگر کتب حدیث میں موجود ہے۔ اس سے بھی یہ مشکل دور ہو جاتی ہے کہ کس حدیث کو کس پر ترجیح ہونی چاہیے۔

[۱۰۲] سورۂ فاتحہ کے رُکن معیّن ہونے کی تائید میں علامہ خازن کا اس حدیث کو پیش کرنا باعثِ حیرت ہے! اس لیے کہ اس حدیث میں صرف سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ مزید تلاوت کا بھی ذکر ہے' تو چاہیے کہ شوافع کے نزدیک جو حکم سورۂ فاتحہ کا ہو وہی حکم سورۂ فاتحہ پر مزید تلاوت کا بھی ہو' یعنی دونوں ہی نماز کے معیّن رکن بن جائیں اور جو شخص بھی سورۂ فاتحہ کے بعد مزید تلاوت چھوڑ دے اس کی نماز بھی باطل ہو جائے۔ حالانکہ شوافع اس بات کے قائل نہیں ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۴۵۱)

دوسرا جواب اس حدیث کا یہ ہے کہ اگر ہم اس حدیث کی وجہ سے سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد مزید تلاوت کو یا کم از کم سورۂ فاتحہ کو نماز کا معیّن رکن قرار دے دیں تو قرآن کریم کے اس حکم پر زیادتی لازم آئے گی کہ ''قرآن سے جو تمہیں آسان ہو پڑھ لیا کرو'' اور ہمارے نزدیک قرآن حکیم پر زیادتی سے کہیں زیادہ آسان یہ ہے کہ ہم علامہ خازن کی پیش کردہ حدیث میں تاویل کر لیں اور وہ تاویل یہ ہے کہ اس حدیث سے سورۂ فاتحہ اور اس کے بعد کم از کم ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات کی تلاوت کا وجوب ثابت ہوتا ہے' یعنی سورۂ فاتحہ بھی نماز میں واجب ہے اور اس کے بعد کم از کم ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات کی تلاوت بھی واجب ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے۔ لہٰذا علامہ خازن علیہ الرحمۃ کی پیش کردہ زیر بحث حدیث مذہب شوافع کی بجائے مذہبِ احناف کی مؤید ہے۔

[۱۰۳] اس عبارت میں علامہ خازن نے امام اعظم کی پیش کردہ حدیثِ اعرابی (جو تمہیں قرآن سے آسان معلوم ہو اس کی تلاوت کرو) کے تین جوابات ذکر کیے ہیں:

(۱) اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہی کی تلاوت ہے کیونکہ وہ آسان ہے۔ لہٰذا یہ حدیث سورۂ فاتحہ کے رکن معیّن ہونے کی دلیل ہے۔

(۲) اس سے سورۂ فاتحہ پر مزید تلاوت کرنا مراد ہے۔ یعنی سورۂ فاتحہ اپنی جگہ رکنِ معیّن ہے' اس حدیث میں اس کے بعد کی تلاوت کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ جو آسان معلوم ہو پڑھ لیا کرو۔

(۳) یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو سورۂ فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو۔ جبکہ وہ شخص جو سورۂ فاتحہ پڑھنے پر قادر ہو اس کے حق میں سورۂ فاتحہ رکن معیّن ہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامہ خازن کے پہلے جواب کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور کے الفاظ "جو تمہیں آسان لگے اُس کو پڑھو" عام ہیں۔ اس میں سورۂ فاتحہ اور کسی بھی سورت کی تلاوت کرنا مساوی طور پر شامل ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے عموم کو باطل کر کے سورۂ فاتحہ کی تخصیص کرنا درست نہیں ہے۔ رہا یہ کہ چونکہ سورۂ فاتحہ ہی آسان ہے اس لیے اس کی تلاوت مراد ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے مقابلہ میں سورۂ اخلاص زیادہ آسان ہے۔ بلکہ کسی کو کوئی سورت آسان لگتی ہے اور کسی کو کوئی۔ پھر چاہیے کہ سورۂ اخلاص کو بلکہ جس کو جو سورت آسان لگے اس کو نماز کا معیّن رکن قرار دے دیا جائے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

علامہ خازن کے دوسرے جواب کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور عام ہے۔ اس میں جب سورۂ فاتحہ کی تخصیص نہیں ہے تو سورۂ فاتحہ کے بعد اضافی تلاوت کا اثبات اس حدیث سے کیسے ہوگا؟ پھر اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اضافی تلاوت اس حدیث سے مراد لی جائے تو یہ خرابی بھی ہے کہ جس طرح سورۂ فاتحہ نماز کا معیّن رکن ہے اسی طرح اضافی تلاوت کرنا بھی فرض ہے حالانکہ شوافع اس بات کے قائل نہیں ہیں۔

علامہ خازن کے تیسرے جواب کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور عام ہے اس کو عاجز کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ اسی حدیث کو رفاعہ بن رافع نے بھی روایت کیا ہے' اس میں رسول اللہ ﷺ نے عاجز آدمی کے لیے مستقل حکم بیان فرمایا ہے کہ اگر تمہیں قرآن آتا ہو تو اس کو پڑھو اور اگر قرآن نہ آتا ہو تو اللہ کی حمد کرو' تکبیر کہو اور "لا الٰہ الا اللہ" پڑھو۔ (سنن ترمذی: ۳۰۲' سنن ابوداؤد: ۸۶۱) جب نبی اکرم ﷺ نے خود عاجز کا حکم بیان فرما دیا ہے تو زیر بحث حدیث کو عاجز کے ساتھ خاص کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۴۵۷' شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۳۰)

سورۃ البقرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔

مختصر تعارف

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ سوائے درج ذیل آیت کے پوری سورت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔

وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡهِ اِلَى اللّٰهِ ۔ (البقرہ:۲۸۱) اور تم اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہ آیت ۱۰ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔

سورۃ البقرہ میں ۲۸۶ آیات ہیں اور بعض علماء کے نزدیک ۲۸۷ آیات ہیں۔ اور اس سورت میں کل چھ ہزار ایک سو اکیس کلمات اور ساڑھے پچیس ہزار حروف ہیں۔

اس سورت کے فضائل

(۷۱) حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے شفاعت کرنے والا بن کر آئے گا اور تم دو روشن سورتوں کو پڑھا کرو یعنی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران۔ کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح آئیں گی جیسے دو بادل ہوں یا دو سائبان ہوں یا اُڑتے ہوئے پرندوں کی دو قطاریں ہوں اور اپنے پڑھنے والوں کی وکالت کریں گی۔ سورۂ بقرہ پڑھا کرو کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے اور نہ پڑھنا حسرت اور افسوس ہے۔ باطل پرست (جادوگر) اس کے حصول کی طاقت نہیں رکھتے۔ معاویہ بن سلام نے کہا کہ مجھے پتا چلا کہ ''بطلة'' سے مراد جادوگر ہیں[۱۰۴]۔ (صحیح مسلم:۸۰۴، السنن الکبریٰ للبیہقی ج۲ص۳۹۵، الترغیب والترہیب:۲۱۵۸۔ ج۲ص۳۴۵، مشکوٰۃ المصابیح ص۱۸۴، المعجم الکبیر:۷۵۴۲۔ ج۸ص۱۱۸، کنز العمال:۲۵۴۴)

۱۰۴؎ علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر لکھا ہے کہ ''بطلة'' سے مراد سستی کرنے والے لوگ ہیں اور حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ سُست لوگ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کو (جلد) حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ دونوں سورتیں طویل ہیں۔ بعض نے ''بطلة'' کا معنیٰ جادوگر کیا ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جادوگر ان سورتوں کا اثر ختم نہیں کر سکتے اور ان سورتوں کے پڑھنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (مرقات ج۴ص۶۲۷) اس لیے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جس گھر یا دوکان میں چالیس روز تک سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جائے اس سے جادو، آسیب اور بندش وغیرہ کے اثرات ختم ہونے لگتے ہیں اور برکات کا نزول ہوتا ہے۔

مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ حدیث کے آخری جملہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس جملہ کے کئی معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ منافقین ریا کار ان سورتوں کو یاد نہ کر سکیں گے، ان کی تلاوت نہ کر سکیں گے۔ یا انہیں یہ دونوں سورتیں بہت دراز اور گراں معلوم ہوں گی مخلصین پر آسان ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ جادوگر وغیرہ ان سورتوں کا اثر اپنے جادو کے زور سے زائل نہیں کر سکتے اور ان کی تلاوت کرنے والے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تیسرے یہ کہ ان سورتوں کی صداقت اس قدر ظاہر ہے کہ انہیں جھوٹے لوگ جھٹلا نہیں سکتے۔ (مراۃ المناجیح ج۳ص۲۴۵)

حدیث مذکور: (۷۱) کی مختصر تشریح

حدیث مذکور میں فرمایا:

''اقـــرء وا الــزهــراویـن '': یعنی دوروشن سورتوں کو پڑھا کرو (سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران) ان دونوں سورتوں کو ''زهـــراویـن'' اس لیے فرمایا گیا کہ یہ دونوں سورتیں نور ہیں اور (عربی میں) ہر روشن چیز کو زاہر کہا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں سورتوں کو ''غمامتان'' اور ''غیابتان'' فرمایا۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو انسان کو سایہ دے' خواہ وہ بادل ہو یا کچھ اور' اس کو (عربی میں) ''غـمـامـة'' اور ''غـیـابـه'' کہتے ہیں۔ اور حدیث میں ان الفاظ کا معنیٰ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا اجر وثواب (بندے کے پاس) اس طرح آئے گا جیسے دو بادل۔

پھر حدیث میں ان دونوں سورتوں کو فرمایا:

''فرقان من طیر صواف '': ''فرقان من طیر '' سے پرندوں کی جماعت مراد ہے۔ اور ''صواف'' '' صافّة'' کی جمع ہے۔ جس کا معنیٰ ہے: وہ پرندے جو اُڑتے وقت اپنے پروں کو پھیلا دیتے ہیں۔

حدیث مذکور میں ''تحاجان'' اور ''بطلة'' کے الفاظ آئے ہیں' ان کے معانی یہ ہیں:

''تحاجان'' (المحاجّة) کا معنیٰ ہے: جھگڑنا اور دلیل وحجت کو ظاہر کرنا۔ اور ''بطلة'' کا معنیٰ ہے: جادوگر۔ جیسا کہ حدیث شریف میں واضح طور پر آیا ہے۔ اور جب کوئی شخص ایسی بات لے کر آئے جو باطل ہو تو کہا جاتا ہے: ''ابــطـل'' (فلاں شخص باطل کے ساتھ آیا)۔

حدیث مذکور سے اس بات کا ثبوت کہ سورۃ البقرہ وغیرہ کہنا جائز ہے

ذکر کردہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ''سورۃ آل عمران'' فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی بھی سورت کو اس طرح کہنا جائز ہے سورۃ البقرہ' سورۂ آل عمران وغیرہ۔ اور اس طرح کہنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ بعض متقدمین علماء نے اس کو مکروہ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ سورۂ بقرہ کی بجائے یوں کہا جائے کہ ''وہ سورت جس میں بقرہ کا تذکرہ ہے''۔ اور اس طرح تمام سورتوں کو کہا جائے۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے (یعنی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران وغیرہ کہنا جائز ہے) اور چونکہ یہ الفاظ حدیث مذکور میں آ چکے ہیں اس لیے اکثر علماء کا یہی مؤقف ہے۔[۱۰۵]

(۷۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اُس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔[۱۰۶]

---

۱۰۵ اور بھی کئی احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے مختلف سورتوں کے نام لفظ سورت کے ساتھ ارشاد فرمائے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری' کتاب فضائل القرآن میں باب فضل سورۃ البقرہ کے تحت یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ''سورۂ بقرہ'' کی آخری دو آیتیں کسی رات پڑھیں تو وہ آیتیں اس شخص کو کافی ہو جائیں گی۔ (صحیح بخاری: ۵۰۰۹)

۱۰۶ اس حدیث میں فرمایا کہ گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ گھروں کو اللہ کے ذکر اور اس کی عبادت سے خالی نہ رکھو ورنہ تمہارے گھر قبرستان اور مُردوں کی مانند ہو جائیں گے۔ دوسرا معنیٰ اس جملہ کا یہ ہے کہ اپنے گھروں میں مُردے نہ دفناؤ۔ پہلا معنیٰ جو بیان کیا گیا اُس کی دلیل حدیث کا اگلا جملہ ہے کہ ''شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے''۔ شیطان کے بھاگنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس سورت کی برکت سے اس گھر کے رہنے والوں کو بہکانے سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں خاص ''سورۂ بقرہ'' کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ سورت لمبی ہے اور اس میں اللہ عزوجل کے اسماء مبارکہ اور اس کے احکامات زیادہ ہیں۔

(مرقات ج ۴ ص ۶۲۶)

(صحیح مسلم: ۷۸۰، سنن الترمذی: ۲۸۷۷، صحیح ابن حبان: ۷۸۳، ج ۳ ص ۶۲، مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۴)

(۷۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر چیز کی ایک کوہان ہوتی ہے اور قرآن کریم کی کوہان سورۂ بقرہ ہے اور اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو قرآن مجید کی تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیۃ الکرسی ہے[۱۰۷] (سنن الترمذی: ۲۸۷۸، مصنف عبدالرزاق: ۶۰۱۹، سنن دارمی: ۳۳۷۷، المستدرک ج ۱ ص ۵۶۰۔ ج ۲ ص ۲۵۹)

☆ اس حدیث کو امام ترمذی نے غریب قرار دیا ہے۔

سورۂ بقرہ کی تفسیر

الٓمّٓ ۝۱

الف لام میم ۝

بعض علماء نے کہا ہے کہ سورتوں کے شروع میں جو حروفِ تہجی ("الٓمٓ، حٰمٓ" وغیرہ) آئے ہیں یہ وہ متشابہ ہیں جن کا علم اللہ عزوجل نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے اور یہ حروف، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا راز ہیں۔ لہٰذا ہم ان حروف کے ظاہر پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا (حقیقی) علم اللہ عزوجل کے سپرد کرتے ہیں۔ (یعنی وہی اِن حروف کی حقیقت جانتا ہے۔)[۱۰۸]

[۱۰۷] اس حدیث میں سورۃ البقرہ کو قرآن کریم کی کوہان فرمانے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کوہان بلند ہوتی ہے اسی طرح یہ سورت بھی دیگر سورتوں سے بلند ہے اور بلند ہونے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ سورت بہت لمبی ہے یا اس لیے کہ یہ بہت زیادہ احکامات پر مشتمل ہے اور اس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ (مرقات ج ۴ ص ۶۸۲) سورۃ البقرہ کے بلند ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے اس میں آیۃ الکرسی ہے اور آیۃ الکرسی ایک ایسی آیت ہے جو قرآن کریم کی تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت جو تمام آیتوں کی سردار ہو وہ جس سورت کے اندر ہو تو یقیناً وہ سورت تمام سورتوں سے بلند ہوگی اور بلندی کی یہ وجہ حدیث کے اگلے جملہ سے بالکل واضح اور ظاہر ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس حدیث میں آیۃ الکرسی کو قرآن کریم کی تمام آیتوں کی سردار قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اُن اوصاف اور احکام کا بیان ہے جو قرآن کریم کی کسی اور آیت میں نہیں ہیں۔ بعض متأخرین علماء نے فرمایا ہے کہ آیۃ الکرسی میں ۱۶ ایسی ضمیریں (Pronouns) ہیں جو اللہ عزوجل کی طرف لوٹ رہی ہیں اور سب میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا مفہوم موجود ہیں۔ یوں یہ آیت قرآن کریم میں سب سے عظیم آیت ہے۔ (المفہم للامام القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ ج ۲ ص ۴۳۶)

[۱۰۸] یہاں ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ آیا سرکارِ دوعالم ﷺ کو ان حروف کا علم ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ان حروف کا علم یقیناً عطا فرمایا ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کو ان حروف کا علم نہ ہو تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے ایسے کلمات کے ساتھ خطاب فرمایا جن کو آپ جانتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

استاذ محترم مفسّر قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدظلّہ العالی نے اپنی تفسیر میں علامہ بیضاوی، علامہ سیّد محمود آلوسی، قاضی ثناء اللہ مظہری نقشبندی اور شیخ محمود الحسن دیوبندی کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان حروف کے معانی جانتے ہیں۔ بلکہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان حروف کی معرفت صرف اولیاء کرام کو ہے جو کہ وارثِ علم رسول ہیں، ان کو اسی دربار سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حروف خود ان اولیاء کو اپنا معنی بتا دیتے ہیں، جس طرح کہ یہ اس ذات کے سامنے بول اٹھتے تھے جس کے مبارک ہاتھوں میں سنگریزوں نے تسبیح پڑھی اور ہرن اور گوہ نے اس ذات سے کلام کیا۔ (تبیان القرآن ج ۱ ص ۲۴۸)

حروفِ تہجی ("الٓمٓ ' حٰمٓ" وغیرہ) ذکر کرنے کا مقصد اور ان کے متعلق صحابہ کرام کے اقوال

(قرآن کریم میں) حروفِ تہجی کو ذکر کرنے کا مقصد اور فائدہ یہ ہے کہ لوگوں سے ان حروف پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان حروف کے متعلق فرماتے ہیں:

فی کل کتاب سرّ وسرّ اللہ فی القرآن اوائل السور. ہر کتاب میں کوئی راز ہوتا ہے اور قرآن مجید میں اللہ عزوجل کا راز سورتوں کے آغاز (میں آنے والے حروفِ تہجی) ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں:

ان لکل کتاب صفوۃ وصفوۃ ھذا الکتاب حروف التھجی. بے شک ہر کتاب میں کچھ حصہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور اس کتاب (کلامِ مجید) کا بہت عمدہ حصہ حروفِ تہجی ہیں۔

یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ (حروف تہجی "الٓمٓ ' حٰمٓ" وغیرہ کے معانی صرف اللہ عزوجل جانتا ہے تو) اُس کا اپنے بندوں کے ساتھ ایسی بات سے خطاب کرنا جس کو بندے جانتے ہی نہ ہوں' یہ درست نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس طرح اللہ عزوجل کا اپنے بندوں کو ان چیزوں کا مکلّف اور پابند کرنا درست ہے جن کا مفہوم ومقصد معلوم نہ ہو' جیسے رمیٔ جمار (حج کے موقع پر منٰی میں شیطان کو کنکریاں مارنا) اس کا معنیٰ ومفہوم اور مقصد ہماری عقل میں نہیں آتا (اس کے باوجود ہمیں اس کے کرنے کا حکم دیا گیا) اور ان کنکریوں کے مارنے میں حکمت یہ ہے کہ اس میں اللہ عزوجل کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری ہے' سو اسی طرح حروف تہجی جو سورتوں کے آغاز میں نازل کیے گئے ان پر بھی ہمیں ایمان لانا واجب ہے اور ان کے متعلق بحث کرنا (ان کے معانی کو تلاش کرنا) ضروری نہیں ہے۔

حروفِ تہجی کے معانی میں مختلف اقوال کی تفصیل

دیگر اہل علم نے کہا ہے کہ ان حروف کے معانی معروف اور معلوم ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ان حروف کے معانی کیا ہیں؟ ذیل میں اس سلسلہ کے مختلف اقوال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

(۱) بعض علماء نے کہا ہے کہ ان حروف میں سے ہر حرف اللہ عزوجل کے کسی نہ کسی نام پاک کی کنجی ہے۔ "الٓمٓ" میں "الف" اللہ عزوجل کے ذاتی نام "اللہ" کی کنجی ہے' لام "لطیف" کی کنجی ہے اور میم "مجید" کی کنجی ہے۔

(۲) بعض علماء کہتے ہیں کہ "الٓمٓ" میں الف سے "آلاء اللہ" (اللہ عزوجل کی نعمتیں)' لام سے اس کے لطف اور میم سے اس کی ملکیت وبادشاہت کی طرف اشارہ ہے۔

اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اہل عرب کسی کلمہ کا ایک حرف ذکر کرتے ہیں اور مراد اس سے پورا کلمہ لیتے ہیں۔ جیسے راجز کا یہ شعر:

قلت لھا قفی فقالت قاف میں نے اس سے کہا کہ تو ٹھہر جا تو اس نے کہا کہ قاف

لا تحسبی انا نسینا الا یجاف (اور میں نے کہا کہ) تو یہ مت سمجھ کہ ہم تیز چلنا بھول گئے ہیں۔

اس شعر میں ہے کہ آدمی نے کہا کہ ٹھہر جا تو عورت نے کہا: "قاف" (یعنی قفت میں ٹھہر میں گئی)۔ اس میں قاف (ایک حرف) بول کر اس نے پورا کلمہ مراد لیا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الٓمٓ کا معنیٰ ہے: "انا اللہ اعلم" (میں اللہ ہوں' زیادہ جانتا ہوں)۔

(۴) بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''الٓمّٓ'' وغیرہ اللہ عزوجل کے ایسے نام ہیں جنہیں مختلف حروف میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اگر لوگوں کو ان حروف کے جوڑنے کا علم ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ضرور جان لیں گے۔ مثلاً ہم پڑھتے ہیں: ''الٓر. حٰمٓ. نٓ'' ان متفرق حروف کا مجموعہ ''الرحمٰن'' ہے۔ اسی طرح تمام حروف مقطعات کا معاملہ ہے۔ لیکن ان تمام حروف کو جوڑنا ممکن نہیں ہے۔

(۵) بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ''الٓمّٓ'' وغیرہ قرآنی سورتوں کے نام ہیں۔ محققین علماء کا بھی یہی قول ہے۔

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ حروف اللہ عزوجل کی قسمیں ہیں' اللہ عزوجل نے ان حروف کے ذریعہ قسم کھائی ہے۔ کیونکہ یہ حروف اعلیٰ مرتبہ اور فضیلت کے حامل ہیں۔ کیونکہ یہی حروف اللہ عزوجل کی نازل کردہ کتابوں کی بنیاد اور اساس ہیں اور یہی حروف اللہ عزوجل کے خوب صورت نام اور اس کی بلند صفات کی بنیاد ہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر قرآن کریم میں ان حروف میں سے بعض کو ذکر کرنے پر اکتفاء کیوں کیا گیا' حالانکہ مراد سارے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے ''الحمد'' پڑھی اور مراد اس سے پوری سورت ہوتی ہے تو گویا اللہ عزوجل نے ان حروف کے ذریعہ قسم کھائی کہ یہ کتاب وہی کتاب ہے جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔

(۷) بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب اللہ عزوجل نے کفار کو چیلنج دیا کہ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (البقرہ:۲۳)

جو کچھ ہم نے اپنے (خاص) بندے پر نازل کیا ہے اگر اس کے متعلق تمہیں کوئی شک ہے تو اس (کلام) جیسی کوئی سورت بنا کر لے آؤ۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ ۔ (ھود:۱۳)

کیا وہ کہتے ہیں کہ (نبی ﷺ نے) قرآن کو خود بنایا ہے تو آپ کہہ دیجئے! پھر تم اس کی مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ۔

تو کفار اس چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے اور اللہ عزوجل نے ''الٓمّٓ'' جیسے دیگر حروف نازل فرمائے اور یہ بتایا کہ قرآن مجید ان جیسے ہی حروف سے بنا ہوا ہے اور تم ان حروف پر قادر ہو لہٰذا تم پر واجب ہے کہ تم اس قرآن کی مثل بنا کر لے آؤ۔ لیکن جب تم ایسا نہ کر سکے اور تم بے بس ہو گئے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید اللہ عزوجل کی جانب سے ہے' کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

(۸) بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب کفار نے قرآن کو سننے سے منہ پھیرا اور اللہ عزوجل نے ان میں سے بعض کی اصلاح کا ارادہ فرمایا تو ''الٓمّٓ'' اور اس جیسے دیگر حروف نازل فرما دیئے۔ پھر جب اُن کافروں نے ان حروف کو سنا تو تعجب سے کہنے لگے کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) جو کلام پیش کر رہے ہیں اُس کو سنو۔ جب انہوں نے اس کلام کو کان لگا کر سنا تو وہ ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا اور یہی ان کے ایمان لانے کا سبب بن گیا۔

(۹) بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے اپنے کلام کے آغاز میں ہی لوگوں کی عقلوں کو حیرت میں ڈال دیا' تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ عزوجل کے کلام کی معرفت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب یہ اعتراف کر لیا جائے کہ ہم اس کے کلام کی حقیقت کو پانے سے عاجز اور بے بس ہیں۔

حروفِ تہجی میں سے کتنے حروف سورتوں کے آغاز میں مقطعات کے طور پر مذکور ہیں؟

سورتوں کے شروع میں مقطعات کے طور پر جو حروف مذکور ہیں وہ کُل ۱۴ ہیں اور وہ یہ ہیں:

الف' لام' میم' صاد' راء' کاف' ھاء' یاء' عین' طاء' سین' حاء' قاف' نون

اور یہ کُل حروفِ تہجی کے آدھے ہیں جو کہ (متفرق طور پر) ۲۹ سورتوں کے شروع میں مذکور ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان حروف کے متعلق مزید گفتگو ان حروف کے مقامات پر آئے گی۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَۙ ②

یہ وہ عظمت والی کتاب ہے جس کے (کلام اللہ ہونے میں) کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہےO

قرآن مجید کے لیے "ذالک الکتاب" (وہ کتاب) فرمانے کی توجیہ

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ کا معنیٰ ہے یہ کتاب یعنی قرآن۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اضمار (یعنی کچھ الفاظ کی پوشیدگی) ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ آپ پر ایسی کتاب نازل فرمائے گا جس کو نہ پانی مٹا سکے گا نہ ہی وہ بار بار کی تلاوت سے پرانی ہوگی پھر جب اللہ عزوجل نے (اپنے محبوب ﷺ پر) قرآن کریم کو نازل کیا تو ارشاد فرمایا:

(ھذا) ذالک الکتاب (الذی وعدتک به). (یہ) وہ کتاب ہے (جس کا میں نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا)۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ایک کتاب کو نازل فرمائے گا اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے ایک رسول بھیجے گا۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں یہودی بھی بہت زیادہ تھے تو اللہ عزوجل نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ "الم ذالک الکتاب" یعنی:

ھذا الکتاب الذی وعدت به علی لسان موسی ان انزله علی النبی الذی ھو من ولد اسماعیل. یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ ان کی قوم سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ کتاب اس نبی پر نازل کروں گا جو حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے ہوں گے (یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ)۔

کتاب کا معنیٰ

کتاب مصدر ہے بمعنیٰ مکتوب (یعنی لکھی ہوئی)۔ اس کا اصل معنیٰ ملانا اور جمع کرنا ہے۔ لشکر کو عربی میں "کتیبة" کہتے ہیں' کیونکہ وہ بھی یکجا اور اکٹھا ہوتا ہے۔ کتاب کو کتاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں بعض حروف بعض کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف ناموں میں ایک نام "الکتاب" بھی ہے۔

﴿لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کتاب کے اللہ عزوجل کی جانب سے ہونے اور اس کے حق اور سچ ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعض علماء کے نزدیک "لا ریب فیه" کا جملہ خبر بمعنیٰ نہی ہے یعنی "لا ریب فیه" کا معنیٰ ہے اس کلام میں تم شک نہ کرو۔

''لا ریب فیہ'' کے معنیٰ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

اگر یہاں اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں کافروں کو تو شک ہے' پھر اس فرمان کا کیا مطلب ہے کہ اس کلام میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ''لا ریب فیہ'' کا معنیٰ ہے یہ کلام اپنی ذات میں بالکل برحق اور سچا ہے۔ اب جو شخص اس کلام میں اچھی طرح غور وفکر کرے گا وہ اس کی حقیقت کو پہچان لے گا۔

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کتاب پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے۔ ہم اس جُملہ کے تحت ہدایت کا معنیٰ' تقویٰ کی تعریف اور متقی کی حقیقت واضح کریں گے:

ہدایت کا معنیٰ

ہدایت کا معنیٰ ہے: رہنمائی کرنا۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: نرمی کے ساتھ رہنمائی کرنا اور بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: ''الارشاد'' (راہ دکھانا) اور ''ھدی للمتقین'' کا معنیٰ ہے: یہ کتاب پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے اور بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ کتاب ایسی ہدایت دینے والی ہے کہ اس کی ہدایت میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ کا معنیٰ ہے:

جعل النفس فی وقایة مما یخاف. جس چیز سے خوف آتا ہو اُس سے اپنا بچاؤ کرنا۔

اور تقویٰ کے شرعی معنیٰ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں' ملاحظہ فرمائیے:[۱۰۹]

(۱) التقوی حفظ النفس مما یؤثم وذالک بترک المحظور وبعض المباحات.

تقویٰ یہ ہے کہ نفس کو ہر اس چیز سے بچایا جائے جو گناہ میں مبتلا کر دے اور یہ مقام اس وقت حاصل ہو گا جب تمام ممنوع کاموں کو چھوڑ دیا جائے اور بعض مباح (جائز) کام بھی چھوڑ دے (مثلاً پیٹ بھر کر کھانا کھانا جائز ہے اللہ کی خاطر اس کو ترک کر دے)۔

(۲) التقوی ترک ما حرم اللہ واداء ما افترض.

تقویٰ یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں اُنہیں چھوڑ دیا جائے اور جو چیزیں فرض فرمائی ہیں اُنہیں ادا کیا جائے۔

(۳) التقوی ترک الاصرار علی المعصیة وترک الاغترار بالطاعة.

تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنے کسی گناہ کو بار بار نہ کرے اور اپنی اطاعت وعبادت سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو۔

(۴) التقوی ان لا یراک مولاک حیث نھاک.

تقویٰ یہ ہے کہ تجھے تیرا مولیٰ وہاں نہ دیکھے جہاں سے اس نے تجھے روکا ہے۔

---

۱۰۹ واضح رہے کہ اس مقام پر علامہ خازن علیہ الرحمۃ کی عبارت کا ترجمہ کچھ تقدیم وتاخیر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یعنی علامہ نے ذیل میں تقویٰ اور متقی کی تعریف میں علماء کے جو مختلف اقوال ذکر کیے ہیں ان کو اصل تفسیر میں انہوں نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ تقویٰ کے بارے میں اقوال ذکر کرتے ہوئے درمیان میں متقی کے متعلق اقوال ذکر کیے ہیں اور اس کے بعد پھر تقویٰ کے بارے میں اقوال ذکر کیے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ علامہ خازن نے کس حکمت کے پیش نظر اس ترتیب کو قائم کیا' ہم نے بہر حال قارئین کی آسانی کے لیے تقویٰ اور متقی کے بارے میں علماء کے اقوال کو علیحدہ کر کے دو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب سے ذکر کیا ہے۔

(۵) التقوی الاقتداء بالنبی ﷺ و اصحابه. تقویٰ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کی پیروی کی جائے۔

اور حدیث میں ہے کہ تقویٰ کا مجموعہ اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ. (النحل: ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم فرماتا ہے اور بے حیائی بُرائی اور سرکشی سے منع فرماتا ہے۔

متقی کون ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

المتقی من یتقی الشرک والکبائر والفواحش. متقی وہ شخص ہے جو شرک کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہو۔

لفظ 'متقی' 'اتقاء' سے ماخوذ ہے جس کا اصل معنیٰ ہے: دو چیزوں کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ ڈالنا۔ جب کوئی شخص اپنے اور اپنے مقصود کے درمیان ڈھال کو حائل کر دے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''اتقی بترسه'' (اس نے اپنی ڈھال کو درمیان میں حائل کر دیا)۔ اور حدیث شریف میں (حضرت براء اور بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے) ہے کہ:

(۷۴) جب جنگ سخت ہو جاتی تو ہم رسول اللہ ﷺ کو اپنے لیے (ڈھال اور دشمن سے) بچاؤ کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔

(صحیح مسلم: ۶۷۷۱ مسند احمد ج ۱ ص ۱۲۶ مسند ابویعلیٰ: ۳۰۲۔ ج ۱ ص ۲۵۸ دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵ ص ۱۳۵)

اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ جب جنگ شدت اختیار کر لیتی تو ہم رسول اللہ ﷺ کو اپنے اور دشمن کے درمیان حائل بنا دیتے تھے تو گویا متقی بھی اپنی ذات اور جہنم کے درمیان اللہ عزوجل کے احکامات کی اطاعت اور ممنوعات سے اپنے پرہیز کو حائل اور رکاوٹ بنا دیتا ہے۔

بعض علماء نے متقی کی تعریف یوں کی ہے:

من لا یری نفسهٔ خیرا من احد. جو اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ سمجھے وہ متقی ہے۔

اور بعض علماء نے متقی کی تعریف یوں کی ہے:

هو الذی یترک مالا بأس به حذرا مما به بأس. جو شخص حرج والی چیزوں سے بچتے ہوئے ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے وہ متقی ہے۔

''ھدی للمتقین'' میں قرآن کریم کے ہدایت ہونے کو متقین کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ

فرمایا کہ یہ کتاب متقین کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں خاص متقین کا ذکر اس لیے فرمایا تا کہ اُنہیں شرف اور اعزاز دیا جائے کیونکہ تقویٰ ایک بہت ہی بلند اور عزت والا مقام ہے اور اس لیے بھی ان کا ذکر فرمایا کہ قرآن کریم کی ہدایت سے فائدہ حاصل کرنے والے بھی یہی حضرات ہیں۔ اور (حق تو یہ ہے کہ ''ھدی للمتقین'' کا فرمان اہلِ تقویٰ کے لیے ایسا اعزاز ہے کہ) اگر بالفرض ان حضرات کو کوئی اور فضیلت حاصل نہ ہوتی تب بھی اُنہیں رب کائنات کا یہ فرمان ہی کافی ہوتا۔

ے علامہ خازن نے اس کو حدیث قرار دیا ہے لیکن تفسیر بغوی کے مُخرج کی تحقیق کے مطابق یہ حدیث نہیں ہے بلکہ مفسرین میں سے کسی کا قول ہے۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ متقی اور پرہیزگار لوگ پہلے ہی ہدایت پر ہوتے ہیں پھر ان کے لیے کیسے فرمایا گیا کہ کتاب، متقین کے لیے ہدایت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی انتہائی عزت دار اور مکرم شخص کو یہ دعا دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عزت عطا فرمائے اور اس کا مطلب ہم یہی لیں گے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری عزت کو وہاں تک بڑھائے اور زیادہ کرے جہاں تک تمہارے لیے مقدر ہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

(پرہیزگار وہ ہیں) جو پوشیدہ چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو ٹھیک طریقہ سے ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں O

ایمان کی تعریف اور اس پر بحث کہ ایمان کم زیادہ ہوتا ہے یا نہیں؟[1]

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ لوگ جو پوشیدہ چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایمان کا اصل معنیٰ لغت میں ہے تصدیق کرنا۔ (جیسے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا''. (یوسف:۱۷) اس آیت میں مؤمن کا معنیٰ ہے: تصدیق کرنے والا تو جب ایمان کا معنیٰ تصدیق ہو تو اس میں کم یا زیادہ ہونے کا تصور نہیں[2] رہے گا۔ کیونکہ تصدیق قابل تجزّی نہیں ہے (یعنی ایسی چیز نہیں ہے جس کو تقسیم کیا جا سکے)۔

اور شریعت میں ایمان کا معنیٰ ہے:

[1] علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر ایمان کے کم زیادہ ہونے کے حوالہ سے جو بحث سپردِ قلم فرمائی ہے اُس کا خلاصہ ترتیب کے ساتھ درج ذیل ہے: (یہاں واضح رہے کہ علامہ خازن رحمۃ اللہ شافعی ہیں اور اس بحث میں کچھ باتیں اُنہوں نے مسلک شافعی کے حوالہ سے ذکر کی ہیں، جن کے جوابات ہم ان شاء اللہ آئندہ حواشی میں متعلقہ مقام پر ذکر کریں گے۔)

(۱) جب ایمان کی تفسیر تصدیق سے کی جائے تو اس میں کم یا زیادہ ہونے کا تصور نہیں رہے گا' کیونکہ تصدیق ایسی چیز ہے جو قابل تقسیم نہیں ہے اور جب ایمان کی تفسیر تصدیق قلبی' اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے کی جائے تو اس میں کم یا زیادہ ہونے کا تصور پایا جائے گا۔ محدثین اہل سنت وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔

(۲) اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص دل سے تصدیق کرے لیکن ایمان کے تقاضوں پر عمل نہ کرے تو اہل سنت کے راجح مذہب کے مطابق ایسے شخص کو ''مؤمن'' نہیں کہا جائے گا۔ وہ صرف مسلمان ہوگا۔

(۳) اہل کلام میں سے اکثر علماء ایمان کے کم یا زیادہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتے' بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان اگر کم یا زیادہ ہونے لگ جائے تو وہ ایمان نہیں ہے' شک اور کفر ہے۔

(۴) محققین متکلمینِ اہل سنت کے نزدیک نفس تصدیق میں کمی زیادتی نہیں ہوتی' البتہ اعمال کے کم یا زیادہ ہونے سے ایمانِ شرعی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

(۵) بعض محققین کا مؤقف یہ ہے کہ دلائل میں غور و فکر کے کم اور زیادہ ہونے سے نفس تصدیق بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

(۶) بعض علماء کے نزدیک اقرار اور عمل کا نام ایمان ہے۔ یعنی اعمال ایمان کا جزء ہیں اور ایمان میں داخل ہیں۔

[2] یہ جمہور علماءِ متکلمین کا مذہب ہے۔ (تبیان القرآن' ج۱ ص۲۶۰)

التصدیق بالقلب والاقرار باللسان والعمل بالارکان. دل سے تصدیق کرنا' زبان سے اقرار کرنا اور ارکان پر عمل کرنا (یہ ایمان ہے)[۱۱۲]۔

اور جب ایمان کا یہ معنیٰ کیا جائے گا تو اس میں کمی اور زیادتی کا تصور پایا جائے گا۔ یہی محدثینِ اہل سنت اور دیگر کا مذہب ہے۔ ایمان کے کم یا زیادہ ہونے کے متعلق اس اختلاف کا نتیجہ ایک مسئلہ میں ظاہر ہوگا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص دل سے تصدیق کرتا ہو لیکن اپنی تصدیق کے ساتھ ایمان کے تقاضوں پر عمل نہ کرتا ہو' مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج وغیرہ دیگر ارکان ادا نہ کرتا ہو تو کیا ایسا شخص ''مؤمن'' کہلائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اہل سنت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ایسے شخص کو ''مؤمن'' نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۷۵) زنا کرنے والا زنا کرتے وقت مؤمن نہیں ہوتا ہے[۱۱۳]۔

(صحیح بخاری: ۲۴۷۵' صحیح مسلم: ۵۷' سنن الترمذی: ۲۶۲۵' سنن ابن ماجہ: ۳۹۳۶' مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷' مطبوعہ کراچی)

اس حدیث میں (بدکاری کرنے والے شخص کے متعلق) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ بدکاری کرتے وقت مؤمن یا کامل مؤمن نہیں رہتا ہے۔

---

[۱۱۲] ایمان کا یہ معنیٰ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے اور اس تعریف کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کی تصدیق میں خلل ہو وہ منافق ہے' جس شخص کے اقرار میں خلل ہو وہ کافر ہے اور جس شخص کے عمل میں خلل ہو وہ فاسق ہے۔ یعنی وہ دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات پالے گا اور بالآخر جنت میں داخل ہو جائے گا۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۶۵) جب کہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان کا شرعی معنیٰ ہے: زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے سو وہ ایمان کو کامل اور اعلیٰ بنانے کے لیے ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے دینِ اسلام کو زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق کے ساتھ قبول کر لیا لیکن بداعمالی کا شکار رہا تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مؤمن تو ہے لیکن کامل مؤمن نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۶۴) لہٰذا وہ حدیث جس میں نبی اکرم ﷺ نے کبھی مؤمن کو زنا کرنے کے باوجود جنت کا مستحق قرار دیا ہے اس کی وجہ نفسِ ایمان کا ہونا ہے' جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث: ۵۸۲۷ میں ہے اور جس حدیث میں زنا کرنے والے شخص سے زنا کے وقت مؤمن ہونے کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ایمان کامل کی نفی ہے۔ یعنی زنا کرنے والا زنا کرتے وقت کامل مؤمن نہیں رہتا۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث: ۲۴۷۵ میں ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۶۶) حاصل کلام یہ کہ امام شافعی کے نزدیک تصدیق' اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ایمان ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے اور عمل سے ایمان کامل ہوتا ہے۔

اس مقام پر علامہ عینی نے ایک شاندار اور فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف لفظوں کی حد تک ہے۔ وگرنہ حقیقتاً اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جو ایمان دوزخ میں داخل ہونے سے بچاتا ہے وہ ایمان کامل ہے اور جو ایمان دوزخ میں ہمیشہ رہنے سے بچاتا ہے وہ نفس ایمان ہے' اس میں اہل سنت متفق ہیں۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۶۹' تبیان القرآن ج ۱ ص ۲۶۲)

[۱۱۳] یعنی زنا کرتے وقت کامل مؤمن نہیں رہتا ہے بلکہ اُس وقت اُس کے ایمان کا نور اُس سے نکل جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ زنا کرنے والا سرے سے مؤمن ہی نہیں رہتا ہے' کیونکہ زنا ایک گناہ کبیرہ ضرور ہے لیکن یہ اور دیگر گناہ کبیرہ آدمی کو ایمان سے خارج نہیں کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص یہ جانتے ہوئے کہ یہ کام شرعاً حرام ہے اس کے باوجود اس کو حلال جان کر کرے تو وہ یقیناً مؤمن نہیں ہے' وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۳۹' مرقات ج ۱ ص ۲۲۳)

اہل کلام میں سے اکثر علماء نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا ہے کہ ایمان کم یا زیادہ ہوتا ہے بلکہ انہوں نے یہاں تک فرما دیا کہ جب ایمان کم یا زیادہ ہونے لگ جائے تو وہ ایمان نہیں بلکہ شک اور کفر ہے اور محققین متکلمین اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ نفس تصدیق میں کمی زیادتی نہیں ہوتی البتہ اعمال کے کم زیادہ ہونے سے ایمانِ شرعی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہیں سے ایمان کے لغوی معنیٰ تصدیق اور قرآن وسنت کی اُن ظاہری نصوص میں تطبیق بھی ممکن ہوگئی جن میں ایمان کے گھٹنے بڑھنے کا ذکر آیا ہے۔

بعض محققین کا قول یہ ہے کہ دلائل میں غور وفکر کے کم اور زیادہ ہونے سے نفس تصدیق بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس لیے صدیقین کا ایمان دوسروں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے کیونکہ اُنہیں اپنے ایمان میں نہ کوئی شبہ لاحق ہوتا ہے نہ ہی کوئی شبہ اُنہیں اپنی جگہ سے ہلاتا ہے۔ جبکہ دیگر لوگوں کا حال اپنے ایمان میں ایسا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی عقل مند کو اس بات میں شک نہیں ہوسکتا کہ امت کے کسی بھی فرد کی تصدیق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق کے برابر نہیں ہے (لہٰذا کہنا پڑے گا کہ تصدیق میں کمی بیشی ہوتی ہے)۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اقرار اور عمل کو ایمان اس لیے کہا گیا ہے کہ ان دونوں میں مناسبت ہے کیونکہ اقرار اور عمل ایمان ہی کے حصے ہیں[١١٤]۔ اعمال کے ایمان کا حصہ ہونے پر دلیل درج ذیل حدیث ہے:

(٧٦) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کے ستر اور کچھ شعبے ہیں۔ ان میں افضل ترین یہ ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا جائے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو دور کیا جائے اور حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔

(صحیح بخاری: ٩، صحیح مسلم: ٣٥، سنن ترمذی: ٢٦١٤، سنن ابوداؤد: ٤٦٧٦، سنن نسائی: ٥٠١٩، سنن ابن ماجہ: ٥٧، مشکوٰۃ المصابیح ص ١٢)

اس حدیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں جن کی کچھ لغوی تشریح پیش کی جاتی ہے:

''بِضْعٌ'': تین سے دس تک کے درمیان کسی چیز پر بولا جاسکتا ہے۔ ''شعبة'': کسی بھی چیز کا ٹکڑا اور حصہ۔ ''اماطة الاذی عن الطریق'': یعنی راستہ سے پتھر اور کانٹے وغیرہ ہٹانا۔

''الحیآء'': نفس کا کسی بُرے فعل سے رُکے رہنا۔ رہا یہ سوال کہ حیاء جب اکتسابی (غیر جبلّی اور غیر فطری) چیز ہے تو اس کو ایمان کا شعبہ کیوں قرار دیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حیاء کرنے والا حیاء کرنے کی وجہ سے بہت سارے گناہوں سے رُکا رہتا ہے اس لیے اس کو ایمان کا شعبہ قرار[١١٥] دیا گیا۔

ایمان اور اسلام کا معنیٰ اور ان دونوں میں فرق[١١٦]

ایمان ''امن'' سے ماخوذ ہے۔ مؤمن کو مؤمن اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اللہ عزوجل کے عذاب سے بچاتا

---

[١١٤] ہمارے نزدیک اعمال ایمان کامل کا حصہ ہیں۔ نفس ایمان میں اعمال داخل نہیں ہیں۔ علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیث: ٧٦ میں حیاء کے شعبۂ ایمان ہونے سے مراد یہی ہے کہ حیاء ایمان کامل کا ایک حصہ ہے۔

[١١٥] یعنی حیاء اگرچہ غیر فطری اور غیر اختیاری صفت ہے، لیکن اس کے نتیجہ میں انسان کا مختلف گناہوں کے ارتکاب سے باز رہنا ایک اختیاری چیز ہے۔ اس لیے اس کو ایمان کا شعبہ قرار دیا گیا۔

[١١٦] اسلام اور ایمان دونوں ایک ہیں یا علیحدہ؟ اس بارے میں علامہ خازن نے جو بنیادی بات بیان کی ہے وہ یہ کہ اسلام کا معنیٰ ہے: ظاہری اعتبار سے اطاعت کرنا۔ اور ایمان کا معنیٰ ہے: باطنی اعتبار سے اطاعت کرنا۔ ایمان اور اسلام (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہے۔ اور اسلام کا معنیٰ ہے: اطاعت کرنا اور جھک جانا۔ لہٰذا ہر ایمان تو اسلام ہے لیکن ہر اسلام جب وہ تصدیق سے خالی ہو وہ ایمان نہیں ہے۔ کیونکہ آدمی کبھی ظاہراً مسلمان ہوتا ہے لیکن باطن میں وہ تصدیق سے خالی ہوتا ہے۔

ایمان اور اسلام میں فرق کی دلیل یہ حدیث ہے[۱۱۷]:

(۷۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ لوگوں کے درمیان جلوہ افروز تھے کہ آپ کی خدمت میں جبریل امین حاضر[۱۱۸] ہوئے اور عرض کیا کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ' اس کے فرشتوں پر' اس سے ملنے پر اور اس کے رسولوں پر یقین رکھو اور اس بات پر یقین رکھو کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ تو فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' نماز قائم کرو' فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ جبریل نے پوچھا کہ احسان (یعنی اخلاص) کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کے درمیان اس فرق پر دلیل حدیث جبریل ہے' جس میں یہ ہے کہ حضرت جبریل نے نبی اکرم ﷺ سے ایمان اور اسلام کے متعلق علیحدہ علیحدہ سوال کیا تو نبی اکرم ﷺ نے جواباً جب اسلام کا تعارف کرایا تو ظاہری افعال بیان فرمائے اور ایمان کے تعارف میں باطنی امور بیان فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان باطنی اطاعت کا نام ہے اور اسلام ظاہری اطاعت کا نام ہے۔ علامہ خازن علیہ الرحمۃ کے اس مؤقف کے برعکس جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں ایک ہیں۔ جو مسلمان ہے وہ مؤمن ہے اور جو مؤمن ہے وہ مُسلم ہے۔ علامہ سعد الدین تفتازانی' امام فخر الدین رازی اور دیگر اکابر علماء نے اسی طرح لکھا ہے۔ (شرح عقائد مع النبراس ص ۴۱۲' تفسیر کبیر' سورۃ الحجرات: ۱۴) رہا یہ کہ حدیث جبریل میں ایمان اور اسلام کے درمیان فرق کیا گیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جواباً ایمان اور اسلام کی تعریف ذکر نہیں فرمائی بلکہ آپ نے ایمان اور اسلام کے متعلقات' ان کے ثمرات اور ان کی علامات بیان فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ایمان اور اسلام دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ (شرح عقائد مع النبراس ص ۴۱۶' فتح الباری ج ۱ ص ۱۵۷)

دوسرا یہ کہ حدیثِ جبریل میں نبی اکرم ﷺ نے ایمان اور اسلام کا ''مفہوم'' بیان فرمایا ہے نہ کہ اُن کا مصداق اور تحقیق یہی ہے کہ ایمان اور اسلام اپنے مفہوم کے اعتبار سے الگ ہیں لیکن مصداق کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ (مرقات ج ۱ ص ۱۱۸)

علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث جبریل کی شرح میں ایک بہت ہی فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے کہ حق یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف صرف لفظوں کی حد تک ہے۔ کیونکہ اسلام کا تعلق دنیاوی احکام سے ہے اور ایمان کا تعلق اُخروی احکام سے ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ اسلام کی بنیاد لغت پر ہے اور ایمان کی بنیاد شریعت پر ہے۔ (حقیقی اختلاف اس بارے میں علماء کے درمیان کوئی نہیں ہے۔) (مرقات ج ۱ ص ۱۱۸)

۱۱۷ اس حدیث سے استدلال کا جواب گزشتہ حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۱۸ حدیث کے یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ہیں اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جبکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کے علاوہ یہی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا جس کا لباس انتہائی سفید اور بال گہرے سیاہ تھے۔ نہ اُس شخص پر سفر کے نشانات تھے اور نہ ہی ہم میں سے اُسے کوئی پہچانتا تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے اپنے گھٹنوں کو حضور کے گھٹنوں سے ملا لیا اور اپنی ہتھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ لیں (یعنی وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس طرح بیٹھا جیسے شاگرد اپنے استاذ کے سامنے باادب بیٹھتا ہے)۔ (صحیح مسلم: ۸' شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۷۷)

کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے[۱۱۹]۔ جبریل نے پوچھا کہ قیامت کب ہے؟ فرمایا کہ جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا[۱۲۰]، البتہ میں تمہیں اس کی

[۱۱۹] اس جملہ میں فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ یعنی اس کے الفاظ مختصر ہیں لیکن معنیٰ اس کا وسیع ہے۔ اس میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ یعنی اس حالت کے ساتھ عبادت کرو کہ اگر تم اللہ عزوجل کو دیکھ رہے ہوتے تو تمہاری کیا کیفیت اور حالت ہوتی! حقیقت یہ ہے کہ غلام جب اپنے آقا و مولیٰ کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس قدر اچھے طریقے سے کام کر سکتا ہے' کرتا ہے اور اِدھر اُدھر قطعاً توجہ نہیں کرتا۔ بس یہی کیفیت بندے کی عبادت کے وقت ہونی چاہیے کہ جب وہ اپنے رب عزوجل کے دربار میں کھڑا ہو تو رب عزوجل کے سوا کسی اور کی طرف قطعاً توجہ نہ کرے اور جس قدر ہو سکے عبادت کو اچھے طریقے سے انجام دے۔

(مرقات ج ۱ ص ۱۲۵ بتغیر و توضیح)

زیرِ بحث جملہ میں مزید فرمایا کہ اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے' اس کی شرح کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ یوں تو ہر وقت ہی سمجھو کہ رب تمہیں دیکھ رہا ہے مگر عبادت کی حالت میں تو خاص طور پر خیال رکھو تو انشاء اللہ تعالیٰ عبادت آسان ہو گی' دل میں حضور و عاجزی پیدا ہو گی' آنکھوں میں آنسو آئیں گے۔ اللہ عزوجل ہم سب کو نصیب کرے' آمین۔

(مراۃ المناجیح ج ۱ ص ۳۷)

[۱۲۰] اس جملہ کے دو مطلب بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں قیامت کا علم نہیں ہے اسی طرح مجھے بھی قیامت کا علم نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی؟ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے زیادہ قیامت کا علم نہیں ہے' جتنا تمہیں قیامت کے بارے میں معلوم ہے اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔ پہلا جو مطلب بیان کیا گیا اس سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو قیامت کا علم نہیں ہے' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے قیامت کا علم عطا فرمایا ہے' بلکہ اسی حدیث کے آخر میں علمِ قیامت سمیت جن پانچ چیزوں کا تذکرہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اُن تمام کا علم عطا فرمایا ہے۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے استاذِ محترم مفسرِ قرآن وشارحِ صحیح مسلم علامہ غلام رسول صاحب سعیدی مدّ ظلّہ العالی نے اس مقام پر بہت مدلّل بحث کی ہے اور قوی ترین دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے کہ قیامت کب واقع ہو گی؟ بارش کب ہو گی؟ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ انسان کل کیا کرے گا؟ اور کون شخص کس جگہ مرے گا؟

(تفصیل کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۴)

رہا یہ سوال کہ زیرِ بحث حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے جبریل سے کیوں فرمایا کہ مسئول سائل سے زیادہ نہیں جانتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ذاتی علم کی نفی ہے یا اس لیے نہیں بتایا کہ آپ ﷺ کو جو علم حاصل ہوا ہے وہ تدریجاً حاصل ہوا ہے' سو ممکن ہے کہ اُس وقت تک آپ کو قیامت کا علم نہ دیا گیا ہو۔ تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ اگر آپ کو اس وقت علم حاصل تھا تو نہ بتانے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق قیامت اچانک آئے گی۔ (الاعراف: ۱۸۷) اگر آپ ﷺ قیامت کے بارے میں بتلا دیتے تو قیامت کا آنا اچانک نہ رہتا اور قرآن کی آیت غلط ہو جاتی۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے فرامین کی تصدیق و تائید کرنے والے بن کر تشریف لائے ہیں۔ البتہ بعض روایات سے یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو خبر دی کہ قیامت جمعہ کے دن دس محرم الحرام کو آئے گی۔ (کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ۳۸۳) پس رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی تصدیق کی خاطر صرف سال نہیں بتایا اور اپنے علم کو ظاہر کرنے کے لیے دن' تاریخ اور مہینہ تک بتا دیا۔

(شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۰)

نشانیاں بتادیتا ہوں کہ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے تو یہ قیامت کی علامات میں سے ہے[۱۲۱] اور جب ننگے پاؤں اور ننگے بدن والے لوگ قوم کے سربراہ بن جائیں تو یہ قیامت کی نشانی ہے اور جب سیاہ اونٹوں کو چرانے والے عالی شان عمارتوں پر فخر کرنے لگیں اور پانچ چیزیں جنہیں اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے (لقمان:۳۴) تلاوت فرمائی کہ:'' بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہ بارش برساتا ہے اور پیٹوں میں جو کچھ ہے وہ جانتا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے گا' بے شک اللہ ہی جاننے والا خبر دینے والا ہے[۱۲۲]''۔ پھر جبریل چلے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُسے واپس بلاؤ لیکن صحابہ کرام کو کوئی نظر نہیں آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ جبریل تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔

(صحیح بخاری: ۴۷۷۷' صحیح مسلم: ۸' سنن الترمذی: ۲۶۱۰' سنن ابوداؤد: ۴۶۹۵' سنن نسائی: ۵۰۰۵' سنن ابن ماجہ: ۶۳)

صحیح مسلم میں اسی طرح کی حدیث حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ گذشتہ سطور میں ہم ایمان اور اسلام کے معنیٰ پر گفتگو کرچکے ہیں' یہاں اس حدیث سے متعلق چند امور پر کلام باقی ہے۔ (سو ہم اختصار کے ساتھ اس کی تشریح پیش کررہے ہیں:)

حدیث مذکور: (۷۷) کی تشریح

''کان النبی ﷺ بارزا یوما للناس '': یعنی نبی اکرم ﷺ ایک دن لوگوں کے درمیان ظاہر تھے اور رونق افروز تھے۔

''ان تؤمن باللہ وملائکتہ و بلقاء ہ ورسلہ وتؤمن بالبعث الاخر '': یعنی ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس سے ملنے پر اس کے رسولوں پر یقین رکھو اور اس بات پر یقین رکھو کہ تمہیں مرنے کے بعد اُٹھنا ہے۔

(حدیث کے اس جملہ میں دو باتیں بہ ظاہر ایک جیسی ہیں' ایک اللہ سے ملنے پر ایمان لانا اور دوسرا مرنے کے بعد اُٹھنے پر ایمان لانا) علماء نے ان دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ اللہ سے ملنا تو اُسی وقت حاصل ہوجاتا ہے جب بندہ (مؤمن) دنیا سے دارِ آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے یعنی موت کے بعد' جبکہ مرنے کے بعد اُٹھنا' یہ اس وقت پایا جائے گا جب قیامت کا وقت آجائے گا۔

حدیث کے اس جملہ میں ''بعث'' کے ساتھ آخر کا لفظ بڑھانے کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو یہ ''بعث من الارحام ''(ماں کے پیٹ سے منتقل ہونا) کہلاتا ہے اور جب انسان قبر سے آخرت کی طرف جائے گا تو یہ ایک دوسرا ''بعث'' (مرنے کے بعد اُٹھنا) کہلائے گا۔ اس لیے حدیث شریف میں ''بعثِ آخِر ''فرمایا گیا۔

---

۱۲۱ یعنی قربِ قیامت میں اولاد اپنی ماں کی نافرمانی کرے گی' اس سے توہین آمیز سلوک کرے گی اور ماں پر اپنا حکم چلائے گی اور اولاد کے سامنے مائیں یوں معلوم ہوں گی جیسے آقاؤں کے سامنے ان کی باندیاں ہوں۔

(مراۃ المناجیح ج ۱ ص ۳۸' شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۰)

۱۲۲ آیت کے الفاظ یہ ہیں: ''ان اللہ علیم خبیر''. (بے شک اللہ علیم خبیر ہے) ''علیم'' کی تفسیر کرتے ہوئے مفسّرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف پانچ چیزوں کا علم نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا علم ہے اور ''خبیر'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چیزوں کے ظاہر کو جانتا ہے اسی طرح چیزوں کے باطن کو بھی جانتا ہے۔ اسی کی تفسیر میں بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خبر دینے والا ہے۔ یعنی علوم خمسہ کی بعض جزئیات پر اللہ تعالیٰ اپنے بعض مخصوص بندوں کو مطلع فرمادیتا ہے۔ (تفسیرات احمدیہ ص ۶۰۸' مرقات ج ۱ ص ۱۳۵)

پھر جبرئیل نے سوال کیا:

''ما الاحسان؟ ''احسان کیا ہے؟ یہاں احسان سے مراد ہے عمل میں اخلاص۔ اور یہ ایمان اور اسلام کے صحیح ہونے کی ایک شرط ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ عزوجل کے ایک ہونے کی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی گواہی دے اور عمل بھی کرے لیکن اس میں اخلاص نہ ہو تو ایسا شخص محسن نہیں ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ احسان سے یہاں پر اللہ عزوجل کا خوف اور بہترین اطاعت مراد ہے۔ سو جس نے اللہ کا خوف پیدا کیا اس کے عمل اچھے ہو گئے اور حدیث شریف کے اس جملہ کا یہی معنی ہے: ''فان لم تکن تراہ فانہ یراک'' (عبادت کرتے ہوئے اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو بے شک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)۔

پھر فرمایا:

''اشــراط الســاعۃ'': اس سے مراد قیامت کی وہ علامتیں ہیں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی۔ اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اذا ولـدت الامۃ ربھا'': جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی باندی ہوگی جس سے لڑکا ہوگا اور وہ لڑکا اس باندی کا بیٹا بھی ہوگا اور آقا بھی۔

پھر دوسری علامت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اذا تطاول رعاۃ الابل البھم فی البنیان'': جب سیاہ اونٹوں کو چرانے والے عالی شان عمارتوں پر فخر کرنے لگیں۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جنگل اور اس جیسی دیگر جگہوں پر رہنے والے لوگوں کو مال بہت دے دیا جائے گا' یہاں تک کہ وہ عالی شان عمارتوں پر فخر کیا کریں گے اور لوگوں پر سرداری کریں گے۔ اس لیے یہ بھی قیامت کی علامات میں سے ہے۔ واللہ اعلم

''یؤمنون بالغیب'' میں غیب کے متعلق مختلف اقوال اور تفاسیر

﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ پرہیزگار وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ غیب یہاں پر مصدر ہے جو کہ اسم کی جگہ پر لایا گیا ہے اور جو چیز غائب ہو اس کو غیب کہا جاتا ہے۔ غیب کا معنیٰ ہے: آنکھوں سے پوشیدہ چیز۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ غیب سے یہاں پر ہر وہ چیز مراد ہے جو ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور ہمیں اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے ملائکہ' مرنے کے بعد اُٹھنا' جنت و دوزخ' پل صراط اور میزانِ عمل۔

بعض علماء کے نزدیک یہاں غیب سے مراد اللہ عزوجل کی ذات ہے' بعض کے نزدیک قرآن کریم' بعض کے نزدیک آخرت' بعض کے نزدیک وحی اور بعض کے نزدیک تقدیر ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو ہم نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کا اور جن چیزوں میں انہوں نے ہم پر سبقت کی اُن کا ذکر کیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلاشبہ نبی کریم ﷺ کا حکم اور آپ کا پیغام ان لوگوں کے لیے واضح تھا جنہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا' لیکن اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' بن دیکھے ایمان لانے سے بڑھ کر کبھی کوئی شخص ایمان نہیں لایا۔ (یعنی جو شخص بن دیکھے ایمان لایا اُس سے بڑھ کر کسی کا ایمان نہیں[۱۲۳] ہے) پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''الٓـم'' سے ''ھـم المفلحون'' تک آیات تلاوت فرمائیں۔

---

۱۲۳ یعنی اجر و ثواب کے اعتبار سے اُس شخص کا ایمان زیادہ ہے جو بن دیکھے نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والا ہے۔ یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ کیا بعد والے جو بن دیکھے نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے وہ صحابہ کرام سے زیادہ افضل ہیں؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

’’یقیمون الصلوۃ‘‘میں نماز قائم کرنے کا معنیٰ اور صلوٰۃ کی لغوی وشرعی تشریح

﴿ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ ﴾ (پرہیز گار لوگ) نماز قائم کرتے ہیں' نماز قائم کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ متقین نماز کو ہمیشہ اس کے اوقات میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس کی حدود اور تمام ارکان کا لحاظ کرتے ہیں اور اس کے فرائض' سُنن اور مستحبات میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہونے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی کام کو تمام حقوق کے ساتھ انجام دے تو عربی میں کہا جاتا ہے:’’قام بالامر و اقام الامر ‘‘(اس نے فلاں کام اچھے طریقہ سے انجام دیا)۔آیت میں نماز سے پانچوں نمازیں مراد ہیں۔

’’صلاۃ‘‘ کا لغوی معنیٰ ہے: دُعا اور رحمت۔اسی معنیٰ میں اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے:

وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ؕ (التوبہ:۱۰۳) اور (اے محبوب ﷺ) آپ ان کے لیے دُعا کیجئے' بلاشبہ آپ کی دُعا ان کے لیے باعثِ تسکین ہے۔

’’صلاۃ‘‘ کا لفظ عربی کے اس جُملہ سے مأخوذ ہے:’’صلیت العود‘‘(میں نے لکڑی کو نرم کردیا) سو نماز پڑھنے والا بھی اپنے آپ کو نرم کرتا ہے اور عاجزی کرتا ہے(اس لیے اُسے عربی میں’’مصلّی‘‘ کہتے ہیں) اور شرعاً قیام' رکوع' سجود' قعود' دعا اور اس جیسے دیگر مخصوص افعال کو ادا کرنا نماز کہلاتا ہے۔

’’ومما رزقناھم ینفقون‘‘میں رزق کا معنیٰ اور اس کو خرچ کرنے کی تفصیل

﴿ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴾ وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں'’’رزق‘‘ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔مثلاً مال اور اولاد۔اور رزق کا اصل معنیٰ ہے:’’الحظّ و النّصیب‘‘(حصّہ)۔

رزق کو خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ متقین اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی راہ میں صدقہ کرتے ہیں۔اس آیت میں وہ خرچ کرنا بھی داخل ہے جو انسان پر واجب ہوتا ہے۔مثلاً: زکوٰۃ' منّت' اپنے آپ پر خرچ کرنا اور جن پر خرچ کرنا واجب ہے اُن پر خرچ کرنا (مثلاً بیوی' بچے)' اسی طرح جب جہاد میں خرچ کرنا واجب ہوجائے تو اس میں خرچ کرنا۔اور اس آیت میں وہ خرچ کرنا بھی داخل ہے جو مستحب ہوتا ہے۔مثلاً نفلی صدقات یا اپنے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی میں خرچ کرنا۔اور یہ تمام اقسام وہ ہیں جن سے آدمی قابلِ تعریف ہوجاتا ہے۔

اس آیت میں’’مما رزقناھم‘‘میں’’مِنۡ‘‘ لایا گیا ہے جو کہ تبعیض کے لیے ہے یعنی یہ بتانے کے لیے کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے بعض خرچ کرو اور ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کا مال مکمل خرچ ہونے سے محفوظ رہے اور اس لیے تاکہ لوگ اسراف وتبذیر (فضول خرچی) سے بچیں' جو کہ شرعاً ممنوع[۱۲۴] ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یا بعد والوں کا مرتبہ صحابہ سے زیادہ ہے؟ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر بحث قول سے معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اجر وثواب اور درجہ ومرتبہ میں فرق ہے۔کسی خاص چیز میں اجر وثواب کے اعتبار سے بعد والوں کا صحابہ سے بڑھ جانا ممکن ہے اور یہ جُزوی فضیلت ہے' لیکن درجہ اور مرتبہ میں بعد کا کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی معظم اور مکرم کیوں نہ ہو کسی صحابی کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ جتنا سونا خیرات کرلے تب بھی وہ صحابہ کے دیئے ہوئے ایک مُد (ایک کلوگرام) بلکہ نصف مُد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔

(صحیح بخاری:۳۶۷۳' صحیح مسلم:۲۵۴۱' سنن ابوداؤد:۴۶۵۸' سنن الترمذی:۳۸۶۱' مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۵۳' مطبوعہ کراچی)

۱۲۴ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

اور (یہ وہی ہیں) جو (اے محبوب علیہ السلام) اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی اور ان (کتابوں) پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں O

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ متقین وہ ہوتے ہیں جو اس کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو آپ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور اُن کتابوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو آپ علیہ السلام سے پہلے دیگر انبیاء کرام پر نازل ہوئیں یعنی تورات' زبور اور تمام انبیاء کو جو صحیفے عطا کیے گئے۔ ان تمام پر ایمان لانا واجب اور ضروری ہے۔ اسی طرح متقین وہ ہوتے ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

آخرت کو آخرت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے بعد آنے والی ہے اور اس پر یقین کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ متقین یہ یقین رکھتے اور جانتے ہیں کہ آخرت آنے والی ہے۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

وہی (پرہیزگار لوگ) اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں O

﴿اُولٰٓئِکَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذکورہ صفات کے حامل ہوں' وہ اپنے رب کی جانب سے ہدایت اور نور پر ہیں اور ایک تفسیر کے مطابق ہدایت سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ استقامت پر ہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ اور وہی لوگ کامیاب ہیں یعنی ایسے ہی لوگ جہنّم سے نجات پانے والے اور جنّت کو حاصل کرنے والے ہیں۔

مُفلح اور فلاح کے معنیٰ کی تحقیق

مُفلح اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یعنی اس کے لیے کامیابی کی راہیں کُھل جائیں اور اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ جبکہ فلاح (کا معنیٰ ہے کامیابی اور یہ) بقاء کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔

اسی سے شاعر کا یہ شعر ہے:

لو کان حیّ مدرک الفلاح — اگر میرا قبیلہ اپنی بقاء چاہتا ہے تو اُسے نیزوں کے ساتھ

ادرکہ ملاعب الرماح — کھیلنا ہوگا۔

فلاح کے اس معنیٰ کے اعتبار سے ''اولئک ھم المفلحون'' کا معنیٰ ہوگا: ایسے ہی لوگ دائمی نعمت اور کامیابی میں باقی رہنے والے ہیں اور خوش بختی' عزت و بقاء اور غنیٰ جیسے (عظیم) مقاصد کو پالینے میں باقی رہنے والے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ O (الانعام:۱۴۱' الاعراف:۳۱) — اور تم بے جا خرچ نہ کرو' بے شک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا O اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَکَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا O (بنی اسرائیل:۲۷۔۲۶) — اور فضول نہ اُڑاؤ' بے شک فضول اُڑانے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

فلاح کا اصل معنیٰ ہے: چیرنا اور کاٹنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''ان الحدید بالحدید یفلح'' (لوہا لوہے کو کاٹتا ہے)۔ اسی طرح ''اولئک ھم المفلحون'' کا معنیٰ ہوگا: یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دنیا و آخرت میں بھلائی کو کاٹ دیا گیا ہے (یعنی خاص کر دیا گیا ہے)۔

یہاں تم یہ جان لو کہ اللہ عزوجل نے سورۃ البقرہ کا آغاز اس طرح فرمایا ہے کہ ابتدائی چار آیات مؤمنین کی شان میں نازل فرمائی ہیں اور اس کے بعد دو آیتیں کافروں کے بارے میں نازل فرمائی ہیں' پھر تیرہ آیتیں منافقین کے متعلق نازل فرمائی ہیں۔ (مؤمنین کی شان میں جو آیات نازل ہوئیں ان کی تفسیر گزر چکی) اب وہ آیتیں جو کافروں کے بارے میں نازل ہوئیں وہ درج ذیل ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

بے شک وہ لوگ جو پکے کافر ہیں' اُن پر برابر ہے آپ اُنہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے O

کفر کا معنیٰ اور اس کی اقسام

کفر کا لغوی معنیٰ ہے: چھپانا اور ڈھانپنا۔ ''رات'' بھی چونکہ اپنی تاریکی کی وجہ سے چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے اس لیے عربی میں اُسے ''کافر'' بھی کہتے ہیں اور اسی معنیٰ میں کسی شاعر نے کہا ہے:

فی لیلۃ کفر النجوم غمامھا — ایسی رات میں (گائے کی پُشت پر مسلسل بارش برستی رہی) جبکہ ابر نے ستاروں کو ڈھانپ دیا تھا۔ (المعلقات السبع' معلّقہ رابعہ)

کفر کی چار قسمیں ہیں:

(۱) کفرِ انکار: یعنی کوئی شخص اللہ تبارک و تعالیٰ کو قطعاً نہ پہچانے۔ جیسے فرعون کا کفر' کفرِ انکار تھا کیونکہ اس نے (اپنے درباریوں سے) کہا تھا:

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ (القصص: ۳۸) — میں اپنے سوا تمہارے لیے کوئی خدا نہیں مانتا۔

(۲) کفرِ جحود: یعنی کوئی شخص باطنی طور پر اللہ عزوجل کو پہچانتا ہو لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے۔ جیسے ابلیس کا کفر' کفرِ جحود تھا۔

(۳) کفرِ عناد: یعنی کوئی شخص دل سے اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہو اور زبان سے اس کے حق ہونے کا اقرار بھی کرتا ہو لیکن اس کو دین کے طور پر اختیار نہ کرے۔ جیسے امیہ بن ابی الصلت اور ابو طالب[۱۲۵] کا کفر' کفرِ عناد تھا۔ چنانچہ خود ابو طالب نے اپنے اشعار میں کہا:

ولقد علمت بان دین محمد — میں یہ جانتا ہوں کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین مخلوق

---

۱۲۵ ابو طالب کے کفر اور ایمان کا مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے۔ علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے جس انداز سے کفر کی اقسام بیان کی ہیں اور ان میں ابو طالب کا ذکر کیا ہے' اس سے واضح ہے کہ علامہ خازن ابو طالب کے مؤمن ہونے کے قائل نہیں تھے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے کہ ابو طالب کے ایمان پر بحث کی جائے' مختصراً یہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ابو طالب کا ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔ مذاہب اربعہ کے معروف علماء' فقہاء' مفسرین اور جمہور اہل سنت کا یہی مؤقف ہے۔

(مدلّل اور مفصل بحث کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ۳ ص ۴۴۴' شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۸۶)

مــن خیــرا دیــان البــریۃ دیــنــا کے دینوں میں سب سے بہتر دین ہے۔
لــو لا الــمــلامۃ او حــذا ر مسبۃ اگر مجھے لوگوں کی ملامت اور گالی گلوچ کا خوف نہ ہوتا تو
لــوجـدتـنـی سـمـحـا بـذاک مبینـا تم مجھے دینِ محمد (ﷺ) کا کھلا پیروکار پاتے۔

(۴) کفرِ نفاق: یعنی کوئی شخص زبان سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے لیکن دل میں اس کو صحیح نہ سمجھے۔

یہ تمام اقسام کفر کی ہیں اور اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی وحدانیت کا انکار ے یا اللہ عزوجل نے جو کچھ اپنے رسول پر نازل فرمایا ہے اس کا انکار کرے یا نبی اکرم ﷺ کی نبوت یا کسی بھی رسول کی نبوت کا انکار کرے وہ کافر ہے اور (العیاذ باللہ) جو اس حالت میں مر گیا وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

مذکورہ آیت جس میں کافروں کا تذکرہ ہے وہ عرب کے مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ایک قول کے مطابق یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

زیر بحث آیت میں ﴿اَنْذَرْ﴾ کا معنیٰ ہے: ''اعلام مع تخویف'' کسی کو ڈراتے ہوئے خبر دینا۔ لہٰذا ہر مُنذر تو خبر دینے والا ہے لیکن ہر خبر دینے والا مُنذر نہیں ہے۔

اس آیت میں جو فرمایا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں' اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں (پہلے سے) یہ کلمۂ عذاب ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یہ کیوں ایمان لانے والے نہیں ہیں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ عزوجل آگے ارشاد فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۷

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مُہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے O

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے' لہٰذا اب اُن کے دل نہ خیر کو حاصل کرتے ہیں نہ اُسے سمجھتے ہیں۔ آیت میں جو ''خَتَمَ'' کا لفظ آیا ہے اس کا اصل معنیٰ ہے: ڈھانپنا اور اس لفظ کی حقیقت یہ ہے جب کسی چیز کو مضبوطی سے باندھ دیا جائے تاکہ اندر کا باہر اور باہر کا اندر نہ جا سکے تو عربی میں ''ختم'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے ''ختم الکتاب'' ہے' یعنی خط پر مُہر لگانا۔

اہلِ سنّت کا موقف یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے پہلے سے مذکورہ کافروں کے بارے میں جان لیا تھا کہ یہ کفر کریں گے' سو اُن کے کفر کے باعث اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی۔ دل کا خاص طور پر یہاں ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ سمجھنے اور جاننے کا مرکز ہے[۱۲۶]۔

﴿وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سننے کی جگہ پر بھی مُہر لگا دی۔ لہٰذا اب وہ نہ تو حق کو سنتے ہیں نہ اُس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے کان حق بات سننے کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ گویا مُہر لگا کر ان کے کانوں کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔

۱۲۶ یہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے کہ دل سمجھنے اور جاننے کا مرکز ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ سمجھنے اور جاننے کا مرکز دماغ ہے نہ کہ دل۔ جیسا کہ مشاہدات اور بداہت سے ثابت ہے۔ البتہ محاورات کی رعایت کی وجہ سے سمجھنے اور جاننے کی نسبت دل کی طرف کی جاتی ہے۔ (دلائل اور تفصیل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ۴ ص ۴۲۰' شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۴۱۳)

یہاں ''سَمْعٌ'' کا لفظ واحد ہے جبکہ معنیٰ کے اعتبار سے یہ جمع ہے۔ واحد لانے کی وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ یہ مصدر ہے اور مصدر تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا ہے۔

﴿ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ ''غشاوۃ'' کا معنیٰ ہے: پردہ۔ اسی سے عربی میں زین کے غلاف کو ''غاشیۃ السرج'' کہتے ہیں۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی توحید کے دلائل سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کرتے ہیں اور حق کو ملاحظہ نہیں کرتے۔

﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے۔ اور ایک قول کے مطابق عذاب عظیم سے مراد دنیا میں قید اور قتل ہے اور آخرت میں دائمی عذاب ہے۔ عذاب کو یہاں جو عظیم فرمایا گیا وہ حقیر کے مقابلہ میں ہے۔

عذاب کا معنیٰ

عذاب کا حقیقی معنیٰ کیا ہے؟ اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال درج ذیل ہیں:

(۱) کل ما یؤلم الانسان ویعیی ویشق علیه.
ہر وہ چیز جو انسان کو دردمند کرے' اُسے تھکا دے اور اُس پر دشوار ہو وہ عذاب ہے۔

(۲) هو الایجاع الشدید.
کسی کو شدید درد پہنچانا عذاب کہلاتا ہے۔

(۳) ما یمنع الانسان من مراده ومنه الماء العذب لانه یمنع العطش.
ہر وہ چیز جو انسان کو اس کی مراد سے روک دے وہ عذاب ہے۔ اسی سے عربی میں میٹھے پانی کو ''ماءٌ عذبٌ'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ۝۸

اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں ○

یہ آیت منافقین یعنی عبداللہ بن اُبی ابن سلول' معتب بن قشیر' جد بن قیس اور ان کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور واقعہ یہ تھا کہ انہوں نے (اپنی زبان سے) اسلام کا کلمہ پڑھا تا کہ اس کے ذریعہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ سے محفوظ رہیں اور (پسِ پردہ) یہ کفر سے بندھے رہے اور ان میں اکثر یہودی تھے۔

منافق کی تعریف اور انسان کو انسان کہنے کی وجہ

منافق وہ ہوتا ہے جو زبان سے مؤمن ہونے کا اعتراف اور اقرار کرے اور دل میں اس کا انکار کرے' اس کی صبح کسی حالت پر ہو اور شام کسی حال پر ہو۔

آیت مذکورہ میں ''ناس'' کا لفظ آیا ہے جو کہ انسان کی جمع ہے۔ انسان کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ:

(۱) اس نے اللہ عزوجل سے کیے ہوئے وعدہ کو بھلا دیا تھا۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

لا تنسین تلک العهود فانما
سمیت انسانا لانک ناسی

تم ان وعدوں کو نہ بھول جانا! کیونکہ تمہیں انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ تم بھولنے والے ہو

(۲) بعض علماء کے نزدیک انسان (اُنس سے ماخوذ ہے) اور چونکہ انسان ایک دوسرے سے اُنس حاصل کرتے ہیں اس لیے انسان کو انسان کہا جاتا ہے۔

﴿وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ یعنی یہ منافقین (بہ ظاہر) کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخرت (قیامت) پر ایمان لائے۔

آخرت کو آخرت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے بعد ہے اور آخرت ہی کا دن وہ دن ہے جو تمام محدود اور قابل شمار دنوں کی انتہاء اور اختتام ہے۔ اور اس دن کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہاء۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا دعویٰ رد کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''یہ (منافقین) مؤمن نہیں ہیں'' اور یوں ان کے ایمان کی مکمل نفی فرمادی۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

وہ (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں' حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور انہیں (اس حقیقت کا) شعور نہیں ہے ○

''خداع'' (دھوکا) کا اصل معنیٰ اور منافقین کے ساتھ اللہ عزوجل کے ''خداع'' کا مفہوم

''خديعة'' کا معنیٰ ہے: مکروفریب اور چال بازی۔ لغت میں اس کا اصل معنیٰ ہے: چھپانا۔ دھوکا دینے والا بھی اپنے بچاؤ کے لیے دل میں جو کچھ ہے اس کے برخلاف ظاہر کرتا ہے۔ سو یہ بھی ایک طرح سے منافقت ہے۔

اور اللہ عزوجل کا منافقین کے ساتھ ''خداع'' کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے لیے دنیا کی نعمتیں ظاہر فرماتا ہے اور اُنہیں وہ نعمتیں جلد عطا فرما دیتا ہے۔ لیکن (حقیقۃً) آخرت کا عذاب اُن سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ''يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ'' باب مفاعلہ سے ہے اور باب مفاعلہ ایسے فعل کے لیے آتا ہے جو مشترک ہو' جب کہ اللہ تعالیٰ مشارکت سے پاک ہے۔ تو میں اس کا جواب دوں گا کہ باب مفاعلہ کبھی کبھار بغیر مشارکت کے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً: ''عافاک الله'' (اللہ عزوجل تمہیں عافیت دے)۔ ''طارقت النعل'' (میں نے جوتے پہنے)۔ ''عاقبت اللّص'' (میں نے چور کا پیچھا کیا)۔ سو یہاں بھی ''مخادعه'' (دھوکا دینا) ایک ہی جانب سے ہے۔ (یعنی منافقین کی جانب سے) اور اللہ تعالیٰ کسی کو دھوکا دینے سے پاک ہے۔

اس سوال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا کیسے ممکن ہے جبکہ وہ ہر پوشیدہ بات کو جانتا ہے؟

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا کیسے دیا جا سکتا ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور اس کو دھوکا دیا جانا ناممکن ہے۔ پھر یہاں کیسے فرمایا گیا کہ منافقین اللہ عزوجل کو دھوکا دیتے ہیں؟

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا نام ذکر فرما کر اپنے رسول ﷺ کی ذات مراد لی ہے اور اس میں نبی اکرم ﷺ کے معاملہ کی بلندی اور آپ کی عظمتِ شان کو واضح کرنا[۱۲۷] ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنا نام ذکر فرما کر مؤمنین مراد لیے ہیں (یعنی منافقین مؤمنین کو دھوکا دیتے ہیں) اور جب یہ مؤمنین کو دھوکا دیتے ہیں تو گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔

پھر یہ دھوکا اس لیے دیتے تھے کہ:

۱۲۷ یعنی حقیقتاً تو منافقین رسول اللہ ﷺ کو دھوکا دیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنا نام ذکر کر کے بتادیا کہ یہ لوگ رسول کو دھوکا نہیں دیتے بلکہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ گویا رسول کے ساتھ خیانت و بدعہدی کرنا اللہ کے ساتھ خیانت و بدعہدی کرنا ہے۔ رسول کی نافرمانی کرنا اللہ کی نافرمانی کرنا ہے اور رسول کو ایذاء پہنچانا اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے۔

(۱) انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان ہمارے حال سے ناواقف ہیں۔
(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ان پر بھی ظاہراً اسلامی احکام جاری ہوں' حالانکہ اُن کا باطن ظاہر کے خلاف تھا۔
زیر بحث آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کو ان کے دھوکے کی سزا دیتا ہے' اس طرح حقیقت میں یہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ منافقین جو دھوکا دیتے ہیں اس کا دبال اور نقصان اُنہیں کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو منافقین کے نفاق سے باخبر فرما دیتا ہے اور یوں وہ دنیا میں رُسوا ہوتے ہیں اور آخرت میں عذاب کے بھی مستحق ہوں گے۔

☆ (آیتِ مذکورہ میں ''انفس'' آیا ہے جو کہ نفس کی جمع ہے) اور نفس کسی بھی چیز کی ذات اور اس کی حقیقت کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک خون کو نفس کہتے ہیں کیونکہ خون پورے جسم کے لیے قوت اور طاقت کا باعث ہے۔
آیت مذکورہ میں ﴿ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ منافقین اس بات کو نہیں جانتے کہ اُن کے دھوکے کا وبال اُنہیں کی طرف لوٹنے والا ہے۔

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿١٠﴾

ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہے O

مرض کا معنیٰ اور اللہ تعالیٰ کا منافقین کے مرض کو زیادہ کرنے کا مفہوم

اس آیت میں مرض سے مراد شک اور نفاق ہے۔ مرض کا اصل معنیٰ ہے: کمزوری اور انسان کا اپنے اعتدال سے نکل جانا۔ دین میں شک اور منافقت کو مرض اس لیے فرمایا گیا کہ یہ چیزیں دین کو کمزور کر دیتی ہیں جس طرح بیماری جسم کو کمزور کر دیتی ہے۔
زیر بحث آیت میں فرمایا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے منافقین کے مرض کو بڑھا دیا'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآنی آیات لگاتار نازل ہوتی رہتی تھیں' سو آیت کے نازل ہونے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ کفر کرتے ویسے ویسے ان کا کفر اور نفاق بڑھتا چلا جاتا۔

﴿ أَلِيمٌ ﴾ کا معنیٰ ہے: مؤلم: (دردناک) مراد یہ ہے کہ منافقین کو ایسا عذاب ہوگا جو ان کے دلوں تک پہنچے گا۔
اس کے بعد (عذاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ﴿ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴾ اس کو ''يُكَذِّبُونَ'' بھی پڑھا گیا ہے اور ''يَكْذِبُونَ'' بھی۔ پہلی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ دردناک عذاب اس وجہ سے ہوگا کہ یہ اپنے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں (اُنہیں جھٹلاتے ہیں) اور دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ دردناک عذاب اس وجہ سے ہوگا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ ویسے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ (حقیقت میں یہ) مؤمن نہیں ہوتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو امن قائم کرنے والے لوگ ہیں O ہوشیار! یہی لوگ فسادی ہیں مگر اُنہیں (خود) اس کا شعور نہیں ہے۔

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ﴾ میں ''لَهُمْ'' سے منافقین اور بعض کے نزدیک یہودی مراد ہیں۔یعنی جب اہل ایمان منافقین یا یہودیوں سے کہتے ہیں کہ ﴿ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ﴾ (زمین میں فساد نہ پھیلاؤ) یعنی اپنے کفر کے ذریعہ اور سیدنا محمد ﷺ اور قرآن کریم پر لوگوں کا جو ایمان ہے اس سے لوگوں کو دور کر کے تم زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

تو جواباً منافقین کہتے ہیں کہ ﴿ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴾ (ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں) اور ان کا یہ کہنا جھوٹ ہے۔

اللہ عزوجل کلمۂ تنبیہ (ایسا کلمہ جس کے ذریعہ مخاطب کو خبردار کیا جائے) کے ساتھ آغاز کرتے ہوئے فرما رہا ہے: ﴿ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴾ خبردار! یہی لوگ فسادی ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ہے۔

یعنی یہی لوگ زمین پر اپنے کفر کے ذریعہ فساد پھیلاتے ہیں اور کفر ہی سب سے بڑا فساد ہے۔لیکن ان منافقین کو اس بات کا شعور نہیں ہے۔کیونکہ یہ اپنی منافقت اور اپنے کفر کے چھپانے کو سمجھتے ہیں کہ یہ ''اصلاح'' ہے حالانکہ یہی اصل فساد ہے۔ بعض علماء نے ''لا یشعرون'' کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کے لیے جو عذاب تیار کر رکھا ہے یہ اس کو نہیں جانتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ ایمان لے آؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں، سنو! یہی لوگ (حقیقت میں) بے وقوف ہیں لیکن یہ جانتے نہیں O

یعنی جب منافقین اور بہ قولِ بعض یہودیوں سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے یعنی مہاجر اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعض کے نزدیک حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے دیگر وہ ساتھی جو یہودی تھے اور انہوں نے ایمان قبول کر لیا۔چونکہ منافقین ظاہری طور پر اپنے آپ کو مؤمن کہتے تھے اس لیے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے ایمان میں مخلص ہو جاؤ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ایمان میں مخلص ہیں۔تو جواباً یہ کہتے ہیں کہ ﴿ أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ﴾ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ بیوقوف لوگ ایمان لائے۔بے وقوفی سے یہاں جہالت مراد ہے۔

منافقین کا اپنے کفر کو ظاہر کرنے کے باوجود ان پر نفاق کا حکم لگانا

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب منافقین کھلم کھلا کہا کرتے تھے کہ ''کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں'' تو پھر ان پر منافقت کا حکم عائد کرنا کیسے درست ہوگا؟ (کہ منافق تو وہ ہوتا ہے جو اپنے کفر کا اظہار نہ کرے)۔

تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ منافقین جو یہ کہتے تھے کہ ''کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں'' یہ اپنے درمیان کہا کرتے تھے نہ کہ مؤمنین کے سامنے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور مؤمنین پر ان کے اس قول کو ظاہر کر دیا اور پھر اس کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴾ یعنی خبردار! یہی لوگ بے وقوف یعنی جاہل ہیں لیکن انہیں اپنی اس حالت کا علم نہیں ہے۔(یہاں ''سفہاء'' کا لفظ آیا ہے جو کہ ''سفۃ'' سے مشتق ہے اور) ''سفہ'' کا اصل معنیٰ ہے: عقل کا ہلکا ہونا اور علم کا کم ہونا۔

اس آیت میں منافقین کو بے وقوف اس لیے فرمایا گیا کہ وہ خود کو عقل مند اور بڑا سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا عکس کر کے

اُنہی کو بے وقوف فرمایا[۱۲۸]۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور جب یہ لوگ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب یہ اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (مسلمانوں کے ساتھ تو) ہم صرف مذاق کرتے ہیں O

یعنی جب یہ منافقین، مہاجرین و انصار صحابہ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے جیسا کہ تم ایمان لائے اور جب یہ لوٹتے ہیں۔ یا ایک تفسیر کے مطابق جب یہ اپنے شیاطین کی طرف علیحدہ ہوتے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق یہاں ﴿اِلٰى﴾ بمعنیٰ "مع" ہے یعنی جب یہ منافقین اپنے شیاطین کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی تمہارے دین پر ہیں۔

منافقین کے شیاطین سے کون مراد ہیں؟

شیاطین سے یہاں منافقین کے سردار اور نجومی مراد ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شیاطین سے پانچ (مخصوص) افراد مراد ہیں:

(۱) کعب بن اشرف یہودی (مدینہ منورہ) (۲) ابو بردہ (قبیلہ بنی اسلم) (۳) عبد الدار (قبیلہ جہینہ)
(۴) عوف بن عامر (قبیلہ بنی اسد) (۵) عبد اللہ بن سواد (ملکِ شام)

اور ہر نجومی کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اس کا پیروکار ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہاں شیاطین سے مراد منافقین کے وہ سردار ہیں جو اپنی سرکشی میں شیاطین کے مشابہ ہو گئے تھے۔

منافقین کا مسلمانوں کے ساتھ استہزاء اور مذاق

آخر میں فرمایا کہ منافقین اپنے شیاطین سے کہتے ہیں: ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ یعنی ہم تو (سیدنا) محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کے سامنے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے ان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں تاکہ ہم اُن کے شر سے محفوظ رہیں، اُن کے راز ہمیں معلوم ہوں، مالِ غنیمت اور ان کے صدقات سے ہمیں حصہ ملے۔

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت عبد اللہ بن اُبی اور اس کے دیگر (منافق) ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہ لوگ ایک دن باہر نکلے تو چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان کا سامنا ہوا تو عبد اللہ بن اُبی اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ دیکھو ابھی میں کس طرح ان بیوقوفوں کو تم سے پھیرتا ہوں؟ وہ گیا اور اس نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر کہا:

---

۱۲۸ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو عقل مند اور بڑا سمجھنا ہی سب سے بڑی حماقت اور بیوقوفی ہے۔ اسی طرح اپنے آپ کو عالم اور ذی فضل کہنا سب سے بڑی جہالت ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿ (النجم: ۳۲) تو تم اپنی پاکیزگی نہ جتاؤ، وہ (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے O

مرحبا بالصديق سيد بني تيم وشيخ الاسلام وثاني رسول الله ﷺ في الغار الباذل نفسه وماله لرسول الله ﷺ.

خوش آمدید ہو صدیق اکبر کو' جو بنی تیم کے سردار اور شیخ الاسلام ہیں' غار میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں اور اپنی جان و مال کو نبی اکرم ﷺ پر قربان کرنے والے ہیں۔

پھر اس نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر کہا:

مرحبا بسيد بني عدي بن كعب الفاروق القوي في دين الله الباذل نفسه وماله لرسول الله ﷺ.

خوش آمدید ہو اس شخصیت کو جو بنی عدی بن کعب کے سردار ہیں اور دینِ خداوندی میں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے اور بہت مضبوط ہیں اور اپنی جان و مال کو رسول اللہ ﷺ کے لیے خرچ کرنے والے ہیں۔

پھر اس نے سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کا ہاتھ تھام کر کہا:

مرحبا بابن عم رسول الله ﷺ وختنه وسيد بني هاشم ما خلا رسول الله ﷺ.

خوش آمدید ہو اس شخصیت کو جو رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی اور آپ کے داماد ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے علاوہ تمام بنی ہاشم کے سردار ہیں۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کہا:

اتق الله يا عبد الله ولا تنافق فان المنافقين شر خليقة الله تعالى.

اے عبد اللہ! اللہ کا خوف کر اور اپنی منافقت کو چھوڑ دے۔ کیونکہ منافقین اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بدترین ہیں۔

اُس نے یہ سنتے ہی کہا:

مهلا يا ابا الحسن اني لا اقول هذا نفاقا والله ان ايماننا كايمانكم وتصديقنا كتصديقكم.

اے ابوالحسن! نرمی سے بات کرو! میں یہ باتیں منافقت کے ساتھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ خدا کی قسم! ہمارا ایمان ویسا ہی ہے جیسا تمہارا ایمان ہے اور ہماری تصدیق ویسی ہی ہے جیسی تمہاری تصدیق ہے۔

یہ کہہ کر منافقین وہاں سے چلے گئے اور پھر عبد اللہ بن اُبی اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: دیکھا تم لوگوں نے میرا کارنامہ! تو اس کے ساتھیوں نے اس پر اس کی تعریف اور تحسین کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سازش کے انکشاف میں مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

اللہ انہیں ان کے مذاق کی سزا دے رہا ہے اور اُنہیں ڈھیل دے رہا ہے تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں O

یعنی منافقین مسلمانوں کا جو مذاق اُڑایا کرتے تھے اللہ تعالیٰ اُس مذاق کی اُنہیں سزا دیتا ہے۔ یہاں استہزاء کی سزا کو استہزاء اس لیے فرمایا گیا کہ سزا استہزاء کے مقابلہ میں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے) فرماتے ہیں کہ مؤمنین کا مذاق اڑانے والے

منافقین کے لیے قیامت کے دن جنت کا دروازہ کھولا جائے گا' جب یہ اس دروازہ تک پہنچیں گے تو اُسے بند کر دیا جائے گا اور اُنہیں جہنم کی طرف پھیر دیا جائے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے منافقین کو چھوڑے رکھا ہے اور مہلت دی ہوئی ہے' وہ اپنی گمراہی میں حیرانی اور پریشانی کے ساتھ بھٹک رہے ہیں۔ زیر بحث آیت میں ﴿یَمُدُّ﴾ کا لفظ ہے۔ (جو کہ مدّ اور امداد دونوں سے آتا ہے) اور معنیٰ یہ دونوں ایک ہیں۔ ان کا اصل معنیٰ ہے: زیادہ کرنا' بڑھانا۔ ''مدّ'' کا لفظ اکثر شر کے لیے اور امداد کا لفظ اکثر خیر کے لیے آتا ہے۔ ﴿طُغْیَانٌ﴾ کا اصل معنیٰ ہے: ''مجاوزۃ الحد'' (حد سے گزر جانا)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا' لیکن ان کی (اس) تجارت نے (انہیں) کوئی فائدہ نہیں دیا اور نہ ہی یہ لوگ (اپنی تجارت میں) سیدھی راہ پر تھے ○

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ سے اشارہ منافقین کی طرف ہے یعنی منافقین ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی کو خریدا یعنی ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کیا۔ یہاں خرید و فروخت اور تجارت کے الفاظ بہ طور استعارہ توسعاً لائے گئے ہیں کیونکہ خرید و فروخت میں معاوضہ دے کر کوئی چیز لی جاتی ہے۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب منافقین ہدایت پر تھے ہی نہیں تو اس آیت میں کیسے فرمادیا گیا کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خریدا؟ (اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ پہلے ہدایت پر تھے' پھر انہوں نے اس کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا حالانکہ ایسا نہیں ہے)۔

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ چونکہ منافقین ہدایت (کو حاصل کرنے) پر قادر تھے' گویا کہ ہدایت ان کے ہاتھ میں تھی اس لیے فرمایا کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی کو خرید لیا۔

آیت مبارکہ میں تجارت کے نفع بخش نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ منافقین کو ان کی اس تجارت نے کوئی فائدہ نہیں دیا اور ہدایت پر نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی تجارت میں درست نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے جب اصلِ مال یعنی ایمان کو ضائع کر دیا اور گمراہی کو اپنے دل میں جاں گزیں کر لیا تو وہ ہدایت سے دور ہو گئے۔ بعض نے ہدایت پر نہ ہونے کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ منافقین اپنی گمراہی میں درستگی پر نہ تھے۔

اس آیت میں ﴿ضلالة﴾ اور ﴿رَبِحَتْ﴾ کے الفاظ ہیں۔ ''ضلالة'' کا معنیٰ ہے: مقصد سے ہٹ جانا اور ہدایت کو کھو دینا۔ اور ''ربح'' کا معنیٰ ہے: اصلِ مال پر ملنے والی زائد چیز (یعنی منافع)۔ اور چونکہ یہ تجارت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے آیت مذکورہ میں اس کو تجارت کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

ان لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اور جب آگ نے اس شخص کا ارد گرد روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے ○

''مَثَل'' کی تعریف اور اس کا استعمال

اس آیت میں ''مَثَل'' کا لفظ ہے جس کی تعریف درج ذیل ہے:

المثل عبارة عن قول يشبه ذالک القول قولا اخر بينهما مشابهة ليبين احدهما الاخر ويصوره.

مثل سے مراد ایک ایسی بات ہے جس میں دو ایک جیسی باتوں کو ایک دوسرے سے تشبیہ دی گئی ہوتا کہ ان میں ایک دوسرے کو واضح کر دے اور اس کی تصویر پیش کر دے۔

(چونکہ مثل کا فائدہ کسی بھی چیز کو خوب واضح کرنا ہے) اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مثالیں بیان فرمائیں جو کہ قرآن مجید کے سات مضامین کا ایک حصہ ہیں[۱۲۹]۔

اور جب (گذشتہ آیات میں) اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حقیقی حالت بیان کر دی تو اس کی مزید وضاحت اور تشریح کے لیے فوراً ہی ان کی مثال بیان فرمائی۔ کیونکہ کسی بھی چیز کی حقیقی حالت کو بیان کرنا دلوں پر اتنا اثر انداز نہیں ہوتا جتنا مثال کے ساتھ بیان کرنا مؤثر ہوتا ہے۔ دوسرا اس لیے کہ مثل کا معنیٰ ہے: پوشیدہ چیز کو ظاہر چیز سے تشبیہ دینا (اور جب پوشیدہ کو ظاہر سے تشبیہ دی جائے گی) تو پوشیدہ چیز کی حقیقت بہت اچھے طریقے سے معلوم ہو جائے گی اور کسی بھی چیز کو واضح کرنے کی یہ انتہاء ہے۔

اور تشبیہ کی شرط یہ ہے کہ وہ ایک ایسی بات ہو جس کے معنیٰ میں بعض اعتبارات سے پوشیدگی ہوتا کہ اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ جیسے مذکورہ آیت: ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ﴾ منافقین کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی ہو۔

﴿ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ﴾ یعنی جب آگ نے اپنے جلانے والے کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کے نور کو لے گیا۔

اس سوال کا جواب کہ ''بنورھم'' میں جمع کی ضمیر اور اس سے پہلے کی ضمیریں واحد کیوں لائی گئیں

اگر یہ سوال کیا جائے کہ پہلے ضمیریں واحد اور ''بنورھم'' میں جمع کی ضمیر لائی گئی' اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ (ہو سکتا ہے کہ ''کمثل الذی استوقد'' اصل میں ''کمثل الذین'' ہو کیونکہ) ''الذین'' کی جگہ ''الذی'' کہنا بھی جائز ہے۔ جیسے التوبہ کی درج ذیل آیت میں ہے:

وَخُضْتُمْ كَالَّذِىْ خَاضُوْا ۚ. (التوبہ:۶۹)

اور (اے منافقو!) تم بھی فضول کاموں میں مشغول ہو گئے جیسے (پہلے زمانے کے کافر) مشغول ہوئے تھے۔

بعض علماء نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اس آیت میں پورے قصہ کو قصہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی منافقین کے قصہ کو آگ جلانے والے کے قصہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت کا معنیٰ اس طرح ہے:

مثل الواحد منهم كمثل الذى استوقد نارا.

منافقین میں سے ہر ایک کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی ہو۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾ اور (اللہ تعالیٰ نے منافقین کو) تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں

---

[۱۲۹] سات مضامین سے مراد درج ذیل مضامین ہیں:

(۱) وعد و عید (۲) محکم و متشابہ (۳) حلال (۴) حرام (۵) امر (۶) نہی (۷) قصص و امثال

دیکھتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ منافقین کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے ایک اندھیری رات میں کسی جنگل کے اندر آگ جلائی اور اس نے اس آگ سے گرمی حاصل کی' پھر اس نے اپنے اردگرد کو دیکھا تو اُسے خوفناک چیزوں سے ڈر لگا اور اتنے میں اس کی آگ بجھ گئی تو وہ اندھیرے میں حیرت زدہ اور خائف ہو کر رہ گیا۔ یہی حال منافقین کا ہے کہ انہوں نے زبان سے ایمان کا اظہار کر کے اپنی جان' اپنے مال اور اپنی اولاد کا تحفظ کیا' مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کیا اور مالِ غنیمت میں ان کے حصہ دار بنے۔ یہ سب کچھ ان منافقین کا نور تھا۔ جب یہ مر گئے تو پھر تاریکی اور خوف کی طرف لوٹ آئے۔

بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ روشنی ضائع ہونے سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ مسلمانوں پر منافقین کا عقیدہ ظاہر کر دیا گیا۔ اور بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے قبر میں یا پلِ صراط پر روشنی کا ضائع ہونا مراد ہے۔

اس سوال کا جواب کہ ایمان کو نور سے اور کفر کو اندھیرے سے تشبیہ کیوں دی گئی؟

یہاں اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایمان کو نور اور کفر کو تاریکی سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ بلند مقصد اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرنے اور حیرت و پریشانی کو دور کرنے میں سب سے زیادہ کامل چیز نور ہے اور ایمان بھی اسی کیفیت کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اور اس کی جنتوں کی طرف ایک واضح راستہ ہے (اس لیے ایمان کو نور سے تشبیہ دی گئی) جبکہ کفر کو تاریکی سے تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ جو شخص درست راہ کو چھوڑ کر تاریکی میں بھٹکتا پھرے اس کی پریشانی بڑھتی ہی رہتی ہے اور کافر کا بھی یہی حال ہے کہ آخرت میں اس کی پریشانی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

منافقین کے لیے آگ کی مثال بیان کرنے کی حکمتیں

مذکورہ آیت میں منافقین کے لیے جو آگ جلانے کی مثال بیان کی گئی ہے اس میں تین حکمتیں ہیں:

(۱) ایک حکمت تو یہ ہے کہ آگ سے روشنی حاصل کرنے والا اپنے غیر سے روشنی حاصل کرتا ہے اور جب وہ روشنی چلی جاتی ہے تو وہ اپنی تاریکی میں پڑا رہتا ہے۔ سو منافقین نے بھی جب دل سے ماننے بغیر زبان سے اپنے مؤمن ہونے کا اقرار کیا تو گویا کہ ان کا ایمان بھی مستعار (عارضی) ہے (اور حقیقت میں وہ ان کا اپنا نور نہیں ہے)۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ آگ اپنی بقاء کے لیے لکڑی کے ساز وسامان کی محتاج ہوتی ہے' یہی معاملہ ایمان کا بھی ہے کہ وہ اپنے دوام اور ہمیشگی کے لیے اعتقاد (دل سے ماننے) کا محتاج ہے۔

(۳) تیسری حکمت یہ ہے کہ انسان پر وہ تاریکی زیادہ سخت گزرتی ہے جو روشنی کے بعد پیدا ہو' بہ نسبت اس تاریکی کے جس سے پہلے کوئی روشنی نہ ہو۔ چونکہ منافقین کی حالت بھی ایسی ہی تھی اس لیے ان کی اس حالت کو روشنی کے بعد پیدا ہونے والی تاریکی سے تشبیہ دی گئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

(یہ لوگ) بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' سو یہ (اپنی منافقت سے) رجوع نہیں کریں گے ۝

''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ'' کا مفہوم

﴿صُمٌّ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ منافقین حق بات سننے سے بہرے ہیں کیونکہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے اور جب اس کو قبول نہیں

کرتے تو گویا کہ انہوں نے اس کوسنا ہی نہیں۔ ﴿ بُکْمٌ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ منافقین حق بولنے سے گونگے ہیں سو وہ حق بات کہتے ہی نہیں۔ اور ﴿ عُمْیٌ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ منافقین کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں جس کی بنیاد پر یہ حق اور باطل کے درمیان تمیز کر سکیں اور جس شخص کو بصیرت حاصل نہ ہو وہ اس کی طرح ہے جس کے پاس آنکھیں نہ ہوں اور وہ اندھا ہو۔ ان منافقین کے حواس درست تھے لیکن جب انہوں نے حق بات سُننے سے اپنے کانوں کو بند کر لیا اور اپنی زبانوں سے حق بات ادا کرنے اور اس کی طرف اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے انکار کر دیا تو وہ اس شخص کی مثل قرار دے دیئے گئے جس کے حواس معطّل (بیکار) ہو چکے ہوں اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ضائع ہو چکی ہو۔ اب ان منافقین کی حالت ایسی ہے کہ ﴿ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴾ یعنی یہ اپنی گمراہی اور منافقت سے واپس نہیں لوٹتے۔

(حواس کے معطّل ہونے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے ضائع ہونے کو) شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

صم اذا سمعوا خیرا ذکرت بہ ــــ کوئی ایسی اچھی بات جس کو تم بیان کرو اس کو سن کر وہ

وان ذکرت بسوء کلھم اذن ــــ بہرے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر تم بُری بات کا ذکر کرو تو وہ سب سننے لگتے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲

یا ان کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو آسمان سے برسنے والی بارش میں (گھرے ہوئے) ہوں، اس بارش میں تاریکیاں، گرج اور چمک ہو، وہ کڑک (سُن کر) موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے O

﴿صیّب﴾ سے مراد بارش ہے اور ویسے ہر وہ چیز جو اوپر سے نیچے کی طرف اترے وہ ''صیّب'' ہے۔ اور آیت میں ''صیّب'' سے اصحابِ صیّب (بارش والے) مراد ہیں۔ اور ﴿سماء﴾ (آسمان) سے مراد یا تو بادل ہیں کیونکہ ہر وہ چیز جو بلند اور سایہ دار ہو وہ (عربی میں) ''سماء'' ہے اور اسی لیے گھر کی چھت کو سماء کہتے ہیں۔

جب کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''سماء'' سے خود آسمان مراد ہے (یعنی بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے) اور باوجود اس کے کہ بارش کا نزول آسمان سے ہوتا ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے آسمان کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ ان لوگوں کا رد ہو جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بارش زمین سے اُٹھنے والے بخارات سے بنتی ہے۔ سو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے آسمان کا خاص ذکر فرما کر حکماء کے مذہب کو باطل کر دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ بارش زمینی بخارات سے نہیں بنتی ہے۔[۱۳۰]

۱۳۰ بارش، زمین سے اٹھنے والے بخارات ہی سے بنتی ہے۔ علامہ خازن کی تحقیق درست نہیں ہے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ بارش زمین سے اٹھنے والے بخارات ہی سے بنتی ہے۔ یہ بخارات فضا کے ٹھنڈے حصے میں چلے جاتے ہیں اور ٹھنڈک کی وجہ سے وہاں جمع ہو جاتے ہیں پھر جمع ہونے کے بعد بارش کی شکل میں برسنا شروع ہو جاتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں بارش کے نزول کو آسمان کی طرف جو نسبت دی گئی ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ آسمان سے مراد بادل ہیں کیونکہ آسمان کو ''سماء'' اُس کی بلندی کی وجہ سے کہتے ہیں، لہٰذا جو چیز بلند ہو وہ ''سماء'' ہے۔ بادل بھی ہم پر بلند ہوتے ہیں لہٰذا وہ بھی ''سماء'' ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۱، البقرہ: ۲۲)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

''ظلمات'' ''رعد'' اور ''برق'' کی لغوی تشریح اور ''رعد'' و ''برق'' کے مصداق کی تحقیق

﴿فِیْهِ﴾ میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع ''صیّب'' ہے اور ﴿ظُلُمٰتٌ﴾ ''ظلمة'' کی جمع ہے اور ''رعد'' سے مراد وہ آواز ہے جو بادلوں سے سنائی دیتی ہے (یعنی گرج) اور ''برق'' سے مراد وہ آگ ہے جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿رَعْدٌ﴾ اس فرشتہ کا نام ہے جو بادل کو اِدھر سے اُدھر بھیجتا ہے اور ﴿بَرْقٌ﴾ سے مراد اُس کوڑے کی چمک ہے جو نور کا ہوتا ہے اور اُس کے ذریعہ فرشتہ بادلوں کو کڑکاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''رعد'' اس فرشتہ کا نام ہے جو بادلوں کو کڑکاتا ہے' اور بادل جب بکھر جاتے ہیں تو انہیں جمع کر کے آپس میں ملا دیتا ہے' پھر جب اس فرشتہ کا غصہ شدید ہو جاتا ہے تو اس کے مُنہ سے آگ نکلتی ہے وہ آگ ''برق'' اور ''صواعق'' ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ''رعد'' سے مراد اُس فرشتہ کی تسبیح ہے اور بعض کے نزدیک اس فرشتہ کا نام ہے۔

﴿صواعق﴾ ''صاعقة'' کی جمع ہے اور اس سے مراد ایسی آواز ہے جو سُننے والے کو مار ڈالے یا بیہوش کر دے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''صاعقة'' سے مراد عذاب کا وہ ٹکڑا ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ جس پر چاہے نازل فرماتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب بادلوں کی گرج اور کڑک کی آواز سنتے تو (اللہ عزوجل کی بارگاہ میں) یوں عرض گزار ہوتے۔

(۷۸) ''اللھم لاتقتلنا بغضبک ولا تھلکنا بعذابک وعافنا قبل ذالک'' ''اے اللہ (عزوجل)! تو ہمیں اپنے غضب کے ذریعہ نہ مار اور اپنے عذاب کے ذریعہ ہلاک نہ فرما اور ہمیں اس سے پہلے ہی عافیت عطا فرما (یعنی اپنے عذاب کے نازل ہونے سے پہلے ہی ہمیں عافیت کے ساتھ موت عطا فرما)''۔[۱۳۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) علامہ سیّد محمود آلوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ سورج جب سمندروں کے مقابل آتا ہے تو اُس سے تر بخارات اٹھاتا ہے اور جب خشکی کے مقابل آتا ہے تو خشک بخارات اٹھاتا ہے۔ پھر یہ سارے بخارات جب فضا کے تیسرے حصے میں پہنچتے ہیں تو گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر فضاء کے اُس حصے میں ٹھنڈک زیادہ نہ ہو تو بخارات وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور گاڑھے پن کی وجہ سے اُن بخارات میں جو بوجھ ہوتا ہے اُس کی وجہ سے وہ ٹپکنے لگتے ہیں۔ پس بخارات جب جمع ہوں تو وہ بادل ہیں اور جب ٹپکنے لگ جائیں تو بارش ہے۔ (روح المعانی ج ۱' البقرہ: ۲۲)

استاذ محترم علامہ غلام رسول صاحب سعیدی مدظلّہ العالی زیر بحث سوال (قرآن کریم میں بارش کے نزول کو آسمان کی طرف نسبت کیوں دی گئی) کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: قرآن مجید میں عام لوگوں کے عرف اور محاورے کے مطابق خطاب ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' (اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اُتارا۔ البقرہ: ۲۲) حالانکہ یہ پانی بخارات کی صورت میں زمین سے اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عرف اور محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آسمان سے بارش ہوئی' اس لیے اس کے مطابق خطاب فرمایا۔ (تبیان القرآن ج ۱ ص ۴۲۲)

[۱۳۱] اس جملہ سے کوئی یہ وہم نہ کرے کہ رسول اللہ ﷺ نے موت کی تمنا یا دعا کی ہے۔ کیونکہ موت کی دُعا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا کہ ہمیں اپنے عذاب سے پہلے ہی عافیت عطا فرما۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم جتنی بھی زندگی گزاریں وہ عافیت اور سلامتی کے ساتھ ہو۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دُعا کی:

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ○ مجھے حالت اسلام پر موت عطا فرما اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دینا۔ (یوسف: ۱۰۱)

اس میں موت کی تمنا یا موت کی دُعا نہیں ہے بلکہ اس بات کی تمنا اور دُعا ہے کہ جب میری روح قبض ہو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(سنن الترمذی: ۳۴۵۰، مسند احمد ج ۲ ص ۱۰۰، مستدرک ج ۴ ص ۲۸۶، مشکوٰۃ ص ۱۳۳، مطبوعہ کراچی)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

زیر بحث آیت میں ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ ہلاکت کا خوف مراد ہے۔یعنی منافقین ہلاکت کے ڈر سے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔﴿وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل کافروں کے حال سے باخبر ہے۔ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو جمع کر کے انہیں عذاب دے گا۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

ایسا لگتا ہے کہ بجلی ان کی نگاہیں اُچک لے گی، جب بھی (وہ بجلی) ان کے لیے چمکتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب (وہ بجلی) ان پر تاریک ہو جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو (گرج کی آواز سے) ان کی سماعت کو اور (بجلی کی چمک سے) ان کی بینائی کو سلب کر لیتا، بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے O

آیت مذکورہ میں ''یکاد''، ''یخطف'' اور ''کلّما'' کا لغوی معنی

﴿يَكَادُ﴾ کا معنی ہے: قریب ہے۔عربی میں کہا جاتا ہے: ''کاد یفعل ولم یفعل'' (یعنی وہ شخص فلاں کام کرنے کے قریب ہوا لیکن اس نے کیا نہیں)۔﴿يَخْطَفُ﴾ کا معنی ہے: کسی چیز کو تیزی سے اُچک لینا اور ''کلّما'' کا معنی ہے: جب بھی۔

آیت کریمہ کا مفہوم

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ (گرج سے پیدا ہونے والی) بجلی قریب ہے کہ منافقین کی آنکھوں کو اُچک لے۔جب وہ بجلی ان کے لیے روشن ہوتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو وہ پریشان ہو کر رُک جاتے ہیں۔

(آیت کے اختتام پر فرمایا:) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو گرج کی آواز سے ان کی سماعت کو اور بجلی کی چمک سے ان کی آنکھوں کو سلب کر لیتا۔بعض علماء نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کی ظاہری سماعت اور بصارت کو لے لیتا جیسا کہ اُس نے اُن کی باطنی سماعت اور بصارت کو سلب کر لیا''۔بے شک اللہ عزوجل ہر چاہے پر قادر ہے۔یعنی جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اُسے کوئی روک ٹوک نہیں سکتا۔

منافقین کے لیے بیان کی جانے والی مثال کی تشریح

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے ایک دوسری مثال بیان فرمائی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو ان کے کفر اور نفاق میں ایک ایسی قوم سے تشبیہ دی ہے جو اندھیری رات میں کسی جنگل میں پڑی ہو اور ان پر بارش ہو جائے جس میں کئی اندھیرے ہو یعنی رات کا اندھیرا بھی ہو، بارش کا اندھیرا بھی ہو اور بادل کا اندھیرا بھی۔اور ان تمام اندھیروں میں خصوصیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تو میں حالت اسلام پر رہوں۔

یہ ہے کہ چلنے والا شخص ان میں چل نہیں سکتا (وہ رُک جاتا ہے) اور گرج کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو سننے والے اس کے خوف سے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے ہیں اور بجلی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی شدت کی وجہ سے لوگوں کی بینائی کو چھین لیتی ہے اور انہیں اندھا بنا دیتی ہے۔

یہ مثال اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم (کی شان) اور کفار و منافقین کے کرتوت کی وضاحت کے لیے بیان فرمائی ہے۔ اس مثال میں ''مطر'' (بارش) سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ وہ دلوں کی زندگی کا باعث ہے جس طرح بارش زمین کی زندگی کا باعث ہے۔ ''ظلمات'' سے مراد قرآن کریم کے وہ مقامات ہیں جہاں کفر و شرک اور منافقت کا تذکرہ ہے۔ اور ''رعد'' (گرج) سے مراد وہ وعیدیں ہیں جن کے ذریعہ منافقین کو ڈرایا جاتا ہے اور اس سے آگ کا ذکر مراد ہے۔ اور ''برق'' (بجلی) سے مراد قرآن کریم کے وہ مقامات ہیں جہاں ہدایت و روشن بیان' نعمتوں کے وعدے اور جنت کا تذکرہ ہے۔ سو کفار اور منافقین قرآن کریم کی قرأت اور سماعت کے وقت اپنے کانوں کو اس خوف سے بند کر لیتے ہیں کہ کہیں ان کے دل قرآن کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ اور یہ (خوف) اس لیے تھا کہ ان کے نزدیک ایمان لانا کفر تھا اور کفر موت ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مذکورہ بالا مثال اللہ تعالیٰ نے اسلام (کی عظمت بیان کرنے) کے لیے بیان فرمائی ہے۔ اس میں ''مطر'' (بارش) سے مراد اسلام ہے۔ ''ظلمات'' سے مراد اس میں پیش آنے والی مصیبتیں اور آزمائشیں ہیں۔ ''رعد'' (گرج) سے مراد اس کی وہ وعیدیں اور خوف دلانے والی باتیں ہیں جو آخرت کے متعلق ہیں اور ''برق'' (بجلی) سے مراد (مختلف نعمتوں کے) وعدے ہیں۔ اور ''منافقین اپنی اُنگلیاں کانوں میں ڈال لیتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ اسلام میں کہیں کوئی آزمائش یا سختی دیکھتے ہیں تو ہلاکت کے خوف سے بھاگ لیتے ہیں اور ''اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرے ہوئے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے بھاگنا کوئی فائدہ نہیں دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے ہر طرف موجود ہے۔ وہ اُنہیں جمع کرے گا اور عذاب دے گا۔ اور ﴿ یَکَادُ الْبَرْقُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر ان پر بدبختی غالب نہ آئی ہوتی تو اسلام کے دلائل اُنہیں غور و فکر کی طرف لے جاتے۔ اور ''جب کبھی وہ بجلی ان کے لیے روشن ہوتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب کبھی منافقین کو کسی آزمائش اور امتحان کے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ زبان سے کلمہ پڑھ کر بڑی صلح صفائی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ بعض نے اس کا معنیٰ اور مراد یہ بیان کی ہے کہ منافقین جب اسلام میں کوئی مالِ غنیمت اور سکون پاتے ہیں تو مسلمان بنے رہتے ہیں اور مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ''جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو رُک جاتے ہیں'' یعنی جب کوئی مصیبت اور سختی آتی ہے تو اسلام کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ ﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا' تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔

''یا ایها الناس'' اور ''یا ایها الذین امنوا'' میں فرق

(اس آیت کا آغاز ''یا ایها الناس'' سے ہے) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ﴾ سے خطاب اہل مکہ کے لیے ہوتا ہے اور ''یا ایها الذین امنوا'' سے خطاب اہل مدینہ سے ہوتا ہے۔ مذکورہ آیت میں ''یا ایها الناس'' سے تمام مکلّف بندوں سے خطاب ہے۔

عبادت کا معنیٰ و مفہوم

﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنیٰ یہ بیان فرمایا کہ تم اپنے رب کو ایک مانو۔ اور قرآن کریم میں جہاں عبادت کا لفظ آیا ہے وہاں توحید مراد ہے۔ اور عبودیت کا اصل معنیٰ ہے: ''التذلل'' (جھکنا' عاجزی کرنا) اور عبادت کا معنیٰ ہے: انتہائی عاجزی کرنا اور بہت ہی جھک جانا۔ لہٰذا اس کا مستحق بھی وہی ہوگا جو انتہائی فضل اور انعام کرنے والا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

﴿الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ یعنی بغیر ماڈل اور نمونہ کے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ (آیت کے اس جملہ میں ''لعلّ'' ہے اور) ''لعلّ'' اور ''عسٰی'' عربی میں اُمید ظاہر کرنے کے لیے آتے ہیں اور جب یہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوں تو وجوب کا معنیٰ دیتے ہیں۔

''لعلکم تتقون'' کا مفہوم یہ ہے کہ تا کہ تم عذاب سے نجات پا جاؤ۔ بعض علماء نے ''تتقون'' کو بچنے کے معنیٰ میں لیا ہے اور یوں معنیٰ کیا ہے کہ ''تم امید رکھو کہ تم اللہ عزوجل کے عذاب سے بچ جاؤ گے''۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم تمہارے ہر طرف موجود ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

(وہ رب) جس نے تمہارے فائدے کے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اُتارا' پھر اُس نے تمہارے کھانے کے لیے پھل پیدا کیے' لہٰذا تم (دیگر کو) اللہ کے برابر اور شریک نہ ٹھہراؤ' جب کہ تم (حقیقت سے) باخبر ہو O

زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنانے کا مفہوم

اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے زمین کو نرم' ہموار اور چلنے کے قابل بنایا اور اس کو ایسا سخت نہیں بنایا کہ اس پر ٹھہرنا ہی ناممکن ہو۔ اور ﴿وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ آسمان کو بلند چھت بنایا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر ایک صاحبِ فکر شخص اس کائنات میں غور وفکر کرے تو وہ اس کو ایک ایسے آباد گھر کی مانند پائے گا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہو۔ چنانچہ آسمان بلند ہے اور ایک چھت کی مانند ہے' زمین بچھی ہوئی ہے اور یہ فرش کی مانند ہے' ستارے چراغوں کی مانند ہیں اور انسان مالک مکان کی مانند ہے۔ اس گھر میں انسان کے فائدے کے لیے مختلف چیزیں اُگی ہوئی ہیں اور طرح طرح کے جانور انسان کے کاموں میں مصروف ہیں۔ لہٰذا جس انسان کے لیے یہ تمام چیزیں بنائی گئی ہیں اُس پر واجب ہے کہ وہ ان چیزوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا یعنی بادل سے بارش نازل فرمائی' پھر اس پانی سے مختلف رنگوں کے پھل اور مختلف قسم کے پودے اُگائے جو کہ تمہارے لیے رزق ہیں اور تمہارے جانوروں کے لیے چارہ۔

﴿ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک نہ بناؤ جن کی تم عبادت کرنے لگ جاؤ جیسا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو حالانکہ تم اپنی عقل سے جانتے ہو کہ ان چیزوں کو اللہ عزوجل کا شریک بنانا درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور ان تمام چیزوں کو پیدا فرمانے والا ہے' اُس کی مثل کوئی نہیں ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾

اور جو کتاب ہم نے اپنے (محبوب) بندے پر نازل کی ہے اگر تمہیں اس کے (کلامِ الٰہی ہونے کے) بارے میں کچھ شک ہے تو ذرا اس جیسی ایک سورت تو بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے گواہوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو O

جب (گذشتہ آیات میں) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و وحدانیت اور اس کا خالق و بے مثل اور لاشریک ہونا واضح اور ثابت ہو گیا تو فوراً ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے دلیل قائم فرمائی اور (اس میں) ایک ایسی بات فرمائی جو کفار کے اُس شک و شبہ کو دور کرنے والی ہے جو اُنہیں قرآن کے معجزہ ہونے اور قرآن کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونے میں پیدا ہوتا تھا۔ اور یہ بات کہ قرآن کریم کو نبی اکرم ﷺ اپنی طرف سے نہیں بناتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا نزول ہوتا تھا اس بارے میں بھی کفار کو شک اور شبہ تھا' سو یہ آیت کفار کے اس شبہ کو بھی دور کرنے والی ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

چونکہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے کہ کفار قرآن میں شک کرنے والے ہیں اس لیے فرمایا کہ اگر تمہیں اُس کتاب میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے محمد (ﷺ) پر نازل فرمائی ہے تو تم اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔

یہاں ﴿ عَبْدِنَا ﴾ فرمایا' اس میں ''عبد'' کی جو اضافت ہے وہ نبی اکرم ﷺ کو شرف دینے کے لیے ہے اور یہ بتانے کے لیے ہے کہ اُن پر جو قرآن کریم نازل ہوا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہے۔

﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ ﴾ میں سورت لانے کا جو حکم فرمایا جا رہا ہے وہ حکم تعجیز ہے یعنی کفار کے عاجز ہونے کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

سورت کا معنیٰ اور ''مثله'' میں ''ہ'' ضمیر کے مرجع کی تحقیق

سورت کس کو کہتے ہیں؟ اس حوالہ سے ایک تعریف تو یہ ہے کہ قرآن کا ایک ایسا ٹکڑا جس کا آغاز اور اختتام معلوم ہو وہ سورت ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ (عربی میں) بلند مرتبہ کو ''سورة'' کہتے ہیں۔ اسی سے ''سور البلد'' کا لفظ ہے یعنی شہر کی فصیل اور باؤنڈری' کیونکہ وہ بھی بلند ہوتی ہے۔ اور قرآنی سورت کو سورت اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھنے والا اس کے ذریعہ بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ تمام سورتیں پڑھ لیتا ہے تو وہ تمام مراتب حاصل کر لیتا ہے۔

اس آیت میں جو ﴿ مِّثْلِهٖ ﴾ فرمایا کہ تم اس کی مثل ایک سورت بنا کر لے آؤ' اس سے مراد یہ ہے کہ تم قرآن کی مثل ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ''مثله'' میں ''ہ'' ضمیر ''عبدنا'' کی طرف راجع ہے یعنی تم ہمارے نبی محمد ﷺ کی مثل لا کر دکھا دو جنہوں نے نہ اچھی کتابت کی ہے' نہ علماء کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور نہ کسی سے علم حاصل کیا ہے[۱۳۲] (اس کے

۱۳۲ یعنی دنیا میں کسی سے علم حاصل نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ. وہ لوگ جو اُس رسول کی غلامی کریں گے جو غیب کی خبریں دینے والا اُمّی ہے۔ (الاعراف: ۱۵۷)

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ اُمّی وہ شخص ہے جو نہ لکھتا ہو نہ کتاب سے دیکھ کر پڑھتا ہو۔ (المفردات بحوالہ تبیان القرآن ج ۱ ص ۳۵۷)

باوجود وہ ایک معجز کلام پیش کر رہے ہیں' اگر تمہارے نزدیک یہ سب کچھ دھوکا ہے تو تم ان جیسی کوئی شخصیت لا کے دکھا دو)۔
مذکورہ دونوں صورتوں میں قرآن حکیم کی طرف ضمیر لوٹانا زیادہ مناسب اور بہتر ہے (یعنی یہ معنیٰ زیادہ بہتر ہے کہ تم قرآن کی مثل کوئی سورت بنا کے لے آؤ) کیونکہ قرآن کریم میں دیگر مقامات پر جہاں قرآن کی مثل لانے کا چیلنج دیا گیا ہے یہ آیت ان کے مطابق ہو جائے گی۔ اور ویسے گفتگو بھی قرآن کریم کے بارے میں چل رہی ہے کیونکہ زیر بحث آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اگر تمہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے تو تم اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ''۔ اگر ''مثلہ'' میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مثل لانا مراد ہوتا تو یوں فرمایا جاتا:

وان ارتبتم فی ان محمدا منزل علیہ فھاتوا قرآنا مثل محمد ﷺ. اگر تمہیں اس بارے میں شک ہے کہ نزولِ قرآن محمد ﷺ پر ہوا ہے تو تم محمد ﷺ کی مثل قرآن لے آؤ۔

(لیکن اس طرح نہیں فرمایا' اس لیے بہتر یہی ہے کہ ''مثلہٖ'' میں قرآن کریم کی مثل لانا مراد لیا جائے۔)

قرآن کریم کی شانِ اعجاز پر دلائل

یہ بات کہ قرآن کریم ایک معجز کتاب ہے (اس کی مثل لانا ناممکن ہے) اس پر دلیل خود قرآن کریم کی وہ فصاحت و بلاغت ہے جو مقام اختصار میں بھی موجود ہے اور مقام طول میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ کہیں تو قرآن نے طویل الفاظ کے ساتھ کسی قصہ کو بیان کیا ہے اور پھر اُسی قصہ کو مختصر الفاظ میں اس طرح دُہرایا ہے کہ اوّلین مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔
(دوسری دلیل قرآن کے معجز ہونے کی یہ ہے کہ) اس کتاب کا طرزِ تخاطب اور اندازِ بیان دیگر لوگوں کے اسلوبِ کلام سے جُدا ہے' اس کی آیتوں کے وزن اُن اوزان سے جُدا ہیں جو اشعار و خطبات اور خطوط میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے اہلِ عرب کو اس کتاب (کی مثل لانے) کا چیلنج دیا گیا لیکن وہ نہ لا سکے اور (اس کی فصاحت و بلاغت کے آگے) حیران رہ گئے اور (بالآخر) انہوں نے اس کتاب کی عظمت کا اعتراف کیا۔
(قرآن کے معجز ہونے پر ہم نے یہ دلیل اس لیے پیش کی ہے کہ) اہل عرب ہی مرکزِ بلاغت ہیں اور میدانِ فصاحت کے شہسوار ہیں' اشعار و خطبات اور خطوط میں نظم و نثر اُنہی کا حصہ ہے۔ حتیٰ کہ ولید بن مغیرہ قرآن کی تعریف میں کہہ اُٹھا کہ:

واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اصلہ لمغدق وان اعلاہ لمثمر. (سبل الہدیٰ والرشاد ج ۲ ص ۳۵۵)

خدا کی قسم! اس کلام میں مٹھاس اور خوبصورتی (کشش) ہے' یہ ایک ایسا سرسبز و شاداب تنا ہے جس سے بے شمار شاخیں پھوٹی ہوئی ہیں اور اس کی ٹہنیاں پکے پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ (ترجمہ ضیاء النبی ﷺ ج ۲ ص ۲۹۶' بتغیر)

زیر بحث آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ ہمارے رسول محمد ﷺ قرآن کریم کو اپنی طرف سے بنا کر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں تو تم اللہ کو چھوڑ کر اپنے گواہوں کو بلا لو' یعنی اپنے اُن معبودوں سے مدد لے لو جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجتے ہو۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر (واقعۃً) معاملہ ایسا ہی ہے کہ تمہارے معبود عبادت کے مستحق ہیں (اور سچے ہیں) تو ہمارے رسول محمد ﷺ کے معاملہ میں جو تمہیں چیلنج دیا گیا ہے اس کا جواب دینے کے لیے اپنے ان معبودوں سے مدد مانگ لو۔ ورنہ جان لو کہ تمہارا اپنے معبودوں کے متعلق خدائی کا جو دعویٰ ہے' اُس میں تم حق پر نہیں ہو۔
بعض علماء نے ''وادعوا شھداء کم'' میں ''شھداء'' سے گواہ مراد لیے ہیں یعنی اگر تم سچے ہو تو ایسے لوگوں کو بلا لو جو تمہارے حق میں گواہی دیں۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

پس اگر تم (ہمارا چیلنج پورا) نہ کر سکو اور (ہم فرمائے دیتے ہیں کہ تم ہمارا چیلنج) ہرگز پورا نہیں کر سکو گے تو اُس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' جس کو کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے O

نبی اکرم ﷺ کے معجزہ کا اظہار اور کفار کی بے بسی

اس آیت میں ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ماضی میں اس کی مثال نہیں لا سکے ہو اور ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ آئندہ بھی تم اس کی مثال نہ لا سکو گے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کفار قرآنِ کریم کی مثل لانے سے عاجز ہیں اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کفار نہ تو اس قرآن کی مثال لا سکے ہیں نہ اس کے کسی ایک حصہ کی مثال۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب منکرین کو اس طرح کی آیات سے جھنجھوڑا گیا تو انہوں نے قرآن کریم یا اس جیسی کوئی سورت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی (لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوئے)۔ اگر انہیں اس بات کی طاقت ہوتی تو وہ اس قرآن کی مثال ضرور پیش کرتے لیکن جب وہ کچھ نہ کر سکے تو نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ظاہر ہو گیا اور کفار کا عاجز و بے بس ہونا واضح ہو گیا' حالانکہ یہ لوگ بہت فصیح و بلیغ زبان والے تھے' قرآن حکیم بھی انہی لوگوں کی زبان میں نازل ہوا تھا اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) یہ لوگ دل سے چاہتے تھے کہ اس قرآن کے نور کو بجھا دیا جائے اور اس کے حکم کو باطل کر دیا جائے' اس شدید خواہش کے باوجود ایک کافر بھی قرآن کا مقابلہ نہ کر سکا (اس کے برعکس) کفار اس بات پر راضی ہو گئے کہ ان کی اولاد کو قید کر لیا جائے' اُن کا مال لے لیا جائے اور اُنہیں قتل کر دیا جائے اور جب مقابلہ کرنے سے کافروں کا بے بس ہونا ظاہر ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا ثابت ہو گیا۔ اور جب حقیقتِ امر یہی ہے تو اب عناد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑنا واجب ہے۔ جیسا کہ آیت کے اس اگلے حصہ سے ظاہر ہے کہ:

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ﴾ یعنی (اے کافرو!) تم ایمان لاؤ اور ایمان لا کر جہنم کی آگ سے بچو۔ وہ (آگ ایسی) ہے کہ اس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔

لوگوں اور پتھروں کا آگ کے لیے ایندھن ہونے کا مفہوم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''حجارۃ'' سے یہاں سُرخ یاقوت کے پتھر مراد ہیں کیونکہ ان کے شعلے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ آگ اور اس کی قوت بہت زیادہ ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ''حجارۃ'' سے بُت مراد ہیں' کیونکہ اُن میں اکثر بت پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ اس آیت میں پتھروں کے ساتھ لوگوں کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ انہی پتھروں کو پوجتے تھے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ (دنیا میں) فائدہ دینے والے ہیں اور (آخرت میں) سفارش کریں گے۔ سو اللہ نے ان پتھروں کو دوزخ کی آگ میں ان کے لیے عذاب بنا دیا۔[۱۳۳]

---

۱۳۳ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۔ بے شک تم خود اور جن چیزوں کو تم پوجتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ (الانبیاء: ۹۸)

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ جہنم کا ایندھن وہ پتھر ہوں گے جن کو کفار و مشرکین پوجتے ہیں۔ رہا یہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُنہیں خوشخبری سنا دیجئے کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں' جب بھی اُنہیں ان (باغات) سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو (صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے' جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا' اور اُنہیں (بہ ظاہر) ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لیے ان (باغات) میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اُن (باغات) میں ہمیشہ رہیں گے O

بشارت اور عمل صالح کا مفہوم

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو حکم فرمایا جارہا ہے کہ آپ نیک عمل کرنے والے مؤمنین کو بشارت دے دیجئے۔ بشارت کا معنیٰ ہے: کسی کو ایسی خوش کن خبر دینا جس سے وہ کھل اُٹھے اور اس کے چہرے کی جلد پر خوشی نمایاں ہو جائے۔ کیونکہ انسان جب کسی بات سے خوش ہوتا ہے تو خوشی اس کے چہرہ کی جلد پر ظاہر ہو جاتی ہے (اس لیے بشارت کا معنیٰ ہے: کسی کو خوش کن خبر دینا) پھر اس لفظ کا استعمال اس قدر زیادہ ہو گیا کہ یہ خیر اور شر دونوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ O (آل عمران: ۲۱) — تو آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دیجئے O

لیکن (بہرحال) یہ لفظ خوشی اور خیر ہی کے معنیٰ میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ یعنی خوش خبری اُن مؤمنین کو دیجئے جو نیک اعمال کرنے والے ہیں۔ نیک کام سے مراد عبادات اور فرمانبرداری کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عمل صالح (نیک کام) وہ ہوتا ہے جس میں چار چیزیں شامل ہوں:

(۱) علم (۲) نیت (۳) صبر (۴) اخلاص

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''وعملوا الصالحات'' سے مراد یہ ہے کہ وہ مؤمنین جور یا کاری (کی ملاوٹ) سے اپنے اعمال کو خالص رکھتے ہیں۔

(بشارت کی وضاحت کرتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا:) ﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ یعنی ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہیں۔

جنت کا معنیٰ اور جنت کو جنت کہنے کی وجہ

''جنات''، ''جنة'' کی جمع ہے۔ اور جنّت سے مراد وہ باغ ہوتا ہے جس میں پھل دار درخت ہوں۔ (جنت کا اصل معنیٰ ہے: ڈھانپنا اور چھپانا) چونکہ جنت بھی چھپی ہوئی ہے اور درختوں اور پتوں سے ڈھانپی ہوئی ہے اس لیے جنت کو جنت کہتے ہیں۔

جنت اور فردوس میں فرق اور جنت میں دریاؤں کے بہنے کا مفہوم

بعض علماء نے کہا ہے کہ جنت اُس باغ کو کہتے ہیں جس میں کھجور کے درخت ہوں اور فردوس اس باغ کو کہتے ہیں جس

میں انگور کے درخت ہوں۔

یہ جو فرمایا کہ نیک عمل کرنے والے مؤمنین کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا رواں ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ اُن باغات کے درختوں اور محلّات کے نیچے دریا بہتے ہیں۔ اور دریا بہنے سے مراد یہ ہے کہ اُن دریاؤں میں پانی بہتا ہے کیونکہ خود دریا نہیں بہہ رہے ہوتے۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جنت میں اہل جنت کے حکم کے مطابق دریا بہہ رہے ہوں گے۔ اور حدیث میں ہے کہ:

ان انهار الجنة تجری فی غیر أخدود. — بے شک جنت کے دریا مسلسل بہہ رہے ہوں گے۔

(درِّ منثور ج ۱ ص ۸۸' بحوالہ ابن جریر و ابن ابی حاتم و بیہقی وغیرہم)

جنت کے پھلوں کا دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہونا

﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی جب کبھی اہل جنت کو کوئی پھل بطور رزق یعنی کھانے کے لیے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دنیا میں دیا گیا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ جنت کے پھل رنگ میں ایک جیسے ہوں گے اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے' لہٰذا جب اہل جنت کو ایک کے بعد دوسرا پھل پیش کیا جائے گا تو (ظاہری صورت دیکھ کر) اُسے پہلا والا سمجھیں گے۔

﴿ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ﴾ یعنی اہل جنت کو (بہ ظاہر) ایک جیسا رزق دیا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُس رزق کے ذائقے مختلف ہوں گے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ جنت میں جو رزق دیا جائے گا وہ عمدگی میں ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہوگا اور اُس رزق میں کسی قسم کی بے عُمدگی نہ ہوگی۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ جنت کے پھل نام کے اعتبار سے دُنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے البتہ ذائقہ میں دُنیا کے پھلوں سے مختلف ہوں گے۔

اہل جنت کے کھانے پینے اور رہن سہن کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان

(۷۹) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا کہ اہل جنت' جنت میں کھائیں گے بھی اور پئیں گے بھی لیکن تھوک' پیشاب' قضاءِ حاجت اور ناک صاف کرنے کی اُنہیں حاجت نہیں ہوگی۔ صحابۂ کرام نے پوچھا: پھر کھانا کہاں جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک ڈکار آئے گی اور مُشک کی طرح خوشبودار پسینہ نکلے گا اور جس طرح سانس جاری رہتا ہے اس طرح (ان کی زبانوں پر) اللہ کی حمد و ثناء جاری رہے گی۔[۱۳۴] (صحیح مسلم: ۲۸۳۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ اُن پتھروں کو جہنم کا ایندھن کیوں بنایا جائے گا' جبکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن پتھروں کو جہنم میں ڈالنے کا مقصد کافروں کو مزید رُسوا کرنا ہے کہ تم جن پتھروں کو خدا سمجھتے تھے اور اُن کی پوجا کرتے تھے اُن کی طاقت کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو آج نہیں بچا سکتے' بلکہ تمہارے ساتھ آگ میں جل رہے ہیں۔ گویا آگ کے ذریعہ کافروں کو جسمانی اور ظاہری عذاب دیا جائے گا اور اُن کے ساتھ اُن کے بتوں کو آگ میں ڈال کر باطنی عذاب اور تکلیف میں مبتلا کیا جائے گا۔

(حاشیۃ الشہاب علی البیضاوی ج ۲ ص ۷۸)

۱۳۴؎ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنت کو ایک ڈکار آئے گی اور مشک کی طرح خوشبودار پسینہ نکلے گا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب مرقات و مرات نے لکھا ہے کہ جنت میں ڈکار کی نوعیت ہی الگ ہوگی' اس میں وہ اوصاف نہیں ہوں گے جو دنیا میں ڈکار کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کا پسینہ بھی بدبودار اور تکلیف دہ نہیں ہوگا بلکہ مشک کی طرح معطر اور خوشبودار ہوگا۔

پھر فرمایا کہ ''جس طرح سانس جاری رہتی ہے اسی طرح (ان کی زبانوں پر) اللہ کی حمد و ثناء جاری رہے گی'' (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیث مذکور: (۷۹) کی مختصر تشریح

اس حدیث میں جوفرمایا: ''یلھمون التسبیح والتحمید کما یلھمون النفس'' ۔اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح سانس ہر وقت جاری رہتا ہے اسی طرح اہل جنت کی زبانوں پر ہر وقت اللہ عزوجل کی تسبیح اور تحمید جاری رہے گی اور جس طرح سانس کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی اسی طرح اہل جنت کو بھی اللہ عزوجل کی پاکی بیان کرنے سے کوئی چیز غافل نہیں کرے گی۔

اور یہ جوفرمایا: ''طعامھم جشاء '' اس سے مراد یہ ہے کہ اہل جنت جو کھانا کھائیں گے اس کا فاضل حصہ ڈکار کے ذریعہ نکل جائے گا۔اس حدیث میں ''جشاء'' کا معنیٰ ہے: ڈکار یعنی معدہ کا سانس لینا اور ''رشح'' کا معنیٰ ہے: پسینہ۔

اہل جنت کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی

﴿وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ یعنی اہل جنت کے لیے جنت میں پاک بیویاں ہوں گی۔ بیویوں سے مراد خوب صورت بڑی آنکھوں والی حوریں ہیں۔اور پاکیزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ پیشاب' قضائے حاجت' حیض' اولاد اور تمام گندگیوں سے پاک ہوں گی۔ایک قول یہ ہے کہ پاک بیویوں سے مراد وہ بوڑھی عورتیں ہیں جو دنیا میں معیوب اور کوتاہ چشم تھیں' جنت میں اُنہیں دنیا کی تمام گندگیوں سے پاک کر دیا جائے گا۔ایک قول یہ ہے کہ وہ بیویاں بُرے اخلاق سے بالکل پاک ہوں گی اور ایک قول یہ ہے کہ جنت میں تم جتنا چاہو گے اتنا اُن سے ملو گے لیکن وہ بچہ نہیں جنیں گی۔[۱۳۴]

﴿وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔یعنی وہ نہ تو جنت سے باہر نکلیں گے نہ اُنہیں موت آئے گی۔''خُلد'' کا معنیٰ ہے: ''البقاء الدائم الذی لا انقطاع لهٗ'' ایسی دائمی بقا جس میں کوئی انقطاع نہ ہو (بلکہ تسلسل اور استمرار ہو)۔

جنت اور اہل جنت کے فضائل احادیث کی روشنی میں

(۸۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح (چمکدار) صورت والا ہوگا۔پھر ان کے بعد جو داخل ہوں گے وہ آسمان کے ایک بہت ہی چمکدار ستارے کی طرح (روشن) صورت والے ہوں گے[۱۳۵]' اُنہیں پیشاب' قضائے حاجت' تھوک اور ناک کی ریزش نکالنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی اور پسینہ مشک ہوگا اور ان کی انگیٹھیوں میں عُود سلگتا ہوگا[۱۳۶]' ان کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح آدمی دنیا میں سانس لینے سے نہیں تھکتا اسی طرح وہاں اللہ عزوجل کی حمد وثناء کرنے سے نہیں تھکے گا اور جس طرح یہاں سانس ہر وقت جاری رہتی ہے اسی طرح وہاں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء ہر وقت جاری رہے گی اور جس طرح یہاں ہر ذی رُوح کے لیے سانس لازمی ہے اسی طرح وہاں اللہ عزوجل کی حمد وثناء ہر جنتی کی لازمی صفت ہوگی۔
(مرقات ج۹ص ۵۸۹' مرات ج۷ص۳۷۴)

[۱۳۴] روایات کے اعتبار سے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔بعض روایات سے ثابت ہے کہ اہل جنت اگر خواہش کریں گے تو اُن کی ازواج اولاد جنیں گی۔(سنن ترمذی:۲۵۶۳)

[۱۳۵] پہلے گروہ کے بارے میں جوفرمایا کہ وہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکدار صورت والا ہوگا' اس سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام ہیں اور دوسرا گروہ جو چمکدار ستارے کی طرح روشن صورت والا ہوگا' اس سے مراد صحابہ کرام' اولیاءِ عظام اور دیگر علماء وشہداء اور صالحین ہیں۔(مرقات ج۹ص ۵۸۶)

[۱۳۶] یہاں اگر یہ سوال کیا جائے کہ جنت میں آگ نہیں ہوگی' پھر عُود کو کیسے سلگایا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں عُود کا سلگنا بغیر آگ کے ہوگا۔جیسے اہل جنت کو پرندوں کا بُھنا ہوا گوشت دیا جائے گا لیکن وہ آگ پر پکا ہوا نہیں ہوگا اور اس کی تائید ترمذی شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ جنت میں آدمی جس پرندے کی خواہش کرے گا وہ فوراً ہی اُس کے سامنے گر پڑے گا اور وہ بُھنا ہوا ہوگا۔
یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عُود کو ایسی آگ سے سلگایا جائے جس میں کسی قسم کا ضرر اور دھواں نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کو نار (آگ) کی بجائے نُور سے روشن کیا جائے۔(مرقات ج۹ص ۵۸۷' عمدۃ القاری ج۱۰ص۲۰۴)

بیویاں بہت ہی سفید اور بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی' ان سب کے اخلاق ایک جیسے ہوں گے اور سب اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوں گے یعنی سب کا قد ۶۰ گز بلند ہوگا۔[۱۳۷]

(صحیح بخاری: ۳۳۲۷' صحیح مسلم: ۲۸۳۴' سنن الترمذی: ۲۵۳۷' صحیح ابن حبان: ۷۴۳۶' مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۶)

ایک روایت میں یہ (اضافہ) بھی ہے:

(۸۱) اہل جنت میں سے ہر شخص کے لیے دو بیویاں[۱۳۸] ہوں گی' حسن و جمال کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں کا مغز گوشت کے اندر سے نظر آ رہا ہوگا۔ اہل جنت کے درمیان نہ کوئی اختلاف ہوگا نہ بغض۔ سب کے دل ایک ہوں گے۔ وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔ (صحیح بخاری: ۳۲۴۵' صحیح مسلم: ۲۸۳۴' سنن الترمذی: ۲۵۳۷)

(۸۲) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک مؤمن کے لیے جنت میں ایک کھوکھلے[۱۳۹] موتی کا خیمہ ہوگا جس کی لمبائی ۶۰ میل ہوگی۔ مؤمن کے اہل خانہ بھی اس میں رہیں گے' مؤمن ان کا چکر لگائے گا اور لوگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ (صحیح بخاری: ۴۸۷۹' صحیح مسلم: ۲۸۳۸' سنن الترمذی: ۲۵۲۸' صحیح ابن حبان: ۷۳۹۵' مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۱)

(۸۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! مخلوق کس چیز سے بنائی گئی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پانی سے[۱۴۰] میں نے پوچھا: جنت کی عمارت کیسی ہے؟ فرمایا: (اس عمارت میں) ایک اینٹ چاندی کی اور ایک اینٹ سونے کی ہے اور اس میں خوشبودار مشک کے گارے کی لپائی ہے' اس میں کنکریاں موتی اور یاقوت کی ہیں اور اس کی مٹی زعفران کی ہے[۱۴۱] جو جنت میں داخل ہوگا وہ عیش کرے گا' مایوس نہیں ہوگا۔[۱۴۲] اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا کبھی موت نہیں

---

۱۳۷ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ۶۰ گز طویل قد عطا فرمایا۔ یہاں پر گز سے مراد شرعی گز (ایک ہاتھ) ہے یعنی ڈیڑھ فٹ۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اسی قد کے ساتھ ہوئی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ جب آپ پیدا ہوئے تو چھوٹے تھے پھر آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے بلکہ ابتداءً ہی آپ کی قامت ۶۰ گز تھی۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۳۴۶' مراۃ المناجیح ج ۶ ص ۲۵۲)

اہل جنت بھی جنت میں اسی قامت پر ہوں گے یعنی سب کا قد ۶۰ گز بلند ہوگا۔

۱۳۸ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بعض دیگر روایات میں بہتر (۷۲) بیویوں کا تذکرہ آیا ہے اور اس روایت میں دو بیویوں کا تذکرہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دو بیویوں سے مراد دُنیا کی دو عورتیں ہیں' ورنہ ایک عام جنتی کو جنت میں بہتر بیویاں دی جائیں گی۔ جیسا کہ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ادنیٰ درجہ کے جنتی کے لیے بہتر بیویاں ہوں گی اور یہ دنیا کی بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۵۳۷' مشکوٰۃ ص ۴۹۹' مطبوعہ کراچی' عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۶۰۴)

۱۳۹ کھوکھلے موتی سے مراد ایسا موتی ہے جس کا اندرونی حصہ وسیع ہو یعنی کشادہ موتی۔

۱۴۰ قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ (الانبیاء: ۳۰) اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی۔

۱۴۱ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں: خیال رہے سونا پیلا ہوتا ہے اور چاندی سفید' جو دیوار ان اینٹوں سے بنے وہ کیسی خوشنما ہوگی۔ پھر زعفران پیلا ہوتا ہے اور مشک سیاہ' جو مٹی اس سے مخلوط ہو وہ کیسی حسین اور کیسی خوشبودار ہوگی۔ پھر موتی سفید چمکیلے ہوتے ہیں اور یاقوت رنگ برنگے' جو بجری ان سے مخلوط ہو وہ کیسی خوبصورت اور قیمتی ہوگی۔ پھر وہاں کے درخت گہرے رنگ کے سبز' ان رنگوں کے ملنے سے جو حسن پیدا ہوا ہے وہ بغیر دیکھے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ کر ہی سمجھیں گے اور سمجھائیں گے۔ خدا تعالیٰ اس قال کو حال کردے' آمین۔ (مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۴۷۹)

۱۴۲ کیونکہ اُسے ہر وہ چیز میسر ہوگی جس کی اُسے چاہت اور خواہش ہوگی اور یقیناً جس شخص کو اُس کی خواہش کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آئے گی، نہ اہل جنت کے لباس پرانے اور بوسیدہ ہوں گے، نہ ان کی جوانی کبھی ختم ہوگی۔ (سنن الترمذی: ٢٥٢٦)

☆ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

(٨٤) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو[١٤٣] درجات ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کے برابر فاصلہ ہے۔ ان تمام درجات میں سب سے بلند درجہ "فردوس" ہے، جس سے جنت کے چاروں دریا بہتے ہیں اور اسی درجہ کے اوپر عرش ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ سے مانگو تو اس سے فردوس مانگا کرو[١٤٤]۔

(سنن الترمذی: ٢٥٣١، مسند احمد ج ٥ ص ٣١٦۔ ٣٢١، ٣٢٢، مصنف ابن ابی شیبہ: ٣٤٠٦٥)

(٨٥) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں ایک بازار ہے جس میں ہر[١٤٥] جمعہ کو جنتی آیا کریں گے پھر شمال[١٤٦] سے ہوا چلے گی جو اُن کے چہروں اور کپڑوں کو بھر دے گی تو ان کا حسن و جمال مزید

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مطابق نعمتیں مل جائیں وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا، بلکہ وہ انتہائی خوش و خرم اور پر عیش زندگی گزارتا ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ (حٰمٓ السجدۃ: ٣١)

اور تمہارے لیے اُس (جنت) میں وہ (سب کچھ) ہوگا جو تمہارا جی چاہے گا اور جس کا تم مطالبہ کرو گے۔

١٤٣ علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے اس مقام پر لکھا ہے کہ سو (١٠٠) سے مراد کثرت ہے یعنی جنت میں بہت سارے درجات ہیں۔ (مرقات ج ٩ ص ٥٩٨)

١٤٤ حدیث کا یہ آخری حصہ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "فردوس" جنت کا اوسط (یعنی افضل) اور اعلیٰ درجہ ہے۔ (صحیح بخاری: ٢٧٩٠، ٧٤٢٣) علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ "فردوس" کے حوالہ سے مختلف اقوال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فردوس" جنت کا وہ باغ ہے جس میں تمام باغات کے درخت، کلیاں اور پودے جمع کر دیئے جائیں گے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اہل جنت جس جگہ سیر و تفریح کیا کریں گے اس مقام کا نام فردوس ہے اور ترمذی میں ہے کہ جنت کی اونچی جگہ کا نام فردوس ہے۔ (عمدۃ القاری ج ١٠ ص ٩٣) اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ فردوس ہی سے جنت کے چاروں دریا بہتے ہیں۔ ان چار دریاؤں سے پانی، دودھ، شہد اور شراب طہور کے دریا مراد ہیں۔ (جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:)

فِيهَآ أَنْهَٰرٌ مِّن مَّآءٍ غَيْرِ ءَاسِنٍ وَأَنْهَٰرٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُۥ وَأَنْهَٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ وَأَنْهَٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ (محمد: ١٥)

اُس (جنت) میں ایسے پانی کے دریا ہیں جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا اور ایسے دودھ کے دریا ہیں جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا اور ایسی شراب کے دریا ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہے اور ایسے شہد کے دریا ہیں جو صاف ستھرا ہے۔

(مرقات ج ٩ ص ٥٨٤)

١٤٥ یہاں یہ سوال ہے کہ جب جنت میں سورج اور دن و رات کا کوئی تصور ہی نہ ہوگا تو اہل جنت یہ کیسے پہچانیں گے کہ فلاں دن جمعہ کا ہے اور فلاں دن جمعہ کا نہیں ہے؟ اس کا جواب علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے یہ دیا ہے کہ جنت میں دن اور رات کی پہچان اس طرح ہوگی کہ جب اللہ تعالیٰ نور کے پردے ڈال دے گا تو وہ رات ہوگی اور جب ان پردوں کو اٹھالے گا تو وہ دن ہوگا۔ اسی طریقے پر اہل جنت جمعہ اور عید کے دنوں کو بھی پہچان لیں گے۔ (مرقات ج ٩ ص ٥٨٥)

١٤٦ یہاں شمالی ہوا کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمۃ اللہ قاضی عیاض (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بڑھ جائے گا۔ پھر وہ اپنے اہل کی طرف لوٹیں گے درآں حالیکہ ان کا حسن و جمال بھی بڑھ چکا ہوگا تو ان کے اہل اُن سے کہیں گے: ہمارے بعد تمہارا حسن و جمال زیادہ ہوگیا ہے۔ تو یہ لوگ (اپنے اہل سے) کہیں گے: اور خدا کی قسم! ہمارے بعد تمہارے حسن و جمال میں بھی اضافہ ہو چکا ہے[۱۴۷] (صحیح مسلم: ۲۸۳۳، الترغیب والترہیب: ۵۵۴۳، کنز العمال: ۳۹۳۳۶، شرح السنہ ج۱۵ص ۲۲۷)

(۸۶) حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں کا ایک مجمع ہوگا وہ اس میں ایسی بلند آوازوں سے کہہ رہی ہوں گی کہ ویسی آوازیں لوگوں نے نہ سُنی[۱۴۸] ہوں گی۔ وہ کہہ رہی ہوں گی: ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں ہم کبھی ختم نہ ہوں گی، ہم خوش حال ہیں مُحتاج اور غمگین نہ ہوں گی، ہم راضی رہنے والیاں ہیں ہم ناراض نہ ہوں گی۔ سعادت ہے اس شخص کے لیے جو ہمارے حصہ میں ہے اور جس کے حصہ میں ہم ہیں۔ (سنن الترمذی: ۲۵۶۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۳۹۶۰، شرح السنہ للبغوی ج۱۵ص ۲۲۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

(نوٹ: مذکورہ احادیث کے لیے دیکھئے: مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۹۷۔۴۹۶، مطبوعہ کراچی)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾

بے شک اللہ اس بات سے حیا نہیں فرماتا کہ (حق واضح کرنے کے لیے) کیسی ہی چیز کی مثال بیان فرمائے، خواہ وہ مچھر ہو یا اُس سے بڑھ کر کوئی اور چیز، جہاں تک مؤمنین کا معاملہ ہے سو وہ تو جانتے ہیں کہ یہ مثال ان کے رب کی طرف سے سچی ہے اور رہے کافر، سو وہ کہتے ہیں کہ ایسی مثال (بیان کرنے) سے اللہ کا کیا مقصد ہے؟ (کہہ دیجئے کہ) وہ اس سے بہت لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت لوگوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے صرف فاسقوں کو ہی گمراہی میں ڈالتا ہے O

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مالکی علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شمالی ہوا بارش لے کر آتی ہے، اسی لیے اہل عرب اس ہوا کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لیے حدیث شریف میں اس ہوا کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ (شرح مسلم للنووی ج۱ص ۳۷۹، مطبوعہ کراچی)

مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۂ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل عرب بلکہ تمام دنیا والے شمالی ہوا کو بہت مبارک سمجھتے ہیں، اسے مون سون کہتے ہیں یہ بارش لاتی ہے، اس لیے شمالی ہوا فرمایا۔ (مراۃ المناجیح ج۷ص ۴۷۲)

۱۴۷ یعنی تمہیں یہاں گھر بیٹھے ہی حسن و جمال میں اضافہ مل چکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت کے بازار میں صرف مرد حضرات جایا کریں گے، عورتیں گھروں پر رہا کریں گی تاکہ عورتوں مردوں کا اختلاط نہ ہو، اس سے ہمیں دنیاوی بازاروں میں آنے جانے کے آداب سیکھنے چاہئیں۔

۱۴۸ یعنی بہت ہی شیریں اور میٹھی آواز میں درج ذیل جملے کہہ رہی ہوں گی۔ وہ آواز اس قدر شیریں ہوگی کہ اس جیسی آواز لوگوں نے نہ سنی ہوگی۔ حدیث قدسی میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی کان نے سنیں، نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزرا۔ (صحیح بخاری: ۳۲۴۴، صحیح مسلم: ۲۸۲۴)

''ان اللہ لا یستحیی'' کا واقعۂ نزول

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے (قرآنی آیات میں) مکھی اور مکڑی کی مثالیں بیان فرمائیں اور شہد کی مکھی اور چیونٹیوں کا ذکر فرمایا تو یہودی کہنے لگے کہ ان حقیر چیزوں کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے؟

ایک قول کے مطابق مشرکین نے کہا کہ ہم ایسے خدا کی عبادت نہیں کریں گے جو ایسی چیزیں ذکر کرتا ہے اور ان کافروں اور یہودیوں نے یہ بات اس لیے کہی کیونکہ وہ نبی اکرم ﷺ کو تکلیف پہنچانے پر متفق تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

حیاء کا معنیٰ اور اللہ عزوجل کے حیاء فرمانے کا مفہوم

حیاء کا معنیٰ ہے:

تغیر وانکسار یعتری الانسان من خوف ما یعاب به ویذم علیه.

حیاء سے مراد وہ غیرت اور انکساری ہے جو انسان پر اس کے عیب دار ہونے اور قابل مذمت ہونے کے خوف سے طاری ہوتی ہے۔

بعض نے حیاء کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے:

هو انقباض النفس عن القبائح.

بُری باتوں اور بُرے کاموں کے ارتکاب سے نفس کا رُکے رہنا۔

یہ حیاء کا اصل معنیٰ ہے اور یہ انسان کے اوصاف میں سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے لیے حیاء کا لفظ بولا جائے گا تو اُس وقت اس کا معنیٰ ہوگا: ترک کرنا اور چھوڑنا۔ کیونکہ ہر فعل کا ایک آغاز ہوتا ہے اور ایک اختتام ہوتا ہے۔ حیاء کا آغاز یہ ہے کہ انسان پر بُرے کام کی نسبت کے خوف سے غیرت طاری ہو جائے اور اس کا اختتام یہ ہے کہ آدمی اُس بُرے کام کو ترک کر دے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے حق میں حیاء کا لفظ آئے گا تو اس سے اس فعل کا آغاز یعنی غیرت اور خوف مراد نہیں ہوگا' بلکہ اس سے اُس فعل کا اختتام یعنی کسی کام کو ترک کر دینا مراد[۱۴۹] ہوگا۔ لہٰذا اب ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا﴾ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کافروں اور یہودیوں کی باتوں کی وجہ سے (مچھر اور مکھی وغیرہ کی) مثال دینا ترک نہیں فرماتا ہے۔

﴿مَّا بَعُوْضَةً﴾ اس میں لفظ ''ما'' کے بارے میں بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ زائدہ ہے اور اس صورت میں آیت کا معنیٰ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے حیاء نہیں فرماتا کہ وہ کسی مچھر کی مثال بیان کرے۔ اور بعض علماء کے نزدیک یہ ''ما'' زائدہ کا نہیں ہے بلکہ ابہام اور نکرہ کے لیے ہے (یعنی یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قسم کی مثال بیان کرنے سے حیاء نہیں فرماتا ہے)۔

اور ''بعوضة'' سے مراد چھوٹے چھوٹے مچھر ہیں اور مچھر اللہ تعالیٰ کی جہت عجیب وغریب مخلوق ہے' کیونکہ یہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی ایک کھوکھلی سونڈ ہوتی ہے اور یہ اپنے چھوٹے ہونے کے باوجود ہاتھی' بھینس اور اونٹ کی کھال میں اپنی سونڈ داخل کر دیتا ہے اور اس کو اندر تک پہنچا دیتا ہے یہاں تک کہ اونٹ اس کے ڈنک سے مر جاتا ہے۔

﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ اس سے مکھی' مکڑی اور جو اِن دونوں سے جسم میں بڑا ہو وہ مراد ہے۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بتایا ہے

۱۴۹۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں نتائج اور انتہاء کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسے رحمٰن اور رحیم۔ (تفصیل کے لیے تفسیر بیضاوی میں بسم اللہ کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔)

کہ جو مچھر سے کمتر اور چھوٹا ہو۔ اور یہی قول آیتِ مذکورہ کے زیادہ قریب اور موافق ہے۔ کیونکہ اس آیت کا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی چھوٹی اور حقیر چیز کی مثال دینے سے بھی نہیں رُکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مچھر کے پَر سے دنیا کی مثال دی ہے۔[150] حالانکہ پَر مچھر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے اور خود اہلِ عرب (اپنی گفتگو وغیرہ میں) انتہائی حقیر چیزوں کے ساتھ مثالیں بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ (جب کسی شخص کی بہت مذمت اور تحقیر کرنی ہو تو) کہا جاتا ہے:

ھو احقر من ذرۃ واجمع من نملۃ واطیش من ذبابۃ وألح من ذبابۃ. فلاں شخص ریت کے ذرّہ سے بھی زیادہ حقیر ہے، چیونٹی سے زیادہ جمع کرنے والا ہے اور مکھی سے زیادہ طیش میں آنے والا اور مکھی سے زیادہ ہٹ دھرم ہے۔

اللہ عزوجل کی بیان کردہ مثالوں پر ایمان لانے والوں اور انکار کرنے والوں میں فرق

﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ یعنی جو لوگ سیدِ عالم محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لے آئے وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان مثالوں کا بیان کرنا اُن کے رب کی جانب سے حق یعنی سچ ہے اور ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مثالیں بیان کرنا عقلاً بھی اچھا کام ہے اور اہلِ عرب کے نزدیک بھی یہ پسندیدہ ہے۔

﴿ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ﴾ یعنی رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال کو بیان کر کے کیا ارادہ کیا ہے؟ (اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا:)

﴿ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ﴾ یعنی اس مثال سے اللہ تعالیٰ بہت سارے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا فرماتا ہے یعنی کافروں کو اور وہ اس طرح کہ کفار (اللہ عزوجل کی بیان کردہ) مثال کو جھٹلاتے ہیں اور یوں اپنی گمراہی میں مزید بڑھ جاتے ہیں۔ اور اس مثال سے اللہ تعالیٰ کئی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے یعنی اہلِ ایمان کو، جو کہ اس مثال کی تصدیق کرتے ہیں اور اُس کو حق جانتے ہیں۔

﴿ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴾ اور اللہ عزوجل اس مثال سے فاسقوں ہی کو گمراہی میں مبتلا فرماتا ہے۔ یہاں ''فاسقین'' سے مراد کفار ہیں۔ جب کہ ایک قول کے مطابق منافقین اور ایک قول کے مطابق یہودی مراد ہیں۔

اور ''فِسق'' کا معنیٰ ہے: ''الخروج عن طاعۃ اللہ وطاعۃ رسولہ'' (اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے نکل جانا)۔

پھر ان فاسقوں کی کیفیت اور ان کے طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

[150] جیسا کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اس میں سے کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ نہ پلاتا۔ (سنن الترمذی: ۲۳۲۰، سنن ابن ماجہ: ۴۱۱۰، المستدرک ج ۴ ص ۳۰۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۸۴۰۔ ج ۶ ص ۱۵۷، المعجم الصغیر ج ۲ ص ۱۳۳، مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۱، مطبوعہ کراچی) یعنی اگر دنیا کی قدر و منزلت مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو نہ دی جاتی، کیونکہ کفار اللہ کے دشمن ہیں اور دشمن کو پیاری چیز نہیں دی جاتی۔ آج جب کہ کافروں کو دُنیا ملی ہوئی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دُنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۳۴)

الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِؕ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

(فاسقین وہ ہیں) جو اللہ سے پکا عہد کرنے کے بعد اس کو توڑ دیتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے' اُس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں' یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں O

اس آیت میں فرمایا جارہا ہے کہ فاسقین وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں یعنی اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں' بعد اس کے کہ وہ اس عہد کو خوب پختہ اور مضبوط ومؤکد کر چکے ہیں۔

(اس آیت میں ''ینقضون'' اور ''عهد'' کے الفاظ ہیں) ''نقض'' کا اصل معنیٰ ہے: ''الفسخ وفک المرکب'' (توڑنا اور بٹی ہوئی رسی کو کھولنا) اور ﴿عَهْدَ﴾ کا اصل معنیٰ ہے: کسی چیز کی حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اُس پر نگاہ رکھنا۔ اس آیت میں عہد سے کون سا عہد مراد ہے' اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

فاسقین جس عہد کو توڑتے ہیں اس سے کون سا عہد مراد ہے؟

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے میثاق والے دن اِن سے لیا تھا کہ:

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ۛ. (الاعراف:۱۷۲)　کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اُن سب نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں یہودی علماء سے لیا تھا کہ وہ سیدِ عالم محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور اُن کی صفات کو (لوگوں کے سامنے) بیان کریں گے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ کفار اور منافقین ہیں جنہوں نے اُس عہد کو توڑا جس کو اللہ تعالیٰ نے اِس طرح محکم اور مضبوط فرمایا کہ اپنی توحید پر دلالت کرنے والی آیتوں کو اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ جن چیزوں کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے (یہ فاسقین) اُن چیزوں کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور گذشتہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کو کاٹتے ہیں' بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور یہ یہودی ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ یہاں ''ویقطعون'' سے قطعِ رحمی مراد ہے (یعنی یہ فاسقین رشتے توڑتے ہیں) جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ یہ فاسقین خود بھی گناہ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی سیدِ عالم محمد ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لانے سے روکتے ہیں۔

﴿اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ یہی فاسقین نقصان اور دھوکہ میں ہیں۔ خسارہ کا اصل معنیٰ ہے: نقصان اور کمی۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے متعجبانہ مگر انتہائی سرزنش اور سختی سے پُر لہجہ میں عرب کے مشرکین سے ارشاد فرمایا:

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

کس طرح تم اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے' اس نے تمہیں وجود بخشا' وہ پھر تمہیں موت دے گا (اور) پھر تمہیں زندہ کرے گا' پھر اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے O

یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر دلائل کے قائم کیے جانے اور ان کو بیان کیے جانے کے بعد تم کس طرح اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہو؟

﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا ﴾ سے اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کے دلائل کا ذکر فرما رہا ہے کہ تم مُردہ تھے یعنی اپنے باپ کی پُشتوں میں نطفہ کی شکل میں تھے' تو اُس نے تمہیں زندہ کیا یعنی ماں کے پیٹ میں اور دُنیا میں۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا یعنی جب تمہاری عمریں پوری ہوں گی۔ پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا یعنی مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی آخرت میں اور وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

(اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے فائدے کے لیے وہ تمام چیزیں بنائیں جو زمین میں ہیں' پھر وہ اوپر کی جانب متوجہ ہوا تو اُنہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنا دیا' اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہےO

اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں جو زمین میں ہیں۔ یعنی معدنیات' پودے' جانور' پہاڑ اور سمندر۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ اس نے تمہارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا فرمائی ہیں جو زمین میں ہیں تا کہ تم اُن چیزوں سے دین اور دُنیا کے کاموں میں فائدہ حاصل کرو۔ دین کے کاموں سے مراد یہ ہے کہ (مختلف چیزوں سے) عبرت حاصل کی جائے اور (مختلف) مخلوقات جو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی دلیل ہیں' اُن کے عجائب میں غور و فکر کیا جائے۔ اور دُنیا کے مصالح سے مراد یہ ہے کہ مختلف مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں رکھی ہیں اُن سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے آسمان کی طرف استواء فرمانے کے معنیٰ میں مختلف اقوال

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ ﴾ یعنی (زمین کی تمام چیزیں پیدا فرمانے کے بعد) اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنانے کا ارادہ کیا اور اس کی طرف توجہ فرمائی۔ بعض نے ''استوٰی'' کا معنیٰ کیا ہے ''عمد'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا)۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کا معنیٰ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بُلند ہوا۔ اور ایک روایت کے مطابق آپ نے اس کا معنیٰ ''چڑھنا'' بتایا ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ اس آیت کے معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم (آسمان کی طرف) بُلند ہوا۔ یہی صاحبِ محکم نے بھی ذکر کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو پیدا فرمایا پھر آسمان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا۔

پہلے زمین کو پیدا کیا گیا یا آسمان کو؟

اگر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا ہے' جب کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (النازعات:۳۰) اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیاO

اس آیت میں اور زیرِ بحث آیت میں تطبیق کیسے ہوگی؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''دَحْو'' کا معنیٰ ہوتا ہے: بچھانا' پھیلانا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کا جسم پہلے پیدا فرما دیا ہو اور اس کو پھیلایا نہ ہو اور پھر آسمان کو بنایا ہو اور آسمان کو

بنانے کے بعد زمین کے جسم کو پھیلا دیا ہو۔

پھر اگر یہ اعتراض ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں جو فرمایا: ''خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (اُس نے تمہارے لیے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا فرمایا)۔ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ زمین کو پہلے ہی بچھا دیا گیا ہو اور اس کی جو دیگر چیزیں ہیں اُنہیں اس کے بعد پیدا کیا گیا ہو (لہٰذا آپ کا اوپر یہ کہنا کہ ممکن ہے کہ زمین کو بعد میں بچھایا گیا ہو' صحیح نہیں ہے)۔

اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' میں ترتیب بتانا مقصود نہیں ہے' بلکہ یہ تو نعمتیں گنوانے کا ایک طریقہ اور انداز ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی کو اپنی مہربانیاں گناتے ہوئے یہ کہے کہ کیا میں نے تمہیں نوازا نہیں ہے؟ کیا میں نے تمہاری قدر و منزلت کو نہیں بڑھایا؟ کیا میں نے تم سے (فلاں مصیبت کو) دُور نہیں کیا (تو معلوم ہوا کہ مختلف چیزوں میں ترتیب کا لحاظ ضروری نہیں ہے)۔ لہٰذا ممکن ہے کہ بعض نعمتیں بعض سے پہلے ہوں۔ واللہ اعلم

﴿فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے (آسمان بنانے کا ارادہ فرمانے کے بعد) سات آسمانوں کو پیدا فرمایا اور وہ ایسے ہیں کہ سب کے سب برابر ہیں' اُن میں کوئی شگاف اور پھٹن نہیں ہے۔

زمین کی پیدائش کیسے ہوئی؟ اس کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت: ۹ (قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ) کے تحت آئے گا۔

زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا کہ وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ یعنی جس طرح وہ کلیات کو جانتا ہے اسی طرح جزئیات کو بھی جانتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: بے شک میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں' فرشتے بولے: کیا تو زمین میں اس شخص کو نائب بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا' جبکہ ہم تجھ کو سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور خوبیاں بیان کرتے ہیں' فرمایا: بے شک میں اُن (حقیقتوں) کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے O

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اے محمد (ﷺ)! آپ یاد کیجئے وہ وقت جب آپ کے رب نے ملائکہ سے فرمایا''۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں اس طرح کا جُملہ آیا ہے وہاں یہی معنیٰ کیا جائے گا (کہ اے محمد ﷺ آپ یاد کیجئے وہ وقت) بعض علماء نے ''اذ'' کو زائدہ قرار دیا ہے (لیکن) پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

اس آیت میں ﴿ملائکۃ﴾ کا لفظ ہے جو کہ ''مَلَک'' کی جمع ہے۔ اور ''مَلَک'' اصل میں ''مَأْلَک'' تھا جو کہ امام بغوی کے الفاظ کے مطابق ''مَأْلَکۃ'' اور ''اَلُوْکَۃ'' سے مشتق ہے۔ اور اس کا (اصل) معنیٰ ہے: پہنچانا اور یہاں ''ملائکہ'' سے مراد وہ فرشتے ہیں جو زمین پر ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین میں خلیفہ بنانے کا واقعہ

واقعہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور فرشتوں اور جنات کو پیدا فرمایا' فرشتوں کو آسمان میں اور جنات کو زمین پر ٹھہرایا۔ جنات ایک عرصۂ دراز تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے' پھر ان میں حسد اور بغاوت نے جنم لے لیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے فساد برپا کیا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن جنات کی طرف فرشتوں کا ایک گروہ بھیجا' ان کو ''جان'' کہا جاتا تھا اور ان کا سردار ''ابلیس'' تھا اور یہ تمام فرشتے جنتوں کے خزانچی تھے۔ ان کو زمین پر اتارا گیا اور انہوں نے جنات کو سمندروں کے جزیروں اور پہاڑ کی گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیا۔ پھر وہ فرشتے زمین پر ٹھہرے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے عبادات میں تخفیف اور اس میں کمی فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو زمین اور آسمانِ دُنیا کا سردار بنایا اور جنت کا خازن بنایا۔ ابلیس تمام فرشتوں کا سردار' اُن کا رہنما اور اُن میں سب سے زیادہ علم والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ زمین میں اللہ کی عبادت کرتا' کبھی آسمان میں اور کبھی جنت میں' جس کی وجہ سے اُس کے دل میں خود پسندی اور تکبر آ گیا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ بادشاہت صرف اور صرف اس وجہ سے دی ہے کہ میں تمام ملائکہ میں سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہوں۔ سو اللہ تبارک و تعالیٰ نے شیطان اور اس کے لشکر سے فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ یعنی میں تمہارے بدلہ میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اور اس کو اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں (جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا) تو اُن فرشتوں کو یہ ناگوار گزرا۔ کیونکہ اُن کی عبادت دیگر فرشتوں کے مقابلہ میں کم تھی۔

حضرت آدم علیہ السلام کو ''خلیفة'' فرمانے کی وجوہ

یہاں ''خلیفه'' سے مراد حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی ذات ہے' کیونکہ آپ جنات کے بعد پیدا کیے گئے۔ بعض نے کہا کہ چونکہ آپ کے نائب دوسرے لوگ ہوں گے (اس لیے آپ کو خلیفہ فرمایا گیا) اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ آپ کو خلیفہ اس لیے فرمایا گیا کہ آپ زمین میں اللہ عزوجل کی حدود کو قائم کرنے اور اس کے احکامات کو نافذ کرنے میں اس کے خلیفہ ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ فرشتوں نے عرض کیا: (مولیٰ) کیا تو اُس کو (اپنا خلیفہ) بنا رہا ہے جو زمین میں فساد پھیلائے گا یعنی گناہ کرے گا اور خون بہائے گا۔ یعنی ناحق اور ناجائز طور پر' جیسا کہ جنات نے کیا۔

اس اعتراض کا جواب کہ فرشتوں نے کیسے کہہ دیا کہ انسان زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا؟

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ فرشتوں کو کیسے معلوم ہوا (کہ انسان زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا؟) تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ اللہ عزوجل کے بتانے سے جان لیا ہو یا انہوں نے شاہد (یعنی جنات کی حالت دیکھ کر) غائب کو اُس پر قیاس کیا ہو۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب فرشتوں نے دیکھا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو مختلف چیزیں ملا کر پیدا کیا گیا ہے تو انہوں نے جان لیا کہ انسان میں کینہ اور غصہ ہوگا اور یہی فساد اور خون بہانے کا باعث ہے۔ اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مذکورہ بات کہی۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا فرمایا تو فرشتے ڈرے اور انہوں نے (بارگاہِ خداوندی میں) عرض کیا کہ (الٰہ العٰلمین!) کس کے لیے تو نے یہ آگ پیدا فرمائی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُس کے لیے جو میری نافرمانی کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'' تو (فوراً) فرشتوں نے کہہ دیا کہ تو اُس کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزی کرے گا؟

اس اعتراض کا جواب کہ فرشتے تو معصوم ہیں، پھر انہوں نے خلیفہ بنانے پر اعتراض کیوں کیا؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ فرشتے تو معصوم ہیں، پھر اُن سے (خلیفہ بنانے پر) اعتراض کیسے صادر ہو گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ بعض علماء فرشتوں کے معصوم ہونے کے قائل نہیں ہیں اور انہوں نے اپنے مؤقف پر جہاں اور دلائل دیئے ہیں وہاں ایک دلیل اِسی آیت سے دی ہے (جو ہماری زیرِ بحث ہے) کہ انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں کہہ دیا کہ کیا تو اُس کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزی کرے گا۔

اور جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں، انہوں نے جواب یہ دیا ہے کہ فرشتوں نے جو عرض کیا کہ ''تو ایسے کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا؟'' یہ بطورِ تعجب تھا، نہ کہ بطورِ انکار اور اعتراض۔ فرشتوں کو (در حقیقت) تعجب اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے کمال پر اور اس بات پر ہوا کہ جو چیزیں اُن سے پوشیدہ ہیں، اللہ عزوجل کا علم اُنہیں بھی محیط ہے۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا کہ: ''انی اعلم مالا تعلمون'' بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

بعض علماء نے زیرِ بحث سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ جو غلام اپنے آقا سے سچی محبت رکھتا ہے وہ اس بات کو (کبھی) پسند نہیں کرے گا کہ میرے آقا کا اور بھی کوئی غلام ہو اور وہ آقا کی نافرمانی کرے۔ یوں گویا فرشتوں نے اللہ عزوجل کی بے پناہ تعظیم کی وجہ سے یہ عرض کیا تھا کہ تو ایسے کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزی کرے گا۔

تسبیح کے معنیٰ کی تحقیق اور تقدیس کا اصل معنیٰ

(فرشتوں نے مزید عرض کیا:) ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ لَكَ بِحَمْدِكَ﴾ ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں۔ یعنی ہم ''سُبحان الله وبحمدہٖ'' کہتے ہیں۔ اور یہ مخلوق کی نماز ہے جس پر اُنہیں رزق دیا جاتا ہے۔

(۸۷) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسی بات سب سے افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (وہ بات سب سے افضل ہے) جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں یا اپنے بندوں کے لیے منتخب فرمائی ہے یعنی ''سبحان الله وبحمدہٖ''[۱۵۱]۔ (صحیح مسلم: ۲۷۳۱، سنن الترمذی: ۳۵۹۳، مسند احمد ج ۵ ص ۱۴۸)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن میں جہاں کہیں تسبیح کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے ''صلاۃ'' یعنی نماز مراد ہے۔ لہٰذا فرشتوں کے قول ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ﴾ کا معنیٰ ہوگا کہ ہم تیرے لیے نماز ادا کرتے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ تسبیح کا اصل معنیٰ ہے: ''تنزیہ الله عمالا یلیق بجلاله.'' یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے جلال اور اُس کی عظمت کی وجہ سے ہر اُس چیز سے پاک قرار دینا جو اُس کی شان کے لائق نہ ہو۔ اس صورت میں فرشتوں کے قول کا معنیٰ ہوگا کہ ہم تجھے ہر برائی اور خامی سے پاک قرار دیتے ہیں۔

(فرشتوں کے اس جملہ میں) ﴿بِحَمْدِكَ﴾ کا جو لفظ ہے اُس کا معنیٰ ہے: تیری حمد کرتے ہوئے یا تیری حمد کے ساتھ متلبس ہو کر (یعنی اس کو ساتھ ملا کر) ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم پر تیری توفیق کا انعام نہ ہوتا تو ہم تیری پاکیزگی

---

[۱۵۱] اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں کے کلام میں سب سے افضل کلام ''سبحان الله وبحمدہٖ'' ہے۔ ورنہ حقیقی فضیلت جو حاصل ہے وہ اللہ عزوجل کے کلام اور اس کی تلاوت کو ہے۔ (شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۳۵۱، مطبوعہ کراچی) اس حدیث میں جو فرمایا کہ ''سب سے افضل کلام وہ ہے جو اللہ نے اپنے فرشتوں یا اپنے بندوں کے لیے منتخب فرما لیا ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ جو اوراد و وظائف بزرگانِ دین سے منقول ہیں اُن کا پڑھنا دیگر وظائف کی بہ نسبت زیادہ افضل اور بہتر ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۳ ص ۳۶۹)

بیان نہ کر سکتے۔

(پھر فرشتوں نے عرض کیا:) ﴿ وَنُقَدِّسُ لَكَ ﴾ اور ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ تقدیس کا اصل معنیٰ ہے: کسی کو پاک اور صاف قرار دینا۔ اب (فرشتوں کے اس جملہ کا) معنیٰ یہ ہے کہ ہم تجھے تمام عیوب اور ہر بُرائی سے پاک صاف قرار دیتے ہیں اور تیرے لیے وہ چیزیں بیان کرتے ہیں جو تیری عزت اور جلال یعنی بلندی اور عظمت کے لائق ہیں۔

بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ ہم تیری اطاعت اور عبادت کے لیے اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مختلف معانی کہ ''میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں نے جو کہا تھا کہ ''کیا تو زمین میں اُس کو خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا'' اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (یعنی) میں اس کی وہ مصلحتیں اور حکمتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ان میں کون میرا عبادت گزار ہوگا اور میری اطاعت و فرمانبرداری کرے گا اور کون میرا نافرمان ہوگا۔ اطاعت کرنے والے انبیاء' اولیاء اور صالحین ہیں اور نافرمانی کرنے والا ابلیس ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ گناہ کریں گے اور مجھ سے مغفرت طلب کریں گے' سو میں اُن کی مغفرت کر دوں گا۔

فرشتوں کی حقیقت کا بیان

بعض علماء نے کہا ہے کہ فرشتے لطیف اور ہوائی (نہ دکھائی دینے والے) اجسام سے متصف ہوتے ہیں' ان کو نور سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مختلف شکلیں اپنا سکتے ہیں' ان کا ٹھکانا (مختلف) آسمان ہیں۔ (اس سلسلے میں حدیث ملاحظہ فرمایئے:)

(۸۸) حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے[۱۵۲]۔ آسمان چرچراتا ہے اور اُسے حق ہے کہ وہ چرچرائے (کیونکہ) اُس میں چار انگلیوں جتنی جگہ بھی ایسی نہیں ہے کہ وہاں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی کو رکھ کر اللہ عزوجل کو سجدہ نہ کر رہا ہو[۱۵۳]۔

(سنن الترمذی: ۲۳۱۲' سنن ابن ماجہ: ۴۱۹۰' مسند احمد ج ۵ ص ۱۷۳' مستدرک ج ۴ ص ۵۱۰)

---

۱۵۲ اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے اور سننے کی جو طاقت عطا فرمائی ہے وہ تمام لوگوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ آپ کے دیکھنے کی قوت یہ ہے کہ آپ نے سَر کی آنکھوں سے اپنے رب عزوجل کا دیدار فرمایا' زمین و آسمان کی تمام چیزیں آپ کی نگاہوں کے سامنے کر دی گئیں' لوگوں کا ظاہر اور باطن یکساں ملاحظہ فرماتے ہیں۔ ایک موقع پر صحابہ سے فرمایا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری توجہ صرف آگے کی طرف ہوتی ہے؟ خدا کی قسم! مجھ پر نہ تو تمہارا رکوع پوشیدہ ہوتا ہے نہ ہی تمہارا خشوع (باطنی کیفیت) اور بلاشبہ میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے بھی دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ (صحیح بخاری: ۴۱۸۔۷۴۱' صحیح مسلم: ۴۲۴) اسی طرح آپ ﷺ کے سننے کی قوت بھی بہت منفرد اور بے مثال ہے۔ شب معراج آپ نے بلاواسطہ رب عزوجل کا کلام سُنا' زمین پر بیٹھ کر آسمان کے چرچرانے کی آواز کو سماعت فرمایا اور مدینہ طیبہ میں بیٹھ کر مکہ سے پکارنے والے ایک فریادی کی فریاد کو سماعت فرمایا۔

۱۵۳ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتے جو سجدہ کرنے والے ہیں اُن کی تعداد دیگر فرشتوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا بیان[۱۵۴]

حضرت وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو زمین کی طرف وحی فرمائی کہ میں تجھ سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جس میں میرے فرمانبردار بھی ہوں گے اور میرے نافرمان بھی۔ جو میرے فرمانبردار ہوں گے اُنہیں میں جنت میں داخل کروں گا اور جو میرے نافرمان ہوں گے اُنہیں میں دوزخ میں ڈال دوں گا۔ زمین نے کہا: (باری تعالیٰ!) کیا مجھ سے تو ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو دوزخ میں جائے گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ تو زمین رونے لگی اور اس سے ایسے چشمے پھوٹ پڑے جو قیامت تک جاری رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو زمین کی طرف بھیجا تا کہ وہ اُس میں سے سُرخ' کالی' پاکیزہ اور ناپاک مٹی ایک ایک مُشت لے آئیں۔ جب جبریل مٹی لینے کے لیے زمین پر آئے تو زمین نے کہا:

اعوذ بعزۃ اللہ الذی ارسلک الی ان لا تاخذ منی شیئا. جس خدا نے تجھے میری طرف بھیجا ہے اُس کی عزت کی میں پناہ مانگتی ہوں تا کہ تو مجھ سے کچھ نہ لے۔

جب زمین نے یہ جملہ کہا تو جبریل امین واپس چلے گئے اور عرض کیا: پروردگار! زمین نے مجھ سے تیری پناہ مانگ لی ہے' سو میں اس کے پاس جانا پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے میکائیل سے فرمایا کہ تم جاؤ اور اُس سے ایک مشت خاک لے آؤ۔ جب وہ زمین کے پاس آئے تو اس نے پھر وہی جملہ کہا جو جبریل امین سے کہا تھا۔ یوں میکائیل بھی اللہ عزوجل کی طرف واپس لوٹ گئے اور زمین نے جو کچھ اُن سے کہا تھا وہ اُنہوں نے رب کی بارگاہ میں عرض کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عزرائیل کو حکم فرمایا کہ تم جاؤ اور زمین سے ایک مُشت خاک لے آؤ۔ جب وہ زمین کے پاس آئے تو زمین نے کہا کہ جس خدا نے تمہیں میری طرف بھیجا ہے اُس کی عزت کی میں پناہ مانگتی ہوں تا کہ تم مجھ سے کچھ نہ لو۔ تو (جواباً) حضرت عزرائیل نے کہا:

وانا اعوذ بعزتہ ان اعصی لہ أمرا. اور میں اُس کی عزت کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں اس کے کسی حکم کی نافرمانی کروں۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے زمین کے نمکین' شیریں' کڑوے' پاک اور ناپاک تمام مقامات سے ایک ایک مُشت خاک لے لی اور اُسے آسمان پر لے گئے۔ حضرت عزرائیل نے یہ جو کچھ کیا اللہ عزوجل اُسے خوب جانتا ہے' اس کے باوجود اس نے اس بارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کیونکہ کئی فرشتے رکوع میں ہیں اور کئی فرشتے قیام میں ہیں۔ یا پھر فرشتوں کے سجدے میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ تمام فرشتے اللہ عزوجل کے بے حد اطاعت گزار اور فرمانبردار ہیں۔ (مرقات ج۹ ص ۲۰۷' مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۱۳۸)

۱۵۴ ذیل میں علامہ خازن نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے وہ تمام جزئیات اور تفصیل کے ساتھ حدیث سے ثابت نہیں ہے بلکہ وھب بن منبہ کی ایک روایت ہے اور وہب بن منبہ کے روایت کردہ قصے عموماً اسرائیلیات سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ ہمارے نزدیک حجت نہیں ہیں۔ اسرائیلیات سے مراد وہ واقعات اور قصے ہیں جو اہل کتاب سے منقول ہیں۔ ان میں بعض وہ ہیں جن کی قرآن مجید تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ یہ واقعات درست ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کی قرآن مجید تردید کرتا ہے اور اُن کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ واقعات غلط اور بے بنیاد ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی قرآن مجید نہ تائید کرتا ہے نہ تردید۔ ایسے واقعات کو بیان کرنا درست ہے لیکن ان میں عموماً دین کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ زیر بحث واقعہ کا تعلق اسی تیسری قسم سے ہے۔ علامہ خازن نے اس طرح کے واقعات مختلف عنوانات کے تحت کئی مقامات پر بیان کیے ہیں۔

میں پوچھا تو عزرائیل نے وہ بات بھی بیان کی جو زمین نے اُن سے کہی تھی اور وہ بات بھی بیان کی جو اُنہوں نے جواباً زمین سے کہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وعزتی وجلالی لاخلقن مما جئت به خلقا و لاسلطنک علی قبض ارواحهم لقلة رحمتک.

مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! جو کچھ تم لے کر آئے ہو اُس سے میں ضرور ایک مخلوق پیدا کروں گا اور تمہیں اُس مخلوق کی جانوں کو قبض کرنے پر مقرر کروں گا کیونکہ تمہارے اندر نرمی کا مادّہ کم ہے۔

پھر اُس مشت کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں اور دوسرا نصف دوزخ میں رکھ دیا اور جب تک چاہا اُسے رہنے دیا' پھر اُس کو نکالا اور اُسے لیس دار مٹی بنا دیا اور کچھ عرصہ بعد اُسے بُو والا گارا اور کچھ عرصہ بعد بجتی ہوئی خشک مٹی بنا دیا۔ پھر اُسے ایک جسم کی شکل دے کر جنت کے دروازے پر رکھ دیا۔ فرشتے اس جسم کی بناوٹ کو دیکھ کر حیرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے اس جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ شیطان بھی وہاں سے گزرتا تھا اور کہتا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے جو اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ پھر اس نے غور سے اس جسم کو دیکھا تو اُسے خالی پایا۔ پھر کہا کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے والی نہیں ہوگی۔ پھر ایک دن اس نے فرشتوں سے کہا کہ اگر اس جسم کو تم پر فضیلت دی گئی تو تم کیا کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنے رب کا کہا مانیں گے' اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ (یہ سن کر) ابلیس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اس کو مجھ پر فضیلت دی گئی تو میں ضرور نافرمانی کروں گا اور اگر مجھے اس جسم پر فضیلت دی گئی تو میں اس کو ہلاک کر دوں گا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس جسم میں روح پھونکنے کا ارادہ فرمایا تو روح کو حکم فرمایا کہ وہ آدم کے جسم میں داخل ہو جائے۔ یہ حکم سن کر رُوح نے جسم کو غور سے دیکھا تو اس میں ایک تنگ راستہ پایا۔ اللہ عزوجل سے عرض کیا: پروردگار! میں کیسے اس جسم میں داخل ہوں؟ ارشاد فرمایا کہ زبردستی اس جسم میں داخل ہو جاؤ اور تمہیں زبردستی ہی اس جسم سے نکالا جائے گا۔ چنانچہ روح اس جسم کے تالو میں داخل ہوئی اور آنکھوں تک پہنچ گئی اور یوں سارے جسم پر مٹی نظر آنے لگی۔ پھر جب روح اس جسم کے ناک میں پہنچی تو اس جسم نے ایک چھینک کھائی اور جب روح زبان میں پہنچی تو زبان نے کہا: ''**الحمد لله رب العالمين**'' (تمام تعریفیں اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) اور یہ پہلا کلمہ تھا جو اس جسم نے ادا کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جسم کو پکار کر فرمایا: اے ابومحمد! تجھ پر تیرا رب رحم کرے' اسی لیے میں نے تجھے پیدا کیا ہے۔ پھر جب روح گھٹنوں تک پہنچی تو اس جسم نے کھڑے ہونے کا ارادہ کیا لیکن کھڑا نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۔ (الانبیاء:۳۷) آدمی جلد باز بنایا گیا ہے۔

پھر جب روح پنڈلیوں اور قدموں میں پہنچی تو وہ جسم گوشت' خون' ہڈیوں' رگوں' پٹھوں اور پیٹ کی تمام چیزوں کے ساتھ ایک تندرست آدمی بن کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر اُسے ناخن پہنائے گئے اور ہر روز جسم کے حسن و جمال میں اضافہ ہونے لگا۔ اس جسم میں اللہ تعالیٰ نے نو دروازے بنائے' سات دروازے سر میں یعنی سننے کے لیے دو کان' دیکھنے کے لیے دو آنکھیں' سونگھنے کے لیے دو نتھنے' اور ایک ایسا منہ جس میں بولنے کے لیے زبان اور کھانے کی چیزوں کو پینے اور ان کی لذت کو پانے کے لیے دانت بنائے۔ اور دو دروازے جسم کے نیچے بنائے' ان میں سے ایک آگے اور ایک پیچھے تاکہ ان سے فاضل غذا خارج ہو جائے۔ اور اس جسم میں دماغ کے اندر عقل کو' دل کے اندر غور وفکر کو' گردے میں لالچ کو' جگر میں غصہ کو' پھیپھڑوں میں خواہش کو' تلی میں ہنسنے کو اور چہرے میں غمی خوشی کو پیدا فرمایا۔

پاک ہے وہ ذات جس نے ایسا جسم بنایا جو ہڈی سے سنتا ہے' چربی سے دیکھتا ہے' گوشت سے بولتا ہے اور خون سے پہچانتا ہے اور اس جسم میں شہوت کو سوار کیا اور شرم و حیاء کے پردے سے اُسے ڈھانپ دیا۔

احادیث کی روشنی میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا بیان

(۸۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا اس حال میں کہ ان کا طول ۶۰ گز تھا[155]' پھر ان سے فرمایا: جاؤ اور اُن فرشتوں کو سلام کرو اور تم غور سے سننا جو وہ تمہیں جواب دیں' وہی جواب تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ حضرت آدم نے جا کر کہا: السلام علیکم۔ تو فرشتوں نے جواباً کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ[156]۔ یعنی فرشتوں نے ورحمۃ اللہ کا اضافہ کیا (پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:) ہر شخص جو جنت میں جائے گا وہ حضرت آدم کی صورت پر ہوگا' پھر لوگ (قامت کے اعتبار سے) مسلسل گھٹتے رہے حتیٰ کہ یہ زمانہ آ گیا۔

(صحیح بخاری: ۳۳۲۶' صحیح مسلم: ۲۸۴۱' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۹۷)

(۹۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت آدم کی صورت بنائی اور انہیں جب تک چاہا اسی حالت پر رہنے دیا۔ تو شیطان حضرت آدم کے گرد گھومنے لگا اور دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہے؟ جب اس نے ان کے جسم کو خالی پایا تو وہ جان گیا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو اپنے آپ پر قابو رکھنے والی نہیں ہے[157]۔ (صحیح مسلم: ۲۶۱۱' مسند احمد ج ۳ ص ۱۵۲' مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۰۶' مطبوعہ کراچی)

(۹۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اُس مشتِ خاک سے پیدا فرمایا جو اس نے زمین کے تمام حصوں سے لی تھی۔ پھر زمین کے مطابق آدم کی اولاد آئی' یعنی اُن میں

---

155 اس کی تشریح حاشیہ: ۱۳۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

156 سلام کے جواب میں سنت طریقہ یہ ہے کہ وعلیکم السلام کہا جائے۔ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے جواب میں جو کہا: (''السلام علیک ورحمة الله'') اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی سلام کرنے والے کے جواب میں ''السلام علیکم'' ہی کے الفاظ دوہرا دینا بھی جائز ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سلام کے جواب میں ''ورحمة الله'' کا اضافہ کرنا چاہیے۔ قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا۔ اور جب تمہیں کسی لفظ سے سلام کیا جائے تو جواب میں اُس سے بہتر الفاظ کہو یا (کم از کم) وہی لوٹا دیا کرو۔ (النساء: ۸۶)

157 یہاں پر خاص حضرت آدم علیہ السلام مراد نہیں ہیں' بلکہ تمام انسان مراد ہیں۔ یعنی کسی انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں ہوگا۔ صاحبِ مفہم علامہ ابوالعباس قرطبی متوفی ۶۵۶ھ اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکے گا اور اپنی خواہشات نفسانی بھی پوری کرنے سے اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکے گا اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔ (المفہم ج ۶ ص ۵۹۷) امام نووی نے اس جملہ کی شرح میں تین اقوال ذکر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی خواہشات کو پورا کرنے سے اپنے نفس کو نہیں روک سکے گا۔ دوسرا یہ کہ آدمی وسوسوں کو اپنے آپ سے دور نہیں کر سکے گا اور تیسرا یہ کہ آدمی غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو نہیں کر سکے گا۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۲۷' مطبوعہ کراچی)

کچھ سُرخ، کچھ سفید، کچھ کالے، کچھ درمیانے، کچھ نرم مزاج، کچھ سخت مزاج، کچھ گندے اور کچھ پاک ہیں۔[۱۵۸]

(سنن الترمذی: ۲۹۵۵، سنن ابوداؤد: ۴۶۹۳، مسند احمد ج ۴ ص ۴۰۶)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

اور اللہ نے آدم کو تمام (چیزوں) کے نام سکھا دیئے، پھر اُنہیں فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا: ذرا ان چیزوں کے نام تو مجھے بتاؤ اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو O

حضرت آدم کے نام کی وجہ تسمیہ اور ان کو تمام چیزوں کے نام سکھانے کی تفسیر

حضرت آدم کا نام آدم اس لیے رکھا گیا کہ آپ ''اُدیم الارض'' یعنی سطح زمین کے حصہ سے پیدا کیے گئے۔ بعض نے وجہ یہ بتائی ہے کہ (آدم کا معنیٰ ہے: گندمی رنگت والا، چونکہ) آپ کا رنگ گندمی تھا اس لیے آپ کو آدم فرمایا گیا۔ آپ کی کنیت ابومحمد اور بعض کے نزدیک ابوالبشر ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا فرمایا اور ان کی تخلیق مکمل ہوگئی تو اُنہیں تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں نے (آپس میں) کہا کہ ہمارا رب عزوجل جو چاہتا ہے ضرور پیدا کرتا ہے لیکن وہ ہم سے زیادہ علمی مرتبہ والا کسی کو پیدا نہیں فرمائے گا۔ اور اگر پیدا کرے گا تب بھی ہم ہی زیادہ علم والے ہوں گے۔ کیونکہ ہم (بہر حال) اس پیدا ہونے والے سے پہلے پیدا کیے گئے ہیں اور ہم نے وہ کچھ دیکھا ہے جو اس نے نہیں دیکھا ہوگا۔ سو (فرشتوں کی اس بات کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے اُن پر سیدنا آدم علیہ السلام کی فضیلت کو علم کے ذریعہ ظاہر فرمایا۔

اس آیت میں اہل سنت کے اس مؤقف پر دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام تمام فرشتوں سے افضل ہیں خواہ وہ رُسلِ ملائکہ ہی کیوں نہ ہوں۔[۱۵۹]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز حتیٰ کہ پیالہ اور پلیٹ تک کا نام سکھا دیا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام حیوانات اور جمادات وغیرہ کے نام سکھا دیئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام یوں سکھائے کہ اے آدم! یہ اونٹ ہے، یہ گھوڑا ہے اور یہ بکری ہے، اس طرح آخر تک تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام فرشتوں کے نام سکھا دیئے۔ بعض نے کہا کہ ان کی اولاد کے نام اُنہیں سکھا دیئے اور بعض نے کہا کہ اُنہیں تمام زبانیں سکھا دیں۔

---

۱۵۸ اس حدیث سے اور گزشتہ حدیث سے ایک حد تک اُس واقعہ کی تائید ضرور ہوتی ہے جو گزشتہ صفحات میں علامہ خازن وہب بن منبہ کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں۔ اُس میں یہ ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کو دیکھا تو اُسے خالی پایا، پھر اُس نے کہا کہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے والی نہیں ہوگی۔ اس سے کچھ سطور اُوپر ہے کہ حضرت عزرائیل نے زمین کے میٹھے، نمکین، شیریں، کڑوے، پاک اور ناپاک تمام مقامات سے ایک ایک مُشت خاک لی اور اُسے آسمان پر لے گئے۔

۱۵۹ شرح عقائد میں ہے: رسل البشر افضل من رسل الملائكة. یعنی انبیاء کرام علیہم السلام رسلِ ملائکہ سے افضل ہیں۔ رُسلِ ملائکہ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے وحی لیتے ہیں اور اس کو تمام فرشتوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جیسے حضرت جبرئیل اور میکائیل وغیرہما۔ (شرح عقائد مع نبراس ص ۵۹۵)

﴿ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی جن چیزوں کے نام اللہ عزوجل نے حضرت آدم کو سکھائے تھے اُن چیزوں کو فرشتوں پر پیش کیا اور اُنہیں عاجز کرنے کے لیے فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اس بات میں کہ میں نے جو مخلوق بھی بنائی ہے اس میں تم سب سے زیادہ فضیلت اور علم والے ہو۔

یہاں ''عرضھم'' فرمایا ''عرضھا'' نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کے نام سکھائے گئے تھے اُن میں عقل والی اور بے عقل دونوں چیزیں شامل تھیں' لیکن چونکہ عقل والی چیزیں زیادہ تھیں اس لیے (ان کا اعتبار کرتے ہوئے) ''عرضھم'' فرمایا۔ جیسے مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے ایک ساتھ مذکر کا لفظ بول دیا جاتا ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲

فرشتوں نے عرض کیا: تو (ہر عیب سے) پاک ہے' ہمیں تو صرف وہی آتا ہے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے' بے شک تو سب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرشتوں کا عجز و اعتراف

فرشتے جب چیزوں کے نام نہ بتا سکے اور ان کا عجز ظاہر ہو گیا تو کہنے لگے: مولیٰ تعالیٰ! تیرے ہی لیے پاکیزگی ہے۔ ہمیں صرف اتنا ہی علم ہے جو تو نے ہمیں عطا کیا۔ یعنی تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ ہم تیرے علم کے کسی حصہ کا احاطہ کر سکیں۔ ہم تو وہی کچھ جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو علیم اور حکیم ہے۔ یعنی پیدا کرنے کا علم رکھنے والا ہے اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔

﴿علیم﴾ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ میں سے ایک نام ہے اور اس کا معنیٰ ہے: وہ ذات جو تمام معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ اور ﴿حکیم﴾ کے دو معنیٰ ہیں:

(۱) بہت انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والا (۲) اپنے معاملہ کو اتنا پختہ کرنے والا کہ وہاں فساد کا گزر نہ ہو سکے۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳

فرمایا: اے آدم! ان کو تمام چیزوں کے نام بتا دو' جب آدم نے اُنہیں تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے ○

جب فرشتوں کا عجز ظاہر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے فرمایا: اے آدم! فرشتوں کو وہ نام بتا دو۔ تو انہوں نے ہر چیز کو اس کے نام کے ساتھ ذکر کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے جس حکمت کے لیے حضرت آدم کو پیدا فرمایا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرما دیا۔

پھر جب حضرت آدم نے فرشتوں کو تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے فرشتو! کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کا غیب جانتا ہوں؟ یعنی جو ہو چکا اور جو ہونے والا ہے وہ سب جانتا ہوں۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت آدم کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اُن کے احوال کو جاننے والا تھا۔ اسی لیے (اس رکوع کی پہلی آیت میں)

فرمایا کہ: ﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ﴿وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو میں اس کو جانتا ہوں۔

کون سی بات فرشتوں نے ظاہر کی تھی اور کس کو وہ چھپاتے تھے؟

جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اس سے مراد فرشتوں کا یہ کہنا تھا کہ: ''تو زمین میں اس کو اپنا خلیفہ بنا رہا ہے جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے گا''۔ اور جو کچھ تم چھپاتے تھے اس سے مراد ان کا (آپس میں) یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ معزز کسی کو ہرگز پیدا نہیں کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو'' اس سے مراد فرشتوں کی فرمانبرداری ہے اور جو ''کچھ تم چھپاتے تھے'' اس سے شیطان کا نافرمانی کرنا مراد ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٝ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور (یاد کیجئے) جب ہم نے فرشتوں کو (حکم) فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ (ابلیس نے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں (کے ٹولہ) میں شامل ہو گیا O

(اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں کن فرشتوں سے خطاب ہے؟) بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں خطاب (یعنی سجدہ کرنے کا حکم) ان فرشتوں کو ہے جو زمین پر رہتے تھے۔ اور صحیح ترین قول اس بارے میں یہ ہے کہ خطاب تمام فرشتوں سے تھا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ (الحجر: ۳۰) پس سارے فرشتے اکٹھے ہو کر سربسجود ہو گئے O

حضرت آدم کے آگے فرشتوں کے سجدہ کرنے کی کیفیت اور سجدۂ تعظیمی کا حکم

فرشتوں نے حضرت آدم کو جو سجدہ کیا تھا اس کے بارے میں دو قول ہیں:

(۱) صحیح ترین بات یہ ہے کہ یہ سجدہ حقیقۃً حضرت آدم علیہ السلام کو تھا' لیکن اس میں پیشانی کو زمین پر نہیں رکھا گیا تھا بلکہ یہ محض ان کے آگے فرشتوں کا جھکنا تھا۔[۱۶۰] اور یہ سجدہ حضرت آدم کی عبادت کے طور پر نہیں تھا بلکہ اُن کی تعظیم کے لیے تھا' جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو (تعظیماً) سجدہ کیا اور (قرآن کریم نے اس کو بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا:

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ (یوسف: ۱۰۰) اور وہ سب یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے۔

اور جب اسلام آیا تو اس نے سلامتی کے ساتھ اس سجدہ کو بھی ختم کر دیا (یعنی اب مخلوق میں کسی کو تعظیمی سجدہ بھی نہیں کیا

[۱۶۰] علامہ قرطبی مالکی' علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی' علامہ خفاجی حنفی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ جمہور علماء کا مؤقف یہ ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدم کے آگے زمین پر پیشانی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

(تفسیر قرطبی ج ۱ص ۳۳۳' مدارک التنزیل ج ۱ص ۴۲' حاشیۃ الشہاب علی تفسیر البیضاوی ج ۲ص ۲۰۴)

علامہ خازن نے جو لکھا ہے کہ ''اس سجدے میں پیشانی کو زمین پر نہیں رکھا گیا تھا'' اس بارے میں امام فخر الدین رازی شافعی فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ عرف شرع میں سجدہ کا معنی یہی ہے کہ پیشانی کو زمین پر رکھا جائے۔

(تفسیر کبیر ج ۱ص ۴۲۸)

جائے گا[۱۶۱]۔ اور فرشتوں نے حضرت آدم کو جو سجدہ کیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے حکم کی تعمیل کرنا مقصود تھا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام (فرشتوں کے لیے) قبلہ کی مانند تھے اور سجدہ درحقیقت اللہ ہی کو تھا۔ جیسے کعبۃ اللہ کو نماز کے لیے قبلہ بنایا گیا ہے اور نماز اللہ کے لیے ہوتی ہے۔

اس آیت میں اہل سنت کے اس مؤقف پر دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام فرشتوں سے افضل ہوتے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ یعنی تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اُس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور سجدہ نہیں کیا اور حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے اس نے اپنے آپ کو بڑا جانا اور تکبر کیا۔

شیطان کا نام ابلیس رکھنے کی وجہ اور اس بات کی تحقیق کہ آیا اس کا تعلق فرشتوں سے تھا یا وہ جنّات میں سے ہے؟

شیطان کا نام ابلیس اس لیے رکھا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا۔ سُریانی زبان میں اس کا نام عزازیل اور عربی میں اس کا نام حارث تھا۔ جب اُس نے اللہ عزوجل کی نافرمانی کی تو اس کا نام بھی تبدیل کر دیا گیا (یعنی ابلیس) اور اس کی شکل بھی تبدیل کر دی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شیطان فرشتوں میں سے تھا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں سے مستثنیٰ کیا ہے اور نکالا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ شیطان جنّات میں سے ہے (فرشتوں میں سے نہیں ہے) کیونکہ اُسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کی اصل ہیں، اس طرح شیطان جنات کی اصل ہے۔

ان دونوں اقوال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (یعنی شیطان فرشتوں میں سے تھا) کیونکہ سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا اور شیطان بھی فرشتوں میں داخل تھا، پھر (الّا ابلیس فرما کر) اُسے فرشتوں سے مستثنیٰ اور الگ کیا گیا[۱۶۲]۔

---

۱۶۱ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو ضرور حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (سنن الترمذی: ۱۱۵۹، مشکوٰۃ ص ۲۸۱، مطبوعہ کراچی)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت قیس بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اگر تم میری قبرِ انور کے پاس سے گزرو تو کیا تم اس کو سجدہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا: تو پھر (مجھے) سجدہ نہ کرو۔ اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شوہروں کا اُن پر حق رکھا ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۲۱۴۰، مسند احمد ج ۴ ص ۳۸۱، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۲، مطبوعہ کراچی)

۱۶۲ خلاصہ یہ کہ علامہ خازن کا مذہب مختار اس بارے میں یہ ہے کہ شیطان فرشتوں میں سے تھا۔ تبیان القرآن میں استاذِ محترم علامہ غلام رسول صاحب سعیدی مدّ ظلّہ العالی نے اس مسئلہ پر بہت مدلّل بحث کی ہے اور کئی دلائل اس بات پر قائم کیے ہیں کہ شیطان جن تھا، فرشتہ نہیں تھا۔ آخر میں انہوں نے مفسّرین کے مذاہب کا جو خلاصہ بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ امام ابن جریر طبری، علامہ قرطبی، امام رازی، قاضی بیضاوی، علامہ ابو الحیان اندلسی اور علامہ آلوسی کی تحقیق کے مطابق شیطان فرشتوں میں سے تھا۔ اس کے برخلاف علامہ سیوطی، علامہ نسفی، علامہ زمخشری اور بعض دیگر مفسّرین و متکلمین کی تحقیق کے مطابق شیطان جن تھا اور قرآن مجید کی ظاہر آیات بھی اسی کے موافق ہیں۔ مثلاً اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ. (الکھف: ۵۰) تو سب نے (آدم کو) سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا۔ (تبیان القرآن ج ۱ ص ۳۵۹)

آخر میں فرمایا: ﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور وہ کافروں میں سے تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ کافروں میں سے تھا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے اس کی بدبختی کو جان لیا تھا اس لیے دوزخ اس کے لیے واجب ہوگئی۔

(۹۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب جب ابنِ آدم آیتِ سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان وہاں سے روتا ہوا چلا جاتا ہے[۱۶۳] اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس! ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کرلیا' سو اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے نافرمانی کی سو میرے لیے دوزخ ہے[۱۶۴]

(صحیح مسلم: ۸۱' سنن ابن ماجہ: ۱۰۵۲' مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۳' سنن بیہقی ج ۲ ص ۳۱۲' جمع الجوامع للسیوطی: ۲۲۶۵)

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس (جنت) میں سے جہاں سے چاہو جتنا چاہو کھاؤ' پر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے O

حضرت آدم اور حواء (علیہما السلام) کے جنت میں سکونت اختیار کرنے کا مفہوم

اس آیت میں فرمایا کہ: ''اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو''۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جنت کو اپنی پناہ اور ٹھہرنے کی جگہ بنالو۔ نہ یہ معنیٰ کہ جنت کو اپنے رہنے کی جگہ بنالو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''اسکنتک الجنة'' (میں نے تمہیں جنت میں ٹھہرایا' بلکہ فرمایا کہ تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو) اور اس لیے بھی کہ جنت زمین پر بسنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے (لہٰذا آیت کا معنیٰ یہی ہوگا کہ اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت کو پناہ کی جگہ بنالو)۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جنت میں ٹھہرایا تو آپ تنہا تھے' کوئی آپ کے ساتھ ایسا نہیں تھا جس سے اُنس حاصل ہوتا اور اس کے ساتھ ہمنشینی اختیار کی جاتی۔ سو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ پر نیند طاری فرمائی اور آپ کی بائیں جانب کی ایک پسلی جو کہ چھوٹی تھی اس سے ان کی زوجہ حضرت حواء کو پیدا فرمایا اور اس پسلی کی جگہ اللہ تعالیٰ نے گوشت رکھ دیا' جس کا حضرت آدم علیہ السلام کو قطعاً پتا نہیں چلا اور نہ ہی آپ نے کوئی درد محسوس کیا۔ اگر (بالفرض) حضرت آدم کو درد ہوتا تو مرد کبھی بھی عورت پر مہربانی نہ کرتا۔ پھر جب حضرت آدم علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے اور حواء کو بہت ہی حُسن کے ساتھ (اپنے قریب) بیٹھے ہوئے پایا تو اُن سے پوچھا: تم کون ہو؟ تو حواء نے کہا کہ میں آپ کی زوجہ حواء ہوں۔ حضرت آدم نے پوچھا: تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ جواب دیا کہ مجھے اس لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ آپ مجھ سے سکون حاصل کریں اور میں آپ سے سکون حاصل کروں۔

☆ حضرت حواء کا نام حواء اس لیے رکھا گیا کہ آپ ''حی'' (یعنی زندہ شخص) سے پیدا کی گئیں۔

جس جنت میں آدم و حواء کو ٹھہرایا گیا اس سے کون سی جنت مراد ہے؟

جس جنت میں حضرت آدم کو ٹھہرنے کا حکم دیا گیا اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ اُس جنت سے کون سی جنت مراد ہے؟

۱۶۳ کیونکہ تلاوت کا سجدہ بھی نماز کے علاوہ ہے اور شیطان نے جس سجدے کا انکار کیا تھا وہ بھی سجدہ نماز کے علاوہ تھا اس لیے یہ سجدہ دیکھ کر اُسے حسرت ہوتی ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۲ ص ۷۹)

۱۶۴ اس آخری جملہ کی شرح کرتے ہوئے علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہے۔ (مرقات ج ۲ ص ۶۱۴)

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے زمین کا ایک باغ مراد ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے وہ جنت مراد ہوتی جو کہ جزاء اور ثواب کی جگہ ہے (یعنی اصل جنت) تو حضرت آدم اور حواء وہاں سے نکالے نہ جاتے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحواء کو جنت سے اترنے کا حکم فرمایا سو اس سے ''تحول و انتقال'' یعنی کسی جگہ چلے جانا مراد ہے (نہ یہ بات کہ آدم وحواء چونکہ اصل جنت میں تھے اس لیے وہاں سے اُترنے کا حکم دیا گیا)۔ اور یہ ایسے ہی جیسے قرآن کریم میں (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے) فرمایا:

اِهْبِطُوْا مِصْرًا. (البقرہ:۶۱) شہر میں چلے جاؤ۔

لیکن اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم وحواء کو جس جنت میں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا اس سے وہی جنت مراد ہے جو کہ جزاء اور ثواب کی جگہ ہے کیونکہ آیت میں ''الجنة'' ہے اور اس پر الف لام عہد کا ہے۔ نیز مسلمانوں کے نزدیک مسلمانوں کے عُرف میں جنت سے وہی جنت مراد ہوتی ہے جو کہ جزاء اور ثواب کی جگہ ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ جنت کے حوالہ سے مذکورہ دونوں باتیں ممکن ہیں اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آگے فرمایا: ﴿وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ تم دونوں اس سے جتنا چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ ''رغدا'' کا معنیٰ ہے: بہت زیادہ کھل کر کھاؤ۔ اور ''حیث شئتما'' کا معنیٰ ہے: جیسے چاہو جب چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ مقصد اس آیت سے یہ ہے کہ تمہیں جنت کی چیزیں کھانے میں کھلی چھوٹ ہے اور کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ہاں جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے وہ نہیں کھا سکتے اور وہ یہ ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ یعنی کھانے کی غرض سے قریب نہ جانا۔

کس درخت کے قریب جانے سے آدم وحواء کو منع کیا گیا؟

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ ممانعت جنسِ درخت سے تھی یعنی کسی بھی درخت کے قریب نہیں جانا۔ بعض مفسرین اس سے خاص درخت مراد لیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے گندم کا خوشہ مراد ہے۔ بعض اس سے انگور مراد لیتے ہیں۔ بعض انجیر کا درخت اور بعض علم کا درخت مراد لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے کافور مراد ہے۔

جبکہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ظاہر کلام میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے بات واضح ہو سکے۔ کیونکہ اس وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ معیّن درخت کی پہچان کرائی جائے اور جو چیز مقصود نہ ہو اس کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی ہے۔

عصمت انبیاء کے بارے میں علماء کا نقطۂ نظر اور انبیاء کی طرف ظلم کی نسبت کرنے کا حکم

اختتام پر فرمایا: ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ یعنی اگر تم نے اس درخت سے کچھ کھایا تو تم دونوں اپنا نقصان کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

جن علماء نے انبیاء کرام سے ارتکابِ ذنوب کو ممکن قرار دیا ہے انہوں نے اس آیت میں کہا ہے کہ حضرت آدم نے معصیت کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اور ظلم کا اصل معنیٰ ہے:

وضع الشیء فی غیر موضعه. چیز کو اس کی جگہ کے علاوہ کسی اور مقام پہ رکھنا۔

اور جن علماء نے انبیاء کرام سے ارتکاب ذنوب کو ناممکن قرار دیا ہے انہوں نے ظلم کا معنیٰ کیا ہے: خلافِ اولیٰ کا مرتکب ہونا۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ظلم کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ حضرت آدم نے قبل نبوت ایسا کیا۔

سوال: کیا انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں یہ کہنا جائز ہے کہ انہوں نے ظلم کیا یا اپنے آپ پر ظلم کیا؟

جواب: میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے ظلم کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں ان کی مذمت ہے۔[۱۶۵]

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

پس شیطان نے اُن دونوں کو جنت سے پھسلا دیا اور اُن نعمتوں سے اُنہیں علیحدہ کر دیا جن میں وہ تھے' اور ہم نے فرمایا کہ نیچے اُترو تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے' اور تمہارے لیے زمین میں ایک خاص وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے O

اس آیت میں فرمایا کہ شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا۔ یعنی حضرت آدم اور حواء کو اور ان دونوں کو زلّت یعنی خطاء کی طرف بُلایا۔

☆ انبیاء کرام علیہم السلام کا معصوم ہونا اور جو انبیاء کرام سے بعض باتیں صادر ہوئیں اُن کے جوابات کی بحث انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ طٰہٰ کی آیت: ۱۲۱ ''وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى'' کے تحت آئے گی۔

یہاں فرمایا کہ: شیطان نے آدم و حواء کو جنت سے پھسلا دیا اور ان دونوں کو اُس سے نکلوا دیا جس میں وہ تھے' یعنی نعمتوں سے۔

حضرت آدم و حواء کے جنت سے نکلنے کا واقعہ

واقعہ یہ ہوا کہ ابلیس نے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تا کہ وہ آدم و حواء کو وسوسہ ڈالے۔ جب اس نے داخل ہونا چاہا تو اُسے جنت کے فرشتوں نے روک دیا۔ ایک سانپ شیطان کا دوست تھا اور بڑا ہی خوب صورت جانور تھا' اونٹ کی طرح اس کی چار ٹانگیں تھیں۔ وہ آیا تو اس سے شیطان نے کہا کہ تم مجھے اپنے منہ کے ذریعہ جنت میں لے جاؤ۔ وہ اس کو جنت میں لے گیا اور جنت کے فرشتوں کے پاس سے بھی گزرا لیکن انہیں پتا نہیں چلا۔[۱۶۶]

بعض علماء نے کہا ہے کہ شیطان نے آدم و حواء کو جنت کے دروازے پر ہی دیکھ لیا تھا' کیونکہ وہ دونوں وہاں سے نکلنے والے تھے اور شیطان بھی وہیں دروازے کے قریب تھا۔ اس نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت میں داخل ہوئے اور انہوں نے جنت کی نعمتیں دیکھیں تو کہنے لگے کہ کاش اس میں ہمیشہ رہنا

---

۱۶۵ حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو ظالم کہنا اہانت و کفر ہے۔ جو کہے وہ کافر ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مالک و مولیٰ ہے جو چاہے فرمائے اس میں ان کی عزت ہے۔ دوسرے کی کیا مجال کہ خلاف ادب زبان پر لائے اور خطاب حضرت حق کو اپنی جرأت کے لیے سند بنائے۔ ہمیں تعظیم و توقیر اور ادب و اطاعت کا حکم فرمایا ہم پر یہی لازم ہے۔ (خزائن العرفان' سورۃ البقرہ: ۳۵)

۱۶۶ اس واقعہ پر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
یہ اور اس جیسے واقعات پر ضروری ہے کہ توجہ نہ دی جائے۔ کیونکہ شیطان اگر سانپ کے منہ میں داخل ہونے پر قادر ہو گیا تھا تو اس نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ اپنے آپ کو سانپ بنا کر جنت میں داخل ہو جاتا؟ اور جب سارا کام سانپ ہی کے ذریعہ انجام پایا تھا تو سانپ تو ایک غیر عاقل اور غیر مکلّف جانور ہے' پھر اُس کو سزا کیوں دی گئی؟ (یعنی اُسے جنت سے کیوں نکالا گیا؟) (تفسیر کبیر' البقرہ: ۳۶)

ہو۔شیطان نے یہ موقع غنیمت جانا اور ہیشگی ملنے سے پہلے ہی حضرت آدم کے پاس پہنچ گیا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ شیطان جب جنت میں داخل ہوا تو وہ آدم اور حواء کے درمیان کھڑا ہو گیا اور ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ابلیس ہے۔ پھر وہ رونے لگا اور خوب آہ وزاری کرنے لگا' جس سے وہ دونوں غمگین ہو گئے۔ سب سے پہلے نوحہ اور آہ وزاری کرنے والا شیطان ہے۔ ان دونوں نے پوچھا: کس وجہ سے تم رو رہے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ تم دونوں مر جاؤ گے اور جن نعمتوں میں تم اس وقت ہو اس سے محروم ہو جاؤ گے۔ اس بات سے آدم اور حواء کے دل میں اثر ہوا اور وہ دونوں غمگین ہو گئے۔ شیطان چلا گیا اور پھر لوٹ کر آیا اور حضرت آدم سے کہنے لگا:

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ . (طٰہٰ:۱۲۰) کیا میں آپ کو وہ درخت بتا دوں جس سے آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے؟

تو حضرت آدم نے شیطان کی اس بات کو ماننے سے انکار کیا۔ اُس نے ان دونوں کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہا:

اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝ (الاعراف:۲۱) بے شک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں O

یوں آدم اور حواء دونوں شیطان کے دھوکہ میں آ گئے' کیونکہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص اللہ کے نام سے جھوٹی قسم کھا سکتا ہے۔ پھر حواء نے اس درخت کو کھانے کے لیے جلدی کی اور آدم کو بھی اس میں سے دیا تو انہوں نے بھی کھایا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم وحواء کے اس ایک لقمہ نے ہمیں طویل غم میں مبتلا کر دیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: اے آدم! جو چیزیں جنت میں میں نے تمہارے لیے مُباح کی تھیں کیا ان میں درخت سے بچنا ممکن نہیں تھا؟ حضرت آدم نے عرض کیا: کیوں نہیں' اے میرے رب! تیری عزت کی قسم! لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص تیرا نام لے کر جھوٹی قسم کھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم! ضرور میں تمہیں زمین پر اتاروں گا۔ پھر وہاں تم اپنی زندگی میں تنگی ہی پاؤ گے۔

پھر اُنہیں جنت سے اتار دیا گیا اور انہیں لوہے کی صنعت سکھائی گئی اور اُنہیں کھیتی باڑی کرنے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے کھیتی باڑی اور کاشت کاری کی اور کھیتی کو خوب سیراب کیا۔ یہاں تک جب کھیتی پک کر تیار ہو گئی تو اُسے الگ کیا اور اُسے صاف کر کے پیسا' پھر اُسے گوندھا اور اس کی روٹی بنائی اور پھر اس روٹی کو تناول فرمایا۔ اور وہ انتہائی محنت کے بعد اس مرحلہ کو پہنچے۔

حضرت آدم نے ممنوعہ درخت سے کیوں کھایا اور اس کا کیا نتیجہ مرتب ہوا؟

ایک دوسری روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے ممنوعہ درخت سے کھایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! کس چیز نے تمہیں یہ کرنے پر مجبور کیا؟ انہوں نے کہا کہ میرے لیے اس کو حواء نے مزیّن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں حواء کو سزا دوں گا' وہ حاملہ بھی تکلیف کے ساتھ ہو گی اور بچہ بھی تکلیف کے ساتھ جنے گی اور مہینہ میں اُسے دو مرتبہ خون آئے گا۔ یہ سن کر حضرت حواء رونے لگیں تو ان سے کہا گیا کہ تمہارے لیے بھی رونا ہے اور تمہاری بیٹیوں کے لیے بھی رونا ہے[۱۶۷] پھر جب آدم وحواء نے ممنوعہ درخت سے کھایا تو اُن کے لباس ان کے جسم سے اُتر گئے اور دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا۔ اور اسی کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا:

---

۱۶۷ تفسیر قرطبی مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت کے مخرّج ومحقق شیخ عبد الرزاق المہدی نے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے' اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (تفسیر القرطبی ج۱ ص۳۵۳)

﴿ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ﴾ یعنی تم سب زمین پر اُتر جاؤ۔ یہ حکم حضرت آدم‘ حضرت حواء‘ شیطان اور (اس کے دوست) سانپ کو ہے۔ سو حضرت آدم کو ہندوستان کے ایک علاقہ سراندیپ میں نو دنامی ایک پہاڑ پر اتارا گیا‘ حضرت حواء کو جدہ میں اتارا گیا‘ ابلیس کو بصرہ کے ایک پہاڑ اَبلّہ پر اور سانپ کو اصفہان میں اتارا گیا۔

﴿ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ﴾ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اس سے مراد وہ دشمنی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے مؤمنین اور شیطان کے درمیان قائم ہے۔ اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے (ایک اور مقام پر) ارشاد فرمایا:

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۖ (الفاطر:٦) بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے‘ سو تم بھی اُسے دشمن سمجھو۔

اولادِ آدم اور سانپوں کے درمیان دشمنی کا بیان اور سانپوں کو قتل کرنے کا حکم

زیر بحث آیت میں وہ دشمنی بھی مراد ہے جو اولادِ آدم اور سانپ کے درمیان موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ:

(۹۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے سانپوں کو ان کے بدلہ لینے کے خوف سے چھوڑ دیا‘ وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے[۱۶۸]۔ جب سے ہم نے سانپوں سے جنگ کی ہے اس وقت سے ان کے ساتھ صلح نہیں کی[۱۶۹]۔

(سنن ابوداؤد: ۵۲۵۰‘ مسند احمد ج ۱ ص ۲۳۰)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

(۹۴) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام سانپوں کو قتل کر دیا کرو۔ جو شخص بھی ان کے غضب ناک ہونے سے ڈر گیا وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ (ابوداؤد: ۵۲۴۹‘ سنن نسائی: ۳۱۹۳‘ شرح السنہ: ۳۲۶۴)

اسی طرح ایک روایت میں اس طرح ہے:

---

۱۶۸ ہمارے طریقے پر نہ ہونے کی تشریح حاشیہ نمبر ۲۳ میں گزر چکی ہے‘ وہاں ملاحظہ فرمالی جائے۔ یہاں سرکار دو عالم ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ جس نے سانپوں کو ان کے بدلہ لینے کے خوف سے چھوڑ دیا وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ اس جملہ سے درحقیقت زمانۂ جاہلیت کے اُس عقیدے کا رد مقصود ہے کہ سانپ کو اگر قتل کر دیا جائے تو سانپنی اس شخص سے بدلہ لیتی ہے۔ (مرقات ج ۷ ص ۲۹۷) مفتی احمد یار خان علیہ الرحمۃ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے جہلاء عرب کہتے تھے اور جہلاء ھند اب تک کہتے ہیں کہ سانپ کو مارنے والے سے اس کی ناگنی بدلہ لیتی ہے۔ اس لیے سانپ کو مت مارو۔ اس فرمانِ عالی میں اسی خیال کی تردید ہے۔ بھلا سانپنی یعنی ناگن کو کیا خبر کہ کس نے مارا ہے؟ لوگوں میں مشہور ہے کہ مارے ہوئے سانپ کی آنکھوں میں مارنے والے کا فوٹو آجاتا ہے‘ اس فوٹو سے ناگن قاتل کو پہچان لیتی ہے۔ اس لیے سانپ کو مار کر اس کا سر جلا دیا جاتا ہے تاکہ آنکھوں میں فوٹو نہ رہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے‘ اس کا سر جلانا تو اُسے مار ڈالنے کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ لاٹھی کھا کر بے ہوش ہو جاتا ہے‘ لوگ مردہ سمجھ کر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ بعد ہوش میں آکر چلا جاتا ہے۔ آگ میں جلانا اس لیے ہے تاکہ واقعی مر جائے۔ خیال رہے کہ جب تک سانپ الٹا نہ پڑ جائے (یعنی جب تک پیٹ اوپر نہ آجائے) تب تک وہ زندہ ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ ص ۲۰۷)

۱۶۹ سانپ اور انسان کے درمیان فطرتی طور پر جنگ اور دشمنی ہے۔ یعنی دونوں اسی طبیعت اور فطرت کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ (مرقات ج ۷ ص ۲۹۷) اس جملہ کا ایک اور مفہوم بیان کرتے ہوئے علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ نے وہ واقعہ بیان کیا ہے‘ جس کی ہم امام فخر الدین رازی کے حوالہ سے حاشیہ: ۱۶۶ میں تردید نقل کر چکے ہیں۔

(۹۵) تمام بڑے سانپوں کو قتل کر دو سوائے پتلے سانپ کے جو چاندی کی شاخ کی طرح ہو۔[۱۷۰] (سنن ابوداؤد: ۵۲۶۱ شرح السنہ ج ۷ ص ۱۴۰)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۹۶) بے شک مدینہ میں کچھ جنات ہیں جو کہ مسلمان ہو چکے ہیں' جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن تک اُسے خبر دار کرو۔[۱۷۱] اگر اس کے بعد بھی تمہارے سامنے ظاہر ہو تو اُسے قتل کر دو کیونکہ وہ شیطان ہے۔[۱۷۲]

(صحیح مسلم: ۲۲۳۶' سنن ابوداؤد: ۵۲۵۷' شرح السنہ: ۳۲۶۳' صحیح ابن حبان: ۵۶۳۷)

ایک روایت میں اس طرح ہے:

(۹۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک ان گھروں میں آباد رہنے والے سانپ ہیں۔[۱۷۳] جب تم ان میں سے کوئی سانپ دیکھو تو تین دن تک اس کو تنگ کرو۔ اگر وہ چلا جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اُسے قتل کر دو کیونکہ وہ کافر ہے۔[۱۷۴]

(صحیح مسلم: ۲۲۳۶' سنن الترمذی: ۱۴۸۴)

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴾ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور مقررہ وقت تک فائدہ اٹھانا ہے۔

اس جملہ میں ''مستقر'' سے مراد ہے: موضعِ قرار (ٹھہرنے کی جگہ) ''متاع'' سے مراد ہے: گزر بسر کی چیز اور قابل نفع چیز۔ اور ''حین'' سے مراد موت کا وقت ہے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی' بے شک وہی ذات بہت توبہ قبول فرمانے والی ہے' مہربان ہے O

﴿ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ ﴾ میں ''تلقی'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو سمجھ کر اس کو قبول کرنا۔ اور ایک قول کے مطابق اس کا معنیٰ ہے: سیکھنا۔

ان کلمات کا بیان جو حضرت آدم نے اپنے رب سے سیکھے

فرمایا: ﴿ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ ﴾ یعنی آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔

اس سے مراد وہ کلمات ہیں جو حضرت آدم کی توبہ کا سبب بنے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ کلمات ہیں:

---

۱۷۰ ہوسکتا ہے کہ اس سانپ کے قتل سے اس لیے منع کیا گیا ہو کہ یہ نقصان نہیں دیتا ہے' کیونکہ اس میں زہر نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اس میں زہر ہو تب بھی اس کو قتل کرنا منع ہے کیونکہ یہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ (مرقات ج ۷ ص ۲۳۰)

۱۷۱ یہ حکم استحبابی تھا' وجوبی نہیں تھا۔ کیونکہ علامہ خازن نے جو احادیث اوپر ذکر کی ہیں اُن میں مطلقاً تمام سانپوں کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ (مرأۃ المناجیح ج ۵ ص ۶۹۴)

۱۷۲ یعنی پھر وہ مسلمان جن نہیں ہے بلکہ کافر جن ہے' یا شیطان کی اولاد میں سے ہے یا واقعی سانپ ہے۔ (مرقات ج ۷ ص ۲۱۶)

۱۷۳ ان سے مراد وہ سانپ ہیں جو گھروں میں ہی رہتے بستے ہیں اور کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔

۱۷۴ تنگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر تم ہمارے پاس ٹھہرے رہے یا ہمارے سامنے آئے یا پھر لوٹ کر آئے تو تم تنگی میں رہو گے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ سامنے آئے تو اُسے قتل کر دو کیونکہ وہ کافر ہے۔ یعنی اپنی جرأت میں اور تکلیف پہنچانے میں کافر کی مانند ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۲۵۲' مرقات ج ۷ ص ۲۱۵)

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (الاعراف:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ضرور ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ○

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ کلمات ہیں:

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اَنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. لَا اِلٰـهَ اَلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ.

تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' تیرے لیے ہی پاکیزگی اور تعریف ہے۔ اے میرے رب! میں نے بُرا فعل کیا اور اپنے آپ پر زیادتی کی۔ سو تو میری توبہ قبول فرما' بے شک تو بہت توبہ قبول کرنے والا رحمت والا ہے۔ تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' تیرے لیے ہی پاکیزگی اور تعریف ہے۔ اے میرے رب! میں نے بُرا فعل کیا اور اپنے آپ پر زیادتی کی۔ سو تو میری بخشش فرما۔ بے شک تو بہت بخشنے والا رحمت والا ہے۔ تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ تیرے لیے ہی پاکیزگی اور تعریف ہے۔ اے میرے رب! میں نے بُرا فعل کیا اور میں نے اپنے آپ پر زیادتی کی۔ سو تو مجھ پر رحم فرما۔ بے شک تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے رب کی بارگاہ میں عرض کیا: پروردگار! جو کچھ میں نے کیا ہے وہ کوئی نئی چیز ہے جو میں نے اپنی جانب سے کی ہے یا اس کو تو نے مجھے پیدا کرنے سے پہلے ہی میرے لیے مقدر فرما دیا تھا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کام کو میں نے تمہیں پیدا کرنے سے پہلے ہی تمہارے لیے مقدر کر دیا تھا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! جس طرح تو نے اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دیا تھا تو میری مغفرت بھی فرما دے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حج کرنے کا حکم دیا اور انہیں حج کے ارکان سکھائے تو حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے۔ اس وقت بیت اللہ ایک سرخ ٹیلے کی شکل میں تھا۔ طواف کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی' پھر بیت اللہ کی جانب رُخ کر کے یہ کلمات کہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِيْ وَتَعْلَمُ حَاجَتِيْ فَاَعْطِنِيْ سُؤْلِيْ وَتَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ.

اے اللہ! بے شک تو میرے باطن اور ظاہر کو جانتا ہے سو میری معذرت کو قبول فرما۔ تو میری حاجت کو جانتا ہے' تو مجھے میرا مطلوب عطا فرما دے۔ میرے دل میں جو کچھ ہے تو اس سے باخبر ہے' سو میری لغزشوں کو تو معاف فرما دے۔

یہ کلمات جب آدم علیہ السلام نے کہے تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے آدم! میں نے تیری لغزشوں کو تیرے لیے بخش دیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اتارا گیا تو آپ نے اللہ عزوجل سے حیاء کے سبب تین سو سال

تک آسمان کی طرف سر نہیں اٹھایا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو کلمات سیکھے اُن سے مراد تین چیزیں ہیں: حیاءُ دُعا اور گریہ و زاری۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جنت کی نعمتوں سے محروم ہو جانے پر حضرت آدم اور حواء دو سو سال تک روتے رہے اور چالیس دن بغیر کچھ کھائے پئے گزار دیئے۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر تمام اہل زمین کے آنسو جمع کیے جائیں تب بھی حضرت آدم علیہ السلام کے وہ آنسو جو انہوں نے اپنی خطاء پر بہائے تھے وہ زیادہ ہوں گے۔ اور اگر حضرت داؤد علیہ السلام اور تمام اہل زمین کے آنسو جمع کیے جائیں تب بھی حضرت آدم علیہ السلام کے آنسو زیادہ ہوں گے جو انہوں نے جنت سے نکالے جانے پر بہائے تھے۔

توبہ کا مفہوم اور اس کی چند شرائط کا بیان

﴿فَتَابَ عَلَیْهِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے درگزر فرمایا اور ان کی بخشش فرمادی۔ توبہ (از تاب یتوب) کا اصل معنیٰ ہے: لوٹنا۔ تو گویا توبہ کرنے والا بھی اپنے کیے ہوئے گناہ سے رجوع کرتا ہے (اس لیے اسے تائب کہتے ہیں)۔

توبہ کے لیے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) علم (۲) حال (۳) عمل۔

علم سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے گناہ کے نقصان کو جانے اور یہ علم رکھے کہ گناہ اللہ عزوجل سے دوری کا باعث ہے۔ جب بندے کو یہ علم حاصل ہوگا تو دل میں دُکھ ہوگا اور جب دُکھ ہوگا تو ندامت اور شرمندگی پیدا ہوگی۔ اور شرمندگی کا پیدا ہونا ہی ''حال'' ہے۔ نتیجۃً بندہ گناہ کو ترک کر دے گا اور تہیہ کرے گا کہ آئندہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ اور یہی ''عمل'' ہے۔ جب یہ تینوں باتیں پائی جائیں گی تو توبہ کا وجود ہوگا۔ توبہ پر مزید گفتگو ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ التحریم کی آیت: ۸ ''تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' کے تحت آئے گی۔

زیرِ بحث آیت کے آخر میں ﴿تواب﴾ کا معنیٰ ہے: اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرنے میں بہت زیادہ (رحمت کے ساتھ) رجوع فرمانے والا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یعنی بندوں کی توبہ کو بہت زیادہ قبول فرمانے والا۔ اور ﴿رحیم﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنی مخلوق کے ساتھ بہت رحمت والا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًاۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے فرمایا: تم سب جنت سے اُتر جاؤ اس کے بعد اگر تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت (کا پیغام) آئے تو جو میری (اُس) ہدایت کی پیروی کریں گے اُنہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

جنت سے اُترنے کا حکم کس کو دیا گیا اور اُترنے کی کیفیت کا بیان

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ یعنی ہم نے مذکورہ چار افراد (آدم و حواء شیطان اور سانپ) سے کہا کہ اُتر جاؤ۔ علماء فرماتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جنت سے آسمانِ دنیا پر اتارا گیا اور دوسری مرتبہ آسمانِ دنیا سے زمین پر اُتارا گیا۔ لیکن اس قول میں کمزوری ہے کیونکہ پہلی مرتبہ اُترنے کا جو حکم دیا گیا اس میں ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ زمین ہی میں تمہارا ''مستقر'' (ٹھکانا) ہوگا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پہلا اُترنا جنت سے زمین پر تھا۔ اور (زیرِ بحث آیت میں اُترنے کا حکم) صحیح ترین قول کے مطابق تاکید کے لیے ہے۔

﴿ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى ﴾ پس اگر تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت آئے۔ اس میں اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت آدم وحواء پر اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ یوں فرما رہا ہے کہ میں نے اگرچہ تمہیں جنت سے اتار دیا ہے لیکن تم پر میرا انعام یہ ہے کہ میں تمہیں اُس ہدایت سے سرفراز کروں گا جو تمہیں دوبارہ جنت کی طرف لے آئے گی اور وہ آنا ایسا دائمی ہوگا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اس آیت میں خطاب اولادِ آدم سے ہے۔ یعنی اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس میری جانب سے رشد وہدایت اور کوئی حکم آئے۔ بعض نے ہدایت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ تمہارے پاس کتاب اور رسول آئے۔

﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں اُنہیں کسی بات کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور غم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ پچھلی کسی بات پر انہیں غم نہیں ہوگا' بعض علماء کے نزدیک خوف اور غم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں اُنہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخی ہوں گے اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے O

اس آیت میں ﴿ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد انکار کرنا اور ﴿ ایـاتـنـا ﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے قرآن کریم کا انکار کیا وہ قیامت کے دن آگ والے ہوں گے۔ ''اُس میں ہمیشہ رہیں گے'' اس سے مراد یہ ہے کہ نہ تو اُنہیں اس سے نکالا جائے گا نہ اُنہیں موت آئے گی۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے اولادِ یعقوب! میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ہے اور تم میرا وعدہ پورا کرو' میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرا کرو O

''اسرائیل'' کے معنیٰ ومصداق کا بیان اور شکر نعمت کے لیے ذکر کا لفظ استعمال کرنے کی توجیہ

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''اســرائیـل'' سے مراد حضرت یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (صلی اللہ علیہم وسلم اجمعین) ہیں۔ اور اسرائیل کا معنیٰ ہے: ''عبد الله'' (اللہ کا بندہ) اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنیٰ ہے: ''صـفـوة الله'' (اللہ کا دوست) اور ﴿ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴾ کا معنیٰ ہے: اے یعقوب کی اولاد۔ ﴿ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ میری نعمت کا شکر ادا کرو۔ یہاں شکر کے لیے ذکر کا لفظ اس لیے فرمایا گیا کہ جس شخص نے اللہ عزوجل کی نعمت کو یاد کیا اُس نے درحقیقت اس کی نعمت کا شکر ادا کیا اور جس نے نعمت کا انکار کیا اُس نے درحقیقت نعمت کی ناشکری کی۔ علماء فرماتے ہیں کہ یاد کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے۔

نعمتوں کا لفظ واحد لانے کی حکمت اور نعمتوں کی اقسام

یہاں اللہ تعالیٰ نے نعمت کا لفظ واحد اس لیے استعمال فرمایا کہ نعمت ایک ایسے فائدہ کو کہتے ہیں جو احسان کے طور پر کسی کو پہنچایا جائے۔ یعنی سراسر نقصان والی چیز نعمت نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر انسان صرف اپنی ذات کے لیے فائدہ کا کام کرے تو

اُسے بھی نعمت نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک کہ اس میں دوسرے شخص کا ارادہ نہ کیا جائے۔

نعمتیں تین طرح کی ہوتی ہیں. (۱) ایک نعمت وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملتی ہے۔ جیسے انسان کی پیدائش اور اس کا رزق۔ (۲) دوسری نعمت وہ ہے جو انسان کو کسی واسطہ سے ملے لیکن اس میں بھی قدرت اور طاقت اللہ عزوجل کی عطا کردہ ہو۔ یوں حقیقت میں نعمت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (۳) تیسری نعمت وہ ہے جو انسان کو اطاعت اور فرمانبرداری کی وجہ سے حاصل ہو۔ یہ نعمت بھی اللہ عزوجل کی جانب سے ہوتی ہے۔ چونکہ تمام نعمتوں کی بنیاد اللہ عزوجل کی ذات سے ہے اس لیے حقیقت میں جو علی الاطلاق (ہر اعتبار سے کامل) نعمتیں دینے والا ہے' وہ صرف اللہ عزوجل ہے۔

اُن نعمتوں کا بیان جو بنی اسرائیل کو عطا کی گئیں اور اس اشکال کا جواب کہ نعمتوں کا نزول اس آیت کے مخاطبین پر نہیں ہوا تھا پھر اُنہیں نعمتیں یاد کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

وہ نعمتیں جو صرف بنی اسرائیل کو عطا کی گئیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو نعمت کا لفظ فرمایا ہے وہ لفظ کی حیثیت سے تو واحد ہے لیکن معناً جمع ہے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہوئیں اُن میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں فرعون سے نجات عطا فرمائی' سمندر کو اُن کے لیے چیر دیا' فرعون کو غرق کر دیا' بادلوں کا اُن پر سایہ کیا' میدانِ تیہ میں اُن کے لیے منّ وسلویٰ (ترنجبین اور بٹیر) نازل کیا' تورات کو نازل فرمایا اور بہت ساری نعمتیں نازل فرمائیں۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ مذکورہ نعمتیں اس آیت کے مخاطبین پر نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ یہ نعمتیں ان مخاطبین کے آباءواجداد پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر ان مخاطبین کو نعمتیں یاد کرنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ مخاطبین کا اُن نعمتوں کو یاد کرنا اس وجہ سے ہے کہ جو چیز آباءواجداد کے لیے فخر کا باعث ہوتی ہے وہ بیٹوں کے لیے بھی باعثِ فخر ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جب بیٹوں کو یہ یقین حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں ہمارے آباءواجداد پر نازل فرمائی تھیں تو بیٹوں پر بھی لازم ہوا کہ وہ اُن نعمتوں کو یاد کریں اور اُن پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کریں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ (زیرِ بحث آیت میں) نعمت سے مراد یہ ہے کہ مخاطبین نے نبی اکرم ﷺ کا زمانۂ اقدس پایا اور اس نعمت کو یاد کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ تم نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

عہد کا معنیٰ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عہد کو پورا کرنے کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ یعنی تم میرے حکم کی فرمانبرداری کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا' یعنی تمہارے اعمال قبول کروں گا اور ان پر اجر وثواب عطا کروں گا۔

عہد کا اصل معنیٰ ہے: کسی چیز کی حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اس کی نگہداشت کرتے رہنا۔ وہ معاہدہ جس کی پاسداری ضروری ہو اس کو ''عہد'' کہا جاتا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں عہد سے وہ تمام احکام مراد ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ عام ازیں کہ اُن میں سے بعض پر ہم عمل کرنے کے پابند ہیں اور بعض کے نہیں ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ عہد سے مراد وہ عہد ہے جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے اور وہ یہ ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ	اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور اُن میں سے ہم نے بارہ نگران مقرر کیے اور اللہ نے فرمایا: بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں' یقیناً اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ ادا کی اور تم میرے رسولوں پر ایمان لائے اور تم نے تعظیم کے

ساتھ اُن کی مدد کی اور اللہ کو اچھا قرض دیا تو میں ضرور تمہارے گناہوں کو تم سے اتار دوں گا۔ (المائدہ:۱۲)

بعض مفسرین کے نزدیک عہد سے مراد اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ۔ (البقرہ:۶۳) اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور ہم نے کوہِ طور کو تم پر بلند کیا کہ ہم نے جو کچھ تمہیں دیا ہے تم اس کو مضبوطی سے لو۔

☆ ''جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے'' اس سے تورات کے احکام مراد ہیں۔

بعض مفسرین کے نزدیک عہد سے مراد اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۔ (البقرہ:۸۳) اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

ایک قول یہ ہے کہ عہد سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ نبیوں کی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی تعریف میں بیان فرمائی ہیں۔ (خصوصاً یہ کہ) اُنہیں آخری زمانہ میں نبی بنا کر بھیجا جائے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے یہ عہد فرمایا کہ میں بنی اسرائیل میں ایک نبی اُمّی بھیجوں گا۔ جو شخص بھی اُن کی اور جس نور کو وہ لے کر آئیں گے اُس کی تصدیق کرے گا میں اُس کے گناہ معاف کر دوں گا' اُسے جنت میں داخل کروں گا اور اُسے دوگنا اجر و ثواب عطا کروں گا۔ یہ وعدہ درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکور ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۔ (آل عمران:۱۸۷) اور یاد کرو جب اللہ نے اُن لوگوں سے عہد لیا جنہیں کتاب عطا ہوئی کہ تم ضرور اُسے لوگوں کے سامنے بیان کر دینا اور چھپانا نہیں۔

☆ ''تم ضرور اُسے لوگوں سے بیان کر دینا'' اس سے نبی اکرم ﷺ کا حکم اور آپ کی تعریف مراد ہے (یعنی تم لوگوں کے سامنے نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور اُن کے حکم کو بیان کرنا)۔

اختتام پر فرمایا: ﴿ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴾ مجھ ہی سے ڈرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے عہد اور وعدہ کو توڑنے کے معاملہ میں مجھ سے ڈرو۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور تم اُس (کتاب) پر ایمان لاؤ جس کو میں نے (اس شان کے ساتھ) نازل کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور تم اس کے سب سے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلہ میں (دُنیا کی) معمولی قیمت نہ لو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو O

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ یعنی قرآن کریم پر ایمان لاؤ۔ قرآن کریم کے مصدق ہونے سے مراد یہ ہے کہ تورات میں توحید و نبوت' واقعات اور نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کی صورت میں جو باتیں موجود ہیں قرآن کریم اُن کے موافق ہے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لانا درحقیقت ان ہی کی تصدیق کرنا ہے۔ کیونکہ تورات میں نبی اکرم ﷺ

کے اوصاف اور آپ کی تشریف آوری کے اشارے موجود ہیں۔ لہٰذا جس نے اس نبی کو مانا اُس نے تورات کو مانا اور جس نے اس نبی کی تکذیب اور انکار کیا اُس نے تورات کی تکذیب اور انکار کیا۔

اس اشکال کا جواب کہ اہلِ مکہ پہلے کفر کر چکے تھے تو پھر یہودیوں کو پہلے کفر کرنے والے کیسے فرمایا گیا؟

فرمایا: ﴿ وَلَا تَكُونُوٓا۟ أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ ﴾ تم اس کتاب کے پہلے منکر نہ بنو۔ یہ خطاب یہودیوں سے ہے۔ اور یہ آیت کعب بن اشرف اور دیگر سردارانِ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے یہودیو! تم اس قرآن کے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جب یہودیوں سے پہلے مکہ کے مشرکین اور دیگر لوگ قرآن کریم کا انکار کر چکے تھے تو زیرِ بحث آیت میں یہودیوں کو قرآن کریم کے پہلے انکار کرنے والے کیسے قرار دیا گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس آیت میں یہودیوں پر تعریض[۱۷۵] ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اے یہودیو! تم پر لازم تھا کہ سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ پر تم ایمان لاتے۔ کیونکہ تمہیں اُن کے اوصاف اور حُلیہ معلوم ہے۔ دوسرے لوگ (پہلے سے) نہیں جانتے اور تم اسی نبی کے وسیلے سے کافروں پر فتح حاصل کیا کرتے تھے لیکن جب اس نبی کی آمد ہوئی تو تم لوگ پھر گئے اور تمہارا معاملہ اُلٹ ہو گیا۔[۱۷۶] بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں میں تم لوگ (جنہیں سرداری حاصل ہے) نبی اکرم ﷺ کے سب سے پہلے مُنکر نہ بن جانا۔ ورنہ لوگ اس میں تمہاری پیروی کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اپنے انکار کا گناہ بھی ملے گا اور پیروی کرنے والوں کا بھی گناہ ملے گا۔

حصولِ دنیا کی خاطر یہودیوں کا حق کو چھپانا

﴿ وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا ﴾ میری آیات کے بدلہ میں معمولی قیمت نہ لو۔ سے مراد یہ ہے کہ تورات میں نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف ہیں اُن کو (خلط ملط) بیان کر کے ثمنِ قلیل نہ لو۔ ثمنِ قلیل سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کا قلیل اور معمولی معاوضہ نہ لو۔ (یہاں دُنیا کے معاوضہ کو قلیل اس لیے فرمایا کہ) آخرت کے اعتبار سے دُنیا اُس معمولی اور حقیر چیز کی مانند ہے جس کی کوئی قیمت نہ ہو۔ اور یہودی جو دُنیاوی معاوضہ لیا کرتے تھے وہ خود دُنیا کے مقابلہ میں معمولی تھا۔ یوں ان کا معاوضہ انتہائی قلیل ہوا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میری آیات کے عوض تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

واقعہ یہ تھا کہ کعب بن اشرف اور یہودیوں کے دیگر سرداران و علماء کو پس ماندہ اور جاہل طبقہ کی طرف سے کھانے پینے کا سامان ملتا تھا۔ اور اُن کی کھیتیوں، پھلوں، نقدیوں اور مویشیوں سے ہر سال ایک مخصوص حصہ وہ وصول کرتے تھے۔ اب اُنہیں یہ خطرہ ہوا کہ اگر ہم نے (سیدنا) محمد (ﷺ) کا حلیہ ان کے سامنے بیان کیا اور انہوں نے محمد (ﷺ) کی پیروی شروع کر دی تو ہماری روٹی پانی بند ہو جائے گی۔ اس خوف اور خطرہ کے پیشِ نظر ان یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف جلیلہ کو بدل دیا،

[۱۷۵] ''تعریض''، علم بلاغت کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ صریح جانب کو چھوڑ کر کلام کو ایک دوسری سمت پھیر دیا جائے۔ جیسے بہت ہی نقصان پہنچانے والے شخص سے یہ کہنا کہ ''خیر الناس من ینفع الناس'' (لوگوں میں بہترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کو نفع دے) اسی طرح زیرِ بحث آیت میں بھی بہ ظاہر یہودیوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پہلے کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ اور مراد یہ ہے کہ تمہیں سب سے پہلے ایمان لانا چاہیے۔

[۱۷۶] جیسا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

وَكَانُوا۟ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا۟ كَفَرُوا۟ بِهِۦ ۚ (البقرہ: ۸۹)

اور اس سے پہلے وہ (یہودی) اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح کی دُعا کیا کرتے تھے تو جب وہ جانا پہچانا رسول ان کے پاس تشریف لے آیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔

آپ کے نامِ مبارک کو چھپادیا' آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کو ترجیح دی اور کفر پر ڈٹ گئے۔

''تقوی'' اور ''رھبۃ'' کے لفظ میں معنوی فرق

﴿ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴾ اور مجھ ہی سے ڈرو۔یعنی محمد ﷺ کے معاملہ میں مجھ سے ڈرو۔(''فاتقون'' ''تقویٰ'' سے ہے) اور تقویٰ کا لفظ معنیٰ کے اعتبار سے ''رَھْبَۃ'' کے قریب ہے (یعنی دونوں کا معنیٰ ڈرنا ہے)۔لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''رھبۃ'' اُس خوف کو کہتے ہیں جس میں غم اور بے چینی بھی ہو۔جبکہ تقویٰ کا معنیٰ ہے:

جعل النفس في وقاية مما تخاف. جس چیز سے خوف آئے اُس سے اپنا بچاؤ کرنا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور تم حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ O

حق کو باطل کے ساتھ ملانے کی تفسیر اور حق بات کو چھپانے کی مذمت

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ یعنی تورات میں تم وہ باتیں شامل نہ کرو جو اس میں نہیں ہیں۔اگر تم ایسا کرو گے تو جو سچی باتیں ہم نے نازل کی ہیں وہ تمہاری لکھی ہوئی غلط باتوں کے ساتھ مل جائیں گی۔بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ تورات میں جو حق بات یعنی نبی اکرم ﷺ کے اوصاف نازل کیے گئے ہیں اُنہیں تم تبدیل کر کے اپنی لکھی ہوئی غلط باتوں کے ساتھ نہ ملاؤ۔بعض مفسرین نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ محمد ﷺ کے اوصاف جو کہ حق ہیں' اُنہیں دجال کے باطل اوصاف کے ساتھ نہ ملاؤ۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی تو یہودی حسد کا شکار ہو گئے اور کہنے لگے کہ ''یہ تو وہی ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے اور یہ مسیح بن داؤد یعنی دجّال ہے''۔(العیاذ باللہ) آیتِ مبارکہ میں اُنہیں اس بات میں جھٹلایا گیا۔

﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کی جانب سے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔☆ اس آیت میں ساری مخلوق کو حق بات چھپانے سے ڈرایا جا رہا ہے۔اگرچہ اس میں خطاب مخصوص لوگوں سے ہے لیکن اس کا پیغام سب کے لیے ہے۔[۱۷۷] ہر شخص پر لازم اور ضروری ہے کہ وہ نہ تو حق کو باطل کے ساتھ ملائے نہ ہی حق کو چھپائے۔کیونکہ یہ نقصان اور فساد کا باعث ہے۔☆ اس آیت میں اس مسئلہ کی بھی دلیل ہے کہ حق جاننے والے پر حق کو ظاہر کرنا واجب ہے اور اس کا چھپانا حرام ہے۔[۱۷۸]

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور تم صحیح طریقہ سے نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو O

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ نماز قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ پانچوں نمازوں کو اُن کے اوقات' اُن کی پابندیوں اور اُن کے تمام ارکان کے ساتھ قائم کرو۔اور زکوٰۃ دینے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مال میں جو زکوٰۃ تم پر فرض کی گئی ہے اس کو ادا کرو۔

---

۱۷۷ کیونکہ اصول ہے کہ ''العبرة لعموم اللفظ لالخصوص السبب''. یعنی اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔

۱۷۸ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو پھر اُس کو وہ چھپائے (یعنی نہ بتائے) تو قیامت کے دن اُس شخص کو آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

(سنن ترمذی: ۲۶۴۹' سنن ابوداؤد: ۳۶۵۸' سنن ابن ماجہ: ۲۶۱' مشکوٰۃ ص ۳۴)

نماز کو رکوع سے تعبیر کرنے کی توجیہ اور ''واركعوا'' کے مخاطبین کا بیان

﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ مراد یہ ہے کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تم نماز پڑھو۔ نماز پڑھنے والوں سے مراد نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔

اس آیت میں نماز کو رکوع سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ رکوع نماز ہی کا ایک رُکن ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے فرمایا کہ تم رکوع والی نماز پڑھا کرو۔ اسی معنیٰ کی وجہ سے ''اقیموا الصلوۃ'' کے بعد اللہ تعالیٰ نے ''واركعوا'' فرمایا۔ کیونکہ ''اقیموا الصلوۃ'' میں سب سے خطاب ہے اور ''واركعوا'' میں مخصوص لوگوں سے یعنی یہودیوں سے خطاب ہے۔

☆ زیر بحث جملہ ''واركعوا مع الراكعين'' میں یہ نکتہ ہے کہ اس میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی ترغیب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جماعت میں نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ نماز ادا کیا کرو۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

کیا تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ O

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ ﴾ اس آیت میں جو سوالیہ انداز ہے وہ تقریر کے لیے ہے (یعنی دعویٰ کو پختہ طریقہ سے ثابت کرنے کے لیے ہے) اور ساتھ ہی یہودیوں کی سرزنش اور اُن کی حالت پر تعجب کے لیے ہے۔ ''بِــرّ'' کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ ایک ایسا اسم ہے کہ نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں کو شامل ہے۔

آیت کے واقعۂ نزول میں علماء کے مختلف اقوال کا بیان

مذکورہ آیت مبارکہ یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ جب کسی یہودی عالم سے اس کا کوئی قریبی اور حلیف (وعدہ شریک) مسلمان نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پوچھتا تو وہ عالم اس کو تلقین کرتا کہ تم محمد (ﷺ) کے دین پر قائم رہو کیونکہ ان کا دین حق ہے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ سچ ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے عرب کے مشرکین سے کہا کہ ایک رسول تم میں سے ظاہر ہونے والا ہے اور وہ تمہیں خیر کی طرف بلائے گا۔ اس طرح کی باتوں سے وہ مشرکین کو نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا شوق دلاتے تھے۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو حضور سے خود جلنے لگے اور آپ کا انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں یہودیوں کی سرزنش فرمائی ہے کہ کہاں یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے ہی لوگوں کو آپ کی اتباع اور پیروی کا حکم دیتے تھے اور جب نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو خود انہوں نے ہی حضور کو چھوڑ دیا اور آپ سے منہ پھیر لیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودی علماء لوگوں کو اطاعت و فرمانبرداری، نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی اور مختلف نیک اعمال کا حکم دیتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں ان کی سرزنش فرمائی ہے۔

﴿ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ مراد یہ ہے کہ تم اُن باتوں سے منہ پھیرتے ہو جن میں تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ ''نِسیان'' اُس بھول چوک کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے معلوم ہونے کے بعد صادر ہو۔ ''وتنسون انفسكم'' کا مفہوم یہ ہے کہ (تم دوسروں کو اسلام کی تلقین کرتے ہو) اور اپنے آپ کو چھوڑ دیتے ہو اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی نہیں کرتے۔

کتاب کی تلاوت سے مراد یہ ہے کہ تم تورات کو پڑھتے ہو۔ اور دیکھتے نہیں کہ اس میں جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کے اوصاف کا بیان ہے وہاں نیک کاموں کے کرنے اور گناہ کے کاموں سے مُنہ پھیرنے کی ترغیب بھی موجود ہے۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (کیا تم نہیں سمجھتے کہ) محمد مصطفیٰ ﷺ حق ہیں اور تمہیں اُن کی پیروی کرنی چاہیے؟

عقل کی حقیقت کا بیان

عقل ایک ایسی قوت کا نام ہے جو آدمی میں قُبولِ علم کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور اُس قوت کی بناء پر آدمی جو علم حاصل کرتا ہے اُسے عقل کہا جاتا ہے۔ اسی سے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے یہ اشعار ہیں:

وان العقل عقلان	فمطبوع و مسموع	عقل دو قسم کی ہوتی ہے' ایک عقل مطبوع اور دوسری عقل مسموع۔
ولا ینفع مطبوع	اذا لم یک مسموع	عقل مطبوع اُس وقت تک فائدہ نہیں دیتی جب تک کہ آدمی میں عقل مسموع نہ ہو۔[۱۷۹]
کما لا تنفع الشمس	وضوء العین ممنوع	جیسا کہ سورج بھی اُس وقت فائدہ نہیں دیتا جب آنکھ میں روشنی موجود نہ ہو۔

عقل کا اصل معنیٰ ہے: روکنا۔ کیونکہ یہ ''عِقَالُ الدَّابَّۃ'' سے مأخوذ ہے۔ (یعنی جانور کو باندھنے کی رسّی) جس طرح اونٹ کو رسّی سے اس لیے باندھا جاتا ہے تا کہ وہ بدکنے سے باز رہے اسی طرح عقل بھی آدمی کو کفر و انکار اور بُرے کاموں سے منع کرتی ہے۔

آیت مذکورہ کا مفہوم اور اپنے عمل کے خلاف تقریریں کرنے کے دُنیاوی اور اُخروی نقصانات

نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ کسی آدمی کو فائدہ حاصل کرنے کی راہ دکھادی جائے اور نقصان کا شکار کرنے والی باتوں سے بچالیا جائے۔ لیکن دوسروں کو نیک بنانے اور اُن کے ساتھ نیکی کرنے سے زیادہ

---

۱۷۹ عقل مطبوع سے مراد عقل فطری ہے اور عقل مسموع سے مراد عقل کسبی ہے۔ عقل مطبوع یا عقل فطری اس قوت کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر آدمی مختلف چیزوں کو جاننا پہچانتا ہے اور اُن میں فرق کرتا ہے۔ یہ قوت اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں ابتداء سے ایک مخصوص مقدار میں رکھی ہے' کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ اسی لیے اس کو عقل مطبوع یا عقل طبعی کہتے ہیں۔ جبکہ عقل مسموع یا عقل کسبی سمجھ بوجھ کی اُس قوت کو کہتے ہیں جو اہل عقل کی مجلس میں بیٹھنے سے یا علم حاصل کرنے سے یا مختلف تجربوں سے حاصل ہوتی ہے۔ (لغات الحدیث' کتاب العین المہملۃ از شیخ وحید الزماں حیدر آبادی) امام راغب اصفہانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت میں یہ فرمایا ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے اس سے عقل مسموع (یعنی عقل کسبی) کی نفی مراد ہوتی ہے۔ (المفردات ص ۳۴۵) جیسا کہ زیر بحث آیت البقرہ: ۴۴ کے اختتام پر علماء یہود کے بارے میں فرمایا: ''کیا تم عقل نہیں رکھتے''۔ یعنی علماء یہود عقل مسموع نہیں رکھتے اور جب عقل مسموع نہیں رکھتے تو اُن کے لیے اُن کی عقلِ مطبوع بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ واضح رہے کہ بعض کتابوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیر بحث اشعار میں اس طرح ہے کہ ''عقل مسموع اس وقت تک فائدہ نہیں دیتی جب تک کہ آدمی میں عقل مطبوع نہ ہو''۔ اس صورت میں آیت کی تشریح یہ ہوگی کہ علماء یہود میں عقل طبعی موجود تھی اور جب عقل طبعی موجود تھی تو ان پر عقل سمعی کا حصول لازم تھا' مگر انہوں نے جب عقل سمعی کو حاصل نہیں کیا تو گویا وہ عقل سے بالکل کورے ہیں اور اس معنیٰ میں اُن کے اندر عقل طبعی موجود نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم (ھذا ما افادنی الاستاذ العلام المفتی محمد الیاس الرضوی الاشرفی شکر اللہ سعیہ وجزاہ خیرا فی الدارین)

بہتر یہ ہے کہ آدمی پہلے اپنے آپ کو نیک بنائے اور اپنے ساتھ بھلائی کرے۔ کیونکہ آدمی کا دوسروں کو نصیحتیں کرتے رہنا اور خود نصیحت حاصل نہ کرنا ایک متضاد کام کرنے کے مترادف ہے جو کہ عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔اسی نکتہ کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں اختتام پر فرمایا کہ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اُس کی تقریر اور نصیحت لوگوں کے دل میں اُتر جائے۔اس لیے اگر اُس کی تقریر اور نصیحت اس کے اپنے عمل کے خلاف ہوگی تو یہ (مؤثر ہونے کی بجائے) لوگوں کے لیے دِلی طور پر قبول نصیحت سے دُوری کا سبب ہوگی۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(٩٨) قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا تو اُس کی آنتیں باہر آ کر آگ میں گر جائیں گی اور وہ اس طرح گھوم رہا ہوگا جس طرح گدھا چکی کے اردگرد گھومتا ہے۔اہل جہنم اُس کے پاس جمع ہو کر اُس سے پوچھیں گے: اے فلاں! یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا تم ہمیں نیکی کا حکم اور بُرائیوں سے منع نہیں کیا کرتے تھے؟ وہ کہے گا کہ میں تم لوگوں کو نیکی کا حکم تو دیا کرتا تھا لیکن خود اس کام کو نہیں کرتا تھا اور بُرائیوں سے تمہیں منع کیا کرتا تھا لیکن خود اس کام میں ملوث ہوتا تھا۔[١٨٠] (صحیح بخاری: ٣٢٦٧، صحیح مسلم: ٢٩٨٩، شرح السنۃ: ٤١٥٧، مسند احمد ج ٥ ص ٢٠٦، مشکوٰۃ: ٥١٣٩۔ص ٤٣٦)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ "فتندلق" آیا ہے، اس کا معنیٰ ہے: نکل آنا۔ اور ایک لفظ "اقتاب" ہے، اس کا معنیٰ آنتیں ہے۔اس کا واحد "قِتبٌ" ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٩٩) مجھے معراج کی رات ایسے لوگ دکھائے گئے جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی امت کے خطباء اور مقررین ہیں جو لوگوں کا نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے، حالانکہ یہ کتاب پڑھا کرتے تھے۔[١٨١]

(تفسیر البغوی زیر بحث آیت مبارکہ، شرح السنۃ: ٤١٥٨، مسند احمد ج ٣ ص ١٢٠، مشکوٰۃ المصابیح: ٥١٤٩۔ص ٤٣٨)

---

١٨٠ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کرنے والے کو خود باعمل اور نیک ہونا چاہیے۔جو شخص دوسروں کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور بُرائیوں سے منع کرتا ہے اور خود اُن باتوں پر عمل نہیں کرتا وہ اپنے قول وفعل میں تضاد کا شکار ہے اور اللہ عزوجل کی سخت ناراضگی کا مستحق ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ (الصف: ٣۔٢) اے ایمان والو! تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے، اللہ کے نزدیک بہت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ باتیں کہو جو خود کرتے نہیں ہو۔

زیر بحث حدیث اور مذکورہ آیت مبارکہ کا منشاء یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو جن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اُن پر خود عمل نہ کرنا اللہ عزوجل کی ناراضگی کا باعث ہے۔اس آیت یا حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو آدمی عمل نہ کرتا ہو اُس کا نیکی کی تبلیغ کرنا ہی جائز نہیں ہے۔نیکی کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔البتہ آدمی اگر خود عمل نہیں کرتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اپنی اصلاح کرے اور خود بھی اپنی تبلیغ پر عمل کرے۔(شرح صحیح مسلم ج ٧ ص ٩٢١)

١٨١ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ نے مزید دو احادیث ذکر کی ہیں جن میں بے عمل عالم کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اُس عالم کو ہوگا جس کو اُس کے علم نے کوئی فائدہ نہیں دیا۔(المعجم الصغیر للطبرانی ج ١ ص ١٨٣، مجمع الزوائد ج ١ ص ١٨٥، جمع الجوامع: ٣٠٨٠) دوسری حدیث یہ ہے کہ جاہل آدمی کے لیے ایک مرتبہ ہلاکت ہے اور عالم کے لیے سات مرتبہ ہلاکت ہے۔(مرقات ج ٨ ص ٨٨٢)

علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کو نیکی کی تعلیم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے وہ چراغ کی طرح ہے جو دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے اور خود کو جلاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص (صرف) زبان کے ذریعہ لوگوں کو نصیحت کرتا ہے اُس کا کلام بیکار جاتا ہے اور جو اپنے عمل کے ذریعہ نصیحت کرتا ہے اس کے تیر پار ہو جاتے ہیں۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے کہ:

ابداء بنفسک فانهها عن غیّها فاذا انتهت عنه فانت حکیم

فهناک یسمع ما تقول ویقتدی بالقول منک وینفع التعلیم

(۱) عمل کا آغاز اپنے نفس سے کرو اور نفس کو گمراہ ہونے سے روکو۔ جب نفس گمراہی سے باز آ جائے گا تو تم دانا ہو جاؤ گے۔

(۲) اور اسی صورت میں تمہاری بات سُنی جائے گی اور اس کی پیروی کی جائے گی اور اسی صورت میں دوسروں کو تعلیم دینا فائدہ مند ہوگا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور تم صبر اور نماز سے مدد لو اور بے شک نماز ضرور (سب پر) بھاری ہے سوائے ان لوگوں کے جو (دل سے اللہ کی طرف) جھکتے ہیں، جنہیں یہ یقین ہے کہ بلاشبہ اُنہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اُسی کی طرف لوٹنا ہے O

آیت مذکورہ کے مخاطبین کے بارے میں دو مختلف اقوال کی وضاحت اور ہر دو قول پر آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ اس آیت میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ کیونکہ جو شخص دین محمدی کی مخالفت کی وجہ سے نماز اور صبر کا منکر ہو اُس کو نہیں کہا جائے گا کہ تم صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس آیت کا مُخاطَب اُن لوگوں کو قرار دیا جائے جو نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کرنے والے اور آپ پر ایمان لانے والے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت مبارکہ کے مخاطبین بنی اسرائیل ہوں۔ کیونکہ اُن کے علاوہ کسی اور کو مخاطب قرار دینے سے نظم قرآن میں خلل لازم آیا ہے، مزید یہ کہ یہودی بھی اصل نماز اور صبر کے منکر نہیں تھے البتہ اُن کی نماز مسلمانوں کی نماز سے مختلف تھی۔ (اس لیے آیت کا مُخاطَب بنی اسرائیل کو (یعنی یہودیوں کو) قرار دینا ممکن ہے۔) اس قول کی صورت میں آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوگا: اللہ تعالیٰ نے جب یہودیوں کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے، آپ کی شریعت کی پیروی کرنے، حکومت کو خیر باد کہنے اور عزت و دولت کی ہوس کو ترک کرنے کا حکم دیا تو اُنہیں فرمایا کہ صبر سے مدد لو یعنی اپنے نفس کو خواہشات سے روکو۔ اور اگر تم اس کے ساتھ نماز بھی ملا لو تو حکومت اور عزت و دولت کی ہوس کو چھوڑنا تم پر آسان ہو جائے گا۔

پہلا جو قول ذکر کیا گیا تھا اس کے مطابق آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم اپنی حاجتوں میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جن مصائب نے تمہیں پریشان کیا ہوا ہے اُن کے حل کے لیے اور ایک قول کے مطابق طلبِ آخرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔

صبر کا معنیٰ اور صبر و نماز سے مدد لینے کا بیان

صبر کا معنیٰ ہے: نفس کو خواہشات سے روکنا اور گناہوں کو ترک کرنا۔ آیت مبارکہ میں جو فرمایا کہ ''صبر سے مدد لو'' اس کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ فرائض کو ادا کرنے میں صبر سے مدد لو۔ (یعنی فرائض کی ادائیگی میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔) بعض کا قول یہ ہے کہ صبر سے مراد روزہ ہے۔ کیونکہ روزہ میں نفس کو اُن تمام باتوں سے روکا جاتا ہے جو روزہ

کے منافی ہیں اور جملہ خواہشات سے بھی روکا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ روزہ میں نفس عاجز اور پست ہو جاتا ہے۔

آیت میں نماز سے مدد لینے کا جو حکم دیا گیا ہے اُس سے مراد یہ ہے کہ تم صبر اور نماز دونوں کو جمع کرو (اور دونوں سے مدد طلب کرو)۔ بعض مفسرین نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ نماز اور وہ تمام چیزیں جو نماز میں ضروری ہیں یعنی نیت کو درست کرنا' دل کو حاضر رکھنا اور خشوع وخشیت (عاجزی اور خوف) کے ساتھ نماز کے تمام ارکان اور آداب کو بجالانا' ان سب پر تم صبر کے ذریعہ مدد طلب کرو (یعنی ان اُمور کے حصول میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو)۔ کیونکہ جو شخص نماز میں مشغول ہوتا ہے وہ نماز کے سوا ہر چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی مشکل معاملہ پیش آتا تھا تو آپ نماز کی پناہ لیا کرتے تھے۔ (سنن ابوداؤد: ۱۳۱۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سفر کے دوران اپنے بھائی قُثم کے انتقال کی خبر ملی آپ نے ''انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون'' پڑھا اور ایک طرف کو اُتر کر دو رکعت نماز ادا فرمائی اور ان میں طویل سجدہ کیا۔ پھر یہ کہتے ہوئے اپنی سواری کی طرف بڑھ گئے: ''فاستعینوا بالصبر والصلوۃ'' (صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو)۔

(جامع البیان للطبری: ۸۵۲' شعب الایمان للبیہقی: ۹۶۸۲' الدر المنثور للامام السیوطی ج ا ص ۱۳۱)

اختتام پر فرمایا: ﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾ بے شک وہ خاشعین کے سوا سب پر بھاری ہے۔ یعنی نماز سب پر بھاری ہے اور ایک قول کے مطابق مدد لینا بھاری ہے۔ ﴿ الْخٰشِعِيْنَ ﴾ سے مراد اہل ایمان ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے ڈرنے والے مُراد ہیں اور ایک قول کے مطابق اس سے اطاعت کرنے والے اور اللہ عزوجل کے حضور عاجزی کرنے والے مراد ہیں (یعنی نماز یا استعانت اہل ایمان پر' ڈرنے والوں پر' اطاعت گزاروں پر اور اللہ عزوجل کے حضور عاجزی کرنے والوں پر دشوار نہیں ہے)۔

خشوع کا معنیٰ اور خشوع وخضوع اختیار کرنے کا فائدہ

''خشوع'' کا اصل معنیٰ ہے: سکون پذیر ہونا۔ خشوع وخضوع والا شخص بھی عبادت سے سکون حاصل کرتا ہے اس لیے اُسے خاشع کہتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خشوع کا معنیٰ ہے: عاجزی کرنا۔ زیادہ تر یہ لفظ جوارح (ظاہری اعضاء) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(زیرِ بحث آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ) جو خشوع وخضوع والے نہیں ہیں اُن پر نماز بھاری ہوتی ہے۔ کیونکہ جو شخص نماز کی ادائیگی پر اجر وثواب کی امید نہ رکھتا ہو اور نماز کو ترک کرنے پر عذاب سے نہ ڈرتا ہو اُسی پر نماز بھاری ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف خشوع وخضوع والا شخص جو کہ نماز پڑھنے پر ثواب کی امید رکھتا ہے اور نماز کو ترک کرنے پر اللہ عزوجل کے عذاب سے ڈرتا ہے اس پر نماز بالکل سہل اور آسان ہوتی ہے۔

﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: وہ لوگ جانتے ہیں۔ ﴿ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔

☆ اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت میں مسلمانوں کو اللہ عزوجل کا دیدار ہوگا۔[۱۸۲]

﴿ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ موت کے بعد اللہ عزوجل کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پھر وہ اُنہیں اُن

---

۱۸۲ جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ کچھ چہرے قیامت کے دن تر وتازہ ہوں گے ۝ اور اللہ تعالیٰ کی جانب دیکھ رہے ہوں گے ۝ (القیامۃ: ۲۳۔۲۴)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ بلاشبہ تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو (یعنی چودھویں کے چاند کو۔) اور تمہیں دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ (بخاری: ۵۵۴' مسلم: ۶۳۳' مشکوٰۃ ص ۵۰۰' مطبوعہ کراچی)

کے اعمال کی جزاء عطا فرمائے گا۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

اے اولادِ یعقوب! میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ہے اور (اس بات کو یاد کرو) کہ میں نے تم کو (اس زمانہ کے) تمام لوگوں پر فضیلت دی تھی O

اس آیت میں ﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ ﴾ کو دوبارہ اس لیے ذکر فرمایا تا کہ یہودیوں پر حجت پختہ ہو جائے اور نبی اکرم ﷺ کی اتباع چھوڑنے سے اُنہیں ڈرایا جائے۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے زمانے کے جہانوں پر فضیلت دی۔ یہ فضیلت اگرچہ مُخاطبین کے آباء و اجداد کے حق میں تھی لیکن بہر حال آباء و اجداد کی فضیلت سے بیٹوں کو بھی شرف اور مقام حاصل ہوتا ہے اس لیے بیٹوں کو اس فضیلت کے یاد کرنے کا حکم فرمایا۔

وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کا کچھ بدلہ نہیں دے سکے گا اور نہ (بلا اِذنِ الٰہی) کسی کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ فدیہ لے کر کسی کی جان چھوڑی جائے گی اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی O

قیامت کے دن کسی کو بدلہ دینے' سفارش کرنے اور فدیہ دے کر جان چھڑانے سے عاجز ہونے کی تفسیر

﴿ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا ﴾ یعنی اُس دن کے عذاب سے ڈرو جب کوئی شخص کسی کو کچھ بدلہ نہیں دے سکے گا۔ یعنی کسی بھی شخص کا جو حق اُس پر لازم ہے وہ اس کو ادا نہیں کر سکے گا۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دِن کوئی کسی کا نائب نہیں ہوگا' کوئی کسی کی جگہ کچھ نہیں کرے گا اور کسی کی مصیبت کو کوئی دُور نہیں کرے گا۔ بلکہ آدمی اپنے بھائی اور والدین سے بھاگ رہا ہوگا۔

﴿ وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ ﴾ یعنی اُس دن کسی سے کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ مراد یہ ہے کہ کافر کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ اس بات کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ ہمارے آباء و اجداد ہماری شفاعت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس بات کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی سے کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

بعض مفسرین نے زیرِ بحث جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اُس دن نیک آدمی کی نیکیاں کسی گناہگار سے اُس کے واجبات کا بوجھ نہیں اُتار سکیں گی۔ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ کافر اگر کسی کو اپنا سفارشی بنا کر لائے گا تو اُس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

﴿ عَدۡلٌ ﴾ سے مراد فدیہ ہے۔ اور اس کا (لُغوی) معنٰی ہے: ''مماثلۃ الشیئ بالشیئ'' ایک چیز کا دوسری چیز کے برابر ہونا۔ (مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن کسی سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔) ﴿ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ کافروں کو عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔

وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب پہنچاتے تھے (یعنی) تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش یا بڑی نعمت تھی O

فرعون اور آلِ فرعون کا مفہوم

﴿ وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ﴾ یعنی وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے اسلاف اور تمہارے آباء واجداد کو فرعونیوں سے نجات دی۔ آباء واجداد کی نجات کو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مُخاطبین پر نعمت اور احسان قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے اسلاف ہی کی نجات کی وجہ سے نجات ملی (ورنہ اگر وہ لوگ نجات نہ پاتے تو یہ لوگ بھی موجود نہ ہوتے)۔

''آل فرعون'' جو فرمایا' اس سے فرعون کے پیروکار اور اس کے ہم مذہب لوگ مُراد ہیں۔ (یہاں لفظ فرعون کے متعلق یہ بات واضح رہے کہ) قبطیوں اور عمالقہ میں سے جو بھی مصر کا بادشاہ ہوتا تھا اُس کو فرعون کہا جاتا تھا۔ یہاں جس فرعون کا ذکر ہے اُس کا نام ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ اس نے چار سو سال سے زیادہ عمر پائی۔

بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے مظالم کا بیان

﴿ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ﴾ اس میں ''یسومون'' سے مراد ہے: تکلیف دینا اور چکھانا۔ اور ''سوء العذاب'' سے مراد ہے: انتہائی سخت اور بدترین عذاب (یعنی وہ تمہیں تکلیفیں دیا کرتے تھے اور تمہیں انتہائی سخت اور بدترین عذاب چکھایا کرتے تھے)۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ تمہیں عذاب میں اِدھر اُدھر گھمایا کرتے تھے۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اپنا نوکر اور غلام بنا کر اُنہیں مختلف کاموں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قسم لوگوں کی وہ تھی جو تعمیرات اور کھیتی باڑی کرتی تھی اور ایک قسم وہ تھی جو فرعون کی خدمت پر مامور تھی اور جو لوگ کسی کام میں نہیں ہوتے تھے ان پر جزیہ اور ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔

ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ فرعون کے کام مختلف قسم کے لوگوں کے سپرد تھے۔ جو طاقت ور لوگ تھے وہ پہاڑوں سے سُتون اُتار کر لاتے تھے جس سے اُن کے ہاتھ اور گردنیں زخمی ہو گئیں اور اُن ستونوں کو کاٹنے اور اُنہیں منتقل کرنے کی وجہ سے اُن کی پیٹھیں جھک گئیں۔ دوسری قسم اُن لوگوں کی تھی جو پتھر اور گارا لاتے تھے اور فرعون کے لیے محلّات تعمیر کیا کرتے تھے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو اینٹیں بناتے اور پکاتے تھے اور ایک گروہ اُن لوگوں کا تھا جو بڑھئی اور لوہار تھے۔ باقی جو کمزور لوگ تھے ان پر ٹیکس عائد کیا جاتا تھا' جسے وہ روزانہ ادا کیا کرتے تھے۔ اور جو شخص سورج غروب ہونے سے پہلے ٹیکس ادا نہ کر پاتا اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ ایک مہینے تک باندھ دیئے جاتے۔ عورتیں ریشم کاتتے اور اس کو بُننے کا کام کرتی تھیں۔

فرعون کا بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرنا اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑنا

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ﴾ کی تفسیر خود آیت مبارکہ میں آگے موجود ہے۔ یعنی ﴿ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ﴾ فرعون کے سپاہی تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے خواب میں دیکھا کہ بیت المقدس سے آگ اُٹھی اور اس نے پورے مصر کو گھیر لیا اور بنی اسرائیل کے علاوہ ہر قبطی کو جلا دیا ہے۔ فرعون اس خواب کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا اور اس نے نجومیوں سے اس کی تعبیر معلوم کی تو انہوں نے بتایا کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہو گا جس کے ہاتھوں تیری ہلاکت ہو گی اور تیری بادشاہت کا زوال ہو گا۔ یہ تعبیر سن کر فرعون نے آرڈر جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور اس کام کے لیے اس نے دودھ پلانے والی عورتوں کو مقرر کر دیا' جو اس کام کو انجام دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طلب میں فرعون نے بارہ ہزار اور بعض کے بقول ستر

ہزار بچے مروا دیئے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے بوڑھے ایک ایک کر کے مرنے لگے تو قبطیوں کے سرداروں نے فرعون کے پاس آ کر کہا کہ بنی اسرائیل پر تو موت آ گئی' اُن کے چھوٹوں کو تم ذبح کر دیتے ہو اور بڑے بوڑھے مرے جا رہے ہیں۔ اگر یہ معاملہ اسی طرح جاری رہا تو سارے کام ہمیں کرنے پڑ جائیں گے۔ فرعون نے حکم جاری کیا کہ ایک سال لڑکے ذبح کیے جائیں اور ایک سال چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ جس سال ذبح نہیں ہونا تھا اس سال حضرت ہارون کی ولادت ہوئی اور جو سال ذبح کا تھا اس میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی۔

آیت کے آخر میں فرمایا: بے شک اس میں تمہارے رب کی جانب سے عظیم بلاء تھی۔ ﴿بَلَآءٌ﴾ سے مراد آزمائش اور امتحان ہے۔ بڑی نعمت کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سخت آزمائش کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ سخت آزمائش اللہ تعالیٰ اس لیے فرماتا ہے تاکہ وہ اپنے بندے کو نعمتیں دے کر اس کے شکر کا امتحان لے اور سختیوں میں مبتلا کر کے اس کے صبر کا امتحان لے۔ لہٰذا آیتِ مذکورہ میں اگر ﴿وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ﴾ سے فرعون کا کام کرنا مراد ہو تو ''بلاء'' کا معنیٰ آزمائش اور امتحان ہوگا اور اگر اس سے نجات مراد لی جائے یعنی فرعون سے نجات دینا تو ''بلاء'' کا معنیٰ نعمت ہوگا۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۰

اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر (کا پانی) چیر دیا' پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور آلِ فرعون (فرعون اور اس کے پیروکاروں) کو تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا○

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے سمندر کے بعض حصے کو بعض سے جُدا کر دیا اور تم لوگوں کے سمندر میں داخل ہونے کی وجہ سے ہم نے اس میں راستے بنا دیئے۔ سمندر کو ''بحر'' اس کی وسعت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

سمندر میں فرعونیوں کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے نجات پانے کا تفصیلی واقعہ[۱۸۳]

واقعہ یہ ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ وہ رات میں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چلے جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ صبح تک گھروں میں چراغ جلائے رکھیں اور قبطیوں سے زیورات اُدھار لے لیں تاکہ وہ زیورات ان کے پاس رہیں' یا پھر مال کی وجہ سے قبطی بھی پیچھے پیچھے آئیں گے۔ قبطیوں میں جو شخص بنی اسرائیل سے ولد الحرام تھا اور بنی اسرائیل میں جو شخص قبطیوں سے ولد الحرام تھا ان سب کو اللہ تعالیٰ نے نکال دیا؟ نتیجۃً ہر بچہ اپنے باپ تک پہنچ گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قبطیوں کو موت دے دی تو ان کا ہر نوجوان مر گیا اور قبطی ان مردوں کو دفنانے میں مشغول ہو گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بات جب فرعون کو معلوم ہوئی تو اس نے کہا کہ میں ان کی تلاش میں صبح مُرغ کی اذان کے ساتھ ہی نکل جاؤں گا۔ ہوا یہ کہ اُس رات مرغ نے اذان ہی نہیں دی اور موسیٰ علیہ السلام چھ لاکھ بیس ہزار بنی اسرائیلیوں کو ساتھ لے کر نکل گئے۔ ان میں بیس سال کے لڑکے اپنی کم سنی کی وجہ سے اور ساٹھ سال کے بوڑھے اپنے بڑھاپے کی وجہ سے شامل نہیں تھے (اس کے باوجود تعداد چھ لاکھ بیس ہزار تک تھی)۔ حالانکہ جس دن بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے تھے اس وقت وہ کل ۷۲ مرد و عورت تھے۔ جب بنی اسرائیل نے رات کے وقت چلنے کا ارادہ کیا تو میدانِ تیہ میں وہ گم ہو گئے اور اُنہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کو بلایا اور ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے وصال

[۱۸۳] اس تفصیلی واقعہ کے بارے میں تفسیر بغوی بیروت اور تفسیر قرطبی مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت کے مخرج اور محقق شیخ عبد الرزاق المہدی نے لکھا ہے یہ اسرائیلیات میں سے ہے اور ہمارے لیے یہ قابلِ استدلال نہیں ہے۔

کے وقت اپنے بھائیوں سے عہد لیا تھا کہ وہ مصر سے اس وقت تک نہ نکلیں جب تک اپنے ساتھ اپنے بھائی (حضرت یوسف) کو نہ لے لیں۔ اس وجہ سے ہم پر راستہ بند ہوگیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے حضرت یوسف کی قبر کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ آواز لگاتے ہوئے کھڑے ہوگئے کہ جو شخص بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر سے واقف ہے اس کو میں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ وہ مجھے اُن کی قبر بتا دے اور جسے اُن کی قبر کا علم نہ ہو اس کے کان میری آواز سُننے سے بہرے ہو جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ آواز لگاتے ہوئے ایک آدمی کے پاس سے گزر رہے تھے لیکن اُس آدمی کو یہ آواز نہ سُنائی دی۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک بڑھیا نے یہ آواز سُن لی۔ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر میں آپ کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بتادوں تو کیا آپ مجھے وہ چیز دے دیں گے جو میں آپ سے مانگوں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا اور فرمایا کہ جب تک میں اپنے رب سے اس کے بارے میں نہ پوچھ لوں اس وقت تک میں جواب نہیں دے سکتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم فرمادیا کہ اس بڑھیا کو وہ دے دو جو وہ مانگ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں ایک بوڑھی عورت ہوں' چلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے لیں اور مصر سے باہر لے جائیں' یہ میرا دنیاوی مقصد ہے اور آخرت میں جو میں آپ سے چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ جس مقام پر آپ سکونت پذیر ہوں اس میں میں بھی آپ کے ساتھ رہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر اس بڑھیا نے بتایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر دریائے نیل میں پانی کے بیچ میں ہے' آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان کی قبر سے پانی کو ہٹا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے وہاں سے پانی ہٹالیا۔ حضرت موسیٰ نے یہ دعا بھی کی کہ اللہ تعالیٰ طلوعِ فجر کو حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ سے فراغت تک مؤخر کردے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ کو کھود کر حضرت یوسف کو نکالا جو کہ سنگ مرمر کے ایک صندوق میں تھے' اُن کو اپنے ساتھ لیا اور شام لے جا کر دفنا دیا۔ اب بنی اسرائیل کے لیے راستہ کھل گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لے کر چل دیئے۔ اس وقت آپ بنی اسرائیل کی پچھلی جماعت میں اور حضرت ہارون اگلی جماعت میں تھے۔ پھر فرعون بنی اسرائیل کی تلاش میں ایک کروڑ سات لاکھ افراد کا لشکر لے کر نکلا' جس میں دیگر رنگوں کے علاوہ ستر ہزار سیاہ گھوڑے بھی شامل تھے اور بعض نے کہا ہے کہ اس لشکر میں ایک لاکھ سیاہ گھوڑے تھے۔ فرعون بڑی جماعت میں تھا اور ھامان لشکر کے اگلے حصے میں تھا۔ (ایک روایت اس طرح ہے کہ) فرعون ستر لاکھ افراد کی جماعت میں تھا' اس کے آگے دس کروڑ تیرانداز اور دس کروڑ جنگجو تھے اور دس کروڑ ایسے افراد تھے جو لوہے کے گرز لیے ہوئے تھے۔

اُدھر بنی اسرائیل چلتے چلتے سمندر تک پہنچے اور پانی بہت ہی زیادہ تھا۔ جب سورج روشن ہوا تو اچانک دیکھتے ہیں کہ فرعون اپنے لشکر سمیت چلا آرہا ہے۔ یہ پریشان ہو کر کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہم سے جو آپ نے وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے اور اب ہم کیا کریں؟ یہ فرعون ہمارے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اگر اُس نے ہمیں پکڑ لیا تو وہ ہمیں قتل کر ڈالے گا اور سامنے سمندر ہے' اس میں اگر ہم داخل ہوئے تو ڈوب جائیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ جب انہوں نے عصا مارا تو سمندر نے اُن کی اطاعت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اے موسیٰ! سمندر کو کنیت دو پھر عصا مارو۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے سمندر پر عصا مارا کہ اے ابوخالد! تو پھٹ جا۔ سو وہ پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند ہوگیا اور اس میں بارہ راستے نکل آئے۔ یعنی بنی اسرائیل کے (بارہ قبیلوں میں سے) ہر قبیلے کے لیے ایک راستہ تھا۔ اور پانی کا حال یہ تھا کہ ہر دو راستوں کے درمیان پہاڑ کی مانند بلند تھا۔ اور (مزید یہ کہ) اللہ تعالیٰ نے سمندر کی گہرائی میں ہوا اور دھوپ کو بھیج دیا جس سے وہ خشک ہوگیا اور بنی اسرائیل سمندر میں گھس گئے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے راستہ میں اس حالت پر تھا کہ اس کے اطراف میں بڑے پہاڑوں کی مانند پانی موجود تھا جس کی وجہ سے بعض بعض کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں خوف ہوا

اور ہر قبیلے کے افراد کہنے لگے کہ ہمارے بھائی ہلاک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کے اُن پہاڑوں کی طرف وحی فرمائی کہ تم ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاؤ۔ وہ نزدیک ہوئے تو پانی اس طرح ہو گیا جیسے کھڑکی۔ بعض بعض کو دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کی گفتگو سننے لگے۔ یہاں تک کہ سلامتی کے ساتھ انہوں نے سمندر کو پار کر لیا اور یہی اللہ عزوجل نے مذکورہ آیت میں فرمایا کہ ''واذ فرقنا بکم البحر'' اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا۔

﴿ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ﴾ یعنی ہم نے تمہیں فرعون سے نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرعون جب سمندر کے قریب پہنچا تو اس نے سمندر کو پھٹا ہوا پایا۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنی قوم سے کہا کہ سمندر کو دیکھو' کس طرح میری ہیبت سے پھٹ گیا ہے تاکہ میں بھاگے ہوئے غلاموں کو پکڑ لوں۔ تم سمندر میں گھس جاؤ۔ جب فرعون نے سمندر میں داخل ہونے کا کہا تو اس کی قوم ڈر گئی اور ایک روایت کے مطابق فرعون سے کہنے لگی کہ اگر تم رب ہو تو پہلے تم سمندر میں جاؤ جیسے موسیٰ (علیہ السلام) اندر گئے۔ فرعون اس وقت سیاہ گھوڑے پر تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی گھوڑی نہیں تھی۔ اچانک جبریل امین ایک شہوت بھری اونٹنی پر آئے اور فرعون سے آگے بڑھ کر سمندر میں داخل ہو گئے۔ جب فرعون کے سیاہ گھوڑے نے گھوڑی کی بُو سونگھی تو وہ اس کے پیچھے سمندر میں گھس گیا اور فرعون کچھ نہ کر سکا۔ پھر دوسرے گھوڑے بھی اس کے پیچھے پیچھے سمندر میں گھس گئے۔ حضرت میکائیل ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور فرعونیوں کو یہ کہتے ہوئے پیچھے سے ہانکنے لگے کہ جاؤ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جاؤ۔ (وہ آگے بڑھنے لگے) یہاں تک کہ سارے فرعونی سمندر میں گھس گئے اور جبریل امین باہر آ گئے۔ (جبریل امین کی اتباع میں) فرعونیوں کے پہلے گروہ نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم فرمایا کہ وہ ان کو پکڑ لے۔ سو سمندر ان پر موجیں مارنے لگا اور اس نے سارے فرعونیوں کو غرق کر دیا۔

مذکورہ سمندر کی وُسعت اور اس کے محل وقوع کا بیان اور بنی اسرائیل کے سامنے فرعونیوں کے غرق ہونے کی تفسیر

سمندر کے دونوں کناروں کے درمیان چار فرسخ کا فاصلہ تھا۔ اور یہ سمندر بحر قلزم ہے جو کہ بحر فارس کے کنارے پر ہے۔
ایک روایت یہ ہے کہ یہ ماوراءِ مصر ایک سمندر ہے جس کو اساف کہا جاتا ہے۔

فرعونیوں کو (مذکورہ سمندر میں) جو غرق کیا گیا وہ بنی اسرائیل کے سامنے کیا گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث آیت کے آخر میں) فرمایا: ﴿ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ یعنی ان کی ہلاکت کو اور ایک قول کے مطابق ان کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ سمندر اُنہیں اِدھر سے اُدھر پھینکتا رہا یہاں تک کہ لوگوں نے اُنہیں دیکھ لیا۔ یہ سارا واقعہ عاشوراء والے دن ہوا' اس لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے شکرِ خداوندی کے طور پر اُس دن کا روزہ رکھا۔[۱۸۴]

۱۸۴ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کو یوم عاشوراء (دس محرم) کا روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کہ اس دن میں کیا خاص بات ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ بہت عظیم دن ہے' اس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق فرما دیا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے شکرِ نعمت کے طور پر اس دن کا روزہ رکھا۔ اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کی بہ نسبت موسیٰ علیہ السلام کے ہم زیادہ حق دار ہیں اور ہمارا تعلق اُن کے ساتھ زیادہ ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اس دن کا روزہ رکھا اور صحابہ کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ (صحیح بخاری: ۲۰۰۴' صحیح مسلم: ۱۱۳۰' سنن ابوداؤد: ۲۴۴۴' سنن ابن ماجہ: ۱۷۳۴' صحیح ابن حبان: ۳۶۲۵' مصنف عبدالرزاق: ۷۸۴۳' مسند احمد ج ۱ ص ۲۹۱)

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دس محرم الحرام کے دن نجات عطا فرمائی وہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس دن اللہ عزوجل کی جانب سے کوئی خاص اور عظیم نعمت حاصل ہو اُس دن خوشی منانا جائز ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کے یوم ولادت کو عید میلاد کے طور پر منایا جاتا ہے۔

وَاِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا' پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑے کی پُوجا شروع کر دی اور تم (اپنے آپ پر) ظلم کر رہے تھے ○

اللہ عزوجل اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے باہمی وعدہ کی تفسیر اور لفظ موسیٰ کی تحقیق

﴿وٰعَدۡنَا﴾ ''مواعدہ'' سے بنا ہے (یعنی باہمی ایک دوسرے سے وعدہ کرنا)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ کا مطلب ہے حکم دینا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے وعدہ کا مطلب ہے قبول کرنا۔ یہاں جس وعدے کا ذکر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ (یعنی اُنہیں حکم) فرمایا کہ وہ مقررہ وقت پر آ جائیں۔

﴿مُوۡسٰی﴾ عبرانی زبان کا لفظ ہے' اس کو عربی بنایا گیا ہے۔ عبرانی زبان میں اس کا معنیٰ ہے: پانی اور درخت۔ آپ علیہ السلام کا نام موشیٰ رکھا گیا تھا کیونکہ آپ کو پانی اور درخت سے لیا گیا تھا' پھر موشیٰ کی شین کو سین سے بدل دیا تو یہ موسیٰ ہو گیا۔

چالیس راتیں گزارنے کی تفسیر

﴿اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً﴾ یعنی چالیس راتیں گزارنے کا وعدہ فرمایا۔ چالیس راتوں سے مراد تیس ذی القعدہ کی اور دس ذی الحجہ کی راتیں ہیں۔ (یہاں واضح رہے کہ اسلامی) تاریخ کا حساب رات سے چلتا ہے نہ کہ دن سے۔ کیونکہ اسلامی مہینے چاند کے طلوع وغروب کے مطابق وضع کیے گئے ہیں اور بعض نے وجہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ تاریکی روشنی پر مقدم ہے اس لیے تاریخ کا حساب رات سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق طُور پر موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لے جانے کا واقعہ[۱۸۵]

علماء بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سمندر سے نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق فرمایا اور اس وقت بنی اسرائیل کے پاس کتاب اور شریعت نہیں تھی جس تک وہ پہنچتے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ وہ آپ پر تورات کو نازل فرمائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں اپنے رب کے وعدے کی طرف جا رہا ہوں اور میں ضرور تمہارے پاس ایک ایسی کتاب لے کر آؤں گا جس میں ان تمام باتوں کا بیان ہو گا جو کرنے کی ہیں اور جو نہیں کرنے کی ہیں۔ آپ نے اپنی قوم سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا اور ان پر اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو نائب مقرر فرمایا۔ جب مقررہ وقت آ پہنچا تو جبریل امین علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کو لے جانے کے لیے ''حیات'' نامی گھوڑے پر آئے۔ وہ گھوڑا جس چیز سے ملتا تھا وہ چیز زندہ ہو جاتی تھی۔ جبریل امین کو سامری نے دیکھا اور سامری ایک سنار تھا جس کا نام میخا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بقول اس کا نام موسیٰ بن ظفر تھا۔ بعض کے نزدیک یہ اہل ماجرا' بعض کے نزدیک اہل کرمان اور بعض کے نزدیک بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کا رہنے والا تھا۔ اس کو السامرہ کہا جاتا تھا' (اصلاً) یہ منافق تھا اور بہ ظاہر مسلمان تھا۔ اور گائے کی پوجا کرنے والی قوم سے اس کا تعلق تھا۔ جب اس نے جبریل امین کو گھوڑے پر سوار دیکھا اور گھوڑے کے قدم کی جگہ کو دیکھا کہ وہ فوراً سبز ہو جاتی ہے تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ ضرور کوئی معاملہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جبریل امین جب فرعون کے پیچھے سمندر میں داخل ہوئے تو سامری نے گھوڑے کے قدم سے ایک مُشت مٹی لے لی اور اپنے دل میں یہ بات بٹھالی کہ اس مٹی کو جس چیز میں بھی ڈالا جائے گا وہ زندہ ہو جائے گی۔

۱۸۵؎ اس واقعہ کا تعلق بھی اسرائیلیات سے ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اپنے مقررہ وقت پر تشریف لے گئے اور کوہِ طور پر چالیس رات ٹھہرے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر زبرجد کی بنی ہوئی مختلف تختیوں میں تورات کو نازل فرمایا' اُن پر راز منکشف کرنے کے لیے اُنہیں اپنا قریبی بنایا اور اُنہیں قلموں کے چلنے کی آواز سنائی۔ بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں اس طرح گزاریں کہ اُنہیں کوئی حدث لاحق نہیں ہوا' یہاں تک کہ وہ طور سے نیچے تشریف لائے۔

بنی اسرائیل نے جب مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت اُنہوں نے قبطیوں سے بہت سارے زیورات شادی کی غرض سے بہ طور استعمال کے لیے ہوئے تھے۔ جب فرعون اور اس کی قوم ہلاک ہوگئی تو وہ زیورات بنی اسرائیل کے پاس باقی رہ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام (طور پر) تشریف لے گئے تو سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ جو زیورات تم لوگوں نے استعمال کرنے کے لیے قبطیوں سے لیے تھے وہ مالِ غنیمت ہیں اور تمہارے لیے حلال نہیں ہیں۔ لہٰذا تم لوگ ایک گڑھا کھودو اور اس میں ان زیورات کو دفن کردو۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں اور اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا تھا۔ جب تمام زیورات جمع ہوگئے تو سامری نے اُن زیورات کو لے کر اُن سے تین دن میں ایک بچھڑا بنادیا اور اس میں وہ مٹی ڈال دی جو اس نے جبریل امین کے گھوڑے کے قدم سے لی تھی۔ چنانچہ وہ سونے کا بنا ہوا جواہرات سے آراستہ اور آواز نکالنے والا بچھڑا بن گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ بچھڑا ڈکار لیتا تھا اور چلتا تھا۔ سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ بچھڑا تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے۔ جس کو اُنہوں نے یہاں چھوڑ دیا ہے اور اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ بنی اسرائیل نے وعدہ خلافی کی اور دن کو رات کے ساتھ ملا کر دو دو دن شمار کرنے لگے۔ اس طرح جب بیس دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام تشریف نہیں لائے تو لوگ فتنہ میں پڑ گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے تیس راتوں کا وعدہ فرمایا تھا' پھر اُن تیس میں دس کا اضافہ کیا گیا تو ان دس میں لوگ فتنہ میں پڑ گئے۔ چنانچہ جب تیس دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام تشریف نہیں لائے تو لوگوں نے گمان کیا کہ آپ وصال فرما چکے ہیں اور لوگوں نے بچھڑے کو دیکھا اور سامری کی باتیں سُنیں تو آٹھ ہزار آدمی اُس بچھڑے کو پوجنے لگے۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام اور بارہ ہزار افراد کے سوا تمام لوگ بچھڑے کو پوجنے لگے تھے۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی پھر تم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔ اور تم ظلم کرنے والے ہو یعنی تم گناہ کر کے اپنے آپ کو نقصان دینے والے ہو۔ اور گناہ یہ ہے کہ تم نے اُس کی عبادت کی جو عبادت کا اہل ہی نہیں ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر بھی ہم نے تمہیں اس کے بعد معافی دی تا کہ تم (ہمارا) احسان مانو O

﴿ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ یعنی تمہاری بچھڑے کی پوجا کے بعد (اور اس کے باوجود) ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹادیا اور تم سے درگزر فرمایا۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی میں نے تمہارے ساتھ جو درگزر اور بہترین سلوک کیا وہ اس لیے تا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

شکر کا معنیٰ' اس کی اقسام اور شکر کی حقیقت کا بیان

شکر کا اصل معنیٰ ہے: نعمت کو یاد کرنا اور اس کا اظہار کرنا۔ شکر کی ضد کفر ہے یعنی نعمت کو بھلا دینا اور اس کو چھپانا۔ شکر تین

طرح کا ہوتا ہے: (۱) شکرِ قلب یعنی نعمت کو یاد رکھنا (۲) شکرِ لسان یعنی زبان سے نعمت کی تعریف کرنا (۳) دیگر تمام اعضاء کے ذریعہ شکر یعنی جتنا نعمت کا استحقاق ہے اتنا اس پر بدلہ دینا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ شکر یہ ہے کہ خلوت اور جلوت دونوں میں تمام اعضاء کے ذریعہ (احکام شرعیہ کی) فرمانبرداری کی جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ شکر کرنے سے عاجز ہو جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کیا: الٰہی! تو نے مجھے کامل نعمتیں عطا فرمائیں اور (اُن پر) مجھے شکر ادا کرنے کا حکم دیا' حالانکہ تیری نعمتوں پر میرا شکر ادا کرنا خود تیری جانب سے ایک نعمت ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اے موسیٰ! تم نے سب سے بلند علم سیکھا ہے' اور مجھے میرے بندے کی جانب سے اتنا ہی بہت ہے کہ وہ یہ یقین رکھے کہ جو نعمت اُسے حاصل ہے وہ میری جانب سے ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: پاک ہے وہ ذات جس نے شکر سے عاجز ہونے کے اعتراف کو بھی ''شکر'' قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی معرفت سے عاجز ہونے کے اعتراف کو ''معرفت'' قرار دیا ہے۔ حضرت فضیل فرماتے ہیں کہ ہر نعمت کا شکر' یہ ہے کہ آدمی اُس نعمت کے ملنے کے بعد اللہ عزوجل کی نافرمانی نہ کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ نعمت کا شکر' یہ ہے کہ آدمی اس کو یاد رکھے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکر' یہ ہے کہ آدمی نعمت کو ہرگز نہ دیکھے بلکہ نعمت دینے والے کی طرف نگاہ رکھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اپنے سے بلند مرتبہ والے کا شکر' یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری اور تعریف کی جائے' اپنے ہمسر اور مساوی کا شکر' یہ ہے کہ اس کو (اس کے حسن سلوک کا) بدلہ دیا جائے اور اپنے سے کمتر کا شکر' یہ ہے کہ اُس پر احسان وانعام اور بھلائی کی جائے۔

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا (معجزہ) عطا کیا تا کہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو O

اس آیت میں ﴿اَلْكِتٰبَ﴾ سے مراد تورات ہے اور ﴿اَلْفُرْقَانَ﴾ سے متعلق بعض کا قول یہ ہے کہ یہ کتاب کی صفت ہے اور واؤ زائدہ ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ ایسی کتاب (ہم نے موسیٰ کو عطا کی) جو حلال وحرام اور کفر وایمان کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ فرقان سے مراد دشمنوں پر فتح ونصرت عطا کرنا ہے اور (اس صورت میں واؤ زائدہ نہیں ہے بلکہ) اصلیہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو تورات بھی عطا کی اور فتح ونصرت بھی عطا کی۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تا کہ تم تورات کے ذریعہ ہدایت پا جاؤ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم! بے شک تم لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے' لہٰذا تم اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں توبہ کرو اور ایک دوسرے کو قتل کرو' یہ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے' سو اللہ نے تمہاری توبہ کو قبول فرمایا' یقیناً وہی ہے جو بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے' مہربان ہے O

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی اُن سے حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے فرمایا:

﴿ یٰقَوۡمِ اِنَّکُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ بِاتِّخَاذِکُمُ الۡعِجۡلَ ﴾ اے میری قوم! بے شک تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اس میں بچھڑے کو بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو معبود بنا کر تم اس کو پوجتے ہو۔ گویا پھر ان کی قوم نے پوچھا کہ اب ہم کیا کریں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰی بَارِئِکُمۡ ﴾ یعنی تم توبہ کے ذریعہ اپنے خالق کی طرف لوٹ جاؤ۔ ان کی قوم نے عرض کیا: ہم کیسے توبہ کریں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ﴾ (تو تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو) یعنی تم میں سے جو شخص جرم سے بَری ہے وہ مجرم کو قتل کر دے۔

توبہ کی تفسیر قتل سے کرنے پر اور ارتداد سے توبہ کرنے کے باوجود قتل کا حکم دینے پر اشکال کا جواب

اگر یہ اعتراض ہو کہ توبہ کا معنیٰ تو ہے: بُرے کام پر نادم ہونا اور اُس کام کو آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا۔ اور یہ معنیٰ قتل میں نہیں پایا جاتا' تو پھر توبہ کی تفسیر قتل کے ذریعہ کرنا کیسے درست ہوگا؟

اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہاں قتل سے توبہ کی تفسیر مراد نہیں ہے بلکہ اس بات کو بیان کرنا مقصود ہے کہ ان (بچھڑا پوجنے والوں) کی توبہ اُسی وقت پوری ہوگی جب وہ ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی تھی کہ مرتد کی توبہ قتل ہی کے ذریعہ پوری ہوگی۔

اگر یہ اعتراض ہو کہ ارتداد (بے دینی) سے توبہ کرنے والا (شرعاً) قتل نہیں کیا جاتا تو پھر یہ لوگ قتل کے مستحق کیسے ہوگئے حالانکہ انہوں نے ارتداد سے توبہ کر لی تھی؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس حکم کا تعلق اُن احکامات سے ہے جن کے بارے میں شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا تقاضا یہ ہو کہ ارتداد سے توبہ کرنے والے کو بھی قتل کیا جائے گا' عام ازیں کہ یہ حکم سب کے حق میں عام ہو یا صرف ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے بچھڑے کو پوجا تھا۔

بنی اسرائیل کا ایک دوسرے کو قتل کرنے کا واقعہ

پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ عِنۡدَ بَارِئِکُمۡ ﴾ یعنی قتل کرنا اور اس تکلیف کو برداشت کرنا تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ موت آنی ہی آنی ہے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم فرمایا کہ ایک دوسرے کو قتل کرو تو لوگوں نے کہا کہ ہم اللہ عزوجل کے اس حکم پر صبر کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ حالتِ احتباء میں بیٹھ گئے۔ "احتباء" "حبوۃ" سے بنا ہے اور اس کا معنیٰ ہے: اس طرح بیٹھنا کہ کسی کپڑے کے ذریعہ پنڈلیوں کو پیٹ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ سو وہ اس حالت میں بیٹھ گئے اور اُن سے کہا گیا کہ جس نے بندھا ہوا کپڑا کھولا یا اپنے قاتل کی طرف نگاہ کی یا ہاتھ پاؤں کے ذریعہ قاتل سے اپنا بچاؤ کیا وہ ملعون ہے اور اس کی توبہ مردود ہوگی۔ (چنانچہ فرمانبرداری کرتے ہوئے) قوم نے اپنے خنجر اور تلواریں سونت لیں اور لوگ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ لیکن ہر شخص اپنے سامنے اپنے بیٹے' اپنے باپ' اپنے بھائی' اپنے رشتہ دار' اپنے دوست اور پڑوسی کو پاتا تو اس کا دل نرم پڑ جاتا۔ یوں اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنا ممکن نہ ہوا تو انہوں نے عرض کیا: اے موسیٰ (علیہ السلام)! اب ہم کیا کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ایک سیاہ بادل بھیجا جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ سو وہ شام تک ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ جب بہت سارے لوگ قتل ہوگئے تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دُعا اور گریہ وزاری کی اور عرض

گزار ہوئے کہ اے پروردگار! بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے' جو باقی بچے ہیں اُن کو قتل سے محفوظ فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اُس بادل کو دور کر دیا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ قتل سے رُک جائیں۔ جب وہ بادل دور ہوا تو (معلوم ہوا کہ) ہزاروں آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات تکلیف دہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ کیا اس بات سے آپ راضی نہیں ہیں کہ میں قاتل اور مقتول دونوں کو جنت میں داخل کر دوں اور ان میں سے جو مقتول ہوئے' وہ شہید ہیں اور جو قتل ہونے سے رہ گئے ان کے گناہ مٹا دیئے گئے ہیں۔

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے (آیت کے آخر میں) اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ مراد یہ ہے کہ تم نے اللہ کے حکم کو پورا کیا تو اس نے تم سے درگزر فرمایا۔ ﴿ تواب ﴾ کا معنیٰ ہے: مغفرت کے ساتھ بہت زیادہ رجوع کرنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا۔ اور ﴿ رحیم ﴾ کا معنیٰ ہے: اپنی مخلوق پر مہربان۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور جب تم لوگوں نے (اپنے نبی سے) کہا: اے موسیٰ! ہم آپ پر اُس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیں' سو (اس گستاخی پر) تم کو بجلی کی کڑک نے آلیا اور تم (اس منظر کو) دیکھ رہے تھے O

﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم ہرگز آپ کی تصدیق نہیں کریں گے۔ اور ﴿ جَهْرَةً ﴾ سے مراد ہے کھلم کھلا۔ (یعنی تم لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ جب تک ہم اللہ عزوجل کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں ہم آپ کی تصدیق نہیں کریں گے۔)

بنی اسرائیل کے ستّر بہترین افراد کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طُور پر جانے کا واقعہ

اس کا واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آئیں جو بچھڑے کو پوجنے پر میری بارگاہ میں معذرت کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بہترین افراد میں سے ستر افراد کو منتخب کیا اور ان سے فرمایا کہ تم روزے رکھو' خوب پاکیزگی حاصل کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے وعدے کے مطابق اُن افراد کو لے کر طُورِ سینَاء پر حاضر ہوئے۔ اُن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ ہمارے لیے دُعا فرمایئے کہ ہم بھی اپنے رب کا کلام سُنیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں (ایسا ہی) کروں گا۔ جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے قریب ہوئے تو اس پہاڑ پر بادل کا ستون آیا اور پورے پہاڑ پر چھا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس بادل میں داخل ہوئے اور اپنی جماعت سے فرمایا کہ تم قریب ہو جاؤ (وہ لوگ قریب ہوئے)۔ یہاں تک کہ بادل کے نیچے داخل ہوئے اور سجدہ میں گر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے رب سے کلام کیا تو ان کے چہرے پر اتنی چمکدار روشنی چھا گئی کہ کوئی اُنہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کے سامنے پردہ حائل تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ عزوجل جو کلام فرما رہا تھا اور جو اوامر و نواہی (کرنے نہ کرنے کے احکامات) اُنہیں عطا فرما رہا تھا وہ اس کو سُن رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان افراد کو سُنایا کہ ''بے شک میں عبادت کے لائق ہوں' میرے سوا کوئی اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے (اور) میں ہی طاقت والا ہوں۔ مضبوط طاقت کے ذریعہ میں نے تمہیں مصر کی زمین سے نجات عطا کی ہے۔ لہٰذا تم میری عبادت کیا کرو اور میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔ جب موسیٰ علیہ السلام فارغ ہوئے اور بادل چھٹ گئے تو موسیٰ علیہ السلام اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو آپ پر اُس وقت تک

ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہراً نہ دیکھ لیں۔

ان لوگوں نے اپنے جملہ میں ''جھرۃ'' کا اضافہ رؤیۃ کی تاکید کے لیے کیا تھا تا کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ رؤیۃ سے مراد علم ہے۔

﴿ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ﴾ (چنانچہ اس گستاخی پر تم کو بجلی کی کڑک نے آلیا۔) بعض علماء نے کہا ہے کہ ''صاعقہ'' سے مراد موت ہے۔ لیکن اس قول میں ضُعف ہے کیونکہ (آیت کا اگلا حصہ) ''وانتم تنظرون'' اس کی تردید کر رہا ہے۔ اس لیے کہ اگر ''صاعقہ'' سے مراد موت ہوتی تو اُن کا ''صاعقہ'' کو دیکھنا ممکن نہیں تھا (حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تم دیکھ رہے تھے)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''صاعقہ'' موت کا سبب ہے۔ اب علماء میں اختلاف ہے کہ سبب سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ آسمان سے ایک آگ نے آکر اُن افراد کو جلا دیا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ آسمان سے ایک سخت آواز آئی تھی۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی ایک جماعت بھیجی جن کی آہٹ ان افراد نے سُنی تو اس آہٹ سے یہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ مراد یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ اس کو کس طرح موت آتی ہے۔ جب (مذکورہ تمام) افراد ہلاک ہو گئے تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام رونے لگے اور گریہ وزاری کرنے لگے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: الٰہی! بنی اسرائیل کے بہترین لوگ ہلاک ہو گئے ہیں' جب میں بنی اسرائیل کے پاس جاؤں گا تو میں اُنہیں کیا کہوں گا؟

لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۚ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ (الاعراف:۱۵۵)	اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہلاک کر دیتا' کیا تو ہمیں اس (غلطی) کی وجہ سے ہلاک کرے گا جو ہم میں سے (چند) احمقوں نے کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام (اسی طرح) اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دعا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن تمام افراد کو یکے بعد دیگرے زندہ فرما دیا حالانکہ ان پر ایک دن اور ایک رات تک موت طاری رہی۔ (جب وہ زندہ کیے گئے تو) ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ کس طرح زندہ کیے جا رہے ہیں۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا:

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں دوبارہ زندہ کیا تا کہ تم (ہمارا) احسان مانو O

﴿ بعثنا ﴾ سے مراد ہے: زندہ کرنا۔ اور زندہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تا کہ تم اپنی بقیہ عمر اور بقیہ رزق پورا حاصل کر لو۔ (مذکورہ افراد پر عارضی موت طاری کی گئی تھی۔ کیونکہ) اگر انہوں نے اپنی پوری عمر گزار کر وفات پائی ہوتی تو انہیں قیامت تک زندہ نہ کیا جاتا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور بادل کو ہم نے تم پر سایہ فگن کیا اور (کھانے کے لیے) تم پر من و سلویٰ نازل کیا' اور (اور ہم نے تمہیں حکم دیا کہ) ہم نے جو تمہیں پاکیزہ چیزیں دی ہیں اُن کو کھاؤ (لیکن تم نے ذخیرہ اندوزی کی) اور (اس سے) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے البتہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے O

بنی اسرائیل پر بادل کے سایہ کرنے کا واقعہ

﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ﴾ یعنی میدان تیہ میں ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا' جو کہ تمہیں سورج کی گرمی سے بچاتا تھا۔
اس کا واقعہ یہ ہے کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اُنہیں (سورج سے) محفوظ رکھتی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز تھی جس سے وہ سایہ حاصل کرتے۔ اُنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اپنی پریشانی بیان کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک ایسا سفید باریک بادل بھیج دیا جو اُنہیں سورج کی گرمی سے بچاتا تھا اور اُن کے لیے نور کا ایک ایسا ستون بنادیا کہ رات میں جب چاند نہ ہوتو وہ اُنہیں روشنی پہنچایا کرتا تھا۔

منّ وسلویٰ کا معنیٰ اور بنی اسرائیل پر ان کے نازل ہونے کا بیان

﴿من و سلوی﴾ کا نزول بھی میدانِ تیہ میں ہوا۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ "منّ" سے مراد ترنجبین ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ "منّ" گوند کی مانند کوئی چیز ہے جو درختوں پر گرتی تھی اور اس کا ذائقہ شہد کی طرح ہے۔ وہب کا قول یہ ہے کہ "منّ" سے پتلی روٹیاں مراد ہیں۔ اور "منّ" کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی محنت ومشقت کے بغیر محض اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرمادے۔

(۱۰۰) حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کُھنبی "منّ" کی ایک قسم[۱۸۶] ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفاء ہے۔[۱۸۷] (صحیح بخاری: ۴۴۷۸' صحیح مسلم: ۲۰۴۹' سنن الترمذی: ۲۰۶۷' سنن ابن ماجہ: ۳۴۵۵' شرح السنہ: ۲۸۹۰)

اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ "کماۃ" (کُھنبی) ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بغیر کسی شخص کی کوشش اور مشقت کے اُگا کر عطا فرماتا ہے اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے "منّ" بنی اسرائیل پر بغیر کسی محنت کے نازل ہوا کرتا تھا۔ اور اس حدیث میں جو فرمایا گیا کہ اس پودے کا پانی آنکھ کے لیے شفا کا باعث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے عرق کو دواؤں میں شامل کیا جاسکتا ہے جو کہ فائدہ مند ہے۔ یہ معنیٰ نہیں ہے کہ خالص اس کا عرق آنکھوں میں ڈال دیا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا عرق آنکھوں میں ٹپکانا فائدہ مند ہے لیکن مخصوص تکلیفوں میں۔ آنکھ کی ہر تکلیف میں اس کا استعمال درست نہیں ہے۔

بنی اسرائیل پر جو "منّ" نازل ہوتا تھا وہ سحر کے وقت سے لے کر سورج طلوع ہونے تک برف کی شکل میں ان کے درختوں پر نازل ہوتا تھا اور اس میں سے ہر شخص کے لیے ایک صاع (تقریباً چار کلو) مقرر ہوتا تھا۔ (جب ایک ہی غذا کھاتے کھاتے کافی دن گزر گئے تو) بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! ہمیں تو اس "منّ" کی مٹھاس نے مار ڈالا ہے' آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں گوشت کھلائے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر سلویٰ نازل فرمایا۔ یعنی بٹیر کی شکل کا ایک پرندہ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بٹیر ہی تھا۔ اس میں سے ہر شخص اپنے ایک دن اور ایک رات کی خوراک لے لیا کرتا تھا۔ اور چونکہ ہفتہ والے دن ان پر کچھ بھی نہیں اُترتا تھا اس لیے جمعہ کے دن ہر شخص دو دن کی خوراک لیا کرتا تھا۔

---

۱۸۶ برسات میں بھیگی لکڑی سے چھتری کی طرح ایک گھاس اُگ آتی ہے' اسے سانپ کی چھتری اور چتر مار بھی کہتے ہیں' بعض لوگ اس کی جڑیں پکا کر کھاتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ "منّ" کی ایک قسم ہے۔ یعنی جس طرح بنی اسرائیل کو بغیر کسی محنت اور مشقت کے "منّ" سے نوازا گیا اسی طرح کُھنبی بھی بغیر قیمت کے مل جانے والی ایک چیز ہے۔ (مراۃ المناجیح ج۶ص ۳۶_۲۱۲)

۱۸۷ علامہ ابوالعباس قرطبی المتوفی ۶۵۶ھ فرماتے ہیں کہ آنکھ کی گرمی کو دور کرنے کے لیے خالص اس کا پانی استعمال کرنا چاہیے اور اگر آنکھ کی کوئی اور بیماری کو دور کرنا مقصود ہوتو اس کے پانی کو کسی چیز کے ساتھ (مثلاً سرمہ وغیرہ کے ساتھ) ملا کر استعمال کرنا چاہیے۔
(المفہم ج۵ص ۳۲۴)

آگے فرمایا: ﴿ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم نے ان سے کہا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں حلال چیزیں دی ہیں اُن میں سے کھاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ (ان چیزوں کو) کل کے لیے جمع نہ کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور ذخیرہ اندوزی کی، جس کی وجہ سے ان کی غذاء میں کیڑے پڑ گئے اور وہ خراب ہو گئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے اس غذاء کو روک دیا۔

(۱۰۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا کبھی خراب نہ ہوتا اور گوشت کبھی بدبودار نہ ہوتا[۱۸۸] اور اگر حواء (علیہا السلام) نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے کبھی خیانت نہ کرتی۔[۱۸۹] (صحیح بخاری: ۳۳۹۹، صحیح مسلم: ۱۴۷۰، صحیح ابن حبان: ۱۴۲۶۹، مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۵، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۰)

آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا: ﴿ وَمَا ظَلَمُوْنَا ﴾ انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے حق کو کم نہیں کیا۔ ﴿ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔ یعنی حد سے زیادہ غذا لے کر اپنے آپ کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے، سو وہ میرے عذاب کے مستحق ہو گئے اور اس رزق سے محروم ہو گئے جو کسی قسم کے بوجھ، دنیاوی تھکاوٹ اور اُخروی حساب و کتاب کے بغیر اُن پر نازل ہوا کرتا تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸

اور (یاد کرو) جب ہم نے (تمہیں) حکم فرمایا کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو جتنا چاہو کھاؤ اور (اس کے) دروازے سے جھکتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا کہ ''حــطة'' (ہمارے گناہ معاف فرما) تو ہم تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے اور قریب ہے کہ نیکی کرنے والوں کو ہم مزید (اجر) دیں ۝

کون سی بستی میں بنی اسرائیل کو داخل ہونے کا حکم فرمایا گیا؟

بستی کو (عربی میں) ﴿قرية﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ لوگ اس میں مجتمع ہوتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ (مذکورہ آیت میں) ''قرية'' سے مراد مقام اریحاء ہے جو کہ جابر لوگوں کی بستی تھی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس بستی میں قوم عاد کے باقی ماندہ لوگ تھے جنہیں عمالقہ کہا جاتا ہے اور ان کا سردار عوج بن عنق تھا۔ اس قول کے مطابق (آیت مذکورہ میں بیان کی جانے والی بات کے) قائل حضرت یوشع بن نون ہوں گے کیونکہ انہوں نے ہی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد اریحاء کو فتح کیا اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام میدانِ تیہ میں انتقال فرما گئے تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''قرية'' سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور اس قول کے مطابق قائل حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ اور آیت کا معنی یہ ہوگا کہ چالیس سال

---

[۱۸۸] کیونکہ بنی اسرائیل کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ تمہیں جو پاکیزہ چیزیں دی گئی ہیں اُن کو کھاؤ۔ یعنی ان کو جمع کر کے نہ رکھو۔ لیکن انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور کھانے پینے کی چیزوں کو اسٹاک کرنا شروع کیا تو بطور سزا ان کے کھانے پینے کی چیزوں کو خراب اور بدبودار کر دیا گیا۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو کوئی کھانا کبھی خراب اور بدبودار نہ ہوتا۔

[۱۸۹] استاذ محترم علامہ غلام رسول صاحب سعیدی اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت حوا نے حضرت آدم کو ممنوعہ درخت سے کھانے کی ترغیب دی تھی اور خیانت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حوا نے شیطان کے وسوسہ کو قبول کر لیا تھا اور اس کے بہکانے میں آ گئی تھیں اور اپنے خیال میں حضرت آدم کی بہتری کے لیے انہیں اس درخت سے کھانے کی ترغیب دی تھی، یہ ان کی غلطی تھی، دانستہ غلط کاری نہیں تھی۔ اس پر خیانت کا اطلاق صورۃً اور مجازاً ہے، جیسے حضرت آدم کی بھول پر صورۃً اور مجازاً عصیان کا اطلاق آیا ہے۔ (''وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى'' طٰہٰ: ۱۲۱) اور چونکہ اولاد میں ماں باپ کا اثر ہوتا ہے اس لیے حوا کی بیٹیوں میں حسب استعداد اس خیانت کا اثر آ گیا۔ (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۰۰۲)

گزرنے کے بعد جب تم میدانِ تیہ سے نکلو تو بیت المقدس میں داخل ہو جانا۔

آگے فرمایا: پھر اُس میں جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو کھانا۔ ﴿رَغَدًا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم پر رزق کو کشادہ کر دیا گیا ہے۔ اور فرمایا کہ ''سر جھکائے ہوئے دروازے سے داخل ہو جانا''۔ اب جنہوں نے ''قـــريـة'' سے اریحاء کی بستی مراد لی ہے اُن کے نزدیک اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اس بستی کے جس دروازے سے چاہو داخل ہو جانا۔ اور اس بستی کے سات دروازے تھے۔ اور جنہوں نے ''قـــريـة'' سے بیت المقدس مراد لیا ہے اُن کے نزدیک اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم حِطّہ کے دروازے سے (بیت المقدس میں) داخل ہو جانا۔ ﴿سُجَّدًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم جھک کر، خضوع کے ساتھ اور انکساری کرتے ہوئے داخل ہونا جس طرح رکوع کرنے والا جھکتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

''حطة'' کہنے اور اس کے نتیجے میں خطاؤں کو بخشنے کی تفسیر

فرمایا: ﴿حِطَّةٌ﴾ کہتے ہوئے داخل ہونا۔ اس لفظ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم سے ہماری خطائیں ساقط فرما دے۔ اس سے بنی اسرائیل کو استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''حطة'' سے مراد یہ ہے کہ تم ''لا اله الا اللّٰه'' کہو کیونکہ یہ جملہ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔ اس صورت میں (''حطّة'' سے پہلے) ''مسألتنا'' مقدر ہوگا۔

﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم تمہاری خطاؤں پر ''غفر'' یعنی پردہ ڈال دیں گے اور (اسی سے مغفرت ہے) کیونکہ وہ گناہوں کو ڈھانپ دیتی ہے۔

﴿وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ اور ہم عنقریب نیک لوگوں کو زیادہ دیں گے یعنی ان کے اجر و ثواب میں اضافہ کریں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾

سو جو لفظ اُنہیں کہنے کو کہا گیا تھا اس کو ظالموں نے (دوسرے) لفظ سے تبدیل کر دیا اس لیے ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ ہمارے حکم کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے O

بنی اسرائیل کا ''حطه'' کو ''حنطه'' سے تبدیل کرنا

﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ﴾ یعنی انہوں نے وہ بات کہی جس کا اُن سے کہا نہیں گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ ''حـطّـه'' کی بجائے ''حنطة'' کہنے لگے اور اپنی زبان سے کہنے لگے: ''حـطـانـا ثـمـقـاثـا'' یعنی سُرخ گندم۔ اور یہ بنی اسرائیل کا اللہ عزوجل کے حکم کو ہلکا جاننا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُن کے لیے دروازے کو نیچے کیا گیا تا کہ وہ اپنے سروں کو جھکا لیں۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور اپنی سُرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ جس طرح انہوں نے قول میں (اللہ عزوجل کے حکم) کی خلاف ورزی کی تھی اور اُسے تبدیل کر دیا تھا اسی طرح انہوں نے فعل میں بھی (حکم خداوندی کی) خلاف ورزی کی۔

(١٠٢) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ ''تم سر جھکائے ہوئے دروازے سے داخل ہونا اور یہ کہتے جانا کہ ہمیں بخش دے''[190] تو ان لوگوں نے اس میں تبدیلی کی اور اپنی

١٩٠ اس سے معلوم ہوا کہ وہ مقدس مقامات جہاں رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے وہاں توبہ واستغفار اور دُعا کرنا جلد قبولیت کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے صالحین کا یہ دستور رہا ہے کہ انبیاء واولیاء کے مزارات پر حاضر ہو کر استغفار و دُعا اور عبادت کرتے ہیں۔ عرس و زیارت کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔ (خزائن العرفان، بتوضیح وتغییر، البقرہ: ۵۸)

سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے (''حطّة'' کہنے کے بجائے) ''حبّة فی شعرة'' (جو کا دانا) کہا۔[191]

(صحیح بخاری: ۳۴۰۳، صحیح مسلم: ۳۰۱۵، سنن الترمذی: ۲۹۵۶، مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۸)

﴿ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ سے مراد ہے: آسمان کا عذاب (یعنی ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب اُتارا) بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر طاعون بھیجا جس سے ایک لمحہ میں اُن کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔

﴿ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴾ یعنی یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے باہر نکل جاتے تھے۔

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰى مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۞

اور (یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا مانگی تو ہم نے (موسیٰ سے) فرمایا کہ اپنا عصا فلاں پتھر پر مارو سو (ان کے مارتے ہی) اُس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ کو پہچان لیا (اور ہم نے فرمایا کہ) خدا کا دیا ہوا کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو O

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کے لیے پانی طلب کرنے کا واقعہ اور آیت میں مذکور عصا اور پتھر کے بارے میں مختلف اقوال کا بیان

﴿ اسۡتَسۡقٰى ﴾ کا معنیٰ ہے: موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو میدانِ تیہ میں پیاس لگی تو انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ اُن کے لیے پانی طلب کریں' چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی نازل فرمائی اور وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ﴾ آپ اپنا عصا فلاں پتھر پر ماریں۔ یہ عصا جنت کے ایک درخت سے تھا۔ اُس کی لمبائی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے طول کے مطابق دس ہاتھ تھی اور اس کی دو شاخیں تھیں جو کہ اندھیرے میں روشنی بن کر چمکتی تھی۔ اس عصا کا نام علیق تھا اور بعض نے کہا کہ اس کا نام نبعہ تھا۔ اس عصا کو سیدنا آدم علیہ السلام نے جنت سے اپنے ساتھ لیا تھا' پھر یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان ایک دوسرے سے منتقل ہوتا رہا تا آنکہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا اور اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا۔

(مذکورہ آیت میں جو فرمایا کہ اپنا عصا ''پتھر'' پر مارو) اس پتھر کے بارے میں وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ یہ کوئی خاص پتھر نہیں تھا بلکہ (مراد یہ ہے کہ) موسیٰ علیہ السلام جس پتھر پر بھی عصا ماریں گے وہاں سے چشمے پھوٹ پڑیں گے۔ ہر قبیلہ کے لیے ایک چشمہ ہوگا اور کل بارہ قبیلے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک مخصوص پتھر تھا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ معرّف باللام ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آدمی کے سر کے برابر ہلکا اور چوکور پتھر تھا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس کو اپنے توبرے میں رکھتے تھے۔ جب لوگوں کو پانی کی ضرورت ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اس پتھر کو نیچے رکھتے اور اس پر اپنا

[191] اس سے اُن کا مقصد اس جملہ کی خلاف ورزی کرنا تھا جس کا اُنہیں حکم دیا گیا تھا (یعنی حطّة) جب ان لوگوں نے اللہ عزّ وجلّ کے حکم کی نافرمانی کی تو انہیں طاعون میں مبتلا کر دیا گیا' جس سے آنِ واحد میں ستر ہزار بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۳۴) علامہ خازن نے بھی اس قول کو ذکر کیا ہے۔ دیکھئے زیرِ بحث آیت کا اختتام۔

عصا مارتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس پتھر کے چار کونے تھے، ہر کونے سے تین چشمے نکلتے تھے اور ہر قبیلے کے لیے ایک چشمہ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مرمر کا پتھر تھا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ''کذان'' یعنی ایک نرم پتھر تھا اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے رکھے تھے تاکہ آپ غسل فرمالیں اور وہ پتھر کپڑوں کو لے کر بھاگ گیا تھا[192] تو سیدنا جبریل امین علیہ السلام نے حاضر ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حکم فرما رہا ہے کہ آپ اس پتھر کو اٹھالیں، اس میں میرے لیے قدرت اور آپ کے لیے ایک معجزہ کا اظہار ہوگا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اٹھا کر اپنے توبرے میں رکھ لیا۔ جب آپ کی قوم نے پانی طلب کیا تو موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ آپ اپنا عصا اس پتھر پر ماریئے۔ پھر (اسی طرح) جب آپ کی قوم کو پانی کی ضرورت پڑتی تو آپ اس پتھر کو نیچے رکھتے اور اس پر اپنا عصا مارتے تو اس سے چشمے پھوٹ پڑتے اور ہر قبیلے کے لیے ایک چشمہ تھا جو کہ اُن کی طرف نہر کی صورت میں بہتا تھا۔ اور آپ جب اُس کو اٹھانے کا ارادہ فرماتے تو اس پر اپنا عصا مارتے، جس کی وجہ سے پانی چلا جاتا اور پتھر خشک ہو جاتا تھا۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا:

﴿ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ﴾ یعنی بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے بہہ نکلے۔ مطلب یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس پتھر پر مارا تو اس سے چشمے پھوٹ پڑے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ ''انفجرت'' اور ''انبجست'' کا ایک ہی معنیٰ ہے (یعنی بہہ نکلنا، پھوٹ پڑنا)۔ بعض نے کہا ہے کہ ''انبجست'' کا معنیٰ ہے: رِسنا اور ''انفجرت'' کا معنیٰ ہے: بہنا۔

﴿ مَّشْرَبَهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہر گروہ نے اپنا مشرب یعنی پانی پینے کی جگہ کو پہچان لیا کہ کوئی قبیلہ کسی دوسرے کے مشرب پر داخل نہیں ہوگا۔ اور ﴿ كُلُوا وَاشْرَبُوا ﴾ سے مراد ہے: ہم نے کہا کہ کھاؤ اور پیو۔ اور ﴿ مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد منّ وسلویٰ اور پانی ہے۔ اور یہ تمام چیزیں (بنی اسرائیل کے لیے) اللہ عزوجل کی جانب سے رزق تھیں جو کہ انہیں بغیر کسی مشقت اور تکلیف کے پہنچ جایا کرتی تھیں۔

﴿ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو۔ ''عیث'' کا معنیٰ ہے: سخت ترین فساد۔

موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنا اور ہمارے نبی ﷺ کا اپنی انگلیوں سے پانی نکالنا

اس آیت کریمہ میں سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک عظیم معجزہ کا بیان ہے اور وہ یہ کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اتنا پانی نکلا کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے سیراب ہوئی۔ جب کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (ﷺ) کا معجزہ اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کی مبارک اُنگلی سے پانی بہہ کر نکلا ہے۔ جس سے (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے) ایک جم غفیر نے سیرابی حاصل کی۔[193] اور یقیناً پتھر سے پانی بہہ نکلنے کے مقابلہ میں خون اور گوشت سے پانی کا بہہ نکلنا زیادہ بڑی

۱۹۲ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری: ۲۷۸، ۳۴۰۴، صحیح مسلم: ۳۳۹، سنن ترمذی: ۳۲۲۱، مسند احمد ج۲ ص ۳۱۵، مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۰۷

۱۹۳ جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ والے دن لوگوں کو پیاس لگی۔ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک چھوٹا برتن تھا، اس میں آپ نے وضو فرمایا تو لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی طرف فریاد کی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم لوگوں کو کیا ہوگیا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے پاس نہ وضو کرنے کے لیے پانی ہے نہ پینے کے لیے ہے، بس پانی صرف یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اُس برتن میں اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہاتھ رکھتے ہی آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی چشموں کی طرح اُبلنے لگا۔ ہم نے اُس پانی کو پیا اور اُس سے وضو کیا۔ راوی نے پوچھا کہ حدیبیہ کے دن تم لوگوں کی تعداد کتنی تھی؟ تو حضرت جابر نے کہا کہ ویسے تو ہم پندرہ سو تھے، لیکن ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ضرور ہمیں کافی ہو جاتا۔ (صحیح بخاری: ۳۵۷۶، سنن الدارمی: ۲۷) نبی اکرم ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے جاری ہونے کا یہ ایک واقعہ نہیں ہے، اس کے علاوہ اور بھی کئی مواقع پر آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی جاری ہوا ہے۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری: ۱۶۹۔ ۳۵۷۹، صحیح مسلم: ۲۲۷۹، سنن الترمذی: ۳۶۳۳

اور عظیم بات ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَاؕ-قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌؕ-اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْؕ-وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُۗ-وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِؕ-ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّؕ-ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۠(۶۱)

اور (یاد کرو) جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے' لہٰذا آپ اپنے رب سے ہمارے لیے دُعا کیجئے کہ وہ (منّ وسلویٰ کی بجائے) ہمارے لیے زمین کی اُگائی ہوئی چیزیں نکالے (مثلاً) سبزی' ککڑی' گندم' مسور اور پیاز' (موسیٰ نے) کہا: کیا تم اچھی چیز کے بدلہ میں کم تر چیز کو لینا چاہتے ہو؟ (اچھا تو پھر ایسا کرو) تم لوگ شہر میں چلے جاؤ' وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں مل جائیں گی' اور ان پر ذلت وغربت مسلّط کردی گئیں اور وہ اللہ کے غضب میں آ گئے۔ یہ (انجام) اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کیا کرتے تھے (اور) یہ کام (وہ اس لیے کیا کرتے تھے کہ) انہوں نے میری نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے O

بنی اسرائیل کا مختلف اقسام کے کھانوں کا مطالبہ کرنا اور منّ وسلویٰ کو ایک کھانے سے تعبیر کرنے کی توجیہ

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل منّ وسلویٰ کھا کھا کر اُکتا گئے تو انہیں کسی اور کھانے کی خواہش ہوئی۔ اس لیے کہ ایک طرح کا کھانا کھاتے رہنے سے خواہش میں کمی آتی ہے (یعنی اُس کھانے کی زیادہ خواہش نہیں رہتی)۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ (بنی اسرائیل پر) جو کھانے اُترتے تھے وہ دو تھے' اس کے باوجود انہوں نے (موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کیوں کہا کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ایک کھانے سے بنی اسرائیل کی مراد تھی: ایک طرح کا کھانا جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اگر کسی شخص کے دستر خوان پر رنگا رنگی کھانے ہوں جنہیں وہ بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے روزانہ کھاتا رہے تو وہ تمام کھانے (اُس شخص کے نزدیک) ایک ہی کھانے کی طرح ہوں گے۔

﴿فَادْعُ لَنَا﴾ کا معنیٰ ہے: آپ ہمارے لیے اپنے رب سے سوال کیجئے (کہ وہ ہمارے لیے اُن چیزوں کو نکالے جن کو زمین اُگاتی ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز)۔

''فوم'' کا معنیٰ اور بنی اسرائیل کا مختلف اقسام کے کھانوں کا مطالبہ کرنے کی وجوہ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''فوم'' سے روٹی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے گندم مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے لہسن مراد ہے۔

بنی اسرائیل نے یہ چیزیں اس لیے طلب کیں کیونکہ یہ شہوت کو مضبوط کرنے میں معاون اور فائدہ مند ہوتی ہیں۔ یا اس لیے طلب کیں کہ وہ میدانِ تیہ میں پڑے پڑے اکتا گئے تھے' انہوں نے وہ کھانے طلب کیے جو صرف شہر میں پائے جاتے تھے

اور مقصد اس کے اُن کا شہروں میں جانا تھا نہ کہ مختلف قسم کے کھانے۔

﴿قَالَ﴾ سے مراد ہے: موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ﴿اَدْنٰى﴾ سے مراد ہے: انتہائی گھٹیا اور کمترین چیز اور یہ اُس چیز کو کہا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل نے طلب کی۔ اور ﴿خَیْرٌ﴾ سے مراد ہے: اعلیٰ اور بہترین چیز۔ اور یہ اُس چیز کو کہا جا رہا ہے جو اُن کے پاس تھی۔ (یعنی حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم لوگ عمدہ چیز چھوڑ کر کمتر چیز لینا چاہتے ہو۔)

''اھبطوا مصرا'' میں کون سا شہر مراد ہے اور ذلّت و مسکنت کے معنیٰ کا بیان

فرمایا: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ یعنی (اس کے باوجود) اگر تم وُہی (سبزیاں کھانا) چاہتے ہو تو کسی بھی شہر میں چلے جاؤ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اُس شہر کا علاقہ ہے جس میں وہ تھے۔ (اس صورت میں) اس پر تنوین کا ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے نوح اور لوط پر تنوین کا ہونا۔ لیکن پہلا قول (کسی بھی شہر میں چلے جاؤ) یہی (زیادہ صحیح) قول ہے۔

﴿فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ سے مراد ہے: جو کچھ تم نے زمین سے اُگنے والی چیزیں مانگی ہیں وہ تمہیں مل جائیں گی۔

﴿ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ذلّت و رسوائی کو اُن کا احاطہ اور گھیراؤ کرنے والا بنا دیا گیا اور وہ لوگ بھی ذلت اور رسوائی سے چمٹ گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ ذلّت سے مراد جزیہ ہے اور (بعض کے نزدیک) یہودیت کا لباس مراد ہے۔ لیکن ذلت کے یہ معانی مراد لینا بعید ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل پر اس واقعہ کے بعد جزیہ عائد نہیں کیا گیا تھا۔

﴿الْمَسْكَنَةُ﴾ سے مراد ہے: فقر و فاقہ۔ مسکین کو بھی مسکین اس لیے کہتے ہیں کہ فقر و فاقہ نے اُسے سکون اور ہل جل سے عاجز کر دیا ہوتا ہے۔ تو تم یہودیوں کو دیکھو گے کہ وہ بہت مال دار ہونے کے باوجود فقیر معلوم ہوتے ہیں اور تم مختلف ملّتوں سے تعلق رکھنے والوں میں دیکھو گے کہ سب سے زیادہ ذلیل اور مال و دولت کے لالچی یہودی ہی ہیں۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ میں ''باؤوا'' کا معنیٰ ہے: وہ لوگ لوٹے۔ اور ''باء'' کا استعمال صرف شر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اللہ کے غضب سے مراد ہے: اللہ عزوجل کا اپنے نافرمانوں سے انتقام کا ارادہ فرمانا۔

﴿ذٰلِكَ﴾ سے مراد: اللہ عزوجل کا غضب ہے۔ اور ﴿بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ سے مراد ہے: سیدنا محمد ﷺ کے اوصاف اور تورات میں مذکور آیتِ رجم۔ (یہودی ان سب باتوں کا انکار کرتے تھے) اور انجیل اور قرآن حکیم کا بھی انکار کرتے تھے۔

﴿وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ﴾ اور انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ ''نبیّ'' ''انبأ ینبئی'' سے مأخوذ ہے بمعنیٰ خبر دینے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ ''نبی'' کا معنیٰ ہے: بلند و بالا اور یہ ''نبوۃ'' سے مأخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے: بلند جگہ۔ یہودی لوگ انبیاء کرام کو ناحق قتل کیا کرتے تھے۔ ناحق سے مراد ہے: بغیر کسی جرم کے۔

انبیاء کرام کے قتل کو ''ناحق'' کیوں فرمایا گیا جبکہ ان کا قتل یقیناً ناحق ہے؟

اگر یہاں سوال کیا جائے کہ انبیاء کرام کا قتل ہوتا ہی ''ناحق'' ہے تو پھر یہاں قتل کے ساتھ ''ناحق'' فرمانے کا کیا فائدہ ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہاں ﴿بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ جو فرمایا ہے وہ قتل کی صفت کے طور پر ہے اور قتل کبھی حق کے ساتھ موصوف ہوتا ہے اور کبھی ''غیر حق'' کے ساتھ موصوف ہوتا ہے (یعنی قتل کرنا کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط ہوتا ہے)۔ قتلِ حق سے مراد وہ قتل ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہو اور قتلِ ناحق سے مراد وہ قتل ہے جو ظلم اور سرکشی کی بنیاد پر ہو۔ اور (یہاں قتل کے ساتھ ''ناحق'' کا لفظ فرمانا) ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ (الانبیاء:۱۱۲) نبی نے عرض کیا: اے میرے رب! حق فیصلہ فرما دے۔

اس آیت میں ''الحق'' حکم کے لیے صفت ہے۔ نہ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ (معاذ اللہ) ظلم پر مبنی ہوتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہودیوں نے صبح سویرے ستر انبیاء کرام کو قتل کر دیا اور شام کے وقت اپنی سبزی منڈی کی طرف گئے اور حضرت زکریا' حضرت یحییٰ' حضرت شعیاء اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کر دیا۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا﴾ کا معنیٰ ہے: یہودیوں کا یہ قتل اور کفر اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ اور ﴿وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ میرے حکم سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے اور میری حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

بے شک اہل ایمان اور یہودیوں' نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے جو لوگ بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آئیں اور نیک کام کریں تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے' نہ ان پر کوئی خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے O

یہودیوں کو یہودی' نصرانیوں کو نصرانی اور ستارہ پرستوں کو صابئین کہنے کی وجہ

آیت مبارکہ میں ﴿اَلَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ سے مراد یہودی ہیں۔ یہودیوں کو یہودی اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا: ''اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ'' یعنی ہم تیری طرف مائل ہوئے۔ (الاعراف:۱۵۶) بعض کا قول ہے کہ یہودیوں کو یہودی اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے توبہ کی تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ چونکہ وہ لوگ دینِ اسلام اور دینِ موسیٰ سے منحرف ہوئے اس لیے اُنہیں یہودی کہتے ہیں۔

نصرانیوں کو ﴿نصارى﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ (حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے) حواریوں نے کہا تھا: ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ'' یعنی ہم دینِ خدا کے مددگار ہیں۔ (الصف:۱۴) بعض نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اُنہیں ''ناصرہ'' نامی ایک بستی کی طرف نسبت کی وجہ سے نصرانی کہا جاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام بھی اس بستی میں ٹھہرا کرتے تھے۔

﴿صابئين﴾ اصل میں ''صبا'' سے مأخوذ ہے۔ جب کوئی شخص ایک دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے تو کہا جاتا ہے: ''صبا'' یعنی وہ نکل گیا۔ ''صابئین'' کو صابی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دین سے نکل گئے۔

''صابئین'' کے بارے میں مختلف اقوال اور مفسر علیہ الرحمہ کا مؤقف

حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ''صابئین'' سے اہل کتاب کا ایک گروہ مراد ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''صابئین'' کا ذبیحہ (درحقیقت) اہل کتاب کا ذبیحہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ صابئین کے نہ تو ذبیحے حلال ہیں نہ ان سے نکاح کرنا حلال۔ بعض کا قول یہ ہے کہ صابئین یہودیوں اور مجوسیوں کی درمیانی قوم تھی' ان کا نہ تو ذبیحہ حلال ہے نہ اُن سے شادی بیاہ جائز۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ یہودیوں اور نصرانیوں کی درمیانی قوم تھی' اپنے سر کو بیچ سے منڈایا کرتی تھی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے تھے' زبور کی تلاوت کرتے تھے' فرشتوں کو پوجتے تھے اور کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ہر دین سے کچھ نہ کچھ اختیار کیا ہوا تھا۔

''صابئین'' کے متعلق زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ستاروں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے پرستش کرتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو پیدا کر کے ستاروں کو اس جہان کی تدبیر کرنے والا بنایا ہے'

لہٰذا (العیاذ باللہ) لوگوں پر ان ستاروں کو پوجنا اور ان کی تعظیم کرنا واجب ہے اور (معاذ اللہ) یہی ستارے اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے ہیں۔

مذکورہ تمام اقسام کو ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔

مذکورہ آیت کے آغاز میں ''ان الذین امنوا'' اور آخر میں ''من امن باللہ'' کے حوالہ سے آیت کی دو مختلف تفاسیر کا بیان

اگر تم سوال کرو کہ یہ کیسی بات ہے کہ اس آیت کے آغاز میں فرمایا: ''ان الذین امنوا'' بے شک مؤمنین۔ اور اس آیت کے آخر میں فرمایا: ''من امن باللہ'' جو اللہ پر ایمان لائے۔ آغاز میں تعمیم اور آخر میں تخصیص کا کیا فائدہ۔

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس آیت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اور ان کے اس سلسلے میں دو طریقۂ تفسیر ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ ''الذین امنوا'' میں مؤمنین سے حقیقی مؤمنین مراد ہیں۔ پھر علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حقیقی مؤمنین سے کون مراد ہیں؟ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مؤمنین ہیں جو فترت کے زمانے میں ایمان لائے اور وہ دین کے متلاشی تھے۔ جیسے حبیب النجار' قس بن ساعدہ' ورقہ بن نوفل' بحیرا الراھب' ابوذر غفاری' سلمان فارسی۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس کو پایا اور آپ کی پیروی کی اور بعض وہ ہیں جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کو نہیں پایا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ بے شک جو لوگ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان لائے اور وہ لوگ جو باطل اور تبدیل کردہ دین پر تھے یعنی یہودی' نصرانی اور صابئین' ان میں سے جو لوگ بھی اللہ عزوجل' یوم آخرت اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تو ان کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ ان مؤمنین سے گذشتہ امتوں کے مؤمنین مراد ہیں۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ ان مؤمنین سے اس امت کے مؤمنین اور یہودی مراد ہیں یعنی وہ یہودی جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی' اور وہ نصرانی جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور انہوں نے اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں کی تھی۔ اور وہ صابئین جو اپنے معاملہ میں ایک حالت پر برقرار رہے' ان میں سے جو ایمان لایا اور حالتِ ایمان ہی میں مر گیا تو وہ مؤمن ہے۔ کیونکہ حقیقت ایمان کا مدار وفات پر ہے۔

دوسرا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ علماء فرماتے ہیں: آغاز آیت میں جن کے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے وہ مجازاً ہے نہ کہ حقیقۃً۔ اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو گذشتہ انبیاء کرام پر ایمان لائے لیکن آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ منافقین ہیں جنھوں نے اپنی زبان سے ایمان قبول کیا اور دلوں سے قبول نہیں کیا اور اس سے یہود و نصاریٰ اور صابئین بھی مراد ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ ان تمام باطل پرستوں میں سے جو بھی حقیقی ایمان لے آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''مؤمن'' ہوگا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''ان الذین امنوا'' میں مؤمنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ماضی میں رسول اللہ ﷺ پر حقیقی ایمان لائے اور مستقبل میں اسی ایمان پر قائم و دائم رہے۔ ''من امن باللہ والیوم الاخر'' کا بھی یہی معنی ہے۔ اور ''وعمل صالحا'' سے مراد ہے: مؤمن ہوتے ہوئے نیک عمل کرے۔

﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے یعنی اعمال کا بدلہ۔ اور نہ انہیں کوئی خوف ہے نہ یہ غمگین ہوں گے یعنی آخرت میں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور ہم نے کوہِ طور کو تم پر بلند کیا (اور حکم دیا کہ) ہم نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس کو مضبوطی سے تھام لو اور جو اس میں (احکام) ہیں اُن کو یاد رکھنا تاکہ تمہارے اندر پرہیزگاری آئے ○

بنی اسرائیل پر کوہِ طور کو بلند کرنے کی تفسیر

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ﴾ یعنی اے گروہِ یہود! یاد کرو جب ہم نے تم سے میثاق یعنی عہد لیا اور تم پر طور کو بلند کیا۔ طور سے مراد ایک بڑا پہاڑ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو حکم فرمایا' تو وہ اپنی جگہ سے نکل کر بنی اسرائیل کے سروں پر قائم ہو گیا۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا اور بنی اسرائیل کو تورات کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا تو اُنہوں نے اس کتاب کے مشکل احکامات اور سخت تکالیف کی وجہ سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو حکم فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کے لشکر کی مقدار کے مطابق ایک پہاڑ کو اُکھیڑیں۔ اور وہ پہاڑ ایک فرسخ[۱۹۴] لمبا اور ایک فرسخ چوڑا تھا۔ سو جبریل نے اس پہاڑ کو سائبان کی طرح لوگوں کی قد و قامت کی مقدار ان کے سروں پر بلند کر دیا اور اُن سے کہا گیا کہ اگر تم لوگوں نے تورات کے احکامات کو قبول نہ کیا تو میں یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دوں گا۔

﴿ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی "ہم نے اُن سے کہا کہ" جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا اس کو قوت یعنی "محنت اور کوشش" کے ساتھ پکڑ لو اور یاد کرو جو کچھ اس میں ہے یعنی "اس کو پڑھو"۔ شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یعنی "تاکہ تم دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ"۔ ورنہ اس پہاڑ کے ذریعہ تمہارے سروں کو جھکا دیا جائے گا۔ جب بنی اسرائیل نے اس پہاڑ کو اپنے آپ پر اُترتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے تورات کو قبول کر لیا اور سجدے میں گر گئے اور وہ سجدے کے دوران پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ یہ یہودیوں کے سجدے کا طریقہ بن گیا اور وہ اپنے نصف چہرے پر سجدہ کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اسی سجدے کی وجہ سے ہم سے عذاب اٹھایا گیا۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

پھر اس (پختہ وعدے) کے بعد تم نے مُنہ موڑ لیا تو اگر تم پر اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ضرور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ○

﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ یعنی تورات کو قبول کرنے کے بعد تم نے اعراض کیا۔

﴿ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے مراد "مہلت دینا" ہے۔ اور "خاسرین" سے مراد ہے کہ تم اس طرح نقصان اٹھاتے کہ تم سے دنیا بھی چلی جاتی اور آخرت میں عذاب بھی دیا جاتا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

اور تم اچھی طرح اُن لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے (قانون) میں حد سے تجاوز کیا تھا' تو ہم نے ان

۱۹۴ یعنی تین میل کے برابر تھا۔ تین میل سے مراد بارہ ہزار گز (یعنی آٹھ کلو میٹر) ہے۔

سے فرمایا کہ تم پھٹکارے ہوئے بندر بن جاؤ O

﴿اعْتَدَوْا﴾ سے مراد ہے: حد سے تجاوز نہ کرنا۔ اور ﴿سبت﴾ سے مراد ہے: ہفتہ کا دن۔ اُن کے اس دن کو ''سبت'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس دن کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس میں اپنے اعمال منقطع کر دیا کرتے تھے۔ ''سبت'' کا اصل معنٰی ہے: ''القطع'' ''منقطع کرنا۔

ہفتہ کے دن شکار کی ممانعت کے قانون میں یہودیوں کی خلاف ورزی کرنے کا تفصیلی واقعہ

علماءِ مؤرخین فرماتے ہیں کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مقام ایلہ کی کسی بستی میں تھے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کو ان پر حرام فرما دیا تھا۔ جب ہفتہ کا دن آتا تو (قدرتِ خداوندی سے) سمندر کی ساری مچھلیاں اکٹھی ہو جاتیں، حتیٰ کہ مچھلیوں کی کثرت کی وجہ سے پانی نہ دکھائی دیتا۔ جب ہفتہ کا دن گزر جاتا تو ساری مچھلیاں بکھر جاتیں اور سمندر کی تہہ سے چمٹ جاتیں۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ. (الاعراف:۱۶۳)

جب ہفتہ کے دن اُن کی مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا تو وہ ان کے سامنے نہ آتیں۔

پھر شیطان نے اُنہیں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ تمہیں صرف ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا ہے، باقی دنوں میں منع نہیں کیا گیا۔ سو اُن میں سے کچھ لوگوں نے ہفتے کے دن کا ارادہ کیا اور سمندر کے اردگرد بڑے بڑے حوض کھود دیئے اور سمندر سے ان حوضوں کی طرف نہریں نکال لیں۔ پھر جب جمعہ کو رات ہوتی تو اُن نہروں کو کھول دیتے اور سمندر کی موجیں مچھلیوں کو ان حوضوں کی طرف موڑ دیتیں۔ یوں مچھلیاں اُن حوضوں میں آ جاتیں اور حوضوں کی گہرائی کی وجہ سے وہاں سے نکل نہ پاتیں (اور ہفتہ کے دن کی مچھلیاں وہاں جمع ہو جاتیں)۔ پھر جب اتوار کا دن آتا تو وہ اُن مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ جمعہ کے دن یہودی اپنے جال اور کانٹے ڈال دیتے تھے اور اتوار کے دن اُنہیں نکالتے تھے۔ ایک عرصہ تک انہوں نے ایسا ہی کیا اور اُن پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے اُنہیں ہفتہ کے دن بھی شکار کرنے کی جرأت پیدا ہوئی اور کہنے لگے کہ ہفتہ کے بارے میں ہمارا خیال یہی ہے کہ یہ ہمارے لیے حلال ہے۔ چنانچہ انہوں نے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیں، اُن پر نمک لگانے لگے، اُنہیں کھانا شروع کر دیا اور ان کی خرید و فروخت شروع کر دی۔ جب اُنہوں نے یہ کام شروع کر دیا تو بستی کے رہنے والے جو کہ تقریباً ستّر ہزار افراد تھے، تین قسموں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک قسم اُن لوگوں کی تھی جو خود بھی شکار سے رُکے رہے اور دوسروں کو بھی شکار سے روکتے تھے۔ دوسری قسم اُن افراد کی تھی جو خود تو شکار نہیں کرتے تھے لیکن کرنے والوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے اور تیسری قسم اُن افراد کی تھی جو اس جرم میں خوب منہمک ہو گئے اور حکم خداوندی کی بے حرمتی کی۔ روکنے والے کل ۱۲ ہزار افراد تھے، جب مجرموں نے ان منع کرنے والوں کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو منع کرنے والوں نے صاف کہہ دیا کہ: خدا کی قسم! ہم ایک بستی میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ایک دیوار قائم کر کے اس بستی کو اُنہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا، اور اسی حالت میں کئی سال ان پر گزر گئے۔ پھر (منع کرنے کے باوجود مسلسل) گناہ پر اصرار کرنے کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام نے یہودیوں کے لیے ہلاکت کی دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا۔ چنانچہ ایک دن سارے منع کرنے والے اپنے گھروں سے نکل گئے جب کہ مجرموں میں سے کوئی بھی نہ نکلا، نہ اُنہوں نے اپنے دروازے کھولے۔ جب اُنہیں اندر دیر ہو گئی تو لوگ دیوار پھلانگ کر ان کے گھروں میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سارے

کے سارے (مجرمین) بندر بن چکے ہیں' اُن کی دُمیں بھی تھی اور وہ بندروں کی آواز بھی نکال رہے تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُن میں جو نوجوان تھے وہ بندر بن گئے تھے اور جو بوڑھے تھے وہ خنزیر بن گئے تھے۔ تین دن تک وہ اسی حال میں رہے' پھر وہ سب ہلاک ہو گئے اور تین دن سے زیادہ اُن کا مسخ باقی نہیں رہا (یعنی صرف تین دن تک اُن کی شکلیں بگڑی رہیں) اور اس دوران اُن کے ہاں کسی قسم کی کوئی ولادت نہیں ہوئی۔

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ ہم نے اُن سے فرمایا کہ تم پھٹکارے ہوئے بندر بن جاؤ۔ آیت مبارکہ کا یہ حکم امر تحویل اور امر تکوین ہے (یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاؤ)۔ ''خاسئین'' کا معنیٰ ہے: دور کیا ہوا' دھتکارا ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس ترکیب میں کچھ تقدیم و تاخیر ہوئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''کونوا خاسئین قردة'' اسی وجہ سے آیت میں ''خاسئات'' نہیں فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پس ہم نے اس (سزا) کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد کے لوگوں کے لیے (نشانِ) عبرت بنا دیا اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت بنا دیا O

مذکورہ آیت میں ''ما بین یدیھا و ما خلفھا'' کی تفسیر میں علماء کے اقوال

فرمایا: ہم نے اس کو یعنی اُن کی سزائے مسخ کو ''نکال'' یعنی انجام اور عبرت بنا دیا۔ ان لوگوں کے لیے جو ان کے سامنے موجود تھے اور بعد میں آنے والوں کے لیے۔ ﴿لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ کے متعلق بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ شکل بگاڑنے کو ہم نے ان کے گذشتہ گناہوں کی سزا اور بعد میں آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ ''ما بین یدیھا'' (سے مراد یہ ہے کہ شکل بگاڑنے کا جو عذاب نازل ہوا اُس کو ان بستیوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا جو اُس وقت (اطراف و اکناف میں) آباد تھیں۔ اور ''ما خلفھا'' سے مراد یہ ہے کہ اُن بستیوں کے لیے بھی باعثِ عبرت بنا دیا جو بعد میں قائم ہوں گی' تاکہ اُن بستیوں کے رہنے والے لوگ یہودیوں کے اس انجام سے نصیحت حاصل کریں۔

﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ متقین سے مراد نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے مؤمنین ہیں (یعنی ان کے لیے اس سزا کو نصیحت بنایا گیا ہے)۔ تاکہ وہ یہودیوں جیسے کسی جُرم کے مرتکب نہ ہوں۔

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۗ قَالُوْٓا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۗ قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا: کیا آپ ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں O

﴿بَقَرَةً﴾ بقر کا واحد ہے اور اس کا معنیٰ ہے: گائے۔ اور یہ لفظ اصلاً ''البقر'' سے مشتق ہے' بمعنیٰ چیرنا۔ گائے کو ''بقرہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کھیتی باڑی کے وقت زمین کو چیرتی ہے۔

بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنے کا تفصیلی واقعہ

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں ایک مال دار آدمی تھا۔ اس کا ایک غریب چچا زاد بھائی تھا اور صرف وہی اس مال دار آدمی کا وارث تھا۔ ایک عرصۂ دراز تک جب اُس شخص کو موت نہیں آئی تو اس کے چچا زاد نے وراثت

پانے کے لیے اُسے قتل کر دیا اور ایک دوسری بستی کی طرف لے جا کر اُسے وہاں کسی کے دروازے پر ڈال دیا۔ اور جب صبح ہوئی تو خود ہی اس کے خون کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اور کچھ لوگوں کے خلاف قتل کا دعویٰ کر کے اُنہیں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے آیا۔ اُن لوگوں نے اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا اور مقتول کا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے مشتبہ ہو گیا۔

ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کریں کہ وہ اس مشکل معاملہ کو ان پر واضح فرما دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایک گائے ذبح کرنے اور اُس گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارنے کا حکم فرمایا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم فرماتا ہے۔

جواباً آپ کی قوم نے کہا: ﴿اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ یعنی ہم آپ سے مقتول کے معاملہ سے متعلق گزارش کر رہے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم فرما کر ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہ بات سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے ان لوگوں نے اس لیے کہی کہ بہ ظاہر قتل کا کیس اور گائے کو ذبح کرنا' ان دونوں میں بہت فرق ہے' لیکن یہ لوگ اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ اس حکم میں (اللہ تبارک وتعالیٰ کی) کیا حکمت ہوگی۔

﴿قَالَ﴾ سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں یعنی اس کی حفاظت میں آتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ یعنی مؤمنوں کا مذاق اُڑانے والوں میں سے ہو جاؤں۔ بعض نے ﴿جـاهـلـين﴾ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ (میں اللہ عزوجل کی پناہ مانگتا ہوں) اس بات سے کہ میں تمہارے سوال کے برخلاف جواب دے کر جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

جب بنی اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ گائے کا ذبح کرنا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب ہے تو انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اُس گائے کی صفتیں اور اس کا حُلیہ معلوم کیا۔ حالانکہ اگر وہ کسی بھی گائے کو ذبح کر دیتے تو وہ (حکم کی تعمیل میں) اُنہیں کافی ہو جاتی' لیکن اُنہوں نے اپنے آپ پر سختی کی' نتیجۃً اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر حکم سخت کر دیا گیا۔

ہوا یہ کہ بنی اسرائیل میں ایک نیک آدمی تھا' جس کا ایک بچہ تھا اور گھر میں ایک بچھیا تھی۔ وہ اس بچھیا کو جنگل میں لے کر گیا اور اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کیا: اے اللہ! یہ بچھیا میں اپنے بچے کے لیے تیرے پاس امانت رکھواتا ہوں یہاں تک کہ میرا بچہ بڑا ہو جائے۔ وہ آدمی انتقال کر گیا اور بچھیا جنگل میں بڑی ہو گئی' وہ لوگوں کے قریب نہیں آتی تھی بلکہ اُن سے بھاگتی تھی۔ اس عرصہ میں اُس شخص کا بچہ بڑا ہو گیا اور وہ اپنی والدہ کا بہت ہی فرمانبردار تھا۔ اُس نے اپنی رات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک حصہ میں وہ نماز ادا کرتا' ایک حصہ میں آرام کرتا اور ایک حصہ میں اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ جب صبح ہوتی تو لکڑیاں چننے کے لیے نکل جاتا اور اُن لکڑیوں کو بازار میں لا کر مشیّتِ الٰہی کے مطابق بھاؤ تاؤ کر کے بیچ دیتا۔ پھر اس کمائی کا ایک حصہ صدقہ کر دیتا' ایک حصہ اپنے کھانے پینے میں خرچ کرتا اور ایک حصہ اپنی والدہ کو دے دیتا۔ ایک دن اس کی والدہ نے اُس سے کہا: بیٹے! تیرے والد نے تیرے لیے ایک بچھڑا وراثت میں چھوڑا ہے اور اس کو فلاں جنگل میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا ہے۔ تم وہاں جاؤ اور جا کر حضرت ابراہیم' اسماعیل اور اسحٰق علیہم السلام کے خدا سے دُعا کرو کہ وہ اس بچھڑے کو تمہارے پاس لوٹا دے۔ اس بچھڑے کی علامت یہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی جلد سے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اس کے حُسن اور زرد رنگ کی وجہ سے اُس کو ''مُـــذَهَّبَة'' کہا جاتا تھا۔ جب وہ لڑکا اس جنگل میں آیا تو اُس نے گائے کو چرتے ہوئے دیکھا' دیکھتے ہی پکار اُٹھا کہ میں تجھے حضرت ابراہیم' اسماعیل اور اسحٰق علیہم السلام کے رب کی قسم دیتا ہوں۔

(گائے نے یہ سُنا تو) فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ لڑکا اُس کے سینگ پکڑ کر اُسے کھینچنے لگا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ گائے بولنے لگی۔ اور اس نے لڑکے سے کہا: اے والدہ کے اطاعت گزار بیٹے! تو مجھ پر سوار ہو جا' تجھے بہت آسانی ہو گی۔ نوجوان نے کہا کہ میری والدہ نے مجھے سوار ہونے کا حکم نہیں دیا۔ گائے نے کہا: خدا کی قسم! اگر تو مجھ پر سوار ہو جاتا تو کبھی بھی مجھ پر تجھے قابو حاصل نہ ہوتا۔ اب تو چل۔ اور اگر تو پہاڑ کو حکم دے گا کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائے تو وہ ضرور ایسا کرے گا' کیونکہ تو اپنی والدہ کا فرمانبردار ہے۔ سو وہ نوجوان اُس گائے کو لے کر اپنی والدہ کی طرف چل پڑا۔ اُس کی والدہ نے اُس سے کہا کہ تو ایک غریب آدمی ہے' تیرے پاس مال و دولت نہیں ہے اور دن میں لکڑیاں چُننا اور رات میں عبادت کرنا تیرے لیے دشوار ہو جاتا ہے' لہٰذا تو جا اور اس گائے کو بازار میں بیچ دے۔ اُس نے والدہ سے پوچھا کہ میں اس کو کتنے میں فروخت کروں؟ تو والدہ نے کہا کہ تین دینار میں اس کو فروخت کرنا اور میرے مشورے کے بغیر اس کو فروخت نہ کرنا۔ اس وقت گائے کی قیمت تین دینار تھی۔ وہ اس گائے کو لے کر بازار کی طرف چل پڑا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف ایک فرشتہ بھیج دیا تاکہ مخلوق کو اپنی قدرت دکھا دی جائے اور اس نوجوان کو آزمایا جائے کہ وہ اپنی والدہ کا کیسا فرمانبردار ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ فرشتے نے آ کر لڑکے سے پوچھا کہ یہ گائے کتنے کی ہے؟ لڑکے نے کہا: تین دینار میں' لیکن اس شرط پر کہ میری والدہ بھی اس پر راضی ہو۔ تو فرشتے نے کہا کہ میں تجھے چھ دینار دینے کو تیار ہوں لیکن تو اپنی والدہ سے مشورہ نہ کر۔ تو اس نوجوان نے کہا کہ اگر تم مجھے اس گائے کے وزن کے برابر سونا دے دو تب بھی میں اُسے اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر نہیں لوں گا۔ یہ کہہ کر وہ نوجوان اپنی والدہ کی طرف لوٹ گیا اور قیمت کے بارے میں (تفصیل) بتائی۔ اس کی والدہ نے کہا کہ تو جا اور اس کو چھ دینار میں بیچ دے اور اس کو میری رضامندی کے بغیر نہ بیچنا۔ وہ گائے کو لے کر بازار کی طرف چل پڑا اور اُدھر فرشتہ بھی آ گیا۔ فرشتے نے پوچھا: کیا تم نے اپنی والدہ سے مشورہ کر لیا؟ تو نوجوان نے کہا: ہاں۔ میری والدہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کی رضامندی کے مطابق قیمت کو چھ دینار سے کم نہ کروں۔ فرشتے نے کہا کہ میں تمہیں بارہ دینار دینے کو تیار ہوں لیکن تم اپنی والدہ سے مشورہ نہ کرو۔ نوجوان نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور والدہ کے پاس جا کر ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ والدہ نے (تفصیلات سُن کر) بیٹے سے کہا کہ جو شخص تمہارے پاس بازار میں آ رہا تھا وہ آدمی کی شکل میں ایک فرشتہ تھا۔ اور اس لیے آتا تھا تاکہ تمہارا امتحان لے۔ لہٰذا اب وہ تمہارے پاس جب آئے تو تم اُس سے کہنا کہ کیا تم ہمیں اس گائے کو بیچنے کا حکم دیتے ہو یا نہیں؟ چنانچہ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ جب اُس نے ایسا ہی کیا تو فرشتے نے اُس نوجوان سے کہا کہ ''اس گائے کو اپنے پاس روک لو۔ کیونکہ حضرت موسیٰ بن عمران اس کو تم سے اُس مقتول کے لیے خریدیں گے جس کو بنی اسرائیل میں قتل کر دیا جائے گا۔ لہٰذا تم اسے اسی صورت میں فروخت کرنا جب تمہیں اس کی جلد کے برابر سونا بطور قیمت مل جائے''۔ چنانچہ اس نوجوان نے اس گائے کو روکے رکھا اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اُسی گائے کو ذبح کرنا فرض کر دیا۔ سو بنی اسرائیل اُس گائے کا حُلیہ پوچھتے رہے یہاں تک کہ انہیں اُسی گائے کا حُلیہ بتا دیا گیا اور یہ اُس نوجوان کے لیے والدہ کی فرمانبرداری کرنے کا بدلہ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے فضل اور انعام تھا۔[195] اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

[195] یہ واقعہ اسرائیلیات سے ہے۔ (کذا فی تخریج البغوی)

انہوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے واضح فرمائے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ (موسیٰ نے) کہا کہ بے شک وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا (بلکہ) دونوں کے درمیان میں ہو بس تم کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کو بجالاؤ O

﴿مَاهِيَ﴾ سے مراد ہے اس کی عمر کیا ہے؟ ﴿قَالَ﴾ کا فاعل سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ﴿يَقُولُ﴾ کا فاعل اللہ عزوجل کی ذات ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ نہ ''فارض'' ہو نہ ''بکر''۔ یعنی نہ بڑی ہو نہ چھوٹی۔ ''فارض'' سے مراد اتنی عمر رسیدہ گائے جو بچہ نہ جنے اور ''بکر'' سے مراد اتنی نو جوان گائے کہ اس نے بچہ نہ جنا ہو۔ (یہ دونوں صفتیں اس گائے میں نہ ہوں بلکہ) وہ ان دونوں کے بیچ میں ہو یعنی ان دونوں عمروں کے بیچ میں ہو۔ آخر میں فرمایا: ﴿فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ﴾ سو تم وہ کرو جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ یعنی گائے ذبح کرو اور زیادہ سوالات نہ کرو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾

انہوں نے کہا: آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے واضح فرمائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ (موسیٰ نے) کہا کہ بے شک وہ فرماتا ہے کہ وہ گہرے پیلے رنگ کی گائے ہے دیکھنے والوں کو سُرور بخشتی ہے O

(انہوں نے رنگ پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) ﴿إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ﴾ بے شک وہ گائے گہرے پیلے رنگ کی ہو دیکھنے والوں کو خوش کر دے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا'' سے مراد ہے: بہت زیادہ پیلے رنگ والی۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: اس کا رنگ صاف ہو بعض کا قول یہ ہے کہ ''صفراء'' سے مراد سیاہ ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ (''فاقعٌ'' کا استعمال ''اصفر'' کے ساتھ ہوتا ہے اور) کہا جاتا ہے: ''اصفر فاقع'' گہرا پیلا رنگ۔ اور (''اسود'' کے لیے کہا جاتا ہے:) ''اسود حالکٌ'' سخت سیاہ۔

آخر میں فرمایا کہ وہ گائے دیکھنے والوں کو خوش کر دے۔ یعنی اُس کا حُسن اور صاف ستھرا رنگ دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے واضح کر دے کہ اُس گائے کی خصوصیات کیا ہیں؟ بے شک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور اس کو تلاش کر لیں گے O

﴿مَاهِيَ﴾ سے ان کا مقصود یہ تھا کہ ہمیں یہ پتا چل جائے کہ وہ گائے چَرنے والی ہو یا کھیتی باڑی کرنے والی۔ ﴿تَشَابَهَ عَلَيْنَا﴾ سے مراد ہے: اس گائے کا معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا ہے۔ (پھر خود ہی کہنے لگے:) ﴿إِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔ یعنی اس کے حلیہ تک پہنچ جائیں گے۔

(۱۰۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم! اگر یہ لوگ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی ان کے لیے گائے کو واضح اور ظاہر

نہ کیا جاتا۔[196] (الطبری: ۱۲۴۶، تفسیر البغوی: ۵۸)

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

(موسیٰ نے) کہا: بے شک وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے کہ اس سے زمین میں ہل چلانے کا کام نہیں لیا گیا ہے اور نہ ہی وہ کھیتی میں پانی دیتی ہے، وہ ایک بے عیب بے داغ (گائے) ہے (یہ اوصاف سُن کر) وہ سب پکار اُٹھے کہ اب آپ پوری بات لے کر آئے، پھر (چارونا چار) انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے O

﴿لَا ذَلُوْلٌ﴾ سے مراد ہے: اُس گائے کو کام کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ ﴿تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾ کا معنیٰ ہے: جو زمین کو زراعت اور کاشت کاری کے لیے الٹ پلٹ کرے۔ ﴿وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ گائے جو سانیہ نہیں ہے۔ اور سانیہ سے مراد وہ گائے ہے جو زمین کو سیراب کرنے کے لیے کنویں سے پانی لائے۔ ﴿مُسَلَّمَةٌ﴾ سے مراد ہے: وہ گائے عیوب و نقائص سے مبرا ہے۔ ﴿لَا شِيَةَ فِيْهَا﴾ کا معنیٰ ہے: اس گائے میں اس کے اپنے رنگ کے علاوہ کوئی اور رنگ نہیں ہے۔ (یہ تمام اوصاف سُن کر وہ لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے) کہنے لگے: ﴿الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾ اب آپ صحیح بات لے کر آئے۔ یعنی ایسی کامل وضاحت جس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس گائے کو تلاش کیا، تو انہوں نے مکمل صفات والی صرف اسی نوجوان کی گائے پائی۔ اور اس گائے کو اس کی جلد کے برابر سونا دے کر اس نوجوان سے خرید لیا۔

(آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) ﴿فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ یعنی وہ حکم کے مطابق عمل کرنے کے قریب نہیں تھے۔ (رہا یہ کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں) بعض کا قول یہ ہے کہ وہ گائے کے مہنگے ہونے کی وجہ سے اُسے ذبح نہیں کر رہے تھے، بعض کا قول یہ ہے کہ ذلت اور رسوائی کے خوف سے اور بعض کے نزدیک اس وجہ سے کہ اُنہیں ایسی گائے کا ملنا دشوار ہو گیا تھا جس کے اندر مذکورہ تمام اوصاف موجود ہوں۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تھا پھر تم ایک دوسرے پر اس کا الزام ڈالنے لگے اور اللہ نے اس چیز کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپا رہے تھے O

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ میں جو خطاب ہے وہ بنی اسرائیل کی پوری جماعت سے ہے۔ کیونکہ قتل اُنہی میں ہوا تھا (اس لیے فرمایا: یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا)۔ ﴿فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ پھر تم اس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''ادار أتم'' کا معنیٰ ہے: تم نے اختلاف کیا اور آپس میں لڑ پڑے۔ یہ ''درء'' سے مشتق ہے، بمعنیٰ دور کرنا، ہٹانا۔ چونکہ جھگڑنے والے بھی آپس میں ایک دوسرے کو ہٹاتے اور دور کرتے ہیں اس لیے ''ادار أتم'' کا معنیٰ ہے: اختلاف کرنا، جھگڑنا۔

---

۱۹۶ اس سے معلوم ہوا کہ کام کو اللہ عزوجل کی مشیت اور مرضی پر چھوڑنا بہت ساری برکات کا باعث ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ اور آپ کسی کام کے متعلق بغیر انشاء اللہ کہے یہ ہرگز نہ کہیں کہ کل میں وہ کام کرنے والا ہوں۔ (الکہف: ۲۴۔۲۳)

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ یعنی مقتول کے معاملہ کو جو تم نے چھپایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ظاہر فرمائے گا اور اس معاملہ کو چھپا ہوا نہیں رکھے گا۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

تو ہم نے فرمایا کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارو' اسی طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ فرمائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ شاید تمہیں عقل آجائے O

مقتول کو گائے کا کون سا ٹکڑا مارا گیا؟ اس بارے میں مختلف اقوال اور مفسر علیہ الرحمۃ کا مؤقف

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ یعنی ہم نے انہیں حکم دیا کہ مقتول کو گائے کا کوئی ٹکڑا مارو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے مقتول کو وہ ہڈی ماری جو پٹھے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس سے مراد کان کا جوڑ ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ انہوں نے مقتول کو گائے کی زبان ماری۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے دُم کی جڑ اس مقتول کو ماری اور بعض کہتے ہیں کہ گائے کی سیدھی ران اس کو ماری۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ (بنی اسرائیل پر کسی مخصوص حصہ کی پابندی نہیں تھی بلکہ اُنہیں) اختیار حاصل تھا کہ وہ مقتول کو گائے کا کوئی سا بھی ٹکڑا ماردیں مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اور پھر قرآن کریم میں بھی اس بات پر کوئی دلیل اور نشانی نہیں ہے کہ گائے کا ٹکڑا مارنے سے کون سا خاص ٹکڑا مراد ہے' قرآن کریم میں اس ٹکڑے کے تعیّن کا نہ ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ بنی اسرائیل کو اس معاملہ میں اختیار تھا۔

زیر بحث آیت میں کچھ اضمار (یعنی جملہ پوشیدہ) ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ''فضربوہ فحیی'' یعنی ہمارے حکم کے نتیجہ میں انہوں نے مقتول کو گائے کا ایک ٹکڑا مارا تو وہ زندہ ہو گیا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور پھر اس نے خود کہا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے۔ مراد اس کی' اُس کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ کہہ کر پھر وہ اپنی جگہ مردہ ہو کر گر پڑا اور قاتل (یعنی مقتول کا چچازاد بھائی) وراثت سے محروم ہو گیا۔ روایت ہے کہ ''صاحب البقرہ'' یعنی گائے والے کے بعد کوئی قاتل وارث نہیں ہوا۔

﴿كَذٰلِكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے گائے والے شخص ''عامیل'' کو زندہ فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مردوں کو زندہ فرمائے گا۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ شاید تم اپنے آپ کو گناہوں سے باز رکھو۔

مقتول کا ذکر بعد میں اور گائے کو ذبح کرنے کے بیان پہلے کرنے کی توجیہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ مذکورہ واقعہ میں حق تو یہ تھا کہ مقتول کا ذکر پہلے کیا جاتا اور پھر گائے ذبح کرنے کا بیان ہوتا (لیکن یہاں ایسا نہیں ہے)؟ آخر یہ ترتیب اس طرح کیوں رکھی گئی؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے (گذشتہ آیات میں) بنی اسرائیل کو زجر وتوبیخ اور تنبیہ کرنے کے لیے مختلف قصے' ان کی مختلف خیانتیں اور اُن لوگوں میں جو بڑی بڑی نشانیاں تھیں اُنہیں بیان فرمایا اور یہاں جو دو قصے بیان فرمائے' وہ اگرچہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں لیکن دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر ایک تنبیہ ہے۔ پہلا قصہ (جس میں گائے کو ذبح کرنے کا تذکرہ ہے) اُنہیں اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس حکم کے متعلقات کو پورا کرنے میں جلدی نہیں کی اور دوسرا قصہ اُنہیں ناجائز قتل پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے۔ اب اگر یہاں مقتول کے قصہ کو گائے کے قصہ سے پہلے بیان کیا جاتا تو یہ پورا ایک ہی قصہ ہو جاتا اور جو اصل مقصد تھا یعنی بار بار تنبیہ کرنا' وہ حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے یہاں گائے ذبح کرنے کا قصہ پہلے بیان

فرمایا اور قتل کا قصہ بعد میں بیان فرمایا۔

مقتول کو گائے کا ٹکڑا مارنے کا حکم کیوں دیا گیا؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مقتول کو گائے کا ٹکڑا مارنے کا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ مقتول کو بغیر کسی چیز کے مارے از سرِ نو زندہ کر دے؟ تو میں یہ کہوں گا کہ اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح کرنے سے دلیل میں پختگی آئے اور حیلے بہانے کا امکان نہ رہے۔ کیونکہ کسی بھی شخص کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے مقتول کو اپنے کسی جادو اور تدبیر سے زندہ کیا ہے۔ لیکن جب وہ مقتول گائے کا ٹکڑا مارنے سے زندہ ہوا تو (ہر قسم کا) شک وشبہ دور ہو گیا۔ اور یہ معلوم ہو گیا کہ مقتول کا زندہ ہونا اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے تھا اور اُسی کے حکم سے ایسا ہوا۔

بنی اسرائیل کو گائے کے علاوہ کوئی اور جانور ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بنی اسرائیل کو گائے کے علاوہ کوئی اور جانور ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا؟ تو میں کہوں گا کہ اگر اُنہیں گائے کے علاوہ کسی اور جانور کے ذبح کرنے کا حکم دیا جاتا تب بھی یہی سوال ہوتا کہ انہیں اس کے علاوہ کسی اور جانور کے ذبح کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا گیا۔ پھر گائے کے ذبح کرنے میں کچھ فوائد بھی ہیں۔ (مثلاً:) یہ کہ قربانی کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہودیوں میں اس کا رواج بھی عام تھا۔ دوسرا یہ کہ یہ قربانی اُن کے نزدیک عظیم قربانیوں میں سے تھی۔ تیسرا یہ کہ اُنہیں ایسی گائے حاصل کرنے میں بڑی دشواری ہوئی جس میں مذکورہ اوصاف موجود ہوں اور ایک فائدہ یہ ہے کہ اس گائے سے اس کے مالک کو بہ طور قیمت ایک بڑی رقم حاصل ہوئی۔

ایسا مقتول جس کے قاتل کا پتا نہ ہو اس کے شرعی حکم کا مفصّل بیان[۱۹۷]

مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی جگہ پر کوئی مقتول پایا جائے اور قاتل کا پتا نہ ہو تو دیکھیں گے کہ اگر وہاں کسی شخص کے بارے میں ایسا لوث ہو جس کی بنیاد پر اس شخص پر قتل کا دعویٰ کیا جا سکے۔ لوث سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو یہ گمان غالب ہو جائے کہ دعویٰ کرنے والا سچا ہے اس طور پر کہ کسی گھر یا کسی صحراء میں کئی لوگ ایک ساتھ جمع ہوں پھر وہ مقتول سے الگ ہو جائیں تو غالب گمان ان کے بارے میں یہی ہوگا کہ قاتل انہی میں موجود ہے۔ یا ایسی صورت ہو کہ کسی ٹھہرنے کی جگہ یا کسی بستی میں مقتول پایا جائے اور وہاں کے سارے لوگ مقتول کے دشمن ہوں' کوئی غیر اُن میں شامل نہ ہو تو وہاں بھی غالب گمان یہی ہوگا کہ یہیں کے لوگوں نے قتل کیا ہے۔ اگر مقتول کا سرپرست ان لوگوں میں سے کسی کے خلاف دعویٰ کر دے تو وہ اپنے مدعیٰ علیہ (جس کے

---

۱۹۷ علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے ذیل میں جس مسئلہ پر بحث کی ہے اُس کو فقہی اصطلاح میں ''قسامت'' کہتے ہیں۔ ائمہ ثلثہ (امام شافعی' امام مالک اور امام احمد بن حنبل) کا موقف اس بارے میں یہ ہے کہ اگر کسی محلّہ میں کوئی مقتول پایا جائے تو پہلے اس کے وُرثاء سے کہا جائے گا کہ تم جس شخص یا جماعت کے بارے میں قتل کا دعویٰ کرتے ہو اس پر پچاس قسمیں کھاؤ۔ اگر ورثاء قسم کھانے سے انکار کر دیں تو جس کے خلاف انہوں نے دعویٰ کیا ہے اس پر قسم لازم ہوگی اور قسم کے بعد اُسے دیت بھی ادا کرنا ہوگی۔ ان ائمہ کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن سہل' حضرت حویصہ اور حضرت محیصہ' (جو کہ یہودیوں پر قتل کے مدّعی تھے) اُن پر نبی اکرم ﷺ نے قسم پیش فرمائی اور جب انہوں نے قسم کھانے سے انکار کر دیا تو پھر آپ نے یہود پر قسم پیش کی۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قسامت میں پہلے قسم مدّعی سے لی جائے گی اور اگر وہ انکار کر دے تو پھر مدعیٰ علیہ سے قسم لی جائے گی۔ (شرح صحیح مسلم ج۴ص ۶۲۸) اس کی مکمل تفصیل کے لیے تفسیر خازن کی حدیث: ۱۰۴ ملاحظہ فرمائیں۔ زیرِ بحث مسئلہ میں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف' اُن کے دلائل اور ائمہ ثلثہ کی دلیل کا جواب آئندہ حواشی میں ذکر کیا جائے گا۔

خلاف دعویٰ کیا ہے) کے خلاف پچاس قسمیں اُٹھائے گا۔ اور اگر مقتول کے کئی سرپرست ہوں تو قسموں کو ان پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ جب وہ سارے قسم اٹھا لیں گے تو وہ اپنے مدعیٰ علیہ کی عاقلہ[۱۹۸] سے دیت لیں گے' بشرطیکہ انہوں نے قتلِ خطاء[۱۹۹] کا دعویٰ کیا ہو۔ اگر ان کا دعویٰ قتلِ عمد[۲۰۰] کا ہو تو دیت مدعیٰ علیہ کے مال سے لیں گے اور اکثر مشائخ کے قول کے مطابق قاتل پر قصاص (خون بہا) نہیں ہو گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ قاتل پر قصاص واجب ہو گا۔ امام مالک اور امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔

اگر وہاں کسی شخص کے بارے میں لوث (غالب گمان) نہ ہو تو پھر مدعیٰ علیہ کی بات معتبر ہو گی۔ کیونکہ اصل اُس کا قتل سے بریٔ الذمہ ہونا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس صورت میں دعویٰ کرنے والا ایک قسم اٹھائے گا یا پچاس قسمیں؟ سو اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم اٹھائے گا' جیسا کہ تمام دعوؤں کا قاعدہ ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ پچاس قسمیں اٹھائے گا' کیونکہ مقتول کا معاملہ بہت سخت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف اس بارے میں یہ ہے کہ لوث (غالب گمان) کی بناء پر قتل کا حکم ثابت نہیں ہو گا' نہ ہی دعویٰ کرنے والے کی قسم سے آغاز کیا جائے گا۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ جب کسی رہائشی جگہ میں کوئی مقتول پایا جائے تو اس جگہ کے رہنے والوں میں جو نیک لوگ ہوں اُن میں سے پچاس آدمیوں کو حاکم وقت منتخب کر کے اُن سے اس بات پر حلف لے کہ انہوں نے نہ تو اس شخص کو قتل کیا ہے نہ ہی وہ لوگ اس کے قاتل کو پہچانتے ہیں۔ اگر وہ پچاس آدمی اس بات پر حلف اُٹھا لیں تو ٹھیک ہے ورنہ وہاں کے رہنے والوں سے دیت لی جائے گی[۲۰۱]۔ یہ بات کہ لوث (غالب گمان) کے ہوتے ہوئے مدعی کی قسم سے آغاز کیا جائے گا' اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' وہ بیان کرتے ہیں:

---

۱۹۸ ''عـاقـلـه'' سے مراد قاتل کے وہ رشتہ دار ہیں جو باپ کی طرف سے ہوں۔ نیز اس میں قاتل کے ورثاء اور اس کی برادری کے لوگ بھی شامل ہیں۔ (مفصل تحقیق کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج۵ ص۸۷۲)

۱۹۹ قتل خطاء سے مراد وہ قتل ہے جس میں غلطی واقع ہو جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:
ایک صورت یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو اپنے گمان اور خیال میں غلطی ہو جائے۔ مثلاً کسی شخص کو حربی یا جانور سمجھ کر نشانہ بنایا اور وہ شخص مسلمان تھا' تو یہ قتل خطاء ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو اپنے نشانہ میں غلطی ہو جائے۔ مثلاً اُس نے کسی شکار کو نشانہ بنایا اور غلطی سے تیر یا گولی کسی مسلمان کو لگ گئی تو یہ بھی قتل خطاء ہے۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج۱۰ ص۱۲۸)

۲۰۰ قتل عمد سے مراد وہ قتل ہے جس میں آدمی جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنے کے لیے آلۂ جارحہ استعمال کرے (یعنی ایسا کوئی ہتھیار جو زخم ڈالنے والا ہو)۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج۱۰ ص۱۲۴)

۲۰۱ اس مقام پر علامہ خازن نے امام اعظم کے مؤقف پر دلیل ذکر نہیں کی' جب کہ اگلی عبارت میں ائمہ ثلثہ کے مؤقف پر دلیل نہ صرف بیان کی ہے بلکہ تفصیل اور شرح کے ساتھ بیان کی ہے۔ نیز اس مقام پر علامہ خازن نے احناف کا مؤقف بھی صحیح بیان نہیں فرمایا۔ احناف کا مؤقف یہ نہیں ہے کہ پچاس آدمیوں کے قسم نہ کھانے کی صورت میں اہل محلّہ سے دیت لی جائے گی۔ جیسا کہ علامہ خازن نے بیان کیا ہے۔
احناف کا مؤقف یہ ہے کہ کسی جگہ سے مقتول کے ملنے کی صورت میں اُس جگہ کے پاس آدمیوں سے اس بات پر قسم لی جائے کہ انہوں نے نہ تو اس شخص کو قتل کیا ہے نہ ہی وہ لوگ اس کے قاتل سے واقف ہیں اور قسم اٹھانے کے بعد پھر وہ لوگ دیت ادا کریں۔
(البحر الرائق' فتاویٰ شامی' فتاویٰ عالمگیری اور دیگر کتب فقہ میں باب القسامۃ دیکھئے)
احناف کے اس مؤقف کا مفہوم یہ ہے کہ قسامت میں قسم کا آغاز مدعیٰ علیہ سے ہو گا۔ جبکہ ائمہ ثلثہ فرماتے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۰۴) حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعود بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما خیبر گئے اور وہ صلح کا زمانہ تھا۔ یہ دونوں وہاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ پھر حضرت محیصہ' عبداللہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ خون میں لتھڑے ہوئے ہیں اور مقتول ہیں۔ محیصہ نے ان کو دفن کر دیا اور وہ مدینہ شریف آ گئے۔ یہاں آ کر عبداللہ کے بھائی عبدالرحمٰن اور مسعود کے دونوں بیٹے محیصہ اور حویصہ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سہل جو کہ ان میں کم سن تھے' بات چیت کرنے کے لیے آگے بڑھے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بڑی عمر والے کو بات کرنے دو۔ وہ خاموش ہو گئے اور محیصہ اور حویصہ نے گفتگو کی۔ نبی اکرم ﷺ نے گفتگو سن کر ارشاد فرمایا: کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں جب کہ ہم نہ تو موقع پر موجود تھے نہ ہم نے دیکھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر تو یہودی پچاس قسمیں کھا کر اپنی برأت ثابت کر لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کافروں کی قسموں کو کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ صورت حال دیکھی تو خود مقتول کی دیت ادا فرمائی۔[۲۰۲]

(صحیح بخاری: ۳۱۷۳' صحیح مسلم: ۱۶۶۹' سنن ترمذی: ۱۴۲۲' سنن ابوداؤد: ۴۵۲۰' سنن نسائی: ۴۷۲۴' سنن ابن ماجہ: ۲۶۷۷' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۰۶)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہیں کہ قسم کا آغاز مدعی سے ہوگا۔ احناف کی اپنے موقف پر دلیل یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہود سے قسامت کی ابتداء کرتے ہوئے فرمایا: کیا تمہارے پاس آدمی قسم کھائیں گے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے انصار سے فرمایا: کیا تم قسم کھاؤ گے؟ انہوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہم غیب پر کیسے قسم کھا سکتے ہیں؟ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہود پر دیت لازم کر دی' کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا تھا۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۰ ص ۲۸۔۲۷' سنن کبریٰ للبیہقی ج ۸ ص ۱۲۲۔۱۲۱' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۲۹) دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قسم کا رواج تھا' نبی اکرم ﷺ نے اس کو برقرار رکھا۔ انصار کا ایک شخص یہود کے ایک قلعہ میں مقتول پایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے ابتداء کی اور ان کو پچاس قسموں کا مکلف کیا۔ الی اخر الحدیث۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۲۷۶' کنز العمال ج ۱۰ ص ۱۴۵۔۱۴۴' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۳۰)

امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے: سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۶۶: ۴۵۲۶' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۳۰)

۲۰۲ اس حدیث سے علامہ خازن ائمہ ثلاثہ کے موقف پر دلیل پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے محیصہ اور حویصہ کی گفتگو سن کر ارشاد فرمایا کہ کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے؟ یعنی آپ ﷺ نے مدعی کی قسم سے آغاز فرمایا۔ جبکہ امام اعظم فرماتے ہیں کہ قسم کا آغاز مدعیٰ علیہ سے کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ حدیث امام اعظم کے موقف کے خلاف ہے۔
احناف اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ جو کلمات ہیں کہ "کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے" یہ اہل تحقیق کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کے کلمات نہیں ہیں۔ اگر بالفرض یہ آپ ﷺ کے کلمات ہیں تو آپ نے یہ کلمات انکار کے طور پر فرمائے ہیں یعنی اس معنیٰ میں کہ تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت نہیں کر سکتے۔ حدیث کے کلمات اس طرح سے ہیں: افتحلفون وتستحقون دم صاحبکم؟ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۔ (الشعراء: ۱۶۶۔۱۶۵) کیا تم دنیا کے مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے ہو اور اپنی ان بیویوں کو چھوڑتے ہو جن کو تمہارے رب نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسا مت کرو۔ اسی طرح زیر بحث حدیث میں جو فرمایا کہ کیا تم قسم کھاؤ گے؟ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ قسم مت کھاؤ۔ (المبسوط ج ۲۶ ص ۱۰۹' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۳۴)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یقسم خمسون منکم علی رجل منهم فیدمع برمته. (صحیح مسلم:۱۶۶۹)

تمہارے پچاس آدمی ان کے کسی آدمی کے خلاف قسم کھائیں' تو وہ آدمی بالکل تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے:

فکرھه رسول الله ﷺ ان یبطل دمه فوداه مائة من ابل الصدقة. (صحیح بخاری:۶۸۹۸' صحیح مسلم:۱۶۶۹)

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن سہل کا خون رائیگاں جائے' سو آپ نے صدقہ کے اونٹوں میں سے اُنہیں سو اونٹ دیت ادا فرمائی۔

(زیر بحث مسئلہ میں) حدیث مذکور سے استدلال کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے قتل کے اس کیس میں دعویٰ کرنے والوں کی قسم سے آغاز فرمایا' تاکہ لوث کے ذریعہ ان کی جانب مضبوط ہو جائے۔ اس لیے کہ قسم ہمیشہ وہی اٹھاتا ہے جس کی جانب مضبوط ہو۔ اور لوث نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ کی جانب مضبوط ہو گی' کیونکہ اصل اس کا بریٔ الذمہ ہونا ہے۔ لہٰذا قسم کے ساتھ اس کی بات مان لی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے' سو وہ (سختی میں) پتھروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں' اور بے شک پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ جب پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور کچھ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ ان کاموں سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو O

﴿قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ کا معنیٰ ہے: تمہارے دل خشک ہو گئے۔ دل سے نرمی اور مہربانی نکل جائے تو اُسے قساوتِ قلبی کہتے ہیں۔ بعض نے ﴿قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تمہارے دل سخت اور سیاہ ہو گئے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ سے مراد ہے: اُن

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) جواب مذکور کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب مدّعیان سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے؟ تو مدّعیان نے عرض کیا کہ ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں جبکہ ہم نہ تو موقع پر موجود تھے نہ ہی ہم نے واقعہ دیکھا ہے۔ اس جواب سے واضح ہوتا ہے کہ مدّعیان نے نبی اکرم ﷺ کے جملہ کو انکاری ہی سمجھا تھا اور اسی انکار کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں؟ اگر مدّعیان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کا مذکورہ جملہ ''ارشاد اور حکم'' ہوتا تو وہ ہرگز یہ جواب نہ دیتے کہ ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں؟ کیونکہ یہ جواب حکم نبوی کا رد ہوتا جو کہ کسی صحابی سے متصور اور ممکن نہیں ہے۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری علیہ رحمۃ الباری نے اس حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا مدّعیان سے فرمانا کہ کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے؟ یہ حکم خاص ہے۔ اس پر تمام احکام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس حدیث کو بنیاد بنا کر ہر فیصلہ میں مدّعی سے قسم کا آغاز کیا جائے اور شارع علیہ السلام کو اختیار ہے کہ وہ کسی کو کسی حکم کے ساتھ خاص فرما لیں۔ دوسرا یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا مدّعیان سے فرمانا کہ کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کر لو گے؟ یہ بہ طور فتویٰ تھا' فیصلہ کے طور پر نہیں تھا۔ کیونکہ فیصلہ تو اس وقت ہوتا ہے جب فریق مخالف موجود ہو اور زیر بحث مسئلہ میں حضرت محیصہ اور حویصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مدّ مقابل (یہودی) موجود نہیں تھے۔ (مرقات ج ۷ ص ۹۲)

دلائل اور نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد (تمہارے دل سخت ہوگئے) جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ﴿مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ میں اشارہ مقتول کو گائے کا ایک ٹکڑا مارنے کے بعد اس کو زندہ کرنے کی طرف ہے (یعنی مقتول کو زندہ کرنے کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے)۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ دل سختی میں پتھروں کی طرح ہے۔ پتھروں سے مراد ایسی سخت چیز ہے جس میں کوئی فاصلہ اور گیپ نہ ہو (اس کے اجزاء آپس میں پیوستہ اور ملے ہوئے ہوں)۔

﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ میں جو "او" ہے اس کے بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ یہ "بل" کے معنیٰ میں ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ "واؤ" کے معنیٰ میں ہے (یعنی "ان کے دل پتھروں کی مانند ہیں بلکہ اس سے زیادہ سخت ہیں" یا "ان کے دل پتھروں کی مانند ہیں اور اس سے زیادہ سخت ہیں")۔

بنی اسرائیل کے دلوں کو لوہے کی بجائے پتھروں کی طرح قرار دینے کی توجیہ

اگر تم سوال کرو کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دلوں کو پتھروں کی طرح کیوں قرار دیا' اور لوہے کی طرح قرار نہیں دیا' حالانکہ لوہا پتھر سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتا ہے؟ تو میں یہ کہوں گا کہ لوہے کی طرح اس لیے قرار نہیں دیا کہ لوہا آگ سے پگھل سکتا ہے اور سیدنا داؤد علیہ السلام کے لیے پگھل گیا تھا [۲۰۳] لیکن پتھر نہ پگھل سکتا ہے نہ کبھی پگھلتا ہے (اس لیے فرمایا: ان کے دل پتھر کی مانند ہیں)۔

سخت دل کے مقابلہ میں پتھر کی فضیلت کا بیان

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے سخت دل کے مقابلہ میں پتھر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ بے شک پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے تمام پتھر مراد ہیں اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے وہ پتھر مراد ہے جس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام قبیلے والوں کو سیراب کرنے کے لیے عصا مارا کرتے تھے۔ "تفجر" کا معنیٰ ہے: کسی چیز کا کشادگی اور کثرت کے ساتھ کھل جانا۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ اور بے شک کچھ وہ پتھر ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی نکل آتا ہے۔ پانی سے یہاں چھوٹے چشمے مراد ہیں جو کہ نہروں سے کم ہوں۔

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ اور کچھ پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ یعنی پہاڑ کے اوپر سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ پتھروں کے اندر خوفِ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اُن سے چاہتا ہے وہ اس سے پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ جب کہ اے گروہِ یہود! تمہارے دل نہ تو نرم ہوتے ہیں نہ ہی خوف رکھتے ہیں۔

پتھر اور دیگر جمادات وحیوانات کے اندر خوفِ الٰہی ہے یا نہیں؟

اگر تم سوال کرو کہ پتھر تو ایک ایسا جماد ہے جو عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتا ہے' پھر وہ (اللہ تعالیٰ سے) کیسے ڈرتا ہے؟ تو میں اس کا جواب دوں گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پتھر اور تمام جمادات کو سمجھ دینے پر قادر ہے یوں اللہ تعالیٰ کے اس خوف کو پیدا کرنے اور عطا کرنے کی وجہ سے جمادات عقل بھی رکھتے ہیں اور خوف بھی رکھتے ہیں۔ اہل سنّت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جمادات اور حیوانات کے اندر ایسا علم وحکمت رکھا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ چنانچہ جمادات اور حیوانات کی بھی

---

۲۰۳ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (سبا:١٠) اور ہم نے داؤد کے لیے لوہا نرم کر دیا۔

اپنی نماز تسبیح اور خوفِ الٰہی ہے۔اس پر دلیل درج ذیل آیات طیبہ اور احادیث مبارکہ ہیں:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ . (الاسراء:۴۴) اور ہر چیز اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہی ہے۔

وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ . (النور:۴۱) اور پرندے پَر پھیلائے ہوئے (اس کی تسبیح کر رہے ہیں) ہر ایک نے اپنی نماز اور اپنی تسبیح کو جان رکھا ہے۔

لہٰذا آدمی پر واجب ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے۔

احادیث مبارکہ درج ذیل ہیں:

(۱۰۵) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میں مکہ کے اندر ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو کہ مجھ پر میری بعثت سے قبل ہی سلام کیا کرتا تھا۔اُس پتھر کو میں ابھی بھی پہچانتا ہوں[۲۰۴] (صحیح مسلم: ۲۲۷۷، سنن الترمذی: ۳۶۲۴، مسند احمد ج۵ ص۸۹، صحیح ابن حبان: ۶۴۸۲، سنن دارمی ج۱ ص۱۵، شرح السنہ ج۷ ص۶۹، ۴۶، مشکوٰۃ ص۵۴۴ مطبوعہ کراچی)

(۱۰۶) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ میں تھا۔(ایک دن) ہم مکہ کے کسی علاقہ میں نکلے تو جو پہاڑ اور جو درخت نبی اکرم ﷺ کے سامنے آیا وہ یہی کہہ رہا تھا: ''السلام علیک یا رسول اللہ'' اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلام ہو۔[۲۰۵]

(سنن ترمذی: ۳۶۲۶، المستدرک للحاکم ج۲ ص۶۲۰، سنن دارمی ج۱ ص۱۵، شرح السنہ ج۷ ص۷۰، ۴۴، مشکوٰۃ ص۵۴۰)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

---

[۲۰۴] علامہ ابوالعباس القرطبی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعثت سے قبل ہی وہ پتھر نبی اور رسول کہہ کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سلام کیا کرتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا نبی اکرم ﷺ پر لطف و احسان تھا کہ اُس نے بعثت سے قبل ہی آپ کے لیے ایسی چیزیں قائم فرما دیں جو آپ ﷺ کی بعثت کی خبر اور بشارت دینے والی تھیں۔(المفہم ج۶ ص۱۵) زیر بحث حدیث میں جس پتھر کا تذکرہ ہے اُس کے بارے میں بعض شارحین کا قول یہ ہے کہ یہ حجر اسود ہے۔لیکن اس بارے میں صحیح ترین بات یہ ہے کہ یہ وہ پتھر ہے جو مکہ معظمہ میں زقاق الحجر میں واقع ہے۔زقاق الحجر مکہ معظمہ کا ایک محلّہ ہے جو کہ کعبۂ معظمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کے درمیان واقع ہے۔اس حدیث میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بچپن شریف میں ہی اپنی نبوت کا علم حاصل تھا۔
(مراۃ المناجیح ج۸ ص۱۲۱)

[۲۰۵] اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ درختوں اور پہاڑوں نے نبی اکرم ﷺ پر سلام پڑھا، یہ آپ ﷺ کا معجزہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس سلام کو سنا، یہ اُن کی کرامت ہے۔کیونکہ بے جان چیزوں کے بولنے اور پڑھنے کی آواز سننے سے ہمارے کان عاجز ہیں۔(مرقات ج۱۰ ص۲۵۶)

(۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ پر سلام پڑھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم اور محبت کی دلیل ہے۔لہٰذا جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر سلام پڑھتے ہیں وہ آپ جناب کی تعظیم کرنے والوں اور آپ ﷺ سے محبت رکھنے والوں کی صف میں ہیں۔

(۱۰۷) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (مسجد نبوی میں) ایک تنا تھا جس کے سہارے نبی اکرم ﷺ کھڑے ہوا کرتے تھے۔ جب آپ کے لیے (باقاعدہ) منبر[206] بنا دیا گیا تو ہم نے اُس تنے سے ایسی آواز سُنی جیسی دس ماہ کی حاملہ اونٹنیوں سے آتی ہے۔ یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور اپنا ہاتھ اُس تنے پر رکھا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ کھجور کا وہ تنا اس طرح چیخنے لگا جس طرح بچہ چیخیں مارتا ہے[207] پھر نبی اکرم ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور اس تنے کو اپنے ساتھ چمٹا لیا (جب اس کو اپنے ساتھ چمٹایا تو) وہ اس طرح کی آواز نکالنے لگا جس طرح (روتا ہوا) بچہ تھپکی دیتے وقت آواز نکالتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ تنا اس پر رو رہا تھا کہ (پہلے) وہ اپنے پاس ذکر سُنا کرتا تھا۔[208] (صحیح بخاری: ۹۱۸۔۳۵۸۴' مسند احمد ج ۱ص ۲۴۹۔ ج ۳ص ۲۹۳۔۳۰۶' سنن دارمی ج ۱ص ۱۷' شرح السنہ ج ۷ص ۲۸۱' مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۳۶' مطبوعہ کراچی)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ "کوئی بھی پتھر اوپر سے نیچے صرف اللہ عزوجل کے خوف سے اُترتا ہے"۔ اور یہ قول ہماری ذکر کردہ باتوں پر شاہد ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ اس میں (یہودیوں کے لیے) وعید اور تہدید (دھمکانا) ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان سنگ دلوں کی تاک میں ہے اور ان کے کرتوت دیکھ رہا ہے' یہاں تک کہ اُنہیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے آخرت میں سزا دے گا۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہاری خاطر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ کا کلام

[206] اس کا واقعہ یہ ہے کہ انصار کی کسی عورت یا مرد نے کہا: یارسول اللہ (ﷺ) کیا ہم آپ کے لیے منبر نہ بنا دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو (تو بنا دو)۔ انہوں نے منبر بنا دیا۔ جب جمعہ کا دن آیا تو نبی اکرم ﷺ منبر کی طرف گئے تو وہ کھجور کا تنا بچے کی طرح بلند آواز سے رونے لگا۔ (صحیح بخاری: ۴۴۹۔۳۵۸۴)

[207] رونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے قرب و وصل سے جدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ جمعہ کے دن اُسی تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث: ۳۵۸۴ میں موجود ہے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جب یہ حدیث بیان فرماتے تو کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے عشق و محبت میں خشک لکڑی نے آہ و زاری کی تو تم زیادہ اس بات کے حق دار ہو کہ نبی اکرم ﷺ کے مشتاق بنو۔ (فتح الباری ج ۶ص ۷۴۷)

[208] اس جملہ سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اُس درخت کے رونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ عزوجل کا جو ذکر سنا کرتا تھا اُس سے وہ محروم ہو گیا تھا' نہ یہ بات کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے جدا ہونے پر غمزدہ تھا۔ ہمارے نزدیک یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اُس تنے کے رونے کی وجہ صرف یہی ہو کہ وہ ذکر سننے سے محروم ہو گیا تھا تو چاہیے کہ ہر درخت کا تنا روتا رہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اس جملہ کا مفہوم یہ لینا ہوگا کہ وہ درخت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ چمٹ کر جو ذکر سنتا تھا اُس سے وہ محروم ہو گیا تھا' نہ یہ معنیٰ کہ وہ محض ذکر سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ کیونکہ محض ذکر سننا تو منبر بننے کے بعد بھی ممکن تھا' جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سنا کرتے تھے۔ اور سب سے مضبوط دلیل یہ کہ تنے کے رونے پر جب اس کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے ساتھ چمٹا لیا تو وہ سسکیاں بھرنے لگا اور بعض روایات کے مطابق وہ سکون میں آ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر وہ نبی اکرم ﷺ کے فراق اور محبت میں رو رہا تھا۔

سنتا ہے پھر اس کو سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تبدیلی کر دیتا تھا۔

''افتطمعون'' میں خطاب صرف نبی اکرم ﷺ سے ہے یا آپ کے اصحاب سے بھی؟

اس آیت میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے۔ کیونکہ آپ ہی ایمان کی طرف بلانے والے ہیں۔ اور جمع کا صیغہ آپ ﷺ کی تعظیم کے پیش نظر لایا گیا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس میں خطاب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب سے ہے۔ کیونکہ صحابہ بھی ایمان کی طرف بُلانے والے ہیں۔

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: ''افترجون'' کیا آپ امید رکھتے ہیں۔ ﴿ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: یہودی اس بات کی تصدیق کریں گے جو تم اُنہیں بتاتے ہو؟ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ کیا تم اس بات کی امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے؟ جبکہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے۔ حالانکہ اُن پر ایمان لانا ہی ان یہودیوں کے لیے ذلت سے نجات کا باعث تھا اور یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام سے معجزات ظاہر ہونے کے باوجود اُن پر ایمان نہیں لائے۔

جو اللہ کا کلام سُن کر اُس میں تبدیلی کر دیتے تھے اُن سے کون سا فریق مراد ہے؟

بعض کا قول یہ ہے کہ فریق سے مراد وہ لوگ ہیں جو میقات والے دن سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے؛ جنہوں نے اللہ عزوجل کا کلام سنا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس کے لوگ ہیں۔ یہ قول زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ ''اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ'' کی ضمیر بھی اُنہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لہٰذا ﴿ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ میں ''کلام اللہ'' سے مراد تورات ہو گی کیونکہ جو شخص تورات سُنتا ہو اُس کے لیے یہ کہنا کہ وہ کلام اللہ سُنتا ہے؛ صحیح ہے۔

﴿ یُحَرِّفُوْنَهٗ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تغیر اور تبدیلی کر دیتے ہیں۔ اب جن علماء نے فریق سے وہ لوگ مراد لیے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے؛ اُن کا استدلال سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس فرمان سے ہے کہ یہ آیت اُن ستّر افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے وعدے کے لیے منتخب فرمایا (اُن کے بارے میں اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ایک گروہ کلامِ الٰہی کو خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر بدل دیتا تھا) کیونکہ یہ ستّر افراد اللہ عزوجل کا کلام سننے کے بعد جب اپنی قوم کی طرف لوٹے تو ان میں سے جو سچ بولنے والے تھے اُنہوں نے جیسا سُنا تھا ویسا اپنی قوم تک پہنچا دیا۔ اور ایک گروہ اُن میں سے ایسا تھا جس نے قوم کے افراد سے کہا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو سُنا؛ وہ اپنے کلام کے آخر میں فرما رہا تھا کہ ''اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرو اور چاہو تو نہ کرو''۔ یہ اُن لوگوں کی تحریف تھی جو انہوں نے کلام الٰہی میں کی۔ جب کہ وہ علماء جنہوں نے فریق سے وہ لوگ مراد لیے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھے؛ اُن کا کہنا یہ ہے کہ اُن لوگوں نے کلامِ الٰہی میں اس طرح تحریف کی کہ نبی اکرم ﷺ کی صفت اور تورات میں موجود آیتِ رجم کو تبدیل کر لیا۔

﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (انہوں نے کلام الٰہی میں تحریف کی) بعد اس کے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کے کلام کی صحت اور اس کی مراد کو جان لیا؛ اس کے باوجود اس کلام کی مخالفت کی۔ ﴿ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کا مخالفت کرنا غلط ہے؛ اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ لوگ جھوٹے ہیں (اس کے باوجود کلام الٰہی میں تحریف کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں)۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

اور جب یہ لوگ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے کے ساتھ

تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتادیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں؟ یوں تو وہ اُن باتوں کو تمہارے رب کے سامنے تمہیں پر حجت بنا کر پیش کریں گے' کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟O

واقعۂ نزول اور یہودیوں کی منافقت کا بیان

یہ آیت مبارکہ ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں موجود تھے۔حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہودیوں میں جو منافقین تھے وہ جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے ملتے تو اُن سے کہتے کہ''ہمارا بھی اُس شخصیت پر ایمان ہے جس پر تمہارا ایمان ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے صاحب (نبی اکرم ﷺ) سچے ہیں اور ان کا پیغام حق ہے۔ہمیں اپنی کتاب (تورات) میں اُن کی نعت اور ان کی تعریف ملتی ہے''۔

﴿وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ﴾ اس سے مراد کعب بن اشرف' کعب بن اسد' وہب بن یہودا اور دیگر سرداران یہود مراد ہیں۔انہوں نے اپنے اُن یہودیوں کو جو منافق تھے' مذکورہ بات کہنے پر ملامت کی اور کہنے لگے:

﴿أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾ کیا تم مسلمان کو وہ باتیں بتادیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری کتاب میں تمہیں (سیدنا) محمد (ﷺ) کی جو تعریف' ان کی حقانیت اور ان کے پیغام کا سچ ہونا بیان کر دیا ہے تم وہ سب مسلمانوں کو بیان کر دیتے ہو؟

﴿لِيُحَاجُّوكُم بِهِ﴾ یوں تو مسلمان ان باتوں کو تمہارے خلاف حجت بنائیں گے۔یعنی محمد ﷺ کے اصحاب تمہارے ہی قول کو بنیاد بنا کر تم سے جھگڑیں گے اور تمہارے خلاف حجت لائیں گے۔(اور جب ایسا ہوگا) تو وہاں تم سے یہ کہیں گے کہ تم ہی لوگوں نے اقرار کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ تمہاری کتاب کے مطابق برحق ہیں' پھر تم لوگوں نے ان کی پیروی کیوں نہ کی؟

ہوا یہ کہ جب اہل مدینہ نے یہودیوں سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ آیا نبی اکرم ﷺ کی اتباع کی جائے یا نہیں؟ تو یہودیوں نے اہل مدینہ سے کہا کہ تم اُن پر ایمان لے آؤ' کیونکہ وہ سچے نبی ہیں۔پھر (خود ہی) ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے تم پر کھول دی ہیں تم وہ مسلمانوں کو بتادیتے ہو؟ تاکہ تمہارے خلاف مسلمانوں کے پاس حجت قائم ہو۔

(مذکورہ آیت میں) ﴿عِندَ رَبِّكُمْ﴾ جو فرمایا اس سے مراد ہے: دنیا میں اور آخرت میں (تمہارے خلاف مسلمانوں کے پاس حجت ہو) بعض کا قول یہ ہے کہ مذکورہ قول بنوقریظہ کے یہودیوں کا ہے جو اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا اور اس وقت کہا جب نبی اکرم ﷺ نے اُن سے کہا:''یا اخوان القردة والخنازیر''اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو! (جب یہودیوں نے یہ سُنا) تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کو یہ بات کس نے بتائی؟ ہو نہ ہو یہ بات تم ہی سے نکلی ہے۔[۲۰۹]

۲۰۹ اس کا واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بنوقریظہ کے موقع پر جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنوقریظہ سے مقابلہ کرنے کے لیے اُترے تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں یہودیوں کو گالی گلوچ کرتے ہوئے سنا۔حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سارا واقعہ نبی اکرم ﷺ کو سنایا تو آپ ﷺ خود یہودیوں کی طرف تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا کہ اے بندر اور خنزیر کے بھائیو! اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ذلیل کرے اور تم پر ایسا عذاب نازل فرمائے' کیا تم لوگوں نے معاہدہ توڑ دیا ہے؟ تو یہودیوں نے جواباً کہا: اے محمد (ﷺ) آپ جاہل نہیں ہیں' لہٰذا آپ ہمارے ساتھ بے خبری والا سلوک نہ کریں (یعنی آپ ہمیں بندر اور خنزیر کا بھائی نہ کہیں) آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ ہو نہ ہو یہ بات ہمارے ہی لوگوں سے نکل کر آپ تک پہنچی ہے۔(تفسیر قرطبی' البقرہ:۷۶' الانفال:۲۷)

اس واقعہ میں نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں سے جو فرمایا:''اے بندر اور خنزیر کے بھائیو!''اس سے ان کی اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ نے ان کے پچھلے لوگوں میں سے بعض کو بندر اور بعض کو خنزیر بنا دیا تھا۔

جیسا کہ خود ارشاد فرمایا:

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ. (المائدہ:۶۰)　　　　اور اُن میں سے بعض کو بندر اور بعض کو خنزیر بنا دیا۔

بعض کا قول یہ ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کو اپنے اُن عذابات کے بارے میں بتادیا جو اُنہیں مختلف جرائم پر اللہ تعالیٰ نے دیئے۔ (جب دیگر یہودیوں کو یہ معلوم ہوا) تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے خلاف عذاب کے جو فیصلے فرمائے وہ تم مسلمانوں کو بتاتے ہو؟ تاکہ مسلمان اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنے آپ کو تم پر معزز سمجھیں۔ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ یعنی جس نہج پہ تم چل رہے ہو وہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۷

کیا وہ (یہودی) اس (حقیقت) کو نہیں جانتے کہ اللہ ان تمام باتوں کو جانتا ہے جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں ۝

﴿اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ﴾ سے مراد ہے: یہودی (یعنی کیا یہودی نہیں جانتے) ﴿مَا يُسِرُّوْنَ﴾ سے مراد ہے: جو وہ چھپاتے ہیں اور ﴿مَا يُعْلِنُوْنَ﴾ سے مراد ہے جو وہ ظاہر کرتے ہیں (یعنی کیا یہودی نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُس سے باخبر ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۷۸

اور ان میں کچھ اَن پڑھ ہیں جو زبانی پڑھنے کے سوا کتاب کو نہیں جانتے اور یہ لوگ صرف وہم وگمان پہ گزارا کرتے ہیں ۝

﴿مِنْهُمْ﴾ سے مراد یہودی ہیں (یعنی کچھ یہودی اُمّی ہیں) اور اُمّی سے مراد یہ ہے کہ وہ نہ تو اچھی طرح لکھ سکتے ہیں نہ اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔

﴿اُمِّيُّوْنَ﴾ ''اُمّــی'' کی جمع ہے اور یہ ''اُمّ'' (بمعنیٰ ماں) کا اسم منسوب ہے۔ گویا اَن پڑھ وہ ہوتا ہے جو اُسی حالت پر برقرار ہو جس پر وہ اپنی ماں سے جُدا ہوا تھا' یعنی نہ تو اُس نے لکھنا سیکھا ہو نہ پڑھنا سیکھا ہو۔

''أمانيّ'' سے مراد تلاوت کرنا ہے یا جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف اقوال

﴿لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ وہ سوائے زبانی پڑھنے کے اللہ کی کتاب کا علم نہیں رکھتے۔ ﴿اَمَانِيَّ﴾ ''أمنية'' کی جمع ہے اور ''أمنية'' کا معنیٰ ہے: تلاوت کرنا اسی معنیٰ میں شاعر کا یہ شعر ہے:

تــمــنــی کتــاب الــلــه اول لیــلــه　　اُس نے رات کے آغاز میں اللہ کی کتاب کی تلاوت کی

تــمــنــی داود الــزبــور عــلــی رســل　　حضرت داؤد علیہ السلام نے آہستگی کے ساتھ زبور کی تلاوت کی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ یہودی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معانی نہیں پہچانتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ''أماني'' سے مراد ہے: جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں۔ یعنی وہ باتیں جن کو یہودی علماء نے اپنی طرف سے لکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا۔ اور وہ یہ تھا کہ انہوں نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور آپ کی صفت کو اور دیگر چیزوں کو تبدیل کر دیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''أمـانـي'' ''تـمـنّي'' سے ہے (بمعنیٰ آرزو اور خواہش) اور اس سے مراد یہودیوں کا یہ قول ہے کہ ''ہمیں آگ صرف چند دن چھوئے گی''۔ اور اس کے علاوہ دیگر آرزوئیں مراد ہیں۔ اس قول کی بناء پر آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ یہودی کتاب کو نہیں جانتے ہیں' البتہ ایسی چیزوں کی آرزو کرتے ہیں جو اُنہیں حاصل نہیں ہوتی ہیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ یہ لوگ صرف وہم وگمان پہ گزارا کرتے ہیں یعنی ان یہودیوں کو یقین حاصل نہیں ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر (مستزاد یہ کہ) اس کے بدلہ معمولی قیمت حاصل کرنے کے لیے (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ سو جو کچھ ان کے ہاتھوں نے لکھا اس کی وجہ سے ان (یہودیوں) کے لیے عذاب ہے اور جو کچھ وہ کماتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے لیے عذاب ہے O

''ویل'' کے معنیٰ کی تحقیق

﴿ویـــل﴾ ایک ایسا کلمہ ہے جس کو اہل عرب ہر اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جو کسی ہلاکت اور تباہی کا شکار ہو جائے۔ لغت میں اس کا اصل معنیٰ ہے: عذاب اور ہلاکت۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''ویـل'' سے عذاب کی سختی مراد ہے۔ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۰۸) ''ویل'' جہنم میں ایک وادی ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال تک کافر اُس میں گرتا رہے گا۔

(سنن ترمذی: ۳۱۶۴' صحیح ابن حبان: ۷۴۶۷' مسند احمد ج ۳ ص ۷۵' المستدرک ج ۴ ص ۲۹۶' مسند ابو یعلیٰ: ۱۳۸۳)

☆ (۱) امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔ (۲) حدیثِ مذکور میں لفظ آیا ہے ''خریف'' اس کا معنیٰ ہے: سال۔

﴿لِلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ اس میں ''بـایـدیـهـم'' کتابت کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ (اس قید کے بغیر) گمان ہو سکتا تھا کہ یہودی کسی اور کو لکھنے کا حکم دیتے ہوں۔ سو اس شبہ کو دور کرنے کے لیے فرمایا: ''بایدیهم'' یعنی وہ خود اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور ان لکھنے والوں سے مراد یہودی ہیں۔

عوام الناس کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے سے باز رکھنے کی یہودی سازش

واقعہ یہ ہوا کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کو اپنی روٹی پانی بند ہونے اور اپنی حکومت کے ختم ہو جانے کا خوف ہوا۔ انہوں نے سازش کی کہ کمزور اور کم درجہ کے لوگوں کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اُن صفات کو جو تورات میں مذکور تھیں تبدیل کر دیا۔ تورات میں نبی اکرم ﷺ کا جو حلیہ مبارکہ مذکور تھا وہ یہ تھا کہ آپ ﷺ حسین و جمیل چہرے والے' خوبصورت بالوں والے' سُرمگیں آنکھوں والے اور درمیانہ قد والے ہیں۔[۲۱۰] یہودیوں نے اس کو تبدیل کر کے جو حلیہ لکھا وہ یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ بہت لمبے قد والے' نیلی آنکھوں

[۲۱۰] ہماری کتب حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ کا یہی حلیہ مبارکہ مذکور ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلہ کی چند احادیث ذکر کر رہے ہیں:

(۱) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں درمیانے قد کے تھے' نہ تو بہت دراز قد تھے نہ بہت پست قد کے تھے۔ خوبصورت رنگ والے تھے' نہ تو بہت زیادہ سفید تھے نہ بالکل گندمی۔ نہ تو بہت گھنگھریالے بالوں والے تھے نہ بہت سیدھے بالوں والے۔ (صحیح بخاری: ۳۵۴۷۔ ۳۵۴۸' صحیح مسلم: ۲۳۴۷)

(۲) حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین تھے اور سب سے زیادہ حسنِ اخلاق کے مالک تھے' نہ تو بہت زیادہ دراز قامت تھے نہ پست قامت کے تھے۔ (صحیح بخاری: ۳۵۴۹' صحیح مسلم: ۲۳۳۷)

(۳) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو یہی کہتا کہ آپ کی دونوں آنکھوں میں سُرمہ لگا ہوا ہے' حالانکہ سُرمہ نہیں ہوتا تھا (یعنی آپ ﷺ سُرمگیں آنکھوں والے تھے)۔

(سنن الترمذی: ۳۶۴۵' المستدرک ج ۲ ص ۶۰۲' مسند احمد ج ۵ ص ۹۷)

نوٹ: مذکورہ احادیث اور اس موضوع پر مزید احادیث کے لیے دیکھئے: مشکوٰۃ المصابیح' باب اسماء النبی ﷺ وصفاتہ' ص ۵۱۶ تا ۵۱۷' مطبوعہ کراچی۔

والے اور سیدھے بالوں والے ہیں۔ چنانچہ جب کمزور اور ادنیٰ ترین درجہ کے لوگوں نے یہودیوں سے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں سوال کیا تو یہودیوں نے اُنہیں وہ پڑھ کر سُنا دیا جو اُنہوں نے خود لکھا تھا۔

﴿ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ یعنی (نبی اکرم ﷺ کا) جو حُلیہ اُنہوں نے خود لکھا ہے (اسکو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرتے ہیں) پھر جب لوگ نبی اکرم ﷺ کو اور (یہودیوں کے بیان کردہ) حُلیہ کو دیکھتے تو نبی اکرم ﷺ کو اس حلیہ کے برخلاف پاتے۔ سو وہ نبی اکرم ﷺ کو جھٹلا دیتے اور کہتے کہ یہ وہ نبی نہیں ہے۔

اگلے جملہ میں ﴿ بِهٖ ﴾ سے مراد "مـا کتبوا" ہے یعنی جو کچھ انہوں نے لکھا اس کے بدلہ وہ تھوڑی قیمت حاصل کریں۔ تھوڑی قیمت سے مراد کھانے پینے کی چیزیں اور رشوت ہے' جو کہ وہ اپنے کمزور اور پسماندہ طبقہ سے لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کچھ اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اُس کی وجہ سے اُن کے لیے ہلاکت ہے اور جو کچھ وہ کماتے ہیں اُس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ
يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

اور (یہودیوں نے) دعویٰ کیا کہ سوائے چند دنوں کے ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی۔ آپ ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ سے تم نے کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ (اگر ایسا ہے) تب تو اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم (یونہی) اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں O

﴿ قَالُوْا ﴾ سے مراد یہودی ہیں' اُنہوں نے کہا کہ ہمیں تو آگ صرف چند دن چھوئے گی۔ چھونے سے مراد ہے پہنچنا۔ یعنی آگ ہمیں صرف چند دن پہنچے گی۔ یعنی ایک محدود مدت تک' پھر وہ عذاب ہم سے دور ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے کہا کہ دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے اور ہر ایک ہزار سال کے بدلے میں ہمیں ایک دن عذاب ہوگا۔ یوں سات دنوں کے بعد وہ عذاب ہم سے ختم ہو جائے گا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ چند دنوں سے ان کی مراد وہ چالیس دن تھے جس میں انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہودی یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کسی وجہ سے اُن پر ناراض ہے' اس لیے اُس نے چالیس دن اُنہیں عذاب دینے کی قسم اٹھائی ہے اور وہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے اُنہیں صرف چالیس دن عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس قول کا رد کرتے ہوئے اور ان کی تکذیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ یہودیوں سے کہیے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد یعنی مضبوط وعدہ لے رکھا ہے اس بات کا کہ وہ تمہیں صرف اسی (محدود) مدت تک عذاب دے گا۔

﴿ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ یا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تم جانتے ہی نہیں؟

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱

ہاں! (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جنہوں نے بُرائی کی اور اُن کی بُرائی نے اُنہیں گھیر لیا وہ جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں

گے ○

لفظ ''بلٰی'' کا فائدہ اور ''سیئۃ'' کی تفسیر

﴿بَلٰی﴾ (کا یہاں فائدہ یہ ہے کہ اس) کے ذریعہ اُس جملہ کا اثبات کیا جارہا ہے جو کلام سابق میں حرف نفی کے بعد تھا۔ یعنی ''لن تمسنا النار'' ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی۔ اور ''بلٰی'' کی وجہ سے معنیٰ ہوگا: کیوں نہیں! تمہیں ہمیشہ آگ چھوئے گی۔ ﴿سَیِّئَۃً﴾ (عربی میں) ایک ایسا لفظ ہے جو کہ چھوٹے بڑے تمام گناہوں کو شامل ہے۔ لیکن یہاں پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق ''سیئہ'' سے مراد شرک ہے۔

انسان کو خطا کے گھیرنے کا مفہوم

﴿اَحَاطَتْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُس شخص کو اُس کی خطا نے ہر طرف سے گھیر لیا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شرک ہے جس پر آدمی کو موت آجائے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''أحاطت بہ'' سے مراد یہ ہے کہ اس کو اس کی خطا نے ہلاک کر دیا ہو اور اس کی اطاعت کے ثواب کو ضائع کر دیا ہو۔

پس اس آیت میں جو ﴿سَیِّئَۃً﴾ اور ﴿خَطِیْٓـَٔتُہٗ﴾ کے الفاظ آئے ہیں اس کی تفسیر مذہب اہل سنت کے مطابق متعیّن ہے کہ اس سے مراد کفر اور شرک ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ اور آگ میں ہمیشہ رہنا کفار اور مشرکین ہی کے لیے ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○

اس سوال کا جواب کہ ایمان میں جب نیک عمل داخل ہو تو پھر اس کے بعد نیک کام کرنے کا ذکر کیوں کیا گیا؟

اگر تم یہ سوال کرو کہ نیک عمل تو ایمان سے خارج ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) فرمایا: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے''۔ اب اگر ایمان کی دلالت عمل صالح پر ہو (یعنی عمل صالح ایمان میں داخل ہو) تو ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر کرنا تکرار ہوگا؟ تو میں کہوں گا کہ اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ ایمان میں اگرچہ تمام نیک اعمال داخل ہیں لیکن کسی شخص کا یہ کہنا کہ ''فلاں شخص ایمان لایا'' اس سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اُس نے ایمان کے مختلف کاموں میں سے ایک کام سرانجام دیا۔ اس لیے یہ کہنا بہتر ہے کہ ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے''۔ بعض نے (سوال مذکور کا) جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ''وہ لوگ جو ایمان لائے'' اس سے گذشتہ زمانہ معلوم ہوتا ہے اور ''نیک اعمال کیے'' اس سے مستقبل کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے تم ایمان لاؤ، پھر بعد میں اس پر ہمیشگی اختیار کرو اور اس میں تمام نیک اعمال داخل ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ قف وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ، رشتہ داروں،

یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز کو قائم رکھنا اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنا پھر تم سب (اس وعدے سے) منحرف ہو گئے مگر تم میں سے کچھ لوگ (ثابت قدم رہے) اور تم تو (ہو ہی) منہ موڑنے والے O

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا۔ یعنی تورات میں یہ وعدہ لیا تھا۔ (اور وہ یہ تھا کہ) تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم فرمایا ہے لہٰذا غیر کی عبادت سے ممانعت اسی میں داخل ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے نہ کہ کوئی اور۔

والدین' رشتے داروں' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ یعنی ان کے ساتھ نیکی' ان کے لیے مہربانی اور نرم دلی اور اُن باتوں میں ان کی فرمانبرداری کرنا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہوں[۲۱۱] اور اُنہیں وہ چیزیں پہنچائی جائیں جن کی اُنہیں ضرورت ہو اور اُنہیں قطعاً تکلیف نہ دی جائے' اگر چہ وہ کافر ہوں[۲۱۲] بلکہ ضروری ہے کہ اُن کے ساتھ احسان (اچھا سلوک) کیا جائے۔ اور اچھا سلوک یہ ہے کہ اُنہیں نرم برتاؤ اور نرم رویہ کے ساتھ اسلام کی دعوت دے۔ اسی طرح اگر والدین فاسق ہوں تو نرمی کے ساتھ بغیر کسی قسم کی سختی کے اُنہیں نیکی کا حکم دے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے حکم پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کو عطف کیا ہے (یعنی اپنی عبادت کے حکم کے بعد ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے) اس لیے کہ نعمت عطا کرنے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بڑی بڑی نعمتیں ہیں' کیونکہ اُس نے بندے کو پیدا کیا اور عدم سے وجود بخشا۔ اس لیے واجب ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا شکر ادا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے۔ پھر والدین کا بھی اپنی اولاد پر بڑا احسان ہے' کیونکہ وہ دونوں اولاد کے وجود کا باعث ہیں۔ پھر اولاد پر والدین کا حقِ تربیت بھی ہے اس لیے دوسرے مرحلہ میں والدین کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔

﴿ذی قربی﴾ سے قرابت اور رشتہ داری والے مراد ہیں۔ کیونکہ رشتہ داری کا حق والدین کے حق کے تابع ہے۔ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا والدین ہی کے واسطہ سے ہے۔ اس لیے والدین پر قرابت کا عطف (یعنی والدین کے بعد

۲۱۱ یعنی اگر وہ ایسی باتوں کا حکم دیں جو اللہ عزوجل کے احکامات کے خلاف ہوں تو اُن باتوں کو نہیں مانا جائے گا۔ جیسے شادی کے موقع پر والدین اپنے بیٹے کو ڈاڑھی کٹوانے کا حکم دیں' یا بلا کسی سبب اور ضرورت کے والدین اپنی اولاد کو نماز روزہ سے روک دیں تو ان امور میں اُن کی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو جب کسی گناہ کے کام کا حکم دیا جائے تو وہ نہ اُس حکم کو سنے نہ ہی اُس کی فرمانبرداری کرے۔ (صحیح بخاری: ۷۱۴۴' صحیح مسلم: ۱۸۳۹) اور دوسری حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۶۶' شرح السنۃ: ۲۴۵۵' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۲۱' مطبوعہ کراچی)

۲۱۲ قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۔ (لقمان: ۱۵)

اور اگر وہ دونوں (والدین) تیرے ساتھ اس بات پر کوشاں ہوں کہ تو اُس چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے تو اُن کی بات نہ مان اور دُنیا میں اچھی طرح اُن کا ساتھ دے۔

اس آیت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ خلافِ شرع اُمور میں والدین کی فرمانبرداری نہیں کرنی چاہیے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر والدین مشرک اور کافر ہوں تب بھی اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔

قرابت کا بیان) بہت خوب ہے۔

یتیم کا معنیٰ اور ان وجوہات کا بیان جن کی بناء پر اس کے حقوق کا لحاظ کرنا ضروری ہے

﴿یتامی﴾ یتیم کی جمع ہے۔ اور یتیم اس کو کہتے ہیں جو چھوٹا بچہ ہو اور اس کا باپ انتقال کر جائے۔ پھر جب یہ بچہ بلوغت کو پہنچے گا تو وہ یتیم نہیں رہے گا۔ (واضح رہے کہ) تین وجوہات کی بناء پر یتیم کے حقوق کا لحاظ کرنا ضروری ہے:

(۱) ایک تو اس لیے کہ وہ چھوٹا ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا اس لیے کہ وہ یتیم ہوتا ہے۔ (۳) اور تیسرا اس لیے کہ وہ ایک ایسے شخص سے محروم ہوتا ہے جو اس کی بہتری کے کاموں کو سرانجام دے' کیونکہ وہ خود نہ تو اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ کسی چیز سے فائدہ حاصل کرے اور نہ اپنی ضروریات کو سرانجام دے سکتا ہے۔

﴿مساکین﴾ مسکین کی جمع ہے۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ) مساکین کا درجہ یتیموں کے بعد اس لیے رکھا گیا ہے کہ مسکین از خود مختلف اشیاء سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور اپنی خدمت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے (لیکن یتیم کا معاملہ ایسا نہیں ہے)۔

''وقولوا للناس حسنا'' کی تفسیر میں اختلاف اقوال

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (ہم نے بنی اسرائیل سے یہ وعدہ لیا تھا کہ) لوگوں سے اچھی بات کہنا۔ اس جملہ میں دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں خطاب اُن یہودیوں سے ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ اقدس میں موجود تھے۔ اور اسی وجہ سے کلام کو غائب سے حاضر کی طرف موڑا گیا ہے۔ اور اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم نبی اکرم ﷺ کی شان میں حق اور سچ بات کہو۔ اور جو کوئی تم سے اُن کے بارے میں پوچھے تو اُسے سچ سچ بتاؤ اور ٹھیک ٹھیک ان کا حلیہ بیان کرو' نہ یہ کہ تم اُسے چھپاؤ۔ یہ تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمائی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب اُن لوگوں سے ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے اور اُن سے عہد لیا گیا تھا۔ پھر غائب سے حاضر کی طرف جو کلام کو موڑا گیا ہے وہ بر سبیل التفات ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ ۔ (یونس:۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہو اور وہ اُنہیں لے کر چلیں۔

بعض کا قول یہ ہے کہ ''وقولوا للناس حسنا'' میں حذف ہے اور تقدیر کلام یہ ہے کہ ہم نے اُن سے کہا کہ تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ یعنی اُنہیں نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے منع کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ اچھی بات کہنے سے مراد ہے: گفتگو اور رہن سہن میں نرمی اختیار کرنا اور اچھے اخلاق اپنانا۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مذکورہ آٹھ احکامات کا حکم فرما دیا تا کہ یہ لوگ ان احکامات پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبہ حاصل کریں تو اس کے بعد ہی یہ بیان فرمایا کہ یہودیوں نے ان باتوں کو پورا نہیں کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ﴾ پھر تم اس وعدہ سے منحرف ہو گئے۔ آگے جو فرمایا: ﴿اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ﴾ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اُن میں سے ایمان لے آئے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام اور آپ کے رفقاء (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) انہوں نے عہد کو پورا کیا۔ ﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اے یہودیو! جس طرح تمہارے آباء و اجداد نے منہ پھیرا اسی طرح تم بھی مُنہ پھیرنے والے ہو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ پختہ وعدہ لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے نکالنا پھر تم نے (اس وعدے پر قائم رہنے کا) اقرار کیا اور تم خود اس کے گواہ بھی ہو۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں اُن یہودیوں سے خطاب ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں تھے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس میں یہودیوں کے آباء و اجداد سے خطاب ہے اور اس میں یہودیوں کی زجر و توبیخ اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ کی جا رہی ہے۔

﴿لَا تَسْفِكُونَ﴾ کا معنیٰ ہے: ''لا تریقون'' تم نہ بہانا۔ ﴿دِمَآءَكُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تم کسی کا خون نہ بہانا ورنہ وہ تمہارا خون بہائے گا اور یہ ایسا ہی ہوگا کہ گویا تم نے اپنا خون بہایا۔ ﴿وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ﴾ یعنی تم ایک دوسرے کو گھر سے نہ نکالنا۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس کی وجہ سے تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا جائے۔

﴿ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ ''ثم اقررتم'' کا معنیٰ یہ ہے کہ تم نے اس بات کا اقرار کیا کہ یہ وعدہ برحق ہے۔ اور ''وانتم تشھدون'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اے گروہِ یہود! آج تم اس پر گواہ ہو۔

ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾

پھر (ان وعدوں کے باوجود) تم ہی تو وہ ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک گروہ کو تم ان کے گھروں سے نکالتے ہو نافرمانی اور ظلم کر کے تم ان کے خلاف (دوسروں کے ساتھ) تعاون کرتے ہو اور اگر وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کو (گھروں سے) نکالنا (بھی تو) تم پر حرام کیا گیا تھا' کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو (اب تم ہی کہو) تم میں جو لوگ ان (جرائم کا) ارتکاب کریں ان کی سزا دنیاوی زندگی میں رُسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور قیامت کے دن تو انہیں زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا' اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

﴿ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ یعنی اے یہودیو! ''تم ہی تو وہ ہو جو اپنوں کو قتل کرتے ہو' مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو' اور تم اپنے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے باہر نکالتے ہو' یعنی تم میں سے بعض بعض کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ ''تم گناہ اور ظلم کے ذریعہ ان کے خلاف مدد کرتے ہو' یعنی نافرمانی اور ظلم کر کے اُن کے خلاف (دوسروں کے ساتھ) تعاون کرتے ہو۔

﴿أُسَارَىٰ﴾ ''اسیر'' کی جمع ہے۔ ﴿تُفَادُوهُمْ﴾ سے مراد ہے: مال کا فدیہ۔ یعنی قیدیوں کو خرید کر قید سے چھڑانا۔ ایک قرأت میں ''تفدوھم'' کو الف کے ساتھ (تفادوھم) پڑھا گیا ہے اور اس کا معنیٰ ہے: تم قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ کرتے ہو۔

مذکورہ آیت کا واقعۂ نزول

اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات میں بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ "وہ ایک دوسرے کو نہ قتل کریں گے نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالیں گے اور بنی اسرائیل کے کسی بھی غلام یا باندی کو پائیں تو جو قیمت اس کی بنتی ہو اس کے عوض اس کو خرید کر آزاد کر دیں"۔

اب صورت حال یہ تھی کہ قریظہ کے لوگ قبیلۂ اوس کے حلیف تھے اور نضیر کے لوگ خزرج کے حلیف تھے۔ اور اوس وخزرج کے درمیان بہت عرصہ سے جنگ تھی۔ اس لیے بنونضیر اپنے حلیفوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے اور بنوقریظہ اپنے حلیفوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے تھے جب دونوں فریقوں میں سے ایک کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ان کو ان کے گھروں سے نکال کر گھروں کو ویران کر دیا اور (حال یہ تھا کہ) جب دونوں فریق میں سے کسی کا کوئی شخص قید ہوتا تو یہ لوگ اس کے لیے مال جمع کرتے اور فدیہ دے کر اُسے چھڑا لیتے' اس پر اہل عرب نے اُنہیں عار دلائی اور کہا کہ کیسی (عجیب) بات ہے تم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو' پھر (قید ہونے کی صورت میں) فدیہ دے کر چھڑاتے بھی ہو۔ تو بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ ہمیں فدیہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل عرب نے کہا کہ پھر قتل کیوں کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس بات سے حیا کرتے ہیں کہ ہمارے حلیف ذلت اُٹھائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں عار دلائی اور فرمایا کہ "پھر تم وہی ہو نا کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو؟"

اس آیت میں کچھ تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے:

"**وتخرجون فریقا منکم من دیارھم تظاھرون علیھم بالاثم والعدوان وھو محرم علیکم اخراجھم وان یأتوکم اساری تفدوھم**"۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل سے چار باتوں کا وعدہ لیا۔ (۱) قتل نہ کرنا (۲) گھروں سے نہ نکالنا (۳) دشمنوں کے ساتھ تعاون نہ کرنا (۴) قیدیوں کو چھڑانا۔

بنی اسرائیل نے تمام باتوں سے منہ پھیر لیا' سوائے ایک بات کے کہ انہوں نے فدیہ دے کر قیدیوں کو چھڑایا۔ (اس پر تنبیہ کرتے ہوئے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ یعنی اگر تم اپنے افراد کو غیر کے ہاتھ میں پاتے ہو تو تم اُنہیں فدیہ دے کر چھڑاتے ہو اور اپنے ہاتھوں سے اُنہیں قتل کرتے ہو۔ سو (اس آیت کے مطابق کتاب کے کچھ حصہ پر) ان کا ایمان یہ تھا کہ وہ فدیہ دے کر (قیدیوں کو) چھڑاتے تھے اور کفر یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کیا کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کے اس تضاد پر ان کی مذمت فرمائی' نہ اس بات پر کہ وہ فدیہ دیا کرتے تھے۔ کیونکہ جو باتیں ان پر واجب تھیں اُن میں سے انہوں نے کچھ کو پورا کیا تھا اور کچھ کو چھوڑ دیا تھا۔

آخر میں فرمایا: ﴿ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی اے گروہِ یہود! جو تم میں ایسا کرے اس کی سوائے اس کے اور کیا سزا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں رُسوا رہے۔ یعنی عذاب اور ذلت میں۔ چنانچہ بنوقریظہ کی رسوائی یوں ہوئی کہ اُنہیں قتل کیا گیا اور قید کیا گیا[۲۱۳] اور بنونضیر کی رسوائی یہ ہوئی کہ اُنہیں ان کے گھروں سے نکال کر ملک شام کی زمین اریحاء اور

۲۱۳ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ (۵ھ میں) جب غزوۂ خندق سے واپس لوٹے اور ہتھیار اُتار کر غسل فرما لیا تو جبریل امین اپنے سر سے گرد جھاڑتے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ آپ نے ہتھیار اُتار لیے؟ ہم نے تو ابھی ہتھیار نہیں اُتارے۔ آپ یہودیوں کی طرف تشریف لے چلیے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ کا پوچھا تو جبریل نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اذرعات کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔[۲۱۴]

﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ ''اور قیامت کے دن اُنہیں زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا'' یعنی آگ کے عذاب میں ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے''۔ اس جملہ میں وعید اور سخت دھمکی ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہا کہ بنوقریظہ کی طرف چلنا ہے۔ بنوقریظہ کے پاس پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے قتال کیا وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر قلعہ سے نکل آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیا۔ حضرت سعد نے کہا کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان کے جنگجو افراد کو قتل کر دیا جائے' بچوں اور عورتوں کو قید کر دیا جائے اور ان کے اموال کو تقسیم کر دیا جائے۔ (صحیح بخاری: ۴۱۲۲' صحیح مسلم: ۱۷۶۹) چنانچہ بنوقریظہ کی افواج کو قتل کر دیا گیا' عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا گیا اور ان کے اموال کو مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔

۲۱۴ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ۴ ھ میں واقعہ بیر معونہ سے واپسی پر حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنوکلاب کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا اور اُنہیں یہ علم نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان دونوں آدمیوں کو امان دے چکے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے انہوں نے صورت حال بیان کی تو آپ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کرنے کا اعلان فرمایا اور آپ اسی معاملہ پر گفتگو کرنے کے لیے بنونضیر کے یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے۔ کیونکہ ان یہودیوں سے آپ کا معاہدہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی تھے۔ یہودیوں نے ظاہری طور پر حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب حضرات کو ایک دیوار کے نیچے بڑے احترام کے ساتھ بٹھایا اور آپس میں یہ مشورہ کیا کہ چھت پر سے ایک بہت ہی وزنی پتھر ان پر گرا دیا جائے تا کہ یہ سب ہلاک ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو اس سازش سے مطلع فرما دیا اور آپ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر واپس تشریف لے آئے اور صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کے بعد یہودیوں کی طرف پیغام بھیجا کہ تم لوگوں نے چونکہ معاہدہ توڑ دیا ہے اس لیے اب تم لوگوں کو دس دن کی مہلت دی جاتی ہے' اس مدت کے اندر تم لوگ مدینہ سے نکل جاؤ اور اس کے بعد جو شخص بھی یہاں پایا جائے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس پیغام کو سن کر بنونضیر جلاوطنی پر راضی ہو گئے لیکن رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے ان لوگوں کو اپنی امداد اور تعاون کا یقین دلا کر جلاوطن ہونے سے روک دیا۔ بنونضیر نے اس کی باتوں میں آ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ جو چاہیں کر لیں' ہم مدینہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ جواب پہنچا تو آپ نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد نبوی کی امامت سپرد فرمائی اور خود بنونضیر کی طرف تشریف لے گئے اور ان یہودیوں کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پندرہ دن تک قائم رہا اور اس دوران کسی بھی قسم کے سامان کی فراہمی ان پر بند کر دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے قلعہ کے محاصرہ کے ساتھ قلعہ کے آس پاس کھجوروں کے کچھ درختوں کو بھی کٹوا دیا۔ کیونکہ ممکن تھا کہ درختوں کے جھنڈ میں یہودی چھپ کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہوتے اور جنگ میں مسلمانوں کو دشواری ہوتی۔ بہر حال بنونضیر کے یہودی محاصرہ سے تنگ آ کر اس بات پر تیار ہو گئے کہ ہم اس شرط پر مدینہ چھوڑیں گے کہ جس قدر مال و متاع اونٹوں پر ہم لے جا سکیں' لے جائیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کی اس شرط کو منظور فرما لیا اور بنونضیر کے سارے یہودی چھ سو اونٹوں پر اپنا مال اور سامان لاد کر مدینہ سے نکل گئے۔ کچھ یہودی تو خیبر چلے گئے اور زیادہ تر ملک شام جا کر اذرعات اور اریحا میں آباد ہو گئے۔

(شرح المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۴۵۷' عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۷۱' بحوالہ سیرت مصطفیٰ ﷺ ص ۲۴۳' شرح صحیح مسلم ج ۵ ص ۳۱۱)

یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کی جگہ دنیاوی زندگی کو خرید لیا ہے۔ لہٰذا ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گیO

یہاں خریدنے سے مراد ہے تبدیل کرنا اور بدل لینا (یعنی انہوں نے آخرت کے بدلہ میں دنیاوی زندگی کو لے لیا) کیونکہ دنیا اور آخرت کی لذتوں کو جمع کرنا ناممکن ہے۔ جو شخص دنیاوی لذتوں کو حاصل کرنے میں مشغول ہوگا اُسے آخرت کی لذتیں نہیں ملیں گی۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ٘ وَاٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْۚ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ٘ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی اور ان کے بعد لگاتار رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات دیئے اور ہم نے پاکیزہ روح (جبریل امین) کے ذریعہ اُنہیں تقویت دی تو کیا ہر بار (ایسا نہیں ہوا کہ) جب بھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری مرضی کے خلاف کوئی پیغام لے کر آیا تو تم نے (اپنے آپ کو) بڑا سمجھا تو ان (انبیاء) میں سے بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم شہید کرتے ہوO

موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمانے اور ان کے بعد مسلسل رسول بھیجنے کی تفسیر

﴿اٰتَیْنَا﴾ کا معنیٰ ہے: "اعطینا" ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی یعنی ایک ہی مرتبہ میں پوری تورات عطا فرمائی۔ ﴿قَفَّیْنَا﴾ کا معنیٰ ہے: ہم نے ان کے پیچھے رسول بھیجے۔ یہ "تقفیه" سے مشتق ہے اور "تقفیه" یہ ہے کہ رسولوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھیجا جائے۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک کے بعد ایک رسول کو ہم نے بھیجا۔ سیدنا موسیٰ سے لے کر عیسیٰ علیہما السلام کے زمانے تک مسلسل رسول تشریف لائے اور بعض بعض کے طریقہ کار پر تھے لیکن شریعت سب کی ایک تھی۔

بعض کا قول یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو رسول تشریف لائے وہ حضرت یوشع بن نون، اشمویل، داؤد، سلیمان، ارمیاء، خرقیل، الیاس، یونس، زکریا، یحییٰ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام تھے۔ اور یہ سب کے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، وہ ایک نئی شریعت لے کر تشریف لائے اور تورات کے بعض احکام میں انہوں نے تبدیلی کی۔ ﴿الْبَیِّنٰتِ﴾ کا معنیٰ ہے: واضح دلیلیں اور نشانیاں۔ اور اس سے مراد ان کے معجزات ہیں۔ یعنی مردوں کو زندہ کرنا، اندھے اور برص زدہ کو شفاء دینا۔ بعض نے "بینات" سے انجیل مراد لی ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کا نام سریانی زبان میں ایشوع ہے اور ﴿مَرْیَمَ﴾ کا معنیٰ ہے: خدمت گزار۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت مریم علیہا السلام کا علم (نام) ہے جیسے مَردوں میں زید۔

روح القدس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف اقوال

فرمایا: ہم نے روح القدس (پاکیزہ روح) کے ذریعہ عیسیٰ کو تقویت دی۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ﴿روح﴾ سے مراد وہی روح ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اندر پھونکی گئی اور ﴿قدس﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی

روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت اس لیے دی تا کہ اُنہیں شرف و عزت اور خصوصیت عطا کی جائے۔ جیسے ''اللہ کا بندہ' اللہ کی بندی' اللہ کا گھر اور اللہ کی اونٹنی'' کہا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''روح القدس'' اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم[٢١٥] ہے' جس کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد انجیل ہے کیونکہ انجیل دلوں کی زندگی کا باعث ہے (جس طرح جسم کی حیات کا باعث ہے)۔ انجیل کو اُسی طرح روح کہا گیا ہے جس طرح قرآن کریم کو روح فرمایا گیا ہے[٢١٦]۔ بعض کا قول یہ ہے کہ روح القدس سے مراد جبریل ہیں۔ اور انہیں قدس (پاکیزگی) کے ساتھ اس لیے موصوف کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ قدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اور روح سے مراد جبریل امین ہے۔ جیسے بندۂ خدا کے لیے ''عبد الله'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جبریل امین کو جو روح فرمایا گیا ہے وہ ان کی لطافت کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ روحانی ہیں اور نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ جبریل کو روح اس لیے فرمایا گیا کہ اُنہیں وحی پہنچانے میں خاص مقام حاصل ہے اور وحی دلوں کی زندگی کا باعث ہے۔ ''روح القدس'' سے اس مقام پر جبریل امین کو مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وأیدناه'' یعنی ہم نے عیسیٰ کو جبریل کے ذریعہ تقویت دی۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا کہ وہ عیسیٰ کے ساتھ رہیں اور ان کے ساتھ جائیں جہاں بھی وہ جائیں۔ چنانچہ جبریل امین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہے یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا گیا۔

جب یہودیوں نے (نبی اکرم ﷺ کی زبانی) عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ سنا تو کہنے لگے: اے محمد (ﷺ) جیسا آپ کا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گمان ہے اُن کی طرح آپ عمل نہیں کرتے اور جیسے آپ مختلف انبیاء علیہم السلام کی ہمیں خبریں بیان کرتے ہیں اُن کی طرح آپ نہ معجزہ دکھاتے ہیں۔ اگر آپ سچے نبی ہیں تو وہ معجزات پیش کیجئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر تشریف لائے تھے۔

﴿ أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسْتَكْبَرْتُمْ ﴾ یعنی اے گروہِ یہود! کیا جب کبھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسا (حکم) لے کر آئے جو تمہارے دلوں کو اچھا نہ لگے تو تم تکبر کرتے ہو؟ یعنی اس پر ایمان لانے سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہو؟

﴿ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴾ ''پس بعض کو تم نے جھٹلایا'' مثلاً عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ ''اور بعض کو تم قتل کرتے ہو'' مثلاً حضرت زکریا' حضرت یحییٰ اور وہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام جن کو تم نے قتل کیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس جب کوئی رسول ایسا حکم لے کر آتا جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا تو وہ اس رسول کو جھٹلا دیتے اور اگر اُنہیں قتل کرنے کا موقع ملتا تو اس رسول کو قتل کر دیتے۔ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ وہ دنیا کے خواہش مند اور حکومت کے طلب گار تھے۔

وَقَالُوا۟ قُلُوبُنَا غُلْفٌۢ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ ٱللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

اور (یہودی) بولے کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں' نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے' پس ان میں بہت تھوڑے لوگ ایمان لاتے ہیں O

---

[٢١٥] اسم اعظم کی تفصیل اور تحقیق ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حاشیہ: ٦٢

[٢١٦] اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ (الشوریٰ: ٥٢) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (جانفزا کلام) بھیجا۔

یہودیوں کے اس قول کا مفہوم کہ ''ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں''

﴿قَالُوْا﴾ سے مراد یہودی ہیں۔ یعنی یہودیوں نے کہا: ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ (ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں) ﴿غُلْفٌ﴾ ''اغــلف'' کی جمع ہے۔ اور ''اغــلف'' اس شخص کو کہتے ہیں جس پر پردہ پڑا ہوا ہو اور وہ نہ کچھ سن سکے نہ سمجھ سکے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''غُلُف'' (لام کے پیش کے ساتھ) غلاف کی جمع ہے۔ اور (آیت کا) معنیٰ یہ ہے کہ ہمارے دل علم کے برتن ہیں' انہیں آپ کے علم کی حاجت نہیں ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ ہمارے دل حفاظت کرنے والے ہیں' یہ جو بات بھی سنتے ہیں اُس کو یاد کر لیتے ہیں' لیکن آپ کی بات کو ہمارے دل نہ تو محفوظ کرتے ہیں نہ اُسے سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کی بات میں بھی کوئی بھلائی ہوتی تو ہمارے دل ضرور اس کو سمجھتے اور اُسے محفوظ رکھتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے (یہودیوں کے اس زعم کی تردید کرتے ہوئے) فرمایا: ﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ ''بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر کے سبب اُنہیں (اپنی رحمت سے) دور کر دیا ہے''۔ ''لعنھم'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں پھٹکار دیا ہے اور ہر خیر سے دور کر دیا ہے۔ یہودیوں کے کفر کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا اعتراف کیا اور پھر اس کا انکار کر دیا اور اُسے جھٹلا دیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت فرمائی۔

آخر میں فرمایا: ﴿فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾ تھوڑے افراد اس لیے فرمایا کہ اُن میں سے تھوڑے افراد ایمان لائے ہیں' مشرکین میں سے جو ایمان لائے تھے وہ یہودیوں کے مؤمنین سے زیادہ تھے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق فرمانے والی ہے اور وہ اس سے پہلے (اسی نبی کے وسیلہ سے) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے' سو جب ان کے پاس وہ جانا پہچانا رسول تشریف لے آیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا' پس منکروں پر اللہ کی لعنت ہو O

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ تصدیق کرنے والی کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور ان کے پاس موجود کتاب سے مراد تورات ہے۔ اور (قرآن کریم تورات کی) تصدیق اس بات میں کرنے والا ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت صحیح ہے' کیونکہ آپ کی نبوت اور آپ کے اوصاف تورات میں موجود ہیں[۲۱۷]۔

یہودیوں کا نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے فتح اور مدد مانگنا

﴿كَانُوْا﴾ سے مراد یہودی ہیں اور ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ سے مراد ہے: نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے۔ اور ﴿يَسْتَفْتِحُوْنَ﴾ کا معنیٰ ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے وسیلہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے۔ ﴿عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے مراد ہے: عرب کے مشرکین۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں پر جب کوئی پریشان کن معاملہ آتا اور ان کا دشمن اُنہیں تکلیف سے دوچار کرتا تو وہ یوں دعا کرتے:

اللّٰھم انصرنا بالنبی المبعوث فی اخر الزمان الذی نجد صفته فی التوراة: اے اللہ! اُس نبی کے وسیلہ سے ہماری مدد فرما جو آخری زمانہ میں مبعوث ہوں گے' جن کے اوصاف ہم تورات میں

---

۲۱۷ اس کی تفصیل اور تورات کے حوالہ جات کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ۱ ص ۴۶۹۔

پاتے ہیں۔

اس دعا سے اُن کی مدد کی جاتی [۲۱۸] اور وہ اپنے مشرک دشمنوں سے کہتے کہ ایک ایسے نبی کا زمانہ سایہ فگن ہونے والا ہے جو ہماری باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے تشریف لائیں گے اور ہم اُن کے ساتھ مل کر تمہیں قتل کریں گے جیسے عاد اور ارم کو قتل کیا گیا تھا۔

﴿مَّا عَرَفُوْا﴾ سے مراد ہے وہ رسول جس کی اُنہیں پہچان تھی یعنی سیدنا محمد ﷺ کیونکہ یہ لوگ آپ ﷺ کے اوصاف اور آپ کے حلیہ کو پہچانتے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ﷺ بنی اسرائیل سے نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے آپ کا انکار کیا اور آپ کو جھٹلایا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سرکشی پر اُتر آئے ہیں اور انہیں آپ کی ذات سے حسد ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾

کیسی بُری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کیا کہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کا اس جلن کی وجہ سے انکار کرتے ہیں کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (کتاب) نازل فرماتا ہے سو وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور کافروں کے لیے رُسوا کن عذاب ہے ○

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ﴾ کا معنیٰ ہے: کیسی بُری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کیا۔ (یعنی) جب کہ اُنہوں نے حق کے بدلہ میں باطل کو اختیار کر لیا۔ ''اشــتــروا'' کا معنیٰ ہے: انہوں نے بیچا۔ یعنی وہ چیز بُری ہے جس کے بدلہ میں اُنہوں نے اپنے نفس کا حصہ بیچ دیا۔

﴿بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد قرآن کریم اور ﴿بَغْیًا﴾ سے مراد حسد ہے۔ ﴿اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد کتاب اور نبوت ہے اور ﴿مَنْ یَّشَآءُ﴾ سے مراد سیدنا محمد ﷺ ہیں۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ پر جو کتاب کا نزول ہوتا ہے اُس سے یہودیوں کو جلن ہوتی ہے اور اس جلن کی وجہ سے یہ لوگ حق بات کو تسلیم نہیں کرتے۔)

غضب بالائے غضب کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف اقوال

﴿عَلٰى غَضَبٍ﴾ کا معنیٰ ہے: ''مع غـضـب'' (یعنی یہ لوگ غضب کے ساتھ مزید غضب کے مستحق ہو گئے)۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلا غضب تو یہ ہے کہ یہودیوں نے تورات کو ضائع کر دیا اور اس میں تبدیلیاں کر دیں۔ اور دوسرا غضب یہ ہے کہ انہوں نے سیدنا محمد ﷺ کا انکار کیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ پہلے غضب سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ اور دوسرا غضب یہ ہے کہ انہوں نے سیدنا محمد ﷺ اور قرآن حکیم کا انکار کیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ پہلے غضب سے مراد یہ ہے کہ اُن لوگوں نے بچھڑے کی پُوجا کی اور دوسرا غضب یہ ہے کہ انہوں نے سیدنا محمد ﷺ کا انکار کیا۔

﴿کــافرین﴾ سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے والے ہیں اور ﴿عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو عذاب میں رُسوا کیا جائے گا۔

۲۱۸ ہمیں بھی اپنی مشکلات میں نبی اکرم ﷺ کے وسیلہ سے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دُعا کرنی چاہیے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی زیرِ بحث آیت البقرہ: ۸۹ اور متعدد احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی توبہ بھی رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے قبول ہوئی۔ (تحقیق کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج۴ ص۶۲) خود رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا صحابی کو اپنے وسیلے سے دُعا کرنے کی تعلیم اور ترغیب فرمائی۔ (تبیان القرآن ج۳ ص۱۷۴)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ ان تمام کتابوں پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمائی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اُسی کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور دیگر کتابوں کا انکار کرتے ہیں' حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور ان کے پاس موجود (اصل کتاب تورات) کی تصدیق کرنے والا ہے۔ آپ (ذرا ان سے) پوچھئے کہ تم اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں شہید کرتے رہے اگر تمہیں (اپنی کتاب تورات پر) ایمان تھا O

﴿ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم قرآن کریم پر ایمان لاؤ۔ بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اس پر تم ایمان لاؤ۔ ﴿ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا ﴾ سے مراد تورات اور وہ (صحائف وغیرہا) ہیں جو اُن کے انبیاء کرام پر نازل ہوئے۔ ﴿ بِمَا وَرَآءَهٗ ﴾ سے مراد ہے: "ماسواه من الكتب" یعنی وہ تورات کے علاوہ دیگر کتابوں کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: "ما بعده يعني الانجيل والقران" وہ تورات کے بعد کی کتابوں یعنی انجیل اور قرآن کا انکار کرتے ہیں۔ ﴿ وَهُوَ الْحَقُّ ﴾ سے مراد قرآن کریم ہے اور ﴿ لِمَا مَعَهُمْ ﴾ سے مراد تورات ہے۔ (یعنی قرآن مجید تورات کی تصدیق کرنے والا ہے۔)

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ ("قل" کا خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے یعنی) اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے: تو تم اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے؟ یہاں قتل کی نسبت اُن یہودیوں کی طرف ہے جن سے قرآن مخاطب ہے۔ جب کہ (فی الواقع) قتل ان یہودیوں کے آباء واجداد نے کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب یہودیوں نے اپنے آباء واجداد کے اس فعل کو پسند کیا اور اس پر راضی ہوئے۔ بعض نے کہا ہے کہ جب زمین میں کوئی برائی کی جائے تو جو شخص اُس بُرائی کو ناپسند کرے اور اس کا رد کرے' وہ اُس برائی سے پاک ہے اور جو شخص اُس بُرائی کو پسند کرے اور اُس پر راضی ہو وہ بُرائی کرنے والوں میں سے ہے۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (تم لوگ انبیاء کو کیوں شہید کرتے رہے) اگر تم تورات کو ماننے والے تھے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ تورات میں تمہیں انبیاء کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور بے شک موسیٰ تمہارے پاس روشن معجزات لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا' اور تم تو ظالم ہو O

﴿ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ سے مراد ہے: واضح دلیلیں اور روشن معجزات۔ ﴿ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ سے مراد ہے: موسیٰ علیہ السلام کے بعد (تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا) جبکہ وہ میقات پر تشریف لے گئے۔ ﴿ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ کو دوبارہ اس لیے دوہرایا تا کہ یہودیوں کی سرزنش ہو اور حجت ان پر پختہ ہو جائے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور تمہارے سروں پر کوہِ طور کو بلند کیا (اور حکم فرمایا کہ) جو (احکامات) ہم نے تمہیں دیئے ہیں اُن کو مضبوطی سے تھام لو اور سُنو' انہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سُنا (اور دل میں کہا کہ) ہم نے نافرمانی کی' اور (اصل بات یہ ہے کہ) اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں میں بچھڑے (کی محبت) رَچ بس چکی تھی' آپ کہیے: تمہیں تمہارا ایمان کیا ہی بُرا حکم دیتا ہے اگر تم (تورات کو) مانتے ہو O

﴿اسْمَعُوْا﴾ کا معنٰی ہے: قبول کرو اور جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو۔ (یہودیوں نے جواباً کہا:) ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ہم نے سُنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ ﴿سَمِعْنَا﴾ سے مراد ہے: آپ کے قول کو سُنا اور ﴿عَصَيْنَا﴾ سے مراد ہے: آپ کے حکم کی نافرمانی کی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ جُملہ اپنی زبان سے نہیں کہا تھا' بلکہ (ہوا یہ تھا کہ) جب اُنہوں نے حکم خداوندی کو سُنا اور سُن کر اُس کے ساتھ نافرمانی کی روش اختیار کی تو نافرمانی کو اُن کی طرف نسبت دے دی گئی۔

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ یعنی اُس بچھڑے کی محبت اور اس کی پوجا کی خواہش اُن کے دلوں میں داخل ہو چکی تھی' جس طرح کہ رنگ کپڑے میں داخل ہو جاتا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ بچھڑے کو (ریتی سے) رگڑ کر نہر میں غوطہ دیا جائے۔ اور پھر لوگ اُس نہر سے پانی پئیں۔ سو جس کے دل میں بچھڑے کی معمولی سی بھی محبت ہو گی اُس کی مونچھوں پر سونے کا بُرادہ ظاہر ہو جائے گا۔

﴿يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمہارا ایمان تمہیں بچھڑے کی پوجا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آیت کا معنٰی یہ ہے کہ وہ ایمان بُرا ایمان ہے جو بچھڑے کی پوجا کا حکم دیتا ہے۔ اور ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے گمان میں ایمان دار ہو۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا ہے ہم اس کو مانتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کی اس بات کو اپنے قول ''ان کنتم مؤمنین'' سے رد فرما دیا۔ (یعنی اگر تورات پر ایمان ہے تو پھر قول وفعل میں تضاد کیوں؟)

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

آپ (ان سے) کہیے: اگر اللہ کے ہاں آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ہے تو ذرا موت کی آرزو تو کرو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو O

یہودیوں کے غلط دعووں کی تردید میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ تم موت کی تمنا کرو' اس کی تفسیر

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے بہت سارے غلط دعوے کیے۔ اُن میں سے ایک دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور ایک دعویٰ یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے (اس آیت کریمہ میں) ان کی تردید فرمائی اور اُن پر حجت قائم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے محمد ﷺ! آپ یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ اگر دارِ آخرت یعنی جنت صرف تمہارے لیے ہے نہ کہ دیگر لوگوں کے لیے تو ''تو تم موت کی تمنا کرو''۔ یعنی اس کو طلب کرو اور مانگو۔ کیونکہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ جنت اس کا ٹھکانا ہے اور جنت اُس کے لیے ہے تو وہ اس کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور جنت میں جانا موت ہی کے بعد متصور ہے' اس لیے تم موت کی آرزو کر کے اس کو جلدی طلب کرو۔ ''اگر تم سچے ہو'' یعنی اپنے قول میں اور اپنے دعوے میں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۰۹) اگر یہ لوگ موت کی تمنا کرتے تو سب ہلاک ہو جاتے اور روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۶ ص ۲۷۴، در منثور ج ۱ ص ۱۷۳)

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

اور یہ لوگ اپنی کارستانیوں کے خوف سے ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے O

فرمایا کہ ''یہ لوگ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے'' کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ (اور یہ موت کی تمنا نہ کرنا) ''اُن بداعمالیوں کی وجہ سے ہے جو وہ کر چکے ہیں'' یعنی بُرے اعمال۔ اس میں عمل کی اضافت ہاتھ کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ انسان کے اکثر گناہ ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں۔ ''اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو جاننے والا ہے''۔ اس جملہ میں یہودیوں کو خوف دلانا ہے اور اُن کے لیے سرزنش ہے۔ ظلم کے ساتھ یہودیوں کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ظلم، کفر کے مقابلہ میں زیادہ عام ہے کیونکہ ہر کافر تو ظالم[۲۱۹] ہے لیکن ہر ظالم کافر نہیں ہے۔ اس لیے ظلم زیادہ عام ہے اور یہودی اس صفت کے زیادہ مستحق ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور آپ ضرور اُنہیں تمام لوگوں سے حتیٰ کہ مشرکین سے زیادہ زندگی کا خواہش مند پائیں گے، اُن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش اس کی عمر ہزار سال ہو اور اتنی عمر کا دیا جانا بھی اُسے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور اللہ ان کے تمام کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے O

﴿لَتَجِدَنَّهُمْ﴾ میں لام قسم کے لیے اور (آخر میں) نون تاکید کے لیے ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: ''واللہ لتجدنھم یا محمد'' اے محمد (ﷺ)! اللہ کی قسم! آپ ضرور اُنہیں پائیں گے یعنی یہودیوں کو۔ ﴿اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ﴾ سے مراد ہے: لمبی زندگی کا خواہش مند۔ ''حرص'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کی شدید خواہش۔

''ومن الذین اشرکوا'' پر ترکیبی اور تفسیری اعتبار سے بحث اور خاص ''ایک ہزار سال'' کے ذکر کرنے کی توجیہ

﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ کا جو جملہ ہے اُس کے بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ یہ پچھلے جُملے کے ساتھ منسلک ہے اور اُسی پر اس کا عطف ہے۔ (اس صورت میں) معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ (یہودی) مشرکین سے زیادہ زندگی کے خواہش مند ہیں۔

اگر تم یہاں سوال کرو کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''احرص الناس'' میں ''ناس'' کے تحت مشرکین بھی داخل ہیں، پھر اُنہیں علیحدہ سے ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ مشرکین بھی زندگی کی بہت زیادہ خواہش رکھتے تھے اس لیے ان کو علیحدہ ذکر کیا۔

اس آیت میں یہودیوں کے لیے ٹھیک ٹھاک سرزنش ہے۔ کیونکہ مشرکین جو قیامت کو نہیں مانتے اور وہ صرف دنیاوی زندگی ہی کو پہچانتے ہیں اُن کا زندگی کے لیے خواہش مند ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔ لیکن جب ایسے لوگوں سے زیادہ زندگی کی خواہش اس شخص کی ہو جائے جس کے پاس کتاب ہو اور وہ مرنے کے بعد اُٹھنے اور جزا و سزا کو بھی مانتا ہو تو وہ زیادہ سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کا مستحق ہے۔

۲۱۹ یعنی حد سے تجاوز کرنے والا اور حق کو چھوڑ کر باطل کو ماننے والا ہے۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ''ومن الذین اشرکوا'' میں واؤ استیناف کا ہے (یعنی اس سے نئے جملہ کا آغاز ہے)۔ اصل عبارت یوں ہے: ''وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ'' (مشرکین میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اُن میں ایک چاہتا ہے) یعنی مجوسی چاہتے ہیں۔ مجوسیوں کو مشرکین اس لیے کہا گیا کہ وہ نور اور ظلمت کے قائل تھے[220] (ان کی خواہش یہ ہے کہ) کاش ایک ہزار سال کی عمر مل جائے۔ خاص ''ایک ہزار'' کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ یہ دہائیوں کی انتہاء[221] اور مجوسیوں کا سلام ہے۔ وہ آپس میں کہا کرتے تھے: ''زہ ہزار سال'' یعنی ایک ہزار سال زندہ رہو۔ یا کہتے تھے: ایک ہزار نیروز یا ایک ہزار مہرجان۔ اس طرح آپس میں سلام کیا کرتے تھے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو مجوسی آپس میں اس طرح کے جملے کہتے ہیں اُن سے زیادہ مشرکین زندگی کے لالچی ہیں۔

﴿مزحزح﴾ کا معنیٰ ہے: دور کرنے والا۔ ﴿عذاب﴾ سے مراد آگ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اگر زندگی کے خواہش مند کو لمبی عمر دے دی جائے تو یہ لمبی عمر بھی اُسے عذاب سے نہیں بچا سکے گی۔ ''اور اللہ اُن کے تمام کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے'' یعنی اُن کے حالات میں سے کوئی پوشیدہ چیز بھی اُس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

آپ کہیے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو (تو ہوا کرے) پس بے شک اس (جبریل) نے تو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن اُتارا ہے جو کہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لیے سراپا ہدایت اور بشارت ہے O

مذکورہ آیت کے واقعۂ نزول میں مفسرین کا اختلاف اقوال اور یہودیوں کی جبریل سے دشمنی کا تفصیلی بیان

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ علماء یہود میں سے ایک عالم عبداللہ بن صوریا نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ آپ کے پاس آسمان سے کون سا فرشتہ آتا ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جبریل آتے ہیں۔ تو اس عالم نے کہا کہ جبریل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر میکائیل آپ کے پاس آتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ جبریل (کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ) عذاب، سختی اور خسف (زمین میں دھنسانے کا عذاب) لے کر اُترتا ہے۔ اور وہ ہم سے کئی بار دشمنی کر چکا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دشمنی ہمارے ساتھ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی پر وحی نازل فرمائی کہ عنقریب بیت المقدس بخت نصر نامی ایک شخص کے ہاتھوں ویران ہو جائے گا۔ جب بخت نصر کا زمانہ آیا تو ہم نے ایک ایسے شخص کو بھیجا جو اس کو قتل کر ڈالے۔ وہ شخص بابل میں ایک مسکین لڑکے سے ملا اور قتل کرنے کے لیے اُس کو پکڑ لیا تو جبریل نے بخت نصر کو بچا لیا اور کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو حکم فرمایا ہے کہ وہ تم سب کو ہلاک کر دے تو تم اس پر غالب نہیں آ سکتے اور اگر ایسا نہیں ہے (یعنی اُس کو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہلاک کرنے کا حکم نہیں دیا ہے) تو پھر کس بنیاد پر تم اُسے قتل کر رہے ہو؟ پھر

۲۲۰ یعنی وہ یہ کہتے تھے کہ اس جہان کی دو اصلیں ہیں۔ ایک نور اور دوسری ظلمت۔ ان ہی دو سے یہ جہان بنا ہے۔
(تفسیر قرطبی، روح المعانی، سورۃ الحج: ۱۷)

۲۲۱ کیونکہ بنیادی اعداد کل بارہ ہیں اور ان میں سب سے آخری عدد ''ہزار'' کا ہے۔ اس لیے آیت میں خاص ''ہزار'' کا تذکرہ فرمایا۔
بنیادی بارہ اعداد یہ ہیں: ایک تا دس، سو اور ہزار۔ (کافیہ ص ۸۷، ہدایۃ النحو ص ۷۰)

جب وہ لڑکا (یعنی بخت نصر) بڑا ہو گیا اور طاقت والا ہو گیا تو اُس نے ہم سے جنگ کی اور بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ اس وجہ سے ہم جبریل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ پر مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔

بعض علماء نے اس آیت کا واقعۂ نزول یہ بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم فرمایا کہ وہ نبوت کو ہماری نسل میں رکھے تو اس نے ہمارے علاوہ میں نبوت رکھ دی اس لیے ہم نے جبریل کو دشمن بنایا ہوا ہے۔

بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ مدینہ شریف کے بالائی حصہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک زمین تھی۔ اس کی طرف جانے کا جو راستہ تھا وہ یہودیوں کی تعلیم گاہ کے پاس سے گزرتا تھا۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہودیوں کے پاس بیٹھا کرتے اور ان کی باتیں سُنا کرتے تھے۔ ایک دن یہودیوں نے حضرت عمر سے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کے اصحاب میں ہمیں آپ سے زیادہ کوئی پسند نہیں ہے اور ہمیں آپ سے چاہت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے اور نہ ہی میں تم سے اس لیے سوالات کرتا ہوں کہ مجھے اپنے دین کے معاملہ میں کوئی شک ہے۔ میں تو تم لوگوں کے پاس صرف اس لیے آتا ہوں تاکہ سیدنا محمد ﷺ کے معاملہ میں میری بصیرت اور زیادہ ہو اور میں تمہاری کتاب میں ان کی علامتیں دیکھوں۔ (حضرت عمر کا یہ جواب سن کر) یہودیوں نے کہا کہ فرشتوں میں سے جو فرشتہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کے پاس آتا ہے وہ کون ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ وہ جبریل ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ جبریل تو ہمارا دشمن ہے۔ ہماری خفیہ باتیں (سیدنا) محمد (ﷺ) کو بتا دیتا ہے اور ہر عذاب 'خسف اور سختی وہی لے کر اُترتا ہے۔ جبکہ میکائیل خوشحالی اور سلامتی لے کر اُترتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ جبریل کو تو پہچانتے ہو لیکن سیدنا محمد ﷺ کا انکار کرتے ہو؟ تو اُن لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تم لوگ مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جبریل اور میکائیل کا کیا مقام ہے؟ تو یہودیوں نے کہا کہ جبریل اللہ تعالیٰ کی سیدھی جانب ہے اور میکائیل الٹی جانب ہے۔ اور میکائیل جبریل کا دشمن ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ جو شخص جبریل اور میکائیل میں سے کسی ایک کا بھی دشمن ہوا وہ دوسرے کا دشمن ہو گا۔ اور جو دونوں کا دشمن ہو گا وہ اللہ عزوجل کا دشمن ہو گا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے تو انہوں نے جبریل امین کو پایا کہ وہ وحی لے کر آ چکے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ آیات پڑھیں اور فرمایا کہ اے عمر! تمہارے رب نے تمہاری موافقت کی ہے[۲۲۲] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! میں نے اس واقعہ کے بعد سے اپنے آپ کو اپنے دین میں پتھر سے زیادہ مضبوط پایا ہے۔

(اس مقام پر) زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہودیوں کی اس دشمنی کا سبب یہ تھا کہ جبریل امین نبی اکرم ﷺ کے پاس وحی لے کر آتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول "فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ" سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ ﴾ کا معنیٰ ہے: جبریل نے قرآن کو نازل کیا۔ اور قرآن سے یہاں پر وہ کلام مراد ہے جو غیر مذکور ہو۔ ﴿ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ (کا خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے یعنی) اے محمد (ﷺ)! آپ کے قلب پر نازل کیا۔ دل کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ حفاظت کی جگہ یہی ہے۔ ﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد ہے: اللہ کے حکم سے اس کو نازل کیا۔ ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ کا معنیٰ ہے کہ یہ کتاب اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق یعنی ان کی موافقت کرنے والی ہے۔ ﴿ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے لیے اُن نیک اعمال کی طرف رہنمائی ہے جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور جب مومنین اُن نیک اعمال کو کر لیں گے تو اُن کے لیے یہ کتاب اُن اعمال پر ثواب کی بشارت اور خوش خبری ہے۔

---

۲۲۲ یعنی جو کلمات تم نے ادا کیے تھے اُن ہی کلمات کو اللہ تعالیٰ نے آیتِ قرآن بنا کر نازل کر دیا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

جوشخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک اللہ (ان) کافروں کا دشمن ہے O

کافروں کی اللہ عزوجل کے ساتھ اور اللہ عزوجل کی کافروں کے ساتھ دشمنی کا بیان

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلی آیت میں بیان فرمادیا کہ جوشخص جبریل کا اس وجہ سے دشمن ہو کہ جبریل نے سیدنا محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر قرآن کریم اُتارا ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ اللہ عزوجل کا بھی دشمن ہوگا۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی قرآن کریم کو سیدنا محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ اب اس آیت میں بیان فرمارہا ہے کہ جوشخص اللہ' اس کے فرشتوں' اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل میں سے کسی ایک کا بھی دشمن ہوگا وہ (صرف ایک کا دشمن نہیں ہوگا) وہ سب کا دشمن ہوگا۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا کہ اللہ بھی اس شخص کا دشمن ہے۔ فرمایا: ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ بے شک اللہ (ان) کافروں کا دشمن ہے۔ جہاں تک کافروں کی اللہ کے ساتھ دشمنی کا تعلق ہے تو وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے نقصان دہ ہے اور نہ کسی اور طرح مؤثر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اُن کافروں کے ساتھ جو عداوت اور دشمنی ہے وہ اُنہیں اس دائمی عذاب تک لے جانے والی ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور نقصان نہیں ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ کافروں کی اللہ عزوجل کے ساتھ دشمنی سے مراد اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور اس کے اطاعت گزاروں کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔ (المائدہ: ۳۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور اس کے اطاعت گزاروں سے جنگ کرتے ہیں اور (زیر بحث آیت میں) اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ﴿ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جو ان میں سے کسی ایک سے بھی دشمنی رکھے گا وہ بلاشبہ سب کا دشمن ہوگا اور جو ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا وہ سب کا منکر ہوگا۔

مذکورہ آیت میں خصوصیت کے ساتھ جبریل اور میکائیل کے نام ذکر کرنے کی توجیہ اور ان دونوں ناموں کی لفظی اور معنوی توضیح

(اس مقام پر فرشتوں میں سے) جبریل اور میکائیل کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے' حالانکہ لفظ ملائکہ کے عموم میں یہ دونوں داخل ہیں اس کی وجہ یہ ہے تاکہ ان فرشتوں کے شرف و مقام اور ان کے بلند مرتبہ کو واضح کیا جائے۔ پھر جبریل کا ذکر میکائیل سے پہلے اس لیے فرمایا کہ جبریل کو میکائیل پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ جبریل وحی لے کر آتے ہیں جو کہ روحوں کی غذا ہے اور میکائیل کا کام ہے بارش لے کر آنا جو کہ بدن کی غذا کا سبب ہے[۲۲۳]

﴿ جِبْرِيْلَ ﴾ اور ﴿ مِيْكٰلَ ﴾ یہ دونوں غیر عربی نام ہیں اور ان کا معنیٰ ہے: اللہ کا بندہ' رحمٰن کا بندہ۔ کیونکہ "جبر" اور "میک" سُریانی زبان میں بندے کو کہتے ہیں اور "ایل" اللہ کو کہتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

۲۲۳ اور یقیناً رُوح کی غذا' بدن کی غذا پر مقدم اور اُس سے افضل ہے۔ اس لیے جبرئیل کو میکائیل پر فضیلت اور تقدم حاصل ہے۔

اور بے شک (اے رسول!) ہم نے آپ پر روشن آیتیں نازل کی ہیں اور سوائے نافرمانوں کے اُن کا کوئی بھی انکار نہیں کرے گا O

واقعۂ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت ابن صوریا (یہودی عالم) کے جواب میں ہے اس نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم پہچانتے ہوں اور نہ ہی آپ پر کوئی واضح نشانی اُتاری گئی ہے جس کی بنیاد پر ہم آپ کی پیروی کریں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ مذکورہ آیت میں ﴿بینات﴾ کا معنیٰ ہے: واضح اور حلال وحرام اور حدود واحکام کی تفصیل کے ساتھ (نشانیاں آپ کی طرف نازل کیں)۔

﴿یَکْفُرُ بِھَآ﴾ کا معنیٰ ہے: ان نشانیوں کو فاسقین جھٹلائیں گے۔ اور ﴿فاسقین﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہماری فرمانبرداری سے نکل جائیں۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

کیا ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے جب بھی کوئی عہد کیا ہے تو اُسے ان ہی کے ایک گروہ نے توڑ دیا ہے؛ بلکہ ان میں اکثر (سرے سے) ایمان ہی نہیں لاتے O

واقعۂ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کے سامنے وہ وعدے بیان کیے جو نبی اکرم ﷺ کے متعلق ان سے لیے گئے تھے اور یہ بات کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے تو مالک بن صیف نے کہا کہ خدا کی قسم! (سیدنا) محمد (ﷺ) کے متعلق ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ سو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مذکورہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔

اس آیت میں ﴿اَوَكُلَّمَا﴾ استفہام انکاری کے لیے ہے۔ ﴿عٰهَدُوْا عَهْدًا﴾ (میں جس وعدے کا تذکرہ ہے) اس سے مراد یہودیوں کا یہ قول ہے کہ بے شک ایک ایسے نبی کا زمانہ سایہ فگن ہو چکا ہے جن کو بھیجا گیا ہے اور جن کا تذکرہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سارے عہد کیے پھر اُن کو توڑ دیا۔ ﴿نَّبَذَهٗ﴾ کا معنیٰ ہے: عہد کو پھینک دیا اور اُسے توڑ دیا۔ ﴿فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے مراد ہے: یہودیوں کا ایک گروہ۔ اور ﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ وعدے کو توڑ کر کافر ہوا اور ایک گروہ حق کا انکار کر کے کافر ہوا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسا رسول تشریف لایا جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (تورات) کو اس طرح اپنی پشتوں کے پیچھے پھینک دیا جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں ہیں O

﴿رَسُوْلٌ﴾ سے مراد ہے: سیدنا محمد ﷺ۔ اور تصدیق کرنے والے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ تورات کے صحیح ہونے اور موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ تورات نے سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی بشارت دی تھی۔ اور جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ کی بعثت ہی سے تورات کی تصدیق ہوگئی۔

یہودیوں نے جو کتاب پھینک دی اس سے کون سی کتاب مراد ہے؟ اور کتاب پھینکنے کا مفہوم

بعض علماء نے ﴿کتاب﴾ سے مراد قرآن لیا ہے اور بعض نے تورات مراد لی ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ پھینکنا اُسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ کسی چیز کو پکڑا جائے۔ اور یہودیوں نے قرآن کریم کو تھاما ہی نہیں (تو پھینکنے کا کیا تصور؟) رہا اُن لوگوں کا تورات کو پھینکنا' وہ اس طرح سے تھا کہ وہ تورات کو پڑھا کرتے تھے لیکن اس کو جانتے نہیں تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہودیوں نے تورات کو ریشم کے کپڑے میں لپیٹا اور سونے کے پانی سے مزین کر کے رکھ لیا اور جو احکامات اُس میں تھے اُن کو نہ جانا۔

﴿کَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی ان یہودیوں نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور اس کو جاننے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اور اس کا سبب نبی اکرم ﷺ کی عداوت اور آپ کی دشمنی تھی۔ اور اس سے مراد وہ یہودی علماء ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے اور اُنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام کو چھپایا اور یہ تھوڑے لوگ تھے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۫ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور وہ ان باتوں کی پیروی کرنے لگے جو سلیمان کے دورِ سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور کفر سلیمان نے نہیں کیا' کفر تو شیاطین نے کیا ہے کہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھاتے تھے' اور وہ (جادو سکھاتے تھے) جو شہر بابل میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا' اور یہ دونوں (فرشتے) اس وقت تک کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (لوگوں کے لیے) صرف آزمائش ہیں' لہٰذا تم اپنا ایمان نہ کھوؤ' (اس کے باوجود) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے وہ (منتر) سیکھتے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جُدائی ڈال دیتے اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر اس (جادو) کے ذریعہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے' وہ وہ چیز سیکھ رہے تھے جو ان کو نقصان دے اور نفع نہ دے اور بے شک وہ اس (حقیقت) سے باخبر تھے کہ جس نے اس (جادو) کو اختیار کیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور کتنی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا' کاش کہ وہ اس کو جان لیتے O

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ﴾ یعنی یہودیوں نے اللہ کی کتاب کو پھینک دیا اور اُن باتوں کی پیروی کرنے لگے

جو شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ ﴿تَتْلُوْا﴾ تلاوت سے ہے بمعنیٰ ''تـقـرء'' پڑھنا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ ہے: ''تـفـتـری و تـکـذب'' جھوٹ باندھنا' جھوٹ بولنا۔ یعنی یہودی اُس جھوٹ کی پیروی کرنے لگے جو شیاطین باندھا کرتے تھے۔

﴿عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ﴾ سے مراد یہودیوں کا یہ قول ہے کہ سلیمان کی بادشاہی جادو کی وجہ سے قائم ہے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ ''علی ملک سلیمان'' کا معنیٰ ہے: سلیمان علیہ السلام کے دور میں اور ان کے زمانے میں۔

عہد سلیمانی میں شیاطین کے جادو سیکھنے کا واقعہ

واقعہ یہ ہے کہ (سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں) شیاطین نے جادو اور اس سے ملتی جلتی دیگر دھوکے کی باتیں آصف بن برخیا کی زبانی لکھ لیں۔ یہ وہ باتیں تھیں جو آصف بن برخیا کو حضرت سلیمان سے معلوم ہوئی تھیں۔ ان باتوں کو لکھ کر انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ اور یہ اُس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام سے بادشاہت واپس لی اور آپ کو اس بات کا پتا نہ چلا (کہ کرسی کے نیچے کچھ دفن کیا گیا ہے)۔

بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل جادو سیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُنہیں اس بات سے منع کیا اور اُن کی کتابیں لے کر اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیں۔ جب آپ کا وصال ہو گیا تو شیاطین نے ان کتابوں کو نکال لیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ تم پر سلیمان کی حکومت صرف اس جادو کی وجہ سے قائم تھی۔ (جب لوگوں نے یہ بات سنی) تو وہ بھی جادو سیکھنے لگے۔ جہاں تک بنی اسرائیل کے اچھے اور ذی علم طبقہ کا تعلق تھا اُنہوں نے تو اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اس بات سے کہ یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہو۔ البتہ بنی اسرائیل میں جو کمترین اور نچلے درجہ کے لوگ تھے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے۔ یہ کہہ کر وہ جادو سیکھنے کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے نبیوں کی کتابوں کو چھوڑ دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق لوگوں میں ملامت پھیل گئی (یعنی لوگ اپنے نبی کو بُرا کہنے لگے)۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی پاکیزگی کے متعلق آیات نازل فرمائیں۔ چنانچہ فرمایا کہ: وہ (یہودی) اُن (جادو کے کفریہ کلمات) کی پیروی کرنے لگے جو سلیمان کے دورِ سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ﴾ ''سلیمان نے کفر نہیں کیا'' اس سے مراد ہے جادو کے ذریعے۔ اور نہ ہی انہوں نے جادو پر عمل کیا۔ اس میں سلیمان علیہ السلام کی جادو سے پاکیزگی کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور کہنے لگے کہ اُنہیں جو بادشاہت ملی تھی اور جن و انس کو ان کے تابع فرمان کر دیا گیا تھا یہ سب جادو کی وجہ سے تھا۔

بعض کا قول یہ ہے کہ یہودی جادوگر اپنے گمان میں یہ سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے جادو حضرت سلیمان علیہ السلام سے سیکھا ہے۔ سو اللہ تبارک و تعالیٰ نے مذکورہ آیت کے ذریعے حضرت سلیمان کی پاکیزگی بیان فرمائی۔

بعض کا قول یہ ہے کہ کچھ یہودی علماء نے لوگوں سے کہا کہ کیا تمہیں (سیدنا) محمد (ﷺ) پر تعجب نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سلیمان (علیہ السلام) نبی تھے' حالانکہ وہ تو صرف جادوگر تھے۔ سو اللہ تبارک و تعالیٰ نے (یہودی علماء کے رد میں) نازل فرمایا کہ: سلیمان نے کفر نہیں کیا۔ یعنی سلیمان علیہ السلام کا نبی ہونا اس بات کے خلاف ہے کہ وہ جادوگر اور کافر ہوں۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس بات کو بیان فرمایا کہ جس (عیب) سے حضرت سلیمان علیہ السلام بَری ہیں وہ عیب (یعنی جادو) دیگر لوگوں میں موجود ہے۔ سوارشاد فرمایا کہ "کفر تو شیاطین نے کیا ہے"۔ یعنی جن لوگوں نے اپنے لیے جادو کو اختیار کیا وہی لوگ کافر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "یہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھایا کرتے تھے"۔ یعنی وہ باتیں جو اُن کے لیے شیاطین نے جادو کی کتابوں سے لکھ دی تھیں (وہ لوگوں کو اُن کی تعلیم دیا کرتے تھے)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ہوسکتا ہے ﴿يُعَلِّمُونَ﴾ سے مراد وہ یہودی ہوں جو "واتبعوا" سے مراد ہیں (یعنی یہودیوں نے شیاطین کی پیروی کی اور وہی یہودی لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں)۔

سحر (جادو) کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق اور اس کے متعلق مذہب اہل سنت کی وضاحت

جادو کو "سحر" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا سبب پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اس کو چھپ کر ہی کیا جاتا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ سحر کا معنیٰ ہے: دُور کرنا اور کسی چیز کو اُس کے ظاہری رُخ سے پھیر دینا۔ اہل عرب کہتے ہیں: "ما سحرک عن کذا" یعنی کس بات نے تمہیں اُس چیز سے دور کر دیا یا پھیر دیا۔ ساحر (جادوگر) بھی چونکہ باطل اور غلط بات کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے اس لیے گویا اُس نے چیز کو اس کے ظاہری رُخ سے سحر کر دیا یعنی پھیر دیا۔ یہ سحر کی لغوی تحقیق کا بیان ہے۔ جہاں تک جادو کی حقیقت کا تعلق ہے سو اس بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد "تمویہ" اور "تخییل" ہے (یعنی خلاف واقعہ جھوٹا بیان سنانا اور کسی چیز کے بارے میں لوگوں کے اندر دوسرا تصور پیدا کرنا)۔

جادو کے متعلق اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اس کا وجود اور حقیقت[۲۲۴] ہے اور اس پر عمل کرنا کفر ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے جب کہ (جادو کرنے والا) یہ عقیدہ رکھے کہ چیزوں کو ان کی حقیقت سے پھیرنے میں ستارے ہی مؤثر ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: جادو لوگوں کی قوتِ خیال کو تبدیل کر دیتا ہے' اُنہیں بیمار کر دیتا ہے اور بسا اوقات قتل بھی کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس شخص پر قصاص واجب ہوگا جس نے جادو کے ذریعے کسی کو قتل کیا۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ چیزوں کو اُن کی حقیقت سے پھیرنے میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ انسان کو گدھا اور گدھے کو کتا بنا دیتا ہے۔ اور بسا اوقات جادوگر ہوا میں اڑتا ہے۔ لیکن یہ قول اہل سنت کے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ جادوگر کے عمل کے وقت جو چیزیں رُونما ہوتی ہیں اُن تمام کو پیدا کرنے اور انجام دینے والا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ نہ یہ بات کہ جادوگر اُن چیزوں کو انجام دیتا ہے اور ان میں مؤثر ہوتا ہے۔

اس بارے میں صحیح ترین بات یہ ہے کہ جادو لوگوں کی قوتِ خیال کو تبدیل کر دیتا ہے اور جسموں میں مختلف امراض' پاگل پن اور موت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ کلام طبیعتوں میں مؤثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان ناگوار باتیں سُنتا ہے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کئی لوگ مختلف باتیں سن کر مر چکے ہیں۔ سو جادو کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے جسم میں مختلف بیماریاں۔

---

۲۲۴ حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی (متوفی ۸۵۲ھ) اور علامہ بدر الدین عینی حنفی (متوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ابو جعفر استر بازی شافعی' امام ابوبکر جصاص حنفی اور ابن حزم ظاہری کا یہی موقف ہے۔ لیکن امام نووی کے بہ قول صحیح مذہب یہ ہے کہ جادو کی حقیقت ہے۔ جمہور اور اکثر اہل علم کا یہی مذہب ہے اور قرآن کریم اور احادیث صحیحہ مشہورہ سے یہی ثابت ہے۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۲۳' عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۲۳۶)

جادو کا شرعی حکم

جادو کا حکم یہ ہے کہ یہ کبیرہ[۲۲۵] گناہوں میں سے ہے جن سے (ہمیں) روکا گیا ہے)۔ اور اس کا سیکھنا حرام ہے۔ کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱۰) سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کون سی سات چیزیں ہیں؟ ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ[۲۲۶] شرک کرنا' جادو کرنا' اس کو قتل کرنا جس کو ناحق قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے[۲۲۷]' یتیم کا[۲۲۸] مال کھانا' سود[۲۲۹] خوری کرنا' جنگ والے دن بھاگ جانا' پاک دامن مؤمن اور انجان عورتوں پر غلط الزام لگانا۔[۲۳۰]

(صحیح بخاری: ۲۷۶۶۔ ۶۸۵۷' صحیح مسلم: ۸۹' سنن ابوداؤد: ۲۸۷۴' نسائی: ۳۶۷۳' مشکوۃ ص ۱۷)

---

۲۲۵ کبیرہ گناہ کی تعریف میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ علامہ بدر الدین عینی متوفی ۸۵۵ھ شیخ عزالدین کے حوالہ سے بعض علماء کا قول ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گناہ کبیرہ ہر اُس گناہ کو کہتے ہیں جس کے کرنے پر شرعاً کوئی وعید یا حد یا لعنت آئی ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۵۳)
استاذ محترم علامہ غلام رسول سعیدی مدظلّہ العالی گناہ کبیرہ کے متعلق مختلف اقوال اور تعریفات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے گناہ کبیرہ کے متعلق ان تمام اقوال اور تعریفات پر غور کیا' میرے نزدیک جامع مانع اور منضبط تعریف یہ ہے:
جس گناہ کی دنیا میں کوئی سزا ہو یا اس پر آخرت میں وعید شدید ہو یا اس گناہ پر لعنت یا غضب ہو وہ گناہ کبیرہ ہے اور اس کے ماسوا گناہ صغیرہ ہے۔ (تبیان القرآن ج ۲ ص ۶۴۷)

۲۲۶ شرک بنیادی طور پر دو باتوں کا نام ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح کسی اور کو مستقل اور واجب مانا جائے۔ یا اس کی صفات کی طرح کسی اور کی صفات کو مستقل اور واجب مانا جائے۔ یعنی یہ سمجھا جائے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات خود سے ہے اور اس کا وجود واجب ہے اسی طرح فلاں شخص یا فلاں چیز بھی مستقل اور واجب الوجود ہے' یا فلاں کی صفات مستقل ہیں' یہ شرک ہے۔
(۲) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو بھی عبادت کا مستحق سمجھا جائے یا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کی جائے' یہ بھی شرک ہے۔
(محصلہ شرح عقائد نسفی ص ۶۱)

۲۲۷ یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ جس کو ناحق قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے تم اُسے قتل نہ کرو۔
(الانعام: ۱۵۱)

۲۲۸ یتیم کا مال کھانے پر قرآن کریم میں بہت سخت وعید اور سزا وارد ہوئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:
اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝ (النساء: ۱۰) بے شک وہ لوگ جو ناحق یتیموں کے مال کھاجاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی آگ میں جائیں گے ۝

۲۲۹ سُود کی مذمت میں اللہ عزوجل فرماتا ہے:
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ (البقرۃ: ۲۷۹) تو اگر تم ایسا نہ کرو (یعنی سود کو نہ چھوڑو) تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سُن لو۔
بے شمار احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے بھی سُود کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں سُود کی ہلاکت اور اس کا گناہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ سُود میں ۷۰ گناہ ہیں' ان میں سب سے کمتر گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔ (سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۴' مشکوۃ المصابیح ص ۲۴۶)

۲۳۰ اس کو عربی میں قذف کہتے ہیں۔ یعنی غلط الزام لگانا اور یہ مرد پر لگایا جائے یا عورت پر یہ ہر صورت گناہ کبیرہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے جادو کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے اور اس کو شرک کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ہمیں اس سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کے فرمان میں ''الموبقات'' کا معنیٰ ہے: ہلاک کرنے والی چیزیں۔

جادو کی اقسام اور ان کا شرعی حکم

جادو کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک قسم وہ ہے جس کا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ اس کام میں اس کی اپنی طاقت کا دخل ہے اور اس کی اپنی ذات مؤثر ہے یا یہ عقیدہ رکھے کہ ستارے ہی اثر کرنے والے اور کام کرنے والے ہیں۔ جب جادو اس حد تک پہنچ جائے تو آدمی اللہ تعالیٰ کا منکر ہو جاتا ہے اور اس کا قتل واجب ہو جاتا ہے[۲۳۱] کیونکہ حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱۱) جادوگر کی سزا یہ ہے کہ تلوار سے اس کی گردن اُڑا دی جائے۔

(سنن الترمذی: ۱۴۶۰، سنن دار قطنی: ۳۱۷۹۔ ج ۳ ص ۱۱۳، مستدرک ج ۴ ص ۳۶۰، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۸ ص ۱۳۶)

(۲) جادو کی دوسری قسم ''تخییل'' (نظر بندی) ہے۔ یہ قسم نیرنجیات (حقیقت پہ پردہ ڈالنا) اور شعبدہ بازی سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا کرنے والا یہ عقیدہ نہیں رکھتا ہے کہ اس میں اُس کی اپنی طاقت کا دخل ہے اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ستارے حقیقتاً مؤثر ہیں۔ بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قدرت اللہ عزوجل ہی کی ہے اور وہی حقیقی مؤثر ہے۔ تو اس قدر جادو سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ گناہ ہے اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس کا کرنا بھی حرام ہے۔ اگر جادو کرنے والے نے اپنے جادو کے ذریعہ کسی کو قتل کر دیا تو قصاص میں جادو کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہیں یہ خبر پہنچی کہ نبی اکرم ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی ایک باندی کو قتل کر دیا جس نے حضرت حفصہ پر جادو کیا تھا۔ حالانکہ حضرت حفصہ اُس کو[۲۳۲] مدبّرہ کر چکی تھیں لیکن انہوں نے اس کے

(بقیہ حاشیہ سابقہ صفحہ) ہے۔ حدیث شریف میں عورتوں کی تخصیص یا تو اس لیے ہے کہ قرآن کریم میں اسی طرح ہے یا اس لیے کہ عموماً عورتوں پر الزام لگایا جاتا ہے۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۲۳) غلط الزام لگانے کی قرآن کریم میں بہت سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (النور: ۲۳)

بے شک جو لوگ انجان پاک دامن مؤمنہ عورتوں پر غلط الزام لگاتے ہیں وہ دُنیا اور آخرت (دونوں جگہ) ملعون ہیں اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے ۝

۲۳۱ احناف کا بھی یہی مؤقف ہے۔ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی المتوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں کہ جو شخص جادو کرے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کام میں اس کی اپنی ذات کا دخل ہے تو وہ کافر ہو جائے گا اور مرتد ہونے کی وجہ سے اس کا قتل واجب ہو جائے گا۔

(ردالمحتار مع الدر المختار ج ۶ ص ۲۹۱)

علامہ عینی امام نووی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جادو کرنا حرام ہے اور یہ بالاتفاق گناہ کبیرہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کو ہلاک کرنے والی چیزوں میں شمار فرمایا ہے۔ یہ بعض صورتوں میں کفر ہے اور بعض صورتوں میں صرف گناہ کبیرہ ہے۔ اگر اس میں کوئی کفریہ قول و فعل استعمال ہو تو کفر ہے ورنہ نہیں۔ جہاں تک اس کے سیکھنے سکھانے کا تعلق ہے، سو وہ حرام ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۳۷۔)

۲۳۲ مدبّرہ اُس باندی کو کہتے ہیں جس کو اُس کے آقا نے کہہ دیا ہو کہ جب میں مرجاؤں تو تم آزاد ہو۔ یہ مدبّرہ مُطْلَقَہ ہے۔ یا آقا نے یوں کہا ہو کہ اگر میں اس بیماری میں فوت ہو گیا تو تم آزاد ہو یا کہے کہ اگر میں اس سفر میں فوت ہو گیا یا اگر میں دس سال میں فوت ہو گیا یا اگر میں فلاں شخص کی موت کے بعد فوت ہو گیا تو تم آزاد ہو۔ یہ مدبّرہ مقیدہ ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۴۳، شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۱۹)

قتل کا حکم دیا اور اُسے قتل کر دیا گیا۔ (مؤطا امام مالک: ۱۶۷۲)۔

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (شیاطین لوگوں کو) وہ باتیں بھی سکھاتے تھے جو دو فرشتوں پر نازل کی گئیں۔ انزال یہاں پر الہام اور تعلیم کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی نازل کرنے سے مراد یہاں پر یہ ہے کہ جو باتیں اُن فرشتوں پر الہام[۲۳۳] کی گئیں اور جو اُنہیں سکھائی گئیں۔ ایک شاذ قرأت میں "مَلِكَيْنِ" کو لام کے زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ (بعض مفسرین نے) فرمایا ہے کہ ان دو فرشتوں سے مراد دو جادوگر مرد ہیں جو کہ شہر بابل میں تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ دو کاشتکار مرد تھے۔ اس لیے کہ فرشتے جادو نہیں جانتے ہیں۔ مشہور قرائت کے مطابق "ملکین" لام کے زبر کے ساتھ ہے۔

فرشتوں پر جادو کی باتیں نازل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اور فرشتوں کا لوگوں کو جادو سکھانا۔ کیونکر جائز ہے؟

اگر تم یہ سوال کرو کہ یہ بات کیسے جائز ہے کہ فرشتوں پر (جادو کی باتیں) نازل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے؟ اور فرشتوں کا جادو سکھانا کس طرح جائز اور ممکن ہے؟ (حالانکہ جادو ممنوعات میں سے ہے؟)

تو میں کہوں گا کہ علامہ ابن جریر طبری نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اُن تمام باتوں کی پہچان عطا فرمائی جن کے کرنے کا اُنہیں حکم فرمایا ہے اور جن سے اُنہیں منع فرمایا ہے۔ جب بندوں نے کرنے نہ کرنے کی تمام باتیں جان لیں تو پھر اُنہیں (مختلف کام) کرنے نہ کرنے کے احکامات جاری فرمائے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو حکم دینے اور منع کرنے کا کوئی مقصد اور مفہوم نہ رہتا۔ (اب غور فرمایئے کہ) جادو کا تعلق اُن چیزوں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے اپنے بندوں کو منع فرمایا ہے۔ تو یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن فرشتوں کو وہ جادو سکھا دے جن کا نام اُس نے اپنے کلام میں ذکر فرمایا ہے اور جنہیں اُس نے بنی آدم میں سے اپنے بندوں کے لیے آزمائش (کا ذریعہ) بنایا۔ جیسا کہ اُس نے اُن دونوں کے حوالہ سے ہمیں (مذکورہ آیت میں) بتایا کہ جو شخص اُن فرشتوں کے پاس جادو سیکھنے کے لیے آتا تو وہ دونوں اُس سے کہتے کہ "ہم تو (لوگوں کے لیے) صرف آزمائش ہیں لہٰذا تم اپنا ایمان نہ کھوؤ"۔ (اور اللہ عزوجل کا ان فرشتوں کو جادو کی تعلیم دینا اس لیے تھا) تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اُن بندوں کا امتحان لے جنہیں اُس نے جادو کرنے اور میاں بیوی کے درمیان جُدائی ڈالنے سے منع فرمایا تھا۔ پس جو مؤمن ہوگا وہ صاف نکھر کر سامنے آجائے گا' کیونکہ وہ ان فرشتوں سے جادو سیکھنا چھوڑ دے گا اور جو کافر ہوگا وہ ان سے کفر اور جادو کی باتیں سیکھتا رہے گا اور دونوں فرشتوں کو جو جادو سکھایا گیا تھا وہ لوگوں کو اس کی تعلیم دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار تھے' کیونکہ ان دونوں کو اس کی تعلیم اللہ کے اذن سے تھی اور یہ دونوں فرشتے لوگوں کو یہ کہہ کر جادو سے روکتے تھے کہ ہم تو صرف آزمائش ہیں لہٰذا تم اپنا ایمان نہ کھوؤ' اس کے باوجود جس نے اُن سے جادو سیکھا اُس کا جادو کرنا ان دونوں کے لیے نقصان دہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان دونوں کو جس بات کا حکم دیا گیا تھا وہ انہوں نے پہنچا دی۔

امام طبری کے علاوہ دیگر نے سوال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دونوں فرشتے قصداً اور ارادۃً جادو نہیں سکھاتے تھے بلکہ پہلے (لوگوں کو) جادو کا تعارف کراتے تھے اور اس کا غلط ہونا بیان کرتے تھے اور لوگوں کو اس سے بچنے کا حکم دیتے تھے۔ اس کے

[۲۳۳] الہام کا معنیٰ ہے: القاء المعنى في القلب بطريق الفيض. یعنی دل میں بہ طریقہ فیض کوئی بات ڈال دینا۔ (شرح عقائد للنسفی ص ۱۸) جیسے نیک اور پرہیزگار لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی بات ڈال دی جاتی ہے یا کسی مسئلہ کا حل بتا دیا جاتا ہے یا کسی اہم معاملہ کی طرف خاص اشارہ کرا دیا جاتا ہے یہ تمام صورتیں "الہام" کی ہیں۔

بعد بد بخت تھا وہ شخص جو ان کی نصیحت پر عمل نہیں کرتا تھا اور جادو کو سیکھتا تھا۔ اور جو شخص ان کی نصیحت کو قبول کر کے ان سے جادو سیکھنا چھوڑ دیتا تھا وہ سعادت مند اور خوش بخت تھا۔

بعض علماء نے جواب میں کہا ہے کہ ان دونوں فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اُس دور میں لوگوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ لہٰذا بدبخت تھا وہ شخص جو ان سے جادو سیکھتا اور اس جادو سے کفر کرتا تھا اور خوش بخت تھا وہ شخص جو جادو کو چھوڑ کر اپنے ایمان پر قائم و دائم رہتا تھا۔ اور (یقیناً) اللہ تبارک و تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جس چیز سے چاہے آزمائے۔ جیسے اُس نے بنی اسرائیل کو طالوت[۲۳۴] کی نہر سے آزمایا۔ (قرآن کریم میں) ارشاد ہے:

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهٗ مِنِّيْٓ　　　تو جو اُس نہر سے پانی پیئے گا وہ میرا نہیں ہے اور جو اُس سے نہیں پیئے گا وہ میرا ہے۔ (البقرہ: ۲۴۹)

''بابل'' سے مراد کون سا شہر ہے؟ اور اس نام کی وجہ

آیت میں فرمایا: ﴿ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ﴾ یعنی وہ دونوں فرشتے بابل میں تھے اور ان کا نام ہاروت اور ماروت تھا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ بابل سے مراد عراق کا بابل ہے جو کہ کوفہ میں ہے۔ اس کا نام بابل اس لیے رکھا گیا کہ (یہ تبلبل سے مأخوذ ہے بہ معنیٰ مختلف ہونا' چونکہ) نمرود کا محل گرنے کے بعد لوگوں کے درمیان مختلف قسم کی زبانیں رائج ہو گئی تھیں' اس لیے اس جگہ کو بابل کہا جانے لگا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ بابل سے مراد نہاوند کا بابل ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح اور زیادہ معروف ہے۔ اُن فرشتوں کے جو نام ہیں: ہاروت اور ماروت' یہ دونوں سُریانی نام ہیں۔

ہاروت اور ماروت کے زمین پر بھیجے جانے کا واقعہ[۲۳۵]

زیر بحث آیت میں جو واقعہ ہے وہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دیگر مفسرین کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں جب انسانوں کے بُرے اعمال کو آسمان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو اُنہوں نے انسانوں کو اس پر عار دلائی اور (اللہ عزوجل کی بارگاہ میں) عرض گزار ہوئے کہ یہ وہی انسان ہیں جن کو تو نے زمین میں مقرر کیا ہے اور ان کو اپنا پسندیدہ بنایا ہے' حالانکہ یہ تیری نافرمانی کرتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں زمین پر اُتار دوں اور تمہارے اندر بھی وہ چیز سوار کر دوں جو انسانوں کے اندر میں نے سوار کی ہے (یعنی شہوت) تو تم بھی

---

۲۳۴ طالوت بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا نام ہے۔ سریانی زبان میں ان کا نام شاول بن قیس تھا۔ لیکن دراز قامت ہونے کی وجہ سے ان کو ''طالوت'' کہا جاتا تھا۔ آپ بنیامین بن حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے پیغمبر حضرت شمویل علیہ السلام نے ان کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۚ　　　اور بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہا کہ بے شک اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔ (البقرہ: ۲۴۷)

واقعہ کی مزید تفصیل کے لیے البقرہ کی اسی آیت (۲۴۷) کے تحت خزائن العرفان' تبیان القرآن اور دیگر معتمد تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

۲۳۵ یہ پورا قصہ ملائکہ کی شان اور عظمت اور ان کی عصمت کے خلاف ہے اور محققین کے نزدیک قطعاً مردود اور باطل ہے۔ خود علامہ خازن نے پورا قصہ ذکر کرنے کے بعد آخر میں اس کی تردید فرمائی ہے۔

ہاروت و ماروت اور دیگر تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کے معزز و مکرم بندے ہیں' ان سے گناہ کا صُدور ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا: (وہ فرشتے اس کے) معزز بندے ہیں' وہ اس کی اجازت سے پہلے کوئی بات نہیں کرتے اور وہ اُسی کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ (سورۃ الانبیاء: ۲۶-۲۷)

(گناہوں کا) ارتکاب کرو گے جس طرح انسانوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ تیری ذات پاک ہے ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم تیری نافرمانی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنے بہترین فرشتوں میں سے دو فرشتے منتخب کر لو اور ان کو زمین پر بھیج دو۔ انہوں نے (اس کام کے لیے) ہاروت اور ماروت کو منتخب کیا۔ یہ فرشتوں میں زیادہ نیک اور زیادہ عبادت گزار تھے۔ ان میں ہاروت کا نام عزا تھا اور ماروت کا نام عزایا تھا۔ جب ان دونوں نے معصیت کا ارتکاب کیا تو ان کا نام تبدیل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر شہوت سوار کی اور انہیں زمین پر اُتار دیا اور انہیں اس بات کا حکم دیا کہ وہ لوگوں کے درمیان دُرست فیصلے کریں اور لوگوں کو شرک، قتلِ ناحق، زنا کاری اور شراب پینے سے منع کریں۔ سو یہ دونوں دن میں لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے اور جب شام ہوتی تو اللہ عزوجل کا اسم اعظم یاد کرتے اور آسمان کی طرف چلے جاتے۔ ابھی ان پر ایک مہینہ نہیں گزرا تھا کہ ان پر آزمائش آ گئی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ پہلے دن ہی آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ ہوا یہ کہ ان کے پاس ایک عورت کا کیس لایا گیا۔ اُس عورت کو زہرہ کہا جاتا تھا اور وہ اہل فارس کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ ملکہ تھی۔ جب اُن دونوں نے اُس عورت کو دیکھا تو اُس پر دل آ گیا۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کیا تمہارے دل میں وہ چیز آ گئی ہے جو میرے دل میں آئی ہے؟ تو اس نے جواباً کہا کہ ہاں! پس اُن دونوں نے اُس عورت کو اپنی طرف مائل کیا اور اُسے رغبت دلائی تو اُس نے انکار کیا اور وہاں سے چلی گئی۔ اگلے دن وہ پھر آئی تو اُن دونوں نے اسی طرح اُسے راغب کیا تو اُس نے انکار کیا اور کہا کہ میں یہ کام اُسی صورت میں کر سکتی ہوں جبکہ تم اس بُت کی پوجا کرو، کسی آدمی کو قتل کرو اور شراب پیؤ۔ اُن دونوں نے کہا کہ یہ کام تو ناممکن ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے منع فرمایا ہے۔ (اُس عورت نے جب یہ جواب سُنا تو) وہ چلی گئی اور پھر تیسرے دن اپنے شراب کا ایک پیالہ لے کر آئی۔ اُن دونوں کے دل میں اُس عورت کی طرف رغبت اور میلان موجود تھا۔ انہوں نے عورت کو اپنی طرف مائل کیا تو اُس نے پھر وہی بات کی جو گذشتہ کل کہی تھی۔ تو اُن دونوں نے کہا کہ غیر اللہ کی عبادت کرنا ایک بہت بڑا کام ہے اور کسی کو قتل کرنا بھی بڑا کام ہے۔ ہاں تینوں میں جو زیادہ آسان ہے وہ ہے شراب پینا۔ یہ کہہ کر اُن دونوں نے شراب پی لی۔ جب اُنہیں نشہ چڑھا تو وہ اُس عورت پر آئے اور اُس سے زنا کر لیا۔ اس دوران کسی آدمی نے اُنہیں دیکھ لیا تو رُسوائی کے خوف سے اُنہوں نے اُس آدمی کو قتل کر دیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُن دونوں نے بُت کو سجدہ بھی کر لیا تھا۔

بعض نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ لوگوں میں سے ایک حسین ترین عورت اُن دونوں (فرشتوں) کے پاس اپنے شوہر کا جھگڑا لے کر آئی تو ایک (فرشتے) نے دوسرے سے کہا کہ کیا تمہارے دل میں وہ بات آ گئی ہے جو میرے دل میں آئی ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں! تو (پہلے والے نے) پوچھا کہ کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ شوہر کے خلاف اس عورت کے حق میں فیصلہ دے دو؟ تو دوسرے نے کہا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ کے ہاں کس قدر سزا اور عذاب ہے؟ تو پہلے نے کہا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ کے ہاں عفو و درگزر اور رحمت کس قدر ہے؟ پھر ان دونوں نے اُس عورت سے اُس کی ذات کا مطالبہ کیا تو اُس نے کہا کہ میں یہ کام اُسی صورت میں کر سکتی ہوں جبکہ تم میرے حق میں اور میرے شوہر کے خلاف فیصلہ کر دو۔ سو اُنہوں نے فیصلہ (اُس کے حق میں) دے دیا۔ پھر اُس سے اُس کی ذات کا مطالبہ کیا تو اُس نے کہا کہ یہ کام تو اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ تم میرے شوہر کو قتل کر دو۔ تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ کے ہاں کس قدر سزا اور عذاب ہے؟ تو دوسرے نے کہا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ کے ہاں عفو و درگزر اور رحمت کس قدر ہے؟ یہ کہہ کر اُن دونوں نے اُس کے شوہر کو قتل کر دیا۔ پھر اُس سے اُس کی ذات کا مطالبہ کیا تو اُس نے کہا کہ یہ کام ایک صورت میں ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ میرا ایک بُت

ہے جس کی میں پُوجا کرتی ہوں اگر تم بھی میرے ساتھ اُس بت کے آگے جھک جاؤ تو میں (تمہارا مقصد) پورا کر دوں گی۔ یہ سن کر ایک نے دوسرے سے وہی پہلے والی بات کہی تو دوسرے نے وہی پہلے والا جواب دیا۔ اور یوں اُنہوں نے اُس عورت کے ساتھ اُس بُت کے آگے عبادت کر لی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زُہرہ کی شکل تبدیل کر کے اُسے شہاب بنا دیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اُس عورت نے اُن فرشتوں سے کہا کہ تم دونوں مجھے اُس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ تم مجھے وہ بات نہ بتادو جس کے ذریعہ تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ تو اُن دونوں نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اُس عورت نے کہا کہ تم دونوں مجھے اُس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ تم مجھے وہ نام نہ سکھا دو۔ تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس کو وہ نام سکھا دو۔ تو اُس نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ تو دوسرے نے کہا کہ پھر اللہ کی رحمت کہاں ہے؟ یہ کہہ کر اُس نے عورت کو اسم اعظم سکھا دیا۔ (جب عورت نے اسم اعظم سیکھ لیا) تو اُس نے اس کو پڑھا اور آسمان پر چڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کی شکل تبدیل کر کے اُسے ستارہ بنا دیا۔ (اب علماء کا اس میں اختلاف ہو گیا) بعض نے کہا کہ زہرہ ستارہ یہ وہی عورت ہے۔ بعض نے اس بات کا انکار کیا اور کہا کہ زہرہ ستارہ تو اُن سات چلنے والے ستاروں میں سے ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے قسم اُٹھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ میں پیچھے ہٹ جانے والے ستاروں کی قسم کھاتا ہوں O اور اُن ستاروں کی جو سیدھے چلنے والے ہیں اور رُکے رہنے والے ہیں O (التکویر: ۱۵۔۱۶)

اور جہاں تک اُس زہرہ کا تعلق ہے جس نے ہاروت اور ماروت کو آزمائش میں مبتلا کر دیا وہ ایک عورت تھی جس کو اس کے حسن و جمال کی وجہ سے زہرہ کہا جاتا تھا' پھر جب اُس نے حد سے تجاوز کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کی شکل کو مسخ کر کے اُسے شہاب بنا دیا۔

مفسّرین بیان کرتے ہیں کہ ہاروت اور ماروت نے گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد شام میں جب آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کیا تو اُن کے پَروں نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ وہ اُس بات کو سمجھ گئے جو اُن پر نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس جانے کا ارادہ کیا اور (اُن کے پاس جا کر) اُنہیں اپنا معاملہ بتایا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں ان دونوں کی سفارش کریں۔ ساتھ ہی اُنہوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کو یہ بھی بتایا کہ جس طرح تمام اہل زمین کی عبادتیں آسمان پر جاتی ہیں اس طرح ہم نے آپ کی عبادت کو بھی آسمان پر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری سفارش کیجئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے اُن کی سفارش کی تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس بات کا اختیار دیا کہ چاہیں تو دنیا کا عذاب اختیار کر لیں اور چاہیں تو آخرت کا عذاب اختیار کر لیں۔ اُن دونوں نے دُنیا کا عذاب اختیار کر لیا' کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ یہ عذاب ختم ہو جائے گا۔ پس وہ دونوں بابل میں ہیں اور اُنہیں عذاب دیا جاتا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُن دونوں کو اُن کے بالوں کے ساتھ قیامت تک کے لیے لٹکا دیا گیا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُن دونوں کو اوندھا کر دیا گیا ہے اور اُنہیں لوہے کے کوڑے مارے جاتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی ان کے پاس جادو سیکھنے کے لیے گیا تو اس نے ان کو ٹانگوں کے بل اس حالت میں لٹکا ہوا پایا کہ اُن کی آنکھیں نیلی اور جلدیں کالی تھیں اور ان کی زبانوں اور پانی کے درمیان صرف انگل کا فاصلہ تھا اور ان دونوں کو پیاس کا عذاب دیا جا رہا تھا۔ جب اُس شخص نے یہ منظر دیکھا تو اُس پر دہشت طاری ہو گئی اور اُس نے کہا: "لا الہ الا اللہ"۔ جب اُن دونوں نے اُس شخص سے یہ کلام سنا تو اُنہوں نے کہا: "لا الہ الا

اللہ'' تم کون ہو؟ تو اُس نے جواب دیا کہ میں لوگوں میں سے ایک آدمی ہوں۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کس اُمت سے تمہارا تعلّق ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ میں سیدنا محمد ﷺ کی اُمت سے ہوں۔ اُنہوں نے پوچھا: کیا سیدنا محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لا چکے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں! تو اُن دونوں نے ''الحمد للہ'' کہا اور خوشی کا اظہار کیا۔ اُس شخص نے پوچھا کہ تم دونوں کس وجہ سے خوش ہو رہے ہو؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ نبی[۲۳۶] قیامت ہیں اور (اُن کی تشریف آوری کی وجہ سے) ہمارے عذاب کا اختتام قریب آ چکا ہے۔

فرشتوں کے معصوم ہونے کا بیان اور علماء امت کا مؤقف

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں اور فضیلت والے ہوتے ہیں۔ اور ائمہ مسلمین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فرشتوں میں جو رسول ہوتے ہیں اُن کا حکم اور انبیاء کرام کا حکم اس بارے میں یکساں ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے پیغام پہنچانے میں معصوم ہوتے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جس میں انبیاء کرام کا معصوم ہونا ثابت ہے اُس میں فرشتوں کا معصوم ہونا بھی ثابت ہے۔ اور انبیاء کرام تک کوئی پیغام پہنچانے میں فرشتوں کا انبیاء کے ساتھ وہی تعلق ہے جو انبیاء کرام کا اپنی اُمتوں کے ساتھ تعلق ہے۔

(یہاں تک تو بات متفقہ تھی) اب اختلاف اُن فرشتوں کے بارے میں ہے جو رُسول نہیں ہیں۔ محققین علماء کی ایک جماعت اور جمیع معتزلہ کا مؤقف یہ ہے کہ تمام فرشتے تمام گناہوں اور بُرائیوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ اس پر اُن کا استدلال قرآن وسنّت اور عقل وقیاس دونوں سے ہے۔ جب کہ ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ وہ فرشتے جو رسول نہیں ہیں وہ معصوم نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا استدلال بھی اپنے مؤقف پر قرآن وسنّت اور قیاس سے ہے۔ ان علماء کے دلائل میں ایک دلیل تو یہی ہاروت اور ماروت کا قصہ ہے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نیز اس کو مؤرخین نے نقل کیا ہے اور علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں صحابہ وتابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ اور ہاروت ماروت کا یہ قصہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت کعب الاحبار، سدی، ربیع اور مجاہد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔

جو علماء تمام فرشتوں کی معصومیت کے قائل ہیں ان کی طرف سے ہاروت ماروت کے قصے کے جوابات ـــ اور اس قصے کے غلط ہونے پر دلائل

جن علماء کا مؤقف یہ ہے کہ تمام فرشتے معصوم ہیں اُنہوں نے ہاروت ماروت کے قصہ کا جواب یہ دیا ہے کہ اس بارے میں مفسرین اور مؤرخین نے جو کچھ نقل کیا ہے اُس میں سے کچھ بھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ اور یہ قصّے صرف یہودیوں سے لیے گئے ہیں۔ جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ یہودی، فرشتوں اور نبیوں پر الزامات لگاتے رہتے ہیں اور زیر بحث آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کا سلیمان علیہ السلام پر الزام لگانا ذکر کیا ہے، پھر اس پر ہاروت ماروت کے قصہ کو عطف کر کے دوسرے نمبر پر ذکر کیا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ یعنی اُس جادو سے جس کو شیاطین نے اُن کی طرف غلط منسوب کیا اور یہودیوں نے اس معاملہ میں شیاطین کی پیروی کی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں

---

۲۳۶ نبی قیامت ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے (اپنی دو انگلیوں کو ملا کر) ارشاد فرمایا کہ مجھے اور قیامت کو اس طرح مبعوث کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۵۰۴، صحیح مسلم: ۲۹۵۱، مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۸۰)

یہودیوں کی الزام تراشی اوران کے جھوٹ کی خبردی۔

مذکورہ علماء نے زیر بحث قصے اوراس کے غلط ہونے کے حوالے سے مزید کچھ جوابات ذکر کیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) (زیر بحث قصے کے غلط ہونے کی) پہلی وجہ یہ ہے کہ اس قصے میں یہ بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ جس چیز کے ذریعہ میں نے بنی آدم کو آزمایا ہے اگر اس چیز کے ذریعہ میں تمہیں آزمائش میں ڈالوں تو تم بھی میری نافرمانی کرو گے۔ تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم تیری نافرمانی کریں۔ فرشتوں کے اس جواب میں اللہ عزوجل کا رد ہے۔ اور اللہ عزوجل (کی کسی بات کا) رد کرنا کفر ہے۔ جبکہ یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ فرشتے اس سے پہلے معصوم تھے (اور جب ان کا معصوم ہونا ثابت ہے) تو اس واقعہ کا صدور بھی ان سے نہیں ہو سکتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہاروت اور ماروت کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب کے درمیان اختیار دیا گیا۔ اور یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ جو شخص شرک کا مرتکب ہو اُس کو اللہ تعالیٰ اختیار نہیں دیتا ہے۔ اور اگر یہ بات ثابت ہو کہ اُن دونوں نے توبہ کر لی تھی تو پھر انہیں عذاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ عورت نے جب گناہ کا ارتکاب کیا تو یہ بات عقل کس طرح قبول کر سکتی ہے کہ وہ (گناہ کر کے) آسمان پر چڑھ جائے اور ستارہ بن جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے اس قول میں قسم کھا کر اس کی قدر و منزلت کو بڑھائے کہ ''فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝'' (التکویر: ۱۵۔۱۶)۔

ان وجوہ سے زیر بحث قصے کا کمزور ہونا ظاہر ہو گیا۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ اس قصے کے صحیح ہونے اور کمزور ہونے کو زیادہ جانتا ہے۔ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ فرشتوں کو ہر اُس بات سے پاک قرار دیا جائے جو اُن کے مقام و منصب کے لائق اور مناسب نہیں ہے۔

آگے فرمایا: ﴿ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ اس کا مطلب اور معنیٰ یہ ہے کہ وہ دونوں کسی کو بھی (جادو کی باتیں) اُس وقت تک نہیں سکھاتے تھے جب تک کہ پہلے اُسے نصیحت نہیں کر دیتے تھے اور وہ سیکھنے والے سے یہ نہیں کہہ دیتے تھے کہ ''ہم تو (لوگوں کے لیے) صرف فتنہ ہیں''۔ یعنی آزمائش اور امتحان ہیں۔ ''لہٰذا تم اپنا ایمان نہ کھوؤ''۔ یعنی تم جادو کو نہ سیکھو ورنہ تم اُس پر عمل کرو گے اور کافر ہو جاؤ گے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ دونوں فرشتے یہ جملہ سات مرتبہ کہتے تھے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص ان کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کرتا اور جادو سکھانے پر ہی اصرار کرتا تو وہ دونوں اُس شخص سے کہتے کہ تم اس راکھ پر جا کے پیشاب کرو۔ جب وہ ایسا کرتا تو اُس راکھ سے ایک نور نکل کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتا۔ اور یہ نور اُس شخص کا ایمان اور اس کی معرفت ہوتا تھا (جو کہ پیشاب کرتے ہی اُس سے جدا ہو جاتا تھا) اور ساتھ ہی دھوئیں کی مانند کوئی سیاہ چیز اُترتی اور اس کے کانوں میں داخل ہو جاتی اور یہ اللہ عزوجل کا غضب ہوتا تھا۔

﴿ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ ''تو لوگ اُن دونوں سے سیکھتے تھے'' یعنی فرشتوں سے ''وہ (منتر) جس کے ذریعے وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے'' یعنی جادو کا علم حاصل کرتے تھے جو کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا سبب تھا۔ مثلاً کسی بات کی حقیقت پر پردہ ڈال دینا' کسی قوتِ خیال کو تبدیل کر دینا' دھاگے پر گرہیں ڈال کر اُن پر پھونکیں مارنا اور اس طرح کی دیگر چیزیں' جن سے میاں بیوی کے درمیان بُغض' نافرمانی اور ایک دوسرے کی مخالفت پیدا ہو جاتی تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ طور آزمائش تھا نہ یہ بات کہ جادو میں

ذاتی طور پر کوئی تاثیر ہے۔ اس لیے کہ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ اس کے ذریعے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے'' یعنی جادو کرنے والے جادو کے ذریعے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ''اللہ کے اذن کے بغیر'' یعنی اس کے علم' اس کے فیصلے اور اس کی تکوین (اثر پیدا کرنے) کے بغیر (کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے)۔ پس جادو کرنے والا جادو کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تقدیر بناتا ہے اور (اس جادو کا اثر) اللہ تعالیٰ کے فیصلے' اُس کی قدرت اور اس کے ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔

﴿ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ﴾

''وہ لوگ اُس چیز کو سیکھتے ہیں جو اُن کو نقصان دے اور اُنہیں فائدہ نہ دے'' یعنی جادو (سیکھتے ہیں اور یہ اُن کے لیے نقصان دہ ہے) کیونکہ وہ اس کے ذریعہ بُرائی کا ارادہ کرتے ہیں۔ ''اور بے شک یہ لوگ جانتے ہیں کہ جس نے اس کو خریدا'' یعنی یہودی جانتے ہیں کہ جس نے جادو کو اختیار کیا ''اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے'' یعنی اس کے لیے جنت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ''اور کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں اُنہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا'' یعنی دین اور حق کے مقابلہ میں جادو اور کفر کو اختیار کر کے اُنہوں نے اپنا حصہ فروخت کر دیا۔[۲۳۷] ﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کاش کہ یہ لوگ جان لیتے۔

اس اشکال کا جواب کہ زیر بحث آیت میں یہودیوں کے لیے پہلے علم کا اثبات کیا گیا اور بعد میں اس کی نفی کر دی گئی؟

اگر تم یہاں سوال کرو کہ یہ کیا بات ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے تاکید قسمی کے ساتھ ''وَلَقَدْ عَلِمُوْا'' فرما کر یہودیوں کے لیے ثابت کیا کہ اُنہیں علم ہے اور اسی آیت کے آخر میں ''لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' فرما کر اُن سے علم کی نفی فرما دی؟

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہودی یہ تو جانتے تھے کہ جس نے جادو کو اختیار کیا' اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے اس علم کی مخالفت کی اور جادو کرنے میں لگ گئے اور کتاب اللہ پر بھی عمل چھوڑ دیا اور جو احکام اللہ کے پیغمبر لے کر تشریف لائے اُن پر بھی عمل چھوڑ دیا' اس وجہ سے کہ اُنہیں اُن رسولوں سے دشمنی تھی اور اُن کی اپنی سرکشی تھی۔ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ یہ جاننے کے باوجود کر رہے تھے کہ اس کام کے کرنے والے کے لیے عذاب ہے۔ تو اُنہیں جب اپنے ہی علم کا علم نہ رہا تو گویا وہ علم سے خالی ہو گئے۔[۲۳۸]

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور اگر وہ لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ضرور اللہ کے ہاں (اس کا) بہترین اجر ہوتا' کاش کہ یہ لوگ جان لیتے O

ارشاد فرمایا کہ ''اگر یہ لوگ ایمان لاتے'' یعنی یہودی' محمد ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان لاتے ''اور پرہیزگاری اختیار کرتے'' یعنی یہودیت سے' جادو سے اور ہر وہ چیز جو اُنہیں گناہ میں مبتلا کرے اُس سے بچتے ''تو ضرور اللہ کے ہاں (اس کا) بہترین اجر ہوتا'' یعنی اُنہیں جو اللہ کی جانب سے اجر ملتا وہ ضرور ان کے لیے بہتر ہوتا۔ ''کاش کہ یہ لوگ جان لیتے'' یعنی اس بات کو جان لیتے۔

۲۳۷ یعنی اپنا اُخروی حصہ فروخت کر دیا اور جہنم کی آگ اُن کا مقدر بن گئی۔ (جلالین' البقرہ: ۱۰۲)

۲۳۸ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص علم رکھتا ہو اور اپنے علم کے تقاضوں پر عمل نہ کرتا ہو وہ حکماً جاہل ہے۔

(روح المعانی' البقرہ: ۱۰۳' تبیان القرآن ج ۱ ص ۴۹٦)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

اے ایمان والو! (میرے حبیب سے بات کرتے وقت) ''راعنا'' نہ کہا کرو بلکہ یوں عرض کرو: ''انظرنا'' اور تم (ابتداء ہی) غور سے سُن لیا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے O

مذکورہ آیت کا واقعۂ نزول اور ''راعنا'' کا معنیٰ

اس آیت کے نازل ہونے کا سبب اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمان (نبی اکرم ﷺ سے گفتگو کے دوران) ''مراعاۃ'' کے لفظ سے یوں عرض کرتے: ''راعنا یا رسول اللہ'' یعنی اپنے کانوں کو ہماری طرف متوجہ اور ہماری بات سُننے کے لیے فارغ فرمائیے۔ صحابہ کرام کا یہ لفظ (''راعنا'') یہودیوں کی زبان میں ایک بہت بُری گالی تھا اور ان کے ہاں اس کا معنیٰ تھا کہ تم سُنو اور تمہاری بات نہ سُنی جائے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ ''رعونۃ'' سے مشتق کر کے یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ (یعنی) جب کسی شخص کو بیوقوف قرار دینا چاہتے تھے تو اُسے ''راعنا'' کہتے تھے یعنی بیوقوف۔ جب یہی کلمہ یہودیوں نے مسلمانوں سے سُنا (کہ وہ اپنے نبی کی بارگاہ میں ''راعنا'' کہتے ہیں) تو اُنہوں نے آپس میں کہا کہ ہم محمد (ﷺ) کو چھپ کر گالیاں دیتے رہے اب علی الاعلان اُنہیں گالی دیا کرو (یعنی اُن کے پاس جا کر گفتگو کے دوران اُنہیں ''راعنا'' کہا کرو) چنانچہ اب یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس آتے اور (کھل کر) کہتے: ''راعنا یا محمد'' اور پھر آپس میں ہنستے تھے۔ (اتفاق سے) اس لفظ کو (یہودیوں کی زبان سے) حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سُن لیا۔ آپ فوراً اس کلمہ کو سمجھ گئے کیونکہ وہ یہودیوں کی زبان جانتے تھے۔ (اس کلمہ کے سُننے کے بعد) اُنہوں نے یہودیوں سے کہا کہ اب اگر تم میں سے کسی کو میں نے یہ کلمہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بولتے ہوئے سُن لیا تو میں اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔ یہودیوں نے کہا کہ کیا تم لوگ خود یہ کلمہ (اپنے نبی سے) نہیں کہتے ہو؟ (جب یہ بات یہودیوں نے کہی) تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرما دی کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ اے ایمان والو! تم ''راعنا'' نہ کہا کرو۔ یعنی اس لیے نہ کہا کرو تاکہ اس سے یہودیوں کو نبی اکرم ﷺ کی بدگوئی کا راستہ نہ ملے۔ بلکہ یوں عرض کرو: ﴿انْظُرْنَا﴾۔

''انظرنا'' اور ''واسمعوا'' کا معنیٰ

﴿انْظُرْنَا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ ہماری طرف نگاہ فرمائیے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ آپ ہمارا انتظار فرمائیے، ہمیں کچھ مہلت دیجئے اور ہمیں اچھی طرح بات سمجھائیے۔

﴿وَاسْمَعُوْا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جن باتوں کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُنہیں غور سے سُنا کرو اور فرمانبرداری کیا کرو۔ (تاکہ محبوب کی بارگاہ میں دوبارہ درخواست کرنے کی نوبت نہ آئے۔)

مذکورہ آیت سے ثابت ہونے والے مسائل

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ نے (اس آیت میں) مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ''راعنا'' کہنے سے منع فرمایا ہے۔ تاکہ کوئی شخص (اس کو بنیاد بنا کر) آپ ﷺ کی گستاخی کا راستہ نہ نکالے۔[۲۳۹]

---

۲۳۹ اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں کوئی ایسا لفظ جس سے توہین اور بے ادبی کا شائبہ ہوتا ہو اس کا استعمال ناجائز، حرام بلکہ موجب کفر ہے۔ پھر کوئی لاکھ تاویلیں کرتا رہے، ہرگز مقبول نہ ہوں گی۔ استاذِ محترم مفسّر قرآن علاّمہ غلام رسول صاحب سعیدی مدظلّہ العالی ''شرح صحیح مسلم'' میں شیخ انور شاہ کشمیری دیوبندی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کفر کے حکم کا دارومدار ظاہر پر ہے، نیت اور قرائن حال پر نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ انبیاء کی شان میں جرأت اور دلیری کفر ہے، خواہ توہین کا ارادہ نہ ہو۔ (اکفار الملحدین ص۷۳تا۸۶، شرح صحیح مسلم ج۶ ص۷۷۹) اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج۱ ص۵۰۱

(۲) اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) مؤمنین کو نبی اکرم ﷺ کی توقیر اور تعظیم کرنے کا حکم فرمایا ہے۔
(۳) اور اس بات کا حکم فرمایا ہے کہ مؤمنین' نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرنے کے لیے ایسے الفاظ اختیار کریں جو بہت ہی خوبصورت ہوں اور ایسے معانی اختیار کریں جو بہت باریکی پر مشتمل ہوں۔
(۴) اور (یہ بھی حکم فرمایا ہے کہ) اگر مؤمنین' نبی اکرم ﷺ سے کوئی سوال کریں تو تعظیم وتکریم کے ساتھ اور نرم لہجہ میں سوال کریں۔
(۵) اور نبی اکرم ﷺ کو اُن الفاظ سے مخاطب نہ کریں جو یہودیوں کے لیے خوشی کا باعث ہوں۔

زیر بحث آیت اس میں کافروں سے مراد یہودی ہیں اور ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ بمعنی ''مؤلم'' ہے (یعنی یہودیوں کے لیے دردناک عذاب ہے)۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

نہ تو کتابی کافر یہ چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی جانب سے کوئی بھلائی (یعنی وحی) نازل کی جائے اور نہ ہی مشرکین (یہ چاہتے ہیں)' حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے O

﴿ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ کتابی کافروں سے مراد یہودی ہیں اور مشرکین سے مراد بتوں کو پوجنے والے ہیں۔ اس لیے کہ کفر ایک اسم جنس ہے جس کے ماتحت دو قسم (کے لوگ) داخل ہیں:
(۱) اہل کتاب (یہودی): یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کو تبدیل کر دیا اور رسولوں کو جھٹلایا۔
(۲) بتوں کے پوجنے والے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دیگر کی پوجا کی (یہ دونوں ہی قسم کے لوگ کافر ہیں)۔

﴿ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ بھلائی سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر نازل فرمائیں یعنی وحی اور نبوت۔ اور اس کو یہودی اور اُن کی پیروی کرنے والے مشرکین اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اُنہیں مؤمنوں سے حسد اور دشمنی ہے۔

واقعۂ نزول

(مذکورہ آیت کے نازل ہونے کا) واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے یہودی حلیفوں سے کہا کہ تم سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ تو اُن یہودیوں نے جواباً کہا کہ جس (دین) کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو' وہ اُس (دین) سے بہتر نہیں ہے جس پر ہم قائم ہیں (یعنی اسلام' یہودیت سے بہتر نہیں ہے)۔ اگر وہ بہتر ہوتا تو ہم ضرور اس کو پسند کرتے۔ (جب یہودیوں نے یہ بات کہی) تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھٹلانے کے لیے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

﴿ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی نبوت اور اپنی رسالت کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے خاص فرما لیتا ہے اور اپنی مخلوق پر رحمت کرتے ہوئے اُس میں سے جس کو پسند فرما لیتا ہے اُسے ایمان اور ہدایت دے کر اُس پر مہربانی فرماتا ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی ہر بھلائی جو اللہ کے بندے اپنے دین اور دنیا میں پا رہے ہیں اُس کا آغاز اللہ ہی کی جانب سے ہے اور یہ اُس کی اپنے بندوں پر مہربانی ہے' نہ یہ کہ کوئی بندہ اس کے فضل کا مستحق ہے' بلکہ اُس کی اپنی مخلوق پر مہربانی اور احسان ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُس جیسی (کوئی اور آیت) لے آتے ہیں؛ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے O

واقعہ نزول

اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ مشرکین نے کہا کہ محمد (ﷺ) اپنے اصحاب کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں پھر اُس سے اُنہیں منع کر دیتے ہیں اور اس کے برخلاف کوئی اور حکم دیتے ہیں اور آج ایک بات کہتے ہیں اور اگلے دن اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اور وہ اپنی جانب سے باتیں بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود اللہ نے ان کے بارے میں اپنے اس قول کے ذریعہ بتایا ہے:

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ (النحل:۱۰۱)

اور ہم جب ایک آیت کو دوسری آیت سے تبدیل کر دیتے ہیں اور اللہ ہی خوب جانتا ہے جو وہ نازل فرماتا ہے تو کافر کہتے ہیں کہ آپ تو صرف اپنے دل سے گھڑ کر لاتے ہیں۔

سو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت ''مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ'' نازل فرمائی۔ اور اس آیت کے ذریعہ نسخ کی حکمت بھی واضح کر دی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ (آیات کا منسوخ ہونا) اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے نہ کہ محمد ﷺ کی جانب سے۔

نسخ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

لغت میں نسخ کا اصل معنیٰ ہے: منتقل کرنا اور کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا۔ اسی سے ''نسخ الکتاب'' ہے: یعنی کسی چیز کو ایک کتاب سے دوسری کتاب کی طرف منتقل کرنا۔ اور اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ پہلی والی تصویر کو ختم کر دیا جائے؛ بلکہ اس کا مقصد اور تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب میں جو چیز موجود ہے اُس جیسی چیز دوسری کتاب میں لکھ دی جائے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے پورا قرآن منسوخ ہے (یعنی منتقل کیا گیا ہے)۔ اور وہ اس طور پر کہ پورے قرآن پاک کو لوحِ محفوظ سے منتقل کر کے ایک ساتھ آسمانِ دنیا پر نازل کر دیا گیا۔

بعض اوقات نسخ کا معنیٰ ہوتا ہے: اُٹھانا اور زائل کرنا (ختم کرنا)۔ یعنی ایک چیز کے پیچھے دوسری چیز لا کر پہلی کو ختم کر دینا جیسے سورج کا کسی چیز کے سایہ کو مٹا دینا اور بڑھاپے کا جوانی کو ختم کر دینا۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے قرآن حکیم کا بعض حصہ منسوخ اور بعض حصہ ناسخ ہوگا۔ زیرِ بحث آیت میں یہی معنیٰ مراد ہے یعنی ایک حکم کے پیچھے دوسرا حکم لا کر پہلے حکم کو زائل کر دینا۔

علماء کی اصطلاح میں نسخ کا معنیٰ ہے:

رفع الحکم الشرعی بدلیل شرعی متاخر عنه.

کسی شرعی حکم کو ایسی شرعی دلیل سے اُٹھا لینا جو اُس حکم کے بعد پائی جائے۔

نسخ کا حکم اور اس کے بارے میں مختلف آراء کا بیان

نسخ (کا حکم یہ ہے کہ یہ) عقلاً جائز ہے اور قرآن وسنّت کے اعتبار سے واقع ہے۔ اس میں یہودیوں کا اختلاف ہے۔ بعض یہودی وہ ہیں جو عقلی اعتبار سے نسخ کے منکر ہیں (اور بعض وہ ہیں جو عقلی اعتبار سے نسخ کے قائل ہیں) لیکن سمعی اعتبار سے

(سب نے) منع کیا ہے۔ مسلمانوں میں سے بھی ایک قلیل جماعت نے (متفقہ مؤقف سے) علیحدگی اختیار کر کے نسخ کا انکار کیا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے نسخ کے جواز اور اس کے وقوع پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت دلائل سے ثابت ہے۔ اور آپ کی نبوت اُسی وقت دُرست ہوگی جب نسخ کا قول کیا جائے گا یعنی آپ ﷺ سے پہلے جو شریعتیں تھیں اُن کے منسوخ ہونے کا قول کیا جائے گا۔ لہٰذا نسخ پر یقین کرنا ضروری ہے۔

وہ یہودی جو نسخ کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے الزامی جوابات

یہودی (جو نسخ کے منکر ہیں) اُن کے لیے ہماری جانب سے کچھ الزامی جوابات ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر ہفتہ کے دن کام کرنے کو حرام فرما دیا' جب کہ ان سے پہلے کے لوگوں پر یہ حرام نہیں تھا (اور یہی نسخ ہے کہ ایک حکم کو ختم کر کے اُس کی جگہ دوسرا حکم لایا جائے)۔

(۲) دوسرا یہ کہ تورات میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کشتی سے نکل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ بے شک میں نے ہر جانور کو تمہارے لیے اور تمہاری اولاد کے لیے کھانے کے قابل بنا دیا ہے۔ اور اس میں' میں نے تمہارے لیے کھلی چھوٹ رکھی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بنی اسرائیل پر کئی جانوروں کو حرام فرما دیا۔

(۳) تیسرا یہ کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام' بھائی بہن کا آپس میں نکاح کر دیا کرتے تھے (یعنی ان کے لیے یہ جائز تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو بعد والوں پر اور سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر حرام فرما دیا۔

ان مثالوں سے ثابت ہو گیا کہ نسخ (یعنی ایک حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانا) جائز ہے۔

نسخ کے بارے میں علماء کے درمیان مختلف اعتبارات سے اختلاف

جب نسخ کا جواز ثابت ہو گیا تو (اب جاننا چاہیے کہ) نسخ کے بارے میں علماء کے درمیان مختلف اعتبار سے اختلاف ہے۔

(۱) ایک اختلاف تو اس میں ہے کہ قرآن کریم نے گذشتہ تمام شریعتوں اور کتابوں مثلاً تورات' انجیل وغیرہما کو منسوخ کر دیا ہے۔

(۲) دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ نسخ سے مراد قرآن حکیم کا لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف منتقل ہونا ہے۔

(۳) تیسرا اختلاف اس میں ہے کہ نسخ سے مراد ہے: کسی آیت کے حکم کو ایک ایسی دلیل کے ذریعہ اُٹھا لینا جو اس آیت کے بعد آئے۔ یہی مؤقف صحیح ہے اور اس پر علماء کی اکثریت متفق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مذکورہ فرمان ''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ'' میں ''نسخ'' کا یہی معنیٰ مراد ہے۔ اس لیے کہ جب مطلقاً ''آیت'' کا لفظ بولا جائے تو اس سے قرآنی آیات مراد ہوتی ہیں' کیونکہ وہی ہمارے یہاں معروف ہیں۔

سنت سے کتاب اللہ کے منسوخ ہونے کے بارے میں امام شافعی اور جمہور علماء کا اختلاف

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم (کی کوئی آیت) سنت[۲۴۰] متواترہ سے منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اُن کا

[۲۴۰] سنت متواترہ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو روایت کرنے والے ہر دور میں اتنے زیادہ ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ (مقدمہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی مع مشکوٰۃ المصابیح ص۶' مطبوعہ کراچی) امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایسی حدیث سے بھی قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''ہم کوئی بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی (کوئی اور آیت) لے آتے ہیں''۔ اور حدیث شریف نہ تو قرآن سے بہتر ہے نہ قرآن کی مثل۔ لہٰذا احادیث سے قرآنی آیات منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر علماء اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہونے والے احکام درحقیقت اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ عرف میں ہم (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

استدلال اسی آیت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ (البقرہ:۱۰۶) کوئی بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اُس جیسی (کوئی اور آیت) لے آتے ہیں۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ (ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کو) لانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو آیت لائی جاتی ہے وہ قرآن کی جنس سے ہوتی ہے اور جو قرآن کی جنس سے ہو وہ بھی قرآن ہے۔ اور مذکورہ آیت میں یہ جملہ کہ ''ہم اُس سے بہتر (کوئی آیت) لے آتے ہیں'' اس کا مفاد یہ ہے کہ اُس بہتر آیت کو لانے میں اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور تنہا ہے۔ اور وہ (جو بہتر لے کر آتا ہے وہ) قرآن ہے جو کہ اللہ کا کلام ہے نہ کہ سنّت۔ کیونکہ سنّت نہ تو قرآن کریم سے زیادہ بہتر ہے نہ ہی قرآن کریم کی مثل ہے (اس لیے سنّت سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی)۔

جمہور علماء (جو سنّت سے کتاب اللہ کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں وہ) اس کے جواز پر اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ:

الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ ۔ (البقرہ:۱۸۰) (اگر وہ شخص کچھ مال چھوڑے تو) والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کر جائے۔

یہ آیت، نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے منسوخ ہے کہ:

(۱۱۲) وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔

(سنن الترمذی: ۲۱۲۰، سنن ابوداؤد: ۳۵۶۵، سنن ابن ماجہ: ۲۷۱۳، سنن دار قطنی ج ۴ ص ۱۵۱، مسند احمد ج ۵ ص ۲۶۷)

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ استدلال ضعیف ہے۔ اس لیے کہ میراث کا وارث کے لیے حق ہونا اس بات سے مانع ہے کہ اس حدیث کو وصیت کی طرف پھیرا جائے، لہٰذا ثابت ہوا کہ آیتِ میراث وصیت سے مانع ہے[۲۴۱] اس بحث کی تفصیل اور وضاحت اُصول فقہ میں معروف ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) قرآن وحدیث کو الگ الگ ناموں سے پہچانتے ہیں لیکن حقیقۃً سب اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ لہٰذا حدیث سے قرآنی آیات منسوخ ہو سکتی ہیں۔ جیسے شادی شدہ شخص اگر بدکاری کا ارتکاب کرے تو کوڑے لگانے کی بجائے اس کو سنگسار کیا جائے گا۔ کیونکہ کوڑے لگانا اس کے حق میں ساقط ہو چکا ہے اور اس کو ساقط کرنے والی دلیل رسول اللہ ﷺ کی فعلی حدیث ہے۔ جبکہ کوڑے لگانا قرآنِ کریم سے ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآنی آیات منسوخ ہو سکتی ہیں۔
(تفسیر قرطبی، البقرہ:۱۰۶)

۲۴۱ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ (البقرہ:۱۸۰ میں) اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ''اگر وہ شخص مال چھوڑے تو والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کر جائے'' اس کا ناسخ حضور کا فرمان (لا وصیة لوارث) نہیں ہے بلکہ اس کا ناسخ خود قرآن کریم ہے یعنی سورۃ النساء کی آیت: ۱۱ اور ۱۲، جن میں اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصے معیّن اور مقرر فرما دیئے ہیں۔ لہٰذا حدیث سے قرآنی آیات کے منسوخ ہونے کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ احناف کی طرف سے امام شافعی کے اس جواب کا رد یہ ہے کہ البقرہ کی آیت: ۱۸۰ کا آیتِ میراث سے منسوخ ہونا قطعی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا ناسخ حضور علیہ الصلوٰۃ کا فرمان (لا وصیة لوارث) ہی ہو۔ جیسا کہ خود علماء احناف کی آراء میں اختلاف رہا ہے۔ (دیکھیے: تفسیرات احمدیہ ص ۱۸) اور دوسرا یہ کہ احناف کی اس دلیل کو رد کر کے یہ دعویٰ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ حدیث سے قرآنی آیات کا نسخ جائز ہے۔ کیونکہ احناف اپنے مؤقف پر اور بھی دلائل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرآن کریم میں آیات کے منسوخ ہونے کے طریقے

قرآن کریم میں آیات کا منسوخ ہونا مختلف طریقوں سے ہے:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ کسی آیت کا حکم اوراس کی تلاوت، دونوں کو منسوخ کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوامامہ بن سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

(۱۱۳) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت نے کسی سورت کی قرأت کے لیے رات کو قیام کیا، لیکن اُنہیں اُس سورت سے صرف "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہی یاد آئی۔ چنانچہ صبح وہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو یہ بات بتائی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سورت اپنی تلاوت اور حکم سمیت اُٹھالی گئی ہے۔

(تفسیر البغوی المسمّٰی بمعالم التنزیل، زیرِ تفسیر آیت البقرہ: ۱۰۶، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۱۴۱)

بعض علماء نے کہا ہے کہ سورۃ الاحزاب، سورۃ البقرہ کی طرح بڑی تھی، پھر اس کا بعض حصہ تلاوت اور حکم دونوں اعتبار سے اُٹھالیا گیا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آیت کی تلاوت اُٹھالی گئی ہو اور اس کا حکم باقی رکھا گیا ہو۔ جیسے آیتِ رجم۔[۲۴۲]

(۱۱٤) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا، جبکہ وہ منبرِ رسول (ﷺ) پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے (سیدنا) محمد (ﷺ) کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اور آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ تو جو کتاب آپ پر نازل کی گئی ہے اُس میں آیتِ رجم بھی ہے، اُس کو ہم نے پڑھا اور اس کو یاد کیا اور اُسے سمجھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد کوئی کہنے والا کہے گا کہ اللہ کی کتاب میں ہم رجم کو نہیں پاتے ہیں۔ اس طرح لوگ اللہ کے نازل کردہ ایک فریضہ کو چھوڑنے کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں گے حالانکہ اگر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کریں اور ان کے خلاف گواہ قائم ہو یا حمل ہو یا وہ اعتراف کرلیں تو ایسے مرد و عورت پر رجم کرنا کتابُ اللہ میں ثابت ہے۔

(صحیح بخاری: ۶۸۲۹، صحیح مسلم: ۱۶۹۱، سنن الترمذی: ۱۴۳۲، سنن ابوداؤد: ۴۴۱۸، سنن ابن ماجہ: ۲۵۵۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اور مثالیں رکھتے ہیں۔ جو نمایاں طور پر اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حدیث سے قرآنی آیات منسوخ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ — بے شک ایمان والوں پر نماز ایک مقررہ وقت میں فرض ہے۝

(النساء: ۱۰۳)

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نماز کو اس کے وقت میں پڑھا جائے، لیکن سنت متواترہ سے عرفات کو خاص کرلیا گیا کیونکہ میدان عرفات میں عصر کو اس کے وقت سے پہلے ظہر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور مزدلفہ کی مغرب کو خاص کرلیا گیا کیونکہ مزدلفہ میں مغرب کو اس کے وقت کے بعد عشاء کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج۱ ص ۸۵)

۲۴۲ اس سے مراد درج ذیل آیت ہے:

الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما البتة نكالا من الله والله عزيز حكيم. (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۶۹۱۱، ج۸ ص۲۱۱، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت) — جب کوئی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کرے تو ان کو ضرور سنگسار کرو، یہ اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

یہ آیت تلاوت کے اعتبار سے منسوخ ہے لیکن حکم اس کا باقی ہے۔ جیسا کہ علامہ خازن کی ذکر کردہ اگلی حدیث سے ظاہر ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ کسی آیت کا حکم اُٹھا لیا گیا ہو لیکن اُس کا لکھا ہوا ہونا اور اس کی تلاوت باقی ہو۔ اور ایسی (آیات) قرآن کریم میں بہت ہیں۔ جیسے وہ آیت جس میں رشتے داروں کے لیے وصیّت کرنے کا بیان ہے، وہ امام شافعی کے نزدیک آیتِ میراث سے منسوخ ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک حدیث سے منسوخ ہے۔ اسی طرح وہ آیت جس میں (بیوہ کے لیے) عدتِ وفات ایک سال (بیان ہوئی) ہے وہ اُس آیت سے منسوخ ہے جس میں چار مہینے دس دِن عدت کا بیان ہے۔ اور (درج ذیل) آیتِ قتال:

اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ ۔ اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ (الانفال:۶۵)

یہ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان سے منسوخ ہے:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم پر (حکم میں) آسانی کر دی ہے اور اُسے معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ (الانفال:۶۶)

اور اس طرح کی بہت ساری آیتیں ہیں (جن کی تلاوت تو باقی ہے لیکن اُن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے)۔

زیرِ بحث آیت کی تفسیر

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ﴾ کا معنیٰ ہے: ہم اُس آیت کو اُٹھا لیتے ہیں یا اُس کا حکم اُٹھا لیتے ہیں۔ ﴿نُنْسِهَا﴾ کو نون کے پیش اور سین کے زیر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور معنیٰ یہ ہے کہ اُس آیت کو ہم آپ کے دل میں ثابت رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ "ہم اُس آیت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اسے منسوخ نہیں کرتے"۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ "ہم اُس آیت کو چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں"۔ اس اعتبار سے پہلے منسوخ کرنے کا معنیٰ ہوگا: کسی حکم کا اُٹھا لینا اور اس کی جگہ کوئی اور حکم لانا۔ اور "ننسھا" کا معنیٰ ہوگا: کسی حکم کی جگہ دوسرا حکم لائے بغیر پہلے والے کو منسوخ کر دینا۔

بعض قراء نے اس کو "نَنْسَأْهَا" بھی پڑھا ہے یعنی نون اور سین کے زبر اور ہمزہ کے اضافہ کے ساتھ۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم اُس آیت کو مؤخر کر دیتے ہیں اور اس کو نازل نہیں کرتے ہیں یا اس کی تلاوت کو اُٹھا لیتے ہیں اور حکم کو مؤخر کر دیتے ہیں جیسے آیتِ رجم۔ اس اعتبار سے پہلے منسوخ کرنے کا معنیٰ ہوگا: کسی آیت کی تلاوت اور اس کے حکم کو اُٹھا لینا۔ حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت عطاء (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے نسخ بمعنیٰ کسی چیز کو ایک کتاب سے دوسری کتاب کی طرف منتقل کرنا کے اعتبار سے (آیت مذکورہ کا معنیٰ) یہ بتایا ہے کہ: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ﴾ سے مراد ہے: ہم جو کچھ بھی قرآن سے نازل کرتے ہیں۔ اور ﴿نُنْسِهَا﴾ کا معنیٰ ہے: ہم اس کو مؤخر کر دیتے ہیں اور لوحِ محفوظ میں چھوڑے رکھتے ہیں اور اس کو نازل نہیں فرماتے۔

﴿بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (ہم ایسی آیت لاتے ہیں) جس میں تمہارے لیے زیادہ فائدہ، زیادہ سہولت اور زیادہ اجر و ثواب ہو۔ اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ (قرآن کریم کی) ایک آیت دوسری آیت سے بہتر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا پورا کلام یکساں ہے۔ ﴿اَوْ مِثْلِهَا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (یا ہم ایسی آیت لاتے ہیں جو) فائدے اور ثواب میں پہلی آیت جیسی ہو۔

مختلف آیات کو منسوخ کر کے اُن کے بدلہ میں آسان، مشکل اور ہم مثل آیات کے نازل ہونے کی مثالیں

(۱) وہ آیات جن کو منسوخ کر کے کوئی آسان حکم لایا گیا ہے اُس میں عمل کے اعتبار سے زیادہ آسانی ہے۔ مثلاً مسلمانوں

پر پہلے رات کا قیام فرض تھا پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا[۲۴۳] (یعنی اس کی فرضیت اٹھالی گئی)۔اور یہ مسلمانوں کے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ بہتر تھا' کیونکہ اس سے ان کی تھکاوٹ اور مشقت ختم ہوگئی۔(۲) وہ آیات جن کو منسوخ کر کے کوئی مشکل اور دشوار حکم لایا گیا ہے' وہ حکم ثواب کے اعتبار سے زیادہ کامل ہے۔جیسے مسلمانوں پر پہلے سال میں چند دنوں کے روزے فرض تھے' پھر اس کو منسوخ کر کے ماہِ رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔اور (یقیناً) ہر سال پورے ایک مہینے کے روزے رکھنا بہ نسبت چند دنوں کے روزوں کے بدن پر زیادہ بھاری اور دشوار ہے۔لیکن اس میں جو ثواب ہے وہ زیادہ کامل اور وافر ہے۔(۳) جہاں تک تعلق ہے اُسی جیسی آیت لانے کا تو اس کی مثال یہ ہے کہ (نمازوں میں) بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کو منسوخ کر کے مسجد حرام کی طرف رُخ پھیر دیا گیا۔اور اس حکم میں اجر وثواب بھی برابر ہے کیونکہ نمازی پر فرض ہے کہ جس طرف اُسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اُس طرف اپنا رُخ کر لے۔

﴿ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴾ مراد یہ ہے کہ کیا تم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ (کسی آیت کو) منسوخ کرنے اور اُس کو تبدیل کرنے پر قادر ہے۔یعنی اے محمد (ﷺ)! کیا آپ نہیں جانتے کہ میں نے اپنے جن احکامات کو منسوخ کیا ہے اور میرے وہ فرائض جو میں نے آپ پر فرض کیے ہیں اُن میں جو میں نے تبدیلی کی ہے' میں اُن سب کا آپ کو اپنی مرضی کے مطابق متبادل دینے پر قادر ہوں (ایسا متبادل) جو آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر ہو اور اُس میں آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے دنیا و آخرت میں زیادہ فائدہ ہو۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے O

﴿ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ اس کا معنیٰ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین میں تصرف فرمانے والا ہے' دونوں میں صرف اُس کی بادشاہت ہے' آسمانوں اور زمین میں اور جتنی ان میں مخلوق ہے ان سب میں وہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور (جس سے چاہتا ہے) منع فرمادیتا ہے اور (جس حکم کو چاہتا ہے) منسوخ اور تبدیل فرمادیتا ہے۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن (درحقیقت) اس میں اُن یہودیوں کو جھٹلانا ہے جنہوں نے نسخ کا انکار کیا اور سیدنا عیسیٰ اور سیدنا محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا انکار کیا۔اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو بتادیا کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور یہ کہ ساری مخلوق اُسی کی بندگی میں ہے اور اُسی کے زیرِ تصرف ہے۔وہ اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور لوگوں پر سننا اور اطاعت کرنا فرض ہے۔

آخری جملہ میں خطاب کافروں سے ہے اور مراد یہ ہے کہ اے گروہِ کفار! جب عذاب نازل ہوگا تو اس وقت اللہ کے سوا تمہارا کوئی ''ولی'' اور ''نصیر'' نہیں ہوگا۔﴿ وَلِیٍّ ﴾ سے مراد ہے: قریبی اور دوست۔بعض نے کہا ہے کہ یہ ''والی'' سے

[۲۴۳] جیسا کہ صحیح مسلم' سنن ترمذی' سنن ابوداؤد اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے' جب سورۃ المزمل کا ابتدائی حصہ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام عبادت کے لیے کھڑے ہو گئے' یہاں تک کہ اُن کے پاؤں سوج گئے اور سولہ ماہ تک سورۃ المزمل کا آخری حصہ آسمان میں روکا گیا۔پھر جب اس کو نازل کیا گیا تو رات کا قیام فرضیت سے منتقل ہو کر نفل بن گیا۔(صحیح مسلم:۷۴۶' سنن الترمذی:۴۴۵' سنن ابوداؤد:۱۳۴۲' سنن ابن ماجہ:۱۱۹۱' سنن دارمی:۱۴۷۵)

ماخوذ ہے اور ''والـــی'' وہ ہوتا ہے جو معاملات کو سنبھالنے والا ہو۔ اور ﴿ نَصِیْرٍ ﴾ کا معنیٰ ناصر (مدد کرنے والا) یعنی ایسا کوئی مددگار نہیں ہے جو تمہیں عذاب سے بچا سکے۔ بعض کے نزدیک اس جملہ میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے بعد (یعنی اس کے سوا) تمہارے لیے کوئی معاملات کو سنبھالنے والا نہیں ہے جو تمہیں حکم دے اور نہ ہی ایسا کوئی مددگار ہے جو تمہاری مدد کرے اور تمہارے دشمنوں پر تمہیں تقویت دے۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُؕ وَ مَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۝۱۰۸

کیا تم بھی اپنے رسول سے ایسے (لایعنی) سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے اور جس نے ایمان کے بدلہ میں کفر کو اختیار کر لیا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیاO

واقعۂ نزول

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ بھی ہمارے پاس آسمان سے ایک ساتھ پوری کتاب لے کر آئیں جس طرح موسیٰ (علیہ السلام) تورات لے کر آئے تھے۔ بعض علماء نے (واقعہ یوں) بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور کہا کہ ہم آپ پر اُس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو بے نقاب اور کھلم کھلا ہمارے سامنے نہ لے آئیں۔ (اور یہ سوال ایسا ہی ہے) جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ: ''أرنا الله جهرة'' ہمیں اللہ کی ذات علانیہ طور پر دکھایئے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ سے بھی ایسا ہی سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ ''کیا تم بھی اپنے رسول سے ایسا سوال کرنا چاہتے ہو جیسا اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیا گیا''۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

اس آیت میں ﴿ اَمْ تُرِیْدُوْنَ ﴾ ہے اس کا معنیٰ ہے: ''أتريدون'' کیا تم چاہتے ہو۔ بعض نے اس کا معنیٰ کیا ہے: ''بل تــريدون'' بلکہ تم چاہتے ہو۔ کہ تم اپنے رسول یعنی محمد ﷺ سے ایسا سوال کرو ''جیسا اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیا گیا''۔ ہوا یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے سوال کیا اور کہا کہ آپ ہمیں علانیہ طور پر اللہ کی ذات دکھایئے۔

پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو اس بات سے منع فرمادیا اور روک دیا کہ وہ دلائل و معجزات کے ظاہر ہونے کے بعد اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلائل و براہین کے قائم ہونے کے بعد (نبی اکرم ﷺ سے) من گھڑت سوالات کریں۔

﴿ یَّتَبَدَّلِ ﴾ کا معنیٰ ہے: ''یستبـدل'' تبدیلی چاہنا۔ (یعنی جو شخص ایمان کو کفر سے بدلنا چاہے) ﴿ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ شخص ''قصد الطريق'' یعنی سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ''وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ'' میں خطاب مؤمنین سے ہے اور انہیں اس سے آگاہ کیا گیا ہے کہ یہودی بددیانت اور جلنے والے لوگ ہیں۔ وہ مؤمنین کے لیے ناپسندیدہ باتوں کی تمنا کرتے ہیں۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو یہودیوں کی کسی بھی ایسی بات کے قبول کرنے سے منع فرمادیا جو وہ بہ ظاہر مسلمانوں کو نصیحت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو بتادیا کہ جو اُس کے دین سے پھر گیا وہ یقیناً سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁

بہت سے کتابیوں کی یہ دِلی خواہش ہے کہ کاش وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنادیں (ان کی یہ خواہش) اُس حسد کی وجہ سے ہے جو ان کے دل میں ہے بعد اس کے کہ اُن پر حق واضح ہو چکا ہے سوتم (اُنہیں) چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا کوئی اور حکم جاری فرمائے' بے شک اللہ ہر چاہے پر قادر ہے O

واقعۂ نزول

یہ آیت یہودیوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ اُس گروہ کے افراد نے جنگ اُحد کے بعد حضرت حُذیفہ بن الیمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کہا کہ اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں شکست نہ ہوتی' لہٰذا تم ہمارے دین کی طرف آ جاؤ کیونکہ ہم تم سے زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں۔ حضرت عمار بن یاسر نے پوچھا کہ تمہارے نزدیک عہد توڑنا کیسا ہے؟ تو یہودیوں نے کہا کہ بہت بُرا ہے۔ حضرت عمار نے کہا کہ میں نے تو یہ عہد کیا ہوا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں' محمد مصطفیٰ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہودیوں نے (یہ جواب سُنا تو) کہا: عمار تو ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ پھر حضرت حذیفہ نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلّق ہے تو میں تو اللہ عزوجل کے رب ہونے' محمد مصطفیٰ ﷺ کے رسول ہونے' مذہبِ اسلام کے دین ہونے' قرآن کریم کے امام ہونے' کعبہ شریف کے قبلہ ہونے اور مسلمانوں کے باہمی بھائی ہونے پر راضی ہو چکا ہوں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت حذیفہ اور حضرت عمار دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو سارا واقعہ بیان کیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں نے خیر کو پالیا اور تم دونوں کامیاب ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں ﴿وَدَّ﴾ کا لفظ ہے' اس کا معنیٰ ہے: تمنا اور آرزو کرنا اور ﴿اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد یہودی ہیں۔ یعنی اے گروہِ مسلمین! بہت سے یہودیوں کی یہ آرزو ہے کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنادیں اور تمہیں گزشتہ حالتِ کفر کی طرف لوٹا دیں۔ ﴿حَسَدًا﴾ سے مراد ہے: ''یحسدونکم حسدا'' یہودی تم سے بہت جلتے ہیں۔

حسد کا معنیٰ اور اس کی مذمت

حسد کا اصل معنیٰ ہے: ''تمنی زوال النعمة عمن یستحقها'' یعنی جو کسی نعمت کا حق دار ہو اُس سے اُس نعمت کے چھن جانے کی تمنا کرنا۔ بسا اوقات (ایسا بھی ہوتا ہے کہ) حسد کے ساتھ ساتھ نعمت کو ختم کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔ بہرحال حسد ایک مذموم اور بُرا فعل ہے۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

(۱۱۵) نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حسد سے بچو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے (یا فرمایا:) گھاس کو کھا جاتی ہے [۲۴۴]

(سنن ابوداؤد: ۴۹۰۳' سنن ابن ماجہ: ۴۲۱۰' تاریخ کبیر للامام البخاری ج ۱ ص ۲۷۲' جمع الجوامع للسیوطی: ۹۲۹۸' مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۸)

[۲۴۴] یعنی حسد کرنے والے کی نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ حسد ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو اپنے مخالف کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کسی نعمت سے نوازے اور دوسرا شخص اس نعمت کے ختم ہو جانے کی تمنا کرے تو یہ حسد ہے اور یہ حرام ہے۔ اگر کوئی شخص اُس نعمت کو کفر اور دیگر گناہ کے کاموں میں لائے اور پھر دوسرا شخص اُس نعمت کے ختم ہو جانے کی تمنا کرے تو یہ نہ تو حسد ہے اور نہ ہی ایسی تمنا کرنا حرام ہے۔ کیونکہ یہ آدمی اُس شخص سے اُس کی نعمت پر اس لیے حسد نہیں کر رہا کہ وہ چیز نعمت ہے بلکہ اس لیے حسد کر رہا ہے کہ وہ اُس نعمت سے شر اور فساد کی طرف جا رہا ہے۔

﴿مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ کا معنیٰ ہے: "من تلقاء انفسهم" یعنی (یہودیوں کو مسلمانوں سے جو حسد ہے وہ) اُن کی اپنی جانب سے ہے' اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس کا حکم نہیں دیا ہے۔ پھر آگے ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (بعد اس کے کہ اُن پر حق واضح ہو چکا) یعنی تورات میں (یہ واضح ہو چکا کہ) محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان اور ان کا دین برحق ہے جس میں ان یہودیوں کو بھی شک نہیں ہے' لیکن اس کا انکار انہوں نے اپنے حسد اور سرکشی کی وجہ سے کیا ہے۔

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ یہودیوں کی بدسلوکی اور اُن کے حسد پر اُن سے درگزر کرو۔ (واضح رہے کہ) عفو و درگزر کرنے کا یہ حکم' جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

"حتی یأتی اللہ بامرہ" میں "امر" کی تفسیر

﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے اور وہ عذاب یہ تھا کہ بنو قریظہ کو قتل کیا گیا اور قیدی بنایا گیا۔ اور بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا گیا[۲۲۵] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ "حتی یأتی بامرہ" میں "امر" سے مراد یہودیوں کے ساتھ جہاد کا حکم ہے جو اُس نے درج ذیل آیت میں دیا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبہ: ۲۹)	اُن لوگوں سے جہاد کرو جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ روزِ آخرت پر' اور نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام کیے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نہ وہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جن کو کتاب دی گئی' (تم ان سے جہاد کرتے رہو) یہاں تک کہ وہ ذلت کے ساتھ جزیہ دیں ۝

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بے شک اللہ ہر چاہے پر قادر ہے۔ اس جملہ میں یہودیوں کے لیے وعید اور ان کی سرزنش ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) غیبت کی طرف لے جاتی ہے اور جب آدمی غیبت کرتا ہے تو اس کی اپنی نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں اور فریق مخالف کی نیکیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس حدیث سے معتزلہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ گناہ کرنے سے نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ گناہ کرنے سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتی ہیں۔ اس حدیث میں جو فرمایا کہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حسد کرنے والے کی نیکیاں مقبول نہیں ہوتی ہیں یا یہ معنیٰ ہے کہ حسد کرنے والے کی نیکیاں اُس شخص کو دے دی جاتی ہیں جس سے حسد کیا گیا ہے۔ (حاشیۃ المشکوٰۃ ص ۴۲۸' مرقات ج ۸ ص ۷۷۲)

۲۲۵ اس کی تفصیل اور تشریح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حاشیہ: ۲۱۳۔۲۱۴

اور صحیح طریقے سے نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور جو نیک کام تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے ہاں پاؤ گے' بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے O

﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ (اس سے پچھلی آیت میں) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہودیوں سے عفو و درگزر کا حکم فرمایا اور اب دو فرائض نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی کے اعتبار سے اپنی اصلاح کرنے کا حکم فرمایا جا رہا ہے۔ اور اس آیت کے ذریعہ تمام واجبات کی ادائیگی پر تنبیہ کی جا رہی ہے۔

﴿ خَیْرٍ ﴾ سے مراد ہے: فرمانبرداری اور نیک عمل۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ خیر سے مراد مال ہے یعنی نفلی صدقہ (نہ کہ زکوٰۃ) کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ (یعنی تم جو نیک عمل یا نفلی صدقہ اپنے لیے آگے بھیجو گے۔) ﴿ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ﴾ تم اُس نیک کام کا اجر و ثواب اللہ کے ہاں پاؤ گے۔ یہاں تک کہ (تمہاری دی ہوئی) کھجور اور لقمہ وہاں اُحد پہاڑ کے برابر ہوں گے[۲۴۶]۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾ یعنی اُس پر (لوگوں کے) تھوڑے اور زیادہ اعمال میں سے کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔ اس جملہ میں (ہمارے لیے) فرمانبرداری اور نیکی کے کام کرنے کی ترغیب ہے اور گناہ کے کاموں سے ممانعت ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ ؕ قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور انہوں نے کہا کہ جنت میں یہودیوں اور نصرانیوں کے سوا کوئی اور شخص ہرگز نہیں جائے گا' یہ اُن کی خام خیالیاں ہیں' آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو O

اس آیت میں جو لفظ ﴿ ھود ﴾ ہے اس کا معنیٰ ہے: یہودی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ''ھائد'' کی جمع ہے۔

واقعۂ نزول

واقعہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے کہا کہ سوائے یہودی کے کوئی اور جنت میں جائے گا ہی نہیں' اور یہودیت کے علاوہ کوئی اور دین ہی نہیں ہے۔ (اسی طرح) نصرانیوں نے کہا کہ سوائے نصرانی کے کوئی اور جنت میں جائے گا ہی نہیں' اور نصرانیت کے علاوہ کوئی اور مذہب ہی نہیں ہے (اُن کے رد میں مذکورہ آیت نازل ہوئی)۔

۲۴۶ احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ کی خاطر جو نیک کام کیے جائیں وہ درحقیقت محفوظ ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں اُن کا بہت عظیم ثواب ہوتا ہے۔ امام قرطبی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں کہ وہ بقیع الغرقد (مدینہ کے قبرستان) سے گزرے تو انہوں نے کہا: اے اہل قبور! السلام علیکم۔ ہمارے پاس جو خبریں ہیں وہ تو یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے دوسری شادیاں کر لی ہیں' تمہارے مکانات آباد ہو چکے ہیں اور تمہارے اموال تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ ہاتف غیب سے آواز آئی کہ اے ابن الخطاب! ہمارے پاس جو خبریں ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم نے جو اعمال اپنے آگے بھیجے تھے' اُن کو ہم نے پا لیا ہے اور جو کچھ ہم نے خرچ کیا تھا اُس کا نفع ہمیں مل چکا ہے اور جو ہم نے (دنیا میں) اپنے پیچھے چھوڑا ہے اُس کا ہم نے نقصان اٹھایا ہے۔ (تفسیر قرطبی' البقرہ: ۱۱۰' تبیان القرآن ج ۱ ص ۵۱۹) ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ گھر والوں نے ایک بکری ذبح کی۔ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ اس بکری میں سے کیا باقی بچا ہے؟ تو حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ اس کا صرف ایک شانہ بچا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ایسا نہیں ہے بلکہ درحقیقت) اُس ایک شانہ کے علاوہ پوری بکری باقی ہے (جس کو تم نے تقسیم کر دیا)۔

(سنن الترمذی: ۲۴۷۰' مسند احمد ج ۶ ص ۵۰)

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت نجران کے ایک وفد کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ نصرانیوں پر مشتمل تھا۔ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے کو اُس کے دعوے میں جھٹلانے لگے (تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت سے اُن کا رد فرمایا)۔

﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ اُن کی وہ باطل خواہشات ہیں جن کی وہ اللہ کے پاس ناحق تمنا کرتے ہیں۔ ﴿ قُلْ ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ کہہ دیجئے کہ ''اگر تم سچے ہو'' یعنی اپنے دعوے میں ''تو اپنی برھان پیش کرو'' یعنی اپنے اس دعوے پر حجت پیش کرو کہ ''جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہو گا اور کوئی دوسرا نہیں جائے گا''۔

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہاں! جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ کے آگے جھکا دیا اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لیے اُس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے' اور ایسے لوگوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی یہ لوگ غمگین ہوں گے O

﴿ بَلٰى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ''جس نے اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دیا اور وہ مخلص بھی ہو'' تو یقینی طور پر وہ جنت میں جائے گا اور اُس میں زندگی کا لطف اُٹھائے گا۔

اللہ کے آگے چہرہ جھکانے کی تفسیر

اللہ کے آگے چہرے کو جھکانے سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے اپنے دین میں مخلص ہو۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو شخص اپنی عبادت کو اللہ کے لیے خالص کر دے۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو شخص اللہ کے آگے خشوع و خضوع اور عاجزی اختیار کرے کیونکہ ''اسلام'' کا معنیٰ ''استسلام'' ہے یعنی خضوع اور عاجزی کرنا۔ رہی یہ بات کہ اس آیت میں خاص چہرے کا تذکرہ کیوں فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چہرہ تمام اعضاء میں زیادہ ذی شرف اور عزت و مرتبہ والا ہے' اور جب آدمی سجدے میں اسی چہرے کو زمین پر رکھ کر سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ (اس کی وجہ سے) تمام اعضاء سمیت سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔[۲۴۷] عمرو بن نفیل نے یہ شعر کہے:

وأسلمت وجهي لمن أسلمت	میں نے اُس ذات کے آگے اپنا چہرہ جھکا دیا جس کے آگے
لہ الأرض تحمل صخرا ثقالا	زمین بھی جھکی ہوئی ہے' اس طرح کہ وہ بھاری بھر کم چٹانیں اُٹھائے ہوئی ہے
وأسلمت وجهي لمن أسلمت	اور میں نے اُس ذات کے آگے اپنا چہرہ جھکا دیا جس کے آگے
لہ المزن تحمل عذبا زلالا	بادل بھی جھکے ہوئے ہیں کہ وہ بہت ہی شیریں پانی اٹھائے ہوئے ہیں

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اُس ذات کی فرمانبرداری کے آگے اپنے رب کو جھکا دیا ہے جس کی فرمانبرداری کے آگے زمین اور بادل بھی جھکے ہوئے ہیں۔

[۲۴۷] یعنی جب آدمی زندہ دلی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس کی وجہ سے بدن کے تمام اعضاء زمین پر یا زمین کی طرف آ جاتے ہیں اور ایک پیشانی کی وجہ سے انسان اپنے پورے وجود کو زمین پر ڈال دیتا ہے اور اپنے خالق و مالک کے حضور سر بہ سجود ہو جاتا ہے۔

﴿ وَهُوَ مُحۡسِنٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص اللہ کی خاطر اپنے عمل میں مخلص ہو۔[۲۴۸] ''تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے'' یعنی اس کے عمل کا ثواب ہے۔ ''اور ایسے لوگوں پر کوئی خوف نہیں ہے'' یعنی آخرت میں ''اور نہ ہی یہ لوگ غمگین ہوں گے'' یعنی جو اُن سے دنیاوی چیزیں ضائع ہوگئیں اُن پر غمگین نہیں ہوں گے۔

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہودیوں نے کہا کہ نصرانیوں کا دین کچھ نہیں ہے اور نصرانیوں نے کہا کہ یہودیوں کا دین کچھ نہیں ہے' حالانکہ یہ (سب آسمانی) کتاب کی تلاوت کرتے ہیں' اسی طرح اِن لوگوں جیسی بات جاہلوں نے بھی کہی' سو قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں یہ جھگڑا کرتے تھے O

واقعۂ نزول

یہ آیت مدینہ منورہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ نجران کے کچھ لوگ جب نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو ان کے پاس کچھ یہودی علماء پہنچ گئے اور یہ سب آپس میں بحث کرنے لگے' یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ یہودیوں نے نصرانیوں سے کہا کہ تمہارے مذہب کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ (جواباً) نصرانیوں نے یہودیوں سے کہا کہ تمہارے مذہب کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا انکار کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ:

﴿ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ﴾ یہودیوں نے کہا کہ نصرانیوں کا دین کچھ نہیں ہے اور نصرانیوں نے کہا کہ یہودیوں کا دین کچھ نہیں ہے' حالانکہ یہ (سب) کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ یعنی دونوں گروہ کتاب کو پڑھتے ہیں اور ان کی کتاب میں یہ اختلاف اور جھگڑا نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کا اپنی کتاب کی تلاوت کرنا اور جو کچھ کتاب میں ہے اس کی خلاف ورزی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اور باطل پر ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ انجیل' جس کے صحیح ہونے پر نصرانیوں کو یقین ہے وہ اُن باتوں کی تصدیق کرتی ہے جو تورات میں موجود ہیں یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور جو اللہ عزوجل نے اُس میں بنی اسرائیل پر فرائض مقرر کیے۔ (اسی طرح) تورات' جس کے صحیح ہونے پر یہودیوں کو یقین ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور اُن تمام احکامات کی تصدیق کرتی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس سے لے کر آئے۔ اس کے باوجود دونوں گروہ ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ دونوں گروہ میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' باطل اور غلط ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ﴾ اسی طرح ان لوگوں جیسی بات جاہلوں نے بھی کہی۔ یعنی عرب کے مشرکین نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے صحابہ کے بارے میں کہا کہ ان لوگوں کا دین کچھ نہیں ہے۔

[۲۴۸] عربی میں ''احسان'' بمعنیٰ اخلاص معروف ہے۔ جیسے حدیث جبریل میں ہے کہ جبرئیل نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ احسان (یعنی اخلاص) کیا ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (اخلاص یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اُسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔

﴿مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جیسی بات یہودیوں نے نصرانیوں اور نصرانیوں نے یہودیوں سے کہی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے پہلے جو اُمّتیں تھیں' مثلاً حضرت نوح' حضرت ھود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قوم' اُنہوں نے اپنے نبیوں کے بارے میں کہا کہ ان کا دین کچھ نہیں ہے۔

﴿یَحْكُمُ﴾ کا معنیٰ ہے: ''یقضی'' اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا۔ ﴿بَیْنَهُمْ﴾ سے مراد ہے: حق پرست اور باطل پرست کے درمیان۔ ﴿فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ﴾ سے مراد ہے: دین کے معاملہ میں جو وہ جھگڑا کرتے تھے۔ (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ فرمائے گا۔)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اللہ کا نام لیے جانے سے روکے اور اُن (مساجد) کو ویران کرنے کی کوشش کرے' ان لوگوں کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ مساجد میں ڈرتے ہوئے داخل ہوتے' ان کے لیے دُنیا میں رُسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے O

واقعۂ نزول

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا﴾ یہ آیت بیت المقدس کو ویران کرنے کے متعلق نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ طیطوس رومی نے بنی اسرائیل پر لشکر کشی کر کے اُن کے جنگجو لوگوں کو قتل کیا اور اُن کی اولاد کو قید کر دیا' تورات کو جلایا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ اور یہ مسلسل ویرانی میں رہا' تا آنکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو تعمیر کیا۔ اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جو اللہ کی مساجد یعنی بیت المقدس میں اللہ کا نام لیے جانے سے روکے یعنی اللہ کی عبادت سے اور نماز پڑھنے سے روکے اور مساجد کو ویران کرنے کی کوشش کرے وہ اور اُس کے ساتھ لڑائی میں حصہ لینے والوں سے بڑا ظالم یعنی کافر اور باغی کون ہے؟

بعض علماء نے (واقعۂ نزول) یہ بیان کیا ہے کہ بخت نصر جو کہ مجوسی اور اہل بابل سے تھا اُس نے یہودیوں پر لشکر کشی کی اور بیت المقدس کو ویران کیا۔ اور نصرانیوں نے اس کام میں اُس کے ساتھ تعاون کیا' کیونکہ یہودیوں نے حضرت یحیٰی بن زکریا علیہما السلام کو شہید کیا تھا۔

﴿اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ﴾ ان لوگوں کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ مساجد میں ڈرتے ہوئے داخل ہوتے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بیت المقدس نصرانیوں کے لیے حج و زیارت کا مرکز تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بیت المقدس کے آباد ہونے کے بعد اُس میں جو رومی یا نصرانی داخل ہوتا وہ اس خوف سے داخل ہوتا کہ کہیں لوگوں کو اس کا علم ہونے پر اُسے قتل نہ کر دیا جائے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ وہ لوگ جزیہ اور قتل کے خوف میں مبتلا تھے۔ یعنی جزیہ ذمّی ہونے کی صورت میں اور قتل حربی ہونے کی صورت میں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُنہیں اپنے تین شہروں کے فتح ہونے کا خوف تھا یعنی قسطنطنیہ' رومیہ اور عموریہ۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ دنیا میں رسوائی سے مراد اُن کی ذلّت، قتل اور ان کو قیدی بنایا جانا ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم سے مراد آگ کا عذاب ہے۔

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں ایک اور روایت

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ مذکورہ آیت مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس میں مساجد سے مراد مسجد حرام ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے ابتدائے اسلام میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے منع کیا اور حدیبیہ والے سال مسجد حرام میں حج کرنے اور نماز ادا کرنے سے روک دیا اور جب انہوں نے ان لوگوں کو روک دیا جو اللہ عزوجل کے ذکر اور نماز سے مسجد حرام کو آباد کرنے والے تھے تو انہوں نے درحقیقت مسجد حرام کو ویران کرنے کی کوشش کی۔

(اس واقعۂ نزول کے پیشِ نظر) ''اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ'' کا معنیٰ یہ ہوگا کہ مشرکینِ مکہ کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ مساجد (یعنی مسجد حرام) میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے۔ (اور آیت کی تفسیر یوں ہوگی کہ) اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے مسلمانو! میں اس مسجد کو تم پر کھول دوں گا، یہاں تک کہ تم اس میں داخل ہو جاؤ گے اور تم مشرکین سے زیادہ اس مسجد کے والی اور حق دار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ (اس وعدہ کے مطابق) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مسجد حرام کی فتح عطا فرمادی اور جب سورۂ برأت نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ نے ایامِ حج میں یہ نداء کروادی کہ:

(۱۱۶) سنو! اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کرے گا۔[۲۴۹]

(صحیح بخاری: ۱۶۲۲، صحیح مسلم: ۱۳۴۷، ابوداؤد: ۱۹۴۶، سنن نسائی: ۲۹۵۷، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۷، مطبوعہ کراچی)

پس (مسجد حرام میں داخل ہونے کے اعتبار سے) مشرکین کو خوف تھا۔ اور یہ بات شرعاً ثابت ہے کہ مسجد حرام میں کسی مشرک کے داخلہ کی گنجائش نہیں ہے۔

''مساجد اللّٰہ'' فرمانے کی توجیہ

اگر تم یہاں سوال کرو کہ (آیت مذکورہ میں) ''مساجد الله'' اللہ کی مسجدیں۔ کیوں فرمایا گیا؟ جب کہ روکنے اور ویران کرنے کا تعلق ایک مسجد کے ساتھ تھا۔ یعنی بیت المقدس کے ساتھ تھا یا مسجد حرام کے ساتھ؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ کسی بات کا سبب اگرچہ خاص ہو لیکن اُس کا حکم عام کر کے لانا جائز ہے۔ جیسے کوئی شخص ایک نیک آدمی کو اذیت پہنچائے تو تم اس سے کہو کہ اس سے بڑا ظالم کون ہے جو نیک لوگوں کو اذیت پہنچائے تو تم اس سے کہو کہ اس سے بڑا ظالم کون ہے جو نیک لوگوں کو اذیت پہنچائے (اسی طرح یہاں بھی واقعہ کا تعلق اگرچہ ایک مسجد سے ہے لیکن حکم کو عام کرنے کے لیے ''مساجد الله'' اللہ کی مسجدیں فرمایا گیا ہے)۔

واقعۂ نزول کے بارے میں ذکر کردہ دو روایتوں میں سے زیادہ راجح روایت کا بیان

یہاں اگر تم سوال کرو کہ (آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول کے بارے میں) دو روایتوں میں سے کون سی روایت زیادہ راجح ہے؟ تو میں کہوں گا کہ امام طبری نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ نصرانیوں نے ہی بیت المقدس کو ویران کرنے کی کوشش

[۲۴۹] یہ اعلان نبی اکرم ﷺ نے ۹ ھ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ کروایا۔ کیونکہ اس سال آپ ﷺ نے خود حج میں شرکت نہیں فرمائی تھی بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیرِ حج مقرر فرمایا تھا اور اُن کے پیچھے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کچھ احکامات دے کر روانہ فرمایا تھا۔ (روح المعانی ج ۱۰ ص ۳۳۴، التوبہ: ۲۸-۲)

کی تھی' کیونکہ مشرکینِ مکہ نے اگرچہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کو مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے روکا تھا لیکن انہوں نے مسجد حرام کو ویران کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ (دوسری وجہ ترجیح) یہ ہے کہ زیر بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیت یہود و نصاریٰ کی مذمت میں ہے اور (اس میں) مشرکینِ مکہ اور مسجد حرام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ زیر بحث آیت میں بیت المقدس مراد ہے۔

امام طبری کے علاوہ دیگر علماء نے واقعۂ نزول کی دوسری روایت کو ترجیح دی ہے' اس دلیل کی بناء پر کہ یہودیوں سے زیادہ نصرانی بیت المقدس کی تعظیم کرتے ہیں۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو ویران کرنے کی کوشش کریں جب کہ وہ ان کے حج کا مرکز بھی ہے۔

علامہ ابن العربی نے احکام القرآن میں ایک تیسرا قول یہ ذکر کیا ہے کہ آیت مذکورہ کا تعلق ہر مسجد سے ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ یہ قول صحیح ہے۔ کیونکہ آیت میں لفظ (مساجد) عام ہے اور جمع کے صیغے کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو کسی ایک مسجد یا زمانہ کے ساتھ خاص کرنا ناممکن ہے۔[۲۵۰]

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے' تو تم جدھر رُخ کرو گے اُدھر اللہ کی ذات ہے' بے شک اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے O

واقعۂ نزول میں مختلف روایات کا بیان

(۱۱۷) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنائے جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت کسی سفر میں نکلی تو اُنہیں بادلوں نے آلیا (یعنی تاریکی چھا گئی) اور ساتھ ہی نماز کا وقت بھی آ گیا۔ تو صحابہ نے قبلہ کے بارے میں تحرّی[۲۵۱] (غور و فکر) کر کے نماز ادا کر لی۔ جب بادل چھٹے تو پتا چلا کہ ان کی سمتِ قبلہ درست نہیں تھی۔ چنانچہ مدینہ شریف واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا (کہ آیا ہماری نماز ہوئی یا نہیں؟) تو مذکورہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للامام البغوی' تفسیر ابن کثیر' البقرہ: ۱۱۵' سنن دار قطنی ج ۱ ص ۲۷۰)

(۱۱۸) حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بتایا کہ ہم ایک تاریک رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ قبلہ کس طرف ہے؟ سو ہم میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے

[۲۵۰] علامہ ابن العربی کے اس قول کا معنیٰ یہ ہے کہ زیر بحث آیت کے الفاظ کو ایک مسجد یا زمانہ کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ الفاظ اگرچہ اپنے پس منظر کے اعتبار سے خاص ہیں لیکن فی نفسہٖ عام ہیں اور اعتبار الفاظ کے عموم ہی کا ہے' نہ کہ ان کے پس منظر اور شانِ نزول کا۔

[۲۵۱] تحرّی کا معنیٰ ہے: غور و فکر کرنا اور سوچ و بچار کرنا۔ اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں اُسے قبلہ کی شناخت نہ ہو اور وہاں کوئی ایسا مسلمان بھی نہ ہو جو قبلہ کی نشاندہی کرے۔ نہ وہاں مسجدیں اور محرابیں ہوں اور نہ چاند' سورج' ستارے نکلے ہوں یا نکلے ہوئے ہوں مگر ان کے ذریعہ قبلہ معلوم نہیں کر سکتا تو ایسے شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ تحرّی کرے۔ یعنی سوچ و بچار کرے اور جس طرف قبلہ ہونے پر دل جم جائے اُسی طرف منہ کر کے نماز ادا کر لے۔ ایسے شخص کے لیے وہی سمت قبلہ ہے۔ حتیٰ کہ اگر بعد میں معلوم ہوا کہ میں نے (غور و فکر کر کے) جو نماز ادا کی ہے وہ قبلہ کی طرف نہیں تھی تو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کے لیے وہی سمت قبلہ تھی جس طرف اُس نے غور و فکر کر کے نماز ادا کی تھی۔ (بہارِ شریعت ج ۳ ص ۳۱' مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور)

طور پر نماز ادا کر لی۔ صبح ہوئی تو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو آیت مذکورہ نازل ہوئی کہ تم جدھر رُخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے۔ (سنن الترمذی: ۳۴۵، سنن ابن ماجہ: ۱۰۲۰، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۲۴۱۔ ج ۱ص ۱۱)

☆ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اُس مسافر کے حق میں نازل ہوئی ہے جو ہر اُس سمت کی طرف نفل ادا کرسکتا ہے جدھر اُس کی سواری کا رُخ ہو۔

(۱۱۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری کی پُشت پر اشاروں سے نفل نماز ادا فرمایا کرتے تھے جس طرف بھی آپ کا رُخ ہو۔ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی اسی طرح کرتے تھے۔[۲۵۲]

(صحیح بخاری: ۱۰۹۶، صحیح مسلم: ۷۰۰)

(۱۲۰) مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور اپنی سواری پر نماز ادا فرما رہے تھے جس طرف بھی سواری نے رُخ کیا۔ اور اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم جدھر رُخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے۔

(صحیح مسلم: ۷۰۰، سنن الترمذی: ۲۹۵۸، سنن نسائی: ۴۹۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۲۰۲، ج ۲ص ۴، مسند احمد ج ۲ص ۲۰، مسند ابو یعلیٰ: ۵۶۴۷)

بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ مذکورہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا۔ اُس وقت یہودیوں نے مسلمانوں کو عار دلائی اور کہا کہ مسلمانوں کا کوئی قبلہ متعیّن نہیں ہے۔ کبھی یہ لوگ اس طرح رُخ کرتے ہیں اور کبھی اس طرح۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ مذکورہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو اختیار دیا گیا کہ مختلف جہات اور سمتوں میں سے جس طرف چاہیں رُخ کر کے نماز ادا کریں۔ پھر اس آیت کو درج ذیل آیت سے منسوخ کر دیا گیا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. (البقرہ: ۱۴۹)　　پس اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔

آیتِ مذکورہ کی تفسیر

فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ یعنی مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کا پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صرف مشرق و مغرب کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ ان کا تذکرہ تمام جہتوں (کے تذکرہ) کو کافی ہو جائے۔ کیونکہ تمام جہتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ اور جو کچھ مشرق و مغرب کے درمیان ہے وہ سب اُسی کی مخلوق اور اُس کی بندگی کرنے والی ہے۔ اور ساری مخلوق پر لازم ہے کہ وہ اُن تمام باتوں میں اللہ کی اطاعت کرے جن کے کرنے کا اُس نے حکم دیا اور جن سے اُس نے منع کیا ہے۔ پس جس چیز کی طرف اللہ عزوجل نے اپنی

---

[۲۵۲] احناف کے نزدیک یہ حکم بیرونِ شہر کے ساتھ خاص ہے۔ یعنی کوئی شخص اپنی سواری پر نفل نماز اشاروں کے ساتھ اُس وقت پڑھ سکتا ہے جب وہ اپنے شہر سے باہر ہو یعنی جہاں سے مسافر پر قصر کرنا واجب ہوتا ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ درمختار اور ردّالمحتار کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ بیرونِ شہر سواری پر بھی نفل پڑھ سکتا ہے اور اس صورت میں استقبالِ قبلہ شرط نہیں بلکہ سواری جس رُخ کو جا رہی ہو ادھر ہی منہ ہو اور اگر اُدھر منہ نہ ہو تو نماز جائز نہیں اور شروع کرتے وقت بھی قبلہ کی طرف منہ ہونا شرط نہیں بلکہ سواری جدھر جا رہی ہو اس طرف منہ ہو اور رکوع و سجود اشارہ سے کرے اور سجدہ کا اشارہ رکوع کی بہ نسبت پست ہو۔

(درّ مختار مع ردّالمحتار ج ۲ص ۴۲۴، طبع جدید، بہارِ شریعت ج ۴ص ۱۳)

مخلوق کو رُخ کرنے کا حکم دے دیا وہی (مخلوق کا) قبلہ ہے۔ کیونکہ قبلہ ذاتی طور پر (از خود) قبلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے قبلہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اُسے قبلہ قرار دیا ہے اور اُس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (تم جدھر رُخ کرو گے اُدھر وجہ اللہ ہے) مراد یہ ہے کہ اُدھر اللہ کا وہ قبلہ ہے جس کی طرف تم نے رُخ کیا ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اُدھر اللہ کی ذات اپنے علم وقدرت کے ساتھ (موجود) ہے۔

اس آیت میں جو ''وجہ'' ہے وہ ایک ایسی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے لیکن یہ شکل وصورت کے اعتبار سے نہیں ہے۔[۲۵۳] بعض نے ''وجہ اللہ'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اُدھر اللہ کی رضا اور خوشنودی (موجود) ہے یعنی لوگ اللہ کی طرف رُخ کر کے اُس کی رضا اور خوشنودی چاہتے ہیں۔

آخر میں فرمایا: بے شک اللہ واسع (اور) علیم ہے۔ ﴿وَاسِعٌ﴾ ''سعة'' (بہ معنیٰ غناء اور مالداری) سے مشتق ہے۔ اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کافی ہونا' انعام واکرام سے نوازنا' سخاوت کرنا اور معاملات کا انتظام کرنا' یہ تمام چیزیں اس کی ساری مخلوق پر چھائی ہوئی ہیں۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ''واسع المغفرة'' ہے (یعنی اُس کی مغفرت بہت وسیع اور کشادہ ہے)۔ ﴿عَلِيْمٌ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جہاں کہیں تم نماز پڑھو اور دُعا مانگو وہ تمہارے اعمال اور نیتوں کو جاننے والا ہے۔ کوئی نیت یا عمل تمہارا اُس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

آیتِ مذکورہ کی روشنی میں نماز کے اُن مسائل کا بیان جن میں استقبالِ قبلہ نہ ہو

(۱) کوئی مسافر جب کسی جنگل میں ہو یا مشرکین کے علاقہ میں ہو اور قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو تو وہ مختلف علامات کے ذریعہ اُس کو تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ اور یہ کوشش اُسے جس رُخ پر موڑ دے اُس پر نماز ادا کر لے۔ اور اس نماز کو دہرانا اُس کے ذمہ نہیں ہے۔ (کیونکہ اس صورت میں) اگرچہ وہ قبلہ کو نہیں پا سکا لیکن اُس کی تلاش وجستجو نے جو جہت اُس کے لیے متعین کر دی وہی اس کا قبلہ ہے۔[۲۵۴]

(۲) اسی طرح وہ شخص جو سمندر میں ڈوب رہا ہو وہ جب تک تختہ پر قائم ہو اپنی حالت کے مطابق نماز ادا کرے گا اور اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔[۲۵۵]

(۳) اسی طرح وہ شخص جو کسی درخت کے تنے کے ساتھ بندھا ہوا ہو اور اس کے لیے قبلہ رُخ ہونا ممکن نہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے (یعنی وہ اپنی حالت پر نماز ادا کرے اُس کی نماز درست ہو جائے گی)۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اُن لوگوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد بنالی ہے' وہ (اس تہمت سے) پاک ہے' بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) جو کچھ آسمانوں

۲۵۳ یعنی زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ''وجہ'' کا لفظ ہے اُس کا معنیٰ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی چہرہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے۔ لہٰذا یہاں پر اور اس طرح کے دیگر مقامات پر ''وجہ'' کا معنیٰ ہوگا: اللہ عزوجل کی ذات' اللہ عزوجل کی توجہ' اللہ عزوجل کی رحمت وغیرہ۔

۲۵۴ اس مسئلہ کی مزید تشریح کے لیے دیکھئے: حاشیہ: ۲۵۱

۲۵۵ بہارِ شریعت میں درِّ مختار کے حوالہ سے ہے کہ کوئی شخص پانی میں ڈوب رہا ہے وہ اگر اس وقت بھی بغیر عمل کثیر اشارے سے پڑھ سکتا ہے' مثلاً تیراک ہے یا لکڑی وغیرہ کا سہارا پا جائے تو پڑھنا فرض ہے' ورنہ معذور ہے بچ جائے تو قضا پڑھے۔
(درِّ مختار مع ردّ المحتار ج ۲ ص ۵۰۲' طبع جدید' بہارِ شریعت ج ۴ ص ۳۸)

اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کی ملکیت ہے، سب کے سب اُسی کے فرمانبردار ہیں○

واقعۂ نزول

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴾ یہ آیت مبارکہ مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جب اُنہوں نے کہا کہ حضرت عُزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی جب اُنہوں نے کہا کہ حضرت مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور عرب کے مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب اُنہوں نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ وہ (اس تہمت سے) پاک ہے۔ ''سبحانہٗ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ کے لیے برأت ہے۔ (اس لفظ کے ذریعہ) اللہ تعالیٰ نے اولاد بنانے اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے الزامات سے اپنی برأت بیان فرمائی ہے۔

(۱۲۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: مجھے ابن آدم نے جھٹلایا حالانکہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے اور اُس نے مجھے سبّ و شتم کیا (بُرا کہا) حالانکہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک اُس کے مجھے جھٹلانے کا تعلّق ہے تو وہ یہ ہے کہ اُس نے میرے متعلق یہ گمان کیا کہ میں اُسے (مرنے کے بعد) دوبارہ اُس حالت پر نہیں لاسکتا جس پر وہ تھا۔ اور جہاں تک مجھے بُرا کہنے کا تعلّق ہے تو وہ اُس کا یہ قول ہے کہ میری اولاد ہے۔ (حالانکہ) میں اس بات سے پاک ہوں کہ میں بیوی یا اولاد رکھوں۔[۲۵۶]

(صحیح بخاری: ۳۱۹۳-۴۴۸۲-۴۹۷۴-۴۹۷۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۷۶۶۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۹۳، صحیح ابن حبان: ۲۶۷)

﴿ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یعنی سب اُسی کے پابند اور اُسی کی ملکیت ہیں۔ (اور جب ایسا ہے) تو پھر اس کی طرف اولاد کی نسبت کیسے کی جاسکتی ہے؟ جبکہ اولاد بھی زمین و آسمان ہی میں داخل ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اولاد کا اپنے والد کی جنس سے ہونا ضروری ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے مشابہ اور مثال سے پاک ہے (لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے)۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اولاد تو اس لیے بنائی جاتی ہے کہ والد کو اپنے عجز و بے بسی اور بڑھاپے کے دنوں میں اُن کی اور اُن سے فائدہ حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام چیزوں سے مبرّا اور پاک ہے۔ لہٰذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا ناممکن ہے۔

''قنوت'' کے معنیٰ کی تحقیق اور اس کی روشنی میں آیت کی تفسیر

﴿ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴾ یعنی آسمانوں والے اور زمین والے سب اللہ عزوجل ہی کے فرمانبردار ہیں اور اُسی کے معبود ہونے

[۲۵۶] یہ حدیث ''حدیثِ قُدسی'' ہے۔ کیونکہ اس میں نبی اکرم ﷺ اللہ عزوجل سے روایت فرمارہے ہیں۔ اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''شتم''۔ اس کا معنیٰ ہے کسی شخص کی طرف ایسی بات کی نسبت کرنا جو اُس شخص کے لیے انتہائی نقص اور عیب کا باعث ہو۔ جیسے اسی حدیث میں ہے کہ ابن آدم کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اس کی اولاد ہے'' یہ بات یقیناً اللہ عزوجل کی شان اور اُس کی عظمت اور الوھیت کے قطعاً خلاف ہے۔ کیونکہ اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنے کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اس کی بیوی بھی ہو اور بیوی ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ نکاح ہوا ہو اور نکاح ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ نکاح کی خواہش ہو۔ جبکہ اللہ رب العزت کی ذات ان تمام چیزوں سے منزہ و مبرّا اور پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ (الانعام: ۱۰۱) اس کی اولاد کیونکر ہوسکتی ہے جبکہ اس کے لیے زوجہ نہیں ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۴۲۷)

کے معترف ہیں۔(اس آیت میں ''قانتون'' کا لفظ ہے جو کہ ''قنوت'' سے ماخوذ ہے) اور ''قنوت'' کا اصل معنیٰ ہے: عاجزی کے ساتھ فرمانبرداری میں لگے رہنا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کا اصل معنیٰ ہے: کھڑا ہونا۔ اور اس معنیٰ میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ:

(۱۲۲) بہترین نماز وہ ہے جس میں طویل قنوت ہو۔[۲۵۷] (صحیح مسلم: ۱۷۵۶، سنن الترمذی: ۳۸۷، سنن ابن ماجہ: ۱۴۲۱، مسند احمد ج ۳ ص ۳۰۲، صحیح ابن حبان: ۱۷۵۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۸، شرح السنہ للبغوی: ۶۵۹)

''قنوت'' کے اس معنیٰ کے اعتبار سے آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ سب کے سب گواہی کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں اور اُس کے ایک ہونے کے معترف ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ''قانتون'' کا معنیٰ یہ ہے کہ لوگ جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اُس کے پابند اور تابع دار ہیں۔

اس بارے میں اختلاف کا بیان کہ آیا آیتِ مذکورہ میں سب لوگوں کا فرمانبردار ہونا اپنے عموم پر ہے۔۔۔ یا اس کا حکم خاص ہے؟

آیتِ مذکورہ کے حکم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آیت خاص ہے۔ پھر ان علماء نے آیت کی تخصیص میں دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک طریقہ یہ کہ اس آیت میں حضرت عزیز، حضرت مسیح علیہما السلام اور فرشتے مراد ہیں (یعنی وہی اللہ کے فرمانبردار ہیں)۔ دوسرا طریقہ یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بہ قول اس آیت میں صرف وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے اطاعت گزار ہیں۔ کفار مراد نہیں ہیں۔

علماء کی ایک دوسری جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ آیت کا حکم عام ہے (یعنی سب کے سب اللہ کے تابع دار ہیں)۔ کیونکہ آیت میں ''کل'' کا لفظ ہے اور ''کل'' کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حکم سب لوگوں کو شامل ہے اور سب کو محیط ہے۔

پھر کفار کے بارے میں علماء نے دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ کفار کے سائے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کفار کی جانب سے جو اطاعت ہے وہ قیامت کے دن ہوگی۔

جن علماء نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ آیت مذکورہ کا حکم خاص ہے اُنہوں نے لفظ ''کل'' کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ عموم اور احاطہ کا تقاضا نہیں کرتا ہے (یعنی ایسا نہیں ہے کہ لفظ ''کـــــل'' کے ساتھ جو بات کی جائے وہ سب کو شامل اور محیط ہو)۔ اس پر دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

---

[۲۵۷] طویل قنوت سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض علماء خصوصاً سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ طویل قنوت سے طویل قیام مراد ہے۔ یعنی بہترین نماز وہ ہے جس میں قیام (کھڑا ہونا) طویل ہو۔ جبکہ بعض دیگر علماء اس بات کے قائل ہیں زیادہ سجدے کرنا طویل قیام سے بہتر ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم: ۴۸۲) امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف پر دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ طویل قیام فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ رات میں اتنا قیام فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں مبارک سُوج جایا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۴۸۳۷۔۱۱۶۷، صحیح مسلم: ۲۸۲۰) عقلی دلیل سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طویل قیام افضل ہے۔ کیونکہ جس قدر قیام طویل ہوگا اُسی قدر قرآن کریم کی تلاوت زیادہ ہوگی اور مشقت بھی اُسی قدر زیادہ ہوگی۔

وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ. (النمل: ۲۳) (ہُد ہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ بلقیس کے بارے میں بتایا کہ) اُسے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ حاصل ہے۔

(اس آیت میں لفظ "کل" ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ ملکہ بلقیس کو ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہے) حالانکہ اُسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت (قطعاً) حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ لفظ "کل" عموم کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔[۲۵۸]

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

(وہ) بغیر کسی نمونہ کے آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے' اور جب وہ کسی چیز (کو پیدا کرنے کا) فیصلہ کرتا ہے تو اسے صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہوجا" تو وہ ہو جاتی ہے O

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا' اُنہیں ایجاد کرنے والا اور اُنہیں بغیر کسی سابق مثال اور ماڈل کے وجود بخشنے والا ہے۔ بعض علماء نے "بدیع" کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ ذات جو چیزوں کو عدم سے وجود میں لائے۔

﴿وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو مقدر فرما دیتا ہے اور اُس کو پیدا کرنے کا ارادہ فرما لیتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حتمی' قطعی اور پختہ فرما لیتا ہے۔

(اس آیت میں "قضٰی" کا لفظ ہے جو کہ "القضاء" سے ماخوذ ہے) اور "القضاء" کا اصل معنیٰ ہے: فیصلہ کرنا اور فارغ ہونا۔ لغت میں "قضاء" کے اور بھی کئی معانی ہیں۔ اور ان سب میں کسی چیز کے ختم ہونے' مکمل ہونے اور اس سے فارغ ہونے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

(آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ وہ صرف اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب وہ کسی حکم کو حتمی اور یقینی کر دیتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ حکم اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق وجود میں آ جاتا ہے۔

غیر موجود چیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی توجیہ

اگر تم یہاں سوال کرو کہ جو چیز موجود نہ ہو اُس کو مخاطب نہیں کیا جاتا ہے' پھر یہاں کیسے فرمایا گیا کہ "اللہ صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ چیز ہو جاتی ہے"؟ جبکہ وہ چیز پہلے موجود نہیں ہوتی۔

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ہر وہ چیز جو ہونے والی ہے' اللہ تعالیٰ اُس کو وجود میں لانے سے پہلے ہی جانتا ہے یوں وہ تمام چیزیں جو پہلے موجود نہیں تھیں وہ اللہ تعالیٰ کے علم کی وجہ سے گویا موجود ہو گئیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اُن چیزوں سے یوں خطاب

---

۲۵۸ یہ موقف درست نہیں ہے۔ صحیح موقف اُن ہی علماء کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ زیر بحث آیت کا حکم عام ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ ہی کی فرمانبردار ہے۔ جیسا کہ لفظ "کل" سے ظاہر اور روشن ہے۔ اور لفظ "کل" کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عموم کا تقاضا نہیں کرتا' قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن وسنت اور عربی تکلم محاورات میں عموم بتانے کے لیے اس لفظ کا استعمال کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ رہی وہ آیت جو عموم کی نفی پر بہ طور دلیل پیش کی گئی ہے' اُس سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ کسی ایک آیت یا حدیث کو سامنے رکھ کر کوئی قاعدہ اور ضابطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ قاعدہ مقرر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام دلائل یا دلائل کے غالب حصہ کو معیار بنایا جائے۔

چیزوں سے یوں خطاب کرنا جائز ہے کہ ہو جاؤ اور اس کا ان چیزوں کو عدم سے وجود کی طرف آنے کا حکم دینا بھی جائز ہے۔[۲۵۹]
بعض علماء نے سوال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿انما یقول له کن فیکون﴾ میں ''لَهٗ'' کا لام لام ''اَجل'' ہے (یعنی غرض بتانے کے لیے ہے)۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یوں ہوگا کہ جب اللہ کسی چیز کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو وجود میں لانے کے لیے اور اس کا ارادہ کرنے کی وجہ سے اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ اس جواب کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا اُس شئی سے خطاب کا معنیٰ ہی باقی نہیں رہا (لہٰذا سوال مذکور وارد نہیں ہوگا)۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور جاہلوں (مشرکوں) نے کہا کہ اللہ ہم سے (خود) کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ان کی سی (بے سروپا) بات اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے تھے ان لوگوں کے دل ایک سے ہیں، بے شک ہم نے یقین کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی نشانیاں صاف صاف بیان کر دی ہیں O

جاہلوں سے کون لوگ مراد ہیں؟

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جاہلوں سے مراد وہ یہودی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس میں تھے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ جاہلوں سے مراد نصرانی ہیں اور بعض کا قول یہ ہے کہ مشرکینِ عرب مراد ہیں۔

﴿لَوْلَا﴾ کا معنیٰ ہے: ''ھلا'' یعنی کیوں نہیں؟ ﴿يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے آ کر (آپ کے بارے میں) ہمیں کیوں نہیں فرماتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ﴿اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس آپ کی سچائی پر کوئی دلیل اور علامت کیوں نہیں آتی؟

﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ﴾ یعنی گذشتہ امتوں کے کافروں نے بھی (اسی طرح کی بات کہی تھی)۔ اور وہ بات یہ تھی کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ اُنہیں کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کا دیدار کروائیں اور اللہ تعالیٰ کا کلام سنوائیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے ایسی نشانیاں طلب کیں جن کا طلب کرنا اُنہیں مناسب نہیں تھا۔ تو وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یہ لوگ وہی بات کہہ رہے ہیں جو ان سے پہلے کے لوگ کہہ چکے ہیں۔

﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ یعنی جو لوگ رسولوں کو جھٹلانے والے ہیں ان کے دل اور ان کے کرتوت آپس میں ملتے جلتے ہیں۔
بعض علماء نے یہ تفسیر کی ہے کہ ان کے دل کفر، سختی، تکذیب (جھٹلانا) اور ناممکن چیزوں کے طلب کرنے میں ایک سے ہیں۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ ہم نے یقین کرنے والوں کے لیے اپنی نشانیاں بیان کر دی ہیں۔ نشانیوں سے مراد نبی اکرم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی چیزیں ہیں۔ یقین رکھنے والے لوگوں سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر یقین

---

۲۵۹ اس جواب کی زیادہ بہتر تقریر یوں ہے کہ ہر چیز جو کسی بھی حیثیت سے عالم وجود میں آنے والی ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں موجود ہے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے فرماتا ہے کہ ''ہو جا'' تو یہ خطاب درحقیقت اسی چیز سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے سے اُس کے علم میں موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ غائب چیز سے خطاب فرماتا ہے۔

رکھتے ہیں کہ قرآنی آیات اور رسول اللہ ﷺ جو روشن معجزات لے کر تشریف لائے ہیں وہ اس شخص کے لیے کافی ہیں جو یقین (اور وحی) کا طلب گار ہو۔

آیت میں صرف اہل یقین کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہی لوگ مختلف معاملات میں اور یقین کے ساتھ چیزوں کو پہچاننے میں خوب چھان بین کرتے ہیں۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾

(اے محبوب!) بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری سنانے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور آپ سے جہنمیوں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا جائے گا O

﴿بِالْحَقِّ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ سچائی کے ساتھ بھیجا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے: ''بالقران'' قرآن کریم کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ ہم نے اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور بعض علماء و مفسرین نے اس آیت کا معنیٰ کیا ہے کہ ہم نے (اس دنیا میں) آپ کو بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

﴿بَشِيۡرًا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میں نے آپ کو اپنے پسندیدہ اور اطاعت گزار بندوں کے لیے عظیم اجر و ثواب کی خوش خبری سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور ﴿نَذِيۡرًا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے دشمنوں اور نافرمانوں کے لیے دردناک عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

''ولا تسأل'' کی قرأت کا بیان اور ''اصحاب الجحیم'' کا مصداق

آیت میں ﴿وَلَا تُسۡـَٔلُ﴾ کو ''وَلَا تَسۡـــأَلۡ'' بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ اہل جہنم کے بارے میں سوال نہ کریں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ:

(۱۲۳) نبی اکرم ﷺ نے ایک دن فرمایا: کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے والدین کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ آپ اہل جہنم کے بارے میں سوال نہ کریں۔[۲۶۰]

(جامع البیان للطبری: ۱۸۷۷، تفسیر القرآن العزیز للامام عبد الرزاق: ۱۲۶، الدر المنثور ج۱ص۲۰۹)

۲۶۰ اس حدیث سے بعض علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے والدین (معاذ اللہ) کافر تھے۔ ہمارے نزدیک نہ یہ استدلال درست ہے نہ یہ مؤقف درست ہے۔ صحیح اور حق یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے والدین کریمین مؤمن ہیں، بخشے ہوئے ہیں اور جنتی ہیں۔ خاتم الحفاظ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر آٹھ رسائل تحریر فرمائے ہیں، جن میں ایک کا نام ''مسالک الحنفا فی والدی المصطفیٰ'' ہے اور ان کی کتاب الحاوی للفتاوی میں موجود ہے۔ تمام رسائل میں انہوں نے بہت دلائل اور براہین کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے والدین کریمین مؤمن اور جنتی ہیں۔ استاذ محترم علامہ غلام رسول صاحب سعیدی مدظلہٗ نے بھی تبیان القرآن کی نویں جلد میں سورۃ الشعراء کی آیت: ۲۱۹ کے تحت اس موضوع پر بہت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ نہایت مدلّل گفتگو رقم فرمائی ہیں۔ اور امام سیوطی کے رسائل کا خلاصہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ یہ دونوں تحریرات قابل مطالعہ ہیں۔ رہا یہ سوال کہ زیر بحث حدیث: ۱۲۳ کا کیا جواب ہے جو علامہ خازن نے ذکر کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام سیوطی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ معضل الاسناد اور ضعیف ہے اور قابل استدلال نہیں ہے۔ (درّ منثور ج۱ص۱۱۱ بحوالہ تبیان القرآن ج۱ص۵۴۰) معضل الاسناد سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں درمیان سے لگا تار دو راویوں کو چھوڑ دیا جائے۔ (تذکرۃ المحدثین ص۳۵)

زیرِ بحث جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اپنے احکام کی تبلیغ کے لیے بھیجا ہے' آپ اہلِ جہنم کے بارے میں سوال نہ کریں۔
بعض قرائے (''وَلَا تَسْـئَلُ'' کی بجائے) ''وَلَا تُسْـأَلُ'' پڑھا ہے۔ اور اس کو خبر قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو نفی قرار دیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ اس لیے بھیجا ہے تا کہ آپ احکام کی تبلیغ کریں اور آپ پر صرف یہی ذمہ داری ہے کہ آپ پیغام پہنچا دیں۔ جو کفر کرتے ہیں اُن کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا۔
اس آیت میں ﴿ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴾ سے مراد ہے: آگ والے۔ یہاں آگ کو ''جـحـیـم'' اس لیے فرمایا گیا کہ اس میں ایسی شدت ہوتی ہے جو آگ کو بھڑکاتی ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ''جحیم'' سے مراد ہے: بڑی آگ۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اور آپ سے یہود و نصاریٰ اُس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ اُن کے دین کی پیروی نہ کرلیں۔ (اے محبوب!) آپ اُنہیں کہہ دیجئے کہ اللہ کی (دی ہوئی) ہدایت ہی (درحقیقت) ہدایت ہے' اور اگر (اے مخاطب!) تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو اللہ کی جانب سے نہ کوئی تیرا دوست ہوگا نہ مددگار O

واقعۂ نزول اور تفسیر

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾ آپ سے یہود و نصاریٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے' جب تک ان کے دین کی پیروی نہ کرلیں۔ اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نبی اکرم ﷺ سے باہمی مصالحت کی درخواست کرتے تھے اور آپ ﷺ کو اس بات کا لالچ دیا کرتے تھے کہ اگر آپ اُن کے ساتھ نرمی فرمائیں تو وہ آپ کی پیروی کرلیں گے۔ جب یہود و نصاریٰ نے یہ بات کہی تو اللہ عزوجل نے مذکورہ آیت نازل فرما دی۔
اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ (اے محبوب ﷺ!) اگرچہ آپ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مصالحت اختیار کرلیں وہ پھر بھی آپ سے خوش نہیں ہوں گے۔ وہ صرف اپنی محبت دکھانے کے لیے مذکورہ مطالبہ کر رہے ہیں اور (حقیقت میں) وہ صرف اُسی وقت آپ سے خوش ہوں گے جب آپ اُن کی ملت کی پیروی اختیار کرلیں۔

واقعۂ نزول میں ایک اور روایت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت قبلہ کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ (ابتداءً) جب رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے تو اس وقت مدینہ کے یہودی اور نجران کے عیسائی آپ ﷺ سے یہ امید رکھتے تھے کہ آپ اُن کے دین میں اُن کی موافقت اور یکسانیت اختیار کرلیں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا دیا تو یہودی اور نصرانی آپ ﷺ سے مایوس ہو گئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''یہودی آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے'' یعنی اس وقت تک جب تک کہ آپ یہودیت اختیار نہ کرلیں'' اور نہ ہی نصرانی'' آپ سے راضی ہوں گے۔ یعنی جب تک کہ آپ نصرانیت اختیار نہ کرلیں۔ اور یہ ایک ناممکن بات ہے۔ کیونکہ ایک وقت میں ایک آدمی کے اندر دو چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اسی کو آگے یوں بیان فرمایا کہ ''جب تک کہ آپ اُن کی ملت کی پیروی نہ کرلیں'' یعنی اُن کے دین اور طریقے کی پیروی نہ کرلیں۔

﴿ قُلْ ﴾ (کے مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں یعنی) اے محمد (ﷺ)! آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی (حقیقۃً) ہدایت ہے۔ اللہ کی ہدایت سے مراد اللہ کا دین یعنی اسلام ہے۔ اور ﴿ هُوَ الْهُدٰی ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ دین اسلام ہی کو ہدایت کہنا بجا ہے۔

''ولئن اتبعت اھواء ھم'' کے مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں یا آپ کی امّت؟

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ (''قل'' کے مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں یعنی) اے محمد (ﷺ)! اگر آپ نے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی کی۔ یعنی ایسی خواہشات جو اُنہیں آپ سے راضی اور خوش کر دیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ خواہشات سے مراد یہود و نصاریٰ کی وہ باتیں ہیں جو درحقیقت خواہشات اور بدعت پر مبنی ہوتی تھیں۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''علم آ جانے کے بعد'' اس سے مراد یہ ہے کہ یہ وضاحت آ جانے کے بعد کہ اللہ کا دین حقیقت میں اسلام ہے اور قبلہ درحقیقت وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے یعنی کعبہ۔

تو اللہ کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ولی اور نصیر نہیں ہوگا۔ ﴿ وَلِیّ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو تمہارے معاملہ کو سنبھالے اور تمہاری ذمہ داری لے اور ﴿ نَصِیْر ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے لیے اللہ کی جانب سے ایسا کوئی شخص نہیں ہوگا جو تمہاری مدد کرے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے۔

بعض علماء نے ''ولئن اتبعت اھواء ھم'' کے متعلق کہا ہے کہ اس میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے اور مراد آپ کی امّت ہے۔ اور معنیٰ یہ ہے کہ (اے لوگو!) تم سے میں مخاطب ہوتا ہوں اور تم ہی لوگوں کے لیے میں ادب بیان کرتا ہوں اور (کئی چیزوں سے) میں روک دیتا ہوں۔ اور تم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمہارے پاس حق اور سچا پیغام لے کر آئے ہیں اور میں نے اُنہیں معصوم بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگ کافروں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم نے اپنے پاس علم اور کھلی نشانیاں آنے کے باوجود اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ عزوجل کی جانب سے تم لوگوں کا نہ کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا اُس کی تلاوت کرنے کا حق ہے، وہی لوگ اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو لوگ اُس کتاب کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں O

واقعۂ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل سفینہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آئے تھے اور یہ لوگ کل ۴۰ مرد تھے ان میں سے ۳۲ افراد حبشہ کے تھے اور آٹھ افراد ملک شام کے پادریوں میں سے تھے جن میں بحیرہ راہب بھی موجود تھا۔[۲۶۱]

۲۶۱ پورا واقعہ اس طرح ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور انہوں نے وہاں نجاشی وغیرہ کو قرآن حکیم سنا کر اسلام کا دلدادہ کر لیا تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ لوگ بھی بذریعہ کشتی وہاں پر آ گئے اور ساتھ میں ان کے ۴۰ افراد وہ تھے جو یہودی اور عیسائی تھے، ان میں بحیرہ راہب بھی شامل تھا۔ ان سب کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرما رہے تھے۔ ایک قول کے مطابق زیر بحث آیت ان چالیس یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ قرآن پاک کو سُن کر اور اپنی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی صفات پڑھ کر ایمان لا کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ (خزائن العرفان، تفسیر نعیمی، زیر بحث آیت)

بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق اہل کتاب کے اُن افراد سے ہے جو ایمان لا چکے تھے' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے دیگر ساتھی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ آیت تمام مؤمنین کے لیے ہے۔

قرآن کریم کی تلاوت کا حق ادا کرنے کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال

اس آیت میں جو فرمایا کہ ''وہ لوگ اس (کتاب) کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا اُس کی تلاوت کرنے کا حق ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اس کتاب کو اُسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کو نازل کیا گیا ہے' اس میں نہ کوئی تبدیلی کرتے ہیں نہ تحریف (ہیر پھیر) کرتے ہیں۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں اُس میں تبدیلی نہیں کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اس کتاب کی اُس طرح پیروی کرتے ہیں جیسا اس کی پیروی کرنے کے حق ہے۔ یعنی اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانتے ہیں' اس کے محکم پر عمل کرتے ہیں اور اس کے متشابہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر توقّف کرتے ہیں اور اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اس کتاب میں اُس طرح غور وفکر کرتے ہیں جیسا اس میں غور وفکر کرنے کا حق ہے۔ اور اس کتاب کے معانی' اس کے حقائق اور اس کے اسرار ورموز میں تفکر اور غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ''وہی لوگ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس آیت کا تعلق اہل کتاب سے ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص تورات پر ایمان رکھتا ہے اور تورات کی اُس طرح تلاوت کرتا ہے جیسا اُس کی تلاوت کا حق ہے وہی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان رکھنے والا ہے۔ کیونکہ تورات میں نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور صفات کا بیان موجود ہے[۲۶۲] اور اگر ہم یہ کہیں کہ اس آیت کا نزول تمام مؤمنین کے حق میں ہوا ہے تو اس کا مفہوم ظاہر اور واضح ہے۔

اس آیت میں جو فرمایا کہ ''جو لوگ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کتاب میں اللہ عزّوجل کے جو فرائض اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا بیان ہے اُس کا جو لوگ انکار کرتے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا ہوا ہے اس طور پر کہ اُنہوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کر لیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

اے اولادِ یعقوب! میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ہے اور (اس بات کو یاد کرو) کہ میں نے تم کو (اس زمانے کے) تمام لوگوں پر فضیلت دی تھی O

۲۶۲ تورات استثناء' باب: ۳۳' آیت: ۲' پرانا عہد نامہ' ص ۲۰۱' مطبوعہ لاہور میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے:

خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا اور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی' وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے' اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں' ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا۔

واضح رہے کہ تورات کے پرانے (۱۹۲۷ء کے) اردو ایڈیشن میں یہ آیت اس طرح تھی: ''دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا'' اور نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ داخل ہوئے تھے' اس طرح یہ آیت نبی ﷺ پر پوری طرح منطبق ہوتی تھی' لیکن عیسائیوں نے اس آیت کے الفاظ بدل دیئے اور یوں لکھ دیا: اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ (تبیان القرآن ج ۱ ص ۳۷۰)

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی میری وہ نعمتیں جو تمہارے پاس ہیں' میرا تمہارے ساتھ جو سلوک ہے اور میں نے بہت ساری نعمتیں جو تم پر کیں اُن میں تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی (ان تمام احسانات کو یاد کرو)۔

﴿ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی تم اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں تمہارے زمانے کے لوگوں پر فضیلت دی تھی۔

اس آیت مبارکہ میں ان یہودیوں کے لیے نصیحت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے۔ (یہ بھی واضح رہے کہ) اس آیت کو اسی سورت کے آغاز میں اور اس مقام پر اس لیے دہرایا گیا تا کہ بات پختہ ہو اور نعمتوں کو یاد دلایا جائے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کا کچھ بدلہ نہیں دے سکے گا اور نہ کسی شخص سے کوئی مالی تاوان قبول کیا جائے گا اور نہ (بلا اِذنِ الٰہی) کسی شخص کو کوئی شفاعت فائدہ دے گی اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی O

(گذشتہ آیت میں یہودیوں کے لیے نصیحت تھی) اور اس آیت میں اُن کے لیے ترہیب ہے (یعنی اُنہیں ڈرایا جارہا ہے)۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل کے وہ لوگو جو میری کتاب میں تبدیلی اور تحریف کرتے رہے ہو' اُس دن کے عذاب سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کا کوئی بدلہ نہیں دے سکے گا۔

''اور نہ کسی شخص سے کوئی مالی تاوان قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی شفاعت فائدہ دے گی''، یعنی کسی سے نہ تو کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا کسی کی سفارش کرے گا۔ یہ حکم عام ہے لیکن اس کی مراد خاص ہے۔ جیسے اللہ عزوجل کے درج ذیل فرمان میں ہے:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۔ اور سوائے اُس شخص کے جس کو وہ اجازت دے دے کسی اور کی شفاعت اس کے حضور کام نہیں دے گی۔ (سبا: ۲۳)

زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی کی شفاعت اس وقت فائدہ نہیں دے گی جب اُس پر عذاب لازمی ہو جائے اور عذاب کے سوا کسی اور چیز کا وہ مستحق نہ رہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں یہودیوں کے اس قول کا رد ہے کہ ''ہمارے آباء واجداد ہماری سفارش کریں گے''۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ''اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بدلہ لے گا تو اس وقت ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ (کی پکڑ) سے نجات دے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب ابراہیم کو اُن کے رب نے چند کلمات کے ذریعے آزمایا تو انہوں نے اُن کو پورا کر دکھایا' اللہ نے فرمایا: بے شک میں تم کو (تمام) لوگوں کا امام بنانے والا ہوں' انہوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے' اللہ نے فرمایا: میرا وعدہ ظالموں کو نہیں

پہنچے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام گرامی کی تحقیق' اُن کی جائے پیدائش اوران کا عالمگیر مقام

﴿اِبْرٰهٖمَ﴾ عجمی (غیر عربی) نام ہے۔اس کا معنیٰ ہے:''اَبٌ رحیمٌ''مہربان باپ۔اور پورا نام اس طرح ہے:
ابراہیم بن تارخ یعنی آزر[۲۶۳] بن ناخور بن شاروع بن ارغو بن فالغ بن عابر ابن شالح بن ارفخشد بن سالم بن نوح علیہ السلام۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش ''سوس'' ہے جو کہ اہواز کی زمین میں ہے۔بعض علماء نے ''بابل'' کو جائے پیدائش قرار دیا ہے۔بعض علماء نے ''کوثی'' جو کہ کوفہ کی بستیوں میں ہے اور بعض نے ''حران'' کو جائے پیدائش قرار دیا ہے۔لیکن اُنہوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل چلے گئے تھے' جو کہ ظالم نمرود کی زمین تھی۔

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ یہ ہے کہ) پہلے اور بعد کے تمام ہی فرقے اُن کے مقام اور فضیلت کے معترف رہے ہیں۔جہاں تک یہود و نصاریٰ کا تعلق ہے تو وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کا اقرار کرتے ہیں اور ان کی طرف اپنی نسبت کرنے کو باعث شرف جانتے ہیں اور یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ جہاں تک زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب کا تعلق ہے تو وہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کا اعتراف کرتے تھے اور ان کے ذریعہ دوسروں پر اپنا شرف ظاہر کیا کرتے تھے' کیونکہ وہ لوگ اُن ہی کی اولاد میں سے تھے' ان کے حرم کے رہنے والے تھے اور اُن کے (تعمیر کردہ) گھر کے خادمین تھے۔ جب مذہب اسلام جلوہ گر ہوا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعض ایسے معاملات بیان فرمائے جو مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اس بات کو لازم کرنے والے تھے کہ وہ سیدنا محمد ﷺ کے پیغام کو قبول کریں' ان کے دین کو تسلیم کریں اور ان کی شریعت کی فرمانبرداری کریں[۲۶۴] اس لیے کہ جو امور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب فرمائے تھے وہ تمام امور سیدنا محمد ﷺ کے دین کی خصوصیات میں سے ہیں۔اور اس میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کے خلاف یہ حجت ہے کہ ان سب پر سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی اطاعت کرنا' آپ پر ایمان لانا اور آپ کی تصدیق کرنا واجب اور ضروری ہے۔

۲۶۳ے اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تارخ اور آزر دونوں ایک ہی ہیں۔جبکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور آزر آپ کے چچا کا نام تھا۔امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ مجاہد نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام نہیں ہے' وہ بُت کا نام ہے۔(جامع البیان للطبری' ج ۷ص ۳۱۶) اگر کوئی سوال کرے کہ سورۃ الانعام کی آیت: ۷۴ میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں باپ سے مراد چچا ہے اور عربی زبان میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ چچا کو باپ کہا جاتا ہے۔(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ص ۲۱۴)
اس موضوع پر تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کے لیے دیکھئے:(تبیان القرآن ج ۳ص ۵۵۳)

۲۶۴ے مثلاً ڈاڑھی بڑھانا' مونچھیں کم کرنا' ناخن تراشنا اور اس طرح کے دیگر اُمور (جن کی تشریح حدیث: ۱۲۴ اور ۱۲۵ کے تحت عنقریب آ رہی ہے) یہ سب کے سب ہمارے دین اور مذہب میں خصوصی حیثیت کے حامل ہیں اور ان ہی اُمور کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی تھی۔اسی طرح جب کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں اور عیسائیوں پر یہ بات بہت ناگوار اور تکلیف دہ گزری اور وہ لوگ مسلمانوں پر مختلف قسم کے الزامات لگانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر واضح فرمایا کہ جس ابراہیم کی عظمت اور مقام و مرتبہ کے تم معترف ہو اُن کا قبلہ بھی یہی کعبہ تھا۔اس لیے تم پر بھی اس قبلہ کی اتباع کرنا واجب اور ضروری ہے۔

''ابتلاء'' کے معنیٰ کی تحقیق اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کو ''ابتلاء'' میں ڈالنے کی توجیہ

فرمایا: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ جب ابراہیم کو اُن کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا تو انہوں نے ان کو پورا کر دکھایا۔ ''ابتــــلاء'' کا اصل معنیٰ ہے: کسی کا حال معلوم کرنے کے لیے اس کو آزمانا اور جانچنا۔ تکلیف کو ''بلاء'' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بدن پر دشوار گزرتی ہے۔ بعض علماء وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ تکلیف کے ذریعہ انسان کی حالت کو جانچا جاتا ہے اس لیے تکلیف کو ''بلاء'' کہتے ہیں۔

جب یہ جملہ کہا جائے: ''ابتـلـی فلانٌ بکذا'' فلاں شخص کو فلاں کام کے ذریعہ آزمایا گیا۔ تو اس جملہ میں دو باتیں شامل ہوتی ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ اُس شخص کی حالت معلوم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے معاملہ کے جو نامعلوم گوشے ہیں وہ پتا چل جاتے ہیں۔ (۲) دوسری بات یہ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ شخص عمدہ ہے یا غیر عمدہ۔

اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کو جو آزمائش میں ڈالتا ہے وہ اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ اُسے اس آزمائش کے ذریعہ بندوں کے حالات پتا چل جائیں گے اور اُن کے معاملات کے نامعلوم گوشے معلوم ہو جائیں گے۔ کیونکہ اُسے تو ازل سے ابد تک کی وہ تمام معلومات بالتفصیل حاصل ہیں جن کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ ہاں اُس کا اپنے بندوں کو آزمانا اس لیے ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو بندوں کے حالات معلوم ہو جائیں اور ان کا عمدہ ہونا اور گھٹیا ہونا ظاہر ہو جائے۔ اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے کہ ''جب ابراہیم کو اُن کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ آزمایا''۔

وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا؟

وہ کلمات جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اُن کے بارے میں علماء مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ وہ تیس کلمات تھے' اُنہیں شرائع اسلام کہا جاتا ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جس کو ان کلمات کے ذریعہ آزمایا گیا ہو اور اس نے تمام کلمات کو پورا کر دکھایا ہو (یعنی صرف سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تمام کلمات کو پورا کر دکھایا) جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے براءت لکھ دی اور ارشاد فرمایا:

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ۙ. (النجم: ۳۷) اور ابراہیم جس نے احکام پر پورا پورا عمل کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی کو آزمائش میں نہیں ڈالا گیا۔ البتہ اُن کے بعد آنے والے انبیاء علیہم السلام کو جو دینی احکامات دیئے گئے وہ سب کے سب اُن انبیاء نے پورے کر دکھائے۔ خصوصاً ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ نے اُن تمام احکامات کو پورا کیا جن کا آپ کو حکم فرمایا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جن تیس کلمات کا قول کیا ہے اُن میں سے دس کلمات (صفات) سورۂ توبہ کی درج ذیل آیت میں مذکور ہیں:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبہ: ۱۱۲)

(یہی لوگ ہیں) توبہ کرنے والے' عبادت کرنے والے' حمد کرنے والے' روزہ رکھنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' برائی سے روکنے والے' اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے' اور اہل ایمان کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۝

دوسرے دس کلمات (صفات) سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت میں مذکور ہیں:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۞ (الاحزاب: ۳۵)

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں' فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں' سچے مرد اور سچی عورتیں' صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں' خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں' صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں' شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں' اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۞

بقیہ دس کلمات (صفات) سورۃ المؤمنون کی درج ذیل آیات میں مذکور ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۞ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۞ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۞ (المؤمنون: ۱۔۹)

بے شک وہ مؤمنین کامیاب ہوئے۞ جو اپنی نماز خشوع سے پڑھتے ہیں۞ جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑتے ہیں۞ جو زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہیں۞ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۞ ماسوا اپنی بیویوں اور باندیوں کے' بے شک اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں۞ اور جو اس کے سوا کوئی اور راستہ تلاش کریں تو وہی لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۞ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہیں۞ اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۞

یہ (آخری دس) سورۃ المعارج (آیت ۲۲ تا ۳۴) میں بھی مذکور ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دس کلمات کے ذریعہ آزمایا۔ اور وہ دس چیزیں فطرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن میں سے پانچ کا تعلق سر سے ہے اور پانچ کا تعلق جسم سے ہیں۔ جن پانچ کا تعلق سر سے ہے وہ یہ ہیں: مونچھیں کم کرنا' کلی کرنا' ناک میں پانی ڈالنا' مسواک کرنا اور سر میں مانگ نکالنا۔[۲۶۵] جن پانچ کا تعلق بقیہ جسم سے ہے وہ یہ ہیں: ناخن تراشنا' بغل کے بال نوچنا' زیر ناف بالوں کو مونڈنا' ختنہ کرنا اور پانی

۲۶۵ مانگ نکالنا نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر معروف کتب حدیث میں موجود ہے۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے: صحیح بخاری: ۳۵۵۸۔۳۹۴۴۔۵۹۱۷' صحیح مسلم: ۲۳۳۶' سنن ابوداؤد: ۴۱۸۸' سنن ابن ماجہ: ۳۶۳۲' سنن نسائی: ۵۲۵۳' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۰' مطبوعہ کراچی)

مانگ نکالنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ بیچ سر سے نکالی جائے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کے سر میں مانگ نکالتی تھی تو درمیان سر سے آپ کی مانگ چیرتی تھی۔

(سنن ابوداؤد: ۴۱۸۹' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۱' مطبوعہ کراچی)

زیر بحث روایت میں دیگر جو چیزیں مذکور ہیں ان کی تشریح حدیث: ۱۲۴ اور ۱۲۵ کے تحت آنے والے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

سے استنجاء کرنا۔ (جامع البیان للطبری: ۱۹۱۰، شرح السنہ ج ۷ ص ۷۸)

(۱۲٤) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ فطرت (سنّت) پانچ چیزیں ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ پانچ چیزیں فطرت (سنّت)[۲۶۶] ہیں: ختنہ کرنا، زیرِناف بالوں کو مونڈنا[۲۶۷]، مونچھیں کم کرنا[۲۶۸]، ناخن تراشنا[۲۶۹] اور بغل کے بال نوچنا[۲۷۰]۔ (صحیح بخاری: ۵۸۸۹، صحیح مسلم: ۲۵۷، سنن ترمذی: ۲۷۵٦، سنن ابوداؤد: ۴۱۹۸، سنن نسائی: ۱۱، سنن ابن ماجہ: ۲۹۲، مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۹۔۲۳۹۔۲۸۳۔۴۱۰، شرح السنہ: ۳۱۹۴، مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۰ مطبوعہ کراچی)

(۱۲۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کم کرنا، ڈاڑھی کو بڑھانا[۲۷۱]، مسواک کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغل کے بال نوچنا، زیرِناف بالوں کو مونڈنا اور پانی سے استنجاء کرنا[۲۷۲]۔ معصب کہتے ہیں کہ دسویں چیز میں بھول گیا ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ کلی کرنا ہو۔ (صحیح مسلم: ۲٦۱، سنن الترمذی: ۲۷۵۷، سنن ابوداؤد: ۵۳، سنن نسائی: ۵۰۵۵، سنن ابن ماجہ: ۲۹۳)

---

۲۶۶ اس حدیث میں پانچ چیزوں کو فطرت یعنی سنتِ انبیاء قرار دیا گیا ہے، لیکن پانچ کا عدد یہاں حد بیان کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ کسی حکمت کی بنا پر یا اہم ترین سُنن بیان کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

۲۶۷ امام نووی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ اگلے پچھلے مقام پر اور اس کے اردگرد جتنے بال اُگ آتے ہیں اُن سب کو مونڈنا مستحب ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۲۸) ہمارے فقہاء نے صراحت کی ہے، زیرِناف بالوں کو ہر ہفتہ میں صاف کرنا مستحب اور بہتر ہے اور پندرھویں روز کرنا بھی جائز ہے لیکن چالیس روز سے زائد گزار دینا مکروہ وممنوع ہے۔ اس پر دلیل یہ حدیث ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ زیرِناف بالوں کو صاف کرنے، ناخن تراشنے، مونچھیں کم کرنے اور بغل کے بال لینے میں رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے چالیس دن کی مدت مقرر فرمائی۔ (صحیح مسلم: ۵۹۸، سنن الترمذی: ۲۷۵۸، سنن ابوداؤد: ۴۲۰۰، سنن ابن ماجہ: ۲۹۵)

۲۶۸ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں ذکر کیا ہے کہ مونچھوں کو کم کرنا بہتر ہے اور کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بالوں کو اتنا کاٹا جائے کہ وہ اوپر والے ہونٹ کے بالائی حصہ سے کم ہوجائیں۔ امام طحاوی نے فرمایا کہ مونچھوں کو منڈوا دینا سنت ہے اور کم کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا یہی مذہب ہے۔
(فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۵۸)

۲۶۹ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کے دن ناخن تراشے جائیں، اگر جمعہ کو نہ تراشے تو پندرھویں روز تراشے اور اس کی انتہائی مدت چالیس دن ہے۔ اس کے بعد نہ ترشوانا ممنوع ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۵۷، بہارِ شریعت جزء ۱٦ ص ۱۳۳)

۲۷۰ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ بغل کے بالوں کو اکھاڑا جائے اور اُنہیں مونڈنا بھی جائز ہے۔
(ردّ المحتار ج ۹ ص ۴۹۷، طبع جدید)

۲۷۱ ڈاڑھی رکھنا شرعاً واجب اور ضروری ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسولُ اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک مجوسی حاضر ہوا۔ اُس نے اپنی ڈاڑھی کو مونڈا ہوا تھا اور مونچھیں لمبی کی ہوئی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اُس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ یہ ہمارے دین کا حصہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے دین میں یہ ہے کہ ہم مونچھوں کو کم کریں اور ڈاڑھیوں کو بڑھائیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۵۴۹۳۔ ج ۸ ص ۳۷۹)

۲۷۲ امام مالک رحمۃ اللہ کے نزدیک پانی سے استنجاء کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ پانی، طعام اور غذا کا ایک حصہ ہے۔ فقہاء احناف کے نزدیک پانی سے استنجاء کرنا سنت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حاجت کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیث مذکور: (۱۲۵) کی تشریح

امام وکیع فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "انتقاص الماء" کا لفظ ہے اُس کا معنیٰ ہے: استنجاء کرنا۔ اور اس میں جو "فطرت" کا لفظ ہے اس کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سنّت ہے' بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے: ملّت۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے: طریقہ' راستہ۔

اس حدیث میں جن دس چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اگرچہ فطرت میں سے ہیں لیکن بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں اور ہمارے لیے سنّت ہیں۔ اور اس پر علماء کا اتفاق ہے ان چیزوں کا تعلق ملّت سے ہے۔

اس حدیث میں جن چیزوں کا ذکر آیا ہے اُن کے معانی کی تفصیل اس طرح ہے کہ مونچھیں کم کرنا اور ڈاڑھی کو بڑھانا' اس میں عجمیوں کی مخالفت ہے کیونکہ عجمی لوگ اپنی ڈاڑھیاں کم کرتے ہیں اور مونچھیں بڑی رکھتے ہیں یا ڈاڑھی اور مونچھوں دونوں کو بڑھاتے ہیں۔ یہ خوب صورتی اور صفائی ستھرائی کے خلاف ہے۔ مسواک کرنا' کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا اس لیے ہے تاکہ مُنہ کو کھانے کی چیزوں سے اور پیلاہٹ سے پاک کیا جائے اور ناک کو گندگی سے پاک صاف کیا جائے۔ ناخن تراشنا اس لیے ہے تاکہ خوب صورتی اور زینت حاصل ہو' کیونکہ ناخن جب لمبے ہو جاتے ہیں تو بدنُما لگتے ہیں۔ اور (مستزاد یہ کہ) اُن میں میل بھی جم جاتا ہے۔ انگلیوں کے جوڑوں کو دھونے کا حکم اس لیے ہے کہ ان میں میل جمع ہو جاتا ہے اور میل جمع ہونے کی صورت میں انگلیوں کا منظر بہت بدنما ہو جاتا ہے۔ زیرِ ناف بالوں کے مونڈنے اور بغلوں کے بال نوچنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ اُس میل سے صفائی حاصل کی جائے جو ان مقامات کے بالوں پر جمع ہو جاتا ہے۔ استنجاء کا یعنی نجاست سے نجات حاصل کرنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ مخصوص مقام کو گندگی سے پاک صاف کیا جائے اور ختنہ کرنے کا حکم اس لیے ہے تاکہ قلفہ (اوپر کی کھال) میں جو پیشاب جمع ہو جاتا ہے اُس سے اُس کو صاف رکھا جائے۔

ختنہ کرنے کا شرعی حکم

ختنہ کے واجب ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ ختنہ کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ ختنہ کرنے کے لیے شرم گاہ (لازماً) کھلتی ہے۔ اور شرم گاہ کو کھولنے کی شرعاً صرف اُسی کام میں اجازت دی گئی ہے جو واجب اور ضروری ہو۔ لہٰذا ختنہ کرنا واجب ہے۔ امام شافعی کے علاوہ دیگر ائمہ کا مؤقف یہ ہے کہ ختنہ کرنا سنّت ہے۔[۲۷۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) لیے تشریف لے جاتے تو میں اور میرے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا' ہم دونوں پانی کا ایک برتن اٹھائے ہوتے تھے اور نبی اکرم ﷺ پانی سے استنجاء فرمایا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۱۵۰ تا ۱۵۲' صحیح مسلم: ۲۷۱) علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ نے مختلف کتب حدیث کے حوالہ سے سات احادیث ایسی ذکر کی ہیں جن میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پانی سے استنجاء فرمایا یا پانی سے استنجاء فرمایا کرتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۲ ص ۴۱۲' طبع ملتان)

۲۷۳ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی کے قائل ہیں کہ ختنہ کرنا سنت ہے۔ کیونکہ ختنہ کے بارے میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ ختنہ کرنا واجب اور ضروری ہے۔ امام شافعی کی جو دلیل علامہ خازن نے ذکر کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً ختنہ نابالغ کی ہوتی ہے اور نابالغ غیر مکلّف ہوتا ہے۔ لہٰذا ختنہ کرنے میں اگر شرم گاہ کو کھولنا لازم آتا ہے تو شرعاً اس میں کیا قباحت ہے؟ ہاں اگر ہمارا یہ دعویٰ ہوتا کہ بالغ اور مکلّف شخص بھی کسی سے ختنہ کرواسکتا ہے تو اعتراض ہوتا کہ ایک سنت کام کے لیے شرم گاہ کو کھولنے کی اجازت کیونکر دی گئی! جبکہ مکلّف اور بالغ شخص کے بارے میں احناف کا مؤقف یہ ہے کہ اگر وہ خود ہی اپنے ہاتھ سے ختنہ کرسکتا ہے تو کرلے ورنہ ترک کردے اور اگر کسی ایسی عورت سے نکاح کرنا ممکن ہو جو ختنہ کرنا جانتی ہو تو اس (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(تاریخ میں) سب سے پہلے جس کی ختنہ ہوئی وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ آپ سے پہلے کسی کی ختنہ نہیں ہوئی۔
(۱۲۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مقام قدوم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ختنہ ہوئی۔ (صحیح بخاری: ۳۳۵۶۔ ۶۲۹۸، صحیح مسلم: ۲۳۷۰، مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۵، شعب الایمان: ۸۶۴۲)

اس حدیث میں جو لفظ ''قدوم'' ہے اس کو ''قَدُوْم'' بھی پڑھا گیا ہے اور ''قَدُّوْم'' بھی پڑھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے بغیر تشدید کے پڑھا ہے اُن کا مؤقف یہ ہے کہ ''قدوم'' اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی چیز کو کاٹا جائے اور جن علماء نے ''قدوم'' کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اُن کا مؤقف یہ ہے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے۔

حضرت یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست) ہیں، لوگوں میں سب سے پہلے آپ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، آپ ہی سب سے پہلے ہیں جنہوں نے اپنی مونچھیں کم کیں اور آپ ہی سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے بالوں میں سفیدی دیکھی تو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض گزار ہوئے: اے میرے پروردگار! یہ کیا چیز ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے ابراہیم! یہ وقار ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میرے وقار میں اضافہ فرما۔[۲۷۴]
(شعب الایمان: ۸۶۴۰، مؤطا امام مالک: ۱۷۵۶)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) سے نکاح کر کے اس سے ختنہ کرالے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۶ ص ۳۵۷) بر سبیل تسلیم امام شافعی کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ کسی کام میں حرام کے ارتکاب سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کام واجب اور ضروری ہو۔ جیسے علاج کے دوران ضرورت کے وقت طبیب کا مریض کے مخصوص مقام کو دیکھنا یا چھونا جائز ہے، حالانکہ بالاتفاق علاج کرنا واجب اور ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح ختنہ میں اگرچہ شرم گاہ کو کھولنا لازم آتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ختنہ کرانا واجب اور ضروری ہے۔ قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمۃ نے یہی جواب دیا ہے۔ (دیکھئے: فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۱۹)

۲۷۴ اس حدیث سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ بالوں میں سفیدی کو برقرار رکھنا اور خضاب نہ لگانا زیادہ بہتر ہے۔ بعض دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً ابوداؤد کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سفید بالوں کو نہ اُکھاڑو، جس شخص کے بال بھی اسلام میں سفید ہوں گے وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور بن جائیں گے۔ (سنن ابوداؤد: ۴۲۰۲) اس کے برعکس صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں ایسی روایت موجود ہیں جن میں بالوں کو رنگنے اور سفیدی کو تبدیل کرنے کا حکم ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہود ونصاریٰ (اپنے بالوں کو) نہیں رنگتے، تم اُن کی مخالفت کیا کرو۔ (صحیح بخاری: ۳۴۶۰۔ ۵۸۹۹، صحیح مسلم: ۲۱۰۳) علامہ بدرالدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ مذکورہ دونوں روایات کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے محبّ طبری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ بالوں کو رنگنے اور نہ رنگنے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے جو آثار مروی ہیں وہ سب صحیح ہیں، لیکن ان میں بعض عام ہیں اور بعض خاص ہیں۔ بالوں کو رنگنے کے متعلق جو احادیث ہیں وہ خاص ہیں۔ یعنی جس شخص کے حضرت ابوقحافہ کی طرح تمام بال سفید ہو جائیں اس کو رنگنے کا حکم دیا ہے اور جس کے بال مخلوط (ملے جلے) ہوں اُس کو سفیدی متغیر نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ نبی اکرم دو متضاد حکم دیں اور چونکہ کوئی حدیث ناسخ نہیں ہے اس لیے ان احادیث کو جمع کرنا متعین ہے۔ لہٰذا جن صحابہ نے سفید بالوں کو رنگا وہ اس پر محمول ہے کہ ان کے تمام بال سفید تھے اور جنہوں نے نہیں رنگا ان کے بال مخلوط تھے۔

(عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۹۶، شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۴۲۱)

زیرِ بحث آیت میں ''کلمات'' کی تفسیر میں مفسرین کے مزید اقوال کا بیان

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جن کلمات کے ذریعہ آزمایا اُن سے مراد مناسکِ حج ہیں (یعنی حج کے ارکان وآداب مراد ہیں)۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو درج ذیل سات چیزوں کے ذریعہ آزمایا: (١) ستارہ (٢) چاند (٣) سورج۔ ان تین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت اچھے انداز میں غور وفکر کیا۔ (٤) آگ (٥) ہجرت (٦) اپنے بیٹے کو ذبح کرنا (٧) اور ختنہ کرنا۔ ان چار پر حضرت ابراہیم نے صبر کا مظاہرہ فرمایا۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اُن کلمات کے ذریعہ آزمایا جن کو آپ کی طرف وحی فرمایا اور اُن پر عمل کرنے کا اُنہیں حکم دیا۔ اُنہوں نے اُن کلمات کو پورا کر دکھایا یعنی جیسا اُن کلمات (اور اعمال) کو ادا کرنے کا حق تھا' اُس طرح اُنہیں ادا کیا اور اُن کلمات کے تقاضے کو جس طرح پورا کرنا چاہیے تھے اُس طرح اُسے پورا کیا اور اُن کلمات پر عمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو نبوت سے پہلے آزمایا گیا یا نبوت کے بعد؟

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ آزمائش قبلِ نبوت ہوئی یا بعدِ نبوت؟ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ آزمائش اُن کی نبوت سے پہلے ہوئی۔ کیونکہ آیت کے اگلے حصہ میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: ''بے شک میں تم کو (تمام) لوگوں کا امام بنانے والا ہوں'' (اس فرمان سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش اُن کی امامت اور نبوت کا سبب ہے) اور سبب اپنے مسبّب سے پہلے پایا جاتا ہے (لہٰذا آزمائش اُن کی نبوت سے قبل ہوئی ہے)۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ آزمائش نبوت ملنے کے بعد ہوئی ہے۔ کیونکہ کسی بھی چیز کا مکلّف ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اور وحی اُسی وقت پائی جائے گی جب نبوت عطا ہوگی (لہٰذا آزمائش نبوت ملنے کے بعد ہوئی ہے)۔

صحیح بات یہ ہے کہ کلمات کے ذریعہ آزمائے جانے کا معنیٰ اگر یہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ستارے اور چاند وسورج کے ذریعہ آزمایا تو یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ اور اگر کلمات سے مراد وہ احکامِ دین لیے جائیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب فرمائے تھے تو یہ واقعہ نبوت کے بعد کا ہے۔

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ اللہ نے (ابراہیم سے) فرمایا: بے شک میں تم کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ یعنی خیر کے کاموں میں آپ کی پیروی کی جائے گی اور لوگ آپ کے طریقے اور سیرت کو اپنائیں گے۔

﴿امام﴾ کا معنیٰ ہے: ''هو الذی یؤتم به'' وہ شخص جس کی پیروی کی جائے۔

﴿قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (اللہ عزوجل کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ میری نسل اور میری اولاد میں بھی کچھ کو امام بنادے کہ اُن کی پیروی کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''میرا عہد'' یعنی میری نبوت اور ایک قول کے مطابق امامت ''ظالموں کو'' یعنی آپ کی اولاد کے ظالموں کو ''نہیں پہنچے گا''۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ (اے ابراہیم!) میں نے نبوت اور امامت عطا کرنے کا آپؑ کے ساتھ جو عہد کیا ہے وہ آپ کی نسل اور اولاد میں سے اُن لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو ظلم کرنے والے ہوں گے۔ (ظلم سے یہاں کفر مراد ہے۔)

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾

اور یاد کیجئے جب ہم نے (اپنے) گھر (خانہ کعبہ) کو لوگوں کے لیے رجوع کرنے کی جگہ اور امن کی جگہ بنادیا اور (لوگوں کو حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیم و اسمٰعیل کو ہم نے تاکید فرمادی کہ میرے گھر کو تم دونوں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھناO

اس آیت میں ﴿الْبَيْتَ﴾ سے بیت الحرام یعنی خانہ کعبہ مراد ہے اور ''البیت'' میں حرم داخل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ''البیت'' کے بارے میں فرمایا کہ یہ امن کی جگہ ہے۔ اور امن والا ہونا پورے حرم کی صفت ہے (لہٰذا ''البیت'' میں حرم بھی داخل ہے)۔

اس آیت میں ﴿مَثَابَةً﴾ کا لفظ ہے۔ اس کا معنیٰ ہے: لوٹنے کی جگہ یہ ''ثـاب یـثـوب'' سے ماخوذ ہے بمعنی لوٹنا۔ ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (ہم نے خانۂ کعبہ کو ایسا مرکز بنادیا ہے کہ) لوگ ہر طرف سے اُس کا حج کرنے کے لیے اُس کی طرف رجوع کریں گے۔ اور ﴿وَاَمْنًا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (ہم نے اس گھر کو) ایسی پُر امن جگہ بنادیا ہے کہ اس میں لوگ مشرکین کی ایذاء رسانیوں سے محفوظ ہوں گے۔ چنانچہ (ایسا ہی ہوا کہ) مشرکین اہل حرم کو پریشان نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اُن کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اللہ والے لوگ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ ''أمناً'' کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے خانۂ کعبہ کو ''پناہ گاہ'' بنادیا۔

(۱۲۷) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ فتح مکہ والے دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ آسمان اور زمین کی پیدائش کے دن ہی اللہ تعالیٰ نے اس شہر (مکہ معظمہ) کو حرم بنادیا تھا۔ اور یہ اس خداداد حرمت کی وجہ سے قیامت تک حرم رہے گا۔[۲۷۵] مجھ سے پہلے کسی کے لیے اس شہر میں جنگ کرنا جائز نہیں ہوا اور میرے لیے بھی دن کی صرف ایک ساعت میں جنگ جائز ہوئی تھی[۲۷۶] اور اب اس خداداد حرمت کی وجہ سے یہ شہر قیامت تک حرم رہے گا۔ نہ اس کے کانٹے کاٹے جائیں[۲۷۷] نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے۔ اور مکہ میں گری پڑی چیز کو سوائے اُس شخص کے کوئی اور نہیں اُٹھا سکتا جو اس چیز کا

۲۷۵ یہاں ایک معروف بحث یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کو حرم کس نے بنایا؟ اللہ عزوجل نے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے؟ زیرِ بحث حدیث سے جو کچھ ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کو اللہ عزوجل نے حرم بنایا اور اُس وقت ہی حرم بنادیا جب زمین و آسمان کو پیدا فرمایا۔ اس کے برعکس ایک دوسری حدیث میں یہ ہے کہ بے شک ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا۔ (دیکھئے: صحیح بخاری رقم الحدیث: ۳۳۶۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۷۴) علامہ بدرالدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ ان دونوں احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکہ کو حرم بنانا اس معنیٰ میں ہے کہ اُن کے ذریعہ لوگوں پر مکہ کا حرم ہونا ظاہر کیا گیا' ورنہ اصلاً مکہ مکرمہ کو حرم بنانے والا اللہ رب العالمین ہے۔ (عمدۃ القاری ج۶ ص۲۲۳)

۲۷۶ یعنی فتح مکہ کے موقع پر دن کی ایک ساعت میں جنگ کو جائز کیا گیا تھا' پھر پہلے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہر مکہ میں جنگ کو حرام کردیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے فقہاء احناف یہ استدلال کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ باہمی مصالحت سے فتح نہیں ہوا' بلکہ دیگر غزوات کی طرح یہ بھی ایک غزوہ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ باہمی صلح سے فتح ہوا ہے۔

۲۷۷ خواہ وہ تکلیف دہ ہوں یا نہ ہوں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ تکلیف دہ کانٹوں کو کاٹنا جائز ہے۔ ہمارے نزدیک چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مطلق ہے اور اس میں تکلیف دہ اور غیر تکلیف دہ کی کوئی قید نہیں ہے اس لیے ہر طرح کے کانٹے کاٹنا (حرم میں) ناجائز ہے۔

اعلان کر کے مالک تک پہنچا دے[۲۷۸] اور یہاں کی گھاس بھی نہیں کاٹی جائے گی۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! اذخر گھاس کاٹنے کی تو اجازت ہونی چاہیے' کیونکہ یہ لوہاروں اور سناروں کے کام آتی ہے اور اس سے گھر بنائے جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اچھا چلو اذخر گھاس کی اجازت ہے[۲۷۹]۔

(صحیح بخاری: ۱۳۴۹۔۳۱۸۹' صحیح مسلم: ۱۳۵۳' سنن ابوداؤد: ۲۰۱۷' مسند احمد ج ۱ ص ۲۵۹' المعجم الکبیر: ۱۰۹۴۴' صحیح ابن حبان: ۳۷۲۰' سنن بیہقی ج ۵ ص ۱۹۵' شرح السنہ للبغوی: ۲۰۰۳۔ ج ۴ ص ۴۱۰' مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۳۷' مطبوعہ کراچی)

حدیث مذکور: (۱۲۷) کی تشریح

اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے حرم میں جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے صرف فتح مکہ والے دن حرم میں جنگ کرنا جائز کیا گیا اور آپ کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''لا یعضد شوکہ'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حرم کے کانٹے نہ کاٹے جائے۔ یعنی وہ کانٹے جو تکلیف دہ نہ ہوں۔ اگر تکلیف دہ کانٹے ہوں تو ان کے کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے[۲۸۰]۔

اس حدیث میں ہے: ''لا ینفر صیدہ'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حرم کے جانور کو شکار کرنے کے در پے نہ ہوا جائے اور اُسے بھڑکایا نہ جائے (کہ وہ بھاگنے پہ مجبور ہو جائے)۔

اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''ولا یلتقط لقطتہ الا من عرّفھا'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حرم میں گری ہوئی چیز کو صرف وہی شخص اُٹھائے جو اُس چیز کا اعلان کردے۔ ''عرفھا'' کا معنیٰ ہے: ''ینشدھا'' (جو کہ ''نشد'' سے مشتق ہے) اور ''نشد'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کی پہچان کراتے ہوئے آواز بلند کرنا۔

---

۲۷۸ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حرم میں گری پڑی چیز کو اٹھانے والے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اُس چیز کو اُس کے مالک تک پہنچائے۔ خواہ کتنا ہی عرصہ کیوں نہ ہو جائے وہ اُس چیز کو نہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے نہ اُس کو صدقہ کرسکتا ہے۔ احناف کا مؤقف یہ ہے کہ گری پڑی چیز خواہ حرم سے اٹھائی جائے یا حرم کے علاوہ کسی اور جگہ سے' اس کا ایک سال تک اعلان کیا جائے گا' اس عرصہ میں اگر اُس چیز کا مالک آجائے تو فبہا ورنہ اُس چیز کو صدقہ کر دیا جائے گا۔ احناف کا استدلال اُن احادیث سے ہے جن میں نبی اکرم ﷺ نے حرم اور غیر حرم کی تخصیص کے بغیر عموم کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کوئی گری ہوئی چیز اٹھائے تو وہ ایک سال تک اُس کا اعلان کرے۔ (سنن دارقطنی ج ۴ ص ۱۸۲' کنز العمال: ۴۰۵۲۲) اور ایک حدیث میں کسی صحابی کو گمشدہ چیز کے بارے میں فرمایا کہ اس (تھیلی) کے باندھنے کی ڈوری اور اس تھیلی کی پہچان کو یاد رکھو' پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو۔ (صحیح بخاری: ۹۱' صحیح مسلم: ۱۷۲۲)

۲۷۹ ''اذخر'' ایک لمبی گھاس کا نام ہے۔ یہ قبر میں' گھر کی تعمیر میں اور دیگر اُمور میں کام آتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخواست پر اس گھاس کو کاٹنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور حرم کی دیگر گھاس کا حکم برقرار رکھا کہ اس کو نہیں کاٹا جائے گا۔ علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ''اذخر'' کا جو استثناء فرمایا وہ وحی الٰہی کی بنیاد پر ہو اور وہ وحی اُسی وقت نازل ہوئی ہو' یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد سے ''اذخر'' کا استثناء فرمایا ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۲۲۴) اس حدیث میں آپ ﷺ کے اختیارات کا بھی ثبوت ہے۔

۲۸۰ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ کانٹے خواہ تکلیف دہ ہوں یا نہ ہوں اُن کو نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مطلق ہے اور اس میں تکلیف دہ اور غیر تکلیف دہ کی کوئی قید نہیں ہے۔

''لُقطہ'' (گری پڑی چیز) پوری زمین میں کہیں بھی ہو اُس کو صرف وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جو ایک سال تک اُس کا اعلان کرے۔ اگر اعلان کے نتیجہ میں اُس چیز کا مالک آ جائے تو وہ اُس کو لے لے گا' ورنہ چیز کو اُٹھانے والا اُس چیز سے اِس شرط کے ساتھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے کہ (نقصان ہونے کی صورت میں) تاوان کا ذمہ دار ہو گا۔[۲۸۱] گری پڑی چیزوں کے متعلق مکہ مکرمہ کا حکم یہ ہے کہ وہاں سے کسی چیز کو اُٹھانے والا ہمیشہ اُس چیز کا اعلان کرتا رہے گا۔ جب کہ دیگر شہروں کا حکم یہ ہے کہ ان میں پائی جانے والی چیز کے اعلان کی مدت محدود ہے اور وہ ایک سال ہے۔[۲۸۲]

اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''ولا یختلی خلاہ'' ''خلیٰ'' (عربی زبان میں) اُس تر اور چھوٹی گھاس کو کہا جاتا ہے جس کو جانور چرتے ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ''خلیٰ'' خشک گھاس کو کہا جاتا ہے۔ اور ''خلاہٗ'' کا معنیٰ ہے: ''قطعہٗ'' اُس نے فلاں چیز کو کاٹا۔ اس حدیث کے آخر میں ایک لفظ ہے: ''قین'' اس کا معنیٰ ہے: ''حداد'' یعنی لوہار۔

آیا پورا حرم مقام ابراہیم ہے یا یہ ایک مخصوص جگہ کا نام ہے؟

فرمایا: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی﴾ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ پورا حرم مقام ابراہیم (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ) ہے۔ اور بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ مقام ابراہیم فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام مقامات حج مراد لیے ہیں۔ جیسے: عرفہ' مزدلفہ' رمی (کنکریاں مارنا) اور دیگر تمام مقامات۔ اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس کے پاس ائمہ نماز پڑھتے ہیں۔ اور یہ وہ پتھر ہے جس پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کی تعمیر کے وقت کھڑے ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مقام ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کی انگلیوں کے نشان تھے' وہ نشانات لوگوں کے بہت زیادہ اُس پر ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے (کافی حد تک) مٹ گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ لوگوں کو مقام ابراہیم کے پاس صرف نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اُس پر ہاتھ پھیرنے اور اُس کو چومنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

(۱۲۸) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ میں نے (نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں) عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کاش ایسا ہو جائے کہ ہم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیں! (میرا یہ عرض کرنا تھا کہ) آیت مبارک نازل ہو گئی:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی۔ اور تم لوگ مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔[۲۸۳]

(البقرہ: ۱۲۵)

(دوسری موافقت) آیتِ حجاب ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! میری خواہش ہے کہ آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرنے کا حکم فرمائیں۔ کیونکہ اچھے بُرے لوگ اُن سے بات کرتے ہیں۔ (میرا یہ عرض کرنا تھا کہ) پردہ کی آیت نازل ہو گئی۔ اور (ایک بار ایسا ہوا کہ) نبی اکرم ﷺ کی ازواج نے غیرت میں آ کر آپ کے خلاف ایکا کر لیا تو میں نے ازواجِ

---

۲۸۱ احناف کے یہاں اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ گمشدہ چیز کو پانے والا اگر غنی اور غیر محتاج ہو تو وہ اُس چیز سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اور اگر اُس چیز کو پانے والا فقیر ہو تو وہ اعلان کی مدّت پوری ہونے کے بعد اور مالک کے نہ آنے کی صورت میں اُس چیز سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۲۹۱' درّ مختار مع ردّ المختار ج ۶ ص ۳۳۷' طبع جدید)

۲۸۲ یہ امام شافعی کا مؤقف ہے۔ احناف کا مؤقف ہم حاشیہ: ۲۷۸ میں واضح کر چکے ہیں۔

۲۸۳ گفتگو اور زیر بحث آیت کی مناسبت سے علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے حدیث صرف یہیں تک ذکر کی ہے۔ راقم نے قارئین کی سہولت اور موافقاتِ ثلثہ کو یکجا کرنے کی غرض سے پوری حدیث کا ترجمہ ذکر کیا ہے۔

مطہرات سے کہا:

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ . (التحریم:۵)

اور نبی کریم تمہیں طلاق دے دیں تو کوئی بعید نہیں کہ اُن کا رب اُنہیں تمہاری جگہ تم سے زیادہ بہتر بیویاں عطا فرما دے۔

میں نے یہ جملہ کہا تو یہ آیت (بن کر) نازل ہوگیا۔

(صحیح بخاری:۴۰۲' صحیح مسلم:۲۳۹۹' صحیح ابن حبان:۶۸۹۶' مسند احمد ج۱ص۲۴' مشکوٰۃ المصابیح ص۵۵۸' مطبوعہ کراچی)

مقام ابراہیم کے متعلق صحیح بخاری کی مفصّل حدیث

امام بخاری نے اپنی صحیح میں جو حدیث[۲۸۴] روایت کی ہے اس کے مطابق مقام ابراہیم کے واقعہ کا آغاز یہ ہے:

(۱۲۸) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عورتوں میں سے جس نے سب سے پہلے اپنی کمر پر پٹکا باندھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ تھیں' انہوں نے یہ پٹکا اس لیے باندھا تھا کہ ان کے قدموں کے نشان مٹ جائیں اور حضرت سارہ کو پتا نہ چلے[۲۸۵] پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اُنہیں اور ان کے دودھ پیتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر روانہ ہوئے اور جس جگہ بیت اللہ ہے وہاں ایک درخت کے پاس چھوڑ دیا' جس جگہ پر اب زمزم کا کنواں ہے۔ اس وقت مکہ میں کوئی آبادی نہیں تھی اور نہ وہاں پانی تھا۔ انہوں نے اس جگہ ان دونوں کو چھوڑ دیا اور ان کے پاس ایک تھیلا رکھ دیا جس میں کھجوریں' ستو اور پانی تھا' پھر حضرت ابراہیم واپس جانے لگے تو حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے گئیں اور کہا: اے ابراہیم! آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہم کو اس غیر آباد بے آب و گیاہ وادی میں کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ وہ بار بار یہ جملے دہراتی رہیں اور حضرت ابراہیم نے ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا' پھر انہوں نے پوچھا: کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں! حضرت ہاجر نے کہا: پھر اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا اور وہ (مطمئن ہو کر) لوٹ آئیں' پھر ابراہیم علیہ السلام واپس روانہ ہوئے حتیٰ کہ جب وہ مقام ثنیہ پر پہنچے جہاں انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا تو انہوں نے اپنا منہ اس طرف کیا جس طرف اب بیت اللہ ہے' پھر انہوں نے دونوں ہاتھ بلند اٹھا کر ان کلمات کے ساتھ دعا کی: اے ہمارے رب! میں نے اپنی بعض اولاد کو بے آب و گیاہ وادی میں ٹھہرا دیا ہے' تیرے حرمت والے گھر کے نزدیک' اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کو قائم رکھیں' تو کچھ لوگوں کو ایسا کر دے کہ وہ ان کی طرف مائل رہیں اور ان کو پھلوں سے روزی دے تاکہ وہ شکر ادا کریں O (ابراہیم:۳۷)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی تھیں' اور اس پانی سے پیتی تھیں' حتیٰ کہ جب مشکیزہ کا پانی ختم ہوگیا تو وہ اور ان کا بیٹا دونوں پیاسے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتیں جو پیاس سے تڑپ رہے تھے' جب وہ ان کو

۲۸۴ اس پوری حدیث کا درج ذیل ترجمہ تبیان القرآن ج۶ ص۲۰۰ تا ۲۰۲ سے مأخوذ ہے۔

۲۸۵ واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت ہاجر سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت سارہ نے غیرت میں آ کر یہ قسم کھالی کہ میں اپنے جسم کے تین اعضا کاٹ دوں گی۔ حضرت ہاجر نے جب یہ بات سنی تو وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں اور اپنی کمر پر پٹکا باندھا اور اس کے پچھلے حصے کو زمین پر لٹکا دیا تا کہ ان کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں اور کسی کو ان کے جانے کا علم نہ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سفارش کے طور پر حضرت سارہ سے کہا کہ تم نے اعضاءِ بدن کو کاٹنے کی جو قسم کھائی ہے اس کو یوں پورا کرو کہ تم اپنے دونوں کانوں میں سوراخ کروالو۔ سو حضرت سارہ نے اپنی قسم کو یوں پورا کیا کہ اپنے کانوں میں سوراخ کروالیے اور آپ ہی سب سے پہلی وہ خاتون ہیں جنہوں نے کان چھدوائے۔ (فتح الباری ج۶ ص۴۹۳' عمدۃ القاری ج۱۱ ص۲۷)

دیکھنے کی تاب نہ لاسکیں تو وہاں سے چل پڑیں' انہوں نے دیکھا اس زمین کے قریب صفا پہاڑ تھا' وہ اس پہاڑ پر کھڑی ہو گئیں کہ کوئی آتا ہوا دکھائی دے' انہیں کوئی نظر نہیں آیا' پھر وہ صفا سے اتریں اور وادی میں پہنچ گئیں' انہوں نے اپنی قمیص کا دامن اٹھایا اور بہت تیز دوڑ کر اس وادی کے پار گئیں پھر مروہ پہاڑ پر گئیں اور دیکھا کہ کوئی شخص دکھائی دے' انہیں کوئی نظر نہیں آیا' انہوں نے صفا اور مروہ کے درمیان اس طرح سات مرتبہ دوڑ لگائی' پھر انہوں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا: اب ٹھہر جاؤ' پھر انہوں نے کان لگا کر سنا تو انہیں ایک آواز سنائی دی اور اس نے کہا: اگر تمہارے پاس کوئی فریاد رس ہے تو تم نے اس کو اپنی آواز پہنچا دی ہے' اچانک دیکھا تو زمزم کے قریب ایک فرشتہ کھڑا تھا' اس فرشتے نے اس جگہ اپنی ایڑی یا اپنے پَر مارے' حتیٰ کہ پانی نکلنے لگا۔[286] حضرت ہاجرہ اپنے ہاتھوں سے اس طرح اس پانی کو حوض کی طرح اکٹھا کرنے لگیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم فرمائے' کاش! وہ زمزم کو بہتا ہوا چھوڑ دیتیں یا فرمایا: کاش! وہ اس میں سے چلو نہ بھرتیں تو زمزم ایک بہتا ہوا چشمہ بن جاتا' پھر حضرت ہاجر نے خود پانی پیا اور اپنے بیٹے کو دودھ پلایا۔ فرشتہ نے ان سے کہا: تم اپنے بچے کے متعلق فکر نہ کرو' اس جگہ بیت اللہ ہے جس کو یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کرے گا اور اللہ اس کے اہل کو ضائع نہیں کرے گا' اور بیت اللہ کی جگہ زمین سے بلند تھی' اس کی دائیں اور بائیں جانب سے سیلاب گزر جاتے تھے۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ جرہم[287] کے کچھ لوگ وہاں سے گزرے یا جرہم کے گھرانوں میں سے کچھ لوگ وہاں سے گزرے' وہ مکہ کے نشیب میں اترے' انہوں نے وہاں پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھا' انہوں نے آپس میں کہا: یہ پرندے پانی پر جا رہے ہیں' ہم اس وادی اور اس میں جو پانی ہے اس کا ارادہ کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک یا دو آدمیوں کو بھیجا تو وہ پانی تک پہنچ گئے انہوں نے واپس جا کر ان کو خبر دی' تو وہ سب وہاں پہنچ گئے' وہاں حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ ہم کو اس کی اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس قیام کریں۔ حضرت ہاجر نے کہا: ہاں! لیکن پانی پر تمہارا کوئی حق نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: اس چیز سے حضرت اسماعیل کی ماں کی ڈھارس بندھی اور وہ اُنس چاہتی تھیں۔ وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی بلا لیا' حتیٰ کہ جب وہاں بہت سے گھر بن گئے اور ان کا بیٹا جوان ہو گیا اور اس نے ان سے عربی زبان سیکھ لی' جب حضرت اسماعیل جوان ہوئے تو وہ جرہم کے لوگوں کو

---

[286] اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ زمزم کا پانی کس طرح جاری ہوا؟ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ زمزم کا پانی از خود جاری ہوا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حضرت ہاجر علیہا السلام کی کرامت کا اظہار ہے۔ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ آبِ زمزم حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں رگڑنے سے جاری ہوا اور یہ اُن کا ارہاص تھا (یعنی اعلانِ نبوت سے پہلے ظاہر ہونے والی خلافِ عادت بات تھی)۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ زمزم کا پانی فرشتے کے پَر مارنے کی وجہ سے جاری ہوا' جیسا کہ صحیح بخاری کی زیرِ بحث روایت میں صراحت کے ساتھ ہے اور بعض روایات میں حضرت جبریل کا نام مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زمزم کا پانی حضرت جبریل کے ایڑی مارنے کی وجہ سے اور حضرت اسماعیل کو سیراب کرنے کے لیے وجود میں آیا۔ (سنن دار قطنی: ۲۷۱۳۰' المستدرک ج ۱ ص ۴۷۳' سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۰۲' بحوالہ تبیان القرآن ج ۶ ص ۲۰۴) راقم کے نزدیک ان تینوں اقوال میں جو سب سے زیادہ قوی اور صحیح قول ہے وہ یہی تیسرا قول ہے کہ زمزم کا پانی حضرت جبریل کے پَر مارنے کی وجہ سے ظاہر ہوا۔ کیونکہ اس کی صراحت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے اور جس قول کو رسول اللہ ﷺ کی تائید حاصل ہو وہی قول سب پر مقدم اور معتمد و مستند ہے۔ سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حق فرمایا: اذا صح الحدیث فھو مذھبی. جب کوئی حدیث سندِ صحیح کے ساتھ مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ (فتاویٰ شامی ج ۱ ص ۱۵۴' طبع جدید)

[287] یہ یمن کا ایک قبیلہ ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔

اچھے لگے تو انہوں نے اپنی ایک عورت کا ان سے نکاح کر دیا اور حضرت اسماعیل کی والدہ فوت ہو گئیں' حضرت اسماعیل کی شادی ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اہل وعیال کے احوال معلوم کرنے کے لیے آئے' انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو موجود نہ پایا تو ان کی بیوی سے ان کے متعلق معلوم کیا' اس نے کہا: وہ ہمارے لیے کچھ چیزیں لینے گئے ہیں (دوسری روایت میں ہے وہ شکار کرنے گئے ہیں) پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے حالات اور گزر اوقات کے متعلق ان سے پوچھا' اس نے کہا: ہم بہت بُرے حالات میں ہیں' اور ہم بہت تنگی اور سختی میں ہیں اور ان سے شکایت کی' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تمہارا خاوند آئے تو تم اس سے میرا سلام کہنا اور اس سے کہنا کہ وہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر لے' جب حضرت اسماعیل آئے تو ان کو کچھ تغیر محسوس ہوا' انہوں نے پوچھا: کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا' بیوی نے کہا: ہاں! اس اس شکل کا ایک بوڑھا آیا تھا' اس نے تمہارے متعلق پوچھا تو میں نے اس کو بتایا' اس نے مجھ سے پوچھا: تمہارے حالات کیسے ہیں؟ تو میں نے اس کو بتایا کہ ہم بہت جفاکشی اور سختی کے ایام گزار رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل نے پوچھا: کیا انہوں نے کسی چیز کی وصیت کی تھی؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں آپ کو ان کا سلام کہوں اور وہ یہ کہتے تھے کہ تم اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو تبدیل کر لو' حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: وہ میرے والد تھے اور انہوں نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تم سے علیحدہ ہو جاؤں'[٢٨٨] تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ' انہوں نے اس کو طلاق دے دی' اور ان لوگوں میں دوسری شادی کر لی' اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا حضرت ابراہیم علیہ السلام ٹھہرے رہے' پھر کچھ عرصہ بعد آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں ملے' وہ ان کی بیوی کے پاس گئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق سوال کیا' ان کی بیوی نے کہا: وہ ہمارے واسطے کچھ لینے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: تمہارا کیا حال ہے؟ اور ان کی گزر اوقات کے متعلق سوال کیا' ان کی بیوی نے کہا: ہم خیریت سے ہیں اور بہت خوش حال ہیں' اور انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: تم لوگ کیا کھاتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم گوشت کھاتے ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: اور تم لوگ کیا پیتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم پانی پیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما' اور نبی ﷺ نے فرمایا: اس وقت ان لوگوں کے پاس اناج نہیں تھا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے لیے اس میں بھی برکت کی دعا کرتے' پھر آپ نے فرمایا کہ صرف ان دو چیزوں (گوشت اور پانی) پر مکہ مکرمہ کے سوا اور کسی جگہ گزارہ نہیں ہو سکتا' صرف یہ دو چیزیں اور جگہوں پر مزاج کے موافق نہیں ہوں گی'[٢٨٩] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جب تمہارا شوہر آئے تو اس کو میرا سلام کہنا اور اس سے کہنا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو قائم رکھے' جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا: کیا کوئی شخص تمہارے پاس آیا تھا۔ ان کی بیوی نے کہا: ہاں! ہمارے پاس اچھی شکل وصورت کا ایک بوڑھا شخص آیا تھا' اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کی' انہوں نے مجھ سے ہماری گزر اوقات کے متعلق پوچھا' میں نے ان کو بتایا کہ میں خیریت سے ہوں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا: کیا انہوں نے تم کو کوئی وصیت بھی کی تھی؟ انہوں نے کہا: ہاں! انہوں نے آپ کو سلام کہا' اور آپ کے متعلق یہ حکم دیا کہ آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو قائم رکھیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: یہ میرے والد تھے اور تم

---

٢٨٨ اس سے معلوم ہوا کہ دروازے کی چوکھٹ تبدیل کرنے سے کنایۃً طلاق مراد لی جا سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ "میں نے اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کر لی ہے" اور مراد اس سے طلاق لے تو بیوی پر ایک طلاق واقع ہو جائے گی۔ (فتح الباری ج ٦ ص ٤٩٩)

٢٨٩ یعنی مکہ مکرمہ کے سوا کسی اور جگہ پر صرف گوشت اور پانی پر گزارہ نہیں ہو سکتا' کیونکہ مسلسل گوشت اور پانی کے استعمال سے طبیعت اپنی جگہ برقرار نہیں رہتی۔ لیکن مکہ مکرمہ ایسی مقدس جگہ ہے جہاں صرف گوشت اور پانی پر گزارہ ہو سکتا ہے اور مکہ مکرمہ کی یہ خصوصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور اُن کی برکات کا نتیجہ ہے۔ (عمدۃ القاری ج ١١ ص ٧٧)

چوکھٹ ہو انہوں نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس برقرار رکھوں۔

پھر جب تک اللہ نے چاہا حضرت ابراہیم ٹھہرے رہے، پھر اس کے بعد آئے اس وقت حضرت اسماعیل زمزم کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھے اپنا تیر درست کر رہے تھے، جب انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے ملتا ہے[۲۹۰] پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے اسماعیل! مجھے اللہ نے ایک چیز کا حکم دیا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: آپ وہی کیجئے جس کا آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: آیا تم میری مدد کرو گے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: میں آپ کی مدد کروں گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں اس جگہ بیت اللہ تعمیر کروں اور انہوں نے اس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا جو اپنے اردگرد کی زمین سے کافی بلند تھا، اس وقت ان دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھائیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان پتھروں کو جوڑ جوڑ کر لگاتے تھے، حتیٰ کہ جب بنیادیں زیادہ بلند ہوگئیں تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اس پتھر (مقام ابراہیم) کو لائے اور اس کو دیوار کے ساتھ رکھ دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے رہے اور وہ دونوں یہ دعا کرتے تھے: اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما بے شک تو بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے، وہ دونوں بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے اور بیت اللہ کے گرد طواف کرتے رہے اور یہ دعا کرتے رہتے تھے: اے ہمارے رب! تو ہم سے قبول فرما بے شک تو بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے۔ (صحیح البخاری: ۳۳۶۴، مصنف عبدالرزاق: ۹۱۰۷، مسند احمد: ۲۲۸۵، عالم الکتب)

اس واقعہ کا آخری حصہ ایک روایت کے مطابق اس طرح ہے کہ جب بنیادیں بلند ہوگئیں اور پتھر منتقل کرنے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کمزوری ہونے لگی تو وہ مقام ابراہیم کے پتھر پر کھڑے ہوگئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اُنہیں پتھر دیتے رہے۔ اور دونوں یہ دعا کرتے: اے ہمارے رب! تو ہم سے قبول فرما۔ بیشک تو بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے۔ (صحیح بخاری: ۳۳۶۵)

ایک روایت اس واقعہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ نیچے تشریف لائیے اور اپنا سر دھو لیجئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نیچے نہ اُترے جس کی وجہ سے اُن کی بہو ان کے پاس مقام ابراہیم کا پتھر لے آئیں اور اس کو حضرت ابراہیم کی سیدھی جانب رکھ دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پتھر پر اپنا قدم رکھا تو بہو نے آپ کے سر کی سیدھی جانب کو دھویا۔ پھر وہ اس پتھر کو ان کی اُلٹی جانب لے گئیں اور آپ کے سر کو اُلٹی طرف سے دھویا۔ اس وجہ سے اس پتھر پر آپ کے قدم مبارک کے نشان جم گئے۔

(۱۲۹) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بلاشبہ رُکن اور مقام دونوں جنّت کے یاقوت ہیں[۲۹۱] اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا نور بجھا دیا ہے۔ اگر وہ ان کا نور نہ بجھاتا تو یہ دونوں (رُکن اور مقام) مشرق سے مغرب تک کو روشن کر دیتے[۲۹۲] (سنن الترمذی: ۸۷۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۳، مستدرک ج ۱ ص ۴۵۶)

---

۲۹۰ یعنی ایک دوسرے سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان یہ ملاقات ہوئی، اُس وقت حضرت ابراہیم کی عُمر سو برس تھی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تیس برس کے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۷۷)

۲۹۱ رُکن سے مراد حجرِ اسود ہے اور مقام سے مراد مقامِ ابراہیم ہے۔ یہ دونوں جنت کے پتھر ہیں۔

۲۹۲ ان دونوں کی روشنی کو اللہ تعالیٰ نے باقی کیوں نہیں رکھا؟ اس بارے میں علاّمہ علی قاری فرماتے ہیں کہ شاید ان کی روشنی اس لیے ختم کی گئی ہو تاکہ ایمان ''بالغیب'' رہے۔ یعنی لوگ ایسی چیز پر ایمان لائیں جو انہوں نے دیکھی نہیں ہے۔

☆ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً مروی ہے۔

مقام ابراہیم کو ''مصلّٰی'' بنانے سے کیا مراد ہے؟

زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ''تم مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنالو'' اس کی تفسیر میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جو علماء ''مقام ابراہیم'' سے حج کے مقامات اور اس کی نشانیاں مراد لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''مصلّٰی'' کا معنیٰ ہے: ''مدعی'' دعا کرنے کی جگہ۔ اور یہ ''صلاۃ'' بمعنیٰ دُعاء سے ماخوذ ہے۔ (لہٰذا مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم مقام ابراہیم کو دُعا کرنے کی جگہ بنالو) اور جو علماء ''مقام ابراہیم'' سے خاص پتھر مراد لیتے ہیں اُن کا مؤقف یہ ہے کہ مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس پتھر کو قبلہ (توجہ کا مرکز) بنالو۔ (کیونکہ) لوگوں کو اس پتھر کے پاس نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی قول صحیح ہے کیونکہ ''صلاۃ'' کا لفظ جب مطلقاً بولا جائے تو اس سے سجود والی معروف نماز مراد ہوتی ہے۔ اور اس لیے بھی یہ قول صحیح ہے کہ آدمی کا مصلّٰی اُس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں وہ نماز پڑھتا ہے۔

﴿عَهِدْنَآ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا اور ان پر لازم اور واجب کیا (کہ وہ بیت اللہ کو پاک رکھیں)۔

''اسماعیل'' کا معنیٰ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام ''اسماعیل'' رکھنے کی وجہ

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام اسماعیل اس لیے رکھا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ وہ اُنہیں بیٹا عطا فرمائے اور دُعا کرتے ہوئے وہ کہتے تھے: ''اسمع یا ایل'' اے خدا! میری دُعا کو سُن لے۔ ''ایل'' سُریانی زبان میں اللہ کو کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹا عطا فرمایا تو اُنہوں نے اُس کا نام ''اسمٰعیل'' رکھا۔

آیت میں فرمایا کہ ''ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کو تاکید فرمائی کہ میرے گھر کو پاک رکھیں''۔ اس میں ''میرے گھر'' سے مراد کعبۃ اللہ ہے اور اس میں جو اضافت ہے وہ کعبۃ اللہ کو شرف و فضیلت اور خصوصیت دینے کے لیے ہے۔

بیت اللہ کو پاک صاف رکھنے کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال کا بیان

کعبۃ اللہ کو پاک رکھنے کا معنیٰ یہ ہے کہ تم دونوں طہارت اور توحید پر اس گھر کی بنیاد رکھو۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تم دونوں اس گھر کو تمام غلاظتوں اور نجاستوں سے پاک رکھنا۔ بعض مفسرین نے معنیٰ یہ کیا ہے کہ تم دونوں اس گھر کو شرک سے بُتوں سے اور جھوٹی باتوں سے پاک رکھنا۔

آیت میں ﴿لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ کا معنیٰ ہے: ''دائرین حولہ'' کعبۃ اللہ کے گرد گھومنے والے۔ اور ﴿الْعٰكِفِيْنَ﴾ کا معنیٰ ہے: ''المقیمن بہ والمجاورین لہ'' بیت اللہ میں ٹھہرنے والے اور اس کا قُرب اختیار کرنے والے۔ ﴿الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ میں ''رکّع'' ''راکع'' کی جمع ہے اور ''السجود'' ''ساجدٌ'' کی جمع ہے اور مراد اس سے نماز پڑھنے والے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''طائفین'' سے مراد مسافرین ہیں، جو باہر سے مکہ مکرمہ حاضر ہوتے ہیں۔ اور ''عاکفین'' سے مراد اہل مکہ ہیں یعنی جو مکہ ہی میں رہتے ہیں۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ مسافرین کے لیے طواف کرنا افضل ہے اور اہل مکہ کے لیے مکہ میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! اس جگہ کو امن والا شہر بنادے اور اس میں رہنے والوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اُن کو پھلوں سے رزق عطا فرما' (اللہ عزوجل نے) فرمایا: اور جس نے کفر کیا اُس کو بھی میں کچھ فائدہ اٹھانے دوں گا پھر اُسے میں دوزخ کی آگ کی طرف جانے پر مجبور کردوں گا اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے O

اس آیت میں ﴿هٰذَا﴾ کا اشارہ مکہ کی طرف ہے اور بعض علماء کے نزدیک حرم کی طرف ہے (یعنی مکہ کو امن والا بنادے یا حرم کو امن والا بنادے)۔ ﴿بَلَدًا اٰمِنًا﴾ سے مراد ایسا شہر ہے جس میں رہنے والوں کو امن و امان حاصل ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مکہ مکرمہ کے لیے دُعائے امن کی وجہ اور حجاج بن یوسف کی لشکر کشی کی توجیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے امن و امان کی دُعا اس لیے کی کہ وہ ایک ایسا شہر تھا جس میں نہ کھیتی باڑی تھی نہ پھل تھے۔ اور اس حالت میں جب اُس میں امن و امان (بھی) نہیں ہوگا تو آس پاس کے شہروں سے کوئی چیز اس میں نہیں پہنچے گی جس کی وجہ سے اس میں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔ سو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دُعا کو قبول فرمایا اور مکہ مکرمہ کو پُر امن شہر بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ پھر جس ظالم و جابر اور سرکش نے کعبۃ اللہ کے خلاف کوئی ارادہ کیا تو اللہ عزوجل نے اس کو ہلاک کردیا۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے اصحابِ فیل اور دیگر متکبروں کے ساتھ سلوک فرمایا۔

یہاں یہ سوال ہو کہ حجاج بن یوسف نے مکہ پر لشکر کشی کی تھی اور اس کو ویران کر دیا تھا (اور یہ امن و امان کے خلاف ہے)؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ حجاج بن[۲۹۳] یوسف کا ارادہ مکہ اور اہل مکہ کے خلاف نہیں تھا اور نہ اس کا ارادہ کعبۃ اللہ کو ویران کرنے کا تھا۔ اس کا مقصد تو صرف حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خلافت سے معزول کرنا تھا اور یہ اُسی طریقہ پر ممکن تھا جس طریقہ کو اُس نے اختیار کیا[۲۹۴] پھر جب اُسے اپنا مقصد حاصل ہو گیا تو اس نے دوبارہ کعبۃ اللہ کو تعمیر کروایا[۲۹۵] اُسے بنایا اور مضبوط بنایا اور اس کی عزت و حرمت کو اُونچا کیا اور مکہ والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے حرم بنایا گیا یا اُن کی دُعا سے پہلے بھی وہ حرم تھا؟۔۔۔۔۔

اس بارے میں دو مختلف اقوال اور ان پر دلائل

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے پہلے بھی حرم تھا یا اُن کی دُعا کی وجہ سے حرم بنا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے پہلے بھی حرم تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

(۱۳۰) بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو اُسی دن حرم بنادیا تھا جس دن اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا۔

(صحیح بخاری: ۱۸۳۴' صحیح مسلم: ۱۳۵۳' السنن الکبریٰ للبیہقی ج۵ ص۱۹۵' مسند احمد ج۱ ص۲۵۹' مشکوٰۃ المصابیح ص۲۳۷)

۲۹۳ حجاج بن یوسف' عبدالملک بن مروان کی طرف سے عراق اور خراسان کا حاکم تھا۔ ماہِ شوال ۹۵ھ میں مقام واسط میں ہلاک ہوا۔ ظلم و جبر میں بہت مشہور اور معروف تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قبیلۂ ثقیف میں ایک جھوٹا ہوگا اور ایک ہلاک کرنے والا۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: جھوٹا تو مختار بن ابی عبید ہے اور ہلاک کرنے والا حجاج بن یوسف ہے۔ ہشام بن حسان نے کہا کہ جن لوگوں کو حجاج نے باندھ کر قتل کیا ہے اُن کو گنو۔ جب گنتی کی گئی تو ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ (سنن ترمذی: ۳۹۴۴' مسند احمد ج۲ ص۸۷' مشکوٰۃ المصابیح ص۵۵۱)

۲۹۴ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح مسلم: ۲۵۴۵' مشکوٰۃ المصابیح ص۵۵۱' مرأۃ المناجیح ج۸ ص۲۹۷' شرح صحیح مسلم ج۶ ص۱۲۴۱

۲۹۵ ۷۳ھ میں عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تعمیر کو منہدم کردیا اور دوبارہ قریش کی بناء پر کعبہ کو بنادیا اور آج تک کعبہ اسی بناء قریش پر قائم ہے۔

دوسری دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول ہے:

اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ (ابراہیم: ۳۷) بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے نزدیک بے آب و گیاہ وادی میں ٹھہرا دیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کا تقاضا یہ ہے کہ مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے پہلے بھی حرم تھا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی وجہ سے حرم بنا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

(۱۳۱) بے شک ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا اور میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں۔[۲۹۶] (صحیح مسلم: ۴/۱۳۷۴، السنن الکبریٰ للبیہقی ج۵ص۱۹۷، مشکوٰۃ المصابیح ص۲۳۹۔ اس کی مثل امام بخاری اور امام بغوی نے بھی روایت کیا ہے۔ صحیح بخاری: ۳۳۶۷-۴۰۸۴، شرح السنۃ: ۲۰۱۰)

مفسّر (علامہ خازن علیہ الرحمۃ) کی مذکورہ دونوں اقوال میں تطبیق

مذکورہ دونوں اقوال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو اُسی دن حرم بنا دیا تھا جس دن اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا۔ جیسا کہ خود نبی اکرم ﷺ نے خبر دی کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو اُسی دن حرم بنا دیا تھا جس دن اُس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے محترم ہونے کو کسی نبی اور رسول کے ذریعہ ظاہر نہیں فرمایا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس شہر کی ہر بدخواہ سے حفاظت فرماتا رہا اور اس شہر میں اور اس میں بسنے والوں سے مصائب اور سزائیں دور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اقامت پذیر کیا اور ان کے گھر والوں کو وہاں ٹھہرایا۔ اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل کی بارگاہ میں درخواست کی کہ وہ ان کے ذریعہ اپنے بندوں پر مکہ مکرمہ کا حرم ہونا ظاہر فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دُعا کو قبول فرمایا اور اپنے بندوں پر لازم کر دیا کہ وہ مکہ مکرمہ کو حرم سمجھیں۔ یوں مکہ مکرمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے حرم بنا اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض فرما دیا کہ وہ مکہ کو حرم سمجھیں اور اس سرزمین کی اور اس کے درخت اور جانور کی بے حرمتی سے باز رہیں۔

یہ ہے وہ تطبیق جو مذکورہ دونوں احادیث کے درمیان ہے اور یہی دُرست ہے۔[۲۹۷]

---

۲۹۶ یعنی میں اس کو قابلِ احترام اور لائقِ تعظیم بناتا ہوں۔ یہ مراد نہیں ہے کہ جس طرح مکہ حرم ہے اس طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور جس طرح مکہ میں درختوں کو کاٹنا اور جانوروں کو شکار کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح مدینہ طیبہ میں بھی جائز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو احادیث میں سرکار دو عالم ﷺ مدینہ منورہ میں شکار سے منع فرما دیتے۔ حالانکہ روایات سے ثابت ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ منورہ میں شکار کرنے کی جگہ بتائی اور فرمایا کہ اگر تم مقام عقیق میں شکار کرتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔ (شرح معانی الآثار ج۲ص۲۸۶، عمدۃ القاری ج۷ص۵۷۰) امام احمد، امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک مدینہ منورہ کے حرم ہونے کا وہی معنی ہے جو مکہ کے حرم ہونے کا ہے، یعنی مدینہ منورہ میں بھی درختوں کو کاٹنا اور اس کے جانوروں کو شکار کرنا جائز نہیں ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف سے مذکورہ حدیث (جس میں خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمہ کو مدینہ منورہ میں شکار کرنے کی جگہ بتائی) اور اس طرح کی دیگر روایات ائمہ ثلثہ پر حجت ہیں۔

۲۹۷ علامہ علی قاری حنفی نے بھی اس تطبیق کو ذکر کیا ہے اور اس کو تحقیق کے مطابق قرار دیا ہے۔ (مرقات ج۵ص۵۹۶)

زیرِ بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھلوں کے رزق کی دُعا اس لیے کی کہ مکہ میں کوئی زراعت اور پھل نہیں تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس دُعا کو قبول فرمایا اور مکہ مکرمہ کو حرم اور ایسی پُرامن جگہ بنادیا جہاں ہر طرف سے پھل لائے جاتے ہیں۔[298]

اس آیت میں جو فرمایا: ﴿مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اہل مکہ میں سے خاص طور پر ایمان والوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔ ایمان والوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ عزوجل سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اُن کی اولاد میں نبوت اور امامت کو مقرر فرما دے، تو ان کی اس دُعا کو اللہ تعالیٰ نے یوں قبول فرمایا تھا کہ:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرہ:۱۲۴) میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

یہ جُملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بہ طور تادیب تھا یعنی اس کے ذریعہ مانگنے اور سوال کرنے کا طریقہ سکھایا گیا۔ لٰہذا لازمی ہو گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع پر اپنی دُعا میں خصوصاً مؤمنین کا ذکر کریں۔

پھر (آیت کے اگلے حصہ میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے کفر کیا اس کو بھی میں کچھ فائدہ اٹھانے دوں گا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ دنیاوی رزق میں مؤمن اور کافر دونوں برابر ہیں۔ اس آیت میں کافر کو فائدہ پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ میں اُسے بھی رزق دوں گا۔ ﴿قَلِيْلًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ دُنیا میں اُس کی زندگی کے آخر تک اُسے رزق دوں گا۔ اور (یقیناً) یہ مدت قلیل ہے کیونکہ یہ ختم ہو جائے گی۔

اس آیت میں ہے کہ پھر میں اُسے دوزخ کی آگ کی طرف جانے پر مجبور کر دوں گا یعنی میں اُسے زبردستی جہنم میں داخل کروں گا۔

آیت کے آخر میں جو فرمایا کہ ''اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جہاں کافر جائے گا یعنی عذاب، وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل (علیہما السلام) خانۂ کعبہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (اور یہ دُعا کر رہے تھے) کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری طرف سے اس (عبادت) کو قبول فرما، بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے ○

کعبۃ اللہ کی تعمیر کا تفصیلی واقعہ اور اس کے بارے میں مختلف روایات[299]

علماء اور مؤرخین کے بیان کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر کا قصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین کو پیدا کرنے سے دو

---

۲۹۸ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (القصص:۵۷)

کیا ہم نے اُنہیں امن والے حرم میں جگہ نہ دی جس کی طرف ہر جانب سے پھل لائے جاتے ہیں (اور وہ پھل) ہماری طرف سے بہ طور رزق ہیں لیکن اُن میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ○

۲۹۹ تفسیر بغوی کے محقق شیخ عبدالرزاق المہدی نے لکھا ہے کہ یہ روایات نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہیں اور جن مآخذ سے یہ روایات ثابت ہیں وہ ہمارے لیے قابلِ حجت نہیں ہیں۔

ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف کی جگہ کو پیدا کیا اور یہ جگہ پانی کی سطح پر سفید جھاگ کی طرح تھی۔ پھر اس کے نیچے زمین کو بچھایا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو اُنہیں وحشت اور اجنبیت محسوس ہوئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے جنت کے یاقوتوں سے بنا ہوا بیت المعمور اُتارا۔ اُس میں دو دروازے تھے جو کہ سبز زُمرّد کے بنے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک دروازہ مشرقی تھا اور ایک مغربی۔ اس گھر کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ رکھ دیا اور فرمایا: اے آدم! میں نے تمہارے لیے ایک گھر اُتارا ہے۔ اُس کا تم طواف کیا کرو گے جیسے میرے عرش کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور تم اس گھر کے پاس نماز ادا کرو گے جیسے میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر حجر اسود کو اتارا۔ حجر اسود پہلے سفید تھا' بعد میں زمانۂ جاہلیت کی حیض والی عورتوں کے چھونے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔ (جب کہ صحیح حدیث میں یہ ہے کہ بنی آدم کی خطاؤں نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا۔ مترجم غفرلہٗ) جب اللہ تعالیٰ نے بیت المعمور اور حجر اسود کو اُتارا تو حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان سے مکہ مکرمہ کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف ایک فرشتہ بھیج دیا جو آپ کو بیت اللہ کا راستہ بتا رہا تھا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ کا حج کیا اور مناسکِ حج ادا کیے۔ جب فارغ ہوئے تو فرشتوں نے آپ سے ملاقات کی اور آپ کو بتایا کہ اے آدم! آپ کا حج مقبول ہو گیا ہے۔ اور آپ سے دو ہزار سال پہلے ہم بھی اس گھر کا حج کر چکے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے مکہ مکرمہ تک پیدل چل کر چالیس مرتبہ حج کیا۔

کعبۃ اللہ کی یہ عمارت طوفان کے دنوں تک اسی طرح باقی رہی' پھر اس کو اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان پر اٹھالیا۔ اور وہاں پر وہ "بیت المعمور" ہے۔ اس کی زیارت کے لیے ہر روز اس میں ۷۰ ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد اُن فرشتوں کو دوبارہ موقع نہیں ملتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو بھیجا تاکہ وہ حجر اسود کو جبل ابوقبیس میں چھپا دیں تاکہ یہ طوفان میں ڈوبنے سے محفوظ رہے۔ اُس وقت سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک بیت اللہ کی جگہ خالی رہی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسماعیل واسحاق کی ولادت کے بعد حکم فرمایا کہ وہ ایک گھر تعمیر کریں جس میں ذکر و اذکار اور عبادت کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ اُن کو گھر تعمیر کرنے کی جگہ بتا دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جگہ کے تعیّن کے لیے سکینہ بھیجی۔ سکینہ سے مراد یہ ہے کہ ایک ریح خجوج (تیز ہوا) بھیجی۔ اس کے سانپ کی طرح دو سر تھے۔ "خجوج" اُس ہوا کو کہتے ہیں جو سخت ہو اور تیز چلتی ہو۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہوا ہے جو چلنے میں ٹیڑھا پن دکھاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ جہاں یہ ہوا ٹھہر جائے وہاں تم گھر کو تعمیر کر دینا۔ سو حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس ہوا کے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ وہ بیت اللہ کی جگہ پہنچی اور طوق کی شکل میں وہ اُس جگہ اس طرح معلّق ہو گئی جس طرح چمڑے کی ڈھال کو طوق بنایا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے کعبہ کی عمارت کے برابر بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا' وہ چلتا رہا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کے سائے میں چلتے رہے یہاں تک کہ وہ ٹکڑا بیت اللہ کی جگہ جا کر ٹھہر گیا اور اس ٹکڑے سے آواز آئی: اے ابراہیم! اس ٹکڑے کے سائے کی مقدار ایک عمارت بناؤ۔ وہ عمارت اس ٹکڑے سے زیادہ ہو نہ کم۔

بعض علماء نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جو ہوا بھیجی گئی تھی اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے کعبۃ اللہ کے اردگرد کو اتنا صاف کر دیا کہ کعبہ کی پہلی بنیاد ظاہر ہو گئی۔ یہ بات اللہ عزوجل کے درج ذیل فرمان میں موجود ہے:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ. (الحج:۲۶) اور (یاد کیجئے) جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کو تعمیر کرنے کی جگہ مقرر فرمادی۔

سو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کو تعمیر کیا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کو بناتے تھے اور اسماعیل علیہ السلام اُنہیں پتھر لا کر دیتے تھے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اور (یاد کرو) جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اُٹھارہے تھے''۔

اس آیت میں ﴿الْقَوَاعِدَ﴾ کا لفظ ہے جو کہ ''قَاعِدَة'' کی جمع ہے اور ''قاعده'' کا معنیٰ ہے: گھر کی بنیاد۔ اور بعض علماء کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: گھر کی دیوار۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں (کے پتھروں) سے بیت اللہ کو تعمیر کیا۔ (۱) طورسیناء (۲) طور زیتاء (۳) لبنان۔ یہ ملک شام کا ایک پہاڑ ہے۔ (۴) جودی۔ یہ جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے۔ (۵) بیت اللہ کی بنیادوں کی تعمیر اُنہوں نے حراء کے ذریعہ کی جو کہ مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑ ہے۔

تعمیر کعبہ کے دوران جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حجر اسود کی جگہ پر پہنچے تو حضرت اسمٰعیل سے فرمایا: تم میرے پاس ایک خوب صورت پتھر لے آؤ' جو لوگوں کے لیے نشانی بن جائے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ایک پتھر لے کر آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اس سے بھی زیادہ خوب صورت پتھر لے کر آؤ۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اُس پتھر کی تلاش میں نکل پڑے۔ اتنے میں جبل ابوقبیس سے آواز آئی: اے ابراہیم! میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے' آپ اُس کو لے لیں۔ پھر اُس پہاڑ نے حجر اسود کو باہر نکالا۔ حضرت ابراہیم نے اس کو لے کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی سات بادشاہوں کے ذریعہ امداد فرمائی' جو کہ اُن کے ساتھ بیت اللہ کی تعمیر میں تعاون کر رہے تھے'' جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو دونوں نے عرض کیا: ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ''۔ اس آیت میں ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ کا جو جملہ ہے اس میں کچھ کلمات پوشیدہ ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! جو کچھ ہم نے کام کیا ہے اور جو ہماری جانب سے تیری اطاعت و عبادت ہے اُس کو ہم سے قبول فرما۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ بے شک تو ہماری دعاؤں کو بہت سننے والا اور نیتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

اے ہمارے پروردگار! ہمیں خاص اپنا فرمانبردار بنادے اور ہماری اولاد میں سے ایک قوم کو خاص اپنی فرمانبردار بنادے اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے تعلیم فرما اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرما' بے شک تو بہت توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے ○

حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی اس دُعا کی تفسیر اور توجیہ کہ ''ہمیں خاص اپنا فرمانبردار بنادے''

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ﴾ یعنی ہمیں توحید پرست' مخلص' اطاعت گزار اور اپنے آگے جھکنے والا بنادے۔

اگر تم یہاں سوال کرو کہ اس آیت میں ﴿مُسْلِمَیْنِ﴾ سے مراد یا تو دین اور اعتقاد ہے یا اس سے مراد ہے سر جھکانا اور فرمانبرداری کرنا' اور یہ دونوں ہی چیزیں دعا کے وقت حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو حاصل تھیں۔ پھر ان کے طلب کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو میں کہوں گا کہ اس کا جواب دو طریقوں سے ہے:

ایک طریقہ یہ ہے کہ اسلام (ماننا اور سر جھکانا) ایسی صفت ہے جو دل کے ساتھ قائم ہے اور بعض اوقات یہ باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی اس دُعا کا معنیٰ یہ ہے کہ ہمیں مستقبل میں مسلمان اور فرمانبردار رکھنا۔ اور یہ دُعا اُن کے اُس وقت مسلمان اور فرمانبردار ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

دوسرا طریقہ جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس دُعا سے ایمان کے زیادہ ہونے کی طلب مراد ہو۔ گویا حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنے یقین اور تصدیق میں اضافہ کی درخواست کی۔ اور یہ بھی اُن کے اُس وقت یقین اور تصدیق کے پائے جانے کے خلاف نہیں ہے۔

﴿ذُرِّیَّتِنَآ﴾ کا معنیٰ ہے: اولاد۔ ﴿اُمَّۃً﴾ سے مراد ہے: جماعت۔ اور ﴿مُسْلِمَۃً﴾ کا معنیٰ ہے: ایسی جماعت جو جھکنے والی اور فرمانبردار ہو۔

حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کا اپنی دُعا میں بعض اولاد کو خاص کرنا

زیر بحث آیت میں ''ذریتنا'' پر تبعیض کا ''مِنْ'' داخل کیا گیا ہے (یعنی ہماری اولاد میں سے بعض کو خاص اپنا فرمانبردار بنا دے) اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو پہلے بتا دیا تھا کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ چونکہ ان کی اولاد میں ظالم موجود تھے اس لیے دعا کے وقت انہوں نے بعض اولاد کو خاص کیا۔

حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے صرف اپنی اولاد کے لیے دُعا کی' باقی کے لیے نہیں کی؟

اگر تم یہاں سوال کرو کہ دُعا میں اپنی اولاد کو خاص کیوں کیا گیا؟ تو میں کہوں گا کہ اولاد اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ اُس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کی جائے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا. اے ایمان والو! تم اپنی جان اور گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔ (التحریم:۶)

سو ہمدردی اور خیر خواہی کی بنیاد پر اُنہوں نے صرف اپنی اولاد کے لیے دُعا کی۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ (بہ ظاہر تو انہوں نے صرف اپنی اولاد کے لیے دُعا کی لیکن حقیقتاً وہ دُعا سب کے لیے تھی) اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد اگر صالح اور نیک ہو تو اس سے دوسرے لوگ بھی صالح بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ لوگوں میں جو عُلماء اور کُبراء ہوئے ہیں وہ اگر درست ہوتے تھے تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے دُرستگی کا سبب بنتے تھے (بس اسی طرح حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے دُعا میں صرف اپنی اولاد کا تذکرکیا' لیکن واقعتاً وہ دُعا سب کے لیے تھی)۔

اس آیت میں جو لفظ ﴿اُمَّۃً﴾ ہے اس کے بارے میں بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد سیدنا محمد ﷺ کی اُمت ہے۔ کیونکہ ان کی دُعا میں یہ جملہ بھی ہے:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ. (البقرہ:۱۲۹) اے ہمارے پروردگار! تو ان لوگوں کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

(اس آیت میں رسول کی بعثت کی دُعا اس بات کی دلیل ہے کہ زیر بحث آیت میں ﴿اُمَّۃً﴾ سے مراد سیدنا محمد ﷺ کی

امّت ہے۔)

﴿اَرِنَا﴾ کا معنیٰ ہے: ہمیں ہمارے مناسک تعلیم فرما اور بصیرت عطا فرما۔﴿مناسک﴾ کا معنیٰ ہے: دین کے احکام اور حج کی علامات۔ بعض علماء نے ''مناسک'' کا معنیٰ کیا ہے: ''مذابح'' یعنی ذبح کرنے کی جگہیں' کیونکہ 'مناسک'' ''نسک'' سے ہے اور ''نسک'' اُس جانور کو کہتے ہیں جس کو ذبح کیا جائے۔ بعض علماء نے ''مناسک'' کا معنیٰ کیا ہے: ''متعبدات'' یعنی عبادت کرنے کے مقامات۔ کیونکہ ''نسک'' کا اصل معنیٰ عبادت کرنا ہے اور ''ناسک'' عبادت گزار کو کہتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے یہ دُعا کی کہ ہمیں ہماری عبادت کے طریقے تعلیم فرما تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دُعا کو قبول فرمایا اور جبرئیل کو اُن کی طرف بھیج دیا۔ جبرئیل نے اُن دونوں کو عرفہ کے دن (یعنی ۸ ذوالحجہ کو) مناسک بتائے۔ جب وہ عرفات میں پہنچے تو جبرئیل نے پوچھا: ''عرفت یا ابراھیم؟'' اے ابراہیم! کیا آپ نے پہچان لیا؟ اُنہوں نے کہا: ہاں۔ سو جب سے اُس دن کا نام عرفہ اور جگہ کا نام عرفات پڑ گیا۔[۳۰۰]

﴿وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ کا معنیٰ ہے: ہم سے درگزر فرما۔ اور ﴿تواب﴾ کا معنیٰ ہے: اپنے بندوں سے بہت درگزر فرمانے والا۔

انبیاء کرام سے گناہوں کے صُدور کو ممکن ماننے والے علماء کا زیرِ بحث آیت سے استدلال اور اس کے جوابات

جو لوگ انبیاء کرام سے گناہوں کے صدور کو ممکن مانتے ہیں اُنہوں نے زیرِ بحث آیت میں ''وتب علینا'' سے استدلال کیا ہے' اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ اُسی صورت میں مانگی جاتی ہے جب پہلے گناہ کیا ہو۔ اگر پہلے کوئی گناہ نہ کیا ہو تو توبہ کرنا بلاوجہ ہوگا۔

اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بندہ اپنے رب عزوجل کی فرمانبرداری میں کتنا ہی کوشاں کیوں نہ رہتا ہو اُس سے کسی نہ کسی وقت کوتاہی ہو جاتی ہے خواہ یہ کوتاہی سہو کی صورت میں ہو یا کسی اولیٰ اور افضل کام کو ترک کرنے کی صورت میں ہو۔ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا بھی اسی بنیاد پر تھی (یعنی کسی سہو کے صادر ہونے پر یا کسی افضل کام کو ترک کرنے پر توبہ کی دُعا کر رہے تھے)۔

بعض علماء نے استدلال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ ہوسکتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دیا ہو کہ ان کی اولاد میں کون ظالم ہوگا؟ اور جب اللہ عزوجل کی جانب سے اس کا معلوم ہو جانا ممکن ہے تو پھر یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان ہی ظالموں کے لیے توبہ کی درخواست کی ہوگی۔ اور اب ''وتب علینا'' کا معنیٰ یہ ہوگا کہ: ہماری اولاد میں جو ظالم ہیں اُن پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرما تا کہ وہ دوبارہ تیری فرمانبرداری اختیار کرلیں۔ حاصل یہ ہے کہ ''وتب علینا'' کا ظاہر تو یہی ہے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اپنے لیے توبہ کی دُعا کر رہے ہیں لیکن مراد اُن کی اس دُعا سے اپنی اولاد ہے۔

بعض علماء نے استدلال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ ہوسکتا ہے بیت اللہ شریف' جو کہ تمام مقامات میں قبولیت کے سب سے زیادہ لائق ہے اُس کی بنیادوں کو اٹھاتے وقت حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے مذکورہ دُعا کی ہو۔ تا کہ وہاں دُعا کرنا ایک طریقہ اور معمول بن جائے اور بعد میں آنے والے لوگ اس دُعا میں اُن کی پیروی کریں۔ کیونکہ بیت اللہ ایسی جگہ ہے جہاں گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار اور دُعا کی جاتی ہے۔

---

[۳۰۰] علاوہ ازیں یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ چونکہ حضرت آدم اور حضرت حواء (علیہما السلام) نے اُسی میدان میں ایک دوسرے کو پہچانا' اس لیے اس کا نام ''عرفات'' پڑ گیا۔ (تفسیرات احمدیہ ص ۹۶)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں ان ہی میں سے ایک عظمت والا رسول بھیج دے جو ان لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے' انہیں کتاب اور حکمت کی باتیں سکھائے اور ان کے باطن کو صاف کر دے' بے شک تو بہت غلبہ اور بے حد حکمت والا ہے O

﴿فِيهِمْ﴾ سے مراد امتِ مسلمہ ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے' یعنی وہ عرب جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں (اب آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ امت مسلمہ میں یا اہل عرب میں ایک عظیم رسول بھیج دے)۔ ﴿رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسا رسول جو ان لوگوں کو اسلام کی طرف بلائے اور دین کو اس کی تشریح کے ساتھ مکمل کر دے۔ اور جب یہ رسول اُن ہی لوگوں میں سے ہوگا تو لوگ اس رسول کے نسب اور اس کی پیدائش سے واقف ہوں گے۔ اور لوگ جب اس رسول سے واقف ہوں گے تو اس کے پیغام کو قبول کرنا زیادہ متوقع ہوگا اور دوسری قوم کے رسولوں کی بہ نسبت یہ رسول لوگوں پر زیادہ مہربان ہوگا۔

زیر بحث آیت میں ''رسولا منهم'' سے کون مراد ہے؟

مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''رسولا منهم'' سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد سیدنا محمد ﷺ کی ذات ہے۔ امام بغوی اپنی سند کے ساتھ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۳۲) بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس میں اُس وقت بھی خاتم النبیین (آخری نبی) لکھا ہوا تھا جب آدم (علیہ السلام) اپنی مٹی میں گندھے ہوئے تھے (یعنی پیدائش کے مرحلہ میں تھے) اور میں تمہیں اپنے معاملہ کا آغاز بتاتا ہوں: میں حضرت ابراہیم کی دُعا اور حضرت عیسیٰ کی بشارت ہوں اور اپنی والدہ کا وہ نظارہ ہوں جو انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا تھا[١٣٠] اس وقت ان کے سامنے ایک ایسی چمکتی دمکتی روشنی ظاہر ہوئی تھی جس کی وجہ سے شام کے محلات اُن کے لیے روشن ہو گئے تھے۔

(شرح السنہ للامام البغوی: ٣٦٢٦' مسند احمد ج ٣ص ١٢٧' تاریخ کبیر للامام البخاری ج ٦ص ٦٨' صحیح ابن حبان: ٦٤٠٤' دلائل النبوۃ للبیہقی ج ١ص ٨٠' مشکوٰۃ المصابیح ص ٥١٣' مطبوعہ کراچی)

حدیث مذکور: (۱۳۲) کی مختصر تشریح

اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''لمنجدل في طينة'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسم مٹی کی شکل میں گُندھا ہوا تھا اور اُس میں روح نہیں ڈالی گئی تھی (اُس وقت بھی میں اللہ عزوجل کے پاس آخری نبی لکھا ہوا تھا)۔

اس حدیث میں جو فرمایا کہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہوں اس سے مراد زیر بحث آیت ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی ہے کہ ''اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دے''۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت

[١٣٠] حدیث شریف کے الفاظ ہیں: ورؤيا امّي التي رأت حين وضعتني. یہاں ''رؤیا'' کا معنیٰ خواب نہیں ہے بلکہ نظارہ ہے۔ کیونکہ سیدہ آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواب ولادت سے پہلے دیکھا تھا اور نبی اکرم ﷺ جس نور کا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ حضرت آمنہ نے ولادتِ مبارکہ کے وقت بیداری میں دیکھا تھا۔ (مراۃ المناجیح ج ٨ص ٣٩)

ابراہیم کی اس دُعا کو قبول فرمایا اور آخرِ زمانہ میں سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کے ذریعہ لوگوں کو کفر اور ظلم سے نجات عطا فرمائی۔

حدیثِ مذکور میں جو فرمایا کہ میں عیسیٰ کی بشارت ہوں اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ہے:

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ (الصف:۶)

(اے بنی اسرائیل!) میں اللہ کی جانب سے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں تا کہ میں اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کروں اور اُس رسول کی خوشخبری سناؤں جو میرے بعد تشریف لائیں گے اور اُن کا نام احمد ہے۔

زیر بحث آیت میں نبی اکرم ﷺ کے لیے بیان کیے جانے والے تین مناصب کی تشریح

﴿ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ ﴾ ایسا رسول مبعوث فرما جو انہیں وہ باتیں سُنائے جو تو اُس رسول کی طرف وحی فرمائے۔ اور وہ قرآن کریم ہے جو کہ سیدنا محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن کریم ہی کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اس لیے ضروری ہے کہ اس آیت میں ''ایاتک'' سے مراد قرآن کریم لیا جائے۔

﴿ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رسول لوگوں کو کتاب کے معانی اور حقائق کی تعلیم دے۔ کیونکہ قرآن کریم کے نزول کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ اس میں توحید و نبوت کے دلائل اور احکام شرعیہ موجود ہیں اُن کی تعلیم دی جائے۔ اس لیے سب سے پہلے جو بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی وہ ہے قرآن کریم کی تلاوت۔ یعنی اس کو یاد کرنا اور اس کو پڑھنا۔ تا کہ یہ کتاب تحریف اور تبدیلی سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس کتاب کے حقائق اور اس کے اسرار و رموز کی تعلیم دی جائے۔

حکمت کی تعریف اور زیر بحث آیت میں حکمت کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

اس آیت میں ﴿ وَالْحِكْمَةَ ﴾ کا لفظ ہے۔ یعنی وہ رسول لوگوں کو حکمت کی تعلیم دے۔ حکمت کا معنیٰ ہے: قول و عمل کا درست ہونا۔ کسی بھی شخص کو ''حکیم'' (دانا) اُسی وقت کہا جا سکتا ہے جب اُس میں یہ دونوں چیزیں جمع ہوں (یعنی وہ اپنے قول میں بھی درست ہو اور عمل میں بھی درست ہو)۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حکمت اُس چیز کو کہتے ہیں جو جہالت اور خطا سے روکے۔ اور یہ معنیٰ اُسی صورت میں حاصل ہوگا جب قول و عمل میں درستگی پائی جائے اور ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ چیزوں کو اُن کے حقائق کے ساتھ جاننا حکمت کہلاتا ہے۔

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ زیر بحث آیت میں حکمت سے کیا مراد ہے؟ ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے پوچھا کہ حکمت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دین کی پہچان، اُس کی سمجھ اور اُس کی اتباع کا نام ''حکمت'' ہے۔ حضرت قتادہ کا قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد سنّت ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے جو چیز بیان فرمائی وہ ہے قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی تعلیم۔ پھر اس پر ''حکمت'' کا عطف کیا ہے (یعنی قرآن مجید کے بعد حکمت کو بیان کیا ہے)۔ لہٰذا (بہ تقاضائے عطف) ضروری ہے کہ حکمت سے کوئی اور چیز مراد ہو اور وہ صرف سنّت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حکمت اللہ عزوجل کے اُن احکامات کو جاننے کا نام ہے، جن کا علم اور معرفت صرف رسول اللہ ﷺ کے بیان سے حاصل ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز کا نام حکمت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ احکام اور قضاء کی معرفت کا نام حکمت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کو سمجھنا حکمت ہے۔ اب آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رسول لوگوں کو

قرآن کے بیان کردہ احکام اور حکمت کی تعلیم دے، یعنی وہ باتیں جو دینی مصلحتوں اور شرعی احکام سے متعلق ہیں اُن کی تعلیم دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر وہ بات جس سے تمہیں کچھ نصیحت یا اچھی بات کی طرف دعوت ملے یا تمہیں بُرے فعل سے روک دے وہ حکمت ہے۔

زیرِ بحث آیت میں اگلا جملہ ہے: ﴿وَیُزَکِّیْهِمْ﴾ یعنی (ایسا رسول مبعوث فرما جو) لوگوں کو شرک سے، بُتوں کی پوجا سے تمام نجاستوں سے، ناشائستہ حرکات سے اور خامیوں سے پاک صاف کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "یـزکیهم" تزکیہ سے مشتق ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن اس بات کی گواہی دیں کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام نے لوگوں تک پیغام پہنچا دیا تھا تو اس وقت وہ مبعوث ہونے والا رسول لوگوں کی راست بازی اور درستگی کی گواہی دے۔

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دُعا کی تفسیر کے بعد جاننا چاہیے کہ) انہوں نے اللہ عزوجل کی تعریف پر اپنی دُعا کا اختتام کیا اور یوں عرض گزار ہوئے: "اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ" بے شک تو غلبہ اور حکمت والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ "عـزیـز" اس کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "عـزیز" اس کو کہتے ہیں: جو غالب ہو اور مغلوب نہ ہو سکے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ "عـزیز" اُس شان وشوکت والی ذات کو کہتے ہیں جس تک کوئی نہ پہنچ سکے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "عـزیـز" کا معنیٰ ہے: قوی اور "عـزۃ" کا معنیٰ ہے: قوت۔ اور یہ اہلِ عرب کے اس قول سے ہے کہ وہ سخت زمین کو "ارض عزاز" کہتے ہیں۔

﴿الْحَكِیْمُ﴾ کا معنیٰ ہے: ایسا جاننے والا کہ اُس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حکیم کا معنیٰ ہے: تمام چیزوں کو جاننے والا اور مضبوط بنیاد پر اُن کے ایجاد کرنے کو جاننے والا۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور ابراہیم کے دین سے سوائے اس شخص کے اور کون منحرف ہو سکتا ہے جو بے وقوف ہو، بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں منتخب کر لیا اور بلا شبہ آخرت میں وہ ضرور نیک لوگوں میں ہوں گے ○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دو بھتیجوں (مہاجر اور سلمہ) کو اسلام کی دعوت دی اور اُن سے کہا کہ تم دونوں کو معلوم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے کہ میں اولادِ اسمٰعیل سے ایک نبی مبعوث کرنے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ جو اُس نبی پر ایمان لائے گا وہ ہدایت یافتہ ہوگا اور جو ایمان نہیں لائے گا وہ ملعون ہوگا۔ یہ سُن کر سلمہ نے اسلام قبول کر لیا اور مُہاجر نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ "وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ"۔ یعنی ابراہیم کے دین اور شریعت کو سوائے بے وقوف کے کون چھوڑ سکتا ہے؟ اس میں یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب پر تعریض ہے۔ کیونکہ یہود ونصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت کر کے اور اپنا تعلق اُن سے جوڑ کر فخر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ سارے لوگ بنی اسرائیل تھے اور اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم ہیں۔ اسی طرح اہلِ عرب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ فخر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ جب یہود ونصاریٰ اور اہلِ عرب کی صورت

حال یہ ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تو وہ تھی کہ آپ نے خود نبی اکرم ﷺ کی آخر زمانہ میں بعثت کی دُعا مانگی۔ سو جو شخص اُس رسول پر ایمان لانے سے منحرف ہوگا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہے وہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے منحرف ہوگا۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت سے منحرف ہونے کا معنیٰ ہے: اُن کے دین اور شریعت کو چھوڑ دینا۔ جب کوئی شخص کسی چیز کی خواہش اور ارادہ کرے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''رغب فی الشیئ'' اور جب کوئی شخص کسی چیز کو ترک کر دے تو کہا جاتا ہے: ''رغب عنه''۔

آیت میں جو فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ اس کا معنیٰ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو نقصان میں ڈالے (یعنی ملّتِ ابراہیم سے صرف وہی منحرف ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو نقصان میں ڈالے)۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو شخص ملتِ ابراہیم کو حقیر اور غیر اہم سمجھے۔

(''سَفِهَ'' کا لفظ ''سِفْهٌ'' سے مشتق ہے) اور ﴿سفهٌ﴾ کا اصل معنیٰ ہے: ہلکا ہونا اور بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: جاہل ہونا اور رائے کا کمزور ہونا۔ لہٰذا ہر بے وقوف جاہل ہے۔ اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو پوجے وہ درحقیقت اپنے آپ سے جاہل اور ناواقف ہے' کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا اعتراف ہی نہیں کیا۔ جب کہ روایات میں آتا ہے کہ ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا[۳۰۲]''۔ یعنی آدمی اپنے نفس کے ذلیل' عاجز' کمزور اور فانی ہونے کو پہچانے اور (اسی کے بالمقابل) اپنے رب کی عزت' قدرت' طاقت اور بقاء کو پہچانے۔ اس معنیٰ کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آپ اپنے آپ کو پہچانیے اور مجھے پہچانیے۔ انہوں نے عرض کیا: اے میرے رب! میں اپنے آپ کو اور تجھے کیسے پہچانوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے نفس کو عاجز' کمزور اور فانی ہونے کے ذریعہ پہچانو اور مجھے قوت' قدرت اور بقاء کے ذریعہ پہچانو۔

﴿اصْطَفَيْنٰهُ﴾ کا معنیٰ ہے: ''اخترناه'' ہم نے ابراہیم کو منتخب کرلیا اور چن لیا۔ ﴿الصّٰلِحِيْنَ﴾ سے مراد کامیاب لوگ ہیں۔ اور بعض علماء نے اس سے انبیاء کرام مراد لیے ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام جنت میں انبیاءِ کرام کے ساتھ ہوں گے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

یاد کیجئے جب اُن سے ان کے رب نے کہا کہ اسلام پر قائم رہو تو انہوں نے کہا کہ میں تمام جہانوں کو پالنے والی ذات کے آگے جھکا ہوا ہوں O

۳۰۲ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ امام نووی سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ ثابت نہیں ہے۔ ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے۔ علامہ زرکشی نے ''الاحادیث المشتھرۃ'' میں ابن سمعانی کے حوالہ سے کہا ہے: یہ (حدیث نہیں ہے بلکہ) یحییٰ بن معاذ رازی کا اپنا قول ہے۔
(الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۳۹) (اس روایت پر مزید تحقیق کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج۲ ص۵۲۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''اَسْلِمْ'' فرمانے کی توجیہ اور ''اَسْلِمْ'' کے معانی میں مختلف اقوال کا بیان

اس آیت میں جو ﴿اَسْلِمْ﴾ کا لفظ ہے اس کا معنیٰ ہے: اسلام پر قائم رہو اور اس پر برقرار رہو (نہ یہ معنیٰ کہ تم اسلام لاؤ)۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (ابتداء ہی سے) صاحبِ اسلام تھے (کہ آپ کا تعلق انبیاء کرام علیہم السلام سے ہے) اور انبیاء کرام علیہم السلام اسلام اور توحید ہی پر پرورش پاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم اللہ تعالیٰ نے اُس وقت فرمایا جب وہ سُرنگ سے نکلے[۳۰۳] (بعض علماء کا قول یہ ہے کہ) یہ حکم اُس وقت کا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوکب (ستارہ) اور چاند و سورج کے ذریعہ اس بات پر دلیل اور خبر حاصل کی کہ ان تمام چیزوں میں حادث ہونے کی علامات موجود ہیں اور اس بات کی علامات موجود ہیں کہ یہ تمام چیزیں کسی ایسی ذات کی محتاج ہیں جو سب کو وجود بخشنے والی اور تدبیر کرنے والی ہو۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام باتوں کو پہچان لیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے فرمایا: ''أسلم'' اسلام پر برقرار رہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: ﴿اَسْلَمْتُ﴾ یعنی میں نے اطاعت میں عاجزی اختیار کی اور اُس کے لیے عبادت کو خالص کیا جو تمام مخلوق کا مالک ہے اور تمام مخلوق کے لیے تدبیر کرنے والا اور اُسے پیدا کرنے والا ہے۔

بعض علماء نے ''اَسْلِمْ'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ (اے ابراہیم!) تم اپنے دین اور اپنی عبادت کو خالص اللہ عزوجل کے لیے کر دو اور اپنی عبادت کو (ہر خامی سے) محفوظ اور صحیح و سالم بنا دو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''ایمان'' کا تعلق دل کی صفات سے ہے اور ''اسلام'' کا تعلق ظاہری اعضاء کی صفات سے ہے۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام (اصولاً) قلبی اعتبار سے مؤمن تھے اور معرفتِ خداوندی کے حامل تھے۔ (سو ''أسلم'' فرما کر) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسم کے ظاہری اعضاء کے ذریعہ عمل کرنے کا حکم دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''أسلم'' کا معنیٰ یہ ہے کہ (اے ابراہیم!) اپنی ذات کو اور اپنے معاملات کو اللہ عزوجل کے سپرد کر دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواباً عرض کیا: ''أسلمت'' یعنی میں نے اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دیا جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جواب

۳۰۳ سُرنگ میں داخل ہونے اور اُس سے نکلنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ خود علامہ خازن اور دیگر کئی مفسرین نے سورۃ الانعام کی آیت: ۷۵ کے تحت ذکر کیا ہے۔ خُلاصہ اس کا یہ ہے کہ نمرود نے ایک خواب دیکھا کہ عنقریب پیدا ہونے والے ایک بچہ کے ذریعے اُس کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اُس نے صبح حکم جاری کر دیا کہ مرد اپنی بیویوں سے الگ رہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ اُس نے ہر پیدا ہونے والے بچہ کو قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ سو اُن کے لیے زمین میں ایک سُرنگ کھودی گئی اور اُس میں اُنہیں محفوظ کر دیا گیا۔ آپ کی والدہ جب بھی دودھ پلانے کے لیے آپ کے پاس آتی تو وہ آپ کو اُنگلیاں چوستے ہوئے پاتی۔ اسی حالت میں جب آپ ایک سال کے ہوئے تو (قدرتِ الٰہی سے) تیس سال کے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کو سُرنگ سے نکالا گیا تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ آپ کی پیدائش تیس سال پہلے کی ہے۔ آپ نے اپنی والدہ سے سوال کیا: میرا رب کون ہے؟ والدہ نے کہا: میں رب ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہارا رب کون ہے؟ والدہ نے کہا: تمہارے والد۔ آپ نے پوچھا کہ اُن کا رب کون ہے؟ یہ سوال جب والدہ نے سُنا تو حضرت ابراہیم کو ایک ہاتھ مارا اور خاموش کر دیا۔ لیکن وہ یہیں سے سمجھ گئی تھی کہ یہی وہ بچہ ہے جس کے ہاتھوں نمرود کی بادشاہت کا خاتمہ ہوگا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ امام کسائی کی کتاب ''قصص الانبیاء'' میں موجود ہے اور یہ ایک قابلِ اقتداء کتاب ہے۔ (تفسیر قرطبی، سورۃ الانعام: ۷۵)

اُس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا جب اُن کو آتش کدہ میں ڈالا جارہا تھا اور انہوں نے فرشتوں سے مدد حاصل نہیں کی[۳۰۴]۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾

اور اسی ملّت پر (کاربند رہنے کی) ابراہیم اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی (اور کہا کہ) اے میرے بچو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو منتخب فرمالیا ہے لہٰذا تم تادم مرگ مسلمان رہناo

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ ابراہیم اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اسی کی وصیت کی۔ یعنی کلمۂ اخلاص ''لا الٰہ الا اللہ'' پر کاربند رہنے کی یا ملّت حنیفہ پر کاربند رہنے کی وصیت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا بیان

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ (۱) اسماعیل: ان کی والدہ حضرت ہاجر قبطیہ تھیں۔ (۲) اسحٰق: ان کی والدہ حضرت سارہ تھیں۔ (۳) مدین (۴) مدان (۵) یقشان (۶) زمران (۷) شبق (۸) شوخ۔ ان سب کی والدہ قطورا بنت یقطن کنعانیہ تھیں۔ ان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت نکاح کیا جب حضرت سارہ کا انتقال ہوا۔

زیر بحث آیت میں حکم کی بجائے وصیّت کا لفظ استعمال کرنے کی توجیہ

اگر تم یہاں سوال کرو کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیّت کی'' اور یہ نہیں فرمایا کہ ''ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا''؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ حکم کے مقابلہ میں وصیّت کے لفظ میں زیادہ تاکید ہے۔ کیونکہ وصیّت اُس وقت ہوتی ہے جب موت کا خوف ہو اور اُس وقت آدمی کی احتیاط اپنی اولاد کے حق میں بہت عروج پر ہوتی ہے۔ اور اولاد کی جانب سے والد کی وصیت کو قبول کرنا زیادہ متوقع ہوتا ہے۔

صرف بیٹوں کو وصیّت کرنے کی توجیہ

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف بیٹوں کو وصیّت کیوں فرمائی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ دوسروں کی بہ نسبت آدمی اپنی اولاد کے ساتھ زیادہ مہربان ہوتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اپنے بیٹوں کو وصیت فرمائی۔ بعض نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کے بیٹے قوم کے پیشوا اور مقتدا تھے اس لیے خاص ان کو وصیّت فرمائی' کیونکہ اُن کی درستگی دوسروں کی درستگی کا باعث تھی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو یعقوب کہنے کی وجہ اور ان کی اولاد کی تفصیل

﴿وَيَعْقُوْبُ﴾ یعقوب نے بھی (اپنے بیٹوں کو) اُسی کی وصیّت کی جس کی وصیّت حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یعقوب اس لیے رکھا گیا کہ وہ اور اُن کے بھائی ''عیص'' دونوں ایک پیٹ میں جڑواں

[۳۰۴] اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو جبریل امین آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: ألک حاجة؟ (آپ کو کوئی کام ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تم سے مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ جبریل نے کہا: فسل ربک (پھر آپ اپنے رب سے سوال کیجئے۔) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: حسبی من سؤالی علمه بحالی. (اُس کو جو میری حالت کا علم ہے وہی میرے لیے میرے سوال سے کافی ہے۔) یعنی مجھے مزید سوال کی حاجت نہیں ہے۔

(معالم التنزیل' سورۃ الانبیاء: ۶۹' روح البیان' سورۃ البقرہ: ۱۳۱)

تھے۔ جب ولادت کا وقت آیا تو ''عیص'' کی ولادت پہلے ہوئی اور ان کے پیچھے ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ اس لیے حضرت یعقوب کو یعقوب کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اُن کی عقب (اولاد) کی کثرت کی وجہ سے یعقوب کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے کُل ۱۲ بیٹے تھے۔ (اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں:)

(۱) روبیل (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہوذا (۵) ربالون (۶) یشجر (۷) دان (۸) نفتالی (۹) جاد (۱۰) آشر (۱۱) یوسف (۱۲) بنیامین۔

﴿ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ یہ کلام حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے ہے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دین کو یعنی دین اسلام کو منتخب فرمالیا ہے۔ لہٰذا تم اس حالت میں مرنا کہ تم مسلمان ہو۔ یعنی مؤمن اور مخلص ہو۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے اسلام پر قائم رہو' یہاں تک کہ جب تمہیں موت آئے تو اس وقت بھی تم حالت اسلام پر ہو۔ کیونکہ یہ بات معلوم نہیں ہے کہ انسان کو کس وقت موت آئے گی؟

بعض علماء نے ﴿ وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تمہیں اس حالت میں موت آئے کہ اللہ عزوجل کے ساتھ تمہارا گمان اچھا ہو۔ اس معنیٰ کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جس کو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے وصال سے تین دن پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا:

(۱۳۲) تم میں سے جو شخص بھی مرے وہ اس حال میں مرے کہ اُس کا گمان اللہ عزوجل کے ساتھ اچھا ہو۔[۳۰۵]

(صحیح مسلم: ۲۸۷۷' سنن ابوداؤد: ۳۱۱۳' سنن ابن ماجہ: ۴۱۶۷' صحیح ابن حبان: ۶۳۶' سنن کبریٰ للبیہقی: ۶۵۷۶۔ ج ۳ ص ۳۷۸' مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۳' مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳۹' مطبوعہ کراچی)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳

کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی؟ جب کہ انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی

۳۰۵ امام حافظ ابوالعباس القرطبی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے کا معنیٰ ہے: نیک عمل کرنا اور اچھے اخلاق کو اپنانا۔ کیونکہ اس سے آدمی اپنے گمان کو اللہ عزوجل کی رحمت کے ساتھ ملا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اُنہی لوگوں کے قریب ہے جو نیک عمل کرنے والے ہیں اور گناہ گاروں کے لیے اُس کا عذاب باعثِ خوف ہے۔ اللہ عزوجل کے ساتھ بغیر عمل کے حسنِ ظن رکھنا محض ایک دھوکا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے اور عاجز و بے بس وہ ہے جو اپنی خواہش کو اپنے نفس کے تابع کر دے (یعنی نفس کی پیروی کرے) اور پھر اللہ تعالیٰ سے امیدیں رکھے۔ (سنن الترمذی: ۲۴۵۹' ابن ماجہ: ۴۲۶۰' مسند احمد ج ۴ ص ۱۲۴' مستدرک ج ۱ ص ۵۷) اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنا اُسی وقت ہو سکتا ہے جب آدمی حالتِ صحت میں ہو اور عمل کی قوت رکھتا ہو۔ یعنی اُس وقت اگر وہ نیک اعمال کرے گا تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کا گمان اللہ عزوجل کے ساتھ اچھا ہے اور اگر بدعملی کا مرتکب ہوگا تو معلوم ہو جائے گا کہ اُس کا گمان اپنے رب کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ (المفہم ج ۷ ص ۱۴۲ بتغییر وتوضیح)

عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے جواباً کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم' اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو کہ ایک معبود ہے اور ہم اُسی کے فرمانبردار رہیں گے O

﴿شُهَدَآءَ﴾ شہید کی جمع ہے بمعنیٰ حاضر اور موجود۔ اور ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (اے یہودیو!) تم موجود نہیں تھے۔ ﴿اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾ اس وقت جب کہ یعقوب کو موت آئی۔ یعنی وہ موت کے قریب ہوئے۔

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ جس دن حضرت یعقوب علیہ السلام کا وصال ہوا تھا اُس دن اُنہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودی مذہب پر قائم رہنے کی وصیّت کی تھی (لہٰذا یہودی مذہب ہی سچا مذہب ہے)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہودیوں کی اس بات کی تکذیب میں مذکورہ آیت کو نازل فرمایا۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے گروہِ یہود! جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو موت آئی تھی تو تم اُس وقت موجود نہیں تھے۔ لہٰذا تم میرے انبیاء اور میرے پیغمبروں پر غلط باتیں مت ڈالو اور ان کو یہودیت کی طرف نسبت نہ دو۔ کیونکہ میں نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام' اُن کے بیٹے اور ان کی اولاد کو صرف دینِ اسلام کے ساتھ مبعوث کیا ہے اور اسی دین کی اُن کی اولاد کو وصیّت کی گئی اور اسی کا اُن سے عہد لیا گیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیّت کا بیان

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ بات بیان فرمائی جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کہی تھی۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ﴾ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بارہ بیٹوں سے کہا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی تم میرے بعد پوجا کرو گے؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو زندگی اور موت کا اختیار دینے سے پہلے اس کی رُوح قبض نہیں فرمائی۔[۶۰۳] چنانچہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو موت اور زندگی کا اختیار دیا تو چونکہ وہ مصر والوں کو بتوں کی اور آگ کی پوجا کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ میں اپنے بیٹوں سے کچھ پوچھ لوں اور اُنہیں (سیدھے راستہ کی) وصیّت کر دوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُنہیں مہلت عطا فرمائی اور اُنہوں نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میرا آخری وقت آ چکا ہے' لہٰذا تم (مجھے بتاؤ کہ) میرے بعد کس کی پوجا کرو گے؟ (اُن کے بیٹوں اور پوتوں نے جو جواب دیا اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا:)

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ اُنہوں نے جواباً کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم' اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے' جو کہ ایک معبود ہے۔ ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور ہم خالصتاً اُسی کی بندگی کرتے رہیں گے۔

حضرت اسماعیل کے نام کو حضرت اسحٰق پر مقدم کرنے کی وجہ اور حضرت اسماعیل کو حضرت یعقوب ـــ کے آباء واجداد میں ذکر کرنے کی توجیہ

اس مقام پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام پہلے اور حضرت اسحٰق کا نام بعد میں ذکر کیا گیا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت

۶۰۳ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حالتِ صحت میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی نبی کی رُوح اُس وقت تک قبض نہیں کی جاتی جب تک کہ وہ جنت میں اپنی جگہ نہ دیکھ لے' پھر اُس کا معاملہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے' یا فرمایا کہ پھر اُسے اختیار دے دیا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۴۴۳۷)

اسمٰعیل علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام سے بڑے تھے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام باوجود اس کے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے، اُنہیں آباء واجداد کی فہرست میں اس لیے داخل کیا کہ اہل عرب (اپنی گفتگو میں) چچا کو 'باپ' اور خالہ کو ''ماں'' کہہ دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۳٤) آدمی کا چچا باپ کے مرتبہ میں ہوتا ہے۔

(صحیح مسلم: ۹۸۳، سنن ترمذی: ۳۷۵۸، سنن ابوداؤد: ۱۶۲۳، صحیح ابن حبان: ۳۲۷۳، سنن کبریٰ للبیہقی: ۱۱۹۱۵، ج ۶ ص ۱۶۴)

اسی طرح ایک موقع پر اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا:

(۱۳۵) میرے باپ کو میرے پاس بھیجو۔[۳۰۷] (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴ ص ۴۸۴، کنز العمال: ۳۰۱۹۵)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، اُنہیں ان کے اعمال کا فائدہ ملے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کا فائدہ ملے گا، اور ان کے اعمال کے بارے میں (اُنہی سے پوچھا جائے گا) تم سے نہیں پوچھا جائے گا O

اس آیت میں ﴿ تِلْكَ ﴾ کا اشارہ اُس جماعت کی طرف ہے جس کا اوپر تذکرہ ہوا۔ یعنی حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد۔ ان سب کے بارے میں فرمایا: ﴿ قَدْ خَلَتْ ﴾ یعنی یہ لوگ انتقال کر گئے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے گروہِ یہود و نصاریٰ! ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق اور ان کی اولاد میں جو جو مسلمان ہیں اُن کا تذکرہ کرنا اور ان پر بہتان لگانا چھوڑ دو۔ آگے جو فرمایا: ﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ ﴾ اس سے مراد عمل ہے اور ﴿ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ﴾ (میں خطاب یہود و نصاریٰ سے ہے) یعنی اے گروہِ یہود و نصاریٰ! تمہارے لیے تمہارے اعمال کا بدلہ ہے۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ سے اس کے اپنے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا، دوسرے کے عمل کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾

۳۰۷ یہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اس وقت فرمایا جب آپ مرّ الظہران کی بستی میں رات بسر کرنے کے لیے اُترے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل مکہ کے انجام سے خوف زدہ تھے۔ اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ اہل مکہ صبح ہونے سے پہلے ہی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان طلب کر لیں ورنہ اگر نبی اکرم ﷺ نے مکہ کو بزورِ شمشیر فتح کر لیا تو قریش تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اسی خیال سے پریشان ہو کر وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں اہل مکہ کو جا کر دعوتِ اسلام دوں اور اُنہیں پناہ دے دوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے نبی اکرم ﷺ کا نیلگوں خچر لیا اور اس پر سوار ہو کر (اہل مکہ کی طرف) روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''میرے باپ کو بُلاؤ، میرے باپ کو بُلاؤ''۔ (وہ اگرچہ میرے چچا ہیں لیکن) آدمی کا چچا باپ کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ قریش اُن کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جو ثقیف والوں نے عروہ بن مسعود کے ساتھ کیا تھا کہ عروہ نے ثقیف والوں کو اللہ عزوجل کی طرف آنے کی دعوت دی تو انہوں نے ان کو شہید کر دیا تھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴ ص ۴۸۴، کنز العمال: ۳۰۱۹۵)

اہل کتاب نے کہا: تم یہودی یا نصرانی بن جاؤ ہدایت پا جاؤ گے (اے رسول مکرم!) آپ کہہ دیجئے ہم تو ابراہیم کے دین کے پیروکار ہیں جو کہ ہر باطل سے جدا تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

﴿ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت سردارانِ یہود کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہودا، ابو یاسر بن اخطب اور نجران کے نصاریٰ اسید اور العاقب اور ان کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ دین کے بارے میں جھگڑا کیا۔ ہر فریق اپنے آپ کو اللہ کے دین کا زیادہ حق دار سمجھتا تھا۔ یہودیوں نے کہا کہ ہمارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں، ہماری کتاب تورات دیگر تمام کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا مذہب تمام مذاہب میں سب سے افضل ہے۔ یہ بات کہہ کر ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی کتاب انجیل اور (ہمارے نبی) سیدنا محمد ﷺ کا انکار کیا۔ پھر عیسائیوں نے بھی اسی طرح کی باتیں کہیں۔ اور دونوں گروہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہمارا مذہب اختیار کر لو۔ کیونکہ ہمارے مذہب کے علاوہ اور کوئی مذہب (قابل اتباع) نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کی ان باتوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ﴿ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ اے محبوب! آپ کہہ دیجئے ہم تو ابراہیم کے دین کے پیروکار ہیں جو کہ ہر باطل سے جدا تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

(﴿ قُلْ ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے) یعنی اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے: اگر اتباع کرنا ضروری ہی ٹھہرا تو پھر ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے پیروکار ہیں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسی شخصیت ہیں جن کی فضیلت پر سب متفق ہیں۔

''حنیف'' کے معنیٰ کی تحقیق

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ﴿ حنیف ﴾ کا لفظ ہے۔ یہ ''الحنف'' سے بنا ہے اور ''حنف'' لغوی اعتبار سے اُس جھکاؤ اور ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو پاؤں میں ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''حنیف'' اُس شخص کو کہتے ہیں: جو تمام مذاہب کو چھوڑ کر دینِ اسلام کو اختیار کرے۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

ولکنا خلقنا اذ خلقنا — جب ہم پیدا ہوئے تو اس حال میں پیدا ہوئے کہ

حنیفا دیننا عن کل دین — ہمارا مذہب ہر مذہب سے جُدا تھا

اسی طرح ہر وہ شخص جو حج کرلے اور ختنہ کروالے اُسے اہل عرب ''حنیف'' کہتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس شخص کا تعلق دینِ ابراہیمی سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''حنیفیت'' حالتِ اسلام میں ختنہ کرانے اور مناسکِ حج ادا کرنے کو کہتے ہیں یعنی حنیفیت ہی دین اسلام ہے اور دین اسلام (درحقیقت) دین ابراہیم ہے۔

زیر بحث آیت کے آخر میں جو فرمایا کہ ''حضرت ابراہیم مشرکین میں سے نہیں تھے'' اس میں یہود و نصاریٰ اور (ان جیسے) دیگر لوگوں پر تعریض ہے جو خود شرک پر ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

(یہود و نصاریٰ سے بچاؤ کی تدبیر بیان فرمانے کے بعد) اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنین کے لیے ایمان کی کیفیات اور اس کے طریقے بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

(مسلمانو!) تم یوں کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اُس (کتاب) پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اُن (صحیفوں) پر جو ابراہیم' اسمٰعیل' اسحٰق' یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیے گئے اور اُس (کتاب) پر ایمان لائے جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا کی گئی اور اُن (تمام کتابوں اور صحیفوں) پر ایمان لائے جو دیگر انبیاء کو اُن کے رب کی جانب سے دیئے گئے۔ ہم (ایمان لانے میں) نبیوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے' اور ہم اُسی (خدائے واحد) کے فرمانبردار ہیں O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ یعنی اے مؤمنو! جو یہودی اور نصرانی تمہیں یہ کہتے ہیں کہ "تم یہودی اور نصرانی بن جاؤ ہدایت پا جاؤ گے" اُن سے تم یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے یعنی اُس کی ہم نے تصدیق کی۔ اور اُس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔ یعنی قرآن کریم۔

ابراہیم علیہ السلام پر جو کچھ نازل ہوا اس سے مراد دس صحیفے ہیں[۳۰۸] (جو اُن پر نازل ہوئے)۔ ﴿الْاَسْبَاطِ﴾ (جمع ہے اور) اس کا واحد "سِبْـــطٌ" ہے۔ اور اس سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں' جو کہ سب کے سب نبی تھے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ "سِبْـــط" پوتے کو کہتے ہیں۔ امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھی اسی معنی میں رسول اللہ ﷺ کا سِبط کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں جو اسباط تھے وہ ایسے ہی تھے جیسے عرب میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کے مختلف قبائل۔ اور ان اسباط میں انبیاء ہوا کرتے تھے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ "جو کتاب موسیٰ کو دی گئی" اس سے مراد تورات ہے اور "جو کتاب عیسیٰ کو دی گئی" اس سے مراد انجیل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تورات اور انجیل پر بھی ایمان لائے اور اُن کتابوں پر بھی ایمان لائے جو دیگر تمام انبیاءِ کرام کو عطا کی گئیں۔ اور ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ تمام (کتابیں) حق ہیں' باعثِ ہدایت اور نور ہیں۔ اور تمام کی تمام اللہ عزوجل کی جانب سے ہیں۔ اور (اس پر بھی ہماری تصدیق ہے کہ) جن انبیاء کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ سب کے سب ہدایت اور حق پر تھے۔

انبیاء کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مفہوم

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ انبیاء کرام کے درمیان فرق نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں۔ جیسا کہ یہودیوں کا شیوہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد ﷺ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور بعض انبیاء کرام کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور جس طرح عیسائیوں

۳۰۸ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں؟ ارشاد فرمایا: سو صحیفے اور چار کتابیں نازل فرمائیں۔ اُن میں سے پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر' تیس صحیفے حضرت خنوخ علیہ السلام پر' دس صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور دس صحیفے تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائے۔ اور تورات' انجیل' زبور اور قرآن مجید اُس نے نازل فرمایا۔ (جمع الجوامع للسیوطی: ۱۵۰۷۶' تفسیر کبیر' سورۃ الاعلیٰ: ۱۹)

کا طریقہ ہے کہ سیدنا محمد ﷺ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور بعض انبیاء کرام کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم تمام انبیاء کرام پر ایمان لاتے ہیں اور (اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ) تمام انبیاء کرام حق اور ہدایت پر تھے۔

آیت کے آخر میں جو فرمایا: ﴿وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم اللہ ہی کے لیے فرمانبرداری کے ساتھ جھکنے والے ہیں اور اُسی کی بندگی کا اقرار کرنے والے ہیں۔

(۱۳۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات کو پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے عربی زبان میں اُس کی تفسیر کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے (مسلمانوں سے) فرمایا کہ تم اہل کتاب کی نہ تو تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو[309] اور یوں کہو کہ ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا'' ہم اللہ پر ایمان لائے اور اُس کتاب پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی۔

(صحیح بخاری: ۴۴۸۵؛ السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۸۷؛ شعب الایمان للبیہقی: ۵۲۰۷؛ شرح السنۃ للامام البغوی: ۱۲۵؛ مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸ مطبوعہ کراچی)

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ ﴿۱۳۷﴾

پھر جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اُس پر اگر وہ بھی ایمان لے آئیں تو یقیناً وہ ہدایت پالیں گے اور اگر وہ انحراف کریں تو (پھر سمجھ لیں کہ) وہ محض اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر ہیں، سو عنقریب (ان کے شر سے بچانے کے لیے) اللہ آپ کو کافی ہوگا اور وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے ○

آیت مذکورہ کی تفسیر

یعنی اگر یہود و نصاریٰ ایمان لے آئیں تو یقیناً وہ ہدایت پالیں گے۔ اس آیت میں جو لفظ ﴿مثل﴾ ہے وہ زائد ہے۔ جیسے اللہ عزوجل کے درج ذیل فرمان میں ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ۚ (الشوریٰ:۱۱) اُس جیسا کوئی نہیں ہے۔

یعنی ''لیس مثله شيئ'' اس کی مثل کوئی نہیں ہے۔ بعض علماء نے اس آیت کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ تمہارے ایمان جیسا ایمان اور تمہاری توحید جیسی توحید اختیار کرلیں تو یقیناً وہ ہدایت پالیں گے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ ایسا کوئی دین اختیار کرلیں جو صحیح اور درست ہونے میں دین اسلام کے برابر ہو تو یقیناً وہ ہدایت پالیں گے۔ لیکن جب دین اسلام کے مُساوی کسی اور دین کا پایا جانا ناممکن ہے تو اس کے علاوہ کسی اور دین سے ہدایت حاصل کرنا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس دین کی بنیاد توحید پر ہے اور اس چیز پر ہے کہ تمام انبیاء کرام کو اُن پر نازل شدہ

[309] یعنی خاموشی اختیار کرو۔ یہ حکم اُن آیات کا ہے جن کا حق اور سچ ہونا واضح نہ ہو۔ ورنہ اگر یہودی یا عیسائی حضرت عیسیٰ یا حضرت عزیر کے بارے میں ایسی باتیں بہ طور آیات پیش کریں جن میں اُن کے خدا ہونے کا تذکرہ ہو تو اُن باتوں کو جھوٹا ہی کہا جائے گا۔ (مراۃ المناجیح ج ۱ ص ۱۵۰) علامہ بدر الدین عینی حنفی، علامہ خطابی شافعی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ زیر بحث حدیث اس بارے میں قاعدۂ کلیہ ہے کہ جس آدمی پر بھی کوئی معاملہ مشکل ہو جائے اور اُسے اُس کا کوئی حل سُجھائی نہ دے اُس پر لازم ہے کہ وہ اُس معاملہ میں توقف کرے۔ یعنی اُس معاملہ کے صحیح یا غلط ہونے اور حلال و حرام ہونے کا فیصلہ نہ کرے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۴۲۹)

کتابوں یا صحیفوں سمیت مانا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ تمہاری کتاب (قرآن مجید) پر ایمان لے آئیں جیسا کہ اُن کی کتاب پر تمہارا ایمان ہے تو یقیناً وہ ہدایت پالیں گے۔

﴿ تَوَلَّوْا ﴾ کا معنیٰ ہے: اعراض کرنا' منہ پھیرنا۔ (یعنی اگر وہ منہ پھیریں) ﴿ فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ﴾ (تو پھر سمجھ لیں کہ) وہ محض شقاق میں ہیں۔ یعنی محض مخالفت اور جھگڑا کرنے پر (کمربستہ) ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ محض دشمنی اور لڑائی کرنے پر (آمادہ) ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ لوگ محض گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

لفظ ''شقاق'' کے معنیٰ کی تحقیق

اس آیت میں جو ﴿ شِقَاقٍ ﴾ کا لفظ ہے وہ ''شِق'' سے بنا ہے اور ''شِق'' کا معنیٰ ہے: جانب۔ گویا جو شخص ''شقاق'' یعنی عداوت میں ہوتا ہے وہ اپنی عداوت کی وجہ سے ایک جانب ہوتا ہے اور اس کا فریقِ مخالف دوسری جانب ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''شقاق'' ''مشقة'' سے ماخوذ ہے اور ''مشقّة'' کا معنیٰ ہے: دشوار ہونا۔ اس صورت میں ''شقاق'' کا استعمال اس لیے ہوتا ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک اپنے مخالف کے لیے دشوار اور تکلیف دہ چیز کی خواہش رکھتا ہے۔

﴿ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ﴾ (اس جملہ میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے) یعنی اے محمد (ﷺ)! یہود و نصاریٰ کے شر سے بچانے کے لیے اللہ عزوجل آپ کو کافی ہوگا۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کے لیے مدد کی ضمانت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی ذمہ داری لے لیتا ہے تو اُسے (ضرور) پورا فرماتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں غیب کی خبر دی جارہی ہے کہ عنقریب اللہ عزوجل آپ کو کافی ہوگا۔ یوں اس میں نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو یوں پورا فرمایا کہ بنوقریظہ کو قتل کیا گیا' قیدی بنایا گیا اور بنونضیر کو جلاء وطن کیا گیا اور یہود و نصاریٰ پر جزیہ عائد کیا گیا۔[۲۱۰]

﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ عزوجل (یہود و نصاریٰ کے) اقوال کو سننے والا اور ان کے حالات کو جاننے والا ہے۔ وہ لوگ جو کچھ باتیں کرتے ہیں اللہ عزوجل سب سنتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے دلوں میں حسد اور کینہ چھپاتے ہیں اللہ عزوجل اُس کو جانتا ہے اور اس پر وہ انہیں بدلہ دے گا اور سزا دے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے خود کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا ہے' اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی (خدائے واحد) کے عبادت گزار ہیں O

اللہ کے رنگ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے رنگ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ اور اللہ عزوجل نے دین کو ''صِبغة'' (رنگ) اس لیے فرمایا کہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ظاہر ہوتا ہے اس طرح دین کا اثر دین دار پر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اللہ کے رنگ سے مراد ''فطرة الله'' ہے یعنی اللہ کا پیدا کرنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ''سنة الله'' ہے یعنی اللہ کا طریقہ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ختنہ کروانا ہے' کیونکہ ختنہ کروانے والا خون سے رنگ جاتا ہے۔

[۲۱۰] اس کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ دیکھئے: حاشیہ نمبر: ۲۱۳' ۲۱۴

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ عیسائیوں میں جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا اور وہ سات دن کا ہو جاتا تو وہ اس کو پیلے رنگ کے پانی میں غوطہ دیتے تھے۔ اُس پانی کو وہ ''معمودی'' کہتے تھے اور بچہ کو اس میں اس لیے رنگتے تھے تا کہ وہ اس کے ختنہ کی جگہ کو پاک صاف کر دیں۔ پھر بچہ کو پانی میں غوطہ دینے کے بعد کہتے تھے کہ اب یہ پکا عیسائی ہو گیا۔

آیتِ مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ کا دین ''اسلام'' ہے اور جو کچھ عیسائی کرتے ہیں وہ اللہ کا دین نہیں ہے۔

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ﴾ یعنی اللہ کے دین سے بہتر کس کا دین ہے؟ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اللہ کے پاک کرنے سے زیادہ بہتر کس کا پاک کرنا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو کفر کے میل سے پاک کرتا ہے۔

آخر میں جو فرمایا: ﴿ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴾ اس میں ''عـابدون'' سے مراد ہے: فرمانبردار (یعنی ہم اُسی خدائے واحد کے فرمانبردار ہیں)۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾

آپ کہیے: کیا تم اللہ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو' حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے' اور ہمارے لیے ہمارے اعمال کا بدلہ ہے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کا بدلہ ہے اور ہم اخلاص کے ساتھ اُسی کے فرمانبردار ہیں O

اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اہل کتاب کی مسلمانوں کے ساتھ بحث اور مسلمانوں کا جواب

(﴿ قُلْ ﴾ کا خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے) یعنی اے محمد ﷺ! جو یہودی اور عیسائی اپنے دین کو آپ کے دین سے بہتر قرار دیتے ہیں اور تم لوگوں کو اپنی پیروی کرنے کا حکم دیتے ہیں اُن سے آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو؟ یعنی اُس خدا کے دین کے معاملہ میں ہم سے جھگڑتے ہو جس نے ہمیں یہ دین اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے؟

اس آیت میں ﴿ اَتُحَآجُّوْنَنَا ﴾ کا جو لفظ ہے یہ ''المحاجّة'' سے مشتق ہے اور ''مـحاجه'' کا معنیٰ ہے: حجت اور دلیل کو ظاہر کرنے کے لیے جھگڑا کرنا۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہمارا دین تمہارے دین سے زیادہ پرانا ہے' انبیاء کرام (علیہم السلام) بھی ہم ہی لوگوں میں سے ہوئے ہیں اور ہمارے دین پر رہے ہیں۔ لہٰذا تم لوگوں کی بہ نسبت ہم اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے (اس بات کے جواب میں) مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے کہیں کہ ''کیا تم اللہ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے''۔ یعنی ہم اور تم اللہ کے معاملہ میں برابر ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ''اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں'' یعنی ہر شخص کے لیے اُس کے عمل کا بدلہ ہے۔

﴿ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴾ یعنی ہم اُس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت میں مخلص ہیں۔ اس جملہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کی سرزنش ہے۔ (کیونکہ جب یہ کہا گیا کہ ہم اخلاص کے ساتھ اُسی کے فرمانبردار ہیں تو) اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ (اے اہل کتاب!) تم اللہ عزوجل کے ساتھ شرک کرنے والے ہو۔

اخلاص کی تعریف اور زیر بحث آیت کا حکم

اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے دین اور اپنے عمل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر دے اور اپنے دین میں شرک کا مرتکب نہ ہو اور

عمل میں دکھلاوا نہ کرے۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی خاطر کسی عمل کو ترک کرنا ریاکاری ہے اور لوگوں کی خاطر کسی کام کو انجام دینا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان دونوں چیزوں سے عافیت عطا فرمائے۔

☆ یہ آیت' آیتِ جہاد سے منسوخ ہے۔

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ ءَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾

کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم' اسماعیل' اسحٰق' یعقوب اور ان کی اولاد (یہ سب) یہودی یا عیسائی تھے؟ (اے رسول مکرم!) آپ (ان سے) کہیے: کیا تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ کو؟ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی جانب سے ہے؟ اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ﴾ اس آیت میں خطاب یہودیوں اور عیسائیوں سے ہے۔ اور (کلام) سوال کے انداز میں ہے' لیکن معنوی اعتبار سے اس میں یہود و نصاریٰ کی سرزنش ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (اے یہود و نصاریٰ!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے تمہارے مذہب اور تمہاری ملت پر تھے؟ حالانکہ یہودیت اور عیسائیت تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کے بعد کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا اے گروہِ یہود و نصاریٰ! یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے بیٹوں کے بارے میں تم جھوٹے ہو۔

﴿ قُلْ ﴾ (کا خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے) یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے: کیا تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ کو؟ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے کس دین پر تھے' یہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ عزوجل؟ (اپنی باتوں سے تو تم کچھ ایسا ہی ظاہر کرتے ہو کہ تمہیں زیادہ علم ہے) حالانکہ خود اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے یہودیت اور نصرانیت پر نہیں تھے بلکہ مسلمان تھے اور ہر باطل سے جدا تھے۔

شہادت کی تفسیر

﴿ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ﴾ اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے اس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی جانب سے ہے۔ شہادت میں یہاں وہ باتیں مراد ہیں جو (اللہ عزوجل کی جانب سے نازل کردہ کتابوں کے ذریعہ) یہود و نصاریٰ کو معلوم ہوئی تھیں اور وہ یہ تھیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے مسلمان تھے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنی صفات کے زیادہ حق دار ہیں۔ یہ باتیں ان کی کتابوں میں موجود تھیں لیکن اُنہوں نے ان کو چھپایا اور ان کا انکار کیا۔ اور یقیناً یہ ان لوگوں کا بہت بڑا ظلم تھا۔

﴿ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے غافل نہیں ہے کہ تم اُن باتوں میں حق کو چھپا جاتے ہو جو اُس نے اپنی کتاب میں تم پر لازم کی ہیں۔ یعنی یہ باتیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے مسلمان تھے اور ہر باطل سے جدا تھے اور (حقیقی) دین' دینِ اسلام ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ اللہ عزوجل کے فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تبارک و

تعالیٰ تمہارے عمل سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمہارے خلاف تمہارے عمل کو شمار فرما رہا ہے' پھر آخرت میں تمہیں تمہارے اعمال کی سزا دے گا۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی' اُنہیں اُن کے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اور اُن کے اعمال کے بارے میں (اُنہی سے پوچھا جائے گا) تم سے نہیں پوچھا جائے گا O

آیت مذکورہ کی تفسیر

اس آیت میں ﴿تِلْكَ﴾ کا اشارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کی طرف ہے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ کیا اُس کا اُنہیں بدلہ ملے گا۔ ﴿وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم نے کیا اُس کا تمہیں بدلہ ملے گا۔ اور ﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص سے اُس کے اپنے عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا' نہ کہ دوسرے کے عمل کے بارے میں۔

اس آیت میں یہودیوں کو اور ہر اُس شخص کو نصیحت اور سرزنش ہے جو اپنے آباء واجداد کی فضیلت اور ان کے مقام ومرتبہ پر بھروسا کر لے (اور عمل کرنا چھوڑ دے)۔ (اس اعتبار سے) آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ اپنے آباء واجداد کی فضیلت پر بھروسا نہ کرلو (بلکہ خود بھی عمل کرو) کیونکہ ہر شخص کی اُس کے اپنے عمل پر گرفت ہوگی۔

اس آیت کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب بحث ومباحثہ اور جھگڑے کے مقامات مختلف ہو گئے تو آیت کو دُہرانا باعثِ حسن ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت کے ذریعہ (لوگوں کو نصیحت کرنا) اور بات کو پختہ کرنا مقصود ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس آیت کو دوبارہ اس لیے لایا گیا تا کہ یہودیوں کو خبردار کیا جائے کہ وہ اپنے آباء واجداد کی فضیلت اور ان کے مقام ومرتبہ سے دھوکا نہ کھائیں۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو اُن کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ اب تک تھے' آپ کہیے: مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں' وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ پر چلا دیتا ہے O

سفہاء سے کون لوگ مراد ہیں؟

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ ﴿سفہاء﴾ سے مراد ہے: جاہل لوگ۔ (یہ ''سِفْهٌ'' سے ماخوذ ہے) اور ''سِفه'' طبیعت کے اُس ہلکے پن کو کہتے ہیں جو عقل کی کمی کی وجہ سے دینی اور دنیاوی کاموں میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اور دین کے معاملہ میں یہ کیفیت زیادہ قابل مذمت ہے۔ کیونکہ (مشاہدات سے یہ بات ثابت ہے کہ) جو شخص اپنے دنیاوی معاملہ میں کسی واضح ترین بات کو چھوڑ دے تو اُسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ تو جو شخص اپنے دینی معاملہ میں اس طرح کی حرکت کا مرتکب ہو وہ زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ اُسے بے وقوف کہا جائے۔ لہٰذا

ہر کفر کرنے والا بے وقوف ہے (کیونکہ اُس نے روشن مذہب' مذہب اسلام کو چھوڑا ہوا ہے)۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ ہر کفر کرنے والا بے وقوف ہے تو اب ''بے وقوف'' کے لفظ سے یہود و مشرکین اور منافقین سب کو مراد لینا ممکن ہو گیا (لہٰذا زیر بحث آیت میں بے وقوف لوگوں سے یہودی اور منافقین و مشرکین مراد ہیں)۔

زیر بحث آیت کے واقعۂ نزول میں علماء کے مختلف اقوال

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیتِ مذکورہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ مسلمانوں نے جب بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا تو یہودیوں نے مسلمانوں کو لعن طعن کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ لوگ ''نسخ'' کو مانتے ہی نہیں تھے[۳۱۱] (یعنی اس بات کے قائل نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی حکمت کی بنیاد پر ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم نازل فرماتا ہے)۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت مذکورہ مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں نے (آپس میں) کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کو اپنے امر (یعنی دین) کے معاملہ میں شک ہو گیا ہے اور اپنی جائے پیدائش (مکۃ المکرمہ) کا اشتیاق ہو گیا ہے اور اس کی طرف انہوں نے اپنا رُخ کر لیا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ وہ تمہارے دین (دینِ مشرکین) کی طرف واپس آ جائیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی' کیونکہ یہی بات انہوں نے بھی اسلام کا مذاق اُڑانے کی غرض سے کہی تھی (لہٰذا منافقین بھی بے وقوف ہیں)۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے آیتِ مبارکہ میں ''سفھاء'' (بے وقوف) کا لفظ عام ہو۔ لہٰذا اس میں تمام کفار و مشرکین اور یہودی داخل ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قبلہ کی تبدیلی پر (یہود و مشرکین اور منافقین) سب نے طعن کیا ہو (اور اس بنیاد پر سب کو بے وقوف فرمایا گیا ہو)۔ کیونکہ آیت کو ایک گروہ کے ساتھ خاص کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور ویسے بھی مخالفین اور دشمن طعن و تشنیع میں اور کسی کو داغ دار کرنے میں بہت آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اپنے حریف کی اگر کوئی بات مل جائے تو لوگوں میں اُسے کہنا شروع کر دیتے ہیں اور (مخالفت کا) میدان مل جائے تو اُس میں گھومتے رہتے ہیں۔

زیر بحث آیت میں فرمایا کہ ''اب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کو اُن کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر وہ پہلے تھے''۔ یعنی بیت المقدس سے کس چیز نے پھیر دیا' جس پر وہ پہلے تھے۔

قبلہ کی تعریف' قبلہ کو قبلہ کہنے کی وجہ اور زیر بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

(واضح رہے کہ) ''قبلہ'' اُس جہت اور سمت کو کہتے ہیں جس کی طرف آدمی رُخ کرتا ہے۔ قبلہ کو قبلہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نماز پڑھنے والا قبلہ کے سامنے ہوتا ہے اور قبلہ نماز پڑھنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے بے وقوفوں کی مذکورہ بات کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ یعنی مشرق و مغرب کے دونوں کنارے اور جو کچھ مشرق و مغرب کے درمیان موجود ہے' سب کا سب اللہ عزوجل کی ملکیت ہے۔ لہٰذا کوئی بھی چیز اس بات کا استحقاق نہیں رکھتی کہ وہ ذاتی طور پر قبلہ ہو' کیونکہ جہتیں سب کی سب (اپنی ذات میں) یکساں ہیں ہاں! کوئی بھی جہت قبلہ اس لیے بنتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اُسے قبلہ بناتا ہے۔ لہٰذا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث آیت کے اختتام پر) فرمایا: ﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم یعنی کعبۃ اللہ کی طرف

[۳۱۱] جیسا کہ خود مفسر علیہ الرحمۃ' البقرہ: ۱۰۶ کی تفسیر میں اختلاف بیان کرتے ہوئے وضاحت کر چکے ہیں کہ بعض یہودی وہ ہیں جو نسخ کو عقلاً جائز نہیں مانتے اور بعض وہ ہیں جو عقلاً جائز مانتے ہیں۔ لیکن سمعی اعتبار سے سارے یہودی نسخ کے منکر ہیں۔

ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۳

اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور (ہمارا) رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائے اور (اے محبوب!) جس قبلہ پر آپ پہلے تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے قبلہ بنایا تھا تا کہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بلاشبہ جن کو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اُن کے سوا سب پر یہ (قبلہ کا بدلنا) بھاری ہے اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے بے شک اللہ لوگوں پر بہت مہربان بے حد رحم فرمانے والا ہے O

آیت مذکورہ کے آغاز میں ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ ہے (اُس کا معنیٰ ہے: اسی طرح اور) اس میں جو ''کاف'' ہے وہ تشبیہ کے لیے ہے (یعنی مشابہت دینے کے لیے ہے)۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں مشبہ بہ کیا ہے (یعنی امتِ مسلمہ کو کس چیز سے تشبیہ دی جا رہی ہے؟) اس کے مختلف جوابات ہیں:

(۱) ایک جواب یہ ہے کہ یہ آیت اپنے سے پہلے آنے والی آیت (۱۳۰) پر معطوف ہے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ (البقرہ: ۱۳۰) اور بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں منتخب کر لیا۔

(اب زیرِ بحث آیت کو اس پر عطف کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ابراہیم کو منتخب فرمایا ہے اس طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے۔)

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت متصل گذشتہ آیت پر معطوف ہے جس میں فرمایا کہ ''یھدی من یشاء الی صراط مستقیم'' اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلا دیتا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی ہے اس طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے۔

(۳) بعض علماء نے توجیہ یہ کی ہے کہ جس طرح ہم نے مشرق اور مغرب کے درمیان تمہارے قبلہ کو وسط (افضل) بنایا ہے اس طرح تمہیں بھی ''اُمّتِ وَسَط'' بنایا ہے۔

''امّتِ وسَط'' کی تشریح

﴿امـــت وســـط﴾ سے مراد ایسی امت ہے جس کے افراد با کردار اور بہترین ہوں۔ اور کاموں میں وہی کام بہترین ہوتے ہیں جو ''اوسط'' درجہ پر ہوں۔ زُہیر کا شعر ہے:

هـم وســط يـرضـى الانـام بـحـكـمـهـم	وہ (سرداران) با کردار ہیں جب کسی رات کوئی مصیبت
اذا نـزلـت احـدى الـلـيـالـى بـمـعـظـم	آ جائے تو لوگ اُن کو حاکم بنانے پر راضی ہوتے ہیں۔

بعض علماء نے ''امّت وسَط'' کا معنیٰ کیا ہے: ''امّتِ متوسّطہ'' یعنی وہ امت جو ایسے مذہب اور دین کی حامل ہو جو غلو اور تقصیر

کے درمیان ہو (یعنی اُس میں نہ تو حد سے تجاوز ہو نہ حد سے کمی ہو)۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں دین کے معاملہ میں قابل مذمت ہیں۔ اِس اُمت کا جو دین اور مذہب ہے اُس میں نہ تو وہ غلو (حد سے تجاوز) ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائی کرتے ہیں[۳۱۲] اور نہ ہی وہ تقصیر (حد سے کمی) ہے جو یہودی اپنے دین میں کرتے ہیں۔ یعنی اس میں تحریف اور تبدیلی کرتے ہیں۔

واقعہ نزول

زیر بحث آیت کا واقعہ نزول یہ ہے کہ سرورانِ یہود نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) نے ہمارا قبلہ (بیت المقدس) صرف اس وجہ سے چھوڑا ہے کہ اُنہیں ہم سے حسد ہے' حالانکہ ہمارا قبلہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کا قبلہ ہے اور محمد عربی (ﷺ) بھی جانتے ہیں کہ لوگوں میں ہم سب سے بہترین لوگ ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہم مسلمان' حق اور عدل پر ہیں۔ اس مکالمہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے زیر بحث آیت نازل فرمائی۔

(۱۳۷) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ یہ اُمت ستر اُمتوں کو پورا کرے گی۔ یہ امت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے آخری' سب سے بہترین اور سب سے معزز ہے[۳۱۳]

(مسند احمد ج ۳ص ۶۱' مستدرک ج ۴ص ۸۴' المعجم الکبیر: ۱۰۲۳۔ ۱۰۳۰' اسی کی مثل امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ دیکھئے: سنن الترمذی: ۳۰۰۱' سنن ابن ماجہ: ۴۲۸۷)

اُمت کی گواہی اور رسول کی گواہی سے کیا مراد ہے؟

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (ہم نے تمہیں بہترین اس لیے بنایا تاکہ تم' لوگوں پر گواہ بن جاؤ۔) مراد یہ ہے کہ تم قیامت کے دن اس بات کے گواہ بن جاؤ کہ دُنیا میں آنے والے رسولوں نے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سیدنا محمد ﷺ کی امت اُن تمام لوگوں پر گواہ ہے جو حق کو ترک کرنے والے ہیں۔ ﴿وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (اور ہمارا رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائے۔) یہاں ''الرسول'' سے مراد سیدنا محمد ﷺ ہیں۔ اور ہمارے حق میں آپ کے شہید ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ انصاف فرمانے والے اور پاکیزہ قرار دینے والے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کو ایک زمین پر جمع فرمائے گا اور اُن میں جو کافروں کی جماعتیں ہوں گی اُن سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ انکار کریں گے اور کہیں گے: ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔

۳۱۲ یعنی اُنہیں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے بیان فرمایا:

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ . (التوبہ: ۳۰) اور عیسائیوں نے کہا کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔

۳۱۳ یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں بھی موجود ہے اور یہی مشکوٰۃ کی آخری حدیث ہے۔ اس کی شرح میں علامہ علی قاری حنفی فرماتے ہیں کہ ستر اُمتوں کو پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی اُمتیں پیدا فرمائی ہیں اُن میں بڑی اُمتیں کل ستر ہیں اور اُمت محمد یہ اُن سب میں آخری ہے' اس لیے فرمایا کہ ''یہ اُمت ستر اُمتوں کو پورا کرے گی''۔ اس حدیث میں جو فرمایا کہ یہ اُمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہترین اور سب سے معزز ہے' اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ . (آل عمران: ۱۱۰) وہ تمام اُمتیں جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہیں تم اُن سب میں بہترین ہو۔

اور خود زیر بحث آیت (البقرہ: ۱۴۳) کا مضمون بھی یہی ہے کہ ہم نے تمہیں بہترین اُمت بنایا۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں سے اس بارے میں دریافت فرمائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہم نے تو ان لوگوں کو پیغام پہنچا دیا تھا' لیکن انہوں نے جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود محض حجت قائم کرنے کے لیے انبیاء کرام سے دلیل طلب فرمائے گا؟ وہ جواب دیں گے کہ سیدنا محمد ﷺ کی اُمت ہمارے حق میں گواہی دے گی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی اُمت کو سامنے لایا جائے گا اور وہ انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی کہ اُنہوں نے لوگوں تک پیغام پہنچا دیا تھا۔ گذشتہ امتوں کے لوگ کہیں گے کہ امت محمدیہ تو ہمارے بعد آئی ہے' پھر انہیں کیسے پتا لگ گیا کہ انبیاء کرام نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ اللہ تبارک و تعالیٰ اِس امت کے افراد سے پوچھے گا تو وہ جواب دیں گے کہ (باری تعالیٰ!) تو نے ہماری جانب ایک رسول بھیجا اور اس رسول پر ایک کتاب نازل فرمائی جس میں تو نے ہمیں یہ خبر دی کہ تیرے رسولوں نے لوگوں تک پیغام پہنچا دیا تھا اور تو اپنے خبر دینے میں سچا ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی جلوہ فرمائی ہوگی اور اللہ تبارک و تعالیٰ آپ سے آپ کی امت کی حالت دریافت فرمائے گا۔ (جواباً) نبی اکرم ﷺ اپنی امت کے افراد کو پاکیزہ قرار دیں گے اور ان کے سچے ہونے کی گواہی دیں گے۔

(۱۳۸) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت کو سامنے لایا جائے گا[۳۱۴] اور حضرت نوح سے پوچھا جائے گا: کیا آپ نے تبلیغ کی؟ وہ کہیں گے: ہاں! اے میرے رب۔ پھر آپ کی امت سے پوچھا جائے گا: کیا حضرت نوح نے تمہیں تبلیغ کی؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا آیا ہی نہیں۔ حضرت نوح سے پوچھا جائے گا: آپ کے حق میں گواہی دینے والا کون ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ سیدنا محمد ﷺ اور ان کی امت۔ پھر تمہیں وہاں سامنے لایا جائے گا اور تم سب گواہی دو گے۔[۳۱۵] پھر رسول اللہ ﷺ نے (زیر بحث) آیت تلاوت فرمائی: ''**وکذالک جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا**''۔

(صحیح بخاری: ۳۳۴۹' سنن الترمذی: ۲۹۶۱' سنن ابن ماجہ: ۴۲۸۴' صحیح ابن حبان: ۷۲۱۶' مسند احمد ج ۳ ص ۵۸' مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۸۵' مطبوعہ کراچی)

آگے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا﴾ جس قبلہ پر آپ پہلے تھے یعنی بیت المقدس اُس سے ہم نے آپ کو صرف اس لیے پھیرا ہے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟ آیت میں پھیرنے کا لفظ ذکر نہیں کیا گیا' کیونکہ آیت کے الفاظ سے معنیٰ حاصل ہو رہا ہے۔ بعض علماء نے ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ﴾ کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جس قبلہ پر آپ پہلے تھے اُس کو ہم نے منسوخ کر دیا ہے۔ اور بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جس قبلہ پر آپ ہیں یعنی کعبۃ اللہ (اُس کو ہم نے صرف اس لیے قبلہ بنایا ہے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟)۔

---

[۳۱۴] چونکہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے وہ نبی ہیں جن کو کفار کی طرف بھیجا گیا اس لیے ابتداء اُن ہی سے کی جائے گی۔

(مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۳۰۴)

[۳۱۵] صحیح بخاری کی ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ ''پھر ہم سب گواہی دیں گے کہ حضرت نوح نے تبلیغ کی تھی''۔ (صحیح بخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۹) اُمّت کی گواہی کی نوعیت یہ ہوگی کہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں ہمارے نبی (سیدنا محمد ﷺ) نے بتایا تھا کہ (تمام) رسولوں نے تبلیغ کی ہے' اس لیے ہم گواہی دے رہے ہیں کہ حضرت نوح نے (اور دیگر تمام رسولوں نے) تبلیغ کی تھی۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی گواہی یہ ہوگی کہ آپ اپنی اُمّت کی گواہی کی تصدیق کریں گے اور لوگوں کو گواہی میں سچا قرار دیں گے۔

''الا لنعلم'' کی توجیہات

اگر تم یہاں سوال کرو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام چیزوں کو اُس وقت سے جانتا ہے جب وہ چیزیں موجود نہیں تھیں۔اس کے باوجود زیرِ بحث آیت میں فرمایا: ﴿ إِلَّا لِنَعْلَمَ ﴾ (تا کہ ہمیں علم ہو) اس سے کیا مراد ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''لنعلم'' میں جو علم ہے اس سے مراد وہ علم ہے جس کے ساتھ ثواب اور عذاب متعلّق ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اُن باتوں کے متعلق نہیں ہوتا جن کو اللہ تعالیٰ پوشیدہ طور پر جاننے والا ہے' بلکہ یہ علم اُن باتوں کے متعلّق ہوتا ہے جو موجود ہوں۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ جس قبلہ پر آپ پہلے تھے اُس کو ہم نے صرف اس لیے قبلہ بنایا تھا '' تا کہ ہمیں وہ علم ہو جائے جس کی بنیاد پر عمل کرنے والا' ثواب اور عذاب کا مستحق ہوتا ہے[۳۱۶]''۔ بعض علماء نے سوالِ مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں ''لنعلم'' سے مراد ہے: ''الـرؤية'' دیکھنا۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جس قبلہ پر آپ پہلے تھے اُس کو ہم نے صرف اس لیے قبلہ بنایا تھا تا کہ ہم رسول کی پیروی کرنے والے اور اُلٹے پاؤں پھرنے والے کو دیکھ لیں اور ایک کو دوسرے سے ممتاز کر لیں۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ ''لـنـعـلـم'' سے مراد ہے: میرے رسول' میرا گروہ اور میرے مؤمن دوست جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟ اہلِ عرب کا طریقہ بھی یہی ہے کہ جو کام ماتحت لوگ کرتے ہیں اُس کی نسبت بڑے کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ''فتح عمر العراق وجبی خراجھا'' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق کو فتح کیا اور وہاں سے خراج وصول فرمایا۔ حالانکہ یہ کام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے اُن کے متبعین اور پیروکاروں نے کیے۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا اُن کے موجود ہونے سے پہلے علم ہے' اس کے باوجود یہ فرمانا کہ ''ہم جان لیں'' یہ اپنے بندوں کے ساتھ اُس کی مہربانی ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ (ہم نے کعبۃ اللہ کو قبلہ اس لیے بنایا ہے) تا کہ تم لوگ اِس کو جان لو اور اس سے واقف ہو جاؤ' کیونکہ تمہیں اس سے پہلے اس کا علم نہیں تھا۔ (اس لحاظ سے دیکھا جائے) تو آیت میں اللہ تعالیٰ نے علم کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی ہے وہ (درحقیقت) اپنے بندوں کے ساتھ اس کی مہربانی ہے۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ ''الا لـنـعـلـم'' کا معنیٰ ہے: ''لـنـعـلـمـنـا'' ضرور ہمیں معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے یہ علم تھا کہ قبلہ کی تبدیلی کچھ لوگوں کے لیے ہدایت اور کچھ لوگوں کے لیے گمراہی کا باعث بنے گی۔

آیتِ مذکورہ کے دیگر کلمات کی تفسیر

آیتِ مذکورہ میں جو فرمایا: ﴿ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اور قبلہ کی تبدیلی کے معاملہ میں

---

[۳۱۶] علامہ خازن کے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ بعض باتیں وہ ہیں جو از قبیلِ غیب ہیں اور اللہ عزّ وجل اُن کو ازل سے جانتا ہے اور بعض باتیں وہ ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کو اُن کے موجود ہونے کے وقت ہوتا ہے۔ زیرِ بحث آیت میں علم کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے اور اللہ عزّ وجل کی مراد یہ ہے کہ جس قبلہ پر آپ پہلے تھے اُس کو ہم نے صرف اس لیے قبلہ بنایا تھا تا کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون (رسول کی پیروی کر کے) اجر کا مستحق ہوتا ہے اور کون (نافرمانی کر کے) عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ علامہ خازن کا یہ جواب بعض علماء کا مختار ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس جواب سے لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کا بعض علم ازلی ہو اور بعض علم حادث ہو اور یہ ناممکن ہے' کیونکہ اُسے ہمیشہ سے ہر چیز کا علم حاصل ہے۔ شرح عقائد میں ہے: اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے (یعنی ہمیشہ سے ہے) اور تمام کلیات و جزئیات کو شامل ہے۔ (شرح عقائد مع نبراس ص ۱۴۴' مطبوعہ کوئٹہ) صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: اس کا علم ہر شے کو محیط ہے' یعنی جزئیات' کلیات' موجودات' معدومات' ممکنات اور محالات سب کو ازل میں جانتا تھا اور اب جانتا ہے اور ابد تک جانے گا۔ اشیاء بدلتی ہیں اور اس کا علم نہیں بدلتا۔

(بہارِ شریعت جزء ۱ ص ۱۹' مطبوعہ مشتاق بک کارنر' لاہور)

کون رسول کی پیروی کرتا ہے؟ اور ﴿مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡهِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ کون ایسا ہے جو اپنی سابقہ حالت یعنی کفر کی طرف لوٹتا ہے اور دین اسلام سے پھر جاتا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جب کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو کچھ لوگ یہودی ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) اپنے آباء واجداد کے دین کی طرف لوٹ گئے ہیں۔

اس آیت میں ﴿اِنۡ کَانَتۡ﴾ "قد کانت" کے معنیٰ میں ہے۔ ﴿لَکَبِیۡرَةً﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی (بعض لوگوں پر) بھاری اور دشوار ہے۔ بعض علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف پھیرے جانے کو بھاری فرمایا گیا ہے اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ تبدیلی سے پہلے جس قبلہ کی طرف رُخ کیا جاتا تھا یعنی بیت المقدس اُس کو بھاری فرمایا گیا ہے۔ "کبیرۃ" کا لفظ مؤنث اس لیے لایا گیا ہے کہ قبلہ مؤنث ہے۔ زیر بحث آیت میں ﴿الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اتباعِ رسول میں سچے ہوں (یعنی جو لوگ رسولِ مکرم کے سچے پیروکار ہیں اُن کے علاوہ سب پر قبلہ کا بدلنا بھاری ہے)۔

"اللہ کی یہ شان نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے" اس فرمان کا پسِ منظر

﴿وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ﴾ یہاں ایمان سے مراد وہ (گزشتہ) نمازیں ہیں جو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی گئیں (یعنی اللہ تعالیٰ اُن نمازوں کو ضائع نہیں فرمائے گا)۔

واقعہ یہ ہوا کہ حیی بن اخطب اور اس کے دیگر یہودی ساتھیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہمیں اُن نمازوں کے بارے میں بتاؤ جو تم نے (اب تک) بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہیں؟ اگر وہ نمازیں ہدایت والی تھیں تو تم نے ہدایت سے منہ پھیر لیا اور اگر وہ گمراہی والی تھیں تو ایک عرصہ تک گمراہی کے ذریعہ اللہ کی عبادت کرتے رہے؟ اور تمہارے وہ ساتھی جو بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا کر کے فوت ہو گئے وہ گمراہی پر فوت ہوئے؟ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہدایت تو صرف وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم فرمائے اور گمراہی وہ ہے جس سے وہ منع فرما دے۔ یہودیوں نے کہا کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے قبلہ پر نمازیں ادا کرتے ہوئے انتقال کر گئے اُن کے بارے میں تمہاری کیا گواہی ہے؟ چونکہ کعبۃ اللہ کے قبلہ بننے سے پہلے بنی النجار کے اسعد بن زرارہ اور بنی سلمہ کے براء بن معرور انتقال کر گئے تھے اور یہ دونوں نقباء[۱۷۱] میں سے تھے اور بھی دیگر لوگ انتقال کر گئے تھے تو ان کے بارے میں یہودیوں نے سوال کیا کہ ان کا کیا بنے گا؟ تو ان افراد کے متعلقین (رشتہ دار وغیرہ) نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قبلہ کی طرف پھیر دیا ہے۔ آپ ہمیں بتائیے کہ ہمارے جو بھائی بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا کر کے انتقال کر گئے اُن کا کیا بنے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے (اپنا یہ ارشاد) نازل فرمایا: "وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ" اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے یعنی اُن نمازوں کو جو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے (اب تک) تم نے ادا کی ہیں۔

آیت مبارکہ کے اختتام پر ﴿رَءُوۡفٌ﴾ اور ﴿رَّحِیۡمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔

۱۷۱ یعنی اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ہجرت سے پہلے عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ میں نبی کریم ﷺ سے بیعت کی تھی۔ ان میں سے حضرت اسعد بن زرارہ نے عقبہ اولیٰ میں اور حضرت براء بن معرور نے عقبہ ثانیہ میں بیعت کی تھی۔ ان کو نقباء اس لیے کہا جاتا ہے کہ عقبہ ثانیہ میں نبی اکرم ﷺ نے بیعت سے پہلے بارہ نقیب (سردار) طلب کیے تھے اور اُن سے فرمایا تھا کہ تم اپنی قوم کے دیگر افراد کے ذمہ دار ہو۔ ان بارہ نقیبوں میں اسعد بن زرارہ اور براء بن معرور (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) بھی شامل تھے اس لیے انہیں نقباء کہا جاتا ہے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۴۶۱، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین ﷺ ص ۵۳ تا ۵۵)

(''رؤف'' ''رأفۃ'' سے ماخوذ ہے) اور ''رافت'' رحمت سے زیادہ خاص ہے اور اس میں نرمی کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''رافت'' میں رحمت سے زیادہ (مہربانی اور نرمی کا مفہوم) ہے۔ بعض علماء نے ''رافت'' اور رحمت کو یکساں قرار دیا ہے اور وہ علماء جو ''رافت'' اور رحمت میں فرق کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''رافت'' کا اطلاق مبالغۃً ایک مخصوص قسم کی رحمت پر ہوتا ہے۔ اور وہ رحمت یہ ہے کہ کسی شخص سے ناپسندیدہ چیز کو دور کرنا اور تکلیف کو زائل کرنا۔ جب کہ ''رحمت'' ایک ایسا لفظ ہے جس میں ذکر کردہ معنیٰ بھی داخل ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و مہربانیاں بھی اس میں داخل ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ''رؤف'' کا تذکرہ فرمایا اور یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ پھر ''رحیم'' کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ اس میں عموم اور شمول زیادہ ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

بے شک ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، پس ہم آپ کو اُسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس میں آپ کی خوشی ہے، سو اب آپ اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیجئے اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رُخ اُسی کی طرف کیا کرو، بلاشبہ وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی وہ ضرور اس (حقیقت) سے باخبر ہیں کہ یہ (حکم) ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اُن کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ﴾ اس آیت کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام مکہ میں کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ جب آپ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے چاہا کہ یہودیوں کی دل جوئی کر کے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا تھا کہ آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کریں۔ کیونکہ یہودی اپنی کتاب تورات میں نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور آپ کی صفات کو دیکھتے تھے۔ سو اس کے ساتھ ساتھ جب آپ ﷺ یہودیوں کے قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کریں گے تو یہودیوں کی جانب سے آپ ﷺ کی تصدیق زیادہ متوقع ہو جائے گی۔ لہٰذا (اس حکم کے مطابق) آپ ﷺ ہجرت کے بعد سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرماتے رہے۔ لیکن آپ کی دلی خواہش یہی ہوتی تھی کہ کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جائے، کیونکہ وہ آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ چونکہ یہودی کہا کرتے تھے کہ ''(سیدنا) محمد (ﷺ) ہم سے دینی اور مذہبی مخالفت کے باوجود ہمارے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں'' اس لیے نبی اکرم ﷺ یہ خواہش رکھتے تھے کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے جبریل امین سے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ مجھے کعبۃ اللہ کی طرف پھیر دے۔ کیونکہ وہ میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ جبریل نے عرض کیا کہ (اللہ عزوجل کے حضور میں) میں بھی آپ ہی کی طرح ایک بندہ ہوں، لیکن رب کے نزدیک آپ معزز اور ذی احترام ہیں۔ اس لیے آپ اپنے رب سے سوال کریں۔ کیونکہ اللہ عزوجل کے نزدیک آپ کو مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ یہ کہہ کر جبریل امین اوپر چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ مسلسل آسمان کی طرف اس

امید پر دیکھنے لگے کہ جبریل آپ کی خواہش کے مطابق قبلہ کا حکم لے کر آئیں گے۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی کہ ''قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ '' یعنی ہم آپ کے چہرے کا تردّد (بار بار اٹھنا) اور ''آسمان میں'' یعنی آسمان کی جانب آپ کی نگاہوں کا گھومنا دیکھ رہے ہیں۔ (واضح رہے کہ) یہ آیتِ مبارکہ اگرچہ تلاوت کے اعتبار سے گزشتہ آیات کے بعد ہے لیکن معنیٰ کے اعتبار سے ان سے پہلے ہے' کیونکہ اس آیت میں واقعہ کا آغاز ہے۔ (یہ بھی واضح رہے کہ) شرعی احکام میں سب سے پہلے جو حکم منسوخ ہوا وہ قبلہ کا حکم ہے۔

آیت میں آگے جو فرمایا: ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم آپ کو بیت المقدس سے اُس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں اور جس کی طرف آپ میلان رکھتے ہیں۔

احادیث کی روشنی میں کعبۃ اللہ کا قبلہ ہونا

آیت میں ﴿شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کا معنیٰ ہے: مسجد حرام کی جانب اور ''مسجد حرام'' سے مراد کعبہ ہے۔

(۱۳۹) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کی تمام اطراف میں دُعا فرمائی اور نماز ادا نہیں کی[۳۱۸]' یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لائے۔ اور جب باہر آئے تو کعبۃ اللہ کی جانب رُخ کر کے دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا کہ یہ قبلہ ہے۔ (صحیح بخاری: ۳۹۸' صحیح مسلم: ۱۳۳۰' شرح السنۃ: ۴۴۸)

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ ''یہ قبلہ ہے'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ قبلہ کا حکم خانۂ کعبہ پر ٹھہر چکا ہے (یعنی اب یہی قبلہ رہے گا)۔ اور آج کے بعد یہ حکم منسوخ نہیں ہوگا' لہٰذا تم سب ہمیشہ کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرو' یہی تم سب کا قبلہ ہے۔

(۱۴۰) حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے آپ نے انصار میں سے اپنے ننھیال یا ماموؤں کے ہاں قیام فرمایا' اور سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمائی' اور خواہش آپ کی یہ تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ چنانچہ سب سے پہلی نماز جو آپ نے خانۂ کعبہ کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ نے بھی ادا کی۔ اُن میں سے ایک شخص مسجد سے نکلا تو اُس کا گزر مسجد قباء والوں کے پاس سے ہوا جو کہ رکوع میں تھے۔ تو اس شخص نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی ہے۔ جب لوگوں نے یہ سُنا تو اُسی حالت میں جس میں وہ تھے' خانۂ کعبہ کی طرف گھوم

---

[۳۱۸] اس حدیث سے امام مالک یہ استدلال فرماتے ہیں کہ کعبۃ اللہ کے اندر فرض نماز کی ادائیگی جائز نہیں ہے اور طواف کی دو واجب رکعتیں بھی ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ جب کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کے اندر نماز ادا کرنا درست ہے' خواہ فرض ہو یا نفل۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال سے پوچھا: کیا نبی اکرم ﷺ نے کعبہ میں نماز ادا کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! کعبہ میں بائیں طرف جو دو سُتون ہیں اُن کے درمیان دو رکعتیں ادا فرمائی ہیں۔ (صحیح بخاری: ۳۹۷) زیر بحث حدیث جس سے امام مالک نے استدلال کیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی موجودگی میں نبی اکرم ﷺ نے نماز ادا نہ فرمائی ہو۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ کعبۃ اللہ میں نماز ہی جائز نہیں' کیونکر درست ہوگا؟ ہاں اگر روایت میں یہ ہوتا کہ نبی علیہ السلام نے کعبہ میں نماز کی ادائیگی سے منع فرمایا ہے تو استدلال درست ہوتا۔

گئے۔[۳۱۹] جب نبی اکرم ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے تو یہود و نصاریٰ اس بات کو پسند کرتے تھے' کیونکہ وہ اُنہی کا قبلہ تھا' لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے اپنا رُخ بیت اللہ کی طرف فرمایا تو یہود و نصاریٰ کو یہ ناگوار ہوا اور انہوں نے اس کو ناپسند کیا۔

حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ خانۂ کعبہ کو قبلہ بنائے جانے سے پہلے کچھ لوگ انتقال کر گئے تھے یا شہید کر دیئے گئے تھے' ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم ان کے بارے میں کیا کہیں؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: '' وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ '' (البقرہ:۱۴۳) اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے۔

(صحیح بخاری:۴۰' صحیح مسلم:۵۲۵' سنن الترمذی:۳۴۰-۲۹۶۲' سنن ابن ماجہ:۱۰۱۰' مسند احمد ج۴ص۲۸۳' صحیح ابن حبان:۱۷۱۶' شرح السنہ:۴۴۴)

کعبۃ اللہ کو قبلہ بنانے کا واقعہ کب پیش آیا؟

علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ تحویلِ قبلہ (کعبۃ اللہ کو قبلہ بنانے کا واقعہ) کس وقت پیش آیا؟ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ ۱۵ رجب' بروز پیر زوال کے بعد یہ واقعہ پیش آیا' اور یہ آپ ﷺ کی ہجرت کے بعد سترہویں مہینے کا آغاز تھا۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ واقعہ منگل کے دن اور اٹھارویں مہینے میں پیش آیا۔ بعض علماء سولہ ماہ کے قائل ہیں اور بعض سترہ ماہ کے قائل ہیں۔

تحویلِ قبلہ کے بارے میں (ایک واقعہ) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو اس وقت رسول اللہ ﷺ بنو سلمہ کی مسجد میں تھے اور آپ نمازِ ظہر کی دو رکعتیں صحابۂ کرام کو پڑھا چکے تھے۔ پھر آپ نماز کے دوران گھوم گئے اور کعبۃ اللہ کی طرف رُخ فرما لیا۔ اور آپ کے پیچھے جو نماز ادا کرنے والے تھے اُن میں مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں۔ چونکہ اس مسجد میں ایک نماز دو مختلف قبلوں کی طرف ادا کی گئی اس لیے اس کا نام مسجد القبلتین رکھا گیا۔ پھر اگلے دن صبح کی نماز میں اس واقعہ کی خبر اہلِ قباء تک پہنچ گئی۔

(۱۴۱) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ پر رات کو وحی نازل ہوئی ہے اور آپ ﷺ کو قبلہ (یعنی کعبۃ اللہ) کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے' لہٰذا تم لوگ بھی کعبۃ اللہ کا رُخ کر لو۔ لوگوں کے چہرے شام کی طرف تھے' (جب انہوں نے یہ حکم سُنا) تو وہ لوگ (حالتِ نماز میں) کعبہ کی طرف گھوم گئے۔

(صحیح بخاری:۴۰۳' صحیح مسلم:۵۲۶' صحیح ابن حبان:۱۷۱۵' مسند احمد ج۲ص۱۶' سنن دارمی:۱۲۳۴' سنن بیہقی:۴۱۸۹۔ ج۲ص۲)

آیت مبارکہ میں ﴿حَيْثُ مَا﴾ کا معنیٰ ہے: تم جہاں کہیں بھی ہو' خواہ سمندر میں ہو یا خشکی میں' مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اپنا چہرہ اُسی کی طرف یعنی بیت اللہ کی طرف کیا کرو۔

(۱۴۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان

[۳۱۹] یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جس شخص نے اہلِ قباء کو خبر دی وہ اُن کی نماز سے خارج تھا' پھر اہلِ قباء نے اُس شخص کی تلقین اور لقمہ کو کیوں قبول کیا؟ جبکہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مؤقف یہ ہے کہ ایسے شخص کا لقمہ قبول کرنا جائز نہیں ہے جو نماز سے خارج ہو؟
اس کا جواب یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی ہجرت کے سولہ مہینے بعد ہوئی تھی اور تلقن من الخارج (غیر کے لقمہ کو قبول کرنے) کی ممانعت کا حکم ابھی عام نہیں ہوا تھا' اس لیے اہلِ قباء کے اس عمل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

قبلہ ہے۔[۳۲۰] (سنن الترمذی: ۳۴۲، سنن ابن ماجہ: ۱۰۱۱، یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے: سنن دار قطنی ج ا ص ۲۷۰، سنن بیہقی: ۲۲۳۰، ج ۲ ص ۹، مشکوٰۃ المصابیح ص ۶۹، مطبوعہ کراچی)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ''حسن اور صحیح'' ہے

حدیث مذکور: (۱٤۲) کی مختصر تشریح

اس حدیث کی تشریح میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مشرق سے مراد وہ مشرق لیا ہے جو سردی میں سال کے سب سے چھوٹے دن کا ہو اور مغرب سے مراد وہ مغرب لیا ہے جو گرمی میں سال کے سب سے طویل دن کا ہو۔ سو جس شخص نے اِس وقت گرمی کے مغرب کو اپنی سیدھی جانب اور سردی کے مشرق کو اپنی الٹی جانب رکھا تو اُس کا رُخ قبلہ کی طرف ہوگا۔ اور یہ حکم اُن کے لیے ہے جو مشرق میں رہتے ہیں۔ کیونکہ سردی کا مشرق جہتِ جنوب میں ہوتا ہے اور خطِ استواء سے ایک میل دور ہوتا ہے۔ جبکہ گرمی کا مغرب، جہتِ شمال میں ہوتا ہے اور خطِ استواء سے دور ہوتا ہے۔ اور سردی کے مشرق اور گرمی کے مغرب کے درمیان جو حصہ ہے وہ سمتِ کعبہ ہے۔

مسئلہ: جو شخص مکہ میں قبلہ کے اندر ہو اُس پر فرض ہے کہ وہ نماز میں عینِ کعبہ کی طرف مُنہ کرے اور جو شخص مکہ سے دور ہو وہ جہتِ مکہ کی طرف مُنہ کرے۔[۳۲۱] یہ مسئلہ (وضاحت کے ساتھ) قبلہ کے متعلق وارد ہونے والے دلائل سے جانا جا سکتا ہے۔ یہاں اُن دلائل کو ذکر کرنے کا موقع نہیں۔

''وان الذین اوتوا الکتاب (الخ)'' کا پس منظر اور آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

(زیرِ بحث آیت کے اگلے جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ) جب کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں نے کہا: اے محمد (ﷺ)! یہ ایک ایسی چیز ہے جو آپ نے اپنی جانب سے ایجاد کر لی ہے۔ کبھی تو آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور کبھی کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے قبلہ (بیت المقدس) پر برقرار رہتے تو ضرور ہمیں امید تھی کہ آپ ہی ہماری وہ شخصیت ہوتے جس کا ہمیں انتظار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (اس کا جواب دیتے ہوئے) ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾ یعنی ''بے شک وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی'' اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں ''وہ ضرور اس (حقیقت) سے باخبر ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے حق ہے'' یعنی قبلہ کا حکم اور کعبۃ اللہ کو قبلہ بنانا ضرور حق ہے۔

---

۳۲۰ یہ مدینہ منورہ کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ میں قبلہ جنوب کی سمت میں ہے۔ ہمارے ہاں قبلہ چونکہ مغرب کی سمت میں ہے اس لیے حدیث کا معنیٰ یہ کریں گے کہ جنوب اور شمال کے درمیان قبلہ ہے۔ مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر نمازی کا منہ ۴۵ ڈگری سے کم کعبہ سے پھر جائے تب بھی نماز ہو جائے گی۔ کیونکہ (اگر وہ مدینہ طیبہ میں ہوا تو) اُس کا رُخ مشرق اور مغرب کے درمیان ہی رہے گا اور اگر یہاں ہوا تو اس کا رُخ جنوب اور شمال کے درمیان ہی رہے گا اور یہی فرمانِ رسول ﷺ کا منشاء ہے۔ (مراۃ المناجیح بتغیر و توضیح ج ا ص ۴۱۵)

۳۲۱ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

تحقیق یہ ہے کہ جو شخص خاص عینِ کعبہ کی سمت رُخ کر سکتا ہے اگرچہ کعبہ کی آڑ میں ہو جیسے مکہ معظمہ کے مکانوں میں جبکہ مثلاً چھت پر چڑھ کر کعبہ کو دیکھ سکتے ہیں تو خاص کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے، جہت کافی نہیں اور جس کو خاص کعبہ کی طرف رُخ کرنا ناممکن ہو اگرچہ وہ خاص مکہ معظمہ میں ہو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کعبہ کی سمت کا رُخ کر لے۔ (بہارِ شریعت ج ا ص ۲۹، مطبوعہ لاہور)

پھر (آیت کے اختتام پر) ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ڈراتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی میں ان یہودیوں کے کاموں سے غافل نہیں ہوں' میں دنیا و آخرت میں اُن کے کاموں پر اُنہیں سزا دوں گا۔ (واضح رہے کہ) اس آیت میں ''یعملون'' کو ''تعملون'' بھی پڑھا گیا ہے۔ (اس صورت میں آیت کا معنیٰ کیا ہوگا' اس کی وضاحت کرتے ہوئے) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ اے گروہِ مؤمنین! تم میری رضا اور خوشنودی چاہتے ہو اور میں تمہارے اجر و ثواب سے غافل نہیں ہوں (بلکہ) میں تمہیں تمہاری عبادت پر بہترین اجر و ثواب دوں گا اور بہترین بدلہ عطا کروں گا۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور اگر آپ اہل کتاب کے پاس ہر قسم کا معجزہ اور دلیل لے کر آ جائیں وہ تب بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ اُن کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں' اور وہ لوگ بھی آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں' اور (اے مخاطب!) اگر معلوم ہو جانے کے بعد تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو ضرور تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو گا O

قبلہ کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کی ہٹ دھرمی اور باہمی اختلاف

آیت مبارکہ میں اہل کتاب سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ اور ﴿ اٰيَةٍ ﴾ سے مراد معجزہ ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس سے حجت و برہان (دلیل) مراد ہے (یعنی اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس ہر قسم کا معجزہ یا دلیل لے کر آ جائیں تب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں)۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ جو کچھ آپ دعویٰ کرتے ہیں اُس پر کوئی دلیل پیش کیجئے' تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور بتایا کہ آپ ہر دلیل یا معجزہ لے آئیں' یہ لوگ آپ کے قبلہ یعنی کعبۃ اللہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔

﴿ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ﴾ (ان دو جملوں میں سے پہلے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ) یہودی بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور عیسائی مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔[۳۲۲] جب کہ اے محمد ﷺ! آپ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر یہود و نصاریٰ میں سے کسی ایک کے بھی قبلہ کی پیروی کیسے ہو سکتی ہے؟ جب کہ جہات بھی مختلف ہیں۔ لہٰذا آپ اُسی قبلہ کے پابند رہیے جس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرنے کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

(پہلے جملہ کے بعد جو فرمایا کہ) وہ لوگ بھی آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہودی' عیسائیوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں اور عیسائی یہودیوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے

۳۲۲ صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قبلہ کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہود صخرۂ بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دیتے ہیں اور عیسائی بیت المقدس کے اس مکان شرقی کو قبلہ قرار دیتے ہیں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نفخ روح کا واقعہ ہوا۔ (خزائن العرفان زیر بحث آیت)

نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ ایک قبلہ پر جمع نہیں ہیں۔

یہود ونصاریٰ کی خواہش اور مسلمانوں کے لیے ان کی پیروی کا ممنوع ہونا

﴿ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ ''اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کی خواہش ہے کہ تو ان کے قبلہ کی طرف لوٹ آئے' اس خواہش اور مقصد میں اگر تو نے اُن کی پیروی کی۔ ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ قبلہ کے بارے میں معلوم ہو جانے کے بعد اگر تو نے اُن کی پیروی کی۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جب تجھے یہ معلوم ہو گیا کہ یہود ونصاریٰ باطل پر اور حق کی مخالفت پر ڈٹے ہوئے ہیں' اس کے باوجود اگر تو نے اُن کی پیروی کی۔ ''تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے''۔ یعنی اگر تم نے ایسا کیا تو تم اپنے آپ پر ظلم کرنے والے اور اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والے کی طرح ہو جاؤ گے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے' لیکن مراد آپ کی امت ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کبھی بھی یہود ونصاریٰ کی خواہشات کی پیروی نہیں فرما سکتے۔ بعض دیگر علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خاص نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے' اور (آپ کے حق میں) یہ نصیحت کے طور پر ہے اور آپ کو مزید متوجہ رکھنے کے لیے ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اُس نبی کو اِس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' اور بے شک اُن میں ایک گروہ ایسا ہے جو جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے O

یہود ونصاریٰ کا نبی اکرم ﷺ کو اپنے بیٹوں کو طرح پہچاننا

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ ''جنہیں ہم نے کتاب عطا کی'' اس سے مراد یہود ونصاریٰ کے علماء ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے وہ یہود ونصاریٰ مراد ہیں جو ایمان لے آئے' جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے دیگر ساتھی۔ ''یہ سب لوگ اُن کو پہچانتے ہیں'' یعنی سیدنا محمد ﷺ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں' کیونکہ آپ کے مخصوص اوصاف ہیں' جن کو یہ لوگ اپنی کتاب میں دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ آگے جو فرمایا کہ ''اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو نبی اکرم ﷺ کے بارے میں شک نہیں ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کا معاملہ ان لوگوں پر مشتبہ ہے۔ جیسے ان پر ان کے بیٹے دوسروں کے بیٹوں کی وجہ سے مشتبہ نہیں ہوتے۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی کہ ''وہ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اُس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں'' یہ پہچان کس طرح کی ہے؟ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: اے عمر! میں نے جس وقت نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تھا اُسی وقت اُن کو پہچان لیا تھا' جیسا کہ مجھے اپنے بیٹے کی پہچان حاصل ہے۔ اور سیدنا محمد ﷺ کی مجھے جو پہچان حاصل ہے وہ میرے اپنے بیٹے کی پہچان سے بڑھ کر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی جانب سے برحق ہیں اور ہماری کتاب میں اللہ عزوجل نے اُن کی تعریف اور اوصاف بیان فرمائے ہیں' جب کہ عورتوں کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کیا کرتی ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جملہ سن کر حضرت عبد اللہ

بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر کو بوسہ دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں توفیق دی اس لیے تم نے سچ کہا۔

زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں بعض علماء کا قول اور آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ﴿ یَعۡرِفُوۡنَہٗ ﴾ میں ''ہٗ'' ضمیر امرِ قبلہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' اس طرح وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ جس قبلہ کی طرف میں نے آپ کو پھیرا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام اور اُن سے پہلے آنے والے انبیاء کا قبلہ ہے' اور اس میں انہیں کوئی شک نہیں ہے۔

﴿ وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡہُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ ﴾ یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو چھپاتا ہے۔ ''حق'' سے مراد نبی اکرم ﷺ کے اوصاف ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد قبلہ کا معاملہ ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کے بعض علماء نبی اکرم ﷺ کے اوصاف چھپاتے ہیں یا قبلہ کا معاملہ چھپاتے ہیں۔

﴿ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء یہ جانتے ہیں کہ حق کو چھپانا گناہ ہے اس کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء اس بات کو جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اوصاف تورات اور انجیل میں اُن کے پاس لکھے ہوئے ہیں اس کے باوجود اُن کو چھپاتے ہیں۔

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾

(یہ تحویلِ قبلہ) تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ تو (اے مخاطب!) تُو شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا O

﴿ اَلۡحَقُّ ﴾ کا معنٰی یہ ہے کہ جس بات کو یہود و نصاریٰ چھپا رہے ہیں وہ بات حق ہے۔ اور ﴿ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ پیچھے جن کا تذکرہ گزر چکا ان کے بارے میں آپ یہ شک نہ کریں کہ اُنہوں نے آپ کی نبوت کے برحق ہونے کو جان لیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا تعلق قبلہ کے واقعہ سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ میں بعض ایسے ہیں جو (دل میں) دشمنی رکھتے ہیں اور حق کو چھپاتے ہیں' لہٰذا آپ قبلہ کے معاملہ میں شک نہ کریں۔

نبی اکرم ﷺ کے شک نہ کرنے کے باوجود آپ کو شک سے منع کرنے کی توجیہ

اگر یہاں تم یہ سوال کرو کہ نبی اکرم ﷺ کو جب (کسی معاملہ میں) شک وشبہ نہیں تھا تو آپ سے یہ کیوں فرمایا گیا کہ ''آپ شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا''؟

تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن مراد آپ کی ذات نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ''اے مؤمنو! تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا''۔ اور اس طرح کی مثال پہلے بھی گزر چکی ہے۔[۳۲۳]

وَلِکُلٍّ وِّجۡہَۃٌ ہُوَ مُوَلِّیۡہَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾

اور ہر (مذہب والے کی) ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (نماز میں) منہ کرتا ہے' سو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے

۳۲۳ علامہ خازن کا اشارہ البقرہ کی آیت: ۱۴۵ کی طرف ہے جس میں یہ ہے کہ اگر آپ نے معلوم ہو جانے کے بعد یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی کی تو بے شک اُس وقت آپ ضرور ظالمین میں سے ہوں گے۔ اس کی تفسیر میں علامہ خازن نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس آیت میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے' لیکن مراد آپ کی اُمت کے افراد ہیں' دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب خاص نبی اکرم ﷺ ہی سے ہے اور آپ کے حق میں یہ نصیحت کے طور پر ہے اور آپ کو متوجہ رکھنے کے لیے ہے۔

آگے بڑھو (اور یہ سن لو کہ) تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تمہیں اکٹھا فرمائے گا' بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○

اس فرمان کی تفسیر کہ ''ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے''

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر ملّت والے کا ایک قبلہ ہے۔ ''وِجهة'' اُس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف رُخ کیا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''وِجهة'' اُس حالت کو کہتے ہیں جو قبلہ کی طرف رُخ کرنے کے دوران ہوتی ہے۔ ''ولکل وّجهة'' کی تفسیر میں بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام مؤمنین ہیں۔ یعنی پورے عالم کے رہنے والوں کے لیے ایک سمت ہے' اور وہ کعبہ ہے جس طرف سب لوگ رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''وجهة'' کا معنیٰ ہے: راستہ اور شریعت۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک شریعت اور طریقہ ہے[۳۲۴] کیونکہ شریعتیں لوگوں کی مصالح (اور ضرورتوں) کے مطابق ہوتی ہیں۔ اسی لیے زمانہ اور افراد کی تبدیلی کے مطابق شریعتیں اور مذاہب مختلف ہو گئے۔

﴿ هُوَ مُوَلِّيْهَا ﴾ اس کا معنیٰ ہے: رُخ کرنے والا۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ملّت والے کا ایک قبلہ اور سمت ہے' جس کی طرف وہ اپنا رُخ کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مولّی'' کا معنیٰ ہے ''متولّی''۔ یعنی جہت اور سمت کو اختیار کرنے والا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''هو مولّیها'' میں جو ''هو'' ضمیر ہے وہ اللہ عزوجل کے نام کی طرف راجع ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبلہ کی طرف پھیرنے والا ہے۔ ایک قراءت میں اس کو ''مُوَلَّاهَا'' پڑھا گیا ہے' اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے ایک ایسی سمت ہے' جس کی طرف اُس کو پھیرا گیا ہے۔

خیرات میں آگے بڑھنے کی تفسیر اور اس سے امام شافعی کے ایک مؤقف پر استدلال

﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ یعنی فرمانبرداری کرنے میں اور شرعی احکامات کو قبول کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اس میں ہمیں اس بات کی ترغیب فرمائی جا رہی ہے کہ جو کام افضل اور بہتر ہو اُس کی طرف سبقت کرنی چاہیے۔ لہٰذا یہ آیت امام شافعی علیہ الرحمۃ کے اس مؤقف کی دلیل ہے کہ نماز کو اُس کے ابتدائی وقت میں پڑھنا افضل ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نیکیاں کرنے میں سبقت کرو۔ اور پھر اس آیت میں جو امر کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ اپنے ظاہر کے مطابق تو وُجوب کے لیے ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہے کہ نماز کو اُس کے ابتدائی وقت میں ادا کرنا واجب ہے' اور جب وجوب ثابت نہیں ہے تو کم سے کم درجہ مستحب کا ہے' لہٰذا (اِس آیت کی روشنی میں) نماز کو اُس کے ابتدائی وقت میں ادا کرنا مستحب اور بہتر ہے[۳۲۵]

---

۳۲۴ اس قول کی تائید قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ (المائدہ: ۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شریعت اور راستہ مقرر کیا ہے۔

۳۲۵ ہمارے نزدیک امام شافعی کے مؤقف پر یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت کے ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے اگر نیکیوں میں مطلقاً سبقت کرنے کو مستحب قرار دیا جائے تو پھر ہونا چاہیے کہ نماز کو اُس کے وقت سے پہلے پڑھنا مستحب ہو' حالانکہ اس کے جواز کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک اُصول یہ ہے کہ نیکی میں سبقت وہ معتبر ہے جو دلائل شرعیہ کے مطابق ہو اور جس سبقت میں دلائل شرعیہ کی خلاف ورزی یا خارجی مفاسد کے پیش آنے کا امکان ہو وہ سبقت شرعاً مستحب اور مستحسن نہیں ہے۔ جیسے خود امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (قول جدید کے مطابق) تہائی رات تک عشاء کی نماز کے مؤخر کرنے کو اس لیے مستحب قرار دیتے ہیں تاکہ عشاء کے بعد دُنیاوی گفتگو کرنے کی جو ممانعت ہے اُس سے بچا جا سکے۔ اسی طرح فقہاء احناف بھی نمازوں کی ادائیگی میں جس تعجیل و تاخیر کو مستحب قرار دیتے ہیں وہ شرعی دلائل ہی کی رُو سے ہے۔ مثلاً فجر کی نماز میں ہمارے ہاں مستحب یہ ہے کہ اُس کو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آگے فرمایا: ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا﴾ اس میں خطاب اہلِ کتاب سے ہے۔ یعنی اے یہود و نصاریٰ! تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تمہیں اکٹھا فرمائے گا' یعنی قیامت والے دن اکٹھا فرمائے گا۔ اس جملہ میں نیک لوگوں سے ثواب کا وعدہ ہے اور نافرمانی کرنے والوں کے لیے عذاب کی وعید ہے۔

آخر میں جو فرمایا کہ ''اللہ ہر چیز پر قادر ہے'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری موت کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے اور فرمانبرداروں کو ثواب دینے اور نافرمانوں کو عذاب دینے پر قادر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور آپ جہاں کہیں سے بھی آئیں' اپنا چہرہ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر لیں' اور بلاشبہ (تحویلِ قبلہ) آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے ○

آیتِ مذکورہ کی مختصر تشریح

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ جس جگہ سے بھی آئیں' خواہ سفر سے آئیں یا کسی اور جگہ سے ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ بہ ہر صورت آپ اپنا چہرہ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔

﴿اِنَّهٗ﴾ سے مراد ہے: قبلہ کی طرف رُخ کرنا۔ یعنی قبلہ کی طرف رُخ کرنا آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے۔ حق سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے' لہٰذا آپ اس قبلہ کی پابندی کیجئے۔

آخر میں جو فرمایا کہ ''اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے''۔ یعنی وہ تمہارے اعمال کو بھولنے والا نہیں ہے' بلکہ وہ تمہارے حق میں اور تمہارے خلاف تمہارے اعمال کو شمار کرنے والا ہے' پھر قیامت کے دن انہی اعمال کا تمہیں بدلہ دے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اُجالے میں پڑھا جائے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ فجر کو خوب روشن کر کے پڑھو کہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے۔ (سنن ترمذی:۱۵۴' سنن ابوداؤد:۴۲۴' سنن ابن ماجہ:۶۷۲) اسی طرح گرمی میں ہم ظہر کر مؤخر کرنے کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو کہ گرمی کی شدت دوزخ کے سانس کی وجہ سے ہے۔ (صحیح بخاری:۵۳۳' صحیح مسلم:۶۱۵) اور مغرب میں ہم تعجیل یعنی جلدی پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت اُس وقت تک خیر پر رہے گی جب تک کہ مغرب کو اتنا مؤخر نہیں کرے گی کہ ستارے آپس میں گُتھ جائیں۔ (سنن ابوداؤد:۴۱۸) ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ فقہاء احناف نے نمازوں کی ادائیگی میں کہیں تعجیل کو اور کہیں تاخیر کو مستحب کہا ہے وہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں ہے اور جہاں تک امام شافعی کے استدلال کا تعلق ہے جو انہوں نے زیر بحث آیت (فاستبقوا الخیرات) سے کیا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ احادیث صحیحہ اور دلائل عقلیہ کی وجہ سے بعض نمازیں اس آیت کے عموم سے خارج ہیں' یعنی جن نمازوں کی ادائیگی میں تاخیر کا مستحب ہونا دلائل سے ثابت ہے اُن کو تاخیر سے ادا کرنا مستحب ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آیتِ مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: ''تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت کرو'' اور سبقت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ اوّل وقت میں ہو۔ بلکہ جس نیکی کو جس وقت اور جس جگہ ادا کرنا مستحسن ہے' اُس کے لیے اُس وقت میں اور اُس جگہ سبقت کرنا مستحسن اور مطلوب ہے۔ لہٰذا فقہاء احناف نے نمازوں کے جو مستحب اوقات بیان کیے ہیں وہ زیر بحث آیت کے خلاف نہیں ہیں۔ (بدائع الصنائع' موضحاً و ملتقطاً' ج۱ ص۲۰۹)

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

اور آپ کہیں سے بھی آئیں' اپنا چہرہ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو نماز کے وقت اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کرو تا کہ لوگوں کو تم پر اعتراض کا موقع نہ ملے' البتہ ان میں جو ظالم ہیں (وہ ضرور تم پر ناحق الزام تراشی کریں گے) سو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرا کرو اور (کعبہ کی طرف منہ کرو) تا کہ میں اپنی نعمت تم پر مکمل کروں اور تم ہدایت پا جاؤO

البقرہ: ۱۴۹ اور ۱۵۰ میں تکرار کا فائدہ

اگر یہاں تم یہ سوال کرو کہ اس آیت میں جو جملہ دوبارہ لایا گیا ہے[۳۲۶] اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس میں بہت ہی عظیم اور زبردست فائدہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری شریعت میں جتنے واقعات میں نسخ وارد ہوا ہے (یعنی منسوخ کیے گئے ہیں) اُن میں سب سے پہلا یہی تحویل قبلہ کا واقعہ ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی اس بات کی کہ اس واقعہ کو مؤکد اور پختہ کرنے اور اس کے بارے میں شبہات کا ازالہ کرنے اور حقیقت کو مکمل واضح کرنے کے لیے اس کو دوبارہ بیان کیا جائے۔ اور چونکہ صحابہ کرام تحویل قبلہ کے دوران ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف منتقل ہوئے تھے اس لیے (دوسمتوں کی مناسبت سے) آیت کی تکرار زیادہ خوب صورتی کا باعث ہے۔

زیر بحث آیت کی تفسیر اور اس میں ''الا الذین ظلموا'' کے استثناء پر بحث

فرمایا: تا کہ لوگوں کو تم پر اعتراض کا موقع نہ ملے۔ یہاں ﴿النـاس﴾ (لوگوں) سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں بعض علماء کا قول یہ ہے کہ لوگوں سے اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) مراد ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تمام لوگ مراد ہیں۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے قریش اور یہودی مراد ہیں۔ قریش تو اس لیے کہ انہوں نے یہ کہا کہ حضور ﷺ کعبۃ اللہ کی طرف اس لیے لوٹ آئے ہیں' کیونکہ اُنہیں معلوم ہو گیا ہے کہ کعبہ ہی سچا قبلہ ہے اور اُن کے باپ حضرت ابراہیم کا بھی یہی قبلہ ہے۔ سو جس طرح وہ ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آئے ہیں' کل کلاں کو ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ اور یہودیوں نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) یہ جانتے ہیں کہ بیت المقدس سچا قبلہ ہے' اِس کے باوجود اُن کا اس قبلہ کو چھوڑ دینا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ محض اپنی رائے پر عمل کر رہے ہیں۔

اس معنیٰ کے اعتبار سے ﴿إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾ (جو آگے آ رہا ہے) کا استثناء زیر بحث جملہ سے متصل اور صحیح ہو گا۔ اور آیت کا معنیٰ یہ ہو گا کہ (اے مسلمانو!) تمہارے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل اور اعتراض نہیں ہے سوائے مشرکینِ قریش اور یہودیوں کے۔ کیونکہ وہ تمہارے ساتھ ناحق اور ظلم کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ ناحق جھگڑا کرنے کو ''حجۃ'' کیوں فرمایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''حجۃ'' کا لفظ ''حجّ'' سے بنا ہے اور ''حـجّ'' کا معنیٰ ہے: غالب آنا۔ سو جس طرح حجت صحیح ہوتی ہے اس طرح غلط بھی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[۳۲۶] یعنی ''ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام''۔

﴿حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الشوریٰ:۱۶) کافروں کی دلیل اُن کے رب کے پاس باطل اور بے کار ہو گی۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ﴿إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ کا استثناء زیر بحث جملہ سے منقطع ہے۔ اور اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ''لیکن جو لوگ ظالم ہیں وہ تمہارے ساتھ ناحق جھگڑا کریں گے''۔

جیسے نابغہ نے کہا:

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم — اُن میں کوئی عیب نہیں ہے' سوائے اس کے کہ اُن کی

بھن فلول من قراع الکتائب — تلواریں لشکر کے سرداروں سے کُند ہو جاتی ہیں۔

اس شعر میں چونکہ استثناء منقطع ہے اس لیے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تلواریں کُند ہو جاتی ہیں اور یہ عیب کی بات نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ یہودیوں کو یہ معلوم تھا کہ کعبۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اور اُنہوں نے تورات میں یہ بھی پڑھ رکھا تھا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) عنقریب کعبۃ اللہ کو اپنا قبلہ بنا لیں گے۔ سو وہ لوگ حجت اس بات کو بنائیں گے کہ ''نبی کے بارے میں ہم نے اپنی کتاب میں یہ پڑھا ہے کہ وہ عنقریب کعبۃ اللہ کو اپنا قبلہ بنا لیں گے اور آپ نے ایسا نہیں کیا' لہٰذا آپ نبی نہیں ہیں''۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا لیا تو اُن لوگوں کی یہ حجت اور دلیل بیکار ہو گئی۔

''الا الذین ظلموا منھم'' اور آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر ظلم کریں اور جس حق کو وہ پہچان چکے ہیں اُس کو چھپا جائیں تو پھر وہ تمہارے ساتھ جھگڑیں گے (ورنہ کسی اور کے لیے یہ گنجائش نہیں ہے کہ وہ تم پر اعتراض کرے)۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (اے مسلمانو!) کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرنے میں یہود و نصاریٰ سے نہ ڈرو کہ وہ ناحق جھگڑا کر کے تم پر غالب آ جائیں گے۔ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں اور دلیل و نصرت کے ذریعہ تمہیں اُن پر غلبہ عطا کروں گا۔ ﴿وَاخْشَوْنِي﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میرے احکامات اور فرائض سے مُنہ پھیرنے کی صورت میں' میں نے جو عذاب تیار کر رکھا ہے اُس سے ڈرو۔ ﴿وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میں تم پر اُس نعمت کو مکمل کر دوں جو میں نے تم پر اس طرح کی ہے کہ تمہیں قبلہ ابراہیمی کی طرف ہدایت دی تاکہ ملت حنیفیہ (سیدھا راستہ) تمہارے لیے مکمل ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نعمت کے مکمل ہونے سے مراد یہ ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو' جنت میں داخلہ ہو اور پھر اللہ عزوجل کا دیدار ہو۔ ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم گمراہی سے ہدایت پا جاؤ۔ (واضح رہے کہ) اللہ عزوجل کی جانب سے جب ''لعل'' اور ''عسٰی'' کے الفاظ کا استعمال ہو تو وہ یقین اور وُجوب کے لیے ہوتے ہیں۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

اسی طرح ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے' تمہارے باطن کو پاک کرتا ہے' تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ٥

آیت مذکورہ کے آغاز میں ''کما'' سے کیا مراد ہے؟

زیر بحث آیت میں ﴿ کَمَآ ﴾ کا جو کافِ تشبیہ ہے وہ (عربی قواعد کی رُو سے) ایک ایسی چیز کا محتاج ہوتا ہے جس کی طرف وہ لوٹ سکے۔ اب یہاں یہ سوال ہے کہ کافِ تشبیہ کہاں لوٹ رہا ہے؟ یعنی آیتِ مبارکہ میں ''اسی طرح'' سے کیا مراد ہے؟ سو بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس کا تعلّق گذشتہ آیت سے ہے۔ یعنی میں اپنی نعمت کو تم پر مکمل کر دوں جیسا کہ میں نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں یہ دُعا کی کہ ''اے ہمارے رب! تو اس قوم کے لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما''۔ (البقرہ:۱۲۹) اور یہ دُعا کی کہ ''اے ہمارے رب! تو ہمیں خاص اپنی فرمانبرداری پر قائم رکھنا اور ہماری اولاد میں ایک امت کو خاص اپنا فرمانبردار بنانا''۔ (البقرہ:۱۲۸) ان دونوں دعاؤں میں سے پہلی دُعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم کے لوگوں میں اُن ہی میں سے ایک رسول یعنی سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور دوسری دُعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا۔ اب زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح میں نے بعثتِ رسول سے متعلّق ابراہیم (علیہ السلام) کی دُعا کو قبول فرمایا اسی طرح میں نے اُن کی دوسری دعا کو قبول فرمایا' اور وہ اس طرح کہ میں نے تم سب کو اُن کے مذہب کی طرف ہدایت دی' تمہیں مسلمان (فرمانبردار) بنایا اور ملتِ حنیفیہ کے اُصول بیان کر کے تم پر اپنی نعمت کو مکمل کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں ''کاف'' کا تعلّق اپنے بعد والی آیت سے ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے: ''تم مجھے یاد کرو' میں تمہیں یاد کیا کروں گا''۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے تم ہی میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا ہے۔ لہٰذا (تمہارا فرض یہ ہے کہ) تم مجھے یاد کیا کرو۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ یاد کرنے کی جو نعمت ہے وہ بعثتِ رسول کی نعمت کے برابر ہے (لہٰذا بعثتِ رسول کی نعمت کے شکرانہ میں تم مجھے یاد کیا کرو)۔ اور اگر زیر بحث آیت میں ''کــمــا'' کا تعلّق گذشتہ آیت سے ہو تو وجہ تشبیہ یہ ہوگی کہ تبدیلِ قبلہ کی نعمت بعثتِ رسول کی نعمت کے برابر ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے تمہیں تبدیلِ قبلہ کی نعمت سے نوازا' اسی طرح تم میں اپنا عظیم رسول مبعوث فرما کر بعثت رسول کی نعمت سے نوازا۔

زیر بحث آیت میں لفظ ﴿ فِيْكُمْ ﴾ ہے' اس کا خطاب اہل مکہ اور اہل عرب سے ہے' اسی طرح ﴿ مِنْكُمْ ﴾ میں بھی خطاب اہل مکہ اور اہل عرب ہی سے ہے (یعنی اے اہل مکہ اور اے اہل عرب! اسی طرح ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا)۔

''بعثتِ رُسول'' اہل عرب کے لیے بہت بڑی نعمت ہے' کیونکہ اس میں اُن کی فضیلت اور شرف کا اظہار ہے۔ اور دوسرا اس لیے کہ اہل عرب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ کسی اور کے آگے سر جھکانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں' اس لیے اُن ہی میں سے اُن کے درمیان ایک رسول مبعوث فرمایا۔ اور اس میں آپ ﷺ کے پیغام کو قبول کرنے اور آپ کی فرمانبرداری کے امکانات زیادہ ہیں (کیونکہ آپ اُن ہی کی قوم سے رسول بن کر آئے ہیں)۔

زیر بحث آیت میں مذکور مقاصدِ بعثت کی مختصر تفسیر

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ رُسول تمہیں قرآن کریم پڑھ کر سناتا ہے۔ اور قرآن کریم ایک بہت بڑی نعمت ہے' کیونکہ وہ ایک ایسا معجزہ ہے جو ہمیشہ باقی رہے گا۔ ﴿ وَيُزَكِّيْكُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ رسول تمہیں شرک (جو کہ سب سے بڑا گناہ ہے) اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کی گندگی سے پاک کرتا ہے۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا یہ کہ وہ رسول تمہیں ایسی باتیں سکھاتا ہے کہ جب تم اُن پر عمل کرتے ہو تو پاکیزہ ہو جاتے ہو۔ مثلاً اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار کی باتیں۔ ﴿ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رسول تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے' یعنی کتاب کے احکام کی تعلیم دیتا ہے' اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ سکھانا اور تلاوت کرنا دو مختلف چیزیں ہیں اس لیے آیت میں تکرار نہیں ہے۔ ﴿ اَلْحِكْمَةَ ﴾ سے مراد سنت اور دین کی سمجھ ہے۔ یعنی وہ رسول تمہیں کتاب وسنت اور فقہ کی تعلیم دیتا ہے۔ ﴿ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ رسول تمہیں گذشتہ امتوں کی خبریں اور اُن کے پیغمبروں کے واقعات بیان کرتا ہے اور اُن واقعات کے بارے میں تمہیں بتاتا ہے جو ہونے والے تھے اور تمہیں اُن کا علم نہیں تھا۔ یعنی ایسے واقعات جو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل رونما ہوئے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾

پس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرے شکرگزار بن جاؤ اور میری ناشکری نہ کیا کرو O

بندے کا اپنے رب کو یاد کرنا اور رب کا اپنے بندے کو یاد کرنا

﴿ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ ﴾ علماء فرماتے ہیں کہ ذکر تین طرح سے ہوتا ہے۔ (۱) باللسان (زبان کے ذریعہ) (۲) بالقلب (دل کے ذریعہ) (۳) بالجوارح (دیگر اعضاء کے ذریعہ)۔

زبان کے ذریعہ جو ذکر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرے اُس کی تعریف کرے اور اُس کی بزرگی بیان کرے۔ اور دیگر ذکر واذکار کرے۔ دِل کے ذریعہ جو ذکر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب تبارک وتعالیٰ کی عظمت میں غور وفکر کرے اور اُن چیزوں میں غور کرے جو اُس کی وحدانیت یعنی ایک ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور جسم کے دیگر اعضاء کے ذریعہ جو ذکر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اعضاء اُن کاموں میں مشغول رہیں جن کے کرنے کا (شرعاً) حکم دیا گیا ہے جیسے نماز اور اس طرح کے وہ تمام کام جن کے کرنے میں اعضاء کا دخل ہوتا ہے۔

زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ''میں تمہیں یاد کروں گا'' اس سے مراد یہ ہے کہ میں تمہیں اجر وثواب عطا کروں گا اور تم سے راضی ہو جاؤں گا (بہ شرطیکہ تم مجھے یاد کرو)۔

''فاذكروني اذكركم'' کی تفسیر میں مختلف اقوال کا بیان

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم میری اطاعت اور فرمانبرداری کے ذریعہ مجھے یاد کرو میں تمہیں اپنی مدد کے ذریعہ یاد کروں گا[۳۲۷] (یعنی تم میری فرمانبرداری کرو میں تمہاری مدد کروں گا)۔

(۲) بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم مجھے اپنے عیش وعشرت اور آرام وسکون کے زمانہ میں یاد کرو میں تمہیں سختی اور مصیبت کے وقت یاد کروں گا۔[۳۲۸]

---

۳۲۷ اس معنیٰ کی تائید قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ (الطلاق:۳-۲)

اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اُس کے لیے نجات کی راہ بنا دیتا ہے اور اُسے وہاں سے رزق عطا کرتا ہے جہاں اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

۳۲۸ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

تعرف الى الله فى الرخاء يعرفك فى الشدة.

تم آسانی کے زمانہ میں اللہ کو یاد کرو اللہ تمہیں سختی کے زمانہ میں یاد فرمائے گا۔

(مسند احمد ج ۱ ص ۳۰۷، الدر المنثور ج ۱ ص ۶۶، کنز العمال: ۴۳۲۱، جمع الجوامع: ۱۰۴۰۸)

(۳) اہلِ معانی نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم مجھے توحید اور ایمان کے ذریعہ یاد کرو' میں تمہیں جنت اور اپنی رضا کے ذریعہ یاد کروں گا[۳۲۹] (یعنی تم مجھے ایک مانو اور مجھ پر ایمان لاؤ' میں تمہیں جنت اور اپنی رضا عطا کروں گا)۔

(۴) بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم مجھے اخلاص کے ذریعہ یاد کرو' میں تمہیں خلاص (نجات) کے ذریعہ یاد کروں گا[۳۳۰] (یعنی تم اپنے اندر اخلاص پیدا کرو' میں تمہیں عذاب سے آزاد کردوں گا)۔

(۵) بعض علماء نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم مجھے اپنے دل سے یاد کرو' میں تمہارے گناہوں کی بخشش کے ذریعہ تمہیں یاد کروں گا[۳۳۱] (یعنی تم مجھے دل سے یاد کرو' میں تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا)۔

(۶) بعض علماء نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم مجھے دُعاء کے ذریعہ یاد کرو' میں تمہیں اپنی عطاء کے ذریعہ یاد کروں گا[۳۳۲] (یعنی تم مجھ سے دُعا کرو' میں تمہیں عطا کروں گا)۔

---

۳۲۹ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۙ (الکہف:۱۰۷)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُن کی ضیافت میں فردوس کی جنتیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ پاک ہے: جس شخص کو اس حالت میں موت آئی کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتا تھا تو وہ جہنم میں جائے گا اور جس کو اس حالت میں موت آئی کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتا تھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

(صحیح مسلم:۹۳' مسند احمد ج۳ ص۳۹۱' مشکوٰۃ المصابیح ص۱۵)

۳۳۰ گذشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۳۱ اس قول کی تائید صحیح مسلم کی ایک طویل اور معروف ترین حدیث سے ہوتی ہے' جس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو ذکر کی محافل تلاش کرتے پھرتے ہیں' جب وہ ذکر کی کوئی مجلس دیکھتے ہیں تو ذکر کرنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ جب ذکر کرنے والے مجلس سے اُٹھ جاتے ہیں تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بیان کرتے ہیں کہ تیرے بندے تجھ سے جنت کا سوال کر رہے تھے اور دوزخ سے پناہ مانگ رہے تھے اور تجھ سے بخشش طلب کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اُن بندوں کو بخش دیا اور جو کچھ انہوں نے مانگا وہ میں نے ان کو عطا کر دیا اور جس چیز سے انہوں نے پناہ مانگی اس سے میں نے ان کو پناہ دی۔ (صحیح بخاری:۶۴۰۸' صحیح مسلم:۲۶۸۹' مشکوٰۃ المصابیح ص۱۹۷) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ عزوجل کو یاد کرنا جنت میں داخل ہونے' جہنم سے بچنے اور مغفرت کے حاصل ہونے کا باعث ہے۔

۳۳۲ قرآن حکیم میں ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ (البقرہ:۱۸۶)

جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو (آپ فرمادیں کہ) بے شک میں ان کے قریب ہوں' دُعا کرنے والا جب دُعا کرتا ہے تو میں اس کی دُعا کو قبول کرتا ہوں۔ لہٰذا لوگوں کو بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان برقرار رکھیں تاکہ اُنہیں کامیابی حاصل ہو۔

احادیث کی روشنی میں ذکر کی تفسیر

(۱۴۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے میں اُس کے ساتھ اس کے مطابق پیش آتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے نفس (تنہائی) میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اپنے نفس (تنہائی) میں یاد کرتا ہوں[۳۳۳] اور اگر وہ مجھے بھری محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر محفل میں اُسے یاد کرتا ہوں[۳۳۴] اگر وہ ایک بالشت مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اُس سے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔[۳۳۵] (صحیح بخاری: ۷۴۰۵، صحیح مسلم: ۲۶۷۵، سنن ترمذی: ۳۶۰۳، سنن ابن ماجہ: ۳۸۲۲، صحیح ابن حبان: ۸۱۱، شعب الایمان للبیہقی: ۵۵۰، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۱، مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹۶، مطبوعہ کراچی)

(نوٹ: اس حدیث کی تشریح حدیث نمبر ۱۴۶ کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔)

(۱۴۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: میرا بندہ جب تک میری یاد میں رہتا ہے اور اس کے ہونٹ میرے ذکر سے متحرک رہتے ہیں میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔[۳۳۶]

(سنن ابن ماجہ: ۳۷۹۲، مسند احمد ج ۲ ص ۵۴۰، مستدرک ج ۱ ص ۴۹۶، مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹۹، مطبوعہ کراچی، امام بخاری نے بھی اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے، دیکھئے: صحیح بخاری کتاب التوحید، باب: ۴۳)

۳۳۳ے اس جملہ کے علماء نے کئی معانی بیان فرمائے ہیں۔ خود علامہ خازن نے حدیث کی تشریح کرتے ہوئے جو معنیٰ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر بندہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں اُسے ایسے اجر وثواب کے ساتھ یاد کرتا ہوں جس کی حقیقت سے کوئی شخص واقف نہیں ہے۔ امام حافظ ابوالعباس القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ زیر بحث جملہ کا زیادہ مناسب مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس طرح تنہا ہو کر یاد کرتا ہے کہ لوگ اس کے ذکر اور عمل پر مطلع نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو جزاء کے طور پر اس طرح یاد فرماتا ہے کہ اُس کے لیے عظیم نعمتیں تیار فرماتا ہے، جو مخلوق سے پوشیدہ ہوں۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (السجدۃ: ۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا جو کچھ لوگوں کے لیے اُن کے اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے۔

(المفہم ج ۷ ص ۷، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت)

۳۳۴ے اس جملہ کی شرح میں علماء نے یہ بحث کی ہے کہ بہتر جماعت اور بہتر لوگوں سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس سے فرشتوں کی جماعت مراد ہے۔ (یعنی آدمی جب لوگوں کے اجتماع میں اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کی جماعت میں اس کو یاد فرماتا ہے۔) بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ بہتر جماعت سے صرف فرشتوں کی جماعت مراد نہیں ہے بلکہ اس میں انبیاء ومرسلین کی ارواح بھی داخل ہیں (یعنی بندہ جب لوگوں کے اجتماع میں اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے رسولوں کی ارواح اور فرشتوں کے اجتماع میں یاد فرماتا ہے)۔ اس کی مزید تشریح کے لیے حاشیہ ۳۳۹ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۳۵ے اس حدیث میں بالشت، ہاتھ اور چلنے دوڑنے کے جو الفاظ آئے ہیں وہ محض سمجھانے کے لیے ہیں، حقیقۃً اللہ عزّوجل ان تمام چیزوں سے منزّہ اور پاک ہے اور اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی طرف جس قدر متوجہ ہوتا ہے، رب تعالیٰ اس سے زیادہ اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

۳۳۶ے اللہ عزّوجل نے اپنی معیت بیان کرنے کے لیے دو باتیں بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ بندہ مجھے یاد کرے اور دوسرا یہ کہ اُس کے ہونٹ میرے ذکر سے متحرک رہیں۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ دل کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی ذکر میں مشغول کرنا چاہیے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۱٤٥) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور وہ جو اپنے رب کا ذکر نہیں کرتا ہے ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مُردہ[۳۳۷]

(صحیح بخاری: ٦٤٠٧، صحیح مسلم: ۹۷۷، مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹٦ مطبوعہ کراچی)

(۱٤٦) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مُــفــرّدون'' سبقت لے گئے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! مفردون کون ہیں؟ ارشاد فرمایا: کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔[۳۳۸] (صحیح مسلم: ۲٦۷٦، مستدرک ج ۱ ص ٤۹٥، مسند احمد ج ۱ ص ٤۱۱، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۷٥، کنز العمال: ۳۹۳۳ـ۳، ۱۷۷۱، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۳۹۹، مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹٦ مطبوعہ کراچی)

☆ اس حدیث میں ''مـفـرّدون'' کا جو لفظ ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جس زمانہ میں وہ ہوں وہ زمانہ تو چلا جائے لیکن وہ لوگ اللہ عزوجل کا ذکر کرتے ہوئے باقی رہیں۔ جب کوئی شخص فقیہ بن جائے اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلے تو عربی میں ''تفرّد'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔

حدیث نمبر: (۱٤۳) کی تشریح

حدیث: ۱٤۳ میں اللہ عزوجل نے فرمایا: ''میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے میں اُس کے ساتھ اُس کے مطابق پیش آتا ہوں'' اس کا معنیٰ بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ جب بندہ مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مغفرت عطا فرماتا ہے' جب آدمی دُعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو قبول فرماتا ہے اور جب آدمی ضرورت کی چیز کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو ضرورت کی چیزیں مہیا فرماتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس جُملہ سے مراد اور مقصد یہ ہے کہ بندہ کی امید پختہ ہو اور عفو و درگزر کی آرزو پیدا ہو اور یہی توجیہ زیادہ دُرست ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس حدیث میں جو فرمایا کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس پر اپنی رحمت نازل کرتا ہوں' اُس کی نصرت و حمایت کرتا ہوں اور اُس کو اسبابِ خیر مہیا کرتا ہوں۔ بعض مقامات پر ساتھ ہونے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے بندے کو (اُس کے ظاہر و باطن سے) جانتا ہوں۔ جیسے قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ . (الحدید: ٤) تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱٦ ص ۲۰۸، مرقات ج ٥ ص ٦۸)

[۳۳۷] یعنی رب کو یاد کرنے والا زندہ شخص کی مانند ہے اور یاد نہ کرنے والا مُردہ شخص کی مانند ہے۔ علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ذات جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور اُس کو کبھی موت نہیں آتی ہے' اُس کے ذکر میں ہمیشہ مشغول رہنا اور اُس کو یاد کرتے رہنا آدمی کو ایسی حقیقی زندگی سے سرفراز کرتا ہے جو کبھی فناء ہونے والی نہیں جیسا کہ کسی کا قول ہے کہ اللہ والوں کو جب موت آتی ہے وہ مرتے نہیں ہیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔

(مرقات ج ٥ ص ۳٥)

[۳۳۸] رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''مفرّدون'' کا یہ معنیٰ التزام اور نتیجہ کے اعتبار سے ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ ''تفرید'' سے مشتق ہے اور ''تـفـریـد'' کا معنیٰ ہے: اکیلا ہونا' تنہا ہونا۔ اس صورت میں ''مـفـرّدون'' کا معنیٰ ہوگا: وہ لوگ جو (ضرورت کے علاوہ دیگر معاملات میں) اپنے زمانہ والوں سے علیحدہ ہو کر اللہ کی یاد میں مشغول ہو جائیں اور اُسی کا ذکر کرتے رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے فرمایا کہ وہ سبقت لے گئے' یعنی نیکیوں میں اور درجات میں آگے بڑھ گئے۔

حدیث مذکور میں یہ بھی ہے کہ ''جب بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں''۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں اپنے بندہ کو رحمت وتوفیق اور ہدایت دیتا ہوں اور اس کی مدد کرتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ ''اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں''۔ نفس کے لغت میں کئی معانی ہیں۔ ایک معنیٰ ہے: ذات۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی باعتبار حقیقت ایک ذات ہے۔ اسی طرح نفس کا ایک معنیٰ ہے: غیب (تنہائی)۔ اس صورت میں جملہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اگر بندہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُسے اجر وثواب کے ذریعہ یاد کرتا ہوں۔ اور وہ ثواب ایسا ہے کہ کوئی شخص اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ پھر حدیث مذکور میں یہ ہے کہ اگر بندہ مجھے ''مـــلاً'' (بھری محفل) میں یاد کرتا ہے تو میں اُسے بہتر محفل میں اُسے یاد کرتا ہوں۔ ''مـــلاً'' اُن افراد کو کہا جاتا ہے جو لوگوں میں بہت شرف والے ہوتے ہیں اور اتنے عظیم ہوتے ہیں کہ اُن کی رائے کی طرف لوگ رُجوع کرتے ہیں۔

حدیث شریف کے اس جُملہ سے معتزلہ اور اُن کے موافقین یہ استدلال کرتے ہیں کہ ملائکہ انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بہترین جماعت میں یاد کرتا ہے اور بہترین جماعت سے مراد فرشتے ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بندوں کا ذکر اکثر ایسی جماعت میں ہوتا ہے جس میں کوئی نبی شامل نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ استدلال غلط ہے کہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں۔[۳۳۹]

حدیثِ مذکور کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے لیے ایک ہاتھ اور دو ہاتھ قریب ہونے کا اور دوڑ کر آنے کا تذکرہ ہے۔ اس کا تعلق احادیث صفات سے ہے اور ان الفاظ کا ظاہری معنیٰ مراد لینا ناممکن ہے اس لیے ان کی تأویل اور توجیہ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا ان کی توجیہ میں ہم یہ کہیں گے کہ حدیث شریف میں ایک بالشت ایک ہاتھ دو ہاتھ اور چلنے دوڑنے کا تذکرہ استعارہ اور مجاز کے طور پر ہے (یعنی جو کچھ الفاظ کا ظاہر ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے)۔ لہٰذا بندے کا اپنے معبود عزوجل سے جو قرب ہے اُس سے مراد ذکر اطاعت اور نیک اعمال ہیں (یعنی بندہ اپنے رب کو یاد کرے اُس کی اطاعت کرے اور نیک اعمال کرے)۔ اور اللہ عزوجل کا اپنے بندے سے جو قرب ہے اُس سے اُس کی نعمتیں رحمتیں عطائیں بخششیں اور انعامات واکرامات مراد ہیں۔ اور حدیث شریف کا معنیٰ یہ ہے کہ میرا بندہ جس قدر فرمانبرداری اور ذکر زیادہ کرے گا اُس قدر میں نوازشیں اور احسانات اُس پر زیادہ کروں گا۔ اور اگر میرا بندہ میری اطاعت میں چلے گا تو میں اُس کی طرف دوڑ کر آؤں گا یعنی میں اس پر اپنی رحمت کے دریا بہادوں گا اور اس کی اطاعت سے بڑھ کر اُسے رحمت سے نوازوں گا۔

''واشکروا لی ولا تکفرون'' کی تفسیر

﴿ وَاشْكُرُوْالِىْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم میرے شکر گزار بن جاؤ یعنی میری اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ ﴿ وَلَاتَكْفُرُوْنِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم میری ناشکری نہ کرو یعنی میری نافرمانی نہ کرو۔ آیتِ مبارکہ کے اس آخری جملہ سے معلوم ہوا کہ جس نے

۳۳۹ علاّمہ خازن کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ میں زیادہ بہتر جماعت میں اپنے بندے کو یاد کرتا ہوں یہ عمومی محافل کے اعتبار سے ہے کیونکہ وہ محافل جن میں انبیاء کرام تشریف فرما ہوں ان کی بہ نسبت ایسی محافل زیادہ ہوتی ہیں جن میں انبیاء کرام تشریف فرما نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ ایسی ہی محافل کے اعتبار سے فرما رہا ہے کہ میں ان سے زیادہ بہتر مجلس میں اپنے بندے کو یاد کرتا ہوں۔ لہٰذا اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ علاّمہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ نے بھی معتزلہ کے استدلال کا یہی جواب دیا ہے کہ اللہ جس بہترین جماعت میں اپنے بندے کو یاد فرماتا ہے اس سے انبیاء کرام کی ارواح اور مقرب فرشتوں کی جماعت مراد ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

(مرقات ج ۵ ص ۳۷)

اللہ عزوجل کی اطاعت کی' حقیقتاً اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جس نے اُس کی نافرمانی کی' حقیقتاً اُس نے اُس کی ناشکری کی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد طلب کرو' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے O

مدد طلب کرنے کے حکم میں صبر اور نماز کو خاص کرنے کی وجہ اور ان دونوں کی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے مدد طلب کرنے کے حکم میں صرف صبر اور نماز کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ ان دونوں سے دیگر عبادات میں مدد حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے سو وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ عزوجل کی خاطر ناگوار باتوں کو برداشت کرنے پر اپنے نفس کو مجبور کرے اور اس کو اس بات پر آمادہ کرلے کہ وہ تمام عبادتوں اور نیک کاموں میں آنے والی دشواریوں کو برداشت کرے' بے صبری اور دیگر ممنوعات سے اجتناب کرے[۳۴۰]۔

بعض علماء نے اس آیت میں صبر سے روزہ مراد لیا ہے اور بعض علماء نے اس سے جہاد مراد لیا ہے۔ جہاں تک نماز سے مدد طلب کرنے کا تعلق ہے سو وہ اس لیے ہے کہ نماز کو اللہ عزوجل کے لیے بہت خشوع و خضوع اور عاجزی اور اخلاص کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ بعض علماء نے صبر اور نماز سے مدد طلب کرنے کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم فرائض پر صبر کرکے طلبِ آخرت پر مدد طلب کرو۔ اور پانچ نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرکے گناہوں کو مٹانے پر مدد طلب کرو۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ ''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا مددگار ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے جائیں اُنہیں مُردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اُن کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے O

[۳۴۰] علامہ خازن نے یہاں صبر اور نماز سے مدد طلب کرنے کی تخصیص کی جو توجیہ کی ہے وہ بعینہٖ تفسیر کبیر میں مذکور ہے۔ لیکن علامہ خازن نے اس کو بہت اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے پوری بات اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عبادات میں صرف صبر اور نماز سے مدد طلب کرنے کا حکم اس لیے فرمایا کہ ان دونوں کو اختیار کرنے سے دیگر عبادات میں آسانی اور مدد ملتی ہے۔ صبر سے دیگر عبادات میں آسانی اور مدد اس طرح ملتی ہے کہ صبر کے ذریعہ نفس کو اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ناگوار اور ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرے اور اللہ کی عبادت میں آنے والی دشواریوں پر بے صبری کی بجائے تحمّل کا مظاہرہ کرے۔ جب آدمی اپنے نفس کو ان تمام باتوں کا تابع بنا دیتا ہے اور صبر کے ذریعہ نفس کو بچھا دیتا ہے تو اللہ کی فرمانبرداری کرنا اور اس کی مختلف عبادات بجالانا قطعاً دشوار نہیں رہتا' اس لیے فرمایا کہ صبر سے مدد طلب کرو۔ نماز کے ذریعہ دیگر عبادات میں آسانی اور مدد اس طرح ملتی ہے کہ اگر نماز کو صحیح طریقہ کے مطابق ادا کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ نماز کو بہت عاجزی و انکساری' خشوع و خضوع اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے ادا کرنا ضروری ہے اور اس میں اپنی فکر و خیال کو دنیاوی اُمور سے بچا کر نماز ہی میں مرکوز رکھنا ضروری ہے' سو جب ہر نماز کو اس طریقہ پر ادا کیا جائے گا تو نفس مکمل طور پر قابو میں آ جائے گا اور روزمرہ کے اس معمول سے اُس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ دیگر عبادات میں آنے والی مشکلات اور دشواریوں کو بہت آسانی کے ساتھ برداشت کرلے گا' اس لیے فرمایا کہ نماز سے مدد طلب کرو۔

(تفسیر کبیر' موضحاً' البقرہ: ۱۵۳)

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ﴾ یہ آیت اُن مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے۔ یہ کل ۱۴ آدمی تھے جن میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصاری تھے۔ جو چھ مہاجرین سے تھے اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلب (۲) حضرت عُمیر بن ابی وقاص بن اُہیب بن عبد مناف بن زھرہ الزھری یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھائی تھے (۳) ذوالشمالین ان کا اصل نام ہے: حضرت عمیر بن عمرو بن العاص بن نھلہ بن عمرو بن خزاعہ پھر بنی غبشان (۴) عاقل بن البکیر از بنی سعد بن لیث بن کنانہ (۵) مہجع حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام (۶) صفوان بن بیضاء از بنی الحارث بن فہر۔

جو آٹھ افراد انصار میں سے تھے اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) سعد بن خیثمہ (۲) مبشر بن عبد بن المنذر (۳) یزید بن الحارث بن قیس بن فسحم (۴) عمیر بن الحمام (۵) رافع بن المعلّی (۶) حارث بن سراقہ (۷) عوف بن حارث بن رفاعہ بن سواد (۸) معوذ بن حارث بن رفاعہ بن سواد۔ عوف اور معوذ دونوں عفراء کے بیٹے ہیں اور عفراء ان کی والدہ کا نام ہے۔

زیر بحث آیت کے نازل ہونے سے پہلے لوگ اللہ کی راہ میں مارے جانے والے شخص کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ فلاں شخص مر گیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے محروم ہو گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور شہیدوں کو مُردہ کہنے سے منع فرما دیا۔

بعض علماء نے اس آیت کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ کفار اور منافقین نے کہا کہ لوگ (سیدنا) محمد (ﷺ) کو خوش کرنے کے لیے اپنے آپ کو ظلماً مروا دیتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (ان کے اس قول کے رد میں) زیر بحث آیت نازل فرمائی اور بتا دیا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے جائیں وہ زندہ ہیں۔

شہداء کی حیات کا بیان

﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ شہداء اس وقت بھی زندہ ہیں اور ان کو یہ زندگی اللہ تعالیٰ نے اس لیے عطا فرمائی ہے تاکہ اجر و ثواب اور نعمتیں انہیں حاصل ہوں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ شہداء اللہ تعالیٰ کے پاس زندہ ہیں اُن کی روحوں پر اُن کا رزق پیش کیا جاتا ہے اور اُنہیں راحت وسکون پھول اور خوشی پہنچتی ہے۔ جیسے فرعونیوں کی ارواح پر صبح وشام آگ کو پیش کیا جاتا ہے جس سے اُنہیں درد اور تکلیف پہنچتی ہے۔

اس آیت میں دلیل ہے اس بات کی کہ جو لوگ اللہ عزوجل کے اطاعت گزار ہوتے ہیں وہ باوجود اس کے کہ برزخ میں اپنی قبروں میں ہوتے ہیں لیکن اُنہیں ثواب پہنچتا ہے۔ اسی طرح نافرمانوں کو اُن کی قبروں میں عذاب دیا جاتا ہے۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ شہید ہونے والے ہمیں تو مُردہ ہی نظر آتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا معنیٰ کہ ''وہ زندہ ہیں؟'' اور اس بات کا کیا مقصد کہ اُنہیں مردہ نہ کہو؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس آیت میں جو فرمایا کہ ''اُنہیں مُردہ نہ کہو'' اس سے مراد یہ ہے کہ دیگر مُردوں کی طرح اُنہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کی رُوحیں جنت میں پہنچتی ہیں۔ جیسا کہ (حدیث شریف میں) وارد ہے کہ:

(۱۴۷) بے شک شہداء کی رُوحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور جنت میں (جہاں چاہتی ہیں) چرتی رہتی ہیں۔[۳۴۱]

[۳۴۱] علماء نے اس کے مختلف معانی اور مفاہیم بیان کیے ہیں: (۱) ایک معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ یہ فرمان تشبیہ کے طور پر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(صحیح مسلم: ۱۸۸۷، سنن ترمذی: ۳۰۱۱، سنن ابن ماجہ: ۲۸۰۱، سنن دارمی: ۲۴۱۰)

لہٰذا اس اعتبار سے شہداء زندہ ہیں۔ اگر چہ جسم سے رُوح کے نکلنے کے اعتبار سے مُردہ ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ شہداء عالمِ غیب میں اللہ تعالیٰ کے پاس زندہ ہیں' کیونکہ وہ آخرت کی طرف جاچکے ہیں اس لیے ہم اُن کی حیات کا مشاہدہ نہیں کرسکتے (اور بہ ظاہر یہی سمجھتے ہیں کہ وہ مردہ ہیں' حالانکہ وہ زندہ ہیں اور اُن کی زندگی ہماری عقل سے ماوراء ہے)۔ اس جواب کی دلیل زیرِ بحث آیت کا آخری جملہ ہے جس میں فرمایا کہ تم اُن کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ شہداء تمہیں زندہ نظر نہیں آتے جو تمہیں اُن کی حقیقت کا علم ہو۔ آج جو تمہیں یہ معلوم ہے کہ شہداء زندہ ہوتے ہیں وہ بھی صرف اس وجہ سے ہے کہ میں نے تمہیں اُن کے زندہ ہونے کی خبر دی ہے۔

آیت میں شہداء کی تخصیص کی وجہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ وہ مسلمان جو اللہ عزوجل کے اطاعت گزار ہوتے ہیں اُن سب کو قبروں میں جنت کی نعمتیں ملتی ہیں' پھر کیا وجہ ہے کہ یہاں صرف شہداء کا تذکرہ کیا گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ صرف شہداء کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شہداء کو دیگر مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے' کیونکہ ان پر نعمتوں کی بارش زیادہ ہے۔ (مثلاً) یہ کہ اُنہیں رزق کے طور پر جنت سے کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جاتی ہیں' اس کے علاوہ اور بھی دیگر چیزوں سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں اس لیے صرف شہداء کا تذکرہ کیا گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ صرف شہداء کا تذکرہ کرنے میں اُن لوگوں کا رد ہے جو اللہ عزوجل کی راہ میں مارے جانے والے کے بارے میں کہتے تھے کہ فلاں شخص مر گیا اور دُنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے محروم ہو گیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت کے ذریعہ بتا دیا کہ شہداء زندہ ہیں۔ یعنی دائمی نعمتوں میں رہنے والے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور ہم ضرور تمہیں کچھ خوف اور بھوک کے ذریعہ آزمائیں گے اور (تمہارے) مال' جان اور پھلوں کے نقصان میں مبتلا کریں گے' اور (اے رسول مکرم!) آپ اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے O جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے O

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اے امت محمد! ہم ضرور تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے۔ ''لنبلونکم'' پر جو لام ہے وہ جواب قسم کا ہے اور قسم محذوف ہے۔ اصلِ عبارت یہ ہے: ''واللہ لنبلونکم'' اللہ کی قسم! ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے۔

ابتلاء (آزمائش) یہ ہے کہ اطاعت گزار کو نافرمان سے ممتاز کر دیا جائے۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ لوگوں کو آزماتا ہے۔ اُس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہے۔ یعنی یہ بتانے کے لیے کہ شہداء کے اجسام اس طرح تیزی سے حرکت کرتے ہیں جیسے سبز پرندے حرکت کرتے ہیں۔ (۲) حدیث سے یہ مراد لینا بھی ممکن ہے کہ شہید کی رُوح حقیقۃً پرندے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ روحیں اتنی لطیف ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی چیز کا جسم اختیار کر سکتی ہیں۔ جیسے جبریل امین حضرت دحیہ کلبی کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔
(روح المعانی ج ۲' البقرہ: ۱۵۴' شرح صحیح مسلم ج ۵ ص ۸۹۹)

(۳) حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ شہداء کی ارواح کو پرندوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے' تا کہ اُن ارواح کا اعزاز مزید بڑھ جائے۔ کیونکہ جب رُوح جنت کے پرندوں میں محفوظ ہو گی تو وہ اندر رہ کر جنت کی تمام نعمتوں کو ملاحظہ کرے گی۔ (المفہم ج ۳ ص ۷۱۵)

کی آزمائش کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ کوئی نامعلوم چیز جاننا چاہتا ہے' اس لیے کہ وہ تو تمام چیزوں کو اُن کے وجود میں آنے سے پہلے ہی جانتا ہے۔

اس آیت میں ﴿ بِشَیْءٍ ﴾ کا لفظ فرمایا گیا' "باشیاء" اس لیے نہیں فرمایا کہ اُس سے یہ گمان ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کئی اقسام کے خوف اور بھوک میں مبتلا فرمائے گا۔ سو جب اللہ نے "بشیئی" فرمایا تو اب اصل عبارت یہ ہوگی: "بشیئی من الخوف وبشیئی من الجوع" کچھ خوف اور کچھ بھوک۔ بعض علماء نے "بشیئی" کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ ہم تم کو مذکورہ تمام چیزوں کے قلیل حصہ سے آزمائیں گے۔

آیت مذکورہ میں خوف اور بھوک اور مال و جان اور پھلوں کے نقصان کی تفسیر

آیت میں جو ﴿ اَلْخَوْفِ ﴾ کا لفظ ہے اُس کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس سے دشمن کا خوف مراد ہے (یعنی ہم تمہیں کچھ دشمن کے خوف میں مبتلا کریں گے) خوف کا معنیٰ ہے: "توقع مکروہ یحصل منہ ألم فی القلب" یعنی ایسی ناپسندیدہ بات کی توقع جس سے دل میں بے چینی پیدا ہو۔ آیت میں جو ﴿ اَلْجُوْعِ ﴾ کا لفظ ہے اس سے قحط اور خوراک کے حصول میں دُشواری مراد ہے (یعنی ہم قحط سالی اور خوراک کے حصول میں دشواری کے ذریعہ تمہیں آزمائیں گے)۔ ﴿ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ ﴾ سے اموال کی ہلاکت اور خسارہ مراد ہے۔ ﴿ اَلْاَنْفُسِ ﴾ کا معنیٰ ہے: "ونقص من الانفس" (یعنی جانوں کی کمی) اور اس سے موت اور قتل مراد ہے۔ اور ﴿ وَالثَّمَرٰتِ ﴾ سے پھلوں کی ہلاکت اور آفت مراد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ پھلوں کی ہلاکت قحط سالی کی وجہ سے اور درختوں میں کام نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

(آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم تمہیں اموال کی ہلاکت' جانوں کی کمی (یعنی موت یا قتل) اور پھلوں کی ہلاکت میں مبتلا کریں گے۔)

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ خوف سے مراد اللہ عزوجل کا خوف ہے اور بھوک سے مراد ماہِ رمضان کے روزے ہیں۔ "نقص من الاموال" مال میں کمی سے مراد زکوٰۃ اور صدقات کی ادائیگی ہے اور جان کی کمی سے مراد مختلف امراض میں مبتلا کرنا ہے اور ثمرات (پھلوں) کی کمی سے مراد اولاد کا مر جانا ہے' کیونکہ اولاد اپنے والد کے دل کا پھل ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

(۱٤۸) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کسی آدمی کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بچہ کی روح قبض کر لی ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا تم نے اُس بندے کے دل کا پھل اُٹھا لیا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب تم نے روح قبض کی تو میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: تیرے بندے نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا اور تیری حمد وثناء کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم اس بندے کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کرو اور اس گھر کا نام بیت الحمد رکھو (یعنی تعریف والا گھر)۔

(سنن ترمذی: ۱۰۲۱' سنن بیہقی ج ۵ ص ۴۵۶' مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۵' شرح السنہ: ۱۵۴۹' مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۵۱' مطبوعہ کراچی)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔

اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے بتا دیا کہ ہم ضرور تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے بتا دیا کہ ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس میں کئی حکمتیں ہیں:

(۱) ایک حکمت یہ ہے کہ آدمی کو جب پہلے سے پتا چل جائے کہ اُسے کسی آزمائش میں مبتلا کیا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو صبر کے لیے تیار کر لیتا ہے۔ پھر جب (واقعۃً) اُس پر آزمائش آ جاتی ہے تو وہ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

(۲) ایک حکمت یہ ہے کہ جب کفار یہ دیکھیں گے کہ مسلمان آزمائشوں کے آنے کے باوجود اپنے دین پر صبر واستقامت کے ساتھ ثابت قدم ہیں تو وہ سمجھ جائیں گے کہ مذہب اسلام صحیح مذہب ہے اور یہی استقامت اُن (کافروں) کے لیے مذہب اسلام کی پیروی اور اُس میں داخل ہونے کا سبب بنے گی۔ اس لیے اللہ عزوجل نے پہلے سے مسلمانوں کو تیار کر دیا کہ ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے۔

(۳) ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آزمائش سے پہلے بتا دیا کہ ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے۔ اب جب واقعۃً آزمائش آئے گی تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبر ہوگی اور نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہوگا۔

(۴) ایک حکمت یہ ہے کہ منافقین نے صرف مال کے لالچ میں اور مال غنیمت سے حصہ پانے کے لیے اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کیا' سو جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ میں اپنے بندوں کو آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہوں تو وہیں سے مؤمن ومنافق اور سچے جھوٹے کے درمیان امتیاز ہو گیا۔

(۵) ایک حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے آسائش کے دنوں کی بہ نسبت آزمائش کے دنوں میں اللہ عزوجل کے ساتھ زیادہ مخلص ہوتا ہے' سو جب اُسے پہلے سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ اُسے آزمائش میں ڈالا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمیشہ گریہ وزاری اور عاجزی کرتا رہے گا تاکہ اللہ تعالیٰ اُسے ممکنہ نازل ہونے والی آزمائش سے نجات عطا فرمائے۔

''الصابرین'' اور ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کی تفسیر

آیت میں ﴿الصّٰبِرِیْنَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو آزمائش کے آنے پر صبر کرتے ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ اُن لوگوں کو بشارت دیجئے جو میری طرف سے آزمائش کے طور پر آنے والی مشکلات اور تکالیف پر صبر کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے (اگلی آیت میں) صبر کرنے والوں کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ﴾ یعنی (صابرین وہ ہیں کہ) اُنہیں جب کوئی مصیبت اور آزمائش پہنچتی ہے ﴿قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ﴾ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں' یعنی اُس کے بندے ہیں یا اُس کی ملکیت میں ہیں ﴿وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے یعنی آخرت میں۔

(۱۴۹) اُم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ ہر وہ بندہ جس کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ یہ کہہ لے:

اِنَّـا لِـلّٰهِ وِاِنَّا اِلَـيْهِ رَاجِعُوْنَ. اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَاَخْلِفْ لِیْ خَيْرًا مِّنْهَا.

بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اے اللہ! مجھے درپیش مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کا مجھے بہترین متبادل عطا فرما۔

تو اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) اپنے بندے کو مصیبت میں اجر عطا فرماتا ہے اور اس سے بہتر اس کو متبادل عطا فرماتا ہے[۳۴۲] (صحیح مسلم: ۹۱۸' سنن ابوداؤد: ۳۱۱۹' مسند احمد ج ۶ ص ۳۰۹' شعب الایمان: ۹۶۹۷' شرح السنہ: ۱۴۵۶' مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۴۰' مطبوعہ کراچی)

[۳۴۲] یہ حدیث ام المؤمنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے اور ام المؤمنین ہی اس کی عملی تصویر ہیں۔ خود فرماتی ہیں: جب (میرے شوہر) ابوسلمہ کا انتقال ہوا تو میں نے سوچا کہ مسلمانوں میں کون ایسا شخص ہے جو ابوسلمہ سے بہتر ہو؟ ابوسلمہ گھر والوں میں وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اس کے بعد میں نے مذکورہ دعا پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے (مجھے ابوسلمہ سے بہتر) متبادل عطا فرمایا اور میرا نکاح نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہو گیا۔ (صحیح مسلم: ۹۱۸)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جو چیز اس امت کو عطا ہوئی ہے وہ کسی اور امت کو عطا نہیں ہوئی' اور وہ ہے مصیبت کے وقت ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھنا۔ اگر کسی اور اُمت کو یہ جملہ عطا کیا جاتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو عطا کیا جاتا۔ کیا تم نے یہ بات نہیں سُنی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو گم پایا تو کہا تھا: ''یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ'' ہائے افسوس! یوسف کی جُدائی پر۔ (یوسف:۸۴)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ بندہ جب ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہتا ہے تو وہ (درحقیقت) اپنے آپ کو اللہ عزوجل کے سُپرد کر دیتا ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ نازل ہونے والی ہر مصیبت اور تکلیف پر راضی ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے خصوصی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پر ثابت قدم ہیں O

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو گذشتہ آیت میں ذکر کردہ صفت کے حاملین ہوں (یعنی ایسے صبر کرنیوالے ہوں کہ ہر مصیبت میں ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہنے والے ہوں)۔ اُن پر اُن کے رب کی طرف سے صلوٰت اور رحمت ہے۔

''صلوات'' اور رحمت کی تفسیر

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''صلوات'' سے مراد مغفرت ہے (یعنی اُن کے لیے اُن کے رب کی طرف سے مغفرت ہے)۔ ﴿صَلَوٰتٌ﴾ کا یہی معنیٰ نبی اکرم ﷺ کے درج ذیل فرمان میں بھی ہے:

(۱۵۰) ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِىْ اَوْفٰى''۔ اے اللہ! ابواوفی کی اولاد کی مغفرت فرما اور اُن پر رحمت فرما۔[۳۴۳]

(صحیح بخاری: ۱۴۹۷' صحیح مسلم: ۱۰۷۸' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۴' سنن بیہقی ج ۲ ص ۱۵۲)

زیر بحث آیت میں ''صلوات'' جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے ایک مغفرت یا ایک رحمت مراد نہیں ہے' بلکہ اس سے مغفرت اور رحمت کا تسلسل مراد ہے۔

''رحمۃ'' کی تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے نعمت سے کی ہے (یعنی اُن کے لیے اُن کے رب کی طرف سے نعمت ہے)۔ رحمت کا استعمال جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس سے اس کا انعام و احسان اور فضل و کرم مراد ہوتا ہے' اور جب لوگوں کی طرف سے اس کا استعمال ہو تو اس سے نرمی اور جھکاؤ مراد ہوتا ہے۔

زیر بحث آیت میں صلوات کے بعد رحمت کا ذکر فرمانے کی توجیہ

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیت میں صلوات کے بعد رحمت کا تذکرہ کیوں کیا گیا؟ بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ الفاظ اور معانی میں وُسعت ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی ''صلوٰۃ'' سے ''رحمت'' مراد ہوتی ہے (اس کو ظاہر کرنے کے لیے صلوات کے بعد رحمت کا لفظ لایا گیا)۔ اور جہاں کہیں ایسا ہو کہ الفاظ مختلف ہوں اور باہم اُن کا معنیٰ ایک ہو تو وہاں اہل

۳۴۳؎ اس طرح کی دُعا نبی اکرم ﷺ کے معمولات میں سے تھی۔ یعنی جب بھی کوئی قوم یا کوئی شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس صدقہ لے کر حاضر ہوتا تو آپ دُعا فرماتے: ''اللھم صل علی آل فلان''. (اے اللہ! فلاں کے گھر والوں کی مغفرت فرما۔) جب حضرت ابو اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا صدقہ لے کر نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کے لیے دُعا فرمائی: اے اللہ! ابو اوفی کی اولاد کی مغفرت فرما۔ (صحیح بخاری: ۱۴۹۷' صحیح مسلم: ۱۰۷۸)

عرب کثرت کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے لفظ کو ذکر کر دیتے ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ صلوات کے بعد رحمت کا لفظ تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنٰی یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر اُن کے رب کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ صبر کرنے والے لوگ مشکلات میں ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہنے کی ہدایت پانے والے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنٰی یہ کیا ہے کہ ایسے لوگ جنت کی طرف ہدایت پانے والے اور اجر وثواب کے ساتھ کامیاب ہونے والے ہیں۔ بعض علماء نے معنٰی یہ کیا ہے کہ ایسے لوگ حق اور درست بات کی طرف ہدایت پانے والے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دونوں ساتھی کتنے ہی بہترین ہیں اور ان پر جو اضافہ ہے اُس کی کیا بات ہے۔ دونوں ساتھیوں سے مراد صلوٰۃ اور رحمت ہے اور اضافہ سے مراد ہدایت ہے۔

(صحیح بخاری تعلیقاً۔ کتاب الجنائز۔ باب: ۴۲' سنن بیہقی: ۷۱۲۶۔ ج ۴ ص ۶۵' مستدرک ج ۲ ص ۲۷۰)

آزمائش میں مبتلا ہونے والوں اور اُس پر صبر کرنے والوں کے اجر وثواب کے بارے میں احادیث

(۱۵۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ (عزوجل) جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اُس کو مصیبت میں ڈالتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۵۶۴۵' السنن الکبریٰ للنسائی: ۷۴۸' مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۷' صحیح ابن حبان: ۲۹۰۷' شرح السنۃ: ۱۴۲۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۳۶۔ ص ۱۳۴' مطبوعہ کراچی)

☆ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بھلائی سے نوازنا چاہتا ہے اُس کو مصائب میں مبتلا فرما دیتا ہے' تاکہ اُن مصائب پر اُسے اجر عطا فرمائے۔

(۱۵۲) حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کو جو بھی تھکاوٹ' بیماری' پریشانی' تکلیف اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ جو کانٹا چبھ جاتا ہے اُس کے عوض اللہ تعالیٰ اُس بندے کی خطائیں معاف فرما دیتا ہے۔[۳۴۴] (صحیح بخاری: ۵۶۴۱' صحیح مسلم: ۲۵۷۳' سنن ترمذی: ۹۶۶' مسند احمد ج ۳ ص ۴۸' صحیح ابن حبان: ۲۹۰۵' سنن بیہقی ج ۳ ص ۳۷۳' شرح السنۃ: ۱۴۲۱' مشکوٰۃ: ۱۵۳۷۔ ص ۱۳۴)

☆ اس حدیث میں دو الفاظ آئے ہیں: ''نَصَب'' اور ''وَصَب''۔ نصب کا معنٰی ہے: تھکاوٹ اور وصب کا معنٰی ہے: بیماری۔

(۱۵۳) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس مسلمان کو کسی بیماری کی تکلیف یا اور کوئی تکلیف پہنچتی ہے اُس کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اُس تکلیف کی وجہ سے اس طرح گرا دیتا ہے جس طرح درخت اپنے پتے گراتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۵۶۶۰' صحیح مسلم: ۲۵۷۱' سنن دارمی: ۲۷۷۱' شرح السنۃ: ۱۴۳۱)

(۱۵۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی مثال اُس درخت کی طرح ہے جس کو ہوا مسلسل ہلاتی رہے' اور مؤمن پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں۔ جبکہ منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے

[۳۴۴] اس حدیث میں مصیبتوں کا جو فائدہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بندے کے گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ جبکہ ایک اور حدیث (جو صرف نیک اعمال کرنے والوں کے لیے ہے) اُس میں یہاں تک ارشاد فرمایا کہ جب بندہ اچھے طریقہ سے عبادت کر رہا ہو پھر وہ بیمار ہو جائے تو جو فرشتہ اس پر مامور ہوتا ہے اُس سے کہا جاتا ہے کہ اس کے تندرست ہونے تک اس کا وہ عمل لکھتے رہو جو یہ صحت کے ایام میں کیا کرتا تھا۔
(صحیح بخاری: ۲۹۹۶' سنن ابوداؤد: ۳۰۹۱' مسند احمد: ۶۸۹۵' کنز العمال: ۶۷۰۳)

جو اُس وقت تک نہیں ہلتا جب تک کہ اُسے کاٹ نہ دیا جائے۔ (صحیح بخاری: ۵۶۴۴، صحیح مسلم: ۲۸۰۹، سنن ترمذی: ۲۸۶۶، صحیح ابن حبان: ۲۹۱۵، مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۳، شرح السنہ: ۱۴۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۴۲۔ ص ۱۳۵)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''الارزۃ'' یہ ملک شام میں ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ عراق اور مصر میں اس کو صنوبر سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن صنوبر اُس درخت کے پھل کو کہا جاتا ہے ایک قول کے مطابق ''ارزہ'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو زمین میں ثابت اور قائم ہو۔

(۱۵۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُسے دنیا میں ہی سزا دے دیتا ہے (یعنی آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے) اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس سے سزا کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اُسے پوری سزا دے گا۔[۳۴۵] (سنن ترمذی: ۲۳۹۶، مسند احمد ج ۴ ص ۸۷، مستدرک ج ۴ ص ۶۰۸، کنز العمال: ۶۷۹۹، شرح السنہ: ۱۴۳۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۶۵۔ ص ۱۳۶)

(۱۵۶) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اجر و ثواب کا زیادہ ہونا آزمائش کے زیادہ ہونے کے ساتھ ہے۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت فرماتا ہے تو اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ پھر جو شخص (اُس آزمائش پر) راضی ہوتا ہے تو اُس کے لیے رضا ہے اور جو (آزمائش پر) ناراض ہوتا ہے اُس کے لیے ناراضگی ہے۔[۳۴۶]

(سنن ترمذی: ۲۳۹۶، سنن ابن ماجہ: ۴۰۳۱، الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۸۳، کنز العمال: ۶۸۰۲، شرح السنہ: ۱۴۳۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۶۶۔ ص ۱۳۶)

(۱۵۷) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آزمائش کی زندگی بسر کرنے والوں کو جب قیامت کے دن اجر و ثواب سے نوازا جا رہا ہوگا تو عافیت کی زندگی گزارنے والے یہ خواہش کریں گے کہ کاش دُنیا میں ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئیں ہوتیں۔[۳۴۷] (سنن ترمذی: ۲۴۰۲، سنن بیہقی ج ۳ ص ۳۷۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۷۰۔ ص ۱۳۷)

(۱۵۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن مرد اور مؤمن عورت پر اُن کی اپنی ذات میں اور اُن کی اولاد میں آزمائش آتی رہے گی یہاں تک کہ وہ (مرد و عورت) اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملیں گے کہ اُن پر کوئی گناہ باقی نہیں ہوگا۔[۳۴۸] (سنن ترمذی: ۲۳۹۹، مستدرک ج ۴ ص ۳۱۴۔ ج ۱ ص ۳۴۶، الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۸۶، کنز العمال: ۶۷۷۷، مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۷، شرح السنہ: ۱۴۳۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۶۷۔ ص ۱۳۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن اور صحیح'' قرار دیا ہے۔

(۱۵۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں

---

[۳۴۵] کیونکہ قیامت کے دن وہ بھر پور گناہوں کے ساتھ آئے گا لہٰذا سزا بھی اُس کے مطابق اُسے دی جائے گی۔

[۳۴۶] اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ آزمائش کا آنا محبت کی علامت ہے۔ جو اللہ کی آزمائش پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور خوش دلی کے ساتھ آزمائشوں کو قبول کرتا ہے وہ اللہ عزوجل کا محبوب اور مقرب ہو جاتا ہے۔ مکہ و طائف، بدر و اُحد اور خندق و حنین میں آنے والی ہر آزمائش اور تکلیف پر نبی کریم ﷺ کی بے مثال صبر و استقامت اسی حدیث کا عملی نمونہ تھی۔

[۳۴۷] یعنی کاش ہم نے بھی سخت آزمائش اور مشکلات کی زندگی گزاری ہوتی تو ہمیں بھی آج عظیم اجر و ثواب سے نوازا جاتا۔

[۳۴۸] اس سے معلوم ہوا کہ آزمائش اور مشکلات کے باعث آدمی کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث ۱۵۲ اور ۱۵۳ میں اس کی تائید اور صراحت موجود ہے۔

اپنے جس مؤمن بندے کے دُنیاوالوں میں سے کسی پیارے کوموت دے دوں اور وہ بندہ اس پر صبر کرے تو اس کی جزاء صرف اور صرف جنت ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۴۲۴' مسند احمد ج ۲ ص ۴۱۷)

(۱۶۰) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کن لوگوں کی آزمائش زیادہ سخت ہوتی ہے؟ ارشاد فرمایا: انبیاء کرام کی آزمائش سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے[۳۴۹]' پھر اُن کے بعد جو زیادہ قرب رکھتا ہو اور پھر اُن کے بعد جو زیادہ قرب رکھتا ہو۔ آدمی اپنی دین داری کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ اگر اُس کے دین میں سختی ہو تو اُس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اُس کے دین میں نرمی ہو تو اُس کے لیے (معاملات میں) آسانی کر دی جاتی ہے۔ آدمی پر مسلسل آزمائشیں آتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ آزمائشیں اُسے ایسا بنا دیتی ہیں کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (سنن ترمذی: ۲۳۹۸' سنن ابن ماجہ: ۴۰۲۳' صحیح ابن حبان: ۲۹۰۱' مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۵' مستدرک ج ۱ ص ۴۱' سنن بیہقی ج ۳ ص ۳۷۲' شرح السنۃ: ۱۴۳۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۶۲۔ ص ۱۳۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے (دو نشانیاں) ہیں' سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر ان دونوں مقامات کے درمیان چکر لگانے میں کوئی گناہ نہیں ہے' اور جو اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ جزا دینے والا خوب علم والا ہے○

صفا' مروہ اور شعائر کی تفسیر

﴿الصَّفَا﴾ ''صـفـاة'' کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے: سخت اور چکنی چٹان۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے صاف ستھرا پتھر مُراد ہے۔ ﴿الْمَرْوَةَ﴾ واحد ہے۔ اس کا معنیٰ ہے: نرم پتھر۔ اور جمع اس کی ''مَرْوٌ'' اور ''مَرَوَاتٌ'' آتی ہے۔

یہ گفتگو صفا اور مروہ کی لغوی تحقیق کے حوالہ سے تھی' جہاں تک آیت کا تعلق ہے سو اس میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں لفظوں سے دو مشہور پہاڑ مراد لیے ہیں جو کہ مکہ میں مقامِ سعی کے دونوں طرف واقع ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو الف لام کے ساتھ استعمال فرمایا ہے۔

آیت میں جو ﴿شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ کا لفظ ہے اُس کا معنیٰ ہے: اللہ کے دین کی نشانیاں۔ یہ (عربی زبان میں) ''اشـعـار'' سے بنا ہے اور ''اشعار'' کا معنیٰ ہے: ''الاعلام'' 'خبر دینا' بتانا۔ ''شعائر'' کا واحد ''شعیرۃ'' ہے۔

(واضح رہے کہ) ہر وہ چیز جو ایسی عبادت کا مظہر ہو جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے وہ چیز اللہ عزوجل کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جیسے نماز' دُعا اور قربانی وغیرہ۔ اسی طرح حج کی وہ نشانیاں جو ہمیں ظاہری طور پر محسوس ہوتی ہیں وہ ''مشـاعـرِ حج'' ہیں' اُن کو شعائرِ حج بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا طواف و وقوف اور قربانی کے مقامات سب کے سب ''شـعـائـر'' ہیں۔ زیرِ بحث آیت میں ''شـعـائـر'' سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کی نشانیاں بنا دیا

[۳۴۹] کیونکہ انبیاء کرام کو آزمائشوں اور مصیبتوں میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو عوام کو نعمتوں اور آسائشوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے عوام پر جو آزمائشیں آتی ہیں وہ ہلکی ہوتی ہیں اور خواص پھر اخص الخواص کی آزمائش درجہ بہ درجہ سخت ہوتی ہے۔

ہے۔صفا اور مروہ بھی اُن ہی نشانیوں میں سے ہیں' اور ان کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔

''حج'' اور ''عمرہ'' کا معنیٰ

﴿ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ ﴾ کا معنیٰ ہے: جو شخص بیت اللہ کا ارادہ کرے۔ یہی حج کا لُغوی معنیٰ ہے: یعنی ارادہ کرنا۔ اور شریعت میں اس کا معنیٰ ہے: ارکانِ حج کی ادائیگی کے لیے مخصوص طریقے اپنانا۔ آیت میں ﴿ اَوِ اعْتَمَرَ ﴾ کا معنیٰ ہے: جو شخص بیت اللہ کی زیارت کرے۔ عُمرہ کا معنیٰ ہے: زیارت کرنا۔ لہٰذا شرعی اعتبار سے حج اور عمرہ دونوں ارادہ اور زیارت کا نام ہیں۔ آیت میں ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ ﴾ کا معنیٰ ہے: اُس شخص پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ ''جُناح'' اصل میں ''جنح'' سے بنا ہے اور یہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص سیدھے راستہ سے منحرف ہو جائے آیت میں جو فرمایا: ﴿ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ صفا اور مروہ کا طواف کرے۔ اس میں طواف سے مراد ہے: صفا مروہ کے درمیان چکر لگانا' سعی کرنا اور دوڑنا۔

زیرِ بحث آیت کا واقعۂ نزول

آیت مذکورہ کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ صفا اور مروہ پر دو بُت نصب تھے' جن میں سے ایک کو اساف اور ایک کو نائلہ کہا جاتا تھا۔ ''اساف'' صفا پر نصب تھا اور ''نائلہ'' مروہ پر نصب تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ ان دو بتوں کی تعظیم اور احترام میں صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگایا کرتے تھے۔ جب اسلام کی آمد ہوئی اور تمام بتوں کو توڑ دیا گیا تو مسلمانوں نے صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کو دُشوار جانا (کیونکہ وہاں پہلے بُت نصب تھے)۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے (مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے) آیتِ مذکورہ نازل فرمائی اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور ساتھ یہ بھی بتادیا کہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

عاصم بن سلیمان الاحول بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ناپسند کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں! ہم ناپسند کرتے تھے' کیونکہ یہ دونوں مقامات جاہلیت کی نشانیوں میں سے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں' سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر ان دونوں مقامات کے درمیان چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے''۔
(صحیح بخاری: ۱۶۴۸)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (جواباً) فرمایا کہ انصار صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ناپسند کرتے تھے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔
(صحیح مسلم: ۱۲۷۸)

صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کا شرعی حکم اور علماءِ اُمت کے مذاہب

حج اور عمرہ میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ سعی کرنا واجب ہے[۳۵۰] حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں' اور امام مالک اور امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بھی یہی مذہب ہے۔ جب کہ علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ سعی کرنا تطوّع ہے[۳۵۱] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہی قول ہے۔ اور حضرت

۳۵۰ یعنی حج کا رُکن ہے' اگر اس کو ترک کر دیا تو حج ادا نہیں ہوگا۔

۳۵۱ یعنی حج کا رکن نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس کو ترک کر دیا تو اُس پر دم دینا لازم ہوگا۔

ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔امام ابوسفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا حج کا رکن نہیں ہے اور جو شخص اس کو ترک کر دے اُس پر دم (یعنی ایک بکری یا بھیڑ) دینا واجب ہے۔ اس کے برعکس حضرت عبد اللہ بن زبیر' حضرت مجاہد اور حضرت عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت یہ ہے کہ جس نے سعی کو ترک کر دیا اُس پر کچھ لازم نہیں ہے۔امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مؤقف کیا ہے؟ اس بارے میں اُن کی روایات مختلف ہیں۔ایک روایت اُن سے یہ ہے کہ جس نے صفا مروہ کے درمیان سعی کو ترک کر دیا اُس کا حج ہی نہیں ہوگا۔اور ایک روایت یہ ہے کہ سعی کو ترک کرنے پر کچھ لازم نہیں ہے' خواہ سعی کو جان بوجھ کر چھوڑا جائے یا بھول کر۔لیکن اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ جمہور علماء نے امام احمد کا جو قول روایت کیا ہے وہ یہ ہے کہ سعی کرنا تطوّع (یعنی نفل) ہے۔

سعی کے حکم میں علماء کے اختلاف کا سبب اور امام شافعی کے مذہب پر دلائل

سعی کے حکم میں علماء کا جو اختلاف ذکر کیا گیا اُس کا سبب یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کا جو فرمان ہے: ''فلا جناح علیہ'' اس کا معنیٰ یوں کیا جا سکتا ہے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔اور جب یہ معنیٰ کیا جائے گا تو اس میں واجب' مستحب اور مُباح تینوں داخل ہو جائیں گے۔اس لیے آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے اس پر دلالت نہیں کرتی کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا واجب ہے یا واجب نہیں ہے۔کیونکہ جو لفظ تینوں اقسام کے درمیان قدرِ مشترک پر دلالت کر رہا ہے (وہ ہے ''جُناح'' اور) اس میں واجب اور غیر واجب کی تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی خارجی دلیل ہو جو اس بات کا تعیّن کرے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی واجب ہے یا واجب نہیں ہے۔امام شافعی اور ان کے موافقین حج اور عمرہ میں سعی کے رکن ہونے پر جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ امام شافعی کی اپنی سند کے ساتھ روایت کردہ حدیث ہے جو اُنہوں نے حضرت صفیہ بنت شیبہ سے روایت کی ہے:

(۱۶۱) وہ بیان کرتی ہیں کہ بنی عبد الدار کی عورتوں میں سے ایک عورت' ابو تجزاۃ کی بیٹی جس کا نام حبیبہ ہے اُس نے مجھے بتایا کہ میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آل ابوحسین کے گھر گئی۔ہم نبی اکرم ﷺ کو صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔میں نے جب آپ ﷺ کو سعی کرتے ہوئے دیکھا تو اس حالت میں دیکھا کہ شدت کے ساتھ سعی کرنے کی وجہ سے آپ کا تہبند مبارک گھوم رہا تھا۔یہاں تک کہ مجھے کہنا پڑتا کہ میں نے آپ کے گھٹنے مبارک کو دیکھا ہے۔ساتھ ہی میں نے یہ بھی فرماتے سنا کہ تم سب سعی کیا کرو' اللہ (عزوجل) نے تم پر سعی کو لازم کیا ہے۔[۳۵۲] (مسند شافعی ج ۱ ص ۳۵۱' مسند احمد ج ۶ ص ۴۲۱' سنن دار قطنی ج ۲ ص ۲۵۶' مستدرک ج ۴ ص ۷۰' سنن بیہقی ج ۵ ص ۹۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۸۲۔ص ۲۲۸۔۲۲۷)

---

[۳۵۲] امام شافعی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہوا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا حج کا رکن ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے اس کو لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔لہٰذا اگر کسی نے سعی کو ترک کر دیا تو اس کا حج ادا نہیں ہوگا کیونکہ اس نے فرض اور رکن کو ترک کر دیا۔ہمارے نزدیک امام شافعی کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔کیونکہ زیر بحث حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد سے فرض و رکن کا ثبوت نہیں ہوتا۔لہٰذا اس حدیث کی بنیاد پر سعی کی فرضیت کو ثابت کرنا درست نہیں ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعی کرنا فرض ہے جبکہ قرآن حکیم کی زیر بحث (البقرہ: ۱۵۸) میں فلا جناح علیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی کرنا جائز ہے' فرض نہیں ہے۔احناف نے قرآن کریم کی اس آیت اور زیر بحث حدیث دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے سعی کو واجب قرار دیا ہے' جبکہ امام شافعی نے صرف حدیث کے ظاہر پر عمل کیا ہے۔تیسرا جواب جو علامہ کاسانی نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سعی کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

☆ امام دارقطنی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

(۱٦۲) حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کی زوجۂ محترمہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر اُن دونوں مقامات کے درمیان چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے؟'' میں تو (اس آیت کی وجہ سے) صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرنے میں کسی پر کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا جیسا تم کہہ رہے ہو تو پھر آیت اس طرح ہوتی: ''**فلا جناح علیه ان لا یطوف بهما**'' جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر ان دونوں مقامات کے درمیان چکر نہ لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ آیت انصار کے حق میں نازل ہوئی ہے جو کہ (زمانۂ جاہلیت میں) منات کا نام لے کر جانور ذبح کیا کرتے تھے اور منات 'قُدَید' (مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک جگہ) کے سامنے نصب تھا۔ اور انصار صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے۔ جب اسلام کی آمد ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

(صحیح بخاری: ۱٦۴۳۔۱۷۹۰، صحیح مسلم: ۱۲۷۷، سنن ترمذی: ۲۹٦۵، سنن ابوداؤد: ۱۹۰۱، سنن ابن ماجہ: ۲۹۸٦، صحیح ابن حبان: ۳۸۳۹، مسند احمد ج ٦ ص ۱۴۴)

(۱٦۳) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما حجۃ الوداع کے بارے میں اپنی ایک طویل حدیث میں بیان کرتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ دروازہ سے صفا کی طرف نکلے۔ جب آپ صفا کے قریب پہنچے تو آپ نے پڑھا: ''**ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ ابدء بما بدء اللہ به**'' بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، میں اُس سے آغاز کر رہا ہوں جس سے اللہ نے آغاز فرمایا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے صفا سے سعی کا آغاز کیا۔

(صحیح مسلم: ۱۲۱۸، سنن ابوداؤد: ۱۹۰۵، سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۴، سنن ترمذی: ۲۹٦۷، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۴، مطبوعہ کراچی)

ان احادیث سے جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے سعی کی ہے تو ہم پر بھی سعی واجب ہو گئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وَاتَّبِعُوْهُ**[۳۵۳]''۔ (الاعراف: ۱۵۸) یعنی ''تم رسول کی پیروی کرو''۔ اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس قول میں اشارہ ہے کہ سعی کرنا واجب ہے، فرض نہیں ہے۔ اگر سعی کرنا فرض ہوتا تو حضرت عائشہ اس کو حج کا تتمہ نہ قرار دیتیں بلکہ فرماتیں کہ سعی کے بغیر حج ادا نہیں ہوتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سعی کرنا فرض اور رکن نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۱۵)

۳۵۳؎ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا حکم ہے یا دیگر آیات میں نبی علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ہر عمل ہر فعل امت کے حق میں فرض یا واجب نہیں ہے، بلکہ کئی افعال آپ کے ایسے ہیں جو باوجود مواظبت کے ہمارے حق میں مستحب یا سنّت کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح فرائض و واجبات میں ہمیں آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح مستحبات اور سنّتوں میں بھی آپ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اتباع کا حکم دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ کا ہر عمل امت کے حق میں فرض ہو۔ آپ ﷺ نے حج کے دوران سعی بھی کی ہے اور دیگر ارکان بھی ادا کیے ہیں لیکن ظاہر ہے تمام ارکان کو فرض قرار نہیں دیا گیا، بلکہ ہر ایک کو دلائل کے اعتبار سے فرض و واجب اور سنّت کا درجہ دیا گیا ہے۔

(۱٦٤) تم مجھ سے مناسک حج لے لو (یعنی حج کے ارکان سیکھ لو)۔ (سنن بیہقی ج ۵ ص ۱۲۵' مسند احمد ج ۳ ص ۳۱۸_۳۶۶)

اس حدیث میں امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے (لہٰذا سعی واجب ہے[۳۵۴])۔

(امام شافعی کی طرف سے سعی کے رکن ہونے پر) عقلی دلیل یہ ہے کہ سعی چند پھیرے لگانے کا نام ہے جو کہ حرم کے مختلف حصوں میں سے ایک خاص حصہ میں مقرر کیے گئے ہیں اور ان کو کامل احرام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے' اس لیے سعی حج کا رکن ہے جیسے طوافِ زیارت حج کا رکن ہے۔[۳۵۵]

امام ابوحنیفہ کے اپنے مؤقف پر دلائل

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور وہ تمام علماء جو صفا مروہ کے درمیان سعی کو فرض نہیں سمجھتے اُن کا استدلال زیرِ بحث آیت سے ہے۔ جس میں فرمایا: ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا'' صفا مروہ کے درمیان چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اس طرح کا اندازِ گفتگو فرائض کے بیان میں اختیار نہیں کیا جاتا۔ پھر مستزاد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو مؤکد کرتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ اس جملہ سے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ سعی کرنا تطوع ہے' رُکن اور فرض نہیں ہے۔

مذکورہ دلائل کے جوابات

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''لا جناح علیه'' کا معنیٰ صرف اتنا ہے کہ سعی کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور یہ معنیٰ واجب اور غیر واجب دونوں میں مشترک ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ لہٰذا اس جملہ میں سعی کے واجب نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔[۳۵٦]

---

۳۵۴ یعنی حج کا رکن اور فرض ہے۔ ہمارے نزدیک علّامہ خازن کا اس حدیث سے استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث سے جس چیز کا وجوب ثابت ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ مناسکِ حج کو نبی اکرم ﷺ سے سیکھا جائے' نہ یہ بات کہ تمام مناسک کو حج میں فرض یا واجب کا درجہ حاصل ہے۔ اگر یہ بات ہو تو پھر تمام مناسک کو حج میں فرض اور رُکن ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ سعی کرنا حج میں فرض ہے۔

۳۵۵ ہماری طرف سے اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عقلی دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ سعی کو فرض اور رکن قرار دیا جائے لیکن قرآن وسنت کے دلائل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ البتہ چند احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سعی کرنا ضروری ہے' احناف نے اُن احادیث اور دیگر دلائل نقلیہ وعقلیہ کو مجتمع کرنے کی غرض سے سعی کو واجب قرار دیا ہے۔

۳۵٦ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ''لا جناح'' کا استعمال مختلف ہے۔ بعض مقامات پر یہ گناہ کی نفی کے لیے اور بعض مقامات پر اباحت اور جواز کے بیان کے لیے وارد ہوا ہے۔ مثلاً اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ . (النساء: ۱۰۱)

جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو قصر کرلو۔

اس آیت میں ''جناح'' کا استعمال گناہ کی نفی کے لیے ہوا ہے اور اس لفظ کے داخل ہونے کے باوجود امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک قصر نماز واجب ہے۔ جبکہ ایک دوسری آیت میں یہی لفظ بیانِ جواز کے لیے وارد ہوا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ . (البقرہ: ۲۳۵)

تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم (عدت والی عورتوں کو) اشارۃً کنایۃً سے نکاح کا پیغام دو۔

اس آیت میں ''لا جناح'' کا استعمال بیان جواز کے لیے ہوا ہے' یعنی یہ بتانے کے لیے کہ عدت والی عورتوں کو اشارہ کنایہ کے ساتھ نکاح کا پیغام دینا جائز ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ''لا جناح'' کا استعمال ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسری دلیل (''ومن تطوع خیرا'' سے استدلال) کا جواب یہ ہے کہ یہ استدلال ضعیف ہے۔ کیونکہ اس جملہ میں جو تطوّع کا لفظ ہے اُس سے ضروری نہیں ہے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا مراد ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور چیز مراد ہو' جیسا کہ اس کی تائید حضرت حسن بصری کے قول سے ہوتی ہے کہ ''ومن تطوع خیرا'' سے تمام نیک کام مراد ہیں۔[۳۵۷] اور اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے فرض عبادات کے علاوہ مزید عبادت کی مثلاً نماز' صدقہ' روزہ' حج وعمرہ' طواف اور دیگر عبادات (تو بے شک اللہ جزاء دینے والا خوب علم والا ہے)۔

حضرت مجاہد نے ''ومن تطوع خیرا'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جس نے اپنی خوشی سے صفا مروہ کے درمیان سعی کی۔ یہ معنیٰ اُن لوگوں کے قول کے مطابق ہے جو سعی کو فرض نہیں جانتے۔ جب کہ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جس نے اپنی خوشی سے نیکی کی یعنی واجب ادا کرنے کے بعد (اپنی جانب سے) مزید سعی کی۔ ان تمام اقوال میں پہلا قول زیادہ بہتر ہے' کیونکہ آیت میں عموم ہے۔

''شاکر'' اور شکر کا معنیٰ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں لفظ ''شاکر'' کا مفہوم

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ بے شک اللہ اپنی فرمانبرداری پر جزاء دینے والا ہے۔ اور ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بندے کی نیت کا علم رکھتا ہے۔

لُغت میں ''شاکر'' کا حقیقی معنیٰ ہے: ''المظهر للانعام عليه'' اپنے آپ پر ہونے والے انعام کا اظہار کرنے والا۔ اور شکر کا معنیٰ ہے: نعمت کو یاد رکھنا اور اُس کا اظہار کرنا۔ (اس معنیٰ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو) اللہ تعالیٰ کو شاکر نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ اُس کی ذات کو فائدے اور نقصانات نہیں پہنچتے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ کے لیے شاکر کا لفظ استعمال ہوگا تو یہ مجاز ہوگا اور مراد اس سے یہ لیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی فرمانبرداری پر اجر وثواب کی صورت میں بدلہ عطا فرمانے والا ہے۔ (رہا یہ سوال کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں مجاز ہے تو اس نے یہ لفظ اپنے لیے کیوں استعمال فرمایا؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُس نے یہ لفظ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی اور لطف وعنایت کے طور پر اور ان کے ساتھ بھرپور احسان کرنے کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾

بے شک وہ لوگ جو ہمارے نازل کردہ دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجود اس کے کہ ہم ان کو لوگوں کے لیے کتاب میں واضح کر چکے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ اپنی رحمت سے دُور فرما دیتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں O

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بعض مقامات پر اس کو بیانِ جواز کے لیے لایا جاتا ہے' جیسا کہ البقرہ کی مذکورہ آیت: ۲۳۵ میں مذکور ہے اور البقرہ کی زیر بحث آیت: ۱۵۸ میں بھی ہمارے نزدیک اسی معنیٰ میں وارد ہے۔ لہٰذا آیتِ قرآنی سے سعی کا جواز معلوم ہوتا ہے اور ہم نے اس کو واجب اس لیے قرار دیا ہے کہ بعض احادیث سے اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے' مزید تفصیل کے لیے حاشیہ: ۳۵۲ دیکھئے۔

۳۵۷ یہ جواب ہماری دلیل کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ تمام نیک کاموں میں سعی بھی داخل ہے۔ بلکہ حضرت مجاہد نے ومن تطوّع سے سعی ہی کو مراد لیا ہے۔ لہٰذا ''تطوّع'' کے لفظ کو عموم پر رکھا جائے یا اس سے سعی مراد لی جائے۔ بہر دو صورت اس سے احناف ہی کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اللہ کے نازل کردہ دلائل اور ہدایت کو چھپانے والوں سے کون مراد ہیں؟

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی ﴾ مذکورہ آیت اُن یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کو' آیتِ رجم کو اور دیگر احکامات کو چھپایا جو کہ تورات میں موجود تھے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ آیت کسی خاص فرد کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اپنے عموم پر ہے اور ہر اُس شخص کے بارے میں ہے جو دین کے کسی معاملہ کو چھپائے۔ کیونکہ اس آیت کے الفاظ عام ہیں اور اعتبار عمومِ الفاظ ہی کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔ اور جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ مذکورہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اُن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ کی دلیلوں اور ہدایت کو چھپانا یہودیوں کی جانب سے ہی ممکن ہے' کیونکہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا تھا' اس لیے یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

''کِتمان'' (چھپانے) کا معنیٰ اور علم دین کے اظہار کا حکم

''کِتمان'' کا معنیٰ ہے: ایسی چیز جس کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہو اُس کو ظاہر نہ کرنا۔ پھر جو شخص دین کے کسی معاملہ کو چھپائے تو اُس کا معاملہ زیادہ خراب ہے۔ حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

دو آیتیں اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل نہ فرمائی ہوتیں تو میں کبھی کوئی چیز بیان نہ کرتا۔ ایک آیت وہی ہے جو زیرِ بحث ہے (یعنی ''ان الذین یکتمون ما انزل اللہ'')۔ اور دوسری آیت یہ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا٘ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ۝ (آل عمران: ۱۸۷)

اور یاد کیجئے جب ہم نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ تم اس کو ضرور لوگوں سے بیان کرنا اور اس کو نہ چھپانا' تو انہوں نے اس عہد کو اپنے پسِ پشت پھینک دیا اور اس کے بدلہ میں تھوڑی قیمت لی' سو وہ کیسی بُری چیز ہے جس کو یہ خرید رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ دینی علوم کا اظہار کرنا فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین؟ سو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ جب بعض لوگ علم کو اس طرح ظاہر کر دیں کہ ہر شخص کے لیے اُس تک پہنچنا ممکن ہو تو یہ مکتوم (چھپایا ہوا) نہیں رہے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب عالمِ دین سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے جو دین سے متعلق ہو اور وہ اس کو جانتا ہو تو اُس پر اُس کا بتانا واجب ہے' ورنہ نہیں۔

زیرِ بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے تورات میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف واضح کر کے بیان کر دیئے ہیں اس کے باوجود یہودی اُن اوصاف کو چھپاتے ہیں۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے ''الناس'' سے بنی اسرائیل کے علماء مراد ہوں گے۔ اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت میں ''الکتاب'' سے وہ تمام احکام مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر نازل فرمائے' اُن کے نزدیک ''الناس'' سے تمام علماء مراد ہیں۔

زیرِ بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر

﴿ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ ﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کا اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو اللہ عزوجل کے نازل کردہ دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کے لعنت فرمانے کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دُور فرما دیتا ہے۔ لُغت میں لعنت کا اصل معنیٰ ہے: ''الطرد والابعاد'' دُھتکارنا اور دُور کرنا۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''ایسے لوگوں پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں'' اس کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی

اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جنات اور انسانوں کے سوا ساری مخلوق ایسے لوگوں پر لعنت کرتی ہے۔ اور اس طرح لعنت کرتی ہے کہ چوپائے کہتے ہیں: ''منعنا المطر بمعاصی بنی آدم'' بنی آدم کے گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے ہم سے بارش کو روک دیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''لاعنون'' (لعنت کرنے والوں) سے مراد جنات اور انسان ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ''لاعنون'' کو عقل والوں کی صفت کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ بعض علماء ''لاعنون'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب بھی دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں تو وہ اُن یہود و نصاریٰ ہی کی طرف جاتی ہے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا۔ پھر ان مستحقینِ لعنت سے استثناء کرتے ہوئے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾

البتہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ اور اپنی اصلاح کر لی اور (جو کچھ چھپایا تھا اس کو) ظاہر کر دیا تو اُن کی میں توبہ قبول کروں گا' اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہوں O

﴿الَّذِينَ تَابُوا﴾ کا معنیٰ ہے: وہ لوگ جو اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے اور کفر سے اسلام کی طرف آ گئے۔ ﴿أَصْلَحُوا﴾ کا معنیٰ ہے: جنہوں نے اپنے اُن اعمال کی اصلاح کر لی جو اُن کے اور رب تعالیٰ کے درمیان تھے۔ ﴿بَيَّنُوا﴾ کا معنیٰ ہے: جنہوں نے اُس علم کو ظاہر کیا جو وہ چھپاتے تھے۔ ایسے تمام لوگوں کے بارے میں فرمایا: ﴿فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں ایسے لوگوں سے درگزر کروں گا اور اُن کی توبہ قبول کروں گا۔ ﴿أَنَا التَّوَّابُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میں اپنے بندوں سے درگزر کرنے والا ہوں اور پلٹتے ہوئے دِلوں کو اپنی طرف پھیرنے والا ہوں۔ ﴿الرَّحِيمُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب وہ لوگ میری طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو میں اُن پر بہت مہربانی فرماتا ہوں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے' تو یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی (لعنت) ہے' (یہ لوگ) ہمیشہ اس (لعنت) میں گرفتار رہیں گے' نہ اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی اُنہیں مہلت دی جائے گی O

کفار پر لعنت کہاں اور کس طرح ہوگی؟ اور تمام لوگوں کے لعنت کرنے سے کیا مراد ہے؟

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جس لعنت کا تذکرہ ہے وہ قیامت کے دن ہوگی۔ اور اس طرح ہوگی کہ کافر کو سامنے لا کر کھڑا کیا جائے گا اور اللہ عزوجل اُس پر لعنت فرمائے گا پھر فرشتے اور پھر تمام لوگ لعنت کریں گے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جب کافر پر لعنت کی جا رہی ہوگی تو اس وقت نہ تو خود کافر اپنے آپ پر لعنت کر رہا ہوگا اور نہ ہی اُس کے ہم مذہب اُس پر لعنت کر رہے ہوں گے' پھر اس کا کیا مفہوم کہ کافر پر تمام لوگوں کی لعنت ہے؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ تمام لوگوں کے لعنت کرنے کی مختلف توجیہات ہیں: ایک توجیہ یہ ہے کہ تمام لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی لعنت قابلِ اعتبار ہوگی' اور وہ مؤمنین ہیں (لہٰذا آیت کا تعلق صرف مؤمنین سے ہے' کفار اس میں داخل نہیں ہیں)۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ قیامت کے دن کفار ایک دوسرے پر لعنت کریں گے (لہٰذا آیت میں مذکور تمام لوگوں کے

عموم میں کفار بھی داخل ہیں)۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ کفار ظالموں پر لعنت کریں گے‘ حالانکہ وہ خود ظالموں میں سے ہیں۔ یوں یہ اُن کی اپنے آپ پر لعنت ہوگی۔

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کفار لعنت میں رہیں گے۔ بعض علماء نے معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ آگ میں رہیں گے۔ چونکہ لعنت اور آگ دونوں پُرخطر چیزیں ہیں‘ اس لیے آیت میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کفار کس چیز میں رہیں گے۔

﴿وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اُنہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ کیا ہے: اُنہیں عذر پیش کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اور بعض مفسرین نے معنیٰ کیا ہے: اُن کی طرف نظرِ رحمت نہیں کی جائے گی۔

کسی شخص کو مُعیّن کر کے لعنت کرنے کا شرعی حکم

علماء فرماتے ہیں کہ معیّن کر کے کسی کافر پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مرتے وقت اُس کی حالت کیا تھی‘ اس کا علم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے اسلام پر اُس کا خاتمہ ہوا ہو۔ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا ہے کہ لعنت کو مطلق رکھنا چاہیے (یعنی جب کسی کافر پر لعنت کرنی ہو تو اس طرح کہنا چاہیے کہ جس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہو اُس پر لعنت ہو)۔

کفار پر لعنت کرنا جائز ہے‘ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

(١٦٥) اللہ (عزوجل) یہودیوں پر لعنت فرمائے! اُن پر چربی کو حرام کیا گیا اُنہوں نے پگھلا کر اُسے بیچ دیا۔[۳۵۸]

(صحیح بخاری: ۳۴۶۰‘ صحیح مسلم: ۱۵۸۲‘ سنن ابن ماجہ: ۳۳۸۳‘ مسند احمد ج۱ ص۲۵‘ سنن بیہقی ج۶ ص۱۲‘ مشکوٰۃ: ۲۷۶۷ ص۲۴۱)

بعض علماء کا مؤقف یہ ہے کہ جو شخص کافر ہو اُس کو معیّن کر کے لعنت کرنا جائز ہے‘ کیونکہ کافر کو قتل کرنا جائز ہے۔ رہے وہ لوگ جو مسلمان ہوں اور گناہ گار ہوں اُن میں سے کسی کو بھی معیّن کر کے لعنت کرنا جائز نہیں ہے‘ البتہ اطلاق کے ساتھ جائز ہے (یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ گناہ کرنے والے مسلمانوں پر لعنت ہو)۔ اس کی دلیل یہ احادیث ہیں:

(١٦٦) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی لعنت ہو چور پر کہ ایک بیضہ (لوہے کا گولہ) چرائے تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور رسّی چرائے تو ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔[۳۵۹] (صحیح بخاری: ۶۷۸۳‘ صحیح مسلم: ۱۶۸۷‘ سنن ابن ماجہ: ۲۵۸۳‘ سنن نسائی: ۴۸۷۳‘ مسند احمد ج۲ ص۲۲۵‘ سنن بیہقی ج۸ ص۲۵۳‘ المستدرک ج۴ ص۳۷۸‘ مشکوٰۃ المصابیح: ۳۵۹۲‘ ص۳۱۳‘ مطبوعہ کراچی)

---

۳۵۸ حالانکہ چربی پگھلنے کے بعد بھی چربی ہی رہتی ہے‘ لہٰذا یہودیوں کا یہ ایک دھوکہ اور خیانت تھی جو انہوں نے اللہ کے احکام میں اختیار کی۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرام کام کے لیے حیلہ کرنا اور تدبیر کا سہارا لینا جائز نہیں ہے۔

۳۵۹ اس حدیث میں چور کی اہانت اور ذلّت بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کا معاملہ کس قدر عجیب ہے کہ وہ چوری کرتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ احناف کے نزدیک چور کا ہاتھ اُس وقت کاٹا جاتا ہے جب چوری کردہ چیز کی قیمت دس درہم (یعنی ۲٫۶۲۵ تولہ اور ۳۰٫۶۱۸ گرام چاندی) کے برابر ہو‘ جبکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کا گولہ اور رسّی چرانے پر بھی چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لوہے کے گولہ اور رسّی کے چرانے پر ہاتھ کاٹنے کا حکم ابتداءِ اسلام کا ہے‘ بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب نبی اکرم ﷺ نے دس درہم کی مقدار بیان نہیں فرمائی تھی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں ہاتھ کاٹنے سے مراد یہ ہے کہ چور معمولی چیزیں چوری کرتے کرتے بڑی چیزیں چوری کرنے کا عادی ہو جاتا ہے‘ حتیٰ کہ اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: عمدۃ القاری ج۱۶ ص۶۳‘ مرقات شرح مشکوٰۃ ج۷ ص۱۷۷‘ مطبوعہ کوئٹہ)

(۱۶۷) گودنے والی اور گدوانے والی عورت پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔[۳۶۰] (صحیح بخاری: ۴۸۸۶، صحیح مسلم: ۲۱۲۵، سنن ترمذی: ۲۷۸۲، سنن ابوداؤد: ۴۱۶۹، سنن ابن ماجہ: ۱۹۸۹، مسند احمد ج ۱ ص ۴۱۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۴۳۱، ص ۳۸۱، مطبوعہ کراچی)

(۱۶۸) سُود کھانے والے اور کھلانے والے پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۵۹۸، سنن ترمذی: ۱۲۰۶، سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۷، سنن ابوداؤد: ۳۳۳۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۸۰۷، ص ۲۴۴، سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۸۵، ج ۹ ص ۳۳۶، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۱۸)

(۱۶۹) جو شخص زمین (کی حد بندی کے) نشانات کو مٹائے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔[۳۶۱]
(صحیح مسلم: ۱۹۷۸، مسند احمد ج ۱ ص ۱۰۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۰۷۰، ص ۳۵۷)

(۱۷۰) جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسبت دی اُس پر اللہ کی، اُس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔[۳۶۲] (صحیح مسلم: ۱۳۷۰، ابوداؤد: ۵۱۱۵، سنن ابن ماجہ: ۲۶۰۹، کنز العمال: ۱۵۳۰۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۲۸، ص ۲۳۹)

☆ مذکورہ تمام امور جن پر لعنت کی گئی ہے وہ صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ نہایت رحم فرمانے والا ہے بہت مہربان ہے O

آیت مذکورہ کا واقعہ نزول اور اس کی تفسیر

آیت مذکورہ کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ کفارِ قریش نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ ہمیں اپنے رب کا حُلیہ بتایئے اور اُس کا نسب بتایئے۔ کفار کی اس بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اور سورۂ اخلاص نازل فرمائی۔

زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کی وحدت کا بیان ہے اور وحدت کا معنیٰ ہے: ''الانفراد'' اکیلا ہونا۔ ﴿وَاحِدٌ﴾ حقیقت میں اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے نہ حصے ہوسکیں اور نہ ہی وہ تقسیم ہوسکے۔ ''واحد'' اللہ تعالیٰ کی صفات میں اِک صفت ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اکیلا ہے اس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ اُس جیسی کوئی چیز ہے۔ بعض مفسرین نے واحد کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ معبود اور پروردگار ہونے میں ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور یہ معنیٰ اس لیے کیا ہے کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی معبودوں کو شریک کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھٹلانے کے لیے ارشاد فرمایا کہ ''تمہارا معبود ایک معبود ہے''۔ یعنی معبود ہونے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور پروردگار ہونے میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

---

[۳۶۰] یعنی وہ عورت جو زینت اور خوب صورتی کے لیے اپنے بال اکھیڑے یا اکھڑوائے اس پر رسول اللہ ﷺ کی لعنت ہے۔ آج کل جدید فیشن میں یہ بھی ہے کہ عورتیں زینت کے لیے اپنی بھویں باریک کرواتی ہیں، شرعاً یہ درست نہیں ہے، البتہ اگر کسی عورت کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال نکل آئیں تو وہ اُن کو اکھاڑ سکتی ہے۔

[۳۶۱] یعنی جو شخص کسی ملک کی حدود کو یا کسی شخص کی ذاتی ملکیت کی حدود کو مٹائے تاکہ اُس پر ناجائز قبضہ کرے اُس پر اللہ عزوجل کی لعنت ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مسافروں کی رہنمائی کے لیے اور مختلف راستوں کی نشاندہی کے لیے زمین پر جو علامات نصب ہوتی ہیں، اُن کو مٹانے والا ملعون ہے۔ کیونکہ اُن کو مٹانا مسافروں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ (مرآۃ المناجیح ج ۵ ص ۶۷۰)

[۳۶۲] یعنی اپنے نسب کو بدلنے والا ملعون ہے۔ اس سے بالخصوص وہ لوگ عبرت پکڑیں جو سیّد نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو سیّد کہتے اور کہلواتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ نسب والد سے چلتا ہے۔

''توحید'' کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے اس بات کو ثابت کیا جائے کہ اُس کا کوئی شریک' حصہ دار (Partner) اور ہم مثل نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں اکیلا ہے۔ یعنی کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں اُس کا شریک ہو۔ اور وہ اپنی ذات میں بھی اکیلا ہے۔ یعنی اُس کا کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ اور وہ اپنی صفات میں بھی اکیلا ہے۔ یعنی مخلوق میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس کی ہم مثل ہو۔

آیت میں جو فرمایا: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اس سے دوسروں کی اُلوہیت کی نفی کر کے اپنی وحدانیت کو مزید پختہ طریقہ سے ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور آخر میں جو ﴿الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ فرمایا اُس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہی تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے' خواہ وہ نعمتیں اُصول سے ہوں یا فروع سے (یعنی مرکزی ہوں یا ذیلی)۔ اور اُس کے سوا کوئی بھی اس صفت کا حامل نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کی ذاتِ پاک کے سوا جو کچھ ہے وہ یا تو نعمتیں ہیں یا نعمتوں والے ہیں۔ نعمتیں عطا کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے اور اپنی مخلوق پر بہت مہربان ہے۔

زیر بحث آیت کی فضیلت اور اگلی آیت سے اس کا ربط

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۱۷۱) اللہ (عزوجل) کا اسم اعظم[۳۶۳] اِن دو آیتوں میں ہے: (۱) ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ''۔ (البقرہ:۱۶۳) (۲) آل عمران کی ابتدائی آیت ''الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ؕ ''۔ (آل عمران:۱۔۲)

(سنن ترمذی: ۳۴۷۸' سنن ابوداؤد: ۱۴۹۶' سنن ابن ماجہ: ۳۸۵۵' مسند احمد ج ۶ ص ۴۶۱' ۴۶۱' شعب الایمان للبیہقی: ۲۳۸۳' شرح السنۃ: ۱۲۶۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت جب نازل ہوئی تو مشرکین نے کہا کہ محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ ''تمہارا معبود ایک معبود ہے''۔ اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو وہ ہمارے پاس کوئی نشانی (اور دلیل) لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی اس بات کے جواب میں اگلی آیت نازل فرمائی۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش' رات و دن کی آمد و رفت اور وہ جہاز جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لیے ہوئے سمندر میں رواں دواں ہیں اور وہ پانی جو اللہ نے آسمان سے اُتار کر اُس سے مُردہ زمین کو زندہ کیا اور اُس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے' اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل جو آسمان و زمین کے درمیان (حکمِ خداوندی کے) تابع ہیں' ان تمام چیزوں میں اہل عقل کے لیے یقیناً (اللہ کی وحدانیت کی) نشانیاں ہیں O

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خالق کی وحدانیت کو جاننے کا طریقہ بتایا ہے اور مشرکین کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں اور اس کی بنائی ہوئی چیزوں کے عجائب میں اور اس کے کاموں کی مضبوطی میں غور و فکر کریں' کہ یہ تمام چیزیں

۳۶۳ے اسم اعظم کی تفصیل کے لیے حاشیہ: ۶۲ ملاحظہ فرمائیں۔

اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ کیونکہ اگر ان کاموں کے انجام دینے والے دو ہوں تو کسی ایک بات پر اُن دونوں کا متفق ہونا محال ہوگا اور یہ بھی ناممکن ہوگا کہ اُن دونوں کے افعال یکساں طور پر کامل ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس جہان کو پیدا کرنے والا اور اُس کی تدبیر فرمانے والا ایک ہے اور وہ قادر ومختار ہے۔

زیر بحث آیت میں اللہ کی وحدانیت پر مذکورہ آٹھ دلائل کی تفسیر

زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ چیزوں کے عجائب میں سے آٹھ اقسام کو بیان فرمایا ہے۔

(۱) ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ (آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش)

آیت میں ''سمٰوات'' کو جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ آسمان مختلف اقسام کے ہیں اور ہر قسم دوسری قسم سے مختلف ہے۔ البتہ زمین چونکہ ایک ہی جنس یعنی مٹی کی ہے اس لیے آیت میں ''الارض'' واحد لایا گیا۔

آسمان کی پیدائش میں اللہ کی وحدانیت کی دلیل اور نشانی یہ ہے کہ آسمان بغیر کسی ستون اور سہارے کے بُلند ہے' پھر اس میں سورج' چاند اور ستارے بھی موجود ہیں۔ اور زمین کی پیدائش میں دلیل اس طرح ہے کہ وہ پانی پر بچھی ہوئی ہے اور اس میں پہاڑ' سمندر' معدنیات' جواہرات' نہریں' درخت' پھل اور نباتات موجود ہیں۔

(۲) ﴿وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ﴾ (رات اور دن کا آنا جانا)

''اختلاف'' سے مراد ہے: آنے جانے میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہونا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اختلاف'' سے رات اور دن کا لمبا چھوٹا ہونا' گھٹنا بڑھنا اور روشن اور تاریک ہونا مراد ہے۔

آیت میں رات کو دن پر مقدم فرمایا' اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریکی (روشنی پر) مقدم ہے۔ رات اور دن کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانی یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے حالات اور معاملات میں جو نظم وضبط حاصل ہوتا ہے وہ کمانے سے ہوتا ہے اور کمانے کے لیے جو کام کیا جاتا ہے وہ دن میں ہوتا ہے' جبکہ نیند اور آرام وسکون رات میں ہوتا ہے۔ سو رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا محض اس لیے ہوتا ہے تاکہ لوگ اپنی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

(۳) ﴿وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ﴾ (وہ کشتیاں یا جہاز جو سمندر میں رواں دواں ہیں)

''الفلک'' کا معنیٰ ہے: کشتیاں۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ ''البحر'' کا معنیٰ ہے: سمندر۔ اور سمندر چونکہ بہت وسیع اور کشادہ ہوتا ہے اس لیے اس کو (عربی میں) ''بحر'' کہتے ہیں۔

کشتیوں میں (یا پانی کے جہازوں میں) اللہ کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسخر اور پابند ہوتے ہیں اور اس وقت بھی پانی پر چلتے رہتے ہیں جب یہ کثیر ساز وسامان اور لوگوں کو اُٹھائے ہوتے ہیں' اور اس کے باوجود (عموماً) ڈوبتے نہیں ہیں۔ پھر پانی میں ان کا جو چلنا ہوتا ہے وہ اُن ہواؤں کے ذریعہ ہوتا ہے جو آگے اور پیچھے چل رہی ہوتی ہیں۔ (پھر اس کی وحدانیت پر خود سمندر ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ) وہ پانی کی بھرپور طاقت اور اپنے جوش کے باوجود کشتیوں کو اُٹھانے کا پابند ہوتا ہے۔ اور صرف اللہ عزوجل ہی لوگوں کو اس سے نجات دیتا ہے۔

(۴) ﴿بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ﴾ (وہ کشتیاں یا جہاز جو لوگوں کے فائدے اور نفع کا سامان لیے ہوئے چلتے ہیں)

لوگوں کے فائدے اور نفع کے سامان سے مراد ہے اُن کشتیوں اور جہازوں میں سوار ہونا اور طلبِ منفعت کی غرض سے اُن پر سامانِ تجارت لادنا۔ اس میں اللہ عزوجل کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کشتیوں اور جہازوں میں سوار ہونے والوں کے دل مضبوط نہ فرمائے تو کبھی بھی تجارت اور منافع میں لوگوں کو اپنا مقصد پوری طرح حاصل نہ ہو۔ پھر یہ بھی

غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے ہر حصہ میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز رکھی ہے جو صرف اُسی حصہ میں پائی جاتی ہے دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کشتیوں اور جہازوں میں سوار ہونے اور سمندر میں داخل ہونے اور اس جیسے بڑے بڑے خطرات اپنے سفر میں گوارا کر لیتے ہیں (ورنہ اگر دنیا کے ہر حصہ میں ہر چیز موجود ہوتی تو لوگ سمندری سفر کو اختیار نہ کرتے)۔ لیکن اس میں سفر کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے اور جس کی طرف سفر کیا ہے' اُس کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے کو فائدہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنی تجارت سے نفع اُٹھاتا ہے' جبکہ دوسرا فریق جس کی طرف سفر کیا گیا ہے وہ سامانِ تجارت سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

(۵) ﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (وہ پانی جو اللہ نے آسمان سے اُتار کر اُس سے مردہ زمین کو زندہ کیا)

پانی سے مراد بارش ہے اور آسمان سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک بادل ہیں۔ آسمان چونکہ بُلند ہوتا ہے اس لیے اس کو (عربی میں) ''سماء'' کہتے ہیں' کیونکہ ہر وہ چیز جو بُلند ہو اور سایہ دار ہو وہ ''سماء'' ہے۔ آسمان سے جو پانی برستا ہے اُس کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں میں پانی کو پیدا فرمایا ہے' وہاں سے وہ زمین پر برستا ہے۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ آیت میں آسمان سے آسمان ہی مراد ہے' اور آسمان میں اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا فرمایا ہے۔ اُس سے وہ بادلوں میں آتا ہے اور بادلوں سے زمین پر برستا ہے۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''اُس سے اُس نے مُردہ زمین کو زندہ کیا'' اس سے مراد ہے پانی سے زندہ کیا۔ اور زمین کے مُردہ ہونے سے مُراد زمین کا خشک اور قحط زدہ ہونا ہے۔ ایسی زمین کو مُردہ کہنا بہ طور مجاز ہے' کیونکہ جب زمین نہ کچھ اُگائے اور نہ اُس پر بارش ہو تو وہ مُردار کی مانند ہے۔

بارش کو نازل کرنے اور اُس سے زمین کو زندہ کرنے میں اللہ کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی رُوح چیزوں کو اور نباتات کو زندگی دینے کے لیے پانی کو سبب بنایا ہے۔ اور (یہ بھی اُس کی قدرت ہے کہ) پانی ضرورت کے وقت برستا ہے اور فائدہ کی مقدار برستا ہے' اور اُس وقت بھی برستا ہے جب اُس سے بارش طلب کی جائے اور دُعائیں کی جائیں۔ علاوہ ازیں بارش کا کسی جگہ ہونا اور کسی جگہ نہ ہونا یہ بھی اللہ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

(۶) ﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ (اور اُس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے)

''بثّ'' کا معنیٰ ہے: پھیلانا۔ ''فیھا'' سے مراد ہے زمین میں۔ اور ''من کلّ دابۃ'' کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس سے ہر مخلوق کا وہ فرد مراد ہے جو سطح زمین پر رینگتا ہے' خواہ وہ لوگ ہوں یا کوئی اور ہو۔

اس بات میں اللہ کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل یہ ہے کہ (مثلاً) تمام کے تمام انسانوں کی اصل اور بُنیاد ایک ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ اس کے باوجود تمام انسانوں کی شکلیں' خدوخال' رنگ' زبان' طبیعت' اخلاق و عادات اور دیگر تمام چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہی حال تمام جاندار چیزوں کا ہے۔

(۷) ﴿وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ﴾ (ہواؤں کی گردش)

''تصریف'' سے مراد یہ ہے کہ ہوائیں اپنے مرکز میں آگے پیچھے اور شمالاً جنوباً چلتی ہیں اور ''نکباء'' (یعنی ٹیڑھی) بھی چلتی ہیں۔ ''نکباء'' سے مراد وہ ہوا ہے جو غلط سمت سے آ رہی ہو' اور ہر وہ ہوا جس کی سمتیں آپس میں بدل جائیں اُس کو ''نکباء'' کہا جاتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''تصریف'' سے مراد یہ ہے کہ ہواؤں کو اُن کے چلنے میں مختلف حالتوں کی طرف پھیر دیا جاتا ہے' یعنی وہ نرم بھی ہوتی ہیں اور تند و تیز بھی' گرم بھی ہوتی ہیں اور سرد بھی۔ ہوا کو ''ریح'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ راحت

پہنچاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم لشکر ''ہوا'' ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہوا جب بھی چلتی ہے تو وہ یا تو کسی بیمار کو صحت یاب کرنے کے لیے چلتی ہے یا صحت یاب کو بیمار کرنے کے لیے۔ اور تین ہوائیں ایسی ہیں جن میں بشارت اور خوش خبری ہے۔ (۱) صَبا (مشرقی ہوا) (۲) شمالی ہوا اور (۳) جنوبی ہوا۔ جبکہ ''دَبور'' میں کوئی خوش خبری نہیں ہے۔ ''دبور'' سے مراد وہ خشک اور بے برکت ہوا ہے جس کے ذریعہ قوم عاد کو ہلاک کیا گیا۔

ہوا کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل یہ ہے کہ ہوا کا جسم لطیف ہے' اُس کو نہ روکا جا سکتا ہے نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ درختوں اور چٹانوں کو اپنی جگہ سے اُکھاڑ دیتی ہے اور بڑی بڑی عمارتوں کو ویران کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے وجود کی حیات اُسی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اگر وہ پَل بھر کے لیے رُک جائے تو ہر ذی رُوح چیز فنا ہو جائے اور جو کچھ سطحِ زمین پر موجود ہے وہ بدبودار ہو جائے۔

(۸) ﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (وہ بادل جو آسمان اور زمین کے درمیان (حکم خداوندی) کے تابع ہیں)

''السحاب المسخر'' کا معنیٰ ہے: ''الغیم المذلّل'' یعنی وہ بادل جو پابند ہو۔ آیت میں بادل کو ''سحاب'' اس لیے فرمایا کہ وہ تیز چلتا ہے گویا کہ اُس کو گھسیٹا جا رہا ہو۔ بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانی یہ ہے کہ بادلوں میں بہت بڑی مقدار میں پانی موجود ہوتا ہے' جس سے بڑے بڑے چشمے بہتے ہیں۔ اس کے باوجود بادل آسمان اور زمین کے درمیان معلّق رہتا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں بیان کردہ اِن آٹھوں اقسام میں اس بات پر بہت بڑی دلیل ہے کہ تمام جہانوں کا ایک با اقتدار و بااختیار صانع (بنانے والا) موجود ہے۔ اور وہ اپنی بادشاہی میں اکیلا ہے' اُس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی مثل ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ''والھکم اله واحد لا اله الا هو'' سے یہی مُراد ہے۔

زیرِ بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر

زیرِ بحث آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ثابت کرنے والی جن چیزوں کو دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اُن میں یقیناً عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

''نشانیاں'' (جمع کے طور پر) اس لیے فرمایا کہ مذکورہ آٹھوں اقسام میں سے ہر ایک کے اندر کئی کئی نشانیاں ہیں' جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ان چیزوں کا کوئی بااختیار اور مُدبّر خالق موجود ہے۔

آیت میں عقل والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذکورہ چیزوں میں اپنی صاف سُتھری عقل کے ذریعہ غور کرتے ہیں اور اپنے دل سے سوچ و بچار کرتے ہیں۔ پھر وہ یہ جان لیتے ہیں کہ ان چیزوں کا ایک بااختیار مُدبّر اور خالق موجود ہے' جو اِن کو بنانے والا ہے اور اُسے ہر اُس کام پر قدرت ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے غیر کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں (اور) اُنہیں اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں' اور جو ایمان والے ہیں وہ تو سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں' اور جس عذاب کو ظالم لوگ (قیامت کے دن) دیکھیں گے اُس کو اگر وہ دُنیا میں جان لیتے (تو ضرور اقرار کر لیتے) کہ ساری قوت اللہ کی ہے اور اللہ بہت سخت عذاب دینے والا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور مشرکین کا غیر اللہ کو اللہ کی طرح محبوب رکھنے کا معنیٰ

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾ "کچھ لوگوں" سے مراد مشرکین ہیں اور "اللہ کے شریک" سے مراد وہ بت ہیں جن کو مشرکین پوجا کرتے تھے۔ ﴿ اَنْدَادًا ﴾ "نِـدّ" کی جمع ہے اور "نِـدّ" اُس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے مثل ہو اور اُس کے مخالف بھی ہو۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے کفار کے بُت ایک دوسرے کے لیے آپس میں "انداد" (یعنی ہم مثل) ہوں گے' اللہ کے لیے انداد نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بُلند ہے کہ کوئی اُس کا شریک ہو یا اُس کا مثل مخالف ہو۔ بعض مُفسرین فرماتے ہیں کہ "انـــداد" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو وہ مثل قرار دیتے تھے یعنی وہ سرداران جن کی مشرکین اُن باتوں میں فرمانبرداری کیا کرتے تھے جو اللہ کی نافرمانی پر مشتمل ہوتی تھیں۔

آیت میں جو فرمایا کہ "مشرکین غیر اللہ کو اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں" اس کا معنیٰ یہ ہے کہ غیر اللہ کو چاہتے ہیں اور اُن کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرح چاہنے سے مراد یہ ہے کہ (۱) جس طرح مؤمنین اللہ سے محبت کرتے ہیں اس طرح مشرکین اپنے بُتوں سے محبت کرتے ہیں۔ (۲) بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ مشرکین اپنے بُتوں سے اللہ کی طرح محبت کرتے ہیں' یعنی اپنے بُتوں کو اور اللہ عزوجل کو محبت میں برابر رکھتے ہیں۔ جن مفسرین نے پہلا معنیٰ بیان کیا ہے اُنہوں نے (درحقیقت) کفار کے لیے اللہ کی محبت کے ثابت ہونے کی نفی کی ہے اور جن مفسرین نے دوسرا معنیٰ بیان کیا ہے اُنہوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ کفار کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے' لیکن وہ لوگ اپنے بُتوں کو اللہ کے ساتھ محبت میں شریک ٹھہراتے ہیں۔

ایمان والوں کا اللہ عزوجل سے بہت زیادہ محبت رکھنا

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ یعنی ایمان والے اللہ کی محبت پر ثابت قدم اور ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ عزوجل کے ساتھ کسی اور کو اختیار نہیں کرتے۔ جبکہ مشرکین کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بُت کو معبود بناتے ہیں' پھر جب اُس سے زیادہ خوب صورت کوئی دوسرا بُت نظر آتا ہے تو پہلے کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مصائب اور تکالیف میں کفار اپنے بُتوں کو چھوڑ کر اللہ عزوجل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ پھر جب مشرکین کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کے لیے اپنے دین کو خالص کر کے اُس کو پکارتے ہیں۔ (العنکبوت: ۶۵)

جبکہ مؤمنین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کسی حالت میں اللہ سے مُنہ نہیں موڑتے۔ خواہ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا' تنگدستی ہو یا خوشحالی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مؤمنین اپنے رب کو ایک مانتے ہیں' جبکہ کفار کئی بُتوں کی عبادت کرتے ہیں اور محبت ایک بُت سے بھی ناقص ہو جاتی ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "مؤمنوں کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہوتی ہے" یہ بات اللہ تعالیٰ نے اس لیے بیان فرمائی کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے محبت فرمائی' پھر مؤمنین نے اللہ سے محبت کی' اور جس کی محبت کی گواہی اُس کا معبود دے' یقیناً اُس کی محبت بہت زیادہ کامل ہو گی۔

☆ محبت کے متعلق تفصیلی گفتگو (انشاء اللہ) المائدہ: ۵۴ کی تفسیر میں "یحبھم ویحبونہ" کے تحت آئے گی۔

زیر بحث آیت میں "ولو یری" کی قرأت وتفسیر اور آیت کے آخری جملہ کا مفہوم

﴿ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا ﴾ کو تاء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے (یعنی "ولو تری الذین ظلموا")۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا کہ اے محمد (ﷺ)! اگر آپ ظالموں کو یعنی مشرکوں کو سخت عذاب میں دیکھیں تو یقیناً آپ ایک بڑی چیز دیکھیں گے۔ "ولو یری" پڑھنے کی صورت میں معنیٰ ہو گا کہ جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا وہ اگر اُس وقت کو دیکھ لیں جب اُنہیں آگ میں ڈالا جا رہا ہو گا تو یقیناً وہ جان لیں گے کہ کُفر میں کتنا نقصان ہے' اور یہ بھی جان لیں گے کہ جن بُتوں کو اُنہوں نے معبود بنایا

ہے وہ اُن کو فائدہ دینے والے نہیں ہیں۔

آیت کے اختتامی کلمات ﴿ اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مشرکین آخرت کے عذاب کو دُنیا میں دیکھ لیں تو اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ ساری قوت اللہ کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کیا ہے اس کے باوجود انہیں اس پر یقین نہیں ہے کہ ساری قوت اللہ کی ہے اور اس پر بھی یقین نہیں ہے کہ جس شرک و انکار پر وہ قائم ہیں وہ خلافِ واقعہ اور خلافِ حقیقت ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

(آخرت میں) جب پیشوا اپنے پیروی کرنے والوں سے بری الذمہ ہو جائیں گے اور عذاب کو دیکھ لیں گے اور آپس کے تمام تعلقات ٹوٹ جائیں گے O

﴿ تَبَرَّاَ ﴾ کا معنیٰ ہے: بَری ہونا، دُور رہنا۔ یعنی مشرک سردار اپنے پیروکاروں سے بَری ہو جائیں گے۔ یہ واقعہ قیامت میں اُس وقت ہو گا جب مشرک سرداروں اور پیروکاروں کو جمع کیا جائے گا۔ پھر جب اُنہیں عذاب دیا جائے گا اور سرداران اپنے پیروکاروں سے درکنار اپنے آپ سے بھی عذاب کو دور نہ کر سکیں گے تو سب آپس میں ایک دوسرے سے برأت اور لاتعلقی ظاہر کریں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں ''پیشواؤں'' سے مراد شیاطین ہیں، جو کہ انسانوں سے بیزاری اور لاتعلقی ظاہر کریں گے۔ ان دونوں اقوال میں پہلا قول صحیح ہے۔

زیر بحث آیت میں ''الاسباب'' سے کیا مراد ہے؟

﴿ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مشرک سرداروں اور اُن کے پیروکاروں کے درمیان رشتہ داری اور دوستی کے جو تعلقات دُنیا میں قائم تھے جن کی بُنیاد پر وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، وہ سب منقطع ہو جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مشرک سرداروں اور پیروکاروں کے درمیان جو معاملات قائم تھے جن کو وہ دُنیا میں انجام دیتے تھے وہ سب منقطع ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مشرک سرداروں اور پیروکاروں کے درمیان معاہدے اور وعدے طے پاتے تھے جن کی بُنیاد پر وہ ایک دوسرے سے دوستی قائم کرتے تھے وہ سب منقطع ہو جائیں گے۔

''الاسباب'' ''سَبَبٌ'' کی جمع ہے اور سبب کا اصلی اور حقیقی معنیٰ وہ رسّی ہے جس کی مدد سے کھجور کے درخت پر چڑھا جاتا ہے پھر اس رسّی سے مشابہت کی وجہ سے ہر اُس چیز کو سبب کہا جانے لگا جس کی مدد سے کسی چیز تک پہنچا جائے۔ خواہ وہ کوئی ذریعہ ہو یا رشتہ داری ہو یا دوستی ہو۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

اور پیروی کرنے والے کہیں گے: کاش! ہمارے لیے (دُنیا میں) لوٹ کر جانا ممکن ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح لاتعلق ہو جاتے جس طرح یہ آج ہم سے لاتعلق ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال باعثِ حسرت و ندامت بنا کر اُنہیں دکھائے گا، اور وہ جہنم کی آگ سے قطعاً نکلنے والے نہیں ہیں O

﴿ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا ﴾ سے مراد پیروکار ہیں۔ اور ﴿ كَرَّةً ﴾ کا معنیٰ ہے: دُنیا میں لوٹ کر جانا۔ اور ﴿ مِنْهُمْ ﴾ سے مراد پیشوا ہیں (یعنی پیروی کرنے والے کہیں گے: کاش! ہمارے لیے دُنیا میں لوٹ کر جانا ممکن ہوتا تو ہم اپنے پیشواؤں سے اسی طرح لاتعلق ہو جاتے جس طرح یہ آج ہم سے لاتعلق ہیں)۔

آیت میں ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو عذاب دکھایا اسی طرح وہ اُن کے اعمال باعثِ ندامت بنا کر اُنہیں دکھائے گا۔ کیونکہ اُنہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو چکا ہوگا۔

حسرت کا معنیٰ اور قیامت میں مشرکین کے اعمال کا باعث حسرت ہونا

آیت میں جو ﴿ حَسَرٰتٍ ﴾ کا لفظ ہے یہ "حسرۃ" کی جمع ہے اور حسرت کا معنیٰ ہے: کسی ضائع ہونے والی چیز پر غمگین اور سخت شرمندہ ہونا (اور حقیقی معنیٰ ہے: کھولنا)۔ گویا کہ جب کوئی شخص حسرت زدہ ہوتا ہے تو اُس پر اُس کی وہ جہالت اور نادانی کھل جاتی ہے جس کی وجہ سے اُس نے باعثِ ندامت کام کا ارتکاب کیا ہوتا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (قیامت میں) اللہ تعالیٰ مشرکین کو اُن کی وہ بداعمالیاں دکھائے گا جن کا اُنہوں نے دُنیا میں ارتکاب کیا تھا۔ جب وہ اپنی بُرائیاں دیکھیں گے تو حسرت زدہ اور نادم ہوں گے کہ انہوں نے یہ بُرائیاں کیوں کی؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کو وہ نیک اعمال دکھائے گا جو اُنہوں نے دُنیا میں چھوڑ دیئے۔ جب وہ نیک اعمال دیکھیں گے تو اُن کو ضائع کرنے پر وہ نادم اور شرمندہ ہوں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مشرکین کے لیے جنّت میں اُن کے مکانات اور محلات کو بُلند کیا جائے گا پھر اُن سے کہا جائے گا کہ اگر تم اللہ عزوجل کی اطاعت کرتے تو یہ محلات تمہارے ہوتے۔ پھر اُن محلات کو مؤمنین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا' اُس وقت مشرکین کو اُن چیزوں پر حسرت اور ندامت ہوگی جو اُن سے ضائع ہو گئیں لیکن یہ شرمندگی اُنہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اے لوگو! زمین کی اُن چیزوں میں سے کھاؤ جو حلال اور پاکیزہ ہیں اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو' بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے' وہ تو تمہیں صرف بُرائی اور بے حیائی (کی باتوں) کا حکم دیتا ہے اور اللہ کے متعلق ایسی بات کہنے کا (حکم دیتا ہے) جس کو تم جانتے نہیں ہو O

آیتِ مذکورہ کا واقعۂ نزول اور حلال وطیب کے معنیٰ کی تحقیق

مذکورہ آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ قبیلہ ثقیف' خزاعہ' عامر بن صعصعہ اور بنو مدلج نے اپنے آپ پر کھیتی' مویشی' بحیرہ[۳۶۴]' سائبہ[۳۶۵]' وصیلہ[۳۶۶] اور حام[۳۶۷] کو حرام کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کی جو چیزیں حلال اور طیّب ہیں اُن کو کھاؤ۔

﴿حلال﴾ اُس جائز چیز کو کہتے ہیں جس کو شریعت نے حلال قرار دیا ہو اور ممانعت کی گرہ اُس سے کھل چکی ہو۔ اپنی اصل

۳۶۴ یعنی وہ اونٹنی جو پانچ بچے جنے اور آخری بچہ نر ہو' ایسی اونٹنی کو اہل عرب کان چیر کر چھوڑ دیتے تھے۔

۳۶۵ یعنی وہ اونٹنی جس کے گوشت اور دودھ کو اپنے آپ پر یہ نذر مان کر حرام کر لیا گیا ہو کہ اگر میں بیماری سے شفایاب ہو گیا تو میری اونٹنی سائبہ ہوگی' ایسی اونٹنی کو بھی اہل عرب اپنے لیے حرام تصور کرتے تھے۔

۳۶۶ یعنی وہ بکری جس کو نر کے ساتھ ملا کر بتوں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔

۳۶۷ وہ اونٹ جس کی جُفتی سے دس بچے پیدا ہوں۔ ایسے اونٹ پر سواری کرنے کو اہل عرب حرام جانتے تھے اور اس سے منفعت کے حصول کو ترک کر دیتے تھے۔

کے اعتبار سے یہ "الحلّ" سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے: کھولنا اور یہ "العقد" (باندھنے) کی ضد ہے۔ جب کہ ﴿طَيِّب﴾ اُس کو کہتے ہیں جس سے لذت حاصل کی جائے۔ مسلمان صرف حلال چیز کو پاکیزہ سمجھتا ہے اور حرام کو ناپسندیدگی کی بناء پر چھوڑ دیتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "طیّب" سے مراد طاہر ہی ہے' کیونکہ نجس چیز کو نفس پسند نہیں کرتا اور ناپسندیدگی کی بناء پر اُسے چھوڑ دیتا ہے۔

شیطان کے قدموں کی پیروی کرنے سے کیا مراد ہے؟

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ اور تم شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی اُس کے راستہ پر نہ چلو۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم نہ شیطان کی پیروی کرو اور نہ اُس کے نقشِ قدم پر چلو اور نہ ہی اُس کی غلطیوں کی پیروی کرو۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ عزوجل نے حلال فرمایا ہے تم اُس کو اس طرف نہ لے جاؤ جس طرف تمہیں شیطان بُلا رہا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شیطان کے قدموں سے مراد وہ منّتیں ہیں جو گناہ کے کاموں میں مانی جائیں۔ اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے حقیر ترین گناہ مراد ہے (خُلاصہ یہ ہے کہ تمہیں ان تمام کاموں سے بچنا لازم ہے)۔ آیت: ۱۶۸ کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ شیطان کی پیروی سے بچنا کیوں ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ یعنی اُس کی دشمنی ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی دشمنی کو اُس آیت میں واضح فرمایا ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا تذکرہ ہے۔

آیت مبارکہ میں "السوء" اور "الفحشاء" کی تفسیر

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ شیطان انسان کے ساتھ کس طرح دشمنی کرتا ہے؟ چنانچہ فرمایا: وہ تمہیں صرف "السوء" اور "الفحشاء" کا حکم دیتا۔

﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ سے مراد گناہ ہے اور "سوء" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کو بُرا کر دے اور رُسوا کر دے۔ اور ﴿الْفَحْشَآءِ﴾ سے مراد ہے: نافرمانی کے کام اور ہر وہ قول و فعل جو بُرا ہو۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ "سوء" اُس کام کو کہتے ہیں جس کے کرنے پر حدِ شرعی جاری نہ ہو اور "فحشاء" اُس کام کو کہتے ہیں جس کے کرنے پر حد جاری ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "فحشاء" سے مراد زنا ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کنجوسی ہے۔

زیرِ بحث آیت کے آخری حصہ میں جو فرمایا کہ "شیطان تمہیں اللہ کے متعلق ایسی بات کہنے کا حکم دیتا ہے جس کو تم جانتے نہیں ہو" اس سے مراد کھیتی اور مویشیوں کا حرام کرنا ہے (یعنی شیطان تم سے یہ کہلوانا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھیتی اور مویشیوں کو حرام فرمایا ہے)۔ نیز یہ بات اُن تمام مذاہب کو شامل ہے جو فاسد ہیں یعنی جن کو نہ اللہ عزوجل کی جانب سے اذن حاصل ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے وہ ثابت ہیں۔

وسوسہ کی حقیقت

شیطان جو کچھ کام کرتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے اُس سے مراد ایسے خیالات ہیں جو آدمی کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان خیالات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ چند حروف اور ایسی آوازیں ہوتی ہیں جو مرتّب ہوتی ہیں اور ہلکی ہوتی ہیں اور یہ ہمارے کلام سے مشابہ ہوتی ہیں۔ پھر ان خیالات کو انسان کے باطن میں پیدا کرنے والا اور معرض وجود میں لانے والا اللہ رب العالمین ہے۔ اور شیطان ایک عرض کی مانند ہے اور اُس کو وسوسہ کی قدرت دینے والا اللہ رب العالمین ہے۔ حدیث صحیح میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ:

(۱۷۲) شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔[۳۶۸]

(صحیح بخاری: ۳۲۸۱، صحیح مسلم: ۲۱۷۵، سنن ابوداؤد: ۴۷۰۰، سنن ابن ماجہ: ۱۷۷۹، مسند احمد ج ۳ ص ۱۵۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۸ ـ ص ۱۸)

اور اللہ رب العالمین نے شیطان کو یہ طاقت اسی لیے عطا فرمائی ہے تا کہ وہ آدمی کے باطن میں وسوسے اور خیالات پہنچا سکے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَاؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے O

آیت مذکورہ کا ربط اور اس کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال

مذکورہ آیت میں ایک نئے قصہ کا آغاز ہے۔ اور اس میں جو ﴿لَهُمُ﴾ ہے اس کا مرجع مذکور نہیں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی تو رافع بن خارجہ اور مالک بن عوف نے کہا کہ ہم تو اُسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیونکہ وہ ہم سے زیادہ بہتر اور زیادہ علم والے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق اپنے ماقبل سے ہے اور ''لھم'' میں جو ضمیر ہے وہ ''ومن الناس من یتخذ'' کی طرف راجع ہے۔ اور معنیٰ یہ ہے کہ مشرکین عرب نے کہا کہ ہم تو اُسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے یعنی ہم بُتوں کی پوجا اور ان کی عبادت کرتے رہیں گے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''لھم'' میں جو ضمیر ہے وہ ''یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض'' کی طرف راجع ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ جب لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تم نے اپنے آپ پر حرام کر رکھا ہے اُس کے حلال ہونے کے بارے میں اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو حلال وحرام کے اُن ہی طریقوں پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ﴾ عقل نہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اُن کے باپ دادا دین کے معاملات میں کوئی چیز نہیں جانتے تھے۔ یہاں لفظ عام ہے اور معنیٰ خاص ہے' یعنی ان کے باپ دادا دنیاوی معاملات میں عقل رکھتے تھے۔ ہدایت یافتہ نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُن کے باپ دادا درستگی کے راستے پر گامزن نہیں تھے۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے باپ دادا کی پیروی کرتے ہیں۔ پھر (اگلی آیت میں) ان لوگوں کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

۳۶۸ یعنی جس طرح خون کے چلنے کا آدمی کو احساس نہیں ہوتا اسی طرح شیطان کے داخل ہونے اور اس کے دوڑنے کا آدمی کو احساس نہیں ہوتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خون انسان کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوتا ہے اسی طرح شیطان بھی آدمی کے پورے جسم پر حاوی ہو کر آدمی کو جس طرح چاہتا ہے وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ جب تک خون آدمی کے جسم میں ہے' اُس وقت تک شیطان بھی اُس کے ساتھ ہے۔ یعنی پوری زندگی شیطان آدمی کے ساتھ خون کی طرح قائم رہتا ہے۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۴۶)

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءًؕ-صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ(۱۷۱)

اور کافروں کی مثال اُس شخص کی طرح ہے جو ایسے جانوروں کے پیچھے چلّا رہا ہو جو بلانے اور آواز دینے کے سوا کچھ نہیں سنتے' یہ بہرے' گونگے' اندھے ہیں' اسی لیے کچھ نہیں سمجھتے ○

''نعق'' کا معنیٰ اور بیان کردہ مثال کی تفسیر

﴿نعیق﴾ اُس آواز کو کہتے ہیں جو چرواہا اپنے ریوڑ کو دیتا ہے۔ اور (عربی زبان میں) ''نعق'' کا لفظ صرف ریوڑ چرانے والے ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں جو مثال بیان کی گئی ہے اُس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ جو کفار کو نصیحت کرتے ہیں اور اُنہیں اللہ کی طرف بلاتے ہیں' اس معاملہ میں آپ کی اور کفار کی مثال اُس چرواہے کی ہے جو اپنے ریوڑ کو آواز دیتا ہو۔ اور ریوڑ صرف آواز سُنتا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ جو اللہ کی طرف بلانے والے ہیں اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ریوڑ کو چرانے والا' اور کفار کی مثال اُس ریوڑ کی مانند ہے جس کو آواز دی جا رہی ہو۔ اس مثال کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ریوڑ آواز کو سنتا ہے اور مراد کو نہیں سمجھتا' اسی طرح کفار رسول اللہ ﷺ کی آواز کو سُنتے ہیں لیکن اُس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

بعض علماء نے اس مثال کی تفسیر یہ کی ہے کہ کم عقلی اور کم فہمی میں کافروں کی مثال اُن جانوروں کی طرح ہے جنہیں آواز دی جائے اور وہ سوائے آواز کے نہ کسی امر کو سمجھتے ہوں نہ کسی نہی کو (یعنی نہ اس بات کو سمجھتے ہوں کہ اُنہیں کسی بات کا حکم دیا جا رہا ہے اور نہ اس بات کو سمجھتے ہوں کہ اُنہیں کسی چیز سے روکا جا رہا ہے)۔ اس صورت میں بیان کردہ مثال کا تعلّق صرف ''منعوق به'' سے ہوگا' یعنی جس کو آواز دی جائے اور ''ناعق'' یعنی آواز دینے والے سے کلام کا تعلّق نہیں ہوگا۔

بعض علماء نے مثال کی تفسیر یہ کی ہے کہ کفار کا اپنے ناسمجھ اور بے عقل بتوں کو جو پکارنا ہے اس میں اُن کی مثال اُس شخص کی مانند ہے جو اپنے ریوڑ کو آواز دے رہا ہو۔ یعنی جس طرح اُسے سوائے آواز دینے اور پکارنے کے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اسی طرح کافر بھی اپنے بتوں کو جو پکارتا ہے اور اُن کی پوجا کرتا ہے اس سے سوائے تھکاوٹ اور غم کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مثال کی یہ جو تفسیر ذکر کی گئی اور اس سے قبل جو ذکر کی گئی ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ آخری تفسیر کے مطابق ''مدعو'' یعنی بُت محذوف ہیں (یعنی بُتوں کی مثال اُن جانوروں کی طرح ہے جو کچھ نہیں سُنتے)۔ اور اس سے قبل ذکر کردہ تفسیر کے مطابق ''داعی'' محذوف ہے یعنی رسول اللہ ﷺ۔

کفار کا بہرا' گونگا' اندھا اور بے سمجھ ہونا

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ﴾ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو جانوروں کی طرح قرار دیا تو مزید اُن کی سرزنش کے لیے فرمایا کہ یہ بہرے' گونگے اور اندھے ہیں۔ بہرے ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب یہ لوگ حق بات کو سُنتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سُنتے ہیں اور کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے تو گویا یہ لوگ بہرے ہیں۔ اور جو شخص کسی بات کو سُنے اور اُس کی سمجھ نہ رکھے اُس کو کہا جاتا ہے کہ یہ بہرے شخص کی مانند ہے۔ گونگے ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ حق بات نہیں بول سکتے۔ اور اندھا ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ آخر میں جو فرمایا کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے' اس کے بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عقل کسبی ہے' کیونکہ طبعی عقل ان کو حاصل تھی۔ (عقل کسبی اور عقل طبعی کی تشریح' البقرہ: ۴۴ کی تفسیر کے تحت مع حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۷۲﴾

اے ایمان والو! وہ پاک چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کیا کرو اگر تم صرف اُس کی عبادت کرتے ہو O

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی پاکیزہ نعمتوں کو کھانا

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب کھانے کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ کبھی وُجوب کے لیے ہوتا ہے' جیسے جان بچانے کے لیے اور جان سے نقصان دور کرنے کے لیے کھانا واجب ہے۔ اور کبھی کھانے کا حکم استحباب کے لیے ہوتا ہے' جیسے مہمان کے ساتھ کھانا مستحب ہے۔ اور کبھی یہ حکم اباحت (جواز) کے لیے ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب واجب اور مستحب ہونے کا کوئی سبب نہ پایا جائے۔ آیت میں جو ''طیّب'' کا لفظ ہے اُس کا معنیٰ ہے: حلال (یعنی وہ حلال چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۷۳) بے شک اللہ تعالیٰ طیّب (پاکیزہ) ہے اور وہ صرف پاکیزہ چیز قبول فرماتا ہے۔ بے شک اللہ عزوجل نے ایمان والوں کو اُس بات کا حکم فرمایا ہے جس کا اُس نے اپنے رسولوں کو حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ اُس نے ارشاد فرمایا: اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ (المؤمنون: ۵۱) اور اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ (البقرہ: ۱۷۲) پھر نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے اور اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم غبار آلود ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ دراز کر کے اپنے رب کو پکارتا ہے' حالانکہ اُس کا کھانا' پینا اور پہننا سب حرام کا ہے اور حرام ہی سے اُس نے غذا پائی ہے' تو ایسے شخص کی دُعا کیونکر قبول ہو سکتی ہے؟[۳۶۹]

(صحیح مسلم: ۱۰۱۵' سنن ترمذی: ۲۹۸۹' مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۸' سنن دارمی: ۲۷۱۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۶۰ ص ۲۴۱)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: ''اشعث اغبر''۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کا حُلیہ تیل سے' نہانے دھونے سے اور صفائی ستھرائی سے دُور ہو۔ اور طیّب کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد لذیذ کھانا ہے۔ سو ممکن ہے کہ کسی قوم کے لوگ لذیذ کھانے سے دور رہتے ہوں تو اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ کو نازل فرما کر اُن کے لیے لذیذ کھانا جائز فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا

﴿ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴾ یعنی اگر تمہاری عبادت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے اور تم اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ وہی تمہارا معبود ہے' اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے تو پھر تم اُن نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو جو اُس نے تمہیں عطا کی ہیں۔ بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ اگر تم اللہ عزوجل کو اور اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہو تو نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾

[۳۶۹] امام حافظ ابوالعباس قرطبی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ حرام کھانا دلوں کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے دلوں سے نرمی اور اخلاص ختم ہو جاتا ہے' اس لیے حرام کھانے والے کے اعمال قبول نہیں ہوتے ہیں۔ حدیث کے آخری جملہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دُعا کے قبول نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ حرام کھانے کی وجہ سے بندہ اس قابل نہیں رہتا ہے کہ اس کی دُعا مقبول ہو۔ ہاں اللہ تبارک وتعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے چاہے تو قبول فرما سکتا ہے۔ (المفہم ج ۳ ص ۶۰۔۵۹)

اللہ نے تم پر صرف مردار' خون' خنزیر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو' سو جس شخص کو جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو اس پر (ان چیزیوں کے کھانے یا استعمال میں) کوئی گناہ نہیں ہے' جب کہ وہ خواہش سے نہ کھائے اور ضرورت کی حد سے آگے نہ بڑھے' بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے O

''میتہ'' ''دم'' اور ''لحم الخنزیر'' کی تفسیر اور آیت کا ماقبل سے ربط

جب اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیت میں ہمیں طیبات یعنی حلال چیزیں کھانے کا حکم فرمایا تو اس کے بعد زیر بحث آیت میں حرام چیزیوں کی اقسام بیان فرمائیں۔ ان میں پہلے جن تین چیزوں کا بیان فرمایا اُن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ﴿میتة﴾ اُس جانور کو کہتے ہیں جس کی رُوح ذبح کے طریقہ کے بغیر اُس کے جسم سے جُدا ہو۔ ﴿الدَّمَ﴾ سے مراد بہنے والا خون ہے۔ اہل عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ آنتوں پر خون لگاتے تھے اور اُنہیں بھون کر کھاتے تھے' سو اللہ تعالیٰ نے خون کو حرام فرما دیا۔ ﴿لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ﴾ میں اگرچہ خنزیر کے صرف گوشت کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس سے خنزیر کے تمام اجزاء مراد ہیں (یعنی پورا خنزیر حرام ہے)۔ رہا یہ کہ صرف گوشت کا تذکرہ کیوں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اصلاً اُسی کے کھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے اس لیے اُس کے حرام ہونے کا تذکرہ کیا گیا۔

آیت کے اگلے حصہ کی مختصر تفسیر

﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ جانور جو بُتوں اور باطل معبودوں کے لیے پیش کیا جائے۔ اس میں جو لفظ ﴿اُهِلَّ﴾ ہے اس کا اصل معنیٰ ہے: آواز بلند کرنا۔ اہل عرب کا معمول یہ تھا کہ جب وہ بتوں کے لیے جانور ذبح کرتے تو اُن بتوں کے ذکر میں اپنی آواز بلند کرتے۔ سو اہل عرب کے دستور اور اُن کے معمول کے مطابق اس لفظ کا استعمال ہونے لگا' اور معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ ہر ذبح کرنے والے کو ''مُهِلّ'' کہا جاتا ہے' اگرچہ وہ بلند آواز سے بسم اللہ نہ پڑھے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص مردار کھانے پے مجبور ہو جائے۔ ﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ میں جو لفظ ''بَاغٍ'' ہے وہ ''البغی'' سے ہے اور ''بغی'' کا اصل معنیٰ ہے: فساد۔ اور ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ اصل میں ''عدوان'' سے ہے اور ''عُدوان'' کا اصل معنیٰ ہے: ظلم کرنا اور حد سے آگے بڑھنا۔ ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر کوئی مجبوراً حرام کھا لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں ﴿غَفُوْرٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی بندہ ضرورت کے وقت حرام کھا لے تو اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے اور ﴿رَّحِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو ضرورت کے وقت حرام کھانے کی رُخصت دی ہے اس لیے وہ بے حد مہربان ہے۔

آیت مذکورہ میں بیان کردہ حرام اشیاء کی تفصیل اور تفسیر مع فقہی احکام و مذاہب ائمہ

پہلا مسئلہ: مُردار کے حکم کے بیان میں: امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ مُردار کا کھانا حرام ہے' اور اس پر بھی سب متفق ہیں کہ مردار نجس اور ناپاک ہوتا ہے۔ البتہ شریعت نے دو جانوروں کو باوجود مردار ہونے کے حلال قرار دیا ہے' ایک مچھلی اور دوسری ٹڈی۔ مچھلی کے حلال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے متعلق ارشاد فرمایا:

(۱۷۴) اس کا پانی پاک ہے[۳۷۰] اور اس کا مردار حلال ہے (امام بخاری اور امام مسلم کے سوا اس حدیث کو چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے)۔ (سنن ترمذی: ۶۹' سنن ابوداؤد: ۸۳' سنن نسائی: ۵۹' سنن ابن ماجہ: ۳۸۶' مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۷' سنن دارمی: ۷۲۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۴۷۹' ص ۵۱)

۳۷۰ اس سے معلوم ہوا کہ سمندر کے پانی سے مطلقاً وضوء جائز ہے' خواہ اس کی رنگت اور مزہ برقرار ہو یا تبدیل ہو چکا ہو۔

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔

ٹڈی کے حلال ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۵) ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات یا چھ مرتبہ جہاد میں شرکت کی اور ہم آپ ﷺ کے ساتھ ٹڈی کھاتے تھے۔

(صحیح بخاری: ۵۴۹۵' صحیح مسلم: ۱۹۵۲' سنن ترمذی: ۱۸۲۲' سنن ابوداؤد: ۳۸۱۲' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۳' سنن دارمی: ۲۰۱۰' صحیح ابن حبان: ۵۲۵۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۴۱۱۳۔ ص ۳۶۰)

البتہ وہ مردہ مچھلی جو پانی کی سطح پر اُبھر آئے اُس کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اُس کو کھا سکتے ہیں۔ جبکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور حسن بن صالح بن جنی فرماتے ہیں کہ وہ مکروہ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ سمندر کا جو جانور مر کر اُوپر آ جائے اُس کو ہم نہیں کھاتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے۔ جب کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایسی مچھلی کا کھانا جائز ہے۔[۳۷۱]

ٹڈی کے بارے میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ پوری ٹڈی حلال ہے' خواہ کوئی

۳۷۱ امام اعظم ایسی مچھلی کے کھانے کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ آپ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو جانور سمندر میں مر کر اوپر آ جائے اُس کو مت کھاؤ۔ (سنن ابوداؤد: ۳۸۱۵' سنن ابن ماجہ: ۳۲۴۷) علامہ خازن نے امام شافعی کا جو موقف ذکر کیا ہے کہ سطح آب پر اُبھر آنے والی مردہ مچھلی کو کھانا جائز ہے اس کی دلیل ائمہ شوافع نے یہ دی ہے کہ المائدہ: ۹۶ میں اللہ عزوجل نے فرمایا: "اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ" (تمہارے لیے سمندری جانور کو شکار کرنا اور اس کو کھانا حلال کر دیا گیا ہے۔) اس میں سطح آب پر اُبھر آنے والی مردہ مچھلی سمیت تمام سمندری جانور شامل ہیں۔ اور حدیث شریف سے دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں: مچھلی اور ٹڈی۔ (دیکھئے علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیث: ۱۷۶) اس حدیث میں مردہ مچھلی کے مطلقاً حلال ہونے کا ثبوت ہے خواہ وہ پانی میں مر کر اوپر آ گئی ہو یا باہر آ کر مری ہو۔ اسی طرح سمندر کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے مطلقاً فرمایا کہ اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

علماء احناف نے ان دلائل کے جوابات یہ دیئے ہیں کہ المائدہ: ۹۶ میں "طعامہ" سے مفسرین کے نزدیک اُس جانور کا کھانا مراد ہے جس کو سمندر کنارہ پر پھینک دے اور وہ مر جائے۔ جبکہ ہماری بحث اس مچھلی کے بارے میں ہے جو پانی ہی میں مر کر سطح پر اُبھر آئے۔ جہاں تک ائمہ شوافع کی پیش کردہ احادیث کا تعلق ہے سو اُن میں وہ مچھلی داخل نہیں ہے جو سطح آب پر اُبھر آئے۔ کیونکہ اس کے کھانے کی ممانعت دیگر کئی احادیث سے ثابت ہے۔ ایک حدیث ہم نے اس حاشیہ کے آغاز میں ذکر کر دی ہے' مزید احادیث کے لیے شروح حدیث اور کتب فقہ میں متعلقہ بحث کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ علماء احناف نے شوافع کے المائدہ: ۹۶ سے استدلال کا جو جواب دیا ہے کہ اس سے مفسرین نے اُس جانور کا کھانا مراد لیا ہے جس کو سمندر نے کنارہ پر پھینکا ہو' یہ جواب مفسرین کے ایک قول کے مطابق ہے۔ امام ابن جریر کی تحقیق کے مطابق بعض مفسرین نے اس سے نمکین مچھلی مراد لی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جو کچھ سمندر میں ہو وہ سب طعامہ میں داخل ہے اور حلال ہے۔ (دیکھئے جامع البیان' المائدہ: ۹۶) اس لیے شوافع کے استدلال کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ چونکہ المائدہ: ۹۶ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں اس لیے یہ اپنے اس مفہوم میں قطعی نہیں ہے جس میں اس سے شوافع نے استدلال کیا ہے۔

شخص اُس کو زندہ پکڑے یا مُردہ پائے[372] امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ٹڈی جو مردہ پائی جائے وہ حلال نہیں ہے اور جو زندہ پائی جائے اُس کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کو اُس جیسے جانوروں کی طرح ذبح کیا جائے یعنی اُس کے سر کو کاٹ دیا جائے پھر ٹڈی کو بھون کر کھایا جائے۔ البتہ اگر کسی شخص نے ٹڈی کو زندہ پکڑا اور پھر اُس سے کسی وجہ سے غافل ہوا یہاں تک کہ ٹڈی مرگئی تو اُس کا کھانا حلال نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ: خون کے حکم کے بیان میں: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خون حرام اور نجس ہے۔ اس کو نہ کھانے پینے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے نہ ہی اس سے کوئی اور فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے[373] امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہر قسم کا خون حرام ہے خواہ وہ بہتا ہوا ہو یا بہتا ہوا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مچھلی کا خون حرام نہیں ہے کیونکہ جب وہ خشک ہوتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے۔

دو خون ایسے ہیں جن کو شریعتِ مطہرہ نے حلال قرار دیا ہے: ایک جگر اور دوسری تلی۔ امام دارقطنی حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے اور وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۷۶) خون میں سے دو خون ایسے ہیں جو ہمارے لیے حلال کیے گئے ہیں اور مردار میں سے دو مردار ایسے ہیں جو ہمارے لیے حلال کیے گئے ہیں۔ دو مردار سے مراد مچھلی اور ٹڈی ہے اور دو خون سے مراد جگر اور تلی ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۳۳۱۴، سنن بیہقی ج ۱ ص ۲۵۴، مسند احمد ج ۲ ص ۹۷، سنن دارقطنی: ۴۶۸۷۔ ج ۴ ص ۱۷۱، ۲۷۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۱۳۲۔ ص ۳۶۱)

☆ امام احمد اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا راوی عبدالرحمٰن بن زید ضعیف ہے اور اس کا بھائی عبداللہ بن زید قوی اور ثقہ ہے۔ امام دارقطنی نے اس حدیث کو عبداللہ بن زید از زید بن اسلم از عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم مرفوعاً روایت کیا

---

[372] جیسا کہ علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیث: ۱۷۶ میں اس کی تائید موجود ہے۔

[373] یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا کسی مریض کو ضرورت کے پیشِ نظر خون کا عطیہ دینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قرآن کریم میں جن جن مقامات پر خون کو حرام قرار دیا گیا ہے وہاں اختتام پر یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اضطرار (یعنی ایسی ضرورت جس میں خون کے بغیر چارۂ کار نہ ہو) کی صورت میں خون کا استعمال (بہ قدرِ ضرورت) جائز ہے۔ فقیہ اعظم مفتی نور اللہ نعیمی بصیر پوری علیہ الرحمۃ سے ۱۹۶۵ء کی پاکستان ہندوستان جنگ کے دوران زخمی ہونے والے مجاہدین کے متعلق پوچھا گیا کہ اُنہیں خون کے عطیات پیش کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایسی ضرورتِ شدیدہ کے وقت کہ زخمی مجاہد کی زندگی خطرہ میں ہو اور کوئی نافع دوائی خون کے بغیر نہ ملے تو استعمالِ خون بہ قدرِ ضرورت شرعاً جائز ہوگا۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی چار آیات کا حوالہ دے کر ثابت کیا کہ ان چاروں میں ضرورت کے موقع پر خون کے استعمال کی اجازت ہے اور مزید فرمایا کہ مذہب حنفیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔ ہدایہ ج ۳ ص ۳۳۲، نور الانوار ص ۱۷۲، تنقیح توضیح تلویح ص ۶۱۵ میں ہے کہ ان آیات میں جو چیزیں حرام کی گئی ہیں ان کا استعمال ضرورت کے وقت جائز ہے۔ (مزید تحقیق کے لیے دیکھیے: فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۵۶۲ تا ۵۶۸)

اُستاذِ محترم حضرت مفسّرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدّ ظلّہ العالی نے بھی شرح صحیح مسلم میں اس مسئلہ پر بہت مفصّل اور مدلّل بحث کی ہے۔ احادیثِ مبارکہ اور معتمد شارحین و محققین کی آراء کی روشنی میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر خون کا عطیہ دینا شرعاً جائز ہے۔ تحقیق کرتے ہوئے آپ نے ضرورت کے مواقع بھی بیان کیے ہیں: مثلاً کسی حادثہ یا گولی لگنے یا آپریشن کی وجہ سے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ جاتا ہے یا کسی کو بلڈ کینسر (خون کا سرطان) ہو جس میں ایک معیّن عرصہ کے بعد ہر مرتبہ جسم کا پورا خون تبدیل کرنا پڑتا ہے ورنہ مریض مر جاتا ہے یا کسی کا جگر خون بنانا بند کر دے ایسی صورت میں اس شخص کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل خون چڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس طرح کے ضروری مواقع پر خون کا عطیہ پیش کرنا شرعاً جائز ہے۔ البتہ محض طاقت اور توانائی حاصل کرنے کے لیے نہ عام طور پر خون چڑھایا جاتا ہے نہ شرعاً اس کی اجازت ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۳۰)

ہے اور ابوبکر بن العربی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک ایسی روایت مروی ہے جو سنداً صحیح نہیں ہے۔ امام بیہقی زیر بحث حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موقوفاً اور مرفوعاً دونوں طرح مروی ہے لیکن صحیح روایت وہ ہے جو موقوفاً مروی ہے۔

پھر ائمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ زیر بحث حدیث قرآنی آیت کے عموم کے لیے باعث تخصیص ہے یا نہیں؟ امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تخصیص کا باعث نہیں ہے کیونکہ جگر اور تلی خون نہیں ہے بلکہ یہ دونوں گوشت ہیں جیسا کہ مشاہدہ سے ثابت ہے اور مشاہدہ کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جگر اور تلی دونوں خون ہیں جیسا کہ زیر بحث حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ حدیث عموم قرآنی کے لیے باعث تخصیص ہے۔[۳۷۴]

تیسرا مسئلہ: خنزیر کے حکم کے بیان میں: ☆ امتِ مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خنزیر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ حرام ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے صرف اس کے گوشت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ لوگوں کا بڑا فائدہ گوشت ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ پھر علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ خنزیر نجس ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کا مؤقف یہ ہے کہ خنزیر نجس ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک نہ صرف خنزیر بلکہ ہر جانور طاہر ہے کیونکہ زندگی جو کہ طہارت (یعنی پاک ہونے) کا سبب ہے وہ جانوروں میں موجود ہے۔[۳۷۵]

اگر خنزیر کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس بارے میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ قول جدید یہ ہے کہ اس کا حکم کتے کی طرح[۳۷۶] ہے اور قول قدیم یہ ہے کہ جس برتن میں خنزیر منہ ڈال دے اس کو ایک مرتبہ دھو لینا کافی ہے۔ اس قول کے پیش

---

۳۷۴ احناف بھی اسی کے قائل ہیں کہ زیر بحث حدیث عموم قرآنی کے لیے مخصص ہے۔ نیز جگر اور تلی دونوں خون ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان دونوں کو خون قرار دیا ہے۔ لہٰذا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ان کو گوشت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں جمے ہوئے خون ہیں اور بہ ظاہر گوشت نظر آتے ہیں۔ (**لئلا تقع المعارضة بين الحديث الشريف والمشاهدة**)

۳۷۵ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی جو معتمد کتب ہیں اُن میں ہمیں یہ نہیں ملا کہ امام مالک نے خنزیر وغیرہ کو علی العموم طاہر قرار دیا ہو۔ البتہ اس کے برعکس علماء مالکیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ جو جانور حلال ہیں وہ ذبح شرعی سے پاک ہو جاتے ہیں اور جو حرام ہیں وہ ذبح شرعی سے پاک نہیں ہوتے مثلاً خنزیر، خچر اور گدھا وغیرہ۔ (یعنی خنزیر ذبح شرعی سے بھی پاک نہیں ہوتا چہ جائیکہ فی نفسہ پاک ہو!) ہاں کتب مالکیہ میں خنزیر سمیت تمام حرام جانوروں کے بالوں کے پاک ہونے کی صراحت موجود ہے۔
(تحقیق کے لیے دیکھیے: حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ج ۱ ص ۴۹، مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل ج ۱ ص ۸۸)

۳۷۶ یعنی جس طرح کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو (امام شافعی کے نزدیک) سات مرتبہ دھویا جائے گا اسی طرح خنزیر اگر منہ ڈال دے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ کتے کے منہ ڈالنے پر امام شافعی نے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا قول اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اُسے چاہیے کہ وہ اُس پانی کو بہا دے اور سات مرتبہ برتن کو دھوئے۔ (صحیح مسلم: ۲۷۹) ہمارے نزدیک یہ حکم ابتداءِ اسلام میں تھا، بعد میں منسوخ ہو گیا۔ ابتداءِ اسلام میں یہ حکم اس لیے تھا تاکہ کتوں کے ساتھ جو انسیت لوگوں کی قائم تھی اس کو ختم کیا جائے۔ جیسے شراب کے حرام ہونے کا جب عمومی حکم نازل ہوا تو شراب کے برتنوں کو بھی توڑنے کا حکم دیا گیا، پھر جب شراب کی حُرمت عام ہو گئی تو اُن برتنوں کا استعمال جائز ہو گیا۔ اسی طرح ابتداء اسلام میں لوگوں کے تعلق اور اُنسیت کو ختم کرنے کے لیے کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا گیا۔ جب اُنسیت ختم ہو گئی تو نبی اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو تین مرتبہ دھویا کرو۔ جیسا کہ سنن دارقطنی ج ۱ ص ۶۴ اور ۶۵ پر روایات موجود ہیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو تین مرتبہ دھویا جائے گا اور خنزیر کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو ایک مرتبہ دھویا جائے گا۔
(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۴۹، ہدایہ اوّلین ص ۴۳)

نظر خنزیر اور کتے میں فرق یہ ہے کہ کتے کا حکم سخت ہے کیونکہ اہل عرب اُس کو پالتے تھے جب کہ خنزیر کو نہیں پالتے تھے اس لیے اس کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو ایک مرتبہ دھولینا کافی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ کتے کے حکم میں جو سختی ہے وہ تعبدی اور خلافِ عقل ہے۔ لہٰذا اس کو کسی اور جانور پر لاگو نہیں کیا جائے گا۔

چوتھا مسئلہ: اُس جانور کے بارے میں جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو: کچھ علماء ایسے ہیں جنہوں نے "ما اھل بہ لغیر اللہ" سے یہ سمجھا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جو بتوں کو پوجنے والے اپنے بتوں کے لیے ذبح کرتے ہیں۔ ان علماء نے عیسائیوں کے اُس جانور کو بھی جائز قرار دیا ہے جس پر ذبح کے وقت عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیں۔ حضرت عطاء، مکحول، حسن بصری، شعبی اور سعید بن مسیّب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا یہی مذہب ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عموم کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۔ (المائدہ: ۵) اہل کتاب کا طعام تمہارے لیے حلال ہے۔

امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا مؤقف یہ ہے کہ عیسائیوں کا وہ جانور جس پر ذبح کے وقت عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیں وہ حلال نہیں ہے۔ کیونکہ جب اس کو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر ذبح کریں گے تو یقیناً وہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا ہوگا، لہٰذا لازماً وہ حرام[۳۷۷] ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم یہود ونصاریٰ کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہوئے دیکھو تو اس جانور کو نہ کھاؤ، اور جب تم اُن سے غیر اللہ کا نام نہ سنو تو اُس جانور کو کھاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے ذبح کردہ جانوروں کو ہمارے لیے حلال قرار دیا ہے۔ البتہ ذبح کرتے وقت یہود ونصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں اُس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔[۳۷۸]

---

۳۷۷ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی جانور کو اللہ عزوجل کے نام کی بجائے نبی اکرم ﷺ یا کسی بزرگ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور بھی حلال نہیں ہوگا۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں ایسے جانوروں کو حرام قرار دیا جارہا ہے جن پر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں اگر نبی اکرم ﷺ یا آپ کے کسی صحابی یا کسی بزرگ (مثلاً غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ) کے ایصال ثواب اور فاتحہ کے لیے کوئی جانور لایا جائے اور اُسے اللہ عزوجل کا نام لے کر ذبح کیا جائے وہ بلاشبہ جائز، طیب اور حلال ہے۔ علامہ شیخ احمد ملاّ جیون جونپوری حنفی علیہ الرحمۃ زیر بحث آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں جیسا کہ رائج ہو چکا ہے کہ اولیاء کرام کے لیے جانور (ذبح کرنے) کی منت مانی جاتی ہے ایسا جانور حلال اور طیب ہے۔ کیونکہ اُس پر ذبح کے وقت اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیا جاتا۔ (التفسیرات الاحمدیہ ص ۴۵)

۳۷۸ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آج کل کے یہود ونصاریٰ کا ذبح کیا ہوا جانور شرعاً حلال ہے یا نہیں؟ اور مختلف ممالک سے بند ڈبوں میں جو گوشت آتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ یہود ونصاریٰ کے ذبح کردہ جانور کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی واقعۃً یہودی یا عیسائی ہو اور وہ صرف اللہ عزوجل کا نام لے کر جانور ذبح کرے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر بحث قول کے مطابق وہ جانور حلال ہوگا اور اگر وہ غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور حرام ہوگا۔ فی زمانہ اکثر یہودی اور عیسائی لامذہبیت اور دہریت کا شکار ہو چکے ہیں اور ذبح کے وقت اللہ عزوجل کا نام بھی نہیں لیتے اس لیے اُن کے ذبح کردہ جانور کو نہیں کھایا جائے گا۔ جس طرح نکاح کے معاملہ میں حکم ہے کہ اہل کتاب سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن فی زمانہ اُن سے نکاح کو علماء نے ممنوع قرار دیا ہے۔ (لا یہ کہ واقعۃً کوئی اہلِ کتاب ہو اور دہریت ونیچریت کا شکار نہ ہو۔)

جہاں تک بند ڈبوں میں گوشت کا شرعی حکم ہے سو وہ جانور کے ذبح کے طریقہ اور ذبح کرنے والے کے مسلمان ہونے پر منحصر ہے۔ اگر جانور کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے کہ پہلے اُسے لوہے کی کسی چیز سے ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا جاتا ہے اس کے بعد پھر کوئی مسلمان شخص اُسے شرعی طریقہ کے مطابق ذبح کرتا ہے تو ایسی صورت میں بند ڈبوں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ بہ شرطیکہ جانور بے ہوش ہونے کے بعد زندہ ہو اور اگر جانور کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے کہ اُسے لوہے کی کسی چیز سے ضرب لگاتے ہیں یا اس کے سر پر گولی چلاتے ہیں یا بجلی کی تار سے جھٹکا لگاتے ہیں جس کی وجہ سے جانور مر جاتا ہے تو اس صورت میں وہ حلال نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں اس وقت تک کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ ذبح کے طریقہ کی تحقیق نہ کر لی جائے۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۸۰۸، شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۲۳ ـ ۱۲۴)

پانچواں مسئلہ: مضطر یعنی اُس شخص کے بارے میں جس کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو جائے: مضطر اُس شخص کو کہتے ہیں جس کو کسی چیز کا پابند کیا جائے اور زبردستی اُس پر اُسے مجبور کر دیا جائے۔ زیر بحث آیت میں جو "**فمن اضطر**" ہے اُس میں مضطر سے مراد وہ شخص ہے جس کو اپنی جان کے ضائع ہونے کا خوف لاحق ہو جائے۔ یہاں تک کہ بعض علماء کا قول ہے کہ جو شخص اتنا مجبور ہو جائے کہ اُسے مردار کھانا پڑے اس کے باوجود وہ نہ کھائے یہاں تک کہ مر جائے تو وہ جہنمی ہے۔[۳۷۹]

"**مُضطر**" تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتا ہے جس کو حرام کھانے پر مجبور کر دیا جائے۔ دوسرا وہ ہوتا ہے جو بہت شدید بھوک کی وجہ سے حرام کھانے پر مجبور ہو جائے۔ اور تیسرا وہ ہوتا ہے جو ایسی غربت میں ہو کہ اُسے کوئی (حلال) چیز نہ ملے۔ ان تینوں افراد کے لیے حرام چیزوں کی حرمت اُٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ آیت میں اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: "**فلا اثم علیہ**" اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے مُردار کا کھانا جائز ہو جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ حرام کھانے کی رُخصت کب تک برقرار رہے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مضطر ایسا ہو کہ اس کو حرام کھانے پر مجبور کیا گیا ہو تو جب تک اُسے مجبور کیا جائے اس وقت تک وہ حرام کھا سکتا ہے اُس کے بعد نہیں۔ اور اگر مضطر ایسا ہو کہ شدید بھوک کی وجہ سے حرام کھانے پر مجبور ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) اگر بھوک ہمیشہ رہتی ہو تو پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ یہ تمام علماء کے نزدیک صحیح ہے۔ (۲) اور اگر کبھی کبھی ایسی بھوک لگتی ہو تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا شخص صرف اتنا کھائے جس سے اس کی رمقِ حیات برقرار رہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا مؤقف ہے۔ اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ ایسا شخص پیٹ بھر کر کھا سکتا ہے۔ یہی امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مؤقف ہے۔[۳۸۰]

چھٹا مسئلہ: "غیر باغ" اور "غیر عاد" کی تفسیر کے بیان میں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ "**غیر باغ**" کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص حرام کھانے پر مجبور ہو وہ حاکم وقت کے خلاف بغاوت کرنے والا نہ ہو۔ اور "**و لا عاد**" کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ شخص حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔ یعنی گناہ کے سفر پر نہ نکلا ہو۔ مثلاً ڈاکہ ڈالنے کے لیے نکلا ہو یا اپنے مالک سے بھاگ کر آیا ہو۔ سو اس طرح گناہ کے سفر پر جو نکلا ہو اور پھر وہ حرام کھانے پر مجبور ہو جائے اس کے لیے مردار کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اس کو وہ سہولتیں بھی شرعاً حاصل نہیں ہیں جو مسافروں کو حاصل ہوتی ہیں۔ اور یہ تمام پابندیاں اس وقت تک ہیں جب تک کہ وہ توبہ نہ کر لے۔ امام شافعی کا یہی مؤقف ہے۔ اس مؤقف کی دلیل یہ ہے کہ اگر گناہ کے سفر پر نکلنے والے شخص کو بھی (مجبوری کی حالت میں) حرام کھانے کی اجازت دے دی جائے تو یہ اس کے فساد اور گناہ پر تعاون ہوگا جو کہ جائز نہیں ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ "**غیر باغ**" اور "**و لا عاد**" کا تعلّق کھانے کے ساتھ ہے (یعنی جب تم حرام کھانے کے لیے مجبور ہو جاؤ تو اس میں حد سے آگے نہ بڑھو)۔ امام ابوحنیفہ کا یہی مؤقف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حرام

---

[۳۷۹] امام شافعی کے نزدیک مجبور شخص پر حرام کھا کر جان بچانا واجب نہیں ہے جبکہ احناف کے نزدیک واجب ہے۔ کیونکہ مجبوری کی حالت میں حرام چیزیں مُباح ہو جاتی ہیں لہٰذا جب جان کا خطرہ ہو اور کوئی حلال چیز نہ ملے تو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بہ قدر ضرورت استعمال کر کے جان بچانا واجب ہوگا۔ (تفسیر مظہری زیر بحث آیت)

[۳۸۰] مفسر علیہ الرحمۃ نے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو مؤقف بیان کیا کہ کسی شخص کو شدید بھوک لگے اور اُسے کوئی حلال چیز میسّر نہ ہو تو وہ ضرورت کی مقدار حرام کھا سکتا ہے اس میں یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ اُسی صورت میں ہے جب شدید بھوک سے جان کا خطرہ لاحق ہو۔ (**کما لا یخفی**) ایسی شدید بھوک اگر کبھی کبھی طاری ہو تو امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حرام چیز کو صرف اس قدر کھا سکتا ہے کہ رمقِ حیات برقرار رہے۔ کیونکہ اصول ہے کہ جو چیز ضرورتاً ثابت ہوتی ہے وہ اس ضرورت تک ہی محدود رہتی ہے۔

کھانے پر مجبور ہو جائے وہ مردار کھا سکتا ہے' اگر چہ وہ شخص گناہ گار ہو۔[۳۸۱] بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''غیر باغ'' کا معنی یہ ہے کہ مجبور شخص مردار کے علاوہ کوئی چیز پا لینے کے بعد مردار کی تلاش میں نہ رہے۔ اور ''ولا عاد'' کا معنی یہ ہے کہ مجبور شخص مقررہ حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ بعض علماء نے ''غیر باغ'' کا معنی یہ کیا ہے کہ مجبور شخص مردار کو حلال نہ سمجھے۔ اور ''ولا عاد'' کا معنی یہ کیا ہے: وہ مُردار کو ذخیرہ نہ کرے۔[۳۸۲]

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی جانب سے کتاب میں نازل کردہ باتوں کو چھپاتے ہیں اور ان کے بدلہ میں حقیر سا معاوضہ لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں' اللہ قیامت کے دن ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک فرمائے گا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

مذکورہ آیت یہودی سرداران اور یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی غریب عوام سے تحفے تحائف اور کھانے پینے کی چیزیں وصول کرتے تھے' اور انہیں یہ اُمید تھی کہ جو نبی تشریف لانے والے ہیں وہ ان ہی میں سے ہوں گے۔ لیکن جب سیدنا محمد ﷺ کی بعثت قریش میں ہوئی تو انہیں ڈر لگا کہ غریب عوام سے ہم جو روٹی پانی وصول کرتے ہیں اور

[۳۸۱] مذہب مشہور کے مطابق امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی مؤقف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ مجبور شخص کو جو حرام چیز کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے وہ اس کے لیے رخصت نہیں ہے بلکہ اس پر بہ قدر ضرورت حرام چیز کھا کر اپنی جان بچانا لازم ہے اور جس طرح واجب امور انسان پر علی العموم واجب ہی رہتے ہیں (خواہ وہ نیکی کے سفر میں ہو یا گناہ کے سفر میں) اسی طرح مجبور شخص اگر چہ گناہ کے سفر میں ہو بہ حالت مجبوری اس پر حرام کے ذریعہ اپنی جان کو بچانا لازم ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ گناہ کے سفر میں مجبور کو جان بچانے کی اجازت دینے سے گناہ پر تعاون کرنا لازم آتا ہے (جیسا کہ علامہ خازن نے امام شافعی کی جانب سے بیان کیا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مجبور کو حرام کے ذریعہ جان بچانے کی اجازت نہ دی جائے تو لازم آئے گا کہ وہ اپنی جان کو ضائع کر دے اور جان کو ضائع کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ جہاں تک گناہ پر تعاون کی بات ہے تو پھر امام شافعی کو چاہیے کہ وہ گناہ گار شخص کو پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرنے کی اجازت نہ دیں' بیمار ہونے کی صورت میں رمضان کا روزہ ترک کرنے کی اجازت نہ دیں' ''مسح علی الخفین'' (موزوں پر مسح) کرنے کی اجازت نہ دیں۔ حالانکہ امام شافعی ان تمام صورتوں میں گناہ گار کو اقامت کی شرط کے ساتھ اور تیمم والی صورت میں بہ حالت سفر رخصت دینے کے قائل ہیں۔ اس لیے صحیح مؤقف یہی ہے کہ جس طرح گناہ گار کو اس کے گناہ کی وجہ سے دیگر واجبات یا رخصتوں سے نہیں روکا گیا ہے اسی طرح اگر وہ گناہ کے سفر میں ہو اور حرام کھانے پر مجبور ہو جائے تو اپنی جان کا تحفظ کرنا بھی اس کے لیے ممنوع نہیں ہوگا۔

(احکام القرآن للجصاص و تفسیر القرطبی' زیر بحث آیت)

[۳۸۲] علامہ خازن علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر ''غیر باغ'' اور ''ولا عاد'' کے متعلق جتنے اقوال ذکر کیے ہیں اُن میں امام شافعی کے قول کے علاوہ دیگر تمام اقوال زیر بحث آیت کے مضمون اور سباق کے مطابق ہیں' جبکہ امام شافعی کا قول آیت کے ظاہر مضمون کے مطابق نہیں ہے۔ کذا قال المفسرون. فلیتأمل.

ہمارا جو اقتدار قائم ہے یہ سب کچھ ختم نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کو چھپایا' جس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ بے شک جو لوگ اللہ کی جانب سے نازل کردہ کتاب کو چھپاتے ہیں یعنی کتاب میں نبی کریم ﷺ کا جو حلیہ مبارک' پاکیزہ اوصاف اور آپ کی نبوت کا وقت بیان کیا گیا اُس کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلہ میں حقیر سا معاوضہ لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں۔

چھپانے کی جو تفسیر ذکر کی گئی (یعنی اوصاف کو چھپانا) وہ مفسرین کا قول ہے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ (متوفی ۶۰۶ ھ) فرماتے ہیں کہ اہل کلام کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ یہودی نبی کریم ﷺ کے اوصاف میں تبدیلی کریں کیونکہ تورات اور انجیل دونوں شہرت اور تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی کتابیں تھیں' لہٰذا ان میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ البتہ یہ لوگ معانی کو چھپایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں میں ایسے افراد موجود تھے جو سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنے والی آیات کو پہچانتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ غلط تاویلات کر کے آیات کو اُن کے صحیح معانی سے پھیر دیتے تھے۔ جن سے نبی اکرم ﷺ کی نبوت ثابت ہوتی تھی۔ زیر بحث آیت میں چھپانے کا یہی معنی مراد ہے۔ یعنی آیات کے معانی کو چھپانا۔ لہٰذا اب آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بے شک جو لوگ اللہ کی جانب سے نازل کردہ کتاب کے معانی کو چھپاتے ہیں۔ اور آگے جو فرمایا کہ ''اُس کے بدلہ میں ثمن قلیل لیتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ چھپانے کے بدلہ میں ثمن قلیل لیتے ہیں یا بعض علماء کے قول کے مطابق اللہ کی جانب سے نازل کردہ کتاب کے بدلہ میں ثمن قلیل لیتے ہیں۔ ثمن قلیل سے مراد ہے تھوڑی قیمت۔ یعنی وہ روٹی پانی جو یہودی اپنی غریب عوام سے لیا کرتے تھے۔ آگے فرمایا: ایسے لوگ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں۔ یعنی اپنے پیٹ میں ایسی چیزیں ڈال رہے ہیں جو آگ کی طرف لے جانے والی ہیں یعنی رشوت اور حرام کا کھانا۔ چونکہ یہ چیزیں آگ کی طرف لے جانے والی ہیں اس لیے گویا وہ آگ کو کھا رہے ہیں۔ آگے فرمایا: اللہ قیامت کے دن ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک فرمائے گا۔ بات نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت اور خوشی کی کوئی بات نہیں فرمائے گا بلکہ سختی کے ساتھ ان سے بات کرے گا۔ یعنی ان سے فرمائے گا کہ تم آگ میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ (المؤمنون:۱۰۸) بعض علماء فرماتے ہیں کہ کلام نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن پر غضب فرمائے گا۔ عام بول چال میں بھی یہ استعمال ہے کہ جب کوئی شخص غصہ میں ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں سے بات نہیں کرتا۔

آخر میں فرمایا: ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یعنی ایسا عذاب ہے جس کا درد اُن کے دلوں تک پہنچے گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی اور مغفرت کے بدلہ میں عذاب کو خرید لیا' کس چیز نے ان کو اس قدر آگ پر صبر کرنے والے بنا دیا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ﴾ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو اور مغفرت پر عذاب کو ترجیح دی' کیونکہ ان لوگوں کو حق کا تو علم تھا لیکن انہوں نے اس کو چھپایا۔ جبکہ حق ہی کو ظاہر کرنے میں ہدایت اور مغفرت تھی اور حق کو چھپانے میں گمراہی اور عذاب تھا۔ جب انہوں نے حق کے چھپانے کو ترجیح دی تو یہ لوگ گمراہی لے کر

ہدایت کے بیچنے والے اور عذاب کو لے کر مغفرت کو بیچنے والے ہو گئے۔

﴿ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ یعنی کس چیز نے ان کو صابر بنا دیا ہے اور آگ پر جرأت مند بنا دیا ہے کہ ان لوگوں نے حق کو چھوڑ کر باطل کی پیروی اختیار کر رکھی ہے؟ اس جملہ میں جو سوالیہ انداز ہے وہ سرزنش کے طور پر ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ انداز ان لوگوں کی حالت پر تعجب کے طور پر ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو بغیر کسی پرواہ کے اُن کاموں میں لگایا ہوا ہے جو آگ میں لے جانے والے ہیں اور جب جانتے ہوئے انہوں نے آگ میں لے جانے والے کاموں کو اختیار کیا تو گویا یہ لوگ عذابِ الٰہی پر خوش ہیں اور اس پر صابر ہیں۔ ان لوگوں کی اس حالت پر تعجب کرتے[۳۸۳] ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آخر کس چیز نے ان لوگوں کو آگ پر صبر کرنے والا بنا دیا ہے؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

یہ (عذاب) اس وجہ سے ہو گا کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا (اور ان لوگوں نے اس کا انکار کیا) اور بے شک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ بہت زیادہ مخالفت میں ہیں O

آیت مذکورہ کی تفسیر

اس آیت میں ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ عذاب کی طرف ہے۔ یعنی یہ عذاب اس وجہ سے ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا اور ان لوگوں نے اس کتاب کا انکار کیا۔ بعض علماء نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ہمارا کافروں کے ساتھ عذاب کا جو معاملہ ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا اور ان لوگوں نے اس کتاب میں تحریف اور تبدیلی کر دی۔ بعض علماء نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ کفار کو عذاب اس وجہ سے ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا اور یہ لوگ اس کے کچھ حصہ پر ایمان لائے اور کچھ کا انکار کیا۔

آخر میں فرمایا: ایسے لوگ ''شِقَاقٍ بَعِيْدٍ'' میں ہیں۔ یعنی ایسی مخالفت اور جھگڑے میں ہیں جو حق سے دُور ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

(اصل) نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ (اصل) نیکی اُس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان

۳۸۳ تعجب کا معنیٰ ہے: کسی ایسی چیز سے متاثر ہونا جس کا سبب پوشیدہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معنیٰ محال ہے کیونکہ اس سے کسی چیز کا سبب پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں تعجب سے مجازی معنیٰ مراد لیں گے۔ یعنی یہودیوں کی اس قدر جرأت اور جسارت انتہائی قابل مذمت ہے۔

لائے اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال سے اپنی محبت کے باوجود (اللہ کے لیے) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، گداگروں اور غلام آزاد کرانے کے لیے خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور وہ لوگ جو وعدہ کرنے کے بعد اپنے وعدے کو پورا کرنے والے ہیں اور مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت صبر کرنے والے ہیں، وہی لوگ سچے ہیں اور وہی پرہیز گار ہیں O

آیت مذکورہ میں خطاب اہلِ کتاب سے ہے یا اہلِ ایمان سے؟

آیت مذکورہ میں خطاب یہود و نصاریٰ سے ہے۔ کیونکہ نصاریٰ (عیسائی) بیت المقدس کے مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور یہودی بیت المقدس کے مغرب کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ اور یہود و نصاریٰ میں سے ہر گروہ یہ سمجھتا تھا کہ نیکی اسی کام میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جس میں نیکی سمجھ رہے ہو اُس میں نیکی نہیں ہے، البتہ نیکی اُن کاموں میں ہے جو مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت میں خطاب مؤمنین سے ہے، کیونکہ ابتدائے اسلام میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص اللہ کی وحدانیت کی اور سیدنا محمد (ﷺ) کی رسالت کی گواہی دے دیتا اور کسی بھی سمت رُخ کر کے نماز ادا کر لیتا اور اسی معمول پر اُسے موت آ جاتی تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے ہجرت فرمائی اور فرائض نازل ہوئے اور کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم ''اپنی نماز میں'' مشرق اور مغرب کی طرف اپنے چہرے پھیر لو اور اس کے علاوہ کوئی عمل نہ کرو بلکہ نیکی اُن کاموں میں ہے جو آیت میں تمہارے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

''بِرّ'' کا معنیٰ اور آیت میں بیان کردہ ''بِرّ'' کی اقسام کی تفسیر

﴿بِـرّ﴾ ایک ایسا لفظ ہے جو فرمانبرداری اور خیر کے اُن تمام اعمال کو شامل ہے جو بندے کو اللہ عزوجل کے قریب کرنے والے، جنت تک پہنچانے والے اور باعث اجر و ثواب ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں نیکی کی جو مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں اُن کی تفسیر درج ذیل ہے:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ یعنی نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔ یہاں ﴿بِـر﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ پر ایمان ہو اور اللہ سے ڈرا جائے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوم آخرت پر ایمان لانے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بُتوں کو پوجنے والے مرنے کے بعد کی زندگی کا انکار کرتے تھے۔ آیت میں فرشتوں پر ایمان لانے کا جو تذکرہ ہے اُس سے مراد یہ ہے کہ تمام فرشتوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔ کیونکہ یہودی حضرت جبریل کو اپنا دشمن کہتے تھے[۳۸۴] کتاب پر ایمان لانے سے مراد بعض علماء کے نزدیک قرآن ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ آگے تمام انبیاء کا تذکرہ ہے اس لیے کتاب سے تمام نازل ہونے والی کتابیں مراد ہوں گی۔ اس آیت میں صرف پانچ چیزوں پر ایمان لانے کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کے ضمن میں کثیر تعداد ایسی چیزوں کی موجود ہے جن کی تصدیق کرنا مؤمن کے لیے ضروری ہے۔

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ یعنی نیکی کے کاموں میں سے یہ بھی ہے کہ مال سے محبت کے باوجود مال کو خرچ کیا جائے۔ آیت میں ﴿عَلٰى حُبِّهٖ﴾ کا جو لفظ ہے اُس کے بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس میں ''ہ'' ضمیر مال کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہے کہ مال سے اپنی محبت کے باوجود خرچ کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ:

۳۸۴۔ یہودیوں کی حضرت جبریل علیہ السلام سے دشمنی کا واقعہ البقرہ: ۹۷ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۷۷) نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! کون سے صدقہ میں اجر وثواب زیادہ ہے؟ آپ نے فرمایا: زیادہ اجر اس میں ہے کہ تم اس وقت صدقہ کرو جب تم تندرست ہو اور مال کے خواہش مند ہو اور تمہیں غربت کا خوف ہو اور مال داری کی اُمید ہو۔[۳۸۵] اور خرچ کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرو کہ جب جان حلق کو پہنچ جائے اور تم کہو کہ اتنا فلاں کو دے دینا اور اتنا فلاں کو دے دینا[۳۸۶]، حالانکہ اس وقت وہ فلاں کا ہو چکا۔[۳۸۷] (صحیح بخاری: ۱۴۱۹، صحیح مسلم: ۱۰۳۲، سنن ابوداؤد: ۲۸۶۵، مسند احمد ج۲ص ۲۳۱، صحیح ابن حبان: ۳۳۱۲، سنن بیہقی ج۴ص ۱۸۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۷، ص ۱۶۴)

☆ اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''حتی اذا بلغت الحلقوم'' یہاں تک کہ جب وہ حلق کو پہنچ جائے۔ اس سے مراد رُوح ہے اگرچہ ماسبق میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ حدیث میں جو فرمایا کہ اتنا فلاں کو دے دینا اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے لیے وصیت کی جائے۔ اور آخر میں جو فرمایا کہ حالانکہ وہ فلاں کا ہو چکا اس سے مراد ورثاء ہیں۔

گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا کہ آیت میں ''علی حبّہ'' کی ضمیر کے متعلق بعض علماء کا قول یہ ہے کہ یہ مال کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہے کہ مال سے اپنی محبت کے باوجود خرچ کرے۔ بعض دیگر علماء فرماتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع اسم جلالت ''اللہ'' ہے۔ اور معنیٰ یہ ہے کہ اللہ کی محبت میں اور اس کی رضا کی خاطر مال خرچ کرے۔

رشتہ داروں کے لیے خرچ کرنے کی فضیلت

آیت میں فرمایا کہ آدمی ''ذوی القربٰی'' کو دے یعنی اپنے رشتہ داروں کو دے۔ پہلے رشتہ داروں کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ ان کا حق زیادہ ہے۔ حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۷۸) مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار کو صدقہ دینا دو صدقے ہیں۔[۳۸۸] ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔

---

۳۸۵ غربت کا خوف اور مال داری کی امید سے مراد یہ ہے کہ انسان ایسی حالت میں خرچ کرے جبکہ اُسے یہ خطرہ ہو کہ اگر میں نے مال خرچ کیا تو میں فقیر ہو جاؤں گا اور اس بات کی امید ہو کہ اگر میں نے خرچ نہیں کیا تو میں مال دار رہوں گا۔ چونکہ اس کیفیت اور حالت میں مال خرچ کرنا نفس پر بہت گراں گزرتا ہے اس لیے اس کو بہترین صدقہ قرار دیا۔ (عمدۃ القاری ج۶ص ۳۸۴، مرقات ج۴ص ۳۷۰)

۳۸۶ یہاں فلاں سے مراد وہ شخص ہے جس کے لیے وصیت کی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے وارث مراد ہو لیکن یہ اس صورت میں ہے جب دیگر ورثاء راضی ہوں۔ کیونکہ وارث کے لیے دیگر ورثاء کے رضامند ہونے کی صورت میں وصیت جائز ہے۔ اختتام پر جو فرمایا کہ ''وہ فلاں کا ہو چکا'' اس میں فلاں سے مراد ورثاء ہیں۔ یعنی اب تم وصیت کرو یا نہ کرو تمہارا مال ورثاء کی ملکیت میں جا چکا۔ مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرض الموت کی حالت ہی میں بیمار کے مال میں وارثوں کا حق ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ بیمار صرف تہائی (۱/۳) مال کی وصیت کرسکتا ہے۔ (مرأۃ المناجیح ج۳ص ۸۴)

۳۸۷ علامہ عینی علیہ الرحمۃ اس حدیث کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل معنیٰ یہ ہے کہ سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جو زندگی میں صحت اور تندرستی کی حالت میں اس وقت کیا جائے جب آدمی کو مال کی ضرورت ہو۔ نہ کہ اس وقت جبکہ آدمی بیمار پڑ جائے اور موت سر پر ہو۔ کیونکہ اس وقت مال کا تعلق کسی اور سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس مفہوم کی تائید حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ کسی شخص کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت سو درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ (عمدۃ القاری ج۶ص ۳۸۴)

۳۸۸ یعنی جو عام مسکین ہو اُسے صدقہ دینا ایک ہی صدقہ ہے لیکن جو مسکین رشتہ دار ہو اُسے صدقہ دینے میں دوگنا ثواب ہے۔ ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرا اس بات کا کہ اُن کے ساتھ صلہ رحمی (یعنی مروت ومحبت اور حسن سُلوک) کا مظاہرہ کیا گیا جو کہ خود ایک بہت عظیم نیکی اور عبادت ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کا ذکر فرمایا اور یہ دونوں چیزیں مال اور رزق میں برکت کا باعث ہیں۔ صدقہ کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مال میں کچھ کمی نہیں آتی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(سنن ترمذی: ۶۵۸، سنن نسائی ج۵ص۹۲، سنن ابن ماجہ: ۱۸۴۴، مسند احمد ج۴ص۲۱۴، سنن دارمی: ۱۶۸۰، صحیح ابن حبان: ۳۳۴۴، سنن بیہقی ج۴ص۱۷۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۳۹، ص۱۷۱)

(۱۷۹) اُم المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اجازت کے بغیر ایک باندی کو آزاد کیا۔ جب اُن کی باری کا دن آیا تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ کو پتا چلا کہ میں نے اپنی باندی کو آزاد کر دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا واقعی تم نے ایسا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تمہیں زیادہ اجر وثواب ملتا۔[۳۸۹]

(صحیح بخاری: ۲۵۹۲، صحیح مسلم: ۹۹۹، سنن ابوداؤد: ۱۶۹۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۳۵، ص۱۷۱)

یتیم، مسکین اور ابن السبیل کے معنیٰ کی تحقیق

﴿ وَالْيَتٰمٰى ﴾ یعنی یتیموں کے لیے خرچ کرے۔ ''یتیم'' اُس کو کہتے ہیں جو چھوٹا ہو اور اس کا باپ نہ ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ بالغ اور نابالغ دونوں کو یتیم کہا جاتا ہے۔[۳۹۰] ﴿ وَالْمَسٰكِيْنَ ﴾ یعنی مسکینوں کے لیے خرچ کرے۔ مساکین ''مسکین'' کی جمع ہے۔ مسکین چونکہ اپنے پاس کچھ موجود نہ ہونے کے باعث ہمہ وقت سکون (یعنی ٹھہراؤ) میں رہتا ہے اس لیے اُسے مسکین کہتے ہیں۔ ﴿ وَابْنَ السَّبِيْلِ ﴾ یعنی مسافروں کے لیے خرچ کرے۔ ''ابن السبیل'' کا معنیٰ ہے: راستہ کا بیٹا۔ مسافر چونکہ راستہ کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اس لیے اُسے ''ابن السبیل'' کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''ابن السبیل'' سے مراد وہ شخص ہے جو مہمان بن کر کسی شخص کے پاس آئے۔ کیونکہ مہمان بھی ''سبیل'' یعنی راستہ ہی کے ذریعہ آتا ہے اس لیے ''ابن السبیل'' سے مہمان مراد ہے۔ ان دونوں اقوال میں پہلا قول زیادہ معقول ہے۔ کیونکہ ''ابن السبیل'' ایسا جامع لفظ ہے جو ''مسافر'' کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) (بلکہ پوشیدہ طور پر برکت ہوتی ہے۔ از مرقات) (مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۸۹) اور صلہ رحمی کے بارے میں فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو صلہ رحمی کرے۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۱۸)

۳۸۹ اگرچہ غلام اور باندی کو آزاد کرنا بھی بہت عظیم اجر وثواب کا باعث ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث میں اس کو جہنم سے آزادی اور ایک حدیث میں جنت میں داخل ہونے کا باعث قرار دیا گیا۔ (دیکھئے: کتاب العتق، مشکوٰۃ المصابیح) لیکن یہاں باندی آزاد نہ کرنے کو زیادہ اجر وثواب کا باعث اس لیے فرمایا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ماموں تنگدستی کا شکار تھے۔ (كذا في المرقاة.) اور ظاہر ہے کہ جب وہ تنگ دستی کا شکار تھے تو اُنہیں باندی ہبہ کرنے میں حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے دوگنا اجر تھا، ایک ہبہ کرنے کا اور دوسرا صلہ رحمی کرنے کا۔ اس لیے آپ نے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اگر تم وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تمہیں زیادہ اجر وثواب ملتا۔

۳۹۰ امام رازی علیہ الرحمۃ نے اس کو شوافع کا قول قرار دیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ''. (النساء: ۲) ''یتیموں کو اُن کا مال دے دو''۔ ظاہر ہے کہ یتیموں کو اُن کا مال بالغ ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔ اس لیے ''یتیم'' بالغ اور نابالغ دونوں کو بولا جاسکتا ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کو بلوغت کے بعد تک ''یتیم ابی طالب'' کہا جاتا تھا۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یتیم کا لفظ بالغ کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ (تفسیر کبیر، زیر بحث آیت) ہمارے نزدیک بہ حسب لغت یتیم صرف اُسی کو کہا جاسکتا ہے جس کی نابالغی کی حالت میں والد کا انتقال ہو جائے۔ بلوغت کے بعد کسی پر یتیم کا اطلاق مجازاً تو ہوسکتا ہے لیکن حقیقۃً نہیں ہوسکتا۔ (دیکھئے: لسان العرب، مادۃ: الیتم) امام رازی نے النساء: ۲ کو بہ طور دلیل پیش کیا ہے اس میں ہمارے نزدیک بالغ پر یتیم کا اطلاق حکایت حال ماضی کے طور پر ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے لیے ''یتیم ابی طالب'' کا لفظ بھی حکایت ماضی کے طور پر ہے۔ (دیکھئے: تفسیر القرطبی، النساء: ۲)

وضع کیا گیا ہے۔ ﴿وَالسَّآئِلِيْنَ﴾ یعنی مانگنے والوں کو دے۔ سائلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو مختلف چیزیں مانگتے ہیں اور کھانا طلب کرتے ہیں۔ مانگنے والوں کو دینے کے بارے میں احادیث درج ذیل ہیں:

سائلین کو دینے کے بارے میں احادیث

(۱۸۰) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مانگنے والے کا حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر آئے۔[۳۹۱] (سنن ابوداؤد: ۱۶۶۵، مؤطا امام مالک: ۱۹۲۷، مسند احمد ج ۱ص ۲۰۱)

(۱۸۱) حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مانگنے والے کو دو اگر چہ وہ گھوڑے پر آئے۔ (مؤطا امام مالک: ۱۹۲۷، مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ص ۹۲، کنز العمال: ۱۵۹۸۳، درِ منثور ج ۱ص ۱۷۱)

(۱۸۲) حضرت ام نجید رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! مسکین لوگ میرے دروازے پر آتے ہیں لیکن میرے پاس دینے کو کوئی چیز نہیں ہوتی (میں کیا کروں؟) آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں جلا ہوا کھر بھی مل جائے تو وہ اُسے دے دو۔ (سنن ترمذی: ۶۶۵، سنن ابوداؤد: ۱۶۶۷، سنن نسائی: ۲۵۶۵، مؤطا امام مالک: ۱۷۶۰، مسند احمد ج ۶ص ۳۸۳، سنن بیہقی ج ۴ص ۱۷۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۷۹۔۱۹۴۲۔ص ۱۶۶۔۱۷۱)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔ ☆ امام مالک نے مؤطا میں اس روایت کو جن الفاظ میں روایت کیا ہے وہ یہ ہیں کہ مسکین کو لوٹاؤ اگر چہ جلے ہوئے کھر کے ساتھ۔ ☆ اس حدیث میں فرمایا کہ ''مسکین کو لوٹا دو'' اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اُسے محروم لوٹا دو بلکہ مراد یہ ہے کہ اُسے کوئی چیز دے کر لوٹاؤ۔ ☆ اس حدیث میں جو فرمایا کہ ''اگر چہ جلا ہوا کھر ہی دے دو'' اس سے مقصود اس بات میں مبالغہ کرنا ہے کہ خواہ کتنی ہی تھوڑی چیز تمہارے پاس کیوں نہ ہو وہ مانگنے والے کو دے دو۔

آیت میں آگے فرمایا: ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ یعنی غلام آزاد کرانے کے لیے خرچ کرے۔ ''الرقاب'' سے مراد وہ غلام ہیں جو مکاتب[۳۹۲] ہوں۔ بعض علماء کے نزدیک ''فی الرقاب'' سے غلام آزاد کرنا مراد ہے اور بعض علماء کے نزدیک قیدیوں کو چھڑوانا مراد ہے۔

زیرِ بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (نیکی اُس شخص کی ہے) جو اقامت صلوٰۃ کرے یعنی فرض نمازوں کو اُن کے اوقات میں ادا کرے۔ اور ''ایتاءِ الزکٰوۃ'' کرے یعنی جو زکوٰۃ فرض ہے اُس کو ادا کرے۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ﴾ اور جو لوگ اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ وعدہ سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لیا ہے یعنی اس کے احکام کی پابندی اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وعدہ سے مراد وہ عہد ہے جو آدمی از خود منّت وغیرہ کی صورت میں اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وعدہ سے وہ عہد مراد ہے جو لوگوں کے اپنے درمیان طے پاتا ہے۔ مثلاً وعدوں کی پاسداری اور امانتوں کی ادائیگی کا عہد۔ آگے جو فرمایا: ﴿اِذَا عٰهَدُوْا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جب وعدہ کرتے ہیں یا منّت مانتے ہیں یا قسم اٹھاتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں اور جب کوئی بات کہتے

---

۳۹۱ یعنی جب کچھ دینے کی طاقت اور استطاعت ہو تو مانگنے والے کو محروم نہیں کرنا چاہیے اگر چہ اس کے ظاہری حلیہ سے اس کا مستحق ہونا ثابت نہ ہوتا ہو۔ اس حدیث میں مانگنے والوں کی حوصلہ افزائی مقصود نہیں ہے بلکہ دینے والوں کو خرچ کرنے کی ترغیب دلانا مقصود ہے اور یہ بھی اس صورت میں ہے جب دینے والے کو مانگنے والے کی حالت اور حقیقت کا علم نہ ہو۔ لہٰذا جو تندرست ہو اور کمانے کے لائق ہو اس کے باوجود پیشہ ور گداگری کرتا ہو اس کو منع کر دینا جائز بلکہ ضروری ہے تاکہ اس کی حوصلہ شکنی ہو۔ (مراۃ المناجیح ج ۳ص ۹۶، شرح صحیح مسلم ج ۷ص ۸۹۸)

۳۹۲ مُکاتب اُس غلام کو کہتے ہیں جس کو اس کے مالک نے ایک مخصوص مقدار میں رقم ادا کرنے کی شرط پر آزاد کر دیا ہو۔

ہیں تو سچائی کے ساتھ کہتے ہیں اور جب کوئی امانت رکھتے ہیں تو اُسے واپس بھی لوٹاتے ہیں۔ ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو سختی اور فقر و فاقہ میں صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور ﴿الضَّرَّآءِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بیماری اور آفت میں صبر کرتے ہیں۔ ﴿وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے وقت صبر کرتے ہیں۔ چونکہ جنگ میں تکلیف اور سختی ہوتی ہے اس لیے جنگ کو "بـــأس" کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی یہ لفظ جنگ کے معنیٰ میں وارد ہوا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: خدا کی قسم! جب جنگ شدت اختیار کر لیتی تو ہم رسول اللہ ﷺ کی پناہ میں آ جاتے تھے اور ہم میں بہادر اُس کو کہا جاتا جو (جنگ میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا۔[۳۹۳] (صحیح مسلم: ۱۷۷۶، مشکوٰۃ: ۵۸۹۰، ص ۵۳۴)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ ہے: "احمرّ البأس" جب جنگ سُرخ ہو جاتی۔ یعنی جب جنگ شدت اختیار کر لیتی۔ ایک لفظ ہے: "نتقی به" اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جنگ میں ہم نبی کریم ﷺ کو اپنے لیے دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بناتے تھے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا﴾ یعنی جن لوگوں کے اندر مذکورہ اوصاف پائے جائیں وہی اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ اور وہی پرہیزگار ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

اے ایمان والو! جو لوگ (ناحق) مارے جائیں اُن کے خون کا بدلہ لینا تم پر فرض کیا گیا ہے، آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت، سو وہ (قاتل) جس کو مقتول کے وارث کی طرف سے کوئی چیز معاف کر دی جائے تو (وارث کو چاہیے کہ) وہ دستور کے مطابق مطالبہ کرے اور (قاتل کو چاہیے کہ) وہ اچھے طریقہ سے ادائیگی کرے، یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے حق میں رعایت اور رحمت ہے، پھر اس کے بعد جو حد سے تجاوز کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال

مذکورہ آیت عرب کے اُن دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ایک مقتول کی وجہ سے زمانۂ جاہلیت میں باہم لڑ پڑے تھے اور اس لڑائی میں بہت سارے افراد مارے گئے، کئی معرکے ہوئے اور کئی افراد زخمی ہوئے۔ اور ابھی دونوں قبیلوں نے ایک

۳۹۳ البقرہ: ۲ کی تفسیر میں علامہ خازن اس حدیث کو ذکر کر چکے ہیں، لیکن وہاں آخری جملہ ذکر نہیں کیا۔ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی عظیم شجاعت اور بہادری کا ثبوت ہے کہ جو آپ کے ساتھ جنگ میں کھڑا ہوتا وہ بھی بہادر متصور ہوتا تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ میدانِ جہاد میں جس مقام پر کھڑے ہوتے تھے جنگ کا زور اسی طرف زیادہ ہوتا تھا اس لیے آپ کے ساتھ یا آپ کے پاس کھڑا ہونا ایک مشکل ترین کام ہوتا تھا۔ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی پناہ میں آنے اور دشمن سے بچاؤ کے لیے آپ کی ذات کا وسیلہ اختیار کرنے کا بھی ثبوت ہے۔ کیونکہ آپ تاقیامِ قیامت ہر مسلمان کی پناہ ہیں۔ خود فرمایا: انا فئة المسلمین (وفی روایة) "انا فئة کل مسلم"۔ میں تمام مسلمانوں کی پناہ ہوں۔
(سنن ابوداؤد: ۲۶۴۷، مسند احمد ج ۲ ص ۵۸۔۹۹، سنن بیہقی ج ۹ ص ۷۷، مراٰۃ المناجیح ج ۸ ص ۱۸۴)

دوسرے سے کچھ لیا بھی نہیں تھا کہ زمانہ اسلام آ گیا۔ اور مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اَوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ دونوں قبیلے تعداد اور فضیلت میں ایک دوسرے پر غلبہ رکھتے تھے اور بغیر مہر کے اپنی عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ ان دونوں قبیلوں نے قسم کھائی کہ ہم اپنے غلام کے بدلہ فریق مخالف کے آزاد شخص کو قتل کریں گے اور اپنی عورت کے بدلہ میں اُن کے مرد کو قتل کریں گے اور اپنے مرد کے بدلہ میں اُن کے دو مرد قتل کریں گے۔ ان دونوں قبیلوں نے یہ بھی طے کیا کہ فریق مخالف کو اپنے زخموں کے مقابلہ میں دوگنا زخم لگائیں گے۔ پھر اس معاملہ کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اس میں مساوات اور برابری کا حکم فرمایا۔ اور اس پر مذکورہ دونوں قبیلے راضی ہو گئے اور اس حکم کو تسلیم کر لیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اس لیے نازل ہوئی تا کہ قتل کے اُن احکام کو ختم کیا جائے جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے رائج تھے۔ یعنی یہودی یہ کرتے تھے کہ بغیر کسی معافی کے' قتل کے بدلہ قتل ہی کو واجب کہتے تھے۔ اور عیسائیوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ قتل کے بدلہ معافی کو واجب کہتے تھے۔ اور زمانہ جاہلیت میں عرب والوں کا معمول یہ تھا کہ وہ قتل کے بدلہ میں کبھی قتل کو واجب کرتے تھے اور کبھی دیت (یعنی خون بہا) لینے کو واجب کرتے تھے۔ اور ان دونوں ہی چیزوں میں وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ یعنی اگر کوئی اعلیٰ قسم کا آدمی مارا جاتا ہے تو اس کے بدلہ میں یہ لوگ کئی افراد کو قتل کرتے اور (اگر دیت لینی ہوتی تو) اعلیٰ آدمی کی دیت ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کئی گناہ زیادہ لیتے۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف کا لحاظ رکھنا واجب فرما دیا اور قصاص یعنی قتل کے بدلہ قتل کا جو حکم ہے اُس میں اپنے تمام بندوں کے درمیان برابری قائم فرما دی۔ اور مذکورہ آیت نازل فرمائی' جس میں ارشاد فرمایا: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى '' اے ایمان والو! جو لوگ (ناحق) مارے جائیں اُن کے خون کا بدلہ لینا تم پر فرض کیا گیا ہے۔ یہاں ﴿ كُتِبَ عَلَیْكُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: تم پر فرض کیا گیا۔

قصاص کا معنیٰ' قصاص کی کیفیت میں مذاہب ائمہ اور قصاص کی فرضیت پر ایک سوال کا جواب

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ شرعاً مقتول کے وارث کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قاتل کو چاہے تو معاف کر دے' چاہے تو بدلہ میں اُسے قتل کر دے اور چاہے تو اُس سے دیت لے' پھر آیت میں کیوں فرمایا کہ تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ قصاص مقتول کے وارث پر فرض نہیں ہے بلکہ قاتل پر فرض ہے کہ وہ (بہ طور قصاص) اپنے آپ کو مقتول کے وارث کے سپرد کر دے (لہٰذا وارث کے اختیارات اور آیت میں دیئے گئے قصاص کے حکم میں تعارض نہیں ہے)۔ بعض علماء نے سوال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم قصاص (یعنی قتل کے بدلہ میں قتل کرنا) چاہو تو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔

﴿قصاص﴾ کا معنیٰ ہے: قاتل کو قتل کرنے میں اور اُسے زخمی کرنے میں اور اُس سے دیت لینے میں برابری کرنا۔ یہ لفظ عرب کے اُس جملہ سے ماخوذ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے پیچھے چلتا ہے تو کہا جاتا ہے: ''قصّ الاثر'' وہ شخص فلاں کے نشانِ قدم پر چلا۔ پس مفعول بہ (یعنی جس کے ساتھ کچھ کیا گیا ہے) وہ کرنے والے کے عمل کی پیروی کرتا ہے یعنی وہ بھی ویسا ہی کرتا ہے جیسا اُس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کو قصاص کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کو لاٹھی کی ضرب سے قتل کر دے یا اُس کا گلا گھونٹ دے یا پتھر سے سر کچل دے جس سے وہ مر جائے تو قاتل کو بھی اُسی طرح قتل کیا جائے گا جیسے اُس نے قتل کیا ہے۔ امام مالک' امام شافعی کا یہی موقف ہے اور دو روایات میں سے ایک روایت کے مطابق امام احمد کا بھی یہی موقف ہے۔ بعض

ائمہ فرماتے ہیں کہ قاتل کو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور دوسری روایت میں امام احمد کا یہی موقف ہے۔[۳۹۴]

کون کس کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا؟ اس بارے میں مذاہب ائمہ اور ان کے دلائل

﴿ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ﴾ یعنی جب دو خون برابر ہوں اس طرح کہ دونوں آزاد مسلمان ہوں یا دونوں مسلمان غلام ہوں یا ایسے غیر مسلم جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو اُن کے آزاد یا غلام ہوں تو ان میں سے جس کو بھی قتل کیا جائے گا اُس کے بدلہ میں اُس ہی جیسا شخص قتل کیا جائے گا۔ یعنی مرد کو مرد کے بدلہ میں اور عورت کو مرد و عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ مؤمن کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا' اسی طرح آزاد کو غلام کے بدلہ میں اور والد کو اس کی اولاد کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ذمّی کو مسلمان کے بدلہ میں اور غلام کو آزاد کے بدلہ میں اور اولاد کو والد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ یہ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا مذہب ہے۔[۳۹۵] ان ائمہ کی دلیل صحیح بخاری کی درج ذیل حدیث ہے:

(۱۸۳) حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: کیا آپ کے پاس قرآن کریم کے سوا ایسی کوئی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ سے آئی ہو؟ حضرت علی نے جواباً فرمایا: اُس ذات کی قسم جس نے دانہ کو چیرا اور مخلوق کو پیدا کیا! ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے' سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو قرآن کی سمجھ عطا

---

[۳۹۴] ائمہ ثلاثہ (امام شافعی' امام مالک اور امام احمد) کا موقف یہ ہے کہ جس طرح مقتول کو قتل کیا گیا ہے اسی طرح قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ جبکہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا موقف یہ ہے کہ قاتل خواہ کسی بھی طریقہ سے قتل کرے اُسے بدلہ میں بہر حال تلوار (یعنی ہتھیار) سے قتل کیا جائے گا۔ دلیل نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ ''قصاص صرف تلوار سے لیا جائے''۔ (سنن ابن ماجہ: ۲۶۶۷' سنن بیہقی ج ۸ ص ۶۳) ایک روایت میں ہے کہ قصاص صرف دھار دار ہتھیار سے لیا جائے۔ (سنن بیہقی ج ۸ ص ۶۲) (ائمہ ثلاثہ کے دلائل اور ان کے جوابات اور دیگر تفصیلات کے لیے تبیان القرآن ج ۱ ص ۶۸۵ تا ۶۹۱ اور شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۶۸۲ کا مطالعہ فرمائیں۔)

[۳۹۵] علامہ خازن کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ ''قصاص'' کا معنیٰ برابری کرنا ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص کسی کو قتل کر دے اور وہ دونوں برابر ہوں یعنی دونوں آزاد ہوں اور مسلمان ہوں یا دونوں مسلمان غلام ہوں یا دونوں اگر کافر ہوں تو اُن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو تو قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا' خواہ قتل کرنے والا مرد ہو اور قتل ہونے والی عورت' یا قتل کرنے والی عورت ہو اور قتل ہونے والا مرد۔ (واضح رہے کہ علامہ خازن نے مرد کو صرف مرد کے بدلہ میں قتل کیے جانے کا تذکرہ کیا ہے جبکہ صحیح یہ ہے کہ مرد خواہ مرد کو قتل کرے یا عورت کو بہر حال اُسے قتل کیا جائے گا جیسے عورت خواہ عورت کو قتل کرے یا مرد کو بہر حال اُسے قتل کیا جائے گا۔ **کذا فی معالم التنزیل للبغوی الشافعی رحمہُ اللہ**) البتہ کوئی مسلمان کسی کافر کو یا آزاد شخص غلام کو یا باپ اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو بالترتیب مسلمان کو کافر کے بدلہ میں (اگرچہ ذمّی ہو) اور آزاد کو غلام کے بدلہ میں اور باپ کو بیٹے کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا موقف ہے۔ امام ابوحنیفہ اس مسئلہ میں باپ بیٹے کی حد تک ان ائمہ کے ساتھ ہیں (کہ باپ اگر بیٹے کو قتل کر دے تو باپ کو اس کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا) لیکن بقیہ دو میں اختلاف فرماتے ہیں۔ مسلمان اور کافر کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان اگر کافر حربی کو قتل کر دے تو مسلمان کو اس کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن اگر وہ ذِمّی کافر کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں اُسے قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح آزاد شخص کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ آخر میں علامہ خازن نے جو فرمایا کہ ''ذمّی کو مسلمان کے بدلہ میں' غلام کو آزاد کے بدلہ میں اور اولاد کو والد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا'' (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرماتا ہے اور وہ جو صحیفے میں ہے۔[۳۹۶] میں نے پوچھا: صحیفے میں کیا ہے؟ حضرت علی نے فرمایا: اس میں دیت اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے احکام ہیں اور یہ ہے کہ کسی مؤمن کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔[۳۹۷]

(صحیح بخاری: ۱۱۱ ـ ۳۰۴۷، سنن ترمذی: ۱۴۱۲، سنن ابن ماجہ: ۲۶۵۸، سنن نسائی: ۴۷۴۴، سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۴۶۱ ـ ص ۳۰۰)

☆ اس طرح کی روایت امام مسلم نے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کی ہے، لیکن وہ حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی نہیں ہے۔ حدیث مذکور میں ایک لفظ آیا ہے۔ ''العقل'' اس کا معنیٰ ہے: دیت۔ اور عاقلہ قاتل کے سرپرستوں کی اُس جماعت کو کہتے ہیں جو دیت ادا کرتی ہے۔

(۱۸٤) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس پر چاروں ائمہ متفق ہیں۔ (نوٹ: ''ذمّی'' اُس کافر کو کہتے ہیں جو مسلم مُلک میں جان و مال کی امان حاصل کر کے رہائش اختیار کر لے۔)

[۳۹۶] اس سے بعض شیعہ استدلال کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اہل بیت خصوصاً سیدنا علی مرتضیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو قرآنِ کریم کے علاوہ وحی الٰہی کے وہ اسرار و رموز عطا فرمائے تھے جو کسی اور کو عطا نہیں فرمائے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شیعہ کا یہ استدلال قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزید سوال کر کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وضاحت کر لی تھی کہ صحیفہ میں دیت اور غلام آزاد کرنے کے احکامات ہیں اور یہ ہے کہ کسی کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ نے قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت ابوجحیفہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیفہ کے متعلق جو سوال کیا تھا وہ یا تو شیعوں کے مذکورہ نظریہ کی وجہ سے کیا تھا یا پھر اس لیے کیا تھا کہ اُن کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (قرآن کریم کے علاوہ) کئی باتیں ایسی موجود تھیں جو کسی اور کے پاس نہیں تھیں۔ (مراۃ المفاتیح ج ۷ ص ۱۲) اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جواب دیا کہ میرے پاس کتاب اللہ کی وہ فہم و فراست ہے جو آدمی کو (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) عطا کر دی جاتی ہے، اس میں اجتہاد و استنباط اور فقہ کا ثبوت ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ ص ۲۵۶)

[۳۹۷] اس آخری جملہ کی وجہ سے علامہ خازن نے حدیث شریف کو ذکر کیا ہے۔ اس جملہ سے امام شافعی، امام مالک اور امام احمد یہ استدلال فرماتے ہیں کہ مسلمان کسی بھی کافر کو قتل کرے (خواہ وہ ذمّی ہو یا غیر ذمّی) اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان اگر حربی کافر کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا لیکن اگر ذمّی کو قتل کر دے تو اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ (حربی کافر اُس کافر کو کہتے ہیں جس کو کسی کافر مُلک کی نیشنلٹی حاصل ہو اور وہ ملک مسلمانوں کے ساتھ آمادۂ جنگ ہو۔) (معجم لغۃ الفقہاء ص ۱۷۸) ذمی کافر کی تعریف حاشیہ: ۳۹۵ میں دیکھیں۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک زیر بحث حدیث میں کافر سے حربی کافر مراد ہے۔ کیونکہ اس حدیث کی ایک اور روایت میں اختتام پر یوں ہے کہ: ''الا لا یقتل مسلم بکافر و لا ذو عهد فی عهده''. (خبردار! نہ کسی کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا نہ کسی ذمّی کو اُس کے زمانۂ عہد میں قتل کیا جائے گا۔) (مشکوٰۃ المصابیح: ۳۴۷۵) اس حدیث میں کافر فرمانے کے بعد ذمّی کافر کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کافر سے حربی کافر مراد ہے اور ذمّی کا حکم علیحدہ ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے مؤقف کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ کسی مسلمان نے ذمّی کو قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اُس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ (هذا استدلال صاحب الهدایة علیه الرحمة.)

(سنن دار قطنی ج ۳ ص ۱۳۴، سنن بیہقی ج ۸ ص ۳۰)

مساجد میں حدود قائم نہ کی جائیں[۳۹۸] اور اولاد کے بدلہ میں والد کو قتل نہ کیا جائے۔[۳۹۹] (سنن ترمذی: ۱۴۰۱ سنن ابن ماجہ: ۲۵۹۹۔ ۲۶۶۱، سنن دارمی: ۲۳۵۷، سنن دار قطنی ج ۳ ص ۱۴۱، سنن بیہقی: ۱۵۹۶۷۔ ج ۸ ص ۳۹، مسند احمد ج ۱ ص ۱۶، مشکوۃ المصابیح: ۳۴۷۰۔ ص ۳۰۱)

اصحاب الرائے[۴۰۰] کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں اور آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ لیکن زیر بحث آیت اور مذکورہ احادیث امام شافعی اور ان کے موافقین کے مذہب کی دلیل ہیں[۴۰۱] امام شافعی اور ان کے موافقین فرماتے

۳۹۸ کیونکہ مساجد کا مقصد عبادت اور ذکر واذکار ہیں اور مساجد کا احترام واجب ہے۔ جبکہ حدود قائم کرنے میں مساجد کی بے حرمتی ہے اس لیے مساجد میں حدود قائم نہیں کی جائیں گی۔ امام ابوحنیفہ اس حدیث کے عموم کی بناء پر فرماتے ہیں کہ جس کا قتل شرعاً واجب ہو جائے وہ اگر حرم میں چلا جائے تو اُسے وہاں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ باہر آنے پر مجبور کیا جائے گا۔ جبکہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مساجد میں حدود قائم نہیں کی جائیں گی، لیکن اگر کوئی شخص فرار ہو کر حرم میں چلا گیا جبکہ اس کا قتل واجب ہو چکا تھا تو اُسے حرم کے اندر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ (مرقات المفاتیح ج ۷ ص ۳۰)

۳۹۹ یعنی اگر والد اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو والد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ چاروں ائمہ اس پر متفق ہیں۔ البتہ امام مالک ایک مخصوص صورت میں اختلاف کرتے ہیں کہ والد جب بیٹے یا بیٹی کو ذبح کر دے تو والد سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن ہماری جانب سے زیر بحث حدیث امام مالک پر حجت ہے۔ کیونکہ اس میں مطلقاً فرمایا ہے کہ ''اولاد کے بدلہ میں والد کو قتل نہ کیا جائے''۔ علماء نے اس حکم کی عقلی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ والد چونکہ اپنی اولاد کو وجود میں لانے کا ایک سبب اور ذریعہ ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہی اولاد اپنے والد کے خاتمہ کا سبب بنے، اس لیے فرمایا کہ اولاد کے بدلہ میں والد کو قتل نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہاں والد کے حکم میں والدہ بھی شامل ہے۔
(ہدایہ اخیرین ص ۵۶۳، مرقات المفاتیح ج ۷ ص ۳۰)

۴۰۰ اس سے امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اور دیگر ائمہ احناف مراد ہیں۔ احناف کو ''اصحاب الرائے'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شوافع اور دیگر غیر احناف علماء کے نزدیک امام ابوحنیفہ احادیث کے مقابلہ میں اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں اور عمل بالحدیث کو ترک کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ امام ابوحنیفہ کی شخصیت پر محض الزام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی سیرت وکردار کے بارے میں جب ہارون الرشید نے امام ابو یوسف سے پوچھا تو انہوں نے ایک بات یہ بھی بیان کی کہ امام ابوحنیفہ سے جب کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے اور اگر اس کی نظیر قرآن وحدیث میں نہ ملتی تو پھر قیاس کرتے۔ (تذکرۃ المحدثین ص ۵۵) امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ خود فرماتے تھے کہ جب کوئی حدیث سندِ صحیح سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ (فتاویٰ شامی ج ۱ ص ۱۵۴) حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ حدیث کی مختلف اقسام کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں اور حدیث اگرچہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو اس پر عمل کرتے ہیں جیسے نماز میں قہقہہ لگانے والی حدیث اور شربت سے وضو کرنے کی حدیث۔ بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک حدیث مشہور سے کتاب اللہ کے حکم کو منسوخ کرنا بھی جائز ہے۔ آپ بغیر کسی توقف اور تاویل کے مراسیل (یعنی مُرسل احادیث) پر بھی عمل کرتے ہیں اور قیاس صرف وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں کوئی واضح روایت موجود نہ ہو بلکہ کسی حکم کی علّت منقول ہو۔ حافظ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ جملہ اصحاب ابوحنیفہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدیث خواہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہی کیوں نہ ہو، بہر حال اپنی رائے اور قیاس پر مقدم اور قابل ترجیح ہوگی۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: **فتح الرحمن فی اثبات مذھب النعمان** یا مترجم اُردو تائید مذہب حنفی)

۴۰۱ علامہ خازن کا مدعا یہ ہے کہ حدیث: ۱۸۳ میں اس بات پر دلیل ہے کہ مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ''کافر'' کے عموم میں وہ بھی داخل ہے اور زیر بحث آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ آزاد شخص کو غلام کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ آیت میں صراحۃً فرمایا ہے کہ آزاد کو آزاد کے بدلہ اور غلام کو غلام کے بدلہ (قتل کیا جائے گا۔) جبکہ امام ابوحنیفہ کا موقف اس آیتِ مبارکہ اور حدیث: ۱۸۳ دونوں کے برخلاف ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ　　اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے۔ (المائدہ:۴۵)

یہ آیت اپنے مفہوم میں مُجمل (غیر واضح) ہے اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے البقرہ کی زیرِ بحث آیت اور مذکورہ احادیث "مفسّر" ہیں یعنی اس کی تفسیر کر رہی ہیں۔ پھر مذکورہ آیت (المائدہ:۴۵) کا جو نزول ہوا ہے وہ اس لیے ہوا ہے تا کہ اُن باتوں کو بیان کیا جائے جو بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کی گئی تھیں۔ اور زیرِ بحث آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور اس میں وہ باتیں بیان کی جا رہی ہیں جو مسلمانوں پر فرض کی گئی ہیں۔ اصحاب الرائے کا مذہب یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت المائدہ کی مذکورہ آیت سے منسوخ ہے[۴۰۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہمارے نزدیک علّامہ خازن کی یہ تقریر درست نہیں ہے۔ حدیث: ۱۸۳ کا جواب ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک کافر کا لفظ عام نہیں ہے بلکہ اس سے کافر حربی مراد ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ نمبر ۳۹۷) جہاں تک زیرِ بحث آیت کا تعلق ہے تو اُس سے امام شافعی اور اُن کے موافقین کا استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں جو فرمایا کہ آزاد کو آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور غلام کو غلام کے بدلہ میں اس سے معاشرۂ عرب کی ایک جاہلانہ رسم کی بیخ کنی مقصود ہے کہ جب کسی غلام کو قتل کر دیا جاتا تو وہ اس کے بدلہ میں آزاد شخص کو قتل کرتے تھے اور اگر آزاد کو قتل کر دیا جاتا تو اس کے بدلہ میں دو آزاد آدمیوں کو قتل کرتے تھے۔ اسی طرح عورت کا قتل ہو جاتا تو اُس کے بدلہ میں مرد کو قتل کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت کے ذریعہ اصلاح فرمائی کہ آزاد کے بدلہ میں آزاد کو اور غلام کے بدلہ میں غلام قتل کرو یعنی اگر قتل کرنے والا آزاد ہے اور اُس نے آزاد کو قتل کیا ہے تو صرف اُسی قتل کرنے والے کو قتل کرو۔ نہ یہ کہ ایک کے بدلہ میں دو آزاد افراد کو قتل کرو۔ اسی طرح اگر قتل کرنے والا غلام ہے اور اُس نے غلام کو قتل کیا ہے تو اُسی قتل کرنے والے کو قتل کرو۔ نہ یہ کہ غلام مقتول کی جگہ آزاد کو قتل کیا جائے۔ اسی طرح اگر قتل کرنے کا جرم عورت نے کیا ہے تو اُسی کو قتل کرو نہ یہ کہ اُس کی بجائے مرد کو قتل کرو۔ آیت مبارکہ کے اس مفہوم کے پیشِ نظر امام شافعی اور اُن کے موافقین کا استدلال اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ (محصلہ تفسیرات احمدیہ ص ۵۰ رقم الآیۃ: ۱۷۸ البقرہ)

۴۰۲۔ علامہ خازن کی اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت (البقرہ:۱۷۸) احناف کے نزدیک المائدہ:۴۵ سے منسوخ ہے اور قصاص کے مسئلہ میں احناف کا استدلال المائدہ والی آیت سے ہے کہ اُس میں النفس بالنفس کے الفاظ مطلق ہیں اور آزاد و غلام سب کو شامل ہیں لہٰذا آزاد آدمی اگر غلام کو قتل کر دے تو اُسے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ علامہ خازن احناف کے اس مؤقف کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت المائدہ:۴۵ سے منسوخ نہیں ہے کیونکہ المائدہ والی آیت میں اُن احکامات کو بیان کیا جا رہا ہے جو یہودیوں پر لازم کیے گئے تھے جبکہ زیرِ بحث آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیرِ بحث آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ المائدہ:۴۵ کے لیے مُفسّر ہے۔

علامہ خازن کے اس رد کا جواب یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت (البقرہ:۱۷۸) کے منسوخ ہونے کے بارے میں احناف کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض علماء نے یہی فرمایا ہے کہ البقرہ:۱۷۸ المائدہ:۴۵ سے منسوخ ہے لیکن صاحب تفسیرات احمدیہ (علامہ شیخ احمد جونپوری حنفی علیہ الرحمۃ) نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: البقرہ:۱۷۸ کو منسوخ قرار دینا ضعیف ہے کیونکہ اس کے ایسے معنیٰ ممکن ہیں جس کی بناء پر اس کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ (اس معنیٰ کی وضاحت ہم گذشتہ حاشیہ میں تفسیرات احمدیہ کے حوالہ سے ذکر کر چکے ہیں۔) لہٰذا احناف اپنے مؤقف پر البقرہ:۱۷۸ اور المائدہ:۴۵ دونوں سے استدلال کر سکتے ہیں۔ احناف کے استدلال کو کمزور ثابت کرنے کے لیے علامہ خازن کا یہ فرمانا کہ المائدہ:۴۵ میں یہودیوں پر فرض کردہ احکام بیان کیے گئے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن و سنّت میں سابقہ شریعتوں کے جو احکام بیان کیے جائیں وہ اس صورت میں قابلِ استدلال نہیں ہوتے جب اُن کا رد بھی کیا گیا ہو۔ اگر بغیر رد اور نسخ کے اُنہیں بیان کیا جائے تو وہ قابلِ استدلال ہوتے ہیں۔ المائدہ:۴۵ میں جو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک شخص کو اگر کئی افراد مل کر قتل کریں تو بدلہ میں کس کو قتل کیا جائے گا؟

کچھ لوگ مل کر اگر ایک شخص کو قتل کریں تو ایک کے بدلہ میں پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ اس مذہب کی دلیل وہ روایت ہے جس کو امام بخاری نے اپنی کتاب (صحیح بخاری) میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیان کیا ہے کہ کسی غلام کو دھوکہ کے طور پر قتل کر دیا گیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر اس قتل میں صنعاء یمن کے رہنے والے شریک ہوتے تو میں اس کے بدلہ اُن سب کو قتل کر دیتا۔

امام بخاری (روایتِ مذکورہ کے بعد) مغیرہ بن حکیم کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ چار آدمیوں نے ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع پر بھی یہی بات ارشاد فرمائی۔ (صحیح بخاری: ۶۸۹۶)

دوسری دلیل وہ روایت ہے جس کو امام مالک نے مؤطا میں حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کیا ہے کہ پانچ یا سات آدمیوں نے مل کر ایک آدمی کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قتل میں شریک تمام افراد کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ اگر اس قتل میں صنعاء کے سارے رہنے والے شریک ہوتے تو میں اُن سب کو قتل کر دیتا۔

(مؤطا امام مالک: ۱۶۷۱، سنن دارقطنی ج ۳ ص ۲۰۱، سنن بیہقی ج ۸ ص ۴۱)

عفو کا معنیٰ اور مقتول کے وارث کو مقتول کا بھائی فرمانے کی وجہ

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ قتل عمد میں جو قصاص واجب ہے اُس کو اگر قاتل سے درگزر کرتے ہوئے ترک کر دیا جائے اور دیت پر یا مطلقاً معافی پر رضامندی ہو جائے یا قتل عمد میں دیت لے لی جائے۔ ﴿مِنْ اَخِيْهِ﴾ جو فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بھائی کا خون معاف کر دیا جائے۔ (اس صورت میں "اخ" سے مراد خود مقتول ہوگا، اور ایک قول کے مطابق) "اخ" سے مقتول کا وارث مراد ہے۔ اور اس کو "اخ" یعنی بھائی اس لیے فرمایا کہ اُسے مقتول کے ساتھ پہلے سے اس بات کا تعلق ہوتا ہے کہ وہ اُس کے خون کا ولی اور سرپرست ہے اور اس کے خون کا مطالبہ کرنے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وارث کو بھائی اس لیے فرمایا تا کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف اس وجہ سے مائل ہوں کہ دونوں کے درمیان ہم جنس ہونے کا رشتہ قائم ہے اور دونوں ہی مسلمان بھائی ہیں۔ آیت میں ﴿شَيْءٌ﴾ کا جو لفظ فرمایا اس میں اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ جب مقتول کا کوئی بھی سرپرست قصاص معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور دیت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ (کچھ کے معاف کرنے سے) خون کا کچھ حصہ باطل ہو گیا۔

"اتباع بالمعروف" اور "اداء باحسان" کی تفسیر

﴿فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مقتول کے وارث کو چاہیے کہ وہ قاتل سے دستور کے مطابق دیت کا مطالبہ کرے۔ یعنی نہ تو فرض حصہ سے زیادہ لے اور نہ ہی اُس پر سختی کرے۔ اور ﴿وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ جو فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ قاتل پر ضروری ہے کہ وہ مقتول کے وارث کو بغیر کسی ٹال مٹول کے دیت ادا کر دے۔ اور قاتل اور مقتول کا وارث دونوں اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) احکام بیان کیے گئے ہیں اُن کو قرآن و سنت میں رد نہیں کیا گیا بلکہ علامہ خازن کے بہ قول البقرہ: ۱۷۸ کے ذریعہ المائدہ: ۴۵ کی تفسیر کی گئی ہے۔ لہٰذا احناف کا استدلال المائدہ: ۴۵ سے درست ہے۔ خواہ اس طور پر کہ اس کے ذریعہ البقرہ: ۱۷۸ کو منسوخ قرار دیا جائے یا نسخ کا قول کیے بغیر استدلال کیا جائے۔

(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۳۵، تبیان القرآن ج ۱ ص ۶۸۷)

بات کے پابند ہیں کہ ہر ایک اپنے معاملہ میں احسان (یعنی اچھائی) کا مظاہرہ کرے۔

آیت مذکور میں ''فمن عفی لہٗ'' سے ''اداء الیہ باحسان'' تک کا جو حصہ ہے اس کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل عبارت یہ ہے کہ جب مقتول کا وارث ایسی چیز معاف کر دے جس کا تعلّق قاتل سے ہو یعنی قصاص کا وجوب تو قاتل کو چاہیے کہ وہ دستور کے مطابق اس معافی کی پیروی کرے اور جو کچھ اُس پر دیت واجب ہو اس کو بغیر ٹال مٹول اور مزاحمت کے مقتول کے وارث کو اچھے طریقہ سے ادا کرے۔

آیت مذکورہ سے اس بات پر استدلال کہ قتل اور فسق موجبِ کفر نہیں ہیں

آیتِ مذکورہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ قاتل (محض کسی کو قتل کرنے سے) کافر نہیں ہوتا' اور اس پر بھی دلیل ہے کہ فاسق (اپنے فسق کے باوجود) مؤمن ہی رہتا ہے۔ ان دونوں مسائل پر آیتِ مذکورہ سے استدلال کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کو قتل کے باوجود ایمان کے ساتھ مخاطب فرمایا ہے اور اس کو مؤمن قرار دیا ہے۔ یعنی فرمایا: اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔ یہاں قاتل کو اُس حالت میں صاحب ایمان قرار دیا ہے جب اُس پر قصاص واجب ہو' اور قصاص اُسی وقت واجب ہوتا ہے جب اُس سے قتل کا صُدور ہو۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قتل عمد اور سرکشی گناہ کبیرہ ہے۔ لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو وہ (بہرحال) مؤمن ہی رہتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں ''فمن عفی لہٗ من اخیہ شیئی'' فرما کر یہ ثابت کیا ہے کہ مقتول کے وارث اور قاتل کے درمیان اخوت اور بھائی ہونے کا رشتہ ہے اور اخوت سے مراد یہ لیا ہے کہ دونوں مسلمان بھائی ہیں۔ اگر محض قتل کی وجہ سے قاتل کا ایمان زائل ہو جاتا تو قاتل کے لیے اخوت کا رشتہ ثابت نہ کیا جاتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ترغیب فرمائی ہے کہ قاتل سے قصاص کو معاف کر دیا جائے' اور معافی صرف اُسی کو دینا مناسب ہے جو صاحب ایمان ہو' کافر کو معافی نہیں دی جاتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قاتل محض قتل سے کافر نہیں ہوتا۔[۴۰۳]

قتل کا بدلہ لینے میں مسلمانوں کے لیے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں تخفیف اور رحمت

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ یعنی آیت میں جو حکم دیا گیا ہے کہ تم قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہو' چاہو تو معاف بھی کر سکتے ہو اور چاہو تو اُس سے دیت بھی لے سکتے ہو یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے حق میں رعایت اور رحمت ہے۔ کیونکہ قاتل کو معاف کرنا یا اُس سے دیت لینا یہودیوں پر حرام تھا اور تورات میں ان پر یہ لازم کر دیا گیا تھا کہ وہ قاتل سے قصاص ہی لیں' یعنی قتل کے بدلہ میں اُسے قتل کریں۔ عیسائیوں کی شریعت میں قانون یہ تھا کہ وہ قاتل سے دیت لیں۔ قصاص اُن پر فرض نہیں تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عیسائیوں پر صرف یہ لازم تھا کہ وہ قاتل کو چھوڑ دیں۔ نہ تو اُس سے قصاص لیں اور نہ ہی اُس سے دیت لیں۔ جب کہ نبی پاک ﷺ کی اُمت کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا کہ لوگ چاہیں تو قاتل سے قصاص لیں' چاہیں تو اُسے معاف کر دیں اور چاہیں تو اُس سے دیت لیں۔ یہ حکم اس لیے ہے تا کہ امتِ مسلمہ کو گنجائش اور آسانی ہو اور اس امت کو

۴۰۳؎ اس پوری بحث سے معتزلہ اور خوارج کا رد مقصود ہے۔ کیونکہ گناہ کبیرہ (مثلاً قتل' چوری وغیرہ) کے بارے میں معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کافر تو نہیں ہوتا لیکن مؤمن بھی نہیں رہتا اور خارجیوں کا نظریہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ بلکہ گناہ صغیرہ سے بھی آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ میں سے کسی کے ارتکاب سے بھی آدمی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا' جیسا کہ علامہ خازن کی تفصیلی بحث سے واضح ہے۔
(مزید تحقیق کے لیے شرح عقائد نسفی اور دیگر کتب عقائد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔)

دوسری امتوں پر فضیلت حاصل ہو۔

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی تخفیف اور رعایت ملنے کے بعد جس نے حد سے تجاوز کیا اور معاف کرنے کے باوجود یا قاتل سے دیت لینے کے باوجود قاتل کو قتل کیا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یعنی اُس شخص کو بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا اور اس سے نہ تو دیت لی جائے گی نہ ہی اُس کو معاف کیا جائے گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دردناک عذاب سے آخرت کا عذاب مراد ہے۔ یعنی ایسے شخص کو آخرت میں دردناک عذاب ہوگا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور اے عقل والو! خون کا بدلہ لینے میں تمہارے لیے زندگی ہے تاکہ تم (ناحق قتل کرنے سے) بچو O

قصاص کے باعثِ حیات ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ خون کا بدلہ لینے میں تمہاری بقاء ہے' کیونکہ قتل کا ارادہ کرنے والے کو جب یہ بات معلوم ہوگی کہ قتل کے بدلہ میں اُسے قتل کر دیا جائے گا تو پھر وہ قتل کرنا چھوڑ دے گا اور اس سے رُک جائے گا' یوں اس میں اس کی اپنی بھی بقاء ہے اور اس شخص کی بھی بقاء ہے جس کو قتل کرنے کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خون کا بدلہ لینا از خود حیات کا ایک سبب ہے۔ کیونکہ قاتل سے جب قصاص لیا جائے گا تو دوسرا شخص جو قتل کا ارادہ رکھتا ہے وہ قتل سے باز رہے گا۔

یہاں یہ بات علم میں رہے کہ مذکورہ حکم صرف قتل کا بدلہ لینے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے زخم کا یہی حکم ہے' کیونکہ جب زخم لگانے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ زخم کے بدلہ میں شرعاً اُسے بھی زخمی کیا جائے گا تو پھر وہ کسی کو زخم نہیں لگائے گا۔ یوں یہ جارح اور مجروح دونوں کی بقاء کا سبب ہوگا (یعنی زخمی کرنے والا اور جس کو زخمی کیا جائے دونوں بچے رہیں گے)۔ کیونکہ بسا اوقات زخم ایسا ہوتا ہے کہ وہ زخمی شخص کے لیے موت کا سبب بن جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زخمی کرنے والے سے قصاص لیا جاتا ہے۔

بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ قصاص کے باعثِ حیات ہونے سے مراد یہ ہے کہ آدمی قصاصِ آخرت (یعنی اُخروی سزا) سے بچ جاتا ہے۔ کیونکہ جب قاتل سے دُنیا میں قصاص لے لیا جائے تو آخرت میں اُس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا' اور یہی اُس کی حیات ہے۔ اور اگر دُنیا میں قصاص نہ لیا گیا تو آخرت میں قصاص لیا جائے گا۔[۴۰۴]

﴿ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اے وہ لوگو! جو عقل رکھتے ہو اور درست بات کو پہچانتے ہو' تمہارے لیے قصاص باعثِ حیات ہے۔ کیونکہ عقل مند آدمی یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی کو ہلاک کر کے اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تاکہ تم قصاص کے خوف سے کسی کو قتل کرنے سے بچو۔

---

۴۰۴ اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا جس پر شرعی سزا معیّن ہو پھر اس کو وہ سزا دے دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۷۰۹) ایک حدیث میں فرمایا کہ جس نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا جس پر شرعی سزا معیّن ہو پھر دُنیا میں اُسے وہ سزا دے دی گئی تو اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ اپنے بندہ کو دوبارہ آخرت میں سزا دے۔ (سنن ترمذی: ۲۶۲۶' مشکوٰۃ: ۳۶۲۹) واضح رہے کہ فقہاء احناف کے نزدیک جن جرائم پر شرعی سزا معیّن ہے اُن کے ارتکاب کی صورت میں محض شرعی سزا پا لینا اُخروی سزا سے بچنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کا توبہ کرنا بھی ضروری ہے۔

(تفصیل وتحقیق کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۸۷۴)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾

تم پر یہ بات فرض کی گئی ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور اس نے مال چھوڑا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے انصاف کے ساتھ وصیت کر جائے' یہ پرہیزگاروں پر حق ہے O

آیت مذکورہ میں آنے والے مختلف الفاظ کی تفسیر اور لفظ خیر پر بحث

﴿ كُتِبَ ﴾ کا معنیٰ ہے: فرض کیا گیا اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حضورِ موت سے مراد یہ ہے کہ موت قریب آ جائے اور خوف ناک بیماریوں کی صورت میں موت کی مختلف علامات آدمی پر ظاہر ہو جائیں۔ حضورِ موت کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ جب آدمی موت کو دیکھ لے' کیونکہ اس وقت تو وہ وصیت ہی نہیں کر سکے گا۔ آیت میں ﴿ خَيْرًا ﴾ سے مراد مال ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ خیر کا لفظ قلیل اور کثیر دونوں طرح کے مال پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر صورت میں وصیت کرنا واجب ہے (خواہ مال زیادہ ہو یا تھوڑا)۔ جب کہ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ خیر کے لفظ سے صرف مالِ کثیر مراد ہوتا ہے۔ رہا یہ کہ کثیر کی کس مقدار میں وصیت کی جائے' سو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ایک ہزار یا اس سے زائد درہم کی مقدار "کثیر" ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ سات سو یا اس سے زائد درہم کی مقدار کثیر ہے۔ بعض کے نزدیک ساٹھ یا اس سے زائد دینار کی مقدار کثیر ہے۔ بعض کے نزدیک پانچ سو سے ایک ہزار درہم تک کی مقدار کثیر ہے۔ اور بعض کے نزدیک کثیر وہ مال ہے جو بال بچوں کی ضروریات سے زائد ہو۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ میں وصیّت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: تمہارے پاس مال کتنا ہے؟ اُس شخص نے کہا: تین ہزار درہم۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: بال بچے کتنے ہیں؟ اُس نے کہا: چار۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان تـرک خیـرا" اگر آدمی کثیر مال چھوڑے تب وصیت کرے۔ اور تمہارے پاس جو مال ہے وہ تھوڑا ہے' لہٰذا تم اس کو اپنے بال بچوں کے لیے چھوڑ دو۔

وصیّت کی تعریف اور اس کے وجوب کے منسوخ ہونے کا بیان

آیت میں جو ﴿وصية﴾ کا لفظ ہے اس کا معنیٰ ہے: "الایصاء" وصیّت کرنا۔ اور وصیّت کا معنیٰ ہے: کسی کو پیشگی کوئی ایسی بات کہنا جس پر عمل کیا جا سکے۔ بعض نے تعریف یہ کی ہے کہ ایسا معاملہ جس کو انجام دینے اور اس پر عمل کرنے کا آغاز آدمی کے مر جانے کے بعد کیا جائے اُس کے بارے میں کوئی واضح بات کہنا "وصیّت" ہے۔

آیت میں فرمایا: والدین اور دیگر اقارب کے لیے وصیّت کی جائے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں صاحبِ مال مرنے والے شخص پر یہ فرض تھا کہ وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیّت کرے۔ کیونکہ دورِ جاہلیت کے لوگ فخر اور فضیلت کے لیے اور دکھلاوے کے طور پر دور دراز کے لوگوں کے لیے وصیت کرتے تھے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو غربت میں چھوڑ جاتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کو لازم فرمایا کہ قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کی جائے۔ پھر اس آیت کو میراث کی آیت اور اُس حدیث سے منسوخ کر دیا گیا جس کو حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کی اونٹنی کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آپ ﷺ خطاب فرما رہے تھے تو میں نے آپ سے یہ بات سنی کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اُس کا حق دے دیا ہے' لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیّت نہیں ہے۔[۴۰۵] (سنن ترمذی: ۲۱۲۰' سنن نسائی: ۳۶۴۱)

[۴۰۵] یہ حدیث اختصار کے ساتھ علامہ خازن البقرہ: ۱۰۶ کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں۔ وہاں اس کی مفصّل تخریج ملاحظہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ وصیت کا واجب ہونا اُس شخص کے حق میں منسوخ ہو چکا ہے جس کو میت کے ترکہ میں سے حصہ ملتا ہے اور جس کو میت کے ترکہ میں سے حصہ نہ ملے اُس کے حق میں وصیت کا واجب ہونا بدستور باقی ہے۔ حضرت حسن بصری، مسروق، طاؤس، ضحاک اور مسلم بن یسار ان سب کا یہی مذہب ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زیر بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا واجب ہے۔ پھر اس وجوب کو آیتِ میراث اور حدیث مذکور کے ذریعہ اُس شخص کے حق میں منسوخ کر دیا گیا جو میت کا وارث ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسا شخص جو میت کا رشتہ دار ہو اور اس کا وارث نہ ہو اس کے لیے وصیت کا واجب ہونا زیر بحث آیت کی دلالت سے بدستور برقرار رہے۔ اس قول کی بنیاد پر نسخ کا تعلق زیر بحث آیت کے بعض احکام کے ساتھ ہوگا۔

اس قول کے برعکس اکثر مفسرین اور حجاز وعراق کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ وصیّت کا واجب ہونا تمام لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکا ہے۔ اور جو شخص وارث نہ ہو اس کے لیے وصیت کرنا مستحب ہے۔

وصیت کے مستحب ہونے کا بیان

وصیت کے مستحب ہونے پر اور اس کی ترغیب پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۸۵) جس مسلمان شخص کے پاس بھی کوئی قابل وصیت چیز ہو اور اس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو اُس کو دو راتیں بھی اس حالت میں نہیں گزارنی چاہئیں کہ اُس کی وصیت اُس کے پاس لکھی ہوئی نہ ہو[۴۰۶] (یعنی ہر رات اس حالت میں گزارے کہ اُس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو)۔ (صحیح بخاری: ۲۷۳۸، صحیح مسلم: ۱۶۲۷، سنن ابوداؤد: ۲۸۶۲، سنن ترمذی: ۹۷۴، سنن نسائی: ۳۶۱۵، سنن ابن ماجہ: ۲۶۹۹، مسند احمد ج ۲ ص ۵۷، سنن دارمی: ۳۱۷۵، سنن دار قطنی ج ۴ ص ۱۵۰، مشکوٰۃ: ۳۰۷۰ ص ۲۶۵)

حضرت نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے مذکورہ بات سُنی ہے اُس وقت سے میری کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میری وصیت میرے پاس لکھی ہوئی نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کی جا سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اُس کا حق دے دیا ہے اس سے مراد آیت میراث ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے میّت کے شرعی ورثاء کے حصے معیّن ومقرر اور بیان فرما دیئے ہیں اور چونکہ حصے معیّن ہونے کے بعد اُن کے لیے وصیت کی حاجت نہیں رہتی اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ساتھ ہی فرمادیا کہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔ یعنی آیت میراث کے نازل ہونے سے وارث کے لیے وصیت کرنا باطل ہو گیا۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے وارث کے لیے وصیت کر جائے تو وہ اس صورت میں نافذ ہو سکتی ہے جب دیگر ورثاء متفق ہو کر اجازت دے دیں۔ (کتب فقہ وشروح حدیث)

[۴۰۶] اس حدیث سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کرنا یا اُسے لکھ کے رکھنا واجب ہے حالانکہ وصیت کرنا مستحب ہے اور علاّمہ خازن کا مقصود بھی یہی ثابت کرنا ہے کہ وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وجوب کو ثابت کرنے کے لیے جو الفاظ علی العموم استعمال ہوتے ہیں (مثلاً علیٰ یا واجب یا لازم وغیرہ) ان سے کوئی لفظ اس حدیث میں مذکور نہیں ہے البتہ ایک روایت میں لا ینبغی کا لفظ ہے اور بعض روایات میں حق کا لفظ ہے۔ اور یہ الفاظ وجوب کے لیے متعیّن نہیں ہیں۔ اس حدیث شریف میں دو راتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی وقت بغیر وصیت کے نہیں گزرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ وصیّت خواہ لکھ کر رکھی جائے یا زبانی کی جائے بہر حال اس کے لیے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ ہونا ضروری ہے ورنہ وصیت ثابت نہیں ہوگی۔ (مرقات ج ۶ ص ۲۵۱)

ہو۔[۴۰۶] (صحیح مسلم: ۱۶۲۷، سنن نسائی: ۳۶۱۸، مسند احمد ج ۲ ص ۱۲۷)

☆ اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''مـا حـق امـرء'' اس میں جو لفظ حق ہے وہ وجوب اور استحباب کے لیے بھی آتا ہے اور ترغیب دلانے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں پر اس کو اسی آخری معنیٰ میں لیا جائے گا' یعنی وصیت کی ترغیب۔ کیونکہ آدمی نہیں جانتا کہ کب موت آ جائے' بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچانک موت آ جاتی ہے اور آدمی وصیّت کرنے سے رہ جاتا ہے۔

دلائل کی روشنی میں اس بات کا بیان کہ وصیت میں انصاف کرنا اور ورثاء کا لحاظ کرنا ضروری ہے

زیرِ بحث آیت میں جو ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ فرمایا اُس کا معنیٰ یہ ہے کہ آدمی انصاف کے ساتھ وصیّت کرے' نہ تو اُس میں کمی کرے اور نہ ہی زیادتی کرے۔ یعنی ایک تہائی سے زیادہ وصیّت نہ کرے اور اس طرح نہ کرے کہ مال دار کے لیے وصیت کرے اور تنگ دست کو چھوڑ دے۔

(۱۸۶) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ میرے شدید درد کی وجہ سے میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مجھے شدید درد اور تکلیف ہے اور میں ایک مال دار شخص ہوں اور میری وارث صرف میری ایک بیٹی ہے۔ اس صورت میں کیا میں اپنے کل مال کا دو تہائی (۲/۳) صدقہ کر دوں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: آدھا مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: ایک تہائی صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: تہائی (ٹھیک ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ بے شک تمہارا اپنی اولاد کو مال دار چھوڑنا اس بات سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ تم اُنہیں تنگ دست اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوا چھوڑو۔[۴۰۸] (صحیح بخاری: ۲۷۴۲، صحیح مسلم: ۱۶۲۸، سنن ترمذی: ۲۱۱۶، سنن ابوداؤد: ۲۸۶۴، سنن نسائی: ۳۶۲۶، سنن ابن ماجہ: ۲۷۰۸، مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۲، سنن بیہقی ج ۶ ص ۲۶۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۰۷۱۔ ص ۲۶۵)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''عـالـة'' اس کا معنیٰ ہے: تنگ دست۔ اور ایک لفظ آیا ہے: ''یتـکـففـون'' اس کا معنیٰ ہے: لوگوں سے مانگنا (یہ ''کف'' سے مشتق ہے اور ''کف'' کا معنیٰ ہے: ہتھیلی)۔

[۴۰۷] علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جو وصیتیں لکھ کر رکھی تھیں اُن سب کو انہوں نے اپنی زندگی ہی میں نافذ کر دیا تھا اور آخری وقت میں آپ نے کوئی وصیّت نہیں فرمائی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ عمل نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے کیا ہو کہ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو۔ (یعنی صبح کے عمل کو شام پر مؤخر نہ کرو اور ہمہ وقت موت کو اپنے پیش نظر نہ رکھو۔ مشکوٰۃ المصابیح: ۱۶۰۴) علامہ عینی مزید فرماتے ہیں کہ اگر حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت سے وصیت کا واجب ہونا مراد لیا جائے تو ہوسکتا ہے یہ اُس شخص کے بارے میں ہو جس پر کسی چیز کی ادائیگی لازمی ہو اور وصیّت نہ کرنے کی صورت میں اُسے مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۷)

[۴۰۸] یعنی اولاد کی ذمہ داری اور ان کے حقوق کی ادائیگی صدقہ وخیرات سے مقدّم ہے۔ اس قدر مال کو خرچ کر دینا یا وصیّت کر دینا کہ مرنے کے بعد اولاد کے لیے خاطر خواہ مال موجود نہ ہو جس کی وجہ سے اولاد کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جائے شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس حدیث میں جو فرمایا کہ تہائی مال زیادہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ تہائی مال کا صدقہ جائز ہے لیکن اولاد کے حقوق کے پیش نظر اس سے بھی کم صدقہ بہتر ہے۔ امام نووی اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مریض کسی درست مقصد کے تحت کسی کے سامنے اپنی بیماری کا اظہار کرسکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مریض کی عیادت کرنا نبی اکرم ﷺ کی سنّت ہے۔ (مرقات ج ۶ ص ۲۵۴)

وصیت کم سے کم مال میں کرنا زیادہ بہتر ہے

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما وصیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کاش لوگ تہائی سے چوتھائی کی طرف اُتر آئیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعد سے فرمایا تھا کہ ایک تہائی بھی زیادہ ہے۔ (صحیح بخاری: ۲۷۴۳ صحیح مسلم: ۱۶۲۹)
حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ چوتھائی حصہ کی وصیت کرنے سے زیادہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں پانچویں حصہ کی وصیت کروں، اور تہائی مال کی وصیت کرنے سے زیادہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں چوتھائی حصہ کی وصیت کروں۔ کیونکہ جس نے تہائی مال کی وصیت کی اُس نے مال نہیں چھوڑا۔ (سنن بیہقی ج۶ ص۲۷۰) بعض علماء فرماتے ہیں کہ مال کے چھٹے یا پانچویں یا چوتھے حصہ کی وصیت کی جائے۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی وہ مؤمنین جو شرک سے بچتے ہیں اُن کے لیے وصیت ایسی چیز ہے جو کہ حق ہے، یعنی مستحب کے طور پر ثابت ہے، نہ یہ کہ اُن پر فرض اور واجب ہے۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

سو جس نے وصیّت کو سُننے کے بعد اُسے تبدیل کر دیا تو اُس کا گناہ صرف اُس میں تبدیلی کرنے والوں پر ہے، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا بہت علم والا ہے O

وصیت میں تبدیلی کرنے اور اس کے گناہ کا بیان

﴿فَمَنْ بَدَّلَهٗ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مرنے والے کے سرپرست اور وصی[۴۰۹] میں سے جس نے وصیت کو تبدیل کر دیا۔ تبدیلی کی مختلف صورتیں ہیں۔ یا تو یہ تبدیلی وصیت کے لکھنے میں ہو یا حقوق کی تقسیم میں ہو یا گواہی دینے میں ہو یعنی گواہان گواہی کو چھپا جائیں یا اس کو بدل ڈالیں۔ رہا یہ کہ ''وصية'' کا لفظ جب مؤنث ہے تو اس کے لیے ''فمن بدلهٗ'' کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''وصيّة'' ''ايصاء'' کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (البقرة: ۲۷۵) اس میں ''موعظة'' ''وَعظ'' کے معنیٰ میں ہے۔ اور ''فمن بدّلهٗ'' کی تقدیرِ عبارت یہ ہے کہ ''فمن بدّل قول الميت او ما اوصى به'' جس نے میّت کی بات کو یا جس چیز کی اُس نے وصیت کی ہے اُس کو تبدیل کیا۔

آیت میں ﴿بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وصیّت کرنے والے سے سُننے کے بعد اور اُس وصیت کے ثابت ہونے کے بعد جس نے وصیت کو تبدیل کیا۔ ﴿فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ﴾ تو اس تبدیلی کا گناہ صرف اُسی کو ہو گا جو وصیت کو تبدیل کرنے والا ہے اور جس نے وصیت کی ہے اور جس کے لیے وصیت کی ہے وہ دونوں گناہ سے بَری ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ بے شک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ یعنی وصیت کرنے والے نے جو کچھ وصیت کی ہے اُس کو سننے والا ہے اور جو شخص وصیت میں تبدیلی کرتا ہے اُس کی تبدیلی کو جاننے والا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

پس جس کو وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی قسم کی طرف داری یا ظلم کا اندیشہ ہو تو وہ ان کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے O

[۴۰۹] یعنی وہ شخص جس کے لیے وصیّت کی گئی ہو یا وہ شخص جس کو مرنے والے کے سرپرست نے مرنے والے کے مال کا ذمہ دار بنایا ہو۔

آیت مذکورہ کے الفاظ کی مختصر تفسیر

آیت میں جو ﴿فَمَنْ خَافَ﴾ فرمایا اُس میں خطاب تمام مسلمانوں سے ہے اور ''خاف'' کا معنیٰ یہ ہے کہ جس شخص کو یہ علم ہو کہ وصیّت کرنے والے نے ﴿جنف﴾ یعنی وصیّت میں ناانصافی اور حق سے انحراف کیا ہے' یا ﴿اثم﴾ یعنی ظلم کیا ہے۔ ''جنف'' کا معنیٰ ہے: مائل ہو جانا' جھک جانا۔ اور ''اثم'' سے مراد ظلم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''جنف'' سے مراد ہے وصیت میں خطا کرنا اور ''اثم'' سے مراد ہے جان بوجھ کر (ناانصافی) کرنا۔

آیت مذکورہ کا مفہوم

بعض علماء کے نزدیک آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مریض کے پاس اُس وقت جائے جب کہ مریض وصیت کر رہا ہو اور وہ دیکھے کہ مریض اپنی وصیت میں کمی بیشی کر رہا ہے یا نااہل کے لیے یا نامناسب جگہ کے لیے وصیت کر رہا ہے تو اس شخص پر اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ مریض کو انصاف کرنے کا حکم دے اور ناانصافی اور حق سے انحراف کرنے سے منع کرے۔ جب کہ بعض علماء کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب مرنے والا شخص اپنی وصیت میں خطاء کرے یا جان بوجھ کر ناانصافی کرے تو اُس کے وارث یا وصی یا حاکم پر اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ وہ وصیّت کرنے والے کی موت کے بعد اُس کے ورثاء اور وہ لوگ جن کے لیے وصیت کی گئی ہے اُن کے درمیان صلح کرا دے اور وصیّت کو عدل و انصاف اور حق کی طرف پھیر دے۔

آیت مذکورہ میں ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ صلح کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ جو فرمایا اُس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مرنے والے کی ناانصافی کے بعد اُس کی وصیت کو درست کر دے اُس کو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور اُس پر رحم فرمانے والا ہے۔

وصیت میں ناانصافی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد

وصیت میں ناانصافی کی ممانعت پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۸۷) بے شک مرد اور عورت دونوں ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہتے ہیں' پھر جب اُنہیں موت آتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں ضرر پہنچاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے لیے آگ واجب ہو جاتی ہے۔[۱۴۱] یہ حدیث سنانے کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

---

[۱۴۱] اس حدیث شریف میں ساٹھ سال کا تذکرہ بہ طور مثال ہے۔ مراد یہ ہے کہ عمر کا ایک بھرپور حصہ اللہ عزوجل کی فرمانبرداری میں گزارنے کے بعد آخر میں اُسے ضائع کر دیا جاتا ہے اس طرح کہ جس کے لیے وصیت نہیں کرنی چاہیے اُس کے لیے وصیت کر دی جاتی ہے یا جو وصیّت کا اہل ہے اس کے لیے ایک تہائی (۱/۳) سے زیادہ کی وصیت کر دی جاتی ہے یا کسی ایک وارث کو تمام مال کا مالک بنا کر دیگر ورثاء کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمام صورتیں ضرر اور نقصان پہنچانے کی ہیں۔ (مرقات ج ۶ ص ۲۵۷) واضح رہے کہ کسی وارث کو ترکہ سے محروم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ورثاء کو ترکہ سے جو حصہ دیا جاتا ہے وہ اللہ عزوجل کے حکم کی وجہ سے ہے۔ ہاں اگر کوئی وارث (بیٹا یا بیٹی وغیرہ) فسق و فجور کا شکار ہو اس کو محروم کرنے کی غرض سے زندگی میں مال کو دیگر ورثاء میں تقسیم کر دینا شرعاً جائز ہے۔ (کما صرّح به الفقهاء في بيان الوصيّة)

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (النساء: ۱۱-۱۲)

(میراث کی تقسیم) اُس شخص کی وصیت پوری کرنے اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد ہو اور وصیت میں کسی کو نقصان نہ دیا گیا ہو' یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا بہت حلم والا ہے ۝ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اس کو اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں' وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے ۝

(سنن ترمذی: ۲۱۱۷' سنن ابوداؤد: ۲۸۶۷' سنن ابن ماجہ: ۲۷۰۴' مسند احمد ج ۲ ص ۲۷۸' سنن بیہقی ج ۶ ص ۲۷۱' مشکوۃ المصابیح: ۳۰۷۵۔ ص ۲۶۵)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: "فیضارّان" ۔ یہ "المضارّہ" سے ہے جس کا معنیٰ ہے: کسی کو نقصان پہنچانا۔ سرے سے وصیت ہی نہ کی جائے' یا اگر کی جائے تو کچھ حصہ میں کمی کی جائے یا نااہل کے لیے وصیت کی جائے یا وصیت میں کسی کے ساتھ ناانصافی کی جائے اور اس طرح کی دیگر صورتیں سب نقصان پہنچانے میں داخل ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ ﴿۱۸۳﴾

اے ایمان والو! جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزے فرض کیے گئے تھے اسی طرح تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں تا کہ تم متقی بن جاؤ ۝

"صوم" کا لغوی اور شرعی معنیٰ

﴿الصوم﴾ کا لغوی معنی ہے: "الامساک" رُکنا۔ نصف النہار پر پہنچ کر دن جب درمیان میں آ جائے اور ٹھہر جائے تو عربی میں کہا جاتا ہے: "صام النہار" دن رُک گیا اور درمیان میں آ گیا۔ "صوم" کا یہی معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے کہ:

اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا. (مریم: ۲۶)

بے شک میں نے آج رحمٰن کے لیے صوم کی نذر مانی ہے۔

یہاں "صوم" کا معنیٰ ہے: خاموشی اختیار کرنا۔ چونکہ اس میں کلام سے رُکنا پایا جا رہا ہے اس لیے اس کو "صوم" فرمایا گیا۔ اور "صوم" کا شرعی معنیٰ ہے: ایک مخصوص وقت میں یعنی طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک نیت کے ساتھ کھانے پینے اور بیوی کے ساتھ جماع سے رُکے رہنا۔

تم سے پہلے لوگوں پر روزے فرض کیے گئے اس سے کون لوگ مراد ہیں؟

﴿ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ تم سے پہلے لوگوں سے مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمہارے زمانہ تک جتنے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے اور اُن کی اُمتیں آئیں اُن پر روزے فرض کیے گئے۔ مقصودِ کلام یہ بتانا ہے کہ روزہ ایک قدیم عبادت ہے اور گذشتہ زمانوں میں کوئی امت ایسی نہیں گزری جس پر اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرح روزے فرض نہ

کیے ہوں۔ روزے فرض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روزہ ایک مشقت والی عبادت ہے۔ اور ہر وہ چیز جس میں مشقت ہو جب وہ عام ہو جائے تو اُس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض فرمائے۔

رمضان کے روزوں میں عیسائیوں کی زیادتی اور تبدیلی

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم پر رمضان کے روزے فرض ہیں اسی طرح عیسائیوں پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے۔ لیکن ایک زمانہ تک انہوں نے رمضان کے روزے رکھے' پھر جب انہوں نے دیکھا کہ رمضان کبھی سخت گرمی میں اور کبھی سخت سردی میں آتا ہے اور سفر میں روزہ رکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی زندگی گزارنے میں اور اس کے اسباب کے حصول میں روزہ سے نقصان بھی ہوتا ہے تو ان کے علماء اور سرداران نے مل کر اس رائے پر اتفاق کیا کہ ہم روزوں کو ایک ایسے موسم میں کر دیتے ہیں جو درمیانہ ہو' نہ اُس میں گرمی زیادہ ہو اور نہ سردی زیادہ۔ چنانچہ ان لوگوں نے موسم بہار میں روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ اور اپنی اس حرکت کے کفارہ میں دس روزے اضافی رکھنا شروع کر دیئے۔ یوں یہ لوگ چالیس روزے رکھنے لگے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہوا کہ ان کا بادشاہ مُنہ کی کسی بیماری میں مبتلا ہوا تو اس نے اللہ کے لیے یہ نذر مانی کہ اگر اُسے اس درد سے آرام ہو گیا تو وہ روزوں میں ایک ہفتے کے روزوں کا اضافہ کرے گا۔ اس نذر کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا اور منت کے مطابق اُس نے ایک ہفتے کے روزے بڑھا دیئے پھر کچھ عرصہ کے بعد اُس بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرا شخص حاکم بن گیا۔ اُس نے قوم سے کہا کہ تم لوگوں نے بقیہ تین روزے کیوں چھوڑے ہوئے ہیں۔ پچاس روزے مکمل کرو۔ یوں ان لوگوں نے پچاس کی تعداد مکمل کی۔[۱۱]

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عیسائیوں میں موت کی وبا پھیل گئی تو ان لوگوں نے کہا کہ اپنے روزوں میں اضافہ کرو۔ یوں انہوں نے دس روزے رمضان کے شروع میں اور دس رمضان کے بعد بڑھا دیئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عیسائیوں پر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کیے پھر ان لوگوں نے رمضان سے پہلے اور رمضان کے بعد ایک ایک روزہ بڑھا دیا اور اسی طرح دن بہ دن اضافہ کرتے رہے حتیٰ کہ تعداد پچاس تک پہنچ گئی' اسی لیے یوم شک کا روزہ رکھنا ممنوع ہے۔[۱۲]

"لعلکم تتقون" کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ یعنی روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں تا کہ تم اُن چیزوں سے بچو جو روزے میں تم پر حرام کی گئی ہیں کہ روزہ تقویٰ ہی تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے' کیونکہ اس میں نفس ٹوٹ جاتا ہے اور کھانے پینے کی' مجامعت کرنے کی اور دیگر چیزوں کی خواہشات چھوٹ جاتی ہیں۔

---

[۱۱] علامہ قرطبی نے اس واقعہ کو حدیث رسول ﷺ کے طور پر ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے تفسیر قرطبی' زیر بحث آیت)

[۱۲] یوم الشک ۳۰ شعبان کے دن کو کہتے ہیں' جبکہ ۲۹ شعبان کو بادلوں کی وجہ سے چاند نظر نہ آ سکے۔ اس دن کے بارے میں چونکہ شک ہوتا ہے کہ آیا یہ شعبان کا ہے یا رمضان کا اس لیے اسے یوم الشک کہتے ہیں۔ اس دن خالص نفل کی نیت سے روزہ رکھنا جائز ہے البتہ کوئی اور روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ علامہ خازن نے جو فرمایا کہ "اسی لیے یوم الشک کا روزہ رکھنا ممنوع ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ عیسائیوں نے رمضان سے پہلے اور رمضان کے بعد ایک ایک روزے کا اضافہ کر کے اُسے (لوگوں کے سامنے) شریعت بنا کر پیش کیا تو ہمیں اُن کی مشابہت سے بچانے کے لیے (رمضان کی نیت سے) یوم الشک میں روزہ رکھنے سے منع کر دیا گیا۔ یوم الشک میں روزہ رکھنے کی ممانعت پر دلیل یہ حدیث ہے کہ جس نے یوم الشک کا روزہ رکھا اُس نے حضرت ابو القاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (سنن ترمذی: ۶۸۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۷۷) یعنی جس نے شروع ہونے والے رمضان کی نیت سے روزہ رکھا' اُس نے نافرمانی کی کیونکہ اس میں عیسائیوں سے مشابہت ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "لعلکم تتقون" کا معنیٰ یہ ہے کہ تاکہ تم اُس کام سے بچو جو عیسائیوں نے کیا یعنی اپنے روزے تبدیل کر دیئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تاکہ تمہارا شمار متقی اور پرہیز گار لوگوں میں ہو کیونکہ روزہ رکھنا انہی لوگوں کی پہچان ہے۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

یہ گنتی کے چند دن ہیں' پھر تم میں سے جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (اُسے یہ اجازت ہے کہ) وہ اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے' اور جن لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار ہو (ان پر ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے' پھر جو خوشی سے فدیہ کی مقدار بڑھا کر زیادہ نیکی کرے تو یہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے' اور اگر تم سمجھو تو روزہ رکھنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے O

"ایاما معدودات" کے مختلف معانی اور رمضان کے روزوں کی فرضیت کا بیان

﴿مَعْدُودَاتٍ﴾ کا معنیٰ ہے: معین' اور ایک قول کے مطابق اس کا معنیٰ ہے: قلیل (اب آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ روزے کے دن معیّن ہیں یا قلیل ہیں)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہر مہینے کے تین روزے اور عاشوراء یعنی دس محرم کا روزہ رکھنا واجب تھا۔ پھر ان روزوں کو رمضان کے فرض روزوں سے منسوخ کر دیا گیا[۴۱۳] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہجرت کے بعد سب سے پہلے جو حکم منسوخ ہوا وہ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا حکم تھا اور پھر روزے کا حکم منسوخ ہوا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ:

(۱۸۸) زمانۂ جاہلیت میں قریش کے لوگ عاشوراء کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ بھی اُس دور میں یہ روزہ رکھتے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ جب مدینہ شریف تشریف لائے تو آپ نے یہ روزہ رکھا اور صحابہ کو اس روزے کے رکھنے کا حکم فرمایا۔ لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ ترک فرما دیا۔ اور جب آپ نے ترک فرما دیا تو آپ کے بعد جو شخص چاہتا تھا اس دن کا روزہ رکھتا تھا اور جو چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا۔[۴۱۴] (صحیح بخاری: ۳۸۳۱' صحیح مسلم: ۱۱۲۵' سنن ترمذی: ۷۵۳' سنن ابوداؤد: ۲۴۴۲' سنن دارمی: ۱۷۶۳' مسند احمد ج ۶ ص ۱۶۲' مصنف عبد الرزاق: ۷۸۴۵' صحیح ابن حبان: ۳۶۲۱' سنن بیہقی: ۲۸۸)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ سے ماہِ رمضان کے دن مراد ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ "تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں" اب اس سے ایک دن کا روزہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور دو دن کے روزے بھی مراد ہو سکتے ہیں' لیکن زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے "ایاما معدودات" فرما کر یہ بتایا کہ ہمارے فرض کردہ

[۴۱۳] یعنی جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشوراء وغیرہ کے روزے نفل ہو گئے اور اُن کا رکھنا لازمی نہ رہا۔

[۴۱۴] نبی اکرم ﷺ نے اس روزہ کو اس لیے ترک فرمایا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اب اس کا رکھنا واجب نہیں رہا۔ نہ یہ بات کہ اس کا رکھنا ناجائز ہو گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ صحابہ کو اس کے رکھنے کی ترغیب نہ فرماتے حالانکہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ عاشوراء کے روزے کے بارے میں' میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ (اس کے ذریعہ) وہ گذشتہ سال کے (صغیرہ) گناہ معاف فرما دے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۴۴) عاشوراء کا روزہ رکھنا سنّت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نو محرم کا روزہ بھی اس کے ساتھ ملا کر رکھا جائے۔ تاہم تنہا عاشوراء کا روزہ بھی رکھنا درست ہے۔

روزے ایک دن اور دو دن سے زیادہ ہیں لیکن ان کی کوئی معیّن تعداد نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں ''شھر رمضان'' فرما کر فرض روزوں کی معیّن تعداد بیان فرمادی۔ جب ان تمام آیات کے درمیان اس طرح کا تعلق ممکن ہے تو پھر ''ایاما معدودات'' سے رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے کے دن مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس صورت میں زیر بحث آیت منسوخ بھی نہیں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ رمضان کے روزوں کا حکم ہجرت کے دوسرے سال یعنی غزوۂ بدر سے ایک مہینہ اور چند دن پہلے نازل ہوا۔ اور غزوۂ بدر ۱۷ رمضان جمعہ کے دن واقع ہوا' جب کہ ابھی ہجرت کے اٹھارویں مہینہ کا آغاز تھا۔

آیت مذکورہ میں آگے فرمایا: تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اور روزے نہ رکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اتنے روزے اور دنوں میں رکھے۔ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ جو روزہ نہیں رکھ سکتے ہیں (وہ فدیہ دیں) اس آیت کے حکم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔

''وعلى الذين يطيقونه'' کے حکم میں علماء و مفسرین کا اختلاف

اس آیت کے بارے میں اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب' حضرت سلمہ بن اکوع اور دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا یہی مؤقف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں لوگوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ چاہیں تو روزہ رکھیں' چاہیں تو نہ رکھیں اور چاہیں تو روزہ کے بدلہ میں فدیہ دے دیں اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار اس لیے دیا تھا تا کہ لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار نہ ہو کیونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس اختیار کو منسوخ کر کے عزیمت (لازمی حکم) نازل فرمایا اور ارشاد فرمایا:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۔ (البقرہ:۱۸۵) تم میں سے جو شخص رمضان کے مہینے میں موجود ہو وہ اُس میں روزہ رکھے۔

لہٰذا یہ آیت گذشتہ اختیار کے لیے ناسخ ہے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ ''وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين'' کا نزول ہوا تو جو شخص چاہتا تھا وہ روزہ نہ رکھ کر فدیہ دے دیتا تھا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت نازل فرمائی اور اُس سے گذشتہ آیت کو منسوخ کر دیا۔ (صحیح بخاری: ۴۵۰۷' صحیح مسلم: ۱۱۴۵)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جو شخص چاہتا تھا وہ روزہ رکھتا تھا اور جو چاہتا تھا وہ روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کا کھانا فدیہ کے طور پر دے دیتا تھا' یہاں تک کہ یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ تم میں سے جو شخص رمضان کے مہینے میں موجود ہو وہ اُس میں روزہ رکھے۔ (صحیح مسلم: ۱۱۴۵)

حضرت قتادہ کا قول یہ ہے کہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا حکم صرف اُس بوڑھے کے لیے ہے جو روزہ تو رکھ سکتا ہے لیکن اس کو دشواری ہوتی ہو' اُس کو یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دے اور اس کے بدلہ میں فدیہ دے دے۔ پھر اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے کہ یہ آیت اُس بیمار کے لیے ہے جس کو بیمار کہا جا سکتا ہو اور وہ روزے کی بھی طاقت رکھتا ہو' اُس کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو روزے رکھے اور چاہے تو اُن کے بدلہ میں فدیہ دے دے۔ پھر اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا۔ مفسرین کی ایک جماعت جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی شامل ہیں اُن کا مؤقف یہ ہے کہ زیر بحث آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ اور اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو جوانی میں روزہ کی طاقت رکھتے تھے پھر بڑھاپے میں اُس کو رکھنے سے عاجز ہو گئے اُن پر لازم ہے کہ وہ روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کو ''وعلى الذين يُطَوَّقُونَهُ'' پڑھا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن پر روزہ رکھنا دشوار ہو۔ حضرت عطاء بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حصرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو یوں پڑھتے ہوئے سنا: ''وعلى الذين يُطَوَّقُونَهُ فدية طعام مسكين''۔ پھر حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ (اور یہ اُس بارے میں ہے) جو بہت بوڑھا یا بہت بوڑھی ہو اور دونوں کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو تو وہ ہر روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۴۵۰۵)[۴۱۵]

روزہ کے فدیہ کی مقدار

﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے (یعنی فدیہ کا معنیٰ ہے: جزاء اور بدلہ) اور اس سے مراد وہ مقدار ہے جس کو آدمی اس لیے خرچ کرتا ہے تاکہ اپنے آپ کو اُس غلطی سے بچائے جو اُس سے کسی عبادت وغیرہ میں واقع ہوئی ہو۔ اب جس نے ماہِ رمضان میں روزہ نہ رکھا ہو اور بڑھاپے کی وجہ سے قضاء کرنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو اُس پر واجب ہے کہ وہ ہر روز ایک مسکین کو شہر کی رائج خوراک سے ایک مُد (یعنی ایک کلوگرام) کی مقدار کھانا کھلا دے۔ یہ فقہاء حجاز کا قول ہے۔ اور عراق کے بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ہر روزے کے بدلہ میں نصف صاع (یعنی دو کلو گرام) کھانا کھلا دیا جائے۔ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر فدیہ میں گندم دینا چاہے تو نصف صاع دے اور اگر کوئی اور چیز دینا چاہے تو وہ ایک صاع (یعنی چار کلوگرام) کی مقدار ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو صبح اور رات کا کھانا دے دیا جائے۔[۴۱۶]

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ﴾ یعنی جو شخص ایک مسکین پر اضافہ کر کے ہر روزہ کے بدلہ میں دو یا دو سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے تو یہ اُس کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو شخص واجب مقدار سے زیادہ فدیہ ادا کرے یعنی مثلاً اُس پر فدیہ ایک مُد ہے اور وہ ایک صاع ادا کرے تو یہ اُس کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بات اُن لوگوں سے فرمائی جا رہی ہے جنہیں روزہ رکھنے میں مشقت ہوتی ہے۔ اب اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے روزہ میں تکلیف اٹھانے والو! روزہ چھوڑنے اور اس کا فدیہ دینے کی بہ نسبت تمہارا روزہ رکھنا اور اس میں مشقت برداشت کرنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب کسی خاص جماعت سے نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں سے ہے۔ اور یہی قول زیادہ صحیح ہے' کیونکہ آیت کے الفاظ میں عموم ہے' لہٰذا اس سے تمام لوگ مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

آیت میں ﴿إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ فرمایا اُس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھو کہ روزہ رکھنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ بعض علماء نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تم روزہ رکھو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ روزہ میں خیر اور تقویٰ کے کس قدر اسباب موجود ہیں۔

---

۴۱۵ علامہ خازن کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ (وعلى الذين يطيقونه فدية) کے منسوخ ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین نے اس کو منسوخ قرار دیا ہے اور ایک جماعت بہ شمول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کو محکم (یعنی غیر منسوخ) قرار دیا ہے۔ جنہوں نے منسوخ قرار دیا ہے اُن کا مؤقف یہ ہے کہ اس آیت میں روزہ کی طاقت رکھنے والوں کو فدیہ دینے کی اجازت دی گئی ہے' حالانکہ یہ اختیار اب باقی نہیں ہے بلکہ جو طاقت رکھتے ہیں اُن پر روزہ لازم ہے۔ لہٰذا یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کے برعکس جو اس آیت کو محکم یعنی غیر منسوخ قرار دیتے ہیں وہ اس کے مختلف معانی اور تاویلات بیان کرتے ہیں۔

۴۱۶ آسان الفاظ میں ایک روزہ کا فدیہ ایک صدقہ فطر ہے۔

وہ عذر جن کی بنیاد پر روزہ ترک کر سکتے ہیں

جاننا چاہیے کہ جتنے مسلمان بھی رمضان میں روزہ رکھنے کے پابند ہیں اُن میں سے کوئی بھی شخص بغیر عذر کے رمضان کا روزہ ترک نہیں کر سکتا۔ اور ایسے کل تین عذر ہیں جن کی بناء پر آدمی رمضان کا روزہ نہیں رکھ سکتا۔(۱) سفر، بیماری اور حیض و نفاس۔ ان عوارض میں مبتلا افراد جب روزہ ترک کریں گے تو ان پر بعد میں اس کی قضاء لازم ہو گی، کفارہ لازم نہیں ہو گا۔ (۲) حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو اپنے بچے کی (غذا کا) ڈر ہو تو وہ روزہ چھوڑ سکتی ہیں۔ البتہ بعد میں ان پر قضاء اور فدیہ دونوں لازم ہوں گے۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور اصحاب رائے کا مذہب یہ ہے کہ ان دونوں عورتوں پر فدیہ نہیں ہے[۱]۔ (۳) بہت زیادہ بوڑھا شخص، بہت زیادہ بوڑھی عورت اور ایسا بیمار آدمی جس کے تندرست ہونے کی کوئی اُمید نہ رہے، ان تینوں پر فدیہ لازم ہے قضاء لازم نہیں ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

(تمہارے روزوں کے لیے) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا (وہ قرآن) جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے اور (اس میں) ہدایت دینے والی اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی روشن دلیلیں ہیں، سو تم میں سے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو وہ اس میں روزے رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو وہ اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، اور (وہ چاہتا ہے کہ) تم مطلوبہ تعداد پوری کرو اور اس بات پر اللہ کی کبریائی بیان کرو کہ اُس نے تمہیں (اپنی اطاعت کی) ہدایت دی اور (سہولت اُس نے تمہیں اس لیے دی ہے) تاکہ تم شکر ادا کرو ○

مہینے کو عربی میں شہر اور رمضان کو رمضان کہنے کی وجہ

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ "رمضان کا مہینہ"۔ یعنی تمہارے روزوں کے لیے جو وقت (مقرر کیا گیا) ہے وہ رمضان کا مہینہ ہے۔ آیت میں مہینہ کے لیے ﴿شَهْرُ﴾ کا لفظ آیا ہے۔ چونکہ مہینہ مشہور ہوتا ہے اس لیے اُسے "شہر" کہتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص راز کی بات کھول دے تو عربی میں کہا جاتا ہے: "شهرهٗ" فلاں نے راز کی بات کھول دی۔ چاند کو بھی اسی لیے "شہر" کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور ہوتا ہے اور سب کے سامنے ہوتا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ چاند کو "شہر" کہنے کی وجہ سے مہینے کو "شہر" کہا جاتا ہے۔

---

[۱] یعنی حمل والی اور دودھ پلانے والی عورت اپنے بچہ کی وجہ سے اگر روزہ نہ رکھ سکے تو امام شافعی کے نزدیک ان دونوں پر اس روزہ کی قضاء بھی لازم ہے اور فدیہ دینا بھی لازم ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان دونوں پر اس روزہ کی صرف قضاء لازم ہے۔ علّامہ کاسانی حنفی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں صحابہ اور تابعین کے درمیان بھی اختلاف رہا ہے۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور تابعین میں سے حضرت مجاہد کا مؤقف یہ تھا کہ مذکورہ دونوں عورتیں اگر روزہ نہ رکھ سکیں تو وہ روزہ کی قضاء بھی کریں گی اور فدیہ بھی دیں گی۔ امام شافعی نے اس سے استدلال فرمایا۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری اس بات کے قائل تھے کہ مذکورہ دونوں عورتوں پر صرف قضاء لازم ہے۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال ان حضرات کے قول سے ہے۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۵۵)

جہاں تک رمضان کے لفظ کا تعلق ہے سو وہ ''رمضاء'' سے مشتق ہے۔ اور ''رمضاء'' اُن پتھروں کو کہتے ہیں جو دھوپ میں گرم ہو جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اہل عرب نے جب قدیم لغت سے مہینوں کے نام منتقل کیے تو جس جس زمانے میں وہ مہینے واقع ہوئے اُس کی مناسبت سے اُن کا نام رکھ دیا' رمضان کا مہینہ ان دنوں میں آیا جب گرمی اپنے عروج پر تھی' تو اہل عرب نے اس کا نام رمضان رکھ دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے لہٰذا ''شہر رمضان'' کا معنیٰ ہے: اللہ کا مہینہ۔ لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ ''رمضان'' بالکل اسی طرح ایک مہینے کا نام ہے جس طرح ''رجب اور شعبان'' مہینوں کے نام ہیں۔

روزے رمضان میں کیوں فرض کیے گئے؟ اور قرآن کا لفظ مشتق ہے یا غیر مشتق

آیت میں جو فرمایا: ﴿الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ اس کا معنیٰ ہے: رمضان کے مہینے میں قرآن نازل کیا گیا۔ اس بات کے فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے روزہ جیسی عظیم عبادت کے لیے رمضان کا مہینہ خاص فرمایا تو اب اس کو خاص کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ اس مہینے میں عظیم ترین کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا گیا ہے اس لیے ہم نے عظیم عبادت ''روزہ'' کو رمضان میں رکھا۔

﴿قرآن﴾ اُس کتاب کو کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن اسم ہے لیکن نہ تو یہ مہموز ہے۔ اور نہ ہی ''قراءۃ'' سے مشتق ہے۔ البتہ یہ تورات اور انجیل کی طرح ہماری کتاب کا نام ہے۔ امام شافعی کے اس قول کی بنیاد پر ''قرآن'' کا لفظ مشتق نہیں ہے۔ جب کہ اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ ''قرءٌ'' سے مشتق ہے۔ اور ''قرءٌ'' کا معنیٰ ہے: جمع کرنا۔ چونکہ اس کتاب نے مختلف سورتوں اور آیتوں کو آپس میں جمع کر دیا ہے اور مختلف احکام و حکایات کو' مثالوں کو اور اللہ عزوجل کی وحدانیت کو ثابت کرنے والی نشانیوں کو جمع کر دیا ہے اس لیے اس کتاب کو ''قرآن'' کہتے ہیں۔

قرآن کریم کا نزول کب ہوا؟

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن مجید ماہِ رمضان شبِ قدر میں لوح محفوظ سے ایک ہی مرتبہ میں پورا نازل کیا گیا اور اُسے آسمان دنیا پر بیت العزت میں رکھا گیا' پھر وہاں سے جبریل امین نے سیدنا محمد ﷺ پر بہ تدریج ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل کیا۔ اسی کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۟ (الواقعہ: ۷۵) میں نزولِ قرآن کے اوقات کی قسم کھاتا ہوں۔

رمضان میں نزولِ قرآن کی تائید ابوداؤد کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۸۹) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر صحیفے اُس وقت نازل ہوئے جب رمضان کی تین راتیں گزر چکی تھیں' ایک روایت میں یوں ہے کہ جب رمضان کی پہلی رات تھی۔ اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تورات اس وقت نازل ہوئی جب رمضان کی چھ راتیں گزر چکی تھیں' اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر انجیل اس وقت نازل ہوئی جب رمضان کی تیرہ راتیں گزر چکی تھیں۔ اور حضرت داؤد (علیہ السلام) پر زبور اس وقت نازل ہوئی جب رمضان کی اٹھارہ راتیں گزر چکی تھیں اور محمد (ﷺ) پر چوبیسویں رات کو قرآن نازل ہوا جب کہ ابھی یقینی طور پر چھ راتیں باقی تھیں[۴۱۸]۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۷' المعجم الکبیر ج ۲۲ ص ۷۵' ۱۸۵' المعجم الاوسط: ۳۷۵۲)

[۴۱۸] اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر رمضان المبارک کی چوبیسویں رات ہے جو کہ جفت ہے۔ جبکہ علماء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ستائیسویں رات ہے۔ طاق رات ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر کو آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ (صحیح مسلم: ۱۱۶۵) اور طاق (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث کی بنیاد پر یہ ثابت ہوگا کہ سیدنا محمد ﷺ پر قرآن کریم کے نزول کا آغاز رمضان کے مہینے میں ہوا۔ ابن اسحٰق اور ابوسلیمان دمشقی کا یہی قول ہے۔

زیر بحث آیت کا بعض علماء نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں روزوں کی فرضیت کے ساتھ قرآن نازل ہوا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت نماز' زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قول حضرت مجاہد اور حضرت ضحاک سے مروی ہے اور حسن بن فضل کا بھی یہی مختار ہے۔

''ھدی للناس'' کے بعد ''و بینات من الھدی و الفرقان'' فرمانے کی وجہ

﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن گمراہی سے ہدایت کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر یہاں یہ اعتراض ہو کہ ''ھدی للناس'' کے بعد ''و بینات من الھدی و الفرقان'' فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ قرآن ہدایت ہے۔ پھر ہدایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ کبھی تو وہ واضح ہوتی ہے اور کبھی واضح نہیں ہوتی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' فرما کر یہ بتایا کہ قرآن کریم اپنی ذات میں باعثِ ہدایت ہے۔ پھر ﴿ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ﴾ فرما کر یہ بتایا کہ یہ ہدایت کو واضح اور روشن کرنے والا ہے اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔
بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ قرآن اپنی ذات میں باعث ہدایت ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' بر سبیل اجمال فرمایا' اور ﴿ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ﴾ بر سبیل تفصیل فرمایا۔ کیونکہ ''بینات'' اُن واضح دلائل کو کہتے ہیں جو حلال و حرام اور حدود و احکام کا بیان کرتے ہیں۔ اور ''فرقان'' کا معنیٰ ہے: حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی۔

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ جو شخص موجود و مقیم ہو اور سفر میں نہ ہو وہ جب اس مہینے کو پائے تو اس میں روزے رکھے۔ ﴿ شھود ﴾ کا معنیٰ ہے: حاضر ہونا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بر سبیل عادت لوگ جس طریقہ سے مہینے کو دیکھتے ہیں وہ اس آیت میں مراد ہے' اور وہ طریقہ ''چاند کا دیکھنا'' ہے (یعنی آیت میں یہ فرمایا کہ جو شخص چاند کو دیکھے وہ روزے رکھے) اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۹۰) چاند کو دیکھ کر روزہ کا آغاز کرو اور چاند کو دیکھ کر روزہ کا اختتام کرو۔[۲۱۹] (صحیح بخاری:۱۹۰۹' صحیح مسلم:۱۰۸۱' سنن ابن ماجہ:۱۶۵۴'

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) راتوں میں ستائیسویں رات کا شب قدر ہونا اگرچہ متفقہ نہیں ہے تاہم جمہور علماء نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ زیر بحث حدیث جو علامہ خازن نے ذکر فرمائی ہے اس میں چوبیسویں رات کا شب قدر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح احادیث سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مزید یہ کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمران بن داوَر القطّان ہے جس کے بارے میں علماء رجال کا اختلاف ہے۔ ابن حبان نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے اور یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی ایک اور سند جس کے مطابق اس کے راوی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اس میں ایک راوی سفیان بن وکیع ہے جس کے بارے میں امام بخاری کے بہ قول علماء رجال کو کلام ہے۔ امام نسائی نے اس کو غیر ثقہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو ساقط الحدیث قرار دیا ہے۔ (تقریب التہذیب مع الحاشیہ ص ۳۰۳)
اس لیے اس سند کے اعتبار سے بھی یہ حدیث ضعیف ہے۔ واضح رہے کہ علامہ خازن نے اس حدیث کے آغاز میں ابوداؤد کا حوالہ ذکر کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے علامہ خازن نے ابوذر لکھا ہو اور کاتب نے ابوداؤد لکھ دیا ہو۔ کیونکہ احادیث ذکر کرنے میں علامہ خازن کا زیادہ اعتماد تفسیر بغوی پر ہے (کما قال بنفسہ فی البدایۃ) اور تفسیر بغوی میں یہ روایت حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔

[۲۱۹] یہاں تمام مسلمانوں کا دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ بعض مسلمانوں کا دیکھنا مراد ہے۔ فقہاء احناف کے نزدیک اس کی تفصیل یہ ہے کہ رمضان کے چاند میں اگر مطلع ابر آلود ہو تو ایک عادل (باکردار) شخص کی گواہی کافی ہے' وہ اگر آ کر گواہی دے تو اس (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سنن نسائی: ۲۱۲۴، مسند احمد ج ۲ ص ۴۵۴، سنن دارمی: ۱۶۸۵، صحیح ابن حبان: ۳۴۴۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۸۰۔ ص ۱۷۴)

چاند کے متعلق خبر دینے کا شرعی معیار اور اس بارے میں علماء امت کے اقوال

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ روزہ وہ شخص رکھے گا جو خود چاند دیکھے اور اگر خود نہ دیکھ سکے تو اُسے چاند کی اطلاع مل جائے۔ البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ چاند کے بارے میں خبر کا معیار کیا ہے؟ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ چاند کے بارے میں ایک شخص کی اطلاع بھی کافی ہے۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ چاند کی اطلاع کا معاملہ گواہی کی طرح ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ رمضان کے آغاز کے بارے میں چاند کی اطلاع اخبار کی طرح ہے یعنی اس میں ایک شخص کی اطلاع بھی کافی ہے جبکہ رمضان کے اختتام پر چاند کی اطلاع گواہی کی مانند ہے، یعنی اس میں دو سے کم افراد کی اطلاع قابل قبول نہیں ہوگی۔ یہ امام شافعی کا مؤقف ہے، اور انہوں نے یہ مؤقف اس لیے اختیار فرمایا کہ دخول وخروج کی وجہ سے عبادت کے معاملہ میں احتیاط ہونی چاہیے۔[۴۲۰]

"ومن كان مريضا او على سفر" کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ اس جملہ کو دوبارہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کے ساتھ ساتھ اُس شخص کو بھی روزہ رکھنے نہ رکھنے کا اختیار بیان فرمایا تھا جو مسافر بھی نہ ہو اور بیمار بھی نہ ہو۔ پھر زیر بحث آیت میں "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" فرما کر اُس کا اختیار ختم کر دیا۔ اب اگر یہیں پر بات روک دی جاتی تو اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ تمام ہی افراد سے اختیار واپس لے لیے گیا ہے (حالانکہ ایسا نہیں ہے)۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ناسخ کے بعد زیر بحث جملہ کے ذریعہ مریض اور مسافر کے اختیار کو دوبارہ بیان فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حکم اُسی طرح برقرار ہے جیسے پہلے تھا (یعنی بیمار اور مسافر کو روزہ رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے)۔

زیر بحث آیت کی روشنی میں روزے سے متعلق چند شرعی احکام کی تفصیل اور مذاہب ائمہ کا بیان

پہلا مسئلہ: کون سی بیماری میں روزہ ترک کرنا جائز ہے؟ اس بارے میں تین اقوال ہیں: پہلا قول جو کہ اصحابِ ظاہر[۴۲۱] کا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ بیماری جس کو بیماری کہا جا سکتا ہو اُس میں روزہ ترک کرنا جائز ہے۔ کیونکہ آیت میں "مریض" کا لفظ مطلق ہے اور مطلق کو اُس کے کم سے کم مرتبہ تک لے جایا جائے گا۔ حسن بصری اور ابن سیرین کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا قول جو کہ امام اصم کا ہے وہ یہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے کا اختیار بیماروں میں صرف اُس بیمار کو ہے جس کو روزہ رکھنے سے سخت تکلیف اور دشواری ہوتی ہو۔ کیونکہ لفظِ مطلق کو اُس کے اعلیٰ مرتبہ پر لے جایا جاتا ہے۔ تیسرا قول جو کہ اکثر فقہاء کا ہے وہ یہ ہے کہ جس بیماری میں روزہ ترک کرنا جائز ہے اُس سے مراد وہ بیماری ہے جو روزہ کی وجہ سے جان کے نقصان کا باعث بن جائے یا روزہ کی وجہ سے بیماری اتنی بڑھ جائے کہ برداشت نہ ہو سکے۔ جیسے بخار زدہ آدمی کو یہ خدشہ ہو کہ اگر اُس نے روزہ رکھا تو بخار میں اضافہ ہو جائے گا تو اُسے روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح آنکھ کی تکلیف میں مبتلا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کی گواہی معتبر ہوگی اور اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو چاند کے ثبوت کے لیے کثیر تعداد میں لوگوں کا خبر دینا ضروری ہے۔ جبکہ عید کے چاند میں اگر مطلع ابر آلود ہو تو دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے اور اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو کثیر تعداد میں لوگوں کی گواہی ضروری ہوگی۔ (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۴۲، شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۴۹)

۴۲۰ اس بارے میں احناف کا مؤقف گذشتہ حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۴۲۱ اس فرقہ کے لوگ اب اس نام سے موجود نہیں ہیں۔ اس کے بانی ابوسلیمان بن داؤد علی ظاہری (م ۲۷۰ھ) ہیں۔ آج کل ان کے پیروکار غیر مقلدین کے نام سے معروف ہیں۔

شخص کو یہ خدشہ ہو کہ اگر اُس نے روزہ رکھا تو اس کی تکلیف بڑھ جائے گی تو اُسے بھی روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے۔ (خلاصہ یہ کہ) مرض سے مراد ایسی بیماری ہے جو روزہ رکھنے سے مزید پختہ اور قوی ہو۔ امام شافعی فرماتے ہیں: روزہ جب بیمار آدمی کو مشقت میں مبتلا کر دے تو وہ اس کو چھوڑ سکتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر (وہ بیمار ہونے کے باوجود) تندرست کے حکم میں ہے[۴۲۲]

دوسرا مسئلہ: سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں: سفر کے دوران روزہ ترک کرنا مباح ہے (یعنی ترک کرنے کی اجازت ہے) اور روزہ رکھنا بھی جائز ہے۔ اکثر علماء کا یہی مؤقف ہے۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ اور بعض اصحاب ظاہر کا مؤقف یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی رکھ لے تو اس پر قضاء لازم ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۹۱) سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہے[۴۲۳]

(صحیح بخاری: ۱۹۴۶، صحیح مسلم: ۱۱۱۵، سنن ابوداؤد: ۲۴۰۷، سنن نسائی: ۲۲۶۱، سنن ابن ماجہ: ۱۶۶۴، مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۹، سنن دارمی: ۱۷۰۹، صحیح ابن حبان: ۳۵۵۲، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۴۲، مستدرک ج ۱ ص ۴۳۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۲۱۔ ص ۱۷۷)

اکثر علماء اس حدیث کو اُس شخص کے حق میں لیتے ہیں جس کے لیے سفر میں روزہ رکھنا مشقت کا باعث ہو، ایسے شخص کے لیے (اس حدیث پاک کے پیش نظر) بہتر یہی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی سفر میں ایک مقام پر لوگوں کا ہجوم اور ایک آدمی کو دیکھا جس پر لوگوں نے سایہ کیا ہوا تھا۔[۴۲۴] آپ ﷺ نے پوچھا: کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ آدمی روزہ دار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہے۔ (اس حدیث کے حوالہ جات گذشتہ حدیث: ۱۹۱ کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

---

۴۲۲ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مؤقف وہی ہے جو علّامہ خازن نے اکثر فقہاء کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ یعنی ایسی بیماری کہ روزہ رکھنے کی صورت میں اُس کے بڑھنے کا خدشہ ہو اس میں روزہ ترک کرنا جائز ہے۔

۴۲۳ یہ حدیث مستقلاً بھی مروی ہے اور ایک واقعہ کے ساتھ بھی مروی ہے جیسا کہ عنقریب علّامہ خازن ذکر کریں گے۔ علّامہ خازن نے زیر بحث عنوان کے تحت تین احادیث ذکر کی ہیں۔ جن میں سے پہلی حدیث: ۱۹۱ سے بہ ظاہر ان علماء کی تائید ہوتی ہے جو سفر میں روزہ رکھنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور دوسری حدیث سے اُن کی تائید ہوتی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ جس شخص کے لیے دورانِ سفر روزہ باعث مشقت ہو اس کے لیے روزہ نہ رکھنا بہتر ہے ورنہ جائز ہے اور تیسری حدیث: ۱۹۲ سے اُن علماء کی تائید ہوتی ہے جو سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں۔ ان تینوں احادیث میں بہ ظاہر تعارض ہے لیکن فی الحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے۔ زیر بحث حدیث جس میں فرمایا کہ روزہ رکھنے میں کوئی نیکی نہیں ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب مسافر کے لیے روزہ رکھنا تکلیف اور مشقت کا باعث ہو تو روزہ رکھنے میں کوئی نیکی نہیں ہے، یعنی اس صورت میں اس کا روزہ رکھنا عبادت اور ثواب کا کام نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیثِ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور آخری حدیث (۱۹۲) جس سے دورانِ سفر روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں کا اختیار ثابت ہوتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب سفر معتدل ہو (یعنی نہ زیادہ باعث آرام نہ زیادہ باعثِ مشقت) تو روزہ رکھنا نہ رکھنا دونوں برابر ہیں۔

۴۲۴ یعنی انہوں نے سفر میں روزہ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئے تھے اور صحابہ کرام نے اُن پر کسی چیز سے سایہ کیا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہے۔ یعنی جبکہ روزہ رکھنا مشقت اور تکلیف کا باعث ہو۔

اکثر علماء جو سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں کو جائز کہتے ہیں اُن کا استدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۹۲) ہم نے رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا' اُس میں نہ تو روزہ دار نے بے روزہ شخص کی مذمت کی اور نہ بے روزہ شخص نے روزہ دار کی مذمت کی۔ (صحیح بخاری: ۱۹۴۷' صحیح مسلم: ۱۱۱۸' سنن ترمذی: ۷۱۲' سنن ابوداؤد: ۲۴۰۵' مسند احمد ج ۳ ص ۵۰' سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۴۵' صحیح ابن حبان: ۳۵۶۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۲۰۔ ص ۱۷۷)

تیسرا مسئلہ: کتنی مقدار کے سفر میں روزہ ترک کرنا جائز ہے؟: اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ داؤد ظاہری کا قول یہ ہے کہ ہر سفر میں روزہ ترک کرنا جائز ہے۔ خواہ وہ ایک فرسخ (یعنی تین میل) ہی کا سفر کیوں نہ ہو۔ امام اوزاعی کا قول یہ ہے کہ ایسا سفر جو ایک دن کی مسافت کا ہو اُس میں روزہ ترک کرنا جائز ہے۔ امام شافعی' امام احمد اور امام مالک کا قول یہ ہے کہ ایسا سفر جس میں روزہ ترک کرنے کی اجازت ہے اس کی کم سے کم مقدار ۱۶ فرسخ (یعنی ۴۸ میل) ہے جو کہ دو دن کے برابر ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کا مؤقف یہ ہے کہ کم سے کم تین دن کی مسافت کا جو سفر ہو اُس میں روزہ ترک کرنا جائز ہے۔

چوتھا مسئلہ: اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر مسافر ہو جائے تو وہ کیا کرے؟: جب رمضان کا آغاز ہو جائے اور آدمی حالت اقامت میں ہو' پھر اثناء رمضان وہ سفر کا آغاز کرے تو وہ حالتِ سفر میں اپنا روزہ ختم کر سکتا ہے۔ یعنی اگر چاہے تو سفر کا کچھ حصہ روزہ کی حالت میں گزارے اور کچھ حصہ کھا پی کر گزارے[۴۲۵] اس مسئلہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ:

(۱۹۳) رسول اللہ ﷺ فتح مکہ والے سال رمضان میں مکہ مکرمہ کی طرف نکلے اور آپ نے روزہ رکھا' یہاں تک کہ آپ مقام کدید[۴۲۶] پر پہنچے۔ پھر آپ نے اپنا روزہ کھول دیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ اپنا روزہ کھول دیا[۴۲۷] اور لوگوں کا معمول یہ تھا

۴۲۵ علامہ خازن کی مراد یہ ہے کہ جو شخص روزہ کی حالت میں ہو اور اس دوران سفر کا آغاز کرے تو اُسے یہ اجازت ہے کہ اپنے روزہ کو ختم کر دے۔ علامہ نے اس مسئلہ پر ذیل میں جو حدیث پیش کی ہے اس کا جواب اگلے حاشیہ میں دیا جائے گا۔ سردست یہ بتانا مقصود ہے کہ علامہ کا بیان کردہ یہ مسئلہ امام شافعی اور امام اعظم (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) دونوں کے خلاف ہے۔ امام اعظم کا مؤقف یہ ہے کہ رمضان کا روزہ رکھنے والا شخص اگر روزہ کے دوران مسافر ہو جائے تو وہ اس دن کے روزہ کو ختم نہیں کر سکتا۔ امام نووی شافعی علیہ الرحمۃ نے امام شافعی کا بھی یہی مذہب بیان فرمایا ہے۔ الفقه علی المذاهب الاربعه میں علامہ جزیری نے بھی امام شافعی کا مذہب یہی بیان فرمایا ہے کہ روزہ کے دوران اگر کوئی سفر کا آغاز کرے تو اُس روزہ کو ختم نہیں کر سکتا۔ (واضح رہے کہ روزہ رکھ کر سفر کا آغاز کرنے والا اگر روزہ توڑ دے تو احناف کے نزدیک گناہ ہوگا' کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ البتہ سفر کے چھوڑے ہوئے دیگر روزوں کی طرح قضاء لازم ہو گی۔)

۴۲۶ بعض روایات میں کدید کی بجائے مقام عُسفان کا ذکر ہے بعض میں قُدید کا ذکر ہے۔ ان میں کوئی تعارض نہیں ہے' کیونکہ کدید پانی کا ایک چشمہ ہے جو کہ عسفان اور قُدید کے درمیان واقع ہے۔ (کما قال الامام البخاری تحت الحدیث: ۱۹۴۴) اس لیے بعض روایات میں کدید کا' بعض میں عسفان کا اور بعض میں قدید کا ذکر ہے۔

۴۲۷ فقیر نے حدیث شریف کا یہ ترجمہ علامہ خازن کے استدلال کے مطابق کیا ہے۔ وگرنہ صحیح ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ فتح مکہ والے سال رمضان میں مکہ مکرمہ کی طرف نکلے اور مقام کدید تک آپ روزے رکھتے رہے۔ (مقام کدید میں پہنچ کر) آپ نے روزہ رکھنا ترک فرما دیا اور آپ کے ساتھ ساتھ صحابہ نے بھی روزہ رکھنا ترک کر دیا"۔ علامہ خازن اس حدیث سے یہ استدلال فرما رہے ہیں کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ روزہ کی حالت میں مکہ سے چلے تھے اور مقام کدید میں پہنچ کر آپ نے اور آپ کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ہر نئے سے نئے حکم کی پیروی کرتے تھے۔[428]

(صحیح بخاری: ۱۹۴۴' صحیح مسلم: ۱۱۱۳' سنن ابوداؤد: ۲۴۰۴' سنن نسائی: ۲۲۸۷' مسند احمد ج ۱ص ۲۹۱' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۲۳۔ ص ۱۷۷)

☆ اس حدیث میں جو ''کدید'' کا لفظ آیا ہے وہ ایک جگہ کا نام ہے' جو کہ مکہ مکرمہ سے ۴۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

پانچواں مسئلہ: سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے یا نہ رکھنا افضل ہے؟: اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد کا مؤقف یہ ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ قول کیا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا دونوں برابر ہیں۔ البتہ افضل وہ ہے جو زیادہ آسان لگے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں فرمایا کہ اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔[429]

چھٹا مسئلہ: ایسا شخص جو گناہ کے سفر میں ہو اس کو بھی روزہ کی رخصت ہے یا نہیں؟: روزہ نہ رکھنے کا اختیار ہر اُس سفر میں ہے جو جائز ہو اور گناہ کا سفر نہ ہو۔ اور ایسا شخص جو گناہ کے سفر میں ہو اُس کو شریعت کی رُخصتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔[430]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ساتھ تمام صحابہؓ نے (اُس دن کا) روزہ کھول دیا تھا اس لیے کوئی شخص اگر روزہ رکھ کر سفر کا آغاز کرے تو دورانِ سفر وہ اپنا روزہ ختم کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ استدلال امام اعظم اور امام شافعی کے مذہب کے خلاف ہے (جیسا کہ حاشیہ: ۴۲۵ میں واضح کیا جا چکا ہے۔) خود امام نووی شافعی نے اس استدلال کو غلط اور تعجب خیز قرار دیا ہے۔ (دیکھئے شرح مسلم للنووی ج ۱ص ۳۵۵) شارح مشکوٰۃ علامہ طیبی اور علامہ ابن حجر مکی نے علاّمہ خازن کی طرح استدلال کیا ہے۔ لیکن علامہ علی قاری نے دونوں کا رد کرتے ہوئے لکھا کہ اس حدیث میں کہیں سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ نبی اکرم ﷺ مقام عسفان میں جس دن پہنچے اس دن روزہ دار تھے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ مدینہ منورہ سے مقام عسفان تک روزے رکھتے رہے' پھر آپ نے (اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام نے) روزہ رکھنا ترک کر دیا۔ (مرقات ج ۴ص ۵۱۹) حاصل یہ کہ علامہ خازن کا بیان کردہ مسئلہ اور اس پر ان کا زیر بحث حدیثِ مبارک سے استدلال دونوں درست نہیں ہیں۔

[428] یعنی رسول اللہ ﷺ نے کسی عمل کو پہلے ایک طریقہ سے انجام دیا پھر بعد میں کسی اور طریقہ سے انجام دیا تو صحابہ کرام دونوں طریقوں میں سے بعد والے کی اتباع کرتے تھے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ اُس صورت میں ہے جب رسول اللہ ﷺ کے پہلے عمل کے بارے میں صحابہ کرام کو معلوم ہو جائے کہ وہ منسوخ ہو چکا ہے یا یہ معلوم ہو جائے کہ دوسرے عمل کو پہلے پر ترجیح حاصل ہے۔

[429] اس باب میں حق یہ ہے کہ سفر جب آرام دہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے' جب آرام دہ نہ ہو تو روزہ ترک کرنا افضل ہے اور جب سفر معتدل ہو تو روزہ رکھنا نہ رکھنا برابر ہے۔ ہوسکتا ہے' ائمہ کا اختلاف اسی تیسری صورت میں ہو کہ جب سفر معتدل ہو تو زیادہ بہتر کیا ہے؟ آیا روزہ رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ سو اس صورت میں دلائل کے مطابق زیادہ بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھ لیا جائے۔

[430] ہمارے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ درحقیقت یہ امام شافعی کے اس اصول پر مبنی ہے کہ گناہ کے سفر میں آدمی شرعی رُخصتوں سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سے قبل علامہ خازن البقرہ: ۱۷۳ کی تفسیر میں بھی اختتام پر امام شافعی کے اس اصول کو واضح کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ مجبور شخص کو جان بچانے کی مقدار حرام چیز کھانا جائز ہے لیکن اگر وہ گناہ کے سفر میں ہو اور مجبور ہو جائے تو حرام کھا کر اپنی جان نہیں بچا سکتا۔ ہم وہاں حاشیہ: ۳۸۱ میں تفصیل سے اس کا رد کر چکے ہیں۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ سفر خواہ گناہ کا ہو یا نیکی کا بہر صورت شریعت نے مسافر کو جو رُخصتیں دی ہیں وہ اُسے حاصل رہیں گی۔ جس طرح اُس کے لیے گناہ کے سفر میں ہونے کے باوجود مجبور ہونے کی صورت میں حرام چیز سے جان بچانا جائز ہے اسی طرح گناہ کے سفر کے باوجود دیگر مسافروں کی طرف روزہ رکھنے نہ رکھنے کا اختیار اُسے حاصل ہے۔

قضاء روزوں کی ادائیگی میں تسلسل ضروری نہیں ہے

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھے اُس پر لازم ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھے۔ اس جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کو علیحدہ علیحدہ قضاء کرنا جائز ہے اگرچہ تسلسل کے ساتھ ان کو قضاء کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ مزید اس جملہ سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کو قضاء کرنا واجب ہے لیکن اس کا کوئی وقت معیّن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ قضاء میں دیر کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اس کی مزید تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

(۱۹۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے ذمہ رمضان کے روزے ہوا کرتے تھے اور میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت کی وجہ سے سوائے شعبان کے کسی اور مہینے میں اُن روزوں کو قضاء نہیں کر پاتی تھی۔[۴۳۱]

(صحیح بخاری: ۱۹۵۰، صحیح مسلم: ۱۱۴۶، سنن ترمذی: ۷۸۳، سنن ابوداؤد: ۲۳۹۹، سنن نسائی: ۲۳۱۹، سنن ابن ماجہ: ۱۶۶۹، مسند احمد ج ۶ ص ۱۷۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۳۰۔ ص ۱۷۸)

زیرِ بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

ارشاد فرمایا: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ﴾ وہ تمہارے لیے روزے کی عبادت میں آسانی چاہتا ہے اور وہ آسانی یہ ہے کہ بیمار اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے۔ ﴿وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم سے تکلیف اور تنگی کو دور کر دیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت پسند ہے کہ کسی آدمی کو دو چیزوں کا اختیار دیا جائے اور وہ اُن میں سے آسان ترین کو اختیار کرے۔

آگے فرمایا: ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ یعنی وہ ایام جن میں تم نے سفر، بیماری اور حیض کے عذر کی وجہ سے روزے نہیں رکھے اُن کی تعداد کے مطابق تمہیں قضاء کرنی چاہیے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ تعداد پوری کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ مہینے کے جو دن ہیں اُن کی تعداد کو پورا کیا جائے۔ اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ حدیث روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۹۵) مہینہ اُنتیس راتوں کا (بھی) ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس وقت تک تم روزہ نہ رکھو جب تک کہ چاند نہ دیکھو لو اور اس وقت تک روزوں کا اختتام نہ کرو جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو۔[۴۳۲] اگر تم پر چاند مشتبہ ہو جائے تو روزوں کی مدت پوری کرو۔ ایک روایت میں یہ

[۴۳۱] اس سے مراد یہ ہے کہ رمضان کے بعد پورا سال میں ہمہ وقت رسول اللہ ﷺ کے لیے تیار رہتی تھی کہ نہ معلوم حضور انور ﷺ مجھے کس وقت شرف قربت عنایت فرمائیں۔ شعبان میں ام المؤمنین قضاء روزوں کی ادائیگی کا موقع ممکن ہے اس لیے پالیتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ خود شعبان کے روزوں میں مشغول ہوتے تھے۔ خود ام المؤمنین کا بیان ہے کہ (رمضان کے بعد) سوائے شعبان کے کسی اور مہینے میں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کثرت سے روزے رکھتے ہوئے نہیں پایا۔

(مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۳۶، عمدۃ القاری ج ۸ ص ۱۴۹، مرقات ج ۴ ص ۵۲۵)

[۴۳۲] یعنی نہ تو مشکوک دن میں روزہ رکھو اور نہ مشکوک میں عید مناؤ۔ لہٰذا ۳۰ شعبان کو اس شبہ سے رمضان کا روزہ نہ رکھو کہ شاید کل چاند ہو گیا ہو اسی طرح شبہ کی بناء پر ۳۰ رمضان کو عید نہ مناؤ یہ سمجھ کر کہ شاید کل عید کا چاند ہو گیا ہو۔ بلکہ جب رمضان یا شوال کا چاند یقینی طور پر ہو جائے تب روزہ یا عید کرو۔ (مراۃ المناجیح ج ۳ ص ۱۵۶) چاند کا یقینی ہونا یا تو خود دیکھ کر معلوم ہو گا یا شرعی گواہی سے ثابت ہو گا۔ اس کی تفصیل کے لیے حاشیہ: ۴۱۹ ملاحظہ فرمائیں۔

الفاظ ہیں کہ تیس کی تعداد پوری کرو[۳۳۳](صحیح بخاری: ۱۹۰۰، صحیح مسلم: ۱۰۸۰، سنن ترمذی: ۶۸۴، سنن ابوداؤد: ۲۳۲۰، سنن نسائی: ۲۱۲۱، سنن ابن ماجہ: ۱۶۵۴، مسند احمد ج ۲ ص ۶۳، سنن دارمی: ۱۶۸۴، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۰۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۶۹۔ ص ۱۷۴)

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ ﴾ (تاکہ تم اللہ کی کبریائی بیان کرو۔) اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے عید کی رات کی تکبیر مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مسلمان جب شوال کا چاند دیکھیں تو اُن پر لازم ہے کہ تکبیر کہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں عیدوں میں بلند آواز سے تکبیر پڑھنا واجب ہے۔ امام مالک، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ میں تکبیر کہی جائے گی اور عید الفطر میں نہیں کہی جائے گی[۳۳۴] امام شافعی اور ان کے موافقین کی دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم مطلوبہ تعداد پوری کرو اور اس بات پر اللہ کی تکبیر کہو کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس بات پر اللہ کی تکبیر کہو کہ اُس نے تمہیں اس عبادت کے اختتام تک (اپنی اطاعت کی) ہدایت دی۔

(۲) دوسرا قول ''ولتکبروا اللہ'' کی تفسیر میں یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس کی عظمت بیان کرو کہ اُس نے تم پر انعام فرمایا اور روزہ کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائی۔

آیت میں جو ﴿ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ فرمایا اُس کا مفہوم یہ ہے کہ (تم اس بات پر اللہ کی تکبیر کہو کہ) اُس نے تم کو اپنی فرمانبرداری کرنے اور ایسے کام کرنے کی توفیق دی جن کی وجہ سے وہ تم سے راضی ہوتا ہے۔ آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تاکہ تم اللہ عزوجل کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو۔

---

۳۳۳ یعنی اگر مطلع ابر آلود ہو یا کسی اور وجہ سے چاند کا ہونا نہ ہونا غیر یقینی ہو جائے تو جس مہینے میں یہ واقعہ پیش آئے اس کے تیس دِن مکمل کیے جائیں گے۔

۳۳۴ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی مراد یہ ہے کہ عید الاضحیٰ میں بلند آواز سے تکبیر کہی جائے گی اور عید الفطر میں بلند آواز سے نہیں کہی جائے گی۔ یہی احناف کا مُفتٰی بہ قول ہے۔ امام شافعی اور دیگر کی دلیل جو علامہ خازن نے بیان کی ہے اُس کی وضاحت یہ ہے کہ زیر بحث آیت (البقرہ: ۱۸۵) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''(اللہ چاہتا ہے) تم مطلوبہ تعداد کو پورا کرو اور اُس نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اُس پر اللہ کی تکبیر کہو''۔ اس میں مطلوبہ تعداد سے روزوں کی تعداد مراد ہے اور ظاہر ہے کہ روزے مکمل ہونے کے بعد عید الفطر کی تکبیرات کہی جاتی ہیں۔ لہٰذا عید الفطر میں تکبیرات کہی جائیں گی اور چونکہ شرعی طریقہ جو عید الاضحیٰ میں رکھا گیا ہے وہ بلند آواز سے تکبیر کہنے کا ہے لہٰذا عید الفطر کی تکبیرات بھی بلند آواز سے کہی جائیں گی۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دلیل یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے تسبیحات وتکبیرات اور ذکر واذکار کو بنیادی طور پر آہستہ آواز سے پڑھنا مقرر فرمایا ہے۔ ماسوا اُن مقامات کے جہاں خصوصیت کے ساتھ بلند آواز سے پڑھنے کا فرمادیا گیا ہے وہاں بلند آواز ہی سے پڑھنے کا حکم رہے گا (جیسے عید الاضحیٰ کی تکبیرات) اور دیگر مقامات پر آہستہ آواز سے پڑھا جائے گا۔ (جیسے رکوع وسجود کی تسبیحات اور عید الفطر کی تکبیرات وغیرہ) علامہ خازن نے امام شافعی کی تائید میں زیر بحث آیتِ مبارکہ سے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں تکبیرات سے نمازِ عید کی تکبیرات مراد ہیں۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ جب تم روزوں کی تعداد مکمل کرلو تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس ہدایت کے شکرانہ میں عید کی نماز ادا کرو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر آیت مبارکہ میں تکبیرات سے عید الفطر کی تکبیرات مراد ہوں تو اس میں آہستہ یا بلند آواز سے پڑھنے کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس سے بلند آواز کے ساتھ پڑھنے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع وغیرہ کتب فقہ)

احادیث کی روشنی میں ماہِ رمضان اور اس کے روزوں کی فضیلت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۹۶) جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے[۴۳۵] اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔[۴۳۶] (صحیح بخاری: ۱۸۹۹، صحیح مسلم: ۱۰۷۹، سنن ترمذی: ۶۸۲، سنن نسائی: ۲۰۹۷، سنن ابن ماجہ: ۱۶۴۲، مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۷، سنن دارمی: ۱۷۷۵، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۰۲، صحیح ابن حبان: ۳۴۳۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۵۶۔ ص ۱۷۳)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''صفّدت'' یہ ''صفد'' سے بنا ہے اور ''صفد'' کا معنیٰ ہے: ہتھکڑی۔ مراد یہ ہے کہ شیاطین کو ہتھکڑیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔

(۱۹۷) نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے ایمان کے ساتھ اور اللہ کی رضا کے لیے روزہ رکھا' اس کے گذشتہ تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔[۴۳۷] (صحیح بخاری: ۲۰۱۴، صحیح مسلم: ۷۵۹، سنن ترمذی: ۶۸۳، سنن ابوداؤد: ۱۳۷۲، سنن نسائی: ۲۲۰۴، سنن ابن ماجہ: ۱۶۴۱، مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۱، سنن دارمی: ۱۷۷۶، سنن بیہقی ج ۲ ص ۴۹۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۵۸، ص ۱۷۳)

حدیث مذکور: ۱۹۷ کی مختصر تشریح

☆ اس حدیث میں فرمایا: ''ایمانا و احتسابا''۔ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کی رضا کے لیے اور اس کی عطا کو حاصل کرنے کے لیے روزہ رکھے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ روزہ رکھے تو اس ایمان کے ساتھ کہ اُس پر روزہ فرض ہے اور اللہ کے پاس اس روزہ کا اجر وثواب طلب کرے۔ بعض علماء نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ بندہ مکمل ارادہ اور نیت کے ساتھ روزے رکھے۔ یعنی اس نیت کے ساتھ کہ وہ روزہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کو مان رہا ہے اور اس کے اجر وثواب میں رغبت رکھے اور ناپسندیدگی کی بجائے خوش دلی کے ساتھ روزہ رکھے۔

---

۴۳۵ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے تو لوگ گناہوں میں ملوّث کیوں رہتے ہیں؟ شارحینِ حدیث نے اس کے متعدّد جوابات دیئے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ گمراہ کرنے والا ایک بیرونی شیطان ہے اور ایک اندرونی شیطان۔ بیرونی شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے' اندرونی شیطان کو قید نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے لوگ گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ تمام شیاطین کو قید نہیں کیا جاتا بلکہ سرکش اور بڑے بڑے شیاطین کو قید کیا جاتا ہے' جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اس لیے عام شیاطین جو کھلے پھرتے ہیں اُن کی وجہ سے لوگ گناہ کرتے ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۷' شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۳۹)

۴۳۶ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی رحمت اور توفیق ملتی ہے کہ لوگ نیک اعمال کر کے اپنے لیے جنت کے دروازے کھلوا لیتے ہیں اور گناہوں سے توبہ کر کے جہنم کے دروازے بند کروا دیتے ہیں اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ رمضان میں حقیقۃً جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (مرقات ج ۴ ص ۴۴۳' شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۳۹)

۴۳۷ علامہ خازن نے ذیل میں اس حدیث کی تشریح فرمادی ہے لیکن آخری جملہ کی تشریح نہیں فرمائی۔ سو وہ یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اور رضائے الٰہی کے لیے روزہ رکھنے والے کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے' اس سے مراد وہ گناہ ہیں جو صغیرہ ہوں اور حقوق اللہ سے متعلّق ہوں۔ کیونکہ حقوق العباد سے تعلّق رکھنے والے گناہوں کی معافی بندوں کے معاف کرنے پر موقوف ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۳۳۸) علامہ علی قاری حنفی نے امام نووی کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ جو اعمال شرعاً گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں' اُن میں تفصیل یہ ہے کہ وہ صغیرہ گناہوں کو مٹا دیتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کے عذاب کو کم کر دیتے ہیں اور بے گناہوں کے درجات بلند کر دیتے ہیں۔ (مرقات ج ۴ ص ۴۴۵' مرآۃ المناجیح ج ۳ ص ۱۳۶)

(۱۹۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے اپنے لیے ہوتا ہے اور اُس کے ہر اچھے عمل کا اجر دس سے سات سو گنا تک بڑھا کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سوائے روزہ کے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اُس کی جزا ہوں۔ آدمی میری خاطر اپنی خواہش اور کھانے پینے کو چھوڑ دیتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی (اُسے) اُس وقت ہوتی ہے جب وہ افطار کرتا ہے۔ دوسری خوشی اس وقت ہو گی جب وہ اپنے رب (عزوجل) سے ملاقات کرے گا۔ اور روزہ دار کے منہ کی جو بُو ہے وہ اللہ کے نزدیک یقیناً مُشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ (ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ) روزہ ایک ڈھال ہے۔ لہٰذا تم میں سے جب کسی کا روزہ ہو تو وہ اُس میں نہ تو فحش کلامی کرے اور نہ شور شرابا کرے۔ اور اگر اُسے کوئی گالی دے یا اُس سے کوئی جھگڑا کرے تو اتنا کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔[۴۳۸] (صحیح بخاری: ۱۹۰۴، صحیح مسلم: ۱۱۵۱، سنن نسائی: ۲۲۵۱، سنن ابن ماجہ: ۱۶۳۸، سنن ترمذی: ۷۶۴، مسند احمد ج ۲ ص ۲۶۶۔۲۸۱، سنن دارمی: ۱۷۷۰، سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۰۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۵۹۔ ص ۱۷۳)

حدیث مذکور: ۱۹۸ کی مختصر تشریح

حدیث مذکور میں فرمایا: ''کل عمل ابن ادم لہ'' ابن آدم کا ہر عمل اُس کے اپنے لیے ہوتا ہے سوائے روزہ کے کہ وہ میرے لیے ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر عمل میں ابن آدم کا اپنا حصہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا عمل لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے مگر روزہ ایسا عمل ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلتا۔ ویسے تو تمام ہی نیک اعمال اللہ کے لیے ہوتے ہیں اور وہ اُن کا بدلہ عطا فرماتا ہے لیکن حدیث شریف میں صرف روزہ کے متعلق فرمایا کہ یہ میرے لیے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ کا اظہار نہ تو آدمی کے قول سے ہوتا ہے اور نہ فعل سے۔ اور فرشتے اس کو نامۂ اعمال میں درج کر لیتے ہیں۔ اور یہی روزہ ایک ایسا عمل ہے جو نیت کے واسطہ سے دل سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ عزوجل کے سوا کوئی اس عبادت پر مطلع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے ہی ذمہ ہے کہ میں بغیر کسی حساب و کتاب کے اپنی مرضی کے مطابق اس کو جزا دوں۔ حدیث مذکور میں جو فرمایا: ''فرحۃ عند فطرہ'' روزہ دار کے لیے ایک خوشی وہ ہے جو اُسے افطار کے وقت ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ روزہ دار چونکہ بھوکا ہوتا ہے اور کھانا کھانے سے نفس کی ضرورت اور تقاضا پورا ہوتا ہے اس لیے کھانے سے روزہ دار کو فرحت ملتی ہے۔ بعض علماء نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ روزہ دار (افطار کر کے) اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے روزہ مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی جس پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ اسی کو بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے آگے فرمایا کہ ایک خوشی اس وقت ہو گی جب وہ اپنے رب عزوجل سے ملاقات کرے گا کیونکہ اُسے عظیم الشان اجر و ثواب نظر آئے گا۔ اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''خلوف'' اس کو خاء کے زبر اور پیش دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس کا معنیٰ ہے: کھانے میں تاخیر کی وجہ سے منہ کے ذائقہ اور بو کا تبدیل ہو جانا۔ آگے جو فرمایا کہ ''روزہ دار کی یہ بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک سے زیادہ پاکیزہ ہے'' اس میں

[۴۳۸] یہ حدیث مفصل ہے اور روزہ کی بہت سی خوبیوں اور فضیلتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ علامہ خازن نے اس کی بہت عمدہ اور جامع شرح آگے بیان فرما دی ہے البتہ آخری جملہ کی شرح نہیں فرمائی۔ سو وہ یہ ہے کہ روزہ دار کو جب کوئی شخص گالی دے یا جھگڑا کرے تو روزہ دار شخص صرف اتنا کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔ یعنی روزہ کی وجہ سے میں اپنی زبان کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا اس لیے تم مجھ سے جھگڑا نہ کرو۔ دوسرا معنیٰ اس کا یہ ہے کہ روزہ کی وجہ سے میں اللہ عزوجل کے ذمہ کرم میں ہوں اس لیے نہ تمہیں جھگڑا کرنا مناسب اور نہ مجھے تم سے بدلہ لینا مناسب۔ ایک معنیٰ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آدمی یہ جملہ اپنے دل میں کہہ لے تاکہ اُسے یہ ذہن میں رہے کہ غصہ کرنا اور زبان کو آلودہ کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ (مرقات ج ۴ ص ۴۴۸)

روزہ دار کی تعریف ہے اور روزہ دار کے فعل پر خوشنودی کا اظہار ہے' تا کہ روزہ رکھنے والا اپنے اُس روزہ کی پابندی کو ترک نہ کرے جس کی وجہ سے اُسے یہ بو ملی۔ روزہ دار کے منہ کی بو کو مشک سے زیادہ پاکیزہ قرار دینے کا اصل معنٰی یہ ہے کہ تمہارے نزدیک مشک کی خوشبو کو جو اہمیت حاصل ہے اُس سے کہیں زیادہ مرتبہ' قبولیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس بو کو حاصل ہے جو روزہ دار کے منہ سے آتی ہے۔ اس حدیث میں فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے اس سے مراد یہ ہے کہ روزہ گناہوں سے بچاؤ کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ روزہ خواہشِ نفس کو توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اس لیے آدمی گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''فلا یرفث'' یہ کلمہ ہر اُس چیز کو شامل ہے جو آدمی اپنی بیوی سے چاہتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے: کھلے لفظوں میں مجامعت اور صحبت کی باتیں کرنا (یہ تمام چیزیں روزہ میں ممنوع ہیں)۔ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''ولا یصخب'' یہ ''صخب'' سے ہے اور ''صخب'' کا معنٰی ہے: شور شرابا' چیخنا' چلانا۔

(۱۹۹) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو ریان کہا جاتا ہے اُس سے قیامت کے دن روزہ دار داخل ہوں گے۔ پکارا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ یہ سن کر روزہ دار کھڑے ہو جائیں گے۔ اور ان کے سوا کوئی اور اُس دروازہ سے داخل نہیں ہوگا۔ جب روزہ دار اُس دروازہ سے داخل ہو جائیں گے تو اُس دروازہ کو بند کر دیا جائے گا' پھر اُس سے کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔

(صحیح بخاری:۱۸۹۶' صحیح مسلم:۱۱۵۲' سنن ترمذی:۷۶۵' سنن نسائی:۲۲۳۶' سنن ابن ماجہ:۱۶۴۰' صحیح ابن حبان:۳۴۲۰' سنن بیہقی ج ۴ص ۳۰۵)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جنت میں آٹھ دروازے ہیں۔ اُن میں سے ایک دروازہ کو ریان کہا جاتا ہے' اُس سے صرف اور صرف روزہ دار داخل ہوں گے۔[۴۳۹] (صحیح بخاری:۳۲۵۷' مشکوٰۃ المصابیح:۱۹۵۷۔ ص ۱۷۳)

(۲۰۰) حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے ایسی بات کا حکم فرمائیں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ عطا فرمائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم روزہ رکھا کرو' کیونکہ اُس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ابوامامہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کون سا عمل زیادہ بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم روزہ رکھا کرو' کیونکہ اُس کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔[۴۴۰] (سنن نسائی:۲۲۲۱۔۲۲۲۲)

---

۴۳۹ یعنی وہ V.I.P گیٹ ہوگا' اُس سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے۔ اُس کا نام ''ریّان'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ ریّان کا معنٰی سیراب ہے۔ چونکہ روزہ داروں نے اللہ عزوجل کی خاطر دنیا میں بہت زیادہ بھوک اور پیاس برداشت کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے اپنے دیدار اور جنت کی دیگر نعمتوں کے علاوہ داخلہ کا دروازہ بھی ایسا مقرر فرمایا جس کے پاس پہنچتے ہی سب پیاسیں ختم ہو جائیں۔ علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ روزہ داروں نے دُنیا میں بھوک اور پیاس دونوں کو برداشت کیا لیکن دروازہ صرف پیاس کی مناسبت سے رکھا گیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ پیاس بھوک سے زیادہ مشقت کا باعث ہوتی ہے' خصوصاً اس وقت جب کہ گرمی اپنے عروج پر ہو۔ پھر یہ کہ بھوک برداشت ہو جاتی ہے لیکن پیاس بسا اوقات برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ (مرقات ج ۴ص ۴۴۴)

۴۴۰ اس سے نفلی روزے مراد ہیں۔ واضح رہے کہ متعدد مقامات پر نبی اکرم ﷺ سے یہ سوال کیا گیا کہ بہترین عمل کون سا ہے؟ اور آپ نے مختلف جوابات ارشاد فرمائے۔ کہیں آپ نے فرمایا کہ نماز کو وقت پر ادا کرنا بہترین عمل ہے' کہیں فرمایا کہ اللہ عزوجل پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا بہترین عمل ہے اور کہیں فرمایا کہ روزہ رکھنا بہترین عمل ہے (جیسا کہ زیرِ بحث حدیث میں ہے۔) ایک ہی سوال کے جواب میں مختلف اعمال کو ذکر کرنے کی علماء نے وجہ یہ بیان کی ہے نبی اکرم ﷺ جواب میں سائل کی طبیعت اور مزاج کا بھی لحاظ رکھتے تھے اور اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے کہ سائل کے لیے زیادہ مفید و مناسب اور ضروری چیز کون سی ہے اور ساتھ ساتھ آپ موقع محل' زمانہ اور ماحول کا بھی لحاظ فرماتے تھے اس لیے ایک ہی سوال کے جواب میں آپ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور (اے رسولِ مکرم!) جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو (آپ فرما دیں کہ) میں بلاشبہ ان کے قریب ہوں، دُعا کرنے والا جب مجھ سے دُعا کرتا ہے تو میں اُس کی دُعا قبول کرتا ہوں لہٰذا لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان برقرار رکھیں، تا کہ انہیں کامیابی حاصل ہو O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مختلف روایات

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے محمد! جب تمہارا خیال یہ ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے تو پھر ہمارا رب ہماری دُعائیں کیسے سنتا ہے؟ اس کے جواب میں مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔ بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ چند صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اُس سے سرگوشی کریں؟ یا وہ دور ہے کہ ہم اُسے پکاریں؟ اس کے جواب میں مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا: کس وقت ہم اپنے رب (عزوجل) سے دُعا کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواباً آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ بعض مفسرین بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ ہمارا رب کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال اور اس کی مختلف صورتیں

لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو سوال کیا اس کی تین صورتیں ہیں۔ یا تو یہ سوال اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں تھا یا اُس کی صفات کے بارے میں تھا یا پھر اُس کے افعال اور کاموں کے بارے میں تھا۔ جہاں تک اللہ عزوجل کی ذات کے بارے میں سوال کا تعلّق ہے تو اُس سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل اپنی ذات کے اعتبار سے ہم سے قریب ہے یا بعید؟ اور صفات کے بارے میں سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہمارا رب ہماری دُعا کو سنتا ہے؟ اور افعال کے بارے میں سوال سے مراد یہ ہے کہ جب ہم اپنے رب سے دُعا کرتے ہیں تو کیا وہ اس کو قبول فرماتا ہے؟ بہرحال آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کا جو فرمان ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ اس میں سوال سے تینوں ہی صورتیں مراد ہو سکتی ہیں۔

"فانی قریبٌ" میں اللہ تعالیٰ کے قرب کی تفسیر

آیت میں جو فرمایا کہ "بلاشبہ میں (اپنے بندوں کے) قریب ہوں" اس سے مراد یہ ہے کہ میں بندوں کا علم رکھتا ہوں اور اُن کی حفاظت کرتا ہوں اور مجھ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اُس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مختلف اعمال کا ذکر فرماتے تھے۔ (دیکھئے: عمدۃ القاری ج ۴ ص ۲۰، مرقات ج ۲ ص ۱۷۲) زیر بحث حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال کرنے پر روزہ کو بہترین عمل قرار دیا۔ ممکن ہے یہ اُن کے مزاج یا ضرورت کے زیادہ موافق ہو۔ بہرصورت روزہ کا بہترین ہونا کئی اعتبار سے ہے۔ ایک تو یہ کہ روزہ ایک پوشیدہ عمل ہے جس میں ریا کاری کا امکان نہیں ہے اور پوشیدہ عمل زیادہ محبوب اور مقبول ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ روزہ میں بھوک پیاس کو برداشت کر کے آدمی کے دل میں غرباء فقراء سے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور یہ حقوق العباد کا اہم شعبہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ روزہ کی وجہ سے کھانے پینے کو ترک کر کے آدمی اللہ عزوجل کی صفت کا مظہر بن جاتا ہے اور یہ حقوق اللہ کی ادائیگی کا اعلیٰ مقام ہے۔ اس طرح کی متعدد وجوہ کے اعتبار سے روزہ ایک بہترین عمل ہے۔

سے دُعا کرتا ہے وہ اُس کی دُعا کو آسانی کے ساتھ قبول فرمالیتا ہے اور جو اُس سے سوال کرتا ہے وہ اس کو پورا فرماتا ہے۔

(۲۰۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تو لوگوں نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا اور بلند آواز سے یہ تکبیر کہنے لگے: ''اللّٰہ اکبر لا الٰہ الا اللّٰہ'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو' تم نہ تو کسی بہرے کو پکار رہے ہو اور نہ کسی غائب کو۔ بلکہ تم اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا اور دیکھنے والا اور قریب ہے اور تمہارے ساتھ ہے۔[۴۴۱] (صحیح بخاری: ۲۹۹۲-۴۲۰۵' صحیح مسلم: ۲۷۰۴' سنن ترمذی: ۳۴۶۱' سنن ابوداؤد: ۱۵۲۶' مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۹' عمل الیوم واللیلہ لابن السنی: ۵۱۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۰۳۔ ص ۲۰۱)

☆ اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''اربعوا علی انفسکم'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اپنی جانوں پر نرمی کرو۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اپنی آواز کو بلند کرنے سے رُک جاؤ' کیونکہ اللہ تعالیٰ قریب ہے اور تمہاری دُعا کو سنتا ہے۔

زیر بحث آیت میں آگے فرمایا: ﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ یعنی دُعا کرنے والا بندہ جب مجھ سے دُعا کرتا ہے تو میں اُس کی دُعا کو سنتا ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ دُعا کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اقرار کیا جائے اور اس کی تعریف کی جائے۔ جیسے آدمی کہتا ہے: ''اے اللہ! تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے''۔ اس جملہ میں اللہ کو پکارنا بہ طور دعا ہے۔ اور جب یہ کہا گیا کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے تو اس میں اللہ عزوجل کے ایک ہونے کا اقرار بھی ہے اور اس کی تعریف بھی ہے اور اسی اعتبار سے اس کو دُعا کہا گیا ہے اور لفظ کی باہمی مجانست کی وجہ سے دُعا کی قبولیت کو اجابت کا نام دیا گیا ہے۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ اُس کا کوئی پروردگار اور تدبیر کرنے والا ہے جو اُس کی دُعا کو سنتا ہے اور جو شخص اُس کی ذات سے اُمید رکھے تو وہ اس کی امید کو ناکام نہیں فرماتا۔ اور ظاہر بات ہے کہ بندہ کے جب علم میں یہ بات ہو کہ اُس کا کوئی پروردگار ہے پھر وہ اخلاص اور گریہ وزاری کے ساتھ دُعا کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کی دُعا کو قبول فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ ''میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتا ہوں'' جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی لوگوں کی دُعا قبول نہیں ہوتی؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ ہم کئی دُعا کرنے والوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ بہت کثرت کے ساتھ دُعا اور گریہ وزاری کرتے ہیں لیکن اُن کی دعا قبول نہیں ہوتی' پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے کہ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتا ہوں۔ (البقرہ: ۱۸۶) اور تم مجھ سے دُعا کیا کرو میں تمہاری دُعا کو قبول کرتا ہوں۔ (المؤمن: ۶۰)

اس سوال کے علماء نے کئی جوابات ذکر کیے ہیں: (۱) ایک جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں مطلقاً ارشاد ہے کہ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتا ہوں' جبکہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے چاہنے کی قید مذکور ہے' ارشادِ باری ہے:

---

[۴۴۱] اس حدیث سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلند آواز سے ذکر واذکار کرنا منع ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ متوسط بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا مستحب ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس ذکر سے کسی کی عبادت' مطالعہ' نیند اور کسی بیمار کے آرام میں خلل واقع نہ ہو اور یہ ذکر ریا کاری سے خالی ہو۔ زیر بحث حدیث میں بلند آواز سے ذکر کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ حد سے زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنے اور گلا پھاڑ کر چلانے سے منع کیا گیا ہے جیسے بہرے آدمی سے چلا کر بات کی جاتی ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۴۷۹) حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ زیر بحث حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو بلند آواز کے ساتھ تکبیر کہنے سے جو منع فرمایا وہ ناجائز ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس لیے منع فرمایا تا کہ آسانی اور جسم پر نرمی ہو۔ حق یہ ہے کہ جب کوئی رکاوٹ نہ ہو تو بلند آواز سے ذکر کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۲ ص ۲۲۹)

بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (الانعام: ۴۱)

بلکہ (عذابِ الٰہی یا قیامت کے آ جانے کی صورت میں) تم اللہ ہی کو پکارو گے پھر اگر وہ چاہے گا تو اُس تنگی کو دور فرما دے گا جس کے لیے تم اس کو پکارو گے۔

یہ آیت مقید ہے اور زیرِ بحث آیت مطلق ہے اور (قاعدہ ہے کہ) مطلق کو مقید پر محمول کر دیا جاتا ہے[۴۴۲] (لہٰذا دُعا کی قبولیت کا معیار اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اُس کی چاہت ہے)۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ''میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتا ہوں'' اس میں دُعا سے مراد اطاعت ہے اور قبولیت سے مراد اجر وثواب ہے۔ اور اجر وثواب آخرت میں ملے گا۔ (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے لیکن ان کا معنیٰ خاص ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو اُس وقت قبول کرتا ہوں جب وہ تقدیر کے مطابق ہو یا پھر یہ معنیٰ ہے کہ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو اُس صورت میں قبول کرتا ہوں جب اُس دعا کی قبولیت اُس کے حق میں بہتر ہو۔ یا یہ معنیٰ ہے کہ میں دُعا کرنے والے کی دُعا اُس صورت میں قبول کرتا ہوں جب وہ کسی غلط یا ناممکن بات کا سوال نہ کرے۔[۴۴۳] (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت کے معنیٰ میں عموم ہے یعنی قبول کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ میں دُعا کو سنتا ہوں۔ جہاں تک مطلوبہ چیز دینے کا تعلق ہے سو اُس کا آیت میں تذکرہ نہیں ہے۔ لہٰذا قبولیت (سُننے کے معنیٰ میں) ضرور پائی جاتی ہے جب دُعا کی جاتی ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ آقا اپنے غلام کی بات کو قبول کر لیتا ہے لیکن (کسی حکمت کے پیشِ نظر) اُس کی مطلوبہ چیز اُس کو فراہم نہیں کرتا۔ (۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ دُعا کے کچھ آداب اور شرائط ہیں۔ اور وہی آداب وشرائط قبولیت کا باعث ہیں۔ لہٰذا جو شخص اُن آداب وشرائط کو کامل طریقہ سے انجام دیتا ہے اُس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور جو آداب وشرائط میں خطا کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی دُعا میں ظلم کرتا ہے۔ نتیجۃً وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اُس کی دُعا قبول ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ یعنی جب میں لوگوں کو ایمان اور اطاعت کی طرف بلاؤں تو لوگوں کو میرا حکم ماننا چاہیے جس طرح میں اُن کی بات پوری کرتا ہوں جب وہ اپنی ضروریات کے لیے مجھ سے دُعا کرتے ہیں۔ ☆ اجابت کا لغوی معنیٰ ہے: اطاعت اور فرمانبرداری کرنا۔ جب اجابت بندہ کی طرف سے ہو تو اُس سے اطاعت مراد ہوتی ہے اور جب اللہ عزوجل کی طرف سے ہو تو اس سے اجر وثواب اور عطا مراد ہوتی ہے۔

﴿لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ تاکہ (مجھ پر ایمان لاکر) لوگوں کو اُن کے دین اور دُنیا کے کاموں میں رہنمائی حاصل ہو۔

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں دُعا کے فضائل اور آداب

(۲۰۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمارا رب ہر رات کو اُس وقت

۴۴۲ احناف کے نزدیک یہ قاعدہ علی الاطلاق دُرست نہیں ہے۔ علماء اصول کے بیان کے مطابق احناف کا مؤقف یہ ہے کہ جب مطلق اور مقید حکم میں وارد ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا لیکن جب مطلق اور مقید سبب یا شرط میں وارد ہوں (یعنی جب کسی حکم کا سبب یا شرط مطلق اور مقید دونوں طرح سے وارد ہو) تو مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ (تفصیل کے لیے کُتب اصول اور تبیان القرآن ج۴ ص۳۲۵ کا مطالعہ فرمائیں۔)

۴۴۳ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو شخص دُعا کرتا ہے اللہ عزوجل اس کو اُس کی مطلوبہ چیز عطا فرماتا ہے یا اُس جیسی کوئی مصیبت اُس سے دُور فرما دیتا ہے بہ شرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دُعا نہ کرے۔ (سنن ترمذی: ۳۳۸۱۔۳۵۷۳)

آسمانِ دُنیا کی طرف نزول فرماتا ہے جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے[۴۴۴] پھر وہ فرماتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دُعا مانگے تو میں اُس کی دعا کو قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اُس کو عطا کروں؟ کون ہے جو بخشش طلب کرے تو میں اُس کی بخشش کر دوں؟ (صحیح بخاری:۱۱۴۵، صحیح مسلم ۷۵۸، سنن ترمذی:۴۴۶، سنن ابوداؤد:۱۳۱۵، سنن ابن ماجہ:۱۳۶۶، سنن دارمی:۱۴۷۹، مسند احمد ج۲ ص۲۶۴، مشکوٰۃ المصابیح:۱۲۲۳۔ ص۱۰۹)

حدیث مذکور:۲۰۲ کی مختصر تشریح

اس حدیث کا تعلق احادیثِ صفات سے ہے اور اس کے بارے میں علماء کے دو معروف مذہب ہیں۔(۱) ایک مذہب وہ ہے جو جمہور اسلاف اور بعض متکلّمین کا ہے کہ اس حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کے نزول کا تذکرہ ہے اُس پر ایمان لانا اور اس کو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق حق جاننا واجب ہے اور ہم اس کا علم اللہ عزوجل اور اس کے رسول (ﷺ) کے سپرد کرتے ہیں اور نزول کا وہ معنیٰ جو بندوں کے حق میں معروف ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے جو مراد ہے اُس کے بارے میں ہم گفتگو نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات سے بھی پاک ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے اور ہلنے جلنے کی صفت سے بھی پاک ہے۔ (۲) دوسرا مذہب جو اکثر متکلّمین اور اسلاف کی ایک جماعت کا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کی جو احادیث ہیں اُن کا ایسا مفہوم بیان کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہو۔ اسی بنیاد پر امام مالک اور دیگر علماء سے یہ منقول ہے کہ حدیثِ مذکور میں اللہ تعالیٰ کے نزول سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، اُس کا حکم اور اس کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے نزول کا لفظ استعارہ کے طور پر ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعا کرنے والوں کی طرف قبولیت اور لطف کے ساتھ توجہ فرماتا ہے۔ حدیث مذکور میں ہمیں دُعا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(۲۰۳) حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک تمہارا رب بہت حیا فرمانے والا اور کریم ہے، اُس کا بندہ جب اُس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اُن کو خالی اور نامراد لوٹانے سے حیا فرماتا ہے[۴۴۵]

(سنن ترمذی:۳۵۵۶، سنن ابوداؤد:۱۴۸۸، سنن ابن ماجہ:۳۸۶۵، المستدرک ج۱ ص۴۹۸، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۴۴۔ ص۱۹۵)

---

[۴۴۴] رات کے آخری تہائی حصہ میں چونکہ غفلت بھی پائی جاتی ہے اور اخلاص بھی اپنے عروج پر ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس وقت نزول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیات سے پاک ہے اس لیے اس کے نزول فرمانے کے علماء نے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ ایک معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت دُعائیں قبول فرماتا ہے اور رحمت و رضوان کی خوب بارش فرماتا ہے۔ ایک معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا خاص حکم فرشتوں پر نازل فرماتا ہے۔ قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمۃ کے نزدیک نزول سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کا لطف و کرم بندوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ بعض صوفیاء کرام کے نزدیک نزول سے مراد ہے منتقل ہونا یعنی اللہ تعالیٰ صفاتِ جلال سے صفاتِ جمال کی طرف نزول فرماتا ہے (صفاتِ جلال سے مراد ہے گناہ گاروں کو سزا دینا، نافرمانوں کی طرف توجہ نہ فرمانا وغیرہ اور صفاتِ جمال سے مراد ہے گناہوں کو ڈھانپ دینا، معذرت قبول فرمانا، حاجتوں کو پورا کرنا وغیرہ)۔ (مرقات ج۳ ص۳۰۱)

[۴۴۵] اللہ تعالیٰ کے حیاء فرمانے سے مراد یہ ہے کہ وہ دُعاؤں کو بلا کسی وجہ اور حکمت کے رد نہیں فرماتا۔ حیاء کا اصل معنیٰ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا مفہوم علامہ خازن البقرہ:۲۶ کی تفسیر میں بیان فرما چکے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حیاء اُس غیرت کا نام ہے جو آدمی پر مذمت کے خوف سے طاری ہوتی ہے۔ یہ معنیٰ آدمی کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے۔ لہٰذا اُس کے حق میں جب حیاء کا لفظ استعمال ہوگا تو اُس سے کسی کام کو ترک کرنا مراد ہوگا۔ لہٰذا حدیث شریف میں جو فرمایا کہ بے شک تمہارا رب بہت حیاء فرمانے والا اور کریم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مانگنے والے کی حاجت اور سوال کو رد نہیں فرماتا۔ علامہ علی قاری فرماتے ہیں: کریم سے مراد یہ ہے کہ وہ بن مانگے عطا فرماتا ہے۔

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔ ☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''صفر'' اس کا معنیٰ ہے: خالی۔ جب کوئی گھر سامان سے خالی پڑا ہو تو اُس کو عربی میں کہا جاتا ہے: ''بَیْتٌ صَفِرٌ'' خالی گھر۔

(۲۰۴) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زمین پر جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے یا پھر اُس سے اُس چیز کی مثل کوئی بُرائی دور فرما دیتا ہے بشرطیکہ بندہ کسی گناہ کی یا قطع تعلّقی کی دُعا نہ کرے۔[۴۴۶] (دُعا کی قبولیت کی یہ خوش خبری سُن کر) قوم کے ایک شخص نے کہا: تب تو ہم زیادہ دُعا مانگیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ (بھی) بہت زیادہ فضل فرمانے والا ہے۔

(سنن ترمذی: ۳۵۷۳، مسند احمد ج ۵ ص ۳۲۹، شعب الایمان للبیہقی: ۱۱۳۱، المعجم الاوسط: ۱۴۷، مستدرک ج ۱ ص ۴۹۳، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۴۷۲، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۴۸، کنز العمال: ۳۲۲۴۹، مشکوٰۃ: ۲۲۵۹۔ ص ۱۹۶)

(۲۰۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح دُعا کرو کہ تمہیں قبولیت کا یقین ہو[۴۴۷]، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اُس دُعا کو قبول نہیں فرماتا جو غافل اور غیر متوجہ دل کے ساتھ مانگی جائے۔

(سنن ترمذی: ۳۴۷۹، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۳، الدر المنثور ج ۱ ص ۱۹۵، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۴۷۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۴۱۔ ص ۱۹۵)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

(۲۰۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مرتبہ دُعا کو حاصل ہے۔[۴۴۸] (سنن ترمذی: ۳۳۷۰، سنن ابن ماجہ: ۳۸۲۹، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۴۷۱، الادب المفرد: ۷۱۲، مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۲، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۳۲۔ ص ۱۹۴)

(۲۰۷) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دُعا عبادت کا مغز ہے۔

(سنن ترمذی: ۳۳۷۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۳۱۔ ص ۱۹۴)

---

[۴۴۶] گناہ اور قطعیت رحم دونوں سے مراد اللہ عزوجل کی نافرمانی ہے۔ لیکن علامہ علی قاری (رحمۃ اللہ علیہ) کی تصریح کے مطابق گناہ سے وہ نافرمانی مراد ہے جس کا نقصان اپنی ذات تک محدود ہو اور قطعیت رحم سے وہ نافرمانی مراد ہے جس کا نقصان لوگوں کو بھی پہنچے۔ (مرقات ج ۵ ص ۲۹) حاصل یہ کہ آدمی کو نہ ایسی چیز کی دُعا مانگنی چاہیے جس کا نقصان اپنی ذات کو پہنچے اور نہ ایسی چیز کی جو دوسروں کے لیے نقصان دِہ ہو۔ گناہ اور قطعیت رحم کی وضاحت یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ گناہ سے حقوق اللہ میں نافرمانی کرنا مراد ہے اور قطعیت رحم سے حقوق العباد میں نافرمانی کرنا مراد ہے۔

[۴۴۷] قبولیت کے یقین سے مراد یہ ہے کہ دُعا ایسی کیفیت میں مانگو جو قبولیت کا باعث ہو۔ یعنی اچھے اعمال کرو، بُرائیوں سے پرہیز کرو، قابل احترام مقامات اور بابرکت اوقات میں دُعا مانگو، دُعا کے وقت دل کو حاضر رکھو اور اس طرح کے دیگر آداب و شرائط کو ملحوظ رکھو۔ قبولیت کے یقین کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یہ یقین رکھتے ہوئے دُعا مانگو کہ وہ اپنے فضل و کرم سے رد نہیں فرمائے گا۔ حدیث قدسی میں رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے میں اُس کے مطابق اُس سے پیش آتا ہوں۔ (مرقات ج ۵ ص ۲۰)

[۴۴۸] یعنی ذکر و اذکار میں سب سے زیادہ مرتبہ دُعا کو حاصل ہے بہ شرطیکہ اس میں اُس کے آداب و شرائط ملحوظ رکھے جائیں۔ تمام اذکار میں دُعا کو مرتبہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بندہ اپنے مولیٰ کے حضور اپنے عاجز اور بے بس ہونے کا اعتراف و اظہار کرتا ہے اور اپنی بے بسی کا اعتراف ہی رب تعالیٰ کی معرفت اور پہچان کی بنیاد ہے۔ جیسا کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے فرمایا کہ: ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' (جس نے اپنے بے بس اور عاجز ہونے کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔) اور رب کی معرفت چونکہ سب سے بڑی نعمت ہے اس لیے اُس کے حصول کا ذریعہ (دُعا) بھی بہت اعلیٰ و ارفع اور بُلند ہے۔

(۲۰۸) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے لیے دُعا کا دروازہ کھل گیا اُس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے اور آدمی اللہ تعالیٰ سے جس چیز کا بھی سوال کرتا ہے اُس میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ آدمی اُس سے عافیت کا سوال[۴۴۹] کرے اور بلا شبہ دُعا آئی ہوئی مصیبتوں میں بھی فائدہ دیتی ہے اور اُن مصیبتوں میں بھی فائدہ دیتی ہے جو ابھی آئی نہیں ہیں۔

(سنن ترمذی:۳۵۴۸، المستدرک ج۱ص۴۹۲ـ۴۹۸، الترغیب والترہیب ج۲ص۲۷۲، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۳۴ـ۲۲۳۹ـص۱۹۵)

(۲۰۹) حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صرف دُعا ایسی چیز ہے جو تقدیر کو ٹال دیتی ہے[۴۵۰] اور صرف بھلائی ایسی چیز ہے جو عمر میں اضافہ کرتی ہے۔ (سنن ترمذی:۲۱۳۹، سنن ابن ماجہ:۹۰ـ۴۰۲۲، مسند احمد ج۵ص ۲۷۷، المعجم الکبیر:۱۴۴۲، المستدرک ج۱ص۴۹۳، الترغیب والترہیب ج۳ص۲۱۲، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۳۳ـص۱۹۵)

(۲۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اُس پر غضب ناک ہوتا ہے (یعنی سزا کا ارادہ فرماتا ہے)۔

(سنن ترمذی:۳۳۷۳، سنن ابن ماجہ:۳۸۲۷، مسند احمد ج۲ص۴۴۳، المستدرک ج۱ص۴۹۱، الدر المنثور ج۵ص۳۵۶، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۳۸ـص۱۹۵)

(۲۱۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی بھی شخص کی دُعا اس وقت قبول ہوتی ہے جب وہ جلدی نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی اور قبول نہیں ہوئی۔ صحیح مسلم کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب تک آدمی کسی گناہ اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے اور قبولیت کے لیے جلدی نہ کرے تو اُس کی دُعا قبول ہوتی رہتی ہے[۴۵۱] پوچھا گیا: یا رسول اللہ! جلدی سے کیا مراد ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: جلدی یہ ہے کہ بندہ یوں کہے کہ میں نے دُعا کی، میں نے دُعا کی لیکن قبول نہیں ہوئی۔ پھر تھک ہار کر دُعا کرنا ہی چھوڑ دے۔

(صحیح بخاری:۶۳۴۰، صحیح مسلم:۲۷۳۵، سنن ترمذی:۳۳۸۷، سنن ابوداؤد:۱۴۸۴، سنن ابن ماجہ:۳۸۵۳، مشکوٰۃ المصابیح:۲۲۲۷ـص۱۹۴)

---

۴۴۹ یعنی دُنیا میں بھی سلامتی اور آخرت کے لیے بھی سلامتی کی دُعا کرے۔ دُنیا میں سلامتی سے مراد یہ ہے کہ صحت وطاقت اور علم وعمل حاصل ہو اور آخرت میں سلامتی سے مراد یہ ہے کہ حشر کی سختی اور رسوائی سے پناہ حاصل ہو۔ دُنیا و آخرت دونوں کی سلامتی طلب کرنے کے لیے جامع ترین کلمات یہ ہیں: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ (البقرہ:۲۰۱) اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

۴۵۰ تقدیر تین طرح کی ہے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی چیز پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا وقوع فائنل ہو چکا ہے (اس کو تقدیر مُبرم کہتے ہیں)۔ دوسری وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی چیز پر موقوف ہے لیکن فرشتوں کے پاس اس کا وقوع فائنل ہے (اس کو تقدیر معلق شبیہ بہ مبرم کہتے ہیں)۔ تیسری وہ جو فرشتوں کے پاس کسی چیز پر موقوف ہو (اس کو تقدیر معلق محض کہتے ہیں)۔ (ملتقطہ بہار شریعت) زیر بحث حدیث شریف میں جو فرمایا کہ دُعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے اس سے دوسری اور تیسری قسم مراد ہے۔ پہلی قسم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح آگے جو فرمایا کہ بھلائی (یعنی نیک سلوک) سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اس کا تعلق بھی تقدیر کی دوسری اور تیسری قسم سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں سے خصوصاً ماں باپ اور رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کرنے کی برکت سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ عمر میں ایسی برکت دے دی جاتی ہے کہ آدمی کم عمر میں بھی بہت زیادہ نیک اعمال کر لیتا ہے اور اپنی آخرت کو سنوار لیتا ہے۔ (مرقات ج۵ص۱۴، مراۃ ج۳ص۳۲۰)

۴۵۱ اس کی تشریح اُس حدیث میں ہے جو علامہ خازن سنن ترمذی کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں۔ (دیکھئے: حدیث:۲۰۴) نیز اِس حدیث شریف کے ساتھ اس کا حاشیہ:۴۴۶ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: "یستحسر" اس کا معنیٰ ہے: مانگنے کو چھوڑ دینا۔ یہ لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے "حسر الطرف" سے ماخوذ ہے اور یہ جملہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب نگاہ تھک جائے اور کمزور ہو جائے۔

(۲۱۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص دُعا کرے تو یوں نہ کہے کہ: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما، بلکہ پورے عزم اور اصرار سے مانگنا چاہیے کیونکہ رب تعالیٰ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔[۴۵۲]

صحیح بخاری کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ کوئی شخص یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے رزق دے دے، بلکہ پورے عزم کے ساتھ آدمی کو سوال کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اُس کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

(صحیح بخاری: ۶۳۳۸۔ ۷۴۷۷، صحیح مسلم: ۶۷۰۹، ۲۶۷۹، سنن ترمذی: ۳۴۹۷، سنن ابوداؤد: ۱۴۸۳، سنن ابن ماجہ: ۳۸۵۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۲۵۔ ص ۱۹۴)

☆ اس حدیث شریف میں ایک جملہ آیا ہے: "لیعزم المسئلہ" اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اپنی دُعا میں تردّد کا اظہار نہ کیا کرو، بلکہ پورے عزم اور کوشش سے دُعا مانگا کرو۔

(۲۱۳) حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں دُعا کرتے ہوئے سُنا اور اُس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود نہیں پڑھا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس شخص نے جلدی کی۔ پھر اُسے بُلایا اور اُس کو یا کسی اور شخص کو فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اللہ کی حمد اور اس کی تعریف سے آغاز کرے، پھر نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھے، پھر جو چاہے دُعا کرے۔[۴۵۳]

(سنن ترمذی: ۳۴۷۷، سنن ابوداؤد: ۱۴۸۱، سنن نسائی: ۱۲۸۴، مسند احمد ج ۶ ص ۱۸، المستدرک ج ۱ ص ۲۳۰، مشکوٰۃ: ۹۳۰۔ ص ۸۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔـٰنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

[۴۵۲] مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہوتا بھی وہی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ لیکن بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب سے مکمل عزم اور یقین کے ساتھ دُعا کرے۔ کیونکہ اس طرح کہنا کہ اگر تو چاہے تو عطا فرما دے اس سے بندہ کا اپنی بے نیازی اور غیر محتاجی ظاہر کرنے کا شائبہ ہوتا ہے جبکہ رب کی بارگاہ میں نیاز مند اور محتاج ہو کر مانگنا درکار ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۴۴۰، ومرأۃ ج ۳ ص ۳۱۶)

[۴۵۳] اس حدیث شریف میں یہ نکتہ ہے کہ اللہ عزوجل کی حمد وثناء اور نبی اکرم ﷺ پر درود شریف دونوں دُعا کی قبولیت کا وسیلہ ہیں۔ جس طرح وسیلہ کے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا جا سکتا اسی طرح حمد وثناء اور درود شریف کے بغیر دُعا کی قبولیت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ (مرقات ج ۳ ص ۱۷)

روزہ کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے' وہ تمہارے لیے پردہ اور سکون کا باعث ہیں اور تم ان کے لیے پردہ اور سکون کا باعث ہو' اللہ کو علم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے' سو اُس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا' سو اب تم (چاہو تو رات میں) اُن سے عمل زوجیت کرو اور اللہ نے (تمہارے نصیب میں) جو لکھ دیا ہے اس کو تلاش کرو' اور تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ فجر کے وقت سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے الگ ہو جائے' پھر رات آنے تک روزہ کو پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو (اس دوران کسی بھی وقت) اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہ کرو' یہ اللہ کی حدود ہیں' لہٰذا تم ان کے قریب بھی نہ جانا' اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ لوگ پرہیزگار بنیں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

آیت مذکورہ کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً روزہ کا معاملہ کچھ یوں تھا کہ جب آدمی روزہ افطار کرتا تو اس کے لیے کھانا' پینا اور عمل زوجیت کرنا جائز ہو جاتا اور اس وقت تک جائز ہوتا جب تک کہ آدمی عشاء کی نماز ادا کر لے یا اُس سے پہلے سو جائے۔ یعنی آدمی نے جب عشاء کی نماز ادا کر لی یا سو گیا تو اگلی رات تک اُس کے لیے کھانا' پینا اور عمل زوجیت کرنا ممنوع ہو جاتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ عشاء کی نماز کے بعد اپنی زوجہ سے مجامعت کر بیٹھے۔ جب غسل سے فارغ ہوئے تو رونے لگے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اور آپ کی بارگاہ میں اپنی اس خطاء کا عذر پیش کرتا ہوں کہ میں عشاء کی نماز پڑھ کر اپنی زوجہ کے پاس گیا تو مجھے (اُس سے) ایسی پاکیزہ خوشبو آئی کہ میرے نفس نے مجھے فریب میں ڈال دیا اور میں نے اپنی اہلیہ سے جماع کر لیا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا: اے عمر! تمہیں یہ کام زیبا نہیں تھا۔ (ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ) کئی افراد کھڑے ہو گئے اور اُن سب نے اپنے بارے میں اُسی بات کا اعتراف کیا جو حضرت عمر نے بیان کی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر اور دیگر صحابہ کے لیے مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔

''رفث'' کی تفسیر اور مرد و عورت کو ایک دوسرے کے لیے لباس فرمانے کی توجیہ

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ﴾ روزے کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے ساتھ رفث کو حلال کر دیا گیا ہے۔ ﴿ رفث ﴾ سے مراد ایسی باتیں ہیں جن کو زبان سے کہنا بُرا معلوم ہو۔ یعنی ہم بستری اور اس کی شروعات کے متعلق گفتگو کرنا۔ آیت مبارکہ میں ''رفث'' سے کنایۃً ہم بستری کرنا ہی مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت باحیا اور بہت خوبیوں والا ہے' وہ اشارات کے ذریعہ باتیں بیان فرماتا ہے۔ لہٰذا مباشرۃ اور ملامسہ وغیرہ کے جو الفاظ وہ ذکر فرماتا ہے اُن سے یہی مجامعت اور ہم بستری مراد ہوتی ہے۔

﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں تمہارے لیے باعث سکون ہیں اور تم ان کے لیے باعث سکون ہو۔ علماء فرماتے ہیں کہ جیسا سکون زوجین کو ایک دوسرے سے حاصل ہوتا ہے ویسا کسی چیز کو دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ آیت میں میاں بیوی کو لباس اس لیے فرمایا گیا کیونکہ دونوں سوتے وقت برہنہ ہو کر ایک کپڑے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض علماء وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ لباس اُس چیز کو کہتے ہیں جو ڈھانپ لے۔ چونکہ شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کو حرام کاری سے محفوظ رکھتے ہیں اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لباس فرمایا۔ اس معنیٰ کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے کہ:

(۲۱۴) جس نے نکاح کرلیا اُس نے اپنے دین کا دو تہائی حصہ (۲/۳) محفوظ کرلیا۔[۴۵۴]
(العلل المتناہیہ لابن الجوزی: ۱۰۰۵۔ ج ۲ص ۱۲۲ المعجم الاوسط: ۶۴۳۔ ۹۸۹ ۷)

خیانت کا معنیٰ اور آیت مذکورہ میں خیانت کی تفسیر

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اللہ کو علم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ خیانت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو امین بنایا تھا اُس میں تم خیانت کرتے تھے۔ خیانت لوگوں کی یہ تھی کہ وہ روزہ کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ملتے تھے (حالانکہ اُس وقت یہ ممنوع تھا)۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم عشاء کے بعد اپنی بیویوں سے مل کر (درحقیقت) اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ اور تمہارا یہ کام ''خیانت'' ہے۔ خیانت کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھوائی جائے اور بعد میں وہ اُس امانت کو ادا نہ کرے۔ گناہ گار اور نافرمان کو بھی خائن کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے پاس اُس کا دین امانت ہوتا ہے اور وہ نافرمانی کر کے اُس میں خیانت کرتا ہے۔

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ پھر تم نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم سے درگزر فرمایا۔ اور ﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس نے تمہارے گناہ مٹا دیئے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگوں کو معمول یہ تھا کہ وہ پورے رمضان اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہیں کرتے تھے پھر چند لوگوں نے اپنے آپ سے خیانت کرنا شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ کو علم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے سو اُس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف کردیا۔ (صحیح البخاری: ۴۵۰۸)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ توبہ قبول فرما کر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فائدہ عطا فرمایا اور اُن کو رخصت اور سہولت عطا فرمائی۔

مباشرت کا معنیٰ اور ''ما کتب اللہ'' کی تفسیر

﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ اب تم اُن سے مباشرت کرلیا کرو۔ مباشرت کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اُن سے مجامعت (ہم بستری) کیا کرو۔ یہ تمہارے لیے روزہ کی راتوں میں جائز ہے۔ آیت میں جو فرمایا کہ ''اللہ نے جو لکھ دیا ہے اس کو تلاش کرو'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں اولاد کا جو فیصلہ فرمادیا ہے اس کو تلاش کرو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کھانے پینے اور مجامعت کے جائز ہونے کی جو رخصت اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دی ہے اُس کو تلاش کرو۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ شبِ قدر کو تلاش کرو۔

---

[۴۵۴] اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک راوی یزید بن ابان رقاشی ہے جس کو علماء رجال (امام ابن سعد، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، امام دارقطنی اور حافظ ابن حجر عسقلانی) نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (کذا فی تخریج البغوی و تقریب التھذیب وھامشہ) البتہ اس کی مثل ایک حدیث جس کو امام حاکم نیشاپوری نے المستدرک میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک عورت عطا فرمائی اُس کے نصف دین پر اللہ تعالیٰ نے اُس کی مدد فرمائی لہٰذا اُسے دوسرے نصف میں اللہ کا خوف رکھنا چاہیے۔ (المستدرک ج ۲ص ۱۶۱) اسی طرح امام سیوطی نے جمع الجوامع میں یہ حدیث ذکر کی کہ جو شخص رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگیا اُس نے نصف ایمان مکمل کرلیا' لہٰذا اُسے ایمان کے دوسرے نصف میں اللہ کا خوف رکھنا چاہیے۔ (جمع الجوامع: ۲۰۴۷۵، کنز العمال: ۴۴۴۳۳)

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ (اور تم کھاتے پیتے رہو حتیٰ کہ فجر کے وقت سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے الگ ہو جائے)۔

مذکورہ جملہ کے نازل ہونے کا واقعہ

مذکورہ جملہ صرمہ بن قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوا۔ ان کو قیس بن صرمہ بھی کہا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہ روزہ کی حالت میں اپنی زمین میں کام کر رہے تھے۔ جب شام ہوئی تو اپنے گھر کھجوریں لے کر آئے اور گھر والی سے کہا کہ کھانا لاؤ۔ اُن کی زوجہ نے سوچا کہ کھانے میں کوئی گرم چیز پیش کی جائے' یہ سوچ کر وہ کھانے کو تیار کرنے میں لگ گئی' جب فارغ ہوئی تو قیس بن صرمہ سو چکے تھے' کیونکہ اُنہیں کام کی وجہ سے بہت تھکاوٹ تھی۔ اُن کی زوجہ نے اُنہیں جگا کر کھانا پیش کیا تو انہیں یہ بات ناگوار ہوئی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی نافرمانی کریں۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور اگلے دن کا آغاز اس حالت میں کیا کہ وہ روزے سے تھے اور بھوکے بھی تھے۔ ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ جب اُنہیں افاقہ ہوا تو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب آپ ﷺ نے ان کو دیکھا تو فرمایا: اے ابوقیس! کیا بات ہے تم بہت کمزور ہو گئے ہو؟ تو حضرت قیس نے اپنی حالت بیان کر دی۔ نبی اکرم ﷺ یہ واقعہ سن کر غمگین ہو گئے' تو اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت نازل فرمائی۔

(۲۱۵) حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ میں سے جب کسی کا روزہ ہوتا اور افطار کے وقت وہ افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تو پھر وہ پوری رات اور اگلا پورا دن شام تک کچھ نہیں کھا سکتا تھا۔ قیس بن صرمہ انصاری کے ساتھ یہی ہوا' وہ روزہ کی حالت میں تھے۔ جب افطار کا وقت آیا تو اپنی زوجہ کے پاس آئے اور پوچھا: کیا کھانے کی کوئی چیز ہے؟ تو بیوی نے کہا کہ نہیں کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ میں جا کر تمہارے لیے لے آتی ہوں۔ چونکہ حضرت قیس پورا دن کام کرتے رہے تھے اس لیے اُن کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُن کی بیوی نے آ کر ان کو دیکھا تو اس نے کہا: تم تو محروم ہو گئے۔ پھر جب اگلا دن آدھا گزر گیا تو حضرت قیس بے ہوش ہو گئے۔ پھر اس واقعہ کا ذکر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ''روزہ کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے''۔ یہ آیت سن کر صحابہ کرام بہت خوش ہوئے اور یہ جملہ بھی نازل ہوا کہ: ''تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ فجر کے وقت سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے الگ ہو جائے''۔[۴۵۵]

(صحیح بخاری: ۱۹۱۵' سنن ابوداؤد: ۲۳۱۴' سنن ترمذی: ۲۹۶۸' صحیح ابن حبان: ۳۴۶۰' مسند احمد ج ۴ ص ۲۹۵' سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۰۱)

مذکورہ آیت میں سفید اور سیاہ دھاگے کا معنیٰ

مذکورہ جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ روزہ کی راتوں میں تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سفید دھاگا یعنی دن کی سفیدی سیاہ دھاگے یعنی رات کی تاریکی سے الگ ہو جائے۔ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی کو دھاگا اس لیے فرمایا گیا کہ یہ دونوں ہی چیزیں آسمان پر دھاگے کی طرح لمبائی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ شاعر کا شعر ہے:

فلما اضاءت لنا سدفة	جب ہمارے لیے تاریکی دور ہو جاتی ہے
ولاح من الصبح خيطا انارا	اور صبح کا دھاگا ظاہر ہو جاتا ہے تو روشنی ہو جاتی ہے

[۴۵۵] علامہ عینی علیہ الرحمہ اس حدیث کی شرح میں ایک سوال قائم فرماتے ہیں کہ حضرت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ کھانے پینے کے متعلق تھا اور جو آیت مبارکہ نازل ہوئی اُس میں بیوی کے پاس جانے کی اجازت کا ذکر ہے ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ خود جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ سے مراد یہ ہے کہ روزوں کی رات میں جب بیوی کے پاس جانا جائز کر دیا گیا تو کھانا پینا بہ طریقہ اولیٰ جائز ہوگا۔ (عمدۃ القاری ج ۸ ص ۵۷)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہاں تک جملہ نازل ہوا کہ ''تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے الگ ہو جائے'' اور اس میں ''من الفجر'' نازل نہیں ہوا تھا تو لوگ جب روزہ رکھنا چاہتے تو اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگا باندھ لیتے اور اس وقت تک کھاتے رہتے جب تک کہ ان دھاگوں کے دیکھنے میں فرق نہیں آ جاتا۔[۴۵۶] پھر اللہ تعالیٰ نے ''من الفجر'' نازل فرمایا۔ اس سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ سفید دھاگے سے مراد دن ہے اور سیاہ دھاگے سے مراد رات ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۹۱۷، صحیح مسلم: ۱۰۹۱، المعجم الکبیر: ۵۷۹۱، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۱۵)

(۲۱٦) حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ فجر کے وقت سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے الگ ہو جائے'' تو میں نے ایک سیاہ اور ایک سفید رسّی لی اور ان دونوں کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ دیا اور رات بھر میں اُن دونوں کو دیکھتا رہا لیکن مجھ پر ان دونوں کا فرق ظاہر نہیں ہوا۔ صبح میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا واقعہ بیان کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ان دونوں دھاگوں سے رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۹۱٦، صحیح مسلم: ۱۰۹۰، سنن ترمذی: ۲۹۷۰، سنن ابوداؤد: ۲۳۴۹، مسند احمد ج ۴ ص ۳۷۷، المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ٦۷، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۱۵)

(۲۱۷) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک بلال رات میں اذان دیتے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ اُس وقت تک کھاتے پیتے رہا کرو جب تک حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم اذان نہ دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابن ام مکتوم ایک نابینا شخص تھے اور یہ اُس وقت تک اذان نہیں دیتے تھے جب تک کہ اُنہیں یہ نہ کہا جاتا تھا کہ صبح ہو گئی، صبح ہو گئی۔[۴۵۷] (صحیح بخاری: ٦۱۷، صحیح مسلم: ۱۰۹۲، سنن ترمذی: ۲۰۳، سنن نسائی: ٦۳۷، سنن دارمی: ۱۱۹۰، صحیح ابن حبان: ۳۴۷۰، مسند احمد ج ۲ ص ۵۷۔ ٦۲، سنن بیہقی ج ۱ ص ۳۸۰، مشکوٰۃ المصابیح: ٦۸۰۔ ص ٦٦)

زیر بحث آیت مبارکہ میں صبح صادق کو دھاگے سے تشبیہ دینے کی توجیہ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں صبح صادق اور صبح کاذب میں فرق

جاننا چاہیے کہ وہ صبح جس کے طلوع ہوتے ہی روزہ دار پر کھانا، پینا اور مجامعت کرنا حرام ہو جاتا ہے اس سے مراد صبح صادق ہے جس کی روشنی اُفق پر جلدی پھیل جاتی ہے، نہ کہ صبح کاذب جس کی روشنی لمبائی میں ہوتی ہے۔ اگر یہاں یہ سوال ہو کہ

[۴۵٦] یعنی رات کی تاریکی میں دونوں دھاگوں میں فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جب کچھ روشنی ہونے لگتی تو سفید دھاگے کی سفیدی اور کالے دھاگے کی سیاہی نظر آنے لگتی، اس وقت لوگ کھانا پینا ترک کر دیتے تھے۔ پھر جب آیت مبارکہ کا اگلا حصہ ''من الفجر'' نازل ہوا تو صحابہ کرام نے دھاگے باندھنا ترک کر دیا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق ایک سال کے بعد آیت مذکورہ میں من الفجر نازل ہوا۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۱٦۸، عمدۃ القاری ج ۸ ص ٦۲)

[۴۵۷] حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان تہجد اور سحری کے لیے ہوتی تھی اور حضرت سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان نماز فجر کے لیے ہوتی تھی۔ نماز کے علاوہ جس مقصد کے لیے بھی اذان دی جائے اُس میں وقت شرط نہیں ہے جبکہ نماز کے لیے دی جانے والی اذان کا وقت میں ہونا شرط ہے۔ جیسا کہ زیر بحث حدیث سے ظاہر ہے۔ (مرآۃ المناجیح ج ۱ ص ۳۹۷) اس حدیث میں راوی نے کہا کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبح ہو جانے کی اطلاع دی جاتی تھی اس سے مراد یہ ہے کہ طلوع فجر کے قریب ہو جانے کی اطلاع دی جاتی تھی۔ اس اطلاع کے بعد وہ اذان کے لیے تیاری کرتے تھے اور پھر فجر کے طلوع ہوتے ہی اذان شروع کرتے تھے۔ (مرقات ج ۲ ص ۳۷۱)

زیر بحث آیت میں صبح صادق کو دھاگے سے تشبیہ کیوں دی گئی جبکہ دھاگا لمبا ہوتا ہے اور صبح صادق کی روشنی لمبائی میں نہیں ہوتی؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ صبح کے اوّل حصہ میں جتنی سفیدی ظاہر ہوتی ہے وہ باریک ہوتی ہے اور چھوٹی ہوتی ہے' پھر وہ پھیل جاتی ہے۔ اس لیے اس کو دھاگے سے تشبیہ دی گئی۔

فجر صادق اور فجر کاذب میں فرق یہ ہے کہ فجر کاذب آسمان کے کنارے پر ظاہر ہوتی ہے اور لمبائی میں بلند ہوتی ہے' بلند ہونے کے بعد پھر وہ گھٹنا شروع ہو جاتی ہے اور گھٹ کر ختم ہو جاتی ہے' پھر فجر صادق ظاہر ہوتی ہے اور اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی روشنی آسمان کے کنارے پر پھیل جاتی ہے۔

(۲۱۸) حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنی سحری میں نہ بلال کی اذان سے دھوکا کھانا اور نہ اُس روشنی سے جو آسمان کے کنارے پر اس طرح لمبائی میں پھیل جاتی ہے۔ ہاں جب وہ اس طرح منتشر ہو جائے (تو وہ وقت کا اختتام ہے)۔ حماد نے اس حدیث کو اپنے ہاتھوں کے اشارہ کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ ''اس طرح'' سے مراد یہ ہے کہ وہ روشنی چوڑائی میں پھیل جائے (تو وہ وقت کا اختتام ہے)۔

(صحیح مسلم: ۱۰۹۴' سنن ابوداؤد: ۲۳۴۶' سنن نسائی: ۲۱۷۱' مسند احمد ج ۵ ص ۱۳)

ترمذی کی روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ تمہیں بلال کی اذان اور لمبائی میں پھیلنے والی روشنی تمہاری سحری سے نہ روکے۔ ہاں وہ روشنی جو آسمان کے کنارے پر (چوڑائی میں) پھیل جاتی ہے (وہ وقت کا اختتام ہے)۔

(سنن ترمذی: ۷۰۶' مسند احمد ج ۵ ص ۱۴' سنن دار قطنی ج ۲ ص ۱۶۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۸۱۔ ص ۶۶)

لہٰذا جب فجر ثانی (یعنی صبح صادق) کا طلوع ہونا یقینی ہو جائے تو روزہ دار پر غروب آفتاب تک کھانا پینا اور مجامعت کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ اس کو بیان کرتے ہوئے آیت مذکورہ میں آگے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ﴾ پھر تم رات آنے تک روزے پورے کرو۔ یعنی روزے کی انتہا رات ہے۔ جب رات آ جاتی ہے تو کھانے پینے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۱۹) جب یہاں سے رات طلوع ہو جائے اور یہاں سے دن چلا جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار کو کھانے پینے کی اجازت ہو جاتی ہے۔[۴۵۸] (صحیح بخاری: ۱۹۵۴' صحیح مسلم: ۱۱۰۰' سنن ترمذی: ۶۹۸' سنن ابوداؤد: ۲۳۵۱' سنن دارمی: ۱۷۰۰' مسند احمد ج ۱ ص ۴۸' سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۳۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۸۵۔ ص ۱۷۵)

غروب آفتاب کے فوراً بعد کھانا واجب ہو جاتا ہے یا نہیں؟ نیز زیر بحث آیت سے احناف کے ایک استدلال پر شوافع کا رد

رہی یہ بات کہ غروب آفتاب کا یقین ہوتے ہی روزہ دار پر کوئی چیز کھانا واجب ہو جاتا ہے یا نہیں؟ سو اس بارے میں دو

[۴۵۸] یعنی جب مشرق کی جانب سے رات کی تاریکی نمودار ہو جائے اور مغرب کی جانب سے دن کی روشنی چلی جائے تو روزہ دار کو کھانے پینے کی اجازت ہو جاتی ہے یا وہ افطار کے وقت میں داخل ہو جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ افطار کے وقت کا آغاز ہوتے ہی روزہ دار کو افطار کر لینا چاہیے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس کو خیر کا باعث قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ لوگ بھلائی میں رہیں گے جب تک (سورج غروب ہونے کے بعد) فوراً افطار کرتے رہیں گے۔ کذا فی الصحیحین۔ (مرقات ج ۴ ص ۴۷۹)

قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ واجب ہو جاتا ہے' کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا ہے[۴۵۹] اور دوسرا قول یہ ہے کہ غروب آفتاب کے ہوتے ہی کچھ کھالینا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ محض رات کے داخل ہوتے ہی روزہ دار اپنے روزہ سے باہر آ جاتا ہے' خواہ کچھ کھائے یا نہ کھائے۔

زیر بحث آیت سے احناف نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ جب کوئی شخص نفلی روزہ رکھ لے تو اس پر اس کو پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ثم اتموا الصیام الی اللیل" رات آنے تک اپنے روزے پورے کرو۔ اس میں امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے' اور یہ آیت تمام روزوں کو شامل ہے (لہٰذا روزہ خواہ نفلی ہی کیوں نہ ہو' رکھ لینے کے بعد اس کو پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے)۔

شوافع اس استدلال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ زیر بحث آیت فرض روزوں کے احکام کے بیان میں وارد ہوئی ہے' لہٰذا اس سے فرض روزے ہی مراد ہوں گے (اور ان کو پورا کرنا واجب ہوگا) جہاں تک نفلی روزوں کا تعلق ہے سو اُن کو توڑنے کے جواز پر دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ:

(۲۲۰) ایک دن نبی اکرم ﷺ گھر میں تشریف لائے اور فرمایا: کیا تمہارے پاس (کھانے کی) کوئی چیز ہے؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: میرا روزہ ہے۔ پھر آپ ہمارے پاس کسی اور دن تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس حَیس (ایک مخصوص کھانا) تحفہ میں آیا ہے۔ آپ نے فرمایا: مجھے دکھاؤ' میں صبح روزہ سے تھا۔ پھر آپ نے اُس کو کھالیا۔[۴۶۰] (صحیح مسلم: ۱۱۵۴' سنن ترمذی: ۷۳۴' سنن ابوداؤد: ۲۴۵۵' سنن نسائی: ۲۳۲۴' سنن ابن ماجہ: ۱۷۰۱' سنن دارقطنی: ۲۲۱۱۔ ج ۲ ص ۱۷۴' مسند احمد ج ۶ ص ۲۰۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۷۵۔ ص ۱۸۱)

---

۴۵۹ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت موجود ہے۔ (دیکھئے: مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۸۶) صوم وصال سے مراد یہ ہے کہ افطار کے وقت کچھ کھائے پیئے بغیر دوسرا روزہ رکھ لیا جائے۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اس لیے ہمارے حق میں یہ ممنوع (مکروہ تحریمی) ہے۔ لیکن اس سے یہ استدلال کرنا کہ غروب آفتاب کا یقین ہوتے ہی روزہ دار پر کوئی چیز کھانا واجب ہو جاتا ہے' درست نہیں ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے افطار میں تاخیر کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ بلا افطار مسلسل روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ آپ نے غروب آفتاب کا یقین ہوتے ہی فوراً افطار کرنے کو بھلائی کا سبب قرار دیا ہے (جیسا کہ گذشتہ حاشیہ میں حدیث شریف ہم تحریر کر چکے ہیں) اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ غروب آفتاب کے فوراً بعد افطار کر لینا مستحب اور بہتر ہے۔

۴۶۰ اس حدیث سے علامہ خازن اس بات پر استدلال فرمارہے ہیں کہ نفلی روزہ توڑنا جائز ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے روزہ سے ہونے کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر حَیس (مخصوص کھانا) کھایا۔ ہمارے نزدیک علامہ خازن کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی زیر بحث آیت (البقرہ: ۱۸۷) میں روزے مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سورۂ محمد: ۳۳ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے روزہ سے ہونے کے باوجود بلا کسی سبب اور وجہ کے کھانا کھایا ہو۔ ہوسکتا ہے کسی عذر کی وجہ سے آپ نے کھانا تناول فرمایا ہو۔ پھر احناف یہ بھی کہتے ہیں کہ نفلی روزہ اگر توڑ دیا جائے تو اس کی قضاء واجب ہے۔ جبکہ علامہ خازن کی پیش کردہ حدیث میں یہ تصریح بھی نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس روزہ کی قضاء نہیں کی تھی اور بالفرض اگر آپ نے اس روزہ کی قضاء نہیں فرمائی تھی تو یہ آپ کی خصوصیت تھی۔ لہٰذا علامہ خازن کی پیش کردہ حدیث نہ احناف کے مؤقف کے خلاف ہے نہ شوافع کے لیے مفید۔ (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۵۰) اس مسئلہ پر مفصل بحث کے لیے احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۳۴ ملاحظہ فرمائیں۔

اعتکاف کا معنیٰ اور زیر بحث آیت میں خصوصیت کے ساتھ اعتکاف کے دوران عمل زوجیت سے منع کرنے کا پس منظر

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ﴾ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہوتو اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہ کرو۔ اعتکاف کا معنیٰ ہے: تعظیماً کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اپنے آپ کو اس کے ساتھ لگا لینا۔ شرعی معنیٰ اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مسجد میں ٹھہرنا۔ مذکورہ جملہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کے دوران عمل زوجیت سے منع فرمادیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھی۔ ان میں سے کسی کو جب اپنی بیوی سے کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے گھر چلا جاتا اور جا کر بیوی سے عمل زوجیت کر کے نہا دھو کر مسجد میں واپس آ جاتا۔ آیت مذکورہ میں اس فعل سے اُنہیں روک دیا گیا' جب تک کہ اعتکاف سے فراغت نہ ہو جائے۔

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ بیان فرمایا کہ روزہ دار کے لیے دن میں عمل زوجیت حرام ہے اور رات میں جائز ہے تو ممکن تھا کہ اعتکاف کا حکم بھی اسی کی مثل ہوتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ جملہ میں یہ واضح فرمادیا کہ معتکف کے لیے دن میں بھی عمل زوجیت حرام ہے اور رات میں بھی حرام ہے جب تک کہ وہ اپنے اعتکاف سے باہر نہ آ جائے۔

اعتکاف کس مسجد میں کیا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں فقہاء امت کے اقوال

اعتکاف سنت ہے' اور یہ مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ زمین کے تمام حصوں میں مسجد کو اپنی فضیلت کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ کیونکہ مسجد کو اطاعت و عبادت کی ادائیگی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف بھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اعتکاف صرف مسجد حرام میں جائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ (ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو تاکیداً فرمایا) کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ (البقرہ:۱۲۵)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مسجد حرام کے ساتھ خاص فرمایا ہے' لہٰذا اعتکاف صرف مسجد حرام میں جائز ہے۔[۴۶۱] حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ اعتکاف صرف مسجد حرام اور مسجد نبوی میں جائز ہے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ اعتکاف مسجد حرام' مسجد نبوی اور بیت المقدس کی مسجد میں جائز ہے۔[۴۶۲] امام زہری فرماتے ہیں کہ اعتکاف صرف اُسی مسجد میں جائز ہے جو جامع

۴۶۱ے یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ پیش کردہ آیت میں اعتکاف کا ذکر ضرور ہے لیکن مسجد حرام کے ساتھ اس کے خاص ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اُن لوگوں کا اعتکاف مراد ہے جو مسجد حرام میں موجود ہوں نہ یہ بات کہ جو شخص بھی اعتکاف کرنا چاہے وہ صرف مسجد حرام میں اعتکاف کرے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص اعتکاف کرنا چاہتا ہو وہ اگر مسجد حرام میں آ کر اعتکاف کرے تو یہ زیادہ بہتر اور باعث ثواب ہے۔

۴۶۲ے حضرت حذیفہ کا یہ قول اور اس سے قبل حضرت عطاء کا قول ان دونوں پر بہ طور دلیل بعض ایسی احادیث پیش کی جاتی ہیں جن میں مسجد حرام' مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ ''اعتکاف صرف مسجد حرام میں کیا جاسکتا ہے''۔ علامہ کاسانی ان تمام روایات کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر مسجد حرام میں اعتکاف والی روایت ثابت ہو تو وہ منسوخ ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اعتکاف فرمایا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان روایات میں مساجد کی باہمی فضیلت اور مرتبہ کا بیان ہے۔ لہٰذا ان میں اعتکاف کرنا بھی اسی ترتیب سے افضل ہوگا۔ ان روایات سے یہ استدلال درست نہیں ہے کہ صرف مخصوص مساجد میں اعتکاف کیا جائے۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۸۱)

ہو (یعنی جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہو)۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں جائز ہے جس میں امام اور مؤذن ہو۔ امام شافعی امام مالک اور امام احمد فرماتے ہیں کہ چونکہ زیر بحث آیت میں عموم کے ساتھ فرمایا ہے: "**وانتم عاکفون فی المساجد**" اس لیے ہر مسجد میں اعتکاف جائز ہے۔ مگر ایسی مسجد میں اعتکاف کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں جمعہ ہوتا ہو تا کہ معتکف کو جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے باہر نہ نکلنا پڑے۔[۴۶۳]

(۲۲۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے وصال تک رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے رہے پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج نے اعتکاف کیا۔[۴۶۴] (صحیح بخاری: ۲۰۲۶، صحیح مسلم: ۲۷۱۱، سنن ترمذی: ۷۹۰، سنن ابوداؤد: ۲۴۶۲، سنن ابن ماجہ: ۱۷۷۳، سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۱۵، مسند احمد ج ۶ ص ۹۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۰۹۷، ص ۱۸۳)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف فرماتے تھے۔

اعتکاف کے متعلق چند فقہی مسائل کا بیان

پہلا مسئلہ: بغیر روزہ کے اعتکاف جائز ہے یا نہیں؟ بغیر روزہ کے بھی اعتکاف جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ اعتکاف میں روزہ[۴۶۵] بھی ہو۔ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ روزہ اعتکاف میں شرط ہے اور بغیر روزہ کے اعتکاف درست نہیں ہے۔ امام شافعی کا استدلال درج ذیل حدیث سے ہے کہ:

(۲۲۲) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں) عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے زمانۂ جاہلیت میں یہ منت مانی تھی کہ میں رات میں مسجد حرام کے اندر اعتکاف کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنی منت پوری کرو۔[۴۶۶] (صحیح بخاری: ۲۰۳۲، صحیح مسلم: ۱۶۵۶، سنن ترمذی: ۱۵۳۹، سنن ابوداؤد: ۳۳۲۵، سنن نسائی: ۳۸۲۰، سنن ابن ماجہ: ۱۷۷۲، مسند احمد ج ۱ ص ۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۰۱، ص ۱۸۳)

۴۶۳؎ متاخرین احناف نے بھی آسانی اسی میں قرار دی ہے کہ ہر مسجد میں اعتکاف درست ہے خواہ اس میں امام مؤذن مقرر ہوں یا نہ ہوں اور پانچ وقت باجماعت نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ (بہارِ شریعت جزء ۵ اعتکاف کا بیان)

۴۶۴؎ یعنی اپنے اپنے گھروں میں اعتکاف کیا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات کے مطابق عورتوں کے لیے مسجد کی بہ نسبت گھر کو ترجیح حاصل ہے۔ ازواجِ مطہرات کا اعتکاف کرنا اس لیے تھا تا کہ نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عمل ہو۔ لہٰذا خواتین اپنے گھروں میں اعتکاف کرسکتی ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ عورتیں گھر میں اُس جگہ اعتکاف کریں گی جو انہوں نے نماز کے لیے مقرر کر رکھی ہے جس کو مسجدِ بیت کہا جاتا ہے۔ (بہارِ شریعت حصہ پنجم اعتکاف کا بیان)

۴۶۵؎ یہ امام شافعی کا مؤقف ہے۔ ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ وضاحت آنے والے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۴۶۶؎ علامہ خازن اس حدیث سے یہ استدلال فرما رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رات میں اعتکاف کرنے کی اجازت دی اور یہ بات واضح ہے کہ رات میں روزہ نہیں ہوتا لہٰذا ثابت ہوا کہ اعتکاف کے لیے روزہ شرط نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک علامہ خازن کا اس حدیث سے استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں رات کی بجائے یوم کا لفظ ہے (یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد حرام میں ایک یوم اعتکاف کی منّت مانی) اور یوم کا لفظ دن اور رات دونوں کو شامل ہے۔ سنن ابوداؤد کی روایت میں لیلۃ او یوما کے الفاظ ہیں۔ (یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد حرام میں ایک رات یا ایک یوم کے اعتکاف کی منّت مانی) علامہ عینی علامہ ابن بطال کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ زیر بحث حدیث کے اصل الفاظ میں ایک دن اور ایک رات کا تذکرہ ہے لیکن بعض راویوں نے صرف رات کا تذکرہ کیا۔ ایک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرا مسئلہ: اعتکاف کی کم سے کم مدت کیا ہے؟: امام شافعی کے نزدیک اعتکاف کے لیے کوئی وقت معیّن نہیں ہے۔اس کی کم سے کم مدت ایک لحہ ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔لہٰذا اگر کسی نے ایک لحہ اعتکاف کی منت مانی تو اس کی منت صحیح ہوگی۔ اور کسی نے مطلق اعتکاف کی نیت مانی (یعنی وقت کی کسی مقدار کا تعیّن نہیں کیا) تو ایک لحہ اعتکاف کرنے سے اس کی منت پوری ہو جائے گی۔امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ ایک دن کا اعتکاف کر لیا جائے۔ امام شافعی نے یہ بات اس لیے بیان فرمائی تا کہ اختلافِ ائمہ سے بچا جائے۔ کیونکہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اعتکاف کی کم سے کم مدت ایک دن ہے' اس شرط کے ساتھ کہ آدمی طلوع فجر سے پہلے مسجد میں داخل ہو اور غروب آفتاب کے بعد مسجد سے نکلے۔[۴۶۷]

تیسرا مسئلہ: اعتکاف کے دوران عورت کے ساتھ چند مخصوص معاملات کا حکم: اعتکاف کے دوران عمل زوجیت کرنا حرام ہے اور اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ جہاں تک دیگر معاملات کا تعلق ہے مثلاً چومنا وغیرہ تو یہ مکروہ ہے اور اکثر علماء کے نزدیک اس سے اعتکاف نہیں ٹوٹے گا۔امام شافعی کے دو اقوال میں سے زیادہ ظاہر قول یہی ہے۔اور دوسرا قول امام شافعی کا یہ ہے کہ ان کاموں سے بھی اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔امام مالک کا یہی مؤقف ہے۔اور ایک قول یہ ہے کہ بوسہ وغیرہ سے انزال ہو جائے تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور اگر انزال نہ ہو تو اعتکاف نہیں ٹوٹے گا۔امام ابوحنیفہ کا یہی مؤقف ہے۔ جہاں تک بغیر شہوت کے بیوی کو ہاتھ لگانے کا تعلق ہے سو وہ جائز ہے اور اس سے اعتکاف بھی نہیں ٹوٹے گا کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(۲۲۳) وہ حالت حیض میں نبی اکرم ﷺ کے بالوں کو کنگھی کیا کرتی تھی' اس حال میں کہ نبی ﷺ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تھے اور وہ اپنے حجرہ میں ہوتی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ اپنا سر اُن کی طرف بڑھا دیتے تھے۔[۴۶۸] ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اعتکاف میں ہوتے تھے تو صرف اُسی صورت میں گھر تشریف لے جاتے جب کوئی ضرورت ہوتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اور مقام پر علامہ عینی امام ابن حبان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یوم کا لفظ ہے اُس سے رات سمیت دن مراد ہے۔(عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۶۶۔۲۷۴) پھر یہ بھی واضح رہے کہ سنن ابوداؤد کی جس روایت کا حوالہ اوپر ذکر کیا گیا اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اعتکف وصم (اعتکاف کرو اور روزہ رکھو) اس سے مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ اعتکاف کے لیے روزہ لازمی ہے۔اس کی مزید تائید ابوداؤد ہی کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے بہت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ: لا اعتکاف الا بصوم. (اعتکاف روزے ہی کے ساتھ کیا جائے)۔ (سنن ابوداؤد: ۲۴۷۳۔۲۴۷۴)

۴۶۷ امام ابوحنیفہ کا یہ مؤقف اُس اعتکاف کے بارے میں ہے جو سنّت مؤکدہ ہو (جیسے رمضان المبارک کا اعتکاف) یا واجب ہو (جیسے آدمی نے اعتکاف کی منت مانی ہو) البتہ نفلی اعتکاف کے بارے میں وقت کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ایک لحہ کا بھی ہو سکتا ہے اور ہفتہ بھر کا بھی۔(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۷۶)

۴۶۸ نبی اکرم ﷺ کے حجرۂ مبارک کا دروازہ مسجد میں تھا تو بہ حالتِ اعتکاف آپ مسجد میں رہتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گھر میں ہوتی تھیں۔آپ مسجد میں بیٹھے ہوئے سر مبارک حجرہ میں کر دیتے اور ام المؤمنین کنگھی کر دیتی تھیں۔اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ اگر معتکف کا کچھ حصہ مسجد سے باہر ہو جائے تو اس سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کنگھی مسجد میں نہ کرنا بہتر ہے کیونکہ اس سے مسجد میں بال گرنے کا امکان ہے۔(مراۃ المناجیح ج ۳ ص ۲۳۱)

اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ (اعتکاف کے دوران) صرف اُس صورت میں گھر تشریف لے جاتے جب کوئی بشری ضرورت پیش آتی۔[۴۶۹] (صحیح بخاری:۲۰۲۹' صحیح مسلم:۲۹۷' سنن ترمذی:۸۰۴' سنن ابوداؤد:۲۴۶۷' سنن نسائی:۲۷۵۔۳۸۶' سنن ابن ماجہ:۱۷۷۶۔۱۷۷۸' سنن دارمی:۱۰۶۶۔۱۰۶۹' مسند احمد ج۶ص۲۶۴' مشکوٰۃ المصابیح:۲۱۰۰۔ص۱۸۳)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: ''ارجّل'' اس کا معنیٰ ہے: بالوں کو کنگھی کرنا۔ اور اس میں جو فرمایا کہ آپ ﷺ کسی ضرورت کی وجہ سے گھر تشریف لے جاتے تھے اس سے مراد ہر وہ ضرورت ہے جس کی وجہ سے انسان باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے اور وہ ضرورت ایسی ہو کہ اُس کو مسجد میں اور اعتکاف کی جگہ میں کرنا جائز نہ ہو۔

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی حدود ہیں۔ جن چیزوں کو حدود اللہ فرمایا گیا ہے اُن سے مراد وہ احکام ہیں جو روزہ اور اعتکاف کے متعلق آیتِ مبارکہ میں بیان کیے گئے' یعنی کھانے پینے اور عمل زوجیت کی حرمت' یہ سب اللہ کی حدود ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ کی حدود سے مراد اللہ کے فرائض ہیں۔

''حد'' کا اصل معنی ہے: روکنا۔ اور ایسی چیز جو دو چیزوں کو ملنے سے روکے وہ بھی حد ہے۔ اور حد کسی چیز کی ایسی تعریف کو بھی کہتے ہیں جو اُس چیز کا احاطہ کر لے اور اُس چیز کو دیگر اشیاء سے ممتاز کر دے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ سے مراد وہ مقداریں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے معیّن فرمادی ہیں اور اُن کی مخالفت سے ہمیں منع فرمایا ہے۔ ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اُن حدود کے پاس نہ آؤ۔

آیت مذکورہ میں ''فلا تقربوھا'' پر دو سوال اور اُن کے جوابات

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں اُن سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ اللہ کی حدود ہیں۔ جب کہ ان میں بعض ایسے ہیں جن کے کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا کرنا ممنوع ہے۔ اس کے باوجود سب کے بارے میں کیونکر فرمایا کہ ''فلا تقربوھا'' تم ان کے قریب نہ آؤ؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ اللہ کی حدود ہیں' لہٰذا تم ان کے قریب نہ جاؤ'' جبکہ ایک اور آیت میں فرمایا کہ ''یہ اللہ کی حدود ہیں' لہٰذا تم ان سے آگے نہ بڑھو'' (البقرہ:۲۲۹) اور ایک دوسری آیت میں فرمایا کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے آگے بڑھے اس کو اللہ (تعالیٰ) جہنم میں داخل کرے گا۔ (النساء:۱۴) ان تمام آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ (یعنی ان کو ایک مفہوم کے تحت کیسے لایا جائے گا؟)

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں' اگر چہ وہ بہت ہیں لیکن اُن میں جو حکم ''فلا تقربوھا'' کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ ''تم جب مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہ کرو'' اس جملہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حالت اعتکاف میں عمل زوجیت حرام ہے۔ اس جملہ سے پہلے یہ ارشاد ہے کہ ''تم رات آنے تک اپنے روزے مکمل کرو''۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دن میں کھانا پینا حرام ہے۔ چونکہ ''فلا تقربوھا'' کے قریب ترین جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ حرمت اور ممانعت کے ہیں اس لیے فرمایا کہ ''یہ اللہ کی حدود ہیں' لہٰذا تم اُن کے قریب نہ آؤ''۔[۴۷۰]

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اللہ عزوجل کی اطاعت اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو تو وہ

---

[۴۶۹] بشری ضرورت سے مراد قضائے حاجت ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ صرف قضائے حاجت کے لیے گھر تشریف لے جاتے تھے۔

[۴۷۰] یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ ''فلا تقربوھا'' سے عدم مخالفت مراد ہے۔ یعنی تم اُن احکام کی مخالفت نہ کرنا جو تمہارے لیے بیان کیے گئے۔ یہ معنی ماموربہا اور منہی عنہا دونوں قسم کے احکام کو شامل ہے۔ (دیکھئے مدارک التنزیل' زیر بحث آیت)

درحقیقت مرتبہ حق میں کام کر رہا ہوتا ہے' اس لیے اس کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اس مرتبہ کو چھوڑ کر حد سے آگے بڑھے۔ کیونکہ اگر وہ حد سے آگے بڑھے گا تو باطل میں چلا جائے گا۔ پھر اس بات میں مزید مبالغہ کرتے ہوئے اُس حد کے قریب جانے سے بھی منع فرمادیا جو حق اور باطل کے درمیان حدفاصل ہے تاکہ آدمی باطل کے قریب بھی نہ جائے۔ کیونکہ اگر باطل کے قریب جائے گا تو باطل کا شکار ہو جائے گا' اس لیے اس کے قریب جانے سے منع فرمایا۔ اور یہ اُس حدیث کی طرح ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۲۴) جو مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا' جیسے وہ چرواہا جو شاہی چراگاہ کے قریب اپنی بکریاں چرائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اُس چراگاہ میں داخل ہو جائے۔ (صحیح بخاری:۵۲' صحیح مسلم:۱۵۹۹' مشکوۃ المصابیح:۲۷۶۲' ص۲۴۱)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں ''حدود اللہ'' سے مراد وہ اُمور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اور اُن کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو اپنی بیویوں سے عمل زوجیت نہ کرو۔ اور اس طرح دیگر جو احکام بیان کیے گئے ہیں اُن کا تعلق حرام سے ہے اس لیے یہ احکام' ایسی حدود ہیں جن کے قریب نہیں جایا جا سکتا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کرنے اور نہ کرنے کے احکامات بیان فرمائے ہیں اسی طرح وہ اپنی آیات یعنی اپنے دین کی نشانیاں اور اپنی شریعت کے احکام کو بیان فرماتا ہے۔ آخر میں ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ فرما کر یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنا یہ شافی اور کامل بیان اس لیے (نازل فرماتا ہے) تاکہ لوگ حرام سے بچ کر عذاب سے نجات پائیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور نہ اُن اموال کا حاکموں کے پاس اس مقصد سے مقدمہ لے جاؤ کہ ظلماً لوگوں کا کچھ مال تمہیں کھانے کو ملے' حالانکہ تمہیں (حقیقتِ حال) معلوم ہے ○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مذکورہ آیت امرء القیس ابن عابس کندی کے حق میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ربیعہ بن عبدان حضرمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک زمین کے سلسلے میں اس کے خلاف دعویٰ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرمی سے پوچھا: کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ اُس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر تو تم اپنے دعویٰ پر قسم اٹھاؤ۔ سو وہ قسم اٹھانے کے لیے چل پڑا' پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۲۵) اگر اس نے اس کے مال پر اس لیے قسم اٹھائی تاکہ اُس مال کو ظلماً کھالے تو یقیناً یہ شخص اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نظرِ رحمت کو اس سے موڑ لے گا[۱۷۲]۔ (صحیح مسلم:۱۳۹' سنن ترمذی:۱۳۴۰' سنن ابوداؤد:۳۲۴۵' سنن بیہقی ج۱۰ ص۱۴۴)

پھر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی' اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ اور آپس میں تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ۔ ﴿باطل﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو طریقہ اللہ نے جائز رکھا ہے اُس سے ہٹ کر ایک دوسرے

۱۷۲ یعنی اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔ غضب ناک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُسے اس کے عمل کی سزا دے گا۔ اس حدیث شریف سے واضح ہے کہ جھوٹی قسم کھانے پر اللہ عزوجل کی سخت ناراضگی اور وعید ہے۔

کا مال نہ کھاؤ ۔ ”باطل“ کا اصل معنیٰ ہے: ایسی چیز جو زائل ہو جائے۔

مال کو باطل طریقہ سے کھانے کی صورتیں

مال کو باطل طریقہ سے کھانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) ایک صورت یہ ہے کہ ظلم، لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کر کے مال کھایا جائے۔ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ لہو و لعب کے ذریعہ مال کھایا جائے۔ جیسے جوا، گانا گانے والے کی اُجرت، شراب اور گانا گانے کے آلات کی قیمت اور اس کے طرح کے دیگر تمام ذرائع سے مال کا حصول باطل اور ناجائز ہے۔ (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں یا جھوٹی گواہی کے لیے رشوت لے کر مال کھایا جائے۔ (۴) امانت وغیرہ میں خیانت کر کے مال حاصل کرنا۔

آیتِ مبارکہ میں مال حاصل کرنے کو ”مال کھانا“ اس لیے فرمایا گیا کہ مال حاصل کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مال کھایا جائے۔ چنانچہ لوگوں میں بھی یہی بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص لوگوں کا مال کھا جاتا ہے، یعنی ناجائز طریقہ سے اُن کا مال لے لیتا ہے۔

آگے فرمایا: ﴿ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ ﴾ یعنی وہ اموال جن کے بارے میں فیصلہ ہونا ہے، اُن کے معاملات حاکموں کے پاس نہ لے جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت اُس شخص کے بارے میں ہے جس پر کسی کا مال لازم ہو اور اس پر کوئی گواہ بھی نہ ہو اور یہ شخص مال دینے سے انکار کرے اور اُسے یہ معلوم بھی ہو کہ حق اُس کے خلاف ہے اور اس مال کے روکنے میں اُسے گناہ مل رہا ہے اس کے باوجود وہ اُس مال کا مقدمہ حاکموں کے پاس لے جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جان بوجھ کر حاکم کے پاس جھوٹی گواہی دی جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ تم باطل طریقہ سے مال کو نہ کھاؤ اور نہ اُس مال کو حاکموں کی طرف منسوب کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب تمہیں معلوم ہو کہ قصوروار تم ہو تو پھر اپنے بھائی کے مال کو حاکم کے پاس نہ لے جاؤ، کیونکہ حاکم کا فیصلہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قاضی شریح فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہارے حق میں فیصلہ دے رہا ہوں، حالانکہ میری سوچ کے مطابق قصور تمہارا ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں اپنے پاس موجود گواہی کی روشنی میں فیصلہ کروں، اور بلا شبہ میرا فیصلہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔

(۲۲۶) حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرہ کے دروازہ کے پاس جھگڑنے والوں کی آوازیں سُنیں، تو آپ اُن کی طرف تشریف لائے اور فرمایا کہ میں فقط ایک انسان ہوں، میرے پاس جھگڑنے والے (اپنا مقدمہ لے کر) آتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُن میں سے بعض کو بعض سے زیادہ اچھا بولنا آتا ہو، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ بعض کو اپنی دلیل بیان کرنے کا زیادہ اچھا طریقہ آتا ہو، اور میں اس کو سچا سمجھ کر فیصلہ اُس کے حق میں دے دوں۔ لہٰذا میں فیصلہ کر کے جس شخص کو کسی مسلمان کا حق دے دوں تو وہ آگ کا ٹکڑا ہے، چاہے تو اُس کو اٹھا لے اور چاہے تو اُس کو چھوڑ دے۔[۴۷۲]

[۴۷۲] اس حدیث شریف میں چند باتیں غور طلب ہیں: (۱) نبی اکرم ﷺ نے اس میں فرمایا کہ میں صرف ایک انسان ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میں خدا نہیں ہوں اور جب خدا نہیں ہوں تو جو فیصلے میں اپنی رائے اور اجتہاد سے کرتا ہوں اُن میں بشری تقاضے سے بھول ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر قسم کی لغزش، گناہ، بدعقیدگی اور ان کے ارادہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ (۲) اس حدیث شریف میں اس بات کا بھی بیان ہے کہ اللہ عزوجل کی عطاء کے بغیر نبی کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ (۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کا حکم ظاہر پر لاگو ہوتا ہے۔ کسی کے باطنی اور داخلی معاملات سے شریعت بحث نہیں کرتی۔ (۴) اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کے اجتہاد فرمانے کا ثبوت ہے۔ علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ذکر کیا کہ جن اُمور میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوتی اُن میں میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔ (۵) یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکم کا حکم کسی حرام کو حلال نہیں بناتا۔ لہٰذا اگر حاکم جھوٹی گواہی پر مال یا طلاق کا غلط فیصلہ کر دے تو مدعی کے لیے اس فیصلہ کی وجہ سے مدِّ مقابل کا مال یا عورت حلال نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ جھوٹی گواہی سے جو فیصلہ ہوگا وہ حق ہوگا اور اس فیصلہ میں حاکم گناہ گار نہیں ہوگا۔ بلکہ جھوٹی گواہی لانے والا اور جھوٹی گواہی دینے والا دونوں گناہ گار ہوں گے۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۱۱، مرقات ج ۷ ص ۳۳۰، مراۃ ج ۵ ص ۴۴۲)

(صحیح بخاری:۲۴۵۸' صحیح مسلم:۱۷۱۳' سنن ترمذی:۱۳۳۹' سنن ابوداؤد:۳۵۸۳' سنن نسائی:۵۴۰۱' سنن ابن ماجہ:۲۳۱۷' سنن بیہقی ج۱۰ ص۱۴۹' مسند احمد ج۶ ص۲۹۰' مشکوٰۃ المصابیح:۶۱-۳۷_ص۳۲۷)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''سمع جلبة خصم'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ نے جھگڑنے والوں کی آوازیں سُنیں۔ ایک لفظ اس حدیث میں آیا ہے: ''الحن بحجته'' عربی میں کہا جاتا ہے: ''فلان الحن بحجته من فلان'' یعنی فلاں شخص فلاں سے زیادہ اپنی حجت میں سیدھا اور پختہ ہے' اور ذہانت کی وجہ سے اپنی حجت پر زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

آیت میں آگے فرمایا: ﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ اس میں ''فریق'' کا معنیٰ ہے: ایک حصہ اور ایک ٹکڑا۔ اور ''اثم'' سے مراد ظلم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''اثم'' سے مراد جھوٹی قسم ہے۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک اس سے جھوٹی گواہی مراد ہے۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جبکہ تم جانتے ہو کہ تم باطل پر ہو اور ناحق ہو۔ (حاصل یہ کہ جب تمہیں حقیقت حال معلوم ہو تو ناجائز طریقہ سے کسی کا مال کھانے کے لیے عدالت میں مقدمہ نہ لے جاؤ۔)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

(اے رسول مکرم!) لوگ آپ سے ہلال (پہلی تاریخ کے چاند) کے متعلق دریافت کرتے ہیں' آپ بتا دیجئے کہ یہ لوگوں کے (دینی اور دنیاوی کاموں) اور حج کے اوقات کی نشانیاں ہیں' اور اس میں کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پیچھے سے آؤ' ہاں نیکی تو اُس شخص کی ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے' اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو' اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

آیت مذکورہ حضرت معاذ بن جبل انصاری اور حضرت ثعلبہ بن غنم انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی' ان دونوں نے (رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں) عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ چاند جب ظاہر ہوتا ہے تو باریک ہوتا ہے' پھر بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ مکمل روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے' اور یہ ایک حالت پر نہیں رہتا؟ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ اور صحابہ کرام کا مقصد یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں کیا فائدہ ہے اور کیا حکمت ہے؟

آیت مبارکہ میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے' یعنی اے محمد (ﷺ)! لوگ آپ سے ہلال کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اس آیت میں ﴿اهلة﴾ ہلال کی جمع ہے اور ہلال چاند کی ابتدائی حالت کو کہتے ہیں جب لوگ اُس کو مہینے کی پہلی رات میں دیکھتے ہیں۔ ﴿مَوَاقِيْتُ﴾ میقات کی جمع ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے چاند میں جو اختلاف رکھا ہے وہ دینی اور دنیوی مصلحتوں کے پیش نظر رکھا ہے' تاکہ لوگوں کو حج' روزہ اور افطار کے اوقات' قرض کی ادائیگی کی جگہ اور اُس کی مدت' اور عورتوں کے لیے عدت اور حیض کے اوقات اور دیگر ایسے احکام جو چاند سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ اور اسی وجہ سے سورج جو کہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا ہے اس کے اور چاند کے درمیان (طلوع و غروب) کا اختلاف رکھا ہے۔ رہی یہ بات کہ جب تمام عبادتوں میں

چاند کو دخل ہے تو پھر آیت مبارکہ میں صرف حج کا ذکر کیوں فرمایا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حج کا ذکر ایک عظیم فائدہ کے پیش نظر کیا ہے۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب ایام گن کر حج کیا کرتے تھے اور حج کے مہینوں کو تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس فعل کو باطل فرمادیا اور یہ بتایا کہ حج کی ادائیگی صرف اُن ہی مہینوں میں ہو سکتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے چاند کے ساتھ معیّن فرمایا ہے۔ اور جن مہینوں کو اللہ تعالیٰ نے معیّن فرمادیا ہے اُن سے کسی اور مہینے کی طرف حج کو منتقل کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ اہل عرب مہینوں کو مؤخر کر کے کیا کرتے تھے۔

آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ''اس میں کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں پیچھے سے آؤ' ہاں! نیکی تو اُس شخص کی ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے' اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو''۔

مذکورہ جملہ کے واقعۂ نزول میں مختلف روایات

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ انصار کا یہ معمول تھا کہ وہ جب حج سے واپس آتے تھے تو گھروں میں دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہو گیا کہ ایک انصاری (حج سے واپسی کے بعد) گھر کے دروازہ سے داخل ہو گیا' اس پر اس کی ملامت ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ گھروں میں پیچھے سے آنے میں کوئی نیکی نہیں ہے' ہاں نیکی اُس شخص کی ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے' اور تم گھروں میں اُن کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔ (صحیح بخاری: ۱۸۰۳' صحیح مسلم: ۳۰۲۶)

ایک روایت میں یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ جب وہ احرام باندھ لیتے تھے تو گھروں میں پیچھے سے داخل ہوتے تھے' اس کے رد میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں لوگوں کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص احرام باندھ لیتا تھا تو وہ نہ تو اپنے باغ میں دروازہ سے داخل ہوتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر اور خیمہ میں دروازہ سے داخل ہوتا تھا۔ اگر وہ شہری ہوتا تو اپنے گھر کے پچھلے حصہ میں سوراخ کر کے اُس سے اندر جاتا اور باہر آتا' یا پھر سیڑھی لگا کر گھر میں چلا جاتا۔ اور اگر وہ دیہاتی ہوتا تو وہ اپنے خیمہ کے پچھلے حصہ سے اندر جاتا اور باہر آتا' اور دروازہ کو اس کام کے لیے استعمال نہ کرتا۔ اور تمام لوگ اس کام کو نیکی سمجھتے تھے۔

اور عرب میں کچھ ایسے بھی قبائل تھے جو اپنے دین میں بہت حماست یعنی شدت رکھتے تھے اور اسی دینی اور مذہبی شدت کی وجہ سے ان سب کو ''حُمُس'' کہا جاتا تھا' ان میں قریش' کنانہ' خزاعہ اور وہ تمام لوگ جو ان قبائل کے دین پر تھے وہ شامل ہیں۔ ان سب کا معمول یہ تھا کہ یہ لوگ جب احرام باندھ لیتے تھے تو پھر قطعاً گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کسی چیز کا سایہ لیتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ایک باغ میں داخل ہوئے اور آپ کے ساتھ ایک انصاری بھی داخل ہوا' پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے تو آپ کے پیچھے رفاعہ بن تابوت نامی ایک انصاری بھی گھر میں دروازہ سے داخل ہوا' اور وہ انصاری حالتِ احرام میں تھا۔ لوگوں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو اُس پر اعتراض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس انصاری سے پوچھا کہ حالت احرام میں ہونے کے باوجود تم دروازہ سے گھر میں کیوں داخل ہوئے؟ اُس انصاری نے جواب دیا کہ میں نے آپ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں بھی آپ کے پیچھے داخل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو احمسی ہوں (یعنی اپنے مذہب پر سختی سے پابندی کرتا ہوں)۔ انصاری نے کہا کہ اگر آپ احمسی ہیں تو میں بھی احمسی ہوں اور میں آپ کی سیرت' آپ کے طریقہ اور آپ کے دین پر راضی ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔[۳۷۲]

امام زہری فرماتے ہیں کہ انصار کے کچھ لوگوں کا معمول یہ تھا کہ جب وہ عمرہ کے لیے ''لبیک اللھم لبیک'' کہہ لیتے

[۳۷۲] امام حاکم نیشاپوری نے المستدرک میں' امام واحدی نے اسباب النزول میں اور امام سیوطی نے درّ منثور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھے تو پھر اپنے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز نہیں آنے دیتے تھے۔ اور ہوتا یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے گھر سے عمرہ کی تکبیر پڑھتا ہوا نکل آتا تھا' پھر اگر کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے گھر چلا جاتا لیکن چونکہ دروازہ پر چھت ہوتی تھی اور دروازہ سے داخل ہونے کی صورت میں چھت اُس کے اور آسمان کے درمیان حائل ہوتی تھی اس لیے وہ گھر کے پچھلے حصہ سے دیوار توڑ کر داخل ہوتا اور اپنی ضرورت پوری کرواتا۔ ہمیں یہ روایت پہنچی کہ حدیبیہ کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کی تکبیر کہی اور آپ ایک حجرہ میں داخل ہوئے اور آپ کی اتباع میں بنوسلمہ کا ایک انصاری بھی حجرہ میں داخل ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اُس نے جواب دیا کہ میں نے آپ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس لیے میں بھی داخل ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں تو اَحمسی ہوں۔ انصاری نے کہا: میں بھی اَحمسی ہوں اور آپ کے دین پر ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ میں جو فرمایا: ﴿ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ احرام کی حالت میں بھی اور اس کے علاوہ بھی گھر میں دروازہ سے آیا کرو۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰

اور تم اللہ کی راہ میں اُن سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے آگے نہ بڑھو' بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ○

اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کرنے کا بیان اور جہاد کے بارے میں زیر بحث آیت کا حکم

اللہ کی راہ میں لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت میں اور اس کی رضا کی طلب میں جہاد کرو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۲۷) رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ جو شخص بہادری کے لیے جہاد کرتا ہے اور جو تعصب کی وجہ سے جہاد کرتا ہے اور جو ریاکاری کے طور پر جہاد کرتا ہے ان میں سے کون سا جہاد اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے کلمہ کی سربلندی کی خاطر جہاد کرے تو وہ اللہ[۲۷۴] کی راہ میں ہے۔ (صحیح بخاری: ۲۸۱۰' صحیح مسلم: ۱۹۰۴' سنن ترمذی: ۱۶۴۶' سنن ابوداؤد: ۲۵۱۷' سنن نسائی: ۳۱۳۶' سنن ابن ماجہ: ۲۷۸۳' مسند احمد ج ۴ص ۳۹۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۱۴۔ص ۳۳۱)

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم فرمایا تھا کہ مشرکین سے جنگ نہ کریں۔ پھر جب نبی ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو زیر بحث آیت نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے ساتھ جہاد کا حکم فرمایا جو مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کریں۔ زیر بحث آیت کے بارے میں ربیع بن انس کہتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلی یہی آیت نازل ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے تمام مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم فرمایا' خواہ مشرکین مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کریں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں اس سے ملتا جلتا واقعہ ذکر کیا ہے۔ دیکھئے: المستدرک ج ۱ص ۴۸۳' اسباب النزول ص ۲۷' الدر المنثور ج ۱ص ۲۰۴۔

۲۷۴؎ اس حدیث شریف سے چند مسائل معلوم ہوئے: (۱) اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ (۲) عبادت کی مقبولیت کے لیے اخلاص شرط ہے۔ (۳) اللہ کا کلمہ (یعنی اسلام) کی سربلندی کے لیے لڑنے والا سب سے افضل اور اعلیٰ مجاہد ہے۔ (۴) اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا بھی ثبوت ہے کہ آپ نے سائل کی پوچھی ہوئی باتوں کی نفی اور اثبات کیے بغیر ایک جامع جواب ارشاد فرمایا اور اس کے ذریعہ یہ ظاہر فرمایا کہ بہادری کے لیے اور تعصب کی وجہ سے جہاد کرنا ہر صورت میں مذموم نہیں ہے بلکہ اگر جہاد اس لیے کیا جائے کہ جو کافر جنگ میں شریک نہیں ہیں اُن کو بہادری دکھائی جائے تاکہ وہ جنگ کی ہمت نہ کریں تو یہ جہاد بھی اللہ عزوجل کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہے۔ اسی طرح دشمنِ اسلام سے دینی تعصب کی وجہ سے جہاد کیا جائے تو یہ بھی اللہ عزوجل کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہے۔ (عمدۃ القاری' بتغیر' وتوضیح ج ۲ص ۲۷۹)

یا نہ کریں اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً. (التوبہ: ٣٦) اور تمام مشرکین کے ساتھ جہاد کرو۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ. (البقرہ: ١٩١) اور تم کافروں کو قتل کردو جہاں کہیں تم اُنہیں پاؤ۔

لہٰذا جس آیت میں جہاد کرنے کا حکم آ گیا وہ زیر بحث آیت کے لیے ناسخ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت محکم ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو لڑنے کے لیے تیار کیا ہے اُن کے ساتھ تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو لڑنے کے لیے تیار نہیں کیا جیسے پادری' بوڑھے' لنگڑے لُولے' اندھے اور پاگل لوگ ان سے جنگ نہ کرو' کیونکہ یہ لوگ تمہارے ساتھ جنگ نہیں کرتے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے زیر بحث آیت میں فرمایا: ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ تم حد سے آگے نہ بڑھو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ تم نہ تو عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرو' نہ پادریوں کو قتل کرو اور نہ ہی اُن لوگوں کو قتل کرو جو تمہارے ساتھ صلح کر لیں۔

(٢٢٨) حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کو کسی لشکر یا فوج کا امیر بناتے تو اُسے اس بات کی نصیحت فرماتے کہ وہ اپنے خالص ذاتی معاملہ میں اللہ سے ڈرے اور جو اُس کے مسلمان ساتھی ہیں اُن کے ساتھ بھلائی کرے [٥٧٥] پھر فرماتے کہ اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا' اور جو اللہ کو نہیں مانتے' اُن سے جہاد کرنا' اور جہاد کے دوران نہ تو خیانت اور بدعہدی کرنا' نہ ہی کسی کو مُثلہ کرنا اور نہ ہی کسی بچہ کو قتل کرنا [٥٧٦] (صحیح مسلم: ١٧٣١' سنن ترمذی: ١٤٠٨' سنن ابوداؤد: ٢٦١٢' سنن ابن ماجہ: ٢٨٥٨' سنن دارمی: ٢٤٣٩' مسند احمد ج ٥ ص ٣٥٨' المعجم الصغیر ج ١ ص ١٢٣' سنن بیہقی ج ٩ ص ٤٩' مشکوٰۃ المصابیح: ٣٩٢٩۔ ص ٣٤١)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''ولا تغلوا''۔ یہ ''غلول'' سے مشتق ہے اور ''غلول'' کا معنیٰ ہے: خیانت کرنا۔ جنگ میں خیانت یہ ہے کہ کوئی مجاہد مالِ غنیمت کو چھپالے (یہ ممنوع ہے)۔ ایک لفظ حدیث شریف میں آتا ہے۔ ''لا تغدروا'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بدعہدی نہ کرو۔

زیر بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿لَا تَعْتَدُوْا﴾ اس کا ایک معنیٰ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم کافروں کے ساتھ جنگ کرنے میں پہل نہ کرو۔ اس صورت میں یہ آیت اُن آیات سے منسوخ ہوگی جن میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت کا واقعہ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب حدیبیہ کے سال مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو (عمرہ کرنے سے) روک دیا اور اس بات پر صلح کی کہ آپ آئندہ سال مکہ میں آئیں' قریش تین دن تک آپ کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے اور آپ بیت اللہ کا طواف کریں گے۔ جب اگلے سال عمرۃ القضاء کے لیے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب تیار ہوئے تو اس بات کا خدشہ لاحق ہوا کہ قریش اپنا وعدہ پورا نہیں کریں گے اور ہمیں پھر بیت اللہ سے روک لیں گے۔ اور صحابہ کرام نے اس بات کو بھی ناپسند کیا کہ وہ محترم مہینے میں اور حرم شریف میں مشرکین سے لڑائی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے (ان تمام

[٥٧٥] خاص ذاتی معاملہ میں اللہ عزوجل سے ڈرنے اور مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بھلائی کرنے سے مراد یہ ہے کہ آنے والی مشکلات کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا جائے اور ان کو برداشت کیا جائے۔ جبکہ ساتھیوں کے لیے آسانی کی راہ نکالی جائے۔
(مرقات ج ٦ ص ٤٧٤)

[٥٧٦] خیانت سے مراد ہے مالِ غنیمت میں خیانت کرنا اور بدعہدی سے مراد ہے کفار سے کیے ہوئے کسی معاہدہ کو جنگ کے دوران پامال کرنا۔ اور مُثلہ سے مراد ہے دشمن کے ناک' کان' ہونٹ وغیرہ کاٹ کر شکل بگاڑنا۔ یہ تمام امور بالخصوص جنگ میں ممنوع ہیں۔
(مرقات ج ٧ ص ٤٧٤' مراۃ ج ٥ ص ٥٥٠)

خدشات اور شبہات کو دور کرنے کے لیے) زیر بحث آیت نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ جو تم سے لڑیں تم اُن سے اللہ کی راہ میں لڑو۔ اس فرمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ محترم مہینے میں اور حرم شریف میں اُن لوگوں کے ساتھ قتال کریں جو مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کریں اور اس بارے میں صحابہ کرام کو جو بھی دل میں خدشہ اور تنگی تھی اُس کو اللہ تعالیٰ نے دُور فرما دیا۔ اور ساتھ ہی "ولا تعتدوا" فرما کر یہ بتا دیا کہ تم جنگ میں پہل کر کے حد سے آگے نہ بڑھنا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾

اور تم کافروں کو قتل کر دو جہاں کہیں تم اُنہیں پاؤ اور تم اُنہیں وہاں سے نکال دو جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکالا' اور (شرک و ارتداد کا) فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے' اور تم مسجد حرام کے پاس اس وقت تک ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں' اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کر دو' کافروں کی یہی سزا ہے O پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O

﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ اس آیت کی تفسیر میں تحقیقِ کلام یہ ہے کہ اس سے پچھلی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب کفار پہل کریں۔ جبکہ زیر بحث آیت میں جہاد کا حکم دونوں ہی صورتوں میں دیا ہے' خواہ کفار لڑائی کریں یا نہ کریں۔ البتہ مسجد حرام کے پاس قتال کرنے کا حکم علیحدہ بیان کیا ہے۔

آیت مذکورہ میں شرک کو فتنہ فرمانے اور قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت قرار دینے کی توجیہ

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ یعنی تم اگر مشرکین کو حرم کے اندر قتل کرو (تو یقیناً یہ ایک بڑی بات ہے) لیکن اس سے کہیں زیادہ سخت اور بڑی چیز اُن کا شرک ہے۔ اس آیت میں شرک کو فتنہ اس لیے فرمایا کہ شرک زمین میں فساد کا باعث اور ظلم کا ذریعہ ہے۔ اس کو قتل سے زیادہ خطرناک اس لیے قرار دیا گیا کہ شرک ایک ایسا جرم ہے کہ اس کا مرتکب دائمی طور پر جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے' جبکہ قتل کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح کفر آدمی کو امت مسلمہ سے خارج کر دیتا ہے لیکن قتل کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ (کفر و شرک کا) فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔

زیر بحث آیت میں مسجد حرام کے پاس جہاد کے حکم میں مفسرین کا اختلاف رائے

﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ﴾ تم مسجد حرام کے پاس اس وقت تک ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ تم سے وہاں جنگ نہ کریں۔ اس جملہ کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے (یعنی منسوخ نہیں ہے)' اور مسجد حرام میں صرف اُسی کے ساتھ قتال جائز ہے جو خود وہاں قتال کرے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ﴾ یعنی اگر وہ تم سے لڑائی کریں تو تم بھی اُن سے لڑائی کرو۔ اور حدیث صحیح میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ثابت ہے کہ مکہ (میں جنگ کرنا) مجھ سے پہلے کسی کے لیے جائز نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے جائز ہوگا۔ میرے لیے صرف دن کی ایک ساعت میں (اس میں جنگ کرنا) جائز ہوا تھا' پھر بدستور اُس کی حرمت لوٹ آئی اور اب قیامت تک اُس کی یہ حرمت برقرار رہے گی۔[۴۷۷] اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حرم

[۴۷۷] یہ حدیث شریف البقرہ: ۱۲۵ کی تفسیر میں رقم: ۱۲۷ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں اس کی مفصّل تخریج اور حاشیہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شریف میں قتل وقتال حرام ہے' الآیہ کہ اگر مشرکین قتال کریں تو پھر اُن کے ساتھ قتال کیا جائے گا' اوراس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ مشرکین کو دُور کیا جائے۔ حضرت قتادہ کا موقف اس آیت کے بارے میں یہ ہے کہ یہ درج ذیل آیت سے منسوخ ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ (التوبہ:۵) سو تم مشرکین کو قتل کردو جہاں کہیں تم انہیں پاؤ۔

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حرم اور غیر حرم دونوں مقامات پر جہاد کا حکم دیا ہے' لہٰذا زیر بحث آیت اس سے منسوخ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔ اور کفار سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

(البقرہ:۱۹۳' الانفال:۳۹)

زیر بحث آیت کے بعد اگلی آیت میں فرمایا: ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اس میں فرمایا: ''اگر وہ باز آ جائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ لڑنے سے باز آ جائیں' بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ شرک اور کفر سے وہ باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ ''غفور'' ہے' یعنی پچھلے جرم کو بخشنے والا ہے اور ''رحیم'' ہے یعنی اپنے بندوں کے ساتھ مہربان ہے کہ اُنہیں فوری عذاب نہیں دیتا۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

اوران سے جہاد کرتے رہو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اورصرف اللہ کی عبادت ہو' پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی اور کو سزا نہ دی جائے ○

﴿قٰتِلُوْهُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ مشرکین سے قتال کرو۔ اور ﴿فِتْنَةٌ﴾ سے مراد شرک ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم مشرکین سے جہاد کرتے رہو۔ یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

اہل کتاب اور بت پرست کے درمیان فرق

''وثنی'' (یعنی جو بتوں کی پوجا کرتا ہو) اُس کے ساتھ صرف ایک بات ہوگی' یا تو وہ اسلام قبول کرلے یا پھر اُسے قتل کر دیا جائے۔ جبکہ اہل کتاب کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اہل کتاب اور بت پرست کے درمیان فرق یہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس آسمان سے نازل کردہ کتابیں ہوتی ہیں جن میں حلال حرام کی باتیں اور دیگر احکام ہوتے ہیں جن کی طرف اہل کتاب رجوع کرتے ہیں' اگرچہ انہوں نے اپنی کتاب میں بہت تحریف اور تبدیلی کردی ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے انہی کتابوں کی عظمت کی وجہ سے انہیں قتل سے بچایا ہے اور ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اُنہیں دباؤ میں رکھ کر اُن سے جزیہ لیا جائے' تاکہ وہ اپنی کتابوں میں غور وفکر کریں اور حق بات پر مطلع ہوں اور اُس حق کی پیروی کریں۔ جیسے وہ اہل کتاب جو ایمان لائے اور حق کو پہچان کر اسلام قبول کیا۔ جہاں تک بت پرستوں کا تعلق ہے تو یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں ہوتی جس کی طرف یہ رُجوع کرسکیں اور ہدایت پاسکیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو مہلت دینا درحقیقت ان ہی کے کفر اور شرک کو بڑھانا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی بھی اسی میں ہے کہ ایسے لوگ یا تو مسلمان ہوجائیں یا پھر ان لوگوں کو قتل کردیا جائے۔

﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت اور عبادت ہو اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ ''اگر وہ باز آ جائیں''۔اس سے مراد یہ ہے کہ قتال اور لڑائی سے باز آ جائیں' بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ شرک اور کفر سے وہ باز آ جائیں۔﴿فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِیْنَ﴾ تو پھر تمہارے لیے ظالموں کے علاوہ کسی اور پر کوئی راستہ نہیں ہے۔یہ معنیٰ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک ہے۔لہٰذا قول اوّل (یعنی جنہوں نے یہ کہا کہ اگر کفار لڑائی سے باز آ جائیں) اس کے مطابق زیرِ بحث آیت اُس آیت سے منسوخ ہوگی جس میں جہاد کا حکم ہے۔اور قول ثانی (یعنی جنہوں نے یہ کہا کہ اگر کفار شرک سے باز آ جائیں) اس صورت میں زیرِ بحث آیت محکم (غیر منسوخ) ہوگی۔

بعض مفسرین نے ''اِلَّا علی الظالمین'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تم ظالموں کے سوا کسی پر ظلم نہ کرو۔چونکہ ظلم کا بدلہ بہ ظاہر ظلم ہوتا ہے اس لیے اُس کو ظلم کہا گیا۔اور کافر کو ظالم اس لیے فرمایا کہ (ظالم کا معنیٰ ہے: ''چیز کو اُس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنے والا'' اور کافر بھی یہی کرتا ہے کہ) عبادت اُس کی کرتا ہے جو اُس عبادت کا مرکز نہیں ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

حُرمت والے مہینے کے بدلہ میں حرمت والا مہینہ ہے اور تمام محترم چیزوں کا بدلہ ہے' لہٰذا جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو تم بھی اس کے ساتھ اتنی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے' اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ (کی مدد) اُن کے ساتھ ہے جو اُس سے ڈرنے والے ہیں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

یہ آیت عمرۃ القضاء کے موقع پر نازل ہوئی۔واقعہ یہ ہوا تھا کہ ۶ ہجری ماہ ذوالقعدہ میں نبی اکرم ﷺ عمرہ کی غرض سے نکلے تھے' لیکن مشرکین نے آپ کو حدیبیہ کے مقام پر بیت اللہ سے روک دیا تھا۔پھر اہل مکہ نے اس بات پر صلح کی تھی کہ اس سال تو آپ واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آ کر اپنے عمرہ کو قضاء کر لیں۔اس صلح کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ واپس تشریف لے آئے تھے' پھر ۷ ہجری ماہ ذوالقعدہ میں اپنے عمرہ کی قضاء فرمائی۔اس بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ حرمت والے مہینے کے بدلہ میں حرمت والا مہینہ ہے۔یعنی جس ذوالقعدہ میں تم نے مکہ جا کر عمرہ کی قضاء کی وہ اُس ذوالقعدہ کا بدلہ ہے جس میں تمہیں بیت اللہ سے روکا گیا تھا۔

حرمات اور اُن کے قصاص کی تفسیر

﴿وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ تمام محترم چیزوں کا بدلہ ہے۔''حرمات'' ''حرمۃ'' کی جمع ہے' اس کو جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے مہینہ' شہر اور احرام سب کی حُرمت مراد ہے۔''قصاص'' کا معنیٰ ہے: برابری اور یکسانیت۔یعنی جب کسی کارروائی کرنے والے کے ساتھ ویسی ہی کارروائی کی جائے جیسی اُس نے کی ہے تو یہ قِصاص ہے۔جُملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب ۶ ہجری میں مشرکین نے تم کو عمرہ سے روکا اور مذکورہ حرمتوں کو پامال کیا تو (اگلے ہی سال) ۷ ہجری میں تم لوگوں کو توفیق مل گئی اور مشرکین کے ارادہ کے برخلاف تم لوگوں نے عمرہ کی قضاء کی۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق قتال اور جہاد سے ہے۔اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مشرکین محترم مہینے میں تمہارے ساتھ جنگ کا آغاز کریں تو تم اُس مہینہ میں اُن کے ساتھ قتال کرو' کیونکہ یہ محترم چیز کا قصاص (یعنی بدلہ) ہے۔

آخر میں جو بات ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى﴾ سے ارشاد فرمائی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ لڑائی کے ذریعہ زیادتی

کرے تو تم بھی اُس کے ساتھ زیادتی کرو یعنی اس کے ساتھ قتال کرو۔ زیادتی کا بدلہ بہ ظاہر زیادتی ہوتا ہے اس لیے آیت میں بدلہ لینے کو زیادتی فرمایا گیا۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور نیکی کیا کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے○

اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنے کا بیان

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ کی راہ سے مراد جہاد ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے جہاد اور اس میں مشغول ہونے کا حکم فرمایا تو اب مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوئی اس لیے اس آیت میں انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ ﴿انفاق﴾ کا معنیٰ ہے: مال کو مختلف دینی کاموں میں خرچ کرنا جیسے حج و عمرہ صلہ رحمی صدقہ جہاد مجاہدین کی تیاری اور اپنی جان اپنی اولاد اور دیگر وہ تمام امور جو اللہ کے قرب کا باعث ہیں ان میں خرچ کرنا انفاق ہے۔ کیونکہ یہ تمام اُمور فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ لیکن (زیر بحث آیت میں) ﴿فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ کے لفظ سے جہاد مراد لیا گیا ہے (یعنی تم جہاد کے لیے خرچ کرو)۔

(۲۲۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس سے اجر و ثواب کے حصول کے لیے اور اُس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا[۴۷۸] تو اُس گھوڑے کا پیٹ بھرنا اُس کو پانی پلانا اور دونوں مقامات کا فضلہ سب چیزیں قیامت کے دن اس شخص کے میزان عمل میں ہوں گی۔ (صحیح بخاری: ۲۸۵۳ سنن نسائی: ۳۵۸۲ مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۴ مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۶۸۔ ص ۳۳۶)

☆ یعنی مذکورہ تمام چیزوں کے بدلہ میں نیکیاں میزانِ عمل میں ہوں گی۔

(۲۳۰) حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں کوئی چیز خرچ کی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے سات سوگنا اجر لکھے گا۔[۴۷۹]

(سنن ترمذی: ۱۶۲۵ سنن نسائی: ۳۱۸۶ مسند احمد ج ۴ ص ۳۴۵ المستدرک ج ۲ ص ۸۷ الترغیب ج ۲ ص ۱۵۶ مشکوٰۃ: ۳۸۲۶۔ ص ۳۳۲)

---

[۴۷۸] اللہ کی راہ سے مراد جہاد بھی ہو سکتا ہے اور حج و زیارت وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور گھوڑا باندھنے سے اس کو پالنا یا وقف کرنا مراد ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے جہاد یا حج و زیارت کے لیے گھوڑا پالا یا لوگوں کے لیے اُسے وقف کیا تو وہ گھوڑا جو کچھ کھائے گا پیئے گا اور قضاء حاجت کرے گا اس کے بدلہ میں قیامت کے دِن اُس شخص کے میزان میں نیکیاں ہوں گی۔ (مراۃ المناجیح ج ۶ ص ۵۱۴ موضحاً) واضح رہے کہ گھوڑا باندھنے سے مراد محض گھوڑا نہیں ہے بلکہ بدلتے ہوئے زمانہ کے مطابق ہر دور کے اسبابِ سفر اس میں داخل ہوں گے۔

[۴۷۹] گذشتہ حدیث: ۲۲۹ کی طرح اس میں بھی اللہ کی راہ سے مراد ہر دینی کام ہے۔ یعنی جس نے جہاد یا حج و عمرہ یا کسی نافع کتاب کی اشاعت یا مسجد و مدرسہ کی تعمیر یا اس طرح کے دیگر امور میں خرچ کیا اس کے لیے سات سو درجہ ثواب لکھا جاتا ہے۔ اس حدیث میں خرچ کی تفصیل نہیں ہے کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ لہٰذا کم خرچ کیا جائے یا زیادہ بہر حال اجر و ثواب سات سو درجہ ہوگا۔ واضح رہے کہ سات سو درجہ اجر و ثواب انتہاء اور اختتام نہیں ہے بلکہ یہ کم از کم درجہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاں سات سو درجہ اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے وہاں آخر میں فرمایا ہے کہ "اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اضافہ فرماتا ہے"۔ (البقرہ: ۲۶۱)

(مرقات ج ۷ ص ۳۸۹ مراۃ ج ۵ ص ۴۸۲)

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت کا حکم اور اس کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے اقوال

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''بـأیـدیکم'' پر جو باء ہے وہ زائدہ ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور ہاتھوں سے مراد جان ہے' لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہاں جان کو ہاتھ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''بـأیدیکم'' میں باء اپنی اصل پر ہے' اور کلام میں ایک لفظ محذوف ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے: ''ولا تـلـقـوا انفسکـم بـایدیکم الی التهـلكة '' اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جیسے کوئی شخص جب اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔

اس آیت میں جو ﴿ تهـلكة ﴾ کا لفظ ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا انجام ہلاکت ہو وہ ''تهـلكـه'' ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''تهـلكـه'' اُس ہلاکت کو کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن ہو اور ''هلاک'' اُس ہلاکت کو کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن نہ ہو۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو' اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا نہ چھوڑو' کیونکہ یہ ہلاکت اور تباہی کا سبب ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو' اگرچہ تمہارے پاس صرف ایک تیر ہو یا چوڑے پھل کا تیر ہو۔ اور تم میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا معمول تھا کہ وہ بغیر کوئی خرچہ لیے فوج کے ساتھ نکل پڑتے تھے' پھر ہوتا یہ تھا کہ یا تو وہ سفر نہیں کر پاتے تھے یا پھر محتاج ہو جاتے تھے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث آیت میں) یہ حکم فرمایا کہ اللہ کی راہ میں اپنے آپ پر خرچ کرو' اور جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کو وہ جہاد کے دوران خرچ کر سکے تو وہ جہاد کے لیے نہ نکلے تاکہ وہ بھوک' پیاس اور چلنے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا نزول ترکِ جہاد کے بارے میں ہوا ہے (یعنی تم جہاد کو ترک نہ کرو)۔ جیسا کہ ابو عمران (ان کا نام اسلم تھا) بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۳۱) ہم شہرِ روم میں تھے۔ تو روم والوں نے ہماری طرف اپنے فوجیوں کا ایک بڑا لشکر بھیجا' جواب میں مسلمان بھی ان کی طرف اُتنے ہی یا اُن سے زیادہ نکلے۔ اُس وقت مصر والوں پر عقبہ بن عامر مقرر تھے' اور امیر لشکر فضالہ بن عُبید تھے۔ (جب جنگ کا آغاز ہوا تو) ایک مسلمان نے لشکر روم پر حملہ کیا' حتیٰ کہ وہ ان کے لشکر میں گھس گیا۔ لوگ چلائے اور کہنے لگے: اللہ کی ذات پاک ہے' یہ شخص اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ اس پر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم لوگ اس آیت ''ولا تـلـقـوا بـایـدیـکـم الی التهلكة '' کا یہ مطلب لیتے ہو' حالانکہ یہ تو ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگ رسول اللہ ﷺ سے علیحدہ ہو کر آپس میں چپکے چپکے یہ کہنے لگے کہ ہمارے اموال ضائع ہو گئے' اور اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا ہے اور اسلام کے مددگار بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب اگر ہم اپنے اموال پر توجہ دیں تو جتنا مال ضائع ہو چکا ہے اُس کی ہم اصلاح کر سکتے ہیں' اس پر اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: ''وانـفـقـوا فی سبیل الله ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة '' اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ لہٰذا اس آیت میں ''تهـلكه'' (ہلاکت) سے مراد یہ ہے کہ اموال کی نگہداشت اور ان کی اصلاح کی جائے اور اس کی وجہ سے ہم جہاد کو چھوڑ دیں (اس سے اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں منع فرمایا)۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری

رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیشہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سرزمین روم میں مدفون ہوئے۔[۴۸۰]

(سنن ترمذی: ۲۹۷۲، سنن ابوداؤد: ۲۵۱۲، المعجم الکبیر: ۴۰۶۰، المستدرک ج ۲ ص ۲۷۵)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ یہ غریب اور صحیح ہے۔ ☆ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی کا جو آخری جہاد قسطنطنیہ کی سرزمین پر کیا تھا اُس میں آپ کا انتقال ہوا اور آپ کو قسطنطنیہ کے شہر میں دفن کیا گیا' لوگ آپ کی قبر سے برکت حاصل کرتے تھے اور اس کے وسیلہ سے بارش کی دُعا کیا کرتے تھے۔[۴۸۱]

(۲۳۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اس حالت میں مر گیا کہ اُس نے (اپنی زندگی میں) نہ جہاد کیا نہ اُس کی تمنا کی تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔[۴۸۲] حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ فرمان نبی اکرم ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔[۴۸۳] (صحیح مسلم: ۱۹۱۰، سنن ابوداؤد: ۲۵۰۲، سنن نسائی: ۳۰۹۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۴، المستدرک ج ۲ ص ۷۹، سنن بیہقی ج ۹ ص ۴۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۱۳۔ ص ۳۳۱)

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت کی دیگر تفاسیر

زیرِ بحث آیت میں جو فرمایا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اس کا ایک معنیٰ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ مایوسی یہ ہے کہ آدمی گناہ کرکے کہے کہ میں تو ہلاک ہو گیا اور اب میری توبہ بھی قبول نہیں ہوگی۔ اس طرح کی باتیں سوچ کر آدمی مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور مزید گناہ کرنے لگ جاتا ہے۔ زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات سے منع فرمایا ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور یہ نہ کہو کہ اگر ہم خرچ کریں گے تو ہمیں غریب ہونے کا اندیشہ ہے' اور جب ہم غریب ہو جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔ اس آیت میں لوگوں کو اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ خرچ کرکے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں (یعنی اس طرح کی بات کہنے سے منع کیا گیا ہے)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ

---

۴۸۰ اس حدیث شریف کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے جو منع کیا گیا ہے اس سے مراد مال و دولت کی ایسی نگہداشت ہے جو جہاد سے غافل کر دے۔ لہٰذا مال و دولت کے حصول میں ایسی توجہ جو خدمتِ دین میں کوتاہی اور غفلت کا سبب ہو شرعاً ممنوع اور مذموم ہے۔

۴۸۱ علامہ ابن اثیر الجزری (متوفی ۶۳۰ھ) اور دیگر علماء رجال نے اپنی کتب میں اس کی صراحت فرمائی ہے اور حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ قحط سالی کے وقت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کو کھول دیا جاتا تھا تو بارش کا نزول ہوتا تھا۔ (دیکھئے: اُسد الغابہ ج ۶ ص ۲۳) اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل کے نیک بندوں کے مزار پر حاضر ہونا' اللہ کی بارگاہ میں اُن کا وسیلہ پیش کرکے دُعا کرنا اور اُن کے آثار و تبرکات سے فیض حاصل کرنا مسلمانوں کا معمول رہا ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کو ممنوع قرار دینا اور مسلمانوں کو ان سے روکنا درست نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل رہا۔)

۴۸۲ نفاق کے شعبہ میں مرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ منافقوں کے مشابہ ہو گیا۔ کیونکہ منافقین بھی جہاد سے پیچھے رہتے تھے اور مختلف قسم کے بہانے کرتے تھے۔ (مرقات ج ۷ ص ۳۷۸)

۴۸۳ زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ یہ حدیث ہر زمانہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ میں عموم ہے۔ البتہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں کم از کم جہاد کی تمنا ہونی چاہیے جس کا دل جہاد کی تمنا اور خیال سے بھی خالی ہو (بایں معنیٰ کہ اُسے ناپسند کرتا ہو) تو وہ منافقوں کے مشابہ ہے۔ (مرقات ج ۷ ص ۳۷۸، مرأۃ ج ۵ ص ۴۷۶)

عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (صحیح بخاری:۴۵۱۶)

﴿ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ''نیکی کرو'' کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی ذمہ داری اور خرچہ تم پر لازم ہے اُن پر خرچ کر کے تم نیکی کرو۔ بعض مفسرین اس کا معنیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ خرچ کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو' نہ حد سے آگے بڑھو اور نہ بہت کمی کرو۔ بعض مفسرین کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ آخر میں جو فرمایا کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کرنے والوں کو اُن کے نیکی کرنے پر اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

اور تم (اللہ کی رضا کے لیے) حج اور عمرہ کو پورا کرو' پھر اگر تمہیں (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی کا جانور تمہیں آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور جب تک قربانی کا جانور اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈاؤ' پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلہ میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے' پھر جب تم حالت امن میں ہو (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو جو جانور اُسے میسر ہو اُس کی قربانی کرے' اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ یہ پورے دس (روزے) ہوئے' (حج تمتع کا) یہ حکم اُس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے نہ ہوں' اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے O

حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کی تفسیر میں علماء مفسرین کے اقوال

﴿ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ اور تم اللہ کے لیے حج اور عمرہ مکمل کرو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حج و عمرہ دونوں کو ان کے مناسک' اُن کی پابندیوں اور ان کے آداب کے ساتھ پورا کیا جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حج و عمرہ کو مکمل کرنا یہ ہے کہ دونوں کا احرام تم اپنے گھر سے باندھو۔ بعض فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو مکمل کرنا یہ ہے کہ دونوں کے لیے علیحدہ سفر کرو۔ بعض فرماتے ہیں کہ مکمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ دونوں میں تمہارا خرچہ حلال ہو اور اُن تمام چیزوں سے تم باز رہو جن سے اللہ عز و جل نے روکا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ مکمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ تم گھر سے جب نکلو تو تجارت یا کسی اور مقصد کو پیش نظر نہ رکھو بلکہ حج اور عمرہ کی غرض سے نکلو۔ بعض فرماتے ہیں کہ جب حج و عمرہ کا آغاز

کر دیا جائے تو ان کو مکمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

حج اور عمرہ کی فرضیت کا بیان

تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حج اُس شخص پر فرض ہے جو آنے جانے کی مکمل طاقت رکھتا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

(۲۳۳) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے لہٰذا تم حج کرو۔ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا (فرض) ہے؟ آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ جب اُس شخص نے تین مرتبہ اپنی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتے۔[۸۴] (صحیح مسلم: ۱۳۳۷، نسائی: ۲۶۱۹، مشکوٰۃ: ۲۵۰۵ ـ ص ۲۲۰)

عمرہ کرنا بھی واجب ہے یا نہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ امام شافعی کا صحیح ترین قول اس بارے میں یہ ہے کہ عمرہ کرنا واجب ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، ابن سیرین، عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا یہی قول ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی یہی مذہب اختیار کیا ہے۔ دوسرا قول عمرہ کے بارے میں یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت جابر، ابراہیم نخعی اور امام شعبی سے یہی منقول ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے۔[۸۵]

جن علماء نے عمرہ کرنے کو ضروری قرار دیا ہے اُن کے دلائل

(پہلی دلیل) صُبَی بن معبد کی حدیث ہے کہ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ میں نے حج اور عمرہ دونوں کو اپنے آپ پر فرض پایا اور میں نے دونوں کی تکبیر پڑھی۔ حضرت عمر نے فرمایا: تمہیں اپنے نبی سیدنا محمد ﷺ کے طریقہ کی ہدایت اور توفیق ملی۔ (سنن ابوداؤد: ۱۷۹۸، سنن نسائی: ۲۷۱۹، سنن ابن ماجہ: ۲۹۷۰، مسند احمد ج ۱ ص ۲۵)

اس روایت سے استدلال اس طرح ہے کہ صُبَی بن معبد نے حضرت عمر کو یہ بتایا کہ مجھ پر حج اور عمرہ دونوں واجب ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے یہ بات سُن کر ان کی تائید فرمائی اور یہ بتایا کہ تم نے حج اور عمرہ دونوں کو جو اپنے آپ پر فرض جانا (اور ان کو ادا کیا) اس میں تم درست تھے کیونکہ یہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ ہے۔ (دوسری دلیل) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی آیت "واتموا الحج والعمرۃ للہ" میں عمرہ کا ذکر حج کے ساتھ ہے۔ (تیسری دلیل) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول ہے کہ حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں۔ اور یہ بھی آپ کا قول ہے کہ اللہ کی مخلوق میں ہر اُس شخص پر حج اور عمرہ فرض ہے جو آنے جانے کی طاقت رکھتا ہو۔ (چوتھی دلیل) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول ہے کہ جس طرح حج فرض ہے اس طرح عمرہ بھی فرض ہے۔ (پانچویں دلیل) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۸۴؎ اس حدیث شریف سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ (صاحب استطاعت پر) حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو شرعی احکام میں بااختیار بنایا ہے، وہ جس بات کو چاہیں نافذ کر دیں اور جس سے چاہیں منع فرما دیں۔ (دیکھئے: اشعۃ اللمعات ج ۲ ص ۳۰۲)

۸۵؎ ذیل میں علامہ خازن نے فریقین کے دلائل ذکر فرمائے ہیں اور احناف کا رد کیا ہے۔ علامہ نے شوافع کے مؤقف پر جو دلائل ذکر کیے ہیں اُن کے جوابات اور امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی تائید آنے والے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲۳۴) لگا تار حج اور عمرہ کرو کیونکہ یہ دونوں غربت اور گناہوں کو اس طرح مٹا دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دُور کر دیتی ہے اور حج مقبول کا ثواب صرف اور صرف جنت ہے۔

(سنن ترمذی: ۸۱۰ سنن نسائی: ۲۶۳۰ مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۷ مشکوۃ: ۲۵۲۴ ص ۲۲۲)

(بعض کتب حدیث میں) یہ اضافہ بھی ہے:

(۲۳۵) کہ جو مسلمان بھی اپنا دن حالت احرام میں گزارتا ہے تو سورج اس کے گناہوں کو لے کر غروب ہوتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۹۲۵ سنن بیہقی ج ۵ ص ۷۰ الترغیب ج ۲ ص ۱۸۸)

حدیث مذکور: ۲۳۴ سے استدلال اس طرح ہے کہ اس میں نبی اکرم ﷺ نے حج اور عمرہ کو لگاتار ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اور حکم (یعنی امر) وجوب کے لیے ہوتا ہے (لہٰذا حج کی طرح عمرہ کرنا بھی فرض ہے)۔

(چھٹی دلیل) یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں حج کے ساتھ ساتھ عمرہ کو بھی مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا جس طرح حج فرض ہے اس طرح عمرہ بھی فرض ہوگا۔[۴۸۶]

[۴۸۶] یہاں تک علامہ خازن نے چھ دلائل ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ عمرہ کی ادائیگی واجب ہے۔ ہماری جانب سے علامہ خازن کے ان دلائل کے بالترتیب جوابات یہ ہیں کہ حضرت صُبی بن معبد کا واقعہ نذر پر محمول ہے۔ یعنی انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہا کہ ''میں نے حج اور عمرہ دونوں کو اپنے آپ پر فرض پایا'' اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے حج اور عمرہ کی منّت مانی تھی ورنہ وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالخصوص اپنا تذکرہ نہ کرتے بلکہ یوں کہتے کہ میں نے حج اور عمرہ دونوں کو لوگوں پر فرض پایا۔ لہٰذا اس سے عمرہ کے واجب ہونے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ (دیکھئے: احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۶۷) دوسری دلیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما صرف یہ فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت میں عمرہ کو حج کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عمرہ ادا کرنا واجب ہے اور اگر بالفرض اس سے عمرہ کا وجوب مراد ہو تو یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اپنا مؤقف ہے۔ جیسا کہ علامہ خازن اس بارے میں صحابہ کرام کا اختلاف ذکر کر چکے ہیں۔ سو احناف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف پر ہیں جو کہ عمرہ کے سنّت ہونے کے قائل ہیں۔ علامہ خازن کی تیسری اور چوتھی دلیل کا بھی یہی جواب ہے۔ پانچویں دلیل کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حج اور عمرہ کی محض ادائیگی کا حکم نہیں دیا بلکہ اُنہیں لگاتار ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ سو اگر یہاں امر وجوب کے لیے ہو تو چاہیے کہ حج اور عمرہ کو لگاتار ادا کرنے کے وجوب کا قول کیا جائے حالانکہ علامہ خازن کا مدّعٰی محض عمرہ کا وجوب ثابت کرنا ہے اور حدیث میں اس پر دلالت نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث شریف کا معنٰی ومفہوم یہ ہوگا کہ حج کے ساتھ ساتھ عمرہ بھی ادا کرنا زیادہ افضلیت کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شارحین نے حج وعمرہ لگاتار ادا کرنے سے حج قِران مراد لیا ہے۔ حدیث شریف کے اس معنٰی ومفہوم کی تائید اسی حدیث کے اگلے حصہ میں موجود ہے۔ علامہ خازن کی چھٹی دلیل کا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں حج اور عمرہ کا ایک ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا حکم یکساں ہو۔ لہٰذا حج کی فرضیت سے عمرہ کے لازمی ہونے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۶۹۸) دوسرا جواب یہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور مکمل کرنا اس وقت ہوتا ہے جب آغاز اور شروع کرنا پایا جائے۔ لہٰذا آیت مبارکہ میں محض عمرہ کی ادائیگی کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ شروع کرنے کی صورت میں اُسے مکمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ عمرہ شروع کرنے سے لازم ہو جاتا ہے جبکہ علامہ خازن کا مدّعٰی محض عمرہ کا وجوب ثابت کرنا ہے اور آیتؔ میں اس پر دلالت نہیں ہے۔

(دیکھئے: احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۶۴ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۶۰)

جن علماء نے عمرہ کرنے کوسنت قرار دیا ہے ان کی دلیل اور اس دلیل کا جواب

عمرہ کوسنت قرار دینے والے علماء کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۳۶) رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا: کیا عمرہ کرنا واجب ہے؟ آپ نے فرمایا: واجب نہیں ہے' البتہ اس کو کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ (سنن ترمذی:۹۳۱' سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۴۹' سنن دارقطنی ج ۲ ص ۲۸۵' مسند احمد ج ۳ ص ۳۱۶)

اس حدیث سے استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس حدیث کو حجاج بن ارطاۃ نے روایت کیا ہے اور یہ شخص ان راویوں میں سے نہیں ہے جن کی تنہا روایت مقبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس شخص کا حافظہ کمزور تھا اور یہ جس حدیث کو بیان کرتا تھا اُس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔[487]

حج اور عمرہ کی اقسام

امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حج اور عمرہ کو تین طریقوں سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ (۱) اِفراد (۲) تمتع (۳) قِران۔

اِفراد یہ ہے کہ آدمی حج کرے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد حدودِ حرم سے باہر قریب ترین جگہ سے (احرام باندھ کر) عمرہ کرے' یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرے' پھر اُس سے فارغ ہونے کے بعد اُسی سال مکہ مکرمہ سے حج کا احرام باندھے۔ تمتع والی صورت میں آدمی چونکہ عمرہ کا احرام کھولنے کے بعد حج کا احرام باندھنے تک ممنوعات احرام سے استمتاع یعنی فائدہ حاصل کرسکتا ہے اس لیے اس کو تمتع کہتے ہیں۔ قِران یہ ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ کا (ایک ساتھ) احرام باندھ کر اُن دونوں کی دل سے نیت کرے۔ اسی طرح اگر آدمی حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے اور اس کا طواف کرنے سے پہلے حج کو بھی عمرہ کے ساتھ شامل کرلے تو یہ بھی قِران ہوگا۔

مذکورہ اقسام میں کون سی قسم سب سے افضل ہے؟ اس بارے میں ائمہ اربعہ کا اختلاف اور ان کے دلائل

اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ مذکورہ اقسام میں کون سی قسم سب سے افضل ہے؟ امام مالک اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ سب سے افضل اِفراد ہے' پھر تمتع اور پھر قِران افضل ہے۔ اِفراد کا افضل ہونا درج ذیل احادیث سے ثابت ہے:

(۲۳۷) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج میں اِفراد کیا۔

(صحیح مسلم:۱۲۱۱' سنن ترمذی:۸۲۰' سنن ابوداؤد:۱۷۷۷' سنن نسائی:۲۷۱۵' سنن ابن ماجہ:۲۹۶۴' سنن بیہقی ج ۵ ص ۴' سنن دارقطنی ج ۲ ص ۲۳۸)

---

[487] علامہ خازن اس سے امام ابوحنیفہ کے مؤقف کو کمزور ثابت کررہے ہیں۔ لیکن علامہ کی یہ گفتگو اس وقت درست ہوتی جب امام ابوحنیفہ کے مؤقف کی تائید میں یہی ایک حدیث ہوتی جس کے راویوں میں حجاج بن اُرطاۃ ہے۔ جبکہ تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مؤقف کی تائید میں اور بھی دلائل موجود ہیں۔ مثلاً حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حج کرنا جہاد ہے اور عمرہ کرنا تطوّع ہے (یعنی واجب نہیں ہے)۔ (سنن ابن ماجہ:۲۹۸۹' سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۴۸) اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ) کیا عمرہ واجب ہے اور اس میں حج کی طرح فرائض ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! (بلکہ) عمرہ کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ (سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۴۹) واضح رہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کی سند میں حجاج بن اُرطاۃ نہیں ہے۔ جبکہ علامہ خازن نے سنن ترمذی کے حوالہ سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت ذکر کی ہے' اُس کی سند میں حجاج بن اُرطاۃ موجود ہے جس کی بنیاد پر علامہ خازن نے اس روایت سے استدلال کو کمزور ثابت کیا ہے۔ لیکن امام ترمذی نے اس حدیث کی سند میں حجاج بن اُرطاۃ کے موجود ہونے کے باوجود اس کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔

(۲۳۸) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج اِفراد کی تکبیر کہی۔ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج افراد کی تکبیر کہی۔(صحیح مسلم:۱۲۳۱)

(۲۳۹) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (مکہ میں) آئے اور ہم بلند آواز سے حج کی تکبیر کہہ رہے تھے۔(صحیح مسلم:۱۲۴۸' مسند احمد ج ۳ ص ۱۷)

(افراد کے اَفضل ہونے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ) حضرت عبد اللہ بن عمر[۴۸۸] رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ارشاد فرمایا: تم اپنے حج اور عمرہ کے درمیان فاصلہ کرو' کیونکہ اس سے تمہارا حج زیادہ کامل طور پر ادا ہوگا۔اور عمرہ کی کامل طور پر ادائیگی یہ ہے کہ آدمی حج کے مہینوں کے علاوہ کسی اور مہینے میں عمرہ کرے۔[۴۸۹] (مؤطا امام مالک:۳۰' صحیح مسلم:۱۲۱۷)

ابو سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ مذکورہ اقسام میں قران اَفضل ہے۔ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۴۰) میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کی ایک ساتھ تکبیر پڑھتے ہوئے سنا۔[۴۹۰]

(صحیح بخاری:۴۳۵۳' صحیح مسلم:۱۲۳۲' سنن نسائی:۲۷۳۱)

امام احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راھویہ کا مذہب یہ ہے کہ مذکورہ اقسام میں تمتع اَفضل ہے۔ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۴۱) رسول اللہ ﷺ' حضرت ابو بکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان (ان سب) نے تمتع کیا۔اور سب سے پہلے جس نے تمتع سے منع کیا وہ حضرت امیر معاویہ ہیں[۴۹۱] (سنن ترمذی:۸۲۲) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

---

[۴۸۸] یہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے۔(کذا فی المؤطا)

[۴۸۹] یہاں تک علامہ خازن نے تین دلائل ذکر کیے ہیں اور ان سے یہ ثابت کیا ہے کہ اِفراد' قران اور تمتع میں سے افراد افضل ہے۔ہمارے نزدیک علامہ خازن کے ان دلائل کے جواب میں صرف وہی بات کافی ہے جو خود علامہ نے متعارض روایات کی تطبیق کے زیرِ عنوان آگے ذکر فرمائی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حج کے لیے روانہ ہوئے تو ابتداءً مفرِد تھے' پھر آپ نے عمرہ کا احرام باندھ کر حج کے ساتھ عمرہ بھی ادا کیا' یوں قارن ہوئے۔سو جس صحابی نے یہ روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حج اِفراد کیا ہے اُس نے آغاز کا اعتبار کیا اور جس نے یہ روایت کیا کہ آپ کا حج قِران تھا تو اس نے آپ کے فعل کے آخری حصہ کا اعتبار کیا۔(الخ) واضح رہے کہ علامہ خازن کی یہ عبارت ہم نے اُن ہی کے زیرِ بحث دلائل کے جواب میں ذکر کی ہے ورنہ ہمارے نزدیک نبی اکرم ﷺ کا حج "قِران" تھا اور قران ہی کو تمام اقسام پر فضیلت حاصل ہے۔جیسا کہ آئندہ حواشی میں دلائل سے واضح ہوگا۔

[۴۹۰] اس حدیث سے جہاں نبی اکرم ﷺ کے حج کا قِران ہونا اور پھر تمام اقسام میں قران کا اَفضل ہونا ثابت ہوتا ہے وہاں علامہ خازن کی اِفراد کے اَفضل ہونے پر گذشتہ احادیث کا محمل بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اصلاً نبی اکرم ﷺ کا حج "قِران" تھا۔البتہ جو صحابہ نبی اکرم ﷺ سے حج کے ساتھ ساتھ عمرہ کی نیت نہ سُن سکے انہوں نے یہ روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ کا حج "افراد" تھا۔سو زیرِ بحث روایت کے ہوتے ہوئے اِفراد کی روایات سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

[۴۹۱] ہمارے نزدیک اس روایت میں اور اس کے بعد والی روایت:۲۴۲ میں تمتع سے اس کا لغوی معنیٰ (فائدہ اٹھانا) مراد ہے۔یعنی نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایک ہی احرام سے حج اور عمرہ دونوں کا فائدہ حاصل کیا۔اس تاویل کی رُو سے تمتع کی روایات درحقیقت قِران کی دلیل ہیں اور مزید یہ کہ اس تاویل سے روایات کے درمیان پایا جانے والا تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے۔جیسا کہ متعارض روایات کی تطبیق کے زیرِ عنوان خود علامہ خازن نے صراحت فرمائی ہے۔

(۲۴۲) حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر تمتع کیا اور ہدی دی۔ آپ ہدی (قربانی کا جانور) ذوالحلیفہ سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے عمرہ کا تلبیہ کیا اور اس کے بعد حج کا تلبیہ پڑھا۔ لوگوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عمرہ اور حج کو ملا کر تمتع کیا لوگوں میں کچھ افراد ایسے تھے جنہوں نے ہدی روانہ کر دی تھی اور کچھ ایسے تھے جنہوں نے ہدی روانہ نہیں کی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ تشریف لائے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص ہدی (قربانی کا جانور) روانہ کر چکا ہے اُس کے لیے حکم یہ ہے کہ جو چیزیں اُس پر حج میں حرام ہو چکی ہیں اُن میں سے وہ کسی بھی چیز کو اختیار کر کے اس وقت تک احرام سے باہر نہ آئے' جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہو جائے۔ اور تم میں سے جس شخص نے ہدی روانہ نہیں کی ہے اُسے چاہیے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرے' صفا و مروہ کی سعی کرے اور بال کاٹ کر احرام سے باہر آ جائے۔ اس کے بعد حج کا احرام باندھ لے اور قربانی کرے۔ اور جس شخص کو قربانی میسر نہ ہو وہ تین روزے ایام حج میں رکھے' اور سات روزے گھر لوٹنے کے بعد رکھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے تو سب سے پہلے آپ نے حجر اسود کا استلام کیا (یعنی دونوں ہاتھ اس پہ رکھ کر اُسے بوسہ دیا) پھر آپ نے طواف کے سات چکروں میں سے تین چکر دوڑ کر لگائے اور چار چکر معمول کے مطابق چل کر لگائے' پھر جب آپ نے طواف کر لیا تو مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز ادا فرمائی' پھر صفا پر تشریف لائے اور صفا مروہ کے سات چکر لگائے اور حج پورا کرنے تک آپ احرام سے باہر نہیں آئے اور قربانی کے دن اپنی ہدی کو ذبح کیا' پھر آپ نے بیت اللہ کا طواف افاضہ (یعنی طواف زیارت) کیا اور (اس کے بعد) اپنا احرام کھول دیا۔ صحابہ میں سے جن لوگوں نے ہدی روانہ کر دی تھی انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی طرح افعال کیے۔[۴۹۲]

(صحیح بخاری: ۱۶۹۱' صحیح مسلم: ۱۲۲۷' سنن ابوداؤد: ۱۸۰۵' سنن نسائی: ۲۷۳۲' مسند احمد ج ۲ ص ۱۴۰)

نبی اکرم ﷺ نے جو حج فرمایا آیا وہ قران تھا یا تمتع یا اِفراد؟ نیز متعارض روایات میں تطبیق

اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جو حج فرمایا' آیا وہ حج اِفراد تھا یا تمتع یا قران؟ مذکورہ مذاہب کے مطابق اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ اور علماء کے ہر گروہ نے اقسام مذکورہ میں سے کسی نہ کسی قسم کو ترجیح دی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا حج اسی طرح تھا۔ آپ ﷺ کے حج کے بارے میں صحابہ کے درمیان جو اختلاف تھا اور اس سلسلے میں جو مختلف روایات ہیں ان کی تطبیق (یعنی تعارض اور اختلاف کو دور کرنے کا طریقہ) یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو ابتداءً آپ مُفرد تھے' پھر آپ نے عمرہ کا احرام باندھ کر حج کے ساتھ عمرہ بھی ادا کیا۔ یوں آپ قارِن ہوئے۔ سو جس صحابی نے یہ روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حج اِفراد کیا ہے اُس نے آغاز کا اعتبار کیا' اور جس نے یہ روایت کیا کہ آپ کا حج قران تھا تو اس نے آپ کے فعل کے آخری حصہ کا اعتبار کیا' اور جس نے یہ روایت کیا کہ آپ نے حج تمتع کیا ہے اُس نے تمتع کا لغوی معنیٰ مراد لیا ہے' یعنی فائدہ اٹھانا۔ اور یقیناً نبی اکرم ﷺ نے حج قران کر کے تمتع کا فائدہ حاصل کیا بلکہ اس سے زیادہ فائدہ حاصل کیا۔ یعنی ایک ہی فعل پر اکتفاء فرمایا (جیسا کہ بیان کر چکے کہ قران میں حج و عمرہ دونوں کے لیے ایک ہی احرام باندھا جاتا ہے)۔ اس طرح وہ تمام احادیث یکجا ہو گئیں جو حجۃ الوداع کے بارے میں مختلف وارد ہوئی تھیں۔ اور یہی توجیہ و تاویل صحیح ہے[۴۹۳] اس موضوع پر امام شافعی نے اپنی ایک کتاب ''اختلاف الحدیث'' میں مختصر اور جامع گفتگو فرمائی ہے'

---

[۴۹۲] اس روایت کے جواب کے لیے گذشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[۴۹۳] ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا حج اوّل تا آخر قران تھا اور آپ نے عمرہ اور حج دونوں کا ایک احرام باندھا تھا۔ البتہ متعارض روایات کی توجیہ امام طحاوی کی تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ''لبیک بحجۃ'' فرمایا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ ایسے تھے جو اِفراد کرتے تھے' بعض ایسے تھے جو قران کرتے تھے اور بعض تمتع کرتے تھے' اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کا عمل نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے افعالِ حج اور آپ کی تعلیم کی روشنی میں ہوتا تھا اس لیے (روایات میں) افراد' قران اور تمتع میں سے ہر ایک کی نسبت اس اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کی طرف کی گئی ہے کہ آپ ہی نے ان کی ادائیگی کا حکم اور اجازت مرحمت فرمائی۔ اور عربی زبان میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ کام کی نسبت جس طرح اُس کام کے کرنے والے کی طرف کی جاتی ہے اسی طرح اُس کام کے حکم دینے والے کی طرف بھی اُس کی نسبت کر دی جاتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنا گھر بنایا' اور مراد لیا جاتا ہے کہ اُس نے بنوایا۔ اور جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے حضرت ماعز کو رجم کیا'' حالانکہ آپ نے رجم کروایا تھا[۴۹۴]۔

نبی اکرم ﷺ کے حج کے بارے میں امام شافعی کا مختار یہ ہے کہ وہ حج اِفراد تھا۔ اس کی ترجیح میں امام شافعی نے جس بات سے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے حج کا حج اِفراد ہونا حضرت جابر' حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی روایت سے سندِ صحیح کے ساتھ ثابت ہے۔ اور یہ تمام وہ افراد ہیں جن کو حجۃ الوداع میں دیگر صحابہ پر فضیلت اور ترجیح حاصل تھی۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اگر دیکھا جائے تو آپ وہ صحابی ہیں جنہوں نے حجۃ الوداع کی حدیث دیگر صحابہ کے مقابلہ میں سب سے اچھے انداز میں بیان کی ہے' کیونکہ آپ نے حجۃ الوداع کو سرکارِ دو عالم ﷺ کے مدینہ منورہ سے نکلنے سے لے کر آخر تک مکمل بیان کیا ہے۔ لہٰذا آپ اس واقعہ کو دیگر صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ یاد رکھنے والے ہیں۔ جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں سندِ صحیح سے ثابت ہے کہ وہ اس واقعہ میں نبی اکرم ﷺ کی اُونٹنی کی مہار تھامے ہوئے تھے اور انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو صرف حج کا تلبیہ (لبیک اللھم لبیک) کہتے ہوئے سنا تھا۔ جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا معاملہ ہے' سو اُن کا علمی' فقہی اور دینی مقام و مرتبہ مشہور و معروف ہے' مزید یہ کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے احوال (کو بیان کرنے سے پہلے اُن کے بارے میں) بہت چھان بین کرتے تھے۔ پھر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جہاں تک تعلق ہے تو اُن کو رسول اللہ ﷺ سے جو قُرب اور رسول اللہ ﷺ کے ظاہری باطنی اُمور کا جو علم تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مزید یہ کہ اُن کا علم وفقہ بھی بہت زیادہ تھا (لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ان تمام صحابہ نے نبی اکرم ﷺ کے حج کی جو صفت بیان کی ہے وہ درست ہے' اور وہ یہ ہے کہ آپ کا حج' حج اِفراد تھا)۔ حج افراد کی ترجیح پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین نے بھی حج اِفراد کیا اور اسی پر کاربند رہے[۴۹۵]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تو اس سے بعض صحابہ نے یہ سمجھا کہ آپ نے صرف حج کا احرام باندھا ہے اس لیے انہوں نے حج افراد کی روایت کی اور جب آپ نے ''لبیک بعمرۃ'' فرمایا تو اس سے بعض صحابہ نے یہ سمجھا کہ آپ نے حج قِران کیا ہے۔ زیرِ بحث روایات کی تطبیق میں شمس الائمہ علامہ سرخسی اور علامہ ابن قیم نے بھی مفصّل تحقیق کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۳۹۸ تا ۴۰۸۔

[۴۹۴] رجم سے مراد یہ ہے کہ شادی شدہ آدمی کے بدکاری کرنے کی صورت میں اُسے سنگسار کیا جائے یعنی پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ احادیث مبارکہ میں رجم کرنے کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر آئی ہے۔ تحقیق کے لیے کتب حدیث میں کتاب الحدود دیکھئے۔

[۴۹۵] علامہ خازن کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعی کے مختار قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا حج ''حج اِفراد'' تھا۔ کیونکہ جن صحابہ نے حج اِفراد کو روایت کیا ہے وہ بہت جلیل القدر اور قُرب رکھنے والے صحابہ ہیں اور ان کی روایت بھی سندِ صحیح سے ثابت ہے۔ مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین حج افراد ہی پر کاربند رہے۔ ہمارے نزدیک علامہ خازن کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حج اور عمرہ کے ارکان اور حصر و احصار کے معانی میں ائمہ لغت کے مختلف اقوال

حج کے ارکان پانچ ہیں: (۱) احرام (۲) وقوف عرفہ (۳) طواف (۴) صفا مروہ کے درمیان سعی (۵) حلق یا تقصیر (یعنی سر منڈانا یا بال چھوٹے کروانا) عمرہ کے ارکان چار ہیں: (۱) احرام (۲) طواف (۳) صفا مروہ کے درمیان سعی (۴) حلق یا تقصیر۔ ان ارکان کی ادائیگی سے حج اور عمرہ کی تکمیل ہوتی ہے۔[۴۹۶]

زیر بحث آیت مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿اُحْصِرْتُمْ﴾ یہ ''حصر'' سے مشتق ہے اور ''حصر'' کا لغت میں اصل معنٰی ہے: روکنا اور تنگ کر دینا۔ پھر اس حصر اور احصار کے بارے میں اہل لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ احصار یہ ہے کہ آدمی کو اس کے مقصد سے واپس لوٹا دیا جائے اور حصر یہ ہے کہ آدمی کو اس کے مقصد تک پہنچنے سے روک دیا جائے۔ ابن السکیت فرماتے ہیں کہ جب آدمی کو کوئی بیماری یا کوئی ضروری کام سفر پر جانے سے روک دے تو احصار کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب دشمن کو تنگی میں ڈال دیا جائے (یعنی معاملہ کو اس پر مشکل بنا دیا جائے) تو حصر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ امام زجاج اہل لغت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے حج افراد کو جن صحابہ نے روایت کیا ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے تلبیہ مکمل نہیں سنا بلکہ صرف ''اللھم لبیک بحج'' سنا۔ اس لیے انہوں نے یہ روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا حج ''حج اِفراد'' تھا۔ علامہ نووی شافعی علامہ خطابی شافعی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے بعض صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کو صرف ''لبیک بحجة'' کہتے ہوئے سنا ہو اور اس کی بنیاد پر انہوں نے یہ بیان کر دیا کہ ہوکہ رسول اللہ ﷺ نے اِفراد فرمایا ہے۔ علامہ خازن کے استدلال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جن صحابہ سے حج اِفراد کی روایت ہے اُن کی مراد اس سے معنٰی لغوی ہے' یعنی نبی اکرم ﷺ نے حج اور عمرہ کو ملا کر ادا کیا لیکن اُن کے افعال کو باہم متحد نہیں کیا۔ (مزید تفصیل و تحقیق کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج۳ ص۴۰۹) علامہ خازن نے افراد کی افضلیت پر خلفاء راشدین کے عمل سے استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ خود علامہ خازن حدیث: ۲۴۱ کے تحت سنن ترمذی کے حوالہ سے حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان غنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا حج تمتع کرنا روایت کر چکے ہیں۔ لہٰذا اِفراد کا قول تمتع کی روایت سے متعارض ہے۔ دوسرا جواب بہت تحقیق اور تفصیل کے ساتھ استاذ محترم شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلّہ نے شرح صحیح مسلم میں دیا ہے جس میں انہوں نے دلائل سے یہ واضح کیا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما قِر ان کو سنّت جانتے تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قِران کی مخالفت ثابت نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج۳ ص۴۰۹) واضح رہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حج قِران تمام اقسام میں افضل ہیں۔ اس کی افضلیت پر شمس الائمہ علامہ سرخسی علیہ الرحمۃ نے المبسوط میں اور شیخ ابن قیم الجوزی نے زاد المعاد میں مفصل اور مدلّل بحث کی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے: شرح صحیح مسلم ج۳ ص۳۹۸ ـ ۴۰۶)

[۴۹۶] علامہ خازن نے حج کے پانچ اور عمرہ کے چار ارکان بیان کیے ہیں۔ ارکان اُن امور کو کہا جاتا ہے جن پر کسی چیز کا وجوب موقوف ہو۔ یعنی علامہ خازن کے بہ قول اگر بیان کردہ پہلی پانچ چیزوں میں سے کوئی چیز نہ پائی گئی تو سرے سے حج ادا ہی نہیں ہوگا۔ اور بعد والی چار چیزوں میں کوئی مفقود ہوئی تو عمرہ ادا نہیں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے کہ احرام کا ہونا حج کے لیے شرط ہے۔ اور وقوف عرفہ و طواف (یعنی طواف زیارت) حج کے ارکان ہیں۔ جبکہ سعی اور حلق یا تقصیر کا تعلق حج کے واجبات سے ہے۔ اسی طرح عمرہ میں احرام شرط ہے' طواف رکن ہے اور صفا مروہ کے درمیان سعی اور حلق یا تقصیر واجب ہے۔ (بدائع الصنائع' حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی وغیرہا) صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا امام شافعی کے نزدیک حج و عمرہ کا رکن ہے اور ہمارے نزدیک حج و عمرہ کے واجبات میں ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو علامہ خازن البقرہ: ۱۵۸ کی تفسیر میں فرما چکے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیے: البقرہ: ۱۵۸' مع حاشیہ ۳۵۰ تا ۳۵۶)

کی ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ جس آدمی کو کوئی خوف یا بیماری کسی کام سے روک دے تو احصار کا لفظ بولا جاتا ہے اور جس شخص کو روک دیا جائے اُس کے لیے حصر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آیت مبارکہ میں جو فرمایا: ''اگر تمہیں روک دیا جائے'' اس کے بارے میں ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو کوئی ایسی بیماری یا چوٹ یا دشمن عارض آ جائے جو اس کے اور حج کے درمیان حائل ہو جائے۔ ایسی صورت میں احصار اور محصَر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب آدمی کو کسی گھر میں یا قید خانہ میں قید کر دیا جائے تو حصر اور محصور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کے نزدیک حصر اور احصار دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ (جب آدمی کو کسی جگہ روک دیا جائے تو) اُس سے حصر اور احصار دونوں الفاظ کے ذریعہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ''من حصرتک ھنا'' یا ''ومن احصرک'' ''تمہیں کس نے یہاں روک دیا؟ احمد بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ حصر اور احصار دونوں کا معنیٰ ہے: روکنا۔ البتہ حصر کا لفظ روکنے کے معنیٰ میں احصار سے زیادہ قوی ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ روکنے والی چیز خواہ ظاہری ہو جیسے دشمن' یا باطنی ہو جیسے بیماری ان دونوں کے لیے احصار کا لفظ استعمال ہوتا ہے' جبکہ حصر کا لفظ صرف ایسی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو باطنی طور پر روکنے والی ہو۔ زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ''اگر تمہیں روک دیا جائے'' اس میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں (یعنی تمہیں دشمن روک دے یا کوئی بیماری روک دے)۔

کس رکاوٹ کے پائے جانے سے احرام کو کھولا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں امام ابوحنیفہ کا مؤقف اور ان کی دلیل

حصر اور احصار کے معنیٰ میں اہل لغت کا جو اختلاف بیان کیا گیا ہے اُس کے مطابق فقہاء کے درمیان اس کے حکم میں اختلاف ہے۔ کچھ علماء کا مؤقف یہ ہے کہ کسی بھی رکاوٹ کے پائے جانے سے احرام کھولنا جائز ہو جاتا ہے خواہ وہ رکاوٹ دشمن کی صورت میں ہو یا بیماری کی صورت میں یا خرچہ کے ختم ہو جانے کی صورت میں ہو۔ حضرت عطاء' مجاہد اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عکرمہ سے مروی ہے' وہ کہتے ہیں مجھے حجاج بن عمرو نے کہا کہ:

(۲۴۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے[۹۷] تو وہ اپنا احرام کھول لے' اور اس پر دوسرا حج کرنا لازم ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ حجاج بن عمرو نے سچ کہا۔ (سنن ترمذی: ۹۴۰' سنن ابوداؤد: ۱۸۶۲' سنن نسائی: ۲۸۶۰' سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۷' مسند احمد ج ۳ ص ۴۵۰' متدرک ج ۱ ص ۴۷۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۳-۲۷ ص ۲۳۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا مذہب اور ان کا استدلال

بعض دیگر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ احرام کھولنا صرف اُس وقت جائز ہے جب کوئی دشمن (حج یا عمرہ کرنے سے) روک دے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام مالک' لیث' امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ ان تمام حضرات کے نزدیک حصر اور احصار کا ایک ہی معنی ہے۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ زیر بحث آیت کا جو نزول ہوا ہے وہ ۶ ھ میں حدیبیہ کے موقع پر ہوا ہے اور اس وقت عمرہ کی ادائیگی میں دشمن ہی کی جانب سے رکاوٹ تھی' کیونکہ کفارِ مکہ نے نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو بیت اللہ کا طواف کرنے سے روک دیا تھا' اُس

[۹۷] ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: أو مرض (یا وہ بیمار ہو جائے)۔ (سنن ابوداؤد: ۱۸۶۳)

وقت زیر بحث آیت نازل ہوئی اور نبی اکرم ﷺ نے عمرہ کا احرام کھول دیا اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کر دیا اور آئندہ سال عمرہ کی قضا فرمائی۔ پھر زیر بحث آیت کے سیاق یعنی اگلے حصے سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ رکاوٹ سے صرف دشمن کی رکاوٹ مراد ہے کیونکہ آگے فرمایا: ''فاذا امنتم'' پھر جب تم حالتِ امن میں ہو۔ اور امن اُسی چیز سے ہوتا ہے جس کا پہلے خوف ہو۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول بھی ثابت ہے کہ: حصر (یعنی رکاوٹ) صرف وہی ہے جو دشمن کی جانب سے ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ احصار سے مراد دشمن کی رکاوٹ ہے نہ کہ وہ رکاوٹ جو بیماری وغیرہ کی ہو۔[۴۹۸]

امام ابوحنیفہ کی پیش کردہ حدیث کا جواب

حجاج بن عمرو کی جو حدیث (احناف کی طرف سے) پیش کی گئی ہے اُس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بیماری وغیرہ کی وجہ سے احرام کھولنے کی اجازت اُس شخص کو ہے جس نے احرام باندھتے وقت ہی اس کی شرط لگادی ہو (یعنی یہ کہہ دیا کہ اگر مجھے بیماری وغیرہ کی کوئی رکاوٹ درپیش ہوئی تو میں احرام کھول دوں گا) اور احرام کو مشروط کرنے کا جواز[۴۹۹] اُس حدیث سے ثابت ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

---

۴۹۸ علامہ خازن نے یہاں امام شافعی اور ان کے موافقین کی تائید میں تین باتیں استدلال کے طور پر پیش کی ہیں۔ (۱) زیر بحث آیت کا شانِ نزول (۲) آیتِ مبارکہ کا سیاق (۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد۔ ہمارے نزدیک علامہ خازن کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ کسی آیت کے ایک مخصوص موقع پر نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آیت اُسی کے ساتھ خاص ہو۔ معروف قاعدہ ہے کہ: ''العبرۃ لعموم اللفظ لالخصوص السبب'' (یعنی جس موقع پر آیت نازل ہو اُس کا اعتبار نہیں ہوتا بلکہ آیت کے الفاظ میں پائے جانے والے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔) زیر بحث آیت میں احصار کا لفظ عام ہے خواہ دشمن کی جانب سے ہو یا کسی بیماری کے سبب۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں احرام کھولنا جائز ہوگا جیسا کہ علامہ خازن کی ذکر کردہ حدیث:۲۴۳ میں اس کی واضح تائید موجود ہے۔ سیاقِ آیت سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ آیتِ مبارکہ کی دلالت اس بات پر نہیں ہے کہ رکاوٹ صرف دشمن کی جانب سے ہوتی ہے بلکہ اس کی دلالت اس بات پر ہے کہ آدمی کو جس طرح دیگر رکاوٹیں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح دشمن کی جانب سے بھی رکاوٹ لاحق ہوتی ہے۔ (تفسیر المظہری زیر بحث آیت) دوسرا جواب یہ ہے کہ سیاقِ آیت میں جو امن کا لفظ ہے اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت میں دشمن کی رکاوٹ مراد ہے بلکہ امن کا لفظ جس طرح دشمن کی رکاوٹ کے زائل ہونے کو شامل ہے اسی طرح بیماری وغیرہ کی رکاوٹ کے زائل ہونے کو بھی شامل ہے۔ یعنی سیاقِ آیت میں امن کا لفظ خود عام ہے اور وہ احصار کے عموم کو مزید پختہ کررہا ہے۔ لہٰذا سیاقِ آیت سے شوافع کا استدلال درست نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع ج۲ص۲۸۱) جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول سے استدلال کا تعلق ہے سو اُس کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں صحابہ کرام کے درمیان بھی اختلاف رہا ہے۔ لہٰذا جہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دیگر صحابہ کے قول میں امام شافعی کی تائید موجود ہے وہاں امام ابوحنیفہ کی تائید میں بھی کئی صحابہ کرام کے اقوال موجود ہیں بلکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے مصنّف ابن ابی شیبہ میں روایت موجود ہے کہ معبد بن حراسہ نامی ایک شخص کے سفرِ حج میں بے ہوش ہونے پر آپ نے اُس کے لیے علاج کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب وہ تندرست ہوجائے تو حج کا احرام فسخ کرکے عمرہ کرلے۔ (الخ) (امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید میں اقوال صحابہ کے لیے ملاحظہ فرمایئے: تبیان القرآن ج۱ص۷۶۸)

۴۹۹ علامہ خازن کا جملہ ''احرام کو مشروط کرنے کا جواز'' قابلِ غور ہے۔ ایک طرف آپ ارشاد فرمارہے ہیں کہ احناف کی پیش کردہ حدیث (۲۴۳) میں بیماری کی وجہ سے احرام کھولنے کی جو اجازت ہے وہ اُس صورت میں ہے جب احرام باندھتے وقت اس کی شرط لگائی جائے اور آگے جو احادیث پیش کررہے ہیں اُن سے شرط کے جائز ہونے پر استدلال فرمارہے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲۴۴) ضباعہ بنت زبیر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں حج کرنا چاہتی ہوں تو کیا میں اس میں کوئی شرط لگا سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اُنہوں نے عرض کیا: میں کیا جملہ کہوں؟ آپ نے فرمایا: تم یوں کہو: اللھم لبیک محلی من الارض حیث تحبسنی. اے اللہ! میں حاضر ہوں میں اپنا احرام اُس جگہ کھول دوں گی جہاں زمین مجھے روک لے گی۔ (سنن ترمذی: ۹۴۱ سنن ابوداؤد: ۱۷۷۶ سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۲۲)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔ دیگر کتب حدیث میں یہ روایت اس طرح ہے کہ:

(۲۴۵) ضباعہ بنت زبیر کو تکلیف تھی۔ اُن سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم حج کرو اور شرط لگا لو (یعنی) یوں کہو کہ اے اللہ! میں اپنا احرام وہاں کھول دوں گی جہاں زمین مجھے روک لے گی۔ (صحیح بخاری: ۵۰۸۹ صحیح مسلم: ۱۲۰۷ سنن نسائی: ۲۷۶۶ سنن ابن ماجہ: ۲۹۳۸ سنن دارمی: ۱۸۱۱ سنن دارقطنی ج ۲ ص ۲۳۴ سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۲۱ مسند احمد ج ۶ ص ۱۶۴ مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۱۱ ص ۲۳۷)

اس حدیث کی بنیاد پر امام شافعی امام احمد اور امام اسحٰق کا مذہب یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج میں شرط لگا لے پھر اس کو کوئی بیماری یا عذر لاحق ہو جائے تو اُس شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنا احرام کھول دے اور باہر آ جائے۔

جس شخص کو حج یا عمرہ کی ادائیگی سے روک دیا گیا ہو وہ قربانی کا جانور کہاں ذبح کرے؟ اس بارے میں احناف اور شوافع کا اختلاف

جس شخص کو روک دیا گیا ہو وہ اپنی قربانی کا جانور ذبح کرے اور سر منڈوا کر احرام سے باہر آ جائے۔ اسی کو بیان کرتے ہوئے زیرِ بحث آیت میں آگے فرمایا: ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ جو قربانی کا جانور تمہیں آسانی سے مل جائے۔ یعنی جب تمہیں حج یا عمرہ کی تکمیل کے بغیر روک دیا جائے اور تم احرام کھول لو تو جو قربانی کا جانور آسانی سے مل جائے اُس کی قربانی تم پر لازم ہے۔ ''ھدی'' اُس جانور کو کہتے ہیں جس کو بیت اللہ کی طرف بھیجا جائے۔ ہدی میں سب سے بڑا جانور اونٹ ہے درمیانہ جانور گائے اور آخری درجہ میں بکری ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ (آیت مبارکہ میں) ''ھدی'' سے مراد بکری ہے۔ کیونکہ اُسی کو بھیجنے میں زیادہ آسانی ہے۔ رہا یہ کہ ہدی کے جانور کو کس جگہ ذبح کیا جائے؟ سو اس بارے میں امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ اُس کو وہیں ذبح کیا جائے جس جگہ آدمی کو روک دیا گیا ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ والے سال حدیبیہ ہی کے مقام پر جانور کو ذبح فرمایا تھا۔[۵۰۰] امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ جس شخص کو روکا گیا ہے وہ اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حالانکہ احرام باندھتے وقت ذکر کردہ شرط کے جواز کے ہم بھی قائل ہیں بلکہ قاضی ثناء اللہ حنفی علیہ الرحمۃ کی صراحت کے مطابق احرام باندھتے وقت ذکر کردہ شرط مستحب ہے اور علامہ خازن نے جو احادیث (شرط کے ثبوت میں) پیش کی ہیں ہمارے نزدیک وہ استحباب پر محمول ہیں۔ اگر کوئی شرط نہ بھی لگائے تب بھی رکاوٹ کے پیش آنے کی صورت میں (زیرِ بحث آیت مبارکہ اور حدیث: ۲۴۳ کے عموم کے پیش نظر) احرام کھولنا اُس کے لیے جائز ہے۔ لہٰذا شرط کے ثبوت میں علامہ خازن کی پیش کردہ احادیث امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف کے خلاف نہیں ہیں۔

۵۰۰ ''حدیبیہ'' کہاں ہے؟ حدودِ حرم میں یا حدودِ حرم سے باہر؟ اس پر علامہ خازن نے کوئی کلام نہیں فرمایا۔ ہمارے نزدیک علامہ خازن کا امام شافعی کے مؤقف پر حدیبیہ کے واقعہ سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ حدیبیہ کا بعض حصہ حدودِ حرم کو شامل ہے اور بعض حصہ حدودِ حرم سے خارج ہے اور دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا خیمہ حدیبیہ کے اُس حصہ میں تھا جو حدودِ حرم سے خارج ہے اور نمازیں آپ اُس حصہ میں ادا فرماتے تھے جو حدودِ حرم میں شامل ہے۔ (دیکھئے: شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۲۲-۳۲۳ مطبوعہ کراچی) لہٰذا بلا دلیل یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے حدودِ حرم سے باہر والے حصہ میں قربانی کی تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ حدودِ حرم میں قربانی کرنا ناممکن نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم میں حج کی قربانی کا مقام ''حرم'' کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آنے والے حاشیہ میں تفصیل موجود ہے۔ (تفسیر المظہری زیرِ بحث آیت بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۸۸)

احرام ہی کی حالت میں جانور کو حرم کی طرف بھیج دے اور ایک ایسے شخص کو مقرر کرے جو اُس جانور کو حرم میں ذبح کرے، جانور کو بھیجنے کے بعد یہ شخص اپنا احرام کھول لے۔[۵۰۱]

زیر بحث آیت میں آگے فرمایا: ''جب تک قربانی اپنے مَحِل کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤ''۔ ''محلّ'' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں جانور کو ذبح کرنا واجب ہے۔ اور اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حرم ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ذبح کی وہ جگہ ہے جہاں آدمی کو روک دیا گیا ہو۔ خواہ وہ جگہ حرم سے باہر ہو یا حرم کے اندر ہو۔ اس آیت میں ﴿مَحِلَّهٗ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جہاں جانور کو ذبح کرنا اور اس کو کھانا حلال ہو جائے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا یہی قول ہے۔ اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۴۶) ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عمرہ کی غرض سے نکلے تو بیت اللہ تک پہنچنے میں (ہمارے درمیان) کفار قریش حائل ہو گئے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنا جانور ذبح فرما دیا اور سر کے بال منڈوا دیئے۔[۵۰۲] (صحیح بخاری: ۱۸۱۲)

آیت میں آگے فرمایا: ''پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلہ میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے''۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم حالت احرام میں اپنے سروں کو نہ منڈاؤ۔ ہاں اگر کسی بیماری یا سر میں کسی تکلیف کی وجہ سے منڈانا پڑ جائے تو پھر (احرام کی حالت میں) سر منڈا سکتے ہو۔ سر کی تکلیف سے یا تو جوئیں مراد ہیں یا سر کا درد مراد ہے۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿فَفِدْيَةٌ﴾ اس میں کچھ اضمار ہے، اصل عبارت اس طرح ہے کہ ''فحلق رأسه فعليه فدية'' یعنی جس کو بیماری ہو یا سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوالے تو اس پر فدیہ ہے۔

زیر بحث آیت میں ''فمن كان منكم مريضا'' کا واقعۂ نزول

آیت مبارکہ کا زیر بحث جملہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:

---

[۵۰۱] علامہ خازن کی اس عبارت میں ابہام ہے۔ احناف کا مکمل اور صحیح مؤقف یہ ہے کہ جس شخص کو حج یا عمرہ میں کوئی رکاوٹ آ جائے تو وہ کسی شخص کے ہاتھ قربانی کا جانور حرم میں بھیج دے اور اس سے یہ طے کر لے کہ وہ فلاں دن فلاں وقت ذبح کرے گا۔ اُس وقت کے گزرنے سے پہلے یہ اپنا احرام نہیں کھول سکتا۔ پھر جس شخص کے ساتھ جانور بھیجا ہے وہ اگر طے شدہ وقت کے مطابق ذبح کرے یا اُس وقت سے پہلے ذبح کرے تو ٹھیک ہے اور اگر اُس نے وقتِ معیّن کے بعد ذبح کیا اور اس شخص کو بعد میں معلوم ہوا تو چونکہ ذبح سے پہلے اس نے احرام کھول لیا اس لیے اس پر دَم لازم ہوگا۔ (دیکھئے بہارِ شریعت جزء ۶ ص ۸۷ و دیگر کتب فقہ) علامہ خازن نے اس بحث میں پہلے امام شافعی کا مؤقف اور اُن کی دلیل بیان کی اس کے بعد امام اعظم کا صرف مؤقف بیان کیا۔ امام شافعی کی تائید میں علامہ نے جو دلیل دی ہے اُس کا جواب گذشتہ حاشیہ میں دیا جا چکا ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دلیل زیر بحث آیت میں اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے کہ: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ. (جب تک قربانی کا جانور اپنی جگہ کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو منڈاؤ۔) ایک مقام پر فرمایا: ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. (الحج: ۳۳) (یعنی اُن جانوروں کے ذبح کی جگہ بیتِ عتیق (قدیم گھر) ہے۔) یعنی حدودِ حرم۔ اور ایک مقام پر ھدی کے جانور کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ کعبہ (یعنی حدودِ حرم) پہنچنے والا ہو۔ (دیکھئے: المائدہ: ۹۵) (شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۲۲، بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۸۸) ان دلائل سے معلوم ہوا کہ قربانی کا مقام حدودِ حرم ہے۔

[۵۰۲] اس سے حدیبیہ کا واقعہ مراد ہے۔ امام شافعی اور ان کے موافقین اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس شخص کو حج یا عمرہ سے روک دیا جائے وہ اُسی جگہ قربانی کر کے احرام کھول لے۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ اُس شخص پر حرم میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲۴۷) میں اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا اور میرے چہرہ پر میری جوئیں گر رہی تھیں' اس حالت میں نبی اکرم ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: کیا تمہارے سر کی جوئیں تمہیں تکلیف دیتی ہیں؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے سر کو منڈوا دو اور (فدیہ کے طور پر) تین روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا ایک قربانی دے دو۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کون سی چیز پہلے ذکر فرمائی۔[503] (صحیح بخاری: ۱۸۱۴' صحیح مسلم: ۱۲۰۱' سنن ترمذی: ۹۵۳' سنن ابوداؤد: ۱۸۵۶' سنن نسائی: ۲۸۵۱' مسند احمد ج ۴ص ۲۴۱' سنن بیہقی ج ۵ص ۵۵' سنن دار قطنی ج ۲ص ۲۹۸)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ ''**فمن کان منکم مریضا او به اذی من رأسه ففدیة من صیام او صدقة او نسک**'' میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ آگے پھر اُسی طرح روایت بیان کی۔ (صحیح بخاری: ۱۸۱۵' صحیح مسلم: ۱۲۱۰) ایک روایت میں اس طرح ہے کہ:

(۲۴۸) کعب بن عجرہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے احرام میں حدیبیہ کے مقام پر تھے' اُن کے پاس سے رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا' تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے اپنا معاملہ بیان کیا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُن سے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تمہیں تکلیف ہو رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہیں بکری نہیں ملے گی؟ (کعب بن عجرہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر تم (سر منڈوا کر) تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو اور ہر مسکین کو نصف صاع (یعنی دو کلوگرام) کھانے کی چیز دینا۔[504] کعب بن عجرہ کہتے ہیں کہ آیت مبارکہ کا نزول خاص میرے بارے میں ہوا ہے لیکن اس کا حکم تم سب کے لیے ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۸۱۶' صحیح مسلم: ۱۲۰۱' مسند احمد ج ۴ص ۲۴۲)

بیماری یا سر کی کسی تکلیف کی وجہ سے حالت احرام میں سر منڈانے کا فدیہ

آیت مبارکہ میں ﴿صِیَامٍ﴾ سے مراد تین دن کے روزے ہیں اور ﴿صَدَقَةٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ چھ مسکینوں کو تین صاع کھانا کھلا دیا جائے' یعنی ہر مسکین کو نصف صاع (دو کلوگرام) دیا جائے۔ ﴿نُسُكٍ﴾ سے مراد ذبح کیا جانے والا جانور ہے' اس کا واحد ''نسیکة'' ہے۔ اس میں سب سے بڑا جانور اونٹ ہے' درمیانہ جانور گائے اور آخری درجہ میں بکری ہے۔ یہاں جو فدیہ بیان کیا گیا ہے وہ اختیاری ہے' یعنی بیمار آدمی یا سر کی تکلیف والا سر منڈوا کر چاہے تو فدیہ کے طور پر جانور ذبح کر دے' چاہے تو روزے رکھ لے اور چاہے تو صدقہ دے دے۔ اور جو بھی قربانی یا صدقہ احرام والے پر لازم ہوتا ہے وہ اُن مساکین کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) قربانی بھیجنا لازم ہے۔ گذشتہ حاشیہ (۵۰۰ اور ۵۰۱) میں امام اعظم کا موقف' اُس کے دلائل اور امام شافعی کے استدلال کا جواب ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[503] اس حدیث شریف میں اور زیر بحث آیت مبارکہ میں فدیہ کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ترتیب لازمی نہیں ہے۔ بلکہ اختیار ہے کہ تکلیف کی وجہ سے حالت احرام میں سر منڈوانے کے بدلہ میں خواہ تین روزے رکھ لیے جائیں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے (ہر مسکین کو دو کلوگرام) یا قربانی کر لی جائے۔ پھر قربانی میں گائے' بکری اور اونٹ تینوں جانور شامل ہیں' لہٰذا ان میں سے کسی بھی جانور کی قربانی کی جا سکتی ہے۔ رہا یہ کہ کون سا فدیہ کہاں ادا کیا جائے؟ سو اس بارے میں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف یہ ہے کہ قربانی مکہ میں کی جائے۔ جبکہ روزے رکھنا اور چھ مسکینوں کو کھانا کھلانا مکہ میں ضروری نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ص ۲۸۲' شرح صحیح مسلم ج ۳ص ۳۶۲)

[504] حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایات زیر بحث آیت مبارکہ کی تفسیر ہیں۔ کیونکہ آیت مبارکہ میں روزوں کی تعداد اور صدقہ کی مقدار کا تعین نہیں کیا گیا' جبکہ پیش نظر احادیث میں روزوں کی تعداد بھی مذکور ہے اور صدقہ کی مقدار بھی بیان کر دی گئی ہے۔ البتہ قربانی میں گائے' بکری اور اونٹ میں سے کسی کو بھی ذبح کیا جا سکتا ہے۔ غالباً اسی لیے اس کا تعین نہیں کیا گیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتا ہے جو حرم میں ہوں۔[505] سوائے اُس جانور کے جو رکاوٹ کی وجہ سے ذبح کیا جائے' کیونکہ اُس کو اُسی جگہ ذبح کیا جائے گا جہاں آدمی کو روکا گیا ہے۔[506] البتہ روزہ کے معاملہ میں آدمی کو اختیار ہے' جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تمہیں اپنے خوف سے امن ہو جائے اور اپنی بیماری سے شفا ہو جائے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تمہیں رکاوٹ سے امن ہو جائے۔

''فمن تمتع'' میں تمتع کی مختلف تفاسیر

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس شخص کو حج کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ آ جائے یہاں تک کہ اُس کا حج فوت ہو جائے اور وہ اسی حالت میں احرام کھولے بغیر مکہ آ جائے اور یہاں عمرہ کر کے احرام کھول لے پھر اس عمرہ کے بعد آنے والے سال تک احرام کھولنے کا فائدہ اٹھائے اور پھر حج کر لے۔ اس طرح وہ پورے سال احرام سے باہر رہنے والی حالت کو آئندہ سال کے احرام کے ساتھ ملانے کی وجہ سے تمتع کرنے والا ہوگا۔ بعض مفسرین نے ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ﴾ کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جب تمہیں امن ہو جائے اور رکاوٹ کے ختم ہونے کے بعد تم اپنے احرام سے باہر آ جاؤ اور اس سال تم نے عمرہ نہ کیا ہو پھر تم آئندہ سال حج کے مہینوں میں عمرہ کرو' اور اس کا احرام کھول کر پھر تم حج شروع کرنے تک اپنی اس بغیر احرام کی حالت سے فائدہ اٹھاؤ پھر تم حج کا احرام باندھو تو تم پر اُس جانور کی قربانی ضروری ہے جو میسر آ جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''فمن تمتع'' میں وہ شخص مراد ہے جو مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ سے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کے لیے آئے اور عمرہ کرنے کے بعد بغیر احرام کے مکہ میں ٹھہرا رہے' پھر مکہ ہی میں رہتے ہوئے حج کا آغاز کرے' یعنی اُس سال حج کرے تو یہ شخص حج کا احرام باندھنے تک اپنی اُس حالت سے فائدہ اٹھانے والا ہوگا جو عمرہ کے بعد احرام کھولنے کی حالت ہے۔

اس آیت میں جو تمتع کا لفظ ہے اُس کا لغوی معنی ہے: عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد سے حج کا احرام باندھنے تک اُن چیزوں سے فائدہ اور لذت حاصل کرنا جو احرام کی حالت میں ممنوع تھیں۔ آگے جو فرمایا: ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (جو شخص حج کے ساتھ عمرہ کو ملائے) تو جو ہدی اُسے میسر آ جائے اُس کی قربانی کرے۔ ہدی سے مراد بکری ہے' جس کو وہ قربانی والے دن ذبح کرے گا۔ اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد قربانی کے دن سے پہلے جانور کو ذبح کر دیا تو امام شافعی کے نزدیک جائز ہے جیسے حج اور عمرہ میں ہونے والے مختلف جرائم کے کفارہ میں جانور کو قربانی کے دن سے پہلے ذبح کرنا جائز ہے۔[507] امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ جس طرح قربانی کے جانور کو عید سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح حج میں کی جانے والی قربانی کے جانور کو قربانی کے دن سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بہرصورت منکرین حدیث کے لیے یہ مقام قابل غور ہے کہ وہ احادیث کا سہارا لیے بغیر آیت مبارکہ میں روزوں کی تعداد اور صدقہ کی مقدار کا تعین کیسے کریں گے؟

[505] امام ابوحنیفہ کے نزدیک قربانی حرم میں ہی دی جائے گی جبکہ کھانا کھلانے میں اختیار ہے خواہ حرم میں کھلایا جائے یا کہیں اور۔ (ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ: ۵۰۳)

[506] امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس جانور کو بھی حرم ہی میں ذبح کیا جائے گا۔ گذشتہ حاشیہ: (۵۰۰ اور ۵۰۱) میں اس مسئلہ پر بحث ہو چکی ہے۔

[507] حج کی قربانی کو کفارہ کی قربانی پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ کفارہ کی قربانی کسی جرم اور خطاء کی بنیاد پر کی جاتی ہے جبکہ حج کی قربانی عظیم فریضہ کے ادائیگی کے شکرانہ کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ کفارہ کی قربانی کے لیے ایام نحر یا اور کسی دن کو (وجوباً یا استحباباً کسی بھی درجہ میں) معین نہیں کیا گیا ہے جبکہ حج کی قربانی کا یوم نحر کے اعمال میں سے ہونا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ (دیکھئے: صحیح مسلم: ۱۳۰۵) اس لیے امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک حج کی قربانی کو قربانی ہی کے ایام میں کرنا واجب ہے۔

تمتع کی قربانی کے واجب ہونے کی شرائط

تمتع (یعنی حج اور عمرہ کو ملانے کی صورت) میں جو قربانی کی جاتی ہے اس کے واجب ہونے کی پانچ شرائط ہیں۔(۱) ایک شرط یہ ہے کہ عمرہ کو حج سے پہلے کیا جائے۔(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا جائے۔(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد اُسی سال حج کیا جائے۔(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ مکہ سے حج کا احرام باندھا جائے' نہ یہ کہ آدمی اپنے شہر کے میقات سے احرام باندھنے کے لیے چلا جائے۔ اگر ایسا کیا تو تمتع نہیں ہوگا۔(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ تمتع کرنے والا مسجد حرام (یعنی مکہ مکرمہ) کا رہنے والا نہ ہو۔ یہ پانچوں شرائط حج تمتع کی قربانی کے واجب ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی شرط مفقود ہوئی تو آدمی تمتع کرنے والا نہیں ہوگا۔ تمتع میں جو جانور قربان کیا جاتا ہے اُس کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی کے نزدیک وہ دم جبر ہے لہٰذا اُس میں سے کھانا جائز نہیں ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ دم نُسک ہے لہٰذا اس میں سے کھانا جائز ہے۔[۵۰۸]

جو شخص تمتع کی قربانی نہ کر سکے وہ کیا کرے؟

آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ہدی (قربانی کا جانور) نہ پائے اُس پر حج کی مصروفیت کے دوران تین روزے رکھنا ضروری ہیں۔ ان تین روزوں کے بارے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک روزہ یوم الترویہ (۸ ذوالحجہ) سے پہلے رکھے اور ایک روزہ یوم الترویہ (۸ ذوالحجہ) کو رکھے اور ایک روزہ یوم عرفہ (۹ ذوالحجہ) کو رکھے۔ بلکہ مستحب یہ ہے کہ حج کے دنوں میں ان تین روزوں کو اس طرح رکھے کہ یوم عرفہ کو روزہ نہ ہو۔ اگر کسی نے قربانی کے دن سے پہلے اپنے تین روزے نہیں رکھے تو بعض ائمہ کے نزدیک وہ ایام تشریق میں روزے رکھے۔ امام مالک اور امام احمد کا یہی موقف ہے اور امام شافعی کے بھی دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے۔ جبکہ بعض ائمہ کے نزدیک ایسا شخص ایام تشریق کے بعد روزے رکھے۔ امام احمد کی ایک روایت یہی ہے اور یہی امام شافعی کا دوسرا قول ہے۔[۵۰۹]

---

۵۰۸ دم جبر کا معنیٰ ہے: ایسی قربانی جو کسی نقصان اور کمی کو پورا کرنے کے لیے پیش کی جائے۔ اور دم نسک سے مراد ایسی قربانی ہے جو شکرانہ کے طور پر پیش کی جائے۔ حج کے موقع پر تمتع اور قران کرنے والے حُجاج جو قربانی کرتے ہیں وہ امام شافعی کے نزدیک دم جبر ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک دم نسک ہے۔ امام شافعی کے نزدیک چونکہ حج افراد (یعنی حج کے موقع پر صرف حج کرنا اور عمرہ کے لیے علیحدہ سفر کرنا) افضل ہے اس لیے اُن کے نزدیک تمتع اور قران کرنے والے نے حج وعمرہ ایک ساتھ کر کے ایک سفر کی کمی کی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اُس پر قربانی کو واجب کیا گیا۔ یوں امام شافعی کے نزدیک یہ قربانی دم جبر ہوئی اور دم جبر سے کھانا شرعاً جائز نہیں ہے' اس لیے امام شافعی کے نزدیک حج کی قربانی سے کھانا جائز نہیں ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک حج قران اور تمتع کو حج افراد پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ قران اور تمتع کرنے والا ایک سفر میں دو عبادتیں جمع کرنے کی فضیلت حاصل کر لیتا ہے اور اسی فضیلت کے شکرانہ میں اُس پر قربانی واجب کی گئی ہے۔ یوں یہ قربانی دم نسک ہے اور دم نسک سے کھانا چونکہ شرعاً جائز ہے اس لیے امام ابوحنیفہ کے نزدیک حج کی قربانی سے کھانا جائز ہے امام ابوحنیفہ کے موقف کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں حج کی قربانی کے متعلق فرمایا: فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. (الحج:۲۸) ''تم (خود بھی) اُس میں سے کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو (بھی) کھلاؤ''۔ (بدائع الصنائع ج۲ص۲۷۹' دار المعرفہ' بیروت)

۵۰۹ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف یہ ہے کہ ابتدائی تین روزے یکم شوال سے ذوالحجہ کی نویں تاریخ تک پورے کر لیے جائیں' اگر پورے نہ کر سکا اور قربانی کا دن آ گیا تو وہ (تین روزے) ساقط ہو گئے۔ یعنی اب اُن کو رکھا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اُن کے بدلہ میں دم (یعنی ایک بکری یا بھیڑ کی قربانی کرنا) واجب ہوگا۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج۳ص۴۹۶ طبع جدید' بہار شریعت ج۶ص۶۹)

رجوع کے بعد سات روزے رکھنے کی تفسیر میں دو مختلف اقوال

﴿ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ﴾ اس کا معنٰی یہ ہے کہ سات روزے اس وقت رکھو جب تم اپنے وطن اور اپنے گھر والوں کی طرف واپس آ ؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس جملہ کی یہی تفسیر فرمائی ہے' اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے گھر لوٹنے سے پہلے روزے رکھے تو امام شافعی کے نزدیک یہ جائز نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں لوٹنے سے مراد یہ ہے کہ جب تم اعمال حج سے فارغ ہو کر گھر لوٹنے لگو۔ اس تفسیر کی بنیاد پر اعمال حج سے فارغ ہونے کے بعد گھر لوٹنے سے پہلے سات روزے رکھنا جائز ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔[۵۱۰]

''تلک عشرۃ کاملۃ'' کی تفسیر اور اس جملہ کو ذکر کرنے کا فائدہ

﴿ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾ (یہ پورے دس روزے ہوئے۔) یعنی اجر وثواب میں یہ دس روزے کامل ہیں۔ بعض مفسرین اس کا معنٰی یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ دس روزے قربانی کا جانور نہ ملنے کی وجہ سے مکمل طور پر اُس جانور کے قائم مقام ہیں (یعنی اُس کا بدل ہیں) کیونکہ کوئی شخص یہ گمان کرسکتا تھا کہ ایام حج میں رکھے جانے والے تین روزے قربانی کے جانور کا بدل ہیں' سو (اس وہم کو دور کرنے کے لیے) اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ پورے دس روزے قربانی کے جانور کا بدل ہیں۔ رہی یہ بات کہ دس روزوں کو واضح طور پر بیان کرنے کے باوجود ''تلک عشرۃ کاملۃ'' کیوں فرمایا' تو بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے اس سے کلام میں تاکید مقصود ہے۔ جیسے فرزدق کے اس شعر میں ہے:

ثلاث واثنتان فهن خمس یعنی تین اور دو پانچ (عورتیں) اور ایک چھٹی عورت (یہ
وسادسة تميل الى شمام[۵۱۱] سب کی سب) میرے قرب کی طرف مائل ہیں۔

پھر چونکہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اہل عرب جب تاکید پیدا کرنا چاہتے ہیں تو (لفظ یا جملہ کی) تکرار کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے دس روزوں کی وضاحت کے بعد فرمایا کہ ''تلک عشرۃ کاملۃ'' بعض علماء اس جملہ کو ذکر کرنے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ علم حساب کی رُو سے اس سے ٹوٹل بیان کرنا مقصود ہے۔ ٹوٹل کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تعداد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے پھر آخر میں ان کا مجموعہ بیان کیا جائے' تاکہ دونوں اعتبار سے تعداد میں احتیاط ہو۔ اسی طریقہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے (پہلے) فرمایا کہ جو قربانی نہ کرسکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آ ؤ (پھر فرمایا:) یہ پورے دس روزے ہوئے۔ بعض علماء وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ اہل عرب حساب نہیں جانتے تھے اور کلام میں اُنہیں بہت وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی وضاحت کے بعد فرمایا کہ یہ پورے دس روزے ہوئے۔ بعض علماء اس جملہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے الفاظ خبریہ ہیں لیکن اس کے معنٰی میں حکم ہے' یعنی اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ (اگر تم قربانی نہ کرسکو تو) دس روزے مکمل کرو اور ان میں کمی نہ کرو۔

---

۵۱۰ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ فتاویٰ عالمگیری اور درّ مختار کے حوالہ سے لکھتے ہیں: سات روزے حج کا زمانہ گزرنے کے بعد یعنی تیرھویں کے بعد رکھے۔ تیرھویں کو یا اس سے پہلے نہیں ہوسکتے۔ ان سات روزوں میں اختیار ہے کہ وہیں رکھے یا مکان واپس آ کر اور بہتر مکان پر واپس ہو کر رکھنا ہے۔ (بہار شریعت جزء ۶ ص ۶۹)

۵۱۱ تفسیر خازن میں ''شمام'' کی بجائے ''سهام'' کا لفظ ہے' وہ صحیح نہیں ہے۔ احکام القرآن میں اسی مقام پر یہ شعر مذکور ہے' اُس میں ''شمام'' کا لفظ ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۹۹)

''حاضری المسجد الحرام'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

آگے فرمایا: ''یہ اُس شخص کے لیے ہے جس کے اہلِ وعیال مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں''۔ اس جملہ میں ﴿ذٰلِکَ﴾ کا اشارہ حج تمتع کے حکم کی طرف ہے جس کا بیان (آیت مبارکہ میں) ہوا۔ ﴿حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں بعض ائمہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مکہ کے رہنے والے مراد ہیں۔ امام مالک کا یہی قول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو حرم (کی حدود) میں رہنے والے ہیں۔ طاؤس کا یہی قول ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عرفہ، رجیع، ضجنان اور نخلہ کے رہنے والے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''حاضری المسجد الحرام'' میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کا وطن مکہ سے قصر کی کم از کم مسافت پر واقع ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو میقات سے اندر رہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو میقات میں رہتے ہیں۔ میقات سے مراد ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن، یلملم اور ذاتِ عرق کے مقامات ہیں۔[۵۱۲] لہٰذا (امام ابوحنیفہ کے نزدیک) جو شخص ان مقامات میں اور ان مقامات سے مکہ تک کسی بھی جگہ رہنے والا ہے وہ ''حاضری المسجد الحرام'' میں داخل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو مسجد حرام میں جمعہ ادا کرنا ضروری ہے۔

زیر بحث آیت میں جو ﴿ذٰلِکَ﴾ فرمایا اس نے قریب ترین ذکر کردہ چیز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمتع کرنے والا جب ایسا شخص ہو جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو تو اُس پر قربانی یا اُس کا بدل (دس روزے رکھنا) لازم ہے۔ اور اگر مکہ کا رہنے والا تمتع یا قران کرے تو اُس پر نہ تو قربانی لازم ہے نہ ہی اُس کا بدل لازم ہے۔ کیونکہ اس پر میقات سے احرام باندھنا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کا تمتع کرنا اُس کے حج میں خلل کا باعث نہیں ہوگا، اس لیے اُس پر تمتع کی قربانی واجب[۵۱۳] نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام بخاری نے حضرت عکرمہ سے تعلیقاً ذکر کیا ہے، حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۴۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ مہاجرین وانصار اور نبی کریم ﷺ کی ازواج نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی احرام باندھا، پھر جب ہم مکہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے جو حج کا احرام باندھا ہے اس کو عمرہ کا احرام کر دو، سوائے اُس شخص کے جس نے جانور کے گلے میں پٹا ڈال کے جانور کو معیّن کر دیا ہے۔ وہ ایسا نہ کرے۔[۵۱۴] پھر ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کے درمیان سعی کی اور

۵۱۲ ذوالحلیفہ مدینہ منورہ کا میقات ہے۔ جحفہ اہلِ شام کا میقات ہے۔ قرن اہلِ نجد کا میقات ہے۔ یلملم اہلِ یمن کا میقات ہے اور ذاتِ عرق عراق والوں کا میقات ہے۔ پھر جو ممالک ان شہروں کی محاذات میں آتے ہوں اُن کا میقات وہی ہوگا جو ان شہروں کا ہے۔ جیسے پاکستان اور ہندوستان میں رہنے والوں کا میقات یلملم ہے۔ (کتب فقہ)

۵۱۳ البتہ اُسے (یعنی میقات کے اندر رہنے والے کو) تمتع اور قران کرنا منع تھا اس کے باوجود اس نے کیا، اس لیے وہ گناہ گار ہوگا اور اس پر صرف دم جبر لازم ہوگا۔ (درّ مختار ج ۳ ص ۵۰۲ طبع جدید) دم جبر کی وضاحت حاشیہ: ۵۰۸ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۵۱۴ یعنی جس نے اپنے ساتھ قربانی کا جانور لے لیا ہے وہ اپنے حج کے احرام پر قائم رہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ استثناء فرما کر تمتع کی دو صورتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ تمتع کرنے والا قربانی اپنے ساتھ لے کر آئے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قربانی ساتھ لے کر نہ آئے۔ اس دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ تمتع کرنے والا اپنے میقات سے عمرہ کا احرام باندھے۔ مکہ معظمہ میں آ کر طواف وسعی کرے اور حلق وتقصیر کرا کے عمرہ سے فارغ ہو جائے پھر بغیر احرام کے مکہ میں رہے۔ اس صورت میں اس کے لیے حج کے آغاز تک اُن تمام جائز چیزوں کا استعمال درست ہے جو عمرہ کے احرام کی وجہ سے اس کے لیے ممنوع ہوئی تھیں (جیسا کہ زیر بحث حدیث سے واضح ہے) پھر ۸ ذوالحجہ کو مسجد الحرام شریف سے حج کا احرام باندھے اور (طواف قدوم کے سوا) حج کے تمام افعال بجا لائے۔ تمتع کی جو پہلی صورت بیان کی گئی (یعنی قربانی کا جانور ساتھ لے جانا) اس کا حکم یہ ہے کہ تمتع کرنے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیگر ارکان ادا کیے، پھر ہم اپنی ازواج سے ملے اور کپڑے پہنے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے جانور کے گلے میں پٹا ڈال دیا ہے وہ اُس وقت تک احرام سے باہر نہیں ہوسکتا جب تک کہ جانور اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔ پھر آپ ﷺ نے ۸ ذوالحجہ کی شام ہمیں حکم فرمایا کہ ہم حج کی تکبیر کہیں۔ جب ہم تمام ارکان سے فارغ ہو گئے تو ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کے درمیان چکر لگائے۔ اس طرح ہمارا حج مکمل ہوا اور ہم پر قربانی لازم ہوگئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو جو جانور اُسے میسر ہو اُس کی قربانی کرے اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایامِ حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ'' (البقرہ:۱۹۶) یعنی اپنے شہروں کی طرف لوٹ آؤ۔ بکری بھی قربانی کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام نے ایک سال میں حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ کر کے دو عبادتیں جمع کیں۔ پس حج تمتع ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور نبی اکرم ﷺ نے اس کو اپنایا اور اہل مکہ کے سوا دیگر لوگوں کے لیے اس کو جائز فرمایا۔[۵۱۵] جیسا کہ (البقرہ: ۱۹۶ میں) اللہ عزوجل نے فرمایا کہ حج تمتع کا حکم اُس شخص کے لیے ہے جس کے اہل وعیال مکہ مکرمہ کے رہنے والے نہ ہوں۔

(صحیح بخاری:۱۵۷۲)

☆ یہ حدیث اضافہ کے ساتھ ہے۔ امام حمیدی فرماتے ہیں کہ ابومسعود دمشقی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے اور میں نے اس کو صرف مسلم بن حجاج کے پاس پایا ہے لیکن انہوں نے عکرمہ کی وجہ سے اس کو اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں ذکر نہیں کیا' کیونکہ امام مسلم نے صحیح مسلم میں عکرمہ سے کسی حدیث کو روایت نہیں کیا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ امام بخاری نے بھی اس حدیث کو امام مسلم ہی سے لیا ہے۔

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ حج اور اس کے علاوہ دیگر معاملات میں اللہ تعالیٰ نے تم پر جو باتیں فرض کی ہیں اور جن سے تمہیں منع فرمایا ہے اُن کے متعلق اللہ سے ڈرو۔ ﴿شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے حکم کی نافرمانی کرے' اُس کی پابندیوں پر عمل کرنے میں سستی کرے اور اس کی منع کردہ چیزوں کا ارتکاب کرے اُس کو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

حج کے مہینے معروف ہیں' سو جو شخص ان مہینوں میں (حج کی نیت کر کے) حج کو اپنے اوپر لازم کر لے تو حج کے دنوں میں نہ تو اپنی بیوی سے صحبت کی باتیں کرے' نہ گناہ کرے اور نہ جھگڑا کرے' اور تم جو بھی نیک کام کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے' اور اپنے ساتھ سفر کا خرچہ لیا کرو' بلاشبہ سفر کا بہترین خرچ تقویٰ ہے' اور اے عقل والو! مجھ ہی سے ڈرتے رہو O

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) والا عمرہ کے بعد بھی احرام میں رہے گا اور حج کے افعال ادا کر کے دس ذوالحجہ کو رمی کرنے گا اور حلق یا تقصیر کرائے گا۔ اس کے بعد حج اور عمرہ دونوں کے احرام سے ایک ساتھ فارغ ہوگا۔ (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۱۲۰' فیوض الباری ج ۳ ص ۱۵۴)

۵۱۵ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ میقات کے اندر رہنے والے ہیں اُن کے لیے تمتع ممنوع ہے اور اسی بنیاد پر علاّمہ خازن نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔

قربانی کا دن حج کے اوقات میں داخل ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ کا اختلاف اور ان کے دلائل

﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ (حج کے مہینے معروف ہیں۔) یعنی حج کے کچھ ایسے مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حج کا جو وقت ہے وہ چند معلوم اور معیّن مہینے ہیں۔ اور وہ شوال' ذوالقعدہ اور یکم ذوالحجہ سے قربانی کے دن فجر طلوع ہونے تک دس راتیں ہیں (یعنی قربانی کا دن حج کے اوقات میں داخل نہیں ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور تابعین میں سے حسن بصری' ابن سیرین اور امام شعبی کا یہی قول ہے۔ امام شافعی' سفیان ثوری اور ابوثور کا بھی یہی مؤقف ہے۔ امام شافعی اور ان کے موافقین کی دلیل یہ ہے کہ قربانی والے دن جب صبح صادق طلوع ہو جائے تو حج فوت ہو جاتا ہے' اور ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی عبادت وقت باقی ہونے کے باوجود فوت ہو جائے' لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا دن حج کے مہینوں میں داخل نہیں ہے۔[۵۱۶] پھر یہ بھی ہے کہ قربانی والے دن حج کا احرام باندھنا جائز نہیں ہے' لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی والا دن اور اس کے بعد کے ایام حج کے مہینوں میں داخل نہیں ہیں۔[۵۱۷]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں سے مراد شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں اور حج کے مہینوں کا آخری دن قربانی کا دن ہے (یعنی قربانی کا دن حج کے اوقات میں داخل ہے)۔ حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عروہ بن زبیر' طاؤس' عطاء' ابراہیم نخعی' قتادہ' مکحول' ضحاک' سدی' امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا یہی مؤقف ہے اور امام مالک کی دو روایتوں میں سے ایک روایت یہی ہے۔ اس قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ قربانی کا دن حج اکبر کا دن ہے۔[۵۱۸] لہٰذا قربانی کا دن حج کے مہینوں میں داخل ہے۔ پھر اس لیے بھی کہ حج کے تمام ارکان کا جو اختتام ہوتا ہے وہ طواف افاضہ (یعنی طوافِ زیارت) پر ہوتا ہے اور طوافِ افاضہ قربانی والے دن کیا جاتا ہے' لہٰذا قربانی کا دن اوقاتِ حج میں داخل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حج کے مہینے پورے تین ہیں۔ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہی قول مروی ہے' امام زہری کا بھی یہی مؤقف ہے۔ اور امام مالک کی دوسری روایت بھی اسی مؤقف کے مطابق ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کے لیے ''اشھر'' جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور جمع مطلق کا

---

۵۱۶ خلاصہ دلیل یہ ہے کہ قربانی کی فجر طلوع ہونے سے پہلے پہلے وقوف عرفہ کر لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قربانی کے دن وقوف عرفہ معتبر نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص قربانی والے دن وقوف عرفہ کرے گا اس کا حج ادا نہیں ہوگا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا دن حج کے ایام میں داخل نہیں ہے۔ ہماری جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ قربانی والے دن تک وقوف عرفہ کو مؤخر کرنے والے شخص کا حج فوت ہونے کی وجہ ''قربانی کا دن' ایام حج میں ہونا اور وقوف عرفہ کو مؤخر کرنے کی وجہ سے حج کا فوت ہونا ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

(روح المعانی' زیر بحث آیت)

۵۱۷ ہمارے نزدیک احرام شرائط حج میں سے ہے اور امام شافعی کے نزدیک فرائض حج میں سے ہے۔ (شرائط خارجی امور کو کہتے ہیں اور فرائض داخلی امور کو۔) شرط ہونے کے اعتبار سے احرام کا افعالِ حج کے آغاز میں ہونا ضروری ہے' اس لیے ہمارے نزدیک اس میں بھی کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے کہ قربانی والا دن حج کے ایام میں داخل ہو اور اس میں احرام باندھنا جائز نہ ہو۔

۵۱۸ یعنی اس دن حج کا اہم ترین رکن (طوافِ زیارت) ادا کیا جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حج اکبر کے دن کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ یوم النحر (قربانی کا دن) ہے۔ (سنن الترمذی: ۹۵۷)
(نوٹ: حج اکبر کے دن کے بارے میں علماء امت کے اقوال مختلف ہیں۔ تفصیل کے لیے شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۶۸۷ ملاحظہ فرمائیں)

اطلاق کم سے کم تین افراد پر ہوتا ہے (لہٰذا حج کے مہینے پورے تین ہیں)۔ پھر یہ وجہ بھی ہے کہ جس مہینے کا ابتدائی حصہ حج کے مہینوں میں داخل ہوا اُس کا آخری حصہ بھی حج کے مہینوں میں داخل ہوگا (اس لیے حج کے مہینے پورے تین ہیں)۔

زیرِ بحث آیت (البقرہ:۱۹۷) کا البقرہ:۱۸۹ سے بہ ظاہر تعارض اور اس کا جواب

یہاں اعتراض یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت سے پہلے البقرہ:۱۸۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "(اے رسول مکرم!) لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں' آپ اُنہیں بتا دیجئے کہ یہ لوگوں کے مختلف کاموں اور حج کے اوقات کی نشانیاں ہیں"۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر مہینے کے چاند کو حج کی نشانی قرار دیا ہے' جبکہ زیرِ بحث آیت کی رُو سے حج کے اوقات مخصوص ہیں؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ:۱۸۹ میں عموم ہے اور زیرِ بحث آیت خاص ہے اور قاعدہ ہے کہ خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔[۵۱۹] بعض مفسرین نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ پچھلی آیت مجمل ہے (یعنی اُس کا مفہوم واضح نہیں ہے) اور زیرِ بحث آیت اُس کے لیے مفسِّرہ ہے (یعنی اُس کی وضاحت کر رہی ہے)۔

"الحج اشھر" میں "اشھر" کے جمع ہونے پر اشکال کا جواب

ایک سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "الحج اشھر" میں "اشھر" جمع کے ساتھ استعمال فرمایا اور جمع کا اطلاق کم سے کم تین افراد پر ہوتا ہے' جبکہ امام شافعی کے نزدیک حج کا جو وقت ہے وہ دو مہینے اور دس راتیں ہیں' اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک دو مہینے اور دس دن ہیں۔ لہٰذا "اشھر" کے جمع ہونے کی کیا توجیہ کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک سے اوپر جو چیز ہو وہ جمع کے لفظ میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) دونوں کے لیے فرمایا: "فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا" "یعنی ضرور تمہارے دل مائل ہو گئے"۔ (التحریم:۴) (اس سے معلوم ہوا کہ تین سے کم افراد پر بھی جمع کا لفظ بولا جاتا ہے) بعض علماء نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ مدتِ حج میں جو دس راتیں یا دس دن ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے پورے مہینے کے برابر قرار دے کر "اشھر" کا لفظ استعمال فرمایا ہے' جیسے کہا جاتا ہے کہ "میں نے تمہیں فلاں سال دیکھا تھا" حالانکہ پورے سال نہیں دیکھا بلکہ اُس سال کے ایک مخصوص وقت میں دیکھا ہوتا ہے۔ رہا علماء کا تیسرا قول کہ مدت حج پورے تین مہینے ہیں' سو اس صورت میں "اشھر" کے لفظ پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

وہ کون سا فعل ہے جس کو انجام دے کر آدمی حج کے افعال میں داخل ہو جاتا ہے؟

آیت میں فرمایا: ﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص حج کے مہینوں میں اپنے آپ پر حج کو لازم اور واجب کر لے۔ یہاں "فرض" سے مراد ایسا فعل ہے جس کو کر کے آدمی حج کرنے والا بن جاتا ہے۔ پھر اس فعل کے بارے

---

۵۱۹ یہ جواب احناف کے اصول کے خلاف ہے۔ احناف کے نزدیک البقرہ:۱۸۹ اپنے عموم پر ہے اور زیرِ بحث آیت (الحج اشھر معلومات) محتمل ہے۔ یعنی اس میں "الحج" سے یا تو حج کرنا مراد ہے یا "احرام بالحج" (حج کا احرام باندھنا) مراد ہے اور جب یہ محتمل ہے تو اس کے ذریعہ البقرہ:۱۸۹ کو خاص نہیں کیا جا سکتا (اور نہ ہی اس پر مقدم قرار دیا جا سکتا ہے۔) کیونکہ احناف کے نزدیک احتمال کے ذریعہ عموم میں تخصیص کرنا جائز نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج۱ص ۲۵۵) لہٰذا ہمارے نزدیک علامہ خازن کا زیرِ بحث آیت اور البقرہ:۱۸۹ کے درمیان تعارض کا اشکال قائم کرنا ہی درست نہیں ہے چہ جائیکہ اس اشکال کا جواب درست ہو۔ کیونکہ ہمارے نزدیک دونوں آیات کا مفہوم اور دلالت علیحدہ ہے۔ زیرِ بحث آیت کی دلالت اس بات پر ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھنا جائز ہے اور البقرہ:۱۸۹ کی دلالت اس بات پر ہے کہ حج کے مہینوں سے پہلے دیگر ایام میں بھی حج کے لیے احرام باندھنا جائز ہے۔

شافعی فرماتے ہیں کہ تلبیہ کے بغیر محض نیت کرنے سے احرام کا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حج میں جو چیز فرض ہے وہ نیت ہے لہٰذا انعقادِ حج کے لیے نیت کا ہونا کافی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ محض نیت سے احرام کا آغاز کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ احرام کے ساتھ تلبیہ (یعنی ''لبیک اللھم لبیک'') نہ کہہ لیا جائے یا قربانی کا جانور نہ لے جایا جائے۔ کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں کچھ چیزیں حلال ہیں اور کچھ چیزیں حرام ہیں' اس لیے نیت کے ساتھ کسی ایسی چیز کو ملانا ضروری ہے (جس سے حلال اور حرام کے آغاز کا تعیّن ہو)۔ جیسے نماز میں نیت کے ساتھ ساتھ تکبیر تحریمہ کہنا ضروری ہے۔

اوقاتِ حج سے پہلے احرام باندھنا جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ کا اختلاف اور ان کے دلائل

زیرِ بحث آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ آدمی اُسی وقت احرام والا سمجھا جائے گا جب اُس نے حج کے مہینوں میں احرام باندھا ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہی قول ہے۔ امام شافعی' امام احمد اور امام اسحٰق کا بھی یہی مذہب ہے۔ دلیل اس قول کی یہ ہے کہ مذکورہ مہینوں میں حج کو فرض فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن مہینوں کو خصوصیت دی ہے۔ اس لیے اگر ان مہینوں کے علاوہ کسی اور مہینے میں احرام باندھا گیا تو پھر ان مہینوں کو خصوصیت دینے کی کوئی وجہ اور کوئی فائدہ نہیں رہے گا۔ اس کے برعکس امام مالک' سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ سال کے تمام مہینوں میں حج کا احرام باندھنا جائز ہے۔ کیونکہ ''احرام'' حج کو اپنے اوپر لازم کرنے کا نام ہے' لہٰذا وقت سے پہلے جس طرح منت ماننا جائز ہے اسی طرح وقت سے پہلے احرام باندھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (البقرہ:۱۸۹ میں) ہر مہینے کے چاند کو حج کے اوقات کی نشانی قرار دیا ہے (لہٰذا حج کے معیّن وقت سے پہلے احرام باندھنا جائز ہے)۔ امام ابو حنیفہ کے اس استدلال کا جواب پیچھے گزر چکا ہے۔[۵۲۰]

''رفث'' کے معنیٰ میں مختلف اقوال اور ''فلا رفث'' کی تفسیر

آیت میں فرمایا: حج کے دنوں میں ''رفث'' کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ اس جملہ میں جو ''رفث'' کا لفظ آیا ہے اس کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جماع یعنی صحبت کرنا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کا قول یہ ہے کہ ''رفث'' سے مراد ہے: عورتوں سے جماع کرنا' اُنہیں بوسہ دینا اور آنکھوں سے اشارے کرنا اور اشاروں میں ان کے ساتھ بے حیائی کی باتیں کرنا۔ حضرت ابن عباس کے اس قول کی بنیاد پر بے حیائی کی وہ گفتگو ''رفث'' میں داخل نہیں ہوگی جو عورتوں کی غیر موجودگی میں ہو۔ چنانچہ حصین بن قیس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے اونٹ کی دُم پکڑ کر اُسے موڑ رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے اُس ہانک رہے تھے کہ: ''وھن یمشین بنا ھمیسا ان یصدق الطیر ننک لمیسا'' یعنی یہ اونٹ ہمیں آہستہ آہستہ لے کر چل رہے ہیں' اگر اڑنا ممکن ہوتا تو ہم اپنی رفیقۂ حیات سے شب باشی کر لیتے۔ یہ شعر سن کر میں نے اُن سے کہا: حضرت! آپ نے احرام باندھا ہوا ہے پھر بھی آپ اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ انہوں نے جواباً فرمایا کہ جو رفث ممنوع ہے اس سے مراد وہ باتیں ہیں جو عورتوں کی موجودگی میں کی جائیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ رفث ایسی باتوں پر مشتمل گفتگو کو کہتے ہیں جن کا تذکرہ کرنا بُرا معلوم ہوتا ہو' یعنی جماع اور اس پر اُبھارنے والی چیزوں کے متعلق گفتگو کرنا رفث ہے۔ زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ اس کا ایک معنیٰ یہ کیا جا سکتا ہے کہ حج کے دوران جماع نہ کرو' اور یہ معنیٰ بھی کر سکتے ہیں کہ جماع کے بارے میں باتیں نہ کرو' کیونکہ اس کے متعلق باتیں کرنا اُس پر ابھارنے کا باعث ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''رفث'' سے مراد وہ باتیں ہیں جو بے حیائی اور

[۵۲۰] علامہ خازن کا اشارہ اُس اشکال کی طرف ہے جو انہوں نے سابق میں زیرِ بحث آیت اور البقرہ:۱۸۹ کے درمیان قائم کیا ہے اور اس کے دو جواب ذکر کیے ہیں۔ گذشتہ سطور میں اس اشکال کو' اُس کے جواب کو اور اُس پر حاشیہ:۵۱۹ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

بُرائی پر مشتمل ہوں۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''رفث'' سے مراد وہ باتیں ہیں جو لغو اور بے کار ہوں۔ اس معنیٰ کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ اس میں نہ تو بے حیائی کی باتیں کرے نہ شور شرابا کرے۔[۵۲۱] (صحیح بخاری: ۱۹۰۴، صحیح مسلم: ۱۱۵۱)

''فسوق'' کے معنیٰ میں مختلف اقوال اور اس کی تفسیر

آگے فرمایا: (حج کے دنوں میں) ''فسوق'' کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ ''فسوق'' کا اصل معنیٰ ہے: اطاعت سے نکل جانا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے تمام گناہ مراد ہیں۔ حضرت طاؤس، حسن بصری، سعید بن جبیر، قتادہ، زہری، ربیع اور قرظی کا یہی قول ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''فسوق'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو حالت احرام میں آدمی کے لیے ممنوع ہیں۔ جیسے شکار مارنا، ناخن تراشنا، بالوں کو نوچنا اور ان جیسی دیگر چیزیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فسوق'' سے مراد گالی دینا اور بُرے القاب سے پکارنا ہے۔

(۲۵۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جس شخص نے حج کیا اور (حج کے دوران) نہ بے حیائی کی بات کی نہ گناہ کیا تو وہ حج سے اس حالت میں لوٹے گا کہ پیدائش کے دن کی طرح (گناہوں سے پاک اور صاف) ہو گا۔[۵۲۲] (صحیح بخاری: ۱۵۲۱، صحیح مسلم: ۱۳۵۰، سنن ترمذی: ۸۱۱، سنن نسائی: ۲۶۲۷، سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۹، سنن دارمی: ۱۷۹۶، سنن دارقطنی ج ۲ ص ۲۸۳، سنن بیہقی ج ۵ ص ۲۶۲، مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۷ ص ۲۲۱)

''جدال'' کے معنیٰ میں مختلف اقوال

آگے فرمایا: ''جدال'' کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ ''جدال'' کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جھگڑنا ہے، یعنی آدمی اپنے ساتھی سے اتنا جھگڑے کہ اُسے غصہ دلا دے (یہ ممنوع ہے)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''جدال'' یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کہے کہ حج آج ہو گا اور دوسرا شخص کہے کہ حج کل ہو گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''جدال'' سے مراد (ایک مخصوص جدال ہے اور وہ) یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ لوگ حج کا احرام باندھ چکے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص جس نے جانور کے گلے میں ہار ڈال کر جانور کو معیّن کر دیا ہے اس کے سوا سب لوگ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دیں۔ تو لوگوں نے کہا کہ ہم جب حج کا تعیّن کر چکے ہیں تو پھر اس کے احرام کو عمرہ کا احرام کیسے بنائیں؟ یہ وہ جدال تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت میں منع فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جدال سے مراد وہ دستور ہے جس پر زمانۂ جاہلیت کے لوگ کاربند تھے، ان کا دستور یہ تھا کہ کچھ لوگ عرفہ میں وقوف کرتے تھے اور کچھ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے، کچھ لوگ ذوالقعدہ میں حج کیا کرتے تھے اور کچھ ذوالحجہ میں حج کیا کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر شخص یہ دعویٰ کرتا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ درست ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ ﴿ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ اور یہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ سارا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق فائنل ہو چکا ہے، لہٰذا اُن کے بعد اس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی مفہوم رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا ہے کہ:

---

۵۲۱ یہ حدیث شریف البقرہ: ۱۸۵ کی تفسیر میں رقم: ۱۹۸ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مفصل حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

۵۲۲ یعنی اس کے تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صغیرہ گناہوں کی معافی یقینی ہے اور کبیرہ گناہوں سے اگر توبہ کر لی ہے تو اُن کی معافی بھی یقینی ہے ورنہ امکان کے درجہ میں ہے۔ جہاں تک بندوں کے حقوق کا معاملہ ہے سو وہ بندوں کے معاف کرنے پر موقوف ہیں۔ (مرقات ج ۵ ص ۳۸۲، مراۃ ج ۴ ص ۸۸)

(۲۵۱) بے شک زمانہ گھوم کر اُس دن کی حالت پر آ گیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا۔[۵۲۳]

(صحیح بخاری: ۳۱۹۷، صحیح مسلم: ۱۶۷۹، سنن ابوداؤد: ۱۹۴۷، مسند احمد ج ۵ ص ۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۶۵۹، ص ۲۳۳)

بعض مفسرین نے ''ولا جدال فی الحج'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حج ذوالحجہ کے مہینے میں ہے۔ سو اس فرمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں میں ردّ و بدل کرنے کو باطل فرما دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فلا رفث و لا فسوق و لا جدال فی الحج'' میں بہ ظاہر ایک خبر دی جا رہی ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس میں ممانعت فرمائی جا رہی ہے۔ اور وہ ممانعت یہ ہے کہ حج کے ایام میں نہ تو بے حیائی کی باتیں کرو نہ گناہ کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا کرو۔ اگرچہ یہ سارے کام حج کے علاوہ بھی ہر حال میں اور ہر وقت ممنوع ہیں اور ان سے بچنا واجب ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ حج میں ان چیزوں سے بچنے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ دیگر مقامات کی بہ نسبت حج میں بے حیائی کی باتیں، گناہ کے کام اور لڑائی جھگڑا کرنا زیادہ بُرا اور قابلِ ملامت ہے۔

زیرِ بحث آیت میں عملِ خیر کی تفسیر اور اس اشکال کا جواب کہ جب اللہ عزوجل تمام اعمال سے باخبر ہے۔ تو اس نے عملِ خیر کی تخصیص کیوں فرمائی؟

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (اور تم جو بھی نیک کام کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔) اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا کوئی عمل اللہ عزوجل سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہی تمہیں ان اعمال پر بدلہ عطا فرمائے گا۔ اس فرمان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بُرے کام کرنے سے منع فرمایا اور پھر فوراً ہی اچھے کام کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم جو بھی نیک کام کرتے ہو اللہ اُس کو جانتا ہے۔ نیک کام سے مراد یہ ہے کہ لوگ حج کے دوران ''رفث'' یعنی بے حیائی کی باتیں کرنے کی بجائے اچھی گفتگو کریں، ''فسوق'' یعنی گناہ کرنے کی بجائے نیکی اور پرہیزگاری اختیار کریں اور ''جدال'' یعنی آپس میں لڑائی جھگڑا کرنے کی بجائے باہمی اتفاق اور اچھے اخلاق کو اپنائیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کا لفظ ارشاد فرما کر مراد یہ لیا ہے کہ لوگ بُرے کام کرنے سے اپنے نفس کو باندھ کر رکھیں (یعنی اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھیں) تاکہ جن چیزوں سے منع کیا ہے اُن کا ارتکاب نہ ہو۔

رہی یہ بات کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اچھے اور بُرے سب کاموں سے باخبر ہے تو پھر اُس نے یہ کیوں فرمایا کہ تم جو نیک کام کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے؟ تو بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس فرمان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے کسی نیک کام کو دیکھتا ہے تو اس کا وہ تذکرہ فرماتا ہے اور اس کو شہرت دیتا ہے، اور جب وہ اپنے بندے کے کسی بُرے کام کو دیکھتا ہے تو اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ سو بتایا یہ جا رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا دنیا میں اپنے بندہ کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو پھر آخرت میں اس کا معاملہ کیسا ہوگا جبکہ وہ سب سے زیادہ مہربانی اور کرم فرمانے والا ہے۔

[۵۲۳] یہ جملہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر قربانی والے دن صحابہ کرام کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اس جملہ میں زمانۂ جاہلیت کی رسم و رواج کا رد فرمایا جا رہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں مشرکین سال کے مہینوں میں تبدیلی کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً اُن کی جنگ کے زمانہ میں اگر کوئی حرمت والا مہینہ آ جاتا اور ابھی جنگ باقی ہوتی تو اُسے کوئی اور مہینہ قرار دے دیتے تاکہ جنگ جاری رکھ سکیں۔ اسی طرح بقر عید میں تبدیلی کر دیتے تھے تاکہ حج کی ادائیگی میں سہولت رہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات سال کو تیرہ مہینوں کا بنا دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس سال حج فرمایا اُس سال حسنِ اتفاق سے ہر مہینہ اپنے مقام پر منایا گیا اور سال بھی بارہ مہینوں پر رہا۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا زمانہ گھوم کر اُسی دن کی حالت پر آ گیا ہے۔ مراد یہ تھی کہ اب اس میں تبدیلی نہ کی جائے اور حج سمیت تمام اعمال کو اُن کے مقام پر ادا کیا جائے۔

(مرقات ج۵ص۵۴۶، مراۃ المناجیح ج۴ص۱۷۱)

سفر میں زادِراہ لینے کے حکم کا پس منظر اور تقویٰ کے بہترین زادِراہ ہونے کی تفسیر

آیت میں فرمایا: اپنے ساتھ سفر کا خرچہ لیا کرو۔ یہ ارشاد یمن کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوا جو اپنے ساتھ سفر کا خرچ لیے بغیر حج کے لیے نکلا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ ہم بھروسا کرنے والے لوگ ہیں، ہم اپنے رب کے گھر کا حج کرتے ہیں تو کیا وہ ہمیں کھانے کی اشیاء عطا نہیں فرمائے گا؟ پھر جب یہ لوگ مکہ میں آتے تو لوگوں سے سوال کیا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی حالت سے مجبور ہو کر لوٹ مار شروع کر دیتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل فرمایا کہ ﴿وَتَزَوَّدُوْا﴾ اپنے ساتھ سفر کا خرچ لیا کرو۔ یعنی ایسی چیز جس سے تم اپنا گزارا کر سکو اور لوگوں سے اپنی آبرو کی حفاظت کر سکو اور لوگوں کو پریشان کرنے اور ان پر بوجھ بننے سے بچ سکو۔

﴿فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (بلاشبہ سفر کا بہترین خرچ تقویٰ ہے۔) بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ تم تقویٰ کو سفر کا خرچ بناؤ، کیونکہ بہرحال انسان کے لیے دنیا میں سفر ایک لازمی چیز ہے، پھر سفر میں زادِراہ کے ضروری ہونے کے ساتھ آدمی کو کھانے پینے اور سواری کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح دنیا سے آخرت کا جو سفر ہے وہ بھی ایک لازمی چیز ہے اور دنیا کی طرح اس میں بھی زادِراہ کا ہونا ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ عزوجل سے ڈرے اور اس کی فرمانبرداری کرے۔ یہ زادِراہ، دنیا کی زادِراہ سے بہت زیادہ بہتر ہے کیونکہ دنیا کی زادِراہ سے نفس کی چاہت اور نفس کی خواہشات پوری ہوتی ہیں جبکہ آخرت کی زادِراہ سے آدمی کو آخرت میں دائمی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اسی معنیٰ میں اَعشٰی کے یہ شعر ہیں کہ:

اذا انت لم ترحل بزاد من التقی ولاقیت بعد الموت من قد تزودا
ندمت علی ان لا تکون کمثلہ وانک لم ترصد کما کان ارصدا

"یعنی جب تو پرہیزگاری کی زادِراہ لیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگا اور مرنے کے بعد ایسے شخص سے ملے گا جو پرہیزگاری کی زادِراہ لیے ہوئے ہوگا تو تجھے اس بات پر شرمندگی ہوگی کہ تو اس شخص کی طرح نہ بن سکا اور اس جیسی تیاری نہ کر سکا"۔

زیرِ بحث آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَاتَّقُوْنِ﴾ (مجھ سے ڈرو) مراد یہ ہے کہ میرے عذاب سے ڈرو۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میرے ڈر اور خوف میں مشغول رہو۔ اس جملہ میں لوگوں کو اللہ عزوجل کی کمالِ عظمت سے خبردار کیا جا رہا ہے۔ اس جملہ کے آخر میں جو فرمایا: ﴿یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ اس میں ان لوگوں کو متوجہ کیا جا رہا ہے جو عقل رکھتے ہیں اور معاملات کے حقائق سے واقفیت رکھتے ہیں۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۱۹۸﴾

(حج کے ساتھ ساتھ اگر) تم اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرو تو (اس میں) تمہارے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے، پھر جب تم عرفات سے (مزدلفہ میں) واپس آؤ تو مشعرِ حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو اور جس طرح اس نے تم کو ہدایت دی ہے اس طرح اس کا ذکر کرو، اور یقیناً اس سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے O

حج کے ساتھ ساتھ اللہ کا فضل تلاش کرنے کا بیان اور اس کی تفسیر

آیت مبارکہ میں ﴿جُنَاحٌ﴾ کا معنیٰ گناہ ہے۔ اور ﴿فَضْلًا﴾ سے مراد روزی اور منافع ہے، یعنی تجارتی فائدہ۔ حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں عُکاظ مُجَنّہ اور ذُوالمَجاز کے بازار لگا کرتے تھے' جب اسلام کی آمد ہوئی تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ حج کے موسم میں تجارت اور کاروبار کرنے سے گناہ ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم''۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کو ''فی مواسم الحج'' کے الفاظ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی حج کے دوران اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے)۔ ایک روایت میں اس طرح ہے ''ان تبتغوا فی مواسم الحج فضلا من ربکم''۔

(صحیح بخاری: ۲۰۵۰۔ ۲۰۹۸)

☆ ''عُکاظ'' مکہ مکرمہ کے قریب ہی ایک مشہور بازار ہے' اور ''مُجَنّہ'' بھی مکہ کے قریب ایک بازار ہے۔ ازرقی نے کہا ہے کہ مجنہ مکہ کی نشیبی زمین پر ہے اور مکہ سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ''ذُوالمَجاز'' عرفہ کے پاس ایک بازار ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب ان بازاروں میں تجارت کیا کرتے تھے اور ہر بازار کا اپنا ایک موسم (اور وقت) تھا' چنانچہ کاروباری لوگ عکاظ میں ذوالقعدہ کے بیس دن ٹھہرتے تھے پھر مجنہ کے بازار میں چلے جاتے تھے اور وہاں اٹھارہ دن ٹھہرتے تھے' یعنی ذوالقعدہ کے آخری دس دن اور ذوالحجہ کے ابتدائی آٹھ دن۔ پھر آٹھ ذوالحجہ کو لوگ وہاں سے میدان عرفہ کی طرف نکلتے تھے۔ داؤدی نے کہا ہے کہ مجنہ کا بازار عرفہ کے پاس ہے۔

(۲۵۲) حضرت ابوامامہ تیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حج کے ساتھ ساتھ جانوروں کو کرایہ پر دینے کا کاروبار بھی کرتا تھا' لوگ مجھے کہتے تھے کہ تمہارا حج نہیں ہوتا۔ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملا اور انہیں بتایا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میں حج کے ساتھ ساتھ جانوروں کو کرایہ پر دینے کا کام بھی کرتا ہوں اور لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تمہارا حج نہیں ہوتا (آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟)۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: کیا تم احرام' تلبیہ' بیت اللہ کا طواف' عرفات سے لوٹنا اور شیاطین کو پتھر مارنا یہ سب کام نہیں کرتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! حضرت ابن عمر نے کہا کہ پھر تمہارا حج درست ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھی ایک شخص نے آکر یہی سوال کیا تھا' لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی تھی اور اس کو جواب نہیں دیا تھا' یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ تمہارے لیے اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (البقرہ: ۱۹۸) جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سوال کرنے والے شخص کو بلوایا اور اس کو یہ آیت پڑھ کر سنائی اور ارشاد فرمایا کہ تمہارا حج درست ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۱۷۳۳' مسند احمد ج ۲ ص ۱۵۵' المستدرک ج ۱ ص ۴۴۹)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حج کے دوران تجارت کرنے سے اگر حج کے افعال کی ادائیگی میں نقص آتا ہو تو پھر دوران حج تجارت کرنا جائز نہیں ہوگا' اور اگر حج کی ادائیگی میں کوئی نقص نہ آتا ہو تو پھر یہ اُن جائز کاموں میں سے ہوگا جن کو نہ کرنا زیادہ بہتر ہے' تاکہ عبادت کسی اور چیز کی آمیزش سے خالی رہے۔ کیونکہ ایسا حج جس میں آدمی تجارت سے دور رہے وہ زیادہ بہتر اور زیادہ کامل ہوتا ہے۔

حج کے مختلف ایام اور مقامات (عرفہ' عرفات و مزدلفہ وغیرہا) کا معنیٰ اور اِن ناموں کی وجوہات

آیت میں فرمایا: جب تم عرفات سے (مزدلفہ میں) واپس آؤ۔ اس جملہ میں ﴿اَفَضْتُمْ﴾ کا معنیٰ ہے: جب تم کوچ کرو۔ یہ ''الافاضہ'' سے ہے اور افاضہ بہت زیادہ کوچ کرنے کو کہتے ہیں۔ ﴿عَرَفَاتٍ﴾ عرفہ کی جمع ہے' اور پوری ایک جگہ ہونے کے باوجود اس کا نام عرفات اس لیے رکھا گیا کہ اس کا ہر حصہ عرفہ ہے اور تمام حصوں کے مجموعہ کا نام عرفات رکھ دیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''عرفات'' جگہ کا نام ہے اور ''عرفہ'' دن کا نام ہے۔ حضرت عطاء کہتے ہیں کہ جبریل امین سیدنا ابراہیم علیہ السلام

کو حج کے ارکان بتاتے تھے پھر پوچھتے تھے: ''عَرَفْتَ'' آپ نے پہچان لیا۔ وہ فرماتے: ''عَرَفْتُ'' میں نے پہچان لیا۔ اس لیے اس جگہ کا نام عرفات اور اس دن کا نام عرفہ ہو گیا۔ ضحاک کا قول یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب آسمان سے زمین پر بھیجا گیا تو وہ ہندوستان میں اُترے اور حضرت حواء علیہا السلام جدہ میں اُتریں' لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے' یہاں تک کہ عرفہ والے دن عرفات میں دونوں کے درمیان ملاقات ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا' اس لیے اُس دن کا نام عرفہ اور جگہ کا نام عرفات ہو گیا۔ سدی کا قول یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب لوگوں کے درمیان حج کا اعلان کیا اور لوگوں نے ''لبیک اللھم لبیک'' کہہ کر اعلان کا جواب دیا اور جن لوگوں نے حاضر ہونا تھا وہ حاضر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو عرفات کی جگہ وغیرہ بتائی اور اُنہیں وہاں جانے کا حکم فرمایا' سو وہ عرفات کی طرف چلے۔ جب وہ (پہلے) جمرہ کے پاس پہنچے تو شیطان سامنے آ گیا اور آپ کو واپس بھیجنے لگا' آپ نے اُس کو سات کنکریاں ماریں اور ہر کنکری پر آپ تکبیر پڑھ رہے تھے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان وہاں سے اُڑ کر دوسرے جمرہ پر چلا گیا' آپ نے پھر اُس کو تکبیر پڑھتے ہوئے کنکریاں ماریں تو وہ اُڑ کر تیسرے جمرہ پر چلا گیا' آپ نے پھر اس کو تکبیر پڑھتے ہوئے کنکریاں ماریں تو وہ اُڑ گیا اور اس نے جب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کی بات نہیں مان رہے تو وہ چلا گیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی وہاں سے تشریف لے گئے اور ذوالمجاز کے بازار میں آئے' لیکن آپ نے اُس جگہ کو نہ پہچانا اس لیے وہاں سے آپ چلے گئے' یوں اُس جگہ کا نام ذوالمجاز ہو گیا۔[۵۲۴] پھر آپ وہاں سے عرفات میں تشریف لائے' چونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آپ کو یہ جگہ بتا دی تھی اس لیے آپ اُس کو پہچان گئے' یوں اُس دن کا نام عرفہ اور جگہ کا نام عرفات ہو گیا۔ پھر جب شام کے وقت آپ نے مقام جمع (مزدلفہ) کی طرف ازدلاف کیا (یعنی اُس کے قریب گئے) تو اُس جگہ کا نام مزدلفہ ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آٹھ ذوالحجہ کی رات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ اُنہیں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے' جب صبح ہوئی تو پورا دن ترویہ فرماتے رہے یعنی غور و فکر کرتے رہے کہ یہ خواب اللہ عزوجل کی جانب سے ہے یا شیطان کی طرف سے؟ اس غور و فکر کی وجہ سے اُس دن کا نام ''یوم الترویہ'' ہو گیا۔ پھر عرفہ والی رات آپ نے دوبارہ وہی خواب دیکھا' جب صبح ہوئی تو آپ نے پہچان لیا کہ یہ خواب اللہ عزوجل کی جانب سے ہے۔ اس پہچان کی وجہ سے اس دن کا نام ''یوم عرفہ'' ہو گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عرفہ والے دن چونکہ لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اس لیے اس دن کا نام عرفہ ہو گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عرفہ والے دن کو جو عرفہ کہا جاتا ہے وہ ''عَرْف'' بہ معنیٰ خوشبو سے مأخوذ ہے اور مِنٰی کو مِنٰی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اُس میں خون کا اِمناء ہوتا ہے یعنی خون کو بہایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں پر گندگی اور خون ہی خون پھیل جاتا ہے' نتیجۃً وہ جگہ خوشبو دار نہیں رہتی' میدانِ عرفات میں چونکہ یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں اس لیے وہ طیّب اور پاکیزہ ہوتا ہے۔

وقوف عرفہ کا وقت اور اس کی اہمیت

وقوف عرفہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے' اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا اور جو شخص وقت کے اندر وقوف عرفہ نہ کر سکے اُس کا حج نہیں ہو گا۔ وقوف عرفہ کا جو وقت ہے وہ عرفہ والے دن (یعنی ۹ ذوالحجہ کو) سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے اور یوم النحر (یعنی ۱۰ ذوالحجہ) کی صبح صادق کے طلوع ہونے تک جاری رہتا ہے۔ اور یہ ٹوٹل آدھا دن اور ایک رات ہوئی۔ لہٰذا جو شخص اس وقت کے اندر اندر رات میں یا دن میں لمحہ بھر بھی عرفات کے میدان میں ٹھہر گیا تو اُس کا وقوف عرفہ ہو گیا اور اُس کا

۵۲۴ کیونکہ جاز یجوز مجازا (از باب نصر) کا عربی میں معنیٰ ہے: کسی جگہ سے گزر کر آگے بڑھنا۔

فریضۂ حج مکمل ہو جائے گا۔امام احمد بن حنبل کا مؤقف یہ ہے کہ وقوفِ عرفہ کا وقت آٹھ ذی الحجہ کی طلوعِ فجر سے دس ذی الحجہ کی طلوعِ فجر تک ہے۔

عرفات سے واپسی کا جو وقت ہے وہ سورج ڈوبنے کے بعد ہے یعنی جب سورج ڈوب جائے گا تو عرفات سے واپسی ہو گی اور مغرب کی نماز کو مؤخر کر دیا جائے گا' یہاں تک کہ مزدلفہ میں مغرب اور عشاء دونوں کو ملا کر ادا کیا جائے گا۔جیسا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۵۳) رسول اللہ ﷺ عرفہ سے واپس ہوئے اور ایک گھاٹی (جو مزدلفہ کے قریب ہے) کے پاس اُترے وہاں آپ نے بول فرمایا اور وضو کیا لیکن مکمل وضو نہیں کیا (یعنی پانی زیادہ نہیں بہایا)۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! نماز۔ آپ نے فرمایا: نماز آگے پڑھیں گے۔ پھر آپ سوار ہو گئے' جب مزدلفہ آیا تو آپ اُترے اور اُتر کر آپ نے کامل وضو کیا' پھر تکبیر ہوئی تو آپ نے مغرب کی نماز ادا فرمائی' اس کے بعد ہر شخص نے اپنا اونٹ اس کے ٹھکانے پر بٹھا دیا' پھر تکبیر ہوئی تو آپ نے عشاء کی نماز ادا فرمائی' اور ان دونوں نمازوں کے درمیان آپ نے کوئی نماز ادا نہیں کی۔[۵۲۵] (صحیح بخاری: ۱۳۹-۱۶۷۲' صحیح مسلم: ۱۲۸۰)

''مشعر حرام'' کا معنیٰ' اس کے محل وقوع کا تعین اور اس کے پاس اللہ عزوجل کا ذکر کرنے کی تفسیر میں احادیث

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ ''پس تم مشعرِ حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو''۔اس جملہ میں ''مشعر'' ''شعار'' سے ماخوذ ہے اور ''شعار'' کا معنیٰ علامت ہے۔ چونکہ یہ جگہ حج کی علامتوں میں سے ہے اس لیے اس کا نام مشعر رکھا گیا۔اس کے ساتھ جو ''حرام'' کا لفظ ہے اس کا اصل معنیٰ ہے: روکنا۔ چونکہ اس میں ہر وہ کام ممنوع ہے' جس کی اجازت نہیں دی گئی اس لیے اس کو حرام کہا گیا۔ ''مشعر حرام'' سے مراد وہ جگہ ہے جو مازمان[۵۲۶] عرفہ سے لے کر وادیٔ محسّر تک مزدلفہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے۔ مازمان اور وادیٔ محسر مشعرِ حرام میں داخل نہیں ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ مشعرِ حرام سے مراد مزدلفہ ہے اور مزدلفہ کو مشعرِ حرام اس لیے فرمایا کہ اس میں نماز کی ادائیگی' رات کا ٹھہرنا اور دُعا کرنا یہ تمام باتیں حج کی علامتوں میں سے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مشعرِ حرام سے مراد قزح ہے جو کہ مزدلفہ کی آخری حد ہے۔ان تمام اقوال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

''مزدلفہ'' کا لفظ ازدلاف سے ہے اور ازدلاف کا معنیٰ ہے: قریب ہونا۔ چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا قرب ہوتا ہے اس لیے اس کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ چونکہ لوگ رات کے قریب اس میں آتے ہیں اس لیے اس کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ چونکہ لوگ اس میں جمع ہوتے ہیں اس لیے اس کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ مزدلفہ کو ''جمع'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں مغرب اور عشاء کی نماز کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کر کے پڑھا جاتا ہے۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''مشعرِ حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو'' اس سے مراد یہ ہے کہ مشعرِ حرام میں مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع کر کے پڑھو۔اس معنیٰ کے مراد ہونے پر دلیل یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''فاذکروا اللہ'' فرمایا ہے اور ''فاذکروا'' امر ہے جو کہ وجوب کے لیے ہے' اور مزدلفہ میں صرف نماز ہی ایسی چیز ہے جو واجب ہے' لہٰذا اللہ کے ذکر سے مراد یہ ہوگا کہ

[۵۲۵] یعنی مغرب وعشاء کی سنتیں ادا نہیں فرمائیں۔اس حدیث شریف کی رُو سے مزدلفہ میں مغرب وعشاء کے درمیان سنتیں ادا کیے بغیر دونوں نمازیں ادا کی جائیں گی۔ البتہ مغرب وعشاء کی سنتیں اور وتر عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ادا کیے جائیں گے۔
(کذا فی ردّ المحتار ج ۲ ص ۳۸ ۔ ج ۳ ص ۴۶۵ طبع جدید)

[۵۲۶] ''مازمان'' ''مازم'' کا تثنیہ ہے۔اس کا اصل معنیٰ ہے: دو پہاڑوں کے درمیان تنگ راستہ۔ یہاں اس سے دو پہاڑ مراد ہیں جو عرفات اور مزدلفہ کے درمیان واقع ہیں۔ (ردّ المحتار ج ۳ ص ۴۶۵)

مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع کر کے پڑھو۔ البتہ علماء کی اکثریت کا مؤقف یہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ مشعر حرام کے پاس دُعا اور تلبیہ کہو اس کے لیے پاکیزگی اور تعریف بیان کرو اور ''لا الٰہ الا اللہ'' اور ''اللہ اکبر'' پڑھو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں:

(۲۵۴) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرفہ سے مزدلفہ تک نبی اکرم ﷺ کے پیچھے (جانور پر) سوار رہے' پھر نبی اکرم ﷺ نے مزدلفہ سے منیٰ تک[۵۲۷] فضل کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ یہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جمرۂ عقبہ کو کنکریاں مارنے تک مسلسل لبیک کہتے رہے (یعنی کنکریاں مارنے سے پہلے تک)۔ (صحیح بخاری: ۱۶۸۷' صحیح مسلم: ۱۲۸۱)

(۲۵۵) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (عرفات سے) مزدلفہ میں آئے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز ادا فرمائی۔ اور ان دونوں نماز کے درمیان آپ نے کوئی تسبیح نہیں پڑھی' پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ فجر ہو گئی اور جب صبح کا ظہور ہوا تو ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ آپ نے فجر کی نماز ادا فرمائی' پھر آپ قصواء اونٹنی پر سوار ہوئے اور مشعر حرام میں آئے اور یہاں آ کر آپ نے قبلہ کی طرف رُخ کر کے اللہ عزوجل سے دُعا کی اور اس کی تکبیر کہی اور ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بیان کیا۔ آپ صبح کے خوب روشن ہونے تک مشعر حرام میں ٹھہرے رہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے آپ (وادیٔ محسر کی طرف) روانہ ہو گئے۔

(صحیح مسلم: ۱۲۱۸' سنن ابوداؤد: ۱۹۰۵' سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۴)

☆ امام بغوی نے اس حدیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے' اور مجھے اصل کتابوں میں یہ حدیث نہیں ملی۔

طاؤس کہتے ہیں: زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا معمول تھا کہ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے عرفہ سے لوٹ جاتے اور سورج غروب ہونے کے بعد مزدلفہ سے لوٹ جاتے اور وہاں ثبیر نامی پہاڑ کو مخاطب کر کے کہتے تھے: اے ثبیر! تو سورج کی روشنی میں آ جا' تاکہ ہم یہاں سے قربانی کے لیے روانہ ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ان جاہلیت کے اعمال کو منسوخ فرما کر یہ حکم دیا کہ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف جو واپسی ہو گی وہ سورج غروب ہونے کے بعد ہو گی اور مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جو لوٹنا ہو گا وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہو گا۔ حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۵۶) زمانۂ جاہلیت کے لوگ مزدلفہ سے اُس وقت تک واپس نہیں لوٹتے تھے جب تک کہ سورج طلوع نہیں ہوتا تھا' اور وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ: اے ثبیر! تو سورج کی روشنی میں آ جا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کے اس عمل کی مخالفت فرمائی اور آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے واپس ہوئے۔

(صحیح بخاری: ۱۶۸۴' سنن ترمذی: ۸۹۶' سنن ابوداؤد: ۱۹۳۸' سنن ابن ماجہ: ۳۰۲۲' سنن دارمی: ۱۸۹۰' سنن بیہقی ج ۵ ص ۱۲۵' مسند احمد ج ۱ ص ۳۹)

زیرِ بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر

اختتام پر فرمایا: ''جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اس طرح اس کا ذکر کرو' اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے دین اور ارکانِ حج کی ہدایت دے کر تمہیں یاد رکھا ہے اس طرح تم بھی اس کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی تعظیم کے ذریعہ اس کو یاد کرو۔ ''یقیناً اس سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اس سے پہلے اللہ کے ذکر اور اس

۵۲۷ فضل سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے بیٹے مراد ہیں (یعنی فضل بن عباس بن عبدالمطلب) جو کہ نبی اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بڑے بھائی تھے۔

کی عبادت کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔اس جملہ میں ﴿مِنْ قَبْلِهٖ﴾ کی ضمیر ہدایت کی طرف راجع ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک رسول کی طرف راجع ہے (یعنی ہدایت سے پہلے یا رسول کے بھیجے جانے سے پہلے تم گمراہ تھے)۔بعض مفسرین کے نزدیک ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''تم اللہ کو یاد کرو' جیسے اُس نے تمہیں اپنی اُس کتاب کے ذریعہ ہدایت دی ہے جو اُس نے تم پر نازل کی ہے'اور یقیناً اس کتاب کے نازل کیے جانے سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے''۔

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۹﴾

پھر تم بھی اُسی جگہ سے واپس آؤ جہاں سے اور لوگ واپس آتے ہیں' اور اللہ سے بخشش طلب کرو' بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے ○

آیت مذکورہ میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال اور آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ اس جملہ میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔(۱) ایک قول یہ ہے کہ اہل قریش سے خطاب ہے۔مفسرین فرماتے ہیں کہ اہل قریش اور ان کے دین پر چلنے والے لوگ یعنی حُمس' ان سب کا معمول یہ تھا کہ یہ مزدلفہ میں وقوف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''ہم اللہ والے ہیں اور اس کے حرم کے خدمت گزار ہیں' لہٰذا ہم نہ تو حرم سے پیچھے رہیں گے' نہ یہاں سے نکلیں گے''۔یہ لوگ عرفات میں دیگر لوگوں کے ساتھ وقوف کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کیونکہ دیگر لوگوں کا معمول یہ تھا کہ وہ عرفات میں وقوف کیا کرتے تھے اور عرفات سے لوگ جب واپس ہوتے تھے تو حُمس مزدلفہ سے واپس ہوتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بھی تمام لوگوں کے ساتھ عرفات کے میدان میں وقوف کریں اور وہاں سے پھر مزدلفہ کی طرف جائیں۔اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بھی خبر دی کہ یہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی سنت ہے۔

(۲۵۷) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ قریش اور ان کے دین پر چلنے والے جن کو حُمس کہا جاتا تھا یہ سب مزدلفہ میں وقوف کیا کرتے تھے' اور باقی تمام اہل عرب عرفہ میں وقوف کرتے تھے' جب اسلام کی آمد ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ عرفات میں آکر وقوف کریں اور یہاں سے لوٹ کر (مزدلفہ کی طرف) جائیں۔اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ثم افیضوا من حیث افاض الناس''۔

(صحیح بخاری: ۴۵۲۰' صحیح مسلم: ۱۲۱۹' سنن ابوداؤد: ۱۹۱۰' سنن نسائی: ۳۰۱۲)

☆ اس حدیث میں جو حُمس کا لفظ ہے وہ اَحمس کی جمع ہے' اس کا اصل معنیٰ بہادری اور طاقتوری ہے۔قریش اور کنانہ کو حُمس اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دین میں بہت سخت تھے۔

مذکورہ تفصیل پہلے قول کی تھی کہ زیر بحث آیت میں خطاب اہل قریش سے ہے۔اس قول کی بنیاد پر ''الناس'' میں سوائے حُمس کے تمام اہل عرب داخل ہوں گے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ جہاں سے (دیگر لوگ یعنی) حضرت ابراہیم واپس آتے تھے تم بھی وہاں سے واپس آؤ۔اللہ تعالیٰ کے فرمان ''ثم افیضوا من حیث افاض الناس'' کا یہی مفہوم ہے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''الناس'' (یعنی لوگ) سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ سعید بن جبیر کی قرأت میں ''الناس'' کی بجائے ''الناسی'' ہے۔''الناسی'' کا معنیٰ ہے: بھولنے والا'

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عہد کو بھول[۵۲۸] گئے تھے اس لیے ''الناسی'' سے مراد صرف وہی ہوں گے۔ (اور آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم اُس جگہ سے واپس آؤ جہاں سے حضرت آدم واپس آئے) کیونکہ عرفات کا وقوف اور وہاں سے واپس ہونا اللہ کا ایک ایسا حکم ہے جو قدیم ہے اور اس کے علاوہ ہر طریقہ خود ساختہ اور بدعت ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مزدلفہ سے منٰی کی طرف جو لوٹنا ہے وہ قربانی والے دن سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے' تاکہ وہاں رمی اور قربانی کی جائے۔ اور آیت میں جو ''الـنــاس'' کا لفظ ہے اس سے حضرت ابراہیم' حضرت اسمٰعیل علیہما السلام اور ان کے پیروکار مراد ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ سورج طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے منٰی کی طرف لوٹ جایا کرتے تھے۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ عرفات سے مزدلفہ کی طرف جو روانگی ہے اس کا تذکرہ ''فـاذا افضتم من عرفات'' میں گزر چکا ہے' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ''ثم افیـضـوا من حیث افاض الناس'' فرمایا ہے' لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں جس لوٹنے کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ مزدلفہ سے منٰی کی طرف لوٹنا ہے۔

ذکر کردہ اقوالِ مفسرین میں صحیح ترین قول کا بیان اور اس پر ایک سوال کا جواب

مذکورہ دونوں اقوال میں جو پہلا قول ہے (یعنی ''ثم افیضوا'' سے مراد عرفہ سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہونا ہے) وہی زیادہ صحیح ہے اور اسی پر اکثر مفسرین قائم ہیں۔

سوال: جس قول پر اکثر مفسرین قائم ہیں اُس پر یہ اعتراض ہے کہ آیت کا ظاہر اس کے خلاف ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے فرمایا کہ ''جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کا ذکر کرو'' اور یقیناً عرفات سے لوٹنا مزدلفہ سے پہلے ہے' تو پھر اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت میں عرفہ سے لوٹنے کا ذکر دوبارہ کیوں فرمایا؟ اس صورت میں تو گویا آیت اس طرح ہو جائے گی کہ ''فـاذا افـضـتم من عرفات فافیضوا من عرفات'' جب تم عرفات سے لوٹو تو عرفات سے لوٹو۔ اور یہ معنیٰ جائز نہیں ہے؟

جواب: اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ درحقیقت آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصلاً زیرِ بحث آیت مقدم ہے اور گذشتہ آیت ''لیـس علیکم جناح ان تبتغوا'' مؤخر ہے۔ اس ترتیب کے مطابق زیرِ بحث آیت ''ثم افیضوا'' سے عرفہ کی واپسی مراد لینا درست ہو جائے گا۔ بعض علماء نے (اس اعتراض کے جواب میں) یہ کہا ہے کہ ''ثـم افیـضـوا'' میں جو ''ثُمَّ'' ہے وہ واؤ کے معنیٰ میں ہے' جیسے ''ثم کان من الذین امنوا'' (البلد:۱۷) میں ''ثم'' واؤ کے معنیٰ میں ہے۔

(۲۵۸) حضرت ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میری موجودگی میں سوال کیا گیا کہ حجۃ الوداع میں عرفات سے مزدلفہ کی طرف جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کس طرح چل رہے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ ﷺ تیز چل رہے تھے' اور جب آپ کشادگی پاتے تو مزید تیز چلتے۔

(صحیح بخاری:۱۶۶۶' صحیح مسلم:۱۲۸۶' سنن ابوداؤد:۱۹۲۳' سنن نسائی:۳۰۲۳' سنن ابن ماجہ:۳۰۱۷' مسند احمد ج۵ص۲۰۵)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: ''عَـنَـق'' یہ چلنے کی ایک قسم ہے' اس میں تیزی ہوتی ہے اور عام رفتار کے مقابلہ میں زیادہ بڑھ کر ہوتی ہے۔ ایک لفظ آیا ہے: ''فـجـوۃ'' اس کا معنیٰ ہے: کشادگی اور کشادہ زمین۔ اسی طرح ایک لفظ آیا ہے: ''نصّ'' اس کا معنیٰ ہے: آدمی کا اتنی تیز چلنا کہ اونٹنی کی آخری حد کو پالے۔

(۲۵۹) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وہ عرفہ والے دن نبی اکرم ﷺ کے ساتھ عرفات سے

۵۲۸ اس میں اشارہ قرآن مجید کی اُس آیت کی طرف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بے شک ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک تاکیدی حکم دیا تھا تو وہ بھول گئے (لیکن) ہم نے اس میں ان کا قصد نہیں پایا''۔ (طٰہٰ:۱۱۵)

مزدلفہ کی طرف لوٹے' تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے پیچھے اونٹوں کو ہانکنے اور مارنے کی تیز آوازیں سُنیں' آپ نے اپنے کوڑے سے اشارہ کر کے فرمایا: اے لوگو! سکون اور اطمینان لازمی ہے' کیونکہ نیکی ایضاع میں (یعنی بہت زیادہ تیز چلنے میں) نہیں ہے۔

(صحیح بخاری:۱۶۷۱' سنن ابوداؤد: ۱۹۲۰' سنن نسائی:۳۰۸۱)

زیر بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر

فرمایا: ﴿ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ﴾ اللہ سے بخشش طلب کرو۔ بخشش طلب کرنے سے مراد یہ ہے کہ وقوف کے معاملہ میں تم لوگوں نے جو مخالفت کی ہے اس کے لیے بخشش طلب کرو اور دیگر تمام گناہوں کے لیے بخشش طلب کرو۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کو اپنی رحمت سے چھپانے والا ہے۔ ''غفور'' اور ''رحیم'' کے الفاظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ بہت زیادہ بخشش اور رحمت فرمانے والا ہے۔ اور اس جملہ میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے بندوں کی توبہ کو قبول فرماتا ہے اور ان کی بخشش فرما دیتا ہے' کیونکہ اس آیت میں اُس نے گناہ کرنے والے کو بخشش طلب کرنے کا حکم دیا ہے اور پھر خود اپنے بارے میں یہ فرمایا کہ میں بہت زیادہ بخشش اور رحمت کرنے والا ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اُن لوگوں کی مغفرت فرما دیتا ہے جو اُس سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ان لوگوں پر مہربانی فرماتا ہے جو گناہ کرتے ہیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰

پھر جب تم اپنے حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو' کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں (سب کچھ) عطا کر دے' ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے O

حج سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کے ذکر کی تفسیر اور زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کی رسم کا بیان

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تم اپنے حج سے اور اپنی عبادت سے فارغ ہو جاؤ اور اپنی قربانی کے جانور ذبح کر لو۔ قربانی کا وقت رمی جمار اور منیٰ میں ٹھہرنے کے بعد ہے۔ ﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ﴾ تو اللہ کا ذکر کرو۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی تعریف اور بزرگی بیان کرو' اس کی تعریف میں ''لا الہ الا اللہ ' اللہ اکبر '' اور دیگر کلمات کہو۔

﴿ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ ﴾ ''جیسے تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو''۔ اس کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ جب وہ اپنے حج کی ادائیگی سے فارغ ہوتے تھے تو منیٰ کی مسجد اور پہاڑ کے درمیان اور ایک قول کے مطابق بیت اللہ کے پاس آ کر اپنے آباء واجداد کی قابل فخر باتیں' کارنامے' فضائل ومناقب اور ان کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ میرا باپ بہت بڑا سخی تھا' بڑے گھر کا مالک تھا' مہمان نواز تھا' ایسا تھا اور ویسا تھا' اس طرح وہ اپنے باپ کی تمام فخریہ باتیں اور خوبیاں گنا دیتا۔ اسی طرح سارے لوگ اپنے باپ دادا کی شان میں ایک دوسرے کو اشعار سناتے اور بہت فصاحت کے ساتھ نظم ونثر دونوں طریقوں سے آپس میں گفتگو کرتے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ باپ دادا کے فضائل بیان کر کے شہرت اور نام کمایا جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور احسان سے ان لوگوں کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی تو انہیں یہ حکم دیا کہ تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرنے کی بجائے میرا ذکر کرو۔ کیونکہ میں نے ہی تم کو اور ان کو پیدا کیا ہے اور میں نے

تمہارے ساتھ اور ان کے ساتھ احسان کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ باپ دادا کی طرح ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح چھوٹے بچے اپنے والدین کو یاد کرتے ہیں اس طرح تم اللہ کو یاد کرو۔ یعنی بچہ جب بولنے کا آغاز کرتا ہے تو اپنے والدین کو پکارتا ہے اور دوسری بات وہ نہیں جانتا' سو اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا کہ جس طرح چھوٹے بچے صرف اپنے والدین کو یاد کرتے ہیں اسی طرح تم بھی صرف اللہ کا ذکر کرو۔

﴿ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ﴾ اس میں ''او'' کا معنیٰ ہے: بلکہ۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک یہ واؤ کے معنیٰ میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس قدر تم اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے ہو اس سے زیادہ اللہ کا ذکر کرو' کیونکہ تم پر اور تمہارے آباء و اجداد پر اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے' اس لیے وہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ صرف اُسی کا ذکر کیا جائے اور اُسی کی تعریف کی جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے زیر بحث آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ آدمی پر ایسا بھی دن آتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو یاد نہیں کرتا' اور یہ معنیٰ یہاں مراد نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر تمہارے والدین تمہیں بُرا بھلا کہیں اور اس وقت تمہیں اُن پر جو غصہ آئے اُس سے زیادہ غصہ تمہیں اللہ کی خاطر کسی پر آنا چاہیے جب اللہ کی نافرمانی کی جائے۔

اللہ تعالیٰ سے صرف دُنیا طلب کرنے والوں کا بیان اور ان کی مذمت

﴿ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا ﴾ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں (سب کچھ) عطا کر دے۔ کچھ لوگوں سے مراد مشرکین ہیں جو کہ حج کے دوران اللہ تعالیٰ سے دنیا کا اور دنیا کی نعمتوں کا سوال کرتے تھے اور کہتے تھے: اے اللہ! ہمیں اونٹ' ریوڑ' گائیں' غلام اور باندیاں عطا فرما۔ کوئی یوں کہتا کہ: اے اللہ! میرا والد بہت بڑے لشکر والا' بہت سخی اور بہت مال دار تھا' جس قدر تو نے میرے والد کو عطا فرمایا تھا' اُتنا مجھے بھی عطا فرما۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جن کے دلی ارادے دنیا کے ساتھ ہوتے ہیں' دنیا ہی کو حاصل کرنے کے لیے یہ خرچ کرتے ہیں اور اسی کے لیے محنت اور مشقت کرتے ہیں۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ ﴿ وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ اور کوئی نصیب نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۶۰) دینار کا غلام' درہم کا غلام اور عالی شان لباس کا غلام ہلاک ہو جائے' (ان سب کا معاملہ یہ ہے کہ) جب انہیں کچھ دیا جائے تو خوش ہوتے ہیں اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔[529] ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہو اور جب انہیں کوئی کانٹا لگے تو نہ نکلے۔[530]

(صحیح بخاری: ۲۸۸۷' سنن ابن ماجہ: ۴۱۳۶' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۵' الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۴۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۶۱۔ ص ۴۳۹)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''تعس'' اس کا معنیٰ ہے: مُنہ کے بل گر پڑنا۔ حدیث میں یہ ہلاکت کی دُعا کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ پھر ایک لفظ ''خمیصه'' آیا ہے' اس سے ریشم یا اون کا نقش و نگار کیا ہوا کپڑا مراد ہے۔ پھر ایک لفظ ''انتکس'' آیا ہے

۵۲۹ یعنی ان کی خوشی اور ناخوشی دُنیا کے ملنے نہ ملنے میں ہوتی ہے۔ یہ دنیا کی محبت اور ہوس سے بہت مغلوب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے اس حدیث میں مالک کی بجائے ''عبد'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ (یعنی عبد الدینار' عبد الدرهم وغیرہ) کہ عبد ہونا کمالِ محبت و استغراق پر دلالت کرتا ہے۔ کذا فی المرقاۃ۔

۵۳۰ یہ جملہ ہلاکت کی دُعا کے طور پر ہے۔ یعنی ایسے لوگ ذلیل و خوار ہو جائیں' جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوں تو کوئی اُنہیں نکالنے والا نہ ہو۔ کذا فی المراۃ عن اشعۃ اللمعات۔

اس کا معنیٰ ہے: سر کے بل گرنا۔ اس میں بھی ہلاکت کی دُعا فرمائی جارہی ہے' کیونکہ جو شخص سر کے بل گرے گا وہ یقیناً خائب و خاسر اور نقصان زدہ ہوگا۔ پھر ایک جملہ ہے: ''اذا شیک'' اس میں ''شیک'' فعل مجہول ہے اور ''شاک یشوک شوکة'' سے مشتق ہے' اس کا معنیٰ ہے: جسم میں کانٹے کا چبھ جانا۔ پھر آخر میں ایک لفظ ہے: ''انتقش'' اس کا معنیٰ ہے: جسم سے کانٹے کو نکالنا۔

زیر بحث آیت میں رہی یہ بات کہ مشرکین (حج کے دوران) صرف دنیا کا سوال کیوں کرتے تھے' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے تھے اس لیے وہ لوگ صرف دنیا کا سوال کرتے تھے اور توبہ' بخشش اور آخرت کی نعمتوں کا سوال نہیں کرتے تھے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا' ان ہی لوگوں کے لیے ان کے اعمال سے حصہ ہے' اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے O

دُنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی اور بہتری طلب کرنا

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ اس آیت میں ''کچھ لوگوں'' سے مراد مؤمنین ہیں (یعنی مؤمنین وہ دُعا کرتے ہیں جو آیت میں مذکور ہے)۔ یہاں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دُعا کرنے والوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں' ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جو اپنی دُعا میں صرف دُنیا طلب کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو کافر ہیں کیونکہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو اور آخرت کو نہیں مانتے۔ اور دوسری قسم مؤمنین کی ہے جو کہ اپنی دُعا میں دنیا اور آخرت دونوں کا سوال کرتے ہیں' کیونکہ انسان کو کمزور اور ضرورت مند بنایا گیا ہے' اُس کے اندر دُنیا کے دکھ درد اور مصائب کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے انسان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ دُنیا کے شر اور اس کے دُکھوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے' کیونکہ اگر انسان کی ایک رگ میں بھی خلل آ جائے تو دنیا میں زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور آدمی اپنے رب کی اطاعت کرنے سے بالکل معطل ہو کے رہ جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دُعا میں دنیا کا سوال کرنا بھی دین کا حصہ ہے' یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں مؤمنین کے متعلق ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما۔

دُنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات

''حسنة فی الدنیا'' یعنی دنیا کی بھلائی' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے صحت و عافیت' امن و امان' نیکی کی توفیق' دشمن پر غلبہ' نیک اولاد اور نیک بیوی مراد ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲٦۱) دُنیا میں بہت ساری فائدہ مند چیزیں ہیں لیکن دنیا کی سب سے بہترین فائدہ مند چیز ''نیک عورت'' ہے۔

(صحیح مسلم: ۷۔ ۱۴٦۷' سنن ابن ماجہ: ۱۸۵۵' سنن نسائی: ۳۲۳۲' سنن بیہقی ج ۷ ص ۸۰' مسند احمد ج ۲ ص ۱٦۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۰۸۳۔ ص ۲٦۷)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حسنة فی الدنیا'' (دنیا کی بھلائی) سے مراد علم اور عبادت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دُنیا کی بھلائی سے حلال رزق اور نیک اعمال مراد ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مغفرت اور اجر و ثواب مراد ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلام' قرآن' اہل خانہ اور مال عطا فرما دیا تو یقیناً اُسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی۔ یعنی اُسے دنیا میں اچھا بدلہ مل گیا اور آخرت میں عافیت مل گئی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲٦۲) رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کی عیادت فرمائی' وہ شخص کم زور ہو کر چوزہ کی طرح ہو گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس سے پوچھا: کیا تم اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا یا کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ ہاں! میں یہ کہا کرتا تھا کہ اے اللہ! جو سزا تو مجھے آخرت میں دینے والا ہے وہ مجھے دنیا میں ہی دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی ذات پاک ہے! تم نہ تو اس کے عذاب کی طاقت رکھتے ہو اور نہ تم اس کو برداشت کر سکتے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ''اللهم اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار'' یعنی اے اللہ! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر اُس شخص نے اللہ تعالیٰ سے یہی دُعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا عطا فرما دی۔ (صحیح مسلم: ۲٦۸۸' سنن ترمذی: ۳۴۸۷' مسند احمد ج ۳ ص ۱۰۷' صحیح ابن حبان: ۹۳٦' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۲۔ ص ۲۲۰)

(۲٦۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اکثر یہی دُعا فرمایا کرتے: ''اللهم اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار[۵۳]''۔

(صحیح بخاری: ٦۳۸۹' صحیح مسلم: ۲٦۹۰' مسند احمد ج ۳ ص ۲۰۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۴۸۷۔ ص ۲۱۸)

(۲٦۴) حضرت عبد اللہ بن سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دو ارکان (یعنی رکن یمانی اور حجر اسود) کے درمیان یہ پڑھتے ہوئے سنا: ''ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار''۔

(سنن ابوداؤد: ۱۸۹۲' السنن الکبریٰ للنسائی: ۳۹۳۴' مسند احمد ج ۳ ص ۴۱۱' المستدرک ج ۱ ص ۴۵۵' سنن بیہقی ج ۵ ص ۸۴)

آیت مذکورہ کی تفسیر

اگلی آیت: ۲۰۲ میں فرمایا: ان ہی لوگوں کے لیے ان کے اعمال سے حصہ ہے۔ اس جملہ میں ﴿أُولَٰئِكَ﴾ کا اشارہ اُن مؤمنین کی طرف ہے جو اپنی دُعا میں دونوں جہان کی بھلائی مانگتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دُعا کرنے والی دونوں جماعتوں کا حکم مکمل ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا: ''وما له فی الاخرة من خلاق'' ان لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا: ''اولئک لهم نصیب مما کسبوا'' ان ہی لوگوں کے لیے اُن کے اعمال سے حصہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿أُولَٰئِكَ﴾ کا اشارہ دونوں جماعتوں کی طرف ہے۔ آیت میں ﴿لَهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے لیے۔ اور ﴿نَصِيبٌ﴾ کا معنیٰ حصہ ہے۔ ﴿مِّمَّا كَسَبُوا﴾ سے نیک اعمال اور وہ دُعائیں مراد ہیں جو دنیا میں دعا کرنے پر اجر و ثواب اور جزاء کے حصول کے لیے مانگی گئیں۔

آیت مذکورہ کے آخری جملہ میں اللہ تعالیٰ کے حساب لینے کے معانی اور متعدد تفاسیر

فرمایا: ﴿وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ مفسرین نے ''حساب'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ

[۵۳] حصن حصین شریف میں ''ربنا اتنا'' ہے۔ اگر ''اللهم ربنا اتنا'' کہہ لیا جائے تو بہتر ہے کہ اس میں دونوں روایتوں پر عمل ہے اور اگر فقط ربنا اتنا کہے تو بھی ٹھیک ہے کہ قرآن کریم میں یونہی ہے۔ (مرقات ج ۵ ص ۳۴٦' مراۃ ج ۴ ص ۲۷)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اُن تمام چیزوں کا علم عطا فرماتا ہے جو بندوں کے لیے فائدہ مند اور نقصان دہ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی مقدار و کیفیت کے مطابق اور بندوں کو ملنے والے ثواب و عذاب کی مقدار کے مطابق اُن کے دلوں میں ضروری معلومات پیدا فرما دیتا ہے۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ ''محاسبہ'' بدلہ دینے کو کہتے ہیں۔ اس کی تائید اللہ عزوجل کے درج ذیل فرمان سے ہوتی ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۔ (الطلاق:۸)

اور کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جن (کے رہنے والوں) نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے بغاوت کی تو ہم نے اُن سے سخت بدلہ لیا۔

بعض مفسرین نے حساب کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں سے کلام فرمائے گا اور اُنہیں اُن کے اعمال کا حال بتائے گا اور جو ثواب و عذاب دیا جانے والا ہے' اُس سے آگاہ فرمائے گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں سے حساب لے گا تو سُرعت (یعنی جلدی) سے حساب لے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی قسم کا حساب لگانے اور سوچ و بچار کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی کثرت اور پھر سب کے اعمال کی کثرت کے باوجود زیرِ بحث آیت میں فرمایا کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے' یہ اس لیے فرمایا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اللہ عزوجل کی قدرت کامل ہے کیونکہ کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کو کسی دوسرے کام سے غافل کرے اور نہ ہی وہ اپنے کاموں میں کسی سبب اور معاون کا محتاج ہے۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ وہ پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں ساری مخلوق کا حساب لے سکتا ہے۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کا حساب اتنے وقت میں لے لے گا کہ جس میں بکری یا اونٹنی کا دودھ دوہ لیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''سریع الحساب'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دُعاؤں کو بہت جلد قبول فرماتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک وقت میں اللہ تعالیٰ سے کئی لوگ دُعا کر رہے ہوتے ہیں اور ہر شخص دنیا اور آخرت کی مختلف چیزیں مانگ رہا ہوتا ہے' اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی مطلوبہ چیز عطا فرماتا ہے اور کسی کا سوال اُس سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کی ہر حالت اور ہر عمل سے باخبر ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اللہ جلد حساب لینے والا ہے'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کی آمد قریب ہے' کیونکہ ہر وہ چیز جو ہونے والی اور آنے والی ہے وہ یقیناً قریب ہے۔ نیز اس فرمان میں اس طرف اشارہ ہے کہ دُعا' ذکر و اذکار' دیگر نیک اعمال اور طلب آخرت میں خوب سبقت اور رغبت کا مظاہرہ کیا جائے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اور گنے چنے چند (مخصوص) دنوں میں اللہ کو (خوب) یاد کرو' سو جو شخص جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے' اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور جو تاخیر کرے اُس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں ہے' یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے' اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جمع کیا جائے گا O

آیت مذکورہ میں گنے چنے دنوں سے کون سے دِن مراد ہیں؟

فرمایا: گنے چنے چند مخصوص دنوں میں اللہ کو خوب یاد کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نمازوں کے بعد اور کنکریاں مارتے وقت

اللہ عزوجل کی وحدانیت، اُس کی عظمت اور اُس کی بڑائی بیان کرو۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہر کنکری مارتے ہوئے تکبیر کہی جائے گی۔ کیونکہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ:

(۲۶۵) نبی اکرم ﷺ ہر کنکری کو مارتے ہوئے تکبیر کہتے تھے۔

(صحیح بخاری: ۱۷۵۰، صحیح مسلم: ۱۲۹۶، سنن ترمذی: ۹۰۱، سنن ابوداؤد: ۱۹۰۵، سنن نسائی: ۳۰۷۰، سنن ابن ماجہ: ۳۰۳۰)

آیت میں جو فرمایا: ﴿فِيٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ﴾ اس سے ایام تشریق مراد ہیں۔ جو کہ منٰی کے ایام ہیں اور کنکریاں مارنے کے ایام ہیں۔ یہ ایام چونکہ تھوڑے ہوتے ہیں اس لیے ان کو "معدودات" گنے چنے فرمایا۔ اور یہ دس ذی الحجہ کے بعد کل تین دن ہیں۔ یعنی پہلا دن ۱۱ ذی الحجہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، عطاء، مجاہد اور قتادہ کا یہی قول ہے، اور یہی امام شافعی کا موقف ہے۔ بعض ائمہ کا قول یہ ہے کہ گنے چنے دنوں سے قربانی کا دن اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی قول ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا موقف ہے۔[۵۳۲]

(۲۶۶) حضرت نُبیشہ ہذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایام تشریق[۵۳۳] کھانے پینے اور اللہ عزوجل کے ذکر کے دن ہیں۔ (صحیح مسلم: ۱۱۴۱، سنن ابوداؤد: ۲۸۱۳، سنن نسائی: ۴۲۳۰، سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۹۸، مسند احمد ج ۵ ص ۷۵)

☆ ایام تشریق میں اللہ کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ تکبیر (یعنی اللہ اکبر) کہا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق مروی ہے کہ وہ منٰی میں مذکورہ ایام کے دوران تکبیریں کہتے اور فرض نمازوں کے بعد تکبیر کہتے، اور اپنے بستر پر، اپنے خیمہ میں اور اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تکبیریں کہتے، یہ معمول مذکورہ تمام دنوں میں جاری رہتا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ اپنے خیمہ میں جب تکبیر کہتے تو مسجد والے بھی اس کو سُنتے اور وہ لوگ بھی پھر تکبیر کہنے لگ جاتے اور بازار والے بھی تکبیر کہتے یہاں تک کہ سارا منٰی تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھتا۔ امام بخاری نے اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب التکبیر ایام منٰی)

ایام تشریق میں تکبیرات پڑھنے کا بیان اور اس میں ائمہ کا اختلاف

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ کے ذکر سے مراد وہی تکبیر ہے جو تشریق کے تمام دنوں میں رمی جمار کے دوران ہر کنکری کے مارتے ہوئے کہی جاتی ہے۔ اور اس پر بھی سب متفق ہیں کہ عید الاضحیٰ میں اور ایام تشریق میں نمازوں کے بعد جو تکبیریں پڑھی جاتی ہیں وہ سنت ہے۔[۵۳۴] البتہ تکبیر پڑھنے کے وقت میں اختلاف ہے۔ بعض ائمہ کا قول یہ ہے

---

۵۳۲ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی طرف اس قول کی نسبت درست نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اور صاحبین کا موقف یہ ہے کہ ایام معدودات سے ایام تشریق مراد ہیں۔ یعنی ۱۰ ذی الحجہ کے بعد تین دن۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور جمہور تابعین کا یہی قول ہے۔ جہاں تک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق ہے سو اُن کی طرف نسبت اس لیے درست نہیں ہے کہ یہ قول اُن سے ایام معلومات (الحج: ۲۸) کی تفسیر میں مروی ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۳۱۶)

۵۳۳ ایام تشریق سے ذوالحجہ کے وہ دن مراد ہیں جن میں فرض نمازوں کے بعد تکبیرات تشریق (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی ۹ ذی الحجہ کی فجر سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک۔ نوٹ: ان دنوں کو ایام تشریق اس لیے کہتے ہیں کہ تشریق کا عربی میں معنیٰ ہے: گوشت کے ٹکڑے بنا کر دھوپ میں سُکھانا۔ چونکہ ان دنوں میں یہی کچھ کیا جاتا ہے اس لیے ان کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ (معجم لغۃ الفقہاء ص ۹۷، البنایہ ج ۳ ص ۳۸۱)

۵۳۴ تکبیرات تشریق کا سنت ہونا متفقہ نہیں ہے۔ امام مالک اس کو مستحب قرار دیتے ہیں، امام شافعی اور امام احمد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ قربانی کے دن ظہر کی نماز سے تکبیرات کا آغاز کیا جائے گا اور ایامِ تشریق کے آخری دن کی نمازِ فجر تک ان کو پڑھا جائے گا۔ علماء کے اس قول کے مطابق پندرہ نمازوں میں تکبیر پڑھی جائے گی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی موقف ہے' اور امام شافعی بھی اپنے صحیح ترین قول میں اسی موقف پر ہیں۔ امام شافعی اپنے موقف کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تکبیر کے معاملہ میں عام لوگ حاجیوں کے تابع ہیں' اور ہمارے بیان کردہ وقت سے پہلے حجاج جو کچھ ذکر کرتے ہیں وہ تلبیہ (یعنی ''لبیک اللھم لبیک '') ہوتا ہے اور تکبیراتِ تشریق کا آغاز وہ لوگ قربانی کے دن ظہر کی نماز سے کرتے ہیں۔ لہٰذا دیگر لوگ بھی اس کے مطابق قربانی کے دن ظہر کی نماز سے اپنی تکبیر کا آغاز کریں گے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ تکبیرات کا آغاز دس ذی الحجہ کی رات مغرب کی نماز سے کیا جائے گا' اور ایامِ تشریق کے آخری دن فجر کی نماز میں ان کا اختتام ہوگا۔ یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے۔ اس قول کے مطابق اٹھارہ نمازوں میں تکبیرات پڑھی جائیں گی۔ امام شافعی کا تیسرا قول یہ ہے کہ نو ذی الحجہ کی نماز فجر سے تکبیرات کا آغاز کیا جائے گا اور ایامِ تشریق کے آخری دن عصر کی نماز میں ان کا اختتام ہوگا۔ اس قول کے مطابق تیئس نمازوں میں تکبیرات پڑھی جائیں گی۔ حضرت علی اور حضرت مکحول (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا یہی قول ہے' اور یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کا موقف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یہ ہے کہ نو ذی الحجہ کی نمازِ فجر سے تکبیرات کا آغاز کیا جائے گا اور دس ذی الحجہ کی نمازِ عصر میں ان کا اختتام ہوگا۔ اس قول کے مطابق آٹھ نمازوں میں تکبیرات پڑھی جائیں گی۔ اور یہی امام ابو حنیفہ کا مؤقف ہے۔[۵۳۵] جب کہ امام احمد بن حنبل کا مؤقف یہ ہے کہ جب آدمی حالت احرام میں نہ ہو تو وہ مسلسل تیئس نمازوں کے بعد تکبیرات کہے گا ان کا آغاز نو ذی الحجہ کی نماز فجر سے ہوگا اور اختتام ایامِ تشریق کے آخری دن نماز عصر میں ہوگا۔ اور اگر آدمی حالت احرام میں ہو تو پھر وہ تیرہ نمازوں کے بعد تکبیرات کہے گا' ان کا آغاز دس ذی الحجہ کی نمازِ ظہر سے ہوگا اور اختتام ایامِ تشریق کے آخری دن نمازِ عصر میں ہوگا۔

تکبیر کن الفاظ کے ساتھ کہی جائے؟ اس بارے میں امام شافعی کا مؤقف یہ ہے کہ تین مرتبہ بالترتیب ''اللہ اکبر'' کہا جائے۔ حضرت سعید بن جبیر' حسن بصری اور اہل مدینہ کا یہی قول ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے ذکر میں اضافہ کرے (یعنی زیادہ اللہ کا ذکر کرے) تو یہ بہتر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ دو مرتبہ تکبیر یعنی اللہ اکبر' اللہ اکبر کہتے تھے۔ اہل عراق کا یہی مؤقف ہے۔

منیٰ سے جلدی واپس ہونے اور تاخیر کرنے کا مفہوم اور اس میں ائمہ کا اختلاف

آیت میں فرمایا: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ﴾ پہلے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص منیٰ میں ایامِ تشریق کا دوسرا دن (یعنی ۱۲ ذی الحجہ) گزار رہا ہو اور وہاں سے پہلے ہی نکلنا چاہتا ہو تو اس کے لیے کوئی ''اثم'' یعنی حرج نہیں ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حاجی پر ایامِ تشریق کی پہلی اور دوسری رات منیٰ میں گزارنا واجب ہے تاکہ وہ ہر جمرہ پر سات کنکریوں کے حساب سے دونوں دن زوال کے بعد اکیس کنکریاں مارے۔ پھر جو حاجی دوسرے دن کنکریاں مارنے کے بعد یہ چاہے کہ واپس چلا جائے اور تیسری رات منیٰ میں نہ گزارے اور دن میں ہی کنکریاں مار لے تو اُسے یہ گنجائش اور اختیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک باجماعت نماز ادا کرنے کی صورت میں ان تکبیرات کو پڑھنا واجب ہے۔ (دیکھئے: کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة)

۵۳۵ فقہ حنفی میں فتویٰ امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول پر ہے جو کہ علامہ خازن ذکر کر چکے کہ ۹ ذی الحجہ کی نمازِ فجر سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک تکبیرات تشریق پڑھی جائیں گی۔

حاصل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص جلدی کر کے دو دن میں چلا جائے' اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے' یعنی جو شخص جلدی کر کے دوسرے دن ہی چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

آگے جو فرمایا کہ ''جو شخص تاخیر کرے اُس پر (بھی کوئی گناہ نہیں ہے)'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ایامِ تشریق کی تیسری رات گزار رہا ہو اور وہاں سے بعد میں نکلے تو اس پر بھی اس کی تاخیر میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جاننا چاہیے کہ جلدی کرنا اُس شخص کے لیے جائز ہے جو ایامِ تشریق کے دوسرے دن زوال کے بعد سورج غروب ہونے سے پہلے نکل جائے۔ اگر سورج غروب ہو گیا اور یہ شخص منیٰ میں ہی تھا تو اب تیسرے دن کی رمی کے لیے اُسے منیٰ میں ہی رات گزارنا لازم ہے۔ یہ امام شافعی اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ (تیسرے دن کی) فجر طلوع ہونے سے پہلے حاجی منیٰ سے نکل سکتا ہے' کیونکہ ابھی رمی کا وقت ہی داخل نہیں ہوا۔ ☆ ایسے لوگ جو اونٹ چراتے ہیں اور حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اُنہیں یہ اجازت ہے کہ وہ منیٰ کی راتیں منیٰ میں نہ گزاریں۔

''جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے'' اس پر ایک اشکال اور اس کے متعدد جوابات

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے'' اس پر اشکال یہ ہے کہ جو شخص حج کے تمام ارکان کو مکمل طور پر ادا کرتا ہے وہ یقیناً اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے کہ ''جو تاخیر کرے اُس پر کوئی گناہ نہیں'' گناہ کا خوف تو صرف اُس شخص کو ہوتا ہے جو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے؟

جواب: میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے کئی جوابات ہیں: (۱) ایک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب رخصت کے طور پر گذشتہ جملہ میں حاجیوں کو منیٰ سے جلدی آنے کی اجازت دی تو ممکن تھا کہ کوئی شخص یہ سمجھتا کہ جو شخص اس رخصت پر عمل نہیں کرے گا وہ گناہگار ہو گا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے اگلے جملہ سے بیان فرمایا کہ دونوں ہی صورتوں میں حاجی کے لیے کوئی گناہ نہیں ہے' خواہ وہ منیٰ سے جلدی واپس آئے یا تاخیر سے آئے۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کچھ لوگوں کا معمول یہ تھا کہ وہ منیٰ سے جلدی واپس آتے تھے اور کچھ لوگوں کا معمول یہ تھا کہ وہ تاخیر سے واپس آتے تھے' اور ان دونوں میں سے ہر گروہ دوسرے گروہ کے مقابلہ میں اپنے عمل کو درست قرار دیتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلے جملہ سے یہ واضح فرمایا کہ دونوں گروہ اپنے عمل میں دُرست ہیں اور دونوں میں سے کسی پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ''ومن تأخر فلا اثم علیه'' فرمایا ہے یہ گذشتہ جملہ سے ظاہری مشابہت قائم کرنے کے لیے فرمایا ہے' جیسے درج ذیل آیت مبارکہ میں ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (الشوریٰ: ۴۰) اور بُرائی کا بدلہ اُسی قدر بُرائی ہے۔

اس آیت میں محض ظاہری مشابہت کے لیے بُرائی کے بدلہ کو بُرائی فرمایا' وگرنہ یہ بات واضح ہے کہ بُرائی کا بدلہ لینا بُرائی نہیں ہے۔ (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ ''ومن تأخر فلا اثم علیه'' سے یہ بات ثابت کی جا رہی ہے کہ منیٰ سے واپسی میں جلدی اور تاخیر دونوں باتیں جائز ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ تم جلدی کرو یا تاخیر کرو' (بہ ہر صورت) نہ تو جلدی کرنے میں کوئی گناہ ہے نہ تاخیر میں کوئی گناہ ہے۔

زیرِ بحث آیت کے بقیہ حصے کی تفسیر

فرمایا: ﴿لِمَنِ اتَّقٰى﴾ یہ حکم اس کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے۔ یعنی منیٰ سے واپس ہونے میں جلدی اور تاخیر کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے اور گناہ کی نفی کی گئی ہے وہ اُس حاجی کے لیے ہے جو پرہیزگار ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''لمن اتقی'' کا

مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو حج کے دوران اللہ عزوجل کی منع کردہ چیزوں کے ارتکاب سے ڈرتا ہو جیسے شکار مارنا اور حج کے دیگر ممنوعات۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''لمن اتقی'' کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص حج کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں بھی پرہیزگاری اختیار کرے گا اُس کے گناہ (حج کے ذریعہ) معاف ہو جائیں گے' کیونکہ حج سے جو بخشش لے کر حاجی واپس آتا ہے وہ اُس صورت میں ہے جبکہ حاجی اپنی بقیہ زندگی میں بھی اللہ عزوجل کی منع کردہ چیزوں کا ارتکاب نہ کرے۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ یعنی مستقبل میں بھی اللہ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ جو کام ضروری ہیں ان کو ادا کیا جائے اور جو ممنوع ہیں اُن سے بچا جائے۔

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ جان لو کہ تم سب کو اُسی کے پاس جمع کیا جائے گا۔ یعنی پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اس فرمان کے ذریعہ لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی ترغیب دی جارہی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

اور لوگوں میں ایک آدمی ایسا ہے کہ دُنیاوی زندگی کے متعلق اُس کی گفتگو آپ کو اچھی لگتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہی سب سے بڑا جھگڑالو ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

آیت مذکورہ اخنس بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ شخص بنو زہرہ کا حلیف تھا۔ اس کا اصل نام اُبی تھا لیکن اس کو اخنس اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ غزوۂ بدر میں بنو زہرہ کے تین سو افراد کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس نے غزوۂ بدر میں بنو زہرہ کے لوگوں کو واپسی کا اشارہ کیا اور کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) تمہارے ہی بھانجے ہیں' اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے نہیں ہیں تو لوگ تمہیں ان سے بچالیں گے اور اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو پھر تم سب سے زیادہ خوش بخت ہو گے۔ یہ بات سُن کر بنو زہرہ کے لوگوں نے کہا کہ تمہاری رائے بہترین ہے۔ اخنس نے کہا کہ اب میں تم لوگوں کو یہاں سے پیچھے لے جاؤں گا لہٰذا تم لوگ میری پیروی کرنا۔ یہ کہہ کر وہ جنگ سے پیچھے چلا گیا اس لیے اس کا نام اخنس پڑ گیا۔ یہ شخص بہت شیریں کلام اور خوب صورت تھا' رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر بیٹھتا تھا اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتا تھا اور اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا تھا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اُسے (ظاہری سلوک کی بناء پر) اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے' جبکہ وہ شخص منافق تھا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ يُعْجِبُكَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کے متعلق اُس کی گفتگو آپ کو اچھی لگتی ہے اور پسند آتی ہے' اور اُس کی باتیں آپ کے دل میں اہمیت پالیتی ہیں۔ ﴿ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُس کی گفتگو کی مٹھاس اُن باتوں میں ہے جو دُنیاوی اُمور سے تعلق رکھتی ہیں۔

﴿ وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ﴾ وہ اپنے دلوں کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ دل کی باتوں سے مراد اخنس کا یہ قول ہے کہ ''خدا کی قسم! میرا آپ پر ایمان ہے اور مجھے آپ سے محبت ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے آخری جملہ میں اس کو ﴿ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴾ فرمایا' اس کا معنیٰ ہے: ''شدید الجدال فی الباطل'' یعنی ایسا شخص جو باطل اور خلاف حق باتوں میں بہت زیادہ جھگڑا کرتا

ہو۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ اپنی بات میں جھوٹا ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ نافرمانی میں بہت پختہ اور سخت ہے' اور ناحق بات میں جھگڑتا ہے۔ حکمت و دانائی کی باتیں کرتا ہے اور گناہ کے کام کرتا ہے۔

(۲٦۷) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ آدمی وہ ہے جو ''الدّ الخصم'' یعنی بہت زیادہ جھگڑنے والا ہو۔ (صحیح بخاری: ۲۴۵۷' صحیح مسلم: ۲٦٦۸' سنن ترمذی: ۲۹۷٦' سنن نسائی: ۵۴۲۳' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۱۰۸' مسند احمد ج ٦ ص ۵۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷٦۲۔ ص ۳۲۷)

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

اور جب وہ آپ کے پاس سے پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں فساد برپا کرنے کی اور کھیتوں اور جانوروں کو تباہ کرنے کی (سرتوڑ) کوشش کرتا ہے' اور اللہ کو فساد پسند نہیں ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اس کے آخری جملہ سے معتزلہ کے ایک استدلال کا جواب

﴿وَإِذَا تَوَلَّىٰ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ نرم اور شیریں گفتگو کرنے کے بعد جب وہ آپ سے مڑ کر واپس جاتا ہے۔ ﴿سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ﴾ وہ زمین میں پھرتا ہے۔ ﴿لِيُفْسِدَ فِيهَا﴾ تاکہ وہ رشتوں کو منقطع کرے اور مسلمانوں کا خون بہائے۔

اس آیت کا واقعہ یہ ہے کہ اخنس بن شریق اور قبیلہ ثقیف کے درمیان جھگڑا تھا۔ اخنس نے ایک رات ثقیف پر حملہ کر کے اُن کے کھیتوں کو جلا ڈالا اور جانوروں کو ہلاک کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ طائف میں کسی آدمی پر اخنس کا قرض تھا' اُس کو لینے کے لیے وہ طائف کی طرف نکلا تو قرض دار کی جو کھیتی تھی اُس کو جلا دیا اور ایک گدھی تھی اُس کے پاؤں کا اگلا حصہ کاٹ دیا۔

بعض مفسرین نے ''اذا تولی'' کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ حاکم اور والیٔ مملکت بن جاتا ہے تو زمین میں فساد یعنی ظلم اور سرکشی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ بدکردار حکمرانوں کا طریقہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ اتنا ظلم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے بارش کو روک لیتا ہے اور جب بارش رُک جاتی ہے تو وہ کھیتوں اور جانوروں کو تباہ کرتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت ہر اُس شخص سے متعلق ہے جس کے اندر مذکورہ صفات پائی جائیں۔ اور یہ بات ممکن ہے کہ مذکورہ آیت ایک مخصوص شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہو اور بعد میں ہر وہ شخص اس کا مصداق بن جائے جس میں مذکورہ صفات پائی جائیں۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو پسند نہیں فرماتا۔ معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ''محبّة'' یعنی چاہنا۔ ارادہ ہی کا نام ہے۔ اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو معنیٰ محبت کا ہے وہ ارادہ کا نہیں ہے' کیونکہ انسان بسا اوقات کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے لیکن اُس چیز کی چاہت نہیں رکھتا' جیسے آدمی کڑوی دوا کھا لیتا ہے لیکن اُس کی چاہت نہیں رکھتا۔ لہٰذا ''محبّة'' (یعنی چاہت) اور ارادہ میں فرق واضح ہو گیا۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ ''محبّة'' کسی چیز کی تعریف اور تعظیم کرنے کا نام ہے' جبکہ ارادہ میں یہ معنیٰ نہیں ہے۔[۵۳٦]

۵۳٦ معتزلہ کے استدلال اور اس کے جواب میں علامہ خازن کی یہ تقریر مبہم ہے۔ امام فخر الدین رازی نے اس مسئلہ کو بہت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ''اللہ کو فساد پسند نہیں ہے''۔ اس کا مفہوم معتزلہ کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کا ارادہ نہیں فرماتا اور فساد کا ارادہ نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ قبیح چیزوں کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

اور جب اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو وہ ضد میں آ کر اور گناہ کرتا ہے ایسے کے لیے جہنم (کا عذاب) کافی ہے اور (جہنم) بہت بُرا ٹھکانا ہے ۝

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اللہ عزوجل سے ڈرنے کا بیان

﴿اتَّقِ اللّٰهَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تنہائی میں اور سب کے سامنے تو اللہ سے ڈر۔ ﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (خوفِ خدا کی دعوت دینے کے نتیجہ میں) اُس کی عزت اور زمانۂ جاہلیت کی ضد اُسے گناہ کرنے پر اُکساتی ہے۔ بعض نے ''بالاثم'' کی اصل عبارت یہ نکالی ہے کہ ''بان یعمل الاثم'' یعنی اُس کی ضد اُسے اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ گناہ کرے۔ گناہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ظلم کرتا ہے اور نصیحت کی باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے۔ آیت میں جو ﴿الْعِزَّةُ﴾ کا لفظ آیا ہے اس کا اصل معنیٰ غلبہ اور تکبر ہے۔

﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس شخص کی سزا اور عذاب کے لیے جہنم کافی ہے۔ ﴿جَهَنَّمُ﴾ کا لفظ درحقیقت اُس آگ کا ایک نام ہے جس کے ذریعہ آخرت میں کافروں کو عذاب دیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ غیر عربی لفظ ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ عربی کا لفظ ہے۔ ''جھنم'' کو جہنم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اُس کی گہرائی بہت زیادہ ہے۔

﴿الْمِهَادُ﴾ کا معنیٰ ہے: بچھونا۔ اور ہموار کرنا بھی اس کا معنیٰ آتا ہے۔ ﴿وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ آگ کا عذاب اُس شخص کے اوپر اور نیچے دونوں طرف ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جب کسی بندہ سے کہا جائے کہ ''اللہ سے ڈرو'' تو وہ جواباً کہے کہ تم اپنا کام کرو۔ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے کہا کہ آپ اللہ سے ڈریں تو حضرت عمر نے فوراً ہی اللہ کی بارگاہ میں عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا چہرہ زمین پر رکھ دیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝

اور لوگوں میں ایک شخص ایسا (بھی) ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کو فروخت کر دیتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے ۝

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور حضرت خُبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے دیگر ساتھیوں کی شہادت کا بیان

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت سریہ رجیع میں نازل ہوئی جو کہ غزوۂ اُحد کے بعد پیش آیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ارادہ نہیں فرماتا اور جب وہ قبیح چیزوں کا ارادہ نہیں فرماتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ قبیح چیزوں کو پیدا بھی نہیں فرماتا۔ کیونکہ ارادہ کے بغیر پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا قبیح چیزوں کی تخلیق فرمانے والا اللہ تعالیٰ نہیں ہے۔ اہل سنت کی طرف سے اس استدلال کا ایک جواب یہ ہے کہ ''محبۃ'' (یعنی پسند کرنا) اور ارادہ کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لہٰذا پسند سے ارادہ مراد لینا درست نہیں ہے۔ دوسرا جواب بر سبیل تسلیم ہے۔ یعنی اگر ہم مان لیں کہ پسند کرنا اور ارادہ کرنا ایک ہی ہے تو جواب یہ ہے کہ یہاں ''الفساد'' میں عموم نہیں ہے۔ (لہٰذا اس سے قاعدۂ کلیہ وضع نہیں کیا جا سکتا۔) (تفصیل کے لیے تفسیر کبیر میں زیر بحث آیت البقرہ: ۲۰۵ ملاحظہ فرمائیں)

(۲٦۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جاسوسی کے لیے (مکہ مکرمہ کی طرف) ایک لشکر بھیجا اور ان پر حضرت عمر کے بیٹے عاصم کے نانا عاصم بن ثابت کو امیر مقرر کیا۔ یہ سب نکل کر جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو ہذیل کے ایک قبیلہ بنولحیان کو ان کا پتا چل گیا۔ چنانچہ اس قبیلہ کے تقریباً سو تیر انداز ان کی تاک میں نکلے اور ان کے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ تیر انداز کسی جگہ اُترے تو وہاں اُنہیں کھجوروں کی گٹھلیاں ملیں یہ کھجوریں وہ تھیں جو اہل لشکر نے مدینہ سے اپنے ساتھ زادِ راہ کے طور پر لی تھیں۔ تیر اندازوں نے گٹھلیاں دیکھ کر کہا کہ یہ یثرب کی کھجوریں ہیں چنانچہ وہ لشکر کے نشانِ قدم کے پیچھے چل پڑے اور چلتے چلتے بالکل لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ جب عاصم بن ثابت اور ان کے دیگر ساتھیوں کو تیر اندازوں کا پتا چلا تو یہ لوگ پناہ لینے کے لیے ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اور پیچھے ہی تیر انداز بھی پہنچ گئے اور انہوں نے لشکر کو گھیر لیا۔ گھیراؤ ڈالنے کے بعد کہا کہ اگر تم نیچے اُتر آؤ تو ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے کسی بندہ کو قتل نہیں کریں گے۔ امیر لشکر عاصم بن ثابت نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تو کسی کافر کی پناہ میں نہیں اُتروں گا (اور) اے اللہ! تو ہمارے رسول کو ہماری خبر پہنچا دے۔ اس کے بعد دونوں لشکروں کے درمیان مقابلہ ہوا اور تیر اندازوں نے اتنے تیر برسائے کہ عاصم سمیت سات افراد کو شہید کر دیا۔ اب حضرت خُبیب حضرت زید اور ایک اور صحابی باقی رہ گئے ان تینوں کے ساتھ اُن لوگوں نے پکا وعدہ کیا (کہ ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے) جب انہوں نے پکا وعدہ کر لیا تو یہ تینوں افراد پہاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ جب تیر اندازوں نے ان تینوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا تو انہوں نے ان کی کمانوں کی تانت کو کھول کر اس سے ان کو باندھ دیا۔ اس پر تیسرے صاحب نے کہا کہ یہ پہلی وعدہ خلافی ہے یہ کہہ کر اُنہوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر تیر اندازوں نے اُن کو گھسیٹا اور ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ سو انہوں نے ان کو بھی شہید کر دیا اور اپنے ساتھ خبیب اور زید کو لے کر چل پڑے یہاں تک کہ مکہ میں دونوں کو بیچ دیا۔ حضرت خبیب کو بنو حارث بن عامر بن نوفل نے خریدا اور چونکہ حضرت خبیب نے غزوۂ بدر میں حارث کو قتل کیا تھا اس لیے وہ بنو حارث کے قیدی بن کر رہے۔ جب بنو حارث حضرت خبیب کو شہید کرنے پر متفق ہو گئے تو حضرت خبیب نے حارث کی کسی بیٹی سے استرہ مانگا تاکہ وہ اُسے استعمال کریں اُس نے حضرت خبیب کو اُسترہ لا کر دے دیا۔ آگے وہ بیان کرتی ہے کہ میں (کسی وجہ سے) اپنے بچہ سے غافل ہو گئی تو میرا بچہ خبیب کے پاس پہنچ گیا۔ خبیب نے بچہ کو اپنی ران پر بٹھا دیا۔ جب میں نے بچہ کو خبیب کے پاس دیکھا تو میں اتنی دہشت زدہ ہو گئی کہ خبیب نے میری کیفیت کو جان لیا اس وقت ان کے ہاتھ میں استرہ تھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا تجھے میرے متعلق یہ خدشہ ہے کہ میں اس بچہ کو مار ڈالوں گا؟ (نہیں نہیں) ان شاء اللہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ حارث کی بیٹی بیان کرتی ہے کہ میں نے خبیب سے زیادہ اچھا کوئی قیدی کبھی نہیں دیکھا میں نے اُنہیں انگور کا گچھا کھاتے ہوئے دیکھا جبکہ اُس دن مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا اور وہ زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے یقیناً یہ انگور کا گچھا اللہ کی طرف سے خبیب کو دیا ہوا رزق تھا۔ جب لوگ خبیب کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے تو خبیب نے کہا کہ مجھے دو رکعت نماز ادا کرنے کی (اجازت) دے دو۔ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد وہ واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگ یہ نہ سمجھتے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں مزید نماز ادا کرتا۔ حضرت خبیب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قتل کے وقت دو رکعت نماز ادا کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پھر حضرت خبیب نے کہا: اے اللہ! ان سب کو چن چن کر ہلاک فرما۔ پھر آپ نے یہ اشعار کہے:

ولست ابالی حین اقتل مسلما — علی ای شق کان للہ مصرعی

وذالک فی ذات الالٰہ وان یشأ — یبارک علی اوصال شلو ممزع

"یعنی جب میں حالت اسلام پر شہید کیا جا رہا ہوں تو پھر مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ میں اللہ کے لیے کس پہلو پر

گروں گا۔ اور یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں ہو رہا ہے' اگر وہ چاہے گا تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے اعضاء پر بھی برکتیں نازل فرمائے گا''۔

پھر عقبہ بن حارث حضرت خبیب کی طرف بڑھا اور اس نے آپ کو شہید کر دیا۔ دوسری طرف کفار قریش نے عاصم بن ثابت کی طرف کچھ افراد کو روانہ کیا تا کہ وہ اُن کے شہید کردہ جسم کا کوئی حصہ (کاٹ کر) لے آئیں' کیونکہ عاصم نے غزوۂ بدر میں قریش کے بڑوں میں سے ایک کو قتل کیا تھا۔ (جب قریش نے افراد کو روانہ کیا) تو اللہ تعالیٰ نے عاصم کے جسم پر بھڑوں کو چھتہ کی مانند بھیج دیا جنہوں نے ان کے جسم کو کفار قریش کے آدمی سے محفوظ رکھا۔ اس طرح وہ اُن کے جسم کے کسی حصہ کو حاصل نہ کر سکے۔ (صحیح بخاری:۴۰۸۶' سنن ابوداؤد:۲۶۶۰' مسند احمد ج۲ص۲۹۴)

ایک روایت میں ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے کہ جب ذکر کردہ صحابہ کرام کو شہید کیا گیا تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو ان کی خبر دی۔ (صحیح بخاری:۳۹۸۹)[۵۳۷]

حدیث مذکور میں چند الفاظ آئے ہیں جن کے معانی درج ذیل ہیں:

''**فدفد**'' ایسی جگہ جس میں سختی اور بلندی ہو۔ ''**عالجوه**'' انہوں نے کوشش کی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تیر اندازوں نے دھوکہ سے حضرت عاصم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ ''**لیستحد**'' استحداد کا معنیٰ ہے موئے زیر ناف کو صاف کرنا۔ ''**القطف**'' انگور کا گچھا۔ ''**شلو**'' انسانی اعضاء میں سے کوئی عضو۔ ''**ممزع**'' بکھرے ہوئے۔ ''**ظلة**'' ایسی چیز جو انسان پر سایہ کرے۔ ''**دبر**'' شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کا لشکر۔

زیر بحث آیت کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے مزید اقوال اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بیان

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تھے تو کفار قریش نے آپ کے پاس کچھ افراد بھیجے کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں' آپ ہمارے ساتھ اپنے اہل علم اصحاب کی ایک جماعت بھیج دیں تا کہ وہ ہمیں آپ کا دین سکھائیں۔ پس پردہ کفار مکہ کی یہ ایک چال تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے عاصم بن ثابت بن ابی افلح الانصاری کی سرپرستی میں خبیب بن عدی انصاری' مَرثد بن ابی مَرثد غَنَوی' خالد بن بکر' عبد اللہ بن طارق بن شہاب بلوی اور زید بن دثِنہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو روانہ کر دیا۔ آگے کا واقعہ بخاری کی مذکورہ حدیث کے مطابق ہے' البتہ مفسرین کے بیان میں یہ اضافہ ہے کہ کفار نے کہا کہ ہم خبیب کو زندہ سولی پر چڑھائیں گے۔ حضرت خبیب نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے آس پاس کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو تیرے رسول کو میرا اسلام پہنچا دے' لہٰذا تو ہی میرے سلام کو ان تک پہنچا دے۔ پھر ابو سروعہ عقبہ بن حارث آگے بڑھا اور اس نے حضرت خبیب کو شہید کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ مشرکین میں سے ایک آدمی جس کو ابو میسرہ سلامان کہا جاتا تھا' اُس کے پاس ایک نیزہ تھا۔ اُس نے وہ نیزہ حضرت خبیب کے سینہ کے درمیان رکھ دیا' حضرت خبیب نے اُس سے کہا: ''**اتق الله**'' اللہ کا خوف کر۔ تو وہ اور بھڑک اٹھا اور اُس

[۵۳۷] اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ عزوجل کی عطا سے نبی اکرم ﷺ کے حق میں دُور اور نزدیک کے مقامات برابر ہیں۔ آپ دُور کے واقعات و مناظر کو اسی طرح ملاحظہ فرما سکتے ہیں جس طرح قریب کے مناظر و واقعات کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ علامہ عینی علیہ الرحمۃ نے اس حدیث کی شرح میں نبی اکرم ﷺ کے خبر دینے کے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آپ کے معجزات میں سے تھا۔ (عمدۃ القاری ج۱۲اص۴۰)

نے آپ کو نیزہ مار کر چیر دیا۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث آیت میں) ارشاد فرمایا کہ ''**واذا قیل له اتق الله اخذته العزة بالاثم**'' یعنی جب ابومیسرہ سلامان کو کہا گیا کہ اللہ کا خوف کر تو اس کی ضد نے اُسے مزید گناہ پر مجبور کر دیا۔

مذکورہ واقعہ میں حضرت زید بن دثنہ کا جو ذکر آیا ہے اُن کا واقعہ یہ ہے کہ اُن کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا تا کہ وہ اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلہ میں ان کو شہید کرے۔ چنانچہ اُس نے نسطاس نامی اپنے غلام کے ساتھ حضرت زید کو مقام تنعیم کی طرف بھیجا تا کہ حرم سے باہر اُن کو شہید کیا جائے۔ ان کے قتل کو دیکھنے کے لیے قریش کے کچھ افراد جمع ہو گئے' جن میں ابوسفیان بھی تھے۔ جب حضرت زید کو قتل کرنے کے لیے سامنے لایا گیا تو ابوسفیان نے حضرت زید سے کہا: اے زید! میں اللہ کی قسم دے کر تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ اگر تم اپنے گھر میں ہو اور تمہاری جگہ اس وقت ہمارے پاس (تمہارے نبی) محمد (ﷺ) ہوں اور اُن کو شہید کیا جائے تو کیا تم اس بات کو پسند کرو گے؟ حضرت زید نے کہا: خدا کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور اس وقت (میرے آقا و مولیٰ) محمد ﷺ جس جگہ ہیں' وہاں اُن کو کوئی تکلیف دہ کانٹا چبھ جائے۔ ابوسفیان نے یہ جواب سن کر کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے ایسی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسی محمد کے صحابہ کو محمد سے ہے۔ (ﷺ) پھر صفوان کے غلام نسطاس نے حضرت زید کو شہید کر دیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: جو کوئی خبیب کو سولی کی لکڑیوں سے اُتار کر لائے گا اُس کے لیے جنت (کا انعام) ہے۔ حضرت زبیر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اور میرا دوست مقداد بن اسود اُن کو اُتار کر لائیں گے۔ چنانچہ دونوں نکل پڑے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ رات کے وقت چلتے تھے اور دن میں چھپ جاتے تھے' بالآخر ایک رات مقام تنعیم پر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ سولی کے اردگرد چالیس مشرکین ہیں جو کہ بدمست سوئے پڑے ہیں۔ ان دونوں نے فوراً حضرت خبیب کو سولی سے اتارا۔ آپ بالکل تر و تازہ تھے اور چالیس دن گزرنے کے باوجود آپ کے جسم کا کوئی حصہ تبدیل نہیں ہوا تھا' آپ کا ہاتھ ایک زخم پر تھا جہاں سے خون بہہ رہا تھا' اُس کی رنگت خون کی تھی اور خوشبو مشک کی تھی۔ حضرت زبیر نے اُن کو اپنے گھوڑے پر اٹھایا اور دونوں چل پڑے۔ اتنے میں کفار جاگ اٹھے' اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت خُبیب موجود نہیں ہیں تو فوراً قریش کو اطلاع دی۔ چنانچہ قریش کے ستر گھڑ سوار اُن مشرکین کے ساتھ سوار ہوئے' اور جب وہ قریب پہنچ گئے تو حضرت زبیر نے حضرت خبیب کو زمین پر ڈال دیا اور زمین نے فوراً حضرت خبیب کو نگل لیا' جس کی وجہ سے آپ کا نام ''**بلیع الارض**'' ہو گیا۔ حضرت زبیر نے تعاقب کرنے والے مشرکین سے کہا: اے گروہِ قریش! کس چیز نے تمہیں ہم پر اتنا جرأت مند بنا دیا ہے؟ یہ کہہ کر حضرت زبیر نے اپنے سر سے عمامہ اُتار دیا اور کہا کہ میں زبیر بن عوام ہوں' میری والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب ہے اور میرا ساتھی مقداد بن اسود ہے۔ ہم دونوں وہ طاقت ور شیر ہیں جو اپنے بچوں کو بچانے کے لیے نکلے ہوئے ہیں' اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہارے ساتھ تیر اندازی میں مقابلہ کے لیے تیار ہوں اور اگر چاہو تو میں قتل و قتال کرنے کے لیے تیار ہوں اور اگر چاہو تو تم لوگ واپس لوٹ جاؤ۔ یہ گفتگو سُن کر سارے کے سارے مکہ کی طرف واپس لوٹ گئے اور حضرت زبیر اور ان کے ساتھی مقداد (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' وہاں پہلے سے جبریل امین موجود تھے' انہوں نے کہا: اے محمد (ﷺ)! بلاشبہ فرشتوں کو آپ کے اِن دونوں صحابیوں پر فخر ہے۔ اور جب ان دونوں نے حضرت خبیب کو لکڑیوں سے اتارتے وقت اپنی جان کی بازی لگا دی تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی شان میں (زیر بحث) آیت نازل فرمائی کہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ یعنی لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کو فروخت کر دیتے ہیں۔

اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ زیر بحث آیت حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ان کو رومی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے مکانات موصل کی زمین میں تھے' جب روم نے موصل پر حملہ کیا تو روم کے فوجی حضرت صہیب کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے' اس وقت حضرت صہیب چھوٹے تھے پھر انہوں نے روم ہی میں پرورش پائی۔ اس لیے ان کو رومی کہا جاتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت عطاء کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف ہجرت کی غرض سے جب حضرت صہیب اپنے گھر سے روانہ ہوئے تو مشرکین قریش کے ایک گروہ نے اُن کا پیچھا کیا۔ وہ اپنی سواری سے اُتر گئے اور اُن لوگوں پر اتنے تیر برسائے کہ اپنا ترکش خالی کر دیا اور اُن لوگوں سے کہا: خدا کی قسم! تم لوگ میری طرف نہ آؤ ورنہ میں اپنے تمام تیر برسا دوں گا اور پھر میرے ہاتھ میں جو تلوار ہے اُس سے وار کروں گا۔ البتہ اگر تم لوگ چاہو تو میں ایک ایسے مال کا پتا بتا دیتا ہوں جو میں نے مکہ میں دفن کیا ہوا ہے وہ تم لے لو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔ وہ لوگ اس پر رضامند ہو گئے اور چلے گئے۔ جب حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو زیر بحث آیت نازل ہوئی کہ "کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کو فروخت کر دیتے ہیں" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابو یحییٰ! تجارت نفع بخش رہی' یہ کہہ کر آپ نے حضرت صہیب کے سامنے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔

بعض مفسرین کے نزدیک زیر بحث آیت کا ہر اُس شخص کے حق میں ہونا جو حق کی خاطر باطل سے ٹکرا جائے اور اپنی جان کی بازی لگا دے

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں: کیا تم جانتے ہو کہ یہ آیت (البقرہ: ۲۰۷) کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ یہ اُس مسلمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کسی کافر سے ملے اور اُسے کہے کہ کلمہ پڑھو' اور کافر کلمہ پڑھنے سے انکار کرے تو مسلمان اُسے سے کہے کہ خدا کی قسم! میں اللہ کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوں' پھر وہ آگے بڑھ کر تن تنہا اُس کافر سے جہاد کرے اور شہید ہو جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے اُس سے مراد میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ شخص ہے جو اللہ سے ڈرنے کا حکم دے اور جب اُس کی بات نہ مانی جائے بلکہ مدّ مقابل ضد میں آ کر مزید گناہ کرنے لگ جائے تو یہ شخص کہہ دے کہ میں اللہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں' اور پھر وہ قتال شروع کر دے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب زیر بحث آیت پڑھتے تو کہتے تھے کہ ربِ کعبہ کی قسم! دونوں نے لڑائی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو یہی آیت پڑھتے سنا کہ "کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کو فروخت کر دیتے ہیں" تو حضرت عمر نے کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون" اس کا مصداق تو وہی شخص ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور شہید ہو جائے یعنی نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے اور اسی حالت میں شہید ہو جائے۔

(۲۶۹) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی بات کہی جائے۔[۵۳۸]

۵۳۸ بعض روایات میں اس کو افضل اور بہترین جہاد قرار دیا گیا ہے۔ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا سب سے بڑا یا سب سے افضل جہاد اس لیے ہے کہ کلمۂ حق کے مؤثر ہونے کی صورت میں حاکم کی تمام رعایا کا فائدہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کفار سے جہاد کرنے میں اپنے جانی اور مالی نقصان کا یقین نہیں ہوتا جبکہ ظالم حکمران کے سامنے آوازِ حق بلند کرنے میں جانی یا مالی نقصان کا یقین ہوتا ہے۔ (مرقات ج ۷ ص ۲۸۱' مراۃ ج ۵ ص ۴۰۷)

(سنن ترمذی: ۴۷۱۷، ۲۱، سنن ابوداؤد: ۴۴۴۴، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۱، المعجم الکبیر: ۸۰۸۰، مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷۰۵، ص ۳۲۲)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں جو ''یشــری'' کا لفظ ہے اس سے مراد ''بیچنا'' ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ہے: ''وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ'' (یوسف: ۲۰) اس میں بھی ''شــروہ'' کا لفظ بیچنے کے معنیٰ میں ہے (یعنی یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو کھوٹے داموں میں بیچ دیا) زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنے رب سے قیامت میں ملنے والے اجر وثواب کے بدلہ میں اپنی جان کو فروخت کر دیتا ہے۔ یہ بیع اور فروختگی اس طرح ہے کہ آدمی نماز، روزہ، حج و جہاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے فرمانبرداری کے کاموں میں اپنی جان کو خرچ کرتا ہے۔ یوں یہ جان ''سامان'' کی طرح ہے اور آدمی فروخت کرنے والے کی طرح ہے، اللہ تعالیٰ خریدنے والا ہے اور قیمت ''اجر وثواب'' ہے۔

اختتام پر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ اللہ عزوجل کی ایک مہربانی اور رحمت یہ ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کے قلیل اور ختم ہو جانے والے عمل پر جو جزاء اور بدلہ مقرر کیا ہے وہ جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ یہ بھی اُس کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، اور یہ بھی اُس کی مہربانی ہے کہ بندوں کی جان اور بندوں کا مال سب کچھ اُس کی اپنی ملکیت ہے۔ اس کے باوجود محض اپنے فضل وکرم اور رحمت کی وجہ سے اپنی ملکیت کے بدلہ میں اپنی ملکیت کو خریدتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے O

مذکورہ آیت کا واقعۂ نزول

مذکورہ آیت اُن یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور اُن کے دیگر ساتھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے احکام کی تعظیم کرتے رہے، چنانچہ ان لوگوں نے ہفتہ کے دن کا احترام کیا اور اونٹ کے گوشت اور اونٹ کے دودھ کو ناپسند کیا، اور کہنے لگے کہ اسلام میں ان چیزوں کو ترک کرنا جائز ہے اور تورات میں واجب ہے۔ مزید یہ کہ ان لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! تورات ہماری کتاب ہے، آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم رات میں اپنی نماز کے اندر اُس کی تلاوت کریں۔ جواباً اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اُنہیں اسلام میں یعنی اسلام کے احکام میں مکمل طور پر داخل ہونے کا حکم فرمایا۔ اور تورات کو اختیار کرنے سے منع فرما دیا، کیونکہ وہ منسوخ ہو چکی ہے۔

آیت مذکورہ میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں اقوال اور آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ یعنی اللہ عزوجل کے تابع دار ہو جاؤ اور احکامات میں اُس کے فرمانبردار بن جاؤ۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''یا ایھا الذین امنوا'' سے جن لوگوں کو خطاب ہے وہ یہودی اور عیسائی ہیں جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے موسیٰ وعیسیٰ پر ایمان لانے والو! اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ۔

(۲۷۰) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم یہودیوں سے بہت سی ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں' آپ فرمائیں کہ ہم اُن کی کچھ باتیں لکھ لیا کریں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے دین میں بے اطمینانی کا شکار ہو؟ بلاشبہ میں تمہارے پاس وہ ملّت لے کر آیا ہوں جو بہت روشن اور پاکیزہ ہے (یعنی اُسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں)۔ اور اگر (اِس وقت) موسیٰ بھی موجود ہوتے تو اُنہیں میری پیروی کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔[۵۳۹] (مسند احمد ج ۳ ص ۳۸۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۷۷ ص ۳۰)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں ''یا ایھا الذین امنوا'' کا خطاب اُن مؤمنوں سے ہے جو درحقیقت منافق تھے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے زبانی طور پر ایمان لانے والو! سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ' یعنی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرلو اور منتشر نہ رہو۔ اس اعتبار سے لفظ ''کافۃ'' کا تعلق مخاطبین کے ساتھ ہے اور اس میں ''سِلْم'' کا معنیٰ ''فرمانبرداری'' اس لیے کیا گیا کہ ''سِلْم'' کی اصل ''استسلام'' ہے اور ''استسلام'' کا معنیٰ فرمانبرداری کرنا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''کافۃ'' کا تعلق اسلام سے بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! اسلام کے تمام احکام میں داخل ہو جاؤ۔ یہ معنیٰ ظاہر آیت کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ لوگ تمام احکام پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلام کے احکام آٹھ حصوں پر مشتمل ہیں: (۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) عمرہ (۶) جہاد (۷) امر بالمعروف (نیکی کا حکم دینا) (۸) نہی عن المنکر (بُرائی سے روکنا) اور جس شخص کے پاس ان آٹھ میں سے کوئی حصہ نہ ہو وہ خسارہ اور نقصان میں ہے۔

شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی ممانعت اور اس کی کھلی دشمنی کا بیان مع اعتراض و جواب

﴿ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ﴾ یعنی جن باتوں کو شیطان نے تمہارے لیے مزین اور خوشنما بنا دیا ہے' جیسے ہفتہ کے دن کا حرام ہونا' اونٹ کے گوشت کا حرام ہونا اور دیگر چیزوں کا حرام ہونا ان میں شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ بعض مفسرین نے اس جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ شکوک وشبہات جو گمراہ لوگ اور گمراہ کن خواہشات والے پیدا کرتے ہیں اُن کی طرف توجہ نہ دو' کیونکہ جو شخص کسی کے طریقہ کو اپناتا ہے وہ اُس کے نقش قدم پر چل پڑتا ہے۔

﴿ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اگر یہاں یہ سوال ہو کہ شیطان کی ہمارے ساتھ دشمنی یہ ہے کہ وہ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے اور وسوسہ ڈالتا ہے۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے' پھر یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے کہ شیطان نقصان پہنچائے اور وسوسہ اندازی کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان ہمیں نقصان اور مصیبت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ اُسے روکتا ہے۔

وسوسہ یہ ہے کہ شیطان گناہ کے کاموں کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے' شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے اور ہر وہ چیز جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہو جائے وہ اُس کے ذریعہ آدمی کو اجر وثواب کے حصول سے روکتا ہے۔ یہ شیطانی دشمنی کے بڑے بڑے رُخ ہیں۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ شیطان کو ''کھلا دشمن'' کیوں فرمایا جبکہ ہمیں وہ نظر نہیں آتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی دشمنی کی حقیقت کو واضح فرما دیا ہے' اس لیے وہ نظر نہ آنے کے باوجود گویا کھلا ہوا اور سامنے ہے۔

۵۳۹۔ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے عالمگیر ہونے' مذہب اسلام کے کامل واکمل ہونے اور گذشتہ مذاہب کے منسوخ ہونے کا ثبوت ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾

پھر اگر تم اپنے پاس روشن دلیلیں آنے کے باوجود پھسلنے لگو تو پھر جان لو کہ اللہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ زَلَلْتُمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم منحرف ہو جاؤ اور گم راہ ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اگر تم شرک کرو۔ ﴿ الْبَیِّنٰتُ ﴾ سے مراد واضح دلیلیں ہیں۔ ﴿ عَزِیْزٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخالف سے بدلہ لینے میں غالب ہے' کوئی چیز اُسے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور ﴿ حَكِیْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ فقط درست اور حق بدلہ لیتا ہے۔ اور حکیم وہ کہلاتا ہے جو اپنے تمام معاملات میں دُرستگی رکھتا ہو۔ زیر بحث آیت میں اُس شخص کو ڈرایا جا رہا ہے جس کے دل میں شک شبہ اور منافقت ہو یا اُس کے نزدیک دین میں شک شبہ ہو۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

وہ (شیطان کے پیروکار) تو صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اللہ کا عذاب اور (عذاب کے) فرشتے اُن کے پاس آ جائیں' حالانکہ اُن کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے' اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ هَلْ یَنْظُرُوْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اسلام میں داخل نہیں ہوتے اور شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہیں وہ (عذاب کا) انتظار کر رہے ہیں۔ ﴿ ظُلَلٍ ﴾ ''ظُلّة'' کی جمع ہے (بمعنیٰ سائبان)۔ ﴿ الْغَمَامِ ﴾ سے مراد وہ بادل ہے جو سفید اور پتلا ہو۔ بادل چونکہ چھا جاتا ہے اور مختلف چیزوں کو ڈھانپ لیتا ہے اس لیے اس کو ''غمام'' کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ ﴿ غمام ﴾ سے مراد بادل نہیں ہے' بلکہ سفید کُہر کی مانند کوئی چیز ہے جو کہ صرف بنی اسرائیل کو میدانِ تیہ میں دی گئی تھی۔

﴿ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ ﴾ یعنی (یہ شیطان کے پیروکار) صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ چھائے ہوئے بادلوں میں اُن کے پاس اللہ اور اُس کے فرشتے آ جائیں۔ اس کی تفسیر میں امام طبری نے سند متصل کے ساتھ از عکرمہ از ابن عباس یہ حدیث روایت کی ہے کہ:

(۲۷۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بادلوں میں کچھ محرابیں ہیں' اُن میں اللہ عزوجل اس حال میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔[۵۴۰] اسی کو بیان کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے فرمایا: ''**هل ينظرون الا ان يأتيهم الله فى ظلل من الغمام وقضى الامر**''۔ (جامع البیان للطبری: ۳۲۱۰)

عکرمہ کہتے ہیں کہ فرشتے اس کے اردگرد ہوتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ فرشتے بادل کے اردگرد ہوتے ہیں اور بعض کا قول یہ ہے کہ فرشتے رب تعالیٰ کے اردگرد ہوتے ہیں۔

---

۵۴۰ اللہ تعالیٰ کے جلوہ گر ہونے اور لپٹے ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس کی خصوصی رحمتیں اور انوار و تجلّیات ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے آسمان دنیا پر نازل ہونے کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ اُس کی رحمتیں آسمان دنیا پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مزید تشریح کے لیے علامہ خازن کی اگلی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

آیت مذکورہ کا آیاتِ صفات سے ہونا اور آیاتِ صفات کے بارے میں علماءِ امت کے دو مذاہب

جاننا چاہیے کہ زیر بحث آیت کا تعلق آیاتِ صفات سے ہے' اور ایسی آیات واحادیث جو صفات سے تعلق رکھتی ہیں اُن کے بارے میں علماء کے دو مذہب ہیں:

(۱) ایک مذہب جو امت کے اسلاف اور اہل سنت کے اکابر علماء کا ہے وہ یہ ہے کہ صفات والی آیات واحادیث میں جو باتیں بیان کی گئی ہوں اُن پر ایمان رکھنا اور اُن کو مان لینا ضروری ہے' یعنی اُن کے ظاہر پر ایمان لانا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو بات جس طرح سے اُن آیات واحادیث میں بیان کر دی گئی ہے اُن پر ہم ایمان لاتے ہیں اور اُن باتوں کا علم ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سُپرد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ایمان اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حدوث کی علامات اور حرکت وسکون سے پاک ہے۔ امام کلبی فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا تعلق اُن آیات سے ہے جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ صفت جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے اُس کی تفسیر یہی ہے کہ اُس کو پڑھا جائے اور اُس پر کچھ کلام نہ کیا جائے' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی کو اختیار نہیں کہ اُس صفت کی تفسیر بیان کرے۔ امام زہری' امام اوزاعی' امام مالک' عبداللہ بن مبارک' سفیان ثوری' لیث بن سعد' امام احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہویہ یہ تمام علماء ومشائخ زیر بحث آیت اور اس طرح کی دیگر آیات کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان آیات کو بغیر کسی کیفیت اور بغیر کسی تشبیہ وتاویل کے اُسی طرح پڑھو جیسی یہ وارد ہوئی ہیں۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے اور اسلافِ اُمت کا عقیدہ ہے۔ اسی مفہوم کے بیان میں بعض علماء نے یہ اشعار کہے ہیں:

عقیدتنا ان لیس مثل صفاته ولا ذاته شیئی عقیدة صائب

''اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں ہمارا جو عقیدہ ہے کہ اُس کی ذات وصفات کی کوئی مثال نہیں ہے' یہ عقیدہ درست ہے''

نسلم ایات الصفات باسرها واخبارها للظاهر المتقارب

''وہ تمام آیات واحادیث جو صفات کے متعلق ہیں اُن کے ظاہری اور قریبی معنی کو ہم تسلیم کرتے ہیں''

ونؤیس عنها کنه فهم عقولنا وتأویلها فعل اللبیب المغالب

''ایسی آیات واحادیث کے متعلق ہم اپنی عقل وخرد کو مایوس قرار دیتے ہیں' اور ان کی تاویل اُس عقل مند کا کام ہے جو اپنی عقل سے مغلوب ہو''

ونرکب للتسلیم سفنا فانها لتسلیم دین المرء خیر المراکب

''ایسی آیات واحادیث کو تسلیم کرنے کے لیے ہم کچھ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں' کیونکہ وہ کشتیاں قرض کی ادائیگی کے لیے بہترین سواریاں ہیں''

(۲) دوسرا مذہب جو جمہور علماء متکلمین کا ہے وہ یہ ہے کہ تمام ذی عقل اور معتبر اصحاب فکر متکلمین اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ آنے جانے سے پاک ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جو چیز بھی آنے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ حرکت وسکون سے جُدا نہیں ہوتی' اور حرکت وسکون دونوں حادث ہیں' اور جو چیز حادث سے جُدا نہ ہو وہ بھی حادث ہوتی ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ کے حق میں آنے جانے کی صفات محال ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ زیر بحث آیت کا جو معنیٰ ظاہر ہے وہ مراد نہیں ہے' اس لیے معنیٰ کی وضاحت کے طور پر آیت کی تاویل ضروری ہے (یعنی زیر بحث

آیت میں جو اللہ عزوجل کے آنے کا ذکر ہے اُس کا کوئی معنیٰ بیان کرنا ضروری ہے)۔

چنانچہ بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اس میں اللہ کے آنے سے اُس کی آیات کا آنا مراد ہے۔یعنی آیات کی عظمت اور بلندی کو ظاہر کرنے کے لیے اُن کے آنے کو اپنے آنے سے تعبیر فرمایا ہے۔بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے آنے سے اُس کے حکم کا آنا مراد ہے۔اس معنیٰ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں خود تفسیر فرمادی ہے' چنانچہ فرمایا:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ (النحل:۳۳) وہ صرف اس بات کے انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس فرشتے یا تمہارے رب کا حکم (یعنی عذاب) آجائے۔

یہ آیت محکم ہے اور زیر بحث آیت مجمل ہے' لہٰذا زیر بحث آیت کے اجمال کے لیے مذکورہ آیت تفسیر ہوگی۔اور اللہ کے آنے سے اُس کے حکم کا آنا مراد ہوگا۔بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے آنے سے اُن چیزوں کا آنا مراد ہے جن کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے یعنی حساب اور عذاب۔سو جو چیز حقیقت میں آنے والی ہے' اُس کو اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا تا کہ کافروں کو مزید خوف میں مبتلا کیا جائے۔کیونکہ اگر آنے والی چیز (عذاب وغیرہ) کا ذکر کر دیا جاتا تو بیانِ وعید میں یہ بات کفار کے لیے ہلکی ہو جاتی' اور جب ذکر نہیں کیا گیا تو کلام بہت بلیغ ہوگیا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں ''فی'' باء کے معنیٰ میں ہو' کیونکہ حروف ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔لہٰذا آیت کا معنیٰ یوں ہوگا: ''هل ينظرون الا ان ياتيهم الله بظلل من الغمام و الملائكة'' یعنی وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اُن کے پاس چھائے ہوئے بادل (یا بادل کے سائبان) لے آئے۔مراد اس سے ایسا عذاب ہے جو بادل سے فرشتوں کے ساتھ آئے۔بعض علماء نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے آنے سے اللہ کے عذاب کا آنا مراد ہے۔یعنی وہ لوگ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں اُن کے پاس اللہ کا غضب اور اس کا عذاب آجائے۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ عذاب کا آنا بادلوں میں کیوں ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بادلوں کو دیکھ کر عموماً رحمت کا خیال آتا ہے اور بادل ہی سے بارشیں برستی ہیں' سو جب اسی بادل سے عذاب کا نزول ہوگا تو یہ کفار کے لیے زیادہ دشوار اور خطرناک ہوگا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ بادل کا نازل ہونا قیامت اور اُس کی ہولناکیوں کے ظاہر ہونے کی علامت ہے۔

آیت مذکورہ کے آخری جملہ کی تفسیر اور ایک اشکال کا جواب

فرمایا: ﴿وَقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ فیصلہ ہو چکا ہے۔مراد یہ ہے کہ کفار کے لیے عذاب واجب اور ثابت ہو چکا ہے اور حساب سے فراغت ہو چکی ہے' اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ہے جو وہ قیامت کے دن اپنے بندوں کے درمیان فرمائے گا۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ ہی کی طرف آخرت میں بندوں کے معاملات لوٹائے جائیں گے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ کیا لوگوں کے معاملات اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف لوٹائے جاتے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام بندوں کے معاملات دنیا اور آخرت میں اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور لوٹیں گے لیکن یہاں لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اعمال پر ثواب اور عذاب دینے والا ہے۔دوسرا جواب یہ ہے کہ لوگوں نے جب دنیا میں غیر اللہ کی پوجا کی اور اللہ کے سوا کسی اور کی طرف اپنے کاموں کو منسوب کیا تو جب قیامت کا دن ہوگا اور پردہ اُٹھے گا تو جن جن کی طرف کفار اپنے کاموں کو دنیا میں منسوب کرتے تھے اُن کو اللہ کی بارگاہ میں لوٹایا جائے گا۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

بنی اسرائیل سے پوچھئے ہم نے اُنہیں کتنی روشن دلیلیں عطا کی تھیں؟ اور جو اللہ کی آئی ہوئی نعمت کو تبدیل کر دے (وہ سُن لے کہ) بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہےO

آیت مذکورہ کی تفسیر اور مفسرین کے مختلف اقوال

﴿سَلْ﴾ میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا کہ آپ مدینہ کے یہودیوں سے پوچھیں کہ ہم نے اُنہیں کتنی روشن دلیلیں عطا کی تھیں۔ اس سوال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ کو وہ دلیلیں معلوم ہو جائیں' کیونکہ آپ تو اللہ عزوجل کے بتانے سے اُن دلیلوں کو جانتے تھے' ہاں سوال کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ یہودیوں کی سرزنش ہو اور اللہ کے دلائل سے وہ جو منہ موڑتے تھے اور شکر ادا نہیں کرتے تھے اُس پر اُن کی خوب مذمت اور سرزنش ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سوال کا مقصد یہ ہے کہ یہودیوں کو اُن نعمتوں کی یاد دہانی کرائی جائے جو ان کے آباء و اجداد کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھیں۔

زیر بحث آیت میں ﴿اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ﴾ سے وہ واضح دلیلیں مراد ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو ثابت کرنے والی تھیں' جیسے عصا' ید بیضاء' سمندر کا پھٹ جانا اور من و سلویٰ کا نازل ہونا۔

﴿وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ یہاں اللہ کی نعمت کو تبدیل کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اُن آیتوں کو تبدیل کر دے جو اللہ کی جانب سے اُس کے پاس آئی ہیں تو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ کیونکہ آیتیں ہدایت کا اور گمراہی سے نجات کا سبب ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کی نعمت سے مراد وہ دلائل ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنے والے ہیں (اُن کو جو تبدیل کر دے تو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے)۔ کیونکہ یہودیوں نے اُن دلائل کا انکار کیا اور اُن میں تبدیلی کر دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کی نعمت سے وہ وعدہ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے لیا تھا اور انہوں نے اس کو پورا نہیں کیا۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْاۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

کافروں کے لیے دُنیاوی زندگی کو خوب صورت بنا دیا گیا ہے اور یہ لوگ مؤمنین کا مذاق اڑاتے ہیں' حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن کافروں سے سر بلند ہوں گے' اور اللہ جسے چاہے بے حساب نوازتا ہےO

مذکورہ آیت کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ یہ آیت عرب کے مشرکین ابو جہل اور اس کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی' کیونکہ دنیا میں ان لوگوں کو جو مال و دولت ملی ہوئی تھی اُس کی وجہ سے یہ لوگ بہت عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے اور ساتھ ہی حشر و نشر کا انکار کرتے تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں یعنی عبد اللہ بن اُبی اور اس کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی' اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ سردارانِ یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ تمام ہی افراد کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

دنیاوی زندگی کو مزین کرنے والا کون ہے؟

مزین (یعنی دنیاوی زندگی کو خوب صورت بنانے والا) اللہ تعالیٰ ہے' کیونکہ آیت مبارکہ میں ایک قرأت کے مطابق ''زَیَّنَ'' ہے۔اور یہ ناممکن بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی زندگی کو مزین کرنے والا ہو' کیونکہ اُسی نے دُنیا میں خوب صورتی' تازگی' خوشبو اور لذت کو ظاہر کیا ہے' اور عجیب وغریب اشیاء کو اور خوب صورت مناظر کو پیدا فرمایا ہے۔اور یہ سب کچھ اُس نے اس لیے کیا ہے تاکہ اپنے بندوں کو آزمائے۔کیونکہ دنیا کو اُس نے آزمائش اور امتحان کی جگہ بنایا ہے اور طبیعتوں میں لذتوں کی طرف میلان اور خواہشات کی محبت پیدا کی ہے۔اور یہ جبر واکراہ کے طور پر نہیں ہے کہ اس کو چھوڑا نہ جاسکے بلکہ اس طور پر ہے کہ اُس نے دلوں میں ایسی محبت ڈال دی ہے کہ دل ان چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ (صلاحیت بھی رکھی ہے کہ) دل ان چیزوں سے اپنا رُخ موڑ لے۔لیکن جب لوگوں نے دنیا کو اُس کی مقدار سے بڑھ کر دیکھا تو اُنہیں اس کا حسن و جمال اور اس کی زیب وزینت اچھی لگی' جس کی وجہ سے لوگوں نے دُنیا کو پسند کیا اور اس کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوگئے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیت میں جو فرمایا کہ ''دنیا کی زندگی کو خوب صورت بنادیا گیا ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دُنیا میں مہلت دی' اس مہلت کے نتیجہ میں لوگوں نے دنیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا اور اس سے محبت کرنے لگے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کو لوگوں کی نگاہوں میں خوب صورت بنانے والا شیطان اور وہ جن وانس ہیں جو گمراہ ہیں۔ کیونکہ ان ہی لوگوں نے کافروں کو یہ ترغیب دی کہ دُنیا کا لالچ اور اُس کی طلب اچھی چیز ہے اور آخرت کا معاملہ بُرا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ شیطان اور گمراہ کرنے والے جن وانس نے کافروں کا ذہن یہ بنادیا کہ آخرت کوئی چیز نہیں ہے' تاکہ کفار دُنیا کی لذتوں اور اُن لذتوں کے لالچ کی طرف متوجہ ہوجائیں[۵۴۱]

یہ تاویل کمزور ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ''کافروں کے لیے دنیاوی زندگی کو خوب صورت بنادیا گیا ہے'' یہ تمام کافروں کے بارے میں ہے' لہٰذا اس میں شیطان اور گمراہ کرنے والے جن وانس بھی داخل ہوں گے۔یعنی ان سب کے لیے دنیاوی زندگی کو خوب صورت بنایا گیا ہے' اور جب ان سب کا تعلق اُن لوگوں سے ہے جن کے لیے دنیاوی زندگی کو خوب صورت بنایا گیا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ دنیاوی زندگی کو خوب صورت بنانے والا اِن کے علاوہ کوئی اور ہو (اور وہ اللہ عزوجل کی ذات ہے)۔لہٰذا ثابت ہوگیا کہ معتزلہ کا مؤقف کمزور ہے۔

کمزور مسلمانوں کا کافروں کے طعن وتشنیع کا نشانہ بننا

﴿ وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ﴾ یعنی کفار اُن مؤمنوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو کم زور اور غریب ہیں۔جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عمار بن یاسر' حضرت صہیب' حضرت بلال اور ان کی مثل دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کفار کہا کرتے تھے: ان مسلمانوں کو دیکھو جن کو سہارا بنا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر غالب آنے کا خیال رکھتے ہیں۔

﴿ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ یعنی وہ مؤمنین جو غریب اور کم زور ہیں وہ قیامت کے دن کافروں سے سر بلند ہوں گے۔کیونکہ مؤمنین بلند ترین لوگوں میں ہوں گے اور کفار ومنافقین انتہائی گھٹیا اور نچلے درجہ کے لوگوں میں ہوں گے۔

(۲۷۲) حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات فرماتے ہوئے سنا

---

۵۴۱ اس قول کے قائلین معتزلہ ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ دنیاوی زندگی کو خوشنما بنانے والا شیطان ہے اور اس کے ساتھ وہ جن وانس ہیں جو گمراہ کرنے والے ہیں۔

کہ کیا میں تمہیں وہ لوگ نہ بتاؤں جو جنت والے ہیں' ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ بھی اُسے کمزور اور حقیر سمجھیں' حالانکہ اگر وہ اللہ کے حضور کوئی قسم کھالے تو اللہ اُس کو ضرور پورا فرماتا ہے[۵۴۲] (ایسا شخص جنتی ہے) اور کیا میں تمہیں وہ لوگ نہ بتاؤں جو جہنمی ہیں؟ ہر وہ شخص جو سخت دل' بدکار اور متکبر ہو (وہ جہنمی ہے)۔

(صحیح بخاری: ۴۹۱۸' صحیح مسلم: ۲۸۵۳' سنن ترمذی: ۲۶۰۵' سنن ابن ماجہ: ۴۱۱۶' مسند احمد ج ۴ ص ۳۰۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۰۶۔ ص ۴۳۳)

☆ اس حدیث میں چند الفاظ آئے ہیں ان کے معانی درج ذیل ہیں: "عتل" "سخت مزاج' بہت جھگڑالو' اچھی بات کی اتباع نہ کرنے والا۔ "جواظ" "بدکار اور تکبر سے چلنے والا' ایک قول کے مطابق اس کا معنیٰ ہے: کوتاہ قد اور زیادہ کھانے والا۔ "جعظری" اکھڑ مزاج' ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے اندر نہ پائی جانے والی خوبیوں پر فخر کرے اور خود اپنی تعریف کرے۔

(۲۷۳) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا (تو میں نے ملاحظہ کیا کہ) جو لوگ جنت میں داخل ہو رہے تھے اُن میں اکثر لوگ مسکین تھے اور جو مال دار لوگ تھے اُن کو روک دیا گیا تھا[۵۴۳]' ہاں جو دوزخی تھے اُنہیں دوزخ میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اسی طرح میں جہنم کے دروازہ کے پاس کھڑا ہوا تو (میں نے ملاحظہ کیا کہ) جو لوگ جہنم میں داخل ہو رہے تھے اُن میں اکثریت عورتوں کی تھی۔

(صحیح بخاری: ۵۱۹۶' صحیح مسلم: ۲۷۳۶' سنن کبریٰ للنسائی: ۹۲۶۵' مسند احمد ج ۵ ص ۲۱۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۳۳۔ ص ۴۴۶)

"بے حساب رزق" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال کا بیان

آیت کے اختتام پر فرمایا: "اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے"۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بے حساب دینے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ اور بغیر مقدار کے عطا فرماتا ہے۔ یہ معنیٰ اس لیے کیا کہ جو چیز حساب کے تحت داخل ہوتی ہے وہ قلیل اور تھوڑی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے گنجائش عطا فرماتا ہے۔ بعض مفسرین نے ﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے دُنیا میں اس طرح رزق دیتا ہے کہ آخرت میں اُس کا حساب نہیں لے گا۔ بعض مفسرین نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں بندے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ بعض مفسرین نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے بغیر استحقاق کے نوازتا ہے۔ بعض نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے خزانوں کے ختم ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے' نتیجۃً اُسے اپنی عطاؤں میں کسی حساب کی

---

۵۴۲ مراد اس سے یہ ہے کہ جنت میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوگی جو بہت ہی منکسر المزاج اور عاجزی کرنے والے ہوں گے اور بہ ظاہر تو بہت خستہ حال ہوں گے لیکن اللہ عزوجل کے نزدیک بہت مقبول اور عالی مرتبہ ہوں گے۔ (مرقات عن النووی ج ۸ ص ۸۲۷)

۵۴۳ کیونکہ دنیا میں انہوں نے بہت پُرعیش زندگی گزاری اور کثیر مال و دولت رکھا اس لیے اُن کا حساب و کتاب طویل ہونے کی وجہ سے اُنہیں روک لیا گیا اور غرباء فقراء کو اُن سے پہلے جنت میں داخل کیا گیا۔ آگے جو فرمایا کہ جو دوزخی تھے اُنہیں دوزخ میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا اس سے اس طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اہل جہنم کو تفصیلی اور طویل حساب کے لیے نہیں روکا گیا بلکہ حساب و کتاب کے بعد سب کو جہنم میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا جبکہ اہل ایمان میں سے فقراء اور اُمراء کے درمیان فرق کیا گیا۔ یعنی فقراء کو پہلے جنت میں بھیج دیا گیا اور اُمراء کو طویل حساب کی وجہ سے روک لیا گیا۔ حدیث کے اختتام پر جو فرمایا کہ جہنم میں اکثریت عورتوں کی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کے اندر تباہی کے اسباب زیادہ ہوتے ہیں (مثلاً غیبت' زیب و زینت وغیرہ) واضح رہے کہ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ جنت اور دوزخ کے مناظر دیکھنے کا جو واقعہ بیان فرما رہے ہیں وہ یا تو شب معراج کا ہے یا کسی موقع پر خواب دیکھنے کا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے حالت کشف میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا ہو۔

(عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۱۰۷' مرقات المفاتیح ج ۹ ص ۸۴)

ضرورت نہیں پڑتی' کیونکہ حساب تو اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ معلوم ہو کہ کتنا خرچ کیا گیا جبکہ اللہ عزوجل ان چیزوں سے بے نیاز ہے اور اُسے اپنی عطا اور بخشش کا بھی علم ہے' پھر یہ کہ اُسے اپنے خزانوں کے ختم ہونے کا بھی کوئی خوف نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کے خزانے کاف اور نون (کے دو حروف) کے درمیان ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''بغیر حساب'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے رزق کو تنگ فرما دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے کشادہ فرما دیتا ہے۔ اور ہر شخص کو اُس کی حاجت اور اُس کی ضرورت کے مطابق نہیں دیتا بلکہ (بسا اوقات) ایسے لوگ جنہیں ضرورت نہ ہو اُنہیں بہت سارا رزق عطا فرماتا ہے' اور کوئی بھی شخص اُس کے فیصلوں کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ جو کچھ عطا فرماتا ہے اُس کا حساب بھی فرمائے گا لیکن کوئی شخص اُس سے یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تو نے فلاں کو نوازا اور فلاں کو محروم کیا' ایسا کیوں؟ نہ ہی کوئی شخص یہ پوچھ سکے گا کہ تو نے فلاں کو فلاں سے زیادہ کیوں نوازا؟ یہ سوال لوگ اس لیے نہیں کر سکیں گے کہ وہ اپنی ملکیت میں تنہا اور اکیلا ہے' نہ اُس کا کوئی شریک (Partner) ہے جو اُس سے جھگڑا کرے' نہ ہی کوئی اُس سے اُس کے کاموں کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے والا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''بغیر حساب'' عطا کرنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں پرہیز گاروں کو اجر و ثواب اور عزت اس طرح عطا فرمائے گا کہ اُن سے اپنے احسانات کا کوئی محاسبہ نہیں فرمائے گا۔ کیونکہ جنت کی جو نعمتیں ہیں وہ کبھی بھی ختم اور منقطع ہونے والی نہیں ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو اُن کے اعمال کے مطابق اجر و ثواب عطا فرمائے گا' پھر اُن پر مزید فضل فرمائے گا اور یہ فضل ''بغیر حساب'' یعنی بے حساب ہوگا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(ابتداء میں) لوگ ایک امت تھے (پھر جب آپس میں اختلاف ہو گیا) تو اللہ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل فرمائی تا کہ وہ (کتاب) لوگوں کے درمیان اُن کی اختلافی باتوں میں فیصلہ کر دے' اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی اُنہوں نے ہی اپنے پاس روشن دلائل آنے کے باوجود محض باہمی حسد کی وجہ سے کتاب میں اختلاف کیا' سو اس اختلاف میں اللہ نے اپنی توفیق سے ایمان والوں کو حق بات کی ہدایت دی' اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ پر چلا دیتا ہے O

''لوگ ایک امت تھے'' اس کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال کا بیان

﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ ایک دین پر تھے۔ لوگوں سے کون مراد ہیں اس بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد مراد ہے جو کہ ایک دین کے ماننے والے تھے' پھر جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو حضرت آدم کی اولاد اختلاف کا شکار ہو گئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے حضرت نوح علیہ السلام کی تشریف آوری تک سچی اور ہدایت والی ایک شریعت پر قائم تھے' پھر لوگوں میں اختلافات ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ اور رسولوں میں آپ ہی کو سب سے پہلے بھیجا گیا اور آپ کے

بعد دیگر رسولوں کو بھیجا گیا۔[۵۴۴] بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں جن لوگوں کا بیان ہو رہا ہے اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے' یہ سب کے سب مؤمن تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد اُن کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے عرب والے مراد ہیں جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے' پھر عَمرو بن لُحی[۵۴۵] نے ان کے دین اور مذہب کو تبدیل کر دیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ جب میثاق لینے کے لیے لوگوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پُشت سے نکالا گیا تو وہ سب ایک دین پر تھے' یعنی اُن سے رب تعالیٰ نے پوچھا: ''اَلست بربکم؟'' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے بندگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہاں! تو ہی ہمارا رب ہے۔ اور جس دن لوگوں سے یہ وعدہ لیا گیا تھا اُسی دن لوگ ایک دین پر تھے' اس کے علاوہ لوگ کبھی ایک دین پر نہیں رہے۔ کیونکہ جب اس معاہدہ کے بعد لوگ عالم وجود میں آئے تو سرکشی اور حسد کی وجہ سے سب آپس میں اختلاف کا شکار ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام تنہا ایک اُمت تھے' یعنی امام اور پیشوا تھے لوگ اُن کی پیروی کرتے تھے' پھر اُن کے بعد لوگ اختلاف کا شکار ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ایک امت ہونے سے مراد یہ ہے کہ سارے لوگ کفر اور باطل پر قائم تھے۔ اس معنیٰ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ﴾ یعنی پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اُن لوگوں میں مسلمان بھی تھے جیسے ہابیل' شیث' حضرت ادریس' اور دیگر مسلمان تو پھر سارے لوگ کفر پر کیسے قائم ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر لوگ کافر تھے اور حکم اکثریت پر لاگو ہوتا ہے۔ بعض مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت سے یہ تو معلوم ہو رہا ہے کہ لوگ ایک امت تھے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ لوگ ایمان پر تھے یا کفر پر تھے۔ لہٰذا یہ بات کسی خارجی دلیل پر موقوف رہے گی۔

انبیاء اور رسولوں کی تعداد اور ''مبشرین'' و ''منذرین'' کی تفسیر

انبیاء اور رسولوں کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے' جن میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں[۵۴۶] اور قرآن کریم میں نام کے ساتھ جن انبیاء کا ذکر آیا ہے وہ کل اٹھائیس ہیں[۵۴۷]۔ آیت میں جو ﴿مُبَشِّرِيْنَ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ جو انبیاء بھیجے گئے وہ

---

[۵۴۴] یہاں رسول سے مراد صاحب شریعت پیغمبر ہے۔ کیونکہ بعض علماء کے نزدیک حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلے پیغمبر ہیں جنہیں صاحب شریعت بنا کر بھیجا گیا۔

[۵۴۵] یہ عرب میں ایک شخص تھا' اس نے بُت پرستی کو ایجاد کیا۔ احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ (شب معراج) میں نے اس کو جہنم میں انتڑیاں گھسیٹتے دیکھا۔ (اور فرمایا کہ) یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کے استعمال کو حرام قرار دیا۔ (ملاحظہ فرمائیے: صحیح بخاری:۱۲۱۲۔۳۵۲۰۔۳۵۲۱' صحیح مسلم:۹۰۱۔۲۸۵۶' مسند احمد ج۲ص۳۶۶' مشکوٰۃ المصابیح:۵۳۴۱) (تفسیر المظہری' زیر بحث آیت)

[۵۴۶] جیسا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ انبیاء کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! ان میں سے رسول کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تین سو تیرہ۔ (الدر المنثور للامام السیوطی بحوالہ تبیان القرآن ج۲ص۸۷۸) یہ حدیث سنداً ضعیف ہے اور انبیاء و رسل کی تعداد میں احادیث و آثار بھی باہم مختلف ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو معیّن تعداد کے ساتھ بیان نہ کیا جائے اور اگر بیان کیا جائے تو ''کم و بیش'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے۔

[۵۴۷] صاحب تفسیر مظہری نے یہ قول امام بغوی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں نام کے ساتھ ۲۶ انبیاء کا ذکر آیا ہے۔ ۱۸ انبیاء کے نام سورۃ الانعام (آیت ۸۳تا۸۶) میں مذکور ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرمانبردار مؤمنوں کو اجر وثواب کی خوش خبری سنانے والے ہیں۔ اور ﴿ مُنْذِرِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ خوش خبری کا تذکرہ ڈرانے سے پہلے اس لیے کیا کہ ''خوش خبری'' ایسے ہے جیسے تندرستی کی حفاظت کرنا اور ''ڈرانا'' ایسا ہے جیسے بدن کی کسی بیماری کو دور کرنا۔ ظاہر ہے کہ اصل چیز تندرستی کی حفاظت ہے' اس لیے خوش خبری کی بات پہلے فرمائی۔

زیر بحث آیت میں کتاب کا لفظ واحد ذکر کرنے کی توجیہ اور آسمانی کتابوں کی تعداد

﴿ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ یہاں سوال یہ ہے کہ جب انبیاء زیادہ ہیں تو پھر کتاب واحد کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''کتاب'' سے مراد کتابیں ہیں' یا پھر اصل عبارت اس طرح ہے کہ ''انزل مع کل واحد الکتاب'' ہر نبی کے ساتھ کتاب کو نازل فرمایا۔ آیت میں جو ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ فرمایا اس سے مراد انصاف اور سچائی ہے (یعنی وہ کتاب انصاف والی اور سچی ہے)۔

(جاننا چاہیے کہ) آسمان سے جو کتابیں نازل ہوئی ہیں وہ ایک سو چار کتابیں ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر دس صحیفے' حضرت شیث علیہ السلام پر تیس صحیفے' حضرت ادریس علیہ السلام پر پچاس صحیفے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دس صحیفے اور تورات نازل ہوئی' حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور' حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اور سیدنا محمد ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿ لِيَحْكُمَ ﴾ اس سے مراد کتاب ہے' یعنی کتاب فیصلہ کرے۔ اور فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اس کے باوجود فیصلہ کی نسبت کتاب کی طرف اس لیے کی گئی کہ اللہ ہی نے کتاب کو نازل فرمایا ہے۔ اب آیت کا مفہوم یوں ہے کہ ''لیحکم اللہ بالکتاب الذی انزلہ'' تاکہ اللہ اُس کتاب کے ذریعہ فیصلہ کرے جو اُس نے نازل فرمائی ہے۔ بعض مفسرین نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ: ''لیحکم بین الناس کل نبی بکتابہ المنزل علیہ'' تاکہ ہر نبی اُس کتاب کے ذریعہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جو اُس پر نازل کی گئی۔ لہٰذا کتاب یا نبی کی طرف فیصلہ کی نسبت مجازاً ہے' اور حقیقۃً فیصلہ کرنے والا اللہ رب العالمین ہے۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ﴾ اس سے مراد وہ حق ہے جس میں لوگوں نے متفق ہونے کے بعد اختلاف کیا۔

﴿ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ حق میں اختلاف کیا۔ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب یعنی تورات اور انجیل دی گئی اور جنہیں دی گئی وہ یہودی اور عیسائی ہیں۔ ان لوگوں کا اختلاف یہ تھا کہ یہ لوگ باہمی سرکشی اور حسد کی وجہ سے ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اختلاف سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ کتاب میں تحریف اور تبدیلی کر دیا کرتے تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''ما اختلف فیہ'' میں جو ضمیر ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے' اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ یہودی جنہیں کتاب دی گئی صرف انہوں نے باہمی سرکشی اور حسد کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کے معاملہ میں اختلاف کیا' حالانکہ آپ کی نبوت کے برحق ہونے پر واضح دلائل موجود تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) یعنی حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق' حضرت یعقوب' حضرت نوح' حضرت داؤد' حضرت سلیمان' حضرت ایوب' حضرت یوسف' حضرت موسیٰ' حضرت ہارون' حضرت زکریا' حضرت یحییٰ' حضرت عیسیٰ' حضرت الیاس' حضرت اسماعیل' حضرت الیسع' حضرت یونس' حضرت لوط (علیہم الصلوٰۃ والسلام) ان کے علاوہ دیگر سورتوں میں متفرق طور پر مزید آٹھ انبیاء کا ذکر ہے۔ یعنی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ' حضرت آدم' حضرت ادریس' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت شعیب' حضرت ذوالکفل' حضرت عُزیر (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اس کے بعد قاضی مظہری فرماتے ہیں کہ سورۃ المؤمن (آیت: ۳۴) میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر آیا ہے' بعض مفسرین کے نزدیک اس سے حضرت یوسف بن یعقوب مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے حضرت یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب (علیہ السلام) مراد ہیں۔ اس اعتبار سے ناموں کے ساتھ مذکور انبیاء کی تعداد ۲۷ ہوئی اور بعض علماء حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے بھی قائل ہیں اس اعتبار سے تعداد ۲۸ ہوئی۔ (تفسیر المظہری' زیر بحث آیت)

آیت میں ﴿الْبَیِّنٰتُ﴾ سے مراد وہ واضح دلائل ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے برحق ہونے پر قائم تھے۔ آخر میں جو ﴿بَغْیًا بَیْنَهُمْ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جو حق سے منہ موڑا ہے اور کتاب کو چھوڑ دیا ہے اس کا ان کے پاس کوئی عذر اور بہانہ نہیں ہے' انہوں نے صرف باہمی حسد یعنی طلب دنیا اور طلب حکومت کے چکر میں حق کی پیروی کو چھوڑ رکھا ہے۔

یہود و نصاریٰ کا جمعہ کے دن کے بارے میں باہمی اختلاف اور جمعہ کی نسبت سے مسلمانوں کی یہود و نصاریٰ پر برتری

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ حق کے بارے میں ہونے والے اس اختلاف میں اللہ نے ایمان والوں کو اپنی توفیق سے ہدایت دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اس اختلاف کی معرفت اور پہچان عطا فرمائی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں قلب ہے' اور اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنین کو اُس حق کی ہدایت عطا فرمائی جس میں یہود و نصاریٰ کا اختلاف تھا۔

یہود و نصاریٰ کا جس چیز میں اختلاف تھا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس دن کی توفیق اور ہدایت عطا فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۷٤) ہم سب سے آخر میں آئے ہیں (لیکن) قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے' یہود و نصاریٰ کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد دی گئی' اُن لوگوں نے اس دن کے بارے میں (یعنی جمعہ کے بارے میں) اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دن کی ہدایت عطا فرمائی[۵۴۸] اور یہودیوں کے لیے ہفتہ کا دن ہے اور عیسائیوں کے لیے اتوار کا دن ہے۔

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم آخر میں آئے ہیں اور (قیامت میں) آگے ہوں گے' سوائے اس کے کہ یہود و نصاریٰ کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر یہ (جمعہ کا) دن وہ دن ہے جو اللہ نے یہود و نصاریٰ پر مقرر فرمایا تھا لیکن اُن لوگوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت عطا فرمائی۔ امام نسائی کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ اس سے جمعہ کا دن مراد ہے۔ پھر شیخین کی متفقہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ لوگ ہمارے پیروکار ہیں' یہودیوں نے ہفتہ کا دن (مقرر کیا ہے) اور عیسائیوں نے اتوار کا دن مقرر کیا ہے۔

(صحیح بخاری: ۸۹٦' صحیح مسلم: ۸۵۵' سنن نسائی: ۱۳٦۷' مسند احمد ج ۲ ص ۳٤۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۳۵٤' ص ۱۱۹)

(۲۷۵) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلے لوگوں کو جمعہ کے دن سے دُور کر دیا۔ چنانچہ یہودیوں کے لیے ہفتہ کا دن ہے اور عیسائیوں کے لیے اتوار کا دن ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے ہمیں وجود بخشا تو ہمیں جمعہ کے دن کی ہدایت عطا فرمائی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے جمعہ' ہفتہ اور اتوار کا دن مقرر فرمایا۔ یونہی یہود و نصاریٰ قیامت کے دن بھی ہمارے پیروکار ہوں گے' ہم دنیا والوں میں سب سے آخری ہیں (لیکن) قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں

۵۴۸ یہود و نصاریٰ کے جمعہ کے بارے میں اختلاف کرنے سے مراد یہ ہے کہ اُنہیں اللہ عزوجل کی طرف سے ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کرنے کا اختیار دیا گیا۔ وہ لوگ متفقہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے بلکہ یہودیوں نے ہفتہ منتخب کر لیا اور عیسائیوں نے اتوار۔ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ فضل فرمایا کہ اُنہیں از خود جمعۃ المبارک کا دن مخصوص عبادت کے لیے عطا فرمایا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمعہ کے دن کی ہدایت عطا فرمائی"۔ علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ یہودی و نصاریٰ پر ہماری یہ ساری فضیلت و برتری رسول اللہ ﷺ کے وجودِ مسعود کی برکت سے ہے۔ (مرقات ج ۳ ص ٤٤٠) (یہاں ایک بحث جمعہ اور اتوار کی چھٹی کے مسئلہ پر بھی کی جاتی ہے۔ لیکن یہ مقام اس کا متحمل نہیں ہے۔ تفصیل و تحقیق کے لیے تبیان القرآن ج ٦ ص ٦۰۱ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔)

گے اور ساری مخلوق سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا۔(صحیح مسلم:٨٥٦'سنن نسائی:١٣٦٨'سنن ابن ماجہ:١٠٨٣'مشکوٰۃ المصابیح:١٣٥٥_ص١١٩)

یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلاف کے بارے میں مفسرین کے مزید اقوال

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان جو اختلاف ہوا تھا وہ قبلہ کے معاملہ میں تھا۔ چنانچہ یہودی بیت المقدس کی طرف مغرب کی جانب رُخ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور عیسائی مشرق کی جانب سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے' اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف رُخ کر کے ہدایت عطا فرمائی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کا جو اختلاف تھا وہ روزوں کے معاملہ میں تھا' تو ہمیں اللہ تعالیٰ نے رمضان میں روزے رکھنے کی ہدایت عطا فرمائی۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا' یعنی یہودیوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا کہ وہ عیسائی تھے' جبکہ ہمیں اللہ عزوجل نے حق بات کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم نے یہ کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سیدھی راہ پر تھے اور مسلمان تھے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں اختلاف کیا' یعنی یہودیوں نے اُن کی حد سے زیادہ مذمت کی اور عیسائیوں نے حد سے زیادہ تعریف کی' جبکہ اللہ عزوجل نے ہمیں اس معاملے میں حق بات کی ہدایت عطا فرمائی۔ زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے ایمان والوں کو اُس حق کی ہدایت عطا فرمائی جس میں اختلاف کرنے والوں نے اختلاف کیا۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿ بِاِذْنِهٖ ﴾ اس سے اللہ عزوجل کا علم' حکم اور ارادہ مراد ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر وہ آزمائشیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی تھیں' اُن لوگوں پر اتنی سختی اور مصیبت آئی کہ وہ لرز اٹھے اور (اس وقت کے) رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (تو اُن سے کہا گیا کہ) سنو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مذکورہ آیت غزوۂ احزاب یعنی غزوۂ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اس غزوہ میں بہت زیادہ تھکاوٹ' سختی' مصیبت' سردی اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ہجرت کے وقت مدینہ منورہ میں داخل ہوئے' تو اُنہیں سخت تنگی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ لوگ اپنے مال و دولت اور گھروں کو مشرکین کے ہاتھوں میں چھوڑ کر بے سروسامانی کی حالت میں مکہ سے نکل پڑے تھے۔ اور ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی کو ترجیح دی' جبکہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھلم کھلا دشمنی شروع کر دی تھی اور کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے منافقت کو ترجیح دی تھی۔ اس موقع پر مذکورہ آیت اللہ عزوجل نے اس لیے نازل فرمائی تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو اطمینان' تسلی اور سکون حاصل ہو۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور آخرت کی بہتری کے لیے دُنیا کے مصائب اور مشکلات کو برداشت کرنے کا بیان

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: "اَحسبتم" درمیان میں میم زائدہ ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ "ھل حسبتم" کے معنیٰ میں ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو! کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ صرف ایمان لا کر جنت میں داخل ہو جاؤ گے

حالانکہ تم سے پہلے کے پیروکارانِ انبیاء پر جو تکالیف، مصیبتیں اور آزمائشیں آئی ہیں اُن کی مثل تم پر آزمائشیں نہیں آئیں۔

﴿مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اُن لوگوں پر غربت یا سختی اور محتاجی آئی۔ "باساء" "بؤس" سے ہے۔ اور ﴿الضَّرَّآءُ﴾ سے بیماری، آفت اور خوف کی مختلف اقسام مراد ہیں۔ ﴿زُلۡزِلُوۡا﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ مختلف آزمائشوں اور بڑی بڑی مصیبتوں کی وجہ سے ہلا دیئے گئے۔ "زلزلہ" کا اصل معنیٰ ہے: ہلنا۔ چونکہ خوف زدہ آدمی بھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا بلکہ مسلسل بے چین اور اپنی پریشانی کی وجہ سے حرکت میں رہتا ہے اس لیے "زلزلوا" فرمایا گیا ہے۔

﴿حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ﴾ چونکہ اللہ کے پیغمبر دیگر لوگوں کے مقابلہ میں مصائب کے وقت اپنے اندر ثابت قدمی، صبر اور ضبطِ نفس کا مادہ زیادہ رکھتے ہیں اور یہی حال ان پیغمبروں کے مؤمن پیروکاروں کا ہوتا ہے (اس لیے اللہ عزوجل نے خاص ان کا ذکر فرما کر آزمائشوں کی شدت کو ظاہر فرمایا ہے)۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم سے پہلے (آنے والے رسول اور اُن کے پیروکاروں) پر اتنی مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں کہ اُن کے لیے صبر کرنا ممکن نہ رہا اور یہ تکلیف کا انتہائی درجہ تھا۔ جب تکلیف اپنے اس درجہ کو پہنچ گئی اور اُن لوگوں نے یہ سمجھا کہ مدد دیر سے آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا:

﴿اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ﴾ سنو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی طلب اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے ارشاد فرمائی۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ لوگ مختلف آزمائشوں کا شکار رہے لیکن آزمائشوں اور مصیبتوں کے عرصہ دراز تک رہنے کے باوجود وہ اپنے دین سے پیچھے نہیں ہٹے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل کی مدد آ پہنچی۔ لہٰذا اے گروہِ مسلمین! تم بھی اسی حالت کو اختیار کرلو اور حق کی تلاش میں تکالیف، مصائب اور مشکلات کو برداشت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے۔

(۲۷۶) حضرت خبّاب بن اَرَت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کعبۃُ اللہ کے سایہ میں اپنی چادر کا تکیہ لگائے لیٹے ہوئے تھے، ہم نے آپ کی بارگاہ میں شکایت کی اور عرض کیا: کیا آپ ہمارے لیے مدد کی دُعا نہیں فرماتے اور ہمارے لیے (دیگر آسانیوں کی) دُعا نہیں فرماتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں کا یہ حال تھا کہ آدمی کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر اُس کو اندر اُتار دیا جاتا اور پھر آرا لا کر اُس کے سر پر رکھ کے اُس شخص کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے اور اس کے گوشت اور ہڈیوں کے نیچے تک لوہے کی کنگھیوں کو داخل کر کے اُن کو چلایا جاتا تھا (لیکن) یہ تکلیف اُس شخص کے لیے اُس کے دین میں رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ خدا کی قسم! یہ دین پورا ہو کر رہے گا، حتیٰ کہ (ایک زمانہ آئے گا کہ) سوار آدمی صنعاء سے حضرموت تک چلے گا لیکن اُسے صرف اللہ عزوجل کا خوف ہوگا اور اس بات کا خوف ہوگا کہ کہیں بھیڑیا اُس کی بکریوں پر حملہ نہ کر دے[۵۴۹]، لیکن تم لوگ جلد بازی کر رہے ہو۔ (صحیح بخاری: ۶۹۴۳، مسند احمد ج۶ ص ۳۹۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۸۵۸۔ ص ۵۲۵)

۵۴۹ یعنی اور کسی چیز کا خوف نہیں ہوگا۔ اللہ عزوجل کا خوف تو اس لیے ہوگا کہ وہ لازمی ہے اور ہونا چاہیے اور بھیڑیئے کا خوف اس لیے ہوگا کہ وہ جانور ہے اور بے عقل ہے۔ اس سے بے خوف نہیں رہا جا سکتا۔ صنعاء اور حضرموت دونوں یمن کے دو شہر ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ حضرموت وہ شہر ہے جہاں حضرت صالح علیہ السلام تشریف لائے اور وہاں اُن کا وصال ہوا۔ نیز حضرت جرجیس علیہ السلام بھی وہاں آئے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔ اس حدیث میں جو فرمایا کہ سوار آدمی صنعاء سے حضرموت تک چلے گا اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ دور دراز کا سفر انتہائی پر امن طریقہ سے کریں گے۔ کسی انسان کا خوف اور کسی سے خطرہ نہیں ہوگا۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ پیش گوئی حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مکمل ہوئی۔ آپ کے زمانہ میں لوگوں کو بھیڑیوں سے بھی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ جب ایک مرتبہ بھیڑیوں نے ریوڑ پر حملہ کر دیا تو معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہو چکا ہے۔ (عمدۃ القاری ج۱۱ ص ۵۲۶، مرآۃ المناجیح ج۸ ص ۱۲۷)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم اپنے مال میں سے خرچ کرو تو وہ والدین' رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافر کا حق ہے' اور تم جو بھی نیک کام کرتے ہو اُس سے اللہ باخبر ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ﴾ یہ آیت حضرت عمرو بن الجموح کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ بہت بوڑھے اور مال دار آدمی تھے۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم کس چیز کا صدقہ دیں اور کس شخص پر خرچ کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

﴿ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ ﴾ میں خیر سے مراد مال ہے اور پورے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے مال سے جو چیز بھی خرچ کرو خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ وہ والدین (وغیرہما) کے لیے ہے۔ یہاں والدین پر خرچ کرنے کا ذکر پہلے اس لیے کیا کہ اولاد پر اُن کا حق واجب ہے کیونکہ وہ دونوں اپنی اولاد کو عدم سے وجود میں لانے کا سبب ہیں۔ والدین کے بعد رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ آدمی تمام غریب لوگوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا' اس لیے دیگر لوگوں کے مقابلہ میں رشتہ داری کو ترجیح دینا زیادہ بہتر ہے۔ رشتہ داروں کے بعد یتیموں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یتیم چھوٹے ہوتے ہیں' نہ تو وہ کمانے کی طاقت رکھتے ہیں نہ اُن کا کوئی اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ پھر ان سب کے بعد مساکین کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ان کی ضروریات مذکورہ افراد کے مقابلہ میں کم ہوتی ہیں۔ پھر ﴿ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ یعنی مسافر کا ذکر فرمایا۔ اور اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بعض اوقات اپنے شہر سے دور ہونے کی وجہ سے ضرورت اور محتاجی پیش آ جاتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ خرچ کرنے کی کیفیت کے بیان میں مذکورہ ترتیب کیسی خوب صورت اور تعجب خیز ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس مکمل اور خوب صورت تفصیل کو بیان فرما دیا تو اس کے بعد فوراً اجمال بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ:

﴿ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ تم جو بھی نیک کام کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کی خاطر تم مذکورہ افراد کے ساتھ یا ان کے علاوہ دیگر افراد کے ساتھ جو بھی بھلائی کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے' لہٰذا وہ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

آیت مذکورہ کا حکم

علماءِ تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ زیر بحث آیت منسوخ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کو آیتِ زکوٰۃ (التوبہ: ۶۰) نے منسوخ کیا ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم (یعنی غیر منسوخ) ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اُن افراد کا ذکر فرمایا ہے جن پر خرچ کرنا غربت کے باوجود آدمی پر واجب ہوتا ہے' یعنی والدین۔ لہٰذا یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ ابن زید کا قول یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے متعلق ہے۔ اور آیت کا ظاہر بھی یہی بتا رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص خرچ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ زیر بحث آیت میں ذکر کردہ افراد پر خرچ کرے اور آیت کی ترتیب کے مطابق خرچ کرے۔

آیت مذکورہ میں نبی اکرم ﷺ سے کیے گئے سوال کے جواب پر ایک اشکال اور اس کا جواب

سوال یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں نبی اکرم ﷺ سے جو سوال کیا گیا اُس میں اور جواب میں یکسانیت نہیں ہے' کیونکہ لوگوں کا سوال یہ تھا کہ وہ کیا خرچ کریں' اس کے جواب میں خرچ کے مصارف بیان کیے گئے۔ تو سوال اور جواب میں یکسانیت

کیسے ہوگی؟اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جوفرمایا:''ما انفقتم من خیر''جو کچھ تم اپنے مال میں سے خرچ کرو۔اس میں لوگوں کے سوال کا جواب موجود ہے' پھراس کے ساتھ ہی تکمیل مقصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مصارف بھی بیان فرمادیئے' کیونکہ خرچ اُس وقت تک خرچ نہیں کہلاتا جب تک کہ اُسے اپنی جگہ میں خرچ نہ کیا جائے۔شاعر کا شعر ہے:

ان الصنیعۃ لا تعد صنیعۃ — یعنی کام اُس وقت تک کام نہیں کہلاتا جب تک کہ اُس

حتی یصاب بھا طریق المصنع — کے کرنے کا راستہ درست نہ ہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے' ممکن ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناگوار ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ (بھی) ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بُری ہو' اور (حقائق کو) اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے O

مذکورہ آیت کی روشنی میں جہاد کا شرعی حکم اور علماءِ امت کے مختلف اقوال کا بیان

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ﴾ تم پر قتال یعنی جہاد فرض کیا گیا ہے۔علماء کا اس آیت (سے ثابت ہونے والے) حکم کے بارے میں اختلاف ہے۔حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ جہاد تطوّع (یعنی نفل) ہے۔اور آیتِ مذکورہ میں جو فرضیّت کا بیان ہے۔وہ صحابہ کرام کے لیے ہے' باقی لوگوں کے لیے نہیں ہے۔سفیان ثوری کا بھی یہی مذہب ہے اور امام اوزاعی سے بھی یہی منقول ہے۔دلیل یہ ہے کہ آیت میں جو''کتب''فرمایا گیا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاد فرض ہے' اور اس پر ایک مرتبہ عمل کافی ہے (جو کہ صحابہ کرام نے کرلیا' لہٰذا اب دیگر لوگوں کے لیے نفل ہے)۔وہ علماء جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام پر جہاد فرض تھا اُن کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں جو ﴿ عَلَيْكُمُ ﴾ فرمایا اُس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم اُن لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو اُس وقت موجود تھے۔بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آیت اپنے ظاہر پر ہے اور جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے۔اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۷۷) تم پر ہر امیر کی سربراہی میں جہاد واجب ہے' خواہ وہ نیک ہو یا فاسق وفاجر[۵۵۰]۔

(سنن ابوداؤد:۲۵۳۳' مشکوٰۃ المصابیح:۱۱۲۵'ص ۱۰۰)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

(۲۷۸) فتح مکہ کے بعد اب (مکہ سے) ہجرت نہیں ہے' البتہ جہاد اور نیت باقی ہیں[۵۵۱]' اور اب جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا

۵۵۰ اس سے معلوم ہوا کہ فسق وفجور امیر کی معزولی کا سبب نہیں ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد کے لیے امیر کا ہونا شرط ہے۔خواہ وہ متقی ہو یا فاسق۔یعنی اگر فاسق وفاجر امیر بن گیا ہو یا امیر بننے کے بعد اس میں فسق وفجور آ گیا ہو تب بھی اُس کی سربراہی میں جہاد کیا جائے گا۔البتہ لوگ مل کر کسی فاسق کو امیر مقرر کریں یہ درست نہیں ہے۔جیسا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کو امیر تسلیم کرنے سے انکار فرمایا۔(مرقات ج۳ص ۲۰۰' مراۃ المناجیح ج۲ص ۱۸۶)

۵۵۱ یعنی اب جسے جہاد میسّر ہو وہ جہاد کرے اور جسے میسّر نہ ہو وہ نیت رکھے کہ اللہ عزوجل جب مجھے موقع عطا فرمائے گا جہاد کروں گا کیونکہ جہاد کی نیت بھی ثواب ہے۔آگے جو فرمایا کہ''جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو نکل پڑو''اس میں فرض کفایہ اور فرض عین دونوں داخل ہیں۔یعنی اگر فرض کفایہ کا موقع ہو تو بہ قدر ضرورت لوگ شریک ہوں اور اگر فرض عین کا موقع ہو تو تمام لوگ شریک ہوں۔(مراۃ المناجیح ج۴ص ۲۰۰)

جائے تو نکل پڑو۔ (صحیح بخاری: ۲۷۱۵، صحیح مسلم: ۱۳۵۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۱۵، ص ۲۳۷)

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے' اگر بعض لوگ اس کو انجام دے دیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔ یہی قول مختار ہے اور اسی پر علماء کی اکثریت متفق ہے۔ امام زہری کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر جہاد کو فرض فرمایا ہے خواہ لوگ جہاد کریں یا نہ کریں' جس نے جہاد کر لیا اچھی بات ہے اور جو بیٹھا رہا وہ تیاری میں رہے' اگر اُس سے مدد طلب کی جائے تو مدد کرے' اگر جہاد کے لیے بلایا جائے تو جہاد میں شامل ہو اور اگر اُس کی ضرورت نہ ہو تو بیٹھا رہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ. (النساء: ۹۵)

اپنی جان اور مال سے جہاد کرنے والے مجاہدین کو اللہ نے بیٹھنے والوں پر درجہ میں فضیلت دی ہے اور سب سے اللہ نے حسنٰی (یعنی جنت) کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت کے مطابق سب لوگوں کے ساتھ جنت کا وعدہ ہے' اگر جہاد کا نہ کرنے والا فرض کا تارک ہوتا تو اللہ تعالیٰ اُس سے جنت کا وعدہ نہ فرماتا۔

آیت مذکورہ کا حکم اور اس میں علماء کے اقوال

زیر بحث آیت کے بارے میں علماءِ نسخ کا اختلاف ہے اور اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم (غیر منسوخ) ہے اور مشرکین سے درگزر کرنے کو منسوخ کرنے والی ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے' کیونکہ اس میں تمام لوگوں پر جہاد کا فرض ہونا بیان کیا گیا ہے پھر اس کو درج ذیل آیت سے منسوخ کر دیا گیا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ. (التوبہ: ۱۲۲) مؤمنوں کے لیے ممکن نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ زیر بحث آیت ایک اعتبار سے ناسخ ہے اور ایک اعتبار سے منسوخ ہے۔ جو حصہ ناسخ ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین سے جہاد کرنا واجب ہے' جبکہ پہلے منع تھا۔ اور جو حصہ منسوخ ہے وہ یہ ہے کہ تمام لوگوں پر جہاد کا وجوب ہے۔

جہاد کے طبیعت پر گراں ہونے کی تفسیر

فرمایا: ﴿ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ جہاد کرنا تم پر گراں اور مشکل ہے۔ اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ طبیعت جنگ کرنے کو پسند نہیں کرتی' کیونکہ اس میں مال کا بوجھ' نفس کی مشقت اور جان کا خطرہ ہوتا ہے' نہ یہ بات کہ لوگوں کو جہاد کا خداوندی حکم ناپسند تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جہاد کے ناپسند ہونے اور گراں گزرنے کی بات بھی اُس وقت منسوخ ہوگئی جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے بارے میں یہ خبر دی کہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' یعنی ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت کی۔ (المائدہ: ۷) بعض علماء فرماتے ہیں کہ لوگوں کو جو جہاد کی ناپسندیدگی تھی وہ اُس وقت تھی جب جہاد فرض نہیں ہوا تھا اور اس لیے تھی کہ اس میں خوف' سختی اور دشمن کی کثرت کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ تم لوگ جہاد کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ چھوڑنے سے زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات پہلے سے اس لیے بیان فرمائی تا کہ جہاد کے فرض ہونے کے بعد لوگ اس کو ناپسند نہ کریں۔

﴿ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ ۔ ﴿ عَسٰى ﴾ کا جو لفظ ہے وہ (عربی زبان میں) ''لعلّ'' کی طرح کلام میں شک کی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو پھر یہ یقین کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''عسٰی'' ایک ایسا کلمہ ہے جو کسی چیز کے حصول کی طلب پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا استعمال اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ قائل کو اپنے کلام میں شک ہے بلکہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ کلام سننے والے کو شک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کرنے میں دو نعمتوں میں سے ایک نعمت ضرور ملے گی۔ یا تو کامیابی اور مالِ غنیمت ملے گا یا پھر شہادت اور جنت حاصل ہوگی۔ بعض علماء

فرماتے ہیں کہ بسا اوقات کوئی چیز فی الوقت مشکل ہوتی ہے لیکن وہی چیز مستقبل میں عظیم فوائد کا سبب ہوتی ہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کڑوی دوا پینا' طبیعت اس کو فی الوقت ناپسند اور ناگوار جانتی ہے لیکن مستقبل میں صحت اور تندرستی ملنے کی توقع میں آدمی اس ناگواری اور مشقت کو برداشت کر لیتا ہے۔

﴿ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـٴًـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ﴾ ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔یعنی تم جہاد سے پیچھے رہنے کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لیے بُرا ہے' کیونکہ اس سے مالِ غنیمت اور اجر و ثواب بھی ہاتھ سے جاتا ہے اور دشمن بھی تمہارا خواہش مند ہو جاتا ہے' کیونکہ جب دشمن کو معلوم ہوگا کہ تم لوگوں کا رُجحان عیش و آرام اور سکون کی طرف ہے تو اُس کی توجہ تمہارے ملک کی طرف ہو جائے گی اور وہ تمہیں قتل کرنے کی کوشش کرے گا' اور اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ تمہارے اندر دماغی قوت اور لڑنے کی صلاحیت (بھرپور) موجود ہے تو وہ تمہاری طرف بڑھنے سے گریز کرے گا۔

﴿ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔اللہ کے جاننے سے مراد یہ ہے کہ جہاد میں جو کچھ مال غنیمت' اجر و ثواب اور بھلائی موجود ہے وہ اللہ عزوجل کے علم میں ہے' لیکن تم ان چیزوں کو نہیں جانتے۔مفہوم یہ ہے کہ جب بندہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کا اپنا علم ناقص اور اللہ عزوجل کا علم کامل ہے اور اللہ نے اُسے جو حکم دیا ہے اُس میں بڑی مصلحت ہے تو پھر بندہ پر واجب ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے حکم کو تسلیم کرے' اگرچہ وہ حکم فی الوقت جان پر گراں گزر رہا ہو۔

یَسْـٴَـلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِؕ وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْاؕ وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِۚ وَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں' آپ بتا دیجئے کہ اس مہینے میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے' (لیکن) اللہ کے راستہ سے روکنا اور اللہ پر ایمان نہ لانا اور مسجد حرام سے روکنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے' اور شرانگیزی قتل سے بھی بڑا گناہ ہے' اور (کفار) تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے' یہاں تک کہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اور (یاد رکھو) تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر گیا اور وہ حالت کفر ہی میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ایسے لوگ جہنم والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کے کافروں پر حملہ کا مفصل بیان

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غزوۂ بدر سے دو مہینے پہلے جمادی الآخرہ میں ایک سریہ[۵۵۲] کی شکل میں روانہ کیا' اور اُن کو سریہ کا امیر مقرر فرمایا اور ایک خط لکھ

[۵۵۲] ''سریہ'' صحابہ کرام کے اُس جہادی لشکر کو کہا جاتا تھا جس میں نبی اکرم ﷺ نے شرکت نہ فرمائی ہو اور جس میں آپ نے شرکت فرمائی ہو اُس کو ''غزوہ'' کہا جاتا تھا۔

کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر چل پڑو اور دو دن کا سفر طے کرنے سے پہلے اس خط کو نہ دیکھنا۔ جب دو دن سفر کرنے کے بعد کسی جگہ پر اترو تو اس خط کو کھول کر اپنے ساتھیوں کو پڑھ کے سنا دینا' پھر جو میں نے حکم دیا ہے اُس کے مطابق عمل کرنا اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا۔ اس ارشاد کو سننے کے بعد حضرت عبداللہ دو دن تک چلتے رہے' پھر کسی جگہ اُتر کر خط کھولا تو اُس میں یہ لکھا ہوا تھا: ''بسم الله الرحمن الرحيم أما بعد فسر على بركة الله تعالى بمن تبعك من اصحابك حتى تنزل بطن نخلة فارصد بها عير القريش لعلك تأتينا منها بخير ''یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' نام خدا کے بعد تم اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ اپنے اُن ساتھیوں کے ساتھ چلتے رہو جو تمہاری اتباع کریں' یہاں تک کہ تم وادیٔ نخلہ میں اُترو' وہاں پہنچ کر تم قریش کے ایک قافلہ کی تاک میں رہو' یقیناً تم اس کی وجہ سے ہمارے پاس خیر اور نفع لے کر پہنچو گے۔ انہوں نے یہ خط پڑھ کر کہا: ''سمعا و طاعة'' (یعنی ہم نے سُنا اور اطاعت کی)۔ پھر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے وہ خط بیان کیا اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے زبردستی کرنے سے منع فرمایا ہے' لہٰذا تم میں سے جو شخص شہادت کا خواہش مند ہے وہ ساتھ چلے اور جو ناپسند کرتا ہے وہ واپس چلا جائے۔ پھر حضرت عبداللہ اور ان کے دیگر ساتھی چل پڑے۔ اور یہ کل آٹھ افراد کا گروپ تھا' اُن میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہا' یہاں تک کہ جب وہ حجاز کی ایک جگہ قرع سے اوپر مقام معدن جس کو نجران بھی کہا جاتا ہے' میں پہنچے تو حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان سے ان کا اونٹ گم ہو گیا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں اس اونٹ کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور حضرت عبداللہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ چل پڑے یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں قیام کیا۔ اسی اثناء میں وہاں سے قریش کے قافلہ کا گزر ہوا جو کہ کشمش' چمڑا اور طائف کے دیگر سامان تجارت سے لدا ہوا تھا۔ اس قافلہ میں عمرو بن الحضرمی' حکم بن کیسان' عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور نوفل بن عبداللہ مخزومی موجود تھے۔ جب ان لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کو دیکھا تو ڈر گئے اور صحابہ کے قریب ہی اُتر گئے۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے (اپنے ساتھیوں سے) کہا کہ یہ لوگ تم سے ڈر گئے ہیں لہٰذا تم اپنے میں سے کسی کا بھی سر مونڈ دو تاکہ وہ ان کے سامنے جائے جب وہ لوگ سر منڈا ہوا شخص دیکھیں گے تو اُنہیں اطمینان ہو جائے گا۔ چنانچہ صحابہ نے حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر مونڈ دیا اور وہ قافلہ والوں کے سامنے چلے گئے۔ جب ان لوگوں نے حضرت عکاشہ کو دیکھا تو اُنہیں اطمینان ہو گیا اور (آپس میں ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ یہ قوم عمار ہے لہٰذا ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ یہ جمادی الاخرہ کا آخری دن تھا اور وہ لوگ اسے رجب سمجھ رہے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر آج کی رات تم نے اس قافلہ کو چھوڑ دیا تو یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور تم سے محفوظ ہو جائیں گے۔ سو سب نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ قافلہ والوں سے جنگ کی جائے۔ چنانچہ حضرت واقد بن عبداللہ سہمی نے عمرو بن الحضرمی کو ایک تیر مارا اور اُسے قتل کر دیا۔ عمرو بن الحضرمی مشرکین میں وہ پہلا شخص ہے جو (مسلمانوں کے ہاتھوں) مارا گیا۔ حکم بن کیسان اور عثمان کو قید کر لیا گیا اور یہ دونوں اسلام کے سب سے پہلے قیدی ہیں۔ نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا اور مسلمان اُس کو نہ پکڑ سکے۔ پھر مسلمان اپنے ساتھ اُن کے اونٹوں اور دونوں قیدیوں کو لے کر چل پڑے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ دوسری طرف قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) نے حرمت والے مہینے کو حلال سمجھ لیا ہے اور اس میں خون ریزی کی ہے اور مال وغیرہ لوٹ لیا ہے۔ اہل مکہ نے بھی مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو اس واقعہ سے غیرت اور عار دلائی اور کہا کہ اے صابیو! تم لوگوں نے حرمت والے مہینے کو حلال سمجھ لیا ہے اور اُس میں جنگ کی ہے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی تو آپ نے حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے دیگر ساتھیوں سے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں کو ماہِ حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا'

پھر آپ نے اونٹوں اور دونوں قیدیوں کو روک لیا اور اُس میں سے کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا۔ مزید یہ کہ دیگر مسلمانوں نے بھی اس سریہ میں شریک افراد کے ساتھ اُن کے فعل کی وجہ سے سختی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے جس کا تم لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا تھا؟ یہ بات سریہ والوں پر گراں گزری اور انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ ہلاک ہو گئے اور جو چیزیں قبضہ میں ہیں وہ ساقط ہو گئیں۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے ابن الحضرمی کو قتل کیا اور جب شام ہوئی تو ہم نے رجب کا چاند دیکھا' اس لیے ہمیں نہیں معلوم کہ ابن الحضرمی کو رجب میں قتل کیا ہے یا جمادی الاخرہ میں (اکثر لوگوں کا خیال اسی واقعہ کی طرف ہے)۔ سو اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت نازل فرمائی' اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کو لے کر اُس میں سے خمس (پانچواں حصہ) علیحدہ کیا۔ یہ اسلام کا پہلا خمس تھا اور پہلا مالِ غنیمت تھا جو کہ تقسیم کیا گیا۔ خمس کے بعد بقیہ اونٹوں کو سریہ میں شریک افراد پر تقسیم کر دیا گیا اور اہل مکہ نے بھی اپنے قیدیوں کے لیے فدیہ بھیج دیا' لیکن نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہم دونوں قیدیوں کو اُس وقت تک اپنے پاس رکھیں گے جب تک کہ سعد اور عتبہ ہمارے پاس نہ آئیں' اگر یہ دونوں نہ آئے تو پھر ہم ان کے بدلہ میں دونوں قیدیوں کو قتل کر دیں گے۔ چنانچہ سعد اور عتبہ پہنچ گئے اور نبی اکرم ﷺ نے دونوں قیدی ان کے حوالے کر دیئے۔ حکم بن کیسان تو اسلام لا کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی مدینہ منورہ میں ٹھہرے رہے اور بئر معونہ والے دن شہید ہوئے۔ جبکہ عثمان بن عبد اللہ مکہ مکرمہ چلا گیا اور وہیں حالتِ کفر میں مرا۔ اور نوفل کا حشر یہ ہوا کہ اُس نے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق پار کرنے کے لیے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضاء ٹوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُسے مار ڈالا۔ مشرکین نے قیمت کے بدلہ میں اُس کی لاش کا مطالبہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے اٹھالو یہ لاش بھی خبیث ہے اور اس کی دیت بھی خبیث ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اس کا حکم

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ﴾ میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے اور ﴿الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ سے مراد رجب کا مہینہ ہے (یعنی اے محمد ﷺ! لوگ آپ سے رجب میں جنگ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں) رجب کو ماہِ حرام اس لیے فرمایا کہ اس میں جنگ کرنا حرام ہے۔ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے والے کون لوگ تھے؟ سو اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آیا اُنہوں نے جو کام کیا وہ غلط کیا یا درست کیا؟ اور دوسرا قول یہ ہے کہ سوال کرنے والے مشرکین تھے' انہوں نے صرف مسلمانوں کو ملامت کی غرض سے مذکورہ سوال کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں۔

﴿قُلْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ اُنہیں کہہ دیجئے کہ اس مہینے میں جنگ کرنا ﴿كَبِیْرٌ﴾ یعنی بہت بڑی بات ہے۔ اس آیت کے حکم کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے' اور اس بارے میں دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے (یعنی اس کا حکم منسوخ نہیں ہے) اور حرمت والے مہینہ میں جہاد کے لیے نکلنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ کفار اس میں لڑائی کا آغاز نہ کریں۔ جب آغاز اُن کی طرف سے ہو تو دفاع کے طور پر مسلمان بھی قتال کریں گے۔ حضرت عطاء کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ ''حرمت والے مہینہ میں نہ جہاد کے لیے نکلنا جائز ہے اور نہ قتال کرنا جائز ہے اور زیر بحث آیت منسوخ نہیں ہے''۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ زیر بحث آیت منسوخ ہے۔ اس قول پر علماء کی اکثریت قائم ہے اور یہ صحیح قول ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب اور سلیمان بن یسار (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ حرمت والے مہینہ میں قتال کرنا جائز ہے اور زیر بحث آیت درج ذیل دو آیتوں سے منسوخ ہے:

(۱) فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ . (التوبہ: ۵) تم مشرکین کو جہاں پاؤ اُنہیں قتل کر دو۔

(۲) وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً . (التوبہ: ۳۶) تم تمام مشرکین سے قتال کرو۔

☆ یعنی حرمت والے مہینوں میں اور دیگر مہینوں میں قتال کرو۔

مشرکین کے جرائم اور مسلمانوں کا مشرکین سے لڑنے میں حق بہ جانب ہونا

﴿ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ اس جملہ سے ایک نئی بات کا آغاز ہو رہا ہے۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ تم لوگوں کا مسلمانوں کو حج سے روکنا یا وہ شخص جو مسلمان ہونا چاہتا ہو اُس کو اسلام سے روکنا اور ﴿ كُفْرٌ بِهٖ ﴾ یعنی اللہ کو نہ ماننا اور ﴿ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ یعنی مسجد حرام سے لوگوں کو روکنا اور ﴿ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کو وہاں سے نکالنا (زیادہ بڑا گناہ ہے)۔ رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کو مکہ سے اس طرح نکالا کہ اُنہیں اذیتیں اور تکلیفیں دیں' حتیٰ کہ ان لوگوں نے ہجرت کی اور مکہ کو چھوڑ دیا۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کو "مسجد حرام کا اہل" اس لیے قرار دیا کہ یہی لوگ مسجد حرام کے حقوق کے ذمہ دار تھے' نہ کہ مشرکین۔ ﴿ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ جرائم (راہِ خدا سے روکنا وغیرہ) کا گناہ اللہ کے نزدیک حرمت والے مہینہ میں قتال کرنے سے زیادہ بڑا ہے۔

﴿ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ اس میں فتنہ سے مراد شرک ہے اور قتل سے مراد ابن الحضرمی کا قتل ہے جو کہ حرمت والے مہینہ میں ہوا۔ جب زیر بحث آیت نازل ہوئی تو حضرت عبد اللہ بن انیس اور ایک قول کے مطابق حضرت عبد اللہ بن جحش نے مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو خط لکھا کہ اگر تمہیں مشرکین حرمت والے مہینہ میں قتال کرنے پر ملامت کریں تو تم اُنہیں اس بات پر ملامت کرنا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا اور بیت اللہ سے روک دیا۔

﴿ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ﴾ یعنی اے گروہِ مؤمنین! مشرکین مکہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے اپنے دین یعنی کفر کی طرف پھیر دیں اگر اُن کے بس میں ہو۔ یعنی اگر وہ اس پر قادر ہوں۔ اس جملہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مشرکین کا تم لوگوں کو دین سے پھیر سکنا بعید اور دُور کی بات ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ دشمن اُس پر غالب نہیں آ سکے گا پھر وہ دشمن سے کہے کہ اگر تم مجھ پر غالب آ بھی گئے تو ثابت قدم نہیں رہ سکو گے (اسی طرح یہاں بھی فرمایا گیا کہ اگر مشرکین کے بس میں ہو تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں)۔

آگے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے مشرکین کی پیروی کی اور اُن کے دین کی طرف چلا گیا اور توبہ کرنے سے پہلے اسی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے' یعنی باطل ہو گئے۔

حالت ارتداد میں مرنے والے کے اعمال کا دنیا اور آخرت میں ضائع ہونا

مرتد کے دنیا میں اعمال ضائع ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس کو قتل کیا جائے گا اور اس کی بیوی اُس سے جدا ہو جائے گی' وہ اپنے مؤمن رشتہ داروں کے ترکہ سے حصہ پانے کا بھی حق دار نہیں ہوگا' اور مدد طلب کرنے پر اس کی مدد بھی نہیں کی جائے گی اور اُس کی تعریف و تحسین بھی نہیں کی جائے گی' اور اس کا مال مسلمانوں کے لیے مال فیئی ہوگا۔ یہ تو دنیاوی احکامات ہیں۔ آخرت میں اُس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال پر اجر و ثواب کا حق دار نہیں ہوگا' اُس کا اجر و ثواب ضائع ہو جائے گا۔ زیر بحث آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارتداد پر احکام اُس وقت لاگو ہوتے ہیں جب مرتد حالتِ کفر میں مر جائے' اور اگر مرتد ہونے کے بعد وہ دوبارہ اسلام قبول کر لے تو اس کے لیے ارتداد کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوگا۔ اس آیت میں امام شافعی کے اس مؤقف کا

ثبوت ہے کہ ارتداد سے اعمال اُس وقت ضائع ہوتے ہیں جب مرتد حالتِ ارتداد میں مر جائے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ ارتداد سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اگرچہ مرتد اسلام قبول کر لے۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ یعنی وہ لوگ جو ارتداد اور کفر کی حالت میں مر گئے وہ جہنمی ہیں۔ ﴿خٰلِدُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جہنم سے کبھی نہیں نکلیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں' اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

یہ آیت حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کیا ہمیں ہمارے اس عمل پر اجر وثواب ملے گا یا نہیں؟ اور کیا ہم یہ خواہش کر سکتے ہیں کہ ہمارا یہ سفر جہاد میں شمار ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کا اور ابن الحضرمی کا واقعہ پیش آیا تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو اس سفر میں اگر کوئی گناہ نہیں ملا تو اجر وثواب بھی کوئی نہیں ملا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ہجرت کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے گھر کو' خاندان کو اور مال و دولت کو چھوڑ دیا' اور مشرکین کے ساتھ اُن کے شہروں میں رہن سہن اور اُن کا پڑوس چھوڑ کر دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اطاعت میں مشرکین سے جہاد کیا۔ اس فرمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے سفر کو جہاد قرار دیا۔

﴿يَرْجُوْنَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسے لوگ اللہ کی رحمت کو پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس فرمان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ افراد کے بارے میں یہ بتایا کہ وہ لوگ رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امید سے مراد یہ ہے کہ اجر وثواب کے ملنے کا تو یقین ہے لیکن اُس کی مقدار اور وقت کا یقینی علم نہیں ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کی بہت اچھی تعریف فرمائی ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا کہ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ایسے لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ یہی (صحابہ) اس امت کے بہترین افراد ہیں' پھر اللہ تعالیٰ نے ان افراد کو امید والا قرار دیا۔ جیسا کہ تم نے سنا ہوگا کہ "من رجا طلب ومن خاف هرب"' یعنی جس شخص کو کسی چیز کی امید ہوتی ہے وہ اس کو تلاش کرتا ہے اور جو خوف زدہ ہوتا ہے وہ اُس چیز سے بھاگتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اس میں "غفور" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہوں کو بہت بخشنے والا ہے۔ اور "رحیم" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ اس پورے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کے اُس کام کو معاف فرما دیا ہے جو اُن سے انجانے میں صادر ہوا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَاؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَۙ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِؕ

آپ سے لوگ شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں' آپ بتادیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے' اور لوگوں کے کچھ فوائد بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑا ہے' اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ بتادیجئے کہ جو ضرورت سے زائد ہو' اللہ اسی طرح اپنی آیتیں تمہارے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں غور وفکر کرو O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

اس آیت کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق' حضرت معاذ بن جبل اور انصار صحابہ کرام کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہمیں شراب اور جوئے کا حکم بیان فرمائیں۔ کیونکہ ان چیزوں سے عقل اور مال چلا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

خمر (شراب) کا معنیٰ اور اس کے حرام ہونے کے متعلق نازل ہونے والی آیتوں کا بیان

لغت میں ﴿خمر﴾ کا اصل معنیٰ ہے: چھپانا اور ڈھانپنا۔ چونکہ شراب عقل کے ساتھ جاکر مل جاتی ہے اس لیے اس کو خمر کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ شراب عقل کو چھپا لیتی ہے اور ڈھانپ لیتی ہے' اس لیے اس کو خمر کہتے ہیں۔ شراب کے حرام ہونے کے بارے میں جو بحث ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کے بارے میں چار آیتیں نازل فرمائیں:

ایک آیت جو مکہ میں نازل ہوئی وہ یہ ہے:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا. (النحل:٦٧)
اور (ہم تمہیں) کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے (پلاتے ہیں) تم اُن سے میٹھے مشروب تیار کرتے ہو۔

مسلمانوں کا معمول یہ تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں کھجور اور انگور کی شراب پیتے تھے' اور یہ اُس وقت مسلمانوں کے لیے حلال تھی۔ پھر مدینہ منورہ میں حضرت عمر اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سوال پر زیر بحث آیت نازل ہوئی' جس میں فرمایا کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے۔ اس آیت کی وجہ سے کچھ مسلمانوں نے شراب پینا چھوڑ دیا اور کچھ نے جاری رکھا کیونکہ اسی آیت میں آگے فرمایا: ''ومنافع للناس'' یعنی شراب اور جوئے میں لوگوں کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ کھانے کا اہتمام کیا اور اس میں کچھ صحابہ کرام کو مدعو کیا' دعوت میں انہوں نے کھانا کھلایا اور شراب پلائی' پھر مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو کوئی صحابی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ گئے' اُس میں انہوں نے سورۃ الکافرون کی تلاوت کی اور ''لا اعبد ما تعبدون'' کی جگہ ''اعبد ما تعبدون'' پڑھ دیا اور پوری سورت میں اسی طرح جہاں جہاں ''لا'' تھا اُس کو نہیں پڑھا' تو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ. (النساء:٤٣)
اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ جب تک کہ تمہیں اپنی کہی ہوئی باتیں معلوم نہ ہوں۔

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اوقاتِ نماز میں نشہ کو حرام فرمادیا۔ چنانچہ اب لوگ یہ کرتے کہ نماز عشاء کے بعد شراب پیتے تھے' اور صبح تک نشہ اتر جاتا تھا اس لیے صبح کی نماز پڑھ لیتے تھے اور نماز کے بعد شراب پیتے تو ظہر کی نماز کے وقت بیدار

ہوتے۔پھر ایسا ہوا کہ حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولیمہ کا اہتمام کیا اور کچھ صحابہ کرام کو مدعو کیا' جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔حضرت عتبان نے لوگوں کے لیے اونٹ کے سر کا بھنا ہوا گوشت تیار کیا تھا۔لوگوں نے کھانا کھایا اور اتنی شراب پی کہ سب مدہوش ہو گئے۔پھر (نشہ کی وجہ سے) ایک دوسرے کو اپنے کارنامے اور نسبی کمالات بیان کرنا شروع کر دیئے اور آپس میں اشعار سُنانے لگے۔اسی دوران حضرت سعد نے بھی ایک قصیدہ سنایا' اُس میں اپنی قوم کے کارناموں کا بیان تھا اور انصار کی مذمت تھی۔ایک انصاری نے مذمت سُن کر اونٹ کا جبڑا حضرت سعد کے سر پر مارا جس سے اُنہیں ایسا زخم لگا کہ اُن کے سر کی ہڈی نظر آنے لگی۔حضرت سعد نے جا کر نبی اکرم ﷺ سے انصاری صحابی کی شکایت کر دی۔(جب حضرت عمر نے یہ منظر دیکھا) تو دُعا کی: "اللهم بيّن لنا في الخمر بيانا شافيا" اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے متعلق کوئی واضح اور تسلی بخش حکم بیان فرما دے۔ایک روایت کے مطابق واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن شراب پی کر گھر سے باہر نکلے تو انصار کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی' اُس کے ہاتھ میں اُس کا اونٹ تھا جس پر پانی لادا جاتا تھا۔اور وہ اپنی قوم کی تعریف کرتے ہوئے کعب بن مالک کے یہ دو اشعار پڑھ رہا تھا:

جمعنا مع الایواء نصرا وهجرة — فلم یر حیّ مثلنا في المعاشر

فأحياءنا خير أحياء من مضى — وامواتنا خير اهل المقابر

"یعنی ہمارا قبیلہ مدد کرنے اور ہجرت کرنے میں تیز رہتا ہے اور کسی بھی جماعت میں ہمارے قبیلہ کی مثال نظر نہیں آتی۔جو لوگ گزر گئے اُن کے جتنے بھی زندہ لوگ ہیں اُن سب میں ہمارے زندہ لوگ بہتر ہیں اور ہمارے مُردے قبرستان کے تمام مُردوں سے بہترین ہیں"۔حضرت حمزہ نے ان اشعار کو سُن کر کہا کہ یہ مہاجرین کے بارے میں ہیں۔انصاری نے کہا: نہیں' بلکہ یہ انصار کے متعلق ہیں۔اس بات پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور حضرت حمزہ نے اپنی تلوار نکال لی' تلوار لے کر انصاری کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اپنا اونٹ چھوڑ کر بھاگ گیا۔حضرت حمزہ نے اُس اونٹ کو کاٹ دیا۔اتنے میں وہ انصاری دوڑتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت حمزہ نے جو کچھ کیا تھا اُس کی مکمل خبر دی۔تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کو ایسا ہی ایک اونٹ دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس واقعہ کو دیکھ کر دُعا کی: اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے متعلق کوئی واضح اور تسلی بخش حکم بیان فرما دے۔سو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیتِ مبارکہ نازل فرمائی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ: ۹۰۔۹۱)

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض ناپاک ہیں شیطانی کاموں میں سے ہیں' لہٰذا تم ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۝ شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے' تو کیا تم باز آنے والے ہو؟۝

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان آیات کو سُن کر کہا کہ اے میرے رب! ہم باز آ گئے۔یہ واقعہ غزوۂ احزاب کے کچھ دنوں بعد پیش آیا۔

شراب کو بالترتیب اور درجہ بدرجہ حرام کرنے کی حکمت اور اس کا فائدہ

مذکورہ ترتیب سے شراب کو حرام کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ لوگوں کو شراب سے محبت ہے اور اس میں

لوگوں کا بہت فائدہ بھی ہے۔ اگر یک دم لوگوں کو شراب سے روک دیا جاتا تو یہ ان کے لیے مشکل کا باعث ہو جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تدریج کو اختیار فرمایا (یعنی وقفہ وقفہ سے حکم نازل فرمایا) اور لوگوں کے لیے نرمی اور آسانی کو اختیار فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شراب کو حرام کر دیا گیا حالانکہ اُس وقت اہل عرب کے لیے شراب سے زیادہ پرلطف عیش و عشرت کا سامان کوئی نہیں تھا' اور اہل عرب پر شراب سے بڑھ کر کوئی چیز حرام نہیں کی گئی۔

(۲۷۹) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ''فَضِیخ'' (کھجوروں کا کچا شیرہ جو پڑے پڑے جوش کھا کر جھاگ چھوڑ دے) کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور شراب نہیں ہوتی تھی۔ میں حضرت ابوطلحہ' حضرت ابوایوب اور دیگر صحابہ کو کھڑے ہو کر یہی شراب پلا رہا تھا' اچانک ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ تو صحابہ نے کہا: اے انس! شراب کے ان مٹکوں کو بہا دو۔ اس آدمی کی خبر کے بعد لوگوں نے نہ کبھی شراب پی نہ کبھی اس خبر کے متعلق کوئی سوال کیا۔

(صحیح بخاری: ۴۶۱۷' صحیح مسلم: ۱۹۸۰' سنن ابوداؤد: ۳۶۷۳' مسند احمد ج ۳ ص ۲۲۷' سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۸۶)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''فَضِیخ'' اس سے مراد وہ شراب ہے جو کھجوروں سے بنائی جائے۔ اسی سے عربی میں ایک لفظ آتا ہے: ''مفضوخ'' ایسی چیز جو شکستہ اور ٹوٹی ہوئی ہو۔ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''اھرق'' یہ ''اھراق'' سے ہے' بمعنیٰ بہانا۔ ایک لفظ ''قِلال'' آیا ہے' یہ ''قُلَّۃ'' کی جمع ہے' بمعنیٰ بڑا مشکیزہ۔

احادیث کی روشنی میں شراب کے حرام ہونے کا بیان

امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شراب حرام ہے اور اس کے پینے والے پر حد جاری کی جائے گی' اور جو شخص اس کو حرام سمجھتے ہوئے پیئے گا وہ فاسق ہوگا اور اگر حلال سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا اور ایسے شخص کو قتل کرنا واجب ہوگا۔

(۲۸۰) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے' جس شخص نے دنیا میں شراب پینے پر ہمیشگی اختیار کی اور اسی حالت میں مر گیا تو وہ آخرت میں (جنت کی) شراب نہیں پیئے گا۔ (صحیح بخاری: ۵۵۷۵' صحیح مسلم: ۲۰۰۳' سنن ترمذی: ۱۸۶۱' سنن ابوداؤد: ۳۶۷۹' سنن نسائی: ۵۶۷۳-۵۷۰۱' سنن ابن ماجہ: ۳۳۷۳' سنن دارمی: ۲۰۹۰' مسند احمد ج ۲ ص ۱۹-۲۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۳۸-ص ۳۱۷)

(۲۸۱) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص یمن کے شہر جیشان سے آیا اور اُس نے نبی اکرم ﷺ سے اُس شراب کے متعلق سوال کیا جو اُس کے علاقہ میں لوگ پیا کرتے تھے' وہ جوار سے بنائی جاتی تھی اور اس کو ''مِزْر'' کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ نشہ آور ہوتی ہے؟ اُس شخص نے کہا: جی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جو شخص بھی نشہ آور چیز پیئے گا اُس کے لیے اللہ عزوجل کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اس کو ''طِیْنَۃُ الْخَبَال'' پلائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ''طینۃ الخبال'' کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ (اس سے مراد) جہنمیوں کا پسینہ ہے یا فرمایا کہ جہنمیوں کا نچوڑ۔ (صحیح مسلم: ۲۰۰۲' سنن نسائی: ۵۷۰۹' مسند احمد ج ۳ ص ۳۶۱' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۳۹-ص ۳۱۷)

(۲۸۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ جو شخص نشہ آور چیز پیئے گا اُس کی صبح کی چالیس نمازیں (اُس کے نامۂ اعمال سے) گھٹا دی جائیں گی۔ اگر اُس نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمالے گا اور اگر چوتھی بار اسی طرح کیا تو اُس کو اللہ تعالیٰ لازماً ''طینۃ الخبال'' پلائے گا۔ پوچھا گیا: یارسول اللہ! ''طینۃ الخبال'' کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ (اس سے مراد) جہنمیوں کا پیپ ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۶۸۰)

(۲۸۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے شراب پی اور اس کو پیٹ میں پہنچا دیا اُس کی سات نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو وہ ناشکری کی حالت میں مرا۔ پھر اگر شراب نے اس کی عقل کو کسی فرض سے اور ایک روایت کے مطابق قرآن سے دور کر دیا تو اُس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو وہ ناشکری کی حالت میں مرا۔ (سنن نسائی:۵۶۶۹)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں سے فرمایا: شراب سے بچو، کیونکہ وہ تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ خدا کی قسم! ایمان اور شراب پینا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ (اگر کہیں جمع ہو گئے تو) ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز دوسری چیز کو نکال دے۔ (سنن نسائی:۵۶۶۶)

☆ اس حدیث کو امام نسائی نے موقوفاً ذکر کیا ہے، اور اس کا ایک مکمل واقعہ ہے۔

(۲۸٤) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے شراب کے حوالہ سے دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے: (۱) شراب بنانے والا (۲) شراب بنوانے والا (۳) شراب پینے والا (۴) شراب پلانے والا (۵) شراب کو لے جانے والا (٦) جس کے لیے لے جائی جائے (۷) شراب بیچنے والا (۸) شراب خریدنے والا (۹) شراب دینے والا (۱۰) شراب کی قیمت کھانے والا۔ (سنن ترمذی:۱۱۹۵، سنن ابن ماجہ:۳۳۸۱، مشکوٰۃ المصابیح:۲۷۷٦، ص۲۴۲)

شراب کے متعلق شرعی احکام کا بیان

پہلا مسئلہ: شراب کی حقیقت کے بارے میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا موقف اور دلائل: خمر (شراب) کس چیز کو کہتے ہیں؟ اس بارے میں امام شافعی کا قول یہ ہے کہ "خمر" انگور کے اُس تیز اور کچے شیرہ کو کہتے ہیں جو جھاگ چھوڑ دے۔ اسی طرح کشمش اور چھواروں کا مشروب اور شہد، گندم، جَو، چاول، جوار سے بنائی ہوئی شراب اور ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو وہ "خمر" ہے۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ انگور سے جو شراب بنائی جائے وہ "خمر" ہے[۵۵۳] اور کھجور، چھواروں اور کشمش سے جو مشروب تیار کیا جائے اس کو اگر اتنا پکالیا جائے کہ اس کا دو تہائی (۲/۳) اُڑ جائے تو اس کا پینا جائز ہے، اور اس کی جو مقدار نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال جن روایات سے ہے اُن میں ایک وہ ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے اپنے کسی گورنر کو خط لکھا کہ لوگوں کو تم طلاء (یعنی انگور کا پکا ہوا وہ شیرہ) دے دو جس کا دو تہائی (۲/۳) حصہ (پکانے سے) اُڑ گیا ہو اور ایک تہائی (۱/۳) حصہ باقی رہ گیا ہو۔ (سنن نسائی:۵۷۱۵) ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خط میں لکھا کہ: تم لوگ اپنی شراب کو پکاؤ، یہاں تک کہ اس میں سے شیطان کا حصہ چلا جائے، کیونکہ اُس میں شیطان کے دو حصے ہیں اور تمہارا ایک حصہ ہے[۵۵۴]۔ (سنن نسائی:۵۷۱۷)

امام ابوحنیفہ کا استدلال اُس روایت سے بھی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے

---

۵۵۳ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خمر کی مکمل تعریف اس طرح ہے کہ: انگور کا کچا شیرہ جو سڑ کر جھاگ چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ دیگر چیزوں سے جو مشروب بنائے جاتے ہیں اُن کے نام مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے اس موقف میں یہ بات واضح رہے کہ خمر قطعی طور پر حرام ہے اس کا ایک قطرہ پینا بھی موجب حد ہے جبکہ دیگر مشروبات جو نشہ آور ہوں وہ بھی حرام ہیں لیکن اُن کی حرمت قطعی نہیں ہے بایں معنیٰ کہ اس کا منکر کافر نہیں ہوگا اُن کے پینے والے پر حد شرعی اس وقت جاری ہوگی جب ان سے نشہ آئے۔

۵۵۴ اس حدیث میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں طلاء کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خمر ایک علیحدہ چیز ہے اور دیگر شرابوں کے اپنے نام ہیں۔ دوسرا یہ کہ طلاء کو جب اتنا پکایا جائے کہ اُس کا دو تہائی حصہ اڑ جائے تو اس کا استعمال جائز ہے کیونکہ اس صورت میں وہ نشہ آور نہیں رہتی۔ ہاں اس کی نشہ آور مقدار کو پینا جائز نہیں ہے۔ (طلاء کو باذق بھی کہتے ہیں۔)

ہیں کہ جو چیز ''خــمــر'' ہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ (بہر حال) حرام ہے اور ہر مشروب کی وہ مقدار جو نشہ آور ہو (وہ بھی حرام ہے[۵۵۵])۔ (سنن نسائی:۵۶۸۴' سنن بیہقی ج۸ص۲۹۷) ہر مشروب کی جو مقدار نشہ آور ہو اُس کے حرام ہونے پر امام ابوحنیفہ کا استدلال اُس روایت سے بھی ہے جو از ابوالاحوص از سماک از قاسم بن عبدالرحمٰن از عبدالرحمٰن از ابو بردہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۸۵) پیو اور نشہ کو نہ پہنچو۔[۵۵۶] (سنن نسائی:۵۶۷۷' سنن بیہقی ج۸ص۲۹۸)

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے لیکن امام نسائی نے اس کو غیر ثابت قرار دیا ہے۔[۵۵۷]

امام شافعی کا جو موقف ہے کہ ''خــمــر'' کئی چیزوں سے بنائی جاتی ہے اس پر امام شافعی کا استدلال اُس روایت سے ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر رسول ﷺ پر فرمایا: (حمد و صلوٰۃ کے) بعد! اے لوگو! ''خــمــر'' (یعنی شراب) کے حرام ہونے کا حکم نازل ہو چکا ہے۔ اور خمر پانچ چیزوں سے بنائی جاتی ہے: انگور' چھوارے' شہد' گندم اور جو۔ اور خمر وہ مشروب ہے جو عقل کو ڈھانپ لے[۵۵۸] تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میں چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں اُن کے متعلق خاص حکم ارشاد فرما دیتے' دادا اور کلالہ کی وراثت کا مسئلہ[۵۵۹] اور سُود کے چند ابواب۔

(صحیح بخاری:۵۵۸۸' صحیح مسلم:۳۰۳۲' سنن ابوداؤد:۳۶۶۹' سنن نسائی:۵۵۷۸' صحیح ابن حبان:۵۳۵۳' سنن بیہقی ج۸ص۲۸۹' سنن دار قطنی

۵۵۵ اس میں امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی تائید اس طور پر ہے کہ اس میں خمر اور دیگر شرابوں کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خمر کی اپنی ایک حقیقت ہے۔ دوسرا یہ کہ خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی اُس مقدار کو پینا حرام ہے جو نشہ آور ہو۔ جبکہ خمر کے حرام ہونے میں نشہ آور ہونے کی قید نہیں ہے۔

۵۵۶ یہ ارشاد اُن مشروبات کے بارے میں ہے جو خمر کے علاوہ ہیں۔ لہٰذا اس سے بھی امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی تائید واضح ہے کہ خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی وہ مقدار حرام ہے جو نشہ آور ہو۔

۵۵۷ امام نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کو غیر ثابت اس لیے قرار دیا ہے کہ اس روایت میں ایک عورت قرصافہ ہے اور یہ ایک مجہول عورت ہے۔ ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ روایت غیر ثابت ہے تو احناف کے لیے اس میں کوئی ضرر نہیں ہے کیونکہ اس کا مفہوم ابوالاحوص کی گذشتہ روایت سے ثابت ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ابوالاحوص کی روایت کو امام نسائی نے منکر قرار دیا ہے' جیسا کہ علامہ خازن آگے ذکر کریں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ روایت صحیح ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ:۵۷۲

۵۵۸ امام شافعی کا استدلال اس سے واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انگور' شہد' گندم' جو اور چھواروں سے بنائی جانے والی شراب کو خمر قرار دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خمر کا اطلاق صرف انگوری شراب پر نہیں ہوتا بلکہ دیگر شرابیں بھی خمر میں داخل ہیں۔ احناف کی طرف سے اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں خمر اُسی شراب کو کہا جاتا ہے جو انگور سے بنائی جائے۔ (کتب لغت میں اس کی تائید موجود ہے) البتہ احادیث و آثار میں جہاں دیگر مشروبات کو خمر کہا گیا ہے وہ اطلاق مجازی کے طور پر ہے۔ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی فرماتے ہیں کہ انگور کا کچا شیرہ جب نشہ آور ہو جائے تو اس کو خمر کہتے ہیں' اہل لغت اور اہل علم کے نزدیک خمر کا یہی معنیٰ معروف ہے۔ بعض ائمہ ہر نشہ آور چیز کو خمر کہتے ہیں اور دلیل میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور عقلی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خمر کا لفظ مخامرۃ العقل سے ماخوذ ہے اور یہ معنیٰ ہر نشہ آور چیز میں پایا جاتا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ انگور کے نشہ آور شیرہ کو خمر کہتے ہیں اسی بناء پر خمر کا استعمال صرف اسی معنیٰ میں مشہور ہے۔ دیگر مشروبات کو جو خمر کہا جاتا ہے وہ مخامرۃ العقل کے معنیٰ کی وجہ سے نہیں کہا جاتا بلکہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر خمر کی طرح شدت اور قوت رکھتے ہیں۔ (یعنی یہ اطلاق بہ طور مجاز و استعارہ ہے۔) (ہدایہ اخیرین ص۴۹۲' شرح صحیح مسلم ج۶ص۱۸۷) سو اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انگور' شہد' گندم' جو اور چھواروں سے بنائی جانے والی شراب کو خمر قرار دینا بر بنائے مجاز ہے۔ لہٰذا یہ روایت احناف کے موقف کے خلاف نہیں ہے۔

۵۵۹ کلالہ اُس مرد و عورت کو کہتے ہیں جو اپنے مرنے کے بعد نہ والدین چھوڑے نہ اولاد۔

ج ۴ص ۲۵۱' مشکوۃ المصابیح: ۳۶۳۵ - ص ۳۱۷)

امام شافعی کا استدلال درج ذیل روایات سے بھی ہے:

(۲۸۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے "بتع" (شہد سے بنائی جانے والی شراب) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔[۵۶۰] "بتع" ایک ایسا مشروب تھا جو شہد سے بنایا جاتا تھا اور اہل یمن اس کو پیا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری: ۵۵۸۵-۵۵۸۶' صحیح مسلم: ۲۰۰۱' سنن ابوداؤد: ۳۶۸۲' سنن نسائی: ۵۵۹۲' مؤطا امام مالک: ۱۶۲۲' مشکوۃ: ۳۶۳۷-ص ۳۱۷)

(۲۸۷) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انگور کی بھی خمر (شراب) ہوتی ہے' گندم کی بھی ہوتی ہے' جَو کی بھی ہوتی ہے اور چھواروں کی بھی ہوتی ہے۔ یہ روایت ابوداؤد کی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جوار کی بھی خمر (شراب) ہوتی ہے اور میں تم لوگوں کو ہر نشہ آور چیز سے روکتا ہوں۔ ترمذی میں بھی حدیث اسی طرح ہے' البتہ امام ترمذی نے اس اضافہ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ شہد کی بھی خمر (شراب) ہوتی ہے۔[۵۶۱]

(سنن ابوداؤد: ۳۶۷۶-۳۶۷۷' سنن ترمذی: ۱۸۷۲' سنن ابن ماجہ: ۳۳۷۹)

(۲۸۸) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے "باذَق" (یعنی انگور کا ایسا شیرہ جس کو پکالیا گیا ہو) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ اس کے بارے میں (سیدنا) محمد (ﷺ) پہلے ہی حکم بیان فرما چکے ہیں۔ لہٰذا جو چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔ سائل نے کہا: جو مشروب حلال اور پاکیزہ ہو (اُس کا بھی یہی حکم ہے)؟ تو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ کے بعد حرام اور ناپاک ہی (کا درجہ) ہے۔[۵۶۲] (صحیح بخاری: ۵۵۹۸' سنن نسائی: ۵۶۰۶)

---

[۵۶۰] اس سے امام شافعی کا استدلال اس طور پر ہے کہ اس میں قلیل وکثیر کی قید کے بغیر ہر نشہ آور مشروب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو مشروب بھی نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے اور کثیر بھی۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ مشروبات میں صرف خمر وہ مشروب ہے جس کی قلیل اور کثیر دونوں مقداریں حرام ہیں' اس کے علاوہ دیگر مشروبات کی وہی مقدار حرام ہے جو نشہ آور ہو۔ زیر بحث حدیث میں جو فرمایا کہ "ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے" اس سے مراد بھی یہی ہے کہ خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی نشہ آور مقدار حرام ہے۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ "**حرمت الخمر بعینها القلیل منها والکثیر والمسکر من کل شراب**"۔ جو مشروب "خمر" ہو وہ حرام ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ (اس کے علاوہ دیگر) مشروبات میں سے نشہ آور کو حرام کیا گیا ہے۔ (اس روایت کی مفصل تحقیق کے لیے ملاحظہ فرمائیے: شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۹۰' عمدۃ القاری ج ۲ ص ۶۸۶)

[۵۶۱] اس کا جواب حاشیہ: ۵۵۸ میں ملاحظہ فرمائیے۔

[۵۶۲] امام شافعی کا استدلال اس سے اس طور پر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سائل کے جواب میں فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ باذَق کو پہلے ہی حرام فرما چکے ہیں۔ یعنی حقیقۃً یہ خمر ہے' اس کو باذَق یا کوئی اور نام دے کر حلال نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دیگر مشروبات کے اگرچہ مختلف نام ہیں لیکن حقیقۃً وہ سب خمر ہیں۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سائل کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ خمر ہے یا نبی اکرم ﷺ چونکہ خمر کو حرام فرما چکے ہیں لہٰذا یہ بھی حرام ہے' بلکہ آپ نے جواباً فرمایا کہ: "نبی اکرم ﷺ پہلے ہی اس کا حکم بیان فرما چکے ہیں اور جو چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے"۔ اس جملہ میں پہلا حصہ مبہم ہے اور بعد والا حصہ اس کی تفسیر کر رہا ہے' یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مراد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پہلے ہی ضابطہ بیان فرما چکے ہیں کہ جو چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے اور یہ معنیٰ احناف کے مؤقف کے خلاف نہیں ہے بلکہ احناف کی اس میں تائید ہے کہ اس میں باذَق کے متعلق سوال کرنے پر نشہ آور مقدار کے حرام ہونے کا حکم بیان کیا گیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ باذَق خمر نہیں ہے کہ اگر وہ خمر ہوتی تو نشہ آور مقدار کو حرام قرار نہ دیا جاتا بلکہ مطلقاً اس کے حرام ہونے کا حکم بیان کیا جاتا۔ لہٰذا امام شافعی کا اس حدیث سے باذَق کے خمر ہونے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ (امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر اس حدیث سے وہ استدلال کریں جو انہوں نے حدیث: ۲۸۶ سے کیا ہے تو اس کا جواب حاشیہ: ۵۶۰ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔)

☆ صاحب مطالع فرماتے ہیں کہ ''بــاذَق'' انگور کے اُس شیرہ کو کہتے ہیں جس کو پکالیا گیا ہو۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس شراب کو بنایا اور اس کا نام ''بــاذَق'' رکھا وہ بنو اُمیہ کے لوگ ہیں۔ انہوں نے اس کا نام ''بــاذَق'' اس لیے رکھا تا کہ اس پر ''خــمــر'' کا نام نہ آ سکے۔ (لیکن) ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو وہ ''خــمــر'' ہے[۵۶۳] کیونکہ محض نام کی وجہ سے کوئی لفظ اپنے اُس معنیٰ سے خارج نہیں ہو جاتا جو اُس کے اندر موجود ہے۔ علامہ ابن اثیر ''نہایہ'' میں فرماتے ہیں کہ ''باذَق'' خمر ہے اور فارسی میں ''خــمــر'' (شراب) کو ''بادہ'' کہتے ہیں تو ''باذَق'' اسی لفظ کا معرَّب ہے۔[۵۶۴] اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''سبق'' اس سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ''بــاذَق'' شراب موجود نہیں تھی۔ یا یہ مراد ہے کہ ''بــاذَق'' اور اس جیسی دیگر شرابوں کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان پہلے ہی آ چکا ہے۔ بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پہلے ہی حکم بیان فرما چکے ہیں کہ جو چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔

(۲۸۹) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اُس چیز سے منع فرمایا ہے جو مسکر اور مفتر ہو (یعنی نشہ آور ہو اور جسم میں ڈھیلا پن پیدا کر دے)۔[۵۶۵] (سنن ابوداؤد: ۳۶۸۶' مسند احمد ج ۶ ص ۳۰۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۵۰۔ ص ۳۱۸)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''مــفــتّر'' اس سے مراد ہر وہ مشروب ہے جو جسم کو گرم کر دے۔ ایسے مشروب کو پینے کے بعد جسم میں ڈھیلا پن اور کمزوری آتی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ''جس مشروب کا کثیر حصہ نشہ آور ہو اُس کا قلیل بھی حرام ہے'' اس پر امام شافعی کا استدلال اُس روایت سے ہے جو حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۹۰) جس مشروب کا کثیر حصہ نشہ آور ہو اُس کا قلیل بھی حرام ہے۔[۵۶۶]

(سنن ابوداؤد: ۳۶۸۱' سنن ترمذی: ۱۸۶۵' سنن ابن ماجہ: ۳۳۹۳' المستدرک ج ۳ ص ۴۱۳' مسند احمد ج ۳ ص ۳۴۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۴۵۔ ص ۳۱۷)

---

۵۶۳ اگر صاحب مطالع کی مراد اس سے خمر حقیقی ہے تو یہ قول درست نہیں ہے' کیونکہ ائمہ لغت کے اتفاق سے حقیقی خمر وہی ہے جو انگور سے بنائی جائے اور اگر صاحب مطالع کی مراد اس سے یہ ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر کی طرح ہے تو یہ احناف کے خلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ حاشیہ: ۵۵۷ میں واضح کیا جا چکا ہے کہ دیگر مشروبات پر مجاز اور استعارہ کے طور پر خمر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

۵۶۴ علامہ ابن اثیر کے علاوہ دیگر ائمہ لغت نے بھی باذق کی تشریح کرتے ہوئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اطلاق مجازی ہے کیونکہ یہی ائمہ لغت خمر کی بحث میں فرماتے ہیں کہ حقیقۃً خمر وہ (شراب) ہے جو انگور سے بنائی جائے۔

۵۶۵ اس حدیث شریف سے استدلال اور اس کے جواب کی وضاحت وہی ہے جو عمدۃ القاری کے حوالہ سے حاشیہ: ۵۶۰ میں کی جا چکی ہے۔

۵۶۶ صاحب ہدایہ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو یحییٰ بن معین نے مطعون قرار دیا ہے۔ (ہدایہ آخرین ص ۴۹۳) صاحب عنایہ علامہ بابرتی ہدایہ کی اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن معین نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور یحییٰ بن معین امام' حافظ اور ثقہ ہیں حتیٰ کہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو یحییٰ بن معین نہ پہچانیں وہ حدیث نہیں ہے۔ (عنایہ مع فتح القدیر ج ۱۰ ص ۹۳) دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ حدیث ثابت ہو تو اس کا حکم منسوخ ہے۔ یعنی ابتداء میں جب شراب کی محبت دلوں میں تھی اس وقت خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی قلیل مقدار کو حرام قرار دیا گیا تا کہ ان کی قلیل مقدار کثیر کی طرف نہ لے جائے۔ حتیٰ کہ شراب کے مختلف برتنوں کا استعمال بھی اُس وقت اسی لیے حرام قرار پایا کہ ان کے استعمال سے شراب کی محبت نہ لوٹ آئے۔ بعد میں جب نبی اکرم ﷺ نے مذکورہ برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی اور فرما دیا کہ پیو اور نشہ کو نہ پہنچو تو اس سے خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی قلیل مقدار کا حرام ہونا منسوخ ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ علامہ خازن کی پیش کردہ یہ حدیث یا تو ثابت نہیں ہے اور اگر ثابت ہے تو منسوخ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۲۰۳)

(۲۹۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس چیز کا ایک فرق پینے سے نشہ ہو جائے تو اس کو چلو بھر پینا بھی حرام ہے۔[۵۶۷]

(سنن ترمذی: ۱۸۶۶، سنن ابوداؤد: ۳۶۸۷، مسند احمد ج ۶ ص ۱۳۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۴۶۔ ص ۳۱۷)

☆ فَرَق ایک پیمانہ ہے جس میں ۱۹ رطل بغدادی (یعنی تقریباً دس کلو) چیز سما جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کے دلائل کے جوابات

امام ابوحنیفہ نے اپنے مؤقف پر استدلال کرتے ہوئے طلاء کے متعلق حضرت عمر کے جس ارشاد کو پیش کیا تھا اُس کا جواب یہ ہے کہ وہ اُس روایت کے مخالف ہے جو حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ایک مرتبہ) کسی شخص کے بارے میں یہ گمان کر کے کہ اُس نے ''طــلاء'' پی ہے، ارشاد فرمایا کہ مجھے فلاں شخص سے شراب کی بُو آئی ہے، میں اُس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اُسے نشہ ہو جاتا ہے تو میں (سزا کے طور پر) کوڑے لگاؤں گا۔ چنانچہ آپ نے اُس شخص کے متعلق پوچھا تو آپ کو بتایا گیا کہ اُسے نشہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے اُس پر پوری حد جاری کی اور اُسے کوڑے لگائے۔[۵۶۸] (صحیح بخاری، تعلیقاً کتاب الاشربۃ، باب: ۱۰، سنن نسائی: ۵۷۰۸، مؤطا امام مالک: ۱۶۱۴)

امام ابوحنیفہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جس روایت سے استدلال کیا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرت ابن عباس پر موقوف ہے (یعنی مرفوع نہیں ہے) اور یہ روایت خود حضرت ابن عباس کی اُس روایت کے مخالف ہے جو اُن سے ''باذَق'' سے متعلق مروی ہے۔[۵۶۹] (دیکھیے: ۲۸۸) امام ابوحنیفہ کی پیش کردہ روایت میں حضرت ابن عباس کا جو قول ہے کہ

---

۵۶۷ مراد یہ ہے کہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اُس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب گذشتہ حاشیہ میں اور حاشیہ: ۵۶۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵۶۸ یہ روایت نہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف کے خلاف ہے نہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گذشتہ ارشاد کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے مؤقف کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خمر کے علاوہ دیگر مشروبات (مثلاً طلاء وغیرہ) کی نشہ آور مقدار کی حرمت ہی کے قائل ہیں اور ان دونوں روایتوں کی دلالت بھی اسی پر ہے۔ پہلی روایت کی دلالت تو واضح ہے، دوسری روایت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طلاء پینے والے شخص کے نشہ کی تحقیق اور پوچھ گچھ کرنا بھی اسی بات کا ثبوت ہے کہ خمر کے علاوہ دیگر مشروبات کی وہ مقدار حرام ہے جو نشہ آور ہو۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طلاء کے مطلقاً حرام ہونے کے قائل ہوتے تو طلاء پینے والے کے نشہ کی تحقیق نہ فرماتے۔ لیکن روایات سے بہت واضح طور پر یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طلاء کے مطلقاً حرام ہونے کے قائل نہیں تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دونوں روایات میں باہم کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے۔

۵۶۹ علامہ خازن نے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیش کردہ روایت ابن عباس پر دو اعتراضات کیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مرفوع نہیں ہے دوسرا یہ کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اُس روایت کے مخالف ہے جس میں باذَق کا تذکرہ ہے۔ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جو روایت حضرت امام ابوحنیفہ نے پیش کی ہے وہ حکماً مرفوع ہے۔ ہمارے استاذ حدیث حضرت مفسر قرآن علامہ غلام رسول سعیدی صاحب مدظلہ العالی نے شرح صحیح مسلم میں مستند کتب احادیث سے اس روایت کے دس طرق بیان کیے ہیں اور صاحب مجمع الزوائد حافظ نورالدین الہیثمی کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ اس روایت کی بعض اسانید کے تمام راوی صحیح ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ یہ حدیث حکماً مرفوع ہے اس لیے فقہاء احناف کا اس حدیث سے یہ استدلال بالکل صحیح ہے کہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار حلال ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۹۰) علامہ خازن کے دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جس روایت میں باذَق کا تذکرہ ہے وہ نہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف کے خلاف ہے نہ حضرت ابن عباس کی اپنی روایت کے خلاف ہے۔ تفصیل کے لیے حاشیہ: ۵۶۳ ملاحظہ فرمائیے۔

''ہر مشروب کی وہ مقدار جو نشہ آور ہو وہ حرام ہے''۔اس کو حفاظِ حدیث نے روایت کیا ہے۔اس میں ایک لفظ ''سَــکَــرٌ'' ہے۔ صاحب الغریبین فرماتے ہیں کہ سکر عجمیوں کی شراب ہے اور ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو اُس کو سکر کہا جاتا ہے۔اس کو امام احمد بن حنبل نے بھی روایت کیا ہے' اُس میں مُسکر کا لفظ ہے۔اور موسیٰ بن ہارون نے اس کو درست قرار دیا ہے۔

امام ابو حنیفہ نے ابوالاحوص کی جس روایت سے استدلال کیا ہے اُس میں دو وہم ہیں۔ایک وہم اس روایت کی سند میں ہے۔کیونکہ اس میں حضرت ابو بردہ کا تذکرہ ہے' حالانکہ اس کو سماک نے قاسم سے اور قاسم نے ابن بُریدہ سے اور ابن بُریدہ نے اپنے والد بُریدہ سے روایت کیا ہے[۵۷۰] دوسرا وہم اس روایت کے متن میں ہے' کیونکہ اس میں ہے کہ ''پیو اور نشہ کو نہ پہنچو'' جبکہ محدثین نے اس کو یوں روایت کیا ہے کہ نشہ آور چیز نہ پیو[۵۷۱] اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جو از محارب بن دثار از ابن بریدہ از بریدہ مروی ہے کہ:

(۲۹۲) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہیں چمڑے کے برتنوں میں پینے سے منع کیا تھا' اب ہر برتن میں پیا کرو' البتہ نشہ آور چیز کو نہ پیو۔(صحیح مسلم:۱۹۹۹' سنن بیہقی ج۸ص۳۱۱)

ابوالاحوص کی جو روایت ہے اس کے بارے میں امام نسائی فرماتے ہیں کہ ''یہ حدیث منکر ہے' اس میں ابوالاحوص سلام بن سلیم نے غلطی کی ہے۔ہم نہیں جانتے کہ سماک کے اصحاب میں سے کسی نے ابوالاحوص کی متابعت کی ہو''۔[۵۷۲] امام ابو حنیفہ نے

---

۵۷۰ بعض ائمہ نے یہی فرمایا کہ زیرِ بحث حدیث از سماک از قاسم از ابن بُریدہ مروی ہے (اس صورت میں ابوالاحوص کا اس کو از ابو بردہ روایت کرنا وہم فی السند ہے اور وہم خواہ سند میں ہو یا متن میں حدیث کے معلّل ہونے کا سبب ہے) جبکہ بعض ائمہ نے اس کو از سماک از قاسم بن عبدالرحمٰن از عبدالرحمٰن از ابو بردہ ذکر کیا ہے۔علامہ ابن اثیر نے حضرت بُریدہ کے احوال میں اس روایت کو ذکر نہیں کیا' البتہ حضرت ابو بُردہ کے احوال میں اس کو ذکر کیا ہے۔(دیکھئے:اسد الغابہ ج۶ص۲۸) نیز اس روایت پر جو بھی طعن یا اشکال ہے وہ یا تو ابو الاحوص کی وجہ سے ہے یا سماک کی وجہ سے اور یہ دونوں راوی ثقہ ہیں' امام ابن حبان نے ان دونوں کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔اس لیے یہ حدیث سنداً صحیح ہے۔کما قال الالبانی. ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ:۵۷۲

۵۷۱ اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کے راوی چونکہ ثقہ ہیں اس لیے اس کا متن صحیح ہے۔خصوصاً اس لیے کہ اس کی تائید میں دیگر احادیث و آثار موجود ہیں۔جیسا کہ احناف کے مؤقف کے ثبوت میں علامہ خازن کے دلائل اور اُن کے ماتحت حواشی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔دوسرا یہ کہ ''پیو اور نشہ کو نہ پہنچو'' اور ''نشہ آور چیز نہ پیو'' ان دونوں میں تعارض نہیں ہے۔کیونکہ متنِ اوّل میں نشہ لانے والی مقدار کو پینے سے منع کیا جا رہا ہے اور متنِ ثانی میں نشہ آور چیز سے منع کیا جا رہا ہے اور نشہ آور چیز جس طرح اُن اشیاء کو شامل ہے جن میں نشہ پایا جاتا ہو اسی طرح اُس مقدار کو بھی شامل ہے جو نشہ آور ہو۔سو جب دونوں کے درمیان تعارض نہیں ہے تو ایک کو دوسرے کے خلاف ٹھہرانا بھی درست نہیں ہے۔

۵۷۲ امام نسائی کی اس عبارت کا مفہوم سمجھنے سے پہلے حدیث منکر کی تعریف اور اس کا مفہوم جاننا چاہیے۔حدیث منکر اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کے کسی راوی میں فحش غلطی یا کثرت غفلت یا فسق کا طعن ہو۔بعض کے نزدیک منکر حدیث وہ ہوتی ہے جس میں غیر ثقہ راوی ثقہ راوی کی مخالفت کرے اور بعض کا قول یہ ہے کہ جس روایت کا متن اُس راوی کے علاوہ کسی اور راوی سے معروف نہ ہو وہ منکر ہے۔(شرح صحیح مسلم ج۱ص۱۳۹) امام نسائی نے زیرِ بحث حدیث کو منکر اس لیے قرار دیا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی ابوالاحوص سَلّام بن سُلَیم ہے' اُس نے اس حدیث کو سماک سے روایت کیا ہے جبکہ سماک کے کسی اور شاگرد نے اس حدیث کو سماک سے روایت نہیں کیا۔پھر مزید یہ کہ سماک بھی قوی نہیں ہے۔ہماری جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو جن راویوں کی بناء پر منکر قرار دیا گیا ہے وہ راوی ثقہ ہیں۔ابوالاحوص سَلّام بن سُلَیم کو امام ابو حاتم' امام عجلی اور امام ابو زرعہ نے ثقہ قرار دیا ہے۔امام ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقہ راویوں میں کیا ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی نے بھی ان کو ثقہ اور متقن (پختہ راوی) قرار دیا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جو روایت استدلال میں پیش کی ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ وہ غیر ثابت ہے جیسا کہ امام نسائی کا قول گزر چکا ہے۔[۵۷۳]

دوسرا مسئلہ: شراب کے ناپاک ہونے کے بارے میں: [''خمر'' (یعنی شراب) اور جو چیزیں خمر کے حکم میں ہیں وہ سب نجس العین ہیں۔ ان کے نجس اور ناپاک ہونے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ''شراب' جوا اور بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض رِجس یعنی ناپاک ہیں' شیطانی کاموں میں سے ہیں لہٰذا تم ان سے بچو''۔ (المائدہ: ۹۰) اس آیت میں جو ''رِجس'' کا لفظ فرمایا' اُس کا لغوی معنیٰ ہے: ناپاک اور گندی چیز۔ اور آخر میں جو فرمایا کہ ''ان کاموں سے بچو' تو یہ ہمیں اجتناب کا حکم فرمایا' لہٰذا شراب نجس العین ہوگی۔ اس کے نجس اور ناپاک ہونے پر یہ دلیل بھی ہے کہ اس کا پینا اس طور پر حرام ہے کہ اس میں اس کی حرمت اور عزت کو ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔[۵۷۴] پھر یہ وجہ ہے کہ لوگوں کو شراب سے لگاؤ ہوتا ہے' سو لوگوں کو اس سے بھرپور روکنے کے لیے یہی حکم ہونا چاہیے کہ یہ نجس اور ناپاک ہے۔

تیسرا مسئلہ: شراب کی خرید وفروخت اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کے حرام ہونے کا بیان: [امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شراب کی خرید وفروخت اور اس سے فائدہ حاصل کرنا بھی حرام ہے اور اُس کی قیمت بھی حرام ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۲۹۳) میں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ والے سال یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کی خرید وفروخت' اُس سے فائدہ کا حصول' مردار' خنزیر اور بتوں کو حرام فرما دیا ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۲۳۶' صحیح مسلم: ۱۵۸۱' سنن ترمذی: ۱۲۹۷' سنن ابوداؤد: ۳۴۸۶' سنن نسائی: ۴۲۵۶' مسند احمد ج ۳ ص ۳۲۴' مشکوٰۃ: ۲۷۶۶' ج ۲ ص ۲۴۱)

(۲۹۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ شراب کی تجارت حرام کر دی گئی ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۲۲۶' صحیح مسلم: ۱۵۸۰' سنن ابوداؤد: ۳۴۹۰' سنن نسائی: ۴۶۶۵' سنن ابن ماجہ: ۳۳۸۲' سنن دارمی: ۲۵۶۹' مسند احمد ج ۶ ص ۴۶)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی کے متعلق معلوم ہوا کہ اُس نے شراب بیچی ہے' تو حضرت عمر نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اُس شخص کو ہلاک فرمائے' کیا اُسے نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ (عزوجل) یہودیوں پر لعنت فرمائے' اُن پر چربی کو حرام کیا گیا تو انہوں نے اُسے پگھلا کر بیچ دیا۔[۵۷۵]

(صحیح بخاری: ۲۲۲۳' صحیح مسلم: ۱۵۸۲' سنن ابن ماجہ: ۳۳۸۳' سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: تقریب التہذیب مع الحاشیہ ص ۳۲۸) اسی طرح سماک بن حرب کو امام ابوحاتم نے صدوق اور ثقہ قرار دیا ہے۔ امام نسائی نے فرمایا ہے کہ اس کی روایت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقہ راویوں میں کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کو صدوق قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: تقریب التہذیب ص ۳۲۰) لہٰذا اس حدیث کو منکر قرار دینا درست نہیں ہے۔ سُنن نسائی کے محقق محمد ناصر الدین البانی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: سنن نسائی' زیر بحث حدیث)

۵۷۳ اس کا جواب ہم وہیں ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: حاشیہ: ۵۵۷۔

۵۷۴ یعنی کسی چیز کو حرام کرنے کے دو مقاصد ہیں' ایک یہ کہ اُس چیز کی عزت وعظمت کو ظاہر کیا جائے۔ (جیسے آدمی کا گوشت اس لیے حرام ہے تاکہ انسان کا احترام اور مرتبہ ظاہر ہو) دوسرا یہ کہ اُس چیز کی گندگی اور ناپاکی کو ظاہر کیا جائے۔ (جیسے شراب اور خنزیر وغیرہ اس لیے حرام ہیں تاکہ ان کا ناپاک اور گندا ہونا ظاہر ہو۔)

۵۷۵ اس حدیث کا آخری حصہ البقرہ: ۱۶۱ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۱۶۵' مع حاشیہ: ۳۵۸

(۲۹۵) حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شراب کی خرید و فروخت کرے اُسے چاہیے کہ پھر وہ خنزیر کے گوشت کے بھی حصے بنائے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۴۸۹' سنن دارمی: ۲۱۰۲' مسند احمد ج ۴ ص ۲۵۳' سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۲)

☆ اس حدیث میں ایک جملہ ہے: ''فلیشقص الخنازیر'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح گوشت بیچنے کے لیے بکری کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جاتے ہیں اس طرح (شراب فروخت کرنے والے کو) خنزیر کے گوشت کے بھی ٹکڑے کرنے چاہئیں۔ مفہوم یہ ہے کہ جو شخص شراب کی فروخت کو حلال سمجھتا ہے اُسے چاہیے کہ پھر وہ خنزیر کی فروخت کو بھی حلال سمجھے' کیونکہ دونوں برابر حرام ہیں۔

(۲۹۶) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میری پرورش میں کچھ یتیم بچے ہیں اُن کے لیے میں نے شراب خریدی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شراب کو بہا دو اور اس کے مشکیزوں کو توڑ دو۔

(سنن ترمذی: ۱۲۹۳' سنن ابوداؤد: ۳۶۷۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۴۹ ۔ ص ۳۱۸)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابوطلحہ کے پاس یتیم بچوں کی شراب تھی۔ یہ روایت گذشتہ روایت سے زیادہ صحیح ہے''۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جب شراب کی خرید و فروخت اور اس سے فائدہ کا حصول حرام ہے تو پھر زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ''اس میں لوگوں کے لیے کچھ فوائد ہیں'' اس سے کیا مراد ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ شراب میں جو فوائد ہیں اس سے مراد وہ لذت ہے جو پیتے وقت ملتی ہے اور خوشی اور مستی کی کیفیت مراد ہے جو ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے اور وہ فائدہ مراد ہے جو لوگوں کو اس کی قیمت سے حاصل ہوتا تھا۔ یہ تمام فوائد شراب کے حرام ہونے سے پہلے کے ہیں' جب شراب حرام کر دی گئی تو (اس سے حاصل ہونے والی) تمام چیزیں حرام کر دی گئیں۔

جوئے کی حرمت کا واقعۂ نزول اور زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کے جوئے کی تفصیل

زیر بحث آیت میں جوئے کے لیے ﴿میسر﴾ کا لفظ آیا ہے۔ یہ ''یُسر'' سے مشتق ہے (بمعنیٰ آسانی) چونکہ جوئے میں بغیر کسی تھکاوٹ کے سہولت اور آسانی کے ساتھ مال حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اس کو ''میســر'' کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا معمول تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے گھر اور مال و دولت کی شرط لگا لیتے تھے' جو شخص غالب آتا تھا وہ اپنے مقابل کا گھر اور مال و دولت لے جاتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت نازل فرمائی۔

جوئے کی بنیاد یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے مال دار لوگ اونٹنی یا بکری خرید کر اُسے ذبح کرتے تھے اور اُسے اٹھائیس حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے' پھر اُن حصوں کے ساتھ جوئے کے دس تیروں کا حصہ ملا لیتے تھے' اُن تیروں کو ازلام اور اقلام کہا جاتا تھا۔ ان کے نام یہ تھے: ''فَذّ' تَوْأَم' رَقِیب' حِلْس' نَافِس' مُسْبِل' مُعَلّٰی' مَنِیح' سَفِیح اور وَغْد''۔ ان میں سات تیروں کے لیے اہل عرب حصے مقرر کر دیتے تھے۔ یعنی ''فذّ'' کے لیے ایک حصہ' ''توأم'' کے لیے دو حصے' ''رقیب'' کے لیے تین حصے' ''حلس'' کے لیے چار حصے' ''نافس'' کے لیے پانچ حصے' ''مسبل'' کے لیے چھ حصے' ''معلّٰی'' کے لیے سات حصے۔ بقیہ جو تین تیر تھے یعنی ''منیح' سفیح اور وغد'' ان کا حال یہ تھا کہ اُن کا کوئی حصہ اہل عرب نے مقرر نہیں کیا تھا۔ کسی شاعر نے ان تینوں تیروں کو اپنے شعر میں یوں بیان کیا ہے:

لــی فــی الــدنیــا سهــام لیـــــس فیهـــن ربــح

انـــمـــا سهـمـی وغـد ومـنیـــح وســـفیـــح

''یعنی دنیا میں میرے لیے ایسے حصے ہیں جن میں کوئی فائدہ نہیں ہے' (کیونکہ) میرے تیر تو صرف وغد' منیح اور سفیح ہیں''۔

پھر تمام تیروں کو اہل عرب ایک بنے ہوئے نقشہ میں جمع کر دیتے تھے' اُس نقشہ کو ''رِبَـابَـه'' کہتے تھے' پھر اُس کو کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں رکھ دیتے تھے جو ان کے نزدیک انصاف کرنے والا ہوتا تھا' اُس شخص کو ''مُجِیل'' اور ''مُفِیض'' کہا جاتا تھا۔ وہ تمام تیروں کو نقشہ پر پھیلا کر اُن میں سے کسی بھی شخص کے نام کا ایک تیر نکال لیتا تھا۔ جس کا نام نکل آتا تھا وہ نکلنے والے تیروں کے مطابق اپنا حصہ لے لیتا تھا۔ اگر اُس کا تیر اُن تیروں میں سے نکلتا جن کا کوئی حصہ مقرر نہیں تھا تو اُسے کچھ نہیں ملتا تھا بلکہ وہ پوری اونٹنی کی قیمت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اُس شخص کو نہ تو کچھ ملتا تھا نہ ہی وہ قیمت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ بلکہ اہل عرب اُس تیر کو لغو (یعنی بیکار) قرار دے کر اونٹنی کو غریبوں میں بانٹ دیتے تھے اور خود اُس میں سے نہیں کھاتے تھے۔ پھر اپنے اس فعل پر فخر کیا کرتے تھے' اور جو اس طرح نہیں کرتا تھا اُس کی مذمت کرتے تھے اور اُسے ''بَرَم'' کہتے تھے۔ ''بَرَم'' سے مراد ایسا کنجوس آدمی جو کنجوسی کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے درمیان کچھ نہ نکالے۔

جوا' چوسر اور شطرنج کا شرعی حکم[۵۷۶]

زیر بحث آیت میں جو ''میسر'' فرمایا اُس سے قمار یعنی جوئے کی تمام اقسام مراد ہیں۔ لہٰذا ہر چیز جس میں قمار ہو وہ ''میسر'' ہے۔ حضرت ابن سیرین' مجاہد اور عطاء سے مروی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں شرط رکھی جائے وہ ''میسر'' ہے حتیٰ کہ بچوں کے اخروٹ اور پانسہ کے ساتھ (یعنی شرط لگا کر) کھیلنا بھی اس میں داخل ہے۔ اسی طرح چوسر کھیلنا بھی حرام ہے' خواہ اُس میں شرط رکھی جائے یا نہیں۔ اس کے حرام ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۹۷) جس نے چوسر کھیلا اُس نے گویا خنزیر کے خون میں اپنا ہاتھ رنگا۔

(صحیح مسلم: ۲۲۶۰' سنن ابوداؤد: ۴۹۳۹' سنن ابن ماجہ: ۳۷۶۳' مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۰۰ ص ۳۸۶)

(۲۹۸) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے چوسر کھیلا اُس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

(سنن ابوداؤد: ۴۹۳۸' سنن ابن ماجہ: ۳۷۶۲' مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۰۵۔ ص ۳۸۶)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ چوسر اور شطرنج دونوں کا تعلق جوئے سے ہے۔ شطرنج کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ شطرنج کھیلنا حرام ہے خواہ اُس میں کسی چیز کی شرط رکھی جائے یا نہیں۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ شطرنج چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ یعنی جب شطرنج میں شرط نہ رکھی جائے' زبان حد سے تجاوز نہ کرے

[۵۷۶] چوسر اور شطرنج دونوں جوے کی طرح ایک قسم کے کھیل ہیں۔ چوسر کو عربی میں نرد یا نردشیر کہتے ہیں۔ لغت میں چوسر کا تعارف یوں ہے کہ ایک کھیل جو سات کوڑیوں سے کھیلا جاتا ہے اور شطرنج کے تعارف میں لکھا ہے کہ ایک کھیل جو ۳۲ مہروں اور ۶۴ خانوں سے کھیلا جاتا ہے۔ (فیروز اللغات ص ۶۸۲۔ ۸۴۲)

اور بیہودہ گوئی نہ کرے اور نماز سے غفلت نہ پائی جائے تو پھر شطرنج حرام نہیں ہے۔[۵۷۷] اور شطرنج جوئے سے خارج ہے کیونکہ جوا وہ ہوتا ہے جس میں مال دیا اور لیا جاتا ہے جبکہ شطرنج میں اس طرح نہیں ہوتا۔[۵۷۸]

شراب اور جوئے میں بڑا گناہ اور لوگوں کے کچھ فوائد ہیں' اس کی تفسیر

آیت میں ﴿فِيْهِمَآ﴾ سے مراد شراب اور جوا ہے' اور ﴿اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ سے مراد ہے بڑا بوجھ۔ کہتے ہیں کہ شراب عقل کے لیے دشمن ہے۔ جب وہ عقل پر غالب آ جاتی ہے تو انسان ہر بُرا کام کر گزرتا ہے پھر اس میں بڑے بڑے گناہ بھی ہیں' جیسے (ایک گناہ یہ ہے کہ) اس سے حرام چیز کا پینا لازم آتا ہے اور (مزید گناہ یہ ہے کہ) اس کے پینے سے ایسے کام آدمی سے صادر ہوتے ہیں جو شرعاً حرام ہیں۔ جوئے میں بڑا گناہ یہ ہے کہ اس میں باطل اور ناجائز طریقہ سے حرام مال کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں فریقین کے درمیان گالی گلوچ' جھگڑا اور دشمنی بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ تمام باتیں بڑے بڑے گناہ ہیں۔

آیت میں جو فرمایا کہ ﴿وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ "ان دونوں میں لوگوں کے لیے کچھ فوائد ہیں" اس سے مراد یہ ہے کہ حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے لوگ شراب بیچ کر نفع حاصل کرتے تھے۔ اور جوئے کا فائدہ یہ تھا کہ بغیر کسی محنت اور مشقت کے مال مل جاتا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ بسا اوقات اہل عرب میں کوئی شخص ایک نشست میں سو اونٹوں کی شرط لگا دیا کرتا تھا تو اُسے بہت سارا مال حاصل ہو جاتا۔ اور بسا اوقات وہ اُس مال کو محتاج لوگوں میں خرچ کر دیا کرتا تھا جس سے اُسے تعریف و توصیف اور پذیرائی ملتی تھی۔ اور یہی جوئے کا منافع تھا۔

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ یعنی شراب اور جوئے کے حرام ہونے کے بعد ان دونوں میں جو گناہ ہے وہ اُس نفع سے زیادہ ہے جو حرام ہونے سے پہلے ان میں تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شراب اور جوئے میں جو گناہ ہے اُس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ "شیطان (شراب اور جوئے کے ذریعہ) صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے"۔ (المائدہ:۹۱) اس میں جو چیزیں بیان کی گئی ہیں وہی درحقیقت ایسے گناہ ہیں جو شراب اور جوئے کے نتیجہ میں بڑے بڑے گناہ بن جاتے ہیں۔

"عفو" کو خرچ کرنے کی تفسیر

فرمایا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دی تو لوگوں نے پوچھا کہ ہم کیا چیز خرچ کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے (جواباً) فرمایا کہ جو "عفو" ہو' یعنی جو مقدار ضرورت سے زائد ہو اُس کو خرچ کر دو۔ چنانچہ صحابہ کرام کا معمول یہ تھا کہ وہ کماتے تھے اور اُس میں سے نفقہ (یعنی ضروری اخراجات) کے مطابق اپنے پاس رکھ کر باقی مال کو زیر بحث آیت کے حکم کے پیش نظر صدقہ کر دیا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو زکوۃ کی آیات نازل فرما کر منسوخ کر دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں عفو سے مراد یہ ہے کہ آدمی اتنا خرچ کرے کہ اس کے بعد بھی غنی رہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

---

[۵۷۷] صحیح یہ ہے کہ شطرنج مطلقاً ممنوع ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شطرنج عجمیوں کا جوا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۱۰) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شطرنج صرف وہی کھیلتا ہے جو خطا کار ہو۔ کسی شخص کے شطرنج کے متعلق سوال کرنے پر فرمایا کہ شطرنج باطل (اور بیکار چیزوں) سے ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں فرماتا۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۱۱-۴۵۱۲) علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے مشکوٰۃ کی ان روایات کی شرح میں شطرنج کی ممانعت پر اور بھی بہت روایات ذکر فرمائی ہیں اور تعدّدِ اسناد کی وجہ سے ان احادیث کو حسن قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے: مرقات ج۸ص۲۸۵' مرأۃ المناجیح ج۶ص۱۸۹)

[۵۷۸] حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شطرنج کو جُوے میں شمار فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: "الشطرنج هو ميسر الاعاجم"۔ (شطرنج عجمیوں کا جوا ہے۔) (شعب الایمان للبیہقی: ۶۵۱۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۱۰ص۳۸۷)

(۲۹۹) بہترین صدقہ وہ ہے کہ اس کے بعد بھی آدمی غنی رہے۔ اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے' اور تم (صدقہ دینے کا) آغاز اُس سے کرو جو تمہارے زیرِ کفالت ہو۔

(صحیح بخاری: ۱۴۲۷' صحیح مسلم: ۱۰۳۴' سنن ابوداؤد: ۱۶۷۶' سنن نسائی: ۲۵۴۳' مسند احمد ج ۲ ص ۴۰۲' سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۶۶' مشکوٰۃ: ۱۹۲۹۔ ص ۱۷۰)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عفو سے مراد یہ ہے کہ درمیانے طریقہ سے خرچ کیا جائے' نہ تو اس میں اسراف ہو نہ اقتار (یعنی نہ تو حد سے زیادہ آگے بڑھا جائے نہ حد سے زیادہ کمی کی جائے)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''جو ضرورت سے زائد ہو خرچ کر دو'' اس سے نفلی صدقہ مراد ہے۔ اگر اس سے صدقہ واجبہ مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی مقدار بیان فرماتا' لیکن جب اس نے مقدار بیان نہیں فرمائی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عفو سے نفلی صدقہ مراد ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ خرچ کرنے کے متعلق جو معاملات تم لوگوں نے دریافت کیے تھے' اُن کو اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ تم دنیا میں فائدہ دینے والی چیز کو اپنے پاس رکھ کر باقی کو خرچ کر دو تا کہ وہ (خرچ کیا ہوا) تمہیں آخرت میں فائدہ دے۔ بعض مفسرین نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ تم دنیا کے زوال میں غور و فکر کر کے اس سے کنارہ کشی اختیار کرو اور آخرت کی طرف توجہ اور اس کی بقاء میں غور و فکر کر کے اس کی طرف رغبت کرو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۗ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۗ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ بتایئے کہ ان کی خیر خواہی کرنا زیادہ بہتر ہے' اور اگر تم ان کو (اپنے معاملات میں) ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں' اور اللہ جانتا ہے کہ (یتیموں کے ساتھ) کون بدخواہی کرنے والا ہے اور کون خیر خواہی کرنے والا' اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ضرور مشقت میں ڈال دیتا' بے شک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''جو لوگ ناجائز طریقہ سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں''۔ (النساء: ۱۰) تو مسلمانوں کے لیے یتیموں کے مال کی حفاظت کرنا بہت دشوار ہو گیا' حتیٰ کہ لوگوں نے اپنے مال کو یتیموں کے مال سے علیحدہ کر دیا اور (معاملات میں) اُن کے ساتھ شرکت کو ترک کر دیا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ یتیم کے لیے بنایا ہوا کھانا اگر بچ جاتا تو لوگ اُس کو چھوڑے رکھتے اور اس کو نہیں کھاتے تھے۔ یہ ساری صورتِ حال لوگوں کے لیے دشواری کا باعث ہو گئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا' تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور یتیموں کے ساتھ خیر خواہی

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ مراد یہ ہے کہ بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے یتیموں کے مال کی ذمہ داری لینا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ یعنی اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ اپنے کھانے میں سے یتیم کو گنجائش دے' نہ کہ یتیم کے کھانے سے خود گنجائش حاصل کرے۔

﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ﴾ اگر تم انہیں اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ ملانے سے مراد یہ ہے کہ کھانے پینے میں' خدمت گزاری میں اور رہائش میں تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو۔ اس سے لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ یتیموں کے ساتھ معاملات میں

مشارکت رکھنا جائز ہے۔لہٰذا اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ اُن کے مال میں شرکت کرو اور ان کے مال کو اپنے مال' اپنے خرچہ' اپنی رہائش' اپنے نوکر اور اپنی سواریوں کے ساتھ شریک کرلو۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم نے اُن کے معاملات کی جو ذمہ داری لی ہوئی ہے اُس کا معاوضہ تمہیں اُن کے مال سے مل جائے گا۔یا جو کچھ تمہیں اُن کے مال سے (فائدہ) مل رہا ہے اُس کی بنیاد پر تم اُن کے معاون بن جاؤ گے۔ ﴿فَاِخْوَانُكُمْ﴾ جو فرمایا اُس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ یتیم تمہارے بھائی ہیں۔اور بھائیوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔اور ذمہ داری اور رضامندی کی بنیاد پر ایک دوسرے کا مال استعمال کرتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ یعنی اللہ جانتا ہے کہ یتیم کے مال میں کون بدخواہی کرنے والا اور کون خیر خواہی کرنے والا۔اور وہ اُس کو بھی جانتا ہے جو یتیم کے ساتھ شرکت کر کے خیانت کرنا چاہتا ہے اور ناحق طریقہ سے یتیم کا مال کھانا چاہتا ہے' اور اس کو بھی جانتا ہے جو یتیم کی خیر خواہی چاہتا ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔مشقت میں ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہارے لیے تنگی فرما دیتا اور یتیموں کے ساتھ مشارکت کو ممنوع فرما دیتا۔اس میں جو ﴿اعنتکم﴾ فرمایا وہ ''عَنَتٌ'' سے مشتق ہے۔اور ''عَنَتٌ'' کا معنیٰ ہے: شدت اور مشقت۔یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ہر اُس چیز کا پابند کر دیتا جو تمہارے لیے دشوار ہوتی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے' وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے بندوں کو سختی اور دشواری میں مبتلا کر دے لیکن وہ حکیم ہے (یعنی بڑی حکمت والا ہے) وہ اپنے بندوں کو اُتنا ہی پابند فرماتا ہے جتنا بندوں کی طاقت اور استطاعت ہو۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو' جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں' اور ضرور مسلمان باندی (آزاد) مشرکہ عورت سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں پسند ہو' اور تم (اپنی مسلمان عورتوں کا) مشرکوں کے ساتھ نکاح نہ کیا کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں' اور ضرور مؤمن غلام (آزاد) مشرک سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں پسند ہو' یہ (مشرکین) آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنی توفیق سے جنت اور بخشش کی طرف بُلاتا ہے' اور لوگوں کے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

یہ آیت حضرت ابومرثد غنوی کے بارے میں نازل ہوئی۔ان کا نام یسار بن حُصین[۵۷۹] تھا۔ان کو رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ یہ خفیہ طور پر مسلمانوں کو وہاں سے لے آئیں۔جب یہ مکہ پہنچے تو عَناق نامی ایک مشرکہ عورت نے ان کے آنے کی خبر سُنی۔وہ زمانۂ جاہلیت میں ان کی دوست تھی۔چنانچہ وہ ان کے پاس آئی اور کہا کہ کیا تم مجھ سے خلوت نہیں کرو گے؟ تو

۵۷۹ صحیح یہ ہے کہ ان کا نام کناز بن حُصین تھا۔کذا فی کتب التفسیر واسماء الرجال۔

حضرت ابو مرثد نے کہا: اے عَناق! تیرے لیے ہلاکت ہو اسلام میرے درمیان اور اس کام کے درمیان حائل ہے۔ تو اُس نے کہا: کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟ حضرت ابو مرثد نے کہا: ہاں! لیکن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر اجازت لوں گا۔ اُس نے کہا: کیا تم میرے ساتھ نخرے کر رہے ہو؟ یہ کہہ کر اُس نے ان کے خلاف اپنی قوم کو مدد کے لیے بُلا لیا۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت ابو مرثد کو بہت مارا اور مارنے کے بعد اُن کو چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے جب مکہ میں اپنا کام پورا کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس آئے تو آپ کو اپنا اور عَناق کا معاملہ بتایا' اور جو کچھ عناق کی وجہ سے انہیں (تکالیف) پہنچی اُس کے بارے میں بتایا۔ اور عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا میرے لیے یہ بات جائز ہے کہ میں عناق سے شادی کر لوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور بتا دیا کہ جب تک مشرکہ عورتیں ایمان نہ لے آئیں ان سے نکاح نہ کرو۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ﴾ لُغت میں نکاح کا اصل معنیٰ ہے: وطی (ہم بستری) کرنا۔ پھر اس لفظ کا استعمال اتنا زیادہ ہو گیا کہ عقد نکاح کو نکاح کہا جانے لگا۔ زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے مؤمنو! تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں' یعنی وہ اللہ عز و جل اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق نہ کریں۔ تصدیق سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار کریں اور اسلامی احکام کی پابندی کریں۔

آیا ہر مشرکہ سے نکاح حرام ہے یا اس میں استثناء ہے؟ اس بارے میں علماء کے اختلاف کا بیان

زیر بحث آیت سے جو حکم ثابت ہو رہا ہے اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان پر ہر قسم کی مشرکہ عورت حرام ہے۔ خواہ وہ بت پرست ہو' مجوسیہ ہو' نصرانیہ ہو یا شرک کی کسی اور قسم سے تعلق رکھنے والی ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے اُن عورتوں کا استثناء فرمایا جو کتابی ہوں اور آزاد ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ . اور اہل کتاب کی آزاد اور پاک دامن عورتیں (تمہارے لیے حلال ہیں)۔ (المائدہ: ۵)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کتابی عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو''۔ پھر اس سے اہل کتاب کی عورتوں کا استثناء فرمایا اور المائدہ کی آیت: ۵ نازل فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں مشرک عورتوں سے نکاح کی جو ممانعت ہے وہ صرف عرب کی اُن مشرک عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو بت پرست ہوں۔ اس میں نہ کچھ منسوخ ہوا ہے نہ کسی کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا حکم عام مخصوص ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں جن مشرکہ عورتوں سے نکاح حرام ہے اُن سے عرب کی وہ مشرک عورتیں مراد ہیں جن کے پاس کتاب نہیں تھی جس کو وہ پڑھتیں۔

اختلاف مذکور کی بنیاد

مذکورہ اختلاف کی وضاحت ایک مسئلہ کی صورت میں ہے' اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ لفظ مشرک کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے؟ اس بارے میں اکثر علماء کا مؤقف جو کہ صحیح اور مختار ہے وہ یہ ہے کہ شرک کے لفظ میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں اور بت پرست' مجوسی اور دیگر شرک کرنے والے بھی داخل ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ پر شرک کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ . (التوبہ:۳۰)

یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

پھر آگے فرمایا:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبہ:۳۱)

(یہود ونصاریٰ نے) اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور پیروں کو خدا بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو (بھی) حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں' اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' اللہ کی ذات اُن لوگوں کے شرک سے پاک ہے O

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہورہا ہے کہ یہود ونصاریٰ نے شرک کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس نے نبی اکرم ﷺ کا انکار کیا وہ مشرک ہے' اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانتا ہو۔ کیونکہ جس شخص نے صحتِ نبوت اور ظہورِ معجزات کے باوجود نبی اکرم ﷺ کا انکار کیا یقیناً اُس نے یہ سمجھا کہ نبی اکرم ﷺ جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس سے لے کر آئے ہیں' یوں اُس شخص نے اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کیا۔ علماء کے اس قول کی بنیاد پر مشرک کے لفظ میں یہودی اور عیسائی بھی داخل ہوں گے' کیونکہ وہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ جبکہ بعض علماء کا مؤقف یہ ہے کہ شرک کے لفظ میں صرف بت پرست داخل ہیں۔ لیکن پہلا قول گذشتہ دلائل کی وجہ سے زیادہ صحیح ہے۔ سو جن علماء کے نزدیک مشرکات کا لفظ صرف بت پرست عورتوں کو شامل ہے اُن کے قول کی بُنیاد پر زیرِ بحث آیت محکم (یعنی غیر منسوخ) ہوگی۔ اور اکثر علماء کا جو مؤقف ہے کہ مشرکات کا لفظ بت پرست' کتابی اور دیگر عورتوں کو شامل ہے اُن کے مؤقف کی بنیاد پر زیرِ بحث آیت بت پرست عورتوں کے حق میں تو محکم ہوگی لیکن کتابی عورتوں کے حق میں منسوخ ہوگی۔

آزاد مشرکہ کے مقابلہ میں مسلمان باندی سے نکاح کی ترغیب اور اس کا واقعۂ نزول

﴿ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ﴾ اور ضرور مسلمان باندی مشرکہ عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو۔ مسلمان باندی کے بہتر ہونے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے وہ زیادہ فائدہ مند' زیادہ مناسب اور زیادہ باعثِ فضیلت ہے۔ یہاں ''مشرکه'' سے آزاد مشرکہ مراد ہے۔ ''ولو اعجبتکم'' سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ تمہیں مشرکہ عورت اپنے حسن و جمال' مال و دولت اور نسب کی وجہ سے پسند آئے لیکن آزاد مشرکہ عورت کے مقابلہ میں مسلمان باندی اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر اور افضل ہے۔

آیت مبارکہ کا زیرِ بحث جملہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لونڈی خنساء کے بارے میں نازل ہوا۔ انہوں نے خنساء سے کہا کہ تیری سیاہی اور بدصورتی کا تذکرہ عالم ارواح میں ہوا ہے' پھر انہوں نے اس کو آزاد کر کے اُس سے نکاح کرلیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ جملہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے بارے میں نازل ہوا' اُن کے پاس ایک باندی تھی وہ کالی تھی۔ ایک دن غصہ میں آکر اُنہوں نے اس کو تھپڑ ماردیا۔ پھر پریشان ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اے عبد اللہ! وہ کیا ہے (مسلمان یا کافرہ)؟ انہوں نے عرض کیا کہ وہ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں' وہ رمضان کے روزے رکھتی ہے اور اچھی طرح وضو کر کے نماز ادا کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تو وہ مسلمان باندی ہے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: (اگر ایسا

ہے) تو مجھے اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغام حق دے کر بھیجا ہے' میں ضرور اُسے آزاد کر کے اُس سے نکاح کروں گا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو کچھ مسلمانوں نے انہیں باندی سے نکاح کرنے کا طعنہ دیا اور آزاد مشرکہ عورت اُنہیں پیش کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ جملہ نازل فرمایا کہ مؤمن باندی (آزاد) مشرکہ عورت سے بہتر ہے۔

زیر بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ اس جملہ میں عورت کے سرپرستوں سے خطاب ہے۔ یعنی تم لوگ اپنی مسلمان عورت مشرکین کے نکاح میں نہ دیا کرو۔ مسلمان عورتوں پر اس بات کو حرام کر دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے مشرک سے نکاح کریں۔ اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ مسلمان عورت مشرک سے نکاح نہیں کر سکتی۔

آگے جو فرمایا کہ ''مؤمن غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو'' اس سے مراد یہ ہے کہ مؤمن غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے' اگرچہ مشرک اپنے حسن و جمال اور مال و دولت کی وجہ سے تمہیں پسند ہو۔

﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ﴾ ''مشرکین آگ کی طرف بُلاتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ شرک کی طرف بلاتے ہیں جو کہ آگ میں لے جاتا ہے۔ ''اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بُلاتا ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ احکام کو بیان فرمادیا ہے' بعض چیزوں کو اُس نے جائز اور بعض کو حرام قرار دیا ہے' لہٰذا اُس نے جو کرنے کا حکم دیا ہے اُس پر عمل کرو اور جس سے منع فرمایا ہے اُس سے باز رہو۔ اور جو شخص اس بات پر عمل پیرا ہوگا وہ جنت اور بخشش کا مستحق ہوگا۔ زیر بحث جملہ میں ''اِذن'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق اور اپنے ارادہ سے جنت اور بخشش کی طرف بُلاتا ہے۔

﴿وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ وہ اپنی آیات یعنی اپنے اوامر اور نواہی اور احکامات کے دلائل اور ان کی حجتوں کو واضح فرماتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۗ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

اور لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ بتائیے کہ وہ ناپاکی (اور گندگی) ہے' لہٰذا تم عورتوں سے (اُن کے) حیض کی حالت میں الگ رہو' اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے عمل زوجیت نہ کرو' جب وہ مکمل پاک ہو جائیں تو تم اُن کے پاس وہاں سے آ سکتے ہو جہاں سے (آنے کا) اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے' بے شک اللہ بہت توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

(۳۰۰) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کا معمول یہ تھا کہ جب اُن کی کسی عورت کو حیض آتا تو وہ گھر میں نہ تو اُس کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت کرتے نہ ہی اُس سے عمل زوجیت کرتے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام نے اس بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے (اس کی تفسیر میں) فرمایا کہ عمل زوجیت کے علاوہ تم عورتوں کے ساتھ تمام معاملات میں شرکت کر سکتے ہو۔ یہ بات جب یہودیوں کو پتا چلی تو انہوں نے کہا کہ

شخص ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتا ہے۔ یہ سُن کر حضرت اُسید بن حُضیر اور عبّاد بن بشر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! یہودی اس اس طرح کی باتیں کہہ رہے ہیں تو کیا (ایسا نہیں ہوسکتا کہ) ہم ایام حیض میں بھی عمل زوجیت کرلیا کریں؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کا رنگ اتنا متغیر ہوگیا کہ ہم سمجھے کہ حضور ان دونوں سے ناراض ہوگئے ہیں۔ اور وہ دونوں مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دُودھ کا ہدیہ آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو بُلا کر دُودھ پلایا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ان سے ناراض نہیں ہوئے تھے۔ (صحیح مسلم: ۳۰۲، سنن ترمذی: ۲۹۷۷، سنن ابوداؤد: ۲۵۸، سنن نسائی: ۳۶۹، سنن بیہقی ج ۱ص ۳۱۳، مسند احمد ج ۳ص ۲۴۶، مشکوۃ المصابیح: ۵۴۵، ص ۵۶)

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿حیض﴾ کا اصل معنیٰ ہے: بہنا اور پھوٹ پڑنا۔ جب کسی جگہ پانی بہہ رہا ہو تو عربی میں کہا جاتا ہے: "حاض الوادی" یعنی اس جگہ نے پانی بہایا۔ آیت میں جو فرمایا کہ حیض ﴿اَذًی﴾ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ حیض ایک گندی چیز ہے۔ لُغت میں "اذی" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو مکروہ اور ناپسندیدہ ہو۔ آگے جو فرمایا کہ "حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو" اس سے مراد یہ ہے کہ اُن سے عمل زوجیت کرنے سے بچو۔

"جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ آؤ" اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک عورتیں حیض سے پاک نہ ہو جائیں یعنی اُن کا خون نہ رُک جائے اُن سے عمل زوجیت نہ کرو۔ یہ جملہ ایک طرح سے گذشتہ جملہ کی تاکید ہے۔ اس میں "یَطْهُرْنَ" کو "یَطَّهَّرْنَ" بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جب تک عورتیں غسل نہ کرلیں اُن سے عمل زوجیت نہ کرو۔ آگے جو فرمایا: ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب عورتیں اپنے حیض سے فارغ ہوکر غسل کرلیں تو اُن کے پاس وہاں سے آؤ جہاں سے (آنے کا) اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ (اس سے مراد یہ ہے کہ) تم اُن سے اگلے مقام میں جماع کرو اور اُس کے علاوہ کسی اور مقام کی طرف نہ جاؤ۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جس کا اللہ نے حکم فرمایا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ (اس سے مراد یہ ہے کہ) تم عورتوں کے پاس اُس طریقہ سے آؤ جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ طریقہ طُہر ہے (یعنی جب عورت پاک ہو) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اُن کے پاس اُس وقت آؤ جب اُن سے عمل زوجیت کرنا جائز ہو۔ یعنی وہ روزہ اعتکاف اور احرام کی حالت میں نہ ہوں۔

حیض کے متعلق شرعی احکام کا بیان

پہلا مسئلہ: حالتِ حیض میں عملِ زوجیت کا حکم: اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حیض کے ایام میں عورت کے ساتھ عمل زوجیت حرام ہے اور جو اس کو حلال جانے وہ کافر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۰۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حائضہ عورت سے عمل زوجیت کیا یا کسی عورت کے پچھلے مقام میں یہ عمل کیا یا کاہن (نجومی) کے پاس آیا اُس نے محمد (ﷺ) پر نازل ہونے والی کتاب کا انکار کیا۔[۵۸۰]

(سنن ترمذی: ۱۳۵، سنن ابوداؤد: ۳۹۰۴، سنن ابن ماجہ: ۶۳۹، سنن دارمی: ۱۱۳۶، مسند احمد ج ۲ص ۴۰۸، مشکوۃ المصابیح: ۵۵۱، ص ۵۶)

---

۵۸۰ نجومی کے پاس آنے سے مراد یہ ہے کہ اُس کی باتوں کی تصدیق کی یا یقین حاصل کرنے کی غرض سے اُس سے خبر معلوم کی۔ ایسے شخص نے نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کا انکار کیا۔ یعنی اُس نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی اور اگر مذکورہ اُمور اُس نے (معاذ اللہ) جائز سمجھ کر کیے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ (واضح رہے کہ کسی گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا گناہ ہے اور گناہ کو جائز سمجھ کر کرنا کفر ہے۔) (مرقات ج ۲ص ۲۴۸)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے جو وعید بیان فرمائی ہے وہ معاملہ کی سنگینی اور شدت بتانے کے لیے ہے اور جو شخص حرام ہونے کا علم رکھنے کے باوجود مذکورہ کاموں کو کرے اُس کو حاکم وقت سزا دے۔

رہی یہ بات کہ حالت حیض میں عمل زوجیت کرنے کی صورت میں کفارہ ہے یا نہیں؟ سو اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی اللہ سے مغفرت طلب کرے اور اپنے گناہ سے توبہ کرے' کفارہ کوئی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کا اور امام شافعی کا قولِ جدید یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آدمی پر کفارہ واجب ہے۔ یہ امام شافعی کا قولِ قدیم ہے' اور یہی امام احمد بن حنبل کا مؤقف ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حالت حیض میں عمل زوجیت کرنے والے شخص کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

(۳۰۲'۳۰۳) ایسا شخص آدھا دینار صدقہ دے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب خون سرخ ہو تو ایک دینار صدقہ دے اور اگر خون پیلا ہو تو آدھا دینار صدقہ دے[۵۸۱] (سنن ترمذی:۱۳۶۔۱۳۷' سنن ابوداؤد:۲۶۴۔۲۶۵' سنن نسائی:۲۸۹' سنن ابن ماجہ:۶۴۰' سنن دارمی:۱۱۰۹' سنن بیہقی ج ۱ ص ۳۱۶' مشکوٰۃ:۵۵۳۔۵۵۴۔ص ۵۶)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ کفارہ کی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح مروی ہے۔

دوسرا مسئلہ: حالتِ حیض میں عورت سے فائدہ حاصل کرنے کی جائز حد کا بیان: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حیض کی حالت میں عورت کی ناف کے اوپر کے حصہ سے اور گھٹنے کے نیچے کے حصہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ نیز حیض والی کے ساتھ لیٹنا اور اس کو چھونا بھی جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ:

(۳۰۴) ہم میں سے (یعنی ازواجِ مطہرات میں سے) جب کوئی حالت حیض میں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ اُس سے مباشرت فرمانا چاہتے تو اُسے چادر باندھنے کا حکم فرماتے' اُس وقت خون اپنے زور پر ہوتا تھا' پھر آپ ﷺ اُس سے مباشرت فرماتے تھے۔ اور تم میں کون شخص ایسا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرح اپنی خواہش کو ضبط کرنے کی طاقت رکھتا ہو[۵۸۲]؟

(صحیح بخاری:۳۰۲' صحیح مسلم:۲۹۳' سنن ترمذی:۱۳۲' سنن ابوداؤد:۲۶۸' سنن نسائی:۲۸۵' سنن ابن ماجہ:۶۳۶)

☆ اس حدیث میں مباشرت سے مراد ہے: شرم گاہ کے علاوہ کسی اور مقام سے فائدہ حاصل کرنا۔ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''فَـــــوْر'' اس کا معنیٰ ہے: ابتداء' آغاز۔ ایک لفظ ''اِرْب'' آیا ہے۔ اس کو راء کے جزم کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنیٰ ہے: عضو۔ اور اگر اس کو راء کے زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنیٰ ہے: حاجت' ضرورت۔

(۳۰۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے پانی لے کر غسل کیا کرتے تھے اور ہم دونوں ہی حالت جنابت میں ہوتے تھے۔ آپ مجھے حکم فرماتے تو میں چادر باندھ لیتی' پھر آپ مجھ سے مباشرت

---

۵۸۱ ایک دینار دس درہم کے برابر ہوتا ہے اور دس درہم تقریباً اڑھائی تولہ چاندی کے برابر ہیں۔ اس حدیث میں صدقہ کرنے کا جو حکم ہے وہ استحباب پر محمول ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حالت حیض میں عمل زوجیت کر بیٹھے تو توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ مستحب یہ ہے کہ وہ کچھ صدقہ خیرات بھی کرے۔ (مرقات ج ۲ ص ۲۵۰' مراۃ ج ۱ ص ۳۳۱)

۵۸۲ اس حدیث شریف میں مباشرت کا لغوی معنیٰ (جسم کو جسم سے ملانا) مراد ہے۔ کیونکہ عمل زوجیت کرنا حالت حیض میں حرام ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ سے متصور نہیں۔ اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوہر کا حالت حیض میں بیوی کے ساتھ سونا' لیٹنا اور جسم کو جسم سے مَس کرنا شرعاً جائز ہے۔ لیکن یہ اُس صورت میں ہے جب آدمی کو اپنے نفس پر کنٹرول ہو اور عملِ زوجیت کا خطرہ نہ ہو۔ جیسا کہ زیرِ بحث حدیث کے آخری جملہ سے ظاہر ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۱۳)

فرماتے' جبکہ میں حالت حیض میں ہوتی تھی۔[۵۸۳] (صحیح بخاری:۲۹۹۔۳۰۰' صحیح مسلم:۲۹۶' مشکوٰۃ المصابیح:۵۴۶' ص۵۶)

(۳۰۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے مسجد سے آواز دے کر فرمایا: جانماز اُٹھا کر مجھے دے دو۔ میں نے کہا کہ میں حائضہ ہوں آپ نے فرمایا کہ حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔ (صحیح مسلم:۲۹۸' سنن ترمذی:۱۳۴' سنن ابوداؤد:۲۶۱' سنن نسائی:۲۷۱' سنن ابن ماجہ:۶۳۲' سنن دارمی:۷۷۱' مسند احمد ج۶ ص۴۵' مشکوٰۃ المصابیح:۵۴۹' ص۵۶)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: ''خُمْرَۃ'' اس سے مراد ایسی چھوٹی چٹائی ہے جو کھجور کے درخت یا کسی اور درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی ہو۔ اس حدیث میں ایک لفظ ہے: ''من المسجد'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مسجد سے حضرت عائشہ کو آواز دی[۵۸۴]' کیونکہ نبی اکرم ﷺ مسجد میں معتکف تھے اور حضرت عائشہ اپنے کمرے میں تھیں۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ان سے جانماز مانگی' جبکہ وہ حالت حیض میں تھیں۔

تیسرا مسئلہ: حائضہ عورت کے لیے شرعی پابندیاں: (۱) حیض والی عورت پر نماز' روزہ' مسجد میں داخل ہونا' قرآن کریم کی تلاوت کرنا' قرآن کریم کو چھونا اور اُس کو اٹھانا (سب) حرام ہے۔ (۲) اگر حیض والی کو یہ اطمینان ہو کہ مسجد سے گزرتے ہوئے خون کی آلودگی نہیں ہوگی تو ایک قول یہ ہے کہ مسجد سے گزر سکتی ہے' جیسے بے غسل آدمی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ نہیں گزر سکتی کیونکہ اس کی ناپاکی زیادہ سخت ہے۔[۵۸۵] (۳) حائضہ عورت پر روزوں کی قضاء ہے' نماز کی قضاء نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت معاذہ عدویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(۳۰۷) میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ حیض والی عورت روزے کی قضاء کرتی ہے اور نماز کی قضاء نہیں کرتی؟ حضرت عائشہ نے کہا: کیا تو حروری (یعنی خارجی) عورت ہے[۵۸۶]؟ میں نے کہا کہ میں حروری نہیں ہوں' البتہ (سوال کے طور پر) یہ بات پوچھ رہی ہوں۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا تو ہمیں روزوں کی قضاء کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

(صحیح بخاری:۳۲۱' صحیح مسلم:۳۳۵' سنن ترمذی:۱۳۰' سنن ابوداؤد:۲۶۲' سنن نسائی:۳۸۲' سنن ابن ماجہ:۶۳۱' مسند احمد ج۶ ص۱۴۳)

---

۵۸۳ اس حدیث شریف میں بھی مباشرت کا وہی مفہوم ہے جو گذشتہ حاشیہ میں حدیث:۳۰۴ کے تحت بیان ہوا۔ البتہ اس میں ایک برتن سے غسل کرنے کا جو ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت عائشہ کپڑے پہن کر غسل فرمایا کرتے تھے۔
(شرح صحیح مسلم ج۱ ص۱۰۱۹)

۵۸۴ ایک قول کے مطابق ''من المسجد'' کا یہی معنیٰ ہے۔ دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ جانماز مسجد میں تھی اور نبی اکرم ﷺ گھر میں تھے۔ سو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ مسجد سے جانماز اٹھا کر مجھے دے دو۔ علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری نے اسی قول کو ظاہر قرار دیا ہے۔ (مرقات ج۲ ص۲۴۷)

۵۸۵ احناف کا یہی مؤقف ہے کہ حیض والی عورت مسجد سے کسی صورت نہیں گزر سکتی اور بے غسل آدمی بھی نہیں گزر سکتا۔

۵۸۶ ''حروری'' حروراء نامی علاقہ کی نسبت سے ہے۔ یہ کوفہ کا ایک علاقہ ہے۔ فرقہ خارجیہ یعنی وہ لوگ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بغاوت کی وہ سب سے پہلے اس علاقہ میں جمع ہوئے۔ ان لوگوں کے جہاں اور بہت سارے باطل نظریات تھے وہاں ایک باطل نظریہ یہ بھی تھا کہ وہ عورتوں پر زمانہ حیض کی نمازوں کی قضاء کو واجب کہتے تھے۔ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے زیر بحث حدیث میں حضرت مُعاذہ کے سوال پر فرمایا کہ کیا تو حروری (یعنی خارجی) عورت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں حروری نہیں ہوں بلکہ (مسئلہ معلوم کرنے کی غرض سے) یہ بات پوچھ رہی ہوں۔ (عمدۃ القاری ج۳ ص۱۵۹)

چوتھا مسئلہ: حائضہ عورت کب حلال ہو گی؟: وہ تمام چیزیں جو حیض کی وجہ سے ممنوع ہیں اُن کی ممانعت صرف خون کے منقطع ہونے سے ختم نہیں ہو گی' بلکہ اُس وقت ختم ہو گی جب عورت غسل کر لے یا پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کر لے۔ البتہ روزہ کا حکم علیحدہ ہے' اور وہ یہ ہے کہ جب رات میں خون آنا بند ہو جائے اور عورت روزہ کی نیت کر لے تو اس کی نیت صحیح ہو گی اگر چہ وہ دن میں غسل کرے۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ جب حیض اپنی اکثر مدت میں آ کر از خود بند ہو جائے تو اس عورت کے غسل سے پہلے بھی اس کا شوہر اس سے عمل زوجیت کر سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حیض کی اکثر مدت دس دن ہیں۔ جبکہ امام شافعی اور دیگر علماء کا مذہب یہ ہے کہ حیض سے فارغ ہو کر عورت جب تک غسل یا پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم نہ کر لے اُس وقت تک اس کا شوہر اُس سے عمل زوجیت نہیں کر سکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں حیض والی عورت کے ساتھ عمل زوجیت کے جواز کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ایک شرط تو یہ کہ خون آنا بند ہو جائے۔ دوسری شرط یہ کہ عورت غسل کر لے۔ چنانچہ زیر بحث آیت میں فرمایا کہ ''جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں اُن سے عمل زوجیت نہ کرو جب وہ پاک ہو جائیں یعنی غسل کر لیں تو اُن کے پاس وہاں سے آؤ جہاں سے (آنے کا) اللہ نے تمہیں حکم فرمایا ہے''۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت جب تک غسل نہ کر لے اُس وقت تک اُس سے عمل زوجیت جائز نہیں ہے۔[۵۸۷]

''توابین'' اور ''متطهرین'' کا معنیٰ

آخر میں فرمایا: بے شک اللہ توابین کو پسند فرماتا ہے اور متطہرین کو پسند فرماتا ہے' ﴿تواب﴾ اُس شخص کو کہتے ہیں کہ جب بھی اُس سے گناہ کا صدور ہو وہ از سر نو اُس سے توبہ کرے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''تـــوّاب'' اُس کو کہتے ہیں جو گناہ کی طرف لوٹ کر نہ آئے۔ اور ﴿متطهرین﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ پانی کے ذریعہ بے وضو اور بے غسل ہونے سے اور تمام ناپاکیوں سے پاکیزگی حاصل کرتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''متـــطهـريـن'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو گناہوں کے پاس نہیں جاتے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۲۳﴾

تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں' لہٰذا تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ' اور اپنے لیے آگے کا انتظام کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے' اور آپ مؤمنوں کو خوش خبری سنا دیجیے ○

[۵۸۷] امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو موقف ہے کہ حیض جب پورے دس دن بعد رُکے تو غسل سے پہلے عورت سے عمل زوجیت جائز ہے اور دس دن سے پہلے رُکے تو غسل کے بغیر عمل زوجیت جائز نہیں ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ''حتـــى يطهـرن'' کی دو قرأتیں ہیں۔ ایک قرأت میں يَطْهُرْنَ اور ایک قرأت میں يَطَّهَّرْنَ پڑھا گیا ہے اور دو قرأتیں دو آیتوں کی مانند ہوتی ہیں۔ اس لیے دونوں پر عمل کرتے ہوئے دس دنوں کی صورت میں جزم والی قرأت (يَـــطْهُــرْنَ) کو اختیار کیا گیا اور دس دنوں سے کم کی صورت میں تشدید والی قراءت کو اختیار کیا گیا۔ کیونکہ جزم والی قرأت کی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''جب تک عورتیں حیض سے پاک نہ ہو جائیں اُن سے عمل زوجیت نہ کرو''۔ یہاں پاک ہونے سے خون کا رکنا مراد ہے اور تشدید والی صورت میں مفہوم یہ ہے کہ جب تک عورتیں حیض سے خوب پاک نہ ہو جائیں (یعنی غسل نہ کر لیں) اُن سے عمل زوجیت نہ کرو۔ حاصل کلام یہ کہ آیت مبارکہ کی دونوں قرأتوں پر عمل کرنے کی غرض سے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ نے ایک صورت میں غسل سے پہلے عمل زوجیت کی اجازت دی ہے۔ تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ دونوں صورتوں میں غسل کے بعد عمل زوجیت کیا جائے۔ (روح المعانی و تفسیرات احمدیہ زیر بحث آیت)

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول احادیث مبارکہ کی روشنی میں

حضرت جابر رضی اللہ تعالٰی عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جب آدمی عورت کے پچھلے مقام سے مجامعت کرتا ہے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں' لہٰذا تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آؤ''۔ (صحیح بخاری: ۴۵۲۸' صحیح مسلم: ۱۴۳۵' سنن ترمذی: ۲۹۷۸' سنن ابوداؤد: ۲۱۶۳' سنن ابن ماجہ: ۱۹۲۵' سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۹۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۱۸۳۔ص ۲۷۵)

(۳۰۸) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس چیز نے تمہیں ہلاک کر دیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے رات اپنی سواری کو پھیر دیا تھا۔ (حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ) نبی اکرم ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اللہ تعالٰی نے آپ کی طرف وحی فرمائی اور یہ آیت نازل فرمائی کہ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں' لہٰذا تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ''۔ تم سیدھے ہو کر آؤ' اُلٹے ہو کر آؤ لیکن پچھلے مقام سے اور حالت حیض میں عمل زوجیت سے بچو۔

(سنن ترمذی: ۲۹۸۰' سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۹۸' مسند احمد ج ۱ ص ۲۹۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔ ☆ اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے جو کہا کہ ''میں نے اپنی سواری کو پھیر دیا تھا'' اس کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ اس سے اُن کی مراد یہ ہے کہ جس جگہ سے عمل زوجیت کیا جاتا ہے میں نے اُس کے علاوہ میں کر لیا ہے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ جس جگہ سے عمل زوجیت کیا جاتا ہے اُنہوں نے اسی جگہ سے کیا ہو لیکن پیٹھ کی جانب سے۔

(۳۰۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما بیان کرتے ہیں کہ انصار کے لوگ جو بت پرست تھے اُن کا قبیلہ یہودیوں کے قبیلہ کے ساتھ (آباد) تھا اور یہودی اہل کتاب تھے۔ تو انصار کے لوگ علم میں اپنے آپ پر یہودیوں کو ترجیح دیتے تھے اور بہت سے کاموں میں اُن کی پیروی کرتے تھے۔ اہل کتاب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک جانب سے عمل زوجیت کیا کرتے تھے' اور یہ طریقہ عورت کے لیے زیادہ ستر اور پوشیدہ کا باعث تھا۔ ان کے اس عمل کو انصار کے اس قبیلہ نے بھی اختیار کیا۔ دوسری طرف قریش کے لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ بہت خطرناک طریقہ سے عمل زوجیت کیا کرتے تھے اور سیدھا کر کے' اُلٹا کر کے اور چت لٹا کر عورتوں سے لذت حاصل کیا کرتے تھے۔ جب مہاجرین مدینہ منورہ میں آئے تو ایک مہاجر نے کسی انصاری عورت سے نکاح کیا اور اس نے اپنے طریقہ کے مطابق عمل زوجیت کرنا چاہا تو عورت نے اُسے روک دیا اور کہا کہ ہمارے ہاں ایک جانب سے عمل زوجیت کیا جاتا ہے' لہٰذا تم بھی اُسی طریقہ پر عمل کرو ورنہ مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ حتیٰ کہ ان دونوں کا یہ معاملہ بڑھا اور نبی اکرم ﷺ تک بات پہنچ گئی' تو اللہ تعالٰی نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں' لہٰذا تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آؤ'' عورتوں کو سیدھا کر کے' اُلٹا کر کے اور چت لٹا کر (یعنی ان تمام حالتوں میں اگلے ہی مقام پر آؤ)۔

(سنن ابوداؤد: ۲۱۶۴' المستدرک ج ۲ ص ۲۷۹' سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۹۵)

☆ اس حدیث شریف میں چند الفاظ آئے ہیں اُن کی لغوی تشریح حسب ذیل ہیں: ''وَثَن'' بت اور ایک قول کے مطابق ایسی شکل جس کا جسم نہ ہو' ''حَرْف'' جانب' کنارہ۔ ''یَشْرَحُوْنَ'' جب کوئی شخص گدی کے بل لٹا کر عمل زوجیت کرے تو عربی میں شرح کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شرح کا اصل معنیٰ ہے: کشادہ ہونا۔ ''شَرِیَ اَمْرُهُمَا'' ان دونوں کا معاملہ بلند ہوا اور اونچا ہوا۔ اس جملہ کی اصل یہ ہے کہ جب بجلی چمک کے اندر داخل ہو تو کہا جاتا ہے: ''شَرِیَ الْبَرْقُ''۔

(۳۱۰) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "نساء کم حرث لکم فاتو حرثکم انی شئتم" کے بارے میں ارشاد فرمایا (کہ اس سے مراد) "فی صمام واحد" ہے (یعنی تم اپنی کھیتی میں ایک راستہ سے آؤ)۔ (سنن ترمذی:۲۹۷۹)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔☆ اس حدیث شریف میں جو لفظ "صِمام" ہے اُس کی جگہ "سِمام" بھی روایت میں آیا ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ بیویوں کے کھیتی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے لیے کاشتکاری اور اولاد کے اُگنے کی جگہ ہیں۔ یہ جملہ تشبیہ کے طور پر ہے یعنی اس میں عورت کے مقام مخصوص کو زمین کی مانند منی کے قطرہ کو بیج کی مانند اور اولاد کو اُگنے والے (سبزہ) کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ آگے جو فرمایا کہ "تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آؤ" اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے چاہو اور جہاں سے چاہو کھیتی میں آؤ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اگلے مقام سے آؤ۔ یعنی جب تمہارا آنا اگلے مقام سے ہو تو پھر جیسے چاہو تم آسکتے ہو۔

عمل زوجیت کے مقام کا بیان

آیت کے اس حصہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ عورتوں کے ساتھ پچھلے مقام میں صحبت کرنا حرام ہے کیونکہ کھیتی اور کاشتکاری کا جو مقام ہے وہ آگے کا مقام ہے نہ کہ پچھلا۔ اس مسئلہ کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۱۱) جو شخص عورت کے پاس پچھلے مقام سے آئے وہ ملعون ہے۔

(سنن ابوداؤد:۲۱۶۲ مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۴ مشکوٰۃ المصابیح:۳۱۹۳ ص ۲۷۶)

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت عزل (ضبطِ تولید) کے بارے میں ہے۔ یعنی اگر تم چاہو تو ضبطِ تولید کرو اور اگر چاہو تو نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عزل کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ عورت تمہاری کھیتی ہے چاہو تو اس کو پیاسا رکھو اور چاہو تو سیراب کرو۔ حضرت ابن عباس ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اگر آزاد عورت نکاح میں ہو تو اس سے مشاورت کر کے ضبط تولید کیا جائے اور اگر عورت باندی ہو تو اُس سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ امام احمد کا یہی مؤقف ہے۔ جبکہ علماء کی ایک جماعت نے ضبطِ تولید کو اس بنیاد پر مکروہ قرار دیا ہے کہ پس پردہ یہ بھی (ایک طرح سے) اولاد کو زندہ درگور کرنا ہے۔

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس قرآن مجید لیے کھڑا تھا کہ آپ نے یہ آیت پڑھی: "نساء کم حرث لکم" تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں۔ اور مجھ سے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ آیت کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت اُس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے پچھلے مقام میں اپنی بیوی سے صحبت کر لی تھی پھر اُسے اپنے اس کام پر پریشانی لاحق ہوئی تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن حسن بیان کرتے ہیں کہ اُن کی حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اُن سے پوچھا کہ اے عم محترم! وہ کون سی حدیث ہے جو نافع حضرت عبداللہ سے بیان کرتے ہیں کہ عورتوں کے پاس پچھلے مقام سے آنے میں کوئی حرج نہیں ہے؟ تو سالم بن عبداللہ نے کہا کہ بندہ نے کذب بیانی کی اور غلطی کی عبداللہ کا

قول تو یہ ہے کہ مرد اپنی عورتوں کے پچھلے مقام سے اگلے مقام میں آ سکتے ہیں۔ امام مالک سے یہ قول مروی ہے کہ پچھلے مقام میں آنا جائز ہے' لیکن اُن کے اصحاب نے اس قول کا انکار کیا ہے۔ علماء کی اکثریت کا جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ پچھلے مقام میں عمل زوجیت کرنا حرام ہے۔ کیونکہ عورت کا جو اگلا مقام ہے اُس کو اللہ تعالیٰ نے عورت کے حیض کے ایام میں اس وجہ سے حرام قرار دیا ہے کہ وہاں عارضی طور پر نجاست آ جاتی ہے۔ تو وہ مقام جہاں لازمی طور پر نجاست ہوتی ہے یعنی پچھلا مقام وہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ''حــرث'' یعنی کھیتی کا لفظ فرمایا ہے اور کھیتی یہ ہے کہ اس سے اولاد پیدا ہو' لہٰذا اس مقام کو چھوڑ کر کسی اور مقام کو اختیار نہیں کیا جائے گا۔

اپنے لیے آگے کا انتظام کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال اور ان کے دلائل

﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی اولاد کی پیدائش کا انتظام کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عمل زوجیت کرنے سے پہلے بسم اللہ اور دُعا پڑھ لیا کرو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۱۲) جب تم میں سے کوئی شخص اپنی اہلیہ سے ہم بستر ہونا چاہے تو وہ یہ کہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا'' یعنی اللہ کے نام سے میں آغاز کرتا ہوں' اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچانا اور جو کچھ تو ہمیں عطا فرمائے اُس کو بھی شیطان سے محفوظ رکھنا۔ تو اگر اس ملاقات میں اُن کے لیے اولاد مقدر ہوگی تو اس کو شیطان کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔[۵۸۸] (صحیح بخاری:۳۲۷۱' صحیح مسلم:۳۴۳۴' سنن ترمذی:۱۰۹۲' سنن ابوداؤد:۲۱۶۱' سنن ابن ماجہ:۱۹۱۹' سنن دارمی:۲۲۱۲' مسند احمد ج۱ص۲۱۷' مشکوٰۃ المصابیح:۲۴۱۶۔ص۲۱۲)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آگے کا انتظام کرنے سے مراد یہ ہے کہ اولاد کو اپنے لیے آگے بھیجا جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۱۳) جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں اُس کو آگ صرف قسم پوری کرنے کے لیے چھوئے گی۔

(صحیح بخاری:۶۶۵۶' صحیح مسلم:۲۶۳۲' سنن ترمذی:۱۰۶۰' سنن نسائی:۱۸۷۵' سنن ابن ماجہ:۱۶۰۳' مسند احمد ج۲ص۲۳۹' سنن بیہقی ج۴ص۶۷)

☆ قسم پوری کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کو صرف اتنی دیر آگ چھوئے گی جس سے اللہ تعالیٰ اپنی قسم پوری فرما لے۔ قسم سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''بے شک تم میں سے ہر شخص کو دوزخ پر آنا ہے''۔ (مریم:۷۱) حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں وہ شخص جب دوزخ پر وارد ہوگا تو وہ اُسے پار کر لے گا' اور یوں اللہ تعالیٰ کا فرمان پورا ہو جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا اگلا حصہ اس بات کی دلیل ہے کہ آگے کا انتظام کرنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے لیے بھلائی اور نیک اعمال آگے بھیجو (تاکہ مرنے کے بعد اُن سے فائدہ ہو)۔

۵۸۸ علامہ عینی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے نام کی برکت سے بچہ جسمانی طور پر شیطانی اثرات سے محفوظ رہے گا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اصلاً شیطان انسان کے ساتھ ازابتداء تا انتہاء لگا رہتا ہے اور انسانی جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو شیطان اُس کے نتھنے پر سوار رہتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو اُس کے دل پر حاوی رہتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج۲ص ۳۸۱) علامہ علی قاری اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عمل زوجیت کے آغاز میں اللہ عزوجل کے ذکر کی برکت سے بچہ کا انجام اور خاتمہ اچھا ہوگا اور وہ اپنی زندگی میں جنون اور اس جیسی دیگر بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہے گا۔ (مرقات ج۵ص۲۶۵)

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں تم سے وہ کام سرزد نہ ہو جائے جس سے اللہ نے تمہیں منع فرمایا ہے۔ ﴿اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (تم یقین رکھو کہ) تمہیں آخرت میں اُسی کی طرف جانا ہے اور وہاں وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مؤمنین کے لیے اللہ عزوجل کی طرف سے جو اعزاز ہے اُس کی اُنہیں خوش خبری سُنائیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اور تم نیکی' تقویٰ اور لوگوں کی خیرخواہی سے بچنے کے لیے جو قسمیں اُٹھاتے ہو اُن میں اللہ کو نشانہ نہ بناؤ' اور اللہ خوب سننے والا' بہت جاننے والا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن رَوَاحہ اور اُن کے بہنوئی حضرت بُشیر بن نُعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان کوئی جھگڑا تھا۔ حضرت عبداللہ نے قسم کھائی کہ وہ نہ تو اپنے بہنوئی کے پاس جائیں گے' نہ اُن سے بات کریں گے اور نہ ہی اُن کی اُن کے مخالف سے صلح کرائیں گے۔ اب ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے مذکورہ باتوں کے متعلق کہا جاتا تو وہ کہتے کہ میں نے ان کاموں کے نہ کرنے پر اللہ کی قسم کھائی ہوئی ہے' لہٰذا میرے لیے صرف یہی صورت ہے کہ میں اپنی قسم کو پورا کروں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ حضرت مِسطح کے لیے آئندہ کچھ خرچ نہیں کریں گے' کیونکہ ''اِفک'' کے معاملہ میں وہ بھی شامل تھے۔[۵۸۹] اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

آیت میں فرمایا کہ اللہ کو ''عُرضہ'' نہ بناؤ۔ ﴿عُرْضَةً﴾ اُس چیز کو کہتے ہیں جس کو آڑ بنایا جائے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: سختی اور قوت۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو درمیان میں حائل ہو کر کسی چیز سے روک دے اُس کو بھی ''عُرضہ'' کہتے ہیں۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اللہ کی قسم کو نیکی اور تقویٰ کی راہ میں رُکاوٹ نہ بناؤ۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ جب کسی کو نیکی اور صلہ رحمی کے لیے بُلایا جائے تو وہ یہ جواب دے کہ میں تو اللہ کی قسم اٹھا چکا ہوں کہ یہ کام نہیں کروں گا۔ اور وہ نیکی اور صلح کو ترک کرنے کے لیے اپنی قسم کو سبب قرار دے۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا﴾ اس کا معنیٰ ایک قول کے مطابق یہ ہے کہ تم اللہ کی قسم اس بات پر نہ اٹھاؤ کہ تم آئندہ نیکی' پرہیزگاری اور صلح کے کام نہیں کرو گے۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تم کثرت کے ساتھ اللہ کی قسم نہ اُٹھایا کرو' اگرچہ تم نیک' پرہیزگار اور صلح کرانے والے ہو' کیونکہ کثرت کے ساتھ اللہ کی قسم اُٹھانا ایک طرح سے اللہ پر جرأت اور جسارت کرنا ہے۔

(۳۱۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی بات پر قسم اُٹھائے'

---

۵۸۹ یعنی ہجرت نبویہ کے پانچویں سال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگی تھی' جس کے تناظر میں سورۂ نور کی آیات نازل ہوئی تھیں' اس تہمت کے لگانے میں حضرت مِسطح بن اُثاثہ بھی شریک تھے۔ (تفصیلی واقعہ کے لیے کتب سیرت ملاحظہ فرمائیے۔)

پھر اس کے خلاف کرنے میں بھلائی دیکھے تو اُسے چاہیے کہ وہ اُس کے خلاف کر گزرے اور قسم کا کفارہ دے دے۔

(صحیح مسلم:۱۶۵۰،سنن ترمذی:۱۵۳۰،مؤطا امام مالک:۱۰۵۸،مشکوٰۃ المصابیح:۳۴۱۳_ص۲۹۶)

آیت کے اختتام پر فرمایا کہ اللہ خوب سُننے والا بہت جاننے والا ہے یعنی تمہاری قسموں کو سُنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

تمہاری بے ارادہ کھائی ہوئی قسموں پر اللہ تمہاری گرفت نہیں فرمائے گا، البتہ وہ قسمیں جو تم نے اپنے دلی ارادے سے کھائی ہیں اُن پر تمہاری گرفت فرمائے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا بہت بُردبار ہے O

''لغو'' کا معنیٰ اور لغو قسم کی تفسیر میں ائمہ کے مختلف اقوال

کسی بھی کلام کا وہ حصہ جو بے کار، گراپڑا اور ناقابل شمار ہو اُس کو ''لـغـو'' کہتے ہیں۔ایسا کلام زبان سے بغیر سوچے سمجھے جاری ہوتا ہے۔قسم میں جس کو لغو فرمایا گیا ہے اُس سے مراد وہ قسم ہے جس میں ارادہ شامل نہ ہو۔جیسے لوگ بغیر نیت اور ارادے کے اپنی زبان سے یہ کلمات ادا کرتے رہتے ہیں کہ ''خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے'' یا ''خدا کی قسم! ایسا ہی ہے''۔اس طرح جو قسمیں کھائی جاتی ہیں وہ ''لغو'' ہوتی ہیں۔امام شافعی کا یہی موقف ہے[۵۹۰] اس کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ اُن باتوں کے بارے میں نازل ہوا ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ ''خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے'' یا ''خدا کی قسم! ایسا ہی ہے''۔

(صحیح بخاری:۴۶۱۳، سنن بیہقی ج۱۰ص۴۸، مشکوٰۃ المصابیح:۳۴۱۷_ص۲۹۶)

امام بخاری نے اس روایت کو موقوفاً ذکر کیا ہے، اور امام ابوداؤد نے اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۱۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لغو قسم سے مراد لوگوں کا اس طرح کہنا ہے کہ ''خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہے'' یا ''خدا کی قسم ایسا ہی ہے''۔[۵۹۱] (سنن ابوداؤد:۳۲۵۴، سنن بیہقی ج۱۰ص۴۹)

☆ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو موقوفاً بھی روایت کیا ہے۔

---

۵۹۰ ایک قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی منقول ہے اور دوسرا قول جو اصل ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے گمان میں کسی چیز کو سچا اور درست سمجھتے ہوئے قسم کھالے بعد میں وہ چیز اس کے برخلاف ظاہر ہو۔یہ قول امام شافعی کے موقف کے خلاف ہے۔البتہ پہلا قول اُن کے موقف کے مطابق ہے۔لیکن امام شافعی لغو قسم کو زمانہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں میں عام رکھتے ہیں۔یعنی آدمی بلا ارادہ قسم کے جملے ماضی کے متعلق استعمال کرے یا حال اور مستقبل کے متعلق، وہ بہر حال لغو قسم شمار ہوں گے اور اُن میں کفارہ نہیں ہوگا۔جبکہ احناف کے نزدیک بلا ارادہ قسم کے جملے (امام اعظم کے ایک قول کے مطابق) لغو قسم اُس وقت شمار ہوں گے جب وہ ماضی یا حال سے متعلق ہوں۔مستقبل سے تعلق رکھنے والے بلا ارادہ قسم کے جملے لغو شمار نہیں ہوں گے اور اُنہیں پورا نہ کرنے کی صورت میں کفارہ بھی لازم ہوگا۔(بدائع الصنائع ج۳ص۷)

۵۹۱ یہ روایت اور اس سے قبل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول امام اعظم ابوحنیفہ کے خلاف نہیں ہے۔کیونکہ خود امام اعظم کا ایک قول یہی ہے کہ لغو قسم اُس قسم کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ زبان سے ادا ہو۔تفصیل گذشتہ حاشیہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بعض علماء کے نزدیک لغو قسم سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کو سچا اور درست سمجھتے ہوئے قسم کھالے پھر بعد میں وہ چیز اس کے برخلاف ظاہر ہو۔ امام ابوحنیفہ کا یہی مؤقف ہے[۵۹۲] اُن کے نزدیک اس قسم میں نہ کفارہ ہے نہ گناہ۔ امام مالک مؤطا میں فرماتے ہیں کہ لغو قسم کے متعلق جو باتیں میں نے سب سے اچھی سُنی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کسی چیز پر یقین کرتے ہوئے قسم کھالے پھر بعد میں اُس کے برخلاف ظاہر ہو اس میں کفارہ نہیں ہے۔ امام مالک مزید فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی چیز پر قسم کھائے اور اُسے یہ معلوم ہو کہ وہ اس قسم میں گناہگار اور جھوٹا ہے لیکن کسی کی خوشی حاصل کرنے کے لیے یا عذر بیان کرنے کے لیے یا مال حاصل کرنے کے لیے یہ قسم اٹھائے تو اس میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں ہوگا۔ کفارہ صرف اس صورت میں ہے جب آدمی کسی جائز کام کو نہ کرنے کی قسم اٹھائے۔ اور پھر اس کو کر گزرے یا کسی کام کے کرنے کی قسم اُٹھائے اور اس کو نہ کرے۔ جیسے کوئی شخص یہ قسم اُٹھائے کہ وہ دس درہم میں اپنا کپڑا نہیں بیچے گا' پھر اس کو دس درہم میں بیچ دے یا یہ قسم اٹھائے کہ وہ اپنے غلام کو لازماً مارے گا' پھر اس کو نہ مارے تو اس صورت میں کفارہ ہے۔ (مؤطا امام مالک کتاب النذ ورو الا یمان' باب خامس)

''لغو'' کی تفسیر میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا جو اختلاف ہے اُس کا ثمرہ اور حاصل یہ ہے کہ آدمی جب یہ کہے کہ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے یا خدا کی قسم! ایسا ہی ہے تو اس طرح کے جملوں میں امام شافعی کفارہ کو واجب قرار نہیں دیتے' بلکہ جب آدمی کسی چیز پر یقین کرتے ہوئے قسم کھالے پھر بعد میں اس کے برخلاف ظاہر ہو تو اس صورت میں وہ کفارہ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حکم اس کے برعکس ہے۔[۵۹۳] امام شافعی کا جو مذہب ہے وہ حضرت عائشہ' امام شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا جو مذہب ہے وہ حضرت عبد اللہ بن عباس' حضرت حسن بصری' مجاہد' نخعی' زُہری' سلیمان بن یسار' قتادہ اور مکحول کا قول ہے۔

ایک قول لغو کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جو غصہ کے وقت کھائی جائے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جو غلطی سے بغیر ارادہ کے کھائی جائے۔ آیت میں جو فرمایا: ''لا یؤاخذکم'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہاری لغو قسموں پر اللہ تمہیں سزا نہیں دے گا۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہاری لغو قسموں میں اللہ تم پر کفارہ لازم نہیں فرماتا۔

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ یعنی جن قسموں کا تم نے پختہ ارادہ اور قصد کرلیا ہو اُن (کو توڑنے کی صورت) میں اللہ تمہاری گرفت فرمائے گا۔ ''کسب القلب'' سے مراد ہے: پختہ اور دلی ارادہ۔

قسم کے متعلق تین اہم شرعی مسائل کا بیان

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ قسم اُسی صورت میں منعقد ہوگی جب اللہ عزوجل کی ذات کی ہو یا اللہ عزوجل کے دیگر ناموں اور صفتوں کی ہو۔ اللہ عزوجل کی ذات کی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے آدمی کہے کہ ''مجھے اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے'' یا ''اُس ذات کی قسم جس کی میں عبادت کرتا ہوں'' یا اور اس طرح کے دیگر جملے اور اللہ عزوجل کے ناموں کی قسم اُٹھانے کی مثال یہ ہے کہ جیسے آدمی کہے کہ اللہ کی قسم' رحمٰن کی قسم' رحیم کی قسم' ''مُهَيْمِن'' (نگہبان) کی قسم! اور اللہ عزوجل کی صفتوں کی قسم اٹھانے کی مثال یہ ہے جیسے آدمی یہ کہے کہ مجھے اللہ کی عزت وعظمت اور اس کی قدرت کی قسم' یا اور اس

[۵۹۲] امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مؤقف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق ہے۔ کیونکہ ''لغو'' کی تفسیر میں انہوں نے یہی فرمایا ہے۔ جیسا کہ علامہ خازن عنقریب ذکر کریں گے۔

[۵۹۳] یعنی امام اعظم کے نزدیک آدمی جب اپنے گمان میں کسی چیز کو سچا اور درست جانتے ہوئے قسم کھالے بعد میں وہ چیز اُس کے برخلاف ظاہر ہو تو اس صورت میں کفارہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ یمین لغو ہے اور لغو میں کفارہ نہیں رکھا گیا۔ (واضح رہے کہ یہ اُس صورت میں ہے جب قسم زمانہ ماضی یا حال سے متعلق ہو۔ مستقبل سے متعلق ہونے کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا۔)

طرح کی دیگر صفات۔ جب آدمی ان میں سے کسی بھی چیز کی قسم اٹھائے اور پھر اس کو توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ جیسے لوگ قسم کھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''کعبۃ اللہ کی قسم'' یا ''نبی کی قسم'' یا ''میرے باپ کی قسم'' یا اور اس طرح کی دیگر چیزیں' ان میں سے کسی کی بھی قسم کھائی تو وہ قسم منعقد نہیں ہوگی[۵۹۴] اور (اس کے توڑنے پر) کفارہ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن ایسی قسم مکروہ ہے' کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۱۶) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قافلہ کے ساتھ چل رہے تھے اور اس دوران اپنے والد کی قسم کھا رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ اُن کے پاس آپہنچے' تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ عزوجل تم لوگوں کو اس بات سے منع فرماتا ہے کہ تم اپنے باپ کی قسم اٹھاؤ' جس شخص کو قسم اٹھانی ہو اُسے چاہیے کہ وہ اللہ عزوجل کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے۔

(صحیح بخاری: ۶۶۴۶' صحیح مسلم: ۱۶۴۶' سنن ترمذی: ۱۵۳۴' سنن ابوداؤد: ۳۲۴۹' سنن نسائی: ۳۷۶۶' سنن ابن ماجہ: ۲۰۹۴' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۸' مسند احمد ج ۲ ص ۱۱' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۴۰۷ ص ۲۹۶)

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب آدمی آئندہ کی کسی بات کی قسم اٹھائے اور اُسے توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم ہے اور اگر گزشتہ زمانہ کی کسی بات کی قسم اٹھائے اور وہ بات نہ ہوئی ہو یا نہ ہونے کی قسم اٹھائے اور وہ ہوئی ہو' اور یوں کہے کہ ''خدا کی قسم! میں نے یہ کام نہیں کیا'' حالانکہ اُس نے کیا ہو۔ یا ''خدا کی قسم! یہ کام میں نے کیا ہے'' حالانکہ اُس نے نہ کیا ہو تو اگر اُسے قسم کے دوران اس بات کا علم ہو (کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے) تو یہ یمین غموس ہے' اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ یہ قسم چونکہ آدمی کو گناہ میں ڈبو دیتی ہے اس لیے اس کو غموس کہا جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اس میں بھی کفارہ واجب ہے' خواہ اُسے حقیقت کا علم ہو یا نہ ہو۔ اور امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ اس قسم میں کفارہ نہیں ہے۔ البتہ اگر اُسے یہ معلوم ہو (کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے) تو یہ گناہ کبیرہ ہے اور اگر معلوم نہ ہو تو پھر یہ یمین لغو ہے۔[۵۹۵]

زیر بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر

﴿غَفُوْرٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ لوگ جو لغو قسمیں کھاتے رہتے ہیں اُن میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو بخشنے والا ہے' یہ وہ قسمیں ہیں جن کے متعلق خود اُس نے بتا دیا کہ وہ گرفت نہیں فرمائے گا۔ ہاں اگر وہ چاہتا تو (ضرور) گرفت فرماتا' یعنی دُنیا میں کفارہ اور آخرت میں سزا لازم کر دیتا (لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ ''غفور'' ہے)۔ اور ﴿حَلِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ بردبار ہے یعنی نافرمانوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔ حلیمی کا قول یہ ہے کہ حلیم اُس کو کہتے ہیں جو لوگوں کے گناہوں کے باوجود اپنے انعام واکرام اور فضل وکرم کو نہیں روکتا بلکہ نافرمان کو بھی اُسی طرح نوازتا ہے جس طرح فرمانبردار کو نوازتا ہے' اور گناہوں میں مشغول رہنے کے باوجود نافرمان کو اُسی طرح بقاء دیتا ہے جس طرح نیک پرہیزگار شخص کو وہ بقاء دیتا ہے اور نافرمان شخص

---

۵۹۴ البتہ قرآن مجید کی قسم کھانا (جیسا کہ فی زمانہ رائج ہے) شرعاً قسم ہے اور اس پر قسم کے تمام احکام لاگو ہوں گے۔ (درّ مختار مع ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۸۵ طبع جدید) ہاں! قسم کا لفظ استعمال کیے بغیر محض قرآن مجید کو اٹھا کر یا سر پر رکھ کر کوئی بات کہنا یا قرآن مجید پہ ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہنا شرعاً قسم نہیں ہے۔

۵۹۵ یمین غموس (یعنی جان بوجھ کر کسی ایسی بات پر جھوٹی قسم اٹھانا جس کا تعلّق گذشتہ زمانہ سے ہو) یہ گناہ کبیرہ ہے البتہ امام شافعی کے نزدیک اس میں کفارہ ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں ہے۔ گناہ کبیرہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو گناہ کبیرہ میں شمار فرمایا ہے۔ (دیکھیے صحیح بخاری: ۶۶۷۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۰)

اگر چہ غافل ہوتا ہے اور دُعا تو درکنار وہ اُس ذات کو یاد تک نہیں کرتا اس کے باوجود وہ اُس کو آفتوں اور مصیبتوں سے اُسی طرح بچاتا ہے جس طرح وہ اپنے اُس عبادت گزار بندے کو بچاتا ہے جو اُس سے دعائیں کرتا ہے اور اُس سے سوال کرتا ہے۔

ابوسلیمان خطابی کا قول یہ ہے کہ ''حلیم'' درگزر کرنے والی اور باوقار شخصیت کو کہتے ہیں جس کو کسی قسم کا غصہ مضطرب نہ کر سکے اور کسی جاہل کی جہالت اور نافرمان کی نافرمانی اس کے مرتبہ میں کمی نہ کر سکے۔ ایسا شخص جو بدلہ لینے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور وہ درگزر کرے تو اُسے ''حلیم'' نہیں کہا جا سکتا۔ ''حلیم'' تو صرف وہ شخص ہوتا ہے جو بدلہ لینے کی قوت کے باوجود درگزر کرے اور ایسا متحمل المزاج ہو کہ سزا دینے میں جلدی نہ کرے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

جو لوگ اپنی بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے' اگر وہ (اس مدت میں) رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے O اور اگر انہوں نے طلاق دینے کا پکا ارادہ کر لیا ہے تو بے شک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے O

الفاظ کی تشریح اور تفسیر

﴿ يُؤْلُوْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: جو لوگ قسم کھاتے ہیں۔ عربی میں ''اَلِیَّۃ'' قسم کو کہتے ہیں' جیسا کہ کثیر کا شعر ہے:

قلیل الا لا یا حافظ لیمینہ وان سبقت منہ الالیۃ برّت

ترجمہ: ''جو شخص کبھی کبھار قسم کھاتا ہے وہ اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور جب وہ قسم کھا لیتا ہے تو اس کو پورا کرتا ہے''۔

عُرفِ شرع میں ''ایلاء'' یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھا لے۔ مثلاً یوں کہے کہ خدا کی قسم! میں تجھ سے صحبت نہیں کروں گا یا تجھ سے ہم بستر نہیں ہوں گا یا تجھ سے قریب نہیں ہوں گا۔ آیت میں ﴿ تَرَبُّصُ ﴾ کا معنیٰ ہے: ٹھہرے رہنا اور انتظار کرنا۔ اور ﴿ فَاِنْ فَآءُوْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر قسم کھانے والے صحبت کر کے اپنی قسم سے رجوع کر لیں' یعنی صحبت نہ کرنے کی انہوں نے جو قسم کھائی تھی اُس سے وہ رجوع کر لیں۔ ﴿ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو جو ضرر پہنچایا اُس سے جب وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ اور وہ تمام ہی توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا اور ان پر بہت مہربانی فرمانے والا ہے۔

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا معمول تھا کہ جب وہ اپنی بیوی سے کوئی چیز مانگتے اور وہ دینے سے انکار کر دیتی تو وہ اُس سے ایک' دو اور تین سال تک قریب نہ ہونے کی قسم کھا لیتے تھے' اور عورت کو اس حالت میں رہنے دیتے کہ وہ نہ تو غیر شادی شدہ ہوتی نہ شادی شدہ۔ جب اسلام کی آمد ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے چار ماہ کی مدت معیّن فرما دی' اور مذکورہ آیت کو نازل فرمایا۔ حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''ایلاء'' زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے درمیان ضرر پہنچانے کا ایک طریقہ تھا۔ یعنی جب آدمی نہ تو اپنی بیوی کو پسند کرتا اور نہ اس کے کسی اور سے نکاح کو پسند کرتا تو وہ یہ قسم کھا لیتا کہ میں کبھی بھی تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ یہ قسم کھا کر وہ اس کو اس حالت میں چھوڑ دیتا کہ وہ نہ تو غیر شادی شدہ ہوتی اور نہ ہی شادی شدہ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی لوگوں کا یہی معمول تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ

نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور چار ماہ کی صورت میں ایک ایسی مدت مقرر فرما دی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ شوہر کے اپنی بیوی سے متنفر ہونے کی وجہ کیا ہے؟

ایلاء کے متعلق چند اہم شرعی مسائل کا بیان

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ وہ کبھی بھی یا چار ماہ سے زیادہ دنوں تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا تو ایسا شخص ایلاء کرنے والا کہلاتا ہے۔ جب چار مہینے گزر جائیں تو شوہر کو روک دیا جائے گا اور اُسے فیئی یعنی رجوع کرنے کا یا طلاق دینے کا حکم دیا جائے گا' اور یہ بیوی کے مطالبہ کے بعد ہوگا۔ سو اگر اُس میں طاقت ہو اور وہ صحبت کے ذریعہ اپنی قسم سے رجوع کر لے یا عاجز ہونے کی صورت میں زبان سے رجوع کر لے تو ٹھیک ہے' اور اگر رجوع بھی نہ کرے اور طلاق بھی نہ دے تو حاکمِ وقت ایک طلاق دلوائے گا۔ حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی موقف ہے۔ سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ میں دس صحابہ کرام کے ساتھ رہا' وہ سب کے سب اس بات کے قائل تھے کہ حکم ایلاء کرنے والے پر موقوف کیا جائے گا۔ حضرت سعید بن جبیر' سلیمان بن یسار اور مجاہد کا یہی مذہب ہے' اور امام مالک' امام شافعی' امام احمد اور اسحٰق کا یہی موقف ہے' جبکہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا موقف یہ ہے کہ جب چار ماہ کی مدت گزر جائے تو عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ جبکہ حضرت سعید بن مسیّب اور زہری کا موقف یہ ہے کہ عورت کو ایک رجعی طلاق ہو جائے گی۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے چار ماہ سے کم عرصہ تک صحبت نہ کرنے کی قسم کھائی تو اُسے ایلاء کرنے والا نہیں کہا جائے گا' بلکہ وہ ایک قسم اُٹھانے والا ہے۔ لہٰذا اگر اُس نے مدت گزرنے سے پہلے صحبت کی تو اُس پر قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہو جائے گا۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے چار ماہ تک صحبت نہ کرنے کی قسم اٹھائی تو اس مدت کے گزر جانے کے بعد وہ شخص امام شافعی کے نزدیک ایلاء کرنے والا نہیں کہلائے گا کیونکہ مدت کا باقی ہونا اس بات کی شرط ہے کہ معاملہ کو شوہر پر موقوف کیا جائے اور اس سے رجوع یا طلاق کا مطالبہ کیا جائے۔ اور وہ مدت گزر گئی (لہٰذا وہ ایلاء کرنے والا نہیں کہلائے گا)۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ وہ شخص ایلاء کرنے والا کہلائے گا اور مدت کے گزرتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی۔

(۴) چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک آزاد اور غلام سب کے لیے ایلاء کی مدت چار مہینے ہیں۔ کیونکہ یہ مدت ایک ایسے سبب کی وجہ سے مقرر کی گئی ہے جس کا تعلق طبیعت سے ہے اور طبیعت یہ ہے کہ شوہر کے بغیر عورت زیادہ اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتی' لہٰذا اس میں آزاد اور غلام دونوں یکساں ہیں' جیسے ''عِنِّین'' ہونے کی صورت میں مدت برابر ہے۔ جبکہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ (غلام کے حق میں) غلامی کی وجہ سے ایلاء کی مدت آدھی ہو جائے گی۔ فرق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کی غلامی کی وجہ سے مدت آدھی ہوگی۔ اور امام مالک کے نزدیک شوہر کی غلامی کی وجہ سے آدھی ہوگی' جیسے طلاق میں۔

(۵) پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ جب شوہر صحبت کر لے گا تو ایلاء سے خارج ہو جائے گا اور اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔ اکثر علماء کا یہی موقف ہے۔ جبکہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اُس پر کفارہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت :۲۲۶ میں مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے' جیسا کہ فرمایا کہ ''اگر وہ اس مدت میں رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان

ہے''۔جن علماء نے کفارہ کو واجب قرار دیا ہے اُن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو آخرت میں سزا نہیں ہوگی' نہ یہ بات کہ اُس پر کفارہ بھی نہیں ہوگا۔

آیت: ۲۲۷ کی تفسیر

﴿ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ ﴾ اگر وہ طلاق کے واقع کرنے کو پختہ کرلیں۔﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ ﴾ تو بے شک اللہ تعالیٰ اُن کی باتوں کو خوب سننے والا ہے۔﴿ عَلِيۡمٌ ﴾ اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں کو خوب جاننے والا ہے۔☆ اس آیت میں اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک شوہر طلاق نہ دے اُس وقت تک عورت کو طلاق نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عزم اور ارادہ کی شرط بیان فرمائی ہے۔

وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡٓ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ‌ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ دَرَجَةٌ ‌ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور طلاق والی عورتیں تین ماہواری تک اپنے آپ کو (دوسرے نکاح سے) روکے رکھیں' اور اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے اُس چیز کا چھپانا جائز نہیں ہے جو اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کی ہے' اور ان کے شوہر (عدت کی) اس مدت میں اپنی بیویوں کو واپس لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں بشرطیکہ وہ میل ملاپ چاہتے ہوں' اور جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے مردوں پر دستور کے مطابق حقوق ہیں' اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اور اللہ بہت غلبہ والا زبردست حکمت والا ہے O

لفظ ''قروء'' سے مراد حیض ہے یا طہر؟ اس بارے میں ائمہ میں کا اختلاف اور ان کے دلائل

﴿ وَالۡمُطَلَّقٰتُ ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ عورتیں جو طلاق پا کر اپنے شوہر کی رسّی سے آزاد ہو جائیں۔﴿ يَتَرَبَّصۡنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسی عورتیں انتظار کریں گی اور (دوسرا) نکاح نہیں کریں گی۔﴿ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ﴾ میں ''قروء'' ''قرء'' کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ حیض (یعنی ماہواری) اور طہر (یعنی حیض سے فراغت) دونوں پر بولا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ کا قول یہ ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے' جیسے ''شفق'' کا لفظ سرخی اور سفیدی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کا حقیقی معنیٰ حیض ہے اور طہر اس کا مجازی معنیٰ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا عکس ہے۔ پھر اس لفظ کی اصل کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل ''قرء'' بمعنیٰ جمع ہے' چونکہ حیض کے دنوں میں خون پیٹ میں جمع ہوتا ہے اور طہر کے دنوں میں وہ بدن میں جمع رہتا ہے اس لیے اسے ''قرء'' کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا اصل معنیٰ وقت ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''رجع فلان لقرئه'' یعنی فلاں شخص اپنے وقت پر واپس آیا۔ چونکہ حیض اور طہر دونوں اپنے اپنے وقت پر آتے ہیں اس لیے ان کو ''قرء'' کہا جاتا ہے۔

مذکورہ جو اختلاف اہل لغت کا ''قروء'' کے معنیٰ میں ہے اُسی کے مطابق فقہاء کے بھی اس بارے میں دو مختلف قول ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ ''قروء'' سے مراد حیض ہے۔ یہ قول حضرت عمر' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت ابوموسیٰ اشعری' حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت ابوالدرداء (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے مروی ہے۔ عکرمہ'

ضحاک، سُدی، اوزاعی، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے دیگر اصحاب کا یہی مؤقف ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ پہلے میں اس بات کا قائل تھا کہ ''قــروء'' سے مراد طہر ہے لیکن اب میرا موقف یہ ہے کہ قروء سے مراد حیض ہے۔ (۲) فقہاء کا دوسرا قول یہ ہے کہ ''قــروء'' سے مراد طہر ہے۔ یہ قول حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ امام زہری، ابان بن عثمان، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔

جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ''قـــــروء'' کا معنیٰ حیض ہے اُن کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے استحاضہ[۵۹٦] والی عورت سے فرمایا کہ:

(۳۱۷) تو اپنے اَقراء کے ایام میں (یعنی حیض کے دنوں میں) نماز کو چھوڑ دے۔

(سنن ترمذی: ۱۲۶، سنن ابوداؤد: ۲۹۷، سنن ابن ماجہ: ٦۲۵، سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۱۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۵٦۰ ۔ص ۵۷)

☆ چونکہ عورت صرف حیض کے دنوں میں نماز چھوڑتی ہے اس لیے اس حدیث میں اَقراء سے حیض کے ایام مراد ہوں گے۔

اور جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ''قــروء'' کا معنیٰ طہر ہے اُن کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جب حالتِ حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ:

(۳۱۸) (اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اپنی بیوی کو پاک ہونے تک اپنے پاس رکھے، اس کے بعد اگر چاہے تو رکھ لے اور چاہے تو جماع سے پہلے اُسے طلاق دے دے۔ کیونکہ یہی وہ عدت (عرصہ) ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ عورتوں کو طلاق دی جائے[۵۹۷] (صحیح بخاری: ۴۹۰۸، صحیح مسلم: ۱۴۷۱، سنن ابوداؤد: ۲۱۷۹، سنن نسائی: ۳۳۸۹، سنن ابن ماجہ: ۲۰۱۹، مسند احمد ج ۲ ص ۲٦، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۷۵ ۔ص ۲۸۳)

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ عدت کا جو وقت ہے وہ طہر ہے نہ کہ حیض[۵۹۸] (لہٰذا آیت میں ''قُروء'' سے مراد طہر ہوگا۔) لُغت میں اس کی تائید اعشٰی کے اس شعر سے ہوتی ہے کہ:

ففی کل عام انت جاشم غزوة　　تشد لاقصاها عزیم عزائکا

مورثة مالا وفی الحیّ رفعة　　لما ضاع فیها من قروء نسائکا

ترجمہ: ''تو پورے سال لڑائی کی تکلیف برداشت کرتا ہے اور اپنی مضبوط طبیعت کو دور و دراز جنگ کے لیے تیار کر لیتا ہے، وہ جنگ ایسی ہے جس سے تجھے مالِ غنیمت اور قبیلہ میں عزت ملتی ہے جبکہ اُس میں تیری عورتوں کے قروء (یعنی طُہر کے ایام) ضائع ہو جاتے ہیں''۔

---

۵۹٦ استحاضہ اُس خون کو کہتے ہیں جو عورت کو کسی بیماری کی وجہ سے آئے اور جو خون عادت کی وجہ سے آئے اُس کو حیض کہتے ہیں۔ استحاضہ میں نماز اور روزہ دونوں کی ادائیگی عورت پر لازم ہے۔ حیض کے مسائل علامہ خازن، البقرہ: ۲۲۲ کی تفسیر میں تفصیل سے بیان فرما چکے ہیں۔

۵۹۷ اس حدیث میں جو عدت کا لفظ ہے اس کا معنیٰ ''زمانہ اور عرصہ'' ہے۔ اس صورت میں حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ جس طُہر میں شوہر نے صحبت نہ کی ہو وہی طلاق دینے کا صحیح زمانہ ہے۔ جو علماء قُروء سے طہر مراد لیتے ہیں وہ اس حدیث شریف میں لفظ عدت سے عدتِ طلاق مراد لیتے ہیں اور حدیث کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ عورت کی عدتِ طلاق کا زمانہ طُہر کے ایام ہیں۔ لہٰذا زیرِ بحث آیت میں مطلّقہ عورتوں کی عدت کے لیے تین قُروء جو فرمایا گیا ہے اس سے ایام طہر مراد ہوں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اوّلاً قروء کا حیض کے معنیٰ میں ہونا صراحت کے ساتھ حدیث: ۳۱۷ سے ثابت ہے۔ ثانیاً زیرِ بحث حدیث: ۳۱۸ میں عدت سے عورتوں کی عدتِ طلاق مراد نہیں ہے بلکہ مردوں کے طلاق دینے کا زمانہ مراد ہے جو کہ طُہر ہے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۰۱۸)

۵۹۸ یہ استدلال درست نہیں ہے۔ گذشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

☆ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے جماع کیے بغیر جنگ کے لیے نکل پڑتا ہے اور اُن کے اُقراء (یعنی حیض سے فراغت کے ایام) ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور یقیناً سفر سے طہر ہی کے ایام ضائع ہوتے ہیں نہ کہ حیض کے ایام۔[۵۹۹]

ذکر کردہ اختلاف کا حاصل

''قروء'' کے متعلق علماء کا جو اختلاف مذکور ہوا اُس کا حاصل یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک عدت کی مدت کم ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک طویل ہے۔ کیونکہ جو ''قـروء'' سے طہر مراد لیتے ہیں اُن کے قول کے مطابق جب عدت گزارنے والی تیسرے حیض میں داخل ہو گی تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور دوسرا نکاح اُس کے لیے جائز ہو جائے گا اور جس طہر میں طلاق دی گئی ہے اُس کے بقیہ حصہ کو ایک ''قـــرء'' (یعنی مکمل طہر) سمجھا جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ طلاق والی عورت تیسرے حیض میں داخل ہوتے ہی اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے اور اس کے لیے دوسرا نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ یہ قول بھی حضرت عائشہ ہی سے مروی ہے کہ ''قـرء'' سے مراد طہر ہے نہ کہ حیض۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ عورتیں ہی اس مسئلہ کو زیادہ جانتی ہیں' کیونکہ حیض اور طہر ایسی چیزیں ہیں جو صرف عورتوں کو پیش آتی ہیں۔ اور اگر عورت کو حالت حیض میں طلاق ہوئی ہو تو اس کی عدت اُس وقت ختم ہو گی جب اُس کا چوتھا حیض شروع ہو گا۔ اور امام ابوحنیفہ کا جو مذہب ہے کہ ''قـــروء'' سے مراد حیض ہے اس کے اعتبار سے مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ اگر عورت کو طہر کی حالت میں طلاق دی گئی ہو تو جب تک وہ تیسرے حیض سے پاک نہ ہو جائے اس وقت تک اُس کی عدت ختم نہیں ہو گی۔ اور اگر حیض کی حالت میں طلاق ہوئی ہو تو جب تک وہ چوتھے حیض سے پاک نہ ہو جائے اُس کی عدت ختم نہیں ہو گی۔

عدت کا حکم بیان کرنے میں خبریہ انداز اختیار کرنے کی توجیہ

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں خبریہ انداز میں کیوں فرمایا کہ ''طلاق والی عورتیں تین قروء تک اپنے آپ کو (دوسرے نکاح سے) روکے رکھیں گی''؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خبر کی شکل میں امر ہے (یعنی بہ ظاہر خبر ہے حقیقۃً حکم ہے)۔ اصل عبارت اس طرح ہے کہ: ''ولیتربـص المطلقات'' طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور خبر کی صورت میں حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ حکم میں تاکید پیدا ہو اور اس بات کا اظہار ہو کہ تین قروء تک عورتوں کا اپنے آپ کو (دوسرے نکاح سے) روکے رکھنا ایک ایسا حکم ہے جس پر جلد از جلد عمل کرنا واجب ہے۔ (لہٰذا آیت میں خبریہ انداز کا مفہوم یہ ہے کہ) عورتوں کو جو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں اُس پر گویا کہ اُنہوں نے عمل کر لیا' اور جو اُن کی طرف سے عمل پایا گیا اُس کو اللہ تعالیٰ نے خبر کے طور پر بیان فرمایا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے لوگ دُعا دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''یـرحمـک اللہ'' (یہ جملہ دُعا کے معنیٰ میں ہے لیکن) قبولیت پر یقین کی وجہ سے اس کو خبریہ انداز میں بیان کیا گیا۔ گویا کہ آدمی نے یوں کہا کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو چکی ہے۔

عدت کے چند اہم شرعی مسائل کا بیان

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جس عورت کو حمل ہو اُس کی عدت اُس وقت پوری ہو گی جب بچہ پیدا ہو۔ خواہ عورت طلاق کی عدت میں ہو یا وفات کی۔ اور وہ آزاد ہو یا باندی' بہر صورت حکم یکساں ہے۔

---

[۵۹۹] اعشیٰ کے یہ اشعار اور اس طرح کی تمام لغوی تائیدات کا جواب یہ ہے کہ احناف کے مؤقف کے مطابق قروء کا حیض کے معنیٰ میں ہونا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور دیگر نصوص سے ثابت ہے' لہٰذا اشعار کے سہارے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔
(تفصیل کے لیے احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۳۶۶' اور تبیان القرآن ج ۱ ص ۸۳۹ ملاحظہ فرمائیں)

(۲) جو عورت وفات کی عدت میں ہو اور وہ حاملہ نہ ہو تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہیں۔ خواہ صحبت سے پہلے شوہر کا انتقال ہوا ہو یا صحبت کرنے کے بعد۔ اور اس مسئلہ میں حائضہ عورت، باندی اور آئسہ سب کا حکم برابر ہے (آئسہ اُس عورت کو کہتے ہیں جو ماہواری سے مایوس ہو گئی ہو)۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایسی طلاق یافتہ عورتیں جن کے ساتھ صحبت کر لی گئی ہو اُن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم اُن عورتوں کی ہے جنہیں حیض آتا ہے، ان کی عدت ''قروء'' سے ہو گی، یعنی تین ''قروء'' گزارنا ان کی عدت ہے۔ اور دوسری قسم اُن عورتوں کی ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے حیض سے مایوس ہو گئی ہوں یا اُنہیں کبھی حیض آیا ہی نہ ہو۔ ایسی عورتوں کو اگر طلاق ہو جائے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ رہیں وہ عورتیں جنہیں صحبت سے پہلے ہی طلاق ہو جاتی ہے اُن کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ جو مدت آدھی ہو سکتی ہے اُس میں غیر آزاد عورت کی عدت آزاد عورت کے مقابلہ میں آدھی ہے۔ اور قروء کی جو عدت ہے اُس میں دو قروء ہوں گے، کیونکہ قروء کو نصف نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ غلام دو عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اور دو طلاقیں دے سکتا ہے، اور باندی دو ماہواری تک عدت گزارے گی۔[۶۰۰]

جو کچھ اللہ نے پیٹ میں پیدا کیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

﴿ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''جو کچھ اللہ نے پیٹ میں پیدا کیا ہے'' اس سے مراد بچہ ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد حیض ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اُس حیض یا حمل کو چھپائے جو اللہ نے اُس کے پیٹ میں پیدا کیا ہے۔ اس چھپانے سے عورت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شوہر کا جو حق ہے یعنی رجوع کرنا اور اولاد اُس کو باطل کر دیا جائے (یعنی شوہر کو نہ رُجوع کا حق رہے نہ اولاد پر کوئی حق حاصل ہو)۔ آگے جو فرمایا کہ ''اگر وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں'' اس جملہ میں سخت وعید اور اس بات کی تاکید ہے کہ پیٹ میں موجود چیز کو چھپانا حرام ہے اور جو کچھ بھی پیٹ میں موجود ہے خواہ وہ حیض ہو یا اولاد اُس کے بارے میں اطلاع دینے کی جو امانت (عورت کے پاس) ہے اُس کی ادائیگی واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کام میں اگر چہ ایمان والی اور کافرہ عورت دونوں برابر ہیں لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ صاحب ایمان عورتوں کا کام ہے۔ جیسے ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اگر تو صاحبِ ایمان یا ایمان دار ہے تو میرا حق ادا کر دے۔ یعنی حقوق کی ادائیگی اُن افراد کا کام ہے جو صاحبِ ایمان ہوں۔ اسی طرح ہم ظالم سے کہتے ہیں کہ اگر تو مؤمن ہے تو مجھ پر ظلم نہ کر۔ یعنی تیرے ایمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ تجھے ظلم سے روک دے۔

رہا یہ کہ آیت مبارکہ میں صرف عورتوں کو وعید کیوں سُنائی گئی؟ سو اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول جو کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ رجوع کا حق شوہر کو حاصل ہے اس لیے وعید عورتوں کو سُنائی گئی۔ دوسرا قول جو کہ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ بچہ کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور کے ساتھ ملا دیا جائے گا اس لیے عورتوں کو وعید سنائی گئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عورتوں کا معمول یہ تھا کہ (طلاق ہو جانے کے بعد دورانِ عدت) اگر

[۶۰۰] اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: باندی کی عدت دو ماہواریاں ہیں۔ (سنن ترمذی:۱۱۸۲)

اُنہیں شوہر سے محبت پیدا ہو جاتی تو حیض سے فارغ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو حائضہ بتاتی تھیں تاکہ شوہر رجوع کر لے۔ اور اگر اُنہیں شوہر سے محبت نہ ہوتی تو اپنے حیض کو چھپاتی تھیں اور شوہر کے حقِ رجوع کو ضائع کرنے کے لیے کہتی تھی کہ ہم پاک ہو چکی ہیں (یعنی حیض سے فارغ ہو چکی ہیں)۔ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا اور امانت کی ادائیگی کا پابند فرمایا۔

رجوع کس مقصد کے تحت کیا جائے؟

فرمایا: ''ان کے شوہر اس مدت میں اپنی بیویوں کو واپس لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں بشرطیکہ وہ میل ملاپ چاہتے ہوں''۔ اس جملہ میں ﴿بُعُوْلَتُهُنَّ﴾ سے مراد شوہر ہیں۔ شوہر چونکہ اپنی بیوی کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے اُسے ''بعل'' کہا جاتا ہے۔ ''بعل'' کا اصل معنیٰ سردار اور مالک ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق والی عورتوں کے شوہر اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ عدت کے دوران ان کو واپس اپنی طرف لوٹا لیں۔ اور جب عدت کا وقت گزر جائے گا تو بیوی کو واپس اپنی طرف لانے اور اس سے رجوع کرنے کا حق باطل ہو جائے گا۔[۱۰۱] آیت میں ﴿اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ (رجوع اس صورت میں کرنا چاہیے) جب شوہر رجوع کے ذریعہ میل ملاپ اور اچھی گزر بسر کا ارادہ رکھتا ہو نہ یہ کہ نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا یہ معمول تھا کہ وہ تکلیف پہنچانے کی غرض سے رجوع کیا کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو اس طرح کرنے سے منع فرما دیا اور اُنہیں اس بات کا پابند کیا کہ وہ رجوع کرنے کے بعد حسن سلوک کی راہ اختیار کریں اور اچھی طرح زندگی گزاریں۔

آگے فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اس میں ﴿لَهُنَّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ عورتوں کے مردوں پر حقوق ہیں۔ اور ﴿عَلَیْهِنَّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کا حق اُسی صورت میں مکمل ہو سکتا ہے جب شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے ضروری اور غیر ضروری حقوق کا لحاظ کریں۔ یعنی شوہر پر واجب ہے کہ وہ عورت کے تمام حقوق اور معاملات کی ذمہ داری نبھائے اور عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی میرے سامنے بن ٹھن کے رہے اس طرح میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اُس کے سامنے بن سنور کے رہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے مردوں پر دستور کے مطابق حقوق ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حجۃ الوداع کے بیان میں نبی اکرم ﷺ کے خطبہ کا جو ذکر کیا ہے اُس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۱۹) تم لوگ عورتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ تم نے اُن کو اللہ تعالیٰ کی امان کے ساتھ (اپنے پاس) لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ (یعنی حکم) سے اُن کی شرم گاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ تمہارا اُن پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمہیں ناگوار ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی سزا دو جس سے چوٹ نہ لگے۔ اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اپنی حیثیت کے مطابق ان کو خوراک اور لباس فراہم کرو۔ (صحیح مسلم: ۱۲۱۸، سنن ابوداؤد: ۱۹۰۵، سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۵۵، ص ۲۲۵)

حدیث مذکورہ: (۳۱۹) کی مختصر تشریح

(۱) ''عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو''۔ اس جملہ میں اس بات کی ترغیب فرمائی جا رہی ہے کہ عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، اُن کے حقوق کا لحاظ کیا جائے اور دستور کے مطابق اُن کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ (۲) ''تم نے اللہ تعالیٰ

[۱۰۱] یعنی اگر تین سے کم طلاقیں دی ہیں تو عدت گزرنے کی صورت میں ازسرِنو نکاح کے بغیر وہ اُسے اپنی زوجیت میں نہیں لا سکے گا۔

کے کلمہ سے اُن کی شرم گاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے''۔یعنی اللہ تعالیٰ کے جائز کرنے سے حلال کیا ہے۔کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ''تمہیں جو عورتیں پسند ہوں اُن سے نکاح کرو''۔(النساء:۳) بعض علماء کے نزدیک کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ ''دستور کے مطابق اُس کو روک لو یا حسن سلوک کے ساتھ اُسے چھوڑ دو''۔(البقرہ:۲۲۹) بعض علماء کے نزدیک کلمہ سے کلمۂ توحید مراد ہے یعنی ''لا الٰه الا الله محمد رسول الله'' کیونکہ کوئی بھی مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے لیے حلال نہیں ہے۔(۳) ''وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمہیں ناگوار ہو''۔یعنی عورتیں کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ آ کر اُن سے باتیں کرے۔اہل عرب کا یہ رواج تھا کہ مرد عورتوں کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے اور اس کو نہ تو وہ عیب سمجھتے تھے اور نہ ہی باعثِ تہمت شمار کرتے تھے' حتیٰ کہ جب آیتِ حجاب یعنی پردے کا حکم نازل ہوا تو لوگوں کو اس فعل سے منع کر دیا گیا۔اس جملہ میں بستروں پر آنے سے مراد زنا کاری نہیں ہے' کیونکہ زنا تو ہر صورت میں حرام ہے خواہ اُس شخص کا آنا شوہر کو پسند ہو یا نہ ہو۔اگر اس جملہ میں بستروں پر آنے سے زنا مراد لیا جائے تو پھر یہ بات بے معنیٰ ہو جائے گی کہ ''جس کا آنا تمہیں ناگوار ہو''۔دوسری بات یہ کہ اگر زنا مراد ہوتا تو یہ نہ فرمایا جاتا کہ اُن کو ایسی سزا دو جس سے چوٹ نہ لگے۔ جبکہ زنا میں جو سزا ہے وہ حد شرعی ہے (یعنی شادی شدہ ہونے کی صورت میں سنگسار کرنا ہے ورنہ سو کوڑے ہیں)۔اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''ضربا غیر مبرح'' یعنی ایسی مار جو سخت نہ ہو۔(۴) ''اُن کا تم پر یہ حق ہے کہ تم معروف کے مطابق اُن کو خوراک اور لباس فراہم کرو''۔''معروف'' سے مراد انصاف ہے (یعنی انصاف کے ساتھ اُنہیں خوراک اور لباس فراہم کرو)۔اس جملہ سے معلوم ہوا کہ بیوی کا خرچ اور اُس کا لباس شوہر پر واجب ہے۔اور یہ اجماع امت سے ثابت ہے۔[۶۰۲]

مرد کی عورت پر فضیلت کی وجوہ

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے۔اس میں ﴿دَرَجَةٌ﴾ سے مراد مقام اور بلندی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ چونکہ مرد عورت کو مہر دیتا ہے اور اُس پر مال خرچ کرتا ہے اس لیے اُس کو فضیلت حاصل ہے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر جن وجوہات کی بناء پر فضیلت حاصل ہے اُن میں سے چند یہ ہیں: عقل' گواہی' میراث' دیت' امامت کی صلاحیت اور قضاء کی صلاحیت۔اسی طرح مرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح کرے یا باندی رکھے۔جبکہ عورت کو یہ اختیار نہیں ہے۔اسی طرح طلاق کا نظام مرد کے ہاتھ میں ہے' وہ طلاق دینے کی بھی طاقت رکھتا ہے اور رجعی ہونے کی صورت میں رجوع بھی کر سکتا ہے' جبکہ عورت کے ہاتھ میں یہ اختیار نہیں ہے۔امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ابوظبیان سے روایت کیا ہے کہ:

(۳۲۰) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی اکرم ﷺ نے کسی غزوہ میں بھیجا تھا' جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے کو سجدہ کر رہے ہیں' انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے بیان کی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔[۶۰۳]

(معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت' سنن ابن ماجہ: ۱۸۵۳' سنن ابوداؤد: ۲۱۴۰' مسند احمد ج۵ ص۲۲۷' سنن بیہقی ج۷ ص۲۹۲)

آخر میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ اس میں ''عزیز'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا غالب ہے کہ کسی کو اُس پر قوت

---

[۶۰۲] خود قرآن کریم کا صریح ارشاد موجود ہے کہ: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرہ:۲۳۳) یعنی جس شخص کا بچہ ہو اُس کے ذمہ دستور کے مطابق ان ماؤں کا کھانا اور اُن کا لباس ہے۔

[۶۰۳] اس حدیث شریف میں مردوں کے عورتوں سے افضل ہونے کا بیان ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی بیان ہے کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کے آگے سجدہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

حاصل نہیں ہے اور ''حکیم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اور احکام میں حکمت والا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

(رجعی) طلاق دو مرتبہ ہے' اس کے بعد یا تو بھلائی کے ساتھ اُسے روک لو یا حُسن سلوک کے ساتھ اُسے چھوڑ دو' اور جو کچھ تم نے ان کو دے دیا ہے اُس میں سے کچھ بھی واپس لینا تمہارے لیے جائز نہیں ہے' الّا یہ کہ دونوں کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے' سو اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ (میاں بیوی) دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عورت جو بھی (مال وغیرہ) دے کر چھٹکارہ حاصل کرے اُس (کے لینے دینے) میں دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے' یہ اللہ کی حدود ہیں' لہٰذا تم ان سے آگے نہ بڑھو' اور جو لوگ بھی اللہ کی حدود سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کا یہ معمول تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر عدت ختم ہونے سے پہلے اس سے رجوع کر لیتا' اگرچہ ہزار مرتبہ طلاق دی ہو۔ ہر مرتبہ طلاق دے کر جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو وہ رجوع کر لیتا اور کہتا کہ اللہ کی قسم! نہ میں تجھے اپنے پاس آنے دوں گا اور نہ کبھی تو حلال ہوگی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ ''(رجعی) طلاق دو مرتبہ ہے' اس کے بعد یا تو بھلائی کے ساتھ اُسے روک لو یا حُسن سلوک کے ساتھ اُسے چھوڑ دو''۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جن لوگوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی تھی اور جنہوں نے نہیں دی تھی اُن سب نے اس دن سے طلاق کے عمل کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ (مؤطا امام مالک: ۱۲۷۹) امام ترمذی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ:

(۳۲۱) لوگوں کا یہ معمول تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو جتنی مرضی آئے طلاق دے دیتا تھا اور دورانِ عدت اُس سے رجوع کر کے پھر اُسے بیوی کے طور پر رکھتا اگرچہ اُس نے سو یا اُس سے زیادہ طلاقیں دی ہوں۔ حتیٰ کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ خدا کی قسم! میں نہ تو تجھے ایسی طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے اور نہ کبھی تجھے اپنے پاس آنے دوں گا۔ عورت نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آدمی نے کہا کہ میں تجھے طلاق دیا کروں گا اور جب تیری عدت ختم ہونے کو آئے گی تو میں تجھ سے رجوع کر لوں گا۔ اُس عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جا کر یہ ساری بات بتا دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خاموش رہیں اور نبی اکرم ﷺ کو بتایا تو نبی ﷺ نے بھی خاموشی اختیار کی یہاں تک کہ قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ''طلاق دو مرتبہ ہے' اس کے بعد یا تو بھلائی کے ساتھ اُسے روک لو یا حسن سلوک کے ساتھ اُسے چھوڑ دو''۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی تھی اور جنہوں نے نہیں دی تھی اُن سب نے (اس آیت کے نازل ہونے کے بعد) طلاق کے عمل کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ (سنن ترمذی: ۱۱۹۲)

آیت مذکورہ کی تفسیر اور دومرتبہ طلاق دینے کا مفہوم

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ یعنی طلاق رجعی دومرتبہ ہے۔ تیسری طلاق کے بعد (دونوں آپس میں) دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے الا یہ کہ عورت دوسرے شخص سے نکاح کرلے۔ آیت کی یہ تفسیر اُن ائمہ کے نزدیک ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایک ہی مرتبہ میں تین طلاقیں دینا جائز ہے۔ یہ امام شافعی کا مؤقف ہے۔ جبکہ بعض دیگر علماء کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شرعی طلاق میں واجب ہے کہ علیحدہ علیحدہ ایک ایک کرکے طلاق دی جائے۔ نہ کہ ایک ساتھ یا الگ الگ تین طلاقیں ایک ہی جملہ میں دے دی جائیں۔ یہ تفسیر اُن ائمہ کے نزدیک ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ تین طلاقیں ایک ساتھ دینا حرام ہے۔ سوائے اس کے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ تین طلاقیں ایک ساتھ دینا حرام ہے لیکن تینوں واقع ہو جائیں گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت میں یہ بات بتائی جارہی ہے کہ کتنی طلاق تک مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے اور کتنی طلاق میں عورت جدا ہو جائے گی۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورتیں جب مدخولہ ہوں تو اُن سے طلاق کے جس عدد میں رجوع کیا جا سکتا ہے وہ دو طلاقیں ہیں، دو کے بعد تیسری طلاق دے کر اگر اُسے چھوڑ دیا تو اب رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

﴿ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ رجوع کرنے کے بعد اُسے بھلائی کے ساتھ روک لو۔ یعنی دوسری طلاق کے بعد جب آدمی رجوع کرلے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ اُسے معروف (یعنی بھلائی) کے ساتھ روک لے۔ ''معروف'' سے حقوق نکاح کی ادائیگی اور اچھے رہن سہن کا وہ طریقہ مراد ہے جو شریعت مطہرہ نے بیان فرمایا۔ ﴿ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آدمی طلاق کے بعد بیوی کو اس طرح چھوڑ دے کہ بغیر کسی ضرر کے اُس کی عدت گزر جائے۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے تو اُس کے تمام مالی حقوق اُسے ادا کردے اور جدا ہو جانے کے بعد نہ تو اُس کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے اور نہ ہی لوگوں کو اُس سے نفرت دلائے۔

طلاق کے چند اہم شرعی مسائل کا بیان

(۱) ایسے صریح اور واضح الفاظ جن کے استعمال سے بغیر نیت کے طلاق واقع ہو جاتی ہے وہ تین ہیں: طلاق، فراق اور سَراح۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک صریح لفظ ''طلاق'' ہے۔[۶۰۴]

(۲) آزاد آدمی جب صحبت کے بعد اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دے تو جب تک بیوی عدت میں ہو اُس کی رضامندی کے بغیر اُسے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر اُس نے رجوع نہیں کیا اور عدت گزر گئی یا صحبت سے پہلے اُسے طلاق دی یا خلع دیا تو وہ صرف اُسی صورت میں اُس کے لیے حلال ہو گی جب اُس سے اُس کی اور اُس کے سرپرست کی اجازت سے ازسرِنو نکاح کیا جائے۔[۶۰۵]

---

۶۰۴ مراد یہ ہے کہ اس لفظ کو کسی بھی طرح استعمال کیا جائے خواہ یوں کہے کہ میں نے تجھے طلاق دی یا تجھے طلاق ہے یا بیوی سے کہے: اے مطلقہ یا طلاغ، تلاغ، طلاک، تلاق وغیرہ کے الفاظ استعمال کرے یہ سب صریح شمار ہوں گے۔ حتیٰ کہ ایسے جُملے جن میں طلاق کا لفظ تو نہ ہو لیکن وہ طلاق کے معنیٰ میں متعیّن ہو چکے ہوں وہ بھی صریح شمار ہوں گے۔ یعنی طلاق کی نیت نہ ہونے کے باوجود اُن سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ جیسے اردو میں بیوی سے کہنا کہ ''میں نے تجھے چھوڑا'' یہ طلاق کے معنیٰ میں صریح ہے۔
(تفصیل کے لیے فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ اور بہارِ شریعت حصہ ۸ ملاحظہ فرمائیں)

۶۰۵ سرپرست کی اجازت کی شرط امام شافعی کے نزدیک ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک کسی بھی عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح اُس کے سرپرست کی اجازت کے بغیر جائز ہے۔ تاہم سرپرست اور والدین کو اعتماد میں لینا ایک اخلاقی فریضہ ہے۔

(۳) غلام اپنی اُس بیوی کو جو باندی ہو' دو طلاقیں دینے کا مالک ہے۔ اور اگر زوجین میں سے کوئی ایک آزاد ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی' امام مالک اور امام احمد کا مؤقف یہ ہے کہ طلاق کی تعداد میں شوہر کی حالت کا اعتبار ہے۔ لہٰذا اگر آزاد شخص کی بیوی باندی ہو تو وہ اُسے تین طلاقیں دے سکتا ہے' اور غلام کی بیوی اگر آزاد ہو تو وہ اُسے صرف دو طلاقیں دے سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ طلاق کی تعداد میں عورت کا اعتبار ہے۔ لہٰذا غلام کی بیوی اگر آزاد ہو تو وہ اُسے تین طلاقیں دے سکتا ہے اور آزاد شخص کی بیوی اگر باندی ہو تو وہ اُسے صرف دو طلاقیں دے سکتا ہے[۶۰۶]۔

آگے فرمایا: ﴿وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا﴾ اس میں ﴿اٰتَیْتُمُوْھُنَّ﴾ سے مراد ہے: ''اعطیتموھن'' یعنی جس چیز کا تم نے بیوی کو مالک بنا دیا ہے۔ ﴿شَیْئًا﴾ یعنی چیز سے مراد یہ ہے کہ مہر اور دیگر چیزیں جو تم نے اُنہیں دے دی ہیں اُن کو واپس لینا جائز نہیں ہے۔ پھر اس سے خلع کا استثناء کرتے ہوئے آگے فرمایا: ''الا یہ کہ دونوں کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے''۔

زیرِ بحث جملہ کے نازل ہونے کا واقعہ

(۳۲۲) مذکورہ جملہ جمیلہ بنت عبداللہ بن اُبی کے بارے میں نازل ہوا' ایک قول یہ ہے کہ حبیبہ بنت سہل انصاری کے بارے میں نازل ہوا۔ وہ ثابت بن قیس بن شماس کی زوجہ تھی۔ وہ ثابت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن ثابت اُس کو پسند کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا تھا۔ جمیلہ نے اپنے والد کے پاس آ کر شوہر کی شکایت کی اور کہا کہ وہ میرے والد کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور مجھے مارتے ہیں۔ والد نے کہا کہ تم اپنے شوہر کے پاس واپس چلی جاؤ' کیونکہ میں عورت کے لیے اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھ اٹھائے شوہر کی شکایت کرتی پھرے۔ پھر وہ تیسری بار اپنے والد کے پاس گئی اور انہیں شوہر کے مارنے کے نشانات دکھائے تو والد نے وہی بات کہی کہ تم اپنے شوہر کے پاس واپس چلی جاؤ۔ جب جمیلہ نے دیکھا کہ والد اُس کی شکایت کو دور نہیں کر رہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور اپنے شوہر کی شکایت کی اور اُن کے مارنے کے نشانات دکھائے[۶۰۷] اور عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! میں اور ثابت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثابت کو بلوایا اور اُن سے پوچھا کہ تمہیں اور تمہاری اہلیہ کو کیا ہو گیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ جس ذات نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے مجھے اُس کی قسم! آپ کے سوا مجھے روئے زمین پر ہر شخص سے بڑھ کر وہ پسند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی زوجہ سے پوچھا کہ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟ تو اُس نے رسول اللہ ﷺ کے سوال پر جھوٹ بولنے کو ناپسند کیا اور کہا کہ یارسول اللہ! ثابت نے سچ کہا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے تباہ نہ کر دیں اس لیے آپ مجھے اُن سے چھٹکارہ دلا دیں۔ مزید عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں آپ کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کر رہی ہوں جو آپ کو ثابت کے خلاف محسوس ہو' وہ تو تمام لوگوں سے بڑھ کر اپنی بیوی سے محبت کرنے والے ہیں' لیکن میں اُنہیں پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا میں اور وہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حضرت ثابت نے کہا کہ میں نے اس کو ایک کھجور کا باغ دیا تھا آپ اس کو حکم دیں کہ وہ مجھے واپس کر دے' میں اس کو چھوڑ دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی زوجہ سے پوچھا: کیا تم ثابت کو باغ واپس کر کے اپنے معاملہ کا اختیار حاصل کرنا چاہتی ہو؟ اُس نے کہا: ہاں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ثابت! جو کچھ تم نے اس کو دیا تھا وہ لے لو اور اس کا راستہ چھوڑ دو۔ چنانچہ حضرت ثابت نے ایسا ہی کیا۔

(جامع البیان للطبری: ۴۸۱۵' سنن ابوداؤد: ۲۲۲۷' مسند احمد ج ۶ ص ۴۳۳' سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۱۲)

---

۶۰۶ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ: باندی کے حق میں طلاق دو مرتبہ ہے اور اس کی عدت دو ماہواریاں ہیں۔ (سنن ترمذی: ۱۱۸۲)

۶۰۷ رسول اللہ ﷺ کے سامنے شوہر کے مارنے کے نشانات دکھانا اس لیے تھا تا کہ شوہر کے خلاف دعویٰ بلا ثبوت نہ رہے۔

(۳۲۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! میں اخلاق اور مال کے اعتبار سے تو ثابت بن قیس کی کوئی مذمت نہیں کرتی البتہ اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں (ابوعبد اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بغض ہے)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ثابت کو اُن کا باغ واپس دیتی ہو؟ اُس نے کہا: ہاں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثابت سے فرمایا کہ اپنا باغ قبول کرو اور اس کو طلاق دے دو۔ (صحیح بخاری: ۵۲۷۳' سنن نسائی: ۳۴۶۳' سنن ابن ماجہ: ۲۰۵۶' سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۱۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۷۴ ص ۲۸۳)

زیرِ بحث جملہ کی تفسیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے ان کو دے دیا ہے اُس میں سے کچھ بھی واپس لینا تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ دونوں کو اپنے بارے میں اس بات کا علم ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی عورت کو اس بات کا ڈر ہو کہ وہ اپنے شوہر کے معاملات میں اللہ کی نافرمانی کر بیٹھے گی' اور شوہر کو اس بات کا ڈر ہو کہ وہ بیوی کی طرف سے نافرمانی کی صورت میں اُس کے ساتھ ناروا سلوک کر بیٹھے گا۔ حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مرد کو اس بات سے منع فرما دیا کہ وہ اپنی بیوی سے دی ہوئی چیزیں واپس لے۔ ہاں اگر نافرمانی بیوی کی طرف سے ہو تو پھر ممانعت نہیں ہے' مثلاً وہ شوہر سے کہے کہ میں نہ تو تمہاری بات مانوں گی اور نہ ہی تمہیں اپنے پاس آنے دوں گی یا اور اس طرح کی دیگر باتیں کہے۔

اس آیت میں ''یَخَافَا'' کو ''یُخَافَا'' بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا کہ دونوں کی حالت سے معلوم ہو رہا ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی قاضی اور سرپرست کو یہ معلوم ہو جائے کہ زوجین اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے (تو اس صورت میں دی ہوئی چیزوں کو واپس لے کر خلع دینے کی اجازت ہے)۔

آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنیٰ ہے: اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ''اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ'' وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی اچھے رہن سہن اور حسن سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے حکم پر عمل کرنے کی جو پابندی اللہ تعالیٰ نے دونوں پر عائد کی ہے اُس کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ ایک قول کے مطابق حدودِ الٰہیہ کو قائم نہ رکھنے سے مراد عورت کی بداخلاقی اور شوہر کے حق کو اہمیت نہ دینا ہے۔ سو جب اس بات کا خوف ہو تو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ﴾ یعنی عورت کو جب ہلاکت اور گناہ کا خوف ہو تو نافرمانی کرنے میں اور مال دے کر چھٹکارہ حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے' کیونکہ ناحق مال کو ضائع کرنا اُس کے لیے ممنوع ہے۔ اسی طرح عورت جب اپنی خوشی اور رضامندی سے شوہر کو مال دے دے تو اس کے لیے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلع کے چند اہم شرعی مسائل کا بیان

پہلا مسئلہ: خلع کب جائز ہے اور کب مکروہ؟: زُہری' نخعی اور داؤد کا قول یہ ہے کہ خلع صرف اُس وقت جائز ہے جب غصہ ہو اور اس بات کا خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ جو خلع ہے وہ فاسد ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت سے صریح اور واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ شوہر طلاق دینے کی صورت میں عورت سے اپنی دی ہوئی چیزیں واپس نہیں لے سکتا' پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک مخصوص صورت کا استثناء کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر دونوں کو اس بات کا خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے (تو پھر ممانعت نہیں ہے) اس سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ دی ہوئی چیز صرف اُس وقت لینا جائز ہے جب غصہ ہو اور اس بات کا خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ اس کے برعکس اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ اگر نافرمانی اور غصہ کی صورت نہ ہو تب بھی خلع جائز ہے لیکن مکروہ ہے' کیونکہ اس صورت میں

بغیر کسی وجہ کے قطع رحمی لازمی آئے گی۔

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۲۴) جس عورت نے بغیر کسی وجہ کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا اُس عورت پر جنت کی خوش بو حرام ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۲۲۲۶' سنن ترمذی: ۱۱۸۷' سنن ابن ماجہ: ۲۰۵۵' مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۷۹۔ص ۲۸۳)

(۳۲۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو چیزیں حلال ہیں اُن میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ''طلاق'' ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۲۱۷۸' سنن ابن ماجہ: ۲۰۱۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۸۰۔ص ۲۸۳)

اکثر علماء کا جو مؤقف ہے کہ بغیر نافرمانی کے بھی خلع جائز ہے اُن کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○ (النساء: ۴) اگر وہ خوشی سے اس (مہر) میں سے تم کو کچھ دیں تو اس کو مزے مزے سے کھاؤ۔

(اس آیت کی روشنی میں) جب یہ بات ثابت ہوئی کہ عورت بغیر کوئی چیز لیے اپنا مہر (شوہر کو) دے سکتی ہے تو خلع جس کی بنیاد پر عورت اپنے معاملہ میں مختار ہو جاتی ہے اُس میں اُس کا اپنی چیز کو خرچ کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ جہاں تک زیر بحث آیت میں استثناء (الّا ان یخافا) کا تعلق ہے' سو وہ استثناء منقطع ہے۔

دوسرا مسئلہ: بدل خلع کی مقدار کے بارے میں: جو کچھ شوہر نے بیوی کو دیا ہو اُس سے زیادہ پر بھی خلع جائز ہے۔ اکثر علماء کا یہی مؤقف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ شوہر نے جتنا دیا تھا اُس سے زیادہ لینا اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ امام زہری' شعبی' حسن بصری' عطاء اور طاؤس کا بھی یہی مؤقف ہے[۶۰۸]۔ حضرت سعید بن میتب کا قول یہ ہے کہ آدمی نے جو کچھ عورت کو دیا ہے اس سے کم واپس لے تاکہ جو اضافہ ہے وہ عورت کے پاس رہے۔ اکثر علماء کا جو مؤقف بیان کیا گیا اُن کی دلیل یہ ہے کہ خلع ایک عقدِ معاوضہ ہے' لہٰذا اس میں کوئی مقدار معین نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عقد نکاح کے وقت کثیر مال ہی پر راضی ہو اسی طرح مرد کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلع کے وقت زیادہ مال پر راضی ہو' خصوصاً اُس صورت میں جبکہ عورت نے مرد سے متنفر ہونے اور اس کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار کر کے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ اُس کے شوہر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ: خلع شرعاً فسخ ہے یا طلاق: علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا خلع فسخ ہے یا طلاق؟ امام شافعی کا قول قدیم یہ ہے کہ خلع فسخ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس' طاؤس اور عکرمہ کا یہی قول ہے۔ امام احمد' اسحٰق اور ابوثور کا بھی یہی مؤقف ہے۔ امام شافعی کا قول جدید جو کہ زیادہ ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ خلع طلاق ہے۔ حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حسن بصری' امام شعبی' نخعی' عطاء' سعید بن میتب' مجاہد' مکحول اور زہری کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور سفیان ثوری کا بھی یہی مؤقف ہے۔ امام شافعی کا جو قول قدیم ہے اُس کی دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ طلاق کا ذکر فرمانے کے بعد خلع کا ذکر کیا ہے' اور پھر (اگلی آیت میں) تیسری طلاق کا ذکر کیا ہے' جیسا کہ ارشاد فرمایا: ''اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ اس وقت تک اُس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے''۔ (البقرہ: ۲۳۰) اگر خلع کو طلاق قرار دیا جائے تو طلاقیں چار ہو جائیں گی۔ قول جدید پر دلیل یہ ہے کہ اگر خلع (شرعاً) فسخ ہوتا تو اقالہ کی طرح اس میں مقررہ مہر پر

---

[۶۰۸] اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر زیادتی شوہر کی جانب سے ہو تو خلع میں مطلقاً عوض لینا مکروہ ہے اور اگر عورت کی طرف سے ہو تو جتنا مہر میں دیا ہے اس سے زیادہ لینا مکروہ ہے' پھر بھی اگر زیادہ لے لے گا تو جائز ہے۔ (بہارِ شریعت حصہ ۸ ص ۴۹)

اضافہ درست نہ ہوتا۔[۶۰۹] اسی طرح اگر خلع فسخ ہوتو اگر آدمی نے (نکاح کے وقت) مہر ذکر نہ کیا ہو اور عورت کو خلع دے تو عورت پر مہر کا وجوب لازم آئے گا' جیسے اقالہ میں ہوتا ہے کہ قیمت کو ذکر نہ کرنے کے باوجود اس کی واپسی واجب ہو جاتی ہے (جبکہ خلع میں ایسا نہیں ہے)۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خلع فسخ نہیں ہے۔ اور جب خلع کا فسخ ہونا باطل ہو گیا تو طلاق ہونا (ازخود) ثابت ہو گیا۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ (جن علماء نے خلع کو فسخ قرار دیا ہے اُن کے نزدیک) تیسری طلاق کا بیان ''او تسریح باحسان'' میں ہے۔ اس اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ اگر ہم خلع کو طلاق قرار دیں تو (خلع کے بعد دوبارہ آپس میں نکاح کی صورت میں شوہر کے پاس) طلاق کی تعداد کم رہ جائے گی' یعنی اگر وہ دوبارہ نکاح کرے گا تو دو طلاق کا مالک رہے گا۔ اور اگر ہم خلع کو فسخ قرار دیں تو عورت تین طلاقوں کے بعد جدا ہو گی (یعنی شوہر خلع کے بعد بھی تین طلاقوں کا مالک رہے گا)۔

آخر میں فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کے ممنوعات ہیں۔ اس سے مراد طلاق' رجوع اور خلع کے وہ مسائل ہیں جن کا بیان گزرا۔ ﴿حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ سے مراد وہ باتیں ہیں جن سے آگے بڑھنا ممنوع ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق دے دی تو اس کے بعد عورت اس وقت تک اس کے لیے حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کر لے' پھر اگر (دوسرا خاوند) اس کو طلاق دے دے تو ان دونوں کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ پھر باہم مل جائیں اگر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدود کو نبھا سکیں گے' اور یہ اللہ کی حدود ہیں جن کو وہ دانش مندوں کے لیے بیان فرماتا ہے O

آیت کی تفسیر اور واقعۂ نزول

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر شوہر تیسری طلاق دے دے ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ﴾ تو اُس کے بعد عورت کو واپس لانا جائز نہیں ہے۔ ﴿تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہاں تک کہ عورت اپنے طلاق دینے والے شوہر کے سوا کسی اور سے نکاح کر لے اور وہ اس سے جماع (صحبت) کر لے۔ (لغوی اعتبار سے) نکاح کا لفظ عقد نکاح اور جماع دونوں معنیٰ کو شامل ہے' لیکن یہاں اس سے جماع مراد ہے۔

زیر بحث آیت ایک قول کے مطابق تمیمہ اور ایک قول کے مطابق عائشہ بنت عبد الرحمٰن بن عتیک قرظی کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ اپنے چچا زاد بھائی رفاعہ بن وہب بن عتیک قرظی کے نکاح میں تھی' انہوں نے اس کو تین طلاقیں دے دیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(۳۲۶) رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں رفاعہ کے نکاح میں تھی' انہوں نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ اور میری طلاق کو منقطع کر دیا تھا' پھر میں نے عبد الرحمٰن بن زبیر سے نکاح کر لیا' لیکن ان کے پاس تو صرف کپڑے کے پلو کی طرح ہے (یعنی وہ نامرد ہیں)۔ رسول اللہ ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا: کیا تم دوبارہ رفاعہ کے پاس جانا

[۶۰۹] مراد یہ ہے کہ اقالہ بیع کے فسخ کرنے کو کہتے ہیں اور اس میں ضابطہ یہ ہے کہ ثمن اوّل (پہلی قیمت) پر بیع کو فسخ کیا جائے۔ اسی طرح اگر خلع بھی فسخ نکاح کا نام ہوتا تو صرف اصل مہر واپس لینے کی اجازت ہوتی' جبکہ اصل مہر سے زائد لینا بھی شرعاً جائز ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلع (شرعاً) فسخ نہیں ہے۔

چاہتی ہو؟ نہیں! یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم ان کی مٹھاس نہ چکھ لو اور وہ تمہاری مٹھاس نہ چکھ لیں۔ (صحیح بخاری: ۲۶۳۹ 'صحیح مسلم: ۱۴۳۳ 'سنن نسائی: ۳۴۱۱ 'سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۲ 'سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۷۳ '۳۷۴ 'مسند احمد ج ۶ ص ۳۷ 'مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۹۵ ص ۲۸۴)

☆ اس حدیث میں چند جملے آئے ہیں جن کی تشریح درج ذیل ہے: (۱) ''فبت طلاقی'' یعنی انہوں نے میری طلاق کو منقطع کر دیا تھا۔ ''بت'' کا معنیٰ کاٹنا ہے۔ (۲) ''مثل هدبة الثوب'' یعنی کپڑے کے کنارے کی طرح۔ اس سے کنایۃً آلۂ تناسل کا ڈھیلا ہونا مراد ہے۔ (۳) ''عُسیلتک'' یہ ''عَسَل'' کی تصغیر ہے۔ اس میں جماع کی لذت کو عسل (یعنی شہد) سے تشبیہ دی گئی ہے' اور شہد سے کنایۃً جماع مراد ہے۔ عسل کو یہاں مؤنث لانے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اہل عرب کے نزدیک یہ مؤنث ہے۔ بعض علماء نے مؤنث لانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں اس کے معنیٰ کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ اس سے نطفہ مراد ہے۔ (۴) اس حدیث میں عبدالرحمٰن کا ذکر ہے' اس سے عبدالرحمٰن بن زَبیر مراد ہیں۔

(۳۲۷) یہ واقعہ یوں بھی مروی ہے کہ رفاعہ کی بیوی (عبدالرحمٰن بن زَبیر کے ساتھ) جب تک اللہ نے چاہا گزارا کرتی رہی' پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں دوبارہ حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھ سے جماع کر لیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اپنی پہلی بات کو جھٹلا دیا ہے لہٰذا ہم تمہاری دوسری بات کو بھی نہیں مانتے۔ پھر وہ گزارا کرتی رہی حتیٰ کہ نبی اکرم ﷺ پردہ فرما گئے۔ پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: اے خلیفۂ رسول! میں اپنے پہلے شوہر کے پاس لوٹنا چاہتی ہوں' کیونکہ میرے دوسرے شوہر نے مجھ سے صحبت کر لی ہے اور مجھے طلاق بھی دے دی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب تم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی تھی اُس وقت میں بھی موجود تھا اور آپ ﷺ نے جو جواب دیا تھا وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ لہٰذا تم اپنے پہلے شوہر کے پاس نہیں جاؤ گی۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پردہ فرما گئے تو وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہی بات کہی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر تو اپنے پہلے شوہر کے پاس گئی تو میں تجھے رجم (سنگسار) کر دوں گا۔ (درمنثور ج ۱ ص ۵۰۵)

آگے فرمایا: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا﴾ مراد یہ ہے کہ اگر دوسرا شوہر جماع کرنے کے بعد طلاق دے دے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ تو عورت اور اس کے پہلے شوہر پر کوئی حرج نہیں کہ وہ از سرِ نو نکاح کر لیں۔ ﴿إِنْ ظَنَّا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر دونوں کو علم اور یقین ہو۔ بعض کے نزدیک اس سے امید کا معنیٰ مراد ہے کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے اُس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (دونوں کو یہ امید ہو کہ) وہ اپنے درمیان معاملات کی درستگی اور اچھی طرح گزر بسر اور رہن سہن کو قائم رکھ سکیں گے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ دونوں کو یہ علم ہو کہ ہمارا جو نکاح ہو رہا ہے وہ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ اس کے لیے حلالہ کروایا گیا ہو۔

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ یہ اللہ کی حدود ہیں جن کو وہ اُن لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے جو جانتے ہیں۔ یعنی اللہ عزوجل کے احکامات اور اس کے ممنوعات کو جانتے ہیں۔ جاننے والوں کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ وہی لوگ احکامات کے بیان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حلالہ کے دو اہم شرعی مسائل کا بیان

(۱) اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ جس عورت کو تین طلاقیں دے دی گئی ہوں وہ چند شرائط کے ساتھ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو گی۔

ـــ یہ سفیان ثوری' امام اوزاعی اور امام مالک وغیرہم کا قول ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک حلالہ کے لیے کیا جانے والا نکاح فاسد ہے۔ جب کہ صحیح قول یہ ہے کہ حلالہ شرعاً جائز ہے۔ (حلالہ کے جائز ہونے کی شرائط اور دیگر اُمور اگلے صفحہ پر آنے والی احادیث اور حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔)

(۱) پہلے شوہر کی دی ہوئی طلاقوں کی عدت گزارے۔ (۲) عدت پوری کرنے کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرے۔ (۳) وہ اس سے جماع کرے۔ (۴) پھر وہ اس کو طلاق دے۔ (۵) اور یہ اس کی عدت گزارے۔ جب یہ شرائط پائی جائیں گی تو عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی' ورنہ نہیں۔ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت سعید بن مسیب (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا قول یہ ہے کہ عورت دوسرے شخص کے ساتھ صرف نکاح کرتے ہی پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ ان دو مختلف اقوال میں جو پہلا قول ہے وہ زیادہ صحیح ہے[۶۱۰] پھر علماء کا اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ جماع کی جو شرط ہے آیا وہ قرآن مجید یا حدیث شریف سے ثابت ہے یا نہیں؟ سو اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ تیسرا قول جو کہ مختار ہے وہ یہ ہے کہ جماع کی شرط قرآن وسنت دونوں سے ثابت ہے[۶۱۱]

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس عورت کو تین طلاقیں ہوگئی ہوں اُس سے کوئی شخص اس لیے نکاح کرے تاکہ پہلے شوہر کے لیے وہ عورت حلال ہو جائے تو یہ نکاح باطل ہوگا اور عقد فاسد ہوگا۔ امام مالک اور امام احمد کا یہی مؤقف ہے[۶۱۲]' کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۲۸) وہ شخص جو حلالہ کرے اور وہ جس کے لیے حلالہ کیا جائے (دونوں) ملعون ہیں[۶۱۳] (سنن ترمذی: ۱۱۲۰' سنن نسائی: ۳۴۱۶' سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۴' سنن بیہقی ج ۷ ص ۲۰۸' سنن دارمی: ۲۲۵۸' مسند احمد ج ۱ ص ۴۴۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۹۶' ص ۲۸۴)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ:

(۳۲۹) نبی اکرم ﷺ نے حلالہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایک ایسا بکرا ہے جس کو کرایہ پر لیا گیا ہو[۶۱۴]

---

۶۱۰ یعنی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے اس وقت حلال ہوگی جب دوسرا شوہر جماع (یعنی صحبت) کر کے اُسے فارغ کرے گا۔ کیونکہ زیر بحث آیت مبارکہ میں "حتی تنکح" سے صحبت کرنا مراد ہے اور حدیث شریف میں اس کی تائید یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں' پھر وہ کسی اور سے نکاح کرے اور وہ شخص صحبت کے بغیر اس عورت کو اپنے نکاح سے فارغ کر دے تو آیا وہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت پہلے شوہر کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اور اس کا دوسرا شوہر دونوں ایک دوسرے کی مٹھاس نہ چکھ لیں۔
(سنن ابوداؤد: ۲۳۰۹' سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۳' سنن نسائی: ۳۴۰۷' سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۷۵' مسند احمد ج ۲ ص ۲۵)

۶۱۱ جیسا کہ گذشتہ حاشیہ میں تفصیل موجود ہے۔

۶۱۲ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے کہ حلالہ کی نیت سے نکاح کیا جائے تو وہ نکاح منعقد ہو جاتا ہے' فاسد نہیں ہوتا۔ صاحب فتح القدیر علامہ ابن الہمام اور دیگر علماء احناف فرماتے ہیں کہ اگر مرد وعورت صرف دل میں حلالہ کی نیت رکھیں اور زبان سے اس کا اظہار نہ کریں تو وہ قابل گرفت نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی شخص (حلالہ کی شرط لگائے بغیر) طلاق یافتہ عورت سے اس لیے نکاح کرے تاکہ وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے اور دونوں کے معاملات سنور جائیں تو اس نیت پر حلالہ کرنے والا اجر وثواب کا بھی مستحق ہوگا۔
(فتح القدیر ج ۴ ص ۱۸۱' روح المعانی ومرقات ایضاً)

۶۱۳ ہمارے نزدیک اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ حلالہ جس میں شرط لگائی جائے وہ لعنت کا سبب ہے۔ یعنی جب کوئی شخص حلالہ کی شرط کے ساتھ نکاح کرے تو حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں ملعون ہیں اور اگر حلالہ کی شرط نہ لگائی جائے تو اس صورت میں لعنت نہیں ہے۔ (ہدایہ اوّلین ص ۴۱۰) اگر ہر حلالہ لعنت کا باعث ہو تو جن احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے اُن سے تعارض لازم آئے گا۔ جواز کی احادیث سے ہماری مراد وہ احادیث ہیں جو علامہ خازن نے رقم: ۳۲۶ اور ۳۲۷ کے تحت ذکر کی ہیں اور ایک حدیث حاشیہ: ۶۱۰ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۶۱۴ اس حدیث میں بھی حلالہ کی مذمت ہے۔ لیکن اس سے مراد وہی حلالہ ہے جو مشروط ہو۔ تفصیل کے لیے گذشتہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

(سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۶، سنن دار قطنی ج ۳ ص ۲۵۱، سنن بیہقی ج ۷ ص ۲۰۸، المستدرک ج ۲ ص ۱۹۹)

البتہ اگر تین طلاق والی عورت سے آدمی نکاح کرے اور اس میں یہ شرط نہ لگائے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا تو یہ نکاح صحیح ہے اور جب آدمی اس کو طلاق دے گا اور اس کی عدت گزر جائے گی تو اس سے تحلیل بھی حاصل ہو جائے گی (یعنی عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی)۔ لیکن یہ صورت اُس وقت مکروہ ہے جب آدمی کے ارادہ میں یہ بات شامل ہو کہ وہ عورت کو طلاق دے دے گا۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کا یہی موقف ہے[۶۱۵] دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت (البقرہ: ۲۳۰) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب عورت دوسرے شخص سے نکاح کرلے اور اس میں مجامعت ہو جائے تو (پہلے شوہر کے حق میں) اس کا حرام ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ حلالہ میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے' لہٰذا ضرور یہ کہا جائے گا کہ (حلالہ سے) عورت کا پہلے شوہر کے حق میں حرام ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ کسی آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں' پھر اُس کے بھائی نے بغیر مشورہ کے اُس عورت سے اس لیے نکاح کیا تا کہ عورت اپنے سابق شوہر کے لیے حلال ہو جائے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ نکاح تو صرف وہی ہوتا ہے جو (دل کی) رغبت کے ساتھ کیا جائے (جو صورت تم نے بیان کی ہے) اس کو نبی اکرم ﷺ کے عہد میں ہم بدکاری قرار دیتے تھے[۶۱۶] (المستدرک ج ۲ ص ۱۹۹)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو (رجعی) طلاق دو پھر وہ اپنی عدت کے اختتام کے قریب پہنچ جائیں تو اُنہیں اچھے طریقہ سے یا تو روک لو یا اچھے طریقہ سے چھوڑ دو۔ اور نقصان پہنچانے کے لیے ظلم کی راہ اختیار کرتے ہوئے اُنہیں اپنے پاس نہ روکے رکھو' اور جو بھی ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم کرے گا' اور تم اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ' اور تم پر اللہ کی جو نعمت ہے اس کو یاد کرو اور اُس کتاب و حکمت کو (یاد کرو) جو نصیحت کے لیے اُس نے تم پر نازل کی ہے' اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس کی تفسیر

یہ آیت انصار کے ایک شخص ثابت بن یسار کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے تھے' جب اس کی عدت ختم ہونے کے قریب آتی تو اس سے رجوع کر لیتے اور پھر اس کو طلاق دے دیتے۔ اس سے ان کا مقصد بیوی کو ضرر پہنچانا ہوتا

۶۱۵ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کا موقف یہ ہے کہ دل میں حلالہ کا ارادہ ہو اور زبان سے کچھ نہ کہا جائے تو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ یعنی اس صورت میں نکاح بلا کراہت جائز ہے۔ تفصیل حاشیہ: ۶۱۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۶۱۶ یہ حدیث تغلیظ پر محمول ہے یعنی اس میں حلالہ کی شدید مذمت اور اس سے بچنے کی تاکید مقصود ہے۔ اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جو بتایا گیا کہ ''اُس شخص کے بھائی نے بغیر مشورہ کے اُس عورت سے اس لیے نکاح کیا تا کہ عورت اپنے سابق شوہر کے لیے حلال ہو جائے'' اس سے مراد یہ ہے کہ اُس شخص نے عورت سے حلالہ کی شرط کے ساتھ نکاح کیا۔ اس لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کو بدکاری قرار دیا۔ گو کہ ہمارے نزدیک وہ نکاح جو حلالہ کی شرط کے ساتھ کیا جائے وہ بدکاری نہیں ہے' تاہم ہو سکتا ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مراد یہ ہو کہ ایسا نکاح صورۃً بدکاری ہے۔

تھا (اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی)۔

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اپنی عدت کے اختتام اور انتہاء کے قریب پہنچ جائیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اُس کی عدت ختم ہو جائے کیونکہ عدت ختم ہونے کی صورت میں شوہر کو امساک کا حق (یعنی بیوی کو روک لینے کا حق) حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا بلوغ سے یہاں بلوغِ مقاربہ مراد ہوگا' جیسے کوئی شخص جب اپنے شہر کے قریب پہنچ جائے تو کہا جاتا ہے کہ ''بلغ فلان البلد'' فلاں شخص شہر میں پہنچ گیا۔ اس صورت میں ''فبلغن'' کا استعمال اُس مجاز سے ہے جس میں اکثر پر کُل کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں جو ''اجـــــل'' کا لفظ ہے اُس سے مراد زمانہ ہے' لہٰذا اس سے عدت کا وہ آخری حصہ مراد ہوگا جس میں رجوع کی اتنی گنجائش موجود ہو کہ اگر وہ حصہ بھی نکل جائے تو رجوع نہ کیا جا سکے۔ اس تاویل کی صورت میں ہمیں مجاز کی طرف جانے کی حاجت نہیں ہوگی (یعنی بلوغ اپنے حقیقی معنیٰ پر رہے گا)۔ آیت میں جو ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: ان سے رجوع کر لو۔ اور ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ رجوع ایسا ہو کہ اُس پر گواہ ہو' اور رجوع زبان کے ذریعہ ہو نہ کہ جماع کے ذریعے[۷۱۷] ﴿سَرِّحُوْهُنَّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یا پھر اُنہیں چھوڑے رکھو یہاں تک کہ اُن کی عدت ختم ہو جائے اور وہ خود مختار ہو جائیں۔

﴿ضِرَارًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم رجوع اس مقصد سے نہ کرو کہ تم انہیں طویل عرصہ تک روک کر نقصان پہنچاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ لوگ عورت کو اس طرح ضرر اس لیے پہنچایا کرتے تھے تا کہ عورت اپنی جان چھڑانے کے لیے مال دینے پر مجبور ہو۔ آیت میں جو ﴿لِتَعْتَدُوْا﴾ فرمایا اُس سے مراد یہ ہے کہ (تم رجوع اس مقصد سے نہ کرو کہ) عورتوں کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود سے آگے نکل جاؤ اور عورتوں پر ظلم کرو۔ بعض کے نزدیک ''لتعتدوا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ ظلم کی غرض سے عورتوں کو ضرر نہ پہنچاؤ۔ ﴿فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ سے مراد ہے کہ (نقصان پہنچانے کے لیے رجوع کرنے والا) اللہ عزوجل کے حکم کی مخالفت کر کے اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کے سامنے پیش کر کے اپنی ہی جان کو نقصان میں ڈالتا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ تم اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی اور اپنی کتاب میں جو بھی حلال و حرام بیان کیا ہے اور جو احکامات و ممنوعات بیان کیے ہیں اُن کو مذاق اور کھیل نہ بناؤ۔ لہٰذا جس شخص پر بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت واجب ہو اُس کو عدت' رجوع' خلع اور نقصان نہ پہنچانے کے مذکورہ احکام معلوم ہوں تو وہ ان کو مذاق نہ بنائے۔ آیت کے اس جملہ میں (لوگوں کے لیے) بہت بڑی سرزنش اور سخت وعید ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا تعلق ''امساک بمعروف او تسریح باحسان'' سے ہے' سو جو شخص بھی احکامِ شرعیہ میں سے کسی شرعی حکم کی مخالفت کرے وہ اللہ کی آیات کو مذاق بنانے والا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ لوگوں کا یہ معمول تھا کہ وہ طلاق اور آزادی دے دیتے تھے اور پھر (اُسی عورت سے) نکاح کر لیتے تھے اور کہتے تھے: ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ سو اس آیت میں اس طرح کرنے سے منع کر دیا گیا۔

(۳۳۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جو سنجیدگی اور مذاق دونوں ہی صورتوں میں واقع ہو جاتی ہیں: نکاح' طلاق اور رجوع۔

(سنن ترمذی: ۱۱۸۴' سنن ابوداؤد: ۲۱۹۴' سنن ابن ماجہ: ۲۰۳۹' سنن دار قطنی ج ۳ ص ۲۵۶' المستدرک ج ۲ ص ۱۹۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۸۴۔ ص ۲۸۴)

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اس میں نعمت سے مراد ایمان ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہ طور انعام عطا فرمایا اور تمہیں

[۷۱۷] جماع (یعنی صحبت) کے ذریعہ رجوع کرنا مکروہ ہے۔ مسنون طریقہ رجوع کا یہ ہے کہ زبان سے رجوع کا کوئی جملہ کہہ کر اپنی طلاق واپس لے نیز اس پر دو باکردار آدمیوں کو گواہ بنائے اور عورت کو بھی اس کی خبر کر دے۔

اس کے اپنانے کی توفیق دی' اور وہ تمام نعمتیں جو اُس نے تم پر نازل کیں (اُن کو یاد کرو)۔ ﴿وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ کتاب وحکمت کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے تم پر جو نعمت نازل کی ہے اُس کو یاد کرو۔ ﴿كِتٰب﴾ سے قرآن مجید مراد ہے اور ﴿حِكْمَة﴾ سے مراد سنت ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمائی اور اس کو تمہارے لیے طریقہ بنایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت سے قرآن کریم کی نصیحتیں مراد ہیں۔ ﴿يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل تم کو اُس کتاب کے ذریعہ نصیحت فرماتا ہے جو اُس نے اپنے نبی ﷺ پر نازل فرمائی ہے۔

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے تمہیں جن باتوں کا حکم فرمایا ہے اور جن باتوں سے منع کیا ہے اُن میں اللہ سے ڈرو۔ ﴿عَلِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر اُس فرمانبرداری اور نافرمانی کو جانتا ہے جو تم چھپ کر یا سب کے سامنے کرتے ہو' اُس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم عورتوں کو (رجعی) طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو انہیں ان کے (پہلے شوہروں کے) ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو' جبکہ وہ شریعت کے مطابق آپس میں راضی ہو جائیں' اس حکم کی نصیحت اُس شخص کو کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو' یہ (حکم) تمہارے لیے بہت صاف اور بہت پاکیزہ ہے اور اللہ (ہی) جانتا ہے اور تم نہیں جانتےO

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

یہ آیت معقل بن یسار المزنی کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے اپنی بہن جمیلہ کو اُس کے سابق شوہر کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا تھا۔ اس کے سابق شوہر ابوالقدرح عاصم بن عدی تھے انہوں نے اس کو طلاق دی تھی۔ چنانچہ معقل بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میری ایک بہن تھی جو مجھے منگنی کرنے کا کہتی تھی اور میں اُسے لوگوں سے روکتا تھا۔ (ایک دن) میرے پاس میرا چچازاد بھائی عدی آیا تو میں نے اپنی بہن کا نکاح اُس کے ساتھ کر دیا' اور جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں ایک ساتھ رہے' پھر عدی نے میری بہن کو رجعی طلاق دے دی اور اُس سے رجوع نہیں کیا' حتیٰ کہ عدت گزر گئی۔ جب میری بہن نے مجھے منگنی کا کہا تو عدی میرے پاس دوبارہ منگنی کا پیغام لے کر آیا' میں نے اُس سے کہا کہ میری بہن مجھ سے منگنی کا کہا کرتی تھی تو میں اُسے لوگوں سے روکتا تھا' اور میں نے تمہیں ترجیح دیتے ہوئے اس کے ساتھ تمہارا نکاح کر دیا تھا' پھر تم نے اُس کو رجعی طلاق دی' لیکن تم نے اُس سے رجوع نہیں کیا یہاں تک کہ اُس کی عدت ختم ہوگئی۔ اب جبکہ میری بہن نے پھر مجھے منگنی کا کہا ہے تو تم منگنی کا پیغام لے کر آئے ہو' لیکن خدا کی قسم! میں کبھی بھی اُسے تمہارے نکاح میں نہیں دوں گا۔ سو میرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ''جب تم عورتوں کو (رجعی) طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو انہیں اُن کے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو''۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور اُسی شخص سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا۔

(صحیح بخاری: ۴۵۲۹' سنن ابوداؤد: ۲۰۸۷' سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۳۸' سنن دارقطنی ج ۳ ص ۲۲۲)

بعض مفسرین کے نزدیک زیر بحث آیت کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک چچازاد بہن تھی' اس کو اس کے شوہر نے ایک طلاق دے دی' جب اس کی عدت ختم ہوگئی تو شوہر نے رجوع کرنا چاہا۔ حضرت جابر نے منع کیا اور فرمایا کہ تم نے ہماری چچازاد بہن کو طلاق دی اور اب تم اُس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتے ہو۔ دوسری طرف عورت کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کو چاہتی تھی اور اس سے خوش تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

اس آیت میں ﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ﴾ سے عدت کا ختم ہونا مراد ہے جبکہ گذشتہ آیت میں ایسا نہیں تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں کلام کا مختلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ (دونوں میں) بلوغ کی مراد علیحدہ ہے۔ ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ ﴾ میں خطاب اولیاء (یعنی سرپرستوں) سے ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اے سرپرستو! تم عورتوں کو اتنی تنگی میں نہ ڈالو کہ اُنہیں از سرنو نکاح کر کے اپنے شوہروں کے پاس جانے سے روک دو' اور اس سے تمہارا مقصد عورتوں کو نقصان پہنچانا ہو۔ آیت کا یہ خطاب تمام سرپرستوں کو ہے' اگرچہ اس کے نزول کا سبب خاص ہے۔

''لا تعضلوهن'' ''عضل'' سے ہے' اور ''عضل'' کا اصل معنیٰ ہے: روکنا' تنگی میں ڈالنا۔ اس معنیٰ میں اَوس بن حجر کا یہ شعر ہے:

وليس اخوك الدائم العهد بالذي	يذمك ان ولى ويرضيك مقبلا
ولكنه النائي اذا كنت امنا	وصاحبك الادنى اذا الامر أعضلا

ترجمہ: ''وہ شخص تیرا بھائی نہیں ہوسکتا جو اُس شخص کا وفادار ہو جو پیٹھ پیچھے تیری بُرائی اور سامنے تعریف کرے۔ ہاں تیرا بھائی وہ ہے جو تیری خوش حالی میں تجھ سے دور رہے اور مشکلات میں تیرے ساتھ رہے''۔

زیر بحث آیت میں امام شافعی اور ان کے موافقین کے لیے اس مسئلہ پر دلیل ہے کہ عورت اپنے عقد نکاح کی سرپرستی نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس کو اس کی اجازت ہے' کیونکہ اگر اس کو اپنے عقد نکاح کا اختیار ہوتو ''عضل'' (یعنی روکنا) نہیں پایا جائے گا اور نہ ہی سرپرست کو روکنے سے منع کرنے کا کوئی مفہوم باقی رہے گا۔[۶۱۸] ﴿ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جب نکاح کا پیغام دینے والے اور عورتیں باہم راضی ہو جائیں۔ ''معروف'' سے مراد یہاں وہ طریقہ ہے جو شریعت کے مطابق ہو' یعنی حلال عقد ہو اور جائز مہر ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''معروف'' سے مراد یہ ہے کہ زوجین میں سے ہر ایک عقد نکاح کے اُس حق پر رضامند ہو جس کو دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اپنے ذمہ لیا ہے' تاکہ اچھا رہن سہن اور بہترین گزر بسر ہو۔

﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ اُس ممانعت کی طرف ہے جو مذکور ہوئی۔ مفہوم کلام یہ ہے کہ صاحب ایمان ہی (ہماری) نصیحت سے فائدہ اٹھائے گا' کوئی اور نہیں۔ ﴿ اَزْكٰى ﴾ اور ﴿ وَاَطْهَرُ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ (حکم) تمہارے لیے بہت بہتر' تمہارے

۶۱۸ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ کسی بھی عاقلہ بالغہ کا نکاح اُس کے سرپرست کی اجازت کے بغیر جائز ہے۔ زیر بحث آیت سے امام شافعی کے مؤقف پر استدلال ضعیف ہے۔ کیونکہ سرپرستوں کو عورت کا نکاح روکنے سے جو منع کیا گیا ہے اُس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ نکاح عورت کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ بات ممکن ہے کہ ایک کام کسی کے اختیار میں ہو اور حکم اُس کے سرپرست کو دیا جائے۔ جیسے ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو (یعنی عورتوں کو) اللہ کی مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔ (سنن ابوداؤد' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۰۶۲) مسجد میں عورتوں کا آنا اُن کے اپنے اختیار میں ہے' اس کے باوجود سرپرستوں سے فرمایا گیا کہ اُنہیں نہ روکو۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سرپرستوں سے خطاب عورت کے اختیار کے خلاف نہیں ہے۔ (تفسیر المظہری' زیر بحث آیت)

دلوں کے لیے بہت پاکیزہ اور اللہ عزوجل کے نزدیک بہت عمدہ اور صاف ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس (حکم) میں جو کچھ صفائی اور پاکیزگی ہے اس کو اللہ عزوجل جانتا ہے لیکن تم اس کو نہیں جانتے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں (یہ حکم) اس کے لیے ہے جو دودھ کی مدت کو پورا کرنا چاہے اور جس شخص کا بچہ ہو اس کے ذمہ دستور کے مطابق ان ماؤں کا کھانا اور ان کا لباس ہے ہر شخص کو اس کی طاقت ہی کے مطابق پابند کیا جاتا ہے نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے ضرر پہنچایا جائے اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر تم (دائیوں سے) اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بہ شرط یہ کہ دستور کے مطابق جو (اجرت) دینا تم نے طے کیا ہے وہ تم ادا کر دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے O

''والدات'' کی تفسیر اور بچہ کو دودھ پلانے کا شرعی حکم

﴿والدات﴾ سے مراد وہ طلاق یافتہ عورتیں ہیں جن کے اپنے شوہروں سے بچے ہوں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے تمام مائیں مراد ہیں خواہ وہ طلاق یافتہ ہوں یا شادی شدہ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ''والدات'' کا لفظ عام ہے اور تخصیص پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کو اس کے عموم پر رکھا جائے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ''والدات'' کے لفظ سے تمام ماؤں کا مراد ہونا اس کا ظاہر ہے لہٰذا اس سے تمام مائیں مراد لینا ضروری ہے۔ آیت میں جو ﴿يُرْضِعْنَ﴾ فرمایا (کہ مائیں دودھ پلائیں) یہ خبر بمعنی امر ہے۔ اصل عبارت یہ ہے کہ مائیں اپنی اولاد کو اس معبودِ برحق کے حکم سے دودھ پلائیں جس نے دودھ پلانے کو واجب کیا ہے۔ (واضح رہے کہ) یہ حکم وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ استحباب کے لیے ہے۔ اور یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ کسی اور کے دودھ کے مقابلہ میں والدہ کا دودھ بچے کی پرورش میں زیادہ کارگر اور درست ثابت ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ والدہ اپنے بچے کے ساتھ مکمل شفقت رکھتی ہے۔

یہ بات کہ والدہ پر اپنے بچہ کو دودھ پلانا واجب نہیں ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''اگر وہ تمہارے لیے بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو''۔ (الطلاق:٦) اگر دودھ پلانا واجب ہوتا تو اس کو اجرت کا مستحق نہ ٹھہرایا جاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''اگر تم دشوار سمجھو تو ممکن ہے کہ اُسے اور دودھ پلانے والی مل جائے''۔ (الطلاق:٦) اس سے بھی صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ دودھ پلانا والدہ پر واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر بچہ کو دودھ پلانے والی نہ ملے یا بچہ اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ قبول نہ کرے تو پھر ماں پر دودھ پلانا واجب ہے جیسے مجبور آدمی کے ساتھ ہمدردی کرنا ہر شخص پر واجب ہے۔ اگر ماں اپنے

بچے کو خود سے دودھ پلانا چاہتی ہو تو کسی اور کے مقابلہ میں اُسی کا حق زیادہ ہے۔

''حولین کاملین'' کی تفسیر اور دودھ پلانے کی مدت کو مکمل کرنے کا شرعی حکم

آیت میں جو ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ فرمایا اس میں ''حول'' کا معنیٰ سال ہے۔اس کی اصل ''حال یحول'' ہے بمعنیٰ پلٹنا۔رہا یہ کہ ''کاملین'' کیوں فرمایا تو وہ اس لیے تا کہ تاکید پیدا ہو کیونکہ اس معاملہ میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ ہم کسی شخص کے پاس ایک سال نہ بھی رہے ہوں تب بھی کہہ دیتے ہیں کہ میں فلاں شخص کے پاس ایک سال ٹھہرا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ دو سال ایسے ہوں کہ پورے ہوں یعنی چوبیس مہینے۔(واضح رہے کہ) دو سال کی جو حد بیان کی گئی ہے وہ واجب نہیں ہے' اس کی دلیل آیت کا اگلا جملہ ہے جس میں فرمایا کہ ''(یہ حکم) اُس شخص کے لیے ہے جو دودھ کی مدت کو پورا کرنا چاہے'' جب اللہ تعالیٰ نے مدت پوری کرنے کے مسئلہ کو ہماری مرضی پر چھوڑ دیا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ دودھ کی مدت پوری کرنا واجب نہیں ہے۔اور یہ بات ثابت ہوئی کہ دو سال کی حد بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مدتِ رضاعت کی مقدار کے متعلق زوجین کے درمیان جو جھگڑا ہو جاتا ہے اُس کو ختم کیا جائے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے دو سال کی مدت کو معین فرمایا دیا تا کہ جھگڑا ہونے کی صورت میں دونوں اس مدت کی طرف لوٹ سکیں۔حضرت عکرمہ کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب عورت چھ مہینے میں بچہ جنے تو اُس کو دو سال تک دودھ پلائے' اور اگر سات مہینے میں جنے تو اس کو ۲۳ مہینے دودھ پلائے اور اگر نو مہینے میں جنے تو اکیس مہینے دودھ پلائے۔ان تمام صورتوں میں (حمل اور دودھ کے مجموعی طور پر) تیس ماہ ہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۔ (الاحقاف:۱۵) حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔

والبی کی روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ دو سال کی مدت ہر بچہ کے لیے ہے خواہ وہ کتنے ہی عرصہ میں پیدا ہو۔اُس کے دودھ کی مدت صرف اُس صورت میں دو سال سے کم ہو سکتی ہے جب والد اور والدہ دونوں کا اتفاق ہو۔بغیر آپس میں اتفاق کیے کسی ایک کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ دو سال سے پہلے بچہ کا دودھ چھڑا دے۔اس کی دلیل زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''اگر دونوں باہمی مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دو سال تک دودھ پلانا فرض کیا تھا' پھر آسانی فرمادی اور ارشاد فرمایا کہ ''(دو سال تک دودھ پلانے کا حکم) اُس شخص کے لیے ہے جو دودھ کی مدت کو پورا کرنا چاہے''۔یعنی جو شخص دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے اُس کے لیے دو سال انتہائی مدت ہے۔دو سال سے کم کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔البتہ وہ بچہ کی پرورش اور اس کے گزر بسر کی چیزوں پر موقوف ہے[۲۱۹]

''مولود له'' کی تفسیر اور توجیہ

آیت میں فرمایا کہ مولود لہٗ کے ذمہ معروف کے مطابق ان ماؤں کا رزق اور ان کا لباس ہے۔اس میں ﴿الْمَوْلُوْدِ لَهٗ﴾ سے مراد باپ ہے۔باپ کو ''مولود لهٗ'' اس لیے فرمایا کہ مائیں باپ ہی کے لیے بچے جنتی ہیں۔اسی وجہ سے اولاد کا نسب باپ سے چلتا ہے نہ کہ ماں سے۔کسی کا شعر ہے:

۲۱۹ بچہ کو دو برس تک دودھ پلایا جائے' اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔دودھ پینے والا لڑکا ہو یا لڑکی۔یہ حکم دودھ پلانے کا ہے۔جبکہ نکاح حرام ہونے کے لیے ڈھائی سال کی مدت ہے۔یعنی دو سال کے بعد اگر چہ دودھ پلانا حرام ہے مگر ڈھائی سال کے اندر اندر نکاح کا حرام ہونا ثابت ہو جائے گا۔(بہارِ شریعت جزء ۷ ص ۱۹)

انـمـا امهـات النـاس اوعیۃ مستودعـات وللاباء ابنـاء

''لوگوں کی مائیں تو صرف امانت رکھنے والے برتن ہیں اور بچے تو باپ کے ہوتے ہیں''۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ باپ کو جو''مولود لهٗ''فرمایا گیا اس میں اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ بچہ کو اس کے والد کے ساتھ رکھا جائے گا کیونکہ وہ اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔گویا(''مولود له'' کہہ کر) یہ فرمایا گیا کہ جب عورت آدمی کی خاطر اور اس کے بستر پر بچہ جنتی ہے تو آدمی پر اُس بچہ کے حقوق کا خیال کرنا واجب ہے۔آیت میں ﴿رزق﴾ سے مراد کھانا پینا ہے' ﴿کسوۃ﴾ سے مراد لباس ہے اور ﴿معروف﴾ سے مراد ہے طاقت کے مطابق۔آگے جو فرمایا: ﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اس میں''وسـع'' سے مراد طاقت ہے اور اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ بچہ کا جو باپ ہو' اُس کو بچہ کے خرچہ میں اور اس کی ماں کے خرچہ میں اتنا ہی پابند کیا جائے گا جتنا اُس کی طاقت اور گنجائش ہو' اور اس میں فضول خرچی نہ ہو۔

ماں باپ کو ضرر نہ پہنچانے سے کیا مراد ہے؟ اور ضرر کا تعلق ماں باپ سے ہے یا بچہ سے؟

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾ ماں کو ضرر نہ پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بچہ کو دودھ پلانے پر راضی ہو جائے تو پھر اُس سے بچہ کو نہ تو واپس لیا جائے نہ کسی اور کو دیا جائے۔بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جب بچہ اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کے دودھ کو قبول کر لے تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہ کیا جائے' کیونکہ دودھ پلانا اُس پر واجب نہیں ہے۔

باپ کو نقصان نہ پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ جب بچہ اپنی ماں سے مانوس ہو تو عورت اس کے باپ کو ضرر پہنچانے کی غرض سے بچہ کو اس کے ساتھ نہ ملائے۔بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ جب باپ اپنے بچہ کو ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ نہ پلوائے تو اس پر بچہ کی ماں کا جو خرچہ واجب ہے اس سے زیادہ کچھ دینا اُسے لازم نہیں ہے۔اس تفسیر کی صورت میں ضرر کا تعلق والدین سے ہوگا اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ والد اور والدہ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو بچہ کی وجہ سے ضرر نہ پہنچائے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضرر کا تعلق بچہ سے ہو۔اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ والد اور والدہ دونوں میں سے کوئی بھی بچہ کو ضرر نہ پہنچائے۔یعنی ایسا نہ ہو کہ والدہ دودھ نہ پلائے اور بچہ مر جائے' یہ اُس بچہ کے لیے نقصان دہ ہوگا۔(اسی طرح) یہ بھی نہ ہو کہ باپ اپنے بچہ پر کچھ خرچ نہ کرے' یا بچہ کو اس کی ماں سے چھین لے' اس سے بھی بچہ کو نقصان ہوگا۔اس تفسیر کی صورت میں''ولـد'' پر جو باداخل ہے وہ باصلہ کی ہوگی اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ والدہ بھی اپنے بچہ کو ضرر نہ پہنچائے اور والد بھی اپنے بچہ کو ضرر نہ پہنچائے۔

''وارث'' کی تفسیر اور اس کی ذمہ داری کے بیان میں مختلف اقوال

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾''وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے''۔یعنی جب والد مر جائے تو بچہ کے حق میں جو باپ کا وارث ہو اُس پر بچہ کے خرچہ اور لباس کی وہی ذمہ داری ہے جو باپ پر تھی۔لہٰذا باپ کے وارث پر لازم ہے کہ وہ بچہ کے حقوق کو پورا کرنے میں باپ کا نائب بنے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد بچہ کا وہ وارث ہے جو بچہ کے مرنے کی صورت میں اس کا وارث ہو۔لہٰذا اُس پر وہی ذمہ داری ہوگی جو بچہ کی زندگی میں باپ پر ہوتی ہے۔

اس بارے میں اختلاف ہے کہ وارث سے کون سے وارث مراد ہیں؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے بچہ کے عصبہ (یعنی باپ کی جانب سے رشتہ دار) مراد ہیں' جیسے دادا' بھائی' چچا اور چچا زاد بھائی۔بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے بچہ کا ہر وارث

مراد ہے' خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں۔ یہی امام احمد کا مؤقف ہے۔ لہٰذا جس وارث کا جو حصہ ہو اُس پر اُسی کی مقدار بچہ کا خرچہ لاگو کیا جائے گا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ جو شخص بھی بچہ کا ذی رحم محرم[۱۲۰] ہو وہ اس کا وارث ہے۔ امام ابوحنیفہ اسی کے قائل ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وارث سے خود بچہ مراد ہے۔ اس قول کی رُو سے دودھ پلانے کی اُجرت خود بچہ کے مال سے دی جائے گی' اگر بچہ کا کوئی مال نہ ہو تو ماں پر اُس کی ادائیگی لازم ہوگی۔ اور بچہ کا خرچہ اس کے والدین کے علاوہ کسی اور پر لاگو نہیں کیا جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی مؤقف ہے۔ بعض مفسرین نے ''وعلی الوارث مثل ذالک'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وارث پر لازم ہے کہ وہ ضرر نہ پہنچائے۔

آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ اَرَادَا﴾ مراد یہ ہے کہ والدین چاہیں۔ ﴿فِصَالًا﴾ دو سال سے پہلے دودھ چھڑانا۔ ﴿تَرَاضٍ﴾ باہمی رضامندی اور اتفاق سے ﴿تَشَاوُرٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ والدین اس بارے میں جان کاروں سے مشورہ کریں' تاکہ اُنہیں یہ بات معلوم ہو جائے کہ دو سال سے پہلے دودھ چھڑانا بچہ کے لیے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ ''مشاورت'' کا معنیٰ ہے: ''استخراج الرأی بما فیه مصلحة'' یعنی ایسی رائے اور تجویز پیش کرنا جس میں فائدہ ہو۔ ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ والدین اگر دو سال پہلے بچہ کا دودھ چھڑا لیں اور اس میں بچہ کو نقصان نہ ہو تو والدین پر ایسا کرنے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں ہے۔

﴿اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ جب بچوں کی مائیں دودھ پلانے سے انکار کریں یا دودھ کے رُک جانے کی بیماری یا کسی اور بیماری کی وجہ سے اُن کے لیے دودھ پلانا مشکل ہو جائے یا اُن کا ارادہ نکاح کرنے کا ہو اور تم اپنے بچوں کے لیے دودھ پلانے والیاں لانا چاہو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ ﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ﴾ جبکہ تم دودھ پلانے والیوں کو وہ دے دو جو تم نے اُن کے لیے دودھ پلانے کی اُجرت طے کی ہے۔ بعض مفسرین نے ''اذا سلّمتم'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تم بچوں کی ماؤں کو اُن کے دودھ پلانے کی مقدار اُجرت دے دو۔ ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ جو فرمایا اُس سے مراد ہے: اچھے اور بہترین طریقہ سے (اُجرت دو) یا یہ مراد ہے کہ اُجرت کی ادائیگی کے وقت لوگوں کو اس حالت میں ہونا چاہیے کہ چہرے کھلے ہوئے ہوں' زبان سے اچھی باتیں ادا ہوں اور حتی الامکان دائیوں کے دل خوش کیے جائیں تاکہ وہ اپنے پاس کسی عذر کے نہ ہونے کے سبب کوتاہی نہ کرسکیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ سے ڈرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری اولاد کے جو حقوق تم پر فرض کیے ہیں اور اُنہیں ضروری قرار دیا ہے اُن میں اللہ سے ڈرو۔ ﴿بَصِيْرٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تمہارے جملہ اعمال خواہ چھپ کر ہوں یا علانیہ' اُن کی کوئی پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ پر چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہر پوشیدہ چیز کو وہ دیکھ رہا ہے اور اس کو جانتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور تم میں سے جو لوگ انتقال کر جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں

[۱۲۰] ذی رحم سے مراد بچہ کا وہ قرابت دار جس سے نسبی رشتہ ہو اور محرم سے مراد وہ جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ جیسے ماں' دادی' نانی' بہن وغیرہا۔

اور جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو (اے والیو!) وہ اپنے لیے دستور کے مطابق جو بھی کریں اُس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے' اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے بہت باخبر ہے O

آیت مذکورہ کے چند الفاظ کی تشریح اور آیت میں ''عشرا'' کو مؤنث لانے کی توجیہ

﴿ يُتَوَفَّوْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: جو مرجائیں۔(یہ ''توفی'' سے ہے) اور ''توفی'' کا اصل معنیٰ ہے: کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا۔ جو شخص مرجاتا ہے وہ بھی درحقیقت اپنی عمر کو مکمل طور پر پالیتا ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''تُوُفِّيَ فُلَانٌ'' یعنی فلاں شخص پکڑا گیا۔ ﴿ أَزْوَاجًا ﴾ سے مراد بیویاں ہیں' کیونکہ اہل عرب زوج کا لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ﴿ يَتَرَبَّصْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: عورتیں انتظار کریں۔

آیت میں ﴿ عَشْرًا ﴾ کو مؤنث لانے کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ جب وہ رات اور دن کی تعداد میں ابہام (یعنی پوشیدگی) رکھتے تو رات کو غالب رکھتے تھے۔ چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے: ''صمنا عشرا من الشھر'' ہم نے مہینے میں دس دن روزہ رکھا۔ چونکہ وہ راتوں کو اکثر وبیشتر دنوں پر غالب رکھتے تھے اس لیے ''عشرا'' استعمال کرتے تھے۔ پھر جب دنوں کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو کہتے تھے: ''صمنا عشرۃ ایام'' ہم نے دس دن روزہ رکھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عدت کے ایام چونکہ غم اور سوگ منانے کے دن ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے استعارہ کے طور پر عدت کے دنوں کو راتوں سے تشبیہ دی۔

شوہر کے انتقال پر چار مہینے دس دن کی عدت مقرر کرنے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے چار مہینے دس دن کی جو عدت مقرر فرمائی ہے اُس میں حکمت یہ ہے کہ بچہ حمل کی آدھی مدت تک ماں کے پیٹ میں متحرک رہتا ہے (یعنی ہل جل کرتا رہتا ہے)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بچہ میں رُوح انہی دس دنوں میں پھونکی جاتی ہے۔ (سو بچہ کے حفاظتِ نسب کے لیے عورت پر مذکورہ عدت لازم کی گئی۔) اس کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا جو کہ صادق اور مصدوق ہیں (یعنی سچے ہیں اور سب آپ کی تصدیق کرتے ہیں) کہ:

(۳۳۱) بے شک تم میں ہر شخص کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دنوں تک نطفہ کی شکل میں رکھا جاتا ہے' پھر اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں پھر اتنے ہی دن گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رکھا جاتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اُس کی طرف ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے جو اُس کا کھانا پینا' اس کی مدت حیات' اس کا عمل اور اس کا خوش بخت یا بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے' پھر اُس میں روح پھونک دی جاتی ہے[۶۲۱] (صحیح بخاری: ۳۲۰۸' صحیح مسلم: ۲۶۴۳' سنن ترمذی: ۲۱۳۷' سنن ابوداؤد: ۴۷۰۸' سنن ابن ماجہ: ۷۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۸۲' ص ۲۰)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بچہ کی پیدائش کا سلسلہ چار ماہ کی مدت تک ماں کے پیٹ میں جاری رہتا ہے اور جب ان دنوں میں روح پھونک دی جاتی ہے تو اس بچہ کی پیدائش کا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے۔

عدت وفات اور سوگ کے چند اہم شرعی مسائل کا بیان

پہلا مسئلہ: عورتوں کے مختلف احوال اور عدت وفات کی مدت: جس عورت کا شوہر مرجائے اس کی عدت چار مہینے دس

۶۲۱ کون کیا کھائے گا' کتنا کھائے گا' کتنا عرصہ زندہ رہے گا' کیا عمل کرے گا اور خوش بخت ہوگا یا بد بخت؟ یہ سب باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی ان کو صرف اللہ عزوجل جانتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ فرشتہ کو بھی ان باتوں کا علم ہوتا ہے اور جب فرشتہ کو اللہ عزوجل کی عطا سے غیب کا علم ہوتا ہے تو انبیاء کرام خصوصاً سید الانبیاء نبی اکرم ﷺ کے علوم غیبیہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ (مراۃ المناجیح ج ۱ ص ۹۴)

دن ہے۔ باندی کی عدت آزاد عورت کے مقابلہ میں آدھی ہے' یعنی دو مہینے پانچ دن۔ یہی جمہور علماء کا مؤقف ہے۔ جبکہ امام ابوبکر الاصم کا مؤقف یہ ہے کہ باندی کی عدت آزاد عورت کی طرح ہے۔ اُن کا استدلال زیر بحث آیت کے ظاہر سے ہے۔ اور اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ خواہ وہ آزاد ہو یا باندی۔ اگر وہ اپنے شوہر کے انتقال کے ایک لمحہ بعد بچہ جن دے تو (اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور) اس کے لیے کسی اور سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت سُبَیعہ اسلمیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے مروی ہے کہ:

(۳۳۲) وہ حضرت سعد بن خولہ کے نکاح میں تھی' جو کہ قبیلہ بنی عامر بن لُوی سے تھے۔ سعد بن خولہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے اور حجۃ الوداع میں اُن کا انتقال ہوا' اس وقت وہ حالتِ حمل میں تھی۔ ان کی وفات کے کچھ روز کے بعد بچہ پیدا ہوگیا۔ جب وہ اپنے نفاس سے فارغ ہوئی تو انہوں نے منگنی کرنے والوں کے لیے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ (انہی دنوں میں) ان کے پاس بنی عبدالدار کا ابوالسنابل بن بعلکک نامی ایک شخص آیا' اس نے کہا کہ کیا بات ہے تم نے منگنی کرنے والوں کے لیے زینت کی ہوئی ہے' شاید نکاح کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن خدا کی قسم! تم اس وقت نکاح نہیں کر سکتی جب تک کہ (عدت کے) چار مہینے دس دن نہ گزر جائیں۔ سُبیعہ کہتی ہیں کہ جب انہوں نے مجھ سے یہ بات کہی تو میں نے شام کے وقت اپنے کپڑے سمیٹے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے اس بارے میں آپ سے دریافت کیا تو آپ نے مجھے یہ فتویٰ دیا کہ بچہ جنتے ہی میں حلال ہو چکی ہوں اور اگر میں چاہوں تو نکاح بھی کر سکتی ہوں۔

☆ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے' اور اس میں ابن شہاب کا یہ قول بھی ہے کہ میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ (عدت وفات گزارنے والی) عورت جب بچہ جن لے تو وہ کسی اور سے نکاح کر سکتی ہے' اگرچہ اس کا خون جاری ہو' سوائے اس کے کہ وہ جب تک وہ پاک نہ ہو جائے اس وقت تک شوہر اُس سے جماع نہیں کر سکتا۔

(صحیح بخاری: ۳۹۹۱' صحیح مسلم: ۱۴۸۴' سنن ابوداؤد: ۲۳۰۶' سنن نسائی: ۳۵۱۸' سنن ابن ماجہ: ۲۰۲۸)

لہٰذا زیر بحث آیت میں عدت کا جو حکم ہے کہ چار مہینے دس دن گزارے جائیں وہ ہر اُس عورت کے بارے میں تھا جس کا شوہر انتقال کر جائے' پھر اس عموم سے حمل والی عورتوں کو علیحدہ کر دیا گیا (یعنی ان کی عدت وضع حمل کر دی گئی) ایک تو حدیث مذکور کی وجہ سے اور دوسرا اس لیے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ (الطلاق: ۴) حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر لیں۔

دوسرا مسئلہ: سوگ کی کیفیت' اس کا طریقہ اور اس کے آداب و احکام

(۱) جس عورت کا شوہر انتقال کر جائے اُس پر اِحداد (یعنی سوگ) واجب ہے۔ ''اِحداد'' یہ ہے کہ زیب و زینت' خوش بو' کسی بھی قسم کے تیل کا سر میں استعمال اور خوش بودار سرمہ کا استعمال نہ کیا جائے۔ البتہ مجبوراً اگر زینت والا سرمہ عورت لگالے تو اس کی اجازت ہے۔ (خواہ دن میں ہو یا رات میں۔) امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہی مؤقف ہے۔ امام شافعی کا مؤقف یہ ہے کہ (ایسی صورت میں) عورت رات میں سرمہ لگالے اور دن میں اُس کو صاف کر دے۔ (کیونکہ) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتی ہیں کہ:

(۳۳۳) جب میرے شوہر ابوسلمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے' اس وقت میں نے ایلوا (ایک کڑوی دوا) اپنے چہرہ پر لگائی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اے ام سلمہ! یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ (ﷺ)! یہ ایلوا ہے، اس میں خوش بُو نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ چہرے کو خوب صورت کرتا ہے، لہٰذا تم اس کو صرف رات میں لگایا کرو اور دن میں صاف کر دیا کرو۔ اور تم خوش بو اور مہندی نہ لگایا کرو، کیونکہ مہندی خضاب ہے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! پھر میں کس چیز سے اپنے بالوں میں کنگھی کروں؟ آپ نے فرمایا: بیری کے ذریعہ، یعنی اس کو اپنے سر میں مَل لیا کرو۔[۶۲۲] (سنن ابوداؤد: ۲۳۰۵، سنن نسائی: ۳۵۳۷، مؤطا امام مالک: ۱۳۱۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۳۳۳۔ ص ۲۸۹)

☆ حدیث مذکور میں چند الفاظ آئے ہیں جن کی تشریح پیش کی جاتی ہے: (۱) ''فانه یشب الوجه'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ''ایلوا'' چہرے کو روشن کرتا ہے اور خوب صورت بناتا ہے۔ جب کوئی شخص آگ جلائے تو کہا جاتا ہے: ''شب النار'' آگ روشن ہوگئی۔ (۲) ''تغلفین به رأسک'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بیری کو اپنے سر میں مَل لیا کرو۔ ''تغلّف'' کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب عورت زعفران کو کسی چیز میں ملا کر اس کو زیادہ کر کے اپنے چہرے یا سر پر مَل لے۔

(۲) سوگ والی عورت کے لیے ریشم کا کپڑا، زیورات اور بہ غرضِ زینت رنگے ہوئے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے، جیسے لال اور پیلے کپڑے۔ البتہ اگر زینت کے لیے نہ رنگا گیا ہو جیسے کالا اور نیلا کپڑا، اس کو پہننا جائز ہے۔ اسی طرح سوتی اور کاٹن کے سفید کپڑے پہننا بھی جائز ہے۔

(۳۳۴) حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی زوجہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والد حضرت ابوسفیان بن حرب کا انتقال ہوا تو میں ام حبیبہ کے پاس گئی، ام حبیبہ نے زعفران ملی ہوئی ایک پیلی خوش بو یا کوئی اور خوشبو منگوائی اور ان کی باندی نے وہ خوش بو اُن کے رخساروں پر لگائی، پھر ام حبیبہ نے کہا کہ خدا کی قسم! مجھے خوش بو کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اُس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوائے اس کے کہ اپنے شوہر پر چار مہینے دس دن سوگ کرے۔ حضرت زینب کہتی ہیں کہ پھر جب حضرت زینب بنت جحش کے بھائی کا انتقال ہوگیا تو میں زینب کے پاس گئی، انہوں نے بھی منگوائی اور اس کو لگایا، پھر کہا کہ خدا کی قسم! مجھے خوشبو کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اُس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوائے اس کے کہ اس کا شوہر مر جائے تو وہ چار مہینے دس مہینے سوگ کرے۔[۶۲۳]

---

۶۲۲ اس حدیث میں امام شافعی کی تائید اس طور پر ہے کہ اس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو عذر کی بناء پر عدت میں دوا لگانے کی اجازت دی لیکن صرف رات میں۔ لہٰذا عورت کو عذر کی وجہ سے دن اور رات دونوں میں زینت والا سُرمہ لگانے کی اجازت دینا درست نہیں ہے۔ علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے امام شافعی کے اس استدلال کا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث میں صرف رات کی اجازت دینا اُن عورتوں کے لیے ہے جنہیں رات میں دوا یا سُرمہ لگانا اُن کے عذر کے لیے کافی ہو جائے۔ وگرنہ جس عورت کو عذر کی وجہ سے دن میں بھی زینت والا سُرمہ یا اس جیسی کوئی چیز لگانے کی ضرورت پڑتی ہو تو اس کے لیے ممانعت نہیں ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ: **الضرورة تتقدر بقدرها** (ضرورت اپنی مقدار کے مطابق ثابت ہوتی ہے۔) (ردّ المحتار ج ۵ ص ۱۷۵ طبع جدید) صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آنکھ کی بیماری میں سُرمہ لگانے کی ضرورت ہو تو یہ لحاظ ضروری ہے کہ سیاہ سُرمہ اُس وقت لگا سکتی ہے جب سفید سرمہ سے کام نہ چلے اور اگر صرف رات میں لگانا کافی ہو تو دن میں لگانے کی اجازت نہیں۔ (بہارِ شریعت حصہ ۸ ص ۲۴۷)

۶۲۳ اس حدیث شریف میں اور اس کے بعد والی احادیث میں اگرچہ صرف عورت کا ذکر ہے لیکن مرد بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ یعنی کسی کے انتقال پر مردوں کو بھی صرف تین دن تک سوگ کی اجازت ہے۔ سوگ سے مراد ماتم کرنا نہیں ہے بلکہ زیب و زینت کو ترک کرنا مراد ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ کسی کے انتقال پر سوگ منانا (یعنی زیب و زینت وغیرہ ترک کر دینا) شرعاً واجب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ شوہر کے انتقال کی صورت میں اس کی بیوہ پر چار مہینے دس دن تک سوگ کرنا واجب اور ضروری ہے۔

(صحیح بخاری: ۵۳۳۴-۵۳۳۵' صحیح مسلم: ۱۴۸۶' سنن ترمذی: ۱۱۹۵' سنن ابوداؤد: ۲۲۹۹' سنن نسائی: ۳۵۳۳' سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۳۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۳۳۰' ص ۲۸۸)

(۳۳۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے' سوائے اس کے کہ وہ اپنے شوہر کے انتقال پر چار مہینے دس دن سوگ کرے۔ (صحیح مسلم: ۱۴۹۰' سنن ابن ماجہ: ۲۰۸۵)

(۳۳۶) حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہمیں اس بات سے منع کیا جاتا تھا کہ ہم کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ کریں' سوائے اس کے کہ شوہر کے انتقال پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا تھا۔ (یعنی) سرمہ لگانا' خوش بو لگانا اور رنگے ہوئے کپڑے پہننا ہمیں منع تھا' البتہ بُنے ہوئے رنگین کپڑوں کی اجازت تھی' اور اس بات کی اجازت تھی کہ جب ہم ماہواری سے فارغ ہو کر غسل کر کے پاک ہو لیں تو خوشبو والی کوئی چیز استعمال کر لیں[۶۲۴] (صحیح بخاری: ۳۱۳' صحیح مسلم: ۹۳۸' سنن ابوداؤد: ۲۳۰۲' سنن نسائی: ۳۵۳۶' سنن ابن ماجہ: ۲۰۸۷' مسند احمد ج ۵ ص ۸۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۳۳۱' ص ۲۸۹)

☆ اس حدیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں جن کی تشریح پیش کی جاتی ہے: (۱) ''الاثوب عصب'' اس میں عصب سے مراد وہ دھاری دار کپڑا ہے جس کے سوت کو پہلے رنگا جائے۔ (۲) ''نبذة من كست'' ''نُبذه'' کا معنیٰ ہے: معمولی چیز اور ''کُست'' ''قُسط'' کی ایک لغت ہے' اس سے مراد ایک معروف چیز ہے جس سے خوش بو حاصل کی جاتی ہے۔

(۳۳۷) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس عورت کا شوہر مر جائے وہ نہ تو زعفرانی کپڑا پہنے' نہ سرخ کپڑے پہنے' نہ زیور پہنے' اور نہ ہی مہندی' سرمہ اور خوشبو لگائے۔

(سنن ابوداؤد: ۲۳۰۴' سنن نسائی: ۳۵۳۵' مسند احمد ج ۶ ص ۳۰۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۳۳۴' ص ۲۸۹)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: ''ممشقة'' اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جن کو ''مَشْق'' یعنی سرخ مٹی سے رنگا گیا ہو۔

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صفیہ بنت عبداللہ اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سوگ میں تھی کہ اُنہیں آنکھ کی شکایت ہوئی تو انہوں نے اس وقت اپنی اُس آنکھ میں سرمہ نہیں لگایا جب تک کہ وہ بہنے نہیں لگ گئی۔[۶۲۵] (مؤطا امام مالک: ۱۳۰۹)

تیسرا مسئلہ: آیا عدت کے لیے شوہر کی وفات کا علم ضروری ہے یا نہیں؟: زیر بحث عدت کا جو سبب ہے اس کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اُس کا سبب شوہر کا فوت ہونا ہے یا اُس کے فوت ہونے کا علم؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت کو شوہر کے انتقال کی خبر نہ ہو تو عدت کے ایام گزرنے کے باوجود اُس کی عدت برقرار رہے گی۔ ان علماء کا استدلال اس بات سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں فرمایا ہے: ''يتربصن بانفسهن'' عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور اپنے آپ کو روکے رکھنا اُسی وقت ممکن ہے جب اس کا ارادہ ہو' اور ارادہ اُس وقت ممکن ہے جب (شوہر کی وفات کا) علم ہو۔ اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ عدت وفات کا سبب شوہر کی وفات ہے۔ لہٰذا اگر عورت کو اس کے شوہر کے مرنے کی خبر اس وقت ملے جب کہ اس کی عدت کے تمام ایام یا اکثر یا بعض ایام گزر چکے ہوں تو جتنے دن گزر چکے اُن کے علاوہ کے ساتھ عدت پوری

---

۶۲۴ یعنی عدت والی عورت جب درمیان میں حیض سے فارغ ہو تو خوشبو والی کوئی چیز شرمگاہ پر مَل سکتی ہے کہ اس سے صرف بدبو کو دور کرنا مقصود ہے نہ کہ جسم کو خوشبودار کرنا۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ ص ۱۷۷)

۶۲۵ یعنی جب اُن کے نزدیک سُرمہ لگانے کی ضرورت ثابت ہوئی تب اُنہوں نے سُرمہ استعمال کیا۔ ضرورۃً سُرمہ کے استعمال کی وضاحت کے لیے حاشیہ: ۶۲۳ ملاحظہ فرمایئے۔

کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صغیرہ یعنی ایسی چھوٹی لڑکی جس کو اپنے خاوند کے انتقال کی خبر نہ ہو اُس کی عدت کے لیے یہی کافی ہے کہ چار ماہ دس دن کا عرصہ گزر جائے۔

چوتھا مسئلہ: زیر بحث آیت کا ناسخ ہونا: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زیر بحث آیت اگرچہ تلاوت میں پہلے ہے لیکن اپنے بعد والی آیت: ۲۴۰ کی ناسخ ہے جس میں عدت وفات ایک سال بیان کی گئی ہے۔ اس مسئلہ پر مکمل گفتگو ہم ان شاء اس آیت کے بعد اپنے مقام پر کریں گے۔

زیر بحث آیت میں آگے فرمایا: ''جب عورتیں عدت وفات پوری کر لیں تو وہ اپنے لیے دستور کے مطابق جو بھی کریں اس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے''۔

مذکورہ جملہ کی تفسیر

اس جملہ میں خطاب سرپرستوں سے ہے' کیونکہ وہی لوگ عقد نکاح کی سرپرستی کرتے ہیں۔ (چنانچہ انہیں خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:) ﴿فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ﴾ یعنی جب اُن کی عدت گزر جائے۔ ﴿فِيۡمَا فَعَلۡنَ﴾ تو وہ اپنے لیے دستور کے مطابق جو بھی کریں' یعنی زیب و زینت کریں' خوشبو لگائیں' جس گھر میں عدت گزاری ہے اُس سے منتقل ہو جائیں' اور جس سے نکاح جائز ہو اُس سے نکاح کر لیں' ان میں سے وہ جو بھی کریں اس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فیما فعلن'' سے صرف نکاح مراد ہے۔ اور اس کے ساتھ جو ﴿معروف﴾ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نکاح جائز اور پاکیزہ ہو۔

مذکورہ جملہ میں ''فیما فعلن'' سے احناف کا بغیر اذن ولی کے کیے ہوئے نکاح کے جواز پر استدلال... اور شوافع کی طرف سے اس کا جواب

زیر بحث آیت میں جو ﴿فِيۡمَا فَعَلۡنَ﴾ فرمایا ہے اس سے امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے یہ استدلال کیا ہے کہ بغیر سرپرست کے نکاح جائز ہے' کیونکہ اس میں فعل کی جو نسبت فاعل کی طرف ہے اُس سے مراد مباشرت ہے (یعنی براہِ راست از خود کوئی کام کرنا)۔ امام شافعی کے اصحاب کی طرف سے اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو فرمایا: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ﴾ اس میں عورت کے سرپرستوں سے خطاب ہے۔ اگر عقد نکاح بغیر سرپرست کے صحیح ہوتا تو اس آیت میں سرپرست سے خطاب نہ ہوتا۔[۶۲۶] اور ﴿فِيۡمَا فَعَلۡنَ﴾ جو فرمایا ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ اس سے زیب و زینت اور خوشبو لگانا مراد ہے' یعنی عدت گزرنے کے بعد عورت زیب و زینت کر سکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے' نہ یہ معنیٰ کہ اپنے آپ نکاح کر سکتی ہے۔[۶۲۷]

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ﴾ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی چھپی ہوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ ﴿خَبِيۡرٌ﴾ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہ ہر چیز کی حقیقت کو جاننے والا ہے اور اب جب مخلوق کے لیے یہ لفظ بولا جائے تو اس سے خاص قسم کا جاننا مراد ہوتا ہے' اور وہ یہ ہے کہ کوشش اور غور و فکر سے کوئی بات معلوم ہو' جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔

---

۶۲۶ علامہ خازن کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ خطاب کسی سے ہو اور اُس میں اختیار کسی اور کا بیان کیا جائے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے تفصیل کے لیے حاشیہ: ۶۱۸ ملاحظہ فرمائیں۔

۶۲۷ ہمارے نزدیک ''فیما فعلن'' میں عموم ہے۔ لہٰذا دورانِ عدت جو جو چیزیں عورت کے لیے ممنوع تھیں اُن سب میں عورت کا اختیار ثابت ہوگا۔ خواہ وہ زیب و زینت ہو یا نکاح ہو۔ لہٰذا عدت کے بعد جس طرح عورت اپنی زیبائش و آرائش میں خود مختار ہے اسی طرح نکاح کے معاملہ میں بھی خود مختار ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ والدین یا جو بھی سرپرست ہو اس کی رضامندی اور اجازت عورت کا اخلاقی فرض ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

اور اس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم (عدت والی) عورتوں کو اشارہ کے ساتھ نکاح کا پیغام دو یا اپنے دل میں اس کا ارادہ رکھو‘ اللہ کو علم ہے کہ اب تم (دل میں) اُنہیں یاد کرو گے‘ لیکن (عدت کے دوران) اُن سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو‘ البتہ شریعت کے مطابق کوئی بات اُن سے کر سکتے ہو‘ اور اس وقت تک اُن سے نکاح کی گرہ مضبوط نہ کرو جب تک کہ اُن کی عدت پوری نہ ہو جائے‘ اور یہ بات اپنے علم میں رکھو کہ اللہ تمہارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے‘ لہٰذا اس سے ڈرتے رہو‘ اور یہ بھی علم میں رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے O

تعریض کا معنیٰ اور اس کی تعریف

﴿لَا جُنَاحَ﴾ کا معنیٰ ہے: کوئی حرج نہیں ہے۔ ﴿فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ﴾ کا معنیٰ ہے: جس چیز کا تم اشارہ دو۔ ﴿عَرَّضْتُمْ﴾ تعریض سے ہے اور تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلام ایسی باتوں پر مشتمل ہو جن سے کلام کا مقصد بھی ثابت ہوتا ہو اور دیگر چیزیں بھی ثابت ہوتی ہوں‘ لیکن اپنے مقصد کی طرف اُس کا جھکاؤ زیادہ غالب ہو۔ بعض علماء نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں ایسا اشارہ دینا جس سے سننے والے کو بغیر وضاحت کے مقصد سمجھ میں آ جائے۔ بعض علماء نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ تعریض سے مراد ایسا کلام ہے جس کا ظاہر بھی ہو اور باطن بھی ہو۔

آیت میں جو ﴿خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ فرمایا اس میں ’’نساء‘‘ سے عدت والی عورتیں مراد ہیں۔ اور ’’خِطبة‘‘ کا معنیٰ ہے: نکاح کرنے کی خواہش اور اس کی درخواست کرنا۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: عورتوں کا تذکرہ کرنا۔ جبکہ ’’خُطبة‘‘ کا معنیٰ ہے: ایسا منظوم کلام جس کا آغاز بھی ہو اور اختتام بھی۔ آیت میں جو ﴿فِيمَا عَرَّضْتُمْ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ عدت والی عورتوں کے پاس اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم عورتوں کا تذکرہ کرو۔

عدت کے دوران تعریض کی تفسیر

عدت کے دوران عورت کو تعریض بالخطبہ (یعنی اشارہ سے نکاح کا پیغام دینا) جائز ہے۔ مثلاً یوں کہے کہ ’’تم بہت جمیل اور نیک ہو‘‘۔ ’’میں شادی کرنا چاہتا ہوں‘‘۔ ’’میں تمہارے ساتھ رغبت رکھتا ہوں‘‘۔ ’’ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی نیک عورت مہیا فرما دے‘‘۔ اور اس طرح کے دیگر جملے جن میں واضح طور پر یہ بات نہ کہی جائے کہ میں تم سے نکاح یا شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تعریض کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کے صحیح ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ تعریض سے مراد یہ ہے کہ آدمی یوں کہے کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں‘ مجھے عورت کی ضرورت ہے‘ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی نیک عورت مل جائے۔ (صحیح بخاری: ۵۱۲۴)

(۳۳۸) مروی ہے کہ حضرت سُکَینہ بنت حَنظلہ بیوہ ہوئیں‘ تو اُن کے پاس دوران عدت ابو جعفر محمد بن علی باقر آئے اور انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میرا کیا رشتہ ہے اور میرے دادا (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا مجھ پر کیا

حق ہے اور اسلام لانے میں کس قدر قدیم ہوں۔ حضرت سکینہ نے (یہ باتیں سن کر) کہا کہ اللہ عزوجل تمہاری مغفرت فرمائے کیا مجھے عدت کے دوران تم نکاح کا پیغام دے رہے ہو حالانکہ اس کا تم سے مؤاخذہ ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے میرا کیا رشتہ اور قرابت ہے۔ جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے شوہر حضرت ابوسلمہ کے انتقال کی عدت میں تھیں تو رسول اللہ ﷺ اُن کے پاس تشریف لے گئے تھے اور حضرت ام سلمہ کے سامنے اپنا وہ مقام بیان فرمایا تھا جو آپ کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں حاصل ہے۔ اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ پر اس طرح زور دے کر بیٹھے ہوئے تھے کہ چٹائی نے اُس میں اپنے نشان ڈال دیئے تھے۔ (سنن دار قطنی ج۳ ص۲۲۴)

زیر بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿أَوْ أَكْنَنتُمْ﴾ اس کا معنیٰ ہے: چھپانا۔ یعنی عدت والی عورتوں سے نکاح کرنے کی جو بات تم دل میں رکھو (اس میں کوئی حرج نہیں)۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آدمی عدت والی عورت کے پاس جا کر سلام کرے اور چاہے تو اُسے کوئی تحفہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مقصود کلام یہ ہے کہ عدت وفات میں اگر تم عورت کو اشارتاً نکاح کا پیغام دو یا اپنے دل میں اُس سے رغبت رکھو اس میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿سَتَذْكُرُونَهُنَّ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اُنہیں اپنے دل میں یاد کرو گے۔ کیونکہ نفس میں جو خواہش اور آرزو پائی جاتی ہے اُس سے کوئی شخص خالی نہیں ہے۔ لہٰذا جب دل میں پیدا ہونے والی یہ چیز ایک دشوار چیز کی طرح ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے حرج کو معاف فرمادیا۔

''سِرّ'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال کا بیان

آگے جو فرمایا: ﴿لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا﴾ (یعنی اُن سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو) اس کے معنیٰ میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے زنا مراد ہے۔ کیونکہ ہوتا یہ تھا کہ عدت والی عورت کے پاس لوگ جا کر اُسے نکاح کے اشارے کرتے تھے اور مراد اس سے زنا کاری ہوتی تھی اور لوگ عورت سے کہتے تھے کہ مجھے اپنے ساتھ اجازت دے دو جب تمہاری عدت پوری ہوگی تو میں یہ ظاہر کروں گا کہ میرا تمہارے ساتھ نکاح ہوا ہے۔ آیت مبارکہ میں اس سے منع کر دیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی عورت سے یوں کہے کہ تو مجھے اپنے آپ سے دور نہ کر کیونکہ میں تجھ سے نکاح کرنے والا ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی عورت سے اس بات کا وعدہ لے کہ وہ میرے علاوہ کسی اور سے نکاح نہیں کرے گی۔ بعض کے نزدیک اس سے عدت میں منگنی کرنا مراد ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''سـرّا'' سے جماع مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ کلبی کے نزدیک ''سرّا'' سے مراد یہ ہے کہ تم عدت والی عورتوں کو اپنے بارے میں یہ نہ بتاؤ کہ میں کثرت سے جماع کر سکتا ہوں۔ لفظ ''سرّ'' سے جماع مراد ہونے کی دلیل امرء القیس کا یہ شعر ہے:

الا زعمت بسباسة القوم انني   كبرت وان لا يحسن السر امثالي

''اے قوم کی بسباسہ (عورت)! کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں بڑا ہوگیا ہوں اور مجھ جیسے اچھی طرح جماع نہیں کر سکتے؟''

آیت مبارکہ میں جماع کو ''سـرّ'' کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ جماع چھپ کر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی باحیا اور عزت والا ہے اس لیے اُس نے جماع کے صریح لفظ کو چھوڑ کر اُس کو ''سرّ'' سے تعبیر فرمایا۔

زیر بحث جملہ ﴿لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ عدت والی عورتوں سے خفیہ وعدہ نہ کرو یا ایسی چیز کا وعدہ نہ کرو جو ''سـرّ'' ہو۔ بعض مفسرین اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اشارتاً نکاح کا پیغام دینے کی اجازت دی اور اختتام پر کھلے لفظوں میں نکاح کا پیغام دینے سے منع فرمایا ہے۔

﴿ اِلَّآ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴾ عدت والی عورتوں سے قولِ معروف کی تمہیں اجازت ہے۔اس میں ''معروف'' سے مراد وہی ہے جو مذکور ہوا کہ اشارتاً نکاح کا پیغام دیا جائے۔بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ عورت کے سرپرست کو یہ بتادیا جائے کہ میں عدت والی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔

﴿ وَلَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَةَ النِّكَاحِ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ عدت کے دوران نکاح کی گرہ کو مضبوط نہ کرو۔﴿ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ ﴾ جب تک کہ عدت نہ گزر جائے۔عدت کو چونکہ کتاب کے ذریعہ فرض کیا گیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدت کو''کتاب'' فرمایا۔آیت میں جو ﴿ فَاحۡذَرُوۡهُ ﴾ فرمایا اُس کا معنیٰ ہے: تم اللہ سے ڈرو۔اور اختتام پر جو ﴿ حَلِيۡمٌ ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص کھلے عام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا بلکہ اُس کی نافرمانی کا پردہ فرماتا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوۡهُنَّ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۲۳۶﴾

اگر تم (اپنی منکوحہ) عورتوں کو اُس وقت طلاق دے دو جب کہ تم نے اُن سے صحبت نہ کی ہو یا اُن کا مہر مقرر نہ کیا ہو تو تمہیں (اس میں) کوئی گناہ نہیں ہے، اور تم اُنہیں استعمال کی کوئی چیز دے دو، خوش حال پر اُس کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کے مطابق ہے، (یہ) خرچہ مناسب طریقہ سے ہونا چاہیے، نیک لوگوں پر (یہ عورتوں کا) حق ہےO

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور ''لا جناح'' فرمانے پر ایک سوال کا جواب

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ انصار کے ایک شخص نے قبیلہ بنی حنیفہ کی کسی عورت سے نکاح کیا اور مہر مقرر نہیں کیا۔ پھر صحبت سے پہلے اُسے طلاق دے دی تو مذکورہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے طلاق دینے والے سے فرمایا کہ تم عورت کو استعمال کی کوئی چیز دے دو، اگرچہ وہ تمہاری ٹوپی ہو۔

سوال: اگر صحبت کے بعد عورت کو طلاق دی جائے تو کیا اس میں کوئی گناہ ہے، جس کو صحبت سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں معاف کیا گیا ہو؟ (اگر نہیں) تو پھر صحبت سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں حرج اور گناہ کی نفی کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ''طلاق''، تعلق کو منقطع کرنے کا ایک سبب ہے۔اور حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ ''جتنی چیزیں حلال ہیں اُن میں اللہ عزوجل کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ''طلاق'' ہے''۔[۶۲۸] اس لیے اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث صورت میں گناہ کی جو نفی فرمائی ہے وہ اس وقت ہے جب عورت کو روکے رکھنے کے مقابلہ میں اس سے جدا ہونا زیادہ راحت اور آرام کا باعث ہو۔

بعض مفسرین نے جواب یہ دیا ہے کہ آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم صحبت سے پہلے عورت کو جس وقت چاہو طلاق دے دو، خواہ وہ حائضہ ہو یا پاک۔کیونکہ صحبت سے پہلے جو طلاق دی جائے اُس میں کوئی ''سنت'' نہیں ہے۔[۶۲۹]

۶۲۸ یہ حدیث شریف 'البقرہ: ۲۲۹ کی تفسیر میں رقم: ۳۳۵ کے تحت گزر چکی ہے۔اس کے حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۶۲۹ اس بحث میں علامہ خازن نے آیت مبارکہ میں لا جناح پر ایک سوال اور اس کے دو جوابات ذکر فرمائے ہیں۔سوال اور دونوں جوابات کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں قبل صحبت طلاق دینے کے بارے میں فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت سے صحبت کی جاچکی ہو اُسے طلاق دینے میں حرج ہے، حالانکہ قبل صحبت اور بعد صحبت دونوں ہی حالتوں میں طلاق دینا جائز ہے؟ اس کا پہلا جواب غیر واضح ہے، لیکن خلاصہ اس کا یہ ہے کہ طلاق قطع تعلقی کا ایک سبب ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿وَمَتِّعُوهُنَّ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے عورتوں کو ایسی چیز دے دو جس سے وہ فائدہ حاصل کریں۔ ''متعہ'' اور ''متاع'' اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر گزارہ ہو جائے۔ ﴿عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ایسا مالدار جو گنجائش رکھتا ہو اُس پر اُس کی گنجائش اور طاقت کے مطابق ہے (یعنی وہ اپنی گنجائش کے مطابق کوئی چیز دے) اور ﴿وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ فقیر جو اپنی غربت کی وجہ سے تنگی میں ہو اُس پر اس کی گنجائش اور طاقت کے مطابق ہے۔ ﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ عورتوں کو معروف کے مطابق فائدہ کی کوئی چیز دو۔ ''معروف'' سے مراد یہ ہے کہ ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ ﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ﴾ اس میں ''حقا'' سے مراد یہ ہے کہ فائدہ کی چیز دینا واجب اور لازمی ہے۔ اور ''محسنین'' سے مراد یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں پر واجب ہے جو طلاق یافتہ عورتوں کو کوئی چیز دے کر نیکی کرنے والے ہوں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے صرف محسنین ہی فائدہ اٹھانے والے ہیں اس لیے خاص ان کا تذکرہ فرمایا۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص محسنین میں شامل ہونا چاہے اُس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے جو بیان ہوا۔ محسن سے مراد مؤمن ہے۔

آیت مذکورہ کی روشنی میں مَتاع کی ادائیگی کے چند شرعی احکام اور اس میں ائمہ مذاہب کے اقوال

(۱) جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اُس کا مہر مقرر نہ کرے پھر صحبت سے پہلے اُس کو طلاق دے دے تو اُس پر واجب ہے کہ عورت کو مُتعہ دے۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا یہی مؤقف ہے۔ امام مالک کا مؤقف یہ ہے کہ متعہ دینا مستحب ہے۔ (مسئلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ) اگر صحبت سے پہلے آدمی عورت کو طلاق دے دے اور مہر مقرر کیا ہوا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ وہ مقررہ مہر کا آدھا حصہ دے اس صورت میں متعہ دینا واجب نہیں ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس عورت کے ساتھ صحبت کی جا چکی ہو اُس کو طلاق ہو جائے تو اس کے بارے میں دو قول ہیں:[۶۳۰] قول قدیم یہ ہے کہ وہ عورت چونکہ پورے مہر کی مستحق ہے اس لیے اس کو متعہ نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کا یہی مؤقف ہے اور امام احمد کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ جبکہ قول جدید یہ ہے کہ اُس عورت کو متعہ دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''مطلقہ عورتوں کے لیے دستور کے مطابق متاع ہے''۔ (البقرہ:۲۴۱) امام احمد کی دوسری روایت یہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر مطلقہ عورت کے لیے متعہ ہے سوائے اس عورت کے جس کا مہر مقرر ہو اور اس کے ساتھ اس کے شوہر نے صحبت نہ کی ہو تو اُسے آدھا مہر دے دینا ہی کافی ہے۔

(۳) تیسرا مسئلہ متعہ کی مقدار کے بارے میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ متعہ کی سب سے بڑی مقدار یہ ہے کہ عورت کو ایک نوکر دے دیا جائے۔ اور درمیانی مقدار یہ ہے کہ اُس کو تین کپڑے دیئے جائیں: شلوار،

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اور اللہ تعالیٰ نے حرج کی جو نفی فرمائی ہے وہ اس صورت میں ہے جب اُسے جدا کرنا زیادہ پریشانی کا باعث نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عورت سے صحبت نہ کی گئی ہو۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ قبل از صحبت دی جانے والی طلاق کے بارے میں فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں قبل صحبت طلاق دینے میں حرج کی جو نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قبل صحبت تم ہر حال میں طلاق دے سکتے ہو خواہ عورت حائضہ ہو یا پاک۔ جبکہ بعد صحبت عورت کو حالت حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے۔

۶۳۰ امام رازی نے بھی اسی طرح فرمایا ہے کہ ''اس کے بارے میں دو قول ہیں''۔ یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ دو اقوال کس کے ہیں۔ غالب یہی ہے کہ اس سے امام شافعی علیہ الرحمۃ کے اقوال مراد ہیں۔

قمیص اور دوپٹہ۔ اور متعہ کی سب سے کم مقدار یہ ہے کہ حفاظت کی یا گزارہ کی کوئی چیز یا چاندی کی کوئی چیز دے دی جائے۔
امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ صاحبِ استطاعت پر متعہ کی بڑی مقدار یہ ہے کہ وہ نوکر دے اور درمیانی مقدار یہ ہے کہ کپڑا دے اور سب سے قلیل مقدار یہ ہے کہ کوئی بھی قیمت والی چیز دے دے بہتر یہ ہے کہ اُس کی قیمت تیس درہم ہوں۔ مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور متعہ کے طور پر ایک کالی باندی اُسے دی۔ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنی بیوی کو متعہ کے طور پر دس ہزار درہم دیئے اور کہا کہ "متاع قلیل من حبیب مفارق" یعنی جدا ہونے والے پیارے شخص کی طرف سے یہ قلیل متاع ہے۔
امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق متعہ کی مقدار یہ ہے کہ جب زوجین کے درمیان اختلاف ہو جائے تو مہر مثلی کا نصف دیا جائے اُس سے تجاوز نہ کیا جائے۔[۶۳۱] امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ لباس کی اتنی مقدار دی جائے جس میں نماز کی ادائیگی ہو جائے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ حاکم وقت جو مقدار معین کر دے اس کے مطابق متعہ دیا جائے۔
زیر بحث آیت سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ متعہ کی ادائیگی میں شوہر کی حالت یعنی اُس کی خوش حالی اور غربت کا لحاظ کیا جائے گا۔ اور یہ بات اجتہاد اور غور وفکر سے معلوم ہو گی کیونکہ متعہ دینا ایسا ہی ہے جیسے بیوی کو نفقہ دینا اللہ عزوجل نے واجب کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نفقہ دینے میں خوش حال اور تنگ دست کا معاملہ آپس میں مختلف ہوتا ہے (اس لیے متعہ کی مقدار بھی شوہر کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہو گی)۔
(۴) چوتھا مسئلہ جو زیر بحث آیت کے احکامات میں سے ہے وہ یہ ہے کہ جس شخص نے کسی بالغ عورت سے اس کی رضامندی کے ساتھ اس شرط پر نکاح کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا تو اس صورت میں نکاح صحیح ہے لیکن عورت کو اس بات کا حق حاصل رہے گا کہ وہ شوہر سے مہر مقرر کرنے کا مطالبہ کرے۔ پھر اگر مہر مقرر کرنے سے پہلے شوہر اُس کے ساتھ صحبت کر چکا ہو تو شوہر پر مہر مثلی واجب ہے اور اگر مہر مقرر کرنے اور جماع کرنے سے پہلے اس کو طلاق دے چکا ہو تو اس صورت میں متعہ دیا جائے گا۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

اور اگر تم نے صحبت سے پہلے ہی عورتوں کو طلاق دے دی اور اُن کا مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو تمہارے مقرر کردہ مہر کا آدھا (ادا کرنا تم پر واجب) ہو گا البتہ عورتیں کچھ معاف کر دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ کچھ زیادہ دے دے (تو درست ہے) اور تمہارا زیادہ ادا کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور تم آپس کے احسانات کو نہ بھولو بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے O

﴿ تَمَسُّوْهُنَّ ﴾ سے مراد جماع ہے۔ اور اس آیت میں جو حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ اُس عورت کے بارے میں ہے جس کو مہر مقرر کرنے کے بعد صحبت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس کو آدھا مہر دیا جائے اور ایسی عورت پر عدت نہیں ہے۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم عورتوں کے لیے مہر

[۶۳۱] احناف کا مؤقف یہ ہے کہ متعہ سے کپڑوں کا ایک جوڑا مراد ہے جو شلوار، قمیص اور دوپٹے پر مشتمل ہو اور اس کی قیمت نصف مہر مثل سے زائد نہ ہو۔
☆ مہر مثل اُس مہر کو کہتے ہیں جو عورت کے خاندان میں اُس جیسی عورتوں کا رکھا گیا ہو۔ مثلاً بہن کا مہر، پھوپھی اور چچا کی بیٹی وغیرہا کا مہر۔ (بہارِ شریعت حصہ ۷ ص ۳۴۔۳۶)

مقرر کر چکے ہو۔ ﴿فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾ تو (ایسی صورت میں) عورتوں کے لیے مقرر کردہ مہر کا آدھا ہے۔

محض خلوت اختیار کرنے سے پورا مہر واجب ہوتا ہے یا نصف؟ اس بارے میں امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا موقف

امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ ایسی خلوت جس میں عورت کے ساتھ جماع نہ کیا جائے (اور اُس کے بعد طلاق دے دی جائے تو) صرف مقررہ مہر کا نصف واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ آیت میں جو "تمسوھن" کا لفظ ہے وہ یا تو حقیقی معنیٰ میں ہے یعنی ہاتھ لگانا' یا اس سے جماع مراد ہے' اور دونوں ہی صورتوں میں طلاق پہلے پائی جا رہی ہے (لہٰذا نصف مہر کی ادائیگی واجب ہوگی)۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہوتا ہے[۶۳۲] "خلوت صحیحہ" سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی منکوحہ کے ساتھ اس طرح تنہائی اختیار کرے کہ وہاں پر کوئی حسّی اور شرعی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ حسّی رکاوٹ یہ ہے کہ جیسے عورت کے مقام پر ہڈی یا غدود پیدا ہو جائیں' یا زوجین کے ساتھ کوئی تیسرا فرد بھی موجود ہو۔ اور شرعی رکاوٹ یہ ہے کہ جیسے عورت حیض ونفاس میں ہو یا (دونوں میں کوئی بھی) فرض روزہ میں یا فرض نماز میں یا احرام میں ہو' خواہ فرض احرام ہو یا نفل (ان سب صورتوں میں خلوت معتبر نہیں ہوگی)۔ زیر بحث آیت امام شافعی کے مذہب کی دلیل ہے۔ قاضی شریح کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی دروازے اور پردہ کا ذکر فرمایا ہو' اگر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے جماع نہیں کیا تو (مقررہ) مہر کا نصف دینا واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب آدمی عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرے لیکن اس سے جماع نہ کرے تو عورت کے لیے نصف مہر ہے[۶۳۳]

مسئلہ: مہر مقرر ہو چکا ہو اور صحبت نہ ہوئی ہو اور اس دوران زوجین میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو عورت کے لیے پورا مہر ہوگا اور وہ عدت گزارے گی' اگر شوہر انتقال کر جائے۔

عفو کی تفسیر اور "بیدہ عقدۃ النکاح" کی تفسیر میں دو مختلف اقوال

﴿إِلَّآ أَن يَعۡفُونَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ طلاق والی عورتیں معاف کر دیں۔ یعنی اگر عورت اپنے مہر کا حصہ نہ لے اور شوہر کو دے دے تو سارا مہر شوہر کی طرف لوٹ جائے گا۔ ﴿بِيَدِهِۦ عُقۡدَةُ ٱلنِّكَاحِ﴾ (جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے) اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے سرپرست مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (اپنی ایک روایت کے مطابق)' حضرت حسن بصری' علقمہ' طاؤس' شعبی' نخعی' زہری اور سُدی کا یہی قول ہے' امام شافعی اپنے قول قدیم کے مطابق اور امام مالک بھی اسی کے قائل ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے شوہر مراد ہے۔ حضرت علی' حضرت عبداللہ بن عباس (اپنی دوسری روایت کے مطابق)' حضرت جبیر بن مطعم' حضرت سعید بن میسب' حضرت ابن جبیر' مجاہد' ربیع' قتادہ' مقاتل' ضحاک اور محمد بن

---

۶۳۲ اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ خلوت صحیحہ (یعنی بغیر صحبت کے عورت کے ساتھ صرف تنہائی اختیار کرنا) آیا صحبت کرنے کے برابر ہے یا نہیں؟ امام شافعی اس بات کے قائل ہیں کہ خلوت صحیحہ صحبت کے برابر نہیں ہے' لہٰذا جس نے صرف خلوت صحیحہ اختیار کی اور صحبت نہیں کی' پھر اُسے طلاق دے دی تو زیر بحث آیت مبارکہ کی رُو سے اُس پر مقرر کردہ مہر کا نصف دینا لازم ہوگا۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ عورت کے ساتھ صرف خلوت صحیحہ اختیار کر لینا اُس سے صحبت کرنے کے برابر ہے۔ لہٰذا جس نے خلوت صحیحہ اختیار کی (یعنی عورت کے ساتھ مجامعت نہیں کی) پھر اُسے طلاق دے دی تو اُس پر کامل مہر کی ادائیگی لازم ہوگی۔ کیونکہ خلوت صحیحہ صحبت کرنے کے برابر ہے۔ خلوت صحیحہ سے کامل مہر کی ادائیگی لازم ہونے پر دلیل اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "جس نے اپنی عورت کا دوپٹہ اٹھا کر اُس پر نظر ڈالی تو مہر کی ادائیگی اُس پر لازم ہوگئی خواہ اُس نے صحبت کی یا نہ کی"۔ (سنن دار قطنی ج ۳ ص ۳۰۶' سنن بیہقی ج ۷ ص ۲۵۶) اس کے علاوہ خلفاء راشدین کے حوالہ سے بھی متعدد روایات احناف کی تائید میں دار قطنی اور بیہقی میں اسی مقام پر موجود ہیں۔

۶۳۳ اس کے جواب میں گذشتہ حاشیہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کعب قرظی کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور جدید قول کے مطابق امام شافعی' امام احمد اور جمہور فقہاء اسی کے قائل ہیں۔

مذکورہ دونوں اقوال کی صورت میں زیر بحث آیت کا مفہوم

قول اوّل کی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورت جب شادی شدہ' بالغہ ہو اور معاف کرنے کا اختیار رکھتی ہو تو وہ اپنا حصہ شوہر کے لیے معاف کر دے' یا عورت کا سرپرست معاف کر دے جبکہ عورت کنواری اور نابالغہ ہو' یا وہ تصرف کرنے کا اختیار نہ رکھتی ہو تو اُس کا سرپرست شوہر کے لیے عورت کا حصہ معاف کر سکتا ہے۔ لیکن (واضح رہے کہ) سرپرست کا عورت کے حصہ کو معاف کرنا چند شرائط کے ساتھ ہے۔ اور وہ یہ ہیں کہ عورت کنواری اور نابالغہ ہو' اور سرپرست اُس عورت کا باپ یا اُس کا دادا ہو' کیونکہ ان دو کے علاوہ کوئی اور شخص نابالغہ کا نکاح نہیں کر سکتا۔

دوسرا جو قول ذکر کیا گیا کہ نکاح کی گرہ جس کے ہاتھ میں ہے وہ شوہر ہے اس کو امام طبری اور امام واحدی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس قول کی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی شوہر' وہ معاف کر دے اور عورت کو پورا مہر دے۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ بات بیان فرمائی کہ عورت اپنا نصف واجب معاف کر دے تو ساتھ ہی) یہ بھی بیان فرمایا کہ شوہر اُس نصف کو معاف کر دے جو اُس پر واجب نہیں ہے (یعنی پورا مہر دے دے)۔ لہٰذا عورت کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ مہر کو معاف کر دے اور اُس میں سے کچھ بھی نہ مانگے۔ اور مرد کے لیے بہتر یہ ہے کہ پورا مہر دے دے۔ مروی ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی عورت کے ساتھ نکاح کیا' پھر صحبت سے پہلے ہی اُسے طلاق دے دی تو اُس کو انہوں نے پورا مہر دیا اور فرمایا کہ میں عفو کرنے کا زیادہ حق دار ہوں۔ آیت میں سرپرست کے مراد نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ مہر عورت کا حق ہے' اور عورت کے سرپرست کو چونکہ یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ عورت کے مال میں سے کوئی چیز کسی کو دے اس لیے مہر کا بھی یہی حکم ہوگا کیونکہ وہ بھی عورت کا مال ہے۔

﴿وَاَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ''تمہارا معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے''۔ اس میں تمام مردوں اور عورتوں سے خطاب ہے۔ البتہ صیغہ کو مذکر لانے کی وجہ یہ ہے کہ مذکر ہونا اصل اور بنیاد ہے اور مؤنث ہونا اُس کی فرع ہے۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے مردو اور اے عورتو! تمہارا ایک دوسرے کو معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک مذکورہ جملہ میں شوہر سے خطاب ہے اور مفہوم یہ ہے کہ مہر کی ادائیگی کی وجہ سے شوہر کا عورت پر قبل از طلاق جو حق عائد ہوتا ہے وہ شوہر کو معاف کر دینا چاہیے۔ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ﴾ تم باہمی احسانات نہ بھولو۔ احسانات کو نہ بھولنے سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کرنی چاہیے' یعنی آدمی پورا مہر ادا کرے یا عورت اپنا حصہ معاف کر دے۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی دونوں کو احسان اور اعلیٰ اخلاق کی ترغیب فرمائی ہے۔

آخر میں جو فرمایا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ ''اللہ تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے'' اس میں کام سے مراد یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو جو واجبی حق معاف کرتے ہو اور دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اُس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾

تمام نمازوں کی پابندی کرو (خصوصاً) درمیانی نماز کی' اور اللہ کے حضور ادب سے کھڑے ہوا کرو O

آیت مذکورہ کی لغوی تشریح اور وُسطیٰ کے معنیٰ میں مختلف اقوال

﴿حٰفِظُوْا﴾ کا معنیٰ ہے: ہمیشگی اختیار کرو اور پابندی کرو۔ ﴿الصَّلَوٰتِ﴾ سے مراد ہے: پانچ فرض نمازیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے

بندوں کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ پانچوں فرض نمازوں کو ان کی شرائط' حدود اور تکمیلِ ارکان کے ساتھ مخصوص اور معیّن اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کریں۔ ﴿الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ اس میں وسطٰی اوسط کا مؤنث ہے۔ اور کسی بھی چیز کا وسط اُس حصہ کو کہا جاتا ہے جو بہترین اور معتدل ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اہل عرب زیادہ فضیلت والی چیز کو "اوسط" کہتے ہیں اس لیے "صلٰوۃ وسطٰی" کا معنٰی ہوگا زیادہ فضیلت والی نماز۔ چونکہ یہ نماز فضیلت میں منفرد ہے اس لیے اس کو علیحدہ بیان کیا گیا اور "الصلوات" پر عطف کیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "وسطٰی" اس لیے فرمایا گیا کہ یہ نماز دیگر نمازوں کے مقابلہ میں درمیانی جگہ پر ہے۔

"صلٰوۃ وُسطٰی" (درمیان والی نماز) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں صحابہ کرام اور دیگر علماء امت کے چھ مختلف اقوال اور ان کے دلائل کا بیان

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور ان کے بعد کے علماء کا اس بارے میں اختلاف رہا ہے کہ صلٰوۃ وسطٰی سے کیا مراد ہے' سو اس بارے میں مختلف مذاہب ہیں۔

(۱) پہلا موقف یہ ہے کہ صلٰوۃِ وسطٰی سے نماز فجر مراد ہے۔ حضرت عمر' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت معاذ' حضرت جابر' حضرت عطاء' حضرت عکرمہ' مجاہد اور ربیع بن انس (رضی اللہ تعالٰی عنہم) کا یہی قول ہے۔ امام مالک اور امام شافعی بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام مالک بیان کرتے ہیں کہ اُنہیں یہ بات پہنچی کہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہم اس بات کے قائل تھے کہ "صلٰوۃِ وُسطٰی" فجر کی نماز ہے۔ اس کو امام مالک نے مؤطا میں اور امام ترمذی نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ تعالٰی عنہما) سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (مؤطا امام مالک: ۳۲۲' سنن ترمذی: ۱۸۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۸۔ ص ۶۳)

صلٰوۃ وسطٰی سے نماز فجر مراد ہونے کی یہ وجہ بھی ہے کہ نمازِ فجر جمع والی نمازوں کے درمیان ہے' یعنی ظہر اور عصر کو جمع کیا جاتا ہے جو کہ دن کی نمازیں ہیں اور مغرب وعشاء کو بھی جمع کیا جاتا ہے جو کہ رات کی نمازیں ہیں۔ ان کے درمیان فجر کی نماز ایک ایسی نماز ہے جس کی نہ قصر ہوتی ہے نہ اُسے کسی اور نماز کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے۔ لہٰذا صلٰوۃ وسطٰی سے فجر کی نماز مراد ہوگی۔ نمازِ فجر مراد ہونے کی یہ وجہ بھی ہے کہ یہ مشکل وقت میں آتی ہے' یعنی اگر سردی ہو تو ٹھنڈ کی وجہ سے مشکل ہوتی ہے اور اگر گرمی ہو تو میٹھی میٹھی نیند کی وجہ سے مشکل ہوتی ہے۔ مستزاد یہ کہ اس وقت اعضاء بالکل ڈھیلے ہوتے ہیں' نیند بھی بہت آ رہی ہوتی ہے اور غفلت بھی طاری ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے خصوصیت کے ساتھ فجر کی نماز کی پابندی کا حکم فرمایا۔ کیونکہ یہ ضائع ہونے کے خطرہ میں ہوتی ہے۔ نیز اس کے مراد ہونے کی یہ وجہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں پابندی کا حکم دینے کے بعد فرمایا: "وقوموا لله قانتين" اس میں جو "قنوت" ہے اس سے طویل قیام مراد ہے۔ اور نمازِ فجر ہی وہ نماز ہے جو طویل قیام کے ساتھ مخصوص ہے' اس لیے صلٰوۃ وسطٰی سے فجر کی نماز مراد ہوگی۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالٰی نے قرآن مجید میں خصوصیت کے ساتھ نماز فجر کا ذکر فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۝ (بنی اسرائیل: ۷۸)	آپ سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم کریں اور فجر کی نماز قائم کریں' بے شک فجر کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

اس آیت میں "مشھود" سے مراد یہ ہے کہ فجر کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں[۶۳۴]' یوں یہ نماز اُس

۶۳۴ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ (بنی اسرائیل: ۷۸) کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ (سنن ترمذی: ۳۱۳۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۵)

نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے جو رات اور دن کے فرشتوں کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اس سے نماز فجر کی فضیلت ثابت ہوئی (لہٰذا صلوٰۃ وسطیٰ سے یہی نماز مراد ہوگی)۔

(۲) دوسرا موقف یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے ظہر کی نماز مراد ہے۔ حضرت زید بن ثابت' حضرت اسامہ بن زید' حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہی قول ہے۔ عُبید اللہ بن شداد بھی اسی کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کے قائل تھے کہ صلوٰۃ وسطیٰ ظہر کی نماز ہے۔ اس کو امام مالک نے حضرت زید سے مؤطا میں اور امام ترمذی نے دونوں سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

(مؤطا امام مالک: ۳۲۱' سنن ترمذی: ۱۸۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۶ ـ ص ۶۳)

اسی طرح امام ابوداؤد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

(۳۳۹) رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت ظہر کی نماز پڑھاتے تھے' اور اس نماز سے زیادہ کوئی اور نماز صحابہ کرام کے لیے دشوار نہیں ہوتی تھی' پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''**حافظوا علی الصلوات و الصلوۃ الوسطی**'' (تمام نمازوں کی پابندی کرو' خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی) زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں۔

(سنن ابوداؤد: ۴۱۱' سنن بیہقی ج ۱ ص ۴۵۸' مسند احمد ج ۵ ص ۱۸۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۷ ـ ص ۶۳)

صلوٰۃ وسطیٰ سے ظہر کی نماز مراد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظہر کی نماز دن کے درمیان میں آتی ہے اور اُس وقت گرمی بھی شدید ہوتی ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ ظہر کی نماز دو ٹھنڈی نمازوں کے درمیان آتی ہے' یعنی فجر اور عصر کے درمیان۔ اس لیے صلوٰۃ وسطیٰ سے ظہر کی نماز مراد ہوگی۔

(۳) تیسرا موقف یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے۔ حضرت علی' حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت ابوایوب' حضرت ابوہریرہ' حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کے قائل ہیں۔ ابو عبیدہ سلیمانی' حسن بصری' ابراہیم نخعی' قتادہ' ضحاک' کلبی اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ' امام احمد' امام ابوداؤد اور امام ابن المنذر کا بھی یہی موقف ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہ کرام اور بعد کے علماء اسی کے قائل ہیں۔ امام ماوردی جو ہمارے اصحاب میں سے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے کیونکہ اس کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ صحیح ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے جو یہ کہا ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ فجر کی نماز ہے اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُنہیں عصر کے بارے میں وارد ہونے والی صحیح احادیث نہیں پہنچیں' اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ احادیث کی اتباع کی جائے۔

''صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے'' اس مذہب کے صحیح ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۴۰) احزاب والے دن اور ایک روایت کے مطابق خندق والے دن[۶۳۵] نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ (عزوجل) کفار کی قبروں کو اور اُن کے گھروں کو آگ سے بھر دے' جیسا کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃِ وسطیٰ سے غافل کر دیا' یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ ''نمازِ عصر'' سے غافل کر دیا۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے

[۶۳۵] ان دونوں روایتوں میں کوئی فرق نہیں ہے' کیونکہ احزاب اور خندق دونوں ایک ہی غزوہ کے نام ہیں۔

کہ پھر نبی اکرم ﷺ نے عصر کی نماز کو مغرب اور عشاء کے درمیان ادا فرمایا۔ (صحیح بخاری: ۲۹۳۱ 'صحیح مسلم: ۶۲۷ 'سنن ترمذی: ۲۹۸۴ 'سنن ابوداؤد: ۴۰۹ 'سنن نسائی: ۴۷۳ 'سنن ابن ماجہ: ۶۸۴ 'مسند احمد ج ۱ ص ۱۴۴ 'مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۳ ۔ص ۶۲ ۔۶۳)

(۳٤۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو نمازِ عصر سے روک دیا (یعنی اس کی ادائیگی کا موقع نہ دیا)۔ یہاں تک کہ سورج سرخ یا زرد ہو گیا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ ''نمازِ عصر'' سے روک دیا' اللہ (عزوجل) ان کے پیٹ اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

(صحیح مسلم: ۶۲۸ 'سنن ابن ماجہ: ۶۸۶)

(۳٤۲) حضرت سَمُرہ بن جُندُب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ (سنن ترمذی: ۱۸۲)

☆ امام ترمذی کے نزدیک بعینہٖ یہی حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے' اور امام ترمذی نے دونوں احادیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔

(۳٤۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آزاد کردہ غلام ابویونس بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عائشہ نے حکم دیا کہ میں اُن کے لیے قرآن کریم کا ایک نسخہ لکھ دوں' اور مجھے فرمایا کہ جب تم آیت مبارکہ ''**حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی**'' کو پہنچو تو مجھے اطلاع دینا۔ سو جب میں اِس آیت کو پہنچا تو میں نے حضرت عائشہ کو بتایا تو آپ نے مجھے یوں لکھوایا: ''**حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی وصلاۃ العصر وقوموا للہ قانتین**''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔[۶۳۶]

(صحیح مسلم: ۶۲۹ 'سنن ترمذی: ۲۹۸۲ 'سنن ابوداؤد: ۴۱۰ 'سنن نسائی: ۴۷۲ 'مسند احمد ج ۶ ص ۷۳ 'سنن بیہقی ج ۱ ص ۴۶۲)

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے بھی اس طرح کا واقعہ مروی ہے۔

(سنن بیہقی ج ۱ ص ۴۶۳ 'مؤطا امام مالک: ۳۲۰ 'صحیح ابن حبان: ۶۳۲۳)

صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسے وقت میں آتی ہے جب لوگ اپنے کاروبار کے معاملات میں مشغول ہوتے ہیں' اس لیے اس کی پابندی کا حکم زیادہ مناسب ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ عصر کی نماز دن اور رات کی دو دو نمازوں کے درمیان ہے۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر ہے اور رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔ نیز جو شخص عصر کی نماز کو ضائع کر دے اس کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس نماز کی تاکید' سختی اور پابندی کا حکم آیا ہے۔ اس کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت ابوالملیح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳٤۵) ہم کسی غزوہ میں حضرت بُرَیدہ کے ساتھ تھے' اُس دوران کسی ابر آلود دن میں حضرت بریدہ نے لوگوں سے کہا کہ نماز

---

[۶۳۶] اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ **الصلوۃ الوسطی** کے ساتھ **صلوۃ العصر** کے الفاظ بھی قرآن کریم کا حصہ ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہ صراحت موجود ہے کہ پہلے یہ آیت مبارکہ ''**حافظوا علی الصلوات وصلوۃ العصر**'' کے الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی' جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہم اس آیت کو اسی طرح پڑھتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور آیت اس طرح نازل فرمائی: **حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی**۔ (صحیح مسلم: ۶۳۰) رہا یہ سوال کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے مصحف میں **الصلوۃ الوسطی** کے بعد **وصلوۃ العصر** کیوں لکھوایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس لفظ کو بہ طور تفسیر لکھوایا تھا' یا آپ تک اس کے نسخ کی روایت نہیں پہنچی ہوگی۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵۳)

عصر جلد ادا کرلو' کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے نمازِ عصر کو چھوڑ دیا اُس کا عمل ضائع ہو گیا۔

(صحیح بخاری: ۵۵۳' سنن نسائی: ۴۷۴' سنن ابن ماجہ: ۶۹۴' مسند احمد ج ۵ ص ۳۵۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۹۵۔ ص ۶۰)

(۳٤٦) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی نماز عصر نکل گئی' گویا اس کے اہل و عیال اور مال و متاع سب ہلاک ہو گئے۔ (صحیح بخاری: ۵۵۲' صحیح مسلم: ۶۲۶' سنن ترمذی: ۱۷۵' سنن ابوداؤد: ۴۱۴' سنن نسائی: ۴۷۸' سنن ابن ماجہ: ۶۸۵' مسند احمد ج ۲ ص ۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۹۴۔ ص ۶۰)

☆ اس حدیث شریف میں ایک جملہ ہے: ''وُتِرَ اَھْلُہٗ وَمَالُہٗ '' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس شخص کے اہل وعیال اور مال میں کمی آ گئی اور وہ ختم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وہ شخص اہل وعیال اور مال کے بغیر تنہا رہ گیا۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ آدمی کو عصر کی نماز کے فوت ہونے سے اس طرح ڈرنا چاہیے جس طرح وہ اپنے اہل وعیال اور مال و دولت کے ضائع ہونے سے ڈرتا ہے۔

(۴) چوتھا مؤقف یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مغرب کی نماز مراد ہے۔ قُبَیْصہ بن ذُوَیْب اسی کے قائل ہیں۔ اس مؤقف کی دلیل یہ ہے کہ مغرب کی نماز دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی کے درمیان میں آتی ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس کی جو رکعتیں ہیں وہ دو سے زیادہ اور چار سے کم ہیں' اس کو سفر میں قصر بھی نہیں کیا جاتا اور یہ دن کی وتر نماز ہے اس لیے صلوٰۃِ وسطیٰ سے مغرب کی نماز مراد ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظہر کی نماز کو پہلی نماز کہا جاتا ہے' کیونکہ جبریل امین نے جب نماز کی کیفیت بیان کی تھی تو ظہر کی نماز سے آغاز کیا تھا۔ سو جب ظہر کی نماز پہلی نماز ہوئی تو مغرب کی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ ہوئی۔

(۵) پانچواں مؤقف یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ یہ بات صرف بعض متاخرین علماء نے ذکر کی ہے' اسلاف سے اس بارے میں کوئی بات منقول نہیں۔ اس مؤقف کی دلیل یہ ہے کہ عشاء کی نماز دو ایسی نمازوں کے درمیان ہے جن کو قصر نہیں کیا جا سکتا' یعنی مغرب اور فجر کے درمیان۔ دوسرا یہ کہ عشاء کی نماز ایسی نماز ہے جو منافقین پر بہت بھاری ہوتی ہے۔[۶۳۷]

(۶) چھٹا مؤقف یہ ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ دن بھر کی پانچ نمازوں میں سے کوئی ایک ضرور ہے' لیکن اس کا تعیّن نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں پانچوں نمازوں کی پابندی کا حکم دے کر صلوٰۃِ وسطیٰ کو اُس پر عطف کیا ہے اور یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس سے کون سی نماز مراد ہے۔ سو جب ایسی صورت حال ہو تو ہر نماز کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔

آیت مبارکہ میں صلوٰۃ وسطیٰ کا تعیّن نہ فرمانے کی وجہ اور اقوالِ مذکورہ میں صحیح اور صحیح ترین قول کا بیان

رہا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ وسطیٰ کی اتنی تاکید فرمائی ہے تو پھر اس کی وضاحت کیوں نہیں فرمائی؟ سو ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب ہو کہ وہ تمام نمازوں کو کامل طریقہ سے ادا کرنے کی پابندی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہِ رمضان میں شبِ قدر کو پوشیدہ رکھا۔ جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کو پوشیدہ رکھا اور اپنے تمام ناموں میں اسم اعظم کو پوشیدہ رکھا۔ تاکہ لوگ ان تمام چیزوں کے مکمل طور پر پابند رہیں۔ صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں یہ وہ مؤقف ہے جس کو علماء کی اکثریت نے اختیار کیا ہے۔ محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم ساری نمازیں پابندی سے ادا کرو' تمہیں صلوٰۃ وسطیٰ مل جائے گی۔ ربیع بن خثیم

[۶۳۷] عشاء کے ساتھ ساتھ فجر کی نماز بھی منافقین پر بھاری ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: منافقوں پر فجر اور عشاء سے زیادہ کوئی نماز بھاری نہیں ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۵۷' صحیح مسلم: ۶۵۱' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۲۹)

سے پوچھا گیا کہ صلوٰۃِ وسطیٰ کون سی نماز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تمام نمازوں میں کوئی ایک نماز وسطیٰ ہے' تم ساری نمازیں پابندی سے پڑھو' خود بخود صلوٰۃِ وسطیٰ کی بھی پابندی ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے مزید فرمایا کہ اگر تمہیں پتا چل جائے کہ فلاں نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے' تو کیا تم اس کی پابندی کرو گے اور باقی نمازیں چھوڑ دو گے؟ سائل نے کہا کہ نہیں! ربیع نے فرمایا کہ اگر تم نے ساری نمازوں کی پابندی کی تو یقیناً تم نے صلوٰۃ وسطیٰ کی پابندی کر لی۔

صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں جو اقوال ذکر کیے گئے ان سب میں صحیح قول دو ہیں' ایک اُن علماء کا جنہوں نے یہ کہا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے فجر کی نماز مراد ہے' اور دوسرا اُس علماء کا جنہوں نے یہ کہا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے۔ پھر ان تمام میں جو قول سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہی ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے' کیونکہ اس کے بارے میں صحیح احادیث وارد ہیں۔

''قانتین'' کا معنیٰ اور قنوت کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿قٰنِتِيْنَ﴾ کا معنیٰ ہے: فرمانبرداری کرتے ہوئے (اُس کی بارگاہ میں کھڑے ہو)۔ ''قنوت'' یہ ہے کہ نماز کو مکمل اطاعت اور فرمانبرداری کے ساتھ ادا کیا جائے اور اس کے ارکان اور سنتوں میں نقص پیدا کرنے سے بچا جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے ایک نماز ہے جس میں وہ لوگ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ (اس لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ) تم اللہ کے لیے اپنی نماز میں فرمانبرداری کرتے ہوئے کھڑے ہوا کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قنوت سے ذکر اور دُعا مراد ہے۔ اس کی دلیل وہ آیت ہے جس میں فرمایا: ''اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ'' (الزمر: ۹) اور زیرِ بحث آیت میں جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم فرمایا کہ نمازوں کی پابندی کی جائے تو لازماً قنوت سے ذکر اور دعاء کا معنیٰ مراد لیا جائے گا۔ اور آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم اللہ کی بارگاہ میں دُعا اور ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوا کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اسی معنیٰ کی وجہ سے نمازِ فجر اور وتر میں خصوصیت کے ساتھ قنوت رکھا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک ''قنوت'' سے مراد یہ ہے کہ جن باتوں کو زبان سے ادا کرنا نماز میں منع ہے اُن سے خاموشی اختیار کی جائے۔ اس کی تائید اُس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۴۷) ہم نماز میں ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے اور لوگ بھی اپنے ساتھ والے شخص سے باتیں کیا کرتے تھے' یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ: ''وقوموا للہ قانتین'' (اللہ کے حضور خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوا کرو)۔ سو ہمیں خاموشی کا حکم دیا گیا اور کلام سے منع کر دیا گیا۔

(صحیح بخاری: ۴۵۳۴' صحیح مسلم: ۵۳۹' سنن ترمذی: ۲۹۸۶' سنن ابوداؤد: ۹۴۹' سنن نسائی: ۱۲۱۹' سنن بیہقی ج ۲ ص ۲۴۸' مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۸)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''قنوت'' یہ ہے کہ نماز میں طویل قیام کیا جائے۔ اس کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین نماز وہ ہے جس میں قیام طویل ہو''۔[۶۳۸]

یہ بھی قنوت ہی کا حصہ ہے کہ رکوع و سجود کو طویل کیا جائے' نگاہیں نیچی ہوں' اطمینان بھی ہو اور عاجزی کے ساتھ ادائیگی ہو۔ علماء کا عالم یہ تھا کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوا کرتے تھے تو اِدھر اُدھر متوجہ ہونے یا سامنے سے کنکریاں ہٹانے یا کسی چیز کے ساتھ مشغول ہونے یا نسیان کے علاوہ اپنے دل میں دُنیاوی خیالات کے پیدا ہونے سے بھی اللہ عزوجل سے ڈرا کرتے تھے۔

[۶۳۸] یہ حدیث شریف' البقرہ: ۱۱۶ کی تفسیر میں رقم: ۱۲۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے حوالہ جات اور حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

پھر اگر تم حالت خوف میں ہو تو پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر (جس طرح بن پڑے نماز پڑھ لو) پھر جب تمہیں امن ہو جائے تو اللہ کو اسی طرح یاد کرو جس طرح اُس نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے O

﴿فَرِجَالًا﴾ کا معنیٰ ہے: پیدل چلتے ہوئے۔ اور ﴿رُكْبَانًا﴾ "راکب" کی جمع ہے' اس کا معنیٰ ہے: اپنے جانوروں پر سواری کی حالت میں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں دشمن وغیرہ کے خوف کی وجہ سے اس بات کی طاقت نہ ہو کہ تم مکمل اطاعت کے ساتھ اور نماز کے حقوق یعنی رکوع وسجود کی تکمیل اور خشوع وخضوع کو پورا کرتے ہوئے نماز ادا کر سکو تو پھر پیدل چلتے ہوئے یا اپنی سواریوں پر سواری کی حالت میں نماز ادا کر لو' خواہ تمہارا رُخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔ یہ حکم اُس صورت میں ہے جب جنگ میں لڑائی اور تلوار بازی ہو رہی ہو۔

نمازِ خوف کی دو اقسام اور احناف وشوافع کے درمیان اختلاف

نمازِ خوف کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق حالتِ جنگ سے ہے' زیر بحث آیت میں وہی مراد ہے۔[۶۳۹] (۲) اور دوسری قسم وہ ہے جو حالت جنگ کے علاوہ ہے اور اس کا بیان سورۃ النساء کی آیت: ۱۰۲ میں ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ اُسی مقام پر آئے گی۔ یہاں پہلی قسم کی تفصیل ملاحظہ ہو:

جب جنگ اپنے عروج پر ہو اور کسی شخص کے لیے بھی اس سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو تو امام شافعی کا مؤقف یہ ہے کہ لوگ جو سواری پر ہوں وہ سواریوں پر اور جو پیدل ہو وہ پیدل نماز ادا کریں گے' قبلہ کی طرف رُخ ہو یا نہ ہو' اور اشارہ سے رکوع وسجود کریں گے لیکن سجدہ میں رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکیں گے اور (رکوع وسجود میں) تسبیحات نہیں پڑھیں گے' کیونکہ اس کی حاجت نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ جو شخص پیدل ہے وہ اس حالت میں نماز ادا نہیں کرے گا' بلکہ اس کو بعد میں قضاء پڑھے گا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے خندق والے دن نماز کو مؤخر فرما دیا تھا۔ اور سورج غروب ہونے کے بعد آپ نے ظہر' عصر اور مغرب کی نماز ادا فرمائی تھی۔[۶۴۰] لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کریں۔ امام شافعی کا اپنے مؤقف پر استدلال زیر بحث آیت سے ہے' اور امام ابوحنیفہ کی جو دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خندق والے دن نماز کو مؤخر فرمایا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک نمازِ خوف کا حکم نازل نہیں ہوا تھا' نمازِ خوف کا حکم غزوۂ خندق کے بعد نازل ہوا تھا اور اس کے بعد کسی موقع پر نبی اکرم ﷺ نے نماز کو مؤخر نہیں فرمایا۔[۶۴۱]

---

۶۳۹ احناف کے نزدیک زیر بحث آیت کا تعلق حالتِ جنگ سے نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۴۴۸) دورانِ جنگ نماز پڑھنے کا طریقہ سورۂ نساء: ۱۰۲ میں مذکور ہے۔

۶۴۰ اس کی تفصیل گذشتہ آیت مبارکہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: حدیث نمبر: ۳۴۰۔۳۴۱۔

۶۴۱ نمازِ خوف کا حکم کب نازل ہوا تھا؟ اس کے بارے میں امام محمد بن اسحٰق اور امام واقدی کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ خندق سے پہلے غزوۂ ذات الرقاع پیش آیا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ ذات الرقاع میں صلوٰۃ الخوف ادا فرمائی تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نماز خوف کا حکم غزوۂ خندق سے پہلے نازل ہوا تھا۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۴۴۹' تبیان القرآن ج ۱ ص ۹۰۹)

ایسا خوف جو جنگ کی وجہ سے نہ ہو اُس میں نمازِ خوف کی کیفیت کا بیان

اگر آدمی کو ایسا خوف نہ ہو جو جنگ کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ کسی اور وجہ سے خوف ہو' مثلاً اس وجہ سے خوف ہو کہ وہ دشمن سے بھاگ کر آیا ہے یا کسی بھڑ کیلے جانور نے اس کا رُخ کیا تھا یا سیلاب چڑھ آیا ہو اور ان صورتوں میں اُسے یہ خطرہ ہو کہ اگر اُس نے عام معمول کے مطابق نماز ادا کی تو جان چلی جائے گی تو دشمن والی صورت میں اُسے یہ اختیار ہے کہ وہ اشارہ سے نمازِ خوف ادا کرے۔ کیونکہ زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ''فان خفتم '' یہ مطلق ہے اور ہر صورت کو شامل ہے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ زیرِ بحث آیت میں ''فرجالا او رکبانا '' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ خوف اُس صورت میں ہے جب جنگ کے دوران دشمن کا خوف ہو؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہ بات درست ہے' لیکن مذکورہ صورت بھی یہاں ثابت ہے کیونکہ ضرر کو دور کرنا مقصود ہے' اور ضرر یہاں موجود ہے اس لیے واجب ہے کہ مذکورہ صورت میں بھی صلوٰۃِ خوف کا حکم دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

(۳۴۸) اللہ (عزوجل) نے تمہارے نبی ﷺ کے ذریعہ حضر میں چار اور سفر میں دو رکعتیں فرض کی ہیں اور حالتِ خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔ (صحیح مسلم: ۶۸۷' سنن ابوداؤد: ۱۲۴۷' سنن نسائی: ۴۵۶' سنن ابن ماجہ: ۱۰۶۸' مسند احمد ج ۱ص ۳۵۵' سنن بیہقی ج ۳ص ۱۳۵' صحیح ابن حبان: ۲۸۶۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۳۴۹' ص ۱۱۹)

اسلاف کی ایک جماعت نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کیا ہے۔ اُن میں حضرت حسن بصری' عطاء' طاؤس' مجاہد' قتادہ' ضحاک' ابراہیم اور اسحٰق بن راھویہ شامل ہیں۔ ان سب حضرات کا قول یہ ہے کہ جب خوف بہت بڑھ جائے تو ایک رکعت نماز ادا کی جائے گی۔ امام شافعی' امام مالک اور علماء کی اکثریت کا موقف یہ ہے کہ تعدادِ رکعات میں نمازِ خوف نمازِ امن ہی کی طرح ہے۔ یعنی اگر حضر میں خوف ہو تو چار رکعات واجب ہوں گی' اور اگر سفر میں خوف ہو تو دو رکعات واجب ہوں گی۔۔ اور کسی بھی حالت میں ایک رکعت پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے۔ جہاں تک اُس حدیث کا تعلق ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے ذکر کی گئی اس کی تاویل میں علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک رکعت امام کے ساتھ اور ایک رکعت تنہا ادا کی جائے۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے حوالہ سے نمازِ خوف کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ یہ تاویل اس لیے ضروری ہے تا کہ تمام احادیث کے درمیان تطبیق ہو جائے۔

آگے فرمایا: ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ جب تمہیں خوف سے امن ہو جائے۔ ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ تو تم اللہ کو اُسی طرح یاد کرو جس طرح اُس نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے مکمل طور پر ارکان اور تمام آداب کے ساتھ پانچ نمازیں ادا کرو۔ ''اللہ نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے'' اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم کی نعمت سے نوازا ہے۔ اور اگر ہمیں اللہ عزوجل کی رہنمائی اور اس کی تعلیم نہ ملتی تو ہم نہ تو کسی چیز کو جان سکتے تھے نہ ہی کسی چیز کی معرفت تک پہنچ سکتے تھے۔ سو تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں کہ اُس نے نعمتِ علم عطا فرمائی۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ اُنہیں ایک سال تک خرچ دیا جائے اور (گھر سے) نہ نکالا جائے' پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اُن کاموں کا کوئی گناہ نہیں ہے جو وہ اپنے لیے دستور کے مطابق کریں' اور اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ○

آیت کے الفاظ کی مختصر تحقیق اور اس کا واقعۂ نزول

﴿مِنْكُمْ﴾ میں خطاب مَردوں سے ہے۔ ﴿وَصِيَّةً﴾ کو تا کے زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے' اس صورت میں معنیٰ ہو گا: ''فليـوصوا وصية'' (چاہیے کہ مرد وصیت کر جائیں) اور اس کو تا کے پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے' اس صورت میں معنیٰ ہو گا: ''كتب عليهم وصيةٌ'' (مَردوں پر وصیت کرنا فرض کیا گیا ہے) آیت میں جو ﴿مَتَاعًا﴾ ہے اس کو زبر اس لیے ہے کہ اصل عبارت اس طرح ہے: ''متعوهن متاعا''۔ ایک قول یہ ہے کہ اصل عبارت اس طرح ہے: ''جعل الله لهن ذالك متاعا'' (اللہ نے اُن کے لیے نفقہ مقرر فرمایا ہے)۔ متاع سے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا ایک سالہ خرچ مراد ہے۔ ﴿غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اُنہیں اُن کے گھروں سے نہ نکالا جائے۔

مذکورہ آیت طائف کے رہنے والے حکیم بن الحارث نامی ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی' اُس نے اپنے والدین اور بیوی سمیت مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی' اُس کی اولاد بھی تھی۔ پھر اُس کا انتقال ہو گیا۔ تو یہ معاملہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے جایا گیا' اُس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور نبی اکرم ﷺ نے اُس شخص کے والدین اور اُس کے بچوں کو اُس کی میراث عطا فرمائی اور اُس کی بیوی کو کچھ نہیں دیا بلکہ اُس شخص کے گھر والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک سال تک شوہر کے ترکہ میں سے اس کی بیوہ پر خرچ کریں۔ ابتداءِ اسلام میں حکم یہ تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کی بیوی ایک سال تک عدت میں رہتی' اور مرنے والے کے ورثاء پر حرام تھا کہ وہ سال ختم ہونے سے پہلے اُس کو گھر سے نکالیں۔ پورے سال تک اُس عورت کا خرچہ اور رہائش شوہر کے مال میں واجب ہوتے تھے' اور شوہر کی میراث سے اُسے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ البتہ اُسے اس بات کا اختیار ہوتا تھا کہ وہ چاہے تو شوہر کے گھر میں عدت گزارے اور خرچہ اور رہائش پائے' اور چاہے تو سال ختم ہونے سے پہلے شوہر کا گھر چھوڑ دے۔ اس صورت میں اس کے لیے خرچہ اور رہائش نہیں ہو گی۔ شوہر پر واجب ہوتا تھا کہ وہ پورے معاملہ کی وصیت کرے۔ سو زیرِ بحث آیت سے مجموعی طور پر دو باتیں ثابت ہو رہی ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ عورت کو پورے سال تک شوہر کے مال سے خرچہ اور رہائش حاصل رہے گی۔ (۲) دوسری یہ کہ عورت ایک سال تک عدت گزارے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں احکام کو منسوخ فرما دیا۔ یعنی خرچہ اور رہائش کی وصیت کو آیتِ میراث سے منسوخ فرما دیا اور اُس (خرچہ اور رہائش) کے عوض یہ مقرر فرما دیا کہ عورت کو ۴/۱ یا ۸/۱ حصہ ملے گا۔ اور ایک سال کی عدت کے حکم کو اُس آیت سے منسوخ فرما دیا جس میں چار ماہ دس دن کا حکم ہے (یعنی البقرہ: ۲۳۴۔ اس کی تفسیر گزر چکی)۔

گذشتہ آیت کا بعد والی کے لیے ناسخ ہونا

اگر یہ سوال ہو کہ گذشتہ آیت اپنے بعد والی آیت کے لیے کیسے ناسخ ہو سکتی ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ کبھی کبھی گذشتہ آیت تلاوت کے اعتبار سے مقدم (یعنی پہلے) ہوتی ہے' لیکن نزول کے اعتبار سے بعد میں آتی ہے۔ جیسے سورۃ البقرہ کی آیت: ۱۴۲ اور آیت: ۱۴۴۔

آگے فرمایا: ﴿فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ﴾ اس جملہ میں خطاب مرنے والے کے سرپرستوں سے ہے (یعنی اے میت کے سرپرستو! اگر میت کی بیویاں خود چلی جائیں تو تم پر اُن کاموں کا کوئی گناہ نہیں ہے

جو وہ اپنے لیے دستور کے مطابق کریں)۔یعنی نکاح کے لیے زیب وزینت۔

آیت مذکورہ میں حرج کی نفی کی تفسیر

یہاں جو فرمایا کہ تم پر کوئی حرج (گناہ) نہیں ہے اس کے دو مفہوم ہیں۔(۱) ایک یہ کہ سال ختم ہونے سے پہلے عورتیں اگر خود چلی جائیں تو اُن کے خرچہ کو روک دینے میں تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں ہے۔(۲) دوسرا یہ کہ تم اُن کو شوہر کا گھر چھوڑنے سے روکو تو اس میں تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں ہے' کیونکہ ایک سال تک شوہر کے گھر میں ٹھہرنا اُن پر واجب نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ چاہے تو عورت ایک سال تک اپنے شوہر کے گھر میں ٹھہرے اور خرچہ اور رہائش پائے۔اور چاہے تو گھر چھوڑ دے اور خرچہ اور رہائش نہ لے۔پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اُس آیت سے منسوخ فرمادیا جس میں چار ماہ دس دن کا حکم ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ اس میں "عـزیـز" کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ممنوعات کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اُس کی حدود سے آگے بڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے بدلہ لینے میں غالب اور قوت والا ہے۔ اور "حکیم" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مسائل اور احکامات دیئے ہیں اُن میں وہ حکمت والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ان کو بھی مناسب طریقہ سے خرچ دینا چاہیے' پرہیزگاروں پر (عورتوں کا یہ) حق ہے O اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو O

آیت مذکورہ میں دوبارہ متاع کا ذکر فرمانے کی توجیہ اور آیت کی تفسیر

﴿ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ یہاں اللہ تعالیٰ نے متعہ دینے کا ذکر دوبارہ اس لیے فرمایا کہ یہاں ایک خاص بات کا اضافہ ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے البقرہ:۲۳۶ میں متعہ کا جو حکم بیان ہوا وہ اُس عورت کے بارے میں ہے جس سے صحبت نہ کی گئی ہو اور طلاق دے دی گئی ہو۔جبکہ یہاں تمام طلاق والی عورتوں کے لیے متعہ کا حکم بیان ہو رہا ہے۔بعض مفسرین نے (تکرار کی وجہ) یہ بیان کی ہے کہ جب البقرہ:۲۳۶ کا نزول ہوا اور اس میں یہ فرمایا کہ "خوش حال پر اس کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کے مطابق ہے' یہ خرچہ مناسب طریقہ سے ہونا چاہیے' نیک لوگوں پر (عورتوں کا یہ) حق ہے" تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں عورت کو متعہ دوں تو یقیناً میں نے نیکی کی اور اگر ایسا نہ کروں تو میں نے نیکی نہیں کی (یعنی کوئی حرج نہیں ہے)۔اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اس میں ﴿ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ ﴾ فرما کر لامِ تملیک کے ذریعہ متعہ کو تمام طلاق والی عورتوں کا حق قرار دیا۔﴿ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (متقین پر عورتوں کا یہ حق ہے) یعنی ایمان والوں پر یہ حق ہے' جو کہ شرک سے بچتے ہیں۔اگلی آیت:۲۴۲ میں جو فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے ایمان والو! اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے وہ باتیں بیان فرماتا ہے جو تمہارے لیے اور تمہاری ازواج کے لیے لازمی ہیں۔اور ان آیات میں تم نے جس طرح میرے احکامات کو اور اپنے اُس حق کو پہچان لیا ہے جو ایک دوسرے پر تمہارا واجب ہے اسی طرح میں اپنے تمام احکامات کو تمہارے لیے اپنی اُن آیتوں میں بیان کرتا ہوں جو میں نے اپنے رسول محمد ﷺ پر اس کتاب میں نازل کی ہیں۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے جو فرائض اور احکام بیان کیے ہیں اُن کو تم سمجھو اور اُن باتوں کو سمجھو جو اُن احکام میں تمہارے لیے اور تمہارے دین کے لیے فائدہ مند ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے (اور) موت کے خوف سے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ فرما دیا، بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ○ اور تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور یہ بات اپنے علم میں رکھو کہ اللہ بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے ○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

اکثر مفسرین نے فرمایا کہ ''داوردان'' نامی ایک بستی تھی، اُس میں طاعون کی بیماری آ گئی۔ وہاں کے رہنے والوں میں ایک گروہ نکل کر چلا گیا اور ایک گروہ بہ دستور وہیں رہا۔ جو لوگ نکل کر چلے گئے تھے وہ بچ گئے اور جو وہیں رہے اُن میں سے اکثر لوگ ہلاک ہو گئے۔ جب طاعون چلا گیا تو بستی سے نکل کر جانے والے لوگ صحیح سلامت واپس لوٹ آئے۔ اس پر وہ لوگ جو وہیں ٹھہرے رہ گئے تھے انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کی سوچ ہم سے زیادہ پختہ ہے، اگر ہم بھی اُن کی طرح طریقہ اختیار کرتے تو اُن کی طرح باقی رہتے اور دوبارہ اگر طاعون آیا تو ہم ضرور ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں کوئی بیماری نہیں ہو گی۔ آئندہ سال طاعون پھر آیا، جس کی وجہ سے بستی کے اکثر لوگ وہاں سے نکل کر ایک وسیع وعریض وادی میں چلے گئے۔ جب وہ پُرامن جگہ پہنچ گئے تو اُنہیں وادی کے بالائی حصہ سے ایک فرشتہ نے اور وادی کے نشیبی حصہ سے ایک فرشتے نے آواز دی کہ ''تم سب مر جاؤ''۔ سو وہ سب کے سب مر گئے۔

(۳۴۹) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے مروی ہے کہ وہ ملک شام کے ارادہ سے نکلے، جب وہ مقام سَرغ میں پہنچے تو اُنہیں خبر ملی کہ یہاں وباء آئی ہوئی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم کسی جگہ کے بارے میں وباء کا سُنو تو وہاں نہ جاؤ، اور جس جگہ تم موجود ہو وہاں اگر کوئی وباء آ جائے تو بھاگنے کی غرض سے وہاں سے نہ نکلو''[۶۴۲]۔ یہ ارشاد سُن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ کی تعریف کی، پھر وہاں سے لوٹ گئے۔

(صحیح بخاری: ۵۷۲۹، صحیح مسلم: ۲۲۱۹، سنن ابوداؤد: ۳۱۰۳، سنن بیہقی ج ۳ ص ۳۷۶، مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۴)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ (مذکورہ بستی والے) درحقیقت جہاد سے بھاگے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی بادشاہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اپنے دشمن سے لڑنے کے لیے گھروں سے نکل جائیں۔ سو بنی اسرائیل نے لشکر تیار کر لیا، لیکن پھر بزدل ہو گئے اور انہوں نے موت کو ناپسند جانا، سو یہ لوگ بیمار ہو گئے اور انہوں نے اپنے بادشاہ سے کہا کہ جس جگہ ہمیں جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں وباء پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم وباء کے ختم ہونے تک یہاں سے نہیں نکلیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر موت بھیجی تو وہ لوگ اس سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بستی سے نکل پڑے۔ جب ایک فرشتہ نے یہ منظر دیکھا تو اس

---

[۶۴۲] اس سے معلوم ہوا کہ وباء والی جگہ سے نکل کر جانا بھاگنے کے ارادہ سے نہ ہو بلکہ کسی اور مقصد سے ہو تو جائز ہے۔
(عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۱۰۷)

نے کہا: اے اللہ! اے ربِ یعقوب! اے موسیٰ کے معبود! تو اپنے بندوں کی نافرمانی کو دیکھ رہا ہے تو ان کو ان کی ذات میں کوئی نشانی دکھا دے تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ تجھ سے بھاگ نہیں سکتے۔ چنانچہ جب وہ لوگ بستی سے نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر اُن سے فرمایا کہ مر جاؤ تو وہ اور ان کے جانور (سب کے سب) اس طرح مر گئے جس طرح ایک شخص کو موت آتی ہے۔ اور ابھی آٹھ دن نہ گزرے تھے کہ اُن کے جسم پھول گئے اور بدبودار ہو گئے۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اُن کی طرف آئے لیکن اُنہیں دفن نہ کر سکے اور لاشوں کو درندوں سے بچانے کے لیے ایک جگہ معیّن کر کے لاشوں کو وہاں ڈال دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور ''اُلوف'' کے معنیٰ میں مفسرین کے اقوال

﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ میں رؤیت سے مراد ہے: دل کے ذریعہ دیکھنا اور اس کا معنیٰ ہے: اے محمد (ﷺ)! کیا آپ نے میرے بتانے سے یہ بات نہیں جانی۔ اہل معانی فرماتے ہیں کہ یہ تعجب کے طور پر فرمایا جا رہا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: کیا تم نے ان جیسے لوگ دیکھے ہیں؟ یا کہا جاتا ہے: کیا تم نے فلاں شخص کا کام نہیں دیکھا؟ ایسے تمام واقعات جن کو نبی اکرم ﷺ نے ملاحظہ نہیں فرمایا اور قرآن کریم میں ان واقعات کے لیے ''الم تر'' فرمایا گیا ہے وہاں یہی معنیٰ مراد ہے جو بیان کیا گیا۔

آیت میں جو ﴿ اُلُوْفٌ ﴾ فرمایا گیا اس کے بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے عدد مراد ہے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کتنی تعداد مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے تین ہزار افراد مراد ہیں ایک قول کے مطابق دس ہزار ایک قول کے مطابق تیس ہزار اور کچھ افراد مراد ہیں۔ ایک قول کے مطابق چالیس ہزار اور ایک قول کے مطابق ستر ہزار افراد مراد ہیں۔ تمام اقوال میں صحیح ترین قول اُن علماء کا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ مذکورہ افراد کی تعداد دس ہزار سے زائد تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''اُلوف'' فرمایا ہے اور ''اُلوف'' جمع کثرت ہے اور ''آلاف'' جمع قلّت ہے۔ بعض علماء نے ﴿ وَهُمْ اُلُوْفٌ ﴾ کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ مذکورہ افراد آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے اس صورت میں یہ ''اِلف'' کی جمع ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے (یعنی اس سے عدد مراد ہے)۔

بنی اسرائیل کے مذکورہ افراد کا مرنے کے بعد زندہ ہونا اور اس کے بارے میں مختلف روایات

علماء فرماتے ہیں کہ مذکورہ افراد پر جب ایک عرصہ گزر گیا اور ان کے جسم بوسیدہ ہو گئے اور ہڈیاں ظاہر ہو گئیں تو ان کے پاس سے حضرت حزقیل بن بُوذی کا گزر ہوا جو کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے تیسرے خلیفہ تھے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد (اوّلاً) جنہوں نے بنی اسرائیل کے معاملات کو سنبھالا تھا وہ حضرت یوشع بن نون تھے پھر ان کے بعد کالب بن یوقنا تھے اور اس کے بعد حزقیل تھے۔ حضرت حزقیل کو ابن العجوز کہا جاتا تھا کیونکہ اُن کی والدہ نے بڑھاپے کی حالت میں اور بانجھ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دُعا کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو حزقیل عطا فرمایا تھا۔ ان کو ذوالکفل بھی کہا جاتا تھا کیونکہ انہوں نے ستر انبیاء (علیہم السلام) کی ذمہ داری لی تھی اور اُنہیں قتل ہونے سے بچایا تھا۔ سو جب مذکورہ افراد جو کہ مردہ تھے اُن کے پاس سے حضرت حزقیل کا گزر ہوا تو وہ اُن کے پاس رُک گئے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں کوئی نشانی دکھاؤں؟ انہوں نے کہا: ہاں اے میرے رب! تو اللہ تعالیٰ نے تمام افراد کو زندہ کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت حزقیل نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن مُردوں کو زندہ فرما دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ افراد حضرت حزقیل ہی کی قوم کے تھے اور ان کو آٹھ دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے زندہ فرما دیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مذکورہ افراد جب مر گئے تو حضرت حزقیل ان کی تلاش میں نکلے (تلاش کرتے ہوئے جب وہاں پہنچے) تو اُنہیں

مردہ پایا۔ یہ دیکھ کر وہ رونے لگے۔ اور عرض کیا: اے میرے رب! مجھے ایسی قوم میسر تھی جو تیری عبادت اور تیرا ذکر کیا کرتی تھی' اب میں تنہا رہ گیا ہوں' میرے پاس کوئی قوم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ ان افراد کی زندگی کو میں نے تمہارے سپرد کردیا ہے۔ حضرت حزقیل نے (اُسی وقت) کہا: تم سب اللہ عزوجل کے حکم سے زندہ ہو جاؤ' سو وہ سب زندہ ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق جب وہ لوگ زندہ ہو گئے تو سب نے کہا: ''سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ'' اے ہمارے رب! تو ہی پاکیزہ ہے اور تیرے لیے ہی تعریف ہے' تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ پھر سارے لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور ایک طویل عرصہ تک زندہ رہے' لیکن موت کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود تھے اور تقدیر میں لکھی ہوئی موت تک ان کی یہ حالت رہی کہ وہ جو بھی کپڑا پہنتے تھے وہ کفن کی طرح میلا ہو جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آج کی جو یہودیوں کی نسل ہے اُن میں مذکورہ افراد کی بُو پائی جاتی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ افراد چونکہ موت سے بھاگے تھے اس لیے سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر موت کو مسلط فرمادیا' پھر بقیہ مدتِ حیات پوری کرنے کے لیے اُنہیں دوبارہ زندہ فرمادیا۔ اگر یہ موت اُن کی وقتِ معیّن والی ہوتی تو قطعاً دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے۔

دنیا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر الدخان: ۵۶ سے معارضہ کا جواب

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ ''دنیا میں لوگ پہلی موت کے علاوہ کوئی اور موت نہیں چکھیں گے''۔ (الدخان:۵۶) اس کے باوجود مذکورہ افراد کو دُنیا میں دو مرتبہ کیوں موت دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو موت مسلط کی گئی تھی وہ سزا کے طور پر تھی' جیسا کہ حضرت قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ مذکورہ افراد پر جو موت مسلط کی گئی اور اس کے بعد زندہ کیا گیا تھا یہ اس قوم کے نبی کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا' اور انبیاءِ کرام کے معجزات ایسی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو خلافِ عادت اور نادر ہوتی ہیں اس لیے معجزات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مذکور (الدخان:۵۶) عام ہے اور اس میں سے معجزاتِ انبیاء کو مخصوص کردیا گیا ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں لوگ صرف اس پہلی موت کو چکھیں گے جو نہ تو انبیاءِ کرام کے معجزات سے ہوگی نہ اُس کا تعلق خلافِ عادت ہونے والی باتوں سے ہوگا۔

زیرِ بحث آیت کے چند فوائد اور نکات

زیرِ بحث آیت میں چونکہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسے واقعہ کی خبر دی ہے جس کا آپ نے مشاہدہ نہیں فرمایا اور یہودی اُس واقعہ کی صحت سے واقف ہیں اس لیے یہ آیت ہماری جانب سے یہودیوں کے خلاف حجت ہے اور اس میں نبی اکرم ﷺ کے عظیم معجزہ (کا بیان) ہے۔ اسی طرح یہ آیت اُن لوگوں کے خلاف بھی حجت ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے منکر ہیں' کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اُس نے مذکورہ افراد کو موت دی اور پھر اُنہیں زندہ فرمادیا۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی خبر میں سچا ہے' لہٰذا (جب اُس نے دنیا میں موت دے کر زندہ کردیا تو) وہ اس پر بھی قادر ہے کہ قیامت کے دن اُنہیں زندہ فرمادے۔

آیت میں ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (مذکورہ افراد) طاعون کے خوف سے گھروں سے نکلے' جبکہ طاعون اُن پر آ چکا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اُنہیں جہاد کا حکم دیا گیا تو وہ موت کے ڈر سے جہاد سے بھاگے۔

جب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ افراد کو فرمایا ﴿مُوْتُوْا﴾ (مر جاؤ) تو ممکن ہے وہ لوگ مر گئے ہوں' اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرنے کا جو حکم دیا گیا وہ امرِ تحویل ہو (یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاؤ)۔ جیسے فرمایا کہ ''کُوْنُوْا قِرَدَۃً خٰسِئِیْنَ'' (البقرہ:۶۵) یعنی تم دھتکارے ہوئے بندر ہو جاؤ۔ آگے جو فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جن

افراد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ فرما کر موت دی اُن پر (یقیناً) اُس نے مہربانی فرمائی' کیونکہ ان لوگوں پر اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے موت مسلط کی گئی تھی' سو جب توبہ کے لیے دوبارہ اُنہیں دنیا میں لوٹایا تو یہ اُس کا فضل اور مہربانی ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ جملہ اپنے عموم پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ دُنیا میں تمام لوگوں پر مہربان ہے' اور قیامت کے دن صرف اہل ایمان پر فضل فرمائے گا۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے نعمت اور مہربانی فرمائی ہے اُن میں سے اکثر لوگ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔ (یعنی) کافر تو قطعاً شکر ادا نہیں کرتے' اور مؤمنین بھرپور طریقہ سے شکر ادا نہیں کرتے۔

آیت کی تفسیر اور اس بات کی وضاحت کہ ''قاتلوا'' کا خطاب کس سے ہے؟

اگلی آیت: ۲۴۴ میں جو فرمایا: ﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (اللہ کی راہ میں جہاد کرو) اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ اُن ہی لوگوں سے فرمایا جارہا ہے جن کو زندہ کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں زندہ فرمایا' پھر اُنہیں جہاد کا حکم فرمایا۔ اس قول کی بنیاد پر آیتِ میں اضمار ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے: ''قيل لهم قاتلوا في سبيل الله'' (مذکورہ افراد کو کہا گیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کی امت سے خطاب ہے' اور مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ موت سے نہ بھاگو' جیسا کہ مذکورہ افراد بھاگے' اور اُنہیں بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ (اس قول کی صورت میں کہا جائے گا کہ) آیتِ مبارکہ میں مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے۔ آیت میں ﴿ سَمِيْعٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام باتوں کو سُنتا ہے جو جہاد سے پیچھے رہنے والا شخص کہتا ہے' اور ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اُن تمام باتوں کو جانتا ہے جو مذکورہ شخص اپنے دل میں چھپاتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے؟ اور اس کے نتیجہ میں اللہ اس کے لیے اُس (قرض) کو کئی گنا کر دے! اور اللہ (رزق میں) تنگی اور کشادگی فرماتا ہے' اور اُسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے O

قرض کا معنیٰ اور مذکورہ آیت میں اللہ عزوجل کو قرض دینے کی تفسیر

﴿ قرض ﴾ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان اس لیے دے تاکہ اُسے اُس پر بدلہ ملے۔ آیت مبارکہ میں اللہ نے مؤمنین کے اُس عمل کو قرض قرار دیا ہے جو اللہ کے لیے کیا جائے اور اُس اجر و ثواب کی امید پر کیا جائے جس کا اللہ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا ہے' کیونکہ مؤمنین جو عمل کرتے ہیں وہ طلب ثواب کے لیے کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جو بھی نیک یا بُرا کام تم نے گذشتہ زمانہ میں کیا وہ قرض ہے۔ اُمیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے:

كل امرئ سوف يجزى قرضه حسنا أو سيئا أو مدينا كالذي دانا

ترجمہ: ''ہر شخص کو اپنے عمل کو بدلہ ملے گا' خواہ عمل اچھا ہو یا بُرا یا ذلت والا''۔

لغت میں قرض کا اصل معنیٰ ہے: کاٹنا۔ چونکہ قرض دینے والا اپنے مال میں سے کچھ حصہ الگ کر کے کسی کو دیتا ہے اس لیے اُسے قرض کہتے ہیں۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کون ہے جو اپنے فائدہ کے لیے اللہ کی بارگاہ میں ایسے اعمال بھیجے جن کے ذریعہ اُسے اللہ عزوجل

سے ثواب کی امید ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہربانی اور لطف و کرم کا اظہار ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو نیکی اور فرمانبرداری کے کاموں کی دعوت دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اختصار ہے اصل عبارت اس طرح ہے کہ کون ہے جو اللہ کے بندوں کو اور اُس کی مخلوق کے محتاج افراد کو قرض دے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے (الاحزاب:۵۷ میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ'' یعنی ''یؤذون عباد اللہ''۔ اس کی ایک اور مثال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی وہ حدیث صحیح ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

(۳۵۰) قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے پروردگار! تو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے میں تجھے کھانا کیسے کھلا سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اُس کو کھانا کھلاتا تو ضرور اُس کا (اجر و ثواب) تجھے میرے پاس ملتا۔

(صحیح مسلم:۶۹ ۲۵، الادب المفرد للامام البخاری:۵۱۷، صحیح ابن حبان:۲۶۹، مسند احمد ج ۲ ص ۴۰۴)

مذکورہ آیت میں قرض کی تفسیر اور علماء مفسرین کے مختلف اقوال

زیر بحث آیت میں قرض سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قرض سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ بعض کے نزدیک اس سے صدقہ واجبہ مراد ہے اور بعض کے نزدیک نفلی صدقہ مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرض کا لفظ فرمایا ہے اور قرض صرف تبرعاً ہی دیا جاتا ہے (یعنی واجب نہیں ہوتا)۔ اور دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۵۱) جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے'' تو حضرت ابو دحداح نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہ رہا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں اے ابو دحداح! انہوں نے عرض کیا: (یارسول اللہ ﷺ!) آپ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھایا تو انہوں نے کہا: میں اپنا باغ اپنے رب کو قرض دے چکا ہوں وہ باغ ایسا ہے کہ اُس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں پھر وہ چلتے ہوئے اپنے باغ میں آئے اور اُن کی والدہ اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھی۔ انہوں نے والدہ کو ندا دی: اے دحداح کی ماں! والدہ نے کہا: جی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ اس باغ سے نکل جائیں میں اپنے رب (عزوجل) کی بارگاہ میں اس کو قرض کے طور پر دے چکا ہوں۔ (طبری کے علاوہ دیگر روایات میں یہ اضافہ ہے کہ) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ابو دحداح کے لیے کھجور کے کتنے ہی پھل دار بڑے بڑے درخت ہیں (یعنی جنت میں)۔ (جامع البیان للطبری، زیر بحث آیت، صحیح مسلم:۹۶۵، مسند بزار:۲۱۹۵)

بعض مفسرین کے نزدیک آیت میں ﴿یُقْرِضُ اللّٰہَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ''کون ہے جو اللہ کی اطاعت میں خرچ کرے''۔ لہٰذا اس میں واجب اور نفل دونوں قسم کا خرچ کرنا داخل ہے۔ یہی قول زیادہ قرین قیاس ہے۔

قرضِ حسن اور اضعاف کثیرہ کی تفسیر

آیت میں قرض کے ساتھ جو ﴿حَسَنًا﴾ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اجر و ثواب کے حصول کے لیے اور خوش دلی سے قرض دیا جائے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ مال حلال میں سے نیکی کے کاموں میں خرچ کیا جائے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ قرض دے کر آدمی نہ تو اُسے جتلائے اور نہ ہی (اُس کے ذریعہ) ایذاء پہنچائے۔ بعض کے

نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ قرض ایسا ہو جو خالصۃً اللہ عزوجل کے لیے ہو اُس میں ریا کاری اور شہرت کی طلب نہ ہو۔

آیت میں جو فرمایا: ﴿فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ نے جو کچھ خرچ کیا ہے اللہ عزوجل اُس کے ثواب کو کئی گنا بڑھا دے گا۔ کئی گنا سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سات سو گنا تک بڑھا دے گا۔ سُدی کا قول یہ ہے کہ اس کی مقدار کو صرف اللہ عزوجل جانتا ہے۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مقدار کو بیان کیوں نہیں فرمایا؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی بات کی ترغیب دی جارہی ہو تو اُس میں تعیّن کر کے کسی چیز کو بیان کرنے کی بہ نسبت غیر معیّن کو بیان کرنا (تاثیر میں) زیادہ قوی ہوتا ہے۔

مذکورہ آیت میں ''قبض'' اور ''بسط'' کی تفسیر اور مفسرین کے مختلف اقوال

﴿وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ﴾ اللہ تنگی اور کشادگی فرماتا ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿یَقْبِضُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے رزق کو تنگ فرما دیتا ہے اور روک لیتا ہے۔ اور ﴿یَبْصُۜطُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس پر چاہتا ہے کشادگی فرما دیتا ہے۔ بعض کے نزدیک ''یــقــبـض'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقات کی قبولیت کو روک لیتا ہے اور ''یبسط'' کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صدقہ کا حکم دیا اور خرچ کرنے کی ترغیب دی تو یہ بھی بتادیا کہ خرچ کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق، اُس کا ارادہ اور اس کی مدد شامل نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض دلوں کو اتنا تنگ فرما دیتا ہے کہ وہ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جبکہ بعض دلوں میں اتنی کشادگی عطا فرماتا ہے کہ وہ نیک کام کرنے اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی (بھرپور) طاقت رکھتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۳۵۲) تمام لوگوں کے دل رحمٰن (عزوجل) کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں جیسے ایک دِل۔ وہ اُسے جدھر چاہے پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر ثابت رکھ۔ (صحیح مسلم: ۲۶۵۴، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۸۹۔ ص ۲۰)

☆ اس حدیث کا تعلق احادیثِ صفات سے ہے، جن پر ایمان لانا اور اُن کے معانی کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا واجب ہے، اور اُن کو اُسی طرح ماننا ضروری ہے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں، یعنی اُن کی نہ کیفیت بیان کی جاسکتی ہے، نہ کوئی مثال دی جاسکتی ہے اور نہ کوئی مسئلہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہ اہل سنت اور اسلاف امت کا مذہب ہے۔

زیرِ بحث آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اللہ ہی کی طرف آخرت میں لوٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

کیا آپ نے موسیٰ (کی وفات) کے بعد ہونے والے گروہ کو نہیں دیکھا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ

ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں (تا کہ) ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں' (اُن کے نبی نے) کہا: اگر تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو شاید تم جہاد نہیں کرو گے' انہوں نے کہا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہیں کریں گے جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے اور اہل و عیال سے نکال دیا گیا ہے' سو جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا تو چند لوگوں کے سوا سب نے منہ پھیر لیا' اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے○

آیت مذکورہ کی تفسیر اور آیت میں مذکور نبی کے تعیّن میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿مـلا﴾ قوم کے معزز اور مرکزی افراد کو کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل معنیٰ ہے: لوگوں کا گروہ۔ اس لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہے' جیسے قوم اور ''رھط'' کا لفظ۔ آیت میں ﴿مِنۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی﴾ سے مراد ہے: موسیٰ علیہ السلام کے وصال یا ان کے زمانہ کے بعد۔ اور ﴿لِنَبِیٍّ﴾ جو فرمایا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک حضرت یوشع بن نون ابن افرائیم بن یوسف بن یعقوب (علیہم السلام) مراد ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے حضرت شمعون بن صفیہ بنت علقمہ مراد ہیں۔ جو کہ لاوی بن یعقوب کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا نام شمعون اس لیے رکھا گیا کہ ان کی والدہ نے اللہ تعالیٰ سے لڑکے کی دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی اور ان کے ہاں بچہ ہوا' اُنہوں نے اس کا نام شمعون رکھا۔ شمعون کا معنیٰ ہے: ''سمع الله دعائي'' اللہ نے میری دُعا سن لی۔ اس میں جو سین تھا اس کو عبرانی زبان میں شین کر دیا گیا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک آیت میں نبی سے مراد حضرت اِشْمَوِیْل بن یال علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ ھلقائی کے بیٹے تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بہر صورت مذکورہ نبی کی حقیقت سے واقف ہونا یہاں مقصود اور مطلوب نہیں ہے' بلکہ یہاں جہاد کی ترغیب دینا مقصود ہے' جو کہ یہاں موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیاء کرام اور آیت مذکورہ میں بیان کردہ واقعہ کی تفصیل

جس گروہ کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے اُس کا اپنے نبی کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو ان کے بعد حضرت یوشع بن نون بنی اسرائیل کے خلیفہ بنے۔ اور بنی اسرائیل کے درمیان اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ کرتے رہے اور تورات کے ذریعے فیصلے کرتے رہے' یہاں تک کہ اُن کا وصال ہو گیا' پھر اُن کے بعد حضرت کالب بن یوقنا اور ان کے بعد حضرت حزقیل خلیفہ بنے' یہاں تک کہ اُن کا بھی وصال ہو گیا۔ اُن کے بعد پھر بنی اسرائیل میں بڑے بڑے حادثات اور واقعات رونما ہوئے۔ بنی اسرائیل نے وعدۂ الٰہی کو بھلا دیا' حتیٰ کہ بتوں کو پوجنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف حضرت الیاس کو نبی بنا کر بھیجا۔ انہوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف آنے کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد جتنے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے اُن سب کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا تا کہ وہ قوم کے سامنے تورات کی اُن باتوں کو تازہ کریں جو لوگوں نے بھلا دی تھیں۔ اور اُنہیں تورات کے احکامات پر عمل کرنے کا حکم دیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام کے بعد حضرت یسع علیہ السلام خلیفہ ہوئے' اور جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ خلیفہ رہے پھر اُن کا بھی وصال ہو گیا۔ اُن کے بعد کئی ناخَلَف لوگ خلیفہ بنے اور بنی اسرائیل میں گناہ بڑھ گئے اور ان کا دشمن بھی سامنے آ گیا' جس کا نام بشاثا تھا۔ یہ جالوت کی قوم کے لوگ تھے اور مصر و فلسطین کے درمیان بحرِ روم کے ساحل پر رہتے تھے اور یہ عمالقہ تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل پر چڑھائی کر دی' ان کی بہت ساری زمینوں پر قبضہ کر لیا' ان کی اولاد کو قید کر لیا' ان کے سرداروں میں سے چار سو چالیس افراد کو قیدی بنا لیا' ان پر جزیہ عائد کیا اور اُن سے اُن کی تورات لے لی۔ بنی اسرائیل کو ان لوگوں سے بہت مصیبت اور تکلیف پہنچی' اس وقت ان کے درمیان کوئی نبی بھی موجود نہیں تھا جو اُن کے معاملہ کی تدبیر کرتا۔ ایک حاملہ عورت کے سوا نبوت کے خاندان کے تمام ہی لوگ ہلاک ہو چکے تھے' اس

کو ان لوگوں نے اس خوف سے ایک گھر میں بند کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بچی جنے اور (لوگوں کے سامنے) بچہ پیش کرے کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ بنی اسرائیل کو اس سے لڑکے کی خواہش ہے۔ سو وہ عورت اللہ عزوجل سے لڑکے کی دُعا کرتی رہی۔ چنانچہ اُس نے لڑکا ہی جنا اور اس کا نام اِشْمُوِیل رکھا۔ اشمویل کا معنیٰ عربی میں ''اسمٰعیل'' ہے۔ ان کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ اللہ نے میری دُعا سن لی۔ جب لڑکا بڑا ہوا تو والدہ نے تورات کی تعلیم کے لیے اس کو بیت المقدس میں علماء بنی اسرائیل میں سے کسی بزرگ کی نگرانی میں دے دیا۔ جب لڑکا بلوغت کو پہنچ گیا تو اس کے پاس جبریل امین علیہ السلام آئے' وہ لڑکا اپنے شیخ کی ایک جانب سو رہا تھا اور شیخ کا معمول یہ تھا کہ وہ اُس کو کسی کی حفاظت میں نہیں دیتے تھے۔ جبریل امین نے شیخ کے لہجہ میں اس کو پکارا: اے اشمویل! لڑکا گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور شیخ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ابا جان! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ نے مجھے آواز دی ہے؟ شیخ نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کو نفی میں جواب دیا جائے ورنہ یہ ڈر جائے گا' انہوں نے کہا: بیٹے! جاؤ سو جاؤ۔ جبریل امین نے دوبارہ آواز دی تو لڑکے نے شیخ سے کہا: آپ نے مجھے آواز دی؟ شیخ نے کہا کہ سو جاؤ۔ اب اگر میں تمہیں آواز دوں تو تم جواب نہیں دینا۔ جب تیسری بار یہ واقعہ ہوا تو جبریل امین سامنے آ گئے اور حضرت اِشْمُوِیل سے کہا: آپ اپنی قوم کی طرف جایئے اور اُنہیں اپنے رب کا پیغام پہنچایئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے نبی بنایا ہے۔ جب وہ قوم کے لوگوں کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کو جھٹلایا اور کہا کہ آپ نے بہت جلدی نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے' حالانکہ ابھی آپ کو نبوت ملی نہیں ہے۔ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر فرما دیں تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں' اور بادشاہ کا تقرر آپ کی نبوت کی ایک نشانی ہوگا۔ بنی اسرائیل کے معاملات کا دارومدار صرف اس پر تھا کہ وہ کسی بادشاہ پر اتفاق کر لیا کرتے تھے' اور جو بادشاہ ہوتے تھے وہ انبیاء کی پیروی کیا کرتے تھے۔ یعنی بادشاہ وہ ہوتا تھا جو تمام لوگوں کو چلائے' اور پیغمبر (علیہ السلام) کا کام یہ تھا کہ وہ اُس بادشاہ کے معاملات کی اصلاح کرتے تھے' اُسے مشورے دیتے تھے' اُس کی رہنمائی کرتے تھے اور اپنے رب کی طرف سے آنے والی خبر کو اُس تک پہنچایا کرتے تھے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اِشْمُوِیل کو نبی بنا کر بھیجا' چنانچہ لوگ چالیس سال تک بہت اچھی حالت میں زندگی گزارتے رہے' پھر جالوت اور عمالقہ کا معاملہ پیش آیا' اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث آیت میں) فرمایا کہ ''جب لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں (تا کہ) ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں''۔ آیت میں ﴿نُّقَاتِلْ﴾ چونکہ جوابِ امر ہے اس لیے اُسے جزم ہے۔

﴿قَالَ﴾ کا فاعل نبی ہے' یعنی اُن کے نبی نے کہا۔ ﴿هَلْ عَسَيْتُمْ﴾ میں استفہام شک کے لیے ہے۔ اور ''عسیتم'' ''لعلکم'' کے معنیٰ میں ہے' یعنی شاید۔ اور ﴿إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ کا معنیٰ ہے: اگر تم پر اُس بادشاہ کے ساتھ جہاد فرض کر دیا جائے۔ ﴿أَلَّا تُقَاتِلُوا﴾ تو تم جہاد نہیں کرو گے' یعنی جو تم نے کہا ہے اس کو پورا نہیں کرو گے اور بادشاہ کے ساتھ جہاد کرنے سے اجتناب کرو گے۔

آیت میں ''وما لنا ان لا نقاتل'' پر نحوی بحث و تحقیق

یہاں یہ سوال ہے کہ ﴿مَا لَنَا﴾ کے بعد ''ان'' کیوں لایا گیا' جبکہ اہل عرب اس طرح نہیں کہتے کہ ''مالک ان لا تفعل'' بلکہ وہ یوں کہتے ہیں: ''مالک لا تفعل کذا''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ (''مالنا'' کے بعد) ''اَن'' لانا اور نہ لانا دونوں صحیح لغتیں ہیں۔ ''اَن'' کو برقرار رکھنے کی مثال اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: ''مَالَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السّٰجِدِينَ'' (الحجر:۳۲) یعنی اے ابلیس! کیا بات ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں سے الگ رہا؟ اور ''اَن'' کو حذف کرنے کی مثال اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ" (الحدید: ۸) کیا بات ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿ مَالَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ ﴾ میں "فی" حرف جر محذوف ہے اور اس کا معنیٰ ہے: "مالنا فی ان لا نقاتل فی سبیل اللہ" یعنی ہمارے لیے اس میں کیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ بعض کے نزدیک "اَن" زائدہ ہے۔ یعنی "مالنا لا نقاتل فی سبیل اللہ"۔

"وقد اخرجنا من دیارنا و ابناء نا" کی تفسیر

﴿ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ﴾ (ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہیں کریں گے جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے اور اہل وعیال سے نکال دیا گیا ہے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ بنی اسرائیل پر قابض ہوئے انہوں نے ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ اس کلام میں بہ ظاہر تو عموم ہے لیکن فی الحقیقت یہ خاص ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے پیغمبر (علیہ السلام) سے بادشاہ کے تقرر کی بات کی تھی وہ اپنے گھروں میں اور اپنے اہل وعیال میں موجود تھے۔ نکالا صرف اُن لوگوں کو گیا تھا جن کو قید کیا گیا تھا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہم نے جہاد صرف اس وجہ سے چھوڑا ہوا تھا کہ ہم اپنے شہر میں محفوظ تھے اور دشمن ہم پر حملہ آور نہیں ہوا تھا' اب جبکہ دشمن ہم تک پہنچ چکا ہے تو ہم اُس سے جہاد کرنے میں اپنے رب (عزوجل) کی اطاعت کریں گے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو تحفظ دیں گے۔

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ ﴾ میں عبارت پوشیدہ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ "پیغمبر نے اللہ عزوجل سے درخواست کی تو اللہ نے لوگوں کے لیے ایک بادشاہ مقرر فرمایا اور اُن پر جہاد کو فرض کیا"۔ سو جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا تو انہوں نے منہ پھیرا۔ ﴿ تَوَلَّوْا ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ انہوں نے جہاد سے منہ موڑا اور اللہ عزوجل کے حکم کو ضائع کر دیا۔ ﴿ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ چند لوگوں نے جہاد سے منہ نہیں موڑا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو پار کیا اور چلو بھر پانی پینے پر اکتفا کیا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ عنقریب آئے گی۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے رب کے حکم کی مخالفت کی اور اپنی بات کو پورا نہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا' اللہ عزوجل اُن سب کو خوب جاننے والا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور ان سے ان کے نبی نے کہا: بے شک اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر فرما دیا ہے' انہوں نے کہا کہ اُس کو کیسے ہم پر بادشاہت مل جائے گی؟ جبکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حق دار ہیں اور اُسے تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں ہے' (نبی نے) کہا: بے شک اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اُس کو منتخب فرما لیا ہے اور اُسے علم اور جسم میں کشادگی بھی زیادہ عطا کی ہے' اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے اور اللہ وسعت والا بہت علم والا ہے O

طالوت کے بادشاہ بننے کا واقعہ

﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ﴾ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت اِشْمَوِیْل علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے درخواست کی کہ وہ لوگوں کے لیے ایک بادشاہ مقرر فرما دے۔ چنانچہ آپ کو ایک عصا اور سینگ دیا گیا جس میں

قدس کا تیل تھا اور اُن سے کہا گیا کہ آپ کا جو ساتھی بادشاہ بنے گا اُس کا قد اس عصا کے برابر ہو گا اور آپ اس تیل والے سینگ کو دیکھتے رہنا' جب آپ کے پاس کوئی شخص آئے اور سینگ والا تیل جوش مارنے لگے تو وہی شخص بنی اسرائیل کا بادشاہ ہو گا۔ لہٰذا آپ اُس کے سر پر وہ تیل لگا دینا اور اُسے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا دینا۔

عبرانی زبان میں طالوت کا نام شَاؤلْ بن قیس تھا' ان کا تعلق بنیامین بن یعقوب کی اولاد سے تھا۔ ان کو طالوت اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کا قد لمبا تھا اور ان کا سر اور کندھے تمام لوگوں سے زیادہ لمبے تھے۔ وہب بن منبہ کے قول کے مطابق طالوت دباغت پیشہ آدمی تھے اور کھالوں کو دباغت دیا کرتے تھے۔ جبکہ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ پانی پلایا کرتے تھے اور گدھے پر پانی لاد کر لاتے تھے' ایک دن اُن کا گدھا گم ہو گیا تو وہ اُسے تلاش کرنے لگے۔ وہب کا قول یہ ہے کہ طالوت کے والد کے کچھ گدھے گم ہو گئے تو انہوں نے طالوت کو ایک لڑکے کے ساتھ گدھے تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ تلاش کرتے ہوئے وہ حضرت اِشْمَوئیل علیہ السلام کے گھر کے پاس سے گزرے۔ تو لڑکے نے طالوت سے کہا کہ ہم اس نبی کے پاس چلتے ہیں اور اُن سے گدھوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں' تاکہ وہ ہماری رہنمائی کر دیں یا ہمارے لیے دُعا کر دیں۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت اشمویل کے پاس گئے اور ابھی ان کے سامنے اپنی حاجت بیان ہی کر رہے تھے کہ سینگ والا تیل جوش مارنے لگا' حضرت اشمویل فوراً کھڑے ہوئے اور عصا کے ذریعہ طالوت کا قد ناپا تو ٹھیک وہ طالوت کے قد کے مطابق تھا۔ چنانچہ انہوں نے طالوت سے کہا کہ اپنا سر قریب لاؤ' انہوں نے اپنا سر قریب کیا تو آپ نے قدس کا تیل ان کے سر میں لگا دیا اور ان سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کے بادشاہ ہو' اور مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ میں تمہیں بادشاہ بناؤں۔ طالوت نے کہا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میرے قبیلہ کا شمار بنی اسرائیل کے پست ترین قبیلوں میں ہوتا ہے؟ حضرت اِشْمَوئیل نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے۔ طالوت نے کہا: پھر کس نشانی سے میں بادشاہ ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ نشانی یہ ہے کہ جب تم گھر جاؤ گے تو تمہارے والد کو اُن کے گدھے مل چکے ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر حضرت اِشْمَوئیل نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت اِشْمَوئیل نے طالوت کو اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ بنا دیا ہے۔ جب یہ اعلان ہوا تو بنی اسرائیل کے بڑے بڑے لوگ حضرت اشمویل علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ طالوت میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ اس کو ہمارا بادشاہ بنا دیا گیا' جب کہ نبوت اور بادشاہت دونوں ہی خاندانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ نبوت لاوی بن یعقوب کے خاندان میں جاری ہے اور بادشاہت یہوذا بن یعقوب کے خاندان میں جاری ہے۔ یہ پوری گفتگو سُن کر حضرت اشمویل علیہ السلام نے کہا کہ بے شک اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر فرما دیا ہے۔

طالوت کے بادشاہ بننے پر بنی اسرائیل کے اعتراض کی وجہ

﴿ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا ﴾ کہاں سے طالوت کو بادشاہت مل جائے گی اور کیسے وہ اس کا حق دار ہو سکتا ہے؟ ﴿ وَنَحْنُ اَحَقُّ ﴾ جبکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حق دار ہیں؟ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی کہ بنی اسرائیل میں دو خاندان تھے' ایک نبوت کا خاندان اور دوسرا بادشاہت کا خاندان۔ نبوت کا جو خاندان تھا وہ لاوی بن یعقوب کا خاندان تھا' سیدنا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا تعلق اسی سے تھا۔ جبکہ بادشاہت کا جو خاندان تھا وہ یہوذا ابن یعقوب کا خاندان تھا' سیدنا داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا تعلق اسی سے تھا۔ اور طالوت کو دونوں میں سے کسی خاندان سے تعلق نہیں تھا' اس کا تعلق بنیامین بن یعقوب کے خاندان سے تھا' اس لیے لوگوں نے اُسے اپنا بادشاہ بنانے سے انکار کیا اور اپنے آپ کو اس سے زیادہ بادشاہت کا حق دار سمجھا' اور اپنی اس

بات کو یہ کہہ کر مزید پختہ کیا کہ ﴿ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ﴾ (اُسے تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں ہے) یعنی وہ تنگ دست ہے جبکہ بادشاہ کو تو مال کی ضرورت پڑتی ہے۔

زیر بحث آیت کی روشنی میں شیعہ فرقہ کی تردید

﴿ قَالَ ﴾ سے مراد حضرت اشمویل ہیں یعنی انہوں نے فرمایا۔ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ اللہ (عزوجل) نے تم پر اُس کو (یعنی طالوت کو) منتخب فرمالیا ہے اور اُسے بادشاہت کے ساتھ خاص فرمالیا ہے۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیعہ فرقہ کے جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ امامت موروثی چیز ہے اُن کا قول باطل ہے۔ کیونکہ ایک ایسا شخص جس کا بادشاہت کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے سے بنی اسرائیل نے جب انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا اور اُنہیں یہ بتایا کہ بادشاہت کے لیے خاندان کی شرط لگانا غلط ہے اور بادشاہت کا حق دار وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت کے ساتھ خاص فرمالے۔

علم اور جسم کی کشادگی کی تفسیر

﴿ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے طالوت کو علم اور جسم میں زیادہ فضیلت اور کشادگی عطا کی ہے۔ ''علم'' میں کشادگی یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ طالوت کو علم حاصل تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ جب اُنہیں بادشاہت دی گئی تھی اُس وقت اُن پر وحی کی گئی تھی۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اُنہیں جنگ کے بارے میں بہت علم حاصل تھا۔ ''جسم'' کی کشادگی سے مراد یہ ہے کہ اُن کے قد کو بڑھایا۔ کیونکہ اُن کا سر اور کندھے تمام لوگوں سے زیادہ طویل تھے۔ بعض کے نزدیک جسم کی کشادگی سے مراد یہ ہے کہ اُن کے حسن و جمال کو بڑھایا۔ کیونکہ طالوت بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوب صورت تھے۔ بعض کے نزدیک قوت اور طاقت مراد ہے۔ کیونکہ جنگوں کے معاملات اور دشمنوں کے خلاف طاقت کا ہونا یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق مملکت کی حفاظت سے ہے۔

''واسع'' اور ''علیم'' کے معانی

﴿ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بادشاہت کے ساتھ خاص فرمالیتا ہے۔ ﴿ وَاسِعٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ فضل و کرم' رزق اور رحمت میں اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے' اس کی رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے' اور اس کا فضل و کرم اور رزق ساری مخلوق کو عام ہے۔ حاصل یہ کہ تم طالوت پر اس لیے طعن اور اعتراض کر رہے ہو کہ وہ غریب ہے (لیکن یہ بھی دیکھو کہ) اللہ تعالیٰ وسیع فضل اور رزق والا ہے۔ لہٰذا جب وہ طالوت کو بادشاہت سپرد کرے گا تو اپنے فضل اور کشادگی کی وجہ سے اُس پر رزق اور مال و دولت کے دروازے کھول دے گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''واسع'' کا معنیٰ ہے: ''ذو السّعة'' یعنی وہ ذات جو بے پروا اور بے نیاز ہو کر دے۔ ﴿ عَلِيْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ فقیر کو غنی کرنے کی قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کی اُسے اپنے معاملات اور اپنی سلطنت کی تدبیر کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ ''علیم'' کا معنیٰ ہے: وہ ذات جو اُن تمام باتوں کو جانتی ہو جو ہوں گی اور جو ہو چکیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۴۸﴾

اور ان کے نبی نے اُسے فرمایا: بے شک اس (طالوت) کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت (صندوق) آئے گا اُس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کی تسکین کا سامان ہے اور معزز موسیٰ اور معزز ہارون کے ترکہ میں سے باقی ماندہ کچھ چیزیں ہیں' اس (تابوت) کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے' اگر تم مؤمن ہو تو بلاشبہ اس (تابوت) میں تمہارے لیے ایک عظیم نشانی ہے O

بنی اسرائیل کے پاس آنے والے تابوت کا پس منظر اور واقعہ

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ﴾ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت اِشْمُوِیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ طالوت کی بادشاہت کی نشانی کیا ہے؟ تو حضرت اشمویل نے بتایا کہ اُس کی بادشاہت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا۔

مؤرخین کے بیان کے مطابق تابوت کا قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام پر ایک تابوت نازل فرمایا' اُس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تصویریں تھیں' اور وہ تابوت شمشاد کی لکڑی کا بنا ہوا تھا' تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا۔ وہ تابوت حضرت آدم علیہ السلام کے پاس رہا' اُن کے بعد حضرت شیث علیہ السلام کے پاس رہا' پھر آدم علیہ السلام کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا حتیٰ کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا' اُن کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس پہنچا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ اُن کے بعد وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچا' پھر بنی اسرائیل میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ وہ اُس میں تورات اور اپنا دیگر سامان رکھا کرتے تھے۔ اُن کے وصال تک وہ تابوت اُن ہی کے پاس رہا' پھر وہ یکے بعد دیگرے بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کے درمیان منتقل ہوتا رہا تا آنکہ حضرت اشمویل علیہ السلام کا زمانہ آ پہنچا۔ اور تابوت میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جن کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ یعنی فرمایا کہ ﴿فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (اُس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہے)۔

تابوت میں موجود ''سکینہ'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ آیت میں ''سکینہ'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یہ ہے کہ یہ ایک سخت اور تیز ہوا تھی۔ اس کے دو سر تھے اور انسانوں جیسا ایک چہرہ تھا۔ حضرت مجاہد کا قول یہ ہے کہ یہ بلّی سے ملتی جلتی ایک چیز تھی' بلّی جیسا اس کا ایک سر اور ایک دُم تھی اور دو پَر تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اُس کی دو آنکھیں تھیں جن میں ایک شعلہ تھا' اس کے زُمُرُّد اور زَبَرْجَد کے دو پَر تھے' لوگ جب اس کی آواز سُنتے تو اُنہیں مدد کا یقین ہو جاتا اور پھر جب وہ (مقابلہ کے لیے) نکلتے تو اُس تابوت کو سامنے رکھتے' جب وہ چلتا تو لوگ چلتے اور جب وہ رُک جاتا تو لوگ بھی رُک جاتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ سکینہ سے سونے کا جنتی طشت مراد ہے' اُس میں انبیاء کرام علیہم السلام کے قلوب دھوئے جاتے تھے۔ وہب بن منبہ کا قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک رُوح تھی جو کہ اس وقت کلام کیا کرتی تھی جب لوگوں کا کسی بات میں اختلاف ہو جاتا تھا اور وہ لوگوں کے سامنے اُن کے ارادے بیان کرتی تھی۔ عطاء بن ابی

رباح کا قول یہ ہے کہ جن آیتوں اور نشانیوں سے وہ سکون پاتے تھے اُن میں جن کو وہ پہچانتے تھے وہ سکینہ ہیں۔ قتادہ اور کلبی کا قول یہ ہے کہ یہ ''سکون'' سے ''فعیلہ'' کے وزن پر ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تابوت میں تمہارے رب کی طرف سے سکون اور اطمینان ہے۔ چنانچہ تابوت جہاں بھی ہوتا تھا لوگ اُس سے اطمینان اور سکون حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ قول صحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس قول کی بنیاد پر ہر وہ چیز ''سکینہ'' ہے جس سے لوگ سکون حاصل کیا کرتے تھے' اور اس لفظ سے اب وہ تمام چیزیں مراد ہوسکتی ہیں جو مختلف اقوال کی صوت میں بیان کی گئیں۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو تسکینِ دل کا باعث ہو وہ سکینہ ہے۔ چونکہ اس لفظ کی مراد کے تعیّن میں کوئی صریح نص وارد نہیں ہوئی اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ (ذکر کردہ اقوال میں سے) کسی قول کو درست اور کسی کو ضعیف قرار دیا جائے۔

آیت میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون سے کیا مراد ہے؟

فرمایا: (اُس تابوت میں) آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے ترکہ میں سے باقی ماندہ کچھ چیزیں ہیں۔ یہاں ﴿اٰلُ مُوْسٰی﴾ اور ﴿اٰلُ هٰرُوْنَ﴾ سے خود موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) مراد ہیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کی آواز کی تعریف میں) فرمایا کہ:

(۳۵۳) بلاشبہ تمہیں اٰلِ داؤد کی خوش آوازی ملی ہے۔

(صحیح بخاری: ۵۰۴۸' صحیح مسلم: ۷۹۳' سنن ترمذی: ۳۸۵۵' سنن نسائی: ۱۰۱۹' سنن ابن ماجہ: ۱۳۴۱' سنن دارمی: ۱۴۸۹' مسند احمد ج ۶ ص ۳۷)

☆ اس حدیث میں اٰلِ داؤد سے حضرت داؤد علیہ السلام مراد ہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے ترکہ کی باقی ماندہ چیزیں اور تابوت کی برکت

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے ترکہ میں سے جو چیزیں باقی تھیں اُن کے متعلق اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ یہ تختیوں کے کچھ ٹکڑے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا عصا اور تورات کی کچھ تختیاں تھیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے علم اور تورات مراد ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس ترکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور نعلین اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور عمامہ شامل تھا اور بنی اسرائیل پر جو ''مَنّ'' نازل ہوا کرتا تھا اُس کی بھی ایک مخصوص مقدار شامل تھی۔

مذکورہ تابوت بنی اسرائیل کے پاس رہا اور عہد بہ عہد ایک دوسرے کو وراثت میں ملتا رہا۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ جب کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جاتا تو تابوت سے فیصلہ کرواتے' چنانچہ تابوت کلام کرتا اور اُن کے درمیان فیصلہ کر دیتا۔ جب اُنہیں جنگ کے لیے جانا ہوتا تو تابوت کو اپنے سامنے رکھ کر اُس کے وسیلہ سے اپنے دشمن پر فتح یاب ہونے کی دُعا مانگا کرتے تھے' پھر اُنہیں مدد ملتی تھی۔ لیکن جب ان لوگوں نے نافرمانیاں شروع کیں اور فساد پھیلانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کر دیا۔ انہوں نے تابوت پر قبضہ کر لیا اور اُن سے تابوت کو لے لیا۔

بنی اسرائیل سے تابوت کے چھن جانے کا واقعہ

بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے تابوت کے نکل جانے کا سبب یہ تھا کہ شیخ عیلٰی جنہوں نے حضرت اشمُوئیل علیہ السلام کی پرورش کی تھی ان کے دو نوجوان بیٹے تھے۔ شیخ عیلٰی بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم تھے اور اپنے زمانہ میں بنی اسرائیل کی قربانیوں کے والی تھے۔ اُن کے دونوں بیٹوں نے قربانی میں ایک ایسی چیز ایجاد کر لی جو پہلے نہیں تھی' اور وہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس کانٹے سے قربانی کا گوشت بھونتے تھے وہ دو کنڈے والا تھا۔ جو گوشت اُن دو کنڈوں کے ساتھ آ جاتا وہ اُس کاہن کا ہوتا تھا

جو گوشت بھونتا تھا۔ شیخ عیلی کے بیٹوں نے اُس کانٹے کے کئی کنڈے بنادیئے' (علاوہ ازیں) بیت المقدس میں جو عورتیں نماز ادا کرتی تھیں یہ دونوں بیٹے ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ حضرت اِشْمُوِیْل علیہ السلام کو وحی آئی کہ آپ شیخ عیلی کے پاس جایئے اور اُن سے کہیے کہ اولاد کی محبت نے تمہیں اس بات سے روک رکھا ہے کہ تم اپنے دونوں بیٹوں کو میری نافرمانی سے اور اُن باتوں سے روکو جو اُنہوں نے قربانی میں اور بیت المقدس میں شروع کر رکھی ہیں۔ لہٰذا میں تم سے اور تمہاری اولاد سے کہانت (قربانی کی سرپرستی کا منصب) چھین لوں گا اور تمہیں اور اُن دونوں کو ہلاک کردوں گا۔ حضرت اشمویل نے شیخ عیلی کو یہ خبر پہنچائی تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ اور (ساتھ ہی) بنی اسرائیل کے دشمن بھی اردگرد سے نکل آئے۔ شیخ عیلی نے اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ دشمن سے جنگ کرو۔ وہ دونوں جنگ کے لیے نکلے اور اپنے ساتھ تابوت کو بھی نکالا۔ جب سب جنگ کے لیے تیار ہو گئے تو شیخ عیلی خبر کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ لوگ (دشمن سے) شکست کھا گئے ہیں اور آپ کے دونوں بیٹے قتل ہو چکے ہیں۔ شیخ نے پوچھا کہ تابوت کا کیا بنا؟ آدمی نے بتایا کہ تابوت دشمن کے قبضہ میں جا چکا ہے۔ شیخ نے جب یہ خبر سُنی تو وہ کُرسی پر بیٹھے ہوئے تھے' وہیں انہوں نے چیخ ماری' گدی کے بل نیچے گرے اور مر گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا اور وہ منتشر ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا تو لوگوں نے اس کی بادشاہت کے صحیح ہونے پر حضرت اشمویل سے دلیل مانگی تو حضرت اشمویل نے فرمایا کہ طالوت کی بادشاہت کے صحیح ہونے پر دلالت کرنے والی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا۔

تابوت کی واپسی

تابوت کی واپسی کا جو قصہ ہے وہ اصحابِ تاریخ کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ جن لوگوں نے بنی اسرائیل سے تابوت چھینا تھا وہ اُس کو فلسطین کی ''ازدود'' نامی ایک بستی میں لے کر آئے اور اس کو اپنے بُت کدہ میں سب سے بڑے بُت کے نیچے رکھ دیا۔ اگلے دن جب صبح اُٹھ کر دیکھا تو بت تابوت کے نیچے تھے' انہوں نے بُت کو پکڑا اور دوبارہ اُس کو تابوت کے اوپر رکھ دیا اور تابوت پر اُس کے پاؤں جما دیئے۔ جب صبح اُٹھ کر دیکھا تو بُت کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے اور بُت تابوت کے نیچے گرا ہوا تھا اور دوسرے بُت بھی اوندھے گرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے تابوت کو بُت کدہ سے نکالا اور شہر کے کسی گوشہ میں رکھ دیا۔ اب ہوا یہ کہ اُس گوشہ کے رہنے والوں کو گردن کے درد نے آ لیا اور اُن میں سے اکثر لوگ ہلاک ہو گئے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کا جو معبود ہے اُس کا کوئی بھی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی؟ لہٰذا تم اس تابوت کو کسی اور بستی میں بھیج دو۔ جب لوگوں نے یہ بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے اُس گوشہ والوں پر ایک چوہے کو مسلط کر دیا' وہ جس شخص کے ساتھ رات بسر کرتا وہ صبح مردہ ہوتا اور جو اُس کے پیٹ میں ہوتا تھا وہ چوہا کھا چکا ہوتا تھا۔ چنانچہ لوگ تابوت کو صحرا میں لے گئے اور گندگی ڈالنے کی جگہ میں اُس کو دفن کر دیا۔ اب یہ ہوا کہ جو شخص بھی اُس جگہ قضائے حاجت کے لیے جاتا اُسے بواسیر اور قولنج (یعنی بڑی انتڑی کا درد) ہو جاتا۔ لوگ اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے تو بنی اسرائیل کی ایک عورت جو کہ اُن کے پاس تھی اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد سے تھی' اُس نے لوگوں سے کہا کہ جب تک تمہارے درمیان یہ تابوت موجود رہے گا اس وقت تک تم پر یہ مصیبتیں آتی رہیں گی' لہٰذا تم اس کو اپنے آپ سے دُور کر دو۔ چنانچہ اس عورت کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے لوگ ایک بیل گاڑی لے کر آئے' اُس پر تابوت کو لادا اور گاڑی کو دو بیلوں کے ساتھ جوڑ کر پیچھے سے بیلوں کو مارنے لگے' جس کی وجہ سے وہ بیل چلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں بیلوں پر چار فرشتے مقرر فرما دیئے جو کہ اُنہیں ہانک رہے تھے۔ بیل چلتے رہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی زمین میں پہنچ کر رُک گئے' وہاں انہوں نے اپنا جُوا توڑ دیا اور رسیاں کاٹ

دیں اور ایک ایسی جگہ جہاں بنی اسرائیل کی کٹی ہوئی فصل رکھی تھی وہاں اُن بیلوں نے تابوت کو اُتارا اور جہاں سے آئے تھے وہاں پلٹ گئے۔ اور بنی اسرائیل پر کچھ ہی دیر گزری تھی کہ تابوت اُن کے سامنے موجود تھا' اس پر اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور حمد وثناء بیان کی۔

فرشتوں کا تابوت کو اٹھانا

آیت میں فرمایا: ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ﴾ فرشتے اس (تابوت) کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اُٹھانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اُسے ہانک رہے ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ فرشتے تابوت کو اس طرح لے کر آئے کہ وہ اس کو آسمان اور زمین کے درمیان اٹھائے ہوئے تھے اور لوگ تابوت کو دیکھ رہے تھے' یہاں تک کہ فرشتوں نے اس کو طالوت کے پاس لا کر رکھا۔ حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے کہ تابوت آسمان میں فرشتوں کے پاس تھا' جب طالوت کو بادشاہ بنایا گیا تو فرشتوں نے تابوت کو اٹھایا اور لوگوں کے درمیان لا کر رکھ دیا۔ حضرت قتادہ کا قول یہ ہے کہ تابوت میدانِ تیہ میں تھا' سیدنا موسیٰ علیہ السلام اسے حضرت یوشع بن نون کے پاس چھوڑ گئے تھے' یہ وہیں رہا یہاں تک کہ فرشتوں نے اسے اٹھایا اور طالوت کے گھر میں رکھ دیا۔ جب صبح اُن کے گھر میں تابوت پایا گیا تو لوگوں نے اُن کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا۔

اختتام پر فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ اگر تم مؤمن ہو تو بلاشبہ اس میں تمہارے لیے ضرور نشانی ہے۔ یعنی لوگوں سے اُن کے نبی حضرت اشمویل علیہ السلام نے کہا کہ وہ تابوت جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے اُس کے آنے میں یقیناً تمہارے لیے نشانی ہے۔ یعنی میں نے تم لوگوں کو جو خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر فرما دیا ہے اس خبر کی سچائی پر وہ تابوت علامت اور دلیل ہے۔ آخر میں جو فرمایا: ''اگر تم مؤمن ہو'' اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اس بات کی تصدیق کرنے والے ہو۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کے پاس تابوت پہنچ گیا اور انہوں نے طالوت کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا تو طالوت نے اُنہیں جہاد کے لیے نکلنے پر تیار کیا۔ چنانچہ انہوں نے طالوت کی بات ماننے میں بہت تیزی دکھائی اور طالوت کے ساتھ نکل پڑے۔ اس بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے (اگلی آیت میں) فرمایا:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۲۴۹﴾

سو جب طالوتؑ (اپنی) فوجیں لے کر روانہ ہوا تو اُس نے (اپنی فوج سے) کہا: بے شک اللہ تمہیں ایک دریا کے ذریعہ آزمانے والا ہے' لہٰذا (اچھی طرح سُن لو کہ) جس نے اس میں سے پیا وہ میرے طریقہ پر نہیں ہوگا اور جس نے اس میں سے نہیں پیا وہ میرے طریقہ پر ہوگا' البتہ جو اپنے ہاتھ سے ایک چلّو پی لے (اُس کے لیے حرج نہیں ہے) تو چند لوگوں کے سوا سب نے اس سے خوب پانی پیا' پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ ایمان والوں نے دریا کو پار کر لیا تو (پانی پینے والے) کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی افواج سے لڑنے کی ہمت نہیں ہے (اس کے برعکس) وہ لوگ جنہیں یہ یقین تھا کہ وہ اللہ سے

ملاقات کرنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ کتنی ہی قلیل جماعتیں اللہ کے حکم سے کثیر جماعتوں پر غالب آ چکی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے O

طالوت کا اپنی فوج کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ ہونا اور پانی کے ذریعہ اُن کی آزمائش

﴿فَلَمَّا فَصَلَ﴾ کا معنیٰ ہے: جب طالوت نکلا۔ ''فصل'' کا اصل معنیٰ ''کاٹنا'' ہے یعنی طالوت نے اپنے رہنے کی جگہ کو چھوڑ کر کسی اور مقام کی طرف کوچ کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ طالوت بیت المقدس سے اپنی ستر ہزار جنگجو فوج کو لے کر روانہ ہوا۔ ایک قول یہ ہے کہ اُس کی فوج اسّی ہزار تھی' بعض کا قول یہ ہے کہ کُل تعداد بیس ہزار ایک سو تھی۔ اس لشکر میں کوئی بوڑھا اپنے بڑھاپے کی وجہ سے یا بیمار اپنی بیماری کی وجہ سے یا معذور اپنے عذر کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے (اپنی آنکھوں سے) جب تابوت کو دیکھ لیا تو اُنہیں فتح و نصرت میں کسی قسم کا شک نہیں رہا' اس لیے اُنہوں نے جہاد کے لیے گھروں سے نکلنے میں تیزی دکھائی۔ وہ لوگ جب جہاد کے لیے نکلے تو اس وقت گرمی بہت شدید تھی۔ اس لیے انہوں نے طالوت سے پانی کی قلت کی شکایت کی اور کہا کہ پانی اتنا ہے کہ ہمارا گزارا نہیں ہوگا' لہٰذا آپ اللہ عزوجل سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے لیے دریا جاری فرما دے۔ چنانچہ طالوت نے کہا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ایک دریا کے ذریعہ امتحان میں ڈالنے والا ہے تاکہ تمہاری اطاعت گزاری ظاہر ہو جائے' حالانکہ وہ اس بات سے خوب واقف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت میں جس دریا کا ذکر ہے اُس سے فلسطین کا دریا مراد ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے ایک میٹھا دریا مراد ہے۔ جو کہ اُردن اور فلسطین کے درمیان ہے۔

﴿فَلَيْسَ مِنِّي﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس پانی کا پینے والا میرے دین اور میری اطاعت والوں میں سے نہیں ہے۔ ﴿مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے پانی نہیں چکھا۔ ﴿فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ تو وہ میری اطاعت کرنے والوں میں سے ہے۔ آیت میں ﴿غُرْفَةً﴾ کو غین کے زبر اور پیش دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''غُـــرفة'' اس پانی کو کہتے ہیں جو ہتھیلی میں آئے اور ''غَرفة'' کا معنیٰ ہے: چلّو میں پانی لینا۔ لہٰذا ''غُرفة'' اسم ہے اور ''غَرفة'' مصدر ہے۔

جن افراد نے پانی نہیں پیا تھا ان کی تعداد کا بیان اور پانی پینے کا واقعہ

﴿فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ﴾ چند لوگوں کے سوا سب نے اس سے خوب پانی پیا۔ جن لوگوں نے پانی نہیں پیا تھا ان کی تعداد میں اختلاف ہے' بعض کے نزدیک اُن کی تعداد چار ہزار ہے اور بعض کے نزدیک تین سو بیس ہے۔ یہی قول صحیح ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

(۳۵٤) سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ آپس میں یہ گفتگو کرتے تھے کہ اصحابِ بدر کی تعداد وہی ہے جو طالوت کے اُن ساتھیوں کی تھی جنہوں نے طالوت کے ساتھ دریا کو پار کیا' اور اُس کے ساتھ صرف تین سو دس (کے قریب) مؤمنوں نے دریا کو پار کیا۔ (صحیح بخاری: ۳۹۵۷) ☆ اس حدیث میں ایک لفظ ''بضع'' آیا ہے' بعض کے نزدیک اس سے تیرہ افراد مراد ہیں۔

واقعہ یہ ہوا کہ لوگ جب دریا کے قریب پہنچے تو اُنہیں پیاس لگی' اس لیے مذکورہ قلیل تعداد کے سوا تمام افراد نے اس دریا سے پانی پی لیا۔ البتہ وہ افراد جنہوں نے حکمِ ربی کے مطابق صرف چلّو بھر پانی پیا' ان کے لیے وہ پانی اتنا کافی ہو گیا کہ اُنہیں اور ان کے جانوروں کو پانی پینے کی ضرورت نہ رہی۔ اُن لوگوں کا دل مضبوط ہو گیا اور ایمان پختہ ہو گیا اور انہوں نے سلامتی کے ساتھ دریا کو پار کر لیا۔ جبکہ وہ لوگ جنہوں نے دریا سے پانی پی لیا اور اللہ عزوجل کے حکم کی مخالفت کی' اُن کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور پیاس اُن پر غالب آ گئی' وہ پانی پی کر سیراب نہ ہوئے بلکہ بزدل ہو گئے اور دریا کے کنارے پر ٹھہر گئے اور دریا کو پار نہ کیا۔

بعض کا قول یہ ہے کہ لشکر کے تمام افراد نے دریا پار کر لیا تھا البتہ جنہوں نے پانی پیا تھا وہ جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے' جنگ صرف اُن قلیل افراد نے کی تھی جنہوں نے پانی نہیں پیا تھا۔

﴿ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب طالوت نے دریا کو پار کر لیا۔﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ﴾ اور اس کے ساتھ صاحبانِ ایمان نے۔ یعنی قلیل افراد نے دریا پار کر لیا۔﴿ قَالُوْا ﴾ تو وہ لوگ کہنے لگے جنہوں نے دریا سے (خوب) پانی پیا تھا اور اللہ عزوجل کے حکم کی مخالفت کی تھی اور شک اور نفاق میں مبتلا تھے۔ اس تفسیر کی رُو سے طالوت کے ساتھ دریا پار کرنے والوں میں مؤمن' منافق' فرمانبردار اور نافرمان سب شامل ہوں گے۔ لوگوں نے جب دشمن کو دیکھا تو جو منافق تھے وہ کہنے لگے کہ ﴿ لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ﴾ آج ہم میں جالوت اور اس کی افواج سے لڑنے کی ہمت نہیں ہے)۔ اس کے جواب میں مؤمنین نے کہا کہ ''کتنی ہی قلیل جماعتیں کثیر جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ چکی ہیں''۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ طالوت کے ساتھ صرف مؤمنین نے دریا پار کیا تھا کیونکہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس طرح ہے کہ ''جب طالوت اور اس کے ساتھ ایمان والوں نے دریا کو پار کر لیا''۔ اگر اس قول پر یہ سوال ہو کہ پھر ''لا طاقة لنا الیوم '' کس نے کہا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اہل ایمان جو کہ تین سو دس کے قریب تھے وہ دو گروہوں میں بٹ گئے ہوں۔ ایک گروہ نے جب دشمن کو اور دشمن کی کثرت کو اور مؤمنین کی قلت کو دیکھا ہو تو کہا ہو کہ ''لا طاقة لنا الیوم '' (آج ہم میں جالوت اور اس کی افواج سے لڑنے کی ہمت نہیں ہے) اور دوسرے گروہ نے جواباً کہا ہو کہ ''کتنی ہی قلیل جماعتیں کثیر جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ چکی ہیں''۔

﴿ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں اس بات کا یقین اور علم تھا کہ وہ آخرت میں اللہ عزوجل کی طرف سے بدلہ اور اس کی رضا پانے والے ہیں' انہوں نے کہا: ﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (کتنی ہی قلیل جماعتیں کثیر جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ چکی ہیں) ''فئة'' کا معنیٰ ہے: جماعت۔ ''رَھطٌ'' کی طرح اس لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہے۔ ''باذن اللّٰہ '' سے مراد ہے: اللہ کے فیصلہ اور اس کے ارادہ سے۔ اور ﴿ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور مدد کے ذریعہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۵۰﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے صف آراء ہوئے تو انہوں نے دُعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو جما دے اور کافر قوم کے خلاف ہماری مدد فرما O

آیت مذکورہ کے الفاظ کی مختصر تحقیق اور تفسیر

﴿ لَمَّا بَرَزُوْا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ طالوت اور اس کی صاحب ایمان فوج نکلی۔ ''برزوا'' کا معنی ہے: وہ زمین کے براز میں آئے' یعنی اس حصہ میں آئے جو بالکل ظاہر اور ہموار ہو۔ ﴿ لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ﴾ سے مراد کفار ہیں۔ ﴿ قَالُوْا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ طالوت کے لشکری جو کہ مؤمن تھے' انہوں نے کہا۔ ﴿ اَفْرِغْ ﴾ ڈال دے (یعنی ہم پر صبر ڈال دے)۔ ﴿ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ﴾ ہمارے دلوں کو مضبوط کر دے تا کہ ہمارے قدم جمے رہیں۔ طالوت والوں نے اپنی دعا میں جالوت والوں کو ﴿ الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ اس لیے کہا کہ جالوت اور اس کی قوم کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے' اس لیے مؤمنین نے اللہ عزوجل سے دُعا کی کہ وہ کافر قوم پر اُن کو مدد عطا فرمائے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

پس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُنہیں بادشاہت اور دانائی عطا فرمائی اور جو چاہا اُنہیں سکھا دیا' اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کی وجہ سے نہ بچاتا تو ضرور زمین تباہ ہو جاتی' لیکن اللہ تمام جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے O

﴿ فَهَزَمُوْهُمْ ﴾ انہوں نے ان کو شکست دے دی۔ شکست دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی دُعا کو قبول فرمایا اور جب مسلمان اور کفار ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر صبر ڈال دیا اور ثابت قدمی دی اور ان کو کافر قوم کے خلاف مدد عطا فرمائی۔ چنانچہ مسلمانوں نے ﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی اللہ کے فیصلہ اور ارادہ سے کافروں کو شکست دے دی۔ ''ھزم'' کا لغت میں اصل معنیٰ ہے: توڑنا۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے کافروں کو توڑ دیا اور اُنہیں واپس لوٹا دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو قتل کرنے کا تفصیلی واقعہ

﴿ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ﴾ ''داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا'' اس کا واقعہ اہل تفسیر اور اصحاب تاریخ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ جن لوگوں نے طالوت کے ساتھ دریا کو پار کیا اُن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد ایشا بھی تھے انہوں نے اپنے تیرہ بیٹوں کے ساتھ دریا کو پار کیا۔ تمام بیٹوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سب سے چھوٹے تھے' وہ تیراندازی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دن اپنے والد سے کہا: ابا جان! میں جس پر بھی اپنا تیر چلاتا ہوں اس کو گرا دیتا ہوں۔ ان کے والد نے کہا: پیارے بیٹے! تجھے خوش خبری ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تیراندازی میں تمہاری روزی مقرر فرما دی ہے۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام دوبارہ اپنے والد کے پاس آئے اور کہا کہ ابا جان! میں پہاڑوں کے درمیان گیا تھا' وہاں میں نے ایک شیر دیکھا جو اپنے منہ میں شکار دبوچے بیٹھا ہوا تھا' میں اُس شیر پر سوار ہو گیا اور میں نے اس کے کان پکڑے لیکن اُس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ یہ سُن کر اُن کے والد نے کہا: پیارے بیٹے! تجھے خوش خبری ہو' کیونکہ یہ وہ بھلائی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ ارادہ فرمایا ہے۔ پھر کسی اور دن حضرت داؤد علیہ السلام اپنے والد کے پاس آئے اور کہا کہ ابا جان! میں تسبیح پڑھتا ہوا پہاڑوں کے درمیان چل رہا تھا تو ہر پہاڑ میرے ساتھ تسبیح پڑھنے لگا۔ والد نے کہا: پیارے بیٹے! تجھے خوش خبری ہو کیونکہ یہ وہ بھلائی ہے جو اللہ نے تجھے عطا فرمائی ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ پھر ظالم جالوت نے بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کو پیغام بھیجا کہ تم میرے مقابلہ کے لیے نکل آؤ' میں تمہارے مقابلہ کے لیے نکل آتا ہوں یا میرے مقابلہ پر ایسا شخص بھیج دو جو مجھ سے لڑے۔ اگر اُس نے مجھے قتل کر دیا تو میری بادشاہت تمہارے نام اور اگر میں نے اس کو قتل کر دیا تو تمہاری بادشاہت میرے نام۔ یہ بات طالوت کو مشکل لگی' اُس نے اپنے لشکر میں آواز لگائی کہ جو شخص جالوت کو قتل کر دے گا اُس کے نکاح میں میں اپنی بیٹی دے دوں گا اور اپنی آدھی سلطنت بھی دے دوں گا۔ یہ سُن کر لوگوں کے دلوں میں جالوت کی ہیبت بیٹھ گئی' اور کسی نے اس اعلان کا جواب نہیں دیا۔ طالوت نے بنی اسرائیل کے نبی سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دُعا کریں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ عزوجل سے دُعا کی تو اُنہیں ایک سینگ دیا گیا جس میں قدس کا تیل تھا اور لوہے کا ایک تنور دیا گیا' اور اُن سے کہا گیا کہ تمہارا جو ساتھی

جالوت کو قتل کرے گا وہ ایسا شخص ہے کہ جب اس کے سر پر یہ سینگ رکھا جائے گا تو وہ اس کے سر پر بہنے لگے گا یہاں تک کہ اُس کا سر تیل والا ہو جائے گا اور وہ تیل چہرے پر بہ کر نہیں آئے گا بلکہ تاج کی شکل میں سر پر رہے گا۔ پھر وہ شخص اس تنور میں داخل ہو گا اور اس میں سما جائے گا لیکن ہل جل نہیں کرے گا۔ طالوت نے بنی اسرائیل کو اپنے پاس بُلایا اور اُن سب پر تجربہ کیا لیکن کوئی شخص بھی اس معیار پر پورا نہ اُترا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے نبی پر وحی فرمائی کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا وہ ایشا کی اولاد میں ہے۔ چنانچہ طالوت نے ایشا کو بلوایا اور اُن سے کہا کہ اپنے بیٹے میرے سامنے لاؤ۔ ایشا نے بارہ بیٹے جو کہ ستون کی مانند تھے طالوت کے سامنے پیش کیے۔ اُن سب کو یکے بعد دیگرے اُس سینگ پر پیش کیا لیکن بات نہ بنی۔ تو انہوں نے ایشا سے کہا: کیا ان کے علاوہ اور کوئی بیٹا باقی ہے؟ ایشا نے کہا کہ نہیں۔ تو نبی (علیہ السلام) نے کہا: اے میرے رب! ایشا کا کہنا ہے کہ اُس کا اور کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایشا نے غلط بیانی کی ہے۔ نبی (علیہ السلام) نے ایشا سے کہا کہ میرے رب نے فرمایا ہے کہ ایشا نے غلط بیانی کی ہے۔ ایشا نے کہا: اے اللہ کے پیغمبر! میرے رب نے سچ فرمایا۔ میرا ایک چھوٹا اور بہت بیمار بیٹا ہے' اُس کا نام داؤد ہے۔ اُس کا قد چھوٹا ہے اس لیے لوگوں کے سامنے اُسے لانے سے مجھے حیا آ رہی تھی اس لیے میں نے اُس کو ریوڑ چرانے پر مقرر کیا ہوا ہے' اس وقت وہ فلاں گھاٹی میں ہو گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا قد چھوٹا تھا' وہ بہت بیمار رہتے تھے' اُن کا رنگ نیلا تھا اور اُن کے بال بہت کم تھے اور پیلے تھے۔ طالوت نے اُن کو بلوایا۔ کہا جاتا ہے کہ طالوت خود حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاش میں نکلا۔ اُس نے اُن کو ایک وادی میں پایا' اُس وقت وادی میں پانی بہہ رہا تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام دو دو بکریوں کو اُٹھا کر پانی کے بہاؤ سے نکال کر باڑہ کی طرف لے جا رہے تھے جس میں ریوڑ کے جانور آرام کرتے تھے۔ جب طالوت نے ان کو دیکھا تو اُس نے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی ہمیں تلاش ہے' اور یہ شخص جب جانوروں کے ساتھ اتنا رحم دل ہے تو یقیناً انسانوں کے ساتھ زیادہ رحم دل ہو گا۔ چنانچہ طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلا کو بُلایا اور اُن کے سر پر سینگ رکھا تو وہ آواز نکالنے لگا اور بہنے لگا۔ طالوت نے اُن سے پوچھا: کیا یہ ممکن ہے کہ آپ جالوت کو قتل کر دیں اور میں اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دے دوں اور اپنے ملک میں آپ کے نام کی انگوٹھی جاری کر دوں؟ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: ہاں! طالوت نے کہا: کیا آپ اپنے دل میں کسی ایسی چیز سے اُنس رکھتے ہیں جس کے ذریعہ آپ کو جالوت کے قتل میں تقویت حاصل ہو؟ حضرت داؤد نے کہا: ہاں! میں ریوڑ چراتا ہوں' اس میں سے شیر یا چیتا یا بھیڑیا ابھی آئے گا اور وہ ایک بکری کو اپنے منہ میں لے گا تو میں کھڑے ہو کر اُس جانور کے جبڑوں سے بکری کو چھڑاؤں گا اور اُس بکری کو اُس جانور کی گدی سے نکالوں گا۔ یہ سُن کر طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو منتخب کیا اور اُنہیں لشکر کی طرف بھیج دیا۔ حضرت داؤد اپنے راستہ میں ایک پتھر کے پاس سے گزرے' اُس پتھر نے ندا دی: اے داؤد! آپ مجھے اُٹھا لیں' میں حضرت ہارون علیہ السلام کا پتھر ہوں۔ حضرت داؤد نے اُس کو اٹھا لیا۔ پھر ایک اور پتھر کے پاس سے گزرے تو اُس نے کہا: اے داؤد! آپ مجھے اٹھا لیں' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر ہوں۔ حضرت داؤد نے اُس کو بھی اٹھا لیا۔ پھر ایک اور پتھر کے پاس سے گزرے تو اُس نے کہا: اے داؤد! مجھے اُٹھا لیں' کیونکہ میں ہی آپ کا وہ پتھر ہوں جس سے آپ جالوت کو قتل کریں گے۔ حضرت داؤد نے اُس کو بھی اُٹھا لیا' اور تینوں پتھروں کو اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ پھر طالوت لشکر میں آیا' اُس میں حضرت داؤد بھی موجود تھے اور دونوں لشکروں نے لڑائی کے لیے صف بندی کر لی تو جالوت اپنے لشکر سے نکل کر سامنے آیا اور اُس نے اپنا مقابل طلب کیا تو حضرت داؤد نے اُس کا جواب دیا۔ پھر طالوت نے حضرت داؤد کو گھوڑا اور اسلحہ دیا۔ اُنہوں نے ہتھیار پہن لیے اور گھوڑے پر سوار ہو گئے اور جالوت کے قریب پہنچ کر پھر طالوت کے پاس لوٹ آئے۔ یہ دیکھ کر پیچھے والوں نے کہا کہ لڑکا بزدل ہو گیا۔ حضرت داؤد طالوت کے پاس آ کر رُک گئے۔ طالوت نے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: اگر میرے رب کی مدد میرے شامل حال نہ ہو تو (تمہارے دیئے

ہوئے) یہ ہتھیار مجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتے اور اگر رب کی مدد میرے ہاتھ ہو تو پھر مجھے ان ہتھیاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اپنی مرضی کے مطابق لڑنے دو۔ طالوت نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر حضرت داؤد نے اپنا تھیلا لیا اور ہار کی طرف گلے میں ڈال لیا اور پتھر پھینکنے کا گوپھیا اپنے ہاتھ میں لے کر جالوت کی طرف چل پڑے۔ جالوت تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخت اور طاقت ور تھا' اور پورے پورے لشکروں کو تن تنہا شکست دے دیا کرتا تھا' اُس نے لوہے کا ایک خود پہنا ہوا تھا جس کا وزن تین سو رطل تھا۔ جب اُس نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے دل میں رعب ڈال دیا۔ اُس نے حضرت داؤد سے کہا: کیا تم مجھ سے مقابلہ کرو گے؟ حضرت داؤد نے کہا: ہاں! اُس وقت جالوت چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا اور مکمل ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اُس نے حضرت داؤد سے کہا: کیا تم میرے پاس گوپھیا اور پتھر لے کر آئے ہو جس طرح کتے کے پاس لایا جاتا ہے؟ حضرت داؤد نے کہا: ہاں! اور تو کتے سے بھی بدتر ہے۔ جالوت نے کہا: میں قسم کھا کر یہ بات کہتا ہوں کہ میں تمہارے گوشت کو زمین کے درندوں اور آسمان کے پرندوں کے درمیان تقسیم کروں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے گوشت کو تقسیم کرے گا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: ابراہیم کے معبود کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے ایک پتھر نکالا۔ پھر کہا: اسحٰق کے معبود کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر دوسرا پتھر نکالا' پھر کہا: یعقوب کے معبود کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر تیسرا پتھر نکالا اور تینوں پتھروں کو گوپھیے میں رکھ دیا۔ اندر جا کر تینوں پتھر ایک پتھر بن گئے۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے گوپھیے کو گھمایا اور اس کے ذریعہ جالوت پر پتھر پھینکا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ہوا کو مسخر اور تابع بنا دیا۔ ہوا پتھر کو لے گئی یہاں تک کہ وہ خود کے اوپری حصہ پر جا کر لگا اور وہاں سے جالوت کے دماغ میں پہنچ کر اُس کی گُدی سے نکل گیا اور جالوت کے پیچھے اُس نے تیس افراد کو قتل کر ڈالا اور خود جالوت قتل ہو کر گر پڑا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُس کو پکڑا اور کھینچتے ہوئے اُسے طالوت کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ بنی اسرائیل اس سے بے پناہ خوش ہوئے اور اللہ عزوجل نے دشمن کے لشکر کو شکست دے دی۔ اس کے بعد طالوت اور اس کے ساتھ کے تمام لوگ شہر کی طرف سلامتی کے ساتھ اور مالِ غنیمت لے کر لوٹے' اور لوگ آپس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرنے لگے۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام طالوت کے پاس آئے اور اُس سے کہا کہ تم نے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرو۔ اُس نے کہا: کیا آپ بغیر مہر کے بادشاہ کی بیٹی کو چاہتے ہیں؟ حضرت داؤد نے کہا: تم نے مہر کی شرط نہیں لگائی تھی اور نہ ہی میرے پاس کوئی چیز ہے۔ طالوت نے کہا: میں آپ کو صرف اتنا ہی مکلّف کروں گا جتنی آپ طاقت رکھتے ہیں۔ آپ جرأت مند آدمی ہیں' ہمیں کچھ دشمنوں کا سامنا ہے اُن کے پاس ہمارے غلاف ہیں۔ اگر آپ اُن میں سے دو سو افراد کو قتل کر دیں اور میرے پاس غلاف لے آئیں تو میں اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دے دوں گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام دشمنوں کی طرف گئے اور اُن سے جنگ شروع کی۔ جوں ہی آپ کسی فرد کو قتل کرتے تو فوراً اُس کے غلاف کو ایک دھاگے میں پرو لیتے یہاں تک کہ دو سو غلاف اُنہوں نے پرو لیے اور اُنہیں طالوت کے پاس لا کر اُس کے سامنے ڈال دیئے۔ اور طالوت سے کہا کہ مجھے میری عورت دے دو۔ طالوت نے اپنی بیٹی حضرت داؤد کے نکاح میں دے دی اور اپنی سلطنت میں حضرت داؤد کے نام کی مُہر جاری کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف مائل ہو گئے' اُن سے محبت اور کثرت سے اُن کے تذکرے کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالوت کو حضرت داؤد سے حسد ہو گیا اور اُس نے حضرت داؤد کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک شخص جس کو ''ذوالعینین'' کہا جاتا تھا اُس نے یہ بات طالوت کی بیٹی (یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کی زوجہ) کو بتا دی' اُس نے حضرت داؤد کو بتا دی اور اُن سے کہا کہ آج رات آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا کہ کون مجھے قتل کرے گا؟ اُس نے کہا: میرا باپ (طالوت) آپ کو قتل کرے گا۔

''رطل'' وزن کرنے کے ایک مخصوص پیمانہ کو کہتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں علی العموم ایک رطل سے ۱۲۸ درہم کا وزن مراد لیتے ہیں۔

حضرت داوٗد نے پوچھا: کیا میں نے کوئی ایسا جرم کر دیا ہے جو قتل کا باعث ہو؟ اُس نے کہا کہ مجھے آپ کے قتل کی بات ایک ایسے شخص نے بتائی ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ اور جب آپ اس خبر کی سچائی دیکھ لیں تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس رات کہیں غائب ہو جائیں۔ حضرت داوٗد نے کہا کہ اگر اس بات کا ارادہ اللہ عزوجل نے فرمالیا ہے تو پھر میں نکل نہیں سکتا' لہٰذا تم شراب کا ایک مشکیزہ لے آؤ۔ وہ شراب کا مشکیزہ لے کر آئی اور اُس نے اُس مشکیزہ کو حضرت داوٗد کے تخت پر اُس جگہ رکھ دیا جہاں وہ لیٹتے تھے اور اُسے ڈھک دیا۔ حضرت داوٗد علیہ السلام تخت کے نیچے چلے گئے۔ جب آدھی رات ہوئی تو طالوت گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیٹی سے پوچھا: تیرا شوہر کہاں ہے؟ اُس نے کہا کہ وہ اپنے تخت پر سو رہے ہیں۔ طالوت نے اُس پر اپنی تلوار ماری تو شراب بہ پڑی۔ جب طالوت کو شراب کی بو آئی تو اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ داوٗد پر رحم فرمائے' وہ کس قدر شراب پیتے تھے۔ یہ کہہ کر وہ گھر سے چلا گیا۔ جب صبح ہوئی تو اُسے پتا چلا کہ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ تو اس نے کہا کہ جس شخص سے میں نے اپنا مطلب پورا کرنا چاہا تھا وہ یقیناً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مجھ سے انتقام لینے تک میرے پیچھے پڑا رہے۔ (یعنی اب حضرت داوٗد ہمیشہ میرے دشمن رہیں گے۔) اس خیال کے آتے ہی اُس نے بہت سخت روپوشی اور حفاظت اختیار کر لی اور اپنے تمام دروازے بند کر دیئے۔ پھر حضرت داوٗد علیہ السلام رات میں طالوت کے پاس اُس وقت آئے جبکہ لوگوں کی آنکھیں پرسکون ہو چکی تھیں' اللہ تعالیٰ نے حجابات اُن کے لیے اٹھا دیئے اور وہ دروازے کھول کر طالوت کے پاس جا پہنچے' طالوت اپنے بستر پر سویا ہوا تھا۔ حضرت داوٗد نے ایک تیر اس کے سرہانے' ایک تیر اس کی پائنتی پر' ایک تیر اُس کی دائیں جانب اور ایک تیر اس کی بائیں جانب رکھ دیا اور واپس چلے گئے۔ جب طالوت بیدار ہوا اور اُس نے تیر دیکھے تو اُن کو پہچان گیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ داوٗد پر رحمت فرمائے' وہ مجھ سے زیادہ بہتر آدمی ہیں کیونکہ جب میں اُن تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو میں نے اُن کو قتل کرنے کا ارادہ کیا اور وہ جب مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو اُنہوں نے مجھے قتل نہیں کیا' حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان تیروں کو میرے گلے میں لگاتے اور میں ان سے اپنا بچاؤ بھی نہ کر پاتا۔ پھر جب اگلی رات آئی تو حضرت داوٗد علیہ السلام دوبارہ طالوت کے پاس آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے حجابات اٹھا دیئے اور وہ طالوت کے پاس جا پہنچے۔ طالوت سویا ہوا تھا' آپ نے اُس کے وضو کا لوٹا اور اس کے پانی پینے کا پیالہ لے لیا' اور چند بال اُس کی ڈاڑھی کے اور کپڑے کے کنارے کا کچھ حصہ کاٹ لیا۔ اُس کے بعد وہاں سے نکل کر چھپ گئے۔ جب صبح طالوت بیدار ہوا اور اُس نے یہ منظر دیکھا تو اُس نے حضرت داوٗد کے لیے جاسوس مقرر کیے اور بہت زیادہ اُن کو تلاش کیا لیکن وہ اُن کو تلاش نہ کر سکا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ طالوت اپنی سواری پر کہیں جا رہا تھا کہ ایک جگہ اُسے حضرت داوٗد علیہ السلام پیدل چلتے ہوئے مل گئے۔ طالوت نے کہا کہ آج میں داوٗد کو قتل کر دوں گا۔ یہ کہہ کر اُس نے حضرت داوٗد کے پیچھے دوڑ لگائی۔ حضرت داوٗد علیہ السلام بھی تیز دوڑنے لگے اور جب گھبراہٹ کی وجہ سے انہیں کوئی جگہ نہیں ملی تو وہ ایک غار میں چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مکڑی کی طرف وحی فرمائی کہ وہ غار پر جالا بُن دے۔ جب طالوت غار کے پاس پہنچے اور مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے لگا کہ اگر داوٗد یہاں داخل ہوئے ہوتے تو یہ جالا سلامت نہ رہتا۔ یہ سوچ کر طالوت چلا گیا اور اُس نے اُن کو چھوڑ دیا۔ حضرت داوٗد علیہ السلام غار سے نکلے اور چلتے چلتے عبادت گزار لوگوں کے پہاڑ پہ پہنچے' وہاں آپ نے اُن کے ساتھ عبادت کی۔ دوسری طرف علماء اور عبادت گزار لوگ حضرت داوٗد کے معاملہ میں طالوت کو مطعون کرنے لگے۔ طالوت نے یہ کیا کہ جو بھی اُسے حضرت داوٗد کے قتل سے منع کرتا طالوت اُس کو قتل کر دیتا۔ یوں اُس نے کثیر تعداد میں علماء اور عبادت گزار افراد کو قتل کر دیا' یہاں تک کہ قتل کا معاملہ اُس عورت تک جا پہنچا جو کہ اسم اعظم جانتی تھی۔ طالوت نے جب اپنے نان بائی کو عورت کے قتل کا آرڈر دیا تو نان بائی کو رحم آ گیا اور اُس نے قتل نہیں کیا اور یہ کہہ کر اُسے چھوڑ دیا کہ شاید ہمیں کسی عالم کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کے بعد طالوت کے دل میں اپنے کام سے توبہ کرنے اور اُس پر نادم ہونے کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ گریہ وزاری میں

مشغول ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں کو اُس پر رحم آنے لگا۔ اُس کا معمول یہ بن گیا کہ وہ ہر رات قبرستان جایا کرتا تھا اور وہاں رویا کرتا تھا اور یوں پکارا کرتا تھا کہ جس شخص کو یہ علم ہو کہ میں توبہ کر سکتا ہوں' اُسے میں قسم دے کر کہتا ہوں کہ وہ مجھے توبہ کے بارے میں بتا دے۔ جب اس کی یہ پکار بہت زیادہ ہو گئی تو قبروں میں سے کسی ندا دینے والے نے ندا دی: اے طالوت! کیا تو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ہمیں قتل کر دے تا کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمیں تیری جانب سے اذیت پہنچے؟ طالوت یہ جملہ سن کر مزید غم گین ہو گیا اور رونے لگا۔ جب نان بائی نے طالوت کی یہ حالت دیکھی تو وہ اس کے پاس آیا اور پوچھا کہ عالی جاہ! کیا معاملہ ہے؟ طالوت نے اُسے اپنا حال سُنایا اور کہا کہ کیا تمہیں میری توبہ کا علم ہے؟ یا تم روئے زمین پر کسی ایسے عالم کو جانتے ہو جس سے میں اپنی توبہ کے بارے میں سوال کروں؟ نان بائی نے جواب دیا کہ عالی جاہ! اگر میں کسی عالم کا پتا آپ کو بتاؤں گا تو ممکن ہے کہ آپ اُس کو قتل کر دیں۔ طالوت نے کہا: نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔ نان بائی نے طالوت سے اس بات پر قسم لی اور پھر اُسے بتایا کہ وہ بیمار عورت جو کہ میرے پاس ہے (وہ تمہیں توبہ کا بتا سکتی ہے)۔ طالوت نے کہا کہ مجھے اُس کے پاس لے چلو تا کہ میں اپنی توبہ کے بارے میں اُس سے دریافت کروں۔ نان بائی اُسے عورت کے پاس لے گیا۔ جب دونوں دروازے کے پاس پہنچے تو نان بائی نے کہا کہ عالی جاہ! وہ عورت جب آپ کو دیکھے گی تو خوف زدہ ہو جائے گی۔ اس لیے آپ میرے پیچھے پیچھے آیئے۔ جب دونوں عورت کے پاس پہنچے تو نان بائی نے عورت سے کہا: کیا تو نہیں جانتی جو میرا تجھ پر حق ہے؟ عورت نے کہا: کیوں نہیں! نان بائی نے کہا کہ مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ کیا تو اُسے کرے گی؟ عورت نے کہا: ہاں! نان بائی نے کہا کہ یہ طالوت ہے' تیرے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا ہے کہ آیا اُس کے لیے توبہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟ عورت نے جب طالوت کا تذکرہ سُنا تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے کہا کہ خدا کی قسم! مجھے طالوت کی توبہ کا علم نہیں ہے۔ البتہ تم مجھے نبی کی قبر پر لے چلو۔ چنانچہ لوگ اُس کو حضرت اِشْمَوِیل علیہ السلام کی قبر پر لے گئے۔ وہ وہاں کھڑی دُعا کرتی رہی' اُسے اسم اعظم کا بھی علم تھا۔ پھر اُس نے صاحبِ قبر کو پکارا تو حضرت اشمویل علیہ السلام اپنے سر سے مٹی جھاڑتے ہوئے قبر سے نکل آئے۔ اُنہوں نے جب اپنے پاس تین افراد کو دیکھا تو فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا؟ کیا قیامت آ چکی ہے؟ عورت نے کہا کہ نہیں قیامت نہیں آئی۔ البتہ یہ طالوت ہے' آپ سے یہ پوچھنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہے کہ آیا اُس کے لیے توبہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟ حضرت اشمویل علیہ السلام نے فرمایا: اے طالوت! تو نے میرے بعد کیا کیا؟ طالوت نے کہا کہ کوئی برائی ایسی نہیں ہے جس کو میں نے نہ کیا ہو۔ اب میں توبہ کی طلب میں حاضر ہوا ہوں۔ حضرت اشمویل نے فرمایا: تمہاری اولاد کتنی ہے؟ طالوت نے کہا کہ میرے دس لڑکے ہیں۔ حضرت اشمویل نے فرمایا کہ میں تو تمہاری توبہ صرف اسی بات کو سمجھتا ہوں کہ تم اپنی سلطنت سے علیحدہ ہو کر اپنے لڑکوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں نکل جاؤ اور تم جہاد کرو' پھر تمہارے لڑکے آگے بڑھیں یہاں تک کہ وہ تمہارے سامنے قتل ہو جائیں' پھر تم قتال کرو یہاں تک کہ اُن کے بعد تم بھی قتل ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر حضرت اشمویل علیہ السلام اپنی قبر میں واپس چلے گئے' اور طالوت بہت غم زدہ ہو کر واپس لوٹ گیا' غمزدہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اُسے اس بات کا ڈر تھا کہ اُس کے بیٹے اس کے ارادہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ وہ روتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکیں جھڑ گئیں اور اس کا جسم کمزور ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے لڑکوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ مجھے بتاؤ اگر مجھے آگ میں ڈالا جائے تو کیا تم لوگ مجھے اُس سے بچاؤ گے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! جس طرح ممکن ہوگا ہم آپ کو بچائیں گے۔ طالوت نے کہا: میں تمہیں ایک حکم دیتا ہوں' اگر تم لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا تو یہ میرے لیے ''آگ'' ہے۔ بیٹوں نے کہا کہ آپ اپنا ارادہ اور خواہش ہمارے سامنے پیش کریں۔ طالوت نے سارا واقعہ اُنہیں بتا دیا۔ بیٹوں نے ساری بات سُن کر کہا: کیا واقعی آپ کو قتل کر دیا جائے گا؟ طالوت نے کہا: ہاں۔ بیٹوں نے کہا کہ آپ کے بعد جینا پھر ہمارے لیے بیکار ہے۔ لہٰذا جو آپ چاہتے ہیں اُس کے لیے ہم خوش دلی سے تیار ہیں۔

جب طالوت نے یہ جواب سنا تو وہ بھی تیار ہو گیا اور اس کے لڑکے بھی تیار ہو گئے' اور طالوت اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکل پڑا۔ پھر اُس کے لڑکے آگے بڑھے اور انہوں نے جہاد کیا یہاں تک کہ وہ سب قتل ہو گئے۔ پھر طالوت نے دشمن پر حملہ کیا اور لڑائی کی یہاں تک کہ وہ بھی قتل ہو گیا۔ پھر طالوت کا قاتل حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آیا اور اُنہیں طالوت کے قتل کی خوش خبری سنائی اور کہا کہ آپ کا دشمن قتل ہو چکا ہے۔ حضرت داؤد نے فرمایا کہ تم بھی اُس کے بعد بچنے والے نہیں ہو۔ یہ کہہ کر آپ نے اُسے قتل کر دیا۔ طالوت کے قتل ہونے تک کی جو کل مدت سلطنت ہے وہ چالیس سال ہے۔ طالوت کے بعد بنی اسرائیل حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے اور اُنہیں اپنا بادشاہ بنا دیا اور طالوت کے خزانے اُنہیں دے دیئے۔ کلبی اور ضحاک کا قول ہے کہ جالوت کے قتل ہونے کے بعد سات سال تک حضرت داؤد علیہ السلام حاکم رہے' اور سوائے حضرت داؤد علیہ السلام کے کسی ایک حاکم پر بنی اسرائیل کبھی متفق نہیں ہوئے۔

''حکمت'' اور ''علّمه ممّا یشاء'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

فرمایا: اللہ نے اُنہیں بادشاہت اور حکمت عطا فرمائی۔ اس میں ﴿الْحِكْمَةَ﴾ سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہت اور نبوت دونوں کا جامع بنایا' اُن سے پہلے ایسا نہیں تھا بلکہ نبوت ایک الگ خاندان میں تھی اور بادشاہت الگ خاندان میں تھی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حکمت'' سے مراد وہ علم ہے جس کے ساتھ عمل بھی ہو۔

آگے جو فرمایا: ﴿وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ﴾ ''اُنہیں جو چاہا سکھا دیا'' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو زرہیں بنانے کا فن سکھایا۔ وہ زرہیں بنا کر فروخت کیا کرتے تھے اور صرف اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی زبان کا علم عطا فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اُنہیں زبور سکھائی اور بعض کا قول یہ ہے کہ آیت میں جس چیز کے سکھانے کا تذکرہ ہو رہا ہے اُس سے مراد اچھی اور سُریلی آواز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں کسی کو حضرت داؤد علیہ السلام جیسی آواز عطا نہیں فرمائی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام جب زبور کی تلاوت فرماتے تھے تو جانور آپ کے اتنے قریب آ جایا کرتے تھے کہ اُن کی گردن سے اُنہیں پکڑ لیا جائے۔ پرندوں کا حال یہ ہوتا تھا کہ وہ جھک کر اُن کے لیے سایہ فگن ہو جاتے تھے' بہتا پانی ٹھہر جاتا تھا اور چلتی ہوائیں رُک جاتی تھیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ملک کی سیاست اور اس کی حفاظت کا علم عطا فرمایا۔ کیونکہ وہ کسی شاہی خاندان کے فرد نہیں تھے کہ اپنے آباء واجداد سے بادشاہت کا طریقہ سیکھ لیتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ایک زنجیر عطا فرمائی' وہ گھر کی شہتیر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اُس کا کنارہ اُن کی عبادت گاہ میں تھا' اُس کی قوت لوہے کی طرح اور رنگت آگ کی طرح تھی۔ اُس کے حلقے گول تھے' فاصلہ فاصلہ سے قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے اور پوری زنجیر نمناک موتی کی لڑی میں پروئی ہوئی تھی۔ ہوا میں کوئی بھی واقعہ پیش آتا تو زنجیر بجنے لگتی تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام اُس واقعہ کو جان لیتے تھے۔ اُس زنجیر کو کسی بھی قسم کا آفت زدہ شخص ہاتھ لگاتا تو وہ تندرست ہو جاتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد لوگ اُسی زنجیر سے فیصلہ کرواتے تھے' یہاں تک کہ وہ زنجیر اُٹھالی گئی۔ لوگوں کا معمول یہ تھا کہ جو شخص بھی اپنے کسی ساتھی کے ساتھ زیادتی کرتا یا اُس کے حق کی ادائیگی سے انکار کرتا تو دونوں زنجیر کے پاس آتے۔ جو سچا ہوتا تھا وہ جب زنجیر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا تو ہاتھ اُس تک پہنچ جاتا اور جو جھوٹا ہوتا اُس کا ہاتھ نہ پہنچتا۔ اسی طرح معاملہ چلتا رہا یہاں تک کہ لوگ مکروفریب اور بدنیتی کا شکار ہو گئے۔ ہمیں یہ خبر پہنچی کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے کسی شخص کے پاس امانت کے طور پر ایک قیمتی پتھر رکھوایا۔ جب اُس سے واپس مانگا تو اُس نے امانت کا انکار کر دیا۔ دونوں اپنا جھگڑا لے کر زنجیر کے پاس پہنچے۔ جس شخص کے پاس پتھر رکھوایا گیا تھا اُس نے ایک ڈنڈا لیا اور اُس میں سوراخ کر کے امانت کے پتھر کو اندر ڈال دیا اور اس کے سہارے چلنے لگا' یہاں تک کہ دونوں زنجیر کے

پاس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر پتھر والے نے اپنی امانت کا مطالبہ کیا۔ دوسرے نے کہا: مجھے نہیں معلوم کہ میرے پاس تمہاری کون سی امانت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھاؤ۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے زنجیر کو پکڑ لیا اور منکر سے کہا کہ تو بھی کھڑے ہو کر زنجیر پکڑ۔ اُس نے پتھر والے سے کہا کہ تم میرا عصا پکڑ لو۔ چنانچہ پتھر والے نے عصا پکڑ لیا اور منکر نے زنجیر کے پاس کھڑے ہو کر کہا: اے اللہ! جس امانت کا یہ شخص دعویٰ کر رہا ہے اگر تیرے علم کے مطابق وہ چیز اس تک پہنچ چکی ہے تو زنجیر کو مجھ سے قریب کر دے۔ چنانچہ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور زنجیر کو پکڑ لیا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی اور شک میں مبتلا ہو گئے۔ جب اگلے دن صبح کو لوگ اٹھے تو (دیکھا کہ) اللہ عزوجل نے اُس زنجیر کو اٹھا لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ایک دوسرے کی وجہ سے بچانا

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ ﴾ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کی وجہ سے نہ بچاتا تو ضرور زمین تباہ ہو جاتی' اس میں ''بعض'' سے مؤمن اور فرمانبردار لوگ مراد ہیں۔ اور ''بعضھم'' سے کفار اور نافرمان لوگ مراد ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور اہل اطاعت کی وجہ سے کفار اور نافرمانوں کو نہ بچاتا تو زمین تباہ ہو جاتی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لشکر کی وجہ سے لوگوں کو نہ بچاتا تو مشرکین پوری زمین پر چھا جاتے اور اہل ایمان کو قتل کرتے' مساجد اور دیگر شہروں کو ویران کر دیتے۔ بعض مفسرین نے آیت کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور نیک لوگوں کی وجہ سے کفار اور نافرمانوں کو نہ بچاتا تو زمین تباہ ہو جاتی۔ زمین کے تباہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ زمین میں جو لوگ موجود ہیں زمین اُن تمام سمیت ہلاک اور تباہ ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ مؤمن کی وجہ سے کافر کو اور نیک کی وجہ سے گناہگار کو بچاتا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵۵) بے شک اللہ تعالیٰ نیک مسلمان کی وجہ سے اس کے قرب وجوار میں بسنے والے سو گھرانوں سے مصیبت کو دور فرما دیتا ہے[۶۴۳] پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: ''**ولو لا دفع الله بعضهم ببعض لفسدت الارض**'' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کی وجہ سے نہ بچاتا تو ضرور زمین تباہ ہو جاتی۔

(جمع الجوامع للسیوطی: ۵۴۵۱' کنز العمال: ۳۴۶۵۴' در منثور ج ۱ ص ۳۲' الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۶۳)

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ لیکن اللہ تمام جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ طریقہ سے جو فساد کو دور کیا ہے وہ اُس کی ایسی نعمت اور مہربانی ہے جو کہ سب کے لیے ہے۔

> تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ پر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں' اور بے شک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ ﴾ سے مراد وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے۔ مثلاً گھروں سے نکلنے والے ہزاروں افراد کا قصہ' اُن پر موت کا مسلط کیا جانا اور پھر اُن کو زندہ کیا جانا' طالوت کا بادشاہ بنایا جانا اور علامت یعنی تابوت کے ذریعہ بادشاہت کا اظہار کرنا اور ایک بچہ کے ہاتھوں متکبرین کو ہلاک کرنا۔

---

[۶۴۳] اس میں اللہ عزوجل کے نیک بندوں کے قُرب کی فضیلت' اُن سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا مقام اور حصول فیض کے لیے اُن کے پاس جانے کا ثبوت ہے۔

آیت میں جو ﴿حق﴾ کا لفظ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہم مذکورہ واقعات کو آپ پر اس یقین کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں کہ اُس میں اہلِ کتاب کو شک نہیں ہوسکتا' کیونکہ یہ باتیں اُن کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ چونکہ کسی کتاب سے پڑھے بغیر اور کسی خبر کو سماعت کیے بغیر عجیب وغریب باتیں اور پرانے واقعات بیان کرتے ہیں' اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ رسولوں میں سے ہیں اور جو کچھ آپ لوگوں کو بتاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے' ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کسی کو (بے شمار) درجات کی بلندی عطا فرمائی' اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن معجزات دیئے اور روح القدس (یعنی جبریل امین) کے ذریعہ ان کو تقویت دی' اور اگر اللہ چاہتا تو ان (رسولوں) کے بعد والے روشن دلیلیں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے' لیکن انہوں نے اختلاف کیا' یعنی کچھ ایمان پر قائم رہے اور کچھ کافر رہے' اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں لڑائی نہ کرتے' لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہےO

بعض انبیاء کرام کی بعض سے افضلیت

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یعنی رسولوں کی جس جماعت کا تذکرہ اس سورت میں گزرا ہے اس میں بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ تمام رسول چونکہ وصفِ رسالت میں برابر ہیں اس لیے فضیلت میں بھی برابر ہیں' اُن کے شبہ کا ازالہ اس آیت میں موجود ہے۔ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعض انبیاء کرام بعض سے افضل ہیں' اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں' کیونکہ آپ سب کے رسول ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا. 　　ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا: ۲۸)

نبی اکرم ﷺ کا تمام انبیاء سے افضل ہونا

آیتِ مبارکہ میں ﴿مِنْهُمْ﴾ سے مراد ہے: اُن رسولوں میں سے۔ اور ﴿مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ سے مراد سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہیں (یعنی رسولوں میں سے حضرت موسیٰ سے اللہ نے کلام فرمایا)۔ آگے جو فرمایا: ﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ ''کسی کو بے شمار درجات کی بلندی عطا فرمائی'' اس سے مراد سیدنا محمد ﷺ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے منصب اور مرتبہ کو تمام انبیاء پر اس طرح بلند فرمایا کہ آپ کو واضح نشانیاں اور معجزات دے کر اُن پر فضیلت عطا فرمائی۔ جس نبی کو بھی جو نشانی یا معجزہ دیا گیا ہے اُس کی مثل ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کو ضرور دیا گیا ہے۔ بلکہ سیدنا محمد ﷺ کو دیگر کئی معجزات اور نشانیوں کے ذریعہ انبیاء

کرام پر فضیلت دی گئی ہے۔ مثلاً اشارہ سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا' آپ کی جدائی کے غم میں درخت کے تنے کا رونا' پتھر اور درختوں کا آپ کو سلام کرنا' جانوروں کا آپ کے ساتھ گفتگو کرنا' انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا۔ اور اس طرح کی کئی نشانیاں اور معجزات ہیں جن کی تعداد بے شمار اور لامحدود ہے۔ آپ کے معجزات میں جو سب سے زیادہ عظیم اور روشن معجزہ ہے وہ قرآن کریم ہے' جس نے زمین والوں کو اپنے مقابلہ سے اور اپنی مثل لانے سے عاجز کر دیا' اور یہ ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔

نبی اکرم ﷺ کی افضلیت احادیث کی روشنی میں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵۶) ہر نبی کو اسی قدر معجزات دیئے گئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لے آئیں' اور یہ صرف میری خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا کلام بہ طور معجزہ عطا فرمایا اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔

(صحیح بخاری:۴۹۸۱' صحیح مسلم:۱۵۲' شرح السنہ:۳۶۱۵)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵۷) مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں[۶۴۴] (۱) ایک مہینہ کی مسافت تک میرا رُعب طاری کر کے میری مدد کی گئی ہے[۶۴۵] (۲) پوری زمین کو میرے لیے عبادت کی جگہ اور پاکیزہ بنا دیا گیا ہے' لہٰذا میرا جو امتی بھی نماز کا وقت پالے وہ نماز پڑھ لے۔ (۳) میرے لیے مالِ غنیمت بھی حلال کر دیا گیا۔ جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے یہ حلال نہیں تھا۔ (۴) مجھے منصبِ شفاعت عطا کیا گیا۔ (۵) پہلے انبیاء کو صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا' جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہے۔ (صحیح بخاری:۳۳۵' صحیح مسلم:۵۲۱' سنن نسائی:۴۳۲' صحیح ابن حبان:۶۳۹۸' سنن بیہقی ج۱ص۲۱۲' مسند احمد ج۳ص۳۰۴' مشکوٰۃ المصابیح:۵۷۴۷۔ص۵۱۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵۸) مجھے چھ چیزوں کے ذریعہ انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ (۱) مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے ہیں[۶۴۶] (۲) میرا رعب طاری کر کے میری مدد کی گئی ہے۔ (۳) میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کیا گیا ہے۔ (۴) پوری زمین کو میرے لیے عبادت کی جگہ اور پاکیزہ بنا دیا گیا ہے۔ (۵) مجھے تمام مخلوق کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (۶) مجھے تمام انبیاء میں آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

(صحیح مسلم:۵۲۳' سنن ترمذی:۱۵۵۳' سنن بیہقی ج۲ص۴۳۳' مسند احمد ج۲ص۴۱۲' مشکوٰۃ المصابیح:۵۷۴۸۔ص۵۱۲)

زیر بحث آیت میں نبی اکرم ﷺ کا نام مبارک ذکر نہ کرنے کی توجیہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کا تذکرہ رمز اور اشارہ کے ساتھ کیوں کیا گیا اور وضاحت کے

۶۴۴ اس حدیث شریف میں پانچ خصوصیات کا ذکر ہے۔ جبکہ بعض احادیث میں چھ خصوصیات کا ذکر ہے اور بعض میں اس سے زائد خصوصیات کا ذکر ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ان روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی معیّن تعداد بیان کرنے سے حصر لازم نہیں آتا۔ (عمدۃ القاری ج۳ص۱۹۴)

۶۴۵ یعنی اگر میرا دشمن اور میرا مخالف ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار بھی مجھ سے دُور ہو تو اُس کے دل پر میری ہیبت چھا جاتی ہے۔ اگر وہ جنگ کرتا بھی ہے تو بہت دباؤ کے ساتھ اور مرعوب ہو کر جنگ کرتا ہے۔ (مراۃ المناجیح ج۸ص۲۸) یہاں ایک مہینہ کا ذکر بہ طور مثال ہے۔ مراد یہ ہے کہ دشمن بہت دور کے فاصلہ پر بھی مرعوب رہتا ہے۔

۶۴۶ ''جوامع الکلم'' اُن احادیث طیبہ کو کہا جاتا ہے جو الفاظ کے اعتبار سے مختصر ہوں لیکن اُن کا معنی و مفہوم بہت وسیع اور کشادہ ہو۔

ساتھ نام مبارک کیوں نہیں لیا گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہاں نبی اکرم ﷺ کے مقام کی عظمت اور آپ کی قدر و منزلت کی بلندی اسی میں ہے کہ آپ کے نام مبارک کو پوشیدہ رکھا جائے۔ کیونکہ اس میں اس بات کی گواہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا نام مبارک وہ نام ہے جو نہ تو کسی اور کے ساتھ مشتبہ ہوتا ہے اور نہ ہی (اس کی طرف ذہن کا سبقت کرنا) دشوار ہوتا ہے۔ یعنی مقام فضیلت میں جب کسی شخصیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے ذہن ''سرورِ کائنات'' ہی کی طرف سبقت کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی کام کیا ہو اور (جب اس سے پوچھا جائے کہ یہ کام کس نے کیا تو) وہ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہے کہ تم ہی میں سے ایک آدمی نے کیا ہے۔ اس طرح کا کلام کسی چیز کو وضاحت سے بیان کرنے کی بہ نسبت زیادہ بلندی کا حامل ہوتا ہے۔ جیسے حطیئہ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ سب سے بڑے شاعر زہیر اور نابغہ ہیں۔ پھر کہا کہ اگر میں چاہتا تو ایک تیسرا نام بھی ذکر کر دیتا۔ اس سے اس کی مراد اپنی ذات تھی۔

آگے فرمایا: ہم نے عیسیٰ بن مریم کو ﴿بینات﴾ عطا فرمائیں یعنی وہ روشن دلائل، حجتیں اور واضح معجزات جو اُن کی نبوت کو ثابت کرنے والے تھے۔ مثلاً: مادرزاد اندھے اور برص زدہ آدمی کو شفا دینا اور مُردوں کو زندہ کرنا اور آگے جو فرمایا: ﴿وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اُن کو تقویت دی۔ یعنی جبریل نے ان کو جو ساتویں آسمان کے اُفق تک پہنچایا اس وقت تک وہ اُن کے ساتھ رہے۔

زیر بحث آیت میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ذکر کی توجیہ

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ آیت مبارکہ میں تمام انبیاء کرام میں سے صرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کا تذکرہ کیوں کیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں پیغمبروں کو عظیم نشانیاں اور روشن معجزات عطا کیے گئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فضیلت دینے کی وجہ آیت مبارکہ میں اس طرح بیان فرمائی ہے کہ کلام کرنے کو اس نے فضیلت قرار دیا' اور یہ ایک عظیم نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے کلام فرمائے۔ اسی طرح جبریل امین کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقویت بھی ایک عظیم نشانی ہے۔ سو جب حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کو عظیم نشانیاں عطا کی گئیں تو فضیلت کے بیان میں صرف ان ہی دو کا ذکر کیا گیا۔ لہٰذا اس بنیاد پر (یہ بات سمجھنی چاہیے کہ) ہر وہ نبی جو عظیم نشانیوں اور کثیر معجزات والا ہو وہ بہت فضیلت والا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ مقام و مرتبہ میں سب نبیوں پر سبقت لے گئے۔ کیونکہ تمام انبیاء میں آپ ہی کی نشانیاں سب سے زیادہ عظیم ہیں اور آپ ہی کے معجزات سب سے زیادہ ہیں۔ لہٰذا آپ ہی سب سے افضل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نبی پر اور تمام انبیاء کرام پر رحمتیں اور سلام نازل فرمائے۔

آیت میں ﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ کا معنیٰ ہے: اگر اللہ ارادہ فرماتا۔ مشیّت کا اصل معنیٰ ارادہ کرنا ہے۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ رسول جن کے اللہ نے اوصاف بیان کیے ان کے بعد والے لوگ نہ لڑتے۔ ﴿الْبَیِّنٰتُ﴾ سے وہ واضح دلیلیں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں اور اُن میں اُن لوگوں کے لیے بہت پابندی تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور توفیق عطا فرمائی تھی (خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ ارادہ فرماتا تو مذکورہ رسولوں کے بعد آنے والے لوگ اللہ کی طرف سے واضح دلیلیں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے)۔

﴿اخْتَلَفُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو (ذکر کردہ) رسولوں کے بعد آئے انہوں نے اختلاف کیا۔ ﴿مَّنْ اٰمَنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (ان میں کچھ ایسے تھے) جو اللہ عزوجل کے فضل سے اللہ اور اس کے رسول کو ماننے پر قائم رہے۔ اور ﴿مَّنْ كَفَرَ﴾

سے مراد یہ ہے کہ ان میں کچھ ایسے تھے جو دلیل کے قائم ہونے اور رسولوں کی تشریف آوری کے باوجود جان بوجھ کر کفر پر قائم رہے۔

خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ انہیں آپس میں لڑنے اور اختلاف کرنے سے روکنا چاہتا تو ضرور انہیں اس سے روک دیتا۔ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یعنی وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم اور مہربانی سے اپنی فرمانبرداری اور اپنی ذات پر ایمان کی توفیق عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عدل کے تقاضے سے بے مدد چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی ملکیت اور اس کے کام میں کوئی شخص اُس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

ایک شخص نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تقدیر کے بارے میں سوال کیا اور عرض کیا: اے امیر المؤمنین! مجھے تقدیر کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک تاریک راستہ ہے تم اس پر مت چلو۔ اُس نے دوبارہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا: یہ ایک گہرا سمندر ہے تم اس میں نہ اُترو۔ اُس نے دوبارہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ عزوجل کا راز ہے اس کو تم پر پوشیدہ رکھا گیا ہے لہٰذا تم اس کی کھوج نہ لگاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کچھ (ہماری راہ میں) خرچ کرلو اس سے پہلے کہ وہ دن آ پہنچے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی نہ (کافروں کے لیے) دوستی ہوگی اور نہ ہی (اُن کے لیے) کوئی سفارش ہوگی اور کفار تو خود ہی ظالم ہیں O

آیت مذکورہ کی تفسیر

اس آیت میں جو ﴿اَنْفِقُوْا﴾ فرمایا یعنی خرچ کرو اس کے بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ مراد ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے نفلی صدقہ اور دیگر نیک کاموں میں خرچ کرنا مراد ہے۔ آگے جو ﴿لَا بَيْعٌ فِيْهِ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی فدیہ نہیں ہوگا۔ چونکہ فدیہ دینے کا معنیٰ ہے: ہلاکت سے بچانے کے لیے جان کو خریدنا' اس لیے یہاں فدیہ کو ''بیع'' فرمایا گیا۔ آیتِ مبارکہ میں بتانا یہ مقصود ہے کہ آج ہی تم اپنے مال میں سے کچھ خرچ کر کے اپنے لیے آگے کا انتظام کرلو اس سے پہلے کہ وہ دن آ پہنچے جس میں کوئی تجارت نہیں ہوگی کہ جس کے سہارے انسان عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ کما سکے۔

آگے جو ﴿وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ فرمایا اس میں ''خُلَّة'' کا معنیٰ محبت اور دوستی ہے۔ یعنی قیامت کے دن نہ کوئی دوستی اور محبت ہوگی اور نہ ہی کوئی شفاعت ہوگی۔ اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی دوستی اور شفاعت کام نہیں آئے گی' جبکہ نصوص (آیات واحادیث) سے ثابت ہے کہ وہاں اہل ایمان کے درمیان محبت اور شفاعت ہوگی۔ اس لیے زیر بحث آیت عام مخصوص عنہ البعض ہوگی۔ یعنی کفار ومشرکین شفاعت سے محروم ہوں گے۔ آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (کفار ہی ظالم ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اُس کی عبادت کی جو عبادت کا اہل نہیں ہے (یعنی بتوں کی اور دیگر معبودانِ باطل کی عبادت کی)۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَاۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے وہ زندہ ہے (اور) سب کو زندہ رکھنے والا ہے اُسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے (سب) اُسی کی ملکیت ہے کون اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور شفاعت کر سکے گا؟ وہ تو لوگوں کے سامنے کی چیز کو بھی جانتا ہے اور بعد میں آنے والی چیز کو بھی جانتا ہے اور لوگ اُس کے علم میں سے صرف اتنا ہی حاصل کر سکتے ہیں جتنا وہ چاہے اُس کی کُرسی آسمانوں اور زمینوں کو حاوی ہے اُسے ان دونوں کی حفاظت تھکاتی نہیں ہے اور وہی بہت بُلند بڑی عظمت والا ہے O

آیت الکرسی کی فضیلت احادیث مبارکہ کی روشنی میں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر چیز کا ایک کوہان ہوتا ہے قرآن کریم کا کوہان سورۂ بقرہ ہے۔ اس سورت میں ایک ایسی آیت ہے جو قرآن مجید کی تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت الکرسی ہے۔[۶۴۷] (سنن ترمذی: ۲۸۷۸)

☆ اس حدیث کے چند الفاظ کی تشریح: (۱) ''سنام'' کسی بھی چیز کا جو بلند حصہ ہو وہ ''سنام'' کہلاتا ہے۔ یہاں سورۂ بقرہ کو اونٹ کے کوہان سے تشبیہ دیتے ہوئے ''سنام'' فرمایا گیا ہے اور مراد اس سے اس سورت کی تعظیم کو بیان کرنا ہے۔ (۲) ''سید'' قوم میں جو شخص فضیلت شرافت اور سخاوت والا ہو وہ ''سیّد'' کہلاتا ہے۔ ''سادیسود'' سے بنا ہے (بہ معنیٰ قیادت کرنا سردار ہونا)۔ یہاں آیت الکرسی کو جو سردار قرار دیا گیا اس سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیتوں میں سب سے افضل ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵۹) اے ابوالمنذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پاس اللہ کی جو کتاب ہے اس میں کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے کہا: ''اللہ لا الہ الا ھو الحیّ القیوم''۔ (یہ جواب سُن کر) نبی ﷺ نے میرے سینہ پر اپنا دستِ مبارک مارا اور فرمایا: اے ابوالمنذر! تمہیں یہ علم مبارک ہو۔[۶۴۸]

(صحیح مسلم: ۸۱۰، سنن ابوداؤد: ۱۴۶۰، شعب الایمان: ۲۳۸۷، المستدرک ج ۳ ص ۳۰۴، مسند احمد ج ۵ ص ۱۴۲، مشکوۃ المصابیح: ۲۱۲۲، ص ۱۸۵)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۶۰) رسول اللہ ﷺ ان کے پاس مہاجرین کے چبوترہ پر تشریف لائے تو آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ قرآن کریم میں کون سی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **''اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم''**۔ (سنن ابوداؤد: ۴۰۰۳)

علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیتوں میں سب سے عظیم آیت ہونے کی خصوصیت صرف آیۃ الکرسی کو اس لیے حاصل

[۶۴۷] یہ حدیث شریف سورۃ البقرہ کے آغاز میں رقم: ۳۷ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مزید حوالہ جات مع حاشیہ وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

[۶۴۸] اس میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عالم ہونے کی بشارت اور اُن کے مقام و مرتبہ کا بیان ہے اور ساتھ ہی اُن کے فضل و کمال میں برکت اور ترقی کی دُعا بھی ہے۔ (مرقات ج ۴ ص ۶۲۹)

ہے کہ یہ سورت اسماء اور صفات کے اُصول کی جامع ہے۔یعنی الٰہیت (عبادت کا مستحق ہونا)' وحدانیت (اکیلا ہونا)' حیات (زندہ رہنا)' علم (جاننے والا ہونا)' قیومیّت (دوسروں کو قائم رکھنے والا ہونا) مِلک (مالک ہونا)' قدرت (قادر ہونا) اور ارادہ۔اللہ عزوجل کے اسماء اور صفات میں یہ اُصول کہلاتے ہیں۔آیت الکرسی کے سب سے عظیم آیت ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جتنی چیزیں ذکر کی جاتی ہیں اُن میں سب سے عظمت والی چیز اللہ عزوجل کی ذات ہے۔پس جو سورت اُس عظیم ذات کی توحید اور تعظیم کے ذکر پر مشتمل ہوگی وہ تمام اذکار میں سب سے زیادہ عظیم سورت ہوگی۔

قرآن کریم کے بعض حصہ کو بعض پر فضیلت دینے کا جواز

جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کریم کے بعض حصہ کو بعض پر فضیلت دینا اور پورے قرآن کو اللہ کی تمام نازل کردہ کتابوں پر فضیلت دینا جائز ہے اُن کے لیے مذکورہ احادیث حجت اور دلیل ہیں۔جبکہ ایک جماعت اُن علماء کی بھی ہے جو قرآن کریم کے بعض حصہ کو بعض پر فضیلت دینے سے منع کرتے ہیں۔ان علماء میں امام ابوالحسن اشعری اور امام ابوبکر باقلّانی بھی شامل ہیں۔یہ دونوں فرماتے ہیں کہ ''اگر قرآن کریم کے ایک حصہ کو فضیلت دی جائے تو اس سے دوسرے کا نقص لازم آئے گا' جبکہ اللہ عزوجل کے کلام میں کوئی نقص نہیں ہے''۔احادیثِ مبارکہ میں جو اعظم اور افضل کے الفاظ آئے ہیں اُن کی تاویل ان علماء نے یہ کی ہے کہ یہ عظیم اور فاضل کے معنیٰ میں ہیں۔اس کے برعکس جن علماء و متکلمین نے قرآن کریم کے بعض حصہ کو بعض پر فضیلت دینے کو جائز قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سورت کے تلاوت کرنے والے کا اجر وثواب (دیگر سورتوں کی تلاوت کی بہ نسبت) زیادہ ہوتا ہے۔اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں آیت یا فلاں سورت زیادہ عظمت یا زیادہ فضیلت والی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔یہی قول مختار ہے اور یہی احادیث کا مفہوم ہے۔واللہ اعلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳٦۱) جس نے صبح کے وقت آیت الکرسی اور سورۃ المؤمن کی ابتدائی دو آیات (از حمٓ تا الیہ المصیر) تلاوت کیں تو وہ اس دن شام تک حفاظت میں رہے گا' اور جس نے شام کے وقت ان کو پڑھا وہ اُس رات صبح تک حفاظت میں رہے گا۔[٦۴۹]

(سنن ترمذی:۲۸۷۹'سنن دارمی:۳۳۸٦'شعب الایمان:۲۴۷۳'مشکوٰۃ المصابیح:۲۱۴۴۔ص۱۸۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

آیت الکرسی کی تفسیر اور ''الحیّ القیّوم'' کے معانی

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے سوا ہر ایک سے الٰہیت (استحقاقِ عبادت) کی نفی کی' پھر اپنی پاک اور بلند ذات کے لیے عبادت کا استحقاق ثابت کیا۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ: ''لا کریم الا زید'' زید کے سوا کوئی سخی نہیں ہے۔اس جملہ میں ''زیدٌ کریمٌ'' (زید سخی ہے) کہنے سے زیادہ معنویت ہے۔

آگے جو فرمایا: ﴿اَلْحَیُّ﴾ اس کا معنیٰ ہے: بغیر زوال کے ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا۔اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ ذات جو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ سے زندہ ہے۔ایسا قطعاً نہیں ہے کہ اُسے موت کے بعد حیات ملی ہو اور نہ ہی ایسا ہے کہ حیات کے بعد اُسے موت آئے۔جبکہ اُس کے سوا جو بھی زندہ ہے اُس پر موت اور عدم طاری ہوتا ہے۔لہٰذا اُس کی پاک اور بلند ذات کے سوا ہر چیز ختم ہونے والی ہے۔﴿اَلْقَیُّوْمُ﴾ کا معنیٰ ہے: ہر چیز کا ذمہ دار اور نگہبان۔اس سے مراد یہ ہے

٦۴۹ اس حدیث شریف میں صبح کے وقت سے مراد یہ ہے کہ نمازِ فجر سے پہلے یا نماز فجر کے بعد مذکورہ آیات پڑھی جائیں اور شام کے وقت سے مراد یہ ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد ان کو پڑھا جائے۔(مرقات ج۴ص ٦۵۸)

کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی پیدائش' اُن کے رزق اور اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرمانے والا ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ وہ جو بغیر زوال کے ہمیشہ سے قائم ہو اور ایسا موجود ہو کہ اُس پر تبدیلی نہ آسکے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جو ہر شخص کے اعمال کا نگہبان ہو۔ ''قیوم'' کا لفظ ''قیام'' سے ''فَیْعُوْلٌ'' کے وزن پر ہے' اور یہ اُس شخص کی صفت کے طور پر بولا جاتا ہے جو ہر چیز کا ذمہ دار اور منتظم ہو۔

اللہ تعالیٰ کا اُونگھ اور نیند سے پاک ہونا

﴿سِنَةٌ﴾ جسم کے ڈھیلے ہونے کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو نیند سے پہلے ہوتی ہے۔ اس کو ''نُعاس'' (یعنی اونگھ) کہا جاتا ہے۔ ''وَسْنَان'' اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو نینداور بیداری کی درمیانی کیفیت میں ہو۔ ''سِنَة'' کے مقابلہ میں ''نوم'' (یعنی نیند) اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو بوجھل ہوتی ہے اور عقل کو اور طاقت کو دور کر دیتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''سِنَة'' کا تعلق سر سے ہے' ''نعاس'' کا تعلق آنکھ سے ہے اور ''نوم'' کا تعلق دل سے ہے۔ یعنی ''سِنَة'' نیند کی ابتدائی شکل ہے' اور ﴿نَوْمٌ﴾ اُس بھاری پردے کو کہتے ہیں جو دل پر پڑتا ہے اور چیزوں کی پہچان میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نیند تو کجا اونگھ بھی نہیں آتی۔ کیونکہ نیند اور غفلت اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے' اس لیے کہ اس طرح کی چیزوں کا معنیٰ ہے: نہ جاننا۔ جو کہ ایک نقص اور کمزوری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمام خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ دوسرا یہ کہ نیند اور غفلت کا طاری ہونا ایک قسم کی تبدیلی ہے' اور اللہ تعالیٰ تبدیلی سے پاک ہے۔

(٣٦٢) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان پانچ باتیں بیان کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل نہ سوتا ہے اور نہ ہی سونا اُس کی شان کے لائق ہے۔ وہ میزان کے پلڑے نیچے کرتا ہے اور بُلند کرتا ہے۔ دن کے عمل سے پہلے رات کا عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کا عمل اُس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اُس کا پردہ نور کا ہے' ایک روایت میں ہے کہ اُس کا پردہ نار کا ہے۔ اگر وہ اپنے پردہ کو ہٹا دے تو اس کی ذات کی شعاعیں تا حد نگاہ تمام مخلوق کو جلا دیں۔ (صحیح مسلم: ۱۷۹' سنن ابن ماجہ: ۱۹۵' مسند احمد ج۴ص ۳۹۵' صحیح ابن حبان: ۲۶۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۹۱۔ ص۲۱)

امام نووی کی شرح مسلم سے حدیث مذکور: ٣٦٢ کی تشریح

شیخ محی الدین نووی علیہ الرحمۃ کی شرح مسلم سے حدیث مذکور کی شرح پیش خدمت ہے: (۱) حدیث مذکور میں فرمایا: ''ان اللہ لا ینام ولا ینبغی له ان ینام'' (بے شک اللہ عزوجل نہ سوتا ہے اور نہ ہی سونا اس کی شان کے لائق ہے)۔ اس سے یہ خبر دینا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے' اور سونا اُس کے حق میں ناممکن ہے۔ کیونکہ سونے کا مطلب ہے مستغرق ہو جانا اور عقل کا مغلوب ہو جانا' اور اس سے کسی چیز کو محسوس کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ (۲) ''یخفض القسط ویرفعه'' (وہ میزان کے پلڑے نیچے کرتا ہے اور اُنہیں بلند کرتا ہے)۔ ''قسط'' سے مراد وہ ترازو ہے جس کے ذریعہ عدل کیا جائے گا۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ بندوں کے جو اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں اُن کو میزان میں تولا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اُن اعمال کے ذریعہ میزان کو جھکائے گا اور بلند کرے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''قسط'' سے مراد وہ رزق ہے جو ہر مخلوق کا حصہ ہے۔ اس صورت میں جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے رزق کو تنگ فرما دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے کشادہ فرما دیتا ہے۔ (۳) ''یرفع الیه عمل اللیل قبل عمل النهار'' (رات کا عمل اُس کے پاس دن کے عمل سے پہلے پہنچ جاتا ہے)۔ یعنی نگہبانی کرنے والے جو فرشتے ہیں وہ بندوں کے رات کے اعمال کو رات کے ختم ہونے کے بعد دن کے آغاز میں اوپر لے جاتے ہیں' اور دن کے اعمال کو دن کے ختم ہونے کے بعد رات کے آغاز میں اوپر لے جاتے

ہیں۔(۴)''حجابه النور لو كشفه لأحرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصره من خلقه''(اُس کا حجاب نور کا ہے' اگر وہ اُسے ہٹادے تو اس کی ذات کی شعاعیں تا حد نگاہ تمام مخلوق کو جلادیں)۔اس جملہ میں ''سُبُحَاتٌ''''سُبْحَةٌ'' کی جمع ہے۔''سبحات وجهه'' کا معنیٰ ہے: اُس کی ذات کا نور' اُس کا جلال اور اُس کا جمال۔''حجاب'' کا لُغت میں اصل معنیٰ ہے: روکنا۔حجاب کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن اجسام کے لیے ہوتا ہے جن کی کوئی حد ہو۔جبکہ اللہ تعالیٰ جسم اور حد دونوں سے پاک ہے' لہٰذا یہاں حجاب سے مراد یہ لیں گے کہ ایسی چیز جو اس کے دیدار سے روکنے والی ہو۔دیدار سے روکنے والی چیز کو نور یا نار اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں عموماً ادراک سے مانع ہوتی ہیں۔''وجه'' سے مراد ذات ہے۔اور ''ما انتهى اليه بصره من خلقه'' سے تمام مخلوق مراد ہے۔کیونکہ اللہ عزوجل کا دیکھنا پوری کائنات کو محیط ہے۔''من خلقه'' میں جو ''مِنْ'' ہے وہ تبعیض کا نہیں ہے بلکہ بیانِ جنس کے لیے ہے۔پورے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ نور یا نار کا جو حجاب حائل ہے وہ اگر ہٹ جائے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر تجلّی فرمائے تو اس کی ذات کا جلال تمام مخلوق کو جلادے۔حدیث مذکور کی شرح میں امام نووی کا کلام ختم ہوا۔واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کے اونگھ اور نیند سے پاک ہونے کی تفسیر میں امام طبری کی دو روایات اور ان کا مفہوم

امام طبری نے ''لا تأخذه سنة ولا نوم'' کی تفسیر میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ سوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ فرشتوں کو حکم فرمایا کہ وہ تین دن تک موسیٰ علیہ السلام کو نہ سونے دیں۔چنانچہ فرشتوں نے ایسا ہی کیا۔پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے دو بوتلیں دیں۔حضرت موسیٰ نے وہ بوتلیں لے لیں۔پھر فرشتوں نے ان کو چھوڑ دیا اور تاکید کی کہ یہ دونوں بوتلیں ٹوٹنے نہ پائیں (تین دن مسلسل جاگنے کے بعد اب موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ تھی کہ) دونوں بوتلیں ایک ایک ہاتھ میں لے کر اونگھتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔یہاں تک کہ اُنہیں مکمل اونگھ آ گئی' جس کی وجہ سے انہوں نے دونوں بوتلوں کو آپس میں ٹکرا دیا اور وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔معمر کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک مثال تھی جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بیان فرمائی' پھر اُس نے فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔(جامع البیان للطبری زیر بحث آیت)

امام طبری نے یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۶۳) میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ حضرت موسیٰ کے دل میں خیال آیا کہ کیا اللہ تعالیٰ سوتا ہے؟ (اس کے بعد واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مذکورہ حدیث کے مطابق ہے)۔(جامع البیان للطبری زیر بحث آیت)

علماء فرماتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے جہلاء کی طرف سے تھا' جیسے ان لوگوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہمیں اللہ کی ذات دکھائیے۔حدیث کو اس معنیٰ میں اس لیے لیا جائے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ عزوجل کو سب سے زیادہ جانتے ہیں' لہٰذا مذکورہ سوال کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال قرار دینا جائز نہیں ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم

آگے فرمایا: ﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی شریک اور مخالف کے تمام چیزوں کا مالک ہے۔وہ سب کا خالق ہے اور سب اُس کے بندے اور اُس کی ملکیت میں ہیں۔

زیر بحث آیت میں ''من'' کی بجائے ''ما'' کا لفظ استعمال کرنے کی توجیہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ ''ما فی السموات'' کی بجائے ''من فی السموات'' کیوں نہیں فرمایا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب اُسی کا پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے۔ چونکہ تمام چیزوں میں اکثریت بے عقل چیزوں کی ہے اس لیے اکثر کو کُل کے قائم مقام ٹھہرایا گیا اور سب کے لیے ''ما'' کا لفظ فرمایا گیا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ کون اس کے اذن کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت کر سکے گا؟ اس میں ''اذن'' سے مراد حکم ہے۔ اور سوال کا جو انداز ہے وہ انکاری ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اُس کی بارگاہ میں کوئی شخص بھی اُس کے حکم اور ارادہ کے بغیر شفاعت نہیں کرے گا۔ چونکہ مشرکین یہ گمان رکھتے تھے کہ اُن کے بت اُن کی شفاعت کریں گے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اُس کی بارگاہ میں اُس کے حکم کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں چلے گی۔ ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ سے جو استثناء فرمایا اس سے نبی اکرم ﷺ کی شفاعت' بعض انبیاء کرام کی شفاعت' فرشتوں کی شفاعت اور مؤمنین کی ایک دوسرے کے لیے شفاعت مراد ہے (یعنی یہ وہ شفاعتیں ہیں جو اللہ عزوجل کے حکم سے ہیں اور مقبول ہیں)۔

''ما بین ایدیھم'' اور ''ما خلفھم'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ﴾ سے مراد دنیا ہے اور ﴿مَا خَلْفَهُمْ﴾ سے مراد آخرت ہے (یعنی وہ دنیا کو بھی جانتا ہے اور آخرت کو بھی جانتا ہے)۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کے برعکس ہے۔ یعنی ''ما بین ایدیھم'' سے مراد آخرت اور ''ما خلفھم'' سے مراد دنیا ہے' کیونکہ لوگ آخرت کی طرف سفر کرتے ہیں اور اپنے پیچھے دنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے جو اللہ سے پہلے تھیں اور اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کے بعد ہوں گی۔ بعض کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے جو اچھے اور بُرے کام کیے اللہ تعالیٰ اُن کو بھی جانتا ہے اور جو وہ کرنے والے تھے اُن کو بھی جانتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام باتیں جانتا ہے' تمام مخلوق کے حالات میں کوئی بات بھی اُس پر مخفی نہیں ہے۔

آیت میں ﴿لَا یُحِیْطُوْنَ﴾ کا لفظ ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز کا وجود' اُس کی جنس' مقدار اور اُس کی حقیقت کو جان لے اور اس پر مطلع ہو کر اس کو اپنے دل میں جمع کر لے تو یہ احاطہ کہلاتا ہے۔ ﴿مِنْ عِلْمِهٖۤ﴾ میں علم سے مراد معلوم یعنی وہ باتیں ہیں جو علم میں ہوں۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آگے جو ﴿اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ فرمایا (یعنی سوائے اُن باتوں کے جو اللہ چاہے) اس سے مراد یہ ہے کہ سوائے اُن باتوں کے جن پر اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو مطلع فرمانا چاہے' تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب میں سے جن باتوں پر اُنہیں مطلع فرمائے وہ (باتیں) اُن کی نبوت کی دلیل بن جائیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ. (الجن: ۲۷۔۲۶)

(اللہ) غیب جاننے والا ہے' تو وہ اپنے غیب سے کسی کو آگاہ نہیں کرتا مگر جس کو وہ پسند فرمائے (اور وہ اس کے سب) رسول ہیں۔

کرسی کا لغوی معنیٰ اور اس کے وسیع ہونے کی تفسیر

﴿وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے''۔ جب کوئی شخص کسی چیز کا بوجھ برداشت کر لے' اُس کی طاقت اپنے اندر رکھے اور اس کی نگرانی کر سکے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''فلان وسع الشیئی سعة'' (فلاں شخص کو فلاں چیز پر مکمل کنٹرول حاصل ہے)۔

''کــرسی'' کالغت میں بنیادی معنیٰ ہے: چیز کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ پر قائم ہونا۔ اسی سے ''کُرّاسۃ'' کالفظ ہے (یعنی کاپی) کیونکہ اس کے اوراق ایک دوسرے پر قائم ہوتے ہیں۔ عرفِ عام میں کرسی اُس چیز کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جائے۔ چونکہ کرسی کی لکڑیاں آپس میں ایک دوسرے پر قائم ہوتی ہیں اس لیے اس کو کرسی کہتے ہیں۔

زیرِ بحث آیت میں کرسی کے متعلق علماءِ مفسرین کے چار اقوال

آیت میں کرسی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء کے چار مختلف اقوال ہیں۔ (۱) حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے کہ کرسی سے مراد عرش ہے۔ کیونکہ عرش اور کرسی اس تخت کو کہا جاتا ہے جس پر بیٹھا جاسکے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ کرسی عرش کے علاوہ ایک چیز ہے اور عرش کے سامنے ہے۔ (بعض کے نزدیک) عرش کے نیچے اور سات آسمانوں کے اوپر ہے۔ امام سدی فرماتے ہیں کہ آسمان اور زمین کرسی کے درمیان میں اس طرح ہیں جیسے وسیع بیابان میں کوئی گول چیز۔ اور کرسی عرش کے پہلو میں اس طرح ہے جیسے بیابان میں کوئی گول چیز۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ساتوں آسمان کرسی میں اس طرح سمائے ہوئے ہیں جیسے سات درہم ڈھال میں رکھ دیئے گئے ہوں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کرسی کے ہر پائے کی لمبائی آسمان اور زمینوں کے برابر ہے۔ اور کرسی عرش کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر فرشتے کے چار چہرے ہیں۔ اور ان کے قدم اُس چٹان پر ہیں جو ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ ایک فرشتہ ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کی شکل کا ہے' وہ بنی آدم کے لیے ایک سال سے دوسرے سال تک رزق اور بارش کی دُعا کرتا ہے۔ ایک فرشتہ گِدھ کی شکل کا ہے وہ ایک سال سے دوسرے سال تک پرندوں کے لیے رزق کی دُعا کرتا ہے۔ ایک فرشتہ بیل کی شکل کا ہے' وہ ایک سال سے دوسرے سال تک جانوروں کے لیے رزق کی دُعا کرتا ہے اور ایک فرشتہ درندے کی شکل کا ہے وہ ایک سال سے دوسرے سال تک وحشی (جنگلی) جانوروں کے لیے رزق کی دُعا کرتا ہے۔ [ے]

بعض روایات میں آتا ہے کہ حاملینِ عرش اور حاملینِ کرسی کے درمیان ستر پردے ظلمت کے اور ستر پردے نور کے حائل ہیں' ہر پردہ کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ اگر ان کے درمیان اس قدر فاصلہ نہ ہوتا تو حاملینِ کرسی حاملینِ عرش کے نور سے جل جاتے۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ ''کــرسی'' اسمِ اعظم ہے۔ کیونکہ جس طرح کرسی پر ٹیک اور سہارا لیا جاتا ہے اسی طرح علم کو بھی سہارا بنایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ کُرسی سے اُس کا علم مراد ہے۔ (۴) چوتھا قول یہ ہے کہ کُرسی سے اُس کی بادشاہت' سلطنت اور قدرت مراد ہے کیونکہ کرسی ہی بادشاہت اور سلطنت کی جگہ ہے۔ اس لیے یہ بعید نہیں ہے کہ کرسی بول کر مجازاً بادشاہت مراد لی جائے۔

آیت مبارکہ میں ﴿لَا یَئُوْدُهٗ﴾ کا معنیٰ ہے: اُسے بوجھل نہیں کرتا' اُسے تھکاتا نہیں ہے اور اُس پر مشکل نہیں گزرتا۔ ﴿حِفْظُهُمَا﴾ سے آسمانوں اور زمین کی حفاظت مراد ہے (یعنی آسمانوں اور زمین کی حفاظت اُسے تھکاتی نہیں ہے)۔

''علیّ'' اور ''عظیم'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

آخر میں فرمایا: ﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ﴾ اس میں ''الــعــلــیّ'' سے مراد یہ ہے کہ جلال اور کمال کے جو اوصاف اس کے لیے لازمی ہیں اُن میں وہ اپنی مخلوق سے اتنا بلند ہے کہ اُس کے اوپر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ وہ مطلقاً بلند ہے اور اپنی مثل' اپنے شریک اور اپنے مدّ مقابل کے پائے جانے سے مُتعالی (یعنی ماوراء) ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''عَلِیّ'' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بادشاہت' سلطنت اور غلبہ کی وجہ سے بلند ہے' کوئی اور اس سے بلند نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک جب اللہ تعالیٰ کی

ے یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے۔ اور قطعاً بے اصل اور نا قابلِ استدلال ہے۔

صفات میں ''عـلـو'' کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہ اقتدار اور غلبہ والا ہے اور تمام اچھی صفات کا ہر اعتبار سے وہی مستحق ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''عـلـی'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات اس سے بلند ہے کہ تعریف کرنے والوں کی تعریف اُس کا احاطہ کر سکے۔ آیت میں جو ﴿الْعَظِيْمُ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عظمت اور کبریائی والا ہے' کوئی چیز اُس سے زیادہ عظمت والی نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ عظیم اُس کو کہتے ہیں جو اپنی عظمت میں کامل ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عظیم سے مراد وہ ذات ہے جو عظمت و جلال اور کمال والی ہو۔ اس لفظ کو جب اللہ عزوجل کی صفات میں استعمال کیا جائے تو اس سے اس کی شان کی عظمت اور مرتبہ کی بلندی مراد ہوتی ہے۔ نہ کہ وہ بلندی جو جسم کے عوارض میں سے ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾

دین (اسلام) میں جبر نہیں ہے' بے شک ہدایت گمراہی سے (علیحدہ ہو کر) خوب واضح ہو چکی ہے' سو جو شخص شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے یقیناً مضبوط گرہ کو تھام لیا' جو کبھی کھلنے والی نہیں ہے' اور اللہ خوب سننے والا بہت علم والا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس کے نسخ کا بیان

(٣٦٤) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کے مطابق آیتِ مذکورہ کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ جب انصار کی کوئی عورت ''مِقلاۃ'' ہوتی' یعنی اس کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تو وہ منت مانتی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اُسے یہودی بنائے گی۔ پھر اگر وہ زندہ رہتا تو وہ اُسے یہودیوں میں شامل کر دیتی۔ لوگ اسی معمول پر قائم تھے کہ اسلام کی آمد ہوئی۔ اسلام کی آمد کے بعد جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں کچھ انصار کے لوگ بھی تھے۔ انصار نے چاہا کہ اپنے افراد کو اپنے پاس رکھا جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی کہ: (دین میں جبر نہیں ہے)۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے جو افراد اور ساتھی ہیں اُنہیں اختیار دیا گیا ہے' اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہیں تو ان کا تعلّق تم سے ہے اور اگر اُن کے ساتھ (یعنی بنونضیر کے ساتھ) رہنا چاہیں تو پھر اُن سے تعلّق ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بنونضیر کے ساتھ ہی اُن کو جلاوطن کر دیا۔ (جامع البیان للطبری زیر بحث آیت' سنن بیہقی ج۹ ص۱۸٦' سنن ابوداؤد:۲٦۸۲' سنن کبریٰ للنسائی:۱۱۰۴۸)

بعض مفسرین کے نزدیک آیتِ مذکورہ کا واقعۂ نزول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل بنی سالم بن عوف کے ابو الحصین نامی ایک انصاری شخص کے دو بیٹے تھے جو کہ عیسائی تھے۔ ایک مرتبہ وہ دونوں عیسائیوں کے ایک تیل بردار قافلہ کے ساتھ مدینہ منورہ آئے تو ان کو ان کے والد نے روک لیا اور کہا: میں تم دونوں کو اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک کہ تم مسلمان نہ ہو جاؤ۔ یہ جھگڑا نبی اکرم ﷺ تک پہنچا۔ والد نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں اپنے ایک حصہ کو دوزخ میں جاتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ نازل فرمائی کہ: ''لا اکراہ فی الدین'' (دین میں جبر نہیں ہے)۔ پھر دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب انہوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا تو انہیں اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل عرب اَن پڑھ تھے' اُن کے پاس کوئی کتاب بھی نہیں

تھی جس کا سہارا لیں۔ اس لیے ان سے صرف یہی مطالبہ کیا گیا کہ تم لوگ یا تو مسلمان ہو جاؤ یا ہم سے جنگ کرو۔ البتہ اہل کتاب جب جزیہ دینے پر راضی ہو گئے تو ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ لہٰذا اُن میں سے جس نے جزیہ دیا اُسے اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔

اس واقعۂ نزول کی بنیاد پر زیر بحث آیت محکم ہوگی' یعنی منسوخ نہیں ہوگی۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا جب کہ ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا' پھر جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو اس آیت کو منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی قول ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ میں نے آیت مبارکہ ''لا اکراہ فی الدین'' کے بارے میں حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ دس سال مکہ میں اس طرح رہے کہ کسی کو آپ زبردستی مسلمان نہیں بناتے تھے۔ اس کے باوجود مشرکین نے صرف جنگ کرنے کو ترجیح دی۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اللہ عزوجل سے جہاد کا اذن طلب کیا' تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت عطا فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دینِ اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ اس کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے۔ ﴿قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ حق باطل سے' ایمان کفر سے اور ہدایت گمراہی سے واضح اور نمایاں ہو چکی ہے' کیونکہ حق کے صحیح ہونے پر دلالت کرنے والی کثیر آیتیں اور دلائل موجود ہیں۔

''طاغوت'' کا مفہوم

فرمایا: ﴿فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ جو شخص طاغوت کو نہ مانے۔ ''طاغوت'' سے مراد شیطان ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک جادوگر اور نجومی مراد ہے۔ بعض کے نزدیک ہر وہ چیز طاغوت ہے جس کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کی جائے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ طاغوت ''طغیان'' سے فاعول کے وزن پر ہے' مراد اس سے ہر وہ شئی ہے جو اللہ عزوجل سے سرکشی کرے۔ ﴿یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اللہ عزوجل کی ربوبیت اور مستحق عبادت ہونے کی تصدیق کرے اور دیگر چیزوں کے معبود ہونے کے انکار کرے۔ ''یؤمن باللہ'' فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافر کو اوّلاً اپنے کفر سے توبہ کرنا اور اس سے بیزاری ظاہر کرنا ضروری ہے' پھر وہ اللہ عزوجل پر ایمان لائے۔ جو شخص اس طرح کرے گا اس کا ایمان صحیح ہوگا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ اس نے دین کی مضبوط اور پختہ گرہ کو تھام لیا۔ ''وثقی'' ''اوثق'' کا مؤنث ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''العروۃ الوثقی'' سے مراد ایسی رسّی ہے جو اللہ عزوجل کی خوشنودی تک پہنچا دے' وہ رسّی دینِ اسلام ہے۔ ﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ جو کبھی کھلنے والی نہیں ہے۔ یعنی وہ رسّی اس وقت تک نہیں ٹوٹے گی جب تک کہ اپنے تھامنے والے کو جنت میں نہ پہنچا دے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے دینِ صحیح یعنی دین اسلام کو تھام لیا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے ایسی مضبوط چیز تھام لی ہو جو ٹوٹنے والی اور منقطع ہونے والی نہ ہو۔

زیر بحث آیت میں ''سمیع'' اور ''علیم'' کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال

﴿سَمِیْعٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بات سنتا ہے جو شیطان کو نہیں مانتے اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور (سیدنا) محمد ﷺ اللہ عزوجل کے رسول ہیں۔ ﴿عَلِیْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل میں جو ایمان ہے اللہ عزوجل اُس کو جانتا ہے۔ بعض مفسرین نے ''سمیع'' اور ''علیم'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ (اے محبوب ﷺ!) آپ کفار و مشرکین کو جو اسلام کی طرف بلاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو سنتا ہے' اور آپ کے دل میں ان

کے ایمان لانے کی جو خواہش ہے اللہ عزوجل اس کو جانتا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۠ (۲۵۷)

اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے، وہ انہیں ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے (جبکہ) کافروں کے مددگار شیطان ہیں، وہ انہیں نور سے نکال کر ظلمتوں کی طرف لاتے ہیں، یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O

''ولیّ'' کا معنیٰ اور ظلمت و نور کی تفسیر

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کا مددگار ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ اہل ایمان سے محبت فرمانے والا ہے اور ان کے معاملات کی نگہبانی فرمانے والا ہے، اس لیے وہ ایمان والوں کو اپنے علاوہ کسی اور کے سپرد نہیں کرے گا۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ایمان والوں کو ہدایت دینے والا ہے۔

آگے جو فرمایا کہ ''وہ انہیں ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کو کفر سے ایمان کی طرف لاتا ہے۔ (واضح رہے کہ) قرآن کریم میں جہاں بھی ظلمت اور نور کا تذکرہ آیا ہے وہاں ظلمت سے کفر اور نور سے ایمان مراد ہے۔ سوائے سورۂ انعام کی اس آیت کے جس میں فرمایا:

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ (الانعام:۱) اُس نے تاریکیوں اور روشنی کو بنایا۔

الانعام کی اس آیت میں ''ظلمت'' سے مراد رات اور نور سے مراد دن ہے۔ زیر بحث آیت میں کفر کو ''ظلمت'' قرار دیا گیا، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کفر کا راستہ مشتبہ اور مشکوک ہوتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ظلمت یعنی اندھیرا حقائق کے ادراک سے آنکھوں کو مستور کر دیتا ہے، یہی معاملہ کفر کا بھی ہے کہ وہ حقائقِ ایمان کے ادراک سے دلوں کو مستور کر دیتا ہے۔ جبکہ اسلام کا راستہ چونکہ واضح ہے اور اس کے دلائل بھی روشن ہیں اس لیے آیت میں اسلام کو ''نور'' قرار دیا گیا۔

﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ﴾ کافروں کے مددگار شیطان ہیں، وہ انہیں نور سے نکال کر ظلمتوں کی طرف لاتے ہیں۔ کافروں سے کعب بن اشرف، حیی بن اخطب اور گمراہی کے تمام سربراہ مراد ہیں۔ یہ لوگ نور سے ظلمات کی طرف یعنی ہدایت سے گمراہی کی طرف لاتے ہیں۔

کافروں کے متعلق یہ فرمانے کی توجیہ کہ وہ نور سے ظلمات کی طرف لاتے ہیں

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ مذکورہ افراد کافر تھے اور کبھی بھی نور میں نہیں رہے پھر ان کے بارے میں کیوں فرمایا کہ یہ نور سے ظلمات کی طرف لاتے ہیں؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ مذکورہ افراد یہودی تھے انہوں نے اپنی کتاب میں نبی اکرم ﷺ کا جو حلیہ اور اوصاف پڑھے ہوئے تھے اس کی وجہ سے انہیں نبی اکرم ﷺ پر اور آپ کی نبوت پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی یقین تھا۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو ان لوگوں نے آپ کا انکار کیا اور آپ کی نبوت کو جھٹلایا۔ اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ نور سے ظلمات کی طرف لاتے ہیں۔ بعض علماء نے سوال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت مبارکہ میں نور سے ظلمت کی طرف لانے کی جو بات ہے وہ تمام کفار کے بارے میں ہے۔

اس بات کی توجیہ کہ شیطان لوگوں کو ایمان سے نکالتا ہے

شیطان لوگوں کو ایمان میں داخل ہونے سے روکتا ہے' اس کو آیت مبارکہ میں ''اخـراج من الایمان'' قرار دیا گیا (یعنی ایمان سے روکنے کو ''ایمان سے نکالنا'' فرمایا گیا ہے)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان لوگوں کو ایمان سے موڑ دیتا ہے اور اُنہیں ایمان کی بھلائی سے محروم رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ کبھی ایمان میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص جب اپنی زندگی میں کسی اور کے لیے اپنے مال کی وصیت کر دے اور اپنے بیٹے کو محروم کر دے تو بیٹا باپ سے کہے: ''اخــرجتنــی عن مالک'' (آپ نے مجھے اپنے مال سے نکال دیا)۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے جیسے اللہ عزوجل نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا کہ ''اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ''۔ (یوسف:٣٧) ''میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے''۔ حالانکہ حضرت یوسف علیہ السلام ان لوگوں کے دین میں کبھی داخل نہیں ہوئے تھے۔

زیر بحث آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ ''یہی لوگ دوزخی ہیں' یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے'' اس سے مراد یہ ہے کہ کفار اور طاغوت (شیطان) آگ والے ہیں۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے علاوہ دیگر لوگ ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

(اے رسولِ مکرم!) کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا (محض اس وجہ سے کہ) اُسے اللہ نے بادشاہت دی تھی' جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے' اُس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرسکتا ہوں اور مار سکتا ہوں' ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ مشرق سے سورج کو لاتا ہے' تو مغرب سے اس کو لا کے دکھا یہ سُن کر کافر کے ہوش اُڑ گئے' اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا O

﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ ''کیا آپ نے نہ دیکھا''۔ یعنی اے محمد (ﷺ)! کیا آپ تک اُس شخص کی خبر پہنچ گئی جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا۔ ''الم تر'' کا یہ مفہوم اس لیے بیان کیا گیا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کے ذریعہ مخاطب کو تعجب میں لایا جاتا ہے' حالانکہ لفظاً یہ استفہام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ''الم تر الی فلان کیف یصنع'' یعنی کیا تم نے فلاں کے کام کو دیکھا؟

نمرود کا تعارف اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اس کے مباحثہ کی وجہ

﴿ اَلَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ ﴾ (وہ شخص جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا) اس سے مراد نمرود بن کنعان ہے' یہ بہت ظالم تھا۔ یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے سر پر تاج رکھا' زمین میں سرکشی اور ظلم کیا اور اپنے متعلق رب ہونے کا دعویٰ کیا۔ آگے جو فرمایا:

﴿ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے بادشاہت دی اس لیے وہ سرکش ہو گیا اور بادشاہت کی وجہ سے اُس نے ظلم و جبر شروع کیا۔ اور بادشاہت کی اکڑ اور سرکشی کی وجہ سے اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ پوری زمین کے بادشاہ چار گزرے ہیں' اُن میں دو مسلمان تھے اور دو کافر تھے۔ جو دو مسلمان تھے وہ حضرت سلیمان بن داؤد اور حضرت ذوالقرنین ہیں' اور باقی دو جو کافر تھے وہ نمرود اور بخت نصر ہیں۔

مذکورہ مباحثہ کب ہوا؟ اس بارے میں اختلافِ اقوال اور مباحثہ کی تفصیل

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نمرود کا جھگڑا کس وقت ہوا تھا اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تھا تو نمرود نے ان کو قید کر دیا تھا' پھر ان کو آگ میں جلانے کے لیے قید سے نکالا تو اس نے پوچھا: (اے ابراہیم!) جس رب کی طرف آنے کی آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں وہ کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جھگڑے کا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے بعد کا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نمرود کے زمانہ میں قحط سالی ہو گئی۔ لوگ نمرود سے اپنی خوراک لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی اس کے پاس خوراک لینے آتا تو نمرود اس سے پوچھتا کہ تمہارا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا کہ تو میرا رب ہے' تب اُس کو وہ خوراک مہیا کرتا۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے گھر والوں کے لیے اس سے خوراک لینے کے لیے نکلے۔ جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ آپ کا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔ نمرود نے کہا کہ (یہ کون سی بڑی بات ہے) میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مشرق سے سورج کو لاتا ہے تو مغرب سے لا کے دکھا دے۔ یہ سُن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور لاجواب ہو گیا اور اُس نے بغیر کھانا دیئے حضرت ابراہیم کو واپس بھیج دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے گھر واپس جا رہے تھے تو سفید ریت کے ایک ٹیلہ کے پاس سے گزر ہوا۔ آپ نے اس ٹیلہ سے کچھ ریت لے لی اس خیال سے کہ جب میں گھر والوں کے پاس جاؤں گا تو ان کی دل جوئی ہو گی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر پہنچے تو اپنا سامان رکھ کر سو گئے۔ ان کی زوجہ سارہ نے ان کا سامان کھولا تو اس میں ایسا عمدہ کھانا موجود تھا کہ کسی نے ایسا کھانا نہیں دیکھا تھا۔ حضرت سارہ نے اس سامان سے روٹی بنائی۔ جب حضرت ابراہیم بیدار ہوئے تو حضرت سارہ نے ان کے سامنے روٹی پیش کی۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب گھر سے نکلے تھے تو گھر والوں کے پاس کھانا نہیں تھا۔ انہوں نے جب روٹی دیکھی تو پوچھا کہ یہ روٹی کہاں سے آئی؟ حضرت سارہ نے کہا کہ جو ساز و سامان آپ لے کر آئے تھے اُسی سے میں نے یہ روٹی بنائی ہے۔ حضرت ابراہیم کو یقین ہو گیا کہ یہ طعام اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ پھر انہوں نے اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ظالم نمرود کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتہ نے نمرود سے کہا کہ تمہارا رب تمہارے لیے کہہ رہا ہے کہ تم مجھ پر ایمان لے آؤ' میں تمہارے لیے تمہاری بادشاہت کو باقی رکھوں گا۔ نمرود نے کہا: کیا میرے علاوہ بھی کوئی خدا ہے؟ پھر وہ فرشتہ دوبارہ آیا اور اسی طرح گفتگو ہوئی' پھر وہ تیسری مرتبہ آیا اور اسی طرح گفتگو ہوئی۔ تو فرشتے نے اس سے کہا تو اپنے لشکر کو جمع کر۔ اس نے اپنے سارے لشکر کو جمع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو حکم دیا تو اُس نے اس لشکر پر مچھروں کا ایک دروازہ کھول دیا یہاں تک کہ سورج چھپ گیا پھر اللہ تعالیٰ نے اُن مچھروں کا لشکر تمام افراد پر چھوڑ دیا۔ ان مچھروں نے لوگوں کا گوشت کھایا اور ان کا خون پی گئے یہاں تک کہ سوائے ہڈیوں کے کچھ باقی نہ رہا۔ نمرود کو کچھ بھی نہیں ہوا وہ صرف یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اُس پر ایک مچھر بھیجا جو اس کے نتھنے میں داخل ہو گیا اور چار سو سال تک اس کے سر میں رہا۔ (آرام وسکون کے لیے) اس کے سر پر ہتھوڑے مارے جاتے تھے۔ وہ شخص لوگوں میں انتہائی رحم دل سمجھا جاتا تھا جو اس کے سر پر مکے مارا کرتا تھا۔ اس پر چار سو سال تک جو کہ اس کی بادشاہت کی مدت تھی اس کو عذاب دیا جاتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ہلاک کر دیا۔

نمرود کی کم فہمی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دانش مندی

﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ سے ایک پوشیدہ سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ نمرود نے پوچھا: تمہارا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔ ﴿قَالَ﴾ یعنی نمرود نے کہا: ﴿اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ﴾ (میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں) اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ نمرود نے دو آدمی بُلائے' ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور ایک کو چھوڑ دیا۔ یعنی اُس نے قتل نہ کرنے کو زندہ کرنا سمجھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کی۔ دوسری دلیل پیش کرنا اس لیے نہیں تھا کہ آپ اپنی پہلی دلیل میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے' کیونکہ پہلی دلیل تو بہت بدیہی اور واضح تھی کہ اس میں زندہ کرنے سے مراد مُردے کو زندہ کرنا تھا۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود سے کہہ سکتے تھے کہ اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو جس کو تو نے مار ڈالا ہے اس کو زندہ کر کے دکھا' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ نمرود کی عقل چھوٹی ہے اور سوچ محدود ہے' جس کی وجہ سے وہ فعل کا فعل سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ تک بھول گیا کہ دونوں فعل باہم مختلف ہیں' تو پھر انہوں نے اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کی جو پہلی سے زیادہ واضح تھی کہ ''بے شک اللہ مشرق سے سورج کو لاتا ہے' تو مغرب سے اس کو لا کے دکھا''۔

﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ﴾ تو کافر مبہوت ہو گیا۔ یعنی نمرود حیران ہو گیا اور اس کے ہوش اُڑ گئے اور بے دلیل ولا جواب ہو کے رہ گیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دلیل سے وہ سمجھ گیا کہ وہ ان کی دلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس فرمان کی توجیہ کہ کافر مبہوت ہو گیا اور اس کے ہوش اُڑ گئے

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ یہ کیوں فرمایا گیا کہ کافر کے ہوش اُڑ گئے جبکہ وہ بھی پلٹ کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے رب سے مطالبہ کریں کہ وہ سورج کو مغرب سے لے کر آئے؟ اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ اس نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ اُسے خدشہ تھا کہ اگر اس نے حضرت ابراہیم سے یہ مطالبہ کیا تو وہ اپنے رب سے دُعا کریں گے۔ اور یہ بات نمرود کی رسوائی اور بے دلیل ہونے میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ بعض علماء نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نمرود کو مذکورہ مطالبہ سے اس لیے پھیر دیا تاکہ اُس کے خلاف حجت کا اظہار ہو اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ظاہر ہو۔ یہ جواب صحیح ہے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یعنی ظالموں کو ایسی دلیل کا راستہ نہیں دکھاتا جس کے ذریعہ وہ بحث ومباحثہ کے وقت اہل حق کے دلائل کو باطل کریں۔ آیت میں ''ظالمین'' سے نمرود مراد ہے۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا اس شخص کی طرح جو ایک ایسی بستی سے گزرا جو اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی' اُس نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ اس بستی کو

اس کی موت کے بعد اللہ کیسے زندہ فرمائے گا؟ سو اللہ نے اس پر سو سال تک موت طاری فرما دی' پھر اس کو زندہ کیا (اور) فرمایا: تم کتنا عرصہ ٹھہرے؟ اُس نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں گا۔ اللہ نے فرمایا: نہیں! تم سو سال تک ٹھہرے رہے' ذرا اپنے کھانے پینے کی اشیاء کو دیکھو وہ ابھی تک بدبودار نہیں ہوئیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو (یہ سب کچھ) اس لیے ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنا دیں' اور (ان) ہڈیوں میں غور کرو کس طرح ہم انہیں جوڑتے ہیں اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں' سو جب اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی تو اس نے کہا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ ہر چاہے پر قادر ہے O

آیت مذکورہ کا گزشتہ آیت سے ربط

﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ﴾ یہ آیت گزشتہ آیت پر معطوف ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کیا آپ نے اس شخص کو نہ دیکھا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا یا ایسا شخص جو ایک بستی سے گزرا۔ اس صورت میں یہ گذشتہ آیت کے معنیٰ پر عطف ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ تقدیر آیت یہ ہے کہ کیا آپ نے اس شخص جیسا دیکھا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا' اور کیا آپ نے اس شخص جیسا دیکھا جس کا ایک بستی سے گزر ہوا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں کاف زائد ہے۔ تقدیر آیت یہ ہے کہ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا یا اس شخص کو جو ایک بستی سے گزرا۔

بستی سے گزرنے والا کون تھا؟ اس بارے میں اختلافِ اقوال

مذکورہ بستی سے گزرنے والا کون تھا؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت مجاہد سے مروی قول یہ ہے کہ مذکورہ بستی سے گزرنے والا ایک کافر شخص تھا کیونکہ اس نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے میں شک کیا تھا۔ حضرت مجاہد کا یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''تم کتنا عرصہ ٹھہرے؟'' جبکہ اللہ تعالیٰ کافر سے خطاب نہیں فرماتا۔ دوسرا یہ کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنا دیں''۔ حالانکہ اس طرح کے الفاظ کافر کے بارے میں استعمال نہیں کیے جاتے' بلکہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے بارے میں فرمائے جاتے ہیں۔ حضرت قتادہ' عکرمہ' ضحاک اور سُدی کا قول یہ ہے کہ مذکورہ بستی سے گزرنے والے شخص حضرت عُزیر بن شرخیا تھے۔ وہب بن منبہ کا قول یہ ہے کہ وہ ارمیاء بن حلقیا تھے جو کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان سے تھے' یعنی حضرت خضر علیہ السلام۔

زیر بحث آیت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا مقصد تو یہ ہے کہ جو لوگ مرنے کے بعد کی زندگی کے منکر ہیں ان کو اس بات کی پہچان کرائی جائے کہ اللہ عزوجل اپنی مخلوق پر موت طاری کرنے کے بعد اُسے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ نہ یہ مقصد کہ بستی سے گزرنے والے شخص کے نام کی پہچان کرائی جائے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ بستی سے گزرنے والے حضرت عزیر ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت ارمیاء ہوں۔ زیر بحث واقعہ میں ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر عظیم دلیل موجود ہے۔ کیونکہ آپ نے یہودیوں کو اس واقعہ کی خبر دی جو ان کی کتابوں میں موجود تھا اور وہ لوگ اس سے واقف تھے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ اُمّی تھے' آپ نے قدیم کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔

مذکورہ بستی کون سی تھی؟ اس بارے میں مختلف اقوال

آیت مبارکہ میں جس بستی کا تذکرہ ہوا ہے وہ کون سی بستی تھی؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے بیت المقدس مراد ہے کیونکہ اس کو بخت نصر نے ویران کیا تھا۔ اس صورت میں آیتِ مبارکہ میں ''اِحیاء'' سے اس کا آباد ہونا مراد ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے وہ بستی مراد ہے جس کے رہنے والے جب ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے دیر سابر آباد مراد ہے۔ یہ فارس میں ایک جگہ کا نام ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے سلما آباد مراد ہے۔ یہ جرجان کے نواحی میں اور ایک قول کے مطابق ہمدان کے نواحی میں ایک محلّہ یا بستی کا نام ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے دیرِ ہرقل یعنی ہرقل کی عبادت کی جگہ مراد ہے۔ یہ بصرہ اور عسکر مکرم کے درمیان ایک مشہور عبادت خانہ ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے قریۃ العنب مراد ہے جو کہ بیت المقدس سے دو فرسخ (تقریباً چھ میل) پر ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس بستی سے ان لوگوں کی جگہ مراد ہے جو ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ اور ان پر اللہ تعالیٰ نے موت طاری فرمائی پھر ان کو حضرت حزقیل کے لیے دوبارہ زندہ فرمایا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل (البقرہ:۲۴۳ کی تفسیر میں) گزر چکی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ بستی مراد ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کے گدھے کو زندہ فرمایا۔

آیت مبارکہ میں بستی کے متعلق جو فرمایا: ﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی۔ یعنی پہلے چھتیں گریں پھر چھتوں پر دیواریں گر گئیں۔

اس سوال کے محامل کہ اس بستی کو اللہ کیسے زندہ فرمائے گا؟

﴿قَالَ﴾ سے مراد ہے: گزرنے والے نے کہا (کہ اس بستی کو اس کی موت کے بعد اللہ کیسے زندہ فرمائے گا؟)۔ جن علماء نے یہ ضعیف قول کیا ہے کہ بستی سے گزرنے والا کوئی کافر تھا انہوں نے سوال مذکور کو اس پر محمول کیا ہے کہ گزرنے والے شخص نے اللہ کی قدرت میں شک ہونے کی وجہ سے یہ سوال کیا کہ اس بستی والوں کو اللہ کیسے زندہ فرمائے گا؟ جبکہ وہ علماء جنہوں نے گزرنے والے شخص سے نبی مراد لیا ہے انہوں نے سوال مذکور کو اس پر محمول کیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے عرف وعادت کے اعتبار سے بعید قرار دیتے ہوئے سوال کیا کہ اس بستی والوں کو اللہ تعالیٰ کیسے زندہ فرمائے گا۔ نہ یہ کہ انہوں نے اللہ عزوجل کی قدرت سے انکار کرتے ہوئے سوال کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے سوال مذکور اس لیے کیا ہوتا کہ تاکید اور پختگی کے لیے زیادہ دلائل حاصل ہوں۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردے کس طرح زندہ کرتا ہے؟ (البقرہ:۲۶۰)

آیت میں جو ﴿أَنَّىٰ يُحْيِي﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کہاں سے زندہ فرمائے گا؟ زندہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ کہاں سے آباد فرمائے گا۔ (جب یہ سوال ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اُسے اس کی ذات میں اور بستی کو آباد کرنے میں نشانی دکھائے۔ چنانچہ ایک واقعہ پیش آیا' جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

مذکورہ بستی کی تباہی کا تفصیلی واقعہ

مذکورہ آیت میں جو واقعہ ہے اس کی تفصیل وہب بن منبہ کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بادشاہ ناشیہ بن اموص کے پاس حضرت اَرْمیاء علیہ السلام کو بھیجا۔ تاکہ وہ اس کی اصلاح کریں اور اسے اللہ تعالیٰ کے احکام لاکر دیں۔ پھر بنی اسرائیل میں بڑے واقعات رونما ہوئے اور وہ گناہوں کا شکار ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اَرْمیاء کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی قوم کو میری نعمتیں یاد دلاؤ اور انہیں ان کے واقعات سے آگاہ کرو اور میری طرف آنے کی دعوت دو۔ حضرت ارمیاء نے کہا: اے میرے رب! اگر تو نے مجھے قوت نہیں دی تو میں کمزور رہوں' اور تو نے مجھے بلاغت نہیں دی تو میں (بولنے سے) عاجز ہوں اور تو نے میری مدد نہیں کی تو میں بے یار و مددگار رہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تیرے دل میں باتیں ڈال دوں گا۔ حضرت اَرْمیاء لوگوں کے درمیان کھڑے ہو گئے جبکہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انہیں کیا بیان کرنا ہے۔ جب وہ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُسی وقت ایک طویل اور بلیغ خطبہ ان کے دل میں ڈال دیا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو اس خطبہ میں اطاعت کا اجر وثواب

اور نافرمانی کرنے کا عذاب بتایا اور خطبہ کے اختتام پر کہا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''مجھے اپنی عزت کی قسم! میں لوگوں کو ایسی آزمائش میں مبتلا کروں گا جو ایک بردبار شخص کے لیے بھی پریشان کن ہوگی۔ اور میں ایک ایسے فارسی جابر کو مسلط کروں گا جسے میں ہیبت کا لباس پہناؤں گا اور اس کے دل سے مہربانی کا جذبہ نکال دوں گا۔ تاریک رات کی سیاہی کی مانند کئی لوگ اس کے پیروکار ہوں گے''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاء کو وحی فرمائی کہ میں بنی اسرائیل کو یافث کے ذریعہ ہلاک کرنے والا ہوں۔ ''یافث'' بابل کے رہنے والے لوگ تھے اور یہ یافث بن نوح کی اولاد سے تھے۔ جب حضرت ارمیاء نے یہ بات سنی تو وہ چیخ کر رونے لگے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور سر پر راکھ ڈالنے لگے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ گریہ وزاری دیکھی تو انہیں ندا دی: اے ارمیاء! میں نے جو وحی کے ذریعہ تمہیں بتایا کیا وہ تم پر شاق گزرا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اے میرے رب! قبل اس کے کہ میں بنی اسرائیل میں ایسی چیز دیکھوں جو مجھے پسند نہیں ہے تو مجھے ہلاک فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! میں اس وقت تک بنی اسرائیل کو ہلاک نہیں کروں گا جب تک کہ تیری طرف سے فیصلہ نہ ہوگا۔ حضرت ارمیاء یہ سن کر خوش ہوئے اور ان کا دل مطمئن ہوگیا۔ اور انہوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ کو حق سے مبعوث فرمایا! میں بنی اسرائیل کی ہلاکت کو پسند نہیں کروں گا۔ پھر حضرت ارمیاء بادشاہِ وقت کے پاس آئے اور اُسے اس بات کی خبر دی۔ بادشاہِ وقت ایک نیک شخص تھا۔ اس نے جب یہ بات سُنی تو بہت خوش ہوا اور کہا کہ اگر ہمارا رب ہمیں عذاب دے گا تو ہمارے گناہوں کی وجہ سے اور اگر ہم سے درگزر فرمائے گا تو اپنی رحمت اور مہربانی کی وجہ سے۔ پھر مذکورہ وحی کے بعد لوگ تین سال تک مسلسل نافرمانیاں کرتے رہے اور برائی میں آگے بڑھتے رہے۔ جب ان کے ہلاک ہونے کا وقت قریب آ گیا تو وحی کا سلسلہ کم ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ نے لوگوں کو توبہ کی دعوت دی، لیکن لوگوں نے توبہ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر بابلی کو مسلط کر دیا۔ وہ چھ لاکھ افراد لے کر بیت المقدس کی طرف نکلا۔ جب وہ سب کو لے کر نکلا اور بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے حضرت ارمیاء سے کہا کہ آپ نے جو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی کی ہے وہ کہاں ہے؟ حضرت ارمیاء نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اور مجھے اس کی ذات پر بھروسا ہے۔ جب ہلاکت کا معیّنہ وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کی شکل میں ایک فرشتہ حضرت ارمیاء کے پاس بھیجا۔ حضرت ارمیاء نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں بنی اسرائیل کا ایک آدمی ہوں، آپ کے پاس اپنے قرابت داروں کے متعلق ایک مسئلہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہوں اور اچھا سلوک کرتا رہتا ہوں لیکن جس قدر میں ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے پیش آتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے ناراض ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ مجھے ان کے بارے میں فتویٰ دیں۔ حضرت ارمیاء نے کہا کہ تمہارے درمیان اور اللہ عزوجل کے درمیان جو معاملہ ہے اس میں حسن سلوک کرتے رہو، ان کے ساتھ تعلق قائم رکھو اور تمہیں بھلائی کی بشارت ہو۔ فرشتہ چلا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد اسی آدمی کی شکل میں دوبارہ آیا، اور حضرت ارمیاء کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت ارمیاء نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں وہی ہوں جو اپنے گھر والوں کے بارے میں فتویٰ لینے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ حضرت ارمیاء نے پوچھا: کیا تمہارے ان کے ساتھ انصاف کے باوجود ان کے اخلاق درست نہیں ہوئے؟ اُس نے کہا: اے اللہ کے نبی! جس ذات نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے مجھے اس کی قسم! میری معلومات کے مطابق جو جو مہربانیاں لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ کرتے ہیں، میں نے وہ سب بلکہ اس سے زیادہ اعلیٰ مہربانیاں اپنے گھر والوں کے ساتھ کی ہیں۔ حضرت ارمیاء نے کہا: تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک جاری رکھو۔ وہ معبودِ برحق جو اپنے نیک بندوں کی اصلاح فرماتا ہے میں اس سے دُعا کروں گا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی بھی اصلاح فرمادے۔ فرشتہ چلا

گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد بخت نصر اپنے لشکر کو لے کر بیت المقدس میں آ گیا۔ بنی اسرائیل بخت نصر کے لشکر سے خوف زدہ ہو گئے۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ نے حضرت ارمیاء سے کہا: اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ جو وعدہ فرمایا تھا وہ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے رب پر بھروسا ہے۔ پھر مذکورہ فرشتہ دوبارہ حضرت ارمیاء کے پاس آیا' اُس وقت حضرت ارمیاء بیت المقدس کی ایک دیوار پر بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد کا جو وعدہ فرمایا تھا اس پر خوش ہو رہے تھے۔ اس دوران فرشتہ آ کر اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت ارمیاء نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں وہی ہوں جو اپنے گھر والوں کے بارے میں فتویٰ لینے دوبارہ آپ کے پاس حاضر ہو چکا ہے۔ حضرت ارمیاء نے کہا کہ کیا ابھی تک ان کی بدسلوکی سے باز آنے کا وقت نہیں آیا؟ فرشتے نے کہا: اے اللہ کے نبی! آج سے پہلے جو جو مصیبتیں مجھے ان کی طرف سے ملی ہیں میں نے ان پر صبر کیا ہے' لیکن آج میں نے ان کی طرف سے ایسا عمل دیکھا ہے جو اللہ عزوجل کو ناپسندیدہ ہے۔ حضرت ارمیاء نے اس کام کے بارے میں دریافت کیا تو فرشتہ نے بتایا کہ وہ ایک ایسا بڑا کام ہے جو اللہ عزوجل کی ناراضگی کا باعث ہے' اس لیے میں اللہ کی خاطر غضب ناک ہوا اور آپ کو بتانے کے لیے حاضر ہوا۔ جس ذات نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں اس کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اللہ عزوجل کے حضور ان لوگوں کے لیے ہلاکت کی دُعا کریں۔ حضرت ارمیاء نے فوراً ہی دُعا کی: اے آسمان و زمین کے مالک! اے جلال و عزت والے! اگر وہ لوگ حق پر ہیں تو ان کو بقاء عطا فرما' اور اگر وہ ایسے عمل میں ملوث ہیں جو تجھے پسند نہیں ہے تو ان کو ہلاک فرما دے۔ جیسے ہی حضرت ارمیاء کے منہ سے یہ کلمات نکلے اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس پر آسمان سے بجلی بھیج دی جس کی وجہ سے قربانی کی جگہ پر آگ بھڑکنے لگی اور بیت المقدس کے دروازوں میں سے سات دروازے جل گئے۔ حضرت ارمیاء نے جب یہ منظر دیکھا تو چیخنے لگے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور اپنے سر پر راکھ ڈالی اور عرض گزار ہوئے: اے آسمان و زمین کے مالک! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ کہاں ہے؟ ندا آئی کہ جو عذاب نازل ہوا ہے وہ آپ ہی کے فتویٰ اور دُعاءِ ہلاکت کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ حضرت ارمیاء کو یقین ہو گیا کہ یہ اُنہی کا فتویٰ ہے اور یہ کہ جو سائل تھا وہ اللہ عزوجل کی طرف سے بھیجا ہوا تھا۔ پھر حضرت ارمیاء جنگلی جانوروں میں چلے گئے اور بخت نصر اپنے لشکر کے ساتھ بیت المقدس میں داخل ہو گیا' ملک شام کو تاخت و تاراج کیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا یہاں تک کہ ان کو تباہ کر دیا' بیت المقدس کو ویران کر دیا اور اپنے لشکر کو حکم دیا کہ ہر شخص اپنی ڈھال کو مٹی سے بھر دے اور اسے بیت المقدس میں پھینکے۔ لشکر نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ بیت المقدس کو مٹی سے بھر دیا۔ پھر اس نے لشکر کو حکم دیا کہ بیت المقدس کے شہروں میں جو لوگ باقی ہوں اُنہیں میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ چھوٹے بڑے جتنے بنی اسرائیل باقی تھے وہ سب بخت نصر کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے ان میں سے ۷۰ ہزار بچے چُن کر اُن بادشاہوں کے درمیان تقسیم کر دیئے جو اس کے ساتھ تھے۔ یعنی ہر بادشاہ کو چار لڑکے ملے۔ اُن لڑکوں میں حضرت دانیال' حضرت حنانیا اور حضرت عزیر (علیہم السلام) بھی موجود تھے۔ بنی اسرائیل کے جو لوگ بچ گئے تھے ان کے اس نے تین گروہ بنا دیئے۔ ایک گروہ کو قتل کر دیا' ایک کو قیدی بنا دیا اور ایک کو ملک شام میں ٹھہرا دیا۔ یہ پہلا عذاب تھا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اُن کے ظلم کی وجہ سے نازل فرمایا۔ جب بخت نصر بنی اسرائیل کے قیدیوں کو اپنے ساتھ لے کر بابل واپس چلا گیا' تو حضرت ارمیاء بیت المقدس کی سرزمین یروشلم میں آئے۔ اس وقت آپ اپنے جانور پر سوار تھے اور آپ کے پاس مشکیزہ میں انگور کا رس اور ایک ٹوکری میں انجیر تھے۔ جب آپ نے وہاں پہنچ کر ویرانی دیکھی تو کہا کہ ''اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا'' اس جگہ کو اللہ تعالیٰ اس کی موت کے بعد کیسے زندہ فرمائے گا؟ یعنی اس کی ویرانی کے بعد اس کو دوبارہ کیسے آباد فرمائے گا؟

جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ بستی سے گزرنے والے حضرت عزیر علیہ السلام تھے وہ یہ کہتے ہیں کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو ویران کر دیا تو بنی اسرائیل کے قیدی اس کے سامنے پیش کیے گئے۔ اُن میں حضرت عزیر اور حضرت دانیال علیہما السلام بھی موجود تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے گھر والوں میں سے ستر ہزار افراد بھی موجود تھے۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام نے بابل سے نجات پائی تو وہاں سے آپ اپنے جانور پر روانہ ہو کر دجلہ کے کنارے کے پاس ہرقل کے عبادت خانہ میں پہنچے۔ وہاں پوری بستی میں گھومے لیکن کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ البتہ اکثر درخت بار آور تھے چنانچہ آپ نے پھل کھائے اور انگور کا رس نکال کر پیا۔ جو پھل بچ گئے تھے اُنہیں ایک ٹوکری میں ڈالا اور جو اس سے بچ گیا تھا اس کو مشکیزہ میں ڈال دیا۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ بستی ویران ہو چکی ہے اور اس کے رہنے والے ہلاک ہو چکے ہیں تو انہوں نے کہا: ''اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا'' حضرت عزیر کا یہ جملہ تعجب کے طور پر تھا' نہ یہ کہ انہیں مرنے کے بعد زندہ ہونے کے بارے میں کوئی شک تھا۔

اب ہم وہب بن منبہ کے واقعہ کی طرف دوبارہ لوٹتے ہیں' وہ بیان کرتے ہیں کہ پھر حضرت ارمیاء نے اپنی سواری (گدھے) کو نئی رسّی سے باندھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی۔ جب وہ سو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض فرمالی۔ چنانچہ سو سال تک ان پر موت طاری رہی۔ ان کے گدھے پر بھی اللہ تعالیٰ نے موت طاری کر دی۔ جبکہ ان کا شیرۂ انگور اور انجیر دونوں ان کے پاس موجود رہے۔ اس پورے منظر سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی نگاہوں کو غافل کر دیا اور کوئی شخص بھی اس کو نہ دیکھ سکا' حالانکہ وہ دن کا وقت تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمام درندوں اور پرندوں سے ان کے گوشت کو محفوظ رکھا۔ جب ان کی موت کو ستر سال کا عرصہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں یوشک نامی بادشاہ کی طرف ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تجھے حکم فرماتا ہے کہ تو اپنے قوم کو لے کر یہاں سے نکل جا اور جا کر بیت المقدس اور یروشلم کو ایسا تعمیر کر کہ وہ پہلے سے زیادہ اچھی حالت میں آ جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے فوراً ایک ہزار ذمہ دار افراد تیار کیے اور ہر ذمہ دار کو تین لاکھ مزدور دے دیئے۔ انہوں نے بیت المقدس اور یروشلم کو تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ایک مچھر کے ذریعہ ہلاک کر دیا' جو کہ اس کے دماغ میں گھس گیا تھا اور جتنے بنی اسرائیل اس کے پاس قید تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے نجات عطا فرمائی اور سب کو بیت المقدس اور اس کے اطراف کے علاقوں میں واپس لوٹا دیا۔ وہ سب تیس سال تک اس کو آباد کرتے رہے' ان کی تعداد بھی بڑھ گئی اور پہلے جس حالت پر تھے اس سے بہتر حالت پر آ گئے۔ جب سو سال پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاء کی آنکھوں میں حیات ڈالی' پھر ان کی آنکھوں کے سامنے بقیہ جسم کو زندہ فرمایا' پھر انہوں نے اپنے گدھے کو دیکھا تو اس کی ہڈیوں پر سفیدی ظاہر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس گدھے کو نداء کی گئی کہ اللہ تعالیٰ تجھے حکم دیتا ہے کہ تو گوشت اور کھال کو پہن لے۔ سو ایسا ہی ہوا' پھر نداء کی گئی کہ اللہ تجھے حکم دیتا ہے کہ تو زندہ ہو جا' تو وہ اللہ کے حکم سے کھڑا ہو گیا اور آواز نکالنے لگا۔ حضرت ارمیاء کو اللہ تعالیٰ نے عمر عطا فرمائی اور مزید زندگی دی' وہ صحرا اور بیابانوں میں گھوما کرتے تھے۔

اس کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ اللہ نے ان پر سو سال تک موت طاری فرما دی' پھر ان کو زندہ کیا۔ ﴿عَامٍ﴾ کا لفظ اصل میں ''عوم'' سے ہے اور ''عوم'' کا معنیٰ ہے: تیرنا۔ چونکہ سورج سال کے تمام برجوں میں تیرتا ہے اس لیے سال کو ''عام'' کہا جاتا ہے۔ ﴿ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا۔ ''بعث'' اصل میں اس جملہ سے ماخوذ ہے کہ جب اونٹنی اپنی جگہ سے کھڑی ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے: ''بعثت الناقة''

''یوم'' اور ''بعض یوم'' کی تفسیر

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ابھی جو میں نے آپ کو زندہ کیا

اس سے پہلے جتنا عرصہ آپ موت کی حالت میں ٹھہرے رہے اس عرصہ کی مقدار کیا ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو زندہ فرمایا تو ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا' اس فرشتے نے ان سے پوچھا کہ آپ کتنا عرصہ ٹھہرے؟ انہوں نے کہا کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں گا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کے آغاز میں چاشت کے وقت ان پر موت طاری فرمائی تھی' اور سو سال کے بعد جب انہیں زندہ فرمایا تو وہ سورج غروب ہونے سے پہلے دن کا آخری وقت تھا۔ تو جب انہوں نے یہ کہا کہ میں ایک دن ٹھہرا ہوں گا اس وقت وہ سمجھ رہے تھے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ پھر انہوں نے توجہ کی اور دیکھا کہ سورج کا کچھ حصہ موجود ہے تو کہا کہ ''او بعض یوم'' (یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں گا)۔

﴿قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ فرمایا: بلکہ تم سو سال تک ٹھہرے رہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔ اور ایک قول کے مطابق فرشتہ نے یہ بات اُن سے کہی۔ ﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ آپ اپنے کھانے پینے کی چیزیں دیکھیں' وہ ابھی تک بدبودار نہیں ہوئیں یہاں ''طعام'' سے وہ انجیر مراد ہیں جو موت کے طاری ہونے سے پہلے ان کے پاس موجود تھے۔ اور ﴿شراب﴾ سے رس مراد ہے۔ ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ کھانے پینے کی ان اشیاء پر گزرنے والے سالوں نے ان کو تبدیل نہیں کیا۔ چنانچہ انجیر ایسے تھے جیسے ان کو اُسی وقت درخت سے توڑا گیا ہو' اور رس ایسا تھا جیسے اسی وقت اُسے نچوڑ کر نکالا گیا ہو' اس میں نہ کوئی تبدیلی آئی تھی نہ ہی بدبو۔ ﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ جو فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اپنے گدھے کے زندہ کیے جانے کو دیکھو۔ چنانچہ انہوں نے گدھے کو دیکھا تو وہ سفید ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کے سامنے اس کی ہڈیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر اس پر گوشت اور کھال چڑھائی اور اُسے زندہ کر دیا۔

''ولنجعلک اٰیۃ'' میں واؤ اور ''آیۃ'' کے متعلق اختلافِ اقوال کا بیان

﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ یہاں جو آغاز میں واؤ ہے' بعض مفسرین کے نزدیک وہ زائد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ واؤ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بعد آنے والا فعل شرط ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے جو موت طاری کی اور پھر زندگی دی یہ اس لیے تھا تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشان بنا دیں۔ یعنی عبرت کا ذریعہ بنا دیں اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی دلیل بنا دیں۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت ارمیاء (زندگی پانے کے بعد) اپنی بستی میں گئے' آپ اس وقت نوجوان تھے اور آپ کے سر اور ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے جبکہ آپ کی اولاد اور آپ کی اولاد کی اولاد مرد و عورت سب بوڑھے ہو گئے تھے' ان کے بالوں میں سفیدی آ چکی تھی۔ سو آپ کی جو حالت تھی وہ لوگوں کے لیے نشانی تھی۔

''ننشز'' اور ''ننشر'' کا معنیٰ اور آیت کا مفہوم

آیت میں ﴿نُنْشِزُهَا﴾ کو راء اور زاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ راء کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ (ان ہڈیوں میں غور کرو) کس طرح ہم انہیں زندہ کرتے ہیں۔ عربی میں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ''انشر اللہ المیت انشارا'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے مردے کو زندہ فرمایا) جبکہ زاء کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ (ان ہڈیوں میں غور کرو) کس طرح ہم انہیں زمین سے اٹھا کر جسم میں معیّنہ جگہ پر لوٹا دیتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو جوڑ دیتے ہیں۔ عربی میں ''انشاز'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو بلند کرنا اور لے جانا۔ مثلاً کہا جاتا ہے: ''نشزتہ فنشز'' یعنی میں نے اُسے اُٹھایا تو وہ اٹھ گیا۔

جن ہڈیوں میں غور کرنے کا حکم دیا گیا ان سے کس کی ہڈیاں مراد ہیں؟ اس بارے میں اکثر مفسرین کا قول

آیت مبارکہ کے مذکورہ جملہ کا مفہوم کیا ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ (جن ہڈیوں

میں غور کرنے کا حکم دیا گیا اُن سے) گدھے کی ہڈیاں مراد ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر یا حضرت ارمیاء (علیہما السلام) کو زندہ کیا پھر اُنہیں فرمایا کہ تم اپنے گدھے کو دیکھو وہ ہلاک ہو چکا ہے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ انہوں نے اپنے گدھے کو دیکھا تو اسے ویسا ہی پایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا کو بھیجا' وہ ہر نرم و ہموار زمین اور پہاڑ سے گدھے کی ہڈیاں لے آئی۔ وہ ساری ہڈیاں آ کر جمع ہو گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو آپس میں جوڑ دیا یہاں تک کہ ہڈیوں کے ٹکڑے بھی اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ اس کے نتیجہ میں وہ ہڈیوں والا گدھا بن گیا لیکن اس پر گوشت اور خون نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہڈیوں پر گوشت' رگیں اور خون چڑھایا۔ اس کے نتیجہ میں وہ گوشت اور خون والا گدھا بن گیا لیکن اس میں روح نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جو کہ چلتا ہوا گدھے کے پاس آیا اور اس کی ناک کو پکڑ لیا اور پھر اس میں روح پھونک دی چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ گدھا بن کر کھڑا ہو گیا اور آواز نکالنے لگا۔

مذکورہ ہڈیوں کے بارے میں بعض مفسرین کا قول

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ (جن ہڈیوں میں غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُن سے) خود اس آدمی کی اپنی ہڈیاں مراد ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عزیز یا حضرت ارمیاء) پر موت طاری فرمائی اور اُنہیں دوبارہ زندہ فرمایا۔ جبکہ ان کے گدھے کو موت نہیں آئی تھی (یعنی وہ زندہ رہا)۔ پھر انہیں زندہ فرمانے کے بعد ان سے کہا گیا کہ اپنے گدھے کی طرف دیکھئے۔ انہوں نے دیکھا تو اسے اسی دن کی طرح زندہ سلامت پایا جس دن انہوں نے اس کو باندھا تھا' حالانکہ سو سال تک نہ اُس نے کچھ کھایا نہ پیا' اور یہ بھی دیکھا کہ اس کے گلے میں جو رسّی تھی ہے اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے بعد اُن سے فرمایا گیا کہ ہڈیوں میں غور کرو کس طرح ہم اُنہیں زندہ کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی آنکھوں میں حیات ڈالی' جس سے انہوں نے دیکھا تو اپنے سارے جسم کو موت زدہ پایا۔

آیت مبارکہ ("وانظر الی العظام ") میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت یوں ہے کہ: "وانظر الی حمارک وانظر الی العظام کیف ننشزھا ولنجعلک ایۃ للناس" (اپنے گدھے کو دیکھو اور ہڈیوں کو دیکھو کس طرح ہم انہیں زندہ کریں گے' یہ اس لیے ہے تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشان بنا دیں)۔

سوال کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام کی اپنی قوم میں واپسی اور اعلان نبوت کا واقعہ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت طاری رکھنے کے بعد حضرت عزیر کو زندہ فرمایا تو وہ گدھے پر سوار ہو کر اپنے علاقہ میں آئے۔ لیکن لوگوں نے ان کو نہیں پہچانا اور انہوں نے بھی نہ لوگوں کو پہچانا اور نہ ہی اپنے گھر کو پہچانا۔ لیکن وہ گمان اور خیال پر چلتے چلتے اپنے گھر میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک سو بیس سال کی ایک نابینا اور اپاہج بڑھیا تھی' جو کہ لوگوں کی باندی تھی۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام ان لوگوں کو چھوڑ کر گئے تھے اس وقت اس بڑھیا کی عمر بیس سال تھی اور وہ حضرت عزیر کو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی تھی۔ حضرت عزیر نے اس نے کہا: اے خاتون! کیا یہ عزیر کا گھر ہے۔ بڑھیا نے کہا: ہاں! پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ عرصہ دراز سے میں نے عزیر کا تذکرہ کسی سے نہیں سُنا تھا۔ حضرت عزیر نے کہا کہ میں عزیر ہوں۔ بڑھیا نے کہا: سبحان اللہ! سو سال سے عزیر ہمارے درمیان موجود نہیں تھے اور نہ ہی ہم نے ان کا کوئی تذکرہ سنا۔ حضرت عزیر نے کہا کہ میں ہی عزیر ہوں' سو سال تک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر موت کو طاری رکھا اور پھر مجھے زندہ فرما دیا۔ بڑھیا نے کہا کہ عزیر تو ایسے آدمی تھے کہ ان کی دعائیں مقبول ہوتی تھیں' وہ بیمار اور مصیبت زدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے۔ لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میری بینائی مجھے واپس لوٹا دے تا کہ میں آپ کا

دیدار کر سکوں۔اگر آپ عزیر ہیں تو دیکھ کر ہی میں آپ کو پہچان لوں گی۔حضرت عزیر نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور بڑھیا کی آنکھیں ٹھیک ہوگئیں۔پھر آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ عزوجل کے حکم سے کھڑی ہو جا۔تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ٹانگوں سے معذوری دور فرمادی اور وہ صحیح سلامت کھڑی ہوگئی۔پھر اس نے آپ کو دیکھا اور دیکھ کر کہا کہ میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ آپ عزیر ہیں۔اس کے بعد وہ (حضرت عزیر کو لے کر) بنی اسرائیل کے پاس گئی۔اس وقت وہ لوگ اپنی اپنی محافل اور مجالس میں تھے۔حضرت عزیر کا ایک عمر رسیدہ بیٹا بھی موجود تھا جس کی عمر ایک سو اٹھارہ سال تھی۔اور آپ کے پوتے بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔اس بڑھیا نے بنی اسرائیل میں جا کر اعلان کیا کہ یہ حضرت عزیر ہیں' جو کہ تمہارے پاس آ چکے ہیں۔ لوگوں نے بڑھیا کی بات کو جھٹلا دیا۔بڑھیا نے کہا کہ میں تم لوگوں کی فلاں باندی ہوں۔عزیر نے میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے میری بینائی مجھے لوٹا دی اور میری ٹانگوں سے معذوری کو دور فرمادیا۔اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور پھر زندہ فرمادیا۔راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے جب یہ باتیں سُنیں تو حضرت عزیر کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے۔حضرت عزیر کے بیٹے نے کہا کہ میرے والد کے دو شانوں کے درمیان ہلالی شکل کا ایک کالا مسہ موجود تھا۔چنانچہ اس نے حضرت عزیر کے دونوں شانے کھولے اور دیکھا تو وہ مسہ موجود تھا۔اُس نے پہچان لیا کہ یہ حضرت عزیر ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام جب اپنی بستی میں واپس لوٹے تو اس وقت حال یہ تھا کہ بخت نصر تورات کو جلا چکا تھا اور لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی فرمان موجود نہیں تھا۔یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عزیر تورات کے ضائع ہونے پر رونے لگے تو آپ کے پاس فرشتہ ایک برتن میں پانی لے کر آیا۔اس نے آپ کو تھوڑا سا پانی پلایا تو تورات آپ کے سینے میں ثبت ہوگئی۔جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو تورات سکھادی اور نبی بنا کر بھیجا تو آپ بنی اسرائیل کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ میں عزیر ہوں۔لوگوں نے آپ کی بات کی تصدیق نہیں کی۔آپ نے فرمایا کہ میں عزیر ہی ہوں' اللہ تعالیٰ نے مجھے تم لوگوں کی طرف اس لیے بھیجا ہے تاکہ میں تمہارے لیے تمہاری تورات کی تجدید کروں۔لوگوں نے کہا کہ (اگر ایسا ہے) تو آپ ہمیں تورات لکھوائیے۔حضرت عزیر نے اپنی یادداشت سے انہیں تورات لکھوادی۔لوگوں نے کہا کہ تورات کے چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ صرف اسی شخص کے دل میں اس کو ڈالتا ہے جو اس کا بیٹا ہو۔پھر لوگ کہنے لگے کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔(العیاذ باللہ) اس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ التوبہ میں آئے گی۔

''تبیّن'' کا معنیٰ اور لفظ ''اعلم'' میں دو مختلف قرأتوں کا بیان

﴿ فَلَمَّا تَبَيَّنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تباہ شدہ بستی کے آباد ہونے کو جو انہوں نے عجیب و غریب سمجھا تھا وہ ان کے سامنے نمایاں طور پر جب واضح ہوگیا اور اس کو خود اپنی ذات میں ملاحظہ کر لیا تو کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔یعنی موت دینے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔آیت میں جو ﴿ أَعْلَمُ ﴾ کا لفظ ہے اس کو صیغہ امر کی حیثیت سے ہمزہ وصلی اور (آخر میں) جزم کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ جان لو کہ اللہ ہر چاہے پر قادر ہے۔اور ایک قرأت کے مطابق ہمزہ قطعی اور (آخر میں) رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔اس صورت میں یہ اُس شخص کے متعلق خبر ہوگی جس نے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کی موت کے بعد کیسے زندہ فرمائے گا۔حاصل یہ کہ بستی کا زندہ ہونا جب اس پر آشکارا ہوگیا اور اس نے خود دیکھ لیا تو کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چاہے پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۠ (۲۶۰)

اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم نے عرض کی: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ فرمائے گا؟ فرمایا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ عرض کی: یقین کیوں نہیں ہے! البتہ (سوال کا مقصد یہ ہے کہ) میرے دل کو قرار آ جائے‘ فرمایا: تو پھر آپ چار پرندے لے لیں اور انہیں اپنے سے مانوس کر لیں‘ پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر (علیحدہ علیحدہ) رکھ دیں‘ پھر اُنہیں بلائیں وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے‘ اور آپ یقین رکھیں کہ اللہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے O

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے احیاءِ موتیٰ کے مشاہدہ کا مطالبہ اور اس مطالبہ کا سبب

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے مذکورہ سوال کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مردہ گدھے کی لاش کے پاس سے گزرے تھے (اس لیے انہوں نے مذکورہ سوال کیا)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ ایک مردہ مچھلی تھی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ ساحل سمندر کے پاس ایک مردہ آدمی تھا۔ ایک قول کے مطابق وہ طبرستان کا سمندر تھا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مردہ آدمی کی لاش دیکھی۔ اس لاش کا معاملہ یہ تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے سمندری اور خشکی کے جانوروں کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ جب پانی چڑھتا تھا تو مچھلیاں اس لاش سے کھاتی تھیں اور جب پانی نارمل ہوتا تو درندے آ کر اس لاش سے کھاتے تھے۔ اور درندوں کے جانے کے بعد پرندے اس لاش سے کھاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ منظر دیکھا تو انہیں تعجب ہوا اور عرض گزار ہوئے: اے میرے رب! یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تو درندوں اور چوپایوں کے پیٹ سے اور پرندوں کے پوٹوں سے اس مردے کے اجزاء کو یقیناً جمع فرمائے گا لیکن مجھے بھی یہ منظر دکھا کہ تو کس طرح اس لاش کو زندہ کرے گا‘ تا کہ میں بھی اس کو اپنی آنکھ سے دیکھوں اور میرے یقین میں اضافہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں عتاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ عرض کی: یقین کیوں نہیں ہے! البتہ مقصد یہ ہے کہ میرے دل کو قرار آ جائے۔

﴿ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ کیا آپ کو تصدیق نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: ﴿ بَلٰى ﴾ یعنی اے پروردگار! مجھے علم ہے اور میرا ایمان ہے۔ ﴿ وَلٰـكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ﴾ تا کہ آنکھوں سے دیکھ کر میرے دل کو سکون اور چین آ جائے۔ اس جملہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ان کا علم الیقین عین الیقین ہو جائے۔ کیونکہ خبر سے حاصل ہونے والا علم دیکھ کر حاصل ہونے والے علم کی مانند نہیں ہوتا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب سمندر پر مردہ لاش دیکھی کہ اس کو درندے‘ پرندے اور سمندری جانور کھا چکے ہیں تو وہ سوچنے لگے کہ اس لاش کے اجزاء کس طرح جمع ہوں گے؟ پھر ان کے دل میں خواہش ہوئی کہ ایک ایسے مردے کا مشاہدہ ہونا چاہیے جس کو اللہ تعالیٰ زندہ فرما دے۔ لیکن اس خواہش کی یہ وجہ نہیں تھی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے احیاءِ موتیٰ (مردوں کو زندہ کرنے) میں شک تھا بلکہ اُن کی خواہش یہ تھی کہ وہ مردے کو زندہ کیے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ جیسے اہلِ ایمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ انہیں نبی اکرم ﷺ کا دیدار ہو جائے اور جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو جائے۔ اہل ایمان اس دیدار کو طلب بھی کرتے ہیں اور ایمان کے ساتھ اپنی دعا میں اس کا سوال بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود

ایمان بھی برقرار رہتا ہے اور شک بھی نہیں پایا جاتا۔ یہی معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا کہ اُنہوں نے چاہا کہ جو چیز خبر سے معلوم ہے وہ آنکھوں سے بھی دیکھ لیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ سوال کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے نمرود کو دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ نمرود نے کہا کہ میں بھی زندگی اور موت دیتا ہوں۔ پھر اس نے دو آدمیوں کو بلا کر ایک کو قتل کر دیا اور ایک کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مردہ جسم کو زندہ فرماتا ہے۔ نمرود نے کہا کہ کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم ہاں نہ کر سکے اور دوسری دلیل کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اللہ عزوجل سے درخواست کی کہ وہ انہیں یہ دکھائے کہ وہ مُردوں کو کس طرح زندہ فرماتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: یقین کیوں نہیں! (مقصد سوال یہ ہے کہ) دلیل کی قوت سے میرا دل مضبوط ہوگا۔ اور جب مجھ سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ تو میں ہاں کہہ سکوں گا۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل (دوست) بنایا تو ملک الموت نے حضرت ابراہیم کو اس پر خوش خبری دینے کی اجازت مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت عطا فرمائی۔ وہ حضرت ابراہیم کے پاس آئے لیکن وہ گھر میں نہیں تھے۔ چنانچہ وہ ان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ لوگوں میں سب سے زیادہ غیرت مند تھے اس لیے وہ جب باہر جاتے تھے تو دروازہ بند کر کے جاتے تھے۔ جب وہ باہر سے آئے تو گھر میں ایک آدمی کو پایا۔ اس کو دیکھتے ہی اس کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ اور اس سے پوچھا کہ تمہیں کس نے گھر میں آنے کی اجازت دی ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے گھر کے رب نے اجازت دی ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ تو نے سچ کہا۔ آپ نے پہچان لیا کہ یہ فرشتہ ہے۔ چنانچہ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ملک الموت ہوں۔ اور اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کو اس بات کی خوش خبری دوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنالیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سُن کر اللہ عزوجل کی حمد کی اور پوچھا کہ اس کی علامت کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا کہ اس کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا کو قبول فرمائے گا اور آپ کے کہنے پر مردے زندہ فرمائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُسی وقت کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: یقین کیوں نہیں! (مقصد سوال یہ ہے کہ) میرے دل کو اطمینان ہو جائے کہ تو نے مجھے اپنا خلیل بنالیا ہے اور جب میں دُعا کروں گا تو تُو اس کو قبول فرمائے گا اور جب میں مانگوں گا تو تو عطا کرے گا۔

حدیث پاک کی روشنی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ سوال کی توجیہ اور علماء کے مختلف اقوال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۶۵) ہم حضرت ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کے حق دار ہیں کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ اے میرے رب! تو مجھے دکھا کہ تو مردے کس طرح زندہ فرمائے گا؟ فرمایا: کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: یقین کیوں نہیں! مقصدِ سوال یہ ہے کہ میرے دل کو قرار آ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحمت فرمائے انہوں نے ایک مضبوط ستون (قبیلہ) کی پناہ میں آنا چاہا تھا۔[۱۵۰] اور

۱۵۰ے اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ فرشتے جب خوب صورت لڑکوں کی شکل میں مہمان بن کر آپ کے گھر آئے تو آپ کی قوم کے بدکاروں نے آپ کے گھر کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ آپ کو اپنے مہمانوں کے متعلق خوف اور فکر لاحق ہوئی۔ کیونکہ آپ کا کوئی حمایتی قبیلہ نہیں تھا جو مہمانوں کو بدکاروں سے چھڑا سکتا۔ اس لیے آپ نے کہا کہ: ''لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ''. (سورۂ ہود: ۸۰) ''کاش مجھ میں تم سے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا کسی مضبوط ستون (قبیلہ) کی پناہ لے سکتا''۔ حضرت لُوط علیہ السلام نے یہ جُملہ مہمانوں کے دلوں کو مطمئن کرنے اور اُن کے سامنے اپنا عذر ظاہر کرنے کے لیے کہا تھا۔ نہ یہ بات کہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جتنا عرصہ حضرت یوسف قید خانہ میں رہے اگر میں اتنا عرصہ رہتا تو بلانے والے کی بات ضرور مان لیتا۔[۶۵۱]

(صحیح بخاری: ۴۷۲، ۳۳۷۲، صحیح مسلم: ۱۵۱، سنن ابن ماجہ: ۴۰۲۶، صحیح ابن حبان: ۶۲۰۸، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۶، ۳۶۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۷۰۵، ص ۵۰۶)

حدیث مذکور میں نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ "ہم حضرت ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کے حق دار ہیں" اس کا کیا مفہوم ہے؟ اس بارے میں علماء کے بہت سارے اقوال ہیں۔ ان میں سب سے اچھا اور صحیح ترین قول جو کہ مُزنی اور دیگر علماء نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے حق میں شک ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام کو مردوں کے زندہ کیے جانے میں شک ہوتا تو میں ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کا حق دار تھا۔ اور تمہیں خوب علم ہے کہ مجھے اس میں شک نہیں ہے لہٰذا جان لو کہ حضرت ابراہیم کو بھی شک نہیں تھا۔

حدیث شریف میں صرف حضرت ابراہیم کا تذکرہ کیا گیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ (البقرہ: ۲۶۰) کو پڑھ کر کسی بھی فاسد ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قدرتِ الٰہی میں کچھ شک تھا' اس لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث پاک میں خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کر کے اُن پر ہونے والے الزام کو دور کر دیا۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو فرمایا کہ "ہم حضرت ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کے حق دار ہیں" اس میں نہ تو اپنے بارے میں شک کا اعتراف ہے اور نہ ہی حضرت ابراہیم کے بارے میں' بلکہ اس میں دونوں سے شک کی نفی ہے۔ یعنی نبی علیہ السلام یہ فرما رہے ہیں کہ جب مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو حضرت ابراہیم کو بہ درجۂ اولیٰ شک نہیں ہوگا۔ البتہ نبی علیہ السلام کا مذکورہ ارشاد عاجزی اور نفس کی انکساری پر مبنی ہے۔ اور یہی حکم اس جملہ کا بھی ہے جو حدیث کے آخر میں فرمایا کہ "جتنا عرصہ حضرت یوسف قید خانہ میں رہے اگر میں اتنا عرصہ رہتا تو بلانے والے کی بات ضرور مان لیتا"۔

حدیث مذکور میں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو سوال تھا وہ شک کی بنیاد پر نہیں تھا البتہ اس بنیاد پر تھا کہ آنکھوں سے مشاہدہ کر کے علم میں اضافہ ہو۔ کیونکہ آنکھوں سے مشاہدہ کرنے سے وہ معلومات اور اطمینان حاصل ہوتا ہے جو خبر کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) انہوں نے اللہ عزوجل کی پناہ لینے سے اعراض کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس پر جو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحمت فرمائے" اس سے اُن کی تعریف مقصود ہے۔ بعض شارحین فرماتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے جو جُملہ فرمایا اُس میں یہ بھی امکان ہے کہ وہ رنج وغم کے غلبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حمایت کی دُعا کرنا بھول گئے ہوں۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے اظہارِ حیرت کے طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حضرت لوط پر رحمت فرمائے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۸۸، مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۴۴۴، شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۳۵)

۶۵۱ حضرت یوسف علیہ السلام نو سال یا بارہ سال جیل میں رہے۔ مگر عزیزِ مصر کا قاصد جب بادشاہ کی طرف سے آپ کو رہائی کی اطلاع دینے کے لیے آیا تو آپ نے فرمایا کہ پہلے میری پاک دامنی کی تحقیق کی جائے پھر میں جیل سے باہر نکلوں گا۔ یہ آپ کا عظیم صبر کا مظاہرہ تھا۔ حدیث شریف میں نبی اکرم ﷺ کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی جگہ ہم اتنا عرصہ جیل میں رہتے تو پہلی ہی دعوت پر جیل سے باہر آ جاتے۔ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد تواضع اور انکساری کے طور پر تھا' ورنہ آپ کا صبر سیّدنا یوسف علیہ السلام سے کہیں زیادہ ہے! نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پہلی دعوت پر ہی جیل سے باہر آ جانا چاہیے تھا تاکہ تبلیغ نبوت جلد شروع ہو جاتی۔ اگر میں وہاں ہوتا تو پہلی دعوت پر ہی باہر آ کر تبلیغ و ارشاد کا آغاز کر دیتا۔
(مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۴۴۴، شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۶۳۵)

بعض علماء نے حدیث مذکور کی توجیہ یہ کی ہے کہ جب زیر بحث آیت نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے یہ بات کہی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا لیکن ہمارے نبی ﷺ نے شک نہیں کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم حضرت ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کے حق دار ہیں۔ آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جس چیز کو تم شک سمجھ رہے ہو میں اس کا زیادہ حق دار ہوں۔ کیونکہ وہ شک نہیں ہے بلکہ درحقیقت یقین میں اضافہ کا مطالبہ ہے۔

حدیث مذکور میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آپ پر جو راجح قرار دیا وہ یا تو عاجزی اور ادب و احترام کی وجہ سے ہے یا یہ اس سے پہلے کا ارشاد ہے جب نبی ﷺ کو معلوم ہوا کہ آپ تمام اولاد آدم میں سب سے افضل ہیں۔

زیر بحث آیت کی تفسیر

آیت مبارکہ میں جو فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! یاد کیجئے جب ابراہیم نے کہا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا عطف ''''(البقرہ:٢٥٨) پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ کیا آپ نے اس شخص کو نہ دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا (اور) کیا آپ نے نہ دیکھا جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ فرمائے گا۔ آگے جو فرمایا: ﴿قَالَ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم سے فرمایا: ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ (کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟) اس جملہ میں جو ہمزہ ہے وہ اثبات اور ایجاب کا ہے۔ جیسے جریر کا قول ہے: ''ألستم خیر من رکب المطایا'' (یعنی جو لوگ سواریوں پر سوار ہوئے کیا تم اُن سب سے بہتر نہیں ہو)۔ اللہ تعالیٰ نے جو ''أولم تؤمن'' فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کیا آپ کو اس بات پر ایمان اور تصدیق نہیں ہے کہ میں مردوں کو زندہ کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے عرض کیا: کیوں نہیں! میرا ایمان بھی ہے اور تصدیق بھی ہے۔ ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ (لیکن سوال اس لیے کر رہا ہوں تا کہ میرے دل کو قرار آئے) یعنی میں نے جو سوال کیا ہے کہ مجھے مردوں کے زندہ کیے جانے کا منظر دکھا' وہ اس لیے ہے کہ میں دل کا اطمینان' یقین میں اضافہ اور دلیل میں پختگی چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''ولکن لیطمئن قلبی'' کا مفہوم یہ ہے کہ تا کہ میں تیری نشانی دیکھوں اور جان لوں کہ تو نے میری دعا قبول فرمالی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو پرندے لیے تھے ان پرندوں کے نام اور اس سوال کا جواب کہ تمام۔۔۔ حیوانات میں پرندے ہی کیوں منتخب کیے گئے؟

﴿قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ فرمایا: پھر آپ چار پرندے لے لیں اور اپنے سے مانوس کر لیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو چار پرندے لیے وہ یہ تھے: مور' مُرغا' کبوتر اور کوا۔ بعض علماء نے کبوتر کی بجائے گِدھ کو شمار کیا ہے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ مردوں کو زندہ کرنے کا منظر دکھانے کے لیے تمام حیوانات میں پرندے ہی کیوں منتخب کیے گئے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ پرندوں کی صفت یہ ہے کہ وہ آسمان میں اُڑتے ہیں اور ہوا میں بلند ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خواہش اور ارادہ بھی اسی طرح کا تھا' یعنی وہ عالم ملکوت کی طرف جانے میں بلندی چاہتے تھے۔ اس لیے اُن کو جو معجزہ دیا گیا وہ ان کے ارادہ اور خواہش کے مشابہ تھا۔

اس سوال کا جواب کہ پرندوں میں مذکورہ چار پرندوں کا انتخاب کیوں کیا گیا؟

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ پرندوں میں مذکورہ چار پرندے ہی کیوں لیے گئے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس میں ایک

خاص اشارہ ہے۔ مور سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان زیب و زینت اور مرتبہ کو پسند کرتا ہے۔ گدھ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کھانے میں بہت زیادہ دل چسپی اور محبت رکھتا ہے۔ مرغے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان نکاح کی بہت خواہش اور اس میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور کوے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان میں لالچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ سو جو پرندے ذکر کیے گئے ہیں وہ انسان کے مذکورہ پسندیدہ اوصاف سے مشابہت رکھتے ہیں۔

نیز آیت مبارکہ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان اگر مذکورہ بُری خواہشات کو ترک کر دے تو وہ جنت میں بلند ترین درجات کو پالے گا اور خوش بختیوں کو پا کر کامیاب ہوگا۔

''فصرھن'' میں قرأت اور اس کے مطابق معنیٰ کا بیان

﴿فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾ اس میں ''فصرھن'' کو صاد کے زیر اور صاد کے پیش دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ اگر صاد کو زیر ہو تو معنیٰ یہ ہوگا کہ آپ ان پرندوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اور اگر پیش ہو تو معنیٰ یہ ہوگا کہ آپ پرندوں کو اپنی طرف مائل کر لیں اور انہیں اپنا بنا لیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ پرندوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ رکھیں۔ جن مفسرین نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ ''پرندوں کو اپنی طرف مائل کر لیں اور اپنے ساتھ رکھیں'' وہ کہتے ہیں کہ آیت میں اضمار ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ آپ پرندوں کو اپنے ساتھ رکھیں پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آیت کا اگلا جملہ اس مفہوم کو ثابت کر رہا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے: ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ (پھر ان پرندوں کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دیں)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرندوں کے ذریعہ احیاءِ موتیٰ کا منظر دکھانے کا واقعہ

مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ پرندوں کو ذبح کریں اور ان کے پَر اکھاڑ دیں۔ پھر ان کے گوشت' خون اور پروں کو آپس میں ملا دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کو حکم فرمایا کہ وہ ہر پہاڑ پر ان پرندوں کا ایک ایک حصہ رکھ دیں۔ رہا یہ کہ حصے اور پہاڑ کتنے تھے؟ سو اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک پہاڑ مشرق کی جانب' ایک مغرب کی جانب' ایک شمال کی جانب اور ایک جنوب کی جانب تھا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے سات ٹکڑے کر کے انہیں سات پہاڑوں پر رکھ دیا اور ان کے سروں کو اپنے پاس رکھ لیا' پھر ان پرندوں کو آواز دی کہ ''اللہ تعالیٰ کے حکم سے آ جاؤ'' تو خون کا ہر قطرہ دوسرے قطرہ کی طرف' ہر پَر دوسرے پَر کی طرف' ہر ہڈی دوسری ہڈی کی طرف اور گوشت کا ہر ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کی طرف اڑ کر جانے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ بغیر سروں کے جسم کا ہر ہر ٹکڑا فضا میں ایک دوسرے سے جا ملا۔ پھر وہ تمام جسم دوڑتے ہوئے اپنے سروں کی طرف آئے۔ جیسے کوئی پرندہ نیچے آتا تو اُسے اس کا سر اپنی طرف مائل کرتا۔ اگر وہ اُسی پرندے کا سر ہوتا تو وہ پرندہ اُس کے قریب ہو جاتا' اور اگر وہ اس کا سر نہ ہوتا تو پرندہ اس سے پیچھے ہٹ جاتا۔ حتیٰ کہ ہر پرندہ اپنے اپنے سر سے جا ملا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا: پھر اُنہیں بلائیں وہ دوڑے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے۔

﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا﴾ پھر اُنہیں بُلائیں وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''سعی'' سے مراد ہے: جلدی کرنا اور دوڑنا (یعنی پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے)۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''سعی'' سے چلنا مراد ہے (یعنی پرندے چلتے ہوئے آئیں گے)۔

آیت مبارکہ میں پرندوں کے لیے ''سعیا'' فرمانے کی توجیہ اور حکمت

یہاں فرمایا گیا کہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے' یہ نہیں فرمایا کہ اڑتے ہوئے آئیں گے' اس میں حکمت یہ ہے کہ پرندوں کا دوڑ کر آنا شک شبہ کے لیے زیادہ ازالہ کا باعث ہے' کیونکہ اگر وہ اُڑ کر آئے تو کوئی سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ یہ کوئی اور پرندے ہیں یا ان کی ٹانگیں سلامت نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ''یاتینک سعیا'' فرما کر اس شبہ کو دور فرما دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''سعی'' سے چلنا مراد ہے' اور چلنے سے اڑنا مراد ہے۔ لیکن اس قول میں ضعف ہے کیونکہ پرندے کے اُڑنے کے لیے ''سعی'' کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''سعی'' سے حرکتِ شدیدہ مراد ہے (یعنی پرندے تیز چلتے ہوئے آئیں گے)۔

﴿عَزِیْزٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر غالب ہے' کوئی چیز اُسے عاجز نہیں کر سکتی۔ ﴿حَکِیْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں حکمت والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی طرح ہے جو سات خوشے اگائے' ہر خوشہ میں سو دانے ہوں' اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اس سے زیادہ) بڑھا دیتا ہے' اور اللہ وسعت والا بہت علم والا ہے O

آیت مذکورہ میں ''انفاق'' کے متعلق اختلافِ اقوال

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''انفاق'' سے یہاں جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ تمام بھلائی اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا مراد ہے۔ اس قول کی صورت میں یہاں واجب اور نفل دونوں طرح کا خرچ کرنا داخل ہے۔ آیت میں کچھ اضمار ہے' تقدیر عبارت یہ ہے: ''مثل صدقات الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله ''۔ آگے جو فرمایا: ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (ان کے صدقات کی مثال) دانہ کو بونے والے کی طرح ہے۔ ﴿اَنْۢبَتَتْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ دانہ نکالے۔ ﴿سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ (سات خوشے) ''سنابل'' ''سُنبلة'' کی جمع ہے۔ ﴿فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ ہر خوشہ میں سو دانے ہوں۔

آیا سو دانوں والی بالی پائی جاتی ہے یا نہیں؟

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ کیا ایسی کوئی بالی پائی جاتی ہے جس میں سو دانے ہوں' حتیٰ کہ اس کی مثال بیان کی جائے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ سو دانوں والی بالی کا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ اور جو چیز ناممکن نہ ہو اس کی مثال بیان کرنا جائز ہے' اگرچہ وہ پائی نہ جاتی ہو۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بالی میں سو دانے ہوں اگر اللہ تعالیٰ انہیں ایک بالی میں پیدا فرمائے۔ بعض مفسرین نے یہ جواب دیا ہے کہ ایسی بالی کنگنی یا جرے میں پائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ آیت میں بتانا یہ مقصود ہے کہ ایسا شخص جو اضافہ اور منافع چاہتا ہو اسے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اگر وہ ایک بیج بوئے گا تو اس سے سات سو بیج پیدا ہوں گے تو وہ نہ تو اسے ترک کرے گا نہ ہی اس میں کوتاہی کرے گا۔ اسی طرح جو شخص اللہ عزوجل کے پاس آخرت میں اجر و ثواب کا طالب ہو اُسے چاہیے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو ترک نہ کرے جب کہ اُسے یہ (بھی) معلوم ہو کہ اُسے ایک کے بدلہ میں دس اور سو اور سات سو ملیں گے۔

''مضاعفہ'' اور ''واسع'' ''علیم'' کی تفسیر

﴿ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے مذکورہ اضافہ فرمادیتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے مذکورہ اضافہ سے زیادہ بڑھا دیتا ہے یعنی سات سے ستر ستر سے سات سو اور سات سو سے وہاں تک جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے' اور اللہ تعالیٰ ہی اس اضافہ کو جانتا ہے۔ آخر میں جو فرمایا: ''اللہ وسعت والا بہت علم والا ہے'' اس میں ﴿ وَاسِعٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا غنی ہے کہ وسعت اور کشادگی سے دیتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جزا دینے اور فضل و کرم کرنے کی جو قدرت اور طاقت ہے اس میں وہ وسعت والا ہے۔ اور ﴿ عَلِیْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرتا ہے اللہ اس کی نیت کو جانتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے کتنا خرچ کیا اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے اور خرچ کرنے والا جس اجر و ثواب کا مستحق ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں پھر جو کچھ خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ ہی دُکھ دیتے ہیں ان ہی کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے' اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عثمان کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کجاوہ اور پالان سمیت ایک ہزار اونٹوں کے ذریعہ مسلمان کا لشکر تیار کیا تھا۔ اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جیش العسرۃ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور انہیں نبی اکرم ﷺ کی گود میں ڈال دیا' پھر میں نے دیکھا کہ:

(۳٦٦) نبی اکرم ﷺ نے ان دیناروں میں اپنا دستِ اقدس داخل کیا اور دیناروں کو ایک دوسرے کے ساتھ پلٹنے لگے' اس وقت آپ فرمارہے تھے کہ آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل اُسے نقصان نہیں دے گا۔ (سنن ترمذی:۳۷۰۱) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ''۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس آیت کے ساتھ واقعۂ نزول کا جو معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ چار ہزار درہم صدقہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ ان میں سے میں نے چار ہزار درہم اپنے اور اپنے عیال کے لیے رکھ لیے ہیں اور بقیہ چار ہزار اللہ عزوجل کے لیے نکالے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو درہم تم نے رکھ لیے ان میں بھی اور جو تم نے خرچ کیے ان میں بھی اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اس طور پر کہ ان کی ضروریات اور ان کی مشکلات میں ان کے لیے اپنا مال

خرچ کرتے ہیں۔

﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى﴾ یعنی جو کچھ انہوں نے مجاہدین پر خرچ کیا اس کے پیچھے وہ نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ ہی تکلیف پہنچاتے ہیں۔

''منّ'' اور ''اذی'' کی تحقیق و تفسیر

آیت مبارکہ میں ''مَـنّ'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی کچھ دینے کے بعد احسان جتائے۔ یعنی یوں کہے کہ میں نے تمہیں فلاں فلاں چیز دی ہے۔ پھر سارے احسان گنا کر اس شخص پر ان احسانات کا مزا کرکرا کر دے۔ اور ''بالاذی'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی کچھ دینے کے بعد عار دلائے۔ (مثلاً) یوں کہے کہ کتنا مانگو گے؟ تم تو ہمیشہ فقیر ہی رہو گے' تم نے تو مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے تم سے راحت اور چین نصیب کرے۔ اور اس طرح کے دیگر جملے۔

''مـنّ'' کا لغوی معنی ہے: نعمت (احسان) کرنا۔ ''مِـنّة'' بھاری احسان کو کہا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی پر بھاری بھرکم احسان کرے تو عربی میں کہتے ہیں: ''منّ فلان علی فلان'' (فلاں نے فلاں پر احسان کیا)۔ ''منّ'' (احسان کرنا) زبان کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ اسی معنیٰ میں شاعر کا یہ شعر ہے:

فمنّی علینا بالسّلام فانما کلامک یاقوت و درمنظم

''میرا احسان ہماری قوم پر سلام کے ذریعہ ہے کیونکہ تمہارا کلام یاقوت اور پروئے ہوئے موتی ہیں''۔

''منّ بالقول'' (زبان کے ذریعہ احسان) کی ایک قسم وہ بھی ہے جو لوگوں کے درمیان بُری سمجھی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی کو کچھ دینے کے بعد اس پر احسان جتائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ جب تم کسی کو کوئی چیز دو اور تم سمجھو کہ تمہارا سلام اس کے لیے دشواری کا باعث ہوگا تو تم اسے سلام نہ کرو۔ اہل عرب کا یہ دستور ہے کہ وہ احسان نہ جتانے کی اور احسان کر کے اُسے چھپانے کی تعریف کرتے ہیں اور (اس کے برعکس) احسان کر کے اُسے ظاہر کرنے اور احسان جتانے کی مذمت کرتے ہیں۔ احسان نہ جتانے کی تعریف کرتے ہوئے اہل عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:

زاد معروفک عندی عظما انہ عندک مستور حقیر

تتناساہ کأن لم تأتہ وھو فی العالم مشھور کبیر

(۱) میرے نزدیک تمہارے احسان کی عظمت بڑھ گئی ہے کیونکہ تمہارے نزدیک وہ احسان چھپا ہوا ہے اور کمتر ہے۔

(۲) تم اپنے احسان کو اس طرح بھول جاتے ہو جیسے تم نے کیا ہی نہیں' حالانکہ وہ پوری دنیا میں بہت مشہور ہے۔

احسان جتانے کی مذمت کرتے ہوئے اہل عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:

اتیت قلیلا ثم اسرعت منة فنیلک ممنون لذاک قلیل

''یعنی تم نے تھوڑا سا احسان کیا' پھر اُسے فوراً جتا دیا' یہی وجہ ہے کہ تم نے اپنے احسان کے نتیجہ میں جو کچھ پایا وہ بھی تھوڑا ہے اور اس میں احسان جتایا ہوا ہے''۔

آیت میں جو ''اذی'' کا لفظ ہے اس سے مراد ہر وہ نقصان ہے جو انسان کو پہنچے۔ خواہ وہ زبان سے ہو یا عمل سے۔ جب ''منّ'' اور ''اذی'' کا معنیٰ معلوم ہو گیا تو اب ہم کہتے ہیں کہ ''منّ'' سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان کر کے اُسے ظاہر کیا جائے اور ان پر احسان جتایا جائے۔ اور ''اذی'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی لوگوں کو جو چیز دے اس کی بنیاد پر ان سے شکوہ

کرے۔ زیر بحث آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلانے اور اس میں تکلیف پہنچانے کو اپنے بندوں پر حرام فرمادیا ہے اور ایسا کرنے والے کی مذمت کی ہے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ''منّان'' کی صفت کے ساتھ اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے' اب دونوں میں کیا فرق رہا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت میں ''منّان'' کا معنیٰ ہے: فضل وکرم کرنے والا۔ یعنی اللہ عزوجل کا ''منّ'' یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرتا ہے اور ان کے ساتھ احسان فرماتا ہے۔ لہٰذا بندوں کے پاس جو جو نعمتیں ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے احسان ہیں۔ اور بندوں کا جو ''منّ'' ہے اس کا معنیٰ ہے: عار دلانا اور مزا کر کرا کرنا۔ لہٰذا دونوں کے درمیان فرق واضح ہو گیا۔

﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ﴾ اس میں ''اجر'' سے مراد ثواب ہے۔ ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ سے مراد ہے: آخرت میں اجر ہے۔ ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ خوف نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن انہیں خوف نہیں ہوگا۔ ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ غمگین نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا اس پر انہیں غم نہیں ہوگا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچے اور اللہ بے نیاز بہت بردبار ہے O

''قول معروف'' اور ''مغفرت'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ سے مراد ہے: اچھی بات کرنا اور مانگنے والے فقیر کو اچھے طریقے سے لوٹانا۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ہے: وہ اچھا وعدہ جو آدمی فقیر اور سائل کے ساتھ کرے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ہے: وہ نیک دعا جو آدمی سائل اور فقیر کے لیے پیٹھ پیچھے کرے۔ ﴿مَغْفِرَةٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم مانگنے والے کی محتاجی اور فقر کو اس تک پوشیدہ رکھو اور اس کا پردہ فاش نہ کرو۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جب بار بار لوٹانے کے باوجود فقیر واپس نہ جارہا ہو تو اس سے درگزر کیا جائے۔ ﴿خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ اچھی بات اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جو تم فقیر کو دو (اور اس کے پیچھے اُسے تکلیف دو)۔ ﴿اَذًى﴾ سے مراد یہ ہے کہ فقیر کو صدقہ دے کر اس پر احسان جتایا جائے اور زبان سے اُسے عار دلائی جائے یا عمل سے تکلیف دی جائے۔ آخر میں جو فرمایا کہ ''اللہ غنی اور حلیم ہے'' اس میں ﴿غَنِيٌّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ بندوں کے صدقہ خیرات سے بے نیاز ہے۔ (واضح رہے کہ) کامل غنی وہ ہوتا ہے جو کسی کا محتاج نہ ہو اور ایسی ذات سوائے خدا کے کوئی اور نہیں ہے۔ ﴿حَلِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا بردبار ہے کہ جو شخص صدقہ خیرات کر کے احسان جتاتا ہے اور تکلیف پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے جلد سزا نہیں دیتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

اے ایمان والو! تم احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنے صدقات کو اس شخص کی طرح ضائع نہ کیا کرو جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا' سو اس کی مثال اس چٹان کی طرح ہے جس پر کچھ مٹی ہو' پھر اس پر زوردار بارش ہو اور وہ اس (چٹان) کو بالکل صاف کر کے چھوڑ دے' ایسے لوگ اپنی کمائی سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے' اور اللہ کافروں کی جماعت کو ہدایت نہیں دیتا O

آیت مذکورہ میں آنے والے الفاظ کے مختصر معانی اور تفسیر

''صدقات'' ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اجر و ثواب کو ضائع نہ کیا کرو۔ ﴿بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی﴾ سے مراد یہ ہے کہ مانگنے والے فقیر پر احسان جتا کر اور اسے تکلیف دے کر ضائع نہ کرو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''بالمنّ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر احسان جتا کر ضائع نہ کرو اور ''الاذی'' سے مراد یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس کو اذیت دے کر ضائع نہ کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا: اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

﴿کَالَّذِیْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس شخص کے باطل کام کی طرح۔ ﴿یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اور شہرت کے لیے خرچ کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے خرچ کو دیکھیں اور کہیں کہ یہ شخص بہت سخی اور دریا دل ہے۔ آگے جو فرمایا: ﴿لَا یُؤْمِنُ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ ریاکاری صدقہ کو ضائع کر دیتی ہے اور ریاکاری کے ساتھ خرچ کرنے سے وہ اہل ایمان کا عمل نہیں رہتا بلکہ منافقین کا عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کافر اپنے کفر میں مُعلِن ہوتا ہے (یعنی علی الاعلان کفر کرتا ہے) ریاکاری نہیں کرتا۔

﴿مَثَلُهٗ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے صدقہ خیرات اور دیگر اعمال میں ریاکاری کرے اس کی مثال ﴿کَمَثَلِ صَفْوَانٍ﴾ صفوان کی مانند ہے۔ ''صفوان'' چکنے اور سخت پتھر کو کہتے ہیں۔ یہ واحد بھی ہے اور جمع بھی ہے۔ جن علماء نے اس کو جمع قرار دیا ہے ان کے بہ قول اس کا واحد ''صَفْوَانَةٌ'' ہے اور جن علماء نے اس کو واحد قرار دیا ہے ان کے بہ قول اس کی جمع ''صُفِیٌّ'' ہے۔ ﴿عَلَیْهِ تُرَابٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ پتھر پر مٹی ہو۔ اور ﴿وَابِلٌ﴾ کا معنیٰ ہے: بڑی بڑی بوندوں والی سخت بارش (یعنی وہ بارش اس پتھر پر پہنچے)۔ ﴿فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ اور اس پتھر کو اس حالت میں چھوڑ دے کہ وہ چکنا ہو اور اس پر مٹی کا کوئی ذرہ نہ ہو۔

آیت مذکورہ میں بیان کی جانے والی مثال کی تشریح

یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافق' ریاکار اور اس مسلمان کے خرچ کی کیفیت کو واضح کرنے کے لیے بیان فرمائی ہے جو صدقہ دے کر لوگوں کو تکلیف دیتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ظاہراً ان کے کچھ اعمال ہیں' جیسے چٹان پر پہلے مٹی نظر آتی ہے پھر جب بارش ہوتی ہے تو وہ مٹی کو دور کر دیتی ہے۔ یہی حال قیامت کے دن ان لوگوں کا ہوگا۔ یعنی ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے کیونکہ وہ اعمال اللہ عزوجل کے لیے نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اس طرح ضائع ہو جائیں گے جس طرح تیز بارش چٹان پر موجود مٹی کو صاف کر دیتی ہے۔

﴿عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے دنیا میں جو اعمال کیے ان میں سے کسی عمل کا ثواب یہ لوگ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ آخر میں جو فرمایا کہ ''اللہ کافروں کی جماعت کو ہدایت نہیں دیتا'' اس میں کافروں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں ازل سے اُسے علم ہے کہ وہ کفر پر مریں گے۔

ریا کاری کی مذمت میں دو احادیث

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۶۷) جن چیزوں کا مجھے تم پر خوف ہے اُن میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ صرف شرک اصغر ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! شرک اصغر کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ریا کاری۔ جس دن لوگوں کو اعمال کا بدلہ دیا جا رہا ہو گا اس دن ریا کاروں سے کہا جائے گا کہ دنیا میں جن لوگوں کو تم دکھاتے تھے ان کے پاس جاؤ اور دیکھو: کیا تمہیں ان کے پاس کوئی جزاء ملتی ہے؟ (تفسیر معالم التنزیل للبغوی' البقرہ: ۲۶۴' مسند احمد ج ۵ ص ۴۲۸' شعب الایمان: ۶۸۳۱' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۳۳۴۔ ص ۴۵۶)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

(۳۶۸) میں تمام شرکاء کے شرک سے بہت بے نیاز ہوں۔ جو شخص ایسا عمل کرے جس میں وہ میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو میں اسے اور اس کے شرک (دونوں کو) چھوڑتا ہوں۔ (صحیح مسلم: ۲۹۸۵' سنن ابن ماجہ: ۴۲۰۲' مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۱)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵

اور وہ لوگ جو اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس باغ کی طرح ہے جو کسی بلند جگہ پر ہو' اس پر زوردار بارش ہو تو وہ اپنا پھل (پہلے کے مقابلہ میں) دوگنا دے اور اگر اس پر زوردار بارش نہ ہو تو شبنم ہی کافی ہو' اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے O

''تثبیت'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ سے مراد ہے: اللہ کی رضا اور خوشنودی کو طلب کرتے ہوئے۔ ﴿تَثْبِيْتًا﴾ سے مراد ہے: اللہ کی فرمانبرداری میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو جماتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی تصدیق کرتے ہوئے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کے دلوں نے جو کچھ خرچ کیا ہے اس پر اللہ عزوجل نے ان سے جو وعدہ فرمایا ہے اس وعدہ پر وہ دل سے یقین رکھنے والے ہوں اور اس کی تصدیق کرنے والے ہوں۔ بعض نے ''تثبیتا'' کا معنیٰ احسان کیا ہے اور بعض نے اس کا معنیٰ تصدیق کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جو لوگ نیکی اور فرمانبرداری کے تمام کاموں میں اپنے اموال کی زکوٰۃ نکالتے ہیں اور اپنے اموال خرچ کرتے ہیں خوش دلی کے ساتھ اور اس یقین کے ساتھ کہ اللہ عزوجل کی جانب سے اجر وثواب حاصل ہوگا' نیز اس کے وعدہ کی تصدیق کے ساتھ خرچ کرتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو انہوں نے رکھ چھوڑا ہے۔ بعض مفسرین نے ''تثبیتا'' کا معنیٰ یہ کیا ہے جو لوگ اس یقین پر قائم رہتے ہوئے خرچ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ جس جگہ پر انہوں نے اپنے صدقات دیئے ہیں اس جگہ قائم رہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ آدمی جب صدقہ دینے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر اگر صدقہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو وہ اس کو دے ڈالے اور اگر اس میں شک یا دکھلاوہ آ جائے تو اس کو روک لے۔

”جنۃ“ ”ربوہ“ اور ”وابل“ کے معانی اور باغ کے دوگنا پھل دینے کا مفہوم

﴿جَنَّۃٍ﴾ سے مراد باغ ہے۔امام فراء فرماتے ہیں کہ باغ میں جب کھجور کے درخت لگے ہوں تو وہ جنت ہے اور اگر انگور کے درخت ہوں تو وہ فردوس ہے۔﴿ربوۃ﴾ سے مراد ایسی جگہ ہے جو ہموار ہو اور زمین سے بلند ہو۔(اس کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ) زمین کا جو حصہ پانی اور وادی کے بہاؤ سے اونچا ہو اس پر اُگنے والا پھل بہت اچھا اور صاف ہوتا ہے۔ بشرطیکہ پانی سے اُسے سیراب بھی کیا جاتا ہو۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ”ربوۃ“ ایسی زمین کو کہتے ہیں جو ایسی ہموار عمدہ اور صاف ستھری ہو کہ جب اس پر بارش ہو تو وہ بلند ہو جائے اور بڑھ جائے اور جب زمین اس طرح بلند ہو تو اس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور درخت پھل دار ہوتے ہیں۔آیت میں جو ﴿وَابِلٌ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: بہت ہی زوردار اور کثیر بارش۔کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

ما روضۃ من ریاض الحزن معشبۃ خضراء جار علیھا وابل ھطل

”سخت زمین پر جو باغات ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سرسبز وشاداب ہو اور اس پر موسلا دھار اور زوردار بارش ہوتی ہو“۔

﴿فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ باغ اپنا پھل دومثل (دوگنا) دے۔بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ دیگر باغات دوسالوں میں جتنی پیداوار دیتے ہیں اتنی پیداوار مذکورہ باغ ایک سال میں دے۔اور بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ وہ باغ ایک سال میں دومرتبہ پیداوار دے۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾ ”طلّ“ کا معنیٰ ہے: ”طش“ یعنی ہلکی ہلکی بارش۔مفہوم آیت یہ ہے کہ اس باغ پر اگر زوردار بارش نہ ہو اور ہلکی ہلکی بارش ہی ہوتی رہے تب بھی وہ باغ اسی طرح دوگنا پھل دیتا ہے اور ہلکی بارش کی وجہ سے پھلوں کی اس مقدار میں کمی نہیں آتی جو زوردار بارش کے نتیجہ میں وہ اُگاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں بیان کی جانے والی مثال کی تشریح

یہ وہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مؤمن کے عمل کی کیفیت کو واضح کرنے کے لیے بیان فرمائی ہے جو خرچ کرنے میں اور دیگر تمام اعمال میں مخلص ہو۔اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جس طرح مذکورہ باغ ہر حال میں پیداوار دیتا ہے اور اس کی فصل میں اضافہ ہوتا ہے اور کبھی بھی اس کے معمول میں تبدیلی نہیں آتی' خواہ بارش تھوڑی ہو یا زیادہ' اسی طرح جو صاحبِ ایمان اپنے صدقہ خیرات میں مخلص ہو اور اس کے ذریعہ نہ احسان جتاتا ہو نہ ہی تکلیف دیتا ہو اس کے صدقہ کو بھی اللہ تعالیٰ دوگنا فرمادیتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ یعنی جو شخص اخلاص کے ساتھ صدقہ دیتا ہے اور اس کے ذریعہ نہ احسان جتاتا ہے نہ ہی تکلیف پہنچاتا ہے اس کا خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں اور وہ شخص جو صدقہ دے کر احسان جتاتا ہے اور تکلیف پہنچاتا ہے اس کا خرچ کرنا بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' اس کے نیچے ندیاں بہتی ہو' اس (باغ) میں اس کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں (انہی حالات میں) اُسے بڑھاپا آ پہنچے جبکہ اُس کے ناتواں بچے بھی موجود ہوں' پھر اُس باغ کو ایک ایسا بگولہ آ پہنچے جس میں آگ ہو' اس کے نتیجہ میں (باغ) جل جائے' اسی طرح اللہ تمہارے لیے نشانیاں بیان فرماتا ہے تا کہ تم غور وفکر کروO

گزشتہ آیت (البقرہ:۲۶۴) میں جو فرمایا گیا کہ اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر ضائع مت کرو' زیر بحث آیت اسی سے متصل ہے۔﴿ اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ ﴾ کا معنیٰ ہے: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے۔﴿ اَنۡ تَکُوۡنَ لَہٗ جَنَّۃٌ ﴾ کہ اس کا ایک باغ ہو۔﴿ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ ﴾ کھجوروں اور انگوروں کا۔ خصوصیت کے ساتھ ان دو پھلوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں تمام پھلوں میں بہت اعلیٰ اور اچھے ہوتے ہیں اور ان میں غذائیت اور لذت بھی موجود ہوتی ہے۔ آگے جو فرمایا:﴿ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اس باغ میں جو نہریں بہتی ہوں وہ اس باغ کے حسن و جمال کی تکمیل کا حصہ ہوں اور اس باغ کے پھلوں میں اضافہ کا باعث ہوں۔﴿ لَہٗ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ﴾ (اس میں اس کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں) کیونکہ ہر طرح کے پھلوں کا ہونا باغ کے کمال اور حسن کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

﴿ وَاَصَابَہُ الۡکِبَرُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ باغ والے کی ضروریات بڑھ جائیں اور باغ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً اس باغ کی اُسے شدید ضرورت ہو گی۔

''اصابہ الکبر'' کا ''ایود'' پر عطف اور اس پر وارد ہونے والے اشکال کی توجیہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ ''واصابہ الکبر'' کا عطف ''ایود'' پر کیسے کیا گیا؟ اور ماضی کا عطف مستقبل پر کیونکر جائز ہو گا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس کی دو توجیہات ہیں۔ ایک توجیہ یہ ہے کہ (''واصابہ'' کا واؤ حالیہ ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ) کیا کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' اس حال میں کہ اس شخص کو بڑھاپا آ پہنچے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہاں (صیغہ پر عطف نہیں ہے بلکہ) معنیٰ پر عطف ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ ''کیا تم میں سے کوئی شخص چاہتا ہے کہ اس کا باغ ہو اور اُسے بڑھاپا آ پہنچے''۔

﴿ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جو کہ ناتوانی اور کم عمری کی وجہ سے کوئی کام کرنے سے عاجز ہوں۔

﴿ فَاَصَابَہَاۤ اِعۡصَارٌ ﴾ سے مراد ہے: اس باغ کو بگولہ آ پہنچے۔ ''اعصار'' اُس ہوا کو کہتے ہیں جو آسمان کی طرف بلند ہو اور ستون کی طرح گول ہو۔

آیت مذکورہ میں بیان کی جانے والی مثال کی تشریح

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو مثال بیان فرمائی ہے وہ منافق اور ریاکار کے عمل کی کیفیت کو واضح کرنے کے لیے بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ منافق اور وہ شخص جو اپنے عمل میں ریاکاری کرتا ہے ان کے عمل کی مثال حسن و جمال میں ایسے ہی ہے جیسے اس باغ کا حسن و جمال جس کا مالک ایک عرصہ تک باغ سے فائدہ حاصل کرتا رہے' پھر جب وہ شخص بوڑھا اور ضعیف ہو جائے اور اولاد بھی ناتواں ہو اور (ان حالات میں) اس کے باغ کو ایسا بگولہ آ پہنچے جس میں آگ ہو اور وہ اس باغ کو جلا ڈالے' جبکہ اُسے اس باغ ہی کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔ اندریں حالات باغ کے جل جانے سے اسے اس قدر غم اور افسوس ہو گا کہ بس اُسے اللہ ہی جانتا ہے۔ غم اور افسوس اس لیے ہو گا کہ وہ بڑھاپے اور کمزوری کا شکار ہے۔ اور اس کی اولاد بھی ناتواں ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس سے وہ اپنی اولاد کو سہارا دے سکے اور نہ ہی اولاد کے پاس

ایسی کوئی چیز ہے جس سے وہ اپنے بوڑھے باپ کو سہارا دے سکے۔ نتیجۃً سب کے سب حیران و پریشان اور اتنے عاجز و بے بس رہ گئے کہ ان کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔ یہی حالت اُس شخص کی ہوگی جو قیامت کے دن اپنے اُن نیک اعمال کو لے کر آئے گا جو اُس نے اللہ عزوجل کے نہیں لیے کیے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن اعمال کو باطل فرما دے گا' حالانکہ شخص مذکور کو اس وقت اُن اعمال کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی جبکہ وہاں نہ طلب رضا کا موقع ہوگا نہ توبہ کرنے کا موقع ہوگا۔

حضرت عبید بن عُمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے پوچھا کہ بتاؤ یہ آیت ''ایود احدکم'' کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ حضرت عمر نے غضب ناک ہوکر کہا کہ یا یوں کہو کہ ہم جانتے ہیں یا کہو کہ ہم نہیں جانتے[۶۵۲]۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ اس کے متعلق میرے دل میں ایک بات ہے۔ حضرت عمر نے کہا: بھتیجے! بیان کرو اور اپنے آپ کو معمولی نہ سمجھو۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عمل کی مثال بیان فرمائی ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا: کون سے عمل کی؟ انہوں نے کہا کہ اس غنی شخص کے عمل کی جو اللہ عزوجل کی اطاعت کرتا ہو' پھر اس پر اللہ تعالیٰ شیطان کو مسلط فرما دے' نتیجۃً وہ گناہ کرنا شروع کر دے یہاں تک کہ اپنے سارے اعمال کو جلا ڈالے[۶۵۳]۔ (صحیح بخاری: ۴۵۳۸' جامع البیان للطبری: ۶۰۹۵)

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ﴾ اسی طرح اللہ تمہارے لیے نشانیاں بیان فرماتا ہے۔ یعنی جس طرح اس نے تمہارے لیے مقبول اور غیر مقبول خرچ کی تفصیل بیان فرمائی اسی طرح تمہارے لیے اس کے علاوہ اپنی نشانیاں بھی بیان فرماتا ہے۔ تاکہ تم غور وفکر کرو' یعنی نصیحت حاصل کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم دنیا کے زوال پذیر ہونے اور آخرت کی طرف توجہ کرنے میں غور کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

اے ایمان والو! جو کچھ تم کماتے ہو اس میں سے عمدہ چیزوں کو خرچ کیا کرو اور ان چیزوں میں سے (خرچ کیا کرو) جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں' اور (اللہ کی راہ میں) ایسی گھٹیا چیز خرچ کرنے کا قصد نہ کرو جس کو تم خود بھی آنکھ بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو' اور یقین رکھو کہ اللہ بہت بے نیاز ہے ہر تعریف کے لائق ہے ○

﴿ طَيِّبٰتِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اپنی کمائی کا بہترین اور عمدہ حصہ خرچ کرو۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی

۶۵۲ اس جملہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مراد یہ نہیں تھی کہ کسی سوال کے جواب میں ''اللہ زیادہ جانتا ہے'' کہنا (معاذ اللہ) غلط ہے' بلکہ مراد یہ تھی جواب میں غور وفکر کرو' جھجک اور خوف نہ رکھو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے' لیکن جن معاملات میں غور وفکر کرنا ممکن ہو اور فہم وفراست کو استعمال میں لایا جا سکتا ہو اُن میں ضرور غور وفکر کرنا چاہیے۔

۶۵۳ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال پر صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بہت اعلیٰ فہم وفراست کے مالک تھے اور انہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاص قرب حاصل تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالم دین جب اپنے کسی شاگرد میں قابلیت محسوس کرے تو اکابرین کی موجودگی میں اُسے جواب دینے کی ہمت دلائے۔ کیونکہ اس سے طالب علم کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے' قلبی طور پر کشادگی ملتی ہے اور علم کی طرف رغبت مزید بڑھتی ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۵۶)

صنعت اور تجارت سے جو کچھ تم کماتے ہو اس میں جو حلال حصہ ہو اس کو خرچ کرو۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں عمدہ اور ناپاک کمائی کا بیان

اس آیت میں اس بات کا ثبوت ہے کہ کمانا جائز ہے۔ اور اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ کمائی اچھی بھی ہوتی ہے اور ناپاک بھی۔ چنانچہ حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۳۶۹) بلاشبہ یہ مال سرسبز اور میٹھا ہے۔ جو شخص اس کو درست طریقہ سے حاصل کرے اس کے لیے اس میں برکت ہوگی۔ اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے مال میں اپنی خواہشات کے مطابق تصرف کرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن صرف دوزخ کی آگ ہوگی۔ (سنن ترمذی:۲۳۷۴' مسند احمد ج۶ ص ۳۷۸' مشکوٰۃ المصابیح:۴۰۱۷ ص ۳۵۱)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''متخوض'' اس کا معنیٰ ہے: وہ شخص جو بغیر کسی وجہ اور سبب کے مال حاصل کرے۔ جیسے انسان پانی میں اِدھر اُدھر غوطہ کھاتا ہے۔

(۳۷۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی جو کچھ لے رہا ہوگا وہ اس میں یہ پرواہ نہیں کرے گا کہ یہ حلال ہے یا حرام۔ (صحیح بخاری:۲۰۵۹' مشکوٰۃ المصابیح:۲۷۶۱ ص ۲۴۱)

(۳۷۱) حضرت مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کبھی کوئی شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کے کھانے سے بہتر کھانا نہیں کھاتا[۶۵۴] اور بلاشبہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے[۶۵۵]۔
(صحیح بخاری:۲۰۷۲' مسند احمد ج۴ ص ۱۳۱' مشکوٰۃ المصابیح:۲۷۵۹ ص ۲۴۱)

(۳۷۲) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک تم جو کچھ کھاتے ہو اُس میں سب سے زیادہ پاکیزہ چیز وہ ہے جو تمہاری اپنی کمائی ہو۔ اور بلاشبہ تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے[۶۵۶]۔
(سنن ترمذی:۱۳۵۸' سنن ابوداؤد:۳۵۲۸' سنن نسائی:۴۴۵۰' سنن ابن ماجہ:۲۲۹۰' سنن دارمی:۲۵۳۷' مسند احمد ج۶ ص ۱۶۲' سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۸۰' مشکوٰۃ المصابیح:۲۷۷۰ ص ۲۴۲)

زیر بحث آیت میں ''انفاق'' سے کس قسم کا خرچ کرنا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء کے تین اقوال

زیر بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿اَنْفِقُوْا﴾ (خرچ کرو) اس کی مراد میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے فرض زکوٰۃ کی ادائیگی مراد ہے۔ کیونکہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی واجب (یعنی فرض) ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ آیت مبارکہ میں ''انـفـقـوا'' سے زکوٰۃ مراد لی جائے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے نفلی صدقہ کی

---

[۶۵۴] یعنی آدمی کا سب سے بہترین کھانا وہی ہوتا ہے جو ذاتی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔

[۶۵۵] یعنی آپ حاکم اور سلطان تھے' اس کے باوجود آپ نے کبھی شاہی خزانہ (بیت المال) سے اپنے اوپر خرچ نہیں فرمایا۔ بلکہ روزانہ ایک زرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار اپنے بال بچوں پر خرچ فرماتے تھے اور چار ہزار فقراء بنی اسرائیل پر خیرات فرماتے تھے۔ (مرقات ج۶ ص ۷' مراۃ ج۴ ص ۲۲۷) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام خلیفۂ وقت تھے' آپ کو کمانے کی قطعاً حاجت نہیں تھی۔ اس کے باوجود آپ نے ہاتھ کی کمائی کا راستہ اختیار کیا' اس لیے نبی اکرم ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ خود نبی اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ہاتھ کی کمائی سے کھانے کے لیے گھر کے کام کاج میں مشغولیت اختیار فرماتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج۸ ص ۳۳۱)

[۶۵۶] مراد یہ ہے کہ حصول رزق کے لیے کوشش کرو اور کوشش کر کے کھاؤ اور اولاد کی کمائی بھی تمہاری کمائی ہے۔ یعنی ضرورت کے وقت تمہارے لیے اُس کا استعمال جائز ہے۔ (مرقات ج۶ ص ۲۱' مراۃ ج۴ ص ۲۴۳)

ادائیگی مراد ہے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے فرض اور نفل دونوں قسم کا خرچ مراد ہے۔ کیونکہ خرچ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جانب فعل جانب ترک پر راجح ہے۔ اور یہ مفہوم فرض اور نفل دونوں کے درمیان قدر مشترک ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ فرض اور نفل دونوں قسم کا خرچ کرنا اس حکم میں داخل ہو۔

علماء کے پہلے قول کی بنیاد پر زیر بحث آیت سے متفرّع ہونے والے تین اہم مسائل زکوٰۃ

پہلا جو قول ذکر کیا گیا کہ ''انفقوا'' سے فرض زکوٰۃ کی ادائیگی مراد ہے اس کی بنیاد پر کچھ مسائل متفرع ہوتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ظاہر آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر اس مال میں واجب ہے جو آدمی کماتا ہے۔ لہٰذا اس میں سونا' چاندی' جانور اور سامانِ تجارت کی زکوٰۃ داخل ہے۔ کیونکہ ان سب چیزوں کو کمائی کہا جاتا ہے۔ مالِ تجارت میں جمہور علماء کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے۔ جبکہ داؤد ظاہری کا مذہب یہ ہے کہ سامان میں محض تجارت کا حکم لگانے سے (یا تجارت کا فیصلہ کرنے سے) زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب آدمی اس سامان کی ملکیت حاصل کرتے وقت اس کی تجارت کی نیت کرتے۔[۶۵۷] جمہور علماء کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۷۳) ہمیں رسول اللہ ﷺ ان چیزوں میں (بھی) زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم فرماتے تھے جو تجارت کے لیے تیار کی جاتی تھیں۔ (سنن ابوداؤد: ۱۵۶۲' سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۴۶)

حضرت ابوعمرو بن حماس بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد نے کہا کہ میں اپنی گردن پر کچھ کھالیں اٹھائے جا رہا تھا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزر ہوا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے حماس! کیا زکوٰۃ ادا نہیں کرو گے؟ میں نے کہا کہ میرے پاس تو صرف یہ کھالیں ہی ہیں نیز کچھ کھالیں اور بھی ہیں جو کہ قرظ (مخصوص درخت) کے پتوں سے دباغت دی ہوئی ہیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ سب کا سب مال ہے۔ لہٰذا تم اس کو یہاں رکھو۔ انہوں نے وہ کھالیں رکھ دیں۔ حضرت عمر نے ان کھالوں کا حساب لگایا اور اس میں سے زکوٰۃ وصول کی۔ (شرح السنۃ: ۱۵۷۸' مسند الامام الشافعی: ۴۴۳' سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۴۷)

(سامانِ تجارت کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب اس پر سال گزر جائے تو اس کی قیمت لگائی جائے۔ اگر اس کی قیمت بیس دینار یا دو سو درہم کو پہنچتی ہو تو اس میں سے ۱۰/۴ زکوٰۃ نکالی جائے۔[۶۵۸]

زمین کی پیداوار میں زکوٰۃ کا شرعی حکم اور اس میں علماء کے درمیان اختلاف

(۲) دوسرا مسئلہ زیر بحث آیت کے آگلے حصہ سے ہے' جس میں فرمایا ﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (ان چیزوں میں سے (خرچ کیا کرو) جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں) اس کے ظاہر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر اس چیز میں واجب ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہے' یعنی وہ نباتات جن کو لوگ کاشت کرتے ہیں۔ لیکن جمہور علماء نے آیت کے عموم کو خاص کیا ہے اور کھجور کے درخت اور انگور کے درختوں میں زکوٰۃ کو واجب قرار دیا ہے اور ایسے غلہ میں

---

۶۵۷ یعنی ایسا سامان جس میں خریدتے وقت تجارت کی نیت کی گئی ہو زکوٰۃ صرف اُس مال میں واجب ہوتی ہے۔ جبکہ صحیح مذہب یہ ہے کہ جو سامان تجارت کی غرض سے خریدا گیا اُس میں بھی زکوٰۃ فرض ہے اور جس سامان کو خریدنے کے بعد تجارت کا بنایا گیا اُس میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

۶۵۸ بیس دینار سے ساڑھے سات تولہ سونا مراد ہے۔ (یعنی ۴۸.۸۷ گرام) اور دو سو درہم سے ساڑھے باون تولہ چاندی مراد ہے۔ (یعنی ۶۱۲.۳۶ گرام) اور ۱۰/۴ سے چالیسواں حصہ مراد ہے (یعنی ڈھائی فیصد)۔

جو قابل غذاء اور قابل ذخیرہ ہو۔ جبکہ امام ابوحنیفہ نے زمین کی ہر اس چیز میں زکوٰۃ کو واجب قرار دیا ہے جو نباتات میں داخل ہے۔ جیسے میوے، سبزیاں، ترکاریاں مثلاً تربوز، ککڑی، کھیرا اور ان جیسی دیگر چیزیں۔ جمہور کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

(۳۷۴) انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو خط لکھا، اس میں آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ سبزیوں (میں زکوٰۃ) کا کیا حکم ہے؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان میں کچھ (واجب) نہیں ہے۔[۶۵۹] (سنن ترمذی: ۶۳۸)

☆ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ "یہ حدیث صحیح نہیں[۶۶۰] ہے، اور اس باب میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی روایت صحت کے ساتھ نہیں ہے۔ البتہ یہ روایت مرسلاً موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے انہوں نے اس کو نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ موسیٰ بن طلحہ کی حدیث کو شیخ ابن تیمیہ الحرانی نے اپنی کتاب احکام میں ذکر کیا ہے۔

(جمہور کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو) حضرت عطاء بن سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مغیرہ[۶۶۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ بن طلحہ کی زمین سے سبزیوں کی زکوٰۃ وصول کریں۔ تو موسیٰ بن طلحہ نے ان سے کہا کہ آپ کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ:

(۳۷۵) سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔[۶۶۲] اس کو امام الاثرم نے اپنی سُنن میں روایت کیا ہے۔

(سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۲۹، دارقطنی ج ۲ ص ۹۵)

جن علماء نے اس حدیث کو مرسل قرار دیا ہے ان کے استدلال کے لیے یہ حدیث تمام مراسیل میں سب سے زیادہ قوی ہے۔

امام زہری، امام اوزاعی اور امام مالک کا موقف یہ ہے کہ زیتون میں زکوٰۃ واجب ہے، اور پھلوں میں اس وقت واجب ہے جب ان کا پکنا ظاہر ہو جائے۔ یعنی کچے پھل سرخ اور پیلے ہو جائیں۔ ان کی زکوٰۃ اس وقت نکالی جائے گی جب ان کو توڑ لیا

---

۶۵۹ اس حدیث کے بارے میں خود علامہ خازن نے امام ترمذی کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ یہ غیر صحیح ہے اور اس باب میں سند صحیح کے ساتھ نبی اکرم ﷺ سے کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔ ثانیاً یہ روایت اور اس مفہوم کی دیگر روایات امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے موقف کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں مطلقاً زکوٰۃ کی نفی نہیں ہے بلکہ عین سبزی سے زکوٰۃ وصول کرنے سے منع فرمایا جارہا ہے۔ یعنی جب کوئی شخص سبزیوں پر عائد زکوٰۃ بہ صورت قیمت ادا نہ کرے تو زکوٰۃ وصول کرنے والے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس سے زکوٰۃ میں سبزیاں وصول کرے۔ کیونکہ اس صورت میں فقراء اور مستحقین تک پہنچنے میں تاخیر کی وجہ سے سبزیوں کے خراب ہونے اور ضائع ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا یہ روایات اس پر محمول ہیں کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا مالک سے عین سبزی وصول نہ کرے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ سبزیوں میں زکوٰۃ ہی نہیں ہے، درست نہیں ہے۔ (دیکھئے: ہدایہ اولین ص ۲۱۸)

۶۶۰ امام ترمذی نے یہ نہیں فرمایا کہ "یہ حدیث صحیح نہیں ہے" بلکہ انہوں نے فرمایا ہے کہ "اس حدیث کی اِسناد صحیح نہیں ہے"۔ اور درست طریقہ بھی یہی ہے کہ غیر صحیح کی نسبت حدیث شریف کی بجائے اُس کی اِسناد کی طرف کی جائے۔

۶۶۱ سنن بیہقی میں عبداللہ بن مغیرہ کی بجائے موسیٰ بن مغیرہ کا نام مذکور ہے۔ (دیکھئے: سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۱۲۹)

۶۶۲ اس حدیث شریف کا محمل ہم حاشیہ: ۶۵۹ میں بیان کر چکے ہیں اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ روایت اور اس معنیٰ کی دیگر روایات امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے موقف کے خلاف نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف زیر بحث آیت میں "ممّا اخرجنا لکم من الارض" کے عموم سے ثابت ہے اور اُن احادیث مبارکہ سے ثابت ہے جن میں نبی اکرم ﷺ نے زمین کی پیداوار پر عموم کے ساتھ زکوٰۃ عائد فرمائی ہے۔ (دیکھئے: صحیح بخاری: ۱۴۸۳، صحیح مسلم: ۹۸۱، ودیگر کتب حدیث، ابواب الزکوٰۃ)

جائے اور خشک ہو جائیں۔ جبکہ غلہ میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہو جاتی ہے جب وہ پک جائے' اور زکوٰۃ اس وقت نکالی جائے گی جب ان کو گاہنے کے بعد صاف کر لیا جائے۔

زمین میں عُشر کی ادائیگی کا حکم

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جو زمین بارش' نہر اور چشمہ کے پانی سے سیراب ہوتی ہے اس میں بہ طور زکوٰۃ عُشر (دسواں حصہ) ادا کرنا واجب ہے۔ اور جو زمین اپنے ذرائع سے یا پانی لادنے والے جانوروں کے ذریعے سیراب ہوتی ہے اس کا نصف عشر نکالنا واجب ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۷۶) جو زمین بارشوں اور چشموں کے پانی سے سیراب ہوتی ہو یا وہ عَثری ہو (یعنی صرف بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہو) اُس میں عُشر ہے' اور جو پانی لانے والے جانوروں کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو اس میں نصف عشر ہے (یعنی بیسواں حصہ)۔

(صحیح بخاری: ۱۴۸۳' سنن ترمذی: ۶۴۰' سنن ابوداؤد: ۱۵۹۶' سنن نسائی: ۲۴۸۸' سنن ابن ماجہ: ۱۸۱۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۷۹۷۔ ص ۱۵۹)[۶۶۳]

☆ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ جبکہ ابوداؤد اور نسائی کے جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں کہ جو زمین بارشوں' نہروں اور چشموں کے پانی سے سیراب ہوتی ہو وہ ''بعل'' ہو (یعنی بارانی ہو) تو اُس میں عُشر ہے اور جو زمین پانی لادنے والے جانوروں اور دیگر ذرائع سے سیراب ہو اُس میں نصف عشر ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ''بعل'' اس زمین کو کہتے ہیں جو از خود اپنی تہہ سے سیراب ہو اور اُسے سیراب کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ امام وکیع فرماتے ہیں کہ ''بعل'' اُس پیداوار کو کہتے ہیں جو بارش کے ذریعہ ہو۔ حدیث مذکور: ۳۷۶ میں ایک لفظ ''عثری'' آیا ہے۔ اس سے مراد وہ زمین ہے جو زراعت کے اعتبار سے پختہ ہو۔ یعنی وہ ''بعل'' ہو۔ اس کی تفسیر حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ حدیث مذکور میں دو لفظ اور آئے ہیں۔ ''نضح'' اور ''سانیہ''۔ ''نضح'' کا معنیٰ ہے: پانی طلب کرنا اور ''سانیہ'' کا معنیٰ ہے: وہ جانور جس پر پانی لاد کر لایا جائے' خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے۔

پھل اور کھیتی میں عشر کی ادائیگی کا حکم اور اس میں علماء کا اختلاف

جہاں تک پھل اور کھیتی کا تعلق ہے سو اُن میں اس وقت تک عُشر واجب نہیں ہے جب تک کہ ان کی مقدار پانچ وسق نہ ہو جائے۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔[۶۶۴] امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ پھل اور کھیتی خواہ کم ہوں یا زیادہ بہر صورت ان میں عُشر واجب ہے۔

---

۶۶۳ اس حدیث شریف کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کھیت میں پانی دینے پر مالک کا خرچ نہ ہو اُس کی زکوٰۃ عُشر ہے (یعنی دسواں حصہ) اور اگر مالک کا خرچ ہو تو نصف عشر (یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ) واجب ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۳ ص ۸۱)

۶۶۴ ایک صاع تقریباً ساڑھے چار سیر ہوتا ہے۔ اس حساب سے ایک وسق چھ من تیس سیر ہوا اور پانچ وسق تقریباً ۳۳ من ۳۰ سیر ہوئے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ دیگر ائمہ کا مؤقف یہ ہے کہ زرعی پیداوار جب تک پانچ وسق (یعنی ۳۳ من ۳۰ سیر کے قریب) نہ ہو اُس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کا مؤقف یہ ہے کہ زرعی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے۔ پیداوار خواہ کم ہو یا زیادہ بہر صورت اُس میں زکوٰۃ (یعنی عُشر یا نصف عُشر) کی ادائیگی واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال زیر بحث آیت میں مما اخرجنا لکم کے عموم سے ہے۔ نیز کثیر احادیثِ مبارکہ جن میں رسول اللہ ﷺ نے قلیل و کثیر کے فرق کے بغیر مطلقاً زمین سے حاصل شدہ پیداوار پر عُشر یا نصف عشر کی ادائیگی کا حکم عائد فرمایا ہے' وہ سب امام ابوحنیفہ کی مؤید ہیں۔ تفصیل و تحقیق کے لیے شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۸۷ تا ۸۸۹ ملاحظہ فرمائیں۔

جمہور علماء نے نصاب کی جو مقدار بیان کی ہے اس کے ثبوت میں انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۷۷) نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پانچ وسق (تقریباً ۳۳ من ۳۰ سیر) سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کھجور یا غلہ پانچ وسق سے کم ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔[۶۶۵] (صحیح بخاری: ۱۴۰۵، صحیح مسلم: ۹۷۹، سنن ابوداؤد: ۱۵۵۸، سنن نسائی: ۲۴۸۶، سنن بیہقی ج ۴ ص ۱۳۴، مسند احمد ج ۳ ص ۶۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۷۹۴، ص ۱۵۸)

جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ زیر بحث آیت میں ''انفقوا'' سے نفلی صدقہ مراد ہے ان کا استدلال اس حدیث سے ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۸۸) جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی کاشت کرتا ہے اور اس میں سے کوئی پرندہ، یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ (درخت یا کھیتی) اس شخص کے لیے صدقہ ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۳۲۰، صحیح مسلم: ۱۵۵۳، سنن ترمذی: ۱۳۸۲، مسند احمد ج ۳ ص ۱۴۷، سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۳۷)

آیت مبارکہ کے زیر بحث جملہ کا مفہوم اور اس کا واقعۂ نزول

فرمایا: ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ﴾ ایسی چیز کا قصد نہ کرو جو تمہارے مال میں گھٹیا ہو۔ ﴿مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ (اس طور پر کہ) تم اس گھٹیا چیز کو خرچ کرو۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ ہمارے کھجور کے باغات تھے۔ کھجوروں کی کمی یا زیادتی کے مطابق لوگ کھجوریں لے کر آتے تھے اور بعض لوگ ایک خوشہ یا دو خوشے لے کر آتے اور اُسے مسجد میں لٹکا دیتے۔ اہل صُفہ کے پاس کھانا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ جب کسی کو بھوک لگتی تو وہ خوشہ کے پاس آ کر اُس پر لاٹھی مارتا جس سے چھوارے یا پھل گرتے تو وہ اُسے کھالیتا۔ ہم میں کچھ لوگ ایسے تھے جو دل سے خیرات دینا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ ایسا خوشہ لے کر آتے جس کی کھجوریں گھٹیا اور ناکارہ ہوتیں اور خوشہ ٹوٹا ہوا ہوتا تھا۔ وہ لا کر اُسے مسجد میں لٹکا دیتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''اے ایمان والو! جو کچھ تم کماتے ہو اس میں سے عمدہ چیزوں کو خرچ کیا کرو اور جو چیزیں ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں ان میں سے خرچ کیا کرو اور (اللہ کی راہ میں) ایسی گھٹیا چیز خرچ کرنے کا قصد نہ کرو جس کو تم خود بھی آنکھ بند کیے بغیر لینے والے نہیں ہو اور یقین رکھو

---

[۶۶۵] اس حدیث شریف میں زرعی پیداوار کی ایک مخصوص پیداوار پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے اور یہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے مؤقف کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی جانب سے ائمہ احناف نے جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد سے قرآن مجید کے عموم (مِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ) کو خاص نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ خبر واحد ظنی ہے اور قرآن مجید کا عموم قطعی ہے اور ظنی دلیل سے قطعی کی تخصیص کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں یہ کیا جاسکتا ہے کہ قطعی کے مُقابل آنے والی ظنی دلیل کا کوئی محمل بیان کیا جائے تاکہ دلائل میں باہمی تعارض نہ رہے۔ اس لیے زیر بحث حدیث کا محمل یہ ہے کہ زرعی پیداوار کی جب تجارت کی جائے تو اُس میں پانچ وسق (تقریباً ۳۳ من ۳۰ سیر) سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک وسق کھجور کی قیمت چالیس درہم تھی تو پانچ وسق کی قیمت دو سو درہم ہوئی اور چاندی کا نصاب زکوٰۃ دو سو درہم ہی ہے (یعنی ۶۱۲.۳۶ گرام) لہٰذا حدیث شریف میں زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کا جو حکم بیان کیا جارہا ہے وہ اُس صورت میں ہے جب اُن کی تجارت کی جائے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اس حدیث میں پیداوار ہی کی زکوٰۃ مراد ہے تو احادیث میں باہمی تعارض لازم آئے گا اور تعارض کی صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ قلیل مقدار کی بھی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ (مراۃ المناجیح ج ۳ ص ۳۵، شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۸۷)

کہ اللہ بہت بے نیاز ہے ہر تعریف کے لائق ہے"۔ حضرت براء بن عازب نے فرمایا کہ لوگ جو چیز خرچ کرتے ہیں اگر انہیں اسی طرح کی چیز تحفہ میں دی جائے تو لوگ اُسے نہیں لیں گے سوائے اس کے کہ درگزر اور حیاء کا مظاہرہ کرتے ہوئے لے لیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بعد ہم میں سے ہر شخص اپنی کمائی میں سے عمدہ حصہ پیش کرتا تھا۔ (سنن ترمذی: ۲۹۸۷)

☆ اس حدیث کو امام ترمذی نے "حسن صحیح غریب" قرار دیا ہے۔

بعض مفسرین آیت مبارکہ کے مذکورہ جملہ کا واقعۂ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ خراب پھل اور گھٹیا مال صدقہ میں دیتے تھے اور عمدہ مال کو اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ گھٹیا چیز خرچ کرنے کا قصد نہ کرو۔

"الا ان تغمضوا فیه" میں "اغماض" کی تفسیر

﴿ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ﴾ "اغماض" کا لغوی معنیٰ ہے: نگاہیں نیچے کرنا اور پلکیں بند کرنا۔ یہاں "اغماض" سے مراد ہے: منع نہ کرنا اور نرمی کا مظاہرہ کرنا۔ (لغوی اور مرادی معنیٰ میں مناسبت یہ ہے کہ) انسان جب ایسی چیز دیکھتا ہے جو اسے ناپسند ہو تو وہ اسے دیکھنے سے بچنے کے لیے اپنی نگاہوں کو نیچے کر لیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ گھٹیا چیز کے ساتھ حق ادا کرے تو وہ اُسے نہیں لے گا' سوائے اس کے کہ وہ اپنے حق سے درگزر کرتے ہوئے اور اپنے حق سے دستبردار ہوتے ہوئے لے لے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں گھٹیا چیز تحفہ میں دی جائے تو تم اسے قبول نہیں کرو گے' سوائے اس کے کہ اپنے دوست سے حیا کرتے ہوئے اور غصہ میں لے لو۔ تو جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو میرے لیے کیونکر پسند کرتے ہو؟

(واضح رہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے) جب آدمی کے پاس سارا مال عمدہ ہو تو اُسے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ گھٹیا چیز خرچ کرے۔ کیونکہ جو حصہ دار ہیں وہ سب کے سب اس مال میں اس کے شریک ہیں جو اس کے پاس موجود ہے۔ ہاں اگر سارا مال گھٹیا ہو تو پھر گھٹیا چیز خرچ کرنے میں حرج نہیں۔

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴾ (یقین رکھو کہ اللہ بہت بے نیاز ہے اور ہر تعریف کے لائق ہے) ﴿ غَنِیٌّ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے صدقات خیرات سے بے نیاز ہے' اس نے تمہیں ان چیزوں کا حکم اس لیے نہیں دیا کہ اُسے ان چیزوں کی ضرورت اور حاجت ہے۔ ﴿ حَمِیْدٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے کاموں میں محمود یعنی لائق تعریف ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "حمید" بمعنیٰ حامد ہے۔ یعنی اللہ تمہارے نیک اعمال پر اجر و ثواب دینے والا ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۶۸

شیطان تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں کنجوسی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل و کرم کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ وسعت والا بہت علم والا ہے O

فقر کا معنیٰ اور شیطان کی طرف سے وعدۂ فقر کا مفہوم

﴿ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: "وعدته خیرا ووعدته شـــــرا" (میں نے فلاں سے اچھائی کا وعدہ کیا یا بُرائی کا وعدہ کیا) جب خیر اور شر کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھائی کے وعدہ کے لیے "وعدته" کہا جاتا ہے (یعنی میں نے اس سے اچھائی کا وعدہ کیا) اور بُرائی کے لیے "اوعدته" کہا جاتا ہے (یعنی میں نے

اس سے بُرائی کا وعدہ کیا)۔آیت میں جو''فقر'' کا لفظ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: بدحال ہونا اور ملکیت کا کم ہونا۔ یہ لفظ اصل میں ''کسر فقار الظهر'' سے ماخوذ ہے(''کسر فقار الظهر'' کا معنیٰ ہے: کمر کی ہڈی کا ٹوٹ جانا)۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور آدمی سے کہتا ہے کہ اپنا مال روک کے رکھو اگر تم نے اس کو صدقہ کیا تو تم محتاج اور تنگ دست ہو جاؤ گے۔

''فحشاء'' کی تفسیر

﴿وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ وہ تمہیں فحشاء کا حکم دیتا ہے۔یعنی تمہیں وسوسے ڈالتا ہے اور کنجوسی اور زکوۃ خیرات نہ دینے کو تمہارے سامنے اچھا بنا کر پیش کرتا ہے۔کلبی فرماتے ہیں سوائے زیر بحث آیت کے قرآن کریم میں جہاں بھی ''فحشاء'' کا لفظ آیا ہے اس سے زنا مراد ہے۔

زیر بحث آیت میں ایک نکتہ کی بات یہ ہے کہ شیطان پہلے آدمی کو تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے پھر اس کے ذریعہ وہ یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ انسان کو ''فحشاء'' یعنی کنجوسی کا حکم دیتا ہے۔کیونکہ کنجوس آدمی ہر شخص کے نزدیک قابل مذمت ہوتا ہے' اس لیے شیطان انسان کے سامنے کنجوسی کو اسی وقت اچھے انداز میں پیش کر سکتا ہے جب پہلے وہ انسان کو تنگ دستی کے خوف میں مبتلا کر دے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں ''فحشاء'' (یعنی کنجوسی) کا حکم دیتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً﴾ اللہ عزوجل تم سے تمہارے گناہوں کو بخشنے اور انہیں چھپانے کا وعدہ فرماتا ہے۔اور ﴿فَضْلًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ رزق اور بدلہ دینے کا تم سے وعدہ فرماتا ہے۔یہاں ''مغفرة'' کا لفظ فرما کر اخروی فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے اور ''فضل'' کا لفظ فرما کر دنیاوی فوائد اور جو بھی رزق اور بدلہ ملتا ہے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

﴿وَاسِعٌ﴾ سے مراد یہ ہے وہ ایسا غنی ہے کہ تمہیں بھی غنی بنانے کی قدرت رکھتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس پر تمہیں بدلہ دینے پر بھی قادر ہے۔اور ﴿عَلِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کو وہ جانتا ہے۔کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں احادیث مبارکہ اور ان کی روشنی میں خرچ کرنے کے فضائل

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۸۹) بے شک آدمی پر شیطان کا بھی اثر ہوتا ہے اور فرشتہ کا بھی اثر ہوتا ہے۔شیطان کا اثر یہ ہے کہ وہ بُرائی (مصیبت) سے ڈراتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ کا اثر یہ ہے کہ وہ اچھائی کا وعدہ کرتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔لہٰذا جو شخص آخر والی بات محسوس کرے تو وہ سمجھ لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' پھر اللہ عزوجل کی حمد کرے۔اور جو شخص دوسری بات پائے تو وہ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے۔پھر نبی علیہ السلام نے یہ آیت مبارکہ پڑھی: ''الشيطان يعدكم الفقر ويأمركم بالفحشاء'' (شیطان تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں کنجوسی کا حکم دیتا ہے)۔(سنن ترمذی: ۲۹۸۸' مسند ابو یعلی: ۴۹۹۹' مشکوۃ المصابیح: ۴/۷۔ص ۱۹)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ آیا ہے: ''لَمَّة'' اس کا معنیٰ ہے: خیال۔یہ ''اِلمام'' سے ہے بمعنیٰ قریب ہونا۔یہاں ''لمّة'' سے مراد ہے: نیکی یا بُرائی کا وہ خیال اور عزم جو دل میں آئے۔شیطان کا ''لمّة'' (یعنی اس کی طرف سے جو اثر ہوتا ہے) وہ وسوسہ ہے اور فرشتہ کا جو ''لمّة'' ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے الہام ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۹۰) ہر روز جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما۔ اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! کنجوس کو تباہی اور بربادی دے۔

(صحیح بخاری: ۱۴۴۲، صحیح مسلم: ۱۰۱۰، مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۰۔ ص ۱۶۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۹۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم خرچ کرو، تم پر خرچ کیا جائے گا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ: اللہ تعالیٰ کا دستِ کرم بھرا ہوا ہے، خرچ کرنے سے اس میں کمی نہیں آتی۔ شب و روز اس کی عطا پاشی جاری ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: غور تو کرو جب سے اُس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے کتنا خرچ کیا ہے؟ اس کے باوجود اس کے دستِ قدرت میں جو کچھ ہے اس میں کمی نہیں آئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جو کچھ سیدھے ہاتھ میں تھا اس میں کمی نہیں آئی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اسی کے قبضہ میں ترازو ہے وہ اُسے پست اور بُلند فرماتا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اُس کے دوسرے ہاتھ میں وسعت دینا اور تنگی کرنا ہے وہ بلند کرتا ہے اور پست کرتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۴۶۸۴، صحیح مسلم: ۹۳۹، سنن ترمذی: ۳۰۴۵، سنن ابن ماجہ: ۱۹۷، مسند احمد ج ۲ ص ۲۴۲۔ ج ۲ ص ۳۱۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۹۲۔ ۱۸۶۲۔ ص ۲۱۔ ۱۶۴)

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۳۹۲) تم خرچ کیا کرو اور گِنا نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے لیے گِنے گا، اور تم جمع نہ کیا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے لیے جمع کرے گا۔ (صحیح بخاری: ۲۵۹۱، صحیح مسلم: ۱۰۲۹، مسند احمد ج ۶ ص ۳۵۴، سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۸۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۱۔ ص ۱۶۴)

اس حدیث شریف میں ایک لفظ ہے: ''لاتوعی'' اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم کنجوسی نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے گا یعنی تمہیں اس طرح بدلہ دے گا کہ تمہارے رزق میں تنگی فرما دے گا اور تمہیں نہ تو عوض دے گا نہ ہی برکت دے گا۔ حاصل یہ کہ تم جمع نہ کیا کرو اور روکا نہ کرو بلکہ خرچ کرتی رہو، اس کو نہ گِنا کرو اور نہ ہی اس میں کنجوسی کیا کرو۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی یقیناً اُسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور (اس کے ارشادات سے) صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں O

حکمت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے قرآن کریم کا علم مراد ہے یعنی قرآن کریم کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر اور حلال و حرام کا علم۔ ضحاک کا قول یہ ہے کہ حکمت سے قرآن کریم اور اس کی سمجھ مراد ہے۔ چونکہ قرآن کریم حکمت کو شامل ہے اس لیے ضحاک نے سمجھ کی بات کی۔ امام ضحاک مزید فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایک سو نو آیتیں ایسی ہیں جو ناسخ اور منسوخ ہیں اور ایک ہزار آیتیں ایسی ہیں جو حلال و حرام کے احکامات پر مشتمل ہیں۔ اہل ایمان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان آیات کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ اُنہیں سیکھ لیں اور نہ اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اہل نہروان یعنی خارجیوں کی طرح ہو جائیں جنہوں نے قرآن کریم کی وہ آیات جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے بارے میں نازل ہوئی تھیں ان میں تاویل کر کے اُنہیں اہل قبلہ

(یعنی اہل ایمان) پر چسپاں کر دیا۔[٦٦٦] یوں انہوں نے اپنے عمل سے جہالت برتی، خون ریزی کی، مال و دولت کو لوٹا اور اہل سنت کے خلاف گمراہی پر گواہی دی۔ لہٰذا تم پر قرآن کریم کا علم حاصل کرنا لازم ہے۔ کیونکہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ فلاں آیت کس بارے میں نازل ہوئی وہ اس سے متعلقہ کسی چیز میں اختلاف نہیں کرے گا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت سے قرآن کریم، علم اور فقہ مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد ہے: قول اور عمل کی درستگی۔

ان تمام اقوال کا خلاصہ دو چیزیں ہیں: ایک علم اور دوسری چیز علم میں درستگی اور اشیاء کو ان کی ذات کے ساتھ جاننا۔

حکمت کا اصل معنیٰ ہے: روکنا۔ اسی سے ''حَکَمَۃُ الدّابۃ'' ہے (بمعنیٰ لگام کا وہ حصہ جو جانور کے دونوں جبڑوں کی جانب ہو)۔ کیونکہ یہ بھی جانور کو روکتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے: ''ابنی حنیفۃ احکموا سفھاء کم'' (یعنی اے بنو حنیفہ! کیا تمہارے بے وقوفوں کو روک دیا گیا ہے)۔

امام سدی فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد نبوت ہے کیونکہ نبی لوگوں کے درمیان حکم (یعنی فیصلہ) فرماتا ہے، اس لیے نبی حاکم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک حکمت سے مراد ہے: اللہ عزوجل کے دین میں پرہیزگاری، کیونکہ پرہیزگاری ایسی صفت ہے جو آدمی کو حرام اور ہر ناجائز کام میں پڑنے سے روک لیتی ہے۔

﴿مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ﴾ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ حکمت عطا کرے۔ ﴿خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ اس میں (بیک وقت) تنکیر اور تعظیم ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ اُس شخص کو ہر قسم کی خیر کثیر مل گئی۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نصیحتیں فرمائی ہیں ان سے صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہوتے ہیں اور وہ اللہ عزوجل کے احکامات و ممنوعات کی پاسداری کرتے ہیں۔

وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو یا کوئی منّت مانتے ہو تو بلاشبہ اللہ اس سے باخبر ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں O

''نذر'' کا لغوی، شرعی معنیٰ، اس کی اقسام اور احکام

﴿مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے جیسے زکوٰۃ وغیرہ۔ اور ﴿نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں اپنے آپ پر واجب کر لیتے ہو اور پھر انہیں پورا کرتے ہو۔

''نــذر'' (یعنی منّت) یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ پر ایسی چیز واجب کر لے جو اس پر پہلے واجب نہ ہو۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''نذرت للہ نذرا'' (میں نے اللہ عزوجل کے لیے نذر مانی)۔

''نــذر'' کا اصل معنیٰ ہے: خوف۔ چونکہ آدمی اہم معاملات میں کوتاہی کے ڈر سے نذر مان لیتا ہے اس لیے اس کو نذر کہا جاتا ہے۔ شریعت میں ''نذر'' کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مفسَّر (۲) غیر مفسَّر۔ مفسَّر یہ ہے کہ آدمی کہے: (مثلاً) ''مجھ پر حج یا روزہ یا

٦٦٦ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے کہ ''خوارج'' مخلوق میں بدترین لوگ ہیں، جو آیات کافروں کے متعلق نازل ہوتی ہیں وہ اُن کو مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین، باب: ٦، قتل الخوارج) اور ہمارے زمانے میں مخالفین کا طریقہ یہ ہے کہ جو آیات بتوں کی مذمت میں نازل ہوئی ہیں اُن کو رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور اولیاء کرام کی عظمت کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔

غلام کو آزاد کرنا یا صدقہ دینا واجب ہے"۔ اس طرح کہنے کے بعد اس منت کو پورا کرنا اس پر لازم ہے' کوئی اور چیز اس کی جگہ ادا نہیں کر سکتا۔ غیر مفسّر یہ ہے کہ آدمی کہے: (مثلاً) "میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے نذر مانی ہے کہ میں فلاں کام نہیں کروں گا"۔ پھر وہ اسے کر بیٹھے۔ یا یوں کہے کہ خدا کی قسم! مجھ پر فلاں چیز کی منّت ہے۔ اس صورت میں اُسے کفارۂ یمین یعنی قسم کا کفارہ دینا لازم ہوگا[۶۶۷]

نذر کے جواز اور ممانعت کے متعلق احادیث

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۳۹۳) جس نے اللہ عزوجل کی اطاعت کرنے کی نذر مانی تو اُسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ اور جس نے اللہ عزوجل کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی اُسے چاہیے کہ وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔

(صحیح بخاری: ۶۶۹۶' سنن ابوداؤد: ۳۲۸۹' سنن ترمذی: ۱۵۲۶' سنن نسائی: ۳۸۰۶' سنن ابن ماجہ: ۲۱۲۶' مشکوۃ المصابیح: ۳۴۲۷ ـ ص ۲۹۷)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۹۴) جو شخص ایسی نذر مانے جو معیّن نہ ہو تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے[۶۶۸] اور جو شخص نافرمانی کی نذر مانے اس کا کفارہ (بھی) قسم کا کفارہ ہے اور جو شخص ایسے کام کی نذر مانے جس کی اُسے طاقت نہ ہو اس کا کفارہ (بھی) قسم کا کفارہ ہے اور جو شخص ایسے کام کی نذر مانے جس کی اُسے طاقت ہو تو چاہیے کہ وہ اسے پورا کرے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۳۲۲' سنن ابن ماجہ: ۲۱۲۸' مشکوۃ المصابیح: ۳۴۳۶ ـ ص ۲۹۸)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۹۵) نافرمانی کی نذر کو بھی پورا نہ کیا جائے اور جو چیز انسان کی ملکیت میں نہ ہو اس کی نذر کو بھی پورا نہ کیا جائے۔

(سنن نسائی: ۳۸۵۰' سنن ابوداؤد: ۳۲۹۲' سنن ترمذی: ۱۵۲۵' مسند احمد ج ۶ ص ۲۴۷' مشکوۃ المصابیح: ۳۴۳۵ ـ ص ۲۹۷)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۹۶) رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ منّت کوئی بھلائی لے کر نہیں آتی۔ یہ صرف بخیل سے مال نکلوانے کا ذریعہ ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۶۰۸' صحیح مسلم: ۱۶۳۹' سنن ابوداؤد: ۳۲۸۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۹۷) بے شک نذر کسی ایسی چیز کو انسان سے قریب نہیں کر دیتی جو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے مقدر نہ فرمائی ہو' البتہ نذر تقدیر کے موافق ہوتی ہے۔ سو اس کے ذریعہ بخیل وہ چیز نکال دیتا ہے جس کو (عام حالات میں) وہ نکالنا نہیں چاہتا۔

(صحیح مسلم: ۱۶۴۰' سنن نسائی: ۳۸۰۵)

مذکورہ احادیث میں نذر سے ممانعت کی توجیہات

بعض علماء فرماتے ہیں کہ (مذکورہ احادیث میں) منّت سے جو منع کیا گیا ہے ہوسکتا ہے وہ اس وجہ سے ہو کہ نذر سے آدمی

۶۶۷۔ قسم کے کفارہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے پھر اُسے توڑ دے تو وہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا دو وقت کھانا دے یا اُنہیں کپڑا دے یا ایک غلام آزاد کرے۔ اگر ان میں سے کسی چیز کی طاقت نہ ہو تو مُسلسل تین روزے رکھے۔ (سورۃ المائدہ: ۸۹)

۶۶۸۔ یعنی ایسی نذر مانی کہ اُس میں کوئی کام معیّن نہیں کیا' مثلاً یوں کہا کہ "اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو اللہ عزوجل کے لیے میری طرف سے نذر ہے"۔ اس میں حج' روزہ یا نماز وغیرہ کسی بھی عبادت کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آدمی پر لازم ہے کہ وہ قسم کا کفارہ ادا کرے' خواہ اُس کا کام ہو یا نہ ہو۔

مال کو اپنے آپ پر لازم کر لیتا ہے اور پھر اسے تکلفاً ادا کرتا ہے اور اس میں اس کی دلچسپی بھی شامل نہیں ہوتی۔ یا ہو سکتا ہے اس لیے منع کیا گیا ہو کہ آدمی جو مال خرچ کرے گا وہ اس کام کے عوض میں خرچ کرے گا جس کی اس نے منّت مانی ہے' نتیجۃً اس کا اجر و ثواب کم ہو جائے گا۔ حالانکہ عبادت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خالصتاً اللہ عزوجل کے لیے ہونی چاہیے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ممانعت کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نذر تقدیر کو ٹال دیتی ہے یا جو مقدر ہو چکا ہے اس سے بچا لیتی ہے۔ لوگوں کے اس اعتقاد کے خدشہ کے پیشِ نظر منّت سے منع کیا گیا۔ حدیث شریف کا سیاق بھی اس بات کی تاکید کرتا ہے۔

بعض روایات میں نبی علیہ السلام کے جو الفاظ آئے ہیں کہ ''نذر کوئی بھلائی لے کر نہیں آتی'' اس سے مراد یہ ہے کہ نذر تقدیر کی کسی چیز کو نہیں ٹالتی۔ حدیث میں یہ جو فرمایا کہ ''نذر کے ذریعہ بخیل شخص وہ چیز نکال دیتا ہے جس کو وہ نکالنا نہیں چاہتا'' اس سے مراد یہ ہے کہ جس عبادت کی بخیل شخص نے نذر مانی ہے اس کو وہ خالص عبادت کے طور پر اس سے پہلے ادا نہیں کرتا بلکہ وہ تو صرف اپنی مطلوبہ چیز کے مقابلہ میں نذر مانی ہوئی عبادت کو انجام دیتا ہے۔ مثلاً بخیل شخص یہ کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے فلاں بیمار کو شفا دے دی تو اللہ کے لیے فلاں عبادت میرے ذمہ ہے۔ اور اس طرح کے دیگر جملے جو نذر کی وجہ سے وہ کہتا ہے۔ واللہ اعلم

''یعلمہ'' کی تفسیر اور ''ہٗ'' ضمیر کے مرجع کی تحقیق

زیرِ بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور نذر مانتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے' لہٰذا تمہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ یہاں ''یعلمہ'' فرمایا ''یعلمھما'' نہیں فرمایا اس لیے کہ ''ہٗ'' ضمیر انفاق اور نذر دونوں میں سے ایک دوسرے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ''وَمَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا'' (جو شخص خطا یا گناہ کرے پھر اُسے کسی بے گناہ پر تھوپ دے تو یقیناً اس نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے ذمہ لیا)۔ (النساء: ۱۱۲) بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''یعلمہ'' کی ضمیر ''ما انفقتم'' کے ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہ اسم ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ''وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ بِهٖ'' (یاد کرو اس کو جو اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری' وہ اس کے ذریعہ تمہیں نصیحت کرتا ہے)۔

(البقرہ: ۲۳۱)

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقہ زکوٰۃ کو غلط جگہ خرچ کرتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو دکھلاوا اور شہرت کی غرض سے صدقہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقہ زکوٰۃ میں حرام مال خرچ کرتے ہیں۔

آیت میں جو ﴿مِنْ اَنْصَارٍ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ (ظالموں کے پاس) ایسے کوئی مددگار نہیں ہیں جو انہیں اللہ عزوجل کے عذاب سے بچا سکیں۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ یُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر تم صدقات کو ظاہر کر کے دو تو یہ بہت اچھی بات ہے' اور اگر تم انہیں چھپا کر فقراء کو دے دو تو یہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اس سے تمہارے کچھ گناہ (بھی) کم ہوں گے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے O

﴿اِنْ تُبْدُوْا﴾ کا معنیٰ ہے: اگر تم صدقات کو ظاہر کرو۔ صدقہ اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان عبادت کی نیت سے اپنے مال

سے ادا کرے۔اس مفہوم کے پیش نظر صدقہ کے لفظ میں فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقہ دونوں داخل ہیں۔آیت میں جو ﴿فَنِعِمَّا هِيَ﴾ فرمایا اس سے مراد ہے: ''فنعمت الخصلة هي'' (یعنی یہ عادت بہت اچھی ہے)۔بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ہے: ''فنعم الشيئي هي'' (یعنی یہ چیز بہت اچھی ہے)۔اور بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ہے: ''فنعم شيئا ابداء الصدقات'' (یعنی صدقات ظاہر کر کے دینا بہت اچھی چیز ہے)۔

﴿وَاِنْ تُخْفُوْهَا﴾ اگر تم صدقات کو چھپاؤ۔﴿وَتُؤْتُوْهَا﴾ اور تم چپکے سے وہ صدقات غریبوں کو دے دو۔﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ تو صدقہ کو چھپا کر دینا سب کے سامنے دینے سے زیادہ بہتر ہے۔اور جب نیت سچی ہو تو صدقہ دونوں ہی صورتوں میں مقبول ہے۔

زیر بحث آیت میں ''صدقات'' سے آیا نفلی صدقات مراد ہیں یا زکوٰۃ یا دونوں؟ نیز صدقات وزکوٰۃ۔۔۔ کو چھپا کر اور ظاہر کر کے دینے کی تفصیل

اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ زیر بحث آیت میں ''صدقہ'' سے کیا مراد ہے؟ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ اس سے نفلی صدقہ مراد ہے۔اور اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ نفلی صدقہ چھپانا افضل ہے اور اُسے چھپا کر دینا سب کے سامنے دینے سے زیادہ بہتر ہے۔کیونکہ چھپا کر دینے سے صدقہ ریا کاری سے بہت دور اور اخلاص سے بہت قریب ہوتا ہے۔اور دوسرا یہ کہ نفس جو چاہتا ہے کہ سب کے سامنے صدقہ دیا جائے اس سے آدمی دور ہو جاتا ہے۔پھر چھپا کر صدقہ دینے میں اس غریب کا بھی فائدہ ہے جو صدقہ کو لینے والا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب اُسے چپکے سے صدقہ دیا جائے گا تو اُسے ذلّت اور کمزوری کا احساس نہیں ہوگا اور اگر سب کے سامنے اُسے صدقہ دیا جائے گا تو اُسے ذلّت اور کمزوری محسوس ہوگی۔

چھپا کر صدقہ دینا افضل ہے اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے'وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۹۸) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات افراد ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اُس دن اپنا سایہ عطا فرمائے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا کسی اور کا سایہ نہیں ہوگا۔[۶۶۹] (۱) عدل وانصاف کرنے والا حاکم۔(۲) وہ نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جوان ہوا۔(۳) وہ شخص جو مسجد سے نکلے تو دوبارہ آنے تک اس کا دل مسجد ہی میں لگا رہے۔(۴) وہ دو شخص جو اللہ عزوجل کی خاطر آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں' اسی محبت پر جمع ہوں اور اسی پر جدا ہوں۔[۶۷۰] (۵) وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اللہ کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔(۶) وہ شخص جس کو کوئی اعلیٰ خاندان والی اور حسن و جمال والی عورت گناہ کی طرف بُلائے تو وہ اُسے کہے کہ میں اللہ عزوجل سے ڈرتا ہوں۔(۷) وہ شخص جو صدقہ دے تو اس طرح چھپا کر دے کہ دائیں ہاتھ نے جو کچھ خرچ کیا ہو بائیں ہاتھ کو اس کا پتا نہ چلے۔(صحیح بخاری: ۶۶۰' صحیح مسلم: ۱۰۳۱' سنن ترمذی: ۲۳۹۱' سنن نسائی: ۵۳۸۰' سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۸۰' مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۷۰۱۔ص ۶۸)

جہاں تک صدقہ کو ظاہر کر کے دینے کا تعلق ہے سو وہ اس شخص کے لیے جائز ہے جس کو یہ اطمینان ہو کہ اس کے اس عمل میں ریا کاری نہیں آئے گی۔یا وہ ایسا شخص ہو جس کے عمل کی لوگ پیروی کرتے ہوں۔کیونکہ وہ جب ظاہر کر کے صدقہ دے گا تو

۶۶۹ یعنی عرش کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔سایہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان افراد کو حشر کی گرمی سے بچا کر راحت وسکون اور حفاظت عطا فرمائے گا۔

۶۷۰ جُدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپس میں ملاقات کر کے جب واپس ہوں تو اُسی محبت کے ساتھ جو اللہ عزوجل کی خاطر اُن دونوں کے درمیان قائم ہے۔دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ ہمیشہ اس خالص محبت پر دونوں قائم رہیں۔کسی دنیاوی غرض کی بناء پر باہمی تعلّق کو ختم نہ کریں۔(عمدۃ القاری ج ۴ ص ۲۵۰)

دوسرے لوگ اس کی اتباع کریں گے۔

رہا زکوٰۃ کا معاملہ' سو چھپا کر دینے کے مقابلہ میں اس کو ظاہر کر کے دینا زیادہ افضل ہے۔ جیسے فرض نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا افضل ہے اور نفل کو گھر میں ادا کرنا افضل ہے۔ ہاں زکوٰۃ کو ظاہر کر کے دینے میں (یہ فائدہ بھی ہے کہ) زکوٰۃ دینے والا تہمت اور الزام سے بچ جاتا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت فرض زکوٰۃ کے متعلق وارد ہوئی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ اقدس میں زکوٰۃ کو چھپا کر دینا زیادہ بہتر تھا کیونکہ صحابہ کرام میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے ہوں گے۔ جبکہ آج کل زکوٰۃ کو ظاہر کر کے دینا زیادہ بہتر ہے' تا کہ زکوٰۃ دینے والے کے بارے میں کسی کو بدگمانی نہ ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت تمام صدقات واجبہ اور نافلہ کو شامل ہے۔ اور ہر صدقہ خواہ وہ زکوٰۃ ہو یا کوئی اور اس کو چھپا کر دینا افضل ہے۔

زیر بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں ''مِن'' زائدہ ہے۔ تقدیر آیت یہ ہے کہ ہم تمہارے گناہ مٹا دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے تمام گناہ مراد ہیں۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہاں ''مِـــن'' تبعیض کا لایا گیا ہے تا کہ لوگوں کو خوف رہے اور تکیہ نہ کر لیں۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تمہارے گناہوں میں سے صغیرہ گناہوں کو مٹا دیں گے۔ لغت میں ''تکفیر'' کا اصل معنیٰ ہے: ڈھانپنا اور چھپانا۔

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی تم جو صدقات کو ظاہر کر کے اور چھپا کر دیتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

اُنہیں (سیدھی) راہ چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے' ہاں اللہ جسے چاہتا ہے (سیدھی) راہ چلاتا ہے' اور تم جو بھی اچھی چیز خرچ کرتے ہو اس کا فائدہ تمہی کو ہے' اور تم تو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اچھی چیز خرچ کرتے ہو' اور تم جو بھی اچھی چیز خرچ کرتے ہو وہ تمہیں پوری دے دی جائے گی اور (اجر و ثواب میں) تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مذکورہ آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ کچھ مسلمانوں کی یہودیوں کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں۔ اسلام لانے سے قبل مسلمان یہودیوں پر اور یہودی مسلمانوں پر (مختلف چیزیں) خرچ کیا کرتے تھے۔ جب مسلمان اسلام لے آئے تو انہیں اب یہودیوں کو فائدہ پہنچانا ناگوار گزرا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ یہودی اسلام لے آئیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ لوگ مدینہ منورہ کے غرباء کو صدقہ دیتے تھے۔ جب مسلمان زیادہ ہو گئے تو نبی اکرم ﷺ نے مشرکین پر صدقہ خرچ کرنے سے منع فرما دیا' تا کہ وہ اپنی ضرورت کی وجہ سے اسلام میں داخل ہو جائیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ اس بات کی بہت خواہش رکھتے تھے کہ مشرکین اسلام لے آئیں اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہدایت دینا آپ کے ذمہ نہیں ہے جو آپ کے اتنے مخالف ہوں کہ آپ اُنہیں مسلمان بنانے کی غرض سے اُن سے صدقہ کو روک دیں پھر آپ اُن پر صدقہ کریں۔ اس آیت کے ذریعہ اللہ

تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو یہ بتایا کہ آپ کو صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو بشارتیں سنائیں عذاب سے ڈرائیں اور اللہ عزوجل کے اذن سے اس کی طرف بلائیں۔ رہی یہ بات کہ وہ ہدایت پائیں گے یا نہیں؟ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے توفیق دیتا ہے اور اسلام کی راہ دکھادیتا ہے۔ یہاں ہدایت سے ہدایتِ توفیق مراد ہے۔ جہاں تک ہدایتِ بیان اور ہدایتِ دعوت کا تعلق ہے سو وہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ تھی[۶۷۱]۔ چنانچہ جب مذکورہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو پھر لوگوں نے اُن کو دینا شروع کر دیا اور اُنہیں صدقہ دینے لگے۔

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ ﴾ میں لفظ ﴿ خَيْرٍ ﴾ سے مراد مال ہے (یعنی جو کچھ تم مال خرچ کرتے ہو)۔ ﴿ فَلِاَنْفُسِكُمْ ﴾ (تو وہ تمہارے اپنے لیے ہے) یعنی جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس کا فائدہ تم اپنے آپ کو پہنچاتے ہو۔ اس کے بعد جو فرمایا: ﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ﴾ یہ ظاہراً تو خبر ہے لیکن حقیقۃً اس میں ممانعت ہے۔ یعنی تم رضاءِ الٰہی کے حصول کے سوا کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہ کرو۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد صرف مؤمنین کے لیے ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ مؤمنوں کو یہ بتایا ہے کہ مجھے یہ بات معلوم ہے کہ تم لوگوں کے صدقات کا مقصود وہ اجر وثواب ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے مشرک رشتہ داروں کو جو صدقات دیتے ہو اُس میں تمہارا مقصد صرف اللہ کی رضا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے دلوں کی یہ بات معلوم ہے۔ لہٰذا تم مشرک رشتہ داروں پر اُس وقت خرچ کیا کرو جب تمہارا مقصد یہ ہو کہ صلہ رحمی کرنے کی وجہ سے اور ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کی وجہ سے اللہ عزوجل کی رضا حاصل ہو گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر تم اللہ عزوجل کی مخلوق میں ان لوگوں پر خرچ کرو گے جو بُرے ہیں تب بھی تمہیں اپنے خرچ کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔

غیر مسلموں کو زکوٰۃ اور صدقۂ فطر دینے کا حکم

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کے سوا کسی اور کو دینا جائز نہیں ہے۔ اور مسلمانوں سے مراد وہ حصہ دار ہیں جن کا ذکر سورۂ توبہ میں کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے ذِمیوں کو صدقۂ فطر دینا جائز قرار دیا ہے[۶۷۲]۔ لیکن تمام علماء نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی ہے۔ سو اس بنیاد پر زیر بحث آیت نفلی صدقہ کے ساتھ خاص ہو گی اور نفلی صدقہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو جائز رکھا ہے کہ وہ مسلمان غرباء اور ذمی غرباء کو دیا جائے۔ جہاں تک فرض زکوٰۃ کا معاملہ ہے سو وہ ذمی کو کسی صورت میں دینا جائز نہیں ہے۔

﴿ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: (تم جو بھی اچھی چیز خرچ کرتے ہو) تمہیں اس کا مکمل بدلہ دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس

۶۷۱۔ جیسا کہ ایک مقام پر آپ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"۔ (الشوریٰ: ۵۲) "(اے محبوب ﷺ!) آپ سیدھے راستہ کی ہدایت دیتے ہیں"۔

۶۷۲۔ "ذمّی" اُس کافر کو کہتے ہیں جو کسی مُسلم ملک میں جان و مال کی امان حاصل کر کے رہائش اختیار کر لے۔ ایسے لوگوں کو صدقہ فطر دینا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس لیے جائز قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مذہب والے کو صدقہ دینا جائز فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا: "تصدقوا علی اهل الادیان"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۳۹۸۔ ج ۳ ص ۱۷۷ درّ منثور ج ۱ ص ۳۵۷) اس حدیث میں صدقہ کا لفظ مطلق ہے جو کہ نفلی صدقات سمیت زکوٰۃ اور صدقہ فطر کو بھی شامل ہے۔ لیکن زکوٰۃ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کو مسلمانوں کے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا: زکوٰۃ مسلمان اغنیاء سے لی جائے گی اور مسلمان فقراء کو دی جائے گی۔ (صحیح بخاری: ۱۳۹۵) (واضح رہے کہ فقہ حنفی میں فتویٰ اس پر ہے کہ صدقۂ فطر کی رقم کسی غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے۔ جواز کا جو قول منقول ہے اس سے نفلی صدقات مراد ہیں۔)

رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ تمہیں قیامت کے دن اس کا بدلہ دے گا۔ آیت میں جو ''یوف'' کے ساتھ ''الیکم'' آیا ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ تمہیں اس کا بدلہ قیامت کے دن ادا کرے گا۔ اسی لیے ''یوف'' کے ساتھ جو ''الی'' کو لایا گیا ہے وہ کلام میں حُسن کا باعث ہے کیونکہ اس صورت میں وہ ادا کرنے کے معنیٰ کو متضمن ہے۔ آخر میں جو ﴿ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے اعمال کے اجر و ثواب میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۷۳﴾

(یہ صدقات) ان فقراء کا حق ہے جو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کیے ہوئے ہیں (اور اس کی وجہ سے) وہ زمین میں (کمانے کے لیے) سفر نہیں کر سکتے' ناواقف شخص اُنہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے خوش حال سمجھتا ہے (جبکہ) تم اُنہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے' وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے تا کہ گڑگڑانا نہ پڑے۔ اور تم جو بھی اچھی چیز (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہو اُسے بلاشبہ اللہ خوب جانتا ہے O

''للفقراء'' میں لام کا متعلق اور فقراء کا مصداق

اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ ﴿ لِلْفُقَرَآءِ ﴾ میں لام کا متعلق کیا ہے؟ بعض فرماتے ہیں کہ یہ گذشتہ آیت میں ''فلانفسکم'' کے لام کے تحت داخل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ جو بھی تم اچھی چیز خرچ کرتے ہو وہ فقراء کے لیے ہے اور وہ تم اپنے نفع کے لیے خرچ کرتے ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''للفقراء'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ صدقات جن کا ذکر کیا گیا وہ فقراء کے لیے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''للفقراء'' مبتداءِ محذوف کی خبر ہے۔ تقدیرِ آیت یہ ہے کہ وہ فقراء جن کا آیت میں حال اور کیفیت بیان کی گئی ہے اُن کا واجبی حق ہے۔

آیت میں جن فقراء کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن سے مہاجرین فقراء مراد ہیں' جو کہ چار سو کے قریب تھے۔ مدینہ منورہ میں نہ تو ان کے گھر تھے نہ خاندان۔ یہ لوگ مسجد میں ایک چبوترے پر رہتے تھے۔ رات میں قرآن کریم سیکھتے تھے اور دن میں گٹھلیاں توڑتے تھے۔ اور جس لشکر کو بھی رسول اللہ ﷺ روانہ کرتے تھے یہ اُس کے ساتھ جاتے تھے۔ یہی لوگ ''اصحاب صفّہ'' تھے۔ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کی لوگوں کو ترغیب فرمائی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے پاس جو چیز زائد ہوتی وہ شام ہوتے ہی ان کے پاس وہ چیز لے آتا۔

آیت مبارکہ میں مذکورہ فقراء کی بیان کی جانے والی صفات کی تفسیر

﴿ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر لیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر لیا ہے۔ آگے جو فرمایا: ﴿ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اہل صفّہ کو تجارت' طلب معاش اور کمانے کی فرصت نہیں ملتی۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اُنہیں غربت اور کچھ نہ ہونے نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے روک دیا ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کے دوران زخم لگے' جس کی وجہ سے وہ اتنے معذور ہو گئے کہ اُنہیں ان کی بیماری اور معذوری نے راہِ خدا میں سفر کرنے سے روک دیا ہے۔

﴿ الْجَاهِلُ ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو اُن فقراء کی حقیقتِ حال سے باخبر نہ ہو۔ وہ اُن کے ''تـعـفّف'' (یعنی سوال نہ کرنے) کی وجہ سے اُنہیں غنی سمجھتا ہے۔ ﴿ تـعفف ﴾ ''عِفّة'' سے باب تفعل ہے۔ اور ''عـفّت'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو ترک کرنا اور اس سے باز رہنا۔ جب کوئی شخص مانگنا چھوڑ دے اور قناعت کو اختیار کرلے تو کہا جاتا ہے: ''تـعـفّف'' (فلاں نے مانگنا چھوڑ دیا اور قناعت شعار ہو گیا)۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ جو شخص (مذکورہ) فقراء کے حال سے واقف نہیں ہے وہ اُنہیں غنی سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ مصائب پر صبر کیے ہوتے ہیں اور کسی سے سوال نہیں کرتے۔

﴿ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ ''سِیـمَاء' سِیـمِیَاء'' اور ''سِمَة'' ان تینوں کا معنیٰ ہے: ایسی علامت جس سے کسی چیز کی پہچان ہو۔ آیت میں اس لفظ کا جو معنیٰ ہے اس کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے عاجزی اور انکساری مراد ہے (یعنی اُن فقراء کو تم اُن کی عاجزی سے پہچان لو گے)۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد مشقت کے وہ اثرات ہیں جو ضرورت اور غربت کی وجہ سے نمودار ہوتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ہے: بھوک کی وجہ سے اُن فقراء کے رنگ کا زرد ہونا اور تنگ دستی کی وجہ سے کپڑوں کا بوسیدہ ہونا۔

آیت مبارکہ میں ''الحاف'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

آگے جو فرمایا: ﴿ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ اس میں ''اِلـحـاف'' سے مراد ''اِلـحـاح'' ہے (بمعنیٰ اصرار کرنا) (یعنی لوگوں سے وہ اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے)۔ بعض مفسرین نے اِلحاف کی تفسیر یہ کی ہے کہ جب اس کے پاس دوپہر کا کھانا ہو تو وہ رات کے کھانے کا سوال نہ کرے اور رات کا کھانا ہو تو دن کے کھانے کا سوال نہ کرے۔ بعض نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ لوگوں سے وہ بالکل سوال نہیں کرتے۔ اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''تعفّف'' کا لفظ فرمایا ہے اور ''تعفّف'' کا معنیٰ ہے: مانگنے کو ترک کر دینا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ قطعاً سوال نہیں کرتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''تـعـرفهـم بسيماهم'' (تم اُنہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے) اگر سوال کرنا اُن کا کام ہوتا تو علامت کے ذریعہ اُن کو پہچاننے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی (سو علامت کے ذریعہ اُنہیں پہچان لینے کا حاصل یہ ہے کہ وہ سوال نہیں کرتے)۔ لہٰذا آیت مبارکہ کا زیر بحث جملہ ''لا يسـئـلون الناس الحافا'' کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ فقراء کسی قسم کا سوال ہی نہیں کرتے جو اُنہیں گڑگڑانا پڑے۔ اس معنیٰ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کسی بھی طرح سوال نہیں کرتے' نہ گڑگڑا کر نہ بغیر گڑگڑائے۔

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ تم جو بھی اچھی چیز خرچ کرتے ہو' اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ یعنی تم کتنا خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور وہ اس پر بدلہ عطا فرمائے گا۔ اس جملہ میں صدقہ دینے' خرچ کرنے اور فرمانبرداری کرنے کی ترغیب فرمائی جارہی ہے۔

لوگوں سے سوال کرنے کی مذمت میں احادیث مبارکہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٣٩٩) بہت زیادہ مال کا ہونا غنا نہیں بلکہ غنا یہ ہے کہ آدمی کا نفس غنی ہو۔

(صحیح بخاری: ٦٤٤٦' صحیح مسلم: ١٠٥١' سنن ترمذی: ٢٣٧٣' سنن ابن ماجہ: ٤١٣٧' مسند احمد ج ٢ ص ٢٦١' ٢' مشکوٰۃ المصابیح: ٥١٧٠' ص ٤٤٠)

(٤٠٠) مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک لقمہ اور دو لقمے' ایک کھجور اور دو کھجوریں دے کر لوگ لوٹا دیں[٦٧٣]' بلکہ مسکین وہ ہے جس

٦٧٣ حدیث شریف کے مکمل الفاظ یوں ہیں کہ مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے پاس چکر لگاتا پھرے اور لوگ اُسے ایک اور دو لقمے' ایک کھجور اور دو کھجوریں دے کر لوٹا دیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ مسکین جو قابل تعریف ہے اور صابر و شاکر لوگوں میں داخل ہے وہ گھر گھر مانگتا نہیں پھرتا' بلکہ حقیقی مسکین وہ ہے جس کی حقیقت لوگوں پر ظاہر نہ ہو اور وہ سوال کرنے سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہو۔

کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جو اُسے لوگوں سے بے نیاز کر دے نہ ہی وہ پہچاننے میں آئے کہ اُسے صدقہ دیا جائے اور نہ ہی اُٹھ کر وہ لوگوں سے سوال کرے۔ (صحیح بخاری:۱۴۷۹' صحیح مسلم:۱۰۳۹' سنن ابوداؤد:۱۶۳۱' سنن نسائی:۲۵۷۱' مسند احمد ج۲ص۲۶۰' سنن بیہقی ج۷ص۱۱' سنن دارمی:۱۶۱۵' مشکوٰۃ المصابیح:۱۸۲۸۔ص۱۶۱)

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۰۱) تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی لے اور اُسے لے کر پہاڑ پر آئے' پھر وہاں سے اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لائے اور اُسے فروخت کرے یہ اس بات سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے۔ خواہ لوگ اُسے دیں یا منع کر دیں۔

(صحیح بخاری:۱۴۷۱' سنن نسائی:۲۵۸۴' سنن ابن ماجہ:۱۸۳۶' مسند احمد ج۱ص۱۶۴' مشکوٰۃ المصابیح:۱۸۴۱۔ص۱۶۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۰۲) جس شخص کے پاس ایسی چیز موجود ہو جو اُسے (سوال کرنے سے) بے نیاز کر دے پھر بھی وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا سوال اس کے چہرے پر خراش اور زخم کی شکل میں ہوگا۔ پوچھا گیا: یارسول اللہ (ﷺ)! ایسی چیز کی مقدار کیا ہے جو لوگوں سے بے نیاز کر دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پچاس درہم یا اس قیمت کا سونا[۶۷۴] (سنن ابوداؤد:۱۶۲۶' سنن ترمذی:۶۵۰' سنن نسائی:۲۵۹۲' سنن ابن ماجہ:۱۸۴۰' سنن دارمی:۱۶۴۰' مسند احمد ج۱ص۳۸۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۴۷۔ص۱۶۳۔۱۶۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۰۳) جس شخص کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت ہو اس کے باوجود اس نے سوال کیا تو یقیناً اس نے الحاف کیا۔[۶۷۵]

(سنن ابوداؤد:۱۶۲۸' سنن نسائی:۲۵۹۵)

☆ ہشام نے اپنی روایت میں یہ بات بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک اوقیہ چالیس درہم تھے۔

☆ حضرت عطاء بن یسار کی روایت میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جس شخص کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے برابر کوئی چیز موجود ہو اس کے باوجود وہ سوال کرے تو یقیناً اس نے الحاف کیا۔

(سنن ابوداؤد:۱۶۲۷' سنن نسائی:۲۵۹۶' مسند احمد ج۵ص۴۳۰' مشکوٰۃ المصابیح:۱۸۴۹۔ص۱۶۳)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[۶۷۴] پچاس درہم ساڑھے بارہ تولے چاندی کے برابر ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جو شخص اتنی چاندی یا اُس کی قیمت یا اس قیمت کے برابر سونا رکھتا ہو وہ لوگوں سے بھیک نہ مانگے۔ یعنی بلاضرورت سوال نہ کرے بلکہ حالات کے تقاضوں کے مطابق حلال رزق کمانے کی کوشش کرے۔

[۶۷۵] ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے اور چالیس درہم دس تولہ چاندی کے برابر ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جس کے پاس کم از کم دس تولہ چاندی یا اُس کی قیمت کے برابر چیز موجود ہو اس کے باوجود وہ بھیک مانگے تو یقیناً اُس نے الحاف کیا۔ یعنی ایسا شخص اُن لوگوں میں سے ہے جو گڑگڑا کر اور اصرار کے ساتھ سوال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ گذشتہ حدیث میں پچاس درہم یا اُس کی قیمت رکھنے والے کو بھیک مانگنے سے منع کیا گیا تھا اور یہاں چالیس درہم رکھنے والے کو منع کیا جا رہا ہے۔ ان میں تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں یا تو مخاطب اور موقع محل کی مناسبت سے مختلف ہوئی ہیں یا پھر یہ تدریج پر محمول ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو آہستہ آہستہ بھیک مانگنے سے منع کیا گیا ہو۔ پہلے پچاس درہم یا اُس کی قیمت رکھنے والوں کو منع کیا گیا' پھر چالیس درہم رکھنے والوں کو منع کیا گیا۔ (مراۃ المناجیح ج۳ص۴۷)

(۴۰۴) جس شخص کے پاس چالیس درہم ہوں اس کے باوجود وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے تو یقیناً اس نے الحاف کیا۔ (سنن نسائی:۲۵۹۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۰۵) جو شخص (اپنا مال) بڑھانے کی غرض سے لوگوں سے سوال کرتا ہے وہ (حقیقت میں) صرف انگارے مانگ رہا ہے۔ اب چاہے تو وہ کم لے یا زیادہ۔ (صحیح مسلم:۱۰۴۱' سنن ابن ماجہ:۱۸۳۸' سنن بیہقی ج۴ص۱۹۶' مشکوٰۃ المصابیح:۱۸۳۸۔ص۱۶۲)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

وہ لوگ جو رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ (دونوں طرح سے) خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے لیے ان کا اجران کے رب کے پاس ہے' اور اُنہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مختلف اقوال

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت کے مطابق مذکورہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اُن کے پاس چار درہم تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز ان کی ملکیت میں نہیں تھی۔ انہوں نے ایک درہم رات میں' ایک درہم دن میں' ایک درہم خفیہ طور پر اور ایک درہم علانیہ طور پر صدقہ کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک دوسری روایت کے مطابق (واقعۂ نزول یہ ہے کہ) جب آیتِ مبارکہ ''لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ '' (البقرہ:۲۷۳) نازل ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل صفہ کے پاس بہت سارے دینار بھیجے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات میں ایک وسق (چھ من تیس سیر) کھجوریں بھیجیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے بارے میں مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ اس میں رات کے خرچ سے حضرت علی کا خرچ کرنا مراد ہے اور دن کے خرچ سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا خرچ کرنا مراد ہے۔ نیز اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پوشیدگی میں صدقہ دینا علانیہ صدقہ دینے سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں رات کے خرچ کو دن کے خرچ پر مقدم فرمایا ہے اور چھپ کر صدقہ دینے کو علانیہ صدقہ دینے پر مقدم فرمایا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لیے گھوڑے باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان گھوڑوں کو رات میں' دن میں' پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور پر چارہ کھلاتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۰۶) جس شخص نے ایمان' اخلاص اور اللہ کے وعدہ کی تصدیق کے ساتھ اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا تو اس کا پیٹ بھرنا' اسے پانی پلانا اور دونوں مقامات کا فضلہ قیامت کے دن اس شخص کے میزان میں ہوگا۔[۶۷۶] ☆ یعنی ان سب کی نیکیاں میزان میں ہوں گی۔ (صحیح بخاری:۲۸۵۳' سنن نسائی:۳۵۸۲' مسند احمد ج۲ص۳۷۴' سنن بیہقی ج۱۰ص۱۶' مشکوٰۃ المصابیح:۳۸۶۸۔ص۳۳۶)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت اُن تمام لوگوں کو شامل ہے جو تمام اوقات میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اپنے مال میں تمام ضرورت مندوں اور فاقہ کشوں کو شامل کرتے ہیں۔

﴿ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے ان کے اعمال کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے۔ اور

۶۷۶ اس کی تشریح کے لیے حاشیہ:۴۷۸ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں ان کا حال تو بس یہ ہوگا کہ وہ (قیامت کے دن) اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو' یہ اس وجہ سے ہوگا کہ ان لوگوں نے کہا کہ خرید وفروخت سود ہی کی مانند ہے' حالانکہ اللہ نے خرید وفروخت کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام' سو جس شخص کے پاس اس کے رب کی جانب سے نصیحت آ گئی اور وہ (سود سے) باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے' اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں' وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے O

سود کے لین دین کو کھانے کے لفظ سے تعبیر کرنے کی توجیہ اور سُود کی حرمت

﴿ یَاْكُلُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ سود کا لین دین کرتے ہیں۔ یہاں سود کے پورے معاملہ کے لیے صرف کھانے کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ مال کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ کیونکہ مال تو خود نہیں کھایا جاتا بلکہ اُسے کھانے کی چیزوں میں صرف کر کے کھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں وعید بیان فرما کر مال کو سود میں خرچ کرنے سے منع فرما دیا۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٤٠٧) اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے' اس کے کھلانے والے' اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور آپ نے فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں۔ (صحیح مسلم:۱۵۹۸' سنن ترمذی:۱۲۰۶' سنن ابن ماجہ:۲۲۷۷' سنن ابوداؤد:۳۳۳۳' سنن بیہقی ج۵ص۲۸۵' مجمع الزوائد ج۴ص۱۱۸' مشکوٰۃ المصابیح:۲۸۰۷۔ص۲۴۴)

﴿ ربا ﴾ کا لغت میں اصل معنیٰ ہے: بڑھانا' اضافہ کرنا۔ جب کوئی چیز بڑھ جائے تو کہا جاتا ہے: ''ربا الشیئی'' (فلاں چیز زیادہ ہوگئی) اس لیے ''ربا'' کا معنیٰ ہے: ''الزیادۃ فی المال'' (مال میں اضافہ)۔

''تخبّط'' اور ''مسّ'' کا معنیٰ اور آیت مبارکہ کا مفہوم

آیت میں جو فرمایا: ﴿ لَا یَقُوْمُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ سُود کھانے والے قیامت کے دن اپنی قبروں سے (اس حالت میں) کھڑے ہوں گے جیسے شیطان نے اُنہیں خبطی بنا دیا ہو۔ آگے جو فرمایا: ﴿ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾ اس میں ''یتخبط'' کا معنیٰ ہے: جس کو شیطان نے گرا دیا ہو۔ ''خبط'' کا اصل معنیٰ ہے: ''الضرب'' (مارنا) اور ''الوطء'' (روندنا) یعنی ناہموار جگہ چلنا۔ ایسی اونٹنی جو زمین میں اپنے پاؤں مارے اور لوگوں کو اپنی ٹاپوں سے روندے اس کو عربی میں ''ناقۃ خبوط'' کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ جملہ بھی ہے: ''یخبط خبط عشواء'' یہ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو درستگی' تمیز اور غور وفکر کے بغیر مختلف کام انجام دے۔ اسی طرح جب کسی شخص کو شیطان پاگل بنا دے تو کہا جاتا ہے: ''تخبطه الشیطان'' آیت میں جو ''من المسّ'' فرمایا اس سے مراد ہے: ''من الجنون'' (یعنی شیطان اُسے پاگل بنا دیتا ہے)۔ جب کسی شخص کو جنون لاحق ہو جائے تو ''مسّ الرجل فهو ممسوس'' کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔

آیت کامفہوم یہ ہے کہ سودخور قیامت کے دن اس شخص کی طرح اٹھے گا جو زمین پر گرا ہوا ہو اور صحیح طور پر چل پھل نہ کر سکتا ہو۔ کیونکہ سود اُن کے پیٹ کو اتنا بڑھا دے گا کہ اُنہیں بوجھ محسوس ہوگا۔ نتیجۃً وہ وہاں پر تیزی نہیں دکھا سکیں گے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سودخور جب سود کو حلال سمجھے تو قیامت کے دن اس کی یہی علامت ہوگی۔

امام بغوی ثعلبی کی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(٤٠٨) مجھے جبریل (ایک ایسی جگہ) لے گئے جہاں بہت سارے لوگ تھے'ان میں سے ہر ایک کا پیٹ ایسا تھا جیسے بہت بڑا گھر ہو۔ تمام لوگ آل فرعون کے راستہ پر پڑے ہوئے تھے۔ اور آل فرعون کا معاملہ یہ ہے کہ اُن پر صبح وشام عذاب پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرعونی اس طرح سامنے سے آ رہے تھے جیسے بھوکے اونٹ پتھروں اور درختوں کو روند ڈالتے ہیں نہ کوئی بات سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ جب ان فرعونیوں کو پیٹ والے آتا ہوا محسوس کرتے تو کھڑے ہونے لگتے لیکن اُن کے پیٹ انہیں جھکا دیتے اور وہ گر جاتے۔ پھر کوئی شخص اٹھنے لگتا تو اسے بھی اس کا پیٹ جھکا دیتا اور وہ گر جاتا۔ اس طرح وہ لوگ اس جگہ نہ ہٹ سکے اور فرعونی اُن پر آ پہنچے اور (ان کا یہی معمول تھا کہ) وہ آتے جاتے اُنہیں روندتے تھے۔ یہ اُن پیٹ والوں کے لیے دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں عذاب تھا۔ پھر فرمایا کہ آل فرعون کہہ رہے تھے: اے اللہ! کبھی بھی قیامت کو برپا نہ کرنا۔ (لیکن) قیامت کے دن وہ فرمائے گا کہ آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں جھونک دو۔[۶۷۷] (سرکار فرماتے ہیں:) میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں یہ اس شخص کی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔ (تفسیر البغوی' سورۃ البقرہ:۲۷۵)

☆ اس حدیث میں آنے والے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح: (۱) ''بطنه مثل البيت الضخم'' یعنی ہر شخص کا پیٹ بہت بڑا اور موٹا تھا۔ (۲) ''منضدين'' یعنی لوگ ایک دوسرے پر پڑے ہوئے تھے۔ (۳) ''سابله'' راستہ۔ (۴) ''الابل المنهومة'' (یعنی بہت بھوکے اونٹ) بھوک کی وجہ سے کھانے کی جو شدید خواہش ہوتی ہے اس کو ''نَهَم'' کہتے ہیں۔

اہل عرب کا خرید وفروخت کو سود کی مثل قرار دینا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا رد

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ یعنی سودخوروں پر مذکورہ جو عذاب نازل ہوگا وہ اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے کہا کہ خرید وفروخت سود ہی کی مانند ہے' اور اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے سود کو حلال سمجھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں جب کوئی شخص کسی کو قرض دیتا اور قرض کی ادائیگی کا وقت آ پہنچتا تو وہ اس سے اپنی رقم کا مطالبہ کرتا۔ مقروض قرض دینے والے سے کہتا کہ تم میری مدت میں اضافہ کر دو میں تمہیں رقم زیادہ دوں گا۔ اہل عرب کہتے تھے کہ وہ اضافہ جو خرید وفروخت کے آغاز میں منافع کی صورت میں ملتا ہے یا جو قرض کی ادائیگی کا وقت آ جانے کی صورت میں تاخیر کی وجہ سے ملتا ہے دونوں منافع ہمارے لیے یکساں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کی تکذیب اور ان کا رد کرتے ہوئے آگے فرمایا:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (حالانکہ اللہ نے خرید وفروخت کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام)۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کے ذریعہ تجارت میں منافع کو تمہارے لیے حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے جو کہ

۶۷۷۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ''اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ'' (المؤمن:۴۶) ''فرعونیوں کو صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا کہ) آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو''۔

مال میں اس اضافہ کا نام ہے جو ادائیگی کی مدت میں تاخیر کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں' وہ سب بندوں کا مالک ہے۔ وہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے اور جس بات کا چاہتا ہے پابند بناتا ہے۔ اس کے کسی بھی حلال یا حرام کردہ کام میں کسی کو اس پر کوئی اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ لوگوں کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ اس کے احکامات اور ممنوعات کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔

تجارت اور سود کے درمیان فرق

بیع (یعنی خرید وفروخت) اور سُود کے درمیان بعض علماء نے فرق بیان کیا ہے کہ جب کوئی شخص ایسا کپڑا جو دو روپے کا ہو اس کو بیس روپے میں فروخت کرے تو یقیناً اس نے کپڑے کو بیس روپے کے مقابل ٹھہرایا اور جب دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل ٹھہرانے پر خریدار اور بیچنے والے کے درمیان رضامندی ہوگئی تو دونوں کے نزدیک مالیت میں کپڑا اور رقم ایک دوسرے کے مقابل ہوگئے۔ لہٰذا اس میں بلاعوض کوئی چیز لینا لازم نہیں آئے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص بیس درہم کے بدلہ میں دس درہم کو فروخت کرے تو اس صورت میں اس نے دس درہم جو زیادہ لیے وہ بلاعوض ہیں (لہٰذا اس درہم کے بدلہ میں درہم وصول کرنا جائز نہیں ہے)۔ یہاں یہ کہنا بھی ناممکن ہے کہ ادائیگی کی مدت میں جو مہلت دی جاتی ہے وہ اضافی رقم کا عوض ہے۔ کیونکہ مہلت دینا نہ تو مال ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے' چہ جائیکہ اسے دس روپے کی زیادہ ملنے والی رقم کا عوض قرار دیا جائے۔ سو یہاں مذکورہ دونوں صورتوں میں فرق واضح ہو گیا۔[1]

سود کے متعلق چند اہم شرعی مسائل کا بیان

پہلا مسئلہ: سود کے حرام ہونے کی وجوہات: علماء نے سود کے حرام ہونے کی کئی وجوہات بیان کی ہیں۔ (١) ایک وجہ یہ ہے کہ سود میں بلاعوض کسی سے مال حاصل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص دو درہم کے بدلہ میں ایک درہم خواہ نقد یا ادھار فروخت کرے گا اُسے یقیناً بلاعوض ایک درہم زیادہ حاصل ہوگا۔ اور یہ حرام ہے۔ (٢) دوسری وجہ یہ ہے کہ سود لوگوں کو تجارت کرنے سے روک دیتا ہے' کیونکہ مال دار شخص جب بھرپور طریقہ سے سودی لین دین کرے گا تو اُسے بغیر کسی تھکاوٹ اور مشقت کے بآسانی بہت ساری رقم حاصل ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا تجارت اور کاروبار کے ذریعہ منافع حاصل کرنا ختم ہو جائے گا۔ (٣) تیسری وجہ یہ ہے کہ سود لوگوں کے درمیان قرض کے رائج طریقہ کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جب سود کو حرام کر دیا گیا تو لوگوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ محتاج کو قرض کے طور پر پیسے دیئے جائیں اور جتنے دیئے گئے ہیں اُتنے ہی واپس لیے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب حاصل ہو۔ (٤) چوتھی وجہ یہ ہے کہ سود کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کو جتنے بھی احکامات دیئے گئے ہیں اُن کی حکمتیں معلوم ہوں۔ لہٰذا سود کے حرام ہونے پر یقین کرنا ضروری ہے اگرچہ ہمیں اس کی حکمت معلوم نہ ہو۔

دوسرا مسئلہ: سود کی حقیقت اور اس کے حرام ہونے کی علّت' اختلافِ ائمہ کی روشنی میں: ''ربــا'' کا لغوی معنیٰ ہے: اضافہ۔ اور ایسا اضافہ جو تجارت سے حاصل ہو وہ حرام نہیں ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس اضافہ کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ سود ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب ایک مخصوص طریقہ سے ایک مخصوص مال میں ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو (اپنے ارشادات سے) واضح فرما دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ایک فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ تاجر جب اپنا روپیہ تجارت میں لگاتا ہے تو اس میں نفع اور نقصان دونوں کے امکان ہیں' جب کہ سود خور جو اپنے روپے پر سود وصول کر رہا ہے اس کو نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج١ ص١٠٤١)

(٤٠٩) سونا چاندی کے بدلہ میں سود ہے مگر جبکہ برابر برابر ہو' گندم گندم کے بدلے میں سود ہے مگر جبکہ برابر برابر ہو' جَو جَو کے بدلہ میں سود ہے مگر جبکہ برابر برابر ہو' چھوارے چھواروں کے بدلہ میں سود ہیں مگر جبکہ برابر برابر ہوں۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ چاندی کے بدلہ میں چاندی سود ہے مگر جبکہ برابر برابر ہو اور سونا سونے کے بدلہ میں سود ہے مگر جبکہ برابر برابر ہو۔
(صحیح بخاری: ۲۱۳۴' صحیح مسلم: ۱۵۸۶' سنن ترمذی: ۱۲۴۳' سنن ابوداؤد: ۳۳۴۸' سنن نسائی: ۴۵۵۸' سنن ابن ماجہ: ۲۲۵۳' مسند احمد ج۱ص۲۴' مشکوۃ المصابیح: ۲۸۱۲_ص۲۴۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤١٠) سونے کے بدلہ میں سونا تول کر برابر برابر فروخت کرو اور چاندی کے بدلہ میں چاندی تول کر برابر برابر فروخت کرو۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سود کمایا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ کھجور کے بدلہ کھجور' گندم کے بدلہ گندم' جَو کے بدلہ جَو اور نمک کے بدلہ نمک برابر نقد بہ نقد فروخت کرو۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اُس نے سود کمایا' الّا یہ کہ اقسام بدل جائیں۔ (صحیح مسلم: ۱۵۸۸' سنن نسائی: ۴۵۵۹)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤١١) سونا سونے کے بدلہ میں' چاندی چاندی کے بدلہ میں' گندم گندم کے بدلہ میں' جَو جَو کے بدلہ میں' چھوارے چھواروں کے بدلہ میں' اور نمک نمک کے بدلہ میں برابر برابر نقد بہ نقد فروخت کرو۔ جب یہ اقسام آپس میں مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو ان کو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہوں۔ (صحیح مسلم: ۱۵۸۷' مشکوۃ المصابیح: ۲۸۰۸_ص۲۴۴)

مذکورہ احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے چھ چیزوں میں سُود کے پائے جانے کی تصریح فرمائی ہے۔ ان چھ میں سے دو چیزیں نقد (یعنی سونا چاندی) ہیں اور بقیہ چار کا تعلق غذاء سے ہے یعنی گندم' جَو' کھجور اور نمک۔ اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ ان چھ چیزوں میں سود کا جو حکم ثابت ہے وہ ان اوصاف یعنی علّتوں کی وجہ سے ہے جو ان میں موجود ہیں۔ لہٰذا جن جن چیزوں میں وہ اوصاف پائیں جائیں گے ان میں بھی سود کا حکم لاگو ہوگا۔ اب یہ بات کہ وہ اوصاف کون کون سے ہیں اس میں اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک مذکورہ تمام چیزوں میں پائی جانے والی علّت ایک ہے اور وہ ''نفع'' ہے۔ اس بنیاد پر ان علماء نے ہر مال میں سُود کا حکم لاگو کیا ہے۔ جبکہ اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ درہم اور دینار میں جو سود کا حکم ہے وہ کسی اور علّت کی وجہ سے اور غذائی اشیاء میں جو سود کا حکم ہے وہ کسی اور علّت کی وجہ سے ہے۔ اب وہ علّت کون سی ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ درہم اور دینار میں سود کا جو حکم ہے وہ نقدیت کی علّت کی وجہ سے ہے' اور اصحاب الرائے (احناف) کا مذہب یہ ہے کہ علّت وزن کی وجہ سے ہے۔ اس بنیاد پر (احناف نے) لوہا' پیتل اور دیگر تمام موزونی چیزوں میں سود کا حکم لاگو کیا ہے۔ جہاں تک باقی چار غذائی اشیاء کا تعلق ہے ان کے بارے میں اصحاب رائے کا مذہب یہ ہے کہ ان میں جو سود کا حکم ہے وہ وزن اور کیل کی علّت کی وجہ سے ہے۔ اس بنیاد پر انہوں نے تمام مکیلی اور موزونی اشیاء میں سود کا حکم لاگو کیا ہے' خواہ وہ غذائی ہوں یا نہ ہوں جیسے گچ' چونے کا پتھر اور ان جیسی دیگر چیزیں۔ جبکہ علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ چار غذائی اشیاء میں جو علّت ہے وہ کیل اور وزن کے ساتھ ساتھ طُعم (یعنی غذائیت) بھی ہے۔ لہٰذا ہر غذائی چیز جو مکیلی یا موزونی ہو اُس میں سود کا حکم لاگو ہوگا۔ اس کے علاوہ جو (غذائی چیز) مکیلی یا موزونی نہ ہو اس میں سود کا حکم لاگو نہیں ہوگا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہی قول ہے۔ اور امام شافعی کا بھی قولِ قدیم یہی ہے۔ جبکہ قولِ جدید یہ ہے کہ مذکورہ غذائی اشیاء میں سود کا جو حکم ہے وہ غذائیت کی علّت کی وجہ سے ہے۔ اس بنیاد پر امام شافعی نے تمام غذائی اشیاء یعنی پھل' میوہ' سبزی اور

دواؤں میں سُود کا حکم لاگو کیا ہے' خواہ وہ مکیلی ہوں یا موزونی۔[۶۷۸] کیونکہ حضرت معمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:
(٤١٢) انہوں نے اپنے غلام کو ایک صاع گندم دے کر بھیجا اور کہا کہ اس کو بیچ دو اور اس کے بدلہ میں جَو خرید کر لے آ ؤ۔ غلام گیا اور اس نے ایک صاع سے زائد جَو لیے۔ جب اُس نے واپس آ کر حضرت معمر کو بتایا تو انہوں نے اس سے کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ جاؤ اور اسے واپس کرو اور جتنی گندم ہے اتنے ہی جَو لے کر آ ؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "کھانے والی چیز کو کھانے والی چیز کے بدلہ میں برابر برابر فروخت کیا کرو"۔ (اُن دنوں) ہماری غذا جَو تھے۔ حضرت معمر سے کسی نے کہا کہ جَو گندم کے برابر تو نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کے مشابہ ہونے کا خدشہ ہے۔[۶۷۹]
(صحیح مسلم:۱۵۹۲' مسند احمد ج۶ ص۴۰۱' سنن بیہقی ج۵ ص۲۸۳' مشکوٰۃ المصابیح:۲۸۱۱۔ ص۲۴۴)

اس بنیاد پر امام شافعی کے نزدیک سودی مال ہر وہ چیز ہے جو ثمن (نقد) سے تعلق رکھتی ہو یا غذا سے۔

تیسرا مسئلہ: ربا (سُود) کی اقسام اور ان کے احکام: ربا (سُود) کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ربا الفضل: فضل سے مراد اضافہ ہے۔ (۲) ربا النسیئۃ: نسیئہ سے مراد وقت معیّن ہے۔

اگر کسی شخص نے ایسی کوئی چیز بیچی جس پر سود کا حکم لاگو ہوتا ہو اور اسی جنس کی چیز کے بدلہ میں بیچی' جیسے سونا چاندی میں سے کسی ایک کو اسی جنس کے بدلہ میں یا غذائی چیز کو اس کی جنس کے بدلہ میں مثلاً گندم کو گندم کے بدلہ میں بیچا تو شرعی معیار کے مطابق دونوں کا برابر برابر ہونا شرط ہے۔ اگر دونوں موزونی چیزیں ہوں جیسے درہم و دینار' تو اس میں دونوں کے وزن کے برابر ہونا شرط ہے۔ اور اگر دونوں مکیلی اشیاء ہوں جیسے گندم اور جَو تو ان کو ان کی ہم جنس کے عوض فروخت کرنے میں دونوں کے کیل کا برابر ہونا شرط ہے۔ نیز مجلس عقد میں فریقین کی جانب سے قبضہ شرط ہے۔

---

۶۷۸ خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جو چیزیں مکیلی یا موزونی ہوں (یعنی ماپ کر فروخت ہوتی ہوں یا وزن کے ذریعہ) وہ خواہ کھانے پینے کی قبیل سے ہوں یا نہ ہوں' امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک اُن کی باہمی خرید وفروخت میں برابری ضروری ہوگی اور کمی بیشی سُود میں شمار ہوگی۔ جبکہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے کہ سُود صرف اُن چیزوں میں ہوتا ہے جو کھانے پینے کی قبیل سے ہوں۔ خواہ وہ مکیلی ہوں یا موزونی۔ اس اختلاف کی بنیاد پر وہ تمام چیزیں جو کھانے پینے کی قبیل سے نہ ہوں (مثلاً لوہا' لکڑی' کپڑا وغیرہ) اُن کی باہمی خرید وفروخت امام شافعی کے نزدیک کمی بیشی کے ساتھ جائز ہوگی' جبکہ احناف کے نزدیک جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ امام شافعی کے نزدیک غذائیت کا اعتبار ہے جبکہ احناف کے نزدیک کیل و وزن کا اعتبار ہے۔

۶۷۹ اس حدیث شریف سے علامہ خازن اس پر استدلال فرما رہے ہیں کہ سُود صرف اُن ہی چیزوں کی باہمی خرید وفروخت میں ہوتا ہے جو کھانے پینے کی قبیل سے ہوں۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ اس میں سود کو نہ کھانے پینے کی اشیاء میں منحصر کیا گیا ہے نہ دیگر اشیاء سے سود کی نفی کی گئی ہے۔ البتہ اس سے جو استدلال کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "کھانے والی چیز کو کھانے والی چیز کے بدلہ میں برابر فروخت کیا کرو"۔ اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو غذائی اشیاء خواہ کسی بھی جنس کی ہوں اُن کی باہمی خرید وفروخت میں برابری ضروری ہے۔ یعنی دونوں کا ہم جنس ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضرت معمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فعل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا یہ مفہوم بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ گندم اور کھجوروں کی باہمی خرید وفروخت میں برابری کو ملحوظ رکھا جائے اور کمی بیشی سُود ہو' حالانکہ یہ اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ کیونکہ گندم اور کھجوروں کی باہمی خرید وفروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ دو غذائی اشیاء جب ہم جنس ہوں تو اُن کی باہمی خرید وفروخت میں برابری کو ملحوظ رکھا جائے۔ جہاں تک حضرت معمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ہے' سو وہ اُن کا تقویٰ اور احتیاط ہے جیسا کہ حدیث شریف کے آخری جملہ سے ظاہر ہے۔ (المفہم' علامہ ابوالعباس القرطبی متوفی ۶۵۶ھ ج۴ ص۴۸۰)

اگر کسی شخص نے ایسی کوئی چیز بیچی جس پر سُود کا حکم لاگو ہوتا ہو اور ایسی چیز کے عوض بیچی جو اس کی ہم جنس نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر اس نے ایسی چیز ہی کے عوض فروخت کیا جس کی علّتِ ربا اس چیز کے موافق نہ ہو' مثلاً اُس نے سونا چاندی میں سے کسی ایک کے عوض غذائی چیز کو فروخت کیا تو اس میں سود نہیں ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص غذائی اشیاء کو ایسی چیز کے عوض فروخت کرے جو سودی نہ ہو۔

اگر کوئی شخص ایسی چیز (جو سودی نہ ہو) کو فروخت کرے اور ایسی چیز کے عوض فروخت کرے جو اس کی ہم جنس نہ ہو لیکن اس کی علّتِ ربا اس چیز کے موافق ہو' مثلاً اس نے دینار کے عوض درہم بیچے یا جَو کے عوض گندم کو بیچا یا غذائی چیز کو خلافِ جنس چیز کے عوض بیچا تو ان میں ربا التفاضل ثابت نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان کو ایک دوسرے کے بالمقابل اضافہ کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ ہاں ان میں ربا النسیہ کا حکم لاگو ہوگا۔ لہٰذا ان کی تجارت کے لیے عقدِ مجلس میں فریقین کی جانب سے قبضہ کرنے کی شرط لاگو ہوگی۔ کیونکہ احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے ''الاید ابید'' (نقد بہ نقد) اور ''ھاء و ھاء'' (نقد بہ نقد) کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ مجلس عقد میں فریقین کی جانب سے قبضہ شرط ہے اور نسیہ (اُدھار) حرام ہے۔ اور احادیث میں ''الاسواء بسواء'' اور ''مثلا بمثل'' (برابر برابر) کے جو الفاظ ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ جب دونوں چیزیں ہم جنس ہوں تو ان دونوں کا برابر برابر ہونا واجب ہے اور اضافہ حرام ہے۔ اور احادیث میں یہ جو فرمایا گیا کہ ''جب اقسام مختلف ہوں تو جس طرح چاہو اُنہیں فروخت کرو'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب دونوں چیزیں ہم جنس نہ ہوں تو اضافہ کے ساتھ ان کی خرید و فروخت جائز ہے لیکن عقد مجلس میں فریقین کی جانب سے قبضہ شرط ہے۔ اس کی دلیل نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ ہیں: ''اذا کان یدا بید'' (جب دونوں چیزیں نقد بہ نقد ہوں)۔ واللہ اعلم

چوتھا مسئلہ: قرض میں سُود کا شرعی حکم: جو شخص کسی کو قرض دے اور یہ شرط لگائے کہ وہ اس سے زیادہ واپس لوٹائے گا تو یہ ایسا قرض ہے جو منافع کا باعث بنا' اور ہر وہ قرض جو منافع کا باعث بنے وہ سود ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے اور یہ شرط لگائی ہے کہ میرے قرض سے زیادہ مجھے وہ واپس لوٹائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ سود ہے۔ (مؤطا امام مالک: ۱۴۲۴)

اگر قرض دیتے وقت آدمی زیادہ واپس کرنے کی شرط نہ لگائے اور قرض لینے والا ازخود زیادہ واپس دے تو یہ جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک شخص سے کچھ درہم قرض لیے' پھر اُسے اُن دراہم سے زیادہ بہتر دراہم واپس کیے۔ اُس شخص نے ان دراہم کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ جو دراہم دے رہے ہیں وہ میرے دراہم سے زیادہ بہتر ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: یہ بات مجھے معلوم ہے' لیکن یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ (مؤطا امام مالک: ۱۴۲۲)

زیرِ بحث آیت کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ﴾ جس شخص کو رب تعالیٰ کی جانب سے نصیحت اور خوف مل گیا۔ چونکہ لفظ ''موعظہ'' کی تانیث غیر حقیقی ہے اس لیے فعل (جاء) کو مذکر لایا گیا ہے۔ اور ایسا اس لیے بھی ہے کہ ''موعظۃ'' اور ''وعظ'' دونوں ایک ہیں۔ ﴿فَانْتَهٰى﴾ سے مراد ہے: جو سود کھانے سے باز آ گیا۔ ﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ تو سود کی ممانعت سے پہلے کے جو اس کے گناہ ہیں وہ اس کے لیے معاف ہیں۔ ﴿وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ یعنی مراد یہ ہے کہ سود کی ممانعت کے بعد اگر

اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ بندے کو محفوظ رکھے گا یہاں تک کہ وہ سود سے باز رہنے پر قائم رہے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو وہ اس کو بے مدد چھوڑ دے گا یہاں تک کہ وہ دوبارہ سود کھانے لگ جائے گا۔ بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جو بھی حکم فرماتا ہے اور جس چیز سے منع فرماتا ہے اور جو چیز بندے کے لیے حلال اور حرام قرار دیتا ہے ان سب میں بندے کا معاملہ اللہ عزوجل کے سپرد ہے' بندے کے اپنے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں یہ آیت مبارکہ اس شخص کے بارے میں ہے جو سود کو حرام سمجھتا ہو اور اُسے کھاتا ہو۔ ایسے شخص کا معاملہ اللہ عزوجل کے سپرد ہے' چاہے تو وہ اُسے معاف کردے اور چاہے تو عذاب دے۔

﴿ وَمَنْ عَادَ ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سود کے حرام ہو جانے کے بعد جنہوں نے اُسے حلال سمجھ کر دوبارہ کھانا شروع کر دیا' ایسے لوگ جہنمی ہیں' وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے' اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں فرماتا O بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور نماز ادا کرتے رہے اور زکوۃ دیتے رہے ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُنہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے O

آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿ يَمْحَقُ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے اور اُس کا خاتمہ فرماتا ہے اور اس کی برکت کو زائل فرماتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سود والے صدقہ خیرات' حج' جہاد اور کسی بھی عطیہ کو قبول نہیں فرماتا۔ ﴿ وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے' ان کے نتائج دیتا ہے' دنیا میں اُن میں برکتیں نازل فرماتا ہے اور آخرت میں اُن کے اجر و ثواب کو دوگنا فرمائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۱۳) جو شخص بھی اپنی پاکیزہ کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتا ہے تو رحمٰن (عزوجل) اُسے اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے[۶۸۰] اگر وہ ایک کھجور ہو تو وہ رحمٰن (عزوجل) کے ہاتھ میں بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑی ہو جاتی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے اور اونٹ کے بچہ کو بڑھاتا ہے۔ مسلم اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ جو شخص اپنی پاکیزہ کمائی میں سے کھجور کے برابر صدقہ کرتا ہے اور اللہ عزوجل کی بارگاہ میں صرف پاکیزہ چیز ہی بلند ہوتی ہے۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ اللہ عزوجل صرف پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتا ہے تو اس (پاکیزہ کمائی میں سے صدقہ کی جانے والی کھجور) کو اللہ تعالیٰ اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتا ہے پھر خرچ کرنے والے کے لیے اُسے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچہ کو بڑھاتا ہے یہاں تک کہ (اللہ عزوجل کے پاس اُس کا خرچ کیا ہوا مال) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔

۶۸۰ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے۔ یہاں دائیں ہاتھ میں لینے سے مراد یہ ہے کہ وہ پاکیزہ کمائی سے کیے جانے والے صدقہ کو اچھی طرح قبول فرماتا ہے' اُس صدقہ کو پسند فرماتا ہے اور اُس کی قبولیت کو مؤخر نہیں فرماتا۔ (عمدۃ القاری ج۶ ص۲۷۰)

(صحیح بخاری:۱۴۱۰، صحیح مسلم:۱۰۱۴، سنن ترمذی:۶۶۱، سنن نسائی:۲۵۲۵، سنن ابن ماجہ:۱۸۴۲، مسند احمد ج۲ص ۳۳۱،۴۳۱، مشکوٰۃ:۱۸۸۸،ص ۱۶۷)

آخر میں فرمایا: اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں فرماتا۔ اس جملہ میں ﴿ كَفَّارٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہر ایسا شخص جو اپنی ناشکری پر ڈٹا ہوا ہو اُس پر قائم ہو اور سود کھانے کو حلال سمجھتا ہو (اُس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا)۔ ﴿ اَثِيْمٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص جو گناہ میں بہت آگے نکل گیا ہو (اس کو بھی اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا)۔ اس لفظ کو فرما کر گناہ سے ممانعت کی گئی ہے۔ اور ایسا شخص جو سود کھاتا ہے وہ نہ تو گناہ سے باز آتا ہے نہ ہی اُسے ترک کرتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ''کفار'' اُس شخص کو کہا گیا ہو جو سود کو حلال سمجھے اور ''اثیم'' اُس شخص کو کہا گیا ہو جو سود لیتا ہو اور اُسے حرام بھی سمجھتا ہو۔ اس صورت میں آیت مبارکہ دونوں فریق کے لیے جامع ہوگی۔

دوسری آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی۔ ﴿ الصّٰلِحٰتِ ﴾ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے کرنے کا اللہ عزوجل نے حکم فرمایا۔ ﴿ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے فرض نماز کو تمام ارکان اور پابندیوں کے ساتھ ان کے اوقات میں ادا کیا۔ ﴿ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے وہ زکوٰۃ ادا کی جو ان کے مال میں اُن پر فرض تھی۔ ﴿ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں ان کے اعمال کا ثواب ہے۔ ﴿ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سُود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم (سچے دل سے) ایمان والے ہو O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مختلف روایات

(۱) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان دونوں نے کھجور میں بیع سلم کی تھی (یعنی پیسے ادا کر چکے تھے، کھجوریں لینا باقی تھا)۔ جب کٹائی کا موسم آیا تو کھجوروں کے مالک نے کہا کہ اگر تم دونوں نے اپنا حق لے لیا تو میرے پاس اتنی کھجوریں بھی نہیں بچیں گی جو میرے بال بچوں کو کافی ہوں۔ اس لیے کیا یہ ممکن ہے کہ تم نصف کھجوریں ابھی لے لو اور بقیہ نصف بعد میں لو؟ (اگر ایسا ممکن ہو تو) میں بقیہ نصف میں اضافہ کر کے دوں گا۔ ان دونوں نے ایسا ہی کیا۔ جب مقررہ مدت آئی تو دونوں نے مالک سے اضافہ طلب کیا۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ تک پہنچی تو آپ نے دونوں کو اس اضافہ کے لینے سے منع فرما دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی تو دونوں نے آیت مبارکہ کو سُن کر اطاعت کی اور صرف اصل مال وصول کیا۔

(۲) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ حضرت عباس اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دونوں ایک دوسرے کے شریک (Partner) تھے۔ اور بنی عمرو بن عمیر جو کہ قبیلہ ثقیف کے لوگ تھے ان سے سود کے ساتھ بیع سلم کرتے تھے۔ پھر اسلام کی آمد ہوئی، اس وقت دونوں کا بہت سارا سُودی مال موجود تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

حجۃ الوداع کا قصہ جو امام مسلم کے رُواۃ میں سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤١٤) سنو! زمانۂ جاہلیت کی ہر چیز میرے ان قدموں کے نیچے پامال ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے خون پامال ہیں۔ سب سے پہلے میں اپنے خون میں سے معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ بن حارث کا خون ہے جو کہ بنو سعد میں دودھ پیتا تھا تو اس کو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ اسی طرح زمانۂ جاہلیت کے تمام سود پامال ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے سود کو چھوڑنے کا اعلان کرتا ہوں اور وہ حضرت عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ وہ مکمل معاف کر دیا گیا ہے [1]

(صحیح مسلم: ١٢١٨، سنن ابوداؤد: ١٩٠٥، سنن ابن ماجہ: ٣٠٧٤، مشکوٰۃ المصابیح: ٢٥٥٥، ص ٢٢٥)

(٣) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ قبیلہ ثقیف کے چار بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ چار بھائی مسعود، عبدیالیل، حبیب اور ربیعہ تھے جو کہ عمرو ابن عمیر بن عوف ثقفی کے بیٹے تھے۔ یہ چاروں بنو مغیرہ بن عبد اللہ بن عمیر بن مخزوم کے ساتھ سودی قرض کا لین دین کرتے تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے طائف کو فتح کیا تو عمرو ثقفی کے یہ چاروں بیٹے اسلام لے آئے اور انہوں نے بنو مغیرہ سے اپنے سود کا مطالبہ کیا۔ بنو مغیرہ نے کہا: خدا کی قسم! اسلام میں ہم سود نہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے اس کو ساقط فرما دیا ہے۔ وہ لوگ حضرت عتاب بن اَسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنا جھگڑا لے گئے جو کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے گورنر تھے۔ چنانچہ انہوں نے فریقین کے جھگڑے کی تفصیل نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لکھ کر بھیج دی۔ اُس میں (مذکورہ چاروں بھائیوں کا) بہت سارا مال موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں زیرِ بحث آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو احکامات دیئے ہیں اُن میں اللہ سے ڈرو اور جن باتوں سے روکا ہے اُن سے باز رہو۔ ﴿وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا﴾ جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یعنی تمہارے اصل مال پر جو اضافہ ہو اس میں سے جو بچ گیا ہو اس کا مطالبہ چھوڑ دو۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ بہ شرط یہ کہ تم مؤمن ہو۔ یعنی اپنے قول اور عمل سے اپنے ایمان کو ثابت کرنے والے ہو۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾

پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کا یقین کر لو اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں نقصان ہو O

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے کے باوجود اگر تم باقی ماندہ سود کو نہ چھوڑو (تو لڑائی کا یقین کر لو) ﴿فَاْذَنُوْا﴾ کو ہمزہ کے مد اور ذال کے کسرہ کے ساتھ "امنوا" کے وزن پر (آذِنوا) پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم دوسروں کو بتا دو کہ سود اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ (دوسری قرأت میں) اس کو ہمزہ کے مد کے بغیر اور ذال کے فتح کے ساتھ (فأْذَنوا) پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم جان لو اور یقین کر لو (کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ ہے)۔

[1] حضرت عباس اسلام سے پہلے سود لیتے تھے۔ لوگوں پر ان کا بہت قرض اور سود تھا جو رسول اللہ ﷺ نے معاف فرما دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ مسلمانوں کی جان و مال کے مالک ہیں۔ چنانچہ آپ نے بذاتِ خود خون بھی معاف فرما دیا اور مال بھی معاف فرما دیا۔ (مراۃ ج ۴ ص ۱۱۵)

اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ سود خوروں کی جنگ سے کیا مراد ہے؟

﴿ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ) سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سُود خور سے کہا جائے گا کہ جنگ کرنے کے لیے اپنا ہتھیار اٹھالو۔ علماء معانی فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کی جنگ سے مراد آگ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی جنگ سے مراد تلوار ہے۔ البتہ جنگ کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے حقیقی جنگ مراد نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ بہت زیادہ ڈرانا اور خوف دلانا مقصود ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے حقیقی جنگ مراد ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ جو شخص مسلسل سُود کھائے اور حاکم کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس کو گرفتار کر لے اور اس پر حکمِ الٰہی جاری کرے یعنی اُسے سزا دے یا جب تک توبہ نہ کر لے اس وقت تک قید میں رکھے۔ اور اگر سود کھانے والا کوئی طاقتور اور صاحبِ لشکر ہو تو حاکم اُس سے اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح باغی گروہ سے جنگ کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جو شخص سود کھانے پر ڈٹا ہوا ہو اور توبہ نہ کرتا ہو تو اہل اسلام کا جو حاکم ہو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے توبہ کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دے۔

﴿ اِنْ تُبْتُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سودخوری چھوڑ دو اور اس سے رجوع کر لو (تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں)۔ ﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تم قرض دار سے اصل مال سے زائد کا مطالبہ کر کے اُس پر ظلم کرو اور نہ ہی اصل مال میں کمی کر کے تمہیں نقصان پہنچایا جائے۔ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو عمرو ثقفی کے بیٹوں نے کہا کہ کون ایسا ہے جو کسی سے سودی لین دین کرے۔ ہم اللہ عزوجل سے توبہ کرتے ہیں' کیونکہ ہم اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر وہ اپنے اصل مال پر راضی ہو گئے۔ بنو مغیرہ جن کے ذمہ قرض تھا انہوں نے تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا کہ فصل توڑنے تک ہمیں مہلت دے دو۔ عمرو ثقفی کے بیٹوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت نازل فرمائی کہ:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اُسے خوش حال ہونے تک مہلت دو اور تمہارا اُسے پورا قرض معاف کر دینا تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو O

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ ﴾ وہ شخص جو تمہارے مقروضوں میں سے ہے اور اس کے ذمہ تمہارا حق ہے وہ اگر تنگ دست ہو (تو خوش حال ہونے تک اُسے مہلت دو)۔ ﴿ عُسْرَ ﴾ "یُسر" کی ضد ہے۔ اور "عُسر" کا معنیٰ ہے: مال کے حصول میں دشواری۔ جب کوئی شخص تنگ دست ہو اور اُسے ایسی چیز میسر نہ ہو جس سے اپنے قرض کی ادائیگی کر سکے تو عربی میں کہا جاتا ہے: "اعسر الرجل" (آدمی تنگ دست ہو گیا)۔ ﴿ نظرة ﴾ کا معنیٰ ہے: مہلت دینا اور مؤخر کرنا۔ اور ﴿ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ﴾ کا معنیٰ ہے: خوش حالی کے زمانے تک۔ یہ "اعسار" (تنگ دستی) کی ضد ہے۔ اور خوش حالی سے مراد ہے: اتنا مال پالینا جس سے قرض ادا کر سکے۔

مقروض کو مہلت دینے کا حکم خاص ہے یا عام؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف

آیت مذکورہ کے اس حکم میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ مقروض کو مہلت دینا آیا سُودی قرض کے ساتھ خاص ہے یا ہر قرض کے بارے میں ہے؟ سو اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ (۱) پہلا قول حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت شریح' ضحاک اور سدّی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا ہے کہ آیت مبارکہ کا تعلق سودی قرض کے ساتھ ہے۔ قاضی شریح کے بارے میں آتا ہے کہ

ایک آدمی نے کسی شخص کے خلاف ان کے پاس مقدمہ کیا۔ آپ نے اُس کے خلاف فیصلہ کیا اور اُسے قید کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ قاضی شریح کے پاس اس وقت ایک آدمی موجود تھا' اُس نے کہا کہ جس کے خلاف آپ نے فیصلہ کیا ہے وہ تنگ دست ہے۔ اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ''اگر مقروض تنگ دست ہو تو اُسے خوش حال ہونے تک مہلت دو''۔ (البقرہ:۲۸۰)
قاضی شریح نے کہا کہ یہ آیت سُود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَاۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِؕ ۔ (النساء:۵۸)

بے شک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل تک پہنچا دو اور جب تم فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

(قاضی شریح نے مزید کہا کہ) اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ کسی چیز کا حکم دے اور پھر اس پر ہمیں عذاب دے۔

(۲) دوسرا قول حضرت مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت کا ہے کہ آیتِ مذکورہ کا حکم ہر اُس قرض کو شامل ہے جو تنگ دست آدمی پر ہو۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں''ذا عسـرة''نہیں فرمایا بلکہ''ذو عسـرة''فرمایا ہے تاکہ حکم تمام تنگ دستوں کو شامل ہو جائے۔

﴿وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ یعنی تنگ دست آدمی پر جو قرض ہے اس کو اگر تم اس پر صدقہ کر دو اور اپنا اصل مال اُس تنگ دست کے لیے چھوڑ دو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ آیت مبارکہ کے زیر بحث جملہ میں صرف''فان تصدقوا''فرمایا گیا ہے اور مفعول بہ کی حیثیت سے تنگ دست اور اس پر اصل مال کو چھوڑ دینے کا ذکر نہیں کیا گیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر جو چل رہا ہے وہ تنگ دستوں اور رأس المال (اصل مال) کا چل رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تصدق کا تعلّق تنگ دست اور رأس المال کے ساتھ ہے۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ جانو کہ قرض معاف کر دینا تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے' کیونکہ یہ دنیا میں بہترین تعریف اور آخرت میں اعلیٰ اجر کا باعث ہے۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں مقروض کو مہلت دینے اور اس کا قرض معاف کرنے کے فضائل اور قرض کی اہمیت اور اس کی ادائیگی کے احکامات کا بیان

(٤١٥) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ایک مقروض سے قرض کا مطالبہ کیا تو وہ ان سے رُوپوش گیا' پھر وہ آپ کو مل گیا تو اس نے کہا کہ میں تنگ دست ہوں۔ حضرت قتادہ نے کہا: بخدا؟ اس نے کہا: بخدا۔ پھر قتادہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کی تکالیف سے نجات دے دے تو وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اُس کا قرض معاف کر دے۔ (صحیح مسلم:۱۵۶۳' مشکوٰۃ المصابیح:۲۹۰۲۔ص ۲۵۱)

(٤١٦) حضرت ابُو الیَسَر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے تنگ دست کو مہلت دی یا اُس کا قرض معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اُس دن اُسے (اپنی رحمت کا) سایہ عطا فرمائے گا جس دن اُس کے سائے کے سوا کسی کا سایہ نہیں ہوگا۔ (صحیح مسلم:۳۰۰۶' مشکوٰۃ المصابیح:۲۹۰۴۔ص ۲۵۱)

(٤١٧) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایک تاجر آدمی تھا جو لوگوں کو قرض دیتا تھا۔ اگر وہ (اپنے قرض دار کو) تنگ دست پاتا تو اپنے لڑکوں سے کہہ دیتا کہ اس سے درگذر کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا۔ (صحیح بخاری:۲۰۷۸' صحیح مسلم:۱۵۶۲' مسند احمد ج۲ص ۲۶۳)

(٤١٨) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تمام کبیرہ گناہ جن

سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اُن کے بعد اللہ (عزوجل) کے نزدیک سب سے بڑا گناہ جس کو لے کر آدمی اپنے رب سے ملے گا وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں مرے کہ اُس کے ذمہ قرض ہو اور وہ ادائیگی کا مال بھی نہ چھوڑے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۳۴۲، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۲۲۔ ص ۲۵۳)

(۴۱۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے لوگوں سے اس ارادہ کے ساتھ مال لیا کہ اُنہیں وہ ادا کردے گا تو اللہ عزوجل اُس کی جانب سے ادا کردے گا اور جس نے تباہ اور ضائع کرنے کے ارادہ سے لوگوں کا مال لیا تو اللہ تعالیٰ اُسے تباہ کردے گا۔ (صحیح بخاری: ۲۳۸۷، مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۱۰۔ ص ۲۵۲)

(۴۲۰) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قرض کی ادائیگی میں) مال دار آدمی کا تاخیر کرنا ظلم ہے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب تم میں سے کسی کا قرض مال دار آدمی کے حوالہ کر دیا جائے تو اُسی سے مانگنا چاہیے۔[۶۸۱] (صحیح بخاری: ۲۲۸۷، صحیح مسلم: ۱۵۶۴، سنن ترمذی: ۱۳۰۸، سنن ابوداؤد: ۳۳۴۵، سنن نسائی: ۴۶۹۱، سنن ابن ماجہ: ۲۴۰۳، مسند احمد ج ۲ ص ۷۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۰۷۔ ص ۲۵۱)

(۴۲۱) حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عہد نبوی میں ابن ابی حَدْرَد سے مسجد میں اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ اس دوران دونوں کی آوازیں اتنی بلند ہوگئیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے گھر میں اُن کی آوازوں کو سماعت فرمایا۔ آپ نے اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور دونوں کے پاس تشریف لائے اور آواز دی: اے کعب! میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں حاضر ہوں پھر آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ آدھا قرض معاف کردو۔ حضرت کعب نے کہا: یارسول اللہ! میں نے آدھا معاف کر دیا۔ آپ (ﷺ) نے (ابو حدرد) سے فرمایا: اٹھو اور قرض ادا کرو۔[۶۸۲] (صحیح بخاری: ۴۵۷، صحیح مسلم: ۱۵۵۸، سنن ابوداؤد: ۳۵۹۵، سنن نسائی: ۵۴۰۸، سنن ابن ماجہ: ۲۴۲۹، مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۰۸۔ ص ۲۵۲)

(۴۲۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ ایک شخص کا اونٹ تھا۔ وہ اس کا مطالبہ کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا۔ آپ نے (صحابہ سے) فرمایا: اس کو وہ دے دو۔ صحابہ نے اس کا اونٹ تلاش کیا لیکن وہ تو نہ ملا البتہ اس سے اعلیٰ اونٹ ملا۔ آپ نے فرمایا: اس کو وہ دے دو۔ اُس شخص نے کہا: آپ نے مجھے بھرپور ادا کیا' اللہ تعالیٰ آپ کو بھرپور عطا کرے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک تم میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ اچھے طریقہ سے (قرض) ادا کرے۔[۶۸۳] (صحیح بخاری: ۲۳۰۵، صحیح مسلم: ۱۶۰۱، سنن نسائی: ۴۶۱۸)

---

۶۸۱ اس جملہ میں ''حوالہ'' کا لفظ اصطلاحی ہے یعنی ''نقل ذمة الی ذمة''. (اپنا قرض دوسرے کے ذمہ ڈال دینا) مراد یہ ہے کہ اگر تمہارا مقروض تم سے کہے کہ فلاں سے وصول کرلینا' اُس نے میرے قرض کی ذمہ داری قبول کرلی ہے تو بہتر ہے کہ اب مقروض کی بجائے اُس غنی سے قرض وصول کیا جائے جس نے ذمہ داری قبول کی ہو۔ (مرأۃ المناجیح ج ۴ ص ۲۹۵)

۶۸۲ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آدھا قرض معاف کروایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ مسلمانوں کی جان اور مال کے مالک ہیں اور اللہ عزوجل کی جانب سے حاکم علی الاطلاق ہیں۔ جس پر چاہیں جیسا چاہیں حکم فرمادیں اور صحابہ کرام اپنے مؤقف' اپنی مرضی حتیٰ کہ اپنی کھائی ہوئی قسم کے خلاف بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم پر خوشی سے عمل کرتے تھے اور اس کو اپنی دنیا اور آخرت کی سعادت گردانتے تھے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۷۵)

۶۸۳ اس حدیث شریف میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرض دار اپنے قرض کی ادائیگی کے وقت محض اپنی خوشی سے اضافہ کے ساتھ قرض واپس کرے تو یہ اضافہ شرعاً جائز اور مستحسن ہے (ہاں اگر اضافہ کی شرط لگائی جائے تو وہ سُود ہے)۔

(۴۲۳) ایک روایت میں یوں ہے کہ مذکورہ شخص نے قرض کا مطالبہ کرتے وقت رسول اللہ ﷺ سے سخت کلامی کی حتیٰ کہ صحابہ کرام اُس کی طرف بڑھے۔ آپ نے فرمایا: اس کو کہنے دو' کیونکہ حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے۔ پھر آپ نے اس کے اونٹ سے زیادہ بہتر اونٹ دینے کا حکم فرمایا۔ (صحیح بخاری: ۲۳۰۶' صحیح مسلم: ۱۶۰۱' سنن ترمذی: ۱۳۱۷' مسند احمد ج ۲ ص ۴۱۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۰۶۔ص ۲۵۱)

(۴۲۴) حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کے درمیان کھڑے ہوئے اور آپ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا تمام اعمال میں سب سے افضل ہے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! یہ بتایئے! اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ مجھ سے مٹا دیئے جائیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اس حال میں اللہ کی راہ میں شہید ہوئے کہ تم ثابت قدم اور مخلص تھے' آگے بڑھنے والے تھے اور پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ اُس شخص نے کہا: میں نے یہ کہا تھا کہ اگر میں راہِ خدا میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ مجھ سے مٹا دیئے جائیں گے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس حال میں کہ تم ثابت قدم اور مخلص ہو' آگے بڑھنے والے ہو اور پیچھے ہٹنے والے نہ ہو تو سوائے قرض کے تمہارے گناہ مٹا دیئے جائیں گے۔ جبریل نے مجھے اسی طرح کہا ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۸۸۵' سنن ترمذی: ۱۷۱۲' سنن نسائی: ۳۱۵۶' مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۱۱۔ص ۲۵۲)

(۴۲۵) حضرت محمد بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے آسمان کی طرف اپنا سر اٹھایا' پھر اپنی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا پھر کہا: ''سبحان اللہ ماذا نزل من التشدید'' (اللہ کی ذات پاک ہے! کیا سختی نازل ہوئی ہے!) ہم یہ سُن کر خاموش رہے اور ڈر گئے۔ اگلے روز میں نے آپ کی خدمت میں سوال کیا: یارسول اللہ! وہ کیا شدت تھی جو نازل ہوئی؟ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر کوئی شخص اللہ (عزوجل) کی راہ میں شہید ہو جائے' پھر اُسے زندگی مل جائے پھر وہ شہید ہو جائے پھر اُسے زندگی مل جائے اور اس پر قرضہ ہو تو وہ جب تک اپنا قرض ادا نہیں کر دے گا اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

(سنن نسائی: ۴۶۸۴' مسند احمد ج ۵ ص ۲۸۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۲۹۔ص ۲۵۴)

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اور تم اُس دن سے ڈرو جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا پھر ہر نفس کو اُس کے کیے کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور نزول کے اعتبار سے اس کے آخری ہونے کے بارے میں حضرت ابن عباس ۔۔ کی روایت

﴿وَاتَّقُوْا﴾ کا معنیٰ ہے: ڈرو۔ ﴿يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ﴾ میں ''ترجعون'' کو تاء کے زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور پیش کے ساتھ بھی۔ زبر کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جس دن تم اللہ کی طرف لوٹو گے (اس دن سے ڈرو) اور پیش والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے (اس دن سے ڈرو)۔ ﴿مَا كَسَبَتْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص نے جو اچھا اور بُرا کام کیا ہے (اس کا اُسے پورا بدلہ دیا جائے گا)۔ ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ☆ اس آیتِ مبارکہ میں سخت وعید اور بڑی سرزنش ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت وہ آخری آیت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ حضرت جبریل نے کہا کہ آپ اس آیت کو سورۃ البقرہ کی آیت: ۲۸۰ کے بعد رکھیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اکیس روز، ایک روایت کے مطابق نو راتیں اور ایک روایت کے مطابق سات راتیں (ظاہراً) موجود رہے پھر ۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ پیر کے دن آپ نے وصال فرمایا۔ امام شعبی کی حضرت ابن عباس سے روایت یہ ہے کہ آخری آیت جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی وہ آیت ربا ہے۔[۶۸۴] (صحیح بخاری: ۴۵۴۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۸۲﴾

اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک وقتِ معیّن تک قرض کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لیا کرو اور تمہارے درمیان لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ دستاویز لکھے اور لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے، جیسا اُسے اللہ نے سکھایا ہے اس کے مطابق اُسے لکھنا چاہیے، اور جس کے ذمہ حق (یعنی قرض) ہے اُسے چاہیے کہ وہ لکھوائے اور اُسے چاہیے کہ اللہ سے ڈرے جو کہ اُس کا رب ہے، اور اس (قرض) میں سے کچھ بھی کم نہ کرے، پھر جس کے ذمہ حق (قرض) ہے اگر وہ کم عقل یا ناتواں ہو یا (خود) نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا سرپرست ٹھیک ٹھیک لکھوا دے، اور تم اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالیا کرو، پس اگر دو

[۶۸۴] آیتِ ربا سے مراد وہ آیت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں سُود کے بیان کا آغاز فرمایا ہے۔ یعنی آیت: ۲۷۵۔ (اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ بعض روایات میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آخری آیت البقرہ: ۲۸۱ (وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ) کو قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے یہ دونوں اقوال بظاہر متعارض ہیں۔ لیکن ان میں تطبیق یہ ہے کہ البقرہ: ۲۸۱ گذشتہ آیات پر معطوف ہے اور جو مضمون ان تمام آیات میں چل رہا ہے اُس میں یہ آخری آیت ہے، اس لیے گذشتہ آیات کے حکم میں ہونے کی وجہ سے اس کو آخری قرار دیا گیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۳۸۰)

مرد نہ ہوں تو تمہارے پسندیدہ گواہوں میں سے (کم از کم) ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ دونوں (عورتوں) میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے' اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں' اور قرض کم ہو یا زیادہ اس کو مقررہ وقت تک لکھ لینے کو بوجھ نہ سمجھو' اللہ کے نزدیک یہ زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی دینے کے لیے بہت درست طریقہ ہے اور تمہیں شک سے بچانے کا آسان طریقہ ہے' ہاں وہ سودا جو تم آپس میں دست بدست کرتے ہو اس کو نہ لکھنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے' اور جب تم آپس میں خرید وفروخت کرو تو گواہ بنالیا کرو اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو' اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارا گناہ ہوگا' اور اللہ سے ڈرتے رہو' اور اللہ تمہیں (آداب معاشرت) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے O

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے سُود کو حرام فرمایا تو سلم کو جائز فرما دیا''۔[۶۸۵] اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک وقتِ معیّن تک جو سودا کیا جاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے۔

''تداین'' کا معنیٰ اور آیت مذکورہ میں ''بِدَیْنٍ'' کے اضافہ کی وجوہ

آیت مبارکہ میں ﴿اِذَا تَدَایَنْتُمْ﴾ کا معنیٰ ہے: جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو یا ایک دوسرے کو قرض دو۔ ﴿تـدایـن﴾ ''دَیْـنٌ'' کا باب تفاعل ہے۔ جب کوئی شخص قرض کا لین دین کرے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''دایـن'' (اُس نے قرض کا لین دین کیا) آیت میں ''تـدایـنـتـم'' کے بعد ''بـدیـن'' اس لیے فرمایا کہ مداینہ کبھی بدلہ دینے کے معنیٰ میں آتا ہے اور کبھی باہمی لین دین کے معنیٰ میں۔ اللہ تعالیٰ نے ''بـدیـن'' کی قید اس کے ساتھ لگائی تا کہ لفظ ''مـدایـنـه'' کی مراد معلوم ہو جائے اور ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ سے جدا ہو جائے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ''بـدیـن'' اس لیے فرمایا تا کہ ﴿فَاكْتُبُوْهُ﴾ کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکے۔ کیونکہ اگر یہاں ''بدین'' کا ذکر نہ ہوتا تو (''فـاكـتـبـوه'' کی بجائے) ''فـاكـتـبـوا الـديـن'' کہنا ضروری ہو جاتا۔ اور اس کی وجہ سے نظم قرآن کا حُسن برقرار نہ رہتا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''بدین'' کا اضافہ تاکید کے لیے ہے۔

''اجل مسمّی'' کا معنیٰ اور اس کے متعلق نبی ﷺ کا ارشاد

آیت میں ''اجـل مـسـمّـی'' فرمایا اس کا معنیٰ ہے: ایک ایسی مدت جس کی ابتداء اور انتہاء دونوں معلوم ہوں۔ جیسے سال اور مہینہ۔ (ایسی معیّنہ مدت تک کی دستاویز لکھی جائے)۔ اور ایسی مدت جو معیّن نہ ہو اس تک کی دستاویز لکھنا جائز نہیں ہے۔ جیسے کسی نے کھیتی کے کٹنے تک کا یا اس طرح کے کسی وقت کا ذکر کیا تو ایسی دستاویز جائز نہیں ہے۔ قیمت کی ادائیگی کے لیے معیّنہ مدت ضروری ہے۔ خواہ بیع ہو یا سلم ہو۔ تا کہ معیّنہ وقت سے پہلے حق دار مطالبہ نہ کرے۔ قرض کا معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ کہ اس میں اکثر علماء کے نزدیک معیّنہ مدت ضروری نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (لوگوں کا معمول یہ تھا کہ) وہ کھجوروں میں ایک اور دو سال تک کی بیع سلم کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

(۴۲۶) جو شخص کھجوروں میں بیع سلم کرے تو ایسی کھجوروں میں کرے جن کا کیل (ماپ) بھی معلوم ہو' وزن بھی معلوم ہو اور مدت بھی معلوم ہو۔ (صحیح بخاری: ۲۲۳۹' صحیح مسلم: ۱۶۰۴' سنن ابوداؤد: ۳۴۶۳' سنن ترمذی: ۱۳۱۱' سنن نسائی: ۴۶۱۶' سنن ابن ماجہ: ۲۲۸۰' مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۷' ۲۱۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۸۸۳۔ ص ۲۵۰)

[۶۸۵] ''بیع سَلَم'' اُس خرید وفروخت کو کہتے ہیں جس میں قیمت پہلے دے دی جائے اور چیز بعد میں ایک وقتِ معیّن پر لی جائے۔

قرض کی دستاویز لکھنے کے حکم میں ائمہ کا اختلاف

آیت مبارکہ میں جو" فاکتبوہ" فرمایا اس کا معنیٰ ہے: وہ قرض جس کا تم نے بیع یا سلم یا قرض کے طور پر لین دین کیا اس کو لکھ لو۔ قرض کی اس دستاویز کو لکھنے کے حکم میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت عطاء' ابن جریج اور امام نخعی کا مذہب یہ ہے کہ یہ لکھنا واجب ہے۔ امام محمد بن جریر طبری کا بھی یہی مختار ہے۔ جبکہ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ لکھنے کا حکم استحباب پر محمول ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے نہ لکھا تو اس میں حرج نہیں ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ دستاویز لکھنا' گواہ بنانا اور گروی رکھوانا پہلے فرض تھا' پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ" اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے"۔ (البقرہ:۲۸۳) تو اس سے دستاویز لکھنے' گواہ بنانے اور گروی رکھوانے کو منسوخ فرما دیا۔ حضرت حسن بصری' حضرت شعبی اور حکم بن عُیَیْنَہ کا یہی قول ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں لکھنے کی کیفیت کو بیان فرمایا ہے چنانچہ فرمایا کہ تمہارے درمیان لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ دستاویز لکھے۔

﴿ بَّيۡنَكُمۡ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مطالبہ کرنے والا اور جس سے مطالبہ کیا جائے گا ان دونوں کے درمیان کاتب قرض کا معاملہ لکھے۔ ﴿ بِالۡعَدۡلِ ﴾ یعنی حق کے ساتھ لکھے' نہ کسی قسم کی کمی زیادتی کرے نہ ہی معینہ مدت کو آگے پیچھے کرے۔ دستاویز لکھنے کا فائدہ علماء نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس سے دونوں جانب سے مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرض خواہ کو جب یہ بات معلوم ہوگی کہ اس کا حق لکھا ہوا ہے تو اس پر یہ بہت دشوار ہوگا کہ وہ اپنی اصل رقم سے زیادہ کا مطالبہ کرے یا معینہ مدت کے آنے سے پہلے مطالبہ کرے۔ اور جس شخص کے ذمہ قرض ہے اُسے جب یہ بات معلوم ہوگی کہ میں نے جو قرض لیا ہے وہ لکھا ہوا ہے تو اُس کے لیے بہت دشوار ہوگا کہ وہ لیے ہوئے قرض سے انکار کرے یا اس میں کمی کرے۔ اس فائدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دستاویز لکھنے کا حکم فرمایا۔

کاتب کا دستاویز لکھنا اور گواہ کا گواہی کی ذمہ داری لینا واجب ہے یا نہیں؟

اس بارے میں اختلاف ہے کہ کاتب کا دستاویز لکھنا اور گواہ کا گواہی کی ذمہ داری لینا واجب ہے یا نہیں؟ بعض ائمہ کا قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ کاتب کا لکھنے سے انکار کرنا ممنوع ہے۔ اور ہر کاتب پر لکھنا واجب ہے۔ لہٰذا جب کتابت کے اہل سے کتابت کا مطالبہ کیا جائے گا اور گواہی کے اہل سے گواہی کی ذمہ داری لینے کا مطالبہ کیا جائے گا تو اُن دونوں پر (اپنا اپنا کام) واجب ہوگا۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ فرض کفایہ ہے۔ امام شعبی کا یہی قول ہے۔ لہٰذا اگر ایک ہی شخص پایا جائے تو اس پر واجب ہوگا۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کاتب کو لکھنا سکھایا اور اُسے کتابت کا شرف عطا فرمایا ہے تو اُس کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دستاویز لکھ دے اور لکھنے کی جس نعمت سے اللہ تعالیٰ نے اُسے نوازا ہے اُس کا شکر ادا کرے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ دستاویز لکھنا گواہی کی ذمہ داری لینا پہلے واجب تھا پھر زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ" کاتب اور گواہ دونوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے" تو اس سے لکھنے اور گواہی کی ذمہ داری لینے کے وجوب کو منسوخ فرما دیا۔

آیت میں جو ﴿ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: جیسی اللہ تعالیٰ نے کاتب کو اجازت دی ہے اور حکم دیا ہے (اس کے مطابق لکھے)۔ یعنی اس طرح لکھے کہ کمی زیادتی نہ کرے اور وہ باتیں لکھے جو ضرورت کے وقت حجت بن سکیں اور ایسا نہ کرے کہ فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ احتیاط برتے اور دوسرے کے ساتھ نہیں۔ اور اس طرح لکھے کہ فریقین میں سے ہر ایک کا حق باطل ہونے سے محفوظ ہو جائے اور جو کچھ لکھے وہ ایسا ہو کہ اہل علم کے نزدیک متفقہ ہو اور ایسے الفاظ لکھنے سے پرہیز کرے جن سے جھگڑا پیدا ہو۔ یہ تمام باتیں صرف اُسی شخص میں موجود ہوں گی جو فقہ میں ماہر ہو اور لغت اور مذاہب علماء سے باخبر ہو۔

آگے فرمایا: ﴿ وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ ﴾ وہ شخص جس کے ذمہ حق ہو وہ لکھوائے۔ مراد یہ ہے کہ جس کے ذمہ میں حق (یعنی قرض) ہو اور اس سے مطالبہ کیا جائے' وہ اپنی زبان سے خود اقرار کرے تاکہ اُس کے ذمہ جو قرض ہے وہ معلوم ہو جائے۔ لہٰذا وہ قرض کی مقدار' اس کی جنس' معینہ مدت اور دیگر چیزیں بیان کر دے۔ ☆ لغوی اعتبار سے "املال" اور "املاء" دونوں فصیح ہیں اور دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ ﴿ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ لکھوانے والا اللہ سے ڈرے۔ ﴿ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو حق ذمہ میں ہے اس میں کمی نہ کرے۔

"سفیہ' ضعیف" اور لکھوانے پر قدرت نہ رکھنے والے کا شرعی حکم

آگے فرمایا: "جس کے ذمہ حق (قرض) ہے اگر وہ کم عقل یا ناتواں ہو"۔ اس جملہ میں ﴿ سَفِیْهًا ﴾ (کم عقل) سے مراد وہ شخص ہے جو لکھوانا نہ جانتا ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نابالغ بچہ ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "سفیہ" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا مال بے جا خرچ کرے اور اپنے دین کو تباہ کرے۔ ﴿ ضَعِیْفًا ﴾ (ناتواں) سے شیخ کبیر (یعنی بوڑھا) مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو مدہوشی یا پاگل پن کی وجہ سے کمزور عقل رکھتا ہو۔ آیت میں جو فرمایا: ﴿ اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ ﴾ (وہ نہ لکھوا سکتا ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گونگا ہو یا اندھا ہو یا لکنت زدہ ہو یا وہ قید ہو یا ایسا غائب ہو کہ کاتب کے پاس اس کی موجودگی ناممکن ہو یا وہ اُس مال سے بے خبر ہو جو اُس کا ہے یا اُس پر کسی کا ہے' ان سب کا اقرار درست نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی اور شخص ان کی جگہ کام کرے۔ ﴿ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ﴾ (تو اس کا سرپرست عدل کے ساتھ لکھوا دے)۔ یعنی مذکورہ تینوں قسم کے مجورین میں ہر ایک کا سرپرست لکھوائے۔ کیونکہ اقرار کی درستگی میں سرپرست اصل فریق کے قائم مقام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ "ولیّ" سے قرض دینے والا مراد ہے۔ یعنی اگر مقروض لکھوانے سے عاجز ہو جائے تو قرض دینے والے کو چاہیے کہ وہ لکھوائے۔ کیونکہ وہ اپنے حق کو اچھی طرح جانتا ہے۔ "بالعدل" سے مراد یہ ہے کہ سچائی کے ساتھ لکھوائے۔

گواہی کا معیار اور غلام کی گواہی کے معتبر ہونے میں ائمہ کا اختلاف

﴿ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ ﴾ تم اپنے حقوق پر دو گواہ بنا لیا کرو۔ کیونکہ دستاویز لکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ گواہ قائم کیا جائے۔ ﴿ مِنْ رِّجَالِكُمْ ﴾ میں اپنے مردوں سے مراد یہ ہے کہ اپنے ہم ملّت لوگوں میں سے دو گواہ بنا لیا کرو۔ یعنی وہ مسلمان ہوں اور آزاد ہوں۔ غلام اور بچے نہ ہوں۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ جبکہ قاضی شریح اور امام ابن سیرین نے غلاموں کی گواہی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے "من رجالکم" فرمایا ہے (یعنی اپنے مردوں میں سے) اور یہ غلام وغیرہ سب کو شامل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس کی عقل' اس کا دین اور اُس کا عادل (یعنی باکردار) ہونا جھوٹ بولنے سے روک دیتا ہے' سو یہ تمام باتیں جب غلام میں بھی پائی جائیں تو اس کی گواہی بھی معتبر ہو گی۔ جمہور علماء کا استدلال یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں" اس نص کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص گواہی کی ذمہ داری لے اُسے جب گواہی کے لیے طلب کیا جائے تو گواہی دینا اس پر واجب ہے۔ جبکہ غلام ایسا نہیں کر سکتا' کیونکہ اُس کا مالک جب اُسے اجازت نہیں دے گا تو گواہی دینے کے لیے جانا اُس پر حرام ہو جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ غلام کا شمار اہل شہادت میں نہ ہو۔

عورت کی گواہی کا شرعی حکم اور ائمہ کا اختلاف

﴿ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر دونوں گواہ مرد نہ ہوں۔ ﴿ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ ﴾ تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اموال میں عورتوں کی گواہی مردوں کے ساتھ جائز ہے۔لہٰذا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حق ثابت ہو جائے گا۔ البتہ اموال کے علاوہ دیگر معاملات کی گواہی میں اختلاف ہے۔ سفیان ثوری اور اصحاب رائے (یعنی احناف) کا مؤقف یہ ہے کہ عقوبات یعنی سزاؤں کے علاوہ تمام حقوق میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مال کے علاوہ کوئی چیز دو عادل مردوں کی گواہی کے بغیر ثابت نہیں ہوگی۔ امام شافعی کا مؤقف یہ ہے کہ وہ معاملات جن کا عموماً عورتوں کو علم ہوتا ہے' جیسے بچہ کی پیدائش' رضاعت' کنوار پن اور شادی شدہ ہونا وغیرہ ان میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یا چار عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ عقوبات اور حدود میں عورتوں کی گواہی جائز بھی نہیں ہے اور مقبول بھی نہیں ہے۔ ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ گواہ وہ ہوں جو تمہارے نزدیک اپنے دین اور امانت داری میں پسندیدہ ہوں۔

گواہی کے مقبول ہونے کی شرائط اور ان کے فوائد

عدالت یعنی آدمی کے باکردار ہونے اور گواہی کے مقبول ہونے کے لیے جن شرائط کا اعتبار کیا گیا ہے وہ دس ہیں۔(۱) اسلام (۲) آزادی (۳) عقل (۴) بلوغ (۵) عدالت (باکردار ہونا) (۶) مروّت (۷) گواہی سے کسی ذاتی فائدہ کا مقصود نہ ہونا (۸) کسی ذاتی نقصان کا دفعیہ مقصود نہ ہونا (۹) کثرت سے غلطی کرنے اور بھولنے میں معروف نہ ہونا (۱۰) گواہ اور فریق مخالف کے درمیان دشمنی کا نہ ہونا۔

لہٰذا (مذکورہ شرائط کی رُو سے) کافر کی گواہی مردود ہے۔ کیونکہ جو شخص بہت جھوٹ بولتا ہو اس کی گواہی مقبول نہیں ہوتی' تو جو شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے اس کی گواہی بدرجۂ اولیٰ مردود ہوگی۔ بعض اہل رائے نے ذمیّوں کی گواہی کو ایک دوسرے کے لیے جائز قرار دیا ہے۔ (اسی طرح شرائط مذکورہ کی رُو سے) غلاموں کی گواہی بھی مقبول نہیں ہوگی۔ البتہ ابن شُریح اور ابن سیرین نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ اسی طرح مجنون کی بات شرعاً معتبر نہیں ہے تو گواہی کیونکر درست ہوگی؟ اور بچوں کی گواہی بھی جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ''ممن ترضون من الشهداء'' فرمایا ہے۔ اسی طرح گواہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کبیرہ گناہوں پر قائم رہنے والا اور صغیرہ گناہوں کو بار بار کرنے والا نہ ہو۔ اسی طرح مروّت بھی شرط ہے۔ مروّت سے مراد وہ چیزیں ہیں جو آدابِ نفس سے تعلق رکھتی ہیں' جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کو ترک کرنے والے میں حیاء کی کمی ہے۔ وہ چیزیں یہ ہیں: ظاہری حلیہ اور کردار کا اچھا ہونا' طرزِ زندگی کا اچھا ہونا اور پیشہ کا اچھا ہونا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی ذات سے ایسی چیزوں کا اظہار کرے جن کا اظہار عموماً باعثِ شرم ہو تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں مروّت کی کمی ہے۔ اور یوں اس کی گواہی کو رد کر دیا جائے گا۔ اسی طرح گواہی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ گواہ تہمت سے محفوظ ہو۔ لہٰذا جو شخص کسی کا دشمن ہو اس کی دشمن کے علاوہ کسی اور کے حق میں تو گواہی قبول کر لی جائے گی لیکن اپنے اُس دشمن کے خلاف اُس کی گواہی مقبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ دشمن کے حق میں وہ تہمت زدہ ہے اور دوسرے کے حق میں وہ تہمت زدہ نہیں ہے۔ اسی طرح کسی شخص کی گواہی اس کی اولاد اور والد کے حق میں قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ ان کے خلاف قبول کر لی جائے گی۔ اسی طرح وہ شخص جو گواہی سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو اس کی گواہی بھی مقبول نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۴۲۷) کسی خیانت کرنے والے مرد اور خیانت کرنے والی عورت کی گواہی جائز نہیں ہے اور اس شخص کی گواہی بھی جائز نہیں ہے

جس کو حدِ شرعی کے طور پر کوڑے لگائے گئے ہوں[۶۸۶] اور اس کی بھی جائز نہیں ہے جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہو[۶۸۷] اور اس کی بھی جائز نہیں ہے جو قانع ہو یعنی اس پر اس کے گھر والے خرچ کرتے ہوں اور وہ ان کے حق میں گواہی دے اور اس کی بھی جائز نہیں ہے جو وَلاء اور نسب میں تہمت زدہ ہو[۶۸۸] فزاری نے کہا ہے کہ قانع سے مراد تابع ہے۔

(سنن ترمذی: ۲۲۹۸، سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۱۵۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷۸۱، ص ۳۲۸)

☆ اس حدیث پاک کے چند الفاظ کی لغوی تشریح: (۱) ''خـائن'' خیانت سے مراد وہ خیانت ہے جو دین، مال اور امانت میں ہو۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات میں سے کسی حکم کو ضائع کر دے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان میں سے کسی کا ارتکاب کرے وہ صاحب عدالت نہیں ہے۔ (۲) ''غِـمـر'' اس کا معنیٰ ہے: کینہ۔ (۳) ''الـقـانع'' وہ شخص جو مانگتا ہو اور کھانا طلب کرتا ہو۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی قوم کی طرف الگ تھلگ ہو کر اُن کی خدمت کرے۔ اس کی گواہی اس لیے مردود ہوگی کہ اس پر اپنی ذات کے فائدہ کو حاصل کرنے کی تہمت لگے گی۔ کیونکہ جس گھر والوں کے ساتھ وہ رہ رہا ہے اُن کی اُن تمام چیزوں سے وہ فائدہ حاصل کرتا ہے جو اُن کی ملکیت میں جاتی ہیں۔ (۴) ''ظَنین'' وہ شخص جس پر تہمت لگے۔

آگے فرمایا: ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ اس جملہ میں ایک عورت کے ساتھ دوسری عورت کو گواہ بنانے کی حکمت بیان کی جا رہی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ (گواہی میں دو عورتیں اس لیے مقرر کر) تا کہ دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی طبیعت میں نسیان (یعنی بھولنے کا) غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے تا کہ کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ''فتـذکر'' ذَکر سے ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک عورت دوسری کو مرد قرار دے۔ یعنی دونوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوگی۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے کیونکہ ''تذکر'' کا عطف ''تضلّ'' پر ہے اور ''تضلّ'' کا معنیٰ ہے: بھولنا۔ لہٰذا ''تذکر'' کا معنیٰ ہوگا: یاد دلانا۔

بُلاوے پر گواہوں کے حاضر ہونے کا شرعی حکم

﴿ وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ﴾ گواہوں کو جب بُلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ یعنی جب اُنہیں گواہی کی ذمہ داری لینے کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں چونکہ انہوں نے گواہی دینی ہے اس لیے آیت مبارکہ میں پہلے انہیں گواہ کا نام دیا گیا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ حکم وجوب کے لیے ہے۔ اور بعض علماء اُس صورت میں وجوب کے قائل ہیں جب کوئی اور شخص

۶۸۶ ترمذی شریف میں اس مقام پر عورت کا بھی ذکر ہے۔ یعنی جس عورت کو حدِ شرعی کے طور پر کوڑے لگائے گئے ہوں اُس کی گواہی بھی جائز نہیں ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۲۹۸) حدِ شرعی سے یہاں تہمتِ زنا کی سزا مراد ہے۔ یعنی جو مرد یا عورت کسی پاک دامن مرد یا پاک دامن عورت پر بدکاری کا الزام لگائے اور اُس الزام کے غلط ثابت ہونے کے نتیجہ میں شرعی قانون کے مطابق حاکم وقت اُس مرد اور عورت کو اسّی کوڑوں کی سزا دے تو ایسے مرد اور عورت کی گواہی شرعاً مقبول نہیں ہے۔

۶۸۷ یہاں بھائی سے اسلامی اور دینی بھائی مراد ہے۔ یعنی کینہ پرور اور دشمن کی گواہی دشمن کے خلاف مقبول نہیں، اگرچہ وہ اس کا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ اپنی دشمنی کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اُس کے خلاف جھوٹی گواہی دے۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ ص ۴۵۴)

۶۸۸ وَلاء سے مراد میراث ہے۔ یعنی جو غلام اپنے آپ کو اپنے آقا کی بجائے کسی اور کا آزاد کردہ غلام بتا کر اپنی میراث اُس کے لیے ثابت کرے یا جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے اُن کی گواہی مقبول نہیں ہے۔

(مرقات ج ۷ ص ۳۴۵)

موجود نہ ہو' اگر کوئی اور شخص موجود ہو تو پھر اختیار ہے۔بعض کے نزدیک یہ حکم استحباب کے لیے ہے۔لہٰذا آدمی کو ہر حال میں اختیار ہے۔بعض فرماتے ہیں کہ مذکورہ حکم گواہی کو قائم کرنے اور اس کو ادا کرنے کے متعلق ہے۔اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس گواہی کی ذمہ داری گواہوں نے لی ہے اس کو ادا کرنے کے لیے جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔بعض فرماتے ہیں کہ آیت کا تعلّق دونوں میں سے ہر حکم کے ساتھ ہے۔یعنی گواہی کی ذمہ داری لینا' اُس کو ادا کرنا اور اس کو قائم کرنا' جبکہ اُسے اچھی طرح علم ہو۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ گواہ جب تک حاضر نہیں ہوتا اس وقت تک با اختیار ہوتا ہے اور جب بُلانے پر حاضر ہو جائے تو گواہی دینا اس پر واجب ہوتا ہے۔

﴿ لَا تَسْئَمُوْٓا ﴾ کا معنیٰ ہے: تم اکتاہٹ اور پریشانی کا شکار نہ ہو۔﴿ اَنْ تَكْتُبُوْهُ ﴾ کی ضمیر حق یا دَین (قرض) کی طرف راجع ہے۔یعنی حق یا قرض کو لکھنے سے تم نہ اُکتاؤ۔﴿ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ حق یا قرض خواہ کم ہو یا زیادہ۔﴿ اِلٰٓى اَجَلِهٖ ﴾ میں ''اجل'' سے حق یا قرض کی جگہ مراد ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ دستاویز لکھنے کی طرف ہے۔﴿ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (دستاویز لکھ لینا) اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے کیونکہ اُسی نے اس کا حکم دیا ہے اور اس کے حکم کو ترک کرنے کی بہ نسبت اس کی پیروی کرنا زیادہ قرین انصاف ہے۔﴿ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ دستاویز لکھ لینا گواہوں کو یاد دلانے کا باعث ہے۔﴿ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ دستاویز لکھ لینا اس بات کے زیادہ مناسب اور قریب ہے کہ کہیں تم گواہی کے معاملہ میں شک میں نہ پڑ جاؤ (یعنی شکوک وشبہات سے بچنے کے لیے دستاویز لکھ لینا زیادہ مناسب ہے)۔

دست بدست ہونے والی تجارت کی دستاویز نہ لکھنے کی توجیہ

﴿ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر سودا ایسا ہو کہ دست بدست ہو۔﴿ تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ ﴾ اور تم اس کو اپنے درمیان اس طرح کرتے ہو کہ اس میں کوئی مدت معیّن نہیں ہوتی ﴿ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ ﴾ تو ایسی صورت میں تم پر کوئی ضرر اور نقصان نہیں ہے کہ ﴿ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ﴾ تم اپنی دست بدست ہونے والی تجارت کی دستاویز نہ لکھو۔تجارت کی اس قسم میں اللہ تعالیٰ نے دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ بنانے میں جو رخصت دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی تجارت لوگ کثرت سے کرتے ہیں۔اگر اس میں بھی لوگوں کو دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کا پابند کیا جاتا تو یقیناً یہ ایک دشوار بات ہوتی۔دوسری وجہ یہ ہے کہ تجارت کے فریقین میں سے جب ہر ایک اپنے فریق سے اپنا حصہ مجلسِ عقد ہی میں وصول کرے گا تو دونوں جانب سے انکار کا خدشہ باقی نہیں رہے گا۔اس لیے اس صورت میں دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کی ضروری نہیں ہے۔☆ تجارت کا معنیٰ ہے: اضافہ اور زیادہ منافع کے حصول کے لیے مال کو گردش میں رکھنا۔

﴿ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ﴾ جب تم خرید وفروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔یعنی اُس خرید وفروخت میں گواہ بنا لیا کرو جس میں گواہ بنانے کا رواج ہو۔یہ حکم کس نوعیت کا ہے؟ اس بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔بعض کے نزدیک یہ وجوب کے لیے ہے۔اس صورت میں گواہ بنانا ہر قرض میں واجب ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ' نقد ہو یا اُدھار۔اور جمہور علماء کے نزدیک مذکورہ حکم استحباب کے لیے ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ مذکورہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے کہ ''اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے''۔(البقرہ:۲۸۳)

کاتب اور گواہ کا نقصان زدہ ہونا اور ان کا نقصان پہنچانا

﴿ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ﴾ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔اس میں نقصان پہنچانے سے منع کیا جا رہا

ہے۔ ﴿ یُضَآرَّ ﴾ کا جولفظ ہے اس کی اصل ''یُضَارِرُ'' ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کاتب نقصان نہ پہنچائے اس طور پر کہ لکھنے سے انکار کردے۔ اور گواہ بھی نقصان نہ پہنچائے اس طور پر کہ گواہی دینے سے انکار کردے۔ یا کاتب اس طور پر نقصان نہ دے کہ لکھنے میں کمی زیادتی کردے یا جولکھوایا گیا ہے اس میں تبدیلی کردے۔ کیونکہ اس سے قرض خواہ یا قرض دار کونقصان ہوگا۔ یہی معاملہ گواہ کا بھی ہے۔ ''یضار'' کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس کی اصل ''یُضَارَرُ'' ہے (یعنی کاتب اور گواہ کونقصان نہ پہنچایا جائے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) آدمی کاتب اور گواہ کو بُلائے' وہ دونوں مصروف ہونے کی وجہ سے جواب میں یہ کہیں کہ ہم ایک اہم کام میں مصروف ہیں لہٰذا تم کسی اور کو بُلا لو۔ وہ شخص کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم دونوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تمہیں جب بُلایا جائے تو حاضر ہو جاؤ۔ پھر وہ شخص ان دونوں سے مزید اصرار کرے حتیٰ کہ اُنہیں ان کی مصروفیت اور کام سے روک دے۔ آیت میں ان دونوں کونقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ کسی اور شخص کو تلاش کیا جائے۔

﴿ وَاِنْ تَفْعَلُوْا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس نقصان کے پہنچانے سے تمہیں منع کیا گیا ہے اس کو اگر تم کرو ﴿ فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ ﴾ تو یہ معصیت (گناہ) ہے اور حکم خداوندی سے علیحدگی اختیار کرنا ہے۔ ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ تم اللہ سے ڈرو اور نقصان پہنچانے سے اور دیگر ممنوعہ کاموں سے بچو۔ ﴿ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تمہارے لیے دنیاوی معاملات میں رہنمائی کا باعث ہیں جس طرح تمہیں آخرت کے معاملہ میں رہنمائی کرنے والی باتیں سکھاتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ بندوں کے جو معاملات ہیں اُن سب کو اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے' اُس پر کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور اگر تم سفر پر ہو اور کسی لکھنے والے کو نہ پاؤ تو (جس سے قرض لے رہے ہو اس کے پاس) کوئی چیز گروی رکھوا دیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو' پھر اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے' اور تم گواہی کو نہ چھپایا کرو اور جو اس کو چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا ضمیر گناہگار ہے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کو جانتا ہے O

﴿ عَلٰى سَفَرٍ ﴾ کا معنیٰ ہے: ''في سفر'' یعنی اگر سفر میں ہو۔ ﴿ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا ﴾ اور کسی لکھنے والے کو نہ پاؤ' یعنی لکھنے کے آلات نہ پاؤ۔ ﴿ فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ﴾ (تو گروی رکھوا دیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو) ''رِهَانٌ'' ''رُهُنٌ'' بھی پڑھا گیا ہے' اس صورت میں یہ ''رَهْــنٌ'' کی جمع ہے۔ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ جس شخص کو تم قرض دے رہے ہو اس سے ایسی چیزیں گروی میں لے لیا کرو جن پر (تمہیں) قبضہ دے دیا جائے۔ تاکہ وہ چیزیں تمہارے لیے تمہارے مال کی دستاویز بن جائیں۔

رہن کا اصل معنیٰ دوام ہے۔ یعنی کسی چیز کا قائم دائم رہنا۔ جب کوئی چیز دائمی ہو جائے اور ٹھہر جائے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''رهــن الشيئى'' (فلاں چیز ٹھہر گئی)۔ (اصطلاح میں) رھن سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس ایسی چیز رکھوانا جو اس سے لیے ہوئے قرض کے قائم مقام ہو۔

آیت مذکورہ میں گروی رکھنے کو حالت سفر اور کاتب کی عدم موجودگی کے ساتھ مشروط کرنے کی توجیہ اور گروی رکھنے کے دیگر احکام

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ آیتِ مبارکہ میں گروی رکھنے کو حالت سفر اور کاتب کی عدم موجودگی کے ساتھ کیوں مشروط کیا گیا ہے؟ حالانکہ گروی رکھنے میں سفر اور حضر کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوالشحم یہودی سے ایک معینہ مدت پر غلہ لیا اور اس کے عوض اپنی زرہ اس کے پاس گروی رکھوائی۔[689] حالانکہ اس وقت آپ نہ تو سفر میں تھے نہ ہی کاتب کی غیر موجودگی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیتِ مبارکہ میں حالت سفر کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ گروی رکھوانا صرف سفر میں جائز ہے اور حضر میں جائز نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سفر میں چونکہ کاتب اور گواہوں کا ملنا دشوار ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مال کی حفاظت کی رہنمائی فرماتے ہوئے مسافر کو یہ حکم دیا کہ وہ دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کی بجائے گروی رکھوانے کا طریقہ اختیار کرے اور اس کے ذریعہ اپنے معاملہ کو پختہ کرے۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گروی رکھنا ہر صورت میں جائز ہے خواہ حالت حضر ہو یا حالت سفر اور کاتب موجود ہو یا نہ ہو۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ گروی رکھنا صرف اُسی صورت میں جائز ہے جب آدمی حالت سفر میں ہو اور کاتب موجود نہ ہو۔ کیونکہ زیرِ بحث آیت کے ظاہر سے یہی ثابت ہے۔ جمہور علماء نے ظاہر آیت کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت مبارکہ میں حالت سفر اور کاتب کی عدم موجودگی کی جو بات کی گئی ہے وہ شرط کے طور پر نہیں ہے بلکہ اعم اور اغلب کے طور پر ہے (یعنی عموماً چونکہ گروی اس صورت میں رکھوائی جاتی ہے جب آدمی سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے کی کوئی صورت نہ ہو اس لیے آیت مبارکہ میں اس کا تذکرہ کیا گیا)۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گروی رکھنا اس وقت مکمل ہوتا ہے جب چیز قبضہ میں دے دی جائے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے "**فرھان مقبوضۃ**" سے بیان فرمایا ہے۔ یعنی تم گروی رکھواؤ اور اس کا قبضہ دے دو۔ کیونکہ گروی رکھوانے کا مقصد یہ ہے کہ جو قرض دینے والا ہے اس کی جانب مضبوط ہو اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب چیز قبضہ میں دے دی جائے۔ لہٰذا اگر کسی نے گروی رکھوائی اور چیز سپرد نہیں کی تو اُسے سپرد کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ پھر جب وہ گروی کی چیز سپرد کر دے تو اس کی طرف سے وہ لازم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جب تک قرض کا کوئی بھی حصہ اس کے ذمہ میں باقی ہوگا اس وقت تک اُس کے لیے گروی کو واپس لینا جائز نہیں ہوگا۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ مقروض اگر قرض خواہ کے نزدیک صاحب امانت ہو اور حسن ظن کی بنیاد پر اس سے کوئی چیز گروی میں نہ لے۔ ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ تو مقروض جو کہ قرض دار کی نگاہ میں صاحب امانت ہے اُسے چاہیے کہ وہ اس کا حق ادا کر دے۔ آیت مبارکہ میں قرض کو امانت قرار دیا گیا ہے باوجود اس کے کہ اُسے ضمانت میں دیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے مقروض کو قرض کی رقم پر امین بناتا ہے اس وقت جبکہ اُسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ مقروض قرض سے منحرف نہیں ہوگا۔ اسی لیے وہ دستاویز بھی نہیں لکھتا' اُس پر گواہ بھی نہیں بناتا اور گروی میں کوئی چیز بھی اس سے نہیں لیتا۔ اس آیت میں (قرض کو امانت فرما کر) مقروض کو اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنے قرض دینے والے کے گمان اور خیال کے مطابق اپنا کردار ادا کرے جس نے اُسے قرض کی رقم کا امین بنایا ہے اور اس رقم کو ادا کر دے جس پر اُسے امین بنایا گیا ہے اور اس کے عوض کوئی چیز گروی نہیں رکھی۔ اس بات کی مزید تاکید کرتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ (وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے) یعنی جب قرض کی ادائیگی کا وقت آ پہنچے تو مقروض اپنے رب سے ڈرتے ہوئے قرض ادا کر

[689] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: صحیح بخاری: ۲۰۶۸' صحیح مسلم: ۱۶۰۳' مسند احمد ج ۶ ص ۱۶۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۸۸۴ ص ۲۵۰۔ واضح رہے کہ ان کتب میں ابوالشحم کا تذکرہ نہیں ہے' بلکہ مطلقاً ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے غلّہ لیا (الیٰ اخرہ)۔

دے اور ٹال مٹول اور انکار نہ کرے بلکہ اپنے قرض خواہ کے ساتھ اسی طرح اچھا معاملہ کرے جس طرح اُس نے اس کے بارے میں اچھا گمان اور خیال رکھا۔ اس کے بعد زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے گواہوں سے خطاب کیا ہے۔﴿ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴾ (تم گواہی کو نہ چھپایا کرو اور جو اس کو چھپاتا ہے تو یقیناً اس کا ضمیر گناہگار ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے)۔

﴿ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ جب تمہیں گواہی قائم کرنے اور اس کو ادا کرنے کے لیے بلایا جائے تو اُس کو نہ چھپاؤ۔ اس لیے کہ گواہ جب گواہی کو قائم کرنے سے رُک جائے اور اس کو چھپا جائے تو یقیناً اُس نے حق دار کا حق ضائع کر دیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے گواہی کو چھپانے سے منع فرمایا اور وعید میں سختی کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ ﴿ وَمَن يَكْتُمْهَا ﴾ جو گواہی کو چھپائے۔﴿ فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ﴾ تو یقیناً اس کا دل آثم یعنی فاجر ہے۔ یہاں دل کو فاجر اور گناہگار اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام چیزیں جو دواعی اور صوارف بنتی ہیں یعنی مختلف کاموں کا سبب بنتی ہیں وہ سب کی سب دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جیسی وعید اللہ تعالیٰ نے گواہی کو چھپانے کی بیان فرمائی ہے ایسی وعید کسی اور چیز پر بیان نہیں فرمائی۔ کیونکہ گواہی کو چھپانے پر فرمایا کہ ''فانه اثم قلبه'' اور اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ گواہی کو چھپانے والے کا دل مسخ ہو جاتا ہے۔ ہم اس سے اللہ عزوجل کی پناہ طلب کرتے ہیں۔﴿ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم جو گواہی کو ظاہر کرتے ہو اور اس کو چھپاتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اس جملہ میں اس شخص کے لیے وعید اور تنبیہ ہے جو گواہی کو چھپائے اور اُسے ظاہر نہ کرے۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۸۴﴾

اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کر دیا اُسے چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چاہے پر قادر ہے O

﴿ لِلَّهِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت میں ہے اور آسمان و زمین کے سب لوگ اس کے بندے ہیں اور وہ سب کا مالک ہے۔ آگے جو فرمایا کہ ''جو کچھ تمہارے دلوں میں اس کو تم ظاہر کر دیا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا'' یہ حدیثِ نفس[۶۹۰] اور ان تمام فاسد خیالات کو شامل ہے جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اور آدمی اُنہیں دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

دل میں پیدا ہونے والے خیالات پر محاسبہ اور گرفت کی توجیہ

(یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ) دل میں پیدا ہونے والے خیالات پر گرفت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی کام کا پابند کیا جائے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دل میں جو خیالات آتے ہیں وہ دو طرح کے ہیں: (۱) بعض وہ ہیں جن پر انسان اپنے آپ کو آمادہ کرتا ہے اور ان کو وجود میں لانے کا عزم و ارادہ کرتا ہے۔ اس طرح کے خیالات پر انسان کی گرفت کی جائے گی۔ (۲) دوسری قسم اُن خیالات کی ہے جو دل میں آتے ہیں اور آدمی اُنہیں اپنے دل سے دُور بھی نہیں کر سکتا لیکن وہ اُنہیں ناپسند کرتا ہے اور اُنہیں کر گزرنے اور وجود میں لانے کا عزم نہیں کرتا۔ اس طرح کے خیالات معاف ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ''۔ (البقرہ: ۲۸۶) آدمی نے جو اچھا کام کیا اُس کا اسے فائدہ ہے اور جو

[۶۹۰] حدیث نفس سے مراد یہ ہے کہ ذہن میں کسی چیز کا خیال اس طرح آئے کہ ذہن اُس کی طرف راغب بھی ہو اور اس کے حصول کے لیے منصوبہ بندی بھی کرے۔

بُرائی کی اُس کا اُسے نقصان ہے۔

زیر بحث آیت خاص ہے یا عام' اس بارے میں علماء کا اختلاف

علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ زیر بحث آیت خاص ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت گذشتہ آیت سے متصل ہے۔ اور یہ بھی گواہی کو چھپانے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے گواہان! تمہارے دلوں میں گواہی کو چھپانے کی جو بات موجود ہے اس کو تم ظاہر کرو یا چھپائے رکھو اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ یہ وجہ کمزور ہے۔ کیونکہ یہ آیت اگر چہ ایک خاص مسئلہ کے بعد وارد ہوئی ہے لیکن اس کے الفاظ میں عموم ہے' اس لیے اس کو گذشتہ آیت کی طرف پھیرنا ضروری نہیں ہے۔ بعض علماء (وجہ تخصیص بیان کرتے ہوئے) فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کافروں کو اپنا دوست بنائیں۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں کافروں سے دوستی کی جو بات موجود ہے اس کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ (تخصیص کے اس مؤقف کے برعکس) اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ زیر بحث آیت عام ہے۔

زیر بحث آیت منسوخ ہے یا غیر منسوخ؟ ائمہ کا اختلاف مع دلائل

پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ منسوخ ہے یا غیر منسوخ؟ علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ یہ اپنے بعد آنے والی آیت سے منسوخ ہے۔ اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

(٤٢٨) جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کی ملکیت ہے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ اس کا حساب لے گا' پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چاہے پر قادر ہے"۔ (البقرہ:۲۸۴) تو صحابہ کرام پر یہ شاق اور دشوار گزرا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھ گئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہمیں اُن کاموں کا پابند کیا گیا جو ہماری طاقت میں تھے' جیسے نماز' روزہ' جہاد اور صدقہ۔ اور اب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے جس پر عمل کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اپنے سے پہلے گزرنے والے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ "ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام سُنے اور نافرمانی کی"۔ بلکہ تم یہ کہو کہ "ہم نے تیرا حکم سنا اور اس کی اطاعت کی' اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے' ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے"۔ جب صحابہ کرام نے یہ کلمات کہے اور ان کی زبانوں پر یہ کلمات جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ "رسول اور اہل ایمان اُن چیزوں پر ایمان لائے جو اس کے رب کی طرف سے اس (رسول) پر نازل ہوئیں (اور) اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر سب کے سب ایمان لائے (اور انہوں نے کہا کہ) ہم ایمان لانے میں اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا: ہم نے سُنا اور ہم نے اطاعت کی۔ اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے"۔ (البقرہ:۲۸۵) جب صحابہ کرام نے اس پر عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیت (البقرہ:۲۸۴) کو منسوخ کر کے یہ آیت نازل فرمائی: اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتا' ہر شخص نے جو اچھا کام کیا اُس کے لیے اس کا فائدہ ہے اور جو بُرائی کی اس کا اس پر وبال ہے۔ اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرمانا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "نـــعـــم" (ٹھیک ہے) اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے "نعم" فرمایا۔ اور اے ہمارے رب! ہم پر ان احکام کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے "نعم" فرمایا۔ اور ہمیں معاف فرما' ہماری مغفرت فرما

اور ہم پر رحم فرما' تو ہمارا مالک ہے تو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ''نعم'' فرمایا۔☆ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح کی ایک حدیث انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کی ہے' اُس میں ''نعم'' کی بجائے ''قد فعلت'' کے الفاظ ہیں۔ (صحیح مسلم: ۱۲۵' مسند احمد ج ۲ ص ۴۱۲)

(٤٢٩) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے دلوں میں جو باتیں پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن سے درگزر فرمالیا ہے جب تک کہ لوگ (اُن خیالات پر) عمل نہ کریں یا زبان سے اُنہیں ادا نہ کریں۔ (صحیح بخاری: ۵۲۶۹' صحیح مسلم: ۱۲۷' سنن ترمذی: ۱۱۸۳' سنن ابوداؤد: ۲۲۰۹' سنن نسائی: ۳۴۳۴' سنن ابن ماجہ: ۲۰۴۰' مسند احمد ج ۲ ص ۳۹۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳۔ ص ۱۸)

علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ زیر بحث آیت منسوخ نہیں ہے۔ کیونکہ خبر پر نسخ وارد نہیں ہوتا' نسخ صرف امر اور نہی پر وارد ہوتا ہے۔ اور زیر بحث آیت میں یہ جملہ ﴿ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ (اللہ اس کا حساب لے گا) یہ خبر ہے' لہٰذا اس پر نسخ وارد نہیں ہوگا۔ اب اس کی تاویل اور معنیٰ کیا ہوگا؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دل کے لیے کمانا ثابت فرمایا ہے۔ جیسے '' بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ '' (البقرہ: ۲۲۵) میں ہے۔ لہٰذا بندہ اللہ کے لیے جو عمل بھی کرتا ہے خواہ سرّاً ہو یا علی الاعلان اور اس میں اس کے ظاہری عضو کی حرکت یا قلبی ارادہ کا دخل ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے' پھر وہ اس کی جزاء دے گا اور اس کا حساب لے گا' پھر جس عمل کو چاہے گا بخش دے گا اور جس پر چاہے گا عذاب دے گا۔ بعض دیگر علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ان تمام اعمال کا حساب لے گا جو انہوں نے ظاہراً یا پوشیدہ طور پر کیے۔ اور اُن پر اُنہیں سزا دے گا۔ البتہ وہ اعمال جو لوگوں نے دل میں چھپا کر رکھے اور ان پر عمل نہیں کیا اُن کی سزا ہلکی ہوگی۔ اور وہ سزا دنیا میں آنے والی مختلف مصیبتیں' مشکلات اور پریشانیاں ہیں جن پر لوگ غمگین ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہی قول ہے۔ حضرت اُمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(٤٣٠) اُنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اللہ عزوجل کے ان دو ارشادات کے بارے میں پوچھا: '' وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ '' (البقرہ: ۲۸۴) اور '' مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ '' (النساء: ۱۲۳) تو انہوں نے کہا کہ میں نے (ان آیات کے بارے میں) جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا اس کے بعد سے لے کر آج تک کسی نے مجھ سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بخار اور مصیبت میں ڈال کر اس پر عتاب فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سامان جس کو آدمی اپنی قمیص کے بازو میں رکھتا ہے وہ بھی اس سے گم ہو جاتا ہے اور وہ اس پر غمگین ہوتا ہے۔ (بندے پر یہ تمام تکالیف آتی رہتی ہیں) یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکلتا ہے جیسے سُرخ سونا بھٹی سے نکلتا ہے۔ (سنن ترمذی: ۲۹۹۱' مسند احمد ج ۶ ص ۲۱۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۵۷۔ ص ۱۳۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

امام ترمذی ہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اُسے دنیا میں ہی سزا دے دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے گناہ کی وجہ سے اس کی سزا کو روک لیتا ہے' یہاں تک کہ قیامت کے دن وہ اُسے پوری سزا دے گا۔[۶۹۱]
(سنن ترمذی: ۲۳۹۶)

[۶۹۱] یہ حدیث شریف' البقرہ: ۱۵۷ کی تفسیر میں رقم: ۱۵۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مکمل حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

دل میں پیدا ہونے والے خیالات پر محاسبہ کی مزید توجیہات

علماء کی ایک جماعت نے زیر بحث آیت کی توجیہ یہ کی ہے کہ "ما فی انفسکم" سے مراد وہ امور ہیں جن کا عزم اور پختہ ارادہ کر لیا گیا ہو۔ یعنی جن باتوں کا تم اپنے دلوں میں عزم کر چکے ہو اُن کو تم ظاہر کر دو یا اپنے ارادہ پر قائم رہتے ہوئے انہیں چھپاؤ' اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ جہاں تک دل میں آنے والے ان خیالات کا تعلق ہے جن کا تم نے عزم نہ کیا ہو تو وہ ان امور میں سے ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی طاقت کے مطابق پابند فرماتا ہے اور ان پر مؤاخذہ نہیں فرماتا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے پوچھا: کیا ارادہ پر بندہ کا مؤاخذہ اور گرفت ہوگی؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب ارادہ عزم کی شکل اختیار کر لے تو بندے کی گرفت ہوگی۔

بعض علماء نے آیت کی توجیہ یہ کی ہے کہ محاسبہ کا معنیٰ ہے: "الاخبار و التعریف" (آگاہ کرنا اور پہچان کرانا) اب آیت میں جو فرمایا کہ اللہ تمہارا محاسبہ فرمائے گا اس سے مراد یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو لوگوں کے ضمیر اور نیت میں ہوتی ہیں خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُس کو تم ظاہر کرو اور اس پر عمل کرو یا اپنے ضمیر اور نیت کی باتوں کو چھپاؤ' اللہ تم سے اس کا محاسبہ فرمائے گا۔ یعنی (قیامت کے دن) تمہیں آگاہ کرے گا اور تمہیں اس کی پہچان کرائے گا' پھر اپنے فضل و کرم کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو بخش دے گا اور عدل کا اظہار کرتے ہوئے کافروں کو عذاب دے گا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے "یؤاخذکم به" نہیں فرمایا بلکہ "یحاسبکم به" فرمایا ہے' کیونکہ محاسبہ الگ ہے اور مؤاخذہ الگ ہے۔ نیز اس توجیہ کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت صفوان بن محرز مازنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۴۳۱) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما طواف کر رہے تھے کہ ایک شخص اس دوران ان کے سامنے آیا اور کہا: اے ابو عبد الرحمٰن! راز دارانہ انداز میں گفتگو کے بارے میں آپ نے رسول اللہ ﷺ سے جو سنا ہے وہ مجھے بتائیے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ (قیامت کے دن) مؤمن اپنے رب کے قریب جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا دستِ قدرت رکھے گا' پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروائے گا کہ فلاں فلاں گناہ تجھے معلوم ہے؟ وہ دو مرتبہ کہے گا: اے پروردگار! مجھے معلوم ہے' مجھے معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے ان گناہوں کو دُنیا میں ڈھانپ کے رکھا اور آج میں تیرے لیے ان گناہوں کی بخشش کر رہا ہوں۔ پھر اس کا نامۂ اعمال لپیٹ دیا جائے گا۔ جہاں تک دوسرے لوگ یعنی کفار اور منافقین کا معاملہ ہے اُن کو اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کے سامنے نداء دے گا (اور فرمائے گا کہ) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پہ جھوٹ باندھا۔ آگاہ ہو جاؤ! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۴۴۱' صحیح مسلم: ۶۸۷۲' سنن ابن ماجہ: ۱۸۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۵۵۱۔ ص ۴۸۵)

زیر بحث آیت میں آگے فرمایا: ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ پھر جسے چاہے گا وہ بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چاہے پر قادر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ (اس سے مراد یہ ہے کہ) جس شخص کے لیے چاہے گا بڑے گناہ کو معاف فرما دے گا اور جسے چاہے گا چھوٹے گناہ پر عذاب دے گا۔ وہ جو کچھ کرے گا اس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا البتہ لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

آخر میں جو فرمایا کہ "اللہ ہر شئے پر قادر ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ فضل کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو بخش دے گا اور عدل کرتے ہوئے کافروں کو عذاب دے گا۔

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

رسول اور اہل ایمان اس (کتاب) پر ایمان لائے جو اس (رسول) کی طرف اس کے رب کی جانب سے نازل ہوئی' سب لوگ اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے (اور یہ کہا کہ) ہم ایمان لانے میں اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا: ہم نے (حکم کو) سُنا اور ہم نے فرمانبرداری کی' اے ہمارے پروردگار! ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعہ نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا محاسبہ فرمائے گا''۔ (البقرہ:۲۸۴) تو صحابہ کے دلوں میں ایسا خوف پیدا ہوا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اپنا معاملہ بیان کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''رسول اور اہل ایمان اس (کتاب) پر ایمان لائے جو اس (رسول) کی طرف اس کے رب کی جانب سے نازل ہوئی' سب لوگ اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے (اور یہ کہا کہ) ہم ایمان لانے میں اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا: ہم نے سُنا اور فرمانبرداری کی' اے ہمارے پروردگار! ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے O اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا' ہر شخص نے جو اچھا کام کیا اس کے لیے اس کا فائدہ ہے اور جو بُرائی کی اس کا اس پر وبال ہے۔ اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرمانا''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قد فعلت'' (میں نے ایسا ہی کیا)۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قد فعلت''۔ اے ہمارے رب! ہم پر ان احکام کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہیں۔ اور ہمیں معافی عطا فرما' ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا مالک ہے پس تو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قد فعلت''۔ (صحیح مسلم:۱۲۶' سنن ترمذی:۲۹۹۲' مسند احمد ج۱ص ۲۳۳' مستدرک ج۲ص ۲۸۶)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

امام زجاج فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نماز' زکوٰۃ' روزہ' حج' طلاق' ایلاء' حیض' جہاد' انبیاء کرام کے واقعات اور اہل حکمت کی باتیں بیان فرمائیں تو اس کا اختتام اس خبر پر فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی ہے۔

﴿اٰمَنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تصدیق کی اور ﴿الرَّسُوْلُ﴾ سے مراد سیدنا محمد ﷺ کی ذات ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ رسول نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ قرآن اور جو کچھ اس میں احکامات ہیں یہ سب کا سب اللہ عزوجل کی جانب سے نازل کردہ ہے۔ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان نے بھی مذکورہ باتوں کی تصدیق کی۔

ضروریاتِ ایمان کے چار مراتب کا بیان

آیت میں ﴿كُلٌّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اہل ایمان میں سے ہر شخص اللہ' اس کے ملائکہ' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر

ایمان لایا۔

اس آیت میں جن چار چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ایمان کے اصول اور اس کی ضروریات کے چار مراتب ہیں: (۱) اللہ عزوجل پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ اللہ ایک ہے' اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے نیز اس کے تمام اسماء حسنیٰ اور صفاتِ عظیمہ پر ایمان لایا جائے۔ اور اس بات پر ایمان لایا جائے کہ وہ زندہ ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ (۲) فرشتوں پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ ان کا وجود ہے اور وہ معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ اور یہ کہ وہ باعزت اور نیک کاتبین ہیں اور اللہ عزوجل اور اس کے رسولوں کے درمیان واسطہ ہیں۔ (۳) کتابوں پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ جو کتابیں اللہ عزوجل کی جانب سے نازل ہوئی ہیں وہ خدا کی اپنے رسولوں کی طرف وحی ہیں' اور یہ کہ وہ اللہ عزوجل کی جانب سے حق اور سچ ہیں' ان میں کوئی شک نہیں ہے۔ نیز اس پر ایمان لایا جائے کہ قرآن مجید میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور اس پر ایمان لایا جائے کہ وہ محکم اور متشابہ پر مشتمل ہے اور اس کی جو محکم آیات ہیں وہ متشابہ آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔ (۴) رسولوں پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ رسول بندوں کی طرف اللہ عزوجل کے پیغمبر ہوتے ہیں اور اللہ کی وحی کے امین ہوتے ہیں۔ نیز اس پر ایمان لایا جائے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور تمام مخلوق میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لایا جائے کہ بعض رسول بعض سے افضل ہیں۔

رسولوں کا ایک دوسرے سے افضل ہونا

رسولوں کے باہم ایک دوسرے سے افضل ہونے کا بعض علماء نے انکار کیا ہے۔ اور زیر بحث آیت کے اس جملہ سے استدلال کیا ہے: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے)۔ اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مقصد کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کی نبوت کو ثابت کیا جائے اور یہود و نصاریٰ کا رد کیا جائے جو صرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کی نبوت کو مانتے تھے اور سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ جبکہ قرآن کریم سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ'' (البقرۃ:۲۵۳) یعنی ''ان رسولوں میں بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے'' جہاں تک ''لا نفرق بین احد من رسله'' کی بات ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان اس طرح فرق نہیں کرتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کریں' جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا' بلکہ ہم اس کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ☆ ''لا نفرق بین احد من رسله'' سے پہلے ''قالوا'' پوشیدہ ہے۔ یعنی اہل ایمان کہتے ہیں کہ ہم اس کے رسولوں میں کسی کے درمیان (ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے۔

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تیری بات کو سنا اور تیرے حکم کی فرمانبرداری کی۔ مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان نے کہا کہ ہمیں ہمارے رب نے حکم دیتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے اس کو ہم نے سنا اور اپنے جو فرائض اس نے ہم پر لازم کیے ہیں اور اپنی فرمانبرداری کا ہمیں جو پابند کیا ہے اس کی ہم نے اطاعت کی اور جن باتوں کا اس نے ہمیں حکم دیا ہے اور جن باتوں سے اس نے ہمیں روکا ہے ان کو ہم نے تسلیم کیا۔ آگے جو ﴿غُفْرَانَكَ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ سے تیری بخشش کا سوال کرتے ہیں۔ یا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہمیں اپنی بخشش میں ڈھانپ لے۔ آخر میں فرمایا: ﴿وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ (ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے) یعنی اہل ایمان نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہمارا رجوع اور عود (لوٹنا) تیری ہی طرف ہے۔ پس تو ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش فرما۔

امام بغوی نے بغیر سند کے حضرت حکیم بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ:

(۴۳۲) حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ اللہ عزوجل نے آپ کی اور آپ کی امت کی تعریف وثناء فرمائی ہے۔ لہٰذا آپ سوال کریں آپ کو آپ کی مطلوبہ چیز دی جائے گی۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اللہ عزوجل کی تلقین سے یہ کہا: ''غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ'' (اے ہمارے پروردگار! ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے)۔

(معالم التنزیل للامام البغوی، جامع البیان للطبری، تفسیر سورۃ البقرہ:۲۸۵)

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ٝ وَاغْفِرْ لَنَا ٝ وَارْحَمْنَا ٝ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۠

اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا، ہر شخص نے جو اچھا کام کیا اس کے لیے اس کا فائدہ ہے اور جو بُرائی کی اس کا اس پر وبال ہے، اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا خطاء کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرمانا، اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بھاری بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا، اے ہمارے رب! ہم پر اُن (احکام) کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہیں، اور ہمیں معافی عطا فرما، ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مالک ہے، پس تو کافر قوم کے خلاف ہماری مدد فرما O

﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا۔ اس جملہ کے بارے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے یہاں سے (نئی بات کا) آغاز ہو اور یہ اللہ عزوجل کی طرف سے خبر کے طور پر ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اہل ایمان کے کلام کی حکایت اور اس کا بیان ہو۔ اس صورت میں یہاں اضمار ہوگا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ''قالوا لا یکلّف اللہ'' (یعنی اہل ایمان نے کہا کہ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا)۔ ''الا وسعھا'' سے مراد طاقت ہے۔ ''وسع'' ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان کے لیے ممکن ہو اور اُس میں دشواری نہ ہو۔

''لا یکلّف اللہ نفسا الّا وسعھا'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے آتے ہیں (اُن کا حکم) اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو تم ظاہر کردو یا چھپاؤ اللہ اس کا تم سے حساب لے گا'' (البقرہ:۲۸۴) تو مسلمان اس سے پریشان ہوگئے اور انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہاتھ، پاؤں اور زبان سے جو کچھ عمل ہوتا ہے اس سے ہم توبہ کر لیتے ہیں، لیکن وسوسہ اور دل میں آنے والے خیالات سے کیسے توبہ کریں؟ اس کے جواب میں زیرِ بحث آیت نازل ہوئی۔ اور اس میں فرمایا کہ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں فرماتا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم وسوسہ اور دل میں آنے والے خیالات سے بچ نہیں سکتے کیونکہ تمہیں اس کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا اُن پر تمہاری گرفت نہیں ہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں صرف مسلمان مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ان کے دین کے معاملہ کو وسیع فرمادیا ہے اور جو کام طاقت سے خارج ہوں اُن کا اُنہیں پابند نہیں فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ . اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔

(البقرہ:۱۸۵)

مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ . (الحج:۷۸) اللہ نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی۔

حضرت سُفیان بن عُیَیْنَہ سے ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' کے متعلق پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اُس کی آسانی کے مطابق پابند فرماتا ہے اور طاقت سے زیادہ کا پابند نہیں فرماتا۔ ''وُسعـــع'' کی تفسیر میں یہ بہترین قول ہے۔ کیونکہ ''وسع'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو طاقت کے اندر اندر ہو۔ بعض نے ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ایسے کاموں کا پابند نہیں فرماتا جو بندے کی طاقت میں نہ ہوں۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس (یعنی آدمی) نے جو نیک اعمال کیے اس کے لیے اُن کا اجر وثواب ہے۔ اور ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ نفس نے جو بُرے کام کیے اس پر اُن کا بوجھ اور سزا ہے۔ بعض مفسرین نے ''لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر دوسرے شخص کے گناہوں کی وجہ سے گرفت نہیں فرمائے گا۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! تو ہماری گرفت نہ فرما۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہلِ ایمان کو اس بات کی تعلیم دی جارہی ہے کہ اُنہیں اپنے رب سے کیسے دُعا کرنی چاہیے۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ یوں کہو: اے ہمارے رب! ہمارا مؤاخذہ نہ فرما۔ یعنی ہمیں سزا نہ دے۔ یہاں مؤاخذہ ایک جانب سے ہے اس کے باوجود اس کو باب مفاعلہ سے اس لیے لایا گیا ہے کہ بُرائی کرنے والا شخص پہلے اپنے آپ کو قادر بناتا ہے اور اپنے فعل سے اس کی طرف راہ نکالتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں گویا وہ (ازخود) اس ذات کو اپنے خلاف دعوت دیتا ہے جو اُسے اس کے گناہ پر سزا دے اور اس کا مؤاخذہ کرے۔

﴿اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (اگر ہم بھول جائیں یا خطاء کربیٹھیں) اس میں نسیان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک نسیان وہ ہے جو ''سہو'' ہوتا ہے اور یہ یاد آنے کی ضد ہے[۶۹۲]۔ کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جن چیزوں کا حکم دیا گیا تھا اُن میں سے اگر وہ کوئی چیز بھول جاتے یا اس کے کرنے میں غلطی کر بیٹھتے تو فوراً اس کی سزا اُنہیں دے دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے لیے کھانے پینے کی جو چیزیں حلال ہوتی تھیں اس میں سے کوئی چیز مذکورہ گناہ کی وجہ سے حرام کردی جاتی تھی۔ اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ وہ اس بات کی دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اس پر مؤاخذہ نہ فرمائے۔

نسیان (یعنی بھولنا) جب قابلِ گرفت نہیں ہے تو پھر اس سے درگزر طلب کرنے کا کیا مقصد ہے؟

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جو شخص کسی چیز کو بھول جائے اس سے تو درگزر کیا جاتا ہے' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد دلیل ہے کہ:

(۴۳۳) میری امت سے غلطی' بھول اور ان کاموں کو اٹھالیا گیا ہے جو زبردستی کرائے جائیں۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۰۴۵' سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۵۶' المستدرک ج ۲ ص ۱۹۸' سنن دار قطنی ج ۴ ص ۱۷۰)

(اس حدیث کی رُو سے) جب نسیان (یعنی بھولنا) یقینی طور پر معاف ہے تو پھر دُعا کے ذریعہ اس سے درگزر طلب کرنے

۶۹۲؎ علامہ خازن کا یہ کلام غالباً تفسیر کبیر (امام رازی علیہ الرحمۃ) سے ماخوذ ہے۔ لیکن امام رازی نے نسیان کی دونوں صورتیں بیان کی ہیں جبکہ علامہ خازن نے صرف ایک صورت بیان فرمائی ہے۔ (یعنی نسیان بمعنیٰ بھولنا جو کہ یاد آنے کی ضد ہے۔) دوسری صورت جو امام رازی نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ نسیان بہ معنیٰ ترک بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی اے ہمارے رب! (جو کام کرنے کے ہیں وہ) اگر ہم چھوڑ جائیں تو ہماری گرفت نہ فرمانا۔ ہوسکتا ہے علامہ خازن نے یہ صورت اس لیے ترک کی ہو کہ ذیل میں آنے والے اعتراض کے پہلے جواب کے ضمن میں اس کا ذکر موجود ہے۔

کا کیا مقصد ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس کے مختلف جوابات ہیں: (۱) ایک جواب یہ ہے کہ نسیان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ نسیان ہے جو آدمی کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہو۔ یعنی جس چیز کا اُسے حکم دیا گیا ہے اُسے وہ چھوڑ دے (یہاں تک کہ بھول جائے) جیسے کوئی شخص اپنے کپڑے پر خون دیکھے پھر اس کی صفائی کو مؤخر کر دے اور اُسے بھول جائے' پھر اُن ہی کپڑوں میں نماز پڑھ لے تو قصور وار اُسی کو ٹھہرایا جائے گا کیونکہ جلد از جلد اُس خون کو صاف کرنا اُس پر لازم تھا۔ ہاں اگر اُسے وہ خون نظر نہ آئے تو اس میں وہ معذور سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جس کام کا حکم دیا گیا ہو اس کو کوئی شخص سہواً چھوڑ دے یا بغیر ارادہ کے کسی ممنوع کام کا ارتکاب کر لے' جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت سے روکا گیا تھا اس سے انہوں نے بھول کر اور مخالفت کے ارادہ کے بغیر کھا لیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''ہم نے اس سے قبل آدم سے عہد لیا تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا (نافرمانی کرنے کا) ارادہ نہیں پایا''۔ (طٰہٰ:۱۱۵) اس طرح کے بھولنے میں واجب ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے درگزر اور معافی کی دُعا کرے۔ دوسرا بھولنا وہ ہوتا ہے جیسے کسی شخص نے نماز چھوڑ دی پھر وہ اُسے بھول گیا' یا حفظ کرنے کے بعد قرآن کریم کو پڑھنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ اُسے بھول گیا تو اس طرح کی بھول اور سہو میں آدمی کو معذور نہیں سمجھا جائے گا' کیونکہ یہ کوتاہی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نسیان کی دو قسمیں ہیں۔ لہٰذا بھولنے سے درگزر اور معافی کی دُعا کرنا صحیح ہے۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرتے تھے جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اگر اُن سے کوئی نامناسب بات سرزد ہوتی تھی تو وہ سہو اور بھول سے ہی ہوتی تھی۔ نتیجۃً سہو اور بھول سے سرزد ہونے والی بات پر جو وہ معافی اور مغفرت کی دُعا کرتے تھے وہ صرف اس وجہ سے ہوتا تھا کہ اُن کے دل میں اللہ کا خوف اور تقویٰ بہت زیادہ تھا۔ (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ بھولنے پر اللہ عزوجل سے معافی کی دُعا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے آگے گریہ وزاری اور عاجزی کا اظہار کیا جائے۔

خطاء کی دو اقسام اور ان کا حکم

زیر بحث آیت میں جو ﴿اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ فرمایا ہے اس میں خطاء کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے اُسے وہ قصد اور ارادہ سے کرے۔ یہ آدمی کی خطاء ہے اور اس پر اس کی گرفت بھی ہوگی۔ اس لیے یہ بات بہت اچھی ہے کہ جس خطاء کا آدمی نے ارتکاب کیا ہے اس کی معافی اور مغفرت کی دُعا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خطاء اس طور پر ہو کہ آدمی کو (کام کے ممنوع ہونے کا) علم ہی نہ ہو اور وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ جائز ہے۔ جیسے ابر آلود موسم والے دن کوئی شخص یہ سمجھ کر کہ ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا' نماز کو مؤخر کر دے یہاں تک کہ اُس کا وقت نکل جائے تو یہ وہ خطا ہے جس پر آدمی کی گرفت نہیں ہے لیکن اس سے معافی اور مغفرت کی دُعا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سرزد ہونے میں آدمی کی اپنی کوتاہی کا دخل ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ اس جملہ میں لفظ ''اصــــر'' سے مراد ہے: بھاری وعدہ اور پختہ عہد۔ مفہوم یہ ہے کہ اے ہمارے رب! ایسا پختہ وعدہ ہم پر نہ ڈال' کیونکہ ہم اس کو انجام نہیں دے سکیں گے۔ نتیجۃً اس کے توڑنے اور چھوڑنے پر تو ہمیں عذاب دے گا۔ ﴿الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ سے مراد یہودی ہیں (یعنی جیسا تو نے ہم سے پہلے یہودیوں پر بوجھ (پختہ وعدہ) ڈالا) تو وہ اس کو انجام نہ دے سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تو نے اُنہیں عذاب دیا۔

گذشتہ لوگوں پر ڈالے جانے والے بوجھ سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اے ہمارے رب! تو ہم پر سختی نہ فرما جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے یہودیوں پر سختی فرمائی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر پچاس نمازیں فرض فرمائیں' مال کا چوتھائی حصہ زکوٰۃ کے طور پر دینے کا حکم دیا' اُن میں جس شخص کے کپڑے پر نجاست لگ جاتی تھی وہ نجاست کی مقدار کپڑے کو (حکمِ الٰہی کے تحت)

کاٹ لیتا تھا اور جو شخص کوئی گناہ کر بیٹھتا تھا اس کا گناہ اس کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اس طرح کے اور دیگر کئی بھاری بھرکم احکامات تھے جو یہودیوں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس لیے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ انہیں اس طرح کی سختیوں اور بھاری معاہدوں سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس دُعا کو اپنی رحمت سے قبول فرمایا اور اپنے فضل و کرم سے ان کے لیے آسانی فرمادی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ ''اللہ نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی''۔ (الحج:۷۸) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اِصْـر'' اُس گناہ کو کہتے ہیں جس کی توبہ نہ ہو' اس لیے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ وہ اُنہیں اس طرح کے گناہ سے محفوظ رکھے۔

''تکلیف ما لا یطاق'' کی تشریح

﴿ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ﴾ اے ہمارے رب! ہم پر اُن چیزوں کا بوجھ نہ ڈالنا جن کی ہمیں طاقت نہیں۔ یعنی وہ احکام جن کا بوجھ ہمارے لیے زیادہ ہے اور ان کو ہم انجام نہیں دے سکتے' ان کا ہمیں مکلّف (یعنی پابند) نہ فرما۔

تکلیف ''مـالا یـطاق'' (یعنی کسی کو ایسے کاموں کا پابند کرنا جن کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو) اس کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) ایک صورت اُن کاموں کی ہے جن کو کرنے کی آدمی میں طاقت نہ ہو۔ جیسے کسی نابینا شخص کو دیکھنے کا کہنا اور لنگڑے کو دوڑنے کا کہنا۔ یہ وہ قسم ہے جس کا اللہ تعالیٰ کسی صورت میں اپنے بندے کو پابند نہیں فرماتا۔ (۲) دوسری صورت اُن کاموں کی ہے جن کو آدمی سخت مشقت اور بہت تکلیف اٹھا کر کر سکتا ہے۔ جیسے کسی کو مشکل اعمال اور بھاری فرائض کا پابند بنانا۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا کہ رات میں نماز ادا کرنا واجب تھا' اور اس طرح کے دیگر احکامات۔ اس لیے اہل ایمان نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اُنہیں ان اعمال کا پابند نہ بنائے جن کی اُنہیں طاقت نہیں۔

وہ لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ ''تـکـلیف مـا لا یطاق'' جائز ہے اُن کا استدلال اسی زیر بحث آیت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ''تکلیف مالا یطاق'' جائز نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ سے اس بات کی دُعا کرنا ہرگز صحیح نہ ہوتا کہ وہ آسانی فرمادے۔

زیر بحث آیت میں ''مالا طاقة لنا'' سے کون سے احکام مراد ہیں؟

﴿ مَا لَا طَاقَةَ ﴾ میں کون سے احکام مراد ہیں؟ اس بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے دل میں آنے والے خیالات اور وسوسہ مراد ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے شہوت کا جوش مارنا مراد ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے محبت مراد ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مصائب پر دشمنوں کا خوش ہونا مراد ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے جُدائی مراد ہے اور بعض کے نزدیک اس سے بندر اور خنزیر والی شکل کا بننا مراد ہے۔ ''نعوذ بالله من ذالک کلّه'' (ہم ان تمام باتوں سے اللہ عزوجل کی پناہ طلب کرتے ہیں)۔

﴿ وَاعْفُ عَنَّا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور اُنہیں ہم سے مٹادے۔ ﴿ وَاغْفِرْ لَنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں رُسوا نہ فرما۔ ﴿ وَارْحَمْنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو ہمیں اپنی اُس رحمت میں ڈھانپ لے جس کے ذریعہ تو ہمیں اپنے عذاب سے نجات دے۔ کیونکہ تیرے عذاب سے رحمت کے سوا کوئی اور چیز بچانے والی نہیں ہے۔ بعض نے ''وارحـمـنا'' کی تفسیر یہ کی ہے کہ ہم پر رحم فرما کیونکہ تیری فرمانبرداری کیے بغیر ہم عمل کو نہیں پا سکتے اور تیری رحمت کے بغیر تیری نافرمانی سے نہیں بچ سکتے۔

''رحمت'' کا اصل معنیٰ ہے: ایسی نرمی جو اس بات کا تقاضا کرے کہ کسی مہربانی کے قابل شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ جب اس لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو متصف کیا جائے تو اس سے صرف وہ احسان مراد ہوگا جو مجرّد ہو (یعنی نرمی کے بغیر ہو' کیونکہ نرمی کا مرکز دل ہے اور اللہ عزوجل دل سے پاک ہے)۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عفوو درگزر کو طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی دُعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے میرے گناہوں کی سزا کو معاف فرمادے۔ اور طلبِ مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی دُعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ رُسوائی سے بچانے کے لیے میری پردہ پوشی فرمائے۔ گویا بندہ یوں عرض کرتا ہے کہ میں تجھ سے درگزر اور معافی کا طالب ہوں اور جب تو مجھے معاف فرمادے تو پھر میری پردہ پوشی فرما۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندہ کو معاف کردیا اور اس کی پردہ پوشی بھی فرمادی تو اس کے بعد بندہ نے رحمت یعنی انعام اور احسان کو طلب کیا تا کہ اُسے نعمتیں اور اجروثواب کی کامیابی حاصل ہو۔

﴿اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تو ہمارا مددگار' محافظ' نگہبان اور ہمارے معاملات کی سرپرستی فرمانے والا ہے۔

﴿فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ تو قومِ کافرین پر ہماری مدد فرما۔ یعنی منکرین جنہوں نے تیرے غیر کی عبادت کی اور تیری وحدانیت کا انکار کیا' ایسے لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب ''غفرانك ربنا'' کہا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تمہیں بخش دیا۔ جب ''لا تؤاخذنا ان نسينا او اخطأنا'' کہا گیا تو فرمایا: میں تمہاری گرفت نہیں کروں گا' جب ''ربنا ولا تحمل علينا اصرا'' کہا گیا تو فرمایا: میں تم پر بوجھ نہیں ڈالوں گا' جب ''ولا تحملنا مالا طاقة لنا به'' کہا گیا تو فرمایا: میں تمہیں (طاقت سے زیادہ کا) پابند نہیں کروں گا۔ جب ''واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا على القوم الكافرين'' کہا گیا تو فرمایا: میں نے تمہیں معاف کیا' تمہیں بخش دیا' تم پر رحمت کی اور کافر قوم کے خلاف تمہاری مدد کی۔

☆ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سورۃ البقرہ ختم کرتے تھے تو آمین کہتے تھے۔

سورۃ البقرہ کے فضائل میں احادیثِ مبارکہ

(٤٣٤) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو آپ کو سدرۃ المنتہیٰ پہ لے جایا گیا۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان پر ہے۔ جو چیز بھی زمین سے بلند ہوتی ہے وہ وہیں تک پہنچتی ہے پھر وہاں سے لے لی جاتی ہے اور جو چیز بھی اُس کے اوپر سے اُترتی ہے وہ وہیں تک پہنچتی ہے پھر وہاں سے لے لی جاتی ہے۔ فرمایا: اچانک سدرہ پر چھا گیا جو چھا گیا۔ فرمایا: وہ سونے کے پتنگے تھے۔[۶۹۳] راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں: (۱) پانچ نمازیں (۲) سورۃ البقرہ کی آخری آیات[۶۹۴] (۳) اور آپ کی امت کا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو اس کے ''مُقْحِمَات'' (یعنی بڑے گناہوں) کی بخشش۔

(صحیح مسلم: ۱۷۳' مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۷' مشکوۃ المصابیح: ۵۵۶۵۔ ص ۵۲۹)

☆ ''مُقْحِمَات'' اُن بڑے گناہوں کو کہتے ہیں جو مرتکب کو جہنم میں داخل کرنے والے ہیں۔ ''اقتحام'' کا اصل معنیٰ ہے: داخل ہونا۔

---

۶۹۳ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: اِذۡ يَغۡشَى السِّدۡرَةَ مَا يَغۡشٰى ۔ (النجم:۱۶) ''جب سِدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا'' حدیث پاک کا زیر بحث جملہ اسی آیت مبارکہ کی تفسیر ہے۔ یعنی معراج کی شب سدرۃ المنتہیٰ پر سونے کے پتنگے چھائے ہوئے تھے۔ سونے کے پتنگوں سے یا تو فرشتے مراد ہیں یا پھر انبیاء کرام (علیہم السلام) کی ارواح مراد ہیں۔ (مراۃ المناجیح ج ۸ ص ۱۵۷)

۶۹۴ سورۃ البقرہ کی آخری آیات نبی اکرم ﷺ کو معراج کی رات بھی عطا کی گئیں اور ہجرت کے بعد بھی ان کا نزول ہوا۔ البتہ معراج میں بلاواسطہ عطا ہوئیں اور ہجرت کے بعد فرشتہ کے واسطہ سے نزول ہوا۔ یا یہ مراد ہے کہ ان آیات میں جن دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے اُن کی قبولیت معراج ہی میں عطا کر دی گئی اور یہ وعدہ کر لیا گیا کہ جو شخص بھی ہم سے یہ دُعائیں کرے گا ہم اُسے عطا کریں گے۔ یا یہ مراد ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جو انوار و تجلّیات اور فیوض و برکات رکھی گئی ہیں وہ نبی اکرم ﷺ کو اس رات عطا کر دی گئیں۔ (مراۃ ج ۸ ص ۱۵۷)

(۴۳۵) حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں کو جس نے رات میں پڑھ لیا اُس کو وہ کافی ہوں گی۔ (صحیح بخاری: ۴۰۰۸، صحیح مسلم: ۸۰۷، سنن ترمذی: ۲۸۸۱، سنن ابوداؤد: ۱۳۹۷، سنن ابن ماجہ: ۱۳۶۸، مسند احمد ج ۴ ص ۱۱۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۲۵۔ ص ۱۸۵)

☆ کافی ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے انسان کو ڈر لگتا ہو جیسے موذی جانور اور شیطان، یہ اس رات (سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تلاوت کے سبب) آدمی کے قریب نہیں آئیں گے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تلاوت رات کی عبادت کی جگہ کفایت کرنے والی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اچانک رسول اللہ ﷺ نے ایک آواز سنی۔ نبی ﷺ نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ حضرت جبریل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جس کو صرف آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ پھر اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا، تو جبریل نے کہا: یہ آج سے پہلے زمین کی طرف کبھی نازل نہیں ہوا۔ اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: آپ کو ان دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کا آخری حصہ۔ آپ ان میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے آپ کو اس کے مطابق دیا جائے گا۔[۶۹۵] (صحیح مسلم: ۸۰۶)

(۴۳۶) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ہمارے لیے ایک کتاب لکھی۔ اُس میں وہ دو آیتیں نازل فرمائیں جن پر سورۂ بقرہ کو ختم فرمایا۔ اور جس گھر میں بھی تین راتوں تک ان دو آیات کو پڑھا جاتا ہے شیطان اُس گھر کے قریب نہیں آتا۔

(سنن ترمذی: ۲۸۸۲، مسند احمد ج ۴ ص ۲۷۴، سنن دارمی: ۳۳۸۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۴۵۔ ص ۱۸۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔[۶۹۶]

سورۃ البقرہ کی تفسیر یہاں اپنے اختتام کو پہنچی۔ اللہ اعلم بمرادہ واسرار کتابہ (اللہ تعالیٰ اپنی مراد اور اپنی کتاب کے راز سب سے زیادہ جاننے والا ہے)۔

[۶۹۵] یہ حدیث شریف، سورۃ البقرہ کے آغاز میں رقم: ۴۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مفصّل حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

[۶۹۶] کئی احادیث مبارکہ کے تحت علامہ خازن نے امام ترمذی علیہ الرحمۃ کا یہ تبصرہ نقل فرمایا ہے کہ یہ حدیث ''غریب'' ہے۔ تفصیل اس کی ہم آغاز میں حاشیہ: ۱۳۰ کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ''حدیث غریب'' حدیث صحیح کی ایک قسم ہے اور تعریف اس کی یہ ہے کہ ایسی حدیثِ صحیح جس کو روایت کرنے والا ایک شخص ہو وہ حدیث ''غریب'' کہلاتی ہے۔

سورۃ آل عمران

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ ہی کے نام سے (شروع) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲

الف لام میم ○ اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں' (خود) زندہ ہے (اور) دوسروں کی زندگی کی تدبیر فرمانے والا ہے ○

سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیات کا واقعۂ نزول

مفسرین فرماتے ہیں کہ:

(۱) آیتِ مذکورہ نجران سے آئے ہوئے وفد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس وفد میں ساٹھ افراد تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں چودہ افراد وہ تھے جو قوم میں بہت معزز تھے۔ ان میں تین افراد ایسے تھے جو قوم کے معاملات کے ذمہ دار اور سرپرست تھے۔ (۱) عاقب: اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ یہ قوم کا امیر اور صاحب مشورہ آدمی تھا' لوگ جو کام کرتے تھے اسی کی رائے سے کرتے تھے۔ (۲) سیّد: اس کا نام الاُیہم تھا۔ یہ قوم کے مال کا نگران اور امیرِ سفر تھا۔ لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام یہی کرتا تھا۔ (۳) ابوحارثہ بن علقمہ: یہ قوم کا اُسقف (بشپ) اور بڑا عالم تھا۔ حتیٰ کہ روم کے بادشاہوں کو جب اس کے علم اور دینی معاملات میں اجتہاد کا پتہ چلا تو وہ بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ خیر نجران کا مذکورہ وفد نبی اکرم ﷺ کی مسجد میں اس وقت آیا جب آپ عصر کی نماز ادا فرما رہے تھے۔ وفد کے لوگوں نے عالمانہ لباس اور چادریں زیب تن کی ہوئی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کا جو صحابی ان کو دیکھتا وہ یہی کہتا کہ ہم نے ان جیسا وفد نہیں دیکھا۔ اس دوران ان کی نماز کا وقت بھی آ گیا تو وہ مسجد نبوی میں نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہیں نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ انہوں نے مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی۔ جب سب فارغ ہو گئے تو سیّد اور عاقب نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں سے فرمایا: اسلام لے آؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم دونوں نے جھوٹ کہا۔ تمہارے مسلمان ہونے سے جو چیز درمیان میں حائل ہے وہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا دعویٰ کرتے ہو' صلیب کی پوجا کرتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو۔ اُن دونوں نے کہا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے نہیں ہیں تو پھر اُن کے والد کون ہیں؟ پھر سب مل کر نبی اکرم ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ اولاد اپنے باپ سے مشابہت رکھتی ہے؟ لوگوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ ہمارا رب زندہ ہے' اُسے موت نہیں آئے گی۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت آئے گی۔ لوگوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔ وہ ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے اور اسے رزق بھی دیتا ہے۔ لوگوں نے کہا: ایسا ہی

ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی چیز کے مالک تھے؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ سے نہ زمین کی کوئی چیز پوشیدہ ہے نہ آسمان کی؟ لوگوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰ یہ سب کچھ جانتے تھے سوائے ان باتوں کے جو اُنہیں بتا دی گئیں؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ ہمارے رب نے رحم مادر میں حضرت عیسیٰ کی صورت بنائی جیسی اُس نے چاہی؟ اور ہمارا رب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے؟ لوگوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ حضرت عیسیٰ کو ان کی ماں نے اپنے رحم میں اسی طرح اٹھایا جس طرح ایک عورت اپنے بچے کو رحم میں اٹھاتی ہے' پھر اُن کی ماں نے اُن کو جنم دیا جس طرح ایک عورت اپنے بچہ کو جنم دیتی ہے' پھر جس طرح ایک بچہ کو غذا دی جاتی ہے اسی طرح اُنہیں بھی غذا دی گئی' پھر وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور گفتگو بھی کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ (ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ) وہ خدا بھی ہوں جیسا کہ تم لوگ سمجھتے ہو؟ اس پر سب لوگ خاموش رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کے آغاز سے لے کر اسّی کے قریب آیات نازل فرمائیں۔

بعض مفسرین نے مذکورہ واقعہ کو اس اضافہ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ لوگوں نے کہ: اے محمد (ﷺ)! کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ پھر انہوں نے کسی بھی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں زیر بحث آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں) اس سے مراد یہ ہے کہ اے عیسائیو! اگر تمہارا جھگڑا معبود کی پہچان کے معاملہ میں ہے تو وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہے۔ پھر تم کیونکر اس کے لیے اولاد ثابت کرتے ہو؟ یعنی مذکورہ جملہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا کہ اس کی ذات کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اکیلا اور ایک ہے۔ نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے نہ ہی اس کی اولاد ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے (اپنی وہ صفات) بیان فرمائیں جو اس کے استحقاق عبادت پر دلیل کے قائم مقام ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ لفظ ''الحیّ'' کی تفصیل اور وضاحت یہ ہے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آئے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسی ذات جو ہمیشہ رہنے والی ہو اور باقی رہنے والی ہو اور اُسے موت آنا ناممکن ہو۔ اور ''القیوم'' کی وضاحت یہ ہے کہ ایسی ذات جو از خود قائم ہو' تمام لوگوں کی تدبیر کرنے والی ہو' لوگوں کی تمام دنیوی اور اُخروی ضروریات کی تدبیر کرنے والی ہو۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾
مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ
عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾

اُس نے آپ پر سچی کتاب نازل فرمائی جو اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس سے پہلے اس نے تورات اور انجیل کو نازل فرمایا جو لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت ہیں اور اس نے فرقان نازل فرمایا' بے شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غلبہ والا بدلہ لینے والا ہے ○

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ میں کتاب سے قرآن کریم مراد ہے۔ ﴿بِالْحَقِّ﴾ سے سچائی اور انصاف مراد ہے۔ ﴿لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

سے مراد وہ کتابیں ہیں جو قرآن کریم سے پہلے نازل ہوئیں۔ان کی تصدیق سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید توحید و رسالت واقعات اور بعض احکامات میں گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔''مـا بین یدیه '' یہاں مجازاً استعمال ہوا ہے۔کیونکہ جو شخص سامنے ہوتا ہے وہ آگے ہوتا ہے۔اسی لیے ہر وہ چیز جو کسی چیز سے آگے ہو اُس کو عربی میں ''بیـن یـدیـه '' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بالکل ظاہر اور سب کے سامنے ہوتی ہے۔

آیت مذکورہ میں قرآن مجید کے لیے ''نزّل'' اور تورات وانجیل کے لیے ''انزل'' فرمانے کی توجیہ

﴿ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ﴾ (اس نے تورات اور انجیل کو نازل فرمایا) اس پر اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں (قرآن مجید کے لیے) ''نزّل '' اور تورات اور انجیل کے لیے ''انزل'' کیوں فرمایا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ قرآن مجید چونکہ وقفہ وقفہ اور تفصیل کے ساتھ مختلف اوقات میں نازل ہوا ہے اس لیے ''نـزّل'' فرمایا۔اور ''نـزّل'' تکثیر کے لیے آتا ہے۔جبکہ تورات اور انجیل کو ایک مرتبہ میں ہی مکمل نازل کیا گیا ہے اس لیے ان کے ساتھ ''انزل'' فرمایا۔

آیت میں ﴿ مِنۡ قَبۡلُ ﴾ سے مراد ہے: قرآن کریم سے پہلے۔ اور ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم سے پہلے تورات اور انجیل کو نازل کرنا لوگوں کے لیے ہدایت کے طور پر تھا۔

زیر بحث آیت میں تورات وانجیل کو ''هـدی لـلـنـاس'' اور قرآن مجید کو سورۂ بقرہ میں ''هـدی لـلـمـتقین'' فرمانے کی توجیہ

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں قرآن کریم کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔اور یہاں تورات اور انجیل کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگوں کے لیے ہدایت کا باعث ہیں؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ قرآن کریم کو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اس لیے قرار دیا گیا کہ پرہیزگار ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔جبکہ تورات اور انجیل کو یہاں ''هـدی لـلـنـاس '' (لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت) اس لیے قرار دیا گیا کہ مناظرہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ تھا۔وہ لوگ تورات اور انجیل کو صحیح سمجھتے تھے۔اس لیے یہاں دونوں کو ''هـدی لـلـنـاس '' فرمایا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیت میں جو ''هدی للناس ''فرمایا گیا ہے وہ قرآن مجید اور تورات وانجیل تینوں کے متعلق ہے۔ ان تینوں کتابوں میں چونکہ شرعی امور اور احکام کا بیان ہے اس لیے ان کو ''هدی للناس'' قرار دیا۔

''الفرقان'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا نازل فرمایا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے قرآن کریم مراد ہے۔اس کا ذکر دوبارہ اس لیے کیا گیا تا کہ اس کی عظمت شان کو بیان کیا جائے اور اس کی تعریف ہو۔کیونکہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا ذکر دوبارہ اس لیے فرمایا تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کے بعد اس لیے نازل فرمایا تا کہ اس کو یہود و نصاریٰ کے اُس جھگڑے میں فرق کرنے والا بنائے جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کیا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''فـرقـان'' سے تینوں کتابیں مراد ہیں۔کیونکہ تینوں کتابیں لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت ہیں اور حلال وحرام اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔ سُدی کا قول یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں تقدیم وتاخیر ہے۔تقدیر آیت یہ ہے کہ ''انـزل الـتـوراة والانـجـيـل والفرقان هدی للناس'' (اُس نے تورات انجیل اور فرقان (یعنی قرآن کریم) کو لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر نازل فرمایا)۔

زیر بحث آیت میں جو ﴿ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ فرمایا اس سے نازل ہونے والی کتابیں اور دیگر چیزیں مراد ہیں۔اور ﴿ الَّذِيۡنَ

﴿کَفَرُوْا﴾ جو فرمایا اس سے نجران کا عیسائی وفد مراد ہے۔ اس وفد نے قرآن کریم اور سیدنا محمد ﷺ کا انکار کیا۔ اس لیے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سبب کا خاص ہونا عموم الفاظ کو مانع نہیں ہے۔ لہٰذا یہ آیت ہر اس شخص کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی بھی آیت کا انکار کرے۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ اس میں "عـزیز" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ اور "ذو انتقام" سے مراد یہ ہے کہ جو اس کا انکار کرے وہ اس سے انتقام لینے والا ہے۔ انتقام سے مراد ہے: بہت سزا دینا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾

بے شک اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں O وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں بناتا ہے جیسی چاہتا ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے (وہ) بہت غلبہ والا حکمت والا ہے O

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی کوئی بات اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تمام لوگوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اس کا یہ فرمانا کہ "بے شک اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا علم کامل ہے جو کہ تمام چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔

مذکورہ آیت اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں انسان کی تصویر اور تخلیق کا بیان

﴿يُصَوِّرُكُمْ﴾ تصویر سے ہے اور تصویر کا معنیٰ ہے: کسی چیز کی صورت بنانا۔ اور صورت اس حالت کو کہتے ہیں جس پر چیز کی ترکیب قائم ہوتی ہے۔ ﴿الْاَرْحَامِ﴾ "رَحِمٌ" "رِحْمٌ" کی جمع ہے۔ ﴿كَيْفَ يَشَآءُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی صورتیں بناتا ہے جو اپنی پیدائش میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی شخص مذکر ہوتا ہے کوئی مؤنث' کوئی سفید ہوتا ہے کوئی کالا' کوئی خوب صورت ہوتا ہے کوئی بدصورت' کوئی مکمل ہوتا ہے کوئی ادھورا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ماں کے پیٹ کی ظلمتوں میں تمہاری ایسی صورتیں بناتا ہے جو شکل' طبیعت اور رنگت میں مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ نطفہ (قطرۂ آب) سے ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

(۲) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا جو کہ صادق اور مصدوق ہیں (یعنی سچے ہیں اور سب آپ کی تصدیق کرتے ہیں) کہ: بے شک تم میں سے ہر شخص کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دنوں تک نطفہ کی شکل میں رکھا جاتا ہے' پھر اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں' پھر اتنے ہی دن گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں رکھا جاتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اُس کی طرف ایک فرشتہ کو بھیجتا ہے جو اس کا کھانا پینا' اس کی مدت حیات' اس کا عمل اور اس کا خوش بخت یا بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے' پھر اس میں رُوح پھونک دی جاتی ہے۔ پس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ بے شک تم میں سے کوئی شخص جنت والوں کے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر تقدیر اس پر سبقت لے جاتی ہے تو وہ جہنم والوں کے عمل کرنے لگ جاتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے کوئی شخص جہنم والوں کے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر تقدیر اس پر سبقت لے جاتی ہے تو وہ جنت والوں کے عمل کرنے لگ جاتا ہے اور وہ جنت میں داخل ہو[1] جاتا ہے۔

[1] یہ حدیث شریف' سورۃ البقرہ:۲۳۴ کی تفسیر میں اختصار کے ساتھ رقم:۳۳۱ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مزید حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ (صحیح بخاری:۳۲۰۸' صحیح مسلم:۲۶۴۳)

(۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے رب! یہ نطفہ ہے' اے رب! یہ جما ہوا خون ہے' اے رب! یہ گوشت کا لوتھڑا ہے[۲] سو جب اللہ تعالیٰ اس گوشت کے ٹکڑے کو پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے: اے رب! یہ مرد ہوگا یا عورت؟ بدبخت ہوگا یا خوش بخت؟ اس کا رزق کتنا ہوگا؟ اس کی زندگی کتنی ہے؟ پھر اس کے مطابق اس کی ماں کے پیٹ میں مقدر کر دیا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۳۱۸' صحیح مسلم: ۲۶۴۶)

آیت مذکورہ کا عیسائیوں کے رد میں ہونا

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت عیسائیوں کے رد میں وارد ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام لوگوں کو غیب کی بعض باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تم نے فلاں چیز کھائی ہے' فلاں کام کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مردے زندہ کیے' مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کیا اور مٹی سے پرندے بنائے اس کے نتیجہ میں عیسائیوں نے ان کے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا اور کہنے لگے کہ اس طرح کے کام صرف وہی کر سکتا ہے جو خدا ہو۔ آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کی اس بات کا رد فرمایا اور لوگوں کو یہ بتایا کہ جو معبود خدا کہلانے کا مستحق ہے وہ وہی ہے جس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین کی نہ آسمان کی' اور وہ ماں کے پیٹ میں اپنی چاہت کے مطابق صورتیں بنانے والا ہے۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی اُن ہی میں سے ہیں جن کی صورت ماں کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ نے بنائی۔ اور اس کے ذریعہ اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ دیگر لوگوں کی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان پر وہ باتیں مخفی ہوتی ہیں جو اللہ عزوجل پر مخفی نہیں ہوتیں۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں' وہ بہت غلبہ والا حکمت والا ہے۔ یہ جملہ بھی عیسائیوں کے رد میں ہے۔ کیونکہ عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا۔ گویا مذکورہ جملہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان فرمائی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ خود اللہ عزوجل نے ماں کے پیٹ میں ان کی صورت بنائی ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞

[۲] علامہ عینی فرماتے ہیں کہ فرشتہ یہ جملے مختلف اوقات میں کہتا ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ میں جب قطرہ پہنچتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے کہ یہ نطفہ ہے۔ چالیس دن گزرنے کے بعد وہ نطفہ جما ہوا خون بن جاتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے کہ یہ علقہ (یعنی جما ہوا خون) ہے۔ پھر مزید چالیس دن گزرنے کے بعد وہ خون گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے کہ یہ مُضغہ (یعنی گوشت کا لوتھڑا) ہے۔ واضح رہے کہ ان جملوں سے فرشتے کا مقصود رب تعالیٰ کو خبر دینا نہیں ہوتا بلکہ مراد یہ ہوتی ہے میں نے اس کو پہلی حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۴۹)

وہ (اللہ) ہی ہے جس نے آپ پر کتاب کو نازل کیا' اُس کی کچھ آیات واضح ہیں' وہی کتاب کی اصل ہیں اور دیگر آیات متشابہ ہیں' پس جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ فتنہ انگیزی اور متشابہ کا (غلط) معنیٰ تلاش کرنے کی غرض سے متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں' حالانکہ اُن (آیاتِ متشابہہ) کا معنیٰ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' اور جنہیں علم میں دسترس حاصل ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے' سب ہمارے رب کے پاس سے ہے' اور نصیحت صرف عقل والے حاصل کرتے ہیں O

''آیاتِ محکمات'' اور ''امّ الکتاب'' کا معنیٰ

فرمایا: وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ پر کتاب کو نازل کیا اُس کی کچھ آیات مُحکمات ہیں' وہی امّ الکتاب ہیں۔اس میں ﴿اَلْکِتٰبَ﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔﴿مُحْکَمٰتٌ﴾ سے مراد ایسی آیتیں ہیں جو واضح اور مفصّل ہوں' ان کے الفاظ میں تاویل اور اشتباہ کا امکان نہ ہو ان کا نام جو مُحکم رکھا گیا ہے وہ ''اِحْکَامٌ'' سے ہے (بمعنیٰ روکنا) گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں محکم بنایا ہے یعنی ان میں تصرف کرنے سے لوگوں کو روک دیا ہے' کیونکہ یہ ظاہر ہوتی ہیں اور ان کا معنیٰ واضح ہوتا ہے۔﴿اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ آیتیں کتاب کی وہ اصل اور بنیاد ہیں جن پر احکام میں اعتماد کیا جاتا ہے اور حلال وحرام کے معاملات میں ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

''آیاتِ محکمات'' کو ''امہات الکتاب'' فرمانے کی بجائے ''ام الکتاب'' فرمانے کی وجہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ ''آیـاتِ محکمات'' کو ''امّ الکتاب'' کیوں فرمایا؟ ''امّھـات الکتاب'' کیوں نہیں فرمایا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ تمام آیتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہونے اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے کی وجہ سے ایک آیت کی مانند ہیں اور اللہ تعالیٰ کا پورا کلام ایک شیئی ہے اس لیے ''مـحـکـمـات'' کو ''ام الـکـتاب'' فرمایا۔ بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ ''امّ الـکتاب'' سے مراد یہ ہے کہ ''آیـاتِ مـحـکمات'' میں سے ہر آیت کتاب کی اصل ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰیَةً''۔(المؤمنون:۵۰) ہم نے ابن مریم (عیسیٰ) اور ان کی ماں کو نشانِ قدرت بنایا۔ یعنی دونوں میں سے ہر ایک کو نشانِ قدرت بنایا۔

آیت میں ﴿اُخَرُ﴾ ''اُخـــریٰ'' کی جمع ہے۔آگے جو ﴿مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ متشابہ آیات کے الفاظ دیگر آیات کے الفاظ سے ملتے جلتے ہی ہیں لیکن معنیٰ علیحدہ علیحدہ ہیں۔

زیر بحث آیت کا قرآن کریم کی بعض دیگر آیات سے بہ ظاہر تعارض کا جواب

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو محکم اور متشابہ میں تقسیم کیا ہے جبکہ سورۂ ھود کے آغاز میں پورے قرآن کو محکم قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ'' (ھود:۱) ''یہ کتاب ہے' اس کی آیتیں محکم کر دی گئیں ہے''۔اور ایک دوسرے مقام پر پورے قرآن کو متشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ زُمَر میں فرمایا: ''اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا'' (الزمر:۲۳) ''اللہ نے سب سے عمدہ کلام نازل فرمایا یعنی وہ کتاب جو متشابہ ہے''۔ان تمام آیات کے درمیان تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے پوری کتاب کو محکم قرار دیا ہے وہاں محکم سے مراد یہ ہے کہ پوری کتاب حق اور سچ ہے' اس میں نہ کوئی لغو بات ہے نہ مذاق کی بات۔اور جہاں پوری کتاب کو متشابہ قرار دیا ہے وہاں متشابہ سے مراد یہ ہے کہ حُسن' حقانیت اور سچائی میں کتاب کا ایک حصہ دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔اور زیر بحث آیت میں جو بعض حصہ کو محکم اور بعض کو متشابہ قرار دیا ہے اس کے بارے میں علماء کی عبارات مختلف ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

محکم اور متشابہ کی تعریف اور تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ تین آیتیں محکم ہیں ۔ اور وہ سورۃ الانعام کے آخر میں ہیں' یعنی آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳۔ اسی مفہوم کی آیات سورۂ بنی اسرائیل میں بھی ہیں' یعنی آیت ۲۳ تا ۲۵۔ (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ محکم سے مراد وہ آیتیں ہیں جو منسوخ کرنے والی ہیں اور متشابہ سے منسوخ آیتیں مراد ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت قتادہ اور سدّی کا یہی قول ہے۔ (۳) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ محکم آیتیں وہ ہوتی ہیں جن میں حلال اور حرام کے احکام ہوں' ان کے علاوہ جو آیتیں ہیں وہ متشابہ ہیں' یعنی بعض بعض سے ملتی جلتی ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ (۴) بعض کا قول یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہوتی ہے جن کے معنیٰ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آگاہ فرما دیتا ہے اور متشابہ آیات وہ ہوتی ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص فرما لیا ہے۔ لہٰذا ان کو جاننے کا کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جیسے قیامت کی نشانیوں کی خبر۔ مثلاً دجّال' یاجوج ماجوج' سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول' سورج کا مغرب سے نکلنا' دنیا کا فناء ہو جانا اور قیامت کا قائم ہونا۔ یہ تمام باتیں وہ ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص فرما لیا ہے۔ (۵) بعض کا قول یہ ہے کہ محکم آیتیں وہ ہوتی ہیں جن میں صرف ایک ہی معنیٰ کی گنجائش ہوتی ہے اور متشابہ آیتیں وہ ہوتی ہیں جن میں کئی معانی کا امکان ہوتا ہے۔ یہ قول امام شافعی سے مروی ہے۔ (۶) بعض کا قول یہ ہے کہ پورا قرآن محکم ہے اور سورتوں کے آغاز میں جو حروف مقطعات ہیں وہ متشابہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک گروہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس میں حیی بن اخطب' کعب بن اشرف اور ان جیسے دیگر لوگ شامل تھے۔ حیی بن اخطب نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پر ''الم'' (کا لفظ) نازل ہوا ہے۔ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی آپ پر یہ لفظ نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اُس نے کہا: اگر یہ سچ ہے تو پھر مجھے معلوم ہے کہ آپ کی امت کی بادشاہت کتنا عرصہ رہے گی۔ آپ کی امت کی حکومت ۱۶۱ سال رہے گی۔ کیا اس کے علاوہ بھی آپ پر (اس طرح کا) کوئی لفظ نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ''الر''۔ اُس نے کہا: یہ مدت زیادہ ہے' یعنی ۲۳۱ سال۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی لفظ نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ''المر''۔ اُس نے کہا: یہ مدت بھی زیادہ ہے' یعنی ۲۷۱ سال۔ اور اب ہم پر حساب مشتبہ ہو گیا ہے اس لیے ہم سمجھ نہیں پا رہے کہ کثیر کو لیں یا قلیل کو؟ اور ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں''۔

(۷) بعض کا قول یہ ہے کہ محکم آیتیں وہ ہوتی ہیں جن کے الفاظ میں تکرار نہ ہو اور متشابہ وہ ہوتی ہیں جن کے الفاظ میں تکرار ہو۔ (۸) بعض کا قول یہ ہے کہ محکم آیتیں وہ ہوتی ہے جو اپنی ذات میں مستقل ہوں' اُنہیں کسی بیان (وضاحت) کی حاجت نہ ہو۔ اور متشابہ آیتیں وہ ہوتی ہیں جن میں بیان کی حاجت ہو۔ (۹) بعض کا قول یہ ہے کہ محکم آیتیں وہ ہیں جن میں امر ونہی اور متشابہ آیتیں وہ ہیں جن میں واقعات اور مثالیں ہیں۔

متشابہ آیات کو کیوں نازل کیا گیا اور پورے قرآن کو محکم کیوں نہیں بنایا گیا؟ اس سوال کے متعدد جوابات

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ قرآن کریم دین کی تشریح اور بندوں کی رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ پھر متشابہ آیات کا کیا فائدہ ہے؟ اور پورا قرآن مجید محکم کیوں نہیں ہوا؟ میں کہوں گا کہ علماء نے اس سوال کے کئی جوابات دیئے ہیں: (۱) ایک جواب یہ ہے کہ قرآن کریم عرب کے الفاظ اور ان کی زبان میں نازل کیا گیا ہے اور عرب کا کلام دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جو مختصر ہوتا ہے اور جلد سمجھ میں آ جاتا ہے اور اس میں ظاہری معنیٰ کے علاوہ کسی اور معنیٰ کا امکان نہیں ہوتا۔ اور مراد کی وضاحت اور تاکید کے

پیشِ نظر اس کوطویل بھی کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ جومجاز، کنایات، اشارات اور تلویحات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں بعض معانی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کلام کی یہ قسم اہل عرب کے نزدیک پسندیدہ ہے اور ان کے کلام میں یہ انوکھی قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مذکورہ دونوں اقسام کے ساتھ نازل فرمایا تاکہ قرآن کی مثل لانے سے اہل عرب کا بے بس ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے کفار سے فرمایا کہ ''تم کلام کی دونوں قسموں میں سے جس سے چاہو اس کتاب کا مقابلہ کرو''۔ اگر پورا قرآن مجید محکم اور واضح ہوتا تو عرب والے کہتے کہ قرآن کو کلام کی اُس قسم پر کیوں نازل نہیں کیا گیا جو ہمارے نزدیک پسندیدہ ہے۔ (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متشابہ آیتیں ایک عظیم فائدہ کے پیشِ نظر نازل فرمائی ہیں۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ علماء و مفکرین متشابہ آیتوں کو محکم آیتوں کے ساتھ ملانے میں مشغول ہوں۔ اس سے ان کا غور وفکر طویل ہوگا اور معانی و مفاہیم کی تحقیق میں ان کی دل چسپی بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں اپنی مشقت پر اجر وثواب ملے گا جس طرح مختلف عبادتوں پر انہیں اجر وثواب ملتا ہے۔ اگر پورا قرآن مجید محکم بنا کر نازل کیا جاتا تو عالم اور غیر عالم سب قرآن مجید کو سمجھنے میں برابر ہوتے اور عالم کو غیر عالم پر فضیلت حاصل نہ ہوتی۔ دل مردہ ہو جاتے اور غور وفکر کے چراغ گل ہو جاتے۔ (اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات میں پیچیدگی رکھی) اور پیچیدگی کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے اور مختلف معانی کو نکالنے کا طریقہ اور تدبیر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مال دار ہونے میں خرابی یہ ہے کہ اس سے آدمی میں بے وقوفی آتی ہے۔ اور غربت کی فضیلت (مرتبہ) یہ ہے کہ اس سے ذہانت آتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے تدبیر کرنا آتا ہے۔ کیونکہ آدمی جب محتاج ہوتا ہے تو تدبیریں کرتا ہے۔ (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ تمام اہل علم اپنے اپنے علوم میں پیچیدہ باتیں اور باریک مسائل رکھتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو آزمائیں کہ آیا وہ ان باریکیوں کا حل نکال سکتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ طلباء جب باریک اور پیچیدہ باتیں حل کرنے پر قادر ہوں گے تو واضح مسائل کو حل کرنے پر زیادہ قادر ہوں گے۔ لہٰذا اہل علم کے نزدیک جب یہ بات پسندیدہ ہے کہ کلام میں باریکی اور پیچیدگی ہو تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی مقصد کے لیے متشابہ آیتیں نازل فرمائی ہوں۔ (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متشابہ آیتیں اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے نازل فرمائی ہیں۔ تاکہ جو صاحبِ ایمان ہو وہ ان آیتوں پر توقف کرے اور اُن کا علم اُس ذات کی طرف لوٹا دے جو جاننے والی ہے۔ اس سے اس کا اجر وثواب بڑھے گا اور جو منافق ہو وہ شک میں مبتلا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس میں ٹیڑھا پن آئے گا اور وہ عذاب کا مستحق ہوگا، جیسے بنی اسرائیل کو نہر کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا گیا۔ (ملاحظہ فرمایئے: البقرہ: ۲۴۹ اور اس کی تفسیر) واللہ اعلم بمرادہ (اللہ عزوجل اپنی مراد سب سے زیادہ جاننے والا ہے)۔

''زیغ'' کا معنیٰ اور اصحابِ زیغ کے بارے میں مختلف اقوال

آیت مبارکہ میں ﴿ زَیْغٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جن کے دلوں میں حق سے بے رغبتی ہے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شک ہے۔ (یعنی جن کے دلوں میں حق سے بے رغبتی یا شک ہے وہ فتنہ انگیزی اور متشابہ کا غلط معنیٰ تلاش کرنے کی غرض سے متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔) رہا یہ کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں اور کن کی طرف اشارہ ہے؟ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے وفد نجران کے لوگ (عیسائی) مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جھگڑا کیا اور کہا کہ کیا آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی روح اور اس کا کلمہ نہیں سمجھتے؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ بعض مفسرین کا

قول یہ ہے کہ اس سے یہودی مراد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس بات کو جاننا چاہا تھا کہ امت مسلمہ کتنا عرصہ باقی رہے گی اور اس مدت کو انہوں نے سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات سے حساب الجمل کے مطابق نکالا تھا۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے منافقین مراد ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے خوارج مراد ہیں۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ اگر حروریہ اور سابیہ[3] نہ ہوتے تو میں نہیں جان سکتا تھا کہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے تمام اہل بدعت مراد ہیں۔

﴿فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ مذکورہ افراد محکم کو متشابہ پر اور متشابہ کو محکم پر موقوف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت کا کیا ہوگا' اس پر اتنے اتنے عرصہ عمل کیا گیا پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ہر وہ شخص اس آیت کا مصداق ہے جو اپنی باطل اور غلط بات کے لیے متشابہ آیات سے استدلال کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(٤) رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''هو الذی انزل علیک الکتاب منه ایات محکمات'' (آخر تک) پھر (لوگوں سے) فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو (سمجھ لو) یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے' لہٰذا تم ان سے بچو۔

(صحیح بخاری: ۴۵۴۷' صحیح مسلم: ۲۶۶۵' سنن ترمذی: ۲۹۹۳' سنن ابوداؤد: ۴۵۹۸' مسند احمد ج ۶ ص ۲۵۶' دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۶ ص ۵۴۵)

''ابتغاء فتنة'' اور ''ابتغاء تاویل'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (مذکورہ افراد جو متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں وہ) فتنہ یعنی شرک اور کفر کی طلب میں ایسا کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شکوک وشبہات اور (آیت کے معنیٰ کو) خلط ملط کرنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں تا کہ اس سے اپنے جہلاء کو گمراہ کریں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی حالت میں فساد برپا کرنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں۔

﴿وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ اس میں ''تاویل'' سے مراد تفسیر ہے۔ لغت میں ''تاویل'' کا اصل معنیٰ ہے: لوٹنا۔ جب معاملہ کسی جانب لوٹ جائے تو کہا جاتا ہے: ''ال الامر الی کذا''۔ اسی طرح عاقبت (یعنی انجام) کو ''تاویل'' کہا جاتا ہے کیونکہ ہر معاملہ اپنے انجام کی طرف لوٹتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ''وابتغاء تاویله'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کی حکومت کے بقاء کی طلب۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے کفار مراد ہیں۔ انہوں نے اس بات کا جواب طلب کیا کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ کب اٹھایا جائے گا اور مرنے کے بعد دوبارہ کس طرح زندہ کیا جائے گا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے متشابہ آیتوں کی تفسیر اور ان کا علم طلب کرنا مراد ہے۔

''متشابہ کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا'' اس کی تفسیر

آگے فرمایا: اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس میں ﴿تَاْوِيْلَهٗ﴾ سے مراد ہے: متشابہ کی تاویل۔ بعض کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ اس امت کی بادشاہت کی انتہاء اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کیونکہ انتہاء اس وقت ہوگی جب قیامت قائم ہوگی اور قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے قرآن کریم میں کچھ ایسے معانی ہوں جن کا علم صرف اللہ عزوجل کو ہو اور اس نے اپنی مخلوق میں کسی کو ان سے آگاہ نہ فرمایا ہو۔ جیسے قیامت کا علم' مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا وقت' دجّال کا ظہور' حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول' حروف مقطعات کا علم اور ان جیسی دیگر چیزیں۔

[3] تفسیر خازن اور بعض دیگر تفاسیر میں ''سبئیه'' کا لفظ ہے' جبکہ تفسیر مظہری میں سابیه کا لفظ ہے۔ یہ خارجیوں کی ایک قسم ہے اور حروریہ بھی خارجیوں کو کہا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے سورۃ البقرۃ' حاشیہ: ۵۸۶ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ سب وہ ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص فرمالیا ہے۔لہٰذا ان پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان کے علوم کے حقائق اللہ عزوجل کی ذات کے سپرد ہیں۔اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود' ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت ابی بن کعب' حضرت عائشہ اور اکثر تابعین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کا یہی مؤقف ہے۔اس قول کی بنیاد پر بات ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر ختم ہو رہی ہے۔لہٰذا اس پر وقف کیا جائے گا۔پھر اگلے جملہ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: جنہیں علم میں دسترس حاصل ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے' سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔

''راسخون فی العلم'' کا معنیٰ اور سب چیزوں پر ان کے ایمان لانے کی تفسیر

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم میں ثابت اور قائم ہوں۔یعنی وہ لوگ جنہیں اپنے علم میں اتنی پختگی حاصل ہو کہ اس میں کوئی شک وشبہ داخل نہ ہو۔(ایسے لوگ متشابہ آیات کے بارے میں کہتے ہیں:) ﴿اٰمَنَّا بِهٖ﴾ (ہم اس پر ایمان لائے) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ لوگوں کو ''راسخین فی العلم'' اس لیے قرار دیا کہ انہوں نے یہ کہا: ہم اس پر ایمان لائے۔لہٰذا ان کا متشابہ پر ایمان لانا ہی اپنے علم میں رسوخ ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جنہیں علم میں رسوخ حاصل ہے ان کا قرآن کے معانی کو سمجھنا اس وقت انتہاء کو پہنچ گیا جب انہوں نے یہ کہا کہ ''امنّا به'' (ہم اس پر ایمان لائے)۔

﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ محکم' متشابہ' ناسخ' منسوخ اور جو کچھ ہمیں قرآن کا علم ہے اور جس کا علم نہیں ہے سب کا سب ہمارے رب کی جانب سے ہے۔جو آیتیں متشابہ ہیں اُن پر ہم یوں اعتماد کرتے ہیں کہ ہمارا اُن پر ایمان ہے۔اور اس کی معرفت ہم اللہ عزوجل کے سپرد کرتے ہیں۔اور جو آیتیں محکم ہیں اُن پر ہم یوں اعتماد کرتے ہیں کہ ان پر ایمان لانا اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہمارے لیے واجب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کی چار صورتیں ہیں۔(۱) قرآن کی ایک تفسیر وہ ہے جس سے واقف ہونا سب کے لیے ضروری ہے۔(۲) دوسری تفسیر وہ ہے جس کو اہل عرب اپنی زبان کی وجہ سے جانتے ہیں۔(۳) ایک وہ تفسیر ہے جس کو علماء جانتے ہیں اور (۴) ایک وہ تفسیر ہے جس کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''والراسخون فی العلم'' میں واؤ برائے عطف ہے۔اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ''متشابہ آیات کا معنیٰ اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں علم میں رسوخ (دسترس) حاصل ہے اور وہ علم رکھنے کے ساتھ ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے''۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں۔حضرت مجاہد کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے تھے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو متشابہ آیات کی تاویل جانتے ہیں۔

مذکورہ قول کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اپنے بندوں کے فائدہ کے لیے نازل فرمایا ہے۔اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید میں ایسی چیز ہو جس کو امت کا کوئی شخص نہ جانتا ہو۔

آیت مبارکہ میں ''راسخون فی العلم'' کے مصداق

آیت مبارکہ میں ''راسخین فی العلم'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے وہ اہل کتاب مراد ہیں جو ایمان لے آئے۔جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے دیگر ساتھی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔

اس قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کو ''راسخین فی العلم'' قرار دیا ہے۔ارشاد فرمایا: ''لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ

فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ ''۔(النساء:۱۶۲)(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ'' راسخین فی العلم '' سے مراد وہ علماء ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے'' راسخین فی العلم '' کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ عالم جو اپنے علم پر عمل کرتا ہو اور لوگ اس کی پیروی کرتے ہوں۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ'' راسخ فی العلم '' اُس عالم کو کہتے ہیں جس کے علم میں چار باتیں پائی جائیں:(۱) وہ معاملات جو اس کے اور خدا کے درمیان ہیں اُن میں تقویٰ اختیار کرنا (۲) وہ معاملات جو اس کے اور لوگوں کے درمیان ہیں ان میں تواضع اختیار کرنا (۳) وہ معاملات جو اس کے اور دُنیا کے درمیان ہیں اُن میں'' زُھد '' (بے رغبتی) اختیار کرنا (۴) وہ معاملات جو اس کے اور نفس کے درمیان ہیں ان میں مجاہدہ کرنا۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ یعنی جو کچھ قرآن میں ہے اس سے صرف عقل والے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔اس جملہ میں اللہ عزوجل کی جانب سے ان لوگوں کی تعریف ہے جنہوں نے یہ کہا کہ'' ہم متشابہ پر ایمان لائے (اور) سب ہمارے رب کے پاس سے ہے''۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝

اے ہمارے پروردگار! جب تو ہمیں ہدایت دے چکا ہے تو اب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما' بے شک تو ہی سب سے زیادہ دینے والا ہے O اے ہمارے پروردگار! بے شک تو تمام لوگوں کو اُس دن جمع فرمانے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے' بے شک اللہ کا وعدہ بدلتا نہیں O

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ اے ہمارے رب! تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔یعنی'' راسخین فی العلم '' کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔یعنی ہمارے دلوں کو حق اور ہدایت سے نہ پھیر۔جیسا کہ تو نے ان لوگوں کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا جن کے دلوں میں کجی ہے۔﴿بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تو ہمیں اپنے دین کی اور اپنی کتاب کی محکم اور متشابہ آیات کی توفیق عطا فرما چکا ہے۔

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً﴾ تو ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔یعنی جس ایمان اور ہدایت پر ہم قائم ہیں' اُس پر ہمیں ثابت قدمی اور توفیق عطا فرما۔بعض مفسرین کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ ہمیں درگزر اور مغفرت عطا فرما۔﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ میں'' وھاب '' (اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اور جب یہ) اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق عطا فرماتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: (۵) تمام انسانوں کے دل رحمٰن (عزوجل) کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں جیسے ایک دل۔اس کو اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے پھیرتا ہے۔پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! اے ہمارے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی فرمانبرداری کی طرف پھیر دے[۱]۔ (صحیح مسلم:۲۶۵۴' مسند احمد ج۲ ص۱۶۸' مشکوٰۃ المصابیح:۸۹۔ص۲۰)

[۱] یہ حدیث شریف' سورۃ البقرہ:۲۴۵ کی تفسیر میں رقم:۳۵۲ کے تحت گزر چکی ہے۔

حدیث مذکور کی تشریح

مذکورہ حدیث احادیثِ صفات میں سے ہے۔ اس کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے اس میں کسی قسم کی تاویل' بیانِ کیفیت اور اس کے معنیٰ کی معرفت کے بغیر اس کو اُسی طرح برقرار رکھا جائے۔ جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے اس پر اور اس کے حق ہونے پر ہم ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کا علم ہم اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے سپرد کرتے ہیں۔ یہ قول امت کے اسلاف اور بعد میں آنے والے محدثین اور دیگر اہل سنت کا مؤقف ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کی مناسب تاویل کی جائے گی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس حدیث کا جو ظاہر ہے وہ مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (اپنی ذات کے بارے میں فرمایا:) ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ''۔ (الشوریٰ:۱۱) کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا مجازی معنیٰ مراد ہوگا۔ جیسے کہا جاتا ہے: فلاں شخص میری مٹھی اور میری ہتھیلی میں ہے۔ یعنی وہ میرے کنٹرول اور تصرف میں ہے۔ نہ یہ بات کہ وہ شخص ہتھیلی میں ہے۔ اس لیے حدیث شریف کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور دیگر لوگوں کے دلوں میں جس طرح چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے۔ کوئی چیز اس کے تصرف میں رکاوٹ نہیں ہے اور نہ ہی اُس کا وہ ارادہ فوت ہوتا ہے جو اُس نے دلوں کے بارے میں فرمایا۔ جیسے انسان کی دو انگلیوں کے درمیان جو فاصلہ ہے اُس پر انسان کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو وہ باتیں بتائیں جن کو وہ سمجھتے اور جانتے ہوں۔ رہی یہ بات کہ حدیثِ مذکور میں دو انگلیوں کا لفظ کیوں فرمایا جبکہ قدرت ایک ہے' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کے عرف اور عادت کے مطابق فرمایا گیا ہے' اگرچہ یہاں تثنیہ یا جمع مقصود نہیں ہے۔ یہ جمہور متکلمین اور دیگر متأخرین علماء کا مؤقف ہے۔ اس حدیث پاک میں صرف دل کا تذکرہ کیا گیا ہے' یہ ایک فائدہ کے پیش نظر ہے۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ دل کو اللہ تعالیٰ نے خیالات اور نیتوں کا مرکز بنایا ہے اور یہ تمام چیزیں مختلف کاموں کا مقدمہ (آغاز اور سبب) ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اعضاء کو مختلف حرکات وسکنات میں دل کے تابع بنا دیا۔

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ یہ ''راسخین فی العلم'' کی دُعا کا بقیہ حصہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ''راسخین فی العلم'' نے پہلے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی طلب کی کہ وہ ان کے دلوں سے شکوک دُور فرما دے اور اُنہیں ہدایت اور رحمت کے ساتھ خاص فرمالے۔ ان تمام باتوں کا تعلق دین اور دنیا کے اُمور سے تھا۔ پھر انہوں نے اس کے بعد ہی یہ کہا کہ: ''اے ہمارے رب! بے شک تو تمام لوگوں کو اُس دن جمع فرمانے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے''۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ تو تمام لوگوں کو قیامت کے دن جزاء کے لیے جمع فرمانے والا ہے اور ہمیں علم ہے کہ تیرا وعدہ سچا ہے۔ ''بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں فرماتا''۔ لہٰذا جس کے دل کو تو نے حق سے بے رغبت فرما دیا وہ ہلاکت میں ہے اور جسے تو نے ہدایت اور رحمت سے نواز دیا وہ عذاب سے محفوظ ہے اور خوش بخت ہے۔

﴿ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ اس سے مراد فیصلہ کا دن ہے۔ اس میں ''یوم'' پر جو لام ہے وہ بعض کے نزدیک ''فی'' کے معنیٰ میں ہے۔ ''لا ریب فیہ'' سے مراد یہ ہے کہ ایسا دن جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور وہ قیامت کا دن ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے ہرگز ان کا کچھ بچاؤ نہ کر سکے گی' اور یہی لوگ آگ کا ایندھن ہیں O (ان کافروں کا طریقہ) وہی ہے جو آل فرعون اور اس سے پہلی اقوام کا تھا' انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا تو اللہ نے اُنہیں ان کے گناہوں کے سبب گرفت میں لے لیا' اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے O

آیاتِ مذکورہ کی مختصر تفسیر اور ''دأب'' کے معانی

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کا انکار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے بنو قریظہ اور بنو نضیر مراد ہیں۔ ﴿ لَن تُغْنِيَ ﴾ کا معنیٰ ہے: اُنہیں ان کا مال اور اُن کی اولاد ہرگز فائدہ نہ دے گی اور دور نہیں کرے گی۔ ﴿ مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے (نہ بچائے گی) بعض کا قول یہ ہے کہ ''مِنْ'' ''عند'' کے معنیٰ میں ہے (یعنی اللہ کے پاس کچھ فائدہ نہ دے گی)۔

آیت میں جو فرمایا: ﴿ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ﴾ اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: ''کفعل ال فرعون صنیعھم فی الکفر'' یعنی (کافروں کا معاملہ) کفر میں آل فرعون کے معاملہ کی طرح ہے۔ بعض نے ''دأب'' کا ترجمہ طریقہ اور بعض نے عادت کیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور حق کا انکار کرنے میں اِن کافروں کی عادت وہی ہے جو فرعونیوں کی تھی۔ انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور فرعون کی تصدیق و تائید کی۔ ﴿ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ سے گذشتہ امتوں کے یعنی عاد اور ثمود وغیرہ کے کفار مراد ہیں۔ ﴿ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب ان کے پاس ہمارے پیغمبر ہماری نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے اُن نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ ﴿ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کی تکذیب کے سبب عذاب میں مبتلا فرمایا۔

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کا معنیٰ اس طرح کیا ہے کہ بے شک جنہوں نے کفر کیا اُن پر جب سزا اور عذاب کا نزول ہوگا تو اُن کے مال اور اُن کی اولاد اُن کا بچاؤ نہ کر سکے گی جیسے آل فرعون اور گذشتہ امتوں کے کفار' کہ جب ہم نے اُن کی گرفت فرمائی تو ان کے مال اور اُن کی اولاد اُنہیں نہ بچا سکی۔

قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾

(اے رسولِ مکرم!) آپ کافروں کو بتا دیجئے عنقریب تم مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف تمہیں ہانکا جائے گا اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے O

﴿ سَتُغْلَبُونَ ﴾ اور ﴿ تُحْشَرُونَ ﴾ کو ایک قرأت کے مطابق ''یغلبون'' اور ''یحشرون'' بھی پڑھا گیا ہے۔ اس قرأت کے مطابق آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ کافروں کو یہ خبر پہنچا دیں کہ عنقریب وہ مغلوب ہوں گے اور جہنم کی طرف اُنہیں ہانکا جائے گا۔ تاء والی قرأت کے مطابق معنیٰ یہ ہے آپ کافروں کو کہہ دیجئے عنقریب تم مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔

آیت مذکورہ میں کافروں سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال

اس آیت میں ﴿الذین کفروا﴾ سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مشرکین قریش مراد ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ آپ کفارِ مکہ سے کہہ دیجئے کہ عنقریب بدر والے دن تم مغلوب ہو گے اور آخرت میں جہنم کی طرف تمہیں ہانکا جائے گا۔ جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ نے بدر والے دن کفارِ مکہ سے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ تم پر غالب ہے اور تمہیں جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ابوسفیان نے غزوۂ بدر کے بعد اپنی قوم کی ایک جماعت کو اکٹھا کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت نازل فرمائی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بدر والے دن مشرکین کو شکست دے دی تو یہودیوں نے کہا: خدا کی قسم! یہ وہی نبی ہیں جن کی سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی' ان کا جھنڈا (ناکام ہو کر) نہیں لوٹ سکتا۔ یہ کہہ کر انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی پیروی کا ارادہ کیا پھر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ جلدی نہ کرو جب تک کہ ہم ان کا ایک اور غزوہ نہ دیکھ لیں۔ چنانچہ جب اُحد کا دن آیا اور صحابہ کرام سے بے احتیاطی ہوئی (اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا) تو مذکورہ یہودی شک میں مبتلا ہو گئے' بدبختی اُن پر غالب آ گئی اور وہ مسلمان نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک عرصہ تک کا معاہدہ تھا انہوں نے وہ بھی توڑ دیا اور کعب بن اشرف یہودی ساٹھ سواروں کو لے کر اہلِ مکہ کی طرف گیا تاکہ انہیں جوش دلائے۔ چنانچہ ان سب نے رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر اتفاق کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیت نازل فرمائی۔

حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس اور دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) بیان کرتے ہیں کہ:

(٦) بدر والے دن جب رسول اللہ ﷺ قریش سے معرکہ آراء ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو آپ نے بنو قَیْنُقَاع کے بازار میں یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا: اے گروہِ یہود! اللہ کی جانب سے اس مصیبت سے ڈرو جو بدر والے دن اُس نے قریش پر نازل فرمائی۔ اور اسلام لے آؤ قبل اس کے کہ تم پر بھی وہ مصیبت آئے جو قریش پر نازل ہوئی۔ تم سب اس بات سے واقف ہو کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک نبی ہوں۔ یہ بات تمہاری کتاب میں موجود ہے۔ یہودیوں نے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ کو یہ بات دھوکہ میں نہ ڈالے کہ آپ نے ناتجربہ کار لوگوں سے جنگ کی ہے' جنہیں جنگ کرنے کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے اُن پر (فتح کا) موقع پالیا۔ خدا کی قسم! اگر ہم سے آپ جنگ کرتے تو آپ کو پتا چل جاتا کہ ہم جواں مرد ہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ "قل للذین کفروا ستغلبون وتحشرون الی جھنم" یعنی آپ یہودیوں سے کہہ دیجئے عنقریب تم مغلوب ہو گے یعنی شکست کھاؤ گے اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ (سنن ابوداؤد: ۳۰۰۱' تفسیر ابن جریر زیرِ بحث آیت)

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اس میں "مھاد" سے بچھونا مراد ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ کافروں کے لیے دوزخ میں جو بچھونا تیار کیا گیا ہے وہ کیسا بُرا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

وہ دو گروہ جو (میدانِ بدر میں) صف آراء ہوئے اُن میں یقیناً تمہارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا' وہ (کفار) ان (مسلمانوں) کو کھلی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ اپنی مدد کے ذریعہ

جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے' بے شک اس (واقعۂ بدر) میں آنکھوں والوں کے لیے ضرور سبق ہے O

آیت مذکورہ میں خطاب کن سے ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال

اس آیت میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ مؤمنین سے خطاب ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کفارِ مکہ سے خطاب ہے۔ اس صورت میں یہ آیت گذشتہ آیت پر معطوف ہوگی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق اس کو گذشتہ آیت کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ خطاب یہودیوں سے ہے۔ یہ امام ابن جریر نے فرمایا ہے۔

آیت مذکورہ میں "قد كانت" کی بجائے "قد كان" فرمانے کی توجیہ

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ آیت مبارکہ میں "قد كان لكم اية" کیوں فرمایا؟ "قد كانت" کیوں نہیں فرمایا جبکہ "اية" کا لفظ مؤنث ہے؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ہر وہ لفظ جو مؤنث حقیقی نہ ہو اس کی تذکیر جائز ہے۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں ﴿ ایَۃٌ ﴾ سے بیان مراد ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ دو گروہ جو باہم صف آراء ہوئے ان میں یقیناً تمہارے لیے بیان ہے۔ لہٰذا "اية" کے اس معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے "كانت" کے بجائے "كان" فرمایا گیا ہے۔ امام فراء کا قول یہ ہے کہ چونکہ فعل (كان) اور اسم مؤنث "اية" کے درمیان صفت (لكم) کو لایا گیا ہے اس لیے فعل کو مذکر لایا گیا ہے۔ اور ہر وہ مقام جہاں ایسا ہو وہاں یہی وجہ ہوگی۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دو گروہ جو بدر والے دن ایک دوسرے سے ملے اُن میں تمہارے لیے یقیناً آیت ہے' یعنی عبرت ہے اور میں جو کہتا ہوں کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اس کی سچائی پر دلیل ہے۔ ﴿ فِئَتَيْنِ ﴾ کا معنیٰ ہے: دو گروہ۔ یہ اصل میں "فيئى الحرب" سے ماخوذ ہے (بمعنیٰ لوٹنا)۔ کیونکہ جنگ میں لوگ ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں۔

﴿ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ﴾ "ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا" یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لڑ رہا تھا۔ اس گروہ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہیں جو کہ تین سو تیرہ افراد تھے۔ ۷۷ صحابہ مہاجرین تھے اور ۲۳۶ صحابہ انصاری تھے۔ مہاجرین صحابہ کے علَم بردار حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور انصار صحابہ کے علَم بردار حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ صحابہ کرام کے پاس کل ۷۰ اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ اور اسلحہ میں چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔

﴿ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ ﴾ اس کا معنیٰ ہے: "وفرقة اخرى كافرة" (یعنی دوسرا گروہ کافر تھا) اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ یہ کل نو سو پچاس جنگ جُو تھے۔ ان کا کمانڈر عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس تھا۔ اور ان کے پاس سو گھوڑے تھے۔ (یہ بھی واضح رہے کہ) غزوۂ بدر ہجرت کے بعد پہلا غزوہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ شریک ہوئے۔

آیت مذکورہ میں "یرون" کی دو قراأتوں کا بیان

﴿ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ﴾ "یرون" کو "ترون" بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہے کہ اے گروہ یہود! تم مکہ والوں کو مسلمانوں سے دوگنا دیکھو گے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت معرکۂ بدر میں یہ دیکھنے کے لیے آئی کہ کون مصیبت میں ہے اور کس کو مدد حاصل ہے؟ چنانچہ ان لوگوں نے دیکھا کہ مشرکین مسلمانوں سے دو گنے ہیں اس کے باوجود مدد مسلمانوں کو حاصل ہے۔ یہ بات ایک معجزہ تھی۔

ایک قراأت کے مطابق "یـرون" پڑھا گیا ہے۔ اب اس کی توجیہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے دیکھنے کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے۔ اس کی پھر دو تاویلیں ہیں۔ (۱) ایک تاویل یہ ہے کہ مسلمان مشرکین کو اپنے

سے دوگنا دیکھ رہے تھے جیسا کہ (واقعۃً وہ دو گنے) تھے۔ یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو دوگنا کیوں قرار دیا' حالانکہ وہ تین گنا تھے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک درہم ہو اور وہ یہ کہے کہ مجھے اس درہم کے دوگنے کی ضرورت ہے۔ اس سے مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ اس درہم کے علاوہ اس کے دوگنے کی ضرورت ہے۔ یوں کل تین درہم ہوئے۔ (۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سامنے مشرکین کی اتنی مقدار ظاہر فرمائی ہوگی جس کو دیکھ کر مسلمانوں نے اپنے دلوں سے خوف نکال دیا ہوگا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم ان پر غالب آ جائیں گے۔ یہ دوسری تاویل ہی زیادہ صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکین کو کم دکھایا' یہاں تک کہ مشرکین نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا۔

آیت مذکورہ کا الانفال:۴۴ سے بہ ظاہر تعارض اور اس کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ''وہ (مشرکین) اُن (مسلمانوں) کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے''۔ جبکہ ایک مقام پر فرمایا:

اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ . (الانفال:۴۴)

جب لڑائی کے وقت تمہاری نگاہوں میں کافر تمہیں تھوڑے کر کے دکھائے اور تمہیں ان کی نگاہوں میں قلیل دکھایا۔

ان دونوں آیتوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی اور یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں کو زیادہ سمجھا یا مسلمانوں نے مشرکین کو زیادہ سمجھا؟ حالانکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو قلیل سمجھنے میں برابر تھے؟

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ (دونوں گروہوں کی) تقلیل اور تکثیر دو مختلف حالتوں میں تھی۔ (۱) اگر یہ قول کیا جائے کہ (''یـــرون''میں) دیکھنے والے گروہ سے مراد مسلمان ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جنگ کے آغاز میں مشرکین کو اتنا ہی دیکھا تھا جتنے وہ تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کی نگاہوں میں قلیل دکھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مشرکوں کے خلاف جَری ہو گئے اور انہوں نے ان کے ساتھ لڑائی میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے (معرکۂ بدر میں) مشرکین کو دیکھا تو اُنہیں اپنے سے دوگنا دیکھا' پھر اُنہیں دیکھا تو ایک آدمی بھی ہم سے زیادہ نہیں تھا (یعنی ان کی تعداد ہمارے برابر تھی)۔ حضرت ابن مسعود کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ ہماری نگاہوں میں مشرکین کو اس قدر تھوڑا کر کے دکھایا گیا کہ میں نے اپنے ساتھ والے ایک آدمی سے کہا: تمہارا کیا خیال ہے یہ ستر افراد ہوں گے؟ اس نے کہا کہ میرے خیال میں یہ سو افراد ہیں۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں: پھر ہم نے ان میں سے ایک آدمی کو قید کیا اور اس سے پوچھا کہ تم کل کتنے افراد تھے؟ اس نے کہا: ایک ہزار۔ (۲) اگر ہم یہ قول کریں کہ (''یـــرون''میں) دیکھنے والے گروہ سے مراد مشرکین ہیں' جیسا کہ بعض مفسرین کا قول ہے کہ دیکھنا مشرکین کی طرف راجع ہے' یعنی مشرکین نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا تو اس صورت میں واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں قلیل تعداد میں دکھایا تاکہ مشرکین کو جرأت پیدا ہو اور وہ واپس نہ پلٹیں۔ جب وہ لڑائی میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کو زیادہ کر دیا تاکہ مشرکین بزدل ہو جائیں اور ان کی بزدلی ان کی شکست کا سبب بن جائے۔ روایت ہے کہ بدر والے دن جب مشرکین قید ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں سے پوچھا: تمہاری تعداد کتنی تھی؟ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم تین سو تیرہ افراد تھے۔ مشرکین نے کہا: ہم تو وہاں تمہیں اپنے آپ پر بڑھتا ہوا ہی دیکھ رہے تھے۔ (مذکورہ پوری گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ) غزوۂ بدر میں تکثیر اور تقلیل کے مختلف احوال تھے اور یہ سب کچھ صرف اللہ (عزوجل) کی قدرتِ کاملہ کا اظہار تھا۔ ☆ زیر بحث

جملہ (یرونهم مثليهم رای العين) میں ''رای العين'' کا معنیٰ ہے: ''فی رأی العين''۔
﴿ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ ﴾ کا معنیٰ ہے: اللہ تعالیٰ قوت دیتا ہے۔آگے فرمایا: بے شک اس میں آنکھ والوں کے لیے ضرور عبرت ہے۔اس جملہ میں ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ اُس مدد کی طرف ہے جو (''بنصره'' میں) مذکور ہوئی۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے لشکر کو دوگنا دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔﴿ لَعِبْرَةً ﴾ کا معنیٰ ہے: ''لآية'' (یعنی معرکۂ بدر میں ضرور نشانی ہے)۔''عبـــرة'' اُس دلیل کو کہتے ہیں جو یقین تک پہنچا دے اور معلومات کا سبب بنے۔اس کی اصل ''عبور'' ہے۔گویا ''عبرة'' ایک ایسا راستہ ہے جس کو عبور کر کے لوگ اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ عبرۃ اُس کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ مرتبہ جہل سے مرتبہ علم کی طرف پہنچا جائے۔آخر میں جو ﴿ لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: ''لـذوی العقول و البصائر '' (یعنی معرکۂ بدر میں عقل ونظر والوں کے لیے ضرور نشانی ہے)۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

جن چیزوں کی طرف دل مائل ہوتا ہے ان کی محبت لوگوں کے لیے خوش نما بنادی گئی ہے' یعنی عورتیں' بیٹے' سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے' نشان زدہ گھوڑے' چوپائے (جانور) اور کھیتی باڑی' یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے O

دل کش چیزوں کی محبت کو لوگوں کے لیے مزین کرنے والا کون ہے؟ اس بارے میں اہل سنت اور معتزلہ کا اختلاف

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ﴾ اہل سنت کا قول یہ ہے کہ مُزَیِّن (دل کو مائل کرنے والی چیزوں کو خوشنما بنانے والا) اللہ تعالیٰ ہے۔کیونکہ وہ بندوں کے تمام کاموں کا خالق ہے۔اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہی دنیا کی تمام لذتوں کو پیدا فرمایا اور انہیں اپنے بندوں کے لیے مباح کیا ہے۔اور اس کا اپنے بندوں کے لیے لذتوں کو مباح کرنا ہی ان لذتوں کو مزین اور خوشنما بنانا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا. (البقرہ:۲۹)	(اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ. (الاعراف:۳۲)	آپ پوچھیں کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کیا جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزیں۔
اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا. (الکہف:۷)	زمین پر جو کچھ ہے بے شک ہم نے اُسے زمین کے لیے زینت بنایا۔
وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا. (المائدہ:۸۸)	اور اللہ نے تمہیں جو حلال پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔

یہ تمام آیتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ مُزَیِّن اللہ تعالیٰ ہے۔اس کی تائید حضرت مجاہد کی قرأت سے ہوتی ہے جس میں

"زُیِّنَ" (فعل معروف) ہے۔ امام حسن بصری کا قول یہ ہے کہ مزین (خواہشات کی چیزوں کو خوشنما بنانے والا) شیطان ہے۔ معتزلہ کے ایک گروہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مذکورہ اشیاء کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ زائل ہونے والی ہیں اور یہ بتا کر انہیں ان چیزوں سے بے رغبتی دلائی ہے (لہٰذا اللہ تعالیٰ مزیّن یعنی خوشنما بنانے والا نہیں ہے بلکہ شیطان مزین ہے)۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں مطلقاً "حُبّ الشّھوات" فرمایا ہے لہٰذا اس میں حرام خواہشات بھی داخل ہیں اور انہیں مزین کرنے والا شیطان ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مذمت کے بیان میں مذکورہ اشیاء کو ذکر فرمایا ہے' جس کی تائید آیت کے آخری حصہ سے ہوتی ہے' جس میں فرمایا: اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔

ابوعلی جبائی معتزلی سے جو قول منقول ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کو خوش نما بنانے والا شیطان ہے اور جو چیز مباح ہے اس کو خوش نما بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن صحیح قول وہی ہے جس کو اہل سنت نے اپنایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پیدا فرمانے والا ہے اور اس کی ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

آیت میں جو ﴿حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ فرمایا ہے اس میں "شھوات" سے مراد "مُشْتَھَیَاتٌ" ہے (یعنی ایسی چیزیں جن کی طرف دل رغبت کرے)۔ کیونکہ "شھوت" کا معنیٰ ہے: "توقان النفس الی الشیئی المشتھی" (جو چیز مرغوب اور پسندیدہ ہو اس کی طرف دل کا تیزی سے مائل ہونا)۔

دل کش چیزوں میں سب سے پہلے عورتوں کا ذکر کرنے کی وجہ اور اولاد میں صرف بیٹوں کا ذکر کرنے کی وجہ

﴿مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے مرغوب چیزوں کے بیان کا آغاز عورتوں سے اس لیے فرمایا کہ اکثر و بیشتر اُن سے لذت لی جاتی ہے اور بھرپور طریقہ سے اُن سے اُنسیت حاصل کی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ عورتیں شیطان کا پھندا ہیں[۵] اور ان کے ذریعہ فتنہ میں پڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کے بعد "بنین" کہہ کر بیٹوں کا ذکر فرمایا۔ اولاد میں صرف بیٹوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بیٹے سے جو محبت ہوتی ہے' وہ بیٹی کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ بیٹا اپنے والد کا مال زیادہ پاتا ہے' اپنے والد کی مدد کرتا ہے اور ان کا قائم مقام (نائب) ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں بیوی اور اولاد کی محبت ایک حکمتِ بالغہ کے تحت رکھی ہے۔ وہ حکمت یہ ہے کہ نسل چلنے کا سلسلہ باقی رہے۔ اگر یہ محبت نہ ہوتی تو نسل چلنے کا سلسلہ نہ ہوتا۔

"قناطیر" اور "مقنطرہ" کے معانی اور "قنطار" کی مقدار

﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ﴾ "جمع کیے ہوئے خزانے"۔ اس میں "قناطیر" "قنطار" کی جمع ہے۔ اور "قنطار" "مضبوط کرنے کے معنیٰ سے لیا گیا ہے۔ جب کسی چیز کو مضبوط کیا جائے تو "قنطر" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے "قنطرہ" (بمعنیٰ پُل) ہے جو کہ مضبوط پتھروں سے بنایا گیا ہو۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ "قنطار" کی مقدار محدود ہے یا غیر محدود؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ اس کی مقدار محدود ہے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ وہ مقدار کیا ہے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "قنطار" ایک ہزار دو سو اوقیہ کو کہتے ہیں[۶] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت ایک ہزار دو سو مثقال[۷] کی ہے اور ایک روایت بارہ ہزار درہم یا دیت کے بارہ ہزار دینار کی ہے۔[۸] حضرت حسن

---

۵ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: النساء حبائل الشیطان. "عورتیں شیطان کا پھندا ہیں"۔
(الترغیب والترہیب ج۳ ص ۷۴۵' درمنثور ج ۲ ص ۲۵)

۶ ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے اور چالیس درہم دس تولہ چاندی کے برابر ہیں۔

۷ ایک مثقال دس درہم کے برابر ہے اور دس درہم تقریباً اڑھائی تولہ چاندی کے برابر ہیں۔

۸ دینار سونے کے سکّہ کو کہتے ہیں اور درہم چاندی کے سکّہ کو کہتے ہیں۔ ایک دینار تقریباً دس درہم کے برابر ہے۔

بصری کا یہی قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ ایک لاکھ ایک سو مَن ایک سو رَطل[9] ایک سو مثقال اور ایک سو درہم یہ سب ''قنطار'' ہیں۔ جس دن اسلام کا ظہور ہوا اُس دن مکہ میں سو آدمی ''قنطار'' کے مالک تھے۔ حضرت سعید بن مسیّب اور قتادہ فرماتے ہیں کہ ''قنطار'' کی مقدار اسّی ہزار ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کی مقدار ستّر ہزار ہے۔ سدی کا قول یہ ہے کہ اس کی مقدار چار ہزار مثقال ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ''قنطار'' کی کوئی مقدار معیّن نہیں ہے۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ ''قنطار'' اُس ڈھیر سارے مال کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے پر رکھا ہوا ہو۔ حضرت ابوعبیدہ عرب کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ''قنطار'' ایک ایسا وزن ہے جس کی مقدار معیّن نہیں ہے۔ امام ابن جریر طبری اور دیگر مفسرین کا یہی مختار ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کے درمیان جو مال ہو اُس کو ''قنطار'' کہتے ہیں۔ ابونضرہ فرماتے ہیں کہ بیل کی کھال میں جو سونا چاندی بھری ہوئی ہو وہ ''قنطار'' ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس طرح ''قنطرۃ'' (پُل) کے ذریعہ راستہ عبور کیا جاتا ہے اسی طرح ''قنطار'' مال کی اُس مقدار کو کہیں گے جس سے آدمی زندگی کو عبور کر لے۔

آیت میں جو ﴿الْمُقَنْطَرَةِ﴾ فرمایا اُس کا معنیٰ ہے: جمع کیا ہوا۔ اور بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: دوگنا کیا ہوا۔ کیونکہ ''قناطیر'' جمع ہے اور جمع کے کم از کم افراد تین ہیں۔ جبکہ ''مقنطرہ'' کا معنیٰ ہے: دوگنا کیا ہوا۔ اس لیے ممکن ہے کہ ''قناطیر'' کی مقدار چھ یا نو ہو۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''مقنطرہ'' اُس کو کہتے ہیں جس کو ڈھالا گیا ہو۔

﴿مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ (سونا اور چاندی) مال کی تمام اقسام میں آغاز ان دو سے اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں تمام اشیاء کی بنیاد ہیں۔ یہ دونوں لوگوں کے نزدیک پسندیدہ اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کا مالک جو چاہے کر سکتا ہے۔ اور یہ صفت کمال ہے جو کہ لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سونے کو ''ذھب'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ چلا جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا۔ اور چاندی کو ''فضّہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بکھر جاتی ہے۔

گھوڑوں کو ''خیل'' کہنے کی توجیہ اور ''مسوّمۃ'' کی تفسیر

﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ ''نشان زدہ گھوڑے''۔ اس میں لفظ ''خیل'' جمع ہے اس کا اس لفظ سے کوئی واحد نہیں ہے۔ جیسے قوم اور رھط۔ گھوڑوں کو ''خیل'' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی چال میں تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ گھوڑوں کو ''خیل'' اس لیے کہتے ہیں ان پر جو شخص بھی سوار ہوتا ہے وہ اپنے دل میں خود پسندی محسوس کرتا ہے۔ آگے جو ﴿الْمُسَوَّمَةِ﴾ فرمایا اس کے معنیٰ میں تین اقوال ہیں۔ (۱) پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چرنے والے گھوڑے ہیں۔ جب گھوڑے کو تم چراگاہ میں چھوڑ دو تو عربی میں کہا جائے گا: ''اَسَمْتَ الدَّابَّةَ يَاسَوَّمْتَ الدَّابَّةَ''۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ جب گھوڑے چَریں گے تو ان کے حُسن میں اضافہ ہوگا۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ''مسوّمہ'' ''سمۃ'' بمعنیٰ علامت سے ہے۔ اب اس قول کے قائلین کا علامت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے ''غُرّہ'' اور ''تحجیل'' (یعنی پیشانی اور ٹانگوں کی وہ سفیدی) مراد ہے جو گھوڑوں میں ہوتی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے چتکبرے گھوڑے مراد ہیں۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جن کو داغا گیا ہو۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ ''مسوّمۃ'' سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو سدھائے ہوئے اور خوب صورت ہوں۔ گھوڑوں کی تسویم سے مراد اُن کا حسن ہے۔

﴿وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ ''چوپائے جانور اور کھیتی باڑی''۔ اس میں لفظ ''انعام'' ''نَعَم'' کی جمع ہے۔ مراد اس سے اونٹ گائے بیل اور بکریاں ہیں۔ ان جانوروں میں سے کسی ایک جنس کو ''نعم'' نہیں کہا جاتا سوائے اونٹوں کے کہ ان پر یہ لفظ غالب آ چکا ہے۔ آیت میں ''حرث'' سے مراد کھیتی باڑی ہے۔

[9] ایک رَطل بارہ اوقیہ کے برابر ہے اور ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔

آگے فرمایا: ''یہ سب دنیوی زندگی کی متاع ہے''۔اس میں ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ مذکورہ سامانِ لذت اور اقسامِ زینت کی طرف ہے۔ان اقسام کو جو﴿ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ فرمایا گیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے دنیاوی زندگی میں فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اور دنیاوی زندگی زائل ہونے والی اور ختم ہوجانے والی ہے۔اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیوی زندگی ایسا سامان ہے جو فنا ہوجائے گا۔

﴿ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ اس میں ''مآب'' سے مراد مرجع ہے (یعنی اللہ ہی کے پاس بہترین لوٹنے کی جگہ ہے)۔ اس جملہ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کی جائے اور آخرت کی طرف توجہ دی جائے۔بعض کے نزدیک اس جملہ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ دُنیا عطا کرے اُس پر واجب ہے کہ وہ اُس سے ایسے کام لے جو اُس کے لیے آخرت میں فائدہ مند ہوں۔کیونکہ آخرت کی بہتری ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

آپ کہیے! کیا میں تمہیں ان سب چیزوں سے بہترین چیز نہ بتاؤں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں' (وہ) اُن (باغات) میں ہمیشہ رہیں گے اور (ان کے لیے) پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی ہے' اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿ اَؤُنَبِّئُكُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: ''اخبـــر کــم'' (میں تمہیں خبر دیتا ہوں)۔﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ کا اشارہ مذکورہ دنیاوی ساز وسامان کی طرف ہے۔﴿ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ اس کی تفسیر میں ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مہاجرین اور انصار مراد ہیں۔اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اُنہیں آخرت کی معرفت اور شوق عطا فرمائے۔علماء فرماتے ہیں کہ ''لـلـذیـن اتـقـوا'' میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو شرک سے بچتے ہوں۔﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس بات کی خبر دی کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ بہتر ہے اگرچہ دنیا کی وہ چیزیں پسندیدہ ہوں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ''عـنـد ربھم'' فرما کر لوگوں کو اس بات کی ترغیب فرمائی کہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو اُن چیزوں کی خاطر چھوڑ دیں جن کی اُنہیں امید ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی تفسیر اور وضاحت فرمائی جو اس کے نزدیک بہترین ہیں۔ چنانچہ فرمایا: (پرہیزگاروں کے لیے) ایسے باغات ہیں جن کے نیچے دریا رواں ہیں' وہ اُن باغات میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۷) بے شک اللہ عزوجل اہل جنت سے فرمائے گا: اے جنت والو! وہ کہیں گے: ''لَبَّيْكَ رَبَّـنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِـــىْ يَــدَيْكَ'' (اے ہمارے رب! ہم تیری اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے بار بار حاضر ہیں' ساری بھلائی تیرے دست قدرت میں ہے)۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم راضی ہوگئے؟ وہ کہیں گے: ہم کیوں راضی نہیں ہوں گے' جبکہ تو نے ہمیں اس قدر عطا کیا ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو تو نے اتنا عطا نہیں کیا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں تمہیں اس سے زیادہ بہتر چیز عطا نہ کروں؟ وہ کہیں گے: اس سے زیادہ بہتر چیز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تم پر اپنی خوشنودی کو حلال کر دیا ہے' اس کے

بعد اب کبھی میں تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (صحیح بخاری: ۷۵۱۸، صحیح مسلم: ۲۸۲۹، سنن ترمذی: ۲۵۵۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۶۲۶، ص ۴۹۶)

بعض علماء فرماتے ہیں کہ بندے کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو چکا ہے تو یہ اُس کے لیے بھرپور مسرت اور عظیم خوشی کی بات ہوتی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اللہ کے پاس ملنے والی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کو بھی جانتا ہے جو دنیا کی خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ اور اعمال کی مقدار کے مطابق ثواب اور سزا دے گا۔ بعض کے نزدیک اس آخری جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو دیکھنے والا ہے اسی لیے اُس نے ان کے لیے جنت تیار کی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے، پس تو ہمارے لیے ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا O (یہ لوگ) صبر کرنے والے، (ہر حال میں) سچ بولنے والے، اطاعت کرنے والے، (راہِ خدا میں) خرچ کرنے والے اور رات کے پچھلے پہر اٹھ کر بخشش طلب کرنے والے ہیں O

آیت مذکورہ میں مذکور اوصاف کی تفسیر

آیت مذکورہ میں ﴿اٰمَنَّا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے تصدیق کی۔ اور ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تو ہماری پردہ پوشی فرما اور ہم سے درگزر فرما۔ ﴿اَلصّٰبِرِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ واجبات کو ادا کرنے پر، حرام و ممنوع کاموں سے بچ کر، مصیبت اور تنگی میں اور جنگ کے وقت صبر کرنے والے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ دین میں اور مصائب پر صبر کرنے والے ہیں۔ ﴿الصّٰدِقِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ قتادہ کا قول یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیتیں سچی ہیں اور ظاہر و باطن میں ان کی زبانیں اور دل سیدھے ہیں۔ (واضح رہے کہ) سچائی قول، فعل اور نیت تینوں میں ہوتی ہے۔ قول میں سچائی یہ ہے کہ جھوٹ سے بچا جائے، فعل میں سچائی یہ ہے کہ اُسے پورا کرنے سے پہلے اس سے اعراض نہ کیا جائے اور نیت میں سچائی یہ ہے کہ کسی کام کا پختہ ارادہ کیا جائے تو اُسے آخر تک پہنچایا جائے۔ ﴿الْقٰنِتِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نماز ادا کرنے والے ہیں۔ ''قنوت'' کا مفہوم یہ ہے کہ فرمانبرداری پر ہمیشگی اور اس پر پابندی کی جائے۔ ﴿الْمُنْفِقِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اموال کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں خرچ کرنے والے ہیں۔ آدمی جو کچھ اپنے آپ پر، اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں پر خرچ کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے وہ سب ''المنفقین'' میں داخل ہے۔ ﴿الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ سحر کے وقت نماز ادا کرنے والے ہیں۔ ''سحر'' رات کی تاریکی سے لے کر فجر طلوع ہونے تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ (صحابہ کرام) رات میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب سحر کا وقت ہوتا تو وہ دعاء اور استغفار میں مشغول ہو جاتے تھے۔ لوگوں کا رات میں یہی طریقہ تھا۔ حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما رات کو بیدار ہوتے تھے اور پوچھتے تھے: اے نافع! کیا سحر ہو گئی؟ میں کہتا کہ نہیں! تو وہ نماز پڑھنے لگ جاتے اور اگر میں ہاں کہتا تو وہ بیٹھ کر استغفار اور دُعا کرتے رہتے یہاں تک کہ صبح کی نماز ادا کر کے اُٹھتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۸) ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا کی طرف اس وقت نزول فرماتا ہے جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر وہ فرماتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دُعا کرے؟ میں اس کی دُعا کو قبول کروں! کون ہے جو مجھ سے سوال کرے؟ میں اُسے عطا کروں! کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے؟ میں اُس کی بخشش کروں[۱](صحیح بخاری: ۱۱۴۵، صحیح مسلم: ۷۵۸)

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں، میں بادشاہ ہوں، کون ہے جو مجھ سے دُعا کرے؟ میں اس کی دُعا کو قبول کروں (الیٰ اخرہ)۔ ایک اور روایت میں مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہے کوئی مانگنے والا کہ اُسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دُعا کرنے والا کہ اُس کی دُعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی بخشش کا طلب گار کہ اُس کی بخشش کی جائے؟ یہ صدا طلوعِ فجر تک آتی رہتی ہے۔ (صحیح مسلم: ۷۵۸)

حدیث مذکور احادیثِ صفات میں سے ہے۔ اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث کے بارے میں علماء کے دو معروف مذہب ہیں: (۱) اسلاف کا مذہب یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس کو اس کے ظاہر معنیٰ پر رکھا جائے اور اس سے کیفیت کی نفی کی جائے۔ (۲) دوسرا مذہب ان علماء کا ہے جو احادیثِ صفات کی تاویل کرتے ہیں۔ ابو سلیمان خطّابی کہتے ہیں کہ اس حدیث کا انکار صرف وہی کرے گا جو معاملات کو اُس (ظاہری) نزول پر قیاس کرتا ہو جو اس کے مشاہدہ میں ہو۔ یعنی اوپر سے نیچے کی طرف آنا اور اوپر سے نیچے کی طرف منتقل ہونا۔ یہ اجسام کی صفت ہے۔ جبکہ وہ ذات جس پر اجسام کی صفات غالب نہیں آتیں اس کے بارے میں ان صفات کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ (حدیثِ مذکور میں جو کچھ بتایا جا رہا ہے) وہ تو صرف اس بات کی خبر ہے کہ وہ قدرت والا ہے، اپنے بندوں پر مہربان ہے، ان کی دُعائیں قبول فرماتا ہے، اُن کی بخشش فرماتا ہے، جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اس کی صفات کی نہ کوئی کیفیت ہے نہ اس کے افعال کی کوئی مقدار۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، وہ خوب سننے دیکھنے والا ہے۔

بعض علماء ''الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ لوگوں کے مختلف اوصاف بیان کیے پھر یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ ان اوصاف کے حامل ہونے کے باوجود شدید خوف اور ڈر رکھنے کی وجہ سے رات کے پچھلے پہر اُٹھ کر بخشش طلب کرنے والے ہیں۔ مروی ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا: اے میرے بیٹے! تم مرغ سے پیچھے نہ رہنا کہ وہ تو سحر کے وقت آواز لگا رہا ہو اور تم اپنے بستر پر سو رہے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''المستغفرين بالاسحار'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت سے ادا کرتے ہیں۔ اس قول کی صورت میں نماز کو استغفار اس لیے قرار دیا گیا کہ نماز کے ذریعہ لوگ مغفرت طلب کرتے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے (گواہی دی) درآں حالیکہ وہ (خدا) انصاف کے ساتھ نظام چلانے والا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں (وہ) بہت غلبہ والا حکمت والا ہے ○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

ایک قول کے مطابق آیتِ مذکورہ کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ ملک شام کے علماء (یہود) میں سے دو علماء نبی اکرم

---

[۱] یہ حدیث شریف، سورۃ البقرہ: ۱۸۶ کی تفسیر میں رقم: ۲۰۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے مفصّل حوالہ جات اور حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے جب مدینہ منورہ کو دیکھا تو ایک دوسرے سے کہا کہ یہ شہر اس نبی کے شہر سے کس قدر ملتا جلتا ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے۔ جب دونوں نبی اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو حلیہ مبارکہ سے انہوں نے آپ کو پہچان لیا۔ ان دونوں نے عرض کیا: آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اُنہوں نے کہا: آپ احمد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ انہوں نے کہا: ہم آپ سے ایک چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں اگر آپ نے وہ ہمیں بتادی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی تصدیق کریں گے۔ آپ نے فرمایا: پوچھو۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں یہ بتایئے کہ اللہ عزوجل کی کتاب میں سب سے بڑی گواہی کون سی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ وہ دونوں علماء مسلمان ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا (یعنی اُن کے خدا ہونے یا خدا کا بیٹا ہونے کا) اُس کے متعلق مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اللہ کی گواہی دینے کے معنیٰ میں مختلف اقوال

﴿شَهِدَ اللّٰهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح اور ظاہر فرمایا۔ کیونکہ شہادت کا معنیٰ ہے: ''التبیین و الاظهار'' (واضح اور ظاہر کرنا)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''شهد الله'' کا معنیٰ ہے: اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا (کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)۔ یہ وہ دلائل ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت تک پہنچنا بندوں کے لیے ممکن ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی معرفت کی طرف اپنے بندوں کی اس طرح رہ نمائی فرمائی کہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے عجائب اور اپنی پیدا کردہ چیزوں کے غرائب بیان فرمائے۔ کسی دیہاتی سے پوچھا گیا کہ ''صانع'' (کائنات کو بنانے والی ذات) کے موجود ہونے پر کیا دلیل ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مینگنی اونٹ کا پتا دیتی ہے اور قدم کے نشان چلنے والے کا پتا دیتے ہیں تو اتنا عظیم جسم جو اس لطافت کے ساتھ بلند ہے (یعنی آسمان) اور وہ مرکز جو اس کثافت کے ساتھ نیچے ہے (یعنی زمین) کیا یہ دونوں ایک باخبر صانع کے وجود کی دلیل نہیں ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو جسموں سے چار ہزار سال پہلے پیدا کیا اور رزق کو ارواح سے چار ہزار سال پہلے پیدا کیا۔ تو اس نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے خود اپنی ذات کے لیے گواہی دی جبکہ صرف اس کی ذات موجود تھی۔ اس وقت نہ آسمان تھا نہ زمین نہ خشکی تھی نہ سمندر۔ اس نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں''۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ سے مراد ہے: ''شهد الملائكة'' (فرشتوں نے گواہی دی) اللہ تعالیٰ کی جو گواہی ہے اس کا معنیٰ ہے: ''الاخبار و الاعلام'' (خبر دینا' آگاہ کرنا) فرشتوں اور مؤمنین کی گواہی کا معنیٰ ہے: اس بات کا اقرار اور اعتراف کرنا کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ چونکہ آگاہ کرنا اور کسی بات کا اعتراف کرنا' ان دونوں کو شہادت کہا جاتا ہے اس لیے آیت میں دونوں کے لیے شہادت کے لفظ کا استعمال باعثِ حسن ہے۔

﴿وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ سے مراد ہے: ''وشهد اولوا العلم'' اہل علم نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

آیت مبارکہ میں ''اولو العلم'' سے کون مراد ہیں؟

''اولوا العلم'' (اہل علم) سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے انبیاء کرام علیہم السلام مراد ہیں' کیونکہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کو وہی جانتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے اہل علم مہاجرین و انصار صحابہ کرام مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے اہل کتاب کے مؤمن علماء مراد ہیں' جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اوران کے دیگر ساتھی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے تمام مسلمان علماء مراد ہیں۔

﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ﴾ اس میں ''قسط'' سے مراد انصاف ہے۔ ''قائما'' کا نصب یا تو حال ہونے کی بناء پر ہے یا قطع[1] کی بناء پر یا مدح کی وجہ سے ہے۔ ''قائما بالقسط'' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تدبیر فرمانے والا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''فلان قائم بامر فلان'' یعنی فلاں شخص فلاں کے لیے تدبیر کرنے والا اور اس کے اسباب کی نگہداشت کرنے والا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: ''فلان قائم بحق فلان'' یعنی فلاں شخص فلاں کے حق کا بدلہ دینے والا ہے۔ (اب ''قائما بالقسط'' کا مفہوم یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے معاملات کی تدبیر فرمانے والا ہے' ان کے رزق کا نگہبان ہے اور انہیں ان کے اعمال پر بدلہ دینے والا ہے۔

آیت مبارکہ ''لا الٰہ الا ھو'' کی تکرار کی توجیہ

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اس جملہ کو دوبارہ اس لیے لایا گیا تا کہ کلام میں تاکید پیدا ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ پہلا جملہ (شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو) تعریف اور وحدانیت کے بیان کے لیے ہے۔ اور دوسرا (یعنی زیر بحث) جملہ حکم اور تعلیم کے لیے ہے۔ یعنی ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تکرار کا مقصد لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ کلمہ (لا الٰہ الا اللّٰہ) سب سے عظیم اور اعلیٰ کلام ہے۔ یعنی تکرار سے اس بات کی ترغیب دی جارہی ہے کہ لوگ اس جملہ کو دہرائیں اور اس کو پڑھتے رہیں۔ کیونکہ جو اس میں مشغول ہوگا وہ یقیناً بہترین عبادت میں مشغول ہوگا۔

﴿الْعَزِيْزُ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا غالب ہے کہ کوئی اُسے مغلوب نہیں کرسکتا۔ اور ﴿الْحَكِيْمُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت والا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین اسلام ہی ہے' اور اہل کتاب نے آپس میں جو اختلاف کیا وہ ان کے پاس علم آ جانے کے بعد آپس کے حسد کی وجہ سے تھا' اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے O

اللہ عزوجل کا پسندیدہ دین

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو دین پسندیدہ ہے وہ اسلام ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا: ''وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' ۔ (المائدہ:۴) یعنی میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کرلیا ہے۔ زیر بحث جملہ میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے جب دعویٰ کیا کہ یہودیت سے زیادہ بہتر کوئی دین نہیں ہے اور عیسائیوں نے دعویٰ کیا کہ عیسائیت سے زیادہ بہتر کوئی دین نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ کے نزدیک دین' اسلام ہی ہے۔

ایک قرأت کے مطابق ''اِنَّ الدِّيْنَ'' کو ''اَنَّ الدِّيْنَ'' پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ گذشتہ آیت کے ''اَنَّ'' (شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ) کے ساتھ متعلق ہوگا۔ اور معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ گواہی دی کہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

---

[1] یعنی ''قائما'' اصل میں ''القائم'' تھا۔ جب شروع میں اس کے الف لام کو گرا دیا گیا تو آخر میں زبر دے دیا گیا۔ جیسے سورۃ النحل میں فرمایا: ''وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا'' ۔ (النحل:۵۲) اصل میں یہ ''ولہ الدین الواصب'' تھا۔ الف لام گرا کر آخر میں زبر دے دیا گیا۔ اس طرح زبر دینے کو نصب بر بنائے قطع کہتے ہیں۔ (تفسیر القرطبی' زیر بحث آیت)

دین اور اسلام کا معنیٰ

لغت میں ﴿دین﴾ کا اصل معنیٰ ہے: بدلہ۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ’’کما تدین تدان ‘‘(جیسا کرو گے ویسا تمہیں بدلہ دیا جائے گا)۔ اس کے بعد یہ (لفظ دین) ملّت اور شریعت کا نام بن گیا۔ (اس صورت میں) اس کا معنیٰ ہے: فرمانبرداری اور شریعت کے لیے جھک جانا۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ دین اُن تمام امور کا نام ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پابند کیا ہے اور ان کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

﴿اسلام﴾ کا معنیٰ ہے: ’’الدخول فی السلم‘‘ (سَلم میں داخل ہونا)۔ ’’سلم‘‘ سے مراد ہے: تابع دار ہونا، فرمانبرداری کرنا، اطاعت میں داخل ہونا۔

امام بغوی نے ثعلبی کی سند سے غالب قطان سے روایت کیا ہے کہ غالب قطان بیان کرتے ہیں:

(۹) میں تجارت کی غرض سے کوفہ گیا، تو میں امام اعمش کے قریب ہی ٹھہرا۔ میں ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک رات جب میں نے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو امام اعمش (کو دیکھا کہ وہ) رات میں اُٹھ کر تہجد ادا کر رہے تھے۔ قرأت کرتے ہوئے وہ اس آیت پر پہنچے: ’’شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ‘‘۔ (آل عمران: ۱۸) امام اعمش نے کہا کہ جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے گواہی دی ہے میں بھی اس کی گواہی دیتا ہوں اور اس گواہی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، یہ گواہی اللہ تعالیٰ کے پاس امانت ہے۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ امام اعمش نے اس جملہ کو کئی بار دوہرایا۔ میں نے کہا کہ ضرور انہوں نے اس کے بارے میں کوئی (حدیث وغیرہ) سُنی ہوگی۔ پھر میں نے صبح کی نماز اُن کے ساتھ ادا کی اور وہی آیت دوہرائی اور میں نے اُن سے کہا کہ میں نے آپ کو یہ آیت بار بار پڑھتے ہوئے سنا ہے، اس کے بارے میں آپ کو کیا خبر پہنچی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کے متعلق جو حدیث ہے وہ تمہیں میں ایک سال تک نہیں سناؤں گا۔ یہ بات میں نے اُسی دن ان کے دروازے پر لکھ لی اور ایک سال تک میں منتظر رہا۔ جب ایک سال گزر گیا تو میں نے اُن سے کہا: اے ابو محمد! ایک سال گزر گیا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابو وائل نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس آیت کے امانت والے کو قیامت کے دن سامنے لایا جائے گا۔ اللہ عزوجل فرمائے گا: بے شک میرے اس بندے کا میرے پاس ایک عہد ہے۔ اور جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے میں اُسے حق دوں گا (لہٰذا) میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔ (معالم التنزیل، زیر بحث آیت، شعب الایمان: ۲۴۱۴، المعجم الکبیر: ۱۰۴۵۳)

آگے فرمایا: ﴿وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ﴾ اہل کتاب نے آپس میں جو اختلاف کیا وہ ان کے پاس علم آجانے کے بعد باہمی حسد کی وجہ سے تھا۔

مذکورہ جملہ ’’وما اختلف الذین‘‘ کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے دو اقوال

کلبی کہتے ہیں کہ یہ (جملہ) یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوا جب انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا۔ مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ اہل کتاب نے (سیدنا) محمد ﷺ کی نبوت کے بارے میں جو اختلاف کیا وہ علم آجانے کے بعد کیا۔ علم سے مراد نبی اکرم ﷺ کا مبارک حلیہ اور وہ اوصاف مبارکہ ہیں جو یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں ہیں۔ ربیع کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب موت حاضر ہوئی تو انہوں نے بنی اسرائیل کے اعلیٰ افراد میں سے ستر آدمی اپنے پاس بلائے اور اُنہیں تورات سپرد کی اور حضرت یوشع بن نون کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جب (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد) پہلا، دوسرا اور تیسرا قرن گزر گیا تو لوگوں کے درمیان انتشار اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختلاف کرنے والے وہی تھے جنہیں کتاب دی گئی تھی اور وہ ستر شہزادے تھے۔ انہوں

نے اس قدر اختلاف کیا کہ لوگوں کا خون بہایا' اور شر اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ اُن کے پاس علم یعنی تورات کے احکام کا بیان آنے کے بعد ہوا۔ آیت میں جو ﴿ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ آپس میں بادشاہت اور فرمانروائی کی طلب میں انہوں نے اختلاف کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جابروں کو مسلط کر دیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث جملہ نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوا۔ اس صورت میں جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جنہیں کتاب یعنی انجیل دی گئی انہوں نے اختلاف کیا۔ اُن کا اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے متعلق خدائی کے دعویٰ میں تھا۔ اور یہ اختلاف ان کے پاس علم آنے کے بعد ہوا۔ یعنی اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ ایک اور اکیلا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ "بغیا بینھم" کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اختلاف آپس کی دشمنی اور اختلاف کی وجہ سے تھا۔

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اس جملہ میں اُن یہودیوں اور نصرانیوں کے لیے وعید اور سرزنش ہے۔ جو کفر پر جمے رہے اور سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کیا۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

تو اگر (اب بھی) آپ سے وہ حجت بازی کریں تو آپ اُنہیں کہہ دیجئے کہ میں اور میرے پیروکار (سب کے سب) اللہ کے آگے اپنا سر جھکائے ہوئے ہیں اور آپ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے کہیں کیا تم نے اسلام قبول کر لیا؟ پس اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیریں تو آپ کی ذمہ داری تو صرف یہی ہے کہ آپ پیغام پہنچا دیں اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے O

آیت مذکورہ کا پس منظر اور اس کی تفسیر

﴿ فَاِنْ حَآجُّوْكَ ﴾ اے محمد (ﷺ)! اگر وہ آپ سے دین کے معاملہ میں جھگڑا کریں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! آپ نے ہمارا جو نام رکھا ہوا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے' یہودیت اور عیسائیت تو صرف نسب ہے جبکہ دین' اسلام ہے اور ہم اس پر قائم ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد ﷺ کو حکم فرمایا کہ وہ ان کے خلاف یہ دلیل پیش کریں کہ میں تو اللہ کے اُسی حکم کا پیروکار ہوں جس کا تم اقرار کرتے ہو۔ چنانچہ حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ﴾ یعنی میں نے اپنے دل' اپنی زبان اور اپنے تمام اعضاء سے اس کی فرمانبرداری اختیار کر رکھی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ "وجـــہ" (چہرہ) کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ چہرہ کو انسان کے تمام ظاہری اعضاء میں سب سے زیادہ شرف حاصل ہے۔ کیونکہ انسان جب کسی چیز کے لیے اپنے چہرہ کو جھکاتا ہے تو (چہرہ کی وجہ سے) اپنے تمام اعضاء کو اس چیز کے آگے جھکا دیتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ چہرہ سے مراد عمل ہے۔ "اسلمت وجھی للّٰہ" کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کیا ہوا ہے اور اپنی عبادت سے اللہ عزوجل کا قصد کر رکھا ہے۔ "ومـــن اتّبعـــن" کا معنیٰ یہ ہے کہ جس طرح میں نے اللہ کے حضور سر جھکا رکھا ہے اسی طرح میرے پیروکاروں نے بھی اپنا سر اُس کے

آگے جھکا رکھا ہے۔

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ﴾ آپ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے کہیں۔اہل کتاب سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔اور غیر اہل کتاب سے عرب کے مشرکین مراد ہیں۔﴿ ءَاَسْلَمْتُمْ ﴾ کیا تم نے اسلام قبول کرلیا؟ اس میں لفظاً استفہام ہے لیکن معنوی طور پر یہ حکم ہے۔یعنی اسلام لے آؤ۔﴿ فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (اگر وہ اسلام لے آئے) تو یقیناً آخرت میں کامیابی اور نجات کی راہ پا گئے۔رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت یہود ونصاریٰ کے سامنے تلاوت کی تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اسلام قبول کرلیا۔آپ نے یہودیوں سے فرمایا: کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے کلیم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں؟ انہوں نے کہا: ''معاذ اللہ'' (ہم اس قول سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)۔آپ نے نصاریٰ سے فرمایا: کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں؟ انہوں نے کہا: ''معاذ اللہ'' (ہم اس قول سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں)۔اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر وہ منہ پھیریں تو آپ کی ذمہ داری تو صرف یہی ہے کہ آپ پیغام پہنچا دیں اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

﴿ اِنْ تَوَلَّوْا ﴾ اگر وہ منہ پھیریں۔﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ﴾ تو آپ پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے اُن کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے۔

آیت مذکورہ محکم ہے یا منسوخ؟

علماء ناسخ ومنسوخ کا اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ایک گروہ کا مؤقف یہ ہے کہ یہ آیت محکم (غیر منسوخ) ہے۔اور اس آیت سے نبی اکرم ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے۔کیونکہ آپ ﷺ لوگوں کے ایمان کی بہت خواہش رکھتے تھے اور دعوت اسلام کو قبول نہ کرنے پر تکلیف محسوس فرماتے تھے۔جبکہ ایک گروہ کا مؤقف یہ ہے کہ یہ آیت آیتِ جہاد سے منسوخ ہے۔کیونکہ زیر بحث آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ آپ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے اور یہ بات آیتِ جہاد سے منسوخ ہے۔آخر میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔یعنی جو ایمان والے ہیں اور جو غیر مؤمن ہیں اللہ سب کو جانتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق شہید کرتے ہیں اور لوگوں میں سے عدل وانصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرتے ہیں آپ اُنہیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے O یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے O

آیاتِ مذکورہ کا حدیث پاک کی روشنی میں پس منظر اور تفسیر

اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کو جھٹلاتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔مراد اس سے یہود ونصاریٰ ہیں۔آگے جو فرمایا کہ ''وہ نبیوں کو ناحق شہید کرتے ہیں اور لوگوں میں سے عدل وانصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرتے ہیں'' اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس وحی آتی تھی' کتاب نہیں آتی تھی۔کیونکہ وہ

تورات کے احکام کے پابند تھے۔ چنانچہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کرتے تھے لیکن قوم کے لوگ اُنہیں شہید کر دیتے تھے۔ پھر جو لوگ اُن نبیوں پر ایمان لا چکے تھے اور اُن کی تصدیق کر چکے ہوتے تھے وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے' نیکی کا حکم دیتے اور بُرائی سے منع کرتے تھے۔ لیکن لوگ اُنہیں بھی قتل کر دیتے تھے۔ ان ہی کو اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں ﴿الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ﴾ فرمایا (یعنی جو عدل وانصاف کا حکم دیتے تھے)۔

امام بغوی نے ثعلبی کی سند کے ساتھ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں:

(۱۰) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! قیامت کے دن کن لوگوں کو سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جس نے کسی نبی کو شہید کیا یا ایسے شخص کو شہید کیا جو نیکی کا حکم دینے والا اور بُرائی سے منع کرنے والا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے (زیر بحث آیت) تلاوت فرمائی: "ویقتلون النبیین سے ومالھم من ناصرین تک"۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! بنی اسرائیل نے دن کے آغاز میں اور ایک وقت میں تینتالیس انبیاء کرام کو شہید کیا۔ اس پر بنی اسرائیل کے عبادت گزاروں میں سے ایک سو بارہ افراد نے کھڑے ہو کر قاتلوں کو اچھائی کا حکم دیا اور بُرائی سے منع کیا تو قاتلوں نے اُسی روز دن کے آخری حصہ میں اُن (عبادت گزاروں) کو بھی شہید کر دیا۔ ان ہی لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا اور ان کے بارے میں آیت مبارکہ (آل عمران: ۲۱-۲۲) نازل فرمائی۔

(معالم التنزیل المعروف بتفسیر البغوی' زیر بحث آیت' شعب الایمان: ۷۸۸۸)

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ ایسے لوگوں پر آپ دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے۔ یہ جملہ "اِنَّ" کی خبر ہے' اس کے باوجود اس پر "فـاء" جو داخل کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ معناً جزاء ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ جو کفر کرے اُسے آپ قیامت کے دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیں۔ عذاب کی خبر کو جو خوش خبری فرمایا گیا ہے وہ بہ طور استعارہ ہے۔ یعنی کفار کو عذاب سے ڈرانا ایسا ہی ہے جیسے نیک لوگوں کو اجر وثواب کی خوش خبری سنانا۔

زیر بحث آیت میں اُن یہودیوں کی سرزنش ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ کیونکہ انبیاء کرام کو شہید کرنے والے اگرچہ ان کے آباء واجداد تھے لیکن یہ لوگ ان کے فعل پر راضی تھے۔

اگلی آیت میں جو فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ اس میں "حبطت" سے مراد یہ ہے کہ اُن کے اعمال باطل ہو گئے۔ عمل کے باطل ہونے سے مراد یہ ہے کہ دُنیا میں اُنہیں قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں اُن کا کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ ﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ اُن کے لیے ایسے کوئی مددگار نہیں ہوں گے جو اُنہیں عذاب سے بچا سکیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰى فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۳

کیا آپ نے اُنہیں نہ دیکھا جنہیں کتاب کا حصہ (علم) دیا گیا' اُنہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرے' پھر اُن میں سے ایک گروہ رُوگرداں ہو کر پھر جاتا ہے O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مختلف روایات

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں کو قرآن کریم کے فیصلہ کی طرف بُلایا گیا

تو انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اہل کتاب اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان حَکَم (ثالث) بنایا۔ تو قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ کے خلاف فیصلہ کیا کہ وہ ہدایت پر نہیں ہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت المدراس میں یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس گئے۔ آپ نے اُنہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی۔ تو اُن میں سے نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ کس دین پر ہیں؟ آپ نے فرمایا: ملتِ ابراہیم پر۔ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم تو یہودی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات لے آؤ' وہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔ ان دونوں نے اس سے انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ اس قول کی روشنی میں آیت میں ''کتاب اللہ'' سے تورات مراد ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت یہ ہے کہ خیبر کے ایک مرد اور عورت نے بدکاری کی' ان کی کتاب میں اس کی سزا رجم لکھی ہوئی تھی۔ بدکاری کرنے والے مرد و عورت چونکہ لوگوں میں معزز تھے اس لیے اُنہیں رجم کرنے کو لوگوں نے ناگوار جانا۔ پھر ان دونوں کا معاملہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے جایا گیا اس امید پر کہ آپ کے یہاں سہولت اور رخصت ہوگی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ نعمان بن اوفیٰ اور بحری بن عمرو نے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ نے ان دونوں پر ظلم کیا ہے حالانکہ ان پر رجم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے اور تمہارے درمیان تورات فیصلہ کرنے والی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نے انصاف کیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سب سے زیادہ تورات کا علم کس کو ہے؟ لوگوں نے کہا: عبد اللہ بن صوریا نامی ایک کانا شخص ہے' وہ فدک میں رہتا ہے' اُسے تورات کا سب سے زیادہ علم ہے۔ لوگوں نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو وہ مدینہ طیبہ آیا۔ اُس کا حلیہ جبریل نے نبی اکرم ﷺ کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ چنانچہ جب وہ آیا تو نبی اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: تم ابن صوریا ہو؟ اُس نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: یہودیوں میں سب سے زیادہ تورات کا علم تمہیں ہے؟ اس نے کہا: لوگوں کا گمان یہی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے تورات منگوائی اور اس سے فرمایا: اس کو پڑھو۔ اُس نے پڑھنا شروع کیا' جب وہ آیتِ رجم پر پہنچا تو اس پر اس نے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بعد والا حصہ پڑھنے لگا۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ آگے چلا گیا ہے۔ پھر حضرت عبد اللہ بن سلام نے کھڑے ہو کر اُس کا ہاتھ آیت سے ہٹایا اور آپ نے رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کے سامنے اُس آیت کو پڑھا۔ اُس میں یہ تھا کہ شادی شدہ مرد و عورت جب بدکاری کریں اور اُن پر گواہی قائم ہو جائے تو ان دونوں کو رجم کیا جائے گا' اگر عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک انتظار کیا جائے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو رجم کرنے کا حکم دیا اور ان دونوں (مرد و عورت) کو رجم کیا گیا۔ اس پر یہودی غصہ میں آ گئے تو اللہ تعالیٰ نے (زیر بحث) آیتِ مبارکہ نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ ﴾ اس میں ''نصیب'' سے مراد علم ہے۔ یعنی کیا آپ نے اُنہیں نہ دیکھا جنہیں کتاب کا علم دیا گیا' وہ علم جو اُنہیں تورات سے حاصل ہوا۔ ﴿ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ ﴾ اُنہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے۔ اس میں ''کتاب اللہ'' سے یا تو قرآن کریم مراد ہے یا تورات۔ کیونکہ اس کے پس منظر میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ﴿ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ﴾ کا معنیٰ ہے: تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ کتاب کی طرف فیصلہ کی نسبت مجازاً کی گئی ہے۔ ﴿ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ ﴾ (پھر اُن میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے) اس میں گروہ سے سرداران اور علماء مراد ہیں۔ ﴿ وَ ہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ حق سے روگرداں ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جو لوگ پھر گئے ان سے مراد علماء ہیں اور جن لوگوں نے اعراض کیا اُن سے مراد

پیروکار ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۪ وَّ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

یہ (جرأت) انہیں اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے کہا: ہمیں چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی اور انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے دھوکہ میں ڈالا جو وہ خود گھڑا کرتے تھے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور یہود و نصاریٰ کے افتراء میں مختلف اقوال

﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ تولّی اور اعراض کی طرف ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ کا منہ پھیرنا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں سوائے چند دنوں کے آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔ اس کی تفسیر سورۃ البقرہ میں (آیت: ۸۰ کے تحت) گزر چکی ہے۔ ﴿ غَرَّهُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: اُنہیں لالچ میں ڈالا۔ ﴿ یَفْتَرُوْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: وہ قسمیں کھاتے تھے اور جھوٹ بولتے تھے (یعنی اُنہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان کی قسموں اور جھوٹی باتوں نے لالچ میں ڈالا)۔ جھوٹی باتوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے یہود و نصاریٰ کا یہ قول مراد ہے: ''نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ'' ۔(المائدہ:۱۸) ''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں''۔ بعض کے نزدیک یہ قول مراد ہے جو آیت میں مذکور ہے: ''ہمیں چند دنوں کے علاوہ ہرگز آگ نہیں چھوئے گی''۔ بعض کے نزدیک یہ قول مراد ہے کہ ہم حق پر ہیں اور تم غلط ہو۔

فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ۫ وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

پس اُن کی کیا حالت ہوگی جب ہم اُنہیں اُس دن اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا O

﴿ فَكَیْفَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (جب ہم اُنہیں اکٹھا کریں گے) تو ان کا کیا حال ہوگا۔ ﴿ لِیَوْمٍ ﴾ کا معنیٰ ہے: ''فی یوم''۔ ﴿ لَا رَیْبَ فِیْهِ ﴾ کا معنیٰ ہے: اس دن کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

آیت مذکورہ میں مذکور فوائد کا بیان

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کی سرزنش ہے اور اُنہیں اُن چیزوں کی اہمیت بتانا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ ایسی باتوں میں پڑے ہوئے ہیں جن میں کوئی تدبیر نہیں چل سکتی۔ اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے بارے میں جس چیز کی خبر دے رہے ہیں اور جس چیز کو اپنے لیے آسان سمجھ رہے ہیں یہ محض ایک غلط بات سے اپنے آپ کو بہلانا ہے اور ایک نا ملنے والی چیز کی خواہش کرنا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: اہل محشر کے سامنے کفار کے جھنڈوں میں سب سے پہلا جس کا جھنڈا بلند کیا جائے گا وہ یہودیوں کا جھنڈا ہوگا' جو اُنہیں سب کے سامنے رُسوا کر دے گا پھر اُنہیں جہنم کی طرف لے جانے کا حکم دیا جائے گا۔

﴿ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴾ لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں کی کوئی نیکی ہوگی تو اُسے کم نہیں کیا جائے گا اور جو برائیاں ہیں اُن میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾

آپ یوں عرض کیجئے: اے اللہ! اے سب ملکوں کے مالک! تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت سے سرفراز کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل فرماتا ہے' تیرے ہی دستِ قدرت میں ساری بھلائی ہے' بے شک تو سب کچھ کرسکتا ہے O

آیتِ مبارکہ کے واقعۂ نزول میں مختلف روایات

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ عزوجل سے دُعا کی کہ وہ فارس اور رُوم کی بادشاہت آپ کی امت کو عطا فرمادے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح فرمایا تو اپنی امت سے فارس اور رُوم کی سلطنت کا وعدہ فرمایا۔ اس پر منافقین اور یہودیوں نے کہا: بہت دور کی بات ہے! (سیدنا) محمد (ﷺ) کو فارس اور روم کی سلطنت کیسے مل سکتی ہے جبکہ وہ ان سے زیادہ غلبہ اور طاقت والے ہیں۔ کیا محمد (ﷺ) کے لیے مکہ اور مدینہ کافی نہیں ہیں جو اُنہیں فارس اور روم کی سلطنت کی خواہش ہورہی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے کہا: خدا کی قسم! ہم اُس شخص کی اطاعت نہیں کریں گے جس نے نبوت کو بنی اسرائیل سے دوسروں کی طرف منتقل کردیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

''اللھم'' اور ''مالک الملک'' کے معانی ومفاہیم میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿اللّٰهُمَّ﴾ کا معنیٰ ہے: یااللہ (اے اللہ!) اس سے جب ''یـــاء'' حرف نداء کو حذف کیا گیا تو آخر میں میم بڑھادیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ میم سے ایک اور معنیٰ مراد ہے اور وہ یہ ہے: ''یَا اَللّٰہُ اُمِّنَا بِخَیْرٍ'' اے اللہ! ہمارے ساتھ خیر کا ارادہ فرما۔

﴿مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ کا معنیٰ ہے: اے بندوں کے اور بندوں کی مملوکہ چیزوں کے مالک۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: اے آسمانوں اور زمین کے مالک۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: اے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں بادشاہت ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: اے وہ ذات جس کو تمام اہل سلطنت اور ان کے ورثاء کی اُس دن ملکیت حاصل ہوگی جس دن اس کے سوا کوئی سلطنت کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ بعض آسمانی کتابوں میں ہے:

انا الله ملک الملوک ومالک الملک قلوب الملوک ونواصیهم بیدی فان العباد اطاعونی جلعتهم علیهم رحمة وان هو عصونی جعلتهم علیهم عقبة فلا تشتغلوا بسب الملوک ولکن توبوا الی اعطفهم علیکم.

میں اللہ (مستحقِ عبادت) ہوں' سب بادشاہوں کا بادشاہ اور سب ملکوں کا مالک ہوں' تمام بادشاہوں کے دل اور ان کی پیشانیاں میرے دست قدرت میں ہیں' اگر بندے میری اطاعت کریں گے تو میں بادشاہوں کو ان کے لیے باعثِ رحمت بنا دوں گا اور اگر میری نافرمانی کریں گے تو میں بادشاہوں کو ان پر سزا کا باعث بنا دوں گا' لہٰذا تم لوگ بادشاہوں کو بُرا بھلا نہ کہا کرو بلکہ میری طرف توبہ کرو' میں اُنہیں تم پر مہربان بنادوں گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "مُلک" کا معنیٰ قدرت ہے اور "مالک" کا معنیٰ ہے: قدرت والا۔اس صورت میں "مالک الملک" کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے ہر مالک و مملوک اور قادر مقدور پر اُسے ملکیت حاصل ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ "مالک الملک" کا معنیٰ ہے: وہ جنسِ مُلک (یعنی سب مُلکوں) کا مالک ہے جس طرح چاہتا ہے اُن میں تصرف فرماتا ہے۔

"مُلک" کا معنیٰ اور ملک عطا کرنے اور چھیننے کی مختلف تفاسیر

﴿ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ ﴾ تو جسے چاہتا ہے مُلک عطا فرماتا ہے۔یہاں ﴿ملک﴾ سے مراد نبوت ہے۔کیونکہ "مُلک" (یعنی سلطنت) کے جتنے مراتب ہیں اُن میں سب سے عظیم مرتبہ نبوت کا ہے۔اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کا حکم مخلوق کے باطن اور ظاہر (دونوں) پر نافذ ہے جبکہ کسی بادشاہ کا حکم دُنیا کے فقط بعض لوگوں کے صرف ظاہر پر نافذ ہوتا ہے اور وہ بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔جبکہ نبی اکرم ﷺ کی اطاعت ساری مخلوق پر واجب ہے۔

﴿ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾ اور جس سے چاہتا ہے مُلک چھین لیتا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے نبوت کو واپس لے کر (سیدنا) محمد ﷺ کو عطا فرما دی۔اور اب آپ کے بعد نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ آپ کی نبوت و رسالت میں آپ کا کوئی شریک ہے۔بعض مفسرین نے "تؤتی الملک من تشاء" میں "من تشاء" سے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو مراد لیا ہے۔اور "وتنزع الملک ممن تشاء" میں "من تشاء" سے ابوجہل اور دیگر سردارانِ قریش مراد لیے ہیں (یعنی تو سیدنا محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کو سلطنت عطا فرماتا ہے اور ابوجہل وغیرہ سے سلطنت چھین لیتا ہے)۔

بعض مفسرین نے پہلے "من تشاء" سے نبی اکرم ﷺ کی امت مراد لی ہے اور دوسرے جملہ میں فارس اور روم مراد لیے ہیں۔

بعض نے پہلے جملہ میں سیدنا آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد مراد لی ہے اور دوسرے جملہ میں شیطان اور اس کے لشکری مراد لیے ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر موجود تھے۔

عزت اور ذلت عطا کرنے کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو سیدنا محمد ﷺ کو نبوت اور رسالت کے ذریعہ عزت عطا فرماتا ہے۔﴿ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو یہودیوں سے جزیہ اور اُن سے نبوت کو واپس لے کر اُنہیں ذلیل فرماتا ہے۔بعض نے یہ مراد لی ہے کہ تو مہاجرین و انصار کو عزت عطا فرماتا ہے اور فارس و روم کو ذلیل فرماتا ہے۔بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ سیدنا محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کو عزت عطا فرماتا ہے۔یعنی وہ مکہ مکرمہ میں دس ہزار کا لشکر بن کر غلبہ کے ساتھ داخل ہوئے۔اور تو ابوجہل اور دیگر سرداروں کو ذلیل فرماتا ہے۔یعنی بدر والے دن اُنہیں قتل کر دیا گیا اور بدر کے ایک کنویں میں ڈال دیا گیا۔بعض نے یہ مراد لی ہے کہ تو جسے چاہتا ہے اطاعت کی وجہ سے عزت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے نافرمانی کی وجہ سے ذلیل فرماتا ہے۔بعض نے یہ مراد لی ہے کہ تو جسے چاہتا ہے مال داری دے کر عزت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے غربت کے ذریعہ ذلیل فرماتا ہے۔

بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ تو جسے چاہتا ہے قناعت اور راضی رہنے کی صفت دے کر عزت عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے لالچ کی صفت دے کر ذلیل فرماتا ہے۔

﴿ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ﴾ بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے۔مراد یہ ہے کہ مدد اور مالِ غنیمت (عطا کرنا) تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔بعض کا قول یہ ہے کہ "الخیر" کا الف لام عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔اس صورت میں مفہوم یہ ہے کہ ساری بھلائیاں تیرے ہی دستِ قدرت میں ہیں۔

’’بیدک الخیر‘‘ میں صرف خیر کا ذکر فرمانے کی توجیہ

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ’’بیدک الخیر‘‘ میں صرف خیر کا ذکر فرمایا' شر کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ کلام اُس خیر کے بیان میں چل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے صاحب ایمان بندوں کو عطا فرماتا ہے اور اس کا یہودی اور منافقین انکار کرتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ’’بیدک الخیر‘‘ یعنی تیرے ہی دستِ قدرت میں ساری بھلائی ہے جسے تو دشمنوں کی خواہشات کے برخلاف اپنے دوستوں کو عطا فرماتا ہے۔ بعض نے سوال مذکور کا جواب یہ دیا ہے کہ ’’بیدک الخیر‘‘ فرمانا اس بات کے خلاف نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ میں خیر کے علاوہ کچھ اور بھی ہو۔ لہٰذا ’’بیدک الخیر‘‘ کا مفہوم یہ ہے کہ ساری بھلائی تیرے دستِ قدرت میں ہے اور بھلائی کے علاوہ دیگر چیزیں بھی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہیں۔ چونکہ فائدہ خیر سے اٹھایا جاتا ہے خیر ہی کو پسند کیا جاتا ہے اس لیے آیت مبارکہ میں صرف خیر کا تذکرہ کیا گیا۔

﴿ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ جسے چاہتا ہے تو بادشاہت عطا فرماتا ہے' جسے چاہتا ہے عزت سے سرفراز کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل فرماتا ہے۔

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

تو رات (کا حصہ) دن میں داخل کرتا ہے اور دن (کا حصہ) رات میں داخل کرتا ہے اور تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب نوازتا ہے O

آیت مذکورہ کا گذشتہ آیت سے ربط

جب گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ میں سب ملکوں کا مالک ہوں تو اب (زیر بحث آیت میں) اپنی اُس عظیم قدرت کا ذکر فرما رہا ہے جس کا ظہور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے میں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب نوازتا ہے۔

اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جو ذات اہل فہم اور صاحبانِ عقل کو حیران کرنے والے عظیم افعال پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ فارس و روم اور یہودیوں سے سلطنت چھین کر اُنہیں ذلیل کر دے اور اہل عرب کو سلطنت دے کر اُنہیں عزت عطا فرما دے۔

رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کرنے کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال

﴿ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے۔ یعنی تو رات کو چھوٹا کرتا ہے اور جو حصہ اس کا گھٹ جاتا ہے اُسے دن میں بڑھا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دن پندرہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے' جو کہ دن کے بڑھنے کی انتہاء ہے اور رات نو گھنٹے کی ہو جاتی ہے اور یہ رات کے چھوٹے ہونے کی انتہاء ہے۔ ﴿ تُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تو دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ رات پندرہ گھنٹے کی ہو جاتی ہے جو کہ اس کے بڑھنے کی انتہاء ہے اور دن نو گھنٹے کا ہو جاتا ہے اور یہ اس کے گھٹنے کی انتہاء ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ رات کو دن میں داخل کرنے اور دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دن کی روشنی کے فوراً بعد رات کی سیاہی لے آتا ہے اور رات کی تاریکی کے فوراً بعد دن کی روشنی لے آتا ہے۔ آیت کی تفسیر میں پہلا

قولِ زیادہ صحیح اور مفہوم آیت کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ رات جب گھٹتی ہے تو اس کی گھٹنے والی مقدار کو دن میں بڑھا دیا جاتا ہے اسی طرح دن کی گھٹنے والی مقدار کو رات میں بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یہی ''ولوج'' کا معنیٰ ہے۔

مردہ سے زندہ اور زندہ کو مردہ سے نکالنے کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال

﴿ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ﴾ تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پانی کا قطرہ جو کہ مردہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ زندہ انسان کو پیدا فرماتا ہے اور انسان سے پانی کا قطرہ نکالتا ہے۔ اسی طرح چوزہ جو کہ زندہ ہے اس کو انڈے سے نکالتا ہے جو کہ مردہ ہے اور مُرغی سے انڈا نکالتا ہے۔ تمام حیوانات کا یہی معاملہ ہے۔ بعض مفسرین اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خشک دانہ سے تروتازہ اور سرسبز چیزیں زمین سے نکالتا ہے اور گٹھلی سے کھجور کا درخت پیدا فرماتا ہے' اسی طرح وہ اُگنے والی تازہ چیزوں سے خشک دانے اور کھجور سے گٹھلی نکالتا ہے۔ بعض اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کافر سے صاحبِ ایمان کو پیدا فرماتا ہے اور صاحب ایمان سے کافر کو پیدا فرماتا ہے۔ اس قول کی توجیہ یہ ہے کہ صاحبُ ایمان کا دل زندہ ہوتا ہے اور کافر کا دل مردہ ہوتا ہے۔

﴿ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾ اور جسے چاہتا ہے بے حساب نوازتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تو تنگی اور کمی نہیں فرماتا بلکہ جس پر چاہتا ہے رزق کو کشادہ اور وسیع فرما دیتا ہے۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾

اہل ایمان' ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو شخص ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا' سوائے اس (صورت) کے کہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو' اور اللہ تمہیں اپنے (حکم کی خلاف ورزی کرنے) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے O

آیتِ مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے مختلف اقوال

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حجاج بن عمرو' ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید (یہودی) انصار صحابہ کی ایک جماعت کو دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ان سے تعلقات قائم کر رہے تھے۔ رفاعہ بن منذر' عبد اللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ نے انصار کی جماعت سے کہا کہ ان یہودیوں سے بچ کر رہنا' کہیں وہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں۔ انصار کی جماعت نے ان سے دوستی اور تعلق ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اور دیگر اُن صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کفارِ مکہ سے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ آیتِ مبارکہ عبد اللہ بن اُبی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ مشرکین اور یہودیوں کی حمایت کرتے تھے اور اُنہیں خبریں پہنچاتے تھے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ اُنہیں رسول اللہ ﷺ پر کامیابی حاصل ہو گی اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اہل ایمان کو ان کے طریقہ پر چلنے سے روک دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کچھ یہودی حضرتِ عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حلیف تھے۔ احزاب والے دن انہوں

نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! پانچ سو یہودی میرے ساتھ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں دشمن کے خلاف اُن سے مدد لوں۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اُنہیں منع فرمادیا گیا۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

آیت مبارکہ میں ﴿ اَوْلِیَآءَ ﴾ سے مراد ہے: مددگار اور معاون۔ اور ﴿ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ کا معنیٰ ہے: مؤمنین کے سوا (یعنی اہلِ ایمان، مؤمنین کے سوا کافروں کو مددگار اور معاون نہ بنائیں)۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مؤمن اُس سے اپنی دوستی نہ رکھے جو غیر مؤمن ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اس بات سے منع فرمادیا کہ وہ کافروں سے دوستی رکھیں یا ان کے ساتھ کسی رشتہ داری یا محبت یا مل جل کر رہنے کی وجہ سے نرمی کا برتاؤ کریں۔ اللہ عزوجل کی خاطر کسی سے محبت اور اللہ کی خاطر کسی سے بغض رکھنا بہت عظیم چیز ہے اور ایمان کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔

﴿ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو شخص کافروں سے دوستی کرے، یعنی اُنہیں خبریں پہنچائے اور مسلمانوں کی خفیہ باتیں اُنہیں بتائے یا اُن سے دوستی اور محبت رکھے (تو اس کا انجام یہ ہے کہ) ﴿ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ ﴾ اللہ کے دین میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اُسے اللہ عزوجل کی جانب سے کسی قسم کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ ایک معقول بات ہے کہ اللہ عزوجل سے محبت یہ ہے کہ اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھی جائے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور کافروں سے دوستی دو ایسی متضاد چیزیں ہیں جو آپس میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

خوف کی بناء پر کافروں سے تعلق رکھنے کا مشروط جواز اور تقیہ کا شرعی حکم

﴿ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ﴾ اس کا معنیٰ ہے: "الا ان تخافوا منهم مخافة" (مگر یہ کہ تمہیں اُن سے کوئی خوف ہو)۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں سے دوستی، نرمی کا برتاؤ اور باہمی تعلق رکھنے سے اہلِ ایمان کو منع فرمایا ہے۔ ہاں اگر کفار زیادہ ہوں اور غالب ہوں یا کوئی مسلمان کافروں میں ہو اور وہ دل کو ایمان پر مطمئن رکھتے ہوئے اپنے دفاع کی غرض سے زبان سے اُن کی طرف مائل ہو مگر کسی حرام خون یا حرام مال یا اور کسی حرام چیز کو حلال نہ سمجھے۔ یا کفار مسلمانوں کے راز فاش کردیتے ہوں (ان تمام صورتوں میں اُن سے ظاہراً تعلق جائز ہے)۔

تقیہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب آدمی کو قتل کا خطرہ ہو اور نیت صحیح ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: " اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ "۔ (النحل: ۱۰۶) "مگر جس شخص کو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو (وہ اللہ کے غضب میں نہیں)"۔ دوسری بات یہ کہ یہ تقیہ بہ طور رخصت ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص اپنے ایمان کے اظہار پر ڈٹ گیا یہاں تک کہ اُسے قتل کردیا گیا تو اس پر اس کے لیے اجرِ عظیم ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ ہے کہ اب تقیہ منع ہے۔ کیونکہ تقیہ اس وقت تھا جب اسلام کا آغاز تھا اور ابھی اسلام اور مسلمان کو اتنی مضبوطی حاصل نہیں تھی۔ جبکہ آج اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہے۔ اس لیے اب مسلمانوں کو اپنے دشمن سے تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔ یحییٰ البکاء فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے دنوں میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ تقیہ کا تعلق زبان سے ہے جبکہ دل ایمان پر جما ہوا ہو۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: حالتِ امن میں تقیہ جائز نہیں ہے، تقیہ صرف حالتِ جنگ میں ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ تقیہ اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کے لیے ہے، کیونکہ ممکنہ حد تک اپنے آپ کو نقصان سے بچانا واجب

ہے۔

آیت مبارکہ میں ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ تم ممنوع کاموں کا ارتکاب کر کے اُس کی نافرمانی کرو یا جن کاموں کا حکم دیا ہے اُن کی مخالفت کرو یا کافروں سے دوستی کرو۔ اِن میں جو کام بھی تم نے کیا تو تم اس کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت کے عذاب سے تمہیں اللہ تعالیٰ ڈراتا ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

آپ کہہ دیجئے! جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ اُس کو جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اُسے اس کا (بھی) علم ہے اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (اے منافقو!) تمہارے دلوں میں جو کفار کی دوستی اور محبت ہے اللہ اُسے جانتا ہے۔ صدر (یعنی سینہ) چونکہ دل کی حفاظت کی جگہ ہے اس لیے آیت میں سینہ کا تذکرہ فرمایا۔ ﴿ اَوْ تُبْدُوْهُ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (اللہ اس بات کو بھی جانتا ہے جو) تم اپنے قول اور عمل سے کفار کی محبت کا اظہار کرتے ہو۔ بعض مفسرین نے ''تخفوا'' اور ''تبدوہ'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کی جو کیفیت ہے اس کو تم چھپاؤ یا جنگ اور لڑائی کے ذریعہ اُسے ظاہر کرو ﴿ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾ اللہ ان باتوں کو تمہارے خلاف محفوظ فرما رہا ہے پھر وہ تمہیں ان باتوں کا بدلہ دے گا۔ ﴿ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان اور زمین کی کوئی شئ پوشیدہ نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارا حال' تمہاری کفار سے دوستی اور اپنے دل سے ان کی طرف مائل ہونا اس پر پوشیدہ رہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا ۢ بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

جس دن ہر شخص اپنے کیے ہوئے نیک عمل (کا بدلہ بھی) حاضر پائے گا اور بُرے عمل (کا بدلہ بھی) ہر شخص یہ خواہش کرے گا کہ کاش اس کے اور اس دن کے درمیان دراز مدت حائل ہوتی' اور اللہ تمہیں اپنے (حکم کی خلاف ورزی کرنے) سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے O

ہر شخص کا قیامت کے دن اچھے عمل کی جزا اور بُرے عمل کی سزا کو پانا

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے اچھے عمل کا بدلہ موجود پائے گا' اُس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہو گی۔ اور اپنے اچھے اعمال کو دیکھ کر خوش ہو گا۔ ﴿ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا ۢ بَعِيْدًا ﴾ اور جو بُرے کام کیے ہوں گے اُنہیں دیکھ کر تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور بُرے عمل کے درمیان انتہاء ہے۔ بعض مفسرین نے جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ بُرائی کو دیکھ کر آدمی یہ خواہش کرے گا کہ کاش اُس نے بُرائی نہ کی

تقیہ کے متعلق شیعوں کے باطل نظریات اور اُن کے خلاف اہل سنت کے دلائل پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تبیان القرآن ج ۲ ص ۱۱۲ تا ۱۱۷

''امد بعید ''، یعنی بہت فاصلہ ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں: جیسے مشرق اور مغرب کے درمیان کا فاصلہ۔ ''امد'' کا معنیٰ مدت اور ہوتی اور میرے اور میری اس بُرائی کے درمیان بہت دراز مدت ہوتی۔ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ اللہ تمہیں اپنے حکم کی مخالفت کرنے سے ڈراتا ہے۔ یہ جملہ وعید کی تاکید کے لیے دوبارہ لایا گیا ہے۔ آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ اس طرح مہربان ہے کہ اُس نے انہیں اپنی ذات کا خوف دلایا اور اُنہیں اپنی قدرت اور علم کے کمال کی پہچان عطا فرمائی۔ مزید یہ کہ وہ مہلت دیتا ہے' بے اعتنائی نہیں فرماتا۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ اس طرح مہربان ہے کہ اُس نے اُنہیں توبہ اور نیک اعمال کرنے کی مہلت دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے وعید بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ویحذر کم الله نفسه ''(اللہ تمہیں اپنے حکم کی خلاف ورزی سے ڈراتا ہے) تو اس کے بعد ہی بہ طور وعدہ فرمایا: ''والله رؤوف بالعباد ''(اللہ بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے) تاکہ بندۂ مؤمن یہ جان لے کہ اللہ کی رحمت اور اس کا وعدہ اُس کی وعید اور ناراضگی پر غالب ہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

(اے رسول مکرم!) آپ کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا بہت مہربان ہے O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے مختلف اقوال

مذکورہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا کہ ''ہم اللہ کے بیٹے اور پیارے ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت اُن کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قریش نے مسجد حرام میں اپنے بت نصب کیے ہوئے تھے اور اُن بتوں پر شتر مرغ کے انڈے لٹکائے ہوئے تھے اور ان کے کانوں میں بالیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ لوگ مسجد حرام میں تھے اور بتوں کے آگے سجدہ کر رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ اُن کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے گروہِ قریش! خدا کی قسم! تم لوگوں نے اپنے باپ ابراہیم اور اسماعیل کی ملّت کا چہرہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ قریش نے کہا: ہم تو ان بتوں کو اللہ کی محبت کے لیے پوجتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کا قریبی بنا دیں۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں نے کہا کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں وہ خالصۃً اللہ کی محبت اور اس کی تعظیم کے پیشِ نظر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ اے محمد (ﷺ)! آپ کہہ دیجئے! اگر تم اپنے گمان میں اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔ کیونکہ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت واضح دلائل اور روشن معجزات سے ثابت ہو چکی ہے اس لیے ساری مخلوق پر ان کی پیروی کرنا واجب ہے۔

آیتِ مذکورہ کی تفسیر

مفہوم آیت یہ ہے کہ (اے محبوب ﷺ!) آپ کہہ دیجئے! اگر تم لوگ محبتِ الٰہی کے دعویٰ میں سچے ہو تو اُس کے احکام کے پیروکار اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ' لہٰذا تم میری پیروی کرو' کیونکہ میری پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی اطاعت کا حصہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ بندے کی اپنے خدا سے محبت یہ ہے کہ وہ اُسے عظمت اور جلالت والا جانے' اُس کی اطاعت کو ترجیح دے' اُس کے حکم کی پیروی کرے اور جس کام سے منع کیا ہے اُس سے پرہیز کرے۔ اور خدا کی بندے سے محبت یہ ہے کہ وہ اُس پر مہربانی کرے' اُس سے راضی ہو' اُسے اجر و ثواب عطا کرے اور اُس سے درگزر فرمائے۔ ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (وہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو بخش دے گا)۔ یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ بخش دے تو یقیناً اُس نے اُس سے عذاب کو دور

فرمادیا۔ آخر میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (اللہ بہت بخشنے والا بہت مہربان ہے) یعنی جس سے وہ محبت فرماتا ہے اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اپنے فضل و کرم سے اس پر رحمت فرماتا ہے۔

آیت مذکورہ اور اگلی آیت کا ربط

جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) اپنی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور ہمیں اپنی محبت کا حکم دیتے ہیں جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم سے محبت کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت مبارکہ نازل فرمائی:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

آپ کہیے! تم اللہ اور رسول کا حکم مانو' پھر اگر وہ منہ پھیریں تو بے شک اللہ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا O

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اہمیت کا بیان

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ متعلق ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کے ہوتے ہوئے اللہ عزوجل کی اطاعت مکمل نہیں ہوتی۔ اسی لیے امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہر امر اور نہی جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو اس کا درجہ ثبوتِ فرضیت میں وہی ہے جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے امر اور نہی کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ (آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرمارہا ہے کہ) تمہارا میرے رسول کی فرمانبرداری کرنا یقیناً میری فرمانبرداری ہے۔ لہٰذا اگر تم نے میری اطاعت کی اور میرے رسول کی نافرمانی کی تو تمہاری جانب سے میری جو اطاعت ہے میں اُسے قبول نہیں کروں گا۔

آیت کے اختتامی جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے اعراض کریں تو بے شک اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی نہ اُن کے فعل کو پسند فرماتا ہے نہ اُن کی بخشش فرمائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱۱) میرا ہر امتی جنت میں جائے گا' سوائے اُس شخص کے جس نے انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کی: انکار کرنے والا کون ہے؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی یقیناً اُس نے انکار کیا۔[۱۲]

(صحیح بخاری: ۷۲۸۰' مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۱' المستدرک ج ۱ ص ۵۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۴۳۔ ص ۲۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۲) جس نے میری اطاعت کی یقیناً اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی یقیناً اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جو شخص حاکم کی اطاعت کرے یقیناً اُس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی یقیناً اُس نے میری نافرمانی کی۔[۱۳] (صحیح بخاری: ۲۹۵۷' صحیح مسلم: ۱۸۳۵' سنن ابن ماجہ: ۲۸۵۹' سنن نسائی: ۴۱۹۳' مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۶۱۔ ص ۳۱۸)

---

۱۲ یعنی نافرمانی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والا ابتداءً جنت میں نہیں جائیگا۔ نہ یہ بات کہ قطعاً جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر انکار سے مراد یہ ہو کہ جس نے میرے لائے ہوئے دین سے رُوگردانی کی اور کفر اختیار کیا تو ایسا شخص قطعاً جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بہ شرطیکہ مرتے وقت تک وہ اسی حالت پر رہا ہو۔ نعوذ باللہ من ذالک۔) (عمدۃ القاری ج ۱۶ ص ۵۰۶)

۱۳ یہاں حاکم کے جائز احکامات کی اطاعت مراد ہے۔ کیونکہ ناجائز حکم میں کسی کی پیروی جائز نہیں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۴﴾

بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو (ان کے زمانے میں) تمام جہانوں پر بزرگی دی O (یہ سب) ایک دوسرے سے ایک نسل ہیں اور اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے O

آیاتِ مذکورہ کا واقعۂ نزول اور حضرت نوح کا مکمل نام اور ان کے نام کا معنیٰ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے کہا کہ ہم حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کے بیٹے ہیں اور ہم ان کے دین پر ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ انبیاء کرام کو اسلام کے ساتھ منتخب فرمایا جبکہ اے گروہِ یہود! تم دینِ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب پر ہو۔

﴿اصْطَفٰۤى﴾ کا معنیٰ ہے: منتخب کیا۔ یہ ''صفوۃ'' سے ہے۔ اور ''صفوۃ'' ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔ ﴿اٰدَمَ﴾ سے مراد حضرت ابو البشر علیہ السلام ہیں۔ اور ﴿نُوْحًا﴾ سے مراد حضرت نوح ابن لامک بن متوشلح بن اخنوخ ہیں۔ اخنوخ سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے اپنی تفسیر میں ابوسلیمان دمشقی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام ''سکن'' تھا چونکہ وہ بہت رویا کرتے تھے اس لیے ان کا نام نوح رکھ دیا گیا۔

''آل ابراهیم'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

آیت میں جو ﴿وَ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ﴾ فرمایا اس کے بارے میں بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں۔ (اس صورت میں آل کا لفظ برائے اعزاز و تکریم ہوگا۔) بعض فرماتے ہیں کہ ''آل ابراهیم'' سے حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) مراد ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دو خاندانوں کی بنیاد بنایا۔ یعنی حضرت اسماعیل بن ابراہیم (علیہما السلام) کو عرب والوں کی بنیاد بنایا۔ سیدنا محمد ﷺ بھی عرب والوں میں سے ہیں، لہٰذا آپ بھی اس اصطفاء اور چناؤ میں داخل ہیں۔ جبکہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے بنیاد بنایا۔ اور اُن میں ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے زمانہ تک اُن میں نبوت اور بادشاہت رکھی۔ پھر قیامت تک کے لیے نبوت اور بادشاہت کو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ اور آپ کی امت میں جمع فرما دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''آل ابراهیم'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں۔

''آل عمران'' میں عمران سے کون مراد ہیں؟

آگے جو ﴿اٰلَ عِمْرٰنَ﴾ فرمایا اس میں عمران کے متعلق مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب مراد ہیں جو کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے والد ہیں۔ اس صورت میں ''آل عمران'' سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون مراد ہوں گے یا خود حضرت عمران مراد ہوں گے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ عمران سے عمران بن اشیم بن امون اور بعض کے نزدیک عمران بن اشیم بن ماثان مراد ہیں۔ یہ حضرت سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور یہی حضرت مریم (علیہا السلام) کے والد ہیں اور حضرت مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہیں۔ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق''. ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی پیروی نہ کی جائے''۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۹۶)

صورت میں "آل عمران" سے حضرت مریم (علیہا السلام) اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہوں گے۔
زیر بحث آیت میں خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم' حضرت نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کا ذکر اس لیے فرمایا کہ تمام انبیاء اور رسل (علیہم السلام) ان کی اولاد میں سے ہیں۔ ﴿عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ شخصیات کو نبوت اور رسالت عطا فرما کر انہیں تمام جہانوں پر چن لیا۔

آیت مذکورہ میں "ذرّیت" اور "بعضها من بعض" کی تفسیر

﴿ذُرِّيَّةً﴾ کا تعلق گذشتہ آیت سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اولاد کو چن لیا۔ "ذرّیہ" کی اصل "ذرأ" ہے یعنی پیدا کرنا۔ بعض کے نزدیک یہ "ذرّ" سے ہے (بمعنیٰ مٹی کے ذرات) اس قول کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پُشت سے اُن کی اولاد کو ذرّات کی مانند نکالا تھا[۱۴] آباء واجداد اور بیٹوں کو جو ذرّیت کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایک دوسرے سے پیدا فرمایا ہے۔ لہٰذا بیٹے اپنے آباء واجداد کی ذریت ہیں اور آباء واجداد حضرت آدم علیہ السلام کی ذُریت ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو براہِ راست اللہ تعالیٰ نے بنایا۔
آیت میں جو ﴿بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کرنے میں بعض بعض کے ساتھ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بعض بعض کے دین پر ہیں۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی باتیں سننے والا ہے اور اُن کی نیتیں جاننے والا ہے۔ وہ اپنی نبوت اور رسالت کے لیے صرف اُس کو منتخب فرماتا ہے جس کے اندر قول اور عمل دونوں اعتبار سے استقامت ہوتی ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: اے میرے رب! بے شک میں تیرے لیے منّت مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے خالص تیری ہی خدمت میں رہے' پس تو میری طرف سے (اس منّت کو) قبول فرما' بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا (ارادوں کو) جاننے والا ہے O

حضرت عمران کی بیوی کا نام اور "محرّر" کا مفہوم

عمران کی بیوی حضرت حُنّہ بنت فاقُوذا ہیں جو کہ حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ ہیں۔ اور عمران سے مراد عمران بن ماثان ہیں' بعض کے نزدیک عمران بن اشیم ہیں۔ یہاں وہ عمران مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں' کیونکہ دونوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اُس زمانہ میں ماثان کے بیٹے بنی اسرائیل کے سردار' بادشاہ اور احبار کا درجہ رکھتے تھے (احبار بڑے علماء کو کہا جاتا ہے)۔
﴿رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ عمران کی بیوی نے کہا کہ میرے پیٹ میں جو حمل ہے اس کو میں ایسی نذر بناتی ہوں جو میری جانب سے تیرے لیے آزاد ہو۔ نذر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان اپنے آپ پر لازم کرتا ہے۔ اُس زمانہ میں "محرّر" وہ ہوتا تھا جس کو لوگ آزاد کر کے عبادت خانہ میں متعیّن کر دیتے تھے' وہ اس کی نگہداشت اور خدمت کرتا اور بالغ

[۱۴] جیسا کہ سنن ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو اُن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ جس سے اُن کی اولاد کے وہ تمام افراد باہر آ ئے جن کو قیامت تک اللہ تعالیٰ پیدا فرمانے والا ہے۔ (الیٰ آخر الحدیث) (سنن ترمذی ۲۰۷۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۱۸)

ہونے تک وہیں رہتا۔ بالغ ہونے کے بعد اُسے اختیار دیا جاتا کہ وہ چاہے تو عبادت خانہ میں ہی رہے یا جہاں چاہے چلا جائے۔ اگر وہ وہاں ٹھہرنے کو اختیار کر لیتا تو اس کے بعد اُسے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ بنی اسرائیل کے انبیاء کرام اور علماء میں سے ہر ایک کی اولاد میں کوئی نہ کوئی ایسا بچہ ہوتا تھا جس کو بیت المقدس میں کام کے لیے آزاد اور فارغ کر دیا جاتا تھا۔ جن کو آزاد اور فارغ کیا جاتا تھا وہ صرف لڑکے ہوتے تھے۔ لڑکی اپنی ماہواری اور تکلیف کے باعث بیت المقدس کا کام انجام نہیں دے سکتی تھی۔

حضرت عمران کی بیوی کا منت ماننے کا واقعہ

حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ کے پیٹ میں جو کچھ تھا انہوں نے اسے ''مُحَرَّر'' (آزاد اور فارغ) بنا دیا تھا۔ اصحابِ تاریخ نے اس کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت زکریا اور حضرت عمران نے دو بہنوں سے شادی کی۔ چنانچہ ایشاع بنت فاقوذا جو کہ حضرت یحییٰ کی والدہ ہیں وہ حضرت زکریا کے عقد میں تھیں اور ایشاع کی بہن حنہ بنت فاقوذا جو کہ حضرت مریم کی والدہ ہیں وہ حضرت عمران کے عقد میں تھیں۔ حنّہ کے یہاں ولادت ہی نہیں ہوئی یہاں تک کہ وہ سن ایاس (حیض نہ آنے کی عمر) اور بڑھاپے کو پہنچ گئیں۔ اُن کے گھر والے نیک اور اللہ کے ہاں مرتبہ والے تھے۔ چنانچہ ان ہی ایام میں ایک مرتبہ حنّہ ایک درخت کے سایہ میں تھیں کہ اچانک ایک پرندے کو دیکھا جو اپنے بچہ کو کھلا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کے دل میں بھی بچہ کی خواہش ہوئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کی دُعا کی اور عرض کی: اے اللہ! اگر تو نے مجھے اولاد عطا فرمائی تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اُسے بیت المقدس کے لیے صدقہ کر دوں۔ وہ بیت المقدس کے دربانوں اور خادموں میں ہوگا۔ (اس دُعا کے بعد) جب حضرت مریم کو حمل ٹھہرا تو جو کچھ اُن کے پیٹ میں تھا اُس کو انہوں نے ''مُحَرَّر'' (آزاد) کر دیا۔ اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ حمل میں بچہ ہے یا بچی؟ ان کے شوہر نے اُن سے کہا: افسوس ہے تم نے کیا کر دیا سوچو! تمہارے پیٹ میں جو کچھ ہے اگر وہ بچی ہوئی تو وہ تو بیت المقدس کی خدمت نہیں کر سکے گی۔ اس بات سے دونوں شدید غمگین ہو گئے۔ پھر حنّہ کے وضع حمل سے پہلے ہی حضرت عمران کا وصال ہو گیا۔

''تقبّل'' اور ''سمیع وعلیم'' کے معانی

آگے اللہ تعالیٰ نے حضرت حنّہ کے قول کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ پس تو اس نذر کو مجھ سے قبول فرما' بے شک تو خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔

﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ مجھ سے میری نذر اور منّت کو قبول فرما۔ ''تَـقَـبَّـل'' کسی چیز کو بہ خوشی لینے کو کہتے ہیں' یہ اصل میں ''مقابلہ'' سے ہے کیونکہ ''تَـقَـبّـل'' میں بدلہ کے طور پر جزاء دی جاتی ہے۔ اور قبولیت کا سوال وہی کرتا ہے جو اپنے کام میں صرف اللہ عزوجل کی رضا اور اپنی دُعا اور عبادت میں اخلاص کی خواہش رکھتا ہو۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اس میں ''سمیع'' سے مراد یہ ہے کہ تو میری گریہ وزاری اور دُعا کو سننے والا ہے۔ اور ''علیم'' سے مراد یہ ہے کہ تو میری نیت اور جو کچھ میرے دل میں ہے اس کو جاننے والا ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾

پھر جب اُس نے لڑکی کو جنا تو (حسرت سے) کہا: اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے اور اُس نے جو کچھ جنا اللہ کو اُس کا خوب علم ہے اور (اس نے جو لڑکا مانگا تھا) وہ (پیدا ہونے والی) لڑکی کے برابر نہیں' اور بے شک میں نے اس کا نام

مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ وَضَعَتۡهَا ﴾ کا معنیٰ ہے: اُس نے اپنا حمل جنا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ حنہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوگی اس لیے "وضعتھا" فرمایا۔ حنہ کی اپنی آرزو یہ تھی کہ لڑکا پیدا ہو۔ ﴿ قَالَتۡ ﴾ یعنی حنہ نے کہا۔ ﴿ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰى ﴾ (اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے) اس سے اُن کا مقصد اپنی گذشتہ مطلق نذر پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عذر پیش کرنے کی غرض سے کہا کہ میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے۔ ان کا یہ جملہ اطلاع دینے کی غرض سے نہیں تھا کیونکہ جو کچھ ان کے پیٹ میں تھا اس کے پیدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم تھا۔

﴿ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ﴾ اُس نے جو کچھ جنا اللہ کو اس کا خوب علم ہے۔ یہاں لفظ "وضعت" میں ایک قرأت تاء کے جزم کی ہے۔ اس صورت میں یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (حنہ نے) جو کچھ جنا اس کو اس کا خوب علم ہے۔ ایک قرأت تاء کے پیش کی ہے۔ اس صورت میں یہ حضرت مریم کی والدہ کا کلام ہوگا۔ اس طور پر کہ جب انہوں نے کہا: "اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے" تو انہیں خدشہ ہوا کہ کہیں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اس جملہ کے ذریعہ انہوں نے اللہ کو خبر دی ہے۔ اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ جو کچھ میں نے جنا اللہ کو اس کا خوب علم ہے۔

آیت مذکورہ میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان افضلیت کا بیان

﴿ وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡاُنۡثٰى ﴾ (وہ لڑکا پیدا ہونے والی لڑکی کی مثل نہیں ہے۔) یعنی عبادت خانہ اور عبادت خانہ میں جو لوگ ہوتے ہیں اُن کی خدمت کرنے میں لڑکا لڑکی کی مثل نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ) مذکورہ جملہ میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے: "ولیس الانثی کالذکر" (لڑکی لڑکے کی مثل نہیں ہے)۔ اس سے لڑکے کو لڑکی پر فضیلت دینا مقصود ہے۔ کیونکہ لڑکا عبادت خانہ کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جبکہ لڑکی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ کمزور ہوتی ہے اور اُسے حیض آتا ہے اور مزید یہ کہ وہ چھپائے جانے والی چیز ہے۔ اور اُسے کسی جگہ مردوں کے ساتھ موجود ہونا بھی جائز نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ زیرِ بحث جملہ سے مراد یہ ہے کہ حضرت حنہ کے یہاں پیدا ہونے والی لڑکی لڑکے سے افضل ہے۔ گویا حضرت حنہ نے کہا کہ لڑکا میں نے اس لیے مانگا تھا تا کہ وہ مسجد کی خدمت کرے اور یہ لڑکی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اور وہ لڑکا جو میں نے مانگا تھا وہ اُس لڑکی کی مثل نہیں ہو سکتا جو اللہ کا عطیہ ہے (کیونکہ وہ لڑکی حضرت مریم علیہا السلام ہیں) اور حضرت مریم اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین اور سب سے افضل تھیں۔

مریم کا معنیٰ اُن کی زبان میں عابدہ اور خادمہ ہے یعنی عبادت اور خدمت کرنے والی۔ حضرت حنہ نے یہ نام اس لیے رکھا تا کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو دنیا کی تمام عورتوں پر فضیلت دے۔ آگے فرمایا: ﴿ اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا ﴾ میں مریم اور اس کی اولاد کو تیری حفاظت اور پناہ میں دیتی ہوں۔ ﴿ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴾ میں "رجیم" کا معنیٰ ہے: رحمت سے دور کیا ہوا اور دھتکارا ہوا (یعنی میں دھتکارے ہوئے شیطان سے مریم اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں)۔ حضرت حنہ نے جو لڑکا مانگا تھا وہ انہوں نے جب نہ پایا اور ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ و زاری کی کہ وہ مریم کو شیطان مردود سے محفوظ رکھے اور اُسے نیک اور عبادت گزار عورتوں میں شامل کر دے۔

احادیث کی روشنی میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

(۱۳) بنی آدم میں جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی پیدائش کے وقت شیطان اُسے انگلی چھوتا ہے تو وہ اس کے انگلی چھونے کی وجہ سے چیخ مارتا ہے' سوائے حضرت مریم اور ان کے فرزند (حضرت عیسٰی) کے[۱۵] پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ''وانی اعیذھا بک و ذریتھا من الشیطن الرجیم'' (میں مریم اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں)۔ (صحیح بخاری:۳۴۳۱' صحیح مسلم:۲۳۶۶' مسند احمد ج۲ص ۲۳۳' مشکوٰۃ المصابیح:۶۹۔ص۱۸)

امام بخاری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۴) بنی آدم کے ہر فرد کے پہلو میں پیدائش کے وقت شیطان اپنی دو انگلیاں چھوتا ہے۔ سوائے حضرت عیسٰی بن مریم کے کہ ان کو چھونے کے لیے گیا تو اُس نے حجاب میں اپنی انگلی چھو دی[۱۶] (صحیح بخاری:۳۲۸۶' صحیح مسلم:۲۳۶۶' مشکوٰۃ:۵۷۲۳۔ص۵۰۹)

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

پس اُسے اُس کے رب نے اچھے طریقہ سے قبول فرمایا اور اس کی بہت عمدہ پرورش فرمائی اور زکریا کو اس کا ذمہ دار بنا دیا' جب بھی زکریا اُس کے پاس (اُس کی) عبادت گاہ میں جاتے تو اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پاتے' (ایک دن) انہوں نے کہا: اے مریم! یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آتی ہیں؟ مریم نے کہا: یہ اللہ کے پاس سے آتی ہے' بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب نوازتا ہے O

''قبول حسن'' اور ''نبات حسن'' کی تفسیر

﴿ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ ﴾ اچھی طرح قبول کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حنہ سے حضرت مریم کو اس لڑکے کی جگہ قبول فرمالیا جس کو آزاد کر دیا گیا تھا۔ یعنی حضرت مریم کو قبول فرمایا اور ان سے راضی ہوا۔

﴿قبول حسن﴾ پر گفتگو کرتے ہوئے امام زجاج فرماتے ہیں کہ عربی قاعدہ کے مطابق اس طرح ہونا چاہیے: ''تقبلّھا بتقبّل'' ۔لیکن جملہ ''قَبِلَھَا قَبُوْلاً'' کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے کوئی چیز پسند آ جائے تو کہا جاتا ہے: ''قبلت الشیئی قبولا'' ۔امام ابوعمرو فرماتے ہیں کہ ''فَعُوْلٌ'' کے وزن پر ''قَبُوْلٌ'' کے سوا کوئی اور مصدر نہیں آتا۔ اور میں نے اس میں فاء پر پیش نہیں سنا۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ ''تقبُّل'' اور ''قبول'' دونوں برابر ہیں۔ یعنی دونوں سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اس کو لے لیا

۱۵ یعنی حضرت مریم اور حضرت عیسٰی (علیہما السلام) کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چھونے سے محفوظ رکھا۔ یہاں یہ وہم نہ کیا جائے کہ معاذ اللہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ نہیں رکھا۔ حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ اور بلند ہے کہ آپ تک شیطان پہنچ سکے۔ حق یہ ہے کہ یہاں نبی اکرم ﷺ بنی آدم کے عموم سے خارج ہیں۔ یعنی آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اثر سے محفوظ رکھا۔ (اشعۃ اللمعات ج۱ص۸۲)

۱۶ حجاب سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم و عیسٰی اور شیطان کے درمیان ایک پردہ کی آڑ پیدا فرمادی۔ (مراۃ المناجیح ج۷ ص۴۵۰) علامہ عینی اور دیگر شارحین کا قول یہ ہے کہ اس سے پیٹ کا وہ حصہ مراد ہے جس میں بچہ ہوتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج۱۰ص۶۳۴' مرقات ج۹ص۲۱۷) اس حدیث میں دو انگلیاں چھونے کا ذکر ہے' اس کی تشریح میں علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شیطان بنی آدم سے بہت زیادہ دشمنی رکھتا ہے اور وہ انسان کو دنیا و آخرت دونوں کے معاملات میں گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ (مرقات ج۱۰ص۲۱۷)

جائے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''تقبّل'' کا معنیٰ ہے: کسی کی پرورش کی ذمہ داری لینا اور پرورش کرنا۔ آیت میں ''قبول'' اس لیے فرمایا تا کہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں۔ یعنی ''تقبّل'' بمعنیٰ ذمہ داری لینا اور ''قَبول'' بمعنیٰ پسند کرنا۔

﴿وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ اس کا معنیٰ ہے: ''وانبتها فنبتت هي نباتا حسنا'' (اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بڑھایا تو وہ بہت اچھے طریقہ سے بڑھیں)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مریم کو اچھے طریقہ سے قبول فرمایا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اُسے خوش بختوں کے راستہ پر چلایا۔ اور اُن کی بہت عمدہ پرورش فرمائی اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسے برابر اعضاء کے ساتھ پیدا فرمایا کہ اُس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ حضرت مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھیں جتنا عام بچہ سال میں بڑھتا ہے۔

حضرت مریم کی کفالت پر قرعہ اندازی کا واقعہ

مؤرخین فرماتے ہیں کہ جب حضرت حنہ نے حضرت مریم کو جنا تو انہوں نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور لے کر بیت المقدس گئیں اور اُسے حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کے علماء کے پاس رکھ دیا۔ بیت المقدس میں ان علماء کا وہی منصب تھا جو کعبہ میں حجبہ[17] کا تھا۔ حضرت حنہ نے ان علماء سے کہا: ''دونكم النذيرة'' (منّت کی یہ بچی لے لو)۔ چونکہ حضرت مریم (علیہا السلام) ان علماء کے امام اور ان کے صاحب قربان کی بیٹی تھیں اس لیے تمام علماء نے حضرت مریم کو اپنی پرورش میں لینے کی خواہش کی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے علماء سے فرمایا کہ چونکہ اس بچی کی خالہ میرے نکاح میں ہے اس لیے اس کی پرورش کا زیادہ حق مجھے حاصل ہے۔ علماء نے ان سے کہا کہ اگر اس بچی کو اس کے ذمہ میں دیا جائے جو اس کا زیادہ حق دار ہے تو پھر اسے اس کی ماں کے ذمہ میں دیا جائے گا جس نے اس کو جنا ہے۔ البتہ ہم اس پر قرعہ اندازی کریں گے اور قرعہ اندازی میں جس کا حصہ نکل آئے گا بچی اس کے پاس رہے گی۔ چنانچہ انتیس افراد ایک بہتی نہر کی طرف گئے۔ ایک قول کے مطابق وہ اردن کی نہر تھی۔ وہاں جا کر انہوں نے اپنے قلم پانی میں اس بات پر ڈالے کہ جس کا قلم پانی میں ٹھہر کر اوپر آ جائے گا وہ مریم کی پرورش کا زیادہ حق دار ہوگا۔ ہر قلم پر ایک ایک شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگ تورات لکھتے تھے اس لیے انہوں نے وہ قلم ڈالے جو ان کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ حضرت زکریا کا قلم پانی کے اوپر آ کر ٹھہر گیا جبکہ لوگوں کے قلم نہر کے اندر نیچے چلے گئے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت زکریا کا قلم بہہ کر اوپر آ گیا اور دیگر لوگوں کے قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ نیچے چلے گئے۔ یوں حضرت زکریا (علیہ السلام) قرعہ اندازی میں لوگوں پر غالب آ گئے۔ حضرت زکریا تمام علماء کے سردار اور نبی تھے۔

''وكفلها زكريا'' میں ''كفّلها'' کی دو قرأتوں کا بیان اور حضرت زکریا کی کفالت

آیت میں جو فرمایا: ﴿وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ اس میں فاء کو تشدید اور غیر تشدید دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔ تشدید والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ نے مریم کو زکریا کی نگرانی میں دے دیا اور قرعہ اندازی کے ذریعہ مریم کو ان کے ساتھ ملا دیا۔ غیر تشدید والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ زکریا نے قرعہ اندازی کے ذریعہ مریم کو اپنے ساتھ ملا لیا اور مریم کے معاملہ کی نگہداشت کی۔

آیت میں زکریا سے مراد حضرت زکریا بن اذن بن مسلم بن صدوق ہیں جو کہ حضرت سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی اولاد میں سے ہیں۔ جب حضرت زکریا نے حضرت مریم کو اپنی پرورش میں لے لیا تو ان کے لیے ایک گھر بنایا اور ان کے لیے دودھ پلانے والی عورتوں کا انتظام کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت زکریا نے حضرت مریم کو ان کی خالہ ام یحییٰ کے ساتھ ملا دیا

---

[17] ''حَجَبَه'' اُن افراد کو کہا جاتا ہے جن کے ذمہ کعبۃ اللہ کی ''حِجَابَت'' (کلید برداری) ہوتی ہے۔ یعنی جن کے پاس کعبۃ اللہ کی کُنجیاں ہوتی ہیں اور وہ کعبۃ اللہ کو کھولنے بند کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوگئیں اور عورتوں کی عمر کو پہنچ گئیں تو ان کے لیے مسجد میں ایک محراب (یعنی عبادت کی جگہ) بنادی جس کے درمیان میں ایک دروازہ رکھا۔ اس محراب تک صرف سیڑھی کے ذریعہ جانا ممکن تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے علاوہ اس میں کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ ہر روز حضرت مریم کے پاس ان کے کھانے پینے کی اشیاء لے کر جاتے تھے۔

''محراب'' اور ''رزق'' کی تفسیر

﴿ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ﴾ ''محراب'' سے حضرت مریم کا حجرہ مراد ہے'بنیادی طور پر ''محراب'' مجلس میں وہ جگہ ہوتی ہے جو سب سے زیادہ معزز اور آگے ہو۔ اسی طرح مسجد میں بھی معزز ترین جگہ ''محراب'' ہوتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''محراب'' اس جگہ کو کہتے ہیں جس پر زینہ کے ذریعہ چڑھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام (جب حضرت مریم کے پاس سے واپس آتے تو) ان پر سات دروازے بند کرتے تھے۔

﴿ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جب حضرت زکریا حضرت مریم کے پاس عبادت گاہ میں جاتے تو ان کے پاس رزق یعنی بے موسم کے پھل پاتے۔ یعنی گرمی میں سردی کے پھل اور سردی میں گرمی کے پھل پاتے۔

﴿ قَالَ ﴾ کا فاعل حضرت زکریا ہیں اور ﴿ أَنَّى لَكِ هَذَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (حضرت زکریا ان سے پوچھتے) تمہارے پاس یہ پھل کہاں سے آتے ہیں۔ ﴿ قَالَتْ ﴾ کا فاعل حضرت مریم ہیں' یعنی حضرت مریم حضرت زکریا کو جواب دیتے ہوئے کہتیں: ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ﴾ یہ اللہ کے پاس سے ہے' یعنی جنت سے ہے۔ حضرت زکریا کہتے: یہ کہاں سے آتا ہے؟ حضرت مریم جواب دیتیں: یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ حضرت مریم نے اپنی کم عمری میں جھولے میں بات کی جیسے ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی کم عمری میں جھولے میں بات کی۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا حضرت مریم سے یہ سوال کہ تمہارے پاس یہ رزق کہاں سے آتا ہے؟۔۔۔۔۔

اس پر واقعہ اور پس منظر

محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر ایک مرتبہ قحط سالی اور تنگی آئی۔ حتیٰ کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم کی پرورش اور ان کی کفالت سے عاجز ہوگئے۔ چنانچہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے اور ان سے کہا: اے بنی اسرائیل! تم لوگ جانتے ہو کہ خدا کی قسم! میری عمر بہت ہوگئی ہے اور میں حضرت عمران کی بیٹی (یعنی مریم) کی پرورش سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب میرے بعد تم میں سے کون اس کی ذمہ داری لے گا؟ لوگوں نے کہا: خدا کی قسم! ہم مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس سال تنگی کا شکار ہیں۔ یہ کہہ کر لوگوں نے ٹال مٹول کیا پھر جب انہوں نے دیکھا کہ مریم کی پرورش ضروری ہے اور اس سے چھٹکارا نہیں ہے تو قلم کے ذریعہ آپس میں قرعہ اندازی کی۔ اس کے نتیجہ میں یوسف بن یعقوب نامی ایک بڑھئی کے نام پر قرعہ نکلا' وہ حضرت مریم کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے حضرت مریم کو اپنے ذمہ لے لیا۔ لیکن اس معاملہ کی وجہ سے اس کے چہرہ پر جو پریشانی تھی اس کو حضرت مریم نے پہچان لیا۔ حضرت مریم نے کہا: اے یوسف! اللہ عزوجل کے ساتھ اچھا گمان رکھ' یقیناً وہ عنقریب ہمیں رزق عطا فرمائے گا۔ پھر یوسف کو حضرت مریم کے تعلق کی وجہ سے رزق ملنے لگا۔ چنانچہ وہ ہر روز حضرت مریم کے پاس اپنی کمائی کا وہ حصہ لے کر آتا جو ان کے لیے ضروری ہوتا۔ جب وہ ان کے پاس محراب میں اپنی کمائی لے کر جاتا تو اللہ تعالیٰ اُس کمائی میں اضافہ فرما دیتا۔ پھر جب حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم کے پاس جاتے تو کہتے: اے مریم! یہ (چیزیں) تمہارے پاس کہاں سے آتی ہیں؟ وہ جواب دیتیں: یہ اللہ عزوجل کے پاس سے آتی ہیں۔

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ اس جملہ میں امکان ہے کہ یہ حضرت مریم کے کلام کا اختتام ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں سے اللہ عزوجل کے کلام کا آغاز ہو۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اتنا

عطا فرماتا ہے کہ کثرت کی وجہ سے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا' یا یہ مراد ہے کہ بغیر سبب کے عطا فرماتا ہے۔ ☆ زیر بحث آیت میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اولیاء کرام کی کرامات اور ان کے ہاتھوں خلافِ عادت کاموں کا ظہور ممکن ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا اولاد کی خواہش کرنا

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس اللہ کی جانب سے رزق دیکھا تو کہنے لگے کہ وہ ذات جو مریم کو بغیر کسی سبب کے بے وقت اور بے موسم پھل دینے پر قادر ہے وہ اس پر بھی ضرور قادر ہے کہ میری بیوی کو (ولادت کے) قابل بنا دے اور مجھے بڑھاپے کے باوجود بے وقت بیٹا عطا کرے۔ چونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھرانہ کے سب لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور خود حضرت زکریا بھی بڑھاپے اور اولاد کے حوالہ سے مایوسی کی عمر کو پہنچ چکے تھے اس لیے انہوں نے بیٹے کی خواہش کی۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

وہیں زکریا نے اپنے رب سے دُعا کی' عرض کی: اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما' بے شک تو دعا کو خوب سننے والا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿هُنَالِكَ دَعَا﴾ یعنی حضرت زکریا علیہ السلام محراب میں داخل ہوئے اور تمام دروازے بند کر لیے' پھر اپنے رب سے اولاد کی دُعا کی۔ اور یوں کہا: ﴿رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً﴾ یعنی اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے ''ذریة طیبة'' یعنی برکت والی' پرہیزگار' نیک اور پسندیدہ اولاد عطا فرما۔ ''ذریة'' کا لفظ واحد جمع مذکر مؤنث سب کے لیے بولا جاتا ہے' البتہ یہاں اس سے واحد مراد ہے۔ اور چونکہ یہ مؤنث ہے اس لیے ''طیبه'' بھی مؤنث ہے۔ ﴿اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ تو دعا کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۳۹﴾

تو جس وقت وہ (زکریا) محراب میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے فرشتوں نے اُنہیں آواز دی کہ اللہ تمہیں یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والے اور سردار ہوں گے اور عورتوں سے بہت بچنے والے ہوں گے اور ہمارے خاص لوگوں میں سے ایک نبی ہوں گے O

''ملائکہ'' یعنی جبریل امین کا حضرت زکریا علیہ السلام کو اولاد کی خوش خبری سنانے کا واقعہ

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ فرشتوں نے حضرت یحییٰ کو آواز دی۔ یہاں فرشتوں سے مراد جبرئیل ہیں۔ ان کی عظمتِ شان بیان کرنے کے لیے جمع کے لفظ سے ان کا ذکر فرمایا اور دوسرا اس لیے کہ وہ تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کو کہیں بھیجا جائے اور ان کے ساتھ فرشتوں کا لشکر نہ ہو (یعنی معمول یہ ہے کہ ان کو جہاں بھی بھیجا جاتا ہے فرشتوں کا لشکر ساتھ ہوتا ہے)۔ سو اس معمول کے مطابق یہاں جمع کا لفظ فرمایا گیا۔ آگے جو فرمایا: ﴿وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ﴾ اس کا

معنٰی یہ ہے کہ زکریا مسجد میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام عالم کبیر تھے' آپ قربانی پیش کرتے تھے۔ لوگوں کے لیے (بیت المقدس کا) دروازہ کھولتے تو آپ کی اجازت کے بغیر کوئی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن آپ ذبح خانہ کے پاس محراب میں نماز ادا کر رہے تھے اور لوگ داخل ہونے کے لیے اجازت کے منتظر تھے کہ اچانک آپ نے ایک نوجوان شخص کو دیکھا جو سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ آپ اُسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ تو جبریل امین نے آپ کو آواز دی: اے زکریا! اللہ تعالیٰ تمہیں یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے۔

اسی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تمہیں یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو''یحیٰی'' کہنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو''کلمة الله'' کہنے کی وجوہ

یحییٰ کی خوشخبری سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہیں ایک ایسے لڑکے کی خوش خبری دیتا ہے جس کا نام یحییٰ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ان کا نام یحییٰ اس لیے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ان کی والدہ کے بانجھ پن کو حیات بخشی۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ذریعہ ان کے دل کو زندہ فرمایا۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی فرمانبرداری کے ساتھ زندہ رکھا یہاں تک کہ کبھی بھی انہوں نے نافرمانی کا ارادہ نہیں کیا۔

آگے جو فرمایا کہ''یحییٰ اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے''اس میں اللہ کے کلمہ سے حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) مراد ہیں۔ حضرت عیسیٰ کو کلمہ اس لیے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں''کُــنْ''کہہ کر پیدا فرمایا تھا۔ لہٰذا بغیر باپ کے اُن کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت کی دلیل تھا اس لیے اُنہیں''کــلمہ''فرمایا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لیے کہا گیا کہ وہ حقائق اور خداوندی اسرار و رموز کی طرف لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے اور جس طرح لوگ کلامِ الٰہی سے رہ نمائی حاصل کرتے ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ سے رہ نمائی حاصل کی جاتی تھی اس اعتبار سے اُنہیں کلمہ قرار دیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کلمہ اس لیے قرار دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعہ حضرت مریم کو ان ہی کی (یعنی حضرت عیسیٰ کی) خوش خبری دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے پہلے آنے والے انبیاء کو ان کی آسمانی کتابوں میں یہ خبر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ بغیر باپ کے واسطہ کے ایک نبی پیدا فرمائے گا۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو کہا گیا کہ یہی وہ''کلمہ''ہیں۔ یعنی وہ وعدہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ بغیر باپ کے واسطہ کے پیدا کروں گا۔

حضرت یحییٰ کا حضرت عیسیٰ کی تصدیق کرنا

حضرت یحییٰ علیہ السلام وہ سب سے پہلے شخص ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ مہینے بڑے تھے اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے ملاقات کی۔ اس وقت دونوں کو حمل تھا۔ حضرت یحییٰ کی والدہ نے کہا: اے مریم! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں حاملہ ہوں۔ حضرت مریم نے کہا کہ میں بھی حاملہ ہوں۔ تو حضرت یحییٰ کی والدہ نے کہا: اے مریم! میں اپنے پیٹ والے کو تمہارے پیٹ والے کے آگے سجدہ کرتے ہوئے محسوس کر رہی ہوں[18] اس کو بیان کرتے ہوئے

[18] سجدہ سے تعظیماً جھکنا مراد ہے۔ یعنی میں اپنے پیٹ والے کو تمہارے پیٹ والے کی طرف تعظیماً جھکتا ہوا محسوس کر رہی ہوں اور اگر اس سے حقیقی سجدہ مراد ہو تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ گذشتہ شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی جائز تھا۔ البتہ ہماری شریعت میں یہ ناجائز اور حرام ہے۔

آیت میں فرمایا کہ ''(یحییٰ) اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے''۔ یعنی حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔

حضرت یحییٰ کا ''سیّد'' ہونا اور ''سیّد'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

آیت میں فرمایا: ﴿سَیِّدًا﴾ حضرت یحییٰ سیّد ہوں گے۔ ''سیّد'' کا لفظ ''سادیسود'' سے ہے۔ ''سیّد'' اس سردار کو کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے اور اس کی بات سے آگے نہ بڑھا جائے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام دین، علم اور حلم میں اہل ایمان کے سردار اور سربراہ تھے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''سیّد'' اُس کو کہتے ہیں جس کے اخلاق اچھے ہوں۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''سیّد'' وہ ہے جو اپنے رب کی اطاعت کرے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''سیّد'' وہ شخص ہے جو فقیہ اور عالم ہو۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''سیّد'' وہ ہے جو علم، عبادت اور پرہیزگاری میں سردار ہو۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''سیّد'' وہ بُردبار شخص ہے جو کسی بھی بات پر غصہ میں نہ آئے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''سیّد'' وہ شخص ہے جو تمام اچھائیوں میں اپنی قوم سے برتر ہو۔ اور بعض کے نزدیک ''سیّد'' وہ شخص ہے جو سخی ہو۔ چنانچہ بنوسلمہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱۵) اے بنی سلمہ! تم میں ''سیّد'' (سخی) کون ہے؟ انہوں نے کہا: جد بن قیس سخی ہے لیکن ہم اُسے بخیل قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بخل سے بڑھ کر کون سی بیماری ہے۔ ہاں تمہارا سخی عمرو بن جموح ہے۔

(الادب المفرد للامام البخاری: ۲۹۶، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۳۱۷)

حضرت یحییٰ کا ''حَصور'' ہونا اور ''حَصور'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

آیت میں فرمایا: ﴿وَحَصُوْرًا﴾ حضرت یحییٰ حَصور ہوں گے۔ ''حَصور'' کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو نہ عورتوں کے پاس آتا ہو نہ ان کے قریب ہوتا ہو۔ اس قول کی صورت میں فَعول کا وزن فاعل کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی حضرت یحییٰ نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا۔ اس لفظ کی اصل ''حَصر'' ہے بمعنیٰ روکنا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حَصور'' سے مراد عِنّین[۱۹] ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے فقیر مراد ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو۔ لہٰذا ''حصور'' بمعنیٰ ''محصور'' ہوگا۔ یعنی وہ شخص جو عورتوں کے پاس جانے سے روکا ہوا ہو۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ کپڑے کے جھالر کی طرح تھا، اس کے باوجود انہوں نے شادی کی تاکہ نگاہ کی حفاظت رہے۔

''حَصور'' کے متعلق ایک اور قول بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو طاقت رکھنے کے باوجود صرف اپنی پاک دامنی اور بے رغبتی کی وجہ سے جماع سے بچنے والا ہو۔ یہی قول صحیح ہے اور محققین کی ایک جماعت کا یہی مؤقف ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے منصب کے بھی زیادہ لائق یہی قول ہے۔ کیونکہ یہاں جو کلام ہو رہا ہے وہ مقام مدح و ثناء میں ہے۔ اور مقام مدح میں نقص کا ذکر جائز نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منصبِ نبوت اس بات سے بہت بلند ہے کہ کسی نبی کی طرف کوئی نقص یا خرابی منسوب کی جائے۔ لہٰذا آیت مبارکہ میں ''حصور'' کا یہ معنیٰ کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام مجامعت کی طاقت کے باوجود اُس سے اپنے آپ کو روکتے تھے یہ مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

---

۱۹ ''عِنّین'' نامرد کو کہتے ہیں۔ حَصور کی تفسیر میں یہ اور اس طرح کے دیگر اقوال یہاں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ یہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف و توصیف ہو رہی ہے اور تعریف و توصیف کا تقاضا یہ ہے کہ حَصور سے مراد یہ لیا جائے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام طاقت رکھنے کے باوجود محض اپنی پاک بازی کی وجہ سے عورتوں سے اجتناب کرتے تھے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام انبیاء صالحین کی اولاد میں سے ہوں گے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝۴۰

عرض کی: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کس طرح ہو گا حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے' فرمایا: بات یہی ہے (لیکن) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے O

جبریل کی نداء کے جواب میں حضرت زکریا نے ''رَبِّ'' کس سے کہا؟ اس بارے میں مفسرین کے دو اقوال

﴿ قَالَ ﴾ کا فاعل حضرت زکریا ہیں۔ ﴿ رَبِّ ﴾ کا معنیٰ ہے: اے میرے رب! بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حضرت زکریا کا جبریل سے خطاب ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جنہوں نے حضرت زکریا کو پکارا تھا وہ فرشتے تھے۔ اس قول کی صورت میں یہاں ''رب'' کا معنیٰ ہو گا: سردار اور تربیت کرنے والا (یعنی حضرت زکریا نے جبریل سے کہا: اے میرے سردار!)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حضرت زکریا کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خطاب ہے۔ اس صورت میں ''رب'' کا معنیٰ مالک ہو گا۔ یعنی ملائکہ نے جب حضرت زکریا کو خوش خبری سنائی تو اُنہیں تعجب ہوا اور اس تعجب کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور کہا: اے میرے رب! ﴿ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ ﴾ میرے ہاں کہاں سے اور کس طرح لڑکا ہو گا۔

﴿ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ ﴾ کے جملہ کے بارے میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ مقلوب ہے۔ معنیٰ اس کا یہ ہے کہ میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں اور بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہی ہے کہ مجھے بڑھاپا پہنچ چکا ہے اور کمزوری نے مجھے آلیا ہے۔

اس سوال کا جواب کہ حضرت زکریا نے اولاد کی بشارت پر حیرت کا اظہار کیوں کیا؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ملائکہ کی جانب سے اولاد کی بشارت ملنے کے باوجود اولاد کا انکار کیسے کیا؟ اور انہوں نے بات کو دوبارہ دوہرایا اس کا کیا مطلب ہے؟ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اولاد کا وعدہ فرما دیا تھا تو انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیوں کیا؟ کیا اُنہیں اللہ کے وعدہ اور اس کی قدرت میں شک تھا؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور اس کی قدرت میں کوئی شک نہیں تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ کیفیت دریافت کرنے کی غرض سے تھا۔ یعنی میرے ہاں لڑکا کس طرح ہو گا؟ آیا اس طرح ہو گا کہ میری بیوی کا بانجھ پن ختم ہو جائے گا اور میری جوانی لوٹ آئے گی یا اس طرح ہو گا کہ ہم دونوں اپنی اپنی حالت پر رہیں گے اور لڑکا پیدا ہو گا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴾ (بات یہی ہے (لیکن) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) (یعنی تم دونوں اپنی اپنی حالت پر رہو گے اور لڑکا پیدا ہو گا)۔

حضرت عکرمہ اور امام سدی فرماتے ہیں کہ جب حضرت زکریا نے فرشتوں کی نداء کو سُنا تو ان کے پاس شیطان آیا اور کہنے لگا: اے زکریا! بے شک جو آواز آپ نے سُنی وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے بلکہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اگر وہ اللہ

تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو ضرور وہ اُسے آپ کی طرف وحی کرتا جیسا کہ تمام معاملات میں وہ آپ کی طرف وحی فرماتا ہے۔تو شیطان کے اس وسوسہ کو دور کرنے کے لیے حضرت زکریا نے عرض کیا کہ اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کس طرح ہوگا۔

ملائکہ اور شیطان کی گفتگو کا انبیاء علیہم السلام پر خلط ملط ہونا ممکن ہے یا نہیں؟

مذکورہ جواب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ فرشتوں کا کلام اور شیطان کی گفتگو انبیاء کرام علیہم السلام پر خلط ملط ہو جائے۔ اگر ہم اس کو ممکن ٹھہرائیں تو انبیاء کرام آسمانی وحی سے جو باتیں بتاتے ہیں اُن باتوں سے یقین ختم ہو جائے گا؟ اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دلائل سے جب یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء کرام فرشتہ کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو باتیں بتاتے ہیں اُن باتوں میں وہ سچے ہوتے ہیں تو اس میں شیطان کی مداخلت کی گنجائش ہی نہیں ہے۔لیکن یہ اُن امور میں ہیں جو دین سے اور احکام شرعیہ سے تعلق رکھتے ہوں' جہاں تک اُن امور کا معاملہ ہے جو دُنیا سے اور اولاد سے متعلق ہیں اُن میں وسوسہ کا حصول ممکن ہے۔ اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں شیطان کی جانب سے جب مذکورہ وسوسہ آیا تو انہوں نے سوال کیا کہ میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟

اولاد کی بشارت کے وقت حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی زوجہ کی عمر

کلبی کہتے ہیں کہ جس دن حضرت زکریا علیہ السلام کو اولاد کی خوشخبری دی گئی اس دن اُن کی عمر ۹۲ سال تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی عمر اُس دن ۹۹ سال تھی۔ضحاک کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اُن کی عمر ۱۲۰ سال تھی اور ان کی زوجہ کی عمر ۹۸ سال تھی۔اس کو بیان کرتے ہوئے حضرت زکریا نے کہا: ﴿ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ﴾ میری بیوی بانجھ ہے' بچہ جننے کے قابل نہیں ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ (بات یہی ہے (لیکن) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ بڑھاپے میں بھی اولاد عطا کرنے پر قادر ہے' وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' کوئی چیز اُسے عاجز نہیں کر سکتی۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ۠﴿۴۱﴾

عرض کی: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے' فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے صرف اشارہ سے بات کرسکو گے' اور تم کثرت سے اپنے رب کا ذکر اور شام و صبح اس کی پاکیزگی بیان کرتے رہنا ○

﴿ قَالَ ﴾ کا فاعل حضرت زکریا ہیں (یعنی حضرت زکریا نے کہا)۔﴿ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ﴾ اے میرے رب! میرے لیے کوئی آیت مقرر فرما دے۔یعنی ایسی علامت مقرر فرما دے جس سے مجھے اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کا وقت معلوم ہو جائے اور میں اس وقت میں تیرے حضور زیادہ عبادت اور شکر ادا کروں۔ آگے جو فرمایا: ﴿ اٰیَتُكَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا سے فرمایا کہ) جس بات کو تم جاننا چاہتے ہو اس پر تمہاری نشانی یہ ہے کہ ﴿ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ﴾ (تم تین دن تک لوگوں سے گفتگو نہیں کرو گے) یعنی تین دن تین رات تک تمہیں لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا تین دن تک لوگوں سے گفتگو نہ کرنا

جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زبان تین دن تک لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے سے بند رہی جبکہ تسبیح اور ذکر و اذکار کی طاقت ان میں برقرار تھی۔اس لیے آیت کے اختتام پر فرمایا کہ ''تم کثرت سے اپنے رب کا ذکر اور شام و

صبح اس کی پاکیزگی بیان کرتے رہنا''۔ یعنی ان ایام میں جن میں تمہیں لوگوں سے گفتگو کرنے سے روکا گیا ہے اُن میں ذکر اور تسبیح کرتے رہنا۔ یہ بات روشن نشانیوں اور کھلے معجزات میں سے تھی' کیونکہ حضرت زکریا کا تسبیح اور ذکر واذ کار کی طاقت رکھنا اور جسمانی صحت اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود لوگوں کے ساتھ دنیاوی معاملات کے بارے میں گفتگو کرنے کی طاقت نہ رکھنا عظیم ترین معجزات میں سے ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے سے جو روکا گیا اس کی وجہ یہ تھی تا کہ وہ مذکورہ ایام میں صرف اللہ عزوجل کی عبادت اور اس کی یاد میں رہیں اور اپنی زبان کو کسی اور چیز میں مصروف نہ کریں۔ تا کہ اس کی جانب سے (اولاد ملنے کی) اس عظیم نعمت کا بھرپور طریقہ سے حق ادا ہو اور جس کام کی خاطر انہوں نے نشانی طلب کی تھی اس کے پورا ہونے پر اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر ادا ہو۔ لوگوں کے ساتھ گفتگو سے روکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کیفیت حمل کے وجود پر دلیل بن جائے تا کہ اس سے ان کی خوشی مکمل ہو۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت زکریا کو ان کے سامنے فرشتوں نے اولاد کی خوش خبری دی تھی اس کے باوجود انہوں نے نشانی کا سوال کیا اس پر بہ طور عقوبت (یعنی گرفت کے طور پر) اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کلام کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ وہ تین روز تک کلام نہ کر سکے[۲۰]۔

''رمز'' کی تفسیر اور حضرت زکریا کا اشاروں سے گفتگو کرنا

آیت میں جو ﴿ اِلَّا رَمْزًا ﴾ فرمایا اس میں ''رمــــز'' کا معنیٰ اشارہ ہے (یعنی تین دن تک تم لوگوں سے صرف اشارہ سے بات کر سکو گے)۔ اشارہ کبھی ہاتھ سے' کبھی آنکھ سے اور کبھی سر سے ہوتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ کبھی اشارہ زبان سے بھی ہوتا ہے لیکن اس میں گفتگو واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ کسی چیز کی آہٹ کی مانند ہلکی آواز ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ تین دن صرف اشاروں کے ذریعہ بات کرنے سے مراد تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جب روزہ رکھتے تھے تو گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ان تمام اقوال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اہل لغت اس پر متفق ہیں۔

حضرت زکریا کا تین دن تک کلام کرنے کی بجائے کثرت سے اللہ کا ذکر اور اس کی تسبیح کرنا

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو مذکورہ تین دنوں میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا تو اُنہیں ذکر کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنے رب کا کثرت سے ذکر کرتے رہنا''۔ کیونکہ اس سے نہ تمہیں روکا جائے گا نہ تمہارے اور ذکر کے درمیان کوئی چیز حائل ہوگی۔ ﴿ سَبِّحْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عظمت اور عیوب سے اس کا پاکیزہ ہونا بیان کرتے رہنا۔ بعض علماء کے نزدیک ''سبّح'' کا معنیٰ ہے: تم اپنے رب کے حضور نماز پڑھتے رہنا۔ چونکہ نماز میں بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی پاکیزگی کا بیان ہے اس لیے نماز کو تسبیح قرار دیا گیا۔ آخر میں جو ﴿ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ﴾ فرمایا اس میں ''عشی'' سے مراد سورج ڈھلنے سے غروب تک کا وقت ہے۔ اسی بنیاد پر ظہر اور عصر کی نماز کو ''صلاۃ العشّی'' کہا جاتا ہے۔ اور ''اِبکار'' سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا درمیانی وقت ہے۔

---

[۲۰] مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ رحمۃ الباری نے حضرت قتادہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے نشانی طلب کرنا اس لیے تھا تا کہ وہ ولادت کے ایام میں صرف اللہ عزوجل کی یاد اور شکر میں مشغول رہیں۔ مذکورہ نشانی دے کر اللہ تعالیٰ نے اُن کے ارادہ کی تائید فرمائی کہ چونکہ آپ ہمارا ذکر چاہتے ہیں اس لیے ہم آپ کو صرف ذکر میں مشغول رکھنے کے لیے آپ کی زبان کو تین دن تک دوسری گفتگو سے روک دیں گے۔ اگر عتاب (اور گرفت) کے طور پر زبان بند ہوتی تو زبان مبارک کو ہر قسم کے کلام سے روک دیا جاتا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے: تفسیر نعیمی زیر بحث آیت' جزء۳ ص۴۰۰)

وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰٮكِ وَطَهَّرَكِ وَاصۡطَفٰٮكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۲﴾

اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں چُن لیا ہے اور خوب پاکیزہ کر دیا ہے اور تمام جہان کی عورتوں میں تمہیں منتخب کر لیا ہے O

﴿اَلۡمَلٰٓئِكَةُ﴾ سے مراد جبریل امین ہیں۔ یعنی حضرت جبریل نے کہا: اے مریم! ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰٮكِ﴾ (اللہ نے) تمہیں منتخب کر لیا۔ ﴿وَطَهَّرَكِ﴾ اور (اللہ نے) تمہیں مردوں کے چھونے سے پاک فرمایا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں حیض و نفاس سے پاک فرمایا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کو ماہواری نہیں آتی تھی۔ بعض کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں گناہوں سے پاک فرمایا ہے۔ آیت میں دوسری مرتبہ جو ﴿وَاصۡطَفٰٮكِ﴾ ہے اس کا معنیٰ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے۔ ﴿عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کے زمانوں کی عورتوں پر منتخب فرمایا۔ بعض کے نزدیک اس سے تمام جہان کی عورتیں مراد ہیں۔

آیت مذکورہ میں حضرت مریم کے انتخاب اور چناؤ کا دو مرتبہ ذکر فرمانا اور ان دونوں میں وجہ فرق

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ آیتِ بالا میں دو مرتبہ جو ''اصطفاء'' یعنی منتخب فرمانے کا ذکر آیا ہے ان دونوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علماء نے ان دونوں کے معنیٰ میں ایسی وجوہ ذکر فرمائی ہیں جن سے ان کے درمیان فرق قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ پہلے ''اصطفاء'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو منتخب فرمایا اور اُن کو اس حال میں قبول فرمایا کہ ان کی منت مانی گئی تھی اور اُن کو مسجد کی خدمت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا جبکہ ان سے پہلے کسی عورت کو (مسجد کی خدمت کے لیے) وقف نہیں کیا گیا اور نہ ان سے پہلے کسی عورت کو یہ (اعزاز) دیا گیا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے اُن کی طرف ان کے کھانے پینے کی اشیاء بھیجیں۔ دوسرے ''اصطفاء'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بغیر باپ کے واسطہ کے عیسیٰ علیہ السلام عطا کیے اور فرشتوں کا کلام سنایا۔ یہ (اعزاز بھی) حضرت مریم کے سوا کسی اور عورت کو حاصل نہیں ہوا۔

حضرت مریم اور دیگر چند نامور خواتین اسلام کے فضائل

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

(۱۶) آسمان و زمین کے درمیان تمام عورتوں میں سب سے بہترین عورت مریم بنت عمران ہے اور آسمان و زمین کے درمیان تمام عورتوں میں سب سے بہترین عورت خدیجہ بنت خُویلد ہے۔[21]

(صحیح بخاری: ۳۴۳۲، صحیح مسلم: ۲۴۳۰، سنن ترمذی: ۳۸۷۷، مسند احمد ج ۱ ص ۸۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۱۸۴۔ ص ۵۷۳)

اس حدیث میں ''خیر نساءھا'' کے الفاظ ہیں۔ ابو کریب کہتے ہیں کہ وکیع نے اس کو بیان کرتے ہوئے آسمان اور

[21] حضرت شیخ محقق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت مریم اور حضرت خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اپنی اپنی امت میں سب سے بہترین خواتین ہیں۔ لیکن یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ان دونوں میں باہم ایک دوسرے سے افضل کون ہے؟ البتہ تفسیر نسفی سے منقول ہے کہ صحیح قول کے مطابق حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں، حضرت مریم (علیہا السلام) سے افضل ہیں۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۷۰۲)

زمین کی طرف اشارہ کیا۔ بعض کے نزدیک اس اشارہ سے وکیع کا مقصد یہ تھا کہ "خیر نسائھا" میں ضمیر (ھا) کی وضاحت ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ حضرت مریم اور حضرت خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) آسمان اور زمین کے درمیان موجود تمام عورتوں سے بہتر ہیں۔ شیخ محی الدین نووی فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ حضرت مریم اور حضرت خدیجہ دونوں اپنے زمانہ میں روئے زمین کی تمام عورتوں سے بہترین ہیں۔ رہا یہ کہ دونوں میں سے آپس میں کون افضل ہے؟ سو اس بارے میں (زیر بحث حدیث میں) سکوت ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

(۱۷) مَردوں میں بہت سارے کامل ہوئے اور عورتوں میں مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا کوئی عورت کامل نہیں ہوئی [۲۲] اور تمام عورتوں پر عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے کھانے کی تمام قسموں پر ثَرید کی فضیلت [۲۳]

(صحیح بخاری: ۳۴۳۳، صحیح مسلم: ۲۴۳۱، سنن ترمذی: ۱۸۳۴، سنن ابن ماجہ: ۳۲۸۰، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۴، مشکوٰۃ: ۵۷۲۴، ص ۵۰۹)

علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کے کھانے کا جو ثَرید بنایا جائے وہ شوربے سے افضل ہے اور گوشت کا ثَرید اس کے اس شوربے سے افضل ہے جس کا ثَرید نہ بنایا جائے اور جس میں گوشت ہی نہ ہو اس کا ثَرید اس کے اُس شوربے سے افضل ہے جس کا ثرید نہ بنایا جائے۔ اور تمام عورتوں پر حضرت عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے ثرید کو کھانے کی دیگر چیزوں پر فضیلت ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ حضرت مریم اور حضرت آسیہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ اس حدیث سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ اس اُمت کی تمام عورتوں سے افضل ہیں۔

۲۲ یعنی حضرت مریم اور حضرت آسیہ کے زمانہ میں کوئی عورت ان سے زیادہ کامل نہیں ہوئی۔ لہٰذا حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہن) بہرحال حضرت مریم اور حضرت آسیہ (علیہما السلام) سے افضل ہیں۔ (مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۴۵۰)
حضرت شیخ محقق فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم اور حضرت آسیہ دُنیا کی تمام عورتوں سے حتیٰ کہ ازواجِ مطہرات سے بھی افضل ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں عورتوں سے حضرت مریم اور حضرت آسیہ کے زمانہ کی عورتیں مراد ہیں یا یہ حدیث اُس زمانہ کی ہے جب کہ ازواج مطہرات کی فضیلت میں اللہ عزوجل کی جانب سے وحی نازل نہیں ہوئی تھی یا ازواج مطہرات اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے فضائل میں دیگر جو احادیث مبارکہ وارد ہیں اُن کی بناء پر زیر بحث حدیث کے عموم سے حضرت فاطمہ اور ازواجِ مطہرات مستثنیٰ ہیں۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۴۵۹)

۲۳ ثَرید اُس کھانے کو کہتے ہیں جو شوربے میں روٹی بھگونے سے تیار ہوتا ہے۔ علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ ثَرید اہل عرب کا سب سے بہترین کھانا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے سب سے زیادہ وہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال ثَرید سے دی۔ (مرقات ج ۹ ص ۱۴۷) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت کا ثبوت ہے، افضلیت کا ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی افضلیت کو ثرید سے تشبیہ نہیں دی بلکہ اُن کی فضیلت کو ثَرید کی فضیلت سے تشبیہ دی ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۴۵) علامہ عینی کی مراد یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بے شمار فضائل کی مالک ضرور ہیں لیکن اس بنیاد پر وہ حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے افضل نہیں ہیں۔ خود علامہ عینی نے آگے اس بات پر دلائل ذکر کیے ہیں کہ حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے افضل ہیں۔ مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں کہ اس میں گفتگو ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ، فاطمۃ الزہراء اور خدیجۃ الکبریٰ ان تینوں میں افضل کون ہے؟ محققین علماء فرماتے ہیں کہ یہ تینوں مختلف جہات سے افضل ہیں، اس میں بحث نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۴۵۱)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۸) تمام جہان کی عورتوں میں تمہیں مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد (ﷺ) اور فرعون کی بیوی آسیہ کافی ہیں[۲۴] (سنن ترمذی:۳۸۷۸، مسند احمد ج۳ ص۱۳۵، المستدرک ج۳ ص۱۵۷، مشکوٰۃ:۶۱۹۰، ص۵۷۳)

یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾

اے مریم! (ادب اور اخلاص کے ساتھ) اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو○

﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ﴾ یعنی فرشتوں نے حضرت مریم سے براہِ راست کہا کہ اپنے رب کی فرمانبرداری کرو۔ بعض کے نزدیک "اقنتی" کا معنیٰ ہے: اپنے رب کے لیے نماز میں قیام کو طویل کرو۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ جب فرشتوں نے حضرت مریم سے مذکورہ جملہ کہا تو انہوں نے اتنا قیام کیا کہ ان کے قدم سُوج گئے اور اُن سے خون بہنے لگا۔ حضرت مجاہد سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے۔

آیت مذکورہ میں حضرت مریم کو رکوع سے پہلے سجدہ کا حکم دینے کی توجیہ

﴿وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾ سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ چونکہ واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتا ہے اور صرف جمع کے لیے آتا ہے اس لیے یہاں سجدہ کو رکوع سے پہلے بیان فرمایا۔ گویا حضرت مریم سے یوں کہا گیا کہ تم رکوع اور سجود کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ سجدہ کو رکوع سے پہلے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھے۔ ابن الانباری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو ایک اختیاری حکم دیا ہے اور اچھے کام کرنے کی ترغیب فرمائی ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ کسی حالت میں سجدہ کرلیا کرو اور کسی حالت میں رکوع۔ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ نہیں ہے کہ سجدہ رکوع سے پہلے کیا جائے بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ دو حالتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک عمومی حکم دیا جائے۔

آیت مذکورہ میں "راکعات" کی بجائے "راکعین" فرمانے کی توجیہ

رہا یہ کہ آیت میں "راکعین" فرمایا "راکعات" کیوں نہیں فرمایا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "راکعین" کا لفظ عام ہے اس میں مرد اور عورتیں سب داخل ہیں۔ اور مردوں کے ساتھ نماز زیادہ افضل اور باعثِ کمال ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ اے مریم! تم بھی اسی طرح رکوع کرو جس طرح رکوع کرنے والے کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے باجماعت نماز ادا کرنا مراد ہے۔ یعنی اے مریم! تم جماعت میں نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ نماز ادا کرو۔

[۲۴] یہ بات تو واضح ہے کہ حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) حضرت مریم اور حضرت آسیہ (علیہما السلام) سے افضل ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں افضل کون ہے؟ علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ امام سبکی سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ بنت محمد ﷺ سب سے افضل ہیں، پھر اُن کی والدہ حضرت خدیجہ اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ علامہ علی قاری مزید فرماتے ہیں کہ ابن العماد کے بہ قول والدہ ہونے کے اعتبار سے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت فاطمہ سے افضل ہیں اور جنتی عورتوں کی سرداری کے اعتبار سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا افضل ہیں۔ (مرقات ج۹ ص۷۱۵)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴿۴۴﴾

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم خفیہ طور پر آپ کو بتاتے ہیں اور آپ اُن کے پاس (اُس وقت) نہیں تھے جب وہ (قرعہ کے لیے) اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے گا اور نہ ہی آپ اُن کے پاس اُس وقت تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھےO

نبی اکرم ﷺ پر اللہ عزوجل کی وحی سے غیب کی خبروں کا آنا

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ﴾ اللہ عزوجل سیدنا محمد ﷺ سے فرما رہا ہے کہ جو کچھ میں نے آپ کو زکریا' یحییٰ' مریم اور عیسیٰ (علیہم السلام) کی باتیں بتائیں وہ غیب کی خبروں میں سے ہیں۔ ﴿نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! یہ خبریں ہم آپ کی طرف ڈالتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ ہماری وحی کے بغیر آپ گذشتہ امتوں کی خبریں جان لیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ''نوحیہ'' اس لیے فرمایا کہ ''ہ'' ضمیر ''ذالک'' کی طرف راجع ہے۔ اور اسی لیے ''ذالک'' کا لفظ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

﴿مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ وہاں اُن کے پاس نہیں تھے۔ ﴿اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ جب وہ قرعہ اندازی کی غرض سے پانی میں اپنے وہ قلم ڈال رہے تھے جن سے وہ لکھا کرتے تھے۔ ﴿اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ﴾ (وہ اس بات پر قرعہ ڈال رہے تھے کہ) کون مریم کی پرورش اور اس کے معاملات کی نگہداشت کرے گا۔

حضرت مریم کی کفالت کے لیے لوگوں کے باہمی جھگڑے اور قرعہ اندازی کی وجہ

یہ بات کہ حضرت مریم کی کفالت میں وہ لوگ کیوں جھگڑ رہے تھے حتیٰ کہ اُنہیں قرعہ اندازی کرنا پڑی' اس کی وجہ بعض علماء نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت مریم حضرت عمران کی بیٹی تھیں اور حضرت عمران لوگوں کے سردار اور ان کے بڑے تھے۔ اس وجہ سے لوگ حضرت مریم کو اپنی کفالت میں لینا چاہ رہے تھے۔ بعض علماء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ حضرت مریم کو اللہ عزوجل کی عبادت اور مسجد کی خدمت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا اور ان کے والد (حضرت عمران) بھی وصال فرما گئے تھے اس لیے لوگ اُنہیں اپنی کفالت میں لینا چاہ رہے تھے۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ اس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب وہ مریم کی کفالت اور اس کی پرورش کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىٕكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ﳓ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴿۴۵﴾

(یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایک کلمہ کی خوش خبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے (وہ) دنیا اور آخرت میں باعزت ہوگا اور قرب والوں میں سے ہوگاO

اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ اُس وقت اُن کے پاس نہیں تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے اور نہ ہی اس وقت آپ اُن کے پاس تھے جب فرشتوں نے یعنی جبرئیل علیہ السلام نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تمہیں اپنے پاس

سے ایک کلمہ کی خوش خبری دیتا ہے۔

﴿یُبَشِّرُکِ﴾ بشارت سے ہے اور بشارت کا معنیٰ ہے: ''اخبار المرء بما یسرّہ من خیر'' (یعنی کسی شخص کو ایسی اچھی بات کی خبر دینا جو اُسے خوش کر دے)۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''بکلمۃ منہ'' کہہ کر اپنا کلمہ قرار دینا اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (اے مریم! اللہ تمہیں) اپنی جانب سے ایک پیغام کی اور اپنے پاس سے بھلائی کی خوش خبری دیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ ''القی الّی فلان کلمۃ سرنی بھا واخبرنی خبرافرحت بہ'' (یعنی فلاں شخص نے مجھ تک ایسی بات پہنچائی جس کے ذریعہ اس نے مجھے خوش کر دیا اور مجھے ایسی خبر دی جس سے میں خوش ہو گیا)۔

زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ فرشتوں نے مریم سے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایک خوش خبری دیتا ہے۔ وہ خوش خبری ایک بچہ ہے جو شوہر اور کسی مذکر کے بغیر تمہارے ہاں پیدا ہو گا۔ اُس بچہ کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے۔

''بکلمۃ منہ'' کی تفسیر میں حضرت قتادۃ فرماتے ہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا قول ''کُن'' مراد ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ ''کُن'' سے پیدا ہوئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ''کلمہ'' قرار دیا۔ جیسے جب کوئی چیز اللہ تعالیٰ مقدر فرمادے تو کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی تقدیر اور اس کا فیصلہ ہے۔ یعنی اس کی تقدیر اور اس کے فیصلہ سے یہ کام رونما ہوا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ''کلمۃ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ اُنہیں کلمہ اس لیے کہا گیا کہ وہ کلمۂ کُن سے وجود میں آئے تھے۔

صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا کلمہ کیوں قرار دیا گیا جبکہ ساری مخلوق کلمۂ کُن ہی کے واسطہ سے وجود میں آئی ہے؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کیوں قرار دیا گیا جبکہ ساری مخلوق کلمۂ کُن ہی کے واسطہ سے وجود میں آئی ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اگر چہ ہر مخلوق کی پیدائش کلمۂ کُن کے واسطہ سے ہوئی ہے لیکن یہ پیدائش کا معروف سبب نہیں ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر کسی واسطہ کے صرف کلمۂ کُن سے ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی پیدائش کو کلمۂ کُن کی طرف نسبت دینا یقیناً بہت جامع اور کامل بات ہے۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ ﴿اسْمُهُ﴾ کی ضمیر کلمہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور کلمہ مؤنث ہے' اس کے باوجود ضمیر کو مذکر کیوں لایا گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ (اگر چہ کلمہ مؤنث ہے لیکن) جس شخصیت کا نام ''کلمہ'' رکھا گیا ہے وہ مذکر ہے اس لیے ''اسمہٗ'' میں ضمیر کو مذکر لایا گیا۔

اگر یہ سوال ہو کہ ﴿الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ﴾ میں عیسیٰ اُن کا نام ہے' مسیح لقب ہے اور ابن مریم صفت ہے' پھر آیت میں پورے کو نام کیسے قرار دیا گیا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''اسمہ'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔ اور ہر شخص کی کوئی نہ کوئی ایسی علامت ہوتی ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے اور دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ گویا (''اسمہ المسیح عیسٰی ابن مریم'' کہہ کر) اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ حضرت عیسیٰ جس چیز سے پہچانے جائیں گے اور اپنے ماسوا سے ممتاز ہوں گے وہ چیز مذکورہ تین (الفاظ) کا مجموعہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح قرار دینے کی متعدد وجوہ

اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''مسیح'' کیوں فرمایا گیا؟ آیا یہ لفظ مشتق ہے یا موضوع؟ (یعنی عربی ہے یا عربی بنایا گیا ہے؟)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اسے عربی بنایا گیا ہے۔ اس کی اصل عبرانی زبان میں مشیح ہے۔ اہل عرب نے اس کو بدل کر مسیح کر دیا۔ اسی طرح لفظ ''عیسیٰ'' کی اصل ایشوع ہے اور ''موسیٰ'' کی اصل مُوشی یا مِیشی ہے۔ اکثر علماء کا مؤقف یہ ہے کہ ''مسیح'' اسم مشتق ہے (یعنی عربی مصدر سے مأخوذ ہے)۔ پھر اس کی علماء نے کئی توجیہات ذکر کی ہیں:
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے ہوا کہ وہ جس آفت زدہ کو ہاتھ پھیرتے تھے وہ صحیح ہو جاتا تھا۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے برکت حاصل کی جاتی تھی اس لیے انہیں مسیح فرمایا گیا۔ بعض نے یہ وجہ بیان کی کہ اُنہیں تمام آلودگیوں سے دور کر دیا گیا تھا اور تمام گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا اس لیے اُنہیں مسیح کا نام دیا گیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ وہ چونکہ اپنی والدہ کے پیٹ سے اس حال میں آئے تھے کہ ان پر تیل مَلا ہوا تھا اس لیے انہیں مسیح کا نام دیا گیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ چونکہ جبریل علیہ السلام نے ان پر اپنے پر پھیرے تھے تاکہ شیطان کو ان پر کوئی راستہ نہ ملے اس لیے اُنہیں مسیح کا نام دیا گیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ چونکہ وہ زمین میں سیر و سیاحت کرتے تھے اور کسی ایک جگہ قیام نہیں فرماتے تھے اس لیے اُنہیں مسیح فرمایا گیا گویا وہ مسح ارض کرتے تھے یعنی زمین کی مسافت طے کرتے تھے۔ اس قول کی صورت میں مسیح کا میم زائدہ ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ مسیح القدمین تھے یعنی ان کے تلوے ہموار تھے اور پیروں کے درمیان میں خالی جگہ نہیں تھی اس لیے اُنہیں مسیح کا نام دیا گیا اور دجّال کو مسیح کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس کی آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ مسیح کا معنیٰ ''صدیق'' ہے (یعنی بہت سچا)۔ اس معنیٰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کا نام دیا گیا۔ اور کبھی کبھی مسیح کا معنیٰ کذاب ہوتا ہے (یعنی بہت جھوٹا) اس معنیٰ میں دجال کو مسیح کہا گیا ہے۔ اس قول کی صورت میں مسیح کا لفظ اضداد میں شمار ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیوی اور اخروی عزت و وجاہت اور مقرب ہونے کی تفسیر

آیت میں فرمایا: ﴿وَجِیْهًا﴾ اس کا معنیٰ ہے: معزز' بلند مرتبہ' قدر و منزلت والا۔ ﴿فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (دنیا اور آخرت دونوں میں حضرت عیسیٰ معزز اور باوجاہت ہوں گے) دُنیا میں ان کی وجاہت یہ ہے کہ اُنہیں نبی بنایا گیا۔ مزید یہ کہ وہ مادر زاد اندھے اور کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے تھے اور مُردے زندہ کر دیتے تھے۔ آخرت میں اُن کی وجاہت اس طرح ہوگی کہ اللہ عزوجل کے حضور ان کا مرتبہ بلند ہوگا۔ اسی کو بیان کرتے ہوئے آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ یعنی وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقربین میں سے ہوں گے۔ کیونکہ اہل جنت کے لیے کئی مراتب اور درجات ہیں اور ان میں انبیاء کرام (علیہم السلام) کے مراتب اور درجات دیگر مخلوق سے زیادہ بلند ہوں گے۔ (''ومن المقربین'' کی تفسیر میں) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو اس بات پر خبردار کرنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ بلند ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں آسمان پر اٹھا لیا ہے۔

وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۴۶﴾

اور وہ لوگوں سے گہوارے میں بات کرے گا اور پختہ عمر میں (بھی) اور (وہ) خاصوں میں سے ہوگا O

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے گہوارے میں لوگوں سے کلام

﴿فِی الْمَهْدِ﴾ (گہوارہ) سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کم عمری میں لوگوں سے گفتگو کریں گے جب کہ ابھی وہ جھولے میں

ہوں گے۔ یعنی گفتگو کرنے کے زمانہ سے پہلے ہی وہ گفتگو کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں جو گفتگو کی اس کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ۝ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪ۖ۝ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝

(مریم: ۳۰-۳۳)

(عیسیٰ نے) کہا: بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں' اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہےO اور اس نے مجھے با برکت بنایا ہے خواہ میں کہیں بھی ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے جب تک میں زندہ ہوںO اور مجھے اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے والا بنایا ہے اور مجھے متکبر بد بخت نہیں بنایاO اور مجھ پر سلامتی ہو جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مجھے موت آئے اور جس دن میں (دوبارہ) زندہ اٹھایا جاؤں گاO

نیز الزامات لگانے والوں نے اُن کی والدہ (حضرت مریم علیہا السلام) پر جو تہمت لگائی اس سے حضرت مریم کے بَری اور پاک ہونے کا اعلان انہوں نے اپنے گہوارے میں کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مریم نے فرمایا: جب میں اور عیسیٰ تنہا ہوتے تھے تو وہ مجھ سے بات کرتے تھے اور میں اُن سے بات کرتی تھی اور جب وہ میرے پیٹ میں تھے اس وقت اگر کوئی شخص اُن سے میری توجہ ہٹا دیتا تو وہ تسبیح کرنے لگ جاتے اور میں اس تسبیح کو سُنا کرتی تھی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ کے بَری اور پاک ہونے کا اعلان کیا تو اس کے بعد وہ (اپنے گہوارے میں) خاموش ہو گئے' پھر انہوں نے اسی وقت گفتگو کا آغاز کیا جب بچے بولنا شروع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ دیر گفتگو کی پھر وہ خاموش ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے اسی وقت گفتگو کی جب وہ گفتگو کی عمر کو پہنچے۔

''کھل'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

زیر بحث آیت میں جو ﴿ کَھْلًا ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں سے حالت کہولت (پختہ عمر) میں بھی گفتگو کریں گے۔ لغت میں ''کھل'' سے مراد وہ شخص ہے جس کی طاقت اکٹھی ہو جائے اور جوانی کمال کو پہنچ جائے۔ اہل عرب کے نزدیک ''کھل'' وہ شخص ہے جس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''کھل'' وہ شخص ہے جس کے سر کے بال کھچڑی ہو جائیں (یعنی سیاہی کے ساتھ ساتھ سفیدی آ جائے)۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں عقل پختہ ہوتی ہے اور انبیاء کرام اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس سال کی عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں رسالت عطا فرمائی' وہ تیس ماہ تک اپنی رسالت میں رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اٹھا لیا۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں تیسویں سال کے آغاز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی' پھر وہ تین سال تک اپنی نبوت میں رہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اٹھا لیا۔

پختہ عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لوگوں سے گفتگو کرنا اور آیت میں اس کے ذکر کے فوائد

زیر بحث آیت میں جو گہوارے اور پختہ عمر میں گفتگو کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گہوارے میں اپنی والدہ کے بَری اور پاک ہونے کے متعلق لوگوں سے گفتگو کریں گے جو کہ ایک عظیم معجزہ ہے اور پختہ عمر میں لوگوں سے دعوت و تبلیغ اور رسالت کے متعلق گفتگو کریں گے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: زیر بحث آیت میں حضرت مریم کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے اُنہیں بتادیا کہ عیسیٰ اپنی عمر کے پختہ ہونے تک باقی رہیں گے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوں گے۔ اگر عیسیٰ (علیہ السلام) خدا ہوتے جیسا کہ عیسائیوں کا گمان ہے تو ان پر تغیر و تبدل نہ آتا۔ لہٰذا اس آیت میں ان عیسائیوں کا رد ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں کہ آیت میں ''و کھــلا'' سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہونے کے بعد (بھی) لوگوں سے کلام کریں گے۔ اور اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ''کھل'' کا معنیٰ ہے: حلیم (بُردبار شخص)۔ اہل عرب کہولت (پختہ عمری) کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ یہ ایسی حالت ہوتی ہے جو زندگی کے تجربات، عقل کی پختگی، رائے اور تجربہ کی عمدگی میں بہت بہترین ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان کردہ اوصاف میں ان کے صالح ہونے کو سب سے آخر میں بیان کرنے کی وجہ

آخر میں فرمایا: ﴿وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام صالح بندوں میں سے ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء کرام (علیہم السلام)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عظیم اوصاف بیان فرمائے اس کے بعد اختتام اس بات پر فرمایا کہ وہ صالحین میں سے ہیں، ایسا اس لیے کیا گیا کہ صالح ہونا تمام مراتب میں سب سے عظیم اور تمام مقامات میں سب سے بلند مرتبہ ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخص کو اسی وقت صالح کہا جا سکتا ہے جب وہ اپنے تمام اقوال اور اعمال میں انتہائی درست طریقے اور کامل ترین راستہ پر گامزن ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب یہ صفات بیان فرمائیں کہ وہ دنیا اور آخرت میں عزت والے ہوں گے اور قرب والوں میں سے ہوں گے اور یہ کہ وہ گہوارے میں اور پختہ عمر میں لوگوں سے گفتگو کریں گے تو اس کے بعد (آخر میں) یہ بیان فرمایا کہ وہ صالح لوگوں میں سے ہوں گے۔ ایسا اس لیے کیا تا کہ تمام درجات اور مقامات میں جو درجہ سب سے بلند و بالا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کامل طور پر ثابت ہو۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَ یُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَۚ ﴿۴۸﴾

(مریم نے) کہا: اے میرے رب! میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا حالانکہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے، فرمایا: بات یہی ہے (لیکن) اللہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے کہ ''ہوجا'' تو وہ ہو جاتا ہےO اور وہ اُسے لکھنے کا، شریعت کا اور تورات و انجیل کا علم عطا فرمائے گاO

آیاتِ مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿قَالَتْ﴾ یعنی حضرت مریم نے کہا۔ ﴿رَبِّ﴾ کا معنیٰ ہے: اے میرے سردار۔ حضرت مریم نے یہ لفظ حضرت جبریل سے کہا جب انہوں نے ان کو بچہ کی خوش خبری دی۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت مریم نے ''رب'' کا لفظ اللہ تعالیٰ سے کہا: ﴿اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ﴾ میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا۔ ﴿وَلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ﴾ حالانکہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا۔ یعنی مجھ تک کوئی مرد

نہیں پہنچا۔ حضرت مریم نے یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں بلکہ تعجب کی وجہ سے کہا تھا' کیونکہ یہ بات معمولات میں نہیں ہے کہ کوئی بچہ بغیر باپ کے پیدا ہو۔ ﴿ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ (فرمایا:) اس طرح اللہ تعالیٰ تجھ سے بچہ پیدا فرمائے گا بغیر اس کے کہ تجھے کسی انسان نے چھوا ہو۔ پھر اس کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے نشانی اور عبرت کا ذریعہ بنائے گا۔ بلاشبہ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسی کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے ﴿ كُنْ ﴾ (ہوجا) ﴿ فَيَكُوْنُ ﴾ تو وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جیسا وہ چاہتا ہے اسی طرح ہو جاتا ہے۔

اگلی آیت: ۴۸ میں جو فرمایا: ﴿ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ ﴾ اس میں کتاب سے کتابت اور ہاتھ سے لکھنا مراد ہے۔ ﴿ الْحِكْمَةَ ﴾ سے علمِ سنت اور احکامِ شریعت مراد ہیں۔ ﴿ التَّوْرٰىةَ ﴾ سے مراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور ﴿ الْاِنْجِيْلَ ﴾ سے مراد جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو یہ خبر دے رہا ہے: جس بچہ کے معزز اور بلند ہونے کی اُس نے حضرت مریم کو بشارت دی ہے اُسے وہ لکھنے کا' شریعت کا اور تورات وانجیل کا علم عطا فرمائے گا۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۴۹

اور (وہ) بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا (یہ فرماتا ہوا) کہ میں تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لیے پرندے کی طرح ایک صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ (صورت) اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتی ہے اور میں مادرزاد اندھے اور (لاعلاج) کوڑھی کو شفا دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے زندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں ان چیزوں کی خبر دیتا ہوں جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو' اگر تم تصدیق کرتے ہو (تو) بلاشبہ ان باتوں میں (میری صداقت پر) تمہارے لیے ضرور نشانی ہے ○

بنی اسرائیل کے پہلے اور آخری رسول کا نام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی کئی نشانیوں کو ایک نشانی ۔۔۔ قرار دینا

﴿ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم اُسے (یعنی عیسیٰ کو) بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائیں گے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے سب سے پہلے نبی حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام ہیں اور ان میں آخری نبی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ کو اُن کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے (قوم سے) کہا: ﴿ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ یعنی میں تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس اپنی بات کی صداقت پر ایک علامت لے کر آیا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہت ساری علامتیں اور نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن انہوں نے ایک علامت اس لیے کہا کہ ساری علامتیں ایک ہی چیز کو ثابت کر رہی تھیں اور وہ تھی دعویٰ رسالت میں اُن کی سچائی۔ چنانچہ جب انہوں نے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ وہ نشانی اور علامت کون سی ہے؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہ کہ میں تمہارے لیے

پرندے کی طرح ایک صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ (صورت) اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتی ہے۔

''خلق'' اور ''هیئت'' کا معنیٰ اور ''فیکون طیرا'' میں دو قرأتوں کا بیان

﴿ اَخْلُقُ ﴾ سے مراد ہے: میں صورت بناتا ہوں اور خاکہ بناتا ہوں۔ ﴿ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ ﴾ میں ''هیئت'' کا لفظ ہے اور ''هیئت'' اس تصویر کو کہتے ہیں جس کو تیار کیا جائے۔ یہ عربی کے اس جملہ سے مأخوذ ہے: ''هَيَّأْتُ الشَّيْئَ'' (میں نے فلاں چیز کو تیار کیا) یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا خاکہ بنایا جائے اور اس کو درست کیا جائے۔ آگے جو ﴿ فَاَنْفُخُ فِيْهِ ﴾ فرمایا اس میں ''فیہ'' سے مراد وہ مٹی ہے جس سے پرندے کا خاکہ اور صورت بنائی گئی (یعنی میں اس مٹی سے بنائی ہوئی صورت میں پھونک مارتا ہوں)۔ ﴿ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ﴾ تو وہ پرندہ ہو جاتی ہے۔

''فیکون طیرا'' میں ایک قرأت کے مطابق لفظ جمع کے ساتھ ''طیر'' ہے۔ کیونکہ ''طیر'' کا لفظ اسم جنس ہے' واحد تثنیہ جمع سب کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور ایک قرأت کے مطابق لفظ واحد کے ساتھ طائر ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ ''یکون ما انفخ فیه طائرا'' (جس میں پھونک مارتا ہوں وہ پرندہ ہو جاتی ہے) یا ''ما اخلقه یکون طائرا'' (جس کو میں بناتا ہوں وہ پرندہ ہو جاتی ہے)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو پرندہ بنایا اس کی تفصیل اور ''باذن الله'' کا مفہوم

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے صرف چمگادڑ بنائی جو رات میں اڑتی ہے۔ تمام پرندوں میں چمگادڑ کو اس لیے منتخب کیا کہ وہ اپنی خلقت کے اعتبار سے تمام پرندوں میں کامل ترین ہے۔ کیونکہ وہ بغیر پروں کے اڑتی ہے اور اس کے منہ میں دانت بھی ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی مادہ کے پستان بھی ہوتے ہیں اور اُسے ماہواری بھی آتی ہے۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے جب نبوت کا دعویٰ فرمایا اور لوگوں کے سامنے معجزات کا اظہار کیا تو لوگوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ وہ چمگادڑ بنا کے دکھائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی لی اور اس سے چمگادڑ کی صورت بنائی' پھر اُس میں پھونک ماری تو وہ پرندہ بن کر زمین اور آسمان کے درمیان اڑنے لگی۔ وہب کہتے ہیں: وہ اس وقت تک اڑتی رہی جب تک وہ لوگوں کو نظر آتی رہی اور جوں ہی وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو مردہ ہو کر نیچے آ گری۔ ایسا اس لیے ہوا تا کہ مخلوق کے فعل اور خالق کے فعل میں فرق ہو اور یہ معلوم ہو جائے کہ (حقیقی) کمال اللہ عزوجل کا ہے۔

آیت میں جو ﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ فرمایا اس سے مراد ہے: اللہ کی تکوین اور اس کی تخلیق۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہے کہ میں تو صرف پرندے کی صورت بناتا ہوں' جہاں تک اس میں زندگی پیدا کرنا ہے تو وہ میرے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے تا کہ معجزہ کا اظہار ہو۔

''اکمه'' اور ''ابرص'' کی تفسیر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاء کا کمال

﴿ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ ﴾ میں مادر زاد اندھے اور (لاعلاج) کوڑھی کو شفاء دیتا ہوں اور اُنہیں تندرست کرتا ہوں۔
''اکمه'' کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو مادر زاد اندھا ہو۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد نابینا ہے اگر چہ اس کی آنکھیں ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے وہ شخص مراد ہے جو دن میں دیکھتا ہو اور رات میں نہ دیکھتا ہو۔ جب کہ ''ابرص'' وہ شخص ہے جس کو برص ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ فن طب کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے لوگوں کو اسی سے تعلق رکھنے والی ایک قسم کا معجزہ دکھایا۔ فرق یہ ہے کہ علم طب میں مادر زاد اندھے اور برص زدہ کا علاج نہیں ہے (جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان دونوں

بیماروں کو تندرست کر دیا کرتے تھے)۔ لہٰذا یہ ان کا معجزہ ہوا اور ان کی سچائی کی دلیل ہوئی۔ وہب کہتے ہیں کہ بار ہا ایسا ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک دن میں پچاس ہزار کے قریب مریض جمع ہو جایا کرتے تھے۔ جو مریض چل کر آ سکتا وہ چل کر آ تا اور جو نہ آ سکتا اس کے پاس آپ خود تشریف لے جاتے اور دُعا کر کے اس کا علاج کرتے اس شرط پر کہ وہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن افراد کو زندہ فرمایا اُن کے واقعہ کا بیان

﴿ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ اللہ کے حکم سے میں مُردے زندہ کرتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار افراد کو زندہ فرمایا۔(۱) عازَر (۲) ابن العجوز (بڑھیا کا لڑکا) (۳) عاشِر کی بیٹی (۴) سام بن نوح۔ یہ چاروں افراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ کرنے کے بعد باقی رہے اور سام بن نوح کے سوا تینوں کے ہاں اولاد بھی ہوئی۔ عازر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوست تھا۔ اس کی بہن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ آپ کا بھائی عازر مرنے کے قریب ہے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عازر کے درمیان تین دن کی مسافت کا فیصلہ تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے اصحاب عازر کے پاس پہنچے تو پتا چلا کہ تین دن ہوئے اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی بہن سے کہا کہ ہمیں اس کی قبر پہ لے چلو۔ وہ سب کو عازر کی قبر پہ لے گئی۔ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے عازر زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا پھر وہ اپنی قبر سے باہر آیا اور لوگوں کے ساتھ زندگی گزاری اور اس کے ہاں اولاد ہوئی۔ ابن العجوز (بڑھیا کے لڑکے) کا معاملہ یہ تھا کہ اُسے مردہ حالت میں ایک تخت پر لوگ اٹھائے لے جا رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزر ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو وہ اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور لوگوں کی گردن سے اُتر آیا۔ پھر اُس نے اپنے کپڑے پہنے اور اپنے گھر والوں کے پاس چلا آیا' اُس نے بھی زندگی گزاری اور اس کے ہاں اولاد ہوئی۔ عاشر کی بیٹی کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا والد لوگوں سے عُشر (زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ) وصول کیا کرتا تھا۔ ایک دن پہلے اس کی بیٹی کا انتقال ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا سے اس لڑکی کو زندہ کر دیا۔ اس لڑکی نے بھی زندگی گزاری اور اس کے ہاں اولاد ہوئی۔ سام بن نوح کا معاملہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی قبر پہ تشریف لے گئے اور اسم اعظم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو سام بن نوح اپنی قبر سے باہر آ گیا' اور قیامت قائم ہونے کے خوف سے اس کا آدھا سر سفید ہو گیا حالانکہ اس زمانہ میں لوگوں کے بال سفید نہیں ہوتے تھے۔ اُس نے قبر سے باہر آ کر پوچھا: کیا قیامت قائم ہو گئی ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں! بلکہ میں نے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے ساتھ تجھے آواز دی تھی۔ پھر آپ نے اُسے فرمایا کہ مر جاؤ۔ اُس نے کہا: اس شرط کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے موت کی سختیوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر دی تو ایسا ہی ہوا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غیب کی خبر دینا

﴿ اُنَبِّئُكُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: میں تمہیں خبر دیتا ہوں۔ ﴿ بِمَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمہاری کھانے پینے کی وہ چیزیں جو میری نظروں میں نہیں ہیں۔ ﴿ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ﴾ سے مراد وہ چیزیں جو تم لے جاتے ہو اور اُن کو اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے ہو تا کہ بعد میں کھا سکو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آدمی کو وہ بھی بتا دیتے تھے جو اس نے گذشتہ رات کھایا ہوتا' وہ بھی بتا دیتے جو وہ آج کھائے گا اور وہ بھی بتا دیتے جو وہ رات کے لیے جمع کرے گا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کتاب

کی تعلیم کے دوران بچوں کو وہ کام بتا دیتے تھے جو اُن کے والدین کیا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کسی لڑکے سے کہتے: جاؤ تمہارے گھر والے فلاں فلاں چیز کھا چکے ہیں اور تمہارے لیے فلاں چیز رکھی ہے۔ وہ بچہ گھر جا کر رونے لگتا یہاں تک کہ گھر والے اُسے وہ چیز دے دیتے۔ پھر گھر والے پوچھتے کہ تمہیں اس چیز کے بارے میں کس نے بتایا؟ وہ کہتا: عیسیٰ نے۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے بچوں کو حضرت عیسیٰ کے پاس جانے سے روک دیا اور بچوں سے کہا کہ اس جادوگر کے پاس نہ بیٹھا کرو اور تمام بچوں کو ایک گھر میں جمع کر دیا۔ حضرت عیسیٰ اُن بچوں کی تلاش میں آئے تو لوگوں نے کہا کہ بچے یہاں نہیں ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے پوچھا: اس گھر میں کیا ہے؟ انہوں نے کہا: خنزیر ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: ایسا ہی ہوگا۔ لوگوں نے جب گھر کھولا تو سب بچے خنزیر تھے۔ یہ بات بنی اسرائیل میں پھیل گئی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا۔ آپ کی والدہ کو آپ کے بارے میں خطرہ ہوا' وہ آپ کو ایک سواری پر لے کر تیزی سے مصر کی طرف چلی گئیں۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نزول مائدہ میں پیش آیا۔ مائدہ ایک ایسا دستر خوان تھا کہ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں وہ جنت کا کھانا لے کر نازل ہوتا تھا۔ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نہ خیانت کریں نہ اگلے دن کے لیے جمع کریں۔ لیکن لوگوں نے خیانت کی اور اگلے دن کے لیے جمع کرنے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُنہیں وہ تمام چیزیں بتا دیتے تھے جو وہ مائدہ سے کھاتے تھے اور جو کچھ جمع کرتے تھے۔ (مذکورہ حکم کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خنزیر بنا دیا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی خبر اور نجومیوں اور کاہنوں کی خبر میں فرق

زیر بحث آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی حقانیت پر قوی دلیل ہے اور اس عظیم معجزہ کا بیان ہے کہ وہ لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اور وہ روشن نشانیاں بھی ہیں جن کا بیان ابھی گزرا' یعنی مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفاء دینا' اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردے زندہ کرنا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو جو غیب کی خبریں دیں وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے دیں۔ اور غیب کی باتیں بتانا ایک ایسا معاملہ ہے جو انسانوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کسی اور سے ممکن نہیں ہے۔ یہاں اگر یہ سوال ہو کہ کبھی کبھی نجومی اور کاہن بھی اس طرح کی خبریں دے دیا کرتے ہیں' پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی خبروں میں اور ان کی خبروں میں کیا فرق ہوگا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ نجومی اور کاہن دونوں میں سے ہر ایک لازماً چند مقدمات کی طرف رجوع کرتا ہے اور خبر دینے کے لیے ان مقدمات پر بھروسہ کرتا ہے۔ نجومی تو کسی بات کی خبر دینے کے لیے یا تو ستاروں اور ان کے باہمی ملاپ کی معرفت اور علم کا سہارا لیتا ہے یا رمل کے حساب اور اس جیسی دیگر چیزوں کا سہارا لیتا ہے۔ اور ان کی بنیاد پر جو وہ خبریں دیتا ہے ان میں بہت ساری خبریں غلط ہوتی ہیں۔ اور کاہن کسی بات کی خبر دینے کے لیے جاسوس جنات کا سہارا لیتا ہے۔ اور پھر جو وہ خبریں دیتا ہے ان میں بھی بہت ساری خبریں غلط ہوتی ہیں۔ جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام جو غیب کی باتیں بتاتے ہیں وہ صرف آسمانی وحی کے ذریعہ ہوتی ہیں اور وحی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ ان کی خبر میں کسی حساب وغیرہ کا سہارا نہیں ہوتا۔ لہٰذا انبیاء کرام علیہم السلام کی خبروں میں اور دیگر کی خبروں میں فرق ہو گیا۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ﴾ ''بے شک اس میں تمہارے لیے ضرور نشانی ہے''۔ یعنی اللہ عزوجل کے حکم سے مٹی سے پرندہ بنانا' مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دینا اور غیب کی باتیں بتانا ان سب میں تمہارے لیے ضرور نشانی ہے یعنی عبرت ہے اور میرے رسولِ خدا ہونے کی صداقت پر دلیل ہے۔ آخر میں جو ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ فرمایا اس سے مراد ہے: بہ شرطیکہ تم ان باتوں کی تصدیق کرو۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۵۱

اور میرے سامنے جو تورات ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا بن کر (آیا ہوں) اور اس لیے تاکہ جو چیزیں تم پر حرام کی گئی تھیں ان میں سے کچھ چیزیں تمہارے لیے حلال کروں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے معجزہ لے کر آیا ہوں' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو O بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے' پس تم اس کی عبادت کرو' یہ سیدھا راستہ ہے O

آیت مذکورہ میں ''ومصدقا'' کی اِعرابی کیفیت اور تفسیر

﴿وَمُصَدِّقًا﴾ کے بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ گذشتہ آیت:۴۹ میں ''وَرَسُوْلًا'' پر عطف ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ گذشتہ آیت میں ''اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' پر عطف ہے۔ یعنی میں تمہارے پاس تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو یہ بات فرمائی کہ ''میرے سامنے جو تورات ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں''۔ یہ اس لیے فرمائی کہ انبیاء کرام علیہم السلام ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہر نبی اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق کرتا ہے اور اُن تمام احکامات اور کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شریعت موسوی پر عمل اور ان کی شریعت میں حرام کردہ چیزوں میں سے بعض کو حلال کرنا

﴿وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ (میں اس لیے آیا ہوں) تاکہ جو چیزیں تم پر حرام کی گئی تھیں اُن میں سے کچھ چیزیں تمہارے لیے حلال کروں۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر تھے۔ ''سبت'' یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے عبادت کرتے تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ جو کچھ تورات میں ہے میں اس کے ایک حرف کی بھی خلاف ورزی کرنے کی تمہیں دعوت نہیں دیتا سوائے اس کے کہ جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں اُن میں سے کچھ چیزیں تمہارے لیے حلال کرتا ہوں اور تم سے (مشکل احکام کا) بوجھ اتارتا ہوں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر ان کی بعض خیانتوں کی وجہ سے سزا کے طور پر کچھ چیزیں حرام فرما دی تھیں' جیسا کہ ارشاد فرمایا:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ . (النساء:۱۶۰)

یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے کئی پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان پر حلال تھیں۔

یہودیوں پر مذکورہ حرمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری تک برقرار رہی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو آپ نے اُن سختیوں کو اٹھا دیا جو اُن پر تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی بہ نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زیادہ نرمی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں جو چیزیں لوگوں پر حرام کی گئی تھیں وہ اونٹ کا گوشت' آنتوں کی چربی' دیگر اعضاء کی چربی اور پرندوں کے کچھ اعضاء تھے' بعض نے ان چیزوں میں مچھلی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسانی لے کر آئے اور ان چیزوں کو لوگوں کے لیے حلال فرمایا۔ دیگر علماء فرماتے ہیں کہ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بہت سارے احکامات کو منسوخ فرمایا اور ہفتہ کے بجائے اتوار کی تعظیم مقرر کی۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ یوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مذکورہ احکام کے منسوخ کرنے والے ہوئے اور ناسخ و منسوخ برحق ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لوگوں کو اللہ عزوجل کے خوف اور اپنی اطاعت کی طرف بلانا

آیت میں ﴿ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ میں ایسی واضح دلیل لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کی حقانیت پر گواہ ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو خوف دلاتے ہوئے کہا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴾ یعنی اے گروہ بنی اسرائیل! جن باتوں کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور جن سے منع فرمایا ہے اُن باتوں میں اللہ سے ڈرو اور میں تمہیں جس بات کی طرف بُلا رہا ہوں اُس میں میری اطاعت کرو۔ کیونکہ رسول کی اطاعت اللہ کے خوف کے توابع میں سے ہے۔ اور جس چیز کی طرف میں تمہیں بُلا رہا ہوں وہ میرا یہ قول ہے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ (بلاشبہ اللہ میرا رب اور تمہارا رب ہے لہٰذا تم اس کی عبادت کرو) کیونکہ تمام رسولوں کا ایک ہی دین تھا' یعنی توحید اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کسی رسول کا نظریہ دوسرے سے مختلف نہیں تھا۔

آیت مذکورہ میں نجران کے عیسائی اور وہ تمام عیسائی جنہوں نے نجران والوں کا قول اپنایا ان سب کے خلاف بہت اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے' اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اُس بات سے بری تھے جو عیسائی اُن کی طرف منسوب کرتے تھے۔ وہ اللہ کے بندے تھے اور اللہ نے ان کو اپنا نبی اور رسول بنایا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی مذکورہ بات کو اس پر ختم کیا کہ ﴿ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴾ یہ یعنی توحید سیدھا راستہ ہے۔

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر جب عیسیٰ نے اُن سے کفر پایا تو کہا: (تم میں) کون لوگ اللہ (کی راہ) میں میرا ساتھ دینے والے ہیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کا ساتھ دینے والے ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں O

﴿ اَحَسَّ ﴾ کا معنیٰ ہے: اُنہوں نے پایا اور پہچانا۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: انہوں نے دیکھا۔ ''احسّ'' کا لفظ احساس سے ہے۔ اور احساس کا معنیٰ ہے: ''وجدان الشیئی بالحاسّة'' (کسی چیز کو حاسّہ کے ذریعہ پانا)۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی زبان سے کلمۂ کفر کہا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کفر کو پایا اور اس بات کو پہچان لیا کہ وہ لوگ کفر پر بہ ضد ہیں اور آپ کو شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ بستی سے نکلنے کا تفصیلی واقعہ

اہل سیرت و تاریخ بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا اور اُنہیں حکم دیا کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے رسول ہونے کا اور اللہ کی طرف بلانے کا اظہار کریں تو لوگوں نے اُن کے پیغام کو سن کر اُنہیں اپنے درمیان سے نکال دیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ (حضرت مریم علیہا السلام) دونوں اپنے علاقہ سے نکل گئے اور زمین میں گھومتے رہے۔ پھر کسی بستی میں ایک شخص کے ہاں ٹھہرے۔ اُس شخص نے انہیں مہمان بنایا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ اس بستی کا ایک ظالم اور سرکش بادشاہ تھا۔ ایک دن مذکورہ شخص (میزبان) اپنے گھر آیا تو بہت غمگین اور پریشان تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو حضرت مریم علیہا السلام اس شخص کی بیوی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضرت

مریم نے اس عورت سے پوچھا: کیا بات ہے تمہارے شوہر کو میں غمگین اور پریشان دیکھ رہی ہوں۔ عورت نے کہا: مجھ سے یہ بات نہ پوچھو۔ حضرت مریم نے کہا: مجھے بتادو ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے شوہر کی مشکل کو دور فرمائے۔ عورت نے بتایا کہ ہماری بستی کا ایک ظالم بادشاہ ہے' اُس نے بستی کے ہر شخص کو اس بات کا پابند کیا ہوا ہے کہ وہ ایک دن بادشاہ کو اور اس کے لشکر کے افراد کو کھانا کھلائے اور شراب پلائے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو بادشاہ اُسے سزا دیتا ہے اور آج کے دن ہماری باری ہے جبکہ ہمارے پاس اس کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت مریم نے عورت سے کہا کہ تم اپنے شوہر سے کہو: وہ پریشان نہ ہو' میں اپنے بیٹے سے اس کے لیے دُعا کراؤں گی' وہ اس کے لیے کافی ہوگی۔ پھر حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ سے دُعا کا کہا' تو انہوں نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ بُرا ہوگا۔ حضرت مریم نے کہا: ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ کیونکہ اس آدمی نے ہمارے ساتھ حسن سلوک کیا ہے اور ہمارا احترام کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا: آپ اُس شخص سے کہیں کہ جب کھانا کھلانے کا وقت قریب آئے تو اپنی دیگوں اور مٹکوں کو پانی سے بھر دے اور مجھے اطلاع کر دے۔ اس آدمی نے ایسا ہی کیا' پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو دیگوں میں ڈالا ہوا پانی شوربا اور گوشت بن گیا اور مٹکوں میں ڈالا ہوا پانی ایسی شراب بن گیا کہ اس جیسی شراب لوگوں نے نہیں دیکھی تھی۔ بادشاہ نے آکر جب وہ کھانا کھایا اور شراب پی تو پوچھا: تم یہ شراب کہاں سے لائے؟ آدمی نے کہا: یہ فلاں زمین کی ہے۔ بادشاہ نے کہا: میری شراب بھی اُسی زمین کی ہوتی ہے لیکن وہ ایسی نہیں ہوتی۔ آدمی نے کہا: یہ شراب کسی اور زمین کی ہے۔ جب بادشاہ نے معاملہ کو مشتبہ پایا تو اُس نے آدمی پر سختی کی۔ آدمی نے کہا کہ میرے پاس ایک لڑکا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز بھی مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے عطا فرماتا ہے۔ اُسی لڑکے نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو شراب بنا دیا۔ بادشاہ کا ایک بیٹا تھا جس کو وہ اپنی سلطنت میں اپنا خلیفہ اور جانشین بنانا چاہتا تھا' بادشاہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ کچھ ہی روز پہلے اس کا انتقال ہوا تھا۔ بادشاہ نے (جب مذکورہ تفصیلات سنیں تو) کہا کہ ایک شخص نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی' اُس کی دُعا سے پانی شراب بن گیا تو ضرور میرے بیٹے کو زندہ کرنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ اُس شخص کی دُعا کو قبول فرمائے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بُلایا اور اُن سے اس بارے میں بات کی تو حضرت عیسیٰ نے اس سے کہا کہ تم ایسا مت کرو۔ کیونکہ تمہارا بیٹا اگر زندہ رہا تو فساد ہوگا۔ بادشاہ نے کہا: مجھے اس کی پرواہ نہیں' کیا میں اُسے زندہ نہ دیکھوں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس شرط پر زندہ کروں گا کہ تم مجھے اور میری والدہ کو چھوڑ دو گے' ہم جہاں چاہیں چلے جائیں۔ بادشاہ نے کہا: منظور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو لڑکا زندہ ہو گیا۔ جب بادشاہ کی سلطنت میں بسنے والے لوگوں نے دیکھا کہ لڑکا زندہ ہو گیا ہے تو وہ لوگ اسلحہ لینے کے لیے دوڑ پڑے اور انہوں نے کہا کہ یہ بادشاہ ہمیں کھاتا رہا' اب جب اس کی موت قریب آگئی تو یہ ہم پر اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے' اس کا بیٹا بھی ہمیں اپنے باپ کی طرح کھا جائے گا۔ پھر لوگوں نے بادشاہ سے جنگ شروع کر دی۔ اس دوران یہ بات بھی کھل گئی کہ لڑکے کو حضرت عیسیٰ نے زندہ کیا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور آپ کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا۔

یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت اور اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طلب نصرت

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ مسیح ہیں اور تورات میں ان کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اور یہ دینِ یہودیت کو منسوخ فرمائیں گے۔ لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا اعلان کیا تو یہودیوں پر یہ بات شاق گزری اور انہوں نے آپ کو تکلیفیں دینا شروع کر دیں اور اس بات کی خواہش کی کہ آپ کو شہید

کر دیا جائے اور آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کے خلاف حمایت طلب کی۔ ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ یعنی حضرت عیسیٰ نے کہا کہ اللہ کی طرف میرے کون مددگار ہیں۔ یہاں ''الی اللہ'' کا معنیٰ ہے: ''مع اللہ'' (یعنی اللہ کے ساتھ میرے مددگار کون ہیں)۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: ''الی ان ابیّن امر اللہ واظہر دینہ'' (یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو واضح کر دوں اور اس کے دین کو غالب کر دوں اس وقت تک میرے مددگار کون ہیں)۔ بعض کے نزدیک ''الی'' بمعنیٰ ''فی'' ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں۔ بعض کے نزدیک ''الی'' اپنے معنیٰ میں ہی ہے اور مراد یہ ہے کہ کون ایسا شخص ہے جو میرے لیے اللہ کی مدد کے ساتھ اپنی مدد کو ملا لے۔

حواریوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تعاون اور نصرت کا واقعہ

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کا ساتھ دینے والے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف آنے کی دعوت دی اور (اس کے جواب میں) انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سرکشی کی اور آپ کی نبوت کا انکار کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام گھر سے نکل کر زمین میں گھومنے لگے۔ اس دوران آپ کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ یہ کُل ۱۲ افراد تھے' ان کے سردار شمعون اور یعقوب تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا: تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم لوگوں کا شکار کرنے نہیں چلو گے؟ انہوں نے کہا: آپ کون ہیں؟ فرمایا: میں عیسیٰ بن مریم ہوں' اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ لوگوں نے ان کی صداقت پر دلیل مانگی' اس وقت شمعون نے اپنا جال پانی میں پھینکا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو شمعون کے جال میں اتنی مچھلیاں ہو گئیں کہ جال پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ لوگوں نے ایک دوسری کشتی والوں سے مدد مانگی اور یوں دو کشتیاں مچھلیوں سے بھر دیں۔ اس وقت وہ لوگ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے اور آپ کے ساتھ چل پڑے۔

حواریوں کو حواری کہنے کی مختلف وجوہ

حواریوں کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: (۱) بعض کا قول یہ ہے کہ وہ لوگ مچھلیاں شکار کرتے تھے' جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وہ ایمان لے آئے تو پھر لوگوں کا شکار کرنے لگے اور انہیں دین کا راستہ دکھانے لگے۔ انہیں حواری کا نام اس لیے دیا گیا کہ ان کے کپڑے سفید تھے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''حوّرت الشیئی'' (میں نے فلاں چیز کو سفید کر دیا)۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ وہ لوگ دھوبی تھے۔ انہیں حواری اس لیے کہا گیا کہ وہ لوگوں کے کپڑے سفید کرتے تھے (یعنی انہیں چمکاتے تھے)۔ (۳) بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ کو مختلف کام کرنے والوں کے سپرد کیا' آخر میں اُنہیں حواریوں کے سپرد کیا۔ یہ لوگ دھوبی اور رنگریز تھے۔ حضرت مریم نے ان کے سردار کے سپرد کر دیا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے یہ فن سیکھ لیں۔ اس کے پاس کچھ کپڑے جمع تھے اور اُسے کسی سفر میں جانا پڑ گیا' اُس نے حضرت عیسیٰ سے کہا: آپ اس کام کو سیکھ گئے ہیں اور میں دس دن کے سفر پر جا رہا ہوں اور آپ کے سامنے یہ مختلف رنگ کے کپڑے ہیں آپ کو ان میں سے ہر ایک کے رنگ کے مطابق جس سے کپڑا رنگا جائے گا اس کا دھاگا معلوم ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میری واپسی تک آپ اس کام کو نمٹا دیں۔ حضرت عیسیٰ نے اس شخص کے سفر پر جانے کے بعد مٹکے میں ایک رنگ کا پانی پکایا اور سارے کپڑے اس میں ڈال دیئے اور کپڑوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میری خواہش اور ارادہ کے مطابق ہو جاؤ۔ جب حواری اپنے سفر سے واپس آیا تو سارے کپڑے مٹکے میں ہی تھے۔ اُس نے حضرت عیسیٰ سے کام کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں

نے کام کر دیا ہے۔ حواری نے پوچھا: وہ کپڑے کہاں ہیں؟ حضرت عیسیٰ نے فرمایا: مٹکے میں ہیں۔ اُس نے پوچھا: سارے؟ فرمایا: ہاں۔ اُس نے کہا: آپ نے سب کپڑوں میں خرابی پیدا کر دی۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: ایسا نہیں ہے' تم کھڑے ہو کر دیکھ لو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے کھڑے ہو کر اُس مٹکے سے سرخ' سبز پیلا اور سیاہ کپڑا نکالا یہاں تک کہ سارے کپڑے آپ نے حواری کی خواہش کے مطابق مختلف رنگوں میں نکالے۔ حواری یہ دیکھ کر حیرت کرنے لگا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اُس نے لوگوں کو بھی یہ منظر دیکھنے کے لیے بلا لیا۔ پھر وہ اور اس کے دیگر ساتھی جو حواری تھے' وہ ایمان لے آئے۔ (۴) بعض کا قول یہ ہے کہ اُنہیں حواری کا نام اس لیے دیا گیا کہ ان کے دل صاف تھے اور ان پر عبادت کا اثر اور عبادت کا نور نمایاں تھا۔ (۵) بعض کا قول یہ ہے کہ حواری مخلص دوستوں کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھی اور خاص آدمی تھے۔ (۶) بعض کا قول یہ ہے کہ حواری خلیفہ اور جانشین کو کہتے ہیں' یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے۔ (۷) بعض کا قول یہ ہے کہ حواری وزیر کو کہتے ہیں' یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وزیر تھے۔ (۸) بعض کا قول یہ ہے کہ حواری مددگار کو کہتے ہیں اور اس شخص کو کہتے ہیں جس سے مدد طلب کی جائے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۹) جنگ خندق والے دن نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی تو حضرت زبیر نے جواب دیا کہ میں حاضر ہوں۔ پھر آپ نے جہاد کی ترغیب دی تو حضرت زبیر نے جواب دیا کہ میں حاضر ہوں' آپ نے پھر جہاد کی ترغیب دی تو حضرت زبیر نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے' میرے حواری زبیر ہیں۔

(صحیح بخاری: ۲۸۴۷' صحیح مسلم: ۲۴۱۵' مسند احمد ج ۳ ص ۳۰۷' سنن ترمذی: ۳۷۴۵' سنن ابن ماجہ: ۱۲۲)

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو جواب دیا اس کی تفسیر

﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ یعنی ہم نے اس بات کی تصدیق کی کہ اللہ ہمارا رب ہے اور ہر چیز کا رب ہے۔ ﴿ وَاشْهَدْ ﴾ میں خطاب حضرت عیسیٰ سے ہے' یعنی اے عیسیٰ! آپ گواہ ہو جائیں۔ ﴿ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ اس کا معنیٰ ایک قول کے مطابق یہ ہے کہ آپ اس بات پر گواہ ہو جائیں کہ آپ جو اپنی مدد اور دفاع چاہتے ہیں اُس میں ہم فرمانبرداری کرنے والے ہیں اور اللہ عزوجل کے حکم کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس جملہ میں ان کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا دین ''اسلام'' ہے۔ اور یہ وہ دین ہے جو حضرت عیسیٰ اور ان سے پہلے تمام انبیاء کرام (علیہم السلام) کا ہے' نہ کہ یہودیت اور عیسائیت۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

اے ہمارے رب! جو تو نے نازل فرمایا ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی کی' پس تو ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں میں لکھ دےO

یعنی حواریوں نے اپنے مسلمان ہونے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنانے کے بعد کہا: اے ہمارے رب! ﴿ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ ﴾ (جو تو نے نازل کیا ہم اس پر ایمان لائے) یعنی وہ کتاب جو تو نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی ہم اس پر ایمان لائے۔ ﴿ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ﴾ (اور ہم نے رسول کی پیروی کی) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی۔

مذکورہ آیت میں "شاھدین" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ﴾ پس تو ہمیں (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ دے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے تیرے نبیوں کے سچے ہونے کی گواہی دی اور جس بات کا تو نے حکم دیا اور جس سے تو نے روکا اس کی انہوں نے پیروی کی ان کے ناموں کے ساتھ ہمارا نام لکھ دے اور ہمارا شمار ان کے ساتھ فرما اور جن چیزوں کے ذریعہ تو نے اُنہیں عزت وشرف بخشا ہے اُن میں ہمیں ان کے ساتھ شامل فرما۔

اس آیت میں حواریوں نے گواہی دینے والوں کے ساتھ اپنا نام لکھوانے کی دُعا کی ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ اُن گواہی دینے والوں کی فضیلت حواریوں سے زیادہ ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے "فاکتبنا مع الشاھدین" کی تفسیر میں فرمایا کہ اس میں "شاھدین" سے سیدنا محمد ﷺ اور آپ کی امت مراد ہے۔ کیونکہ وہی اس فضیلت کے ساتھ خاص ہیں۔ کیونکہ وہ دیگر رسولوں کی تبلیغ کی گواہی دیں گے۔ بعض کے نزدیک "شاھدین" (یعنی گواہوں) سے انبیاء (علیہم السلام) مراد ہیں' کیونکہ ہر نبی اپنی امت کے لیے گواہ ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾

اور یہودیوں نے (مسیح کو شہید کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (مسیح کو بچانے کی) خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے عمدہ خفیہ تدبیر فرمانے والا ہے O

"مکر" کا معنیٰ اور بنی اسرائیل کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکر

﴿وَمَكَرُوْا﴾ کا معنیٰ ہے: بنی اسرائیل کے وہ کفار جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کفر پایا انہوں نے مکر کیا۔ "مکر" کا اصل معنیٰ ہے: "صرف الغیر عما یقصدہ بضرب من الحیلۃ" (یعنی حیلہ سازی کر کے کسی کو اُس کے ارادہ سے غافل کر دینا)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ خفیہ طور پر فساد کی کوشش کرنا مکر ہے۔ بنی اسرائیل کے کافروں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو مکر کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے آپ کو شہید کرنے کی سازش کی اور آپ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم نے نکال دیا تو وہ اور اُن کی والدہ (حضرت مریم علیہا السلام) حواریوں کے ساتھ واپس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں میں دعوت کا اعلان کیا اور اپنی رسالت کا اظہار کیا تو لوگوں نے آپ کو شہید کرنے اور آپ پر اچانک حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ یہ وہ مکر تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے "مکروا" کہہ کر بیان فرمایا۔ لوگوں کے لیے جو مکر کا لفظ آتا ہے اس کا معنیٰ خباثت' دھوکا اور حیلہ سازی ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا "مکر" فرمانا اور اس کے مکر کی تفسیر

﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کے مکر کی سزا دی۔ چونکہ سزا اُن کے مکر کے مقابلہ میں ہے' اس لیے سزا کو بھی مکر کہہ دیا گیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کے مکر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو (مہلت دے کر) درجہ بہ درجہ ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اور اچانک ایسے مقام پر اُسے گرفت میں لے لیتا ہے جہاں بندہ کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ زیر بحث آیت میں جو "مکر اللہ" فرمایا اُس سے یہاں مراد یہ ہے کہ یہودیوں کا وہ آدمی جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتایا تھا اُس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت ڈال دی تھی اس وقت جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تھا' چنانچہ اس مشابہت کی وجہ سے اس شخص کو قتل کر دیا گیا۔

یہودیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوشہید کرنے کی سازش کا واقعہ اوراس کے متعلق مفسرین کی مختلف روایات

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودیوں کے ایک گروہ کا آمنا سامنا ہوا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کہا: ''جادوگرنی کا بیٹا جادوگر آ گیا اور بدکار عورت کا بیٹا بدکار آ گیا'' (معاذ اللہ)۔ اس جملہ سے انہوں نے آپ پر اور آپ کی والدہ پر تہمت لگائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ جملہ سنا تو اُن کی ہلاکت کی اور رحمت سے دُوری کی دُعا کی۔ اس کے نتیجہ میں وہ لوگ خنزیر بن گئے۔ جب یہودیوں کے سردار اور بادشاہ ''یہوذا'' نے یہ منظر دیکھا تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دُعائے ہلاکت کا خطرہ ہو گیا۔ چنانچہ تمام یہودیوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوشہید کردیا جائے۔ پھر وہ اُنہیں شہید کرنے کے لیے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو بھیجا' انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسے مکان میں داخل کردیا جس کی چھت میں روشن دان تھا۔ اُس روشن دان سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا۔ یہوذا جو یہودیوں کا بادشاہ تھا اُس نے اپنے ساتھیوں میں سے ططیانوس نامی ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ اس گھر میں جاکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوشہید کردے۔ جب وہ شخص اندر داخل ہوا تو اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نظر نہ آئے اور اندر اُسے دیر ہوگئی۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لڑ رہا ہوگا۔ اُس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت ڈال دی۔ جب وہ باہر آیا تو لوگوں نے اُسے عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیا اور اُسے قتل کرکے سولی پر چڑھادیا۔

وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کے لیے ایک لکڑی تیار کی اور رات کے کسی حصہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے تو زمین پر اندھیرا چھا گیا اور اللہ عزوجل نے فرشتے بھیج دیئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودیوں کے درمیان حائل ہوگئے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس رات اپنے حواریوں کو جمع کیا اور اُنہیں وصیت کی اور فرمایا کہ صبح مرغ کے آواز لگانے سے پہلے تم میں سے ایک شخص میرے ساتھ کفر کرے گا اور چند درہموں میں مجھے فروخت کردے گا۔ پھر حواری چلے گئے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ دوسری جانب یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں تھے تو ان کے پاس ایک حواری آیا اور اُس نے کہا کہ اگر میں تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتادوں تو مجھے کیا دو گے؟ اُنہوں نے اس کے لیے ۳۰ درہم مقرر کردیئے' اُس نے وہ درہم لیے اور اُنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتا دیا۔ جب وہ شخص اُس گھر میں داخل ہوا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام موجود تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت ڈال دی اور حضرت عیسیٰ کو اٹھالیا۔ جس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتا بتایا تھا یہودیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے کہا: میں تو تم لوگوں کو پتا بتانے والا آدمی ہوں۔ لوگوں نے اُس کی بات کی طرف توجہ نہ دی اور اُسے عیسیٰ سمجھ کر قتل کرکے سولی پر چڑھا دیا۔ جب اُسے سولی پر چڑھایا گیا تو حضرت مریم علیہا السلام اور وہ عورت آئی جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے جنون سے شفاء دی تھی۔ وہ دونوں آکر سولی چڑھے ہوئے شخص کے پاس رونے لگیں۔ جب وہ روئیں تو حضرت عیسیٰ ان کے پاس آئے اور کہا کہ کس پر تم دونوں رو رہی ہو؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے تو اٹھالیا ہے اور مجھے صرف بھلائی ملی ہے۔ اور یہ جو شخص ہے اس کو لوگوں کے سامنے (میرا) مشابہ بنادیا گیا تھا۔ پھر سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: تم مریم کے پاس اُترو جو کہ مجدلانی ہیں۔ مجدلان ایک جگہ کا نام ہے اس کی طرف حضرت مریم کو نسبت دی گئی۔ بے شک تم پر مریم کی طرح نہ کوئی رویا ہے نہ مریم کی طرح کسی نے غم کیا ہے۔ جب تم اُترو گے تو حواری تمہارے پاس اکٹھے ہو جائیں گے۔ تم اُنہیں مبلّغ بناکر زمین میں پھیلا دینا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو پہاڑ بقعۂ نور

بن گیا۔ یہ منظر دیکھ کر تمام حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے اُنہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دینے والا بنا کر زمین میں پھیلا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھا لیا۔ یہی وہ رات ہے جس میں عیسائی آپس میں جمع ہوتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو جس حواری کو جس قوم کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مبلّغ بنایا تھا وہ اُسی قوم کی زبان میں کلام کر رہا تھا۔

سدی بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ حواریوں میں سے دس افراد کو ایک گھر میں قید کر دیا۔ تو ان ہی میں سے ایک منافق آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس داخل ہوا' اُس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت ڈال دی۔ چنانچہ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا۔

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا کہ اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم میں کون اس بات کے لیے تیار ہے کہ اس پر میری مشابہت ڈال دی جائے پھر اُسے قتل کر دیا جائے گا؟ اُن میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں اس کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ اُس شخص کو قتل کر دیا گیا اور حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا اور اُنہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پَر لگا دیئے اور نور کا لباس پہنایا اور کھانے پینے کی لذت اُن سے منقطع کر دی۔ وہ فرشتوں کے ساتھ اڑنے لگے اور عرش کے اردگرد اُن کے ساتھ ہوتے تھے' وہ انسان اور فرشتہ کی خصوصیات اور زمین و آسمان کی خصوصیات والے بن گئے۔

حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم (علیہما السلام) کی عمر اور ان کی زندگی کے چند واقعات کے متعلق اہم باتیں

اہل تاریخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مریم ۱۳ سال کی عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حاملہ ہوئیں اور اُنہیں یروشلم میں بیت اللحم میں جنا۔ جبکہ بابل پر بادشاہ اسکندر کے غلبہ کو ۶۵ سال گزر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جب وحی فرمائی اُس وقت حضرت عیسیٰ اپنی عمر کے تیسویں سال میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ماہ رمضان کی شب قدر میں بیت المقدس سے اٹھا لیا' اُس وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ یعنی آپ کی نبوت کا عرصہ تین سال ہے۔ آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام چھ سال زندہ رہیں۔

زیر بحث آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بُرائی کے بدلہ میں بہترین سزا دینے والا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

(اے محبوب! یاد کیجئے!) جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! بے شک میں تمہیں پوری عمر تک پہنچانے والا ہوں' اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں اور تمہارے پیروکاروں کو قیامت تک (دلائل کے ذریعہ) کافروں پر برتری دینے والا ہوں' پھر تم سب کو میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے' پھر میں تمہارے درمیان اُن باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم جھگڑتے تھے O

آیت مذکورہ میں ''متوفّی'' اور ''توفّی'' کی تفسیر و توجیہ میں مفسرین کے مختلف اقوال

آیت مبارکہ میں جو ﴿متوفی﴾ کا لفظ ہے اس کی تفسیر میں مفسرین کے دو مختلف طریقے ہیں۔ (۱) پہلا طریقہ یہ ہے کہ

اس آیت میں کوئی تقدیم اور تاخیر نہیں ہے' یہ اپنے ظاہر پر ہے۔اس صورت میں مفسرین کے نزدیک آیت کے مختلف معانی ہیں۔(۱) پہلا معنیٰ ''متـوفـی'' کا یہ ہے کہ میں آپ کو موت دیئے بغیر اپنی طرف قبض کرنے والا ہوں اور اٹھانے والا ہوں۔ جب کوئی شخص کسی چیز کو لے کر اس پر مکمل قبضہ حاصل کرلے تو کہا جاتا ہے:''تـوفـيـت الشيئ اور استوفيته'' (میں نے فلاں چیز کو اپنے قبضہ میں لے لیا)۔یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن ہیں وہ شہید کرنے کے لیے یا کسی اور غرض سے حضرت عیسیٰ تک نہیں پہنچ سکتے۔(۲) دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اس سے نیند مراد ہے۔اسی معنیٰ میں اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے:''اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا''۔(الزمر:۴۲)(اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور جن کی موت کا وقت نہیں آیا اُن کی روحوں کو حالت نیند میں)۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نیند کو وفات قرار دیا ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی سوئے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حالت نیند میں اٹھالیا تا کہ اُنہیں خوف لاحق نہ ہو۔اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ میں آپ پر نیند طاری کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔(۳) تیسرا معنیٰ یہ ہے کہ اس سے حقیقی معنیٰ مراد ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بے شک میں تمہیں موت دینے والا ہوں۔وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دن میں تین گھنٹے تک موت طاری رکھی تھی پھر اُنہیں زندہ کر کے اپنے پاس اٹھالیا۔بعض فرماتے ہیں کہ عیسائی یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دن میں سات گھنٹے تک موت طاری رکھی تھی پھر انہیں زندہ کر کے اپنے پاس اٹھالیا تھا۔(۴) چوتھی توجیہ یہ ہے کہ''ورافـعـک الـی'' میں جو واؤ ہے اس سے ترتیب ثابت نہیں ہوتی۔آیت کی دلالت اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آیت میں مذکور افعال کرے گا۔یہ بات کہ وہ کب اور کیسے کرے گا؟ یہ دلیل پر موقوف ہے۔ حدیث شریف سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ عنقریب اُتریں گے اور دجّال کو قتل کریں گے۔اس حدیث کو انشاءاللہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔(۵) علامہ ابوبکر واسطی فرماتے ہیں کہ''انـی متوفـیـک'' کا معنیٰ یہ ہے کہ بے شک میں تمہیں تمہاری خواہشات اور تمہارے نفس کے تقاضوں سے تمہیں دُور کرنے والا ہوں اور اپنے پاس اٹھانے والا ہوں۔چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان کی طرف اٹھائے گئے تو خواہش قلب کے زائل ہونے میں اُن کی حالت فرشتوں کی طرح ہو گئی۔(۶) چھٹی توجیہ یہ ہے کہ''تـوفـی'' کا معنیٰ ہے:کسی چیز کو مکمل طور پر لے لینا۔چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ کچھ لوگوں کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس صرف حضرت عیسیٰ کی روح کو اٹھایا ہے' جسم کو نہیں اٹھایا۔جیسا کہ عیسائیوں کا نظریہ ہے کہ حضرت مسیح کی لاہوت یعنی روح اٹھالی گئی اور اُن کی ناسوت یعنی جسم زمین میں باقی ہے۔ان کا رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ فرمایا۔اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ اُس نے حضرت عیسیٰ کو روح اور جسم دونوں کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھالیا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں تقدیم اور تاخیر ہے۔اصل عبارت یہ ہے کہ بے شک میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں اور زمین پر تمہیں اُتارنے کے بعد وفات دینے والا ہوں۔مفسرین میں سے کسی سے پوچھا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اُتریں گے' کیا یہ بات آپ کو قرآن کریم میں ملی؟ انہوں نے کہا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں (آل عمران:۴۶ میں)''کـهـلا''فرمایا ہے (یعنی وہ پختہ عمر میں لوگوں سے کلام کریں گے)۔اس سے اُن کا زمین پر نازل ہونا اس لیے ثابت ہے کہ جب تک وہ دنیا میں تھے پختہ عمر کو نہیں پہنچے تھے۔اس لیے ''کہلا'' کا معنیٰ ہے:وہ آسمان سے نازل ہونے کے بعد پختہ عمر میں (لوگوں سے کلام کریں گے)۔

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور اُن کی وفات کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۰) اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے ضرور عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے، وہ فیصلہ کرنے والے اور انصاف کرنے والے ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ معاف کریں گے[۲۵] مال اتنا زیادہ ہو جائے گا کہ کوئی اُسے قبول نہیں کرے گا۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس وقت ایک سجدہ دُنیا اور دنیا میں موجود تمام چیزوں سے بہتر ہوگا[۲۶] پھر حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ''۔ (النساء: ۱۵۹) (اہل کتاب میں سے ہر شخص اُس کی (یعنی عیسیٰ کی) وفات سے پہلے ضرور اس پر ایمان لے آئے گا)[۲۷] (صحیح بخاری: ۳۴۴۸، صحیح مسلم: ۱۵۵، سنن ترمذی: ۲۲۳۳، سنن ابن ماجہ: ۴۰۷۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۴۰، مشکوٰۃ: ۵۵۰۵۔ ص ۴۷۹)

(۲۱) ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہارا اُس وقت کیا عالم ہوگا جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور تم ہی میں سے تمہارے امام نازل ہوں گے[۲۸] ایک روایت میں اس طرح ہے کہ وہ تم ہی میں تمہارے امام ہوں گے۔ ابن ابی ذئب نے کہا: (اے نافع!) کیا تم جانتے ہو کس چیز سے وہ تمہاری امامت کریں گے؟ میں نے کہا: آپ بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تمہارے رب عزوجل کی کتاب اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت سے تمہاری امامت کریں گے۔ (صحیح بخاری: ۳۴۴۹، صحیح مسلم: ۱۵۵)

مسلم کی روایتوں میں نواس بن سمعان سے مروی حدیث میں ہے، وہ (نبی ﷺ سے) بیان کرتے ہیں:

---

[۲۵] صلیب توڑنے سے مراد یہ ہے کہ وہ عیسائیت کو باطل فرما کر مذہب اسلام کا حکم نافذ کریں گے۔ خنزیر کو قتل کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے قتل کی عام اجازت دے دیں گے اور جزیہ معاف کرنے سے مراد یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ پر اسلامی ریاست میں جو جزیہ لازم ہوتا ہے اُس کو وہ ساقط فرمادیں گے اور اُن سب کو وہ اسلام قبول کروائیں گے۔ ایک معنیٰ اس کا یہ ہے کہ اُس وقت چونکہ مال کی کثرت کی وجہ سے کوئی جزیہ لینے والا نہیں ہوگا اس لیے آپ جزیہ معاف فرمادیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف کے اگلے جملہ میں تائید موجود ہے کہ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ کوئی اُسے قبول نہیں کرے گا۔ (مرقات ج ۹ ص ۴۳۸)

[۲۶] اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں اللہ عزوجل کی عبادت اور نماز کا ذوق اس قدر ہوگا کہ ایک ایک سجدہ دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ لوگوں کو محبوب ہوگا۔ اللہ عزوجل کی بندگی اور فرمانبرداری کا جذبہ بہت زیادہ ہوگا اور دُنیا کی طرف رغبت کم ہوگی۔

(مرقات ج ۹ ص ۴۳۸)

[۲۷] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے یہودی اور عیسائی سارے ہی آپ کو اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول مان لیں گے اور ابھی تو سب مسلمان ہوئے نہیں، معلوم ہوا کہ ابھی عیسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی نہیں ہوئی۔ (مراٰۃ المناجیح ج ۷ ص ۲۶۹) علامہ شرف الدین طیبی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ کیونکہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر کتاب والا شخص (یہودی اور عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُن کی وفات سے پہلے ایمان لے آئے گا۔ ابھی چونکہ سب اُن پر ایمان نہیں لائے اس لیے لازماً وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور اُس وقت جتنے منکرین موجود ہوں گے وہ سب اُن پر ایمان لائیں گے۔ (مرقات ج ۹ ص ۴۳۸)

[۲۸] اس فرمانِ عالی کے چند معنیٰ کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس حالت میں اُتریں گے کہ نماز کی جماعت ہو رہی ہوگی اور حضرت مہدی امامت فرمارہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خلیفۃ المسلمین ہوں گے مگر امامتِ نماز حضرت مہدی علیہ السلام کیا کریں گے جو کہ عربی ہوں گے اور قرشی ہاشمی مسلمانوں میں سے ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی تم مسلمانوں میں سے ہوں گے اور امام ہوں گے، نماز پڑھایا کریں گے۔ (مراٰۃ ج ۷ ص ۲۷۰)

(۲۲) دجال اسی حالت میں ہوگا (یعنی فتنہ انگیزی کر رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا' وہ دمشق کی مشرقی جانب میں سفید مینار پر اُتریں گے۔ (صحیح مسلم: ۲۹۳۷' سنن ترمذی: ۲۲۴۰' سنن ابوداؤد: ۴۳۲۱' سنن ابن ماجہ: ۴۰۷۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۳) میرے اور ان کے درمیان (یعنی عیسیٰ کے درمیان) کوئی اور نبی نہیں ہے۔ وہ یقیناً نازل ہونے والے ہیں' جب تم اُنہیں دیکھو تو پہچان لینا' وہ سرخ اور سفید کے درمیانی رنگت والے شخص ہیں' وہ دو زرد کپڑوں میں اُتریں گے۔ اگرچہ اُن کے سر پر کوئی تری نہیں ہوگی لیکن اُن کے سر سے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔ وہ اسلام کی خاطر لوگوں سے جہاد کریں گے' صلیب کو کچلیں گے' خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ کو ساقط کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا دیگر تمام ملتوں کو نیست و نابود فرما دے گا اور مسیح دجال کو بھی ہلاک فرما دے گا۔ پھر حضرت عیسیٰ چالیس سال تک زمین میں ٹھہریں گے۔ پھر وہ وفات پائیں گے اور مسلمان اُن کی نمازِ جنازہ ادا کریں گے۔ (سنن ابوداؤد: ۴۳۲۴' مسند احمد ج ۲ ص ۴۰۶' المستدرک ج ۲ ص ۵۹۵)

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارکہ میں دفن ہوں گے' پھر قیامت کے دن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سیدنا محمد ﷺ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان اٹھیں گے۔[۲۹]

زیر بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں تمہیں کافروں کے درمیان سے نکالنے والا ہوں اور تمہیں اُن سے نجات دینے والا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متّبعین کا قیامت تک کافروں پر غالب ہونا اور ''متّبعین'' کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ ''تمہارے پیروکاروں کو میں قیامت تک کافروں پر برتری دینے والا ہوں''۔ اس میں پیروکاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے توحید میں حضرت عیسیٰ کی پیروی کی اور ان کی بات کی تصدیق کی یعنی امتِ محمد ﷺ کے مسلمان۔ اُنہیں میں قیامت تک عزت' مدد اور واضح دلیل کے ساتھ غلبہ دے کر کافروں پر برتری دینے والا ہوں۔ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ ''الذین اتبعوک'' سے وہ حواری مراد ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُن کے دین میں پیروی کی۔ بعض کے نزدیک اس سے عیسائی مراد ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں کو یہودیوں پر برتری حاصل ہے۔ کیونکہ یہودیوں کی سلطنت زائل ہو چکی ہے' اب اُن کی کوئی (مستقل اور ذاتی) سلطنت باقی نہیں ہے۔ جبکہ عیسائیوں کی سلطنت باقی ہے۔ اس قول کی صورت میں ''الذین اتبعوک'' میں اتباع سے (پیروی کرنا مراد نہیں ہوگا بلکہ) محبت اور دین کی پیروی کا دعویٰ کرنا مراد ہوگا۔ کیونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا خواہ کتنا ہی اظہار کیوں نہ کریں وہ حضرت عیسیٰ کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ جس شرک میں وہ لوگ مبتلا ہیں اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی پسند نہیں کیا۔ ان تمام اقوال میں پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی' وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کے لیے اس بات کی گواہی دی کہ وہ اللہ کے بندے' اللہ کے رسول اور اللہ کا کلمہ ہیں۔ اور یہ اہل اسلام ہیں' ان کی سلطنت قیامت تک باقی ہے۔

﴿ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ ﴾ پھر تم سب کو میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ یعنی عیسیٰ کی پیروی اور تصدیق کرنے والے اور اُن کا

[۲۹] مشکوٰۃ المصابیح میں علامہ ابن جوزی کے حوالہ سے یہ روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عیسیٰ بن مریم زمین پر نازل ہوں گے' نکاح کریں گے' اُن کی اولاد ہوگی اور پینتالیس سال قیام کریں گے' پھر وفات پائیں گے اور میرے ساتھ مقبرہ میں دفن کیے جائیں گے۔ پھر (روزِ محشر) میں اور عیسیٰ بن مریم ابوبکر و عُمر کے درمیان ایک مقبرہ سے اٹھیں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۵۵۰۸' ص ۴۸۰)

انکار کرنے والے دونوں گروہوں کو آخرت میں میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ ﴿ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جو حق بات ہے جس میں تم جھگڑتے ہو اس کا میں فیصلہ کروں گا۔ اگلی آیت میں اس فیصلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں اُنہیں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا O اور وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ اُنہیں اُن کا پورا اجر دے گا' اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا O

آیت مذکورہ میں کفار اور ان کے لیے دنیوی اور اُخروی عذاب کی تفسیر

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے وہ تمام یہودی اور عیسائی مراد ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور ان کی ملت کی مخالفت کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط باتیں کہیں اور اُن کی طرف غیر مناسب باتیں منسوب کیں۔ (اُن کے بارے میں فرمایا:) ﴿ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ (میں اُنہیں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا)۔ دُنیا کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ وہ قتل ہوں گے' قیدی بنیں گے' ذلیل ہوں گے اور اُن سے جزیہ لیا جائے گا۔ آخرت کے عذاب سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ آخر میں فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ (اُن کا کوئی مددگار نہیں ہوگا) یعنی ایسے لوگ نہیں ہوں گے جو اُنہیں ہمارے عذاب سے بچا سکیں۔

آیت مذکورہ میں اہل ایمان اور ان کے نیک عمل کرنے کی تفسیر اور اللہ تعالیٰ کا ظالموں کو پسند نہ فرمانے کا مفہوم

﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور اس بات کی تصدیق کی کہ وہ اللہ کے نبی' اللہ کے بندے' اللہ کے رسول اور اللہ کا کلمہ ہیں۔ ﴿ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والوں پر جو باتیں فرض کی گئیں اور جن کی اجازت دی گئی اُن باتوں پر انہوں نے عمل کیا۔ (تو ان کے بارے میں فرمایا:) ﴿ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ﴾ (اللہ اُنہیں اُن کا پورا اجر دے گا) یعنی اُن کے اعمال کا بدلہ دے گا' اُس میں کچھ کمی نہیں فرمائے گا۔ ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا) یعنی جو شخص کسی پر اُس کے حق کے لیے ظلم کرے یا کسی چیز کو اُس کی جگہ کے علاوہ رکھے اُسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ پسند نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں پر نہ رحم فرمائے گا نہ ہی اُن کے کسی اچھے کام کی تعریف فرمائے گا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

(مذکورہ جو باتیں) ہم آپ کو بتا رہے ہیں وہ نشانیاں اور حکمت بھری نصیحت ہیں O

آیت مذکورہ میں "ذالک" کا مشار الیہ اور "آیات" اور "ذکر حکیم" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿ ذٰلِكَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام اور حواریوں کی باتیں اور دیگر

واقعات جو میں نے آپ سے ذکر کیے۔ ﴿ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! ہم جبریل کی زبان سے آپ کو ان واقعات کی خبر دیتے ہیں۔ چونکہ جبریل جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے اور اُسی کے حکم سے ہوتا ہے' وہ اُس میں قطعاً فرق نہیں کرتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے بیان کرنے کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی اور یوں فرمایا کہ ''ذالک نتلوہ علیک'' (یہ باتیں ہم آپ کو بتا رہے ہیں)۔ آگے جو فرمایا: ﴿ مِنَ الْاٰيٰتِ ﴾ اس سے مراد قرآن کریم ہے (یعنی جو باتیں ہم آپ کو بتا رہے ہیں وہ قرآن کریم کا حصہ ہیں)۔ بعض کے نزدیک ''آیات'' سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! ہم جو باتیں آپ کو بتا رہے ہیں وہ ایسی نشانیاں ہیں جو آپ کی نبوت کو ثابت کرنے والی ہیں۔ کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں صرف وہ جان سکتا ہے جو پڑھتا لکھتا ہو یا وہ نبی جس کی طرف وحی کی جاتی ہو۔ جبکہ آپ ''اُمّی'' ہیں' پڑھتے اور لکھتے نہیں ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ باتیں اُس آسمانی وحی کا حصہ ہیں جو آپ پر نازل ہوئی۔ ﴿ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ باتیں ایسی نصیحت ہیں جو مستحکم اور باطل سے محفوظ ہیں۔ بعض کے نزدیک ''ذکر حکیم'' سے قرآن حکیم مراد ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم ایسا حاکم ہے جس سے تمام احکام پتا چلتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ''ذکر حکیم'' سے لوحِ محفوظ مراد ہے جہاں سے اللہ عزوجل کی تمام کتابیں اُس کے رسولوں پر نازل ہوئیں۔ ''لوح محفوظ'' سفید موتی کی ایک تختی ہے جو کہ عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے' اُسے مٹی سے بنایا پھر اُسے فرمایا ''ہو جا'' تو وہ ہو گیا O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ مذکورہ آیت نجران کے ایک عیسائی وفد کے جھگڑے کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نجران کے کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اُن میں سیّد اور عاقب بھی تھے۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ کیا بات ہے آپ ہمارے صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (تمہارا صاحب) کون ہے؟ انہوں نے کہا: عیسیٰ (علیہ السلام)۔ آپ اُن کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہاں! یقیناً وہ اللہ کے بندے ہیں۔ عیسائیوں نے کہا: کیا آپ نے اُن کی کوئی مثال دیکھی ہے یا کسی نے آپ کو اُن کی مثال بتائی ہے؟ پھر وہ لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس سے چلے گئے۔ آپ کے پاس جبریل امین آئے اور کہا کہ اگر وہ آپ کے پاس (دوبارہ) آئیں تو اُنہیں کہہ دیجئے کہ: بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے' اُس نے اُسے مٹی سے بنایا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے عیسائیوں سے کہا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے' اللہ کے رسول اور اللہ کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاک مریم کی طرف القاء فرمایا۔ یہ سُن کر عیسائی غصہ ہو گئے اور کہا: اے محمد (ﷺ)! کیا آپ نے کبھی کوئی انسان دیکھا ہے جو بغیر باپ کے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ﴾ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی طرح ہونے سے مراد یہ ہے کہ پیدا کرنے اور وجود بخشنے میں عیسیٰ کی مثال آدم کی طرح ہے۔ یعنی عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا جیسا کہ آدم کو بغیر ماں باپ

کے مٹی سے پیدا کیا۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ایسا ہی ہے جیسے آدم کا بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا ہونا۔ لہٰذا جو شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کہ بھرپور قدرت والا ہے اُس نے خشک مٹی سے آدم کو پیدا کیا ہے وہ اس بات کو تسلیم کیوں نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ بن مریم کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے۔ جبکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ زیادہ حیرت انگیز ہے۔

آیت میں ''ان مثل عیسی'' سے ''مثل ادم'' تک ایک مکمل تشبیہ ہے اس لیے ''کمثل ادم'' پر جملہ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد جو فرمایا: ''خلقه من تراب'' یہ ایک مستقبل خبر ہے' اس اعتبار سے کہ اس میں حضرت آدم کے مٹی سے پیدا ہونے کا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے مٹی سے آدم کے جسم کا خاکہ بنایا۔

آیت میں ''خلق'' اور پھر کلمہ ''کُن'' فرمانے پر اشکال کا جواب

﴿ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴾ (پھر اُسے فرمایا: ہو جا تو وہ ہو گیا۔) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو کلمہ (کُــن) سے پیدا کر کے وجود بخشا' اسی طرح عیسیٰ کو بھی کلمہ (کُن) سے پیدا کر کے وجود بخشا۔

زیر بحث جملہ کی اس تفسیر کی صورت میں مفسرین نے آیت پر ایک اشکال بیان کیا ہے۔ وہ اشکال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون'' (اُس نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اُسے فرمایا ہو جا تو وہ ہو گیا)۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کلمہ کُن سے پہلے ہوئی (اور کلمہ کُن بعد میں فرمایا گیا) حالانکہ ''خلق'' کے بعد کوئی تکوین نہیں ہے (یعنی پیدا کرنے کے بعد ''کُــن'' نہیں فرمایا جاتا)؟ اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے یہ خبر دی کہ اُس نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' کسی مرد اور عورت کے ملاپ سے نہیں۔ پھر ایک اور خبر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں یہ بھی خبر دیتا ہوں کہ میں نے اُسے ''کُن'' کہا (یعنی ہو جا) تو وہ ہو گیا۔ اور اس کے پیدا ہونے میں وہ ترتیب نہیں تھی جو ولادت میں ہوتی ہے۔ (دوسرا جواب یہ ہے کہ) ہو سکتا ہے آیت میں مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے آدم کا جسم بنایا پھر اُسے فرمایا: بشر ہو جا تو وہ ہو گیا۔ لہٰذا اس صورت میں نظم آیت میں کوئی خلل نہیں ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''کُــن'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے (یعنی حضرت عیسیٰ سے فرمایا: ''ہو جا'' تو وہ ہو گئے)۔ اس صورت میں آیت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی مثل قرار دینے پر اشکال کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور حضرت آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ (اس فرق کے پائے جانے کے باوجود) حضرت عیسیٰ کو حضرت آدم سے تشبیہ کیوں دی گئی؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ حضرت عیسیٰ دو جانب میں سے ایک جانب میں حضرت آدم کی مثل ہیں۔ اور صرف ایک جانب کا پایا جانا حضرت عیسیٰ کو حضرت آدم کے مشابہ قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ کسی کے ساتھ مماثلت یہ ہے کہ آدمی اُس کی کسی ایک صفت میں شریک ہو جائے۔ (دوسرا جواب یہ ہے کہ) حضرت عیسیٰ کو حضرت آدم سے جو تشبیہ دی گئی ہے وہ اس بات میں ہے کہ پیدائش کا جو طریقہ تسلسل سے چلا آ رہا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس سے مختلف طریقہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس بات میں دونوں (حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم) آپس میں ہم مثل ہیں۔ کیونکہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہونا صرف باپ کے بغیر پیدا ہونے کی بہ نسبت زیادہ عجیب و غریب ہے۔ لہٰذا اس آیت میں جو تشبیہ دی گئی ہے وہ غریب کو اغرب سے (یعنی حیرت انگیز کو زیادہ حیرت انگیز سے) دی گئی ہے۔ تاکہ اس سے مخالف (کے اعتراض) کا مکمل طور پر خاتمہ ہو اور جس چیز کو اُس نے عجیب و غریب سمجھا تھا (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی پیدائش) اُس سے زیادہ عجیب وغریب (حضرت آدم کی پیدائش) کو دیکھ کر اُس کے شبہ کا بھرپور ازالہ ہو۔
کسی عالم کے بارے میں آتا ہے کہ وہ روم کے کسی علاقہ میں قید ہو گئے۔ انہوں نے عیسائیوں سے پوچھا: تم حضرت عیسیٰ کو کیوں پوجتے ہو؟ عیسائیوں نے وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کا باپ کوئی نہیں ہے۔ عالم نے کہا: پھر تو حضرت آدم زیادہ اس بات کے حق دار ہیں کہ اُن کی پوجا کی جائے۔ کیونکہ اُن کا باپ بھی کوئی نہیں ہے اور ماں بھی کوئی نہیں۔ عیسائیوں نے کہا: حضرت عیسیٰ مُردے زندہ کرتے تھے۔ عالم نے کہا: پھر تو حضرت حزقیل زیادہ اس بات کے حق دار ہیں کہ اُن کی پوجا کی جائے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ نے صرف چار افراد زندہ کیے تھے اور حضرت حزقیل نے چار ہزار افراد زندہ کیے تھے۔ عیسائیوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوڑھ کے مریض اور برص والے کو شفا دیتے تھے۔ عالم نے کہا: پھر تو حضرت جرجیس اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کی پوجا کی جائے۔ کیونکہ اُنہیں پکا کر جلایا گیا پھر وہ صحیح سالم حالت میں کھڑے ہو گئے۔ (اس پر عیسائی لاجواب ہو گئے۔)

آیت میں ''فیکون'' کے معنیٰ کی تاویل

زیرِ بحث آیت میں جو فرمایا: ﴿ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ''ہو جا تو وہ ہو گیا''۔ یہاں ''فیکون'' جو مستقبل ہے اس سے ماضی مراد ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے (آدم کو مٹی سے بنانے کے بعد) فرمایا: ''ہو جا''۔ اور اے محمد (ﷺ)! آپ جان لیجئے کہ جس چیز کو آپ کا رب فرما دے ''ہو جا'' وہ ضرور ہو کر رہتی ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

(اے سننے پڑھنے والے!) یہ تیرے رب کی طرف سے حقیقت (کا بیان) ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں نہ ہو جانا O

آیت مذکورہ کی تفسیر

یعنی جو کچھ میں نے عیسیٰ کی آدم کے ساتھ مشابہت کی بات بیان کی ہے وہ تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔ لہٰذا تم ''ممترین'' یعنی شک کرنے والوں میں نہ ہو جانا۔ (کیونکہ) جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اسی طرح ہے۔
اس آیت میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے کبھی شک نہیں فرمایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ''۔ (الطلاق:۱) (اس میں بھی خطاب نبی ﷺ سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے)۔ زیرِ بحث آیت میں ﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اے مذکورہ مثال اور دلیل کو سننے والے! تو شک کرنے والوں میں نہ ہو جانا''۔ یہ جملہ از قبیل ''تہییج'' ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ ثابت قدمی اور اطمینان میں اضافہ کرنے پر ابھارا جا رہا ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

پھر (اے محبوب!) جبکہ آپ کے پاس علم آچکا اس کے بعد بھی جو آپ سے (عیسیٰ کے معاملہ میں) جھگڑا کریں آپ (اُنہیں) کہہ دیجئے آؤ ہم بلالیں اپنے اپنے بیٹوں اپنی اپنی عورتوں اور اپنے آپ کو پھر ہم مباہلہ (اللہ کے حضور بہت عاجزی

سے التجا) کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں O

آیت مذکورہ میں آنے والے کلمات کی مختصر تفسیر اور مفہوم

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص آپ سے عیسیٰ کے معاملہ میں جھگڑا کرے۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جو شخص آپ سے حق کے بارے میں جھگڑا کرے۔ ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آپ کے پاس یہ علم آ چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ عزوجل کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ آپ سے عیسیٰ کے معاملہ میں حجت بازی کریں۔ ﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا ﴾ آپ (انہیں) کہہ دیجئے آؤ۔ ''تعالوا'' کا لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے ''علو بالرأی والعزم'' سے ماخوذ ہے (یعنی رائے اور ارادہ کا بلند ہونا) جیسا کہ کہتے ہیں: ''تعال نتفکر فی ھذہ المسئلۃ'' (آؤ ہم اس مسئلہ میں غور و فکر کریں)۔ آگے جو فرمایا: ﴿ نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے بیٹوں کو بلائے۔ (اسی طرح ہم میں سے ہر ایک اپنی عورتوں اور اپنے آپ کو بلائے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ بیٹوں سے حضرت حسن اور حضرت حسین مراد ہیں۔ عورتوں سے حضرت فاطمہ مراد ہیں۔ اور نفس سے خود نبی اکرم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کی پوری جماعت شامل ہے۔

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کا معنیٰ بیان کرتے ہیں: پھر ہم گریہ و زاری کے ساتھ دُعا کریں۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم خوب کوشش کے ساتھ بھرپور دُعا کریں۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم لعنت بھیجیں۔ ''ابتہال'' کا معنیٰ ہے: ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ''علیہ بَهْلَةُ اللّٰہ'' یعنی اُس پر اللہ کی لعنت ہو۔

﴿ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں ہم میں اور تم میں جو جھوٹا ہو اُس پر ہم لعنت کریں۔

نبی اکرم ﷺ اور عیسائیوں کے درمیان مباہلہ کا واقعہ

(۲٤) مفسرین فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے نجران کے وفد کے سامنے مذکورہ آیت مبارکہ تلاوت کی اور اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم واپس جا کر اپنے معاملہ میں غور کرتے ہیں' پھر کل آپ کے پاس ہم آئیں گے۔ جب وہ لوگ علیحدگی میں ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے اپنے سردار اور صاحب رائے شخص عاقب سے کہا: اے عبدالمسیح! تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا: اے گروہِ نصاریٰ! تم لوگ اس بات سے واقف ہو کہ محمد (ﷺ) (اللہ کی طرف سے) بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اگر تم نے اُن سے مباہلہ کیا تو یقیناً ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمہارا اپنے صاحب (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں جو مؤقف ہے اگر تم اس پر ہی قائم رہنا چاہتے ہو تو محمد (ﷺ) سے صلح کر لو اور اپنے علاقہ کی طرف لوٹ آؤ۔ یہ رائے سُن کر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اس وقت رسول اللہ ﷺ حضرت حسین کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھے اور حضرت حسن کا آپ نے ہاتھ پکڑا ہوا تھا' فاطمہ آپ کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی فاطمہ کے پیچھے چل رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ ان سب کو فرما رہے تھے کہ جب میں دُعا کروں تو تم آمین کہنا۔ جب نجران کے بڑے پادری نے یہ قافلہ دیکھا تو کہا: اے گروہِ یہودی! میں ضرور ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ سے پہاڑ کو ہٹانے کی درخواست کریں تو اللہ تعالیٰ پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دے گا' لہٰذا تم لوگ مباہلہ نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور روئے زمین پر قیامت تک کوئی عیسائی نہیں بچے گا۔ یہ سُن کر عیسائیوں نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے ابوالقاسم (ﷺ)! ہماری رائے یہ ہے کہ ہم آپ سے مباہلہ نہ

کریں اور ہم آپ کو آپ کے دین پر اور آپ ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگ مباہلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اسلام لے آؤ' جو مسلمانوں کو مراعات حاصل ہیں وہ تمہیں بھی حاصل ہوں گی اور جو اُن پر لازم ہے وہ تم پر بھی لازم ہوگا۔ انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: میں تم سے مقابلہ کروں گا۔ انہوں نے کہا: ہم میں عرب کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ البتہ ہم آپ سے اس بات پر صلح کر لیتے ہیں کہ آپ ہم سے نہ لڑائی کریں گے نہ ہمیں خوف زدہ کریں گے اور نہ ہی ہمیں ہمارے دین سے لوٹائیں گے اور ہم آپ کو ہر سال دو ہزار حُلّے ادا کریں گے' ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ۳۳ جنگی زرہیں' ۳۳ اونٹ اور ۳۴ جہادی گھوڑے ہم ہر سال ادا کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر اُن سے صلح فرمالی اور ارشاد فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! بے شک عذاب نجران والوں کے قریب آ چکا تھا' اگر وہ لوگ مباہلہ کرتے تو انہیں بندر اور خنزیر بنادیا جاتا اور جنگل آگ سے بھڑک اُٹھتا اور اللہ تعالیٰ نجران کے رہنے والوں کو حتیٰ کہ درختوں پر موجود پرندوں کو ہلاک فرمادیتا۔ اور ایک سال نہ گزرنے پاتا کہ سارے عیسائی ہلاک ہو جاتے۔ (دلائل النبوۃ لابی نعیم: ۲۴۵' سنن ابوداؤد: ۳۰۴۱)

مباہلہ میں بیٹوں اور عورتوں کو شامل کرنے کی وجہ

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے جو مباہلہ کی دعوت دی اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ اور آپ کے مدمقابل (نصاریٰ) میں سے سچے اور جھوٹے کا اظہار ہو جائے۔ اور اس مقصد کا تعلق صرف آپ کے ساتھ ہے اور اُن لوگوں کے ساتھ ہے جن سے آپ مباہلہ کرنے والے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے مباہلہ میں بیٹوں اور عورتوں کو ساتھ ملایا اس کی کیا وجہ ہے؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہ آپ کے اپنے حال اور اپنی سچائی پر یقین کی زیادہ پختہ دلیل ہے۔ کیونکہ آپ نے اُن افراد کو میدان میں پیش کرنے کی جرأت کی جو آپ کے پیارے اور جگر کے ٹکڑے تھے اور تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ اس لیے آپ نے اُنہیں مباہلہ میں پیش کیا۔ نہ آپ نے مباہلہ میں صرف اپنے آپ کو پیش کرنے پر اکتفاء کیا اور نہ اس یقین پر اکتفاء کیا جو آپ کو اپنے مدمقابل کے جھوٹے ہونے کا حاصل تھا۔ (بلکہ مدمقابل کو بھی بچوں اور عورتوں کے ساتھ آنے کی دعوت دی) تا کہ مباہلہ کے مکمل ہونے کی صورت میں مدمقابل اپنے پیاروں اور عزیزوں کے ساتھ نیست ونابود ہو جائے۔

گھر کے افراد میں صرف بیٹوں اور عورتوں کو شامل کرنے کی وجہ

رہا یہ کہ گھر کے دیگر افراد میں صرف بیٹوں اور عورتوں کو کیوں لیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹے اور عورتیں گھر والوں میں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں اور قلبی تعلق ان کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات آدمی ان پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے اور ان کی خاطر جنگ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خود قتل ہو جاتا ہے۔ آیت میں نفس یعنی اپنی ذات کا تذکرہ بعد میں ہے اور بیٹوں اور عورتوں کا تذکرہ پہلے ہے' یہ اس لیے تا کہ اس بات پر آگاہ کیا جائے کہ ان کا مرتبہ بہت نازک ہوتا ہے اور ان کو گھر میں بہت قریب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

مباہلہ کے اس واقعہ میں سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کے برحق ہونے پر بہت زبردست اور واضح دلیل موجود ہے۔ کیونکہ کسی موافق یا مخالف شخص نے نہیں دیکھا کہ عیسائی' مذکورہ مباہلہ کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ کیونکہ انہیں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا برحق ہونا بھی معلوم تھا اور آپ کی نبوت کے وہ دلائل بھی معلوم تھے جو ان کی کتابوں میں موجود تھے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

بے شک یہی سچا بیان ہے' اور اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں' اور بے شک اللہ ضرور بہت غلبہ والا حکمت والا ہے O پھر بھی اگر وہ لوگ منہ پھیریں تو بے شک اللہ فساد برپا کرنے والوں کو خوب جانتا ہے O

آیاتِ مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿اِنَّ هٰذَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بندۂ خدا اور رسول خدا ہونے کے بارے میں جو خبر دی (وہ ضرور حق ہے)۔ ﴿الْقَصَصُ﴾ اصل میں ''قصٌّ'' سے ہے۔ ''قصٌّ'' کا معنیٰ ہے: نشانِ قدم کی پیروی کرنا۔ ''قصص'' اُس خبر کو کہتے ہیں جس میں پے درپے اور مسلسل معانی ہوں۔ ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں) اس میں ''مِنْ'' اس لیے لایا گیا ہے تاکہ نفی میں تاکید پیدا ہو۔ مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا نہیں ہے' جیسا کہ عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ اس جملہ میں عیسائیوں کا رد ہے اور جن جن کو مشرکین خدا قرار دیتے ہیں ان سب کی نفی ہے اور وہ خدا تعالیٰ جس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے اُس کی خدائی اور لائقِ عبادت ہونے کا بیان ہے۔ آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اس میں ''عزیز'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے' اس کے حکم کی مخالفت کرے اور اس کے ساتھ کسی اور کو بھی خدا مانے اُس سے وہ بدلہ لینے والا ہے۔ اور ''حکیم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی تدبیر میں حکمت والا ہے۔ اس جملہ میں عیسائیوں کا رد ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ صفات نہیں ہیں۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ جو فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ لوگ ایمان سے مُنہ پھیریں اور ایمان قبول نہ کریں۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ (تو بے شک اللہ فساد برپا کرنے والوں کو خوب جانتا ہے) یعنی وہ لوگ جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور لوگوں کو کسی اور کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں اُنہیں اللہ عزوجل خوب جانتا ہے۔ اس جملہ میں عیسائیوں کے لیے وعید اور سرزنش ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

(میرے نبی!) آپ کہیے: اے اہل کتاب! تم ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (اور وہ یہ ہے) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو رب نہ بنائے' پھر اگر وہ مُنہ پھیریں تو تم سب کہہ دو (اے کتابیو!) گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مفسرین فرماتے ہیں کہ نجران کا وفد جب مدینہ منورہ آیا تو وہ لوگ یہودیوں کے پاس اکٹھے ہوئے اور سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ عیسائیوں کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے اور ہم اُن کے دین پر

ہیں اور لوگوں میں سب سے زیادہ ہم اُن سے قریب ہیں۔ جبکہ یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور ہم ان کے دین پر ہیں اور لوگوں میں سب سے زیادہ ہم ان کے قریب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دونوں گروہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دین سے بَری ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام راہِ حق پر تھے اور مسلمان تھے اور میں اُن ہی کے دین پر ہوں۔ لہٰذا تم سب اُن کے دینِ اسلام کی پیروی کرو۔ یہ بات سُن کر یہودیوں نے کہا: آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم آپ کو رب بنالیں جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو رب بنالیا۔ عیسائیوں نے کہا: آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہم آپ کے بارے میں وہ باتیں کہیں جو حضرت عزیر کے بارے میں یہودیوں نے کہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ﴾ اے اہل کتاب! تم ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یعنی ایسی بات جس میں انصاف ہو اور اس میں کسی شخص کا اپنے ساتھی کی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ ہر وہ واقعہ یا قصیدہ جس کا آغاز، اختتام اور تشریح بھی ہو اس کو اہل عرب ''کلمة سواء'' کہتے ہیں۔ (آیت میں) ''کلمه سواء'' سے مراد یہ ہے کہ ایسی یکساں بات جس میں تورات، انجیل اور قرآن کریم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

کلمہ کی تفسیر کرتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی عبادت کی، اللہ کے ساتھ شرک کیا یعنی یہ کہا کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں ایک خدا ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے بڑے علماء اور مشائخ کو رب بنایا۔ یعنی ان کے علماء لوگوں کو شرک کا حکم دیتے تھے اور لوگ اُن کی اطاعت کرتے تھے اور اُنہیں سجدے کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عیسائیوں نے ان تینوں معاملات میں کئی چیزیں جمع کی ہوئی تھیں۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ یہود و نصاریٰ سے کہیے! تم ایسے معاملہ کی طرف آ جاؤ جو (ہمارے درمیان) یکساں اور مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم نہ حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا قرار دیں نہ حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دیں، کیونکہ دونوں انسان ہیں اور ہماری طرف پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے علماء و مشائخ نے حلال و حرام کی جو باتیں ایجاد کر رکھی ہیں اُن میں ہم حقیقی جائز بات کی طرف رجوع کیے بغیر اطاعت نہ کریں۔ نہ ہم میں سے کوئی کسی کو سجدہ کرے کیونکہ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ ہم ایسے کام میں کسی کی بات نہ مانیں جس میں اللہ عزوجل کی نافرمانی ہوتی ہو۔

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ یعنی جس چیز کا میں نے اُنہیں حکم دیا ہے اگر وہ اس سے مُنہ پھیریں تو تم اُنہیں کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، یعنی اللہ کو ایک ماننے اور اس کی عبادت کرنے میں مخلص ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا قیصر روم ہرقل کی طرف مکتوب اور اس میں آیت مذکورہ سے تبلیغ

(۲۵) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان نے اُنہیں بتایا کہ ہرقل (شاہِ روم) نے ان کے پاس ایک آدمی بھیجا جبکہ وہ قریش کے قافلہ میں تھے۔ قریش کا یہ قافلہ ملک شام میں تاجر بن کر گیا تھا۔ اور یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان اور کفارِ قریش سے ایک معاہدہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ہرقل کے پاس آئے جبکہ یہ لوگ ایلیاء (بیت المقدس) میں تھے۔ ہرقل نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا، ہرقل کے اردگرد روم کے رئیس بھی جمع تھے۔ پھر ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا وہ مکتوب منگوایا جو آپ نے دِحیہ کلبی کے ہاتھ بصریٰ کے رئیس کو بھیجا تھا۔ اور رئیس بصریٰ نے ہرقل کے

پاس بھیج دیا تھا۔ ہرقل نے اس مکتوب گرامی کو پڑھا' اُس میں یہ الفاظ تھے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ اِثْمُ الْيَرِيْسِيِّيْنَ وَيَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ.

(صحیح بخاری:۷' صحیح مسلم:۱۷۷۳' مسند احمد ج۲ ص۲۶۳' سنن ترمذی:۲۷۱۷' سنن ابوداؤد:۵۱۳۶' مشکوٰۃ:۳۹۲۶۔ ص۳۴۰)

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا' محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں اُن کی طرف سے یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا بادشاہ ہے۔ جو ہدایت کی پیروی کرے اُس پر سلامتی ہو۔ اس کے بعد تمہیں اسلام کی طرف بُلاتا ہوں' تم اسلام لے آؤ سلامتی میں رہو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر تم نے اس پیغام کو تسلیم نہ کیا تو تمہارے پیروکاروں کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اور اے اہل کتاب! آؤ اس بات کو قبول کرلو جو ہمارے اور تمہارے درمیان متفقہ ہے (اور وہ یہ ہے) کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو رب نہ بنائے' پھر اگر وہ منہ پھیریں تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔

مکتوب مذکور میں لفظ ''یریسین'' کی تحقیق

☆ حدیث شریف کے مذکورہ الفاظ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ہیں۔ اور امام بخاری نے اس حدیث کو ہمارے ذکر کردہ الفاظ کی بہ نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں کافی باتیں ہیں۔ ☆ حدیث مذکور میں ایک لفظ ہے: ''الیریسین''۔ ایک روایت میں ''الاریسین'' ہے۔ ''اریس'' کاشت کار کو کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہرقل کی قوم کے لوگ عبداللہ بن اریس کے پیروکار تھے۔ عبداللہ بن اریس ایک آدمی تھا جس کو پہلے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اور اس کی قوم نے اس کی مخالفت کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اروسی تھے۔ اور اروسی وہ عیسائی ہیں جو عبداللہ بن اروس کے پیروکار ہیں۔ ان پیروکاروں کو اروسہ کہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اُریسی تھے۔ اُریسی ان بادشاہوں کو کہتے ہیں جو اپنے نبیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اریسی سے متکبر لوگ مراد ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ اگر تم نے اس پیغام کو تسلیم نہیں کیا تو ''اریسین'' یعنی اُن یہود و نصاریٰ کا گناہ بھی تم پر ہوگا جن کو تم نے اسلام سے روکا اور انہوں نے تمہارے کفر میں تمہاری پیروی کی۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں' تو کیا تم اتنی بھی عقل نہیں رکھتے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجران کے عیسائی اور یہودیوں کے

بڑے بڑے علماء جمع ہوئے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ یہودی علماء نے کہا کہ حضرت ابراہیم یہودی تھے' عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق مذکورہ آیت نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا: اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب یہودیوں اور عیسائیوں نے نبی اکرم ﷺ کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا کیا اور ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت ابراہیم کا تعلق ہم سے تھا اور وہ ہمارے دین پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دعووں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برأت بیان فرمائی اور یہ بتایا کہ یہودیت اور عیسائیت کا وجود تورات اور انجیل کے نازل ہونے کے بعد ہوا ہے اور تورات و انجیل حضرت ابراہیم کے ایک طویل عرصہ بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور ان پر جو تورات نازل ہوئی اس میں ۵۷۵ سال کا عرصہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ۱۶۳۲ سال کا عرصہ ہے۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے درمیان ۵۶۵ سال کا عرصہ ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ۱۹۲۰ سال کا عرصہ ہے۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مُسلم تھے' اس پر اشکال کا جواب

آیتِ مبارکہ کی مذکورہ تفسیر پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام بھی حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے ایک طویل عرصہ بعد وجود میں آیا ہے' اسی طرح قرآن کریم کا نزول بھی تورات اور انجیل کے نزول کے بعد ہوا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم کے بارے میں مسلمانوں کا جو دعویٰ ہے کہ وہ راہِ حق پر تھے اور مسلمان تھے' یہ کیسے درست ہوگا؟ اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کے راہِ حق پر ہونے اور مسلمان ہونے کی خبر اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں دی ہے' جبکہ تورات اور انجیل میں حضرت ابراہیم کے یہودی ہونے یا عیسائی ہونے کا تذکرہ نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا دعویٰ صحیح اور ثابت ہے اور یہود و نصاریٰ کا دعویٰ باطل ہے۔ اسی بطلان کو بیان کرتے ہوئے آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴾ (کیا تم اتنی عقل بھی نہیں رکھتے) یعنی اگر گروہِ یہود و نصاریٰ! کیا تم اپنے قول کا باطل ہونا نہیں سمجھتے تاکہ تم اس جھگڑے سے باز آ جاؤ!

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۞

سنو! تم ہی وہ لوگ ہو کہ تم نے اُن باتوں میں جھگڑا کیا جن کا تمہیں (کچھ نہ کچھ) علم تھا' تو اب اُن باتوں میں کیوں جھگڑ رہے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ○ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی' بلکہ وہ (ہر گمراہی سے) الگ رہنے والے مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے ○

آیت مذکورہ میں الفاظ کی تشریح اور تفسیر

﴿ هٰۤاَنۡتُمۡ ﴾ میں ''ها'' برائے تنبیہ ہے۔ اور یہ مقام نداء کا ہے۔ اس لیے ''ها أنتم هؤلاء'' کا معنیٰ ہے: ''يا هؤلاء'' مراد اس سے اہل کتاب ہیں' یعنی اے گروہِ یہود و نصاریٰ۔ ﴿ حَاجَجۡتُمۡ ﴾ تم نے جدال اور مخاصمت (یعنی جھگڑا) کیا۔ ﴿ فِيۡمَا

لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ (اُن باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم ہے) یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام کے دین کی جو باتیں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور اُن کی وضاحت تم پر نازل کی گئی ہے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تم ان دونوں کے دین پر ہو اور تورات وانجیل بھی تم پر نازل کی گئی ہے۔ اُن میں تم اب تک جھگڑتے رہے۔

﴿ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ (لیکن اب تم اُن باتوں میں کیوں جھگڑنے لگے ہو جن کا تمہیں بھی علم نہیں۔) ''جن باتوں کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری کتابوں میں موجود نہیں ہیں یعنی حضرت ابراہیم کا یہودی یا نصرانی ہونا۔ آخر میں جو فرمایا: ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے'' اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم جس دین پر تھے وہ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ یعنی حضرت ابراہیم کے بارے میں جو کچھ تم کہتے ہو اس سے تم جاہل اور بے خبر ہو۔

آیت: ۶۷ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ''حنیف مسلم'' ہونے اور مشرک نہ ہونے کی تفسیر

اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن باتوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برأت بیان فرمائی جو یہود ونصاریٰ نے ان کے متعلق کہیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کو بتا دیا کہ ابراہیم یہودیت اور عیسائیت سے بَری ہیں۔

﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ﴾ یعنی یہود ونصاریٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق جو دعویٰ کیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے مطابق نہیں تھے۔ رہا یہ کہ وہ کس دین پر تھے؟ اس کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ وہ حنیف مسلمان تھے۔ یعنی تمام مذاہب سے الگ تھلگ اور دین مستقیم ''اسلام'' سے وابستہ تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حنیف وہ شخص ہوتا ہے جو توحید کا قائل ہو، ختنہ والا ہو، قربانی کرتا ہو اور اپنی نماز میں کعبۃ اللہ کی طرف رُخ کرتا ہو۔ اسلام تمام مذاہب میں سب سے اچھا اور سب سے آسان مذہب ہے اور اللہ عزوجل کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو بتوں کو پوجتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں ''مشـــــرکیـــن'' فرما کر بہ طور تعریض یہ بتایا گیا ہے کہ عیسائی مشرک ہیں کیونکہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں اور اُن کی پوجا کرتے ہیں۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

بے شک تمام لوگوں میں (دینی اعتبار سے) ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابراہیم کی پیروی کی اور یہ نبی اور اہل ایمان، اور اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿ اَوْلَى النَّاسِ ﴾ سے مراد ہے: حضرت ابراہیم کے سب سے زیادہ خاص اور قریبی لوگ۔ ﴿ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھے اور حضرت ابراہیم پر ایمان لائے اور ان کی شریعت کی پیروی کی۔ ﴿ هٰذَا النَّبِيُّ ﴾ سے سیدنا محمد ﷺ کی ذات مراد ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے یہ مسلم امت مراد ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد کے ذریعہ اہل ایمان کا ولی ہے (یعنی اہل ایمان کا مددگار ہے)۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۶) ہر نبی کے لیے نبیوں میں سے کچھ قریبی ہوتے ہیں اور میرے جو قریبی ہیں وہ میرے باپ اور میرے رب کے خلیل

(ابراہیم) ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین امنوا واللہ ولی المؤمنین'' (بے شک تمام لوگوں میں ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابراہیم کی پیروی کی اور یہ نبی اور اہل ایمان' اور اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے)۔

(سنن ترمذی: ۲۹۹۵' مسند احمد ج۱ص ۱۰۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۷۶۹۔ص ۵۱۴)

آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت جعفر بن ابوطالب اور کفارِ قریش کے درمیان نجاشی کے دربار میں گفتگو کا تفصیلی واقعہ

(۲۷) کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور محمد بن اسحٰق نے ابن شہاب سے اپنی سند کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کی حدیث بیان کی ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت جعفر بن ابوطالب اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کچھ لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں سکونت اختیار کر لی اور نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس دوران غزوۂ بدر میں (کفارِ مکہ کی ہلاکت کا) جو سانحہ ہوا اس کی وجہ سے قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کے جو لوگ نجاشی کے پاس پناہ گزین ہیں ان سے ہم اپنے بدر کے مقتولین کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ مال جمع کر کے نجاشی کو تحفہ بھیجو تا کہ تمہاری قوم کے جو افراد اس کے پاس پناہ لیے ہوئے ہیں وہ انہیں تمہارے حوالے کر دے۔ اور اس کام کے لیے دو دانش مند آدمی تیار ہونے چاہیے۔ چنانچہ قریش نے عمرو بن العاص اور عمارہ بن ابی معیط کو چمڑے اور دیگر چیزیں تحائف کے طور پر دے کر روانہ کیا۔ وہ دونوں کشتی میں سوار ہو کر حبشہ پہنچے۔ جب نجاشی کے پاس آئے تو دونوں نے نجاشی کو سجدہ کیا اور سلام کیا اور کہا کہ ہماری قوم کے لوگ آپ کے خیر خواہ اور شکر گزار ہیں اور آپ کے ساتھیوں سے محبت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے تا کہ ہم آپ کو ان لوگوں سے بچائیں جو آپ کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ (العیاذ باللہ) ایک ایسے کذاب شخص کی قوم ہیں جو ہمارے درمیان اپنے رسول ہونے کا نظریہ لے کر ظاہر ہوا ہے۔ اور ہم میں سے اُس شخص کی سوائے بیوقوفوں کے اور کسی نے پیروی نہیں کی۔ ہم نے ان لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور اپنی زمین کی ایک گھاٹی میں محصور کر دیا تھا۔ نہ کوئی شخص ان کے پاس جا سکتا تھا اور نہ ان میں سے کوئی باہر آ سکتا تھا۔ بھوک اور پیاس نے انہیں مار ڈالا تھا۔ جب زندگی گزارنا ان کے لیے دشوار ہو گیا تو انہوں نے (یعنی محمد ﷺ نے) اپنے چچازاد بھائی کو آپ کے پاس بھیج دیا تا کہ وہ آپ کے مذہب' آپ کی بادشاہت اور آپ کی رعایا میں فساد پیدا کرے۔ لہٰذا آپ ان لوگوں سے محتاط رہیں اور انہیں ہمارے حوالے کر دیں تا کہ ہم آپ کو اُن سے بچا سکیں۔ (دونوں نے مزید کہا کہ) ہماری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ جب آپ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو نہ آپ کو سجدہ کریں گے نہ ہی آپ کو اُس طرح سلام پیش کریں گے جس طرح دیگر لوگ آپ کو سلام پیش کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو آپ کے مذہب اور آپ کے معمولات سے نفرت ہے۔ یہ باتیں سن کر نجاشی نے ان لوگوں کو بُلا بھیجا۔ جب وہ لوگ پہنچے تو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دروازہ پر بلند آواز سے کہا: اللہ تعالیٰ کا گروہ آپ کے پاس آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ نجاشی نے جب یہ جملہ سُنا تو اُس نے (دربانوں سے) کہا کہ جس نے یہ جملہ کہا ہے اُس سے کہو کہ وہ اپنا جملہ دہرائے۔ حضرت جعفر نے دوبارہ مذکورہ جملہ کہا کہ اللہ کا گروہ اجازت چاہتا ہے۔ نجاشی نے کہا: اجازت ہے' اللہ کی حفظ و امان کے ساتھ اندر آ جاؤ۔ نجاشی کا یہ جواب عمرو بن العاص اور عمارہ بن ابی معیط کو بُرا لگا اور عمرو نے عمارہ کی طرف دیکھ کر کہا: سُن رہے ہو کس طرح یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کا گروہ کہہ رہے ہیں اور بادشاہ نے کیا جواب دیا ہے؟ پھر وہ لوگ اندر آئے اور بادشاہ کو سجدہ نہیں کیا۔ عمرو بن العاص نے

بادشاہ سے کہا: آپ دیکھتے نہیں یہ لوگ آپ کو سجدہ کرنے میں تکبر کر رہے ہیں؟ نجاشی نے ان لوگوں سے پوچھا کہ کس چیز نے تمہیں میرے آگے سجدہ کرنے اور اُس سلام کو پیش کرنے سے روک دیا جو دور دراز سے آنے والے لوگ مجھے پیش کیا کرتے ہیں؟ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم تو اُس معبودِ برحق کے حضور سجدہ کرتے ہیں جس نے آپ کو پیدا کیا اور آپ کو بادشاہت عطا فرمائی۔ جہاں تک سلام کا تعلق ہے تو وہ ہم اس وقت کرتے تھے جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے، پھر ہم میں اللہ عزوجل نے اپنا سچا نبی مبعوث فرمایا جس نے ہمیں اللہ کے پسندیدہ سلام کا حکم دیا یعنی ''السلام''۔ اور یہ اہل جنت کا سلام ہے۔ نجاشی نے یہ جواب سُن کر جان لیا کہ یہ حق ہے اور یہ تورات اور انجیل میں موجود ہے۔ پھر اُس نے کہا کہ تم میں وہ شخص کون ہے جس نے یہ جملہ کہا تھا کہ ''اللہ کا گروہ اجازت چاہتا ہے؟'' حضرت جعفر نے کہا: میں نے یہ جملہ کہا تھا۔ نجاشی نے کہا: گفتگو کرو۔ حضرت جعفر نے فرمایا: آپ اہل کتاب میں سے ایک بادشاہ ہیں، آپ کے پاس نہ زیادہ کلام کرنا مناسب ہے نہ ظلم۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے جواب دوں، لہٰذا آپ دونوں افراد (عمرو اور عمارہ) کو حکم دیں کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بات کرے اور دوسرا خاموش رہے اور آپ ہماری گفتگو سماعت کریں۔ چنانچہ دونوں میں سے عمرو نے حضرت جعفر سے کہا: آپ کلام کا آغاز کریں۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آغاز کرتے ہوئے نجاشی سے کہا: آپ ان دونوں سے پوچھیں کہ ہم غلام ہیں یا آزاد؟ اگر ہم اپنے آقاؤں کے بھاگے ہوئے غلام ہیں تو آپ ہمیں ہمارے آقاؤں کے پاس واپس بھیج دیں۔ نجاشی نے سوال کیا: بتاؤ یہ لوگ غلام ہیں یا آزاد؟ عمرو نے جواب دیا کہ یہ لوگ معزز آزاد ہیں۔ نجاشی نے کہا کہ غلامی سے ان لوگوں کو نجات مل گئی۔ حضرت جعفر نے کہا: آپ ان دونوں سے پوچھیں کیا ہم نے ناحق کوئی خون بہایا ہے جس کا ہم سے بدلہ لینا ہو؟ عمرو نے جواب دیا: نہیں، ایک قطرہ بھی نہیں بہایا۔ حضرت جعفر نے کہا: آپ ان دونوں سے پوچھیں کیا ہم نے لوگوں کا ناحق مال لیا ہے جس کی ادائیگی ہم پر لازم ہو؟ نجاشی نے کہا: اگر تم پر ڈھیر سارا مال بھی ہو تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ عمرو نے کہا: نہیں، ایک قیراط (درہم کے بارہویں حصہ کے برابر ایک وزن) بھی کسی کا ان پر نہیں ہے۔ نجاشی نے یہ ساری باتیں سُن کر عمرو بن العاص سے کہا: پھر تم ان لوگوں سے کیا چاہتے ہو؟ عمرو نے جواب دیا کہ ہم اور یہ لوگ سب ایک دین اور ایک طریقہ پر تھے جو ہمارے آباء واجداد کا دین تھا۔ ان لوگوں نے اس دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کر لیا ہے۔ ہمیں ہماری قوم نے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں۔ نجاشی نے کہا: جس دین پر تم تھے وہ کون سا دین تھا اور جس کی انہوں نے پیروی اختیار کی وہ کون سا دین ہے؟ حضرت جعفر نے جواباً فرمایا: جہاں تک اُس دین کا تعلق ہے جس پر ہم پہلے تھے تو وہ شیطان کا دین ہے۔ ہم اللہ عزوجل کا انکار کرتے تھے اور پتھروں کو پوجتے تھے۔ جبکہ وہ دین جسے ہم نے بعد میں اپنایا ہے وہ اللہ کا دین ''اسلام'' ہے۔ اُسے ہمارے پاس اللہ کی جانب سے ایک رسول لے کر آیا ہے اور ایک کتاب ہے جو حضرت ابن مریم (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کی کتاب کی مثل اور اس کے موافق ہے۔ نجاشی نے کہا: اے جعفر! یہ تم نے ایک بڑی بات کی ہے، تم ٹھہرو۔ پھر نجاشی نے ناقوس بجانے کا حکم دیا۔ ناقوس بجایا گیا تو سارے علماء اور پادری نجاشی کے پاس جمع ہو گئے۔ نجاشی نے ان سے کہا: جس خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی ہے میں تمہیں اس کی قسم دیتا ہوں، بتاؤ کیا تمہارے علم کے مطابق حضرت عیسیٰ اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی مُرسَل ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! ہمیں حضرت عیسیٰ نے اُس نبی کی بشارت دی ہے اور فرمایا ہے کہ جس نے اس نبی کو مانا اُس نے مجھے مانا اور جس نے اُس نبی کا انکار کیا اُس نے میرا انکار کیا۔ یہ گفتگو سُن کر نجاشی نے حضرت جعفر سے کہا: تمہیں یہ شخص (سیدنا محمد ﷺ) کیا بتاتے ہیں، کن باتوں کا حکم دیتے ہیں اور کن باتوں سے روکتے ہیں؟ حضرت جعفر نے فرمایا: وہ ہمیں اللہ عزوجل کی کتاب پڑھ کر سناتے ہیں، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور

بُری باتوں سے روکتے ہیں' اچھے تعلقات' رشتہ داری اور یتیم کے ساتھ حُسن سلوک کا حکم دیتے ہیں۔ وہ ہمیں کہتے ہیں کہ ہم اُس خدا کی عبادت کریں جو اکیلا ہے اور لاشریک ہے۔ نجاشی نے جب یہ باتیں سُنیں تو (بہ طور فرمائش) کہا: جو کچھ وہ تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں اُس میں سے کچھ مجھے بھی سنایئے! حضرت جعفر نے سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم پڑھ کر سنائی۔ ان کی تلاوت سے نجاشی اور اس کے درباریوں کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں' انہوں نے کہا: اس پاکیزہ کلام سے مزید کچھ سُنایئے تو حضرت جعفر نے سورۃ الکہف پڑھ کر سنائی۔ عمرو بن العاص نے نجاشی کو غصہ دلانے کے لیے کہا کہ یہ لوگ عیسیٰ اور اُن کی والدہ (مریم) کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ نجاشی نے حضرت جعفر سے پوچھا: حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ (حضرت مریم) کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟ جواب میں حضرت جعفر نے سورۂ مریم پڑھ کر سُنا دی۔ تلاوت کے دوران جب حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کا ذکر آیا تو نجاشی نے اپنی مسواک سے آنکھ میں گرنے والے تنکے کے برابر ایک ریشہ نکالا اور کہا کہ جو کچھ تم لوگ بیان کر رہے ہو' خدا کی قسم! حضرت مسیح اس ریشہ کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں (یعنی تمہاری بات بالکل برحق ہے)۔ پھر نجاشی نے حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں سے کہا: جاؤ' تم لوگ میری زمین میں امن سے رہو۔ جس نے تمہیں بُرا بھلا کہا یا اذیت دی وہ نقصان اٹھائے گا۔ مزید کہا کہ تم لوگ خوش رہو' خوف نہ رکھو' آج سے ابراہیم کے گروہ کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ عمرو نے کہا: اے نجاشی! ابراہیم کا گروہ کون سا ہے؟ نجاشی نے کہا: یہ لوگ اور ان کے سردار (یعنی سیدنا محمد ﷺ) جن کے پاس سے یہ آئے ہیں اور جس نے ان سب کی پیروی کی۔ مشرکین نے ان کا انکار کیا اور حضرت ابراہیم کے دین کے بارے میں غلط دعویٰ کیا ہے۔ پھر نجاشی نے عمرو بن العاص اور اس کے ساتھی کو وہ مال واپس کر دیا جو وہ لے کر آئے تھے اور اُن سے کہا کہ تمہارا یہ تحفہ ''رشوت'' ہے' تم اسے واپس لے لو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بادشاہت سے نوازا (اس کے باوجود) اُس نے مجھ سے رشوت نہیں لی۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم دربار سے واپس آئے تو ہمیں بہترین پناہ حاصل تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسی دن رسول اللہ ﷺ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہودیوں کے جھگڑا کرنے پر مدینہ منورہ میں یہ آیت نازل فرمائی: ''اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ''۔ (آل عمران:۶۸) (بے شک تمام لوگوں میں ابراہیم سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے ابراہیم کی پیروی کی اور یہ نبی اور اہل ایمان' اور اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے)۔ (اسباب النزول للواحدی: ۲۱۱' دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۳۰۱-۳۰۶)

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

اہل کتاب کا ایک گروہ دل سے چاہتا ہے کہ کاش تمہیں گمراہ کر دے' حالانکہ وہ صرف اپنے ہی آپ کو گمراہ کر رہے ہیں اور اُنہیں (اس حقیقت کا) شعور نہیں ○ اے کتابیو! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو ○

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور مختصر تفسیر

آیت مذکورہ: ۶۹ حضرت معاذ بن جبل' حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی' جب انہیں یہودیوں نے اپنے دین کی طرف آنے کی دعوت دی۔

﴿وَدَّتْ﴾ کا معنیٰ ہے: تمنا کرنا۔ ﴿طَّآئِفَةٌ﴾ کا معنیٰ ہے: گروہ' جماعت۔ ﴿مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ سے یہودی مراد ہیں (یعنی اہل کتاب کی ایک جماعت تمنا کرتی ہے)۔ ﴿لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (کاش کہ وہ تمہیں بہکا دے) یعنی تمہارے دین سے بہکا

دے اور کفر کی طرف پھیر دے۔ ﴿ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ ﴾ (حالانکہ وہ صرف اپنے ہی آپ کو گمراہ کر رہے ہیں) کیونکہ جو اہل ایمان ہیں وہ اُن کی بات قبول نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی تمنا اور خواہش کی وجہ سے وہ لوگ گناہگار ہوتے ہیں۔ ﴿ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ (وہ اس کا شعور نہیں رکھتے) یعنی اس بات کا شعور نہیں رکھتے کہ گمراہ کرنے کا وبال خود اُن ہی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ کیونکہ اُنہیں ڈبل عذاب ہوگا ایک تو خود اپنے گمراہ ہونے کا اور دوسرا مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی خواہش کا (اس حقیقت کا اُنہیں شعور نہیں)۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جو خواہش ہے اُس کو پورا کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے، درحقیقت وہ صرف اپنے ہی جیسے لوگوں کو اور اپنے پیروکاروں کو اور اپنے ہم جماعت لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور گواہی دینے کی تفسیر

﴿ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ ﴾ میں یہودیوں سے خطاب ہے (یعنی اے یہودیو!) ﴿ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ﴾ (تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو) اللہ کی آیتوں سے مراد قرآن کریم ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے سیدنا محمد ﷺ کی وہ تعریف و توصیف مراد ہے جو تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہے۔ اس قول کی صورت میں آیت میں کفر سے تحریف اور تبدیلی مراد ہوگی۔ یعنی تورات اور انجیل میں نبی اکرم ﷺ کی جو تعریف و توصیف اور آپ کی نبوت کی جو بشارت موجود ہے اُس میں انہوں نے تبدیلی کر دی، کیونکہ وہ ان باتوں کے منکر ہیں۔ ﴿ وَاَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس بات کے گواہ ہو کہ نبی ﷺ کی تعریف و توصیف تورات اور انجیل میں موجود ہے۔ (اس جملہ کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) علماءِ یہود نبی اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف کو چھپایا کرتے تھے، البتہ جب تنہائی میں ایک دوسرے سے ملتے تھے تو آپس میں ان باتوں کا اظہار کرتے تھے اور ان باتوں کے حق ہونے کی گواہی دیتے تھے۔

یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

اے کتاب والو! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم باخبر ہو O

یہودی اور عیسائی علماء دلی طور پر اس بات کو جانتے تھے کہ سیدنا محمد (ﷺ) اللہ کی جانب سے ایک رسول ہیں اور ان کا دین حق ہے۔ لیکن زبان سے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے دین کا انکار کرتے تھے اور مختلف شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ کیونکہ حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والا شخص یہی کام کر سکتا ہے۔

اہل کتاب کے حق کو باطل کے ساتھ ملانے کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ (تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو؟) اس سے تورات میں تحریف اور تبدیلی مراد ہے۔ وہ لوگ تحریف کر کے اپنے ہاتھ سے جو کچھ لکھتے تھے اس کو اُس حق سے ملا دیتے تھے جو نازل ہوتا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے: اسلام کو یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ ملانا۔ کیونکہ انہوں نے آپس میں اس بات پر اتفاق کیا کہ دن کے آغاز میں ہم اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں گے اور آخری حصہ میں اسلام سے دوبارہ پلٹ جائیں گے۔ اس سے ان کا مقصد لوگوں کو شک میں مبتلا کرنا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ لوگ (حق کو باطل کے ساتھ ملانے کا مظاہرہ اس طرح کرتے تھے کہ) کہتے تھے کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) حضرت موسیٰ کی نبوت کو صحیح اور برحق مانتے ہیں اور تورات سے بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہیں ہوگی۔ اس طرح کی باتیں کر کے لوگوں پر وہ حق اور باطل کو خلط ملط کر دیا کرتے تھے۔

﴿وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ (تم حق کو کیوں چھپاتے ہو؟) اس سے مراد یہ ہے کہ تورات میں نبی اکرم ﷺ کی جو تعریف و توصیف ہے اُس کو کیوں چھپاتے ہو؟ ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (حالانکہ تم جانتے ہو) یعنی یہ بات تمہیں معلوم ہے کہ محمد مصطفےٰ (ﷺ) اللہ کی جانب سے ایک رسول ہیں اور ان کا دین حق ہے۔ اور تم نے جو حق کو چھپایا ہے وہ محض دشمنی اور حسد کی بنیاد پر ہے حالانکہ حق کو چھپانے پر جس عذاب کے تم مستحق ٹھہرو گے اس سے تم باخبر ہو۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا: جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لے آؤ اور سرِ شام (اس کا) انکار کر دو' شاید (اس طرح) وہ (مسلمان اپنے دین سے) پھر جائیں O

آیت مذکورہ کے پس منظر کے بیان میں مفسرین کے دو اقوال

اس آیت میں اہل کتاب کی جو بات بیان فرمائی وہ یہودیوں کا حق کو باطل کے ساتھ ملانے کا ایک اور انداز ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ خیبر اور عُرینہ کی بستیوں کے بارہ یہودی علماء نے آپس میں یہ طے کیا کہ قلبی اعتقاد کے بغیر محض زبان سے (سیدنا) محمد (ﷺ) کے دین میں صبح داخل ہو جاؤ اور شام میں کافر ہو جاؤ۔ اور لوگوں سے یوں کہنا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں غور کیا اور اپنے علماء سے مشورہ کیا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) وہ شخص نہیں ہیں جس کی ہماری کتابوں میں تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے۔ اور ہم پر ان کا کاذب ہونا ظاہر ہو گیا۔ جب تم یہ کام انجام دو گے تو (سیدنا) محمد (ﷺ) کے دین میں اُن کے ماننے والوں کو شک ہو جائے گا اور وہ اُن پر تہمت لگائیں گے۔ اور ہمارے بارے میں کہیں گے کہ یہ لوگ اہل کتاب ہیں' ان لوگوں کو ہم سے زیادہ معلومات ہیں۔ پھر وہ اپنے دین سے پلٹ جائیں گے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت قبلہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں کو اس سے تکلیف ہوئی۔ چنانچہ کعب بن اشرف یہودی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) پر کعبہ کے متعلق جو حکم نازل ہوا ہے' صبح تم اس پر ایمان لے آؤ اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرو' پھر شام میں کافر ہو جاؤ اور اپنے قبلہ کی طرف واپس پلٹ آؤ' شاید کہ مسلمان (اپنے دین سے) پھر جائیں۔ کیونکہ وہ ہمارے بارے میں کہیں گے کہ یہ لوگ اہل کتاب ہیں' ان لوگوں کی معلومات ہم سے زیادہ ہیں۔ پھر وہ ہمارے قبلہ کی طرف پلٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رازدارانہ گفتگو پر اپنے رسول (ﷺ) کو مطلع فرما دیا اور مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ میں یہودیوں کے قول ''وجه النهار'' اور ''لعلهم يرجعون'' کی تفسیر

آیتِ مبارکہ میں جو ﴿وَجْهَ النَّهَارِ﴾ فرمایا اس کا معنیٰ ہے: ''اول النهار'' (دن کا ابتدائی حصہ)۔ ''وجه'' ہر چیز کے اگلے حصہ (Front) کو کہتے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے اُسی کی طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ اسی معنیٰ میں یہ شعر ہے:

من كان مسرورا بمقتل مالك ۔۔۔ فليأت نسوتنا بوجه نهار

''جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوا سے چاہیے کہ وہ دن کے ابتدائی حصہ میں ہماری عورتوں کے پاس آئے''۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (شاید اس طرح وہ مسلمان اپنے دین سے پھر جائیں) اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے یہ شک شبہ اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو اپنے دین میں شک ہو جائے۔ اور جب شک ہو گا تو وہ اپنے دین سے پلٹ جائیں گے۔

یہودیوں نے جب یہ سازش تیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس سے آگاہ فرما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی سازش پوری نہ ہو سکی اور اہل ایمان کے دلوں میں اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو اس سازش سے آگاہ نہ فرماتا تو ممکن تھا کہ وہ بعض مسلمان جن کے ایمان میں کچھ کمزوری تھی وہ اس سازش سے متاثر ہو جاتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚۙ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اور (انہوں نے ایک دوسرے کو تاکید کی کہ) جو شخص تمہارے دین کا پیروکار ہو اس کے سوا تم کسی کی بات نہ ماننا' (اے محبوب!) آپ کہیے: بے شک ہدایت تو اللہ کی (عطا کردہ) ہدایت ہے' (اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم اس بات کو نہ ماننا کہ) جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اُس جیسا کسی اور کو بھی دیا جا سکتا ہے یا وہ (مسلمان) تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کریں گے' (اے محبوب!) آپ کہہ دیجئے! بے شک فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ جسے چاہتا ہے اُسے (فضل) سے نوازتا ہے' اور اللہ وسعت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے O وہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص فرما لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے O

آیت مذکورہ: ۷۳ کا گزشتہ آیت سے اتصال

﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ یہ جملہ گزشتہ آیت کے ساتھ متصل ہے۔ یعنی یہودی آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ جو شخص تمہارے دین کا پیروکار ہو یعنی تمہاری ملت یہودیت کے مطابق ہو اس کے سوا کسی کی تصدیق نہ کرنا۔ ''لِمَنْ'' میں لام زائدہ ہے جیسے ''ردف لکم'' بمعنیٰ ''ردفکم'' میں لام زائدہ کا ہے۔

آیت مبارکہ میں ''قل ان الھدی ھدی اللہ'' کے معترضہ اور مستانفہ ہونے کے بارے میں مفسرین کا اختلاف

﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ آپ کہیے: بے شک ہدایت تو اللہ کی عطا کردہ ہدایت ہے۔ یعنی دین اللہ کا دین ہے اور بیان اللہ کا بیان ہے۔ یہ جملہ اللہ عزوجل کی جانب سے ایک خبر ہے۔ پھر مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے یا اس جملہ سے نئے مستقل کلام کا آغاز ہے؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ جملہ دو باتوں کے درمیان معترضہ ہے اور اس کے بعد والا کلام اس سے پہلے والے کلام سے متصل ہے۔ آیت کا مفہوم یوں ہے کہ یہودیوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ جو شخص تمہارے دین کا پیروکار ہو اس کے سوا کسی کی بات نہ ماننا' اور یہ بھی نہ ماننا کہ جو کچھ تمہیں علم و حکمت' کتاب اور سمندر کو چیرنے اور منّ و سلویٰ کو نازل کرنے کی نشانیاں اور دیگر اعزازات تمہیں عطا کیے گئے ہیں اُن کی مثل کسی اور کو بھی دیا جائے گا۔ اور یہ بھی نہ ماننا کہ لوگ تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف کوئی حجت پیش کریں گے۔ کیونکہ تمہارا دین لوگوں میں سب سے اچھا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس بات کو بیان کیا تو درمیان میں فرمایا: ''قل ان الھدی ھدی اللہ'' (آپ کہیے! بے شک ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے)۔ مراد یہ ہے کہ (اے یہودیو!) جس دین پر تم قائم ہو وہ اللہ کے حکم اور اس کے فرمان ہی سے دین بنا ہے۔ سو جب اُس نے دوسرے دین کو اختیار کرنے کا حکم دیا تو اس کی پیروی اور اس کے حکم کی فرمانبرداری واجب ہوئی' کیونکہ اُسی نے اس دین کی ہدایت دی ہے اور اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ ''اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے! بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور میں اُسی ہدایت کو لے کر تمہارے پاس آیا ہوں اور تم اس کے خلاف جو کمزور مکر وفریب کر رہے ہو وہ تمہیں ہرگز فائدہ نہیں دے گا''۔ امام حسن اور اعمش نے ''اَنْ یُّؤْتٰی'' کو ''اِنْ یُّؤْتٰی'' پڑھا ہے۔ اس صورت میں ''الا لمن تبع دینکم'' پر یہودیوں کا کلام مکمل ہو گیا اور اس کے بعد جو جملہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ''اے محمد (ﷺ) آپ کہیے! بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے' اے امتِ محمد (ﷺ)! تمہیں جو دین اور ہدایت عطا کی گئی ہے اس کی مثل کسی کو عطا نہیں کیا گیا' سوائے اس کے کہ یہودی تم پر ناحق حجتیں قائم کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تم سے افضل ہیں''۔

مذکورہ جو مفہوم آیت کا بیان کیا گیا اس میں ''اِنْ یُّؤْتٰی'' کے ''اِنْ'' کو جحد کے معنیٰ میں کر کے ''ما یؤتی'' کا معنیٰ کیا گیا ہے۔ اور ﴿ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ ﴾ کو ''الا ان یحاجوکم'' کے معنیٰ میں لیا گیا۔ بعض کے نزدیک ''او یحاجوکم'' میں ''اَوْ'' ''حتّٰی'' کے معنیٰ میں ہے۔ اور ﴿ عِنْدَ رَبِّكُمْ ﴾ جو فرمایا وہ ''عند فعل ربکم'' کے معنیٰ میں ہے۔ مرادِ آیت یہ ہے کہ اے امتِ محمد (ﷺ) جو دین اور حجت تمہیں عطا کی گئی ہے اس کی مثل کسی کو عطا نہیں کیا گیا جو وہ تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کر سکے۔

ابن کثیر نے ''ان یؤتی'' کو ہمزۂ استفہام کے ساتھ مد کر کے ''آنْ یُّؤْتٰی'' پڑھا ہے۔ اس صورت میں کلام میں اختصار ہو گا اور تقدیرِ عبارت یہ ہو گی کہ اے گروہِ یہود! کیا کسی کو تمہاری مثل کتاب اور حکمت عطا کی جائے تو تم اس سے حسد کرو گے اور اس پر ایمان نہیں لاؤ گے؟ یہ قتادہ اور ربیع کا قول ہے۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ یہ (ان یؤتی) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔ اللہ عزوجل فرما رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے! بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اس طور پر کہ اُس نے تمہاری کتاب کی مثل ایک کتاب نازل فرمائی اور تمہارے نبی کی طرح ایک نبی بھیجا جس سے تم نے حسد کیا اور اس کا انکار کیا۔ آپ کہہ دیجئے بے شک فضل وکرم اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس (فضل) سے نوازتا ہے۔ ابن کثیر کی مذکورہ قرأت کی صورت میں ''او یحاجوکم'' کا خطاب اہل ایمان سے ہو گا اور ''اَو'' بمعنیٰ ''اِنْ'' ہو گا۔ کیونکہ یہ دونوں حروف شرط ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ اے گروہِ مؤمنین! اگر وہ لوگ تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کریں تو اے محمد (ﷺ)! آپ کہہ دیجئے بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور ہم اسی پر قائم ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں خطاب کے متعلق مزید احتمالات

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری آیت میں خطاب اہل ایمان سے ہو۔ اور نظم آیت یوں ہو کہ اے گروہِ مؤمنین! جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے اس کی مثل اگر کسی کو عطا کیا جائے اور پھر وہ لوگ تم سے حسد کریں تو (اے محمد ﷺ!) کہہ دیجئے بے شک فضل وکرم اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اگر وہ تمہارے خلاف حجت قائم کریں تو کہہ دیجئے بے شک ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہودیوں کے متعلق کلام ''لعلھم یرجعون'' پر مکمل ہوا اور زیرِ بحث آیت (ولا تؤمنوا) سے اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ (اس صورت میں یہ کہیں گے کہ) ''ولا تؤمنوا'' سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو تقویت دی ہے۔ تاکہ جب یہودی مسلمانوں کو دین کے معاملہ میں شکوک وشبہات اور فریب میں مبتلا کریں تو مسلمان شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوں۔ پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے: اے گروہِ مؤمنین! جو شخص تمہارے دین کا پیروکار ہو اس کے سوا کسی اور کی بات نہ مانو اور نہ ہی اس بات کو مانو کہ جو دین اور فضل وکرم تمہیں عطا کیا گیا ہے اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے گا اور نہ ہی اس بات کو مانو کہ لوگ تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت قائم کریں گے یا اس کا موقع پائیں گے۔ کیونکہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور فضل وکرم اللہ

کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے فضل و کرم سے نوازتا ہے اور اللہ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

(مذکورہ مفہوم سے واضح ہو گیا کہ) پوری آیت میں اہل ایمان سے خطاب فرمایا گیا ہے اس وقت جبکہ یہودیوں نے مسلمانوں کو شکوک میں مبتلا کیا۔ تاکہ مسلمان ان کے شکوک و شبہات کے شکار نہ ہوں۔

فضل و کرم کا اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہونا اور یہودیوں کی تردید و تکذیب

﴿ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ کہہ دیجئے بے شک فضل یعنی ایمان کی توفیق اور اسلام کی ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے یعنی وہ اس کا مالک ہے اور وہی اس پر قادر ہے تمہیں اور ساری مخلوق میں کسی کو اس پر قدرت نہیں ہے۔ ﴿ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ فضل یعنی دینِ اسلام اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اپنی مخلوق میں جسے چاہتا ہے اس کی توفیق دیتا ہے۔ اس میں یہودیوں کے اس قول کی تکذیب ہے جو انہوں نے کہا کہ "ان یؤتی احد مثل ما أوتیتم" (یعنی اس بات کو نہ ماننا کہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس کی مثل کسی اور کو بھی دیا جا سکتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا: آپ ان سے کہہ دیجئے کہ یہ بات ان کے اختیار میں نہیں ہے فضل و کرم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

"فـــضـــل" کا لغت میں اصل معنیٰ ہے: زیادہ کرنا، بڑھانا۔ اکثر اس کا استعمال احسان زیادہ کرنے کے وقت ہوتا ہے۔ "فاضل" اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو اچھی خصلتوں میں دوسروں سے آگے ہو۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴾ اس میں "واســـع" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت اور کشادگی والا ہے، جس پر چاہتا ہے فضل و کرم فرماتا ہے۔ اور "عـــلـــیـــم" سے مراد یہ ہے کہ جس پر وہ فضل و کرم فرماتا ہے اور جو فضل و کرم کا اہل ہوتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے۔

آیت مذکورہ میں رحمت کی تفسیر اور آیت سے نبوت کے وہبی ہونے پر استدلال

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ وہ اپنی مخلوق میں جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص فرما لیتا ہے۔ رحمت سے مراد یہ ہے کہ اپنی نبوت اور رسالت کے ساتھ خاص فرما لیتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے دین "اسلام" کے ساتھ خاص فرما لیتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ خاص فرما لیتا ہے۔

آیت مذکورہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ نبوت کسی استحقاق کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ صرف اختصاص اور تفضل سے حاصل ہوتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے خاص فرما لیتا ہے اور اپنے فضل سے نبوت عطا فرماتا ہے)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اختصاص ہی کے باب سے منسلک فرمایا ہے۔ اور مالک و مختار کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے عطا کرے، خواہ وہ شخص استحقاق نہ رکھتا ہو۔ ﴿ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴾ (اور اللہ بڑے فضل والا ہے)۔

> وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۞

اور اہل کتاب میں کچھ ایسے ہیں کہ اگر تم اُن کے پاس ڈھیر سارا مال امانت رکھواؤ تو وہ اُسے تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور کچھ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھواؤ تو وہ اُسے ادا نہیں کریں گے الا یہ کہ تم ان کے سر پہ کھڑے رہو یہ

(بدیانتی) اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ ان اَن پڑھوں (کا مال کھا جانے) میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہو گی اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں O

یہودیوں میں بعض کا امانت دار اور بعض کا بددیانت ہونا

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ﴾ یہ آیت مبارکہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے بتایا کہ ان میں امانت بھی ہے اور خیانت بھی۔ آیت میں "قنطار" سے مال کثیر مراد ہے اور "دینار" سے مال قلیل مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہودیوں میں کچھ ایسے ہیں جو امانت لوٹا دیتے ہیں اگرچہ اس کی مقدار زیادہ ہو' جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور کچھ ایسے ہیں جو امانت واپس نہیں کرتے اگرچہ اس کی مقدار کم ہو' اس سے اہل کتاب کے کفار مراد ہیں۔ جیسے کعب بن اشرف اور اس کے دیگر ساتھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قریش کے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن سلام کے پاس ایک ہزار دو سو اوقیہ[1] سونا امانت کے طور پر رکھوایا تو آپ نے اُس شخص کو وہ امانت لوٹا دی۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں کچھ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ڈھیر سارا مال امانت رکھواؤ تو وہ اُسے تمہاری طرف لوٹا دیں گے۔ اور آگے جو فرمایا کہ کچھ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی رکھواؤ تو وہ اُسے ادا نہیں کریں گے۔ اس سے فنحاص بن عازوراء مراد ہے۔ اس کے پاس قریش کے ایک شخص نے ایک دینار رکھوایا تو اس نے خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا اور ادائیگی نہیں کی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اہل امانت سے نصاریٰ مراد ہیں اور اہل خیانت سے یہودی مراد ہیں' کیونکہ یہودی اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص دینی طور پر ان کا مخالف ہو اس کو قتل کرنا اور کسی بھی طریقہ سے اس کا مال حاصل کرنا جائز ہے۔

سر پر کھڑے رہ کر امانت کا مطالبہ کرنے کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآىٕمًا﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ (خیانت کرنے والا یہودی تمہیں اس وقت امانت واپس کرے گا جب) تم اس پر کھڑے رہو اور بہت اصرار' جھگڑا اور بار بار رُجوع کر کے اُس سے مطالبہ کرو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (خیانت کرنے والا یہودی تمہیں اس مدت میں امانت واپس کرے گا) جس میں تم اس کے سر پر کھڑے رہو اور اس کی اس طرح ذمہ داری لو کہ اس سے مطالبہ کرتے رہو اور حاکم کے پاس مقدمہ لے جا کر اور اس کے خلاف گواہ قائم کر کے اس سے سختی کے ساتھ پیش آؤ۔ بعض مفسرین کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم نے (خیانت کرنے والے یہودی کے پاس) کوئی چیز رکھوائی پھر اُسی وقت جبکہ تم اُس کے سر پر کھڑے تھے اُس سے امانت واپس مانگی تو وہ واپس کر دے گا اور اگر تم نے واپس لینے میں تاخیر کی تو وہ انکار کر دے گا اور واپس نہیں کرے گا۔

امانت میں یہودیوں کی خیانت اور بددیانتی کی وجہ

آیت میں ﴿ذٰلِكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں نے لوگوں کے مال کو جو حلال سمجھا اور اس میں خیانت کا ارتکاب کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿بِاَنَّهُمْ قَالُوْا﴾ انہوں نے یعنی یہودیوں نے کہا کہ ﴿لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ عرب والوں کا مال لینے میں ہم پر کوئی حرج اور گناہ نہیں ہے۔ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی کہ جو شخص بھی دینی اعتبار سے اُن کا مخالف ہوتا تھا اس پر وہ ظلم کو جائز سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ عرب والوں کا مال ہمارے لیے حلال ہے کیونکہ وہ نہ تو ہمارے دین پر ہیں نہ ہی ہماری کتاب میں ان کا کوئی احترام ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں اور سب

[1] ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے اور چالیس درہم تقریباً دس تولہ چاندی کے برابر ہیں۔

لوگ ہمارے غلام ہیں' لہٰذا ہم اگر اپنے غلاموں کا مال کھالیں تو اس میں ہماری کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودی کہتے تھے کہ سارا مال ہمارا ہے' لہٰذا جو کچھ عرب والوں کے پاس ہے وہ بھی ہمارا ہے۔ کیونکہ عرب والوں نے ہم پر ظلم کر کے ہم سے مال چھینا ہے' لہٰذا ہم جس طرح بھی اُن سے وہ مال حاصل کریں ہماری کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں یہودیوں کا کچھ مسلمان مَردوں سے لین دین تھا۔ جب وہ مرد اسلام لے آئے تو انہوں نے یہودیوں سے اپنا بقیہ مال طلب کیا تو یہودیوں نے کہا کہ تمہاری ہمارے ذمہ کوئی چیز نہیں ہے نہ ہی ہم کچھ ادا کریں گے۔ کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے اور ہمارا باہمی معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ (اس بات کو ثابت کرنے کے لیے) انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ بات اُنہیں اپنی کتاب سے ملی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں جھٹلاتے ہوئے آگے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں)۔ یعنی وہ (اپنے مذکورہ دعویٰ میں) جھوٹے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بات کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

ہاں کیوں نہیں! جس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا اور پرہیزگاری اختیار کی تو بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند فرماتا ہے O

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر

﴿ بَلٰى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے جو یہودیوں نے کہا ہے (کہ ہماری گرفت نہیں ہوگی) بلکہ اُن کی گرفت ہوگی۔ ''بلٰی'' کا لفظ اپنے ماقبل کی صرف نفی کے لیے آتا ہے۔ اس بنیاد پر آیت میں اچھا طریقہ یہ ہے کہ ''بلٰی'' پر وقف کیا جائے اور اس کے بعد ''مَنْ اَوْفٰی'' سے آغاز کیا جائے۔ ﴿ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ البتہ جس نے اللہ کے اُس عہد کو پورا کیا جو تورات میں اُس نے لیا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ گے اور اُن پر جو قرآن نازل کیا جائے گا اُس پر ایمان لاؤ گے اور جس نے امانت رکھوائی ہے اُسے اس کی امانت لوٹاؤ گے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''بعھدہ'' کی ضمیر وعدہ پورا کرنے والے کی طرف راجع ہے۔ ﴿ وَاتَّقٰى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو کفر' خیانت اور عہد شکنی سے بچا۔ ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ تو بے شک اللہ اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو شرک سے بچتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۸) چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں اُن چار میں سے ایک خصلت پائی جائے تو اس میں منافقت کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دے۔ (۱) جب اُس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب وعدہ کرے تو بے وفائی کرے (۴) جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے' جب معاہدہ کرے تو اُسے پورا نہ کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔

(صحیح بخاری:۳۴_۲۴۵۹' صحیح مسلم:۵۸' سنن ترمذی:۲۶۳۲' سنن ابوداؤد:۴۶۸۸' سنن نسائی:۵۰۲۰' سنن بیہقی ج۹ص۲۳۰' مسند احمد ج۲ص ۱۸۹' مشکوٰۃ المصابیح:۵۶_ص۱۷)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلہ میں ذلیل دام لیتے ہیں اُن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور قیامت کے روز اللہ ان سے بات تک نہیں فرمائے گا' نہ اُن کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا اور نہ اُنہیں پاک فرمائے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں متعدد اقوال کا بیان

حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ یہودی علماء اور سرداران ابورافع' کنانہ بن ابی الحقیق' کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اُس عہد کو چھپایا جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں سیدنا محمد ﷺ کے متعلق اُن سے لیا تھا۔ انہوں نے اس عہد کو تبدیل کر کے اس کے علاوہ کچھ باتیں اپنے ہاتھ سے لکھ دیں اور قسم کھا کر کہا کہ یہ باتیں اللہ کی جانب سے ہیں۔ یہ بات اس لیے کہی تاکہ جو رشوت اور روٹی پانی وہ اپنے پیروکاروں اور غریب لوگوں سے وصول کرتے تھے وہ بند نہ ہو جائے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ اُن یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان پڑھ لوگوں کا مال کھانے پر ہماری کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ پھر انہوں نے یہ بات اپنے ہاتھ سے لکھ ڈالی اور قسم کھا کر کہا کہ یہ بات اللہ کی جانب سے ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت اشعث بن قیس اور ان کے مد مقابل کے بارے میں نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۲۹) جس نے کسی مسلمان پر ناحق قسم کھائی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اُس پر غضب ناک ہوگا۔ حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی تائید میں قرآن مجید سے یہ آیت ہمیں سُنائی: ''ان الذین یشترون بعهد الله و ایمانهم ثمنا قلیلا'' (الی اخر الایة)۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان کا مال حاصل کرنے کے لیے ''یمین صبر'' (جھوٹی قسم) کھائی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اُس پر غضب ناک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی: ''ان الذین یشترون بعهد الله و ایمانهم ثمنا قلیلا'' (الایة)۔ پھر اشعث بن قیس کندی داخل ہوئے' انہوں نے کہا کہ ابوعبدالرحمٰن تمہیں کیا بیان کر رہے تھے؟ ہم نے کہا: اس طرح وہ بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ابوعبدالرحمٰن نے سچ کہا' میرے ہی بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی ہے۔ میرے اور ایک آدمی کے درمیان ایک کنویں کے معاملہ میں جھگڑا تھا' ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے دو گواہ ہونے چاہیے یا پھر اس کی (یعنی تمہارے مد مقابل کی) قسم ہوگی۔ میں نے عرض کیا: وہ تو بے پروائی سے (جھوٹی) قسم اٹھا لے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان کا مال حاصل کرنے کے لیے جھوٹی قسم اٹھائی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''ان الذین یشترون'' (الایة)۔ (صحیح بخاری: ۲۵۱۵۔ ۲۶۶۹۔ ۴۵۵۰' صحیح مسلم: ۱۳۸' سنن ابن ماجہ: ۲۳۲۳' سنن ترمذی: ۳۰۱۲' مسند احمد ج ۵ ص ۲۱۱' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۴۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷۵۹۔ ص ۳۲۶)

☆ امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے فرمایا ہے کہ مذکورہ جھگڑا اشعث اور ایک یہودی کے درمیان تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے بازار میں سامان لا کر یہ قسم کھائی کہ مجھے اس کی اتنی اتنی قیمت مل رہی تھی اور میں نے وہ نہیں لی۔ حضرت عبداللہ بن اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

(۳۰) ایک شخص نے بازار میں اپنا سامان لگایا اور اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ مجھے اس کی اتنی اتنی قیمت مل رہی تھی اور میں نے وہ

نہیں لی۔ وہ اس طرح مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''ان الذین یشترون'' (الایۃ)۔

(صحیح بخاری: ۲۰۸۸' درِ منثور ج ۲ ص ۸۷)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں تمام معاملات کو داخل مانا جائے۔ کیونکہ اس آیت میں جو فرمایا کہ ''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد کے عوض قلیل دام لیتے ہیں'' اس میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے' اس میں وہ تمام وعدے اور معاہدے بھی شامل ہیں جو رسولوں کے ذریعہ لیے گئے' اسی طرح آدمی اپنے آپ پر جو وعدہ اور معاہدہ لازم کر لیتا ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ سب کے سب اللہ کے عہد اور وعدے ہیں جن کو پورا کرنا واجب ہے۔

آیت مذکورہ کی تفسیر

﴿یَشْتَرُوْنَ﴾ کا معنیٰ ہے: بدلہ میں لیتے ہیں۔ ﴿بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ سے مراد امانت ہے۔ ﴿اَیْمَانِهِمْ﴾ سے جھوٹی قسمیں مراد ہیں۔ ﴿ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ سے مراد ہے: دنیا کے ساز و سامان میں سے معمولی چیز (یعنی بے شک جو لوگ اللہ کی امانت اور اپنی جھوٹی قسموں کے عوض دنیا کی معمولی چیز لیتے ہیں)۔ آیت میں اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے عوض لی جانے والی حقیر چیز کو ''ثمن'' اس لیے فرمایا کہ خریدار سودے میں کچھ لیتا ہے اور کچھ دیتا ہے۔ جو کچھ وہ دیتا ہے اور جو کچھ لیتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ''ثمن'' ہوتے ہیں۔ یہی شراء (خرید و فروخت) کا معنیٰ ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مذکورہ صفات پائی جائیں۔ ﴿لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے اور آخرت کی کوئی نعمت اور فائدہ بھی ان کے لیے نہیں ہے۔ ﴿لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ (اللہ اُن سے بات تک نہیں فرمائے گا۔) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے ایسا کلام نہیں فرمائے گا جو ان کے لیے خوشی اور فائدہ کا باعث ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کلام نہ فرمانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن پر غضب ناک ہوگا۔ ﴿لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ﴾ (نہ اُن کی طرف نظر فرمائے گا۔) اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن پر نہ رحمت فرمائے گا نہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک فرمائے گا اور نہ اُنہیں کوئی خیر عطا فرمائے گا۔ ﴿وَلَا یُزَكِّیْهِمْ﴾ (اور نہ اُنہیں پاک فرمائے گا۔) اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ اُنہیں گناہوں سے پاک فرمائے گا نہ اُن کے کسی اچھے کام پر اُن کی تعریف فرمائے گا۔ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان اشخاص کا بیان جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی نظرِ رحمت سے محروم ہوں گے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۱) تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام فرمائے گا نہ ان کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا اور نہ اُنہیں (گناہوں سے) پاک فرمائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ (۱) وہ شخص جو اپنے سامانِ تجارت کے بارے میں قسم کھا کر کہے کہ جس قیمت میں میں یہ دے رہا ہوں اس سے زیادہ مجھے اس کی قیمت مل رہی تھی' حالانکہ وہ اپنی بات میں جھوٹا ہو۔ (۲) وہ شخص جس نے کسی مسلمان کا حق مارنے کے لیے عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائی [۱] (۳) وہ شخص نے جس نے بچا ہوا پانی

[۱] عصر کے بعد کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عموماً اہلِ عرب اس طرح کی قسمیں شام کے وقت میں کھایا کرتے تھے' کیونکہ شام میں جب اُنہیں تجارت کے اختتام تک کوئی منافع نہیں حاصل ہوتا تھا وہ اس وقت جھوٹی قسمیں کھا کر منافع کماتے تھے۔

(عمدۃ القاری ج ۹ ص ۶۵' مرقات ج ۶ ص ۱۸۹)

روک لیا[۳۲] اس شخص سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج میں اسی طرح تم سے اپنا فضل روکوں گا جس طرح تم نے وہ پانی جس میں تمہاری کوئی کاوش نہیں تھی اس کا بچا ہوا حصہ روک لیا۔ (صحیح بخاری: ۲۳۶۹، صحیح مسلم: ۱۰۸، سنن نسائی: ۴۴۶۲، سنن ابن ماجہ: ۲۲۰۷، مسند احمد ج ۲ص ۲۵۳، سنن بیہقی ج ۶ص ۱۵۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۹۵۔ص ۲۵۹)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۲) تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام فرمائے گا نہ ان کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا اور نہ اُنہیں پاک فرمائے گا اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اس بات کو دوہرایا۔ میں نے عرض کیا: ایسے لوگ خائب و خاسر ہو گئے۔ یارسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: (ٹخنوں سے) نیچے کپڑا لٹکانے والا[۳۳]، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنے والا۔ نسائی میں حدیث اس طرح ہے: ایسا شخص جو اپنی دی ہوئی چیز پر احسان جتلانے والا ہو، اپنے تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنے والا۔

(صحیح مسلم: ۱۰۸، سنن ترمذی: ۱۲۱۱، سنن ابوداؤد: ۴۰۸۷، سنن نسائی: ۴۴۵۸، سنن ابن ماجہ: ۲۲۰۸، سنن بیہقی ج ۵ص ۲۶۵، مسند احمد ج ۵ص ۱۴۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۹۵۔ص ۲۴۳)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۳) جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارا اُس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام اور آگ کو واجب فرما دیا ہے[۳۴] صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! اگرچہ معمولی چیز حاصل کی ہو؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ پیلو کے درخت کی شاخ ہو۔ (صحیح مسلم: ۱۳۷، سنن نسائی: ۵۴۱۹، سنن ابن ماجہ: ۲۳۲۴، مسند احمد ج ۵ص ۲۶۰، سنن بیہقی ج ۱۰ص ۱۷۹، مؤطا امام مالک: ۱۴۷۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷۶۰۔ص ۳۲۶)

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور بے شک اُن میں ضرور کچھ وہ ہیں جو کتاب (تورات) پڑھتے وقت اپنی زبانیں موڑ لیتے ہیں تاکہ تم (ان کی) اس

---

[۳۲] بچے ہوئے پانی سے مراد وہ پانی ہے جو گزرگاہوں اور راستوں میں مسافروں کے لیے ہوتا ہے۔ اس پانی کو کوئی شخص اپنے قبضے میں لے لے اور لوگوں کو اس میں سے نہ پینے دے تو اس کا بھی وہی عذاب ہے جو حدیث شریف کے آغاز اور اختتام پر بیان ہوا۔

[۳۳] امام نووی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو تکبر کی نیت سے اپنا کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے۔ کیونکہ ایک حدیث میں تفصیل سے بیان ہے کہ "جس شخص نے تکبر سے کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکایا اللہ تعالیٰ اس پر نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا"۔ اسی طرح نبی ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس میں رخصت دی تھی اور فرمایا تھا کہ تم تکبر کی نیت سے کپڑا نہیں لٹکاتے۔ اس رخصت اور تکبر کی قید سے معلوم ہوا کہ عذاب کی یہ وعید صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو تکبر سے کپڑوں کو ٹخنوں کے نیچے لٹکاتے ہیں۔ (شرح صحیح مسلم ج ۱ص ۵۶۷)

[۳۴] یہاں مسلمان کی قید اہتماماً ہے، ورنہ ذمی اور مستامن کافر کا حق مارنے کی بھی یہی سزا ہے کہ اُس پر جنت حرام اور نارِ جہنم واجب ہے۔ جنت کے حرام ہونے اور جہنم کے واجب ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگر اُس نے حلال جان کر حق مارا تب تو دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کی وجہ سے دائمی طور پر جہنم کا مستحق ہوا اور اگر حرام سمجھ کر حق مارا تو اُس کا داخلہ اولاً جنت میں نہیں ہوگا بلکہ اہلِ نار کے ساتھ پہلے سزا پائے گا، پھر ایمان کی برکت سے اس کی بخشش ہوگی۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ص ۴۴۱)

(الٹ پھیر) کو اصل کتاب کا حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں O

آیت مذکورہ کے چند الفاظ کی تشریح اور کتاب پڑھتے ہوئے زبان کو موڑنے کی تفسیر میں مختلف اقوال

﴿مِنْهُمْ﴾ سے مراد یہودی ہیں اور ﴿فریقا﴾ سے مراد گروہ اور جماعت ہے (یعنی یہودیوں کا ایک گروہ اور جماعت ایسی ہے)۔ اس جماعت کے لوگ یہ ہیں: کعب بن اشرف، مالک بن صیف، حیی بن اخطب، ابو یاسر، شعبہ بن عمر اور شاعر۔
﴿یَلْوٗنَ﴾ ''لَیّ'' کا اصل معنیٰ بٹنا اور مضبوط کرنا ہے۔ جب ہاتھ مضبوط ہو جائے تو کہا جاتا ہے: ''لَوِیَتْ یَدُہٗ'' (اس کا ہاتھ مضبوط ہو گیا)۔ ﴿اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ کتاب میں تحریف (ہیر پھیر) اور تبدیلی کرتے ہیں۔ کلام میں تحریف کرنے سے مراد یہ ہے کہ کلام کو ظاہری رُخ سے پھیر دیا جائے۔ کیونکہ تحریف کرنے والا شخص جو کلام اپنی جانب سے پیش کرتا ہے اس کو وہ اس کے صحیح طریقہ سے ہٹا کر اپنی زبان موڑتا ہے۔ امام واحدی فرماتے ہیں: ہو سکتا ہے ''یلوون السنتھم بالکتاب'' کا معنیٰ ہو: ''یلوون بالسنتھم الکتاب'' (وہ اپنی زبانوں سے کتاب کو موڑتے ہیں)۔ کیونکہ وہ لوگ کتاب کو اس کی حقیقت سے پھیر دیتے تھے اور اس میں الٹ پھیر کر کے پڑھتے تھے۔ امام فخر الدین رازی نے علامہ قفال کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''یلوون السنتھم'' کا معنیٰ یہ ہے کہ کتاب (تورات) میں جو الفاظ تھے اُن کے زبر زیر پیش وغیرہ میں وہ لوگ ایسی تبدیلی کر دیا کرتے تھے جس سے معنیٰ بدل جاتے تھے۔ عربی زبان میں اس کا بہت دخل ہے، سو عبرانی زبان میں بھی اسی طرح (حرکات کی تبدیلی سے معنیٰ کا بدل جانا) بعید نہیں ہے۔ تورات میں سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی جو آیات تھیں ان میں جب یہودیوں نے اس طرح کی تبدیلی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا کہ ''یلوون السنتھم بالکتاب'' (وہ کتاب میں اپنی زبانیں موڑتے ہیں)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''یلوون السنتھم بالکتاب'' سے مراد یہ ہے کہ تورات میں نبی اکرم ﷺ کا جو حلیہ مبارکہ اور اوصاف موجود تھے اُس کو اور آیتِ رجم کو ان یہودیوں نے تبدیل کر دیا اور اس کے علاوہ دیگر جو تبدیلیاں کیں وہ مراد ہیں۔
﴿لِتَحْسَبُوْهُ﴾ (وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں تا کہ تم اس کو اصل کتاب سمجھو۔) یعنی جو کچھ انہوں نے تحریف اور تبدیلی کی ہے اس کو تم اس کتاب کا حصہ سمجھو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر نازل فرمائی ہے۔ ﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ حالانکہ جس کو وہ لوگ کتاب کا حصہ گمان کر رہے ہیں وہ کتاب کا حصہ نہیں ہے۔ ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں (کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے) اور تبدیلیاں کر کے پیش کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے مفہوم ایک ہونے کے باوجود دو مختلف طریقوں سے اس لیے بیان فرمایا تا کہ تاکید ہو جائے۔
﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔) یعنی انہیں معلوم ہے کہ وہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں (اس کے باوجود وہ اپنے تحریف کردہ کلام کو اللہ کا کلام قرار دیتے ہیں)۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے تورات اور انجیل میں تحریف کی اور اللہ عز و جل کی کتاب میں وہ باتیں شامل کر دیں جو اُس میں نہیں تھیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ اُسے کتاب، حکم اور نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ (وہ تو کہے گا کہ) تم اللہ والے بن جاؤ کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور بشر اور کتاب کا مصداق

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں نے کہا کہ ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دیا تھا کہ ہم انہیں رب بنالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ﴿مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ﴾ (کسی بشر کی مجال نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے: تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ)۔ یہاں بشر سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور کتاب سے انجیل مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں بشر سے سیدنا محمد ﷺ مراد ہیں اور کتاب سے قرآن مجید مراد ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہودیوں میں سے ابورافع اور نجران کے عیسائیوں میں سے سیّد نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو اپنا رب بنالیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ اس بات سے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کا حکم دوں۔ نہ اس بات کا مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور نہ اس مقصد کے لیے مجھے (رسول بنا کر) بھیجا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

﴿مَاكَانَ لِبَشَرٍ﴾ کا معنیٰ ہے: کسی بشر کے لیے مناسب نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے تمام افراد کو ''بشـــر'' کہا جاتا ہے۔ لفظ ''قوم'' اور ''رھط'' کی طرح اس کا بھی اپنے لفظ سے کوئی واحد نہیں۔ اس کو واحد اور جمع دونوں جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ آیت میں ﴿الْحُكْمَ﴾ سے فہم (سمجھ بوجھ) اور علم مراد ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ہے: اللہ عزوجل کی جانب سے حکم اور فیصلہ جاری کرنا۔ ﴿النُّبُوَّةَ﴾ سے بلند درجہ مراد ہے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی آدمی میں نبوت اور یہ بات جمع نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے بجائے اپنی عبادت کی دعوت دے؟ حالانکہ اُسے کتاب، حکم اور نبوت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام ایسی صفات رکھتے ہیں کہ اُن صفات کے ہوتے ہوئے اُن کی طرف سے اپنے متعلق خدا اور رب ہونے کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ اُن صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں آسمانی کتابیں عطا فرماتا ہے اور ایک صفت یہ ہے کہ اُنہیں نبوت عطا فرماتا ہے۔ اور ان کا حصول علم کے کامل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں ایسی ہیں جو مذکورہ دعویٰ کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ یعنی (جسے کتاب، حکم اور نبوت عطا کی جائے گی) وہ تو لوگوں یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔ یہاں آغاز میں قول (یقول لھم) پوشیدہ ہے کیونکہ اہل عرب کا طریقہ ہے کہ وہ کلام میں اضمار کرتے ہیں بہ شرط یہ کہ اُس اضمار پر دلالت اور نشانی موجود ہو۔

''ربّاني'' کی تعریف اور تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال

آیت میں جو ''ربانیین'' کا لفظ ہے اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: ''کـــونـوا ربـــانیین'' کا معنیٰ یہ ہے کہ تم فقیہ اور عالم ہو جاؤ۔ (۲) انہی کا ایک قول یہ ہے کہ تم فقیہ اور معلّم ہو جاؤ۔ (۳) بعض کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ تم حکمت و دانائی والے اور بردبار بن جاؤ۔ (۴) بعض کا قول یہ ہے کہ ''ربّـــانـی'' وہ ہے جو علم کی چھوٹی اور بڑی باتوں کے ذریعہ لوگوں کی تربیت کرے۔ (۵) بعض کے نزدیک ''ربّـانی'' وہ ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہو۔ (۶) بعض کے نزدیک ''ربّـانی'' وہ ہے جو حلال و حرام اور امر و نہی کا علم

رکھتا ہو۔(۷) بعض کے نزدیک ''ربّانی'' وہ ہے جسے بصیرت کا اور ''سیاسۃ الناس'' (لوگوں کے معاملات) دونوں کا علم حاصل ہو۔ جب حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا وصال ہوا تو حضرت محمد بن حنفیہ نے کہا کہ آج اس امت کے ''ربّانی'' کا انتقال ہوگیا۔(۸) سیبویہ کا قول ہے کہ ''ربّانی'' ''ربّ'' کی طرف منسوب ہے۔یعنی ''ربّانی'' وہ شخص ہے جو ربّ کو جانتا ہو اور اس کی اطاعت کا پابند ہو۔ اس لفظ میں جو الف اور نون کا اضافہ ہے وہ اس لیے ہے تاکہ مذکورہ معنیٰ کے کمال پر دلالت ہو۔(۹) مبرّد کا قول ہے کہ ''ربانیون'' اہلِ علم کو کہتے ہیں۔اس کا واحد ''ربّان'' ہے۔یعنی ایسا شخص جو علم کو بڑھائے اور لوگوں کو تربیت دے۔یعنی انہیں علم سکھائے اور انہیں نصیحت کرے۔الف اور نون کا اضافہ اس میں مبالغہ کے لیے ہے۔

مذکورہ دونوں اقوال میں سیبویہ کے قول کے مطابق ''ربّانی'' ''ربّ'' کی طرف منسوب ہے اور صرف ربّ کی معرفت اور اس کی فرمانبرداری کے معنیٰ میں ہے جبکہ مبرّد کے قول کے مطابق ''ربّانی'' ''تربیت'' سے مأخوذ ہے۔

(۱۰) بعض کا قول یہ ہے کہ ''ربّانی'' سے حکمران اور علماء مراد ہیں۔اور یہ دونوں وہ طبقے ہیں جن کی فرمانبرداری کی جاتی ہے۔ اس قول کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ: (جس شخص کو اللہ تعالیٰ نبوت عطا کرے وہ لوگوں سے یہی کہے گا کہ) میں تمہیں اس بات کی دعوت نہیں دیتا کہ تم میرے بندے بن جاؤ بلکہ میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم بادشاہت والے، علم والے لوگوں کو اچھی باتیں سکھانے والے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عبادت کی پابندی کرنے والے بن جاؤ۔

(۱۱) ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ (ربّانی) عربی نہیں ہے بلکہ عبرانی یا سریانی لفظ ہے۔بہرصورت یہ لفظ عربی ہو یا عبرانی اس سے جو معنیٰ پتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسا شخص جو علم حاصل کرے اور اپنے علم پر عمل کرے اور لوگوں کو اچھائی کا راستہ بتائے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾ تم اللہ والے اس لیے بنو کیونکہ تم عالم اور معلّم ہو اور کتاب پڑھتے ہو۔اس آیت سے ثابت ہوا کہ علم، تعلیم اور دراستہ (یعنی علم حاصل کرنا اور دوسروں کو سکھانا) اس سے آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ والا بنے۔لہٰذا جو شخص علم حاصل کرے اور دوسروں کو سکھائے لیکن اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنا نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ اُس کا علم ضائع ہوگیا اور اس کی ساری محنت وکوشش رائیگاں گئی۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع

اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنالو (خود سوچو) کیا وہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد تمہیں کفر کا حکم دے گا ○

آیت مذکورہ میں ''ولا یأمرکم'' کی قراٴت کا بیان

﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ ﴾ میں راء کو دو طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔زبر کے ساتھ اور پیش کے ساتھ۔(۱) زبر والی صورت میں اس کا عطف گذشتہ آیت: ۷۹ میں ''ثم یقول'' پر ہوگا اور اس کے واسطہ سے اس کا تعلّق ''لبشر'' سے ہوگا۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں زبر والی صورت میں ''اَنْ'' پوشیدہ ہے۔یعنی ''وَلَا اَنْ يَاْمُرَكُمْ''۔(۲) پیش والی صورت میں استیناف (یعنی کلام کا آغاز) ہوگا اور یہ واضح بات ہے۔اس صورت میں اس کا معنیٰ ہوگا: ''وَلَا يَاْمُرُكُمُ اللّٰهُ'' (اللہ تمہیں اس بات کا حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنالو)۔بعض مفسرین نے اس صورت میں معنیٰ کیا ہے: ''وَلَا يَاْمُرُكُمْ مُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم)''

(محمد مصطفیٰ ﷺ تمہیں مذکورہ بات کا حکم نہیں دیتے)۔ بعض نے معنیٰ کیا ہے: ''وَلَا یَـاْمُـرُكُمْ عِیْسٰی '' (حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہیں مذکورہ بات کا حکم نہیں دیتے)۔ بعض نے معنیٰ کیا ہے: ''وَلَا یَـاْمُرُكُمُ الْاَنْبِیَاءُ '' (انبیاء تمہیں مذکورہ بات کا حکم نہیں دیتے)۔

﴿اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بشر تمہیں یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنالو۔ جیسا کہ قریش اور ستارہ پرستوں نے کیا کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا کہ حضرت مسیح اور حضرت عزیر (علیہما السلام) کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔

آیت میں صرف فرشتوں اور نبیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے غیر اللہ کی پوجا کی ہے اُن کے حوالہ سے صرف فرشتوں کی اور حضرت مسیح وعزیر (علیہما السلام) کی عبادت اور پرستش منقول ہے۔ اس لیے صرف فرشتوں اور نبیوں کا ذکر فرمایا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے پختہ وعدہ لیا کہ میں تمہیں جو کتاب اور حکمت عطا کروں پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لے آئے جو تمہارے پاس موجود کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس (کے مشن) کی مدد کرنا' (اللہ نے) فرمایا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کرلیا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کرلیا' (اللہ نے) فرمایا: پھر تم گواہ ہو جاؤ اور میں (خود) تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں O پھر جو اس کے بعد (اس عہد سے) پھرے تو وہی لوگ نافرمان ہوں گے O

یہاں جو ﴿اِذْ﴾ فرمایا اس کے بارے میں زجاج فرماتے ہیں کہ یہ موضع نصب میں ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ (اے محمد ﷺ!) آپ اپنے واقعات میں اُس واقعہ کو یاد کیجئے جب اللہ نے نبیوں سے پختہ وعدہ لیا۔ امام طبری فرماتے ہیں: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے پختہ وعدہ لیا۔

''میثاق'' کا معنیٰ ومفہوم اور اس سوال کا جواب کہ میثاق مذکور کس سے لیا گیا؟

فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ﴾ (یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے پختہ وعدہ لیا۔) لفظ ''میثاق'' کا اصل معنیٰ ہے: ایسا معاہدہ جس کو قسم کے ذریعہ مضبوط کیا جائے۔ ﴿مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ﴾ سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی بنایا گیا' یعنی جن باتوں کا اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا ہے اور جن سے منع فرمایا ہے اُن میں اللہ کی فرمانبرداری۔

یہ بات کہ مذکورہ وعدہ اور عہد کس سے لیا گیا اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مذکورہ عہد انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عہد انبیاء علیہم السلام کے لیے کسی اور سے لیا گیا۔ اسی لیے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ (۱) بعض مفسرین کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ عہد اللہ تعالیٰ نے صرف انبیاء کرام سے لیا

اور اس وقت لیا جبکہ انہوں نے لوگوں تک اللہ کی کتاب اور اس کے پیغام کو پہنچایا نہیں تھا۔ عہد یہ لیا گیا کہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے اور ہر نبی اپنے بعد آنے والے نبی پر ایمان لائے گا اور اس کا زمانہ پانے کی صورت میں اس کی مدد بھی کرے گا اور اگر زمانہ نہ پاسکے تو اپنی قوم کو حکم دے گا کہ وہ اگر بعد میں آنے والے نبی کا زمانہ پائیں تو اس نبی کا ساتھ دیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر' حسن بصری اور طاؤس کا قول ہے۔

(۲) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ مذکورہ عہد جو انبیاء کرام سے لیا گیا وہ صرف سیدنا محمد ﷺ کے متعلق لیا گیا۔ یہ حضرت علی' حضرت ابن عباس' قتادہ اور سدی کا قول ہے۔

اس قول کی صورت میں مفسرین کے درمیان پھر اختلاف ہے کہ مذکورہ عہد صرف انبیاء کرام سے لیا گیا یا ان کی امتوں سے یا دونوں سے؟ (۱) بعض کا قول یہ ہے کہ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے اُن کتابیوں سے لیا جن کی طرف انبیاء کرام بھیجے گئے۔ اس کی تائید آیتِ مبارکہ کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ: **"ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن به ولتنصرنه"** (پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لے آئے جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہو' تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس (کے مشن) کی مدد کرنا)۔ سیدنا محمد ﷺ کو اہل کتاب کی طرف بھیجا گیا تھا نہ کہ انبیاء کرام کی طرف۔ (اس لیے عہد مذکور کا تعلق انبیاء کرام سے نہیں ہے)۔ رہی یہ بات کہ جب مذکورہ عہد اہل کتاب سے لیا گیا تھا تو آیت مبارکہ میں "میثاق النبیین" کیوں فرمایا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کہا کرتے تھے کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کے مقابلہ میں ہم نبوت کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ ہم اہل کتاب ہیں اور انبیاء کرام ہم میں سے ہوتے ہیں۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ عہد سیدنا محمد ﷺ کے متعلق انبیاء کرام اور اُن کی امت دونوں سے لیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ آیتِ مبارکہ میں صرف انبیاء کا ذکر اس لیے فرمایا کہ (انبیاء کرام پیشوا ہیں اور امتیں پیروکار۔ اور) پیشوا سے عہد لینا پیروکاروں سے عہد لینا ہے اس لیے آیت میں صرف انبیاء کرام کا ذکر فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جتنے انبیاء کو بھیجا ہے ہر ایک سے نبی اکرم ﷺ کے معاملہ میں عہد لیا ہے اور وہی عہد اس نبی کی قوم سے لیا کہ لوگ محمد مصطفیٰ ﷺ پر ضرور ضرور ایمان لائیں اور زندگی میں ان کی تشریف آوری ہو جائے تو ضرور ضرور اُن کا ساتھ دیں۔ (۳) بعض مفسرین فرماتے ہیں: آیت مبارکہ میں انبیاء سے عہد لینے سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں سے یہ عہد لیں گے کہ جب محمد مصطفیٰ ﷺ اعلان نبوت فرمائیں تو تم لوگ ضرور ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کا ساتھ دینا۔ مفسرین کی کثیر تعداد کا یہی قول ہے۔

آیت مذکورہ میں "لَمَا" کی قرأت میں مفسرین کا اختلاف

﴿لَمَآ﴾ میں ایک قرأت کے مطابق لام کو زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ایک قرأت کے مطابق لام کو زیر اور مَا کو غیر مشدد پڑھا گیا ہے (یعنی "لَمَا" اور "لِمَا")۔ جنہوں نے "لَمَا" پڑھا ہے ان کے نزدیک آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ: یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے اس وجہ سے پختہ وعدہ لیا کہ اُس نے اُنہیں کتاب اور حکمت عطا کی۔ پھر تمہارے پاس ایک رسول آیا۔ اس سے نبی اکرم ﷺ کا وہ تذکرہ مراد ہے جو تورات میں ہے۔ تو تم ضرور ضرور اس رسول پر ایمان لانا کیونکہ تمہارے پاس تورات میں اُن کا ذکر موجود ہے۔ جن علماء نے "لِمَا" پڑھا ہے انہوں نے "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ" کو میثاق قرار دیا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: "اخذت میثاقک لتفعلن" (میں نے تم سے یہ عہد لیا ہے کہ تم یہ کام ضرور کرو گے)۔ چونکہ عہد لینا قسم لینے کی طرح ہوتا ہے اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ: یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے حلف لیا اس وجہ سے کہ اُنہیں اس نے کتاب اور حکمت عطا کی

کہ جب اُن کے پاس وہ رسول تشریف لائے جو اُن کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہو تو ضرور ضرور وہ اس رسول پر ایمان لائیں اور اس (کے مشن) کی مدد کریں۔

﴿رَسُوْلٌ﴾ سے سیدنا محمد ﷺ کی ذات مراد ہے۔ آگے جو صفت بیان فرمائی کہ ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ (وہ رسول تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا) اس کی توجیہ یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کا مبارک حلیہ اور آپ کے احوال بیان فرمائے پھر جب آپ کی تشریف آوری کے بعد آپ کے اوصاف اور احوال گذشتہ کتابوں کے مطابق ہوئے تو یوں آپ اُن کتابوں کے تصدیق کرنے والے ہو گئے۔ لہٰذا اب آپ پر ایمان لانا اور آپ کے ارشادات کو تسلیم کرنا واجب اور ضروری ہے۔

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ میں جو لام ہے وہ قسم کا لام ہے۔ اصل عبارت ہے: ''واللہ لتؤمنن به'' (خدا کی قسم! تم اس رسول پر ضرور ضرور ایمان لانا)۔ ﴿وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (اور تم اس رسول کی ضرور ضرور مدد کرنا)۔

میثاق مذکور کس وقت لیا گیا؟

امام بغوی فرماتے ہیں کہ میثاق کی یہ باتیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے اس وقت فرمائیں جب اُس نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام مخلوق کو نکالا اُس میں انبیاء کرام اس طرح تھے جیسے چراغ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے سیدنا محمد ﷺ کے متعلق عہد لیا اور فرمایا: کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے میثاق سے مراد یہ ہو کہ جن دلائل سے نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کا وجوب ثابت ہے اُن کو انبیاء علیہم السلام کے ذہن میں پختہ طریقہ سے ثابت فرمایا ہو۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ کی سچائی کو ثابت کرنے والے معجزات کا ظہور ہوا اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو یہ بھی بتایا کہ لوگوں کو بھی اللہ کی جانب سے اُس رسول پر ایمان لانے کا حکم ہے تو انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ اس رسول پر ایمان لانا واجب ہے۔ میثاق سے یہی مراد ہے۔

میثاقِ مذکور کو قبول کرنے کا اقرار کس سے کروایا گیا؟

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ (اللہ نے فرمایا: کیا تم سب نے اقرار کیا؟) یہاں اگر ہم یہ تفسیر کریں کہ زیر بحث میثاق انبیاء کرام سے لیا گیا تھا تو اس جملہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے فرمایا: کیا تم نے اس رسول پر ایمان لانے اور اس (کے مشن) کی مدد کرنے کا اقرار کیا۔ اور اگر ہم یہ تفسیر کریں کہ مذکورہ میثاق انبیاء کرام کی اُمتوں سے لیا گیا تھا تو جملہ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ ہر نبی نے اپنی امت سے کہا کہ کیا تم نے اقرار کیا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ یہ میثاق انبیاء کرام نے اپنی امت سے لیا تھا لیکن چونکہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے میثاق لینے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اقرار کے بارے میں سوال کیا اور اس کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی حالانکہ اقرار کے متعلق سوال بھی انبیاء کرام نے اپنی امت سے کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ انبیاء کرام نے اس میثاق کو بھر پور طریقہ سے ثابت کیا' اپنی اپنی امت کو اس کی بہت تاکید فرمائی' اُن سے اس میثاق کے قبول کرنے کا مطالبہ کیا اور اُنہیں گواہ بنا کر اس میثاق کو مزید پختہ کیا۔

﴿وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ﴾ کیا تم نے اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ ''اِصْــر'' بھاری عہد کو کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عہد کا تعلق چونکہ ان باتوں سے ہے جن کو پختہ کیا جاتا ہے اس لیے اُسے ''اصر'' کہا جاتا ہے۔ ﴿قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ انبیاء نے کہا کہ وہ رسول جن کو تو ہماری کتابوں کی تصدیق کرنے والا بنا کے بھیجے گا اُن پر ایمان لانے کو تو نے ہم پر لازم فرمایا ہے ہم نے اُس کا اقرار کیا۔

﴿ قَالَ فَاشْهَدُوْا ﴾ اللہ عزوجل نے انبیاء سے فرمایا کہ تم سب گواہ ہو جاؤ یعنی اپنے آپ پر گواہ ہو جاؤ۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ہے: تم اپنی امتوں اور اپنے پیروکاروں پر گواہ ہو جاؤ جن سے تم نے عہد لیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ تم گواہ ہو جاؤ۔ اس صورت میں یہاں غیر مذکور سے کنایہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ شہادت کا اصل معنیٰ ہے: ''العلم و البیان'' (جاننا اور واضح ہونا)۔ اس لیے ''فاشھدوا'' کا معنیٰ یہ ہے کہ تم بتادو اور واضح کر دو۔

﴿ وَاَنَامَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ (میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔) اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے گروہِ انبیاء! میں بھی تمہارے ساتھ تم اور تمہارے پیروکاروں پر گواہوں میں ہوں۔ اور ایک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ انبیاء پر گواہوں میں ہوں۔

اگلی آیت: ۸۲ میں جو فرمایا: ﴿ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس نے اس اقرار کے بعد محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے اور ان (کے مشن) کی مدد کرنے سے منہ پھیرا۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ تو یہی لوگ فاسق ہیں۔ یعنی ایمان اور اطاعت سے خارج ہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۸۳

تو کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کی سب مخلوق خواہی نہ خواہی (خوشی اور مجبوری سے) اُسی کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہے اور اُسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور آیت میں ''یبغون'' کی قرأت کا بیان

اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے درمیان دین ابراہیمی کے متعلق اختلاف ہوا۔ ہر فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین پر ہیں۔ وہ لوگ یہ جھگڑا نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں لے کر حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے فرمایا کہ دونوں گروہوں کا تعلق دین ابراہیمی سے نہیں ہے۔ یہ بات سن کر وہ لوگ غصہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہیں اور ہم آپ کے دین کو اختیار نہیں کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

﴿ اَفَغَيْرَ ﴾ میں ہمزہ برائے سوال ہے لیکن اس سے انکار اور سرزنش مقصود ہے۔ یعنی اہل کتاب سے میثاق لے لیا گیا اور اُن پر دلائل سے یہ بات واضح ہو چکی کہ دین ابراہیمی اللہ تعالیٰ کا دین ''دین اسلام'' ہے (اس کے باوجود وہ کسی اور دین کو چاہتے ہیں)۔ ﴿ يَبْغُوْنَ ﴾ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے۔ یاء کے ساتھ اور تاء کے ساتھ۔ تاء والی صورت میں حاضر سے خطاب ہوگا۔ یعنی اے گروہِ یہود و نصاریٰ! کیا تم اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کر رہے ہو۔ اور یاء والی صورت میں غائبین سے خطاب ہوگا اور اس کا تعلق گذشتہ آیت ۸۲ (**فمن تولّی بعد ذالک**) سے ہوگا۔

﴿ اَسْلَمَ ﴾ کا معنیٰ ہے: جھکانا' فرمانبرداری کرنا۔ ﴿ طَوْعًا ﴾ کا معنیٰ ہے: سہولت اور آسانی کے ساتھ کسی کی پیروی کرنا۔ اور ﴿ كَرْهًا ﴾ کا معنیٰ ہے: مشقت اور نفس کی ناگواری کے ساتھ کسی کی پیروی کرنا۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان و زمین کی ساری مخلوق خوشی اور مجبوری سے اللہ ہی کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہے۔

''طوعا و کرھا'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

آیت میں جو فرمایا کہ ''آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوق ''طوعـا و کرھـا'' (خوشی اور ناخوشی سے) اُسی کے آگے سر

جھکائے ہوئے ہے''اس میں''طوعا و کرھا'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں: (۱) بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان والوں نے خوشی سے اطاعت کی اور بعض اہل زمین نے بھی خوشی سے اطاعت کی اور بعض نے قتل اور قید ہونے کے ڈر سے مجبوراً اطاعت کی۔ (۲) بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ مسلمان نے خوشی سے اطاعت کی اور کافر نے مجبوراً اطاعت کی۔ (۳) بعض کا قول یہ ہے کہ اس ارشاد کا تعلّق میثاق والے دن سے ہے جس میں اللہ نے (تمام مخلوق سے) فرمایا: ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سب نے کہا: ''بَلٰی'' (کیوں نہیں!) اب جس کے لیے سعادت اور خوش بختی غالب ہوئی اُس نے مذکورہ جواب (بَلٰی) خوشی سے دیا اور جس پر بدبختی غالب ہوئی اُس نے ناخوشی سے دیا۔ (۴) بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ مسلمان نے خوشی سے اطاعت کی تو اُس کے لیے اُس کی اطاعت قیامت کے دن نفع بخش ہوگی۔ اور کافر چونکہ مرنے کے قریب مایوسی کے وقت مجبوراً اسلام قبول کرتا ہے اس لیے قیامت کے دن اس کے لیے اُس کی یہ اطاعت نفع بخش نہیں ہوگی۔ (۵) بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو بھی مرضی اور ارادہ ہوتا ہے اس میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر روک ٹوک نہیں کر سکتا۔ مسلمان تو اُن تمام امور میں خوشی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور جن سے منع فرمایا ہے۔ جبکہ کافر اپنے آپ پر لاگو ہونے والے تمام احکامات میں مجبوراً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور تقدیر کو اپنے آپ سے دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾ (سب لوگ اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔) اس میں ''یرجعون'' کو تاء اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تمام مخلوق کو قیامت کے دن اللہ عزوجل ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس جملہ میں اُن لوگوں کے لیے بہت بڑی وعید ہے جو دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

یوں کہیے ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم' اسمٰعیل' اسحٰق' یعقوب اور ان کے بیٹوں پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ' عیسیٰ اور (دیگر) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا' ہم (ایمان لانے میں) ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اُسی کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہیں O

آیت مذکورہ کا گذشتہ آیت سے ربط اور آیت میں ''قل'' کو واحد اور ''امنّا'' کو جمع لانے کی توجیہ

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان فرمائی کہ انبیاء کرام سے میثاق یعنی پختہ عہد لیا گیا کہ وہ اس رسول کی تصدیق کریں جو اُن کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اب مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما رہا ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی صفت یہ ہے کہ وہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ (آپ کہیے ہم اللہ پر ایمان لائے)۔

یہاں ''قل'' کو واحد اور ''امنّا'' کو جمع اس لیے لایا گیا تا کہ (''قل'' کے واحد ہونے سے) یہ بات ثابت ہو کہ مخلوق تک اللہ تعالیٰ کا یہ حکم صرف سیدنا محمد ﷺ کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے۔ اور ''امنّا'' کو جمع لانے سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ جب محمد مصطفیٰ ﷺ نے کہا: (کہ میں اللہ پر ایمان لایا) تو آپ کے صحابہ نے بھی آپ کی طرح یہ بات کہی یوں ''امنّا'' فرما کر سب کا

تذکرہ باعث حسن ہو گیا۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد ﷺ ! آپ کہیے ہم نے تصدیق کی کہ اللہ ہمارا پروردگار اور معبود ہے' اس کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود ہے نہ پروردگار۔ یہاں دیگر چیزوں پر ایمان لانے کے مقابلہ میں اللہ پر ایمان لانے کا ذکر پہلے اس لیے فرمایا کہ اللہ پر ایمان لانا اصل ہے۔ آگے جو فرمایا: ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اے محمد ﷺ ! آپ کہیے ہم نے اس کی بھی تصدیق کی جو ہم پر اُس کی وحی سے نازل ہوا۔ یہاں قرآن کریم پر ایمان لانے کا ذکر پہلے اس لیے فرمایا کہ تمام کتابوں میں سب سے زیادہ باعظمت کتاب قرآن مجید ہے۔ دوسرا یہ کہ قرآن کریم میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں ہوئی جبکہ دیگر کتابوں میں تحریف اور تبدیلی ہوئی ہے۔

آگے فرمایا: (ہم اس پر بھی ایمان لائے) جو ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کے بیٹوں پر نازل کیا گیا اور جو کچھ موسیٰ' عیسیٰ اور دیگر نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ یہاں ان انبیاء کرام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لیے کیا گیا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ان انبیاء کرام کو مانتے تھے اور ان کے نبی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ آیت میں ﴿اسباط﴾ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے مراد ہیں۔ وہ سب کے سب نبی تھے۔

آگے یہ جو کہلوایا گیا کہ ''ہم (ایمان لانے میں) ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب بعض انبیاء پر ایمان لاتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے۔ اس لیے اللہ عزوجل نے اپنے نبی سیدنا محمد ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ اپنے بارے میں اور اپنی امت کے بارے میں آگاہ کریں کہ ہم تمام انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ''انزل'' کو حرفِ جر ''علٰی'' اور البقرہ:۱۳۶ میں حرفِ جر ''الٰی'' کے ذریعہ ـــــ متعدی کرنے کی توجیہ

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ زیر بحث آیت میں ''انزل'' کو حرف استعلاء (علٰی) کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے اور اسی طرح کی آیت سورۂ بقرہ میں گزری ہے اس میں ''انزل'' کو حرف انتہاء (الٰی) کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''انزل'' کے ساتھ ''علٰی'' اور ''الٰی'' کے استعمال سے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے نزول میں ''الٰی'' اور ''علٰی'' دونوں کا مفہوم موجود ہیں۔ کیونکہ وحی اوپر سے نازل ہوتی ہے اور رسولوں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے کبھی ایک مفہوم کے اعتبار سے اور کبھی دوسرے مفہوم کے اعتبار سے ''انزل'' کا استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (ہم اُسی کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہیں) اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والے اور صرف اُسی کے ساتھ اپنے تعلق کو رکھنے والے ہیں' ہم اپنی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہیں بناتے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو اس سے ہرگز وہ قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۝

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر

اس آیت میں جو فرمایا کہ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین ''دین اسلام'' ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور دین اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح دین وہ ہوتا ہے

جس کو اختیار کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ فرمائے اور اس کے اختیار کرنے والے سے وہ راضی ہو اور اُسے اُس پر اجر و ثواب دے۔
اختتام پر جو فرمایا کہ وہ آخرت میں ''خاسرین'' میں سے ہوگا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو ثواب سے محروم ہوں گے اور انہیں عذاب ہوگا۔

امام ابن جریر طبری نے زیر بحث آیت ''ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه'' کی تفسیر میں حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کیا ہے کہ (یہ آیت جب نازل ہوئی) تو یہودیوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سیّدنا محمد مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا کہ آپ انہیں کہیے: ''ولله علی الناس حج البیت'' (لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا اللہ کا حق ہے)۔ لیکن یہودیوں نے حج نہیں کیا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اس قوم کو ہدایت دے جس نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیا ہو حالانکہ وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی نشانیاں آ چکی تھیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

مذکورہ آیت ان بارہ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام سے منحرف ہو گئے اور مدینہ منورہ سے نکل کر حالت کفر میں مکہ آ گئے۔ اُن میں حارث بن سوید انصاری' طعمہ بن ابیرق اور حجوج بن اسلت بھی تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ یہودی لوگ نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے کافروں پر آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے اور آپ کی آمد کا اقرار کرتے تھے اور کہتے تھے: اُس نبی کا زمانہ سایہ فگن ہو چکا ہے جو تشریف لانے والے ہیں۔ جب سیدنا محمد ﷺ تشریف لائے تو حسد کی وجہ سے انہوں نے آپ کا انکار کر دیا۔
﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ (کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اس قوم کو ہدایت دے جس نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیا ہو۔) یعنی اللہ تعالیٰ اُس قوم کو درستگی کی طرف رہنمائی اور ایمان کی توفیق کیسے دے گا جس نے ایمان لانے کے بعد محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا ہو۔ ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ پہلے وہ لوگ نبی اکرم ﷺ اور جو کچھ نبی ﷺ اپنے رب عزوجل کے پاس سے لائے اس کی تصدیق اور اس کا اقرار کر چکے تھے۔
﴿وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اقرار کر چکے تھے اور گواہی دے چکے تھے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کی طرف رسول ہیں اور وہ برحق اور سچے ہیں۔ ﴿وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُن کے پاس دلائل و براہین اور وہ معجزات آ چکے تھے جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت برحق ہے۔ وہ معجزات ایسے تھے کہ ان جیسے معجزات سے نبوت ثابت ہو جاتی ہے۔
﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔) یعنی ظالموں کو حق اور درست بات کی طرف جانے کی توفیق نہیں دیتا۔ کیونکہ اُن کا ظالم ہونا اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم ہے۔ بعض کے نزدیک ظالموں کو ہدایت نہ دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو آخرت میں جنت اور اجر و ثواب کی طرف نہیں لے جائے گا۔

آیت مذکورہ میں تکرار کا اشکال اور اس کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ زیر بحث آیت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جس قوم نے ایمان لا کر کفر اختیار کیا ہو اس کو اللہ کیسے ہدایت دے گا'' پھر اختتام پر فرمایا کہ ''اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'' یہ تکرار ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس میں تکرار نہیں ہے۔ کیونکہ پہلا جملہ (جس قوم نے ایمان لا کر کفر اختیار کیا ہو اس کو اللہ کیسے ہدایت دے گا) یہ صرف اُن لوگوں کے بارے میں ہے جو اسلام سے منحرف ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت کے اختتام پر اس حکم کو عام کر دیا اور فرمایا کہ ''اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'' یعنی نہ اُن کافروں کو ہدایت دیتا ہے جو اسلام لا کر منحرف ہو گئے اور نہ اُن کو ہدایت دیتا ہے جو شروع سے کافر ہیں۔ آیت میں کافر کو ظالم اس لیے کہا گیا کہ وہ حق دار کو چھوڑ کر غیر حق دار کی عبادت کرتا ہے۔ اور ظالم بھی اُسی کو کہتے ہیں جو چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دے۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے O وہ ہمیشہ اس (لعنت) میں رہیں گے' نہ اُن پر عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُنہیں مہلت دی جائے گی O سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور نیکی کی راہ اختیار کر لی تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے O

آیاتِ مذکورہ کی مختصر تفسیر

آیت مذکورہ: ۸۷ میں ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے' ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ اگلی آیت: ۸۸ میں جو فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ لعنت کے عذاب میں رہیں گے۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ (۱۶۰۔۱۶۱) میں گزر چکی ہے۔ ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ (اُنہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔) اس سے مراد یہ ہے کہ عذاب کا جو وقت ہے اس سے نہ وہ لوگ مؤخر ہوں گے نہ عذاب اپنے وقت سے کسی اور وقت کی طرف مؤخر ہو گا۔ اس کے بعد اگلی آیت: ۸۹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے (توبہ کرنے والوں کا) استثناء کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا﴾ (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور نیکی کی راہ اختیار کی) یعنی اپنے ارتداد و انحراف اور کفر کے بعد توبہ کر لی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حارث بن سوید انصاری جب کافروں میں شامل ہو گئے تو اس پر شرمندہ ہوئے' انہوں نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرو کیا میرے لیے توبہ کی گنجائش ہے؟ لوگوں نے سرکار سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: ''الا الذین تابوا من ذالک واصلحوا'' (الایۃ)۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حارث کے بھائی جُلاّس نے اپنی قوم کے ایک شخص کے ساتھ یہ پیغام بھیجا تو وہ (یعنی حارث) توبہ کے ساتھ مدینہ منورہ آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اور ان کے اسلام قبول کرنے کی تحسین فرمائی۔

زیر بحث آیت میں جو ﴿وَاَصْلَحُوْا﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے توبہ کے ساتھ نیک اعمال کو بھی شامل کیا۔

''اصلحوا'' فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا کہ صرف توبہ کر لینا اس وقت تک کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کے ساتھ نیک اعمال نہ کیے جائیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''اصلحوا'' سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی توجہ کر کے اس کے ساتھ اپنے باطن کو درست رکھا اور عبادت وفرمانبرداری کر کے اس کی مخلوق کے ساتھ اپنے ظاہر حال کو درست رکھا۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے)۔ ﴿غَفُوْرٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ لوگ جو برائیاں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی پردہ پوشی کر کے دنیا میں بخش دیتا ہے۔ اور ﴿رَّحِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں وہ درگزر اور معافی کے ذریعہ مہربانی فرمانے والا ہے۔ بعض کے نزدیک ''غفور'' کی تفسیر یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کو دور فرما دیتا ہے اور ''رحیم'' کی تفسیر یہ ہے کہ وہ اجر وثواب عطا فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝۹۰

بے شک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کیا پھر وہ کفر میں اور آگے بڑھے اُن کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور یہی لوگ (راہِ حق سے) بھٹکے ہوئے ہیں O

آیت مذکورہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال

آیت مذکورہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ (پھر وہ کفر میں اور آگے بڑھے) یعنی سیدنا محمد ﷺ کو جب دیکھا تو ان کا انکار کیا حالانکہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ آپ پر ایمان لا چکے تھے کیونکہ ان کے پاس کتابوں میں آپ کا حلیہ مبارکہ اور اوصاف کا بیان موجود تھا۔ پھر وہ کفر میں اور آگے بڑھے یعنی حالت کفر میں مزید گناہ کیے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ تمام کافروں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ لوگ اس بات کا اقرار کر چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُن کا خالق ہے اس کے بعد انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا پھر کفر میں اور آگے بڑھے۔ یعنی اپنے کفر پر جمے رہے یہاں تک کہ حالت کفر میں ہلاک ہوئے۔ بعض کے نزدیک ان کے کفر میں آگے بڑھنے سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ ہمیں محمد (ﷺ) پر زمانہ کے حوادث اور مصائب کا انتظار ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ حارث بن سُوید کے اُن گیارہ ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام سے منحرف ہو گئے۔ حارث بن سوید اسلام کی طرف واپس آ گئے لیکن ان کے ساتھی مکہ میں اپنے کفر پر قائم رہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جب تک چاہیں گے کفر پر قائم رہیں گے اور جب ہم دوبارہ اسلام کی طرف آنا چاہیں گے تو جو آیت حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس طرح کی آیت ہمارے بارے میں بھی نازل ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ فتح فرمایا تو اس وقت تک ان میں سے جو اسلام لے آئے تھے اُن کی توبہ قبول ہو گئی اور جو کفر کی حالت میں مر گئے تھے ان کے بارے میں اگلی آیت مبارکہ:۹۱ (ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار) نازل ہوئی۔

ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کرنے والے کی توبہ کے قبول نہ ہونے کی متعدد توجیہات

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی توبہ کو قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اس کے باوجود زیر بحث آیت میں فرمایا کہ (جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کیا پھر وہ کفر میں اور آگے بڑھے) اُن کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے

گی۔اس سے کیا مراد ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔
(۱) حضرت حسن بصری' عطاء' قتادہ اور سدی کا قول یہ ہے کہ ان کی توبہ اس وقت قبول نہیں ہو گی جب ان کے پاس موت آ جائے گی' یعنی غرغرۂ موت کے وقت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ . (النساء:۱۸)

اور ان لوگوں کی توبہ مقبول نہیں جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔

لہٰذا جو شخص حالت کفر میں مر جائے اُس کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ گویا زیر بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہودی یا کفار یا مرتد ہونے والے جو گناہ کرتے رہے پھر اسی حالت میں مر گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہو گی (۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام سے منحرف ہوئے اور انہوں نے اپنے احوال کو چھپانے کے لیے توبہ کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا حالانکہ ان کے دلوں میں کفر موجود تھا۔ (۳) امام ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حالت شرک میں کیے جانے والے گناہوں سے توبہ کی لیکن شرک سے توبہ نہیں کی۔ ایسے لوگوں کی توبہ حالت شرک میں مقبول نہیں ہے۔ (۴) حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ان کی توبہ اس صورت میں قبول نہیں ہو گی جب وہ حالت کفر ہی میں مر جائیں۔ (۵) امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں جو فرمایا کہ ﴿ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ﴾ (ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہو گی) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کر کے اُس میں مزید آگے بڑھے۔ نہ یہ بات کہ انہوں نے کفر کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب وعدہ فرما دیا کہ وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمائے گا اور وہ ہر قسم کے گناہگار خطا کار کی توبہ کو قبول فرماتا ہے' جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور نیک عمل کی راہ اختیار کر لی تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے) تو اس سے معلوم ہو گیا کہ جن کی توبہ قبول نہیں کی جاتی اور جن کی توبہ قبول کی جاتی ہے ان دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کرنے کے بعد اُس میں مزید آگے بڑھے' ایسے لوگ جب تک اپنے کفر پر قائم رہتے ہیں ان کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ کیونکہ کوئی بھی مشرک جب تک اپنے شرک پر قائم رہتا ہے اس کا عمل اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ جب وہ اپنے شرک اور کفر سے توبہ کر کے نیکی کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ''غفور'' اور ''رحیم'' (یعنی بہت بخشنے والا بے حد مہربان) ہے' جیسا کہ اُس نے خود اپنے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

زیر بحث آیت کے اختتام پر جو فرمایا: ﴿ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴾ (یہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں) اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کیا پھر کفر میں مزید آگے بڑھے' یہی وہ لوگ ہیں جو راہِ حق سے بھٹک گئے اور غلط راستہ پر چل پڑے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۟ ﴿۹۱﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے تو اُن میں سے کسی سے زمین بھر سونا (بھی) قطعاً قبول نہیں

کیا جائے گا اگر چہ وہ اسے اپنے چھٹکارہ کے لیے دے ان ہی کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار و مددگار نہیں O

آیت مذکورہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ مکرمہ کو فتح فرمایا تو حارث بن سوید کے جو ساتھی تھے وہ اسلام لے آئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں آیت مذکورہ نازل فرمائی جو ان میں سے حالت کفر میں مر گئے تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بت پرست اور دیگر تمام کفار ان میں سے جو بھی حالت کفر میں مر گئے ان سب کے بارے میں آیت مذکورہ نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو حالت کفر میں مر گئے آیت مذکورہ ان سب کو شامل ہے۔

آیت مبارکہ میں جو ﴿مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ مشرق سے لے کر مغرب تک زمین کی مقدار سونا بھی اُن سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ آگے جو ﴿وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ فرمایا بعض کے نزدیک یہ "لو افتدى به" کے معنیٰ میں ہے اور واؤ زائدہ ہے۔ بعض کے نزدیک واؤ اپنے حال پر قائم ہے (یعنی زائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا فائدہ "عطف" ہے)۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زمین بھر سونا خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے پھر وہ کفر کی حالت میں مرے تو اُسے وہ سونا فائدہ نہیں دے گا اسی طرح اگر وہ زمین بھر سونا دے کر عذاب سے چھٹکارہ پانا چاہے تو اس سے وہ قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔ "لن يقبل" فرمانے سے بہت زیادہ سختی کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ اس میں ہر اعتبار سے قبول کرنے کی نفی کی گئی ہے۔

قیامت میں کافر سے زمین بھر سونا قبول نہ کرنے پر اشکال کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ آخرت میں کافر کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا پھر یہ کیوں فرمایا کہ اُن میں سے کسی سے زمین بھر سونا (بھی) قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہ کلام بر سبیل فرض ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر کافر کے پاس قیامت کے دن زمین بھر سونا بھی ہو تو وہ عذاب سے چھٹکارہ کے لیے اُسے خرچ کر دے گا۔ لیکن ان میں سے کسی چیز کی اُسے طاقت نہیں ہوگی (یعنی نہ اُس کے پاس عوض دینے کی کوئی چیز ہوگی نہ وہ عذاب سے چھٹکارہ پا سکے گا)۔

بعض مفسرین کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کافر دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کرے پھر کفر ہی کی حالت میں مر جائے تو اُسے اُس سونے کا خرچ کرنا فائدہ نہیں دے گا کیونکہ حالت کفر میں نیکی قبول نہیں ہوتی۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ (انہی کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں) یعنی جو لوگ کفر پر مر گئے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور ان کے لیے "ناصرین" یعنی ایسے افراد نہیں ہوں گے جو انہیں عذاب سے بچا سکیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۴) اللہ عزوجل قیامت کے دن دوزخیوں میں سب سے ہلکے عذاب والے شخص سے پوچھے گا کہ زمین میں جو کچھ موجود تھا اگر وہ (اس وقت) تمہارے پاس ہوتا تو تم اُس کے ذریعہ عذاب سے اپنی جان بچاتے؟ وہ کہے گا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جب تم آدم کی پشت میں تھے تو میں نے تم سے اس سے زیادہ ہلکی چیز کا مطالبہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا مگر تم شرک پر جمے رہے۔ (صحیح بخاری: ۳۳۳۴، صحیح مسلم: ۲۸۰۵، مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۷، مسند ابویعلیٰ: ۴۱۸۶، مشکوٰۃ: ۵۶۷۱ ـ ص ۵۰۲)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

تم ہرگز (کامل) نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ تم اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو اور جو چیز بھی تم خرچ کرو وہ بلاشبہ اللہ کو معلوم ہے O

آیت مذکورہ میں لفظ ''برّ'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال اور ''برّ'' کے متعلق احادیث

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (تم ہرگز کامل نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ تم اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔) یہاں ''البـرّ'' کا لفظ فرمایا گیا ہے۔اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جنت ہے۔بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تقویٰ ہے۔بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نیکی ہے (یعنی جنت یا تقویٰ یا نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو)۔بعض مفسرین آیت کا معنیٰ یہ کرتے ہیں کہ تم نیکی کی حقیقت کو نہیں پا سکتے اور نیک نہیں بن سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔بعض یہ معنیٰ کرتے ہیں کہ تم ''بـرّ اللّٰه'' یعنی اللہ کے ثواب کو اُس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔''برّ'' کا اصل معنیٰ ہے: ''التوسّع فی فعل الخیر'' (نیکی کے کام میں کشادگی اختیار کرنا)۔عربی میں کہا جاتا ہے: ''برّ العبدُ ربَّه'' یعنی بندے نے وسعت کے ساتھ اللہ عزوجل کی اطاعت کی۔لہٰذا ''برّ'' کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد ثواب ہے اور جب اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو اس سے مراد اطاعت ہے۔کبھی کبھی اس کا استعمال سچائی اور اچھے اخلاق کے معنیٰ میں بھی ہوتا ہے۔کیونکہ یہ دونوں ایسی نیکیاں ہیں جو اپنے اندر وسعت رکھتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۳۵) بے شک سچائی ''بِـرّ'' کی طرف یعنی نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُسے صدیق (بہت سچا) لکھ دیا جاتا ہے۔(اسی طرح) جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے۔آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُسے کذّاب (یعنی بہت جھوٹا) لکھ دیا جاتا ہے۔(صحیح بخاری: ۶۰۹۴، صحیح مسلم: ۲۶۰۷، سنن ابوداؤد: ۴۹۸۹، سنن ترمذی: ۱۹۷۱، الادب المفرد للامام البخاری: ۳۸۶، سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۳، مسند احمد ج ۱ ص ۳۸۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۸۲۴ ـ ص ۴۱۲)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۶) میں نے رسول اللہ ﷺ سے ''برّ'' اور ''اثم'' (یعنی نیکی اور گناہ) کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور لوگوں کا اس پر مطلع ہونا تمہیں ناپسند اور ناگوار ہو۔

(صحیح مسلم: ۲۵۵۳، سنن ترمذی: ۲۳۸۹، سنن دارمی: ۲۷۸۹، مسند احمد ج ۴ ص ۱۸۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۰۷۳ ـ ص ۴۳۱)

ان احادیث کی روشنی میں زیر بحث آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم پر نیک عمل کرنا لازم ہے یہاں تک کہ تم نیک بن جاؤ اور نیک لوگوں کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ۔جن مفسرین کے نزدیک لفظ ''بـرّ'' سے جنت مراد ہے اُن کے نزدیک آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ جو نیکی جنت تک پہنچانے والی ہے اس کو تم نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔

آیت مبارکہ میں ﴿حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (تم اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے) جب تک کہ وہ مال

جو تمہارے نزدیک بہت عمدہ اور بہت اعلیٰ ہے اس کو خرچ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ'' (البقرہ:٢٦٧) (تم اللہ کی راہ میں ناکارہ اور ناقابل استعمال چیز خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو)۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں ''مـمـا تـحبّون'' سے مراد یہ ہے کہ جس مال کی تمہیں ضرورت ہے اس میں سے خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (الحشر:٩) (جو دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود شدید تنگی میں ہوں وہ کامیاب ہیں)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٣٧) ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کون سا صدقہ سب سے زیادہ فضیلت والا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اپنی تندرستی اور بخل کی حالت میں صدقہ کرو جبکہ تمہیں غربت کا ڈر اور مال داری کی امید ہو اور اتنی دیر نہ لگاؤ کہ جب جان گلے میں پہنچ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دینا اور فلاں کو اتنا۔ حالانکہ وہ فلاں کا ہو ہی چکا۔[٣٥] (صحیح بخاری:١٤١٩، صحیح مسلم:١٠٣٢، سنن نسائی:٢٥٤٢، مسند احمد ج ٢ ص ٢٣١، مشکوٰۃ المصابیح:١٨٦٧، ص ١٦٤)

آیت مذکورہ میں خرچ کرنے کے شرعی حکم کے بارے میں مفسرین کے اقوال اور حضرت حسن بصری کے قول پر دلائل

زیر بحث آیت میں خرچ کرنے کا جو ذکر ہے اس کے (شرعی حکم کے) بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(١) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرو۔ اسی قول کی بناء پر بعض علماء نے فرمایا کہ زیر بحث آیت زکوٰۃ کی آیت سے منسوخ ہے۔ حالانکہ یہ بات بعید از عقل ہے کیونکہ زیر بحث آیت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی ترغیب ہے۔ (٢) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ خرچ کرنے سے مراد تمام صدقات ہیں۔ (٣) حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو مسلمان اللہ عزوجل کی رضا اور اجر وثواب کے حصول کے لیے اپنے مال میں سے خرچ کرے خواہ کھجور ہی کیوں نہ ہو وہ زیر بحث آیت میں داخل ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٣٨) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ میں تمام انصار سے زیادہ مال دار تھے۔ ان کو اپنے مال میں ''بَيْـرُحَـاء'' نامی باغ سب سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ باغ مسجد کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس میں تشریف لے جا کر اس کا پاکیزہ پانی نوش فرمایا کرتے تھے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ کھڑے ہوئے۔ عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ ''تم ہرگز اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو'' مجھے اپنے سارے مال میں ''بیـرحـاء'' سب سے زیادہ پیارا ہے۔ وہ (میری جانب سے) اللہ عزوجل کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اس (صدقہ) کی نیکی اور اس کے ذخیرہ ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ جس کام میں چاہیں اس کو خرچ فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بـخ بـخ'' (واہ واہ) یہ تو آمدنی کا مال ہے۔ (لیکن) میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ حضرت ابوطلحہ نے کہا: یارسول اللہ! میں ایسا ہی کروں گا۔ پھر ابوطلحہ نے اس باغ کو اپنے رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

[٣٥] اس کی تشریح سورۃ البقرہ:١٧٧ کی تفسیر کے تحت حاشیہ:٦٨٦ میں ملاحظہ فرمائیں۔

(صحیح بخاری: ۱۴۶۱' صحیح مسلم: ۹۹۸' مسند احمد ج ۳ ص ۱۴۱' سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۶۵' سنن ترمذی: ۲۹۹۷)

حدیث مذکور کے چند الفاظ کی تشریح درج ذیل ہے: (۱) ''بَخٍ بَخٍ'' یہ عربی میں ایک ایسا کلمہ ہے جو تعریف اور خوشی کے وقت بولا جاتا ہے۔ مبالغہ کی غرض سے اسے دو مرتبہ بولا جاتا ہے یہ مبنی بر سکون ہے جب اسے ملایا جاتا ہے تو آخر میں دو زیر کے ساتھ (بَخٍ) پڑھا جاتا ہے۔ (۲) ''مال رابح'' یعنی نفع والا مال۔ ایک روایت میں ''مال رایح'' ہے یعنی ایسا مال کہ اس کا نفع اور ثواب تمہاری طرف آئے گا۔ (۳) ''بَیْرُحَاء'' یہ مدینہ منورہ میں ایک جگہ کا نام ہے اور یہ حضرت ابوطلحہ کا باغ تھا۔

حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھا کہ جلولاء کے جو لوگ فتح کے دن قیدی بنائے گئے ہیں اُن میں سے میرے لیے ایک لونڈی خرید و۔ جب وہ لونڈی آئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہ پسند آئی۔ حضرت عمر نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (تم ہرگز اس وقت تک نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو)۔ یہ کہہ کے حضرت عمر نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

حضرت حمزہ بن عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دل میں اس آیت مبارکہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ کا خیال آیا تو انہوں نے کہا میں نے اُن چیزوں کو یاد کیا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ غور وفکر کے بعد فلاں باندی سے زیادہ مجھے اپنے مال میں کوئی چیز پسند نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد ہے اور جو چیزیں میں نے اللہ کی راہ میں اپنی ملکیت سے نکال دیں ان کے بارے میں اگر میں نے یہ طے نہ کیا ہوتا کہ میں ان کی طرف رجوع نہیں کروں گا تو میں اس باندی سے نکاح کر لیتا۔

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۳۹) جب آیت مبارکہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنا ایک پسندیدہ گھوڑا جس کو ''سبل''[۳۶] کہا جاتا تھا لے کر حاضر ہوئے۔ اور عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! اس کو آپ صدقہ فرما دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ گھوڑا حضرت زید کے بیٹے اسامہ بن زید کو دے دیا۔ حضرت زید نے کہا: یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے اس کو صدقہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا صدقہ قبول ہو چکا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس گھوڑے پر حضرت زید کے بیٹے اسامہ کو سوار کیا تو گویا حضرت زید کو اپنے دل میں اس سے رنج ہوا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید کی اس کیفیت کو دیکھا تو فرمایا: سنو! بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرما لیا ہے۔ (تفسیر جامع البیان لابن جریر الطبری زیر بحث آیت)

مروی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک مہمان آیا' انہوں نے چرواہے سے کہا کہ میرے پاس میرا ایک بہترین اونٹ لے کر آؤ۔ وہ ان کے پاس ایک کمزور اونٹنی لے آیا۔ آپ نے اس سے فرمایا: تم نے میرے ساتھ خیانت کی ہے۔ اُس نے کہا کہ میں نے تمام اونٹوں میں ایک اونٹ کو بہترین پایا لیکن میں نے اُس دن کو یاد کر کے اُسے چھوڑ دیا جس دن آپ کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ حضرت ابوذر نے فرمایا: مجھے اس کی اُس دن ضرورت پڑے گی جب مجھے قبر میں رکھا جائے گا۔

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ (اور جو چیز بھی تم خرچ کرو وہ بلاشبہ اللہ کو معلوم ہے۔) یعنی جو بھی چیز ہے' خواہ ایسی پاکیزہ ہو جسے تم پسند کرتے ہو یا ایسی ناکارہ ہو جسے تم ناپسند کرتے ہو' اللہ کو وہ معلوم

[۳۶] تفسیر خازن میں سبل کا لفظ ہے' جبکہ تفسیر ابن جریر میں سَبَل کا لفظ ہے۔

ہے یعنی وہ اُسے جانتا ہے اور وہ تمہیں اس پر بدلہ دے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوهَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿٩٣﴾

تورات کے نازل ہونے سے پہلے ہر قسم کے کھانے کی چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی سوائے ان چیزوں کے جن کو اسرائیل (یعنی یعقوب) نے اپنے آپ پر حرام کرلیا تھا' آپ کہیے: اگر تم سچے ہو تو تورات لا کر اُسے پڑھو O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

اس آیت مبارکہ کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ آپ اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر سمجھتے ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ استعمال نہیں کرتے تھے اور آپ سب کچھ استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ اُن کی ملّت پر نہیں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ چیزیں حضرت ابراہیم کے لیے حلال تھیں۔ یہودیوں نے کہا کہ جن چیزوں کو ہم آج حرام قرار دے رہے ہیں وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور یہودیوں کا ردّ فرمایا۔

آیت مبارکہ میں ﴿إِسْرَآءِيلَ﴾ سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ﴿مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہودی جو دعویٰ کر رہے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اونٹ کا گوشت حرام تھا' ایسا نہیں ہے بلکہ اونٹ کا گوشت حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) پر حلال تھا۔ البتہ حضرت یعقوب نے کسی وجہ سے (از خود) اپنے اوپر حرام کرلیا تھا پھر وہ اُن کی اولاد میں بھی حرام رہا۔ یہودیوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں تورات لانے کا حکم دیا اور یہ مطالبہ فرمایا کہ اس میں دکھاؤ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ وہ لوگ اس بات کو ثابت نہ کر سکے اور رُسوا ہو گئے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مذکورہ چیزوں کے حرام ہونے کا جو دعویٰ کیا تھا اُس میں وہ جھوٹے ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کی شریعت کا انکار کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ کسی حکم کا منسوخ ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے اس حقیقت کو بیان فرمایا کہ حضرت یعقوب نے اپنے اوپر جو چیزیں حرام کر دی تھیں اُن کے سوا بنی اسرائیل پر کھانے پینے کی ہر چیز حلال تھی۔ حضرت یعقوب نے جو چیزیں اپنے اوپر حرام کی تھیں وہ بھی پہلے حلال تھیں' پھر وہ ان پر اور ان کی اولاد پر حرام ہو گئیں۔ یوں پچھلا حکم منسوخ ہو گیا اور یہودیوں کی یہ بات غلط ہو گئی کہ کسی حکم کا منسوخ ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہودیوں نے اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ اونٹ کا گوشت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اب تک حرام چلا آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں تورات لانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تورات یہ بتاتی ہے کہ کھانے کی کچھ اقسام اس لیے حرام کر دی گئیں تھیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُنہیں اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ یہودیوں کو اپنی ذلت اور رُسوائی کا خوف ہوا تو وہ تورات سامنے لے کر نہیں آئے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں اور تورات کی طرف ایسی باتیں منسوب کر رہے ہیں جو تورات میں نہیں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اُن کا کسی حکم کے منسوخ ہونے کو ناممکن قرار دینا غلط ہے۔ اس سے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا برحق ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ کیونکہ آپ ﷺ اُمّی تھے' آپ نے نہ (کسی انسان سے) کتاب پڑھی تھی اور نہ ہی (کسی شخص کے بتانے سے) یہ جانتے تھے کہ تورات

میں کیا ہے۔اس کے باوجود آپ نے جب یہ خبر دی کہ اونٹ کے گوشت کے ہمیشہ سے حرام ہونے کی بات تورات میں موجود نہیں ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو خبر دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہے۔

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا﴾ اس میں ''كلّ الطعام'' کا معنیٰ ہے:''كلّ انواع الطعام یاسائر المطعومات'' (یعنی کھانے کی تمام اقسام یا ہر قسم کے کھانے) ''حِلًّا'' کا معنیٰ ہے: حلال۔﴿إِسْرَآءِيلَ﴾ سے مراد حضرت یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کن چیزوں کو حرام کیا تھا؟

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کن چیزوں کو حرام کیا تھا؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ انہوں نے اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔امام طبری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ:

(٤٠) یہودیوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے ابو القاسم (ﷺ)! آپ ہمیں بتائیں تورات کے نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کھانے کی کون سی چیزیں حرام کی تھیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ معبود جس نے حضرت موسیٰ پر تورات نازل کی ہے اُس کی قسم دے کر میں تمہیں پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت اسرائیل یعقوب علیہ السلام بہت سخت بیمار ہو گئے تھے' جب اُن کی بیماری کا عرصہ بہت طویل ہو گیا تھا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے منّت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بیماری سے عافیت دے دی تو وہ اپنا سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا اور پسندیدہ مشروب (اپنے لیے) حرام کر دیں گے۔اور (تمہیں معلوم ہی ہے کہ) اُنہیں تمام کھانوں میں سب سے زیادہ اونٹ کا گوشت پسند تھا اور مشروبات میں سب سے زیادہ اونٹنی کا دودھ پسند تھا۔یہودیوں نے (تمام باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے) کہا: ہاں۔(مسند احمد ج۱ص۲۷۳' تفسیر جامع البیان لابن جریر الطبری 'زیر بحث آیت)

(۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر جو چیزیں حرام کی تھیں وہ رگیں تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنہیں عرق النساء[ل] کی تکلیف تھی اور یہی تکلیف ان کے درد کی بنیاد تھی اُس واقعہ میں جو ضحاک سے مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے منّت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بارہ بیٹے دیئے اور خود وہ صحت کے ساتھ بیت المقدس پہنچ گئے تو اُن بارہ میں سے ایک کو ذبح کریں گے' ایک روایت میں ہے کہ بارہ میں جو آخری ہوگا اس کو ذبح کریں گے۔اُن سے ایک فرشتہ ملا اور اُس نے کہا: اے یعقوب! آپ ایک طاقتور آدمی ہیں' کیا آپ کشتی لڑ سکتے ہیں؟ انہوں نے آپس میں کوشش کی لیکن دونوں ایک دوسرے کو نہ پچھاڑ سکے۔فرشتہ نے اُنہیں ایک ایسا نشان لگایا کہ اس کی وجہ سے اُنہیں عرق النساء کی بیماری ہو گئی۔پھر فرشتہ نے کہا کہ اگر میں آپ کو پچھاڑنا چاہتا تو پچھاڑ دیتا لیکن میں نے یہ نشان اس لیے لگایا ہے کہ آپ نے منّت مانی ہے کہ اگر آپ صحت کے ساتھ بیت المقدس پہنچ گئے تو اپنا آخری بیٹا ذبح کریں گے۔اس نشان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس منّت سے نکلنے کا ایک راستہ بنا دیا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام بیت المقدس پہنچے تو فرشتہ کی بات بھول گئے اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔اس وقت آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے آپ کو نشان اسی لیے لگایا تھا تاکہ آپ منّت سے بچ جائیں۔ آپ کی منّت پوری ہو چکی ہے' اب آپ بیٹے کو ذبح نہیں کر سکتے۔

ل یہ ایک تکلیف ہے جو ٹانگ میں ران کے اوپری پٹھے سے ٹخنوں تک ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بھائی عیص سے بھاگ کر بیت المقدس کی طرف جارہے تھے۔حضرت یعقوب علیہ السلام ایک مضبوط اور طاقتور آدمی تھے۔راستہ میں ایک فرشتہ کسی آدمی کی شکل میں آپ سے ملا۔آپ نے اُسے چور سمجھ کر زمین پر گرانا چاہا لیکن اُس فرشتہ نے ایسا نشان لگایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام گر گئے اور فرشتہ آسمان کی طرف چلا گیا۔حضرت یعقوب اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔اُس فرشتہ کے نشان کی وجہ سے آپ کو عرق النساء کی بیماری لگ گئی۔اس بیماری سے آپ کو اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ درد کی وجہ سے رات کو سونہیں پاتے تھے۔اور پوری رات چیخ کر گزارتے تھے۔چنانچہ آپ نے قسم کھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرمادی تو آپ نہ کبھی رگ کھائیں گے نہ ہی رگ والا کھانا کھائیں گے۔آپ نے اپنے اوپر رگوں کو حرام کرلیا اور آپ کے بعد آپ کے بیٹے بھی اس کی اتباع کرتے رہے وہ گوشت سے رگیں نکال دیتے تھے اور اُن کو نہیں کھاتے تھے۔

(۳) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلا کو عرق النساء کا مرض لاحق ہوا تو ڈاکٹروں نے اُنہیں اونٹ کے گوشت کا پرہیز بتایا انہوں نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت حرام کرلیا۔

(۴) بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے طور پر اپنے لیے اونٹنی کا گوشت حرام کیا تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اس کو جاری رکھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد پر اس گوشت کو حرام فرمادیا۔آیت مبارکہ کے ظاہر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (ہر قسم کے کھانے کی چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی)۔پھر اس سے استثناء کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ '' (سوائے ان چیزوں کے جن کو اسرائیل (یعقوب) نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا)۔اس استثناء کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر جو گوشت حرام کیا تھا وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہو گیا تھا۔

تورات کے نازل ہونے کے بعد یہودیوں پر مختلف اشیاء کے حرام ہونے کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تورات کو نازل کرنے سے پہلے بنی اسرائیل کے لیے ہر قسم کے کھانے کی چیز حلال تھی سوائے ان چیزوں کے جو حضرت یعقوب نے خود اپنے اوپر حرام کرلی تھیں۔پھر جب تورات کا نزول ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر کھانے کی بہت ساری چیزیں حرام فرمادیں۔کھانے کی جو چیزیں تورات کے نازل ہونے کے بعد بنی اسرائیل پر حرام ہوئی تھیں اُن کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔(۱) امام سدی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں اُن پر وہ چیزیں حرام فرمائی تھیں جو اُنہوں نے تورات کے نزول سے پہلے خود اپنے اوپر حرام کی ہوئی تھیں۔(۲) امام عطیہ فرماتے ہی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اوپر کھانے کو حرام کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل پر وہ کھانا حرام ہوا' کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیماری سے عافیت دی تو میری اولاد بھی (یہ گوشت) نہیں کھائے گی۔حالانکہ تورات میں اُسے حرام قرار نہیں دیا گیا تھا۔(۳) کلبی کا قول یہ ہے کہ طعام مذکور کو اللہ تعالیٰ نے تورات میں حرام نہیں فرمایا تھا بلکہ تورات کے نازل ہونے کے بعد بنی اسرائیل پر اس طعام کو ان کے ظلم کی وجہ سے حرام کیا گیا تھا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے اُن پر کئی ایسی چیزیں حرام فرمادیں جو اُن کے لیے حلال تھیں''۔(النساء:۱۶۰) اسی طرح ایک اور مقام پر یہودیوں کے لیے چند چیزوں کو حرام کرنے کا بیان فرمانے کے بعد آیت کے اختتام پر فرمایا: ''یہ ہم نے اُن کو اُن کی سرکشی (اور ظلم) کی سزا دی تھی''۔(الانعام:۱۴۶) چنانچہ بنی اسرائیل جب کوئی بڑا گناہ کرتے تو اللہ تعالیٰ اُن پر کوئی بھی پاکیزہ طعام حرام فرمادیتا اُن پر ''رِجْـــز'' یعنی موت ڈال دیتا۔(۴) ضحاک کا قول یہ ہے کہ طعام مذکور میں سے کچھ بھی یہودیوں پر حرام نہیں تھا نہ ہی اللہ تعالیٰ نے تورات میں اُسے

حرام قرار دیا تھا۔ اس کو انہوں نے اپنے باپ (حضرت یعقوب علیہ السلام) کی پیروی میں اپنے اوپر خود حرام کر لیا تھا اور پھر یہ کہنے لگے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے (زیر بحث آیت میں) آگے فرمایا: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ!) آپ اُن سے کہیے اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تورات کو لاؤ اور اُس میں جو کچھ ہے اُسے پڑھو تاکہ پتا چل جائے کہ حقیقت کیا ہے! (اس مطالبہ کے جواب میں) یہودیوں کو اپنی ذلّت اور رُسوائی کا خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ تورات کو پیش نہ کر سکے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٩٤﴾

پھر اس کے بعد جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں تو وہی ظالم ہیں O

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر اور افتراء کی لغوی تشریح

﴿افْتَرٰى﴾ ''افتراءٌ'' سے ہے۔ افتراء کا معنیٰ ہے: جھوٹ گھڑنا۔ اور ''فِرْيَه'' کا معنیٰ ہے: جھوٹ بولنا، تہمت لگانا اور فساد کرنا۔[٣٧] یہ اصل میں ''فَرْىُ الْاَدِيْم'' سے ماخوذ ہے۔ یعنی کھال اور چمڑا کاٹنا۔ چونکہ جھوٹا شخص بھی خلاف حقیقت بات تراش کر لاتا ہے اس لیے اس کی بات کو افتراء کہتے ہیں۔

آیت میں جو ﴿مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ (جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں) اس دلیل کے ظاہر ہونے کے بعد کہ گوشت کا حرام ہونا حضرت یعقوب علیہ السلام کی جانب سے تھا اور اس سے پہلے وہ حرام نہیں تھا۔ ﴿فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (تو وہی ظالم ہیں) یعنی عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ اُن کا جو کفر تھا وہ ان کے اپنے لیے بھی ظلم تھا اور جن کو انہوں نے اپنے بعد گم راہ کیا تھا ان کے لیے بھی ظلم تھا۔

آیت مذکورہ میں یہودیوں کا رد اور ان کی تکذیب کی گئی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہودی جن برائیوں کا مُسلسل ارتکاب کیا کرتے تھے اُن کے متعلق انہوں نے اپنے آپ کو پاکیزہ قرار دینے کا ارادہ کیا تھا۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿٩٥﴾

آپ کہیے اللہ نے سچ فرمایا ہے لہٰذا تم ابراہیم کے دین پر چلو جو ہر باطل سے جدا تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے O

''صدق الله'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ (آپ کہیے: اللہ نے سچ فرمایا ہے۔) یعنی اے محمد (ﷺ)! آپ کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے کھانے کی ایک قسم پہلے حلال تھی اور بعد میں حرام ہو گئی تھی اس خبر میں اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ لہٰذا حکم کے منسوخ ہونے کا قول صحیح ہے اور یہودیوں کا قول غلط ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ﴿صَدَقَ اللّٰهُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اس قول میں سچ فرمایا ہے کہ اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حلال تھا، بنی اسرائیل پر اُس کو جو حرام کیا گیا وہ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُسے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''صــدق اللـــه'' کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے اس قول میں سچ فرمایا ہے کہ تمام کھانے بنی

[٣٧] تفسیر خازن میں دونوں جگہ افتراء کا لفظ ہے۔ یعنی عبارت یوں ہے کہ: ''افتراء کا معنیٰ ہے جھوٹ گھڑنا اور افتراء کا معنیٰ ہے: جھوٹ بولنا، تہمت لگانا اور فساد کرنا''۔ جبکہ تفسیر کبیر کی روشنی میں صحیح یہ ہے کہ جھوٹ گھڑنا ''افتراء'' کا معنیٰ ہے اور جھوٹ بولنا وغیرہ ''فِرْيَه'' کا معنیٰ ہے۔

اسرائیل کے لیے حلال تھے یہودیوں پر ان کو ان کے بُرے اعمال کی سزا کے طور پر حرام کیا گیا۔ لہٰذا اس میں تعریضاً اس بات کا بیان ہے کہ یہودی جھوٹے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو باتیں نازل فرمائیں اور جن باتوں کی خبر دی اُن میں وہ سچا ہے اور اے گروہِ یہود! تم جھوٹے ہو۔

آیت مذکورہ کے بقیہ حصہ کی تفسیر

﴿ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم کی اُس ملّت کی پیروی کرو جس کی طرف تمہیں محمد مصطفیٰ ﷺ بلا رہے ہیں۔ وہ ملّت ''اسلام'' ہے۔ اور اسلام دینِ صحیح ہے' اسی پر سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے قائم ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ملّت ابراہیم کی طرف دعوت اس لیے دی کہ وہی سیدنا محمد عربی ﷺ کی ملّت ہے۔ ﴿ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ (وہ مشرکین میں سے نہیں تھے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی معبود کی عبادت کی ہے نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کی ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (عبادت کے واسطے) بنایا گیا وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور تمام جہان والوں کا رہنما ہے ○

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں دو روایات

اس آیتِ مبارکہ کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ بیت المقدس ہمارا قبلہ ہے اور کعبہ سے زیادہ افضل اور پرانا ہے۔ وہ انبیاء کرام کا مقامِ ہجرت اور ان کا قبلہ ہے اور وہی محشر کی زمین ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ کعبہ افضل ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے جب اپنے بارے میں ملّت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے (گذشتہ آیت: ۹۵ میں) اُن کے دعویٰ کو غلط قرار دیتے ہوئے یہ بتایا کہ حضرت ابراہیم ''حنیف'' (ہر باطل سے جُدا) اور مسلمان تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے اور اُنہیں حضرت ابراہیم کی پیروی کا ان الفاظ میں حکم دیا: **''فاتبعوا ملة ابراهیم حنیفا''** (تم ابراہیم کی ملّت کی پیروی کرو جو ہر باطل سے جدا تھے)۔ اور چونکہ ملّت ابراہیم کی عظیم ترین نشانیوں میں ایک عظیم نشانی کعبۃُ اللہ کا حج کرنا بھی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں بیت اللہ کی فضیلت بیان فرمائی تاکہ اس کے بعد حج کو واجب کرنے کا ذکر کیا جائے۔

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ ﴾ (بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا' وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے۔) ''اوّل'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو دیگر چیزوں میں سب سے پہلے اور سب سے آگے ہو۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''اوّل'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو آغاز میں پائی جائے خواہ اس کے بعد کوئی چیز ہو یا نہ ہو۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''سب سے پہلا گھر لوگوں کے لیے بنایا گیا'' اس سے مراد یہ ہے کہ اُسے نیک اعمال اور عبادت کے لیے بنایا گیا' نماز کے لیے قبلہ اور حج و طواف کرنے کی جگہ بنایا گیا اور اس میں نیکیاں اور عبادت کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔

﴿ وُضِعَ لِلنَّاسِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس گھر میں سب لوگ شریک ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِیۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ اِۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَالۡبَادِ ۔ ہم نے اس (مسجد حرام) کو تمام لوگوں کے لیے مساوی بنایا ہے خواہ وہ اس مسجد میں معتکف ہوں یا باہر سے آئیں۔ (الحج:۲۵)

زیر بحث آیت میں بیت اللہ کی نسبت لوگوں کی طرف کرنے پر اشکال اور اس کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ (البقرہ:۱۲۵اور الحج:۲۶ میں) اللہ تعالیٰ نے گھر (یعنی بیت الحرام) کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ فرمایا: ''طَهِّرَا بَيۡتِيَ'' ''اے ابراہیم! میرے گھر کو ستھرا رکھو) اور زیر بحث آیت میں لوگوں کی طرف نسبت کی ہے' اس میں کیا تطبیق ہے؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ جہاں گھر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے وہ اس گھر کی تشریف اور تعظیم کے طور پر ہے (یعنی اُسے عظمت دینے اور اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے) جیسے ''ناقة الله'' فرما کر اونٹنی کو اپنی طرف نسبت دی۔ اور جہاں گھر کی نسبت لوگوں کی طرف فرمائی ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس گھر میں تمام لوگ شریک ہیں کیونکہ یہ لوگوں کے لیے مرکز حج اور قبلۂ نماز ہے۔

لفظ ''بکّہ'' کی تحقیق اور مکہ مکرمہ کو ''بکّہ'' کہنے کی وجہ

آیت میں جو ''بَکَّة'' کا لفظ ہے اس کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس سے مکّہ مراد ہے۔ اہل عرب باء اور میم کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً ''ضَرۡبَةٌ لَازِبٌ'' کو وہ ''ضَرۡبَةٌ لَازِمٌ'' بھی کہتے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''بکّہ'' اُس جگہ کا نام ہے جہاں بیت اللہ اور مکہ شہر کا نام ہے۔

لفظ ''بکّہ'' کا ماٴخذ اشتقاق کیا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ ''بَکٌّ'' سے ہے بمعنیٰ دُور کرنا۔ جب کوئی شخص کسی کو ہٹائے اور دھکیلے تو ''بَکَّ يَبُکُّ'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی معنیٰ کی وجہ سے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بیت اللہ میں طواف کرتے ہوئے چونکہ لوگوں کے درمیان دھکا پیلی ہو جاتی ہے اس لیے مکہ کو ''بکّہ'' کہا جاتا ہے۔ محمد بن علی باقر اور حضرت مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شہر چونکہ بڑے بڑے متکبرین کی گردنیں کچل دیتا ہے اور جس ظالم نے بھی اس شہر کی طرف ناپاک ارادہ سے قدم بڑھایا ہے اُس کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک فرما دیا ہے اس لیے اس کو ''بکّہ'' کہا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی قول ہے۔

مکہ مکرمہ کو ''مکّہ'' کہنے کی وجہ اور اس کے چند دیگر ناموں کی وجوہ

''مکّہ'' کو مکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پانی کم ہوتا ہے۔ بچہ جب ماں کے پستان کو پوری طرح چوس لے تو اہل عرب کہتے ہیں: ''مَکَّ الۡفَصِيۡلُ ضَرۡعَ اُمِّهٖ يا اِمۡتَكَّهٗ'' (بچہ نے ماں کے پستان کو مکمل چوس لیا)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ شہر گناہوں کو مٹا دیتا ہے اس لیے اس کو مکّہ کہتے ہیں۔ مکہ کو امّ الرحم بھی کہتے ہیں کیونکہ وہاں رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور حاطمہ بھی کہتے ہیں کیونکہ جو شخص اس کی حُرمت کا استخفاف کرے (یعنی اس کے مقام اور مرتبہ کو معمولی سمجھے) اس کو یہ کچل دیتا ہے یا لوگ رحمت کے حصول میں ایک دوسرے کو کچلتے ہیں۔ اس کو امّ القریٰ بھی کہا جاتا ہے' کیونکہ (امّ کا معنیٰ ہے: اصل اور بنیاد) یہ شہر تمام شہروں کی بنیاد ہے اور اسی کے نیچے سے زمین کو بچھایا گیا ہے۔

خانہ کعبہ کو سب سے پہلا گھر قرار دینے کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

''خانہ کعبہ سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا'' اس سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ لوگوں کے لیے بنائے جانے کے اعتبار سے پہلا گھر' خانہ کعبہ ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ زمینوں

کے ہر ٹکڑے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو پیدا فرمایا۔ ان ہی کی ایک روایت میں یہ ہے کہ زمین کے کسی بھی حصہ کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی جگہ کو پیدا فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت پانی کی سطح پر ظاہر ہوا۔ اس گھر کو اللہ تعالیٰ نے زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا فرمایا' اس وقت یہ پانی کی سطح پر جھاگ کی شکل میں تھا پھر اس کے نیچے سے زمین کو بچھایا گیا۔ حضرت ابن عمر' مجاہد' قتادہ اور سدی کا یہی قول ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا۔ حضرت علی بن حسین بن علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے بیت المعمور بنایا اور فرشتوں کو اس کا طواف کرنے کا حکم دیا۔ پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ زمین پر بیت المعمور اور اسی کی مقدار کا ایک گھر بنائیں۔ چنانچہ اُن فرشتوں نے خانہ کعبہ بنایا اور اس کا نام ''الضـراح'' رکھا۔ اور زمین والوں کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کا طواف کریں جس طرح آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کو بنایا اور وہی اس کا حج کرتے تھے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا حج کیا تو فرشتوں نے اُن سے کہا: اے آدم! آپ کا حج مقبول ہو گیا۔ ہم آپ سے دو ہزار سال پہلے سے اس گھر کا حج کر رہے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بیت اللہ وہ پہلا گھر ہے جو حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر بنایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اُتارا گیا تو اُنہیں وحشت اور اجنبیت محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ انہوں نے کعبہ کو تعمیر کیا اور اس کا طواف کیا۔ حضرت آدم کی بنائی ہوئی یہ عمارت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک برقرار رہی۔ جب طوفان آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو آسمان پر اٹھا لیا اور گھر کی جو جگہ تھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبعوث ہونے تک ایک سفید ٹیلہ کی شکل میں رہی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا تو اُنہیں اس کی تعمیر کا حکم فرمایا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں جو بیت اللہ کو پہلا گھر قرار دیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بابرکت ہونے میں سب سے پہلا گھر ہے۔ آیت کا اگلا حصہ جس میں ''مُبَارَکًا'' کا لفظ ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی: کیا آپ ہمیں بیت اللہ کے بارے میں نہیں بتائیں گے کہ وہی سب سے پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا؟ آپ نے جواباً فرمایا: ایسا نہیں ہے' اس سے پہلے بھی بہت سارے گھر تھے۔ البتہ بیت اللہ جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے وہ اس اعتبار سے پہلا گھر ہے کہ وہ بابرکت اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اُس میں مقام ابراہیم ہے اور جو بھی اس میں داخل ہوتا ہے وہ (ہر خطرہ سے) محفوظ ہو جاتا ہے[۳۸]۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ بیت اللہ وہ پہلی مسجد ہے جس میں اللہ عزوجل کی عبادت کی گئی۔ مطرف فرماتے ہیں کہ بیت اللہ وہ پہلا گھر ہے جو عبادت کے لیے بنایا گیا۔ ضحاک فرماتے ہیں: یہ وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت رکھی گئی' یہ وہ پہلا گھر ہے جو حج کے واسطے لوگوں کے لیے بنایا گیا اور یہ وہ پہلا گھر ہے جس کو لوگوں کے لیے قبلہ بنایا گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

[۳۸] یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے' کیونکہ اس کے مقابلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا صحیح ارشاد موجود ہے کہ زمین پر سب سے پہلے مسجد حرام بنائی گئی پھر مسجد اقصیٰ اور ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ (تفصیل آگے حدیث: ۴۱ کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔)

(٤١) میں نے رسول اللہ ﷺ سے اُس مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر سب سے پہلے بنائی گئی ہو۔ آپ نے فرمایا: مسجد حرام۔ میں نے عرض کی: پھر کون سی مسجد؟ آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال۔ پھر پوری زمین تمہارے لیے مسجد ہے جہاں کہیں نماز کا وقت تم پر آ جائے تم نماز ادا کرلو۔ امام بخاری کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ فضیلت اُسی میں ہے[٣٩]

(صحیح بخاری:٣٣٦٦، صحیح مسلم:٥٢٠، سنن نسائی:٦٩٠، سنن ابن ماجہ:٧٥٣، مسند احمد ج ٥ ص ١٥٠، سنن بیہقی ج ٢ ص ٤٣٣)

بیت اللہ کا ''مبارک'' اور ''ھدی للعالمین'' ہونا

﴿مُبٰرَكًا﴾ کا معنیٰ ہے: برکت والا۔ برکت کا اصل معنیٰ بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ اس آیت میں بیت اللہ کو جو ''مبارک'' فرمایا اس سے مراد بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اس گھر میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خیر اور بھلائی موجود ہے۔ بعض یہ مراد لیتے ہیں کہ بیت اللہ وہ پہلا گھر ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ برکت اور نیکیوں میں اضافہ رکھا گیا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ چونکہ اس گھر میں نیکیاں اور تمام عبادتوں کا ثواب بڑھ جاتا ہے اس لیے اس کو ''مبارک'' فرمایا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٢) میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے[٤٠]

(صحیح بخاری:١١٩٠، صحیح مسلم:١٣٩٤، سنن ترمذی:٣٢٥، سنن نسائی:٢٨٩٩، سنن ابن ماجہ:١٤٠٤، مسند احمد ج ٢ ص ٢٥١، سنن بیہقی ج ٥ ص ٢٤٦، مشکوٰۃ المصابیح:٦٩٢۔ ص ٦٧)

﴿وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (یہ گھر تمام جہان والوں کا رہنما ہے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ بیت اللہ اہل ایمان کا قبلہ ہے اس سے وہ اپنی نماز کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بیت اللہ تمام جہان والوں کے لیے ہدایت اس لیے ہے کہ اس سے پوری کائنات کے بااختیار صانع اور بنانے والے کے وجود کا پتا چلتا ہے۔ کیونکہ اس گھر میں وہ نشانیاں ہیں جو کہیں اور نہیں ہوسکتیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''ھدی للعالمین'' سے مراد یہ ہے کہ یہ گھر تمام جہان والوں کی جنت کی طرف رہ نمائی کرنے والا ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی نماز یا حج کی ادائیگی کے لیے اس کا رُخ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے لیے جنت کو واجب فرما دیتا ہے۔

---

[٣٩] یعنی جہاں نماز کا وقت آ پہنچے وہاں نماز ادا کر لینا ہی باعثِ فضیلت ہے۔

[٤٠] یعنی مسجد نبوی کی ایک نماز کعبۃ اللہ کے سوا جہان بھر کی مسجدوں کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ میری مسجد میں ایک نماز ٥٠ ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد حرام کی نماز کا ثواب مسجد نبوی کی نماز سے زیادہ ہے۔ عارفین فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کی نماز اجر و ثواب میں اگرچہ بیت اللہ شریف کی نماز سے کم ہے لیکن درجہ اور قُرب میں مسجد نبوی ہی کی نماز سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ مسجد حرام میں کعبہ سے قُرب ہے اور مسجد نبوی میں اُن سے قرب ہے جنہوں نے کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی مہاجرین و انصار صحابہ کرام مدینہ منورہ ہی میں رہے اور یہیں زیادہ نمازیں ادا کیں۔ نیز یہ بحث حدیث میں واضح رہے کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نماز کی جو فضیلت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے وہ ان مساجد کے اُس حصہ کو بھی شامل ہے جس کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔ یعنی مسجد حرام اور مسجد نبوی میں جتنی توسیع ہوئی ہے اُس میں کسی بھی جگہ نماز کا وہی مقام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ١ ص ٤٠٥، شرح صحیح مسلم ج ٣ ص ٧٦١)

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹۷

اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جاتا ہے وہ پُرامن ہو جاتا ہے اور (اس) گھر کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور جو انکار کرے تو (وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ) بلاشبہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے ○

بیت اللہ کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی روشن نشانیاں

﴿اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس گھر میں اس کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی پر واضح نشانیاں ہیں۔ وہ نشانیاں کون سی ہیں؟ اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے وہ نشانیاں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آیت میں (خود) بیان فرمائی ہیں یعنی "مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" (ایک مقام ابراہیم اور دوسری یہ کہ جو اس گھر میں داخل ہو جاتا ہے وہ پرامن ہو جاتا ہے)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نشانیاں آیت میں مذکور نہیں ہیں۔ البتہ اس سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن سے اس گھر کی فضیلت اور مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ نشانیاں یہ ہیں: (۱) پرندے ہوا میں کعبہ کے اوپر نہیں اڑتے بلکہ اڑتے ہوئے جب کعبہ تک پہنچتے ہیں تو دائیں یا بائیں سے ہو کر جاتے ہیں۔ (۲) حرم میں جانور ایک دوسرے کو تکلیف نہیں دیتے حتیٰ کہ کتے بھی ہرن پر نہیں بھونکتے اور نہ ہی انہیں شکار کرتے ہیں۔ (۳) جب کوئی پرندہ بیمار ہوتا ہے تو وہ کعبۃ اللہ سے شفا حاصل کرتا ہے۔ (۴) جو بھی بیت اللہ کی عزت و حرمت کو پامال کرتا ہے اس کو جلد سزا دے دی جاتی ہے۔ اور بیت اللہ کی طرف جس ظالم نے بھی ناپاک قدم بڑھایا ہے اللہ نے اُسے تباہ فرما دیا ہے جیسے اصحاب فیل اور دیگر کو ہلاک فرمایا۔ (۵) حجر اسود (۶) مُلتزَم (۷) حطیم (۸) زمزم (۹) حج کے ارکان ادا کرنے کے مختلف مقامات (۱۰) اس گھر کو یہ عظیم فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس گھر کو بنوانے والا اللہ تعالیٰ ہے انجینئر جبریل امین ہیں تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور تعمیر میں ساتھ دینے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔

آیت میں جو ﴿مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ فرمایا اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تھے۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات بھی تھے لیکن وہ مسلسل لوگوں کے ہاتھ لگانے کی وجہ سے مٹ گئے (اب کچھ خفیف سا نشان باقی ہے۔ از مترجم)

بیت اللہ میں داخل ہونے والے شخص کے امان میں ہونے کی تفسیر اور حرم میں حدود و قصاص جاری کرنے میں احناف اور شوافع کا اختلاف

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (جو حرم میں داخل ہوا وہ پُرامن ہو گیا۔) بعض[۱] علماء اس سے پورا حرم مراد لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "ان اول بیت وضع للناس" کے بعد جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ پورے حرم میں پائی جاتی ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "ومن دخله کان امنا" سے پورا حرم مراد ہے۔ اس کی تائید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ: "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا" (ابراہیم: ۳۵) اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے۔ یعنی جو اس شہر میں خوف و ہراس پھیلائیں ان سے محفوظ فرما دے۔ اہل عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے

[۱] بعض علماء سے مراد امام ابوبکر جصاص حنفی ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھئے: احکام القرآن ج ۲ ص ۲۰۔

اور حملہ کرتے تھے لیکن جو حرم میں داخل ہو جاتا تھا وہ قتل و غارت گری اور حملہ سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک ''ومن دخلہ کان امنا'' سے یہی مراد ہے۔ (ایک اور مقام پر) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا جب کہ ان کے آس پاس والے لوگ اچک لیے جاتے ہیں''۔ (العنکبوت: ٦٧)

بعض مفسرین کے نزدیک ''ومن دخلہ کان امنا'' سے مراد یہ ہے کہ جو شخص عمرۃ القضاء والے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس میں داخل ہوا وہ امن والا ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ جملہ (بہ ظاہر) خبر ہے لیکن معناً امر ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے اُسے امن دے دو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہی قول ہے۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جس شخص پر قتل کا حکم لگ جائے خواہ قصاص کے طور پر یا حدِ شرعی کے طور پر اور وہ حرم میں پناہ لے لے تو حرم میں اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا نہ ہی اس پر وہاں حد جاری کی جائے گی' البتہ اس کا کھانا پینا' اس کے ساتھ خرید و فروخت اور گفتگو بند کر دی جائے گی اور اس وقت تک اس پر یہ تنگی کی جائے گی جب تک کہ وہ حرم سے نکل آئے۔ جب وہ حرم سے باہر آئے گا تو اس پر حد قائم کی جائے گی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب کسی شخص پر حرم سے باہر قصاص واجب ہو جائے پھر وہ حرم میں پناہ لے لے تو حرم میں اُس سے قصاص لیا جائے گا۔ البتہ اس پر تمام ائمہ متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص حرم میں قتل یا چوری یا زنا کرے تو حرم ہی میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔

بعض مفسرین کے نزدیک ''ومن دخلہ کان امنا'' سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اس گھر کی تعظیم کرتے ہوئے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے داخل ہوا وہ قیامت کے دن عذاب سے محفوظ رہے گا۔ بعض نے یہ معنیٰ بیان کیا ہے کہ جو شخص اس گھر میں داخل ہوا وہ گذشتہ گناہوں سے امن میں آ جائے گا۔

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ (اس گھر کا حج کرنا لوگوں پر اللہ کا حق ہے۔) یعنی اللہ کے لیے لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے۔ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٣) اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) حج کرنا اور (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔

(صحیح بخاری: ۸' صحیح مسلم: ۱٦' سنن ترمذی: ۲٦۰۹' سنن نسائی: ۵۰۰۱' مسند احمد ج ۲ ص ۱۴۳' سنن بیہقی ج ۱ ص ۳۵۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۴' ص ۱۲)

☆ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے حج کو اسلام کے پانچ ارکان میں شمار فرمایا۔

آگے فرمایا: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ فریضۂ حج کی ادائیگی اُن مکلف لوگوں پر واجب ہے جو استطاعت رکھتے ہوں اور اُنہیں حج کا راستہ میسّر ہو۔

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بیت اللہ اور اس کے اہم مقامات کے فضائل

(٤٤) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک جو گھر سب سے پہلے لوگوں کے لیے بنایا گیا جو کہ بابرکت ہے اور اس میں نماز ادا کی جاتی ہے وہ کعبہ ہے۔ میں نے عرض کی: پھر کون سا گھر ہے؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ فرمایا: چالیس سال[۴۲]

---

[۴۲] یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ کتبِ حدیث میں مجھے نہیں ملی' البتہ اس کا مفہوم اُس روایت سے ثابت ہے جو گذشتہ آیت مبارکہ: ۹٦ کی تفسیر میں علامہ خازن (رقم: ۴۱ کے تحت) ذکر فرما چکے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٥) حجر اسود جنّت سے اس حالت میں اُترا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ بنی آدم کی خطاؤں نے اُسے سیاہ کر دیا۔

(سنن ترمذی: ۸۷۷، مسند احمد ج ۱ ص ۳۰۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۷۷، ص ۲۲۷)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٦) خدا کی قسم! اس پتھر کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس حالت میں اٹھائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا اور جس شخص نے حق کے ساتھ اُسے بوسہ دیا ہوگا اُس کی تعریف کرے گا۔[۴۳]

(سنن ترمذی: ۹۶۱، سنن ابن ماجہ: ۲۹۴۴، سنن دارمی: ۱۸۳۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۷۸، ص ۲۲۷)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(٤٧) رکن اور مقام جنّت کے دو یاقوت ہیں۔ اُن کے نور کو اللہ تعالیٰ نے بجھا دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کا نور نہ بجھاتا تو یہ دونوں (رکن اور مقام) مشرق سے مغرب تک کو روشن کر دیتے۔[۴۴] (سنن ترمذی: ۸۷۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۳، المستدرک ج ۱ ص ۴۵۶، مشکوٰۃ: ۲۵۷۹، ص ۲۲۷)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٨) تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی طرف (سفر کے لیے) تم سواریاں نہ باندھو۔ (ایک) مسجد حرام، (دوسری) مسجد رسول ﷺ اور (تیسری) مسجد اقصیٰ۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٤٩) تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی طرف (سفر کے لیے) سواریاں نہ باندھی جائیں۔ میری یہ مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔[۴۵] (صحیح بخاری: ۱۱۹۷، صحیح مسلم: ۸۲۷۔۱۳۹۷، سنن ترمذی: ۳۲۶، سنن ابوداؤد: ۲۰۳۳، سنن نسائی: ۷۰۰، سنن ابن ماجہ: ۱۴۰۹۔۱۴۱۰، مسند احمد

---

[۴۳] حق کے ساتھ بوسہ دینے سے مراد یہ ہے کہ توحید اور ایمان کی حالت میں جس نے بوسہ دیا ہوگا اُس کی یہ پتھر تعریف کرے گا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حجر اسود اپنے محبت کرنے والوں کو پہچانتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ اُمت کے حال سے بے خبر نہیں ہیں۔

[۴۴] یہ حدیث شریف، سورۃ البقرہ: ۱۲۵ کی تفسیر میں رقم: ۱۲۹ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کا حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[۴۵] ان دونوں روایات میں پہلی روایت جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس کو علامہ خازن نے اصل کتاب میں ''لا تشدوا'' کے ساتھ ذکر کیا ہے جبکہ صحیح مسلم: ۱۳۹۷ میں ''لاتُشدّ'' کے ساتھ ہے۔ البتہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو علامہ نے لا تُشدّ کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن وہ دونوں طرح سے مروی ہے۔ صحیح بخاری میں لاتُشدّ کے ساتھ اور صحیح مسلم میں لا تشدوا کے ساتھ۔ بہرصورت اس حدیث شریف میں تین مساجد (مسجد نبوی، مسجد حرام اور بیت المقدس) کے علاوہ کی طرف سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف اس نیت سے سفر نہ کیا جائے کہ وہاں نماز پڑھنا زیادہ باعثِ ثواب ہے۔ ان تین مساجد کے علاوہ ہر جگہ کی مسجد ثواب میں برابر ہے۔ مخالفین خصوصاً غیر مقلدین کے شیخ اور پیشوا ابن تیمیہ نے اس حدیث کا مفہوم یہ لیا کہ ان تین مساجد کے سوا کسی اور جگہ کی طرف حصول برکت کے لیے سفر کرنا ہی حرام ہے۔ لہٰذا مزارات وغیرہ کی زیارت کی غرض سے سفر کرنا ناجائز ہے۔ حالانکہ اس حدیث کا اگر یہ مفہوم ہو تو لازم آئے گا کہ طلب علم اور تجارت وغیرہ کے لیے سفر کرنا بھی جائز نہ ہو، جو کہ سراسر غلط اور باطل مفہوم ہے۔ اس لیے اس حدیث شریف کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف اس خیال سے سفر نہ کیا جائے کہ وہاں نماز پڑھنا زیادہ باعثِ ثواب ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۷۶۲)

ج ۳ص ۷۔ ج ۲ص ۲۳۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۹۳۔ ص ۶۷۔ ۶۸)

(۵۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج کو فرض فرما دیا ہے۔ لہٰذا تم حج کیا کرو۔ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا ہر سال حج کرنا ہے؟ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ جب تین مرتبہ اس نے اپنی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) حج فرض ہو جاتا اور تم اس کو نہ کر پاتے۔[۴۶]

(صحیح مسلم: ۱۳۳۷، سنن نسائی: ۲۶۱۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۵۔ ص ۲۲۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۵۱) ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! کون سی چیز حج کو واجب کرتی ہے؟ فرمایا: زاد اور راحلہ (یعنی سامانِ سفر اور سواری)۔ (سنن ترمذی: ۸۱۳، سنن ابن ماجہ: ۲۸۹۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۲۶۔ ص ۲۲۲)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی ''ابراہیم بن یزید جوزی[۴۷] مکی''، پر اس کے حافظ کے حوالہ سے بعض اہل علم کو کلام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۵۲) ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مقبول کا بدلہ صرف جنت ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۷۷۳، صحیح مسلم: ۱۳۴۹، سنن ترمذی: ۹۳۳، سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۸، مؤطا امام مالک: ۷۹۰، مسند احمد ج ۲ص ۲۴۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۸۔ ص ۲۲۱)

(۵۳) ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے اللہ عزّوجل کے لیے حج کیا، ایک روایت میں یہ ہے کہ جس نے اس گھر کا حج کیا اور (حج کے دوران) نہ اُس نے بے حیائی کی کوئی بات کی نہ کوئی گناہ کیا تو وہ اپنے پیدائش کے دن کی طرح (گناہوں سے پاک ہو کر) لوٹے گا۔ ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔[۴۸] (صحیح بخاری: ۱۵۲۱، صحیح مسلم: ۱۳۵۰، سنن ترمذی: ۸۱۱، مشکوٰۃ: ۲۵۰۷۔ ص ۲۲۱)

(۵٤) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حج اور عمرہ لگاتار کرو۔ بلاشبہ یہ دونوں گناہوں اور غربت کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونا چاندی کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔ اور مقبول حج کا ثواب صرف جنت ہے۔ (سنن ترمذی: ۸۱۰) اور جو صاحب ایمان دن بھر حالت احرام میں رہتا ہے، سورج اس کے گناہوں کو لے کر غروب ہوتا ہے۔[۴۹] (سنن ابن ماجہ: ۲۹۲۵)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[۴۶] یہ حدیث شریف، سورۃ البقرہ: ۱۹۶ کی تفسیر میں رقم: ۲۴۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ مع حاشیہ اس کو وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[۴۷] ترمذی شریف اور دیگر کتب رجال میں جوزی کی بجائے خُوزی کا لفظ ہے۔ یعنی ابراہیم بن یزید خُوزی مکی۔ اس کے بارے میں علماء رجال کو کلام یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم، امام نسائی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض ائمہ نے غیر ثقہ اور ضعیف قرار دیا ہے۔ (تقریب التہذیب مع الحاشیہ ص ۶۰)

[۴۸] یہ حدیث شریف، سورۃ البقرہ: ۱۹۷ کی تفسیر میں رقم: ۲۵۰ کے تحت گزر چکی ہے، اس کا حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[۴۹] یہ حدیث شریف بھی سورۃ البقرہ: ۱۹۶ کی تفسیر میں رقم: ۲۳۴ اور ۲۳۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ تفصیلی حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

(٥٥) جو مسلمان بھی تلبیہ (لبیک اللھم لبیک) کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں مشرق سے لے کر مغرب تک پوری زمین میں جو بھی پتھر یا درخت یا مٹی کے ڈھیلے ہوتے ہیں وہ بھی تلبیہ کہتے ہیں۔

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔ (''غریب'' کا معنیٰ ومفہوم جاننے کے لیے سورۃ البقرہ کا آخری حاشیہ (٧٩٦) ملاحظہ فرمائیں۔) (سنن ترمذی: ٨٢٨، سنن ابن ماجہ: ٢٩٢١، المستدرک ج ا ص ۴۵۱، مشکوٰۃ: ٢٥٥٠۔ ص ٢٢٣)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٥٦) جس نے پچاس مرتبہ بیت اللہ کا طواف کیا وہ اپنے گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہو جائے گا جس دن اس کی ماں نے اُسے جنا تھا۔ ☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔ (سنن ترمذی: ٨٦٦)

حج کے چند اہم فقہی مسائل

☆ علماء فرماتے ہیں کہ حج ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ ☆ حج کے فرض ہونے کی پانچ شرائط ہیں: مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عقل والا ہونا، آزاد ہونا اور صاحب حیثیت ہونا۔ ☆ کافر اور پاگل پر حج فرض نہیں ہے۔ اگر ان دونوں نے حج کیا تو وہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ کافر عبادت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور پاگل پر شرعی حکم عائد نہیں ہوتا۔ ☆ بچہ اور غلام پر بھی حج فرض نہیں ہے۔ اگر عقل اور سمجھ رکھنے والے بچہ نے حج کیا یا غلام نے حج کیا تو ان کا حج نفل کی حیثیت سے درست ہو جائے گا، البتہ فرض ساقط نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ بچہ جب بالغ ہوگا اور غلام آزاد ہوگا اور ان میں حج کی شرائط پائی جائیں گی تو ان پر دوبارہ حج کرنا فرض ہوگا۔ ☆ جس آدمی کو استطاعت نہ ہو اس پر بھی حج فرض نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ کے لیے لوگوں پر (اُس) گھر کا حج کرنا فرض ہے، جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو''۔ (آل عمران: ٩٧) اگر طاقت نہ رکھنے کے باوجود آدمی نے مشقت برداشت کر کے حج کر لیا تو اس کا حج ہو جائے گا اور اس سے فریضۂ حج ساقط ہو جائے گا۔ ☆ استطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی از خود استطاعت رکھتا ہو۔ اور دوسری یہ کہ کسی اور وجہ سے آدمی کو استطاعت حاصل ہو۔ ان دونوں اقسام کی تفصیل درج ذیل ہے:

(ا) جو از خود استطاعت اور طاقت رکھتا ہو اس سے مراد یہ ہے کہ اُسے سفر کی قوت اور طاقت حاصل ہو۔ اور زادِ سفر اور سواری بھی میسر ہو۔ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت کردہ جو حدیث: ۵۱ گزر چکی ہے اس میں زادِ سفر اور سواری کا ذکر موجود ہے۔ امام ابن منذر فرماتے ہیں کہ زادِ سفر اور سواری والی حدیث ثابت نہیں ہے کیونکہ وہ متصل نہیں ہے۔ البتہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور حضرت ابن عمر نے نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث روایت کی وہ مرفوع ہے۔ ابراہیم متروک الحدیث ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ ثقہ (مضبوط) راوی نہیں ہے۔[٥٠]

''من استطاع الیه سبیلا'' میں استطاعت کی تفسیر اور اس کی مختلف صورتیں

ابن المنذر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ اس کی تفسیر میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ (i) ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ آیت اپنے عموم پر ہے۔ کیونکہ ہمارے علم میں نبی اکرم ﷺ کی کوئی ایسی حدیث یا اہل علم کا کوئی ایسا اجماع نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم بعض کو اس آیت سے مستثنیٰ کریں۔ لہٰذا جس شخص کو بھی حج کرنے کی استطاعت ہو اور راستہ میسر ہو تو خواہ کسی بھی طرح اُسے استطاعت حاصل ہو بظاہر آیت کے مطابق اُس پر حج کرنا فرض ہوگا۔ (ابن المنذر نے مزید فرمایا کہ) ہم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ آیتِ مبارکہ میں استطاعت سے صحت مراد ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ حج

٥٠ اس کی تفصیل حاشیہ: ۴۷ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

کرنے والا ایک صحت مند نوجوان ہو تو اُسے اپنے خورد و نوش اور سفر کے اخراجات کا اتنا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ فریضۂ حج کی ادائیگی سے فارغ ہونے تک چل سکیں۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ استطاعت تو لوگوں کی اپنی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔ کسی کے پاس زادِ سفر اور سواری موجود ہوتی ہے لیکن وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتا اور کسی کو (زادِ سفر اور سواری کے ساتھ ساتھ) چلنے کی بھی طاقت ہوتی ہے۔ (ii) علماء کے ایک دوسرے گروہ کا مؤقف یہ ہے کہ استطاعت زادِ سفر اور سواری کا نام ہے۔ حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر، مجاہد اور امام احمد بن حنبل کا یہی قول ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ استطاعت کی دو قسمیں ہیں: (i) ایک یہ کہ آدمی اپنے بدن کے ذریعہ قوت رکھتا ہو اور اتنا مال اُسے حاصل ہو کہ وہ حج کر سکے۔ تو اس کی استطاعت کامل ہوگی اور اس پر حج کرنا فرض ہوگا۔ (ii) دوسری یہ کہ آدمی کو سواری پر سوار ہونے کی طاقت نہ ہو لیکن ایسا شخص میسر ہو جو اس کی طرف سے اس کے حکم پر حج کر سکے یا مال موجود ہو اور ایسا شخص ملے جس کو یہ اُجرت دے کر اپنی طرف سے حج کروائے۔ ان سب صورتوں میں اُس پر حج کی ادائیگی فرض ہوگی۔

زادِ سفر اور سواری کی تفصیل یہ ہے کہ ایسی سواری میسر ہو جس پر حج کا سفر کیا جا سکے۔ اور زادِ سفر سے مراد یہ ہے کہ اتنی رقم ساتھ ہو جو جانے کے لیے اور واپسی کے لیے کافی ہو، وہ اس کے اپنے خرچ اور جن کے نان نفقہ کا وہ ذمہ دار ہے ان کے خرچ سے زائد ہو اور اگر اس پر قرض ہو تو اس سے بھی وہ رقم زائد ہو۔ اور اس کو ایسے ساتھی میسر ہوں جو لوگوں کے عرف اور معمول کے وقت پر نکلیں۔ اگر وہ اس وقت سے پہلے نکل جائیں یا اپنے نکلنے کو ایسے وقت تک مؤخر کر دیں کہ اُس میں ایک دن سے زیادہ سفر کیے بغیر وہ نہ پہنچ سکیں تو ان کے ساتھ نکلنا اس شخص پر لازم نہیں ہے۔ (حج کے فرض ہونے کے لیے) یہ بھی ایک شرط ہے کہ راستہ پرامن ہو۔ اگر اُس میں کسی مسلمان دشمن یا کافر دشمن کا خوف ہو یا اُس پہرہ دار کا خوف ہو جو اپنا معاوضہ طلب کرے تو آدمی پر حج فرض نہیں ہے۔ (حج کے فرض ہونے کے لیے) یہ بھی ایک شرط ہے کہ پانی کے مقامات آباد ہوں اور اُن میں دستور کے مطابق جو پانی اور زادِ سفر ہوتا ہے وہ اُسے میسر ہو۔ اگر خشک سالی کی وجہ سے وہاں کے لوگ چلے گئے ہوں یا پانی تہ میں چلا گیا ہو تو آدمی پر حج فرض نہیں ہے۔ ایسا شخص جس کو سواری میسر نہ ہو لیکن اُس کو چلنے کی طاقت ہو، یا زادِ سفر میسر نہ ہو لیکن کمانے کی طاقت ہو تو اس پر اُن علماء کے نزدیک حج فرض نہیں ہے جنہوں نے زادِ سفر اور سواری کے میسر ہونے کو حج کے فرض ہونے کے لیے شرط قرار دیا ہے۔ البتہ ایسی صورت میں حج کر لینا مستحب ہے۔ اور امام کے نزدیک فرض ہے۔

(۲) وہ شخص جس کو کسی اور کی وجہ سے استطاعت حاصل ہو اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی لنگڑا ہونے کی وجہ سے از خود حج کرنے سے عاجز ہو یا اُسے ایسی بیماری ہو جس سے نجات کی امید نہ ہو لیکن اس کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ کسی کو اجرت دے کر اپنی طرف سے حج کروائے تو اُس پر واجب ہے کہ وہ اجرت دے کر اپنی طرف سے حج کروائے۔ اگر اس کے پاس مال نہ ہو اور اُسے اس کی اولاد یا کوئی اجنبی شخص نیکی کرتے ہوئے رقم دے دے کہ تم اپنا حج ادا کر لو تو اس پر حج ادا کرنا فرض ہے، بہ شرط یہ کہ اُسے دینے والے کی سچائی پر اعتماد ہو کیونکہ حج کا فرض ہونا استطاعت پر موقوف ہے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مؤقف یہ ہے کہ نیکی اور احسان کے طور پر دی ہوئی رقم سے حج فرض نہیں ہوتا[۵۱]۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جس شخص کا مال

۵۱ یعنی امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک حج اُس شخص پر فرض ہے جو ذاتی طور پر حج کی استطاعت رکھتا ہو۔ ذاتی طور پر جو شخص استطاعت رکھتا ہو اس کو مستطیع بنفسہٖ کہتے ہیں اور جس کو کسی اور کی جانب سے استطاعت حاصل ہو اس کو مستطیع بغیرہٖ کہتے ہیں۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ فتاویٰ عالمگیری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ کسی نے حج کے لیے آدمی کو اتنا مال مُباح کر دیا کہ حج کر لے تو حج فرض نہ ہوا کہ اباحت سے مِلک نہیں ہوتی اور فرض ہونے کے لیے ملک درکار ہے خواہ مباح کرنے والے کا اُس پر احسان ہو، جیسے ماں باپ، اولاد۔ یونہی اگر عاریۃً سواری مل جائے گی تب بھی فرض نہیں۔ (بہارِ شریعت جز ۶ ص ۸، مطبوعہ لاہور)

چھین لیا جائے اس پر حج فرض نہیں ہے۔ جن علماء نے نیکی کے طور پر دی ہوئی رقم سے حج کو فرض قرار دیا ہے اُن کا استدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ:

(۵۷) حضرت فضل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پیچھے سوار تھے۔ آپ کے پاس قبیلہ خثعم کی ایک عورت مسئلہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ اس دوران فضل بن عباس اس عورت کو دیکھنے لگے وہ عورت اُنہیں دیکھنے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فضل کے چہرہ کو دوسری جانب پھیر دیا۔ اُس عورت نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! بے شک اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں پر حج کرنا فرض ہے' میرے والد بہت بوڑھے ہیں وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتے' کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ہاں! (یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیش آیا)[۵۲] (صحیح بخاری: ۱۵۱۳' صحیح مسلم: ۱۳۳۴' سنن ترمذی: ۹۲۸' سنن ابوداؤد: ۱۸۰۹' سنن نسائی: ۲۶۴۱' سنن ابن ماجہ: ۲۹۰۷' سنن بیہقی ج ۴ ص ۳۲۸' مسند احمد ج ۱ ص ۳۴۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۱۱۔ ص ۲۲۱)

زیر بحث آیت کے آخری جملہ کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

فرمایا: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (اور جو انکار کرے تو بلاشبہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کا جو حج فرض کیا ہے اُس کا جو شخص انکار کرے تو اللہ تعالیٰ اُس سے' اُس کے حج سے' اُس کے عمل سے اور تمام مخلوق سے بے نیاز ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بات اُس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جسے حج کے اسباب میسر ہوں' اس کے باوجود وہ حج کیے بغیر اس دنیا سے چلا جائے تو اُس نے حج کا انکار کیا۔ کیونکہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۵۸) جس شخص کو زادِ سفر اور ایسی سواری میسر ہو جو اُسے بیت اللہ تک پہنچا سکے' اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو پھر اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ شخص یہودی یا عیسائی ہو کر مرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اللہ ہی کے لیے لوگوں پر گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔ (سنن ترمذی: ۸۱۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۲۱۔ ص ۲۲۲)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں صرف اسی سند کے ساتھ یہ حدیث معلوم ہے۔ اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔ اس کے راویوں میں ایک راوی ہلال بن عبداللہ مجہول ہے اور حارث کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

---

۵۲ امام شافعی اور امام احمد اس بات کے قائل ہیں کہ کسی اور کی جانب سے حاصل ہونے والی استطاعت سے بھی حج فرض ہو جاتا ہے' وہ اس حدیث شریف سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں خثعمی عورت کے والد بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے سے عاجز تھے' اُن کی طرف سے وہ عورت حج کرنا چاہتی تھی۔ اس کو رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس عورت کے والد کی استطاعت کو نبی اکرم ﷺ نے برقرار رکھا اور بڑھاپے کے باوجود ان کو غیر مستطیع اور عاجز قرار نہیں دیا۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور استطاعت کی شرط نص قرآنی (آل عمران: ۹۷) سے ثابت ہے' لہٰذا اس حدیث سے احناف کے مؤقف پر معارضہ نہیں کیا جا سکتا۔ (تفسیر مظہری' زیر بحث آیت) دوسرا جواب جو ائمہ مالکیہ نے امام مالک علیہ الرحمۃ کی طرف سے دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں فرضیت حج کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور اُن کی دینی اور دُنیاوی ضروریات کا لحاظ رکھنے کی ترغیب دینا مقصود ہے۔ لہٰذا اس سے غیر مستطیع پر حج کی فرضیت کو ثابت کرنا درست نہیں ہے۔ علامہ ابن عبدالبر مالکی نے جواب میں کہا ہے کہ یہ حدیث مذکورہ عورت کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ (تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی' زیر بحث آیت ملاحظہ فرمائیں۔)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''ومن کفر'' سے مراد وہ شخص ہے جو حج کرے تو اُسے نیکی نہ سمجھے اور حج نہ کرنے کو گناہ نہ سمجھے۔ ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ ''جو انکار کرے تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے''۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے''۔ انہوں نے حج نہیں کیا۔ اور کہا کہ حج کے لیے مکہ جانا فرض نہیں ہے۔ یوں انہوں نے حج کا انکار کیا' پھر یہ جملہ نازل ہوا کہ جس نے انکار کیا تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

ان اقوال کی بنیاد پر زیر بحث جملہ (من کفر) اپنے ماقبل کے جملوں سے منسلک ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''من کفر'' سے نئے کلام کا آغاز ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ جس نے اللہ اور یوم آخرت کا انکار کیا تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾

آپ کہیے اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے حالانکہ جو کچھ تم کرتے ہو اس پر اللہ گواہ ہے O

آیت مذکورہ میں مخاطب کا تعین اور ''آیات اللہ'' کی تفسیر

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ﴾ میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء سے خطاب ہے جو اس بات کو جانتے تھے کہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت برحق ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں تمام یہودیوں اور عیسائیوں سے خطاب ہے جو کہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے منکر تھے۔ ﴿ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (تم اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے۔) اس میں ''آیات اللہ'' سے وہ نشانیاں مراد ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور آپ کی حقانیت کو ثابت کرنے والی ہیں۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں جو محمد عربی ﷺ کی نبوت کی سچائی کو ثابت کرنے والی ہیں تم اُن کا انکار کیوں کرتے ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ ''آیات اللہ'' سے قرآن کریم اور سیدنا محمد عربی ﷺ کی ذات مراد ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہارے اعمال پر گواہ ہے لہٰذا وہ تمہیں تمہارے اعمال پر بدلہ دے گا۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

آپ کہیے! اے اہل کتاب تم اللہ کی راہ سے اُس شخص کو کیوں روکتے ہو جو ایمان لا چکا' تم اُس (راستہ) کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو حالانکہ تم خود (اُس کی درستگی کے) گواہ ہو اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے O

اہل کتاب کا مسلمانوں کو راہِ خدا سے روکنے کا طریقہ اور ان کے گواہ ہونے کی تفسیر

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (اے اہل کتاب!) جو شخص ایمان لا چکا اس کو تم اللہ کے دین سے کیوں روکتے ہو؟ اہل کتاب کا اللہ کے راستہ سے روکنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ (مسلمانوں کے دلوں میں) شکوک وشبہات پیدا کرتے تھے' یعنی کہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کے اوصاف موجود نہیں ہیں۔ آگے جو ﴿ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ٹیڑھا پن اور حق سے انحراف کیوں تلاش کرتے ہو؟ ''عِوَج'' کا معنیٰ ہے: (١) ٹیڑھا پن (٢) دین میں' قول وفعل میں اور ہر وہ چیز جو نظر نہ آتی ہو اس میں اعتدال سے انحراف۔ ہاں اگر چیز

ایسی ہو جونظر آتی ہو جیسے دیوار نیزہ اور اس جیسی دیگر چیزیں تو ان میں ٹیڑھا پن کو (عین کے زبر کے ساتھ) "عَـوَج" کہتے ہیں۔ آیت میں "تبغونھا" کی "ھا" ضمیر سبیل کی طرف راجع ہے۔ مفہوم جملہ یہ ہے کہ (اے اہل کتاب!) تم کمزور لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر اللہ کی راہ میں ٹیڑھا پن اور انحراف کیوں تلاش کرتے ہو؟

﴿وَأَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ﴾ (حالانکہ تم خود گواہ ہو۔) اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ (اے اہل کتاب!) تم اس بات کے گواہ ہو کہ محمد عربی ﷺ کی تعریف اور ان کے اوصاف تورات میں لکھے ہوئے ہیں اور اس کے بھی گواہ ہو کہ اللہ کا دین جس کے سوا کوئی اور دین مقبول نہیں ہے وہ دین اسلام ہے۔ بعض نے "و انتـم شهـداء" کا معنٰی یہ کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے صادر ہونے والے وہ معجزات جو آپ کی نبوت کی دلیل ہیں اُن کو تم دیکھتے رہتے ہو۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ﴾ (اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے) اس میں اہل کتاب کے لیے وعید اور سرزنش ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے اور نبی اکرم ﷺ کی تصدیق سے لوگوں کو روکنے کے لیے دلوں میں مختلف شبہات ڈالنے کی تدبیریں اور کوشش کیا کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کے کہنے پر چلو گے تو (نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں گے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس کی تفسیر

زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ شاس بن قیس یہودی جو کہ بوڑھا اور سخت کافر تھا اور مسلمانوں کو بہت زیادہ طعنے دیتا تھا وہ اوس اور خزرج کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا۔ یہ لوگ ایک مجلس میں بیٹھ کر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُس نے جب یہ دیکھا کہ زمانۂ جاہلیت میں ان لوگوں کے درمیان دشمنی تھی اور اب اسلام کی وجہ سے ان کے درمیان الف ومحبت اور تعلق داری قائم ہو چکی ہے تو وہ غضب ناک ہو گیا۔ اور اُس نے کہا کہ اس شہر میں تو قیلہ کے بیٹوں کے پیروکار جمع ہو گئے ہیں اور خدا کی قسم! جب تک یہ لوگ اکٹھے رہیں گے ہمیں چین نہیں آئے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک یہودی نوجوان جو اس کے ساتھ ہی تھا اس کو حکم دیا کہ تم ان کی طرف جاؤ اور ان کے ساتھ بیٹھ کر اُنہیں یوم بعاث اور اس سے پہلے کے واقعات یاد دلاؤ اور وہ لوگ (اپنی دشمنی کے زمانہ میں) ایک دوسرے کے خلاف جو اشعار کہتے تھے اُن میں سے کچھ سناؤ۔ یوم بعاث وہ دن تھا جس میں اوس اور خزرج کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور اوس کو خزرج پر فتح ملی تھی۔ اس یہودی نوجوان نے شاس بن قیس کے حکم پر ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے درمیان بحث اور جھگڑا ہو گیا اور ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے۔ قبیلہ اوس کے بنی حارثہ کا ایک شخص اوس بن قیظی اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ کا ایک شخص جبار ابن صخر دونوں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے' دونوں کے درمیان بحث ہوئی' ایک نے دوسرے سے کہا کہ خدا کی قسم! اگر تمہارے قبیلہ کے لوگ چاہیں تو ہم گذشتہ واقعات کو ابھی تازہ کر دیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر غضب ناک ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم لڑائی کے لیے تیار ہیں اور لڑائی باہر حرہ (پتھریلی زمین) میں ہوگی۔ چنانچہ لوگ حرہ کی طرف

"قَيۡلَه" کے بیٹوں سے اوس اور خزرج نامی افراد مراد ہیں' کیونکہ یہ دونوں آپس میں بھائی تھے اور ان کی والدہ کا نام "قَيۡلَه" تھا۔

چلے اور وہاں پہنچ کر اوس اور خزرج زمانہ جاہلیت کے دعوے کرتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ مہاجرین کی جماعت کے ساتھ اوس اور خزرج کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

(٥٩) اے گروہِ مسلمین! کیا تم نے دورِ جاہلیت کے دعوے شروع کر دیئے ہیں حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور اللہ تعالیٰ تمہیں اسلام کی نعمت سے سرفراز کر چکا ہے' اُس نے تم سے زمانہ جاہلیت کے معاملات کو ختم کر کے تمہارے درمیان اُلفت ڈال دی ہے۔ کیا تم کفر کی طرف لوٹنا چاہتے ہو جس پر پہلے تھے؟ اللہ سے ڈرو! اللہ سے ڈرو۔

صحابہ کرام نے یہ باتیں سُنیں تو سمجھ گئے کہ جو کچھ ہمارے درمیان ہوا یہ شیطان کا وسوسہ اور دشمن کی سازش تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار اپنے ہاتھوں سے پھینک دیئے اور رونے لگے اور ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سننے والے اور فرمانبرداری کرنے والے بن کر لوٹے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اس دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں دیکھا جس کا آغاز بدترین اور اختتام حسین ترین ہو۔ اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

(تفسیر ابن جریر للطبری)

آیت میں فرمایا: ﴿فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (اہل کتاب کا ایک گروہ) اس سے شاس بن قیس یہودی اور اس کے دیگر ساتھی مراد ہیں (یعنی اے ایمان والو! اگر تم ان یہودیوں کے کہنے پر چلو گے تو) ﴿يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾ (وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنادیں گے) اور کفر سے چونکہ دشمنی' بغض' فتنہ انگیزی' قتل و غارت گری اور خون ریزی پیدا ہوتی ہے اس لیے یہ دنیا میں تباہی کا باعث ہے اور آخرت میں جہنم کا باعث ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾

اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (دوبارہ) کفر کرنے لگو حالانکہ تمہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول (بھی) موجود ہے' اور جو شخص اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے اُسے یقیناً سیدھا راستہ دکھا دیا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں کلمہ ''کیف'' کی تشریح اور قرآن کریم کی عظمت

﴿كَيْفَ﴾ کلمۂ تعجب ہے۔ اور تعجب کرنا اُس شخص کو زیب دیتا ہے جسے متعلقہ بات کی وجہ معلوم نہ ہو۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔ لہٰذا یہاں اس کلمہ سے ''منع اور تغلیظ'' مراد ہوگا (یعنی روکنا اور سختی کرنا)۔ (اس صورت میں ''كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ'' کا مفہوم ہوگا: تم کفر مت کرو) کیونکہ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی قرآن کریم کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کی تم میں موجودگی (یہ دونوں چیزیں) تمہارے لیے تمہارے کاموں میں رہنما ہیں۔ اور ان کی رہنمائی کفر کے واقع ہونے سے روکتی ہے۔ اس اعتبار سے صحابہ کرام سے کفر کا واقع ہونا بعید تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دو روشن نشانیوں کا بیان ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب اور ایک اللہ تعالیٰ کا نبی (سیدنا محمد عربی ﷺ)۔ نبی (بہ ظاہر) تو تشریف لے گئے البتہ کتاب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور نعمت کے طور پر تمہارے درمیان باقی رکھا ہوا ہے۔

(٦٠) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دینے کے لیے مکہ اور مدینہ کے درمیان اس تالاب پر کھڑے ہوئے جس کو خُم کہا جاتا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا: اے لوگو! سنو میں صرف ایک بشر ہوں' عنقریب میرے رب کا پیغام لانے والا (فرشتۂ اجل) میرے پاس آئے گا اور میں

''لبیک'' کہوں گا۔ میں تم میں دو ثقیل (عظیم) چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں' ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے' اللہ کی کتاب پر عمل کرو اور اس کو مضبوطی سے تھام لو۔ پھر آپ نے کتاب اللہ کے بارے میں ہمیں جوش دلایا اور اس کی طرف شوق بڑھایا' پھر فرمایا: اور (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں' میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں[۵۳]

(صحیح مسلم: ۲۴۰۸' مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۷' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۱۱۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۱۴۰۔ ص ۵۶۸)

آخر میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ ﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ سے قوت حاصل کرتا ہے اور اس کے دین اور عبادت کو تھام لیتا ہے۔ (اعتصام عصمت سے ہے اور) ''عصمة'' کا اصل معنیٰ ہے: مصیبت میں پڑنے سے بچنا۔ یہاں ''من یعتصم باللہ'' فرما کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بات کی رغبت دلائی ہے کہ وہ اپنے آپ سے کفار کے شر کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیں۔ ﴿ فَقَدْ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یقیناً ایسے شخص کو سیدھے راستہ کی ہدایت مل گئی۔ اس میں ''صراط مستقیم'' سے واضح راستہ مراد ہے۔ یعنی حق کا راستہ جو کہ جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے' اور تم صرف حالتِ اسلام میں مرنا O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول

مقاتل بن حیان بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس و خزرج کے درمیان دشمنی اور باہمی لڑائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ان دونوں قبیلوں کے درمیان صلح کروا دی۔ صلح ہونے کے بعد کسی دن قبیلہ اوس کے حضرت ثعلبہ بن غنم اور قبیلہ خزرج کے حضرت سعد بن زُرارہ ایک دوسرے پر فخر کی باتیں کرنے لگے۔ حضرت ثعلبہ اوسی نے کہا کہ خزیمہ بن ثابت کا تعلق ہمارے قبیلہ سے ہے' جن کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا گیا ہے' حضرت حنظلہ بھی ہمارے قبیلہ سے ہیں جو کہ غسیل ملائکہ ہیں' حضرت عاصم بن ثابت بن افلح بھی ہمارے قبیلہ سے ہیں' جن کی لاش کی شہد کی مکھیوں کے ذریعہ حفاظت کی گئی اور حضرت سعد بن معاذ بھی ہمارے قبیلہ سے ہیں' جن کے انتقال پر خدائے رحمٰن عزوجل کا عرش ہل گیا اور بنو قریظہ کے بارے میں انہوں نے جو فیصلہ کیا اُس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ حضرت سعد بن زرارہ خزرجی نے یہ ساری باتیں سُن کر کہا کہ (ہمارے قبیلہ کی شان یہ ہے کہ) چار صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کریم کو محفوظ کیا وہ ہمارے قبیلہ سے ہیں' یعنی حضرت اُبی بن کعب' حضرت معاذ بن جبل' حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوزید۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ جو انصار کے خطیب اور سردار ہیں وہ بھی ہمارے قبیلہ کے ہیں۔ اس طرح دونوں کے درمیان بات چلتی رہی حتیٰ کہ دونوں غصہ میں آ گئے اور (ایک دوسرے کے خلاف) اشعار پڑھنے لگے اور فخریہ باتیں کرنے لگے۔ یہ سُن کر اوس اور خزرج کے لوگ ہتھیار لیے وہاں پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے ان کے درمیان صلح کروائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی۔

اللہ تعالیٰ سے کماحقہٗ ڈرنے کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال

فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو' جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔)

---

۵۳ اس حدیث شریف کو علامہ خازن تفسیر کے آغاز میں ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے: رقم الحدیث: امع الحاشیہ۔

(١) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے' نافرمانی نہ کی جائے' اس کا شکر ادا کیا جائے' ناشکری نہ کی جائے' اُسے یاد کیا جائے' بھلایا نہ جائے۔ (٢) حضرت مجاہد فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت تمہیں (تمہارے مشن سے) پیچھے نہ ہٹا سکے۔ اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انصاف قائم کرو اگر چہ تمہارا فیصلہ تمہاری اپنی ذات' تمہارے آباء واجداد اور تمہاری اولاد کے خلاف کیوں نہ ہو۔ (٣) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جیسا اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق ہے اُس طرح کوئی شخص بھی اُس وقت تک نہیں ڈر سکتا جب تک کہ اپنی زبان کو قابو میں نہ کر لے۔ (٤) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس قدر اللہ سے ڈرنا واجب ہے اُس قدر اُس سے ڈرو۔ یعنی جو کام ضروری ہیں اُن کو کرو اور جو ممنوع ہیں اُن سے بچو۔

اللہ تعالیٰ سے کماحقہٗ ڈرنے کا حکم منسوخ ہے یا نہیں؟

آیت کا زیر بحث حصہ منسوخ ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں: (١) ایک قول یہ ہے کہ منسوخ ہے۔ کیونکہ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو مسلمانوں کو دشوار معلوم ہوئی۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے اس پر کون عمل کر سکے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس پر درج ذیل آیت نازل فرمائی:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ۔ (التغابن:١٦) تم اپنی طاقت کے مطابق اللہ سے ڈرتے رہو۔

اس آیت میں زیر بحث آیت کے مذکورہ حصہ کو منسوخ کر دیا۔ حضرت ابن عباس' حضرت سعید بن جبیر' قتادہ' ابن زید اور سدی کا یہی قول ہے۔ (٢) دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کا زیر بحث حصہ محکم ہے' یعنی منسوخ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بھی ایک روایت یہی ہے اور طاؤس کا بھی یہی قول ہے۔

مذکورہ اختلاف کی جو بنیاد ہے وہ یہ ہے کہ آیت مبارکہ میں ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' کا مفہوم کیا ہے؟ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ آیت مبارکہ کا زیر بحث حصہ منسوخ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ پر اپنے رب کی طرف سے جو جو واجبات اور حقوق عائد ہوتے ہیں بندہ اُن میں سے ہر ہر واجب اور حق کو ادا کرے۔ چونکہ اس حکم کو پورا کرنا بندہ کے بس سے باہر ہے اس لیے اس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ آیت مبارکہ کا زیر بحث حصہ منسوخ نہیں ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ''حق تقاته'' کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی پر جو کام لازم ہیں ان کو وہ اپنی طاقت کے مطابق ادا کرے۔ اس مفہوم کی رُو سے التغابن کی مذکورہ آیت (فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' کی تفسیر ہے نہ کہ اس کی ناسخ یا مخصص۔ لہٰذا جو شخص بھی اپنی طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے ڈرا وہ یقیناً ''حق تقاته'' کے مطابق ڈرا (یعنی جیسا ڈرنے کا حق تھا وہ اس کے مطابق ڈرا)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حق تقاته'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح ڈرنا واجب ہے اس طرح ڈرا جائے' یعنی اُس کی جملہ نافرمانیوں سے اجتناب کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے کماحقہٗ ڈرنے کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کی تشریح

''حق تقاته'' کی تفسیر میں اوپر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا جو قول ذکر کیا گیا اس کی وضاحت کرتے ہوئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس کا یہ فرمانا کہ ''اللہ کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے'' یہ بالکل درست ہے لیکن آدمی جو کام غلطی سے کر جاتا ہے یا کرنا بھول جاتا ہے وہ موجبِ طعن نہیں ہے۔ کیونکہ غلطی اور بھول چوک کے موقع پر آدمی مکلف نہیں رہتا۔ اسی طرح ان کا یہ فرمانا کہ ''اللہ کا شکر ادا کیا جائے' اس کی نافرمانی نہ کی جائے'' اس کے بموجب جب آدمی پر

لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے جن نعمتوں سے نوازا ہے اُن کا وہ اپنے دل میں تصور رکھے' ہاں غلطی ہونے کی صورت پر آدمی پر یہ لازم نہیں ہے۔ اسی طرح اُن کا یہ فرمانا کہ "اللہ کو یاد کیا جائے اُسے بھلایا نہ جائے" یہ اس وقت واجب ہے جب آدمی دُعا یا عبادت کرے۔ غلطی اور بھولنے کی صورت میں واجب نہیں ہے۔

اس جملہ کی تفسیر کہ "تم صرف حالت اسلام میں مرنا"

فرمایا: ﴿ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ (تم صرف حالتِ اسلام میں مرنا۔) اس میں بہ ظاہر موت پر نہی وارد ہوئی ہے لیکن معنوی طور پر اس میں اسلام پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تم اسلام پر قائم رہو' جب تم پر موت وارد ہو تو حالت اسلام میں وارد ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس جملہ میں درحقیقت اسلام کو چھوڑنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تم اسلام کو نہ چھوڑنا کیونکہ موت لازماً آنی ہے' لہٰذا جب تمہیں موت آئے تو اس حالت میں آئے کہ تم اسلام پر ہو۔ کیونکہ جب موت آنے تک اسلام پر قائم رہنا لوگوں کے لیے ممکن ہے تو اسلام پر ہوتے ہوئے جو موت آئے گی وہ لوگوں کی اپنی طاقت کے مطابق حالت اسلام پر موت کہلائے گی۔ بعض مفسرین کے نزدیک جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس حالت میں مرنا کہ تم مخلص ہو' اپنے معاملات اللہ عزوجل کے سپرد کرنے والے ہو اور اس کے ساتھ حُسن ظن رکھنے والے ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۶۱) رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ پڑھی: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ"۔ (آل عمران: ۱۰۲) "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم صرف حالت اسلام میں مرنا"۔ پھر آپ نے فرمایا: اگر زقوم کا ایک قطرہ دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو وہ زمین والوں کی روزیاں خراب کر دے[۵۴]' (سوچو) اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کا کھانا "زقوم" ہو۔

(سنن ترمذی: ۲۵۸۵' سنن ابن ماجہ: ۴۳۲۵' مسند احمد ج ۱ ص ۳۰۱' مستدرک ج ۲ ص ۲۹۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۶۸۳۔ ص ۵۰۳)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھام لو اور جدا جدا نہ رہو اور اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو جو اُس نے تم پر اس وقت فرمائی جب تم (آپس میں) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی' نتیجہ یہ ہوا کہ تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچایا' اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پر رہو ۝

---

۵۴ "زقـوم" جہنم میں ایک درخت کا نام ہے۔ نہایت تلخ' انتہاء درجہ کا بدبودار اور حد درجہ کا بدمزہ درخت ہے۔ اہل دوزخ کو کھانے کے لیے دیا جائے گا اور اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس درخت کا ذکر موجود ہے۔ زیر بحث حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا کہ اس کا ایک قطرہ اگر دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو وہ زمین والوں کی روزیاں خراب کر دے' اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی کڑواہٹ' بدبو اور تپش سے روئے زمین کے تمام دانے' پھول' پودے اور کھانے پینے کی تمام اشیاء خراب ہو جائیں۔ (اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا برحمتہ وبجاہ حبیبہ الکریم ﷺ)

''حبل'' کا معنیٰ اور ''حبل الله'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ تم سب مل کر اللہ کی رسّی تھام لو۔ ''حبل'' اُس سبب کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ مقصد تک پہنچا جا سکے۔ امن کو ''حبل'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خوف کے زوال اور خاتمہ کا ذریعہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حبل الله'' سے مراد وہ سبب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل ہو۔ ''حبل'' کے اس معنیٰ کی بناء پر آیت میں ''حبل الله'' کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک ''حبل الله'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے دین کو تھام لو' کیونکہ اللہ کا دین اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ بعض کے نزدیک ''حبل الله'' سے قرآن کریم مراد ہے۔ کیونکہ قرآن بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سنو! میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' ان میں ایک کتاب اللہ ہے جو کہ اللہ کی رسّی ہے۔ جس نے اُس کی پیروی کی وہ ہدایت پر رہے گا اور جس نے اُسے چھوڑا تو وہ گمراہ ہو جائے گا۔[۵۵] (صحیح مسلم: ۲۴۰۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۶۱۴۰۔ ص ۵۶۸)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٢) بے شک یہ قرآن اللہ (عزوجل) کی مضبوط رسّی ہے' یہ واضح روشنی ہے' فائدہ مند شفاء ہے۔ جو اس کو تھام لے اس کا یہ محافظ ہے۔ امام بغوی نے اس حدیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت' المستدرک ج ۱ ص ۵۵۵)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''حبل الله'' سے مراد جماعت ہے۔ اور ارشادِ نبوی ہے کہ ''تم پر جماعت کے ساتھ رہنا لازم ہے''۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۲۴۳) چونکہ جماعت اللہ کی وہ رسّی ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے اس لیے ''حبل الله'' سے جماعت مراد ہے۔ نیز جماعت اور نیکی میں جو باتیں تمہیں ناپسند ہیں وہ اُن باتوں سے بہت بہتر ہیں جو تمہیں جدا جدا رہنے میں پسند ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''حبل الله'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا حکم اور اُس کی اطاعت کو تھام لو۔

''تفرّق'' کی تفسیر

فرمایا: ﴿ وَلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ (جُدا جُدا نہ رہو۔) اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح یہودی اور عیسائی آپس میں بٹ گئے تم اس طرح نہ بٹو۔ بعض مفسرین کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ آپس میں اس طرح جدا جدا نہ رہو جس طرح زمانۂ جاہلیت میں تم ایک دوسرے سے جدا تھے' آپس میں اختلاف اور دشمنی رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ تم ایسی باتیں نہ کرو جس سے انتشار پیدا ہو اور اجتماعیت اور باہمی محبت کا خاتمہ ہو۔ یعنی اس آیت میں انتشار اور اختلاف سے منع کیا گیا ہے اور اتفاق اور اجتماعیت کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ حق اور سچ ایک ہی ہوتا ہے' باقی جو کچھ ہوتا ہے وہ جہالت اور گمراہی ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ دین میں اختلاف اور باہمی جدائی سے منع کیا جائے کیونکہ یہ سب اہل جاہلیت کی عادت کا حصہ تھا۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٣) بے شک اللہ (عزوجل) تمہارے لیے تین باتوں کو پسند فرماتا ہے اور تین باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔ وہ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور جس کو

[۵۵] اس حدیث شریف کو علّامہ خازن تفسیر کے آغاز میں رقم: ۲ کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمہارے امور کا والی بنائے اس کے ساتھ تم مخلص رہو۔ اور اس بات کو ناپسند فرماتا ہے کہ تم فضول بحث کرو' مال ضائع کرو اور بہت زیادہ مانگ تانگ کرو۔

(معالم التنزیل' زیر بحث آیت' صحیح مسلم: ۱۷۱۵' الادب المفرد: ۴۴۲' مؤطا امام مالک: ۱۹۱۴' مسند احمد ج ۲ ص ۳۶۰)

بیعت عَقَبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے ذریعہ انصار میں اسلام پھیلنے کا تفصیلی واقعہ

محمد بن اسحٰق اور دیگر اہل تاریخ بیان کرتے ہیں کہ اوس اور خزرج دونوں آپس میں سگے بھائی تھے۔ ان کے درمیان کسی مقتول کی وجہ سے دشمنی ہو گئی۔ پھر یہ دشمنی اور ان کی باہمی جنگیں ایک سو بیس سال تک چلتی رہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ اس دشمنی کو بجھا دیا اور سیدنا محمد عربی ﷺ کے ذریعہ ان کے درمیان محبت پیدا فرمادی۔ ہوا یہ کہ بنی عمرو بن عوف کا بھائی سُوید بن صامت جو کہ ایک شریف آدمی تھا اور اُسے اس کے صبر و استقلال اور نسب کی وجہ سے لوگ کامل کہتے تھے' وہ حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ حاضر ہوا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اعلانِ نبوت فرما چکے تھے اور دعوت و تبلیغ کا حکم آپ کو آچکا تھا۔ آپ نے جب سُوید کے بارے میں سُنا تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اُسے اللہ عزوجل کی طرف اور مذہب اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔ سُوید نے کہا کہ شاید آپ کے پاس بھی اُسی طرح کی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ اُس نے کہا: میرے پاس مجلّہ لقمان یعنی حضرت لقمان کی حکمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: مجھے دکھاؤ۔ اُس نے وہ دکھایا تو آپ نے فرمایا: یہ کلام عمدہ ہے' لیکن میرے پاس اس سے زیادہ بہتر کلام ہے اور وہ قرآن کریم ہے' جس کو اللہ تعالیٰ نے نور اور ہدایت بنا کر مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ پھر آپ نے اس کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی اور اسے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اُس نے جواباً کسی قسم کی نفرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ کہا کہ یہ کلام عمدہ ہے۔ پھر وہ مدینہ منورہ واپس چلا گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یوم بعاث سے پہلے ہی اُسے خزرج نے قتل کر دیا۔ اُس کی قوم کے لوگ کہتے تھے کہ اُسے حالت اسلام میں قتل کیا گیا ہے (یعنی وہ مسلمان ہو چکا تھا)۔ پھر ابوالحیسر انس بن رافع بنی اشہل کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ آیا' اس جماعت میں ایاس بن معاذ بھی تھا۔ یہ سب اپنی قوم خزرج کے خلاف قریش کے ساتھ معاہدہ کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان لوگوں کے بارے میں سنا تو آپ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کے پاس بیٹھ کر اُن سے کہا کہ جس مقصد کے لیے تم یہاں آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز تم چاہتے ہو؟ انہوں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں' اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ میں یہ دعوت پیش کروں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کتاب بھی نازل فرمائی ہے۔ پھر آپ نے ان کے سامنے اسلام کے متعلق کچھ باتیں کیں اور اُنہیں قرآن کریم کی تلاوت سُنائی۔ ایاس بن معاذ جو ایک نوجوان لڑکا تھا اس نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا کہ خدا کی قسم! جس مقصد کے لیے تم لوگ یہاں آئے ہو' یہ چیز اُس سے بہت بہتر ہے۔ ابوالحیسر نے یہ سُن کر کنکروں کی ایک مٹھی ایاس کے منہ پر ماری اور کہا کہ ہمیں اپنا کام کرنے دو' میری زندگی کی قسم! ہم کسی اور مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ایاس یہ سُن کر بالکل خاموش ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ وہاں سے اٹھ گئے اور وہ لوگ مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس کے بعد اوس اور خزرج کے درمیان جنگ بعاث ہوئی اور کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایاس بن معاذ ہلاک ہو گیا۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے دین کے غلبہ اور اپنے محبوب ﷺ کی عزت افزائی کا ارادہ فرمایا تو حج کے جس موقع پر آپ نے انصار کی جماعت سے ملاقات فرمائی تھی اس موقع کے آنے پر آپ دوبارہ تشریف لے گئے اور عرب کے قبائل سے ملاقات کی۔ آپ ایک گھاٹی کے پاس خزرج کے کچھ لوگوں سے ملے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا ارادہ فرمالیا تھا۔ یہ لوگ کل چھ افراد تھے: سعد بن زرارہ' عوف بن

الحارث (ابن عفراء)، رافع بن مالک عجلانی، قطبہ بن عامر بن خریدہ، عقبہ بن عامر بن بانی اور جابر بن عبد اللہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم خزرج کے لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا وہی جنہوں نے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ بیٹھو گے تاکہ میں تم سے ایک بات کروں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! یہ کہہ کر وہ لوگ آپ کے پاس بیٹھ گئے، آپ نے اُنہیں اللہ عزوجل کی طرف آنے کی دعوت دی اور اسلام کا پیغام پیش کیا اور اُنہیں قرآن کریم کی تلاوت سنائی۔ راوی کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی جو رغبت عطا فرمائی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے علاقوں میں ان کے ساتھ یہودی رہتے تھے۔ یہودیوں کے پاس کتاب اور علم تھا جبکہ یہ لوگ بت پرست اور مشرک تھے۔ ان کا یہودیوں کے ساتھ کسی بات پر جب جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی فوراً کہتے کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے، اس کا زمانہ سایہ فگن ہو چکا ہے، ہم اس نبی کی پیروی کر کے اس کے ساتھ مل کر تمہارا اس طرح قتل عام کریں گے جیسے عاد اور اِرم کا قتل ہوا۔ اب جب رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے گفتگو فرمائی اور انہیں اللہ عزوجل کی طرف آنے کی دعوت دی تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: خدا کی قسم! تم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد کا تم سے یہودی وعدہ کرتے رہے ہیں۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے پہلے اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت کو قبول کیا، آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لے آئے۔ اور عرض گزار ہوئے کہ ہم جس قوم کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں وہ ایک ایسی قوم ہے کہ اس سے زیادہ کسی اور قوم میں دشمنی اور فتنہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اُن میں اتفاق پیدا فرمادے۔ ابھی ہم جا کر اُنہیں آپ کے پیغام کی طرف بلائیں گے، اگر آپ کی ذات پر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں متفق کر دیا تو آپ سے بڑھ کر کوئی غلبہ والا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد وہ لوگ اپنے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو لوگوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور اُنہیں اسلام کی دعوت پیش کی۔ ہوتے ہوتے بات اتنی پھیل گئی کہ ہر ہر انصاری کے گھر میں رسول اللہ ﷺ کا چرچا ہو گیا۔ حتیٰ کہ آئندہ سال انصار کے بارہ افراد حج کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ بارہ افراد یہ تھے: (۱) اسعد بن زرارہ (۲) عوف (ابن عفراء) (۳) معاذ (ابن عفراء) (۴) رافع بن مالک عجلانی (۵) ذکوان ابن عبد القیس (۶) عبادہ بن صامت (۷) زید بن ثعلبہ (۸) عباس بن عبادہ (۹) عقبہ بن عامر (۱۰) قطبہ بن عامر (یہ تمام افراد قبیلہ خزرج کے تھے)۔ (۱۱) ابو الہیثم بن تیہان (۱۲) عویمر بن ساعدہ (یہ دونوں قبیلہ اوس کے تھے)۔ یہ سب عقبہ اولیٰ میں نبی اکرم ﷺ سے ملے اور وہاں انہوں نے آپ سے اُن ہی باتوں پر بیعت کی جن باتوں پر عورتوں نے آپ سے بیعت کی تھی۔ وہ باتیں یہ تھیں:

اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ ۔ (الممتحنہ: ۱۲)

وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی، چوری نہیں کریں گی، بدکاری نہیں کریں گی، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گی، جھوٹا الزام نہیں لگائیں گی جو انہوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیا ہو اور کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

ان ہی باتوں پر مذکورہ بارہ افراد نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ اختتام پر آپ نے فرمایا: اگر تم لوگوں نے ان باتوں پر عمل کیا تو تمہارے لیے جنت ہے اور اگر ان میں سے کسی بھی بات کی خلاف ورزی کی اور اس کے نتیجہ میں دُنیا میں ہی سزا (یعنی حدِ شرعی) پالی تو وہ سزا کفارہ بن گئی اور اگر تمہاری پردہ پوشی کر دی گئی تو تمہارا معاملہ اللہ عزوجل کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے گا تو تمہیں عذاب دے گا اور چاہے گا تو تمہاری بخشش کر دے گا۔

راوی کہتے ہیں کہ بیعت کا یہ واقعہ جنگ کے مسلط ہونے سے پہلے پیش آیا۔ بیعت کر کے جب وہ لوگ واپس جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر ابن ہاشم بن عبد مناف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ وہ انہیں قرآن کریم پڑھائیں' اسلام کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سکھائیں۔ مدینہ منورہ میں حضرت مصعب کو لوگ مُقرِی (TEACHER) کہنے لگے۔ حضرت مصعب کی رہائش حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر تھی۔ ایک دن حضرت اسعد اور حضرت مصعب دونوں گھر سے نکلے اور بنی ظفر کے باغات میں سے کسی باغ میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں ان کے پاس کچھ مسلمان جمع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سعد بن معاذ نے اُسید بن حُضیر سے کہا: تم ایسا کرو یہ دو آدمی جو (آج کل) ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں ان کے پاس جاؤ اور انہیں جھڑک دو۔ میں خود اس لیے نہیں آ رہا ہوں کہ اسعد بن زرارہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں اکیلا ہی اس سے نمٹ لیتا۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں اپنی قوم بنی اشہل کے سردار تھے اور اس وقت تک مشرک تھے۔ سعد بن معاذ کے کہنے پر اسید بن حضیر نے اپنا نیزہ لیا اور حضرت مصعب اور اسعد بن زرارہ کی طرف چل پڑے۔ وہ دونوں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت اسعد نے جب اسید بن حضیر کو دیکھا تو حضرت مصعب سے کہا کہ یہ اپنی قوم کے سردار ہیں' آپ کے پاس آئے ہیں آپ انہیں مسلمان بنائیں۔ حضرت مصعب نے کہا کہ اگر وہ یہاں بیٹھیں تو میں اُن سے بات کروں۔ اسید بن حضیر وہاں آئے اور کھڑے ہو کر دونوں کو خوب برا بھلا کہا اور کہا کہ کیوں تم دونوں ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بنانے کے لیے آئے ہو؟ اگر تم دونوں کو اپنی زندگی عزیز ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔ حضرت مصعب نے (کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے) فرمایا: آپ بیٹھ کر ہماری بات تو سُنیں' اگر آپ کو پسند آئے تو قبول کر لیں اور اگر پسند نہ آئے تو اس سے اپنا دامن بچا لیں۔ اسید بن حضیر نے حضرت مصعب کی بات سُن کر کہا: آپ نے انصاف کی بات کی ہے۔ پھر وہ زمین میں نیزہ گاڑ کر دونوں کے پاس بیٹھ گئے۔ حضرت مصعب نے اُن سے اسلام کے متعلق گفتگو کی اور اُنہیں قرآن کریم پڑھ کر سُنایا۔ پھر حضرت مصعب اور حضرت اسعد دونوں نے کہا کہ خدا کی قسم! ہم نے تو ان کے (یعنی اسید بن حضیر کے) چہرہ کی چمک اور نرمی کو دیکھ کر ان سے بات کرنے سے پہلے ہی ان کے چہرہ پر اسلام کے آثار دیکھ لیے تھے۔ پھر اسید بن حضیر نے (کلامِ الٰہی کی تعریف کرتے ہوئے) کہا کہ یہ کس قدر حسین و جمیل کلام ہے۔ (مجھے بتاؤ کہ) تم لوگ جب اس دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ آپ غسل کریں' اپنے کپڑے پاک کریں' حق کی گواہی دیں پھر دو رکعت نماز ادا کریں۔ اسید بن حضیر نے وہاں سے جا کر غسل کیا' اپنے کپڑے پاک کیے' حق کی گواہی دی اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر کہا کہ میرے پیچھے ایک اور آدمی بھی ہے' اگر اس نے تم دونوں کی بات مان لی تو پھر اس کی قوم کا کوئی آدمی (اسلام قبول کرنے سے) پیچھے نہیں رہے گا۔ وہ شخص سعد بن معاذ ہے' ابھی میں اُسے آپ دونوں کے پاس بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر اسید بن حضیر نے اپنا نیزہ لیا اور سعد بن معاذ اور ان کی قوم کی طرف گئے۔ وہاں پہنچے تو سب لوگ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر کو آتے دیکھا تو کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ اسید جو چہرہ لے کر گیا تھا' اب وہ چہرہ نہیں ہے' اب وہ کوئی اور چہرہ لیے آ رہا ہے۔ جب اسید مجلس کے پاس پہنچے تو سعد بن معاذ نے پوچھا کہ تم نے کیا کارروائی کی؟ اسید بن حضیر نے کہا کہ میں نے دونوں آدمیوں سے گفتگو کی ہے لیکن خدا کی قسم! اُن دونوں میں میں نے کوئی خطرہ کی بات نہیں دیکھی۔ میں نے ان دونوں کو (ان کے مشن سے) روکا تو انہوں نے مجھے کہا کہ ہم وہی کریں گے جو آپ چاہتے ہیں۔ مزید مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ بنی حارثہ' اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کی غرض سے نکلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ بنی حارثہ کو معلوم ہے کہ اسعد بن زرارہ تمہارا خالہ زاد بھائی ہے۔ تو وہ تمہارے ساتھ معاہدہ توڑنے کی غرض سے یہ اقدام کر رہے ہیں۔ سعد بن معاذ بنی

حارثہ کے متعلق یہ باتیں سُن کر غصہ میں کھڑے ہو گئے اور اپنا نیزہ اپنے ساتھ لے کر اُسید سے کہا: خدا کی قسم! میرے نزدیک تم نے کوئی فائدہ مند کام نہیں کیا۔ یہ کہہ کر وہ اسعد اور حضرت مصعب کی طرف چل پڑے وہاں پہنچ کر اُنہیں پرسکون اور مطمئن دیکھا تو سمجھ گئے کہ اسید نے ان دونوں کی بات سُنانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں کھڑے ہو کر دونوں کو خوب برا بھلا کہا' پھر اسعد بن زرارہ سے کہا کہ اگر میرے اور تمہارے درمیان رشتہ داری نہ ہوتی تو تم میرے ہوتے ہوئے یہ جرأت نہ کرتے کہ تم ہماری ناپسندیدہ باتیں ہمارے ہی گھر میں عام کرتے۔ سعد بن معاذ کے بارے میں حضرت اسعد بن زرارہ حضرت مصعب کو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آپ کے پاس جو شخص آ رہا ہے وہ قوم کا سردار ہے' اگر اُس نے آپ کی بات مان لی تو اس کی قوم کا کوئی شخص آپ کی مخالفت نہیں کرے گا۔ اب جب حضرت مصعب نے سعد بن معاذ کی مذکورہ گفتگو سُنی تو انہوں نے سعد بن معاذ سے کہا کہ آپ بیٹھ کر ہماری بات سُنیں اگر پسند آئے تو قبول کر لیں اور نہ آئے تو اس سے اپنا دامن بچا لیں۔ سعد بن معاذ نے حضرت مصعب کی یہ بات سُن کر کہا کہ آپ نے انصاف کی بات کی ہے۔ پھر وہ زمین میں نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔ حضرت مصعب نے اُنہیں اسلام کی دعوت پیش کی اور اُنہیں قرآن کریم پڑھ کر سنایا۔ پھر حضرت مصعب اور حضرت اسعد دونوں نے کہا کہ خدا کی قسم! ہم نے تو اِن سے (یعنی سعد بن معاذ سے) بات کرنے سے پہلے ان کے چہرہ کی چمک اور نرمی کو دیکھ کر ان کے چہرہ پر اسلام کے آثار دیکھ لیے تھے۔ پھر سعد بن معاذ نے کہا کہ (مجھے بتاؤ) تم لوگ جب اسلام لاتے ہو اور دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ آپ غسل کریں' اپنے کپڑے پاک کریں' پھر حق کی گواہی دیں' اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کریں سعد بن معاذ نے غسل کیا' اپنے کپڑے پاک کیے' حق کی گواہی دی اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر وہ اپنا نیزہ لے کر اپنی قوم کی مجلس کی طرف آئے' اس وقت مجلس میں اسید بن حضیر موجود تھے۔ لوگوں نے جب سعد بن معاذ کو آتے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ سعد جو چہرہ یہاں سے لے کر گئے تھے اب وہ چہرہ نہیں ہے' اب وہ کوئی اور چہرہ لیے آ رہے ہیں۔ سعد بن معاذ لوگوں کے پاس پہنچے اور لوگوں سے پوچھا: اے بنی اشہل! تم اپنے درمیان مجھے کس حیثیت سے جانتے ہو؟ لوگوں نے کہا: آپ ہمارے سردار ہیں' ہم میں سے سب سے زیادہ اعلیٰ رائے رکھنے والے ہیں اور سب سے زیادہ بابرکت فکر رکھنے والے ہیں۔ حضرت سعد نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو جب تک تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے اس وقت تک تمہارے مردوں اور عورتوں کا مجھ سے بات کرنا حرام ہے۔ حضرت سعد کے اس جملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اشہل کے کسی گھر میں کوئی مرد اور عورت ایسی نہیں بچی جو مسلمان نہ ہوئی ہو۔ پھر حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت مصعب باغ سے واپس آ گئے اور حضرت مصعب حضرت اسعد کے گھر میں رہ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انصار کے گھروں میں کوئی گھر ایسا نہیں بچا جس میں مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوں۔ صرف امیہ بن زید' خطمہ اور وائل کے گھر میں کوئی مسلمان نہیں تھا' کیونکہ ان میں ابوقیس بن اسلت نامی شاعر موجود تھا' یہ لوگ اس کی باتیں سن کر اُس کی پیروی کرتے تھے۔ اُس نے انہیں اسلام سے روک کر رکھا' حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ ہجرت کر کے تشریف لے آئے اور غزوۂ بدر و اُحد اور خندق بھی گزر گیا۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ پھر حضرت مصعب بن عُمیر مکہ مکرمہ واپس آ گئے' اس دوران ستر انصاری مسلمان اور آپ کی مشرک قوم کے حُجاج آپ کے ہم راہ تھے۔ یہ سب مکہ مکرمہ آئے اور وہاں ایام تشریق کی درمیان رات کو عقبہ (گھاٹی) میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ (ایمان لے آنے کا) عہد کیا۔ یہ بیعتِ عقبہ ثانیہ تھی۔ حضرت کعب بن مالک جو کہ اس بیعت میں شریک تھے' وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم حج سے فارغ ہوئے اور وہ رات ہوئی جس کا ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کیا تھا تو

ہمارے ساتھ جو عبد اللہ بن عمرو بن حرام ابو جابر موجود تھا اس کو ہم نے اپنی قوم کے مشرکین سے چھپ چھپا کر یہ کہا کہ اے ابو جابر! آپ ہمارے سردار ہیں اور قوم کے عالی مرتبت لوگوں میں ایک ذی مرتبہ شخص ہیں' ہم نہیں چاہتے کہ آپ شرک کی وجہ سے کل جہنم کا ایندھن بنیں۔ یہ کہہ کر ہم نے اُسے اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اُس نے اسلام قبول کر لیا اور ہم نے اُسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مقررہ وقت کے بارے میں بتا دیا۔ چنانچہ وہ سردار بن کر ہمارے ساتھ عقبہ میں حاضر ہوا۔ ہم نے وہ رات اپنی قوم کے ساتھ اپنی قیام گاہ میں گزاری۔ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معینہ جگہ کی طرف آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کھسکتے ہوئے نکلے اور گھاٹی کے پاس ایک جگہ میں جمع ہو گئے۔ ہم ستر مرد تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ ایک نسیبہ بنت کعب امّ عمارہ از خواتین بنی نجار اور دوسری اسماء بنت عمرو بن عدی ام منیع از خواتین بنی سلمہ۔ ہم سب گھاٹی میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرنے لگے' حتیٰ کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس بن عبد المطلب بھی تھے۔ وہ اس وقت اگر چہ اپنی قوم کے مذہب پر تھے لیکن ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے بھتیجے کے معاملہ میں شریک ہو کر عہد و پیمان کریں۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو حضرت عباس بن عبد المطلب نے گفتگو کا آغاز کیا۔ انہوں نے ہمیں خزرج کی جماعت کہہ کر مخاطب کیا۔ ہم سب کو انہوں نے خزرج اس لیے کہا کہ اہل عرب انصار کے اس قبیلہ کو خزرج ہی کہتے تھے خواہ اس میں خزرج کے لوگ ہوں یا اوس کے۔ (حضرت عباس نے کہا کہ) محمد (ﷺ) کو ہمارے درمیان جو حیثیت حاصل ہے اس سے تم لوگ بہ خوبی واقف ہو' ہم نے اپنی قوم سے ان کو بچایا ہے۔ ہماری نظر میں ان کا شمار افضل ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کو اپنی قوم میں عزت اور شہر میں تحفظ حاصل ہے۔ انہوں نے تم لوگوں کے پاس آنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جس چیز کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو اس کی پاسداری کرو گے اور ان کے مخالفین سے ان کی حفاظت کرو گے تو تم ذمہ داری لے لو اور اگر یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں دشمنوں کے حوالہ کر دو گے اور وہاں لے جا کر ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو ابھی ساتھ چھوڑ دو۔ کیونکہ یہاں ان کو عزت اور تحفظ (دونوں) حاصل ہیں۔ حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عباس کی گفتگو سن کر کہا کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ہم نے سُن لیا اب یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ گفتگو فرمائیں اور ہم سے اپنے اور اپنے رب تعالیٰ کے لیے جو چاہیں عہد لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی' قرآن کریم کی تلاوت فرمائی' اللہ عزوجل کی طرف آنے کی دعوت دی اور اسلام کی رغبت دلائی' پھر فرمایا: میں تمہیں اس بات پر بیعت کرتا ہوں کہ تم لوگ ان چیزوں سے مجھے محفوظ رکھو گے جن سے تم اپنی جان' اپنی عورتوں اور اپنی اولاد کو محفوظ رکھتے ہو۔ حضرت براء بن معرور نے آپ کا دستِ مبارک تھام لیا اور کہا کہ جس ذات نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے اس کی قسم! جن چیزوں سے ہم اپنی ذات' اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو محفوظ رکھتے ہیں اُن تمام سے آپ کو محفوظ رکھیں گے۔ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ ہمیں بیعت فرما لیں' ہم جنگ جُو اور متحد قوم ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ہمیں اپنے آباء واجداد سے وراثت میں ملی ہیں۔ حضرت براء ابھی رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے کہ درمیان میں ابو الہیثم بن تیہان نے کہا: یا رسول اللہ (ﷺ)! لوگوں کے ساتھ ہمارے معاہدے ہیں' ان معاہدوں کو ہم توڑ رہے ہیں۔ اگر ہم ایسا کر لیں پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو کیا آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف واپس پلٹ آئیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ تمہارا خون میرا خون ہے اور تمہاری عزت میری عزت ہے' تم مجھ سے ہو میں تم سے ہوں' جس سے تمہاری جنگ ہو گی اس سے میری بھی جنگ ہو گی اور جس سے تم صلح کرو گے اس سے میں بھی صلح کروں گا۔ پھر آپ نے فرمایا: اپنے میں سے بارہ نقیب (ذمہ دار اور ضامن افراد) پیش کرو جو حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے حواریوں کی طرح قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں۔ لوگوں نے بارہ نقیب پیش کر دیئے' ان میں سے نو افراد خزرج

کے تھے اور تین افراد اوس کے تھے۔

عاصم بن عمرو بن قتادہ کہتے ہیں کہ جب تمام لوگ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے پر متفق ہو گئے تو عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری نے لوگوں سے کہا: اے جماعتِ خزرج! کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کس چیز پر تم اس شخص سے بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم کے ساتھ جنگ کرنے پر بیعت ہے۔ اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جب تمہارے مال پر مصیبت آئے گی اور تمہارے سردار مارے جائیں گے تو تم ان کو دشمنوں کے حوالہ کر دو گے تو ابھی سے ان کو چھوڑ دو ورنہ خدا کی قسم! دنیا اور آخرت میں رسوائی ہوگی۔ اور اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جس چیز کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو اس کو اپنے مال کی ہلاکت اور سرداران کے قتل ہونے کے باوجود پورا کرو گے تو بیعت کر لو بخدا! دنیا اور آخرت میں یہ سب سے بہترین چیز ہے۔ لوگوں نے کہا: ہم اپنے مال کی تباہی اور سرداران کے قتل ہونے کے باوجود ان سے بیعت کرتے ہیں۔ یارسول اللہ (ﷺ)! اگر ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا تو ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت۔ لوگوں نے عرض کی: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے! سرکار نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا' تمام لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی۔ سب سے پہلے حضرت براء بن معرور نے بیعت کی پھر ان کے بعد پے در پے تمام لوگوں نے بیعت کی۔ راوی کہتے ہیں کہ جب ہم سب نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کر لی تو شیطان نے عقبہ کی چوٹی پر اتنی بلند آواز سے چیخ ماری کہ اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی اونچی آواز نہیں سُنی تھی۔ (شیطان نے چیخ کر مکہ والوں سے کہا:) اے اہل حباحب! کیا تم لوگوں کو مذمم (یعنی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ) اور اس کی طرف مائل ہونے والوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ لوگ تم سے جنگ کرنے پر متفق ہو چکے ہیں[٥٦] رسول اللہ ﷺ نے یہ آواز سن کر فرمایا: یہ اللہ کا دشمن اور عقبہ کا شیطان ہے۔ اے اللہ کے دشمن! سن لے! خدا کی قسم! میں تجھ سے بھی نمٹوں گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا: تم لوگ اپنی قیام گاہوں کی طرف چلے جاؤ۔ حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ نے کہا: جس ذات نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اُس کی قسم! اگر آپ چاہیں تو کل ہم منٰی والوں کے پاس تلواریں لے کر آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا' تم لوگ اپنی قیام گاہوں کی طرف چلے جاؤ۔ ہم اپنی خواب گاہوں میں آ کر سو گئے۔ صبح کو جب ہم بیدار ہوئے تو قریش کے بڑے بڑے سردار ہمارے پاس آئے اور آ کر کہا کہ اے جماعتِ خزرج! ہمیں پتا چلا ہے کہ تم لوگ ہمارے آدمی (سیدنا محمد ﷺ) کو اپنے ہاں لے جانے کے لیے اور ہم سے جنگ پر بیعت کرنے کے لیے اُن کے پاس آئے تھے؟ (کان کھول کر سُن لو!) اگر ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہو گئی تو عرب کا کوئی قبیلہ ہمارے نزدیک تم سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہوگا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر ہماری قوم کے مشرکین کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اللہ کی قسمیں کھا کر کہا کہ ہمارا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اس کا کوئی علم ہے۔ چونکہ اُنہیں واقعۃً اس بات کا کوئی علم نہیں تھا اس لیے وہ اپنی بات میں سچے تھے۔ جبکہ ہمارا معاملہ یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ قریش کے سرداران ہمارے پاس سے کھڑے ہو گئے۔ اُن میں حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی بھی موجود تھا۔ اس نے نئے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر ہماری قوم کے مشرکین نے سردارانِ قریش سے جو بات کہی تھی اس میں میں نے اپنی شرکت ظاہر کرنے کے لیے ابو جابر سے کہا: آپ ہمارے سردار ہیں' اس کے باوجود آپ اتنا نہیں کر سکتے کہ قریش کے اس نوجوان (حارث بن ہشام مخزومی) جیسے جوتے بنوا لیں؟ میری یہ بات حارث بن ہشام نے سُن لی' اُس نے اپنے

[٥٦] شیطان نے اس جُملہ کے آغاز میں مکہ والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے اہل حباحب''۔ تفسیر خازن میں اسی طرح ہے۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ حباحب کی بجائے جَبَاجِب کا لفظ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے اہل منازل۔ (یعنی اے گھروں میں رہنے والو۔)

(البدایہ والنہایہ جز ٣ص ١٧٣)

پاؤں سے وہ جوتے اُتار کر میری طرف پھینکے اور کہا کہ بخدا! اب تم یہ جوتے پہنو گے۔ ابو جابر نے مجھ سے کہا کہ جوتے واپس کر دو تم نے اس نوجوان کو غصہ دلا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں یہ جوتے واپس نہیں کروں گا۔ کیونکہ اے ابو صالح! خدا کی قسم! اگر یہ فال سچی ہوئی تو آج تو میں نے حارث سے جوتے اُتروائے ہیں آئندہ میں اس کے کپڑے اتارلوں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر تمام انصار مدینہ شریف لوٹ گئے۔ اور چونکہ (نبی اکرم ﷺ کے ساتھ) مضبوط وعدہ کر کے آئے تھے اس لیے آتے ہی انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کر دیا۔ یہ بات جب قریش کو پتا چلی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کچھ بھائی بنا دیئے ہیں اور ایک امن کی جگہ تیار فرمادی ہے۔ لہٰذا تم لوگ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر لو اور اپنے انصاری بھائیوں کے پاس چلے جاؤ۔ سب سے پہلے حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد مخزومی نے ہجرت فرمائی پھر عامر ابن ربیعہ نے اور پھر عبد اللہ بن جحش نے ہجرت فرمائی اس کے بعد پے در پے صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اللہ عزوجل نے مدینہ والوں کو یعنی اوس اور خزرج کو اسلام پر یکجا کر دیا اور اپنے محبوب مکرم ﷺ کے ذریعہ ان کے درمیان صلح فرمادی۔ اور (زیر بحث آیت میں) یہ حکم نازل فرمایا کہ:

﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ اے گروہِ انصار! تم اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر فرمائی' یعنی تمہیں اسلام سے نوازا۔ ﴿ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً ﴾ جبکہ تم دشمن تھے' یعنی اسلام سے پہلے۔ ﴿ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ ﴾ تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی' یعنی مذہب اسلام اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ۔ ﴿ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ﴾ تو تم اس نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ یعنی اس کی رحمت اور اس کے دینِ اسلام کے ذریعہ تم آپس میں دینی بھائی بن گئے۔ اور دشمنی کے بعد دوستی کے رشتہ میں ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ﴿ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ﴾ اے اوس اور خزرج والو! تم کنویں کے کنارے کی طرح آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے' تمہارے اور آگ میں گرنے کے درمیان صرف اس بات کا فاصلہ تھا کہ تم کفر پر مرو۔ ﴿ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ﴾ تو اللہ نے تمہیں اس سے بچایا' یعنی ایمان کی وجہ سے آگ میں گرنے سے بچالیا۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تا کہ تم ہدایت پر رہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

اور تم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں' اچھی بات کا حکم دیں اور بُرائی سے منع کریں' اور (درحقیقت) یہی لوگ کامیاب ہیں O

نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے یا مخصوص افراد کی؟ اس بارے میں ـــــ اختلاف اور دلائل

اس آیت میں ﴿ وَلْتَكُنْ ﴾ کا لام' لام امر ہے۔ یعنی تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلانے والا ہو۔ آیت میں جو ﴿ مِّنْكُمْ ﴾ ہے اس کا ''مِـــنْ'' بعض مفسرین کے نزدیک تبعیض کا نہیں ہے بلکہ تبیین کا ہے (یعنی نیکی پھیلانے کا کام تمام لوگوں کو کرنا چاہیے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کا کام تمام امت کے ہر ہر فرد پر واجب کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ . (آل عمران:۱۱۰) جتنی امتیں لوگوں میں ظاہر ہوئیں تم ان سب میں بہترین امت ہو' تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اس آیت مبارکہ کے پیش نظر ہر مکلّف پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے۔ یہ کام یا تو ہاتھ سے ہو یا زبان سے ہو یا دل سے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ:

(٦٤) تم میں جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے' اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے اور یہ ایمان کا کمزور ترین حصہ ہے۔

(صحیح مسلم: ۴۹' سنن ابوداؤد: ۱۱۴۰۔۴۳۴۰' سنن ترمذی: ۲۱۷۲' سنن نسائی: ۵۰۰۸' سنن ابن ماجہ: ۱۲۷۵' سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۹۷' مسند احمد ج ۳ ص ۲۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۳۷۔ ص ۴۳۶)

اس حدیث شریف کی بنیاد پر زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم ایک ایسا گروہ بن جاؤ جو نیکی کی طرف بلانے والا' اچھی بات کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا ہو۔ جو علماء اس قول کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فرض کفایہ ہے' یعنی کوئی ایک شخص بھی اُسے ادا کرلے تو دیگر لوگوں پر یہ فرض نہیں رہے گا۔

بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ آیت مبارکہ میں ''مِـــن'' ''تبعیض'' کا ہے (یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا تمام لوگوں پر فرض نہیں ہے)۔ کیونکہ امت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے عاجز اور کمزور ہونے کی وجہ سے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس آیت میں جو ''مِن'' لایا گیا ہے وہ بہت مفید ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا علماء اور صاحبانِ اقتدار کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہوں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٥) اللہ عزوجل کی حدود کو نافذ کرنے والا اور اس کی حدود میں گر پڑنے والا' ان دونوں کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے کشتی (کی باہمی تقسیم) پر قرعہ اندازی کی' اُن میں سے کچھ کو اوپر والا حصہ ملا اور کچھ کو نچلا حصہ۔ نیچے والے جب پانی لاتے تو اوپر والوں کے پاس سے گزر ہوتا۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ کشتی کے اپنے حصہ میں (نیچے کی طرف) سوراخ کر دیں تاکہ اوپر والوں کو ہم سے تکلیف نہ ہو۔ اب اگر لوگ ان نیچے والوں کو کام کرنے دیں (اور منع نہ کریں) تو سب لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ لیں (یعنی سوراخ نہ کردیں) تو سب لوگ بچ جائیں گے۔

(صحیح بخاری: ۲۴۹۳' سنن ترمذی: ۲۱۷۳' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۹۱' مسند احمد ج ۴ ص ۲۷۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۳۸۔ ص ۴۳۶)

''خیر'' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال اور ''معروف و منکر'' کی تعریف

فرمایا: ﴿يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ (تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بُلائے) اس میں ''خیـــر'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: (۱) خیر سے وہ تمام اچھے کام مراد ہیں جن کی طرف رغبت پائی جائے۔ (۲) بعض فرماتے ہیں کہ یہاں اس سے اسلام مراد ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو اسلام کی طرف اور ہر اُس اچھے کام کی طرف بلانے والا ہو جو شرعاً اور عقلاً دونوں طرح اچھا ہو۔ (۳) بعض کا قول یہ ہے کہ خیر کی طرف

بلانے کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ جو کام کرنے کے ہیں ان کی طرف لوگوں کو راغب کیا جائے' اس کو "امر بالمعروف" کہتے ہیں۔ اور دوسری یہ ہے کہ جو کام کرنے کے نہیں ہیں اُن کے ترک کرنے کی لوگوں کو رغبت دلائی جائے' اس کو "نھی عن المنکر" کہتے ہیں۔ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جنس یعنی خیر کو ذکر فرمایا پھر حکم کو خوب واضح کرنے کے لیے خیر کی دونوں قسمیں بیان فرمائیں۔

☆ **معروف اور منکر:** ﴿معروف﴾ ہر اس کام کو کہتے ہیں جو عقل اور شریعت دونوں اعتبار سے اچھا ہو۔ اور ﴿منکر﴾ اس کام کو کہتے ہیں جو عقل اور شریعت دونوں اعتبار سے بُرا ہو۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (یہی لوگ کامیاب ہیں) اس کی تفسیر (البقرہ: ۵ میں) گزر چکی ہے۔

> وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے پاس روشن دلیلیں آنے کے باوجود انتشار اور اختلاف کا شکار ہو گئے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے ○

یہودیوں کا تفرق اور اختلاف اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا﴾ اس میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو باہم تفرّق (انتشار) اور اختلاف کا شکار ہو گئے۔ ﴿كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا﴾ سے اکثر مفسرین کے نزدیک یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ اور ﴿اخْتَلَفُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اللہ عزوجل کے دین اور اس کے امر و نہی میں اختلاف کیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "تَفَرَّقُوْا" اور "اخْتَلَفُوْا" کا ایک ہی معنیٰ ہے' تاکید پیدا کرنے کے لیے دونوں کو ذکر فرمایا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ "تَفَرَّقُوْا" کا معنیٰ ہے: یہود و نصاریٰ (باہمی) دشمنی اور خواہشات کی پیروی کی وجہ سے بٹ گئے اور "اخْتَلَفُوْا" کا معنیٰ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کے دین میں اختلاف کیا۔ نتیجہ یہ کہ ان کے کئی گروہ بن گئے جو ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے والے ہیں۔ امام ربیع فرماتے ہیں کہ "تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا" سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں (یعنی یہودی اور عیسائی آپس میں بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہو گئے)۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی طرح باہمی انتشار اور اختلاف کا شکار ہونے سے مسلمانوں کو منع فرمایا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اجتماعیت کا حکم دیا ہے اور اختلاف و انتشار سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے تباہ ہوئے کہ وہ اپنے دین کے معاملات میں باہمی لڑائی جھگڑوں کا شکار ہو گئے تھے۔

تفرّق اور اختلاف کی تفسیر میں خارجیوں کی مذمت

بعض کا قول یہ ہے کہ "تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا" سے اس امت کے بدعتی مراد ہیں۔ ابو امامہ فرماتے ہیں کہ اس سے حروری[ل] (یعنی خارجی) مراد ہیں۔ (چنانچہ اس بارے میں عبد اللہ بن شداد ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) حضرت ابو امامہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جامع مسجد دمشق کے زینہ پر حروریوں کے سَروں کے پاس کھڑے تھے' میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اچانک ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ کہنے لگے کہ یہ اہل جہنم کے کتے ہیں' یہ مؤمن تھے لیکن ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے۔ آسمان کے نیچے یہ سب سے بدترین مقتول ہیں اور جو لوگ ان کے ہاتھوں شہید ہوئے وہ آسمان کے نیچے سب سے

بدترین مقتول ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ رو کیوں رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: مجھے ان پر ترس آ رہا ہے' یہ مسلمان تھے لیکن ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے۔ حضرت ابوامامہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میری زمین میں یہ لوگ بہت پائے جاتے ہیں۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ لوگ مسلمان تھے اور ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ پھر آپ نے زیر بحث آیت اور اس کے بعد والی آیت تلاوت فرمائی۔ امام ترمذی نے یہ واقعہ ابوغالب سے روایت کیا ہے۔ ابوغالب بیان کرتے ہیں کہ:

(٦٦) حضرت ابوامامہ نے کچھ سر دیکھے جو جامع مسجد دمشق کے زینہ پر نصب کیے ہوئے تھے[٥٨] انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ جہنم والوں کے کتے ہیں' آسمان کے نیچے سب سے بدترین مقتول ہیں اور جو لوگ ان کے ہاتھوں شہید ہوئے وہ آسمان کے نیچے سب سے بہترین مقتول ہیں۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: ''یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ''۔ (آل عمران:١٠٦) یعنی ''جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے' سو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا تھا؟ سو اب تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزا چکھو''۔ میں نے ابوامامہ کی پوری بات سن کر پوچھا: کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے؟ انہوں نے کہا: اگر میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ایک یا دو یا تین یا چار یا پانچ یا چھ یا سات مرتبہ نہ سنی ہوتی تو میں تمہیں یہ بیان نہ کرتا۔

(سنن ترمذی:٣٠٠٠' سنن ابن ماجہ:١٧٦' سنن بیہقی: ج٨ص١٨٨' مسند احمد ج٥ص٢٥٠۔٢٦٩' مشکوٰۃ المصابیح:٣٥٥٤۔ص٣٠٩)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

آیت میں ''بیّنات'' کی تفسیر اور ''جاء ھم'' فرمانے کی توجیہ اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق کی اہمیت

فرمایا: ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ﴾ اس میں ''بیّنات'' سے واضح دلائل مراد ہیں۔ یعنی تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کے پاس واضح دلائل آئے' انہوں نے ان دلائل کو جانا پھر بھی ان کے خلاف عمل کیا اور آپس میں انتشار اور اختلاف کا شکار ہو گئے۔ یہاں ''جاء ھم'' فرمایا' ''جاء تھم'' نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل جب مقدم ہوتا ہے تو ہمیشہ واحد ہوتا ہے' تثنیہ اور جمع کی علامت سے خالی ہوتا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بھی جائز رکھا گیا ہے کہ فعل جب مقدم ہو تو اُس سے علامت تانیث کو حذف کر دیا جائے۔ اس لیے آیت میں ''جاء ھم'' فرمایا۔

﴿وَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ یعنی جو لوگ آپس میں بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہو گئے اُن کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ اختتام پر اس جملہ کو ارشاد فرمانے میں اہل ایمان کو انتشار اور اختلاف سے روکنا مقصود ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٧) جس شخص نے ایک بالشت کی مقدار بھی لوگوں کی جماعت کو چھوڑا اُس نے ''ربقة الاسلام'' (اسلام کا پٹا) اپنی گردن سے اتار دیا۔ (سنن ابوداؤد:٤٧٥٨' مسند احمد ج٥ص١٨٠' مشکوٰۃ المصابیح:١٨٥۔ص٣١)

---

[٥٧] خارجیوں کو حروری ''حروراء'' نامی علاقہ کی نسبت سے کہا جاتا ہے۔ یہ کوفہ کے قریب ایک علاقہ ہے فرقہ خارجیہ یعنی وہ لوگ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بغاوت کی وہ سب سے پہلے اس علاقہ میں جمع ہوئے' اس لیے ان لوگوں کو حروری کہا جاتا ہے۔

[٥٨] یہ سر خارجیوں کے تھے۔ غالباً ان کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جماعت کے افراد نے جہنم رسید کیا تھا۔ آگے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو فرمایا کہ یہ جہنم والوں کے کتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخ میں کتوں کی شکل میں جائیں گے۔ یا مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخیوں کے نزدیک بھی کتوں کی طرح ذلیل وخوار ہوں گے۔ پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ (مراٰۃ المناجیح ج٥ص٣١٢)

☆ اس حدیث شریف میں جو ''ربقة الاسلام'' کا لفظ ہے اس سے اسلام کا بندھن مراد ہے۔ ''ربق'' اصل میں اُس رسّی کو کہتے ہیں جس میں کئی گٹھانیں ہوتی ہیں اور اس سے جانور کو باندھا جاتا ہے۔ ایک گٹھان کو ''ربقة'' کہتے ہیں۔

امام بغوی نے اپنے سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۶۸) جو شخص ''بُحبُوحةُ الجنّة'' (یعنی جنت کے درمیان) میں رہنا چاہتا ہو اس پر جماعت کے ساتھ رہنا لازم ہے کیونکہ شیطان اکیلے شخص کے ساتھ ہوتا ہے اور دو افراد سے دور رہتا ہے۔

(معالم التنزیل للبغوی' زیر بحث آیت' سنن ترمذی: ۲۱۶۵' مسند احمد ج ۱ ص ۱۸' سنن بیہقی ج ۷ ص ۹۱' المستدرک ج ۱ ص ۱۱۴)

☆ اس حدیث میں جو ''بحبوحة الجنه'' کا لفظ ہے اس کا معنیٰ ہے: جنت کا درمیان۔ (اس سے جنت کا افضل ترین حصہ مراد ہے۔) ایک لفظ ''فذّ'' ہے' اس کا معنیٰ ''اکیلا'' ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے' پس جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا:) تم ہی ہو نا کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے! (اب) اپنے کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو O اور جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (کے سائے) میں ہوں گے' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے O

قیامت کے دن کن لوگوں کے چہرے روشن اور کن کے چہرے سیاہ ہوں گے؟ اور چہروں کے روشن اور سیاہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ یہاں ''اذکروا'' محذوف ہے' یعنی اُس دن کو یاد کرو جس میں کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔ مراد یہ ہے کہ اہل ایمان کے چہرے روشن ہوں گے اور کافروں کے چہرے کالے ہوں گے۔ بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ اہل سنت کے چہرے روشن ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ مخلص لوگوں کے چہرے روشن ہوں گے اور منافقوں کے چہرے کالے ہوں گے۔

چہروں کے روشن اور سیاہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ روشن ہونے سے خوشی اور مسرت مراد ہے اور سیاہ ہونے سے غم اور پریشانی مراد ہے۔ عربی میں اس طرح مجازاً جملے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً جو شخص اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اس کے لیے عربی میں کہا جاتا ہے: ''اِبْيَضَّ وَجْهُهٗ'' یعنی اس کا چہرہ خوشی اور مسرت سے روشن ہو گیا ہے اور جو کسی مصیبت کا شکار ہو جائے اس کے لیے کہا جاتا ہے: ''اِسْوَدَّ وَجْهُهٗ وَاَرْبَدَّ لَوْنُهٗ'' یعنی غم اور پریشانی کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہے۔ اس معنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا'' ۔ (النحل: ۵۸) یعنی ''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا منہ دن بھر سیاہ رہتا ہے'' مراد یہ ہے کہ وہ پریشان رہتا ہے۔

اسی طرح آیت مبارکہ میں چہروں کے سفید ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُس دن کچھ چہرے عمل کی وجہ سے روشن اور خوش و

خرم ہوں گے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان شخص نے جو جو نیک اعمال کیے ہیں قیامت کے دن جب وہ اُن اعمال کے پاس آئے گا تو اُن پر ملنے والے خداوندی اجر وثواب اور انعام واکرام کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔ اسی حالت میں اس کے چہرے کی رنگت میں سفیدی' روشنی اور چمک دمک ڈال دی جائے گی' اس کا نامۂ اعمال سفید اور روشن ہو جائے گا' جبکہ ایک روشنی اس کے آگے اور دائیں بائیں چل رہی ہوگی۔ اس کے برعکس کافر اور ظالم نے دنیا میں جو جو برائیاں کی ہیں قیامت کے دن جب وہ اُن برائیوں کے پاس آئے گا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا علم ہونے کی وجہ سے وہ پریشان اور غم گین ہو جائے گا۔ اسی حالت میں اس کے چہرے کی رنگت میں سیاہی اور تغیر پیدا کر دیا جائے گا' اس کا نامۂ اعمال سیاہ اور تاریک ہو جائے گا اور ہر طرف سے اُسے تاریکی نے گھیر رکھا ہوگا۔ ''**نعوذ بفضل الله وسعة رحمته من الظلمات يوم القيامة**'' (ہم قیامت کی تاریکیوں سے اللہ عزوجل کے فضل وکرم اور اس کی وسیع رحمت میں پناہ کے طلب گار ہیں)۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ چہروں کے روشن اور سیاہ ہونے سے حقیقی طور پر سفید اور سیاہ ہونا مراد ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کا چہرہ سفید ہوگا اور انہیں نور کا لباس پہنایا جائے گا' جبکہ کافروں کا چہرہ سیاہ ہوگا اور اُنہیں ظلمت کا لباس پہنایا جائے گا۔ یہ معنیٰ اس لیے مراد لیا گیا ہے کہ سفید اور سیاہ ہونے کا حقیقی معنیٰ یہی ہے۔

قیامت میں چہروں کے سفید اور سیاہ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ اہل محشر جب صاحبِ ایمان کے چہرے پر سفیدی اور روشنی دیکھیں گے تو پہچان لیں گے کہ یہ اہل سعادت اور خوش بخت لوگوں میں سے ہے اور جب کافر کے چہرے پر سیاہی دیکھیں گے تو پہچان لیں گے کہ یہ اہل شقاوت اور بد بخت لوگوں میں سے ہے۔

''أكفرتم بعد ايمانكم'' پر اشکال کا جواب

فرمایا: ﴿ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ﴾ (جن کے چہرے سیاہ ہوں گے' اُن سے کہا جائے گا: کیا تم ہی ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے تھے۔)

یہاں ''**اکفرتم**'' سے پہلے ''**یقال لھم**'' کا جملہ مقدر ہے' یعنی جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا تھا؟ ''**أکفرتم**'' میں جو ہمزہ ہے وہ توبیخ اور تقریع (یعنی سرزنش) کے لیے ہے۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ مذکورہ جملہ جن لوگوں سے کہا جائے گا وہ تو وہ ہوں گے جو دنیا میں مسلمان ہی نہیں تھے۔ پھر اُن سے کیسے کہا جائے گا: ''**أکفرتم بعد ایمانکم**'' (کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے؟) اور جو ایمان لا کر کافر ہو گئے تھے اُن سے کون لوگ مراد ہیں؟

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ علماء کے اقوال اس بارے میں مختلف ہیں۔ (۱) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یہ ہے کہ اس سے وہ ایمان مراد ہے جو میثاق والے دن تمام لوگوں نے قبول کیا تھا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا تھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: کیوں نہیں! یوں اس وقت تمام ہی لوگ ایمان لے آئے تھے' پھر دنیا میں آنے کے بعد جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ درحقیقت ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے۔ (۲) حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یہ ہے کہ ایمان لا کر کافر ہونے والوں سے مراد منافقین ہیں۔ کیونکہ منافقین زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے لیکن دل میں اس سے انکار کرتے تھے۔ (۳) حضرت عکرمہ کا قول یہ ہے کہ اس سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔ کیونکہ وہ سیدنا محمد عربی ﷺ پر ان کی تشریف آوری سے پہلے ایمان لے آئے جب نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو آپ کے منکر ہو گئے۔ (۴) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کے مرتدین مراد ہیں۔

ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کی تفسیر میں اہل بدعت' مرتدین اور خارجیوں کی مذمت میں احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٦٩) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں' تم میں سے کچھ لوگ میرے سامنے کیے جائیں گے حتیٰ کہ میں انہیں تھامنے کے لیے آگے بڑھوں گے لیکن اُنہیں میرے پاس سے دور کر دیا جائے گا۔ میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ میرے صحابہ ہیں۔ کہا جائے گا کہ آپ (ازخود) نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعتیں نکالی تھیں [٥٩]

(صحیح بخاری: ٦٥٨٣۔ ٧٠٥٠' صحیح مسلم: ٢٢٩٣' سنن ابن ماجہ: ٤٣٠٦' مسند احمد ج ٦ ص ١٢١' مشکوۃ المصابیح: ٥٥٧١۔ ص ٤٨٧)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٧٠) میرے صحابہ میں سے چند آدمی میرے پاس حوض پر آئیں گے' حتیٰ کہ جب وہ میرے سامنے آئیں گے تو ان کو میرے پاس سے ہٹا دیا جائے گا' میں عرض کروں گا: اے میرے رب! یہ میرے اصحاب ہیں' یہ میرے اصحاب ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ (ازخود) نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا بدعتیں نکالی تھیں۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ میں کہوں گا: جن لوگوں نے میرے بعد (دین میں) تبدیلی کی ان سے دوری ہو۔

(صحیح بخاری: ٦٥٨٢' صحیح مسلم: ٢٣٠٤' مسند احمد ج ٣ ص ٢٨١)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٧١) قیامت کے دن میرے صحابہ کا ایک گروہ میرے پاس آئے گا۔ (راوی کو شک ہے کہ میرے صحابہ کا ایک گروہ فرمایا یا میری اُمت کا ایک گروہ فرمایا) اُنہیں (میرے) حوض سے دور کر دیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا: اے میرے رب! یہ میرے اصحاب ہیں۔ وہ فرمائے گا کہ آپ کے بعد انہوں نے جو بدعتیں نکالی تھیں اُن کا آپ کو علم نہیں ہے' یہ لوگ آپ کے بعد اُلٹے قدم پھر گئے تھے [٦٠] (صحیح بخاری: ٦٥٨٥)

---

[٥٩] اس حدیث شریف سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ علم نہیں تھا کہ صحابہ میں سے کون اسلام پر قائم رہا اور کون بعد میں مرتد ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں علم کی نفی نہیں ہے بلکہ دِرایت کی نفی ہے۔ درایت کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو اپنی عقل سے جاننا۔ مراد یہ ہے کہ آپ کو ان کے بارے میں ذاتی اور اپنی عقل سے معلومات نہیں ہے۔ ہاں وحی ربانی سے جس طرح آپ کو علم ما کان وما یکون تھا اسی طرح اِن کے بارے میں بھی اللہ عزوجل کی عطا اور اُس کی وحی سے علم حاصل ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ اس حدیث شریف کی بعض روایات کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے میرے بعد (دین میں) تبدیلی کی اُن سے دوری ہو۔ اس صورت میں نبی اکرم ﷺ کا مذکورہ افراد کو اپنا صحابی کہنا ان میں زیادہ حسرت اور تکلیف پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ جب آپ ان کو اپنا صحابی کہیں گے تو ان کو نجات کی اُمید ہو گی اور جب آپ یہ فرمائیں گے کہ ان سے دُوری ہو تو ان کی اُمید ٹوٹ جائے گی اور اُمید بندھ کر ٹوٹ جانا زیادہ حسرت اور عذاب کا باعث ہے۔ غزالیٔ زماں علامہ سیّد احمد سعید کاظمی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے نبی اکرم ﷺ کے علم کی نفی پر استدلال یہ عجیب قسم کا شبہ ہے۔ جو حدیث مثبتِ علم ہو اس کو نفی میں پیش کیا جا رہا ہے' غور فرمایئے! یہ واقعہ قیامت کے دن ہو گا لیکن حضور ﷺ اس کو پہلے بیان فرما رہے ہیں' علم نہ تھا تو بیان کیسے فرمایا۔ (جوابات کی مزید تفصیل و تحقیق کے لیے دیکھئے: شرح صحیح مسلم ج ٦ ص ٧٤٦)

[٦٠] علامہ خازن نے اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا ہے۔ لیکن صحیح مسلم میں مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ البتہ اس مفہوم کی روایاتِ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہیں اس لیے ہو سکتا ہے علامہ نے اس اعتبار سے اس کو متفق علیہ قرار دیا ہو۔

حضرت زید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر میں تھے' جب لشکر خارجیوں کی طرف چلا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

(٧٢) اے لوگو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ میری اُمت میں کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن کریم پڑھیں گے۔ تمہاری تلاوتِ قرآن اُن کی تلاوت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوگی' (اسی طرح) تمہاری نماز ان کی نماز کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوگی اور تمہارے روزے بھی ان کے روزوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوں گے۔ وہ قرآن کریم یہ سمجھ کر پڑھیں گے کہ قرآن ان کے حق میں ہے' حالانکہ قرآن ان کے خلاف ہوگا۔ ان کی نماز ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گی' وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے شکار سے۔ (صحیح مسلم: ١٠٦٦' سنن ابوداؤد: ٤٧٦٨)

حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٧٣) رسول اللہ ﷺ سے میں نے سُنا کہ وہ لوگ قرآن مجید پڑھیں گے (لیکن) ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا' وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر اپنے شکار سے۔ جہاں کہیں بھی تمہیں یہ لوگ ملیں تم اُنہیں قتل کر دو کیونکہ ان کو قتل کرنے میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس قاتل کے لیے اجر وثواب ہے۔

(صحیح بخاری: ٣٦١١ _ ٦٩٣٠' صحیح مسلم: ١٠٦٦' سنن ابوداؤد: ٤٧٦٧' مسند احمد ج ١ص ١٣١' مشکوٰۃ المصابیح: ٣٥٣٥ _ ص ٣٠٧)

حضرت بشیر بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت سہل بن حنیف سے پوچھا کہ:

(٧٤) کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے خارجیوں کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عراق کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہاں سے ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو قرآن کریم پڑھیں گے (لیکن) وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا' وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر (اپنے) شکار سے۔

(صحیح بخاری: ٦٩٣٤' صحیح مسلم: ١٠٦٨)

☆ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے اس امت کے اہل بدعت مراد ہیں' جیسے قدریہ اور ان جیسے دیگر لوگ۔ جو علماء اس قول کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ﴿ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ ﴾ (کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے) اس سے مراد یہ ہے کہ کیا تم جماعت سے نکل گئے تھے اور عقیدہ میں اُن سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(٧٥) اُن فتنوں کے پیدا ہونے سے پہلے اعمال کر لو جو تاریک رات کے مختلف حصوں کی طرح چھا جائیں گے۔ آدمی صبح کو مؤمن ہوگا اور شام کو کافر ہو جائے گا (اسی طرح) شام کو مؤمن ہوگا اور صبح کو کافر ہو جائے گا[٦١] اور (حالت یہ ہوگی کہ) دنیا کے معمولی فائدہ کو حاصل کرنے کے لیے اپنی متاعِ دین کو فروخت کر ڈالے گا۔

(صحیح مسلم: ١١٨' سنن ترمذی: ٢١٩٥' سنن ابوداؤد: ٤٢٥٩' سنن ابن ماجہ: ٣٩٥٤' سنن دارمی: ٣٣٨' مسند احمد ج ٢ص ٣٠٤' مشکوٰۃ: ٥٣٨٣ _ ص ٤٦٢)

حارث اعور بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے تو جنت میں لے جانے والا کوئی عمل کر کے واپس لوٹتا ہے اور کوئی آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے تو جہنم میں لے جانے والا کوئی عمل کر کے واپس لوٹتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ''یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ. الایۃ''

[٦١] سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی میں یہ اضافہ بھی ہے کہ (اس ماحول میں وہی لوگ محفوظ ہوں گے) جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی زندگی عطا فرمائی ہوگی۔ اس سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی۔

(اُس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ' جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کو اختیار کر لیا تھا' سو اب اپنے کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو)۔ پھر آپ نے فرمایا: ربِ کعبہ کی قسم! یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کو اختیار کیا۔

روشن چہرے والوں کا قیامت کے دن اللہ عزوجل کی رحمت میں ہونا

اگلی آیت: ۱۰۷ میں فرمایا: ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (جن کے چہرے روشن اور سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔) روشن چہرے والوں سے مراد وہ اہل ایمان ہیں' جو اللہ عزوجل کی فرمانبرداری کرتے ہوں۔ اور ''رحمت'' سے مراد جنت ہے (یعنی فرمانبردار مسلمان جنت میں ہوں گے)۔ جنت چونکہ رحمت کی جگہ ہے اس لیے یہاں اُسے ''رحمت'' کا نام دیا گیا۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ آدمی نیک اعمال کرنے کے باوجود جنت میں صرف اللہ عزوجل کی رحمت سے داخل ہوگا۔

﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہاں ''فی'' کو دوبارہ لایا گیا' اس کی وجہ بعض علماء کے نزدیک یہ ہے کہ گزشتہ جملہ میں اور اس جملہ میں ''فی'' کا معنیٰ علیحدہ علیحدہ ہے۔ یعنی یہ کہ روشن چہرے والے اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اللہ کی رحمت میں ہمیشہ رہیں گے۔

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم آپ پر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا O اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جائیں گے O

آیت مذکورہ میں فرمایا کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جن کو ہم آپ پر حق کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں۔ اس میں ﴿اٰیٰتُ اللّٰهِ﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے گزشتہ آیات مراد ہیں۔ ﴿بِالْحَقِّ﴾ جو فرمایا اس سے معنیٰ کا حق ہونا مراد ہے کیونکہ الفاظِ قرآن کا حق ہونا تو ظاہر ہے۔ ﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (اللہ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا۔) اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جرم اور استحقاقِ سزا کے بغیر سزا نہیں دیتا۔

آیت مذکورہ میں ظلم کے ذکر کی توجیہ اور اللہ تعالیٰ کے ارادۂ ظلم نہ فرمانے کی وجوہ

رہی یہ بات کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ظلم کا ذکر کیوں فرمایا (اور یہاں اس کی کیا مناسبت ہے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت: ۱۰۶ میں سزا کا تذکرہ آیا تھا کہ ''جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا: تم ہی ہو نا کہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے' اب اپنے کفر کے بدلہ میں عذاب چکھو''۔ اس کے بعد زیرِ بحث آیت میں یہ فرما کر ''اللہ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا'' یہ بتادیا کہ سیاہ چہرے والے جس عذاب میں گرفتار ہوں گے وہ ان کے اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ بھی بتادیا کہ اللہ اپنی مخلوق میں کسی پر ظلم نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ جہان والوں پر ظلم کا ارادہ کیوں نہیں فرماتا' اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ ظالم یا تو اس لیے ظلم کرتا ہے تاکہ اس کے مال و دولت یا عزت و وقعت یا غلبہ اور سلطنت میں اضافہ ہو جائے یا اُس کے پاس کسی چیز میں جو کمی ہے وہ پوری ہو جائے۔ جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اِن تمام چیزوں سے بے نیاز ہے اور وہ ہر چیز میں صفت کمال کا مالک

ہے۔اس لیے اگلی آیت :١٠٩ میں ﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ فرما کر یہ بتایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اُسی کی ملکیت ہے۔ اور آسمان وزمین والے (سب کے سب) اس کے بندے ہیں۔ اس لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حق میں یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں کسی فرد پر ظلم کرے' کیونکہ سب اس کے بندے ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ (اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جائیں گے) یعنی تمام لوگ خواہ مسلمان ہوں یا کافر' فرمانبردار ہوں یا نافرمان سب اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ پھر وہ سب کو اُن کے استحقاق کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا اور کسی پر ظلم نہیں فرمائے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾

جو امتیں لوگوں میں ظاہر ہوئیں تم اُن سب میں بہترین ہو' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو' اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ اُن کے حق میں بہتر ہوتا' اُن میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ تر کافر ہیں O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس میں ''کنتم'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ مالک بن صیف یہودی اور وہب بن یہود یہودی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت ابی بن کعب' حضرت معاذ بن جبل اور حضرت حذیفہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سلام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے کہا کہ ہم تم لوگوں سے افضل ہیں اور جس دین کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس سے ہمارا دین بہتر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور مسلمانوں کو بہترین قرار دیا۔

یہاں جو ﴿ كُنْتُمْ ﴾ کا لفظ ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کس معنیٰ میں ہے؟ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ حدوث اور وقوع کے معنیٰ میں ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ تم لوگ بہترین امت کے طور پر وجود میں آئے ہو اور بہترین امت بن کر پیدا ہوئے ہو۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہاں ''کنتم'' ناقصہ ہے۔ اور کان ناقصہ صرف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فلاں چیز گذشتہ زمانہ میں پائی گئی۔ وہ چیز منقطع ہوئی یا نہیں اس پر کان ناقصہ دلالت نہیں کرتا[٦٢] کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وكان الله غفورا رحيما''۔ اس قول کی صورت میں ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم اللہ عزوجل کے علم میں ہی بہترین امت تھے۔ بعض نے معنیٰ یہ کیا ہے کہ گذشتہ امتوں میں تمہارا تذکرہ کیا جاتا تھا کہ تم بہترین امت ہو۔ بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ لوح محفوظ میں تمہاری یہ صفت لکھی ہوئی تھی کہ تم بہترین امت ہو۔ بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ جب سے تم ایمان لائے ہو اس وقت سے تم بہترین امت ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''خَيْرَ اُمَّةٍ'' کا تعلق ''وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ''

[٦٢] یہ دفع دخل مقدر ہے۔ یعنی ایک اعتراض کا جواب ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ ''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ'' میں کنتم جو کہ فعل ناقص ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی امت پہلے بہترین تھی' اب بہترین نہیں ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ کان ناقصہ صرف گذشتہ زمانہ میں کسی چیز کے وقوع کو ثابت کرتا ہے۔ وہ چیز بعد میں بھی ثابت رہی یا نہ رہی اس پر اس کی دلالت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ'' میں ''کنتم'' سے امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا التحیہ) کے صرف ماضی میں بہترین ہونے اور اب بہترین نہ ہونے کو ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

سے ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے کہ دخولِ جنت کے وقت روشن چہرے والوں سے کہا جائے گا کہ تم دنیا میں بہترین امت تھے اس لیے تم چہرے کی روشنی اور "نعیم مقیم" (دائمی نعمت) کے حق دار ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" میں "کنتم" "أنتم" کے معنیٰ میں ہے (یعنی تم بہترین امت ہو)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ "کنتم" "صِرْتُم" کے معنیٰ میں بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" کا معنیٰ یہ ہوگا کہ تم بہترین امت ہوگئے۔

آیت مذکورہ میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال اور امام ضحاک کے قول پر دلائل

اس آیت میں خطاب کس سے ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے کہ "کنتم خیر امة" (تم بہترین امت ہو) یہ اُن لوگوں سے فرمایا گیا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت فرمائی۔ (۲) امام ابن جریر نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس آیت مبارکہ میں "کنتم" کی بجائے "أنتم" فرماتا؛ جس کی وجہ سے ہم سب اس میں داخل ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نبی اکرم ﷺ کے کچھ مخصوص صحابہ کے بارے میں فرمایا ہے۔ اور وہ لوگ جو اُن صحابہ کی طرح عمل کریں وہ بھی بہترین امت میں شامل ہیں۔ (۳) امام ضحاک کا قول یہ ہے کہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ امام ضحاک کی مراد وہ صحابہ کرام ہیں جن کا شمار راویوں اور مبلغوں میں ہوتا ہے جن کی پیروی کرنے کا اللہ عزوجل نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۷۵) تمام لوگوں میں سب سے بہترین میرا زمانہ ہے' پھر وہ لوگ (سب سے بہترین ہیں) جو اُن کے بعد آئیں گے اور پھر اُن کے بعد والے (سب سے بہترین ہیں)۔ حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے زمانہ کے بعد مزید دو زمانوں کا تذکرہ فرمایا یا تین زمانوں کا۔ (آگے فرمایا:) پھر اُن کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گواہی دیا کریں گے حالانکہ ان سے گواہی طلب نہیں کی جائے گی۔ بددیانتی کریں گے اور اُن پر بھروسا نہیں کیا جائے گا' وہ نذر (منّت) مانیں گے لیکن اُسے پورا نہیں کریں گے اور وہ (ہر چیز میں) کثرت اور وسعت کی خواہش کرنے لگیں گے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ قسمیں اٹھائیں گے حالانکہ ان سے قسم کا مطالبہ نہیں کیا ہوگا۔

(صحیح بخاری:۲۶۵۱_۶۴۲۸' صحیح مسلم:۲۵۳۵' سنن بیہقی ج ۱۰ص ۱۲۳' مسند احمد ج ۴ص ۴۴۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۷۶) تمام لوگوں میں سب سے بہترین میرا زمانہ ہے۔ پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد آئیں گے اور پھر اُن کے بعد والے۔ پھر ایسے لوگ آئیں گے جن کی گواہی اُن کی قسم پر اور قسم اُن کی گواہی پر سبقت لے جائے گی[۶۳] (صحیح بخاری:۲۶۵۱_۲۶۶۲' صحیح مسلم:۲۵۳۳' سنن ترمذی:۲۲۲۲' سنن ابن ماجہ:۲۳۶۲' سنن بیہقی ج ۱۰ص ۱۶۰' مسند احمد ج ۱ص ۴۴۲' مشکوٰۃ المصابیح:۳۷۶۷_ص ۳۲۷)

☆ اس حدیث شریف میں فرمایا: "خیر الناس قرنی" (تمام لوگوں میں سب سے بہترین میرا زمانہ ہے) یعنی میرے

---

۶۳ یعنی وہ گواہی دینے اور قسمیں اٹھانے کے بہت شوقین ہوں گے۔ اُن کے اس شوق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی تو وہ گواہی دینے سے پہلے قسم اٹھالیں گے اور کبھی قسم اٹھانے سے پہلے گواہی دے دیں گے۔ اُن میں گواہ بننے اور قسم اٹھانے کی حرص اتنی زیادہ ہوگی کہ اُنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ پہلے کیا کرنا چاہیے۔ حد درجہ دین سے لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے وہ گواہی اور قسم میں بہت تیزی سے سبقت کریں گے۔ (عمدۃ القاری ج ۹ص ۵۰۱)

صحابہ۔ "قرن" ہر زمانہ والوں کو کہتے ہیں۔ یہ "اقتران" سے مأخوذ ہے (بمعنیٰ ملنا) گویا "قرن" وہ زمانہ ہے جس میں اُس زمانہ والے اپنی عمر اور اپنے معاملات میں (ایک دوسرے سے) ملے ہوئے ہوں۔ بعض علماء کے نزدیک "قــرن" چالیس سال کے عرصہ کو کہتے ہیں، بعض کے نزدیک ٨٠ سال کے عرصہ کو اور بعض کے نزدیک ١٠٠ کے عرصہ کو کہتے ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(٧٧) میرے صحابہ کے بارے میں بُرا مت کہو۔ اگر کوئی شخص اُحد پہاڑ برابر سونا بھی خرچ کرے تو وہ اُن کے ایک مُد اور آدھے مُد کے برابر نہیں ہے[٦٤]

(صحیح بخاری: ٣٦٧٣، صحیح مسلم: ٢٥٤١، سنن ابوداؤد: ٤٦٥٨، سنن ترمذی: ٣٨٦١، مسند احمد ج ٣ ص ١١، مشکوٰۃ المصابیح: ٦٠٠٧۔ ص ٥٥٣)

(٤) حضرت عطاء کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" (تم بہترین امت ہو) اس سے نبی اکرم ﷺ کی پوری امت مراد ہے۔ (٥) امام زجاج کا قول یہ ہے کہ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" میں خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے ہے لیکن یہ فرمان پوری امت کو شامل ہے۔ جیسے "کتب علیکم الصیام" (تم پر روزے فرض کیے گئے) اور "کتب علیکم القصاص" (تم پر قصاص فرض کیا گیا) ان آیات میں اگرچہ لفظی اعتبار سے خطاب حاضرین سے ہے لیکن ان کا حکم سب کو شامل ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث آیت میں بھی پوری امتِ مسلمہ شامل ہے۔

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں امتِ محمدیہ کے فضائل

حضرت بہز بن حکیم اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے "کنتم خیر امۃ" کی تفسیر میں نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(٧٨) تم ستر امتوں کو پورا کرو گے، تم تمام امتوں میں اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے بہترین اور سب سے زیادہ معزز ہو[٦٥] (سنن ترمذی: ٣٠٠١، سنن ابن ماجہ: ٤٢٨٧، مشکوٰۃ المصابیح: ٦٢٩٤۔ ص ٥٨٤)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

"امت" کا اصل معنیٰ ہے: ایسی جماعت جو کسی بات پر متفق ہو جائے۔ "امت محمد ﷺ" سے مراد ایسی جماعت ہے جو اللہ عزوجل اور سیدنا محمد عربی ﷺ پر ایمان لے آئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٧٩) انکار کرنے والے شخص کے سوا میرا ہر امتی جنت میں جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا: انکار کرنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جس نے میری فرمانبرداری کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے نافرمانی کی اُس نے انکار کیا[٦٦]

(صحیح بخاری: ٧٢٨٠، مشکوٰۃ المصابیح: ١٤٣۔ ص ٢٧)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[٦٤] چار مُد کا ایک صاع ہوتا ہے اور ایک صاع ساڑھے چار سیر کا۔ تو ایک مُد ایک سیر آدھ پاؤ کا ہوا۔ حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ میرا صحابی سوا سیر جو خیرات کرے اور ان کے علاوہ کوئی مسلمان (خواہ غوث و قطب ہو یا عام مسلمان) پہاڑ بھر سونا خیرات کرے تو اس کا سونا قربِ الٰہی اور قبولیت میں صحابی کے سوا سیر جَو کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہی حال روزہ، نماز اور تمام عبادات کا ہے۔ (مراۃ ج ٨ ص ٣٠١)

[٦٥] یہ حدیث شریف البقرہ: ١٤٣ کی تفسیر میں رقم: ١٣٧ کے تحت گزر چکی ہے۔ حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[٦٦] یہ حدیث شریف آل عمران: ٣٢ کی تفسیر میں رقم: ١١ کے تحت گزر چکی ہے۔ مزید حوالہ جات اور حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(٨٠) بلاشبہ اللہ تعالیٰ میری امت کو (یا فرمایا) امت محمد (ﷺ) کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا' اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوا وہ آگ میں اکیلا ہوا۔

(سنن ترمذی: ٢١٦٧' المستدرک ج ١ ص ١١٥' کنز العمال: ٦١-٣٣٣٣' مشکوٰۃ المصابیح: ٣-١٧٣ ص ٣٠)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨١) بلاشبہ میری امت وہ امت ہے جس پر رحمتوں کا نزول ہوا ہے۔ آخرت میں اس کے لیے عذاب نہیں ہے[٦٧] (البتہ) دنیا میں اس کا عذاب فتنے' زلزلے اور قتل ہے۔ (سنن ابوداؤد: ٤٢٧٨' المستدرک ج ٤ ص ٢٥٤' مسند احمد ج ٤ ص ٤١٠-٤١١-٤١٨' کنز العمال: ٣٤٥٣١)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨٢) میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے۔ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا آخری حصہ بہترین ہوتا ہے یا پہلا حصہ[٦٨]

(سنن ترمذی: ٢٨٦٩' مسند احمد ج ٣ ص ١٣٠' مشکوٰۃ المصابیح: ٦٢٨٦-ص ٥٨٣)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨٣) اہل جنت کل ١٢٠ صفوں میں ہوں گے۔ اُن میں سے ٨٠ صفیں میری امت کی ہوں گی اور ٤٠ صفیں دیگر امتوں کی ہوں گی۔ (سنن ترمذی: ٢٥٤٦' سنن ابن ماجہ: ٤٢٨٩' سنن دارمی: ٢٨٣٥' مسند احمد ج ٥ ص ٣٥٥' مشکوٰۃ المصابیح: ٥٦٤٤-ص ٤٩٨)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨٤) میری امت کا وہ دروازہ جس سے وہ جنت میں داخل ہوگی اس کی چوڑائی تیز رفتار سوار کی تین (سال) کی مسافت کے برابر ہے۔ (اس کے باوجود) اہلِ جنت اس دروازے پر تنگ ہوں گے حتیٰ کہ ان کے کندھے آپس میں ملنے کے قریب ہو جائیں گے۔ (سنن ترمذی: ٢٥٤٨' کنز العمال: ٣٩٣١١' مشکوٰۃ: ٥٦٤٥-ص ٤٩٨)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد (یعنی امام بخاری) سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس کو نہیں پہچانا اور فرمایا کہ خالد بن ابی بکر کی سالم بن عبداللہ سے ایسی روایات ہیں جو منکر ہیں۔ امام ترمذی کے علاوہ دیگر کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ میری امت کے لوگ تمام دروازوں پر لوگوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨٥) (قیامت کے دن) میری امت کے کچھ افراد وہ ہوں گے جو لوگوں کی کئی جماعتوں کی شفاعت کریں گے' کچھ وہ ہوں گے جو ایک قبیلہ کی شفاعت کریں گے' کچھ وہ ہوں گے جو اپنے ''عَصَبہ'' (رشتہ داروں) کی شفاعت کریں گے اور کچھ وہ ہوں گے جو صرف ایک شخص کی شفاعت کریں گے۔ (سنن ترمذی: ٢٤٤٠' مسند احمد ج ٣ ص ٢٠)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(٨٦) جنت میں میری امت کے ستر ہزار یا سات لاکھ افراد صف بستہ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے داخل ہوں گے حتیٰ کہ پہلا

---

[٦٧] ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آخرت میں میری امت کے لیے وہ عذاب نہیں ہے جو دیگر امتوں کے لیے ہے۔ دیگر امتوں کے مقابلہ میں میری امت پر دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب کی مقدار کم ہے اور انعام کی مقدار زیادہ ہے۔

[٦٨] یعنی وہ بارشیں جو اپنے وقت پر آتی ہیں اُن کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں بارش مفید تھی اور باقی بیکار یا پہلی بارش مفید تھی اور باقی غیر مفید۔ کیونکہ موقع کی ساری بارشیں فائدہ مند ہوتی ہیں۔ ابتدائی بارشوں سے کھیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور آخری بارشوں سے دانہ وغیرہ پکتا ہے۔ اسی طرح میری ساری امت میں خیر ہے۔ ہر فرد کا رآمد اور فائدہ مند ہے۔ (مراٰۃ ج ٨ ص ٥٠٥)

اور آخری فرد سب جنت میں اس حالت میں داخل ہوں گے کہ اُن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح (روشن) ہوں گے۔
(صحیح بخاری: ۳۲۴۷۔۶۵۵۴، صحیح مسلم: ۲۱۹)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۸۷) میرے رب (عزوجل) نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار افراد کو جنت میں اس طرح داخل فرمائے گا کہ نہ اُن کا حساب ہوگا نہ عذاب اور اُن میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے اور (اس پر مزید) میرے رب کی جانب سے تین لَپ[۶۹] (سنن ترمذی: ۲۴۳۷، سنن ابن ماجہ: ۴۲۸۶، مسند احمد ج ۵ ص ۲۶۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۵۵۶۔ ص ۴۸۶)

امام بغوی نے امام ثعلبی کی سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۸۸) جب تک میں جنت میں داخل نہیں ہوں گا اس وقت تک جنت تمام انبیاء پر حرام رہے گی اور جب تک میری امت داخل نہیں ہوگی اس وقت تک دیگر امتوں پر حرام رہے گی۔
(معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت، الکامل لابن عدی ج ۴ ص ۱۲۹، المعجم الاوسط للطبرانی: ۹۴۶)

زیر بحث آیت میں ''اخرجت للناس'' کی تفسیر

زیر بحث آیت میں جو ﴿ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ تمام زمانوں میں جتنی امتیں بھی لوگوں کے لیے ظاہر کی گئیں حتیٰ کہ وہ ممتاز اور معروف ہوئیں اُن سب میں تم بہترین امت ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں کے لیے تم وہ بہترین امت ہو جس کو ظاہر کیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''کنتم خیر امة اخرجت للناس'' اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے لیے تم سب سے بہترین افراد ہو (کیونکہ) لوگ جب زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں تو تم انہیں لے کر آتے ہو حتیٰ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں[۷۰] (صحیح البخاری: ۴۵۵۷) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اخرجت'' کا لفظ زائد ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''کنتم خیر امة للناس'' (تم لوگوں کے لیے بہترین امت ہو)۔ بعض کے نزدیک ''اخرجت للناس'' کا مفہوم یہ ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ سے زیادہ بہتر کوئی امت لوگوں کے لیے ظاہر نہیں ہوئی۔

آگے فرمایا: ﴿ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔) یہاں سے نئے جملہ کا آغاز ہے اس کے ذریعہ بتانا یہ مقصود یہ ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کے سب سے بہتر امت ہونے کی علت اور وجہ کیا ہے؟

[۶۹] اس حدیث شریف میں ۷۰ ہزار کا جو عدد بیان فرمایا اس کی شرح میں علامہ علی قاری فرماتے ہیں کہ اس سے یا تو ستر ہزار ہی مراد ہیں یا پھر اس سے کثرت بیان کرنا مقصود ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ میری امت کے بے شمار افراد کو بلا حساب وعذاب جنت میں داخل فرمائے گا۔ حدیث کے آخر میں جو فرمایا کہ ''اس پر مزید میرے رب کی جانب سے تین لَپ'' اس میں لَپ سے مراد ہے: بے اندازہ۔ کیونکہ جب کسی چیز کو بغیر گنے اور بغیر ناپ تول کے دینا ہوتا ہے تو وہاں لَپ بھر بھر کر دیتے ہیں۔ یا دوسری توجیہ یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ مٹھی اور لَپ سے پاک ہے اس لیے یہ جملہ متشابہات میں سے ہے۔ (مرقات ج ۹ ص ۴۹۹، مراۃ المناجیح ج ۷ ص ۳۰۹)

[۷۰] اس میں جو فرمایا کہ ''لوگ جب زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں تو تم انہیں لے کر آتے ہو'' اس سے مراد یہ ہے کہ تم قیدیوں کو دارالاسلام کی طرف لے کر آتے ہو پھر وہ تمہاری صحبت کی برکت سے مسلمان ہو جاتے ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۵۰۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کی تائید نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ جو لوگ زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت میں داخل ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں پسند فرماتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۳۰۱۰)

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ''زید کریم یطعم الناس یکسوھم ویقوم بمصالحھم'' (زید ایک سخی آدمی ہے وہ لوگوں کو کھانا اور کپڑے دیتا ہے اور ان کی دیگر ضروریات پوری کرتا ہے)۔اس سے زید کے سخی ہونے کی وجہ بتانا مقصود ہوتا ہے۔اسی طرح یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ مسلمان اس لیے افضل ہیں کہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں۔

یہاں ﴿معروف﴾ سے توحید مراد ہے اور ﴿منکر﴾ سے شرک مراد ہے۔مفہوم یہ ہے کہ تم لوگوں کو ''معروف'' یعنی ''لا الــہ الا الــلــہ'' کہنے کا حکم دیتے ہو اور منکر یعنی شرک سے روکتے ہو۔﴿ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) یعنی اللہ عزوجل کی تصدیق کرتے ہو صرف اُسی کو ایک مانتے ہو اور اُسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس سوال کا جواب کہ زیر بحث آیت میں ''امر بالمعروف ونھی عن المنکر'' کا ذکر پہلے ــــــ اور ایمان کا ذکر بعد میں کیوں کیا گیا؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ ایمان کا تمام نیکیوں اور عبادتوں سے پہلے ہونا ضروری ہے اس کے باوجود زیر بحث آیت میں ''امر بــالــمـعروف ونھی عن المنکر'' کا ذکر پہلے کیا گیا اور ایمان کا ذکر بعد میں کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''ایـمـان بـالـلـہ'' (اللہ کو ماننا) ایک ایسا معاملہ ہے جس میں تمام مؤمن اُمتیں شریک رہی ہیں۔اور تمام امتوں پر نبی اکرم ﷺ کی امتِ اسلامیہ کو جس بنیاد پر فضیلت حاصل ہے وہ ''امر بـالمعروف ونھی عن المنکر'' ہے۔اسی بنیاد پر یہ امت تمام امتوں میں سب سے بہترین امت ہے جہاں تک اللہ پر ایمان لانے کا تعلق ہے تو وہ ''امـر بالمعروف ونھی عن الــمـنـکـر'' کی شرط ہے کیونکہ جب تک ایمان نہ ہو اس وقت تک کوئی نیکی مقبول ہی نہیں ہوتی۔اس لیے ثابت ہوا کہ ہماری امت سب سے بہترین اس لیے ہے کہ اس کے افراد نیکی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے ہیں۔اس لیے آیت میں ایمان سے پہلے ''امر بالمعروف اور نھی عن المنکر'' کا ذکر کیا گیا۔

﴿ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ (اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ضرور اُن کے حق میں یہ بہت بہتر ہوتا۔) یعنی اگر یہودی اور عیسائی محمد مصطفیٰ ﷺ پر اور ان کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آتے تو یہ اُن کی اپنی یہودیت اور عیسائیت سے بہتر ہوتا۔اُن کے ایمان نہ لانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اقتدار کے خواہش مند تھے اور لوگوں کو اپنا پیروکار بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔حالانکہ اگر وہ ایمان لے آتے تو اُنہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت میں ثوابِ عظیم یعنی جنت بھی مل جاتی۔

﴿ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب میں کچھ صاحب ایمان ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے دیگر یہودی ساتھی جو مسلمان ہو گئے اسی طرح نجاشی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے عیسائی رفقاء جنہوں نے اسلام قبول کیا۔﴿ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (اور اہل کتاب میں اکثر فاسق ہیں) یعنی کفر میں سرکشی کرنے والے ہیں۔بعض مفسرین فرماتے ہیں: (ان کو فاسق اس لیے فرمایا کہ) کافر بسا اوقات اپنے مذہب میں معتدل ہوتا ہے لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ کافر ہونے کے ساتھ ساتھ فاسق بھی ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

وہ زبانی تکلیف کے سوا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیر جائیں

گے' پھر اُن کی مدد نہیں کی جائے گی O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ جو یہودی مسلمان ہو گئے تھے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے دیگر ساتھی' ان کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہودی سرداروں نے تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔ اور فرمایا: ﴿لَنۡ یَّضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی ﴾ یعنی اے مسلمانو! یہ یہودی سوائے اذیت دینے کے اور کچھ نقصان تمہیں نہیں پہنچا سکیں گے۔ اذیت دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کے ذریعہ تمہیں تمہارے دین میں طعنے دیں گے یا دھمکائیں گے' یا دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کریں گے اور یہ تمام چیزیں اذیت اور غم کا باعث ہیں۔ ﴿یُوَلُّوۡکُمُ الۡاَدۡبَارَ ﴾ (جنگ کرنے کی صورت میں وہ تم سے پیٹھ پھیر جائیں گے) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر تم سے پیٹھ پھیر جائیں گے۔ ﴿ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴾ (پھر اُن کی مدد نہیں کی جائے گی) یعنی اُنہیں تم پر نصرت حاصل نہیں ہو گی بلکہ تمہیں ان پر نصرت حاصل ہو گی۔ اس جملہ میں اُن یہودیوں کو اطمینان دلایا جا رہا ہے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ چونکہ یہودی لوگ اُن مسلمانوں کو اپنی باتوں کے ذریعہ اذیت پہنچاتے تھے اور اُنہیں ڈراتے دھمکاتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں یہ بتایا کہ یہودی لوگ زبانی اذیت کے سوا اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ پھر (اگلی آیت میں) اس بات کا وعدہ فرمایا کہ تمہیں غلبہ ملے گا اور اُن سے بدلہ لیا جائے گا اور بالآخر وہ ذلیل ورُسوا ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا:

ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡمَسۡکَنَۃُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّکَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

وہ جہاں کہیں بھی ہوں اُن پر ذلت ورُسوائی مسلّط کر دی گئی ہے' سوائے اس کے کہ وہ (کبھی) اللہ کے عہد اور (کبھی) لوگوں کے عہد میں (پناہ لیں) اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور اُن پر محتاجی مسلّط کر دی گئی' یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق شہید کیا کرتے تھے' یہ (جرأت) اس لیے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جایا کرتے تھے O

یہودیوں پر ذلّت اور رسوائی کا مسلّط ہونا اور ان کی ذلّت کے خاتمہ کی دو صورتیں

فرمایا: ﴿ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ ﴾ یہاں ﴿ضُرِبَتۡ ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے' مراد اس سے یہ ہے کہ ذلّت یہودیوں کے ساتھ چپکا دی گئی ہے' جیسے کوئی چیز جب کسی چیز پر ماری جائے تو وہ اس کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ ﴿الذِّلَّۃُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ قتل ہوں گے اور قیدی بنیں گے اور ان کے مال کو غنیمت بنایا جائے گا۔ بعض مفسرین کے نزدیک ذلّت سے مراد یہ ہے کہ ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا' کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی ذلّت اور رسوائی ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ذلّت سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں میں تمہیں کوئی ایسا بادشاہ نہیں ملے گا جو غالب رہا ہو' نہ ہی کوئی ایسا سردار ملے گا جس پر لوگوں نے اعتماد کیا ہو۔ بلکہ یہ لوگ تمام ملکوں میں کمزور (اور مغلوب) رہے ہیں۔ آیت میں ﴿ثُقِفُوۡۤا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جہاں کہیں وہ پائے جائیں اور اُن سے ملاقات ہو (وہ ذلیل ہی نظر آئیں گے)۔ آگے جو ﴿اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے عہد کو (تھام لیں) یعنی مسلمان ہو جائیں تو اُن کی ذلّت ختم ہو جائے گی۔ اور ﴿حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ جزیہ دے کر

مسلمانوں کے عہد کو (تھام لیں تو ان کی ذلّت ختم ہو جائے گی)۔ اب پورے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ عام حالات میں یہودیوں پر ذلت مسلّط کر دی گئی ہے۔ سوائے اس کے کہ جب وہ اللہ کی رسّی اور لوگوں کی رسّی کو تھام لیں۔ اللہ تعالیٰ کی رسّی سے مراد اللہ کی امان اور اس کا عہد ہے اور لوگوں کی رسّی سے مراد مسلمانوں کی امان اور ان کا عہد ہے۔ یہودیوں کے لیے صرف اُسی صورت میں عزت ہے جب وہ جزیہ کی ادائیگی کو قبول کر کے ذمی بن جائیں۔ آیت میں عہد کو جو "حبل" فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد امن تک پہنچا دیتا ہے اور خوف و ہراس کو ختم کر دیتا ہے۔ جیسے رسّی مطلوبہ مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

یہودیوں کا غضبِ الٰہی میں گرفتار ہونا اور ان پر "مَسْکَنَہ" کا مسلّط ہونا

آیت میں ﴿بَآءُوْ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کا غضب لے کر لوٹے اور اس کے مستحق ٹھہرے۔ یہ لفظ اصل میں "بواء" سے ہے جس کا معنیٰ ٹھہرنا ہے۔ یعنی وہ لوگ اللہ کے غضب میں ٹھہر گئے اور اس میں اُتر پڑے۔ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ (اُن پر محتاجی مسلّط کر دی گئی) اس میں "مَسْکَنَہ" سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کوئی گھر اپنے افراد کو اپنے اندر روک لیتا ہے اور لوگ اُس میں رہتے ہیں اور اس سے نکلتے نہیں ہیں اسی طرح یہودیوں پر "مسکنہ" (یعنی محتاجی) کو اس طرح مسلّط کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں۔ امام حسن بصری کا قول یہ ہے کہ "مسکنہ" سے مراد جزیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا استثناء نہیں فرمایا۔ اور جب استثناء نہیں فرمایا تو اس سے یہودیوں پر "مسکنہ" کا باقی ہونا ثابت ہوا۔ اور جو چیز (فی الواقع) یہودیوں پر بدستور باقی ہے وہ جزیہ ہے، اس لیے "مسکنہ" سے جزیہ مراد ہوگا۔ بعض مفسرین کے نزدیک "مسکنہ" سے مراد یہ ہے کہ یہودی لوگ مال دار اور خوش حال ہونے کے باوجود اپنے آپ کو فقیر اور محتاج ہی ظاہر کرتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ﴾ اس میں "ذالک" کا اشارہ اُن باتوں کی طرف ہے جو آیت میں مذکور ہوئیں، یعنی ذلت و رسوائی اور محتاجی کا مسلط کیا جانا اور غضبِ الٰہی کا مستحق ہونا۔ "بـأنهم" میں باء سبب کی ہے (یعنی یہودیوں پر جو ذلّت اور محتاجی مسلط کی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے تھے)۔ آگے جو ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ فرمایا اس میں بھی "ذالک" سے وہی (ذلّت و محتاجی وغیرہ) مراد ہے جو یہودیوں پر نازل ہوئی۔ یعنی جو جو (سزائیں) یہودیوں پر نازل ہوئیں وہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کی نافرمانی کی اور اللہ کی حدود سے آگے بڑھ گئے۔

> لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ○

یہ سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق پر) قائم ہے، (اُس گروہ کے افراد) رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں ○

آیت مذکورہ کا واقعہ نزول اور ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً﴾ کی تفسیر میں دو اقوال

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے رفقاء مسلمان ہو گئے تو علماء یہود نے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) پر صرف ہمارے بدترین افراد ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ بدترین نہ ہوتے تو اپنے آباء و اجداد کا دین نہ چھوڑتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً﴾ (یہ سب برابر نہیں ہیں۔) اس جملہ کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ کلام تام ہے، اس پر وقف کیا جائے گا۔ اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ جن اہل کتاب کا ذکر گذشتہ آیات میں گزرا اُن میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ

ترفاسق (یعنی کافر) ہیں' سب کے سب برابر نہیں ہیں۔ بعض مفسرین (اس پہلے قول کی صورت میں) آیت کا معنیٰ اور مراد یہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی اور سیدنا محمد ﷺ کی امت جو کہ اللہ کے احکامات کی پابند اور حق پر ثابت قدم ہے آپس میں دونوں برابر نہیں ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ "لیسوا سواء" کا تعلق بعد والے جملہ سے ہے' اس پر وقف نہیں کیا جائے گا۔

آیت مذکورہ میں "امّة قائمة" کا ذکر کرنے اور غیر قائمہ کا ذکر نہ کرنے کی توجیہ

﴿ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ ﴾ اس جملہ میں اختصار اور اضمار ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ "یہ لوگ برابر نہیں ہیں' اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو قائم (یعنی درست) ہے اور ایک گروہ ایسا ہے جو قابل مذمت اور غیر قائم ہے"۔ آیت میں اس دوسرے گروہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ دو گروہوں میں ایک کا تذکرہ کافی ہوتا ہے۔ یہ اہل عرب کے اس قانون کے مطابق ہے کہ "ذکر احد الضدین یغنی عن ذکر الاخر" (دو متضاد چیزوں میں سے ایک کا ذکر کر دیا جائے تو دوسری کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی)۔ چنانچہ ابوذویب شاعر کہتا ہے:

دعانی الیها القلب انی امرء لها مطیع فلا أدری أرشد طلا بها

"مجھے دل نے اس کی طرف مائل کر دیا ہے کیونکہ میں ایک فرمانبردار شخص ہوں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس کے طلب گار سیدھے راستہ پر گامزن رہے"۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ مجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس کے طلب گار سیدھے راستہ پر رہے یا گمراہ ہو گئے۔ شاعر نے ایک چیز (رشد و ہدایت) ذکر کر کے دوسری چیز (گمراہی) کا تذکرہ چھوڑ دیا۔

امام زجاج کا قول یہ ہے کہ یہاں قابل مذمت گروہ کا تذکرہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے' کیونکہ (گذشتہ آیت میں) اہل کتاب کا تذکرہ ان الفاظ میں آ چکا ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق شہید کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق پر) قائم ہے۔ اس کے بعد اب ہمیں یہ کہنے کی حاجت نہیں ہے کہ اُن میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق پر) قائم نہیں ہے۔

اہل کتاب میں اکثریت کا جو عمل ہے یعنی کفر اور عداوت اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا' پھر اُن لوگوں کا ذکر فرمایا جو اپنے عمل میں اکثریت کے مخالف ہیں۔ اس کا بیان یوں فرمایا کہ "لیسوا سواء من اهل الکتاب امة قائمة" (یہ سب برابر نہیں ہیں' اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو قائم ہے)۔

امت قائمہ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿ قَآىِٕمَةٌ ﴾ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ (اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو) ہدایت یافتہ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے' نہ تو وہ اللہ کے حکم کو ضائع کرتا ہے نہ ہی اُسے ترک کرتا ہے۔ (۲) بعض کے نزدیک قائمہ سے مراد عادلہ ہے (یعنی انصاف پسند گروہ)۔ (۳) بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ (اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو) اللہ عزوجل کی کتاب اور اُس کی حدود پر قائم ہے۔ (۴) بعض کے نزدیک اس سے نماز کا قیام مراد ہے' یعنی اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو نماز میں قیام کرتا ہے۔

امت قائمہ کے افراد کا رات کے اوقات میں آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت کرنا اور سجدہ کرنا

فرمایا: ﴿ يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (وہ اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔) سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ عزوجل کی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ ﴿ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ سے مراد ہے: رات کے لمحات میں۔ ﴿ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾ سے مراد ہے: وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ سجدہ میں چونکہ تلاوت نہیں ہوتی اس لیے یہاں سجدہ سے نماز مراد ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "یسجدون" سے نماز

تہجد کی ادائیگی مراد ہے یعنی وہ لوگ رات میں تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''یسجدون'' سے عشاء کی نماز کی ادائیگی مراد ہے۔ کیونکہ یہودی عشاء کی نماز نہیں پڑھتے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے سجدہ سے اللہ تعالیٰ نے خشوع وخضوع مراد لیا ہو (یعنی وہ لوگ خشوع اور خضوع کے ساتھ عبادت کرتے ہیں)۔ کیونکہ اہل عرب خشوع کو سجدہ کہہ دیتے ہیں۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ ''اس آیت میں جن اہل کتاب کو ''امة قائمة'' فرمایا گیا ہے اس سے اہل نجران کے چالیس عربی افراد' حبشہ کے بتیس اور روم کے آٹھ افراد مراد ہیں۔ یہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے' انہوں نے سیدنا محمد ﷺ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ انصار کے کچھ لوگ جن میں اسعد بن زرارہ' براء بن معرور' محمد بن مسلمہ اور ابوقیس صرمہ بن انس شامل تھے یہ لوگ بھی قبل از اسلام مُوَحِّد تھے۔ غسل جنابت کرتے تھے اور ملّت حنیفہ کے جو احکام انہیں معلوم تھے ان پر عمل کرتے تھے' یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے ان کے پاس نبی اکرم ﷺ کو بھیجا۔ یہ لوگ آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) ان لوگوں کی وہ صفتیں بیان فرمائیں جو یہودیوں میں موجود نہیں تھیں۔ چنانچہ فرمایا:

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١١٤﴾

وہ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نیکی کا حکم دیتے ہیں' بُرائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ لائق ہیںO

آیت مذکورہ میں اللہ عزوجل اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی صفت ذکر کرنے کی توجیہ

﴿ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔) چونکہ اہل کتاب کے ایمان میں شرک بھی پایا جاتا ہے اور آخرت کے بارے میں اُن کے خیالات مسلمانوں سے مختلف ہیں اس لیے اُن کے مذکورہ گروہ کے بارے میں (خصوصیت کے ساتھ) اس صفت کا تذکرہ فرمایا کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین اس صفت کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لایا جائے' جبکہ یہودیوں کا حال یہ ہے کہ وہ بعض نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح یوم آخرت پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ گناہوں سے بچا جائے' جبکہ یہودیوں کا حال یہ ہے کہ وہ گناہوں سے نہیں بچتے۔ اس لیے اللہ اور یوم آخرت پر ان کا ایمان خالص نہیں ہے۔

آیت مبارکہ میں مذکور دیگر صفات کی تفسیر

﴿ وَيَاْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ ﴾ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ مداہنت (یعنی بے جا نرمی اور خوشامد) نہیں کرتے' جیسا کہ یہودیوں کا طریقہ ہے کہ وہ آپس میں مداہنت سے کام لیتے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نیکی کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے اور سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیتے ہیں۔ اور بُرائی سے روکنے سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک سے اور سیدنا محمد عربی ﷺ کی صفات کو چھپانے سے روکتے ہیں۔

''نیک کاموں میں مسارعت کرتے ہیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں وہ کام رہ نہ جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس شخص کا کسی کام میں دل لگ جاتا ہے وہ اُس میں جلدی کرتا ہے اور کسی قسم کی سُستی کیے بغیر اُس کام کو ادا کرتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نیک کاموں میں جلدی کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ نیک کاموں کو نہ بوجھ سمجھتے ہیں نہ ان کے کرنے میں سُستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اختتام پر ﴿اُولٰٓئِکَ﴾ سے اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جن کے اوصاف اوپر مذکور ہوئے۔ ﴿مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کا شمار ان صالحین میں ہے جن کے معاملات اللہ عزوجل کے نزدیک درست ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ اس کے انعام واکرام کے مستحق ہیں۔ صالحین کی یہ تفسیر اس لیے کی گئی کہ ''صَلاح'' (صالح ہونا) فساد کی ضد ہے۔ چنانچہ جب آدمی صالح ہو جاتا ہے تو وہ بلند وبالا اور کامل ترین مقام ومرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ''صالحین'' سے مراد مسلمان ہو۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ جن لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے وہ مسلمانوں میں سے ہیں۔

وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ ۗ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور وہ جو بھی نیک کام کریں گے ان کا حق ہر گز نہیں مارا جائے گا اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جاننے والا ہے O

آیت مبارکہ میں ''یفعلوا'' اور ''لن یکفروا'' کی دو قرأتوں کا بیان اور ہر دو قرأت کی صورت میں۔۔۔ آیت کی تفسیر

اس آیت میں ﴿یَفْعَلُوْا﴾ اور ﴿یُکْفَرُوْہُ﴾ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے: یاء کے ساتھ اور تاء کے ساتھ۔ یاء والی قرأت کی صورت میں آیت کا تعلق گذشتہ آیت کے ساتھ ہوگا جس میں اہل کتاب کے مؤمنین کا ذکر ہے۔ (یعنی اُن کے بارے میں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ جو بھی نیک کام کریں گے اُن کا حق ہر گز نہیں مارا جائے گا)۔ اور یہ بات اس لیے فرمائی گئی کہ یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء سے کہا کہ جس دین کو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے تم لوگ خسارہ اور نقصان کا شکار ہو گئے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت نازل فرما کر یہ بتایا کہ (یہ لوگ خسارہ کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اس دین کو اختیار کر کے) بلند ترین مقامات پر فائز ہوئے ہیں اور یہ لوگ جو بھی نیک کام کریں گے اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کی جزاء عطا فرمائے گا۔ (یہاں یہ بات واضح رہے کہ) سبب کا خاص ہونا حکم کے عام ہونے کو مانع نہیں ہوتا' لہٰذا اس آیت کے حکم میں ہر نیک کام کرنے والا شخص داخل ہے۔

تاء والی قرأت کی صورت میں زیر بحث آیت ایک مستقل کلام ہوگی اور اس کا خطاب اہل کتاب کے مؤمنین سمیت تمام مسلمانوں کو شامل ہوگا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم جو بھی نیک کام کرو گے اس کے ثواب سے تمہیں دور نہیں رکھا جائے گا نہ ہی اس سے محروم رکھا جائے گا یا روکا جائے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ اور جزاء عطا فرمائے گا۔

﴿وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ﴾ (اللہ پرہیزگاروں کو خوب جاننے والا ہے) اس میں پرہیزگاروں کو عظیم اجر وثواب کی بشارت ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں صرف ایمان اور تقویٰ والے ہی کامیاب ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـا ؕ وَ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اُنہیں اُن کے مال اور اُن کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ برابر بھی ہرگز نہیں بچا سکیں گے' اور یہی لوگ جہنمی ہیں' اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ○

آیت مذکورہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال اور آیت کی تفسیر

یہ آیت مبارکہ کن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی اور اس میں کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس میں بنوقریظہ اور بنونضیر مراد ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سرداران یہود رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال و دولت حاصل کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ کی دشمنی سے اُن کا واحد مقصد یہ تھا کہ اقتدار اور مال و دولت حاصل ہو جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی کہ اُنہیں اُن کے مال اور ان کی اولاد ذرہ برابر بھی ہرگز نہیں بچا سکے گی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت مشرکین قریش کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ ابوجہل اپنے مال و دولت پر بہت زیادہ فخر کیا کرتا تھا اور حضرت ابوسفیان نے غزوۂ بدر اور احد میں مشرکین پر بہت زیادہ مال خرچ کیا تھا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ یہ آیت تمام کفار کے بارے میں ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ میں عموم ہے۔ اور ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جو موجب تخصیص ہو' اس لیے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ کو ان کے عموم پر ہی رکھا جائے۔

آیت میں ﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ کفار اگر اپنے مال کے ذریعہ فدیہ دے کر جان چھڑانا چاہیں گے تو وہ فدیہ بھی اُن سے اللہ عزوجل کے عذاب کو دور نہیں کر سکے گا۔ ﴿وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُن کی اولاد بھی ان کے لیے مددگار ثابت نہیں ہوگی۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ مال اور اولاد کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ انسان کبھی مال کے ذریعہ فدیہ دے کر اپنا بچاؤ کرتا ہے اور کبھی اولاد سے مدد لے کر اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ کافر کو آخرت میں مال اور اولاد میں سے کوئی بھی چیز فائدہ نہیں دے گی اور عذاب الٰہی سے چھٹکارہ پانے کی اُس کے لیے کوئی صورت نہیں ہوگی۔ آیت کے اختتام پر جو فرمایا کہ "یہی لوگ جہنمی ہیں' اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے" اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جہنم سے نہ نکلیں گے نہ اُس سے جدا ہوں گے۔

مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

جو چیز وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اُس ہوا کی طرح ہے جس میں سخت ٹھنڈ ہو' وہ اُن لوگوں کے کھیت میں پہنچے جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہو' پھر وہ اُس (کھیت) کو تباہ کر دے' اور اُن پر اللہ نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ (خود) اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ○

آیت مذکورہ میں کون سا خرچ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال

﴿مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ اس آیت میں کافروں کا کون سا خرچ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین

کے اقوال مختلف ہیں: (۱) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کا وہ مال مراد ہے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں غزوۂ بدر و اُحد کے موقع پر خرچ کیا۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے یہودیوں کا وہ مال مراد ہے جو وہ اپنے علماء اور سرداروں پر خرچ کرتے تھے۔ (۳) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے تمام ہی کافروں کا وہ مال اور صدقات مراد ہیں جو انہوں نے دنیا میں دیئے۔ (۴) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے ریا کاری کرنے والے شخص کا مال مراد ہے جس کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول نہیں ہوتا۔

ان تمام اقوال میں جن جن کے مال خرچ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن کے خرچ کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اُنہیں دنیاوی فوائد حاصل ہوں یا اس لیے ہے کہ آخرت کے فوائد حاصل ہوں۔ اگر ان کا خرچ دنیاوی فوائد کے لیے ہے تو (جاننا چاہیے کہ ایسی صورت میں) خرچ کرنے کا کوئی فائدہ آخرت میں مسلمان کو بھی نہیں ملے گا' پھر کافر کو کیونکر ملے گا۔ اور اگر ان کا خرچ اخروی فوائد کے لیے ہے' جیسے کوئی شخص صدقہ دے اور نیک اعمال کرے تو اگر وہ کافر ہے تو (جاننا چاہیے کہ) کفر تمام نیک اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس لیے اس نے آخرت کے لیے جو کچھ دنیا میں خرچ کیا وہ اُسے فائدہ نہیں دے گا۔ اسی طرح وہ شخص جو ریا کاری کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے ارادہ سے خرچ نہیں کرتا اُسے بھی اُس کا خرچ کیا ہوا مال آخرت میں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

آیت مبارکہ میں کفار کے مال و دولت خرچ کرنے کی مثال اور اس کی تفسیر

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مذکورہ خرچ کی مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ﴾ (اُن کے خرچ کی مثال اُس ہوا کی طرح ہے جس میں سخت ٹھنڈ ہو) اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) ایک قول جو اکثر مفسرین اور اہل لغت کا ہے وہ یہ ہے کہ ''صِـرّ'' سخت ٹھنڈ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس' حضرت قتادہ' سدی اور ابن زید کا یہی قول ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ''صِـرّ'' اُس گرم اور لُو والی ہوا کو کہتے ہیں جو ہلاک کر دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ ائمہ لغت میں سے ابن الانباری کا بھی یہی قول ہے۔ اور ان دونوں اقوال کی صورت میں آیت مبارکہ میں بیان کردہ تشبیہ صحیح ہے اور مقصد پورا ہو جاتا ہے کیونکہ ہوا میں ٹھنڈ ہو تب بھی وہ مہلک ہوتی ہے اور گرمی ہو تب بھی وہ مہلک ہوتی ہے۔

﴿أَصَابَتْ﴾ سے مراد ہے: وہ ہوا جس میں ٹھنڈ ہو وہ پہنچے۔ ﴿حَرْثَ قَوْمٍ﴾ کا معنیٰ ہے: قوم کی کھیتی۔ ﴿ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ﴾ سے مراد ہے: ایسی قوم جس نے کفر اور گناہ کر کے اور اللہ عزوجل کے حقوق کی ادائیگی نہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہو۔ ﴿فَأَهْلَكَتْهُ﴾ کا معنیٰ ہے: اس ہوا نے کھیتی کو تباہ کر دیا ہو۔

مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ کافروں نے جو کچھ خرچ کیا ہے وہ ضرورت کے وقت اس طرح ضائع ہو جائے گا جیسے وہ کھیت جسے ٹھنڈی ہوا لگی ہو اور اُس ہوا نے اُسے تباہ کر دیا ہو یا آگ پہنچی ہو اور اُس نے کھیت کو جلا ڈالا ہو۔ نتیجہ یہ کہ اب اس کے مالکان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح کفار کو بھی اپنے خرچ کیے ہوئے مال کا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔

مثال مذکور پر اشکال اور اس کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ آیت میں مقصود تو یہ ہے کہ کافروں کے خرچ کیے ہوئے مال اور اُس مال کے بے اجر و ثواب اور بے فائدہ ہونے کو اُس کھیت سے تشبیہ دی جائے جو ہوا سے تباہ ہو گیا ہو۔ پھر یہاں کھیت کی بجائے کھیت کو تباہ کرنے والی ہوا سے تشبیہ کیوں دی گئی؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ اس آیت میں جو تشبیہ ہے وہ تشبیہ مرکب ہے۔ تشبیہ مرکب وہ تشبیہ ہوتی ہے جس سے دو جملوں سے حاصل ہونے والے مقصد کے درمیان مشابہت حاصل ہو۔ اگرچہ اُن دونوں جملوں کے اپنے اجزاء

کے درمیان مشابہت موجود نہ ہو۔ لہٰذا اب آیت میں اشکال باقی نہیں رہا۔ اور ایک تشبیہ وہ ہوتی ہے جس میں دو جملوں سے حاصل ہونے والے مقصد کے درمیان بھی مشابہت ہو اور اُن دونوں کے اپنے اجزاء کے درمیان بھی مشابہت ہو۔ اگر ہم زیرِ بحث آیت میں بیان کی جانے والی مثال کو تشبیہ کی اس قسم میں شامل کریں تو اس صورت میں تفسیر کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ پر تقدیرِ آیت یہ ہوگی: "**مثل الکفر فی اھلاک ما ینفقون کمثل الریح المھلکۃ للحرث**" (یعنی کافر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو ہلاک کرنے میں اُن کا کفر ایسا ہی ہے جیسے کھیت کو ہلاک کرنے والی ہوا)۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: "**مثل ما ینفقون کمثل مھلک الریح وھو الحرث**" (یعنی کفار جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اُس جگہ کی طرح ہے جس کو ہوا نے تباہ کر دیا ہو یعنی کھیت)۔ مقصود اس مثال کو بیان کرنے سے یہ ہے کہ کفار جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو مکمل طور پر ضائع ہو جائے اور کچھ بھی اس میں سے باقی نہ رہے۔

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ﴾ "اللہ نے اُن پر ظلم نہیں فرمایا" اس سے مراد یہ ہے کہ اُس نے کافروں سے اُن کے خرچ کیے ہوئے مال کو قبول نہ کر کے اُن پر ظلم نہیں فرمایا۔ ﴿وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔) یعنی انہوں نے (خود) اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے اُن کے خرچ کیے ہوئے مال کو ضائع کر دیا اور ان کے لگائے ہوئے کھیت کو تباہ کر دیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کافروں کا اپنا آپ پر ظلم یہ ہے کہ انہوں نے اپنا مال اس طرح خرچ کیا ہی نہیں جس سے ان کا مال قبولیت کا مستحق ٹھہرتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے ایمان والو! تم غیروں کو (اپنا) راز دار نہ بناؤ، وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، اُنہیں وہ باتیں پسند ہیں جن سے تمہیں تکلیف پہنچے، بُغض اُن کی باتوں سے ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ اُن کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اُس سے بھی بڑا ہے، ہم نے تمہارے لیے روشن نشانیاں بیان کر دی ہیں اگر تم عقل مندی سے کام لو O

آیت مذکورہ میں جن لوگوں کو راز دار بنانے سے منع کیا گیا ہے اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال

اس آیت مبارکہ کا نزول کن لوگوں کے متعلق ہوا ہے اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں: (۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ رشتہ داری، دوستی، معاہدہ، پڑوس اور دودھ کے رشتہ کی وجہ سے کچھ مسلمانوں کے یہودیوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فتنہ انگیزی کے خوف سے مسلمانوں کو یہودیوں کی مباطنت (یعنی اُنہیں راز دار بنانے) سے منع فرما دیا۔ حضرت ابن عباس کے اس قول کے صحیح ہونے کی تائید اُن گذشتہ آیات سے ہوتی ہے جن میں یہودیوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان ہی آیات کی طرح اس آیت کا تعلق بھی یہودیوں سے ہوگا۔ (۲) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ کچھ مسلمان منافقین کی صفوں میں جایا کرتے تھے اور جا کر اُنہیں راز کی باتیں اور مخفی حالات بتا دیا کرتے تھے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منع فرما دیا (یعنی منافقین کو راز دار نہ بناؤ)۔ اس قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا ہے کہ "جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو تم پر

غصہ سے انگلیاں چباتے ہیں" یہ منافقین کی صفت ہے یہودیوں کی صفت نہیں ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (٣) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ہر قسم کے کافر مراد ہیں (یعنی کسی کافر کو رازدار نہ بناؤ)۔ اس قول کے صحیح ہونے کی تائید اسی آیت کے مفہوم سے ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں غیروں کو رازدار بنانے سے منع فرمایا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ اہل اسلام کو چھوڑ کر کسی اور کو رازدار بنائیں۔ لہٰذا یہ تمام ہی کافروں کو رازدار بنانے سے ممانعت ہوئی۔

"بطانة" کا معنیٰ اور آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ (تم غیروں کو رازدار نہ بناؤ۔) "بِطَانَةً" کسی بھی شخص کے اُس مقرب اور خاص آدمی کو کہتے ہیں جو اس کے راز سے واقف ہو۔ یہ لفظ "بطانة الثوب" سے مشتق ہے (بمعنیٰ کپڑے کا اَستر) کیونکہ اہل عرب جب کسی چیز کو خاص کر لیتے ہیں تو کہتے ہیں: میں نے فلاں چیز کو اپنا لباس بنالیا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: "فلان شعاری و دثاری" (یعنی فلاں شخص میرے بدن کا لباس ہے)۔ "شعار" کپڑے کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو جسم سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ "بطانة" بھی اُسی کو کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کو انسان اپنے بہت قریب کر لے اُسے "بطانة" کہتے ہیں کیونکہ وہ آدمی کے معاملات کو چھپاتا ہے اور اُسے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوتیں۔

﴿مِنْ دُوْنِكُمْ﴾ کا "مِنْ" زائدہ ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً دُوْنَكُمْ" (غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ)۔ بعض کے نزدیک "مِنْ" بیانیہ ہے۔ اس صورت میں معنیٰ ہوگا: "لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِ اَهْلِ مِلَّتِكُمْ" (اپنے ہم مذہب کو چھوڑ کر کسی اور کو رازدار نہ بناؤ)۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ اپنی ملّت والوں کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا حمایتی اور مخلص دوست نہ بناؤ۔ ممانعت کی وجہ کیا ہے؟ اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اُنہیں وہ چیزیں پسند ہیں جن سے تمہیں تکلیف پہنچے)۔

﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایسی باتیں جو تمہارے درمیان فتنہ اور فساد کا باعث بنیں اُن میں وہ اپنی کوشش کو نہ ترک کریں گے نہ اُس میں کسی قسم کی کوتاہی کریں گے۔ فتنہ و فساد کو آیت میں "خبال" کہا گیا ہے کیونکہ "خبال" کا بنیادی معنیٰ یہی ہے کہ وہ فساد اور نقصان جو انسان کو پہنچے اور عقل کی کمی کا باعث بنے۔ آیت میں ﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ جو فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایسی چیزیں چاہتے ہیں جو تمہارے لیے دشواری کا باعث بنیں۔ یعنی نقصان، فتنہ اور ہلاکت۔ "عَنَتٌ" کا معنیٰ مشقت ہے۔

﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (بُغض اُن کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے۔) یعنی وہ لوگ اپنے مُنہ سے جو گالیاں دیتے ہیں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑواتے ہیں اس سے اُن کی عداوت سامنے آ گئی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں کے راز اور خفیہ باتیں مشرکین کو بتا دیتے ہیں۔ ﴿وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اُن کے سینوں میں جو دشمنی اور غیظ و غضب چھپا ہوا ہے وہ اُن باتوں سے زیادہ بڑا ہے جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ (ہم نے تمہارے لیے روشن نشانیاں بیان کر دی ہیں۔) یعنی ایسی نشانیاں جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ دین میں اس طرح مخلص ہونا واجب ہے کہ مسلمانوں کو اپنا دوست بنایا جائے اور کافروں سے دشمنی رکھی جائے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے لیے بیان کیا گیا ہے اگر تم اس کو سمجھو تو اس سے نصیحت حاصل کرو۔

هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا یُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾

سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ اُن سے محبت کرتے ہو حالانکہ وہ تم سے (ذرا) محبت نہیں کرتے اور تم ساری کتابوں پر ایمان لاتے ہو' اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب تنہا ہوتے ہیں تو غصہ سے تم پر انگلیاں چباتے ہیں' آپ (اُنہیں) کہہ دیجئے! اپنی گھٹن میں مر جاؤ' بے شک اللہ دلوں کی باتیں خوب جاننے والا ہے O

''تحبّونهم ولا یحبّونکم'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال اور آیت مبارکہ کی تفسیر

﴿هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ﴾ میں ''ھا'' تنبیہ کے لیے ہے' ''انتم'' مذکر حاضر کی ضمیر ہے اور ''أولاء'' ان مخاطبین کا مشار الیہ ہے جو ''تحبونهم'' میں مذکور ہیں۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے مؤمنو! جن یہودیوں کو راز دار بنانے سے میں نے تمہیں منع کیا ہے تم اُن سے اپنی باہمی رشتہ داری' رضاعت و مصاہرت کے تعلقات اور معاہدہ کی وجہ سے محبت کرتے ہو۔ ﴿وَلَا یُحِبُّوۡنَكُمۡ﴾ (لیکن) تمہارے اور یہودیوں کے درمیان جو دین کا اختلاف موجود ہے اس کی وجہ سے وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ بعض مفسرین نے ﴿تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا یُحِبُّوۡنَكُمۡ﴾ کی تفسیر یہ کی ہے کہ تم تو یہودیوں کے لیے اسلام چاہتے ہو جو کہ سب سے بہترین چیز ہے (لیکن) وہ تمہیں نہیں چاہتے کیونکہ وہ تمہارے لیے کفر کی خواہش رکھتے ہیں جو کہ بدترین چیز ہے۔ اور بدترین اس لیے ہے کہ اس میں دائمی ہلاکت اور بربادی ہے۔ بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ اس آیت میں منافقین مراد ہیں۔ یعنی چونکہ منافقین تمہارے سامنے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور تمہیں ان کے دل کی باتیں معلوم نہیں ہیں اس لیے تم ان سے محبت کرتے ہو (لیکن) وہ تم سے محبت نہیں کرتے کیونکہ کفر ان کے دلوں میں موجود ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو یعنی اپنے راز اُنہیں بتا دیتے ہو (لیکن) وہ تم سے محبت نہیں کرتے' یعنی وہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرتے۔

﴿وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ (تم ساری کتابوں پر ایمان لاتے ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ (ساری کتابوں پر) ایمان نہیں لاتے۔ یہاں ''کتاب'' کا لفظ واحد ہے اور مراد ساری کتابیں ہیں کیونکہ اسے جنس کے طور پر لایا گیا ہے۔ جیسے بہت سارے درہموں کے لیے کہتے ہیں: ''کثر الدرهم فی ایدی الناس'' (لوگوں کے پاس درہم زیادہ ہو گئے ہیں)۔ آیت کے مذکورہ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہو اور وہ تمہاری کتاب کے کسی حصہ پر ایمان نہیں لاتے۔

یہودیوں یا منافقین کا مسلمانوں کے سامنے ایمان کا اقرار اور تنہائی میں مسلمانوں پر غصہ سے انگلیاں چبانا

﴿وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا﴾ (جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔) یعنی جن لوگوں کا اس آیت مبارکہ میں کردار بیان کیا گیا ہے وہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جس طرح تم مؤمن ہو اس طرح ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور تمہاری طرح تصدیق کر چکے ہیں۔ (ایک قول کے مطابق) یہ منافقین کی صفت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں۔

﴿وَاِذَا خَلَوۡا﴾ جب وہ (آپس میں) ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں۔ ﴿عَضُّوۡا عَلَیۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ﴾ (تو غصہ کی وجہ سے تم پر انگلیاں چباتے ہیں)۔ ''انامل''' ''اَنۡمِلَة'' کی جمع ہے۔ اور ''انمله'' انگلی کے پورے کو کہتے ہیں۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو مسلمانوں کی باہمی محبت اور اتحاد و اتفاق کو دیکھ کر پیدا ہونے والی غصہ کی شدت اور

دشمنی کا (بھرپور طریقہ سے) اظہار کرتے ہیں۔ انگلیاں چبانا جو فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ غضب ناک ہوتے ہیں۔ یہ مجازِ اَمثال کی قبیل سے ہے۔ اگر چہ یہاں حقیقۃً چبانا نہیں پایا گیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ''عض یدہ من الغیظ و الغضب'' (فلاں شخص نے غصہ سے اپنا ہاتھ کاٹ لیا)۔

﴿ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ﴾ (آپ کہہ دیجئے تم اپنے غضب میں مر جاؤ۔) یہ یہودیوں کے خلاف اس بات کی دعا ہے کہ اُن کا غضب اور غصہ زیادہ ہو جائے حتیٰ کہ اس میں وہ ہلاک ہو جائیں۔ یہودیوں کا غصہ کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ (روز بروز) اسلام کی قوت اور مسلمانوں کا غلبہ دیکھتے تھے اور اس میں ان کی اپنی ذلت اور رُسوائی تھی۔ جملہ ''موتوا بغیظکم'' کا مفہوم یہ ہے کہ تم لوگ مرنے تک غیظ و غضب میں رہو۔

''ذات الصدور'' کی تفسیر

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ (بے شک اللہ دلوں کی باتیں خوب جاننے والا ہے۔) دلوں کی باتوں سے مراد دل میں ٹھہرنے والے خیالات اور دل میں پائی جانے والی وہ باتیں ہیں جو کسی کام کی طرف راغب کر دیتی ہیں اور کسی کام سے روک لیتی ہیں۔ چونکہ یہ باتیں دل میں ٹھہر جاتی ہیں اور دل ہی کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے اس لیے آیت میں انہیں ''ذات الصدور'' سے تعبیر فرمایا۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو جو تمہارے دل میں خیالات آتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ اس جملہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو اس بات سے آگاہ فرما دیا کہ تنہائی میں وہ لوگ غصہ سے انگلیاں چبا کر جو باتیں چھپاتے ہیں وہ ان سے بھی واقف ہے اور دلوں میں وہ جو باتیں چھپاتے ہیں ان کا بھی اُسے علم ہے۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۱۲۰﴾

اگر تمہیں (کہیں سے) کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو انہیں بُرا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس سے (بڑے) خوش ہوتے ہیں' اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کیے رہے تو ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' بے شک ان کے سب کام اللہ کے گھیرے میں ہیں ○

دنیا میں مسلمانوں کو پہنچنے والی ''حَسَنه'' اور ''سیّئه'' کی تفسیر

﴿ تَمْسَسْكُمْ ﴾ (''مَسّ'' سے ہے اور) ''مَسّ'' کا اصل معنیٰ ہے: ہاتھ سے چھونا۔ لیکن پھر تشبیہ کی بناء پر ہر اُس چیز کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ وہ اُسے چھو رہی ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''مَسَّهُ نَصَبٌ وَتَعَبٌ'' یعنی فلاں شخص کو مشقت اور تھکاوٹ پہنچی۔ آیت میں ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ سے دنیاوی فوائد مراد ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! اگر تمہیں دنیاوی فوائد پہنچتے ہیں مثلاً تمہارا اپنے دشمن پر غالب آ جانا' دشمن سے مالِ غنیمت پانا' لوگوں کا مسلسل تمہارے دین میں داخل ہونا اور تمہاری زندگی کا خوش حال ہونا ﴿ تَسُؤْهُمْ ﴾ تو انہیں (تمہارے یہ فوائد) غمگین اور پریشان کر دیتے ہیں۔

﴿ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ﴾ (اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔) یعنی جب تمہیں کوئی برائی پہنچتی ہے مثلاً تمہارا لشکر پسپا ہو جائے یا دشمن تم پر حملہ آور ہو جائے یا تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے' یا کوئی تم سے بدعہدی کر جائے یا کوئی تکلیف اور مصیبت آ جائے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

﴿ اِنْ تَصْبِرُوْا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ان کی اذیتوں پر صبر کیے رہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ

اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس میں آنے والی مشقتوں پر صبر کیے رہے۔ ﴿ وَتَتَّقُوْا ﴾ اور اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تمہیں رب نے جن باتوں سے روکا ہے اُن سے بچتے رہے اور اللہ ہی پر بھروسا کیے رہے۔ ﴿ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ﴾ تو تمہیں اُن کی دشمنی اور مکر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی توجہ اور اس کی حفاظت میں ہو۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴾ اس میں ''يَعْمَلُوْنَ'' کو یاء (صیغۂ غائب) اور تاء (صیغۂ حاضر) دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ صیغۂ غائب کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ جو دشمنی رکھتے ہیں اور تمہیں اذیتیں دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہے' وہ انہیں اس پر سزا دے گا اور صیغۂ حاضر کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! تم جو صبر اور تقویٰ اختیار کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے' وہ اس پر تمہیں جزاء عطا فرمائے گا۔ ﴿ مُحِيْطٌ ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور سب چیزیں اس کے لیے محفوظ ہیں۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾

اور یاد کیجئے جب آپ لڑائی کے مورچوں پر مسلمانوں کو قائم کرنے کے لیے صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے' اور اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے O

آیت مذکورہ کے نزول میں مفسرین کا اختلاف کہ یہ احد کے موقع پر نازل ہوئی یا بدر کے موقع پر؟

جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت غزوۂ احد کے متعلق ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس' زہری' قتادہ' سدی' ربیع اور ابن اسحٰق کا یہی قول ہے۔ جبکہ امام حسن بصری' حضرت مجاہد اور مقاتل کا قول یہ ہے کہ یہ غزوۂ احزاب کے متعلق ہے۔ امام حسن بصری سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوۂ بدر کے متعلق ہے۔ امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب تم میں سے دو گروہ بزدلی پر تیار ہو گئے''۔ علماء کا اتفاق ہے اس بات پر کہ دو گروہوں کے بزدل ہونے کا واقعہ یوم اُحد کا ہے۔

غزوۂ اُحد کا بیان اور زیر بحث آیت مبارکہ کی تفسیر

مجاہد' کلبی اور واقدی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے نکل کر میدان اُحد پیدل تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے لڑائی کے لیے تیر کی طرح صفیں سیدھی فرمائیں۔ محمد بن اسحٰق اور سدی اپنی اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ مشرکین بدھ کے دن میدان احد آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اُن کے آنے کی خبر سُنی تو اپنے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ عبداللہ بن اُبی ابن سَلول کو اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں بلایا تھا لیکن اس موقع پر اسے بھی بُلا کر اس سے مشورہ کیا۔ عبداللہ بن اُبی اور اکثر انصار نے (بہ طور مشورہ) کہا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ مدینہ میں رہیں اور مشرکین کی طرف نکل کر نہ جائیں۔ کیونکہ خدا کی قسم! ہم جب بھی مدینہ سے کسی دشمن کی طرف نکل کر گئے ہیں تو ہمیں شکست ہوئی ہے اور جب بھی مدینہ میں دشمن ہم پر حملہ آور ہوا ہے تو اُسے شکست ہوئی ہے۔ لہٰذا اب جبکہ آپ ہمارے درمیان ہیں تو ہم یہاں سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ انہیں چھوڑ دیں۔ وہ اگر وہاں ٹھہرے رہے تو وہ ان کے لیے بُری جگہ ہے اور اگر مدینہ پر وہ حملہ آور ہوئے تو مرد اُن کا مقابلہ کریں گے اور عورتیں اور بچے اُنہیں اوپر سے پتھر ماریں گے اور اگر وہ لوٹ گئے تو خائب و خاسر ہو کر لوٹیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا۔ جبکہ بعض صحابہ نے یہ کہا کہ یارسول اللہ (ﷺ)!

آپ ہمیں ان کتوں کی طرف لے چلیں تا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اُن سے بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے خواب میں ایک گائے دیکھی ہے اس سے میں نے خیر مراد لی ہے۔ اور اپنی تلوار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی ہے اس سے میں نے شکست مراد لی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اپنا ہاتھ میں نے ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے اُس سے میں نے مدینہ طیبہ مراد لیا ہے۔ اگر تم لوگوں کی رائے یہی ہو تو مدینہ میں ٹھہرے رہو اور اُنہیں چھوڑ دو۔ اگر وہ لوگ وہیں ٹھہرے رہے تو وہ ان کے لیے بُری جگہ ہے اور اگر وہ ہم پر حملہ آور ہوئے تو ہم مدینہ میں رہ کر اُن سے جنگ کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ وہ لوگ مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہوں اور اُن سے گلی کوچوں میں لڑائی ہو۔ کچھ وہ مسلمان جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور غزوۂ احد میں اُنہیں اللہ عزوجل نے شہادت سے نوازا تھا اُنہوں نے کہا کہ آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کی طرف لے چلیں۔ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے سامنے دشمنوں سے شوقِ ملاقات کا اظہار کرتے رہے حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دولت کدہ میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر تشریف لائے۔ صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ کو ہتھیار پہنے دیکھا تو اپنے فعل پر نادم ہوئے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو غلط مشورہ دیا' حالانکہ آپ کے پاس وحی آتی ہے۔ پھر وہ کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ سے معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے: یارسول اللہ (ﷺ)! آپ جو چاہیں کریں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ زرہ پہننے کے بعد جنگ سے پہلے اُتار لے۔

مشرکین میدانِ احد میں بدھ اور جمعرات کے دن ٹھہرے رہے۔ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن صحابہ کرام کو جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد گھر سے نکلے۔ اس دن انصار کے ایک شخص کا انتقال ہو گیا تھا' آپ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی پھر مشرکین کی طرف تشریف لے گئے۔ ۱۵ شوال ۳ھ کو ہفتہ والے دن آپ اُحد کی گھاٹی میں پہنچے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ وادی کی جانب سے اُترے اور اپنی پشت اور صحابہ کرام کو اُحد کی جانب رکھا اور حضرت عبد اللہ بن جُبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تیر اندازوں کا امیر مقرر فرمادیا اور اُن سے فرمایا کہ تم لوگ تیروں کے ذریعہ کفار کو ہم سے دور رکھنا تا کہ وہ پچھلی طرف سے ہم پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا کہ تم لوگ اس جگہ ڈٹے رہنا' جب وہ لوگ تمہیں دیکھیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے لیکن تم نہ ان کے چھوڑے ہوئے مال و متاع کی خواہش کرنا اور نہ ہی اپنی اس جگہ سے جدا ہونا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی رائے کی مخالفت فرمائی تو اسے یہ ناگوار گزرا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ (محمد ﷺ) نے بچوں کی بات رکھ لی اور میری بات ٹھکرا دی۔ (پھر اُس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ) محمد (ﷺ) کو اپنے دشمن پر جو کامیابی ملے گی وہ صرف تمہارے ذریعہ ملے گی۔ اور محمد (ﷺ) نے اپنے لوگوں سے یہ وعدہ کیا ہوا ہے کہ اُن کے دشمنوں نے اگر اُنہیں دیکھا تو دشمنوں کو شکست ہو جائے گی۔ اس لیے (میں تم لوگوں کو نصیحت کر رہا ہوں کہ) تم ان کے دشمنوں کو دیکھتے ہی لشکر سے پیچھے ہٹ جانا' تمہیں دیکھ کر مسلمان بھی تمہاری طرح پیچھے ہٹ جائیں گے۔ یوں محمد ﷺ نے جو کچھ اپنے صحابہ سے کہہ رکھا ہے اس کا اُلٹ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس وقت جب کہ مسلمان ایک ہزار اور مشرکین تین ہزار کی تعداد میں تھے باہم صف آراء ہوئے تو عبد اللہ بن ابی ابن سلول اپنے تین سو منافق ساتھیوں کو لے کر (لشکر اسلام سے) علیحدہ ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تقریباً سات سو صحابہ کرام باقی رہ گئے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت و ہمت اور ثابت قدمی عطا فرمائی کہ مشرکین پسپا ہو گئے۔ مسلمانوں نے جب مشرکین کی پسپائی دیکھی تو اُنہیں اس بات کی خواہش ہوئی کہ یہ غزوہ بھی غزوۂ بدر کی طرح ہو جائے۔ چنانچہ وہ مشرکین کے چھوڑے ہوئے ساز و سامان کی طرف چل پڑے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پابندی نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ صحابہ کرام کا حصہ اس جنگ سے منقطع کر دے تا کہ وہ آئندہ رسول اللہ

ﷺ کی مخالفت نہ کریں اور یہ جان لیں کہ غزوۂ بدر میں اُنہیں جو کامیابی ملی تھی وہ بھی صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی برکت سے تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں سے رُعب کو دور کر دیا اور وہ مسلمانوں پر دوبارہ حملہ آور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان شکست کھا گئے اور رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ایک گروہ میں رہ گئے جن میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت طلحہ اور حضرت سعد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) شامل تھے، مزید یہ کہ آپ کے اگلے[1] دندان مبارک شہید ہو گئے اور چہرۂ انور زخمی ہو گیا۔

آیت مبارکہ میں غزوۂ احد کے اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ (جب آپ صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے) یعنی یاد کیجئے جب آپ (صبح) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر سے نکلے۔ اس جملہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عظیم فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ اس میں ''لِاَهْلِکَ'' کے الفاظ ہیں اور ''لِاَهْلِکَ'' فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی صراحت فرما دی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم ﷺ کے اہل سے ہیں۔ ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں پر بٹھا رہے تھے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آپ جنگ کا لشکر تیار فرما رہے تھے۔ ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اس میں ''سمیع'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہاری باتوں کو سننے والا ہے اور ''علیم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے ارادوں اور مافی الضمیر کو بھی جانتا ہے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآىٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٢﴾

جب تم میں سے دو گروہ بزدلی پر تیار ہو گئے حالانکہ اللہ ان کو سنبھالے ہوئے تھا، اور اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسا کرنا چاہیے O

غزوۂ احد کے موقع پر دو گروہوں کا بزدلی کا ارادہ کرنا

﴿تَفْشَلَا﴾ سے مراد ہے: دونوں گروہ بزدل اور کمزور ہو گئے۔ دونوں گروہوں سے خزرج کے بنو سلمہ اور اوس کے بنو حارثہ مراد ہیں۔ یہ دونوں لشکر اسلام میں شامل تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کی طرف چلے بعض کا قول یہ ہے کہ ساڑھے نو سو کا لشکر تھا، جبکہ مشرکین تین ہزار تھے۔ جب مسلمان میدان میں پہنچے تو عبد اللہ بن ابی ایک تہائی افراد لے کر علیحدہ ہو گیا اور تین سو افراد کے ساتھ یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ ہم اپنی جان اور اپنی اولاد کو کیوں قتل کریں؟ ابو جابر سلمی اس کے پیچھے گئے اور اس سے کہا کہ میں تمہیں تمہارے نبی (ﷺ) اور تمہاری جانوں کا واسطہ دیتا ہوں۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا: اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ عبد اللہ بن ابی کے ساتھ ساتھ دو گروہوں نے بھی واپسی کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بچا لیا تو وہ جم گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنی اس عظیم نعمت کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا: ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآىٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ جب تم میں سے دو گروہ بزدلی پر تیار ہو گئے۔ ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ (حالانکہ اللہ ان کو سنبھالے ہوئے تھا) یعنی ان کا مددگار و محافظ تھا اور اپنی توفیق و حفاظت کے ذریعہ ان کے معاملہ کی نگہداشت فرما رہا تھا۔

---

[1] اگلے دندان مبارک سے مراد یہ ہے کہ سامنے کے چار دانتوں میں سے نیچے کے ایک دانت شریف کا ایک کنگرہ شہید ہوا تھا۔ (مراۃ المناجیح ج ٨ ص ١١٧)

اس اشکال کا جواب کہ بزدلی کا پختہ ارادہ کرنے کے باوجود زیرِ بحث آیت میں دونوں گروہوں کی ـــ تعریف کیوں کی گئی؟

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ ''ھَمّ'' کا معنیٰ ہے: کسی کام کا پختہ ارادہ کرنا لہٰذا زیرِ بحث آیت مبارکہ میں ''ھَمَّتْ'' کے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ دونوں گروہوں نے بزدلی اور ترکِ جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا تھا اور یہ معصیت ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ''وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا'' فرما کر دونوں گوہوں کی تعریف کیوں فرمائی؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ''ھمّ'' کا لفظ کبھی پختہ ارادہ کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی دلی خیال کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ اور جب یہ دونوں ہی معنیٰ رکھتا ہے تو آیت مذکورہ میں اس لفظ کو دلی خیال کے معنیٰ میں لینا زیادہ بہتر ہے۔ (اور جب دلی خیال کے معنیٰ میں لیں گے تو کوئی اشکال نہیں رہے گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ دل کے خیالات پر گرفت نہیں فرماتا۔ اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مذکورہ دونوں گروہوں کے دل میں یہ بات تھی کہ لوٹ جائیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت پر قائم رکھنے کا ارادہ فرمایا اور وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ٹھہرے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں گروہوں کی تعریف میں فرمایا کہ ''واللہ ولیھما'' (اللہ ان کو سنبھالے ہوئے تھا)۔

(٨٩) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ ''اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا'' ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم بنو حارثہ اور بنو سلمہ ہی دو گروہ ہیں (جن کا اس آیت میں ذکر ہے)۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ آیت ''وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا'' کے ارشاد کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ (صحیح بخاری: ٤٠٥١۔ صحیح مسلم: ٢٥٠٥)

اس حدیث شریف میں صحابہ کرام اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں کہ انہیں عظیم شرف حاصل ہوا اور اُن کے بارے میں اللہ عزوجل نے ایسی آیت نازل فرمائی جس میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ اُن کو سنبھالے ہوئے ہے اور (مزید یہ کہ) انہوں نے بزدلی کا جو ارادہ کیا اس کے باوجود وہ اللہ کی نگہبانی سے خارج نہیں ہوئے۔

اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنے کی تفسیر

آخر میں فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰہِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔) اس میں ''توکّل'' کا لفظ باب تفعل سے ہے اور ''وکل امرہ الی غیرہ'' سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کے اپنے لیے کافی ہونے اور ذمہ دار ہونے میں اس پر اعتماد کرے۔ ''توکّل'' کا معنیٰ ہے: عاجز ہونا اور کسی پر اعتماد کرنا۔ بعض کے نزدیک توکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حسنِ تدبیر پر یقین رکھتے ہوئے اپنے معاملات کو اس کے سپرد کر دینا۔ زیرِ بحث جملہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ صرف اُسی پر بھروسا کریں اور اپنے معاملات صرف اُسی کے سپرد کریں۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢٣﴾

اور یقیناً اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی تھی جبکہ تم (بالکل) بے سر و سامان تھے پس تم اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کرو○

''بدر'' کا معنیٰ اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی بے سروسامانی

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ (یقیناً اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی تھی جبکہ تم بالکل بے سروسامان تھے۔)

''بدر'' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک معروف جگہ کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک اُس جگہ کے ایک کنویں کا نام ہے وہ کنواں جس شخص کا تھا اس کا نام بدر تھا تو اس شخص کی وجہ سے کنویں کا نام بدر پڑ گیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر

اپنے احسان کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے بدر والے دن مدد کے ذریعہ فرمایا تھا۔ آیت میں جو ﴿ اَذِلَّةٌ ﴾ کا لفظ ہے وہ ذلیل کی جمع قلّت ہے اور جمع قلّت سے مقصود تعداد کی کمی ہے کیونکہ مسلمان تین سو دس اور کچھ تھے' ایک روایت کے مطابق تین سو تیرہ تھے۔ ﴿ وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی حالت کمزور تھی' اسلحہ' سواری اور مال کم تھا اور دشمنوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ کیونکہ مسلمان پانی لادنے والے اونٹوں پر روانہ ہوئے تھے۔ اور حال یہ تھا کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے جبکہ اکثر صحابہ پیدل تھے اور پورے لشکر میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ (اس کے برعکس) مسلمانوں کے دشمن کفارِ قریش ایک ہزار کے قریب کثیر تعداد میں تھے ان کے پاس سو گھوڑے تھے اور ہتھیار اور طاقت بھی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کم ہونے اور دشمن کے زیادہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کو دشمن پر مدد عطا فرمائی۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (پس تم اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ شکر ادا کرو۔) اللہ سے ڈرنے سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہنے کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ اور شکر گزار ہونے سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے تقویٰ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اس مدد پر شکر ادا کرو جس سے اس نے تمہیں نوازا۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

(اے رسولِ مکرم!) یاد کیجئے! جب آپ مسلمانوں سے فرما رہے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے O ہاں کیوں نہیں! بشرطیکہ تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو اور اسی دم تم پر دشمن آ دھمکیں تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا O

مذکورہ آیات میں فرشتوں کو نازل کرنے کا وعدہ بدر میں پورا کیا گیا یا اُحد میں؟ اس بارے میں مفسرین کا پہلا قول مع دلیل

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ فرشتوں کو نازل کرنے کا یہ وعدہ غزوۂ بدر میں پورا ہوا تھا یا غزوۂ احد میں؟ مفسرین کے دو قول ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ وعدہ غزوۂ بدر میں پورا ہوا تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ بدر والے دن اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی' جیسا کہ ارشاد فرمایا:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ. (الانفال: ۹)

یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اُس نے تمہاری دُعا قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمانے والا ہوں O

اس کے بعد فرشتوں کی تعداد تین ہزار ہوگئی پھر پانچ ہزار ہوگئی جیسا کہ زیر بحث آیت میں مذکور ہے۔

آیت: ۱۲۵ میں جو فرمایا کہ ''اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو اور اسی دم تم پر دشمن آ دھمکیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا'' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کرام نے بدر والے دن صبر اور تقویٰ کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کے مطابق پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ ان کی مدد فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے سوا فرشتوں نے کسی غزوہ میں قتال نہیں کیا۔ دیگر غزوات میں وہ حاضر ہوتے تھے لیکن لڑائی میں شریک نہیں ہوتے تھے' صرف تعداد

بڑھانے یا مدد کے لیے آتے تھے۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ پانچ ہزار فرشتے قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے سہارا ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ بدر والے دن رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو خبر ملی کہ کرز بن جابر المحاربی مشرکین کی امداد کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات مسلمانوں پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے زیرِ بحث آیات (اذ تقول للمؤمنین تا مسوّمین) نازل فرمائی۔ کرز کو جب مشرکین کی شکست کی خبر ملی تو وہ واپس چلا گیا اور اس نے مشرکین کی مدد نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد نہیں فرمائی۔ البتہ ایک ہزار فرشتوں کی مدد مسلمانوں کو ملی تھی۔

صحیح بخاری میں بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے کہ:

(٩٠) رسول اللہ ﷺ نے بدر والے دن فرمایا: یہ جبریل ہیں' اپنے گھوڑے کو سر سے پکڑے ہوئے ہیں' اور جنگی آلات سے لیس ہیں۔ (صحیح بخاری: ٣٩٩٥)

زیرِ بحث قول کے صحیح ہونے پر اس بات سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیت: ١٢٣ میں فرمایا ہے کہ ''اللہ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی جب کہ تم (بالکل) بے سروساماں تھے'' اس کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد اس وقت فرمائی جب نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: ''اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ'' (کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے)۔ پھر یہ بات بھی زیرِ بحث قول کی تائید کرتی ہے کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی اور مدد کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔

اختلاف مذکور میں مفسرین کا دوسرا قول اور اس پر دلائل

(٢) دوسرا قول یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں فرشتوں کو نازل کرنے کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ غزوۂ احد میں پورا ہوا۔ حضرت عکرمہ' ضحاک اور مقاتل کا یہی قول ہے۔ عمیر بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کے دن لوگ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے' لیکن حضرت سعد بن مالک[٢] رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیراندازی کرتے رہے۔ ایک نوجوان اُنہیں تیر دیئے جا رہا تھا[٣] جیسے ہی تیر ختم ہوتے وہ مزید لا کر اُن کے آگے پھیلا دیتا اور دوبارہ کہتا: اے ابواسحٰق! تیراندازی جاری رکھو۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو حضرت سعد بن مالک سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں اُسے نہیں پہچانتا۔ (دلائل النبوت للبیہقی ج ٣ ص ٢٥٦)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٩١) میں نے غزوۂ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے جو سفید لباس میں ملبوس تھے۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے (کافروں کے ساتھ) بہت سخت قتال کر رہے تھے کہ میں نے اُنہیں نہ اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں۔ حضرت سعد کی مراد جبریل اور میکائیل ہیں۔ (صحیح بخاری: ٤٠٥٤' صحیح مسلم: ٢٣٠٦' مسند احمد ج ١ ص ١٧١)

زیرِ بحث قول کے صحیح ہونے پر اس بات سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ غزوۂ بدر میں جو مدد نازل ہوئی تھی وہ ایک ہزار فرشتوں کی شکل میں تھی جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت: ٩) میں اس کی صراحت موجود ہے' تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتے نازل نہیں ہوئے تھے جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں ہے۔ نیز اس بات سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ بدر میں کفار ایک ہزار یا اس کے قریب تھے جبکہ مسلمان ایک تہائی تھے' یعنی تین سو دس اور کچھ کم تعداد میں تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدر والے دن کافروں کی تعداد

[٢] یہ وہی سعد بن مالک ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: ''یاسعد ارم فداک ابی و امی''۔ اے سعد! تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں' تم تیراندازی کیے جاؤ۔ (صحیح بخاری: ٢٩٠٥' صحیح مسلم: ٢٤١١)

[٣] قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمۃ نے صراحت کی ہے کہ جبریل امین اُنہیں تیر دیئے جا رہے تھے۔ (تفسیر المظہری' زیرِ بحث آیت)

کے مقابلہ میں ایک ہزار فرشتے نازل فرمائے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کفار شکست کھا گئے۔ احد والے دن معاملہ یہ تھا کہ مسلمان ایک ہزار تھے اور کافر تین ہزار تھے۔ اس لیے مناسب یہ تھا کہ اس دن مسلمانوں کی مدد تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ ہوتا کہ غزوۂ بدر کی طرح فرشتوں کی تعداد کافروں کی تعداد کے برابر ہو جائے۔

دوسرے قول پر دیئے گئے دلائل کے جوابات

اس قول پر جو پہلی دلیل دی گئی ہے اس کا جواب[٤٧] یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں اوّلاً ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی جیسا کہ سورۂ انفال میں مذکور ہے' پھر جب صحابہ کرام نے کرز کی جانب سے کفار قریش کی امداد کا سنا اور ان پر یہ خبر شاق گزری تو اُن سے تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا تا کہ اُن کا دل مضبوط رہے۔ دوسری دلیل جو قول مذکور پر دی گئی کہ ''بدر میں کفار ایک ہزار تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتے نازل فرمائے اور غزوۂ احد میں کفار تین ہزار تھے اس لیے تین ہزار فرشتے نازل فرمائے'' اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تقریب حسن ہے (یعنی یہ تقاضائے عقل و قیاس بات اچھی ہے) لیکن اللہ تعالیٰ جس وقت جس چیز میں چاہے اضافہ فرما دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عکرمہ نے ارشادِ باری تعالیٰ (بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ) کے بارے میں کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے بدر والے دن فرمایا۔ مزید کہا کہ احد والے مسلمانوں نے صبر اور تقویٰ کا مظاہرہ نہیں کیا اس لیے ان کو مدد نہیں ملی۔ اگر مدد ملی ہوتی تو اس دن شکست نہ ہوتی۔

اختلاف مذکور میں مفسرین کا تیسرا قول اور اس کے دلائل

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے صبر اور تقویٰ کا مظاہرہ صرف غزوۂ احزاب میں کیا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے (غزوۂ احزاب میں) فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی ایسی مدد فرمائی کہ انہوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(٩٢) رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ خندق سے واپس تشریف لائے اور ہتھیار اُتار کر غسل فرمایا تو جبریل حاضر ہوئے اور عرض کی: آپ نے ہتھیار اُتار دیئے حالانکہ خدا کی قسم! ہم نے ابھی تک نہیں اتارے۔ آپ ان کی طرف چلیے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کس طرف؟ جبریل نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس طرف چلنا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ بنو قریظہ کی طرف تشریف لے گئے۔ (صحیح بخاری: ٤١١٧)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٩٣) رسول اللہ ﷺ جب بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے تو بنی غنم کے گلی کوچوں میں مجھے جبریل کے ساتھ چلنے والے گھڑ سواروں کا گرد و غبار بلند ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ (صحیح بخاری: ٤١١٨)

عبداللہ بن ابی اوفیٰ بیان کرتے ہیں کہ:

(٩٤) جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہم بنو قریظہ اور بنو نضیر کا محاصرہ کیے رہے لیکن ہمیں فتح نہیں ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے پانی منگوایا اور اس سے آپ اپنا سر دھونے لگے۔ اسی دوران جبریل آ گئے اور کہا کہ کیا آپ لوگوں نے اپنے ہتھیار اتار دیئے؟ حالانکہ فرشتوں نے اپنے ہتھیار نہیں اتارے۔ رسول اللہ ﷺ نے کپڑے کا ایک ٹکڑا منگوا کر اُسے اپنے سر پر لپیٹ دیا اور سر کو

[٤٧] پہلی دلیل سے مراد وہ دلیل ہے جو چند سطور قبل مذکور ہوئی کہ ''زیر بحث قول کے صحیح ہونے پر اس بات سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ غزوۂ بدر میں جو مدد نازل ہوئی تھی وہ ایک ہزار فرشتوں کی شکل میں تھی''۔ (الیٰ آخرہ)

(مکمل) نہیں دھویا۔ پھر آپ نے ہمیں ندا فرمائی تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور بنو قریظہ اور بنو نضیر کی طرف آئے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ ہماری مدد فرمائی اور ہمیں بہت آسان فتح عطا فرمائی۔ (جامع البیان للطبری زیر بحث آیت)

مذکورہ اقوال میں امام ابن جریر طبری کا فیصلہ

امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ تمام اقوال میں جو قول صحت اور درستگی کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کے متعلق بتایا کہ انہوں نے مسلمانوں سے فرمایا: ''اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُنْزَلِیْنَ'' (کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے)۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے (اوّلاً) تین ہزار فرشتوں کی مدد کا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا پھر صبر اور تقویٰ کی شرط پر پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ فرمایا۔ لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مسلمانوں کو یہ مدد ملی یا نہیں ملی اس پر آیت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مدد نازل فرمائی ہو اور ہوسکتا ہے نازل نہ فرمائی ہو۔ اب اس بات کا ثبوت صرف اُسی نص سے ہوسکتا ہے جو اس باب میں قابل حجت ہو۔ چنانچہ قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے کہ بدر والے دن مسلمانوں کو ایک ہزار فرشتوں کی مدد ملی جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت:٩) میں ہے۔ جبکہ غزوۂ احد میں امداد ملنے کی بہ نسبت امداد نہ ملنے پر آیت کو دلیل بنانا زیادہ واضح ہے کیونکہ اگر غزوۂ احد میں مسلمانوں کو مدد ملی ہوتی تو شکست اور دیگر نقصانات نہ ہوتے۔ (جامع البیان للطبری زیر بحث آیت)

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی جو حدیث غزوۂ احد کے بارے میں ابھی ذکر کی گئی ہے کہ ''انہوں نے نبی اکرم علیہ السلام کے دائیں اور بائیں دو فرشتے (قتال کرتے ہوئے) دیکھے'' اس کا کیا جواب ہوگا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہ (اہتمام) صرف نبی اکرم علیہ السلام کے لیے تھا کیونکہ آپ نے صبر کا (بھرپور) مظاہرہ فرمایا تھا اور صحابہ کی طرح آپ کو پسپائی نہیں ہوئی تھی۔

آیت مذکورہ:١٢٤ کی تفسیر

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ﴾ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے متعلق ہے ان کے نزدیک اس کا تعلق ''ولقد نصرکم اللہ ببدر'' (آیت:١٢٣) سے ہے۔ اور نظم آیت یوں ہے کہ: یقیناً اللہ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی جب کہ تم (بالکل) بے سروسامان تھے۔ اس وقت (اے محبوب!) آپ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے۔ جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آیت غزوۂ احد کے متعلق ہے ان کے نزدیک نظم آیت اس طرح ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے احد کا واقعہ بیان فرمایا پھر اس کے بعد ''ولقد نصرکم اللہ ببدر'' نازل فرما کر یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح بدر میں تمہاری مدد فرمائی اسی طرح وہ تمام مواقع پر تمہاری مدد فرمائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت (اذ تقول للمؤمنین) میں دوبارہ قصۂ احد کو بیان فرمایا۔

آیت مبارکہ میں جو ''لَنْ یَّكْفِیَكُمْ'' کا لفظ ہے یہ ''کفایة'' سے مشتق ہے اور ''کفایة'' کا معنیٰ ہے: کسی کی ضرورت پوری کرنا اور معاملات کی اس طرح ذمہ داری لینا کہ مقصد حاصل ہو جائے۔ ''ان یمدکم'' کا جو لفظ ہے وہ ''امداد'' سے مشتق ہے اور ''امداد'' کا معنیٰ ہے: لشکر کی مدد کرنا[۵۷]۔ امداد کی دو صورتیں ہیں: (١) وہ امداد جو قوت اور تعاون کے طور پر ہو اس کے

[۵۷] امداد کا مکمل معنیٰ ہے: لشکر کی لشکر کے ذریعے مدد کرنا۔ تفسیر مظہری میں اسی طرح ہے اور بغوی کے جدید نسخہ میں بھی اسی طرح کر دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے علامہ خازن نے مکمل معنیٰ تحریر کیا ہو اور کاتب کے سہو سے وہ نامکمل رہ گیا ہو۔

لیے ''امد یمد امداد'' استعمال کرتے ہیں۔(۲)وہ جو اضافہ کے طور پر ہو اس کے لیے ''مد یمد مدا'' استعمال کرتے ہیں۔
بعض کا قول یہ ہے کہ ''مد'' کا استعمال شر کے لیے اور امداد کا استعمال خیر کے لیے ہوتا ہے۔

آیت میں جو فرمایا: ''تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا'' یہ وعدہ اس لیے فرمایا تا کہ مسلمانوں کے دل مضبوط ہوں' انہیں اللہ عزوجل کی مدد کا یقین حاصل ہو اور وہ ثابت قدمی کا عزم کریں۔

آیت مذکورہ:١٢٥ کی تفسیر

﴿ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا ﴾ (ہاں کیوں نہیں! بشرطیکہ تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔) اس میں ''بَلٰٓى'' کا لفظ وعدۂ الٰہی کی تصدیق کے لیے ہے۔یعنی ہاں کیوں نہیں ہم تمہاری مدد کریں گے۔بعض علماء کے نزدیک ''بلٰی'' کا لفظ ''ألن یکفیکم'' کے ایجاب کے لیے ہے۔یعنی ہمارا فرشتوں کو مدد کے لیے بھیجنا تمہارے لیے کافی ہوگا۔سو یہاں ''بلٰی'' فرما کر اللہ تعالیٰ نے مدد کے کافی ہونے کو لازمی فرما دیا۔

﴿ اِنْ تَصْبِرُوْا ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم اپنے دشمن سے ملنے کے موقع پر صبر کرو۔﴿ وَتَتَّقُوْا ﴾ اور اللہ کی نافرمانی اور نبی اکرم ﷺ کی مخالفت سے بچو۔﴿ وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا ﴾ اور (اسی دم) تمہارے پاس مشرکین آ جائیں۔''من فورهم هذا'' کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جس کام کے لیے یہ (لفظ ''فوز'') استعمال ہوتا ہے اس کا آغاز بتاتا ہے' پھر وہ کام دوسرے کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے[٦] لہٰذا جن مفسرین نے ''من فورهم'' کا معنیٰ ''من وجههم'' کیا ہے (یعنی مشرکین تمہارے پاس اسی طرح آ جائیں) ان کی مراد ابتداء مخرج ہے' یعنی بدر والے دن جہاں سے مشرکین نکلے تھے وہیں سے اگر وہ تمہارے پاس آ جائیں۔اور جن مفسرین نے ''من فورهم'' کا معنیٰ ''من غضبهم'' سے کیا ہے (یعنی مشرکین غصہ سے تمہارے پاس آ ئیں) اس سے مراد یہ ہے کہ بدر والے دن ان کو اپنے مقتولین کی وجہ سے جو غصہ تھا اس کی وجہ سے وہ اگر تمہارے پاس آ جائیں۔اس معنیٰ کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین احد والے دن بدر والے غصہ کی وجہ سے لڑائی کرنے آئے تھے۔

﴿ يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴾ (تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا۔) یہاں علیحدہ پانچ ہزار فرشتے مراد نہیں ہیں بلکہ پہلے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ ملا کر کل پانچ ہزار فرشتے ہیں۔لہٰذا جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ امداد بدر والے دن نازل ہوئی تھی وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی (اولاً) ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ مدد فرمائی پھر جب مسلمانوں نے کرز بن جابر المحاربی کے بارے میں سنا کہ وہ مشرکین کی امداد کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں پر یہ بات شاق گزری تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے۔نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان اس صورت میں تھا جب مشرکین کو (کرز بن جابر کی طرف سے) مدد پہنچے۔لیکن جب ان کو مدد نہیں پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کی صرف ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ مدد فرمائی۔

امام ابن جوزی نے اپنی تفسیر میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کیا ہے کہ:

(۹۵) حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بیان کیا کہ میں بدر کے کنویں سے پانی نکال رہا تھا کہ اس دوران آتی

---

[٦] اس قاعدہ کی وضاحت تفسیر ابن جریر میں مذکور ہے۔امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ لفظ فور کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ ایسے کاموں کا آغاز بتانے کے لیے آتا ہے جو شروع ہو کر مسلسل ہوتے رہیں۔جب ہانڈی میں جوش کا آغاز ہوتا ہے اور پھر مسلسل وہ جوش مارتی رہتی ہے تو عربی میں کہا جاتا ہے: فارت القدر. (یعنی ہانڈی اُبل رہی ہے۔)

تیز ہوا چلی کہ اس سے زیادہ تیز ہوا میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر ایک اور تیز ہوا چلی' وہ اتنی تیز تھی کہ پہلی کے علاوہ اس سے زیادہ تیز میں نے کوئی ہوا نہیں دیکھی تھی' پھر ایک اور تیز ہوا چلی' وہ اتنی تیز تھی کہ اس سے پہلی ہوا کے علاوہ اس سے زیادہ تیز ہوا میں نے کوئی نہیں دیکھی تھی۔ پہلی ہوا جو چلی تھی وہ جبریل تھے' وہ دو ہزار فرشتے لے کر اترے تھے۔ اور وہ سب کے سب نبی اکرم ﷺ کے سامنے تھے۔ دوسری ہوا میکائیل تھے' وہ بھی دو ہزار فرشتے لے کر اترے تھے اور وہ سب نبی اکرم ﷺ کی دائیں جانب تھے۔ تیسری ہوا اسرافیل تھے۔ وہ ایک ہزار فرشتے لے کر اترے تھے اور وہ سب نبی اکرم ﷺ کی بائیں جانب تھے۔ میں بھی رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب تھا۔ آپ کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ نے شکست خوردہ بنایا۔

بعض علماء نے فرشتوں کی قلیل اور کثیر تعداد کو یکجا کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے اور یہاں (زیر بحث آیات میں) تین ہزار اور پانچ ہزار کا ذکر فرمایا ہے۔ ان سب کا مجموعہ نو ہزار ہوا۔ اگر ہم فرشتوں کے نزول کو غزوۂ احد سے متعلق کریں تو اس میں مجموعہ آٹھ ہزار بنتا ہے کیونکہ غزوۂ اُحد کے لیے تنہا ایک ہزار کا تذکرہ نہیں ہے۔ (جیسا کہ غزوۂ بدر میں سورۂ انفال:۹ میں ہے۔ لہٰذا راجح یہی ہے کہ فرشتوں کی صورت میں نازل ہونے والی مدد کا تعلق غزوۂ بدر سے ہے۔)

زیر بحث آیت میں مذکور لفظ ''مسومین'' کی قرأت اور اس کی تفسیر میں اقوال

زیر بحث آیت کے اختتام پر جو ﴿مُسَوِّمِیْنَ﴾ کا لفظ ہے اس میں واؤ کو زبر اور زیر دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔

(۱) جنہوں نے زبر کے ساتھ پڑھا ہے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نشان والا بنایا۔ ''سومة'' اور ''سیما'' کا معنیٰ علامت ہے۔ اور یہ علامت وہ ہوتی ہے جو گھڑسوار اپنے آپ پر جنگ والے دن پہچان کے لیے لگا لیتے ہیں۔ عنترہ کا شعر ہے:

فتعرفونی اننی انا ذلکم شاکی سلاح فی الحوادث معلم

''تم لوگ تو مجھے پہچانتے ہی ہو کہ میں وہی شخص ہوں جو مشکلات میں مسلح اور نشان زدہ ہوتا ہے''۔

(۲) جن ائمہ نے ''مسوّمین'' کو واؤ کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے نشان لگانے کی نسبت فرشتوں کی طرف کی ہے۔ یعنی جو فرشتے نازل ہوئے تھے وہ اپنے آپ پر مخصوص علامات لگائے ہوئے تھے یا اپنے گھوڑوں پر نشانات لگائے ہوئے تھے۔

وہ نشان اور علامت کیا تھی؟ اس بارے میں اقوال مختلف ہیں: (۱) حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فرشتے چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے اور زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے۔ (۲) حضرت علی اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) فرماتے ہیں کہ فرشتے سفید عمامے باندھے ہوئے تھے اور کندھوں کے درمیان شملہ لٹکائے ہوئے تھے۔ (۳) ہشام بن عروہ اور کلبی کہتے ہیں کہ فرشتے زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے اور کندھوں پر شملہ لٹکائے ہوئے تھے۔ (۴) قتادہ اور ضحاک فرماتے ہیں کہ فرشتے اپنے گھوڑوں کی پیشانیوں اور دُموں میں عہن یعنی رنگین اُون لگائے ہوئے تھے۔ مروی ہے کہ بدر والے دن نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

(۹۶) تم بھی نشان زدہ ہو جاؤ کیونکہ فرشتے اپنی ٹوپیوں اور خودوں میں سفید اُون لگائے ہوئے ہیں۔ ☆ اس حدیث کو امام بغوی نے بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی' جامع البیان للطبری' مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۶۶۵۷۔ ج ۱۴ ص ۳۵۸)

(۵) بعض کا قول یہ ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدر والے دن زرد رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے تو فرشتے بھی اسی رنگ کے عمامے میں نازل ہوئے۔ (۶) بعض کا قول یہ ہے کہ فرشتے اپنے آپ پر جنگ کی علامت (ہتھیار وغیرہ)

لگائے ہوئے تھے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾

اور اللہ نے اس (امداد) کو تمہارے لیے صرف خوش خبری بنایا ہے اور اس لیے تا کہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں اور (درحقیقت) مدد تو صرف اللہ کی جانب سے ہے جو بہت غلبہ والا حکمت والا ہے ○

آیت مذکورہ کی تفسیر میں اس بات کی وضاحت کہ مدد صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے

﴿مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے نزول کے وعدہ اور مدد کو تمہارے لیے بشارت بنایا ہے۔ بشارت اس طرح کہ تمہیں مدد ملے گی تو تم اس سے خوش رہو گے۔ ﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمہارے دلوں کو اس (مدد) سے ایسا سکون حاصل ہو کہ دشمن کی کثرت اور اپنی تعداد کی کمی سے دل میں کوئی گھبراہٹ نہ ہو۔ ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ فرشتوں کو لشکر کو اور تعداد کی کثرت کو دارومدار نہ سمجھو کیونکہ حقیقی مدد اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے غیر کی جانب سے نہیں ہوتی۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ صحابہ کرام کا توکل اور بھروسا اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے نہ کہ ان فرشتوں پر جن کے ذریعہ مدد کی گئی۔ اس میں اس بات پر بھی تنبیہ مقصود ہے کہ اسباب سے اعراض کر کے مسبب الاسباب کی طرف توجہ کی جائے۔[۶] آیت میں جو ﴿الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل سے مدد مانگو اور اس پر بھروسہ کرو کیونکہ "عـــزّ" یعنی بھرپور طاقت و اختیار اور "حکم" یعنی کمال علم اُسی کے پاس ہے اس لیے بندوں کی ضروریات اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

(یہ مدد اس لیے تھی) تا کہ اللہ کافروں کے ایک گروہ کو (جڑ سے) کاٹ دے یا اُنہیں رُسوا کر دے۔ نتیجۃً وہ ناکام و نامراد واپس ہوں ○

آیت مذکورہ کا گذشتہ آیت سے تعلق اور تفسیر

یہ آیت مبارکہ "ولقد نصر کم الله ببدر" (آیت:۱۲۳) سے متعلق ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری جو مدد فرمائی وہ اس لیے تھی تا کہ اللہ کافروں کی ایک طرف یعنی ان کے گروہ کو کاٹ دے۔ بعض کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ تا کہ وہ قتل اور قید کے ذریعہ شرک کے ستونوں میں سے ایک ستون گرا دے۔ چنانچہ بدر والے دن مشرکین کے ۷۰ سردار مارے گئے اور ۷۰ کو قید کر لیا گیا۔ جن مفسرین نے اس آیت کو غزوۂ احد کے ساتھ متعلق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مشرکین کے ۱۶ سردار مارے گئے اور مسلمانوں کو اس وقت تک مدد ملتی رہی جب تک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت نہیں کی۔

آیت میں جو ﴿اَوْ يَكْبِتَهُمْ﴾ فرمایا یہ "کَبْتٌ" سے ہے اور "کبت" کا لغت میں بنیادی معنیٰ ہے: کسی چیز کو مُنہ کے بل

---

[۶] علامہ خازن کا یہ نظریہ محلِ نظر ہے۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اُمور کے لیے جو اسباب پیدا فرمائے ہیں اُن کو اپنی کوشش اور استطاعت کے مطابق کام میں لایا جائے اور نتیجہ اللہ عزوجل کی ذات پر چھوڑ دیا جائے۔ یہی توکل کا صحیح مفہوم ہے۔ اسباب سے اعراض کرنا توکل نہیں ہے۔

گرا دینا۔ یہاں معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کو (میدان میں) مُنہ کے بل گرائے گا۔ یعنی مشرکین قتل ہوں گے اور شکست کھائیں گے۔ یا ہلاک کر دیئے جائیں گے یا ملعون اور رسوا ہوں گے۔ ﴿فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ﴾ پھر وہ نقصان کے ساتھ اس حال میں واپس ہوں گے کہ اُنہیں تم پر فتح حاصل کرنے کی جو آرزو ہے وہ قطعاً پوری نہیں ہوگی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿١٢٨﴾

یہ معاملہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے' اللہ (چاہے تو) ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو انہیں عذاب دے' پس بے شک وہ ظالم ہیں O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مفسرین کا اختلاف اور اس سلسلے میں پہلے قول پر دلائل

اس آیت کے واقعۂ نزول میں اختلاف ہے: (ا) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ بئر معونہ والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ کُل ٧٠ قُراء صحابہ تھے' ان کو رسول اللہ ﷺ نے بیر معونہ کی طرف بھیجا تھا (یہ مکہ اور عسفان اور مقام ہذیل کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے)۔ یہ واقعہ ہجرت کے چوتھے سال غزوۂ احد کے چار ماہ بعد صفر کے مہینے میں پیش آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان صحابہ کو اس لیے بھیجا تھا تا کہ وہ لوگوں کو قرآن کریم اور علم سکھائیں۔ حضرت منذر بن عمرو کو آپ نے ان صحابہ کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ (یہ تمام صحابہ جب وہاں پہنچے) تو عامر بن طفیل نے ان کو شہید کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس سانحہ سے شدید رنج پہنچا اور ایک ماہ تک آپ تمام نمازوں میں قنوت پڑھتے رہے' جس میں آپ ان قبیلوں والوں کے خلاف لعنت کی دُعا فرماتے تھے۔[٧٧]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(٩٧) انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فجر کی آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے وقت یہ کہتے ہوئے سنا: ''اللھم العن فلانا وفلانا وفلانا'' (اے اللہ! فلاں' فلاں اور فلاں پر لعنت فرما)۔ یہ جملہ آپ ''سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد'' کے بعد کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

(صحیح بخاری: ٤٠٦٩' سنن بیہقی ج ٢ ص ١٩٨' سنن کبریٰ للنسائی: ١١٠٧٦' مسند احمد ج ٢ ص ١٤٧)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(٩٨) رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت سے سر اقدس اٹھاتے تھے تو یوں کہتے تھے: اے اللہ! ولید بن ولید' سلمہ بن ہشام' عیاش بن ابی ربیعہ اور مکہ کے کمزوروں کو نجات عطا فرما۔ اے اللہ! (قبیلہ) مضر کو سختی سے روند دے اور ان پر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ کی طرح قحط کے سال مسلط فرما۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: اے اللہ! فلاں فلاں قبائل عرب پر لعنت فرما۔ یہ دُعا آپ آیت مبارکہ: ''لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ'' کے نازل ہونے تک فرماتے رہے۔ یونس کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبائل کے نام لے کر کہا: اے اللہ! رِعل' ذکوان اور عُصَیہ پر لعنت فرما' جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی۔ راوی (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہتے ہیں کہ پھر ہمیں پتا چلا کہ جب آیت مبارکہ ''لیس لک من الامر شیئی'' نازل ہوئی تو آپ نے اس دُعا کو ترک فرمادیا۔ (صحیح بخاری: ٤٥٦٠' صحیح مسلم: ٦٧٥' سنن ابوداؤد: ١٤٤٢' سنن

[٧٧] بعض کتابوں میں اس طرح کے مقام پر ''بددُعا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور تقاریر میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ قابلِ اصلاح ہے۔ ہر وہ مقام جہاں نبی اکرم ﷺ نے کسی کے لیے ہلاکت کی دُعا فرمائی ہے اُس کو بددُعا سے تعبیر کرنے کی بجائے یوں کہنا اور لکھنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے فلاں کے خلاف دُعا فرمائی' یا فلاں کے لیے ہلاکت اور بربادی کی دُعا فرمائی یا اس طرح کے دیگر جُملے جن میں نبی اکرم ﷺ کی دُعا کی طرف ''بد'' کی نسبت نہ ہو۔

نسائی:۴۷۰۱، سنن ابن ماجہ:۴۴۲۲، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۵، سنن بیہقی ج ۲ ص ۱۹۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۲۸۸۔ ص ۱۱۳)

اختلاف مذکور میں دوسرے قول پر دلائل

(۲) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ غزوۂ احد کے دن نازل ہوئی تھی۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس دن کیوں نازل ہوئی تھی؟ بعض کہتے ہیں کہ عتبہ بن ابی وقاص نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کو زخمی کر دیا تھا اور آپ کی چوکڑی کو شہید کر دیا تھا۔ اس لیے آیت نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۹۹) رسول اللہ ﷺ کی چوکڑی کو شہید کر دیا گیا اور سر انور زخمی ہو گیا تو آپ اپنا خون پونچھنے لگے۔ اور آپ یہ فرما رہے تھے کہ جس قوم نے اپنی نبی کو زخمی کر دیا ہو اور اس کی چوکڑی کو شہید کر دیا ہو وہ کیسے فلاح پا سکتی ہے۔ اس دوران آپ کافروں کے لیے ہلاکت کی دُعا فرما رہے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ ''لیس لک من الامر شیئی'' نازل فرمائی۔[۸ے]

(صحیح مسلم:۱۷۹۱، سنن ترمذی:۳۰۰۲، سنن ابن ماجہ:۴۰۲۷، مسند احمد ج ۳ ص ۲۸۸، مشکوٰۃ المصابیح:۵۸۴۹۔ ص ۵۲۳)

بعض کا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے (غزوۂ احد کے موقع پر) کافروں کی مکمل ہلاکت کے لیے دعا کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ اور اس لیے نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان میں اکثر لوگ اسلام لے آئیں گے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ (غزوۂ احد سے فارغ ہونے کے بعد) جب اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے اور کفار نے جو مُثلہ کیا تھا اس کو ملاحظہ فرمایا تو آپ نے کافروں کی ہلاکت کے لیے دُعا کرنے کا ارادہ فرمایا، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ علماء فرماتے ہیں کہ ان تمام واقعات کا پیش آنا ممکن ہے، اس لیے ان میں سے کسی بھی واقعہ کو زیر بحث آیت کا واقعۂ نزول بنانا بعید از عقل نہیں ہے۔

زیر بحث آیت میں ''لیس لک من الامر شیئی'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ میرے بندوں کے معاملات میں آپ صرف وہی کچھ کر سکتے ہیں جس کی میں آپ کو وحی کر دوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے معاملات کا مالک ہے، وہ (چاہے تو) اُن کی توبہ قبول فرما کر اُنہیں ہدایت دے جس کے نتیجہ میں وہ اسلام لے آئیں اور (چاہے تو) ان کے کفر پر ڈٹے رہنے کی صورت میں اُنہیں تباہ کر دے اور ان پر عذاب نازل فرمائے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''لیس لک من الامر شیئی'' کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ کو (اس بات کا حق) نہیں ہے کہ آپ کافروں کی ہلاکت کی دُعا کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے معاملات کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس لیے وہ اُن میں سے جس کی چاہے توبہ قبول فرما سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک معنیٰ یہ ہے کہ میری مخلوق کے معاملات میں آپ صرف وہی کچھ کر سکتے ہیں جو میرے حکم کے مطابق ہو۔ کیونکہ آپ کو صرف کفار کے ڈرانے اور اُن سے جہاد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں ﴿اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ کا جملہ گذشتہ آیت میں ''لِيَقْطَعَ طَرَفًا'' پر معطوف ہے۔ اور ''لیس لک من الامر شیئی'' کا جملہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترض ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے:

۸ے علامہ خازن نے اس حدیث کو متفق علیہ قرار دیا ہے۔ لیکن جس پس منظر کے ساتھ یہاں یہ حدیث علاّمہ نے ذکر کی ہے اس کے ساتھ صحیح بخاری میں مجھے نہیں ملی۔ البتہ صحیح بخاری کی روایات میں نبی اکرم ﷺ کی چوکڑی مبارک کے شہید ہونے اور خون پونچھنے کا ذکر موجود ہے۔

لیقطع طرفا من الذین کفروا أو یکبتھم أو یتوب علیھم أو یعذبھم فانھم ظالمون لیس لک من الامر شیئی (بل الامر أمری فی ذالک کلّه).

(فرشتوں کے ذریعہ مدد اس لیے تھی) تا کہ اللہ کافروں کے ایک گروہ کو کاٹ دے یا اُنہیں رُسوا کر دے یا اُن کی توبہ قبول فرمالے یا اُنہیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ یہ معاملات آپ کے ہاتھ میں نہیں ہیں' بلکہ ان سب معاملات میں میرا ہی حکم کارفرما ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو کافروں کے بارے میں دُعائے ہلاکت سے منع کرنے کی حکمت

نبی اکرم ﷺ کو کافروں کے خلاف دُعا کرنے اور اُن پر لعنت کرنے سے منع کیوں کیا گیا؟ اس کی حکمت بعض علماء نے یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ بعض کافر اسلام لے آئیں گے اور وہ ان کی توبہ قبول فرمالے گا یا ایسا ہوگا کہ بعض کافروں کے ہاں ایسی اولاد ہوگی جو نیک مسلمان اور پرہیز گار ہوگی۔ اس حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو کافروں کے لیے ہلاکت کی دُعا کرنے سے منع فرمایا' کیونکہ آپ ﷺ کی دُعا مقبول ہوتی ہے' اگر آپ ہلاکت کی دُعا فرماتے تو سارے کافر ہلاک ہو جاتے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے علم ازلی کا تقاضا یہ تھا کہ کفار باقی رہیں تا کہ بعض کی وہ توبہ قبول فرمائے اور بعض کے ہاں نیک مسلمان اولاد پیدا فرمائے اور بعض کو قتل اور موت کے ذریعہ ہلاک فرمائے۔ جیسا کہ آیت میں ﴿أَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ ''أو یعذّبھم'' میں جس عذاب کا تذکرہ ہے اس سے دنیا اور آخرت (دونوں کا) عذاب مراد ہو۔ دنیا کے عذاب سے قتل اور قید ہونا مراد ہے اور آخرت کے عذاب سے جہنم کا عذاب مراد ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿فَإِنَّهُمْ ظَٰلِمُونَ﴾ (بے شک وہ ظالم ہیں) اس میں گویا اُن کو عذاب دیئے جانے کا سبب بیان کیا جا رہا ہے یعنی اُنہیں عذاب اس لیے ہوگا کہ وہ ظالم ہیں۔

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٩﴾

اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمینوں میں ہے (سب) اللہ ہی کا ہے' وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ نہایت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے O

آیت مذکورہ کا گذشتہ آیت سے تعلق اور تفسیر

﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ یہ گذشتہ آیت میں ''لیس لک من الامر شیئی'' کی تاکید ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ حکم صرف اُس کا ہونا چاہیے جس کی ملکیت میں آسمان و زمین کی تمام چیزیں ہوں۔ اور وہ ذات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ کسی اور کا حکم نہیں ہے۔ ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم اور رحمت سے جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ ﴿وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ﴾ اور اپنے عدل سے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ (خلاصہ یہ ہے کہ) لوگوں کے لیے وہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔ اُس کے فیصلہ میں کوئی اس سے اختلاف نہیں کرسکتا اور اس کے کاموں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (اللہ غفور رحیم ہے) ''غفور'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں کو ڈھانپ دیتا ہے اور اُن کو بخش دیتا ہے۔ ''رحیم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ان پر اس طرح مہربانی فرماتا ہے کہ اُنہیں جلد عذاب

نہیں دیتا۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ یہ سب کچھ صرف فضل اور احسان کے طور پر کرتا ہے' نہ یہ بات کہ یہ چیزیں اس پر واجب ہیں' کیونکہ اگر وہ ساری مخلوق کو جنت میں داخل کر دے تو یہ اس کی رحمت ہوگی اور اگر سب کو جہنم میں داخل کر دے تو یہ اس کا عدل ہوگا لیکن (اس کی ذات میں) مغفرت اور رحمت کا حصہ غالب ہے۔[۹]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

اے ایمان والو! دو گنا چوگنا کر کے سُود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤO اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہےO

دوگنا چوگنا سُود کھانے کی ممانعت

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ اللہ تعالیٰ کی مراد اس سے وہ سود ہے جس کا لین دین لوگ زمانۂ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی کے وقت کیا کرتے تھے کہ مال زیادہ دیتے تھے اور مقررہ مدت کو بڑھا دیتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں جب کسی شخص کا کسی پر قرض ہوتا اور مقررہ مدت آجانے پر قرض دار کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہ ہوتی تو قرض خواہ اس سے کہتا کہ میں ادائیگی کی مدت بڑھا دیتا ہوں۔ تم مجھے رقم زیادہ دے دینا۔ اس طرح وہ (ایک ہی لین دین میں) کئی بار مدت بڑھا کر زیادہ رقم کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قرض کی رقم دوگنی چوگنی ہو جایا کرتی تھی۔ اس بات سے اللہ تعالیٰ نے (زیرِ بحث آیت میں) منع فرمادیا اور سود کے ساتھ ساتھ اس کو دوگنا کر کے دینا بھی حرام فرمادیا۔

﴿وَّاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ سود کھانے کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو یعنی سود نہ کھاؤ۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تمہیں آخرت میں اُس کی جانب سے اجر و ثواب سے نوازا جائے۔ (یہاں فلاح و کامیابی کے لیے تقویٰ کو بنیاد اس لیے بنایا گیا کہ) فلاح و کامیابی تقویٰ ہی پر موقوف ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص (سود) کھاتا رہے اور پرہیز گاری اختیار نہ کرے اُسے کامیابی نہیں مل سکتی۔ اس آیت میں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ سود کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ اسی لیے اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے)۔

یعنی اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ کسی بھی چیز کو حلال سمجھنے سے بچو' کیونکہ جس نے اللہ کی حرام کردہ کسی بھی چیز کو حلال سمجھا وہ بالاتفاق دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا اور اس سبب سے وہ جہنم کا بھی مستحق ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سُود اور آگ میں لے جانے والی جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کو حلال سمجھنے سے مسلمانوں کو اس آیت میں ڈرایا جا رہا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ خوف دلانے والی آیت ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوفِ خدا نہ رکھنے اور حرام سے اجتناب نہ کرنے کی صورت میں اُس آگ سے ڈرایا ہے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ امام واحدی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو امید ہوتی ہے اس آیت میں اس کو مضبوط کیا جا رہا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں فرمایا کہ (آگ) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ) آگ کو کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

[۹] جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا فرمایا تو عرش کے اوپر اپنے پاس کتاب میں یہ بات لکھ دی کہ "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے"۔ (صحیح بخاری: ۳۱۹۴' صحیح مسلم: ۵۱:۲۷)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾

اور اللہ اور اس کے رسول کے فرمانبردار رہو تا کہ تم پر رحمت ہو O

﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جن کاموں کا حکم دیا ہے سود اور دیگر جن چیزوں سے منع فرمایا ہے اُن میں اللہ کی فرمانبرداری کرو۔ ﴿وَالرَّسُوْلَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ رسول کی بھی اطاعت کرو۔ کیونکہ اُن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ امام محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اُن مسلمانوں پر عتاب ہے جو اُحد والے دن رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پابندی نہ کر سکے۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ (تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو) تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور عذاب نہ دیا جائے۔ (اللہ کے ساتھ رسول کی اطاعت) اس لیے کہ اللہ کی ایسی اطاعت جس میں رسول کی نافرمانی ہو وہ اطاعتِ خدا نہیں ہے۔

وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٣﴾

اور تم اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے وہ پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے O

آیت مذکورہ میں ''مغفرت'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال

﴿وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (تم اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو۔) یہاں مغفرت سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) اُن اسباب کی طرف سبقت کرو جو تمہارے رب کی جانب سے مغفرت کے حصول کا باعث بنیں۔ وہ اسباب نیک اعمال ہیں جن کے کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ (۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ''الی مغفرة'' کی تفسیر کی ہے: ''الی الاسلام'' (یعنی اسلام کی طرف سبقت کرو) اس معنیٰ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ''مغفرة'' کا لفظ نکرہ کے طور پر ذکر فرمایا ہے لہٰذا اس سے عظیم مغفرت مراد ہے۔ اور عظیم مغفرت صرف اسلام کے ذریعہ مل سکتی ہے کیونکہ اسلام پچھلی تمام خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔ (۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہی ایک معنیٰ ''الی توبة'' بھی مروی ہے (یعنی توبہ کی طرف سبقت کرو)۔ کیونکہ گناہوں سے توبہ کرنا مغفرت کا باعث ہے۔ (۴) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کی طرف دوڑو۔ چونکہ یہاں مغفرت کا لفظ مطلق ہے اس لیے یہ سب باتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ (۵) بعض کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ تمام نیک اعمال کی طرف جلدی کرو۔ ان کی وجہ بھی وہی ہے کہ مغفرت کا لفظ مطلق ہے۔ (۶) حضرت انس بن مالک اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے نماز کی پہلی تکبیر یعنی تکبیر تحریمہ مراد ہے (یعنی پہلی تکبیر پانے کے لیے جلدی کرو)۔ (۷) بعض کے نزدیک اس سے عمل میں اخلاص پیدا کرنا مراد ہے۔ کیونکہ تمام عبادتوں کا مقصد اخلاص ہی ہے۔ (۸) بعض کے نزدیک اس سے ہجرت مراد ہے۔ (۹) اور بعض کے نزدیک جہاد مراد ہے۔

زیر بحث آیت میں مغفرت اور جنت کو علیحدہ بیان کرنے کی توجیہ اور جنت کی چوڑائی کا بیان

﴿وَجَنَّةٍ﴾ کا معنیٰ ہے: ''سارعوا الی جنة'' (جنت کی طرف سبقت کرو) آیت میں مغفرت اور جنت کو علیحدہ علیحدہ بیان کیوں کیا گیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ (ان دونوں کے معنیٰ علیحدہ ہیں) مغفرت کا معنیٰ ہے: عذاب کو ختم کرنا۔ جبکہ جنت اجر

وثواب کے حاصل ہونے کا نام ہے۔ بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جو توبہ مغفرت کا باعث بنتی ہے اس کی طرف سبقت اور جلدی کرنا ضروری ہے اور توبہ کی طرف سبقت کا طریقہ یہ ہے کہ ممنوع کاموں کو ترک کر دیا جائے اور جنت میں لے جانے والے نیک اعمال میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا جائے۔

﴿عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کی چوڑائی کے برابر ہے (نہ یہ معنیٰ کہ آسمان اور زمین جنت کی چوڑائی ہیں) کیونکہ آسمان اور زمین از خود جنت کی چوڑائی نہیں ہیں۔ یہاں ''عـــرض'' سے وسعت مراد ہے (یعنی جنت کی وسعت آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے)۔ طول کے مقابلہ میں عرض کا ذکر مبالغہ کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ کیونکہ عموماً طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ جب جنت کی چوڑائی اتنی زیادہ ہے تو اس کا طول کتنا ہوگا۔ یہاں چونکہ جنت کی وسعت اور کشادگی بیان کرنا مقصود ہے اس لیے اُسے ایسی چیزوں سے مشابہت دے کر بیان کیا گیا جو لوگوں کی معلومات میں سب سے زیادہ کشادہ ہیں (یعنی آسمان اور زمین)۔ مراد یہ ہے کہ اگر آسمانوں اور زمینوں کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک حصہ بنا دیا جائے تو وہ جنت کی چوڑائی کے برابر ہوگا۔ جہاں تک جنت کے طول کا معاملہ ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ چوڑائی سے وسعت اور کشادگی مراد ہے۔ جیسے اہل عرب بڑے بڑے اور کشادہ شہروں کو ''بلاد عریضة'' کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

کـــأن بـــلاد الـــلـــه وهـــي عـــريـــضـة عـــلـــى الـــخـــائـف الـــمـطـلـوب كـفـة حـابـل

''اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ ہونے کے باوجود اُس شخص کے لیے شکاری کے جال کی مانند ہو جاتی ہے جو ڈرا ہوا ہو اور اُسے تلاش کیا جا رہا ہو''۔

''عرض'' کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ جس چیز کا عرض بڑا ہو وہ چیز نہ تنگ ہوتی ہے نہ چھوٹی اور جس کا عرض تنگ ہو وہ چھوٹی ہوتی ہے' اس لیے یہاں جو فرمایا کہ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ اس سے جنت کی کشادگی مراد ہے۔

(۱۰۰) مروی ہے کہ ہرقل بادشاہ نے نبی اکرم ﷺ کو پیغام بھجوایا کہ آپ نے مجھے جو خط لکھا ہے اُس میں آپ نے مجھے اُس جنت کی طرف آنے کی دعوت دی ہے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ سوال یہ ہے کہ دوزخ کہاں ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ (اللہ کی ذات پاک ہے) جب دن آ جاتا ہے تو رات کہاں چلی جاتی ہے!۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۴۴۲' مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۳۵' الدر المنثور ج ۲ ص ۷۲)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کے برابر جنت کی چوڑائی کا حقیقی معنیٰ اللہ تعالیٰ ہی کو زیادہ معلوم ہے' لیکن (بہ ظاہر) اس سے مراد یہ ہے کہ جب آسمان گردش کرتا ہے تو ایک جانب دن ہو جاتا ہے اور دوسری جانب رات ہو جاتی ہے۔ یہی حال بلندی کی جانب میں جنت اور پستی کی جانب میں جہنم کا ہے۔

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آپ کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ یہودیوں نے آپ سے پوچھا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے' تو جہنم کہاں ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ بتاؤ کہ جب رات آتی ہے تو دن کہاں چلا جاتا ہے اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں چلی جاتی ہے؟ یہودیوں نے یہ بات سن کر کہا کہ اسی طرح کی بات تورات میں موجود ہے۔ حضرت عمر کی مراد یہ تھی کہ دن کے وقت رات اور رات کے وقت دن وہاں ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

جنت کی چوڑائی پر ایک اشکال کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ '' (الذاریات:٢٢) ''تمہارا رزق اور جن چیزوں کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ آسمان میں ہے''۔ ''**وما توعدون** '' سے اللہ تعالیٰ کی مراد جنت ہے اور مذہب اہل سنت بھی یہی ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے۔ جب جنت آسمانوں میں ہے تو پھر اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر کیسے ہوگی؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ جنت آسمانوں میں ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جنت آسمانوں کے اوپر عرش کے نیچے ہے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنت کے بارے میں پوچھا گیا کہ جنت آسمان میں ہے یا زمین میں؟ آپ نے فرمایا: کون سی زمین اور آسمان جنت کا احاطہ کرسکتا ہے؟ پوچھا گیا کہ پھر جنت کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: آسمان کے اوپر عرش کے نیچے ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فردوس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی چھت رحمٰن کا عرش ہے۔[80]

(سنن ترمذی: ٢٥٣٠، مسند احمد ج ٥ ص ٣٢١)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ (صحابہ کرام) یہی رائے رکھتے تھے کہ جنت سات آسمانوں کے اوپر ہے اور جہنم سات زمینوں کے نیچے ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جنت کا دروازہ آسمان میں ہے اور جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کی چوڑائی کے برابر ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ اس کا معنٰی یہ ہے کہ جنت پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ جنت اور دوزخ دونوں کو اس وقت پیدا کیا جاچکا ہے۔[81]

الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣٤﴾

(پرہیزگار وہ ہیں) جو خوش حالی اور تنگ دستی میں خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ پینے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے O

آیت مذکورہ میں پرہیزگاروں کی صفات اور اُن صفات میں سب سے پہلے سخاوت کو بیان کرنے کی توجیہ

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ اس میں ''سرّاء'' اور ''ضرّاء'' سے تنگی اور آسانی مراد ہے۔ (یعنی پرہیزگار لوگ) مال داری اور غربت، فراخی اور سختی، خوشی اور آزمائش ان میں سے کسی حالت میں خرچ کرنے کو ترک نہیں کرتے۔ خواہ خوشی کا موقع ہو یا قید کا وہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کو جاری رکھتے ہیں۔

٨٠ یہ الفاظ مجھے کتب حدیث میں نہیں ملے۔ البتہ سنن ترمذی وغیرہ میں یہ ہے کہ فردوس کے اوپر عرش ہے اور بعض روایات میں یہ ہے کہ فردوس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے۔ یہ حدیث بتمام وکمال، سورۃ البقرہ: ٢٥ کی تفسیر میں رقم: ٨٤ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں اس کو مع حاشیہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

٨١ اس سے معتزلہ کے نظریہ کی تردید مقصود ہے۔ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں پیدا فرمائے گا۔ جبکہ اہل سنت کا مؤقف یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمادیا ہے۔ قیامت کے دن ان کو اُن لوگوں کے سامنے ظاہر کیا جائے گا جنہوں نے اپنی زندگی میں ان کو نہیں دیکھا۔ (اہل سنت اور معتزلہ کے دلائل کی تفصیل شرح عقائد اور دیگر کتب عقائد میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔)

پرہیز گاروں کی عادات و اخلاق جو جنت کا باعث ہیں اُن میں سب سے پہلے جو چیز اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی وہ سخاوت ہے۔ کیونکہ سخاوت کرنا نفس پر بہت ہی گراں گزرتا ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ آیت مبارکہ کے نزول کے وقت سب سے زیادہ حاجت اس بات کی تھی کہ مال خرچ کیا جائے' کیونکہ دشمنوں کے ساتھ جہاد اور غریب مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کے لیے مال کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں سخاوت کے فضائل اور بخل کی مذمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱۰۱) سخی آدمی اللہ عزوجل سے قریب ہوتا ہے[۸۲]' لوگوں سے قریب ہوتا ہے' جنت سے قریب ہوتا ہے اور جہنم سے دور ہوتا ہے۔ جبکہ بخیل (کنجوس) اللہ عزوجل سے دور ہوتا ہے' لوگوں سے دور ہوتا ہے' جنت سے دور ہوتا ہے اور جہنم سے قریب ہوتا ہے۔ اور سخی جاہل اللہ تعالیٰ کو کنجوس عابد سے زیادہ پسند ہے[۸۳] (سنن ترمذی ۱۹۶۱' مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۲۷' الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۳۸۱' کنز العمال: ۱۵۹۲۸' الدر المنثور ج ۶ ص ۱۹۷' المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۳۸۴' شعب الایمان للبیہقی: ۱۰۸۵۲۔ ص ۱۶۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۱۰۲) بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال اُن دو آدمیوں کی طرح ہے جن پر چھاتی سے گلے تک لوہے کی زرہ ہو۔ اب خرچ کرنے والے کا حال یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرتا ہے تو زرہ اُس کے جسم پر پھیل جاتی ہے حتیٰ کہ اس کے کپڑوں کو چھپا لیتی ہے اور اس کے نشانات کو مٹا دیتی ہے' جبکہ بخیل کا حال یہ ہے کہ وہ کوئی بھی چیز خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو زرہ کا ہر حلقہ اپنی جگہ چمٹ جاتا ہے' بخیل زرہ کو کشادہ کرنا چاہتا ہے لیکن وہ کشادہ نہیں ہوتی۔

(صحیح بخاری: ۱۴۴۳' صحیح مسلم: ۱۰۲۱' مسند احمد ج ۲ ص ۳۸۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۴۔ ص ۱۶۴)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ ''جُنَّۃ'' ہے' اس کا معنیٰ ہے: لوہے کی زرہ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۰۳) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر روز جب صبح کو لوگ بیدار ہوتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: اے اللہ! تو خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما۔ اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! تو بخیل کو تباہی عطا فرما[۸۴]

(صحیح بخاری: ۱۴۴۲' صحیح مسلم: ۱۰۱۰' مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۰۔ ص ۱۶۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۰۴) اللہ تبارک وتعالیٰ (بندے سے) فرماتا ہے: خرچ کر' تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔

(صحیح بخاری: ۵۳۵۲' صحیح مسلم: ۹۹۳' مسند احمد ج ۲ ص ۲۴۲' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸۶۲۔ ص ۱۶۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

۸۲ اس حدیث شریف میں سخی آدمی کی تعریف اور بخیل کی مذمت کی گئی ہے۔ سخی سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا رہے اور بخیل سے مراد وہ شخص ہے جو واجب اور ضروری مقام پر بھی خرچ نہ کرے۔ (مرقات ج ۴ ص ۳۷۲)

۸۳ یہاں جاہل کا لفظ عابد کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی ایسا شخص جو صرف فرائض کی پابندی کرتا ہو اور عابد اُس کو کہتے ہیں جو فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ نوافل بھی کثرت سے پڑھتا ہو۔

۸۴ یہ حدیث شریف البقرہ: ۲۶۸ کی تفسیر میں رقم: ۳۹۰ کے تحت گزر چکی ہے۔

(١٠٥) جو اللہ کی راہ میں کسی چیز کا جوڑا خیرات کرے گا اُس کو (قیامت کے دن) جنت کے ہر دروازے کے پہرہ دار بلائیں گے: اے فلاں! آؤ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! ایسے شخص کے لیے تو کوئی ہلاکت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ضرور امید رکھتا ہوں کہ وہ شخص تم ہی ہو گے۔ (صحیح بخاری: ١٨٩٧، صحیح مسلم: ١٠٢٧، سنن نسائی: ٢٢٣٩، سنن دارمی: ٢٤٠٣، موطا امام مالک: ١٠٤٣، مسند احمد ج ٢ ص ٣٦٦، مشکوٰۃ المصابیح: ١٨٩٠، ص ١٦٧)

☆ اس حدیث میں ایک جملہ ہے: "أَیْ فُلُ" اس کا معنیٰ ہے: اے فلاں۔ یہ ترخیم نہیں ہے[85] ایک اور جملہ ہے: "لَا تَوٰی عَلَیْہِ" اس میں "توی" کا معنیٰ ہلاکت ہے۔ جملہ کا ترجمہ ہے: ایسے شخص کے لیے کوئی ہلاکت نہیں ہے۔

پرہیز گاروں کی دوسری صفت غصہ کو ضبط کرنا اور اس کی فضیلت میں احادیث

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ (اور وہ غصہ پینے والے ہوتے ہیں۔) یعنی پرہیز گاروں کے دل جب غصہ سے لبریز ہو جاتے ہیں تو وہ اُسے پی جاتے ہیں۔ "کاظمین" "کظم" سے ہے اور "کظم" کا معنیٰ ہے: جب کوئی چیز بھر جائے تو اُسے روک لینا۔ "کظم الغیظ" (یعنی غصہ کو پینا) یہ ہے کہ جب آدمی غصہ سے لبریز ہو جائے تو اپنے اندر اُسے واپس لے جائے اور اپنے قول و فعل سے اس کا اظہار نہ کرے بلکہ صبر اور خاموشی اختیار کرے۔

زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ پرہیز گار لوگ اپنے غصہ کو پورا نہیں کرتے بلکہ اُسے اپنے اندر واپس لے جاتے ہیں (یعنی اُسے ضبط کر لیتے ہیں) اور یہ صفت صبر اور بُردباری کی ایک قسم ہے۔

حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت انس جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٠٦) جس شخص کو غصہ پورا کرنے کی طاقت حاصل تھی اس کے باوجود وہ غصہ کو پی گیا' قیامت کے دن اُس کو اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے سامنے بلائے گا اور اُسے اس بات کا اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ (سنن ترمذی: ٢٠٢١، سنن ابوداؤد: ٤٧٧٧، سنن ابن ماجہ: ٤١٨٦، مسند احمد ج ٣ ص ٤٤٠، شعب الایمان للبیہقی: ٨٣٠٣، مشکوٰۃ المصابیح: ٥٠٨٨، ص ٤٣٢)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٠٧) بہادر وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے (بلکہ) بہادر تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پہ قابو کرے۔ (صحیح بخاری: ٦١١٤، صحیح مسلم: ٢٦٠٩، سنن ابوداؤد: ٤٧٧٩، موطا امام مالک: ١٧٤٧، مسند احمد ج ٢ ص ٢٣٦، مشکوٰۃ المصابیح: ٥١٠٥، ص ٤٣٣)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ اُن کے کسی خادم نے اُنہیں غصہ دلایا' انہوں نے خادم سے کہا: تقویٰ کی خوبی اللہ ہی کے لیے ہے' جس کو غصہ والے کے لیے شفاء بنا دیا گیا ہے[86]

---

٨٥ یعنی "اَیْ فُلُ" اصل میں "اَیْ فُلَانُ" تھا۔ لفظ فلان کے آخر میں بلا ترخیم الف اور نون کو حذف کر دیا گیا۔ بلا ترخیم اس لیے کہ اگر یہ ترخیماً حذف ہوتا تو "اَیْ فُلَانُ" سے "اَیْ فُلَا" ہوتا۔ (عمدۃ القاری ج ١٠ ص ١٥٦)

٨٦ یعنی تقویٰ ایسی باکمال چیز ہے کہ اس سے غصہ والے کا غصہ جاتا رہتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس قول کی عربی یہ ہے: "لله در التقوى ما تركت لذى غيظ شفاء"۔ اس میں "ما تركت" کے "ما" کو ہم نے موصولہ اور "تركت" کو ابقاء کے معنیٰ میں لیا ہے۔ اگر "ما" کو نافیہ لیا جائے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ تقویٰ نے غصہ والے کے لیے کوئی شفاء نہیں چھوڑی۔ یعنی کسی اور چیز میں غصہ کی وہ شفاء اور علاج نہیں ہے جو تقویٰ اور پرہیز گاری میں ہے۔

پرہیزگاروں کی تیسری صفت عفو ودرگزر کی تفسیر اور محسن کے معنیٰ میں مفسرین کے اقوال

﴿ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ﴾ (اور وہ لوگوں سے درگزر کرتے ہیں۔) یعنی اُن سے جب کوئی غلطی کے ساتھ پیش آتا ہے تو وہ اس کی گرفت نہیں کرتے۔ اس تفسیر کی رُو سے یہ جملہ اپنے عموم پر ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں "النـاس" سے غلام مراد ہیں۔ یعنی پرہیزگار لوگ اپنے غلاموں کی بے ادبی سے درگزر کرتے ہیں۔ اس تفسیر کی رُو سے یہ جملہ خاص ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ پرہیزگار لوگ اپنے ظلم کرنے والوں اور بدسلوکی کرنے والوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ تفسیر پہلے قول کے قریب ہے۔

﴿ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ پر جو لام ہے وہ جنس کا بھی ہوسکتا ہے اور عہد کا بھی[۸۷] جنس کی صورت میں "محسنین" کا لفظ ہر نیک آدمی کو شامل ہوگا۔ اور عہد کی صورت میں (صرف) وہ نیک افراد مراد ہوں گے جن کا آیت میں ذکر چل رہا ہے۔

"محسنین" احسان سے ہے اور احسان یہ ہے کہ کسی کو فائدہ پہنچایا جائے یا تکلیف کو دور کردیا جائے۔ بعض مفسرین کے نزدیک احسان یہ ہے کہ جو شخص بدسلوکی کرے اس کے ساتھ حُسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ اور جو پہلے ہی حسن سلوک سے پیش آتا ہو اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا احسان نہیں ہے بلکہ تجارت ہے[۸۸]۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ محسن وہ ہوتا ہے جس کا احسان سورج، بارش اور ہوا کی طرح ہر شخص پر ہو۔ بعض فرماتے ہیں: گنجائش کے مطابق نیکی اور حسن سلوک کرنا یہ بھی احسان ہے، ہر وقت احسان لازم نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ "احسان" وہ صفتیں ہیں جو زیر بحث آیت میں مذکور ہیں۔ جس نے ان کو اپنا لیا وہ محسن ہے۔ چونکہ یہ صفتیں ایسی ہیں جن میں احسان (یعنی حسن سلوک) پایا جاتا ہے اس لیے ان کا اجروثواب یہ کہہ کر بیان فرمایا کہ "اللہ کو احسان کرنے والوں سے محبت ہے" کیونکہ اللہ کا اپنے بندے سے محبت فرمانا اجروثواب کے تمام درجات میں سب سے بڑا درجہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵

اور (پرہیزگار وہ ہیں کہ) جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرلیتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو (فوراً) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے، اور جو (لغزشیں) اُن سے سرزد ہوجاتی ہیں ان کو وہ جانتے بوجھتے بار بار نہیں کرتے ○

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں روایات وواقعات

(۱۰۸) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

۸۷ لام جنس وہ لام ہوتا ہے جس کے مدخول سے اس کی ماہیت اور حقیقت مراد ہوتی ہے اور لام عہد وہ لام ہوتا ہے جس کے مدخول سے اس کی ماہیت اس طور پر مراد ہوتی ہے کہ وہ کچھ مخصوص افراد کے ضمن میں پائی جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ لام جنس کا مدخول اپنی ماہیت کے تمام افراد کو شامل ہوتا ہے اور لام عہد کا مدخول مخصوص افراد کو شامل ہوتا ہے۔

۸۸ یعنی مکافات ہے۔ امام فخر الدین رازی نے حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ تمہارے ساتھ جو نیکی کرے اُس کے ساتھ نیکی کرنا "احسان" نہیں ہے، بلکہ یہ **مکافاۃ** (یعنی بدلہ) ہے۔ احسان یہ ہے کہ تمہارے ساتھ جو بُرائی کرے اُس کے ساتھ تم حسنِ سلوک کرو۔ (تفسیر کبیر، زیر بحث آیت)

یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ کو ہم سے زیادہ بنی اسرائیل پیارے تھے' اُن میں جب کوئی شخص گناہ کرتا تھا تو اس کے گناہ کا کفارہ صبح اس کے دروازہ کی چوکھٹ پر لکھا ہوتا تھا کہ تمہارے ناک کان کٹ جائیں' جاؤ فلاں کام کرو۔ رسول اللہ ﷺ یہ سُن کر خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر بغوی' زیر بحث آیت)

(۱۰۹) عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت نبہان (جو کہ کھجوریں فروخت کیا کرتے تھے) کے بارے میں نازل ہوئی۔ اُن کے پاس ایک خوب صورت عورت کھجوریں خریدنے آئی۔ انہوں نے اس سے کہا کہ یہ کھجوریں عمدہ نہیں ہیں' گھر میں اس سے زیادہ عمدہ کھجوریں موجود ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اُس عورت کو گھر میں لے گئے اور اُسے اپنے سے چمٹا کر بوسہ لے لیا۔ عورت نے اُن سے کہا: اللہ سے ڈرو۔ تو انہوں نے اس کو چھوڑ دیا اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر بغوی)

(۱۱۰) ابو صالح کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری اور ثقفی کے درمیان مواخات قائم فرمائی (یعنی دونوں کو ایک دوسرے کے بھائی بنایا)۔ ایک دن ثقفی کا کسی غزوہ میں جانا ہوا تو وہ اپنے انصاری بھائی کو اپنی اہلیہ کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک دن انصاری گوشت لے کر آیا۔ جب عورت نے گوشت لینا چاہا تو انصاری اس کے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا اور اس کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر اپنے کیے پر شرمندہ ہوا اور وہاں سے چلا گیا' اپنے سر پر خاک ڈالی اور خراب وخستہ حال پھرتا رہا۔ جب ثقفی اپنے سفر سے واپس آیا تو اس نے انصاری کو نہ پایا۔ اپنی بیوی سے معلوم کیا تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ ایسے بھائیوں کی تعداد نہ بڑھائے۔ پھر پورا واقعہ بیان کیا۔ دوسری طرف انصاری پہاڑوں میں توبہ استغفار کرتا پھر رہا تھا' لیکن ثقفی نے اُسے تلاش کر لیا اور اُسے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے کر آیا اس امید پر کہ یہاں اُسے سکون مل جائے اور غم دور ہو جائے۔ انصاری نے (حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے) کہا: میں تباہ ہو گیا' پھر پورا قصہ بیان کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ تم پر افسوس ہے! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاد نہ کرنے والے سے اتنی غیرت نہیں فرماتا جتنی مجاہد سے فرماتا ہے۔ پھر وہ دونوں (ثقفی اور انصاری) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے تو انہوں نے بھی دونوں سے یہی فرمایا۔ پھر وہ دونوں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھی وہی بات ارشاد فرمائی جو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے کہی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر بغوی)

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ''فاحشہ'' اور ''ظلم'' کا فرق اور ''ذکر اللہ'' کی تفسیر میں اقوال

﴿ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جو بے حیائی کا ہوتا ہے او اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہوتا ہے (تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں)۔ ''فاحشۃ'' اُس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو بہت ہی زیادہ بُرا ہو۔ ''فحش'' کا اصل معنیٰ ہے: بُرا ہونا اور حد سے نکل جانا۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ''فاحشہ'' سے مراد زنا ہے۔ اور ﴿ اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ میں اپنے آپ پر جو ظلم کرنے کا ذکر ہے اس سے وہ افعال مراد ہیں جو زنا سے نیچے ہیں' جیسے بوسہ لینا' گلے لگانے' چھونا اور دیکھنا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فاحشہ'' سے گناہ کبیرہ مراد ہے اور ظلم سے گناہ صغیرہ مراد ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''فاحشہ'' اُس گناہ کو کہتے ہیں جس کا کرنا مکمل طور پر بُرا ہو اور ظلم کسی بھی گناہ کو کہہ سکتے ہیں۔

﴿ ذَكَرُوا اللّٰهَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (جب وہ کسی بے حیائی کا ارتکاب کر لیتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو) اللہ کی وعید اور اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں' اور اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُن سے اس گناہ کے

بارے میں پوچھے گا۔ بعض مفسرین نے ''ذکروا الله'' کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے اُس جلال کو یاد کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُس سے حیا پیدا ہوتی ہے۔ بعض نے یہ معنیٰ بیان کیا ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے بعد زبان سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ (وہ اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں) یعنی اپنے گناہوں کی وجہ سے بخشش طلب کرتے ہیں اور اُن سے توبہ کرتے ہیں اور اُن پر ندامت کرتے ہوئے اس عزم کے ساتھ اُنہیں ترک کر دیتے ہیں کہ دوبارہ یہ گناہ نہیں کریں گے۔ یہی مقبول توبہ کے صحیح ہونے کی شرائط ہیں۔

زیر بحث آیت میں ''ومن یغفر الذنوب الا الله'' کے فوائد اور اس میں مذکور تنبیہات

﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے!) اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق یہ باتیں بتائی ہیں کہ: (۱) اس کی رحمت وسیع ہے۔ (۲) اس کی مغفرت قریب ہے۔ (۳) گناہوں سے توبہ کرنے والا اس کی بارگاہ میں بے گناہ شخص کی مانند ہے۔ (۴) گناہ گاروں کا ٹھکانا صرف اُس کا فضل و کرم، احسان، درگزر اور اس کی رحمت ہے۔

اس جملہ میں لوگوں کو ان باتوں سے آگاہ کیا گیا ہے کہ: (۱) بندہ صرف اُسی سے مغفرت طلب کرے۔ (۲) وہ گناہگار کو عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ (۳) اور اس بات کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ گناہگار سے عذاب کو دور فرما دے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ مغفرت اللہ عزوجل کے سوا کسی اور سے طلب کرنا جائز نہیں ہے۔

گناہوں پر اصرار کرنے کا معنیٰ اور آیت میں مذکور ''وهم یعلمون'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا﴾ (پرہیزگار لوگ اپنی لغزشوں پر قائم نہیں رہتے۔) مراد یہ ہے کہ وہ گناہوں پر نہ قائم رہتے ہیں نہ جمے رہتے ہیں بلکہ توبہ کرتے ہیں، رجوع کرتے ہیں اور بخشش طلب کرتے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''اصرار'' سے ترک استغفار مراد ہے (یعنی وہ اپنی لغزشوں پر استغفار کو ترک نہیں کرتے)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱۱) جو استغفار کر لے وہ اصرار کرنے والا نہیں ہے اگرچہ وہ اُسی دن ستر مرتبہ اُس گناہ کو کرے۔

(سنن ترمذی: ۳۵۵۹، سنن ابوداؤد: ۱۵۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۴۰ـ۲۰۴)

☆ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن اور غریب قرار دیا ہے[۸۹] اور ان کی روایت میں ''لو عاد'' کی بجائے ''لو فعله'' کے الفاظ ہیں۔

﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (پرہیزگار لوگ جان بوجھ کر اپنی لغزشوں پر قائم نہیں رہتے۔) اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ (پرہیزگار لوگ) جانتے ہیں کہ وہ گناہ کا کام ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہوں کو بخشش دیتا ہے۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ (پرہیزگار لوگ) جانتے ہیں کہ گناہ کو بار بار کرنا نقصان دہ ہے۔ (۳) بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش کا مالک ہے۔ (۴) بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ گناہ خواہ کتنے ہی ہوں ان کو معاف کرنا

۸۹ حدیث شریف کو حسن اور غریب قرار دینے کی نسبت امام ابوداؤد کی طرف درست نہیں ہے۔ سندِ حدیث کا تعین امام ترمذی کی خصوصیت ہے۔ پھر حسن اور غریب میں بھی تسامح ہے۔ صحیح یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث شریف کو غریب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔(۵) بعض فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کی تو اللہ تعالیٰ بخشش فرمادے گا۔

ثابت البنانی کہتے ہیں: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ جب زیر بحث آیت مبارکہ نازل ہوئی تھی تو شیطان رو پڑا تھا۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں استغفار کے فضائل وفوائد

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث خود سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے جتنا چاہتا تھا نفع عطا فرماتا تھا اور جب کوئی صحابی مجھے حدیث بیان کرتا تھا تو میں اس سے اس پر قسم لیتا تھا' جب وہ میرے سامنے قسم لے لیتا تھا تو میں اس کی تصدیق کرتا تھا۔ مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا اور سچ بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۱۱۲) جو بندۂ مومن بھی (یا فرمایا) جو شخص بھی گناہ کر بیٹھتا ہے پھر اُٹھ کر طہارت حاصل کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی بخشش فرمادیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت مبارکہ پڑھی: ''والذين اذا فعلوا فاحشة أو ظلموا أنفسهم ذكروا الله (الى اخر الاية)''۔

(سنن ابوداؤد: ۱۵۲۱' سنن ترمذی: ۴۰۶ـ ۳۰۰۶' سنن ابن ماجہ: ۱۳۹۵' مسند احمد ج ۱ ص ۱۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۳۲۴ـ ص ۱۱۷)

☆ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو عثمان بن مغیرہ سے کئی راویوں نے روایت کیا ہے اور اُن سب نے مرفوعاً روایت کیا ہے جبکہ مِسْعَر اور سفیان نے اس حدیث کو عثمان بن مغیرہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ نیز اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی اسماء بن الحکم ہے اس کی صرف یہی ایک حدیث ہمیں معلوم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱۳) جو پابندی سے استغفار (یعنی بخشش طلب) کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ اور ہر غم سے آزادی مہیا فرمادیتا ہے اور جہاں اُس کا گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے اُسے رزق عطا فرماتا ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۱۵۱۸' سنن ابن ماجہ: ۳۸۱۹' مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۳۹ـ ص ۲۰۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱٤) جس ذات کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے اُس کی قسم! اگر تم لوگ گناہ ہی نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر کے ایسے لوگ لے آئے گا جو گناہ کریں گے۔ گناہ کرنے کے بعد وہ بخشش طلب کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمادے گا۔[90]

(صحیح مسلم: ۲۷۴۹' سنن ترمذی: ۲۵۲۶' مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۹' مشکوٰۃ: ۲۳۲۸ـ ص ۲۰۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی بات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(۱۱۵) جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے اور یوں عرض کرتا ہے: ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ'' (اے اللہ! میرے گناہوں کی میرے لیے بخشش فرمادے)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے گناہ کیا اور اس بات کو بھی جان لیا کہ اس کا ایک رب

---

۹۰ اس حدیث شریف میں لوگوں کو توبہ واستغفار اور خوف خدا کی طرف راغب کرنا مقصود ہے۔ علامہ شرف الدین طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں گناہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا ہے اور معافی کو بہت پسند فرماتا ہے۔ وہ جس طرح فرمانبرداروں کو انعام دینا پسند کرتا ہے اسی طرح نافرمانوں سے درگزر کرنا بھی پسند کرتا ہے۔ لہٰذا اُس کے حضور لوگوں کو بخشش اور معافی طلب کرتے رہنا چاہیے۔ (مرقات ج ۵ ص ۱۶۱)

موجود ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ پھر بندہ دوبارہ گناہ کرتا ہے اور عرض کرتا ہے: "أي رب اغفرلي ذنبي" (اے میرے رب! میرے لیے میرے گناہ کی بخشش فرمادے)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے گناہ کیا اور اس بات کو بھی جان لیا کہ اس کا ایک رب موجود ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ پھر بندہ دوبارہ گناہ کرتا ہے اور گناہ کرنے کے بعد عرض کرتا ہے: "أَيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ" (اے میرے رب! میرے لیے میرے گناہ کی بخشش فرمادے)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس بات کو بھی جان لیا کہ اس کا ایک رب موجود ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ (بندے سے) فرماتا ہے: اب جو چاہو تم کرو میں نے تمہاری بخشش کر دی ہے۔ عبدالاعلیٰ کہتے ہیں کہ یہ جملہ "اب جو چاہو تم کرو" تیسری یا چوتھی بار میں سرکار نے فرمایا یا نہیں؟ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔

(صحیح بخاری: ۷۵۰۷، صحیح مسلم: ۲۷۵۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۶، المستدرک ج ۴ ص ۲۴۲، سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۱۸۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۳۳۔ ص ۲۰۳)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱۱٦) اے ابنِ آدم! جب تک تو مجھ سے دُعا کرتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے رکھے گا میں تیرے گناہوں کے باوجود تجھے بخشتا رہوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ عنان سماء (آسمان کے کنارہ کو) پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے بخشش طلب کرے میں تب بھی تجھے بخش دوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ اے ابن آدم! اگر تو قراب ارض (زمین بھر) خطائیں لے کر میرے پاس آیا لیکن اس حالت میں آیا کہ کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہراتا تھا تو میں زمین بھر مغفرت لے کر تیرے پاس آؤں گا۔ (سنن ترمذی: ۳۵۴۰، مسند احمد ج ۵ ص ۱۷۲، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۳٦۔ ص ۲۰۴)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ ☆ اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: "عَنان السماء" (عین کے زبر کے ساتھ) بعض کے نزدیک اس سے بادل مراد ہیں۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے آسمان کا وہ حصہ مراد ہے جو ہمارے لیے ظاہر ہے۔ ایک لفظ "قراب الارض" آیا ہے (قاف کے پیش کے ساتھ اور ایک قول کے مطابق قاف کے زیر کے ساتھ، لیکن پیش کے ساتھ زیادہ مشہور ہے) اس سے مراد اتنی مقدار ہے جس سے زمین بھرنے کے قریب ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۱۷) جس نے یہ کلمات کہے: "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ" (وہ عظمت والا معبود جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جو خود زندہ ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے اُس سے میں بخشش طلب کرتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں) تو اُس شخص کے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اگرچہ وہ جنگ سے بھاگا ہو۔

(سنن ابوداؤد: ۱۵۱۷، سنن ترمذی: ۳۵۷۷، المستدرک ج ۱ ص ۵۱۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۳۵۳۔ ص ۲۰۵)

☆ امام حاکم (صاحب مستدرک) نے اس حدیث کو حسن کہا ہے[۹۱] اور امام بخاری و امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۱۱۸) ہر گناہ کے لیے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بخش دے، مگر جو شخص حالت شرک میں مر گیا اور جس نے کسی مؤمن کو جان

۹۱ امام حاکم نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ یہ حدیث شریف امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔
(دیکھیے: المستدرک ج ۱ ص ۵۱۱)

بوجھ کر قتل کیا (ان دونوں کا گناہ نہیں بخشا جائے گا)۔[92] (سنن ابوداؤد: ۴۲۷۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۴۶۸۔ص ۳۰۱)

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ؕ﴿۱۳۶﴾

یہ (وہ نیک بخت لوگ) ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی جانب سے بخشش اور ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور باعمل لوگوں کا اجر کتنا اچھا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر میں توبہ کے دو مقاصد کا بیان

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ سے اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جن کا گذشتہ آیت میں تذکرہ ہوا۔ مذکورہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ توبہ کے دو مقاصد ہیں: (۱) عذاب سے نجات۔ اس کی طرف اشارہ ﴿مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ فرما کر کیا گیا۔ (۲) اجر وثواب سے نوازنا۔ اس کی طرف اشارہ ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ فرما کر کیا گیا۔ یعنی مذکورہ افراد کے لیے ایسا ذخیرہ اور اجر وثواب ہے جس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ فرمانبرداروں کا اجر وثواب یعنی جنت کیا خوب ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

بے شک تم سے پہلے (قانونِ قدرت کے) طریقے گزر چکے ہیں، تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ (دعوتِ حق کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا O

''قد خلت من قبلکم سنن'' کی تفسیر اور سنّت کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ (بے شک تم سے پہلے طریقے گزر چکے ہیں۔) یعنی تم سے پہلے گذشتہ امتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ گزر چکا ہے کہ اُس نے اُنہیں ہلاک کر دیا اور ان کی بنیاد ہی مٹا کر رکھ دی۔ کیونکہ انہوں نے انبیاء کرام اور رسولوں کی مخالفت کی۔ اور یہ مخالفت اس لیے کی کہ وہ اپنے دلوں میں دنیا کی حرص رکھتے تھے، دنیا کی لذتیں اور دنیا میں بقاء چاہتے تھے۔ لیکن سب کے سب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور کسی کو بھی یہاں بقاء نہ مل سکی۔

(آیت میں جو ''سُنَنٌ'' کا لفظ ہے یہ سنّت کی جمع ہے، اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:) (۱) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے سیدھا راستہ اور ایسا نمونہ مراد ہے جس کی پیروی کی جائے۔ ہر امت کا اپنا ایک طریقہ اور راستہ ہوتا ہے، جب امت اس طریقہ کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ سُنن سے شرائع مراد ہیں (یعنی شریعتیں)۔ (۳) بعض کے نزدیک اس سے امتیں مراد ہیں۔ اور ''سنۃ'' امت کے معنیٰ میں ہے۔

[92] مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس نے کسی صاحب ایمان کو ایمان لانے اور مؤمن ہونے کی وجہ سے قتل کیا یا اُس کے قتل کو حلال سمجھ کر قتل کیا تو قتل کرنے والا خود دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا اور خدانخواستہ اسی حالت میں مر گیا تو اُس کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ البتہ وہ شخص جس نے کسی صاحب ایمان کو کسی تنازع کی بناء پر یا کسی اور وجہ سے قتل کیا تو یہ حرام اور گناہ کبیرہ ضرور ہے لیکن دائرۂ اسلام سے خروج کا باعث نہیں ہے۔

جملہ مذکورہ ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ تم سے پہلے جو کافر امتیں گزر چکی ہیں اُن کے ساتھ میرے طریقے گزر چکے ہیں کہ میں نے ان کو مہلت دی اور آہستہ آہستہ میں اُنہیں عذاب کی طرف بڑھاتا رہا حتیٰ کہ اُن کو ہلاک کرنے کا جو وقت مقرر تھا وہ آپہنچا۔

گذشتہ امتوں کے حالات کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کی دعوت و ترغیب

﴿فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ (تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔) زمین میں سیر کرنے کا حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ استحبابی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ گذشتہ اقوام کے حالات معلوم ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ ''دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا''۔ اس جملہ سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کو گذشتہ امتوں کے حالات میں غور و فکر کی ترغیب دی ہے۔ تاکہ لوگوں میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور دنیا اور اس کی لذتوں سے منہ موڑنے کا جذبہ بیدار ہو۔ نیز اس جملہ میں کافر کو بھی کفر سے باز آنے کی دعوت دی جارہی ہے کیونکہ جب ایک کافر آدمی دیگر کافروں کے حالات خصوصاً اُن کی ہلاکت کے اسباب میں غور و فکر کرے گا تو اس کے دل میں ایمان لانے کا جذبہ بیدار ہو گا۔ کیونکہ گذشتہ لوگوں کے حالات میں غور و فکر سے دل میں اثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر کا شعر ہے:

ان آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

''ہمارے نشانات ہمارا پتادیتے ہیں' اس لیے ہمارے جانے کے بعد تم ہمارے نشانات کو دیکھ لیا کرنا''۔

زیر بحث آیت میں نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کو غزوۂ احد کے معاملہ میں تسلی دینا بھی مقصود ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ میں نے کفار کو صرف اس لیے ڈھیل دی تھی تاکہ اُن کو ہلاک کرنے کے بارے میں اور محمد مصطفیٰ ﷺ اور صحابہ کرام کی تائید و نصرت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ اپنے معیّن وقت کو پہنچ جائے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾

یہ لوگوں کے لیے ایک کھلی بات ہے اور پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے O

آیت مذکور کی تفسیر اور اس میں مذکور تین الفاظ (بیان' هُدٰی اور موعظة) کے درمیان فرق

﴿هٰذَا﴾ کا اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے جو احکامات' ممنوعات' وعدے اور وعیدیں بیان فرمائیں اُن کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگوں کے لیے بیان ہے۔ ﴿هُدًى﴾ سے مراد ہے: گمراہی سے ہدایت دینے والا۔ اور ﴿مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ خصوصاً پرہیز گاروں کے لیے نصیحت ہے۔

اس آیت میں ''بیان'' ''هُدٰی'' اور ''موعظة'' کے درمیان چونکہ عطف ہے اور عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے اس لیے مفسرین نے ان تینوں میں فرق بیان کیا ہے۔ فرق درج ذیل ہے:

البیان هو الدلالة التی تفید ازالة الشبهة بعد ان کانت حاصلة.	''بیان'' اس رہنمائی کو کہتے ہیں جو پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالہ اور خاتمہ کا فائدہ دے۔
الهُدٰی هو طریق الرشد المأمور بسلوکه دون طریق الغیّ.	''هُدٰی'' ہدایت کے اُس راستہ کو کہتے ہیں جس پر گمراہی کا راستہ ترک کر کے چلنے کا حکم دیا گیا ہو۔

الموعظة هي الكلام الذي يفيد الزجر عما لا ينبغي في طريق الدين. ''موعظة'' اُس کلام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ آدمی دین کے راستہ میں ناپسندیدہ باتوں سے باز آ جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''بیان'' ایک جنس ہے اور اس کی دو انواع ہیں۔ ایک وہ کلام جو دین میں پسندیدہ باتوں کی طرف رہنمائی کرے۔ اس کو ''ھُدیٰ'' سے تعبیر کیا گیا۔ اور دوسری نوع وہ کلام جو دین میں ناپسندیدہ باتوں سے روکنے والا ہو، اس کو ''موعظة'' سے تعبیر کیا گیا۔

اس آیت میں جو فرمایا کہ یہ (قرآن) پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت اور نصیحت کا فائدہ پرہیز گار ہی اُٹھاتے ہیں، دوسرے لوگ نہیں اٹھاتے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾

اور تم لوگ نہ ہمت ہارو نہ غم کھاؤ، اگر تم (کامل) مؤمن ہو تو تم ہی سربلند رہو گے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور تفسیر

یہ آیت غزوۂ احد کے دن اس وقت نازل ہوئی جب نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو زخم لگنے کے باوجود کافروں کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ اُن پر یہ حکم گراں گزرا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اس میں نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کو اس بات کی ترغیب فرمائی کہ زخم لگنے اور اپنے افراد کے قتل ہونے کے باوجود جہاد کرو۔ غزوۂ احد میں انصار میں سے ستّر صحابہ اور مہاجرین میں سے پانچ صحابہ کرام شہید ہوئے۔ ان پانچ میں نبی اکرم ﷺ کے محترم چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مُصعَب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل ہیں۔

آیت میں ﴿وَلَا تَهِنُوا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم جہاد کے معاملہ میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اور ﴿وَلَا تَحْزَنُوا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے جو لوگ شہید ہو گئے ان پر غم نہ کرو، کیونکہ وہ جنت میں ہیں۔

''وانتم الاعلون'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

﴿وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ﴾ (تم ہی بلند رہو گے) اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری مدد ہوگی، تمہیں کافروں پر غلبہ دیا جائے گا اور نتیجہ تمہارے حق میں ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (اس جملہ کی تفسیر میں) فرماتے ہیں کہ[٩٣] ایک گھاٹی میں مسلمان پسپا ہو گئے تو خالد بن ولید مشرکین گھڑ سواروں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنے کی غرض سے سامنے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دُعا کی: ''اللهم لا يعلوه علينا اللهم لاقوة لنا الا بك'' (اے اللہ! اس کو ہم پر غلبہ نہ دے، اے اللہ! ہمیں صرف تیری ذات سے قوت حاصل ہے)۔ اس دُعا کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت تیر اندازی کرتے ہوئے واپس پلٹ آئی اور آتے ہی

---

٩٣ تفسیر بغوی کے محقق ومخرّج عبدالرزاق المھدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت کو سنداً غیر صحیح اور مُنکر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام واحدی نے اسباب النزول میں اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ نیز اس روایت کی سند میں ایک راوی عطیہ العوفی ہے جو کہ ضعیف ہے اور اس کی بہت ساری مجہول روایات ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ اس بارے میں صحیح روایات سے جو ثابت ہے وہ وہی ہے جو معروف ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اچانک حملہ کی وجہ سے مسلمان پسپا ہو گئے۔ اس کی تفصیل آل عمران: ١٤٠ کی تفسیر میں رقم: ١١٩ کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (تفسیر البغوی، آل عمران: ١٣٩)

پہاڑ پہ چڑھ کر مشرکین گھڑ سواروں پر اتنی تیر اندازی کی کہ وہ پسپا ہو گئے اور مسلمان پہاڑ پہ چڑھ گئے۔ اس کو اس آیت میں ''و انتم الاعلون'' کہہ کر بیان فرمایا (یعنی تم ہی بلند رہو گے)۔ بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ تم ہی بلند ہو کیونکہ تمہارا معاملہ مشرکین کے معاملہ سے بہت زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ تمہارے جو افراد شہید ہوئے وہ جنت میں ہیں اور مشرکین کے جو لوگ مارے گئے وہ جہنم میں ہیں' اسی طرح تمہارا جو جہاد ہے وہ حق پر ہوتا ہے اور اُن کا جو لڑنا ہے وہ باطل پر ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے تفسیر یہ کی ہے کہ انجام کے اعتبار سے تم ہی بلند رہو گے کیونکہ تمہیں کافروں پر کامیابی اور غلبہ حاصل ہوگا۔

آخر میں فرمایا: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (بہ شرطیکہ تم مؤمن ہو۔) اس سے مراد یہ ہے کہ (تم اس صورت میں بلند رہو گے) جب تم صاحب ایمان ہو گے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ (تم بلند رہو گے) اگر تم اس بات کی تصدیق کرو گے کہ تمہارا مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد حق اور سچ ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اگر تمہیں زخم لگا ہے تو ایسا ہی زخم (تمہاری دشمن) قوم کو بھی لگ چکا ہے' اور (ہار اور جیت کے) ان دنوں کو ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں تاکہ اللہ مسلمانوں کو ممتاز (اور نمایاں) کر دے اور تم میں سے کچھ کو مرتبۂ شہادت پر فائز کر دے اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور ''قرح'' کا معنیٰ

﴿ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ﴾ (اگر تمہیں زخم لگا ہے تو ایسا ہی زخم دشمن قوم کو بھی لگ چکا ہے۔) اس میں ﴿ قَرْحٌ ﴾ کو قاف کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور یہ دو مختلف لغتیں ہیں لیکن معنیٰ ایک ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''قَرح'' (قاف کے زبر کے ساتھ) مصدر ہے اور ''قُرح'' (قاف کے پیش کے ساتھ) اسم ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ''قَرح'' زخم کو کہا جاتا ہے اور ''قُرح'' زخم کے درد کو۔

آیت مبارکہ میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اور یہ خطاب اس وقت فرمایا جب مسلمان غزوۂ احد سے غم ناک اور پریشان لوٹ رہے تھے۔ فرمایا کہ اے مسلمانو! اگر احد والے دن تمہیں زخم لگا ہے تو بدر والے دن قوم کافرین کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے۔ بعض نے اس جملہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ (اے مسلمانو!) احد والے دن تمہیں جس قدر زخم پہنچے اور قتل کیا گیا اسی طرح کافروں کو بھی (اسی دن) اتنے زخم لگے اور اُنہیں قتل کیا گیا۔ چنانچہ کافروں کے تقریباً ۲۰ آدمی مارے گئے اور کثیر تعداد میں زخمی ہوئے۔

اللہ عزوجل کی جانب سے ایام زمانہ کی گردش اور غزوۂ احد میں جنگ کا پانسا پلٹنے کا بیان

﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ (ان ایام کو ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔) اس میں ''نُدَاوِلُهَا'' ''مُدَاوَلَة'' سے ہے اور ''مداولہ'' کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو ایک سے لے کر دوسرے کی طرف منتقل کرنا۔ جب کوئی چیز ایک کے پاس سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''تداولته الایدی'' (یعنی فلاں چیز مختلف ہاتھوں میں گھومتی رہی۔ یا لوگوں نے اُسے باری باری لیا)۔ اسی طرح دنیا کو ''دَوْلٌ'' کہتے ہیں' اس معنیٰ میں کہ وہ ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف پھر کسی اور قوم کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔

آیت میں جو فرمایا کہ ''ان ایام کو ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کے ایام لوگوں

کے درمیان گھومتے رہتے ہیں۔ ایک دن اِن کا ہے تو دوسرا دن اُن کا۔ چنانچہ بدر والے دن مسلمانوں کو مشرکین پر غلبہ حاصل ہوا کہ ستّر مشرکین کو انہوں نے قتل کر دیا اور ستر کو قید کر لیا۔ جبکہ احد والے دن مشرکوں کو مسلمانوں پر کچھ غلبہ مل گیا تو انہوں نے ستّر مسلمانوں کو زخمی کر دیا اور ۷۵ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۱۹) نبی اکرم ﷺ نے اُحد والے دن حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پچاس پیدل اور تیر انداز (مجاہدین) کا امیر مقرر کیا اور ارشاد فرمایا: اگر تم لوگ دیکھو کہ پرندے ہمارے بدن کو نوچ رہے ہیں تب بھی اپنی اس جگہ سے پیچھے نہ ہٹنا جب تک کہ میرا پیغام تمہیں نہ مل جائے۔ اور اگر تم لوگ دیکھو کہ ہم نے کافروں کو شکست دے دی ہے اور انہیں روند ڈالا ہے تب بھی پیچھے نہ ہٹنا جب تک کہ میرا پیغام تمہیں نہ مل جائے۔ پھر ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو شکست دے دی۔ (حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں:) خدا کی قسم! میں نے (مشرک) عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے کپڑے اوپر چڑھائے اتنی تیز بھاگ رہی تھیں کہ اُن کے پازیب اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھی یہ دیکھ کر کہنے لگے: لوگو! غنیمت لوٹو' تمہارے ساتھی غالب آ چکے ہیں' اب کس بات کا انتظار ہے؟ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا تم لوگ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بھول گئے؟ ساتھیوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! ہم تو لوگوں کے پاس ضرور جائیں گے اور مال غنیمت سے ضرور حصہ لیں گے۔ جب وہ (اپنی جگہ کو چھوڑ کر) لوگوں کے پاس آئے تو ان کے چہرے پھیر دیئے گئے اور شکست کھا کر واپس لوٹے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ'' (آل عمران: ۱۵۳) یعنی ''رسول تمہاری پچھلی جماعت میں کھڑے ہوئے تمہیں بلا رہے تھے''۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف بارہ مجاہدین باقی رہ گئے اور (اس دن) ستّر مسلمان شہید ہوئے۔ جبکہ بدر والے دن نبی اکرم ﷺ نے ستر مشرکین کو قید اور ستّر کو قتل کیا تھا۔ ابوسفیان نے اس موقع پر تین مرتبہ آواز لگائی: کیا قوم کے اندر محمد (ﷺ) ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو جواب دینے سے منع فرما دیا۔ پھر ابوسفیان نے تین مرتبہ کہا: کیا قوم میں ابوقحافہ کا بیٹا (ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے؟ پھر تین مرتبہ کہا: کیا قوم میں عمر بن الخطاب ہے؟ یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ یہ سب لوگ (سیدنا محمد ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) شہید ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر سے رہا نہ گیا' فوراً بولے: اے دشمنِ خدا! اللہ کی قسم! جن کے تو نے نام لیے ہیں وہ سب کے سب زندہ ہیں اور تیرے لیے سوائے رنجیدہ ہونے کے اور کچھ نہیں ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ آج کا دن بدر والے دن کا بدلہ ہے۔ (کیونکہ) جنگ کا پانسا پلٹتا رہتا ہے۔ تم اپنے مقتولوں میں مُثلہ دیکھو گے جس کا نہ تو میں نے اپنے لوگوں کو حکم دیا تھا اور نہ ہی اس کا مجھے کوئی رنج ہے۔ پھر وہ یہ رجز پڑھنے لگا: ''اُعْلُ هُبَل اُعْلُ هُبَل'' (ہُبل زندہ باد' ہُبل زندہ باد)۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: کیا تم لوگ اس کا جواب نہیں دو گے؟ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ)! ہم جواب میں کیا کہیں؟ فرمایا: تم لوگ کہو: ''اللّٰه اعلیٰ و اجلّ'' (اللہ تعالیٰ سب سے بلند اور سب سے زیادہ عظیم ہے)۔ ابوسفیان نے کہا: ''ان لنا عزّٰی ولا عزّٰی لکم'' (بے شک ہمارے پاس عزّیٰ ہے' تمہارے پاس کوئی عزّیٰ نہیں ہے)۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: کیا تم لوگ اس کا جواب نہیں دو گے؟ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ)! ہم جواب میں کیا کہیں؟ فرمایا: تم لوگ کہو: ''اللّٰه مولانا ولا مولی لکم'' (اللہ ہمارا مولیٰ ہے' تمہارا کوئی مولیٰ نہیں ہے)۔

(صحیح بخاری: ۳۰۳۹' سنن ابوداؤد: ۲۶۶۲' سنن کبریٰ للنسائی: ۱۱۰۷۹' مسند احمد ج ۴ ص ۲۹۳)

امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہی مضمون حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے' اُن کی روایت کردہ

حدیث میں یہ ہے کہ:

(۱۲۰) ابوسفیان نے کہا کہ ایک دن دوسرے دن کے بدلہ میں ہوتا ہے (کیونکہ) دن گردش کرتے رہتے ہیں اور جنگ کا پانسا پلٹتا رہتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً کہا کہ ہم میں تم میں قطعاً برابری نہیں ہے' ہمارے شہداء جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین جہنم میں ہیں۔ (المستدرک للحاکم' ج ۲ ص ۲۹۶)

امام زجاج فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ○'' (الصافات: ۱۷۳) ''بلاشبہ ہمارے ہی لشکر کو غلبہ حاصل ہے''۔ اس آیت مبارکہ کی وجہ سے مسلمانوں کو ہی کافروں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے' لیکن اُحد والے دن کافروں کو مسلمانوں پر جو غلبہ حاصل ہوا وہ اس وجہ سے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پابندی نہ کی۔

(معالم التنزیل للبغوی' زیر بحث آیت)

زیر بحث آیت میں مذکور ''ولیعلم اللہ الذین امنوا'' کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

فرمایا: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (تا کہ اللہ ایمان والوں کو ممتاز کر دے۔) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اُحد والے دن) کافروں کو مسلمانوں پر جو غلبہ عطا فرمایا وہ اس لیے تھا تا کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت مخلص مسلمان اور مرتدوں کے درمیان فرق قائم ہو جائے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''ولیعلم اللہ الذین امنوا'' سے مراد یہ ہے کہ دشمنوں سے جہاد کرتے ہوئے اہل ایمان جس صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن اہل ایمان کو ظاہراً پہچان لے۔ جس سبب سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جانا (یعنی صبر کا ظہور) وہ یہاں آیت میں محذوف ہے۔ بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ (غزوۂ احد میں) مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ صادر اور واقع ہوا اُس کو اللہ تعالیٰ جان لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو ان کے وجود سے پہلے ہی جانتا ہے اور جاننے کے لیے وہ کسی سبب کا محتاج نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کا اُسے علم ہے وہ لوگوں کے سامنے کھلم کھلا واقع ہو جائے۔ اور بدلہ بھی اُسی چیز پر ہوتا ہے جو رُونما ہو۔ جو محض علم میں ہو اور خارج میں اُس کا وجود نہ ہو اُس پر بدلہ نہیں ہوتا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''لعیلم اللہ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ والے ایمان والوں کو جان لیں۔ اللہ والوں کے علم کی نسبت اپنی ذات کی طرف اس لیے فرمائی تا کہ اللہ والوں کی عظمت ظاہر ہو۔ بعض مفسرین نے اس جملہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ فرما دے۔ چونکہ فیصلہ علم کے بعد ہوتا ہے اس لیے یہاں فیصلہ کی بجائے علم کا لفظ استعمال فرمایا۔

''ویتخذ منکم شھداء'' کی تفسیر اور اس کے ضمن میں شہید کا معنیٰ اور شہید کو شہید کہنے کی وجوہات

﴿وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (اور تم میں سے کچھ کو شہادت کا مرتبہ دے دے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا مرتبہ دینے کا ارادہ فرمایا ہے اُنہیں (اس غزوہ میں) شہادت سے سرفراز فرمائے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ مسلمان غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اُن کی یہ خواہش اور آرزو تھی کہ اُنہیں دشمن سے جنگ کا موقع ملے اور یوم بدر جیسا کوئی دن میسر ہو جس میں وہ دشمنوں سے جہاد کریں اور شہادت کا مرتبہ حاصل کریں (اُن کو شہادت سے سرفراز کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو کچھ مشکلات سے دوچار کیا)۔

''شھداء''' 'شھید'' کی جمع ہے۔ شہید اُس مسلمان کو کہتے ہیں جو جنگ میں کافروں کی تلوار سے مارا جائے۔ شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: (۱) بعض کا قول یہ ہے کہ شہید کا معنیٰ ہے: زندہ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کے بارے میں فرمایا ہے: ''بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ'' (آل عمران: ۱۶۹) ''وہ اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں'

اُنہیں رزق دیا جاتا ہے''۔اس آیت مبارکہ کی رُو سے شہداء کی رُوحیں زندہ ہوتی ہیں اور دارالسلام (جنت) میں حاضر ہوتی ہیں' جبکہ غیر شہداء کی روحیں وہاں حاضر نہیں ہوتیں اس لیے شہید کو شہید کہتے ہیں۔(٢) بعض کا قول یہ ہے کہ شہید کے لیے چونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی گواہی دی ہے اسی لیے اُسے شہید کہتے ہیں۔(٣) بعض کا قول یہ ہے کہ شہداء چونکہ قیامت کے دن انبیاء کرام اور صدیقین کے ساتھ امتوں پر گواہ ہوں گے اس لیے اُنہیں شہداء کہتے ہیں۔انبیاء اور صدیقین کے ساتھ شہداء اس لیے گواہ ہوں گے کہ شہادت اُمت کے افضل لوگوں کو ملتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شہادت بہت عظیم منصب اور بلند و بالا مقام ہے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔) ظالموں سے مراد مشرکین ہیں۔بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں جو زبان سے ایمان ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کفر رکھتے ہیں۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو اپنے ایمان پر ثابت قدمی اور جہاد میں صبر کا مظاہرہ نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اُسے پسند نہیں فرماتا۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾

اور اس لیے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور کافروں کو مٹا دے O

﴿لِيُمَحِّصَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو گناہوں سے پاک کر دے اور گناہوں کو اُن سے دُور فرما دے۔ لُغت میں ''مَحص'' کا اصل معنیٰ ہے: پاک صاف کرنا اور زائل کرنا۔﴿يَمْحَقَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو فنا اور ہلاک کر دے۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا کافروں کے ہاتھوں جو قتل ہوا ہے وہ تمہارے لیے شہادت اور (خطاؤں سے) پاکیزگی کا سبب ہے' جبکہ تم جو اُنہیں قتل کرو گے تو اُن کے مٹنے اور فنا ہونے کا سبب ہوگا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾

کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے نہ مجاہدین کا امتحان لیا ہے نہ صبر کرنے والوں کو آزمایا ہے O

آیت مذکورہ میں مذکور ''ولما یعلم اللہ'' کی تفسیر

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے۔) اس جملہ میں لفظ ''اَمْ'' ''بَلْ'' کے معنیٰ میں ہے اور مراد اس سے انکار ہے۔یعنی اے مؤمنو! تم یہ گمان مت رکھو کہ (بغیر آزمائش کے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور میرے انعام و اکرام کو پالو گے۔﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ (حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے مجاہدین کی آزمائش نہیں فرمائی۔) اس کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ اس جملہ کے الفاظ سے بہ ظاہر اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی معلوم ہوتی ہے' لیکن (حقیقت میں) مقصود اس سے معلوم کی نفی ہے۔تقدیرِ آیت یہ ہے کہ اے مسلمانو! کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم نے جہاد نہیں کیا۔وضاحت اس کی یہ ہے کہ علم کا اپنے معلوم کے ساتھ تعلّق ہوتا ہے جیسا کہ معلوم علم پر موقوف ہوتا ہے۔جب علم اور معلوم دونوں کا آپس میں تعلّق موجود ہے تو ان کو ایک دوسرے کی جگہ

استعمال کرنا یقیناً بہت اچھا اور درست ہے۔[۹۴]

امام واحدی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں (بہ ظاہر) اللہ عزوجل کے علم کی نفی ہے لیکن (حقیقت میں) جہاد کی نفی مراد ہے۔ اور ایسا اس لیے کیا گیا کہ اس میں جہاد کی نفی میں اختصار ہے۔ کہ اگر جہاد ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو ضرور اس کا علم ہوتا۔ تقدیر آیت یہ ہے کہ کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ فرض جہاد جو کہ معلوم ہے وہ ابھی تک ظہور پذیر نہیں ہوا۔ کلام میں چونکہ مختلف طریقے استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے آیت میں اختصار کے طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے علم کی نفی کی گئی۔ کیونکہ آیت کا معنیٰ (اس صورت میں بھی) بغیر کسی خلل کے سمجھ میں آ رہا ہے۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ: ''**ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین**'' کا معنیٰ یہ ہے کہ (کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے) حالانکہ اللہ تعالیٰ کو جہاد کا اور صبر کرنے والوں کے صبر کا جو علم ہے وہ ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔ امام طبری اس جملہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے: (اے مسلمانو! کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟) حالانکہ ابھی میرے مؤمن بندوں کے سامنے وہ لوگ کھل کر نہیں آئے جو میرے حکم کے مطابق تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (اور نہ ابھی تک اللہ نے صبر کرنے والوں کو آزمایا ہے۔) یعنی جنگ میں اور جو کچھ مسلمانوں کو اللہ عزوجل کی خاطر زخم اور درد پہنچا اُس معاملہ میں (اللہ نے صبر کرنے والوں کو ابھی نہیں آزمایا)۔ اس آیت مبارکہ میں اُن لوگوں پر عتاب کا اظہار ہے جو احد والے دن پسپا ہو گئے تھے۔ مفہوم یہ ہے کہ اے پسپا ہونے والو! کیا تم اس خیال میں ہو کہ جنہوں نے اپنے رب عزوجل کی خاطر اپنی جان اور زندگی کا نذرانہ پیش کیا' زخم کے درد پر صبر کیا اور اپنے دشمن کے آگے ڈٹے رہے اُن کے راستہ پر چلے بغیر اور ان کی طرح صبر کیے بغیر تم اُن کی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

اور تم تو موت کے آنے سے پہلے موت کی تمنا کیا کرتے تھے تو بے شک اب تم اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہو O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور اس کی تفسیر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء بدر کو جس اعزاز و اکرام سے نوازا تھا اس سے بہ زبان مصطفیٰ ﷺ مسلمانوں کو آگاہ کیا تو مسلمانوں کو بھی شہادت حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ وہ اس بات کی تمنا اور آرزو کرنے لگے کہ جنگ کا موقع آئے اور اُس میں شہید ہو کر اپنے بھائیوں سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُحد والے دن ہی اُنہیں (شہادت کا موقع) دکھا دیا لیکن اللہ نے جن کو ثابت قدمی دینا چاہی ان کے سوا باقی مسلمان جلد ہی شکست سے دوچار ہو گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے یہ تمنا کی کہ اُنہیں بدر جیسا کوئی اور دن مل جائے جس میں جہاد کر کے شہید ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُحد کا دن دکھایا۔

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ﴾ (تم موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔) مراد یہ ہے کہ تم موت کے اسباب یعنی جہاد کی تلاش میں

---

۹۴ امام رازی علیہ الرحمۃ کی اس عبارت کا مفہوم اور حاصل یہ ہے کہ علم اور معلوم دو مختلف چیزیں ہیں۔ علم سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کا مجاہدین کو جاننا اور معلوم سے مراد جہاد ہے۔ زیر بحث آیت میں بہ ظاہر علم الٰہی کی نفی معلوم ہوتی ہے' حقیقت یہ ہے کہ ''معلوم'' یعنی جہاد منتفی اور معدوم ہے اور جو چیز معدوم ہو اس کے ساتھ علم الٰہی متعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے معلوم کے علم کی جو نفی کی جا رہی ہے وہ عین مقتضائے عقل کے مطابق ہے' کیونکہ وہ چیز معدوم ہے۔

رہتے تھے۔[٩٥] ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یوم اُحد کو پانے سے پہلے (یعنی تم یوم احد کے آنے سے پہلے جہاد کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے)۔ ﴿فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ﴾ تو جس کی تم تلاش اور آرزو میں تھے اس کو تم نے دیکھ لیا۔ ''رأیتموہ'' میں ھاء موت کی طرف راجع ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر اور اپنے بھائیوں کے شہید ہونے کا مشاہدہ کر کے تم نے موت کے اسباب کو دیکھ لیا ہے۔

﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (اور وہ موت تمہارے سامنے تھی۔) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کو تاکیداً ذکر کیا گیا ہے۔ امام زجاج نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ: ''فقد رأیتموہ وانتم بصراء'' تم اُسے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تم نے فلاں چیز کو اس طرح دیکھا کہ تمہاری آنکھ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی' یعنی واقعۃً اور حقیقۃً اُس کو دیکھا۔ بعض مفسرین نے معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ: ''وانتم تنظرون ما تمنیتم فلم انھزمتم'' (تم اپنی آرزو کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے اس کے باوجود تم نے شکست کیوں کھائی؟)۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ ﴿١٤٤﴾

اور محمد (خدا نہیں ہیں) صرف رسول ہیں' اُن سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں' تو کیا اگر وہ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے' اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ ہرگز اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا' اور اللہ شکر کرنے والوں کو عنقریب صلہ عطا کرے گا O

غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ تیرانداز صحابہ کرام کے اپنی جگہ کو چھوڑنے ـــــ اور اس کے نتائج کا مفصّل واقعہ

اہل تاریخ وسیرت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سات سو افراد کے ساتھ اُحد کی گھاٹی میں تشریف لائے اور حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پچاس پیدل مجاہدین کا امیر مقرر کیا اور فرمایا کہ تم لوگ پہاڑ پر ڈٹے رہنا اور ہمارے تحفظ کے لیے تیراندازی کرتے رہنا تاکہ ہمارے پیچھے سے ہم پر کوئی حملہ آور نہ ہو۔ اور (سُن لو!) جنگ ہمارے حق میں جائے یا ہمارے خلاف' تم لوگوں نے میرا پیغام آنے تک اپنی جگہ سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ جب تک تم لوگ اپنی جگہ پر قائم رہو گے ہم غالب رہیں گے۔ قریش کے لشکر کی ترتیب اس طرح تھی کہ ان کے میمنہ (سیدھی جانب) پر خالد بن ولید اور میسرہ (اُلٹی جانب) پر عکرمہ بن ابی جہل تھے۔ لشکر کے ساتھ عورتیں بھی تھیں جو دف بجا رہی تھیں اور اشعار پڑھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے جنگ کا آغاز ہوا اور (دیکھتے ہی دیکھتے) میدان کارزار گرم ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو مشرکین کے خلاف اتنا جوش دلایا کہ انہوں نے مشرکین کو شکست دے دی۔ نبی اکرم ﷺ ایک تلوار پکڑے ہوئے تھے' آپ نے فرمایا: کون ہے جو اس تلوار کو لے کر اس کا حق ادا کرے اور دشمن پر خوب کاری ضرب لگائے؟ حضرت ابودجانہ سماک بن خرشہ انصاری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اس تلوار کو

[٩٥] یہ دفع دخل مقدر ہے۔ یعنی ایک اعتراض کا جواب ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ موت کی تمنا اور آرزو کرنا جائز نہیں ہے' پھر صحابہ کرام موت کی تمنا کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موت کی تمنا جو ناجائز ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے موت کی دُعائیں کرے اور موت کی آرزوئیں کرے۔ جبکہ صحابہ کرام موت کی دُعا یا تمنا نہیں کرتے تھے بلکہ موت کے اسباب یعنی جہاد کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس کو قرآن کریم نے موت کی تمنا سے تعبیر فرمایا۔

لے لیا۔ انہوں نے اس تلوار کو لے کر سرخ عمامہ باندھا اور اترا کر چلنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
(۱۲۱) اس چال کو اللہ اور اس کا رسول اِس موقع کے علاوہ ناپسند کرتے ہیں۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۳ ص ۲۳۳)

دوسری طرف پہاڑ پر جو تیر انداز صحابہ مقرر تھے انہوں نے جب مشرکین کو دیکھا کہ شکست کھا گئے ہیں اور اپنے ساتھی مال غنیمت لوٹ رہے ہیں تو وہ بھی مال غنیمت لوٹنے پہنچ گئے۔ خالد بن ولید نے جب دیکھا کہ تیر انداز کم ہو گئے ہیں اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کی پشت کی جانب خالی ہو گئی ہے تو انہوں نے اپنے لشکر کو آواز دی اور صحابہ کرام کے خلاف جوش دلایا۔ (خالد بن ولید کی آواز پر مشرکین نے دوبارہ حملہ کر دیا) اور مسلمانوں کو شکست دے دی۔ عبد اللہ بن قمیئہ نے رسول اللہ ﷺ کو پتھر مار کر آپ کی ناک اور اگلے دانت شہید کر دیئے اور چہرۂ انور کو زخمی کر دیا۔ جس کی وجہ سے آپ مشکل میں مبتلا ہو گئے اور آپ کے صحابہ (اس ناگہاں حملہ کی وجہ سے) آپ سے جدا ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ ایک چٹان کی طرف بڑھے تا کہ اس پر چڑھ جائیں لیکن آپ نہ چڑھ سکے۔ آپ نے تہ بہ تہ دو زر ہیں پہنی ہوئی تھیں، آپ کے نیچے حضرت طلحہ بیٹھ گئے اور اُن پر کھڑے ہو کر آپ چٹان پر آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طلحہ نے (اپنے لیے جنت) واجب کر لی۔ ہند اور اس کے ساتھ دیگر عورتیں صحابہ کرام کی لاشوں کا مثلہ کرنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے صحابہ کرام کے کان اور ناک کاٹ دیئے، حتیٰ کہ ھند نے اُن کے ہار بنا کر وحشی کو دے دیئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اُسی دن شہید ہوئے تھے اُن کا پیٹ چاک کر کے اُس نے جگر نکال لیا اور اس کا ایک ٹکڑا منہ میں چبایا لیکن اُس کو نگل نہ سکی تو منہ سے پھینک دیا۔ عبد اللہ بن قمیئہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی غرض سے آگے بڑھا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اُس دن رسول اللہ ﷺ کے علمبردار تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا۔ لیکن ابن قمیئہ نے ان کو شہید کر دیا۔ وہ حضرت مصعب کو شہید کر کے یہ سمجھ رہا تھا کہ اُس نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا ہے۔ چنانچہ اُس نے پلٹ کر کہا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے' یا کسی اور نے آواز لگائی کہ آگاہ ہو جاؤ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آواز لگانے والا ابلیس لعین تھا۔ صحابہ کرام یہ آواز سن کر واپس جانے لگے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ اُنہیں آواز دینے لگے: اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ' اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔ یہ سن کر ۳۰ صحابہ آپ کے پاس جمع ہو گئے اور جب تک مشرکین آپ سے دور نہیں ہو گئے اس وقت تک انہوں نے آپ کو گھیرے میں رکھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (مشرکین پر) اتنی تیراندازی کی کہ اُن کی کمان کا سرا ٹوٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنا ترکش ان کے لیے خالی کر دیا۔ آپ (حضرت سعد سے) فرماتے تھے: تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں! تم تیر اندازی کیے جاؤ۔ (صحیح بخاری: ۴۰۵۷، صحیح مسلم: ۲۴۱۲) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی زبردست تیر انداز تھے' انہوں نے اس دن دو یا تین کمانیں تیراندازی میں توڑ دیں۔ جو شخص بھی ترکش لے کر گزرتا رسول اللہ ﷺ اُس سے فرماتے کہ یہ تیر ابوطلحہ کے سامنے بکھیر دو۔ حضرت ابوطلحہ جب تیر پھینکتے تو رسول اللہ ﷺ جھانک کر دیکھتے کہ تیر کہاں لگا؟ اس دن حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ زخمی ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ کے بچانے سے اُن کا ہاتھ خشک ہو گیا (یعنی خون بہنا بند ہو گیا)۔ اسی طرح حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھ نکل کر رخسار پر آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو اس کی جگہ پر لگا دیا اور وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی۔
(المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۹ ص ۸، رقم الحدیث: ۱۲، المستدرک ج ۳ ص ۲۹۵)

رسول اللہ ﷺ جب جنگ سے واپس ہونے لگے تو ابی بن خلف جمحی آپ کو ملا' وہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ بچ گئے تو میں نہیں بچوں گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا ہم میں سے کوئی اس کا کام تمام نہ کر دے؟ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: اسے چھوڑ دو۔ ابی بن خلف غزوۂ احد سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے ملتا تھا تو کہتا تھا کہ میرے پاس ایک اونٹنی ہے جسے میں روزانہ ایک فُرق[96] (ایک مخصوص مقدار) مکئی کھلاتا ہوں' اُس پر سوار ہو کر میں آپ کو قتل کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ اُس سے فرماتے تھے کہ انشاء اللہ! میں تجھے قتل کروں گا۔ اب یہاں رسول اللہ ﷺ جب اس کے قریب پہنچے تو آپ نے حضرت حارث بن صمہ سے نیزہ لے کر اُس کی گردن پہ معمولی زخم لگا دیا۔ زخم کے لگتے ہی وہ گھوڑے سے گر گیا اور بیل کی طرح آواز نکالنے لگا کہ محمد (ﷺ) نے مجھے قتل کر دیا۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے اٹھایا اور کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اُس نے کہا: (کہ پریشانی کی بات کیوں نہیں ہے) اگر یہ نیزہ قبیلہ ربیعہ اور مضر پر پڑتا تو اُنہیں قتل کر ڈالتا کیا (محمد ﷺ نے) مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا۔ اگر اس بات کے بعد وہ مجھ پر تھوک بھی دیتے تو اسی سے مجھے قتل کر ڈالتے۔ نبی اکرم ﷺ کے اس زخم لگانے کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مقام سرف میں وہ مر گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۲۲) جس شخص کو اللہ کی راہ میں کوئی نبی قتل کرے اُس شخص پر اللہ (عزوجل) کا غضب بڑھ جاتا ہے۔ (اسی طرح) جو لوگ اللہ کے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیں اُن پر بھی اللہ کا غضب بڑھ جاتا ہے۔

(صحیح بخاری: ۴۰۷۴' صحیح مسلم: ۱۷۹۳' مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۷' مشکوۃ المصابیح: ۵۸۵۰۔ ص ۵۲۳)

راوی کہتے ہیں کہ لوگوں میں یہ افواہ اڑ گئی کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) شہید ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر بعض مسلمانوں نے کہا: کاش ہمارے پاس کوئی قاصد ہوتا جو عبداللہ بن ابی کے پاس جا کر ابوسفیان سے ہمیں امان لے دیتا۔ بعض صحابہ ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے۔ منافقوں نے کہا کہ اگر (سیدنا) محمد (ﷺ) شہید ہو گئے ہیں تو پھر اپنے پہلے دین پر لوٹ جاؤ۔ حضرت انس بن نضر جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ کے چچا تھے انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اگر سیدنا محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ سیدنا محمد ﷺ کا رب تو شہید نہیں ہوا اور اب تم رسول اللہ ﷺ کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ اٹھو اور اس مشن کے لیے جہاد کرو جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جہاد کیا اور اس مقصد کے لیے اپنی جان قربان کر دو جس مقصد کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ پھر (حضرت انس بن نضر) عرض گزار ہوئے: اے اللہ! یہ مسلمان جو باتیں کہہ رہے ہیں اُن سے میں تیری بارگاہ میں معذرت چاہتا ہوں اور مشرکین نے جو کچھ کیا ہے اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی تلوار باندھی اور لڑنے میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کو پکارتے ہوئے چٹان پر آئے۔ سب سے پہلے جس نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود کے نیچے آپ کی چمکتی ہوئی دونوں آنکھوں کو پہچان لیا اور پہچانتے ہی میں نے بلند آواز سے پکارا: اے گروہِ مسلمین! خوش ہو جاؤ! رسول اللہ ﷺ موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں اشارہ سے کہا کہ خاموش ہو جاؤ۔ پھر صحابہ کرام کا ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گیا۔ آپ نے اُنہیں فرار ہونے پر ملامت فرمائی۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان! ہمیں یہ خبر ملی تھی کہ آپ شہید ہو گئے ہیں' اس سے ہمارے دل مرعوب ہو گئے تھے اور ہم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے۔ اس پر اللہ عزوجل نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

زیر بحث آیت کی تفسیر

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ محمد (ﷺ) بھی عنقریب چلے جائیں گے جس

[96] فُرق ایک پیمانہ کو کہتے ہیں جس میں تین صاع (یعنی تقریباً ۱۲ کلو) کی مقدار چیز آتی ہے۔

طرح اُن سے پہلے اور رسول گزر گئے۔ اور جس طرح اُن رسولوں کے ماننے والوں نے اپنے نبیوں کے اس دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کے دین کو تھامے رکھا اسی طرح تم بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کے اس دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کے دین کو لازماً تھامے رکھنا۔ کیونکہ رسول کے اس دنیا میں آنے کا مقصد پیغام کو پہنچانا اور حجت کو پورا کرنا ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ اپنی قوم میں (ہمیشہ) موجود رہے۔ (اس آیت میں ''رسول'' کا لفظ ہے) رسول مرسَل اور رسالت دونوں معنیٰ میں آتا ہے۔ لیکن یہاں ''مُرسَل'' (یعنی پیغمبر) کے معنیٰ میں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا: ''اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ'' (یٰس:۳) آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے نام نامی اسم گرامی ''محمّد'' کے فضائل ومناقب

''محمّد'' رسول اللہ ﷺ کا اسم اعظم ہے۔ اس نام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ بہت ہی قابل تعریف ہیں اور اس نام کے ساتھ آپ مخصوص ہیں۔ اس نام کا معنیٰ درج ذیل ہے:

الذی کثرت خصالہ المحمودۃ والمستحق لجمیع المحامد. (محمد) وہ شخصیت جس کی قابل تعریف عادتیں بہت زیادہ ہوں اور وہ تمام خوبیوں کی مستحق ہو۔

اس معنیٰ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی ذات اس لیے خاص ہے کہ آپ اپنی ذات میں کامل شخصیت ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو یہ اعزاز بخشا کہ اُنہیں دو ایسے نام عطا فرمائے جو اُس کے قابل تعریف نام سے مشتق ہیں۔ یعنی اُنہیں محمد اور احمد کا نام عطا فرمایا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

(۱) ألم تر ان اللہ ارسل عبدہ ببرھانہ واللہ اعلی وامجد
(۲) اغر علیہ بالنبوۃ خاتم من اللہ مشھور یلوح ویشھد
(۳) وشق لہ من اسمہ لیجلّہ فذو العرش محمود وھذا محمّد

(۱) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص (سیدنا محمد ﷺ) کو اپنی برہان عطا کر کے بھیجا ہے اور اللہ (عزوجل) بہت ہی بلند اور بزرگی والا ہے۔ (۲) وہ حسین وجمیل ہیں' اُن پر اللہ (عزوجل) کی جانب سے نبوت کی چمکدار اور گواہی دینے والی بلند مہر موجود ہے۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے اُن کی عظمت بڑھانے کے لیے اپنے نام سے اُن کا نام مشتق کیا ہے' یعنی وہ مالکِ عرش ''محمود'' ہے اور یہ رسول ﷺ ''محمد'' ہیں۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۲۳) میرے پانچ نام ہیں[۹۷]' میں محمد ہوں' حامد ہوں' ماحی ہوں (یعنی) اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر کو مٹائے گا' میں حاشر ہوں (یعنی) میرے قدموں میں لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ اور میں عاقب ہوں (یعنی) وہ شخص کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور اللہ نے اُن کا نام رؤوف رحیم (بھی) رکھا ہے[۹۸] (صحیح بخاری:۳۵۳۲' صحیح مسلم:۲۳۵۴' سنن ترمذی:۲۸۴۰' مؤطا امام مالک:۱۹۴۲' سنن

---

۹۷ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اسماء مبارکہ بہت زیادہ ہیں۔ علامہ ابن العربی نے شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ بھی ایک ہزار ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے اسماء بھی ایک ہزار ہیں۔ زیر بحث حدیث میں جو فرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ پانچ نام میری خصوصیت ہیں۔ بعض نے یہ معنیٰ بیان کیا ہے کہ میرے ناموں میں سب سے عظیم نام پانچ ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ کسی چیز کی تعداد بیان کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ چیز اُسی عدد میں محدود ہو۔ (عمدۃ القاری ج۱۱ص۲۸۲)

۹۸ حدیث شریف کا یہ آخری جُملہ زیر بحث روایت سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یونس بن یزید کی ایک روایت جو امام زُہری سے ہے' اُس میں یہ جملہ ہے۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں امام زُہری کا قول قرار دیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج۱۱ص۲۸۳)

دارمی: ۲۷۷۵، مسند احمد ج ۴ ص ۸۰-۸۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۷۷۶-ص ۵۵۱)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۲۴) رسول اللہ ﷺ ہمیں اپنے کچھ نام بتایا کرتے تھے۔ (ایک مرتبہ) آپ نے فرمایا: میں محمد ہوں، احمد ہوں، مقفّی[99] ہوں، نبی التوبہ اور نبی الرحمۃ ہوں۔ (صحیح مسلم: ۲۳۵۵، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۷۷۷-ص ۵۵۱)

☆ اس حدیث شریف میں ''مقفّی'' کا جو لفظ ہے اس کا معنیٰ ہے: ایسا شخص جو تمام نبیوں میں سب سے آخری ہو اور اس کے بعد مزید کوئی نبی نہ ہو۔

نبی اکرم ﷺ کا انتقال فرما جانا یا شہید ہو جانا اس بات کو مستلزم نہیں کہ آپ کے دین کو ترک کر دیا جائے

﴿اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ﴾ یعنی اگر محمد (ﷺ) انتقال کر جائیں یا اُنہیں شہید کر دیا جائے تو کیا تم اپنے پہلے دین کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ جو شخص بھی اپنی پہلی والی حالت کی طرف چلا جائے اُس کے لیے عربی میں کہا جاتا ہے: ''رجع وراء ہ ونکص علی عقبیہ'' (وہ پیچھے اپنی پہلی حالت پر الٹے پاؤں پلٹ آیا)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت مبارکہ میں) یہ بات بیان فرمائی ہے کہ محمد عربی ﷺ کے انتقال کر جانے یا شہید ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کے دین میں آدمی کمزور ہو جائے اور دین کو ہی چھوڑ دے۔ کیونکہ اُن سے پہلے جتنے انبیاء آئے سب کو موت آئی ہے اور ان کے ماننے والے اپنے نبیوں کے انتقال کے بعد اُن کے دین پر قائم رہے۔

﴿وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا﴾ یعنی جو شخص بھی اللہ کے دین کو چھوڑ کر کفر کی طرف جائے گا وہ اس دین کو چھوڑ کر اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے اس لیے کافروں کا کفر اُسے نقصان نہیں دے سکتا۔ کفر خود مرتد اور کافر کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

''شاکرین'' کی تفسیر

﴿وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ﴾ اللہ شکر کرنے والوں کو عنقریب صلہ عطا فرمائے گا۔ اس میں ''شاکرین'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے دین پر ثابت قدم رہتے ہیں اور پلٹتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چونکہ اللہ (عزوجل) کی عطا کردہ نعمت اسلام اور اس پر ثابت قدمی کا شکر ادا کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ''شاکرین'' فرمایا۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق اور ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اُنہیں عنقریب اللہ تعالیٰ بدلہ عطا فرمائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس جملہ کی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ عنقریب اللہ دین پر ثابت قدم رہنے والوں یعنی حضرت ابوبکر اور رسول اللہ ﷺ کے دیگر صحابہ کو بدلہ عطا فرمائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ حضرت

---

99 یہ لفظ ''مُقَفِّی'' اور ''مُقَفّٰی'' دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ ''مُقَفِّی'' (اسم فاعل) کی صورت میں اس کا معنیٰ ہوگا: سب نبیوں کے بعد دُنیا میں آنے والا۔ اور ''مُقَفّٰی'' (اسم مفعول) کی صورت میں اس کا معنیٰ ہوگا: تمام انبیاء کرام اور ساری مخلوق سے آگے رہنے والا اور سب اُن کے نقش قدم پر چلنے والے۔ اس حدیث شریف کے آخر میں جو فرمایا کہ میں نبی التوبہ اور نبی الرحمۃ ہوں، اس میں نبی التوبہ سے مراد یہ ہے کہ ساری مخلوق میرے ہی ہاتھ پر توبہ کرنے والی ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ میرے دین میں توبہ کو آسان کر دیا گیا ہے یا میری برکت اور وسیلہ سے حضرت آدم اور دیگر انبیاء کرام (علیہم السلام) کی توبہ مقبول ہوئی۔ یا یہ مراد ہے کہ جو میرے دربار میں حاضر ہو کر اللہ سے بخشش طلب کرے گا وہ اللہ عزوجل کو توّاب (بہت توبہ قبول کرنے والا) اور رحیم (نہایت مہربان) پائے گا۔ جیسا کہ سورۃ النساء: ۶۴ میں مذکور ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۸ ص ۵۸)

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شاکرین کے امین ہیں اور اللہ عزوجل نے جو خبریں دی ہیں ان کے بھی امین ہیں۔ وہ تمام صحابہ میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ شکرگزار اور سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر نہیں مر سکتا' سب کا وقت لکھا ہوا ہے' اور جو دُنیا کا انعام چاہے گا ہم اُسے اُس میں سے دیں گے اور جو آخرت کا انعام چاہے گا ہم اُسے اس میں سے دیں گے اور ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو جزاء دیں گے O

آیت مذکورہ میں اس بات کو بیان کرنے کی وجہ کہ ہر شخص کی موت اللہ عزوجل کے حکم کے تابع ہے

آیت میں ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ سے اللہ عزوجل کا حکم' فیصلہ' تقدیر اور علم مراد ہے (یعنی جس شخص کو بھی موت آتی ہے تو اللہ عزوجل کے حکم' اس کے فیصلہ' تقدیر اور علم سے موت آتی ہے)۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت کو لوگوں کی رُوح قبض کرنے کا حکم فرماتا ہے' یوں سب کی موت اللہ عزوجل کے حکم سے ہوتی ہے۔ آیت مبارکہ میں اس بات کو اس لیے بیان فرمایا تاکہ مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ بڑھے اور دشمن سے مقابلہ کرتے وقت ہمت اور حوصلہ قائم رہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ بزدلی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور جو چیز ہونے والی ہے وہ خوف سے دور نہیں ہوتی اور کسی بھی شخص کو اس کے وقتِ معین سے پہلے موت نہیں آتی اگرچہ وہ تباہ کن مقامات میں گھس جائے اور میدانِ جنگ میں پھنس جائے۔ البتہ جب وقتِ معین آ جاتا ہے تو کوئی تدبیر موت کو دور نہیں کر پاتی۔ اس لیے ڈر' خوف اور بزدلی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس آیت مبارکہ میں یہ بات بھی بتائی جا رہی ہے کہ جب کسی شخص پر دشمن غالب آ رہا ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حفاظت کو یاد کرے اور جب دشمن اُس کی طرف رُخ کرے یا آدمی کو اُس کے ساتھی دشمن کے حوالہ کر دیں تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نجات دلانے کو یاد کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو دشمن سے سلامتی اور حفاظت کے ساتھ نجات عطا فرما دے گا اور دشمن اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

آیت میں جو ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ فرمایا ہے اُس میں ''مؤجل'' کا معنیٰ ''مؤقت'' ہے (یعنی) موت کا ایک معیّن وقت ہے' وہ نہ آگے ہو گا نہ پیچھے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے لیے ایک وقت لکھ دیا ہے۔ کوئی شخص اس کو تبدیل یا آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''کتابا مؤجلا'' میں کتاب سے لوحِ محفوظ مراد ہے۔ کیونکہ اس میں تمام لوگوں کی موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔

ثوابِ دنیا اور ثوابِ آخرت کی تفسیر

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ جو شخص دُنیا کا ثواب چاہے گا ہم اُسے اس میں سے دیں گے۔ اس میں ''ثوابِ دُنیا'' سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے عمل اور اپنی عبادت کے بدلہ میں دُنیا چاہے گا اور دُنیا کے حصول کے لیے عمل کرے گا ہم اُسے اس دنیا کی وہ چیز دے دیں گے جو اس کے عمل کا بدلہ ہو جائے۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس شخص کے لیے جو کچھ مقدر کیا ہے اس کے مطابق ہم جو چاہیں گے اس دنیا میں اُسے دے دیں گے۔ یہ ارشاد اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوا جو احد والے دن مرکز کو چھوڑ کر مالِ غنیمت میں مصروف ہو گئے تھے۔

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾ اور جو شخص آخرت کا ثواب چاہے گا ہم اُسے اس میں سے عطا کریں گے۔ اس

میں ''ثوابِ آخرت'' اسے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے عمل کے بدلہ میں آخرت چاہے گا ہم اُسے آخرت میں اُس کا اجر عطا کریں گے۔ یہ ارشاد اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوا جو اُحد والے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

نوٹ: یہ آیت مبارکہ اگرچہ خصوصیت کے ساتھ جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن (اس کا حکم) تمام اعمال کو شامل ہے۔ کیونکہ تمام اعمال کی بنیاد بندے کی نیت پر ہے۔ اگر وہ اپنے عمل کے بدلہ میں دنیا کی خواہش رکھتا ہے تو اُسے صرف دنیا میں بدلہ ملے گا اور آخرت کی خواہش رکھتا ہے تو آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی بدلہ ملے گا۔

احادیث کی روشنی میں حسن نیت کا مقام

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(١٢٥) اعمال کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے۔ (ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اعمال کا دارومدار صرف نیت پر ہے)۔ ہر شخص کے لیے صرف وہی ہے جو وہ نیت کرے۔ لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ دُنیا مل جائے یا نکاح کے لیے عورت کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی طرف اُس نے ہجرت کی۔ (صحیح بخاری: ١۔٥٤، صحیح مسلم: ١٩٠٧، سنن ابوداؤد: ٢٢٠١، سنن ترمذی: ١٦٤٧، سنن نسائی: ٧٥، سنن ابن ماجہ: ٤٢٢٧، مسند احمد ج١ص ٢٥، سنن بیہقی ج٤ص ٢٣٥، مشکوٰۃ المصابیح: ١۔ص ١١)

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٢٦) جس شخص کی نیت طلب آخرت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اُس کے دل میں اُس کا غِنا پیدا فرما دیتا ہے اور اس کے متفرقات کو جمع فرما دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے[١٠٠] اور جس شخص کی نیت طلب دنیا ہو اللہ تعالیٰ اُس کی آنکھوں کے سامنے محتاجی ڈال دیتا ہے' اُس کے معاملات کو اُس پر پھیلا دیتا ہے اور اُسے صرف اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے لکھا ہوتا ہے[١٠١] (سنن ترمذی: ٢٤٦٥، سنن ابن ماجہ: ٤١٠٥، مسند احمد ج٥ص ١٨٣، مشکوٰۃ المصابیح: ٥٣٢٠۔ص ٤٥٤)

﴿وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ﴾ (ہم شکر کرنے والوں کو عنقریب بدلہ عطا کریں گے۔) یعنی اُن فرمانبردار مسلمانوں کو بدلہ عطا کریں گے جنہیں کوئی چیز جہاد سے نہ روک سکی اور انہوں نے اپنے اعمال کے بدلہ میں صرف ذاتِ باری تعالیٰ اور آخرت کی خواہش کی۔

---

[١٠٠] دل میں غنا پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے ضرورت کی چیزوں پر قناعت کرنے والا بنا دے گا۔ لالچ اور اضافہ کی خواہش سے اُسے دُور رکھے گا۔ متفرقات جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اُس کے بکھرے ہوئے معاملات اور پریشانیوں کے حل کے لیے ایسے اسباب یکجا فرما دے گا کہ اُسے اپنی مشکلات کے آسان ہونے کا احساس تک نہ ہوگا۔ دُنیا کے ذلیل ہونے سے مراد یہ ہے کہ دُنیا اُس کے پاس اس حالت میں آئے گی کہ اُسے دُنیا کی کوئی 'طلب' خواہش اور ضرورت نہیں ہوگی۔ دُنیا کے سارے وسائل اُس کے قدموں میں اور ہاتھوں کے اشاروں پر ہوں گے۔ (مرقات' بتوضیح' ج٩ص ١٨٠)

[١٠١] اس حدیث شریف میں طلب آخرت والے کے لیے فرمایا کہ دُنیا اُس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے اور طلب دُنیا والے کے لیے فرمایا کہ اُسے صرف اتنا ہی ملتا ہے جتنا اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے لکھا ہوتا ہے۔ علامہ شرف الدین طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ طالب دُنیا اور طالب آخرت دونوں کو وہی ملتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں لکھا ہوتا ہے' لیکن طالبِ آخرت کو اس حالت میں ملتا ہے کہ دُنیا اُس کی محتاج اور تابع ہوتی ہے اور خود اُس کے پاس آتی ہے۔ جبکہ طالب دُنیا کو اس حالت میں ملتا ہے کہ وہ دُنیا کا محتاج اور تابع ہوتا ہے۔ (مرقات ج٩ص ١٨١)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور کتنے ہی نبی (ایسے گزرے) جنہوں نے جہاد کیا' اُن کے ساتھ بہت اللہ والے تھے' پس انہوں نے اللہ کی راہ میں پہنچنے والی مصیبتوں میں نہ ہمت ہاری نہ کمزور پڑے نہ دبے' اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے O

آیت مذکورہ میں ''قَاتَلَ'' کو ''قَاتَلَ'' اور ایک قرأت کے مطابق ''قُتِلَ'' پڑھنے کی صورت میں آیت کے معانی ومفاہیم

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ ﴾ (اور کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا' اُن کے ساتھ بہت اللہ والے تھے)۔

اس آیت میں ''قَـاتَـلَ'' اور ''قُتِلَ'' دونوں قرأتیں ہیں۔ جنہوں نے ''قُتِلَ'' پڑھا ہے ان کے نزدیک آیت کے معنیٰ و مفہوم کی چند توجیہات ہیں:

(۱) ایک یہ کہ قتل کا تعلّق صرف نبی سے ہے۔ اس صورت میں ''قُتِـلَ'' پر چونکہ کلام تام ہو گیا اس لیے اس پر وقف کیا جائے گا۔ اور اس میں واؤ کو محذوف مانیں گے۔ یعنی ''قتل ومعهٗ ربیون کثیر'' معنیٰ یہ ہوگا کہ کتنے ہی نبی شہید ہو گئے اس حال میں کہ اُن کے ساتھ بہت اللہ والے تھے۔ یعنی بہت سے انبیاء شہید ہوئے اور جو لوگ اُن کے پیچھے باقی رہ گئے وہ اپنے دین میں نہ کمزور پڑے نہ انہوں نے ہار مانی بلکہ دشمن کے ساتھ جہاد اور اپنے دین کی مدد میں لگے رہے۔ اس لیے تمہیں بھی چاہیے کہ اُن جیسے بنو۔

(۲) دوسری توجیہ یہ کہ قتل کا تعلّق انبیاء اور ان کے ساتھ موجود اللہ والوں سے ہے۔ لیکن بعض اللہ والے مراد ہیں۔ اور آگے ''فـمـا وهنوا'' (الخ) کا تعلّق باقی اللہ والوں سے ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ کتنے ہی انبیاء اور ان کے ساتھ بعض اللہ والے شہید ہو گئے۔ لیکن ان کے پیچھے جو باقی لوگ تھے وہ اپنے بھائیوں کے شہید ہونے کی وجہ سے کمزور نہیں پڑے بلکہ مصروف جہاد رہے۔ اس لیے تمہیں بھی چاہیے کہ اُن جیسے بنو۔

(۳) تیسری توجیہ یہ ہے کہ قتل کا تعلّق نبی سے نہیں ہے' صرف اللہ والوں سے ہے۔ اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ کتنے نبی ایسے ہیں کہ اُن کے ساتھ جو بہت سارے اللہ والے اُن کے دین پر تھے اُن کی ایک تعداد شہید ہو گئی۔

جن علماء نے آیت میں ''قُتِلَ'' کی بجائے ''قَاتَلَ'' پڑھا ہے اُن کے نزدیک آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ کتنے ہی نبی ایسے ہیں جن کے ساتھ اُن کے کئی اصحاب نے جہاد کیا' دشمن نے اُنہیں زخموں سے چور کر دیا لیکن انہوں نے تکالیف اور مصائب کی وجہ سے ہمت نہیں ہاری بلکہ مسلسل دشمنوں سے برسر پیکار رہے۔ کیونکہ اُنہیں جو تکلیفیں پہنچی تھیں وہ اللہ عزوجل کی راہ میں' اُس کی اطاعت میں' اس کے دین کے نفاذ میں اور اس کے پیغمبر کی نصرت وحمایت میں پہنچی تھیں۔ اس لیے اے امت محمد (ﷺ)! تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاہیے۔ اس قرأت کی دلیل وہ قول ہے جو حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: ''ما سمعنا ان نبيا قتل في القتال'' (ہم نے نہیں سُنا کہ کسی نبی کو لڑائی کے دوران شہید کیا گیا ہو)۔

آیت میں جو ﴿ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ﴾ کے الفاظ ہیں اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس سے جموع کثیرہ (یعنی کثیر گروہ) مراد ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''رِبیّون'' سے ''اُلوف'' مراد ہیں (یعنی کئی ہزار لوگ)۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ایک ''ربیّـه'' دس ہزار کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ''ربیّـه'' ایک ہزار کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین

فرماتے ہیں کہ ''ربیّون'' سے فقہاء وعلماء مراد ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے پیروکار مراد ہیں۔

''وھن' ضعف''اور''استکانۃ''کی تفسیر

﴿فَمَاوَهَنُوْا﴾ کا معنیٰ ہے: (انبیاء اور ان کے ساتھ اللہ والے) راہ خدا میں جہاد سے بزدلی کا شکار نہ ہوئے۔ ﴿وَمَاضَعُفُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُنہیں اپنے زخم اور اپنے ساتھیوں کے شہید ہونے کی جو تکلیف پہنچی اس کی وجہ سے وہ جہاد کرنے کے معاملہ میں کمزور نہیں پڑے۔ ﴿وَمَااسْتَكَانُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے نہ دباؤ قبول کیا نہ دشمن کے آگے جھکے بلکہ اپنے رب عزوجل کے حکم اور اپنے نبی کی اطاعت اور اپنے دشمن سے جہاد پر قائم رہے۔

گزشتہ انبیاء کرام اور ان کے ساتھ اللہ والوں کے متعلق مذکورہ باتیں بیان کر کے اشارتاً یہ بتایا جارہا ہے کہ صحابہ کرام غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر ہمت ہار بیٹھے تھے اور مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے میں کمزور پڑ گئے تھے اور اُن کے دباؤ میں آ گئے تھے کیونکہ انہوں نے ایک منافق شخص عبد اللہ بن ابی کے سہارے ابوسفیان سے امان طلب کی تھی۔ زیر بحث آیت مبارکہ میں مقصود اُن باتوں کو بیان کرنا ہے جو تمام انبیاء کرام اور اُن کے ماننے والوں کو پیش آئیں۔ تاکہ یہ امت بھی اُن کی پیروی کرے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں جوش جہاد بڑھے۔

﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (اور اللہ صابرین کو پسند فرماتا ہے۔) یعنی اُن لوگوں کو جو جہاد میں صبر (واستقامت) سے کام لیتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ جو شخص طلب آخرت میں پیش آنے والی تکالیف کو برداشت کرتا ہے اور گریہ وزاری اور بے ہمتی کا مظاہرہ نہیں کرتا اس سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے۔ اللہ کی بندے سے محبت کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو انعام واکرام اور عزت و ثواب عطا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور اُسے اپنے نیک اور محبوب بندوں کے ساتھ جنت میں داخل کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

اور ان کی دُعا صرف یہی تھی کہ اے ہمارے رب! تو ہمارے گناہوں اور ہماری اپنے کام میں زیادتیوں کو ہمارے لیے بخش دے' اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور کافر لوگوں پر ہماری مدد فرما ○

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ''ذنوب' اسراف''اور ثابت قدمی کا معنیٰ ومفہوم

﴿قَوْلَهُمْ﴾ سے اُن لوگوں کا قول مراد ہے جنہیں گزشتہ آیت میں ''ربیّون'' فرمایا گیا ہے (یعنی انبیاء کے ساتھ جو اللہ والے تھے وہ یہ دُعا کرتے تھے جو آیت میں مذکور ہے)۔ ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ میں جو''ذنوب'' کا لفظ ہے اس میں صغیرہ کبیرہ تمام گناہ داخل ہیں (یعنی ہمارے صغیرہ کبیرہ تمام گناہوں کو معاف فرما)۔ ﴿وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا﴾ میں''اسراف'' سے مراد یہ ہے کہ ہماری اُن باتوں کو معاف فرما جن میں ہم نے زیادتی کی اور اس کے نتیجہ میں بڑے گناہوں تک جا پہنچے۔ اس معنیٰ کو مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ''اسراف'' کسی چیز میں زیادتی اور حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا زیر بحث پورے جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ہمارے رب! ہمارے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو معاف فرما۔

﴿ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ (ہمیں ثابت قدمی عطا فرما) تاکہ جب دشمن کا سامنا ہو تو ہم پھسل نہ جائیں۔ ثابت قدمی سے مراد یہ تھی کہ اُن کے دلوں سے دشمن کا خوف اور دبدبہ نکال دیا جائے۔

آخری جملہ میں کافروں کے خلاف اللہ تعالیٰ سے جو مدد کی دُعا کی گئی اُس کی وجہ یہ ہے کہ دشمنوں کے خلاف اللہ تعالیٰ ہی

سے مدد حاصل ہوتی ہے۔[102]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ گذشتہ انبیاء کرام کے ساتھ جو اللہ والے تھے وہ دشمن کا مقابلہ کرنے سے پہلے دعاء اور گریہ وزاری کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے تائید ونصرت طلب کرتے تھے (یعنی ان سب چیزوں کے ساتھ تیار ہو کر وہ جنگ کرتے تھے)۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کو بھی اس طریقۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ اے امتِ محمدیہ! جو کام گذشتہ لوگوں نے کیے وہ تم کیوں نہیں کرتے اور جو کچھ انہوں نے کہا (یعنی دُعا کی) وہ تم کیوں نہیں کہتے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

تو اللہ نے ان کو دنیا کا انعام (بھی) دیا اور آخرت کا عمدہ ثواب (بھی) اور نیکی کرنے والوں کو اللہ پسند فرماتا ہے O

ثوابِ دنیا اور ثوابِ آخرت کی تفسیر

﴿ثَوَابَ الدُّنْيَا﴾ سے مراد ہے: مددٗ مالِ غنیمت، دشمنوں کا مغلوب ہونا، تعریف وتحسین کا حاصل ہونا اور گناہوں خطاؤں کی بخشش۔ جبکہ ﴿ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ سے جنت اور جنت کی دائمی نعمتیں مراد ہیں۔

اس آیت میں ثوابِ آخرت کے ساتھ حُسن کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اُخروی انعامات بہت ہی جلیل القدر اور عظیم ہیں۔ کیونکہ وہ نہ کبھی ختم ہوں گے نہ اُن میں بدمزگی آئے گی۔ اس کے برخلاف ثواب دنیا (یعنی دنیاوی فائدہ) چونکہ قلیل اور جلد ختم ہونے والا ہوتا ہے اور (وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ) اُس میں بدمزگی بھی آجاتی ہے اس لیے آیت میں اُس کے ساتھ حُسن کا لفظ نہیں بڑھایا گیا۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (اور محسنین کو اللہ پسند فرماتا ہے۔) ''محسنین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو گذشتہ انبیاء کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے طریقہ پر چلتے ہیں (یعنی دشمن کا مقابلہ کرنے سے پہلے رب ذوالجلال کے حضور اپنی لغزشوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور اس سے ثابت قدمی اور مدد کی دُعا کرتے ہیں)۔ اس میں اللہ عزوجل کی جانب سے مسلمان بندوں کو اس بات کی تعلیم ہے کہ وہ بھی دشمن سے مقابلہ درپیش ہونے پر اس طرح کے جملے کہیں (یعنی اس طرح کی دُعا کریں)۔ نیز اس آیت میں ایک باریک نکتہ موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء کے ساتھ جہاد کرنے والوں نے جب اپنی لغزشوں کا اور اپنے خطاکار ہونے کا اعتراف کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ''محسنین'' کے نام سے سرفراز فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

اے ایمان والو! اگر تم کافروں کے کہے پر چلے تو وہ تمہیں اُلٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا دیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خسارہ میں رہو گے O بلکہ اللہ تمہارا حامی ہے، اور وہ بہترین مددگار ہے O

---

[102] بلکہ ہر معاملہ میں مدد اللہ عزوجل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خواہ وہ فرشتوں کے ذریعہ ہو یا انبیاء اور اولیاء کے وسیلے سے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یا اللہ تعالیٰ کے دیگر نیک بندوں سے جو مدد مانگی جاتی ہے وہ وسیلہ اور سبب کے طور پر ہوتی ہے۔ یعنی یہ حضرات وسیلہ ہوتے ہیں اور مدد اللہ عزوجل کی جانب سے ہوتی ہے اور یہ حضرات کسی کی مدد کرتے ہیں تو اللہ عزوجل ہی کی عطا اور اُس کی دی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں۔

کافروں کی مخالفت کا حکم اوران کی پیروی کرنے کا انجام

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ﴾ کافروں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے منافقین مراد ہیں۔ یہاں کافروں کی جس بات میں اطاعت کرنے سے منع کیا جارہا ہے وہ یہ تھی کہ اُحد والے دن جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو کافروں نے مسلمانوں سے کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف واپس آ جاؤ اور اپنے (گذشتہ) دین میں داخل ہو جاؤ۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ ''اے مسلمانو! کفار تمہیں جو جہاد ترک کرنے کا کہتے ہیں اُس کو اگر تم نے مان لیا تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹا دیں گے''۔ الٹے پاؤں لوٹانے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں تمہارے پہلے معاملہ کی طرف لوٹا دیں گے۔ یعنی ایمان لانے کے بعد کفر اور شرک کی طرف لوٹا دیں گے۔ کیونکہ کافروں کی دعوتِ کفر کو قبول کرنا بھی کفر ہے۔

﴿ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴾ ''نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خسارہ میں رہو گے''۔ یعنی (اگر تم کافروں کے کہے پر چلے تو) دنیا اور آخرت میں نقصان کا شکار رہو گے۔ دنیاوی نقصان سے مراد یہ ہے کہ کافروں کے پیروکار اور دشمنوں کے آگے جھکے رہو گے۔ اور آخرت کے نقصان سے جہنم میں جانا اور جنت سے محروم ہونا مراد ہے۔

اگلی آیت: ۱۵۰ میں جو فرمایا: ﴿ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل تمہارا نگہبان، مددگار اور محافظ ہے، لہٰذا تم اُس سے مدد طلب کرو۔ ﴿ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پر قادر ہے۔

مقصود کلام یہ ہے کہ تم کافروں کے کہے پر اس لیے چلتے ہو تا کہ وہ تمہاری مدد کریں۔ حالانکہ وہ اپنی مدد نہیں کر سکتے، دوسروں کی مدد کیا کریں گے! اس لیے تم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیا کرو، کیونکہ وہ بہترین مددگار ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اُس چیز کو شریک کیا جس کی کوئی دلیل اس نے نازل نہیں کی، اور ان کا (آخری) ٹھکانا جہنم ہے اور یہ ظالموں کا کتنا بُرا ٹھکانا ہے O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور کافروں کے دلوں میں رُعب ڈالنے کا مفہوم

﴿ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔) اس کی تفصیل یہ ہے کہ اُحد والے دن (جنگ کے بعد) ابوسفیان اور ان کے ساتھ دیگر کفار و مشرکین مکہ کی طرف واپس جانے لگے۔ جب کچھ راستہ طے ہو گیا تو اُنہیں شرمندگی ہوئی اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم نے بہت بُرا کیا کہ مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے زخمیوں کو چھوڑ دیا۔ چلو دوبارہ ان کی طرف اور ان کو مکمل ختم کر دو۔ جب انہوں نے یہ ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں رعب یعنی سخت خوف پیدا کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اس تفصیل کی رُو سے کافروں کے دلوں میں رُعب ڈالنے کا وعدہ غزوۂ اُحد کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ جبکہ بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ آیت کا سبب (پس منظر) اگرچہ خاص ہے لیکن اس میں جو وعدہ کیا گیا ہے وہ عام ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مہینہ کی مسافت تک رعب طاری کر کے (اللہ عزوجل کی جانب سے) میری مدد کی گئی ہے[۱۰۳] (مشکوٰۃ المصابیح:

---

[۱۰۳] یہ حدیث شریف تیسرے پارے کی پہلی آیت (البقرہ: ۲۵۳) کی تفسیر میں رقم: ۳۵۷ کے تحت مکمل تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔ اس کے حوالہ جات اور حاشیہ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۷۷،۵۷۸۔ص ۵۱۲) گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے کہ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں تمہارا اتنا رعب ڈال دیں گے کہ تم اُن پر غالب آ جاؤ گے اور تمہارا دین تمام ادیان پر غالب آ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دین اسلام تمام ادیان اور ملتوں پر غالب آ گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس (دین) کو تمام ادیان پر غالب کر دے''۔ (الحجرات: ۲۸)

﴿ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ﴾ (اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اس چیز کو شریک کیا جس کی کوئی دلیل اُس نے نازل نہیں کی۔) یعنی اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب و دبدبہ اس لیے ڈالا کہ وہ اللہ عزوجل کے ساتھ ایسی چیز کو شریک کرتے تھے جس کی کوئی حجت اور دلیل اُس نے نازل نہیں فرمائی۔ ''سلطان'' چونکہ سلیط سے مشتق ہے اور سلیط چراغ جلانے کے تیل کو کہتے ہیں اس لیے حجت اور دلیل کو سلطان کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سلطان کا معنیٰ قوت اور قدرت ہے۔ چونکہ حجت اور دلیل میں باطل کو دور کرنے کی طاقت موجود ہوتی ہے اس لیے اسے سلطان کہا جاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کی دنیاوی حالت بیان فرما دی کہ ان کے دلوں میں رُعب اور خوف ڈال دیا جائے گا تو اس کے بعد اُن کی اخروی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ ظالموں کا کتنا بُرا ٹھکانا ہے۔

﴿ مَاْوٰى ﴾ کا معنیٰ ہے: مسکن (یعنی رہنے کی جگہ)۔ اور ﴿ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (دوزخ) ظالموں کا ایسا ٹھکانا ہے جس میں وہ ٹھہریں گے۔ اس جملہ میں جو ﴿ بِئْسَ ﴾ کا کلمہ ہے وہ تمام قابل مذمت چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے آگ میں لے جانے والے اور اس میں ٹھہرانے والے کام کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا اُن کا ٹھکانا کتنا بُرا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے حتیٰ کہ جب تم نے بزدلی دکھائی اور (رسول اللہ ﷺ کا) حکم ماننے میں اختلاف کیا اور اللہ نے جب تمہیں تمہاری پسندیدہ چیز دکھا دی اس کے بعد تم نے نافرمانی کی' تم میں کچھ وہ تھے جو دنیا چاہ رہے تھے اور کچھ وہ تھے جو آخرت چاہ رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمہیں کافروں سے پھیر دیا تا کہ وہ تمہاری آزمائش کرے اور یقیناً اللہ نے تم سے درگزر فرمایا اور اللہ مؤمنوں پر فضل و کرم والا ہے O

آیت مذکورہ کا پس منظر اور تفسیر

محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام جب احد سے مدینہ منورہ واپس پہنچے تو جو مصائب در پیش ہوئے تھے اُن کے بارے میں بعض صحابہ کرام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے مدد کا وعدہ فرمایا تھا پھر یہ مصائب ہم پر کہاں سے آ گئے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ ﴾ (یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔) اس میں ''وَعْدَهٗ'' سے مدد اور کامیابی کا وعدہ مراد ہے۔ کیونکہ جنگ کے آغاز میں کامیابی مسلمانوں کی طرف تھی۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ اُحد میں مدد کا وعدہ فرمایا تھا لیکن جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور مال غنیمت میں مشغول ہو گئے تو شکست سے دوچار ہو گئے۔

﴿ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب تم کافروں کو جلدی جلدی قتل کر رہے تھے۔ بعض مفسرین نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ جب تم قتل کر کے کافروں کو جڑ سے اکھاڑ رہے تھے۔ ﴿ بِاِذْنِهٖ ﴾ میں ''اذن'' سے اللہ کا علم اور حکم مراد ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے اللہ کا فیصلہ اور تقدیر مراد ہے (یعنی جب تم کافروں کو اللہ کے حکم اور فیصلہ سے قتل کر رہے تھے)۔

﴿ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ ''حتیٰ کہ جب تم نے بزدلی دکھائی اور حکم ماننے میں اختلاف کیا اور اللہ نے جب تمہیں تمہاری پسندیدہ چیز دکھا دی اس کے بعد تم نے نافرمانی کی''۔

امام فراء کہتے ہیں: یہاں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''حتی اذا تنازعتم فی الامر وعصیتم فشلتم'' (یعنی جب تم نے حکم کے بارے میں اختلاف کیا اور نافرمانی کی تو بزدل ہو گئے)۔ بعض مفسرین نے آیت کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ تمہاری جانب سے بزدلیٰ اختلاف اور نافرمانی (کے ظاہر ہونے) تک اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث جملہ (حتی اذا فشلتم) میں شرط کا معنیٰ موجود ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ جب تم بزدل ہو گئے اور حکم کے بارے میں اختلاف کیا اور نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنی مدد روک لی۔

آیت میں ''فشلتم'' کا معنیٰ اور غزوۂ احد میں مسلمانوں کا باہمی اختلاف

﴿ فَشِلْتُمْ ﴾ کا معنیٰ ہے: تم کمزور پڑ گئے۔ یہ ''فشل'' سے ہے اور ''فشل'' ایسی کمزوری کو کہتے ہیں جو بزدلی کے ساتھ ہو۔ ﴿ تنازع ﴾ کا معنیٰ اختلاف کرنا ہے۔ صحابہ کرام کا اختلاف اور تنازع یہ تھا کہ جب مشرکین کو شکست ہو گئی تو تیر انداز صحابہ جو حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھے ان میں سے بعض نے بعض سے کہا کہ جب مشرکین کو شکست ہو گئی ہے تو پھر یہاں رہ کر ہم نے کیا کرنا ہے؟ یہ کہہ کر وہ لوگ مال غنیمت کی طرف چلے گئے۔ جب اُن میں سے بقیہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے انحراف نہ کرنا۔ اس طرح اُن تیر اندازوں کے امیر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دس سے کم صحابہ کی ایک قلیل جماعت کو لے کر اُس جگہ پر ڈٹے رہے۔ جب خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے یہ منظر دیکھا تو وہ دیگر مشرکین کو لے کر تیر اندازوں کی اُس قلیل جماعت پر ٹوٹ پڑے اور حضرت عبد اللہ بن جبیر اور ان کے دیگر ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ اُنہیں شہید کر کے دیگر مسلمانوں کی طرف رخ کیا اور ہوا جو پہلے بادِ صبا تھی بادِ مخالف بن گئی۔ مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور مشرکین و مسلمان سب آپس میں مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خوف کے مارے انجانے میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ اور (ان سب پر مستزاد یہ کہ) ابلیس نے لوگوں میں نداء کر دی کہ محمد (ﷺ) شہید ہو گئے۔ ان وجوہات کی بناء پر مسلمانوں کو شکست ہو گئی۔

زیر بحث آیت میں جو ﴿ عَصَیْتُمْ ﴾ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ نے مرکز پر قائم رہنے کا جو حکم دیا تھا اس کی تم نے نافرمانی کی۔ ﴿ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ اس میں ''ما تحبون'' سے مدد کامیابی اور مالِ غنیمت مراد ہے۔ یعنی اے گروہِ مسلمین! تمہیں اللہ نے مدد کامیابی اور مالِ غنیمت دکھا دیا اس کے بعد تم نے (رسول اللہ ﷺ کے حکم کی) نافرمانی کی۔

﴿ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ﴾ ''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دُنیا چاہ رہے تھے اور کچھ وہ تھے جو آخرت چاہ رہے تھے''۔ جو دنیا چاہ رہے تھے اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو مرکز کو چھوڑ کر مالِ غنیمت کی طرف چلے گئے۔ اور جو آخرت چاہ رہے تھے اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو شہید ہونے تک اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مرکز پر قائم رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی صحابی بھی دُنیا کو چاہتا ہو گا حتیٰ کہ غزوۂ احد کے موقع پر مذکورہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

﴿ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ ﴾ ''پھر اللہ نے تمہیں کافروں سے پھیر دیا''۔ یعنی اے گروہِ مسلمین! (اللہ عزوجل نے) تمہیں شکست کے ذریعہ مشرکین سے پھیر دیا۔ ﴿ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تاکہ وہ تمہیں آزمائے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ وہ تم پر آزمائش نازل کرے تاکہ تم اس کی بارگاہ میں توبہ استغفار کرو۔ بعض نے یہ معنیٰ بیان کیا ہے کہ اللہ سب سے زیادہ علم رکھتا ہے لیکن (اُس نے تمہیں مشرکوں سے اس لیے پھیرا) تاکہ وہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اس آزمائش سے مسلمان اور منافق کے درمیان اور دنیا و آخرت کے چاہنے والوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

﴿ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ﴾ ''اور یقیناً اللہ نے تم سے درگزر فرمایا''۔ اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے مؤمنین سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر فرمایا اور مخالفت و نافرمانی کے باوجود تمہارا خاتمہ نہیں فرمایا۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے تمہیں سزا دینے سے درگزر فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ ''اور اللہ مؤمنوں پر فضل فرمانے والا ہے''۔ یہ اُن نعمتوں کا اختتام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مسلمان بندوں پر فرمائیں۔ کیونکہ پہلے اُس نے مسلمانوں کی مدد فرمائی پھر اُن میں جن سے لغزشیں ہوئیں اُن سے درگزر فرمایا۔ کیونکہ وہ فضل و کرم اور احسان فرمانے والا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہی رہتا ہے[104] اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اپنے فضل و کرم سے اُس سے درگزر فرمالے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت جو کہ گناہ کبیرہ ہے اس کے باوجود زیر بحث آیت کے اختتام پر ''مؤمنین'' قرار دیا اور اُن سے درگزر فرمالیا۔

إِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡٓ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّا ۢ بِغَمٍّ لِّـكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

اور جب تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر کسی کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے حالانکہ (ہمارے) رسول تمہاری پچھلی جماعت میں (کھڑے ہوئے) تمہیں بلا رہے تھے تو اللہ نے تمہیں غم بالائے غم میں مبتلا کیا (اور عفو و درگزر کی نوید اس لیے سنائی) تاکہ تمہیں نہ اس پر غم ہو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اُس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی، اور اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے ○

آیت مذکورہ کا گزشتہ آیت سے تعلق اور اس کی تفسیر

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿ إِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ ﴾ گزشتہ آیت کے ساتھ متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ولقد عفا

[104] اس سے معتزلہ اور خارجیوں کا رد مقصود ہے۔ معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے آدمی کافر تو نہیں ہوتا لیکن مؤمن بھی نہیں رہتا اور خارجیوں کا نظریہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ بلکہ گناہ صغیرہ سے بھی آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اہل سنّت کے نزدیک یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ میں سے کسی کے ارتکاب سے بھی آدمی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

عنکم اذ تصعدون'' (اللہ نے تمہیں معاف فرمادیا جب تم بھاگے جارہے تھے)۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ سے جو درگزر فرمایا اس کے لیے کسی کام کا ہونا ضروری ہے جس کا انہوں نے ارتکاب کیا ہو اور وہ کام اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں ''اذ تصعدون'' سے بیان فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اذ تصعدون'' کا گذشتہ آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس سے نئے کلام کا آغاز ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ یاد کرو وہ وقت جب تم بھاگے جارہے تھے۔

''تُصعدون'' کو جمہور نے تاء کے پیش اور عین کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ ''اِصْعَاد'' سے ہے بمعنیٰ زمین میں چلنا اور دور چلے جانا۔ جبکہ امام حسن بصری نے اس کو ''تَصْعَدُوْنَ'' پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ ''صُعُود'' سے ہے بمعنیٰ نیچے سے اوپر کی طرف چڑھنا' جیسے پہاڑ' سیڑھی اور اس جیسی دیگر چیزوں پہ چڑھتے ہیں۔ اس جملہ کی تفسیر میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ صحابہ کرام شکست کے وقت پہاڑ پر چڑھے جارہے تھے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ شکست کے وقت اور بھاگتے وقت صحابہ کرام زمین میں دور نکل گئے تھے۔

﴿ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ ﴾ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ (تم اس طرح بھاگ رہے تھے کہ) اس دوران نہ کسی کی طرف مڑ رہے تھے نہ ٹھہر رہے تھے اور تیز بھاگنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی طرف بھی توجہ نہیں کر رہے تھے۔ ﴿ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ ﴾ ''حالانکہ رسول تمہاری پچھلی جماعت میں تمہیں بُلا رہے تھے''۔ مراد یہ ہے کہ رسول (ﷺ) تمہارے پیچھے کہہ رہے تھے: اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ' میں اللہ کا رسول ہوں' جو لوٹ آیا وہ جنت کا حق دار ہوگا۔

ثواب کا لفظ استعمال کرنے کی تحقیق

﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ ﴾ ''تو اللہ نے تمہیں غم بالائے غم میں مبتلا کیا''۔ یعنی تم اپنے نبی کریم (ﷺ) کو چھوڑ کر جو بھاگے اور دشمن کے سامنے بزدلی دکھائی اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم بالائے غم دیا۔ یہاں ﴿ اثابکم ﴾ کا لفظ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے سزا کو ثواب فرمایا ہے یہ بر سبیل مجاز ہے' کیونکہ ثواب کا لفظ اکثر امور خیر میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن شر کے کاموں میں بھی اس کا استعمال جائز ہے کیونکہ یہ ثاب یثوب سے مأخوذ ہے (بمعنیٰ لوٹنا)۔ لہٰذا ثواب بنیادی طور پر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کام کرنے والے کو اس کے کام کے بدلہ میں ملے۔ خواہ وہ کام اچھا ہو یا بُرا۔ اس لیے جب ہم لفظ ثواب کا اصل لغوی معنیٰ مراد لیں گے تو آیت مبارکہ میں غم کے لیے ''اثــاب'' کا لفظ اپنے حقیقی معنیٰ میں ہوگا اور جب اسے اغلب و اکثر پر محمول کریں گے تو ''اثاب'' کا لفظ بر سبیل مجاز ہوگا۔ جیسے شاعر کا یہ شعر:

اخــاف زیــادا ان یــکــون عــطــاءہٗ　　أداهــم ســودا أو مــحــدرجة ســمــرا

''میں زیاد کی اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی عطاء و بخشش سیاہ بیڑیاں اور گندمی کوڑے نہ بن جائے''۔

اس شعر میں شاعر نے عطاء و بخشش کا لفظ سزا کی جگہ استعمال کیا ہے کیونکہ آگے ''اَدَاهِمُ سُوْد'' اور ''مُحْدَرَجَه'' کے الفاظ ہیں۔ ''اَدَاهِمُ سُوْد'' بھاری بیڑیوں کو کہتے ہیں اور ''مُحْدَرَجَه'' کوڑے کو کہتے ہیں۔

زیر بحث آیت میں ﴿ غَمًّۢا بِغَمٍّ ﴾ کی باء مع یا علیٰ کے معنیٰ میں ہے۔ کیونکہ حروف جارہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک باء اپنے معنیٰ میں ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں غم کے متصل غم میں مبتلا کیا۔

''غمّا بغمّ'' میں جن دو غموں کا تذکرہ ہے ان کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

یہاں دو غموں کا تذکرہ ہے اس سے کون سے دو غم مراد ہیں؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں: (۱) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلے غم سے مراد وہ ہے جو فتح و نصرت اور مال غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے سے ہوا اور دوسرا غم وہ ہے

جو اپنے افراد کی شہادت اور شکست سے پہنچا۔ (۲) بعض فرماتے ہیں: پہلے غم سے مراد وہ ہے جو اپنے افراد کے شہید اور زخمی ہونے سے پہنچا اور دوسرا غم وہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے شہید ہونے کی خبر سُن کر ہوا۔ اس غم نے صحابہ کرام کو پہلا غم بھلا دیا۔ (۳) بعض مفسرین فرماتے ہیں: پہلے غم سے مراد یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے حکم کی مخالفت کر کے غمگین کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں صحابہ کو شہادت اور شکست دی۔ (۴) بعض فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کو پہلا غم وہ تھا جو مشرکین کے لشکر کے ساتھ خالد بن ولید کے حملہ آور ہونے سے ہوا۔ اور دوسرا غم وہ تھا جب مسلمانوں نے ابوسفیان اور دیگر مشرکین کو گھاٹی کے دروازے پر دیکھا اور انہیں دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ لوگ دوبارہ حملہ آور ہو کر قتل کریں گے۔ اس سے مسلمان غمگین ہو گئے۔

''لکیلا تحزنوا'' میں ''لا'' کے متعلق مفسرین کے دوقول اور دونوں صورتوں میں آیت کا مفہوم

﴿ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ﴾ ''تا کہ تمہیں نہ اُس پر غم ہو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اُس مصیبت پر جو تمہیں پہنچی''۔ یہاں ''لِكَيْلَا'' میں جو لفظ ''لا'' ہے اس کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ (۱) ایک قول یہ ہے کہ یہ اپنی اصل پر ہے اور نفی کے معنیٰ میں ہے۔ اس صورت میں یہ گذشتہ آیت میں ''وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ'' سے متصل ہوگا۔ معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ نے یقیناً تم سے درگزر فرمایا تا کہ تمہیں نہ اُس پر غم ہو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اُس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی۔ کیونکہ اللہ عزوجل کا درگزر ہر رنج وغم کو دور کر دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے ''لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اللہ نے تمہیں ایسے غم میں مبتلا کیا جس نے تمہارے ہاتھ سے نکل جانے والی چیزوں پر اور پیش آنے والی مصیبتوں پر ہونے والے غم کو فراموش کر دیا۔ مروی ہے کہ احد والے دن جب صحابہ کرام نے یہ خبر سنی کہ نبی اکرم ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے تو وہ تمام مصائب اور ہاتھ سے نکل جانے والی چیزوں کا غم بھول گئے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ''لکیلا'' میں لفظ ''لا'' زائدہ ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں غم بالائے غم میں اس لیے مبتلا کیا تا کہ تمہیں اُن چیزوں کا غم ہو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئیں اور اُن مصیبتوں کا جو تمہیں پہنچیں۔ یہ تمہارے لیے مخالفتِ حکم کی سزا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جو چیز مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اُس سے مال غنیمت مراد ہے اور جو (مصیبت پہنچی) اُس سے قتل اور شکست مراد ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اچھے بُرے اعمال کو جانتا ہے اس لیے وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

پھر اُس نے تم پر غم کے بعد سکون نازل کیا (یعنی) ایسی غنودگی جو تمہارے ایک گروہ پر چھارہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جس کو اپنی جان کی فکر لگی ہوئی تھی' وہ زمانہ جاہلیت والوں کی بدگمانی کی طرح اللہ کے ساتھ ناحق بدگمانی کررہے تھے' وہ کہہ رہے تھے کیا اس معاملہ میں ہمیں بھی کوئی اختیار ہے؟ آپ کہیے! بے شک تمام معاملات میں اختیار اللہ کا ہے' وہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے ہوئے ہیں' جو وہ آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے' وہ کہتے ہیں: اگر ہمیں اس معاملہ میں کوئی اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے' آپ کہیے! اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کا قتل ہونا مقدور ہو چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف (خود ہی) نکل آتے' (یہ سارے مصائب اس لیے تھے) تاکہ اللہ تمہارے سینوں میں (چھپی) باتوں کو آزمائے اور تمہارے دلوں میں جو (اندیشے) تھے اُنہیں صاف کردے اور اللہ سینے کے راز جاننے والا ہے O

آیت مذکورہ میں ''اَمَنَةً'' اور ''نُعَاسًا'' کی تشریح

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً ﴾ ''پھر اُس نے تم پر غم کے بعد سکون نازل کیا''۔ یعنی اے مسلمانو! تمہیں جو غم پہنچا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم پر امن وسکون نازل فرمایا۔ ''اُمنة'' اور ''اُمن'' کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ بعض کے نزدیک ''اُمن'' وہ ہوتا ہے جس میں خوف نہ ہو اور ''اُمنة'' اُسے کہتے ہیں جس میں خوف کا سبب باقی ہو۔ یہاں چونکہ خوف کا سبب باقی تھا اس لیے ''اُمنة'' کا لفظ فرمایا۔ ﴿ نُّعَاسًا ﴾ (یعنی مذکورہ سکون غنودگی کی صورت میں تھا۔) ''نعاس'' نیند سے کم درجہ کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں جو خوف اور رُعب لاحق ہوا تھا اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا امن دیا کہ تم خوف کے ساتھ ساتھ نیند کررہے تھے۔ کیونکہ جسے خوف اور ڈر لگا ہوتا ہے وہ نیند نہیں کرپاتا۔ اس لیے صحابہ کرام کو جو امن و سکون ملا تھا وہ خوف کے بعد تھا۔ ﴿ یَّغْشٰى طَآىٕفَةً مِّنْكُمْ ﴾ ''وہ غنودگی تمہارے ایک گروہ پر چھارہی تھی''۔ اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ نے اُحد والے دن ایسی اونگھ کی شکل میں امن دیا جو اُن پر چھارہی تھی۔ اور اونگھ اُسی کو آتی ہے جو امن وامان میں ہو' خوف زدہ شخص کو نیند نہیں آتی۔

جنگ اُحد کے دن صحابہ کرام پر غنودگی طاری ہونے کے بارے میں احادیث

(١٢٧) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اُن لوگوں میں شامل تھا جن پر احد والے دن غنودگی چھارہی تھی' حتیٰ کہ کئی مرتبہ میرے ہاتھ سے میری تلوار گری۔ وہ (میرے ہاتھ سے) گرتی میں اُسے اٹھالیتا وہ پھر گرتی میں پھر اٹھالیتا۔ (صحیح بخاری: ٤٠٦٨ ـ ٤٥٦٢' سنن ترمذی: ٣٠٠٨' مسند احمد ج ٤ ص ٢٩)

(١٢٨) امام ترمذی نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم احد والے دن اپنی صفوں کی جگہ پر تھے کہ ہم پر غنودگی چھاگئی۔ اس کے بعد کا حصہ امام بخاری کی روایت کی طرح ہے۔ البتہ یہ اضافہ ہے کہ دوسرا گروہ منافقین کا تھا' اُنہیں صرف اپنی جان کی فکر لاحق تھی۔ وہ سب سے زیادہ بزدل' سب سے زیادہ مرعوب اور حق کا ساتھ چھوڑنے میں سب سے آگے تھے۔ (امام ترمذی: ٣٠٠٨)

(١٢٩) امام ترمذی کی ایک اور روایت میں حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اُحد والے دن میں اپنا سر اٹھا کر لوگوں کو دیکھنے لگا تو ہر شخص غنودگی کی وجہ سے اپنی ڈھال کے نیچے جھکا جارہا تھا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا''۔ (سنن ترمذی: ٣٠٠٧' المستدرک ج ٢ ص ٢٩٧' السنن الکبریٰ للنسائی: ١١١٩٨)

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(١٣٠) جب ہمارا خوف بڑھ گیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے آپ کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر نیند مسلط

فرمادی ہے۔ خدا کی قسم! مجھ پر غنودگی طاری تھی اور میں مُعَتِّب بن قُشَیر کی بات سن رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خواب میں اس کی بات سُن رہا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا: ''لَوْكَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا'' (اگر ہمیں اس معاملہ میں کوئی اختیار ہوتا تو یہاں نہ مارے جاتے)۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۳ ص ۲۷۳، معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت)

مسلمانوں پر غنودگی طاری ہونے کا فائدہ اور منافقوں کا نقصان

﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ ''ایک گروہ ایسا تھا جس کو اپنی جان کی فکر لگی ہوئی تھی''۔ پہلے جس گروہ کے بارے میں فرمایا کہ اُس پر غنودگی چھارہی تھی اس سے مسلمان مراد ہیں اور اب جس گروہ کا تذکرہ ہورہا ہے اس سے منافقین مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو منافقوں سے ممتاز اور جُدا کردے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر غنودگی طاری فرمائی جس سے وہ پرسکون ہوگئے اور منافقوں پر غنودگی طاری نہیں فرمائی جس کی وجہ سے وہ خوف و ہراس کا شکار رہے۔ صرف مسلمانوں پر غنودگی طاری کرنے میں ایک عظیم نشانی اور روشن معجزہ ہے۔ کیونکہ غنودگی مسلمانوں کے لیے راحت وسکون کا باعث بنی اور منافقین پر غنودگی کا طاری نہ ہونا ان کے لیے خوف کا باعث بنا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ یعنی ایک گروہ کو اُن کی جانوں نے غم کرنے پر اُکسایا ہوا تھا۔ کیونکہ خوف کرنے کا سبب یعنی دشمنوں کا حملہ آور ہونے کا ارادہ اس گروہ کے نزدیک موجود تھا۔

﴿یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ﴾ ''وہ زمانہ جاہلیت والوں کی بدگمانی کی طرح اللہ کے ساتھ ناحق بدگمانی کر رہے تھے''۔ یعنی وہ (منافقین) اس بدگمانی میں تھے کہ اللہ عزوجل (سیدنا) محمد ﷺ اور صحابہ کی مدد نہیں فرمائے گا۔ ایک قول کے مطابق ان کی بدگمانی یہ تھی کہ (سیدنا) محمد ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے اور ان کا دین اب ختم ہو جائے گا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو حق اور صحیح گمان رکھنا واجب تھا اس کے خلاف وہ اللہ عزوجل کے ساتھ گمان کر رہے تھے۔ ﴿ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ﴾ کا معنی ہے: ''كظنّ أهل الجاهلية'' (جیسا کہ زمانہ جاہلیت والوں کا گمان)۔

منافقین کے قول ''هل لنا من الامر من شیئ'' کا پس منظر اور اس کا مفہوم

﴿یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ منافقین یہ کہہ رہے تھے کہ اس معاملہ میں ہمیں کیا اختیار ہے؟ ہوا یہ کہ غزوۂ احد کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی ابن سلول سے مشورہ فرمایا۔ اُس نے مشورہ دیا کہ مدینہ سے باہر نہ نکلا جائے (یعنی باہر نکل کر جنگ نہ لڑی جائے)۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کی مخالفت فرمائی اور باہر نکل کر جنگ لڑی۔ جب بہت سارے صحابہ کرام اس جنگ میں شہید ہوئے تو کسی نے عبد اللہ بن ابی سے کہا کہ بنوخزرج شہید ہوگئے۔ اُس نے کہا: ''هل لنا من الامر شیئی '' (کیا ہمارا اس معاملہ میں کوئی اختیار ہے؟) یہ استفہام انکاری کے طور پر اُس نے کہا، یعنی ہماری کوئی بات نہیں مانی جاتی۔ بعض مفسرین نے ''من الامر من شیئی'' میں ''امر'' سے مدد اور کامیابی مراد لی ہے۔ اس صورت میں ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ کا مفہوم یہ ہوگا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) نے ہم سے جس فتح و نصرت کا وعدہ کیا تھا اس میں سے ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا، بلکہ مشرکین بازی لے گئے۔

منافقین نے اپنے دلوں میں جو باتیں چھپا رکھی تھیں اُن کے متعلق اقوال

﴿یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ﴾ ''وہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو وہ آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے''۔ جو باتیں وہ چھپاتے ہیں اس سے ان کا کفر اور اللہ عزوجل کے وعدہ میں شک کرنا مراد ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لیے نکلنے پر دل ہی دل میں اُنہیں جو شرمندگی ہورہی تھی اُس کو وہ چھپا رہے تھے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ جس چیز کو وہ چھپا رہے تھے اس کو اللہ تعالیٰ نے خود آگے بیان فرمادیا ہے کہ: ''یَقُوْلُوْنَ لَوْکَانَ لَنَامِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا'' (یعنی وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس معاملہ میں کوئی اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے)۔ ہوا یہ کہ منافقین نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر ہمارے پاس عقل ہوتی تو ہم (سیدنا) محمد (ﷺ) کے ساتھ اہل مکہ سے جنگ کے لیے نہ نکلتے اور ہمارے سردار بھی نہ مارتے جاتے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: انہوں نے آپس میں یوں کہا کہ اگر ہم حق پر ہوتے تو یہاں نہ مارے جاتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما زیر بحث آیت میں ''یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے ساتھ منافقوں کی بدگمانی یہ تھی کہ انہوں نے تقدیر کو جھٹلایا۔ اور تقدیر کو اس طرح جھٹلایا کہ (اپنی زبان سے یہ جملہ) کہا: ''لَوْکَانَ لَنَامِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا'' (اگر ہمیں اس معاملہ میں کوئی اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے)۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ''هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ'' کہا تھا وہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول منافق تھے اور جس نے ''لَوْکَانَ لَنَامِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ'' کہا تھا وہ معتب بن قشیر تھا۔

﴿قُلْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ ان منافقین سے کہہ دیجئے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ جن کے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے اور قتل ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ ﴿مَضَاجِعِهِمْ﴾ سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں قتل کے وقت مقتولین گریں گے (یعنی اے محمد ﷺ! آپ منافقوں سے کہہ دیجئے! اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے قتل ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے)۔

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ فیصلہ اور تقدیر کی باتوں میں خوف سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور تدبیر تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا جن کے قتل ہونے کا فیصلہ اللہ عزوجل نے فرمادیا ہے وہ یقیناً قتل ہوں گے۔ یعنی اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے تب بھی قتل ہونے والے اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔

سینوں میں چھپی باتوں کو آزمانے اور قلبی خدشات کو دور کرنے کی تفسیر میں اقوال

﴿لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ﴾ (ان مصائب کا مقصد یہ تھا کہ) تمہارے سینوں میں جو کچھ ہے اس کو اللہ تعالیٰ آزمائے' تا کہ جو باتیں اُسے بہ طورِ غیب معلوم ہیں وہ بہ حیثیت مشاہدہ بھی اس کے علم میں آجائیں۔ کیونکہ جزاء وسزا اُنہی باتوں پر مرتب ہوتی ہے جن کو وہ مشاہدہ کی حیثیت سے جانتا ہے۔ بعض مفسرین نے ''لیبتلی اللہ'' کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آزمانے والے کی طرح معاملہ فرمائے۔ بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو اللہ والے آزمائیں۔ اللہ عزوجل نے اپنے مؤمن اور نیک بندوں کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آزمانے کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی۔

﴿وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (اور تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو نکھار دے۔) اس کی تفسیر میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے عجائب دکھا کر تمہارے دلوں کو شکوک وشبہات سے پاکیزہ فرماتا ہے۔ قدرت کے عجائب سے مراد یہ ہے کہ اُس نے تم پر (عین خوف کے عالم میں) غنودگی طاری کر کے تمہیں راحت پہنچائی' تمہارے دشمن کا رُخ تم سے موڑ دیا اور منافقین کے دل کی باتیں سب پر کھول دیں۔ اس تفسیر کی رُو سے مخاطبین صرف مسلمان ہوں گے۔ جبکہ بعض مفسرین نے ''لیمحص ما فی قلوبکم'' کی تفسیر یہ کی ہے کہ تمہارے دلوں میں اللہ' اس کے رسول (ﷺ) اور مسلمانوں کی جو دشمنی ہے اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر فرمادے۔ اس تفسیر کی رُو سے مخاطبین صرف منافقین ہوں گے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (اللہ سینے کی باتیں جانتا ہے۔) اس جملہ میں ''ذات الصدور'' سے وہ چیزیں مراد

ہیں جو سینے میں ہوتی ہیں۔ یعنی راز اور پوشیدہ باتیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم ہے اس لیے وہ سینے کے راز بھی جانتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْاۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۠

بے شک جس دن دو لشکر (مقابلہ کے لیے) صف آراء ہوئے تھے اس دن تم میں سے جو واپس چلے گئے تھے اُنہیں شیطان ہی نے اُن کے ایک عمل کی وجہ سے پھسلا دیا تھا' اور یقیناً اللہ نے اُن سے درگزر فرمالیا' بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت بُردبار ہے○

اُن مسلمانوں کا بیان جو غزوۂ احد میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ (بے شک دو لشکروں کے ملنے کے دن تم میں سے جو واپس چلے گئے تھے۔) یعنی اے گروہِ مسلمین! تم میں سے جو شکست کھا گئے تھے اور بھاگ گئے تھے۔ اس میں خطاب اُن مسلمانوں سے ہے جو احد والے دن نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ اکثر مسلمان اس دن شکست کھا گئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صرف تیرہ صحابہ کرام باقی تھے۔ ایک قول کے مطابق چودہ صحابہ باقی تھے۔ جن میں سات مہاجرین اور سات انصار تھے۔ جو مہاجرین تھے ان میں حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر' حضرت علی' حضرت طلحہ بن عبید اللہ' حضرت عبد الرحمٰن بن عوف' حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) شامل تھے۔

غزوۂ احد میں شیطان کا مسلمانوں کو لغزش میں مبتلا کرنا

﴿ اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ ﴾ (ہمت ہارنے والوں کو شیطان نے پھسلا دیا تھا۔) یعنی شیطان نے اُن سے غلطی کروائی۔ جیسے ''استعجلہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی اُس نے جلدی کروائی۔ بعض نے ''استزلھم'' کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ شیطان نے اُنہیں لغزش پر اکسایا۔ لغزش پر اس طرح اکسایا کہ اُن کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ نہ یہ کہ اُنہیں لغزش کا حکم دیا۔ ﴿ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ (کسی عمل کی وجہ سے پھسلا دیا) اس سے اُن کی نبی اکرم ﷺ کی نافرمانی اور مرکز کو چھوڑنا مراد ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شیطان نے اُنہیں اُن کی گذشتہ لغزشیں یاد دلا کر پھسلا دیا تھا۔ چنانچہ گذشتہ لغزشیں یاد آنے کی وجہ سے انہوں نے اس بات کو ناگوار جانا کہ وہ اُن لغزشوں سے خالص توبہ کرنے سے پہلے شہید ہوں۔ یہ قول امام زجاج نے پسند کیا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ صحابہ کرام اس وجہ سے میدان چھوڑ کر نہیں گئے تھے کہ اُن کے دل میں عناد اور مخالفت تھی یا دنیا کی رغبت اور خواہش تھی۔ بلکہ شیطان نے اُنہیں اُن کی گذشتہ لغزشیں یاد دلا دی تھیں' جس کی وجہ سے انہوں نے یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ سے ناپسندیدہ حالت میں ملنا (یعنی لغزشوں میں شہید ہونا) اچھا نہیں ہے۔ اس لیے وہ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

﴿ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو میدان سے چلے گئے تھے ان سے اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمالیا اور اُنہیں اس پر کوئی سزا نہیں دی بلکہ بخشش فرمادی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ احد والے دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس پر کسی نے اُنہیں ملامت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک خطاء ضرور تھی لیکن اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرما چکا ہے۔ پھر آپ نے زیر بحث آیت کی تلاوت فرمائی۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ اس میں "غفور" سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے توبہ اور اس کی طرف رجوع کرے اُس کو وہ بہت بخشنے والا ہے اور "حلیم" سے مراد یہ ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا اور نہ ہی قتل کے ذریعہ لوگوں کا بالکلیہ خاتمہ فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾

اے ایمان والو! کافروں کی طرح نہ ہو جانا کہ جب اُن کے بھائی سفر میں یا جہاد کو گئے تو ان کے بارے میں کہا کہ اگر ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ مارے جاتے' انجام یہ ہے کہ اللہ اس (خیالِ باطل) کو اُن کے دلوں میں حسرت کا باعث بنا دے گا' اور اللہ زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے O

آیت مذکورہ کی مختصر تفسیر اور اس بات کا بیان کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے کوئی فرار نہیں ہو سکتا

﴿ كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ میں کافروں سے منافقین مراد ہیں' یعنی عبد اللہ بن اُبی اور اس کے دیگر ساتھی۔ ﴿ لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ میں بھائیوں سے وہ مراد ہیں جو نفاق اور کفر میں ان کے بھائی تھے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے وہ مسلمان مراد ہیں جو اُن کے نسبی بھائی تھے۔ ﴿ ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ تجارت وغیرہ کے لیے زمین میں سفر کرتے تھے۔ ﴿ اَوْ كَانُوْا غُزًّى ﴾ میں "غُـزًّا" غازی کی جمع ہے بمعنی مجاہدین۔ اس مقام پر کلام میں معنوی طور پر پتا چل رہا ہے کہ کچھ محذوف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ فَمَاتُوْا اَوْ كَانُوْا غُزًّا فَقُتِلُوْا" (یعنی جب وہ حالت سفر میں مر جاتے ہیں یا جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں)۔ ﴿ لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ ہمارے پاس ٹھہرے رہتے۔ ﴿ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ ﴾ میں "ذالک" کا اشارہ کافروں کے قول اور گمان کی طرف ہے۔ ﴿ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ میں حسرت سے غم اور افسوس مراد ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ (اللہ زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے) اس میں منافقین کی اُس بات کا رد ہے جو اُنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہی کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ مارے جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی مراد یہ ہے کہ تمام معاملات اللہ کے دستِ قدرت میں ہیں' زندہ فرمانے والا موت طاری کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ (ایسا قادر ہے کہ) چاہے تو مسافر اور مجاہد کو زندہ لوٹائے اور غیر مسافر اور غیر مجاہد کو موت دے دے۔ اس لیے گھر میں بیٹھے رہنا کیونکر نفع بخش ہو سکتا ہے؟ اور موت سے کون محفوظ رہ سکتا ہے؟

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے۔) یعنی تمہارے اچھے بُرے کاموں سے وہ باخبر ہے' وہ تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اس لیے تم اس سے ڈرو اور منافقوں جیسے نہ بنو۔ کیونکہ منافقین اپنے بھائیوں کے بارے میں جو کہتے ہیں کہ "اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ مارے جاتے" اس سے وہ مسلمانوں کو جہاد سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ زندگی اور موت دینے والی ذات اللہ عزوجل کی ہے۔ جس کے لیے اُس نے زندگی اور بقاء مقدر فرما دی ہے وہ جہاد میں جانے کے باوجود قتل نہیں ہو سکتا اور جس کے لیے اس نے موت لکھ دی ہے وہ بچ نہیں سکتا اگرچہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس ٹھہرا رہے۔ اس لیے اے مسلمانو! جو شخص جہاد میں جانا چاہتا ہو اُسے تم یہ نہ کہنا کہ جہاد میں مت جاؤ ورنہ قتل ہو جاؤ گے۔ کیونکہ

اس کا جہاد میں مر کر اجر و ثواب کا حق دار ہونا گھر میں بلا اجر و ثواب مرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَىِٕنۡ قُتِلۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحۡمَةٌ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَىِٕنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِالَى اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

اور اگر تمہیں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جائے یا تمہیں موت آ جائے تو ضرور اللہ کی بخشش اور رحمت اُن چیزوں سے بہت بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں O اور اگر تم مر گئے یا مار دیئے گئے تو اللہ ہی کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا O

مذکورہ دونوں آیات کی تفسیر اور اس کے ضمن میں بندگی کی اقسام

آیت مذکورہ: ۱۵۷ میں ﴿ رَحۡمَةٌ ﴾ سے اُخروی رحمت مراد ہے۔ اور ﴿ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴾ [۱۰۵] سے مالِ غنیمت مراد ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں اللہ عزوجل کی راہ میں قتل کر دیا جائے یا موت کے ذریعہ تم ہلاک ہو جاؤ جس سے کہ تم ڈرتے ہو تو اس موت یا قتل فی سبیل اللہ کے ذریعہ جو بخشش اور رحمت تمہیں ملے گی وہ دنیا اور اس کے منافع سے کہیں زیادہ بہتر ہے جنہیں تم زندگی میں جمع کرتے ہو۔

اگلی آیت: ۱۵۸ میں جو فرمایا ﴿ لَاِالَى اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴾ (اللہ ہی کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا) اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں تمہیں اُس خدا کے حضور جمع کیا جائے گا جو بہت مہربان، وسیع رحمت اور مغفرت والا اور عظیم اجر و ثواب عطا کرنے والا ہے۔ وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

بعض علماء نے عبُودیت (بندگی) کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ (۱) جو شخص دوزخ کے خوف سے اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ سے نجات عطا فرماتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ "لَمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ" کہہ کر فرمایا۔ (۲) جو شخص جنت پانے کے شوق میں اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ جنت عطا فرماتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ "وَرَحۡمَةٌ" کہہ کر فرمایا، کیونکہ رحمت جنت ہی کا ایک نام ہے۔ (۳) جو شخص اللہ عزوجل کی عبادت صرف اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اس کے علاوہ کوئی اور خواہش نہیں ہوتی۔ ایسا شخص "عبدِ مخلص" ہوتا ہے جس کو خدائے سبحانہٗ و تعالیٰ جنت میں اپنی تجلّی سے نوازے گا۔ اس کی طرف اشارہ "لَاِالَى اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ" کہہ کر فرمایا۔

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴿۱۵۹﴾

پس اللہ کی عظیم رحمت سے آپ مسلمانوں کے لیے نرم ہو گئے، اور اگر آپ دُرشت کلام سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے چھٹ جاتے، سو آپ ان سے درگزر فرمائیں، ان کے لیے بخشش کی دُعا کریں اور (اہم) معاملات میں ان سے مشورہ کیا کریں، پھر جب آپ (کسی کام کا) عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے O

۱۰۵ تفسیر خازن میں "مِمَّا تَجۡمَعُوۡنَ" ہی ہے۔ جبکہ ہماری قراءت میں یہ "مِمَّا يَجۡمَعُوۡنَ" ہے۔

اللہ عزوجل کی رحمت سے نبی اکرم ﷺ کا شیریں گفتار اور نرم دل ہونا

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ﴾ ''فبرحمة'' کے معنی میں ہے۔اور''ما'' زائدہ ہے۔﴿لِنْتَ لَهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (اللہ کی رحمت سے) آپ کے اخلاق مسلمانوں کے لیے نرم ہو گئے اور آپ کی قوت برداشت بڑھ گئی اور اُحد والے دن مسلمانوں سے جولغزش ہوئی اس پر آپ نے سختی کرنے میں جلد بازی نہیں کی۔''فبما رحمة من الله'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کو مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور لطف وکرم کی توفیق عطا فرمائی۔اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کے دل میں رحمت ولطف کا جذبہ پیدا فرمایا۔نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے مسلمانوں کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ فرمایا۔

﴿فَظًّا﴾ کا معنی ہے: سخت' دُرشت۔﴿غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ کا معنی ہے: سخت دل' بداخلاق' کم برداشت والا (یعنی اے محبوب ﷺ! اگر آپ سخت اور بداخلاق اور کم برداشت والے ہوتے)۔﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ تو ضرور لوگ آپ سے دور ہو جاتے اور اس طرح بکھر جاتے کہ کوئی بھی آپ کے پاس باقی نہ رہتا۔

نبی اکرم ﷺ کو عفو واستغفار اور مشاورت کا حکم دینے کی تفسیر

فرمایا:﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ (آپ اُن سے درگزر فرمائیں۔) یعنی آپ مسلمانوں کی لغزشوں سے (خصوصاً) احد والے دن جولغزش ہوئی اس سے درگزر فرمائیں۔﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ آپ اللہ عزوجل سے اُن کے لیے بخشش طلب کریں تا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے حق میں آپ کی شفاعت (سفارش) کو قبول فرمائے۔بعض مفسرین کے نزدیک''فاعف عنهم'' سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنے معاملات میں مسلمانوں سے درگزر کریں اور''واستغفر لهم'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے حقوق کے معاملہ میں اُن کے لیے بخشش طلب کریں۔یہ مسلمانوں پر کامل مہربانی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو صحابہ سے مشاورت کا حکم کیوں دیا گیا؟

فرمایا:﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آپ اہم معاملات میں اُن سے مشورہ لیا کریں۔) یعنی مسلمانوں سے رائے لیا کریں اور اُن کا خیال معلوم کیا کریں۔اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب بہ ذات خود کمال عقل اور بلندیٔ فکر کے حامل تھے' آپ پر وحی ربانی کا نزول بھی ہوتا تھا اور تمام لوگ اپنی پسند ناپسند میں آپ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے پابند تھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کا حکم کیوں دیا؟

بعض علماء نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ یہ حکم عام مخصوص ہے۔مراد یہ ہے کہ آپ مسلمانوں سے اُن معاملات میں مشورہ کریں جن کے متعلق اللہ عزوجل کی جانب سے کوئی حکم آپ کے پاس نہ ہو۔جیسے جنگ کا معاملہ اور اس جیسے دیگر دنیاوی معاملات۔ان میں آپ مسلمانوں سے مشورہ کریں تا کہ درپیش معاملہ میں مسلمانوں کی دل جوئی اور ہمت افزائی ہو۔کیونکہ مشورہ کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ بھرپور شفقت بھی ہے اور اس سے ان کے دلوں کا کینہ بھی صاف ہو جائے گا۔کیونکہ عرب کے سرداروں کا معاملہ یہ تھا کہ جب اُن سے مشورہ نہ کیا جاتا تو اُنہیں تکلیف ہوتی تھی۔سوال مذکور کے جواب میں حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے باخبر تھا کہ نبی اکرم ﷺ کو مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ آپ کے بعد آنے والے آپ کے اس طریقے کو اختیار کریں۔بعض علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم اس لیے نہیں دیا تھا کہ آپ آراء وافکار میں مسلمانوں سے استفادہ کریں بلکہ اس لیے حکم دیا تھا تا کہ مشورہ کر کے آپ یہ جان لیں کہ مسلمانوں میں کون کتنا صاحب عقل اور سمجھ دار ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتی ہیں کہ:

(۱۳۱) میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو لوگوں سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا۔

(معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت، شرح السنۃ للبغوی: ۳۶۱۱)

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جن معاملات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی نازل ہو جاتی تھی اُن میں رسول اللہ ﷺ کے لیے کسی سے مشورہ کرنا جائز نہیں تھا۔ آپ کو ان کے علاوہ دنیاوی، جنگی اور ان جیسے دیگر معاملات میں مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ دینی اور دنیاوی معاملات میں سے جن کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا اُن میں آپ کو مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں صحابہ سے مشورہ فرمایا تھا جو کہ ایک دینی معاملہ تھا۔

مشورہ کرنے کے فوائد وثمرات

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

الاستشارة عين الهداية وقد خاطر من استغنى برأيه والتدبر قبل العمل يؤمنك من الندم.

مشورہ کرنا بہ ذات خود ہدایت کا سامان ہے۔ جس نے اپنی رائے پر اکتفاء کیا وہ خطرہ میں پڑ گیا۔ کام سے پہلے غور وفکر کر لینا شرمندگی سے بچاتا ہے۔

کسی دانا کا قول ہے کہ ''مشورہ جیسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر درست نتیجہ حاصل کیا جا سکے''۔ مشورہ کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آدمی بسا اوقات کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے، پھر مشورہ کرتا ہے تو دوسرے آدمی کی بات سے اُسے صحیح راستہ نظر آتا ہے۔ اُس وقت اُسے یہ بات پتا چل جاتی ہے کہ معاملات کے تمام شعبوں کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مشورہ کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب آدمی مشورہ کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ محض میرے مقدر کا نتیجہ ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ کسی شاعر نے مشورہ کرنے کی تعریف کرتے ہوئے یہ اشعار کہے ہیں:

وشاور اذ شاورت كل مهذب لبيب اخي حزم لترشد في الامر

''جب تو مشورہ کرے تو اپنے معاملہ میں صحیح راستہ کے تعیّن کے لیے ایسے شخص سے مشورہ کر جو با اخلاق، صاحب عقل اور پختہ ارادہ کا مالک ہو''۔

ولاتک ممن يستبد برايه فتعجز اولا تستريح من الفكر

''تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، ورنہ یا تو تیرا کام نہیں ہو پائے گا یا تجھے اپنی فکر سے راحت نہیں ملے گی''۔

الم تر ان الله قال لعبده وشاورهم في الامر حتما بلانكر

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص (سیدنا محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو فرمایا کہ آپ (اپنے) معاملہ میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کریں، یہ حکم حتمی ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں''۔

زیر بحث آیت میں آگے فرمایا: ﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴾. (جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب آپ مشورہ کرنے کا عزم کر لیں۔ ﴿ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ﴾ تو اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیجئے اور اسی کی ذات پر بھروسا کیجئے، کسی اور پر اعتماد نہ کریں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ مددگار، محافظ اور درستگی پر قائم رکھنے والا ہے، بتانا یہ مقصود ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات میں اللہ عزوجل ہی کی ذات پر اعتماد کرے۔ (دوسرا یہ بتانا مقصود

ہے کہ) مشورہ کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ آخر میں ﴿ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ عزوجل پر اپنے تمام معاملات میں بھروسا کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں (بے مدد) چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا؟ اور اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسا کرنا چاہیے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اللہ عزوجل کی ذات پر بھروسا کرنے کا بیان

﴿ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے اور یوم بدر کی طرح دشمنوں سے تمہاری حفاظت فرمائے۔ ﴿ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ﴾ تو لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ (اپنے فضل سے) تمہاری مدد کا ذمہ دار ہے۔ ﴿ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ احد والے دن کی طرح تمہاری مدد نہ فرمائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کی وجہ سے تمہیں تمہاری ذات پر چھوڑ دے۔ ﴿ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ تو اس کے بعد یعنی بے مدد چھوڑنے کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا۔ آخر میں جو فرمایا: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کسی اور پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ تمام تر اختیار اللہ عزوجل کو ہے۔ کوئی اس کے فیصلہ اور حکم کا رد نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات میں اللہ عزوجل ہی پر بھروسا کرے' کسی اور پر بھروسا نہ کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ توکل یہ ہے کہ آدمی اپنے رزق کے لیے اللہ عزوجل کی نافرمانی نہ کرے' اس کے سوا کسی اور کو اپنا مددگار اور اپنے عمل کا گواہ نہ بنائے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۳۲) میری امت کے ستر ہزار افراد بے حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! وہ کون ہوں گے؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نہ داغ لگاتے ہیں' نہ منتر جنتر کرتے ہیں اور نہ بدفالی لیتے ہیں[۱۰۶] (بلکہ) اپنے رب عزوجل پر بھروسا کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عُکّاشہ بن مِحْصَن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کھڑے ہوگئے' عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ سے دعا کریں وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے' آپ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے ہو۔ ایک اور صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ) میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے[ہ]۔ رسول اللہ ﷺ

---

۱۰۶ داغ لگانے سے مراد ہے: کسی زخم وغیرہ کو داغنا' تاکہ وہ زخم ٹھیک ہو جائے۔ منتر جنتر سے مراد ہے: ایسے تعویذ جو زمانۂ جاہلیت کی باتوں پر اور خلاف شرع امور پر مشتمل ہوں اور بدفالی سے مراد ہے: مختلف پرندوں اور جانوروں سے بدشگونی لینا۔ (جیسا کہ جاہل لوگ کالی بلّی کے راستہ کاٹنے کو خطرناک سمجھتے ہیں۔) زیر بحث حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے ستر ہزار افراد جنت میں بے حساب جائیں گے جو نہ تو داغ لگانے کو اپنے مرض کی حقیقی شفاء سمجھتے ہوں نہ منتر کرتے ہوں اور نہ بدفالی لیتے ہوں۔ (عمدۃ القاری ج ۱۴ ص ۶۸۹)

ہ علامہ علی قاری اس مقام پر لکھتے ہیں کہ وہ صحابی یہ جانتے تھے کہ جنت میں داخل ہونے کا یہ مقام رسول اللہ ﷺ کی دُعا کے وسیلے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے' اس لیے انہوں نے دُعا کے لیے آپ کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ رہی یہ بات کہ حضور نے ان کے لیے دُعا کیوں نہ فرمائی؟ تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُنہیں آئندہ نیکیوں میں سبقت کی ترغیب دینا مقصود ہو۔

نے فرمایا: عُکاشہ تم پر اس میں سبقت لے گئے۔

(صحیح بخاری: ٦٥٤١، صحیح مسلم: ٢١٨، سنن ترمذی: ٢٤٤٦، مسند احمد ج ٤ ص ٤٣٦، سنن بیہقی ج ١٠ ص ١٣٩، مشکوٰۃ المصابیح: ٥٢٩٥۔ ٥٢٩٦۔ ص ٤٥٢)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٣٣) اگر تم اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکل (بھروسا) کرو جیسا کہ اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے وہ صبح بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے لوٹتے ہیں۔

(سنن ترمذی: ٢٣٤٤، سنن ابن ماجہ: ٤١٦٤، مسند احمد ج ١ ص ٣٠، المستدرک ج ٤ ص ٣١٨، مشکوٰۃ المصابیح: ٥٢٩٩۔ ص ٤٥٢)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۚ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾

اور کسی نبی کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ (کوئی بات) چھپا کر رکھے اور جو چھپا جائے گا وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی ہوئی چیز لے کر آئے گا، پھر تمام لوگوں کو ان کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا O

اس آیت کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے مختلف اقوال

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(١٣٤) یہ آیت ''وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ'' ایک سرخ مخملی چادر کے بارے میں نازل ہوئی جو بدر والے دن گم ہو گئی تھی اور اس کے گم ہونے پر بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے وہ چادر لے لی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔ (سنن ابوداؤد: ٣٩٧١، سنن ترمذی: ٣٠٠٩)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

امام ضحاک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لشکر بھیجے، ان سے آپ نے مال غنیمت لیا اور لشکروں میں تقسیم نہیں فرمایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

امام ابن جریر طبری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ شان نہیں کہ آپ کچھ مسلمانوں میں (مال وغیرہ) تقسیم کریں اور کچھ کو چھوڑ دیں اور ناانصافی کریں۔ بلکہ نبی ﷺ عدل و انصاف سے تقسیم فرماتے ہیں۔ تقسیم میں آپ اللہ عزوجل کے حکم کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا ہے اس کے مطابق (مال وغیرہ کا) فیصلہ فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مزید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی نبی کو اپنے اصحاب کے ساتھ خیانت کرنے والا بنائے۔ اگر نبی اکرم ﷺ ایسا کریں تو لوگ بھی اتباع میں ایسا ہی کریں گے۔ (تفسیر ابن جریر، زیر بحث آیت)

مقاتل اور کلبی بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت کا نزول اُحد کے مال غنیمت کے بارے میں ہوا، جب تیر اندازوں نے غنیمت لینے کے لیے اپنے مرکز کو چھوڑ دیا۔ جب تیر اندازوں نے مرکز کو چھوڑا تھا ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں نبی اکرم ﷺ یہ نہ فرما دیں کہ ''جس کے ہاتھ میں جو چیز آ جائے وہ اس کی ہے اور جس طرح بدر کا مال غنیمت تقسیم نہیں ہوا تھا اس طرح آج بھی تقسیم نہیں ہوگا''۔ اس خیال کے پیش نظر انہوں نے مرکز کو چھوڑ دیا اور مال غنیمت میں مشغول ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا میں نے تم لوگوں کو اس بات کا پابند نہیں کیا تھا کہ میرا حکم آنے تک مرکز کو نہ چھوڑنا۔ انہوں نے عرض کی: ہم اپنے کچھ بھائیوں کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (ایسا نہیں ہے) بلکہ تم لوگوں نے یہ گمان کیا تھا کہ ہم خیانت کریں گے اور مال غنیمت تقسیم نہیں کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی ہے[١٠٧]۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب سے کچھ لوگوں نے خیانت کی ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قوی اور طاقت ور لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں یہ اصرار مال غنیمت سے حصہ کی درخواست کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت مبارکہ نازل فرمائی کہ خیانت کرنا نبی کی شان کے لائق نہیں ہے۔ یعنی نبی کچھ لوگوں کو نوازے اور کچھ کو محروم رکھے (ایسا نہیں ہوسکتا) بلکہ نبی کی ذمہ داری ہے کہ وہ (مال وغیرہ کو) لوگوں میں برابر تقسیم کرے۔

محمد بن کعب القرظی اور محمد بن اسحٰق بن یسار کا قول یہ ہے کہ یہ آیت ''وحی'' کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی لالچ یا خوف یا مداہنت (دھوکہ دہی) کی وجہ سے وحی الٰہی کو چھپائیں۔

آیت کی تفسیر اور غُلول کی تحقیق

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ﴾ کسی نبی کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی بات چھپا کر رکھے۔

''اَنْ يَّغُلَّ'' ''غلول سے ہے'' بمعنیٰ خیانت کرنا۔ اس کا اصل معنیٰ ہے: اخذ الشيء خفية. پوشیدہ طور پر کوئی چیز حاصل کرنا۔ ''یغل'' کو ایک قرأت کے مطابق یاء کے زبر اور غین کے پیش کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ (اس صورت میں) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ کیونکہ نبوت اور خیانت دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ منصب نبوت تمام مناصب میں سب سے زیادہ پر عظمت اور بلند و بالا منصب ہے۔ اس لیے خیانت اس منصب کے لائق نہیں ہے کیونکہ خیانت انتہائی گھٹیا اور حقیر چیز ہے اور دو متضاد چیزوں کا جمع ہونا محال ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کے ساتھ کسی چیز میں خیانت نہیں کی نہ مال غنیمت میں نہ وحی ربانی میں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں نبی سے امت مراد ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے دامن کا خیانت سے پاک اور صاف ہونا ثابت ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں غلول سے کوئی اور معنیٰ مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ''لِنَبِيٍّ'' پر جو لام ہے وہ لیغل سے منقول ہے یعنی مَا كَانَ النَّبِيُّ لِيَغُلَّ۔ اس صورت میں انبیاء سے غلول اور خیانت کی نفی ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث جملہ ''مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَلْغُلُوْلُ'' کے معنیٰ میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی نبی نے کبھی خیانت نہیں کی۔ اس صورت میں بھی انبیاء کرام سے خیانت کی نفی ہے۔ بعض مفسرین نے زیر بحث جملہ کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ کسی نبی کے لیے خیانت کرنا جائز نہیں ہے اور جب خیانت جائز نہیں ہے تو نبی اس کا ارتکاب بھی نہیں کرے گا۔ (یہ تمام توجیہات اس صورت میں ہیں جب آیت مبارکہ میں ''اَنْ يَّغُلَّ'' کو یاء کے زبر اور غین کے پیش کے ساتھ پڑھا جائے) اس قرأت کی دلیل یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو خیانت کی طرف منسوب کیا تھا۔ اس لیے زیر بحث آیت نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ خیانت کرنا نبی اکرم ﷺ کی شان کے لائق نہیں ہے۔

١٠٧ تفسیر بغوی کے مخرج و محقق عبد الرزاق المہدی نے اس روایت کو انتہائی ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام واحدی نے اسباب النزول میں اس روایت کو بلاسند ذکر کیا ہے۔

ایک قراءت کے مطابق ''اَنۡ یُّغَلَّ'' کو یاء کے پیش اور غین کے زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔(یعنی اَنۡ یُّغَلَّ) اس صورت میں اس کے دو معنیٰ ہیں۔ایک تو وہی جو مذکور ہوا (یعنی از غلول بمعنیٰ خیانت کرنا) اور دوسرا از غلال بمعنیٰ خیانت کی طرف نسبت دینا' خائن قرار دینا۔پہلے معنیٰ کی صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کسی نبی کی شان نہیں کہ اس کے ساتھ خیانت کی جائے۔ یعنی اس کی امت اس کے ساتھ خیانت کرے اور دوسرے معنیٰ کی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کسی نبی کی شان نہیں کہ اس کو خائن (خیانت کرنے والا) قرار دیا جائے۔

جس نے جو چیز چھپائی ہوگی اس کو وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا

﴿ وَمَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ﴾ اور جو چھپائے گا (یعنی خیانت کرے گا) وہ اپنی چھپائی ہوئی چیز قیامت کے دن لے کر آئے گا۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے جو چیز چھپائی ہوگی (اور خیانت کا ارتکاب کیا ہوگا) وہ اس چیز کو قیامت کے دن اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے آئے گا' تاکہ رسوائی میں اضافہ ہو۔بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے جو چیز چھپائی ہوگی اس کے سامنے اسی جیسی چیز جہنم میں لائی جائے گی۔پھر اس سے کہا جائے گا کہ نیچے اتر کر اس چیز کو اٹھاؤ۔وہ نیچے اتر کر اس چیز کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گا۔جب واپس اپنی جگہ آئے گا تو وہ چیز آگ میں گر جائے گی۔اب اسے کہا جائے گا کہ نیچے اتر کر اس کو نکالو۔اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا اس کے ساتھ اسی طرح فرمائے گا۔بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے جو چیز چھپائی ہوگی اس کا گناہ وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا اور اسے اس گناہ کی سزا دی جائے گی۔اس کو بیان کرتے ہوئے آگے فرمایا:

﴿ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴾ پھر تمام لوگوں کو ان کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یعنی جس نے جو اچھا اور بُرا کام کیا ہوگا' اس کو اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔مفہوم یہ ہے کہ ہر اچھے بُرے عمل کرنے والے کو قیامت کے دن بدلہ ملے گا اور عمل کی پوری پوری جزاء دی جائے گی۔''لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا'' اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن بدلہ دینے میں لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا۔

غُلول کے مخصوص معنیٰ (مال غنیمت میں خیانت) کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے ارشادات

یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ غلول کا بنیادی معنیٰ ہے: کسی چیز کو پوشیدہ طور پر حاصل کرنا' اور یہی خیانت ہے۔مگر عرب میں اس لفظ کا استعمال اس خیانت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو مال غنیمت میں کی جائے۔اس معنیٰ میں نبی اکرم ﷺ کی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں' ملاحظہ فرمائیے:

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۳۵) ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور (مال غنیمت میں) خیانت کرنے کی بہت مذمت فرمائی اور اس کے لیے سخت سزا بیان کی' یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر اونٹ بڑبڑا رہا ہو۔اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے' میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کسی چیز کا اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں۔میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے۔میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں' میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن

پر بکری ممنا رہی ہو اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے' میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں' میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر کوئی شخص چیخ رہا ہو اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے' میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر کپڑے لدے ہوئے ہل رہے ہوں اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے' میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر صامت (سونا' چاندی) لدے ہوئے ہوں اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے' میں جواباً کہوں کہ مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' میں تمہیں تبلیغ کر چکا ہوں[۱۰۸]۔ (صحیح بخاری: ۳۰۷۳' صحیح مسلم: ۱۸۳۱' مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۶' مشکوۃ المصابیح: ۳۹۹۶۔ ص ۳۴۹)

☆ اس حدیث کے الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ ☆ اس حدیث کے چند الفاظ کے معانی: رُغَاء (اونٹ کی آواز) ثُغَاء (بکری کی آواز) رِقَاع (کپڑے) اور صَامِت (سونا چاندی)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۳۶) ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر کی طرف نکلے' اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا فرمائی۔ اس میں ہمیں مال غنیمت میں سونا چاندی تو نہیں ملا' البتہ سامان' غلہ اور کپڑے ملے۔ پھر ہم وادیٔ قریٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غلام بھی تھا جو قبیلہ جذام کے ایک شخص نے آپ کی نذر کیا تھا' اس شخص کو رفاعہ بن زید کہا جاتا تھا اور وہ بنوضُبیب سے تھا۔ جب ہم نے وادی میں پڑاؤ ڈالا تو رسول اللہ ﷺ کا غلام کھڑا ہوا اور آپ کے سامان کو کھولنے لگا۔ اسی اثناء میں اسے ایک تیر لگا اور وہ مر گیا۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ (ﷺ)! اسے شہادت مبارک ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! بے شک جو چادر اس نے خیبر کے مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے لے لی تھی وہ اس پر شعلہ زن ہے۔ یہ سن کر صحابہ خوف زدہ ہو گئے۔ (اسی دوران) ایک شخص چمڑے کے ایک یا دو تسمے لے کر آیا اور کہا کہ مجھے یہ جنگ خیبر کے دن ملے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تسمہ آگ کا ہے (یا یوں فرمایا کہ) یہ تسمے آگ کے ہیں۔

ایک اور روایت میں بھی یہ واقعہ موجود ہے لیکن اس میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مِدْعَم نامی ایک غلام تھا جو بنوضبیب کے ایک شخص نے آپ کو نذر کیا تھا۔ (اور تیر لگنے کا بیان اس طرح ہے کہ) اچانک اس غلام کو ایک ''سہم عائر'' لگا (یعنی ایسا تیر جس کا چلانے والا معلوم نہیں تھا)۔ (صحیح بخاری: ۴۲۳۴۔ ۶۷۰۷' صحیح مسلم: ۱۱۵' سنن ابوداؤد: ۲۷۱۱' سنن نسائی: ۳۸۲۷' سنن بیہقی: ج ۹ ص ۱۰۰' المستدرک ج ۳ ص ۴۰' مؤطا امام مالک: ۱۰۱۹' مشکوۃ المصابیح: ۳۹۹۷۔ ص ۳۴۹)

☆ اس حدیث شریف کے چند الفاظ کے معانی: (۱) ''شِرَاک'': جوتے کا تسمہ جو قدم کے اوپر والے حصہ پر ہوتا ہے اس کو شِسْعُ النَّعْل بھی کہتے ہیں (۲) ''السهم العائر'': وہ تیر جس کا مارنے والا معلوم نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

---

[۱۰۸] اس حدیث شریف میں قیامت کے دن آدمی کی گردن پر مختلف چیزوں کے سوار ہونے کا ذکر ہے' اس کی شرح میں مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہے' اس کی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ قیامت میں نیک اعمال انسان کی سواری بنیں گے اور برے اعمال انسان پر سوار ہوں گے اور مذکورہ چیزوں کے گردن پر سوار ہونے سے آدمی انتہائی ذلت اور رسوائی کا شکار ہوگا۔ (مراۃ المناجیح ج ۵ ص ۶۱۳' موضحاً)

(۱۳۷) رسول اللہ ﷺ کے ساز وسامان پر ایک شخص مقرر اور معین تھا، اسے کرکرہ کہا جاتا تھا۔ اس کا انتقال ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ جہنم میں ہے۔ صحابہ کرام اسے دیکھنے کے لیے گئے تو وہاں ایک دھاری دار بڑی چادر پائی جو اس نے مال غنیمت میں سے نکال لی تھی۔ (صحیح بخاری: ۳۰۷۴، سنن ابن ماجہ: ۲۸۴۹، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۹۹۸۔ ص ۳۴۹)

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۳۸) رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی کا انتقال ہوگیا۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا: تم لوگ (خود ہی) اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ یہ سن کر صحابہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا رسول اللہ ﷺ نے (وجہ بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: تمہارے ساتھی نے اللہ کی راہ میں خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔ (راوی کہتے ہیں:) ہم نے اس صحابی کے ساز وسامان کی تلاشی لی تو یہودیوں سے جو منکے (بہ طور غنیمت) حاصل ہوئے تھے اس میں سے کچھ منکے ہم نے اس میں پائے، وہ دو درہم کے برابر بھی نہیں تھے۔[۱۰۹] (سنن ابوداؤد: ۲۷۱۰، سنن ابن ماجہ: ۲۸۴۸، سنن نسائی: ۱۹۵۹، مسند احمد ج ۵ ص ۱۹۲، مؤطا امام مالک: ۱۰۱۷، سنن بیہقی ج ۹ ص ۱۰۱، المستدرک ج ۲ ص ۱۲۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۰۱۱۔ ص ۳۵۰)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۳۹) جو شخص (مال غنیمت میں) خیانت کرے اس کا سامان جلا دو اور اس شخص کو مارو۔

(سنن ترمذی: ۱۴۶۱، سنن ابوداؤد: ۲۷۱۳، مسند احمد ج ۱ ص ۲۲، المستدرک ج ۲ ص ۱۲۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۶۳۳۔ ص ۳۱۷)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱٤۰) رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلا دیا اور اس کو مارا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایسے شخص کو اس کا حصہ بھی نہیں دیا۔ (سنن ابوداؤد: ۲۷۱۵)

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۶۲﴾

تو کیا جو اللہ کی رضا کی پیروی کرتا ہو وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کے غضب کا حقدار ہوگیا ہو اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو اور وہ کتنا بُرا ٹھکانہ ہے O

آیت کی تفسیر

اللہ کی رضا کی پیروی کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو شخص خیانت کرنا چھوڑ دے۔ ''بَاءَ'' کا معنیٰ ہے: لوٹنا۔ ''سَخَطٍ مِّنَ

[۱۰۹] یعنی اُس صحابی نے نہایت معمولی قیمت کے کچھ موتی تقسیم سے پہلے ہی مال غنیمت سے لے لیے تھے۔ اس معمولی چیز کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کی نماز سے محروم ہوگئے۔ بعض لوگ اس طرح کی احادیث کو بنیاد بنا کر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں اور اُن کی طرف فِسق کی نسبت کرتے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ جُرم گناہ صغیرہ ہے جو صرف ایک باران صحابی سے سرزد ہوا جبکہ فِسق کا ثبوت یا تو گناہ کبیرہ سے ہوتا ہے یا صغیرہ کو بار بار کرنے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے تمام صحابہ کو صاحبِ عدالت (باکردار) بنایا ہے، کوئی بھی ان میں سے فِسق سے متہم نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ''وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى''. (الحدید: ۱۰) ''تمام (اصحابِ رسول) سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمالیا ہے''۔ لہٰذا ذکر کردہ صحابی اور وہ تمام صحابہ جن پر حضور انور نے نماز جنازہ ادا نہیں فرمائی اُن سب کی صحابیت اور مقبولیت یقینی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جنازہ ادا نہ فرمانا ہماری تعلیم اور تنبیہ کے لیے ہے۔ گندم کھالینے سے سیدنا آدم علیہ السلام کی نبوت اور مقبولیت زائل نہیں ہوئی۔ (مرآۃ المناجیح بتغیر وتوضیح، ج ۵ ص ۶۲۲)

اللّٰہِ ''سے مراد اللہ کا غضب ہے۔یعنی خیانت کا مرتکب ہونا۔''مَسۡخَطٌ ''اس شدید غصہ کو کہتے ہیں جو سزا کا باعث بن جائے۔ اللہ عزوجل کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس پر وہ غضب فرماتا ہے اسے سزا دیتا ہے(آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو خیانت کرنا چھوڑ دے کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو خیانت کا مرتکب ہو)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب مسلمانوں کو اپنی اتباع کرنے اور احد والے دن اپنے ساتھ جنگ کے لیے باہر نکلنے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے آپ کی اتباع کی اور منافقین پیچھے رہے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰہِ﴾ فرما کر نبی اکرم ﷺ کی اتباع کرنے والوں کا حال بتایا اور ﴿کَمَنۡ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ فرما کر پیچھے رہنے والوں کا حال بتایا۔

آخر میں جو فرمایا: ﴿وَمَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ خیانت کرنے والے یا نبی اکرم ﷺ سے پیچھے رہنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ۝

وہ اللہ کے نزدیک (الگ الگ) مقام رکھتے ہیں اور اللہ ان کے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے O

اس آیت میں درجات والوں سے کون لوگ مراد ہیں؟

﴿هُمۡ دَرَجٰتٌ﴾ سے مراد ہے: ھم ذوو درجات (وہ اللہ کے نزدیک درجات والے ہیں)۔اس سے کون لوگ مراد ہیں اور درجات سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ عزوجل کی رضا کی پیروی کی اور جو لوگ اللہ عزوجل کے غضب کے حق دار بنے وہ اللہ عزوجل کے نزدیک علیحدہ علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ جنہوں نے اللہ عزوجل کی رضا کی پیروی کی ان کے لیے اجر عظیم ہے اور جو اللہ عزوجل کے غضب کے حق دار بنے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔(گذشتہ آیت اور زیر بحث آیت کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ) جنہوں نے اللہ عزوجل کی رضا کی پیروی کی کیا وہ ان کی طرح ہو سکتے ہیں جو اللہ عزوجل کے غضب کے حقدار ٹھہرے؟ یہ لوگ برابر نہیں ہیں بلکہ اپنے اعمال کے اعتبار سے اللہ عزوجل کے نزدیک (الگ الگ) مقام کے حامل ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''هُمۡ دَرَجٰتٌ ''میں ھم ضمیر کا مرجع گذشتہ آیت میں صرف ''اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰہِ ''ہے۔ (یعنی جنہوں نے اللہ عزوجل کی رضا کی پیروی کی صرف ان کے لیے ھم درجات فرمایا گیا ہے۔) کیونکہ عُرف میں درجات کا لفظ عموماً ان لوگوں کے استعمال ہوتا ہے جو اجر وثواب کے اہل ہوں۔ جب کہ وہ لوگ جو دوزخ کے حق دار ہوں ان کے لیے درکات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں جن مستحقینِ غضب کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا حکم اللہ تعالیٰ نے وہیں بیان فرمادیا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔لہٰذا یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ هُمۡ دَرَجٰتٌ میں ھم ضمیر کا مرجع صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ عزوجل کی رضا کی پیروی کی۔

☆ اس آیت میں ''هُمۡ دَرَجٰتٌ ''فرما کر ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی فرمانبرداری کرنے کی ترغیب فرمائی ہے اور اپنی نافرمانی سے خوف دلایا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾

یقیناً مسلمانوں پر اللہ نے بڑا احسان فرمایا جب ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیجا' جو انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے باطن کو صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے' بے شک وہ (لوگ) اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے O

آیت میں ''منّ'' کا مفہوم اور ''من انفسھم'' کی تحقیق

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ احسان اور ان پر فضل و کرم فرمایا۔ ''مِنَّة'' بڑی نعمت کو کہتے ہیں اور یہ درحقیقت صرف اللہ عزوجل کی جانب سے ہوتی ہے۔اسی معنیٰ میں اس آیت میں منّ کا لفظ ہے۔

آگے جو ﴿ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ فرمایا' اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسا رسول بھیجا جو ان ہی کی جنس سے ہے یعنی ان کی طرح عربی ہے۔ان ہی کے شہر میں پیدا ہوا اور ان ہی کے درمیان پرورش پائی۔ وہ سب اس رسول کے نسب کو جانتے ہیں (یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ) عرب میں جو بھی قبیلہ پیدا ہوا اس کا عرب کے ساتھ نسبی تعلق ضرور ہوتا تھا' سوائے بنی تغلب کے کہ وہ عیسائی تھے اور عیسائیت پر پختہ ہو چکے تھے۔اس لیے (من انفسھم فرما کر) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بنی تغلب کے ساتھ نسبی تعلق سے پاک فرمادیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت میں جو مؤمنین کا لفظ ہے اس سے تمام مسلمان مراد ہیں۔اور (اس صورت میں) ''من انفسھم'' کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا رسول بھیجا جو نسبی اعتبار سے نہیں بلکہ ایمان اور شفقت کے اعتبار سے ان ہی میں سے ہے اور ان ہی کی جنس سے ہے۔یعنی وہ نہ تو فرشتہ ہے نہ ہی بنی آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق سے ہے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''من انفسھم'' سے مراد یہ ہے کہ وہ رسول اسماعیل بن ابراہیم خلیل اللہ (علیہما السلام) کی اولاد میں سے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے نعمت اور احسان ہونے کی وجوہات

رسول اللہ ﷺ کی اس دنیا میں آمد مسلمانوں کے لیے احسان اور نعمت کس طرح ہے؟ اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

(١) آپ کی آمد کے نعمت ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس (فکر و عمل) کی طرف بلایا جو مسلمانوں کے لیے دردناک عذاب سے نجات اور جنّت میں داخلہ کا سبب ہے۔

(٢) ایک وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں ہی کی جنس سے ہیں (یعنی انسان ہیں نہ کہ فرشتہ)۔یہ بات اس لیے احسان کا سبب ہے کہ جب زبان ایک ہو تو ضروری امور سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔(پھر یہاں مستزاد یہ ہے کہ) لوگ آپ ﷺ کے تمام افعال واحوال سے واقف تھے اور آپ کی سچائی اور امانت داری کو بھی جانتے تھے۔اس لیے اس سے آپ کی تصدیق اور آپ پر اعتماد کرنا لوگوں کے لیے زیادہ آسان تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کا مسلمانوں کی جنس سے ہونا یہ بھی مسلمانوں کے لیے باعث شرف ہے۔

وہ موقع کہ جب ابوطالب نے بنو ہاشم اور قبیلہ مُضر کے سرداروں کی موجودگی میں حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا نکاح کیا تھا اس وقت ابوطالب نے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں انہوں نے کہا تھا:

الحمد لله الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم وزرع اسماعیل وضئضئی معد وعنصر مضر وجعلنا سدنۃ بیتہ وسوّاس حرمہ وجعل لنا بیتا محجوبا وحرما امنا وجعلنا الحکام علی الناس وان ابنی ھذا محمد بن عبد اللہ لا یوزن بہ فتی الا رجح ھو واللہ بعد ھذا لہ نبأ عظیم وخطب جلیل۔

تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے ہم لوگوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بنایا اور مَعد اور مُضر کے خاندان میں پیدا فرمایا اور اپنے گھر (کعبہ معظمہ) کا نگہبان اور اپنے حرم کا منتظم بنایا' ہمارے لیے اس نے ایک محفوظ گھر اور امن والا حرم بنایا اور ہمیں لوگوں کا حاکم بنایا۔(اس تعریف وثناء کے بعد) میرا یہ بیٹا (یعنی بھتیجا) محمد بن عبداللہ ایسا شخص ہے کہ قریش کے جس جوان کا بھی اس سے موازنہ کیا جائے یہ اس سے آگے رہے گا' خدا کی قسم! اس کا مستقبل بہت ہی عظیم الشان اور تابناک ہے۔

(۳) نبی اکرم ﷺ کی آمد کے نعمت ہونے کی بعض علماء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ مخلوق میں فطرتی اور پیدائشی طور پر جہالت' کم عقلی' کم فہمی اور بے خبری موجود ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر یہ انعام اور احسان فرمایا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جس کے ذریعہ انہیں گمراہی سے نجات دی' جہالت کو دور کر کے بصیرت دی اور انہیں سیدھی راہ چلایا۔
اس آیت میں جو فرمایا کہ اللہ نے رسول کو بھیج کر مسلمانوں پر احسان فرمایا' اس میں صرف مسلمانوں کا ذکر اس لیے کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین سے فائدہ اٹھانے والے مسلمان ہی ہیں نہ کہ غیر مسلمین۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے مقاصد

فرمایا: ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ ﴾ (وہ رسول اُنہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے۔) یعنی وہ رسول لوگوں کو اپنے آپ پر نازل ہونے والی کتاب پڑھ کر سناتا ہے جبکہ وہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے لوگ تھے' انہوں نے کبھی آسمانی وحی نہیں سُنی تھی۔﴿ وَیُزَکِّیْھِمْ ﴾ (اور وہ اُنہیں پاکیزہ کرتا ہے۔) یعنی وہ رسول لوگوں کو کفر کے میل اور محرمات و خبائث کی نجاست سے پاک صاف فرماتا ہے۔﴿ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾ (وہ اُنہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔) میں کتاب سے قرآن مجید اور حکمت سے وہ طریقہ مراد ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی زبانی لوگوں کے لیے سُنت قرار دیا۔
﴿ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔ کھلی گمراہی سے مراد یہ ہے کہ جہالت اور حیرانگی میں تھے' ہدایت سے ایسے نابینا (اور غافل) تھے کہ نہ نیکی کو پہچانتے تھے نہ بُرائی کو بُرا جانتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے ذریعہ اُنہیں ہدایت عطا فرمائی۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا ؕ قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾

یہ کیا ہوا کہ جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی حالانکہ تم اس سے دوگنی مصیبت (کفار کو) پہنچا چکے تھے (پھر بھی) تم نے کہا: یہ (مصیبت) کہاں سے آئی' آپ کہیے یہ مصیبت تمہاری ہی طرف سے آئی ہے' بے شک اللہ ہر چاہے پر قادر ہے O

جنگ احد میں مسلمانوں پر مصیبت کا آنا

﴿اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ﴾ سے مراد وہ مصیبت ہے جو مسلمانوں کو اُحد والے دن پہنچی۔ ﴿اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ (اُحد والے دن تمہیں جو مصیبت پہنچی) اُس سے دوگنی مصیبت تم بدر میں پہنچا چکے تھے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اُحد والے دن مشرکین نے ستر مسلمان شہید کیے تھے جبکہ مسلمانوں نے بدر میں ستر مشرکین کو قتل کیا تھا اور ستر کو قیدی بنالیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بدر والے دن مسلمانوں نے مشرکوں کو شکست دی تھی اور احد والے دن بھی ابتداءً اُنہیں شکست دے دی تھی لیکن جب انہوں نے اللہ عزوجل اور اس کے رسول (ﷺ) کے حکم کی خلاف ورزی کی تو مشرکین نے اُنہیں شکست دے دی۔ یوں مشرکین کو دو مرتبہ اور مسلمانوں کو ایک مرتبہ شکست ہوئی۔

﴿قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی تو پکار اٹھے کہ) ہمارے لیے یہ قتل اور شکست کہاں سے آ گئی؛ جبکہ ہم مسلمان ہیں اور رسول اللہ ﷺ بھی ہمارے درمیان موجود ہیں؟ یہ استفہام بہ طور انکار ہے۔

مصیبت کے آنے کا سبب

﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ (آپ کہیے یہ مصیبت تمہاری ہی طرف سے آئی ہے۔) مراد یہ ہے کہ (اُحد میں) تم جس مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے وہ تمہاری اپنی خطا یعنی نبی اکرم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی بے برکتی کا نتیجہ تھی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے (اُحد کے موقع پر) جنگ کے لیے مدینہ میں ہی ٹھہرے رہنے کو ترجیح دی تھی جبکہ صحابہ کرام کی ترجیح یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ مزید یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے تیراندازوں کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ اپنی معیّنہ جگہ پر ہی ڈٹے رہیں۔ لیکن انہوں نے خلاف ورزی کی اور غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے مرکز کو چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے احد والے دن قتل اور شکست مسلمانوں کے حصہ میں آئی۔

حضرت عبیدہ السلمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بیان کیا کہ:

(۱٤۱) جبریل امین نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کی قوم نے قیدیوں سے جو فدیہ لیا ہے اس کو اللہ عزوجل نے ناپسند فرمایا ہے اور آپ کے لیے یہ حکم دیا ہے کہ آپ مسلمانوں کو اس بات کا اختیار دیں کہ وہ چاہیں تو قیدیوں کو قتل کر دیں اور چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ اُن ہی کی تعداد کے مطابق مسلمان شہید ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات صحابہ کو بتائی تو انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں اور ہمارے بھائی ہیں؛ اس لیے ہم ان سے فدیہ لیں گے جس کے ذریعہ ہمیں اپنے دشمن کے ساتھ جنگ کرنے میں قوت حاصل ہوگی اور ہم میں سے ان کی تعداد کے مطابق لوگ شہادت سے سرفراز ہوں گے۔ یوں بدر کے قیدیوں کی تعداد کے مطابق اُحد والے دن ستر مسلمان شہید ہوئے۔

(سنن ترمذی: ۱۵٦۷؛ معالم التنزیل للبغوی و جامع البیان للطبری؛ زیر بحث آیت)

☆ امام بغوی نے اس حدیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے جبکہ امام ابن جریر طبری نے سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اس حدیث میں جس اختیار کا ذکر کیا گیا ہے وہی زیر بحث آیت میں "مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ" کا مفہوم و مراد ہے۔ یعنی اُحد میں تم پر (قتل کی) مصیبت اس لیے آئی کہ تم نے قیدیوں سے فدیہ لیا اور اپنے لیے شہادت کو اختیار کیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (بے شک اللہ ہر چاہے پر قادر ہے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور اگر اس کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو وہ تمہاری مدد نہیں فرمائے گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

اور دو فریقوں کے مقابلہ کے دن تم پر جو مصیبت آئی تھی وہ اللہ کے حکم سے تھی اور اس لیے تھی تا کہ اللہ مسلمانوں کو نمایاں کر دے ○ اور منافقوں کو ظاہر کر دے اور منافقوں سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کر دیا (اپنے شہر کا) بچاؤ کرو (تو جواباً) کہا اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ضرور تم لوگوں کی پیروی کرتے' اس دن وہ (منافقین) ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھیں اور اللہ ان چیزوں کو زیادہ جاننے والا ہے جن کو وہ چھپاتے تھے ○

غزوۂ احد میں آنے والی مصیبتوں پر اللہ عزوجل کی جانب سے مسلمانوں کو تسلی

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (دو فریقوں کے مقابلہ کے دن تم پر جو مصیبت آئی تھی وہ اللہ کے حکم سے تھی۔) مصیبت سے مراد یہ ہے کہ تمہارے جو افراد قتل ہوئے تھے اور تمہیں شکست ہوئی تھی۔ ﴿الْجَمْعٰنِ﴾ سے مسلمانوں اور مشرکوں کے دو فریق مراد ہیں اور مقابلہ کے دن سے اُحد کا دن مراد ہے۔ ﴿باذن الله﴾ سے مراد یہ ہے کہ (تمہیں جو مصیبت پہنچی تھی وہ) اللہ کے علم و حکمت اور اس کے قضاء و قدر (تقدیر) سے تھی۔ اس میں مسلمانوں کو غزوۂ احد میں پہنچنے والی مصیبتوں پر تسلی دینا مقصود ہے۔ اور تسلی اُسی صورت میں ملے گی جب مسلمانوں کو یہ علم ہو کہ یہ مصیبتیں اللہ عزوجل کے قضاء و قدر سے آئی تھیں۔ نتیجۃً وہ اللہ عزوجل کے فیصلہ پر راضی رہیں گے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا﴾ (تا کہ اللہ مسلمانوں کو نمایاں کر دے اور منافقوں کو ظاہر کر دے۔) یعنی مصیبتوں پر مسلمانوں کی ثابت قدمی سے مسلمانوں کا ایمان اور منافقوں کی کم ہمتی سے اُن کی منافقت کو ظاہر فرما دے۔ یہاں علم سے معلوم مراد ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ (یہ مصیبتیں اس لیے آئیں) تا کہ مسلمان اور منافق ظاہر ہو جائیں اور دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں۔

منافق کی حقیقت اور منافق کو منافق کہنے کی وجہ

منافق وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی زبان سے ایمان کا اظہار کرے اور دل میں اس کے خلاف نظریہ رکھے۔ ''منافق'' کا لفظ ''نَفَق'' سے مشتق ہے۔ ''نَفَق'' اُس سرنگ کو کہتے ہیں جو (دونوں جانب سے) کھلی ہوئی ہو۔ اسی لیے جنگلی چوہے کے بل کو نافقاء کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دو دروازے ہوتے ہیں' ایک سے اُسے تلاش کیا جائے تو دوسرے سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح منافق بھی دو راستے اختیار کرتا ہے۔ ایک راستہ زبان سے ایمان کو ظاہر کرنے کا اور دوسرا راستہ دل میں کفر چھپائے رکھنے کا۔ ان میں سے جس راستہ سے اس کو تلاش کیا جاتا ہے تو دوسرے سے وہ نکل جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ منافق چونکہ ایمان میں ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے اس لیے اُسے منافق کہتے ہیں۔ ''نِفاق'' ایک اسلامی لفظ ہے۔ اسلام سے قبل اہل عرب اس لفظ سے واقف نہیں تھے۔

مسلمانوں کی جانب سے منافقوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت اور منافقوں کا جواب

﴿ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ﴾ (منافقوں سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں جہاد کرو یا اپنے شہر کا بچاؤ کرو۔) یہ بات عبداللہ بن اُبی ابن سلول منافق اور اس کے ساتھیوں سے کہی گئی۔ ہوا یہ کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر احد کی طرف نکلے' جب احد اور مدینہ منورہ کے درمیان مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن اُبی اپنے ایک تہائی افراد کو لے کر یہ کہتے ہوئے لشکر سے الگ ہو گیا کہ ہم بلاوجہ اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالیں؟ حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو قبیلہ بنی سلمہ کے تھے یہ کہتے ہوئے اس کے لشکر پیچھے گئے کہ اے میری قوم! میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں تم اپنے نبی کو (ایسے نازک وقت میں) نہ چھوڑو جبکہ اُن کا دشمن سامنے موجود ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ جملہ فرمایا۔ مراد یہ تھی کہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے دیگر منافق ساتھیوں سے کہا گیا کہ اللہ کی راہ میں دین اور اطاعت کی خاطر جنگ کرو یا بچاؤ کرو۔ بچاؤ سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال اور اہل وعیال کا بچاؤ کرو۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد یہ لیا ہے کہ (اے منافقو!) تم اگرچہ جنگ نہ کرو لیکن اس میں صرف شریک ہو جاؤ اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر دو تا کہ اس سے دشمن دور ہو جائے اور ذلیل ومغلوب ہو جائے۔

﴿ قَالُوْا ﴾ منافقوں نے کہا۔ ﴿ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ﴾ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آج جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے اور واپسی اختیار نہ کرتے۔ (لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ) اگر ان منافقوں کو جنگ کے ہونے کا علم ہوتا تب بھی یہ مسلمانوں کی پیروی نہ کرتے۔

آیت میں ﴿ لِلْكُفْرِ ﴾ ''الی الکفر'' کے معنیٰ میں اور ﴿ لِلْاِيْمَانِ ﴾ ''الی الایمان'' کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی منافقین اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ﴿ يَوْمَئِذٍ ﴾ (اُس دن) کا لفظ اس لیے فرمایا کہ اس سے قبل منافقین نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور اُن سے منحرف ہونے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اور یہ بھی کبھی کھل کر نہیں کہا تھا کہ اگر ہمیں جنگ ہونے کا علم ہوتا تو ہم ضرور تم لوگوں کی پیروی کرتے۔ بلکہ اس سے قبل وہ ظاہر میں اسلام کا کلمہ پڑھا کرتے تھے اور کفر کو چھپاتے تھے۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (منافقین اپنے منہ سے ایسی باتیں کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھیں۔) یعنی اپنی زبان سے ایمان کا اظہار کر رہے تھے جو کہ اُن کے دلوں میں نہیں تھا۔ اُن کے دلوں میں تو صرف کفر اور منافقت تھی۔ اور اس طرح دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ ظاہر کرنا منافقوں کا طریقہ ہے' مسلمانوں کا نہیں ہے۔ کیونکہ مخلص مسلمان کی صفت یہ ہے کہ اس کے دل اور زبان دونوں پر ایک ہی چیز ہوتی ہے یعنی اللہ عزوجل کی وحدانیت اور اُس کی حاکمیت کی بات۔

﴿ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو نفاق چھپائے ہوئے تھے اُسے اللہ خوب جاننے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو بیٹھ رہے اور اپنے (شہید ہونے والے) بھائیوں کے بارے میں کہا کہ اگر یہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے' آپ کہیے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے موت دور کر کے دکھاؤ O

مسلمانوں کی جہاد میں شرکت اور شہادت پر منافقین کا تبصرہ اور اللہ عزوجل کی جانب سے اس کا جواب

یہ آیت مبارکہ عبد اللہ بن اُبی منافق اور اس کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس میں جو فرمایا کہ ان (منافقین) نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا' اس میں بھائی سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں: (۱) ایک یہ ہے کہ بھائیوں سے اُن کے نسبی بھائی مراد ہیں جو کہ اُحد والے دن شہید ہو گئے۔ دینی بھائی مراد نہیں ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بھائیوں سے اُن کے منافق بھائی مراد ہیں۔

پہلے قول کی صورت میں ﴿ لِاِخْوَانِهِمْ ﴾ ''فی اخوانھم'' یا ''عن اخوانھم'' کے معنٰی میں ہے۔ یعنی اُن کے جو بھائی احد میں شہید ہو گئے تھے اُن کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ ہوتے۔ یہ ترجمہ اس لیے کیا کہ قتل ہونے کے بعد اُن کی گفتگو اپنے بھائیوں سے نہیں تھی (بلکہ اپنے بھائیوں کے بارے میں دوسروں سے تھی)۔ اور دوسرے قول کی صورت میں آیت کا معنٰی یہ ہو گا کہ عبد اللہ بن اُبی اور اس کے دیگر ساتھیوں نے اپنے منافق بھائیوں سے مذکورہ بات کہی۔

آیت میں جو ﴿ قَعَدُوْا ﴾ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ (منافقین) جہاد سے بیٹھ رہے۔ اور ﴿ لَوْ اَطَاعُوْنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) یہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (میدانِ جنگ کی طرف) چلے ہیں اگر ہماری بات مان لیتے' یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جاتے یا واپس پلٹ آتے تو ﴿ مَا قُتِلُوْا ﴾ اُس دن نہ مارے جاتے۔ اس بات پر اُن لوگوں کا رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اے محمد (ﷺ) آپ ان (منافقین) سے کہہ دیجئے کہ تم اپنے آپ سے موت کو دور کرو اگر تم سچے ہو۔ مراد یہ ہے کہ ڈر اور خوف آدمی کو تقدیر سے نہیں بچا سکتا۔ ☆ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ قتل ہونے والے شخص کو جو موت آتی ہے وہ اس کے وقتِ معیّن پر ہی آتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کا اختلاف ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ قتل سے آدمی کا وقتِ مقرر منقطع ہو جاتا ہے۔[۱۱]

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ ﴾

اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں شہید کر دیئے جائیں اُنہیں ہرگز مردہ خیال مت کرو' بلکہ وہ زندہ ہیں' اپنے رب کے پاس اُنہیں رزق ملتا ہے O

آیت مذکورہ کا نزول کن شہداء کے بارے میں ہوا؟ اس میں اختلاف اور شہدائے احد کے بارے میں نازل ہونے پر تین احادیث سے استدلال

یہ آیت کن شہداء کے بارے میں نازل ہوئی؟ اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ شہداء بدر کل ۱۴ تھے جن میں سے چھ مہاجرین اور آٹھ انصار تھے۔

---

[۱۱] اس سے بعض معتزلہ مراد ہیں اور یہاں اُنہی کا رد مقصود ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ قتل ہونے والے شخص کی موت وقت معیّن سے پہلے واقع ہو جاتی ہے۔ یعنی قتل ہونے کی وجہ سے جو موت آتی ہے وہ اپنے وقت پر نہیں ہوتی۔ جبکہ اہل سنّت کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص خواہ قتل کے ذریعہ مرے یا طبعی موت مرے' بہر صورت اپنے وقت پر مرتا ہے۔ کسی بھی شخص کی موت وقتِ معیّن سے نہ ایک لحہ پہلے آ سکتی ہے نہ بعد میں۔ (دلائل کی تفصیل کے لیے کتب عقائد ملاحظہ فرمائیے۔)

(۲) اکثر مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آیت شہداء اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اس کی تائید میں درج ذیل تین روایات پیش خدمت ہیں:

پہلی حدیث: (i) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۱٤۲) رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اُحد والے دن جب تمہارے بھائی شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رکھ دیں۔(اب اُن کا حال یہ ہے کہ) وہ جنت کے دریاؤں پر جاتے ہیں' جنت کے پھل کھاتے ہیں اور عرش کے سایہ میں جو سونے کی قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں وہاں پلٹ آتے ہیں۔جب انہوں نے کھانے پینے اور آرام کرنے کی پاکیزہ چیزیں حاصل کرلیں تو انہوں نے کہا کہ ہمارے بھائیوں تک ہمارا یہ پیغام کون پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں۔تاکہ وہ جنت سے بے رغبتی نہ کریں اور جہاد سے پیچھے نہ ہٹیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُن تک تمہارا یہ پیغام میں پہنچاؤں گا۔پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا '' (الی اخر الایة)۔

(سنن ابوداؤد: ۲۵۲۰' المستدرک ج ۲ص ۸۸' مسند احمد ج ۱ص ۲۶۶' سنن بیہقی ج ۹ص ۱۶۳' الترغیب والترہیب ج ۲ص ۱۹۷' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۵۳۔ص ۳۳۴)

دوسری حدیث: (ii) حضرت مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آیت مبارکہ ''ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا (الی اخر الایة)'' کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ:

(۱٤۳) شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں' ان کے لیے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلیں ہیں۔وہ (روحیں) جنت میں جہاں سے چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں پھر اُن قندیلوں کی طرف لوٹ آتی ہیں۔پھر ان کی طرف اُن کے رب نے متوجہ ہو کر فرمایا: کیا تم اور بھی کچھ چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ کیا چیز (رہ گئی) ہے جس کی ہم خواہش کریں۔جبکہ ہم جنت میں جہاں سے چاہتے ہیں کھاتے ہیں۔تین مرتبہ اُن سے یہی سوال کیا گیا۔جب انہوں نے دیکھا کہ اس سوال کا جواب دینا ہی پڑے گا تو انہوں نے کہا: اے پروردگار! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں دوبارہ ہمارے جسم میں ڈال دی جائیں تاکہ ہم تیری راہ میں دوبارہ قتل ہوں۔جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ان کی کوئی حاجت نہیں ہے تو انہیں چھوڑ دیا گیا[(۱)]

(صحیح مسلم: ۱۸۸۷' سنن ترمذی: ۳۰۱۱' سنن ابن ماجہ: ۲۸۰۱' سنن دارمی: ۲۴۱۰' سنن بیہقی ج ۹ص ۱۶۳' مشکوٰۃ: ۳۸۰۴۔ص ۳۳۰)

حدیث مذکور: ۱٤۳ کی تشریح اور اس کے فوائد

☆ اس حدیث میں حضرت مسروق نے صرف ''عبد الله'' کہا ہے اور ولدیت ذکر نہیں کی۔جبکہ بعض علماء نے ولدیت ذکر کرتے ہوئے ''عبد الله بن عمر'' کہا ہے۔اور ابو مسعود دمشقی اور امام حُمیدی نے اپنی مسند میں اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔یہی صحیح ہے۔

☆ یہ حدیث مرفوع ہے۔کیونکہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسروق سے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا تھا تو آپ نے یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔☆ اس حدیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ جنت کو پیدا کیا جا چکا ہے۔کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس میں فرمایا کہ شہداء کی روحیں جنت میں جہاں سے چاہتی

(۱) اس حدیث شریف کا ابتدائی حصہ' البقرہ: ۱۵۴ کی تفسیر میں رقم: ۱٤۷ کے تحت گزر چکا ہے۔وہاں اس کو مع حاشیہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ہیں کھاتی پیتی ہیں۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔

☆ اس حدیث میں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ روحیں باقی رہتی ہیں۔ جسم کے فنا ہونے سے فنا نہیں ہوتیں۔ ☆ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قیامت سے پہلے ہی نیک لوگوں کو انعام اور اجر وثواب ملتا ہے اور گناہگاروں کو سزا اور عذاب ملتا ہے۔ یہ بھی اہل سنت کا مذہب ہے۔ ☆ اس حدیث میں جو فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شہداء کی ارواح کو سبز پرندوں کے پوٹوں میں رکھ دیتا ہے۔ اور یہ کوئی بعید نہیں ہے خصوصاً اس لیے کہ رُوح کو جسمِ لطیف قرار دیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد روح اور جسم کے جس حصہ پر نعمت یا عذاب ہوتا ہے وہ جسم کا صرف ایک جزء ہے۔ اس میں رُوح بھی باقی رہتی ہے۔ اور جسم کا یہی جزء نعمت کی لذت اور عذاب کی تکالیف محسوس کرتا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس جزء کو پرندہ بنا دے اور اُسے پرندے کے پوٹے میں رکھے۔ پھر وہ پرندے جنت میں کھائیں پئیں اور قندیلوں کی طرف لوٹ آئیں۔ ☆ اس حدیث کا وہ لوگ بھی سہارا لیتے ہیں جو تناسخ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ روحیں (ایک جسم سے دوسرے جسم میں) منتقل ہوتی ہیں اور انہیں جب اجر وثواب دیا جاتا ہے تو وہ خوب صورت اور خوش وخرم شکل میں ہوتی ہیں اور جب عذاب دیا جاتا ہے تو وہ بدنما اور ذلیل شکل میں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ اسی کو ثواب اور عذاب سمجھتے ہیں۔ یہ قول کھلی گمراہی اور نہایت کمزور قول ہے اور بدعت باطلہ ہے کیونکہ اس قول کی بنیاد پر حشر ونشر ومعاد اور جنت ودوزخ سب کا تصور ہی ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔ زیر بحث حدیث کی بعض روایات میں ایک جملہ ایسا ہے جس سے اس قول کے قائلین کا رد ہوتا ہے، وہ جملہ یہ ہے کہ (شہداء کی روحیں سبز پوٹوں میں رہیں گی) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جس دن اُنہیں اٹھائے گا اُس دن روح کو جسم کی طرف لوٹا دے گا۔ اُٹھانے سے مراد یہ ہے کہ اُس دِن پورے جسم کو زندہ فرمائے گا۔ اور یہ قیامت کا دن ہو گا۔ واللہ اعلم (اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ علم والا ہے)۔

تیسری حدیث: (iii) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں غمزدہ تھا' رسول اللہ ﷺ مجھ سے ملے اور فرمایا: (١٤٤) کیا بات ہے میں تمہیں دل شکستہ دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! اُحد میں میرے والد شہید ہو گئے اور پیچھے اولاد اور قرض چھوڑ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس بات کی بشارت نہ دوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد سے ملاقات فرمائی؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی حجاب کے بغیر کسی سے کلام نہیں فرمایا۔ (جبکہ) تمہارے والد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ فرمایا اور اُن سے بالمشافہ کلام کیا۔ اور اُن سے فرمایا: اے میرے بندے! میرے سامنے تو آرزو کر میں تجھے عطا کروں گا۔ انہوں نے کہا: اے میرے رب (عزوجل)! تو مجھے زندگی دے دے تا کہ میں دوبارہ شہادت پاؤں۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا: میرا قانون جاری ہو چکا ہے کہ (جنہیں موت آ جائے گی) اُنہیں دُنیا میں واپس لوٹایا نہیں جائے گا۔ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (الاٰية)''۔

(سنن ترمذی: ٣٠١٠' سنن ابن ماجہ: ١٩٠۔ ٢٨٠٠' المستدرک ج ٣ ص ٢٠٣۔ ٢٠٤' مشکوٰۃ المصابیح: ٦٢٣٦۔ ص ٥٧٩)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

زیر بحث آیت کے نزول میں مفسرین کا تیسرا قول اور واقعۂ بیر مَعُوْنہ کا بیان

(٣) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت شہداء بیر معونہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ''معونہ'' مکہ مکرمہ' عسفان اور ہذیل کی زمین کے درمیان ایک کنواں ہے۔

محمد بن اسحٰق اپنے صاحب علم مشائخ سے روایت کرتے ہیں کہ بنی عامر بن صعصعہ کا سردار ابو براء بن مالک بن جعفر جو

''مُلَاعِبُ الْاَسِنَّه'' (نیزوں سے کھیلنے والا) کے لقب سے مشہور تھا وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تحفہ پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں کسی مشرک کا تحفہ قبول نہیں کرتا۔ پھر آپ نے اُسے اسلام کی دعوت دی اور اسلام کے فوائد سے آگاہ کیا اور اُن چیزوں کے متعلق بتایا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں اور اُسے قرآن کریم پڑھ کر سنایا۔ لیکن اس نے نہ اسلام قبول کیا نہ آپ کے پاس سے اُٹھ کر گیا۔ بلکہ اس نے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! جس (مذہب) کی آپ دعوت دے رہے ہیں وہ یقیناً حسین اور جمیل ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنے کچھ صحابہ کو اہل نجد کی طرف اسلام کی دعوت کے لیے بھیج دیں تو مجھے امید ہے کہ وہاں کے لوگ آپ کے پیروکار ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انی اخشی علیھم أھل نجد'' (مجھے اُن صحابہ کے بارے میں اہل نجد سے خطرہ ہے)۔ ابو براء نے کہا کہ میں اُن صحابہ کو پناہ دیتا ہوں، آپ اُنہیں اپنے مذہب کی دعوت کے لیے بھیج دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو ساعدہ کے المنذر بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعلیٰ درجہ کے ستر صحابہ جنہیں قُراء کہا جاتا تھا، کا امیر بنا کر روانہ کیا۔ ان صحابہ میں حضرت حارث بن صِمَّہ، حَرام بن مَلْحَان، عُروہ بن اسماء بن الصَّلْت، نافع بن بُدَیل بن وَرقاء الخزاعی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ یہ واقعہ غزوۂ اُحد کے چار مہینے بعد ماہِ صفر ۴ھ میں پیش آیا۔ یہ سب (مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر) بیر معونہ پہنچے۔ (بیر معونہ بنی عامر کے علاقہ اور بنی سُلیم کے حرہ (پتھریلی زمین) کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے)۔ جب وہاں پہنچے تو آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ اس کنویں کے پانی والوں کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام کون پہنچائے گا؟ حضرت حرام بن ملحان نے کہا کہ میں پہنچاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی لے کر عامر بن طُفیل کے پاس گئے۔ اس وقت عامر بن طفیل کنویں کے پانی پر تھا۔ حضرت حرام بن ملحان جب لوگوں کے پاس پیغام لے کر آئے تو عامر بن طفیل نے رسول اللہ ﷺ کے مکتوب گرامی کو دیکھا تک نہیں۔ حضرت حرام بن ملحان نے لوگوں سے کہا: اے بیر معونہ والو! میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ (عزوجل) کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور (سیدنا) محمد ﷺ اس کے برگزیدہ بندے اور رسول ہیں۔ تم لوگ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ حضرت حرام نے جب یہ بات کہی تو گھر کی ایک طرف سے ایک شخص نیزہ لے کر نمودار ہوا اور اُس نے حضرت حرام کے پہلو میں وہ نیزہ اس زور سے مارا کہ اُن کے آر پار ہو گیا۔ حضرت حرام نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ پھر عامر بن طفیل نے چیخ چیخ کر بنو عامر کو مسلمانوں کے خلاف مدد کے لیے بُلایا لیکن اُن لوگوں نے مدد سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم ابو براء سے عہد شکنی نہیں کریں گے۔ کیونکہ ابو براء نے مسلمانوں کو پناہ دینے کی ضمانت لے رکھی ہے۔ عامر بن طفیل نے جب بنو عامر کی یہ بات سُنی تو اُس نے بنو سُلیم کے قبائل عُصَیَّہ، رِعْل اور ذَکْوَان کو مدد کے لیے بُلایا۔ انہوں نے عامر بن طفیل کی پکار پر لبیک کہا اور صحابہ کرام پر دھاوا بول دیا۔ تمام صحابہ کو انہوں نے سواری سمیت اپنے گھیرے میں لے لیا۔ صحابہ کرام نے جب ان لوگوں کو دیکھا تو انہوں نے بھی اپنی تلواریں سنبھال لیں اور یوں باہم جنگ شروع ہو گئی۔ ان لوگوں نے حضرت کعب بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا تمام صحابہ کو شہید کر دیا۔ حضرت کعب بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں رمقِ حیات باقی تھی، اُنہیں وہاں سے لے آیا گیا۔ وہ غزوۂ خندق تک زندہ رہے پھر غزوۂ خندق میں شہادت پائی۔ حضرت عمرو بن اُمَیَّہ الضَّمری اور قبیلہ بن عمرو بن عوف کے ایک انصاری صحابی اس جماعتِ صحابہ کے اونٹ چرانے میں مشغول تھے۔ اُنہیں اس سانحہ کا اس طرح علم ہوا کہ کچھ پرندے لشکر پر چکر کاٹنے لگے۔ ان پرندوں کو دیکھ کر ان دونوں نے کہا کہ خدا کی قسم! یہ پرندے بتا رہے ہیں کہ کوئی بات ہو گئی ہے! یہ کہہ کر دونوں دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ساتھی خون میں لت پت پڑے ہیں۔ اور جو گھوڑے ساتھ لائے تھے وہ کھڑے ہوئے ہیں۔ انصاری نے عمرو بن امیہ سے کہا کہ کیا کرنا چاہیے؟ عمرو بن امیہ نے کہا

کہ ہم چلتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دیتے ہیں۔ انصاری نے کہا کہ جس جگہ (ہمارے امیر لشکر) منذر بن عمرو کو شہید کیا گیا ہے اس جگہ کو میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے بھی کافروں سے لڑائی شروع کر دی حتیٰ کہ کافروں نے اُس انصاری کو شہید کر دیا اور عمرو بن امیہ الضمری کو قیدی بنا لیا۔ جب عمرو بن امیہ نے بتایا کہ میں قبیلہ مضر کا ہوں تو عامر بن طفیل نے ان کی پیشانی کے بال کاٹ لیے اور یہ سمجھ کر اُنہیں آزاد کر دیا کہ میری والدہ کے ذمہ جو غلام آزاد کرنا تھا وہ آزاد ہو گیا۔ پھر عمرو بن امیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ ابو براء کا کیا دھرا ہے۔ اور میں اسی وجہ سے صحابہ کو بھیجنا ناپسند کر رہا تھا اور ان کے بارے میں خطرہ کا اظہار کر رہا تھا۔ ابو براء کو جب اس سانحہ کی اطلاع ملی تو اُسے عامر بن طفیل کی عہد شکنی اور رسول اللہ ﷺ کے غمگین ہونے کی بہت تکلیف پہنچی۔ رسول اللہ ﷺ کے ابو براء پر غمگین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے پناہ دینے کی ذمہ داری لی تھی۔

اس واقعہ میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے اُن میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ اُن کے حوالہ سے محمد بن اسحٰق ہشام بن عروہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عامر بن طفیل بعد میں لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ جو افراد قتل کیے گئے ہیں ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا کہ جب اُسے قتل کیا گیا تو میں نے دیکھا کہ اُسے آسمان اور زمین کے درمیان اتنا بلند کیا گیا کہ آسمان نیچے رہ گیا' وہ شخص کون تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ عامر بن فہیرہ تھے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ ابو براء کے بیٹے ربیعہ کو جب پتا چلا کہ عامر بن طفیل نے میرے والد کے معاہدہ میں رخنہ ڈالا ہے تو اس نے عامر بن طفیل پر حملہ کر کے اُسے نیزہ گھونپ دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھوڑے سے گر پڑا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن الاثیر جزری نے اپنی کتاب جامع الاصول کی اسماء والی جلد میں عامر بن طفیل کے حالات میں لکھا ہے کہ عامر بن طفیل نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اسّی سال سے زیادہ تھی۔ اُس نے اسلام قبول نہیں کیا اور واپس چلا آیا۔ پھر اُس کے کان پر ایک پھوڑا نکل آیا جس کی وجہ سے اس کا کان آگ کی طرح (لال) ہو گیا۔ اس پھوڑے کی تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ تاب نہ لا سکا اور اسی تکلیف سے مر گیا۔

واقعۂ بیر مَعُوْنَہ کے بارے میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مفصّل حدیث شریف

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(١٤٥) رسول اللہ ﷺ نے بنو سلیم[١٢] کے ستّر صحابہ کو بنو عامر کی طرف (تبلیغ کے لیے) بھیجا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں یعنی امّ سُلیم کے بھائی حضرت حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ستّر سواروں کا امیر بنا کر روانہ فرمایا۔ جب یہ سب لوگ (معیّنہ جگہ پر) پہنچے تو میرے ماموں نے صحابہ سے کہا کہ میں پہلے تبلیغ کے

[١٢] امام بخاری کے الفاظ ہیں: ''بعث النبی ﷺ اقواما من بنی سُلیم''. اس پر اعتراض یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ کے لیے بنی سُلیم کے صحابہ کو نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ بنی سُلیم کی طرف صحابہ کرام کو بھیجا تھا؟ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ امام بخاری کو یہاں وہم لاحق ہوا ہے۔ کیونکہ بنی سُلیم کی طرف صحابہ کی نسبت درست نہیں ہے۔ علامہ کرمانی کا قول یہ ہے کہ یہاں کوئی وہم نہیں ہے۔ کلام بالکل درست ہے۔ کیونکہ ''اقواماً'' کا جو زبر ہے وہ ہو سکتا ہے نصب بہ نزع خافض ہو۔ یعنی اصل عبارت یوں ہو: بعث النبی ﷺ الی اقوام من بنی سُلیم. (نبی اکرم ﷺ نے بنی سُلیم کے کچھ قبائل کی طرف صحابہ کرام کو بھیجا۔) اس صورت میں متن پر یا امام بخاری پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ علامہ کرمانی نے اس پر مزید کلام کیا ہے اور علامہ عینی نے علامہ کرمانی کے کلام پر کلام کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: عمدۃ القاری ج ١٠ ص ١٠٤)

لیے آگے بڑھتا ہوں' اگر رسول اللہ ﷺ کے پیغام سُنانے تک انہوں نے مجھے اطمینان سے رکھا تو ٹھیک ہے ورنہ تم لوگ میرے قریب ہی ہو۔ یہ کہہ کر وہ (پیغام سنانے کے لیے) آگے چلے گئے۔لوگوں نے (ابتداءً) اُنہیں اطمینان سے رکھا۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا پیغام سنانا شروع کیا تو اسی دوران لوگوں نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اُس نے اشارہ پاتے ہی حضرت حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایسا نیزہ مارا کہ وہ ان کے آر پار ہو گیا۔ انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ ''فُـزْتُ وَ رَبِّ الْـكَـعْبَةِ '' (رب کعبہ کی قسم! میں نے زندگی کی بازی جیت لی)۔ پھر باقی صحابہ کرام پر بھی لوگوں نے حملہ کر دیا اور سب کو شہید کر دیا سوائے ایک صحابی کے جو پاؤں سے معذور تھے وہ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ (ہمام راوی کہتے ہیں: میرا گمان ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی اور بھی صحابی تھے) اس سانحہ کے بعد جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ کو بتا دیا کہ وہ (ستر صحابہ) اپنے رب سے جا ملے ہیں' اُن کا رب اُن سے راضی ہو چکا ہے اور اُس نے اُنہیں راضی کر دیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس (واقعہ کے بعد) ہم یہ آیت پڑھا کرتے تھے کہ: ''بَـلِّغُوْا قَوْمَنَا اَنْ قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَاَرْضَانَا'' (ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب تعالیٰ سے جا ملے ہیں' وہ ہم سے راضی ہے اور اس نے ہمیں راضی کر دیا ہے)۔ پھر بعد میں یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ نبی اکرم ﷺ چالیس دن تک صبح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے والے قبیلہ رِعْل' ذکوان اور عُصَیَّہ کی تباہی اور بربادی کی دُعا فرماتے رہے۔

ایک روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ قبیلہ رِعْل وذکوان اور بنی لحیان نے رسول اللہ ﷺ سے مدد مانگی۔ نبی اکرم ﷺ نے ستر صحابہ کو بھیج کر اُن کی مدد فرمائی۔ یہ صحابہ وہ تھے جنہیں ہم اُن کے زمانہ میں قُرّاء کہتے تھے۔ یہ دن میں لکڑیاں چُنتے تھے اور رات میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہ تمام لوگ جب (مدینہ منورہ سے نکل کر) بیر معونہ کے پاس پہنچے تو (قبیلہ رِعْل وذکوان اور بنی لحیان نے) ان کو شہید کر دیا اور ان کے ساتھ غداری کی۔ یہ خبر نبی اکرم ﷺ کو ملی تو ایک مہینہ تک صبح میں آپ ان قبائل عرب رِعْل' ذکوان' عُصَیَّہ اور بنی لحیان کی ہلاکت اور بربادی کی دُعا فرماتے رہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس واقعہ کے شہداء کے متعلق ہم قرآن کریم کی ایک آیت پڑھا کرتے تھے جس کو بعد میں اٹھا لیا گیا۔ وہ آیت یہ تھی: ''بـلّـغوا قومنا ان قد لقينا ربنا فرضي عنا وارضانا '' (ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب تعالیٰ سے جا ملے ہیں' وہ ہم سے راضی ہے اور اس نے ہمیں راضی کر دیا ہے)۔

امام مسلم کی روایت اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں' کچھ لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ ہمارے ساتھ کچھ آدمی بھیج دیں جو ہمیں قرآن اور سنّت کی تعلیم دیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ستّر انصار صحابہ کو اُن کی طرف روانہ فرما دیا۔ اس کے بعد واقعہ گذشتہ تفصیل کے مطابق ہے۔

(صحیح بخاری: ۱۰۰۱۔ ۲۸۰۱۔ ۴۰۹۱' صحیح مسلم: ۶۷۷' مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۶' سنن بیہقی ج ۲ ص ۱۹۹)

زیرِ بحث آیت کے نزول میں مفسرین کا چوتھا قول

(۴) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شہداء کے سرپرست اور اُن کے گھر والوں کو جب کوئی نعمت اور اچھی چیز ملتی تو اُنہیں اپنے شہید ہونے والوں پر حسرت ہوتی اور کہتے کہ ہم تو نعمت اور آسودگی میں زندگی گزار رہے ہیں اور ہمارے آباء و اجداد' ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی تاکہ شہداء کے گھر والوں کو دلی اطمینان اور تسلّی حاصل ہو اور اُنہیں اپنے شہداء کا حال معلوم ہو۔

زیرِ بحث آیت کی تفسیر اور شہداء کے زندہ ہونے کی کیفیت کا بیان

﴿لَاتَحْسَبَنَّ﴾ کا معنیٰ ہے:''لا تظنن ''(آپ گمان نہ کریں)۔اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہر امتی سے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص بھی یہ گمان نہ رکھے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ ہیں اوران لوگوں کی طرح ہیں جو راہِ خدا میں جان دیئے بغیر (طبعی) موت مرجاتے ہیں۔﴿بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ کا معنیٰ ہے:''بل هم احياء ''یعنی شہداء زندہ ہیں۔

اس آیت کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے زندہ ہوتے ہیں۔اب دوصورتیں ہیں' یا تو زندہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت میں زندہ ہوں گے یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی زندہ ہیں۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ شہداء اس وقت زندہ ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ اُن کی یہ زندگی روحانی ہے یا جسمانی؟ یہ شہداء کے زندہ ہونے کی کل تین صورتیں ہیں۔

جو علماء پہلی صورت کے قائل ہیں' یعنی شہداء آخرت میں زندہ ہوں گے وہ آیت کا معنیٰ یہ بیان کرتے ہیں کہ شہداء اپنے ذکر اور تذکرہ کے اعتبار سے زندہ ہیں' اُن کے شہید ہونے کے بعد لوگ اُن کے نیک اعمال اور شہادت کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ دینی اعتبار سے زندہ ہیں۔

لیکن یہ قول درست نہیں ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں ''بَلْ اَحْیَآءٌ ''فرما کر حالیہ زندگی کو ثابت کیا ہے یعنی جب وہ قتل ہوتے ہیں تو (اُسی وقت) اُنہیں زندہ کردیا جاتا ہے۔یہی شہداء کی حیات کا دوسرا معنیٰ ہے۔

اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ شہداء کی زندگی روحانی ہوتی ہے یا روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوتی ہے؟ (۱) جو علماء اس بات کے قائل ہیں کہ شہداء صرف روحانی طور پر زندہ ہوتے ہیں اُن کی دلیل نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ ''شہداء کی رُوحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں''۔اس حدیث میں رُوح کا تذکرہ ہے' جسم کا تذکرہ نہیں ہے۔اسی طرح بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شہداء کی رُوحیں ہر رات عرش کے نیچے رکوع اور سجود کرتی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ (۲) جبکہ وہ علماء جو اس بات کے قائل ہیں کہ شہداء جسمانی اور روحانی دونوں طرح زندہ ہوتے ہیں اُن کی دلیل زیرِ بحث آیت کا اگلا حصہ ہے۔یعنی ''عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ''(شہداء کو اپنے رب کے پاس رزق ملتا ہے) اس جملہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ شہداء کو رزق ملتا ہے' وہ زندوں کی طرح (مختلف چیزیں) کھاتے ہیں اور اُن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شہید کا جسم قبر میں نہ بوسیدہ ہوتا ہے نہ اوروں کی طرح زمین اس کے جسم کو کھاتی ہے۔مروی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب شہداء کی قبروں کے پاس نہر کھدوانے کا ارادہ کیا تو لوگوں میں یہ اعلان کروایا کہ جس کا کوئی شہید یہاں مدفون ہو وہ اُسے نکال کر دوسری جگہ منتقل کردے۔حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ اعلان سُن کر ہم شہداء کی طرف گئے اور جاکر اُنہیں قبروں سے نکالا تو وہ تروتازہ بدن تھے۔اس دوران ایک شہید کی انگلی میں کدال لگ گئی تو اس سے خون نکلنے لگا۔

شہداء احد کے مزار پر حاضر ہونے اور انہیں سلام پیش کرنے کی فضیلت

امام بغوی نے بغیر سند کے حضرت عبید اللہ بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ:

(۱٤٦) اُحد سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ کا گزر حضرت مُصعَب بن عُمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر سے ہوا جو کہ شہید ہو گئے تھے۔آپ وہاں رُکے اور اُن کے لیے دُعا کی۔پھر یہ آیت پڑھی:

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِۚ. مسلمانوں میں کچھ ایسے مرد ہیں جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کر دکھایا۔ (الاحزاب:۲۳)

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ قیامت کے دن یہ سب اللہ عزوجل کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ تم ان کے پاس آ کر ان کی زیارت کیا کرو اور انہیں سلام کیا کرو۔ (کیونکہ) وہ ذات جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے مجھے اُس کی قسم! قیامت تک جو شخص بھی انہیں سلام کرے گا یہ اُسے سلام کا جواب دیں گے۔[۳۱]

(معالم التنزیل للبغوی، زیر بحث آیت، المستدرک ج۲ ص۲۴۸، کنز العمال:۲۹۸۹۲، الدر المنثور ج۵ ص۱۹۱)

آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ﴾ (اپنے رب کے پاس اُنہیں رزق ملتا ہے۔) اس میں ''عند ربّهم'' سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور عزت کی جگہ مراد ہے۔ اور ''یرزقون'' میں جنت کے پھل اور جنت کے تحائف مراد ہیں (یعنی شہداء کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور عزت کے مقام پر جنت کے پھل اور تحائف ملتے ہیں)۔

فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

اللہ نے جو اُنہیں اپنا فضل عطا فرمایا ہے اس پر وہ خوش ہیں اور اپنے بعد والے لوگ جو ابھی اُن سے نہیں ملے اُن کے بارے میں وہ اس بشارت سے خوش ہو رہے ہیں کہ اُنہیں بھی نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے O وہ اللہ کی طرف سے (ملنے والی) نعمت اور فضل پر خوشی منا رہے ہیں اور (اس پر) کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا O

شہداء کا اللہ عزوجل کی نعمتوں پر خوش ہونا اور اپنے بعد شہید ہونے والوں کے لیے مسرت کا اظہار کرنا

﴿فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کو جنت میں جو اجر و ثواب، انعام و اکرام اور فضل و کرم عطا فرمایا ہے وہ اس سے خوش ہیں۔ ﴿یَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ ''استبشار'' سے ہے اور ''استبشار'' اُس خوشی کو کہتے ہیں جو آدمی کو کسی خوش خبری کے ملنے پر حاصل ہوتی ہے۔ ﴿بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُن کے وہ بھائی جنہیں وہ دنیا میں ایمان اور جہاد کی راہ پر زندہ چھوڑ آئے ہیں (اُن کے متعلق بھی وہ خوش ہو رہے ہیں) کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ جب ہمارے بھائی شہید ہوں گے تو وہ ہم سے آملیں گے اور اُنہیں بھی ہماری طرح انعام و اکرام ملے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شہداء نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں درخواست کی کہ ہمیں جو انعام و اکرام ملا ہے اس سے ہمارے بھائیوں کو باخبر فرما دے۔ تاکہ اُنہیں جہاد کا شوق اور اس کی رغبت رہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہداء سے فرمایا کہ میں نے اپنے نبی محمد ﷺ پر (آیت) نازل کر دی ہے اور اُنہیں تمہارے حال سے اور تمہارے انعام و اکرام سے باخبر کر دیا ہے۔ اور محمد (ﷺ)

[۳۱] اس حدیث شریف میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ عزوجل کے نیک بندوں کی قبروں پر حاضری دینا جائز بلکہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ ہے۔ دوسرا یہ معلوم ہوا کہ اہل قبور سلام کا جواب دے سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ شہداء اُحد کی قبروں پر حاضری دینا رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی کا باعث ہے، تو خود آپ کے روضۂ اقدس پر مسلمانوں کی حاضری آپ کے لیے کس قدر فرحت و انبساط اور خوشی کا باعث ہوگی!

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہارے بھائیوں کو اس سے باخبر کر دیا ہے۔ شہداء یہ سُن کر شاداں وفرحاں اور خوش ہو گئے[١٤]

آگے فرمایا: ﴿ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ﴾ مراد یہ ہے کہ (شہداء کے بعد آنے والوں کو) آخرت میں کوئی خوف نہیں ہوگا اور ﴿ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی جو نعمتیں اُن کے ہاتھ سے چلی گئیں اُن پر وہ غمگین نہیں ہوں گے۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ شہداء اپنے بعد والوں پر خوشی منا رہے ہیں جو ابھی اُن سے ملے نہیں ہیں۔ اس کے بعد ﴿ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ ﴾ فرما کر یہ بتایا کہ انہیں جو نعمت اور فضل وکرم عطا ہوا ہے اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ پر بھی خوش ہو رہے ہیں۔ نتیجہ کلام یہ ہے کہ پہلی خوشی جو ذکر کی گئی وہ دوسروں کی وجہ سے ہے اور دوسری خوشی خاص اپنی ذات کی وجہ سے ہے۔

﴿ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ مجاہدین اور شہداء کا اجر وثواب ضائع نہیں فرماتا اسی طرح وہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔

اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد اور شہادت کے فضائل (احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(١٤٧) جو شخص اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہو جاتا ہے۔ (اور فرماتا ہے کہ) جو شخص صرف میری راہ میں جہاد کے لیے اور صرف مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق کی وجہ سے نکلتا ہے اس کے لیے میں اس بات کا ضامن ہوں کہ اُسے جنت میں داخل کر دوں یا اُسے اجر وثواب اور مالِ غنیمت کے ساتھ اس کے گھر لوٹاؤں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اللہ کی راہ میں جو زخم بھی لگتا ہے وہ قیامت کے دن اُسی حالت میں آئے گا جس حالت میں وہ زخم لگا تھا۔ اس کا رنگ تو خون کا ہوگا (لیکن) خوشبو مُشک کی ہوگی۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا تو میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی لشکر سے کبھی پیچھے نہ رہتا۔ لیکن میرے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں تمام مسلمانوں کو سواریاں مہیا کروں اور نہ مسلمانوں کے پاس اتنی گنجائش ہے اور (اگر میں تنہا جہاد کے لیے نکل جاؤں تو) مسلمانوں کا مجھ سے پیچھے رہ جانا ان کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میں اس بات کی خواہش رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں' پھر جہاد کروں پھر شہید ہو جاؤں اور پھر جہاد کروں پھر شہید ہو جاؤں[١٥]☆ حدیث کے یہ الفاظ صحیح مسلم کے مطابق ہیں۔

(صحیح بخاری: ٣٦ـ٢٧٩٧' صحیح مسلم: ١٨٧٦' سنن نسائی: ٥٠٢٩ـ٣١٥٢' سنن ابن ماجہ: ٢٧٥٣' مؤطا امام مالک: ٩٩٦' مسند احمد ج ٢ص ٣٩٩ـ ٤٢٤' سنن بیہقی ج ٩ص ١٥٧' سنن دارمی: ٢٣٩١' مشکوٰۃ المصابیح: ٣٧٨٩ـ٣٧٩٠ـ ص ٣٢٩)

[١٤] اس کی تائید میں حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ جس کو علامہ خازن گذشتہ آیت کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: آل عمران: ١٦٩' رقم الحدیث: ١٤٢۔

[١٥] اس حدیث شریف سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ جس چیز کا حصول ناممکن ہو اُس کی تمنا کرنا بھی جائز' بلکہ حسنِ نیّت کی وجہ سے باعثِ ثواب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ کوئی کافر آپ کو شہید نہیں کر سکے گا اس کے باوجود آپ کا شہادت کی تمنا کرنا اس لیے تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور نبی کی تمنا سے لوگوں میں جذبہ جہاد بیدار ہو۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب کسی عمل میں گنجائش موجود ہو اور اس کا کرنا لوگوں کے لیے دشواری کا باعث ہو تو سربراہ کو اُس عمل کے شروع کرنے سے بچنا چاہیے۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فقراء مسلمین کا لحاظ کرتے ہوئے جہاد سے محبت کے باوجود بعض مواقع پر شریک نہ ہوئے اور زیرِ بحث حدیث میں فرمادیا کہ اگر مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا تو میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کسی لشکر سے کبھی پیچھے نہ رہتا۔ (عمدۃ القاری ج ١٠ص ١٠١' مرقات ج ٧ص ٣٥٥)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱٤۸) صبح یا شام اللہ (عزوجل) کی راہ میں نکلنا دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۷۹۲، صحیح مسلم: ۱۸۸۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۷۹۲۔ص ۳۲۹)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱٤۹) اللہ کی راہ میں ایک دن گھوڑا باندھنا دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور جنت میں تمہارے ایک کوڑے کی مقدار جگہ دُنیا اور دُنیا کی چیزوں سے بہتر ہے۔

(صحیح بخاری: ۲۸۹۲، صحیح مسلم: ۱۸۸۱، سنن نسائی: ۳۱۱۸، مسند احمد ج ۵ ص ۳۳۹، مشکوٰۃ: ۳۷۹۱۔ص ۳۲۹)

حضرت فُضالہ بن عُبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۰) ہر مرنے والے کا سلسلۂ عمل (اس کے مرنے کے بعد) روک دیا جاتا ہے سوائے اُس شخص کے جو اللہ کی راہ میں آلات جہاد لیے تیار رہا، اس کا عمل قیامت تک اس کے حق میں بڑھتا رہتا ہے اور وہ فتنۂ قبر سے بھی محفوظ رہتا ہے۔[۱۱٦]

(سنن ابوداؤد: ۲۵۰۰، سنن ترمذی: ۱٦۲۱، مسند احمد ج ٦ ص ۲۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۲۳۔ص ۳۳۲)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ:

(۱۵۱) جس شخص نے اونٹنی کے دو دفعہ دودھ دوہنے کے درمیانی وقت کی مقدار بھی جہاد کیا اُس کے لیے جنت واجب ہو گئی اور جس نے راہِ خدا میں شہید ہونے کی صدقِ دل سے اللہ کی بارگاہ میں دُعا کی پھر وہ مر گیا یا اُسے قتل کر دیا گیا تو اُسے شہید کا اجر و ثواب ملے گا اور جس کو اللہ کی راہ میں زخمی کر دیا گیا یا (جانور سے گرنے کی وجہ سے) کوئی زخم لگ گیا تو قیامت کے دن وہ (زخم) پہلے سے زیادہ (بڑھا ہوا) ہو کر آئے گا۔ اس کا رنگ زعفران کا اور خوشبو مشک کی ہو گی۔ اور جسے اللہ کی راہ میں کوئی پھوڑا نکل آیا تو یقیناً اس پر شہداء کی مُہر ہو گی۔ (سنن ترمذی: ۱٦۵٤۔۱٦۵۷، سنن ابوداؤد: ۲۵٤۱، سنن نسائی: ۳۱٤۱، سنن ابن ماجہ: ۲۷۹۲، سنن دارمی: ۲۳۹٤، مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۲۵۔ص ۳۳۲)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو مقامات پر الگ الگ روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۵۲) ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے دریافت کیا کہ لوگوں میں سب سے افضل شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ صاحبِ ایمان جو اپنی جان اور مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اُس نے پوچھا: پھر کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جو پہاڑ کی کسی گھاٹی میں رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہو۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو پہاڑ کی کسی گھاٹی میں رہ کر اللہ سے ڈرے اور لوگوں کو اپنے شر سے بچائے۔ (صحیح بخاری: ۲۷۸٦، صحیح مسلم: ۱۸۸۸، سنن ترمذی: ۱٦٦۰، سنن ابوداؤد: ۲٤٦۵، سنن نسائی: ۳۱۰۵، سنن ابن ماجہ: ۳۹۷۸، سنن بیہقی ج ۹ ص ۱۵۹، مسند احمد ج ۳ ص ۳۷)

---

۱۱٦ اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے آلاتِ جہاد کی تیاری کے ساتھ زندگی گزار دی، صرف اُسی کے لیے یہ فضیلت ہے کہ اُس کے مرنے کے بعد بھی اُس کا سلسلۂ عمل جاری رہتا ہے، جبکہ ایک حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اپنے پیچھے کوئی صدقہ جاریہ یا نفع بخش علم یا دُعا دینے والی نیک اولاد چھوڑی ہو اُس کا سلسلہ عمل بھی جاری رہتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث حدیث میں مجاہد کے لیے سلسلۂ عمل کے جاری رہنے کے ساتھ ساتھ یہ فضیلت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ فتنۂ قبر سے محفوظ رہے گا۔ اس خصوصیت کی بناء پر مجاہد کو دیگر سے امتیاز حاصل ہے۔ (مرقات ج ۷ ص ۳۸۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۳) جس نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس سے اجر وثواب کے حصول کے لیے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا تو اُس گھوڑے کا پیٹ بھرنا' اُس کو پانی پلانا اور اس کی لید اور پیشاب سب چیزیں قیامت کے دن اُس شخص کے میزان عمل میں ہوں گی ؎١ یعنی ان چیزوں کی نیکیاں۔

(صحیح بخاری: ۲۸۵۳' سنن نسائی: ۳۵۸۲' مسند احمد ج ۲ص ۳۷۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۸۶۸۔ص ۳۳۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۴) جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ دُنیا میں واپس آئے اور نہ زمین کی کسی چیز کو اپنے لیے پسند کرے گا البتہ صرف شہید اپنے اعزاز وانعام کو دیکھ کر اور ایک روایت کے مطابق شہادت کی فضیلت کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ وہ پھر دنیا میں جائے اور دس بار راہِ خدا میں قتل ہو۔ (صحیح بخاری: ۲۸۱۷' صحیح مسلم: ۱۸۷۷' سنن ترمذی: ۱۶۶۱)

حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۵) قرض کے سوا شہید کا ہر گناہ بخش دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم: ۱۸۸۶' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۱۲۔ص ۲۵۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۶) شہید کو قتل سے صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی تمہیں ایک چٹکی سے۔

(سنن ترمذی: ۱۶۶۸' سنن نسائی: ۳۱۶۱' سنن ابن ماجہ: ۲۸۰۲' مسند احمد ج ۲ص ۲۹۷)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۵۷) شہید اپنے خاندان کے ستر افراد کی شفاعت کرے گا۔ (سنن ابوداؤد: ۲۵۲۲' سنن ترمذی: ۱۶۶۳' سنن بیہقی ج ۹ص ۱۶۴)

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾

وہ لوگ جنہوں نے (گہرا) زخم لگنے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا اُن میں نیکی کرنے والوں اور پرہیزگاروں کے لیے بڑا اجر ہے O

غزوۂ اُحد کے بعد مسلمانوں کے کفار کا پیچھا کرنے کا تفصیلی واقعہ اور اس کے متعلق آیت مذکورہ کا نزول

اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھ دیگر کفار اُحد سے واپسی پر جب مقام روحاء میں پہنچے تو اُنہیں اپنے واپس ہو جانے پر شرمندگی ہوئی۔ اور ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ تم لوگوں نے نہ محمد (ﷺ) کو قتل کیا نہ نوجوان عورتوں کو لوٹ کر ساتھ لیا۔ تم لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کیا اور جب وہ تھوڑے رہ گئے تو انہیں چھوڑ دیا۔ آؤ دوبارہ چلو اور مسلمانوں کو بالکل ختم کر دو۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے دشمنوں کو مرعوب کرنے اور اُنہیں اپنی اور اپنے صحابہ کی قوت دکھانے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ اس کے لیے آپ نے صحابہ کو ترغیب دلائی کہ جاؤ ابوسفیان کو تلاش کرو۔ یہ سُن کر صحابہ کی ایک جماعت زخموں کے درد اور تکلیف کے باوجود تیار ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ کے منادی نے اعلان کیا کہ (ابوسفیان کی تلاش میں) ہمارے ساتھ وہی جائے گا جو کل (اُحد میں) ہمارے ساتھ موجود تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ

؎١ یہ حدیث شریف' البقرہ: ۱۹۵ کی تفسیر میں رقم: ۲۲۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

اعلان سُن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے والد نے مجھے میری سات بہنوں کی ذمہ داری دی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ میرے اور تمہارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ان عورتوں کو بغیر کسی مرد کے تنہا چھوڑ دیں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے میں اپنی جگہ تمہیں بھیج دوں اس لیے تم اپنی بہنوں کی ذمہ داری سنبھالو (اس وجہ سے میں جہاد میں شریک نہیں ہو سکا تھا)۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ بھی (ابوسفیان کی تلاش میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ کا مقصد دشمن کو صرف مرعوب اور خوف زدہ کرنا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ روانہ ہوئے تو کفار کو اس بات کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قوت ہے اور زخموں نے مسلمانوں کو کمزور نہیں کیا۔ یہ سوچ کر وہ لوگ واپس چلے گئے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر، حضرت عثمان و علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن الیمان سمیت ستر صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو لے کر روانہ ہوئے اور حمراء الاسد تک پہنچ گئے۔ ☆ حمراء الاسد مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

زیر بحث آیت (اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ) کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ:

(۱۵۸) انہوں نے عروہ سے کہا کہ اے میرے بھانجے! تمہارے باپ دادا یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تذکرہ فرمایا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو اُحد والے دن جب سخت تکلیف پہنچی اور مشرکین (میدانِ جنگ سے) چلے گئے تو آپ کو یہ خدشہ ہوا کہ کہیں مشرکین واپس نہ آ جائیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: کون مشرکین کا پیچھا کرے گا؟ یہ اعلان سُن کر ستر صحابہ تیار ہو گئے۔ اُن میں حضرت ابوبکر اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی شامل تھے۔[۱۱۸]

(راوی کہتے ہیں) کہ پھر حمراء الاسد کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے پاس سے معبد خزاعی کا گزر ہوا۔ قبیلہ خزاعہ کے مسلمان اور کافر سب تہامہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رازدارانہ تعلق رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان لوگوں کا معاہدہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے معاہدہ کے مطابق کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ معبد خزاعی اُن دنوں مشرک تھا۔ اُس نے عرض کی: یا محمد (ﷺ)! اللہ کی قسم! آپ اپنے صحابہ کے معاملہ میں جس تکلیف سے دوچار ہوئے ہیں وہ ہم پر بہت گراں گزری ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے اصحاب کے معاملہ میں تسلی عطا فرمائے۔ یہ کہہ کر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے چلا گیا اور جا کر مقام روحاء میں ابوسفیان اور دیگر کافروں سے ملاقات کی۔ یہ وہ موقع تھا کہ کفار متفقہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف دوبارہ آنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور (آپس میں) یہ بھی کہہ چکے تھے کہ محمد (ﷺ) کے جتنے بھی اصحاب اور کمانڈر جنگ میں شریک ہوئے تھے اُن میں سے اکثر کو ہم قتل کر چکے ہیں اور اب جو باقی بچ گئے ہیں اُن پر بھی ہم ضرور حملہ کریں گے اور اُن کا کام تمام کریں گے۔ ابوسفیان نے جب معبد خزاعی کو دیکھا تو پوچھا: اے معبد! پیچھے کیا حال ہے؟ معبد نے کہا کہ محمد (ﷺ) ایسا لشکر لے کر تم لوگوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں کہ اس جیسا لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تم لوگوں پر خوب جلے ہوئے ہیں اور اُن میں جو جنگ میں شریک نہیں تھے وہ بھی اس لشکر کے ساتھ ہو گئے ہیں اور اُنہیں جنگ میں

[۱۱۸] یہاں تک کی روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔ جبکہ روایت کا اگلا حصہ آخر تک دلائل النبوۃ میں مذکور ہے۔ یعنی امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں زیر بحث روایت کو مکمل ذکر کیا ہے۔

شریک نہ ہونے پر پشیمانی ہے۔ پورے لشکر میں اتنا شدید غصہ پھیلا ہوا ہے کہ اس جیسا غصہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ابوسفیان نے یہ باتیں سُن کر کہا: (اے معبد!) تیرے لیے ہلاکت ہو! تو کیا کہہ رہا ہے؟ معبد نے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہاں سے واپس جانے سے پہلے گھوڑوں کی پیشانیاں دیکھ لوگے۔ ابوسفیان نے کہا کہ خدا کی قسم! ہم نے تو متفقہ طور پر طے کرلیا ہے کہ دوبارہ حملہ کر کے باقی مسلمانوں کو بھی نیست و نابود کر دیں۔ معبد نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں اور اللہ کی قسم! مسلمانوں کا لشکر دیکھ کر مجھے اتنا جوش آ گیا کہ میں نے کچھ اشعار پڑھ ڈالے۔ ابوسفیان نے پوچھا: تم نے کیا اشعار کہے؟ معبد نے کہا کہ میں نے یہ اشعار پڑھے۔

کادت تهدّ من الاصوات راحلتی　　اذ سالت الارض بالجرد الابابیل

تردی باسد کرام لا تنابلة　　عند اللقاء ولا میل معازیل

فقلت ویل ابن حرب من لقائکم　　اذا تغطمطت البطحاء بالخیل

انی نذیر لاهل البسل ضاحیة　　لکل ذی اربة منهم ومعقول

من جیش احمد لا وخش قنابلهٗ　　ولیس یوصف ما أنذرت بالقیل

(۱) (افواج) کے شوروغل سے خوف زدہ ہوکر میری اونٹنی نیچے گرنے کے قریب ہوچکی تھی، جب زمین پر گروہ در گروہ گھوڑوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ (۲) یہ گھوڑے جنگ کے وقت اپنے اُن سواروں کو بہت تیزی سے لے جانے والے ہیں جو دراز قامت اور اصلی نسل کے شیروں کی طرح نہتے اور غیر مسلح نہیں ہیں۔ (۳) میں نے کہا کہ تم مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی صورت میں ابنِ حرب (یعنی ابوسفیان) کا بُرا ہوگا، یہ میں نے اُس وقت کہا جب بطحاء کی زمین اُن گروہوں کی وجہ سے ہلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ (۴) میں اہلِ قریش بلکہ ہر صاحبِ عقل اور ہوش مند آدمی کو محمد (ﷺ) کے اُس لشکر سے ڈرا رہا ہوں جو حقیر و قصیر لوگوں کا لشکر نہیں ہے۔ (۵) اور جس چیز سے میں ڈرا رہا ہوں اُسے صرف زبانی جمع خرچ نہ سمجھا جائے۔

راوی کہتے ہیں کہ مَعبد کی باتیں سُن کر ابوسفیان اور دیگر کفار واپس لوٹ گئے۔ اس دوران اُن کے پاس سے عبدالقیس کا ایک قافلہ گزرا۔ انہوں نے اس قافلہ سے پوچھا کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟ قافلہ والوں نے کہا کہ ہم غذائی اجناس کی غرض سے مدینہ جا رہے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا: کیا تم لوگ وہاں جا کر محمد (ﷺ) کو ہمارا ایک پیغام پہنچا دو گے؟ (اگر تم لوگوں نے ہمارا پیغام اُن تک پہنچا دیا تو) عکاظ کے بازار میں جب تم پہنچو گے تو میں تمہارے اونٹ کشمش سے لاد دوں گا۔ قافلہ والوں نے پیغام پہنچانے کی حامی بھرلی۔ ابوسفیان نے کہا کہ تم لوگ محمد (ﷺ) کے پاس جا کر ہمارے بارے میں اُنہیں یہ اطلاع دینا کہ ہم نے اُن کی طرف اور اُن کے اصحاب کی طرف دوبارہ آنے کا متفقہ فیصلہ کرلیا ہے تاکہ جو اصحاب باقی رہ گئے ہیں انہیں ہم ختم کر دیں۔ ابوسفیان قافلہ والوں کو یہ پیغام بتا کر مکہ روانہ ہوگیا۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ حمراء الاسد میں تھے کہ آپ کے پاس سے مذکورہ قافلہ کا گزر ہوا۔ قافلہ والوں نے رسول اللہ ﷺ کو ابوسفیان کا پیغام پہنچا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے پیغام سُن کر کہا: ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' (ہمیں اللہ (عزوجل) کی ذات کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تین دن مزید ٹھہر کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

(صحیح بخاری: ۴۰۷۷، صحیح مسلم: ۲۴۱۸، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۳ ص ۳۱۵)

غزوۂ بدر صغریٰ کا واقعہ اور ایک قول کے مطابق اس کے بارے میں زیرِ بحث آیت کا نزول

حضرت مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت غزوۂ بدر صغریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ غزوۂ بدر صغریٰ کی

تفصیل یہ ہے کہ اُحد والے دن ابوسفیان نے لوٹتے وقت کہا کہ اے محمد (ﷺ)! اگر آپ چاہیں تو آئندہ سال بدر میں میلہ لگنے کے موقع پر ہمارے اور آپ کے درمیان جنگ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ذالک بیننا وبینک انشاء اللہ'' (اگر اللہ نے چاہا تو ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوگی)۔ آئندہ سال جب وقتِ مقرر آیا تو ابوسفیان اہل مکہ کو لے کر مکہ سے روانہ ہوا اور مر الظہران کی جانب سے مجنہ میں آکر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں جب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رُعب ڈال دیا اور اس نے واپس لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔ نعیم بن مسعود اشجعی جو عمرہ کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا اس سے ابوسفیان نے ملاقات کی اور کہا کہ میں نے محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب سے اس سال بدر میں میلہ لگنے کے موقع پر جنگ کا وعدہ کیا ہوا تھا لیکن یہ سال تو قحط اور خشک سالی کا ہے۔ جبکہ ہمارے لیے وہ سال مناسب ہوتا ہے جس میں ہم جانوروں کو سبزہ چرائیں اور (ان جانوروں کا) دودھ پئیں۔ اب میرا موڈ بدر میں جانے کا نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ محمد (ﷺ) بدر میں پہنچ جائیں اور میں نہ پہنچوں! اس سے تو مسلمانوں کی جرأت اور ہمت اور بڑھ جائے گی۔ اور پھر میری جانب سے وعدہ خلافی ہو اس کی بہ نسبت مسلمانوں کا وعدہ خلافی کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ اس لیے تم مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو کسی طرح جنگ سے روکو۔ اور اُنہیں یہ بتاؤ کہ میرے پاس بہت بڑا لشکر ہے اور ہم سے لڑنے کی اُن میں طاقت نہیں ہے۔ اس کام کے انعام میں میرے پاس تمہارے لیے دس اونٹ ہیں جو میں سہیل بن عمرو کے پاس رکھوا دیتا ہوں وہ تجھے اُن اونٹوں کے دینے کا ضامن ہوگا۔ نعیم اشجعی یہ باتیں سُن کر سہیل بن عمرو کے پاس پہنچا اور اس سے کہا: اے ابو یزید! میں محمد (ﷺ) کے پاس جا کر اُنہیں بدر میں جانے سے روک دوں اس کے بدلہ میں تم مجھے اونٹنیاں دینے کی ضمانت دیتے ہو؟ سہیل نے ضمانت لینے کی ہامی بھر لی۔ نعیم اشجعی وہاں سے نکل کر مدینہ پہنچا۔ مدینہ میں اُس نے صحابہ کو دیکھا کہ وہ ابوسفیان کے وعدہ پر عمل درآمد کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اُس نے صحابہ سے پوچھا کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ ہم نے اور ابوسفیان نے بدر میں معرکہ آرائی کا وعدہ کیا ہوا ہے اُس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اُس نے کہا کہ تم لوگوں نے بہت ہی غلط رائے اپنائی ہے۔ اُن لوگوں نے تمہارے گھر اور مرکز میں آکر تم سے لڑائی کی تو سوائے بھاگنے والوں کے انہوں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ اب تم خود باہر نکل کر اُن کے پاس جانا چاہ رہے ہو؟ جبکہ وہ لوگ مقام بدر میں جمع ہو چکے ہیں۔ خدا کی قسم! تم میں سے کوئی بچ کر نہیں آئے گا۔ اس کی یہ باتیں سُن کر صحابہ کرام کو جنگ میں جانے سے ناگواری ہونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! مجھے اگر تنہا جانا پڑے تب بھی میں ضرور جاؤں گا۔ صحابہ کرام کا معاملہ یہ تھا کہ ان میں جو کمزور دل تھے انہوں نے تیاری چھوڑ دی اور مضبوط دل والے ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل'' (ہمیں اللہ عزوجل کی ذات کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) کہہ کر جنگ کے لیے بالکل تیار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو لے کر بدر میں پہنچے۔ بدر کی طرف جاتے ہوئے جن مشرکین سے ملاقات ہوئی اُن سے قریش کے بارے میں پوچھتے تو وہ صحابہ کرام کو ڈرانے کے لیے اور مرعوب کرنے کے لیے بتاتے کہ انہوں نے تمہارے لیے لشکر جمع کر لیا ہے۔ صحابہ کرام کہتے کہ: ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل'' (ہمیں اللہ عزوجل کی ذات کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)۔ (زمانۂ جاہلیت میں بدر کے مقام پر بازار لگتا تھا' لوگ اس میں ہر سال آٹھ دنوں تک جمع ہو کر تجارت کرتے تھے) رسول اللہ ﷺ بدر میں پہنچ کر ابوسفیان کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ مجنہ سے ہی مکہ واپس چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی کسی مشرک سے بدر میں ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن موقع چونکہ بازار لگنے کا تھا اور صحابہ کرام ساتھ میں اسبابِ تجارت لیے ہوئے تھے اس لیے سب نے خوب تجارت کی اور چیزوں پر ایک کی بجائے دو دو درہم وصول کیے۔ اور بالآخر عافیت وسلامتی کے ساتھ خوب منافع کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے

فرمایا: ''اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (الی اٰخر الاٰیۃ)''۔ (تفسیر ابن جریر للطبری زیر بحث آیت، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۳ ص ۳۸۳)

زیر بحث آیت کی مختصر تفسیر

﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ عزّ وجلّ کی دعوت پر لبیک کہا اور تمام احکامات میں اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کی۔ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ باوجود اس کے کہ اُنہیں زخموں کا درد اور تکلیف تھی۔ ﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ اُن میں سے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر کے نیکی کی اور اُن کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہا اور اُن کی نافرمانی اور ساتھ چھوڑنے سے ڈرے اُن کے لیے اجرِ عظیم یعنی بہت زیادہ ثواب ہے۔ مُراد اس سے جنت ہے۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ﴿۱۷۳﴾

(یہ) وہ لوگ ہیں کہ (جب) انہیں لوگوں نے کہا کہ ''بلاشبہ کافروں نے تمہارے لیے (بڑا سامان اور لشکر) جمع کر دیا ہے اس لیے تم ان سے ڈرو'' تو اس (دھمکی) نے ان کے ایمان کو اور پختہ کر دیا اور انہوں نے کہا کہ اللہ کی ذات ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے O

آیت مذکورہ کا گذشتہ آیت سے تعلق اور اس میں پہلے ''النّاس'' کے متعلق مفسرین کے اقوال

یہ آیت گذشتہ آیت سے منسلک ہے۔ کیونکہ اس میں ﴿اَلَّذِیْنَ﴾ سے وہی لوگ مراد ہیں جن کا تذکرہ گذشتہ آیت میں ہو چکا ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا۔

﴿النَّاسُ﴾ (یعنی جنہوں نے مسلمانوں کو کافروں کے لشکر سے ڈرانے کی کوشش کی اُن) سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے نعیم بن مسعود الاشجعی مراد ہے۔ اس صورت میں ''النّاس'' کا لفظ عام ہوگا لیکن مراد اس سے فردِ خاص ہوگا۔ یہاں اگر یہ سوال ہو کہ ایک شخص کے لیے ''النّاس'' کا لفظ کیوں لایا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص جب کوئی کام کرے یا کوئی بات کہے اور دوسرا شخص اس سے راضی ہو تو ایسے فعل یا قول کو پوری جماعت کی طرف نسبت دینا کلام میں حُسن کا باعث ہوتا ہے۔ اگرچہ اُس فعل کا کرنے والا یا قول کا کہنے والا ایک ہی شخص ہو۔ اس کی مثال جیسے قاتل کے ایک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا'' (جب تم لوگوں نے ایک شخص کو قتل کیا)۔ (البقرہ: ۷۲)

(۲) ''النّاس'' کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے عبد القیس کا قافلہ مراد ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور محمد بن اسحٰق کا قول ہے۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ ''النّاس'' سے منافقین مراد ہیں (یعنی انہوں نے مسلمانوں کو کافروں کے لشکر سے ڈرانے کی کوشش کی تھی) کیونکہ انہوں نے جب نبی اکرم ﷺ کو ابوسفیان کے وعدہ پر عمل کرنے کے لیے تیاری کرتے دیکھا تو انہوں نے صحابہ کرام کو جنگ کے لیے نکلنے سے منع کیا اور کہا کہ قریش تمہارے گھر میں آ کر تم میں سے اکثر کو قتل کر چکے ہیں۔ اب اگر تم لوگ یہاں سے نکل کر اُن سے لڑنے کے لیے گئے تو تم میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔

آگے جو دوسرا ﴿النَّاسَ﴾ ہے (یعنی جن لوگوں نے لشکر جمع کر رکھا ہے) اُن سے ابوسفیان اور اس کے ساتھ کے دیگر

مشرک سردار مراد ہیں۔ ﴿قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مشرکین نے بہت زیادہ لشکر جمع کر رکھا ہے۔ یہاں ''جمعوا'' کے لفظ سے لشکر کشی اس لیے مراد لی کہ اہلِ عرب لشکر کو ''جَمْعٌ'' کہتے ہیں اور اس کی جمع ''جُمُوْعٌ'' لاتے ہیں۔ ﴿فَاخْشَوْهُمْ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ (مشورہ دینے والوں نے مسلمانوں سے کہا کہ) تم لوگ کافروں کے جمع کردہ لشکر سے ڈرو اور اُن سے اپنا بچاؤ کرو' کیونکہ تمہارے اندر اُن سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس تخویف (دھمکی) نے مسلمانوں کے ایمان ویقین' دینی پختگی اور نبی اکرم ﷺ کی تائید وحمایت پر ثابت قدمی کو مزید بڑھا دیا۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح لفظوں میں ایمان کے بڑھنے کا ذکر فرمایا ہے اس لیے یہ جملہ اُن علماء کی دلیل ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے۔[۱۱۹]

''حسبنا الله ونعم الوكيل'' کی تفسیر

﴿وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے کہا: ہمیں اللہ (عزوجل) کی ذات اُن لوگوں کے معاملہ میں کافی ہے جو ہمیں ڈرانے والے ہیں۔ یہاں ''حَسْب'' کا ترجمہ کافی ہونے سے کیا گیا ہے اس کی مثال امرء القیس کے ایک شعر کا یہ مصرعہ ہے: ''وحسبک من غنی شبع وری'' یعنی تمہیں غنی ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ تمہارا پیٹ بھرا ہوا ہو اور تم سیراب ہو۔

﴿وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہی بہترین ذات ہے جسے تمام کام سپرد کیے جائیں۔ بعض کے نزدیک ''وکیل'' بمعنیٰ کافی ہے اس صورت میں ''حسبنا الله ونعم الوكيل'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہمیں اللہ کی ذات کافی ہے اور وہ بہترین کافی ہونے والی ذات ہے۔ بعض کے نزدیک ''وکیل'' بمعنیٰ کفیل ہے۔ چنانچہ وکیلِ مال اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی آدمی کے مال کو اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں لفظ ''وکیل'' سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کا رزق اور اُن کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں ہیں اور وہی تمام معاملات کو تنہا سنبھالے ہوئے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما زیر بحث آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

(۱۵۹) ''حسبنا الله ونعم الوكيل'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت کہا جب اُنہیں آگ میں ڈالا گیا اور محمد مصطفیٰ ﷺ نے اُس وقت کہا جب لوگوں نے مسلمانوں کو (ڈرانے کے لیے) کہا کہ کافروں نے تمہارے لیے لشکر جمع کر لیا ہے۔ (صحیح بخاری: ۴۵۶۳' المستدرک ج ۲ ص ۲۹۸' الدرالمنثور ج ۲ ص ۱۰۳)

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

(ان کے عزم اور توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) وہ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ (اس شان سے) واپس آئے کہ اُنہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور انہوں نے اللہ کی رضا کے مطابق کام کیا اور اللہ بڑے فضل والا ہے O

غزوۂ بدر صغریٰ سے مسلمانوں کی کامیاب واپسی

﴿فَانْقَلَبُوْا﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ مسلمان اپنے گھروں سے نکلنے کے بعد واپس لوٹ کر آئے۔ چونکہ ''انقلبوا'' کے لفظ سے نکلنا ثابت ہوتا ہے اس لیے یہاں نکلنے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ معنیٰ یہ ہے کہ مسلمان گھروں سے نکلے پھر پلٹ کر آئے۔ ﴿بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ

[۱۱۹] ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل اِسی جلد میں سورۃ البقرہ: ۳ کی تفسیر کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

﴿وَفَضْلٍ﴾ میں ''نعمت'' سے مراد یہ ہے کہ عافیت کے ساتھ واپس آئے اور دشمن کا سامنا نہیں ہوا۔ اور فضل سے مراد یہ ہے کہ بدر کے بازار میں تجارت کر کے جو منافع کمایا وہ لے کر لوٹے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ نعمت سے دنیاوی نفع مراد ہے اور فضل سے آخرت کا اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوٓءٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ قتل یا زخم کی کسی تکلیف اور پریشانی کا شکار نہیں ہوئے۔

﴿وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں رہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کی: کیا یہ بھی غزوہ (اور جنگ) کہلائے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو غزوہ کا ثواب عطا فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محض میدان کی طرف نکلنے سے اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا۔

﴿وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيْمٍ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو میدان کی طرف نکلنے کی توفیق عطا فرما کر اُن پر فضل فرمایا۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر اس طرح فضل فرمایا کہ مشرکین کے دلوں میں اُن کا رعب ڈال دیا حتیٰ کہ وہ مکہ واپس چلے گئے۔

إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

وہ تو شیطان ہے جو اپنے چیلوں کے ذریعہ (تمہیں) دھمکاتا ہے، اس لیے تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ میرا خوف رکھو اگر تم صاحبانِ ایمان ہو O

شیطان کی سازشوں پر تنبیہ اور خوفِ خدا کی ترغیب

﴿إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهٗ﴾ یعنی خوف دلانے والا اور جنگ سے روکنے والا شیطان ہے جو کہ وسوسہ کے ذریعہ دھمکاتا ہے۔ دھمکانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے چیلوں کے منہ میں وسوسہ کی باتیں ڈال دیتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کافروں سے ڈرائیں، دھمکائیں اور اُنہیں بزدل بنائیں۔

اس آیت میں ﴿أَوْلِيَآءَهٗ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے گروہِ مسلمین! شیطان اپنے دوستوں کے ذریعہ تمہیں ڈراتا ہے۔ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ شیطان اپنے دوستوں کی ہیبت تمہارے دلوں میں طاری کرتا ہے تاکہ تم اُن سے ڈر جاؤ۔ بعض نے یہ معنیٰ کیا ہے کہ شیطان اپنے منافق دوستوں کو خوف زدہ کرتا ہے تاکہ وہ مشرکین کے خلاف جہاد کرنے میں شریک نہ ہوں۔

☆ ''اولیاء شیطان'' اُن کفار و منافقین کو کہا جاتا ہے جو شیطان کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور اس کے حکم کو ترجیح دیتے ہیں۔ جبکہ ''اولیاء اللہ'' اُن صاحبانِ ایمان کو کہا جاتا ہے جو نہ شیطان کے ڈرانے سے ڈرتے ہیں اور نہ اس کے حکم پر سر جھکاتے ہیں۔

﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم شیطان کے دوستوں سے نہ ڈرو، نہ کافروں کے خلاف جہاد سے پیچھے رہو نہ اُن کے مقابلہ میں بزدلی دکھاؤ۔ ﴿وَخَافُوْنِ﴾ یعنی میرے رسول کے ساتھ میری راہ میں جہاد کرتے رہو۔ بلاشبہ میں تمہاری حمایت اور مدد کرنے والا ہوں۔ ﴿إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اگر تم میرے اس وعدہ کو سچ سمجھو کہ تمہاری مدد اور کامیابی میرے ذمہ ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اور آپ اُن لوگوں سے غمزدہ نہ ہوں جو تیزی سے کفر میں داخل ہو رہے ہیں، بلاشبہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اللہ چاہتا

ہے کہ آخرت (کی نعمتوں) میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے اور اُن کے لیے بڑا عذاب ہےO

کفر میں تیزی سے داخل ہونے والوں سے کون مراد ہیں؟

﴿ وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ ﴾ (آپ اُن لوگوں سے غمزدہ نہ ہوں جو کفر میں تیزی سے داخل ہو رہے ہیں۔) کفر میں تیزی سے داخل ہونے والوں سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے کفارِ قریش مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے منافقین اور سردارانِ یہود مراد ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے اسلام سے منحرف ہونے والے (یعنی مرتد) مراد ہیں۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) جو لوگ تیزی سے کفر میں داخل ہو رہے ہیں اور آپ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے لشکر جمع کر رہے ہیں اُن سے آپ غمزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ تیزی سے کفر میں داخل ہونے سے مراد ہے: نبی اکرم ﷺ کے خلاف کافروں کا ساتھ دینا۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (اے محبوب ﷺ!) جو لوگ تیزی سے کفر کی حمایت کی طرف جا رہے ہیں اُن کی اس حمایتِ کفر سے آپ غمزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ آپ کو اُن پر فتح و نصرت حاصل ہے۔

کفر میں تیزی کرنے والوں کے لیے نقصان

﴿ اِنَّھُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْــٴًـا ﴾ (بلاشبہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔) یعنی جس طرح تیزی سے وہ کفر کی طرف جا رہے ہیں اس سے وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ بعض نے اس جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ یہ لوگ اللہ والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

﴿ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں اُن کے لیے کوئی حصہ نہ رکھے۔) آخرت میں حصہ نہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اُن کے لیے آخرت کے اجر و ثواب میں حصہ نہ رکھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بے مدد چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تیزی سے کفر کی طرف چلے گئے۔ ﴿ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُن کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

☆ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خیر اور شر دونوں کا وجود اللہ عزوجل کے ارادہ سے ہے۔ اس میں قدریہ (منکرینِ تقدیر) اور معتزلہ کا رد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْــٴًـا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۷﴾

بے شک جن لوگوں نے ایمان کے بدلہ میں کفر خرید لیا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اُن ہی کے لیے دردناک عذاب تیار ہےO

ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کرنے والوں کی ہلاکت

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ ﴾ (بے شک جن لوگوں نے ایمان کے بدلہ میں کفر خرید لیا) اس سے وہ منافقین مراد ہیں جو ایمان لا کر پھر کفر کی طرف چلے گئے۔ جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایمان کے بدلہ کفر کو اختیار کر لیا۔ گویا جس طرح خریدار بیچنے والے کو کوئی چیز دے کر اس کے بدلہ میں دوسری چیز لیتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے ایمان دے کر کفر لے لیا۔

﴿ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ ﴾ (یہ لوگ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے) یعنی ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کر کے اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے بلکہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ ﴿ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ (اُن کے لیے دردناک عذاب ہے) یعنی آخرت میں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

اور کافر لوگ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ ہم اُنہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ اُن کے حق میں بہتر ہے' ہم جو اُنہیں ڈھیل دیئے ہوئے ہیں اس کا انجام یہ ہے کہ وہ مزید گناہ کر لیں اور اُن کے لیے توہین آمیز عذاب ہےO

آیت مذکورہ میں ''لا یحسبنّ'' کی دو قراٰتوں کا بیان اور آیت مبارکہ کی تفسیر

اس آیت میں ﴿ لَا يَحْسَبَنَّ ﴾ کو تاء اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تاء والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ اے محمد (ﷺ)! آپ ہرگز یہ گمان نہ فرمائیں کہ ہمارا کفار کو مہلت دینا اُن کے حق میں بہتر ہے۔ اور یاء والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ کفار ہرگز اس گمان میں نہ رہیں کہ ہمارا اُنہیں مہلت دینا اُن کے حق میں بہتر ہے۔ یہ آیت کن کافروں کے متعلق نازل ہوئی؟ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی اور ایک قول یہ ہے کہ بنوقُریظہ اور بنونضیر کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں جو ﴿ نُمْلِيْ ﴾ کا لفظ ہے یہ ''اِمْلَاءٌ'' سے ہے اور ''امــلاء'' کا معنیٰ ہے: مہلت دینا اور مؤخر کرنا۔ بنیادی طور پر یہ لفظ ''مَلْـوَاَةٌ''[۱۲۰] سے ہے بمعنیٰ زمانہ کی ایک مدت۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ کافر لوگ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ ہم نے طویل عمر دے کر اور موت کو مؤخر کر کے اُنہیں جو ڈھیل دے رکھی ہے وہ اُن کے حق میں بہتر ہے۔

﴿ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾ ہم نے تو اُنہیں جو مہلت دی ہوئی ہے اور اُن کی موت کو مؤخر کیا ہوا ہے وہ صرف اس لیے ہے تاکہ وہ زیادہ گناہ کر لیں۔ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ (اُن کے لیے توہین آمیز عذاب ہے) یعنی آخرت میں۔

آیت مبارکہ کی تفسیر میں اس بات کی ترغیب کہ زندگی کو اچھے اعمال میں صرف کیا جائے

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اُن کے والد (حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بیان کیا کہ:

(۱۶۰) رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں کون سا شخص سب سے بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جس کی عمر طویل ہو اور اعمال اچھے ہوں۔ پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے بُرا کون ہے؟ فرمایا: جس کی عمر طویل ہو اور اعمال خراب ہوں۔

(معالم التنزیل للبغوی' زیر بحث آیت' سنن ترمذی: ۲۳۳۰' مسند احمد ج ۵ ص ۴۹' المستدرک ج ۱ ص ۳۳۹' سنن دارمی: ۲۷۴۲' مشکوٰۃ: ۵۲۸۵۔ ص ۴۵۰)

امام ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۱ھ) نے اپنی سند کے ساتھ حضرت اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کوئی بھی شخص خواہ نیک ہو یا بد اُس کے لیے موت بہتر ہے[۱۲۱] پھر انہوں نے یہ دو

---

[۱۲۰] عربی لغات میں مَـلَاوَۃ اور مَلْوَاۃ کے الفاظ موجود ہیں۔ البتہ ہمزہ کے ساتھ (مَلْوَاَۃ) مجھے نہیں مل سکا۔

[۱۲۱] حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مراد یہ ہے کہ نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے مسلمان اور کافر دونوں کے لیے موت بہتر ہے۔ مسلمان کے لیے اس طرح کہ اُس کے ایمان کے نتیجہ میں مابعد الموت کی نعمتیں اُس کے لیے زیادہ بہتر ہیں' جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلاوت کردہ پہلی آیت سے واضح ہے اور کافر کے لیے اس طرح کہ اُس کی موت اُس کے کفر و سرکشی میں اضافہ کو روکنے کا باعث ہوگی جیسا کہ دوسری آیت مبارکہ سے واضح ہے۔ اس لیے کسی بھی شخص کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے موت بہ نسبت زندگی کے بہتر ہے۔ لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ موت کی تمنا اور آرزو کی جائے۔ کیونکہ موت کی تمنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہاں استقامت اور ہدایت کی دُعا کرتے رہنا چاہیے۔

آیتیں پڑھیں:

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ. (آل عمران:١٧٨)

اور کافر لوگ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ ہم اُنہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ اُن کے حق میں بہتر ہے' ہم جو اُنہیں ڈھیل دیے ہوئے ہیں اس کا انجام یہ ہے کہ وہ مزید گناہ کرلیں۔

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ. (آل عمران:١٩٨)

یہ (جنتیں) اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

(جامع البیان للطبری' زیر بحث آیت)

علامہ ابن الانباری فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت (وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ) اُن لوگوں کے بارے میں نازل فرمائی ہے جو حق سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ازل سے اُن کے بارے میں علم ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لیے فرمایا: ''اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا'' یعنی ہم اُنہیں صرف اس لیے ڈھیل دیے ہوئے ہیں تاکہ وہ حق سے دشمنی اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر کے مزید گناہ کرلیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

(١٦١) جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (کسی بندے کو) گناہوں کے باوجود نواز رہا ہے تو (سمجھ لو کہ) یہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ استدراج ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت (ولا یحسبن الذین کفروا) تلاوت فرمائی۔[١٢٢]

(مسند احمد ج ٤ص ١٤٥' مشکوٰۃ المصابیح: ٥٢٠١ـ ص ٤٤٣)

امام زجاج فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت میں جن کافروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ عزوجل نے اپنے محبوب ﷺ کو بتادیا تھا کہ یہ لوگ کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور ان کی منافقت انہیں مزید کفر اور گناہ کی طرف لے جائے گی۔

☆ زیر بحث آیت مبارکہ فرقہ قدریہ کے خلاف کُھلی دلیل ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ بعض لوگوں کو جو طویل عمر اور مہلت دیتا ہے وہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ اُن کے کفر و گناہ اور گمراہی میں مزید اضافہ ہو۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٩﴾

اللہ کی یہ شان نہیں کہ اہل ایمان کو اس حال پر رہنے دے جس پر کہ تم ہو' یہاں تک کہ وہ گندے کو ستھرے سے علیحدہ کر

١٢٢ استدراج سے مراد ہے: ڈھیل دینا' مہلت دینا اور بُرے انجام کی طرف لے جانا۔ حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ گناہوں کے باوجود نعمتوں اور رحمتوں کی کثرت سے آدمی کو خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کو اللہ عزوجل کی ناراضگی اور اُس کی طرف سے ڈھیل سمجھنا چاہیے۔ اس حدیث شریف کے اختتام پر جس آیت مبارکہ کی طرف علامہ خازن نے اشارہ فرمایا ہے وہ مسند احمد اور مشکوٰۃ المصابیح میں نہیں ہے۔ بلکہ وہاں سورۃ الانعام کی آیت: ٤٤ مذکور ہے۔ خود علامہ خازن نے الانعام: ٤٤ کی تفسیر میں اس حدیث کو دوبارہ ذکر کیا ہے اور وہاں کتب حدیث کے مطابق الانعام: ٤٤ کو ذکر کیا ہے۔

دے اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تم (عام لوگوں) کو غیب کی باتیں بتائے' ہاں (اس کے لیے) اللہ جنہیں چاہتا ہے منتخب فرمالیتا ہے' یعنی اپنے پیغمبر' سو تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو اور اگر تم ایمان اور تقویٰ پر (برقرار) رہے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہوگا O

آیت مذکورہ کے واقعۂ نزول میں مفسرین کے اقوال اور رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کا بیان

یہ آیتِ مبارکہ کب اور کیوں نازل ہوئی؟ اس کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) کلبی کا قول یہ ہے کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی مخالفت کرنے والا جہنمی ہے اور اللہ اس سے ناراض ہے اور جو آپ کا پیروکار اور آپ کے دین پر چلنے والا ہے وہ جنتی ہے اور اللہ اُس سے راضی ہے۔ (اگر ایسا ہی ہے) تو ہمیں بتائیں کہ کون آپ پر ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان نہیں رکھتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

(۲) سُدّی کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ:

(١٦٢) میری اُمت مٹی کی شکل میں مجھ پر پیش کی گئی جیسے حضرت آدم علیہ السلام پر پیش کی گئی تھی۔ اور مجھے اس میں بتا دیا گیا کہ کون مجھ پر ایمان لائے گا اور کون میرا انکار کرے گا۔ منافقین تک جب یہ بات پہنچی تو مذاق اُڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں ان میں سے کون اُن پر ایمان لائے گا اور کون اُن کا انکار کرے گا اُن سب کا اُنہیں علم حاصل ہے۔ حالانکہ ہم لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ ہمیں نہیں پہچانتے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پہنچ گئی۔ آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی' پھر فرمایا:

ما بال اقوام طعنوا في علمي لا تسألوني عن شيئي فيما بينكم وبين السّاعة الا نبأتكم به.

اُن لوگوں کی کیا حالت ہوگی جو میرے علم پہ طعنہ کرتے ہیں۔ اِس وقت سے لے کر قیامت تک کی جو بات بھی تم مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں بتا دوں گا۔

یہ سُن کر حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوگئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میرے والد کون ہیں؟ فرمایا: حذافہ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہوکر عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! ہم اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ اللہ عزوجل پروردگار ہے' اسلام دین ہے' قرآن امام ہے اور آپ نبی ہیں۔ آپ ہمیں معاف فرما دیجئے اللہ عزوجل آپ کے درجات بلند فرمائے۔[۱۲۳] نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ باز آ گئے' کیا تم لوگ باز آ گئے؟ پھر آپ منبر سے نیچے تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔[۱۲۴] (معالم التنزیل للبغوی زیر بحث آیت)

۱۲۳ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: "فاعف عنا عفاک الله ". اس کا لفظی ترجمہ ہے: آپ ہم سے درگزر فرمائیے' اللہ عزوجل آپ سے درگزر فرمائے۔ یہ ترجمہ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ تفسیر مظہری اُردو (ج ۲ ص ۲۱۰' مطبوعہ ضیاء القرآن) میں اس کا بہت عمدہ اور بہترین ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اسی کے مطابق ہے۔

۱۲۴ تفسیر بغوی کے محقق و مخرج عبدالرزاق المہدی نے لکھا ہے کہ یہ روایت اس شانِ نزول اور پس منظر کے ساتھ بہت ضعیف ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ علیحدہ اور مستقل روایت کے ساتھ صحیح بخاری (۷۲۹۴) صحیح مسلم (۲۳۵۹) اور مسند احمد (ج ۳ ص ۱۶۲) میں موجود ہے۔ (تفسیر بغوی' زیر بحث آیت) ہم یہ کہتے ہیں کہ زیر بحث آیت کے نزول کے لیے مذکورہ واقعہ کو پس منظر قرار دینا باعتبار سند ضعیف ہوسکتا ہے' لیکن بذاتِ خود اس واقعہ کو ضعیف قرار دینا دشوار ہے۔ کیونکہ اس واقعہ میں بنیادی طور پر دو باتیں مذکور ہیں۔ ایک منافقین کا نبی اکرم ﷺ کے خداداد علم و عظمت پر طعن و تشنیع اور دوسرا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۳) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے یہ درخواست کی تھی کہ ایسی آیت نازل ہو جس سے مؤمن اور کفر کے درمیان ہم فرق کر سکیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

(۴) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ منافقوں کی ایک جماعت نے اپنے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ جیسا ایمان مسلمان رکھتے ہیں ہم بھی اُسی طرح کا ایمان رکھتے ہیں۔ اُحد والے دن اللہ تعالیٰ نے اُن کی منافقت کا پردہ چاک کر دیا اور مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کے پہلے جملہ کی تفسیر اور اس کے مخاطبین کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (اللہ کی یہ شان نہیں کہ اہل ایمان کو اس حال پر رہنے دے جس پر کہ تم ہو یہاں تک وہ خبیث کو طیّب سے علیحدہ کر دے۔) اس جملہ کی تفسیر اور اس کے حکم میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس میں خطاب کفار اور منافقین سے ہے۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ اے گروہِ کفار و منافقین! اللہ کی یہ شان نہیں کہ جس حالتِ کفر و نفاق پر تم قائم ہو اس پر مسلمانوں کو چھوڑے رکھے۔ حتیٰ کہ خبیث کو طیّب سے (یعنی گندے کو ستھرے سے) علیحدہ کر دے۔

(۲) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ مذکورہ جملہ میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔ اور مفہوم آیت یہ ہے کہ اے گروہِ مسلمین! اللہ کی یہ شان نہیں کہ اِس وقت تم جس حالت پر ہو یعنی مسلمان اور منافقین کا ایک ساتھ رہنا' اس پر تمہیں قائم رکھے۔ حتیٰ کہ خبیث کو طیّب سے یعنی منافق کو خالص مسلمان سے علیحدہ کر دے۔ چنانچہ اُحد والے دن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منافقوں سے ممتاز کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کھل کر سامنے آ گئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اُحد والے دِن مسلمانوں اور منافقوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز کیا گیا کہ سب پر خوف و ہراس اور قتل و شکست مسلّط کر دی گئی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو صاحبانِ ایمان تھے وہ اپنے ایمان و یقین پر قائم رہے اور اُن کے پائے استقامت میں ذرا تزلزل بھی نہیں آیا۔ جبکہ منافقین اپنی منافقت اور کفر کے ساتھ کھل کر سامنے آ گئے۔

(۳) زیر بحث جملہ کا معنیٰ و مفہوم بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ (اللہ کی یہ شان نہیں کہ اہل ایمان کو اس حال پر رہنے دے جس پر کہ تم ہو) حتیٰ کہ مسلمانوں کو منافقین و کفار سے جہاد اور ہجرت کے ذریعہ ممتاز کر دے۔

(۴) بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ مسلمانوں کو مشرک مردوں کی پُشت اور مشرک عورتوں کے رحم میں رہنے دے۔ یعنی (اے مشرکو!) تمہاری اولاد میں سے جن کا مسلمان ہونا مقدر ہو چکا ہے اُن کو اللہ تعالیٰ اُسی حالتِ شرک پر رکھے جس پر تم قائم ہو' یہ اللہ کی شان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ خبیث کو طیّب سے علیحدہ کر دے۔ یعنی تمہاری پُشت اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) نبی اکرم ﷺ کا علم غیب اور یہ دونوں باتیں مسلّم الثبوت اور ناقابل انکار ہیں۔ کیونکہ دیگر دلائل سے منافقین کی طعنہ زنی اور اعتراضات بھی ثابت ہیں اور نبی اکرم ﷺ کا علم غیب بھی ثابت ہے' جیسا کہ خود زیر بحث روایت میں حضرت عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ اس کی روشن دلیل ہے۔ لہٰذا زیر بحث واقعہ پر خارجی دلائل و شواہد کی رُو سے کوئی اعتراض اور تردّد نہیں ہونا چاہیے۔ (نبی اکرم ﷺ کے علم غیب کے ثبوت میں باحوالہ اور مفصّل بحث کے لیے تفسیر تبیان القرآن ج ۲ ص ۴۸۱ تا ۴۸۴ اور ج ۴ ص ۴۴۷ تا ۴۸۶ ملاحظہ فرمایئے۔)

تمہاری عورتوں کے رحم میں جو مسلمان ہیں اُن کو تم سے جُدا کر دے اس طور پر کہ مسلمانوں کے لیے جنت کو مقدر فرما دے اور مشرکین و کفار اور منافقین کے لیے دوزخ کو مقدر فرما دے۔

آیت مذکورہ کے دوسرے جملہ کی تفسیر اور اس کے مخاطبین کا بیان

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ ﴾ (اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تم لوگوں کو غیب کی باتیں بتائے۔) اس جملہ میں خطاب قریش کے اُن کافروں سے ہے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ اے محمد (ﷺ)! جو لوگ آپ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو ایمان نہیں رکھتے اُن کے بارے میں ہمیں بتایئے وہ کون لوگ ہیں۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ اے کافرو! اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہارے لیے مؤمن اور کافر کا فرق بیان کرے اور یوں فرمائے کہ فلاں شخص مسلمان ہے اور فلاں کافر یا منافق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ ہے کہ وہ (پیغمبروں کے سوا) لوگوں میں سے کسی کو بھی غیب کی خبر نہیں دیتا۔ اس لیے کسی بھی شخص کے مسلمان، کافر اور منافق ہونے کی پہچان اُسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ ابتلاء و آزمائش اور آفات و مصائب کا شکار ہو۔ اس صورت میں جو مخلص مسلمان ہو گا وہ اپنے ایمان پر ثابت قدمی سے نمایاں ہو جائے گا اور جو منافق ہو گا وہ پھسل جائے گا۔

بعض مفسرین نے زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کی یہ شان نہیں کہ محمد (ﷺ) کو غیب پر مطلع کرے اور اس کے نتیجہ میں وہ تمہیں یہ بتائیں کہ مسلمان کون ہے اور کافر کون؟ ۔

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب فرما لیتا ہے اور اُسے اپنے غیب کی جو باتیں چاہتا ہے بتا دیتا ہے۔

﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ﴾ (لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔) یعنی جب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے برحق ہونے پر دلائل قائم ہو چکے ہیں تو اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آیا جائے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے فقط ایک رسول پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ''رُسُلِهٖ'' کو جمع لا کر (تمام) رسولوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ جملہ (وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ) میں بھی ''مـن رسلـه'' (بہ صیغۂ جمع) فرمایا گیا ہے اس لیے یہاں بھی ''مـن رسلـه'' فرمایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی جب تمام رسولوں کی رسالت کا اقرار کرے گا تو ایک رسول کی رسالت پر ایمان لانا بھی اسی میں داخل ہو گا۔ اور ایمان والوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

﴿ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ (اگر تم تقویٰ اور ایمان پر قائم رہے تو تمہارے لیے بڑا اجر ہو گا۔) یعنی جس کو میں نے رسالت عطا کر کے اپنا منتخب بنایا ہے اور اپنے غیب میں سے جو چاہا میں نے اُسے بتا دیا ہے اور تم میں کون منافق ہے اور کون سچا مؤمن، اس کا علم بھی اُسے عطا کر دیا ہے اُس کی اگر تم تصدیق کرو گے اور جن باتوں کو وہ تمہیں حکم دے اور جن سے منع کرے اُن میں تم اپنے رب تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے (یعنی اُن باتوں پر عمل پیرا رہو گے) تو تمہارے اس ایمان و یقین کی وجہ سے تمہارے لیے ''اجر عظیم'' ہو گا۔ اجر عظیم سے مراد ہے: بڑا ثواب اور وہ جنت ہے۔

ـــــــــــ

ـــــ یہ قول قطعاً غلط اور باطل ہے۔ کیونکہ آیت کے اگلے جملہ میں تمام رسولوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اُنہیں اللہ تعالیٰ (غیب کا علم عطا فرمانے کے لیے) منتخب فرما لیتا ہے۔ (مزید وضاحت کے لیے دو صفحات پیچھے حدیث: ۱۶۲۱ اور اس کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں!)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

جو لوگ اُن چیزوں میں بخل کرتے ہیں جو اُنہیں اللہ نے اپنے فضل سے دی ہیں وہ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ وہ (بخل) اُن کے حق میں بہتر ہے' بلکہ وہ اُن کے لیے بُرا ہے' جس (مال) میں وہ بخل کرتے تھے اُس کو قیامت کے دن اُن کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا' اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے اور اللہ اُن کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اس کے ضمن میں بخل کی مذمت

﴿ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بخل کرنے والے بخل کو اپنے لیے بہتر نہ سمجھیں۔ ﴿ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ﴾ بلکہ وہ یعنی بخل اُن کے لیے بُرا ہے۔ بخل سے مراد یہ ہے کہ جمع کردہ مال و دولت کو جس جگہ خرچ کرنے سے روکنا نہیں چاہیے اُس جگہ سے روک دینا۔ اور بخیل اُس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ بخل اور کنجوسی کرتا ہو۔ زیرِ بحث آیت سے بخل کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں درج ذیل احادیث سے بھی بخل کی مذمت ثابت ہوتی ہے:

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن[۱۲۵] العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱٦۳) رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''شُح'' (یعنی قلبی لالچ) سے بچو۔ کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی قلبی لالچ کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ اُنہیں اس (قلبی لالچ) نے بخل (یعنی کنجوسی) کا حکم دیا تو وہ لوگ کنجوس ہو گئے اور اُنہیں گناہ کرنے کا حکم دیا تو وہ گناہ میں مبتلا ہو گئے۔

(سنن ابوداؤد: ۱٦۹۸' مسند احمد ج ۲ ص ۱۹۱' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۳' المستدرک ج ۱ ص ۱۱ - ۴۱۵' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۸٦۵ - ص ۱٦۴)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱٦۴) دو عادتیں کسی صاحب ایمان میں جمع نہیں ہو سکتیں: ایک بخل اور ایک بد اخلاقی۔

(سنن ترمذی: ۱۹٦۲' مشکوٰۃ: ۱۸۷۲ - ص ۱٦۵)

☆ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور غریب قرار دیا ہے۔

آیت مذکورہ کا نزول کن لوگوں کے بارے میں ہوا؟ اس میں مفسرین کے دو اقوال

(۱) حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت ابوہریرہ اور ابو صالح کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عباس' امام شعبی اور حضرت مجاہد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا قول یہ ہے کہ مذکورہ آیت کا نزول اُن لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جو چیز واجب اور لازمی ہو اس کے روکنے کو بخل کہتے ہیں۔ جو چیزیں لازمی نہ ہوں اُن کو نہ دینے والا بخیل نہیں ہوتا۔ زیرِ بحث آیت کا سیاق (اگلا حصہ)

---

۱۲۵ تفسیر خازن میں حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا نام مذکور ہے۔ جبکہ کتب حدیث میں یہ روایت حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ ہو سکتا ہے علامہ خازن نے ''عبد اللہ بن عمرو'' لکھا ہو (جیسا کہ کتبِ حدیث میں ہوتا ہے) اور کاتب نے واؤ چھوڑ دیا ہو۔ جس کی وجہ سے روایت کی نسبت غلط ہو گئی۔ یہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات معمولی غلطی سے کیسی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔

جس میں سخت وعید بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جس (مال) میں وہ بخل کرتے تھے اُس کو قیامت کے دِن اُن کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا' اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جو چیز واجب ہو اس کو نہ دینا بخل کہلاتا ہے۔ کیونکہ گلے میں طوق ڈالنے کی سزا واجب کے ترک پر ہی ہوسکتی ہے نہ کہ غیر واجب کے ترک پر۔

(۲) ابن عطیہ کی روایت از ابن عباس کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت ابن جریج اور حضرت مجاہد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا قول یہ ہے کہ مذکورہ آیت اُن علماءِ یہود کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت کو چھپایا۔ امام زجاج کا بھی یہی مختار ہے۔ دلیل اس قول کی یہ ہے کہ ''بخل'' کسی بھی اچھی چیز اور نفع کو روکے رکھنے کا نام ہے۔ اس میں علم بھی داخل ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ ''فلانٌ بخل بعلمه'' (فلاں شخص نے اپنے علم میں بخل سے کام لیا)۔ امام ابن جریر طبری نے پہلے قول کو صحیح قرار دیا ہے اور اُسی کو اختیار فرمایا ہے۔

آیت مذکورہ میں بخل سے زکوٰۃ کی عدم ادائیگی مراد لینے کی صورت میں مال کو گلے کا طوق بنانے کی تفسیر اور اس کی تائید میں دو احادیث

﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (جس چیز میں وہ بخل کرتے تھے اس کو قیامت کے دن اُن کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔) یعنی جس چیز میں وہ بخل کرتے تھے اُس کا وبال اور نقصان قیامت کے دن اُن سے اس طرح چمٹے گا جیسے طوق چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ گذشتہ سطور میں جو اختلاف ذکر کیا گیا اس کی رُو سے اگر ہم بخل سے زکوٰۃ کی عدم ادائیگی مراد لیں تو زیر بحث جملہ کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا قول یہ ہے کہ آدمی نے جس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اس کو قیامت کے دِن سانپ کا طوق بنا کر اُس شخص کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ سانپ آدمی کو سر سے پاؤں تک ڈسے گا۔ اس تفسیر کے صحیح ہونے کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٦٥) جس شخص کو اللہ تعالیٰ مال عطا کرے اور وہ اُس کی زکوٰۃ نہ دے تو قیامت کے دِن اُس مال کو ایک گنجے سانپ کی شکل میں اُس شخص کے سامنے لایا جائے گا۔ اُس کی آنکھوں پر دو زبیب (یعنی سیاہ نشان) ہوں گے۔ اُسے طوق بنا کر اُس شخص کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ اُس شخص کے جبڑے پکڑ کر کہے گا کہ میں تیرا مال اور تیرا خزانہ ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: ''وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ'' (الی اخر الاية)۔

(صحیح بخاری: ۱۴۰۳' سنن نسائی: ۲۴۸۱' مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۵' سنن بیہقی ج ۴ ص ۸۱' مؤطا امام مالک: ۶۰۷' مشکوٰۃ: ۱۷۷۴۔ ص ۱۵۵)

☆ حدیث مذکور میں آنے والے لفظ ''زبیبتـان'' کی تشریح میں اقوال: (۱) اس سے دو سیاہ نشان مراد ہیں جو سانپ کی آنکھ پر ہوتے ہیں۔ (۲) بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے دو دھبے مراد ہیں جو مُنہ پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ (۳) بعض کہتے ہیں کہ سانپ کے جبڑوں پر دو نشان ہوتے ہیں۔ جبکہ حدیث مذکور میں ایک لفظ ''لهـزمة'' آیا ہے اس کی تفسیر راوی نے جبڑے سے کی ہے۔ (۴) بعض کہتے ہیں: اس سے گوشت کے دو ٹکڑے مراد ہیں جو تالو کی جڑ میں ہوتے ہیں۔ (۵) بعض کہتے ہیں کہ اس سے دونوں کان کے نیچے کی وہ جگہ مراد ہے جہاں جبڑے مڑتے ہیں یہ تمام اقوال (معنوی اعتبار سے) باہم قریب ہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(١٦٦) میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: ربِ کعبہ کی قسم! وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ میں آکر بیٹھ کر گیا پھر بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)!

میرے ماں باپ آپ پر قربان! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں ـ ماسوا اُن کے جو اِدھر اُدھر آگے پیچھے دائیں بائیں خرچ کرتے ہیں اور ایسے سرمایہ دار بہت کم ہیں ـ جو شخص اونٹ یا گائے یا بکریاں رکھتا ہو اور اُن کی زکوٰۃ نہ دیتا ہو قیامت کے دن وہ جانور گذشتہ تمام دنوں سے زیادہ بڑے اور فربہ ہو کر آئیں گے اور اپنے سینگ سے اُس شخص کو ماریں گے اور اپنے کھروں سے اُسے روندیں گے ـ جب بھی آخری جانور روند کر گزرے گا تو پہلا جانور روندنے کے لیے آجائے گا اور لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک یونہی عذاب ہوتا رہے گا ـ

(صحیح بخاری: ١٤٦٠ ' صحیح مسلم: ٩٩٠ ' سنن ترمذی: ٦١٧ ' سنن نسائی: ٢٤٣٩ ' سنن ابن ماجہ: ١٧٨٥ ' مسند احمد ج ٥ ص ١٥٢ ' مشکوٰۃ المصابیح: ١٨٦٨ ـ ص ١٦٤)

☆ حدیث مذکور کے الفاظ صحیح مسلم کے مطابق ہیں ـ امام بخاری نے اس حدیث کو اسی مفہوم میں دو جگہ علیحدہ علیحدہ روایت کیا ہے[١٢٦] ـ

بعض مفسرین زیر بحث جملہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بخل کرنے والوں کی گردنوں میں آگ کے طوق ڈالے جائیں گے ـ بعض کہتے ہیں کہ بخل کرنے والوں نے دُنیا میں جس مال میں بخل کیا تھا اُس کو سامنے لانے کا اُنہیں حکم دیا جائے گا ـ

آیت مذکورہ میں بخل سے علم کا چھپانا مراد لینے کی صورت میں آیت مبارکہ کی تفسیر

اگر ہم زیر بحث آیت میں بخل سے علم کو چھپانا مراد لیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ''سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' کی تفسیر میں یہ ہے کہ بخل کرنے والے جس مال میں بخل کرتے تھے وہ قیامت کے دن اُس مال کا بوجھ اور گناہ اٹھائیں گے ـ اس صورت میں آیت میں طوق پہنانے کا تذکرہ بر سبیل مثال ہوگا ـ جیسے کہتے ہیں کہ: ''قلدتک هذا الامر وجعلته في عنقک'' (یہ کام میں نے ہار بنا کر تمہارے گلے میں ڈال دیا ہے) ـ بعض مفسرین ''سيطوقون'' کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ بخل کرنے والوں کی گردن میں آگ کا طوق ڈالا جائے گا ـ

زیر بحث آیت میں بخل سے علم چھپانا مراد لینے کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

(١٦٧) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اُسے معلوم ہے پھر اُس نے اُس کو چھپایا تو اُسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی ـ اس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے ـ ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یوں ہیں کہ: جس سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اُس نے وہ چھپادی تو اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائے گا ـ

(سنن ترمذی: ٢٦٤٩ ' سنن ابوداؤد: ٣٦٥٨ ' سنن ابن ماجہ: ٢٦١ ' مسند احمد ج ٢ ص ٢٦٣ ' مشکوٰۃ المصابیح: ٢٢٣ ـ ص ٣٤)

☆ حدیث مذکور کی مختصر تشریح: اس حدیث کی تشریح میں بعض علماء نے فرمایا ہے کہ (اہل علم سے) جب کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ اُسے چھپا جائیں' زبان سے اس کا اظہار نہ کریں تو اس کے بدلہ میں (قیامت کے دن) سزا کے طور پر اُن کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی ـ واللہ تعالیٰ اعلم

آسمان وزمین کا اللہ کی میراث اور ملکیت ہونا

﴿وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے ـ) یعنی تمام مخلوق کے فنا ہونے اور اُن کی ملکیت کے ختم ہو جانے کے بعد اللہ عزوجل ہی کی پاک ذات باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے ـ سب لوگ مر جائیں گے اور اُن کی

[١٢٦] ایک کتاب الزکوٰۃ' باب: ٣٤ میں اور دوسرا کتاب الایمان والنذور' باب: ٣ میں ـ ملاحظہ فرمایئے حدیث نمبر: ١٤٦٠ اور ٦٦٣٨ ـ

ملکیت باقی ہو گی تو اللہ عزوجل اُس کا مالک ہو گا۔ اس آیت میں بتانا یہ مقصود ہے کہ تمام ملکیت رکھنے والوں کی ملکیت ختم ہو جائے گی لیکن اللہ عزوجل کی ملکیت باقی رہے گی۔

بعض مفسرین نے زیرِ بحث جملہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ آسمان و زمین والے جس مال و دولت، علم و فضل اور دیگر چیزوں کے آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں وہ سب چیزیں اللہ عزوجل کی ملکیت ہیں اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ بخل کرنے والے لوگ اللہ عزوجل کی ملکیت کی چیزوں میں بخل کرتے ہیں اور اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔) اس جملہ میں "بِمَا تَعْمَلُوْنَ" کو "بما یعملون" بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ بہ طریقہ التفات[۱۲۷] ہو گا اور یہ وعید میں زیادہ شدت کا باعث ہے۔ معنیٰ یہ ہو گا کہ بخل کرنے والے لوگ حقوق کی ادائیگی میں جس بخل سے کام لیتے ہیں اللہ اُس سے باخبر ہے۔ اور باخبر ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اُنہیں اس بخل کی سزا دے گا۔ ایک قرأت میں "بما تعملون" پڑھا گیا ہے، اس صورت میں یہ حاضرین سے خطاب ہو گا۔ یعنی اللہ اُن کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

اللہ نے اُن (گستاخوں) کی بات سُن لی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں، ہم عنقریب اُن کی (یہ) بات اور اُن کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا لکھ لیں گے اور ہم کہیں گے کہ آگ کا عذاب چکھو O

آیت مذکورہ کا واقعۂ نزول اور یہودیوں کا اللہ عزوجل کو فقیر کہنا

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ حضرت حسن بصری اور قتادہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی کہ "کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے" (البقرہ: ۲۴۵) تو یہودی سن کر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ محتاج ہے، ہم سے قرض مانگ رہا ہے اور ہم غنی ہیں۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ یہ بات حیی بن اخطب یہودی نے کہی تھی۔

حضرت عکرمہ، سدی، مقاتل اور محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ بنو قینقاع کے یہودیوں کو ایک خط بھیجا۔ اُس خط میں اُنہیں نبی اکرم ﷺ نے اسلام لانے، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ عزوجل کو قرضِ حسن دینے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ یہودیوں کے بیت المدراس میں گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ فنحاص بن عازوراء کے پاس جمع ہیں۔ فنحاص یہودیوں کا عالم تھا۔ اُس

[۱۲۷] التفات سے مراد یہ ہے کہ کلام جس صیغہ کے ساتھ جاری ہو اُس سے اُس کو پھیر دیا جائے۔ مثلاً غائب کے صیغوں کے درمیان حاضر یا حاضر کے صیغوں کے دوران غائب کا صیغہ لایا جائے۔ زیرِ بحث آیت میں ابتداء سے جو صیغے ہیں وہ غائب کے ہیں اور آخر میں "بما تعملون" حاضر کا صیغہ ہے۔ یہ طریقہ عربی زبان میں چونکہ خوف دلانے اور ممنوع امور سے باز رکھنے کے لیے زیادہ بلیغ اور مؤثر ہے اس لیے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ بعض قرأتوں میں زیرِ بحث آیت کا آغاز حاضر کے صیغوں سے ہے اور اختتام غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں التفات کا اظہار "بما یعملون" سے ہو گا۔ علامہ خازن نے زیرِ بحث آیت کے آغاز میں واضح نہیں کیا کہ اس آیت میں کون کون سی قرأت ہے؟ اور ظاہراً یاء والی قرأت پر اعتماد کیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ کا "بما تعملون" میں یاء والی صورت کو طریقہ التفات قرار دینا درست نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، علامہ زمخشری، قاضی مظہری اور دیگر مفسرین نے اس آیت میں تاء والی صورت کو طریقہ التفات قرار دیا ہے۔

کے ساتھ ہی ایک اور عالم بھی موجود تھا جس کو اشیع کہتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فنحاص سے کہا کہ تم اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔ خدا کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ (سیدنا) محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے پاس سے نظام حق لے کر آئے ہیں۔ تورات میں بھی تمہیں معلوم ہے کہ اُن کا ذکر موجود ہے۔ اس لیے تم ایمان لے آؤ اور اُن کی تصدیق کرو اور اللہ عزوجل کو قرضِ حسن دو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں داخل فرمائے گا اور دوگنا ثواب دے گا۔ فنحاص نے یہ گفتگو سُن کر کہا کہ اے ابوبکر! تمہارا خیال یہ ہے کہ ہمارا رب ہم سے قرض مانگ رہا ہے' حالانکہ قرض تو فقیر اور محتاج شخص غنی سے مانگتا ہے۔ اس لیے اگر تمہاری بات حق اور سچ ہے تو پھر اللہ عزوجل فقیر ہوا اور ہم غنی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فنحاص کی یہ باتیں سُن کر غضب میں آگئے اور فنحاص کے چہرہ پر ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔ اور کہا کہ اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو اے اللہ کے دشمن! میں تیری گردن اڑا دیتا۔ فنحاص اُٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس چلا گیا اور عرض کی: اے محمد (ﷺ)! آپ دیکھیں آپ کے آدمی نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا! رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ اللہ کا دشمن ہے' اس نے ایک خطرناک بات کہی ہے۔ اس کے خیال میں اللہ عزوجل محتاج ہے اور یہ لوگ غنی ہیں۔ یہ بات سُن کر اللہ کی خاطر مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ فنحاص نے یہ باتیں سُن کر انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق اور فنحاص کی تکذیب وتردید میں زیر بحث آیت نازل فرمائی۔ اور اس میں فرمایا کہ ''اللہ نے اُن لوگوں کی بات سُن لی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی''۔ یہ بات اگرچہ ایک یہودی (فنحاص) نے کہی تھی لیکن دیگر یہودی چونکہ اس کی بات سے متفق تھے اس لیے آیت مبارکہ میں اس بات کو تمام یہودیوں کی طرف نسبت دی گئی۔ (رہا یہ کہ یہودیوں نے یہ بات اعتقاداً کہی تھی یا استہزاءً سو دونوں ہی باتیں ممکن ہیں)۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اللہ کی طرف فقیر ہونے کی جو نسبت کی تھی وہ اُن کا نظریہ اور اعتقاد ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے مذاق اُڑانے کی غرض سے یہ بات کہی ہو۔ بہر دوصورت یہ بات بہت ہی خطرناک اور قبیح ہے۔ کوئی عقل مند شخص ایسی بات نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو کافر ہو اور اپنے کفر وضلالت میں سرکش ہو چکا ہو۔

اللہ عزوجل کو فقیر کہنے اور انبیاءِ کرام کو شہید کرنے پر یہودیوں کی مذمت

﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ (ہم عنقریب اُن کی بات لکھ لیں گے۔) اس سے مراد وہی بات ہے جو یہودیوں نے کہی کہ (معاذ اللہ) اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ چونکہ یہ بات جھوٹ اور بہتان تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم عنقریب اُن کی یہ بات لکھ لیں گے۔ لکھنے سے مراد یہ ہے کہ ہم اُن کی اس بات کو اُن کے خلاف اپنے پاس محفوظ رکھیں گے۔ بعض کے نزدیک لکھنے سے مراد یہ ہے کہ ہم اُن کی اس بات کو اُن کے نامۂ اعمال میں اُن کے خلاف پختہ کر دیں گے' حتیٰ کہ اُنہیں نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی باتوں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہودیوں کے لیے وعید اور سرزنش ہے۔

﴿وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ بعض نے اس کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ اِن یہودیوں نے جو کچھ کہا اس کو بھی ہم عنقریب لکھ لیں گے اور ان کے آباء واجداد نے جو کچھ کیا (یعنی انبیاء کا ناحق قتل) اس کو بھی لکھ لیں گے۔ اور دونوں ہی فریق جس سزا کے مستحق ہیں وہ سزا ہم اُنہیں دیں گے۔ (خیال رہے کہ) نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ انبیاء کے قاتل نہیں تھے بلکہ اُن کے آباء واجداد نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا تھا۔ لیکن یہ یہودی چونکہ اپنے آباء واجداد کی کارستانی سے متفق تھے اس لیے آیت مبارکہ میں قتل کی نسبت ان یہودیوں کی طرف کی گئی۔

بعض مفسرین نے زیر بحث جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اِن یہودیوں نے اپنے مُنہ سے جو بات کہی وہ بھی ہم ان کے خلاف لکھ لیں گے اور اپنے آباء واجداد کی کارستانی سے انہوں نے جو اتفاق کیا وہ بھی ہم لکھ لیں گے۔

مذکورہ دونوں جرائم کو ایک ساتھ بیان کرنے کا مقصد

''یہودیوں کی اللہ عزوجل کی طرف فقیر ہونے کی نسبت اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنا'' ان دونوں جرائم کو آیتِ مبارکہ میں ایک ساتھ بیان کرنے سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ دونوں جرائم خطرناک ہونے میں برابر ہیں (یعنی دونوں ہی بہت خطرناک اور بھیانک جرائم ہیں)۔اور یہودیوں نے اللہ عزوجل کو (معاذ اللہ) جو فقیر اور محتاج کہا ہے تو یہ اُن کا کوئی پہلا جرم نہیں ہے بلکہ یہ لوگ اپنے کفر و جہالت اور گمراہی میں بہت پکے ہو چکے ہیں۔ان کی تاریخ جرائم سے بھری ہوئی ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے نامۂ اعمال میں اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے کا جُرم موجود ہو وہ اگر اللہ تعالیٰ کو فقیر اور محتاج کہہ دے تو ایسی فحش اور قبیح باتوں کی جرأت کرنا اُس سے کب بعید ہوسکتا ہے۔

﴿ وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ (اور ہم کہیں گے کہ آگ کا عذاب چکھو۔) یعنی جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو فقیر اور محتاج کہا ہے اُن سے ہم بدلہ اس طرح لیں گے کہ اُنہیں قیامت کے دن ہم کہیں گے کہ آگ کا عذاب چکھو جس طرح تم نے دُنیا میں مسلمانوں کو رنج وغم میں مبتلا کیا۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٨٢﴾

یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کیے ہوئے (اعمال) کی سزا ہے اور اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے O

﴿ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ میں ''ذالک'' سے آگ کا عذاب مراد ہے۔یعنی وہ جلانے والا عذاب تمہارے اس فعل کی سزا ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو فقیر کہا اور انبیاء کو شہید کرنے کی جرأت کی۔ ''بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ'' میں ہاتھوں کا ذکر مجازاً کیا گیا ہے' کیونکہ کام کرنے والا انسان ہے نہ کہ ہاتھ۔لیکن ہاتھ کے ذریعہ چونکہ کام کیا جاتا ہے اس لیے کام کی نسبت ہاتھوں کی طرف باعثِ حُسن ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر کام ہاتھوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں' اس لیے اکثریت کو ترجیح دیتے ہوئے تمام کاموں کی نسبت ہاتھوں کی طرف کردی گئی۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے کہ بغیر کسی جرم اور گناہ کے عذاب دے دے۔بلکہ وہ عدل اور انصاف کرنے والا ہے۔اور عدل وانصاف یہ ہے کہ گناہگار کو وہ سزا دے اور نیک کام کرنے والے کو اجر وثواب دے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٨٣﴾

(یہ وہ لوگ ہیں) جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ہمیں تاکید فرمائی ہے کہ ہم کسی بھی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ پیش کرے جس کو آگ کھا جائے' آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے کئی رسول تمہارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے اور تمہاری کہی ہوئی (نشانی بھی) لے کر آئے تو (بتاؤ) تم نے اُنہیں کیوں قتل کیا اگر تم (اپنے

دعویٰ میں) سچے ہو؟

آیت مذکورہ کا واقعہ نزول

کلبی کہتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ یہودیوں کے کعب بن اشرف مالک بن صیفی وہب بن یہوذا زید بن تابوت فنحاص بن عازوراء اور حیی بن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی: اے محمد (ﷺ)! آپ کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے (اگر ایسا ہی ہے تو آپ سن لیجئے کہ) اللہ تعالیٰ نے تورات میں ہمیں یہ تاکید فرمائی ہے کہ جو رسول بھی یہ دعویٰ کرے کہ وہ اللہ کے پاس سے آیا ہے اس پر ہم اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ رسول ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جس کو آگ کھا جائے۔ لہٰذا اگر آپ ایسی قربانی ہمارے سامنے کر دیں تو ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اس بات کا بیان کہ آیا نبوت کے ثبوت کے لیے تورات میں مخصوص قربانی پیش کرنے کی شرط مذکور ہے یا نہیں؟

﴿ اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا ﴾ (کا تعلق گذشتہ آیت میں "الـذیـن قـالـوا" سے ہے) یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی سُن لی ہے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے اور اپنی کتابوں میں تلقین کی ہے ہم کسی بھی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ پیش کرے جس کو آگ کھا جائے۔ یعنی ایسی قربانی اُس رسول کے سچے ہونے کی نشانی اور دلیل ہو گی۔

امام واحدی نے سُدّی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تورات میں اس بات کا حکم دیا کہ جو شخص بھی تمہارے پاس اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ لے کر آئے تو تم اس وقت تک اس کی تصدیق مت کرنا جب تک کہ وہ ایسی قربانی نہ پیش کرے جس کو آگ کھا جائے۔ (لیکن یہ اصول) حضرت مسیح اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے آنے تک ہے۔ یعنی حضرت مسیح اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری ہو تو تم ان پر ایمان لے آنا۔ وہ دونوں بغیر قربانی کے آئیں گے۔

امام واحدی کے علاوہ دیگر مفسرین نے سُدّی کے حوالہ سے یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ نبوت کے ثبوت میں قربانی پیش کرنے کا طریقہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری تک جاری رہا پھر اس کو اٹھا لیا گیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ دعویٰ کرنا کہ تورات میں نبوت کے ثبوت کے لیے قربانی پیش کرنے کی شرط بیان کی گئی ہے یہ تورات پر جھوٹا الزام ہے۔ جو کہ یہودیوں کی تہمت تراشی اور تحریف کا نتیجہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ کسی بھی نبی کے سچے ہونے پر جو ثبوت درکار ہوتا ہے وہ یہی ہے اس سے کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو جو عُرف و عادت کے خلاف ہو۔ لہٰذا نبی کوئی سا بھی معجزہ پیش کرے اُسے قبول کیا جائے گا اور وہ اُس کے سچے ہونے کا ثبوت ہو گا۔ چونکہ ہمارے نبی جناب رسالت مآب ﷺ نے اپنے سچے ہونے کے ثبوت میں بہت ہی روشن اور اعلیٰ درجہ کے معجزات پیش کیے اس لیے پوری مخلوق پر آپ کی پیروی اور تصدیق واجب ہے۔

لفظ "قُربان" کا معنیٰ و مفہوم اور بنی اسرائیل کی قربانیوں کے قبول ہونے کا معیار

اس آیت میں ﴿قُربان﴾ کا لفظ ہے۔ "قُربان" ہر اُس نیک عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔ مثلاً قربانی صدقہ جانور کو ذبح کرنا اور دیگر تمام نیک اعمال۔ دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(١٦٨) روزہ ڈھال ہے اور نماز قُربان ہے۔ (مسند احمد ج ٣ ص ٣٩٩) ☆ نماز کے قُربان ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ عزوجل کا قُرب حاصل کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے قربانی کے جانور اور مالِ غنیمت حلال نہیں تھے۔ بلکہ جب وہ قربانی کرتے تھے یا مالِ غنیمت پاتے تھے تو اُسے ایک جگہ جمع کر دیتے تھے' پھر آسمان سے بغیر دھویں کی ایک سفید آگ آتی تھی جس میں ایک (مخصوص) آواز اور سرسراہٹ ہوتی تھی' وہ آ کر اُس قربانی یا مالِ غنیمت کو کھا جاتی تھی اور جلا دیتی تھی۔ یہ اُس کے مقبول ہونے کی دلیل اور نشانی ہوتی تھی۔ اور اگر وہ بارگاہِ الٰہی میں نامقبول ہوتی تو اسی طرح پڑی رہتی اور اوپر سے آگ نازل نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عطاء کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل اللہ کے لیے جانور ذبح کرتے تھے' پھر اُس کی چربی اور عمدہ گوشت لے کر گھر کے درمیان میں رکھ دیتے تھے۔ اُوپر سے چھت کھلی ہوتی تھی۔ اُس گھر میں اُن کے پیغمبر (علیہ السلام) کھڑے ہو کر اللہ عزوجل سے خشوع وخضوع کے ساتھ دُعا کرتے تھے۔ اس دوران بنی اسرائیل اُس گھر کے اردگرد باہر ہوتے تھے۔ پھر بغیر دھویں کی ایک سفید آگ جس میں ایک مخصوص آواز اور سرسراہٹ ہوتی تھی وہ آ کر اُس قربانی کو کھا جاتی تھی۔

یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ سے نبوت کے ثبوت میں مخصوص قربانی کا جو مطالبہ کیا اس کا جواب

فرمایا کہ: ''آپ کہہ دیجئے مجھ سے پہلے کئی رسول تمہارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے اور تمہاری کہی ہوئی نشانی بھی لے کر آئے تو بتاؤ تم نے اُنہیں کیوں قتل کیا' اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو؟''۔

یہودیوں نے (نبی اکرم ﷺ پر) جو اعتراض کیا تھا کہ ''نبوت کے ثبوت کے لیے ایک ایسی قربانی پیش کرنا ضروری ہے جس کو آگ آ کر کھالے'' اُس کے جواب میں اللہ نے مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا اور یہودیوں کے خلاف حجت قائم فرما دی۔ اس میں ﴿قُلْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! آپ ان یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ اے گروہِ یہود! تمہارے پاس مجھ سے پہلے بھی رسول آ چکے ہیں' مثلاً حضرت زکریا' حضرت یحییٰ' حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) (یہ سب) تمہارے پاس ﴿بینات﴾ لے کر آئے۔ یعنی ایسی واضح نشانیاں جو اُن کی سچائی کو ثابت کرنے والی تھیں۔ ﴿وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ﴾ اور ان رسولوں نے ایسی قربانی بھی پیش کر کے دکھائی جس کا تم نے مطالبہ کیا۔ (اب ہمارا سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود) تم نے اُن نبیوں کو جنہوں نے تمہارا مطالبہ پورا کیا مثلاً حضرت زکریا' حضرت یحییٰ (علیہما السلام) اور وہ تمام انبیاء جو شہید ہوئے اُنہیں تم نے قتل کیوں کیا اگر تم سچے ہو یعنی اپنے دعویٰ میں۔

(واضح رہے کہ) نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ انبیاء کے قاتل نہیں تھے بلکہ اُن کے آباء واجداد نے انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا تھا۔ لیکن آیت مبارکہ میں خطاب اِن یہودیوں سے اس لیے کیا گیا کہ یہ اپنے آباء واجداد کے فعل سے راضی اور متفق تھے۔

مفہوم: مذکورہ آیت کا حاصل اور مفہوم یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! یہ یہودی آپ کی سچائی سے واقف ہونے کے باوجود آپ کو جھٹلاتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے انہوں نے گذشتہ انبیاء (علیہم السلام) کو قربانی پیش کرنے کے باوجود اُنہیں شہید کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ مکرم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴿۱۸۴﴾

پس اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے کئی رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے جو واضح نشانیاں' صحیفے اور چمکتی کتاب لے کر آئے ○

﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ﴾ یعنی اگر یہ یہودی آپ کو جھٹلاتے ہیں۔ ﴿فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ تو آپ سے پہلے کئی

رسول مثلاً حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم اور دیگر رُسلِ کرام (علیہم السلام) کو جھٹلایا گیا ہے۔ ﴿جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ﴾ جو کہ بیّنات لے کر آئے، یعنی واضح نشانیاں اور اعلیٰ معجزات لے کر آئے۔ ﴿وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴾ "زُبر" یعنی کتابیں اور "کتابِ مُنیر" یعنی واضح اور روشن کتاب لے کر آئے۔

"زُبُرٌ" کا واحد "زَبُوْرٌ" ہے۔ زبور ہر اُس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حکمت اور دانائی کی باتیں ہوں۔ یہ لفظ بنیادی طور پر "زَبْـرٌ" سے ہے بمعنیٰ روکنا۔ چونکہ حکمت و دانائی والی کتاب لوگوں کو باطل سے روکتی ہے اور حق کی طرف بُلاتی ہے اس لیے اُس کو زبور کہتے ہیں۔ رہا یہ کہ "زُبر" کے بعد "کتابِ مُنیر" کا ذکر کیوں فرمایا؟ تو اس لیے تاکہ "کتابِ مُنیر" کی عظمت اور فضیلت کا اظہار ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "زُبر" سے صحیفے مراد ہیں اور "کتابِ مُنیر" سے تورات و انجیل مراد ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

ہر شخص موت کو چکھنے والا ہے، اور تمہیں تمہارے اعمال کا پورا بدلہ تو قیامت کے دن ہی دیا جائے گا، پس جس شخص کو دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ یقیناً مراد کو پہنچا، اور دُنیاوی زندگی تو صرف دھوکہ کا سامان ہے ۞

آیت مذکورہ کے نازل ہونے کا پس منظر

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ یعنی ہر شخص کو موت کا چکھنے والا بنایا گیا ہے۔ اور ہر ایک کو موت لازمی ہے۔ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ اس بارے میں بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت "قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" (السجدہ:۱۱) "آپ کہیے کہ تمہیں موت کا فرشتہ موت دیتا ہے" نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! یہ آیت تو انسانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جنات، چوپائے، وحشی جانور اور پرندے ان سب کی موت کا ذکر کہاں ہے؟ تو زیر بحث آیت نازل ہوئی کہ ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو زمین سے جو مٹی لی گئی تھی اس کی وجہ سے زمین نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں شکایت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ فرمایا کہ جتنا حصہ اُس سے لیا گیا ہے وہ اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ اس لیے جو شخص بھی مرتا ہے وہ مرنے کے بعد اُسی مٹی میں دفن ہوتا ہے جس سے وہ پیدا ہوا تھا۔

"کل نفس ذائقۃ الموت" پر ایک سوال کا جواب

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ حُوریں اور جنتی خُدّام تو جنت ہی میں پیدا ہونے والے نفوس ہیں اور یہ موت بھی نہیں چکھیں گے تو لفظ "کُل" کا کیا حکم ہوگا اور زیر بحث آیت میں ہے کہ "ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے"؟ اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ "کُل" کا لفظ عموم اور احاطہ کا تقاضا نہیں کرتا (یعنی ایسا نہیں ہے کہ لفظِ "کُل" کے ساتھ جو بات کی جائے وہ سب کو شامل اور محیط ہو) اس پر دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے:

وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ . (النمل:۲۳) (ہد ہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ بلقیس کے بارے میں بتایا کہ) اُسے ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہے۔

(اس آیت میں لفظ "کُل" ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ ملکہ بلقیس کو ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ حاصل ہے) حالانکہ اُسے

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت (قطعاً) حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا زیر بحث آیت میں ''کــلّ نــفــس'' کا لفظ عام مخصوص عنہ البعض ہوگا (یعنی بعض افراد اس لفظ کے عموم میں شامل نہیں ہوں گے)۔ سوال مذکور کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیتِ مبارکہ میں ''ہر نفس'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکلّف ہوں[۱۲۸] (یعنی جن پر احکام شرعیہ لاگو ہوتے ہوں)۔ اس کی دلیل اسی آیت کا اگلا حصہ ہے جس میں فرمایا کہ: تمہیں تمہارا پورا بدلہ قیامت کے دن ہی دیا جائے گا۔

﴿ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ اس میں ''اُجُوْرَكُمْ'' سے اعمال کا بدلہ مراد ہے۔ یعنی تمہیں تمہارے اعمال کا پورا بدلہ قیامت کے دن دیا جائے گا۔ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو بدلہ بھی اچھا ہوگا اور اگر اعمال بُرے ہوں گے تو بدلہ بھی بُرا ہوگا۔

﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ یعنی جس کو نجات مل گئی اور جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ یقیناً کامیاب ہوا اور خوف و خطر سے بچ گیا۔

دنیاوی زندگی صرف دھوکہ کا سامان ہے

﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ (دُنیاوی زندگی تو صرف دھوکہ کا سامان ہے۔) یعنی اس دارِ فانی کی زندگی انسان کو دھوکہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کیونکہ انسان اس زندگی کو دیکھ کر یہ آرزوئیں کرنے لگتا ہے کہ وہ یہاں ایک طویل عرصہ تک رہے حالانکہ یہ زندگی عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ آیت مبارکہ میں اس زندگی کو دھوکہ کا سامان اس لیے فرمایا گیا کہ یہ انسان کو دل پسند چیزیں مہیا کر کے دھوکہ اور فریب میں رکھتی ہے اور اس خیال میں مبتلا کر دیتی ہے کہ میں اس دنیا میں ہمیشہ رہوں گا۔ حالانکہ انسان ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

زیر بحث جملہ میں ﴿ مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ کا لفظ آیا ہے۔ (۱) ''مـتـــاع'' ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان فائدہ حاصل کرے، جیسے مال اور دیگر چیزیں۔ بعض کے نزدیک ''مَتــاع'' سے (عام استعمال کی چیزیں) مراد ہیں جیسے کلہاڑی، ہانڈی، پیالہ اور اس طرح کی دیگر چیزیں۔ (۲) ''غُـــرور'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جو ہمیشہ رہنے والی نہ ہو اور انسان کو دھوکہ میں مبتلا کر دے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ غرور باطل چیز کو کہتے ہیں۔

آیتِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا دُنیا سے فائدہ حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے استعمال کی زائل ہونے والی چیزوں سے فائدہ اٹھانا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دُنیا کی زندگی ایک متاعِ متروک ہے (یعنی ایسا سامان ہے جسے کوئی چھوڑ کر چلا گیا ہو)۔ یہ عنقریب فنا اور زائل ہو جانے والا ہے۔ اس لیے اسے لے لو اور جس قدر ہو سکے اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دُنیاوی زندگی اُس شخص کے لیے دھوکہ کا سامان ہے جو اس کو طلبِ آخرت میں صَرف نہ کرے۔ ہاں! جو شخص اس زندگی کو طلبِ آخرت میں صرف کرے اُس کے لیے یہ زندگی فائدہ مند ہے اور اپنی اچھائیوں تک پہنچانے والی ہے۔

زیر بحث آیت کے آخری حصہ کی تفسیر حدیث پاک کی روشنی میں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱٦٩) اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ (نعمتیں) تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ''فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ

[۱۲۸] یہ احتمال دُرست نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ غیر مکلّفین (مثلاً بچوں اور پاگلوں) کو موت نہ آئے، حالانکہ سب کو موت آتی ہے اور آئے گی۔ (تبیان القرآن، زیر بحث آیت)

قُرَّةِ اَعۡيُنٍ ۚ ‘‘ (السجدہ:١٧) ’’کوئی نہیں جانتا کہ اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیسی نعمتیں چھپا کر رکھی گئی ہیں‘‘۔

امام ترمذی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جنت میں ایسا درخت ہے جس کے سائے میں کوئی سوار آدمی سو سال تک بھی چلتا رہے تب بھی وہ اُس درخت کو طے نہیں کر سکے گا۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ’’وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ‘‘ (الواقعہ:٣٠) ’’(اہل جنت) ہمیشہ کی چھاؤں میں (ہوں گے)‘‘۔ اور جنت میں ایک کوڑے کی مقدار جگہ بھی دُنیا اور دُنیا میں موجود تمام چیزوں سے بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ’’فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَـنَّةَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ‘‘ (آل عمران:١٨٥) ’’جس شخص کو آگ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ یقیناً مراد کو پہنچا‘ اور دُنیاوی زندگی تو صرف دھوکہ کا سامان ہے‘‘۔

(صحیح بخاری:٣٢٤٤‘ صحیح مسلم:٢٨٢٤‘ سنن ترمذی:٣٢٩٢‘ سنن ابن ماجہ:٤٣٢٨‘ مسند احمد ج ٢ ص ٣١٣‘ مشکوٰۃ المصابیح:٥٦١٢۔ ص ٤٩٥)

لَتُبۡلَوُنَّ فِىۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

تمہیں اپنے مال اور جان میں ضرور آزمایا جائے گا‘ اور تم سے پہلے جنہیں کتاب دی گئی اور جن لوگوں نے شرک کیا اُن سے تم بہت کچھ بُرا سنو گے (لیکن) اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کیے رہو تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے O

آزمائش کا معنیٰ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا مفہوم

﴿لَتُبۡلَوُنَّ﴾ میں لام لامِ قسم ہے۔ تقدیر عبارت ہے: ’’واللہ لتبلوّن‘‘ (خدا کی قسم! تمہیں مبتلا کیا جائے گا)۔ یعنی تمہیں ضرور آزمایا جائے گا۔ اس طور پر کہ ہم تم پر آزمائشیں ڈالیں گے تاکہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے۔

کسی کو آزمائش میں ڈالنے کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس کی جانچ پڑتال کی جائے تاکہ کھوٹے اور کھرے میں فرق ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ معنیٰ و مفہوم محال ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اُن سب کی حقیقت سے واقف ہے۔ اس لیے آزمانے کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ آزمانے والوں کی طرح معاملہ فرماتا ہے۔

مالی اور جانی ابتلاء و آزمائش کی تفسیر اور مسلمانوں کو آنے والی آزمائشوں کی خبر دینے کی توجیہ

﴿فِىۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں تمہارے مال میں کمی کر کے آزمایا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مال میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں اُن کی ادائیگی کے ذریعہ تمہیں آزمایا جائے گا۔ ﴿وَاَنۡفُسِكُمۡ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مصائب و امراض‘ قتل و غارت گری اور اعزاء و اقارب کی وفات کے بعد تمہیں آزمایا جائے گا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے آزمائشوں کے آنے کی خبر دی گئی ہے‘ تاکہ مسلمان پہلے سے اپنے آپ کو آنے والے مصائب و آلام اور تکالیف برداشت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب واقعۃً مصیبتیں آئیں گی تو مسلمان پہلے سے صبر کے ہتھیار سے لیس ہوں گے اور اچانک مصیبت آنے کی وجہ سے خوف و وحشت اور پریشانی کی جو کیفیت آدمی پر طاری ہوتی ہے وہ مسلمانوں پر طاری نہیں ہوگی۔

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فنحاص بن عازوراء کے بارے میں نازل ہوا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بنو قینقاع کے سردار فنحاص کے پاس امداد لینے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک خط دے کر روانہ فرمایا۔ اور اُن سے فرمایا کہ ”میری مرضی کے خلاف اپنی جانب سے تم کوئی کام نہ کر بیٹھنا‘ واپس آ جانا“۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار سے مسلح ہو کر فنحاص کے پاس گئے اور اُسے نبی اکرم ﷺ کا مکتوب گرامی دیا۔ فنحاص نے اُس مکتوب کو پڑھ کر کہا کہ تمہارا رب اتنا محتاج ہو گیا ہے کہ ہم اُس کی مدد کریں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ گستاخانہ جملہ سُن کر فنحاص کی گردن اڑانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن (فوراً ہی) نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک یاد آ گیا کہ ”میری مرضی کے خلاف اپنی جانب سے تم کوئی کام نہ کر بیٹھنا‘ واپس آ جانا“۔ اس پر آیت مبارکہ کا مذکورہ جملہ نازل ہوا۔

کعب بن اشرف یہودی کے قتل کا واقعہ اور ایک قول کے مطابق اس کے بارے میں زیرِ بحث جملہ کا نزول

امام زہری کا قول یہ ہے کہ زیرِ بحث جملہ نبی اکرم ﷺ اور کعب بن اشرف یہودی کے معاملہ میں نازل ہوا۔ کعب بن اشرف نبی اکرم ﷺ کی گستاخیاں کرتا تھا‘ مسلمانوں کو گالیاں دیتا تھا اور اشعار کے ذریعہ مشرکین کو مسلمانوں سے لڑنے پر اکساتا تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۰) رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ سے) فرمایا: کون کعب بن اشرف کو قتل کرے گا؟ کیونکہ اُس نے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو اذیتیں پہنچائی ہیں۔ حضرت محمد بن مَسلَمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! کیا اس بات کو پسند فرمائیں گے کہ میں اُسے قتل کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر مجھے آپ اس بات کی اجازت دیں کہ پہلے میں اُس سے کچھ بات کروں۔ آپ نے فرمایا: کہہ لینا۔ چنانچہ وہ کعب بن اشرف کے پاس پہنچے اور اُس سے باتیں کیں اور اپنا اور نبی اکرم ﷺ کا معاملہ بیان کیا۔ (یعنی) کہا کہ یہ شخص ہم سے صدقات لیتا ہے اور ہم کو اس نے مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ کعب بن اشرف نے سُن کر کہا کہ بخدا! ابھی تو تم پر اور مصیبت پڑے گی۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا کہ ہم اس کے پیرو کار بن چکے ہیں اور اب اُسے چھوڑنا ہمیں بُرا معلوم ہوتا ہے‘ جب تک کہ ہم یہ نہ دیکھ لیں کہ اس کا انجام کار کیا ہوتا ہے۔ پھر حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں تم سے کچھ قرض چاہتا ہوں۔ کعب بن اشرف نے کہا کہ گروی میں تم کیا رکھواؤ گے؟ کیا (ایسا ہوسکتا ہے کہ) تم اپنی عورتیں گروی رکھوا دو؟ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا کہ تم عرب کے حسین ترین شخص ہو‘ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی عورتیں تمہارے پاس گروی رکھوا دیں۔ کعب نے کہا کہ پھر اپنے بچے گروی رکھوا دو۔ حضرت ابن مسلمہ نے کہا کہ پھر ہمارے بچوں کو لوگ یہ گالی دیں گے کہ ان کو دو وسق[۱۲۹] کھجور کے بدلہ میں گروی رکھا گیا۔ البتہ یہ کر لیتے ہیں کہ ہم اپنے ہتھیار تمہارے پاس گروی رکھوا دیتے ہیں۔ کعب بن اشرف نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر حضرت ابن مسلمہ نے کعب سے وعدہ کیا کہ میں حارث‘ ابوعبس بن جبر اور عباد بن بشر کو لے کر تمہارے پاس (گروی رکھوانے) آؤں گا۔ چنانچہ یہ سب لوگ کعب بن اشرف کے پاس گئے اور اُسے آواز دی۔ رات کا وقت تھا‘ وہ نیچے آیا۔ نیچے جاتے وقت اُس کی بیوی نے اس سے کہا کہ مجھے خون کی سی آواز آ رہی ہے۔ کعب نے کہا کہ محمد بن مسلمہ آیا ہے‘ اُس کے ساتھ میرا رضاعی بھائی ابونائلہ ہے۔ اور معزز آدمی کو اگر رات کے وقت بھی نیزہ بازی کے لیے بُلایا جائے تو وہ چلا جاتا ہے۔ ادھر حضرت محمد بن مسلمہ نے (اپنے ساتھیوں سے) کہہ دیا تھا کہ جب کعب بن اشرف ہمارے پاس آئے گا تو میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاؤں گا اور جب میں اس پر قابو پاؤں گا تو تم اس پر حملہ کر دینا۔ (راوی کہتے ہیں کہ) کعب بن اشرف سر پر چادر لپیٹے نیچے آیا۔ حضرت ابن مسلمہ اور اُن کے دیگر ساتھیوں نے کہا کہ آپ سے تو خوشبو کی مہک آ رہی ہے۔ اُس نے کہا: ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی فلاں عورت ہے‘ وہ عرب کی سب سے معطر

[۱۲۹] ایک وسق تقریباً چھ من تیس سیر کا ہوتا ہے۔

عورت ہے۔ حضرت ابن مسلمہ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں یہ خوشبو سونگھ لوں۔ اُس نے کہا: ہاں! سونگھ لو۔ حضرت ابن مسلمہ نے (اُس کا سر) پکڑ کر اُسے سونگھا پھر کہا کہ اجازت ہو تو ایک مرتبہ اور سونگھ لوں۔ (راوی کہتے ہیں کہ) پھر حضرت ابن مسلمہ نے مضبوطی سے اُس کا سر پکڑ لیا اور ساتھیوں سے کہا کہ حملہ کرو۔ چنانچہ انہوں نے اُسے قتل کر دیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قتل کرنے کے بعد مذکورہ افراد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس کے قتل کی خبر دی۔

(صحیح بخاری: ۴۰۳۷، صحیح مسلم: ۱۸۰۱، سنن ابوداؤد: ۲۷۶۸)

اصحاب سیر و مغازی نے مذکورہ واقعہ میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ کعب بن اشرف پر محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھیوں نے مسلسل تلوار چلائی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ حضرت محمد بن مسلمہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک خنجر یاد آ گیا جو میری تلوار کے نیام میں تھا وہ میں نے نکال لیا۔ اللہ کے دشمن نے ایک زور کی چیخ ماری۔ ہمارے اردگرد ہر قلعہ پر آگ روشن تھی۔ (حضرت ابن مسلمہ کہتے ہیں کہ:) میں نے وہ خنجر کعب بن اشرف کے سینہ میں گھونپ دیا اور اس پر اتنا زور صرف کیا کہ میں اُس کی ناف تک پہنچ گیا۔ اور اللہ عزوجل کا دشمن ہلاک ہو گیا۔

ہمارے ساتھیوں میں حارث بن اوس کو ہم میں سے کسی کی تلوار سے سر میں زخم لگ گیا تھا جس کی وجہ وہ ہم سے پیچھے رہ گئے اور خون بہنے کی وجہ سے نڈھال ہو گئے۔ اُن کے لیے ہم کچھ دیر رُک گئے۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچے تو ہم نے اُن کو اٹھا لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اُن کے ساتھ پہنچ گئے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر نماز ادا فرما رہے تھے۔ ہم نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا تو آپ ہمارے پاس تشریف لے آئے۔ ہم نے آپ کو کعب بن اشرف کے قتل کی خبر دی اور اُس کا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے ہمارے ساتھی (حارث بن اَوس) کے زخم پر اپنا لعابِ دہن لگایا۔ پھر ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صبح ہوئی تو یہودی ہمارے حملہ سے خوف زدہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرما دیا کہ جو یہودی مرد تمہارے ہاتھ لگ جائے اُسے مار ڈالو۔ (حاصل یہ کہ) اللہ تعالیٰ نے کعب بن اشرف یہودی کے معاملہ میں زیر بحث جملہ (وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا) نازل فرمایا۔

زیر بحث جملہ کی تفسیر

زیر بحث جملہ میں ﴿الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ اور ﴿مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا﴾ سے مشرکین عرب مراد ہیں۔ یعنی تمہیں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے بہت ساری اذیت ناک باتیں سُننے کو ملیں گی۔ اذیت ناک باتوں سے مراد یہودیوں کا یہ قول ہے کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ اس طرح اور دیگر الزامات اور بہتان تراشیاں جو انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کیں اور کعب بن اشرف نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی مذمت میں جو کچھ کہا وہ سب اذیت ناک باتوں میں داخل ہے۔

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کیے رہے تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔) اس جملہ میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے ہے۔ مفہوم و معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی اذیتوں پر صبر کرو اور اللہ تعالیٰ کے احکامات و ممنوعات میں پرہیز گاری اختیار کرو (تو یہ بلاشبہ بہت ہمت کے کام ہیں)۔ یہاں صبر سے مراد اذیتوں پر صبر کرنا اور تقویٰ سے احکامات و ممنوعات میں پرہیز گاری اختیار کرنا اس لیے مراد لیا گیا ہے کہ صبر کا معنیٰ ہے: "تکلیف اور ناگوار بات کو برداشت کرنا اور تقویٰ کا معنیٰ ہے: اپنے آپ کو ایسی باتوں سے بچانا جو نامناسب کے درجہ میں ہوں۔

آخر میں صبر اور تقویٰ کے بارے میں جو فرمایا کہ یہ ''عــزم الامور'' (ہمت کے کام) ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایسی بہترین تدبیر کا حصہ ہیں جس میں ہدایت کا ہونا یقینی ہے۔ اور ایسی تدبیر کو ترک کرنا کسی عقل مند کو زیب نہیں دیتا۔ اس میں ''عزم الامور'' کا لفظ اصل میں ''عـزمت علیک ان تفعل کذا'' سے ماخوذ ہے۔ یعنی میں نے تم پر فلاں کام لازم کر دیا ہے۔ وہ تمہیں بہرصورت کرنا ہے' اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔ بعض کے نزدیک ''عــزم الامــور'' سے وہ اعمال مراد ہیں جن کا کرنا لازمی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اور یاد کیجئے جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم ضرور بہ ضرور اس (کتاب) کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور اس کو چھپانا نہیں' سو اُنہوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلہ ذلیل قیمت حاصل کی۔ پس اُن کی یہ خریداری کتنی بُری ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور یہودیوں کی اپنی کتاب کے معاملہ میں خدا سے بدعہدی کا بیان

﴿ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ)! اُس وقت کو یاد کیجئے جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے عہد لیا۔ یہود و نصاریٰ سے تمام لوگ مراد نہیں ہیں بلکہ صرف اُن کے علماء مراد ہیں۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اہل کتاب سے صرف یہودیوں کے علماء مراد ہیں۔ بہرصورت اُن سے عہد لیا گیا' یعنی اُنہیں تاکید کی گئی اور پابند کیا گیا کہ جو کتاب اُنہیں عطا کی گئی ہے اُس کو وہ بیان کریں۔ ﴿ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ ﴾ یعنی جو کچھ کتاب میں ہے اُس کو لوگوں کے سامنے بیان کر دینا اور ظاہر کر دینا تاکہ لوگوں کو اُس کا علم ہو۔ ﴿ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ﴾ اور لوگوں سے اس کو چھپانا نہیں۔

(اس گفتگو کا پس منظر یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کا علم رکھنے والے یہود و نصاریٰ کو اس بات کا پابند کیا تھا کہ ان دونوں کتابوں میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کے ثبوت میں جو دلائل ہیں اُن کو لوگوں کے سامنے وضاحت سے بیان کر دینا۔ لیکن اس کے برخلاف انہوں نے کیا روش اختیار کی اس کی وضاحت آیت کے اگلے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں:

﴿ فَنَبَذُوْهُ ﴾ انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ بعض مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ انہوں نے معاہدہ کو پس پشت ڈال دیا۔ پس پشت ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے (کتاب اور معاہدہ کو) ضائع کر دیا اور اس پر عمل کو ترک کر دیا۔ ﴿ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ﴾ (اور اس کے بدلہ انہوں نے معمولی قیمت حاصل کی۔) یعنی روٹی پانی اور رشوتیں حاصل کیں جو وہ اپنے عوام اور کمزور طبقہ سے وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں ﴿ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس روش کی مذمت فرمائی ہے۔

آیت مذکورہ کے ضمن میں امت محمدیہ (علی صاحبہا التحیہ) کے علماء کو تنبیہ اور علم کے چھپانے کی مذمت

جاننا چاہیے کہ بہ ظاہر یہ آیتِ مبارکہ صرف یہودی اور عیسائی علماء کے بارے میں ہے لیکن اس میں امتِ محمدیہ (ﷺ) کے علماء کا داخل ہونا بھی ممکن ہے۔ کیونکہ وہ بھی اہل کتاب ہیں یعنی قرآن مجید والے ہیں اور قرآن مجید تمام کتابوں میں سب سے بلند مرتبہ کتاب ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو معاہدہ مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اہل علم سے لیا ہے' لہٰذا جس کو بھی کسی بات کا علم حاصل ہو وہ اُسے آگے پہنچا دے۔ اور تم علم کی بات چھپانے سے بچو کیونکہ علم چھپانا ہلاکت اور بربادی کا

باعث ہے۔ (حضرت قتادہ مزید فرماتے ہیں کہ) جس علم کو بیان نہ کیا جائے وہ اُس خزانہ کی طرح ہے جس کو خرچ نہ کیا جائے اور دانائی کی جس بات کو ظاہر نہ کیا جائے وہ بُت کی مانند ہے جو نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ بیان کرنے والے اور سُن کر محفوظ رکھنے والے صاحبِ علم کے لیے خوش خبری ہے۔ ایسے ہی شخص نے (حقیقۃً) علم حاصل کر کے اُسے خرچ کیا اور اچھی بات سُن کر اُسے قبول کیا اور محفوظ رکھا۔

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اُسے معلوم ہے پھر اُس نے اس کو چھپایا تو اُسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ یہ امام ترمذی کی روایت ہے۔ جبکہ ابوداؤد کی روایت میں الفاظ یوں ہیں کہ جس سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اُس نے وہ چھپادی تو اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائے گا۔[۱۳۰]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ عزوجل نے اہل کتاب سے عہد نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی بات بیان نہ کرتا۔ پھر انہوں نے یہی آیت مبارکہ پڑھی: ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (الی اخر الایة)''۔

حضرت حسن بن عمار کہتے ہیں کہ میں امام زہری کے پاس گیا جبکہ وہ حدیث شریف بیان کرنا چھوڑ چکے تھے۔ میں نے اُنہیں اُن کے دروازہ پر پایا۔ میں نے عرض کی کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی حدیث شریف مجھے بیان فرمائیں۔ اُنہوں نے کہا: کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں نے حدیث شریف بیان کرنا چھوڑ دیا ہے؟ میں نے عرض کی کہ یا تو آپ مجھے حدیث شریف بیان فرمادیں ورنہ میں بیان کرتا ہوں۔ فرمایا کہ تم بیان کرو۔ میں نے کہا کہ مجھے حکم بن عُیَیْنَہ نے یحییٰ بن خزاز سے بیان کیا' وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرماتے سُنا کہ:

ما أخذ الله علی اهل الجهل ان یتعلموا حتی أخذ علی أهل العلم ان یعلموا.	اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے یہ عہد نہیں لیا کہ وہ علم حاصل کریں بلکہ اہل علم سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کو علم سکھائیں۔

حسن بن عمار کہتے ہیں کہ جب میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد سنایا تو امام زہری نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾

جو لوگ اپنے کاموں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے کیے ہی نہیں ہیں اُن پر (بھی) اُن کی تعریف کی جائے ایسے لوگوں کو آپ ہرگز ہرگز عذاب سے محفوظ نہ سمجھیں اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے O

اس آیت میں ﴿لَا تَحْسَبَنَّ﴾ کو تاء اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تاء والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ اے محمد (ﷺ)! جو لوگ اپنے کاموں پر خوش ہوتے ہیں آپ انہیں (عذاب سے محفوظ) نہ سمجھیں۔ یاء والی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنے کاموں پر خوش ہوتے ہیں وہ اپنی خوشی کو عذاب سے بچنے کا ذریعہ نہ سمجھیں۔

آیت مذکورہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟ اس میں مفسرین کے دو قول اور اُن کی دلیل

(۱) ایک قول یہ ہے کہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان

۱۳۰ یہ حدیث شریف ابھی آیت: ۱۸۰ کی تفسیر میں رقم: ۱۶۷ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس کے تفصیلی حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

کرتے ہیں کہ:

(۱۷۲) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ منافقین کی عادت تھی کہ جب آپ ﷺ جہاد کے لیے تشریف لے جاتے تو یہ لوگ پیچھے رہ جاتے اور جہاد میں شریک نہ ہونے پر خوش ہوتے۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لاتے تو یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر عذر پیش کرتے اور حلفیہ طور پر اپنے آپ کو معذور ظاہر کرتے اور اس بات کی خواہش رکھتے کہ جو کام اُنہوں نے کیے ہی نہیں اُن پر اُن کی واہ واہ کی جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری: ۴۵۶۷، صحیح مسلم: ۲۷۷۷)

(۲) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیتِ مبارکہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت حمید بن عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۳) مروان نے اپنے دربان سے کہا کہ اے رافع! تم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ اگر حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص بھی اپنے کام پر خوش ہوتا ہے اور نہ کیے ہوئے کام پر تعریف کا خواہش مند ہوتا ہے اُسے عذاب ہوگا تو پھر ہم سب کو عذاب ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جواباً فرمایا کہ تمہارا اس آیت سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو اہل کتاب (یہودیوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ دو آیتیں پڑھیں: ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (الى اخر الاية)''۔ (آل عمران: ۱۸۷) اور ''لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مزید فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے ایک بات دریافت کی تھی، اس کو وہ چھپا گئے اور نبی اکرم ﷺ کو کچھ اور بتا دیا تھا اور ظاہر یہی کیا تھا کہ نبی ﷺ نے جو بات دریافت کی ہے وہی ہم نے بتائی ہے۔ (مستزاد یہ کہ) اس پر انہوں نے اپنی تعریف کی خواہش کی اور نبی اکرم ﷺ کی دریافت کردہ بات کو چھپانے پر خوش ہوئے تھے۔ (صحیح بخاری: ۴۵۶۸، صحیح مسلم: ۲۷۷۸، سنن ترمذی: ۳۰۱۴، المستدرک ج۲ ص۲۹۹)

بغیر کوئی کام کیے اپنی تعریف چاہنے اور واہ واہ کروانے والوں کا بیان

﴿وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (آپ اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھیں جو بغیر کچھ کیے اپنی تعریف کروانا چاہتے ہیں۔) یعنی وہ پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے اُن پر لوگ اُن کی تعریف اور واہ واہ کریں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے علماء یہود کی ایک جماعت مراد ہے۔ وہ لوگوں کو جس طرح گمراہ کرتے تھے اور لوگ اُنہیں عالم کہتے تھے اس پر وہ خوش ہوتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آل عمران کی زیر بحث آیت اور اس سے گذشتہ آیت میں فنحاص، اشیع اور ان جیسے دیگر یہودی علماء مراد ہیں جو لوگوں کے لیے گمراہی کو مزین کر کے دُنیا کماتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام انہوں نے کیے ہی نہیں ہیں اُن پر تعریف کے خواہش مند رہتے ہیں یعنی چاہتے ہیں کہ لوگ اُنہیں عالم کہیں حالانکہ وہ اہل علم نہیں ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تمام یہودی مراد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آپس میں یہ اتحاد کیا تھا کہ ہم سب نبی اکرم ﷺ کو جھٹلائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عراق و شام اور یمن کے یہود اور دنیا بھر میں جہاں جہاں تک یہودیوں کو اُن کی بات پہنچ سکتی تھی اُن سب کو انہوں نے بذریعہ خط یہ بات پہنچائی کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) نبی نہیں ہیں۔ لہٰذا تم لوگ اپنے دین پر قائم رہنا۔ اس طرح تمام یہودی کفر پر متحد ہو گئے اور اپنے اس اتحاد پر بہت خوش ہوئے۔ یہودیوں نے اپنے بارے میں یہ بھی کہا کہ ہم روزہ اور نماز والے ہیں۔ پھر اس پر اُنہوں نے خواہش کی کہ اُن کی تعریف کی جائے۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے

تورات میں جوتبدیلیاں کی تھیں اس پر وہ خوش ہوئے اور یہ خواہش کی کہ لوگ اس پر اُن کی تعریف کریں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ خیبر کے یہودی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہم آپ کو پہچانتے ہیں اور آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے صحابہ کرام سے کہا کہ ہم تم لوگوں کی رائے اور خیال سے متفق ہیں اور تمہارے مددگار ہیں۔ یہ باتیں انہوں نے صرف زبان سے کہیں اور پھر اس پر یہ خواہش کی کہ نبی اکرم ﷺ اور مسلمان ان باتوں پر اُن کی تعریف کریں۔

آیت میں ﴿ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے قتل و غارت گری، قید و بند، جزیہ کی ادائیگی اور ذلت و رسوائی کا جو عذاب تیار کر رکھا ہے اس سے آپ اُن لوگوں کو محفوظ اور نجات یافتہ نہ سمجھیں۔ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔☆ (واضح رہے کہ) یہ آیت مبارکہ اگرچہ خصوصیت کے ساتھ یہودیوں یا منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا حکم ہر اُس شخص پر عائد ہوگا جو یہ خواہش رکھتا ہو کہ اُس نے نیکی اور بھلائی کے جو کام نہیں کیے اُن پر اُس کی واہ واہ ہو یا لوگ اُسے صاحبِ علم کہیں حالانکہ وہ عالم نہ ہو۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿١٨٩﴾

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چاہے پر قادر ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اللہ عزوجل کو فقیر کہنے والوں کو تنبیہ

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں پائے جانے والی تمام چیزوں کا مالک ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے اُن میں تصرف فرماتا ہے۔ اس آیت میں اُن لوگوں کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اللہ عزوجل فرما رہا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں جس کی ملکیت ہوں وہ فقیر کیونکر ہو سکتا ہے!

آخر میں جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو فقیر کہا ہے اُن کو اس گستاخی پر اللہ تعالیٰ جلد عذاب دینے پر قادر ہے لیکن یہ اُس کی اپنی مخلوق کے ساتھ مہربانی ہے کہ اُن کو مہلت دی ہوئی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾

بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور رات و دن کے بدلتے رہنے میں عقل و خرد والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں O

آیت مذکورہ کا پس منظر اور اس کی تفسیر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے کوئی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان و زمین کی جن چیزوں کو تمہارے معاش اور رزق کے لیے میں نے پیدا کیا ہے اور رات دن کو ایک دوسرے کے بعد رکھا ہے اور چھوٹے بڑے ہونے میں اُن کو مختلف رکھا ہے اس میں غور و فکر کرو۔ رات اور دن کو باہم مختلف اور ایک دوسرے کے بعد اس لیے رکھا ہے تاکہ تم اس میں اپنے معاش کے لیے کام کر سکو۔ چنانچہ دن میں تم لوگ روزی کماتے ہو اور رات میں جسمانی راحت اور سکون کے لیے آرام کرتے ہو۔ اس لیے اے عقل رکھنے والو! عبرت حاصل کرو اور غور و فکر کرو۔

آیت میں ''اُوْلُوْا الْاَلْبَاب'' سے عقلِ سلیم رکھنے والے لوگ مراد ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو اپنی نگاہیں غور و فکر، استدلال اور عبرت کے لیے کھلی رکھتے ہیں۔ اور آسمان و زمین کو اس طرح نہیں دیکھتے جس طرح جانور دیکھتے ہیں۔ بلکہ آسمان اور زمین میں جتنی عجیب و غریب مخلوق اور نئی نئی چیزیں ہیں اُن سب میں وہ غور و فکر کرتے ہیں۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ۔۔۔ تعالیٰ عنہا کے گھر رات گزارنے کا واقعہ

حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

(١٧٤) انہوں نے اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر رات گزاری۔ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنے کے لیے رات رُکا تھا۔ چنانچہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بستر بچھا دیا اور میں بستر کے عَرض میں لیٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کی اہلیہ (حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بستر کے طول میں لیٹ گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ سو گئے حتیٰ کہ جب آدھی رات ہوگئی تو اُس وقت یا اُس سے کچھ پہلے یا کچھ بعد رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور نیند کی وجہ سے اپنے چہرۂ انور کو اپنے ہاتھوں سے ملنے لگے۔ پھر آپ نے سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں اس کے بعد آپ ایک لٹکے ہوئے مشکیزہ کے پاس گئے اور اُس سے بہت عمدہ وضو فرمایا پھر کھڑے ہو کر نماز ادا فرمانے لگے۔ (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ) میں نے بھی کھڑے ہو کر وہی کیا جو حضور نے کیا تھا پھر میں جا کر آپ کی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سیدھا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرے کان کو موڑا۔ پھر آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پھر وتر ادا فرمائے اور پھر لیٹ گئے حتیٰ کہ مؤذن حاضر ہوا تو آپ نے کھڑے ہو کر اختصار کے ساتھ دو رکعتیں ادا کیں پھر صبح کی نماز پڑھائی۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا آپ نے مجھے پکڑ کر سیدھی جانب کھڑا کیا۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر رات گزاری۔ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ (حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ جب رات کا آخری تہائی حصہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ''۔ اس کے بعد حدیث حسب سابق ہے[١٣١] (صحیح بخاری: ٦٣١٦، صحیح مسلم: ٧٦٣، سنن بیہقی ج ٣ ص ٧، مسند احمد ج ١ ص ٣٤١)

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾

(عقل و خرد رکھنے والے) وہ ہیں جو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور کروٹوں کے بل لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (اور تسلیم کرتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بیکار پیدا

[١٣١] یہ حدیث شریف کئی مسائل شرعیہ کی جامع ہے۔ امام بخاری نے اس کو مختلف مسائل کے اثبات کے لیے تقریباً ١٩ مقامات پر ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے اس کو پندرہ اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سے جو مسائل شارحین حدیث نے مستنبط کیے ہیں وہ ستر کے قریب ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: شرح صحیح مسلم ج ٢ ص ٥٢٢۔

نہیں فرمایا' تیری ذات پاک ہے' پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لےO

کھڑے ہوئے' بیٹھے ہوئے اور کروٹوں کے بَل اللہ عزوجل کو یاد کرنے کی تفسیر

﴿الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ حضرت علی بن ابی طالب' حضرت عبد اللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت قتادہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا تعلق نماز سے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ (جو عقل وخرد والے ہیں) کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں' اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں اور اس کی بھی طاقت نہیں رکھتے تو اپنے پہلوؤں کے بَل نماز ادا کرتے ہیں۔ یعنی کسی حالت میں نماز ترک نہیں کرتے بلکہ ہر حال میں نماز ادا کرتے ہیں۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۵) مجھے بواسیر کی تکلیف تھی' میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کی ادائیگی کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم کھڑے ہو کر نماز ادا کرو' اگر نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھو اور یہ بھی نہ ہو سکے تو کروٹ کے بَل (لیٹ کر) پڑھو۔

(صحیح بخاری: ۱۱۱۷' سنن ترمذی: ۳۷۲' سنن ابوداؤد: ۹۵۲' سنن ابن ماجہ: ۱۲۲۳' مسند احمد ج ۴ ص ۴۲۶' مشکوٰۃ: ۱۲۴۸۔ ص ۱۱۰)

☆ امام ترمذی نے (بھی) اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اُس میں حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مریض کی نماز کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد حدیث حسب سابق ہے۔

زیر بحث آیت کی روشنی میں بیمار آدمی کے لیٹ کر نماز ادا کرنے کی کیفیت میں امام شافعی کے مؤقف سے استدلال اور احناف کا رد

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بیمار آدمی جب لیٹ کر نماز ادا کرے تو اُس پر واجب ہے کہ وہ کروٹ کے بل لیٹ جائے اور سر کے اشاروں سے نماز ادا کرے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ بیمار آدمی جب لیٹ کر نماز ادا کرے تو پیٹھ کے بل چت لیٹ کر نماز ادا کرے اور اس دوران طبیعت میں کچھ بہتری محسوس کرے تو بیٹھ جائے۔[۱۳۲]

امام شافعی کا استدلال زیر بحث آیتِ مبارکہ میں ''وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ'' سے ہے (یعنی وہ لوگ اپنی کروٹوں کے بل اللہ کو یاد کرتے ہیں)۔[۱۳۳] اور دوسرا استدلال حدیث مذکور سے ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ

۱۳۲؎ علامہ خازن نے احناف اور شوافع کا یہ اختلاف غالباً تفسیر کبیر کی اتباع میں ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احناف کا مؤقف جس طرح امام رازی نے صحیح بیان نہیں فرمایا اسی طرح علامہ خازن نے بھی صحیح بیان نہیں کیا۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مؤقف یہ ہے کہ بیمار آدمی جب کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر نماز ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو وہ چت لیٹ کر اور کروٹ کے بَل دونوں طرح نماز پڑھ سکتا ہے' البتہ چت لیٹ کر نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مریض گدی کے بَل چت لیٹ کر نماز پڑھے اور اس کے دونوں پیر قبلہ کی جانب ہوں۔ (سنن دار قطنی ج ۲ ص ۴۳) چت لیٹ کر نماز پڑھنے کے بہتر ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ اس صورت میں لیٹنے والے کا اشارہ کعبۃ اللہ کی فضا کی طرف ہوگا اور کروٹ کے بل لیٹ کر نماز پڑھنے والے کا اشارہ اپنے قدموں کی جانب ہوگا' اس لیے (قیام وقعود سے عاجز ہونے کی صورت میں) مریض کا چت لیٹ کر نماز ادا کرنا کروٹ کے بَل نماز ادا کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

۱۳۳؎ احناف کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق زیر بحث آیت کا تعلق فقط نماز سے نہیں ہے بلکہ اس میں قیام وقعود اور لیٹنے کی حالت میں اللہ کو یاد کرنے کا جو ذکر ہے اس سے یادِ الٰہی کی پابندی اور اس میں مشغول رہنا مراد ہے۔ (جیسا کہ خود علامہ خازن آگے ذکر کر رہے ہیں۔) اور بالفرض اگر یہ آیت صلوٰۃ المریض ہی کے متعلق ہو تب بھی احناف پر اعتراض نہیں ہے' کیونکہ اس میں نہ چت لیٹ کر نماز ادا کرنے کی ممانعت ہے نہ کروٹ کے بل لیٹ کر نماز ادا کرنے کے وجوب کا بیان ہے۔ (تفسیر المظہری' زیر بحث آیت)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:
عنہ سے فرمایا کہ اگر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی بھی طاقت نہ ہو تو کروٹ کے بَل (لیٹ کر) نماز ادا کرو۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے صرف کروٹ کے بَل لیٹ کر نماز ادا کرنے کی صراحت فرمائی ہے۔ کسی اور طرح لیٹنے کی کیفیت کو بیان نہیں فرمایا۔ لہٰذا بیمار شخص (جب لیٹ کر نماز ادا کرے تو) کروٹ کے بَل لیٹ کر نماز ادا کرے گا۔[۳۴]

کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور کروٹوں کے بَل اللہ عزوجل کو یاد کرنے کی تفسیر میں اکثر مفسرین ــــ کا قول اور اس کی دلیل

اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور کروٹ کے بل لیٹ کر ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ (عقل وخرد رکھنے والے) اپنی روزمرہ زندگی کا اکثر حصہ پابندی کے ساتھ یادِ الٰہی میں صرف کرتے ہیں۔ مذکورہ تین احوال (قیام، قعود اور لیٹنے) سے معمولات کا اکثر حصہ اس لیے مراد لیا گیا کہ آدمی عموماً ان ہی تین حالتوں میں سے کسی ایک پر ہوتا ہے۔

(۱۷۶) رسول اللہ ﷺ تمام اوقات میں اللہ عزوجل کا ذکر فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم: ۳/۴۷۳، سنن ترمذی: ۳۳۸۴، سنن ابوداؤد: ۱۸، سنن ابن ماجہ: ۳۰۲، مسند احمد ج ۶ ص ۷۰، صحیح بخاری، تعلیقاً، کتاب الاذان، باب: ۱۹، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۵۶، ص ۴۹)

(۱۷۷) جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اللہ کا ذکر نہ کرے اُس پر اللہ کی جانب سے ناراضگی ہے۔ (اسی طرح) جو خواب گاہ میں لیٹے اور اُس میں اللہ کا ذکر نہ کرے اُس پر اللہ کی ناراضگی ہے اور جو شخص چلے اور اس دوران اللہ کا ذکر نہ کرے اُس پر اللہ کی جانب سے ناراضگی ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۴۸۵۶، مشکوٰۃ المصا[بیح]: ۲/۲۷۲، ص ۱۹۸)

☆ اس حدیث شریف میں ایک لفظ "تِرَۃ" ہے، مراد اس سے نقصان ہے۔ بعض کے نزدیک یہاں اس سے بُرا انجام مراد ہے۔

فکر کی حقیقت اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرنے کی تفسیر

﴿وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (عقل والے لوگ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔)
"فِکر" کا اصل معنی ہے: قلبی خیال کو کسی چیز میں لگا دینا اور دل کا بار بار اُس چیز کی طرف مائل ہونا۔ یہ ایک ایسی قوت کا نام ہے جو علم کو معلومات کا راستہ دکھاتی ہے۔ اور "تفکّر" اُسی قوت کو عقلی زاویہ سے استعمال کرنے کا نام ہے۔ تفکّر اُسی چیز میں ممکن ہے جس کی تصویر دل میں موجود ہو۔ اسی لیے کسی نے کہا کہ اللہ عزوجل کی نعمتوں میں غور کیا کرو، اللہ کی ذات کے بارے میں نہ سوچا کرو[۳۵] کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ اُس کی کوئی شکل وصورت بیان کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر بحث آیت میں اپنے نیک بندوں کے بارے میں یہی بتایا کہ وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں تفکّر کرتے ہیں اور جو جو عجیب وغریب اور انوکھی چیزیں ان دونوں میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں اُن میں غور وفکر کرتے ہیں۔ تاکہ اس غور وفکر سے اُن پر یہ حقیقت ثابت ہو جائے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی قدرت میں کوئی نقص نہیں ہے بلکہ وہ کامل اور مکمل ہے۔ اور یہ بھی پتا چل جائے کہ آسمان اور زمین دونوں کو پیدا کرنے والی ایک ایسی ذات ہے جو قادر، مدبّر اور حکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر

[۳۴] حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے علامہ خازن کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بواسیر کا مرض تھا، (جیسا کہ روایت میں صراحۃً مذکور ہے۔) اس لیے ہو سکتا ہے نبی اکرم ﷺ نے اُن کو اُن کے مرض کی وجہ سے کروٹ کے بل لیٹ کر نماز ادا کرنے کا حکم فرمایا ہو۔ (تفسیر المظہری وتبیان القرآن، زیر بحث آیتِ مبارکہ)

[۳۵] علامہ خازن نے اس کو بہ طور قول ذکر کیا ہے، لیکن کتبِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: مجمع الزوائد ج ۱ ص ۸۱، دُرِّ منثور ج ۲ ص ۱۱۰، کنز العمال: ۵۷۰۷، کتاب الاسماء والصفات ص ۴۲۰

سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت اس لیے حاصل ہوگی کہ اس نے جو جو عظیم چیزیں پیدا فرمائی ہیں وہ سب اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ان کا خالق بھی عظیم ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ:

فی کل شیئی له اية ☆ تدلّ علی انه واحد — ہر شئی میں اُس کی نشانی موجود ہے جو اُس کے ایک ہونے کو ثابت کرتی ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فکر'' فرک کا مقلوب ہے۔ کیونکہ فکر کا لفظ معنوی چیزوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا معنیٰ ہے: ''فـرک الامـور وبـحثهـا طـلبا للوصول الی حقيقتها'' (معاملات کی تہ تک پہنچنے کے لیے اُن کو کھرچنا اور کریدنا)۔

بعض فرماتے ہیں کہ فکر (یعنی سوچ و بچار کرنا) غفلت کو دور کر دیتا ہے اور دل میں خوف پیدا کرتا ہے جیسے پانی کھیتی میں اضافہ کرتا ہے۔ غموں سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو دلوں کو ویران کرے اور فکر سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے دلوں کو روشنی ملے۔

آگے فرمایا: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بیکار پیدا نہیں فرمایا۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بیکار پیدا نہیں فرمایا۔

﴿بَاطِلًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو نے یہ بے فائدہ اور بلاحقیقت پیدا نہیں فرمایا بلکہ تو نے اس کو اپنی وحدانیت اور کمالِ قدرت کی دلیل بنایا ہے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تو کسی چیز کو بے فائدہ اور بے حکمت پیدا کرنے سے پاک ہے۔ ﴿فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔) مراد یہ ہے کہ ہم نے اس بات کی تصدیق کی کہ تو اکیلا ہے اور تیری ہی ملکیت میں جنت اور دوزخ ہیں' پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

جملہ مذکورہ (سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ) میں بندوں کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ اللہ عزوجل کے حضور دُعا کس طرح کی جائے۔ سو جو شخص دُعا کرنے کا ارادہ کرے اُسے چاہیے کہ آغاز میں اللہ عزوجل کی حمد و ثناء کرے جیسا کہ ''سُبْحٰنَكَ'' سے ثابت ہوتا ہے۔ حمد و ثناء کے بعد دُعا کرے جیسا کہ ''فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' سے ثابت ہو رہا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

اے ہمارے پروردگار! بے شک تو نے جس کو دوزخ میں داخل کر دیا یقیناً اس کو تو نے رُسوائی دی اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور لفظ ''اخزٰی'' اور ''خِزْیٌ'' کی تحقیق

﴿اَخْزَيْتَهٗ﴾ کا معنیٰ یہ ہے کہ تو نے اُس کو رُسوا اور ذلیل کر دیا۔ بعض کے نزدیک اس کا معنیٰ ہے: تو نے اُسے ہلاک کر دیا اور ایک قول یہ ہے کہ تو نے اُسے رُسوا کیا اور خوب تکلیف دی۔ یہ لفظ ''خِـزْیٌ'' سے ہے اور یہ استخفاف یا انکسار کی ایک کیفیت ہے جو انسان پر طاری ہوتی ہے (استخفاف کا معنیٰ ہے: اپنے آپ کو معمولی اور حقیر سمجھنا اور انکسار کا معنیٰ ہے: عاجز ہونا)۔ اسی کیفیت کا نام ''حیاءِ مُفرط'' ہے (یعنی آدمی کا بہت زیادہ باحیاء ہونا)۔

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ ''ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''۔ (ظلم کا معنیٰ ہے: کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر

دوسری جگہ رکھنا) یہاں ظالموں سے مراد مشرکین ہیں کیونکہ انہوں نے عبادت کو اُس کے مرکز سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دیا (یعنی غیر اللہ کو پوجنے لگے)۔ ان لوگوں کے لیے ایسے افراد نہیں ہوں گے جو قیامت کے دن ان کی مدد کر سکیں اور انہیں عذاب سے بچا سکیں۔

زیر بحث آیت اور التحریم: ٨ سے معتزلہ کا اپنے ایک فاسد نظریہ پر استدلال اور اہل سنت کی جانب ــــ سے اُس کے متعدد جوابات

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ معتزلہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم: ٨ میں فرمایا ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ (اپنے) نبی اور اُن کے ساتھ ایمان والوں کو رُسوا نہیں کرے گا'' اور زیر بحث آیت میں یہ ہے کہ ''اے ہمارے پروردگار! جس کو تو نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو یقیناً تو نے رُسوا کیا''۔ ان دونوں آیات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہنم میں جو شخص بھی جائے گا وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ کیونکہ جہنم میں جانا رُسوائی کا سبب ہے اور صاحب ایمان کو (قیامت کے دن) رُسوا نہیں کیا جائے گا۔

علماء نے معتزلہ کے اس استدلال کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

(١) ایک جواب تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے جو زیر بحث آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ جہنم میں داخل کرنے سے ہمیشہ جہنم میں رکھنا مراد ہے (یعنی اے ہمارے پروردگار! جس کو تو نے جہنم میں ہمیشہ کے لیے داخل کر دیا اس کو تو نے رُسوا کیا)۔ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت صرف اُن لوگوں کے بارے میں ہے جن کو جہنم سے نکالا نہیں جائے گا۔

یہ جواب اہل سنت کے مذہب پر تو صحیح ہے کیونکہ مذہب اہل سنت یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اُنہیں (ایک مخصوص وقت کے بعد) نکال لیا جائے گا' لیکن معتزلہ کے مذہب پر یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ ''فاسق کو ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے گا' لہٰذا یہ لوگ (گناہگار مسلمان) زیر بحث آیت میں داخل ہیں''۔

(٢) دوسرا جواب یہ ہے کہ جس کو جہنم میں داخل کیا جائے گا وہ داخل ہوتے وقت رُسوا ہوگا اگرچہ انجام اس کا یہ ہو کہ اس کو نکال لیا جائے۔ اس صورت میں زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ہمارے رب! جس کو تو نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو تو نے اس میں داخل کر کے اور اس کا عذاب دے کر رُسوا کر دیا۔ اس مفہوم کی تائید حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ کسی عمرہ کے دوران حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے ہاں آئے تو میں اور حضرت عطاء دونوں اُن کے پاس گئے اور اُن سے ''رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ'' کے متعلق سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ جہنم میں رسوائی اُس وقت نہیں ہوگی جب آگ جلائے گی بلکہ اس سے پہلے رُسوائی ہوگی۔ امام ابن جریر طبری نے اسی جواب کو اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ جس شخص کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اُسے اگرچہ بعد میں نکال لیا جائے لیکن محض اُس میں داخل ہونے سے ہی وہ رسوا ہو جائے گا۔ رُسوائی سے مراد یہ ہے کہ اُس کا پردہ فاش ہو جائے گا اور اس کے عیوب و گناہ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

علامہ ابن الانباری فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''اَخْزَيْتَهٗ'' سے کوئی مخصوص معنیٰ مراد لینے پر چونکہ کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو عموم پر رکھا جائے۔

(۳) تیسرا جواب جو علماء معانی نے دیا ہے یہ ہے کہ ''خـزی'' کا لفظ کئی معانی کی گنجائش رکھتا ہے۔ مثلاً ''اِهـانة'' (توہین کرنا' رسوا کرنا) ''اِهلاک'' (تباہ و برباد کرنا) ''اِبعاد'' (دور کرنا' دھتکارنا) یہ معانی کافروں کے لیے ہیں۔ اور ایک معنیٰ ''اِخـجال'' بھی ہے (یہ معنیٰ شرمندہ کرنا) جب کسی شخص کو شرم آ جائے یا کوئی قابل شرم کام کرے اور اس پر شرمندہ ہو تو عربی میں کہا جاتا ہے: ''خزی خزاية''۔ اس تفصیل کی روشنی میں جواب کی وضاحت یہ ہے کہ جس مؤمن کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اس کے لیے ''اَخْزَيْتَهٗ'' کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم میں جانے کی وجہ سے اُسے اہل ایمان سے حیاء آئے گی تا آنکہ وہ جہنم سے باہر آ جائے۔ اور کافر کے لیے ''اَخْزَيْتَهٗ'' کا مفہوم یہ ہے کہ تباہ و برباد کیا جائے گا یعنی جہنم میں ہمیشہ رکھا جائے گا۔

خلاصہ اس جواب کا یہ ہے کہ ''اِخـزاء'' کا لفظ شرمندہ کرنے اور تباہ کرنے کے معنیٰ میں مشترک ہے۔ اور جو لفظ مشترک ہو اُس سے اُس کے تمام معانی مراد لینا ممکن نہیں ہے۔ خواہ کلام منفی ہو یا مثبت۔ اس لیے زیر بحث آیت سے (معتزلہ کا اپنے موقف پر) استدلال ساقط ہے۔

(۴) چوتھا جواب جس کو امام فخر الدین رازی نے اختیار فرمایا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے' یہ ہے کہ سورۃ التحریم میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ''قیامت کے دن اللہ (اپنے) نبی اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا'' اس کا تقاضا مطلقاً رسوائی کی نفی نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایمان والے نبی (ﷺ) کے ساتھ ہوں گے اس وقت اُنہیں رسوا نہیں فرمائے گا۔ اور یہ اس بات کے خلاف نہیں ہے کہ پورے وقت میں کسی بھی وقت رسوا کیا جائے۔ کیونکہ دوسرے کسی وقت میں رسوائی ممکن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم نے ایک منادی کو ایمان کی نداء فرماتے ہوئے سنا کہ (اے لوگو!) تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے' اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہمارے گناہوں کی بخشش عطا فرما اور ہماری خطاؤں کو محو فرما اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت عطا فرماO

آیت مذکورہ کی تفسیر اور اس بات کی تحقیق کہ منادی سے سیدنا محمد ﷺ کی ذات مراد ہے یا قرآن کریم؟

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ (اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک منادی کو ایمان کی نداء فرماتے ہوئے سنا کہ تم لوگ اپنے رب پر ایمان لے آؤ۔) حضرت سیدنا ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ منادی سے مراد سیدنا محمد عربی ﷺ کی ذات ہے۔ اس قول کی تائید اُس آیت سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے (اپنے محبوب ﷺ سے) فرمایا کہ ''آپ (لوگوں کو) حکمت (یعنی مضبوط دلائل) کے ساتھ اپنے رب کی راہ کی طرف بلایئے''۔ (النحل:۱۲۵) اور اُس آیت سے بھی تائید ہوتی ہے جس میں آپ کے بارے میں فرمایا: ''اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بُلانے والے''۔ (الاحزاب:۴۶)

محمد بن کعب قرظی کا قول یہ ہے کہ ﴿مُـنـادی﴾ سے مراد قرآن کریم ہے۔ کیونکہ اس آیت میں یہ ہے کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے مُنادی کو سُنا'' جبکہ ہر شخص کی نبی اکرم ﷺ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے منادی سے قرآن کریم مراد ہونا چاہیے کیونکہ قرآن کریم کو ہر شخص سنتا اور سمجھتا ہے اور سننے سمجھنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرماتا ہے تو آدمی

ایمان لے آتا ہے۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی کہ قرآن کریم میں رشد و ہدایت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ثابت کرنے والے مختلف النوع دلائل بھی ہیں اس لیے قرآن کریم گویا اُن دلائل کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ (واضح رہے کہ) ﴿لِلْاِیْمَانِ﴾ میں لام ''اِلٰی'' کے معنیٰ میں ہے (یعنی ہم نے ایک منادی کو سُنا وہ ایمان کی طرف آنے کی نداء کررہا تھا)۔ ﴿فَاٰمَنَّا﴾ تو ہم نے اس کی تصدیق کی۔

''ذنوب'' اور ''سیّات'' کی تفسیر اور اس میں متعدد اقوال

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا﴾ اس میں ''ذنوب'' سے کبیرہ گناہ مراد ہیں اور ''سیات'' سے صغیرہ گناہ مراد ہیں (یعنی اے پروردگار! تو ہمیں ہمارے کبیرہ گناہوں کی بخشش عطا فرما اور ہمارے صغیرہ گناہوں کو محو فرما)۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ﴿اِغْفِرْ﴾ ''غَفْرٌ'' سے ہے اور ''غفر'' کا معنیٰ ڈھانپنا ہے۔ اسی طرح ﴿كَفِّرْ﴾ کا معنیٰ بھی ڈھانپنا ہے۔ دونوں الفاظ کو ذکر کرنے کا مقصد تاکید اور کلام میں زور پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ ہمیں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہم گریہ وزاری اور خوب اصرار اور کوشش کے ساتھ دُعا کریں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اغفر لنا ذنوبنا'' سے مراد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے گذشتہ گناہوں کی بخشش عطا فرما اور ''کفّر عنا سیّاتنا'' سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں ہونے والی ہماری خطاؤں کو معاف فرما۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ''اغفر لنا ذنوبنا'' میں وہ گناہ مراد ہیں جو توبہ کرنے سے ختم ہو جائیں اور ''کفّر عنا سیاتنا'' میں وہ گناہ مراد ہیں جو عبادت اور نیکیاں کرنے سے ختم ہو جائیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ مراد یہ ہے کہ ہمیں نیک لوگوں کی جماعت اُن کے زمرے میں موت عطا فرما۔ نیک لوگوں سے مراد انبیاء کرام اور صالحین ہیں۔ اور اُن کے ساتھ وفات سے مراد یہ ہے کہ ہمیں اپنے نیک بندوں کی طرح عمل پر موت عطا فرما۔ تاکہ ہم قیامت کے دن اُن کے درجہ میں ہوں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اُن کے ساتھ وفات سے مراد یہ ہے کہ ہمیں نیک بندوں کے پیروکاروں میں اور اُن کے گروہ میں موت عطا فرما۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿١٩٤﴾

اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جن کا تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رُسوا نہ فرمانا' بے شک تو وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور یہ دُعا کہ ''جن چیزوں کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عطا فرما'' اس پر۔۔۔ اشکال اور اس کے متعدد جوابات

آیت میں ﴿عَلٰی رُسُلِكَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اپنے رسولوں کی زبانی تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے رسولوں کی تصدیق کرنے پر تو نے ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عطا فرما۔

یہاں اگر یہ سوال ہو کہ جب اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی فرماتا ہی نہیں ہے تو اُس سے یہ دُعا کیوں کی گئی کہ جن چیزوں کا تو نے وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عطا فرما؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہاں درحقیت اُن کاموں کی توفیق طلب کرنا مراد ہے جن کی وجہ سے وعدہ پورا کرنے کے اسباب محفوظ رہیں (یعنی اے پروردگار! تیرے وعدہ پورا کرنے کے جو اسباب ہیں اُن کو بروئے کار لانے والے اعمال کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما)۔ بعض مفسرین نے جواب یہ دیا ہے کہ یہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں پناہ طلبی' عاجزی وانکساری اور بندگی کے اظہار کا ایک انداز ہے۔ جیسے انبیاء کرام علیہم السلام اپنی بخشش کا علم ہونے کے باوجود اللہ

تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی اللہ عزوجل کے حضور عاجزی انکساری اور پناہ طلب کرنا ہوتا ہے جو کہ بندگی کی پہچان اور نشانی ہے۔ بعض مفسرین نے جواب یہ دیا ہے کہ زیر بحث دُعا کا مفہوم یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو تیرے انعام کے مستحق ہیں اور جنہیں تو وہ چیز عطا فرمائے گا جس کا تو نے اُن سے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا ہے۔ یہ دُعا اس لیے کی گئی کہ جس نعمت و عزت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اُس کے مستحق ہونے کا دعا کرنے والوں کو یقین حاصل نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ دُعا کی کہ ہمیں اپنی نعمت اور اجر و ثواب کا مستحق بنا۔ بعض مفسرین نے جواب یہ دیا ہے کہ زیر بحث دُعا میں درحقیقت عُجلت کی درخواست کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دینے کا جو وعدہ فرمایا تھا اس کو جلد پورا کرنے کی دُعا کی گئی ہے۔ (گویا) دُعا کرنے والوں نے یوں کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم جانتے ہیں کہ تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں فرماتا' لیکن تیرے حِلم اور برداشت پر ہم صبر نہیں کر پا رہے۔ اس لیے تو دشمنوں کو جلد ہلاک فرما اور ہمیں اُن پر فتح و نصرت عطا فرما۔

آیت مذکورہ میں رسوائی سے بچنے کی دُعا کرنے پر ایک سوال کا جواب

﴿ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (قیامت کے دن ہمیں رُسوا نہ فرمانا۔) یعنی ہمیں ہلاک نہ فرمانا' ہمارے گناہوں کو ظاہر نہ کرنا۔ یہاں اگر یہ سوال ہو کہ گذشتہ جملہ میں جو فرمایا کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جن کا تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے وعدہ فرمایا ہے'' اس میں اجر و ثواب کی طلب ہے اور یقیناً جب اجر و ثواب ملے گا تو عذاب نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود یہ کیوں فرمایا گیا کہ ہمیں قیامت کے دن رُسوا نہ فرما؟ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ یہاں درحقیقت اطاعت و عبادت اور گناہوں سے بچنے کی توفیق طلب کرنا مقصود ہے۔ گویا دُعا کرنے والوں نے یوں کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں نیکیوں کی توفیق عطا فرما اور جب تو اس کی توفیق عطا کرے تو ایسے کاموں سے بچا جو نیکیوں کو ضائع کرنے اور ہمیں رُسوا یعنی تباہ کرنے کا باعث ہوں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رُسوائی سے بچنے کی دُعا اس لیے کی گئی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر فرمایا ہے:

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ اللہ کی جانب سے اُن کے سامنے وہ عذاب ظاہر ہوا جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ (الزمر: ٤٧)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے آپ کو نیک عمل کرنے والا سمجھتا ہے لیکن قیامت کے دن ظاہر ہوگا کہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اُس وقت اُسے شرمندگی اور افسوس ہوگا۔ زیر بحث جملہ (وَلَا تُخْزِنَا) میں اسی کیفیت کو دُور کرنے کی دُعا کی گئی ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝١٩٥

پس اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کروں گا خواہ مرد

ہو یا عورت' تم سب ایک ہو' پس جنہوں نے ہجرت کی اور انہیں اُن کے گھروں سے نکال دیا گیا اور میری راہ میں ستایا گیا اور انہوں نے جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور اُن کی تمام خطاؤں کو مٹا دوں گا اور اُنہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں (یہ) اللہ کے ہاں (اُن کے لیے) جزاء ہے اور اللہ ہی کے پاس بہترین جزاء ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور عبادت کا ثواب پانے میں مرد و عورت کی برابری

﴿فَاسْتَجَابَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اُن کے رب نے اُن کی دُعا قبول فرمائی اور جو اُنہوں نے مانگا تھا وہ عطا کر دیا۔ ﴿اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اُن سے فرمایا کہ اے صاحبانِ ایمان! میں تمہارا عمل (اور محنت) برباد نہیں کروں گا بلکہ تمہیں اس کی جزاء دوں گا۔ ﴿مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى﴾ سے مراد یہ ہے کہ عمل کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت' میں اس کا عمل ضائع نہیں کروں گا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ:

(۱۷۸) میں نے عرض کی: یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے نہیں سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بیان میں عورتوں کا کوئی تذکرہ کیا ہو' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (الی اخر الایة)"۔

(سنن ترمذی: ۳۰۲۳' المستدرک ج ۲ ص ۳۰۰' الدر المنثور ج ۲ ص ۱۱۲)

آگے فرمایا: ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (تم سب ایک ہو۔) یعنی دین میں' مدد کرنے میں اور دوستی میں تم سب ایک ہو۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب آدم و حواء سے ہو۔ بعض فرماتے ہیں "من بعض" میں "مِنْ" کاف کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی تم سب عبادت پر ثواب پانے میں اور گناہ پر سزا پانے میں ایک دوسرے کی طرح ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ "فلانٌ منّی" (فلاں مجھ سے ہے) یعنی میرے طریقہ اور عادت پر ہے۔ بعض مفسرین نے زیرِ بحث جملہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ مرد اور عورتیں اطاعت و فرمانبرداری میں ایک شکل پر ہیں۔

آیت مبارکہ کے بقیہ حصہ کی تفسیر اور فقراء صحابہ کا مقام

﴿فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ﴾ (جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیا گیا اور میری راہ میں ستایا گیا۔) یعنی جن ہجرت کرنے والوں نے اپنے وطن اور اپنے اہل و عیال کو چھوڑا اور اُنہیں اُن کے اسلام اور اتباعِ رسول ﷺ کی وجہ سے مشرکین نے ستایا' جس کے نتیجہ میں وہ ہجرت کر کے اللہ اور اس کے رسول کی طرف چلے گئے اور اللہ و رسول ہی کی خاطر اپنے وطن اور خاندان کو چھوڑا (اُن کے گناہ معاف ہیں اور اُن کے لیے جنت ہے)۔ ﴿فِیْ سَبِیْلِیْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جنہیں میری اطاعت و فرمانبرداری کی خاطر اور میری رضا کی طلب میں ستایا گیا۔ اس سے وہ مہاجرین صحابہ مراد ہیں جنہیں مشرکین نے مکہ معظمہ سے نکال دیا تو کچھ صحابہ طائف کی طرف ہجرت کر گئے اور کچھ صحابہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ سے پہلے اور کچھ آپ کی ہجرت کے بعد مدینہ منورہ چلے گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ (مستقل طور پر) مدینہ منورہ آ گئے تو جن صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ بھی لوٹ کر آپ کے پاس آ گئے۔ آیت میں ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے دشمن سے جہاد کیا اور جہاد کے دوران شہید ہو گئے۔ ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ﴾ میں اُن کے گناہ مٹا دوں گا اور اُن کے گناہوں کی اُنہیں بخشش دے دوں گا۔ ﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (یہ اللہ کے نزدیک اُن کے لیے جزاء ہے۔) یعنی ان لوگوں کے گناہوں کو جو مٹایا جائے گا اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا یہ اُن کے لیے اللہ عزوجل کے فضل و کرم اور احسان کے طور پر اجر و ثواب ہو گا۔ ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (اللہ ہی کے پاس بہترین اجر و ثواب ہے) یہ اس بات کی تاکید

ہے کہ مذکورہ افراد کو اللہ تعالیٰ جو اجر و ثواب عطا کرے گا وہ اُس کا فضل و کرم ہوگا کیونکہ وہ بہت ہی عطا کرنے والا اور نوازنے والا ہے۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۷۹) میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا وہ ہجرت کرنے والے اُن فقراء صحابہ کا ہوگا جن کو مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں' اُنہیں جب کوئی حکم دیا گیا تو انہوں نے سن کر اس پر عمل کیا۔ ان میں کسی کو اگر حاکمِ وقت سے کوئی کام پڑا اور اس کا وہ کام نہ بن سکا حتیٰ کہ وہ اپنی اس حاجت کو سینے میں لے کر انتقال کر گیا تو قیامت کے دن اللہ عزوجل جنت کو بُلائے گا' وہ اپنی زیبائش و آرائش کے ساتھ حاضر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے وہ بندے جو میری راہ میں لڑے اور شہید ہوئے' میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں جہاد کیا وہ کہاں ہیں؟ (پھر اُن سے کہا جائے گا کہ) جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ بغیر کسی عذاب و حساب کے جنت میں چلے جائیں گے۔ فرشتے یہ سب کچھ دیکھ کر حاضر ہوں گے اور سجدہ کریں گے اور عرض کریں گے: پروردگار! ہم شب و روز تیری پاکیزگی اور عظمت بیان کرتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں جن کو تو نے ہم پر ترجیح دی ہے؟ رب عزوجل فرمائے گا کہ یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے میری راہ میں جہاد کیا اور میری راہ میں اذیتوں کا سامنا کیا۔ فرشتے یہ سُن کر جنت کے ہر دروازے سے ان کے پاس یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ: ''سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ'' (تمہارے صبر و ہمت کی وجہ سے تم پر سلامتی ہو' آخرت کا گھر بہت ہی اچھا ہے)۔

(جامع البیان للطبری زیر بحث آیت' المستدرک ج ۲ ص ۷۱' درِ منثور ج ۲ ص ۱۱۲)

گذشتہ آیات دُعائیہ کو بیان کرنے کا مقصد اور دُعا کی مقبولیت کا نسخہ

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیات جو مختلف دعاؤں پر مشتمل ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کو یہ بات سکھانا مقصود ہے کہ دُعا کس طرح کرنی چاہیے اور اس کی بارگاہ میں عاجزی اور گریہ وزاری کس طرح کرنی چاہیے۔ اِن آیات میں جو بار بار ''ربنا'' کا لفظ آیا ہے اس میں عاجزی کے اظہار کا ایک انداز ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سے دُعا اچھی طرح قبول ہوتی ہے۔ حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کسی معاملہ میں مصیبت آ جائے وہ پانچ مرتبہ ''ربنا'' کہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے خوفناک چیز سے نجات دے گا اور اُس کی خواہش کو پورا فرمائے گا۔ پھر انہوں نے مذکورہ آیاتِ دُعا پڑھیں۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ افراد جنہوں نے دُعائیں کیں اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ بات ظاہر فرمائی کہ انہوں نے پانچ مرتبہ ''ربنا'' کہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ: ''استجاب لهم ربهم'' (اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمالی)۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾

(اے مخاطب!) کافروں کا شہروں میں (خوش حالی سے) گھومنا پھرنا تمہیں دھوکہ میں ہرگز نہ ڈال دے O (یہ عیش و عشرت) قلیل مدت کا ساز و سامان ہے پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا بُرا ٹھکانا ہے O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور پس منظر

یہ آیت مبارکہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی۔مشرکین بہت خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے' کاروبار کرتے تھے اور مزے اُڑاتے تھے۔بعض مسلمانوں نے یہ دیکھ کر کہا کہ اللہ کے دشمن تو مزے میں ہیں اور ہم مصیبت میں ہیں۔اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مذکورہ:۱۹۶ میں جو فرمایا: ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ﴾ (تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے) اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے کیونکہ آپ (ﷺ) نے کبھی دھوکہ نہیں کھایا۔مفہوم یہ ہے کہ اے سننے والے! تجھے کافروں کا زمین میں گھومنا اور تجارت ومنفعت اور کمائی کے لیے زمین میں سفر کرنا دھوکہ میں نہ ڈال دے۔

﴿مَتَاعٌ قَلِيلٌ﴾ کا معنیٰ ہے: ''ذالک متاع قلیل'' یعنی یہ سب کچھ قلیل اور فنا ہونے والا گزارے کا سامان ہے اور زائل ہونے والی نعمت ہے۔﴿ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ﴾ پھر آخرت میں اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ''مِهَاد'' کا معنیٰ ہے: بچھونا۔یعنی جہنم کیا ہی بُرا بچھونا ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

لیکن جو اپنے رب سے ڈرتے رہے اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں' وہ اُن (باغات) میں ہمیشہ رہیں گے' (یہ) اللہ کی طرف سے مہمانی ہوگی اور جو (نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ نیک لوگوں کے لیے (تمام چیزوں سے) بہتر ہیں O

آیت مذکورہ کی تفسیر اور دُنیا کے مقابلہ میں آخرت کی برتری کا بیان

﴿الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے' اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے اور اپنے منع کردہ امور سے بچنے کا حکم فرمایا ہے اس میں وہ اپنے رب عزوجل سے ڈرتے ہیں اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں' وہ اُن باغات میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ میں ''نزلا'' سے بدلہ اور اجر وثواب مراد ہے اور ''من عند اللہ'' سے اللہ کا فضل وکرم اور احسان مراد ہے (یعنی مذکورہ تمام نعمتیں پرہیزگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بدلہ اور جزاء کے طور پر ہوں گی)۔

''نُزُل'' اُن چیزوں کو کہتے ہیں جو مہمان کی آمد پر تیار کی جاتی ہیں۔

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ میں ''ما عند اللہ'' سے بھلائی' عزت اور وہ دائمی نعمتیں مراد ہیں جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔اور ''خیر للابرار'' سے مراد یہ ہے کہ وہ فضل وکرم اور نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے نیک اور فرمانبردار لوگوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں وہ دُنیا کی اُس عیش وعشرت اور ساز وسامان سے بہت بہتر ہیں جس میں یہ کفار گھوم رہے ہیں۔کیونکہ دُنیا کا سامان قلیل اور زوال پذیر ہے۔

حضرت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۸۰) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ اپنے بالا خانہ میں چٹائی پر (لیٹے ہوئے) تھے۔آپ کے سر مبارک کے نیچے چمڑے کا ایک تکیہ تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔آپ کے پیروں کی جانب درخت سَلَم کے بہت

سے بٹے پڑے ہوئے تھے اور سرہانے کچھ کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشان دیکھے اور دیکھ کر میں رو پڑا۔ آپ نے فرمایا: کیوں رو رہے ہو؟ میں نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! قیصر و کسریٰ کتنی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہ رہے ہیں' جبکہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اور یہ عالم ہے)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ اُن کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت۔ ☆ اس حدیث کے الفاظ صحیح بخاری کے مطابق ہیں۔

(صحیح بخاری: ۴۹۱۳' صحیح مسلم: ۱۴۲۳' سنن ابن ماجہ: ۴۱۵۳' سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۶' مسند احمد ج ۱ ص ۴۳۴' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۴۰۔ ص ۴۴۷)

☆ اس حدیث میں ایک لفظ ''مشربة'' آیا ہے اس کا معنیٰ ہے: کمرہ اور بالا خانہ۔ اس کی جمع ''مشارب'' ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

اور یقیناً بلاشبہ اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اُس (کتاب) پر جو آپ پر نازل کی گئی اور جو اُن پر نازل کی گئی' اُن کے دل اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں' وہ اللہ کی آیتوں کے بدلہ قلیل معاوضہ بھی نہیں لیتے ہیں' ان ہی لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے' بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے O

آیت مذکورہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟ اس میں مفسرین کے متعدد اقوال

(۱) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ والیِ حبشہ حضرت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اُن کا نام اصحمہ تھا۔ اصحمہ کا معنیٰ عربی زبان میں عطیّہ ہے۔

ہوا یہ کہ جب نجاشی کا انتقال ہو گیا تو جبریل امین نے اُسی دن رسول اللہ ﷺ کو اُن کے انتقال کی خبر دی۔ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا: چلو اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھو' نجاشی کا اپنے علاقہ میں انتقال ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بقیع میں تشریف لائے اور حبشہ کی زمین آپ پر ظاہر کر دی گئی۔ آپ نے نجاشی کا جنازہ دیکھا اور پھر چار تکبیرات اور دُعائے مغفرت کے ساتھ اس کی نماز جنازہ ادا کی۔[۱۳۶] منافقین نے جب یہ معاملہ دیکھا تو کہنے لگے کہ اس نبی کو دیکھو۔ ایک ایسے عجمی حبشی عیسائی کی نمازِ جنازہ ادا کر رہے ہیں جس کو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں اور نہ وہ ان کے دین پر تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تردید میں مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

[۱۳۶] اس میں نجاشی کی نمازِ جنازہ کا جو تذکرہ ہے وہ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ لیکن اس میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حبشہ کی زمین نبی اکرم ﷺ پر ظاہر کر دی گئی۔ البتہ صحیح ابن حبان میں یہ تصریح ہے کہ: وهم لا يظنون الا ان جنازته بين يديه. یعنی اس جنازہ میں صحابہ کرام کو یہی ظن تھا کہ حضرت نجاشی کا جنازہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے حاضر ہے۔ (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ج ۵ ص ۴۰) اور فتح الباری میں صحیح ابوعوانہ کے حوالہ سے اسی واقعہ کے متعلق یہ صراحت ہے کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور ہم یہی سمجھتے تھے کہ جنازہ ہمارے آگے موجود ہے۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۳) نیز اسی فتح الباری میں امام واحدی کی اسباب النزول سے یہ روایت موجود ہے کہ حضرت نجاشی کا جنازہ نبی اکرم ﷺ کے لیے ظاہر کر دیا گیا تھا' آپ ﷺ نے اُسے دیکھا اور اُس پر نماز ادا فرمائی۔ (لہٰذا اس واقعہ سے غائبانہ نمازِ جنازہ کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔) (فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۳' شرح الزرقانی علی المواہب ج ۸ ص ۸۷' بحوالہ فتاویٰ رضویہ مخرجہ ج ۹ ص ۳۴۹)

(٢) بعض مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ نجران کے چالیس، حبشہ کے تین اور روم کے آٹھ آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے۔ پھر نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے اور آپ کی تصدیق کی۔

(٣) بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے۔

(٤) بعض کا قول یہ ہے کہ یہ اُن تمام یہود ونصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے یہودیت اور عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ یہی قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ گذشتہ آیات میں جب کفار اور یہود ونصاریٰ کا حال بیان کیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے تو اب زیر بحث آیت میں اُن یہود ونصاریٰ کا حال بیان کیا جارہا ہے جو اسلام لے آئے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ اُن کا ٹھکانا جنت ہے۔

آیت مبارکہ میں ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد کچھ یہودی اور عیسائی ہیں۔ ﴿يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم پر جو کتاب نازل کی گئی ہے یعنی قرآن کریم اس پر یہ لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اور ﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ یہ اُن کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، مثلاً تورات، انجیل اور زبور۔

﴿خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے آگے عاجزی انکساری کرنے والے ہیں، تکبّر کرنے والے نہیں ہیں۔ ﴿لَا يَشْتَرُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ دیگر سردارانِ یہود کی طرح اپنی کتابوں میں نہ تبدیلی اور تحریف کرتے ہیں نہ سلطنت و رشوت اور لوگوں سے روئی پانی وصول کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ﴾ سے اشارہ اُن یہود ونصاریٰ کی طرف ہے جو اس آیت میں مذکورہ اوصاف کے مالک ہوں۔ ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے جو اعمال کیے ہیں اُن کا اجر وثواب اُن کے لیے اللہ عزوجل کے پاس جمع ہے، وہ قیامت کے دن اُنہیں مکمل ثواب عطا فرمائے گا۔ ﴿سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام باتوں کو جاننے والا ہے، بندوں کا کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق وہ بدلہ عطا فرمائے گا کیونکہ وہ ''سریع الحساب'' (جلد حساب لینے والا) ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٢٠٠﴾

اے ایمان والو! (قدرتی مصائب پر) صبر کرو اور (دشمن کے مقابلہ میں) ثابت قدم رہو اور اپنے نفس اور سرحدوں کی حفاظت کرو اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

صبر کا معنیٰ، صبر کی اقسام اور زیر بحث آیت میں صبر کا حکم دینے کی متعدد تفاسیر

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا﴾ (اے ایمان والو! صبر کرو۔) یعنی اپنے دین پر قائم رہو اور کسی تکلیف، مصیبت یا کسی اور وجہ سے اس دین کو ترک نہ کرو۔ ''صبر'' کا اصل معنیٰ ہے: ''حبس النفس عما لا يقتضيه شرع ولا عقل'' (جو باتیں شرعاً اور عقلاً دُرست نہ ہوں اُن سے اپنے آپ کو روک کے رکھنا)۔ لفظِ صبر عام ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس کی چند اقسام ہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ صبر کی تین اقسام ہیں: (١) ترکِ شکایات (یعنی شکوہ شکایت نہ کرنا) (٢) قبولِ قضاء (یعنی تقدیر کے

فیصلہ کو مان لینا) (۳) صدقِ رضا (یعنی حقیقۃً راضی رہنا)۔

اس آیت مبارکہ میں صبر کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی اطاعت پر صبر کرو (یعنی اس میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو)۔ (۲) ایک قول یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔ (۳) ایک قول یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے دوران آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔ (۴) ایک قول یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے حکم پر عمل کرنے میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔ (۵) ایک قول یہ ہے کہ آزمائشوں میں صبر کرو۔ (۶) ایک قول یہ ہے کہ جہاد میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔ (۷) ایک قول یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکام پر عمل کرنے میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرو۔

مصابرہ اور مرابطہ کا معنیٰ اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں مرابطہ کے معنیٰ کی تحقیق

﴿وَصَابِرُوْا﴾ یہ ''مُصَابَرۃ'' سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ کافروں اور دشمنوں (کے مقابلہ) پر صبر کرو اور اُن سے جہاد کرو۔ اور ﴿وَرَابِطُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ مشرکین سے ہمیشہ اور ثابت قدمی کے ساتھ جہاد کرو۔ مرابطہ کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ دو مخالف گروہ ایک دوسرے سے جنگ کی تیاری کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑے باندھ لیں۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق ہر اُس شخص پر ہونے لگا جو سرحد کی حفاظت اور حملہ آور سے بچاؤ کرنے پر مقرر رہوا گرچہ اُس نے کوئی سواری نہ باندھی ہو۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

(۱۸۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ (عزوجل) کی راہ میں ایک دن سرحد پہ پہرہ دینا دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور جنت میں تمہارے ایک کوڑے کی مقدار جگہ دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور صبح یا شام اللہ (عزوجل) کی راہ میں نکلنا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔[۱۳۷] (صحیح بخاری: ۲۷۹۲،۲۷۹۴، ۲۸۹۲، صحیح مسلم: ۱۸۸۰۔۱۸۸۱)

حضرت سلمان الخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

(۱۸۲) ایک دن اور ایک رات سرحد پر پہرہ دینا ایک ماہ کے روزوں اور قیام سے زیادہ بہتر ہے۔ اگر (بالفرض) اُس دن وہ مر گیا تو اُس کا وہ عمل جاری رہے گا اور اُسے رزق بھی ملتا رہے گا اور فتنۂ قبر سے اُسے محفوظ رکھا جائے گا۔

(صحیح مسلم: ۱۹۱۳، مسند احمد ج ۵ ص ۴۴۰، سنن بیہقی ج ۹ ص ۳۸، المستدرک ج ۲ ص ۸۰)

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مرابطہ سے مراد یہ ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا جائے۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں ایسے غزوات نہیں ہوتے تھے کہ اُن میں سرحدوں پر حفاظت کی غرض سے گھوڑے باندھے جاتے ہوں بلکہ (اُس وقت) مرابطہ یہ تھا کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اس معنیٰ کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱۸۳) کیا میں ایسے اعمال نہ بتاؤں جن (کے وسیلہ) سے اللہ تعالیٰ خطائیں مٹا دیتا ہے اور درجات کو بلند فرماتا ہے؟ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ (ﷺ)! کیوں نہیں۔ فرمایا: مشقت اور پریشانی کے باوجود وضو کو کامل اور مکمل کرنا، کثرت سے مسجد کی

---

۱۳۷ یہ حدیث شریف، آل عمران: ۱۷۰۔۱۷۱ کی تفسیر میں رقم: ۱۴۸ اور ۱۴۹ کے تحت گزر چکی ہے۔ مزید حوالہ جات وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

طرف جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ یہی رباط ہے، یہی رباط ہے (یعنی یہی سرحد کی حفاظت ہے)۔[١٣٨]

(صحیح مسلم:٢٥١، سنن ترمذی:٥١، سنن ابن ماجہ:٤٢٧، سنن نسائی:١٤٣، مسند احمد ج٢ص ٢٢٥، مؤطا امام مالک:٣٩٣، المستدرک ج١ص ١٩١، مشکوٰۃ المصابیح:٢٨٢۔ص ٣٨)

اختتام پر فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔) محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو معاملات ہیں اُن میں تم مجھ سے ڈرتے رہو تاکہ کل جب تم مجھ سے ملاقات کرو تو کامیابی حاصل ہو۔

زیرِ بحث آیت کی صوفیانہ تفسیر

زیرِ بحث آیتِ مبارکہ کی علماء معانی نے جو تفاسیر کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(١) اے ایمان والو! میری آزمائشوں پر صبر کرو، میری نعمتوں پر قائم رہو، میرے دشمنوں سے مقابلہ پر کمر بستہ رہو، میرے سوا کسی اور سے محبت کرنے سے بچو تاکہ (کل بروزِ قیامت) مجھ سے ملاقات کر کے تم کامیاب ہو جاؤ۔

(٢) بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ نعمتوں (میں آنے والی مشکلات) کو برداشت کرو، تنگ دستی اور محتاجی پر خوب صبر کرو، دشمنوں کے گھر میں مقابلہ کرو، زمین و آسمان کے معبود سے ڈرو تاکہ دار البقاء (آخرت) میں تمہیں کامیابی حاصل ہو۔

(٣) بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ سلامتی کی امید کے ساتھ دنیا اور دنیا کی مصیبتوں پر صبر کرو، دشمن سے لڑتے وقت ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ صبر کا مظاہرہ کرو، نفسِ لوامہ سے ہمیشہ لڑتے رہو، جو کام ندامت کا باعث بنیں اُن سے بچو تاکہ کل بروزِ قیامت دار العزّت میں تم کامیاب ہو جاؤ۔

واللہ اعلم بمرادہ واسرار کتابہ (اللہ عزوجل اپنی مراد اور اپنی کتاب کے اسرار و رموز کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے)۔

۞۞۞۞۞

---

[١٣٨] اس حدیث شریف میں مشقت اور پریشانی کے باوجود وضوء کو کامل اور مکمل کرنے سے مراد یہ ہے کہ پانی کی جب قلّت اور ضرورت ہو یا کسی مقام پر مہنگے داموں خریدنا پڑ جائے یا سردی کے موسم میں پانی ٹھنڈا ہو یا اس طرح کی اور کوئی مشکل صورتِ حال درپیش ہو اُس وقت مکمل آداب کے ساتھ کامل وضوء کرنا گناہوں کی معافی اور درجات کی بُلندی کا باعث ہے۔ کثرت سے مسجد کی طرف جانے سے مراد یہ ہے کہ ہر فرض نماز کو مسجد میں ادا کیا جائے اور نماز کے علاوہ دیگر عبادات کے لیئے بھی مسجد میں حاضری دی جائے تو یہ بھی موجبِ ثواب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بلاضرورت قریب کی مسجد کو چھوڑ کر دُور جا کر نماز پڑھے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار سے مراد یہ ہے کہ قلبی طور پر نماز کو یاد رکھا جائے اور اپنے کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود اس کی طرف توجہ رکھی جائے۔ حدیث شریف کے آخر میں جو فرمایا کہ یہی رباط ہے، یہی رباط ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہی اعمال سرحدِ ایمان کی حفاظت ہیں۔ جس طرح دشمن کے مقابلہ میں مورچے سنبھالنا ظاہری رباط ہے اسی طرح نفس اور شیطان کے مقابلہ میں مذکورہ اعمال کو اختیار کرنا باطنی رباط ہے۔ (مرقات ج٢ص ١٠، مراۃ ج٥ص ٢١٨)

مآخذ و مراجع

کتب الٰہیہ

۱۔ قرآن مجید
۲۔ تورات

کتب احادیث

۳۔ امام مالک بن انس اصبحی مدنی متوفی ۱۷۹ھ' مؤطا امام مالک' مطبورہ دار المعرفہ بیروت' ۱۴۱۹ھ
۴۔ امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ' المصنّف' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۲۱ھ
۵۔ امام عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۶ھ
۶۔ امام عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ' المصنف' مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی' ۱۴۰۶ھ
۷۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' المسند' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۱۵ھ
۸۔ امام ابو عبد اللہ بن عبد الرحمٰن دارمی متوفی ۲۵۵ھ' سنن دارمی' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۷ھ
۹۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ' صحیح بخاری' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۲۲ھ
۱۰۔ امام ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ' صحیح مسلم' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۸ھ
۱۱۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ' سنن ابن ماجہ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۹ھ
۱۲۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ' سنن ابو داؤد' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت' ۱۴۲۱ھ
۱۳۔ امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ' سنن ترمذی' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' ۱۴۲۳ھ
۱۴۔ امام علی بن عمر دار قطنی متوفی ۳۸۵ھ' سنن دار قطنی' مطبوعہ نشر السنۃ ملتان' ۱۴۲۰ھ
۱۵۔ امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن نسائی' مطبوعہ مکتبۃ المعارف ریاض' ۱۴۱۷ھ
۱۶۔ امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ' سنن کبریٰ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۱۱ھ
۱۷۔ امام احمد بن علی المثنی التمیمی متوفی ۳۰۷ھ' مسند ابو یعلیٰ' مطبوعہ دار المأمون بیروت' ۱۴۰۴ھ
۱۸۔ امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ' صحیح ابن خزیمہ' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۵ھ
۱۹۔ امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی متوفی ۳۲۱ھ' شرح معانی الآثار' مطبوعہ مکتبہ حقانیہ ملتان
۲۰۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ' المستدرک' مطبوعہ مکتبہ نزارِ مصطفیٰ ریاض' ۱۴۲۰ھ
۲۱۔ امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' سنن کبریٰ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۲۰ھ
۲۲۔ امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ' شعب الایمان' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۲۱ھ
۲۳۔ امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ' شرح السنۃ' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۹ھ

۲۴- امام عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری متوفی ۶۵۶ھ الترغیب والترہیب مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ ۱۴۰۷ھ
۲۵- امام ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۱ھ مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۴ھ
۲۶- امام ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۱ھ مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۲۷- امام حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ جمع الجوامع مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۱ھ
۲۸- علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری متوفی ۹۷۵ھ کنز العمال مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹ھ

کتب تفاسیر

۲۹- امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ جامع البیان مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ۱۴۲۱ھ
۳۰- امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ احکام القرآن مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۱۲ھ
۳۱- امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ معالم التنزیل مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۰ھ
۳۲- علامہ محمود بن عمر زمخشری حنفی متوفی ۵۳۸ھ الکشاف مطبورہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۷ھ
۳۳- امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ تفسیر کبیر مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور
۳۴- علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ تفسیر قرطبی مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۲۰ھ
۳۵- علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ البحر المحیط مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۲ھ
۳۶- امام حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الدر المنثور مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ۱۴۲۱ھ
۳۷- امام حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الاتقان فی علوم القرآن مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور
۳۸- امام حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الاتقان فی علوم القرآن مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۳۹- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی مصری حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ عنایۃ القاضی (حاشیہ بیضاوی) مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۷ھ
۴۰- علامہ احمد جیون جونپوری حنفی متوفی ۱۱۳۰ھ تفسیرات احمدیہ مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور
۴۱- علامہ محمد اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ روح البیان مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۱ھ
۴۲- قاضی ثناء اللہ مظہری پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ تفسیر مظہری مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ۱۴۱۲ھ
۴۳- ادارہ ضیاء المصنفین ترجمہ تفسیر مظہری مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
۴۴- علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ روح المعانی مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۰ھ
۴۵- علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی متوفی ۱۳۶۷ھ خزائن العرفان مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
۴۶- حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ تفسیر نعیمی مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ لاہور
۴۷- جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری ضیاء القرآن مطبوعہ ضیاء القرآن لاہور
۴۸- شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور

شروح حدیث

۴۹- قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ اکمال المعلم بفوائد مسلم مطبوعہ دارالوفا بیروت ۱۴۱۹ھ
۵۰- علامہ ابوالعباس احمد بن عمر ابراہیم القرطبی مالکی متوفی ۶۵۶ھ المفہم مطبوعہ دارابن کثیر بیروت ۱۴۱۷ھ

۵۱- علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ شرح مسلم مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۵۲- حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور
۵۳- حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۲۰ھ
۵۴- حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۵۵- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ عمدۃ القاری مطبورہ دار الحدیث ملتان
۵۶- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ شرح سنن ابوداؤد مطبوعہ مکتبۃ الرشید ریاض ۱۴۲۰ھ
۵۷- علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی متوفی ۱۰۱۴ھ مرقات المفاتیح مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۵۸- شیخ محقق شاہ عبد الحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ اشعۃ اللمعات مطبوعہ کتب خانہ مجیدیہ ملتان
۵۹- حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ مراۃ المناجیح مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ لاہور
۶۰- شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم مطبوعہ فرید بک اسٹال لاہور

کتب سیرت وتاریخ ولغت

۶۱- حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ البدایہ والنہایہ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۴ھ
۶۲- علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی متوفی ۹۴۲ھ سبل الہدیٰ والرشاد مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۴ھ
۶۳- علامہ محمد عبد الباقی زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ شرح المواہب اللدنیہ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۳ھ
۶۴- جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری ضیاء النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مطبوعہ ضیاء القرآن لاہور
۶۵- علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی سیرت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) مطبوعہ مکتبۃ المدینہ کراچی
۶۶- علامہ عزّ الدین ابن الاثیر الجزری متوفی ۶۳۰ھ اسد الغابہ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۴ھ
۶۷- حافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ تقریب التہذیب مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۴۲۲ھ
۶۸- علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ المفردات مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
۶۹- علامہ میر سیّد شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ کتاب التعریفات مطبوعہ دار المنار
۷۰- لوئیس معلوف الیسوعی المنجد مطبوعہ دار الاشاعت کراچی
۷۱- محمد رواس وحامد صادق قنیبی معجم لغۃ الفقہاء مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی

کتب فقہ

۷۲- علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۴۲۰ھ
۷۳- علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ ہدایہ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان
۷۴- علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ ہدایہ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور
۷۵- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ البنایہ مطبوعہ مکتبہ حقانیہ ملتان
۷۶- علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ فتح القدیر مطبوعہ دار الفکر بیروت
۷۷- علامہ حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ الحاوی للفتاویٰ مطبوعہ فیصل آباد
۷۸- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن الخطاب المغربی المالکی متوفی ۹۵۴ھ مواہب الجلیل مطبوعہ مکتبۃ النجاح لیبیا

۷۹- علامہ علاء الدین محمد بن علی حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ، درِّ مختار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ
۸۰- علامہ نظام الدین حنفی متوفی ۱۱۶۱ھ، فتاویٰ عالمگیری، مطبوعہ مطبع کبریٰ مصر، ۱۳۱۰ھ
۸۱- علامہ شمس الدین محمد بن عرفہ دسوقی مالکی متوفی ۱۲۱۹ھ، حاشیۃ الدسوقی، مطبوعہ دار الفکر بیروت
۸۲- علامہ سیّد محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ، ردّ المحتار (فتاویٰ شامی)، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۹ھ
۸۳- فخر المتکلمین علامہ محمد بن عبد العزیز پرہاروی، النبراس مع شرح العقائد، مطبوعہ مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ
۸۴- اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ، فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور
۸۵- صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی متوفی ۱۳۷۶ھ، بہارِ شریعت، مطبوعہ از مطابع مختلفہ